سب رس

ادارۂ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

چاند سلطانہ
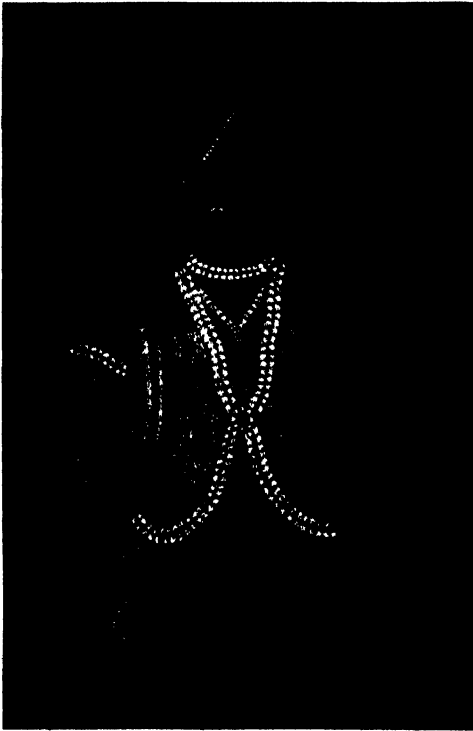
نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۴)

"اِدارۂ ادبیاتِ اُردو" حیدرآباد دکن

کا

ماہ نامہ

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

زیر ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکشؔ

جلد (۱) شمارہ (۸) اگست ۱۹۳۸ء

فہرست تصاویر

فہرست مضامین

اِدارِیَہ

ادارۂ ادبیاتِ اردو کی جدید تنظیم

"ادارۂ ادبیاتِ اردو" سے متعلق ہم نے گذشتہ شمارہ میں بعض باتیں لکھی ہیں۔ اب اس کے مقاصد، قواعد اور معلومات ایک کتابی صورت میں شائع کر دیئے گئے ہیں۔ ان کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ "ادارہ" کی مجلس مؤسسین نے "ادارہ" کی جدید تنظیم میں غور و فکر سے کام لیا ہے۔ ادارہ کے سرپرست اعلیٰ ہز ہائنس والاشان نواب اعظم جاہ بہادر شہزادۂ برار ہیں۔ ہز ہائنس کو جو علمی و ادبی ذوق ورثہ میں ملا ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اس لئے "ادارہ" کی آپ سے وابستگی نے بڑی خوش گوار توقعات پیدا کر دی ہیں۔ ہز ہائنس کے بعد سرپرستوں میں ہز اکسلنسی رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر اکبر حیدری، نواب سالار جنگ بہادر ثالث اور راجہ شام راج راجونت بہادر کے نام نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قدردانِ علم و ادب ہیں۔ سر اکبر حیدری کے اردو دنیا پر احسانات کا ایک عملی ثبوت جامعہ عثمانیہ ہے جس کی تاسیس میں انھوں نے انتہائی کوشش فرمائی تھی۔ نواب سالار جنگ بہادر قدیم دکنی ادبیات کا اپنے بیش بہا کتب خانہ میں ایک نایاب ذخیرہ رکھتے ہیں اور خوشی کی بات ہے کہ وہ صرف کتب خانہ کی الماریوں میں بند نہیں رکھا گیا بلکہ اس کی اشاعت کا انتظام بھی کیا گیا ہے۔ راجہ شام راج راجونت بہادر حیدرآباد کے ایک قدیم باعظمت خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کو علم و ادب کا اچھا ذوق ہے۔ "ادارہ" کی صدارت نواب مہدی یار جنگ بہادر نے قبول فرمائی ہے۔ نواب صاحب خوش ذوق وسیع النظر اور علم و فضل کے مالک ہیں۔ ان کی رہنمائی میں "ادارہ" کی غیر معمولی ترقی یقینی ہے۔

ادارہ کے معاونین بھی اہل ذوق اور علم دوست اصحاب ہیں، نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ، مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب، مولوی لیاقت اللہ خاں صاحب، مولوی سید اظہر حسین صاحب، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، حضرت امجدؔ، مولوی قاضی محمد حسین صاحب، مولوی سید محمد حسین صاحب جعفری، نواب عنایت جنگ بہادر، مولوی سید محمد اعظم صاحب، مولوی مرزا حسین علی خاں صاحب، مولوی سید علی اکبر صاحب، راجہ نرسنگھ راج بہادر عالیؔ، مولوی سجاد مرزا صاحب، مولوی خورشید علی صاحب، مولوی مرزا احمد بیگ صاحب، ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب، محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ اور مولوی میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر کی معاونت اور ادارہ کے مؤسسین، ڈاکٹر زورؔ، پروفیسر سروری، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، پروفیسر عبدالقادر صدیقی اور مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی علمی دلچسپی سے یقین ہے کہ ادارہ کی بڑھتی ہوئی ترقی میں برق رفتاری پیدا ہو جائے گی۔

ادارہ نے مستند علمی و ادبی خدمات اور ادارہ کے علمی و ادبی کاموں میں عملی ہمدردی کے اعتراف میں بعض اصحاب کو "رفیق" منتخب کیا ہے۔ یہ ایک اچھی ابتدا ہے، اور اس کا ارادہ ہے کہ ہر سال کے ختم پر وہ اسی طرح مجلس رفقا کی فہرست میں اضافہ کرتا رہے گا، اس سے ایک طرف تو ادارہ نے اپنا حق ادا کیا ہے اور دوسری طرف خدمت کا احساس رکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اب تک ادارہ نے ان اصحاب کو رفیق بنایا ہے:۔ ڈاکٹر محمد رضی الدین صاحب، ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب، ڈاکٹر قاری

کلیم اللہ صاحب، ڈاکٹر امیر علی خاں صاحب ہاشم، مولوی سید محمد صاحب، مولوی سید محمد اکبر صاحب وفاقانی، نواب محمد ظہیر الدین خاں صاحب، مولوی میر حسن صاحب، مولوی مخدوم محی الدین صاحب، مولوی میر سعادت علی صاحب رضوی، مولوی میر سکندر علی صاحب وجد، مسٹر اکھویندر راؤ جذب، محترمہ لطیف النسا بیگم صاحبہ، محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ، مسٹر مہندر راج سکینہ اور میکش۔

"ادارہ" کے قواعد وضوابط اسی شمارہ میں کہیں دوسری جگہ شائع کئے جارہے ہیں۔ ہر صاحب ذوق کو ان کا مطالعہ کرکے یہ سوچنا چاہئے کہ اسے اس ادارہ کی سرپرستی اور معاونت کرنا چاہئے یا نہیں؟ ہمیں یقین ہے کہ غور وفکر کے یہ لمحے انھیں ضرور "ادارہ" کی طرف متوجہ کرکے رہیں گے اور جو اصحاب سرپرستی اور معاونت قبول نہ کرسکتے ہوں، وہ کم از کم رکن بن کر ادارہ کی مطبوعات سے فائدہ اٹھائیں گے۔

ماضی کے کارنامے مستقبل کے لئے

"یوم ولی" کے بعد ہی دکن کے قدیم ادب کی تحقیق اور اشاعت کے لئے نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی میں ایک انجمن قائم ہوئی جس کے صدر مولوی سید محمد اعظم صاحب ہیں، نائب صدر ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، معتمد مولوی سید محمد صاحب، نائب معتمد نواب سعادت علی صاحب رضوی اور اراکین مولوی مرزا حسین علی خاں صاحب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری اور پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی۔ یہ انجمن بڑی محنت سے قدیم دکنی کتابوں کو ترتیب دے رہی ہے۔ چنانچہ اب تک کوئی پچیس کتابیں مرتب اور طبع کی گئی ہیں جو عنقریب شائع ہوجائیں گی۔

اس انجمن کا سب سے بڑا کارنامہ محمد قلی قطب شاہ بانیٔ حیدرآباد کے اُردو دیوان کی طباعت ہے۔ اس کی ضخامت کوئی ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ اس ضخیم دیوان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانہ میں نہ صرف عاشقانہ شاعری ہی کا رواج تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ فطری شاعری کی طرف خاص توجہ کی جاتی تھی۔ چنانچہ قلی قطب شاہ کے دیوان میں سیکڑوں ایسی نظمیں ملتی ہیں۔ اس کتاب کے علاوہ کلیات عبداللہ قطب شاہ، نصرتی کی کتابیں گلشن عشق اور علی نامہ، غواصی کی سیف الملوک وبدیع الجمال اور طوطی نامہ، شاہ برہان الدین جانم کا ارشاد نامہ اور سکھ سہیلا، صنعتی کا قصۂ ابوتمیم انصاری، عبدل کا ابراہیم نامہ اور مثنویات شاہ سراج اور نگ آبادی مرتب اور طبع کی گئی ہیں۔ ان سب کتابوں کے ساتھ دکنی الفاظ کی فرہنگ اور یادداشتیں شائع کی جارہی ہیں۔ جن لوگوں کو تحقیق وتدقیق کا ذوق ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ کام کس قدر دقت طلب ہے، لیکن نواب سالار جنگ بہادر کی سرپرستی اور مرتب کرنے والوں کے ذوق عمل نے اس کو آسان کردیا ہے۔ بلاشبہ اردو ادب پر اس انجمن کا ایک احسان عظیم ہے۔ اس لئے کہ اس کی وجہ سے اُردو دنیا میں نئے انکشافات کا رونما ہونا یقینی ہے۔

ایک کروٹ

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ گئی تھی، لیکن اس سال پھر اس نے اپنی کروٹ بدلی ہے اور زندگی کا ثبوت دیا ہے — اس محوِخواب کی طرح جو ایک احساسِ بیداری کے ساتھ چونک اٹھتا ہے — لیکن صبح کا بھولا اگر شام کو واپس آئے تو اُسے بھولا نہ سمجھنا چاہئے۔ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے ایک زمانہ تک ملک کے تعلیمی مسائل میں گہری دلچسپی لی تھی اور اس کی دلچسپیوں کے آثار اب بھی عملاً موجود ہیں۔ اس کی تحریکات کی
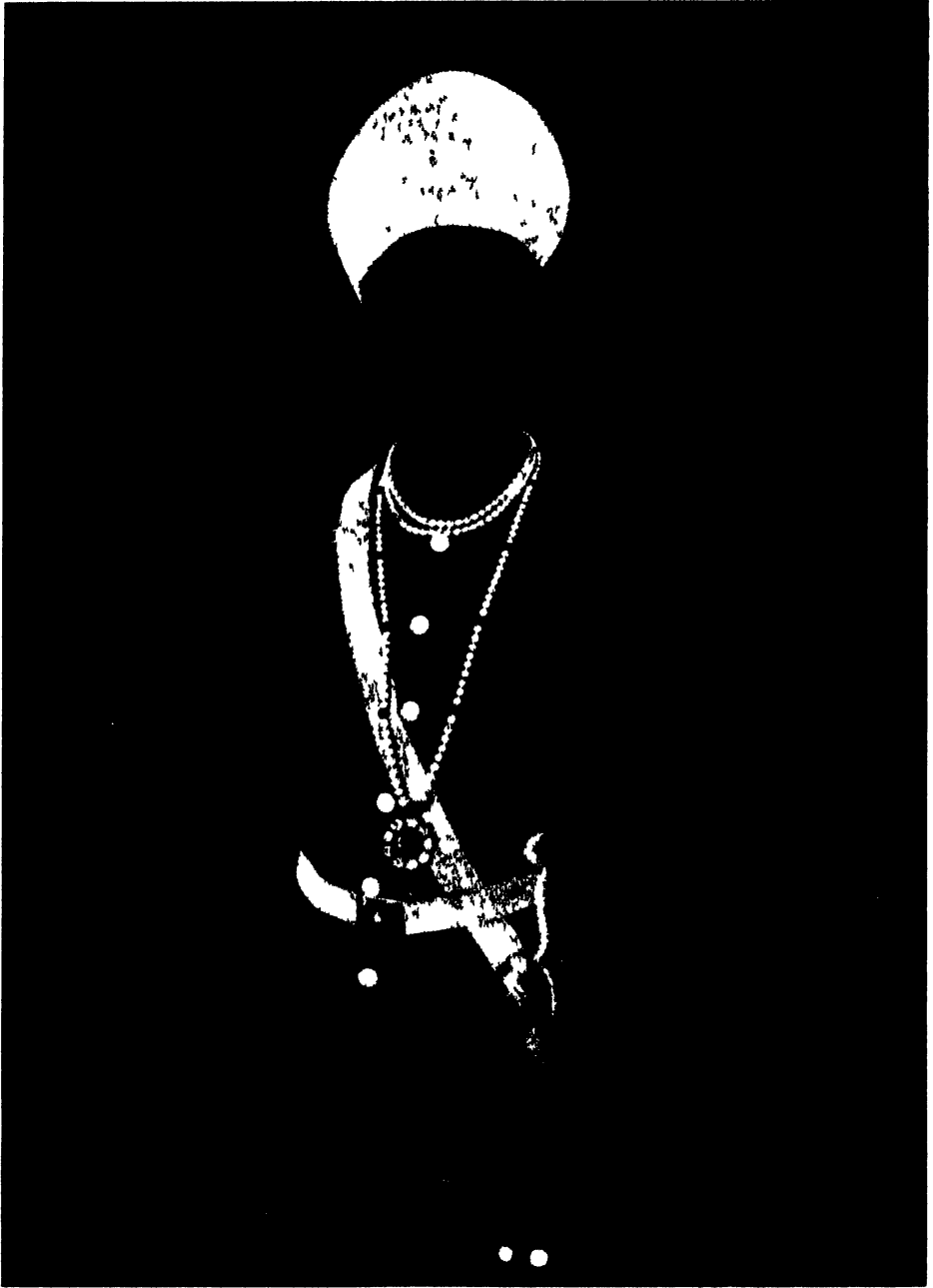
نواب سالار جنگ بہادر

خاص وقعت تھی اور ان میں سے اکثر ملک کے حالات کو پیش نظر رکھ کر بر وقت پیش کی جایا کرتی تھیں۔

کام کے وقت کسی ایک پر بھروسہ کر لینا اور ناکامی کے وقت کسی ایک کے سر تمام الزامات تھوپ دینا' دنیا کا دستور ہے۔ چنانچہ کانفرنس کے جمود کے متعلق بھی "شکوہ و شکایت" کا ایک دفتر کھل گیا۔ ارباب کانفرنس اگر برا نہ مانیں تو ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا کانفرنس کا سارا نظام ایک ہی مرکز پر کار فرما تھا؟ اگر کسی ایک فرد نے اس کے کاموں میں دلچسپی نہیں لی تو ساری ملت کیا اس ایک فرد کے تغافل میں گم ہو گئی — کسی کو سوتا ہوا دیکھ کر یہ ضروری نہیں کہ تمام جاگنے والے اپنے سر پر لحاف ڈال لیں بات یہ ہے جب اپنی کمزوری کا احساس ہوتا ہے تو لوگ دوسروں کی آڑ میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔

بہر حال جو کچھ بھی ہوا اس سال پھر یہ کانفرنس منعقد ہو رہی ہے۔ اس کی گذشتہ اہمیت کے پیش نظر ہم نے سب رس کا ایک حصہ اس کے لئے خاص طور پر وقف کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کانفرنس بہت جلد اپنی گذشتہ عظمتیں حاصل کر لے گی' اور اس کی رگ و پے میں وہی خونِ عمل موجزن ہو جائے گا جس نے اس کو ایک "زندہ ادارہ" کی طرح کار فرما رکھا تھا۔

دو نئی کتابیں

ادارہ ادبیات اردو نے دو نئی کتابیں شائع کی ہیں — نقد سخن اور گریہ و تبسم۔ نقد سخن' کلامِ فانی پر نواب عزیز یار جنگ بہادر کی سخن ورانہ تنقید ہے۔ تصنیف و تالیف کی دنیا میں تنقید کی اہمیت ہے لیکن افسوس ہے کہ اکثر نقادوں نے تنقید اور ذاتیات کی حدیں ملا دی ہیں' اور جب کبھی وہ تنقید کرتے ہیں تو ان کی نظروں کے سامنے "کیا لکھا" کا سوال ضمنی بن جاتا ہے اور "کس نے لکھا؟" ان کے ذوق تنقید کا موضوع بن جاتا ہے۔ خلوص اور عداوت کے جذبات میں بہہ کر وہ اپنی ان ذمہ داریوں کو فراموش کر دیتے ہیں جو بہ حیثیت دیانت دار نقاد کے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ نواب عزیز کی یہ تنقید بڑی حد تک اس عیب سے پاک ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہم نواب عزیز کے اُن تمام اعتراضات سے متفق ہوں جو انھوں نے کلامِ فانی پر کئے ہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ ہر شخص ان سے اتفاق کرے۔ یہ تنقید پبلک ہو چکی ہے اور ضرورت ہے کہ اس کے متعلق ایک عام بحث شروع کی جائے۔ اسی خیال کے تحت ہم نے "سب رس" میں نواب عزیز کی تنقید کا جواب اور ان کی جانب سے اس کا جواب الجواب شائع کیا تھا۔

اُردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کو اس طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ کھوٹے کھرے کا صحیح اندازہ قائم کیا جا سکے۔

"گریہ و تبسم" مدیر سب رس کی نظموں کا مجموعہ ہے اس کے "حسن و قبح" کے متعلق اس کے پڑھنے والے ہی رائے دے سکتے ہیں۔ البتہ اس سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے' شباب کے تبسم کی یہ چند لہریں اور مرتعش دل کی ٹھیس سے بہنے والے آنسوؤں کی یہ چند بوندیں — محض جذبات اور احساسات کا سرمایہ ہیں جن کو "فن اور ادب" سے کوئی تعلق نہیں۔ "گریہ و تبسم" اسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے کہ وہ دل کی آواز ہے اور اگر اُس نے دلوں پر اثر کر لیا تو اس کے ہزاروں عیب اُس کی ایک ہی خوبی میں دب کر رہ جا سکتے ہیں۔

خوش گوار تاثرات

گذشتہ مہینے شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب صدر شعبۂ عربی جامعہ دہلی' ڈاکٹر زبیر صاحب صدیقی

صدر شعبہ اسلامیات کلکتہ یونیورسٹی، مولوی سلیمان ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ اور مولوی شاہد احمد صاحب بی اے مدیر ساقی دفتر " ادارۂ ادبیات اردو " پر تشریف لائے اور دفتر " سب رس " کا بھی معائنہ کیا۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ اچھے اثرات لئے ہوئے گئے۔ ان چاروں اصحاب سے جو خدمت گزاران علم و ادب ہیں، اردو کے مستقبل، جدید ادب کے رجحانات اور اسی قسم کے بعض دوسرے مسائل پر تبادلۂ خیال کرکے ہمیں مسرت ہوئی۔

"خیر جاریہ" عربی ادبیات کی وسعت، اس کی بلندی اور لطافت اور سب سے بڑھ کر اس کی غیر فانی زندگی اس قابل ہے کہ مشرق اس کی جانب خاص طور پر توجہ کرے۔ ہم ہر چیز کے ایک ہی رخ کو دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں مغربی ادبیات کی افادیت مسلم لیکن ہم اپنے لٹریچر سے اس قدر بیگانہ ہیں کہ اس کے جوہر ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں۔

دائرۃ المعارف، جس کے سالانہ اجلاس حال ہی میں ختم ہوئے ہیں، عربی ادبیات کی اشاعت کے لئے اعلیٰ حضرت غفران مکاں کی سرپرستی میں نواب عماد الملک، ملا عبد القیوم اور نواب فضیلت جنگ کی کوششوں سے قائم ہوا تھا۔ اس ادارہ کا کام عربی ادب کی اشاعت ہے۔ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے عہد مبارک میں اس دائرہ نے بڑی ترقی کرلی ہے اور خوش قسمتی سے اس کے صدر سر اکبر حیدری اور معتمد نواب مہدی یار جنگ بہادر ہیں۔

اس سال فرخندہ بنیاد میں اس دائرہ کے سالانہ اجلاسوں کی وجہ سے بڑی علمی چہل پہل رہی۔ اکثر علماء و فضلاء بہ حیثیت سرکاری مہمان یہاں آئے اور اپنے علم و فضل سے اہل حیدرآباد کو مستفید کیا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا افتتاح اعلیٰ حضرت بندگان عالی کے ایک گراں قدر پیام سے ہوا جس میں ارشاد ہمایونی ہوتا ہے کہ

> "مجھے بہت مسرت یہ سن کر ہوئی کہ اس مرتبہ مجلس دائرۃ المعارف کا ایک سالانہ اجلاس منعقد ہونے والا ہے جس میں علوم عربیہ کے متبحر عالم، ہندوستان کی مشہور جامعات اور دیگر علمی اداروں سے آکر شریک ہونے والے ہیں۔ پس میں امید کرتا ہوں کہ ان کی قیمتی معلومات سے دائرۃ المعارف کے کارکن نیز ہماری جامعہ عثمانیہ کے عربی شعبہ کے اساتذہ اور طلبہ مستفید ہوں گے اور دوسری طرف یہ علما خود ہمارے دائرۃ المعارف کی تحقیق اور تصحیح کے کام کو دیکھ سکیں گے جس کی بدولت حیدرآباد کو علوم عربیہ میں ایک بین الاقوامی حیثیت حاصل ہوگئی اور جس کی شہرت نہ صرف بلاد اسلامی میں بلکہ یورپ کے اکثر حصوں میں پھیل گئی ہے، جہاں کے سربرآوردہ مستشرقین اس کام میں ہمارے علماء کے ساتھ حصہ لے رہے ہیں۔ آخر میں، میں امید کرتا ہوں کہ یہ نیک اور خالص علمی کام ایک خیر جاریہ کی طرح ہمیشہ برقرار رہے گا۔"

سر اکبر حیدری نے اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں دائرۃ المعارف کے کاموں کا مختصراً تعارف کرایا۔ اور آپ نے کہا کہ "مصر سے جامعہ ازہر کے ایک وفد نے جو حال ہی میں حیدرآباد آیا تھا، اس مجلس کا تفصیل سے معائنہ کرنے کے بعد نہ فقط اس کے طریق کار کی تحسین کی بلکہ یہ بیان کیا کہ گو کہ مصر میں بھی قدیم کتابیں شائع ہوتی ہیں، مگر مجلس دائرۃ المعارف کے پیش نظر جو علمی تحقیق اور احیاء علوم ہے، وہ اس کو دوسرے اس قسم کے اداروں سے ممتاز کرتی ہے۔" آپ نے اس امر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ

جشن سیمیں شاہانہ کی تقریب میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور آکسفورڈ یونیورسٹی کو اس مجلس کے مطبوعات بھیجی گئیں فرمایا کہ "انڈیا آفس کے مشہور کتب خانہ نے بھی بعض کتابیں حاصل کرنے کی خواہش کی ہے۔ ہندوستان کے بھی اکثر مشہور کتب خانوں سے فرمائشیں آتی رہی ہیں اور یورپ کے بھی اکثر مستشرقین نے ان مطبوعات کی تعریف کی ہے۔"

ان اجلاسوں میں شرکت کے لئے جو حضرات باہر سے تشریف لائے ان میں مولانا سید سلیمان صاحب ندوی، مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، شمس العلماء مولانا عبدالرحمان صاحب، مولانا عبدالعزیز صاحب، ڈاکٹر داؤد پوتا صاحب، ڈاکٹر زبیر صاحب صدیقی، مولانا امتیاز علی صاحب عرشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہم دائرۃ المعارف کے سالانہ اجلاس کی کامیابی پر نواب مہدی یار جنگ بہادر کو مبارکباد دیتے ہیں۔ ایک لائق باپ کے لگائے ہوئے پودے کو تناور بنانے میں ایک لائق فرزند کی مخلصانہ کوشش یقیناً لائق مبارک باد ہے۔

کچھ اپنے متعلق

گذشتہ شمارہ صرف (۴۶) صفحات پر شائع کیا گیا۔ اگرچہ یہ "سب رس" کے قواعد کے خلاف نہیں، تاہم ہماری گذشتہ ششماہی روایات کے پیش نظر ایک کمی ضرور تھی جس کا ہمیں احساس ہے۔ لیکن "اقبال نمبر" کے سلسلے میں غیر معمولی مصروفیات نے ہمیں اس شمارہ کی ترتیب کے لئے کم مہلت دی اور ہم نے پابندی وقت کی خاطر چند صفحات کی قربانی گوارا کرلی۔ اس کے علاوہ جب ہم محرم نمبر اور اقبال نمبر کی ضخامت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں خوشی ہوتی ہے کہ ہم نے بڑی حد تک قبل از قبل اس کمی کی تلافی کردی تھی۔

"اقبال نمبر" کے انعامی مضامین اور نظموں کا تصفیہ اس وقت ہوا جب کہ جولائی نمبر شائع ہوچکا تھا۔ ہم نہایت مسرت کے ساتھ حسب ذیل مضامین کے لئے انعامات کا اعلان کرتے ہیں:—

کلام اقبال میں رجائیت کا عنصر از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ (انعام عطیہ نواب ولی داد خاں صاحب مندوزی)

اقبال (نظم) از حضرت علی اختر اختر حیدرآبادی (انعام عطیہ صاحبزادہ اشرف بی۔ اے)

اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی از ح انصاری متعلم ریذیڈنسی مڈل اسکول (انعام عطیہ خواجہ حمید الدین صاحب شاہد)

دوستوں کا مکالمہ از مرزا عثمان بیگ صاحب متعلم سٹی کالج (انعام عطیہ معین الدین صاحب انصاری)

محسن قوم اقبال (نظم) از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ (انعامات عطیہ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز و سراج الدین احمد صاحب)

سب رس کے حالیہ شمارہ کا ایک حصہ ایجوکیشنل کانفرنس سے متعلق ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ اس میں جو مضامین شائع ہو رہے ہیں وہ اس کانفرنس کے متعلق معلومات آفرینی کا ذریعہ بن سکیں گے۔

اس نمبر میں نواب سالار جنگ بہادر کی تصویر شائع کی جارہی ہے۔ نواب صاحب معزز امرائے حیدرآباد میں نہ صرف تمول کے اعتبار سے ایک خاص درجہ رکھتے ہیں بلکہ آپ میں مشرقی امارت کی بعض اچھی خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔ اب جب کہ قدیم زمانہ کے امیروں کی علمی سرپرستیاں، افسانوں کی طرح سنائی جاتی ہیں، آپ کا وجود مغتنمات سے ہے۔ نواب صاحب قدیم دکنی کتابوں کو اپنی سرپرستی میں شائع کروا رہے ہیں۔ اور یہ ایک ناقابل فراموش احسان ہے جس کے بوجھ سے

رہتی دنیا تک اُردو کی گردن خم رہے گی۔

چاند بی بی کی تصویر جو سکندر علی وجد کی نظم کے سلسلہ میں شائع کی جارہی ہے نواب صاحب کی عطیہ ہے۔ یہ تصویر نہ صرف تاریخی اہمیت رکھتی ہے بلکہ اپنی ندرت اور نفاست کے اعتبار سے حسن کاری کا بھی ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم حضرت کیفی مرحوم اور مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب کی تصویریں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے سلسلے میں شائع کی جارہی ہیں۔ مولوی محمد مرتضیٰ اور حضرت کیفی اس کانفرنس کے بانیوں میں شمار کئے جاتے ہیں اور مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب اس کے ابتدائی کارکنوں میں سے ہیں اور اس سال اس کانفرنس کے صدر ہیں۔ اول الذکر اور آخر الذکر حضرات کے متعلق مستقل مضامین بھی شائع کئے جارہے ہیں۔ حضرت کیفی کا نام ایک شاعر کی حیثیت سے تمام اردو داں طبقہ میں مشہور ہے لیکن غالباً یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنے زمانہ میں ملک کے ایک بڑے قومی خدمت گزار بھی تھے۔ ان کے دل میں ملک و قوم کا بڑا درد تھا اور وہ ان کی ترقی میں ہمیشہ مصروفِ عمل رہتے تھے۔

میکش

"واردات"

مرے حبیب!! یہ تاکیدِ ضبطِ غم کیسی
تجھے یہ فکرِ فراموشیٔ کرم کیسی

خیالِ ترکِ وفا ہی سے کانپ جاتا ہوں
سنبھال اے غمِ الفت کہ لڑکھڑاتا ہوں

بس ایک دُھن ہے اُسی دُھن میں گائے جاتا ہوں
ترا سکوتِ وفا آزمائے جاتا ہوں

یہ جانتا نہیں کس سمت جا رہا ہوں میں
ہے اتنا ہوش کہ تجھ کو بُلا رہا ہوں میں

خدائے عشق کو اپنا بنا رہا ہوں میں
تُو مجھ سے دور ہی نزدیک آرہا ہوں میں

رواں دواں ہوں کہیں اب مجھے قیام نہیں
یہ بیخودی مری پابندِ صبح و شام نہیں

جو اس کے سجدوں کو مل جائے پائے ناز ترا
خوشی سے جان ہی دے دے غریب ساز ترا

صمد رضوی ساز

ظریف اور ظرافت

ظریف (جسے عوام الناس مزاح نگار کہتے ہیں) بننے یا کہلانے کا روگ عموماً ایسے شریف لوگوں میں پایا جاتا ہے جنھوں نے اصل خیر سے صرف مڈل تک تعلیم پائی ہو۔ اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر افسانہ نویسی شروع کر رکھی ہو۔ اور افسانے بھی وہ افسانے کہ ارے معاذ اللہ! نہ توبہ! ماشاء اللہ! ایسے گرما گرم۔ اتنے مزیدار اور اِس قدر چٹ پٹے کہ ایک بار اگر کوئی پڑھ لے تو پھر مرتے دم تک افسانوں سے طبیعت بیزار رہے۔ ایسے گراں پایہ اہلِ قلم جب افسانہ نویسی کے میدان میں خم ٹھوک کر اترتے ہیں تو اپنی گوناگوں خصوصیات کی بدولت اور نہیں تو "فسانہ آزاد" کے ایک بار "خوجی" تو ضرور بن جاتے ہیں۔ اور خدا سلامت رکھے ہمارے مدیر حضرات کو جو ایسے باکمالوں سے اکثر "بالسٹ ٹرین" کا کام لیتے ہیں

حکیم لقمان نے بوستاں میں ایک مزاح نگار کی جو تعریف لکھی ہے پہلے وہ سن لیجئے اس کے بعد پھر کچھ اور عرض کریں گے۔

ظریف حقیقت میں صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جسے دیکھتے ہی ایک صاحبِ عقل و ہوش کو ہنسی آجائے۔ (اگر کوئی رو بھی دے تو کچھ مضائقہ نہیں) قد و قامت کے لحاظ سے قطب صاحب کی لاٹھ کے برادرِ خورد معلوم ہوں کلّے "طوطا پری" آم کی یاد تازہ کرتے ہوں۔ چہرے پر ہوائیاں (آتشبازی کی ہوائیاں نہیں) اُڑ رہی ہوں۔ اور لباس زبانِ حال سے صورت بیں حالت مپرس کی داستان کہہ رہا ہو۔ اور چال کا یہ ڈھنگا پن دیکھ کر راہ چلتے بھی ذرا پلٹ کر دیکھ لیں۔ چنانچہ اگر یہ تجربہ واقع ہوئی ہے تو صحافتی منڈی میں مانگ بھی زیادہ ہوگی اور جو اُبلے ہوئے انڈے کی طرح جس پر سے چھلکا اتار لیا گیا ہو صاف اور ملائم ہے تو وہ قطعی مزاح نگار ہے۔ اور اس کی شہرت کا چاند اس طرح چمکے گا جیسے مضامین مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب۔ یا آسمانِ ادب پر اس طرح درخشاں نظر آئے گا جیسے کسی شکیں نسب محبوبہ کے کان میں بنارس کے بنے ہوئے بادلہ کے آویزے۔ جو پونے تین آنے میں جوڑی ملتی ہے

تو جناب! یہ واقعہ ہے کہ ابتدائے آفرینش میں شریف آدمیوں پر ہنسی کا دورہ صرف اس وقت پڑتا تھا جب وہ اپنے کسی ہم جنس میں کوئی ایسی چیز دیکھ پاتے جو بادی النظر میں انوکھی یا غیر مانوس سی معلوم ہوتی تو ظاہر ہے کہ اس وقت جناب ابنِ آدم شکل و صورت میں "ستر پوشی" کے معاملے میں کوئی ایسی اختراع یا ایجاد فرما لیتے ہوں گے جو ہنسی کی محرک ہوتی ہوگی جس طرح آج کل ایک "راس مرد" مونچھیں منڈوا کر عقل سے فارغ البال ہو جاتا ہے اور بیوقوف لوگ اس شریف آدمی کی "مستورانہ" شکل دیکھ کر صرف معذرت کے طور پر مسکرا دیتے ہیں ممکن ہے کہ گئے وقتوں میں بھی کوئی اللہ کا بندہ ایسی ہی ناشدنی حرکات کا مرتکب ہوتا ہوگا جو دیکھنے والوں کے لئے ہنسی کا باعث بن جاتی ہوں گی۔

اور یہ تو ایک مشہور تواریخی واقعہ ہے کہ ہنسا مت تک محض ایک قسم کا مرض ہی متصور ہوتا رہا ہے۔ اور جو یقین نہ ہو تو ہندوستان کی کوئی جدید تواریخ اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ اس میں قطب صاحب کی لاٹ کے بارے میں سب سے زیادہ پتے کی بات یہ لکھی ہے کہ ہندوستان میں آٹھ سو سال تک مہا سبھائیوں نے مسلمانوں سے جو "رگڑے" کھائے ان کی فریاد برہما تک پہنچانے کے لئے ڈاکٹر ڈنڈا پرشاد اور بنارسی پنڈت جی مہاراج کی کوششوں سے یہ لاٹ تعمیر کی گئی تھی۔

کہتے ہیں کہ "کسی مذہبی مزاجی" کے وصال میں جنھوں نے اپنے یہاں جنت البقیع بھی بنوا رکھی تھی پہلے آسمان پر بڑے بڑے جہاں پرشتوں اور علاموں کی ایک مجلس حضرت کو "برین عقل و دانش" پر داد دینے کے لئے منعقد ہوئی لیکن نوریوں کو خاکیوں کی اس جسارت پر حیرت سی ہو رہی تھی اور چپکے چپکے آپس میں سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ اتنے میں جناب عزرائیل بھی کہیں سے آنکلے اور سن کر بولے لو دیکھ لو ؎

غافل آداب سے سکانِ زمیں کیسے ہیں		شوخ و گستاخ یہ پستی کے مکیں کیسے ہیں

یہ سنتے ہی ایک طرف سے "الحق" کا نعرہ بلند ہوا اور ؎ کہا منصور نے خدا ہوں میں ۔

پاس سے :-		بولا ڈارون کہ بوزینہ ہوں میں

یہ سن کر :-		ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست		فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست !

غالباً سیماب تھے ۔

تو جناب جس طرح مہاشے ڈارون جی کے نقطۂ نظر سے بندر شکل بدلتے بدلتے اِرتقائی قلابازی سے انسان بن گیا اسی طرح حکیم لقمان کے نظریہ کے مطابق ہنسی جو محض ایک قسم کی بیماری تھی عادت بن گئی ۔
رہا ڈارون کا نظریہ ! تو ممکن ہے کہ آپ کی قوم پہلے بندر ہی ہو لیکن بندر "ضاحک" نہیں ہوتا اور ابنِ آدم ضاحک ہے ۔ اور وہ بھی پیدائشی اس لئے اگر کوئی سیلانی طبیعت کے بزرگ سیر کرتے کرتے کہیں عدم میں جانکلیں تو ڈارون سے مل کر ہمارا اعتراض ضرور پیش کر دیں ۔ ہم رمضان میں استیصالِ ثواب کے لئے ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس کسی بے روزہ دار کو پلا دیں گے ۔

پھر ایک زمانہ وہ آیا کہ بعض لوگوں نے ہنسانا اپنا پیشہ بنالیا ۔ ایسے لوگ ابتدا میں ہندوستان میں بھانڈ اور یورپ میں فُول یا جسٹر کہلانے لگے ۔ اور جب تعلیم کا دور دورہ ہوا تو ڈارون کے نظریہ کے مطابق یہی فُول یا جسٹر ترقی کرتے کرتے "ہیومرسٹ" بن گیا اور اس نے لاکھوں کمائے ۔ اب رہا ہندوستان، تو جناب ! اول تو کسی نے اس فن کی طرف توجہ ہی نہیں فرمائی لیکن جب اوروں کی دیکھا دیکھی کچھ غیرت آئی بھی تو وقت گذر چکا تھا

یعنی :-		باہم پیار کے جلسے تھے دستورِ محبت قائم تھا

اور اس کی بجائے :-		اب بحث میں اردو ہندی ہے قربانی ہے یا جھٹکا ہے

غور کا مقام ہے کہ جب صورتِ حال اتنی خوشگوار ہو اور ملک کا ملک دوسروں کے لئے مکمل مذاق اور سامانِ ظرافت بن رہا ہو تو مزاح نگاری کی ضرورت ہی کہاں رہتی ہے ۔ مغرب میں تو لوگ ادبی ظرافت کا لطف اٹھاتے ہیں اور ہم ہندوستان والے عملی ظرافت کی داد دیتے ہیں ۔
آپ پیپل پر کلہاڑا چلائیے تو دوسرا آپ کی گردن پر کلہاڑا چلائے گا، آپ گائے ذبح کیجئے تو کوئی آپ کو ذبح کرنے اٹھ دوڑے گا ۔ ظرافت کا لطف تو صرف ہم ہندوستان والے ہی کچھ اٹھاتے ہیں ۔ یورپ والوں کی بات ہی جانے دیجئے ۔

چہ داند بوزینہ لذاتِ ادرک		ایم اسلم

سیرتِ سلطانی

جب ہوئی مسجدِ اعلیٰ کی مکمل تعمیر ۔۔۔ یادگارِ حشم حضرت سلطان ٹیپو !

کون ؟ وہ شانہ کش کاکلِ آئینِ کہن ۔۔۔ فرق مذہب میں نہ آنے دیا جس نے سرمو

جس کی ہستی تھی رخِ دینِ نبیؐ کا غازہ ۔۔۔ جس نے معشوقۂ ملت کے سنوارے گیسو

گلِ رعنائے گلستانِ رسولِ اکرم ۔۔۔ سارے عالم میں تھی پھیلی ہوئی جس کی خوشبو

شہ شیر افگن وجم جاہ وسکندر سطوت ۔۔۔ نصب تھے جس کی صف آرائی کے "رن کھم" ہر سو

رزم گاہوں میں صفِ کفر الٹ دیتی تھی ۔۔۔ اُس کی ہلکی سی بھی ایک جنبشِ تیغِ ابرو

عرض کی میر عمارت نے یہ سلطاں کے حضور ۔۔۔ حسبِ فرماں ہوئی تعمیل بہر یک پہلو

افتتاحی کیا ایک جشن شہِ والا نے ۔۔۔ تھے ہزاروں علماء گھر میں خدا کے مدعو

مشورے سے یہ ہوا طے وہ بنے پہلے امام ۔۔۔ ہو اگر "صاحبِ ترتیب" بصد شانِ علو

یعنی جس نے نہ قضا کی ہو صلوٰۃِ خمسہ ۔۔۔ عمر بھر جس نے کیا ہو نہ کوئی ترک وضو

سن کے یہ عالم و مفتی و مشائخ، صوفی ۔۔۔ بن کے تصویرِ خجالت نگراں تھے ہر سُو

شہ نے فرمایا کہ "وہ صاحبِ ترتیب ہوں میں ۔۔۔ للہ الحمد وہ بندہ ہوں کہ جس میں ہے یہ خُو

پھر بڑھا بہرِ امامت وہ مجاہد وہ جری ۔۔۔ وہ شہیدِ رہِ مولا وہ حرم کا آہو

کیوں نہ ان پر ہوا ےمشتاق خدا کی رحمت ۔۔۔ بادشاہی میں بھی رکھتے تھے جو دل پر قابو

نوٹ: "مسجد اعلیٰ" جس کی افتتاحی رسم کا واقعہ منظوم ہوا ہے۔ آج تک اپنے شاندار بلند میناروں کے ساتھ قلعہ سرنگاپٹم میں حضرت ٹیپو سلطان شہید کی عالی ہمتی اور زہد و تقویٰ کی شہادت دے رہی ہے

ابوالخیر مشتاق قریشی (بنگلوری)

مرکزِ خیال

(۱) دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر ۔۔۔ ما ہمچناں در اولِ وصفِ تو ماندہ ایم (سعدی) ←

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے ۔۔۔ سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے (غالب)

(۲) بوئے یار من ازیں سست وفا می آید ۔۔۔ ساغر از دست بگیرید من از کار شدم (نظیری) ←

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ۔۔۔ ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں (سودا)

مرسلہ سکینہ بیگم

محبت میں فتح و شکست

محبت کے برق رفتار بازو، ہمیں مسرت و انبساط کے ساتویں آسمان پر لے اڑتے ہیں، یہ فضا انتہائی سنسنی خیز و خمار آگیں ہوتی ہے۔ اس وقت سوہانی خوابوں کے ایام بہار ہم پر سایہ فگن ہوتے ہیں۔

لیکن ساغر محبت سے جرعہ کشی کے بعد ـــ ناکامی و حرماں نصیبی! آہ! ایک جگر سوز و جانگداز المیہ ہے۔

خلد بریں کی ٹھنڈی و معطر ہواؤں میں سانس لینے، کیف آور و رنگین ماحول میں بسر کرنے کے بعد، کوئی خود کو شکست و ناکامی کے خونخوار و آتشیں پنجہ میں گرفتار محسوس کرے، یہ ایسی کیفیت ہے کہ جس میں قلب حساس و شوخ طبیعت کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔

یہ ایک تجربہ ہے جو تمہیں اعلیٰ و ارفع منزل پر پہونچا دے گا، یا قعر ذلت میں ڈھکیل دے گا۔ ان دونوں کیفیات کا انفرادی صلاحیت پر انحصار ہے۔ اس مہلک ناکامی و محرومی کے تاثرات برداشت کرنے کی سکت، اگر تم میں موجود ہے، تو تمہیں جو سبق ملا وہ بیش بہا ہوگا۔ اور اگر تم نے کشمکش و پیکار کے تمام ہتھیار ڈال دیئے، درد و اضطراب، سوز و گداز جس کی شدت کبھی ناقابل تحمل ہو جاتی ہے، اس سے دلیرانہ مزاحم ہونے کا اپنے میں قوی ارادہ نہیں ہے، تو ایسی صورت میں شاید تباہی و بربادی تمہارا انجام ہے۔

تم نے محبت کی ـــ اپنی ہستی کامل و تمام نذر کر دی ـــ اور تمہیں ناکامی کی صورت دیکھنی پڑی۔ اب تمہارے وجود کے کسی گوشہ میں ایک ایسا زخم پیدا ہو گیا، جو کبھی مندمل نہیں ہوگا۔ تمہاری تکالیف، آہ و زاریاں، تمہارے روبرو استادہ رہیں گی۔ تم گویا اپنے سلسلہ مصائب کو تحریک دیتے، اور جاری کرتے رہیں گے۔

ایسی نوبت پر، ماضی کو اپنے میں سے بالکل محو کر دینا ایک صحیح چارہ کار ہے ـــ اپنے دلخراش تجربات کی یاد رد کر دو۔ دیگر دلچسپ و فرحت بخش مشاغل میں، کمال انہماک و چستی کے ساتھ ایسے مصروف ہو جاؤ کہ تمہیں اپنی تکلیف سے پریشان و حواس باختہ ہونے کا موقع نہ مل سکے۔

کہا جاتا ہے، مصیبت و غم ایک عظیم المرتبت معلم ہے۔ خود غرضی کے استیصال کے لئے اس سے مدد ملتی ہے۔ ہم جنسوں کے حالات کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے سے، ان کے واقعات کی قدر و قیمت سے انسان میں ہمدردی کے سدا جاری چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔

اکثر لوگ جو ناکامی محبت کے رنج و الم سے کچلے اور روندے گئے تھے، بعد۔ مشاہدہ ہے، بلند کردار، ترقی یافتہ شخصیتوں اور وسیع عمیق فہم و شعور کے ساتھ ابھر آئے ہیں۔

شخصی تحلیل ہمیشہ پسندیدہ رہی ہے۔ جب تمہاری ثابت قدمی میں لغزش آجائے، مایوسی کی انتہائی گہرائی میں تم نے اپنا مسکن بنا لیا ہو، تو اپنی نبرد آزما جبلتوں کو بیدار کرنے کی مخلصانہ سعی کرو۔ "اس سے کیا حاصل؟" کہکر شاید تم ہاتھ اٹھا لو، اور اسی مایوسی کے عالم میں اپنے کو گم کردو، جو تمہیں نگل رہی ہے۔

صاحب فہم و فراست کا فرض ہے کہ ان خونخوار درندوں کے چنگل کی آزادی حاصل کرنے کی پہلی خواہش ہی سے فائدہ اٹھائے۔ کچھ نہ کچھ دلچسپ مشاغل کرو۔ ایسے اوقات میں جسمانی نقل و حرکت ایک حیرت انگیز علاج ہے۔ پیدل چلنا اور خوب چلنا، یہاں تک کہ تم تھک کر چور چور ہو جاؤ۔ حصول مقصد کے لئے اکثر مفید ثابت ہوا ہے۔

خواہ تم کسی امر پر عمل پیرا ہو جاؤ، لیکن اپنے عز و وقار کو قائم و مستحکم رکھو، خود کو شکست خوردہ ہرگز ہرگز نہ بناؤ۔ مزاحمتوں سے کشمکش کرتے ہوئے، جوں جوں تم آگے بڑھو گے، تمہاری طاقت، قوت ارادی اور مضبوط ہوتی چلی جائے گی۔

آخر کار، وہ قوت و ہمت جس کی نشو و نما تم میں ہو جائے گی، دنیا میں ہر شعبۂ زندگی کے لئے تم میں زیادہ استطاعت پیدا کر دے گی۔

ہاں! اگر تم نے کسی سے محبت کی ـــ اور ناکامی نصیب ہوئی، حیران و پریشان نہ ہوں۔ تقریباً ہر شخص کو اس قسم کے تجربہ میں گداز ہونا پڑتا ہے۔ یاد رکھو، اپنے کو کامل طور سے سنبھال لینا، یہ تمہارے ہی قبضہ قدرت میں ہے۔ اگر ممکن ہو تو ایک عملی تصور پسند، ایک تعمیری فلسفی بن جاؤ، اور اپنے تلخ تجربات سے اوروں کو فائدہ پہونچاؤ۔

مترجمہ یس۔ بی۔ اعتنا

سب رس اگست ۱۹۳۸ء

ہم سفر

تعطیلات ویسے بھی جلد گزرتے ہیں، جیسے پر لگ گئے ہوں۔ گاؤں پہنچ کر ہاتھ پاؤں بھی سیدھے نہ کرنے پایا تھا کہ آٹھ دن گذر گئے اور آنکھ جھپکانے ہی میں (مجھے تو کچھ ایسا معلوم ہوا) بیس۲۰ دن گزر گئے۔ دلچسپیوں کا یہ عالم تھا کہ بس امڈی پڑتی تھیں آج تنکار پارٹی ہے تو کل جلسۂ موسیقی، کہیں دعوت ہے تو کہیں ڈرامہ، ہر وقت دوست احباب کے جھرمٹ میں گھرا رہتا۔ ہنسی ہی لگی رہتی۔ دھول دھپا رہتا اور اسی طرح تعطیلات ختم ہونے کو آ گئے۔ واپسی کی ٹہری۔ والدین کی جلدی نے دو چار دن ٹہرنے کی بھی مہلت نہ دی سمجھتے ہوں گے کہ دو۲ چار۴ دن پہلے چلا جاؤں گا تو واپسی میں شاید کچھ دن پہلے اجازت مل جائے۔ مجبوری تھی۔ سارے دوست احباب اسٹیشن پہنچانے اور خدا حافظ کہنے آئے تھے ان لوگوں کے جھرمٹ سے دور میری نظریں چند اور چیزوں کو بھی دیکھ رہی تھیں۔ ہرے ہرے کھیت، گہری گہری باولیاں، گھنے جنگل، وحشی پرند سب مجھے حسرت سے تکتی دکھائی دیں میں نے سب پر الوائی نظر ڈالی۔ اور اپنا سر کھڑکی کے اندر کر لیا سوچا کہ اب چاہے گاڑی قیامت تک یہیں کھڑی رہے۔ میں تو اب جھانکنے والا نہیں ہوں۔ ڈبہ میں میرے اور ایک دو۲ مسافروں کے سوا کوئی بھی نہ تھا۔ اور میرے نزدیک دوسرے مسافروں کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی۔ لیکن گاڑی اب چھوٹنے کو ہوی تھی کہ گاؤں والوں کا ایک قافلے کا قافلہ ڈبہ میں گھس پڑا۔ کسی کے ہاتھ میں ڈوئی ہے تو کسی کے ہاتھ میں چھاج۔ کوئی بچہ چمکار رہا ہے تو کوئی تمبا کو گھول رہا ہے۔ ایک عجیب سی ہربونگ مچ گئی۔ مارے چیخوں کے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ "ارے وہ ٹوکرا کہاں ہے" "ارے بچے کو ادھر دے" میں تو بوکھلا گیا۔ ڈانٹ کر کہا "جاؤ۔ اے۔ جاؤ، دوسرے ڈبے میں" وہ کہنے لگے "دوسرے اسٹیشن پر ہی اتر جائیں گے صاب" مجھے بہت غصہ آیا لیکن چپ ہو رہا۔ "اسٹیشن کا تو سوال ہے" سمجھا اور ان میں سے ہر ایک کو غور سے دیکھنے لگا۔ اتنے میں ایک بے تکلف ہم سفر نے میرے بستر پر بیٹھنے کی "سعیٔ بلیغ" کی۔ بھرا تو بیٹھا ہی تھا۔ اپنے پاؤں پھیلا دئے۔ وہ کسمسا کر اٹھے۔ اور چپ چاپ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگے ان کی اس "خاموشی" نے میرے دل پر بہت اثر کیا اور میں نے از راہِ عنایت اپنا بستر کھینچ لیا۔

سفر کئی طرح دلچسپ ہو سکتا ہے۔ یا تو کوئی "اچھا ہم سفر ہو" یا پھر کوئی دلچسپ ناول ہی اس کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ اپنے ماحول سے بے خبر اور بے نیاز ہو کر اس خاموش ہم سفر کی باتیں سنئے۔ راستہ بڑے مزے سے کٹ جاتا ہے۔ میرے ساتھ ایک ناول "گہری چال" تھا۔ لیکن اپنے ہم سفروں کے بارے میں بڑا بدقسمت ثابت ہوا۔ کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے بات چیت کرتا، دوسرے گھر سے بورڈنگ جاتے ہوئے کوئی بھی اس اقدام پر مائل نہیں ہوتا۔ گاڑی اپنی رفتار پر آ گئی تو میں نے اپنا ناول نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ پڑھنے سے طبیعت اکتا جاتی تو کوئی شعر گنگنانے لگ جاتا چند اسٹیشن گزر گئے لیکن یہ بات باعث اطمینان تھی کہ برآمد کی بہ نسبت درآمد کم ہے۔ آگے کے اسٹیشن پر ایک صاحب، صورت و لباس سے تعلیم یافتہ معلوم ہونے والے، ڈبے میں گھسنے کے لئے لپکے۔ میں نے صورت بنالی۔ مخلصانہ انداز میں کہا "جگہ نہیں ہے" "کھڑا رہوں گا"۔ جواب دیا گیا "جی" کہہ کر خون کے گھونٹ پیتا میں پھر سے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ اب اِن نووارد صاحب کی شرارت تو ملاحظہ کیجئے کہ کھڑے کھڑے ناول سے شوق فرما رہے ہیں۔ میں نے کنکھیوں سے ان کے اِس قابلِ گرفت فعل کو دیکھا اور انجان بن گیا تھوڑی دیر بعد جب میں ورق پلٹنے کو ہوا تو کہنے لگے "جی ذرا۔ معافی چاہتا ہوں۔ بس ایک دو۲ سطریں اور۔ شکریہ" میں نے کتاب بند کر کے ان کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ بھلا وہ شخص جس نے ہمارا کہنا نہ مانا

ڈبے میں در آیا اس کا کیا لحاظ۔ کچھ جھجکے۔ پھر کتاب ہاتھ میں لے لی اور اسے میرے صندوق پر رکھ دیا۔ وہ برابر دو اسٹیشن کھڑے رہے۔ کوئی بات کرنے والا نہ کوئی ہمدرد۔ عجیب عالم بیکسی تھا۔ کھڑے کھڑے پاؤں سند ہوگئے تھے اور آخر کسی نہ کسی طرح سامنے کی سیٹ پر جگہ نکال ہی لی۔ میں ان کی طرف بالکل متوجہ نہ تھا کھنکار کر مجھے متوجہ کرنا چاہا مگر میں انجان بنا رہا۔ نہایت ہی ملائم لہجہ میں دریافت کیا گیا "کہاں سے تشریف آوری ہو رہی ہے" میں نے سنی ان سنی کردی کچھ سٹ پٹائے، میرے گھٹنے کو جھنجوڑتے ہوئے کہنے لگے۔ "مجھے آگے کے اسٹیشن پر پانی مل سکے گا" میں نے بیزاری ظاہر کرتے ہوئے کہا "معافی چاہتا ہوں۔ مجھے آپ دق نہ کریں۔ میں کچھ پریشان سا ہوں" ان کے لئے یہہ جاننا کہ میں پریشان ہوں گویا کھلا دعوت نامہ تھا نہایت ہی ہمدردانہ لہجہ میں پوچھا "آخر میں بھی تو سنوں! کیوں کوئی خاص بات تو نہیں۔" "جی نہیں" میں نے ٹالتے ہوئے کہا مگر مجھے محسوس ہوا کہ واقعی میں پریشان سا ہوں اور اگر پہلے نہ بھی تھا تو اب ہو گیا ہوں۔ انھوں نے بڑھ کر کچھ کہنے کا ارادہ کیا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے سارے ڈبے میں ہُو کا عالم تھا۔ تقریباً تمام مسافر ایک ایک کرکے اتر چکے تھے۔ خاموشی ناقابلِ برداشت ہو رہی تھی انھوں نے کھڑے ہو کر اپنے کوٹ میں سے ایک کتاب نکال لی اور ورق گردانی کرنے لگے تھوڑی دیر بعد ایک آہ کے ساتھ کتاب بند کردی مجھے بھی دل لگی سوجھی۔ میں نے انھیں مخاطب کیا۔ تنہا سفر میں یہہ ہم سفر ہی کچھ غنیمت معلوم ہوا۔ "آپ بھی کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں" "کچھ نہ پوچھیے" انھوں نے کتاب کے اوراق الٹتے ہوئے جواب دیا۔ "آخر کچھ تو" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا کہنے لگے "جناب جس کا رنج اسی کو آپ کو بجائے ہمدردی کے ہنسی آئیگی۔ میں نے پختہ وعدہ کیا کہ سخت ہمدردی ظاہر کروں گا۔ تھوڑی دیر مجھے گھور کر دیکھا اور نظر چار ہوتے ہی مسکرا کر کہنے لگے۔ "میں بڑا بدنصیب ہوں۔ بچپن ہی سے محبت کے نام سے بھاگنے والا۔ دنیا کو دارالمحن سمجھتا۔ جہاں انسان صرف رونے دھونے کے لئے آتا ہے۔" اس کے بعد انھوں نے اپنی ایک رشتہ کی بہن سے ملاقات کے واقعات اور پھر پروفیسر صاحب کی بیوی سے محبت کا واقعہ اس دردانگیز اور دلچسپ پیرائے میں بیان کیا کہ میں ہمہ تن گوش بن گیا "ہوں" "ہوں" کی آوازیں تیزی سے نکلنے لگیں۔ اور آخر میں میں نے ایک آہ کے ساتھ ہمدردانہ لہجہ میں کہا "آپ واقعی قابلِ رحم ہیں، آپ کی زندگی میں عجیب عجیب واقعات رونما ہوے۔ آپ ہی کا دل و جگر ہے جو سہہ گئے ورنہ مجھ جیسا ہوتا تو مر ہی جاتا۔" اِس کے بعد میں نے توشہ نکالا اور اصرار کے ساتھ انھیں بھی شریک کر لیا میری نظروں میں ان کی عزت کئی گونہ بڑھ گئی تھی۔ ان کے ساتھ ہمدردی اور ان کا دل بہلانا میرا اولین فرض بن گیا۔ میں نے کئی غزلیں گا کر سنائیں دلچسپ موضوع چھیڑے، بہت کھل کر بات چیت کی پوری دلچسپی سے اُن کی باتیں سنیں۔ اپنے گزشتہ برتاؤ کی معافی چاہی، اُن کا اسٹیشن قریب آرہا تھا۔ انھوں نے اپنا سامان درست کیا۔ اور جب گاڑی کی رفتار دھیمی ہونے لگی تو میرا سفری ناول بطور یادگار مانگا میں نے بخوشی پیش کر دیا جس پر انھوں نے بھی اپنی کتاب "خوابِ خیال اور دیگر افسانے" مجھے تحفتہً دی کہ میں بقیہ فاصلہ اسے پڑھ کر کاٹوں۔ گاڑی چلنے لگی وہ اتر چکے تھے۔ مسکراتے ہوئے مصافحہ کیا اور خدا حافظ کہا۔ بہت دور تک اُن کی مسکراتی ہوئی شکل آنکھوں میں پھر رہی تھی۔

پہلا ہی افسانہ "خواب و خیال" جوں جوں پڑھتا جاتا تھا۔ حیرت بڑھتی جاتی تھی اور پھر غصہ بھی آنے لگا۔ دانت پیستے ہوئے میں نے کتاب بند کردی جی تو چاہتا تھا کہ کتاب کے پُرزے پُرزے اڑا دوں مگر ضبط کیا۔ "جھوٹا، مکار، دغاباز، فریبی، کتا، گدھا" نہ جانے کیا کیا اس عیار ہم سفر کی شان میں کہہ گیا۔ اس کی داستان کا سارا پلاٹ اسی قصہ کا تھا۔ بیہودے نے کتنا دھوکہ دیا، اسی پیچ و تاب میں بیٹھا تھا۔ اپنی سادہ لوحی پر خود کو کوستا اور اس ناہنجار کو بددعائیں دیتا رہا جس نے میری توجہ سے اس بری طرح فائدہ اٹھایا دور سے یونیورسٹی کی سربفلک عمارت نظر آرہی تھی۔ خوشی کی ایک لہر سارے جسم میں دوڑ گئی۔ اور میں سارے واقعات کو بھول چکا تھا۔

رشید قریشی

میم صاحب کا پردہ

ہمارے مکان کے بازو میں ایک اور ہمارا مکان ہے جو کرایہ پر دیا جاتا ہے وہ مکان ایک ہندو صاحب نے ہم سے کرایہ پر لیا ان کی بی بی سوئیٹزرلینڈ کی رہنے والی تھیں، ان کے میاں یورپ سے آن کر سکندرآباد کے ہوٹل میں مع اپنی بی بی کے ٹھیرے تھے جب ہمارا مکان ملا تو اس میں آکر اتر گئے بی بی کو ایک لفظ اردو کا نہیں آتا تھا انھوں نے ہم سے کہا میں حیدرآباد میں کسی کو نہیں جانتی آپ جب کہیں جائیں مجھے ہمراہ لیجئے اور حیدرآباد کی بیبیوں سے ملائیے چنانچہ جب میں کہیں جاتی ان کو بلا لیتی وہ میرے ساتھ اکثر شادیوں میں کلب وغیرہ میں جایا کرتیں نہایت شریف کم سخن بی بی ہیں ایک روز میں نے یک بیک کہلا بھیجا کہ میں شادی میں جا رہی ہوں آپ بھی چلئے انھوں نے کہلا بھیجا کہ اگر آپ تھوڑی دیر پہلے کہلا بھجواتیں تو میں آپ کے ہمراہ چلتی اس وقت میرے صاحب دفتر گئے ہیں ان سے میں نے اجازت نہیں لی، یہ سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی ایک یوروپین عورت کے ایسے اچھے خیالات ہیں۔ وہ پردہ تو نہیں کرتی لیکن کبھی تنہا کسی کے پاس نہیں جاتی اپنے شوہر کے ہمراہ جایا کرتی ورنہ میرے ہمراہ یا اپنی کوئی دوست عورت کے ہمراہ۔ وہ سینما تھیٹر کا شوق نہیں رکھتی تھی ان کے کمرے میں بٹلر یا بائے وغیرہ بغیر اجازت نہیں آسکتا تھا ان کے شوہر کے دوست اگر آتے اور شوہر گھر پر نہ ہوتا تو وہ نہیں ملتی تھیں البتہ شوہر کی موجودگی میں وہ دوستوں سے ملتی تھیں، شوہر دفتر کو چلا جاتا خود گھر کا کام کیا کرتیں یا سلائی سیا کرتیں۔ ان کی زندگی دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی یہ اسی بی بی کا ذکر ہے جس کی ساتھ پشت نے پردہ نہیں کیا۔ اس کا نام پردہ ہے، اصل پردہ آنکھ کا اور دل کا ہے اگر یہ ہے تو سب کچھ اور یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

صغرا ہمایوں مرزا

اندھا

سنتا ہے حسنِ شمس و قمر دیکھتا نہیں — یعنی نظامِ شام و سحر دیکھتا نہیں
اُس کے بھی پیرہن پہ گناہوں کے داغ ہیں — دنیا کو جانتا ہے مگر دیکھتا نہیں
اُس کو بھی ہیں نصیب محبت کی لذتیں — دل تھامتا ہے تیرِ نظر دیکھتا نہیں
اُس کے بھی دل میں آگ بھڑکتی ہے عشق کی — جلتا ہے اور رقصِ شرر دیکھتا نہیں
اُس کے بھی سر نے پایا ہے احساسِ بندگی — سجدے میں گر تو جاتا ہے در دیکھتا نہیں
اُس کو سنبھال لیتی ہیں ہر بار ٹھوکریں — چلتا ہے اور راہ گذر دیکھتا نہیں
باتوں سے تاڑ لیتا ہے باطن کی حالتیں — ملتا ہے اور روئے بشر دیکھتا نہیں
ہنستا ہے صرف اپنے لئے غیر پر نہیں — روتا ہے اور دامنِ تر دیکھتا نہیں
معلوم ہے تمول و غربت کی کشمکش — آنکھوں سے امتیازِ نظر دیکھتا نہیں
اس کو سکون چاہئے جینے کے واسطے — رہتا ہے اور اپنا ہی گھر دیکھتا نہیں

میکش

غزل

خود وہ جفا پر مائل ہیں، ارمان جفا کا کون کرے
اُن کے کرم کی حد نہیں کوئی اُن سے تقاضا کون کرے

جانِ تمنا تو ہے مگر اظہارِ تمنا کون کرے
تیری بدولت ہم ہوے رسوا اب تجھے رسوا کون کرے

زیست عبارت ناکامی سے زیست کا حاصل ناکامی
غم کے سوا دنیا میں نہیں کچھ پھر غمِ دنیا کون کرے

تو ہی قاتل تو ہی مسیحا تو ہی مارے تو ہی جلائے
دردِ محبت کا میرے جز تیرے مداوا کون کرے

ضبط سے ہے ناموسِ محبت کون بنائے غم کو ڈھائے
دل سے جو موجِ خون اٹھے اس موج کو دریا کون کرے

میری شکستہ کشتی کو ہر موج سہارا دیتی ہے
موجیں ہی جب ساحل ہوں ساحل کی تمنا کون کرے

دل کے ہیں سارے جلوے نمایاں کچھ نہ حقیقت کچھ نہ مجاز
دل اک رازِ سربستہ ہے رازِ دل افشا کون کرے

ہجر میں لب پر دم ہے مگر دے کون تجھے تکلیفِ خرام
تو اک محشر ہے سرتاپا محشر برپا کون کرے

تابش میں رودادِ محبت دل کو سناتے ڈرتا ہوں
دل ہے مرا ہم راز کسی کا دل پہ بھروسا کون کرے

مسعود الحسن تابش

غزل

جس کو دیکھا سو آپ کا دیکھا
جس کو پایا سو آپ کا پایا

تیری ہستی سے آشنا جو ہوا
ذرہ ذرہ کو آشنا پایا

زندگی کو وبالِ جاں سمجھا
موت کو صبر آزما پایا

اُن کی ہرجائی سے نقی ہم نے
اُن کی یکتائی کا پتہ پایا

نقی

چاند سلطانہ

تیرا دماغ واقفِ غیب و حضور تھا
دل نورِ حق سے غیرتِ صد کوہِ طور تھا
رُخ پر جلالِ عصمتِ مریم کا نور تھا
بازو میں زورِ بازوئے حیدرؓ ضرور تھا
اکبر کے دل میں صرف خلش تیرے دم سے تھی
کشتِ دکن ہری ترے ابرِ کرم سے تھی

طوفاں تھا، زلزلہ تھا، نہ تھا لشکرِ مغل
آوازِ طبلِ جنگ سے تھرا گئے جبل
تیغیں کھنچی ہوئیں، وہ عیاں برچھیوں کے پھل
وہ رن پڑا کہ خوف سے گھبرا گئی اجل
لیکن تری جبیں پہ شکن تک نہیں پڑی
مغلوں کے ہوش اڑ گئے تو اس طرح لڑی

دشمن یہ کہہ رہے تھے کہ رن اپنے ہات ہے
نقشہ وہ آپڑا ہے کہ ہر چال مات ہے
کل صبح سارے رنج و محن سے نجات ہے!
واقف نہ تھے کہ رات قیامت کی رات ہے
ارماں دلِ عدو میں رہا قال و قیل کا
شب بھر میں تو نے بھر دیا رخنہ فصیل کا

مشکل کو تیرے عزم نے آسان کر دیا
فوجِ شہنشہی کو پریشان کر دیا!
ہمت نے سورماؤں کو حیران کر دیا
عزت پہ تو نے جان کو قربان کر دیا
احمد نگر کے دل پہ ترے غم کا داغ ہے
یہ داغ اس کی بزمِ عزا کا چراغ ہے

خدمت وطن کی تیری عبادت رہی مدام
ہے یادگارِ دہر ترا حسنِ انتظام
تیری بہادری میں کسی کو نہیں کلام
پلٹے ترے چمن سے شکاری شکستہ دام
تھا غم سے حال زار دلِ دردمند کا
لیکن جھکا نہ سر ترے عزمِ بلند کا

غربت کی بے بسی تجھے اپنے وطن میں تھی
بیگانہ مثلِ سبزۂ بیکس چمن میں تھی
سوزاں بسانِ شمع بھری انجمن میں تھی
اک حور تھی کہ صحبتِ زاغ و زغن میں تھی
پایا نہ حیف گوہرِ عصمت نے جوہری
اُجڑی ترے شباب کی کھیتی ہری بھری

گردن پہ بارِ عمرِ گریزاں نہیں لیا
دستِ عدو سے درد کا درماں نہیں لیا
ہمراہ رختِ حسرت و ارماں نہیں لیا
جنسِ بقا کو تو نے کچھ ارزاں نہیں لیا
سرشار ہو کے توڑ گئی جامِ زندگی
لوحِ جہاں پہ چھوڑ گئی نامِ زندگی

سکندر علی وجد

تیسرا درجہ

یہ ایک بہت ہی معمولی سا حساب ہے۔ دو ایک سے زیادہ ہے اور تین، ایک اور دو سب سے زیادہ۔ اس کے خلاف کہو تو حساب کا مبتدی بھی منہ پر تھپیڑ لگائے گا۔ لیکن دفتری منطق نے اس بدیہہ کو نہایت دیدہ دلیری سے الٹ دیا ہے۔ اس کے ثبوت ہمارے اطراف بے شمار ہیں۔ دفتروں کے گریڈ ملاحظہ ہوں۔ امتحان کی کامیابی کے درجے اور ریل کے درجے دیکھیے۔ اس عالم کا ہر "ایک" "دو" اور "تین" سے فضیلت رکھتا ہے۔ یہ الٹا حساب نہ معلوم کس جادوگر نے سکھایا تھا کہ آج جدھر دیکھو اسی کا بول بالا ہے۔ ذہن اس قدر ماؤف ہو گئے ہیں! دفتروں میں ہر "پہلے گریڈ" والا نازاں ہے کہ وہ دوسرے گریڈ والے سے برتر ہے۔ اور دوسرے گریڈ والا تیسرے گریڈ والے غریب پر رعب گانٹھ رہا ہے۔ اسی طرح جو لڑکا امتحان میں درجہ اول میں کامیاب ہو، اس کی ہر جگہ عزت ہے۔ دوسرے درجے والے بھی یوں توں گزار لیتے ہیں۔ لیکن درجہ سوم کے کامیاب کے لئے عرصۂ آفاق تنگ نظر آتا ہے۔ دفتروں میں اس کے لئے جگہ نہیں، کاروبار میں یہ تیسرا کسی قابل نہیں اور کالج؟ یہیں سے تو وہ نکالا جاتا ہے۔ نہ معلوم خدا اس پر اتنا کیوں مہربان ہے کہ دنیا میں اس کے لئے جگہ رکھ چھوڑی ہے!

اب یہی تیسرے درجہ کو ادنیٰ کہنے والے، اسی منہ سے ریل کے تیسرے درجہ کو اعلیٰ ترین درجہ کہنے سے نہیں جھجکتے۔ آخر اس بے ربطی کا کچھ ٹھکانا بھی ہے! اسی کی بدولت چلتی گاڑی بن گئی، اور زندگی نارنگی۔

لیکن بہرحال ایک تسلی یہ ہے کہ یہ ساری جدتیں حال کی پیداوار ہیں۔ قدیم زمانے میں صرف گاڑی تھی، درجے نہ تھے۔ خواہ اسے درجہ اول قرار دیجیے، یا درجہ سوم کہیے۔ یہی چیز ریل کی ایجاد تک بھی موجود تھی۔ چنانچہ اس کے ثبوت اب تک بھی باقی ہیں۔ آپ کسی ریل گاڑی کو دیکھیں تو اس میں درجہ سوم ہی سب سے بڑا پائیں گے۔ اور اولین گاڑی جس پر آپ کی نظر پڑے گی اور آخری گاڑی جو آپ دیکھیں گے اور جو ہمیشہ آپ کے سامنے رہے گی، درجہ سوم ہی ہوگا۔ اور حقیقت میں ریل کے تمام ڈبوں میں یہی سب سے بڑا ہوتا ہے۔

اس بدیہہ کو الٹنے والا گروہ، دراصل دولت مندوں کا ہے جن کا بدقسمتی سے اس دنیا پر ہمیشہ اثر رہا۔ دولت مند دنیا میں ہوتے کتنے ہیں؟ ظاہر ہے کہ جتنے وہ ہوں گے، اتنا ہی ان کا ڈبہ اور اُن کا درجہ ہوگا۔ اس درجہ کو خواہ وہ پہلا کہیں یا دوسرا۔ اس کے برخلاف درجہ سوم ایک جہان ہے۔ کیونکہ احتیاج اصل ہے اور ثروت اس کی ایک فروع۔

درجہ سوم نہ صرف ظاہر میں بڑا ہے، بلکہ اس کے باطنی اوصاف بھی بڑے اور گوناگوں ہیں۔ اس کی وسعت کو ساری دنیا کے دوسرے اور تیسرے درجے بھی، اکھٹے نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی زندگی، چہل پہل اور لطف کی ایک چھینٹ بھی، پہلے اور دوسرے درجے کے بزرگوں پر نہیں پڑی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں فطرت کے رنگا رنگ جلوے ہر آن بے نقاب ہوتے رہتے ہیں۔ اس فضا میں آزادی کی پرورش ہوتی ہے۔ اور یہاں کی نشستیں خدا کی زمین کی طرح کسی کے لئے مخصوص، معین، اور محفوظ نہیں ہو سکتیں۔

غالب کے گھر کی طرح اس عالم آب و گل کی رونق بھی ایک ہنگامہ پر موقوف ہے۔ اور ہنگامہ تیسرے درجہ کی بلا شرکت غیرے، ملک ہے۔ پہلے اور دوسرے درجہ کے پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے اور ناپ تول کر کہنے والے نازنینوں کو اس ہنگامہ کی ہوا تک نہیں لگ سکتی۔ وہ بیچارے اسی پر نازاں رہیں کہ درجہ سوم کو ادنیٰ بنا لیا ہے۔

ہنگامہ اصل میں، تیسرے درجہ کی جان ہے۔ اس کے بغیر یہ ایک عالم بے رونق، ایک انجمن بے شمع، اور ایک خرمن بے برق ہے۔ اس ہنگامہ کی ابتدا ٹکٹ گھر سے ہوتی ہے۔ پلیٹ فارم پر یہ نشو و نما پاتا، اور ریل میں تو فراٹے بھرنے لگتا ہے۔

جس چیز کی ابتدا ایسی اچھی اور جس کا اٹھان اس خوبی سے ہوا ہو اس کے انجام کا کیا پوچھنا۔ ہنگامہ کے اس عرصۂ بوم میں جدھر دیکھئے ہنگامہ ہی ہنگامہ ہے۔ گاڑی میں چڑھنے سے پہلے ہنگامہ، چڑھنے کے بعد ہنگامہ، نشست پر ہنگامہ، اس بات پر ہنگامہ، اس بات پر ہنگامہ، غرض بات بات پر ہنگامہ، اور ہنگامہ لازمۂ حیات ہے۔

حیات کے کیسے گوناگوں اور بوقلموں نقشے یہاں نظر کے سامنے ہیں۔ زندگی اور زندہ دلی، رنج و مسرت اور محبت و نفرت کی نئی نئی تصویریں یہاں ہر روز دکھائی دیتی ہیں، ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے کسی شاعر یا مصور کی بصیرت چاہیئے۔ ہر وضع قطع کے لوگ یہاں موجود ہوتے ہیں اور ان کی صورت شکل کی طرح ان کے لباس اور خیالات میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ کوئی کپڑوں کی گٹھری ہے تو کوئی "لنگوٹی آشنا"۔ ان میں کالے بھی ہیں گورے بھی ہیں، سانولے سلونے بھی ہیں۔ اندھے بھی ہیں، گونگے بہرے اور کانے بھی ہیں، تنومند اور نحیف بھی ہیں۔ کسی کی ہاتھ بھر کی داڑھی ہے تو کوئی صفاچٹ، کوئی گولڈ فلیک سگریٹ کے کش اڑا رہا ہے تو کوئی پتوں کی بیڑی سے کام چلا رہا ہے۔ ان کے سامان کا تنوع بھی قابل دید ہے۔ کھانے کے لئے تانبے، پیتل، الیومنیم، تام چینی، بانس کپڑے غرض ہر قسم کے توشہ دان یہاں موجود ہیں۔ ٹرنک چمڑے کے بھی ہیں، لوہے اور جست کے بھی ہیں اور انہیں کے پہلو بہ پہلو کپڑے کی گٹھڑیاں بھی ہیں۔ اسی طرح بستروں میں "اور آل" سے لے کر دری اور چادر کے بستر بند تک نظر آتے ہیں۔ کچھ خدا کے بندے ایسے بھی ہیں جو نہ بستر کے ممنون ہیں اور نہ توشے کے احسان مند۔ جہاں اسٹیشن آیا پیسے دو پیسے کے چنے کوڑیاں لے کر پھانک لیتے ہیں اور جب سونے کا وقت آتا ہے تو ڈبے کے فرش یا کمبل کا بستر اور ہاتھ کا تکیہ ان کے لئے نرم نرم بچھونوں سے زیادہ آرام دہ ہوتا ہے۔ یہ سب لوگ بھی آسانی سے گزار لیتے ہیں۔

ان کے مقابلے میں درجہ اول اور دوم کے نشینوں کو دیکھئے۔ یہاں زندگی کا ایک اصول اور سفر کا ایک ہی ضابطہ کارفرما ہے۔ جو چیز زید کے پاس ہے وہی بکر، عمرو، ایرے غیرے غرض ہر شخص کے پاس موجود ہے۔ وہی سوٹ کیس وہی، ٹائی کیس اور وہی "ہولڈ آل" وہی "پلاس کے تین پات"۔ اور یہی ان کا سرمایۂ ناز ہے۔

زندگی کے ایک اور رخ پر نظر ڈالئے تو تیسرے درجے کے منافل محفل ہوش رہا ہیں۔ یہاں کی وسیع فضا میں، لوگ گروہ در گروہ، بیٹھے آپس میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ کوئی آلتی پالتی مارے بے تکلف بیٹھا ہے۔ کوئی نشست پر اپنے بازو ہی گٹھری رکھے اور اس پر سہارا دئے لیٹا ہوا ہے۔ گفتگو دنیا کے ہر معاملے سے متعلق ہوتی ہے۔ گھر اور بیوی بچوں سے متعلق، صحت اور بیماریوں سے متعلق، معاشی اور سیاسی امور سے متعلق، ادب اور فنون لطیفہ، زمینوں اور آسمانوں سے متعلق، دنیا و مافیہا سے متعلق، لیکن وہ نہیں جانتے کہ ان کی گفتگو کے اصطلاحی موضوع کیا ہیں۔ وہ فقط بولنا جانتے ہیں، اور ہم اصطلاحیں بنانا، ان کی معلومات کی ایک مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ "سکنڈ ہینڈ" بلکہ ان کے درجہ کی طرح "تھرڈ ہینڈ" ہوتی ہے۔ اور سچ پوچھو تو فرسٹ ہینڈ علم ذرا مشکل ہی ہے۔

باتوں باتوں میں کبھی تو تو میں میں بھی ہو جاتی ہے۔ اور یہ حیات کے لئے ضروری بھی ہے۔ یہاں ہر شخص دوسرے کو دشمن سمجھتا ہے اور دوست سمجھتا ہے۔ جہاں کسی کے تیور کڑے دیکھے یہ جانی دشمن ہے۔ دوستی کے راستے سے آؤ تو یہ جان فدا کرنے تیار ہیں۔ ان کی دوستی اور لڑائی ہر چیز پر خلوص ہے۔

چند خوش باش بھی تیسرے درجہ میں موجود ہوتے ہیں جن کی زندگی قہقہوں اور نغموں سے مامور نظر آتی ہے۔ کچھ نصیب کے مارے بھی ہیں، جن کی صورتوں کو دیکھ کر محرم یاد آتا ہے۔

کہیں قلی سے پیسے دو پیسے پر ہنگامہ آرائی ہے۔ کہیں خوانچے والے سے مفت مال ہتیانے پر ہاتھا پائی ہے۔ ایک طرف سے بچوں کے رونے کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں، تو ایک جانب نظر بازیاں بھی ہو رہی ہیں۔ یہ عموماً نوجوان ہوتے ہیں۔ جو گاڑی سے اسٹیشن کے رکتے ہی اپنے ڈبے سے اتر کر ٹہلنے یا سامان خریدنے کے بہانے زنانی گاڑیوں کے سامنے گھومنے میں بڑا لطف اٹھاتے ہیں۔

پہلے اور دوسرے درجے والے فطرت کی ان تمام تبدیلوں اور رنگا رنگ کیفیتوں سے بے نصیب ہیں جو تیسرے درجہ والوں کو حاصل ہیں۔ وہ سردی کا پورا لطف اٹھا سکتے ہیں اور نہ گرمی ان میں تڑپ اور بے چینی پیدا کر سکتی ہے۔ سردیوں میں ان کے موٹے موٹے گدّے اور دلائیاں اور بلانکٹیں انھیں مصنوعی طور پر گرم رکھتی ہیں اور گرمیوں میں پنکھے اور برف انھیں سردی پہنچاتے ہیں۔ پنکھے اور گدّے ہی در اصل پہلے اور دوسرے درجہ کا طرۂ امتیاز ہیں۔ کیا خوب وجہ امتیاز ہے؟۔ اس کو علیحدہ کر لیجئے تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

تیسرے درجہ کے مسافر حقیقت میں فطرت کی آزاد روحیں ہوتی ہیں جن سے کبھی نچلا بیٹھا نہیں جا سکتا۔ وہ کودتے پھاندتے چیختے چلاتے، ہنستے بولتے، گاتے روتے، سفر کی گھڑیوں کو لطف کے ساتھ گزار دیتے ہیں۔ درحالیکہ پہلے اور دوسرے درجے کے لوگ نہایت متانت کے ساتھ، سگریٹ پیتے اور اخبار پڑھتے، اخبار پڑھتے اور سگریٹ پیتے، نرم گدوں پر بھی پہلو بدل بدل کر یہ کٹھن لمحے کاٹتے ہیں۔

دنیا کی فلاح اور بہبود کو مطمح نظر بنا کر جتنے نظام آج معرض وجود میں آ رہے ہیں، سنتے ہیں کہ ان کا بڑا سہارا یہی تیسرے درجہ کے لوگ ہیں۔ اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ کیونکہ جب سب نقطۂ خیال نیز جائیں، تو زندہ رہنے کے لئے کچھ سہارا بھی تو ہو!۔ اس کا مقصد یہ کہ نصیب دشمناں تیسرے درجہ والوں کی حالت کچھ بری ہے۔ حالانکہ ان کی حالت بری تھی نہ اچھی ہوی۔ یہ جیسے تھے ویسے ہیں اور جیسے ہیں ویسے ہی رہیں گے۔ توجہ پہلے اور دوسرے درجے والوں کی طرف منعطف ہونی چاہئے۔ یہ درست ہوے تو دنیا درست ہوی۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ سب انہیں پیٹ بھروں کی تصنیفات ہیں۔ یہ خود اٹھنا چاہتے ہیں اور تیسرے درجہ والوں کو سہارا بناتے ہیں نتیجہ یہ ہے کہ خود شہرت اور دولت کما لیتے ہیں۔ اور تیسرے درجہ والے جہاں تھے وہیں رہ جاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو آج دنیا میں تیسرا ہی تیسرا درجہ ہوتا۔

عبدالقادر سروری

مشکل

حسن کے رعب سے ہے آنکھ اٹھانا مشکل
ضعف اتنا ہے کہ ہے جان سے جانا مشکل

بات بگڑی ہوی بن جاتی ہے آسانی سے
بگڑی تقدیر کا ہوتا ہے بنانا مشکل

حال کہہ سکتے ہیں، فریاد بھی کر سکتے ہیں
درد وہ چیز ہے جس کا ہے دکھانا مشکل

اڑ گیا رنگ جلد رز دحنا کی صورت
ان کی محفل میں ہوا رنگ جمانا مشکل

بارِ عصیاں سے جھکی جاتی ہے گردن میری
عرصۂ حشر میں ہے سر کا اٹھانا مشکل

روکنا حسرت دیدار کا آساں ہے صمیم
بعد دیدار کے ہے ہوش میں آنا مشکل

صمیم

غزل

اک تبسم کی جھلک دکھلا گیا
طور تک آیا مگر شرما گیا

پھر زمیں کا نہیں فلک تھرا گیا
پھر کسی کا دل کسی پر آ گیا

ہائے وہ ساقی کی مستانہ نظر
میں بھی سارے میکدہ پر چھا گیا

ہو گئی بدنام دنیا آپ کی
ہم مسافر ہیں ہمارا کیا گیا

اس ادائے شرم سے الٹی نقاب
طالب دیدار بھی شرما گیا

جیسے برحق تھا تغافل آپ کا
جو کوئی آیا ہمیں سمجھا گیا

مژدہ باد اے آبروئے عاشقی
آج اشکوں میں لہو بھی آ گیا

کوئی آساں تھا سمجھنا دیکھنا
درد دل دیکھا گیا سمجھا گیا

کس کے نغمہ نے متانت چھین لی
نجم پھر عہد جنوں یاد آ گیا

نجم افندی

یگانہ آرٹ

چھپائیں سی پردے پہ دکھاتا کیوں ہے
امکان پہ ہوس کو آزماتا کیوں ہے
میں یہ نہیں کہتا کہ پلٹ آئے شباب
بھولا ہوا خواب یاد آتا کیوں ہے

(۲)

بیداری ہو تو ہو مگر کی پروا نہ ہے
کہنے کے لئے وقت بہت خوب ہے لیکن
کس کی سے آج تک ہے کیا گزری
کیا جانے کل ہے کتنا کٹھن
یا نئی کتنا بہا ہے

مرزا یگانہ چنگیزی

ہنسی اور ظرافت

(بہ سلسلہ گذشتہ)

"ایک مثلث کے تین زاویوں کا مجموعہ دو قائمہ زاویوں کے مساوی ہوتا ہے" اس کو انگریزی زبان میں یوں ادا کر سکتے ہیں ایسے۔

The three angles of a triangle are together equal to two right angles

اور اگر اسی کا فارسی زبان میں ترجمہ کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ۔ "مجموع زوایائے ثلاثہ یک مثلث مساوی دو زوایائے قائمہ باشد" اسی طرح عربی، ترکی، پشتو، ہندی غرض یہ کہ جس زبان میں چاہو ترجمہ کرلو۔ ہر لفظ اپنی اپنی جگہ اسی خوبی سے بیٹھ جائے گا، جیسے انگوٹھی میں نگینہ پھر عبارت کی روانی کے ساتھ ساتھ مفہوم کے اصلی جوہر الگ چمکتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ مگر مذاق کی زبان میں ظریفانہ الفاظ و معنین کے وقت واحد میں دو دو اشارے۔ بازاری اور معیاری زبان کا فرق۔ روزمرہ محاورے۔ ملکی رسم و رواج قومی روایات۔ تلمیحات۔ اشارات وعنمیات یا دیو مالا کا ترجمہ اگر کسی اہل قلم نے کیا بھی تو ظرافت تو رہی ایک طرف اصل مضمون ہی خبط ہو جائے گا۔ اور ہر لفظ کے ساتھ ایک حاشیے کا دم چھلا الجھن کی رسی دراز کرتا رہے گا۔ مثلاً کسی ظریف نے کالستوں کے مذاق کا خاکہ اڑایا ہے کہ:۔

"بروَمن کہ فرستا یندند کوچہ بود خندق نہ رفت"

یہ بالکل اسی قسم کا مذاق ہے جیسے کسی صاحب نے لفافہ پر تحریر فرمایا تھا کہ "در شہر دیوار زرد۔ بخدمت لالہ بینی سوراخ سرخ صاحب برسد" یہاں دیوار زرد سے مطلب پیلی بھیت اور لالہ بینی سوراخ سرخ صاحب سے مطلب "لالہ نک چھید لال صاحب" تھا۔ یا یہ جملہ کہ "بر دو گوش نشستہ بودم۔ ہر چند طلبیدم مگر حجام" یہاں دو گوش سے مطلب دوکان یعنی دوکان اور حجام سے نائی یعنی نہ آئی مراد ہے۔ اس طرح پورے جملے کے یہ معنی ہوئے کہ دکان پر بیٹھ کر اسے ہر چند بلایا مگر وہ نہ آئی۔ اسی طرح ایک شوقین طبع نے لفافہ پر بٹلر روڈ لکھنو کی بجائے سڑک موسومہ بنام نائب السلطنت از ۱۹۱۸ء لغایت ۱۹۲۲ء شہر لکھنو لکھا تھا۔

کسی صاحب نے انگریزی میں بھی اسی قسم کا ترجمہ کیا ہے چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ (There is no grass but god) یعنی سوائے خدا کے کسی کو چارہ نہیں ہے یہاں چارہ کا ترجمہ انگریزی میں (grass) کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ کسی پروفیسر نے تاریخ انگلستان کا ترجمہ کیا۔ جس میں ایک جملہ یہ تھا (The Pope Innocent issued a bull) صاحب موصوف نے اس جملے کا ترجمہ کیا کہ "معصوم پاپائے روم نے ایک سانڈ چھوڑا" بہرحال ان پُر مذاق جملوں میں سے کسی جملہ کا ترجمہ اگر کوئی صاحب کسی دوسری زبان میں کریں تو انھیں مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کرنا پڑیگا۔ مثلاً وہی جملہ لیجیے کہ "بروَمن[1] کہ فرستا یندند کوچہ[2] بود خندق نہ رفت[3]" اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جامن جو بھیجی گئی تھی گلی ہوئی تھی کھائی نہ گئی مگر جن الفاظ سے یہ مذاق پیدا کیا گیا ہے ان کی شرح اس طرح کی جائیگی۔

نوٹ نمبر (۱)۔ بروَمن "برو" صیغہ امر "بمعنی جا" من بمعنی من۔ یہاں من کے معنی واحد متکلم یعنی میں کے نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں من سے مطلب صرف "من" ہی ہے ان دونوں ٹکڑوں کو ملا کر ایک اسم بنایا ہے یعنی "جامن"

جامن ہندوستان میں ایک پھل ہوتا ہے۔

نوٹ نمبر (۲)۔ کوچہ بمعنی گلی یہاں دراصل گلی کوچہ کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ گلی یعنی سڑی یا پھپھوندی لگی ہوئی۔

نوٹ نمبر (۳)۔ خندق بمعنی کھائی مگر یہاں وہ کھائی مراد نہیں جو خندق کے معنوں میں مستعمل ہے بلکہ وہ کھائی مراد ہے جو فارسی میں خورد کے معنوں میں مستعمل ہے۔

نوٹ نمبر (۴)۔ رفت ماضی بعید بمعنی گیا یا گئی۔ مگر دراصل یہاں گئی جانے کے معنوں میں نہیں آیا ہے۔

غرض یہ کہ جو مذاق زبان سے متعلق ہو یا جس میں ضلع اور جگت وغیرہ کے چٹخارے ہوں کسی دوسری زبان میں اس کا ترجمہ کرکے وہی چٹخارے پیدا کرنا قطعی غیر ممکن ہے۔ مثلاً یہاں ضلع سے مذاق پیدا کیا گیا ہے۔ ایک صاحب نے کسی طوائف سے پوچھا کہ تمھارا نام کیا ہے؟ جواب پاکے انھوں نے کہا کہ "تم تو شیرا ہو" طوائف نے جواب دیا کہ اگر آپ اس میں خوش ہیں تو ہم شیرہ (ہمشیرہ) ہی سہی۔

دو شخص چوسر کھیل رہے تھے۔ ان میں ایک کانا تھا۔ انھوں نے چار کانے کا داؤ رکھا۔ پانسا پھینکا تو تین کانے پڑے۔ ایک ظریف نے پوچھا کہ "پریشان کیوں ہو" کہا کہ "پانچ روپیہ کی بازی ہے داؤ رکھا چار کانے۔ پانسا پھینکا تو پڑے تین کانے" وہ کہنے لگا کہ "حضرت تین کانے یہ ہیں چوتھے کانے آپ ہیں چاروں کانوں کو ملا کر رنگ کو تو اٹھا جاؤ۔ بدرنگ کے چگٹ کو پھر دیکھ لینا" یا جملہ میں کوئی غلط یا غیر موزوں لفظ بٹھا دیا ہو مثلاً

ایک میراثی کا لڑکا نماز پڑھتے وقت التحیات بھول گیا۔ نماز توڑ کر مولوی صاحب سے پوچھنے لگا کہ "خلیفہ جی بیٹھنے کا انترہ کیا ہے"

یا یہ واقعہ کہ :-

چڑیا خانے میں ایک صاحب مع اپنے صاحبزادے کے جانوروں کے ملاحظے میں مصروف تھے۔ جس وقت وہ اس احاطہ کے سامنے پہنچے جہاں ہاتھی بند تھا لڑکے نے گنا دینے کے لئے ہاتھ بڑھایا ان کے والد نے چلا کر کہا "دیکھنا بیٹا۔ بچ کے رہنا کہیں اس کا ڈنک نہ لگ جائے"۔

یا بعض اوقات مذاق پیدا کرنے کے لئے جملے کے الفاظ الٹ دیتے ہیں۔ مثلاً :-

ایک صاحب شتر خانہ میں منشی کی جائداد پر نوکر ہوے۔ دوسرے روز کوئی افسر معائنے کو آیا۔ اور ان سے پوچھا تم کون ہو یہ فوراً گھبرا کر بولے میں منشی خانہ کا شتر ہوں۔

یا بعض اوقات لکھا ہوا کچھ ہوتا ہے مگر حرفوں پر نقطے وغیرہ نہ ہونے سے پڑھ کچھ لیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک نسخہ میں لکھا تھا۔

"شربت بنفشہ وانہ الاکی۔ کسی صاحب نے اسے پڑھا "شربت بنفسہ وانہ اکیحی"

غرض یہ کہ ان سب کے لطف صرف ایک اہل زبان ہی لے سکتا ہے۔ ترجمہ کیا اور مزہ کرکرا ہوا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ لفظی مذاق کی کیفیت ایک آئینے کی سی ہے جس میں لطف زبان اور حسن بیان کے جلوے نظر آتے ہیں اور دور سے کھڑے رہ کر دیکھو تو سب کچھ ہے اور نزدیک آکر ٹٹولو تو کچھ بھی نہیں۔

ہاں اگر ظرافت لفظی الٹ پھیر یا کسی خاص گروہ کے لب و لہجہ یا طرز تکلم کی نقالی کو چھوڑ کر حیات نگاری اور سیرت نگاری کے میدان میں قدم رکھے کائنات کی متضاد کیفیتیں اور واقعات میں تناقض کی صورت پیدا کرے، مختلف قوموں کے عادات و اطوار اور ان کی خصوصیات اخلاقی رنگ میں پیش کرے تو اس میں ادبی خصوصیت اور معیاری ظرافت کا اصلی رنگ جھلکتا ہوا نظر آئے گا۔ ظریفانہ اور مضحکہ خیز افعال کون سے ہیں۔ ایک شیخی باز نواب جو زمین و آسمان کے قلابے ملاتا رہتا ہو ایک پروفیسر جو ہمیشہ اپنے خیالات میں غرق رہے یہاں تک کہ اگالدان کو گلاس سمجھ کر اپنے منہ سے لگائے۔

انہماک میں اپنا گھر سمجھ کر دوسرے کے گھر میں گھس جائے۔ اور لوگ کچھ پوچھیں اور وہ اپنے انہماک میں جواب کچھ کا کچھ دئے جائے مثلاً۔

ایک لڑکے کا جوتا چوری گیا۔ اُس نے مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب ایک گھنٹے سے "کفش" ڈھونڈ رہا ہوں مگر وہ نہیں مل رہی ہے۔
مولوی صاحب جو مطالعے میں غرق تھے۔ سر جھکائے ہوئے فرمانے لگے "بیٹا غیاث اللغات میں کاف کے باب میں ڈھونڈو مل جائے گا۔
اسی طرح ایک کنجوس امیر ایک حریص مفلس، بنے ہوئے مرشد شریر طالب علم، بے وقوف عالم، مارواڑی، افیونی، افغانی غرض یہ کہ جدھر نظر اٹھاؤ گے ایک پر لطف مجمع نظر آئے گا۔ اور اُن کی باتیں سنو گے تو ہنستے ہنستے لوٹ جاؤ گے۔

"مشتے نمونہ از خروارے" چند مثالیں قابل ملاحظہ ہیں۔

ایک افیونی نے تقریباً ڈیڑھ سیر گوشت لاکر اپنی بیوی کو دیا۔ اتفاقاً وہ گھر میں سے غائب ہو گیا بیوی نے بلی پر شبہ ظاہر کیا کہ شاید یہ کھا گئی ہو گی۔ افیونی نے کہا کہ بھلا اتنی سی بلی۔ اتنا گوشت کیسے کھا گئی۔ اچھا بلی کو تول کر دیکھو تو معلوم ہو جائے گا۔ بلی کو تولا تو اس کا وزن کل ڈیڑھ سیر نکلا افیونی نے تعجب سے کہا کہ گوشت تو مل گیا۔ لیکن بلی کہاں گئی۔

ایک بونا تھانے میں دوڑتا ہوا بدحواس آیا اور کہا کہ مجھے پناہ دو۔ تھانہ دار نے پوچھا کہ "واقعہ کیا ہے" بونے نے جواب دیا "میں نے اپنی بیوی کو دستِ پناہ کھینچ کر مارا ہے" تھانہ دار نے پھر پوچھا کہ "کیا وہ مرگئی" تو بونے نے جواب دیا کہ مری ہوتی تو نہیں مگر وہ مجھے پکڑنے آرہی ہے۔

استاد نے جماعت میں ایک سوال کیا جو بچوں کی استعداد سے باہر تھا۔ یہ سن کر ایک لڑکے نے دوسرے لڑکے کے کان میں کہا کہ ہمارا استاد بھی ذرا اُلو ہی ہے۔ استاد نے انھیں سرگوشی کرتے ہوئے دیکھ کر سمجھا کہ شاید جواب کی فکر میں ہیں خوش ہو کر کہا کہ شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ ہاں زور سے کہو شاید درست ہو۔

موہن گڑگڑا کر دعا مانگ رہا تھا کہ اے ایشور روم کو ترکی کا دارالسلطنت بنادے! باپ نے پوچھا کہ "موہن تم یہ دعا کیوں مانگ رہے ہو" موہن نے جواب دیا۔ اس لئے کہ امتحان کے پرچہ میں میں نے غلطی سے روم کو ترکی کا دارالسلطنت لکھ دیا ہے۔
ایک وکیل نے دوسرے وکیل سے کہا کہ تم گدھے ہو۔ دوسرے نے کہا کہ تم اُلو ہو۔ دونوں نے جج سے شکایت کی جج نے کہا کہ آپ دونوں تھوڑی دیر کے لئے باہر چلے جائیے۔ جب آپ ایک دوسرے کو اچھی طرح سے پہچان لیں تو پھر آکر بحث کریں۔
ایک شخص کا کتا کھو گیا۔ اس نے اخبار میں اشتہار دیا کہ جو اسے ڈھونڈ لائے گا اس کو دس روپے انعام دیا جائے گا۔ اشتہار چھپا۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ وہ مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے دفتر پہنچے اور کہنے لگے کہ صیغۂ اشتہار کے منیجر سے ملنا چاہتا ہوں۔ جواب ملا کہ وہ موجود نہیں ہیں۔ پھر کہا کہ اُن کے نائب سے مل سکتا ہوں۔ تو جواب ملا کہ وہ بھی نہیں ہیں۔ "اچھا تو ایڈیٹر صاحب ہیں" جواب دیا کہ وہ بھی باہر گئے ہوئے ہیں" پھر پوچھا کہ "سب ایڈیٹر صاحب تو ہوں گے۔ ان سے ہی مل لوں" جوان نے کہا کہ وہ بھی باہر گئے ہوئے ہیں" تو یہ فرمانے لگے کہ اوہو سب کے سب کتے کی تلاش میں مصروف ہیں۔ شکریہ۔ شکریہ۔

(باقی آئندہ)

مرزا عصمت اللہ بیگ

بھاکھا کے مسلمان شعراء

اس مختصر سے مضمون میں تقریباً سوا سو مسلمان شعراء کا کلام بقید تاریخ درج کرنا ناممکن ہے۔ جنھوں نے زبان بھاکھا کو اپنا بنایا تھا۔ صرف بڑے بڑے چند افراد کا ذکر بہ تفصیل درج کر دیا جاتا ہے۔ اور کسی دوسرے موقعہ پر کسی دوسری محفل میں ماباقی شعراء جن کے یہاں پر صرف نام گنانے پر اکتفا کیا جاتا ہے مع نمونہ کلام پیش کئے جائیں گے۔

پہلا مسلمان شاعر جس کا ذکر ملتا ہے قطب علی تھا جو بارھویں صدی عیسوی میں گذرا ہے۔ مگر اس کا کوئی کلام ہمدست نہیں ہوا۔ امیر خسرو کی پہیلیاں اور کہ مکرنیاں مشہور ہیں ہر خاص و عام کی زبان پر ان کی پہیلیاں اب تک ہیں یہاں صرف ایک نمونہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

خسرو کہین بناؤ پہیلی ' بن دادے کا پوتا ہے ہاتھ چڑھا وہ گھر گھر ڈولے ' بن مارے وہ روتا ہے

خسرو کے بعد مدت تک کسی مسلمان ہندی شاعر کا پتہ نہیں ملتا۔ لودھی خاندان کے دور حکومت میں کبیر صاحب پیدا ہوتے ہیں اگر سچ پوچھا جائے تو خسرو، کبیر اور رحیم۔ یہی تین شعراء ہیں جن کا نام زبان ہندی سے محو نہیں ہو سکتا۔ کبیر صاحب کے بچن زبان زد خاص و عام ہیں۔ اور کسی تعریف کی ضرورت نہیں۔ یہاں صرف ایک نمونہ ان کے مقدس کلام سے درج کیا جاتا ہے۔

سائیں کے سب جیو ہیں، کیری کنجر دوئے دیا کون پر کیجیے کا پر نردئی ہوئے

دیا = رحم، نردئی = بے رحم، کیری = چیونٹی، کنجر = ہاتھی، دوئے = دونوں، فرماتے ہیں کہ کس سے رحم کیا جائے اور کس پر ظلم جائز رکھا جائے۔ چیونٹی اور ہاتھی دونوں اسی رحمٰن و رحیم کی مخلوق ہیں۔

خاندان سوری کے مختصر سے دور میں دو شاعر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک شیخ قطبن دوسرے ملک محمد مصنف پدماوت۔ جس طرح سروانٹیز کے باعث ڈلسنیا ڈل ٹوباسو (Dulcinia - del Tobaso) مشہور ہوئی اسی طرح ملک محمد نے سنگل دیپ کی پدمنی کو حسن و عشق کا نمونہ بنا دیا ہے۔ اس کی داستان غم ہم پھر کسی وقت پیش کریں گے۔

دور مغلیہ میں جب کہ ہر طرف امن و اماں قائم ہو گیا۔ تجارت کے ساتھ دولت کی فراوانی ہوئی اور عوام آسودہ اور خوش حال ہوئے تو پھر ادب کا بھاگ جاگا۔ ہندی کے تمام مشہور شعراء اس دور میں گذرے ہیں۔ تلسی اور سور یا بہاری اور دیو، متی رام اور بھوشن یہ وہ شعراء ہیں جو کسی زبان کے مایۂ ناز ہو سکتے ہیں۔

یہ سب دور مغلیہ ہی میں گذرے ہیں یہی وہ زمانہ ہے جب کہ دکن کی سرزمین سے اس نئی زبان کی ابتداء ہوتی ہے۔ جسے پہلے ریختہ اور اب اردو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ شہنشاہ اکبر خود ہندی میں کلام کرتے تھے۔ بیربل کے مرجانے پر اکبر کو بڑا صدمہ ہوا اور اس کے احساسات نظم ہو گئے۔

دین دیکھ سب دین، ایک نہ دینو دسہ دکھ سو اب ہم کو دین، کچھ نہیں راکھو بیربل

دین = قابل رحم، دکھی = رنجیدہ، دَین = دے ڈالا، دینوں = دیا، دُسہ دُکھ = ناقابل برداشت غم، راکھو = رکھا،

کہتے ہیں کہ غربا اور مساکین کو اس نے سب ہی کچھ دے ڈالا تھا۔ صرف ایک ناقابل برداشت غم تھا جو اب ہم کو دیا ہے
بیربل نے اپنے پاس کچھ بھی تو نہ رکھا۔

اس خاندان میں شہزادہ دانیال اور شہزادہ دارا شکوہ نے بھی ہندی میں کلام چھوڑا ہے۔ اسی طرح ابراہیم عادل شاہ نے
ہندی نظم کو سنوارا اور اپنی تصنیف نو رس یادگار چھوڑی۔

دربار اکبری کے نورتن میں سے ایک عبدالرحیم خانخاناں تھے۔ فارسی اور بھاکھا کے صدہا اہل قلم ان کی سخاوت سے مستفیض ہوئے۔ خود بھی
نہایت پاکیزہ نظم لکھتے تھے۔ یہاں چند دوہے بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

اب رحیم مشکل پڑی، گاڑھے دوؤ کام
سانچے تے تو جگ نہیں، جھوٹے ملے نہ رام

رحیم اس زمانے میں بڑی مشکل ہے۔ دونوں طرح مشکل ہے۔ سچ کہو تو دنیاداری نہیں نبھتی اور اگر جھوٹ کی راہ اختیار کی جائے تو
عاقبت خراب ہوتی ہے۔

کملا تھِر نہ رحیم کہے، یہ جانت سب کوئے
پُرش پُراتن کی بدھو، کیوں نہ چنچلا ہوئے

کملا = دولت کی دیوی، پُرش پراتن = بوڑھا آدمی، وشنو کو بھی دیومالا میں اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بدھو = زوجہ، عورت،
چنچل = چلبلی، تھِر = مستقل، پابند، جو چنچل نہ ہو، یہ سب کوئی جانتا ہے کہ دولت کسی کے یہاں مستقل طور پر نہیں رہتی۔ آخر پُرش پراتن
کی زوجہ ہے کیوں نہ چنچل ہو۔

دیومالا میں کملا وشنو بھگوان کی زوجہ کہی جاتی ہے جن کا نام پُرش پراتن بتا کر رحیم کیا عمدہ چٹکی لیتا ہے۔

سب ہی ساتھی سَبل کے، نبل نہ کوئی سہائے
پون جرایت انل کو، پاپک دیت بجھائے

سَبل = مضبوط، قوی، نبل = کمزور، سہائے = حامی، مددگار، پون = آندھی، تیز و تند ہوا، انل = آگ، پاپک = چراغ، دیا۔

قوی کا ہر ایک ساتھ دیتا ہے مگر کمزور کا کوئی حامی نہیں۔ ہوا کو دیکھو کہ آگ کو تو روشن کرتی ہے اور کمزور دیا کو بجھا دیتی ہے۔

دُھور دھرت نج شیش پر، کہو رحیم کس کاج
جے ہی رج رشی پتنی تری، سو ڈھونڈت گج راج

دھور = مٹی خاک، نج = اپنے، شیش = سر، کاج = غرض، کام، جے ہی = جس، رج = دھور، خاک، رشی پرتنی = گوتم کی ناری، اہلیہ، گج راج = ہاتھی
رحیم کہو ہاتھی اپنے سر پر خاک کیوں ڈالتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مٹی کی تلاش میں ہے جس کے چھونے سے اہلیا تر گئی۔
کہتے ہیں کہ اہلیا گوتم کی زوجہ تھی اور پتھر ہو گئی تھی جب بھگوان رام چندر جی اس راستے گذرے تو ان کی خاک پا سے اہلیا پھر
آدمی ہو گئی۔ ہاتھی آج تک اسی مقدس خاک کو تلاش کر رہا ہے جس سے اس کی زندگی بھی سنبھل جائے۔

اسی دور کے ایک اور شاعر قادر بخش گذرے ہیں جو زمانے کی ناقدر شناسی کے باعث یوں شاکی ہیں۔

گن کی نہ پوچھے کوؤ اوگن کی بات پوچھیں
کہا بھیو دئی کلجگ یوں کھرانو ہے
پوتھی اور پران گیان ٹھٹھن میں ڈار دیت
چگل چبائن کو مان ٹھہرانو ہے
کادر کہت یا تے کچھو کہبے کی نا ہین
جگت کی ریت دیکھو چپ من جانو ہے

کمول دیکھو ہوسب بھانتین سوی بھانت بھانت گن ناہرا نون گن کا ہک پرا نو ہے

گن۔ بھلائی، کمال، اوگن۔ برائی، دئی۔ یا آلہی۔ کلجگ۔ موجودہ زمانہ، زمانہ کی تقسیم ست جگ، تریتا، دواپر اور کلجگ چار حصوں میں کی گئی ہے۔ پوتھی۔ کتاب، گیان۔ علم، منطق۔ مذاق، چگل چغلی۔ چبا ؤ۔ بہتان، مان۔ عزت، ہیو۔ دل، ضمیر، پرانون۔ کم ہوا، گم ہوا، تخفیف میں آیا۔

بھلائی کی بات تو کسی کو آتی نہیں۔ جسے دیکھو برائی کی باتیں بناتا ہے۔ الٰہی آخر اس زمانہ کو یہ ہو کیا گیا ہے۔ علم و فن کا طرف مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ہر ایک چغلی اور بہتان میں مشغول ہے۔ قادر کہتا ہے کہ اس سے تو کچھ بھی نہ کہہ۔ دنیا کی ریت دیکھ کر خاموشی اختیار کرنا بہت بہتر ہے۔ میں نے خوب اچھی طرح غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کمال کی کمی نہیں ہے کمی ہے اس کے قدردانوں کی۔

برج بھاشا کی نظم کا ایک مجموعہ برج مادھوری سار کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے مصنف کی رائے ہے کہ رسکھان نہایت شستہ بولی میں کرشن جی کی تعریف میں کتا کرتا ہے۔

ڈرے سدا، چاہے نہ کچھ سہے سبے جو ہوئے رہے ایک رس چاہکے پریم بکھانوں سوئے

پریم وہ ہے جو ہمیشہ ڈرتا رہے اور کسی امر کی خواہش نہ رکھے۔ جو کچھ گذرے اسے سہتا رہے صرف یار کے خیال میں مست رہے۔ بس یہی عشق ہے۔

ستیہ نارائن حال ہی کے مشہور شاعر گذرے ہیں۔ انھیں موسیقی سے خاص ذوق تھا ایک موقع پر غایت درجہ موسیقی کے ساتھ انھوں نے رسکھان کے حسب ذیل کلام کو پڑھا تھا۔

یا لکوٹی اور کامریا پر راج تہوں پر کو تج ڈاروں — اٹھوں سدھ نو ندھ کو سکھ نند کی گائے چرائے بساروں
آنکھیں سوں رسکھان کبہے برج کے بن باگ تڑاگ نہاروں — کوٹن ہوں کل دھوت کے دھام کریل کے کنجن اوپر واروں

لکوٹی۔ چھوٹی چھڑی، کامریا۔ کلیم، کمبل، تہوں پر۔ تینوں لوگ جن میں ساری ارض کو تقسیم کیا گیا ہے، تج ڈاروں۔ ترک کردوں، سدھ۔ عظمت، وکمال، نو ندھ۔ ثروت و دولت، بساروں۔ بھول جاؤں، کبہے۔ کب، باگ تڑاگ۔ باغ اور تالاب، نہاروں۔ دیکھوں، کوٹن۔ کروڑوں، کل دھوت۔ سونا، طلا، دھام۔ مقام، کریل۔ کانٹے دار ایک قسم کا درخت، کنج۔ کنج، درختوں کا جھرمٹ میں تو بھگوان کرشن کی اس چھڑی اور کملی پر تینوں عالم ترک کردوں۔ اور اٹھوں سدھ اور نو ندھ کی لذت نند کی گائیں چرانے میں بھول جاؤں کاش میں اپنی آنکھوں سے برج کے جنگل باغ اور تالاب دیکھ سکوں (شاعر نابینا تھا) میں اس خوبصورت کنج پر کروڑوں سونے سے سجے ہوئے مقام نثار کردوں۔

مانس ہو تو وہی رسکھان بسوں برج گوکل گاؤں کے گوارن — جو پشو ہوں تو کہا بس میرو چروں نت نند کی دھینو مجھارن
پاہن ہوں تو وہی گر کو جو دھر یو کر چھتر پرندر دھارن — جو کھگ ہوں تو بسیرو کروں وہی کالندی کول کدمب کی ڈارن

مانس۔ انسان، بسوں۔ آباد ہوتی رہوں، پشو۔ جانور، حیوان، دھین۔ گائے، پاہن۔ پتھر، گر۔ پہاڑ، پرندر۔ کرشن بھگوان، کھگ۔ پرند، کول۔ کنارے۔

اگر میں آدمی بنایا جاؤں تو برج اور گوکل کے گوالا کے ساتھ جاکر رہوں، اگر میری قسمت میں جانور ہونا ہے تو پھر ہر روز نند کی

گائیوں کے ساتھ چرا کروں۔ اگر میں پتھر بنوں تو اس پہاڑ کا جسے کرشن بھگوان نے چھتری کی طرح اپنے ہاتھ پر اٹھا لیا تھا۔ اور اگر پرند ہونا میری قسمت میں لکھا ہو تو پھر کالندی کے کنارے کدنب کی ڈالیوں میں میرا آشیانہ ہو۔

خال کی تعریف اردو شعرا نے خوب کی ہے۔ سید مبارک علی بلگرامی اپنے کلام میں اسے ایک اچھوتے رنگ میں پیش کرتے ہیں ملاحظہ ہو۔

سب جگ پیرت تین تھکو چتہ یہ ہیر — تو کپول کو ایک تل، سب جگ ڈاریو پیر

پیرہ پیرنا، تیل نکالنا ۔ تکلیف دینا، تل ۔ اجناس کی قسم سے ایک اور خال کو بھی کہتے ہیں، تو ۔ تمھارے، کپول۔ چہرہ، رخسار دنیا جہاں تل کو (تیل کے لئے) پیرتا ہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوں کہ وہی تل جب تیرے رخسار پر آگیا تو اس نے سارے جہان کو پیر دیا ہے۔

دورِ مغلیہ میں چھوٹے بڑے بہت سے مسلمان شعرا نے ہندی میں کلام کہا۔ اکثر کا تو صرف نام اور تخلص ہی باقی ہے۔ شیخ عثمان، جمال، طاہر، دلدار، شیخ وزیر وغیرہم بہت سے نام گنائے جا سکتے ہیں۔

بہادر شاہ کے ایک حاشیہ نشین عبدالرحمٰن نامی گذرے ہیں۔ انھوں نے (۱۷۰۰ء) دوہے اپنی یادگار چھوڑے۔ ان میں سے ایک یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

پلکن میں راکھو پیہی، پلک نہ جھاڑ و سانگ — پتری سوتے ہو ہی جن، ڈر پت اپنے انگ

میں اپنے معشوق کی تصویر اپنی آنکھوں میں رکھتی ہوں۔ لحظہ بھر کے لئے جدا نہیں ہونے دیتی، پھر بھی ڈر یہ ہے کہ کہیں آنکھ کی پتلی بھی میری رقیب نہ بن جائے۔

سید نظام الدین بلگرامی اپنا تخلص مدھناک کرتے تھے۔ غلام علی آزاد اُن کی بابت فرماتے ہیں:۔

سید نظام الدین شہرۂ روزگار در موسیقی ہندی یگانہ ادوار است در عصر خود ممتاز و کرم می زیست وصفت مروت و سخاوت بمرتبہ کمال داشت و ہموارہ خلق خاص وجود حاتمی را رنگی تازہ می بخشد و در صحبت نکتہ سنجی و لطیفہ گوئی ہیر مجلس بہ او مسلم می شد۔

مدھناک بلگرام سے بنارس بغرض تحصیل علم روانہ ہوئے دو تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ اوّل ناد چندریکا دوم مدھناک سنگار۔ ایک مرتبہ ان بزرگ نے میگھ راگ گا کر خوب بارش کی ۱۱۹۰ھ میں انھوں نے وفات پائی۔

کاری کجراری انیاری جگ موہن کوں تن پیچ ماری تی ترل تر پری ہیں — جیسی میں ساوک جا وک جل بھرن بھرکین سو کیسے ہوں رہت نہ گھیری ہیں
لال مدھناک سو بیروں موہنی کوں پٹ بیگری بیجبر رہت نہ ہیری ہیں — سالوکی سدھار سو بھا ہار ہکار ایسی ہیں کی کھلوناں کیدھوں کینں کی تیری ہیں

کجراری۔ کاجل لگائے، انیاری۔ نوکدار، ترل چنچل، ترپری۔ آنکھ کا گھومنا، ساوک۔ کسی جانور کے چھوٹے بچے کو ساوک کہتے ہیں، ہیری۔ ڈھونڈ۔

تیری کالی کاجل دار نوکیلی آنکھیں دنیا کو ہنستے ہوئے ایسی پھرتی ہیں جیسے کہ مچھلی کے بچے پانی میں پھرتے ہیں اور کسی کے روکے نہیں رک سکتے۔ مدھناک کا دل اس جال سے بچائے پھر بھی نہیں بچتا۔ ان آنکھوں کی خوبصورتی تو دیکھو کہ یہ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ہیں یا تیری پیاری پیاری آنکھیں ہیں۔

سید رحمت اللہ نے ۱۱۱۸ھ میں وفات پائی ایک دوہا جو آنکھوں کی تعریف میں انھوں نے لکھا بہت ہی اچھا ہے۔

آن بان کو لہت ہیں نینن بان سمان — وے لاگت سالت جو یہ دیکھت بیدھت پران

عوام آنکھوں کی ہجان (تیروں) سے مشابہت بتاتے ہیں مگر بان تو لگنے سے زخم پیدا کرتا ہے اور آنکھوں کے تو دیکھنے سے ہی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔

ان کے ہمسر میر عبدالجلیل گذرے ہیں جنھوں نے اپنی تصنیف نکھ سکھ (سراپا) یادگار چھوڑی ہے۔ معشوق کی نزاکت طبع کا کیا ہی عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔

پھلواری گھونگھٹ کی باتین جات ــــ سمن باس بن چھائیں نہیں سُہات ــــ

کہتے ہیں پھولوں کی خوشبو بھی جب تک چھن کر آئے پسند خاطر نہیں ہے۔ اس لئے تو گھونگھٹ کا استعمال جائز رکھا گیا ہے۔

زبان کی شستگی، سلاست اور موسیقی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو برج بھاشا میں رس کھاں، رس لین کا درجہ بہت اعلیٰ قرار دیا جائے گا۔

رس لین کا پورا نام سید غلام نبی تھا۔ میر عبدالجلیل کے ہمشیر زادے اور بلگرام کے رہنے والے تھے۔ ۱۷۲۷ء میں رنگ درپن اور ۱۷۳۱ء میں رس پربودھ ختم کی۔ چند نمونے ان کے کلام سے پیش کیے جاتے ہیں۔

اے من ریت بچتر ہے ریت نینن کی چیت ــــ بکھ کا جر بخ کھائے کے جیہ اورن کی لیت

شاعر کہتا ہے کہ اے میرے دل ان کی آنکھوں کا عجیب طرز تو دیکھ خود تو زہر یلا کاجر کھاتی ہیں اور دوسروں کے دل پر آفت ڈھاتی ہیں۔ ایک جگہ آنکھ کے کھلنے اور بند ہونے کی تشریح کرتے ہیں کہ بند ہونا تو ان کی ریت ہے مگر کھلتے وقت پریم کا اثر ہوتا ہے۔

کہلت پریم کے جور تے ، مندت نیم کی جور

ہم کہہ چکے ہیں کہ سوا سو مسلمان شعرا کا تذکرہ جنھوں نے بھاکھا میں نظم لکھی ہے۔ ایک مضمون میں لانا ناممکنات سے ہے۔ اس کے لئے بہت زیادہ تحقیق و تدقیق کی ضرورت ہے۔ یہ چھوٹا سا مضمون اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ آئندہ اس جانب کسی کی توجہ مبذول ہو اور یہ معلوم کرنے کی بھی کوشش کی جائے کہ دکن کے اہل قلم نے کہاں تک اس ترقی میں حصہ لیا۔ بیجاپور کے حکمران ابراہیم عادل شاہ کے علاوہ اب تک صرف ایک نام ہاشم بیجاپوری کا ملتا ہے۔ ابنائے وطن کا فرض ہے کہ اپنے بزرگوں کا نام دنیا میں جیتا جاگتا رکھنے کے لئے انھیں دنیا سے روشناس کریں۔ وما علینا الا البلاغ۔

میں اب اس مضمون کو سید برکت اللہ کے دو تین نمونے درج کر کے ختم کرتا ہوں۔

تم دیکھ ہم پتنگ اچگت کہے سنائے ــــ } من شمع جاں گدازم
بن دیکھے نہیں رہ سکوں دیکھے رہوں نجائے ــــ } سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی

پیمی ہند و ترک ہیں ہر رنگ رہو سمائے
دیول اور مسیت میں دیپ ایک ہیں بھائے

ہوں چکئی وا سندھ کی جہاں نہ سورج چند
رات دیس نہیں ہوت ہے نا دکھ نہیں آنند

بھاکھا کے مسلمان شعراء کی فہرست

(الف)

۱ اکبر
۲ ابراہیم عادل شاہ
۳ ابراہیم
۴ انور خاں
۵ احمد
۶ آصف خاں
۷ اعظم خاں
۸ میر احمد بلگرامی
۹ اعظم
۱۰ سید میر علی
۱۱ الہ داد
۱۲ انشاء
۱۳ اکرم

(ب)

۱۴ بارک
۱۵ پیتم
۱۶ پریمی
۱۷ بختاور خاں
۱۸ سید برکت اللہ بلگرامی

(ج)

۱۹ جمال الدین
۲۰ جمال

(د)

۲۱ شہزادہ دانیال
۲۲ شہزادہ دارا شکوہ
۲۳ دلدار
۲۴ دانشمند خاں
۲۵ دین

(ھ)

۲۶ ہمت بہادر
۲۷ ہاشم بیجاپوری
۲۸ ہمت خاں

(و)

۲۹ شیخ وزیر
۳۰ وہاب
۳۱ واجد
۳۲ واحد

(ز)

۳۳ زین الدین

(حطی)

۳۴ خان
۳۵ خسرو
۳۶ حسین
۳۷ حاجی
۳۸ طاہر
۳۹ طالب شاہ
۴۰ طالب علی بلگرامی
۴۱ یعقوب خاں
۴۲ یوسف خاں
۴۳ یزدانی
۴۴ حسن اہیروی
۴۵ حسین

(ک)

۴۶ کبیر
۴۷ کریم
۴۸ کشور علی
۴۹ کاظم علی

(ل)

۵۰ لطیف

(م)

۵۱ مبارک
۵۲ ملک محمد جائسی
۵۳ محبوب
۵۴ میر رستم
۵۵ محمد
۵۶ مدہنالک
۵۷ مظہر جان جاناں
۵۸ میاں
۵۹ میرن
۶۰ میر
۶۱ مراد
۶۲ شاہ محمد

(ن)

۶۳ نور محمد
۶۴ نواز بلگرامی
۶۵ نجیبی
۶۶ غلام نبی
۶۷ نیاز
۶۸ نشاط
۶۹ مرزا روشن نظیر
۷۰ نجیب خاں

(س)

۷۱ سلطان
۷۲ سید پہاڑ

(ع)

۷۳ عالم
۷۴ عبدالرحیم خان خاناں
۷۵ عثمان
۷۶ عبدالرحمن
۷۷ عبدالجلیل بلگرامی
۷۸ عادل
۷۹ علیم
۸۰ علی
۸۱ محمد عارف بلگرامی
۸۲ خان عالم
۸۳ خان ملتان
۸۴ خان سلطان
۸۵ عبدالواحد ذوقی بلگرامی

(ف)

۸۶ فضائل خاں
۸۷ فرید

(ص)

۸۸ صاحب

(ق)

۸۹ قطبن
۹۰ قادر
۹۱ قاسم شاہ

(ر)

۹۲ رسکھان
۹۳ رس لین
۹۴ رجب علی
۹۵ سید رحمت اللہ بلگرامی

(ش)

۹۶ شیخ
۹۷ شاہ شفیع
۹۸ شاہ ہادی
۹۹ شیخ گدائی
۱۰۰ شیخ سلیمان
۱۰۱ شیخ شاہ محمد بلگرامی

(ت)

۱۰۲ تاج
۱۰۳ تیغ علی
۱۰۴ تراب

(ذ)

۱۰۵ ذوالقرنین

بی این چوبے

میرا ایک دوست

میرا ایک دوست ہے۔ کالج کا ساتھی۔ نہایت دلچسپ ظرافت کا پتلا۔ اگر تم اس کی بے تکلف صحبتوں میں بیٹھو تو وہ تمھیں اتنا ہنسائے گا کہ تمھارے رخسار درد دینے لگیں۔ تم شائد اس کی زندگی پر رشک کرنے لگو گے۔ تم سمجھو گے کہ اس کی زندگی آلام و مصائب سے پاک اور مسرتوں سے لبریز ہے۔ لیکن مجھے اس کی زندگی کا ایک راز معلوم ہے۔ وہ راز جسے آج تک اس نے سوا میرے ہر ایک سے چھپا رکھا ہے۔

"آج میں تمھیں سب کچھ سنا دوں گا" اس نے کہا تھا "اس لئے نہیں کہ دنیا کے لئے درس عبرت ہو۔ اس لئے نہیں کہ بھٹکے ہوئے اس کو سن کر راستے پر آجائیں نہیں مجھے ایسے بڑے بڑے دعوے کرتے نہیں آتے۔ میں سناؤں گا صرف اس لئے کہ بس سنا دینا چاہتا ہوں۔ دل میں ایک جذبہ ہے جو رہ رہ کر مجبور کرتا ہے کہ میں سب کچھ سنا دوں۔ تمام دنیا کو۔ دنیا کے تمام افراد کو۔ خاموش بہتی ہوئی ندیوں کو۔ سر ٹپکتے ہوئے آبشاروں کو۔ اڑتے ہوئے بادلوں کو ٹمٹماتے ہوئے تاروں کو جگمگاتے ہوئے چاند کو زمین کو آسمان کو۔ میں اپنی کتاب زندگی کے اوراق کو بکھیر دینا چاہتا ہوں۔ تمام دنیا میں۔ کائنات میں۔ میں اپنی آواز کو پھیلا دینا چاہتا ہوں۔ فضائے بسیط میں۔ خلاء میں۔ ارض و سما میں — لیکن نہیں۔ یہ اس کا وقت نہیں ہے۔ سوائے اپنا مذاق اڑالینے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس کے اظہار کے لئے صرف وہی لمحہ مناسب ہے جس کے بعد زندگی میں دوسرا لمحہ آنے والا نہ ہو۔

تمھیں معلوم ہے نا۔ بلکہ اکثر احباب کو بھی کہ کالج کے اخراجات برداشت کرنے کے لئے مجھے مجبوراً ٹیوشن کرنا پڑتا تھا۔ غریبوں کے لئے بھی تو ایک لے دے کر سہارا ہے۔ لیکن باوجود ٹیوشن کی سخت ترین ضرورت کے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ کیونکہ میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ بلا وجہ جھڑکا جاؤں اور خاموشی کے ساتھ سب کچھ سہتا رہوں۔"

"ہاں وہ بڑی خراب فطرت کا آدمی ہے" لوگ کہتے ہیں۔ "بھئی وہ بڑا مغرور شخص ہے بڑا احسان فراموش" لیکن کوئی نہیں جانتا کہ اس کے پیچھے کیا حالات چھپے ہوئے ہیں۔ اور یہی وہ راز ہے جسے میں نے آج تک سینے میں محفوظ رکھا۔ لیکن آج تمھیں سنا رہا ہوں کہ شاید کچھ دل کی بھڑاس نکل جائے۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے محض اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ایسا نہیں کیا بلکہ عمداً۔ شائد وہ مجھے نکال دینا چاہتے تھے لیکن وہ کوئی الزام مجھ پر نہ دھر سکتے تھے۔ میں پابندی سے جاتا تھا۔ روحی جو بلا کی ذہین تھی اور جسے پڑھانے میں کبھی میں نے دقت محسوس نہیں کی کبھی فیل نہیں ہوئی۔ اس نے انعامات اور تمغے حاصل کئے۔ تم جانتے ہو ان دنوں میں نے کتنی تکالیف اٹھائی ہیں۔ روزانہ کالج جانا اور پھر اتنی دور کی جگہ ٹیوشن کے لئے صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک مجھے مسلسل دماغی محنت کرنی پڑتی تھی لیکن اس کے باوجود میں روحی کے ہاں برابر جایا کرتا تھا۔ سرما کی ٹھٹھرا دینے والی سردیوں میں ٹھنڈی ہواؤں کے تھپیڑے کھاتا ہوا، گرما کی جھلسا دینے والی دھوپ میں گرم لو کا مقابلہ کرتا ہوا، بجلی کی دل دہلا دینے والی گرج اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی چمک کا سامنا کرتا ہوا پانی سے شرابور میں وہاں پہنچ جایا کرتا تھا۔ اور شائد تم اندازہ نہ کر سکو کہ روحی کی معصوم بھولی بھالی باتوں میں میں ان تمام تکالیف کو کس آسانی سے فراموش کر دیا کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر یہ ٹیوشن چھوٹ جائے تو پھر میرے لئے مصیبت کا سامنا ہو لیکن یہ بھی میں محسوس کرتا تھا کہ اس دن بھی جس دن میرے پاس وہاں نہ جانے کی کافی وجہ ہوتی تھی مجھے بغیر گئے چین نہ پڑتا تھا۔

دن گذرتے گئے۔ بہت دن ہو گئے یا صرف چند مجھے ٹھیک یاد نہیں میں نے گننے کی کوشش نہیں کی۔ تم جانتے ہو انسان کی فطرت کو۔ سمجھتا ہے دنیا ایک ہی حالت پر قائم رہے گی۔ جانتا ہے۔ دیکھتا ہے ہر روز بلکہ ہر لحظہ کہ دنیا بدل رہی ہے۔ مگر پھر بھی اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا چاہتا ہے۔

خود اپنے آپ کو غلط فہمی میں مبتلا کرکے خوش ہوجاتا ہے اور اگر کوئی اسے سمجھانا بھی چاہے تو وہ اسے سننے اور سمجھنے سے انکار کرنے لگتا ہے۔ یہی میں نے بھی کیا۔ ابھی میری تعلیم کی تکمیل کو ایک سال باقی تھا کہ ایک انقلاب آیا۔ اس دلچسپی نے جو مجھے روحی سے اور روحی کو مجھ سے ہو چلی تھی۔ روحی کے والد کے دل میں شاید خوف پیدا کر دیا کہ کہیں یہ دلچسپیاں کچھ رنگ نہ لائیں۔ اور یہی اصل سبب ہے ان کے مجھے نکال دینے کی کوشش کرنے کا۔ یوں تو شروع ہی سے وہ کوئی ملنسار یا خلیق آدمی نہ تھے مگر ان دنوں ان کا طرزِ عمل ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔

اس دن جس دن کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ غصہ کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔ بلا وجہ ہاں بالکل بلا وجہ انھوں نے مجھے اس طرح جھڑک دیا کہ میری آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں ـــ تعجب کرتے ہو دوست! اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ ابھی زندگی میں تم نے قدم نہیں رکھا ہے۔ زمانہ تمھیں سب کچھ معلوم کرا دیگا۔ میں فریب زمانہ سے ابھی ناآشنا تھا۔ برداشت نہ کر سکا۔ خون جوش کھانے لگا۔ مگر پھر بھی بغیر ایک حرف زبان سے نکالے خاموشی سے اٹھ کر سیدھے گھر چلا آیا اس ارادہ سے کہ اب یہاں پھر کبھی قدم نہ رکھوں گا۔ ان کی تدبیر کارگر ہو گئی۔ میں نے اسے بہت آسان سمجھا تھا۔ جب تک میں اور روحی ملتے رہے میں اس سے قطعی لاعلم رہا کہ اس سے ملنا میرے لئے ضروریات زندگی میں داخل ہو گیا ہے۔ جس طرح کہ دولتمند انسان فاقہ کی تکلیف کا تصور بھی ذہن میں نہیں لا سکتا۔ جس طرح چشمے کے کنارے بسنے والا پیاس کو ایک معمولی خواہش تصور کرنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح میں نے بھی اس وقت اس سے جدائی کے بار کو محسوس نہ کیا۔ آہ وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو دل کی اس وقت کی حالت کو بیان کر سکیں جب یہ خیال آتا ہے کہ بغیر اس سے ملے بغیر اسے بتلائے ہوئے کہ روحی میں تم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو رہا ہوں میں چلا آیا۔ مجھے بالکل خبر نہ تھی کہ زندگی میرے لئے سوہان روح بن جائے گی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کا خیال جس سے میں سمجھتا تھا کہ مجھے کوئی قلبی تعلق نہیں ہے مجھے راتوں کو چین سے نہ سونے دے گا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس کا خیال جسے اس کا وجود سامنے آ کر دبا دیا کرتا تھا اس سے دور ہوتے ہی میری زندگی پر چھا جائے گا۔ آگ کی دبی ہوئی چنگاری تیز ہو رہی ہے۔ شعلے بھڑک رہے ہیں۔ یہ میرے دل و دماغ کو پھونک ڈالیں گے۔ میرے خرمنِ عقل و ہوش کو جلا کر خاک کر ڈالیں گے۔ نہیں میری زندگی ہی بھسم ہو کر رہ جائے گی۔

روحی ایک متمول خاندان کی چشم و چراغ ہے۔ دولت اس کے قدموں میں کھیل رہی ہے۔ سیکڑوں ایسے سامان اس کے گرد و پیش ہیں جو میرے خیال کو اگر وہ اس کے دل کے کسی گوشے میں موجود ہے بہت جلد نکال باہر کر دیں گے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ جلد اور بہت جلد مجھے بھلا دے گی۔ یا ممکن ہے بھلا چکی ہو۔ اور شاید یہی بہتر بھی ہے کیونکہ اب ہم دونوں دور ہو چکے ہیں۔ ایک ہی جگہ رہ کر بھی بہت دور ہو چکے ہیں۔ اتنی دور کہ شاید اب اس دنیا میں پھر کبھی ایک دوسرے سے نہ مل سکیں۔ لیکن میرے لئے اسے بھلا دینا ناممکن ہے۔ دل میں رہ رہ کر ایک جذبہ پیدا ہوتا ہے جو مجھے مجبور کرتا ہے کہ کسی طرح اس سے مل لوں۔ لیکن غیرت گوارا نہیں کرتی کہ اس در پر پھر جاؤں جس سے اس بری طرح نکال دیا گیا۔ اسی ذہنی کشمکش میں اکثر میری تمام تمام راتیں گذر جاتی ہیں۔ کئی دفعہ راتوں کو ماں میری سسکیوں کی آواز پر چونک پڑی ہیں۔ اور کئی مرتبہ انھوں نے مجھے آنسو صاف کرتے پکڑ لیا ہے۔ لیکن دن کو اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے میں قہقہے لگاتا ہوں ہنستا ہوں ہنساتا ہوں۔ میری فطری ظرافت بالکل مردہ نہیں ہو گئی ہے۔ وہ میری بہت مدد کرتی ہے۔ اس طرح دنیا کے اسٹیج پر اس کے باوجود کہ میرا دل روتا رہتا ہے۔ ایک مسرور آدمی کا پلاٹ ادا کئے جاتا ہوں۔ لیکن یہ قہقہے مجھے بہت مہنگے پڑتے ہیں۔ اور پھر رات میں مجھے آنسو بہا کر ان کی قیمت ادا کرنی ہوتی ہے۔

اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو رہی تھیں۔ گلدان کے پھولوں پر وہ نظریں جمائے تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ ایسے میں دو دوست آگئے۔ اس نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ برج شروع ہوا پھر وہی میرا دوست تھا اور مذاق۔ وہی ہنسنا اور ہنسانا۔ لیکن آج پہلی مرتبہ میں نے محسوس کیا کہ اس کے قہقہے بناوٹی ہیں اور اس کا دل رو رہا ہے۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ راز منظر عام پر لایا جائے۔ وہ یقیناً بہت غصہ ہوگا لیکن اس کے اظہارِ خفگی سے قبل ہی میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔

محمد دلاور خاں مہدوی

کِسان

انسانوں سے ویران اور فطرت کے مناظر سے آباد، بالاگھاٹ کے دامن میں ایک درہ ہے اس میں سے ہوتا ہوا ایک راستہ انسانی آبادیوں کی طرف جاتا ہے جس سے کبھی کبھی صبح یا شام میں دو چار بیل گاڑیاں اور دو چار گھوڑے گذرتے ہیں۔ پہاڑ کی اس بلندی پر ایک چشمہ بھی ہے جو خورداد اور تیر کے آتشی مہینوں میں پیاسے جانوروں کو سیراب کرتا ہے۔ تین تین میل دور کے جانور پانی کے لئے وہیں جمع ہوتے ہیں اور گھڑی بھر کے لئے ٹھیر کر واپس چلے جاتے ہیں۔ شاید آتشی مہینوں میں یہاں کی بہاریں لوٹتے ہوں۔

چشمہ ایک پرانے آم کے درخت کے نیچے ہے جس کی عمر کوئی نہیں بتلا سکتا اور جس کے آم کسی نے ابھی تک نہیں کھائے بوڑھا درخت ہمیشہ جوانی کی بہاریں بکھیرتا رہتا ہے اس کے ہمسائے نیم کے ان گنت درخت ہیں جو پتھر کو پگھلانے والی گرمیوں میں دلربایانہ اداؤں سے جھومتے رہتے ہیں مغربی سمت میں کچھ دور پر سنکیسر کے بے شمار درخت سرخ چادریں اوڑھے ہوئے بہار کی دلہن معلوم ہوتے ہیں۔ ذرا اوپر نظر اٹھتی ہے تو "کانٹے سیوری" کا وہ عظیم الشان درخت نظر آتا ہے جو اطراف میں پچاس میل سے زیادہ تک اپنی رفعت کی عظمت کا لوہا منواتا ہے۔ شاید یہ فطرت کی اس چھوٹی سی سلطنت کا علم بردار ہو۔

میرا زیادہ وقت اسی جگہ گذرتا ہے۔ یہاں کا پتہ پتہ میری نظروں میں ہے۔ مجھے یہاں کی وہ جگہ بھی معلوم ہے جہاں ایک چرواہے کا بچہ مر گیا تھا اس کا واقعہ یوں ہے کہ وہ اپنی بھیڑیں چراتے ہوئے "ناگ پھنی" کی ایک پیڑ کے قریب پہنچا۔ اس کو لوہے کی ایک کڑی پیڑ پر اس طرح پڑی نظر آئی گویا درخت کی جڑ زمین سے باہر نکلی اور پھر اندر مڑ گئی ہے اس نے کڑی اٹھائی جس کے ساتھ ہی لوہے کی زنجیر بھی تھی۔ اس نے زنجیر کھینچی اور کھینچتا گیا، کوئی بیس گز زنجیر کھینچ کر تھک گیا۔ زنجیر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زرزراتی ہوئی اپنے مقام پر پہنچ گئی۔ لڑکا وحشت کے مارے زمین پر گر گیا۔ ہمیشہ کے لئے۔ حسب معمول کڑی اب بھی پیڑ پر نظر آتی ہے لیکن اس کو چھونے کی کسی میں ہمت نہیں۔

اس کوہستانی سلسلے سے کچھ دور جانے کے بعد سیاہ زمین شروع ہوجاتی ہے اور ڈھونڈے سے نہ تو پتھر ملتا ہے اور نہ سایہ کے لئے درخت ان ابلتی گرمیوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیروں تلے ظلمات ہے اور سر پر غصیلا آفتاب۔ — آفتاب حشر، کسان اپنے جھونپڑیوں کی گز گز بھر کی اونچی دیواریں اسی ظلمات کو شرمانے والی مٹی سے بناتے ہیں لیکن بنیاد میں پتھر ڈالنے کے لئے اسی پہاڑی پر آتے ہیں۔

میں اپنی محبوب جگہ چشمے کے کنارے بیٹھا — "یہیں کھیتوں میں پانی کے کنارے یاد ہے اب بھی" — گنگنا رہا تھا، دور پہاڑی کی نصف بلندی سے کچھ اوپر ایک بیل گاڑی نظر آئی، دو تین سیاہ اور تقریباً عریاں انسانی شکلیں اس میں پتھر بھر رہی تھیں گاڑی نصف سے زیادہ بھر چکی تھی گاڑی کے بیل اچانک پلٹ گئے۔ ان کا پلٹنا تھا کہ گاڑی قلابازیاں کھاتی ہوی دامن کی طرف چلی۔ آٹھ یا نو قلابازیوں کے بعد وہ ایک خاردار جھاڑی پر جاکر رک گئی۔ میں اس کے رکنے تک دوڑتا ہانپتا نصف سے زیادہ راستہ طے کر کے پہاڑ کی کچھ بلندی پر چڑھ چکا تھا میرے گاڑی کے قریب پہنچتے تک کسان بھی گاڑی کے پاس آ گئے۔ وہ زیادہ شکستہ نہیں ہوی تھی اور ابھی قابل استعمال تھی ہم سب نے اس کو اٹھایا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔ بیل جو پہلی ہی الٹن میں گاڑی سے الگ ہو گئے تھے لاکر لگا دئے اور جنھوں نے اشارہ پاتے ہی گاڑی کو اوپر پہنچا دیا میں نے کسانوں سے پوچھا کہ وہ اِن پتھروں کو کہاں لے جارہے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ بارش کا پانی نالا بنتا ہوا کھیت میں سے بہتا ہے اور

ہر سال دو سال میں اس کا راستہ بدلنے کے لئے کھیت کے کنارے پتھر ڈال کر اس کی سطح برابر کرنی پڑتی ہے۔ اُف۔ غریب کسان اتنی محنت کے باوجود روٹی کے ایک ٹکڑے اور موٹی کھادی کی گز بھر دھجی کے لئے محتاج۔ اب میں

جس کھیت سے انساں کو میسر نہ ہو روزی   اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جوش سے پڑھتا ہوا اپنے "رکنا باد" کی طرف واپس ہوا۔

مغرب ہو رہی تھی اور میں وضو کرنے کے لئے قمیص کی آستین چڑھا رہا تھا کہ اڑدھڑ ادھڑ کی آوازیں سنائی دیں یہہ تو روز ہی ہوتا تھا اس لئے میں نے کوئی توجہہ نہ کی اور وضو کر لیا جب نماز کے لئے تکبیر کہہ رہا تھا تو ایک شخص میرے سامنے آیا اور کہنے لگا۔ "میاں! میری گاڑی کا کتا ٹوٹ گیا ہے۔ اب میں کیا کروں" میں اس آدمی کو جانتا تھا اس لئے اس سے کہا کہ تم ہمارے کھیت تک جاؤ اور وہاں سے ہماری گاڑی لے آؤ۔ نشانی کے لئے میں نے اپنا ریشمی رومال اس کے حوالے کیا تاکہ میرے ملازمین میرے حکم کی تعمیل میں عجلت کریں میں نماز پڑھکر اس کی گاڑی کی طرف چلا گیا جب گاڑی دیکھی تو معلوم ہوا کہ کتا بے ترتیب زینہ نما راستہ کی تاب نہ لا کر دو ٹکڑے ہو گیا تھا تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور میں تنہائی شدت سے محسوس کر رہا تھا فطرت کے مناظر ظلمت کے پردوں میں چھپے جا رہے تھے "رکنا باد" میری نظروں میں ویران نظر آ رہا تھا کیونکہ اب یہہ مقام انسانوں اور فطرت کے مناظر دونوں سے بھی غیر آباد ہوتا جا رہا تھا میری وحشت اس لئے بھی بڑھ رہی تھی کہ یہاں ناگ بھنی میں ایک شیر رہتا ہے اب اس کے پانی پینے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ مجھے اپنی اتنی زیادہ فکر نہ تھی جتنی غریب کسان کے بیلوں کی کیونکہ شیر آدم خوار نہ تھا اور اسی وجہہ سے گاؤں کا بچہ بچہ بھی اس سے واقف تھا اس شیر کا شکار عموماً کتنے اندھے نحیف اور معذور گھوڑے گدھے اور زخمی ہرن تھے۔ کسی نے آج تک یہہ نہیں سنا کہ اس نے کوئی طاقتور اور جوان جانور مارا ہو حالانکہ ایسے جانور اس پہاڑی کے دامن میں اور اوپر میدانوں میں چرتے رہتے تھے اس لئے کچھ ڈھارس بھی بندھتی کہ وہ اپنی عادت کے لحاظ سے ہمیں کچھ نہ کرے گا۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ اڑدھڑ ادھڑ کی آواز سنائی دی اور چند لمحے بعد میری گاڑی لئے ہوئے چار آدمی آگئے۔ قندیل بھی ساتھ تھی۔ ان چاروں نے کپاس کے ان بوجھوں کو میری گاڑی میں منتقل کیا اور ساتھ لایا ہوا کتا ٹوٹے ہوئے کتے کی جگہ لگا دیا۔ اب ہم دونوں گاڑیاں لئے ہوئے اپنے کھیتوں پر آگئے میں نے کسان سے کہا کہ آج کل کپاس کا نرخ بہت گرا ہوا ہے پھر وہ فروخت کرنے میں کیوں عجلت کر رہا ہے اس نے کہا مجھے اس "ہفتے" کی تحصیل ادا کرنی ہے اور میرے پاس اتنی رقم نہیں سوائے کپاس کی فروخت کے کوئی چارہ نہیں میں نے اس کا جواب سنا اور جگر تھامے ہوئے

نہیں منت کشِ تابِ شنیدن داستاں میری   خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں میری

گنگناتا ہوا گھر آگیا۔

اکبر صدیقی

غزل

نگۂ ناز پڑی دل پہ جو نشتر بن کر!   بہہ گیا خونِ دل آنکھوں سے سمندر بن کر

ہوں میں وہ بلبل ناشادِ گلستانِ الم   پھول بھی سر پہ برس پڑتے ہیں اخگر بن کر

شبِ فرقت میں مہ نو نہ دکھا اپنی ضیا   کاٹتی ہے تری صورت مجھے خنجر بن کر

ہائے ناسازیٔ قسمت کا گلہ کس سے کریں   آپ ہی آپ بگڑتا ہے مقدر بن کر

ناز تھا جس دلِ ناداں پہ تجھ کو منصور   وہی پہلو میں کھٹکنے لگا نشتر بن کر

محمد احمد اللہ خاں منصور حیدر آبادی

فلمی افسانے کی خصوصیات

انسان میں تحقیق و تفتیش کا مادہ جبلّی طور پر موجود ہے۔ وہ دوسروں کے حالات معلوم کرنے کا بڑا شایق ہوتا ہے اس کو آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی بھاتی ہے۔ حالانکہ اس کی زندگی کا مطالعہ ہی اس کے لئے کافی عبرت آموز ثابت ہو سکتا ہے مگر اس کی طبیعت صرف زندگی کے واقعات حالات سے سیر نہیں ہوتی۔ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے قصہ اور کہانی کی ابتداء ہوی اور قدیم زمانے میں عرصے تک حکایتوں اور قصوں ہی کے ذریعے ہدایت و تعلیم دی جاتی رہی۔ ابتداء میں محض فرضی داستانوں اور دیو پری کی کہانیوں میں خاص لطف آتا تھا لیکن بتدریج عقل سلیم کی روشنی نمودار ہوتی گئی۔ آخر اب وہ زمانہ بھی آگیا کہ افسانہ میں تاوقتیکہ زندگی کا اصلی رنگ اور سچے جذبات و خواہشات کا اظہار نہ ہو وہ ایک مہمل و بے اثر داستان معلوم ہوتا ہے۔

ڈرامہ کی اصلی غرض و غایت محض ایک افسانے کو عملی صورت میں پیش کر دینا ہے۔ چونکہ افسانوں سے محض وہی حظ اٹھا سکتے ہیں جو نوشت و خواند سے واقف ہوں ڈرامے سے لطف اندوز ہونے میں علمی کم مائگی حارج و مانع نہیں ہوتی یہی وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم ہی سے عوام کو ڈرامے سے زیادہ دلچسپی رہی پہلے پہل اس میں مذہبی رنگ کی چاشنی بھی تھی۔ اس لئے تمام مہذب ملکوں میں مثلاً یونان، روما اور ہندوستان میں جہاں آریا قومیں آباد تھیں ڈرامہ کا زور ہوا اور موسیقی کے ساتھ یہ اعلےٰ فنونِ لطیفہ میں شمار ہونے لگا۔ اس کو مکمل فن اور علم کی صورت میں پیش کرنے کا فخر صرف ہندوستان ہی کو حاصل ہے۔ چاہے ہندوستان والے اس کو تسلیم نہ کریں لیکن خود یورپ والے مانتے ہیں۔

فلم دراصل ڈرامے ہی کی ایک متحرک اور ناطق تصویر ہے۔ اس لئے فلمی افسانے میں بھی ان تمام خصوصیات کا ہونا لازمی ہے جو ایک عمدہ ڈرامے کے لئے ضروری ہیں۔ لیکن اب سوال یہ رہتا ہے کہ عمدہ ڈرامہ یا فلمی افسانے کے لئے کن خصوصیات کا ہونا ضروری ہے اس کے جواب میں لمبے چوڑے منطق کی ضرورت نہیں، معمولی سے آدمی بھی اس بات کو بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ جب ہم کہانی یا افسانہ کا خیال کرتے ہیں تو اس میں ایک مخصوص عنصر مضمر ہوتا ہے یعنی "**انسان کی عام اور ہمہ گیر دلچسپی کا تعلق**" پس ڈرامہ ہو یا فلمی افسانہ وہ بغیر اس کے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ فرضی و قیاسی باتوں کو اصلیت پر ترجیح دی جائے بلکہ اس کی مدد سے حقیقت کو صحیح لباس پہنا کر اس طرح سامنے کھڑا کر دیں کہ طبیعتیں اچاٹ نہ ہونے پائیں۔ ورنہ افسانے کی مثال ایک ایسی تصویر کی سی ہوگی جو صحیح تو ہے مگر قدرتی رنگ اور روپ سے عاری ہے یعنی ایک بےجان مرقع ہے جس کے مشاہدہ سے ہمارے محسوسات پر کچھ اثر نہیں پڑتا اور قلوب نیکی و اصلاح قبول کرنے کے بدلے منغض ہو جاتے ہیں اس لئے افسانے میں چند باتیں لازمی طور پر عام اور ہمہ گیر دلچسپی قائم رکھنے کے لئے ایجاد طلب ہوتی ہیں مثلاً افسانے کی ترتیب۔ کردار کا نشو و نما اور تکمیل۔ ان تمام چیزوں کو اس عمدگی کے ساتھ پورا کیا جائے کہ نفسِ افسانے میں کوئی نقص نہ آنے پائے۔ تصنع اصلیت و حقیقت کے نیچے دب جائے اور افسانے کے واقعات ایک حد تک عریاں حالت میں نظر آئیں یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ افسانے میں محض خیالات کی بلند پروازی دکھلانے کی بجائے اپنی گرد و پیش کی دنیا کا غائر مطالعہ کریں اور افسانے میں انھیں واقعات و کردار کو ترتیب دیں جو چشم دید ہوں۔ اور جن کی زندگی کے مطالعہ کا موقع ملا ہو جس میں محض "وہم و خیال" سے کام نہ لیا جائے بلکہ قوتِ مشاہدہ غالب ہو یوں تو یہ کام نہایت آسان معلوم ہوتا ہے مگر دراصل یہ اس قدر آسان نہیں جتنا کہ بادی النظر میں سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص میں فطرت کے سمجھنے کی صلاحیت اور انسانی

جذبات و خیالات کا صحیح احساس نہیں ہوتا اس کے لئے بڑی قابلیت اور دماغ و ذہن کو خاص طور پر ترتیب دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پہلے تو ہندوستانی فلم اس وقت تک شیطان، بھوت، دیو، پری کے خلاف قیاس داستانوں پر مشتمل ہیں اور اگر چند فلم سوشیل ہیں بھی تو افسانے کے مخصوص کردار اس دنیا کی مخلوق نہیں بلکہ فرشتہ یا اس سے مختلف کوئی نوع ہیں یہ ایک مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ انسان عناصر اربعہ ہونے کی حیثیت سے اس میں معائب و محاسن ہونا لازم و ملزوم ہے۔ دنیا میں کسی چیز کو کمال حاصل نہیں۔ معمولی طبائع کا تو ذکر ہی کیا مضبوط سے مضبوط اکبر کرٹ کے انسانوں کا قدم بھی بعض موقعوں پر ڈگمگا جاتا ہے مگر ہمارے فلموں میں بھولی بھالی ناتجربہ کار لڑکی کو ہمیشہ عصمت و عفت کی دیوی اور ہیرو کو عاشق صادق نہایت دلیر اور سورما ظاہر کیا جاتا ہے فلمی افسانوں کے اکثر کردار انتہائی نازک موقعوں پر جب کہ طبائع انسانی کا انقلاب یقینی و لابدی ہے۔ وہ ثابت قدم نظر آتے ہیں جو فطرت بشری کے سراسر خلاف ہے۔ اس قسم کی فرضی و خیالی تصویریں نہایت معیوب و مہلک ہوتی ہیں کیونکہ اس سے ہم دھوکا اور غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ فطرت انسانی کی اصلیت ہماری نظروں سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ اور ایک باطل خیال دل و دماغ پر قائم ہو جاتا ہے جس کا اثر حقیقی طور پر ہمارے قول و فعل پر پڑ کر ہم کو راہ راست سے بھٹکا دیتا ہے۔

بعض حضرات افسانے کے واقعات کو فطرت کے مطابق پیش کر دینا مخرب اخلاق تصور کرتے ہیں۔ اور اس قسم کے افسانے پسند کرتے ہیں جس میں برائی کی مذمت اور نیکی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا کر مبالغہ کے انتہائی درجے تک پہونچ گئے ہوں جس سے ناظرین کے دلوں پر اندر ہی اندر اس غلط وعظ و پند کا الٹا اثر مرتب ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسانی زندگی کے خراب پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور صرف اس کی اچھی باتیں ظاہر کی جائیں جو یقیناً بعید از انصاف و خلاف فطرت ہیں اس میں شک نہیں کہ افسانے کی اصلی غرض اصلاح ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ افسانہ کے بعض مخصوص کرداروں کو نمایاں کرنے کے لئے ان کی کمزوریوں سے کہیں زیادہ بھلائیوں کا اظہار کیا جائے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ تمام کمزور پہلوؤں کو نظر انداز کر کے صرف خوبیاں ہی ظاہر کی جائیں جس کی وجہ سے وہ اوصاف و اطوار بشریت سے بعید ہو جائیں۔ گو اکثر نقاد انگریزی فلموں اور افسانوں کو فطرت کے بالکل مطابق سمجھتے ہیں اور ان کی تعریف میں اخبارات و رسائل کے کالم سیاہ کر دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ یورپ میں ایسے ڈراموں اور ناولوں کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے جس میں مادی زندگی اور خوش آئند باتوں کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے وہ تصنع اور بناوٹ سے پاک نہیں ہو سکتے۔ البتہ اتنی خوبی ضرور ہوتی ہے کہ اس میں بظاہر کوئی بات خلاف فطرت نظر نہیں آتی وہ جھوٹ پر سچ کو اس طرح لپیٹتے ہیں جس طرح قرص کونین پر مٹھاس ہوتی ہے لیکن حلق سے نیچے اترتے ہی خون میں کڑواہٹ اثر کرنے لگتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں ریاکاری تہذیب کا شعار بن گئی ہے۔

بہرحال میں اس امر پر زیادہ زور دینا نہیں چاہتا۔ مختصر یہ کہ وہی افسانہ کامیاب اور حقیقی معنی میں اصلاح کا حامی ہو سکتا ہے جس میں زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی جائے خواہ وہ واقعات شیریں ہوں یا تلخ البتہ ان کو زیب و زینت دے کر خوشنما اور پسندیدہ بنانا ضروری ہے مگر صداقت کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے کیونکہ اسی میں سب سے بڑی پند و نصیحت ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ بلحاظ مذاق افسانوں کے طرز ادا میں تبدیلی ہو مگر ان کی فضیلت کا معیار اسی پر منحصر ہے کہ افسانے کے کردار فطرت و قدرت کے مطابق ہوں تاکہ عوام الناس اپنی اصلی صورت اس آئینہ میں دیکھ کر سبق حاصل کریں۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں نے آصفیہ ڈرامیٹک اسوسیئشن حیدرآباد میں......."Cinema is the mirror of the nation" (سینما قوم کے لئے آئینہ ہے) کے عنوان سے تقریر کی تھی جس کا حاصل یہی تھا۔

"جس طرح آئینہ دیکھنے سے چہرے کی خوبی اور برائی بلا کم و کاست ہمارے سامنے آجاتی ہے اسی طرح فلم اور ڈرامے کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ قوم کے مصائب و محاسن کی سچی ترجمانی کرے" سطور بالا میں بیان کیا جاچکا ہے کہ افسانے کی ترتیب اور کردار کا نشو و نما و تکمیل ہی ایک ایک فلم کی کامیابی کے لیے نہایت لازمی چیز ہے اور اسی سے افسانہ نگاری کے کمال فن کا اظہار ہوتا ہے۔ ہندوستانی فلموں میں اکثر کردار محض واقعات سے چسپاں کردئے جاتے ہیں اور ان کے نفسیاتی پہلوؤں کو نظر انداز کردیا جاتا ہے جس کی وجہہ وہ بے اثر اور اکثر خطرناک ہوجاتے ہیں۔

جس طرح مصور ایک مرقع کھینچتا ہے تو پہلے گرد و پیش کے مناظر موقع و محل کے لحاظ سے اتارتا ہے پھر اپنی تصویروں کو ان کے حسب حال ترتیب دے کر باہمی نسبت و تعلق اور ایک دوسرے میں امتیاز پیدا کرتا ہے۔ یعنی دور کی چیزوں کو نزدیک کی چیزوں سے چھوٹی اور نزدیک کی چیزوں کو نمایاں کرکے تناسب اعضا میں فرق نہیں آنے دیتا بعینہ یہی حال افسانہ کی ترتیب و کردار کے نشو و نما کا ہے لیکن اس کے برعکس ہندوستانی فلموں کے کردار بالکل لغو طریقہ سے نمایاں کئے جاتے ہیں جس سے کسی قسم کا مفید نتیجہ مترتب نہیں ہوسکتا۔ اسی سلسلے میں مکالمہ کے متعلق بھی بیان کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ مکالمہ ہی افسانہ اور ڈرامہ کی روح ہے۔ مکالمہ تحریر کرتے وقت موزوں الفاظ کا انتخاب ان کی مناسب نشست و ترتیب محاورات، استعارات و تشبیہات کا صحیح استعمال نہایت ضروری ہے اور یہہ ساری باتیں ایسی ہیں جن کی ذراسی بھول چوک سے افسانے کے تمام اثرات زائل اور مطالب فوت ہوجاتے ہیں۔ مکالمہ نگار کو کردار کی فطرت کا نہایت دقیق مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ کردار کے خیالات و جذبات کے اظہار میں کس قسم کے لہجے کس طرح کی عبارت استعمال کرے کہاں اختصار اور کہاں تفصیل سے کام لے زبان کیسی ہو خیالات کس طرح ادا کئے جائیں اور یہہ ایک نہایت ہی مشکل و دشوار امر ہے جس پر ہر کوئی قادر نہیں اس کے لئے بڑی زباں دانی اور خداداد قابلیت کی ضرورت ہے مکالمہ میں زیادہ تفصیل غیر ضروری ہوتی ہے کیونکہ زیادہ تر خیالات کا اظہار لب و لہجہ حرکات و سکنات کے ذریعے پورا ہوتا ہے۔ مکالمہ لکھتے وقت مکالمہ نویس کا فرض ہے کہ وہ کردار کی ہستی میں گم ہوجائے ورنہ ڈرامے کی روح غائب ہوجائے گی اور مکالمہ بے اثر و مضحکہ انگیز ہوجائے گا۔ مکالمہ کی غرض و غایت محض جملوں کو ترتیب دے کر مطلب ادا کردینا نہیں بلکہ اس میں ایک قوت، جوش اور ولولہ ہو جو اداکاری کے بعد دلوں پر نشتر کا کام کرے اور روح کو بیدار کردے۔ اور اس کا ہر لفظ ایک ایسا ترانہ ہو جس کے مسرت انگیز اور درد بھرے راگ سے اہل مجلس تڑپ اٹھیں۔

فلمی افسانے میں ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے۔ ڈرامے اور فلمی افسانے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جس طرح قصہ اور کہانی میں واقعات از اول تا آخر تمام باتوں کو راز میں رکھے بغیر بیان کردے جاتے ہیں۔ اسی طرح ڈرامے میں تمام واقعات نمایاں کردئے جاتے ہیں۔ لیکن فلمی افسانے میں یہہ بات نہیں بلکہ اس کی ترتیب ناول کے طرز پر ہوتی ہے جس میں بعض باتوں کو راز میں رکھا جاتا ہے جس کا افشا خاتمہ پر ہوتا ہے اس قسم کی ترتیب نہایت مشکل ہے کیونکہ اس کے ذریعے افسانے کے تاثرات کو قوی بنادیا جاتا ہے لیکن افسوس کہ عدم واقفیت کی بنا پر ہمارے فلمی افسانوں میں یہہ ترتیب بالکل ادھوری اور بے جوڑ ہوتی ہے جس سے کردار کی ساری خوبیاں دب جاتی ہیں اور فلم کا مقصد اصلی مفقود ہوجاتا ہے۔

اکثر ہندوستانی فلموں کو میرے پیش کردہ معیار پر جانچا جائے تو شاید ہی کوئی ہندوستانی فلم حقیقی معنی میں فلم کہلانے کے قابل ہوگا۔ اس کا مطلب یہہ نہیں کہ ہندوستان میں قابل افسانہ نگاروں کی کمی ہے بلکہ فلم سازوں کی بدذوقی کی وجہ سے بہترین افسانہ نگار اس وقت تک اس طرف متوجہ نہیں ہوے اگر ہمارے فلم ساز خواب غفلت سے چونک کر ہندوستانی ادیبوں کی قدردانی اور عزت افزائی کا عملی طور پر ثبوت دیں تو کوئی وجہہ نہیں کہ ہندوستانی فلم بھی حقیقت میں فلم کہلانے کے مستحق نہ ہوجائیں۔

محمد حسام الدین خاں غوری (سکندرآباد)

تجدیدِ شوق

یہہ بے قرار نظریں　　یہہ شرمسار نظریں
تجدیدِ شوق کا پھر پیغام دے رہی ہیں
شب زندہ داریوں کا انعام دے رہی ہیں

روحِ خموش ہمدم بیدار ہورہی ہے　　پھر دل کی آج دھڑکن غمخوار ہورہی ہے
تاروں نے پھر الٹ دی رخ سے نقابِ رنگیں　　پھر گدگدا رہی ہے ان کو فضائے سیمیں!
کرنوں کا آسماں پھر جھولا بنا رہا ہے　　پینگوں سے پھر صبا کے ان کو جھلا رہا ہے
ایسے میں یاد میری ان کو ستا رہی تھی　　ہاں چھیڑ چھاڑ پچھلی یا یاد آرہی تھی
ٹھکرا کے بندشوں کو بے تاب ہو کے آئیں　　آنکھیں ہیں سرخ کیوں یہہ شاید ہیں رو کے آئیں
تجدیدِ شوق کا پھر پیغام دے رہی ہیں
شب زندہ داریوں کا انعام دے رہی ہیں

یہہ کہہ رہی ہیں مجھ سے اے کشتۂ محبت　　بیگانۂ حقیقت دیوانۂ محبت!!
دنیا فریب ناداں چل دور اس جہاں سے　　بے درد کی زمیں سے ظالم کے آسماں سے
نورِ شفق کے اندر دنیا نئی بسائیں　　قوسِ قزح سے آگے اپنا جہاں بنائیں
اس دلنشیں جہاں میں اک باغ پھر سجائیں　　کرنوں کی ڈالیوں میں شبنم کے گل کھلائیں
اس باغ میں ہمیشہ موجِ بہار آئے　　انساں کی قوتوں سے قدرت بھی جھینپ جائے
بے دردیاں جہاں کی واں ہم عناں نہ ہوں گی　　الفت کی داستانیں رسوا وہاں نہ ہوں گی
تجدیدِ شوق کا پھر پیغام دے رہی ہیں
شب زندہ داریوں کا انعام دے رہی ہیں
یہہ بے قرار نظریں　　یہہ شرمسار نظریں

نظر (حیدرآبادی)

شیطان کی آنت پر ایک نظر

"توقع" کے مطابق لیکن "توقع" کے خلاف ہمیں یہ مضمون وصول ہوا۔ توقع کے مطابق اس لئے کہ ہم "شیطان کی آنت" کے جواب کو ضروری تصور کرتے تھے اور توقع کے خلاف اِس لئے کہ اس میں سنجیدگی سے ہٹ کر موقتی جذبات کا اظہار کیا گیا۔ مذہب کی آڑ میں پناہ لینے سے زیادہ موجودہ سماج کے مطالعہ کی ضرورت ہے۔ شیطان کی آنت کا باعث مرد بھی اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح ایک عورت ہوتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ امر واقعہ ہے یا نہیں؟ "شیطان کی آنت" کے مصنف یا ان پر تبصرہ کرنے والے خواہ کچھ ہی کہیں لیکن ہم تو جاہل عورتوں اور مردوں کی ہرزہ سرائی کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں ــــــ اس لئے کہ وہ احمق بہت بڑا احمق ہے جو اپنی حماقتوں کو خاموشی میں دفن کر دیتا ہے علم و حکمت کی عدم موجودگی میں جاہلوں کی یہ ہرزہ سرائی ہی بہت غنیمت ہے ــــــ ان کو علم و حکمت کے نکتے سکھائیے پھر ہمیں امید ہے کہ نہ "شیطان کی آنت" لکھنے کی ضرورت ہوگی اور نہ اس پر تبصرہ کرنے کی ضرورت۔ (ادارہ)

رسالہ سب رس ۱۹۳۸ء جولائی میں ایک مضمون مسمیٰ بہ شیطان کی آنت میری نظر سے گذرا جو ہمارے ایک مسلم بھائی کا تصنیف کردہ ہے۔ ہمارے معزز بھائی نے اس مضمون میں جو واقعہ نگاری کی ہے اور نسوانی کمزوریوں کا خاکہ کھینچا ہے اگر اس پر نظر غائر روشنی ڈالی جائے تو نہیں معلوم کہ ان اعتراضات کی ذمہ داری کن ہستیوں پر عاید ہوگی۔ قبل اس کے کہ کوئی اشتہار جاری کیا جائے یا ایسے مضامین طبع کئے جائیں کہ جس کے مطالعہ سے ناظرین کو نوٹس لینے کا موقع ملے۔ مضمون نگار صاحب کو چاہئے کہ اس کے نتیجہ پر غور کرے ورنہ (تا مرد سخن نگفتہ باشد۔ عیب و ہنرش نہفتہ باشد) کا وہی مصداق بن جائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ عورت بالطبع کمزور پیدا کی گئی ہے۔ لیکن اس سے یہ مقصد نہیں کہ وہ تمام عمر لاغر و لاعقل ہی رہے گی۔ دنیا کی ہر چیز کو صیقل کی ضرورت ہے۔ اگر بیش بہا جواہر کو بھی عمدہ تراش و خراش سے آراستہ و پیراستہ نہ کیا جائے تو اس کی ظاہری حالت ایک معمولی پتھر سے سوا نہ ہوگی۔ اسی طرح انسان کا دماغ بھی صیقل گری کا محتاج ہے کیا عورت اور کیا مرد اگر کسی مرد کی پرورش بھی کسی تہہ خانہ میں یا مکان کی چار دیواری میں مقید رکھ کے کی جائے تو بلا مبالغہ وہ ایک گنوار اور جاہل عورت سے بھی بدتر نکلے گا۔ ایام سلف میں حقوق نسوانی جس بری طرح پامال کئے جاتے تھے وہ مکرر محتاج بیان نہیں ہے۔ غریب عورتیں مردوں کے آہنی پنجوں میں اس طرح محبوس و مقید رہتی تھیں جیسے کوئی بے بال و پر شکستہ پرندہ ظالم صیاد کے دام میں ہو۔ ان بے زبانوں کا کوئی حامی تھا نہ ہمدرد۔ زمانۂ جاہلیت کی رسم دختر کشی نے تو اس صنف نازک کا خلع قمع ہی کر رکھا تھا ان کی تعلیم و تربیت تو درکنار بیچاریاں اس بری طرح زندہ درگور کر دی جاتی تھیں کہ خدا کی پناہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک آیا تو ان مظلوموں کو جفا کار مردوں کے مظالم اور بیدردانہ موت سے نجات ملی اور اسی مسعود و مامون زمانے سے ان کی تعلیم و تربیت کا دور دورہ شروع ہوا اس ہادی برحق نے مظلوم کی داد رسی گمراہیوں کی رہبری کی اگر اور چندے آپ کا وجود مسعود اس ہستی ناپائیدار میں ظہور پذیر نہ ہوتا تو شاذ صفحہ دنیا پر ایک عورت کا بھی نام نظر نہ آتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جہنم کے سات طبقے ان ظالم اور سیاہ کار مردوں سے بھرے جاتے جو فرقہ نسوان کی عدم موجودگی سے مرتکب جرائم نازیبا ہو کر اپنے نامۂ اعمال سیاہ کرتے۔ من بعد رفتہ رفتہ ان کا نام و نشان بھی صفحہ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتا گویا اس طرح سے دنیا کب کی معدوم ہو چکی ہوتی اور خدائی کا منشا بھی ادھورا رہ جاتا۔ لیکن خدائے عزوجل کو اپنی خدائی کا تماشا دکھانا منظور تھا۔ ان ظالموں کو ابدی مصیبت سے بچانے کے لئے رسول مقبول صلعم کو اپنا نبی برحق اور خلق کی شمع ہدایت بنا کر بھیجا۔ اس پر بھی متعدد گھرانے ایسے تھے جہاں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت

باعث ننگ و عار خیال کی جاتی تھی مجبور و محکوم عورتیں ستمگار مردوں کی نفسانیت کا تختۂ مشق سمجھی جاتی تھیں اور ان سے مویشیوں کی طرح باربرداری کا کام لیا جاتا تھا ایک زمانۂ دراز تک یہہ طبقہ یوں ہی ناروا مظالم اور نازیبا جور و ستم کا شکار بنا رہا آخر ان بیکسوں کی فریاد کب تک خالی جاتی۔ اور ستم زدوں کی آہ کیونکر رنگ نہ لاتی خاک دہلی نے چند ایسے افراد پیش کئے جو اس محروم طبقے کے سچے حامی اور حقیقی جاں نثار نکلے جن کے اکثر نام مجھے یاد نہیں۔ جیسے راشد الخیری، نذیر احمد وغیرہ وغیرہ۔ ان حضرات کی سعی بلیغ نے فرقۂ نسواں کا ڈوبتا ہوا بیڑا سنبھالا اور ان کی تعلیم و تربیت کا بار گراں اپنے دوش پر اٹھایا۔ ہر گھڑی ہر لحظہ تعلیم نسواں کا راگ گایا جن کی پُر درد صداؤں نے خواب غفلت میں سونے والے مردوں کے جذبات خوابیدہ کو جگایا انجام کار حق بہ حق دار رسید کا مقولہ صادق آیا۔ مگر افسوس یہہ دور اس وقت آیا جب کہ دنیا درجۂ اختتام کو پہونچ رہی ہے۔ (مجلس تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر۔ ماہم چنان در اول وصف تو ماندہ ایم) کے بہ مصداق آخری زمانے میں عورتوں نے ترقی کی باوجود اس قلیل مدت کے ان ہستیوں نے جو کارنمایاں کئے ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔ آج دنیا کا کوئی مرد یہہ نہیں بتاسکتا کہ عورتیں۔ کج فہم۔ بےعقل۔ نالائق محض ہیں۔ ہماری رائے میں تو فی زمانہ مرد و عورت میں کوئی تخصیص باقی نہیں اگر کوئی مرد گریجوٹ ہے تو عورت بھی اس کے قدم بہ قدم ہے اگر کوئی بڑی خدمت پر ممتاز ہے تو عورتیں بھی اس سے بے نیاز نہیں ہیں۔ شاعری۔ مضمون نگاری۔ تقاریر۔ وعظ پند۔ اشاعت اسلام۔ القصہ یہہ تمام خوبیاں مرد ہی کے حصے میں نہیں آئیں بلکہ عورتوں میں بھی اس کا مادہ بدرجۂ اتم موجود ہے غرض وہ کون سی خوبی ہے جو مرد کے لئے مخصوص اور عورت کے لئے محروم ہو۔ لہذا ہمارے اسلامی بھائی نے جو طبقۂ اناث کی کمزوری۔ جہالت اور بے مغزی کا اظہار اپنے مضمون میں فرمایا ہے کیا وہ یہہ ثابت کرسکتے ہیں کہ دنیا کا کوئی مرد ان اوصاف سے متصف نہیں ہے۔ کیا مردوں کی مجلس میں اس قسم کی ہرزہ سرائی نہیں ہوا کرتی۔ ہوتی اور ضرور ہوتی ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر یہاں تک کہ دفتر خلوت کا ہر ہر ورق احباب کے سامنے کھول کر رکھ دیا جاتا ہے یہہ ہماری انسانیت و شرافت سے بعید ہے کہ لغو اذکار کو قلمبند کریں لیکن میں پھر بھی یہہ کہوں گی کہ نہ دنیا کے تمام مرد ایسے ذلیل اور نہ تمام عورتیں۔

نہ ہر زن زنست و نہ ہر مرد مرد
خدا پنج انگشت یکساں نہ کرد

ہر طبقے میں ضرور اچھے اور چند برے ہیں۔ الغرض مردوں کو چاہئے کہ اپنی مستورات کو اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اعلیٰ سوسائٹی میں نشست و برخاست کا موقع دیں تاکہ وہ آداب مجلس سے بخوبی واقف ہو جائیں۔ سوسائٹی سے مطلب پردہ کی مخالفت نہیں ہے کیونکہ میں پردہ کی زبردست حامی ہوں۔ یہہ خیال سراسر غلط ہے کہ خواتین محفلوں میں بے سرو پا گفتگو کرتی ہیں۔ ہاں جب ان کے معلومات ہی محدود ہوں اور گفتگو کا کوئی موضوع نہ ملے تو آخر ان کی قوت ناطقہ کس کام میں صرف ہوگی۔ اس لحاظ سے اس بے معنی قیل و قال کا الزام ان کے سرپرست مردوں ہی کے سر رہے گا۔ مرد سے ہمارا مقصد صرف شوہر نہیں ہے بلکہ۔ باپ۔ بھائی۔ بیٹا غرض کنبہ کے تمام مرد ہیں۔ علیٰ ہذا شارع اسلام کا بھی یہی فرمان واجب الاذعان ہے۔

لطف النساء بیگم آثمہ
بنت شمس العلماء شاطر مدراسی

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا گروپ
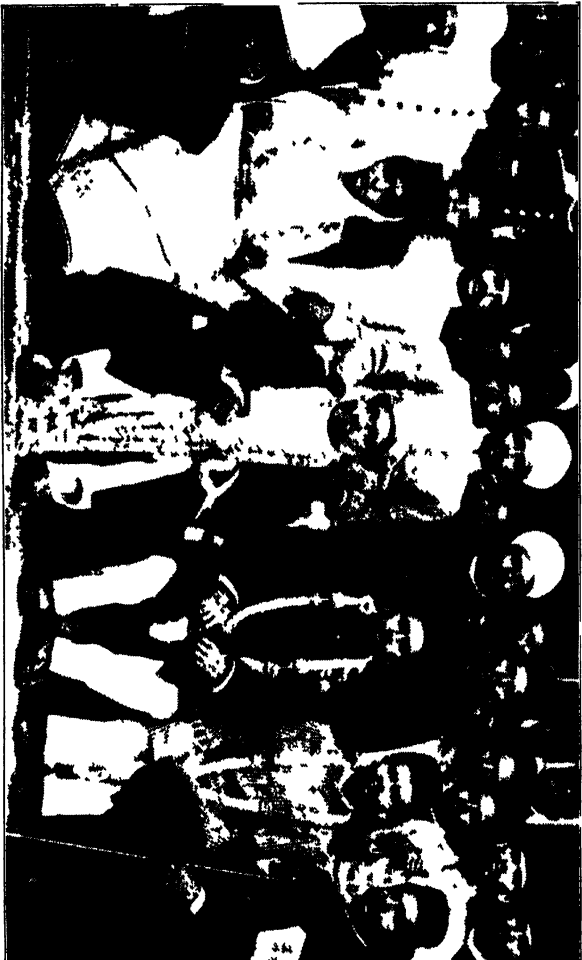
نشستہ سیدھے جانب سے :- (۱) مرزا محمد بیگ صاحب اول تعلقدار (۲) محمد مرتضی صاحب مرحوم سکریٹری کانفرنس (۳) محمد فیص الدین صاحب ایڈوکیٹ (۴) سر اکبر حیدر نواز جنگ بہادر (۵) مسز سروجنی نائیڈو (۶) رائے بالمکند صاحب آنجہانی رکن ہائیکورٹ۔

استادہ دوسری صف میں :- (۱) حافظ محمد مظہر صاحب سکریٹری کانفرنس (۲) ایچ ایم سلطان صاحب مرحوم (۳) محمد برہان الدین صاحب منتظم دفتر کانفرنس (۴) غلام محمد صاحب مرحوم وکیل (۵) محمد مسیح الدین مرحوم وکیل (۶) محمد شمس الدین صاحب منصف وظیفہ یاب (۷) محمد غوث صاحب ایم اے ال ال بی۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

کے لئے

اِدارۂ ادبیات اُردو کے ماہ نامہ "سب رس" کا ضمیمہ

فہرست

تصاویر

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

کا

پہلا خطبۂ صدارت

(اقتباس)

حضرات! یہ بہت نازک اور پُرخطر وقت ہے۔ یورپ میں ایک خونخوار اور خوں ریز جنگ ہو رہی ہے جس سے ایک عالم میں ماتم بپا ہے ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا بے وجہ و بے گناہ قتل کئے جا رہے ہیں اور ساری دنیا میں ایک تشویش اور ہنگامہ مچا ہوا ہے۔ لیکن اس تاریکی میں صرف ایک جھلک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے بہ حیثیت رعایا کے اپنے فرض کو بکمال خوبی انجام دیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے آقائے ولی نعمت **اعلیٰ حضرت حضور پرنور خلد اللہ ملکہٗ** نے اپنی پُرخلوص دوستی کا حق ادا کر دیا جو انھیں اپنے آبائے کرام سے ارثاً ملا ہے ہمیں خدائے ذوالجلال پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے گا اور جبر و استبداد کو پامال کرے گا۔ اس لئے یہاں نہ بدامنی ہے اور نہ بے چینی اور پورا اطمینان حاصل ہے اور اس اطمینان کی ایک دلیل یہ ہے کہ ہم آج اس نیک کام کو شروع کرنے والے ہیں اور اس تعلیمی مجلس کا آغاز کرنے کو ہیں جس سے ہمارے ملک کی فلاح اور ہماری امیدیں وابستہ ہیں اور ہم سب کو **اعلیٰ حضرت حضور پرنور خلد اللہ ملکہٗ** کا تہ دل سے شکر گزار ہونا چاہئے کہ از راہ مراحم خسروانہ اس مجلس کے انعقاد کی منظوری عطا فرمائی ۔۔

حضرات! میں آپ صاحبوں کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اس تعلیمی مجلس کے قیام سے ملک پر ایسا بڑا احسان کیا ہے کہ جس کا شکریہ نہ صرف ہم بلکہ آئندہ نسلیں بھی ادا کریں گی۔ میری رائے ہیں اگر اس ملک کے لئے سب سے بہتر اور سب سے مفید اور سب سے اعلیٰ کوئی کام ہو سکتا ہے تو وہ ایک ایسی ہی تعلیمی مجلس ہے اگرچہ یہ کام بہت پہلے شروع ہونا چاہئے تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے بہت دیر کی ہے لیکن اس تاخیر کی تلافی ہم اپنی مستعدی جفاکشی اور محنت سے کرسکتے ہیں اور اگر یہ کام اسی جوش اور مستعدی کے ساتھ جاری رہا تو ہم دیکھیں گے کہ اس کے نتائج کیسے عمدہ اور اس کے اثرات کیسے بے بہا پیدا ہوں گے۔ مناسب تو یہ تھا کہ اس مجلس کی صدارت کے لئے کسی صاحب علم و فضل کا انتخاب کیا جاتا جو اس خدمت کو مجھ سے بہتر اور زیادہ خوبی کے ساتھ انجام دیتا۔ مجھے علم و فضل کا ہرگز دعویٰ نہیں ہے اور یہ میں بغیر کسی انکسار اور تصنع کے کہتا ہوں لیکن میں علم کا خدمت گزار ضرور ہوں۔ اور اس ناچیز خدمت گزاری پر مجھے فخر ہے میرا دلی منشا ہے کہ اس ملک میں تعلیم عام ہو اور علم کی روشنی سے سارا ملک منور ہو جائے۔ مجھے ابتدائے ملازمت سے جہاں جہاں میں رہا۔ تعلیم سے خاص دلچسپی رہی۔ اور میں نے اپنی بساط کے موافق ہمیشہ اس میں حصہ لیا اور جب سے میں اس ریاست میں ہوں مجھے سب سے زیادہ خیال تعلیم کا رہا۔ اور جب تک میں رہوں گا۔ میں ہمیشہ اس کی ترقی کو مدِّ نظر رکھوں گا اس لیے جو عزت کہ آپ نے مجھے اس مجلس کے اجلاس اول کی صدارت کی بخشی ہے اس کا میں تہ دل سے ممنون ہوں اور اس موقع کو میں اپنی زندگی میں ہمیشہ فخر و مباہات کے ساتھ یاد رکھوں گا ۔۔۔۔۔

حضرات! علاوہ اُن اعلیٰ خوبیوں اور نیکیوں کے جو ہمیشہ عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ ہر زمانہ میں بہ لحاظ ضروریات وقت اور اقتضائے زمانہ بہت سی دوسری ایسی چیزیں اور بہت سے دوسرے ایسے کام ہیں جن کی قدر و منزلت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ان کا درجہ نیکی اور ثواب تک پہونچ جاتا ہے اگر اس زمانے کے حالات اور ضروریات پر نظر ڈالی جائے تو اشاعت تعلیم اور

علم پھیلانا درحقیقت نیکی اور ثواب کا کام ہے اور اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ جہاد کا کام ہے۔ کیا جہالت اور ظلمت سے جنگ کرنا، تاریکی کو رفع کرنا اور علم کی روشنی پھیلانا جہاد نہیں ہے۔ خصوصاً ایک ایسے ملک میں جہاں تعلیمی حالت پست ہے جہاں علم مفقود ہوتا جاتا ہے۔ اور جہاں ابھی لوگوں کو علم کی پوری قدر نہیں ہے ....

لیکن حضرات، جہالت کی جڑ اس وقت تک نہیں کٹ سکتی جب تک علم کی اشاعت ہماری عورتوں اور لڑکیوں میں نہ ہو وہ ملک اور قوم کبھی تعلیم یافتہ اور شائستہ نہیں ہو سکتی۔ جس کے مرد تو علم حاصل کریں اور عورتیں علم سے بے بہرہ رہیں۔ گویا اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک جسم ایسا ہے جو نصف تو صحیح سالم ہے اور نصف مفلوج؟ بچوں پر ماں باپ دونوں کا اثر ہوتا ہے لیکن یہ مسلم ہے کہ ماں کا اثر باپ سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور جب ہم یہ تسلیم کرتے ہیں تو کیا اس کے ساتھ یہ بھی مانتے ہیں کہ جاہل اور بے علم ماں کا اثر بچے پر اچھا پڑے گا؟ اگر وہ گودیں جن میں ہماری اولادیں پرورش پاتی ہیں جہاں وہ اخلاق و مذہب کا پہلا سبق سیکھتی ہیں جہاں اول اول ان کا کیرکٹر بنتا ہے۔ علم سے خالی ہیں تو پھر ہم کیونکر یقین کر سکتے ہیں کہ جب ہماری اولادیں اُن گودوں میں سے پرورش پا کر بڑھیں گی تو وہ حقیقی علم اخلاق سے آراستہ ہوں گی؟ ....

اشاعت تعلیم کا ایک بڑا ذریعہ کتب خانے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مدارس کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں کتب خانوں نے ہمیشہ بڑا کام کیا ہے اور بڑے بڑے لوگ پیدا کئے ہیں۔ ہندوستان کتب خانوں کے لئے قدیم زمانے سے مشہور ہے۔ ہر پڑھے لکھے شخص کے گھر میں کتابوں کا مجموعہ ہوتا تھا۔ اور بعض بزرگوں اور خاندانوں کا ذخیرہ تو نہایت بیش بہا اور قابل رشک تھا اور اس زمانے میں تو اس کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ کتابوں کی آج کل اس قدر کثرت ہوتی جاتی ہے کہ ان کا جمع کرنا کسی ایک شخص کا کام نہیں۔ ایک شخص اپنے مذاق کی کتابیں جمع کر سکتا ہے لیکن ہر فن و علم کی کتب کا جمع کرنا شخصی قدرت سے باہر اور اس لئے ضرور ہے کہ سرکار کی طرف سے یا باہمی کوشش سے جگہ جگہ کتب خانے قائم کئے جائیں تاکہ طالب علم اطمینان خاطر سے اپنی فرصت کے وقت میں کتب کا مطالعہ کر سکیں۔ اور جنھیں خدا نے علمی ذوق اور ذہن رسا عطا فرمایا ہے۔ وہ جدید تحقیقات کا ڈول ڈالیں اور اپنے ملک کے علم میں اضافہ کریں۔ اور جو لوگ اپنے کام دھندوں میں مصروف ہیں۔ انھیں بھی موقع ملے گا۔ اور ترغیب ہوگی کہ اپنے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد مطالعہ کتب سے سچی خوشی اور فیض حاصل کریں۔ ایک اچھا کتب خانہ ایسی نعمت عظمیٰ ہے کہ اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے اشاعت علم میں کتب خانہ مدرسوں کالجوں اور یونیورسٹیوں سے کسی طرح کم نہیں بہت سے لوگ جنھوں نے صرف ابتدائی تعلیم پائی تھی کتب خانوں کی بدولت بڑے آدمی بن گئے ہیں اور انھوں نے بڑی بڑی علمی خدمتیں کی ہیں۔

....

اگر ہم صاحب جاہ و مال امیر صاحب حکومت کی عزت کرتے ہیں تو اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر ہمیں صاحب علم کی بھی عزت کرنی چاہئے۔ جو لوگ علم حاصل کرتے ہیں اور علم کی اشاعت کرتے ہیں وہ ہماری عزت کے بدرجہا مستحق ہیں بہ نسبت

ان لوگوں کے جو مال و دولت کے جمع کرنے میں مصروف ہیں۔ ایک مدرس خواہ وہ کتنی ہی کم تنخواہ کا کیوں نہ ہو قابل وقعت ہے اس لئے کہ وہ ملک کی بڑی خدمت کر رہا ہے اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کا محسن ہے۔ ہمارا ملک استاد کی عزت کرنے میں ضرب المثل ہے اور ہمارے ہاں استاد کی عزت باپ سے زیادہ کی جاتی تھی۔ اور بلاشبہ وہ اس کا مستحق ہے دوسرے کم استطاعت اور ہونہار طلبہ کی مدد کرنا ہمارا بڑا فرض ہے۔ ان ہی کنکروں میں جواہر بھی ہوتے ہیں اور کیا معلوم کہ ان ہی میں سے ایسے لوگ پیدا ہوں جو ہمارے ملک کے لئے باعث فخر ہوں۔ ایسے لڑکوں کی مدد کرنا اپنے ملک کی مدد کرنا ہے ....

جہاں ہم اپنی ذات کے لئے اتنا کچھ کرتے ہیں وہاں ہم تھوڑا سا کچھ اپنے ملک کے لئے بھی کریں۔ ہم دنیا میں تنہا نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں ہماری ساری حالتیں اور ساری امیدیں اپنے ملک سے وابستہ ہیں ملک کی فلاح میں ہماری فلاح اور ملک کے نقصان میں ہمارا نقصان ہے اس لئے ہمیں کچھ ایثار سے بھی کام لینا چاہئے اگر ہم میں اپنے ملک کی کچھ محبت ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ان خوفناک آفتوں سے بچنے کے لئے جو جہالت سے پیدا ہوتی ہے خلوص و ایثار جوش و صداقت سے کام لیں۔ جہالت کا مقابلہ کریں اور علم کا نور تمام ملک میں پھیلائیں۔ ایثار و خلوص وہ خوبیاں ہیں کہ جس قوم و ملک میں پیدا ہو گئیں۔ انھیں کوئی قوت ترقی سے نہیں روک سکتی ....

حضرات! وقت کم ہے اور کام بہت، رستہ کٹھن ہے اور منزل مقصود دور۔ اس لئے آؤ اب یک زبان و یک دل ہو کر اس مقدس کام کو شروع کریں۔ جس پر ہمارے ملک کی ترقی و اصلاح کا دارومدار ہے اور خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے ارادوں اور ہمتوں میں برکت دے اور ہم سب کو نیک توفیق عطا کرے۔ اور ہمارے آقائے ولی نعمت حضور پر نور بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی کی صحت و اقبال و عمر میں ترقی عطا فرمائے کیونکہ ان کی کامیابی میں ہماری کامیابی اور اُن کی عظمت و اقبال میں ہماری عزت و مسرت ہے۔ آمین

سر اکبر حیدری

نظم (عثمانیہ یونیورسٹی)

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے سالانہ اجلاس ۱۳۳۶ھ میں ایک کمسن لڑکے سید آصف الدین احمد طالب علم مدرسہ دسشتکار تلنگانہ نے عثمانیہ یونیورسٹی پر ایک نظم سنا کر حاضرین کو محظوظ کیا چونکہ یہ جامعہ عثمانیہ پر پہلی نظم ہے اس لئے اس کے چند شعر درج ذیل ہیں:-

میر عثمان علی خاں رحم دل ہیں بادشاہ ! — اس کے عہدِ معدلت میں خوش ہیں سب شاہ و گدا

حیدرآباد اور یونیورسٹی کا ہو قیام ! — خوب سمجھیں آپ معمولی نہ تھا یہہ کوئی کام

یہہ نہ ہوتا۔ علم دوست ہوتا نہ اپنا بادشاہ — جانا پڑتا امتحاں دینے ہمیں میلوں کی راہ

اور کیا کیا اس سے آسانی ہوی کچھ ہے خبر — ہوں گے اردو کی زباں میں جتنے ہیں علم و ہنر

پھر تو کیا آسان ہوگا ہم کو دنیا امتحاں — کیوں کہ ہر اک فن میں ہوگی مادری اپنی زباں

ملک کو مرہون منت ان کا رہنا چاہیے ! — ان کو اپنا ناخدائے علم کہنا چاہئے !!

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس

کا

تیسرا خطبۂ صدارت

(اقتباس)

حضرات! اگر میں سنتِ بزرگانِ قوم کی تقلید کروں تو میرا فرض ہوگا کہ میں حامیانِ کانفرنس کے آگے اپنی نااہلی اور بے بضاعتی کا اظہار کرکے معذرت کروں اور ان کی نوازش کا شکریہ دل وجان سے ادا کروں کہ ان کی حسن عقیدت نے مجھ کو آج کے روز کرسئ صدارت سے معزز کیا مگر حضرات! آپ تعجب نہ فرمائیں کہ بعوض معذرت و تشکر کے میں خود اس وقت حامیان کانفرنس سے معذرت کا طلبگار ہوں کہ ان حضرات نے کیوں اور کس ضرورت سے ایسے ایک ضعیف مریض بے بصارت اور بے بصیرت شخص کا انتخاب آج کی صدارت کے واسطے کیا جو نہ فقط سرکاری خدمات سے تقریبًا نصف صدی کی محنت و مشقت کے بعد وظیفہ پا چکا ہے بلکہ تمام دوسری دنیاوی گفت و شنید و تفکرات سے بلا وظیفہ بطور خود دست کش ہو چکا ہے ....

میری غرض و غایت اس مختصر تقریر سے یہ ہے کہ ہمارا طریقۂ تعلیم غلط اصول پر مبنی ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ ہم خود جہاں تک ممکن ہو ان اصول کی اصلاح کردیں اور حکومت کی نظر کو بھی تا بہ حدِ امکان اس طرف منعطف کریں اس کا طریقہ میرے نزدیک یہ ہوگا کہ اسکولوں میں تمام فنون مثل حساب، جغرافیہ، تاریخ وغیرہ اپنی زبان میں سکھائے جائیں۔ انگریزی جو ایک اجنبی اور مشکل زبان ہے بطور ایک زبان کے تعلیم دی جائے اور اس کی تکمیل کی طرف بہت زیادہ توجہ کی جائے۔ محض طوطوں کی طرح ریڈروں کے رٹنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ زبان سکھانے کے جدید طریقے اختیار کئے جائیں اور اس کے لئے روزانہ معقول اوقات اور خاص مدرس مقرر کئے جائیں مجھے یقین کامل ہے کہ یہ طریقہ اختیار کیا جائے تو اسکولوں کی تعلیم کی تکمیل میں اس قدر وقت ضائع نہ ہوگا جس قدر اب ضائع ہوتا ہے اور طلبہ کی انگریزی دانی کے معیار میں بھی ترقی ہو جائے گی۔ ذخیرہ لغات انگریزی۔ صحت تلفظ وغیرہ میں بہت کچھ اضافہ ہو جائے گا اس کے علاوہ میری رائے ناقص میں اگر یہ طریقہ اختیار کیا گیا تو لڑکوں کو موجودہ حالت سے کم تر مدت میں اسکول کی تعلیم سے فراغت ہو جائے گی۔ کالجوں کی تعلیم میں بہت سے چھوٹے بڑے نقائص اب بھی باقی ہیں اور ان کی اصلاح یقینًا رفتہ رفتہ ہو جائے گی۔ مگر مجھے دو امور کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا اس وقت بہت ضرور ہے۔

امر اول یہ ہے کہ گویا کالجوں میں بوساطت زبان انگریزی علوم و فنون کی تعلیم بعض اعتبار سے مفید ہے مگر یہی طریقہ قائم رہا تو ہماری آبائی زبان یعنے اردو ایک جاہلانہ زبان رہ جائے گی۔ اور عام طور پر ہمارے ہم قوم و ہم وطن علوم مغربیہ سے ہمیشہ ناآشنا رہیں گے۔ بلاد یورپ و امریکہ میں یہاں تک کہ مصر میں بھی جو ایک اسلامی ملک ہے علوم کی تحصیل میں کسی اجنبی زبان کی وساطت کی حاجت نہیں ہوتی۔ مصر میں بہت سی علمی کتابوں کا فرنچ اور انگلش زبانوں سے عربی میں

ترجمہ ہو گیا ہے اور ہوتا جاتا ہے ایک ہم ہند کے مسلمان ہی اس نعمت سے محروم ہیں۔ اگر اس مبارک عثمانیہ یونیورسٹی یعنے جامع علیہ عثمانیہ کو جس میں خاص اُردو زبان واسطہ تعلیم علوم و فنون قرار دی گئی ہے بحسب امید کامیابی ہوئی تو یہ عیب مٹ جائے گا اور ہماری زبان قلیل عرصے میں دولت علمیہ سے مالا مال ہو جائے گی۔ اور کامیابی کیوں نہ ہوگی جب کہ اس کی سرپرستی خود ہمارے شاہ جم جاہ نے منظور فرمائی ہے اور اس کو اپنے نام نامی و اسم گرامی سے منسوب کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے

دوسرا امر جس کی طرف کارپردازانِ جامع علیہ کی توجہ مبذول ہونی چاہئے وہ یہ ہے کہ اس جامع کے مسلمان طلبہ بطور دوسری زبان تعلیمی کے عربی کے اختیار کرنے پر مجبور کئے جائیں اور ہندو طلبہ کے واسطے سنسکرت کے درس تدریس کا بندوبست کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ چار پنج سالہ مدت تعلیم میں زبان انگریزی کے ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی تکمیل ہو جائے اگر اساتذہ لائق ہوں اور طریقہ تعلیم و نصاب کتب درست اختیار کیا جاوے تو مجھے یقین کلی ہے کہ ہمارا منشاء پورا ہو جائے گا۔ اور اگر فقط اُردو انگریزی پر اکتفا کیا گیا تو بجز ناکامی کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ دوسری یونیورسٹیوں کے کامیاب طلبہ سے آپ کے کامیاب طلبہ پیچھے رہ جائیں گے۔ اور آپ کی ساری محنت اکارت جائے گی طلبہ کو وہ پایۂ فضیلت نصیب نہ ہوگا جس کی ان کو اور ہم کو امید اور انکی قوم کو ضرورت ہے ....

حضرات! میں اپنی لاطائل تقریر کو طول دینا نہیں چاہتا آپ کی کانفرنس کے مقاصد بہت وسیع اور نہایت مفید ہیں خدا کرے کہ آپ ان مقاصد کی تکمیل میں کامیاب ہوں اور تمام ملک میں تحصیل علم کا شوق پیدا ہو جائے۔ اور اہل ملک خواب غفلت سے بیدار ہو کر اپنی حالت کی اصلاح کی طرف دل و جان سے متوجہ ہو جائیں سچ تو یہ ہے کہ اگر اس عہدِ معدلت مہد میں جب کہ ہم پر ایسے ظل اللہ کا سایہ پڑ رہا ہے جو ہمہ تن اور ہر وقت اپنی رعایا کی صلاح و فلاح کی فکر میں مصروف ہیں اور کوئی تجویز، کوئی استدعاء کوئی گزارش خصوصاً تعلیمی معاملات کے متعلق جس میں واقعی اور درست طور پر اہل ملک کی بہتری کی امید ہو کبھی رد نہیں ہوتی۔ آپ کی کانفرنس ملک میں تعلیم کا شوق اور اہل ملک میں اپنی اصلاح کا مذاق نہ پیدا کر سکے تو سمجھ لیجئے کہ بجز ہماری شوئی قسمت کے اور کوئی اس کا ذمہ دار نہیں۔ اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ حامیان کانفرنس اور نیز وہ بزرگانِ قوم جو شاید اتفاقاً کانفرنس میں شریک نہیں ہیں عملی طور پر کام کریں اور فقط فصیح و بلیغ تقریروں پر بھروسہ نہ کریں وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ

عماد الملک سید حسین بلگرامی

نظم

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ اورنگ آباد میں عبدالغنی خاں صاحب رافت نے ایک طویل نظم سنائی تھی جس کے چند شعر درج ذیل ہیں:۔

تمھیں بتائیں عزیزو یہ انجمن کیا ہے — کہ جس پہ ملک کا خورد و بزرگ شیدا ہے

فلاحِ ملک کی بنیاد ہے یہہ کانفرنس — کہ روئداد سے اس کے یہ سب ہویدا ہے

دلیل راہ ترقی یہہ انجمن ہو گی — اسی کی ذات سے یہ بیڑا پار ہونا ہے

گزارشوں کو نصیب اس کی گر ہو سمعِ قبول — ہزار آفریں، کیا ملک تیرا کہنا ہے

یہی ہیں رافتِ دل خستہ کی تمنائیں! — الٰہی اب تو بھلے دن ہمارے بھی آئیں

دنیا کے بڑے سے بڑے کاموں کا آغاز عجز و انکسار کے ساتھ ہوا ہے۔ ان کے بانی اپنے عاجزانہ خلوص اور کمزور سعی کی مدد سے اپنے شروع کئے ہوئے کاموں کو بہت جلد ارفع و اعلےٰ مقام پر پہنچتے دیکھ کر متحیّر رہ جاتے ہیں کہ ان سے اتنے بڑے کام اس قدر جلد کیسے ہو سکے۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی رسمی بنیاد دارالعلوم کے چند فارغ التحصیل طلبہ کے ہاتھوں سے ماہ جمادی الاول ۱۳۳۲ھ میں رکھی گئی۔ چنانچہ اس مہینے میں آپ کی ایک مختصر جماعت نے جلسہ کرکے تعلیمی کانفرنس قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور اس کا نام حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس رکھا۔ ان ابتدائی اجلاسوں میں شدّ و مد کے ساتھ کام کرنے والوں میں مندرجہ ذیل علی الخصوص قابل ذکر ہیں:۔
مولوی محمد مرتضیٰ صاحب مرحوم۔ مولوی عبدالباسط صاحب۔ مولوی رضی الدین صاحب کیفی مرحوم۔ مولوی سید بہاء الدین صاحب شطاری مولوی جمال الدین صاحب مرحوم۔

اس کے بعد دارالعلوم کے بعض اور نوجوانوں نے رسمی شرکت کی۔ جن میں سے (میں اپنی ذاتی معلومات کے لحاظ سے کہہ سکتا ہوں کہ) مولوی میر اکبر علی صاحب۔ مولوی مرزا محمد بیگ صاحب۔ مولوی شمس الدین صاحب۔ مولوی محمد مظہر صاحب۔ مولوی محمد عبدالسلام صاحب مرحوم کو خاص امتیاز حاصل ہے۔

ظاہر ہے کہ سارے حیدرآباد کی تعلیمی کانفرنس کا کام چلانے کے لئے ایک مشرقی تعلیم کا ادارہ اگرچہ وہ اس وقت ملک میں انتہائی شہرت حاصل کر چکا تھا، کافی رضاکار اور معاون پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ نوجوان بانیوں نے اپنے دائرہ کو وسعت دی اور ملک کے ہر حصے اور تعلیمی ادارے سے ارکان جمع کئے۔ باہمی مشورہ اور تبادلۂ خیالات کے بعد اعلیٰ عہدہ داران تعلیم وغیرہ سے بھی مدد اور ہمدردی حاصل کی گئی اور بالآخر ان کی زبردست سرپرستی میں ۲۷، ۲۸ فروردی ۱۳۲۴ف کو بمقام ٹاؤن ہال کانفرنس کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔ اس مشہور جلسہ کی صدارت رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر نے (جو اُس وقت معتمد عدالت و کوتوالی و امور عامہ سرکار عالی تھے) قبول فرمائی۔ معتمد کانفرنس مولوی مرتضیٰ صاحب مرحوم تھے۔ انھوں نے انعقادِ ذیلی مجالس، فراہمی عام ارکان و تقسیم کار کے ضمن میں جو محنت اٹھائی ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اس موقع پر ان کا شریکِ کار رہا ہو۔ جلسہ نہایت شاندار اور کامیاب ثابت ہوا۔ ملک میں تعلیم کے ساتھ عام دلچسپی پیدا ہو گئی۔ علم دوست عہدہ داران سرکار عالی اور دائرۂ ملازمت سے باہر متمول اشخاص نے محسوس کیا کہ ملک تعلیم میں بمقابل دیگر ممالک و صوبہ جات ہند کے کس قدر پیچھے ہے اور اس نقص کو پبلک کس طرح خلوص نیت کے ساتھ مذہب و ملت کے ظاہری قیود سے اپنے آپ کو آزاد رکھ کر دور کر سکتی ہے۔ معلّمین و متعلّمین کی بھی ہمت افزائی ہوی اور براہ راست ان کو اس کا انکشاف ہوا کہ

قوم کی ترقی بغیر ان کے باقاعدہ اور منظم اشتراک عمل کے ناممکن ہے۔

نادار طلبہ کے لئے کانفرنس کی جانب سے وظائف تعلیمی دئے جانے لگے ۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کانفرنس کی اس تعلیمی سرپرستی کو دیکھ کر ملک کے بعض ممتاز سرکاری اداروں نے نہ صرف کانفرنس کے پاس اپنے ہونہار طلبہ کی مالی امداد کی سفارش کی بلکہ اس سے متاثر ہو کر خود بھی سرکار اور دیگر ذرائع سے اپنے طلبہ کے لئے وظائف منظور کرائے ۔ اس کانفرنس میں چونکہ ذمہ دار اشخاص نے اپنے ذاتی تجربہ اور وسیع معلومات کی بنا پر بتلایا تھا کہ زبان اردو تعلیم کے جملہ مدارج میں ذریعہ تعلیم ہو سکتی ہے شاید یہہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ملک اس تاریخی اجلاس کے بعد فطری طور پر بذریعہ زبان اردو اعلیٰ و فنی تعلیم حاصل کرنے پر ایک بڑی حد تک نہ صرف آمادہ ہو گیا بلکہ اصرار بھی کرنے لگا۔ گویا جامعۂ عثمانیہ کے مبارک قیام کے لئے راستہ صاف کرنے والی قوتوں کی فہرست میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کو بھی ایک اچھی جگہ حاصل ہے کانفرنس کا سب سے زیادہ شاندار کارنامہ اس کی وہ امداد ہے جس کی بدولت ملک کے اکثر غیر معمولی ذہین مگر کم خوش قسمت نوجوان میدانِ علم میں اپنے معراجِ کمال کو پہنچ سکے ۔ ہندوستان بھر میں شاید ہی کسی دوسرے تعلیمی ادارہ کو یہہ عزت نصیب ہوی ہے کہ اس کی مالی اعانت سے ملک اس قدر کم مدت میں ایسے قابل اور صاحب کمال افراد پیدا کر سکا ۔

ہمیں امید ہے کہ ملک کے تمام حضرات اور خصوصاً وہ ممتاز ہستیاں جنھوں نے کانفرنس کو اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنی ریاضت و ذہانت طبعی سے ملک کی بہترین خدمت گزاری کا موقع عطا کیا ۔ اب اپنی مرفہ الحالی اور کمال عروج کے زمانے میں اس اِدارہ کا فیاضی و حق شناسی سے ہاتھ بٹائیں گے ۔ ملک کا سب سے بڑا محسن اور مستحق سپاس وہی ہے جو نوجوانانِ ملک کے جسمانی دماغی و ذہنی ارتقاء کی کوشش کرتا ہے ۔

محمد عبد الرحمٰن خاں

نظم

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس میں مرزا غلام مصطفےٰ صاحب رسؔا سوم تعلقدار اورنگ آباد نے ایک نظم سنائی تھی جس کے چند شعر یہ ہیں :—

مرحبا قوم کی آواز پر آنے والے
ہم ترے واسطے آنکھیں ہیں بچھانے والے

ہم اسی شخص کے قائل ہیں جو کچھ کر کے دکھائے
نوحۂ قوم تو لاکھوں ہیں سنانے والے

جدتیں کی ہیں زمانے نے ہزاروں لیکن
آج تک ہم ہیں وہی اگلے زمانے والے

سونے والوں پہ ہم الزام لگائیں کیونکر!
آپ سو جائیں جو سوتوں کے جگانے والے

ہے اگر منزل مقصود کو جانا تو اٹھو
بیٹھ کر جائیں گے کس طرح سے جانے والے

میر عثمان علی خاں رہیں آباد رسؔا
اپنے مالک کی ہیں ہم خیر منانے والے

مولوی محمدؐ مرتضیٰ مرحوم

مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کے ملکی قومی اور علمی خدمات

مولوی محمد مرتضیٰ کو انتقال کئے ہوئے آج تیرہ سال ہوتے ہیں، یکم رجب ۱۳۴۴ھ کو ان کی رحلت ہوئی ہے، ہماری نئی نسل جو اَب کالج سے فارغ ہوکر میدانِ عمل میں گام زن ہوئی ہے، یا وہ سپوت جو ہنوز تحصیلِ علم میں معروف ہیں غالباً اُن کے نام اور کام سے پوری طرح واقف نہیں ہیں، اس لئے یہاں مرحوم کے بعض کارناموں کا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ ہماری نئی نسل ایک سچے محبِ وطن کے کارناموں سے آگاہ ہوکر ان کے نقشِ قدم کو اپنے لئے چراغِ ہدایت تصور کریں۔

شمالی ہندوستان کی طرح حیدرآباد میں بھی کئی نامور محبانِ وطن جلوہ نما ہوئے ہیں، جن کے کارنامے زندگی جاوید کے مستحق ہیں۔ ملا عبدالقیوم مرحوم، مولوی عبدالقادر مرحوم، ڈاکٹر اگھورناتھ چٹو پادیا، مولوی انوار اللہ فضیلت جنگ مرحوم، حضرت کیفیؔ، رائے بال مکند، مولوی عبدالسلام مرحوم وغیرہ وہ معزز ہستیاں تھیں جن کے کارنامے فراموش نہیں کئے جاسکتے، ان ہی محب وطن ہستیوں میں مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کا نام چوٹی پر نظر آتا ہے، مرحوم کے کارنامے تاریخِ دکن میں تابناک رہیں گے نسلیں ان پر فخر کریں گی، زمانہ ان کو مٹا سکے گا اور نہ حوادث اس کو محو کرسکیں گے۔

سطور ذیل سے معلوم ہوگا کہ مرحوم مرتضیٰ نے ملک اور وطن کی کیا خدمت انجام دی ہے، قوم اور مادرِ وطن کی بہبودی کیلئے کیا کام کئے ہیں۔

قلمروِ آصفی میں جامعہ کے قیام کی جدوجہد

قلمروِ آصفی میں توسیع تعلیم اور ایک مستقل یونیورسٹی کی ضرورت کی تحریک کو مرتضیٰ خاندان کے ایک سے زیادہ اصحاب نے مختلف اوقات میں پیش کیا ہے، سب سے پہلے آج سے تقریباً نصف صدی پہلے راقم کے والد مولوی عبدالقادر مرحوم سابق رجسٹرار بلدہ نے ایک طویل مضمون مخبرِ دکن میں شائع کیا تھا جس میں حیدرآباد کے لئے ایک یونیورسٹی کی تحریک سرکارِ عالی کے سامنے پیش کی تھی، مرحوم نے تفصیل کے ساتھ اعداد و شمار پیش کرکے بتایا تھا کہ سرکارِ عالی سررشتہ تعلیمات پر کس قدر رقم صرف کررہی ہے، اور مزید کس قدر صرفے سے ایک یونیورسٹی قایم ہوسکتی ہے، اور مطلوبہ رقم کی سبیل سرکار کس قدر آسانی سے کرسکتی ہے، اور اس مستقل یونیورسٹی سے کیا کیا فوائد حاصل ہوسکتے ہیں۔ اُس وقت یہ تحریک بہت قبل از وقت ثابت ہوئی۔

اس کے بعد ۱۳۲۲ھ میں مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم میدانِ عمل میں اُترے، ایک پمفلٹ "روحِ ترقی" کے نام سے شائع کیا، اس سوال کا جواب دیا گیا تھا کہ حیدرآباد کیوں ترقی نہیں کرتا۔ اس میں تفصیل کے ساتھ تعلیمی پستی کا اظہار کرتے ہوئے ایک جامعہ کی جانب توجہ دلائی تھی، اس کے بعض اقتباس حسب ذیل ہیں:—

"نصاب کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے سب سے اہم بحث یہ ہے کہ حیدرآباد کی عام تعلیمی زبان کونسی ہو؟ انگریزی یا اردو؟ موجودہ حالت سے یہی خیال پیدا ہوتا ہے کہ اصلی زبان انگریزی قرار دی گئی ہے، جس کی وجہ بظاہر یہی

معلوم ہوتی ہے کہ مغربی فنون، معاشرت، تمدن کا سیلاب جس زور شور سے بڑھ رہا ہے، اس لحاظ سے بہ تقلید برٹش انڈیا یہی سچی خیر خواہی ہے کہ ابنائے ملک کو اس سمندر میں ہاتھ پاؤں مارنے کے قابل بنایا جائے۔ یہ خیال اگرچہ بظاہر درست پایا جاتا ہے لیکن سچائی اس کے بالکل خلاف بیان کرتی ہے ....

..... اردو زبان کی رفتار خود اس سفسطہ کو دور کر دیتی ہے، دیکھو یہ زبان جو خاص ملکی دکنی پیداوار ہے کب پھولنے لگی، اسی وقت سے جبکہ سیلاب مغرب کا تموج شروع ہوا، اور جیسے جیسے اس کی موجیں بلند ہوتی جاتی ہیں یہ سریلی اور خوش آئند صدا بھی قوی بن رہی ہے، ابنائے ملک اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جبکہ وہ اپنی اس عام زبان کو تازہ رکھیں .... وہ دکن ہے جس نے ملکی لحاظ سے اردو کی ضرورت سمجھی اور بندگان عالی کے عہد میمنت مہد میں اردو کو یہ عظمت نصیب ہوئی کہ وہ ہندوستان کی اعلیٰ دیسی حکومت کی سرکاری زبان بنی ...... اسی بنا پر اب حیدرآباد اردو کا اصلی مرکز ہو سکتا ہے اور سلطنت کا استحکام اسی میں منحصر ہے کہ اس شاہی زبان کو عام ملکی تعلیم کا آلہ قرار دیا جائے، اسی میں شاہ کی اطاعت ہے اور اسی میں ملک کی بہبودی، اردو عام تعلیم کے لئے کافی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کے برخلاف بیانات محض بکواس ہیں۔ (صفحہ ۲۵ و ۲۶)

عام تعلیم کا سلسلہ اعلیٰ تعلیم کے ساتھ اس طرح مرتبط ہونا چاہیئے کہ ایک دن نظام کالج کی جگہ نظام یونیورسٹی قائم ہو جائے، .... آج اگر ہم نظام یونیورسٹی کا نعرہ مارنے لگیں تو ظاہر ہے کہ اس سے کوئی اثر مترتب نہیں ہو سکتا اور اس لئے تابمقدور ایسی تجویزیں کی گئی ہیں جو سہل الحصول کہی جا سکتی ہیں۔"

اس رسالہ "روح ترقی" کے شائع کرنے کے بعد مرحوم مرتضیٰ بالکل خاموش نہیں ہو گئے بلکہ وہ وقت کے منتظر رہے تاآنکہ ۱۳۳۲ھ میں انھوں نے حیدرآباد میں ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد رکھی، اس کے بعض مقاصد حسب ذیل تھے :-

(الف) علوم و فنون کے تراجم اردو زبان میں کیئے جائیں۔

(د) ادنیٰ تعلیم کا سلسلہ اعلیٰ تعلیم سے بہ سہولت مرتبط رہنا ترقی کے لئے لازمی ہے، اس لئے اعلیٰ تعلیم خود ہمارے ہاتھ میں ہونا ضروری ہے، اعلیٰ تعلیم کا ہمارے ہاتھ میں رہنا نظام یونیورسٹی کے وجود پر منحصر ہے۔ کانفرنس اس کے متعلق پوری کوشش عمل میں لائیگی۔

(ھ) ایک یونیورسٹی کے لئے مواد مہیا ہے .... کانفرنس کو یقین ہے کہ وہ دن دور نہیں جب کہ نظام یونیورسٹی عملاً ہمارے نوجوانوں کی زندگی کا محور بنے۔

مرحوم حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ انجمن طلبہ قدیم دارالعلوم کے ذریعہ بھی یونیورسٹی کی ضرورت ثابت کرتے رہے، اور دارالعلوم کو ترقی دے کر جامعہ کے درجہ پر پہنچانے کی کوشش ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی چنانچہ دارالعلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی کے موقع پر جو اڈریس نواب سالار جنگ بہادر (ثالث) مدارالمہام وقت کی خدمت میں

پیش کیا گیا تھا اس میں حسب ذیل استدعا بھی کی گئی ہے :۔

"ہمارے ملک میں دارالعلوم قائم ہے، جس کے امتحانات ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں، ضرورت ہے کہ ان امتحانات کی بنا مستحکم طور سے قائم کی جائے، یا بالفاظ دیگر یونیورسٹی قائم کی جائے۔"

اس کے بعد بھی انجمن طلبار قدیم دارالعلوم کے سالانہ جلسوں میں اس تحریک یا استدعا پر سرکار کو متوجہ کرتے رہے، چنانچہ دارالعلوم کے (۶۳) سالہ جلسہ میں حسب ذیل تحریک کی گئی ہے :۔

"حقیقت میں یہ امر تازیانۂ عبرت ہے کہ حیدرآباد، جہاں سب سے پہلے علوم قدیمہ و جدیدہ کے اجتماع کی کوشش دارالعلوم کے ذریعہ ۶۳ سال پیشتر شروع ہوئی، اس طویل عرصہ میں مشہور آفاق دارالعلوم بن جانے کے عوض ایسی حالت میں ہو کہ بالآخر دُور دُور سے اس کی ترقی کے لئے توجہ دلائی جائے، سال پہلے جسٹس عبدالرحیم صاحب نے پونہ کانفرنس میں مشرقی یونیورسٹی کے لئے حیدرآباد کو توجہ دلائی اور ابھی حال میں ندوہ میں بھی ایک رزولیوشن ہمارے دارالعلوم کی یونیورسٹی بنائے جانے کے متعلق منظور ہوا۔ اگرچہ دارالعلوم میں علوم جدیدہ و انگریزی ۶۳ برس پہلے سے شروع تھے اور اسی زمانہ میں اردو میں مغربی علوم و فنون کے تراجم کا کام بھی امیر کبیر شمس الامرا مرحوم کی توجہ سے معتد بہ ترقی پا چکا تھا۔ نیز طرز تعلیم کی اصلاح بھی مولوی عون الدین صاحب مرحوم کی بدولت دارالعلوم میں ایک مدت پیشتر عمل میں آچکی تھی، لیکن یہ ملک کی بدقسمتی ہے کہ ہم اپنی تاریخ سے بے خبر ہیں۔ بہر کیف اب تاریکی میں اُجالا ہونے لگا ہے، دارالعلوم اپنی شایان شان مرتبہ کو پہنچنے کے قریب ہے، جس کے لئے جوبلی کے موقع پر توجہ دلائی گئی تھی، کہ ہمارے ملک میں دارالعلوم قائم ہے، جس کے امتحانات ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں، ضرورت ہے کہ ان امتحانات کی بنا مستحکم طور سے قائم ہو جائے یا بالفاظ دیگر جامعہ قائم کیجائے"

ان تمام تفصیلات سے یہ امر بخوبی واضح ہو سکتا ہے کہ مرتضیٰ مرحوم کو حیدرآباد میں **جامعہ** قائم ہونے کی تحریک سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ ہمیشہ جد و جہد کرتے رہے، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی کا مقصد اور نصب العین یہی تھا کہ حیدرآباد میں ہماری **جامعہ** قائم ہو جائے۔

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام

مرتضیٰ مرحوم کا دوسرا زریں کارنامہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام ہے، ۱۳۳۲ھ میں مرحوم نے ہمدردانِ ملک و قوم کی خدمت میں ایک تحریک پیش کی اور اس میں ہماری تعلیمی پستی کا ذکر کرتے ہوئے اپیل کی کہ اس پستی کے دور کرنے کے لئے کمر ہمت چست کی جائے، اپیل کے بعض فقرے درج کئے جاتے ہیں، جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مرحوم کو ہماری تعلیمی پستی کا کسقدر رنج تھا، اور کس طرح درد بھرے دل سے انھوں نے اپیل کی تھی :۔

"جیسے جیسے بلاد مغرب میں علمی مجالس کے ذریعہ سے باہمی اجتماع و تعاون کا زور بڑھتا گیا اسی نسبت سے ہماری علمی مجالس شخصیت کے بدنصیب قربان گاہ پر ذبح ہوتی گئیں۔ ہمارے علمی ولولے

دن بدن ماند ہوتے گئے' اور ہمیں خبر ہی نہ ہوئی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے' .... آج ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں بھی بہت سے مولوی فاضل اور یم اے' بی اے نوجوانوں کی شکلیں نظر آ رہی ہیں' اگرچہ ایسے فارغ التحصیل افراد کی تعداد قلمرو آصفی کی عظیم الشان آبادی کے لحاظ سے جس قدر مختصر ہے وہ خود قابل افسوس ہے' لیکن اس سے زیادہ قابل افسوس یہ ہے کہ تعلیم یافتہ افراد میں بھی باہم کوئی جہت جامعہ یا رابطہ علمی ایسا قائم نہیں ہے جس سے ملک کی ضرب المثل مردہ دلی دور ہونے اور علمی جذبات کی نشو و نما میں مدد ملے' .... اگر اس تعداد سے کئی چند زیادہ گرائجویٹ بھی پیدا ہو جائیں تو اس وقت بھی علمی تازگی جو منشاء تعلیم ہے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ کسی اور علم کا گہوارہ ایسا مہیا نہ ہو جس کے لب جاں بخش اور مسیحا نفسی کے کرشمے' حیات جاودانی کا لطف بخشیں۔ اسی بنا پر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا قیام عمل میں آیا ہے۔"

کانفرنس کے تین مقصد قرار دئے گئے تھے یعنی :۔

۱۔ ایک علمی سوسائٹی کا قیام جو وقتاً فوقتاً عام مجالس تقریروں اور علمی تحریرات کے ذریعہ علمی تازگی پیدا کرے۔

۲۔ قلمرو آصفی میں اشاعت تعلیم کی کوشش۔

۳۔ اصلاح تعلیم۔

ان مقاصد کی تکمیل کے لئے حسب ذیل نظام العمل مقرر کیا گیا تھا :۔

(الف) علوم و فنون کے تراجم اردو زبان میں کئے جائیں۔

(ب) حیدرآباد کی تاریخ و جغرافیہ مرتب کرانا۔

(ج) نصاب تعلیم کا ایک موزوں و مناسب حال سلسلہ مہیا کرنا۔

(د) ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک سلسلہ قائم کرنا۔

(ھ) جامعہ کے قیام کی تحریک۔

(و) تعلیم زراعت کی طرف توجہ۔

(ز) تعلیم طب کی طرف توجہ۔

(ح) تعلیم صنعت و حرفت و تجارت کی طرف توجہ۔

مرحوم مرتضیٰ اپنی زندگی تک یعنی (۱۲) سال کانفرنس کے آنریری سکریٹری رہے' اس عرصہ میں (۸) سالانہ اجلاس ہوئے' سرکار عالی نے کئی تحریکات کو منظور فرمایا' اکاسی ہزار سات سو اڑسٹھ کی رقم کانفرنس کے فنڈ میں جمع ہوئی باون ہزار چار سو ساٹھ کے وظائف غیر مستطیع طلبہ کو دیے گئے' اور انتیس ہزار تین سو آٹھ سلاک باقی تھی۔

مرتضیٰ مرحوم کانفرنس کی رقم کی بڑی امانت اور دیانت کے ساتھ حفاظت کرتے تھے۔ کبھی بلا منظوری ایک حبہ بھی انھوں نے خرچ نہیں کیا۔ وظائف کی ادائی اور اس کی بازیافت وصولی میں ان کو تلخ سے تلخ تجربات ہوئے'

کانفرنس کی ترقی میں قدم قدم پر مراحل اور مشکلات کا ان کو سامنا ہوا، مگر ایک پہاڑ کی طرح انھوں نے تمام مشکلات کا مقابلہ سینہ سپر ہو کر کیا، ہمت اور استقلال سے قدم آگے ہی بڑھاتے رہے، اور ثابت کر دیا کہ ایک درد بھرا سچا دل اور بے ریا کیا نہیں کر سکتا۔

یہ خلاف واقعہ نہیں ہے کہ حیدر آباد کی تعلیمی ہل چل، علمی چہل پہل، علم و فن کے ذوق و شوق کی جو گرم بازاری اب نظر آرہی ہے اس میں کانفرنس کا بڑا حصہ ہے۔

کانفرنس کے اعلیٰ خدمات کا اعتراف ملک کے دیگر ارباب قلم نے بھی کیا ہے، چنانچہ ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" میں اس کے متعلق جو صراحت کی حسب ذیل ہے :-

"ایجوکیشنل کانفرنس مستحق مبارکباد ہے کہ اس کی اکثر تحریکیں بالآخر کامیاب رہیں اور اس نے حیدرآباد میں اردو کی ترقی اور وسعت کے لئے جیسی اہم اور مستحکم خدمت انجام دی ہے، اس کی نظیر کہیں نہیں ملسکتی۔"

انجمن طلبا قدیم دار العلوم مولوی مرتضیٰ مرحوم کو اپنی مادر تعلیمی (دار العلوم) سے بڑی محبت تھی، دار العلوم کی ترقی کے لئے ہمیشہ جد و جہد کرتے رہے۔ ۱۳۳۲ھ میں انجمن طلبا قدیم دار العلوم کے نام سے ایک انجمن قائم فرمائی تھی اور اپنے انتقال تک وہ اس کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے، ان کی تمنا تھی کہ دار العلوم ترقی کر کے جامعہ کی صورت اختیار کرلے، اس اہم مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے سعی پیہم برابر جاری رکھی اور نہایت مستعدی کے ساتھ دامے، درمے، قدمے اور قلمے جد و جہد کرتے رہے، بڑی حد تک ان کو کامیابی بھی ہوئی تھی۔

دار العلوم کی جدید تنظیم ہوئی، مدرسین کا جدید اسکیم منظور ہوا، کئی متخرجین دار العلوم کو اعلیٰ خدمات ملے جامعہ عثمانیہ کے مجلس رفقا میں ان کے لئے جگہ معنون کی گئی، انجمن کی جانب سے کئی علمی اخلاقی کتابیں شائع ہوئیں۔ کئی مولوی فاضل، منشی فاضل وغیرہ اصحاب نے انگریزی تعلیم پائی اور ان کے لئے ہائی لسٹ کا امتحان قائم ہوا۔

بہرحال انجمن طلبا قدیم دار العلوم نے بھی ملک کی علمی ترقی اور ملی بیداری میں خاص حصہ لیا ہے، انجمن مذکور کے خدمات کے متعلق ڈاکٹر زور کے خیالات قابل ملاحظہ ہیں :-

"کارکنانِ انجمن اور خاص کر محمد مرتضیٰ مرحوم قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے اپنے قریب قریب جملہ مقاصد میں کامیابی حاصل کی۔ اس حقیقت حال سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے حیدرآباد کی علمی سرگرمیاں اور ادبی جد و جہد، انہی ارباب ہمت سے وابستہ تھی، انہی کی زندہ دلی سے دار العلوم کی ساٹھ سالہ جوبلی نہایت خوش اسلوبی اور جوش و خروش کے ساتھ منائی گئی، اور یہ غالباً حیدر آباد میں اپنی قسم کا پہلا علمی اجتماع تھا۔ انہی کی پے در پے صداؤں اور تحریکات نے جامعہ عثمانیہ اور دار التالیف و تراجم کے قیام میں مدد دی، انہی کی سرگرمیوں نے حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس جیسے مفید اور اہم ادارے کی بنیاد ڈالی اور انھیں نے حیدر آباد میں سب سے پہلے سلسلہ تالیف اردو قائم کر کے ملک میں نظیر پیدا کی۔"

(عہد عثمانی میں اردو کی ترقی صفحہ ۳۹)

ذاتی وظائف تعلیمی

یوں تو حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن طلبا قدیم کے فنڈ سے وظائف تعلیمی مقرر تھے، مگر ان کی تعداد منظورہ ہوتی تھی، بلا منظوری مجلس منتخبہ وظائف کوئی وظیفہ جاری نہیں کیا جاتا تھا مگر اکثر مرتبہ ضروریات وغیرہ کے مدنظر جب کسی طالب علم کو وظیفہ نہیں مل سکتا یا اس کے تعلیمی ضروریات پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ تو مرتضیٰ مرحوم اپنی ذات سے بھی ایسے نادار طلبہ کی خدمت کرتے تھے، ان کی ماہوار کا ایک بڑا حصہ اس قسم کے وظائف میں خرچ ہوتا

مدرسۂ نظامیہ کی تنظیم میں مرحوم کا حصہ

مولوی مرتضیٰ مرحوم کو اگرچہ مدرسہ نظامیہ سے تعلیمی تعلق نہیں تھا، مگر مولانا انوار اللہ فضیلت جنگ مرحوم کے تعلقات کے باعث وہ مدرسہ نظامیہ سے دلچسپی لینے لگے، اس کے بعد چونکہ مدرسہ نظامیہ خالص دینی مدرسہ تھا اسلئے بھی ان کی دلچسپی میں اضافہ ہوگیا۔

مولانا انوار اللہ مرحوم کے آخر زمانہ میں جو تنظیم مدرسہ نظامیہ کی ہوئی تھی اس میں مرتضیٰ مرحوم کا بڑا حصہ تھا بلکہ تنظیم کا خاکہ بھی مرحوم کا مرتبہ تھا، نواب فضیلت جنگ کے انتقال کے بعد بھی مرحوم مدرسہ نظامیہ کی انتظامی مجلس میں شریک رہے اور اپنے انتقال تک دل سوزی اور انہماک کے ساتھ مدرسہ کے کاموں سے دلچسپی لیتے رہے۔

انجمن معین المسلمین انجمن اشاعت العلوم وغیرہ

مولوی مرتضیٰ کو حیدرآباد کی ہر جہتی ترقی سے دلچسپی تھی، ان کی دلی تمنا تھی کہ حیدرآباد ترقی کرکے معراج پر پہنچ جائے۔ اس لئے مرحوم ہر اس صدا پر لبیک کہتے تھے جو ملک کی ترقی، خوش حالی سے متعلق ہوتی، اسی بنا پر وہ کئی انجمنوں کے سرگرم رکن تھے اور نہایت جوش و خروش کیساتھ ان انجمن کے عملی کاموں میں حصہ لیا کرتے — اس قسم کے کئی انجمنیں ہیں جن میں سے معین المسلمین (جو بلا سودی قرضہ کی انجمن تھی) اور انجمن اشاعت العلوم قابل ذکر ہیں، جن میں مرتضیٰ مرحوم نے خاص حصہ لیا ہے۔

حجاز ریلوے اور انجمن ہلال احمر

ملا عبد القیوم مرحوم نے حجاز ریلوے کی تعمیر کے زمانہ میں چندہ کی اپیل کی تھی، یہ زمانہ مرتضیٰ مرحوم کی تعلیم کا تھا، مگر وہ اس زمانہ میں بھی نہایت سرگرمی سے ملا صاحب موصوف کو مدد دیتے رہے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ عام جمود کی حالت تھی، قومی کاموں سے بہت کم ہمدردی ہوتی تھی۔ مرحوم نے جس دلچسپی سے اس کام کو انجام دیا تھا اس کا ملا صاحب کو بھی اعتراف تھا — مرتضیٰ مرحوم جب سفر حجاز کو تشریف لے گئے تھے تو اس وقت انھوں نے حجاز ریلوے کے انتظامات وغیرہ کے متعلق کئی عربی مضامین قسطنطنیہ کے اخبارات میں شائع کئے تھے۔ مرحوم کے یہ مضامین اسلامی ممالک میں خاص وقعت کی نظر سے دیکھے گئے تھے۔

جنگ بلقان کے زمانہ میں جب ملا عبد القیوم مرحوم کے فرزند ملا عبد الباسط صاحب نے انجمن ہلال احمر قائم کرکے مجروحین کی امداد کے لئے چندہ کی اپیل کی تھی اور حیدرآباد سے ایک لاکھ سے زیادہ رقم بھیجی گئی تھی، اس وقت بھی مرحوم مرتضیٰ ملا عبد الباسط کے دست و بازو کی حیثیت سے کام کرتے رہے، چنانچہ ملا صاحب کو بھی اس کا اعتراف ہے۔

اوقاف مذہبی کی حفاظت اور انتظام

مولوی محمد مرتضیٰ اپنے انتقال کے چند سال پہلے مہتمم اوقاف کی خدمت پر مامور کئے گئے تھے، اگرچہ مرحوم نے اس خدمت کے فرایض کو ایک ملازم سرکار کی حیثیت سے انجام دیا ہے، مگر اس امر کا اظہار بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ ان کو مذہبی اوقاف کی تباہی اور غیر متعلق امور میں اس کی آمدنی کے

خرچ کا بڑا ذریعہ تھا۔ وہ نہایت توجہ و انہماک کے ساتھ شب و روز محنت کرتے تھے، ان کی دلی خواہش تھی کہ اوقاف کی آمدنی جائز مصرف میں خرچ ہو اور اس سے ملک و قوم کی بہبودی ہو سکے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسی شب و روز کی محنتِ شاقہ نے ان کی صحت پر بھی اثر کیا تھا۔

مرحوم کی ملازمت کا بڑا حصہ امورِ مذہبی کے سررشتہ سے رہا وہ متعلقہ کام کے علاوہ سررشتہ کا غیر متعلق کام بھی دلچسپی سے انجام دیتے تھے۔

رسالہ صحیفہ اور اخبار صحیفہ کی قلمی امداد

رسالہ "صحیفہ" حیدرآباد کا قدیم ماہوار رسالہ تھا، اس کے مضمون نگاروں کا تقریباً تمام حصہ ملکی اصحاب پر مشتمل تھا۔ اس حیثیت سے یہ رسالہ ملک کا واحد رسالہ تھا۔ اس کے مضامین اعلیٰ اور بلند پایہ ہوتے تھے، اربابِ علم و فن، اصحابِ ذوق میں اس رسالہ کی بڑی عزت اور وقعت تھی۔ اس کے دلچسپ اور پُر از معلومات مضامین خاص و عام میں مقبول تھے — اس رسالہ کے اڈیٹر اگرچہ اولاً کیفی مرحوم اور پھر مولانا اکبر علی صاحب تھے۔ مگر مولوی مرتضیٰ بھی اس رسالہ کے روحِ رواں تھے، ان کے کئی بلند پایہ اور محققانہ مضامین اس میں شائع ہوئے ہیں۔

رسالہ صحیفہ نے زمانہ مابعد میں اخبار کی صورت اختیار کرلی اور آج تک جاری ہے، اس وقت کئی ایک دوسرے اخبار بھی جاری ہیں مگر اُس زمانہ میں صرف اخبار صحیفہ ہی ملک و قوم کا ترجمان سمجھا جاتا تھا، صداقت، راستی، حق پرستی اس اخبار کی امتیازی شان تھی — چونکہ اخبار صحیفہ ملک اور قوم کی زبان تصور کیا جاتا تھا اسلئے مرتضیٰ مرحوم بھی اخبار کی قلمی امداد اور نیک مشورہ سے دریغ نہ کرتے تھے، مولوی اکبر علی صاحب کو بھی اس امر کا اعتراف ہے کہ اخبار صحیفہ اور رسالہ صحیفہ مرتضیٰ کا رہینِ منت ہے۔

تصنیف و تالیف

آخر پر ہم مولوی مرتضیٰ مرحوم کے تصانیف کا ذکر کرتے ہیں، یوں تو مرحوم کے شائع کردہ کتابوں کی تعداد بہت کم ہے، مگر مسودات شائع ہو جائیں تو اہلِ ملک کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تالیفی حیثیت سے بھی کس قدر بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔

مولوی وحید الدین سلیم مرحوم علی گڈھ سے ایک رسالہ "معارف" کے نام سے شائع کرتے تھے، اُس زمانہ میں یہ رسالہ اپنے اعلیٰ معیار اور پسندیدہ مضامین کے لحاظ سے اردو زبان کا واحد رسالہ تھا — مرتضیٰ مرحوم اس رسالہ کے خاص مضمون نگار تھے، اور انکے کئی بلند پایہ مضامین اڈیٹر کی تعریفی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئے ہیں، یہ زمانہ مرحوم کے طالب علمی کا تھا۔ مرحوم کے اکثر مضامین اپنے موضوع کے لحاظ سے اردو زبان میں پہلی چیز ہوتی تھی، آپ کے سب مضامین تحقیقات اور انکشافات سے مملو ہوتے تھے، آپکی تاریخ دانی کے مدنظر علامہ شبلی نے آپ سے خواہش کی تھی کہ ان کے لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کریں — رسالہ صحیفہ کے بھی آپ مضمون نگار تھے، اور آپ کے مضامین خاص اہمیت رکھتے تھے، آپ کے بعض مضامین کی صراحت بے محل نہیں ہو سکتی۔

(۱) تاریخ التاریخ۔ انجمن ترقی اردو نے اس موضوع کی جانب متوجہ کیا تھا، کسی انگریزی داں نے اس پر توجہ نہیں کی، مرتضیٰ مرحوم نے اس عنوان پر ایک مقالہ مرتب کیا اور اخبار وکیل امرتسر نے اس کو شائع کیا ہے۔

(۲) "سسلی میں مسلمانوں کی حکومت" مرتضیٰ مرحوم وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس عنوان پر قلم اٹھایا اور ایک طویل مقالے کے ذریعہ اس پر روشنی ڈالی تھی، چنانچہ مولف تاریخ صقلیہ مولوی ریاست علی ندوی لکھتے ہیں:۔

"اردو میں غالباً سب سے پہلے رسالہ معارف علی گڈھ میں مولوی محمد مرتضیٰ صاحب نے ۱۸۹۹ء میں ایک

سلسلہ مضامین لکھا جو آثار ہی کے اسی مجموعہ سے ماخوذ تھا' مولوی صاحب مرحوم کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے انہی نے سب سے پہلی مرتبہ اردو میں سسلی کی تاریخ لکھنے کا قصد کیا۔" صلا

(۳) "سواحل ہند پر مسلمانوں کا توطن" رسالہ صحیفہ میں یہ مقالہ شائع ہوا تھا۔ اسکے پہلے اردو زبان میں اس عنوان پر کچھ مواد نہیں تھا۔ (۴) سوانح قادر ولی (۵) سوانح باقر آگاہ (۶) سوانح قاضی بدالدولہ (۷) سوانح سالار جنگ ۔ یہ تمام مضامین رسالہ صحیفہ میں شائع ہوئے ہیں' اور اپنے انکشافی حیثیت سے اہمیت رکھتے ہیں۔ (۸) تنقید سفرنامہ ابن جبیر' بلحاظ فن تنقید یہ بلند پایہ مضمون ہے۔ (۹) سفرنامہ حجاز' اخبار صحیفہ میں آپ کا یہ سفرنامہ شائع ہوا ہے' خاص انداز اور اہم معلومات کا گنجینہ ہے۔ (۱۰) "میلاد خاتم النبیین صلعم" انجمن طلبا رقدیم دارالعلوم نے اس مقالہ کو شائع کیا ہے' رسالت مآب صلعم کی یہ مختصر مگر جامع سوانحمری ہے —— ان کے علاوہ آپ کے بیسیوں مضمون ہیں جو اخبارات مخبر دکن' جریدہ روزگار' نیر آصفی' اخبار صحیفہ وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں' آپ کے بعض عربی مضمون اخبار العدل قسطنطنیہ میں بھی شائع ہوئے ہیں۔

ایجوکیشنل کانفرنس کی تین روئدادیں بھی آپ کی مرتبہ ہیں۔ ان کے علاوہ دو اہم کتابیں آپ کے زیر تالیف تھیں۔

(۱) "حیات تمدن" یہ خاندان آصفی کی مکمل تاریخ ہے' مرحوم نہایت محنت اور تحقیق کے ساتھ اسکو مرتب کر رہے تھے افسوس ہے کہ اس کا تکملہ نہیں ہوا۔ مرحوم کی زندگی میں اس کا ابتدائی حصہ رسالہ ترقی حیدرآباد میں شائع ہوا اور مرحوم کے بعد "عہد سلف" کے نام سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے' تاریخ ہند کا بہترین نچوڑ ہے' گویا دریا کو کوزے میں بھر دیا ہے۔

(۲) "تفسیر قرآن مجید" سر سید نے جس اصول پر تفسیر قرآں لکھنے کا ارادہ کیا تھا اسی اصول پر آپ تفسیر قلمبند کر رہے تھے یہ بھی مکمل نہ ہوسکی —— ان دونوں کتابوں کے علاوہ بعض اور مسودات بھی ہیں جو تاریخ و سوانح وغیرہ پر مشتمل ہیں' یہ سب شائع ہو جائیں تو مرحوم کے تصانیف کی پوری اہمیت واضح ہوسکتی ہے۔

اس تمام تفصیل سے بڑی حد تک مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کے قومی خدمات کا حال معلوم ہوسکتا ہے' اس امر کا خیال رہے کہ مرحوم انگریزی کی کوئی ڈگری نہیں رکھتے تھے' وہ دارالعلوم کے "مولوی فاضل" تھے' مذہب کی پابندی کے لحاظ سے وہ پورے "ملا" تھے "مولوی" تھے' مگر وہ پرانے زمانے کے ملا اور مولوی نہیں تھے بلکہ "روشن خیال" زمانہ کی رفتار سے باخبر' سیاسیات ملکی سے واقف تھے' اور ہر امر کے متعلق وہ اپنی ذاتی رائے رکھتے تھے۔

آج سے پندرہ سال قبل ان سے بڑا کوئی قومی لیڈر حیدرآباد میں نہیں تھا۔ وہ جاہ اور مرتبہ سے دور' منکسر المزاج اور متواضع تھے' قومی خدمت سے ان کو عشق تھا۔ وہ صداقت' سچائی' خلوص سے اپنے مفوضہ کام کو انجام دیتے تھے۔

یہ امر کسقدر افسوسناک ہے کہ ان کے بعد انجمن طلبا رقدیم دارالعلوم کا کوئی خبر لینے والا نہیں رہا۔ اور ایجوکیشنل کانفرنس میں بھی وہ جوش اور خروش باقی نہیں رہا۔ سچ تو یہ ہے کہ کانفرنس سے بہت سارے واقف بھی نہیں فقط

نصیر الدین ہاشمی

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی اُردو خدمات

اس کانفرنس کا خاکہ اصل میں انجمن طلبۂ قدیم دارالعلوم کی تشکیل کے ساتھ ہی بن چکا تھا اور اس کے لئے آج سے قریب قریب پچیس سال قبل ۱۴ رجمادی الثانی ۱۳۳۲ھ کو ایک تفصیلی اپیل حامیانِ تعلیم و بہی خواہانِ وطن کی خدمت میں روانہ کی گئی تھی۔ اس اپیل میں کانفرنس کے قیام کی ضرورت اور اس کے مقاصد وغیرہ کی نسبت وضاحت کی گئی تھی اور آخر میں اس کا پروگرام بھی درج تھا۔ کانفرنس کے تین مندرجہ مقاصد کا خلاصہ یہ ہے :۔

(۱) قلمروئے آصفیہ میں کم از کم ایک علمی سوسائٹی تو ایسی ضروری ہے جو اس قلمرو کی جغرافی، تاریخی، ادبی تحقیقات کو وقتاً فوقتاً علمی دنیا کے روبرو پیش کرے، اور باشندگانِ قلمرو میں علمی تحقیقات کا ذوق شوق پیدا کرے۔ اُن کی مادری زبانوں کو علوم و فنون کے سرمایہ سے مالامال کردے جس کے بغیر یہ طے شدہ ہے کہ کوئی ملک حقیقی ترقی نہیں کر سکتا۔

(۲) اشاعتِ تعلیم کی کوشش۔ ایک کانفرنس کے ذریعہ سے مختلف شہروں اور قصبوں میں تعلیمی ہل چل اور توسیع دائرۂ تعلیم پیدا کرے۔

(۳) پبلک خود اپنی ضرورتوں پر غور کرکے تعلیم کی اصلاح کرے۔

ان مقاصد کے حصول کے لئے جو پروگرام کانفرنس کے مدنظر قرار دیا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے :۔

الف۔ اردو زبان میں علوم و فنون کے تراجم کئے جائیں جن کی قلمروئے آصفیہ میں سخت ضرورت ہے۔

ب۔ حیدرآباد کی تاریخ و جغرافیہ کے متعلق بکثرت تصانیف اردو میں مرتب کرائے جائیں۔

ج۔ نصابِ تعلیم کا ایک عمدہ سلسلہ خود کانفرنس اُردو میں مہیا کرے گی کیونکہ جب تک ملکی زبان میں تعلیم کی بنیاد مستحکم نہ ہوگی ترقیٔ ملک کی امید بے سود ہے۔

د۔ ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک سلسلہ قائم کرائے گی اور کوشش کرے گی کہ اعلیٰ تعلیم تو دا پنے ہاتھ میں ہو جو نظام یونیورسٹی کے وجود پر منحصر ہے۔ کانفرنس اس کے متعلق پوری کوشش عمل میں لائے گی۔

ہ۔ یونیورسٹی کے قیام کی تحریک

و۔ تعلیم زراعت کی طرف توجہ۔

ز۔ تعلیم طب کی طرف توجہ۔

ح۔ تعلیم صنعت و حرفت و تجارت کی طرف توجہ وغیرہ۔

ظاہر ہوتا ہے کہ کانفرنس کے مقاصد اور پروگرام میں اردو زبان کی ترقی و اشاعت کے لئے نہایت غور و خوض کے بعد مفید ترین طریقے پیش کئے گئے۔

اس کانفرنس نے حیدرآباد کی تعلیمی اصلاح و ترقی اور دیگر ضروری امور کے لئے جو کوششیں اور کامیابیاں حاصل کیں ان کا ذکر ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ ہم یہاں اجمالی طور پر کانفرنس کے صرف اُن ہی کارناموں کی طرف اشارہ کریں گے جو حیدرآباد میں اردو زبان و ادب کی ترقی کا باعث ہوئے۔

یوں تو کانفرنس کے جملہ اجلاسوں اور اُن کی کارروائیوں میں اردو زبان ہی استعمال کی گئی یہاں تک کہ مسز سروجنی نائڈو اور پروفیسر ولنکر نے بھی انگریزی کی جگہ اُردو ہی میں تقریریں کیں اور صرف یہی خصوصیت اس قدر اہم ہے کہ اگر کانفرنس اردو پر کوئی اور احسان عظیم نہ بھی کرتی تو اردو کی ترقی اور ذوق کے لئے یہی خدمت کافی تھی کیونکہ اس کانفرنس کے لئے ہر سال جو تحقیقی، تخلیقی اور اصلاحی مقالے اور پرچے لکھے گئے۔ استقبالیہ اور صدارتی خطبے قلمبند ہوئے، مختلف تحریکات وغیرہ کی نسبت تقریریں تیار کی گئیں اور پھر جو سالانہ تفصیلی رپورٹیں مرتب اور بعض شائع بھی ہوئیں، اُن سب کے ذریعہ اردو زبان کے ذخیرۂ ادب اور معلومات میں قابل لحاظ اضافہ ہوا مگر اس ضمنی خدمت کے علاوہ کانفرنس کے دو چار کارنامے اتنے اہم ہیں کہ حیدرآباد کی موجودہ ترقیٔ اردو کی کوئی تاریخ ان کے ذکر کے بغیر نہیں لکھی جا سکتی۔

ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے پہلے سالانہ اجلاسوں ہی سے جامعہ عثمانیہ کے قیام کی ضرورت کو محسوس کرانا شروع کیا اس کے جلد سے جلد قائم کرنے کی تحریکیں کیں، ساتھ ہی اُردو زبان میں علوم و فنون کے تراجم و تصانیف کی اشاعت پر زور دیا، اس کے علاوہ اس نے اپنے تقریباً ہر اجلاس میں اُردو کو ملک کا عام ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے قسم قسم کی ترکیبوں سے کام لیا اور آخر کار ثابت کر دکھایا کہ حیدرآباد اگر ترقی کر سکتا ہے تو اُردو ہی میں تعلیم و تعلّم کے ذریعہ سے۔

ایک مشرقی جامعہ کے قیام اور اردو تراجم و تالیف کے انتظام کی نسبت کانفرنس نے جو تحریکیں کیں اُن کا اجمالی تذکرہ یہ ہے:

جامعہ عثمانیہ۔ ۱۳۳۳ھ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا جو اس وجہ سے نہایت اہم ہے اور تاریخ دکن میں ہمیشہ یادگار رہے گا کہ جامعہ عثمانیہ زیادہ تر اسی کی چہل پہل اور تقریروں کے باعث بہت جلد ظہور میں آ سکی۔

اس کانفرنس کی صدارت سر حیدر نواز جنگ بہادر جیسے فرد فرید نے کی جو اس وقت معتمد تعلیمات تھے۔ انھوں نے ملک کے اس عام رجحان اور شدتِ احساس کو محسوس کر کے اپنے خطبۂ افتتاحیہ ہی میں اس امر کی طرف اشارہ کر دیا کہ:۔

> "خدا نے چاہا تو چند سال میں دار العلوم ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہو جائے گا جس کی نظیر ہندوستان بھر میں نہ ہوگی اور جس کا فیض دور دور تک پہنچے گا اور لوگ ملک ملک سے اس سے مستفید ہونے کے لئے آئیں گے اور حیدرآباد مرکز علوم و فنون بن جائے گا۔" (روئداد کانفرنس صفحہ ۴۸)

صدر کے اس ہمت افزا بیان کے علاوہ دوران کانفرنس میں بعض تقریروں میں بھی اس کی طرف اشارے کئے گئے۔ غرض پہلی کانفرنس نے یہ ثابت کر دیا کہ حیدرآباد تعلیمی ترقی کے لئے تیار ہو چکا ہے اور اب اہل ملک بیدار ہیں۔

ایک سال بعد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس اورنگ آباد میں ہوئے اور اس کی صدارت ملک کے فاضل سپوت مولوی شیخ محمد حبیب الدین مرحوم صدر محاسب سرکار عالی نے کی اور انھوں نے قیام جامعہ کی نسبت گذشتہ کانفرنس سے زیادہ مدلل اور ہمت افزا طریقہ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چنانچہ انھوں نے فرمایا کہ:۔

"اس کانفرنس کے اجلاس کا یہ دوسرا سال ہے اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی ترقی تعلیم کے اہم کام کے لئے انتہائی مقصد مرکوز خاطر رکھیں اور اس کے حاصل کرنے کے لئے متفقہ کوششیں کی جائیں۔ ہمارا مقصد اعلیٰ ترقی تعلیم تو ہے لیکن لفظ تعلیم بہت ہی شعبوں پر حاوی ہے۔ مثلاً اعلیٰ تعلیم، تعلیم ثانویہ، تعلیم ابتدائی، تعلیم نسواں، اخلاق جسمانی، صنعت و حرفت و زراعت وغیرہ کی تعلیم یہ سب شعبے بجائے خود مکمل نہیں ہو سکتے جب تک ممالک محروسہ سرکار عالی میں بلحاظ حالات ملک و مقاصد رعایا برایا ایک جامع العلوم یعنی یونیورسٹی قائم نہ کی جائے۔ کیونکہ جب ہم اپنے ملک کی خصوصیات پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں حاکم و محکوم کی جداگانہ قوتیں نہیں ہیں اور ہماری حکومت ہم سے متبائن اغراض نہیں رکھتی ہے، اور خوش بختی سے اس ریاست دکن میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیب صدیوں کے میل جول سے ممتزج و مرکب ہو گئی ہے، اور یہاں کے روشن دماغ حکمرانوں نے ہمیشہ کشادہ دلی اور فیاضی سے دونوں کی طمانیت و دلجوئی ملحوظ رکھی ہے، پس یہ وہ پاک خطہ ہے جہاں جامع العلوم جیسی ایک عظیم الشان درسگاہ کا قیام ہر طرح مناسب و موزوں ہے، جو مغربی علوم و فنون کی تعلیم اور اختراعات و ایجادات کے مواقع پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ علوم مشرقیہ کا مامن اور دلکش مسکن بن سکے اور جس میں مشرق کے مختلف علوم ادبیہ اور دقیق فلسفہ، حکمت اور تصوف اور حیرت انگیز اخلاقی و مذہبی تمدن اور تعجب خیز صنایع و بدایع قدیم کے خزائن فراہم کئے جا سکیں۔

دنیا میں انسانی جواہر معنوی کو کوئی چیز اس جوش سے ظہور میں نہیں لا سکتی، اور علما و فضلائے وقت کا مرکز نہیں بنا سکتی جیسی وہ یونیورسٹی بنا سکتی ہے جس کو ابنائے ملک اپنی سعی، اپنے اہتمام اپنے ملک کے پیسے اپنی دماغی محنت، اپنے علوئے ہمت، اپنی حکومت کے ذریعہ قائم کریں اور جس کو وہ اپنی یونیورسٹی کے نام سے پکاریں۔

چنانچہ ہماری ہم سایہ ریاست میسور . . . . . . قیام یونیورسٹی پر رجوع ہے جس پر ملک کی اخلاقی و دماغی ترقی کا انحصار ہے۔ میری دلی تمنا اور پُرخلوص دعا اپنے ملک کے لئے بھی یہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ دن دور نہیں ہے جب ہمارے ملک کی ضروریات کے لحاظ سے ہمارے یہاں کے بھی جامع العلوم کا سنگ بنیاد ہمارے ہر دلعزیز علم پرور، بادشاہ ظل اللہ میر عثمان علی خاں بہادر دام اقبالہ و زید اجلالہ کے دست مبارک سے رکھا جائے گا" (روئداد صفحہ ۳۳-۳۴)

چنانچہ مولوی حبیب الدین مرحوم کی یہ پیشین گوئی اور پُرخلوص دعا اور اس کانفرنس کے اکثر مقررین مثلاً مسٹر وامن رام چندر نایک، مولوی اکبر علی، اور مسٹر ولنکر کی خواہشیں دوسرے ہی سال پوری ہوئیں، جب کہ اہل ملک کے اس عام رجحان اور اعلیٰحضرت آصف جاہ سابع کی خاص علمی سرپرستیوں سے واقف ہونے کے بعد ایک نبض شناس اور صاحب ذوق ہستی نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے جو اس وقت معتمد تعلیمات تھے اعلیٰ حضرت حکیم السیاست کی خدمت میں ۱۹۱۷ء م ۱۳۳۶ھ

میں قیام جامعہ کی اجازت کے لئے عرض داشت پیش کی جس کے ملاحظہ کے بعد اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ :-

"اس یونیورسٹی کا اصل اصول یہ ہونا چاہیئے کہ اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اُردو قرار دی جائے اور انگریزی زبان کی تعلیم بھی بہ حیثیت ایک زبان کے ہر طالب علم پر لازمی گردانی جائے۔ لہٰذا میں بہت خوشی کے ساتھ اجازت دیتا ہوں کہ میری تخت نشینی کی یادگار میں حسب مذکور اصول مولہ عرض داشت کے موافق ممالک محروسہ کے لئے حیدرآباد میں یونیورسٹی قائم کرنے کی کارروائی شروع کی جائے۔ اس یونیورسٹی کا نام عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد ہوگا۔"

دارالترجمہ۔ ایجوکیشنل کانفرنس نے پہلے ہی اجلاس میں یہ تحریک کی کہ "اس کانفرنس کو اردو میں علوم و فنون کے تراجم و تصانیف کی اشاعت کی ضرورت سے پورا اتفاق ہے اور اس کے لئے یہ جلسہ سرکار عالی کی مزید توجہ کا طالب اور مستدعی ہے کہ مخففہ سررشتہ علوم و فنون کے اخراجات سالانہ بارہ ہزار بہترین علمی تراجم و تصانیف اُردو پر انعامات مرحمت کرنے کے لئے منظور فرمائے جائیں۔" مولوی عبدالحق صاحب نے اس تحریک کو کانفرنس میں پیش کیا اور اُردو کی اہمیت اور ضرورتوں کے اظہار کے بعد اس کی طرف حسب ذیل الفاظ میں توجہ دلائی :-

"کیا ایک ایسی زبان کو ترقی دینے اور زندہ رکھنے کے لئے جسے کروڑوں بندگان خدا بولتے ہیں بارہ ہزار سالانہ کچھ زیادہ رقم ہے؟ یہ کچھ بھی نہیں۔ اور اگر آپ اس تجویز کو منظور کریں اور سرکار سے درخواست کریں تو یقین ہے کہ سرکار ہماری التجا کو ضرور پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گی۔ سرکار نے اس سے بہت پہلے اس ضرورت کو محسوس کیا تھا اور صرف کثیر سے ایک سررشتۂ علوم و فنون قائم کیا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ بعض وجوہ سے قائم نہ رہ سکا، شاید وہ قبل از وقت تھا لیکن اب اس کا وقت آگیا ہے لوگوں میں عام طور سے بیداری پیدا ہوگئی ہے اور ملک کے تعلیم یافتہ اور پرجوش اصحاب اس کام کو کرنے کے لئے مستعد ہیں۔" (روئداد کانفرنس صفحہ ۱۷)

اس کی تائید بابو گیا پرشاد نے کی اور آخر کار وہ نہ صرف کانفرنس میں کامیاب ہوئی بلکہ سرکار نے بھی اس کی طرف کافی توجہ کی اور اس سلسلہ میں نصاب کی کتابوں کے ترجمہ کا کام انجمن ترقی اردو کے تفویض کیا گیا۔

اس ضمن میں حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ اجلاس میں یہ تحریک منظور ہوئی کہ :-

"کانفرنس سرکار عالی کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ اس نے اُردو میں علمی تراجم و تصانیف کی اشاعت کے لئے کانفرنس کی تحریک پر توجہ فرمائی۔ کانفرنس نہایت ادب کے ساتھ اس امر پر توجہ دلاتی ہے کہ جو رقم فی الحال سرکار سے بطور امداد ترقی علم دیجاتی ہے اس کا بہت قلیل حصہ اس مقصد یعنے اردو زبان میں تراجم و تصانیف علمی کی اشاعت میں صرف ہوتا ہے جو ضروریات ملک کے لحاظ سے بالکل غیر مکتفی ہے۔ اور اس لئے مکرر کانفرنس سرکار کی توجہ اس کام کی خاص امداد کے لئے مبذول کراتی ہے۔"

اس کی تحریک پنڈت کیشوراؤ صاحب نے کی اور تائید حافظ محمد مظہر صاحب نے۔ اس کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے واضح کیا۔

"مجلس اصلاح نصاب امتحانات السنہ مشرقیہ نے جن کتابوں کا ترجمہ ہونا تجویز کیا ہے اور جو آئندہ شامل نصاب ہوں گی اُن کے متعلق انجمن ترقی اُردو نے اس مجلس کے ایما پر کام شروع کر دیا ہے اور بہت جلد اس ضرورت کو پورا کر دے گی لیکن اس کی تکمیل کے لئے انجمن کو سرکار سے مزید امداد ملنے کی ضرورت ہے۔"

(روئداد کانفرنس صفحہ ۶۵)

اس واقعہ کے دوسرے ہی سال جب جامعہ عثمانیہ کی تشکیل ہونے لگی تو ایجوکیشنل کانفرنس کی یہ درخواست بھی منظور ہو گئی اور ۱۳۳۵ھ م ۱۹۱۷ء میں ایک سررشتہ تالیف و ترجمہ قائم کر دیا گیا جس کی نظامت مولوی عبدالحق صاحب کے تفویض کی گئی۔ اس میں پہلے صرف مغربی زبانوں ہی کی کتابوں کے ترجمہ کا انتظام کیا گیا تھا مگر حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے تیسرے اجلاس منعقدہ ماہ صفر ۱۳۳۶ھ میں توجہ دلائی کہ:-

"اس کانفرنس کی رائے میں سررشتہ تالیف و ترجمہ کے ذریعہ سے علوم مشرقیہ کے لئے بھی اُن کے اصلی ماخذوں سے اردو میں ترجمہ و تالیف کا انتظام ہونا چاہیئے۔"

اس کی تحریک کرتے وقت حافظ محمد مظہر نے کہا کہ:-

"حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کو اس امر کی اولیت حاصل ہے کہ پہلے پہل رائے عامہ کے سامنے اس نے یہ امر پیش کیا کہ علوم و فنون کی تعلیم اُردو میں دینا ممکن ہے اور اس کے بعد سے تمام ملک میں اور برٹش انڈیا میں یہ مسئلہ زیر بحث ہو گیا۔ یہ خوشی اور مسرت کی بات ہے کہ سرکار عالی نے اس اصول کو تسلیم فرما لیا ہے اور عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہو رہی ہے۔ اس اصول کو عملی حیثیت میں لانے کے لئے نیز ملک میں علوم و فنون کو ترقی دینے کے لئے پہلے اجلاس کانفرنس میں یہ استدعا بھی پیش کی گئی کہ ترجمہ و تالیف علوم و فنون کے لئے مخصوص سررشتہ علوم و فنون قائم ہونا ضروری ہے..... ہم سب کو خوش ہونا چاہیئے کہ کانفرنس کی مجوزہ تحریکات میں سب سے پہلے یہ تحریک منظور ہوئی ہے اور حضرت بندگان عالی کے مرحمت شاہانہ سے شاندار اور وسیع پیمانے پر سررشتہ علوم و فنون قائم فرما دیا گیا ہے۔ ہم کو یہ توقع کرنی چاہیئے کہ وہ صحیح اصول پر کام کریگا ..... اس سررشتہ کے متعلق جیسا کہ رزولیوشن سرکار عالی شائع شدہ سے واضح ہوتا ہے فی الحال صرف علوم مغربیہ کی تالیف و ترجمہ کا فرض عاید کیا گیا ہے۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس اہم کام کے ساتھ ساتھ علوم مشرقیہ یا دوسرے الفاظ میں عربی، فارسی، سنسکرت میں جو علوم و فنون کے ذخیرے ہیں اُن کے اصل ماخذوں سے اُردو میں تالیف و ترجمہ کے ذریعہ سے اضافہ کیا جائے۔" (روئداد کانفرنس صفحہ ۵۲)

کانفرنس کی یہ تحریک بھی ناکام نہ رہی۔ دارالترجمہ میں مشرقی اور خاص کر عربی اور فارسی کتابوں کے تراجم کا بھی انتظام کیا گیا۔ چنانچہ اس کام کے لئے نواب حیدر یار جنگ نظم طباطبائی مرحوم، مولوی عبداللہ عمادی، مولوی ابوالخیر مودودی اور مولوی سید ابراہیم ندوی وغیرہ جیسے عربی و فارسی کے علما کا بھی تقرر کیا گیا۔

پہلے ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے اجلاس میں مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب نے "سائنس اور اس کی تعلیم کی ضرورت" پر

ایک مفید مضمون پڑھا اور اس میں سائنس کی ابتدائی تعلیم کے انتظام پر زور دیتے ہوئے زبان اُردو کی ضرورت کی نسبت حسب ذیل تجویز پیش کی :—

"اپلائڈ کمسٹری، ٹکنیکل الکٹرسٹی، سیول اور میکانکل انجنیرنگ کے ابتدائی مدارج کی ہمارے ملک میں ذرا سی کوشش سے نہایت عمدہ تعلیم ہوسکتی ہے ...... ان سب فنون کی تعلیم نہایت آسانی سے اردو زبان میں ہوسکتی ہے حسب ضرورت کتابوں کے (جو جدید ترین طریقہ پر لکھی گئی ہوں) ترجمے بلا کسی شدید دقت کے تیار ہوسکتے ہیں۔" (روداد کانفرنس صفحہ ۱۲۷)

صنعت وحرفت اور انجنیرنگ کی اُردو تعلیم کے لئے کانفرنس کئی سال تک برابر کوشش کرتی رہی۔ پہلے سال یہ رزولیوشن پاس کیا گیا کہ "اس کانفرنس کی رائے میں تعلیم صنعت وحرفت پر کافی توجہ کی ضرورت ہے ...... انجنیرنگ اسکول کو ترقی دے کر سیول مکانکل الکٹریکل انجنیرنگ کی تعلیم کا ہائی اسکول بنایا جانا مناسب ہے۔ جس میں ورکشاپ اور سررشتہ برقی کے ذریعہ سے عملی تجربہ کا بھی بند وبست ہو اور عام فائدہ کی غرض سے تعلیم اُردو میں ہونی چاہیئے۔" اس کے محرک خان محمد یوسف صاحب اور موید حافظ محمد مظہر صاحب تھے۔ موخرالذکر نے صنعت وحرفت کی نسبت نہایت وسیع معلومات کے اظہار کے بعد اردو تعلیم کی نسبت ان الفاظ میں تحریک کی :—

"جو مدارس صنعت وحرفت آئندہ اضلاع میں قائم ہوں اُن میں بھی اُردو کے ذریعہ تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے کل کے اجلاس میں کانفرنس میں اس امر پر کافی بحث ہوچکی ہے کہ تعلیم اُردو میں دینا کس قدر مفید ہے .... تعلیم اردو میں دینے کے لئے مقدم چیز کتابیں ہیں اور پھر پڑھانے والے ...... ایسی کتابیں ہیں جن کا ترجمہ شمس العلما مولوی ذکا اللہ مرحوم نے اردو میں کردیا ہے۔ انجنیری کے متعلق جو کتابیں ہیں وہ رڑکی کالج کا نصاب ہیں۔ رڑکی کالج کے نصاب کے کچھ حصہ کا اُردو ترجمہ تو رڑکی کالج میں سرکاری طور پر ہوا ہے ...... دو تین کتابیں البتہ ترجمہ شدہ نہیں ہیں مگر ان کا بلکہ کل رڑکی کالج کے بقیہ حصہ غیر ترجمہ شدہ کا ترجمہ اُردو میں سرکار عالی کے صرف ایک حکم پر ہوجا سکتا ہے۔ رہا پڑھانے والے جب نواب مختار الملک مرحوم کے زمانہ میں ایسے اصحاب ملتے تھے جو اُردو میں تعلیم انجنیرنگ دیا کرتے تھے۔ موجودہ اسٹاف مدرسہ اردو دانوں کا ہے وغیرہ۔" (روداد کانفرنس صفحہ ۱۶۱)

دوسرے سال بھی اس موضوع سے متعلق ایک رزولیوشن پیش کیا گیا، جس کی تحریک کرتے ہوئے مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب نے فرمایا کہ :—

"یہ رزولیوشن سال گذشتہ ایک حد تک سرکار سے منظور ہوچکا ہے، اب صرف اجرائی باقی ہے۔ سال گزشتہ کے رزولیوشن میں یہ بھی تحریک تھی کہ عام فائدہ کی غرض سے اس مدرسہ کی تعلیم اردو میں ہونی چاہیئے ..... اردو میں سائنس اور انجنیری کی تعلیم بالکل ممکن ہے انجنیری سائنس کا ایک شعبہ ہے اور اس میں ریاضی، فزکس، اور کمسٹری کی ضرورت ہے ان تینوں کی تعلیم اُردو میں ہوسکتی ہے۔" وغیرہ

سائنس وصنعت وحرفت، اور انجنیری کی اردو تعلیم کے ساتھ کانفرنس نے طب کی اردو تعلیم کی نسبت بھی تحریکیں پیش کیں۔ چنانچہ پہلے سال کی تحریک یہ ہے:۔

"کانفرنس کی رائے میں طبی تعلیم کی ترقی اور ملک کو کافی طور سے فائدہ پہنچنے کی غرض سے کم از کم اسسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم حسب سابق اردو میں ہونا مناسب ہے۔"

ڈاکٹر مرزا رضا خاں صاحب نے تحریک کے سلسلہ میں کہا کہ:۔

"مدرسہ طبابت میں فوراً اردو زبان میں تعلیم کا جاری ہونا نہایت ضروری امر ہے اور کم از کم فی الحال سب اسسٹنٹ سرجن کی تعلیم اردو ہی میں ہونا چاہیے، جس میں ملک کی بہبودی ہے۔
(روئداد کانفرنس صفحہ ۲۱۱)

پھر تفصیلی بحث کے بعد کہا کہ:۔

"اردو میں طبی تعلیم ہونے سے لوگ پہلے تو اپنی زبان میں لائق ہوں گے، پھر طبی علم کے سمجھنے کی قدرت بھی حاصل ہوگی۔ اور عام طور پر جو ترقی ہوگی اس سے وہ تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی جن کا اشارہ کیا گیا ہے۔ ہمارے پاس اس کے زندہ نظائر موجود ہیں کہ جن لوگوں نے اردو زبان میں تعلیم پائی وہ کسی طور سے اپنے دوسرے ہم پیشہ ڈاکٹروں سے کم نہیں ہیں۔" (روئداد صفحہ ۲۱۳)

اس رزولیوشن کی مزید تائید محمد مرتضیٰ مرحوم نے کی اور کہا کہ:۔

"عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تعلیم طب کے لئے اردو میں مواد نہیں ہے لیکن جب ستر سال پہلے ہمارے ملک میں تعلیم اردو میں دیجاتی تھی اور جب اس تعلیم کی بدولت ایسے مکمل اور اعلیٰ نمونے اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں جیسے ڈاکٹر ارسطو یار جنگ بہادر تو کیا وجہ ہے کہ ہم ترقی معکوس کر کے ستر سال کے بعد یہ خیال کرنے لگیں کہ ہماری زبان بند ہو گئی۔ زبان دن بہ دن کھلتی جائے گی یا بند ہوگی؟" (روئداد صفحہ ۲۱۴)

دوسری سالانہ کانفرنس میں بھی یہ مسئلہ پھر پیش کیا گیا۔ اس کے محرک شیخ محی الدین صاحب اور موئید محمد مرتضیٰ مرحوم نے نہایت معقول اور مدلل تقریریں کیں جن کے اقتباسات کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ گذشتہ سال بھر کے عرصہ میں کانفرنس نے اس بارے میں بہت کچھ مواد فراہم کر لیا تھا۔ تحریک تھی:۔

"چونکہ علاقۂ سرکار عالی میں مشرقی امتحانات کا سلسلہ بھی قایم ہے اس لئے بلحاظ اس سلسلہ کے طلبہ کے سب اسسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ سے دینے کے لئے ایک جدید شعبہ کا امتحاناً کھولا جانا مناسب ہے۔"

اس کو پیش کر کے محرک نے مروجہ خامیوں کے تفصیلی تذکرہ کے بعد کہا کہ:۔

"اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ضرورت یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ انگریزی طبابت کو اردو کا جامہ پہنایا جائے

اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ انگریزی مدرسہ طبابت میں...... ایک جماعت امتحاناً ایسے طلبہ کی جاری کی جائے جو طبابت انگریزی کو بذریعہ زبان اردو حاصل کریں...... انگریزی کتب طبابت کے تراجم کا مہیا کرنا بلاشبہ ایک مشکل کام نظر آتا ہے لیکن جو معلومات کہ اطراف و اکناف ہند سے کانفرنس کے دفتر میں جمع ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام بھی قریب قریب حل شدہ ہے۔ صوبۂ پنجاب و صوبۂ متحدہ کے مدرسہ طبیہ انگریزی کے ڈاکٹروں اور طبی افسروں کے جو آراء وصول ہوئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیشتر اس طریقۂ تعلیم کے موافق ہیں مثلاً کل چالیس اصحاب میں سے صرف تین یا چار ایسے ہیں جو اس تعلیم انگریزی طبابت کو بذریعہ زبان اردو ناقابل عمل ظاہر کرتے ہیں۔ باقی چھتیس ۳۶ لائق ڈاکٹر اس انتظام کی ضرورت اور اہمیت کے صاف طور پر معترف ہیں..... ان ہی تحریرات میں صاف درج ہے کہ پنجاب اور صوبۂ متحدہ میں انگریزی طبی مدرسہ کی سب اسسٹنٹ سرجن کلاس کی تعلیم قریب پچاس سال تک بذریعہ اردو رہی ہے اور اردو تراجم اسی لئے موجود بھی ہیں۔"

(روداد صفحہ ۱۱۵-۱۱۶)

محمد مرتضیٰ معتمد کانفرنس نے بھی اس کی تائید میں نہایت پر جوش تقریر کی۔

یہی تحریک ۱۳۲۶ء م ۱۹۰۸ء میں پھر پیش کی گئی اور سید محی الدین صاحب سرجن وظیفہ یاب نے طبیبوں اور طب کے مروجہ خطروں اور نقائص کے سلسلہ میں استدعا کی کہ:۔

"ایسی حالت میں ضرور ہے کہ سرکاری طور پر اس کی تعلیم کا اردو میں انتظام کیا جائے جیسے کہ پہلے تھا جس کے عمدہ نتائج مسلم ہیں۔" (روداد کانفرنس ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۷)

اِن علوم و فنون کے علاوہ اردو میں حیدرآباد کی تاریخ و جغرافیہ کی تعلیم کے بارے میں بھی کانفرنس نے نہایت مفید تحریک کی اور اس کے محرک مولوی محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب نے بیان کیا کہ:۔

اردو زبان میں جہاں فنون کی کتابیں تصنیف کرنے کی کوشش ہو رہی ہے وہاں تاریخ و جغرافیہ دکن کی تالیف کا بھی انتظام ہو تو نہایت مناسب ہوگا۔ (روداد کانفرنس صفحہ ۶۰)

اسی طرح تعلیم نسواں کی نسبت بھی تحریک پیش کی گئی کہ وہ زیادہ تر السنہ ملکی کے ذریعہ سے ہونی چاہئے، مولوی سید خورشید علی صاحب نے اس تحریک کو پیش کر کے کہا کہ:۔

عورتوں نے اب تک تعلیم میں جو نمایاں ترقی نہیں کی اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کو اپنی زبان میں اچھی کتابیں نصیب نہ ہوئیں۔ (روداد ۱۹۰۵ء صفحہ ۷۰)

یہ تو اردو زبان کو مختلف علوم و فنون وغیرہ کے لئے ذریعہ تعلیم بنانے اور اس میں وسعت دینے کی نسبت تجاویز تھیں۔ آخر میں ایک اور تحریک کا ذکر ضروری ہے جو ملک کے اردو ذوق اور معلومات میں اضافہ کے لئے لازمی تھی، چنانچہ تیسری سالانہ کانفرنس نے یہ تحریک پیش کی کہ:۔

"اس کانفرنس کی رائے میں کتب خانہ آصفیہ میں ضرورت ہے کہ اعلیٰ درجہ کی اردو تصانیف و تراجم سابقہ و حال کوشش کے ساتھ فراہم کئے جائیں۔"

اس کی تحریک مولوی عبدالحق صاحب نے کی اور کتب خانۂ آصفیہ کے مشرقی ذخیرۂ کتب کی ترقی کے سلسلہ میں کہا کہ:-

"اس کتب خانہ میں سب سے کم ذخیرہ اردو زبان کا ہے۔ اردو زبان کی کتابوں کے متعلق کوئی ذریعۂ دریافت نہیں ہے اور اس وجہ سے بھی بہت بڑی دقت پیش آتی ہے۔ بہت سی عمدہ عمدہ کتابیں اردو میں لکھی جاچکی ہیں۔ لیکن گمنامی میں پڑی ہیں، اور ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ اگر سب کتابیں فراہم کی جائیں، اور اس طرح قدیم اردو کی کتابیں فراہم ہوجائیں تو کتب خانہ کی ایک عمدہ شاخ قائم ہوجائے گی۔ ضرورت ہے کہ اردو کتابوں کی ایک فہرست مرتب ہو جس سے معلوم ہوسکے کہ ہر مبحث پر کون کون کتابیں اردو میں موجود ہیں۔ اگر اس طرح کتابیں ایک جگہ جمع ہوجائیں گی تو یہ بہت آسانی سے ممکن ہوگا کہ ایک شخص جس کو خدا نے کسی خاص فن کی مناسبت اور استعداد عطا کی ہے، صرف اُردو کی کتابیں دیکھ کر تصنیف و تالیف کرسکے۔"

(روئداد صفحہ ۷۵)

ایجوکیشنل کانفرنس مستحق مبارک باد ہے کہ اس کی اکثر تحریکیں بالآخر کامیاب رہیں اور اس نے حیدرآباد کی اُردو ترقی اور وسعت کے لئے جیسی اہم اور مستحکم خدمت انجام دی ہے، اس کی نظیر کہیں نہیں مل سکتی۔ لیکن اس کی اس ساری کامیابی کا سہرا اس کے ارباب حل و عقد کے سر ہے جنھوں نے نہایت خلوص، توجہ، محنت اور جرأت کے ساتھ اس اہم قومی اور اعزازی کام کو انجام دیا۔ اس کی مجلس انتظامی غیر معمولی خوش قسمت رہی کہ نواب سر حیدر نواز جنگ جیسا علم دوست، صاحب دل، اور ہمدرد صدر اس کو مل گیا، اور محمد مرتضیٰ مرحوم اور مولوی سید خورشید علی صاحب جیسے معتمدین۔ ان دونوں کا خلوص، سرگرمی اور ایثار تمام اہل ملک کے لئے لائق تقلید ہے۔

کانفرنس کے سرگرم اراکین میں مولوی اکبر علی صاحب، پروفیسر ولنکر صاحب، مولوی مرزا احمد بیگ صاحب، مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب، مولوی عبدالحق صاحب، حافظ محمد مظہر صاحب، رضی الدین حسن کیفی مرحوم، اسداللہ صدیقی صاحب، محمد عبدالعلی صاحب، وامن رام چندر نایک صاحب، ملا عبدالباسط صاحب، رائے بالمکند صاحب اور عبداللطیف خاں صاحب وغیرہ کے ناموں کو ملک کی آئندہ نسلیں ان کی قومی ہمدردی اور علمی مستعدی کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھیں گی۔

سید محی الدین قادری زور

(نوٹ۔ اس مضمون کے اکثر اجزا میں نے اپنی کتاب "عہد عثمانی میں اردو کی ترقی" سے اخذ کئے ہیں۔)

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی میں ایجوکیشنل کانفرنس کا حصہ

"حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" ایک طرح پر "انجمن طلبائے قدیم دارالعلوم" کے سلسلہ میں قائم ہوئی۔ کیونکہ ایک تو اس کے بانی زیادہ تر وہی حضرات تھے، جو انجمن طلبائے قدیم کی سرگرمیوں کا بھی مرکز تھے، دوسرے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے قیام سے متعلق ابتدائی امور پر غور کرنے کے لئے ۱۳۲۲ف ۱۹۱۴ئہ میں سب سے پہلا جو اجتماع ہوا تھا، اُس کی کارروائیوں پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجتماع کے داعی مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کے دل میں دارالعلوم کی فلاح کا خیال سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ لیکن ابتدائی بحث و گفتگو کے بعد اس نوزائیدہ انجمن کی جو ہیئت مرتب ہوئی وہ وسیع تر اپیل کی مالک تھی۔

ملک کے علمی حلقوں میں "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کی فوری مقبولیت اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ ملک کی عام ضرورت تھی، چنانچہ اس کے انعقاد کے ساتھ ہی ہر طبقے اور نقطۂ خیال کے علما، اس میں حصّہ لینے اور ہاتھ بٹانے کے لئے تیار ہو گئے۔

خانگی اداروں میں "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" کی سی وسیع اور سنجیدہ انجمنیں ہندوستان میں کم ہی نظر آئینگی۔ ایسے صحت بخش اصولوں پر اس نے کام کی ابتدا کی، کہ تھوڑے ہی عرصہ میں، یہ ملک کا اہم ترین غیر سرکاری تعلیمی مرکز بن گئی۔ اس کی رائیں اور اس کی تحریکات، عوام اور حکومت دونوں کی نظروں میں وقعت رکھتی ہیں۔ اکثر تحریکات کو حکومت نے کشادہ پیشانی کے ساتھ پسند اور منظور کیا۔ کانفرنس کی اس کامیابی میں اس کے اراکین اور خصوصاً اس کے معتمد مولوی محمد مرتضیٰ مرحوم کی والہانہ سعی کو بہت بڑا دخل ہے۔

کانفرنس، اپنی مساعی اور کامیابیوں کو وقفوں وقفوں سے، ملک اور عوام کے سامنے پیش کرنے کے لئے، اپنے سالانہ اجلاس منعقد کرتی ہے۔ یہ اجلاس نہ صرف بلدہ، بلکہ اہالیان اضلاع کی خواہش پر، اضلاع میں بھی منعقد ہوتے رہے۔ اب تک اس طرح کے دس اجلاس ہو چکے ہیں۔

کانفرنس کا پہلا اجلاس ۱۹۱۵ئہ میں بمقام حیدرآباد (ٹاؤن ہال) منعقد ہوا۔ اس کی صدارت، ملک کے مشہور مصلح تعلیم، نواب حیدر نواز جنگ بہادر (سر اکبر حیدری) نے کی۔ نواب صاحب اس زمانے میں معتمد تعلیم کے اس عہدہ پر فائز تھے۔ اس اولین اجتماع میں کئی مفید مضامین پڑھے گئے، اور کم سے کم دس اہم تحریکیں منظور کی گئیں۔ قیام جامعہ کی تحریک جو اس سے پہلے کئی دفعہ اُبھر اُبھر کر دب گئی تھی اس دفعہ پھر پیش ہوئی، خود صدر اجلاس نے جو افتتاحیہ خطبہ پڑھا تھا اس میں بھی اس امر پر خاص زور دیا گیا تھا۔ ہندوستان اور خاص کر حیدرآباد کی اعلیٰ تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے صاحب صدر نے نری مغربی تعلیم کے غیر تشفی بخش نتائج کو نمایاں کیا اور ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر معین رائے کا اظہار کرتے ہوئے حسب ذیل خیالات ظاہر فرمائے۔

"تقریباً ایک صدی کے تجربے نے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچا دی ہے کہ خالص مغربی تعلیم، ہمارے ملک کے لئے

مفید نہیں ہو سکتی، جس تعلیم میں ملکی ضروریات کا لحاظ نہ ہو، اور جس کی بنیاد ملکی اور قومی خصائص پر نہ ہو، وہ کوئی تعلیم نہیں۔ اسی طرح خالص مشرقی تعلیم بھی موجودہ زمانے کی ضرورت کے لحاظ سے سود مند نہیں ہو سکتی۔ ایک، ہمیں ملک و قوم سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ دوسری، ہمیں زمانۂ حال کی ترقی اور روشنی سے محروم رکھتی ہے۔ اس لئے ضرور، اور لابد ہے کہ دونوں کی خوبیوں کو ایک جگہ جمع کیا جائے۔"

کانفرنس کے ایک سرگرم کارکن، مولوی محمد مظہر صاحب نے "تعلیم حیدر آباد" پر جو سیر حاصل مضمون پڑھا تھا، اس میں اعلیٰ تعلیم کی پستی کے اسباب میں سب سے زیادہ زور اس امر پر دیا کہ، ہماری تعلیم کی باگ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں وہ فرماتے ہیں:۔

"سب سے اہم...... اور سب سے پہلا کام یہی ہے کہ ایک مکمل اور قطعی نظام العمل یا پروگرام سررشتہ تعلیم کا مرتب ہو۔ جس میں ملکی ضرورتوں کا پورا لحاظ رکھا جائے ...... جس طرح برٹش انڈیا کے ہر صوبے کی تعلیمی حالتیں، ضرورتیں، باہم مختلف ہیں، اور اس کے لحاظ سے علحدہ علحدہ نظام العمل رکھنا پڑتا ہے، اسی طرح ہماری سلطنت کی تعلیمی حالت اور ضروریات ایسے ہیں جو کسی ایک خاص صوبہ برٹش انڈیا سے مطابقت نہیں رکھتے .... یہ امر کہ سررشتۂ تعلیم حیدر آباد کی بنیاد ملک کی ضرورتوں پر رکھی جائے، کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ اس کا پتہ اس وقت سے چلتا ہے جب کہ بتیس (۳۲) سال قبل بصدارت حضرت غفران مکاں، اسی باغ عام میں ایک دارالفنون قائم کرنے کے مسئلہ پر غور و خوض ہوا تھا۔ ہمارے ملک کی حالت کا اقتضا یہ ہے کہ فی الحال ان شغلوں کی تعلیم جو ابتدائی درجہ پر منتہی ہوجانے والی ہو، ان کی مادری زبان میں دی جائے، اور ساتھ ہی اردو کی تعلیم بھی ان کو دی جائے۔ جن طلبا کا منشا ثانوی تعلیم سے آگے بڑھنے کا نہیں، ان کی تعلیمی پہلی زبان اردو رہنی چاہیئے۔ اور جس قدر تعلیم علوم مثل حساب، ریاضی، تاریخ جغرافیہ، طبعیات وغیرہ ان کو دی جائے، وہ بھی اردو ہی میں رہے۔ ساتھ ہی ساتھ انگریزی لٹریچر کی تعلیم لازمی ہے۔"[۱]

اسی اجلاس میں مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن ترقی اردو نے بھی اردو میں علوم و فنون کے تراجم کی شدید ضرورت پر پر مغز تقریر کی اور حکومت کی توجہ اس طرف منعطف کرنے کی تحریک پیش کی تھی، جس کی پر زور تائید بابو گیا پرشاد وکیل نے کی۔ یہ دونوں تحریکیں جس قدر جلد بار آور ہوئیں اس سے کانفرنس کی رائے کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

مستحق طلبہ کو، وظائف کے ذریعہ امداد دینے کی ایک تیسری تحریک پیش ہوئی تھی۔ جس کو کانفرنس نے فوراً منظور کرلیا۔ اور بڑی جانفشانی سے ایک وظیفہ فنڈ نہایت صحت بخش اصول پر قائم کیا۔ اس فنڈ سے غیر مستطیع طلبہ کو تعلیمی وظیفے دئے جاتے ہیں اور آج تک سینکڑوں طلبہ اس امداد سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔

اس وقت تک کانفرنس نے مختلف اوقات میں دس سالانہ اجلاس کئے۔ جن میں سے تین، یعنے دوسرا، پانچواں اور چھٹا علی الترتیب اورنگ آباد، لاتور اور پربھنی میں منعقد ہوئے اس سے اضلاع میں اشاعت تعلیم اور تعلیمی دلچسپی پیدا کرنے کے

---

[۱] روداد "حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس" اجلاس اول (۱۹۱۵ء)، صفحہ ۱۱۱ و صفحہ ۱۲۹

ایک ضروری مقصد میں کانفرنس کو بڑی کامیابی ہوئی۔

ان سالانہ جلسوں میں حقیقی مفید اور علمی تحریکیں منظور ہوئیں، اور ان کو رو براہ لانے میں کانفرنس نے جو کوششیں کیں۔ اُن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ممالک محروسہ کی تعلیم کے تقریباً ہر پہلو پر ان جلسوں میں اظہار خیال کئے گئے۔ اور جو تحریکیں منظور ہوئیں، اُن کو آگے بڑھانے میں کانفرنس نے اپنے تمام وسائل سے کام لے کر تھوڑے ہی عرصہ میں ملک کی فضا کو تعلیمی دلچسپیوں سے روشناس کردیا۔ ......

ہر سال بیسیوں غیر مستطیع طالب علم کانفرنس کے وظیفہ فنڈ سے امداد حاصل کرکے تعلیم جاری رکھنے کے قابل بن رہے ہیں۔

جس وقت کانفرنس قائم ہوئی تھی ملک میں کوئی عام علمی یا تعلیمی مرکز موجود نہیں تھا۔ اسی لئے بسا اوقات کانفرنس کو، تعلیم کے علاوہ دوسرے علمی، اقتصادی یا سماجی مسائل کو بھی سمیٹنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ لیکن، چند سال سے، ملک کو ایک حیثیت اور خصوصی جماعت یعنے "انجمن اساتذہ حیدرآباد" کی خدمات حاصل ہوگئی ہیں، جو کارگزاری، کے اعتبار سے اپنی نوعیت کی مفید ترین انجمن ثابت ہوچکی ہے۔ دوسری طرف "انجمن طیلسانیین عثمانیہ" نے تعلیمی اور علمی معاملات کے علاوہ، سماجی، اقتصادی اور شہری خدمات کو بھی اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ اور نہایت خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دے رہی ہے۔ ان انجمنوں کے قیام کے باعث کانفرنس کا بار کچھ ہلکا ہوگیا ہے، پچھلے چند سال سے اس کے اجلاس وقفوں سے منعقد ہو رہے ہیں، اور ان کی کارروائیوں کی نوعیت بھی زیادہ علمی ہوگئی۔

عبدالقادر سروری

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا نیا دور

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس ایک عرصۂ دراز سے نہایت خاموشی کے ساتھ ممالک محروسہ سرکار عالی میں علم کی اشاعت، نادار اور مستحق طلبہ کی مالی امداد اور اُردو زبان کی ترقی کے لیے جو شاندار خدمات انجام دے رہی ہے اس کا تفصیلی حال ان مختلف مضامین میں ملے گا جو ادارۂ ادبیات اُردو نے اس نمبر میں جمع کئے ہیں اگرچہ کانفرنس کے اجلاس کئی سال سے نہ ہوسکے اور عام طور پر اس کے چرچے نہیں رہے لیکن اس کا اساسی کام برابر جاری رہا اور سیکڑوں تشنگانِ علم نے اس کی مالی امداد سے مستفید ہوکر بحر علم سے سیراب ہوے اور اعلیٰ مدارج علمی حاصل کئے اور کر رہے ہیں اس کا یہ سلسلۂ امداد ابتدا سے لے کر اس وقت تک برابر جاری ہے اور بحمداللہ اس کی اس خصوصیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔

سال حال سے کانفرنس کا نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ اور پھر اس کے سالانہ اجلاسوں کی بناڈالی جارہی ہے۔ اگرچہ موجودہ زمانے میں جس کو کمیٹی بازی یا کانفرنس کا دور کہا جاتا ہے، سالانہ اجلاس یا کانفرنس وغیرہ رسمی چیزیں بن گئی ہیں لیکن جہاں تک ایجوکیشنل کانفرنس کا تعلق ہے، وہ ایسی رسمی چیزوں سے بالکل مستثنیٰ رہی ہے۔ یہ کانفرنس قوم کی اس خاص سرگرمی سے تعلق رکھتی ہے جس کو فی الحقیقت "قوم ساز سرگرمی" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی گزشتہ روایات اور پچھلے تمام اجلاس اس کے پروگرام کو آگے بڑھاتے اور اس کے دائرہ افادہ کو برابر وسیع کرتے رہے ہیں۔ اس کا لایحۂ عمل بالکل تعمیری اور ہر قسم کے تنگ نظرانہ خیالات اور مفادات سے الگ اور تعلیمی ہے اور جب تک کوئی ملک اور قوم جہالت کی تاریکی سے نکل کر علم کی روشنی میں نہیں آئے گی اور تعلیم عام نہ ہوگی کسی قسم کی اصلاح و ترقی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔

ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے گزشتہ اجلاسوں میں جس مقصد کے حصول کیلئے تحریکات اور قرار دادیں منظور کیں تقریریں کرائیں نظمیں لکھائیں اور ہر کہ ومہ کو متوجہ کیا وہ تدریجی طور پر حاصل ہو رہا ہے۔ عہد عثمانی کے فیوض وبرکات سے سارے ممالک محروسہ میں مدارس کا جال بچھا ہوا ہے۔ نہ صرف صوبوں اور اضلاع کے مقامات مستقر پر مدرسے قائم ہوگئے ہیں بلکہ وسطانی، تحتانی اور ابتدائی مدارس ملک کے قصبے قصبے اور گاؤں گاؤں میں موجود ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے لیئے ہمارے علم پرور بادشاہ **اعلیٰ حضرت سلطان العلوم** کی توجہات شاہانہ سے جامعۂ عثمانیہ سی ملکی اور قومی جامعہ وجود میں آچکی ہے جو گوناگوں خصوصیات کے لحاظ سے اپنی آپ نظیر اور برطانوی ہند کے تمام صوبوں اور دیسی ریاستوں کیلئے نمونہ ہے۔ خود رعایائے ملک سرکار عالی میں بیداری اور تعلیم کا شوق عام طور پر پیدا ہوگیا ہے۔ نہ صرف مختلف مقامات پر مدرسوں کے قیام کیلئے آئے دن سرکار کی توجہ منعطف کرائی جاتی ہے بلکہ ابتدائی تعلیم کو جبری اور لازمی بنانے کا مطالبہ بھی کیا جارہا ہے اور پبلک نمائندوں کی طرف سے اس کے دو مسودہ ہائے قانون بھی مجلس وضع آئین و قوانین میں پیش ہوچکے ہیں۔ خود سررشتہ تعلیمات نے بھی ملک کی تعلیمی پیمائش اور ضروریات کو فنی طور پر جانچ پڑتال کرکے ایک مسودۂ قانو

ابتدائی تعلیم کو لازمی بنانے کے لئے سرکار عالی میں پیش کیا ہے اور اس وقت زیر غور ہے۔ گزشتہ چند سال سے طلبہ کی تعداد میں اس طرح روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے کہ سرکاری مدارس ہی نہیں بلکہ خانگی اداروں اور امدادی درسگاہوں میں عدم گنجایش سے طلبہ کو داخلہ نہیں مل رہا ہے۔ اور خصوصاً اعلیٰ تعلیم کے لئے ہر سال ملک کے طلبہ کی ایک کثیر تعداد علی گڈھ اور دوسری جامعات میں شریک ہونے پر مجبور ہو رہی ہے۔

جہاں تک ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا تعلق ہے سررشتہ پوری کوشش اور جد و جہد سے موجودہ مدارس کے استحکام اور نئے مدارس کے قیام میں مصروف ہے۔ مختلف غیر ضروری مدات میں ہر سال جو کثیر رقم خرچ ہوتی تھی اس کی گنجایش سے اور بعض مدات کی کفایت شعارانہ تنظیم کے ذریعے ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہی بچت نکالی گئی اور اس کو ترقی تعلیم کے ضروری ابواب مثلاً قیام مدارس جدید پر صرف کیا جا رہا ہے۔ دوپہری طریقہ (شفٹ سسٹم) رائج کر کے مروجہ تعلیم کو زیادہ مستحکم بنانے کے علاوہ مدرسوں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اساتذہ کو کم سے کم خرچ سے تربیت یافتہ بنانے کی کوشش بھی جاری ہے۔ پیشۂ وراثت کے لئے موزوں اور کارآمد اشخاص کا انتخاب کرنے اور اس طرح بالواسطہ نتائج تعلیمی کو بہتر بنانے کے لئے امیدواران سررشتہ کا معائنہ کر کے ان کی صلاحیتوں اور موزونیت وغیرہ کی کافی جانچ کرنے کے بعد ان کو سررشتے میں ملازم رکھا جاتا ہے۔

خصوصی تعلیم کے مختلف شعبے بھی ارباب تعلیم کی توجہ سے محروم نہیں رہے۔ پست اقوام کے لئے صحت پرور طریقے پر جو جدید انتظامات کئے گئے ہیں وہ نہایت کامیاب اور حوصلہ افزا ثابت ہوئے ہیں۔ ملک کے ان بدنصیب افراد کی تعلیم کے لئے جو گونگے، بہرے یا اندھے ہونے کی وجہہ سے عام طریقۂ تعلیم سے مستفید نہیں ہوسکتے اور جن کی طرف اس وقت تک کوئی توجہ نہیں کی گئی تھی ضروری تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ چند اساتذہ کو معذوروں کی تعلیم کے خاص خاص طریقوں کی تحصیل کے لئے کلکتہ بھیجا گیا ہے اور ان کی واپسی کے بعد عنقریب بلدۂ حیدرآباد میں معذوروں کے مدرسے قائم کئے جائیں گے۔ تعلیم بالغان کی طرف بھی سرکار عالی متوجہ ہے اور اگرچہ اس کے لئے باضابطہ سرکاری مدارس قائم نہیں ہیں اور نہ اس غرض کے لئے عام مدارس روزینہ کی ضرورت ہے البتہ کافی تعداد میں امدادی مدرسے یا جماعتیں قائم کی گئی ہیں اور پبلک کی بے توجہی کے باوجود اس خصوص میں سرکاری مساعی کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

ملک سے جہالت اور ناخواندگی کو دور کر کے اس کو علم کی روشنی سے منور کرنے کے لئے سررشتۂ تعلیمات متعدد دشواریوں کے باوجود جس توجہ اور جوش عمل سے کوشاں ہے اور جو تعمیری پروگرام اس کے پیش نظر ہے اس کا لحاظ کرتے ہوئے تمام غیر سرکاری اور پبلک اداروں علمی اور تعلیمی انجمنوں، سبھاؤں، دولت مند اور ذی ثروت شہریوں کا اولین فرض ہے کہ دامے درمے قدمے اس مفید کام میں مدد سے دریغ نہ فرمائیں اور سررشتے کے پیش نظر پروگرام کی تکمیل میں ممکنہ تعاون و اتحاد عمل فرمائیں۔ خصوصاً ملک کی اس قدیم تعلیمی خدمت گزار انجمن یعنے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس سے یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ وہ اس سلسلے میں اپنے تعاون سے دوسری انجمنوں اور اداروں کے لئے ایک نمونہ

ثابت ہوگی۔ اگر یہ کانفرنس جواب تک نادار اور غیر مستطیع طلبہ کو وظایف تعلیمی دے کر حصول تعلیم میں مدد دیتی رہی ہے اپنا دائرۂ عمل وسیع کر کے فی الوقت دو خاص امور اپنے پروگرام میں شریک کرے اور ان کی تکمیل کے لئے ضروری جدوجہد کام میں لائے تو وہ یقیناً ایک ٹھوس اور تعمیری کام انجام دے گی اور اس سے سررشتۂ تعلیمات کے مقاصد کی بھی بہت کچھ پیش رفت ہوگی۔

تعلیم بالغاں اور پبلک کتب خانوں کا قیام ملک کی اہم تعلیمی ضروریات میں سے ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی موجودہ تعداد کے مدنظر اگر ایک عمدہ تنظیم کے ساتھ مدارس شبینہ کے ذریعے ان پڑھ لوگوں کو خواندہ بنانے کی کوشش کی جائے تو اس سے نہ صرف موجودہ جہالت اور ناخواندگی میں معتدبہ کمی ہو جائے گی بلکہ آئندہ نسلوں کی ابتدائی تعلیم کے اچھے مواقع نکل آئیں گے موجودہ ان پڑھ والدین خود خواندہ بن کر اپنے بچوں کو بھی زیورِ علم سے آراستہ کرنے کے فوائد سے آگاہ ہو جائیں گے۔ یہ کام گورنمنٹ سے زیادہ پبلک اور بلدیوں کے فرائض سے زیادہ تعلق رکھتا ہے اور ایجوکیشنل کانفرنس جو قیل وقال اور شور وشغب پر ہمیشہ عمل کو ترجیح دیتی رہی ہے اس کام کو بہ احسن الوجوہ انجام دے سکتی ہے۔

دوسری اہم ضرورت پبلک کتب خانوں کے قیام کا ہے۔ بہ حالت موجودہ عام تعلیم اور خصوصاً اضلاع وغیرہ میں جو ابتدائی تعلیم دی جا رہی ہے اس کے ایک حد تک بے اثر اور بے کار ثابت ہونے کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ عمداً ایسا ہو رہا ہے کہ جو طلبہ ابتدائی تعلیم اور ضروری خواندگی کی تحصیل کے بعد مدرسہ ترک کر دیتے ہیں توسیع و ترقی علم کے مواقع نہ ہونے کی وجہ سے وہ پھر رفتہ رفتہ ناخواندہ بن رہے ہیں۔ جہالت کی طرف عود کرنے کی یہ حالت متمدن اور ترقی یافتہ ممالک میں بھی ایک اہم مسئلہ بنی ہوی ہے وہاں بھی مختلف تدبیروں کے ذریعے اس کی اصلاح کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس تضیع تعلیم اور صحیح معنوں میں علم کی توسیع اور ترقی تعلیم کے لئے پبلک کتب خانوں اور مطالعہ گھروں کا قیام ناگزیر ہے خصوصاً اضلاع میں کتب خانوں کی سخت ضرورت ہے۔ اگرچہ بلدہ حیدرآباد میں بھی ان کی موجودہ تعداد کسی طرح کافی نہیں ہے۔ اگر جگہ جگہ کتب خانے اور مطالعے خانے قائم کئے جائیں اور ان میں عام پسند، سلیس اور مفید معلومات بہم پہنچانے والی کتابیں، اخبار اور رسالے مہیا کئے جائیں تو پبلک میں خود بخود مطالعہ اور تحصیلِ معلومات کا شوق ترقی کرے گا اور بہت جلد مستحکم علمی ترقی عمل میں آئے گی

رفیق

مولوی محمد عبدالرحمن خان صاحب

محمد عبدالرحمٰن خاں

اے آر سی اس۔ بی اس سی (لندن) فیلو رائل اسٹرونامکل سوسائٹی صدر ایجوکیشنل کانفرنس

پروپاگنڈے کی دُنیا میں کھوٹے کھرے کی پہچان مشکل ہوگئی ہے۔ ہر چمکتی ہوئی چیز کو سونا سمجھ لیا جاتا ہے۔ جس کو نام و نمود کی ہوس نہیں وہ پھسڈی بن کر رہ جاتا ہے۔ "کام کم اور شور زیادہ" زندگی کا اصول بن گیا ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مرعوب کن ناموں کو نظر انداز کرکے صرف ٹھوس کارناموں کا موازنہ کیا جائے اور اس کے بعد اپنے حقیقی مدارج کی روشنی میں شخصیتیں اُبھاگر ہو جاتی ہیں۔ کتنے خاموش خدمت گزار ایسے ہیں جو دنیائے نام و نمود سے ہٹ کر کام کو کام کی خاطر انجام دیتے ہیں؟ ان کے کام غرض سے آلودہ نہیں بلکہ خدمت گزاری ان کا مقصد ہے۔ ان کے جذبۂ عمل اور ذوقِ کار میں ایک مسلسل تڑپ ہے اور ان کی لذتِ کاوش تشنگیٔ دنیا سے تلخ ہونے نہیں پاتی —— بہت کم ہوں گے جو اس معیار پر پورے اتریں!

میرے نزدیک کسی کی عظمت کا اندازہ قائم کرنے کا معیار کون ہے؟ "نہیں بلکہ میں" اس نے کیا کیا؟" کی روشنی میں اس کی حقیقی عظمت تلاش کرتا ہوں۔ نام کو پس پردہ رکھ کر کام کا احترام میرا تنقیدی اصول ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسی کسوٹی پر کھوٹے اور کھرے کی صحیح جانچ ہو سکتی ہے۔

آنسوؤں میں دلوں کی دھڑکنیں۔ خان صاحب کا نام میں نے سب سے پہلی مرتبہ اُس وقت سنا جب میں فوقانی درجوں میں زیر تعلیم تھا اور ترقی کی امنگیں مجھے جامعہ عثمانیہ کی طرف کھینچ رہی تھیں۔ جب میں نے جامعہ عثمانیہ میں شرکت کی تو ان کو پہلی مرتبہ دیکھا —— ہندوستان کی یہ بلند پایہ ہستی جس نے مشرق و مغرب سے اپنے ذوقِ علم کے لئے بہت کچھ حاصل کیا اور مشرق اور مغرب کو اپنے علم و فضل سے بہت کچھ دیا، میری نگاہوں کے سامنے تھی —— اس کے بعد وہ ایک سال تک کلیہ جامعہ عثمانیہ کے صدر رہے لیکن بدقسمتی سے میں نے اُن سے کسی قسم کا استفادہ نہیں کیا۔ اڈک میٹ میں جامعہ کی منتقلی کے ساتھ ہی وہ وظیفۂ حسن خدمت پر سبک دوش ہو گئے۔

اُن کی علٰحدگی نے طلبائے کلیہ میں ایک الم انگیز ہیجان پیدا کر دیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ کلیہ کے ایک ہر دلعزیز صدر تھے اور جامعہ کی ترقی بڑی حد تک ان کے پرخلوص مساعی کی رہینِ منت ہے۔ لیکن جب میں نے طلبہ کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں میں دلوں کی دھڑکنیں سُنیں تو مجھے دکن کے اس مایۂ ناز سپوت کی زندگی سے ایک قسم کی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ میں سوچنے لگا کہ کیا ان آنسوؤں کا سبب یہی ہے کہ ایک ہمدرد اور دیرینہ محسن بچھڑ گیا؟ —— کیا کوئی اور بھی؟؟ —— اسی تجسّس میں جب میں نے ان کے کارناموں کے متعلق معلومات حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ یہ ماتم رسمی اور موقتی ماتم نہیں ہے بلکہ انسانی نفسیات نے ہٹ کر اپنے اندر ماضی اور مستقبل کی ایک کشمکش بھی رکھتا ہے۔ ہم سے وہ شخص بچھڑ رہا تھا جس نے ماضی کو تابناک بنایا تھا اور مستقبل کو تابناک تر بنا رہا تھا۔ اور ایسے وقت بچھڑ رہا تھا جب کہ ہم کو اس کی ضرورت تھی۔ کام کرنے والے یا کام لینے والے مل ہی جاتے ہیں لیکن ایسے لوگوں کا تھا لا رجال ہے جو خود بھی کام کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی کام لیتے ہیں۔ دوسری خصوصیات سے قطع نظر مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب کی یہی ایک خصوصیت اس قدر اہم ہے کہ اس سے اُن کے احساس خدمت گزاری اور خلوصِ عمل کا بین ثبوت مل جا سکتا ہے۔ ایثار، ہمدردی اور عمل —— یہی تین اوصاف ہیں جو اُن کو دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں۔

پہلا قدم اور مسلسل جادہ پیمائی۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب اکتوبر ۱۸۸۱ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم مدرسۂ عالیہ میں ہوئی جب کہ نظام کالج کی صدارت مسٹر سیٹن کے تفویض تھی۔ بارہ برس کی عمر میں امتیازِ اولیت کے ساتھ مڈل کامیاب کرکے سرکاری انعام پایا۔ فوقانی تعلیم کے دوران میں پیہم امتیازات حاصل کئے۔ بعض وقت طبیعیات میں ان کو صد فی صد نشانات ملے۔ اس طرح پروفیسر انڈرسن کی شفقت و ستائش کا مرکز بنے رہے۔ میٹرک ۱۸۹۷ء میں کامیاب ہوئے اور ۱۹۰۱ء میں مدراس یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ طیلسان حاصل کیا۔ ان تعلیمی امتیازات کے ساتھ کھیل کے میدانوں میں بھی ان کی نمایاں حیثیت رہی۔ انھوں نے بین المدارس اور بین الکلیاتی مقابلوں میں کئی انعامات حاصل کئے۔

یوں تو ان کی زندگی ہمیشہ طالب علمانہ رہی ہے۔ انھوں نے طلبِ علم کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا رکھا ہے۔ وہ دنیائے جستجو میں ہمیشہ گام زن رہتے ہیں۔ لیکن اُن کی مکتبی زندگی کا پہلو بھی اتنا روشن ہے کہ جس کو ان کے روشن مستقبل کی ضمانت کہا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ایک زندہ اور نصب العینی طالب علم کی حیثیت سے نہ صرف دماغی مشاغل میں اپنے آپ کو معروف رکھا بلکہ جسمانی تربیت سے بھی غافل نہیں رہے۔

مِسلوں کا انبار۔ طیلسان حاصل کرنے کے بعد خاں صاحب یوروپی وظیفہ کے مستحق تھے لیکن عمر کی تحدید نے ان کو اپنے اس حق سے محروم رکھا، حالانکہ عماد الملک مرحوم اور پرنسپل سیٹن نے ان کے لئے پرزور سفارش کی تھی۔ تلافی کے طور پر بہت جلد سر جارج کاسن واکر کی کوشش سے محکمۂ فینانس میں ان کی خدمات حاصل کرلی گئیں، جہاں وہ کئی ماہ تک کارگزار رہے۔ چوں کہ دفتری زندگی کی پیہم مشق میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کی تباہی کا اندیشہ تھا اس لئے انھوں نے اسی راستہ کی طرف اپنا رخ کیا جو ان کی منزلِ مقصود کی طرف جاتا تھا۔ ان کا ہر سانس مسلوں کے انبار سے نکل کر علمی وسعتوں میں لہرانا چاہتا تھا، اس لئے وہ ایم اے (ریاضی) کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے دفتر کی چار دیواری سے باہر نکل گئے۔

پھر مادرِ علمی کی آغوش میں۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں ان کا تقرر نظام کالج کی مددگاری سائنس پر ہوا۔ ڈاکٹر اگھورناتھ کی وظیفہ پر علیحدگی (اکتوبر ۱۹۰۷ء) سے مسٹر میک ایوان کے تقرر (نومبر ۱۹۰۹ء) تک وہ شعبۂ سائنس کے ذمہ دار نگران رہے۔ اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں وہ مددگار پروفیسر بنائے گئے۔ ۱۹۱۵ء میں جب وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے یورپ سے واپس ہوئے تو ان کا تقرر نظام کالج کی پروفیسری پر ہوا۔ اور وہ سب سے پہلے ہندوستانی پروفیسر طبیعیات کی حیثیت سے جس نے نظام کالج کی پروفیسری کے لئے اپنے آپ کو اہل ثابت کیا۔ کام کرنے لگے۔ انھوں نے اپنی سائنٹفک خدمات سے نہ صرف اس ادارہ کو بلکہ تمام حیدرآباد کو مستفید کیا۔ چنانچہ سائنس کے نئے تجربہ خانے ان ہی کے غور و فکر اور کوشش کا نتیجہ ہیں۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے تمام مدارس میں سائنس کی تعلیم کو رواج دینے میں ان کا بڑا حصہ ہے۔

اس عرصہ میں وہ جامعۂ مدراس کی مجلس رفقاء، مجلس امتحانات، اس سے ملحقہ کلیوں کی کونسل کے رکن اور مجلس ممتحنین کے رکن اور صدر منتخب ہوتے رہے اور اکثر جامعاتِ ہند کی اعلیٰ جماعتوں کے ممتحن مقرر ہوئے۔

اس ملازمت میں انھیں نہ صرف اپنی معلومات سے طلبہ کو مستفید کرنے کا موقع ملا بلکہ ساتھ ساتھ وہ اپنی تشنگیٔ علم بھی بجھاتے رہے اور یہی وہ میدان تھا جس میں ان کو اپنی موزونیٔ طبع اور شوقِ علم کے باعث ترقی کی وسعتیں نظر آئیں۔

مغرب کی دنیا - ۱۹۱۱ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ روانہ ہوئے اور رائل کالج آف سائنس لندن میں شرکت کی جہاں سے انھوں نے اپنی غیر معمولی ذہانت کے سبب امتیازات کے ساتھ دو ہی سال میں بی ایس سی (آنرز) کی ڈگری حاصل کی اور ریاضی، مساحت، طبیعیات، میکانیات، کیمیا، برق اور انجنیری کے متعلق قیمتی معلومات حاصل کیں۔ خوش قسمتی سے وہاں انھیں پروفیسر کیلینڈر، آنربل آر جے، اسٹرٹ (موجودہ لارڈ ریالے) لے فاولر، ڈبلیو واٹس پیری ماتھر جیسے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ماہرین سائنس کی تقاریر سننے کا موقع ملا۔ جن سے ان کی قابلیت میں اضافہ ہوا۔

بی ایس سی کی تعلیم کے دوران میں وہ وائرلس کے لئے لندن یونیورسٹی کالج میں پروفیسر فلمنگ ایف، آر، ایس کے زیر تعلیم رہے اور ۱۹۱۳ء میں فزیکل سوسائٹی لندن کے رفیق منتخب کئے گئے۔

نیا طور - نئی برق تجلی - جامعہ عثمانیہ ابھی ابتدائی منزل میں تھی۔ اس کا کاروان ایک رہنما کی تلاش میں تھا۔ اس کی بنیادیں قائم ہو چکی تھیں۔ ایک معمار کی ضرورت تھی جو ان پر ایک قصر تعمیر کرے۔ ایسے نازک وقت میں اس کے انتظام کی باگ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب کے سپرد کی گئی۔ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کا یہ نیا تجربہ ہدف اعتراض بنا ہوا تھا لیکن خاں صاحب نے اپنے دور صدارت میں اس کو مرکز ستایش بنا دیا۔ استہزا آمیز قہقہوں کی گونج ہوا میں دفن ہو کر رہ گئی اور ہر طرف سے قدر کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے دل میں اپنے وطن اور نونہالان وطن کا سچا درد ہے اور ان کے تجربوں نے ان میں "یقین محکم" پیدا کر دیا ہے ۔۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ترقی تعلیم مادری زبان ہی کو ذریعہ تعلیم بنانے میں پوشیدہ ہے۔

اعلیحضرت سلطان العلوم خلداللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ کے فرمان مبارک کی تعمیل میں (۱۹۲۴ء) صدارت کا جائزہ لیتے ہی انھوں نے جامعہ کے تمام پہلوؤں کی جانب توجہ کی۔ ملحقہ کالجوں کے قیام سے عثمانئین کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ موجودہ شعبوں کو ترقی دی گئی اور نئے شعبے کھولے گئے۔ ایک "اسٹاف کلب" قائم کیا گیا جس کی ترقی یافتہ صورت اب بھی "یونیورسٹی ایسوسی ایشن" کے نام سے موجود ہے۔ کیمیا، ریاضی اور طبیعیات کے تجربہ خانوں نے برق رفتاری کے ساتھ ترقی کی اور ان کو اس قابل بنا دیا گیا کہ وہ ہندوستان کی ہر ایک جامعہ کے مقابلہ میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ حیاتیات اور نباتیات کے دبستانوں کا افتتاح ہوا اور جدید طریقوں پر ان کے تجربہ خانے قائم کئے گئے۔ عمرانیات کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ فلسفہ، اردو، فارسی اور ریاضی کے ام اے اور طبیعیات، کیمیا، نباتیات اور حیاتیات کے ایم ایس سی کی جماعتیں کھولی گئیں۔ ام اے اور ایم ایس سی میں تحقیقاتی کام کرنے والے طلبہ کی رہنمائی کے لئے اساتذہ کی ایک مجلس تشکیل دی گئی اور اس کے بعد بھی تحقیقاتی کام کے سلسلہ کو جاری رکھنے کے لئے وظائف جاری کئے گئے۔ جامعہ سے دو بلند پایہ رسالے نکلنے لگے۔ مجلہ عثمانیہ میں طلبہ اور اساتذہ کے علمی و ادبی مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں اور مجلہ تحقیقات علمیہ میں صرف نتائج تحقیق۔

ان طلبہ کے لئے جو اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونی ممالک جانے کا خیال رکھتے ہوں فرانسیسی اور جرمن زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا ان میں طلبائے جامعہ کے علاوہ اساتذہ اور بیرونی اصحاب کو بھی شرکت کی اجازت دی گئی۔

کتب خانہ کی جدید تنظیم کر کے اس میں جدید ضروریات کے تحت ہزاروں کتابوں کا اضافہ کیا گیا تاکہ اس کا ذخیرہ اعلیٰ تعلیم پانے والے طلبہ، اساتذہ اور تحقیق کرنے والوں کے لئے کارآمد ہو سکے۔

ان کے دور صدارت میں جامعہ عثمانیہ کھیل کے میدانوں کا بھی مرد رہا۔ کھیل کے موزوں میدانوں کی عدم موجودگی کے باوجود وہ ہرسال پیہم کامیابیاں حاصل کرتا رہا اور مختلف بیرون خانہ اور اندرون خانہ کھیلوں میں کئی انعامات حاصل کئے خصوصاً فٹ بال اور اس کے بعد چند سال تک کرکٹ کا معیار اس قدر بلند ہوگیا تھا، جس کا رد عمل آج کل نظر آتا ہے۔

ان کی کوششوں سے کلیہ جامعہ عثمانیہ میں کئی ذیلی بزمیں قائم ہوئیں جو انجمن اتحاد کے علاوہ اپنے اپنے حلقہ میں علمی خدمات انجام دیتی ہیں۔ کلیہ کی مرکزی انجمن کے علاوہ اقامت خانوں میں بھی انجمنیں قائم تھیں جو معاشرتی اور علمی مشاغل میں معروف رہتی تھیں۔ ان تمام انجمنوں اور بزموں کے انتخابات موجودہ جمہوری طریقۂ انتخابات کے تحت عمل میں لائے گئے تاکہ طلبہ میں حرکت و حیات پیدا ہو اور وہ تربیت حاصل کرکے مستقبل کی جدوجہد میں کامیابی کے ساتھ حصہ لے سکیں۔

تجربہ بڑھانے کے لئے طلبہ کو ذمہ دارانہ خدمات دی گئیں۔ انجمنوں، اقامت خانوں اور مجلۂ عثمانیہ کے تمام کاروبار اساتذہ کے زیر نگرانی ان کے ہی سپرد کئے گئے۔ اس کے علاوہ تعلیمی سفر کے مواقع بہم پہنچائے گئے کہ بیرون ملک کی تحریکات سے واقفیت حاصل کی جائے۔

وطن سے باہر۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب جب یونیورسٹی کالج لندن کی جوبلی میں شرکت کے لئے لندن گئے تو انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے متعلق ایک وسیع پروپگنڈا کیا اور ان کے خلوص و صداقت نے آن گنت دلوں میں جامعہ عثمانیہ کی عزت و احترام کے جذبات پیدا کردئے۔ انھوں نے مختلف جامعات یورپ کے ارباب حل و عقد کے سامنے جامعہ عثمانیہ کے تعلیمی نقطۂ نظر کی وضاحت کی جس کا نتیجہ خوش آئند نکلا۔ ڈاکٹر رضی الدین نے جو اس وقت وہاں موجود تھے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ

"میں بعض ملاقاتوں میں شریک تھا اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جہاں کہیں انھوں نے جامعہ عثمانیہ کی نمائندگی کی جامعہ کی عزت میں اضافہ ہوگیا۔"

اب جب کہ یورپ کی تقریباً تمام جامعات نے رفتہ رفتہ ہماری جامعہ کی ڈگریوں کو تسلیم کرلیا ہے۔ کون نہیں سمجھتا کہ اس میں ان کی محنتوں کا کافی دخل ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہندوستان کی کئی کانفرنسوں اور مجالس میں جامعہ عثمانیہ کی نمائندگی کی اور ہرجگہ اپنی لیاقت اور جامعہ کی افادیت کا سکہ منوایا۔

یہ سب کام انجام نہ پاسکتے اگر؟ داخلی استحکام کے علاوہ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے جامعہ عثمانیہ کے دوسرے پہلوؤں کی طرف بھی اپنے وقت کا کافی حصہ صرف کیا۔ وہ مجلس اعلیٰ اور مجلس رفقار کے رکن اور وضع اصطلاحات کی کئی مجالس کے صدر رہ چکے ہیں۔ اور ۱۹۲۶ء میں شعبہ سائنس کے میر شعبہ منتخب کئے گئے۔ غالباً یہ امر اکثروں کے لئے باعث تعجب ہوگا کہ انتظامی الجھنوں کے باوجود انھوں نے تدریس کا سلسلہ برابر جاری رکھا اور ایم ایس سی کے طلبہ کی رہنمائی کرتے رہے۔ چنانچہ وداعی جلسہ کے موقع پر جو طلبائے جامعہ کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا سپاس نامہ کے جواب میں کہا:۔

"میں خدا کا بے حد ممنون ہوں کہ اس نے مجھ کو اعلیٰ تعلیم اور ملک کی دیگر اہم خدمات ادا کرنے کے غیر معمولی مواقع عطا فرمائے۔ شاید میں ان مواقع سے خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھاسکتا، اگر مجھ کو ان کے ساتھ ساتھ ہمت اور عزم اور غیر معمولی صحت جسمانی بھی عطا نہ ہوتی۔ سب سے بڑھ کر مجھ کو اس بات کی خوشی ہے کہ میں باوجود انتظامی کاروبار کے آپ کا

معلم بھی رہا ہوں اور اعلیٰ جماعتوں کے درسوں کی تیاری کا لطف (جس کا صحیح اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جو تعلیم کا حقیقی معنوں میں دلدادہ ہے) سالہا سال تک اٹھایا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کلیہ میں میری صدارت کے زمانے میں اتنے نئے شعبے اور انتہائی تعلیمی جماعتیں کھولی گئیں اور ریسرچ کا مشکل کام جس کا ہمارے پاس سابق میں فقدان تھا نہایت آسانی کے ساتھ انجام پاتا رہا۔ ان کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ ریسرچ جرنل کی پہلی جلد جب شائع ہوئی ہے تو ارباب تنقید نے اس کا جس خوبی سے خیر مقدم کیا اس سے جامعہ کا ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کام انجام نہ پا سکتے، اگر میں طلبہ اور اساتذہ کو اپنا ہمنوا اور حقیقی معنوں میں شریک اور ساتھی بنانے میں کامیاب نہ ہوتا۔"

حسن انتخاب۔ مستحق اور قابل طلبہ کے ساتھ خان صاحب کی ہمدردیاں ہمیشہ رہیں۔ ان کی جوہر شناسی کا ثبوت اس امر سے مل سکتا ہے کہ انھوں نے جن طلبہ کو یوروپی وظائف کے لئے منتخب کیا انھوں نے ملک سے باہر اپنے اعزاز کے ساتھ جامعہ کے اعزاز میں بھی اضافہ کیا۔ اس کے علاوہ انھیں جب کبھی موقع ملا تو انھوں نے طلبہ کی رہنمائی کے لئے ایسے اصحاب کا انتخاب کیا جن کے دل میں جامعہ اور اس کے فرزندوں کا درد ہو۔ چنانچہ ان کے عہد صدارت میں اکثر عثمانیین کا تقرر جامعہ کے عہدوں پر ہوا اور اس طرح جامعہ کے فرزندوں کے لئے اپنی مادر علمی کی خدمت کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ یہ نہ صرف ان عثمانیین کی ہمت افزائی کا باعث ہوا جن کی لیاقت اور قابلیت دوسروں کے لئے رہبری کا کام دے سکتی تھی بلکہ جامعہ کو بھی ایسے لوگ مل گئے جنھوں نے اردو میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور جامعہ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے۔

یہ سربہ فلک عمارتیں ـــ یہ مینار و گنبد!! کالج کی عمارتیں شہر میں بکھری ہوئی تھیں تعلیمی نظام الاوقات کی پیچیدگیوں کے علاوہ اس کی وجہ سے طلبہ کی برادری میں یک جہتی کا ماحول پیدا کرنے کے لئے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ عثمانیہ کا خاص تمدن شہر کے شور و شغب میں اس انداز سے نشو و نما نہیں پا رہا تھا کہ وہ اپنی ایک علٰحدہ صورت اختیار کر لیتا۔ اس لئے مولوی عبدالرحمن خان صاحب نے جامعہ کے ارباب اقتدار کو بار بار اس کی جانب متوجہ کیا اور نہ صرف لفظی اور تحریری حد تک بلکہ عملی طور پر بھی اس سلسلے میں سعی کی۔ چنانچہ اڈک میٹ میں جامعہ کی منتقلی ان کی متواتر اور پیہم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے جامعہ کی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے عارضی بلدۃ الجامعہ کی تعمیر میں اپنے تجربات کی مدد سے قیمتی مشورے دئے اور اس کو اپنی نگرانی میں بسایا۔ــ جب تک جامعہ کی سربہ فلک عمارتوں کے مینار و گنبد پر علم کا پرچم لہراتا رہے گا، ان کے در و دیوار عبدالرحمن خاں کے احسانات کا ترانہ خاموشی کے ساتھ الاپتے رہیں گے۔

"لڑکھڑاتی زبان"۔ یہ چند باتیں برسبیل تذکرہ لکھ دی گئی ہیں ورنہ ان کی خدمات جامعہ پر ایک مستقل تفصیلی مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ ان کی خدمتیں اتنی محدود نہیں ہیں کہ صرف چند صفحوں پر بیان کر دی جائیں۔ ان کی یہی مخلصانہ خدمات تھیں جن سے متاثر ہو کر "سپاس نامہ" کے ذریعہ طلبائے جامعہ نے "لڑکھڑاتی زبان" سے کہا تھا کہ :ـــ

> "جامعہ عثمانیہ کی تشکیل اور اس کا قیام جامعات ہند میں ایسی اجتہادی کوشش ہے جس کی علم برداری اور قیادت معمولی استعداد کے رہنما سے ممکن نہ تھی۔ پندرہ سال کے قلیل عرصہ میں ہماری جامعہ نے مختلف ابتدائی دشوار گزار مراحل طے کر کے ہم عصر جامعات میں ایک اعلیٰ مرتبہ حاصل کیا ہے۔ جامعہ عثمانیہ کی توسیع و ترقی اور اس کی

نشو و نما میں یوں تو بہت سے حضرات نے حصہ لیا' لیکن صدر کی حیثیت سے آپ نے دس سال کی مدت میں ان سچے جذبات اور اعلیٰ احساسات کے ساتھ جو قیمتی خدمات انجام دی ہیں وہ جامعہ کی تاریخ میں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔"

اس امر سے ہر شخص واقف ہے کہ جس وقت جناب والا نے کلیہ جامعہ عثمانیہ کی باگ اپنے ہاتھ میں لی۔ اس کلیہ کی حالت بالکل معمولی تھی' لیکن عالی جناب کی خدمت کا دور شروع ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سے اس کے فرزند مختلف محکموں میں طرح طرح کی خدمتیں انجام دینے کے قابل بن گئے۔ اس کے علاوہ ایک سب سے زیادہ خوش گوار اور حوصلہ افزا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کلیہ کے قابل فرزند اپنے اپنے مضامین میں کمال پیدا کرنے کے بعد اسی کلیہ میں معلمی کی کرسیوں پر متمکن ہونے لگے۔ اس اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کی ہمت افزائی عالی جناب کا مستقل نصب العین رہا۔"

متعلم و معلم کے تعلقات کا مسئلہ نہایت نازک اور اہم ہے۔ اس رشتہ کا حقیقی معنوں میں قائم رکھنا بڑی حکمت عملی اور بلند حوصلگی کا کام ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کسی ادارہ کے نظام کو بلند اور اعلیٰ اصول کے ساتھ قائم رکھنے کی کوشش کے دوران میں اربابِ حل و عقد کو متعدد الجھنوں میں پھنس جانا پڑتا ہے' لیکن جناب والا کے حسنِ انتظام نے ثابت کر دیا کہ ایک صاحب رائے اور مدبر انسان' ایک ایسی درس گاہ کو جس میں تقریباً سات آٹھ سو طالب علم تعلیم و تربیت پاتے ہوں' بہ طریقِ احسن چلا سکتا ہے' بشرطیکہ وہ اس کے صحیح نصب العین کو سمجھ لے۔ ایسے اہم کام کو آپ نے جس حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے' اس کا ثبوت کلیہ جامعہ عثمانیہ کے ارتقا میں ملتا ہے۔"

ہمارے کلیہ کی ترقی و توسیع اور اس کے طلبہ کی ذہنی نشو و نما اور ان کے اخلاق و کردار کی درستی میں جناب والا نے جو کامیاب سعی فرمائی' وہ قابلِ ستایش ہے۔ ہم طلبائے کلیہ جامعہ عثمانیہ کسی طرح اس بات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری فلاح و بہبود اور بھلائی کے لئے عالی جناب نے محض ہمارے مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہر قسم کی تکلیف اور ایثار سے کبھی دریغ نہیں فرمایا۔"

طلبائے قدیم کی جانب سے بھی نواب فخر نواز جنگ بہادر نے ان کی اعلیٰ خدمات کا اسی طرح اعتراف کیا' اور اساتذہ صاحبان نے بھی ان کے حسن انتظام کو سراہتے ہوئے ان کی جدائی پر ملال کا اظہار کیا۔ ان تمام کا جواب دیتے ہوئے مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے کہا تھا کہ:۔

"اگرچہ میرا تعلق اب جامعہ اور علی الخصوص کلیۂ جامعہ عثمانیہ سے منقطع ہو گیا ہے لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں جہاں کہیں رہوں گا آپ کا اور جامعہ کا بہی خواہ رہوں گا اور آپ کے ارتقاء کو دیکھ کر خوشی حاصل کروں گا۔"

یہ ہے ان کا مستحکم کردار ۔ ایک باغبان جس نے اپنے ہاتھوں باغ کو سجایا ہو دور رہ کر بھی اس سے کبھی غافل نہیں رہ سکتا۔

میں نے مختلف ملاقاتوں کے دوران میں دیکھا ہے کہ وہ جامعہ کی ترقی سے مسرور ہوتے ہیں اور اس کے متعلق جب کبھی کوئی مایوس کن خبر ملتی ہے تو ان کے چہرہ پر بھی مایوسی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔

احساسِ پستی کی شکست - حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف اجلاسوں اور دوسرے جلسوں میں انھوں نے اپنی تقریروں کے ذریعے سے بار بار اس کا یقین دلایا کہ اردو میں سائنٹفک علوم کی تعلیم بآسانی دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے عملی طور پر بھی اپنی خدمات پیش کیں۔ ترقی اردو کی تاریخ میں اس بیان کے بغیر ایک کمی رہ جائے گی کہ سائنٹفک علوم کو اردو میں منتقل کرنے کے اولیں علمبرداروں میں مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب بھی ہیں۔ اگر وہ اس احساس پستی کو کہ اردو علمی و فنی علوم کے بار کی حریف نہیں ہو سکتی' دلوں سے نہیں نکال دیتے تو ممکن تھا کہ ایک زمانہ تک ہماری قومی زبان جو اپنی فطرت میں ایک لچک رکھتی ہے افسانوں اور شاعری کے ذخیروں ہی میں دبی رہتی۔

تخلیقی ادبیات کا دھارا - انھوں نے نہ صرف اردو کے علمی اور فنی پہلوؤں کو روشن کیا بلکہ تخلیقی ادب کو ترقی دینے میں بھی کوشش کی۔ چنانچہ عثمانیین میں شاعری' افسانہ نگاری اور ڈرامہ نویسی کا شوق' ان ہی کی حوصلہ افزائیوں اور ذاتی دلچسپیوں کا مرہونِ احسان ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں بزم ڈرامہ ان ہی کی انفرادی کوشش اور بعض دوسرے اہل ذوق اصحاب کے تعاون سے قائم ہوئی اور اس بزم کی وجہ سے حیدرآباد میں اردو ڈرامہ نے جو فنی اور ادبی لحاظ سے ترقی کی ہے' اس سے ہر شخص واقف ہے۔ ان کی صدارت کے زمانے میں کئی ایک اردو ڈرامے جامعہ عثمانیہ کے اسٹیج پر کھیلے گئے اور ان کا اثر رفتہ رفتہ ان ڈرامائی کوششوں کا باعث ہوا جو آج کل وسعت اور امتیاز کے ساتھ جاری ہیں۔

کیا محض یہی ؟ ایک بڑے ادارہ کے انتظامی کاروبار کی غیر معمولی مصروفیات کے باوجود انھوں نے تصنیف و تالیف کے لئے بھی وقت نکالا۔ ان کی اکثر تصانیف علمی دنیا میں بڑا وزن رکھتی ہیں۔ انھوں نے نور کی عملی تعلیم میں آسانی پیدا کرنے کے لئے علم المناظر کا ایک مفید آلہ بھی ایجاد کیا جس کے متعلق "جرنل آف سائنٹفک انسٹرومنٹس لندن" بابتہ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں تفصیلات شائع ہوئیں اور جس کو مانچسٹر کے مسرس فلاٹرس اور گارنٹ تیار کرتے ہیں۔ ان کے بلند پایہ مضامین ہندوستان' یورپ اور امریکہ کے معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جامعہ کے لئے انھوں نے طبعیات کی متعدد کتابیں تصنیف و ترجمہ کیں۔ آواز اور برق کے متعلق ان کی مترجمہ کتابیں اور منمیے اپنی جامعیت اور طرز بیان کی وجہ سے اس فن کی بہترین کتابوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ اعلیٰ ریاضی سے متعلق بھی ان کی تالیف قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ ان سائنٹفک تحریروں کے معیار کے متعلق تو کوئی سائنس داں ہی بہتر رائے دے سکتا ہے' جہاں تک مجھ جیسے ناواقف سائنس کا تعلق ہے میں اس کے صرف ایک پہلو کے متعلق اپنا خیال ظاہر کر سکتا ہوں اور وہ پہلو ان کا طرز ادا ہے۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں صاحب نے سائنس جیسے خالص فنی مضمون کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ ایک عامی بھی اس کی بعض اصطلاحوں سے واقف ہو کر اپنے لئے آسانی سے معلومات حاصل کر سکتا ہے۔

یوں تو ان کی اکثر تحریریں جو مختلف موضوعات سے متعلق ہیں' شائع ہوئی ہیں۔ چنانچہ "سب رس" کے کسی گذشتہ شمارہ میں ان کا مضمون "دورِ حاضرہ کے خطرات اور ان سے بچنے کی تدبیریں" نوجوانوں کے لئے ایک قیمتی پیام ہے' لیکن ان کا ڈرامہ

"ضمیمہ" سے جو اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کیا گیا ہے، ان کی نظر کی وسعت اور ان کی قدرت زبان کا پتہ چلتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر کس قدر حاوی ہیں۔ "ضمیمہ" کے متعلق پروفیسر عبدالقادر سروری کی تنقید "سب رس" کے پہلے شمارہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ان کی یہی غیر معمولی علمی وجاہت ہے جس کے باعث وہ امریکہ کی انجمن محققین شہاب ثاقب، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کورٹ اور بزم تشہیر سائنس کے رکن اور حیدرآباد کی سائنس ایسوسی ایشن کے صدر منتخب کئے گئے اور کئی عظیم الشان جلسوں اور ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس ۱۹۲۱ء کی صدارتیں ان کے تفویض کی گئیں۔

اب !! ۔ مولوی عبدالرحمن خاں صاحب نے صدارت کلیہ جامعہ عثمانیہ سے سبکدوش ہوتے ہوئے کہا تھا کہ :۔

> "میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ بقیہ عمر علمی انہماک اور تحقیقاتی کاروبار میں صرف کروں، جامعہ کے باہر انفرادی کوشش سے اس قسم کا کام ہونا بہت مشکل ہے، لیکن ایک شخص کے لئے جس نے عمر بھر ہر حالت میں طالب علمانہ زندگی بسر کی ہو ایسے طریقۂ زندگی کا لطف ہی بالکل نرالا ہے۔"

چنانچہ وہ ہمیشہ علمی انہماک اور تحقیقاتی کاروبار میں مصروف رہتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی صدارت اور نظام کالج کی پروفیسری کے دوران میں تعلیمی مسائل سے ان کی ذاتی دلچسپی نے کئی تجربے حاصل کئے اور ناممکن تھا کہ ایک ہستی جس کی زندگی دوسروں کو فائدہ پہنچانے سے عبارت ہو خاموش رہتی۔ چنانچہ وہ اپنے وسیع تجربوں سے مختلف تعلیمی اداروں کو مستفید کر رہے ہیں۔ مدرسۂ آصفیہ، اسلامیہ ہائی اسکول سکندرآباد اور مدرسہ اعزہ جیسے ترقی پرور اور کامیاب مدارس ان کے قیمتی مشوروں سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔

اس سال وہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی مجلس انتظامی کے صدر ہیں اور کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کے فرائض بھی انجام دیں گے۔ ہمیں توقع ہے کہ ان کی قابلانہ رہنمائی میں یہ کانفرنس جس نے ملک و ملت کی بڑی اہم خدمات انجام دی ہیں، اپنی گذشتہ روایات اور عظمتوں کو پھر حاصل کر لے گی۔

وہی کسوٹی۔ وہی جانچ ۔ ہر چند میں نے اپنی وہ ذمہ داریاں بہ احسن الوجوہ پوری نہیں کیں جو مولوی عبدالرحمن خاں صاحب کے کارناموں پر قلم اٹھانے سے عائد ہو جاتی ہیں۔ تاہم اجمالی طور پر میں نے ان کی باعمل زندگی اور ان کے قیمتی لمحوں کا ایک تصور پیش کر دیا ہے۔

اب آپ ہی غور کیجیے کہ میں نے جس نام کی حقیقی عظمت اس کے کاموں میں تلاش کی ہے وہ ایک باعظمت ہستی ہے یا نہیں؟ ــــ "نہیں" کا گمان تک نہیں کیا جا سکتا۔

میکش

حیدر آباد ایجوکیشنل کانفرنس کے سرگرم رکن
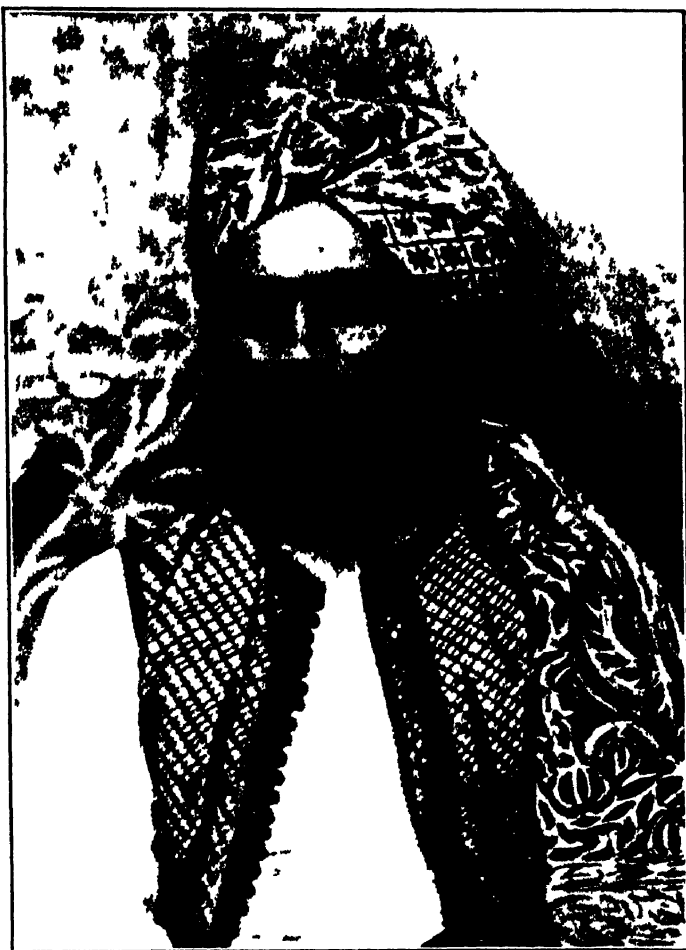
سیّد رضی الدین حسن کیفی

کیفی کی نظمیں

حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں

سرزمینِ دکن اردو شاعری کا گہوارہ رہی ہے۔ اس کی خاک سے سیکڑوں جگمگاتے تارے طلوع ہوئے جو آسمانِ شاعری پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکے۔ تحقیقات، پوشیدہ سرایوں پر سے نقاب اُٹھتی جارہی ہیں اور جیسے جیسے یہ نقاب اٹھتا جارہا ہے، حیرانیوں کے جلو میں نئے نئے انکشافات رونما ہوتے جارہے ہیں۔ یہ خیال بھی کہ قدیم دکھنی شاعری "گل و بلبل" کے بے سروپا افسانوں کا ایک طومار ہے، دُور ہوتا چلا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ، بانیٔ حیدرآباد کا ضخیم دیوان ثبوت دے سکتا ہے کہ آج سے تین سو برس پہلے کا دکنی شاعر بھی فطری شاعری سے غافل نہیں تھا۔ جذبات و احساسات صرف محبت سے متحرک نہیں ہوتے۔ زمانے کے ساتھ اس میں کوئی شک نہیں موضوع بھی بدل گئے ہیں لیکن شاعر کے دل کی دھڑکنیں اب بھی ان ہی احساسات میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہیں جن کا وجود انسانی نفسیات کے باعث ناگزیر ہے۔ مبالغہ اور تصنع سے ہٹ کر صداقتِ شعری جن تخیلات کی تخلیق کرتی ہے وہ کہیں پست ہو کر اور کہیں بلند ہو کر دلوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

کارواں منزل کی طرف

شوریت تھی، شاعر تھے۔ لیکن شاعری میں ایک جمود کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ تخیلات تغزل اور تصوف میں الجھ کر رہ گئے تھے۔ مشاہدہ و نظر کی حدیں زندگی سے دُور ہو کر خیالی دنیا میں محصور ہوگئی تھیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سرسید احمد خاں کی حیات آفریں تحریکات نے قومی احساس پیدا کرنے کا بیڑہ اٹھایا — اور ناممکن تھا کہ شاعر جس کی اعجاز بیانی بعض وقت "جزو پیغمبری" بن جاتی ہے اس حقیقتِ حال سے چشم پوشی کرتا۔ اس کی دنیائے وجدان نے ایک کروٹ لی — چند رندِ بدست "خیالی شاہد و شراب" کی محفل سے اٹھے اور انھوں نے قدیم پیالوں میں نئی شرابِ چھلکانی شروع کی۔ اس جرأت رندانہ کے ساتھ اٹھنے والوں میں مولوی حالی سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

دکن میں کیفی کی شاعری کا بول بالا تھا۔ فیض کے اثر، میکش کے تصوف اور داغ کے تغزل اور لطف زبان کے امتزاج سے انھوں نے اپنی شاعری میں ایک خاص رنگ پیدا کر لیا تھا۔ یاس کی وطنیت سے وہ متاثر ہی تھے۔ ایسے وقت حالی اور اکبر کے نغمے ایک پیام بیداری لئے ہوئے دکن میں پہنچے۔ اور وآلی کے وطن کا یہی آزاد منش سپوت تھا جس نے سب سے پہلے ان نغموں میں اپنے ارتعاشِ دل کو جذب کر دیا اور اس طرح دکن کی موجودہ شاعری کا محرک اسی کو قرار دیا جاسکتا ہے۔

سرسید کی بانگِ درا نے حیدرآباد میں بھی قومی خدمت گزاروں کا ایک کارواں پیدا کر دیا جو جستجوئے منزل میں سرگرم سفر ہوگیا۔ اسی کارواں میں کیفی بھی شریک ہوگئے۔ بعض ہمدرد اہل ملک کی کوششوں سے جب ملک کی تعلیمی ترقی کے لئے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی تشکیل عمل میں آئی تو اس نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اس کے لئے وقف کر دیں۔ اس کے سالانہ جلسوں میں کیفی کی نظمیں حرکت و حیات کی لہر دوڑا دیتی تھیں اور سننے والے ایک عزمِ عمل کے ساتھ محفل سے اٹھتے تھے۔

شاعری آواز، دراصل دل کی آواز ہوتی ہے۔ اس لئے دلوں پر اثر کرتی ہے۔ پھر کیفی جیسے شاعر کی آواز جس کے جذبات و احساسات کی عظمت ہزاروں دلوں میں پوشیدہ تھی کس طرح بے اثر رہتی؟ چنانچہ دکن کے علمی نشاۃ ثانیہ کی ساری ہنگامہ آرائیوں میں ان کے مترنم نغموں کی گونج سنائی دیتی ہے۔

تصویر کا تاریک رخ

دار العلوم کی شصت سالہ جوبلی میں جو نواب سالار جنگ بہادر کے زیرِ صدارت منائی گئی تھی کیفی نے ایک طویل لیکن اثر آفریں نظم سنائی۔ اس نظم میں ایک جگہ انھوں نے موجودہ شاعری کے متعلق اپنے تصور کا اس طرح اظہار کیا ہے۔

جو غزل گو ہیں وہ شہدے ہیں قصائد گو ہیں بھاٹ — مرثیہ گو ہیں شکم پرور، رباعی گو خراب
شاعری کی علتِ غائی ہوئی تفریحِ طبع — اور اب تفریح کے سامان ہیں بے حد و حساب
اک زمانہ تھا کہ شاعر صاحبِ تاثیر تھے — آگ یا گل ان سے کوئی ہوتا تھا کوئی آب آب
شاعر اپنے عہد کے لوگوں کی ہے گویا زباں — لوگ جیسے ہوں گے اس کے شعر ہوں گے انتخاب
شاعری کا رنگ بھی بدلا زمانہ کی طرح — زلفِ شب گوں کٹ گئی پھیکا پڑا لعلِ شرابِ
اب جو شاعر رہ گئے ہیں ان کی حالت ہے عجیب — تین میں گنتی رہی، ان کی نہ تیرہ میں حساب
جذبہ و تاثیر و تخئیل و تلاشِ فکرِ شعر — خود بخود گم کیوں نہ ہوں جب ہو دماغ و دل خراب

"دل و دماغ" کی اس خرابی کو دور کرنے کے لئے انھوں نے شاعروں کو ایک نئے راستے کی طرف گام زن کیا اور اس طرح قومی و ملی شاعری کے ذریعے سے اصلاحِ قوم کی طرف توجہ کی۔

تعلیم نما جب حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا سالانہ جلسہ ۴ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ کو زیرِ صدارت رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری، منعقد ہوا تو باغ عامہ کے ٹاون ہال میں کیفی نے ایک ممتاز مجمع کے روبرو اپنی قومی نظم "تعلیم نما" سنائی۔ عشق و محبت کی داستانیں سنتے سنتے لوگ اکتا گئے تھے اور جب یہ نئی آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی تو گویا وہ چونک سے گئے۔

کیفی نے اس نظم میں تعلیم کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نظم کی ابتدا میں وہ اربابِ ملک کے جمود کا خیال کرکے مایوس نظر آتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ان میں یقین آفرینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

سنو میری سنو، توبہ گناہوں کی خدا شاہد — کہ ہو سکتا ہے جو تم سے کسی سے ہو نہیں سکتا

وہ نمود و نمائش کو ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے بلکہ کمال کو عظمت کا سبب قرار دیتے ہیں اور اپنی ملت کو کمال حاصل کرنے کے لئے نصیحت کرتے ہیں۔

کمال انسان کو عالم سے کر دیتا ہے مستغنی — خدا کے واسطے اے بھائیو سیکھو کمال اپنا

اس کے بعد وہ علم کا حقیقی تصور پیش کرتے ہیں اور تصور کی وضاحت کے پردے میں وقت کی نزاکت کا لحاظ کرتے ہوئے اپنی مستقبل شناسی کا ثبوت دیتے ہیں۔ علم کا نصب العین، ملازمت کے تنگ دائرہ کا پابند ہو گیا تھا اور حیات کے دوسرے شعبوں کی طرف کوئی رخ کرتا نظر نہ آتا تھا۔ اس طرح اشاعتِ تعلیم کا مفہوم، تعلیم یافتہ بے روزگاری میں گم ہوتا جا رہا تھا۔ کیفی، اس نظم کے ذریعے سے علم کے کردار ساز مقصد کو واضح کرتے ہوئے حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کی تشکیل کے متعلق کہتے ہیں۔

یہ سب کچھ سچ ہے کیفی کوئی تم سے یہ اگر پوچھے — کہ بچوں کو کہاں کس طرح سے کیوں کر پڑھائیں گا
جواب ایسے سوالوں کا نہیں ہے بحث سے خالی — اسی کے واسطے قائم ہوئی ہے انجمن اس جا
کہ اہل الرائے و اہلِ علم و فضل و دانش و بینش — اکٹھے ہو کے سوچیں ہم کو کرنا چاہئے کیا کیا؟
اسی دھن میں کئی دن سے تھے ہمدردانِ تعلیمی — کہ اپنے ملک میں بھی ہو کمالِ علم کا چرچا
خدا کا شکر ہے تجویز اب یہ راس آئی ہے — اسی کا آج یہ جلسہ ہوا ہے منعقد پہلا

غرض اس سے یہ ہے ہم کام کچھ کرنے لگیں ایسے	کہ جن سے ہو ترقی حالتِ موجودہ میں پیدا

"تعلیم نما" کا اتنا اثر ہوا کہ ارباب کانفرنس کے غیر معمولی اشتیاق کے پیش نظر رائے بالمکند آنجہانی بی اے کی خواہش پر جو اس وقت

جام حیدری

رکن ہائیکورٹ تھے کیفی کو اس کانفرنس کے دوسرے اجلاس میں ایک فی البدیہہ نظم سنانی پڑی۔ اس نظم کو سر اکبر حیدری کے نام سے منسوب کیا گیا جس کے لئے سر اکبر نے کیفی کا تحریری شکریہ ادا کیا۔

پلا وہ جام صہبائے کرامت ریزا سے ساقی	جھلک جس کی ہو مہرستاں قطرہ جس کا ہو دریا

اس رندانہ ابتدا کے بعد وہ نظم کے آخری اشعار میں کانفرنس کے متعلق کہتے ہیں کہ

رہے تا دورِ ثانی آج کا جلسہ نگاہوں میں	جو تجویزیں ہوی ہیں پاس رکھنا پاس کچھ ان کا
نگاکر اس کا چرکا اپنا ہم مشرب بنا لو تم	جہاں مل جائے کوئی بھی ہو ہندو کیا مسلماں کیا؟

آخری مصرعہ سے ان کی رواداری کا ثبوت ملتا ہے۔ شاعر کا مذہب تعصبات سے بالاتر ہوتا ہے، اس لئے اگر کیفی نے "کفر و ایمان" کو ایک ہی "مذہب انسانیت" کے دو مختلف شعبے خیال کئے ہوں تو اس نقطۂ خیال کی وسعت کو کون شک کی نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ "ہندو کیا مسلمان کیا؟" میں ایجوکیشنل کانفرنس کا لائحہ عمل بھی پوشیدہ ہے اس لئے کہ یہ کانفرنس بلاتفریق مذہب و ملت کام کرنا چاہتی ہے۔

اس نظم سے کیفی کی روانی طبع کا پتہ بھی چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت کس قدر موزوں، ان کی نظر کس قدر وسیع اور ان کی فکر کس قدر بلند تھی!

ناندیڑ میں صدا

ایجوکیشنل کانفرنس کے پہلے ہی جلسے نے بلدہ میں ایک علمی چہل پہل پیدا کر دی اور اس کی تحریکوں نے بلدہ سے بڑھکر اضلاع کو بھی اپنے آغوش میں لینا شروع کیا۔ یہ وقت کی ایک اہم ضرورت تھی۔ اس زمانہ میں جب کہ ہمارا ملک آج سے پچیس برس پیچھے تھا، شہر کے خوابیدہ باشندے، نقل و حمل اور رسل و رسائل کے ذرائع کی وجہ سے خارجی اور داخلی تحریکات سے ایک حد تک واقف ہی رہتے تھے۔ اس لئے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہی وہ انگڑائیاں لینے لگتے تھے لیکن دیہات کے ناواقف باشندوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر بیدار کرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔

چنانچہ اس کانفرنس کا ایک وفد ناندیڑ گیا اور وہاں اس نے ایک جلسہ کیا۔ اس جلسہ میں بھی کیفی نے ایک نظم سنائی جس کے ذریعے سے انھوں نے کانفرنس کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی اور ارباب ناندیڑ کو ترقی تعلیم کی جانب متوجہ کیا۔

وہ ماضی پر افسوس کرتے ہوے کہتے ہیں۔

باتوں میں آج تک تو بہت وقت کھو چکے	وہ وقت جا چکا وہ زمانہ گذر چکا
اب وقت آگیا ہے کہ ہمت کریں بلند	ہر طرح اپنے ملک کی خدمت کریں ادا

اس کے بعد تعلیم کے مفاد کی وضاحت کے ساتھ ان محرومیوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو تعلیم کے نہ ہونے سے اہل ملک کو نصیب تھیں۔

تعلیم پر ہے دار و مدار ترقیات	تعلیم سے ہے نشو و نمائے گل بقا
تعلیم عام ہو تو ترقی نصیب ہو	پھولے پھلے نہال طرب، نخل مدعا
تعلیم کے نہ ہونے سے ایسے ہوے تباہ	سرمایۂ سلف بھی تو ہم نے گنوا دیا
صنعت ہی وہ رہی نہ تجارت ہی وہ رہی	ہیں اہل ملک جہل سے محتاج یا گدا

آخر میں وہ ایجوکیشنل کانفرنس کے رجحانات کو ظاہر کرتے ہوے تعاونِ عمل کی اپیل کرتے ہیں۔

تعلیم عـام کے لئے جلسے ہیں جا بجا ۔۔۔ کی ہے توجہ از سر نو اہل ملک نے

"از سر نو" کہہ کر ماضی کی ظلمتوں کی یاد دلائی ہے ۔

۱ قائم ہے پایہ تخت میں تعلیمی انجمن ۔ صدر اس کے حیدری ہیں سکٹری ہیں مرتضیٰ ۔ خود دیں گے دوسروں سے دلائیں گے کچھ ۔ ہندو بھی ہو تو کیا ہے مسلماں بھی ہو تو کیا

۲ ناندیڑ میں بھی چاہیئے اک ایسی انجمن ۔ جو اس کی ہے غرض ہو وہی اس کا مدعا ۔ سب جانتے ہیں معنوں جہاں کی ہو اس پہ خرچ ۔ کام آئے گا وہاں بھی یہاں بھی لیا دیا

۳ اے اہل ملک حوصلہ مندی دکھائیں گے ۔ اپنی مدد خود آپ کریں گے بلا ریا ۔ اے اہلیان خطۂ ناندیڑ، دیتے جاؤ ۔ سمجھے تم اس کلام کو درویش کی صدا

رایت علم ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ میں جو مولوی شیخ حبیب الدین صاحب مرحوم بی اے صدر محاسب سرکار عالی کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا کیفی نے پہلے جلسہ کی طرح ایک پر جوش نظم سنائی۔ یہ جلسہ اورنگ آباد میں بڑی دھوم دھام کے ساتھ ہوا تھا اورنگ آباد جیسے شہرت نواز اہم تاریخی مقام پر کیفی کا یہ نغمہ مستقبل کے لئے ماضی کی ایک آواز بازگشت تھا۔

اس نظم کی خصوصیت اس کا غیر معمولی جوش ہے۔ الفاظ سے بھی رجائیت کا جذبہ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے۔ ابتداء کی طرح ان میں قنوطیت نہیں پائی جاتی بلکہ حالات کے نقشے کو بدلتا ہوا دیکھ کر توقع اور یقین نے ناامیدیوں کو ٹھکرا دیا ہے۔

۱ ہم نے کیا ہے رایت علم و ہنر بلند ۔ آجائے اس کے سامنے جو پست، ہر بلند ۔ پست و بلند دہر پہ شاہد ہے آفتاب ۔ ہے وقت شام پست تو وقت سحر بلند

۲ ہم کون ہیں ترقیٔ تعلیم ملک خواہ ۔ آواز جن کی پست ہے جن کی نظر بلند ۔ ہر فرد قوم قوم ہی کیا خورد کیا بزرگ ۔ اب اس میں پست قد ہو کوئی یا ہو سر بلند

۳ پستی بھی کام کی ہے بلندی بھی کام کی ۔ کب؟ جب کہ پست وقت پہ ہوں وقت پر بلند ۔ فی الجملہ ہم سلیقے سے جڑ جائیں ایک دگر ۔ تو پست مبتدا کی بھی نکلے خبر بلند

وہ حاضرین کی نفسیات کا مطالعہ کر کے اپنی طویل نظم کو دلچسپ بنانے کے لئے ایک داستان سناتے ہیں اور اسی داستان سے تشبیہ کا بھی کام لیتے ہیں۔

۱ تم نے سنی ہے ایک افیمی کی داستان ۔ جس سر نگوں کے قصر کے تھے بام و در بلند ۔ نوکر سے اپنے اس نے کہا دیکھ کیا گرا؟ ۔ کیا بات ہے؟ ہوا ہے یہ کیا شور و شر بلند

۲ پینک میں ایک روز گرا اپنے بام سے ۔ آواز ایک دھم سے ہوئی مختصر بلند ۔ نوکر نے عرض کی کہ "میاں آپ ہی گرے" ۔ فرماتے ہیں یہ سن کے وہ آقائے سر بلند

۳ "جب ہم گرے تو ہائے بڑی سخت چوٹ آئی ۔ شور و بکا و گریہ ہوا بیشتر بلند

توقع اور یقین کی دنیا میں بھی وہ ایک وقت گھبرا جاتے ہیں! اور اس کی وجہ ان کا احساس پستی نہیں بلکہ ان لوگوں کی بے حسی ہے جن کو وہ "بے درد گوش ناشنوا" سے تعبیر کرتے ہیں۔

بے درد گوش ناشنوا کہتے ہیں "خموش" ۔ منشائے درد دل ہے کہ "فریاد کر بلند" ۔ بیٹھا ہوا گلا ہے تو فریاد کیا کریں ۔ کیوں کر ہو کوئی طائر بے بال و پر بلند

فریاد میری کون سنے بے ٹھکانہ ہو ۔ گویا کہ ایک طوطی نقار خانہ ہوں

اس کے بعد وہ ایجوکیشنل کانفرنس کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہیں

ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں اس انجمن کے لوگ ۔ پیدا ہوں جس سے ملک میں ہر ایک فن کے لوگ ۔ سرسبز ابر علم سے ہو کشور نظام ۔ ہوں بہار فضل و کمال اس چمن کے لوگ

یہ خاص کوشش ہیں کہ تعلیم عام ہو ۔ سانچے میں علم و فن کے ڈھلیں سب دکن کے لوگ ۔ وہ وقت جلد آئے خدا وہ بھی دن دکھا ۔ جس دن کی آرزو میں ہیں اس انجمن کے لوگ

کوشش کرو کہ نام کے مانند کام ہو ۔ وہ کام ہو کہ جس سے زمانے میں نام ہو

آخری بند میں اپنے ملک کی عبرت ناک حالت کا نقشہ کھینچ کر اس میں درد کی رنگ آمیزی کرتے ہیں۔ اور بتاتے ہیں کہ اہل ملک کے غرور ہمہ دانی نے ان کے حوصلوں میں کس قدر خامی پیدا کر دی ہے۔

خوش خوش اسی میں ہیں کہ کچھ آتا نہیں ہمیں سر میں سمائی ہے سر اہل دول ہیں ہم ان چھوٹی شیخیوں میں گرفتار خواب ہیں اپنے دماغ کے لئے وجہ خلل ہیں ہم

اسلامیوں کو دعوئ ہمہ دانی زیب ہیں ہندو سمجھ رہے ہیں کہ اب اجنبی ہیں ہم کب تک رہے جبیں پہ یہ ٹیکا کلنک کا دنیا میں کیا برائے شگار اجل ہیں ہم

آخر میں اپنا پیام سناتے ہیں اور اس پیام کے اثر کو عملی صورت میں دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔

زندہ دلی کا کچھ تو نمونہ دکھاؤ تم ثابت کرو کہ صاحبِ علم و عمل ہیں ہم دیکھو ہیں کہ شعلۂ شمع شعور ہیں رخشانی ستارۂ صبح ازل ہیں ہم

پرچم علم

ایجوکیشنل کانفرنس کے تیسرے سالانہ جلسہ ۱۳۳۶ھ میں جو زیر صدارت نواب عماد الملک مرحوم ٹاؤن ہال باغ عامہ میں منعقد ہوا کیفی نے "پرچم علم" کے عنوان سے ایک نظم سنائی۔ اور اس شان کے ساتھ سنائی۔

پہلے بند میں وہ اہل ملک کی بے حسی کا پر شکوہ کرتے ہیں۔ لیکن شکوہ میں گزشتہ اثرات کا بھی ایک پہلو ہے۔

آواز ہم نے چیخ کے ناحق بلند کی چبھتی ہے دل میں جب بھی دلِ دردمند کی آہ دلِ شکستہ کہاں گوش دل کہاں تقدیر آزماتے ہیں ٹوٹی کمند کی

سن لیجئے یہ ایک دکھی کی پکار ہے صورت تو زہر کی ہے حلاوت ہے قند کی سن لی جو بات آپ نے احسان آپ کا سن کر کیا عمل بھی تو منت دوچند کی

عام لوگوں سے ہٹ کر ان لوگوں کا حال بھی عجیب ہے جن کو تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے، وہ اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتے جو تعلیم یافتہ ہونے کے باعث ان پر عائد ہو جاتی ہیں۔ "خود پسندی" ان کا شعار ہے اور "سستی" ان کا عمل۔

سوچو تو جہل و علم میں اب فرق کیا رہا غفلت انھوں نے آپ نے سستی پسند کی بے سود شاعری کی طرح وعظ و پند ہے دیکھو جسے وہ اپنی جگہ خود پسند ہے

ان میں ایسے لوگوں کا بھی ایک گروہ ہے جن کے سروں میں "لیڈر" بننے کا سودا تو ہے لیکن ان کا جذبۂ عمل خلوص سے ناآشنا۔

ہر ایک اپنے زعم میں لیڈر ہے قوم کا ہر ایک اپنی رائے میں اہل کمال ہے پر زور اختلاف ہے پر جوش اغراض دیکھو جو غور سے تو کڑی کا ابال ہے

پس یہ رفارم اور یہی ہے رفاہِ عام اخلاص ہے حرام رعونت حلال ہے

"خود ساختہ قائدوں" کا یہ خاکہ اس قدر سچا ہے کہ اس کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

اس کے بعد ان کو اپنے وطن کے "سب سے بڑے محسن" یعنے اپنے بادشاہ کا خیال آتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے احسانات اور عنایتوں کا وہ عزت و احترام کے بے پایاں جذبات کے ساتھ اظہار کرتے ہیں اور اہل ملک سے پوچھتے ہیں کہ کیا مالک مجازی کی یہ نوازش ہائے پیہم اپنے اندر ایک درس عمل تو پوشیدہ نہیں رکھتیں؟ اگر احساس احسان مندی، فرائض شناسی میں مدد دے سکے تو وہ کہتے ہیں کہ:۔

کس حال میں ہماری ہے اولاد دیکھئے تعلیم یافتوں کی بھی تعداد دیکھئے ہم کس ہوا میں بیٹھے ہیں اس کو بھی سوچئے کس طرح عمر ہوتی ہے برباد دیکھئے

سنجیدگی سے دل میں ذرا غور کیجئے کیسی پڑی ہے ہم پہ یہ افتاد دیکھئے

تین سال کی اس متواتر چیخ پکار کے متعلق جو ایجوکیشنل کانفرنس کے اسٹیج سے بلند ہو رہی ہے وہ پوچھتے ہیں کہ:۔

کچھ نظم و نثر کی ہوئی تاثیر یا نہیں؟ کچھ آپ نے بھی سوچی ہے تدبیر یا نہیں؟ اتنے دنوں سے دیکھ رہے تھے جو آپ ہم اس خواب کی بھی ہے کوئی تعبیر یا نہیں؟

یہ چیخ اور پکار بھی کچھ کام آئے گی جاگے گی اہل ملک کی تقدیر یا نہیں؟ کب تک رہیں گے قعر مذلت میں سرنگوں اٹھیں گے اپنے بل پہ زمیں گیر یا نہیں؟

اس کے بعد وہ ہمت بڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مایوسیوں کے باوجود ہمت نہ ہارنا چاہیئے۔

جب تک ہے دم میں دم کبھی ہمت نہ ہارنا ٹوٹے جو کوہِ غم تو خوشی سے سہارنا اے ممبران انجمن اے بانیانِ خیر ہم پھر یہی کہیں گے کہ ہمت نہ ہارنا

جب دکھ چکے ہیں پاؤں گزرگاہِ سیل میں جس طور جس طریق سے گذرے گذارنا گیتی زمیں ہمیں سخنے ہست گوش کن تا ساغرت پُر است بنوشان و نوش کن

دامنِ آرزو اسی سالانہ جلسہ کے دوسرے اجلاس میں سر اکبر حیدری اور نواب عماد الملک کی فرمائش پر انھوں نے یہ نظم سنائی۔ اس نظم میں کیفی نے اہلِ ملک کی اقتصادی حالت بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں تعلیم بہت گراں خرچ ہوگئی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ایجوکیشنل کانفرنس ایسے شریف لیکن نادار طلبہ کی اعانت کی طرف متوجہ ہوئی جو مالی الجھنوں کے باعث تعلیم کو خاطر خواہ طور پر حاصل نہیں کر سکتے۔ درد اور اثر اس نظم میں جابجا جھلکتا ہے۔ وہ فقیری کے بھیس میں تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں اور خوئے سوال کو برا نہیں سمجھتے اسی کے ساتھ سفارش کے اس عہد میں باثر اصحاب سے اپنی گدائی کے لئے سفارش مانگتے ہیں۔

جناب حیدری صاحب ہوں یا عماد الملک سفارش اتنی کریں حاضریں سے اٹھ کر کہ اس فقیر کی جھولی میں کچھ نہ کچھ ڈالیں زبانِ پاک میں اللہ نے دیا ہے اثر
صدا فقیر کی گر تم سنو گے کیا ہو گا ذرا ادھر بھی نظر پھینکنا بھلا ہوگا

دردِ دل کیفی سے جلنے والوں کی ایک جماعت پیدا ہوگئی جو ان کو کسی طرح نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ خلوص اور عمل کے راستے میں ہمیشہ رکاوٹیں رہی ہیں۔ کیفی نے اسی جماعت کی اغیار پرستی سے متاثر ہو کر یہ نظم ایجوکیشنل کانفرنس کے چوتھے سالانہ جلسہ میں، جو زیر صدارت نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمٰن خاں شیروانی آنریری سکرٹری آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس ۱۲ و ۱۳ ذی حجہ کو منعقد ہوئی تھی، سنائی تھی۔ ان کو عداوتوں کا کوئی خوف نہیں اور نہ ستائش و صلہ کی پروا۔۔ ان کا کام خود انعام ہے۔ عید قربان کے دنوں میں ایثار و قربانی کا یہ پیکر کس شانِ استغنا کے ساتھ اپنی نظم سناتا ہے۔

خیمۂ ابر بھی ہے اوٹ میں خورشید بھی ہے — کچھ چکا چوند بھی ہے کچھ ہوس دید بھی ہے
یاس کی یاس ہے امید کی امید بھی ہے — کہ چھری تیز بھی ہے تہنیتِ عید بھی ہے
کٹنے والوں کے گلے ہیں کہ ادھر کٹتے ہیں — حصے بخرے ہیں کہ بٹتے ہیں جدھر بٹتے ہیں
بھیڑ بکروں کو کیا ذبح تو کیا ظلم کیا — ظلم جو اس کو سمجھتا ہے یہ ہے اس کی خطا
عید کا روز ہے ساقی مرے ساقی ادھر آ — ترے قربان مری جان پلا، جلد پلا
کہ خیالاتِ پریشان چلے آتے ہیں — مرے کھوئے ہوئے اوسان چلے آتے ہیں
بے خودی پردۂ اربابِ خرد ہے ساقی — تیرے میخانے میں خیرات کی مد ہے ساقی
بے نیازانہ ادا کی کوئی حد ہے ساقی — المدد المدد اب وقتِ مدد ہے ساقی
کب تک آخر ہدفِ اہلِ حسد کیفی ہو — نیک ساقی ہو تو کس طرح سے بدکیفی ہو
کیوں حسد مجھ پہ کرے کوئی لیاقت والا — کہ نہیں ہوں میں کوئی دولت و ثروت والا
ہاں مگر بات ہے اتنی کہ ہوں قسمت والا — مرے ساقی نے بنایا ہے مجھے متوالا
بے خودی میں بھی مگر اتنی خبر لگتی ہے — کہ مجھے ایک زمانہ کی نظر لگتی ہے
نہیں معلوم کہ ہے مجھ سے کوئی کیوں بدظن — آج تک میں نے کسی کو نہیں سمجھا دشمن
جانتے ہیں مجھے اک عمر سے اعیانِ دکن — فخر ہے میرے لئے خدمتِ ابنائے وطن
للہ الحمد ملا ہے مجھے کیا خوب وطن — حیدرآباد دکن ہے مرا محبوب وطن

آج تک امن سے چالیس برس اس میں رہا — بزم عشرت میں رہا علم کی مجلس میں رہا
نہ کھٹک بن کے کبھی دیدۂ نرگس میں رہا — میں اسی طرح کا خود بن کے رہا جس میں رہا
عمر ہنس بول کے اب تک تو گزاری ہے یہاں — آب و دانہ نہیں معلوم کہ لے جائے کہاں

اس کے بعد وہ اپنے وطن والوں سے یہ کہتے ہوئے کہ "خوش رہو ہم وطنو! میں نہ رہا تو نہ رہا" چند نصائح کرتے ہیں۔

ایک تو ترکِ رزائل ہے اسے یاد رکھو — دوسرا کسبِ فضائل ہے اسے یاد رکھو
مختصر حسنِ شمائل ہے اسے یاد رکھو — منبع عیب و ہنر دل ہے اسے یاد رکھو
شر بھی ہے خیر بھی ہے قہر بھی ہے مہر بھی ہے — بر بھی ہے بحر بھی ہے موج بھی ہے لہر بھی ہے
بے عدو گنج جواہر کا تمسک سمجھو — دل بڑی شئے ہے مری بات نہ بے تک سمجھو
برگِ گل سے بھی زیادہ اسے نازک سمجھو — بارگاہِ صمدیت کا تبرک سمجھو
دل کسی کا نہ دکھایا تو بڑا کام کیا — دل دکھوں کی جو خبر لی تو بڑا نام کیا
دل کشادہ ہے کبھی اور کبھی تنگ بھی ہے — مایۂ صلح بھی ہے معرکۂ جنگ بھی ہے
باعثِ نام بھی ہے یہ سبب ننگ بھی ہے — موم کا موم بھی ہے سنگ کا یہ سنگ بھی ہے
اس سے ہے شادی و غم عیش و الم وابستہ — مختلف رنگ کے پھولوں کا ہے اک گلدستہ
دل میں اک درد ہے اظہار کروں یا نہ کروں — دل سے اک آہ شرربار کروں یا نہ کروں
اپنا رخ جانبِ اغیار کروں یا نہ کروں — نیند کے ماتوں کو بیدار کروں یا نہ کروں

دل کا رہ رہ کے تقاضا ہے کہ فریاد تو کر
نہ سنے کوئی مگر اپنا سبق یاد تو کر

چار سال کے جلسوں میں پڑھی ہوئی نظموں کا اگر ایک عمومی نظر سے جائزہ لیا جائے تو ان میں تدریجی جوش کا مظاہرہ نمایاں نظر آئے گا۔ قومی زندگی کے راستے میں کیفی کے قدم جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ان کا قومی جذبہ بھی ابھرتا گیا۔

افسوس ہے کہ پانچویں کانفرنس سے پہلے ہی ان کا انتقال ہوگیا اور ان کی آوازیں ختم ہوگئیں۔ لیکن انھوں نے اپنے جو نقوش چھوڑے ہیں زمانہ کی کوئی کروٹ ان کو نہیں مٹا سکتی۔

کیفی ایک حقیقی شاعر تھے اس لئے ان کی شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔

میکش

بچوں سے

سب رس کی بچوں اور بچیوں کو مضمون لکھنے کے لئے "مدرسہ کا پہلا دن" عنوان دیا گیا تھا لیکن اب بہت کم مضمون وصول ہوے۔ سید سعید صاحب (مدرسہ عالیہ) کا مضمون سب سے اچھا رہا جس کو اس شمارہ میں شایع کیا گیا ہے۔ آئندہ مہینے کے مضمون کا عنوان "طالب علم کے اخلاق" ہوگا۔ توقع ہے کہ یہ مضمون بہت دلچسپی سے لکھا جائے گا۔

"اقبال نمبر" کے انعامات کا تصفیہ ہوگیا ہے جو یہ ہے۔

۱۔ "اقبال نے بچوں کی کیا خدمت کی" از ح۔ انصاری متعلم رزیڈنسی مڈل اسکول (انعام عطیہ خواجہ حمید الدین صاحب مہتمم سب رس)

۲۔ "دوستوں کا مکالمہ" از مرزا عثمان بیگ صاحب متعلم سٹی کالج (انعام عطیہ معین الدین احمد صاحب انصاری)

۳۔ "محسن قوم اقبال (نظم)" از لطیف النسا بیگم صاحبہ (انعام عطیہ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز و سراج الدین احمد صاحب)

یہ سب انعامات نواب مہدی یار جنگ بہادر صدر ادارۂ ادبیات اردو پہلی اگسٹ کو ادارہ کے سالانہ جلسہ میں تقسیم فرمائیں گے۔

پہیلیوں کے حل:۔

جولائی کے سب رس کی پہیلیوں کے صحیح حل یہ ہیں۔ (الف) انڈا، مہتر، (ب) انڈا، ڈھول۔ (ج) چراغ۔

حسب ذیل سب رس کی بھائیوں نے وقت پر حل روانہ کیے۔ حبیب شمس سٹی کالج (۳) محمد اسد اللہ خاں سٹی کالج (۳) لائق علی خاں سٹی کالج (۲) جن کے حل وقت کے اندر وصول نہیں ہوے ان کے نام درج نہیں کیے جاتے۔ کئی بچوں اور بچیوں نے نئی پہیلیاں بھی بھیجی ہیں لیکن آئندہ سے وہی نئی پہیلیاں چھاپی جائیں گی۔ جن کے ساتھ پہلی پہیلیوں کے حل بھی روانہ کئے گیے ہوں۔

انعامی معمہ:۔

سب رس کے معاون مسیح الدین خاں متین نے ایک انعامی معمہ بھیجا ہے جس کے حل پر ایک کتاب بطور انعام دی جائے گی۔ کتاب وصول ہو چکی ہے۔ دوسرے سب رس کی بھائی اور بہنیں بھی اسی طرح انعامی چیزیں بھیج کر سب رس کی دلچسپیوں میں اضافہ کریں۔

ادارہ

اشارے آڑے

(۱) اس معمہ کا حل ـــــ میں شایع ہوگا۔
(۲) گولکنڈہ کا غدار وزیر (۳) ملکہ مصر کا نام (۴) موت کو خوشی کے ساتھ لبیک کہنے والا مسلم (۵) چہرہ کا خوبصورت حصہ (۶) آگرہ کی مشہور عمارت (۷) جس شخص کو اپنے ـــــ سے محبت نہیں ہوتی وہ کسی سے سچی محبت نہیں کرسکتا۔ (۸) سچا ـــــ وہ جس کو اپنی دھن میں کھانے پینے کی بھی پروہ نہ ہو...... (۹) بمعنی شیر ببر (۱۰) دارالحکومت۔

				ر		س
٥		م	ج		ی	۲
	ا			ل		۳ ذ
		ل		ب		۴ ا
			ا		خ	٥
			م		ا	٦
				ن		۷
			ر		ا	۸
			ف		ض	۹
					و	۱۰ ر

تارا

اے رات کو جگمگانے والے
اے دن کو نظر نہ آنے والے

تبلا تو مجھے کہ کون ہے تُو
کیا رنگ ہے تیرا اور کیا بُو

شعلہ ہے ذرا سا آگ کا، یا
ننھا سا چراغ ہے خدا کا

او ننھے سے جگمگاتے تارے
سچ سچ یہ بتا دے مجھ کو پیارے

ہر رات کو یوں چمک چمک کر
چھپتا ہے کہاں تو صبح جا کر

ہر چند کہ دن میں تجھ کو ڈھونڈا
پایا نہ پتہ ترے مکاں کا

بس ہو تو میں آسماں پہ آؤں
اور توڑ کے تجھ کو ساتھ لاؤں

تُو تو ہے مزے سے آسماں پر
دل میرا ترستا ہے یہاں پر

دم بھر کے لئے تو پاس آجا
بس ہاتھ میں آکے پھر چلا جا

آنکھیں تری روشنی سے بھر لوں
کھیلوں ترے ساتھ، پیار کرلوں

لطیف النساء بیگم

کاش میں ایسا نہ کرتا

ایک سبق آموز افسانہ

جب میری عمر گیارہ سال کی تھی ایک نوجوان شخص ناصر نامی ہمارے پاس نوکر ہوا۔ یہ جوا بہت کھیلا کرتا تھا۔ کئی مرتبہ میں نے اسے دوسرے نوکروں کے ساتھ بھی کھیلتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر مجھ میں بھی دن بدن جوئے کا شوق بڑھتا گیا۔ آخرکار میں نے ناصر کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ اگر میں کسی دن ہار جاتا تو والدہ کے روپیوں کے صندوق سے ایک دو روپے تو ضرور اڑا لیتا۔ میری عادت اس قدر بڑھ گئی کہ میں اگر کسی دن نہ کھیلتا تو میری طبیعت کسی نامعلوم وجہ سے کبیدہ ہو جاتی۔ میری اس خفیہ کارروائی سے میرے والدین بالکل واقف نہ تھے۔ اور اگر کسی دن میرے پاس بہت پیسے رہتے تو وہ کبھی یہ بھی خیال نہ کرتے کہ مجھے کہاں سے ملے ہیں اور کس نے دئے۔

۲

جمعہ کا دن تھا تعطیل تھی اور میں بہت خوش تھا کہ آج خوب موقع ملے گا۔ میں اور ناصر کوٹھے پر چڑھ گئے اور تاش کھیلنے

سب میں
گئے۔ آج کا ایسا منحوس دن تھا کہ میں نے ایک پیسہ بھی نہ جیتا جو کچھ بھی تھا ہار گیا۔ میں اپنی قسمت کو بار بار کوسنے لگا۔ اور پیسے فراہم کرنے کی بہت سی کوششیں کیں۔ مگر بے سود ناچار میں نے مجبور ہو کر ناصر سے کچھ قرض لیا مگر وہ بھی ہار گیا۔

۳

ایک دن کا ذکر ہے کہ شام کے وقت والد صاحب کے پاس کہیں سے تقریباً چار سو روپے آئے۔ والد نے مجھے رقم دے کر کہا کہ تجوری میں رکھ آؤ۔ میں نے رقم لی اور تجوری میں رکھنے کی غرض سے آگے بڑھا۔ روپیوں کو دیکھتے ہی میرے منہ میں پانی بھر آیا اور جوا کھیلنے کے لئے بکمال چالاکی دس روپے نکال لئے اور باقی روپے تجوری میں۔ میں نے چرائے ہوئے روپے اپنے کمرے میں میز کی دراز میں رکھ دیئے۔ کھانا کھایا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ یہاں تک کہ دنیا و مافیہا کا کچھ دھیان نہ رہا۔

۴

جب رات کو والدین نے روپیوں کا حساب کیا تو دس روپے کم نکلے۔ والد کا گمان مجھ پر تھا مگر والدہ نے کہا کہ میرا لڑکا ہرگز چور نہیں ہو سکتا آخر کار والدین نے میرا تمام کمرہ ڈھونڈ ڈالا۔ اور روپے میز کی دراز سے مل گئے۔ والدین غصے سے لال پیلے ہو گئے مگر رات کا وقت تھا مجھ کو اٹھانا مناسب نہ سمجھا اور خاموش ہو رہے۔

۵

صبح کو اٹھا ہاتھ منہ دھویا۔ ناشتہ کیا۔ اور کتابوں کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ یکایک مجھے کل والے روپے یاد آئے۔ مگر دیکھا تو میز کی دراز خالی خولی تھی۔ اسی کشمکش میں تھا کہ ملازمہ نے آ کر کہا کہ آپ کو ابا جان بلاتے ہیں۔
میں سمجھ گیا کہ ضرور میری چوری پکڑی گئی۔ اور والد ہی نے دراز سے روپے نکال لئے ہیں "مجبوری کا دوسرا نام صبر" ڈرتا ڈرتا والد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ والد نے مجھے اپنے پاس بلا کر بٹھایا اور کہنے لگے کہ تمہارے پاس دس روپے کہاں سے آئے۔ میں نے صاف انکار کیا۔ مگر والدین نے مجھے بہت ڈرایا اور مجھے اپنے جرم کا اقرار کرنا ہی پڑا۔ اس واقعہ سے میرے ضمیر نے مجھ پر بہت کچھ لعنت، ملامت، اور نفرین کی اور میں نے پورے طور پر عہد کر لیا کہ آئندہ کبھی جوئے کی نوبت میں نہ پھنسوں گا۔

۶

اس واقعہ کو گزرے ہوئے پورے دس سال ہوتے ہیں اور میاں ناصر تو ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ والد بھی ہمیں ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئے ہیں۔
اب میری عمر ۲۱ سال کی ہے میں والدہ کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔ آج کل میرے گھر کے کاروبار اعلیٰ پیمانہ سے چل رہے ہیں۔ میرا جوا نہ کھیلنے کا عہد اب بھی قائم ہے۔ کبھی کبھار میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ گھوڑ دوڑ میں کچھ روپیہ لگاؤں مگر ضمیر کی آواز سے مجبور ہو کر میں اپنے عہد پر قائم ہوں اور ہر جواری سے اس سبق آموز واقعہ کے پڑھنے کی استدعا کرتا ہوں۔

محمد کمال خاں متعلم
(مدرسہ عالیہ)

نظام ساگر کی سیر

ہم نے نظام ساگر کو تین دن کے لئے جانے کی ٹھانی تھی اور ضروری انتظام کے بعد ایک دن موٹر میں ہم چھ آدمی روانہ ہوئے۔ میرے سوا امی جان بڑے اور چھوٹے ماموں اور بڑی آپا بھی تھیں۔ کھانے کی بہت سی مزے مزے کی چیزیں ساتھ تھیں اور ہم نے ایک کیامرا بھی ساتھ رکھ لیا تھا۔ راستے میں ہم بڑے خوش تھے کبھی گاتے تھے کبھی ہنستے تھے اور طرح طرح کے مناظر دیکھ کر جی خوش ہوتا تھا کہ ہمارے ملک میں کیسے کیسے خوشنما مناظر موجود ہیں۔ جب ہم (۶۰) میل کا سفر طے کر چکے تو پھٹ کر ایک ٹائر پھٹا خیر خدا کا شکر ہے۔ کہ ہمارے پاس ایک زائد ٹائر تھا کہ وقت ضرورت کام آئے۔ میرے بڑے ماموں جو بڑے مذاقی ہیں انھوں نے جب دیکھا کہ ہم سب سوائے امی کے اتر کر ٹائر لگانے میں شوفر کی مدد کر رہے تھے۔ تو انھوں نے جلدی سے ہماری ایک تصویر لے لی جب دوسرا ٹائر درست ہوگیا تو پھر ہم نے اپنا سفر شروع کیا اب سب خوش اور اطمینان کے ساتھ جا رہے تھے۔ خدا کی شان دیکھئے کہ (۳) میل بھی طے نہ ہوئے تھے کہ پھر پھٹ سے وہی ٹائر پھٹا جو درست کر کے لگایا گیا تھا۔ اب تو سب کے ہوش جاتے رہے۔ اور خاص کر ڈرائیور کی حالت دگرگوں ہوگئی۔ ہم سب املی کے ایک پیڑ تلے بیٹھ کر سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے۔ ہماری اس جماعت میں ایک میں ہی سب سے کم عمر تھی وہی مذاقی ماموں صاحب نے مجھے ڈرانا شروع کیا اور کہا کہ رات کو اگر ہمیں یہیں رہنا پڑے تو کہاں ٹیک گے۔ اور پاس روشنی بھی نہیں ہے۔ اگر جنگلی جانور حملہ کرے تو کیا ہوگا بہرحال اس طرح کی ڈراؤنی باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ادھر سے دو آدمی گزرے تو ہم نے ان سے پوچھا کہ کیا یہاں قریب میں کوئی گاؤں ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہاں سے ۴ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں کوم نور ہے سب نے خدا کا شکر ادا کیا۔ سب کو ناگوار گزرا کہ موٹر کو اس طرح ڈھکیلتے ہوئے لے جائیں۔ لیکن مجبوری تھی سب موٹر میں بیٹھ گئے سوا ان دو لوہ بچارے ماموں کے جو دھوپ میں موٹر کے ساتھ ساتھ ٹائروں کی طرف نظر جمائے چل رہے تھے۔ دھوپ کی تیزی اور بھوک سے چڑچڑاہٹ اور بات بات پر غصہ آتا تھا۔ گاؤں والوں کا موٹر کو دیکھ کر ہنسنا تو اور بھی غضب ڈھا رہا تھا پانچ میل کی رفتار سے موٹر ٹھمکتے ٹھمکتے۔ چل رہی تھی بعض وقت ہم بھی ہنستے اور بعض وقت موٹر کی حالت پر ترس کھاتے تھے۔ کہ اس کی بنڈی سے بدتر حالت بن گئی ہے۔ خدا خدا کر کے وہ گاؤں آگیا اور ہم نے ایک گھنے درخت کے نیچے موٹر روک لی۔ درخت کے سامنے ہی ایک بہت بڑی پرانی مسجد تھی اور مسجد کے قریب ہی ایک بہت وسیع تالاب تھا جس کا کٹہ ایک میل کا ہوگا ہم نے مسجد میں بیٹھ کر کھانا کھایا لیکن کھانا کس کے حلق سے اترتا تھا جب کہ واپسی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی تھوڑی دیر کے بعد ادھر سے ایک بڑے میاں گذرے امی جان کے دل میں یہ آیا کہ اب یہاں رہنا نہیں ہو سکتا کھانا رکھ کر کیا فائدہ اس غریب مسلمان بوڑھے کو دے کر ثواب حاصل کریں اور اگر اللہ میاں خوش ہوگئے تو شاید جانے کی کوئی صورت کر دیں۔ انھوں نے اپنا ارادہ ہم پر ظاہر کیا ہمیں بھی یہ بات پسند آئی اور ہم نے بڑے میاں کو بلا کر کھانا دیا اور کھانے سے فراغت پا کر ان سے باتیں کرنے لگے۔ اور سب کے سب ان کو نانا کہہ کر پکارنے لگے۔ باتوں باتوں میں ہم نے معلوم

کرلیا کہ وہاں بھی سرکاری بس آتی ہے۔ یہ سن کر سب کو ذرا تسکین ہوی جب ہماری واپسی کی خوشی ہوتی تو موٹر کی فکر ہوتی کہ معلوم کتنے دن اس کو یہاں پڑے رہنا ہوگا۔ دوسرا دن انگریزی مہینوں کا نیا سال تھا۔ ٹائروں کی دکانیں بند ہونے کا ڈر تھا۔ اس سے بھی زیادہ۔ ڈر یہ تھا کہ اگر ابا کو خبر ہوگی کہ موٹر جنگل میں پڑی ہے......... تو پھر غضب ہوجائے گا۔ جب ناما موٹر کی تسلی دیتے تو کوئی اور گاؤں والا آکر کچھ اور خبر سناتا کہ کبھی موٹر آتی ہے۔ اور کبھی نہیں آتی۔ ناما نے یہ کبھی سنایا کہ بعض وقت لوگوں کی کثرت سے موٹر والا موٹر نہیں روکتا۔ یہ سنتے ہی ہم سب ڈر گئے۔ ناما سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہاں شیر بھی آیا کرتے ہیں اور کئی مرتبہ آکر کتوں کو کھا گئے ہیں۔ یہ سنتے ہی اب تو ڈر کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ناما نے سب کو ہمت دلائی کہ میرا غریب خانہ حاضر ہے۔ آپ سب وہیں رات کو سونا اور صبح کو چلے جانا۔ یہ سن کر ہمارا خوف جاتا رہا۔ ناما بڑے بکواسی تھے اپنی بہادریوں کا ذکر اور ادہر ادہر کی دوسری باتیں کرتے رہے۔ اگر اب جو بس کا ذکر کرتے تو ہم کو بالکل ڈر نہ ہوتا کیونکہ ناما کے گھر کا بھروسہ تھا۔ امی جان کو مسجد میں چھوڑ کر ہم سب تالاب پر گئے۔ وہاں تھوڑی دیر تک بیٹھ کر اچھے منظروں کی تصویریں لیں۔ امی کے بلانے پر ہم تالاب سے واپس آئے اور ایک نئی خبر ناما کی زبانی سنی کہ بس کوئی پانچ بجے آئے گی۔ یہ سنتے ہی ہم نے چلنے کی شروع کی۔ بچھونے باندھتے تھے اور دوسرے کام میں جب ہم مصروف تھے۔ تو چھوٹے ماموں نے پھر ایک تصویر بطور یادگار لے لی۔ ہمیں بڑا افسوس ہے کہ وہ پوری صاف نہیں آئی کچھ حصہ سیاہ پڑگیا۔ جانے سے پہلے ہم نے ڈرائیور کو سمجھا دیا تھا کہ موٹر کی حفاظت کرتے رہنا اور ہم وہاں تمھارے پاس پہنچتے ہی ٹائر بھیج دیں گے۔ بچا ہوا سب کھانا ہم اس کے حوالے کردیا اور بس کے انتظار میں مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ انتظار میں ساڑھے پانچ کے قریب ہوگئے۔ ادہر سے ایک گاؤں کا آدمی آیا اور باتوں باتوں میں اس سے معلوم ہوا۔ کہ بس (۶) بجے آئے گی یہ سن کر ناما پر بڑا غصہ آیا کہ انھوں نے ہم سے جھوٹ کہا۔ پھر ناما آکر کہنے لگے کہ آپ کو بس لے جاکر ایک جگہ پر چھوڑے گی جہاں ایک دوسری بس اس کے انتظار میں رہے گی اور وہ آپ کو لے جاکر ایک اسٹیشن پر چھوڑے گی جہاں سے آپ ریل کے ذریعہ حیدرآباد پہنچیں گے۔ شام ہو رہی تھی اور ہم موٹروں کی آواز پر چونکتے جاتے تھے کہ شاید بس آرہی ہوگی انتظار کرتے کرتے ہم سب ناامید ہوگئے تھے۔ خیر ساڑھے چھ بجے جو بس کی آواز ہمارے کانوں میں آئی سب ایک دم آئی بس کے ساتھ کھڑے ہوگئے۔ امی نے ماموں کو کہا کہ جاکر دیکھیں کہ بس بھری ہوی تو نہیں ہے۔ انھوں نے خوشی سے آکر کہا کہ بس میں چند لوگ ہیں ہم سب مردانہ حصہ میں بیٹھ گئے۔ سوائے امی اور بڑی آپا کے جو زنانہ حصے میں بیٹھ گئیں۔ بس ہمیں اسٹیشن پر لے جاکر چھوڑی ٹکٹ لے کر ریل میں سوار ہوے اور پھر کاچی گوڑہ اسٹیشن پر گیارہ بجے پہنچے گھر جانے کے لئے کسی موٹر کی بہت تلاش کی گئی۔ لیکن کوئی ٹکسی نہیں ملی مجبوراً تانگہ میں بیٹھ کر چرخ چوں چرخ چوں کرتے ہوئے گھر پہنچے۔ جب ہم لوگ گھر پہنچے تو ساڑھے گیارہ ہوئے تھے اور پھاٹک بند تھی دروازہ خوب مار، شور وغل لیا چوکیدار نیند سے چونک کر آیا اور پھاٹک کھولا جب وہ ہمیں تانگہ میں دیکھا تو حیران تھا کیا معاملہ ہے۔ جب ہم اندر گئے تو دیکھتے کیا ہیں کہ خالہ جان اور ایک ماما کمرے کے دروازے بند کر کے سو رہے ہیں۔ ہم جاکر دروازہ کھٹکھٹائے تو ڈرتے ڈرتے انھوں نے دروازہ کھولا اور ہمیں اتنی جلد واپس ہوتے دیکھ کر بہت حیران ہوے جب ہم نے اپنا پورا قصہ سنایا تو سب کے ہنستے ہنستے پیٹوں میں بل پڑ گئے صبح کو

موٹر کی فکر ہوئی تو خیال آیا کہ موٹر جنگل میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کو فوراً کسی طرح سے منگوانا چاہیئے ابا جان کو جب معلوم ہوا تو وہ اس وقت دادا کی موٹر میں جاکر دو نئے ٹائر اور ٹیوب خرید کر لائے اور ایک ٹکسی موٹر منگوا کر اس میں ہمارے ایک نوکر کو بھی ساتھ کیا ہم یہاں اپنی موٹر واپس آنے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ خدا خدا کر کے شام کے سات بجے موٹر بخیر و خوبی کے ساتھ پہنچی۔ مگر ڈرائیور بہت تھکا ہوا اور دنیا سے بیزار نظر آتا تھا۔ ایسے مزوں سے ہمارا نظام ساگر کا سفر ختم ہوا۔

مظفر سلطانہ (سنیٹ جارجز گرامر اسکول)

بالاحصار

بنایا ہے کیا خوب مٹی کا گھر — مرے بھائی جاں ہیں بڑے کاریگر
بنا کیسا پیارا یہ گھر واہ وا — نہ ہوگا محل کوئی اس شان کا
لگایا ہے کیا خوب سبزے کا رنگ — جو دیکھے اسے بس وہ ہوجائے دنگ
کرو بھائی جاں صاف چوٹی کو یوں — لگا دو بس اب چار اس پہ ستوں
پڑے اس پہ چھپّر جو اک گھاس کا — تو آئے نظر پھر یہ کیسا بھلا

نہ مٹی کا گھر ہے نہ ہے یہ محل — لگا کر ستوں گھر بنائیں گے کل
بس اک چاندنی پھر بنائیں گے ہم — منڈیر ایک اس پر لگائیں گے ہم
نہیں تم کو ننھی ذرا بھی قرار — بناتا ہوں میں دیکھو بالاحصار

لطیف النساء بیگم

لطیفہ

لڑکا:- دادا جان کیا آپ کی عینک سے ہر چھوٹی چیز بڑی معلوم ہوتی ہے؟

دادا:- ہاں بیٹا۔

لڑکا:- اچھا تو دادا جان جب آپ مجھے کوئی چیز دیا کریں تو برائے مہربانی عینک اتار کر دیا کیجئے۔

مرزا محمد ارشد مختار بیگ دہلوی

نانی اور انکی شریر نواسی

خداوندکریم ہماری نانی اماں کو سلامت رکھے جو ہروقت ہمارے لئے اسباب تفریح مہیا کرتی رہتی ہیں۔ مزاج کی بھی اللہ رکھے عجیب ہیں۔ یوں تو والدہ صاحبہ کی سگی والدہ نہیں، بلکہ رضائی والدہ ہیں۔ مگر چونکہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے اس لئے وہ شروع ہی سے ہمارے ہاں رہتی ہیں۔ وہ کسی ضرورت سے اپنے کسی عزیز کے ہاں چلی بھی جاتی ہیں تو دل بہت ہی اداس رہتا ہے۔ مجھے خاص طور پر ان سے بہت دلچسپی ہے اگرچہ وہ ہر وقت مجھ پر برستی رہتی ہیں مگر ان کو مجھ کچھ محبت بھی ہے۔ ہماری نانی اماں کو خیر سے دکھائی بھی کم دیتا ہے، اس لئے آپ ہر وقت عینک چڑھائی رہتی ہیں۔ اور جب کوئی ان کے سامنے ہنستا ہے تو ان کو سخت غصہ آتا ہے۔ اور جب روٹھتی ہیں تو ان کا منانا مشکل ہوجاتا ہے۔ ہاں اگر کوئی ان کے آگے مٹھائی لاکر رکھ دے تو وہ فوراً من جاتی ہیں۔

ایک اور بات ان کے متعلق قابلِ ذکر یہ ہے کہ ان کو شیشے کے گلاس سے سخت دشمنی ہے اور اگر کوئی بھولے بسرے شیشے کے گلاس میں پانی دیدے تو وہ اپنی توہین خیال کرتی ہیں۔ ایک دن کا ذکر سنیئے کہ میں نانی اماں کے پاس بیٹھی ان کو بنا رہی تھی۔ نانی اماں بیٹھی کرتہ سی رہی تھیں۔ اور خیر سے عینک بھی لگائے ہوئے تھیں۔ سوئی میں تاگا کسی طرح نہ ڈالا جاتا تھا آخر میں نے پرو دیا۔ انھوں نے جو سینا شروع کیا تو گرہ لگانی یاد نہیں رہی۔ اور جونہی سوئی کو کھینچا تو ہگا تمام کپڑے سے نکل آیا۔ خدا جانے کتنی بار انھوں نے ایسا کیا۔ آخر مجھ سے ہنسی نہ رک سکی اور میں بے اختیار ہنس پڑی۔ میں نے کہا نانی اماں گرہ تو لگا لو تو وہ الٹی خفا ہوگئیں۔ کیونکہ ان کی سمجھ میں میرا مطلب نہیں آیا میں جو کہتی کہ گرہ لگالو تو وہ گز اٹھا کر ناپ لیتی تھیں اور کہتی سولہ ہی گرہ تو ہے اسے کتنی بار ناپوں وہ میرے لفظ "گرہ" کا مطلب نہ سمجھی تھیں۔ جب ناپیں تو مجھے اور زیادہ ہنسی آتی تھی اور ان کا غصہ بڑھتا۔ اتنے میں اوپر سے والدہ صاحبہ نے آواز دی کہ تمھاری نانی اماں کیا کر رہی ہیں ان سے کہنا کہ پہلے ذرا چائے پی لیں۔ میں نے جواب دیا وہ دجّال والی گدی سی رہی ہیں، گرہ لگانی یاد نہیں رہتی اور جب میں گرہ لگانے کو کہتی ہوں تو گرتہ اٹھا کر ناپ لیتی ہیں۔ میرے اس کہنے پر نانی اماں بس آگ بگولہ ہوگئیں اور لگیں مجھے صلواتیں سنانی اور اس کے بعد سے تو وہ اس قدر خفا ہوگئیں کہ چار پانچ روز تک قطعی نہ بولیں اور میرا سامنے آنا بھی انھیں ناگوار گزرتا تھا۔

اتفاق کی بات دوچار دن بعد ہی ان کے سر میں سخت درد ہوا سب لوگ ان کے پاس جا بیٹھے، میں بھی پہنچی اور کہا نانی اماں تمھارا سر دبا دوں لیکن انھوں نے مجھے سخت غصے سے پرے ہٹا دیا مجھے کچھ ہنسی آگئی اور میں اپنے کمرے میں چلی گئی آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی اور میں ان کے کمرے میں پھر آگئی۔ ہمشیرہ صاحبہ ان کا سر دبا رہی تھیں۔ میں ان کے پیچھے بیٹھ گئی اور آہستہ سے کہا نانی اماں دودھ جلیبی لاؤں؟ دودھ کا نام سنتے ہی نانی اماں کے دل کی کلی کھل گئی اور کہنے لگیں کہ بیٹی سامنے تو آ تیری صورت دیکھنے کو جی ترس گیا۔ خیر میں سامنے آگئی تو میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا

بیٹی وہ دودھ کہاں ہے لاؤ۔ میں جلدی سے جاکر دودھ لے آئی تو وہ من گئیں۔ خیر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

اور سنیے ایک روز نانی اماں نے کھانا کھاتے ہوئے کہا کہ بیٹی ذرا ایک گلاس پانی اور تھوڑی سی چینی لادو مجھے پھر شرارت سوجھی اور میں ایک شیشے کے گلاس میں پانی اور ایک پلیٹ میں چینی لے آئی۔ اور کہا لو نانی اماں پیو۔ نانی اماں آئیں تو جائیں کہاں گلاس میرے ہاتھ سے لےاس زور سے پھینکا کہ چور چور ہو گیا۔ اور لگیں مجھ پر خفا ہونے۔ میں نے فوراً چینی کی پلیٹ آگے کرتے ہوئے کہا لیجئے شکر۔ وہ فوراً ہنس پڑیں اور کہا۔ بیٹی برا نہ مانیو۔ میں ہنستی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ ہاں ہماری نانی اماں کو نرم چیز زیادہ پسند ہے ہر ایک چیز کو پہلے دباکر دیکھتی ہیں اور پھر کھاتی ہیں ایک دفعہ ہماری ایک جگہ دعوت تھی نانی اماں بھی ہمارے ساتھ تھیں اگر ان کو نہ لے جاتے تو اپنے ہی جانے کی کس کو امید تھی دعوت میں ہم پہنچے تو تھوڑی دیر کے بعد کھانا چنا گیا مختلف قسم کے کھانے تھے مٹھائی بھی تھی۔ کھانا جو شروع ہوا تو نانی اماں نے سب سے پہلے مٹھائی پر ہاتھ ڈالا میں بیچ میں شرارت سے بول اٹھی نانی اماں دیکھ کر کھائیے۔

نانی اماں۔ کیا دیکھ کر کھاؤں؟

میں۔ یہی کہ پہلے اسے دباکر دیکھ لیں: نانی اماں نے یہی کیا کہ گلاب جامن کو دباکر دیکھا، دبانا ہی تھا کہ شیرے کی پچکاری تمام ان کے کرتے دوپٹے پر۔

میں۔ نانی اماں دیکھا اس میں سے کیا نکلا؟ ذرا اور دباکر صاف کر لیجئے نہ معلوم اس میں کیا بلا بھری ہوی ہے۔ نانی اماں میری شرارت کو نہ سمجھیں اور دبایا تو شیرہ گردن پر گرا۔

گلاب جامن تو خیر انھوں نے چورا ملیدہ کر کے کھا لیا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد نانی اماں کا ریشمی دوپٹہ اور کارگے کا کرتہ چپک کر گلے کا ہار ہو گیا ادھر گردن پر شیرہ سوکھ کر کھال تڑخنے لگی۔ چنانچہ ان کا غضبی خانہ مجھ پر نازل ہوا اور لگیں بے نقط سنانے میں گھبرائی اور اماں سے کہا جلدی چلو ورنہ یہ زیادہ برس پڑیں گی اور خواہ مخواہ کر کری ہوگی۔

غرض ہم گھر آئے اور ان کے کپڑے بدلوائے تو کہیں وہ چپ ہوئیں۔ خدا تعالیٰ انھیں زندہ رکھے عجب ظریفہ معجون ہیں اور روزانہ ہمارے لئے ہنسی دل لگی کے سامان فراہم کرتی رہتی ہیں۔ چنانچہ ہماری بھی دعا ہے ؎

وہ سلامت رہیں ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ارجمند ریحانہ
(از دہلی)

کام کی باتیں
(دوسری قسط)

(۱) کمینوں کے ساتھ بیٹھنے میں علمیت کا خون ہوتا ہے۔ برابروں کیساتھ برابری حاصل ہوتی ہے۔ اور بڑے لوگوں کے ساتھ بندگی۔ (ہٹوپادلیسہ)

(۲) اپنے دل کو غم و الم سے دور رکھو۔ اور اس تکلیف کا خیال نہ کرو جو ابھی نازل نہ ہوی ہو۔ (فردوسی)

(۳) کوئی شخص دنیا میں باقی رہنے کے لئے نہیں پیدا ہوا ہے۔ سوائے اس کے جس نے نیک نام چھوڑا ہو۔ (سعدی)

سیدہ عظیم النساء بیگم (از میسور)

طلسمی قالین

ایک بادشاہ کے تین (۳) بیٹے تھے۔ سب میں بڑے کا نام قمر، منجھلے کا نام انور، اور چھوٹے کا نام اظہر تھا۔ یہ تینوں اپنی چچی زاد بہن قیصر سلطانہ سے بے حد محبت کرتے تھے۔

قیصر سلطانہ اپنے زمانے میں حسن و دلنوازی کا اعلیٰ نمونہ خیال کی جاتی تھی اس کی نقرئی اور بے عیب پیشانی شکن سے پاک صاف چودھویں رات کے چاند کی طرح دمکتی تھی ناک سیدھی بے عیب جسم نازک اور سڈول تھا۔ تینوں شاہ زادے اس ارضی حور سے دلی محبت رکھتے تھے حتیٰ کہ اپنی جانیں اس مہ جبیں پر قربان کرنے کو تیار تھے۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا اس کی الوداعی سنہری کرنیں سرسبز درختوں اور شفاف پانی کی لہروں پر پڑ کر نہایت دلفریب اور دلکش معلوم ہوتی تھیں۔ مگر یہی وقت ان دلدادگانِ حسن کے لئے نہایت پرخطر ثابت ہوا۔ یعنی بادشاہ نے تینوں بیٹوں کو بلا کر کہا کہ میں تمھارے دلی حالات سے واقف ہوں۔ تم تینوں شاہ زادے اور میرے لخت جگر ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں قیصر سلطانہ کا ہاتھ دے کر بقیہ دو کا دل دکھاؤں۔ اس لئے میرا فیصلہ یہ ہے کہ تم میں سے جو سب سے بہتر تحفہ میرے لئے لائے گا وہی قیصر سلطانہ کا شوہر ہوگا۔ تم لوگ سفر کرو اور ٹھیک ایک برس بعد ایک ہی تاریخ کو اپنے تحائف میرے روبرو پیش کرو۔ شاہزادوں نے باپ کے فیصلے کے آگے سر تسلیم خم کیا اور دوسرے دن تینوں مختلف سمتوں میں چلے گئے۔ قمر شہر طوس پہونچا جہاں ایک دن شام کے وقت بازار میں اس نے مجمع کثیر دیکھا۔ قریب گیا تو معلوم ہوا کہ ایک قالین فروخت ہو رہا ہے۔ پینتیس (۳۵) ہزار اشرفیوں تک دام لگ چکے ہیں مگر قالین فروش کہتا ہے کہ چالیس (۴۰) ہزار سے ایک کوڑی کم نہ ہوگی۔ قمر نے قالین کی صفت دریافت کی تو قالین فروش نے کہا کہ حضور یہ طلسمی قالین ہے۔ صفت اس میں یہ ہے کہ حضور اس پر بیٹھ کر جس مقام کا تصور فرمائیں خواہ وہ مقام کیسا ہی دور دراز ہو پلک جھپکاتے یہ قالین آپ کو وہاں پہونچا دے گا۔ قمر قالین کی یہ صفت سن کر پھولا نہ سمایا اور سوچا کہ اس سے بہتر تحفہ اب دستیاب نہ ہوگا۔ بے تامل چالیس ہزار اشرفیوں میں اسے خرید لیا۔ اور اطمینان سے طوس کی کارواں سرا میں جہاں مقیم تھا عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگا کیونکہ واپسی میں ابھی بہت دیر تھی۔

بالکل اسی قسم کا واقعہ دوسرے بھائی انور کو بھی پیش آیا وہ سفر کی صعوبتیں سہتا ہوا ازمیر پہونچا وہاں بازار میں اسے ایک شخص دوربین بیچتا ہوا ملا انور نے قیمت دریافت کی شخص مذکور نے کہا کہ پینتالیس (۴۵) ہزار اشرفیاں انور معمولی سی دوربین کی یہ قیمت سن کر ہکا بکا ہو گیا مگر اس شخص نے کہا کہ اس دوربین کے ذریعہ آپ گھر بیٹھے تمام عالم کی سیر کر سکتے اگر باور نہ ہو تو امتحان کیجئے انور نے دوربین اس کے ہاتھ سے لے کر پہلے اپنی محبوبہ شاہ زادی قیصر سلطانہ اس کے بعد اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو دیکھا دوربین بیچنے والا سچا ثابت ہوا اسے وہ سب لوگ جن کو وہ دیکھنا چاہتا تھا اس طرح نظر آئے گویا وہ اس کے پاس ہی موجود ہیں۔ انور یہ نایاب تحفہ پا کر بیحد خوش ہوا فوراً منہ مانگی قیمت ادا کر کے دوربین خرید لی اور اطمینان سے طوس کی کارواں سرا میں تھکان سفر دور کرنے کی خاطر مقیم ہوا۔

تیسرا بھائی اظہر زیتان پہونچا اس نے وہاں کے بازار میں ایک میوہ فروش کو ایک سیب بیچتے ہوئے دیکھا قیمت دریافت کی تو میوہ فروش نے پچاس ہزار اشرفیاں بتائیں اظہر ایک سیب کی یہ قیمت سن کر حیران سا ہوا تو میوہ فروش نے اس سیب کی یہ خاصیت بیان کی کہ جس بیمار کو اس کا ایک ٹکڑا کھلا دیجئے خواہ اس کی حالت کیسی ہی خراب ہو چکی ہو مگر ایک گھنٹے کے اندر بیمار تندرست ہو جائے گا۔ اظہر نے پہلے اسی شہر میں سیب کا امتحان کیا اور پھر پچاس ہزار اشرفیاں دے کر وہ سیب خرید لیا۔

جب ان کی واپسی میں تین مہینے باقی رہ گئے تو تینوں بھائی ایک شہر کی کارواں سرا میں جہاں جدا ہونے سے پہلے ملنے کا قول و قرار کر چکے تھے ملے ہر شخص نے اپنے اپنے تحفہ کا ذکر کیا۔ اور فوراً فوراً ایک نے دوسرے کو مبارک باد دی۔ تھوڑی دیر بعد قمر نے انور سے کہا کہ بھائی عرصے سے ہیں اپنے والدین کی خبر نہیں ملی ذرا تم اپنی طلسمی دوربین سے دیکھو کہ ان کا کیا حال ہے۔ انور نے صندوق سے دوربین نکالی اور دیکھ کر کہا ارے بڑا غضب ہوا جس کے لئے ہم لوگوں نے وطن چھوڑا والدین سے جدائی اختیار کی وہی (قیصر سلطانہ) دم توڑ رہی ہے اور ہم کچھ نہیں کر سکتے یہ سن کر قمر اور اظہر نے بھائی کے ہاتھ سے دوربین چھین لی دیکھتے کیا ہیں کہ فی الحقیقت قیصر سلطانہ بستر مرگ پر دراز اور کوئی دم کی مہمان ہے۔ قمر نے کہا کہ بھائیو تاخیر کا موقع نہیں تم دونوں میرے طلسمی قالین پر بیٹھ جاؤ دم کے دم میں قیصر سلطانہ کے پاس پہنچے جاتے ہو یہ کہہ کر اس نے اپنا قالین بعجلت بچھایا انور اور اظہر بھی اپنا اپنا طلسمی تحفہ لے کر اس پر بیٹھ گئے۔ بیٹھنے کی دیر تھی پلک جھپکنے میں تو شاید کچھ دیر بھی ہوتی ہو۔ مگر ان کو پہونچنے میں اتنی دیر بھی نہیں لگی۔ سب نے اپنے آپ کو اپنے محل کی چھت پر پایا۔ تینوں بھائی دوڑ کر قیصر سلطانہ کے کمرے میں گئے۔ جہاں بادشاہ اور ان کی ماں بھی موجود تھی۔ دونوں کو بیٹوں کے خلاف توقع آجانے پر حیرت آمیز خوشی ہوئی۔ اظہر نے فوراً اپنے طلسمی سیب سے ایک ٹکڑا کاٹ کر مریضہ کو دیا جس کے کھاتے ہی اس کے بے رنگ چہرے پر صحت کی سرخی دوڑ گئی اور چند منٹ میں قیصر سلطانہ تندرستوں کی طرح اٹھ کر بیٹھ گئی اس نے بھی بھائیوں کو دیکھ کر سجدۂ شکر ادا کیا۔ شاہی محل میں جہاں کچھ دیر پہلے موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ مبارک سلامت کا شور مچ گیا۔

بادشاہ نے بیٹوں کو گلے سے لگایا اور ان کے سفر کے حالات سنے تینوں شاہزادوں نے اپنے اپنے طلسمی تحفے باپ کو نذر دئے بادشاہ ان تحفوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور کہا کہ فی الحقیقت یہ تحفے لاجواب ہیں مگر افسوس کہ میں اب بھی تم میں سے کسی کو بقیہ دو پر ترجیح نہیں دے سکتا۔ انور کی دوربین کی بدولت تم قیصر سلطانہ کی نازک حالت سے آگاہ ہوئے قمر کی قالین کی بدولت چشم زدن میں دور دراز مقام سے یہاں تک پہونچے اظہر کے سیب نے اس کی جان بچائی۔ اس صورت سے مجھ پر اور میری بھتیجی پر تم تینوں کا برابر احسان ہے اب معاملے کے تصفیہ کی میں کوئی اور صورت نکالوں گا۔ تم تینوں اب اپنی اپنی جگہ جا کر آرام کرو۔

مرزا مظفر الدین احمد صادق
(چادر گھاٹ ہائی اسکول)

مردانے موسیٰ جانی

ایک چیونٹی اور چوہیا میں بڑی دوستی تھی۔ چیونٹی کا نام مورچہ جانی اور چوہیا کا نام موسیٰ جانی تھا۔ ایک دن چیونٹی چکی پیسنے بیٹھی اور چکی میں خود پس گئی۔ چوہیا کو اپنے دوست کی بےوقت موت کا بڑا رنج ہوا اور خاک سر پر ڈال ایک برگد کے درخت کے نیچے جا بیٹھی۔

درخت نے چوہیا کا یہ حال دیکھ کر پوچھا "کیوں خاک برسر موسیٰ؟" چوہیا نے جواب دیا "خاک برسر موسیٰ مردانے مورچہ جانی مرجائیں، ہم مرجائیں؟" یہ سن کر درخت نے اپنے سب پتے گرا دیے۔ ایک کوا ادھر سے اڑتا آیا اور درخت پر بیٹھ گیا۔ درخت کے پتے گرے ہوئے دیکھ کر اس نے پوچھا "کیوں درخت بارکند؟ کیوں درخت بارکند؟" درخت نے کہا۔

درخت بارکند
خاک برسر موسیٰ
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

کوے نے یہ بات سنی تو کیا کام کیا کہ اپنے بال و پر سب نوچ کھسوٹ ڈالے۔

جب یہ ندی کنارے پانی پینے گیا تو ندی نے کوے کو بے بال و پر ایک مضغۂ گوشت بنا دیکھ کر حقیقت حال دریافت کیا کہ "کیوں قلادہ چنگی منگی؟ کیوں قلادہ چنگی منگی؟" کوے نے جواب دیا۔

"قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک برسر موسیٰ
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

پانی جو تھا وہ یہ سنتے ہی بہہ نکلا۔ پاس ایک کسان کا گیہوں کا کھیت تھا اس میں بہہ کر گیا۔ گیہوں نے کہا "کیوں آیا تیرا پیرا؟ کیوں آیا تیرا پیرا؟" پانی نے کہا۔

"آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک برسر موسیٰ
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

یہ سنتے ہی گیہوں جتنے تھے پٹ پٹ گر پڑے۔ کسان جو کھیت میں آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ گیہوں جو کچھ دیر آگے لہلہا رہے تھے سب گرے پڑے ہیں۔ اس نے پوچھا "کیوں گندا گرتی پڑتی؟ کیوں گندا گرتی پڑتی؟" گیہوں نے کہا۔

گندا گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک برسر موسیٰ
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں"

کسان نے بیلدستہ جو اس کے ہاتھ میں تھا اٹھا کر اپنے پاؤں پر مار لیا۔ کسان کی بیٹی عاشقان جو باپ کے لئے روٹی لایا کرتی تھی ادھر آ نکلی اس نے باپ کا جو یہ حال دیکھا تو پوچھا "کیوں باوا بیلدستہ کنی؟" باپ نے جواب دیا۔

"باوا بیلدستہ کند
گندا گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بارکند
خاک برسر موسیٰ
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

بیٹی جو تھیں یہ سنتے ہی جھٹ زمین پر لوٹ گئیں۔ ماں نے

بیٹی کو خاک میں غلطاں دیکھا تو پوچھا "کیوں عاشقاں لوٹی پوٹی؟ کیوں عاشقاں لوٹی پوٹی؟ عاشقاں بولی۔

"عاشقاں لوٹی پوٹی
باوا بیلدستہ کند
گندا گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بار کند
خاک برسر موسی
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

ماں نے روٹی پکانے کے لئے توا گرم کیا تھا اس پر جھٹ سے جا بیٹھیں۔ اتنے میں پڑوسن تکوا درست کروانے آئی۔ وہاں کیا دیکھتی ہے کہ عاشقاں کی ماں توے پر سوار بیٹھی ہیں؟ اس نے پوچھا کیوں عاشقاں مادراں توا کند؟ کیوں عاشقاں مادراں توا کند؟ عاشقاں کی ماں بولیں۔

"عاشقاں مادراں توا کند
عاشقاں لوٹی پوٹی
باوا بیلدستہ کند
گندا گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بار کند
خاک برسر موسی
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

پڑوسن نے یہ سنتے ہی وفورِ غم میں تکوا اٹھا کر اپنی ناک میں گھسیڑ لیا جب پڑوسن گھر سے باہر نکلیں تو لوگوں نے کہا "کیوں پڑوسن تکوا کند کیوں پڑوسن تکوا کند" پڑوسن نے جواب دیا۔

"پڑوسن تکوا کند
عاشقاں مادراں توا کند
عاشقاں لوٹی پوٹی
باوا بیلدستہ کند
گندا گرتی پڑتی
آیا تیرا پیرا
قلادہ چنگی منگی
درخت بار کند
خاک برسر موسی
مردانے مورچہ جانی مرجائیں ہم جئیں؟"

یہ سننا تھا کہ سارے گاؤں کے لوگ مردانے مورچہ جانی کی حسرت ناک موت پر آنسو بہانے لگے اور اس کے غم میں سوگوار ہوے۔ ہوتے ہوتے یہ بات بادشاہ تک پہنچی تو بادشاہ نے بھی ماتمی لباس زیب تن کیا اور امرائے عظام و تمام رعایا کو حکم دیا کہ مردانے مورچہ جانی کی بوقت موت پر اظہار تاسف کریں اور چالیس دن تک اس کا سوگ کریں۔

غرض جب چالیس دن ختم ہوے تو تمام شہر نے سوگ بڑھایا۔ درخت کی نئی کونپلیں پھوٹیں۔ کوتے کے بال و پر نکل آئے۔ دریا اپنی روانی میں پہلے کی طرح چلنے لگی۔ گیہوں سب بٹور لئے گئے۔ عاشقاں اور اس کے ماں باپ اپنے دکھ درد سے چنگے ہو گئے۔ پڑوسن کی ناک کا زخم سوکھ گیا لیکن چوہیا نے مورچہ جانی کے غم میں سر پر خاک ڈالنا نہ چھوڑا اور اسی طرح تمام عمر گنوا دی۔

سکینہ بیگم
(بیگم پیٹھ)

مدرسے کا پہلا دن

۱۰ر جون اور پیر کا روز ہمارے اسکول کا پہلا دن تھا۔ صبح ہی صبح امی نے جگا دیا۔ میں پھر سو گیا۔ میں سویرے اٹھنے کا عادی ہوں۔ مگر بات یہ تھی کہ رات میں ہماری پھوپی کی چوتھی تھی۔ کنبہ کے اکثر بچے جمع تھے بڑی رات تک اودھم مچی رہی۔ دیر سے سونا ملا۔ وہ تو غنیمت ہوا کہ چوتھی کھیلنے کی اجازت نہ ملی اور رسم سے پہلے سلا دیئے گئے ورنہ ہم نے تو رات بھر جاگنے کی ٹھانی تھی۔

تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ ارجمند نے آکر جگا دیا۔ وہ تیار ہو چکی تھی۔ میں نے بھی جلد جلد غسل کر کے کپڑے بدلے اور ناشتہ کر کے تیار ہو گیا۔ بابا ابھی تک نماز پڑھ رہے تھے۔ امی مریم کو حروف سمجھا رہی تھیں۔ ارجمند سبق دوہرا رہی تھی۔ میں نے بھی اپنا بیگ سنبھالا۔ آٹھ بجے ہم بابا کو خدا حافظ کہہ کر اور مریم، نرجس کو پیار کر کے سوار ہوئے اور چند منٹ میں اسکول پہونچ گئے۔

میں امی جان اور ارجمند بی بی کو محبوبیہ میں چھوڑ کر عالیہ پہونچا تو بہت سے بچے آ چکے تھے۔ اور الگ الگ ٹولیوں میں پھر رہے تھے۔ میں بھی اپنی جماعت کی ٹولی میں جا ملا۔ تھوڑی دیر میں سارے لڑکے آگئے اور آپس میں ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھنے لگے۔ ہماری رپورٹ گھر پر آئی تھی۔ جن بچوں کی رپورٹ پر "ترقی دی گئی" (Promoted) لکھا تھا وہ تو بہت خوش بحال تھے۔ لیکن جن کی رپورٹ پر یہ جملہ نہ تھا وہ بہت غمگین اور اداس نظر آتے تھے۔ ہم کو ان کی مایوسی سے رنج ہوا اور ہم نے اپنے امکان بھر ان کے خوش کرنے کی کوشش کی۔ میرے ساتھی اپنے انعامات کا بھی ذکر کر رہے تھے جو ان کی کامیابی پر انہیں ان کے والدین نے دیے تھے۔ ایک نے کہا "مجھے بابا نے ایک خوبصورت ہوائی جہاز لا دیا ہے" دوسرے نے کہا "مجھے بڑی پیاری بائیسکل ملی ہے"۔ میری باری پر میں نے کہا کہ مجھے کچھ بھی نہیں ملا کیونکہ میں اس بار اول نہیں آسکا۔ ہاں جب اول آتا ہوں تو امی اور بابا دونوں انعام دیتے ہیں۔ یہ چھوٹا فونٹن پن مجھے اس لئے ملا ہے کہ کردار اور اخلاق کی نسبت اچھی رپورٹ آئی ہے۔ میرے ساتھیوں نے چھوٹے بلو برڈ کو باری باری سے دیکھا اور مختلف رائیں قائم کیں۔

پھر ہم نے ان بچوں کو دیکھا جو دوسرے مدرسوں سے عالیہ میں شریک ہونے آئے تھے۔ وہ بے چارے کچھ پریشان سے تھے کیونکہ انھیں پھر امتحان دینا تھا اور پچاس فیصدی نمبر لینے تھے۔ بعض بچے انھیں یہ کہہ کر اور بھی ڈرا رہے تھے کہ جو بچہ نوے سے کم نمبر لیتا ہے وہ اس مدرسہ سے واپس کر دیا جاتا ہے۔

اتنے میں حاضری کی گھنٹی بجی اور پورا ہائی اسکول جمع ہو گیا۔ احمد علی خاں صاحب نے نئی جماعتوں کے لحاظ سے بچوں کے نام پڑھے اور میں حاضری کے بعد اپنے ساتھیوں کے ساتھ دوسری جماعت (سکنڈ فارم) میں چلا گیا۔ وہاں ہم کو ڈسک درست کرنے اور اپنے اپنے نمبر لگانے پڑے۔ پھر حبیب اللہ صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے کامیابی کی مبارک باد دی ہم سے ادھر اُدھر کی باتیں کیں۔ مختلف سوالات بھی کیے اور صحیح جوابات پر شاباش بھی دی۔

کھانے کی چھٹی میں ہم سب باہر آئے۔ بڑی چہل پہل تھی۔ بچے نئی جماعتوں میں جا کر بہت خوش تھے۔ مدرسے کا پہلا دن ہونے سے اسباق بھی باقاعدہ نہ تھے۔ پرائمری کے بچے اچھل کود رہے تھے۔ جھولوں اور پھسل بنڈوں پر بچوں کا ہجوم تھا۔ کئی پھیری والے بھی آگئے تھے۔ کوئی "چورن مزے دار" کی آواز دے رہا تھا تو کوئی "کافی گرم" پکار رہا تھا۔ کہیں میٹھی گولیاں بک رہی تھیں

تو کہیں چنے والا اپنی ہنڈی لئے کھڑا تھا۔ میرے ساتھی اور دوسرے بچے مختلف چیزیں لے لے کر کھانے لگے۔ لیکن میں اور ایسے بچے جن کے پاس پیسے نہ تھے دوسری طرف کھیلنے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد اور بچے بھی آ گئے اور ہم سب ملکر دوڑنے کودنے لگے کالج کے بچے بھی دو دو چار چار ملکر پھر رہے تھے۔ جب کوئی جان پہچان کا بڑا لڑکا ادھر سے گزرتا تو "اچھے ہو سعید" پوچھ لیتا اور میں "جی اچھا ہوں" کہہ کر سلام کر لیتا تھا۔ جب تھوڑا وقت رہ گیا تو ہم نے جلد جلد کھانا کھایا اور گھنٹی پر جماعتوں میں پہونچے تھوڑی دیر بعد ہم کو جماعت کا ٹائم ٹیبل ملا اور کتابوں کی فہرست۔ ہم نے کورس کی کتابوں کے نام نقل کئے اور ٹائم ٹیبل اتارا۔ پھر ہمیں چھٹی مل گئی۔ ہم باہر آتے ہی نئے بچوں کا نتیجہ دریافت کرنے اس طرف پہونچے۔ بعض بچوں کو مدرسے کے فارم مل گئے تھے مگر اکثر نہیں لئے گئے تھے۔ جس پر ان کے ساتھ والے خفا نظر آتے تھے۔ ہم نے ان لڑکوں سے باتیں کیں اور سوالات کی بوچھار شروع کر دی۔ "جی آپ کا نام"، "آپ کے والد کا اسم شریف"، "کہاں رہتے ہیں آپ"، "آپ کون سے اسکول سے آئے ہیں جناب"، "آپ کیا پڑھتے تھے وہاں"، "اردو کی کونسی کتاب؟" "اور انگریزی کی؟" "حساب میں کیا کیا سکھاتے ہیں وہاں" وغیرہ جب وہ بے چارے جواب دیتے دیتے اور ہم پوچھتے پوچھتے تھک گئے تو پھر ہائی اسکول کا میدان تھا اور ہم۔ خوب دوڑے۔ کھیلے کودے۔ فٹ بال لون پاٹ۔ لنگوچہ۔ بھیڑ یا بکری یہ ہمارے خاص کھیل ہیں۔ اس کے سوا املی کے جھاڑوں پر چڑھے۔ جھاڑ بندر کھیلا۔ ریت پر کلائیاں کھائیں۔ پھسل بنڈوں پر اپنا اپنا کمال دکھایا۔ بعض ساتھیوں کو ستایا بھی۔ ڈرنے والوں کو زبردستی پھسل بنڈوں پر سے ڈھکیلا جھولوں پر بٹھا کر بڑے بڑے جھوکے دیے۔ پھر سب ریت پر بیٹھ گئے اور یہ ترانہ خوب لہک لہک کر گایا۔

ہم ہیں پودے ملکِ دکن کے — توڑنے والے رسمِ کہن کے
ہم ہیں بندے اپنے وطن کے — دینے والے تن من دھن کے

دیس پہ مرنا کام ہمارا
دیس پہ مرنا کام ہمارا

غرض بڑا مزا آیا۔ چار بجے امی کو لینے محبوبیہ گیا۔ امی نے پوچھا "دن کیسا گزرا میرے لال" میں نے جواب دیا "مدرسہ چھوڑنے جی نہ چاہتا تھا۔ امی۔ آپ کے خیال سے آنا پڑا" امی نے کہا تم بڑے اچھے بچے ہو سعید ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے اور وقت کو سمجھنا ہر انسان کا فرض ہے۔"

گھر آنے کے بعد بھی بعض شرارتیں یاد آ آ کر ہنساتی رہیں۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے چا ر وغیرہ سے فراغت حاصل کی۔ عابد بھائی نے انجمن (انجمن بہبودیٔ اطفال) کی چند نئی کتابیں بتائیں جو اسی روز آئی تھیں۔ میز پر "پیام تعلیم" "سب رس" "نونہال" اور "آیا" کے تازہ پرچے رکھے تھے۔ چونکہ بارش کم کم ہو رہی تھی ہم سب بہن بھائی دیر تک وہیں پڑھتے اور ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ پھر سات بجے کھانا کھایا۔ کچھ دیر دالان میں ٹہلتا رہا۔ ہوم ورک تو تھا نہیں۔ بچھونے پر لیٹ کر "ترکوں کی کہانیاں" پڑھنے لگا اور پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ یہ ہے میرے مدرسے کے پہلے دن کی سچی سچی روداد۔

سید سعید (مدرسہ عالیہ)

اخبار بینی

اخبار بینی کا ذوق آئے دن بڑھتا جا رہا ہے اور دنیا کے ہر حصے میں روزانہ کئی صفحے روزنامے ہفتہ وار اور ماہوار رسالے شائع ہو رہے ہیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔ ان اخباروں کے ذریعہ سے ملک کے ہر فرد بشر تک علم کی روشنی پہنچائی جاتی ہے۔ اور لوگوں کی ذہنی، دماغی اور اخلاقی نشو و نما بھی ہوتی ہے۔ آج کل اخباروں میں اکثر حالاتِ حاضرہ جن میں سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات شامل ہیں زیادہ دلچسپی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں کیونکہ عوام کا رجحان اسی طرف زیادہ ہے بعض اخباروں میں محض سیاسی پروپگنڈے ہوتے ہیں۔ مگر ہماری نظروں میں وہی اخبار اور رسائل قابل قدر ہیں جن میں سماجی معاشی اور معاشرتی اصلاحی امور پر بحث کرنے کے بعد ایک صحیح نتیجہ پر پہنچ کر عوام الناس کو ان پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ غیر ترقی یافتہ قومیں ان پر عمل کر کے میدانِ ترقی میں گامزن ہو جاتی ہیں۔

اب ہم پر اخبارات کی اہمیت واضح ہو گئی جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر طالب علم کو جو اپنی معلومات میں اضافہ کرنا چاہتا ہے اور حالاتِ حاضرہ سے واقف رہ کر عملی دنیا میں قدم رکھنے کے بعد اپنی قوم و وطن کو اگر کچھ فائدہ پہنچانا چاہتا ہے تو اخبار بینی کا ذوق پیدا کرے جس سے اس کے ذہنی اور عملی قوتیں ترقی کرتی جاتی ہیں اور اس کے علم و قابلیت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے جو لڑکا اخبار پڑھنے کا عادی ہے وہ اپنے ساتھیوں میں ایک امتیاز پیدا کر لیتا ہے۔

ہمارے شہر میں بھی بہت سے اخبار و رسائل روزانہ شائع ہوا کرتے ہیں جن کا مطالعہ ہمارے لئے مفید ہے۔ یہاں کے جتنے اخبار شائع ہوتے ہیں وہ سب اپنی خصوصیت سے ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی رسائل جن میں طلباء کی دلچسپی کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ ہفتہ وار و ماہوار شائع ہوتے ہیں۔ ان میں "سب رس" بچوں کی توجہ اس طرف منعطف کرانے کے لئے شائع ہوتا ہے جس میں بچوں کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ میں اس کو خاص طور پر دلچسپی کے ساتھ پڑھتا ہوں۔

محمد عبد المنعم صدیقی (دستم شی کالج)

کالج کی علٰحدگی پر

مدرسہ سے جدا ہوا کالج — شوکت و شان لے گیا کالج
پہلے چھوٹا سا ایک پودا تھا — بڑھتے بڑھتے شجر ہوا کالج
جب ثمر کی طرح ہوا تیار — ٹہنیوں سے جدا ہوا کالج
ہم سے کالج کی سب بڑی بہنیں — چھٹ گئیں جب الگ ہوا کالج
ساری دنیا میں نام ہو اس کا
اعلیٰ ہر ایک کام ہو اس کا

منیر فاطمہ (زنانہ ہائی اسکول)

ادارۂ ادبیاتِ اردو

کے

قواعد و مقاصد

یہ ادارہ سنہ ۱۹۳۱ع میں معتمد کی تحریک اور دیگر موسسین کے تعاون سے قائم ہوا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اردو زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا جائے، نوجوان انشا پردازوں اور شاعروں میں تصنیف و تالیف کا شوق بڑھایا جائے اور حیدرآباد کی علمی و ادبی کوششوں کو اجتماعی شکل دی جائے۔

مجلسِ موسسین

ادارہ کے مقاصد کو روبہ عمل لانے، اس کی ترقی و اشاعت کے ذرائع پر غور کرنے، اس کے جمع و خرچ کی نگرانی اور علمی و ادبی امور میں مشورہ دینے کا کام مجلس موسسین کے سپرد ہے۔ یہ مجلس جن پانچ اصحاب پر مشتمل ہے وہ ادارہ کے موسسین ہیں۔

قواعد و ضوابط

مجلس موسسین نے ادارہ کے حسب ذیل قواعد و ضوابط معین کیے ہیں:-

(۱) سرپرست وہ ہوں گے جو ایک ہزار روپیے یکمشت یا ایک سو روپیہ سالانہ ادارہ کو عطا فرمائیں۔ ان کی خدمت میں تمام مطبوعات ادارہ بلا قیمت پیش کی جائیں گی۔

(۲) معاون وہ ہوں گے جو ڈھائی سو روپیے یکمشت یا پچیس روپیے سالانہ ادارہ کو عطا فرمائیں۔ ان کو سال بسال مطبوعات ادارہ بلا قیمت دی جائیں گی۔

(۳) رفیق وہ ہوں گے جن کی علمی و ادبی خدمات مستند سمجھی گئی ہوں، یا جو ادارہ کے علمی و ادبی کاموں میں غیر معمولی حصہ لے رہے ہوں جس کے اعتراف میں مجلس موسسین ان کو رفیق منتخب کرے گی۔

(۴) رکن وہ ہوں گے جو پچاس روپیے یکمشت یا پانچ روپیہ سالانہ دیں۔ ان کو ادارہ کی جملہ مطبوعات و رسائل رعایتی قیمت پر دی جائیں گے۔

ہمارے پچھلے معمہ کا نتیجہ و صحیح سربمہر حل

5	42	25
44	24	4
23	6	43

(۱) سردار جیون سنگھ صاحب بی۔اے امرتسر، ڈاکٹر ایم۔ ایس جگر نوشہرہ اور مس سرور بانو صاحبہ کھیوڑہ کے صحیح حل وصول ہوئے۔ اس لئے (۲۰۰۰) روپیہ صحیح حل کا انعام ان کو دیا گیا۔

(۲) سب سے زیادہ حل (۶۶) سردار جیون سنگھ صاحب کے وصول ہوئے اس لئے۔ (۱۵۰۰) روپے کا دوسرا انعام ان کو ملا۔

(۳) ۲۰ جون تک سب سے زیادہ حل سردار صاحب کے تھے۔ اس لئے مزید (۱۰۰۰) کا انعام ان کو دیا گیا۔

(۴) ۲۱ جون اور ۱۵ جولائی کے درمیان سب سے زیادہ اور دوسرے نمبر پر ڈاکٹر جگر صاحب کے حل ۲۲ وصول ہوئے اس لئے ہر دو انعامات (۱۰۰۰) روپے اور (۵۰۰) روپے ان کو دئے گئے۔

نوٹ:۔ (۱) واضح ہو کہ محترمہ مس سرور بانو کا صرف ایک حل وصول ہوا تھا۔ وہ صحیح تھا اس لئے وہ اول نمبر کے انعام کی مستحق ہوئیں۔

(۲) بعض نام نہاد اشخاص نے یوں ہی نام رکھ کر ہمارے معمہ کو حرف بحرف نقل کرکے اخبارات میں مشتہر کیا ہے۔ اس لئے آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ایسے نام نہاد ۳/- روپے کرایہ والے مکان کے کرایہ داروں کے دھوکہ سے بچیں جو ایسے ہی دھوکہ دے کر بھاگ جاتے ہیں۔ واضح ہو کہ برٹش بزنس کارپوریشن کی اپنی بلڈنگ ہے اس لئے آپ کا لگایا ہوا روپیہ ہر طرح سے محفوظ ہے۔ اس لئے آج ہی معمہ نمبر ۶ میں شمولیت فرما کر گرانقدر انعامات حاصل کریں۔

معمہ نمبر ۶ — گورنمنٹ کی طرف سے منظور شدہ — معمہ نمبر ۶

بنک میں سربمہر حل رکھا گیا ہے۔ جو ۱۷ اگست ۱۹۳۸ء کو ممبران کے عام اجلاس میں کھولا جائیگا اجلاس میں شمولیت کیلئے مقامی شرفا و مدیران اخبارات مسلم لیگ، احسان، زمیندار، ٹریبون، سول ملٹری گزٹ، نیرنگ، رومان، اختر، زمزم وغیرہ کو مدعو کیا جائیگا جو ممبران نتیجہ کے موقعہ پر حاضر ہونا چاہیں۔ اپنے خرچ پر تشریف لا سکتے ہیں۔

فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ | **مبلغ RS10,000 دس ہزار روپیہ نقد انعام** | **داخلہ کی آخری تاریخ ۷ اگست ۱۹۳۸ء**

پہلا انعام (۵۰۰۰) روپیہ صحیح حل والے کو **دوسرا انعام** (۳۰۰۰) روپیہ سب سے زیادہ حل بھیجنے والے کو **تیسرا انعام** (۱۰۰۰) روپیہ اسکو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ حل بھیجنے میں دوسرے نمبر پر ہوگا **چوتھا انعام** (۷۰۰) روپیہ اسکو دیا جائیگا جو سب سے زیادہ حل بھیجنے میں تیسرے نمبر پر ہوگا **پانچواں انعام** (۳۰۰) روپیہ اس کو دیا جائے گا جو سب سے زیادہ حل بھیجنے میں چوتھے۔

	9	

ترکیب حل:۔ سامنے دیئے ہوئے ۹ خانے مربع میں خالی خانوں کو ہندسوں سے اسطرح پر کریں۔ کہ داہیں بائیں اوپر نیچے اور ترچھے غرض کہ جس طرف سے بھی شمار کریں ہر قطار کا مجموعہ ۲۷ ہو۔ جو ہندسہ آپ چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ کسر بٹہ استعمال نہ ہوگا

فیس داخلہ و شرائط:۔ فیس داخلہ فی حل ایک روپیہ ایک سے زائد بھی آپ جسقدر حل بھیجنا چاہیں سفید کاغذ پر بھیج سکتے ہیں اور فیس داخلہ بحساب ایک روپیہ فی حل بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔ رسید منی آرڈر حل کے ہمراہ ارسال کریں مشکوک حل غلط تصور ہوں گے درست اور مستحق انعام حل وہ ہوگا جو ہمارے سربمہر حل سے خانہ بخانہ اور ہندسہ بہ ہندسہ مطابقت کریگا۔ جو بنک میں سربمہر امانت رکھ دیا گیا ہے۔ تقسیم انعامات موصول شدہ حلوں کی تعداد کے مطابق بعد وضع اخراجات ہو گی۔ ایک سے زائد درست حل ہونے کی صورت میں صحیح حل کی رقم مساوی تقسیم کی جائیگی مینجر معمہ کا فیصلہ ہر حالت میں قطعی اور قانونی طور پر قابل تسلیم ہوگا۔ یہ اس معمہ کی واضح شرط ہے۔ وصول شدہ فیس کسی صورت میں واپس نہ ہوگی نتیجہ منگوانے کے لئے ایک آنہ کا ٹکٹ ارسال کریں

آخری تاریخ:۔ ۷ اگست ۱۹۳۸ء تک سب حل دفتر میں پہنچ جانے چاہیں۔ اسی روز شام کو ایک کھلے اجلاس میں اخبارات کے ایڈیٹروں، مقامی شرفا اور شامل ہونے والے ممبروں کی موجودگی میں نتیجہ نکالا جائے گا۔ اگر آپ نتیجہ میں شمولیت کرنا چاہیں۔ تو بخوشی کر سکتے ہیں۔ آپ آنے کی اطلاع ۷ اگست تک بھیج دیں۔ فیس شمولیت نتیجہ ۳/- روپیہ ہوگی۔ انعامات ۲۳ اگست کو روانہ کئے جائیں گے۔

ترسیل فیس و حل کا پتہ

مینجر صاحب برٹش (انڈیا) بزنس کارپوریشن ۱ فاروق روڈ لاہور

شبنم کی آغوش
میں
آگ کا طوفان
یعنی
طلسم حیات
جسے پڑھ کر
ہنسیے، روئیے، حیران ہو کر سبق حاصل کیجیے
جو ہندوستان کے نامور ادیب و شاعر مشہور اور مقبول افسانہ نویس
ماہر القادری
کے
تازہ ترین و دلچسپ افسانوں کا حسین و جمیل مجموعہ ھے
ہر افسانہ ادبیات کا صحیفہ اور ادب کا گلدستہ ہے یورپ کی زبانوں میں بھی اس تصنیف
کے ترجمہ کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔
حجم تقریباً ۲۵۰ صفحات سرورق تین رنگی باتصویر نہایت حسین اور پائدار کتابت و طباعت
لاجواب مصنف کے فوٹو کے ساتھ قیمت صرف دو روپے (عہ)
آپ کا کتب خانہ اس ادبی گلدستہ سے خالی نہ رہنا چاہیئے۔
فوراً اس پتہ سے طلب فرمائیے
ملک دین محمد اینڈ سنز پبلشرز و تاجران کتب بل روڈ لاہور

مئی ۱۹۳۸ء کی مطبوعات جامعہ

بیوہ۔ منشی پریم چند آنجہانی نے ایک بیوہ کے حالات دردناک پیرایہ میں لکھے ہیں۔ ایک بیوہ کی ترغیبات اس کی الجھنوں۔ اور ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوششوں کو بہترین طریقہ سے پیش کیا ہے۔ ضمناً یہ بھی بتایا ہے کہ ایک بیوہ کو کیسی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔

قیمت مجلد عہ

بنی اسرائیل کا چاند۔ مصنفہ رائڈر ہیگرڈ، بترجمہ عبدالمجید حیرت بی اے جلیگ۔ فرعون کا دور حکومت شاہزادہ سیٹی ولی عہد سلطنت کی عدل و انصاف کے لئے معزولی۔ عبرانیوں پر مظالم۔ ایک عبرانی لڑکی میراپی کے حیرت انگیز کارنامے۔ مصر پر خدائے بنی اسرائیل کی طرف سے پے درپے مختلف قسم کی وبائیں۔ بنی اسرائیل کی آزادی۔ فرعون کی معہ لشکر غرقابی۔ اور سیٹی و میراپی کے تعلقات کی دلگداز داستان۔ قیمت مجلد عاں

ضرب الامثال۔ از خواجہ محمد عبدالمجید دہلوی۔ یہ ۸۷ ضرب الامثال کا مجموعہ ہے۔ جس میں ایسے ضرب الامثال ہیں جو قصہ طلب ہیں اور جن کا مفہوم بغیر قصہ بیان ہوئے کماحقہ سمجھ میں نہیں آتا۔ اب تک اردو زبان میں ایسی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی۔ قیمت ۸ر

دلی کی دو سو برس کی تاریخ۔ یہ اردو اکاڈمی کا ایک مقالہ ہے۔ اس میں تمام تر دہلی کے نابود شدہ اور موجودہ آثار سے بحث کی گئی ہے۔ اور ان کا اسلامی اور ہندی فنون سے ربط اور ارتقائے فنون میں ان کی جگہ۔ اور قدر و قیمت دکھائی گئی ہے۔ قیمت ۵ر

عقاب۔ از رقیہ ریحانہ۔ یہ چار چھوٹے چھوٹے قصوں کا مجموعہ ہے۔ ذرا ابو خاں کی بکری کو تو دیکھو یہ بھی غلام رہنا پسند نہیں کرتی۔ لڑتے لڑتے مرجاتی ہے۔ لیکن غلامی کی زنجیر میں بندھنا پسند نہیں کرتی۔

قیمت ۴ر

چنبیلی:۔ یہ چھوٹے بچوں کے لئے آسان زبان میں ایک دلچسپ کہانی ہے۔ قیمت ۲ر

مکتبہ جامعہ

دہلی۔ نئی دہلی۔ لاہور۔ لکھنؤ

سب رس کتاب گھر

حیدرآباد، اضلاع اور برطانوی ہند سے دفتر سب رس کو ادارۂ ادبیات اردو کی مطبوعات کے علاوہ عام اردو ادب اور خاص کر دکن کی مطبوعات فراہم کرنے کے لئے فرمائشیں وصول ہوئی ہیں لیکن ابھی دفتر نہیں چاہتا کہ ایک مکمل اردو بک ڈپو کے انتظامات کی ذمہ داری لے۔ تاہم اہل ذوق اصحاب کے اصرار پر حیدرآباد کے خاص خاص اور مشہور و معروف مصنفین و شعراء کی کتابیں دفتر سب رس میں فروخت کے لئے حاصل کی گئیں اور خواہشمند اصحاب کے یہاں روانہ کی جاتی ہیں۔ دوسرے اہل ذوق اصحاب کی اطلاع کے لئے بھی ذیل میں ان کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے جو سب رس کتاب گھر سے عام بازار کی قیمت پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔

تصنیفات حضرت حکیم الشعراء سید احمد حسین امجد

کتاب	قیمت
رباعیات امجد حصہ اول	عمہ/
رباعیات امجد حصہ دوم	عمہ/
ریاض امجد حصہ اول	عہ
ریاض امجد حصہ دوم	عہ
خرقہ امجدی پیوند	عہ
نذر امجد	۲ر
حج امجد	عال
میاں بیوی کی کہانی	۴ر
حکایات امجد	عہ
جمال امجد	سے
گلستان امجد	سے

تصنیفات و تالیفات مولوی سید محمد رضا صاحب ایم اے

کتاب	قیمت
ارباب نثر اردو	عال
گلشن گفتار	۱۲ر
ملفوظات میر	عال
ابتدائی فارسی	۱۲ر
یادگار ولی	عال

کلام استاد سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

کتاب	قیمت
ارمغان عزیز	عال
متاع سخن	۱۲ر

تصنیفات ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور

کتاب	قیمت
اردو کے اسالیب بیان	۴ر
اردو شہ پارے	۴ر
روح تنقید	۱۲ر
تنقیدی مقالات	۴ر
عہد عثمانی میں اردو کی ترقی	عمہ/
محمود غزنوی کی بزم ادب	عہ
ہندوستانی لسانیات	عال
ہندوستانی صوتیات (انگریزی)	عال
فن انشا پردازی	۴ر
طلسم تقدیر	۸ر
سیر گولکنڈہ	۱۵ر
گولکنڈے کے ہیرے	۱۲ر

تصنیفات و تالیفات پروفیسر عبد القادر صاحب سروری

کتاب	قیمت
دنیائے افسانہ	عمہ/
کردار اور شاعری	عمہ/
جدید اردو شاعری	عال
حیدرآباد کی تعلیمی ترقی	عہ
چینی اور جاپانی افسانے	۲ر
انگریزی افسانے	عمہ/

کلام سید محمد حسین صاحب آزاد

کتاب	قیمت
خیالات آزاد جلد اول	عمہ/
خیالات آزاد جلد دوم	عہ

تصنیفات و تالیفات مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی

کتاب	قیمت
یورپ میں دکنی مخطوطات	للعہ
دکن میں اردو	سے
خواتین عہد عثمانی	عمہ/
حضرت امجد کی شاعری	۱۲ر
مکتوبات امجد	۱۲ر
رہبر سفر یورپ	۱۲ر
ذکر نبی	۱۲ر

باہتمام
خواجہ حمید الدین شاہد
مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس میں طبع ہو کر دفتر ادارہ خیریت آباد سے شائع ہوا

اشاعت کتب ادارہ

گذشتہ سات سال کے عرصہ میں ادارہ نے حسب ذیل چند کتابیں شائع کیں۔

ورڈز ورتھ اور اسکی شاعری:۔ از میر حسن صاحب ام' اے قیمت عہ

ٹیگور اور انکی شاعری:۔ از مخدوم محی الدین صاحب ام' اے قیمت عہ

ہوش کے ناخن (ڈرامہ):۔ از میر حسن اور مخدوم محی الدین صاحبان قیمت ۱۲ر

یوسف ہندی قید فرنگ میں:۔ از مولوی محسن بن شبیر صاحب بی' اے۔ ال ال بی۔ قیمت ۸ر

مرقع سخن (جلد اول):۔ دکن کے پچیس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے۔ قیمت عہ

مرقع سخن (جلد دوم):۔ مرقع سخن کا دوسرا حصہ ہے جس میں پچاس شعرائے دور آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے۔ قیمت عہ

سراج سخن:۔ پروفیسر عبد القادر صاحب سروری نے شاہ سراج اورنگ آبادی کے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

ایمان سخن:۔ مولوی سید محمد صاحب ام اے۔ نے عہد آصفجاہ ثانی کے ملک الشعرا شیر محمد خان ایمان کے کلام کا انتخاب کیا ہے ۱۲ر

فیض سخن:۔ میر شمس الدین محمد فیض اردو شاعری کے مسلم الثبوت استاد تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے حضرت فیض کے کلام کا انتخاب شائع کیا ہے اور اسکے ساتھ ان کا ایک مقدمہ بھی ہے۔ قیمت ۱۲ر

بادۂ سخن:۔ ڈاکٹر احمد حسین مائل مرحوم کے کلام کا دلچسپ اور معیاری انتخاب ہے۔ قیمت ۱۲ر

کیف سخن:۔ حضرت کیفی ایک بوقلمون طبیعت کے سخن گو ہیں۔ ڈاکٹر زور نے کیف سخن کے نام سے ان کے کلام کا انتخاب ایک معلومات آفرین مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے قیمت ۱۲ر

متاع سخن:۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر فصیح الملک داغ کے شاگرد اور حیدر آباد کے ایک پختہ مشق شاعر ہیں۔ ڈاکٹر زور نے ان کے حالات اور ان کی شاعری پر تبصرے کے ساتھ ان کے کلام کا لطیف انتخاب پیش کیا ہے۔ قیمت ۱۲ر

نقد سخن:۔ نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نے حضرت فانی بدایونی کے کلام پر فنی نقطہ نظر سے سخن ورانہ تنقید کی ہے۔ قیمت عہ

نذر ولی:۔ اس میں دکن کی چار خواتین انشا پرداز کے دلچسپ مضامین ہیں جو بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کے حالات زندگی اور خصوصیات کلام پر نہایت دلچسپ اسلوب میں اور جدید ترین نقطۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ قیمت عا رعہ

گریۂ تبسم:۔ صاحبزادہ میکش مدیر سب رس کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے میکش حیدر آباد کے نوجوان شعرا میں ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں اور انکا کلام بہت مقبول ہے۔ ڈاکٹر زور کا دیباچہ عمومی اور پروفیسر عبد القادر سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ عالر

پارچہ
خوش نما
پائدار
سستا
کرناٹک، بکنگھم اور بنگلور اولن ملز کا
بنا ہوا کپڑا
قمیص، سوٹ اور شیروانی
کے لئے
مضبوط، خوش وضع اور کم دام ثابت ہوا ہے
(ہر کپڑے کی دوکان سے دستیاب ہو سکتا ہے)
بکنگھم ملز
BINNY & Co (MADRAS) LTD
BANGALORE
AGENTS SECRETARIES & TREASURERS
بنگلور اولن ملز
کرناٹک ملز
یف ڈی۔ خاں۔ اینڈ کو
تاجر پارچہ

سب رس

اردو نمبر

نشان پتہ آصفیہ (۱۵۳)

رجسٹرڈ نمبر (M 3950)
ٹیلیفون نمبر (۲۲۰۹)

اردو نامہ

یعنی

ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ماہنامہ

سب رس

کا سالگرہ نمبر بابتہ جنوری سنہ ۱۹۴ء

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

مجلسِ ادارت

صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش
سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہد
عبدالحفیظ صدیقی (بی اس سی)
معین الدین احمد انصاری

دفتر ادارۂ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن سے شایع ہوا

سب رس کے مقاصد و قواعد

(۱) "ادارۂ ادبیات اردو" کا ماہوار علمی و ادبی رسالہ جس میں اردو زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوگی۔

(۲) مضامین متعلقہ سیاسیات حاضرہ اور مذہبی مباحث کسی صورت میں قابل اشاعت متصور نہ ہوں گے۔

(۳) اردو مطبوعات پر بے لاگ تنقید کر کے اردو تصنیف و تالیف کا ذوق صحیح پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

(۴) غیر زبانوں کے شاہکار مضامین کو اردو میں منتقل کر کے اردو کے علمی و ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا جائے گا۔

(۵) یہ رسالہ کم از کم (۶۴) صفحے اور زیادہ سے زیادہ (۹۶) صفحات پر ہر ماہ عیسوی کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوا کرے گا۔

(۶) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع پندرہ تاریخ تک دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔

(۷) جواب طلب امور کے لئے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے

(۸) خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا جائے۔

(۹) اشتہارات کی اجرت پیشگی لی جائے گی۔ وی پی کے ذریعے سے وصولی منظور نہیں کی جائے گی۔

سب رس کی قیمت

بلدہ حیدرآباد کے لئے

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
چار روپے	دو روپے آٹھ آنے	چھ آنے

شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
روپے آٹھ آنے	دو روپے بارہ آنے	سات آنے

بچوں کے سب رس کی قیمت

بلدہ حیدرآباد کے لئے

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ

شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

سب رس معلومات کی قیمت

بلدہ حیدرآباد کے لئے

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ	دس آنے	ڈیڑھ آنہ

شہر میں یا شہر سے باہر بذریعہ ٹپہ

سالانہ	شش ماہی	فی پرچہ
ایک روپیہ آٹھ آنے	بارہ آنے	دو آنے

خاص نمبر — محرم نمبر ۱۲/ - اقبال نمبر عہ/ - دکن نمبر عا/ - اردو نامہ عا/

سب رس معلومات

حیدرآباد کے مشہور و مقبول رسالہ سب رس کے اس ضمیمے میں مشاہیر کی زندگیاں عام فہم سائنس کے مضامین تعلیمی اور سیاسی خبریں مسابقتی امتحانات سے متعلق معلومات کھیل کی خبریں وغیرہ شامل رہیں گی اس ضمیمے کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو لوگ حیدرآباد یا برطانوی ہند کے مسابقتی امتحانات میں حصہ لینا چاہتے ہیں ان کے لئے اردو زبان میں قیمتی معلومات اور حالات حاضرہ سے متعلق تمام باتیں فراہم کی جائیں ایسے حضرات کے علاوہ جن لوگوں کو علمی باتوں اور معلومات سے دلچسپی ہے اور غزلوں اور افسانوں کو چھوڑ کر زمانے کی رفتار پر بھی نظر رکھنا چاہتے ہیں یقین ہے کہ وہ اس حصے سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔

سب رس۔ اردو نامہ جنوری سنہ ۱۹۴ء

فہرست تصاویر

مشاہیرِ اردو کا تاریخی گروپ

فرش پر بیٹھے ہوئے:۔ (۱) سر عبدالقادر (۲) حافظ ساجد علی وکیل اورنگ آباد (۳) ظفر عمر۔

کرسیوں پر سامنے:۔ (۱) غلام محمد منشی (۲) سر اکبر حیدری (۳) وقار الملک (۴) حکیم محمد اجمل خاں (۵) حالی (۶) عزیز مرزا (۷) محسن الملک۔
(۸) مرزا محمود علی خاں (۹) منشی محبوب عالم۔

کرسیوں پر دوسری صف:۔ (۱) علی الدین حسن (۲) شبلی (۳) پروفیسر آرنلڈ (۴) نذیر احمد (۵) نواب ابوالحسن خاں

کرسیوں پر تیسری صف:۔ (۱) ظفر علی خاں، دستار میں) (۲) سر محمد اقبال (۳)، نور المنیب اللہ حیدر آبادی (شملے میں)

پیچھے کھڑے ہوئے:۔ (غلام محمد منشی سے حکیم اجمل خاں تک) (۱) ابوالحسن (۲) خواجہ غلام ثقلین (شملے میں) (۳) حبیب الرحمن خاں شروانی (۴) مسعود علی محوی۔

پیچھے کھڑے ہوئے:۔ (منشی محبوب عالم کے پیچھے) (۱) قاسم دین (شملے میں، (۲) مصطفیٰ علی وکیل جالنہ۔

وسط میں استادہ:۔ ظفر علی خاں کے پیچھے ستون سے لگے ہوئے غلام جیلانی۔ نور المنیب اللہ کے پیچھے شرف الحق۔

نوٹ:۔ اس اہم تاریخی گروپ کے اصحاب کے پہچاننے میں سر عبدالقادر اور مولوی نور المنیب اللہ صاحب وکیل نے سب سے زیادہ مدد کی ہے اس کے لئے ادارہ شکر گزار ہے۔
یہ تصویر اگرچہ پہلے سب رس بابت جولائی ۱۹۳۰ء میں شائع ہو چکی تھی لیکن مولوی نور المنیب اللہ صاحب کی مدد اور مشورہ ہی کی وجہ سے دوبارہ بڑی بنا کر چھاپی جا رہی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ اصحاب کے نام معلوم ہو سکیں اور جو نام غلط لکھ دیئے گئے تھے ان کی تصحیح ہو سکے۔

مشاہیر اردو کا تاریخی گروپ

فہرست مضامین

۱۹۲۷ء

خوابِ شیریں

تو خواب کے مانند گزر جاتا ہے
تو آنکھوں میں نیند کی طرح آتا ہے
تو پاس آتا ہے جب میں سو جاتا ہوں
تجھ کو پا کر میں آپ کھو جاتا ہوں

رباعی

بے خود میں رہوں، تو وہ قریں آتا ہے
اس پردے میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
جب وہ آتا ہے، میں نہیں رہتا ہوں
میں جب رہتا ہوں، وہ نہیں آتا ہے

اے نیند عجیب طرح ڈالی تو نے
میری آنکھوں میں رہ نکالی تو نے

رباعی

کونین کی فکروں سے فراموشی ہے
خاموشی میں کیفیتِ سرگوشی ہے
آنکھیں لذت میں ڈوب کر بند ہوئیں
یہ نیند ہے، یا تری ہم آغوشی ہے

ان بند پپوٹوں نے چھپایا ہے کسے
ان نور کی پتلیوں نے پایا ہے کسے
مستی میں بھی ہوشیار ہوں، واہ رے میں
بند آنکھوں سے دیکھتا ہوں اللہ رے میں
ہے صاحبِ عرش کا مکاں آنکھوں میں
ہے نورِ زمین و آسماں آنکھوں میں

رباعی

اصلیت اگر نہیں، تو دھوکا ہی سہی
اللہ! بہت نہیں، تو تھوڑا ہی سہی
تسکین کی آخر کوئی صورت بھی تو ہو
رویت ممکن نہیں، تو رویا ہی سہی

سید احمد

کایا پلٹ

(میکش صاحب ورڈز ورتھ کی نظموں کا آزاد منظوم ترجمہ کر رہے ہیں کایا پلٹ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ "شاہد")

اس کاغذی گلزار میں بُو ڈھونڈنے والے !
بے جان لکیروں میں لہو ڈھونڈنے والے !

ابرو میں شکن ہے، ترے ماتھے پہ پسینہ
ساحل سے مگر دور ہے "کاغذ کا سفینہ"

غیروں کے بنائے ہوئے نقشوں کو چبانا
ایسا ہی ہے جیسے کسی "گونگے کا ترانا"

انوارِ بصیرت پہ نہ چھا جائے "سیاہی"
آنکھوں کے لئے مانگ لے آزاد نگاہی

اٹھ اور نگاہوں سے کتابوں کو ہٹا دے
فطرت کے حسیں رخ سے نقابوں کو ہٹا دے

وہ دیکھ حسیں شام کی رنگین جوانی
کھیتوں کو سناتی ہے بہاروں کی کہانی

وہ دامنِ کہسار میں جھرنے کا ترنم
تتلی کے وہ چھو لینے سے کلیوں کا تبسم

جگنو میں جھلکتا ہے مہ نو کا اشارا
لیتے ہوئے مخمور فضاؤں کا سہارا

....

کر دفن کتابوں میں غم لا متناہی
وہ دیکھ کہ لی طائرِ رنگیں نے جماہی

پیپل کی لچکتی ہوئی ٹہنی کو جھکا کر
آکاش پہ تاروں کو بلاتا ہے وہ، گا کر

سوگند مری روح کی، یہ مست ترانے
دنیا میں لٹاتے ہیں، مسرت کے خزانے

دیکھ، ان میں حیات آفریں نکتوں کی روانی
سن، ان میں خرد بخشیٔ فطرت کی کہانی

ان نغموں میں گم ہو کے تمنائے اثر سیکھ
تسخیرِ جہاں کے لئے اندازِ نظر سیکھ

خوابیدہ دماغوں کو جگاتے ہیں یہ نغمے
فطرت کی طرف دل کو بلاتے ہیں یہ نغمے

....

بکھرے ہوئے پھولوں کی بھی اک ہلکی سی جنبش
ہے بربطِ تحقیق کا اک نغمۂ دانش

انساں کی حقیقت کا کھلا راز ہے گویا
اک دور سے آئی ہوئی آواز ہے گویا

....

یہ عقل، فریب آشنا، تخئیل کی دشمن
انساں کے لئے "محنتِ فردا" کی ہے الجھن

یہ عقل، سیہ داغ ہے فطرت کی جبیں پر
پھینکی ہوئی اک آگ ہے فردوسِ بریں پر

اس عقل کے ہاتھوں سے بگڑ جاتی ہے ہستی
زنجیرِ تعین میں جکڑ جاتی ہے ہستی

اس عقل و خرد کو رہِ فطرت میں گنوا دے
آزاد نگاہوں سے کتابوں کو ہٹا دے

اٹھ اور یہیں اپنے لئے مانگ لے "وہ دل"
ہر شئے میں نظر آئے جسے "علم کا حاصل"

میکش

اداریہ

"سب رس" کی زندگی کا تیسرا سال "اُردو نمبر" سے
شروع ہو رہا ہے۔ گزشتہ دو سال میں اس کی ترقی جس صحت بخش
طریقے سے ہوئی ہے، اس کا اظہار یہاں بے ضرورت ہوگا اس
لیے کہ "سب رس" ارباب ملک سے ہمیشہ قریب تر رہا ہے
اور ملک کے دماغوں سے نکلے ہوئے علمی و ادبی سرمائے کو ملک کے
دماغوں تک پہنچانے میں اس کی پُر خلوص کوشش قدر کی نگاہوں
سے دیکھی جاتی رہی۔

یورپ کی موجودہ صورت حال صحافت کے لیے صبر آزما
بن گئی ہے۔ اشیاء کی غیر معمولی گرانی نے ظاہری معیار کو پست
کر دیا ہے اور ارباب صحافت کے لیے اپنی ساکھ کو قائم رکھنے
کے لیے دو ہی راستے کھلے ہوئے ہیں۔ چندہ میں اضافہ یا
موجودہ چندہ کا بدل۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ خدمت
ادب کی راہ میں کسی عذر کو خواہ وہ حقیقت سے قریب
ہی کیوں نہ ہو "سنگ گراں" باور کرائیں۔ اسی احساس
کے پیشِ نظر ہم نے اپنے اعلانات کے مطابق "اُردو نمبر"
کو شاندار بنانے کی کوشش کی ہے اور سب رس کا روایاتی
معیار باقی رکھا ہے بلکہ ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ
اس کو بلند تر کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

سرورق "اُردو نمبر" کے لیے سرورق کا انتخاب یقیناً
ایک نازک کام تھا۔ اس لیے کہ ادبیات کے
جدید دور نے "ظاہر و باطن" کی حدیں ملا دی ہیں جس طرح
ادب اور زندگی کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اچھی کتاب
نام ہے، اپنے موضوع، انداز بیان اور دیدہ زیبی کا ایک
بدنما پھول، اپنی خوش بُو کے باوجود گیسوؤں کی زینت نہیں
بن سکتا۔ ہم نے جب موزوں سرورق کے متعلق غور کیا تو ہمارے
تصور میں جامعۂ عثمانیہ کے کلیۂ فنون کی وہ حسین و شاندار عمارت
آئی جو اپنی طرز تعمیر میں تہذیب و تمدن کا ایک سرمایہ
رکھتی ہے۔ جامعۂ عثمانیہ نے ترقی اُردو میں جو حصہ لیا ہے
وہ عہد آفریں ہے۔ کلیۂ فنون کی عمارت ہند و مسلم تہذیبوں
کے امتزاج کا خوش گوار نمونہ ہے اور اس عمارت کا افتتاح
اُردو کے سب سے بڑے محسن اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ
نے فرمایا ہے۔ یہی وہ غیر معمولی خصوصیات ہیں جن کے باعث
اُردو نمبر کے سرورق پر جامعۂ عثمانیہ کے کلیۂ فنون کی تصویر ہی
موزوں ترین سمجھی گئی۔

یہ تصویر جو "اُردو نمبر" کے سرورق پر دکن کی "خدمت اُردو"
کے نمایاں ثبوت میں شایع کی جا رہی ہے، اصل میں چاندی
کے اس کیسکٹ کا عکس ہے جو پندرہ ہزار روپیے کے صرفے
سے تیار ہوا اور بارگاہِ سلطان العلوم میں افتتاح کلیۂ فنون کے
موقع پر گزرانا گیا۔ کلیۂ فنون کی عمارت چونے اور پتھر سے بنائی گئی ہے اور اس کا
نمونہ چاندی سے تیار کیا گیا ہے۔ لیکن ان دونوں میں عثمانیین کے
دلوں کا سکون پرور اضطراب، روح کا تقدس اور علم و
عمل کی پاکیزگی دکھائی دیتی ہے۔ فن کاروں کا یہ سب سے
بڑا کمال ہے کہ انھوں نے حُسن کو حقیقت سے ہم آہنگ کر دیا۔

تصویریں "اُردو نمبر" کی مناسبت سے اس کی تمام تر
تصویریں یا تو اُردو ادب کے شاعروں،
ادیبوں اور محسنوں کی ہیں یا اُردو سے تعلق رکھتی ہیں جیسا

ہم نے پہلے بھی کہا ہے، جنگ کی وجہ سے کاغذ، بلاک سازی اور طباعت میں جو گرانی پیدا ہوگئی ہے اس کے پیشِ نظر ایک ہی نمبر میں تقریباً پچاس تصویروں کا شائع کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھوں نے کبھی اس کوچہ میں قدم رکھا ہے۔ اس واقعے کا اظہار ہم محض یہ بتانے کے لیے کر رہے ہیں کہ ہمیں "سب رس" کتنا عزیز ہے اور ہم اس کو مقبول و مفید بنانے کے لیے کیا کر رہے ہیں۔

مشاہیرِ اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط۔ ادبیات میں مکتوبات کی خاص اہمیت ہے۔ اس لیے کہ مکتوبات زندگی کا آئینہ ہوتے ہیں جن میں کاتب بے تکلفی کے ساتھ اپنی زندگی کے عکس پیش کرتا ہے۔ چونکہ مکتوب چھپوانے کے خیال سے نہیں لکھا جاتا اس لیے اس میں سادگی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے۔ اسی لیے مشاہیر کے خطوط کا ذخیرہ ہر زبان میں محفوظ کیا جاتا رہا ہے۔ اُردو میں بھی مکتوبات کے بعض مجموعے شائع کیے گئے ہیں۔ آپ کو اس نمبر میں مشاہیرِ اُردو کے سولہ[16] غیر مطبوعہ خطوط ملیں گے جو پہلی دفعہ شائع ہو کر منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ شبلی، داغ، ... طیبہ بیگم، گرامی، شاد عظیم آبادی، راشد الخیری اور ممتاز علی وغیرہ کے نام اور کام سے ہر اُردو داں واقف ہے۔ یہ مکاتیب اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ یہاں یہ کہہ دینا بے محل نہ ہوگا کہ ادارۂ ادبیات اُردو اکثر مشاہیرِ اُردو کی غیر مطبوعہ تحریریں جمع کر رہا ہے اور اسی ذخیرے سے چند اُردو خطوط اُردو نمبر کے لیے حاصل کیے گئے ہیں۔

اُردو پروفیسروں کے حالات اُردو ادب کی تاریخ، ان خاموش خدمت گزاروں کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی جن کی رہنمائی نوجوانوں میں اپنی زبان کی خدمت کرنے کا ذوق پیدا کرتی ہے، زبان کے ان خدمت گزاروں پر بہت کم لوگوں کی نظر گئی ہے۔ ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کو سراہنے والے ان کو کسی طرح نہیں بھلا سکتے، جن کی دماغی محنت اور ایثار سے نوخیز ادیبوں، انشا پردازوں اور شاعروں کی صحت بخش تربیت ہوتی ہے۔ اس نمبر میں ہم نے ہندوستان کی مختلف جامعات کے اساتذۂ اُردو کے حالات اور خدمات سے اہلِ زبان کو روشناس کرایا ہے۔ افسوس ہے کہ بعض حضرات نے اپنے حالات روانہ نہیں کیے ورنہ یہ تذکرہ مکمل ہو جاتا۔ اب اس کی تکمیل کا یہی طریقہ رہ گیا ہے کہ اس کو ایک جداگانہ کتاب کی صورت میں شائع کیا جائے "ادارۂ ادبیات اُردو" ایسی ایک کتاب شائع کر رہا ہے جس میں گزشتہ اساتذہ کے حالات و خدمات کا تذکرہ بھی شریک رہے گا۔

حصۂ نظم و نثر اُردو نمبر کا حصۂ نظم پُر تنوع اور بلند پایہ ہے۔ اس کے لیے اکثر و بیشتر مشہور شاعروں کی غیر مطبوعہ غزلیں اور نظمیں خاص طور پر حاصل کی گئی ہیں۔ جلیل، امجد، علی منظور، ماہر، ساغر، حفیظ جالندھری، صفی اورنگ آبادی، احسان دانش، خنجر، مخدوم، وجد وغیرہ، کی غزلوں اور نظموں میں جو قدیم اور جدید طرزِ شاعری کے نمونے ہیں، آپ اُردو شاعری کے مختلف رجحانات دیکھیں گے۔

حصۂ نثر میں ہندوستان کے بہترین انشا پردازوں کے معلومات آفریں مضامین اور مقالے شامل ہیں، جو "سب رس" کے لیے خاص طور پر حاصل کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر زور ۔ احسن یار جنگ ۔ سید عارف الدین ۔ عزیز یار جنگ ۔ بہادر یار جنگ ۔ سر عبدالقادر ۔ محمد اکرام ۔ سیف علیخان ۔ ہاشمی
اقبال علی پروفیسر سروری ۔ ظہیر الدین احمد ۔ پروفیسر سید محمد ۔ ناصر الدین احمد ۔ پروفیسر فضل حق ۔ ڈاکٹر امیر علیخان
عارف علی کمال علی ۔ پروفیسر مجید صدیقی ۔ سراج الدین احمد ۔ عبدالحفیظ ۔ حمید الدین شاہد

مرزا فرحت اللہ بیگ، ایم اسلم، ماہر القادری، علامہ ڈاکٹر نجم الدین احمد جعفری، پروفیسر عبدالقادر سروری کے علاوہ متعدد ایسے اصحاب کی قلم کاری کے نتائج آپ کو اس نمبر میں ملیں گے جنھوں نے اپنی زندگی خاص خاص موضوعوں کے لیے وقف کر رکھی ہے۔

سب رس معلومات اس نمبر سے بچوں کے ضمیمہ کے علاوہ ایک اور ضمیمۂ معلومات کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔ جس میں عام فہم طریقے سے تازہ معلومات فراہم کی جائیں گی۔ زندگی کی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں نے ایک طرف وقت کو تنگ بنا دیا ہے اور دوسری طرف رفتارِ زمانہ سے واقف رہنا ناگزیر ہے۔ اس لیے کم وقت میں بہت کچھ حاصل کرنے کے مواقع فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ضمیمہ ان طلبہ کے لیے خاص طور پر مفید ہوگا جو امتحانات مقابلہ کے لیے تیاری کرتے ہیں۔ کیونکہ اس میں سائنس اور دیگر جدید علوم کے علاوہ مقابلہ کے امتحانوں کی ضروریات اور اطلاعیں شایع ہوتی رہیں گی۔ اس ضمیمہ کی ترتیب کا کام مولوی عبدالحفیظ صاحب صدیقی بی، ایس سی کے سپرد کیا گیا ہے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ضمیمہ ان اصحاب کے لیے جو اپنی مصروفیتوں کے باعث مطالعہ کے لیے بہت کم وقت دے سکتے ہوں، کار آمد ہوگا۔

ادارۂ ادبیاتِ اردو بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے باعث اس وسیع کام کو جس کی انجام دہی مرکزی ادارے کے لئے وقت طلب ثابت ہو رہی تھی، شعبہ واری [illegible] لیے سے پھیلا دیا گیا ہے۔ اس طرح اب تک شعبۂ زبان، شعبۂ تالیف و تراجم، شعبۂ تاریخ دکن، شعبۂ شعرا و مصنفین دکن، شعبۂ تنقید، شعبۂ سائنس، شعبۂ امتحانات، شعبۂ نسواں، شعبۂ اطفال اور شعبۂ طلبہ قائم ہو چکے ہیں۔ اور ادارہ کے کام میں تنظیم کے ساتھ وسعت ہوتی جا رہی ہے۔ ملک کے علم دوست اور اہل ذوق خواتین و اصحاب کی معاونت سے ان شعبوں نے ایک انفرادی حیثیت حاصل کر لی ہے اور ہر شعبہ اپنے مفوضہ کام کو دلچسپی کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔ یہ شعبے نہ صرف مختلف مسائل پر غور و خوض کر رہے ہیں بلکہ ان کی جانب سے خاص موضوع پر کتابیں تصنیف و تالیف کروائی جا رہی ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ یہاں ادارے کی شعبہ جاتی مصروفیتوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کریں لیکن ادارہ سے ہم سفارش کر رہے ہیں کہ وہ ایک کتابچہ شایع کرے جس میں ادارے کی مکمل روداد ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ادارہ نے حیدرآباد میں اپنے خلوصِ عمل اور ذوقِ کار سے کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے اور اس کی عملی کوششوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جا رہا ہے۔ اس لئے ایسے کتابچے کی اشاعت اربابِ ملک کو یہ واقف کرانے کے لئے ضروری ہے کہ ادارے نے اب تک کیا کیا؟ اور اب وہ کیا کر رہا ہے؟

ایک وسیع کتب خانے کے قیام کی اسکیم جس میں تمام قدیم و جدید اردو کتابیں ہوں زیر غور ہے تاہم فی الحال ادارہ کے دفتر ہی میں ایک کتب خانہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کتب خانے میں دکنی مخطوطات کا بھی ایک قابلِ لحاظ ذخیرہ ہے۔ ملک کے وہ اہلِ ذوق اصحاب جو زبان کی خدمت کو ایک مقدس فرض سمجھتے ہیں، اس کتب خانے کے لئے قلمی و مطبوعہ کتابیں فراہم کرنے میں مدد دیں تو یقین ہے کہ اردو [illegible] والوں اور اردو ادب پر تحقیقی کام کرنے [illegible] مشکل حل ہو جا سکتی ہے۔

"مذکری ادارے" نے صرف بلدے کے اصحاب ذوق کا تعاون حاصل کیا تھا۔ اور یہ ناممکن تھا کہ اضلاع حیدرآباد کے خدمت گزاران اردو اپنی اعانت سے ادارے کو محروم رکھیں۔ اردو زبان حیدرآباد کی قومی اور سرکاری زبان ہے اس لئے اس کے ہر دیہات میں بولی اور سمجھی جاتی ہے لیکن بلدہ سے زیادہ اہلِ دیہات میں اشاعتِ اردو کا کام اس لئے ہونا چاہیئے کہ ...... وہ شہر سے دور ایسے گوشوں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں، جو شہری سہولتوں سے محروم ہے۔ ادارہ کی شاخیں اب تک اورنگ آباد، محبوب نگر، جالنہ اور عثمان آباد میں قائم ہو چکی ہیں۔ اور توقع ہے کہ حیدرآباد کے ہر گوشے میں اس کی شاخ قائم ہو جائے گی۔ ہم اضلاعی شاخوں سے بلند آہنگ توقعات وابستہ کرنے میں غلطی نہیں کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اضلاع میں رہ کر اضلاع کی ضروریات سے بہت زیادہ واقف ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کی پُرخلوص کوشش سے حیدرآباد کے ہر گوشے میں اردو ادب عام ہو جائے۔ یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ جاہلیت کے خلاف ایک مستحکم محاذ قائم کیا جائے۔

یہ کوئی دقت طلب کام نہیں ہے اگر ارادہ میں پختگی، مزاج میں استقلال اور دل میں خلوص ہو۔ ادارہ نے شعبۂ امتحانات قائم کر کے ایک راہِ عمل کھول دی ہے۔ اس لئے ضلعی شاخوں کو چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ طالب علموں کو ادارے کے امتحانات کی تیاری کے لئے آمادہ کریں اور ترغیب و مدد سے انھیں اس قابل بنائیں کہ وہ امتحانوں میں کامیابی حاصل کر سکیں۔

شاخ محبوب نگر۔ صدر۔ مولوی سید تقی صاحب بلگرامی بیرسٹر ایٹ لا ناظم عدالت ضلع۔ نائب صدر۔ مولوی احمد عبداللہ صاحب مسدوسی بی اے ال ال بی۔ معتمد۔ مولوی حسن علی مرزا صاحب وکیل شریک معتمد ... مرطی صاحب فاروقی وکیل۔

اراکین۔ [illegible] صاحب وکیل ہنمنت راؤ صاحب وکیل۔ مولوی عبدالرزاق خاں صاحب [illegible] صاحب بی اے ال ال بی وکیل۔ ننداگیری وینکٹ راؤ صاحب بی اے ال ال بی وکیل۔ ڈاکٹر افتخار الدین صاحب سیول سرجن سید ساجد علی صاحب مہتمم تعلیمات۔ مولوی سالم مسدوسی صاحب۔ مولوی عبدالعزیز صاحب گتہ دار۔ مولوی عبدالرحمٰن صاحب آواز گتہ دار۔

شاخ جالنہ۔ صدر۔ مولوی افضل علی صاحب وکیل ہائیکورٹ معتمد۔ مولوی افضل عابدی صاحب وکیل۔ مہتمم [illegible] لوی سید عمر صاحب مولوی فاضل۔ کتب خانہ دار مسٹر غازی۔

نشرگاہ حیدرآباد

موجودہ زمانے میں نشریات نے جو غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی ہے وہ محتاجِ تشریح نہیں۔ ریڈیو تفریحی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے تمدنِ حاضرہ میں اپنا ممتاز مقام رکھتا ہے۔ برق کی ترسیلی قوت نے صوتی لحاظ سے ایک عالمی ارتباط پیدا کر دیا ہے۔ اور اس کی وجہ سے دنیا کے مختلف گوشے ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے ہیں جتنے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں تھے۔ ریڈیو نے ملک و قوم کی خدمت کے نئے راستے کھول دئے ہیں۔ جس طرح قلم سے تعلیم و تہذیب کی اشاعت میں مدد لی جا سکتی ہے، اسی طرح ریڈیو کے ذریعے سے بھی زیادہ وسعت کے ساتھ تعمیری کام لیا جا سکتا ہے۔ ریڈیو سے جو خدمات ہو سکتی ہیں، ان میں خدمتِ زبان بھی ہے۔ دنیا بھر کی نشرگاہوں سے ادبی پروگرام کی نشر عوام میں "ادبی ذوق" پیدا کر رہی ہے۔ چونکہ ریڈیو کا راست تعلق عوام سے بھی ہے اس لئے ذریعۂ نشر وہی زبان ہو سکتی ہے جو عوام کی مشترکہ زبان ہو۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں زبان کے مسئلہ کو سیاسی رنگ دیا گیا ہے اور یہ بحث ختم ہوتی نظر نہیں آتی کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو ہے یا ہندی؟

افسوس ہے کہ ادبی تعصبات کی پھیلی ہوئی تاریکی میں ایک کرن بھی ایسی نہیں جو انتہا پسندوں کو ایک مقام پر لا سکے۔ لیکن جب "آل انڈیا ریڈیو" نے اپنے سننے والوں سے دریافت کیا کہ وہ کس زبان میں پروگرام سننا پسند کرتے ہیں تو زیادہ خط اردو (ہندوستانی) کی تائید میں وصول ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ جس طرح ہندوستان کے فنون لطیفہ اپنے میں ہندوستانی تمدن کی روح رکھتے ہیں اسی طرح اردو بھی ہندوستان کے مشترکہ تمدن کی نشانی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ حیدرآباد میں زبان کا مسئلہ ابھی تک خارزار سیاست میں نہیں الجھا ہے اور "سیاسی دیوانگی" کا داؤں ہمیشہ پٹ ہی پڑا ہے۔ اردو حیدرآباد کی قومی اور ملکی زبان ہے۔ اس لئے اردو کی خدمت نہ صرف ملک و قوم بلکہ اپنی حقیقی تہذیب کی خدمت ہے۔

نشرگاہ حیدرآباد کا کل ہند بنیادوں پر حال ہی میں افتتاح ہوا ہے۔ لیکن وہ اردو کی جو خدمت کر رہی ہے قابل مبارکباد ہے ہمارے ملک میں ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک اردو بولی یا سمجھی جاتی ہے، ہماری دفتری زبان اردو ہے، ہمارا ذریعۂ تعلیم اردو ہے اس لئے یہ ناممکن تھا کہ ہمارا ذریعۂ نشر بھی اردو نہ ہو۔ جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں نشرگاہ کی سرکاری اور غیر سرکاری تقریروں میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ اردو کے موجودہ رجحانات کا صحیح عکس ہے۔ اس کو ہندی نوازی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور نہ فارسی و عربی آمیز اردو سمجھا جا سکتا ہے۔ ہم ملک کے تمام حقیقت شناس باشندوں کی جانب سے یقین دلاتے ہیں کہ یہی زبان ہماری زبان ہے۔ ہم نشرگاہ حیدرآباد سے استدعا کریں گے کہ وہ بے جا اعتراضوں کو درمیان میں لائے بغیر زبان کے معاملہ میں موجودہ حکمت عملی ہی پر کاربند رہے تاکہ پروگرام کو زیادہ سے زیادہ لوگ سنیں اور سمجھیں۔

چونکہ نشرگاہ حیدرآباد کی تقریریں عوام میں ایک علمی و ادبی بیداری پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہیں اس لئے ادارۂ ادبیات اردو نے ان کو مقررین صاحبان کی اجازت سے اپنے ماہنامہ سب رس میں یا کتابوں کی صورت میں شائع کرنے کا انتظام کیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی پہلی کتاب "سائنس کے کرشمے" شائع ہو چکی ہے۔ جس کو ادارہ کے مخلص رفیق میر حسن صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں سائنس کے کرشموں پر ملک کی قابل ہستیوں کی عام فہم تقریریں جمع کی گئی ہیں۔

سب رس کی مجلس ادارت نے تصفیہ کیا ہے کہ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء میں "سب رس" کا ایک "فضائی ادب نمبر" شائع کیا جائے جس میں ان نشری تقریروں کا انتخاب پیش کیا جائے جو اب تک نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہو چکی ہیں۔ ہم آئندہ شمارے میں اس نمبر کے متعلق تفصیل کے ساتھ عرض کرنے کے قابل ہو سکیں گے، فی الحال صرف یہی کہنا کافی ہوگا کہ ایسا تنوع، شائد ہی آپ نے کسی رسالہ میں دیکھا ہوگا جیسا کہ سب رس کے فضائی ادب نمبر میں ہوگا۔

جامعہ عثمانیہ جامعہ نگر گزشتہ چند دنوں تک غیر معمولی علمی چہل پہل کا مرکز بنا رہا۔ کلیۂ فنون کی جدید عمارت کا افتتاح اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ نے بنفس نفیس فرمایا۔ جس عمارت کی بنیاد حضور شاہانہ نے اپنے دست مبارک سے رکھی ہو اور جس کا افتتاح خود حضور شاہانہ فرمائیں، وہ یقیناً علم و عمل کی پرورش کا گہوارہ بن سکتی ہے۔ اس موقع پر اربابِ جامعہ اور طلبائے انجمن اتحاد کی جانب سے بارگاہ شاہانہ میں عقیدت مندانہ سپاس نامے پیش کرنے کی عزت حاصل کی گئی۔ ان سپاس ناموں کا

جو جوابِ شاہانہ ارشاد فرمایا گیا، وہ عثمانیین کی زندگیوں کے لئے نہایت ہی بصیرت افروز ہے۔ حضور اقدس و اعلیٰ کے ارشاداتِ عالیہ جامعہ عثمانیہ کے بلند تر مستقبل کی ضمانت ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ برادرانِ جامعہ نے اپنی زندگیوں کے لئے " اپنی زندگیوں کے مرکز " سے وہ سب کچھ حاصل کر لیا ہے جو انہیں از راہِ عطوفت خسروی عنایت فرمایا گیا۔ اس سرزمین پر جہاں " علم نامانوس زبانوں کی قید سے آزاد کیا گیا " اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی تشریف آوری ایک فالِ نیک ہے جس نے عثمانیین کے جذبۂ عمل کو تیز تر کر دیا ہے۔

کلیۂ فنون کی جدید عمارت میں افتتاح کے بعد ہی دو شاندار علمی اجتماعات ہوئے۔ ایک تو ماہرینِ فلسفہ کی کانفرنس، اور دوسرا ماہرینِ ریاضی کی کانفرنس۔ ان دونوں کانفرنسوں میں ہندوستان کی مختلف جامعات کے مندوبین جمع ہوئے تھے جنھوں نے جامعہ عثمانیہ کی سرپرستی میں اپنے فنون کے متعلق غور و خوض کیا۔ ان دونوں کانفرنسوں کے لئے اعلیٰ حضرت سلطان العلوم نے اپنے لطف و کرم سے پیاماتِ کامیابی عطا فرمائے۔ کلیۂ فنون کی جدید عمارت نے اپنی زندگی کی پہلی ہی منزل میں دو ایسے شاندار اجتماعات دیکھے جو شاید ہی کسی جامعہ کو آٹھ دن کی قلیل مدت میں نصیب ہوئے ہوں گے۔

طلبائے جامعہ کی جانب سے حسبِ معمول اس سال بھی " یوم حالیؔ " منایا گیا لیکن اس کی ایک اہم خصوصیت ایسی ہے جو دوسری ایسی تقریبوں سے اسے ممتاز کر دیتی ہے اور وہ مشاعرہ میں والاشان حضرت معظم جاہ بہادر شجیعؔ کی تشریف آوری ہے۔ شہزادۂ والاشان نے جامعہ کے مشاعرہ کی صدارت قبول فرما کر خانوادۂ شاہی کی ان پیہم عنایات کا ایک اور نمایاں ثبوت دیا جو جامعۂ عثمانیہ پر ہمیشہ مبذول رہی ہیں۔ فرزندانِ جامعہ کے شعری رجحانات " زندگی اور ادب " کو قریب تر کر رہے ہیں۔ " ادارۂ ادبیاتِ اردو " کی کتاب " شعرائے عثمانیہ " میں اس کی جا بجا جھلک دکھائی دیتی ہے۔ جو حسنِ اتفاق سے انہی دنوں میں شائع ہوئی۔ ان شعری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں شاہزادۂ والاشان کی دلچسپی جن کا پاکیزہ ذوقِ تغزل اردو شاعری پر دکن کے روایاتی الطافِ شاہانہ کا زندہ ثبوت ہے، بلاشبہ معاون ثابت ہوگا۔

" انجمنِ طیلسانیین عثمانیہ " ملک کی واحد انجمن ہے جس میں تمام اعلیٰ تعلیم یافتہ اراکین ہیں۔ ہم یہاں اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے کہ انجمنِ طلبائے قدیم اور انجمنِ طیلسانین کو ایک مرکز پر لا لینے سے کیا کوئی ایسے نقصان کا امکان ہے جو ان دونوں انجمنوں کے مفادات کو متصادم کر دے گا۔ ہم ہمیشہ سے جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل اصحاب کو ایک ہی مرکز پر دیکھنے کے متمنی ہیں۔ بہر حال جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دونوں انجمنیں اپنے اپنے حلقۂ اثر میں سرگرمِ عمل ہیں تو ہمیں اس کا زیادہ احساس بھی نہیں ہوتا۔ عثمانی طیلسانوں کی کانفرنس، اس سال اورنگ آباد میں منعقد ہوئی، جس کی صدارت ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ایک مؤسس مولوی عبد المجید صاحب صدیقی نے کی۔ اور جس کا افتتاح حضرت بسالت جاہ بہادر نے فرمایا۔ نواب بسالت جاہ بہادر کو ملک کی تعلیمی ترقی سے جو گہری دلچسپی ہے اس کا ثبوت ان کی مصروفیتوں سے نمایاں ہوتا رہتا ہے۔

انجمن کی معاشی کمیٹی نے گزشتہ سال کی طرح، اس سال بھی باغ عام میں ایک عظیم الشان صنعتی نمائش منعقد کی ہے۔ اس قسم کی نمائشیں نہ صرف ملکی صناعوں کی حوصلہ افزائی کا باعث ہوتی ہیں بلکہ اربابِ ملک کے دلوں میں بھی ایک احساس ترقی پیدا کرتی ہیں۔

دکن کی صنعتوں کا زوال ہماری سرد مہریوں کا نتیجہ ہے۔ اور آج جبکہ نظام زندگی کی بنیاد معاشی مسائل پر قائم ہے ہمیں محسوس کرنا چاہیے کہ پیدائش دولت کے بغیر ہماری اجتماعیت ترقی نہ کر سکے گی۔ معاشی کمیٹی قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ملک کی صنعتوں کو ارباب حکومت کے سامنے پیش کرکے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ملکی صناع کا داغِ دل، دراصل ملک کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ ہے۔

فلموں کی زبان

ہندوستان کے طول و عرض میں فلموں کی زبان کے متعلق چہ میگوئیاں زمانے سے جاری ہیں۔ اور فلموں کو دیکھنے والوں نے افسوس کے ساتھ یہ محسوس کیا ہے کہ اکثر فلموں کی زبان کا پلہ اُس غیر مانوس زبان کی طرف جھکا ہوا ہے جس کو کم از کم اہل حیدرآباد سمجھنے سے قاصر ہیں۔ فلم میں بھی وہی زبان استعمال ہونی چاہیے جو ہماری مشترکہ زبان ہے۔ اس لیے کہ وہ کسی خاص طبقے کے لئے نہیں تیار کیا جاتا ہے۔ غرض یہ ایک طولانی بحث ہے جس کو ہمیشہ اٹھایا جاتا رہا ہے۔ لیکن اردو سے محبت رکھنے والوں کا کیا یہ مقدس فرض نہیں ہے کہ وہ ایسے فلموں کی حوصلہ افزائی کریں جو اردو کی اشاعت میں مدد دے رہے ہیں؟ یہ ایک سوال ہے جس کے انکاری جواب کا ہمیں گمان تک نہیں۔ ہم ہندی نواز فلمی کمپنیوں کی نیتوں پر حملہ کئے بغیر اپنی زبان اور اس کے ذریعے سے اپنے تمدن کی حفاظت کے دل سے آرزومند ہیں۔ یہی وہ احساس تھا جس کے تحت مسٹر سہراب مودی کا جب وہ اردو نواز دکن میں آئے تو خندہ پیشانی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا۔ وہ سہراب مودی کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک خدمتگزار اردو کی حیثیت سے ہمارے تحسین و ستائش کے مستحق ہیں۔ ذاتیات کی الجھنوں میں الجھ کر خدمات کو فراموش کر دینا کوئی ایسی قابل تعریف بات نہیں جس کو ہنگامہ آرائی کے لئے بہانہ بنایا جائے۔ "کون کیا ہے"؟ کا سوال "کس نے کیا کیا؟" کے درمیان کیوں لایا جائے۔ جو لوگ اردو کے سہارے جیتے ہیں وہ تعصبات ظاہری میں پڑ کر اصل حقیقت کو نظرانداز نہ ہونے دیں گے۔ ہمیں اس کا دلی افسوس ہے کہ غلط فہمی یا کسی اور بنا پر اس بارے میں عوام کی رائے کو غلط راستہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ بہرحال یہ ایک وقتی چیز تھی، لیکن کام قدر حاصل کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مسٹر سہراب مودی کی حیثیت صاف ہے اور اردو کے متعلق انھوں نے جو خیالات اپنی نشری تقریر میں ظاہر کئے ہیں، ان کی وجہ سے ان کی عزت اردو دنیا میں اور بھی بڑھ گئی ہے۔

امدادی سرمایۂ جنگ

گزشتہ مہینے امدادی سرمایۂ جنگ کے لئے ٹاؤن ہال باغ عامہ میں ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت، ادارۂ ادبیات اردو کے سرپرست اعلیٰ ہز ہائنس پرنس آف برار نے فرمائی۔ یورپ کی نازک صورت حال، ایک عالمی تشویش کا باعث بن گئی ہے اس لئے ساری دنیا کے امن و امان کو آمری قوتوں سے محفوظ رکھنے کے لئے مخالفین نبرد آزما ہیں۔ امن و امان کے تحفظ کا جذبہ یقیناً ایک مقدس جذبہ ہے اس لئے ان کی امداد ضروری ہے جو ہماری سلامتی کے لئے اپنی سلامتی کو خاطر میں لائے بغیر لڑ رہے ہیں اس جلسہ میں ہز ہائنس پرنس آف برار کے علاوہ شہزادہ والاشان نواب معظم جاہ بہادر سرِ یمین السلطنت، ہز ایکسلنسی سر اکبر حیدری، نواز جنگ بہادر اور نواب سالار جنگ بہادر نے بھی تقریریں فرمائیں۔ یہ جلسہ حیدرآباد کی تاریخ میں پہلا جلسہ ہے جس کے اسٹیج سے ایک ہی وقت میں ملک کی بلند پایہ شخصیتوں نے اہل شہر کو مخاطب کیا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس

اس سال آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کے لئے نواب کمال یار جنگ بہادر کو منتخب کیا گیا ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس ہندوستان کی علمی بیداری میں قابلِ لحاظ حصہ لیتی رہی ہے۔ اور نواب کمال یار جنگ بہادر ملک کے ان گنے چنے امراء میں سے ہیں جو ملک و قوم کا حقیقی درد رکھتے ہیں۔ خصوصاً دکن کے قحط زدہ غریبوں کے لئے انھوں نے حال ہی میں جو پُرخلوص کوششیں کی ہیں، کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔ اس لئے ایجوکیشنل کانفرنس کے حالیہ اجلاس کی صدارت کے لئے ان کا انتخاب اربابِ کانفرنس کی بیدار مغزی کا ثبوت ہے۔ ہم نواب کمال یار جنگ بہادر کو پُرخلوص مبارک باد دیتے ہوئے ان سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی ملک و قوم کی تعمیری خدمت میں پیچھے نہیں رہیں گے۔ کانفرنس میں جو تحریکیں منظور ہوئیں ان میں سب سے زیادہ اہم شمالی ہند کی جامعات اور خصوصاً جامعہ علی گڑھ میں اردو کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور جہاں ابھی تک اردو کی تعلیم اختیاری مضامین کے طور پر نہیں دی جا رہی ہے، وہاں اس کا انتظام کرنے سے متعلق ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ انجمن ترقیٔ اردو اپنے تمام وسائل سے کام لے کر اس تحریک کو عملی جامہ پہنائے بغیر چین نہیں لے گی۔

انجمن ترقیٔ اردو کی مقامی شاخ

دہلی میں "انجمن ترقیٔ اردو" کی منتقلی کے بعد حیدرآباد میں اس کی ایک شاخ قائم کی گئی ہے۔ "انجمن ترقیٔ اردو" نے اردو کی ترقی و اشاعت میں ہمیشہ سرگرم حصہ لیا ہے۔ اور ایسے وقت میں جب کہ اردو ہندی کشمکش بڑھتی جا رہی ہے، اردو کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس انجمن کو حکومتِ حیدرآباد کی جانب سے ایک بیش قرار رقم سالانہ امداد کے طور پر دی جاتی ہے۔ حیدرآباد میں اس کی شاخ کے معتمد ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی پروفیسر ریاضی جامعہ عثمانیہ ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو فنِ ریاضی میں ہندوستان گیر شہرت حاصل ہے۔ اس انجمن سے ہماری خوش گوار توقعات وابستہ ہیں۔

بے بنیاد افواہ

حال ہی میں ایک شگوفہ چھوڑا گیا اور وہ یہ کہ مقامی انجمن ترقیٔ اردو اور ادارۂ ادبیاتِ اردو میں اختلاف ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بے بنیاد افواہ کیوں پھیلائی گئی اور اس کے ذمہ دار کون ہیں؟ اردو اکاڈمی جامعۂ ملیہ دہلی، دارالمصنفین اعظم گڑھ، ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد، اردو مرکز لاہور کی طرح ادارۂ ادبیاتِ اردو بھی، انجمن ترقیٔ اردو یا کسی اور ایسی انجمن کے ساتھ تعاون عمل کرنے ہمیشہ تیار رہا جس کا مقصد اردو کی خدمت گزاری ہے۔ انجمن ترقیٔ اردو ہندوستان بھر میں اردو کے سیاسی اور ثقافتی اقتدار کو برقرار رکھنے کی جوان تھک کوشش کر رہی ہے، وہ غالباً دوسری کسی انجمن سے ممکن نہیں۔ انجمن کے اغراض کی تکمیل کے لئے جس قدر زیادہ شاخیں قائم کی جائیں اچھا ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دوسرے ادارے جن کے نام ہم نے اوپر مثالاً دئے ہیں، وہ اپنی برسوں کی کارگزاری اور اس کے لازمی وجوبات (Obligations)، کے ساتھ اپنا وجود ختم کر دیں۔

انعامی مضامین کا اعلان

سب رس ۱۹۳۹ء کے بہترین مضامین کے لئے حسبِ ذیل اصحاب نے انعامات عطا فرمائے ہیں۔ انعامات دینے کا تصفیہ ایک مجلس کے سپرد کیا گیا ہے جس کا نتیجہ فروری ۱۹۴۰ء کے سب رس میں شائع ہوگا۔

(۱) اصلاحی مضمون یا انشا:- محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا۔

(۲) ضمیمۂ سب رس دیہچا کے لئے بہترین مضمون یا افسانہ یا نظم۔ نواب مرزا سیف علی خاں صاحب جاگیردار۔

(۳) سب رس کا بہترین علمی و ادبی مضمون:- ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ میکش

پہلی صف ۱۔ اشک۔ ۲۔ ذکی ۳۔ قریشی ۴۔ زور ۵۔ اکبر ۶۔ رشدی
دوسری صف ۷۔ مخدوم ۸۔ وجد ۹۔ رگھونندن راج سکسینہ ۱۰۔ باقی
تیسری صف ۱۱۔ مہندر راج سکسینہ ۱۲۔ شکیب ۱۳۔ میکش

اردو ادب کا مطالعہ

زبان خواہ مادری ہو یا غیر مادری ادب خواہ ملکی ہو یا غیر ملکی ان سب کے مطالعہ کے اصول اور تحصیل کے طریقے تقریباً متحد ہیں۔ متمدن اقوام مادری زبان کو بغیر کسی خاص کاوش کے حاصل کر لینے کو فطری طریقہ سمجھتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جس کو ہم فطری طریقہ سمجھتے ہیں اس میں ہماری اکتسابی قوت کا جزو کہاں تک شریک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی زبان خواہ وہ آغوشِ مادر میں سیکھی جائے یا استاد کے سایۂ شفقت میں بغیر تکرار اور اعادہ کے حاصل نہیں ہوتی۔ بچہ ولادت کے وقت کوئی زبان بولتا ہوا نہیں پیدا ہوتا ہے بلکہ جس ماحول میں وہ آنکھیں کھولتا ہے اور جن لوگوں سے دوچار ہوتا ہے ان کی آواز اور زبان وہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں بار لگاتار سنتا رہتا ہے جتنی آوازیں اس کے کان تک پہونچتی ہیں وہ اس کے دماغی اعصاب پر مرتسم ہو جاتی ہیں۔ جب بچہ اس قابل ہوتا ہے کہ اپنی زبان ہلا سکے تو سب سے پہلے وہ مفرد الفاظ کو استعمال کرتا ہے پھر رفتہ رفتہ الفاظ کو جملوں کے ذریعہ ادا کرتا ہے۔ اس طریق تحصیل کے تحت میں اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اعادہ و تکرار کا نفسیاتی پہلو سامنے آئے گا۔ جن جملوں کو بچہ بار بار سنتا ہے ان کا کچھ عرصہ بعد بلا تامل اور بلا اختیار اپنی زبان سے اعادہ کرتا ہے۔

اس طور سے اور انہیں اصول کے بنا پر جب ہم کسی غیر زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو مفرد الفاظ اور مکمل جملوں کو بار بار دہراتے اور انہیں کو لکھ کر مشق و مزاولت پیدا کرتے ہیں۔ مادری اور غیر مادری زبان کے استعمال میں جو فرق ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ مادری زبان کے سننے اور بولنے کے موقعے ہم لوگوں کو بہ نسبت غیر مادری زبان کے زیادہ ملتے ہیں۔ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جو نوجوان کسی غیر ملک میں جاکر کسی خاندان میں قیام پذیر ہوتے ہیں تو وہ جلد تر وہاں کی زبان اور اس کے روزمرہ اور محاورں پر قدرت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس تمہید کی غرض یہ ہے کہ ہم اس بین اصول کو پوری طرح ذہن نشین کریں کہ زبان اور ادب خواہ وہ کسی ملک کا ہو اکتسابی ہے نہ کہ وہبی۔ انفرادی استعداد، ذہانت اور طباعی کا اثر ادب کی تحصیل اور تخلیق میں اکثر پایا جاتا ہے۔ مگر ان فطری صلاحیتوں کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کوئی شخص محض ذکاوت اور طباعی کے بھروسے پر رہ کر بغیر محنت اور کسب کے زبان پر قدرت حاصل کر لے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بغیر کدو کاوش اور بغیر محنت و جانفشانی کے کوئی علم یا ادب حاصل نہیں ہو سکتا۔

عرصۂ دراز تک اردو زبان کی تحصیل اور صحت کا دارومدار اہلِ زبان ہونے پر غلط فہمی سے مانا جاتا تھا۔ جو لوگ دہلی یا لکھنؤ کے رہنے والے ہوتے انہیں کو یہ طغرائے کمال حاصل تھا کہ وہ صحیح زبان لکھنے اور بولنے کے اہل سمجھے جاتے۔ اس کمزور نظریہ کی سبب سے اردو زبان کی ترقی کو بہت بڑا نقصان پہونچا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی معمولی ذہانت اور عقل و فہم کا انسان اگر کافی توجہ اور تندہی سے کسی ادب کا عموماً اور اردو کا خصوصاً بالاستیعاب مطالعہ کرے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ کچھ عرصہ میں اس پر قابلِ رشک قدرت نہ حاصل کر لے۔ ہمارے ادیبوں میں اکثر و بیشتر جن کو لکھنؤ یا دہلی کے شہری ہونے کا فخر نہیں حاصل تھا، باوجود اس امر کے وہ آسمانِ ادب کے درخشاں ستارے مانے جاتے ہیں اور ان کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا۔ شبلیؔ، حالیؔ، نذیر احمد، عبد الماجد دریابادی

سید سلیمان ندوی، عبدالسلام، مہدی حسن، وہ اہلِ قلم ہیں جن کو براہِ راست دہلی یا لکھنؤ سے کوئی واسطہ نہ تھا پھر بھی ان کے علمی کارنامے ایسے وقیع اور ٹھوس ہیں جن کی اہمیت سے کوئی ادیب انکار نہیں کر سکتا۔

اب زمانہ آ گیا ہے کہ ہم کو ایسے پیش پا افتادہ اور فرسودہ نظریوں سے انحراف کرنا ہوگا۔ دہلی اور لکھنؤ کی مرکزیت کے خیالات نے اردو کی لسانی ترقی کو بہت نقصان پہونچایا ہے۔ جو الفاظ یا محاورے قدیم دہلی یا لکھنؤ کے شعراء کے کلام میں نہیں ملتے تھے، ان کو ثقہ حضرات مستند نہیں مانتے تھے۔ بدقسمتی سے ان کو اس امر کا دھندلا سا بھی خیال نہیں ہے کہ زبان انسانی جذبات اور خیالات کے ساتھ ترقی کرتی ہے۔ جیسے جیسے ہماری ضروریاتِ زندگی بڑھتی جاتی ہیں اور نئی چیزوں کا انکشاف ہوتا جاتا ہے انہیں کے ساتھ ساتھ نئے نئے الفاظ اور ترکیبیں بھی معرضِ وجود میں لائی جاتی ہیں۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس کو ہمارے وہ شعراء اور ادبا جن کو قدامت پرستی پر اصرار ہے پیشِ نظر نہیں رکھتے۔ وہ اس امر کو فراموش کر جاتے ہیں کہ وہ الفاظ اور محاورے جو متقدمین شعرا کے زیرِ استعمال تھے ان میں سے اکثر و بیشتر اب متروک سمجھے جاتے ہیں اسی طرح سے جن محاوروں کو وہ ان دنوں اپنے استعمال میں لاتے ہیں ایک عرصے کے بعد وہ بھی پس پشت ڈال دئیے جائیں گے۔ کسی زبان کا لغت دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر دسویں سال اس کے الفاظ میں معتد بہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ یورپین زبانوں میں ہمسایہ زبانوں کے الفاظ کثرت سے ایک دوسرے کی زبان میں داخل کر لئے جاتے ہیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد انگریزی زبان کی جو لغات شائع ہوئی ہیں ان میں غیر زبانوں کے بہت سے نئے الفاظ درج ہیں جو اس امر کا ثبوت دیتے ہیں کہ جب قومیں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تو ان کے الفاظ سے بھی کافی متاثر ہو کر بہت سے خارجی الفاظ کو اپنا بنا لیتی ہیں۔

ان اصولوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم چند تجاویز طلبہ کی ہدایت کے لئے پیش کرتے ہیں تاکہ اس پر عمل پیرا ہو کر اردو ادب سے نہ صرف آشنا ہوں بلکہ اس پر کافی دست گاہ حاصل کر سکیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے ملکی ادب کو اسی اہمیت اور شغف کے ساتھ حاصل کریں جس طرح ہم انگریزی ادب کی تحصیل میں اب تک مصروف رہے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ ہم منتخب اور اعلیٰ پیمانے کے شاعروں، ادیبوں اور نثاروں کی کتابوں کو توجہ کے ساتھ مطالعہ کریں اور الفاظ اور محاورات کی تحقیق کریں اور یہ کام ہم اسی وقت انجام دے سکتے ہیں جب کہ ہم مستند لغات کو پیشِ نظر رکھیں گے۔ بار بار کے مطالعہ سے جملوں کی ساخت اور الفاظ کے استعمال ہمارے جزو دماغ ہو جائیں گے اور ہم لکھتے اور بولتے وقت بلا اختیار انہیں جملوں اور لفظوں کا اعادہ کریں گے۔ کسی بلند، غامض اور حکیمانہ خیالات کے اظہار کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ ہم زبان کے مختلف الفاظ اور ان کے استعمال سے پوری طور پر واقف ہوں۔ ہمارے طلبہ اردو لغت کو بھولے سے بھی ہاتھ نہیں لگاتے ہیں اس لئے الفاظ کے مختلف معنی اور جو اوزان ہیں ان سے ناواقف رہتے ہیں۔ جہاں کہیں ان کو ایک تولہ وزن کے الفاظ استعمال کرنا چاہیے وہاں غلط فہمی اور نادانی کی وجہ سے ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کا وزن ایک سیر سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

ادب کے باقاعدہ مطالعے کے لئے ضروری ہے کہ ہم چند ضمنی اور ضروری علوم سے بھی ایک گونہ واقفیت رکھیں مثلاً کوئی شخص اردو یا فارسی علم و ادب پر پوری قدرت حاصل نہیں کر سکتا اور نہ اس کے ادبی نکات کو سمجھ سکتا ہے اگر وہ مذہبی تلمیحات اعتقادات اور روایات سے ناواقف ہے۔ ہمارے شعرا متقدمین ہوں یا متوسطین مذہبی جذبات اور روایات سے اس درجہ متاثر تھے کہ ان کا کلام جگہ جگہ پر مذہبی تلمیحات سے پُر ہے۔ محسن کاکوروی کے نعتیہ قصائد یا مومن، غالب اور ذوق کے قصائد اور غزلوں کو بغیر مذہبی معلومات سے واقفیت حاصل کئے ہوئے کوئی پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ ید بیضا، کوہ طور، جنت عدن، جنت الماوا، تحت الثرا، رستخیز، شجر طوبیٰ، لن ترانی، گلزار ابراہیم، آتش نمرود وغیرہ وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن کو مذہبی روایات سے بیگانہ شخص کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح موٹے موٹے تاریخی واقعات سے بھی واقفیت ضروری ہے۔ شاعر یا مصنف جس زمانے میں پیدا ہوتا ہے وہ اس دور کے مذہبی، معاشری، سیاسی اور اخلاقی ماحول سے کافی طور پر متاثر ہوتا ہے لہٰذا اس زمانے کے اخلاقی، تاریخی واقعات سے بغیر واقف ہوئے کوئی طالب علم شاعر کے ادبی رجحانات اور اس زمانے کی تحریکوں سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح شاعر کے مفصل سوانح حیات اور اس کے معاصرین کے خیالات اور حالات کا ایک حد تک جاننا بھی بہت ضروری ہے اس لئے کہ شاعر کبھی تو آپ بیتی اور کبھی جگ بیتی واقعات قلمبند کرتا ہے جس وقت شاعر اپنے زمانے کی بلندی یا پستیٔ اخلاق کا ذکر کرتا ہے تو اس پر غور کرنا چاہیے کہ وہ کس تاریخی دور سے ہو کر گزرا ہے اس زمانے کے افراد یا جماعت کے اخلاق بلند یا پست تھے۔ میر حسن اپنی مثنوی کو شاہزادہ بدر منیر کی زبان سے ایک فرضی قصے کو نظم کرتے ہیں مگر حقیقت میں وہ لکھنؤ کے معاشری اور سیاسی حالات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ مثنوی بدر منیر کے مطالعے سے لکھنؤ کی سوسائٹی کی پوری تصویر کھنچ جاتی ہے۔ اس لئے تاریخی واقعات سے ایک گونہ واقفیت بھی ادب کے مطالعے کے لئے ضروری ہے۔

اگر یہ کلیتہً صحیح ہے کہ ادب حیات انسانی کے مختلف شعبوں کی ترجمانی کرتا ہے تو ہم اس نتیجہ پر بلا تامل پہنچ سکتے ہیں کہ بغیر حیاتِ انسانی کی گہرائیوں کو سمجھے ہوئے ہم کسی ادب پر حاوی نہیں ہو سکتے اور نہ اس کے رموز و نکات کو سمجھ سکتے ہیں۔ جو شخص انسانی جذبات کی پیچیدگیوں اور بوقلمیوں سے ناواقف ہوگا یا ذہنی شعور کے مختلف پہلوؤں کو نہ جانتا ہوگا وہ رنج و غم، حسرت و یاس، وصل و فراق، کامیابی اور ناکامیابی، نقصان اور فائدہ، بغض و کینہ، ہمدردی اور سنگ دلی، رقابت اور دوستی کی نفسی کارفرمائیوں سے بے بہرہ رہے گا اور جب کہ شاعر اپنے وارداتِ قلب کو الفاظ کا جامہ پہنا کر صفحۂ قرطاس پر مزین کرے گا تو وہ شخص جو نفسیات انسانی کی مبادیات سے بھی ناآشنا ہو کما حقہٗ شاعر کے حقیقی مافی الضمیر کو نہیں سمجھ سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیئے جو شخص عادت کے فلسفہ کو نہ جانتا ہو اور اس کی زبردست طاقت سے ناواقف ہو وہ غالب کے اس مشہور شعر کے اصلی مفہوم کو نہیں سمجھ سکتا ۔

صد بار دامِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

یا نواب شیش محل کا یہ شعر ؎

کہتا ہے کون یار کی محفل اُداس ہے
کوئی نہیں اُداس مرا دل اُداس ہے

اس شعر کا لطف وہی اٹھا سکتا ہے جس کو یہ معلوم ہو کہ ہماری دنیا ہمارے جذبات اور خیالات کا عکس ہوا کرتی ہے جس کی طبیعت مضمحل یا پژمردہ نہ ہوئی ہو وہ اس شعر سے بھلا کیا لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

میری آخری تجویز یہ ہے کہ ادب اردو کا مطالعہ بے لاگ سچائی اور ذہنی ایمانداری کے ساتھ کرنا چاہیے۔ عام طور سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ہمارے ادیب اور ناقد جب کسی سے خوش ظن ہوتے ہیں تو اس کے کلام کے ہر پہلو کی تعریف کرتے ہیں خواہ بلند پایہ کلام نہ ہو اسی طرح سے اگر وہ کسی سے بدظن یا ناخوش ہوتے ہیں تو اس کا کلام خواہ کتنا ہی پُر معنی اور پُر مغز کیوں نہ ہو پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتے یہ روّیہ اصولِ تنقید کے منافی ہے۔ کلام کو پرکھتے وقت اس کے حسن و قبح پر یکساں نظر ڈالنی چاہیے۔ قطع نظر اس کے کہ ہم شاعر سے خوش ظن ہیں یا بدظن۔ ذاتی مناقشات اور اختلاف رائے کو پس پشت ڈال کر اور اپنے رذیل جذبات پر قدرت حاصل کر کے ہم کو ادب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ تنقید کا بے لاگ اصول یہ ہے کہ جس کلام میں جتنے محاسن ہیں ان کو سراہیں اور ان کی ادبی خوبیوں اور باریکیوں کو منظرِ عام پر لاویں اور جتنے معائب ہوں ان کو بلا کم و کاست اور بغیر کسی تحقیر و تذلیل کے مہذب طریقے سے جتا دیں۔ اردو ادب کو سب سے زیادہ نقصان ہمارے ذاتی مناقشات اور غیر ضروری اختلافات پر ضرورت سے زیادہ زور دینے سے پہونچا ہے۔ جب تک ہم ایک دوسرے کے کلام کی منصفانہ قدر نہ کریں گے اور ذہنی ایمانداری کو اپنا اصولِ زندگی نہ بنائیں گے ہماری زبان اور ادب کو ترقی نہیں ہو سکتی اور نہ بغیر باہمی ہمت افزائی اور قدردانی کے ہونہار اہلِ قلم اپنی محنت اور جانکاہی کے ثمرہ سے ہم کو فیضیاب کر سکتے ہیں۔

م حفیظ سیّد

میر حسن ایم اے

عکس خط شاد عظیم آبادی

محترمہ صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا

صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش

(یہ مضمون کلاسکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا تھا۔)

دکنی بولی آج اردو زبان کی ایک شاخ ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن اپنے آغازی دور میں اور اس کے بعد بھی کئی سو سال تک اس کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہی وہ زبان ہے جو گولکنڈہ، بیجاپور اور دکن کی دوسری سلطنتوں میں ایک عرصے تک تعلیم یافتوں کی معیاری تحریری اور بول چال کی زبان کی حیثیت سے رائج رہی ہے۔

دکنی زبان کی اہمیت اور اس کے نشوونما کے خاص حالات پر غور کرنے کے لئے اردو زبان کی تاریخ میں سیکڑوں سال پیچھے کی طرف جانا پڑتا ہے۔ اردو زبان جیسا کہ سب جانتے ہیں، فارسی بولنے والے مسلمانوں اور کھڑی بولی بولنے والے ہندوؤں کے پنجاب میں میل جول کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ صوبہ ہے جہاں سلطان محمود غزنوی کی حکومت بڑے عرصے تک قائم رہی۔ اس کے بعد محمد غوری کا دور شروع ہوا۔ اس دور میں بھی اردو کے خدوخال موہوم ہی رہے اور اس میں انفرادیت یا شخصیت کا کوئی رنگ پیدا نہ ہو سکا۔

خلجیوں کے دور میں اردو، جس نے پنجاب میں جنم لیا تھا، علاء الدین خلجی کے ساتھ دکن پہنچی۔ یہاں اس کی پرورش شمال سے بالکل مختلف اور دکنی طبائع کے میلانات کے مطابق جداگانہ قسم کے ماحول اور اثرات کے تحت ہوئی۔ دکن کی یہ اردو دکنی کہلانے لگی۔

دکنی زبان نے بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کے عروج کے زمانے میں بڑی ترقی کی۔ اس میں سوڈیڑھ سو سال تک ادبی کتابیں لکھی جاتی رہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ شمال میں اردو صرف بول چال کی زبان تھی، علم و ادب شعر و شاعری یہاں تک کہ خط و کتابت کی زبان بھی ایرانی تھی۔ شمال میں اردو سے بے توجہی اور ایرانی کے فروغ کی کئی وجوہات ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہاں صدیوں تک ایرانی علماء اور شعراء کی آمد کا تانتا بندھا رہا۔ اور سرکاری زبان بھی ایرانی ہی تھی جسے ہندوؤں کے لئے بھی ملازمت کے لئے ضروری قرار دے کر راجہ ٹوڈرمل نے ترقی کی رفتار اور تیز کر دی۔

برخلاف اس کے دکن کے حالات شمال سے مختلف رہے۔ ہندوستان کے اس حصے پر زیادہ تر یورشیں شمال ہی کی طرف سے ہو سکتی تھیں۔ لیکن اس زمانے میں بندھیاچل کو عبور کر کے دکن پہنچنا بڑی زحمت کا باعث ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دکن کی سلطنتوں میں سالہا سال تک امن رہا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں میل جول کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا ہوئے اور ایک مخلوط دکنی تمدن کی بنیادیں قائم ہوئیں۔

اردو زبان اور ادب کے دکن میں فروغ پانے کی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی سلطنتوں کی عدالتی اور سرکاری زبان دکنی تھی۔ اس کے علاوہ بیجاپور اور گولکنڈہ کے بیشتر بادشاہ نہ صرف خود عالم اور اہل قلم تھے بلکہ علم و ادب کی سرپرستی بھی بڑی فیاضی سے کرتے تھے۔

ان سازگار حالات اور شاہی سرپرستیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے عالموں نے دکنی زبان کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ابتداء ایرانی ادب کے زیر اثر شعر و شاعری سے ہوئی۔ اور تقریباً تمام مروجہ اصناف شعر مثلاً قصیدہ، مثنوی، رباعی، مراثی، اور غزل میں درباری شعراء نے خوب زور دکھلایا۔

اس عہد کے مشہور شاعروں میں غواصی، ابن نشاطی، ملا قطبی، جنیدی، سعدی، نوری، شاہی، مرزا، طالب، مومن وغیرہ قابل ذکر ہیں جن میں سے بعض کے کلام کے نمونے "اردو شہ پارے" میں شایع ہو چکے ہیں۔

مرثیہ گوئی کو اس عہد میں بہت فروغ ہوا۔ کیونکہ شعراء مرثیہ گوئی کو دین اور دنیا دونوں کی بہتری کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ مرثیے سنا سنا کر ایک طرف دربار وں میں انعام پاتے تھے اور دوسری طرف انھیں ثواب اور نجات کی بھی امید تھی۔

بیجاپور کے عادل شاہی دربار کے شاعروں میں نصرتی، ہاشم، مرزا، امین، شاہ ملک اور مومن قابل ذکر ہیں۔
دکنی دور کی نثری تصانیف میں سب سے زیادہ اہمیت ملا وجہی کی "سب رس" کو حاصل ہے۔ جو ۱۰۴۵ھ میں یعنی آج سے تقریباً تین سو سال قبل لکھی گئی۔ یہ اردو زبان کی سب سے پہلی نثری تصنیف سمجھی جاتی ہے اور انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے چھپ کر شایع ہو چکی ہے۔

ملا وجہی سلطان عبداللہ قطب شاہ والی گولکنڈہ کا درباری شاعر تھا۔ سب رس اسی بادشاہ کے حکم سے شایع ہوئی۔ قدیم دکنی اردو نثر کے بعض نمونے اس سے پہلے کے بھی ملفوظات اور مذہبی رسائل کی شکل میں ملے ہیں۔ لیکن "سب رس" ایک مکمل اور جامع تصنیف ہے۔ اس سے پہلے کی کسی کتاب میں ایسی خوبیاں پائی نہیں جاتیں، جو گولکنڈہ کے اس مصنف کی تحریر میں نظر آتی ہیں۔ سب رس کا موضوع حسن و دل کا قصہ ہے جو تمثیلی پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی عبارت میں ادبی شان پائی جاتی ہے۔ نثر مقفیٰ ہے اس کے باوجود زبان سادہ سلیس اور شگفتہ ہے۔ وجہی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے اپنی کتاب میں بعض مقامات پر دکنی زبانوں مثلاً تلنگی اور مرہٹی کے الفاظ اور محاورے بھی استعمال کئے ہیں۔

دکنی ادب کی ترقی کے سلسلے میں اس وقت تک جن لکھنے والوں کا ذکر ہوا تقریباً ان سب کی شہرت بیسویں صدی کے اوائل تک مقامی رہی۔ دکن کا پہلا شاعر جس کا کلام نہ صرف سارے دکن میں مقبول ہوا بلکہ جس نے بندھیاچل کو عبور کر کے شمالی ہندوستان کو بھی مسخر کر لیا ولی تھا۔ ولی اورنگ آبادی کا کلام جب شمال پہنچا تو اہل کمال نے اس کی دل سے قدر کی۔ یہ ولی ہی کا اثر تھا کہ شمال میں حاتم، آبرو، آرزو اور دوسرے اساتذہ نے پہلی دفعہ اردو میں شعر کہنا شروع کیا جس کا ثبوت خود ان کے کلام سے ملتا ہے۔ ولی کے اثرات سے دکنی الفاظ اور محاورے شمالی ہند کے متقدمین کے کلام میں کثرت سے داخل ہوئے اور اپنی دل آویزی اور انوکھے پن کی وجہ سے ادب میں ایسے رچ گئے کہ متوسطین کے کلام میں بھی اس کی چاشنی پائی جاتی ہے۔

شمال میں اردو نویسی کو مزید تقویت یوں بھی ہوئی جب شہنشاہ اورنگ زیب کے ساتھ گولکنڈہ کے شاہی کتب خانہ کی نادر دکنی کتابیں دلی پہنچیں۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ادبی ذوق رکھنے والوں کی آنکھیں کھل گئیں۔ اور اردو شعر و نثر کا دور شمال میں بھی شروع ہوگیا۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد ہندوستان نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ شمال اور جنوب کے درمیان کی رکاوٹیں روز بروز دور ہوتی گئیں۔ آمد و رفت اور رسل و رسائل کی آسانیوں نے دور افتادہ مقامات کو بھی گویا ایک دوسرے سے قریب کر دیا، جس کی وجہ سے ہندوستان کے سارے حصوں کی انفرادیت اور مقامی خصوصیات پر کل ہند اثرات حاوی ہونے لگے۔

بہت جلد وہ زمانہ آگیا جب کہ دکنی ادبی زبان کے لئے ناموزوں ہوگئی اور ناموزوں سمجھی جانے لگی اس کے برخلاف شمالی ہند اور خاص طور پر دلی اور لکھنؤ کی زبان نے معیاری زبان ہونے کا امتیاز حاصل کر لیا۔ اس انقلاب کی وجہ صاف ہے جو یہ ہے کہ جس حصۂ ملک کے اہل قلم تصنیف و تالیف میں پیش پیش رہتے ہیں وہیں کی زبان معیاری اور قابل تقلید بن جاتی ہے۔

دکن میں جس وقت تک علم و ادب کا زور رہا دکنی معیاری زبان بنی رہی گو اس کا دائرہ مختلف وجوہات کی بنا پر بہت بڑی حد تک محدود ہی رہا۔ اور جب شمال میں ایک سے ایک بڑے اور باعظمت شاعر اور نثر نگار پیدا ہونے لگے جنھوں نے اپنی تحریروں سے اردو کو غیر فانی بنا دیا تو انہیں کی زبان لازمی طور پر ادبی زبان کے رتبہ پر پہونچ گئی۔

معیاری اردو نے شمالی ہند میں جنم لیا لیکن آج وہ تمام جغرافی پابندیوں سے آزاد ہو کر سارے ہندوستان کے تعلیم یافتوں اور انشا پردازوں اور شاعروں کی زبان ہے۔ دکنی اپنی خاص دلکشیوں کے باوجود ایک مقامی بولی ہو کر رہ گئی ہے اس کے بولنے والوں میں دکن کے دیہات کے رہنے والے اور شہروں اور اضلاع کے اَن پڑھ باشندے ہیں۔ تعلیم یافتوں کے اثر سے شہر کے عوام کی زبان تو آدھا تیتر آدھا بٹیر کی مصداق ہے لیکن بعض اضلاع والوں کی زبان باہر کے اثرات سے اس وقت تک اس قدر محفوظ ہے کہ ان سے باتیں کرنے میں "سب رس" پڑھنے کا لطف آجاتا ہے۔

بازاری دکنی بڑی پر لطف بولی ہے جو دکن اور خاص طور پر ریاست حیدرآباد کے شہری علاقوں میں بے تکلف رائج ہے۔

میر حسن

فاتحہ سالانہ

آج مصروف نظر آئے نہ کیوں ریحانہ
عورتیں آئی ہیں کثرت سے محلے والی
یہ جو پھیلا ہوا سامان ہے بریانی کا
اک یہی فرض نہیں، اس کے فرائض ہیں کئی
عورتیں خاص عزیزوں میں کم ایسی ہوں گی
کام بھی کرتی ہے باتیں بھی کئے جاتی ہے

کیسے دم ساز کا ہے فاتحۂ سالانہ
اس بڑے گھر میں جگہ رہ گئی ہے کم خالی
فرض کرتی ہے ادا اُس کی نگہبانی کا
آ گئی کوئی عزیزہ تو یہ ملنے کو گئی
جو کسی خاص سبب ہی سے نہ آئی ہوں گی
داد سنجیدہ خیالی کی لئے جاتی ہے

۲

حیرت انگیز ہے اس کا "عمل آرا" عالم
گوشت بنوائی ہے بیٹی کی مدد سے گا ہے
دیگ کے نیچے کبھی آگ یہ بھڑکاتی ہے
کبھی یخنی کے مصالح کی یہ لیتی ہے خبر
جب کسی کام میں دیتی ہے بہو اس کا ساتھ
یاں بہو، منتظرِ حکم ہے باہر بیٹا

زعفراں حل کبھی کرتی ہے کھرل میں پیہم
جو ہو خود دار وہ اوروں سے مدد کیوں چاہے
چہرہ تپتا ہے تو دم بھر کو سرک جاتی ہے
غرض، آتی ہے نظر گاہ اِدھر گاہ اُدھر
کام کرتی ہوئی کر لیتی ہے کچھ کام کی بات
دل کسی کام میں اس کا نہیں ہوتا ہیٹا

۳

عمر چالیس کے لگ بھگ ہے مگر اس پر بھی
چلن اس غم زدہ بی بی کا شریفانہ ہے
زخمِ دل ہے ستمِ ہجرِ دوام شوہر
کون یاد آئے گا پھر گر نہ اُسے یاد کیا
بست و یک سالہ رفاقت کا اثر کیا کہنا
پختہ کارانہ تصور یہ ہیں اس کے سب ڈھنگ

نظر آتی ہے یہ فی الحال جواں ہمت ہی
سبق آموزِ جہاں عصمتِ ریحانہ ہے
آہ کس طرح بھلا دیتی یہ نام شوہر
جس نے اکیس برس ہر جہتی ساتھ دیا
اس کو آسان ہے اب اُس کی ہی دھن میں رہنا
ایک تصویر میں برسوں سے بھری جاتی ہے رنگ

یہ مناتی ہے جس انداز سے یوم شوہر
اس کے ہر سال ہُوا کرتے ہیں چرچے گھر گھر

علی منظور

حیدرآباد تا دلّی

ایک انگریزی مثل ہے کہ "بعض واقعات قصہ کہانیوں سے بڑھ جاتے ہیں" حیدرآباد سے چلتے وقت مجھے شان گمان بھی نہ تھا کہ ایسا کوئی واقعہ خود مجھے پیش آنے والا ہے۔

چھتیس ۳۶ گھنٹے کے لگاتار سفر سے وحشت تو ضرور تھی مگر یہ کیا خبر تھی کہ راستے میں یہ وحشت دہشت کا رنگ اختیار کرلے گی۔ ۲۷ نومبر کو گھر سے چلا اسٹیشن پر یار دوست چھوڑنے آئے۔ گھنٹی بجی گارڈ نے سیٹی دی۔ انجن نے چیخ ماری۔ پہیوں نے گردش کی۔ گاڑی چلی اور ہم حیدرآبادی سے دلّی والے بننے شروع ہوگئے۔ بعض دوستوں نے دور ہی سے سلام علیک کھینچ ماری۔ بعض ریل کے ساتھ ساتھ چلتے اور ہاتھ ملاتے رہے۔ مگر کہاں تک ذرا سی دیر میں "ایک میں تھا ایک خدا کی ذات تھی" معلوم نہیں مسافروں کو مجھ سے کیا دشمنی تھی کہ ایک بھلا آدمی بھی میرے درجے میں نہیں آیا۔ اور حیدرآباد سے لگا کر دہلی تک میں رہا اور چار قدم لمبا اور تین قدم چوڑا درجہ بعض مسافر ایسے بھی ہوتے ہیں جو خالی درجہ پاکر خوش ہوجاتے ہیں۔ لیکن ان کو اگر وہ واقعہ پیش آئے جو مجھے پیش آیا ہے تو یقین مانیے کہ وہ خالی درجے میں بیٹھنے سے اتنا ہی ڈریں جتنا یو۔ پی کے زمیندار آج کل نئے قانونِ اراضی سے ڈر رہے ہیں۔

ہاں صاحب تو، خیر، گاڑی چلی ہم کھڑکی میں سے جھانکتے اور دیکھتے رہے کہ فلاں صاحب کا گھر سامنے سے گزر گیا، فلاں صاحب کا بنگلہ نکل گیا۔ خیرت آباد کا اسٹیشن آیا، حسین ساگر جنکشن آیا اور گھس گھس گھس گھس کرکے ریل سکندرآباد پہونچ ہی گئی۔ کہنے کو تو یہ گاڑی گرانڈ ٹرنک اکسپرس کی دُم ہے، مگر شاید ہی کوئی اسٹیشن ہوگا جہاں یہ سستانہ لیتی ہو۔ شوال کی پانچویں شب تھی تھوڑی سی دیر میں چاندنی غائب ہوگئی۔ اس لئے ناچار کچھوے کی طرح گردن کھڑکی سے اندر کرلی جھلملیاں چڑھا دیں۔ بستر پر سے کوئلے کے ریزوں کو جھٹکا اور چادر اوڑھ سونے کی تیاری کی۔ مگر جو شخص رات کے گیارہ بارہ بجے سوتا ہو اس کو بھلا نو بجے نیند کیوں آنے لگی تھوڑی دیر لوٹتے پوٹتے خیال آیا کہ ابھی تک نماز تو پڑھی ہی نہیں لاؤ وہ بھی پڑھ لیں۔ غسل خانے میں جاکر وضو کیا اور نماز کو کھڑے ہو گئے مگر ریل کے جھٹکوں کی وجہ سے بیٹھ جانا پڑا۔ خیر نماز تو ہوگئی مگر کیسی ہوئی یہ اللہ بہتر جانتا ہے۔ کتاب اٹھائی کہ شاید پڑھنے ہی میں کچھ وقت کٹ جائے مگر سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ اس میں لکھا کیا ہے۔ اس وقت خیال آیا کہ یار اگر اس وقت افیون ساتھ ہوتی تو مزا آجاتا۔ میں اوپر کے درجے میں سفر کرنے والوں کو صلاح دیتا ہوں کہ وہ سفر میں اپنے ساتھ افیون کی دو چار گولیاں رکھ لیا کریں تاکہ اگر سفر دو دن کا ہو اور درجہ خالی ملے تو یہ گولیاں "داشتہ آید بکار" بن سکیں۔

جعفر زٹلی فرماتے ہیں "گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است" سوچے کہ لاؤ افیون نہ سہی سگریٹ ہی سے اس کمی کو پورا کریں۔ ڈبہ پاس تھا کھولا اور سگریٹ پر سگریٹ دھنکنے شروع کئے۔ لیکن اس کے دھوئیں نے دماغ میں وہ خشکی پیدا کی کہ رہی سہی نیند اور بھی اڑ گئی۔ دس بجے قاضی پیٹھ پہونچے۔ وہاں ہماری گاڑی گرانڈ ٹرنک اکسپرس میں جڑنے والی تھی اور اس گاڑی کے آنے میں دیر تھی اس لئے پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع کیا مگر یہ چہل قدمی

چالیس قدم کے اندر ہی رہی۔ کیونکہ جانتے تھے کہ فدا ادھر ادھر ہوئے اور مال دوستوں کا ہوگیا۔ خدا خدا کر کے مدراس کی گاڑی آئی اور ہم مشرق کی بجائے شمال کی طرف چلنے شروع ہوئے۔ یہاں جس حصۂ ملک میں سے ریل گزرتی ہے اس میں انسانوں سے زیادہ جانور آباد ہیں اور چونکہ وہ مسافروں کو اتارنے چڑھانے بہت کام آتے ہیں اس لئے یہ اسٹیشن اکثر سنسان کف دشت میدان بنے رہتے ہیں۔ ہاں اگر کبھی کوئی شیر یا چیتا ادھر آنکلتا ہے تو ذرا چہل پہل ہوجاتی ہے۔ بہرحال ریل چلتی رہی اور ہم بنچ پر لوٹ مارتے رہے۔ اسٹیشن آتا تو کھڑکی کھول کر ذرا جھانک لیتے اور اگر کوئی اللہ کا بندہ نظر آجاتا تو اسی سے پوچھ بھی لیتے کہ "بھئی یہ کونسا اسٹیشن ہے" مگر وہ ذات شریف کچھ ایسے لہجے میں جواب دیتے کہ اس کا سمجھنا ہماری عقل سے باہر ہوتا۔ خدا خدا کر کے رات کے چار بجے بلہار شاہ اسٹیشن آیا اور اس وقت ذرا طبیعت بحال ہوئی کہ چلو اب صبح قریب ہے اور کچھ نہیں تو کم سے کم آدمیوں کی شکلیں تو دکھائی دیں گی۔ کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد پو پھٹی مشرق کے کنارے سرخ ہوئے اور پھٹ سے صبح ہوگئی۔ اس ور صبح ہونے کی جس قدر خوشی مجھے ہوئی ہے وہ بیان نہیں ہوسکتی رات کی ساری کلفت دور ہوگئی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ شاعر شب فراق اور عالم تنہائی کا رونا اس قدر روتے ہیں مگر جب دیکھو تن تازہ موچھوں پر تاؤ دیتے نظر آتے ہیں۔ ریل میں اس رات کے گزارنے کے بعد یہ مسئلہ بآسانی حل ہوگیا اور پتہ چلا کہ واقعی شب فراق ان بچاروں پر سخت گزرتی ہے مگر صبح کی آمد پھر ان کو جیسے کا ویسا کر دیتی ہے۔

کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے واردھے کا اسٹیشن آیا۔ آج کل اس اسٹیشن نے ریل کی آمدنی بہت بڑھا دی ہے۔ ذرا کہیں کچھ گڑبڑ ہوئی اور چل مرے یار واردھے کو۔ یہاں ہم نے وہ کنکنا بادامی رنگ کا پانی پیا جس کو عرفِ عام میں چائے کہا جاتا ہے کوئی بیس برس کی بات ہے کہ ہمارے محلہ میں ایک شخص کافی بیچنے آتا اور بڑے سخت لہجے میں آواز لگایا کرتا تھا کہ "کافی ایٹ گرم" چنانچہ اس کا نام ہی "کافی ایٹ" پڑ گیا تھا۔ خوب بکری ہوتی تھی مگر خدا معلوم کیا بات ہوئی کہ اس نے یہ چلتا ہوا دھندا چھوڑ ہمارے ہاں نوکری کرلی۔ ایک دن سب نے اس سے فرمایش کی کہ کافی بناؤ۔ اس نے پانی دیگچی میں چڑھا، خدا معلوم کیا کیا الابلا ڈال کافی بنا ہمارے سامنے لا رکھی۔ آپ یقین مانیے کہ اس کافی کے تھے تو دس بارہ اجزا مگر اس میں بُن نام کو نہ تھے۔ اسی نمونے کی وہ چائے ہوتی ہے جو اسٹیشنوں پر ملتی ہے اور زہر مار کی جاتی ہے۔

میں پالیٹکس سے ہمیشہ دور رہتا ہوں مگر خبر نہیں کہ یہ واردھے کی چائے کا زور تھا یا وہاں کی آب و ہوا کا اثر کہ ایک دفعہ ہی میرے خیالات پولیٹیکل ہوگئے اور ان خیالات کا وہ زور بندھا کہ بڑی مشکل سے یہ زور ساڑھے نو بجے ناگپور کے سنترول کی ترشی سے اترا۔ میں ہر اس مسافر کو جو ناگپور پر سے گزرتا ہے آگاہ کئے دیتا ہوں کہ اسٹیشن پر سنترول کی جو ٹوکریاں بکنے آتی ہیں ان کو ذرا دیکھ بھال کر لیا کریں ورنہ بھئی وہ جانے اور ان کا کام جانے۔ انگریزی کی ایک مثال ہے کہ "ہر وہ چیز جو چمکتی ہے سونا نہیں ہوتی" اسی طرح سمجھ لو کہ "ہر وہ چیز جو ان ٹوکریوں میں ہوتی ہے سنترہ نہیں ہوتی" ہم نے بھی

ایک ٹوکری خریدی۔ پہلے بارہ آنے مانگے گئے آخر جب ریل چلنے لگی تو دو آنے پر تصفیہ ہوا۔ چلتی گاڑی سے ہم نے دوانی باہر پھینکی اور اس نے سنتروں کی ٹوکری اندر لڑھکا دی ٹوکری میں سے جو سنترے نکلتے ہیں وہ بس دیکھنے کے قابل تھے۔ کھانے کے کام کے تو تھے نہیں۔ ہاں خاصہ بھلا چنگا آچار تھا۔ اوپر کی تہ ذرا اچھی تھی، سوچے کہ چلو دو آنے میں چھ سنترے ہی کیا بُرے رہے۔ ایک کو چھیلا پھانک کو صاف کیا، بیج نکال کر پھینکے پھانک منہ میں رکھی اس کے بعد کچھ نہ پوچھو کہ کیا ہوا۔ بس یہ سمجھ لو کہ کھٹا اس افعل التفضیل کے صیغہ کے ساتھ منہ میں داخل ہو گئی۔ گھبراہٹ میں بغیر سوچے سمجھے کلی کی نتیجہ یہ ہوا کہ دانت بیکار ہو گئے ذوق مرحوم فرماتے ہیں ؎

دشنام ہو کے ترش وہ مجھ کو ہزار دے
یاں وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے

اگر جاڑے میں استاد مرحوم ناگپور کے سنترے کھاتے تو ہرگز یہ شعر نہ لکھتے۔ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کونسے عاشق ہیں جو جاڑے میں ناگپور کے سنترے کھائیں اور اس ترشی سے ان کا نشۂ عشق ہرن نہ ہو جائے۔

ناگپور سے آگے جو اسٹیشن پڑتے ہیں ان کو معناً اسٹیشن کہا جا سکتا ہے کہ وہاں گاڑی ٹھیرتی ہے ورنہ بغیر دوربین کسان کو دیکھنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ ہاں سنترے ہر جگہ ملتے ہیں اور خدا کے فضل سے کھانے بھی جاتے ہیں بھلا ناگپور کے سنتروں کا مزہ چکھنے کے بعد میری کیا ہمت ہو سکتی تھی کہ ان کے خریدنے کا خیال بھی دل میں لا سکتا۔ اس لئے دور ہی سے ان کا نظارہ کرتا اور کھانے والوں کے کام و دہن کی تعریف کرتا رہا۔ وقت کسی طرح کاٹے نہ کٹتا تھا اس لئے ناول نکالا

ایک آدھ صفحہ پڑھا تھا کہ پان کا خیال آیا یہ کچھ عجیب بات ہے کہ جب تک پان منہ میں نہ ہو میں نہ کچھ لکھ سکتا ہوں اور نہ پڑھ سکتا ہوں۔ دانتوں کی حالت مجھے معلوم تھی لیکن مرتا کیا نہ کرتا ڈبیا میں سے پان نکالا ڈرتے ڈرتے منہ میں رکھا، پان منہ میں رکھنا تھا کہ دانت کٹر کٹر کرنے لگے آخر پوپلوں کی طرح منہ چلایا تھوڑی دیر میں ترشی کا اثر ذرا دور ہوا اور پڑھنے میں دل لگنے لگا کوئی بارہ ساڑھے بارہ بجے ہوں گے کہ پیٹ نے فریاد بلند کی کہ "بیار بدہر چہ دارید" کھانے کی گاڑی ریل میں لگی ہوئی تھی دوسرے ہی اسٹیشن پر کھانا منگوایا۔ یہ تو خدا ہی کو خبر ہے کہ اس میں کیسی کیا کیا چیزیں۔ مگر بھوک کا وہ زور تھا کہ " زر خود دان" کی گردان کرتے کرتے ساری رکابیاں صاف کر دیں۔ اس کے بعد اطمینان ہوا۔ پان کھایا۔ سگریٹ سلگایا اور ناول پڑھنا شروع کیا۔ پانچ بجے اٹارسی پہونچے۔ یہاں خوب ڈٹ کر چائے پی۔ ہوشنگ آباد پہونچتے پہونچتے شام ہو گئی۔ سات بجے بھوپال آیا یہاں میرے ایک عزیز اپنی عنایت سے بہت مرغن کھانا لائے کھانا اپنی رکابیوں میں الٹ ان کی پلیٹیں ان کے حوالے کیں۔ بھوپال سے نکلنے کے بعد خیال آیا کہ کھانا کھا کر اب لوٹ مارو۔ چوبیس پچیس گھنٹے کے جاگے ہوئے ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیمار پڑ جاؤ۔ کھانا کھایا عشا کی نماز پڑھی۔ کھڑکیاں چڑھائیں۔ دروازوں کے کھٹکے لگائے روشنی گل کی کمبل تانا اور اپنے آپ کو نیند میں ڈالا۔ نیند تو راہ دیکھ ہی رہی تھی جھٹ آنکھ لگ گئی۔

خدا معلوم وہ کونسی جگہ تھی کیا وقت تھا کہ ایک دروازے کی کھڑکی پٹ سے گری اور اس آواز کے ساتھ ہی میری

آنکھ کھل گئی کیا دیکھتا ہوں کہ کھڑکی میں سے کالے دستانے پہنا ہوا ایک ہاتھ نکلا۔ ساتھ ہی آہستہ آہستہ دروازہ کھلا اور ایک صاحب سیاہ اورکوٹ ڈانٹے نقاب منہ پر ڈالے ایک پستول ہاتھ میں لئے اندر تشریف لائے اندر آکر انھوں نے بجلی تو نہیں کھولی ہاں ان کے دوسرے ہاتھ میں جو چھوٹی سی بیاٹری تھی اس کو روشن کیا۔ مگر روشنی کا رُخ نیچے کی طرف رکھا اور نہایت متانت سے کہا کہ "اٹھیے" میں اُٹھ بیٹھا کہنے لگے "لاؤ تمھارے پاس کیا ہے" میں نے کہا "تین روپے چھ آنے نو پائی اور دلی کا ٹکٹ" کہنے لگے "مذاق کرتے ہو" میں نے کہا "جناب والا ایسی حالت میں کیا کوئی بھلا آدمی مذاق کرسکتا ہے" مگر نہ معلوم یہ کیا بات تھی کہ باوجود ایسا نازک موقعہ ہونے کے ان حضرت کا اثر مجھ پر کچھ زیادہ نہیں ہوا۔ یہ ضرور ہے کہ پستول ایک خطرناک چیز ہے مگر جب یہ یقین ہو جائے کہ یہ کسی پلپلے آدمی کے ہاتھ میں ہے تو پھر اس کا ڈر ور کچھ نہیں رہتا۔ میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ انھوں نے پھر ذرا اونچی آواز میں کہا "نکالتے ہو یا نہیں" میں نے کہا "بہت اچھا نکالتا ہوں" یہ کہہ کر میں ذرا جھجکا بنچ کے نیچے میرا کالا پمپ شوز پڑا تھا وہ میں نے اٹھایا اور ایک دفعہ ہی زور سے کہا کہ "ہیں یہ دروازہ میں کون ہے" میری اس آواز پر انھوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ میں نے پمپ شوز کے پچھلے حصے کو مٹھی میں دبایا اور اس کی نوک سامنے کرکے کہا "رکھ دو پستول نہیں تو گولی ماردوں گا" اب جو وہ میری طرف مڑ کر دیکھتے ہیں تو ایک بردست پستول ان کے سینے کی طرف ہے۔ بیاٹری کی روشنی نیچے پڑ رہی تھی اس لئے وہ میرے پستول کی ماہیت کو نہ سمجھ سکے آہستہ سے اپنا پستول میرے سامنے والے بنچ پر ڈال دیا بیاٹری نیچے پھینک دی اور دونوں ہاتھ اونچے کرکے کھڑے ہوگئے میں نے بنچ پر سے ان کا پستول اٹھایا اٹھ کر بجلی کا بٹن دبایا۔ اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ ان کے پستول سے زیادہ میرا جوتا بکارآمد ثابت ہوا۔ میں نے بہت ڈانٹ کر کہا "سامنے بنچ پر بیٹھ جاؤ" وہ حضرت یا تو اس زوروں سے آئے تھے یا تھر تھر کانپنے لگے اور بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے اٹھ کر چاہا کہ خطرے کی زنجیر کھینچوں کہ انھوں نے رونا شروع کیا اور کہا کہ "خدا کے لئے زنجیر نہ کھینچیے میں گاڑی سے کود کر جان دیدوں گی" "ہیں! جان دیدوں گی" ایں چہ معنی دارد' میں نے کہا کہ "تم ہو کون" انھوں نے کہا "عورت" میں نے کہا "نام" کہا "راسخہ" میں نے کہا "سبحان اللہ" آپ کو دیکھیے آپ کے کرتوتوں کو دیکھیے۔ اللہ کی بندی تجھے گھر میں بہو بیٹی بن کر بیٹھنا تھا یا اس طرح ڈاکے ڈالتے پھرنا" کہنے لگی "مصیبت سب کچھ کراتی ہے اور رفتار زمانہ سب کچھ سکھاتی ہے" میں نے کہا "نقاب آتارو" کہنے لگی "نہیں" میں نے کہا "نہیں! تو اچھا میں زنجیر کھینچتا ہوں" آخر ناچار ہوکر بچاری نے نقاب اٹھائی خاصی اچھی شکل کی جوان عورت تھی مگر آنکھوں کے نیچے کی کالی کالی لکیریں بتا رہی تھیں کہ مصیبت زدہ ہے۔ بڑی دیر تک ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے تیور دیکھ کر سمجھ گئی کہ میرا ارادہ اس کو پولیس کے حوالے کرنے کا نہیں ہے کیونکہ وہ ایک دفعہ ہی کھڑی ہوگئی اور کہا کہ "خدا حافظ" میں نے پستول کا رُخ اس کی طرف کرکے کہا کہ "بیٹھ جاؤ"

اس نے ایک قہقہہ مارا اور کہا کہ "پہلے پستول کو تو دیکھ لیجئے کہ یہہ چلتا بھی ہے یا نہیں آپ نے جوتے کے پستول سے لکڑی کا پستول چھین کر کوئی بڑا کمال نہیں کیا ہے۔"
اب جو میں نے غور سے پستول کو دیکھا تو واقعی لکڑی کا ٹکڑا تھا۔ گو شکل صورت میں عین مین پستول تھا میں نے کہا "کچھ ہرج نہیں پستول کام دے یا نہ دے۔ میرے ہاتھ پاؤں تو کام دیتے ہیں اب بیٹھتی ہے یا میں اٹھوں" یہہ سن کر وہ بیٹھ گئی اور کہنے لگی "آخر اس سے آپ کا مطلب" میں نے کہا۔ "میں تمہاری داستان سننا چاہتا ہوں۔" پوچھا "یہ کیوں" میں نے کہا "مضمون لکھنے کو" کہنے لگی "تو اچھا آپ مضمون نگار ہیں اور آپ کا اسم شریف" میں نے کہا "فرحت اللہ بیگ" کہنے لگی "اوہو آپ ہی مرزا صاحب ہیں' آداب عرض کرتی ہوں آپ کے مضمون پڑھتی تھی۔ آپ کو دیکھنے کا شوق تھا چلو وہ بھی اللہ نے پورا کر دیا۔ اجی مرزا صاحب! میں کیا بتاؤں کہ میں کون ہوں ایک مصیبت زدہ عورت ہوں۔ ایف اے تک تعلیم پائی ہے۔ چھوٹی عمر میں شادی ہوئی' دو ہی برس کے بعد وہ مر گئے۔ سسرال والوں نے ان کے مرنے کا سبب مجھ کو ٹھیرایا' الزام یہ تھا کہ میں سسرال والوں پر بھاری ہوئی کہ ایک ہی سال میں ایک چھوڑ چار کو کھا گئی' میکے میں آ کر رہی وہاں سوتیلے بھائیوں نے ٹکنے نہ دیا۔ آخر ایک بھلے آدمی سے نکاح کر لیا وہ اللہ کے فضل سے ڈاکو نکلے' دن کو گھر میں رہتے اور رات کو خدا معلوم کہاں کہاں جا کر ڈاکہ ڈالتے۔ مجھے بچپن ہی سے ڈاکوؤں اور سراغ رسانوں کے قصے پڑھنے کا شوق تھا۔ میں ان کے سر ہو گئی کہ مجھے بھی ساتھ لے چلا کرو۔ پہلے تو وہ "نہیں نہیں" کرتے رہے لیکن بعد میں راضی ہو گئے اور اس طرح تھوڑے ہی دنوں میں مجھے گھوڑے کی سواری بھی آ گئی اور چلتی ریل میں چڑھنے اترنے کی مشق بھی ہو گئی۔ ابھی ڈیڑھ سال کی بات ہے کہ تبارک گ کے گاؤں والوں نے ان کو گھیر لیا اور گولی مار کر شہید کر دیا۔"
میں نے کہا "شہید کر دیا کی بھی بہت ہوئی یہ کیوں نہیں کہتیں کہ جہنم واصل کر دیا" کہنے لگی "مرزا صاحب دیکھئے خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کیجئے میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر ان کے متعلق اگر آپ نے کوئی برا لفظ زبان سے نکالا تو اچھا نہ ہوگا" میں نے کہا "تو بیگم صاحبہ آپ چاہتی ہیں کہ میں ایک ڈاکو کی تعریف کروں" کہنے لگی "ساری دنیا ڈاکو ہے کوئی اپنی عقل سے دنیا کو لوٹتا ہے۔ کوئی اپنے ہاتھ پاؤں کے زور سے۔ ایک کی آپ تعریف کرتے ہیں اور دوسرے کی مذمت ورنہ ہیں دونوں ڈاکو" میں نے کہا "اللہ رے تیری منطق' اچھا اس جھگڑے کو تو چھوڑو اور اپنا قصہ ختم کرو" کہنے لگی "اس کے بعد اب قصے میں رہ ہی کیا گیا ہے۔ ان کے مرنے کے بعد سال بھر تک تو اپنی جمع پونجی پر گزارہ کرتی رہی جب وہ ختم ہو گئی تو میں نے اکا دکا مسافروں کو لوٹنا شروع کیا۔ چنانچہ خوش قسمتی سے آج آپ سے نیاز حاصل ہو گیا اچھا اب اجازت ہے" میں نے کہا "راسخہ! بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم شریف اور تعلیم یافتہ ہو کر اپنی ڈاکہ زنی پر فخر کرتی ہو" کہنے لگی "اجی مرزا صاحب' مثل مشہور ہے کہ بھوکے شریف اور پیٹ بھرے رذیل سے ڈرنا چاہیے۔ مگر میں کہتی ہوں کہ یہ دونوں ایسے خطرناک نہیں ہوتے جتنے بگڑے ہوئے تعلیم یافتہ شریف یقین

اس التجا پہ طیش محرّر کو آگیا
ٹھوکر لگائی ایسی بچارے کے تان کر

نالی میں گر گئی وہ سنگھاڑوں کی ٹوکری
چپ تھا غریب ضعف سے تھامے ہوئے جگر

۳

یہ ہے یہاں غریب کا معیارِ زندگی
یہ غم زدوں کے حال پہ ہے لطف کی نظر

یہ قدر آدمی کی یہاں آدمی کو ہے
شرمائیں جس کو دیکھ کے جنگل کے جانور

یہ خستہ کامیوں کی مدارات، الاماں!
یہ نامرادیوں پہ عنایات، الحذر!!

یہ فاقہ مستیوں پہ سخاوت کی بارشیں!
ناداریوں پہ یہ ہیں کرم ہائے اہلِ زر!!

یہ ملک میں ہے عزّتِ باشندگانِ ملک
محصول دے سکیں تو کریں زندگی بسر

یہ زندگی پہ جور و ستم ہائے زندگی!
یہ دورِ خود نما "کہ بشر کا خدا بشر"!!

مذہب غلام، روح غلام، آبرو غلام
آزادیٔ ضمیر، نہ آزادیٔ نظر

احسان دانش

روحِ غالب اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسد اللہ خاں غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگذشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب جس کو جناب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور نے نہایت محنت اور جانفشانی سے مرتب کیا ہے اس کتاب کا پیش لفظ نواب مہدی یار جنگ بہادر ام اے (کیمبرج) صدر المہام تعلیمات و معین امیر جامعہ عثمانیہ نے تحریر فرمایا ہے۔

اس کتاب میں سب سے پہلی دفعہ غالب کے خاندان و اعزہ اور ان کے سسرالی اعزہ و اقارب کے دو تفصیلی شجرے بھی شائع کئے گئے ہیں۔

غالب کے حالاتِ زندگی جس خوبی اور اجمال کے ساتھ اس میں درج ہیں آج تک کسی سوانح غالب میں نہیں شائع ہوئے۔

صفحات (۲۴۰) تعداد تصاویر (۳) کتابت و طباعت نفیس کاغذ اعلیٰ قسم قیمت عاہر۔

موجودہ اردو شاعری

آج کل کی اردو شاعری گرد و پیش کے اثرات کے لئے جس قدر کشادہ آغوش بن گئی ہے، ایسی کسی زمانے میں بھی نہیں تھی۔ وہ تمام قومی اور ملکی سیاست، عالمی معاشی اور سیاسی افراتفری، نظری اور عملی علوم کی توسیع اور حسن کاری کے اگلے تخیلات کی تبدیلیاں، جن سے ہماری قومی زندگی متاثر ہو رہی ہے، ان کا تھوڑا بہت عکس، ہماری موجودہ شاعری میں بھی اتر رہا ہے۔

موجودہ شاعری کے پس منظر میں، دو واقعات، بے حد نمایاں اور خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں پہلا اور سب سے اہم واقعہ، مغربی قوموں سے ہمارا تصادم ہے۔ جس کا انجام بالآخر، ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کی صورت میں ہوا۔ لیکن یہ انجام ہماری شاعری کے لئے چند اہم تحریکوں کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔ انگریزی تسلط کے بعد ہماری شائستہ زندگی کا رخ، ایران سے انگلستان کی طرف پھر گیا۔ ہمارے خیالات، اعتقادات، رہنے بسنے کے طور طریق غرض ہر چیز میں تبدیلی ہو رہی تھی۔ اس کا اثر ہمارے ادبی تخیلات پر بھی پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ بدلی ہوئی فضا سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے لئے ہم کو جو جد و جہد کرنی پڑی، اس کا تھوڑا بہت اثر ہماری شاعری پر بھی پڑا۔ اس زمانے میں نئی روشنی کو ہماری زندگیوں میں داخل کرنے کا باعث اس عصر کے اولین مصلح، سر سید احمد خاں بنے، اور اس تحریک کو شاعری میں، داخل کرنے کا باعث آزاد اور ان سے بڑھ کر حالی تھے۔

حالی کی تحریک کا مقصد، اردو شاعری کو اس کے مخصوص فنی تخیلات سے ہٹانا تھا۔ اس میں ان کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ، فنِ شعر کے نظریہ میں ایک ہلچل برپا ہو گئی اور ہماری شاعری نیچرل شاعری، قومی شاعری جیسی تحریکوں اور سادہ طرز بیان سے روشناس ہوئی۔ لیکن شعر کی صنفیں اور شکل و صورت ابھی تک معرضِ بحث میں نہیں آئی تھی۔ حالی، مروجہ شاعری کے مضامین کے ساتھ، ردیف اور قافیہ کی "اوگھٹ گھاٹیوں" سے بھی بیزار تھے۔ لیکن ان کی عملی ذہنیت اصنافِ شعر کو چھیڑنے کا مشورہ نہیں دیتی تھی۔ تاہم یہ تخم بھی بویا جا چکا تھا، اور طوفان راہیں تلاش کر رہا تھا۔ ایسے میں، دوسرا اہم واقعہ پیش آیا۔ یہ یورپ کی جنگ عظیم تھی

اس اہم عالمی حادثہ کا اثر، ہماری شاعری پر شاید براہِ راست نہیں پڑا، اس جنگ کے بعد سے، عالمی سیاست میں جو گتھم گتھا ہو گئی تھی، اس کے سبب ہم ان اثرات سے، بے تعلق بھی نہیں رہ سکتے تھے۔

اس جنگ کا اثر دنیا پر کس قدر دور رس ثابت ہوا، اس کا پورا پورا اندازہ ابھی تک بھی نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ سے جہاں بہت سا جانی اور مالی نقصان ہوا، اور دولت مند قومیں مفلس ہو گئیں، وہیں، مشرقی قوموں کے دلوں میں آزادی کی ایک لہر دوڑ گئی اور ترکی انقلاب نے راستہ اور بھی ہموار کر دیا۔ اور یورپ، اور خاص کر انگریزوں کی برتری کا طلسم ہمارے ذہنوں سے ٹوٹنے لگا۔ یہی زمانہ ہماری شاعری میں، قومی جوش اور حب وطن کے ترانوں کا زمانہ ہے۔ اس سلسلے میں اقبال نے رہنمائی کی، اور چکبست، سرور اور نوجوان شعرا کی ایک بڑی تعداد ان کے نقشِ قدم پر چلنے لگی۔ اقبال کا مشہور [illegible] اس احساس کو جگانے [illegible]

ہوا۔ یورپی شاعری میں، قومی جوش و خروش کا زمانہ مین
جنگ کا زمانہ تھا۔ لیکن اردو شاعری میں یہ احساس
مابعد جنگ اثرات کا پیدا کردہ ہے۔

جنگ کے بعد دنیا سمٹ کر اتنی قریب ہوگئی کہ
دنیا کی ساری قومیں ایک دوسرے کی ہمسایہ بن گئیں۔ دوران
جنگ میں، اس مصیبت کو جلد سے جلد یکسو کرنے کے لئے
علمائے سائنس کے جو ذہن تیزی سے کام کر رہے تھے۔
بعض وقت تمام حدوں کو توڑ کر آگے نکل گئے، اور یوں تو
بہت سی اچھی بری چیزوں کو وجود میں لانے کا باعث
ہوئے۔ لیکن، دنیا کو قریب تر لانے میں، جن سے بہت
مدد ملی، وہ ہوائی جہازوں کی ترقی اور لاسلکی کی ایجاد ہے۔

جنگِ عظیم میں جو جانی نقصانات ہوئے، ان کے
اثرات، وہیں پر ختم ہوگئے، لیکن اس کے مالی نقصانات
بہت دور رس ثابت ہوئے۔ اس حادثے نے جیتنے والے
اور ہارنے والے، سب کو یکساں مفلس بنا کر چھوڑا۔ جنگ کے
زمانے میں امن کے خوش گوار خواب دیکھنے والوں کے لئے
جنگ کے بعد کا زمانہ اور بھی حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ معاشی
ابتری کی وجہ سے، ان کی زندگی کے سارے نظامات
درہم برہم ہوگئے تھے۔ فطرتاً ان کا سب سے بڑا نصب العین
معاشی ترتیب بن گئی۔ جنگ کی تلخیوں نے، ان کے
مذہبی جذبے کو خدا اور اس کی دنیا کے نظام کے خلاف
انتقام کے جذبے میں تبدیل کر دیا، اگلی گھریلو زندگی
کی راحتیں اب خواب و خیال ہوگئیں اور صنعتی تعلقات
میں نیکی، بدی کا کوئی سوال نہیں رہا۔ ان کی حسن کاری
کا سارا تناظر بھی چوپٹ ہوگیا، جس کا اثر، تعمیر کاری،
مصوری اور شاعری غرض تمام فنونِ لطیفہ میں نمایاں ہے

غرض یورپ کی جنگ زدہ قومیں، اپنے آپ کو
بدلی ہوئی فضا کے ہم آہنگ بنانے کے لئے بیٹھیں، تو
انھیں جیسی جیسی ضرورت ہوئی، حیات کے نئے نئے
نظامات ترتیب دینے پڑے، اشتراکیت، اشتمالیت،
فاسطیت، جیسی تحریکیں اسی کی پیدا کردہ ہیں۔ ان کے
علمانے بھی، اس معاملے میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ اور حیاتیات
نفسیات، معاشیات، اور سائنس کے عالموں کی
تحقیقات نے، زندگی کے لئے بہر حال، سہارا پیدا
کر دیا۔ جو نئی معاشرہ انھوں نے ترتیب دی، اس کا
دارومدار معاشیات پر تھا۔ زیادہ سے زیادہ دولت
پیدا کرنے کے وسیلے، کلوں اور دوسری مصنوعات کی صورت
میں فراہم کئے گئے۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ
اٹھانے کے لئے، ایسے اجتماعی نظریے وجود میں آئے
جن کی بدولت، فرد، ایک nonentity بن کر
رہ گیا۔ ہم بھی چونکہ اس عالمی کل کے جز بن گئے تھے
ان تمام تحریکوں سے بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے۔
ان تحریکوں کو ہمارے درمیان اور بھی چلتا کرنے
میں، ہمارے ان تعلیم یافتہ نوجوانوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے
جواب انگریزی برتری کا ہوّا دور ہونے کے سبب، یورپ
کی جامعات کو بھی علم و فن کا اسی طرح مرکز سمجھ کر جانے لگے
جس طرح وہ اس سے پہلے صرف انگریزی جامعات کو سمجھتے
تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ، وہ نہ صرف یورپ کی اہم زبانوں
اور ان کے علوم و فنون سے بہرہ ور ہوئے، بلکہ وطن لوٹتے
ہوئے ان کی نئی نئی تحریکوں کے اثرات بھی ساتھ
لیتے آئے۔ اس کا اشتراکی اور بعض وقت اشتمالی نظامِ حیات
ان کے لئے سب سے زیادہ جاذبِ نظر ثابت ہوا۔

ان عالمی تحریکوں کے علاوہ ہم اپنے ذاتی ملکی اور قومی مسائل سے بھی دوچار ہیں، جن میں سب سے اہم مغربی یلغاروں سے اپنے آپ کو بچانا اور اپنی قومی انفرادیت اور آزادی پر قابو پانا ہے۔

ان تمام تحریکوں کے اثرات اور ان کے ردِ عمل کا سب سے بڑا مظہر اس عصر کے شاعرِ اعظم اقبال کی شاعری ہے۔ ہماری اجتماعی زندگی کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا رہ گیا ہوگا جس کو ان کی فکر نے نہ چھیڑا ہو۔ لیکن اور نوجوان شعرا کی طرح وہ، ان تحریکوں کی نظر فریبیوں پر قانع نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے وسیع علم اور ان کی دقیق نظر نے کسی تحریک کو چھان بین اور تنقید کی کسوٹی پر پرکھے بغیر قبول کرنے نہیں دیا۔ ان کی دور رس نگاہیں "دم کٹی لومڑی کے فلسفہ" کی تہ تک آسانی سے پہنچ گئیں۔ انھیں صاف نظر آگیا کہ یورپ کا سارا نظام کھوکھلی عمارتوں پر تعمیر ہوا ہے۔ اور جو چیزیں ضرورت زمانہ کی مجبوریوں سے وجود میں آئی ہوں، ان کا ہر حالت میں پائدار ہونا ضروری نہیں ہے۔ انھیں مغالطوں کو دور کرنے اور پائدار اہمیت کی چیزوں پر نظر جمانے کی تلقین کے لئے انھوں نے اپنی ساری شاعرانہ، ملہمانہ اور مصلحانہ قوتیں بلکہ اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ فرد کی حیات اور اس کی خودی کو وہ ایک اتفاقی چیز نہیں سمجھتے تھے، اور جنگ کے مابعد اثرات نے جو موقتی فضا پیدا کر دی تھی، اس کے حل کے ساز و سامان کو وہ اٹل نظام زندگی نہیں تصور کر سکتے تھے۔ جمہوریت جیسی کہ عام طور پر یورپ میں رائج ہے ان کی نظر میں ایک ایسی طرزِ حکومت تھی، جس میں "بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے" قومیت کا احساس بھی، وقتی فرقہ بندی کے جوش و خروش کا نتیجہ تھا۔ اصل چیز، انسانیت ہے۔ یہی قومیت، جو دراصل "قومیت" کے مفروضہ کا نتیجہ ہے، ظاہر ہے، بے بنیاد چیز ہے۔ مجلس اقوام، ایک "داشتہ پیرک افرنگ" اور "کفن چوروں" کی ایک محفل ہے۔ غرض اقبال نے تمام مسائلِ حاضرہ کی ترجمانی کی ہے۔ اور ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ انہیں کے الفاظ میں "ضربِ کلیم" ہے یعنی اعلانِ جنگ دورِ حاضر کے خلاف"۔

اقبال جتنے بڑے شاعر تھے، اتنے ہی بڑے مفکر بھی تھے۔ انھوں نے انسان کے لئے جو نظامِ حیات ترتیب دیا تھا، اس کے تمام خد و خال انھوں نے واضح کر دیے ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری اجزا سے نہیں بلکہ ان کی ترتیب سے جانچی جانی چاہیے۔

نئی تحریکوں میں، اشتراکیت کی طرف وہ اپنے مخصوص اعتقاد کے سبب مائل تھے، جس کا ثبوت ان کی کئی نظمیں ہیں، جن میں سب سے زیادہ زباں زد "پنجاب کے کسان سے" ہے۔ اور یہی نظامِ حیات، ہمارے نوجوان شعرا میں سے اکثروں کو بھی بہت پسند ہے۔

اقبال کی سی وسیع نظر، ظاہر ہے کہ عام شعرا کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اسی لئے ان میں سے ہر ایک ان تحریکوں کا اثر اپنی اپنی بساط کے مطابق لیتا ہے۔ اور ان کی ترجمانی اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق کرنے میں بھی وہ فطرتاً مجبور ہیں۔

ایک چیز جو آج کل کی شاعری کے معیار پر برا اثر ڈال رہی ہے، وہ صحافت کی گرم بازاری اور طباعت کی آسانیاں ہیں۔ اس کی وجہ سے، پیش رس کارنامے عام ہو گئے ہیں۔ اس "کثیر پیداوار" کے دور میں، اچھے اور

پائدار دلچسپی رکھنے والے کارناموں کی پیدائش شاذ ہو گئی ہے اور ان کے لئے یہ فضا ساز گار نہیں ہے۔ اسی کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام سطح سے ابھرنے کے لئے شاعر بعض وقت عجیب و غریب اسالیب اور اندازِ بیان کا اختراع کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ یورپ میں بھی یہ رجحان موجود ہے۔ لیکن اس بدیع اسلوبی کے اختراع کا سہرا وہاں ان شعرا کے سر ہے' جو الفاظ کی عام بے قدریوں سے جل کر' انتقام لینے کے لئے' ان کے استعمال کے عجیب عجیب انداز وضع کر رہے ہیں' اس سے یورپی شاعری کا ایک بڑا حصہ نہایت ادق اور عوام کی سمجھ بوجھ سے باہر ہو گیا ہے۔

زبان کے ابتدائی کارناموں کی تحقیقات کا بھی خاصہ اثر اس زمانے کی شاعری پر پڑ رہا ہے۔ موجودہ شعرا میں' ایک خاصہ گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو شاعری کو قدیم زمانے کی سادہ اور سلیس زبان اور اندازِ بیان کی طرف لوٹانا چاہتا ہے۔ اس کی ابتدا بھی کہنے کو تو حالی سے ہوئی تھی' کیونکہ وہ میر کی سادہ زبان کو اپنا مطمحِ نظر سمجھتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں یہ کوئی تحریک نہیں بنی تھی۔ اسمٰعیل میرٹھی اور شوق قدوائی نے اپنے ذوق کی بدولت اس اصول کی پیروی کی تھی۔ عظمت اللہ خاں مرحوم کے ہاتھوں میں یہ ایک شدید تحریک بن گئی۔ اور انتہا پسندوں کی ایک بڑی تعداد ایسی پیدا ہو گئی' جو میر اور ولی کی زبان سے بھی آگے بڑھ کر' برج بھاشا کی نقل اتارنا چاہتی ہے۔

آج سے کوئی ساٹھ ستر سال پہلے' ہمارے ایک رسم و قیود سے بیزار شاعر نے' "غزل" کی تنگنائی کی شکایت کی تھی' اور اس میں مرثیہ اور قصیدے کے عناصر بھی شامل کر کے' وہ اپنے بیان کے لئے وسعت چاہتا تھا۔ لیکن قدامت پسندوں کی گراں گوشی کے لئے یہ صدا بے اثر ثابت ہوئی۔ ایک اور آزاد رو شاعر نے' مقبول شاعری' من مانی صنفوں میں پیش کی وہ بھانڈ سمجھا گیا۔

حالی نے اسے محسوس کیا' لیکن وہ قدیم اصناف کی اصلاح اور توسیع کے خیال سے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن موجودہ زمانے میں' اس تحریک کے برپا ہونے کی سہولت موجود تھی۔ اس میں کچھ تو زبانوں کے بولنے والوں کی عام ذہنی وسعت کا تقاضا تھا اور کچھ قدیم قیود کی سختیوں کا ردِ عمل۔ چنانچہ آج کل کی شاعری میں صورتِ شعر کے لحاظ سے جو نت نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں' ان کو حصر کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اقبال اور جوش جیسے درمیانی مسلک پر چلنے والے شعرا مسلسل' غزل' قطعہ یا مثنوی کے قافیہ کی ترتیب کو قائم رکھ کر خیال کے اٹھان کے لحاظ سے' ان کے ٹکڑے کر لینے پر اکتفا کرتے ہیں' لیکن انتہا پسند' انھیں سرے سے سامنے سے ہٹا دیتے ہیں۔ یہ تحریک دراصل "قدیم زبان کی طرف رجعت" کی تحریک کے دوش بدوش چلی ہے۔ چنانچہ عظمت اللہ خاں مرحوم اور ان کے دبستاں کے شاعروں نے' عروض و قوافی کی قیدوں کو سرے سے توڑ دیا ہے۔ عظمت اللہ خاں' ہندی اوزان کی طرف زیادہ مائل تھے۔ اور انھوں نے ایسی نفیس نفیس نظمیں سرانجام کیں کہ' ان کی بدولت وزنوں کے اختراع کا ایک نیا باب کھل گیا۔ اور اب ہندی پنگل اردو شعر کے مسلمہ اوزان میں داخل ہو گیا ہے۔ موجودہ عصر کے مقبول شعرا جیسے حفیظ جالندھری' اختر شیرانی' احسان بن دانش' روش صدیقی' حافظ غازی پوری

اس طرح کی نظمیں لکھنے میں بڑی دست گاہ رکھتے ہیں۔ ہندی وزن کے علاوہ، فارسی بحروں میں بھی وہ حسبِ ضرورت ترمیم کر لینے کو برا نہیں سمجھتے۔

اگلے اساتذہ کے مسلّم اوزان استعمال کرنے والے شعرا بھی، بعض وقت قافیہ کے تمام ضوابط کی پابندی ملحوظ نہیں رکھتے۔ اس سے بلاشبہ اردو شاعری کی صنفوں میں توسیع ہو گئی ہے اور اردو میں بہت سی مترنم بحریں استعمال ہونے لگی ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیز شاعر کے ذوق پر منحصر ہوتی ہے۔ اس کے غلط استعمال سے، بہت سی ایسی چیزیں بھی شاعری کے نام سے معرض وجود میں آ رہی ہیں۔ جن کا شاعری سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

ایک خاص صورت نظم کی جو مقبول ہے، وہ ایک طرح کا مستزاد ہے۔ جس میں، خیال کے ٹکڑوں کے لحاظ سے، چھوٹے بڑے مصرعے بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کی نظمیں، غنائی شاعری میں بہت استعمال ہونے لگی ہیں۔ اور یہ قدیم شاعری کے یکساں لب و لہجہ کے مقابلہ میں ایک پسندیدہ جدت ہے۔

اس طرح اردو شاعری کی موجودہ پیداوار پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ حقیقت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ آج کل کی شاعری میں ظاہر اور باطن ہر لحاظ سے اتنی وسیع تبدیلیاں ہو چکی ہیں کہ آج سے پچیس تیس سال پہلے کی شاعری کو بھی اس سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ جتنا انقلاب ہماری شاعری میں رونما ہو چکا ہے اتنا ہماری واقعی حالت میں شاید پچاس سال کے بعد بھی نہ ہو سکے گا۔ اور یہ ہمارے ذہنی تاثرات کی موجودہ تاریخ ہے۔

عبدالقادر سروری

غزل

ضرور تھا کافرِ محبت، حقیقتاً دین دار بھی ہوں
زمانۂ مصلحت پرستی میں لائقِ اعتبار بھی ہوں

خموش ہوں بے قرار بھی ہوں، اسیرِ زلفِ بہار بھی ہوں
میں شاعرِ دل فگار ہی کیا، مصورِ حسن کار بھی ہوں

نظر نظر اس کی یوں جھجکتی ہے جیسے سلمائے پاک دامن
ادا ادا کہہ رہی ہے عصمت مآب و عفت شعار بھی ہوں

تری محبت، تری پرستش میں دل پہ قابو نہیں ہے مجھ کو
تری محبت تری پرستش میں صاحبِ اختیار بھی ہوں

عیاں ہے دنیا پہ میری پستی، مٹے مٹے ہیں نقوشِ ہستی
نقوشِ ہستی نظر کو حائل نہ ہوں تو اک شاہکار بھی ہوں

بہار آتے ہی میرے "ہونے" سے باغباں کیوں کھٹک رہا ہے
نہیں الجھتا میں دامنوں سے تو کیا قباحت کہ خار بھی ہوں

محاسنِ انتظارِ محبوب پر دلائل کی کیا ضرورت
وفائے وعدہ سے باخبر ہو کے، مائلِ انتظار بھی ہوں

مری ہی تخلیق ہے زمانہ میں خوش مذاقی و کور ذوقی
میں رحمتِ روزگار بھی ہوں میں زحمتِ روزگار بھی ہوں

چمن کے پھولوں سے دل لگانے کا بزدلی سے نہیں تعلق
اگر چمن کو مری ضرورت پڑی تو میں جاں نثار بھی ہوں

یہ مجھ پہ آزادیوں کی بنیاد رکھنے والوں کو کیا ہوا ہے
انھیں تو پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ میں استوار بھی ہوں

شناورِ گنگ شعر جتنے ہیں شاد، گردانتے ہیں مجھ کو
تو ایک "تالاب میں فراہم" جو میں انھیں ناگوار بھی ہوں

شاد عارفی

اردو کے نظم گو شاعر

نظم کے پیش خاکے نظم ہماری زبان میں ایک مربوط اور مسلسل صنفِ سخن کا نام ہے۔ یہ ظاہری اور معنوی حیثیتوں سے غزل سے بالکل مختلف ایک مستقل صنفِ سخن ہے، جس کو جدید ادب میں روزافزوں اہمیت حاصل ہوتی جا رہی ہے۔ اردو میں اس کا خاکہ عہد قدیم ہی سے پڑ چکا تھا۔ قدیم دکنی ادب کے نمونے تمام تر مثنویوں کی شکل میں ملتے ہیں، خاور نامہ یوسف زلیخا، چندر بدن مہیار، قصۂ بہرام و حسن بانو اس دور کی مشہور مثنویاں ہیں، ان مثنویوں سے متعلق تفصیلی معلومات پیش کرنا اردو مثنویوں کی تاریخ لکھنے والے کا کام ہے۔ لیکن ہمارے لئے اتنا جاننا ضروری ہے کہ ہم آج جس صنفِ سخن کو نظم کہتے ہیں، اس کا ایک دھندلا سا خاکہ ان مثنویوں کی شکل میں قدیم دکنی ادب میں تیار ہو چکا تھا۔

نظیر اکبر آبادی نظیر اکبر آبادی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے نظم کو جدید طرز اور نئے رنگ سے پیش کیا۔ نظیر نے اپنی نظموں کے موضوعوں کے لئے ہندوستانی احول اور ہندوستانی معاشرت کا انتخاب کیا۔ الفاظ کا جتنا ذخیرہ نظیر کی نظموں میں ملتا ہے اتنا میر انیس کے علاوہ غالباً کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں ملتا۔ نظیر کے اکثر و بیشتر الفاظ آج کل متروکات میں شمار کئے جاتے ہیں، ان کے اسلوب ان کی زبان اور ان کی نظموں کے موضوعوں پر بہت سارے اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں۔ یہ نقادوں کا کام ہے کہ ان کی تائید یا تردید کرتا رہے، لیکن ایک مورخ کی نظر میں نظیر اکبر آبادی پہلے شاعر ہیں جنھوں نے منظر کشی اور واقعہ نگاری کی طرف توجہ کی اور اس طرح اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک مستقل شاہراہِ سخن تیار کرلی۔

میر انیس میر انیس نے منظر کشی اور جذبات نگاری کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا۔ لیکن خود میر انیس نے نظم کی ایک خاص صنف کو اپنی شاعری کا محور بنا لیا تھا۔ اس لئے ان کی شاعری تاریخی حیثیت سے اردو مرثیے اور اردو کی ڈرامائی شاعری سے متعلق ہو جاتی ہے۔ بہرحال میر انیس کی منظر نگاری اور جذبات نگاری کو جدید نظم کے پیش خاکے کا اہم جزو سمجھنا چاہیے۔

عہد حالی انیس کے بعد نظم کے پیش خاکے "مختلف حیثیتوں سے مختلف شاعروں کے ہاں تیار ہوتے رہے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائڈ کے مشورے سے جس وقت انجمن پنجاب کے جدید مشاعروں کی بنا ڈالی ہوگی تو ان کا وجدانِ شعری غیر شعوری طور پر ان پیش خاکوں سے متاثر رہا ہوگا۔ نظیر اکبر آبادی کی نظمیں میر حسن کی مثنوی کے دلچسپ مرقعے میر انیس کے مرثیوں کے مناظر اور ان کی جذبات نگاری یہ سب ان کے پیش نظر رہے ہوں گے۔ اور ان کے ذہن میں ان اجزا کی مدد سے جدید نظم کی عمارت کی تعمیر ہو رہی ہوگی۔ مختصر یہ کہ آزاد کی تحریک نے جدید شاعری کے سب سے بڑے علمبردار اور اس عہد کے سب سے بڑے قومی شاعر حالی کے شعور کو بیدار کر دیا اور ہماری زبان میں ان دونوں بزرگوں کی کوششوں سے اس صنفِ سخن کی مستقل بنیاد پڑی جس کو ہم آج نظم سے تعبیر کرتے ہیں، حالی چونکہ سرسید کی اصلاحی تحریکوں سے بے حد متاثر تھے، یہ اصلاحی تحریکات ان کی شاعری کا ایک اہم جزو بن گئی۔ حالی کی نظمیں چونکہ ان کے دل سے نکلی تھیں وہ براہِ راست دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں۔

خواجہ الطاف حسین حالی پانی پتی

اکبر حسین اکبر الہ آبادی

شبیر حسن جوش ملیح آبادی

ابوالاثر حفیظ جالندھری

شیخ ابراہیم ذوق

خواجہ حیدر علی آتش

خواجہ میر درد

قوم پر حالی کے پیام کا کیا اثر ہوا یہ ایک علٰحدہ بحث ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری نے مسلمانوں کے اجتماعی شعور کو بیدار کر دیا۔ حالی کی شاعری مسلمانوں کے تنزل کا ایک دردناک مرثیہ ہے۔

شبلی ۱۸۵۷ء تا ۱۹۱۴ء | حالی کی نظمیں اصلاحی مقاصد کے لئے اس قدر موثر اور مقبول ثابت ہونے لگیں کہ شبلی جیسے سنجیدہ عالم اور مورّخ کو بھی اس کی طرف توجہ کرنی پڑی، شبلی چونکہ فطرت سے شاعرانہ دل و دماغ لے کر آئے تھے ان کو اپنی شاعری کے لئے کسی ذہنی کاوش سے دوچار ہونا نہ پڑا۔ شبلی نے تاریخ اسلام کے بعض دلچسپ اور سبق آموز واقعات نہایت کامیابی کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ ان کی مثنوی صبح امید تاریخی اور ادبی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔

اسماعیل میرٹھی ۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۷ء | اسماعیل میرٹھی دبستانِ حالی کے ایک ممتاز پیرو ہیں، انھوں نے بہت ہی اخلاقی اور اصلاحی نظمیں کہی ہیں، یوں کہنے کو اسماعیل بچوں کے شاعر تھے لیکن اسلوب کی شگفتگی اور سلاست کے اعتبار سے ان کی نظمیں ہر مذاق اور ہر طبیعت پر یکساں اثر رکھتی ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی ۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء | اکبر ہماری زبان کے سب سے بڑے طنز نگار satirist تھے۔ انھوں نے جس لطیف طنز کی زبان میں بنا ڈالی اس کے آپ موجد اور آپ ہی منتہی تھے، ان کی شاعری ہماری بڑھتی ہوئی مغربیت کے خلاف ایک احتجاج تھی۔ اکبر اپنے دور کے واحد نمائندہ شاعر ہیں جن کے کلام میں ہم کو اس عہد کے سارے ذہنی رجحانات نظر آتے ہیں اس میں ہم اس عہد کی مغرب پرستی اور اس کے ردِ عمل دونوں ملتے ہیں، مغربیت کے خلاف اکبر کے بھی جذبات زیادہ قوت کے ساتھ اقبال کی نظموں میں جلوہ گر ہوئے اس اعتبار سے مشرق کے شاعرِ اعظم علامہ اقبال مرحوم کی شاعری اکبر کی شاعری کی ہی صدائے بازگشت ہے۔

چکبست لکھنوی ۱۸۸۲ء تا ۱۹۲۶ء | اس عہد کے ایک اور ممتاز نظم گو شاعر چکبست لکھنوی ہیں۔

چکبست کی نظمیں منظر نگاری اور وطن پرستی کے جذبات کے اعتبار سے اردو ادب میں ایک ممتاز اور رفیع مقام رکھتی ہیں، چکبست کی منظر کشی اور جذبات نگاری کے اسلوب پر میر انیس کا نمایاں اثر ہے۔

شوق ۱۸۵۳ء تا ۱۹۲۷ء اور نظم طباطبائی ۱۸۵۳ء تا ۱۹۳۳ء | شوق اور نظم بھی اس عہد کے نظم نگار شاعروں میں قابلِ ذکر ہیں، شوق کی جذباتی نظمیں بے حد دلچسپ ہیں، نظم طباطبائی کی شاعری قدیم اور جدید تحریکات کا سنگم ہے گرے کی مشہور نظم گورِ غریباں ان کا غیر فانی کارنامہ ہے نظم طباطبائی اور عبدالحلیم شرر مرحوم نے اردو میں قافیہ معرا (بلینک ورس) کو رواج دینے کی کوشش کی تھی لیکن یہ مساعی غیر مشکور ثابت ہوں۔

عظمت اللہ خاں ۱۸۸۷ء تا ۱۹۲۷ء | تقریباً اسی دور کے ایک اور ممتاز شاعر عظمت اللہ خاں گذرے ہیں۔ انھوں نے بڑی شاعرانہ طبیعت اور حسن کارانہ مذاق پایا تھا وہ ایک خاص طرز کے موجد اور تنہا مالک تھے، ان کی نظموں پر ہندی شاعری کا بڑا اثر تھا۔ ان کے الفاظ مترنم اور اسلوب بےحد من موہن ہوتا تھا۔

تسلیم | مولوی وحید الدین سلیم عظمت اللہ خاں اور جوش ملیح آبادی

سے بے حد متاثر تھے۔ سلیم نے شاعری اپنی عمر کے آخری حصے میں شروع کی ان کی نظموں میں جوش اور روانی بہت زیادہ نظر آتی ہے۔

عہدِ اقبال | اقبال (۱۸۷۵ء تا ۱۹۳۸ء) اقبال کی عظیم الشان شخصیت ان کی زندگی ہی میں بجائے خود ایک ادارہ بن گئی تھی۔ اور ان کی شاعری کا اثر شعوری یا غیر شعوری طور پر سارے ادب پر پڑ رہا تھا، اقبال بلاخوف تردید اردو کے بلکہ ساری ایشیائی زبانوں کے سب سے بڑے شاعر سمجھے جا سکتے ہیں۔ ان کی حیات اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے وہ اردو کے کسی اور شاعر کے متعلق نہیں لکھا گیا۔ اقبال کی شاعری نے اردو کے ہر چھوٹے اور بڑے شاعر کو متاثر کیا ہے اور ہر شاعر نے کسی نہ کسی طرح ان کی فکر سے اکتساب کیا ہے اور ان کی شاعری کی تقلید کی ہے۔

جوش ملیح آبادی ۱۸۹۴ء | جوش غالباً موجودہ عہد کے سب سے زیادہ مشہور و مقبول نظم گو شاعر ہیں، جوش و سرمستی ان کے کلام کی اہم خصوصیات ہیں۔ جوش ملیح آبادی اپنے مسلک اور عقائد کے اعتبار سے اقبال سے بالکل مختلف ہیں لیکن ان کی طرزِ فکر اور ان کے اسلوب پر اقبال کا اثر ضرور ہے۔ جس سے شاید وہ خود باخبر نہیں ہیں۔ جوش نے نہایت آزاد اور بیباک شاعرانہ طبیعت پائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں ان کی نظموں میں ایک بے اعتدالی اور بے آہنگی سی پائی جاتی ہے لیکن اس سے ان کی شاعرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ جوش شاعرِ انقلاب بھی ہیں اور شاعرِ شبابیات بھی، انقلاب کے لئے ان کے پاس اقبال کی طرح کوئی مستقل فلسفہ یا پیام نہیں ملتا، جوش جس انقلاب کا خواب دیکھتے ہیں۔ اس انقلاب کی تعبیر محض خون آشامیوں اور ہنگامہ آرائیوں میں ہوتی نظر آتی ہے، اقبال جس انقلاب کے متمنی ہیں وہ ایک وجدانی انقلاب ہے جس کا وہ ایک مکمل نصاب اپنے فلسفے میں پیش کرتے ہیں، اقبال شاعر بھی تھے اور مفکر بھی لیکن جوش شاعر اور صرف شاعر ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی انقلابی شاعری سے زیادہ اہم ان کی جذباتی اور شبابیاتی شاعری ہے، اسی کو ان کی حیاتِ ادبی کا غیر فانی سرمایہ سمجھنا چاہیے۔

علی اختر | حیدرآباد دکن کے علی اختر عہدِ حاضر کے نظم گو شاعروں میں سب سے زیادہ سنجیدہ اور سب سے بلند شاعرانہ حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کی نظمیں فکرِ عمیق کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ ان کا ہر شعر ایک مستقبل دعوتِ فکر ہوتا ہے ان کی نظمیں "میلارمے" (فرانسیسی شاعر) کی نظموں کی طرح عوام کے لئے چیستاں بن کر نہیں رہ جاتیں، ان کا کلام غیر شعوری طور پر ایک دلکش نغمہ بن کر دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ اقبال کا صحیح اثر علی اختر سے زیادہ کسی شاعر نے قبول نہیں کیا۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا حسن ان کی فکر اور ان کے اسلوب کی ہمواری اور ہم آہنگی ہے، فارسی ترکیبوں کے استعمال کا سلیقۂ جمیل علی اختر سے زیادہ عہدِ حاضر کے کسی شاعر کو نصیب نہیں ہو سکا۔

سیماب اکبرآبادی | سیماب اکبرآبادی اس عہد کے ایک اور ممتاز صاحبِ طرز نظم گو شاعر ہیں، انھوں نے آگرہ اسکول کی بنیاد ڈالی ہے سیماب کے دبستاں کے شاعروں میں ساغر نظامی، منظر، اعجاز احمد، شاہد خاص طور سے

حافظ نذیر احمد

شبلی نعمانی

عبدالحلیم شرر

راشدالخیری

ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب بی اے - ڈی لٹ

قابلِ ذکر ہیں۔

ماہر القادری | ماہر القادری بھی اس دور کے ایک ممتاز اور خوش فکر نظم گو شاعر ہیں، اصلاحی اور شبابی دونوں قسم کی نظمیں ماہر کے کلام میں موجود ہیں، یہ نظمیں حسنِ خیال اور حسنِ بیان کا نہایت دلکش اور اچھوتا نمونہ ہیں۔

احسان بن دانش | احسان بن دانش عہد حاضر کے سب سے بڑے انقلابی شاعر ہیں، ان کی انقلابی شاعری کوئی رسمی شاعری نہیں بلکہ ان کی اپنی بنیا ہے۔

ان کے علاوہ اختر شیرانی، روش صدیقی، حفیظ جالندھری، عدم، مجاز، ابو الفخر سلام، مخدوم عثمانیہ، میکش عثمانیہ، ساز عثمانیہ، علی منظور، زیبا، وحید، جان نثار اختر، الطاف شہدی، آثر صہبائی اور فطرت واسطی ہماری زبان کے مشہور نظم گو شاعر ہیں ان کا کلام اس عہد کا بیش بہا ادبی سرمایہ ہے۔ اردو شعر و ادب کے مستقبل کی تعمیر ان ہی ہاتھوں سے ہونے والی ہے۔

عمر مہاجر

یاد

(۱)

جب چاند ستارے ہنستے ہیں رنگین نظارے ہنستے ہیں
خاموش اندھیری راتوں میں معصوم شرارے ہنستے ہیں
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۲)

جب سخت اندھیرا ہوتا ہے جب سارا عالم سوتا ہے
اور پریم کی ویراں نگری میں دل چپ کے چپکے روتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۳)

جب تینن گنگا بہتی ہے اور پریم کہانی کہتی ہے
جب بگلے اڑتے رہتے ہیں اور ندیا بہتی رہتی ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۴)

جب پریم تپشا ہوتی ہے اور "شاما" گا کر روتی ہے
تاروں کی سندر چھاؤں میں جب پریم کی دنیا سوتی ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۵)

جب بادل شور مچاتا ہے الفت کے ترانے گاتا ہے
جب "ساون بھادوں" ملتے ہیں شہنائی میگھ بجاتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۶)

اک نور کا گھیرا ہوتا ہے رنگین سویرا ہوتا ہے
جب دیپک بجھنے لگتا ہے معدوم اندھیرا ہوتا ہے
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

(۷)

جب صبح پہ تارے ہوتے ہیں خاموش اشارے ہوتے ہیں
جب کلیاں ہنستی رہتی ہیں معصوم نظارے ہوتے ہیں
کیوں یاد تمھاری آتی ہے

انس کلیانوی
(ناگر گنٹہ)

میرا سنگِ مزار

سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک مضمون میں نے لکھا تھا جس کا
عنوان "ہماری آخری خواب گاہ" تھا۔ جو رسالہ النساء میں
چھپا اُس میں یہ بتایا تھا کہ ہم اپنے رہنے کے لئے تو
عالی شان عمارتیں بناتے ہیں۔ اور ہمارے بعد ہمارے
مزار پر جانور لوٹا کرتے ہیں ہندو اور مسلمانوں کے قبرستان نہایت
بری حالت میں رہتے ہیں ہم کو چاہیے اپنی زندگی ہی میں اپنی
آخری خواب گاہ بنالیں وہاں چمن و باغ ہو جس کی جو حیثیت
ہو اسی طرح کا انتظام پہلے سے کرنا چاہیے۔ اٹلی کا قبرستان
نمائش گاہ بنا ہوا ہے۔ اور پانڈیچری کا بھی قبرستان قابل دید
ہے ہم کو بھی چاہیے کہ ہم بھی اپنی آخری خواب گاہ خوبصورت
بنائیں وغیرہ وغیرہ۔

مضمون تو لکھا تھا مگر میں نے خود اس پر عمل نہیں
کیا۔ البتہ جہاں ہمارا مزار بنایا جائے گا وہ زمین سوچ
لی تھی مگر مقبرہ وغیرہ نہیں بنایا تھا۔ اب سید ہمایوں مرزا صاحب
مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے لئے نہایت خوبصورت مقبرہ
بنایا ہے اور مقبرے کے اندر تاریخیں جو ان کے انتقال پر
لوگوں نے لکھی ہیں وہ آئینے کے چوکھٹوں میں لگوا کر آویزاں
کردی ہیں۔ سرہانے مزار کے سنگِ مزار پر حضرت
اقدس و اعلیٰ دام اقبالہ کی فرمودہ تاریخ "در جنت ہمایوں ہم رفت"
کندہ کروادی ہے اس کے نیچے خان بہادر احمد علی خاں صاحب
کی لکھی ہوئی ۱۳۳۲ف ہجری تاریخ کندہ کی ہے۔

مرحوم کے مزار کے بازو میں میں نے اپنا مزار بھی
کھدوا کر تیار رکھا ہے میں نے اپنا سنگِ مزار بھی کندہ کرنے
اسی شخص کو دیدیا جس نے تمام مقبرے میں سنگِ مرمر کا
فرش کیا ہے۔ میرے سنگِ مزار کی عبارت یہ ہے۔

یا رحیم

نصر من اللہ و فتح قریب

"مزار صغرا ہمایوں مرزا بنت حاجی کیپٹن ڈاکٹر صفدر علی مرزا
صاحب مرحوم سنہ پیدائش سنہ وفات"

ہر کس وسیلہ دارد و ما بے وسیلہ ایم
ما را وسیلہ نیست بجز ذات پاک تو

اس کے نیچے جگہ چھوڑ دی ہے مرے بعد جو کوئی تاریخ
لکھے وہ اسی جگہ کندہ کی جائے گی۔

جب میں نے سنگِ مزار لکھنے دیا تو دوکان دار
صاحب نے ہمدردی سے کہا ابھی جلدی کیا ہے خدا نکرے
آپ کیوں اپنا سنگِ مزار کندہ کرواتی ہیں؟ میں نے کہا آپ کو
اس سے کیا آپ کندہ کر دیجئے انھوں نے چار روز میں
کندہ کر کے دینے کا وعدہ کیا اور آج پانچ ماہ ہوتے
ہیں نہ دیا۔

دوکان دار صاحب جن کا نام صفدر علی صاحب
ہے مجھے کہہ رہے ہیں آپ کا سنگِ مزار لوگ دیکھا
کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی اپنی زندگی میں
سنگِ مزار بنالیں"۔ آپ کے سنگِ مزار کی وجہ میرے
بہت سے پتھر فروخت ہو رہے ہیں اس لئے میں ابھی تو
آپ کا سنگِ مزار نہیں دوں گا"۔ یہ سن کر مجھے ہنسی
آئی کہ لو میرا سنگِ مزار اشتہار کا کام کر رہا ہے
دوسروں کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔ میرا خیال آج سے
نہیں ایک زمانے سے بھی ہے۔ میں نے کہ منطقہ سے

وہ کفنی سنہ ۱۹۰۶ء میں منگائے تھے۔ مری پھوپی صاحبہ مرحومہ اور خالہ صاحبہ مرحومہ جب کہ مکہ معظمہ جا رہی تھیں۔ ان کے ذریعہ منگائے تھے جو زمزم کے پانی سے دھوئے گئے تھے ایک تو مرحوم کے کام آیا ایک میرے انتظار میں رکھا ہے۔

مسز صغرا ہمایوں مرزا

حسرت

مہتاب کے جلووں سے منور ہیں فضائیں — بے خود کیے دیتی ہیں سکوں ریز ہوائیں
جھرمٹ میں ستاروں کے قمر جھوم رہا ہے — فطرت کی جبیں خوابِ سحر چوم رہا ہے

چھایا ہوا ہر ذرۂ عالم پہ سکوں ہے
بگڑا ہوا لیکن مرا اندازِ جنوں ہے

تڑپاتا ہے یہ درد میں ڈوبا ہوا منظر — بے حال ہوا جاتا ہے حالِ دلِ مضطر
سہما ہوا دل رونگٹے تھرائے ہوئے ہیں — احساس پہ طوفانِ الم چھائے ہوئے ہیں
ہنستا ہوا نظروں میں مری آتا ہے کوئی — جذبات کے شانوں کو ہلا جاتا ہے کوئی
اشکوں میں تڑپتے ہوئے بیتاب شرارے — ہر سانس نکلتا ہوا آہوں کے سہارے
کروٹ ہی بدلتا رہا میں نیند نہ آئی — دشمن کو بھی اللہ نہ دے دردِ جدائی
اک جانِ حزیں اور یہ سختی ارے توبہ — لٹتی ہوئی ارمانوں کی بستی ارے توبہ
بجھتی ہوئی یہ شمعِ جوانی کوئی دیکھے — دل چیر کے حسرت کی کہانی کوئی دیکھے
سوگند تمھیں سوزِ محبت کے اثر کی — سوگند تمھیں بڑھتے ہوئے دردِ جگر کی
آہوں کی قسم اشک کے طوفاں کی قسم ہے — قسموں پہ مچلتے ہوئے پیماں کی قسم ہے

آؤ بھی کہ اب صبر کا یارا نہیں مجھ کو
تم بن کوئی جینے کا سہارا نہیں مجھ کو

رشید احمد رشید (عثمانیہ)

خواتینِ دکن کی ادبی خدمات

ہر قوم کے تمدن میں "زبان" کا خاص درجہ ہوتا ہے، زبان کی ترقی اس وقت تک نہیں ہو سکتی، جب تک کہ اس میں ادبی ذخیرہ کثرت سے فراہم نہ ہو، ادبیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ زبان کی وسعت اور زبان کی ترقی ہوتی ہے، وہ قوم اور وہ ملک سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور مہذب کہلاتا ہے جس میں ادبیات کا کافی ذخیرہ ہو، یہ تصور کرنا چاہیے کہ "ادب" ایک کسوٹی ہے جس پر ہر زبان کو پرکھا جاتا ہے۔

"لٹریچر" یا ادبیات میں کئی چیزیں شامل ہیں مثلاً "شاعری" "مضمون نگاری" افسانے، ناول، ڈرامے اور خطوط وغیرہ، ان ہی عنوانوں کے تحت ہم یہاں کچھ صراحت کریں گے۔

شاعری

ادب کی ایک اہم شاخ شعرگوئی ہے، نظم انسان کو بالطبع مرغوب ہے، بہ نسبت نثر کے نظم زیادہ موثر ہوتی ہے۔

نظم کا احاطہ نہایت وسیع ہے، اگر نظم میں مذہب اور اخلاق کو بیان کیا جا سکتا ہے تو پھر اسی نظم کے قالب میں تاریخ اور سوانح بھی بیان کی جا سکتی ہے، نظم کے جامے میں فلسفہ اور تصوف کے نکات پیش کئے جا سکتے ہیں تو پند و نصیحت بھی بیان کی جا سکتی ہے، نظم میں رزم و بزم کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے، مناظرِ قدرت کی نیرنگی اور خوش نمائی، فطرتی اشیاء کی ترجمانی نظم کی صورت میں بہتر سے بہتر طریقے سے ہوتی ہے، قوم اور ملک کو بیدار کرنے، جوش و ہمت دلانے، شاہراہِ ترقی پر قدم بڑھانے کے لئے نظم ہی موزوں خیال کی جاتی ہے، میدانِ جنگ میں بہادری و دلاوری کے جوہر دکھانے کی ترغیب نظم ہی سے وابستہ ہوتی ہے، اگر نظم کے ذریعہ ہنسایا جاتا ہے تو اسی میں مرثیہ اور نوحہ کہہ کر رلایا جاتا ہے، اگر کسی کی مدح اور ستائش کر کے آسمان پر چڑھایا جا سکتا ہے، تو کسی کی ہجو کہہ کر اس کو تحت ثریٰ پر پہونچایا جا سکتا ہے، غرض کہ شاعری یا نظم نگاری سے بیسیوں کام لئے جا سکتے ہیں۔

اردو شعرگوئی میں خواتینِ دکن نے جو حصہ لیا ہے اس کی تفصیلی وضاحت اس مختصر مضمون میں دشوار ہے، البتہ اجمالاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصرِ حاضر میں ایک سو سے زیادہ خواتین شعرگوئی کی حیثیت سے پیش ہو سکتی ہیں، جن میں سے کئی خواتین شعرگوئی کے لحاظ سے بلند مرتبہ رکھتی ہیں، ان کا کلام پسندیدہ اور شائستگی کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے، ان کی شاعری اکثر ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

ہماری شاعر خواتین کا کلام قدیم طرز کی شاعری تک محدود نہیں ہے، بلکہ جدید خیالات اور جدید طرز کی شاعری میں بھی وہ خاصہ حصہ لیا کرتی ہیں، اگر ان کے کلام میں قدیم طرز کی عشق و عاشقی، گل و بلبل، شاہد و ساقی، کی داستانیں اپنی رنگین و شیریں بیانی، جدت آفرینی اور زبان کی لطافت کے لحاظ سے قابلِ ستائش ہوتی ہے، تو جدید طرز کی شاعری جو ملک اور قوم کو بیدار کرتی، مناظرِ قدرت اور نیچر کی

ترجمانی کرتی ہے، خیالات کی بلند پروازی اور جدت،
زبان کی صفائی اور سادگی، اسلوب بیان کی ندرت
اور نزاکت کے لحاظ سے قابل داد ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر میں جن خواتینِ دکن نے شاعر
کی حیثیت سے نام و نمود پیدا کیا ہے اور جن کے
کلام نے کافی شہرت حاصل کر لی ہے، ان میں سے
بعض کا مختصر تعارف اس موقع پر بے محل نہیں ہو سکتا
اس خصوص میں سب سے پہلے ملکۂ دکن حضرت
دلہن بادشاہ بیگم کا اسم گرامی پیش ہوگا جو اعجاز
تخلص کے ساتھ شعر کہتی ہیں، آپ دکن کی پہلی ملکہ
ہیں جو اردو میں طبع آزمائی فرماتی ہیں۔

اس کے بعد بشیر النساء بیگم بشیر، رابعہ بیگم رابعہ
منظور فاطمہ بیگم سردار، رحمت بیگم اسیر، نوشابہ خاتون
نوشابہ، لطیف النساء بیگم لطیف، وغیرہ کا نام لینا چاہیے
جو اپنے ہمعصروں میں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں،

بشیر کو نظم نگاری اور غزل گوئی کا بہت اچھا
ملکہ ہے، ان کے کلام کا مجموعہ عنقریب شایع ہونے
والا ہے، رابعہ بیگم کو فطرتی اشیا کی ترجمانی کا خاصا
سلیقہ ہے، ان کی نظمیں قابلِ قدر ہوتی ہیں، اسیر
اور سردار کو غزل گوئی وغیرہ میں اچھی مہارت
ہے، ان کے کلام میں زبان کی لطافت اور رنگینی
کے جوہر پائے جاتے ہیں، نوشابہ خاتون جامعۂ عثمانیہ
کی پہلی بی اے خاتون ہیں۔ ان کے کلام کا مجموعہ "موجِ گل"
کے نام سے شایع ہو چکا ہے، نوشابہ خاتون کا کلام
سوز و گداز کے لحاظ سے قابلِ ستایش ہوتا ہے،
لطیف النساء بیگم نے بچوں کے لئے نظم لکھنے کی اچھی
مشق کر لی ہے۔

ان کے علاوہ بیسیوں خواتین ہیں جن کی شاعری
قابلِ داد اور لایق ستایش ہوتی ہے، ان کے نام
بھی طوالت کا موجب ہوں گے۔

مضمون نگاری

ادب کا ایک شعبہ مضمون نگاری ہے، جو ساری
ادبی کوششوں کا نچوڑ ہوتا ہے، نثر کے ذریعہ سنجیدہ
اور متین مسائل سمجھائے جا سکتے ہیں، تحقیقات اور
انکشافات کو واضح طور پر ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔

مضمون نگاری کے بیسیوں اقسام اور بیسیوں
موضوع ہیں، ادب کی جو گراں بہا اور بیش قیمت
خدمت مضمون نگاری کے ذریعہ ہو سکتی ہے وہ ایک
حقیقتِ نفس الامر ہے۔

خواتینِ دکن نے نثر نگاری کے ذریعہ اردو ادب
کی جو خدمت انجام دی اور دے رہی ہیں اس کی
صراحت طویل صفحات کی خواہاں ہے، اس موقع پر
ہم صرف نثر نگار خواتین کے نام بھی پیش نہیں کر سکتے
چہ جائے کہ ان کے کارناموں کی تفصیل کی جائے، البتہ
بعض ممتاز نثر نگار خواتین کا نام لیا جا سکتا ہے جن کی
ادبی خدمتیں فروگذاشت نہیں کی جا سکتیں۔

اس خصوص میں سب سے پہلے طیبہ بیگم مرحومہ کا
نام لینا چاہیے اگرچہ وہ آج زندہ نہیں ہیں مگر انھوں نے
جو داغ بیل ڈالی تھی، جو بنیاد قائم کی تھی، وہ آج
مستحکم ہو چکی ہے اور بار آور ہو کر پھول پھل رہی ہے،
خوشی کی بات ہے کہ اب ادارۂ ادبیاتِ اردو کے شعبۂ
نسواں کی جانب سے ان کے اعلیٰ اور بلند پایہ

مضامین کتابی صورت میں شایع ہونے والے ہیں۔

اس تفصیل میں صغرا بیگم ہمایوں مرزا کا نام لینا ضروری ہے جن کی اب تک چودہ پندرہ کتابیں مختلف عنوان کے تحت شایع ہوچکی ہیں' اور مضامین جو مختلف رسالوں میں شایع ہوا کرتے ہیں ان کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے' ان کی ادبی دلچسپی اور انہاک ہر آئینہ مستحق تقلید ہے۔

اس کے بعد جہاں بانو بیگم نقوی لطیفۃ النسا بیگم اور سکینہ بیگم کے ناموں کی صراحت بھی ضروری ہے' جہاں بانو بیگم کے ادبی دلچسپ اور پر از معلومات مضامین دکن اور ہندوستان کے رسالوں میں تعریف کے ساتھ شایع ہوتے ہیں' رسالہ شہاب کے حصۂ نسوان کی ایڈیٹر کی حیثیت سے آپ جو ادبی خدمت انجام دے رہی ہیں وہ مستحق ستایش ہے' اسی طرح سکینہ بیگم مدیرۂ "سب رس" اور ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسوان کے داعی کی حیثیت سے جو ادبی کام کر رہی ہیں وہ ہر طرح تعریف و توصیف کے قابل ہے۔

حیدرآباد اور ہندوستان کے زنانہ اور مردانہ رسالوں اور اخبارات میں بیسیوں خواتین دکن کے مضامین جو مختلف موضوع پر ہوتے ہیں تعریف و ستایش کے ساتھ شایع ہوتے ہیں' ان مضامین کی زبان صاف' اسلوب بیان پسندیدہ اور طرز نگارش دلچسپ ہوتا ہے' دختران جامعہ عثمانیہ اور غیر عثمانی خواتین جو نام و نمود مضمون نگاری کی حیثیت سے پیدا کر رہی ہیں وہ ایک درخشاں مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

ناول اور افسانے

نظم سے جس طرح انسانی دل پر اثر ہوتا ہے اسی طرح دلچسپ قصے کے پیرایے میں کسی تاریخی' اخلاقی یا معاشرتی پہلو کو بیان کن خاص طور پر موثر ہوتا ہے' خشک فلسفیانہ مضامین سے بڑھ کر افسانے زود اثر ہوتے ہیں' انسانی فطرت اس امر کی مقتضی ہے کہ ان کے دماغ کے لئے عمدہ عمدہ غذا میسر ہو' اور ان کی دلبستگی کے لئے ایسی کہانیوں کی ضرورت ہے جن میں زیادہ تر ان کے ابنائے جنس کے واقعات اور حالات اس طرح بیان کئے گئے ہوں جو یا تو سچ معلوم ہوتے ہوں یا ایسے ہونے کی قابلیت رکھتے ہوں۔

ناول ایک فوٹو یا آئینہ ہے جس سے زمانۂ گزشتہ کے حالات اور موجودہ زمانے کے واقعات اصلی رنگ و روغن میں نظر آتے [illegible] واقعات کے انتخاب اور ان کی مناسب تر[illegible] پلاٹ بنتا ہے' اس میں حرکت' روانی اور جوش [illegible] چاہیے۔

پلاٹ کا [illegible] کردار نگاری ہے' جن اشخاص کا اس میں ذکر ہوتا ہے' ان کی پوری تفصیل اس طرح ہونی چاہیے کہ وہ انسان کی طرح چلتے پھرتے' کام کرتے' بولتے زندہ معلوم ہوں' قصے کے اشخاص کا تعلق جس زمانے اور جس مقام سے ہوتا ہے' اس زمانے اور مقام کی تمام خصوصیات سے ناول نگار کو واقف ہونا چاہیے تا کہ اس وقت کے رسم و رواج تمدن اور تہذیب کا پورا پورا حال اس ناول سے معلوم ہوسکے' غرض جو قصہ ناول یا افسانے میں بیان کیا جائے وہ ہر طرح اصلی معلوم ہو' اس کا کوئی پہلو عقل کے خلاف نہ ہو۔

ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر جب ہم دکن کی

خواتین کے کارناموں پر [illegible] ہمیں [illegible] کافی نہیں ہوتی، اور ہم بہ مسرت کہہ سکتے ہیں کہ خواتینِ دکن نے اس قسم کی ادبی خدمت بھی انجام دی ہے۔

"انوری بیگم" اور "حشمت آرا" کے نام سے دو ناول ایسے پیش کئے جا سکتے ہیں جو اصلاحِ معاشرت کے لئے لکھی گئی ہیں، ان میں حیدرآباد کے تمدن، تہذیب کی سچی اور اصلی [illegible] گئی ہے، حقوقِ نسواں، تعلیمِ نسواں، پردے [illegible] مصاحبات، رسم و رواج، روزمرہ کے کام کاج، [illegible] مشاغل [illegible] امور بہت دلچسپ طریقے [illegible] لئے گئے ہیں۔

ان دونوں ناولوں کی مصنفہ مرحومہ طیبہ بیگم ہیں جن کا تذکرہ اس کے پہلے ہوچکا ہے، صغرا بیگم ہمایوں مرزا کے ناول "سرگذشت ہاجرہ" اور "موہنی" کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے دلچسپ اور مفید ہیں۔

مختصر افسانے

موجودہ زمانہ میں مختصر افسانوں نے بڑی اہمیت حاصل کر لی ہے، اس قسم کا بڑا ذخیرہ ہر زبان کے ادبیات میں فراہم ہو گیا ہے۔ طول طویل ناول کے بجائے مختصر افسانے جو چند اوراق میں ختم ہو جاتے ہیں زیادہ پسند کئے جاتے ہیں۔

ناول اور افسانے کے لئے جو امور ضروری ہیں وہی مختصر افسانوں کے لئے درکار ہیں۔ مختصر افسانے بیسیوں عنوان اور موضوع پر لکھے جاتے ہیں، اردو زبان میں اب اس قسم کا ادبی ذخیرہ کافی حد تک فراہم ہو گیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر کی صراحت ناگزیر ہے کہ بہترین افسانوں کی تعداد (جو ہر حیثیت سے قابلِ ستائش اور لائقِ داد ہوں) کم ہے، اور چند ہی افسانہ نگار کامیاب افسانہ نگار کی حیثیت سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

مختصر افسانہ نگار کی حیثیت سے ہندوستان کی کئی خواتین متعارف کی جا سکتی ہیں جن میں مسز حجاب امتیاز علی کا نام اس عنوان میں سرِفہرست ہونا چاہئے، جو دنیائے اردو میں اپنے خزینۂ افسانہ نگاری کے باعث امتیاز رکھتی ہیں، مسز حجاب کی پیدائش اور ابتدائی پرورش حیدرآباد میں ہوئی اور پھر مدراس کی سرزمین میں انھوں نے افسانہ نگاری میں امتیاز حاصل کیا ہے۔

موجودہ زمانے میں کئی خواتین مختصر افسانے قلمبند کرتی ہیں، ان کے ترجمے اور طبع زاد دونوں افسانے چھپتے ہیں، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ خواتینِ دکن کے افسانے بہر طور قابلِ ستائش ہیں اور ان میں کوئی خامی نہیں ہوتی، اس قسم کا دعویٰ کرنا ابھی قبل از وقت ہے، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کامیاب افسانے لکھنے کی ضرور کوشش کی جا رہی ہے، اور توقع ہے کہ آئندہ بہترین نتائج رونما ہو سکیں۔

دخترانِ جامعہ عثمانیہ اور غیر عثمانی خواتین کے بیسیوں نام اس عنوان میں بیان کئے جا سکتے ہیں، خصوصاً جہاں بانو بیگم کا نام فراموش نہیں کیا جا سکتا، جن کے افسانوں کا مجموعہ "رفتارِ خیال" کے نام سے شایع ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔

ڈرامے

ادبیات کی ایک اہم شاخ ڈرامہ نگاری ہے، اس خصوص میں اردو زبان میں ایسا ذخیرہ بہت کم ہے جس پر فخر کیا جا سکے، اچھے ڈراموں کی شدید ضرورت ہے، خوشی کی بات ہے کہ اب پنجاب، دہلی اور حیدرآباد میں اس کی جانب توجہ کی گئی ہے۔

پنجاب اور دہلی کے قطع نظر حیدرآباد میں اس کی طرف خاص توجہ ہو چکی ہے، اب تک کئی ڈرامے لکھے گئے ہیں اور اسٹیج پر کامیاب طور پر ان کو بتایا گیا ہے۔ ان ڈراموں میں مولوی فضل الرحمٰن صاحب بی اے ڈپٹی کنٹرولر لاسلکی کے دو ڈرامے خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں جو اپنی خوبیوں کے باعث عام مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

بعض حیدرآبادی خواتین نے بھی اس کی جانب توجہ کی ہے، اور دو چار مختصر ڈرامے لکھے ہیں، مگر یہ ڈرامے ایسے نہیں کہ ان کا تذکرہ کیا جائے، البتہ مس جیسی نندی کا نام ضرور لیا جا سکتا ہے، انھوں نے اپنے والد ڈاکٹر جارج نندی کے ایک انگریزی ڈرامہ کو اردو کا لباس پہنایا ہے، اور بمبئی ٹاکیز نے کسی قدر ترمیم کے بعد "عزت" کے نام سے اس کو فلم میں پیش کیا ہے، مس جیسی نے اس کے علاوہ بھی چند ڈرامے قلمبند کئے ہیں مگر ہنوز ان کو شایع نہیں کیا ہے۔

خطوط ادب کا ایک جزو خطوط بھی ہے، ہر زبان کے ادبیات میں اس کا بھی ذخیرہ ہوتا ہے اگرچہ آج تک عورتوں کے خطوط کا کوئی مجموعہ اردو زبان میں شایع نہیں ہوا ہے مگر بعض رسالوں میں ایسے خطوط شایع ہوئے ہیں جو ہمارے ادب کا بہترین نمونہ کہلا سکتے ہیں۔

جہاں بانو بیگم نقوی کا تعارف اس عنوان میں ضروری ہے، ان کے خطوط جو رسالہ شہاب میں اکثر شایع ہوئے ہیں ہمارے ادبیات میں گراں قدر اضافہ کا موجب ہوتے ہیں۔

آخر پر "ادارۂ ادبیات اردو" کے شعبۂ نسوان کا تذکرہ بھی نہایت ضروری ہے، جس کی صدر رابعہ بیگم، اور معتمد سکینہ بیگم، اور ارکان جہاں بانو بیگم، سارہ بیگم اور لطیف النساء بیگم ہیں، توقع ہے کہ آگے چل کر یہ ادبی ادارہ اپنے پرجوش اور مستعد کارکنوں کی دلچسپی کے باعث خواتین دکن میں نئے خیالات نئی امنگیں پیدا کرنے میں اپنی آپ نظیر ہوگا۔

ہمارے اس مضمون سے اس امر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خواتین دکن بھی اردو ادب کی خدمت گزاری میں کسی اور ملک سے پیچھے نہیں ہیں، ان کے خدمات قابل قدر اور لایق تحسین ہیں، اور امید ہے کہ آنے والی نسل کے لئے اپنا اچھا نمونہ اور شاندار نقش چھوڑ جائیں۔

نصیر الدین ہاشمی

نذر دکن (باتصویر) دکن کے متعلق خواتین دکن کے رشحات قلم کو محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے خاص ذوق اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ یہ مجموعہ ایک ایسا بیش بہا تحفہ ہے جس کے مطالعہ سے عورتیں اور مرد دونوں مستفید ہو سکتے اور سرزمین دکن کے متعلق ضروری معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ اس میں صنف نازک کے مذاق کی نفیس تصویریں بھی ہیں صفحات ۱۴۰ قیمت مجلد عہ

من کی بتیا محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے نے اس کتاب میں متوسط طبقہ کی خواتین کی معاشرتی (اور اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کر کے زندگی کی الجھنوں سے کامیاب مقابلہ کرنے کے طریقے پیش کئے ہیں۔ یہ کتاب بہت ہی دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہے۔ خواتین اور خصوصاً موجودہ تعلیم یافتہ خواتین کے لئے اس کا مطالعہ بیحد ضروری ہے۔ اس کو ہر گھر میں ہر وقت موجود رہنا چاہیے۔ صفحات ... قیمت مجلد ۸،

دکن کے چند کایستھ شعراء

جب انقلابِ روزگار نے شمال میں اردو کے لئے کوئی آسرا نہ رکھا، تو پھر یہ بیچاری اسی آغوش میں چلی آئی جہاں اس سے بہت زمانہ قبل اس کی خوب آؤ بھگت ہوئی تھی۔ سرزمینِ دکن ہمیشہ سے اردو کے لئے سازگار رہی اور یہیں اس نے اپنے عہد کے خوبصورت ترین گل بوٹے نکالے چنانچہ یہ صحت بخش آب و ہوا اس کی خلط کے عین موافق تھی پھر اس کو سرسبز کرنے لگی۔

اس میں شک نہیں کہ اب یہاں سے قطب شاہوں کا وہ شفیق سایہ اٹھ چکا تھا، جس نے ایک عرصۂ دراز تک اس کو نظرِ بد سے بچائے رکھا۔ اس کی داشت و پرداخت جان سے زیادہ کی، اور صحیح معنوں میں پروان چڑھایا لیکن ان کی بجائے اسے یہاں ایک ایسے خانوادۂ علم دوست کی بارگاہ ملی جو اردو نوازی میں قطب شاہوں سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اس نازوں کی پلی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اپنی سرپرستی میں جگہ دی۔ اور اپنے مضبوط ہاتھوں میں اس کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا۔ یہی تو ہوئی کہ تقریباً ایک صدی تک حیدرآباد کی مجلسیں عاشقانِ اردو کا جمگھٹ بنی رہیں۔ اور اس عرصے میں وہ محفلیں گرم ہوئیں جن کی یاد او دہ اور لال قلعہ کی صحبتوں سے پہلو زنی کرتی ہے۔ مولانا شبلی نعمانی۔ رتن ناتھ سرشار۔ نذیر احمد دہلوی۔ عبدالحلیم شرر۔ نواب محسن الملک۔ امیر مینائی۔ مرزا داغ اس شمع کی ضیاء پاشیوں پر دور دور سے شیدا ہو کر آئے۔ دکن کی مہماں نواز زمین نے ان احباب کی یہاں بڑی قدر کی۔ دربارِ آصفی نے ان کی توقیر بڑھائی۔ اور زبردست اعزاز عطا کئے۔

اسی زمانہ میں خود اس مردم خیز ملک نے اپنے یہاں ایسے ایسے جید عالم اور بڑے بزرگ پیدا کئے جن کے فیض سے دکن فن و ادب کا مرجع بن گیا۔ شیر محمد خاں ایمان۔ مہاراجہ چندو لال شاداں۔ حافظ میر شمس الدین فیض۔ راجہ محبوب نواز ونت باقی۔ ڈاکٹر احمد حسین مائل۔ میر احمد علیخاں عصر۔ حفیظ الدین پاتراب علی زور۔ بہاری لال رمز۔ مہاراجہ کشن پرشاد شاد بچو لال تمکین، اس دور کی چند ممتاز شخصیتیں ہیں۔

یہ زمانہ سچ پوچھئے تو دکن کے ادبی مذاق کا اصل محرک ہے۔ اس لئے کہ اس عہد میں یہ بزرگ ہستیاں مذہب اور قوم کی ظاہری کسوٹی پر نہیں جانچی گئیں۔ بلکہ ملک نے انہیں اپنے ذاتی جوہر کی بنا پر پرکھا۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے دوش بدوش ہندوؤں نے بھی اس زبان کے سنوارنے میں برابر کا حصہ لیا اور کبھی تنگ نظر یا مذہبی کدورت کو اپنے سینوں میں جگہ نہ دی۔

ان لوگوں میں طبقۂ کایستھ بہت نمایاں تھا۔ اور یہ اس کے لئے کوئی نئی بات بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ اگر حقیقت کا اظہار بے جا تعلی نہیں ہے۔ تو نہایت وثوق کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ تمدن کے ہر دور میں اور ہر زمانہ میں جب امن آشتی نے ملکوں میں فن و ادب کو تازہ کیا یہ قوم اپنی فطری قابلیت سے پیش پیش رہی۔ اور اپنی طبیعت کے جواہرِ خفتہ کو چمکایا۔

راجگانِ و سلاطینِ سلف کی طرح شاہانِ آصفیہ نے بھی اس فرقہ کی قابلیتوں کو پہچانا۔ اور ان کی خاص سرپرستی فرمائی۔ انہیں کسبِ معیشت سے جو ایک فنکار کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ مانعِ ترقی ہوتا ہے تقریباً آزاد کر دیا اور موقع بموقع ان کی قدر و منزلت میں کوتاہی نہ کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قلیل عرصے میں اس گروہ میں بعض

ایسے ادیب بلیغ اور شاعر نکتہ رس پیدا ہوئے جو دکنی ادب میں ایک خاص پایہ رکھتے ہیں اور جنہیں اپنے زمانہ کے اساتذہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

چنانچہ اردو گو شعرائے قدیم راجہ محبوب نواز ونت باقی۔ رائے جوالا پرشاد فاضل۔ راجہ سری پرشاد احقر۔ رائے انبا پرشاد ہنر۔ رائے ٹھاکر پرشاد نظم۔ رائے شنکر پرشاد افضل اور شعرائے جدید میں رائے گرسرن بلی آزاد۔ راجہ سنگھ راج بہادر عالی۔ رائے محبوب راج محبوب۔ رائے ستگرو پرشاد رتبیر۔ رائے رگھوبیر پرشاد شوق۔ فارسی گو شعراء میں بچو لال تمکین۔ راجہ باقی۔ راجہ لکھن لال ساقی۔ رائے جوالا پرشاد فاضل۔ انبا پرشاد حکم وغیرہ وغیرہ قابل تذکرہ ہیں۔

ان اصحاب بزرگ کے علاوہ اور بھی ایسے بلند حیثیت شاعر گزرے ہیں جنہیں ایک تو میں اپنی کوتاہ واقفیت و دوسرے عدیم الفرصتی کی وجہ سے یہاں چھوڑ رہا ہوں اگر معروفیتوں نے دم لینے دیا' تو خیال ہے کہ ایک علحدہ تذکرہ کی صورت میں اس یادرفتگاں کو تازہ کیا جائے انشاء اللہ

(۱) **باقی**۔ راجہ محبوب نواز ونت گردھاری پرشاد باقی

راجہ باقی جو اپنے زمانے کے نہایت بلند پایہ شاعر اور انشاپرداز گزرے ہیں، حضرت شمس الدین فیض کے حلقۂ تلامذہ میں سے تھے۔ باقی کا خاندان دکن کے ان قدیم خاندانوں میں سے ہے جو حضرت آصفجاہ نظام الملک کے ساتھ دہلی سے اورنگ آباد آیا۔ ایک عرصہ تک اورنگ آباد میں مقیم رہنے کے بعد جب رائے راجارام ابن رائے دولت رائے کو دربار آصفی سے چھتیس ۳۶ کارخانوں کی تنقیح و نگرانی کا کام عطا ہوا' تو ۱۱۹۸ھ میں انہوں نے محلہ چندر کاپور عرف حسینی علم میں ایک مکان خریدا اور مستقل ڈیوڑھی کی بنیاد ڈالی۔ چنانچہ وہ خود اپنی کتاب "کلام متفرقات" میں اس کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ از دہلی وارد دکن گردیدند چندے در شہر اورنگ آباد بود و باش ورزیدہ پس ازاں اقامت پذیر بلدہ حیدرآباد شدند رائے راجارام بن رائے دولت رائے جد اعلیٰ راقم آثم بخدمت استیفائے تحاویل خانسامانی کہ کار تنقیح سی و شش کارخانجات سرکار آصفی میباشد در عہد نظام الملک بعز امتیاز میدا شتند و در سنہ یک ہزار و یکصد و نود و ہشت ہجری در محلہ حسینی علم عرف چندر کاپور یک قطعہ حویلی بجہ برائے اقامت خود خرید نمودہ مقیم شدند"

اسی ڈیوڑھی میں وہ بتاریخ یکم رجب سنہ ۱۲۴۴ھ پیدا ہوئے اس خاندان کے اکثر اراکین صاحب مناصب و خطابات ہوئے ہیں۔ چنانچہ پیشگاہ نواب سکندرجاہ بہادر۔ نواب ناصرالدولہ بہادر۔ نواب افضل الدولہ بہادر سے اس خاندان کی مسلسل عزت افزائی ہوتی رہی خود راجہ باقی تادم مرگ خدمات جلیلہ اور مناصب اعلیٰ پر سرفراز رہے۔ باقی نے حضرت محمد علی صاحب عاشق سے فارسی پڑھی اردو فن شعر میں انہیں حضرت شمس الدین فیض سے تلمذ حاصل تھا۔ جن خدمات پر باقی فائز رہے اور اپنے فرائض جس خوش اسلوبی سے بجالاتے رہے انہیں سامنے رکھ کر یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کس قدر مصروف انسان تھے۔ چنانچہ ان کی کثیرالتعداد تصانیف اور کلام کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ ایسے ہی حالات میں کیا ہم سے اس کا عشر عشیر بھی ہوسکتا ہے؟

ان کی تصانیف تیس ۳۰ سے زیادہ ہیں اور یہ فارسی اردو۔ ہندی۔ تین زبانوں میں پھیلی ہوئی ہیں جب ان کتابوں کے عنوان اور مضامین پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ باقی کو علاوہ فن شاعری کے کس قدر علوم و فنون میں دخل تھا۔

فن شاعری۔ عروض و قافیہ۔ انشاء۔ حساب۔ حکمت۔ لغت خواص الاشیاء۔ فلکیات۔ سفرنامے۔ مذہبیات۔ بھجن۔ پوتی پران۔ یہ چند عنوان ہیں جن پر باقی نے خامہ فرسائی کی ہے

اس کے علاوہ انہوں نے رباعیات خواجہ میر درد کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ اردو میں خواجہ صاحب کی رباعیوں کا ترجمہ کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس لئے کہ ان رباعیات کو جو تصوف اور فلسفہ کے گراں بہا جواہر سے مالامال ہیں۔ ایک ایسی زبان میں منتقل کرنا تھا جو فارسی کے مقابل میں ابھی بچہ ہی تھی۔ پھر بھی اس ترجمہ کو دیکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باقی اس باب میں کس قدر کامیاب رہے ہیں۔ مثلاً مشتے نمونہ از خروارے۔

درد

برجرم گر اعتراف خواہی کردن + دل را اے درد صاف خواہی کردن
یارب تو کریم و من گنہگار توام + دانم آخر معاف خواہی کردن

باقی

مجرم ہوں اعتراف کرتا ہوں صاف + کیا منہ ہے جو چاہوں میں اپنا انصاف
یارب تو کریم ہے گنہگار ہوں میں + تقصیر معاف ہو گی تقصیر معاف

درد

اے جلوہ بدید یار خواہد گردید + رازش ہمہ آشکار خواہد گردید
ما آئینہ ایم خود پرست است نگار + ناچار دو چار خواہد گردید

باقی

اک دن دیدار یار ہو جائے گا + راز اس کا خود آشکار ہو جائیگا
میں آئینہ ہوں نگار حسن پرست + ناچار کبھی دو چار ہو جائیگا

درد

ہر لحظہ دریں خانہ کہ من می آیم + گم کردہ رہ شناختن می آیم
چوں شعلہ کجا رسید نم منظور است + پیوستہ برون خویشتن می آیم

باقی

معلوم نہیں گھر سے کہاں جاتا ہوں + بھولا ہوا راستہ ہے گھبراتا ہوں
شعلہ کی طرح کہیں یہ پہنچا ہوگا + یوں آپ سے باہر جو نکل جاتا ہوں

باقی کا کلام نہایت سلیس و سادہ ہے گو بعض وقت مناسبات و رعایات لفظی پر جو اس عہد کے مذاق کا ایک نمایاں پہلو تھا۔ زیادہ زور دیتے ہیں۔ شعر میں ایک کے لئے چار چار مناسبتیں رکھنا، دور دور کی بندشیں، ایہام و صنعت لفظی کی بھرمار اس زمانہ کی خصوصیت تھی۔ باقی بھی اس رو سے بچ نہ سکے۔

چشم بلبل سے بنا دو مرے مرقد کا غلاف + جس میں سب جانیں کہ عاشق تھا کسی گل رو کا
لفظ بسمل ہے بجائے بسم اللہ تھا تیرا سبق + تو نے کتب ہی میں یہ پہلے خوں کیا استاد کا
اس کی مژگاں کا تصور نہ کر اے دل نہار + کیوں تو بوتا ہے یہ اپنے لئے ناداں کانٹے
کسی کے ہے لب شیریں کی ہمسری کی سزا + جو نیشکر کے جدا بند بند کرتے ہیں

بعض وقت اسی گورکھ دھندے میں بھی وہ ایسے در ہائے مضمون نکال لاتے ہیں کہ ان کی قادر الکلامی پر یقین ہو جاتا ہے

نیم جاں خنجر قاتل سے میں ٹ پا بھی نہیں + بولی شمشیر نہ گھبرا ترے سر پر میں ہوں

لیکن ان کے سرمایہ سخن پر اجمالاً نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ وہ اس دھارے میں ہمعصر شعرا کی طرح بہہ نہیں جاتے بلکہ سلامت و شستگی کا دامن برابر تھامے رہتے ہیں۔

ملاحظہ ہو کس قدر صاف زبان ہے۔

کہہ رہا ہے دل شیدائے شراب + ہائے خم ہائے سبو ہائے شراب
میرے زخموں سے جو بہا اُترا + بن گیا پنبۂ مینائے شراب

دریا موج سے موج ہے دریا نہیں الگ + ہم سے جدا نہیں ہے خدا اور خدا سے ہم
عارض یار نہیں عکس فگن پانی میں + گل شاداب کا پھولا ہے چمن پانی میں

یہ شعر ملاحظہ ہو۔

آپ نے لطف سے آنسو جو نہ پونچھے ہوتے + دیکھتے پھر یہ مراد یدۂ تر کیا کرتا
پھر ہے میرے قتل کو ترچھی نظر + دیکھئے اے بندہ پرور دیکھئے

سلامت زبان دیکھئے۔

دل میں تو لگی ہے آگ اس کو + کیوں پانی سے گھر بہا رہے ہو

سنتا ہے تمہاری کون باؔقی + دیوانے ہو غل مچا رہے ہو

ماہ نو جھکتا ہے مجرے کے لئے + مہرباں نیچے سے اوپر دیکھئے

باؔقی نے ۱۳۱۴ھ ماہ صفر بعارضہ مرض مفاصل بلدہ میں انتقال کیا۔

(۲) رائے جوالا پرشاد فاضل

رائے جوالا پرشاد فاضل سررشتہ داران سکھان راجہ موہن لال جاگیردار و خزانچی کے صاحبزادے ہیں۔ محلہ حسینی علم دیوڑھی راجہ موہن لال میں ۱۲۶۲ھ کے قریب پیدا ہوئے فارسی اور عربی کی تعلیم مولوی محمد علی عاشقؔ سے حاصل کی باوجود تحقیق کے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ شعر میں انہیں کس سے تلمذ تھا

رائے جوالا پرشاد فاضل کا خاندان دکن کے نہایت قدیم اور ممتاز گھرانوں میں سے شمار ہوتا ہے ان کے والد رائے موہن لال خزانچی بڑے باسطوت رئیس ہوئے ہیں۔ ان کے نانا راجہ سری پرشاد نواب ناصر الدولہ کے اتالیق اور معتمد تھے اس کے علاوہ سررشتہ سکھان بھی انہیں کے تفویض تھا۔

فاضل بچپن سے ہی نہایت طباع و ذہین تھے۔ فارسی بہت کہتے تھے۔ اور لب و لہجہ میں عجمیوں سے ٹکر لیتے تھے سنا ہے کہ عربی میں بھی شعر کہتے تھے اور انہوں نے عربی میں حضرت غفران مکان کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا تھا لیکن ان کا کوئی شعر اس زبان میں میری نظروں سے اس لئے نہیں گزرا کہ ان کا تمام سرمایہ سخن امتداد زمانہ اور دیمک کے نذر ہو چکا ہے۔ اور جو کچھ دو تین فارسی غزلیات۔ چند قصائد اور دو ایک اردو شعر اس بربادی سے بچ بچا کر مجھ تک پہنچ سکے ہیں وہ میرے یہاں محفوظ ہیں۔

فاضل کی عربی و فارسی کی قابلیت کا اس سے پتہ چلیگا کہ حیدرآباد کی کایستھ برادری میں وہ ضرب المثل ہو چکی ہے اور ابتک والدین اپنے لڑکوں کو ان کی مثال دیتے ہیں۔

یہ چند شعر ملاحظہ میں پیش کرتا ہوں لیکن ناظرین یہ جان لیں کہ یہ شعر منتخب نہیں ہیں بلکہ ان کے خرمن سخن کے وہ چند ریزے ہیں جو زمانہ کی تباہی سے بچ رہے۔ علاوہ ازیں جہاں تک میں نے سنا ہے فاضل فارسی زیادہ کہنے کے عادی ہیں۔

مدام جلتا ہوں کوئی خبر نہیں لیتا + کسی غریب کی شمع سر مزار ہوں میں
مثال وسمہ جو ہر ہری کدورت نے + چھپا ہوں گرد میں اپنی وہ شہسوار ہوں میں

جگہ کوئی در جاناں سے بہتر میں نہ سمجھا تھا + وہاں ارنے نہ دیگا یہ مقدر میں نہ سمجھا تھا
دن جوانی کے گئے بجھ گیا اب دل فاضل + پھر کر شمع کو ہم بھی تھے جلانے والے

فاضل نے ۱۳۲۴ف میں بعارضہ بخار بمقام جاگیر گھٹ اوپل انتقال کیا

(۳) راجہ ایسری پرشاد۔ احقرؔ

راجہ ایسری پرشاد احقرؔ راجہ باقی کے برادر زادے اور راجہ نرسنگھ راج بہادر عالیؔ کے عم زاد بھائی ہیں۔ احقرؔ بہت کم سن ہی تھے کہ ان کے والد رائے خوب چند کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے ان کی تعلیم و تربیت ان کے شفیق چچا راجہ باقیؔ کی زیر سرپرستی ہوئی۔

شعر و سخن کا مذاق اس خاندان میں ایک عرصے سے موجود تھا۔ ان کے جد رائے چمن لال ایک زبردست انشا پرداز تھے۔ جنہوں نے فن انشا پر مبسوط کتاب لکھی ہے راجہ لچھمن لال ساقیؔ ایک بڑے مورخ اور شاعر گزرے ہیں انہوں نے شائد سب سے پہلے رباعیات عمر خیام کا اردو میں ترجمہ کیا۔ مزید براں تاریخ لچھمن لال کے بھی یہی مصنف ہیں۔

اخترؔ شاعری میں لکھنو لال تائبؔ لکھنوی سے تلمذ رکھتے تھے۔ لیکن راجہ باقیؔ کی فیض صحبت کا ان کے کلام پر اثر پڑا۔

راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت نے انہیں دفتر فوج باقاعدہ کی تنظیم پر مامور کیا تھا۔ نیز ان کے انتقال کے بعد ایک عرصہ تک اخترؔ اسٹیٹ کا کاروبار دیکھتے رہے۔ بدقسمتی سے جوانی میں ہی اخترؔ کو ایک پیچیدہ مرض لاحق ہو گیا چنانچہ اسی مرض موت کی تشخیص کے لئے مدراس گئے تھے کہ سنہ ۱۳۱۸ھ میں انہوں نے وہیں داعی اجل کو لبیک کہا۔

نمونتاً چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جوشش دیدۂ گریاں کو نہیں جانتے کیا + نوح کے صدمۂ طوفان کو نہیں جانتے کیا

کوئی کہتا ہے فلک اسکو کوئی ابر سیاہ + دود آہ دل سوزاں کو نہیں جانتے کیا

ابرو و عارض دلدار کا مفتوں نہیں کون + ماہ نو مہر درخشاں کو نہیں جانتے کیا

میں بھی اک بندۂ اخترؔ ہوں نمک خوار ترا + میر محبوب علی خاں کو نہیں جانتے کیا

افسوس کہ باوجود تلاش کے ان کا کلام بھی دستیاب نہ ہو سکا۔

(۴) ہنرؔ رائے انبا پرشاد ہنرؔ

انبا پرشاد ہنرؔ بمقام بلدہ حیدرآباد سنہ ۱۲۷۵ف میں پیدا ہوئے۔ اس زمانہ کے حسب قاعدہ ان کی ابتدائی تعلیم خانگی مکتب میں ہوئی۔ لیکن نوعمر انبا پرشاد نے بہت جلد ہی اپنے ہم سبقوں میں امتیاز پیدا کر لیا۔ عربی و فارسی میں کافی دستگاہ حاصل کی۔ اور خطاطی میں جو قدما کے یہاں ایک مستقل فن شمار ہوتا تھا اچھی مہارت پیدا کر لی۔ چنانچہ ہنرؔ کا دیوان جو خود انہوں نے اپنے قلم سے نہایت خوبصورت نستعلیق میں لکھا تھا حال حال تک محفوظ تھا۔ مگر افسوس کہ وہ کسی حادثہ کی وجہ سے برباد ہو گیا۔ اس لئے ان کے دو چار شعر حاصل کرنے کے لئے بھی بڑی دقت اٹھانی پڑی۔

کیوں نہ ہو ابن پہ حال روئے انور آئینہ + صاف کہدیتا ہے جو کہنا ہو منہ پر آئینہ

تھی ہی رخ کی صفائی جبکہ آنا تھا خط + کور ہو جاتا جو پیدا کرکے جوہر آئینہ

دیدہ رہتی ہے تمہارے روئے روشن کی نصیب + بن گیا ہے اپنے طالع کا سکندر آئینہ

ہنرؔ بارگاہ آسماں جاہی میں سررشتہ دار افواج تھے نیز انہیں صرف خاص مبارک سے منصب بھی ملتا تھا سنا ہے شاعری میں انہیں نواب خیرات علیخاں سخیؔ سے تلمذ تھا۔

ہنرؔ نے ۶۲ سال کی عمر پائی اور سنہ ۱۳۳۵ف میں بعارضہ وجع مفاصل انتقال کیا۔

نظمؔ ۔ رائے ٹھاکر پرشاد نظمؔ سنہ ۱۲۷۴ف میں بمقام بلدہ حیدرآباد پیدا ہوئے۔ ان کے آبا و اجداد بسلسلۂ ملازمت شمالی ہند سے مدراس آئے اور یہیں خاندان والاجاہی کی سلسلہ ملازمت میں منسلک ہو گئے۔ چنانچہ ان کے جد رائے سند لال مہتمم شادی خانہ نواب والاجاہ اور رئیس شہر تھے۔

جب اس خاندان کا ستارا ڈوب گیا۔ تو ان کے صاحبزادے رائے منبی دھر حیدرآباد آئے۔ جہاں انہیں بارگاہ آصفیہ سے منصب عطا ہوا۔ نظمؔ پیشکاری سرکار عالی میں خدمت مددگاری پر مامور تھے اور یہاں ارباب اقتدار کی نظروں میں انہوں نے بحیثیت ایک متدین و منتظم عہدہ دار کے بہت جلد اپنا مقام پیدا کر لیا۔ چنانچہ بزمانۂ مدارالمہامی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ جب صیغہ اصلاح مصارف قائم ہوا تو اس اہم صیغہ پر بطور خاص نظمؔ کا انتخاب عمل میں آیا۔

نظمؔ ایک نہایت ہی خوش اخلاق اور ہمدرد انسان تھے چنانچہ وہ ان معدودے چند افراد میں تھے جنہوں نے ... میں اصلاح قوم کا بیڑا اٹھایا اور مرتے دم تک اس پر اڑے رہے۔ ایک عرصہ تک وہ بزم تہذیب کے معتمد کی حیثیت سے علمی و ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ پھر آل انڈیا ٹیمپرنس لیگ

کے رکن کی حیثیت سے انہوں نے حیدرآباد کے کالستھوں کی بہت کچھ خدمت کی۔

نہ صرف نظم میں ان کا مذاق بلند تھا بلکہ نثر پر بھی انہیں خاص قدرت حاصل تھی۔ اس عہد کا مشہور ادبی پرچہ "دبدبۂ آصفی" جو حضرت صوفی شاد کی زیر نگرانی اور ایک عرصہ تک پنڈت رتن ناتھ سرشار کے زیر ادارت نکلا کرتا تھا انہیں کے زیر اہتمام شائع ہوتا تھا۔ اور وہ خود اس رسالہ کے لئے بڑا بھی مضامین لکھا کرتے۔ نظم کا کلام شمالی ہند کے اکثر رسالوں مثلاً مذاقِ سخن۔ بہار اودھ وغیرہ میں شائع ہوتا رہا۔ شاعری میں انہیں حضرت لکھنو لال تاب سے تلمذ حاصل تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حافظ شمس الدین فیض سے بھی غائبانہ عقیدت تھی اس لئے کہ ان کے یادگاری مشاعروں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے اور ان کی مدح میں اکثر کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے۔

لامکاں ہے اگر مکانِ فیض	عرش اعظم ہے آستانِ فیض
وہی دیکھا جو کہہ گئے حضرت	لب اعجاز تھی زبانِ فیض
اب بھی ہیں فیض تاب اہل دکن	ایسی بافیض تھی زبانِ فیض
کیوں نہ ان کی غزل ہو سلکِ گہر	کہ تھا گنجِ گہر دہانِ فیض
اٹھ گیا لطفِ شاعری اے نظم	رہ گئی لب پہ داستانِ فیض

نمونۂ کلام یہ ہے

دل لگا کر سب سے کہتے پھرتے ہو ہم لٹ گئے + نظم یہ بھی ہیں بھلا کوئی طریقے پیار کے

درد و غم رنج والم نالہ و فریاد و فغاں + رات دن ان سے رہا کرتی ہے صحبت میری

خیر اتنا تو کیا جذبۂ الفت نے اثر + کہ مقر تو ہیں وہ سب سے مرے تڑپانے کے

آزاد رائے گردھاری لال آزاد۔

آزاد کے آبا و اجداد غدر کے بعد بلدہ حیدرآباد آئے اور دیگر خاندانوں کی طرح یہیں کے ہو رہے ان کے والد رائے راج بلی اوج بڑے اچھے شاعر اور صاحب مذاق گزرے ہیں۔ انہوں نے آزاد کی تربیت کا خاص خیال رکھا اردو فارسی کی تعلیم قابل اساتذہ سے دلوائی۔ آزاد کے جد کا تخلص توکل تھا۔ اور ان کے چچا مہابلی انور ایک بڑے بلند مرتبہ شاعر گزرے ہیں۔ اس لئے شعر سخن کا مذاق انہیں ورثہ میں ملا۔ یہ سنہ ۱۳۰۸ھ میں بمقام بلدہ دیوڑھی راجہ راجان غیور جنگ و حرم ونت پیدا ہوئے اور اب بھی یہیں مقیم ہیں۔

آزاد بڑے خوش اخلاق۔ بذلہ سنج اور مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ رباعی خوب کہتے ہیں۔ چنانچہ عمر خیام کی رباعیوں کا ایک سلیس ترجمہ الخیام عنوان سے شائع کیا ہے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے ہیں۔ اور مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کے مشاعروں میں برابر پابندی سے شریک رہتے ہیں۔ ان کی ایک مثنوی الشمس بھی جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے قابل دید ہے۔ عمر خیام کی ایک رباعی کا ترجمہ ملاحظہ ہو۔

آغاز روان گشتن ایں زریں طاس	انجام روانی مہ و خور کیا ہے
وانجام خرابی جنس نیکا ساس	بربادی کائنات کا گر کیا ہے
دانستہ نمی شود بمعیار عقول	آتی نہیں کچھ عقل میں اپنے یہ بات
سنجیدہ نمی شود بمقیاس قیاس	جمتا نہیں ساز پر جو یہ سر کیا ہے

نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

حشر میں حشر بپا ہوگا نیا اک آزاد + بے نقاب آج وہ محشر میں چلے آتے ہیں

واعظا الجھ نہ مجھ سے کدھر کو خیال ہے + رندوں کی بات تجھکو سمجھنی محال ہے

فریب نظر یہ مکان و زماں ہے + طلسمات ہے کارخانہ ہمارا

مثنوی الشمس جو ابھی ابھی چھپی ہے اپنی سلاست بیان کی وجہ سے قابل دید ہے۔ اس میں آزاد نے ایک سائنٹفک یا نیم سائنٹفک مضمون کو نظم میں منتقل کرنے کی کوشش کی ہے۔

عالی راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی

راجہ نرسنگھ راج بہادر عالی راجہ گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقی کے فرزند اکبر ہیں۔ وہ بمقام بلدہ سنہ ۱۳۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور اپنے برگزیدہ والد کی طرح سلسلۂ خدامانِ بارگاہ آصفی میں منسلک ہیں۔ راجہ باقی کو ہمیشہ اپنی اولاد کا غم رہا۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی بھر صدموں سے متاثر رہے۔ حسن اتفاق کہ بنارس کے ایک خدارسیدہ بزرگ سوامی بھاسکر آنند سرسوتی نے عالی کے لئے دعا کی اور باقی کو یہ ہدایت فرمائی کہ اس لڑکے کی رسم بسم اللہ اور شادی بنارس میں ہی ان کے پاس کی جائے۔ چنانچہ یہ دونوں رسمیں وہیں ادا ہوئیں۔

جب والد کا سایہ سر سے اٹھا تو عالی نہایت کم سن تھے اور ان نو عمر کاندھوں پر بڑی ذمہ داریاں تھیں چھوٹے بھائی محبوب راج کا ابھی بچپن تھا۔ اسٹیٹ نااہل کارکنوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔ اس لئے اس افراتفری میں عالی نے جو کچھ بھی تعلیم حاصل کی اور اپنے برادر صغیر کی تربیت کا جس قدر بھی خیال رکھا وہ انہیں کی ہمت اور حوصلہ کا کام تھا۔

بحیثیت شاعر عالی صاحب مذاق خوش فکر ہیں۔ شاعری انہیں ورثہ میں ملی ہے۔ زبان سادہ اور سلیس ہے جو بات کہتے ہیں سیدھی اور صاف۔ کلام میں لگاوٹ بناوٹ کو دخل نہیں دیتے۔

رند ہوش ہیں مگر کیسی ÷ کر رہے ہیں شعور کی باتیں
بت خدا بن گئے معاذ اللہ ÷ نہیں اچھی غرور کی باتیں

میں نہا دھو کے ہوا پاک ہر اک عصیاں سے
اشکِ خجلت جو مرے دیدۂ تر سے نکلا

کون کہتا ہے کہ تو خوگر بیداد نہیں
مجھ میں پہلی سی مگر طاقتِ فریاد نہیں

رفتہ رفتہ باعثِ تسکیں ہوئیں بیتابیاں
دردِ دل اتنا بڑھا بڑھ کر مداوا ہو گیا

رباعی ملاحظہ ہو۔

پوشیدہ ہے گر جلوہ عیاں تیرا ہے
کثرت ہو کہ وحدت ہو نشاں تیرا ہے
کس کے دل میں نہیں ہے تیرا مسکن
کس کے لب پر نہیں بیاں تیرا ہے۔

کلام میں تصوف کا نقش زیادہ واضح ہے اور اس کو مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد جیسے صوفی کی فیض صحبت اور استاد جلیل کے ذاتی اثر نے اور بھی گہرا کر دیا ہے۔ اصناف سخن میں زیادہ تر غزل اور رباعی ہیں لیکن سب میں ان کا مخصوص رنگ برابر قائم ہے۔

محبوب ۔ رائے محبوب راج محبوب

رائے محبوب راج محبوب راجہ محبوب نواز ونت باقی کے چھوٹے فرزند اور راجہ نرسنگھ راج عالی کے برادر خورد ہیں۔ وہ ایک نہایت جامہ زیب اور وجیہہ انسان تھے۔ طبیعت نہایت شگفتہ پائی تھی۔ چنانچہ حلقۂ احباب میں اپنی بذلہ سنجی اور خوش طبعی کی وجہ سے وہ بہت ہر دل عزیز تھے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر شاد انہیں انتہا سے زیادہ دوست رکھتے اور ایک منٹ کے لئے جدا نہ ہونے دیتے تھے۔

محبوب سنہ ۱۳۱۲ھ میں بمقام بلدہ حیدرآباد پیدا ہوئے۔ پدر بزرگوار راجہ باقی نے اپنے مالک مجازی کے حسبِ ارشاد

ونشار ان کا نام محبوب راج رکھا۔ وہ بچپن سے نہایت طباع و ذہین تھے۔ اس لئے انہوں نے بہت جلد مکتبی تعلیم سے فراغت پالی۔ اس کے بعد ان کو مدرسہ عالیہ میں داخل کیا گیا۔ جہاں انہیں گوناگوں حالات کی وجہ سے میٹرک کے بعد ہی تعلیم ختم کر دینی پڑی۔

محبوب کے کلام کی خصوصیت ان کی زبان ہے وہ نہایت سلیس و شستہ لکھتے ہیں۔ بحریں چھوٹی چھوٹی اور بندشیں چست ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی اچھا داستان گو عشق و محبت کی کہانی نہایت موثر اور چبھتی ہوئی زبان میں سنا رہا ہے۔

آفت ہیں بلائیں فتنہ گر کی ؛ کچھ خیر نہیں دل و جگر کی
تھا عشق کا مرحلہ نہ آساں ؛ سر دے کے مہم یہ ہم نے سر کی
اللہ رے درازیٔ شبِ ہجر ؛ ملتی ہی نہیں خبر سحر کی

سنبھالو می کشو اب شیشہ و جام ؛ گھٹا چھائی ہو ساون کی جھڑی ہے
گلے مل لو کہ سوزِ غم کے ہاتھوں ؛ چراغِ زندگی بس دو گھڑی ہے
قدم کیوں کر اٹھیں کوچے سے تیرے ؛ یہاں تو حسن کی مٹی گڑی ہے

مضامین اور ندرت بیان دیکھئے۔

جاں بلب شوقِ شہادت میں تھے ہم ؛ تیغِ قاتل کی مسیحا ہو گئی
خواب میں آتے ہو پھر ہو لگا و شوق میں ؛ کیا پردہ ہے کہ چھپتے ہو نکل کر سامنے

ستم کا دیکھ کر انداز ہوتی ہے خوشی ہم کو
کہ ہم بھی چاہنے والوں میں شامل ہوتے جاتے ہیں

انہیں استاد فصاحت جنگ بہادر جلیل سے تلمذ حاصل تھا۔ افسوس کہ نوجوان شاعر کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ سنہ ۱۳۵۵ھ میں بعارضہ نمونیہ عین ہنگام شباب میں اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے۔

رہبر حکیم رائے ست گرو پرشاد رہبر

حکیم ست گرو پرشاد رہبر رائے بنکٹ پرشاد صاحب مرحوم منصبدار و سررشتہ دار افواج نظم جمعیت سرکار عالی کے فرزند ہیں آپ بتاریخ ۶ صفر سنہ ۱۳۱۷ف بروز جمعہ بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ رہبر بچپن ہی سے شاعری کی جانب مائل تھے طبیعت رسا اور فطرت رنگین پائی تھی اور چونکہ نہایت تیز ہوش طباع واقع ہوئے تھے۔ اس لئے ان کا جوہر بہت نو عمری ہی میں چمک گیا۔

حسن اتفاق کہ ان کی تعلیم علامہ عبدالرزاق نیشاپوری جیسے جید عالم کے یہاں ہوئی جو فارسی اور عربی میں اپنے عصر کی ممتاز شخصیتوں میں شمار ہوتے تھے۔ اردو ان کی مادری زبان تھی۔ اور شعر و سخن ان کے خاندان کا خاص مذاق تھا۔ اس لئے نو عمری سے ہی اس ماحول نے شاعرانہ مزاج کے لئے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔

استعداد ادب سے ایک گونہ فراغت ہوئی تو انہیں مفید الانام ہائی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں انہوں نے انٹرنس تک اپنی تعلیم ختم کی اور چونکہ حکمت سے بھی طبعی لگاؤ تھا۔ اس لئے مدرسہ طبیہ سرکار عالی میں شریک ہو کر اس فن کی تکمیل کر لی۔ فن شاعری میں انہوں نے استاد عصر حضرت سید علی احمد زیرک سے تلمذ حاصل کیا۔

رہبر کایستھوں کے ایک قدیم اور معزز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے آبا و اجداد والاجاہانِ مدراس کے عہد میں خدماتِ جلیلہ پر فائز اور صاحب خطابات و مناصب

ہوئے ہیں۔ حیدرآباد آنے کے بعد بھی یہاں ان لوگوں کو سرفرازیوں اور اعزاز خاص سے نوازا گیا۔ یہی گزشتہ خاندانی تمکنت کی بُو باس جو رہبر کے دماغ میں اب تک بسی ہوئی ہے انہیں اہل دولت و امارت کی بے جا خوشامد اور چاپلوسی سے دور رکھتی ہے اور یہی احساس خودداری ہے جو انھیں کسی کے آگے بے محل جھکنے سے روکتا ہے۔

طبیعت نہایت غیور اور تنہائی پسند ہے۔ علاوہ منصبدار ہونے کے انھیں میز خانۂ مبارک میں منسلک خدمت ہونے کا بھی شرف حاصل ہے غزل زیادہ کہتے ہیں گو دیگر اصناف کی بھی ان کے سرمایۂ سخن میں کمی نہیں۔

اس امر کی ضرورت ہے کہ اس نوجوان شاعر نکتہ رس کے کلام کا تفصیلی تجزیہ کیا جائے۔ دیکھئے اگر موقع ملے تو اس فرض کو بجا لاؤنگا۔ رہبر کی زبان اس قدر صاف اور سلیس ہے کہ بے اختیار منہہ سے واہ نکل جاتی ہے۔

کب خوف ہجر یار نہ تھا وصل یار میں ؛ کس دن خزاں کی یاد نہ آئی بہار میں

پرہیز میکشی ہے ہو فصل بہار میں ؛ یہ احتمال رحمتِ پروردگار میں

کانٹو نہیں ہے خلش نہ گلوں میں ہے رنگ بو ؛ کیسی ہوا چلی چمن روزگار میں

دم گھٹ نہ جائے ضعف جنوں کچھ تو رحم کر ؛ ثابت بھی ہے آپنا گریباں بہار میں

حرم تیرا گھر بتکدہ تیرا مسکن ؛ ہے تفریق شیخ و برہمن میں کیسی

زحمت اٹھاؤ کیوں نظر قہر ڈال کے ؛ رکھدوں میں آپ اپنا کلیجہ نکال کے

اے شوق فروشی عشاق مژدہ باد ؛ بیٹھے ہیں وہ تنے ہوئے خنجر نکال کے

مضمون آفرینی ملاحظہ ہو

توڑ دیتے ہے ذوق آزادی مرا تارِ نفس ؛ روح کو اس قید سے آزاد کر لیتا ہوں میں

کھینچ کے آجاتے ہیں وہ جذب تصور کے نثار ؛ ایک نئے خیال آباد کر لیتا ہوں میں

یاس اور امیدوں کا کھلونا ہے یہ دل ؛ شاد کر لیتا ہوں میں ناشاد کر لیتا ہوں میں

رُباعی میں اُن کا اپنا رنگ مخصوص ہے۔

دنیا میں بُری رہ نہ برادر چلنا ؛ ہشیار خبردار سنبھل کر چلنا

رہنا ہے اگر بزم طرب میں رہبر ؛ شیشہ کی طرح سر کو جھکا کر چلنا

شوقؔ۔ رائے گھبیر پرشاد شوقؔ

رگھوبیر پرشاد شوقؔ۔ بی۔ اے عثمانیہ بتاریخ ۱۱ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں بلدہ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ اپنے برادر بزرگوار رائے ست گرو پرشاد رہبر کی طرح فارسی اور عربی کی تعلیم اپنے خاندانی استاد علامہ عبدالرزاق نیشاپوری سے حاصل کی۔

۱۳۲۸ف میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے کا امتحان فلسفے کے کامیاب کیا۔ اور دفتر پولیس بلدہ میں ملازم ہوگئے۔ انھیں عروض اور فن شعر کی تعلیم اپنے بڑے بھائی حکیم ست گرو پرشاد رہبر سے ملی۔ اور شعر و سخن کا مذاق بھی انہیں کی فیض صحبت سے چمکا۔

کرشمے بھی تیرے اے سوز الفت کیا نرالے ہیں

کسی جا شمع بننا اور کہیں پروانہ ہو جانا

ظاہر ہیں گہ نہاں میں عیاں ہر نہاں میں آپ

مسکن گزیں بتائیے ہیں کس مکاں میں آپ

آنکھیں ہوں گر تو گھر میں ہے ملیلے خاب قیس

کیا ڈھونڈتے ہیں نجد کی ریگِ رواں میں آپ

یوں جو ہر ایک سے الجھتی ہے۔ کس کے دامن کا خار ہے دنیا

بدقسمتی سے عرصہ ۲ سال ہوا کہ بعارضہ خلل دماغ علیل ہیں۔ ورنہ نہ جانے دکن کے اس نوجوان شاعر سے فن شعر کی کس قدر خدمت ہوسکتی۔ **مہندر راج سکسینہ**

اُردُو اَدَب اَور قَومی شاعِری

عذر کے بعد اردو شاعروں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا
جس نے سوچا کہ اب "حسن وعشق" کی منزلیں حد سے
گذر چکی ہیں۔ مغربی سیلاب اور زمانے کا انقلاب اب اس کا
مقتضی نہیں کہ وہی پرانا راگ الاپا جائے لہذا شاعری
کو قوم اور وطن کی بیداری کا ایک ذریعہ بنانا چاہیئے چنانچہ
حذف اور اضافے کئے گئے اور اس شاعری کو جدید شاعری
سے تعبیر کیا جانے لگا۔ اس جدید شاعری کا آغاز قومی شاعری
سے ہوا۔ یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کی ابتدا کس
زمانے سے ہوئی مگر یہ کہنا بجا نہیں کہ اس کا سنگ بنیاد حالی
کے ہاتھوں رکھا گیا۔ حالی پہلے پہلے تو اسی ڈگر پہ چلے جس پر
شیفتہ، مجروح وغیرہ چل چکے تھے لیکن انہیں تو ایک جدید
اسکول کا بانی ہونا تھا۔ اس وقت اردو شاعری نے ایک
نئی کروٹ لی اور یہیں سے اس کا RENAISSANCE
یعنی دورِ نہضت شروع ہوا۔ اسلامی سلطنت کی دیا خاموش
ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کی زندگی اور سیاسیات میں ایک
انقلاب کی ضرورت تھی۔ حالی نے مسدس لکھی اور اپنے
قوم کی زندگی میں حیات کی گرمی اور حرکت پیدا کی۔ شمع سے
شمع جلتی ہے۔ حالی کی 'برکھارُت' اور 'حُبِ وطن' نے اکبر
اور چکبست، اقبال اور جوش جیسے شاعر پیدا کئے۔

اکبر نے اپنے بے شمار مزاحیہ قطعوں اور نظموں سے
مغربی تہذیب کی برائیوں اور خرابیوں سے آگاہ کیا۔
چکبست نے ہندوستان کی بہار رفتہ اور عظمتِ قدیم کا
ذکر کر کے عوام کے دلوں میں حس اور قوت بیکار پیدا کی۔
یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان پستی و گمراہی کی
ضلالت میں گھرا ہوا تھا اور ایک ایسے بڑے قومی شاعر کی
ضرورت محسوس کر رہا تھا جو صحیح جادۂ اعتدال کی طرف
رہنمائی کرے۔ چنانچہ قدرت نے اس کے لئے اقبال
کا انتخاب کیا جس نے ہم کو نئی تہذیب کے اثراتِ بد سے
آگاہ کر کے ایک شاندار مستقبل کے لئے آمادہ کیا۔ ہمارے
دلوں میں ہماری ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنے کی
کوشش کی۔ اسلاف کے کارنامے سنا کر ہمارے سرد
اور منجمد خون میں روانی پیدا کی۔

اقبال کی قومی شاعری کو تین عنوانات کے تحت
رکھا جاسکتا ہے۔

۱۔ وطنی ۲۔ اسلامی ۳۔ بین قومی

اقبال اور وطنیت:۔ اقبال نے جب آنکھ کھولی
اس وقت ہندوستان مغربی طرزِ تمدن اور مغربی افکار سے
آشنا ہوتا جا رہا تھا۔ بہتیرے ناعاقبت اندیش اس رو میں
بہہ گئے اور مغرب کی اندھی تقلید میں اپنا مشرقی ناموس
کھو دیا۔ یہ ماحول تھا جو اقبال کی شاعری پر اثر انداز ہوا اور
اقبال کو وطنیت کی رَو میں بہا لے گیا۔ بانگِ درا کا صفحہ
صفحہ اسی ماحول کا پرتو ہے "بانگِ درا" کھولتے ہی پہلی
نظم جس پر نظر پڑتی ہے ہمالیہ ہے۔ ہندوستان کا
بچہ بچہ اسے جانتا اور فخر کرتا ہے۔ یہ نظم قطع نظر بلندیٔ تخیل
اور جدتِ تشبیہات کے ایک اچھوتا پیغام دلوں تک پہنچاتی
ہے اور اس کے لفظ لفظ سے 'حُبِ وطن' کی بو آتی ہے
پھر جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں اس کی جھلک بڑھتی جاتی
ہے۔ چند صفحوں کے بعد "صدائے درد" کے عنوان سے
ایک چھوٹی نظم ہے۔ شاعر شدتِ دردِ دل سے چیخ اٹھتا
ہے اور اپنے ملک کی بدنصیبی پر آنسو بہاتا ہے۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے

ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے
سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں
اختلاطِ موجۂ و ساحل سے گھبراتا ہوں

پھر ایک اور نظم تصویرِ درد ہے جس میں شاعر نے دل کھول کر اپنے وطن کا مرثیہ پڑھا ہے۔

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
دیا رونا مجھے ایسا کہ سب کچھ دے دیا گویا
لکھا کلکِ ازل نے مجھ کو تیرے نوحہ خوانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

چند ہی ورق اُلٹنے کے بعد ترانۂ ہندی آتا ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اُس کی یہ گلستاں ہمارا

اس نظم کو وہ مقبولیت حاصل ہے جو شاذ ہی کسی دوسری نظم کو ہوئی ہو اور قومی گیت کی حیثیت سے چھوٹے بڑے خاص و عام سب کی زبان پر جاری ہے۔ اس کا ایک ایک شعر حُبِ وطن میں رنگا ہوا ہے۔ اس کے ختم ہوتے ہی "نیا شوالہ" ہے۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اس کے ہر شعر میں حبِ وطن کی آگ بھری ہوئی ہے۔ اس میں ایک ایسے نئے شوالے کی تعمیر کی طرف اشارہ ہے جہاں پرستارانِ وطن کا سر جھک جائے۔

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

اور پھر یہیں سے عالمگیر محبت اور اتحاد کی بنیاد قائم ہو۔ نئے شوالے کے ساتھ ہی اقبال کی وطنی شاعری ختم ہو گئی۔ بعد میں یہ ہندی نغمہ روز بروز دھیما پڑتا گیا اور آخر میں عجمی خم اور حجازی بادہ ہی رہ گئی۔

اقبال اور اسلامیات:- قوموں میں ایک نہ ایک ایسا وقت آتا ہے جب اس کے افراد اپنے آپ کو منصبِ انسانیت سے گرا کر ضلالت و گمراہی میں ڈال دیتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر بھی ایک ایسا دور آیا کہ ان کی انسانیت اپنے مرکزِ اصلی سے ہٹ کر اوہام و خرافات کی اندھیری اور پیچ بہ پیچ وادیوں میں اِدھر اُدھر بھٹکنے لگی۔ اقبال نے اسے محسوس کیا اور اپنی شاعری کا رخ جس کا آغاز وطنیت سے ہوا تھا اسلام کی طرف پھیر دیا۔ مسلمانوں میں ایک نئی روح ڈال دی اور ایک ایسا صُور پھونکا کہ اکثر اٹھ بیٹھے اور جو نہ اٹھے وہ کم از کم چونک تو ضرور پڑے جس کا احساس اُسے خود بھی ہوا اور وہ پکار اٹھا۔

عجم از نغمہ ام آتش بجان است ؛ صدائے من درائے کاروان است

اقبال کے کلام کا بڑا ذخیرہ اسلامیات کے متعلق ہے۔ اقبال نے اسلامی شاعر کی حیثیت سے مذہب و ملت کی بڑی خدمات انجام دیں۔ اس صنف کی ابتدائی نظمیں بےحد پرجوش اور ولولہ انگیز ہیں۔ "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" اس رنگ کی مخصوص نظمیں ہیں۔

یورپی اقوام نے قومیت کی ساری بنیاد وطن پر رکھی جس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ خود غرضی اور جنگ و جدال نے انسانوں سے سکھ اور شانتی کو چھین لیا۔ اقبال نے بتایا کہ افراد قوم اور انسانی سیرت کی صحیح تجدید صرف اسی وقت ہو سکتی ہے جب انسان جغرافی حدود سے پرے نکل جائے یعنی انہوں نے بتا دیا کہ ملتِ اسلامیہ کی بنیاد وطن پر رکھنا درست نہیں۔

آں چناں قطع اخوت کردہ اند　٭　بر وطن تعمیر ملت کردہ اند

مردمے اندر جہاں افسانہ شد　٭　آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند　٭　آدمیت گم شد و اقوام شد

کوئی قوم جب تنزل اور انحطاط کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس کے عملی قوی شل ہو جاتے ہیں اور وہ ساتھ ہی ساتھ اپنی تمام خصوصیتوں اور روایتوں کو ذلیل سمجھنے لگتی ہے۔ اقبال نے اسلام کی بلندی و برتری کی ایسی تشریح کی کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی حیران رہ گئے کہ واقعی ہمارا اسلام اتنا ارفع و اعلیٰ ہے اور ہمارا یہ رتبہ ہے۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو　٭　فروغِ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور　٭　کہ شاہینِ شہ لولاک ہے تو

بعض وقت اقبال کے اندر ایک ایسے سخت قسم کا فرقہ وارانہ رجحان (Communalistic Tendency) پیدا ہو جاتا ہے جو بڑھتے بڑھتے جہاد فی سبیل اللہ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں بانگ درا کی نظمیں "بلال" "ایک حاجی مدینے کے راستے میں" اور ضرب کلیم کی "جہاد" "اسلام" "مسلمانوں کا زوال" اور "ہندی اسلام" پیش کی جا سکتی ہیں۔

نظم "اذان" کے دو شعر ملاحظہ ہوں کتنے اثر آفریں ہیں۔ یہ نظم اقبال نے قرطبہ (اسپین) میں لکھی تھی۔

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب
ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرورِ عہدِ شباب

اقبال اور بین قومی تاثرات: اقبال نے ان مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق نہ تو ان کے وطن سے ہے اور نہ ان کے مذہب اسلام سے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو نظمیں کہی ہیں وہ زیادہ تر "ضرب کلیم" میں پائی جاتی ہیں مثلاً "نپولین کے مزار پر" اور "مسولینی" وغیرہ میں۔ بین الاقوامی سیاسیات پر اقبال نے جن افکار کا اظہار کیا ہے ان میں شاعرانہ تخیل کے ساتھ انسانیت کا شرف بھی بدرجۂ اتم موجود ہے "بالشویک روس" "ابی سینا" "مسولینی" "سیاساتِ فرنگ" "جمعیت اقوام" اور "مشرق" قابل ذکر ہیں۔ مسولینی پر اقبال کی نظم بال جبریل میں بھی ہے اور ضرب کلیم میں بھی۔ موخر الذکر نظم "مسولینی" میں انھوں نے مسولینی کی تعریف تو نہیں کی لیکن معترضین یورپ پر ایک زبردست اعتراض ضرور کیا ہے۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میں پھٹکا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
پردۂ تہذیب میں غارتگری، آدم کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

اقبال نے دول یورپ کی پکار اور چیخ کی حقیقت خوب سمجھی تھی وہ نفسیات یورپ کے ماہر تھے۔ خونریزی اور بدامنی کو روکنے کی خاطر جمعیت اقوام قائم کی گئی اور دنیا نے یہ یقین کیے

طور پر سمجھ لیا کہ اب امن ہی امن رہے گا۔ لیکن اقبال سیاست
افرنگ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے انہوں نے
اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دوزے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

زمانہ جانتا ہے کہ اقبال کی پیشین گوئی حرف
بحرف کتنی درست ثابت ہوئی۔ واقعات نے بتا دیا کہ
ارباب سیاست کی عیاریوں کے سامنے اس کی کچھ نہیں
چل سکتی۔ آج ہماری یہ "امن کی دیوی" کس کس مپرسی
کی حالت میں دم توڑ رہی ہے۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے
ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

اقبال کی شاعری کا چراغ گل ہوتے ہوتے یہ قومی
شاعری عوام میں بھی آ چکی تھی۔ لہذا اس میں نئی شاخوں اور
نئی راہوں کا اضافہ ہوا۔ مفلس اور بے روزگاروں کی
زندگی پر تنقید اور تبصرے ہونے لگے۔ نظموں کے ذریعہ
مزدور کسان اور سرمایہ داروں کی کشاکش کا معمہ سلجھانے
اور بیان کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ طبقۂ کسان اپنی
جہالت، بے مائگی کے سبب سوسائٹی میں خواہ کتنا ہی ذلیل
کیوں نہ ہو پھر بھی اس حقیقت سے گریز نہیں کہ اسی کی ذات پر
ہماری ساری طمانیت اور شادمانیٔ حیات کا دار و مدار ہے
اقبال نے اس مقدس طبقہ کی طرف ہندوستان کی توجہ
منعطف کرائی تھی۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جوش، سیماب، احسان دانش نے بھی اپنے قدم
بڑھائے۔ محل سے نکل کر جھونپڑوں میں چراغ جلائے۔
مفلسوں کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ کسان کی بدحالی پر دنیا کو
ہمدردی کے لئے مائل کرنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں
جوش کا قدم سب سے آگے ہے۔ جوش کی ایک نظم
کسان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جھٹ پٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب

یہ سماں اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار
خون ہے جس کی جوانی کا بہار روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار

دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی انگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر

دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منہ گھر کی جانب ہے رواں
ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی دوش پر مضبوط ہل

قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پہ ہے نگاہ
پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار

گھر کی ناامید دیوی کا شبابِ سوگوار
سیم وزر، نان ونمک، آب وغذا کچھ بھی نہیں
گھر میں ایک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری ہائے ہائے
یہ ستم اے سنگدل سرمایہ داری ہائے ہائے

اسی عنواں پر سیماب اکبرآبادی کے بھی چند اشعار دیکھئے۔ مزدور کی حالت کا نقشہ کس فطری انداز میں کھینچا گیا ہے

گرد چہرے پر پسینہ میں جبیں ڈوبی ہوئی۔
آنسوؤں میں کہنیوں تک آستیں ڈوبی ہوئی
پیٹھ پر ناقابلِ برداشت اک بارگراں۔
ضعف سے لرزی ہوئی سارے بدن کی جھریاں
ہڈیوں میں تیز چلنے سے چٹخنے کی صدا
درد میں ڈوبی ہوئی مجروح ٹخنے کی صدا

جارہا ہے جانور کی طرح گھبراتا ہوا۔
ہانپتا، گرتا، لرزتا ٹھوکریں کھاتا ہوا
مضمحل واماندگی سے اور فاقوں سے نڈھال
چار پیسے کی توقع سارے کنبے کا خیال
ایک لمحہ بھی نہیں فکر معیشت سے نجات
صبح ہو یا شام ہے تاریک اس کی کائنات
دیکھ اسے قارونِ اعظم دیکھ اسے سرمایہ دار
نامرادی کا مرقع بے کسی کا شاہکار
گو ہے تیرے ہی طرح انسان پر مجبور ہے۔
دیکھ آ دولت کے اندھے سانپ یہ مزدور ہے

صرف کسان اور مزدور ہی نہیں بلکہ غریبوں کے وہ طبقے بھی جو باوجود بے انتہا کارآمد ہونے کے ایک بے توجہی کے شکار تھے اور کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کو ہمارے وطن پرست شعرا نے نہایت دلکش پیرائے میں ملک کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں بعض شعرا مثلاً احسان دانش کو اتنا انہماک ہو گیا ہے کہ انہوں نے ایسے ہی طبقے کو اپنا موضوع شاعری بنا لیا ہے۔ انکی ایک نظم "خانہ بدوش" کے کچھ اشعار دیکھئے۔

میداں کے صاف سینے پہ آبادیوں سے دور
ٹھہرا ہوا ہے خانہ بدوشوں کا کارواں
ان کا کسی کو شہر میں رہنا نہیں پسند، دشمن ہے گر زمیں تو مخالف ہے آسماں
تاریخ ہند کے یہ پریشان سے ورق، یہ بیاری ضعیف تمدن کی داستاں
برباد ہیں ذلیل ہیں رسوا ہیں خوار ہیں، القصہ جنگلوں میں بھی ملتی نہیں اماں
جن کے مکاں پہ فتح کے پرچم تھے موج ریز
وہ پھر رہے ہیں سر پہ اٹھائے ہوئے مکاں

الطاف مشہدی کی ایک انقلابی نظم "قربانی" کے بھی چند اشعار ملاحظہ ہوں

جو نہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن۔
سرور وکیف میں ڈوبی ہوئی ملاقاتیں
فسوں نواز جوانی کی رازداں راتیں
گلے کو چومنے والی حسیں تریں باہیں
دیارِ دوست کی مخمور و دلنشیں راہیں
کسی کی ہوش ربا و جنوں فروش نگاہ
ہماری پاک محبت کا اولین گناہ
وطن کے نام پہ سب کچھ نثار کرتا ہوا
دیارِ ہند کو وقفِ بہار کرتا ہوا
خوشی سے جھومتا، گاتا، گرجتا آؤں گا
مثالِ ابر زمانے پہ گھر کے چھاؤں گا
جو نہی مدد کو پکارے گا میرا پیارا وطن۔

علی احمد (عثمانیہ)

مشاہدے

کئی سال بعد راقم کو شمالی ہندوستان میں سفر کرنے
کا موقع ملا اُس چند روزہ سفر کی بعض باتیں یاد رہ گئیں
اور اس امید میں میں ان کو قلم بند کر رہا ہوں کہ وہ شاید
بعض لوگوں کی تفریحی مطالعہ کی مستحق ہوں، یا ان لوگوں کے
لئے کام کی باتیں ثابت ہوں جنہیں ادبیات اور تمدن
سے دلچسپی ہے۔

سب سے زیادہ جس چیز سے مجھے ناگوار حیرت
ہوئی وہ شمالی ہند کی مغرب زدگی اور انگریزیت پسندی ہے
چنانچہ خاص دوآبے میں جو نہ صرف ہندستانی تہذیب و
تمدن کا گہوارہ بلکہ اردو کا وطن ہے اور کئی ہندستانی زبانو
اور تمدنی تحریکوں کا سرچشمہ ہے معمولی معمولی لوگ بلا وجہ
انگریزی لفظوں کا استعمال کرکے اپنی مغرب زدگی کا ثبوت
دیتے ہیں۔ خیال تھا کہ ادھر دس بارہ برس سے ہندستانی
زبانوں کا عروج ہو رہا ہے کئی صوبوں میں کانگریسی حکومت
قائم ہوگئی ہے ممکن ہے کہ حالات کچھ بہتر ہوگئے ہوں،
لوگوں کی معاشی اور مالی حالت کے ساتھ (خیال ہوا کہ)
شائد زبان بھی سنبھل گئی ہو۔ مگر یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ تمدنی
اور زبانی نقطۂ نظر سے ہم میں احساسِ کمتری کے متعدد آثار
پائے جاتے ہیں، اور ہم اس ضبط کی وجہ سے اپنی ذاتی
تذلیل کر رہے ہیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں میں تو اپنی آنکھوں
دیکھی اور کانوں سنی باتیں لکھ رہا ہوں اور میرا مقصد اظہار
حقیقت اور دعوتِ اصلاح ہے نہ کہ دل آزاری یا وعظ پسندی

تاج محل کے ایک موروثی خادم کو میں نے کسی دوسرے
شخص کو کہتے ہوئے سنا کہ :-

"وہ اس ٹری کے پرے ہے"!

ٹری ؟؟؟ عجب!! یہ کیا ؟؟.......... درختا!
جس ملک کے چھوٹے بڑے سب اسی خبط میں مبتلا
ہوں کہ بے وجہ انگریزی لفظوں کا استعمال کرکے اپنی
ادھوری تعلیم کا رعب گانٹھیں تو پھر اُن کم سمجھ اَن پڑھوں
کا کیا قصور اگر انہوں نے بھی اپنی قابلیت جتانے کے
لئے دو چار انگریزی لفظ سیکھ رکھے ہوں۔؟

ایک "خان بہادر" کے ہاں مہمان تھا۔ ان کے ایک
ملاقاتی سوٹ پوش، گلوری چباتے ہوئے۔ موٹر سے
اترے، رسمی طور پر میرا بھی تعارف کرایا گیا۔ ان میں باتیں
ہونے لگیں۔ میں ایک خاموش سننے والے کی حیثیت سے
مجبوراً بیٹھا رہا۔ گھر کی بیماری اور عدم فرصت کا ذکر ہوا
ایک نے کہا :-

"میری وائف کو ان دنوں بہت کام تھا اور وہ
آپ کے ہاں ملنے نہ آسکیں"!

جواب ملا :-

میری وائف کو بھی ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔

نہ جانے.... میں سمجھتا تھا کہ یہ صرف دکن کے مغرب زدہ
خبطیوں کا شیوہ ہے کہ بیوی کو بیوی کہتے انہیں شرم آتی ہے
..... وائف کہتے شرم نہیں آتی مگر اب معلوم ہوا کہ ہمالیہ
کے پرے بھی مغربیت کا اندھا جنون روزمرہ کی گفتگو کو
غارت کر رہا ہے۔

لاہور میں غضب کی سردی تھی مگر پنجابیوں کے

حسنِ سلوک اور ان کی مہمان نوازیوں نے دل میں اتنی
گرمی اور جان میں اتنی تازگی پیدا کی کہ بیرونی سردی زیادہ
اثر نہ کر سکی۔ مختلف طبقوں کے لوگوں سے ملنے کا موقع ملا
وہاں والوں کے حسن سیرت کو دیکھ کر اہنوں کے متعلق
جو مغالطہ تھا وہ دور ہو گیا۔ پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر
حیات خاں اور وزیر داخلہ خضر حیات ٹوانہ سے ملاقات
کا شرف حاصل ہوا۔ کھدر پوش راجہ صاحب محمود آباد کے
درشن نصیب ہوئے۔ پنجابیوں کی پگڑیاں بڑی بانکی ہوتی
ہیں۔ ان لوگوں کی جسمانی صحت اور سڈول بدن پر یہ طرے
اور بھی زیادہ بانکے معلوم ہوتے ہیں۔ حسن صحت، حسن صورت
اور حسن سیرت کے اعتبار سے پنجابیوں میں متعدد خوبیاں
پائی جاتی ہیں۔ اردو نوازی، اچھی طباعت، خوشنویسی، اعلیٰ
کتابت اور عمدہ جلد سازی میں لاہور سے بڑھنا تو بڑی
بات ہے کوئی اس سے ہمسری بھی نہیں کر سکتا۔ غالب کے
دیوان کے جیسے عمدہ مصور اور خوشنما اڈیشن پنجاب نے
شائع کئے ہیں، وہ نہ صرف اردو بلکہ سارے ہندستان کے
لئے قابلِ فخر ہے۔

حیدرآبادی "تانگہ" اور جھٹکا متوسط طبقے کی عام
سواریاں ہیں جو آگرہ اور اودھ کے تانگوں اور اکوں سے
زیادہ تکلیف دہ اور بدنما ہیں۔ قاضی پیٹھ سے ورنگل تک
خاصہ ششنا میل کا فاصلہ ہے۔ مجبوراً اسی جھٹکے میں بیٹھا
جا رہا تھا۔ مجھے جلدی تھی، جھٹکا خراب تھا، راستہ بدتر تھا۔
ٹٹو کمزور تھا مگر انعام کی توقع اور پیسہ کی لالچ کسی طرح
چابک کو تھمنے نہیں دے رہی تھی اور جھٹکا مقابلتہً تیز رفتاری
سے جا رہا تھا۔ چابک کی آواز، پتھریلی سڑک پر پہیوں کی
گڑگڑاہٹ اور جھٹکے بان کی صدائیں خاصہ لطف دے رہی تھیں
شہر کے قریب ایک دیسی صاحب ہیٹ اور سوٹ بوٹ پہنے
چلے جا رہے تھے۔ جھٹکے والے نے ملائم لہجے میں کہا

" چلئے صاحب! ہٹئے جناب!"

تھوڑی دیر بعد ایک سفید پوش صاحب کاندھے
پر رومال ڈالے راستہ سے گزر رہے تھے۔ جھٹکے والے
نے صاف آواز میں کہا۔

" چلو صاحب! ہٹو میاں!"

چوراہے کے قریب ایک شخص ننگے سر، معمولی لباس
پہنے، دکھائی دیا۔ جھٹکا گزرنے سے پہلے ہی وہ جا سکتا تھا
مگر جھٹکے والے نے زور سے کہا۔

" سرکو جی! دیکھتے نہیں ہو؟"

ذرا آگے بڑھتے ہی ایک غریب کمل پوش نظر آیا
وہ بھی راستے سے گزرنا چاہتا تھا۔ اسے دیکھ کر جھٹکے والا
آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے للکار کر کہا۔

"ہٹ بے! اندھے!!"

وہ بیچارہ سہم کر خاموش ہو گیا اور اس طرح
آنکھ بچا کر نکل گیا گویا اس نے کوئی جرم کیا تھا اور سزا سے
سے بچ گیا! ان کی مرعوبیت ان کی سب سے بڑی کمزوری ہے
اسی ایک مثال سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہماری معاشرت
کس طرح مختلف طبقوں میں منقسم ہے اور ان مختلف
طبقوں کے افراد کے ساتھ جھٹکے والے بھی کس طرح
سلوک کیا کرتے ہیں۔

ہسیم ریحاں

ہندوستان کی زبان

نوا را تلخ ترمی زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی!

ہندوستان جو گئے ایام میں جنت نشان کہلاتا تھا اب اس کو اگر غلامستان کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ غلامستان محض اس لئے نہیں کہ اس ملک پر ایک مدت سے بدیسی لوگ حکمران ہیں۔ بلکہ اس لئے کہ ہندوستانی کہلانے والوں کی ذہنیت کچھ اس قدر پست ہوگئی ہے کہ یہاں سوائے ذلت و ادبار کے اب اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ایک جھگڑا ختم نہیں ہونے پاتا کہ محبانِ وطن اور قوم پرست بزرگ دوسرا کھڑا کر دیتے ہیں۔

اس ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی تو یہ ہے کہ یہاں چپہ چپہ پر مختلف مذہب و ملت کے لوگ آباد ہیں۔ کوئی آج سے نہیں بلکہ روزِ ازل سے غلامی، فرقہ بندی، اور قومی بغض و عناد نے اس ملک والوں کو یار و اغیار کی نگاہوں میں رسوا کر دیا ہے اور رہی سہی کسر اس زبان کے سوال نے پوری کر دی ہے۔ خدا بخشے! شاعرِ مشرق نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

اُجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو

مرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

بہت ممکن تھا کہ ہندوستان کے رہنے والوں میں نہ کہیں اخوت نظر آتی نہ ہمدردی پائی جاتی نہ لوگوں میں میل ملاپ ہوتا ایک کی ڈگر دوسرے سے علیحدہ ہی رہتی۔ لیکن قدرت کو چونکہ کچھ بھلے دن بھی دکھانے تھے اس لئے اس نے ہندوستان والوں کو آپس میں شیر و شکر کرنے کے لئے ایک ایسی زبان پیدا کر دی جس کی طفیل یہاں کچھ یک رنگی سی نظر آنے لگی۔ اس کے ساتھ کچھ روزمرہ کی ضروریات بھی اس امر کی متقضی تھیں کہ کوئی ایسا طریق اختیار کیا جائے جو سب کے لئے آسان اور قابلِ قبول ہو۔ تو جناب! یہ مشکل اردو زبان نے حل کر دی۔ اردو زبان کی نشو و نما ہندو اور مسلمان دونوں کے ہاتھ سے ہوئی، اور دونوں نے مل کر اسے عروج پہنچایا اور آج بلادِ مشرق میں اردو کو وہی حیثیت حاصل ہے جو مغربی ممالک میں فرانسیسی زبان کو۔ اردو زبان کی افادیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر دور میں ہندو اور مسلمان ادبا اور شعرا اس کی ترقی کے لئے کوشاں رہے ہیں اور آج بھی جب کہ زبان کا جھگڑا ہندو قوم کے رہنماؤں کی تنگ نظری کی بدولت ایک ناگوار کشیدگی کی صورت اختیار کر رہا ہے اردو زبان کے ہندو ادبا اور شعرا اس کی خدمت سے غافل نہیں۔

خیال تو کیجیے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف الخیال لوگ آباد ہوں، جہاں فرقے فرقے کا مذہب علیحدہ ہو، رسم و رواج الگ الگ ہوں، جن کی تہذیب اور تمدن میں زمین اور آسمان کا فرق ہو، جو اپنے قومی اور سیاسی مفاد کے لیے علیحدہ علیحدہ اکھاڑے بنا رہے ہوں، لیکن جہاں تک زبان کا تعلق ہے ملک کی اکثریت ایک زبان بولنے یا سمجھنے والی ہو تو اس سے زیادہ اس زبان کی ہمہ گیری کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ اس گئے گزرے زمانے میں لے دے کر ایک زبان ہی تو ایسی چیز ہے جس سے ہمارا آپس میں کچھ میل جول نظر آ رہا ہے۔ ورنہ خود غرضی اور قوم پرستی کا جو خوفناک حربہ یارانِ وطن

کر رہے ہیں اس نے تو کبھی کے اس نازک رشتے کو بھی مٹا دیا ہوتا۔ اور لطف یہ ہے کہ اردو زبان کو مٹانے والے وہی محترم ہستیاں ہیں جو ہندوستان کی آزادی کی علم بردار بنی پھرتی ہیں۔ اور ہندو مسلم اتحاد کی خواہاں ہیں۔ علامہ اقبال علیہ الرحمہ کیا خوب فرما گئے ہیں ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مجھے اس وقت یہ بتلانا مقصود نہیں کہ اردو زبان بنی کیسے۔ مجھے تو کچھ اس کے متعلق عرض کرنا ہے کہ اردو زبان پر اعتراض کرنے والے کون بزرگ ہیں اور اس کی تہہ میں کونسا جذبہ کار فرما ہے۔

اردو زبان پر اعتراض کرنے والے صرف ہمارے ہندو دوست ہیں۔ ان میں سے کچھ تو مذہب کی آڑ لے کر اردو پر برس رہے ہیں اور کچھ وہ لوگ ہیں جو ہندوستان میں رام راجیہ قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ ان دونوں قسم کے لوگوں کی تنگ نظری اور فرقہ پرستی اب اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ انہی کے اکثر بھائی بند ان کی اس قسم کی تفرقہ انگیز چالوں سے متنفر نظر آنے لگے ہیں۔ ہندوؤں کے سوا ہندوستان کی کسی دوسری قوم نے اردو کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ بنگالی زبان کا اردو کے بعد ہندوستان میں دوسرا درجہ ہے۔ بنگالی میں علم و ادب کا بھی ایک گراں قدر ذخیرہ موجود ہے بنگال والوں نے بڑے نامور ادیب، شاعر اور باکمال آدمی پیدا کئے ہیں لیکن اردو کے خلاف آج تک اس قوم نے کبھی کسی قسم کی ناپاک کوشش نہیں کی بلکہ اکثر بزرگ اس کوشش میں ہیں کہ بنگال میں بھی اردو زبان کا رواج عام ہو جائے۔ جس طرح اردو کئی ایک زبانوں کے ملاپ سے بنی ہے اسی طرح بنگالی زبان میں فارسی اور عربی کے بہت الفاظ ملتے ہیں جنھیں بنگالیوں نے اپنا لیا ہے۔ جیسے روز کی بجائے "روج"۔ کباب کی بجائے "کاباب"۔ جانور کی بجائے "جنوڑ"۔ یا کاری گر کا "کاری گڑ" یا مزدور کا "موجور" یا ہفتہ کی بجائے "ہوپتا"۔ اسی طرح عربی کے الفاظ دیکھ لیجئے کس طرح بنگالی بن گئے ہیں۔ "ناقص کا "ناکس"۔ غسل کا "گسل" تو قیر کا "توکر" ضبط کا "جبت" "مضبوط" "مجبوت" "حضور کا "ہجور" وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح مرہٹی، گجراتی یا تلنگی بولنے والوں کی طرف سے بھی کبھی اس قسم کا مطالبہ یا خواہش نہیں کی گئی۔ یہ سودا صرف ہمارے ہندو دوستوں کے سر میں سمایا ہے گو اس فرقے کے اکثر سمجھ دار بزرگ اس تحریک کے خلاف ہیں اور آواز محض گاندھی صاحب کے تقدس کی خاطر اس کے خلاف بلند نہیں کرتے۔

اردو کے خلاف کٹر خیال کے ہندو تو ایک مدت سے اونگی بونگی بول رہے تھے لیکن جب سے کانگرس برسر اقتدار آئی ہے اس روز سے ہندی کو ملک کی قومی زبان بنانے کا مرض بہت ترقی کر گیا ہے۔ یہ سب کانگرس کے اقتدار کی برکات ہیں جو آج اس ملک میں واردھا اور ودیا مندر ایسی ناپاک اسکیمیں تیار ہو رہی ہیں۔ ان اسکیموں کا صرف ایک مطلب ہے یعنی مسلمانوں کی تہذیب اور تمدن کو ملیا میٹ کیا جائے۔ ہم تو یہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ

ناخن خدا نہ دے تجھے اے پنجۂ جنوں !

لیکن قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس نے پنجۂ جنوں کو آخر ناخن عطا کر ہی دیئے۔ اور اسی وحشت نے کہیں سرسوتی کی پوجا کہیں بندے ماترم کا گیت کہیں کچھ اور کہیں کچھ فتنے برپا کر دیئے۔ کانگرس نے حکومت سنبھالتے ہی جو پر پرزے نکالے تھے انہیں دیکھ دیکھ کر زبان پر باربار یہ آتا تھا کہ ع

آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

تو جناب! یہ ان لوگوں کے لئے ایک سبق ہے جنھیں ملک کی بہتری کانگرس کے اقتدار میں نظر آرہی ہے۔ اور پھر لطف تو یہ ہے کہ اردو ہندی کا سوال پیدا کرنے والے وہی محترم لوگ ہیں جو کانگرس کے کرتا دھرتا کہلاتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو ہندوستان کی آزادی کے خواب دیکھ رہے ہیں وہی اردو ایسی عالمگیر زبان کے خلاف محض اس لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں کہ ایک تو بقول جناب گاندھی یہ مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ دوسرے پنڈت مالویہ صاحب کو یہ خوف دامنگیر ہو رہا ہے کہ اردو زبان پڑھنے لکھنے سے ہندو دھرم کا ناش ہو جائے گا۔ چنانچہ انھوں نے مذہب کی آڑ لے کر اپنی قوم میں اردو کی مخالفت کا بیج بو دیا۔ افسوس ؎

اور ہے تیرا شعار آئینِ ملّت اور ہے

زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

"ہندی" کو راشٹر بھاشا کا درجہ دینے والے ذرا گریبان میں منہ ڈال کر تو دیکھیں کہ "ہندی" کی ملک میں حیثیت کیا ہے۔ اردو کے مشہور رسالہ ساقی (دہلی) میں "سوجھ بوجھ کے ڈھائی اکھر" کے عنوان سے جناب سید ابوالقاسم صاحب سرور کے نام سے گذشتہ دو تین مہینوں سے ایک بہت دلچسپ اور پُراز معلومات مضمون شائع ہو رہا ہے۔ ساقی بابت نومبر میں سرور صاحب نے ہندوستان کی تمام زبانوں کے جو اعداد شمار (جو غالباً کسی مغربی محقق کے ممنونِ منت ہیں) دیئے ہیں اس سے "ہندی" کی زبوں حالی صاف ظاہر ہو رہی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

نام زبان	بولنے والوں کی تعداد
۱۔ اردو	آٹھ کروڑ پچاس لاکھ (یہ اندازہ بالکل غلط ہے)
۲۔ بنگالی	تین کروڑ نوے لاکھ
۳۔ مرہٹی	ایک کروڑ ستر لاکھ
۴۔ تلنگی	ایک کروڑ ستر لاکھ
۵۔ پنجابی	ایک کروڑ ساٹھ لاکھ (یہ غلط ہے پنجاب میں کم و بیش پونے دو کروڑ آدمی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔)
۶۔ تامل	ایک کروڑ تیس لاکھ
۷۔ گجراتی	پچانوے لاکھ
۸۔ اوڑیا	ستر لاکھ
۹۔ کنڑی	پچاس لاکھ
۱۰۔ ملیالم	پچاس لاکھ
۱۱۔ سندھی	چالیس لاکھ
۱۲۔ ہندی	تیس لاکھ

لیکن بُرا ہو اس مذہبی تعصب کا جس کے ہوتے ہوئے کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی ؎

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

کانگرس کی اپنی چھان بین سے بھی اردو کی مقبولیت آشکارا ہوتی ہے۔ کانگرسی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں اردو بولنے والے اٹھارہ کروڑ کے لگ بھگ ہیں۔ حالانکہ یہ اسی طرح غلط ہے جس طرح کانگرسی اور مہا سبھائی پروپیگنڈا کی وجہ سے ہندوستان میں اسلامی آبادی صرف آٹھ کروڑ بتلائی جا رہی ہے۔ کوئی آج سے نہیں بلکہ نصف صدی سے یہ دروغ بیانی جاری ہے۔ حالانکہ اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی گیارہ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔

ہندوستان کی کل آبادی کم و بیش اڑتیس کروڑ ہے اور آج اس ملک میں ۲۴ اور ۲۵ کروڑ آدمی اردو بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔

اور سنئے! اس ملک میں ۱،۲۹۰ اخبارات اور رسائل شایع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۲۱۰ ہندی کے ہیں اور ۱۳۰۸ اردو زبان میں نکلتے ہیں۔ یہ تو رہی ہندوستان کی حالت اب ذرا بیرونِ ہند بھی اردو کی مقبولیت کا اندازہ کیجئے۔

افغانستان }
ایران } ۰۰ لاکھ آدمی اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔

گلگت }
بلخ اور ختن } پچاس لاکھ اردو بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں۔

عرب اور عدن ۔۔۔۔۔۔۔۔ پچانوے لاکھ
یورپ اور امریکہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ بیس لاکھ
جاپان اور سنگاپور ۔۔۔۔۔۔۔۔ پانچ لاکھ
دیگر اسلامی علاقے ۔۔۔۔۔۔۔۔ پندرہ لاکھ

اب ان اعداد و شمار کو سامنے رکھ کر ذرا "ہندی" کے علم برداروں سے کوئی اتنا تو پوچھے کہ کیوں بھیا! ہند یہ کا ڈھونگ رچانے کے کیا معنی! خیر! یہ تو رہیں دور کی باتیں۔ ابھی تھوڑے روز ہوئے آل انڈیا بمبئی ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے ریڈیو سننے والوں سے یہ پوچھا گیا تھا کہ وہ کس زبان میں پروگرام پسند کریں گے۔ اس کا نتیجہ جو سرکاری طور پر شایع کیا گیا ہے لاحظہ فرمائیے۔

بمبئی :- اردو یعنی ہندوستانی ۲،۵۶۰۔ انگریزی ۲۵۳۲۔ گجراتی ۱،۷۴۲۔ مرہٹی ۱۵۲۹۔ ہندی ×

اس کے بعد دوسرا سوال یہ تھا کہ اگر صرف ایک ہی زبان میں ریڈیو پروگرام تیار کیا جائے تو آپ کس زبان میں ریڈیو سننا پسند کریں گے۔ اس کا جواب سنئے!

اردو (ہندوستانی) ۳۶۵۰۔ انگریزی ۱،۷۴۷۔ گجراتی ۹۲۰۔ مرہٹی ۸۳۵۔ ہندی ×

پھر کلکتہ، دہلی اور مدراس کے ریڈیو سننے والوں سے بھی یہی پوچھا گیا ان صوبوں سے زبان کے متعلق جو جواب ملا

اس سے اردو کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

کلکتہ:۔ اردو ۳۵۵۹۔ انگریزی ۱۷۵۴۔ بنگال ۳۹۹۔ ہندی ×

دہلی:۔ اردو ۳۸۴۸۔ انگریزی ۱۷۳۶۔ ہندی ×

مدراس:۔ اردو ۳۵۲۵۔ انگریزی ۱۸۷۱۔ تامل ۳۹۴۔ تلنگی ۲۱۹۔ ہندی ×

ان اعداد شمار سے یہ روزِ روشن کی طرح ظاہر ہے کہ اردو زبان کو ملیامیٹ کرنے کا جنون صرف ہندوؤں میں پایا جاتا ہے۔ دوسری اقوام ہندوؤں کی ہم نوا نہیں اردو زبان کے خلاف صوبۂ متحدہ میں جس کاوش سے کوشش ہو رہی ہے اس کی مثال دوسری جگہ شاید نہ ملے۔ کانگریس والوں سے کچھ شکوہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ یہ خالص ہندو قوم کی نمائندہ ہے۔ لیکن افسوس تو مسلمانوں پر ہے جو یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے ؎

ما قیمت منزل او ادیٔ خاموشان است

حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

ابھی پچھلے دنوں ریڈیو اسٹیشن دہلی والوں نے جو اردو کی گت بنائی ہے اور جس جس طرح اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی وہ کسی سے کچھ چھپی ہوئی نہیں سنتے تو یہ تھے براڈ کاسٹنگ کا محکمہ بھی سرکاری محکمہ ہے۔ لیکن دہلی ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر نے تو قولاً اور فعلاً یہ ثابت کر دکھایا کہ یہ خالص کانگرسی محکمہ ہے۔ آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن سے جو خبریں نشر ہوتی ہیں۔ اس میں ہندی کے اور ایسے ایسے من گھڑت الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جنھیں سُن کر یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ ہندوستان کے قدیم باشندے بات چیت کر رہے ہیں۔ خیال تو فرمائیے کہ

"ایکا" (اتفاق) "ہتھیار بند بھاؤ"۔ "دہڑا دھڑ"۔ "پناؤ"۔ "پچھمی نرنٹ"۔ "سندیسہ"۔ "راج دہانی"۔ پورب۔ پچھم۔ اتر۔ دکن۔ "اڑان" (پرواز) "سناہی والا مال"۔ "سمیع چھانٹا"۔ "ڈبکنی کشتی"۔ "صلح کے بیان کی سواگت"۔ "ڈپلومیٹک حلقوں کی بات چیت میں" "مانگیں" (مطالبہ) "لیکھت"۔ "لکھت پڑہت"۔ "سمیر ٹھ میں شانتی ہوگئی"۔ "پرکھت کا وقت"۔ "لڑائی بند کرنے کی مانگ"۔ "بہتری ثابت کرنے والے" وغیرہ وغیرہ الفاظ اگر رام راجیہ کے دور میں ہندو جاتی کی حکومت استعمال کرتی تو کچھ مضائقہ نہ تھا۔ لیکن ابھی تو دہلی دوَر والا معاملہ ہے۔ ہندو دوستوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان اور اردو کے بہی خواہ اس قسم کی "غیر مہذب زبان" کبھی قبول نہیں کر سکتے۔ اگر اسی کا نام "ہندوستانی" ہے تو پھر یہ ہندوؤں کو ہی مبارک ہو۔ لطف تو یہ ہے کہ گاندھی صاحب کو "اردو" نام بھی ناپسند ہے اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ اگر صلح اور اہنسا کے دیوتا کو ہمسایہ قوم سے بغض نہ ہو تو اور کس کو ہو۔ آپ نے زبان کا نام "ہندوستانی" تجویز فرمایا ہے۔ لیکن جناب گاندھی کو کوئی اتنا تو بتلا دے کہ "ہندوستانی" تو انگریزوں کا دیا ہوا نام ہے۔ آپ تو انگریز کی ہر چیز سے متنفر ہیں یہ نام کیوں پسند آگیا آپ کو۔

اردو زبان کے خلاف جو یہ نفرت انگیز اور اختلاف پرور تحریک جاری ہے اس کی تہہ میں صرف سیاسی جذبہ کارفرما ہے۔ انگریزوں نے کسی مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے کانگریس کو ذرا ڈھیل دے دی تھی جس سے اس کی رسی اور بھی دراز ہو گئی۔ اور گھر بیٹھے یہ لوگ رام راجیہ کے خواب دیکھنے لگے۔ اور جناب آج ہندوستان میں رام راج قائم ہونے دیجئے پھر دیکھئے کہ اسلامی تہذیب اور تمدن پر کس کس طرح کلہاڑا چلایا جاتا ہے۔

اردو ایسی عالمگیر اور شگفتہ زبان جس میں ہر پڑھے لکھے آدمی کو اپنا مطلب ادا کرنے کے لئے لفظی نزاکت، لطافت، رنگینی اور دلکشی حاصل ہو سکے۔ اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنا اپنی ذہنیت کی پستی کا پروپیگنڈا کرنا ہے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے کہ فارسی ایک بے حد دلآویز اور دلکش زبان ہے لیکن اردو کی شگفتگی اور دلکشی اسے بھی مات کر گئی ہے۔ ہندوؤں کا یہ کہنا کہ اردو محض مسلمانوں کی زبان ہے ایسا ہی لغو اور بے معنی ہے جیسے بنارس کے ایک پنڈت نے ایک بار یہ کہہ دیا تھا۔

"مہاراجہ بکرماجیت اور بابر بادشاہ میں کئی معرکے ہوئے لیکن جیت ہمیشہ مہاراجہ بکرماجیت کی ہی رہی"

پنڈت مدن موہن مالویہ کی کوششوں سے تو صرف ہندو ریاستوں سے اردو زبان اور اردو رسم الخط کو دیس نکالا ملا تھا۔ لیکن ہندو مسلم اتحاد کے حامی جناب گاندھی کے تقدس نے یہ آگ اب ہر جگہ لگا دی ہے اور آپ اپنے دامن کی ہوا سے اسے تیز سے تیز تر کئے جا رہے ہیں۔ رہی سہی کسر تھی وہ گاندھی صاحب نے ناگپور میں یہ کہہ کر پوری کر دی کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔

میرے خیال میں وہ سب لوگ جو اردو ہندی کی آویزش کے ذمہ دار ہیں مصلح قوم اور محب وطن کہلانے کے مستحق نہیں۔ زبان سے ملک و ملت کی شان نظر آتی ہے۔ آپس میں اخوت اور اتحاد کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ اس لئے جو قوم یا جو فرقہ یا جو شخص اس مقدس رشتہ کی جڑ کاٹنے والا ہو ہرگز قابل اعتبار نہیں۔ کسی ملک کی آزادی کے لئے اس کی زبان کا ایک ہونا بھی ضروری ہے۔ اور زبان کا اختلاف غلامی کی دلیل۔

اردو زبان پر یارانِ وطن کو سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں عربی فارسی الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان "عقل کے پتلوں" نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ عام بول چال کی زبان اور ہوتی ہے اور ادبی زبان اور عام بول چال میں کوئی احمق ہی ہوگا جو خواہ مخواہ عربی اور فارسی کے غیر ضروری الفاظ استعمال کرے۔ لیکن جہاں ادبی شگفتگی مدنظر ہو وہاں ان الفاظ کا استعمال کرنا بھی ضروری ہوگا۔ پھر ہر لکھنے والے کی اپنی اپنی طرز ہوتی ہے۔ کوئی سادہ الفاظ استعمال کر کے زبان میں چاشنی اور لطافت پیدا کرتا ہے کوئی عربی فارسی اور ہندی کے الفاظ سے اپنی تحریر کو مزین کرتا ہے۔

لیکن ہندی کو تو یہ بات بھی حاصل نہیں۔ اور حاصل ہو بھی کیسے سکتی ہے کیونکہ بقول جناب گاندھی ہندی وہ زبان ہے جو کتابوں میں ملتی ہے۔ پھر اس پر یہ دعویٰ کہ ہندی ہی ہندوستان کی راشٹر بھاشا کہلا سکتی ہے جس قدر مضحکہ خیز ہے سب پر عیاں ہے۔

ہندوستان کی زبان کو ہم "ہندوستانی" تب کہہ سکتے تھے جب کہ تمام ملک میں ایک ہی قوم و ملت کے لوگ آباد ہوتے۔ پھر آج تک یہ بھی تو معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ "ہندوستانی" کیا ہو گی کیسی ہو گی۔ ڈاکٹر تارا چند۔ بابو راجندر پرشاد اور علامہ کیفی نے ہندوستانی کے موضوع پر آل انڈیا ریڈیو دہلی سے جو تقریریں نشر کی تھیں۔ اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا تھا کہ جدید ہندوستانی "اردو اور ہندی کے بیچ کا راستہ" لے گی۔ لیکن ان تینوں بزرگوں نے اس بیچ کا راستہ لینے والی زبان کی مثال تو ایک بھی نہ دی۔ جس سے اس جدید ہندوستانی کا کچھ اندازہ ہو سکتا۔ ہاں! ہندو قوم جو زبان چاہتی ہے اس کی مثال میں مسٹر سمپورنانند کی وہ تقریر پیش کی جا سکتی ہے جو انھوں نے صوبۂ متحدہ کی کونسل میں کی تھی اور جسے مسلمان تو رہے درکنار اسّی فیصدی ہندو بھی نہ سمجھ سکے تھے۔

یارانِ وطن کی اردو زبان کے خلاف سرگرمیاں تو اب شاید حشر تک بھی ختم نہ ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ کب تک خاموش رہیں گے۔ اردو کی حمایت اور ترویج کے لئے انجمنوں کا قیام ہے تو ایک نیک فال، لیکن کچھ کام بھی تو ہونا چاہیے۔ اردو زبان کے حامیوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ اردو کے خلاف ہر تحریک کو کچلنے کے لئے سینہ سپر رہیں۔ خواہ یہ تحریک جناب گاندھی کی طرف سے ہو یا کسی کانگرسی جماعت کی طرف سے۔ افراد کا جمود قوم کی تباہی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ اور آج اردو زبان کے ہوا خواہوں کا یہی جمود اردو زبان کے حق میں زہر قاتل ثابت ہو رہا ہے۔ یہ مصلحتوں کا وقت نہیں بلکہ اب اردو زبان کی لاج اور آبرو کا سوال ہے۔ اور اس لاج اور آبرو کو برقرار رکھنے کے لئے کچھ عمل کی ضرورت ہے۔ باتوں کا وقت ہو چکا۔ آپ نے اردو کی ترویج کے لئے انجمنیں تو قائم کر لیں۔ لیکن یہ تو فرمائیے کہ آپ کی انجمنوں نے عملی کام بھی کچھ کیا۔ ع

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی!

ایم اسلم

مدراس میں اردو (مجلد) اس کتاب میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی منشی فاضل نے مدراس میں اردو کے نشو و نما اور اس کے ارتقاء کی تاریخ پیش کی ہے۔ کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے ہر دور کے شاعروں اور نثر نگاروں کے سوانح حیات اور نمونۂ کلام کو پیش کیا ہے تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔

صفحات (۲۰۰) قیمت مجلد (عہ ۲/)

کیفِ جاوید

حجاب آلودہ جلوے تھے شباب انگیز روماں تھا
مری نظروں کی دولت تھی کہ حسن کارنیرداں تھا

چمن کا ذرہ ذرہ لے رہا تھا ایک انگڑائی
ترے جلوے کی رعنائی میں گم سارا گلستاں تھا

نگاہِ درد پرور کی خلش کیا خاک کم ہوتی
تری رنگینیاں تھیں اور مرا معصوم ایماں تھا

میں ہر قیمت پہ لے سکتا ہوں وہ جاں آفریں لمحے
کہ جب پہلے پہل مل کر کوئی مجھ سے پشیماں تھا

چمن کا پتہ پتہ بن گیا تصویر ناکامی
ترے جانے سے پژمردہ گلستاں کا گلستاں تھا

رو پہلی چاندنی میں وہ مرے پہلو میں بیٹھی تھیں
مرے اُس چاند سے لیکن فلک کا چاند لرزاں تھا

وہ اپنے حسن سے بڑھ کر مری چاہت پہ نازاں تھیں
مری نظریں اور اتنی کامراں میں خود بھی حیراں تھا

صنوبر کے حسیں سائے لبِ جو گود میں کوئی
مگر اب یاد کرتا ہوں تو اک خوابِ پریشاں تھا

کوئی خوابیدہ تھا قیصری مری آغوشِ رنگیں میں
فلک بھر چاندنی تھی یا گلستاں کا گلستاں تھا

قیصری رامپوری

"ورڈزورتھ اور اس کی شاعری" ادارۂ ادبیاتِ اردو کی اولین کتاب ہے جو آج سے پانچ سال پہلے شایع ہوئی۔ یہ کتاب مولٰنا سلیمان ندوی کی رائے میں جدید قسم کی بہترین سوانح عمری ہے۔ اصغر گونڈوی مرحوم اس کو ۱۹۳۲ء کی بہترین اردو کتاب سمجھتے تھے۔ مولوی عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ اردو کے ہر شاعر کو یہ کتاب پڑھنی چاہیے اور حضرت نیاز فتح پوری کا ارشاد ہے کہ مشرق اور مغرب کی ادبیات کا تقابلی مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ ایک خاص چیز ہے۔

اس دوران میں اردو شعر پر ورڈسورتھ کے اثرات ایک حد تک نمایاں ہو گئے۔ موضوع، اسلوب اور زبان کی سادگی کا جو رنگ مغربی شاعری اور خاص طور پر ورڈزورتھ سے متاثر ہو کر مولٰنا حالی نے اپنا شروع کیا تھا اس کے اثرات میں اضافہ ہو جا رہا ہے۔

عنقریب ورڈسورتھ اور اُس کی شاعری کا دوسرا ایڈیشن بعض اضافوں کے ساتھ شایع ہونے والا ہے۔ اس میں ہیکش صاحب کی بعض نظمیں بھی شامل ہوں گی۔ ان نظموں کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اردو شعر کی ساری خوبیوں کو برقرار رکھ کر ورڈسورتھ کی ترجمانی کی گئی ہے

ادب اور ذوق

(ایک مغربی صاحب ذوق کی مفید تصنیف کا پہلا باب ترجمے کی صورت میں پیش ہے۔ اس کے پڑھنے سے ادب والوں اور "بے ادبوں" دونوں کے دل پر شاید کچھ اثر ہو)

سب سے پہلے ضرورت اس امر کی ہے کہ راستے سے ایک غلط فہمی دور کر دی جائے۔ اگر عموماً نہیں تو اکثر حضرات ادبی ذوق کو ایک نفیس تحصیل اور اکتساب سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسے حاصل کرنے سے وہ اپنے آپ کو مکمل کر لیں گے اور ایک صحیح سوسائٹی کے رکن بننے کے اہل ہو جائیں گے۔ وہ دراصل ادب سے ناواقفیت رکھتے ہیں اور اپنی ناواقفیت سے اس طرح شرمندہ بھی ہیں جس طرح وہ کسی اعلیٰ اور مہذب تقریب میں آداب مجلس سے اپنی لاعلمی کی بنا پر محجوب رہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس طرح ناقابل اور مشوش پاتے ہیں جس طرح کسی سواری نہ جاننے والے شخص کو یکایک گھوڑے پر سوار ہونے کے لئے کہا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کے لئے دنیا میں بعض چیزوں کو جاننا یا ان کے متعلق معلومات رکھنا ضروری ہے اور ان میں سے ایک ادب ہے۔ انھوں نے شائستگی کے ساتھ لباس پہننا سیکھ لیا ہے، وہ ہر موقع پر شائستگی اور تہذیب کا اظہار بھی کر سکتے ہیں۔ وہ زندگی کے روزآنہ اور ضروری مسائل سے کماحقہ واقف ہیں۔ محنت اور کوشش سے وہ اپنے اوقات فرصت میں کچھ تحصیل و اکتساب بھی کر لیتے ہیں۔ اس لئے، یہ امر بھی ان کے حق بجانب معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب سے واقفیت کو ہر باعزت اور خوددار انسان کا ذاتی سرمایہ اور لازمہ قرار دیں۔ مصوری ضروری نہیں۔ موسیقی ضروری نہیں۔ لیکن ادب سے تعلق رکھنا ہر شخص کے لئے ضروری ہے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ ادب ایک دلفریب ترغیب اور دل بہلائی ہے۔ گویا ادبی ذوق کے دو مقاصد ہوئے۔ ایک صحیح تہذیب کا صداقت نامہ بننا، دوسرے ایک خانگی مشغلہ ثابت ہونا۔ ریاضیات کے ایک نوجوان پروفیسر نے، جو ریاضیات اور کھیل کا ماہر، شطرنج میں خطرناک، وایولین بجانے میں مشاق تھا، ایک دفعہ کتاب سے متعلق میری گفتگو سن کے کہا "جی ہاں، مجھے بھی ادب کی تحصیل کرنی چاہیے"۔ گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ "میں اسے حاصل کرنا بھول گیا تھا۔ میں نے دوسری چیزوں پر تو چھاپہ مارا ہے، اب ادب کی طرف بھی کچھ توجہ کروں گا"

یہ رجحان یا وہ خیال جو اس کے مماثل ہو، سراسر غلط ہے۔ اس شخص کے لئے جو واقعی ادب کو سمجھ سکتا ہے، اور یہ جان سکتا ہے کہ ادب کا مقصد اور عمل کیا ہے، اس قسم کے رجحانات محض مضحکہ خیز ہیں۔ علاوہ ازیں ادبی ذوق کی تکمیل میں ان سے نقصان بھی پہنچتا ہے۔ جو لوگ ادبی ذوق کو صرف ایک تحصیل و اکتساب سمجھتے، اور ادب کو ایک تفریح اور ترغیب قرار دیتے ہیں، وہ نہ اکتساب میں کامیاب ہوں گے اور نہ اس نیم اکتسابیت سے کوئی تفریح کا کام لے سکیں گے۔ یہ ایک اور بات ہے کہ یہ ترغیب دوسری ترغیبات سے زیادہ مکمل ہے اور یہ تحصیل و اکتساب مہذب انسانیت کی عام دیوانگی کو موثر بنانے میں دوسرے قسم کی تحصیلات سے بہت زیادہ قوی اور دلکش ہے۔ ادب، ایک اضافہ، یا ایک ضروری لاحقہ نہیں بلکہ حیاتِ کامل کی اصل اور روح ہے۔ میں اس موقع پر فصیح و بلیغ اور جذبات انگیز جملے قطعاً استعمال نہیں کرنا چاہتا اور نہ کسی خطبے اور مبالغے سے کام لینا چاہتا ہوں۔ تاہم، میں حق بجانب ہوں گا، اگر میں کہوں کہ جس انسان کا ادب کی آزادی کا سامنا نہ ہو، وہ درحقیقت اپنے خوابِ غفلت سے جاگا ہی نہیں ہے۔ وہ ابھی پیدا ہی نہیں

ہوا ہے۔ وہ پوری طور پر دیکھ نہیں سکتا، سن نہیں سکتا، محسوس نہیں کرسکتا۔ وہ صرف کھانا کھا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو جو ادب کے صحیح عمل اور منشا سے واقف ہیں، اور انھوں نے اس سے استفادہ بھی کیا ہے، اس سے زیادہ اور کوئی امر تکلیف نہیں دے سکتا کہ وہ ہزاروں افراد کو اس ترغیب میں مبتلا دیکھیں کہ وہ زندہ ہیں، حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ وہ زندگی سے صرف اتنا قریب ہیں جتنا موسم سرما میں ایک ریچھ ہوتا ہے۔

اب میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ادب کیا چیز ہے؟۔ نہیں، کاش میں ایسا کرسکتا مگر میں نہیں کرسکتا، نہ کوئی اور کرسکتا ہے۔ اس راز پر صرف ہلکی سی روشنی ڈالی جاسکتی ہے، یا کچھ اشارے کئے جاسکتے ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں بھی صرف اس کی طرف اشارہ کروں گا۔ اس کے لئے میں آپ کو آپ کی زندگی کے کسی واقعے کی طرف واپس لے جاؤں گا یا مستقبل کی طرف بڑھا دوں گا۔

آپ کو وہ شام یاد ہے جب کہ آپ اپنے ایک بے تکلف اور جانی دوست کے ساتھ تفریح کررہے تھے۔ آپ کا وہ دوست آپ کا رازدار تھا، آپ اُس سے کوئی بات چھپا نہ سکتے تھے۔ اس شام کو آپ اس سے ایک ایسی بات چھپانا چاہتے تھے جو آپ کے دل و دماغ پر پورا قبضہ کئے ہوئے تھی۔ لیکن خدا جانے کونسی قوت تھی جو آپ کو اس کی طرف کھینچے جارہی تھی۔ آپ پر ایک والہانہ جوش سوار تھا۔ چونکہ آپ کا دوست ہمدرد بھی تھا اور فرزانہ بھی، وہ ایک باعزت خواہش اور ذوقِ جستجو کے ساتھ آپ کی خوشامد بھی کررہا تھا اس لئے آپ اس واقعے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھتے گئے۔ جیسے جیسے زیادہ اعتماد اور رازداری کا جذبہ پیدا ہوتا گیا، آپ اصل واقعہ کے قریب ہوتے گئے، حتیٰ کہ آپ نے ایک تہلکہ آمیز سرگوشی کے ساتھ کہہ ہی دیا "میرے دوست، وہ لڑکی، حسن کا معجزہ ہے"! اس لمحے اور ساعت میں آپ ادب کی سلطنت میں موجود تھے۔

مجھے اس کی تشریح کرنے دیجئے۔ یہ سچ ہے کہ لفظ "معجزہ" کے عام مفہوم کے اعتبار سے وہ لڑکی حسن کا معجزہ تو نہ تھی۔ آپ کے وفادار دوست نے کبھی اسے اتنا حسین نہیں سمجھا اور نہ ان چالیس ہزار نظارہ بازوں نے سمجھا تھا جو اسے دیکھا کرتے تھے۔ وہ صرف ایک لڑکی تھی۔ اس کے لئے شہرِ تراکیے جلایا نہیں گیا تھا۔ ایک لڑکی کو معجزہ نہیں کہا جاسکتا۔ اگر آپ ایک لڑکی کو معجزہ کہیں گے تو دنیا کی ہر معمولی چیز کو بھی اسی نام سے یاد کیا جاسکے گا۔ لیکن ٹھیک ہے، آپ ایسا کرسکتے ہیں۔ آپ کو ایسا کرنا چاہیے۔ کائنات کے بے انتہا معجزات میں سے آپ کو صرف ایک کا احساس ہوا تھا۔ اس وقت آپ اپنی ایجاد اور انکشاف ہی میں مصروف تھے اس انکشاف کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے آپ میں ایک قدرتی ولولہ موجود تھا۔ آپ کو کسی چیز کے زبردست حسن کا قوی احساس ہوگیا تھا اور آپ اس جذبے کو اپنا بنانے پر مجبور تھے۔ آپ کسی چیز کے متعلق جذبات اور خواہشات سے بھرے ہوئے تھے۔ آپ سارے بنی نوع انسان سے ہٹ کر اس ایک ہستی کی طرف کھنچ آئے تھے۔ اب آپ اپنے جذبے اور اظہار کا وہ اثر ملاحظہ فرمائیں جو آپ کے دوست پر ہوا۔ معلوم تھا کہ لڑکی ایک معجزہ نہیں ہے۔ کوئی اور شخص اسے مجبور کرسکتا تھا کہ اس معجزے پر ایمان لائے۔ لیکن آپ نے اپنے نظارے کی طاقت اور ایمان داری سے اور اپنے دوست کو اپنے نظارے میں شریک کرنے کے جوش اور ولولے سے، بہت دیر تک اس غریب

یہ محسوس کرنے اور سمجھنے پر مجبور کیا کہ لڑکی میں کوئی غیر معمولی بات ہے اور وہ اب تک اس کے اعجازِ حسن کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے تھا۔

اس منزل پر آپ ادب پیدا کر رہے تھے۔ آپ زندہ تھے۔ دنیا کے تھوڑے سے حسن اور اعجوبیت کی طرف آپ کی آنکھوں پر پٹی نہیں تھی آپ کے کان بہرے نہ تھے۔ آپ کے اندر ایک ایسی قوت تھی جو آپ کو اپنے جذبے کے اظہار پر مجبور کر رہی تھی۔ یہ آپ کے لئے کافی نہ تھا کہ آپ اسے دیکھیں یا سنیں۔ آپ کے لئے ضروری تھا کہ دوسرے بھی اسے دیکھیں اور سنیں۔ دوسروں کو جگانا لازم تھا اور آپ نے جگا دیا۔ یہ ممکن ہے۔ گو مجھے یقین کامل نہیں ہے۔ کہ دوسرے ہی روز یا دوسرے مہینے آپ کا وفادار دوست کسی اور لڑکی کو دیکھے اور فوراً محسوس کرے کہ وہ بھی معجزۂ حسن ہے۔ یہ ادب کا اثر ہے!

ادب کے بنانے والے دراصل وہ لوگ ہیں جنھوں نے کائنات کے اعجاز نیرنگ وحیرت کو دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ اور ان میں سب سے بڑے معمار وہ ہیں جن کا مطمح نظر بہت زیادہ وسیع اور جن کا احساس بہت زیادہ شدید ہے۔ آپ کی تیز نگاہی کا ایک ٹکڑا ممکن ہے اتفاقی ہو اور عارضی بھی، لیکن ان کی زندگی ایک طویل نیرنگ، ایک مسلسل حسرت ہے جو ہمیشہ اس امر سے انکار کرتی رہی کہ دنیا ایک اُداس جگہ ہے۔ اگر آپ بھی یہ سمجھنے اور معلوم کرنے کے قابل ہوں کہ دنیا ایک اُداس جگہ نہیں ہے تو کیا آپ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہ ہوگی؟ اگر آپ کو بھنوروں اور غاروں سے نکال کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر کھڑا کر دیا جائے تاکہ آپ زندگی کے صحیح لذت اور کیف سے لطف اندوز ہوں، اور آپ کی اس خوبصورت شیروانی کے نیچے ایک سچا دھڑکنے والا دل پیدا ہو تو کیا آپ اسے کوئی بات نہ سمجھیں گے؟ ادب کے معمار آپ کو ان چیزوں کا حریف اور مدمقابل بنا دیتے ہیں!

ادبی مطالعے کا مقصد یہ نہیں کہ اوقاتِ فرصت بہلائے جائیں۔ اس کا مقصد اپنے آپ کو جگانا، زندہ کرنا، ہمدردی، مسرت اور فہم و ادراک، اخذ و جذب کی صلاحیتوں کو زیادہ قوی بنانا ہے۔ اس کا منشا صرف ایک گھنٹے کو متاثر کرنا نہیں بلکہ چوبیس گھنٹوں کو متاثر کرنا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ دنیا کے ساتھ ہمارے تعلقات کا رخ اور نوعیت ہی بدل دے۔ ادب کا سمجھنا اور اسے پسند کرنا دنیا کو سمجھنے اور پسند کرنے کے مرادف ہے۔ اس کے سوا اس میں کوئی اور معنی نہیں ہیں۔ اس میں زندگی کے بے جوڑ اور علحدہ ٹکڑوں کو جوڑنا نہیں بلکہ پوری زندگی کو ایک مربوط اور جامع نقشے میں دیکھنا ہے ادب کی روح ربط اور اتحاد ہے۔ ادب قندیل اور ستار کو ملاتا ہے اور تصویر اور عکس کے جادو سے یہ ثابت کرتا ہے کہ ایک بڑی چیز کا حسن درحقیقت ایک چھوٹی چیز میں ہے۔ وہ اس امر پر اکتفا نہیں کرتا کہ حسن کا انکشاف کیا جائے یا ساری چیزوں کو ایک ہی مرکز خیال پر لایا جائے، بلکہ وہ علت و معلول، سبب اور نتیجے کے قانون کا پتہ چلا کر ایک قسم کی اخلاقی فہم و ادراک پیدا کرتا اور اسے ہم پر مسلط کرتا ہے۔ اس کی تشفی اور تسکین دو قسم کی ہوتی ہے۔ وہ ایک غیر مشکوک دلکشی کو بے نقاب کرتا ہے، دوسرے وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہماری قسمت بھی کائنات کے ساتھ ہے۔ یہ ایک انکشاف کرنے والے شخص کی زبردست پکار ہے جو ہمدردیاں بانٹتی اور ایک ہی اشارے میں ہمدردیاں حاصل بھی کرنا چاہتی ہے۔

کسی شاعر کے دیوانوں کے قدیم نسخے ٹٹولنے، کسی ڈرامہ نگار کے مضمون کے ماخذ معلوم کرنے، یا علم عروض کی تاریخ لکھنے، یا ان

امور کے انکار و اقرار کے دلائل ڈھونڈنے میں کہ نظام الملک طوسی یا حسن بن صباح عالی فکر اور بدمعاش انسان تھے، اس امر کا امکان ہے کہ لوگ اصل ادب اور اس کی روح کو بھول جائیں اور یہ نہ معلوم کرسکیں کہ اس کا مقصد کیا ہے، اور یہ کس کے لئے ہے، مجھے پھر یہ یاد دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادب درحقیقت صحیح زندگی کا ذریعہ ہے، اور ادبی ذوق کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس ذریعے کو اپنی اعلیٰ ترزندگی کے لئے کتنی خوبی سے استعمال کرسکتے ہیں؟ جو لوگ زندہ نہیں رہنا چاہتے، جن کو محسوس کرنے سے زیادہ دل بہلائی کی خواہش ہے، وہ براہ کرم ادب کو خیرباد کہہ دیں۔ یہی ان کی عقلمندی ہوگی۔ بقول ایک عمدہ شاعر کے پاکیزہ مصرعے کے "بیٹھے ہوئے سند ہولے کھایا کریں"! ایک معمولی جھاڑی کا نظارہ "جو جلال ایزدی سے معمور ہو" شاید ان کو حواس باختہ بنادے گا!

محمد عبدالقیوم خان باقی

دُعا

آپ بھی بے حجاب ہو مجھ کو بھی بے حجاب کر　　جامِ مئے حیات کو چشمۂ آفتاب کر

ڈوب رہی ہے نبضِ دل سانس کہیں الٹ نہ جائے　　سینۂ آب و خاک کو عرصۂ انقلاب کر

میری دعائے نیم شب اور یہ سوز و تاب و تب　　میرے چمن میں جلوۂ سلسلۂ سحاب کر

عشق ہے محوِ آب و رنگ عقل ہے محوِ خار و سنگ　　حسنِ ازل کا واسطہ حسن کو بے نقاب کر

منزلِ بے خودی میں یہ مرحلۂ خبر کہاں!　　حسن جوابِ حسن ہے عشق کو لاجواب کر

تشنہ ہے روحِ زندگی گل ہے چراغِ بندگی　　مجھ کو پیامِ تازہ دے مجھ کو عطا کتاب کر

درد ہے رازِ کائنات یہ جو نہیں تو کچھ نہیں　　عشرتِ رنگ پر نہ جا درد کا انتخاب کر

میری حیات کا جمال تیرے شباب کا خیال　　ہستیٔ ناتمام کو نقش گرِ شباب کر

کاوشِ خستہ دل ہوں میں صناعِ رنگ و بو ہے تو
غنچۂ ناشگفتہ کو پھول بنا، گلاب کر!

کاوش

گل بوٹے

کسی کے ہر اپریل اور مئی کے گرم تقاضوں سے تنگ آکر پور ے ایک جگ کے بعد پچھلی گرمیوں میں بنگلور کے لئے ہم نے رختِ سفر باندھا! اس تقریب میں ہماری بیچاری پانچ سال کی نئی فورڈ "پر بھی آفت آئی وہ بھی ہمارے ساتھ چلنے پر مجبور ہوئی۔ اپریل کے آخری ہفتہ میں ہمارا "کاروان" کچھ موٹر میں اور کچھ ریل میں صبح سویرے بنگلور چل پڑا، شہر سے کوئی چونسٹھ میل موٹر میں چلنے کے بعد ہم محبوب نگر پہنچے یہاں ہم سب نے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں ناشتہ کیا اور چلے اسٹیشن ماسٹر سے ملنے۔ کرنول کے قریب جو ندیاں آڑے آتی ہیں ان کو پار کرنے کے لئے ہم نے چار روز پہلے ہی ریلوے ٹرک اپنی موٹر کے لئے محفوظ کرا لیا تھا، اسٹیشن ماسٹر سے مل کر ہم نے اپنی موٹر کو ٹرک میں بٹھا دیا، سب کے ٹکٹ کرنول تک کے خرید لئے اور پلیٹ فارم پر ٹرین کے انتظار میں ٹہلنے لگے

ساڑھے نو بجکر کچھ منٹ پر ٹرین آئی، ہم سب اپنے اپنے ڈبوں میں سوار ہو گئے، اور دہویں کی گاڑی ہمیں اڑاتی ہوئی کرنول چلی، ہمارے ڈبے میں ہمارے سوا دو اور مسافر تھے، ایک صاحب اوپر کی برتھ پر لیٹے ہوئے کوئی موٹی سی کتاب بہت غور سے پڑھ رہے تھے اور کچھ گنگنا بھی رہے تھے، دوسرے صاحب نیچے کی سیٹ پر ٹائمز آف انڈیا دیکھ رہے تھے، ہم اپنی تنہائی کو بری طرح محسوس کر رہے تھے، اتنے میں اوپر والے صاحب دھم سے نیچے کود ے اور "السلام علیکم" کہہ کر ہمارے بازو بیٹھ گئے۔ اب جو ہماری نظر انکی کتاب پر پڑی تو اس پر سنہری حرفوں میں "دیوانِ حافظ" لکھا دیکھا، اس دیوان کو ان کے ہاتھ میں دیکھ کر ان کی عظمت ہماری نظروں میں بہت بڑھ گئی، ہم نے موصوف سے سوال کیا۔

"کیا حافظ سے آپ کو خاص لگاؤ معلوم ہوتا ہے؟"

فرمایا "جی ہاں! میں ان کے دیوان کا ترجمہ منظوم انگریزی میں کر رہا ہوں"!!

انگریزی میں دیوان حافظ کا "منظوم" ترجمہ سنکر ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور موصوف کی لیاقت کی دھاک ہم پر خوب بیٹھ گئی، ہم یہ چاہتے ہی تھے کہ اس منظوم ترجمے کے سننے کی سعادت ہمیں نصیب ہو کہ اتنے میں موصوف نے ہم سے پوچھا۔

"کیا کوئی غزل کا فی البدیہ منظوم ترجمہ سناؤں؟"

ہم نے عرض کیا "چشم ما روشن دلِ ما شاد! نیکی اور پوچھ پوچھ!! ضرور ارشاد ہو"!!!

فرمایا "حافظ کی غزل کا انگریزی میں منظوم ترجمہ کرنا بچوں کا کھیل نہیں! بہت مشکل کام ہے!! اس کے لئے بڑی قابلیت کی ضرورت ہے"!

ہم نے کہا "اسمیں کیا شک! پہلے تو ترجمہ کرنا ہی کچھ آسان کام نہیں ہے اور پھر حافظ کا انگریزی میں اور پھر منظوم ترجمہ!! واقعی یہ کارے وارداین ...... از تو آید و مردان چنیں کنند"!!!

مسکرا کر جواب دیا "کوئی پچیس برس کی مشق کے بعد یہ کام مجھ کو اب آسان معلوم ہوتا ہے، پہلے میں نے اردو غزلوں کا ترجمہ منظوم انگریزی میں کرنا شروع کیا،

اس پر کافی عبور حاصل کرنے کے بعد اب فارسی کا شروع کیا
ہے، یہ ترجمہ اگر کسی انگریزی داں ایرانی کو سناؤں تو واللہ
پھڑک اٹھے، دیکھئے حافظ مرحوم کی روح کو ایک الحمد
اور یقین کامل ہوا اللہ پر ٹکر بخشتا ہوں اور پھر "شاخ نبات" کی قسم
دیکر کتاب کھولتا ہوں اور جو غزل نکلے اوس کا ترجمہ فی البدیہ
سناتا ہوں۔"

چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا اور بسم اللہ کہکر کتاب کھولی،
غزل نکلی۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

اس شعر کا آپ نے انگریزی میں جو منظوم ترجمہ کیا ہے وہ
سچ مچ ایک "شاہکار" ہے، ملاحظہ ہو!

The last yousuf will come back to Kan-an swallow-not sorrow.

The cottage of sorrow will become a flower garden one day swallow no sorrow

اس "فی البدیہ" ترجمہ کو سن کر ہم نے اپنے پر قابو رکھنے
کی جو کوشش کی تو ہمارے جسم میں کچھ عجیب "ارتعاش" پیدا
ہوا ہم نے اپنے پیٹ کو اچھی طرح پکڑ لیا کہ کہیں جوشِ مسرت سے ابل نہ پڑے
معلوم نہیں "کنار آب رکن آباد" گلگشت کرنیوالے حضرت
حافظ کی روح پر کیا گزرتی اگر وہ انگریزی داں ہوتی! ہم نے
پلٹ کر ٹائمز آف انڈیا پڑھنے والے ہمسفر کی طرف جو دیکھا تو
ان کے چہرہ کو اخبار کے ورقوں سے ملا ہوا اور ان کے بھاری بھرکم
جسم کو کچھ عجیب وضع سے ہلتا ہوا پایا۔ اس اثنا میں موصوف
نے دوسرے شعر کا ترجمہ بھی کر ڈالا، ارشاد ہوا۔

"این دل غم دیدہ حالش بہ شود دل بد مکن
وین سر شوریدہ باز آید بسامان غم مخور"

The condition of this sorrow seen heart will become better, dont make the heart bad. This noisy head will come back with luggage, swallow not sorrow

اس ترجمہ میں "پیچ" کی ہم دل ہی دل میں داد دے رہے تھے
کہ تیسرا شعر ارشاد ہوا۔

در بیاباں گر بہ شوق کعبہ خواہی زد قدم
سرزنش ہا گر کند خار مغیلاں غم مخور"

If you wish to strike foot in jangle in fondness for Kaba. If Babool thorns take you to task swallow not sorrow

ارشاد ہوا "اس منظوم ترجمہ کو قافیہ سے بے نیاز رکھا گیا ہے
Swallow not Sorrow اس کی ردیف
ہے، قافیہ لگانے کی کوشش کیگئی تھی مگر یہ دیکھکر کہ شعر وزن سے
گر جاتا ہے صرف ردیف ہی پر قناعت کیگئی۔"

غرضکہ موصوف نے پوری غزل کا ترجمہ چند منٹوں میں
اسی طرح "بڑی روانی" سے کر ڈالا اور ہماری رائے پوچھی!
ہم ششدر رہ گئے اور "لسان الغیب" ہماری زبان سے
بے ساختہ بول اٹھے "جزاک اللہ فی الدارین خیرا" سچ تو یہ ہے

کہ آپ نے انگریزی اور فارسی شاعری دونوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ اس ترجمہ کا نسخہ انشاءاللہ کسی دن لندن کے عجائب خانہ میں پہنچ جائیگا"!

تو آپ کی رائے ہے کہ اس ترجمہ کی کاپیاں چھپوائی جائیں؟

ہم نے کہا "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے" اس ترجمہ کی تو کم سے کم دس ہزار کاپیاں چھپوا لینی چاہیے"۔

اس وقت "ٹائمز آف انڈیا" والے ہمارے ساتھی نے اپنا چہرہ اخبار کے ورقوں سے جو باہر نکالا تو ہم نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں کچھ سرخ ہوگئی ہیں اور ان میں پانی کھیل رہا ہے! غالباً وہ اپنی بے بضاعتی پر آنسو بہا رہے تھے کہ ان میں ایسا منظوم ترجمہ کرنے کی لیاقت نہیں تھی! یہ معلوم کرکے ہمیں بڑی مسرت ہوئی کہ قابل مترجم صاحب بھی گرمیاں گزارنے بنگلور جا رہے ہیں، بنگلور میں آپ نے اور ترجمہ سنانے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنا بنگلور کا پتہ نہیں دیا اور ہم سے وعدہ لیا کہ کسی دن ان کا ترجمہ سننے ضرور آئیں، چنانچہ بنگلور میں کئی مرتبہ ہم نے ان کا ترجمہ بڑے فرے سے لیکر سنا۔ انشاءاللہ کبھی ناظرین سب رس کے ملاحظہ میں اس ترجمے کے چند نمونے پیش کرینگے۔

سب رس زندہ صحبت باقی

آج ہم ان وقتوں کا ذکر کرتے ہیں جبکہ ایک بزرگوار اپنے "دورِ آخری" امتحان میں رونق افروز تھے، اردو کا پرچہ بڑی پھرتی سے لکھ رہے تھے کیونکہ "پدری زبان جو ٹھہری"!!! ایک گھنٹہ پہلے ہی آپ نے پرچے گارڈ کے حوالے کر دئے اور امتحان کے ہال سے نکل کر ادھر ادھر گلگشت کرنے لگے۔ آخر بڑے انتظار کے بعد ایک ساتھی باہر آئے، دونوں میں پرچہ کے متعلق گفتگو شروع ہوئی، آپ نے کہا۔

"آج کا پرچہ بھی کچھ تھا! مجھ کو تو سو میں سو نمبروں کی امید ہے"!

ساتھی نے اپنا پرچہ دیکھ کر کہا "مجھ کو پچاس نمبروں سے زیادہ کی امید نہیں ہے کیونکہ بعض اشعار میری سمجھ میں نہیں آئے، کہئے آپ نے اس شعر کا مطلب کیا لکھا؟ ؎

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ ÷ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں"

ارشاد ہوا "تم بھی عجب احمق ہو! ارے اتنے آسان شعر کا مطلب تمہاری سمجھ میں نہ آیا! اسنو! شاعر کہتا ہے، لوگ مضامین کی ایسی فاش غلطیاں کرتے ہیں کہ گویا ندی نالوں کو رسّوں سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں"!!!

ایک صاحب نے اپنی سنہ ۱۹۲۱ء کی بڑی سیڈان "ڈاج" "موٹر کار برائے فروخت ہوتی ہے" کا ایک چھوٹا سا بورڈ سامنے کے آئینہ پر لٹکایا ہے اور موٹر کو صحن میں ایک درخت کے نیچے بڑی حفاظت کے ساتھ رکھ چھوڑا ہے۔

ہمارے ایک دوست کو "سکنڈ ہینڈ" کار کی ضرورت تھی، ایک واقف کار کی حیثیت سے ہم ان کی ہمرکابی کی عزت حاصل کرنے پر مجبور کئے گئے اور چلے موٹر دیکھنے۔ کوئی تین بجے ہونگے کہ ہم دونوں در دولت پر پہنچے۔ وہاں ایک "مرد معقول" سے آمنا سامنا ہوا۔ ٹھگنا سا قد، گندمی دھوپ چھاؤں رنگ، جھرا ہڈیوں پر منڈھا ہوا، گال سے زیادہ کن پٹیاں پچکی ہوئیں، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑے بڑے کان، چونچ دار ناک، چگی داڑھی، موٹا ہفت پیوند پاجامہ، باریک ململ کا نسبتاً اجلا ڈھیلا ڈھالا کرتہ، اس پر پرانا، عمر سے کا ہے بازاری بلٹ، سر پر ایک لچھے دار پرانی جو کسی زمانے میں غالباً سالو کے رنگ کی ہوگی بہت ڈھیلی شاگرد پیشہ کی پگڑی۔ ان حضرت سے معلوم ہوا کہ سرکار خاصہ پر ہیں"!

ہم نے موٹر دیکھنے کی اجازت چاہی، جواب ملا
"ٹھیرو! سرکار آتیں"!!
اتنے میں آواز آئی "کیا ہے مدار صاب کون ہے"؟
"مدار صاب گویا ہوئے" "سرکار دو جنے موٹر دیکھتے بولتیں!
ارشاد ہوا "اچھا دیکھو بولو"!

ہماری پریشانی کی کوئی حد نہ تھی جب ہم نے یہ محسوس کیا کہ "مدار صاب" کے سرکار بغیر دکھائی دئے وہیں کہیں سے بول رہے ہیں حسب الحکم ہم موٹر کے پاس لائے گئے، موٹر کیا تھی بہادر شاہ سرد و گرم روزگار چشیدہ، گویا اپنے وقت کی "مدار صاب" تھی اندر جو نظر پڑی تو دیکھتے کیا ہیں، ایک گل موچھ، ڈاڑھی جیٹ دو گوشتہ "سرکار برآمد ہیں۔ لٹھے کا نکمہ دار کرتہ پہنے ہوئے ہیں، سر بال صفا ہے اور ہاتھوں میں لو اسیبر و نو اسیبر کے کئی چھلے ہیں۔

اب یہ عقدہ کھلا کہ سرکار ہی "سروش غیب" تھے۔ "مدار صاب" نے بالکل سچ کہا تھا کہ "سرکار خاصہ پر ہیں"! موٹر میں ایک تپائی تھی، کچھ تپائی پر اور کچھ گدے پر رکابیاں، کٹور سے بکھرے پڑے تھے۔ باریک چانول ابلے ہوئے مشقاب بھر، خمیری روٹیوں کا اونتر، تلا ہوا چرب مسالہ دار تقریباً سیر بھر گوشت، دو چار لال بھبو کے سالن، بالائی، شکر۔ یہ تھا وہ "لیٹ لنچ" جو سرکار اڑا رہے تھے اور خوب پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ قریب میں پاندان تھا، ناس کی ڈبیہ تھی، ہاتھ کا نیلیا رومال تھا اور کچھ ہٹ کر ایک پست قد، جسیم "آتش بہ سر" پیچوان سرکار کی جنبش لب پر بولنے تیار رکھا تھا۔

جوں ہی سرکار نے ہمیں دیکھا ارشاد ہوا "سلام والیکم" اور اس طرح کہ "والیکم" کا "کم" باہر نہ نکل سکا، اس وجہ سے کہ سرکار کے "لقمہ" نے اس کو بیچوں بیچ دھر لیا۔

ہم نے وعلیکم السلام عرض کرتے ہوئے موٹر کو چلا کر دیکھنے کی اجازت چاہی، کسی قدر گرجتے ہوئے فرمایا "کیا میری موٹر چلتی نین سمجے رین؟ ذرا ٹھیرو! ڈریور بمبئی کو گیا ہے، آنے دیو چلا کر بتاتوں!!

اس "ذرا ٹھیرو" کی تکلیف ہمارے لئے ناقابل برداشت تھی، اس لئے ہم نے لب چباتے ہوئے عرض کیا "اجازت ہو تو ہم خود چلا کر دیکھ لیتے ہیں"

بپھرتے ہوئے فرمایا "نئیں جی او پکچ ہاتھ پو بھی چلتی ہے" یہ سنکر ہم لاجواب ہوگئے اور اس ملاقات کو جلد ختم کرنے کی نیت سے لجلجاتے ہوئے قیمت دریافت کی۔

ارشاد ہوا "بیچوں گا تو نئیں، پن کیا قیمت کو بیچوں گا سو بی نین بول سکتا"

ہم نے پھر حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہوئے آداب عرض کیا اور لوٹنے لگے۔ "مدار صاب" چند قدم ہمارے ساتھ آئے اور احتیاطاً ادھر ادھر دیکھکر آہستہ سے کہا۔

"بڑی بیگم صاب کی کندی کر کو آئیں۔ ابی گرم ہین، پھر کو آؤ"!

"باغبان"

سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ ۱۱۷ صفحات قیمت ؏، غزنین کی فارسی شاعروں اور وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا مبسوط تذکرہ۔

سلطان محمود کی ادبی سرپرستیاں اور اس کے دربار کے شعرا کے حالات اور کلام پر تبصرہ فارسی زبان پر ان شعرا کی کاوشوں کا اثر وغیرہ

جون آف آرک کی زندگی کے چار دور

جون آف آرک

(فرانس کی اس مشہور دوشیزہ کے حالاتِ زندگی پر ادارہ کی طرف سے ایک دلچسپ کتاب لکھی جا رہی ہے جس کے تعارف کے طور پر یہ مضمون درج ہے۔)

مشرق اپنی مردہ پرستی کی وجہ سے بدنام ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ بہت کم خوش نصیب صاحبِ کمال ایسے گذرے ہیں جن کی قدر ان کی زندگی میں کی گئی۔ لیکن یہ کمزوری صرف ایشیائی ممالک تک محدود نہیں۔ یورپ میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں گو ان کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ ذیل میں فرانس کی ایک باعصمت دوشیزہ کی کہانی لکھی جاتی ہے جو بقول "راسکوپ تھیبیر" اپنی زندگی میں ایک بدکار سفلی روح اور انسانیت کے لئے باعثِ ننگ سمجھی جاتی تھی لیکن مرنے کے بعد صاحبِ کشف و کمال اور مقدس ہستی سمجھی گئی اور اس کی پوجا کی جانے لگی۔

آج سے تقریباً پانسو سال پہلے متعدد لڑائیوں کے بعد فرانس پر انگلستان کی سیادت قائم ہوگئی۔ تخت کا جائز وارث فرار ہو کر پائٹیرز چلا گیا اور اس کی ماں نے سفارش کر کے تخت و تاج انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

فرانس کی ابتری اور بربادی انتہا کو پہنچ چکی تھی لیکن ایک گڈرئیے کی لڑکی نے جس کا نام جون تھا چند ہی سال میں فرانس کو پھر آزادی دلا دی۔

فاتح اعظم نپولین کے وطن کی خاک سے یوں تو بہت سی بڑی ہستیاں اٹھیں اور فرانسیسی بلانویس افسانہ نگاروں نے بہتیرے مکمل اور نصب العینی تخیلی کردار پیدا کئے۔ لیکن کوئی تاریخی یا افسانوی شخصیت جون کی بلندی پر نہیں پہنچ سکی۔

جون آف آرک کے واقعات شروع سے آخر تک کچھ اس نوعیت کے ہیں کہ آج مادیت کے چرچے کی وجہ سے بہت کم لوگ ان پر یقین کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جون آف آرک ایک روز اپنے گاؤں میں گلہ بانی کر رہی تھی کہ ایک غیبی آواز اس کے کان تک پہنچی جو یہ تھی "جا، فرانس کو آزاد کرا اور روئن میں شہزادہ ڈافن کو تاج پہنا"

اس آسمانی حکم کے سنتے ہی یہ لڑکی اپنے باپ کے پاس پہنچی اور اس کو سارا واقعہ سنایا۔ باپ نے مسکرا کر کہا "پاگل ہو گئی ہے"۔ وہ خاموش ہو گئی۔ لیکن خدائی آواز روزانہ سوتے جاگتے اس کے کانوں میں پڑتی رہی یہاں تک کہ لوگ مذاق اڑاتے اور اسے پاگل بناتے ہی رہے لیکن وہ ایک درباری رئیس کے توسط سے ڈافن تک پہنچ گئی۔ ڈافن کو جون آف آرک کے دعوؤں کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ اس نے پہلا امتحان اس طرح لیا کہ اپنی جگہ ایک اور شخص کو دے کر خود درباریوں میں جا بیٹھا۔ لیکن شہزادہ اور اہلِ دربار کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ جون جس نے کبھی شہزادے کو نہیں دیکھا تھا سیدھا اسی کے پاس پہنچ گئی اور اس کا نام لے کر اسے مخاطب کیا۔ اور بھی آزمائشیں ہوئیں جس کے بعد فوج کی کمان جون کے حوالے کی گئی۔

جون نے چاند سلطانہ کی طرح مردانہ اور سپاہیانہ لباس پہن لیا۔ ہتھیار لگائے اور شہزادے کے دئے ہوئے سفید گھوڑے پر سوار ہو کر نکلی۔ دشمنوں سے جہاں جہاں مقابلہ ہوا اس نے انہیں شکست دی۔ ایک لڑائی میں تیر سے زخمی

ہوکر دیوار پر سے نیچے گری لیکن اس حالت میں بھی فوج کو برابر بڑھاوے دیتی اور سپاہیوں کے دل بڑھاتی رہی۔ دوست دشمن سب حیران تھے۔ خود جون کے ساتھی اسے ساحرہ سمجھ کر ڈرنے لگے تھے۔ مقابلے جاری رہے اور کامیابیاں ہوتی رہیں یہاں تک کہ انگریزوں کے پیر اکھڑ گئے۔

خدائی احکام کی تعمیل کے یہ اہم مدارج طے ہو چکے۔ اب صرف تخت نشینی باقی تھی۔ جون نے شہزادے سے کہا کہ وہ "روئن" چل کر تاج و تخت سنبھالے لیکن شہزادہ ڈرا ہوا تھا۔ بہ قول شخصے اس کا باپ پاگل اور ماں دغاباز تھی۔ جون کے بارے میں دنیا بھر کے شبہات اس کے دل میں تھے۔

بالآخر شہزادہ راضی ہو گیا اور اس کو ساتھ لے کر جون آف آرک "روئن" پہونچی۔ تاج ڈافن کے سر پر رکھا اور یہ کہہ کر کہ آسمانی احکام کے مطابق اس کے فرائض پورے ہو چکے ہیں، اپنے گاؤں کو واپس جانے کی اجازت چاہی۔ کاش اس کی اجازت جون کو مل جاتی مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ ڈافن نے جون کے عزیزوں کو جاگیر اور منصب سے سرفراز اور جون کو اپنے ساتھ ہی رکھا۔

جون کے بارے میں لوگوں کے شبہات بڑھتے گئے انھوں نے علی الاعلان کہنا شروع کیا کہ جون ساحرہ ہے اور اس نے سفلی ارواح کی مدد سے فوق الانسان مہمیں سر کی ہیں۔ صداقت کے آفتاب پر کذب اور افترا کے کالے کالے بادل چھانے لگے یہاں تک کہ تاریکی پھیل گئی۔ علما اور ہادیان مذہب نے بھی عوام کی ہاں میں ہاں ملائی یہاں تک کہ فرانس نے ـــــ جون کے وطن نے.... اس سرزمین نے جس کے لئے جون نے اپنی جان کو خطرات میں ڈال دیا تھا اور جس کی محبت کا خون جون کی رگ رگ میں دوڑ رہا تھا ـــــ اپنے اس محسن کو سولہ ہزار پاؤنڈ قیمت لے کر انگریزوں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

جون کی زندگی کے ڈرامے کا تیسرا ایکٹ سینکڑوں حزنیوں سے بھی کہیں زیادہ دردناک ہے کہا جاتا ہے کہ عدالت اندھی ہوتی ہے اس قول کا اطلاق سب سے زیادہ اس عدالت پر ہوتا ہے جس میں جون پر مقدمہ چلایا گیا۔ بڑے بڑے ماہرین قانون اور انسان دشمنوں نے قسم قسم کے سوالات کرکے اور جرح کے ذریعہ جون کو پھانسنا چاہا لیکن حقیقت ہمالیہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمی رہی۔ توہم پرست اور کمزور اعتقاد کے لوگوں نے اس کو سحر سامری سمجھا۔ آخرکار خود عدالت کے منشی کا بیان ہے کہ جون کے بیانات میں مجرمانہ تحریف کی گئی۔ دنیا کی اس عظیم الشان ہستی کے لئے موت کی سزا تجویز ہوئی۔

بڑے آدمیوں کی موت بھی بڑی ہی ہوتی ہے جون کو سولی نہیں دی گئی۔ اسے زہر نہیں کھلایا گیا۔ اس کا سر نہیں کاٹا۔ اس لئے کہ جو گناہ فرانس کو آزاد کرکے اس نے کئے تھے ان کی سزا دینے کے لئے یہ سارے عام طریقے غیر مناسب سمجھے گئے۔

شہر روئین کے ایک پبلک مقام پر جون کے لئے چتا تیار ہوئی۔ اور آن کی آن میں فرانس کی یہ موہنی مورت بھڑکتے ہوئے شعلوں میں چھپ گئی۔ ہزاروں آدمی کھڑے دیکھ رہے تھے اور دیکھتے رہے یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے

شعلے بیٹھ گئے اور آگ راکھ بن کر چاروں طرف اڑنے لگی۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور خوشی خوشی گھر لوٹے کہ ایک بدکار کاہنہ کا خاتمہ ہوگیا۔

لیکن یہ لوگ غلطی پر تھے۔ ان شعلوں نے جون کا خاتمہ نہیں کیا بلکہ اس کی عظمت اور تقدس میں ہمیشہ کے لئے چار چاند لگا دیئے۔ حقیقت کے چہرے سے کذب وافترا اور توہمات کے پردے جلد جلد اٹھنے لگے اور جون کی عظمت کی کرنیں سارے فرانس میں پھیلنے لگیں۔ جون آف آرک سینٹ جون کہلانے لگی۔ فرانسیسی اس کے نام پر جان دیتے ہیں۔ جون آف آرک فرانس کے غیر فانی ادیبوں، مصوروں اور مورت سازوں کا موضوع بن گئی۔ آج بھی پیرس کی شاہراہ پر جون آف آرک کا مجسمہ فرانسیسیوں کو یاد دلاتا ہے کہ آزادی پانی اور ہوا کی طرح تمام قوموں کا فطری حق ہے۔

میر حسن

اردو

اے جمالِ پیکرِ ہندوستان تیرا عالم میں رہے اونچا نشاں

اے کہ پالا ہے بزرگوں نے تجھے آفتیں سہہ کر اٹھا کر سختیاں

مر گئے پر تجھ کو زندہ کر گئے! داستاں تیری ہے کتنی خونچکاں

پھر یہ کیسے ہم سے دیکھا جائیگا کوندتی ہوں تیرے سر پر بجلیاں

لوحِ ہستی سے مٹانے کی تری دشمنوں میں ہوتی ہیں سرگوشیاں

کوئی یہ پیغام پہنچا دے انہیں کوششیں بے سود، محنت رائیگاں

تجھ کو حاصل ہوگئی اقبال سے سربلندی، اور عمرِ جاوداں!

تو نہ ڈر مطلق کہ حق ہے تیرے ساتھ ہیں ترے فرزند بھی لاکھوں جواں

جن کا دل سیماب جن میں جوش ہے بازوؤں میں زور جیسے پہلواں

اختروں کی طرح تابندہ تمام! جن سے روشن ہیں زمین و آسماں

آنچ آئے تجھ پہ یہ ممکن نہیں تیرے دم کے ساتھ ہے ہم سب کی جان

شور عابدی (گلبرگہ)

اردو کی نئی کتابیں

ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ تنقید و تبصرہ کے پہلے جلسہ کی قرارداد مورخہ ۶ بہمن ۱۳۴۸ف کے مطابق ہندوستان کی جدید اردو مطبوعات کی فن وار فہرست ہر مہینہ رسالہ "سب رس" میں درج ہوا کرے۔ ماہ جنوری ۱۹۳۹ء سے اس فہرست کی اشاعت پابندی سے ہو رہی ہے۔ "سب رس" کی صرف دو تین اشاعتوں میں جگہ کی تنگی کی وجہ سے یہ فہرست درج نہ ہو سکی۔

اس فہرست کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ ناظرین سب رس کو مختلف مضامین کی مطبوعات میں سے اپنے ذوق کی کتابیں انتخاب کرنے کا پہلا موقع ملے، اس کے علاوہ مصنفین، مولفین اور ناشرین کو بھی اس فہرست کی اشاعت سے استفادہ کا موقع ملتا ہے، وہ اس طرح کہ ان کی تصنیف، تالیف اور مطبوعات کی نشر و اشاعت ہندوستان کے طول و عرض میں جہاں جہاں "سب رس" کی رسائی ہوتی ہے بلا کسی معاوضہ کے ہوا کرتی ہے۔

زیر نظر فہرست میں کوشش کی گئی ہے کہ آخر ستمبر ۱۹۳۹ء تک کی جملہ اردو کتابوں کی تعداد فن وار درج ہو، چونکہ آخر سہ ماہی ۱۹۳۹ء کی مطبوعات کی فہرست اس وجہ سے لکھی نہ جا سکی کہ اس نمبر کی کتابت ماہ نومبر ہی میں شروع کر دی گئی۔ اس لئے آخر سہ ماہی ۱۹۳۸ء کی مطبوعات بھی اس فہرست میں شریک کر لی گئی ہیں تاکہ پورے ایک سال کے اعداد و شمار سے ناظرین کو واقفیت ہو، اس فہرست کی ترتیب میں ہندوستان بھر کے اردو رسالوں، مختلف کتب خانوں اور چھاپے خانوں کی فہرستوں اور مقامی کتب فروشوں سے مواد حاصل کیا گیا ہے۔

آخر سہ ماہی ۱۹۳۸ء سے آخر نو ماہی ۱۹۳۹ء تک سوانح، افسانہ، ڈراما، شاعری، فلسفہ، تاریخ، ادب، طب، سیاست، قانون، مذہب، اخلاقیات، ریاضیات، نفسیات، نسوانی ادب و خانہ داری وغیرہ وغیرہ پر جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی تعداد فن وار ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

سوانح ۷۳، افسانہ ۱۰۲، ڈراما ۱۵، شاعری ۱۲۶، فلسفہ ۳، تاریخ ۸۶، ادب ۱۹۰، طب ۴۸، سیاست ۲۵، قانون ۲۲، مذہب ۱۵۷، اخلاقیات ۴، ریاضیات ۶۹، سفرنامہ ۳، نفسیات ۱۴، نسوانی ادب و خانہ داری ۲۵، لغات ۴، صنعت و حرفت ۴، معاشیات ۲، تعلیم ۲، متفرق ۹۳،

اس طرح ایک سال میں جملہ ۱۰۶۷ اردو کی کتابیں شائع ہوئیں، ادب، مذہب اور شاعری پر سب سے زیادہ کتابیں طبع ہوئیں ان کے بعد افسانہ تاریخ اور سوانح کا نمبر رہا، ریاضیات پر بھی کافی کتابیں نکلیں، ان میں سے جو اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کی تفصیل فن وار ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

سوانح

(۱) حیات عثمانی (سلطان العلوم اعلیٰ حضرت آصف جاہ ہفتم کے حالات) از شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی ۴۰۸ صفحات قیمت عہ

(۲) ہٹلر اعظم (ہر ہٹلر کی سوانح عمری) از پروفیسر چندر شیکھر شاستری ۴۰۰ صفحات قیمت مجلد سے

(۳) اشرف السوانح (اشرف علی صاحب تھانوی کی سوانح عمری) ۲۹۸ صفحات

(۴) تذکرہ وقار (نواب وقار الملک مرحوم کی سوانح) ۳۰۸
صفحات قیمت عہ
(۵) محمد علی جناح (جناح کے حالات) از عبدالعزیز صاحب
(۲۵۶) صفحات ۔
(۶) سخنوران دکن (عہد عثمانی کے شعرا کا تذکرہ) از سید
تمکین صاحب عابدی ۴۸۴ صفحات قیمت سے
(۷) اتاترک ۔ باتصویر (مصطفیٰ کمال مرحوم کی سوانحعمری)
از محمد مرزا صاحب آزاد ۲۰۰ صفحات قیمت عہ
(۸) روح غالب ۔ باتصویر (غالب کی سوانحعمری) از ڈاکٹر
سید محی الدین صاحب زور ۲۴۰ صفحات قیمت عہ
(۹) مشاہیر ہند (چند مشہور لوگوں کے حالات) از سید
بادشاہ حسین صاحب ۱۳۱ صفحات قیمت عہ
(۱۰) حیات و کلیات اسمٰعیل باتصویر (محمد اسمٰعیل صاحب کی
سوانح عمری مع مجموعہ کلام) دوسرا ایڈیشن مرتبہ محمد اسلم صاحب
سیفی ۷۰۸ صفحات قیمت للعہ
(۱۱) سر سید (سوانحعمری) مرتبہ انصار الحق صاحب ۱۴۰ صفحات
قیمت ۸/
(۱۲) عہد حاضر کے بڑے لوگ حصہ اول و دوم باتصویر
(مشہور سیاسی رہنماؤں کے حالات) ۲۵۶ صفحات قیمت عہ
(۱۳) سیرت سید احمد شہید (سید احمد صاحب بریلوی کی سوانح
عمری) از سید ابوالحسن علی صاحب ۴۴۴ صفحات قیمت عہ
(۱۴) آب حیات کے لطیفے (آزاد مرحوم کے حالات)
از آغا محمد اشرف صاحب ۱۴۴ صفحات قیمت عہ
(۱۵) رحمۃ للعالمین جلد اول (آنحضرت کے حالات) از
قاضی محمد سلیمان صاحب ۔ ۴۶۴ صفحات قیمت عہ
(۱۶) مشاہیر پولیس (پنجاب پولیس کے چند افسروں کے کارنامے
از مرزا فرید الدین بیگ صاحب ۳۹۱ صفحات
(۱۷) رئیس قادیان حصہ اول (مرزا غلام احمد صاحب قادیانی
کے حالات) ۲۱۴ صفحات
(۱۸) شہید مکسوینی (آئرش محب وطن کی سوانحعمری) ۲۴۱ صفحات
(۱۹) سیرت اقبال از محمد طاہر صاحب فاروقی ۳۰۹ صفحات
قیمت سے
(۲۰) حیات اقبال (مرتبہ تاج کمپنی لاہور) ۲۱۵ صفحات قیمت عہ
(۲۱) میری جد و جہد (ہٹلر کی خود نوشت سوانح عمری کا ترجمہ)
۲۶۵ صفحات قیمت عہ
(۲۲) حضرت امام حسینؓ کی مختصر سوانح عمری) از ظفر حسن صاحب
۲۳۲ صفحات
(۲۳) کمال اتاترک (محمد توفیق کی ترکی کتاب کا ترجمہ) ۸۸ صفحات
قیمت عہ
(۲۴) واقعات ظفری (مترجمہ محمد حسین صاحب محوی لکچرار اردو
مدراس یونیورسٹی ۔ قیمت عہ
(۲۵) رسول پاک (از عبدالواحد صاحب سندھی) ۱۲۵ صفحات
قیمت ۸/
(۲۶) میری کہانی میری زبانی (سید ہمایوں مرزا صاحب مرحوم
بیرسٹر کی خود نوشت سوانح) مرتبہ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ
۳۲۸ صفحات قیمت سے
(۲۷) شاہ نعمت اللہ ولی از ایم ۔ اے حنیف ۸۰ صفحات ۔ ۸/
(۲۸) خود نوشت سرگذشت (مسولینی کے حالات) ۲۸۶ صفحات
قیمت عہ
(۲۹) تذکرہ حضرت عبدالرحمن بن عوف (از مولوی فضل اللہ صاحب
۲۴۰ صفحات ۔ قیمت عہ
(۳۰) محمد علی جناح (از احسان اللہ صاحب کرمانی ۲۸ صفحات قیمت ۱۰/

(۴۱) لینن (مترجمہ ڈاکٹر محمد اشرف صاحب قیمت مجلد عیعہ
(۴۲) غالب با تصویر (غالب کی خود نوشت سوانح عمری)
مرتبہ چودہری غلام رسول صاحب مہر ... ۴۰ صفحات قیمت ۸ے)
(۴۳) شعرائے پنجاب (پنجاب کے موجودہ شعرا کے حالات
معہ نمونہ کلام) مرتبہ ملک محمد باقر صاحب رضوانی ۳۰۶ صفحات
قیمت عہ
(۴۴) ہلال و تصلیب (سلطان صلاح الدین کی سوانح) از ایم
اسلم صاحب ۲۵۰ صفحات قیمت عاں
(۴۵) گلبدن بیگم (شہزادی گلبدن کی سوانح عمری) از سید
ابن حسن صاحب شارق ۱۰۰ صفحات قیمت ۱۲ر
(۴۶) مشاہیر عالم (سولہ مشاہیر کے حالات) از سکے سے
حمید سیر سٹر ۲۳۶ صفحات قیمت عہ
(۴۷) وداع راشد (حیات راشد کا آخری باب) رزاق الخیری
۹ صفحات قیمت ۸ر

افسانے

۱۔ محبت کا فسانہ (از لطیف الدین احمد صاحب اکبر آبادی
۴۴ صفحات قیمت عاں
۲۔ ربیعہ (از خالدہ ادیب خانم مترجمہ عبدالرسیم صاحب
شبلی ۴۴ صفحات قیمت عصہ۔
۳۔ پس پردہ (سات مختصر افسانے) از چندر بھوشن سنگھ
صاحب۔ ۱۲۸ صفحات قیمت عصہ
۴۔ گئودان (ناول) از منشی پریم چند صاحب ۶۵۰
صفحات قیمت عاں۔ مکتبہ جامعہ ۔ دہلی۔
۵۔ میری کہانی: سنئے گا؟ از سید علی صاحب شاکر ۱۲۵
صفحات قیمت عصہ

۶۔ انسپکٹر کی لڑکی (ناول) از یم جیکب صاحب
۱۶۰ صفحات
۷۔ ماتا ہری۔ از خلیل احمد صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عصہ
۸۔ لالہ رخ با تصویر۔ جدید ایڈیشن مترجمہ لطیف الدین احمد
صاحب۔ قیمت مجلد عاں
۹۔ ساز ہستی (افسانہ) از عبدالاحد صاحب فہرودن ۱۹۰
صفحات
۱۰۔ خدائی راج اور دوسرے افسانے۔ از علامہ
راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت عصہ
۱۱۔ افسانہ بابل از سردار محمد اقبال صاحب سیف ۱۶۰
صفحات قیمت ۱۲ر
۱۲۔ شب غم از میاں ایم۔ اسلم صاحب قیمت عصہ ۴ر
۱۳۔ پریت افسانے حصہ دوم از گربخش سنگھ صاحب
۲۵۵ صفحات۔
۱۴۔ ہاشمی دوشیزہ حصہ اول و دوم (عہد عباسی کا
تاریخی ناول) از محمد صادق حسین صاحب ۲۸۰ صفحات
۱۵۔ خودکشی کی انجمن (اسٹونس کے ناول سوئی سائڈ
کلب کا ترجمہ) از عبدالمجید خاں سالک ۲۰۴ صفحات
۱۶۔ زندگی کے کھیل (مختصر افسانے) از لطیف الدین
احمد صاحب ۱۶۰ صفحات قیمت عصہ
۱۷۔ تسخیر استنبول (تاریخی ناول) از محمد مائل صاحب
۲۵۶ صفحات۔
۱۸۔ جنت اور جہنم (ناول) از کرشن چندر صاحب قیمت عاں
۱۹۔ باسی پھول۔ (افسانے) از سید علی عباس صاحب حسینی
۴۰۰ صفحات۔ قیمت عصہ
۲۰۔ طلسم خیال۔ (افسانے) از کرشن چندر صاحب ۲۵۰

صفحات قیمت عہ

۲۱ - قطرات شبنم (افسانے اور ادبی مضامین) از لالہ گوردھن داس صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عہ

۲۲ - خون ملت (تاریخی ناول) از محمد مائل صاحب ۲۷۶ صفحات قیمت عہ

۲۳ - بیسویں صدی کی سیاہکاریاں (عبرت خیز افسانے) از یس. یس منور صاحب ۱۰۲ صفحات قیمت عمہ

۲۴ - سعی ناکام اور دیگر افسانے از امتہ الرفیق صاحبہ ۱۲۰ صفحات

۲۵ - منزل - از علی سردار صاحب جعفری قیمت ۱۲ر

۲۶ - انوکھے افسانے (جاسوسی افسانے) از شیخ بدرالاسلام صاحب فضلی ۲۰۰ صفحات

۲۷ - کاشانہ نادر (ناول) از عطاء الرحمن صاحب عطا ۲۴۸ صفحات قیمت عہ

۲۸ - اندھی دنیا - (کہانیاں) از اختر انصاری صاحب ۱۵۸ صفحات قیمت عمہ

۲۹ - لندن کی ایک رات (افسانہ) از سید سجاد ظہیر صاحب ۱۵۲ صفحات قیمت عمہ

۳۰ - خواب فراموش (انگریزی ناول کا ترجمہ) ۲۵۰ صفحات قیمت عمہ

۳۱ - ماہ درخشاں (ناول) از بیگم مرزا احمد علی صاحب ۵۵۰ صفحات قیمت مجلد عاں

۳۲ - قاتل (مختصر افسانے) از میاں محمد اسلم صاحب ۲۵۶ صفحات

۳۳ - طلسم حیات (کہانیاں) از منظور حسین صاحب ماہر القادری ۲۰۴ صفحات قیمت مجلد عاں

۳۴ - جواہرات (اخلاقی افسانے) از چودھری افضل حق صاحب ۲۲۴ صفحات

۳۵ - پری اور دیگر افسانے) از راحت آرا بیگم صاحبہ ۱۲۸ صفحات

۳۶ - آئی۔سی۔یس۔ (اخلاقی افسانے) از سید عباس علی صاحب حسینی قیمت عہ

۳۷ - وفا کا پتلا ("دی ریڑن آف آرسین لوپن" کا ترجمہ) از تیرتھ رام صاحب فیروزپوری ۲۰۴ صفحات قیمت عاں

۳۸ - خاموش حسن (ٹیگور کے افسانوں کا ترجمہ) ۲۲۴ صفحات قیمت عہ

۳۹ - فریبی ڈاکو (جاسوسی ناول) از راجہ رام صاحب ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۲ر

۴۰ - لعل مقدس (دی اکیوزڈ پرنسس کا ترجمہ) از تیرتھ رام صاحب فیروزپوری ۲۲۴ صفحات قیمت عاں

۴۱ - من کی دنیا (جدید طرز کے افسانے) از رشید صاحب قریشی ۱۶۰ صفحات قیمت مجلد عمہ

۴۲ - بحری طوفان (ناول) از نعیم اللہ صاحب کوثر ۲۰۰ صفحات

۴۳ - مسلمان مجاہد (ناول) از خواجہ نذیر احمد صاحب ۸۰ صفحات

۴۴ - معیار محبت اور دیگر افسانے (از سیاح سنائی صاحب جرنلسٹ ۱۲۷ صفحات قیمت عمہ

۴۵ - سحر فرانس (موپساں کے افسانوں کا ترجمہ) از طاہر قریشی صاحب ۳۲۵ صفحات قیمت عہ

۴۶ - انمول کہانیاں (بارہ انقلابی افسانے) از شوکت عثمانی صاحب ۱۳۱ صفحات قیمت ۱۲ر

۴۷ - کیلے کا چھلکا اور دیگر مضامین (مزاحیہ افسانے و مضامین) از سند باد جہازی صاحب ۱۷۶ صفحات قیمت عمہ

۴۸ - ایک کہانی - چہار دیسوں کی زبانی) از نیاز۔ل۔احمد علی عباس وغیرہ

۲۰۷ صفحات قیمت ۶ر

۴۹ - چوپال (دیہاتی افسانے) از احمد ندیم صاحب قاسمی ۳۰۴ صفحات قیمت عہ

۵۰ - محبت کی چھاؤں (افسانے) از مرزا ظفر الحسن بی۔ اے ۱۳۲ صفحات قیمت ۱۲ر

۵۱ - ڈاچی (افسانے) از اپندر ناتھ اشک ۲۰۸ صفحات قیمت عمہ

۵۲ - صدائے جرس (افسانے) از والدہ سراج الدین ظفر ۳۰۰ صفحات قیمت ۱۲ر

۵۳ - افسانہ پدمنی (اور رانی پدمنی کے فسانہ کی مورخانہ تحقیق) از احتشام الدین ایم۔ اے ۱۵۰ صفحات قیمت عمہ

ڈرامے

۱ - ریڈیو ڈرامے (آٹھ ڈراموں کا مجموعہ از فضل حق صاحب قریشی ۱۹۲ صفحات قیمت عمہ

۲ - انارکلی (تیسرا ایڈیشن) از سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔ اے ۱۹۸ صفحات قیمت ۱۲ر

۳ - تسلیم (المیہ ڈراما) از سید مظہر علی صاحب گیلانی ۱۹۸ صفحات قیمت ۶ر

۴ - پہلا شراب کار (ٹالسٹائی کے ڈرامہ کا ترجمہ) از محمد یونس صاحب سلیم ۴۰ صفحات قیمت ۴ر

۵ - بے انصافی کا انصاف (عدالتوں کی بے انصافیاں) از پنڈت دیودت صاحب شرما ۳۱۰ صفحات قیمت عمہ

شاعری

۱ - باغی (باغیانہ نظمیں) از اعجاز قریشی صاحب ۱۲۵ صفحات قیمت عمہ

۲ - گلستان شرف (اردو و فارسی کلام کا مجموعہ) از سید ابو الفتح شرف الدین الحسینی صاحب شرف ۱۲۰ صفحات قیمت عمہ

۳ - نور مشرق (نظمیں) از جوہر لال صاحب ضیا فتح آبادی۔ ۱۳۶ صفحات قیمت عمہ

۴ - نیرنگ فطرت (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ) از پنڈت اندرجیت صاحب شرما ۲۱۷ صفحات قیمت ۱۲ر

۵ - افکار سلیم (وحید الدین صاحب سلیم کی نظمیں) مرتبہ محمد اسمٰعیل صاحب پانی پتی ۳۱۸ صفحات قیمت عہ

۶ - دیوان بیدار (میر محمدی صاحب بیدار کا مجموعۂ کلام) مرتبہ محمد حسین صاحب محوی صدیقی لکچرار اردو مدراس یونیورسٹی قیمت عہ

۷ - جنون و حکمت (رباعیات کا مجموعہ) از جناب جوش ملیح آبادی قیمت عہ

۸ - آہنگ (نظمیں) از اسرار الحق صاحب مجاز ۱۰۴ صفحات قیمت عمہ

۹ - الخیام (عمر خیام کی رباعیوں کا اردو ترجمہ) از رائے گورسرن لال صاحب آزاد قیمت ۱۲ر

۱۰ - میخانۂ الہام (مجموعۂ کلام) از جناب شاد عظیم آبادی قیمت ۱۲ر

۱۱ - ارمغان حجاز (علامہ اقبال کا آخری کلام) قیمت ۸ر

۱۲ - نغمۂ حرم (نظمیں) از اختر صاحب شیرانی قیمت ۱۲ر

۱۳ - آہ کے سو شعر از ڈاکٹر سید محمد صفدر صاحب آہ قیمت ۸ر

۱۴ - ترجمان الغیب (حافظ کی چھ سو غزلوں کا منظوم ترجمہ) از محمد احتشام الدین ایم اے ۲۳۲ صفحات قیمت ۱۲ر

۱۵ - آہنگ رزم (رزمیہ نظمیں) از جناب قمر انبالوی ۴۴ صفحات قیمت ۸ر

۱۶ - تصویر کشمیر (نظمیں) از جناب حفیظ جالندھری۔ قیمت ۸ر

۱۷ - نغمانہ ازل (نعتیہ کلام) از محمد یونس صاحب خلیل ۹۰ صفحات قیمت عمہ

۱۸ - نغمۂ نور (غزلیں اور نظمیں) از جناب بہزاد لکھنوی ۰۰ ۲ صفحات قیمت عہ

۱۹ - بادۂ فطرت (مجموعۂ کلام) از میر زیدی صاحب ۲۸۸ صفحات قیمت ۱۲ ر

۲۰ - حدیثِ حسن (نظمیں) از شمیم احمد صاحب فطرت قیمت عہ

۲۱ - اربعہ عناصر (رباعیات) از حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر ۲۰۸ صفحات قیمت عہ

۲۲ - حرف و حکایات (نظمیں) از جناب جوش ملیح آبادی ۲۴۸ صفحات قیمت عہ

۲۳ - قندیلِ نور (مرثیوں کا مجموعہ) از جناب نور لدھیانوی ۱۸۴ صفحات

۲۴ - دیوانِ ثاقب (از مرزا ذاکر حسین صاحب ثاقب لکھنوی ۵۵۰ صفحات قیمت عا

۲۵ - تصویرِ احساس (مجموعہ کلام) از الطاف مشہدی صاحب قیمت عا

۲۶ - ارمغانِ جذب حصہ دوم (رباعیات) از راگھو ندر راؤ صاحب جذب ۱۲۰ صفحات قیمت ۱۲ ر

۲۷ - کلیاتِ بحری (قدیم دکھنی شاعر) مرتبہ ڈاکٹر محمد حفیظ سید صاحب ۲۱۲ صفحات قیمت ے

۲۸ - ریاضِ حیدر (مرثیوں کا مجموعہ) از حیدر عباس صاحب رضوی ۲۰۰ صفحات

۲۹ - نغمۂ نانک (مجموعۂ کلام) از نانک چند صاحب نانک لکھنوی ۲۵۲ صفحات

۳۰ - تمثیلی مشاعرہ (مشہور قدیم شعرا کا کلام ڈرامائی طرز میں) از پنڈت کیفی صاحب ۱۰۰ صفحات قیمت عہ

۳۱ - سرودِ جاوید (مثنوی سحر البیان پر تبصرہ) از شمس الحسن صاحب شمس ۲۰۴ صفحات

۳۲ - جوہرِ تخلیق (شاہنامہ کی ایک جنگ کا منظوم ترجمہ) از سید محمد علی صاحب چشم ۹۸ صفحات قیمت ۸ ر

۳۳ - شہنشاہ نامۂ اسلام (آنحضرتؐ اور خلفا کے غزوات) ۲۱۵ صفحات

۳۴ - تنقیدی مضامین (شعرا کے کلام پر تنقید) از ایم۔ ایم۔ اے ہاشمی صاحب و فیاض حسین صاحب زیدی۔

۳۵ - سریلی بانسری (مجموعہ کلام) از سید انور حسین صاحب آرزو ۲۰۰ صفحات قیمت عا

۳۶ - چراغاں (مجموعہ کلام) از جناب احسان دانش ۲۳۲ صفحات قیمت عہ

۳۷ - آتشِ خاموش (مجموعہ کلام) " " ۲۰۰ صفحات قیمت عہ

۳۸ - نفیرِ فطرت " " " ۲۰۰ صفحات قیمت عہ

۳۹ - جادۂ نو (قطعات) " " قیمت ۸ ر

۴۰ - نوائے کارگر (مجموعہ کلام) " " ۲۶۸ صفحات قیمت عا

۴۱ - تفصیلِ غالب (دیوانِ غالب کی شرح) از جناب احسان دانش قیمت عہ

۴۲ - خضرِ عروض (علم عروض کی الجھنوں کا حل) از جناب احسان دانش قیمت ۸ ر

۴۳ - فرحتِ دل (منتخب اشعار) از خان بہادر عبد اللہ خاں ۱۷۰ صفحات قیمت عہ

۴۴ - معارفِ جمیل (مجموعہ کلام) از حکیم آزاد انصاری ۲۵۶ صفحات قیمت عہ

۴۵ - گل نغمہ (نظموں کا مجموعہ) از ڈاکٹر عظیم الدین احمد عظیم قیمت عا

۴۶ - جذباتِ بسمل با تصویر (مجموعہ کلام) از منشی سکھ دیو پرشاد

بستل قیمت ۱۲؍

۴۷۔ پیام روح با تصویر (مجموعہ کلام) از حامد اللہ افسر قیمت ۱۲؍

۴۸۔ شعرائے عثمانیہ (مرقع سخن کی چوتھی جلد) مرتبہ سید معین الدین قریشی و عبد القیوم خاں باقی ۲۳۱ صفحات قیمت عہ

۴۹۔ عرفانیات فانی (کلیات) از شوکت علی خاں فانی قیمت عہ

۵۰۔ خونابۂ دل (مجموعہ کلام) از شعیب احمد ندرت میرٹھی قیمت عہ

۵۱۔ خمخانہ (مجموعہ کلام) از گورسرن لال آزاد ۲۱۲ صفحات قیمت عہ

۵۲۔ متاع اقبال (اقبال کی شاعری پر تبصرہ) از ابو ظفر عبد الواحد قیمت عہ

۵۳۔ تخلقہ (غزلوں اور نظموں کا مجموعہ) از حاجی لق لق قیمت عہ

۵۴۔ برق و باراں (انقلابی نظمیں) از شمیم کرمانی قیمت عہ

۵۵۔ کائنات دل (نظمیں) از منور لکھنوی ۳۵۰ صفحات

۵۶۔ اقبال اور اس کا پیغام (شاعری پر تبصرہ) از ڈاکٹر تصدق حسین خالد قیمت ۸؍

۵۷۔ یاد حکمت (حکمت اور ان کی شاعری پر مضامین) از پنڈت انند نرائن ملا ۱۷۰ صفحات

فلسفہ

(۱) فہم انسانی (ہیوم کی مشہور کتاب کا ترجمہ) ۴۹۱ صفحات

۲۔ خواب کی دنیا (خواب کی ماہیت اور اس کا فلسفہ) از عبد المالک صاحب ۱۹۰ صفحات قیمت عہ

۳۔ فلسفۂ حسن از مسٹر رام صاحب ۱۹۲ صفحات

۴۔ حیات کیا ہے (حیات کی ابتدا اور اس کے ارتقا پر تبصرہ) قیمت عہ

تاریخ

۱۔ دہلی کی دو سو برس کی تاریخ) از سید حسن صاحب برنی ۱۵۴ صفحات

۲۔ تاریخ مدینہ منورہ از غلام دستگیر صاحب نامی ۱۸۴ صفحات

۳۔ نور المبین (فرقہ اسماعیلیہ کے ائمہ کے تاریخی حالات) از علی محمد خاں صاحب ۸۰۰ صفحات قیمت عہ

۴۔ دنیا کی کہانی (تاریخی تقاریر کا مجموعہ) از پروفیسر محمد مجیب صاحب ۲۲۷ صفحات قیمت عہ

۵۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل (تین سو برس کی تاریخ) از سید طفیل احمد صاحب علیگ ۶۰۸ صفحات قیمت عہ

۶۔ تاریخ گولکنڈہ با تصویر (مشہور تاریخی قلعہ گولکنڈہ کے حالات) از پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی ۱۴۲ صفحات قیمت عہ

۷۔ شجرۂ آصفیہ (شجرۂ خاندان آصفی) از حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری ۵۹ صفحات معہ متعدد شجرے قیمت عہ

۸۔ مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ (اسلامی سیاسیات کی تاریخ) از عبد الوحید خاں صاحب ۵۲۴ صفحات

۹۔ تاریخ نظم و نثر از آغا محمد باقر صاحب ۳۱۶ صفحات

۱۰۔ مرقع ملتان از سید محمد اولاد علی صاحب گیلانی ۴۱۶ صفحات

۱۱۔ مدراس میں اردو۔ از نصیر الدین صاحب ہاشمی ۲۰۰ صفحات قیمت مجلد عہ

۱۲۔ تاریخ ائمہ (انبیا کرام و ائمہ طاہرین کے حالات) از سید علی عید صاحب ۵۰۴ صفحات قیمت عہ

۱۳۔ تاریخ اسلامی ہند از جناب نیاز فتحپوری ۲۲۴ صفحات قیمت عہ

۱۴۔ تاریخ ملت (ایام جاہلیت سے خلافت راشدہ تک کی تاریخ) از مسلم صاحب دہلوی ۲۸۴ صفحات

۱۵۔ برطانوی ہند کی تاریخ اور اس کے مورخین۔ از ڈاکٹر سر شفاعت احمد خانصاحب ۱۰۳ صفحات

۱۶۔ انقلاب حبش (حبش پر اطالیہ کے مظالم) از محمد اشرف خانصاحب۔ عطا قیمت ۱۲/

ادب

۱۔ پیام اقبال (علامہ اقبال کے پیام پر مضامین) ۳۰۰ صفحات قیمت عا/

۲۔ صحرا نورد کے خطوط از مرزا ادیب صاحب ۵۰۰ صفحات قیمت عہ/

۳۔ مضامین فراق از خواجہ سید ناصر نذیر صاحب فراق ۱۶۰ صفحات قیمت عمہ

۴۔ مضامین رشید (مزاحیہ) از رشید احمد صاحب صدیقی ۲۲۳ صفحات قیمت عا/

۵۔ مضامین فلک پیما از خان بہادر میاں عبدالعزیز صاحب ۳۰۸ صفحات قیمت عاا/

۶۔ فلکش (مزاحیہ مضامین) از سید ابو طاہر داؤد صاحب ۲۵۶ صفحات قیمت عہ/

۷۔ مطائبات (فکاہی مضامین) از چراغ حسن صاحب حسرت ۱۱۶ صفحات عمہ

۸۔ جوہر اقبال (مجموعہ مضامین) از ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب وغیرہ قیمت عہ/

۹۔ بکھری ہوئی پتیاں (مجموعہ مضامین) از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت عمر

۱۰۔ مقالات شبلی جلد ششم از مولانا شبلی نعمانی مرحوم ۲۰۲ صفحات

۱۱۔ مکاتیب مہدی (مہدی حسن صاحب کے خطوط) مرتبہ مہدی بیگم صاحبہ ۲۰۲ صفحات قیمت سے

۱۲۔ قطرات شبنم (مجموعہ مضامین) از گوردھن داس صاحب بی۔ اے ۱۴۴ صفحات

۱۳۔ تاریخ و تنقید (مضامین کا مجموعہ) از پروفیسر عابد حسن صاحب ۲۲۴ صفحات قیمت عہ/

۱۴۔ شمع راہ (خطبات) از پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ صاحب ۱۱۵ صفحات قیمت ۱۰/

۱۵۔ نوجوان اور مفلسی (اصلاحی مضامین) از سید صابر حسین صاحب قیمت ۱۰/

۱۶۔ ہندوستانی (ریڈیو تقاریر) از ڈاکٹر تارا چند صاحب وغیرہ قیمت ۱۲/

۱۷۔ راز و نیاز۔ از سلطان احمد صاحب۔ جودی قیمت عمہ

۱۸۔ موتی (اقوال کا مجموعہ) از سید یوسف صاحب بخاری ۱۷۰ صفحات قیمت ۱۲/

۱۹۔ محاورات اردو۔ از حافظ عبدالکریم صاحب مفتوں ۱۴۴ صفحات قیمت ۸/

۲۰۔ اصلاح ادب (اردو زبان کی غلطیاں) از غلام حیدر صاحب

۲۱۔ نقوش سلیمانی (مضامین و تقاریر کا مجموعہ) از مولانا سلیمان صاحب ندوی ۴۷۶ صفحات قیمت عاا/

۲۲۔ مقالات ہاشمی۔ از نصیر الدین صاحب ہاشمی ۴۴۶ صفحات قیمت علعہ/

۲۳۔ مجنوں کے خطوط از عطاء الرحمن صاحب عطا علیگ ۳۰۰ صفحات قیمت عا/

۲۴۔ سہرا حلقہ (ایک خاتون کے خطوط) از ناظر صاحب کاکوری ۸۰ صفحات

طب

۱۔ کلیات ادویہ از حکیم کبیرالدین صاحب ۵۹۰ صفحات قیمت مجلد صہ

۲۔ تحفۂ نایاب (مجرب نسخے) از محمد عبدالرحیم صاحب جمیلؔ ۵۴۴ صفحات قیمت

۳۔ شاہراہ تندرستی (صحت و امراض کا ترجمہ) از لالہ رنگ بہاری لال صاحب ۱۲۰ صفحات

۴۔ بچوں کی بیماریاں از ڈاکٹر سید ممتاز حسین صاحب ۲۰۰ صفحات قیمت عصہ

۵۔ طبیب نسواں معہ رہنمائے دایاں از حاجی اصغر علی صاحب ۱۹۲ صفحات

۶۔ اسرار جیلانی از حکیم غلام جیلانی صاحب ۴۰۰ صفحات

۷۔ پاکٹ ڈاکٹر (دوسرا ایڈیشن) از محمد عبدالرحمن صاحب ۳۱۰ صفحات

۸۔ کفیل صحت از محمد خلیل شاہ صاحب ۱۷۹ صفحات

۹۔ نیا علم شفا بخشی (نواں ایڈیشن) از لوئیس کوھنی ۶۵۲ صفحات

۱۰۔ گنجینۂ طبیب حصہ چہارم از حاجی اصغر علی صاحب ۲۹۶ صفحات

۱۱۔ گلزار رحمت از حکیم وزیر چند صاحب ۱۱۸ صفحات

۱۲۔ مشیر الصحت عرف دیہاتی چٹکلے (چند مجرب نسخے) از میر مصطفےٰ علی صاحب دوم تعلقدار نلگنڈہ

۱۳۔ گربہ شاستر (ضبط تولید اور زچہ و بچہ کی حفاظت) ۲۰۵ صفحات

۱۴۔ مرقع جمیل از محمد عبدالرحیم صاحب جمیلؔ ۲۲۸ صفحات

۱۵۔ تہذیبی نسخے۔ (تہذیب نسواں کے نسخوں کا مجموعہ) ۲۸۴ صفحات

۱۶۔ ہومیو علاج (ہومیوپیتھی علاج کے متعلق) ۳۹۲ صفحات

۱۷۔ ضبط تولید و اصلاح نسل مرتبہ حکیم عبدالحمید صاحب دہلوی ۴۰۰ صفحات قیمت ۱۲؍

۱۸۔ خوراک صحت (مہاتما گاندھی کے تجربات) ۱۷۶ صفحات قیمت ۱۲؍

سیاسیات

۱۔ حکومت خود اختیاری اور ہندو مسلم مسئلہ کا حل از طفیل احمد صاحب ۶۵۲ صفحات

۲۔ ترکی جمہوریہ (ترکی کی سیاست) از ضمیر احمد صاحب ہاشمی ۴۳۶ صفحات

۳۔ کمیٹی دستوری اصلاحات کی رپورٹ (حیدرآباد کے دستوری اصلاحات) مرتبہ سید یوسف علی صاحب معتمد کمیٹی ۴۱۶ صفحات قیمت عہ

۴۔ تحریک ترقی مملکت آصفیہ از خواجہ حمید احمد صاحب ایم اے عثمانیہ ۱۳۲ صفحات قیمت ۸؍

۵۔ سیاسیات کی پہلی کتاب از محمد عاقل صاحب ایم اے ۶۰ صفحات ۵؍

۶۔ مسلمانان ہند کی سیاست وطنی از محمد امین صاحب زبیری ۲۱۹ صفحات قیمت ۱۰؍

۷۔ شیطان کا انتقام (دور حاضر کے سیاسی حالات) از محمد جلال الدین صاحب اشکؔ ۹۰ صفحات قیمت عصہ

۸۔ جمیعۃ الاقوام پر ایک نظر (جمیعۃ الاقوام کے مقاصد اور عمل کا جائزہ) ۸۰ صفحات

۹۔ متاع حق (اسلامی سیاست) از سید امیر احمد صاحب ۱۵۸ صفحات قیمت ۸؍

۱۰۔ جدید جغرافیہ پنجاب (پنجاب کی سیاست پر مزاحیہ تبصرہ) از سندباد جہازی قیمت عمہ

قانون

۱۔ قانون اسٹامپ حصہ اول از گردھاری صاحب ساگر ۲۴۴ صفحات

۲۔ آئین حکومت ہند (دوسرا ایڈیشن) از عبدالمجید خاں صاحب سالک بی۔ اے۔ ۴۰۰ صفحات

۳۔ تحفہ نمبر ۳ (قانون وراثت) از رلیا رام صاحب ۱۹۲ صفحات۔

۴۔ میڈیکل جورس پروڈنس از محمد سلیمان صاحب قریشی ۱۱۰ صفحات

۵۔ معاشدار (عطیہ معاش کی وضاحت) از کاشی ناتھ رلو صاحب وکیل نظام آباد قیمت عہ

دینیات

۱۔ مذاہب اور انسانیت (بارہ مختلف مذاہب کے اصول) از لالہ ہردیال صاحب ۲۸۸ صفحات قیمت عمہ

۲۔ اظہار حقیقت از مجبور صاحب چشتی ۴۰۰ صفحات

۳۔ بچوں کے لئے رامائن از پروفیسر رام سروپ صاحب ۲۲۸ صفحات

۴۔ عرفان نانک (سکھوں کی دعا کا ترجمہ) از برج لعل سنگھ صاحب بیدی ۲۲۲ صفحات

۵۔ جیون چرتر (مذہبی ہدایات) از سوامی بھگوان سنگھ صاحب ۳۸۰ صفحات

۶۔ ید بیضا (اسلام اور مسلم سوسائٹی پر مضامین) از ڈاکٹر سید نجم الدین احمد صاحب جعفری ۱۴۰ صفحات

۷۔ تاثیرات قادیان از ملک فضل حسین صاحب ۲۴۴ صفحات

۸۔ گیتا امرت (ماخوذ از بھگوت گیتا) از چودھری روشن لال صاحب ۲۳۸ صفحات قیمت ۶ر

۹۔ فن تفسیر از مرزا عزیز صاحب قیصانی ۲۰۰ صفحات

۱۰۔ ہندوستانی اسلام (دو خاص مذاہب کی تاریخی حیثیت) از قاضی اظہار الدین صاحب ۵۰ صفحات قیمت ۶ر

۱۱۔ مدح صحابہ اور تبرا (اقتباسات اخبار مدینہ) ۹۶ صفحات قیمت ۴ر

۱۲۔ اسلامی نظام تعلیم از ریاست علی صاحب ندوی ۵۶ صفحات

۱۳۔ نغمۂ توحید از سری سچدانند سدگرو یوگی راج ۲۰۰ صفحات قیمت عہ

۱۴۔ پیام امین (کلام اللہ کی تدوین اور اس کی تعلیم) دوسرا ایڈیشن از محمد عبداللہ صاحب منہاس ۴۰۰ صفحات قیمت عہ

۱۵۔ اسلام میں غلامی کی حقیقت از سعید احمد ایم۔ اے ۲۶۲ صفحات قیمت عا

۱۶۔ مقدس قانون۔ از ناصرالدین رشید ترابی قیمت ۱۰ر

۱۷۔ تنقیحات (اسلام اور مغربی تہذیب پر تبصرہ) از سید ابوالاعلیٰ مودودی ۲۴۰ صفحات قیمت ۱۲ر

اخلاقیات

۱۔ انسان (انسان اور انسانیت کے متعلق) از کاشی ناتھ رام صاحب چاؤلہ ۲۰۰ صفحات قیمت ۴ر

۲۔ مخزن اخلاق (پانچواں ایڈیشن) از رحمت اللہ صاحب سبحانی

۴۰۸ صفحات

ریاضیات

۱۔ فہیم حساب حصہ دوم از ایم اے نذیر صاحب ۱۸۶ صفحات
۲۔ کرشنا میکینکل گائیڈ از پنڈت کشن چند صاحب سردار ۲۰۰ صفحات

سفرنامہ

۱۔ سفرنامہ حکیم ناصر خسرو۔ مرتبہ حرمت اللہ صاحب کیانی ۲۵۰ صفحات
۲۔ سیر کشمیر۔ از کویراج بلونت سنگھ صاحب ۲۳۶ صفحات قیمت ؏
۳۔ اندرون ہند خالدہ ادیب خانم کی انگریزی کتاب ان سائڈ انڈیا کا اردو ترجمہ از سید ہاشمی قیمت ؎

نفسیات

۱۔ مظاہر ذہنیات از ڈاکٹر فضل الرحمن صاحب ۱۸۴ صفحات قیمت عہ

نسوانی ادب و خانہ داری

۱۔ نذر دکن۔ (سب رس کے دکن نمبر کا ضمیمہ نسواں) مرتبہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ۱۰۴ صفحات قیمت ؏
۲۔ بڑھاپے کی برکتیں اور عورت از خواجہ عبدالحمید صاحب دہلوی ۹۶ صفحات قیمت عصہ
۳۔ علم خانہ داری از محترمہ ممتاز شاہنواز صاحبہ ۷۰ صفحات قیمت عصہ
۴۔ گلزار درخشاں (دستکاری کے متعلق) از آر۔ کے درخشاں صاحبہ قیمت عصہ
۵۔ ہندوستانی کشیدہ کاری۔ از مس امتہ اللہ قیمت عصہ

۶۔ مراۃ العروس (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۳۲ صفحات قیمت ۱۲ر
۷۔ بنات النعش (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۳۰ صفحات قیمت ۱۲ر
۸۔ توبۃ النصوح (جدید ایڈیشن) از مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ۲۲۶ صفحات قیمت ۱۲ر
۹۔ مسلمان عورت کے حقوق از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت ۱۲ر
۱۰۔ ساجن موہنی (تسخیر شوہر کے طریقے) از علامہ راشد الخیری صاحب مرحوم قیمت ؏
۱۱۔ من کی بیتا (اصلاح معاشرت) از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ۔ ایم۔ اے ۸۸ صفحات قیمت ۸ر
۱۲۔ محکومیت نسواں (حقوق نسواں) از معین الدین صاحب انصاری قیمت عصہ
۱۳۔ مکمل باورچی خانہ از فہمیدہ خاتون صاحبہ۔ فرحت ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲ر
۱۴۔ سوتیلی ماں۔ از رابعہ بیگم صاحبہ۔ شعبہ نسوان ادارہ ادبیات اردو۔ ۵۶ صفحات قیمت ؏

لغات

۱۔ فرہنگ عامرہ۔ (عربی۔ فارسی اور ترکی کی لغات کا فرہنگ) از محمد عبداللہ خاں صاحب قریشی ۵۸۲ صفحات قیمت عہ
۲۔ مبادی اللغات (اردو لغت) از فیض محمد صاحب ۱۸ صفحات

صنعت و حرفت

۱۔ روپئے بنانے کی مشین (صابن سازی فوٹوگرافی وغیرہ)

از ایم۔ آر انند ۱۱۲ صفحات

۲۔ انڈین ماسٹر آف کرافٹ مع تصویر (لباس کی کتر بیونت) قیمت ۱۲/

۳۔ وصلی کی دستکاری از سید رضا احمد صاحب جعفری ۵۶ صفحات قیمت ۸/

۴۔ لکڑی کا باریک کام از سید رضا احمد صاحب جعفری ۵۸ صفحات قیمت ۱۰/

۵۔ صنعت و حرفت کے قیمتی راز از مہانندجی قیمت عہ

۶۔ ہندوستان کی صنعت و تجارت از منت اللہ صاحب رحمانی ۱۲۲ صفحات

معاشیات

۱۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے بعض معاشی اور مالی پہلو۔ از ڈاکٹر زین الدین احمد صاحب ۱۵۰ صفحات قیمت ۱۰/

۲۔ اجتماعی زندگی کی ابتدا از محمد عاقل صاحب ۱۱۲ صفحات

تعلیم

۱۔ رہنمائے اساتذہ از للیارام صاحب ۲۵۶ صفحات

۲۔ بنیادی قومی تعلیم کا نصاب از ڈاکٹر حسین صاحب ۲۴۰ صفحات قیمت عہ

۳۔ اردو مضمون نویسی از پروفیسر نانک پرشاد صاحب بی۔ اے قیمت ۸/

متفرق

۱۔ کرشمۂ روحانی از محمد شریف صاحب ۹۶ صفحات

۲۔ تلوار (متعلق شمشیر زنی) از کپتان اعجاز علی صاحب شہرت قیمت ۶/

۳۔ لذت شادی۔ از بی چندر صاحب بکل ۱۶۰ صفحات

۴۔ کالاعلم۔ (طلسمات پر ایک مصری کتاب کا ترجمہ) ۲۱۶ صفحات۔

۵۔ ترکاری۔ از جی۔ ایم ملک صاحب ۸۰ صفحات

۶۔ معلم بٹوارا از آغا نثار احمد صاحب ۴۴ صفحات

۷۔ چوپائے اور انسان از موہن لال صاحب ۱۶ صفحات

۸۔ انسداد گداگری از سلطان احمد صاحب قیمت عہ

۹۔ اسلامی سپہ گری از عبدالکریم صاحب قیمت عہ

۱۰۔ سکھی کسان از عبدالحمید صاحب تحصیلدار آرمور نظام آباد ۱۳۹ صفحات ۱۲/

۱۱۔ بوبھیریہ (مہاتما گاندھی کے تجربات) ۶۰ صفحات قیمت ۹/

۱۲۔ گرہست جیون (") ۵۰ صفحات قیمت ۱۲/

۱۳۔ یورپ کے تاثرات (انگلستانی اہل قلم کے تاثرات) مرتبہ بدر شکیب بی۔ اے ۱۹۰ صفحات قیمت عہ

۱۴۔ مغربی تصانیف کے اردو متراجم از میر حسن ایم اے ۴۴ صفحات قیمت عہ

۱۵۔ نئے مسائل (فکر و عمل کی نئی راہیں) از محمد محبوب الدین بی۔ اے قیمت ۸/

مرزا سیف علی خاں

(یہ مضمون حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا)

ضلع سے میری مراد ضلع عثمان آباد، ضلع بیڑ یا ہندوستان کے کسی خاص ضلع سے نہیں ہے بلکہ ضلع سے میرا مقصد اس صنعت سے ہے جسے گھٹیا درجہ کے شعراء اپنے شعروں میں اور بڑھیا درجہ کے خوش مذاق اصحاب ظرافت پیدا کرنے کے لئے عام طور پر اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔

اس صنعت کا دوسرا نام رعایتِ لفظی ہے اور عام طور پر اس میں ایسے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں جن کو دوسرے الفاظ کے ساتھ محض ایک لفظی تعلق ہوتا ہے مگر ان کے معنوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً کسی کا شعر ہے کہ

سن کے چرچا غیر نے جا کے چھچھوندر چھوڑ دی　　　گھر جلا عاشق کا ان لوگوں کا کپا ٹوٹا ہوا

یہاں چھچھوندر چھوڑنے کے معنی شگوفہ چھوڑنے کے ہیں اور ٹوٹے کے معنی نقصان کے ہیں مگر چھچھوندر اور ٹوٹا آتش بازی کے نام بھی ہیں اس لئے "گھر جلا"، چھچھوندر اور ٹوٹا ضلع کے الفاظ ہیں اور ان میں ایک دوسرے سے مناسبت ہے

اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ جس چیز کا نام لیا جائے، وہ ایک سالم لفظ سے ظاہر ہو جائے جیسے کہ یہ ایک مشہور لطیفہ ہے کہ

جج بھی کانا تھا اور ملزم بھی کانا تھا۔ ملزم نے جج کی طرف دیکھا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ حضور! ہم چشموں پر چشمِ عنایت چاہیے۔ جج نے کہا کہ ہم سب کو ایک آنکھ دیکھتے ہیں۔ ملزم نے کہا کہ یہ تو حضور کی عین منصفی ہے

اس کی دوسری قسم میں الفاظ اس قدر کھینچ تان کر بٹھائے جاتے ہیں کہ ان کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ جاتی ہیں مثلاً امانت کا یہ مشہور شعر ہے کہ

ہم کو ہو زہر غیر کو مصری کی ڈلی ہو　　　ایسی نہ بات آپ زباں سے نکالئے

یہاں دوسرے مصرع میں "نہ بات" کا لفظ، زبان سے نکالتے وقت نبات ہو جاتا ہے۔ جس کے معنی مصری کے ہیں اور زہر، مصری، نبات، یہ سب ضلع کے لفظ ہیں۔

آپ نے وہ شعر تو سن لیا جس میں زبردستی کھینچ تان کر ضلع باندھا گیا تھا اب ایک چھوٹی سی اسی نمونے کی گفتگو بھی سن لیجئے۔

ایک صاحب استرہ خریدنے گئے۔ دوکاندار نے قیمت زیادہ بتائی۔ خریدار نے کہا کہ میاں تم تو مونڈتے ہو (یعنی دوکان دار کو حجام بنایا) دکاندار نے تڑ سے جواب دیا کہ حضور ہم اس طرح سے مونڈتے ہیں اور آپ اُس طرح سے مونڈتے ہیں (یہاں "اُس طرح" سے تلفظ کرتے وقت اُسترے سے ہو جاتا ہے)

ابتداء میں شعراء نے اس دل لبھانے والی صنعت کو اس خوبی سے پیش کیا کہ ہر شخص اس پر لٹو ہو گیا

چند روز کے بعد بازار میں چل نکلی اور ایسی چلی کہ ہر شخص اس کا سودائی بن گیا۔ اس لئے بعض شعرا نے تو اس قدر گریز کی کہ اس کو حدودِ شاعری سے ہی خارج کردیا اور بعض نے اس قدر وسعت دی کہ کشورِ شعر سخن کا رکنِ اعظم بنالیا۔

غالب کی مشہور و معروف غزل کا مصرع ہے کہ "ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو" اکثر ضلع بازوں کا خیال ہے کہ یہاں ہیہات، پانو کی مناسبت سے ضلع کے طور پر بٹھایا گیا ہے۔

مگر ان کے بعض واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں ضلع جگت کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ چنانچہ یہ ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک روز کوئی صاحب ان سے ملنے آئے۔ کلام کی بہت تعریف کی اور کہا کہ آپ کا یہ شعر مجھے دور و دراز سے کھینچ کر لایا ہے پھر یہ شعر پڑھا۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی   میرے شیر شاباش رحمت خدا کی

چونکہ یہ شعر غالب کا نہیں تھا اور اسد کی رعایت سے شیر کو کہاں خاطر میں لاتے تھے اس لئے اسنا! مسکرائے اور کہا کہ جناب جس بزرگ کا یہ شعر ہے ان پر بقول ان کے رحمت خدا کی اور یہ میرا شعر ہے تو مجھ پر لعنت خدا کی۔

غالب سے پیشتر بھی اکثر شعرا نے ضلع بولنے والوں پر چوٹیں کیں ہیں۔ چنانچہ سودا فرماتے ہیں۔ کہ

پکڑی جو تو رے نے کہیں کھیتی سے چڑیا   سمجھا کہ نہیں باز کوئی مجھ سا کلاں گیر

استاد کی ان کے ہے انھوں کو یہ نصیحت   لفظی نہ تناسب ہو تو کچھ مت کرو تحریر

اتنا تو تلازم رکھو الفاظ کا ملحوظ   ہے پنجہ و ناخن نہ لکھو دودھ کو تم شیر

جب تک کہ نہ معلوم ہو پاسنگ و ترازو   باندھو نہ کبھی شعر میں تم لفظ شکم سیر

یہاں پنجہ، ناخن، شیر، پاسنگ، ترازو، اور شکم سیر یہ سب ضلع کے الفاظ جنہیں اعتراض کے پردے میں لکھ کر استاد نے خود اپنا ذوقِ سلیم بھی بتا دیا ہے۔

بہرحال اس لے دے کے باوجود اس وقت ہزاروں غزلیں، ہزاروں قصیدے اور ہزاروں مثنویاں اس صنعت میں بھری پڑی ہیں اور پھر ضلع بازوں نے تو وہ دریا بہائے ہیں کہ شعرا کے کارناموں پر بھی پانی پھیر دیا ہے۔

جس طرح اکثر لوگ بیت بازی اور دوسرے مشاغل میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں اسی طرح بعض اصحاب ضلع بازی میں اپنا وقت گزارتے رہتے ہیں جہاں دو آدمی مل کر بیٹھے اور ضلع شروع ہو گیا۔ مثلاً کسی صاحب نے حقہ پیتے پیتے سرکایا اور یار لوگوں نے حقہ پر ضلع شروع کر دیا۔ اب حقہ سے متعلق جتنی چیزیں ہیں دماغ سے اترنی شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ حقہ سے مناسبت رکھنے والے الفاظ یہ ہیں۔

اپنا کوئی ہمدم سہے نہ دمساز دمسے میں دم نہیں اب خیر مانگو جان کی۔ این گلِ دیگر شگفت بندہ ہر دم تازہ

رہتا ہے۔ دل کی کلی کھلی رہتی ہے۔ گرم گرمی اور شکر شکر ہی ہے۔ اگر کوئی میرے منہ کو آئے تو منہ نائی میں دے دوں۔ ہمارا خدا ضامن ہے۔ وہ عالی دودماں ہے۔ چلمن سے لگے بیٹھے رہو۔ وہ منہ نیچا کئے ہوئے باہر نکل گئے جس کو پیا چاہے وہ سہاگن ہے۔ سانچ کو کیا آنچ ہے۔ سخن تازہ فرمائیے۔ جواب تلخ۔ سوختہ جاں۔ زنجیر پا۔ خشک تر ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید۔ بے کلی سر پر توا باندھ کر آؤ۔ دعوائے لبیک سا اللہ سے تو لگائے رہو۔ فقیر کا تھیلا وغیرہ وغیرہ۔

بظاہر ان الفاظ میں نہ تو کوئی ظرافت معلوم ہوتی ہے اور نہ اس قدر دم کہ ظرافت کا عنصر اور تفنن طبع کا ذریعہ بن سکیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر برمحل اور برموقع کسی گفتگو کے سلسلہ میں ضلع کے الفاظ بٹھا دئے جائیں تو پھر اٹھائے نہیں اٹھتے بلکہ تلازمہ کی آڑ میں جو چاہو کہہ جاؤ بقول شخصے سات خون معاف ہیں۔

نمونے کے طور پر ہم آپ کو چند قصے سناتے ہیں، جن میں ضلع کا چٹخارہ دے کر ظرافت پیدا کی گئی ہے وہ آپ بھی سنئے اور لطف اٹھائیے۔

ایک صاحب کسی چرب زبان جوتے والے کی دکان پر پہنچے۔ دکاندار نے کہا کہ کیا حکم ہوتا ہے خریدار نے کہا کہ ایک جوڑے کی ضرورت ہے۔ دکاندار نے کہا کہ حضور تو نری کا چاہتے ہونگے۔ خریدار نے کہا کہ مجھے وصلی کا درکار ہے۔ ذرا خوش رنگ اور مضبوط تلے کا ہو۔ دکاندار نے کہا کہ آپ اس کی فکر نہ کیجئے۔ پھر چند جوتوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ دیکھئے وہ جوتے جو آپ کے سامنے پڑے ہیں، خوش رنگ بھی ہیں مضبوط بھی ہیں اور بڑی بات یہ ہے کہ آپ کو بہت سستے پڑیں گے۔ خریدار نے قیمت دریافت کی تو کچھ زیادہ بتائی۔ اس پر خریدار نے کہا کہ آج کل تو آپ لوگ بے حساب کھانے لگے ہیں۔ اول تو صرف چار آنے جوتا کھاتے تھے مگر اب تو کیفیت کہ آپ ایک ایک روپیہ جوتا کھاتے ہیں اور پھر بھی آپ کا پیٹ نہیں بھرتا۔

دکاندار نے کہا حضور! ہم اپنے جوتے زبردستی کسی کے سر تھوڑی مارتے ہیں۔ یہ تو خوشی کا سودا ہے۔ اگر پسند ہو تو یہ حاضر ہیں ورنہ جہاں آپ کو سستے پڑیں وہاں جا کر آپ بخوشی لے سکتے ہیں۔

اسی قسم کی ایک اور گفتگو ملاحظہ فرمائیے۔

ایک حجام کا لڑکا کسی بڑے عہدہ پر پہنچ گیا۔ ایک روز خفا ہو کر اس نے منتظم دفتر پر جرمانہ ٹھوک دیا۔ منتظم صاحب جوش میں بھرے ہوئے ان کے گھر پہنچے اور کہا کہ سرکار نے تو الٹے استرے سے میرا سر مونڈھ دیا۔ افسر صاحب نے کہا کہ ذرا سوچ سمجھ کر بات کرو۔ منتظم صاحب نے کہا کہ اب اور کیا سوچوں، صاف صاف کہتا ہوں پوست کندہ کہتا ہوں اگر بال برابر بھی فرق ہو تو آپ میری ڈاڑھی مونچھیں حقے کے پانی سے مونڈھ دیجئے گا۔

اس طرح ایک عرب کا قصہ مشہور ہے کہ وہ بارش کے موسم میں کسی ظریف کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ رستے میں ظریف نے پوچھا کہ تمہارا کیا نام ہے۔ جواب دیا کہ سطر پوچھا کنیت، اس نے کہا کہ ابو الغیث پھر ظریف نے پوچھا کہ

تمہارے باپ کا کیا نام ہے اس نے جواب دیا کہ ابو الغیث پھر پوچھا کہ تمہاری ماں کا کیا نام ہے۔ اس نے جواب دیا کہ سحاب پوچھا کنیت۔ جواب دیا کہ ام البحر ظریف یہ سن کر رک گیا اور کہا کہ ذرا ٹھیر جا۔ میں ابھی ایک کشتی لے آتا ہوں۔ ورنہ تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے گا۔ ظریف کے منہ سے یہ فقرہ سن کر وہ محترم سے پانی پانی ہوگیا

کسی ظریف کا قصہ مشہور ہے کہ وہ کسی درویش کے ہاں مہمان ٹھیرا۔ درویش کا مکان بہت پرانا تھا اور چھت میں سے چٹ چٹ کی آوازیں آتی تھیں۔ ظریف نے گھبرا کر پوچھا کہ خیر تو ہے، قبلہ یہ کیا ماجرا ہے؟ درویش نے کہا کہ ڈرو مت۔ میرے گھر کی کڑیاں ذکر و تسبیح کرتی رہتی ہیں ظریف نے کہا کہ مجھے ڈر ہے کہ اسی ذکر و اذکار میں کہیں ان کو حالتِ وجد نہ پیدا ہو جائے اور وہ رقص کر کے سجدے میں نہ آپڑیں تو پھر اس وقت اس گنہگار کا کیا حشر ہوگا۔

ایک صاحب نے اپنے بچے کا ختنہ کیا اور احباب کو دعوت دی مکان چھوٹا تھا اس لئے دعوت کا انتظام ایک خواجہ سرا کے مکان میں کیا۔ استاد ذوق بھی مدعو تھے کھانا کھا کر صحن میں آبیٹھے۔ اتنے میں میزبان پان لئے ہوئے آئے۔ حکیم آغا جان عیش نے کہا کہ آج تو دست مبارک سے گلوری کھلانا واجب ہے۔ ذوق نے کہا کہ ضیافت تو سنت ہی تھی۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ ان کی ظرافت کے نکتے کو کہاں تک پائیے۔ ختنے کی ضیافت اور خواجہ سرا کے مکان میں کھانا کھلایا۔ ذوق نے کہا کہ ظرافت پہ ظرافت یہ کہ کھلایا بھی تو خشکہ پلاؤ

شاہ نصیر کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ انہوں نے لکھنو کے کسی معرکے کے مشاعرے میں ایک غزل پڑھی جس کا مطلع یہ تھا

خال پشتِ لبِ شیریں ہے عسل کی مکھی
روح فرہاد لپٹ بن کے جبل کی مکھی

کسی صاحب نے ایک شعر پر کہا کہ سبحان اللہ، استاد کیا مکھی بیٹھی ہے۔ کسی نے دوسرے شعر پر کہا کہ حضور یہ مکھی تو ٹھیک نہیں بیٹھی۔ غزل ختم ہونے کے بعد ایک صاحب نے کہا کہ قبلہ غزل تو خوب ہے مگر ردیف سے جی متلانے لگا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جنھیں چاشنیٔ سخن کا مذاق ہے وہ تو لطف ہی اٹھائیں گے ہاں جنھیں حسد کے صفرے کا زور ہے ان کا جی بھی متلائے گا اور ردیں بھی ہوں گی۔

مرزا عصمت اللہ بیگ

تاریخ گولکنڈہ حیدر آباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے ایل ایل بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنی تمدن" بھی عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آجائے گی۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔

بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت [illegible]

ہماری زبان

جنم اس نے ہندوستاں میں لیا — اسی ملکِ جنت نشاں میں لیا
اسی کی ہواؤں میں پھولی پھلی — مگر تھی ازل سے بڑی منچلی

نگاہوں کی بے باک دل کی جواں
نزاکت کی پتلی لطافت کی کاں

امیروں کی آنکھوں کا تارا بنی — غریبوں کے دل کا سہارا بنی
رہی امتیازات سے بے نیاز — ہر اک دل ہر اک بزم میں سرفراز
ہوا اس کی شہرت کا پرچم بلند — نگاہوں میں سب کی ہوئی ارجمند
عرب سے فصاحت کا آیا خراج — اور اس میں لطافت کا تھا امتزاج

جو فارس سے آئی ربابِ دچنگ
تو ہندی نے بھی نذر کی جلترنگ

تبسم پہ اس کے ستاروں کو ناز — ترنم پہ اس کے ہزاروں کو ناز
یہ پاکیزگی۔ یہ توازن۔ یہ شان — یہ اس کا سنورنا یہ اس کی اٹھان
ہر اک کی نگاہوں میں جچتی گئی — دلوں میں لہو بن کے رچتی گئی
اٹھی تھی جو اس محترم خاک سے — لگی چشمکیں کرنے افلاک سے
لئے رنگ قوس قزح سے کبھی — کبھی پہنچ کہکشاں تک گئی
ستاروں سے ان کی چمک چھین لی — قمر سے غمِ دل کی تسکین لی

فلک سے ملی وسعتِ بے کنار
ہوا حسن خورشید از خود نثار

ہر اک جلوہ پیشِ نظر ہے یہاں — ہر اک دلفریبی کا گھر ہے یہاں
ہر اک حسن اس بزم میں باریاب — ہر اک ذرہ اس بزم میں آفتاب

زمیں زاد ہے آسماں جاہ ہے
وطن کی ترقی کی شاہ راہ ہے

ہر اک مسلم کو اس کا ہے اعتراف — کہ اردو کا دامن ہے کانٹوں سے صاف
نہ الجھن نہ مشکل نہ بے مائیگی — یہ وسعت۔ یہ ایجاز یہ سادگی
نہ مشرق نہ مغرب کی ہے کوئی قید — کہ دونوں جہاں اس کی نگاہوں کے صید

زمانے کی ہر خوبصورت زباں — اسے پیش کرتی ہے کچھ ارمغاں
ہراک حلقہ میں سب کو آئی پسند — ہراک دور میں یہ رہی سر بلند
ہراک ملک میں اس کا سکہ رواں — کہ دنیا سمجھتی ہے اردو زباں

میسر ہوا اس کو رنگِ قبول
کہ ہیں اس میں ہر ایک گلشن کے پھول

ہمیں کیوں نہ اردو سے ہو اتنا پیار — سماعت نے پایا اسے خوشگوار
رتن ناتھ سرشار اس کے اسیر — پرستار اس کے انیس و دبیر
امیر اور محبت کی ترجماں — نسیم اور غالب کی پیاری زباں

ہمارے تمدن کی بانی ہے یہ
حقیقت میں ہندوستانی ہے یہ

یہی آشتی کی ہے آئینہ دار — اسی پر ترقی کا ہے انحصار
اسے ہاتھ سے جانے دینگے نہ ہم — اسے کوئی غم کھانے دینگے نہ ہم

بزرگوں کا پیارا نشاں ہے یہی
ہماری مقدس زباں ہے یہی

عبدالعزیز فطرت
(راولپنڈی)

گریہ و تبسم۔ صاحبزادہ میکش مدیر سب رس کی نظموں اور غزلوں کا بہترین مجموعہ ہے۔
جناب میکش حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں ایک امتیاز کے مالک ہیں اور ان کا کلام بہت مقبول ہے۔
عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

میکش کے کلام کا مجموعہ ہے اور رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ
کتاب کی تقسیم کئی حصوں پر ہے مثلاً حرکت و حیات، سکون و اضطراب
ماضی و حال، حال و قال، عقیدت و یقین، شباب و شعر وغیرہ بعض بعض
نظموں پر بے اختیار کلام اقبال کا دھوکا ہو جاتا ہے۔
"صدق" لکھنو بابت یکم جنوری سنہ ۱۹۳۹ء صفحات (۱۹۲) طباعت و کتابت

نفیس، کاغذ اعلیٰ قسم کا جلد پر سنہری نام
(قیمت عہ)

پرانی اور نئی باتیں

(تمدن اور شعر و ادب پر ایک نگاہ)

سنسار کی ریت اور دنیا کا دستور ہے کہ پرانی باتوں کو لوگ بھول جاتے ہیں اور وہی بھولی باتیں جب دہرائی جاتی ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ بالکل نئی اور اچھوتی باتیں کہی جا رہی ہیں۔ دنیا کا حافظہ بہت کمزور ہے۔ تاریخ اپنے کو ہمیشہ دہراتی رہتی ہے۔ لیکن ہم اس کے دہرانے کو محسوس نہیں کرتے۔ دنیا کے انقلابات اور واقعات کا حال، سینما کے پردے سے ملتا جلتا ہے، دیکھی ہوئی تصویریں تھوڑے الٹ پھیر کے ساتھ نمودار ہوتی رہتی ہیں، اور فریب خوردہ نگاہیں سمجھتی ہیں کہ کوئی جدید فلم دکھایا جا رہا ہے۔ حوادث و انقلابات کے ان مناظر کو دیکھ کر، ایک مشہور فلسفی بے اختیار پکار اٹھا کہ :-

"دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں۔!"

تمدن و تہذیب کو لئے ہوئے نقوش جب ابھرتے ہیں، تو لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ کسی جدید تہذیب کی داغ بیل پڑ رہی ہے۔ دنیا پرانے ملبہ سے نئی عمارتیں بنا کر اکڑنے لگتی ہے۔ آج دنیا تہذیب و علم کی جن "جدید شاہراہوں" پر ناز کر رہی ہے، وہ سب گزشتہ تہذیبوں کے روندے ہوئے راستے ہیں۔ آج ہم محکمۂ آبرسانی کے حسنِ انتظام پر فخر کرتے ہیں، مگر آج سے کئی ہزار سال قبل یونان کے مشہور مورخ ہیروڈوٹس نے بابل کے شہر میں ابلتے ہوئے فوارے اور ڈھلکتے ہوئے آبشار دیکھے تھے۔ جن لوگوں نے بیدر (دکن) کے قلعہ کو دیکھا ہے وہ اس زمانے کے "واٹر ورکس" کے حسنِ انتظام کا ضرور اعتراف کرینگے۔

سینما کو دورِ جدید کی ایجاد بتایا جاتا ہے مگر ڈریپر کی مشہور کتاب (Conflict between Religion & Science) "معرکۂ مذہب و سائنس" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں متحرک تصویروں کا رواج تھا، اور حسین و جمیل رقاصاؤں کے نغمہ و رقص کے ساتھ ساتھ، متحرک تصویریں ذوقِ نظارہ کو تسکین بخشتی تھیں محکمۂ اکتشافاتِ اثری کی کوششوں کی بدولت، قدیم نوادر منظرِ عام پر آ کر، تہذیب و تمدن کی کڑیوں کو ملا رہے ہیں۔ اور دنیا کو اپنے حافظہ کی کمزوری کا احساس ہوتا جا رہا ہے۔ اگر آپ کسی چیز کو بھول جاتے ہیں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ چیز کبھی تھی ہی نہیں آپ کی بھول چوک سے "ہوئی بات" "ان ہوئی" نہیں ہو سکتی۔ عدم علم شئے سے وجود شئے کی نفی نہیں ہوتی۔

فکر و خیال کی یکسانی

تمدن و تہذیب اور علم و ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے تمدن و تہذیب کی طرح علم و ادب کے نقوش بھی مٹتے اور ابھرتے رہتے ہیں۔ قدیم افکار نئے سانچوں میں ڈھلتے جاتے ہیں اور وہی نغمے جو فضا میں گونج چکے ہیں، مختلف دھنوں اور سروں میں اس انداز میں گائے جاتے ہیں، جیسے یہ پہلے پہل سامعہ نواز ہوئے ہیں۔ فکر و خیال کی جو شراب روم و یونان کے میکدوں میں کھنچی تھی، وہی شراب بھارت ورش کی بھٹیوں پر جوش کھاتی ہوئی نظر آتی ہے، ایک دو آنچ کی البتہ کسر رہ گئی ہے، مگر اس سے

شراب کی اصلیت پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔ روم کی رزمیہ شاعری، فردوسی کے شاہنامے سے ٹکراتی ہے، اور ہومر اور ورجل کے نغموں کی گونج ایران میں سنائی دیتی ہے۔ اگر دنیا کے قدیم لٹریچر کا تاریخ واری تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت پہلے کہی ہوئی باتیں کس کس انداز میں دہرائی گئی ہیں، اور یہ "توارد" اپنے اندر کس قدر عمومیت رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ دنیا کے تمام انسان قوم و نسل کے امتیاز و اختلاف کے باوجود فکر و تصور کے مرکز پر آکر ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ گرد و پیش اور ماحول سے متاثر ہوکر محسوسات کے اظہار میں ضرور فرق ہوتا ہے، مگر فکر و خیال کی تان ایک ہی حقیقت پر آکر ٹوٹتی ہے۔ عرب کی لیلیٰ، ایران کی شیریں، ہندوستان کی شکیلا اور مصر کی قلوبطرہ پر شاعروں اور راویوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اصطلاحات کے فرق کے سوا بہت سی چیزیں ملتی جلتی ہیں۔ ایک ہی نغمہ مختلف دھنوں میں زبانوں سے نکلا ہے، اور ایک ہی شراب مختلف پیمانوں میں ڈھلی ہے۔

پرانے چراغ ہماری موجودہ "اردو غزل" جو ہمارا سرمایۂ ناز و افتخار ہے۔ اس کی داغ بیل بھی بہت پہلے پڑ چکی ہے۔ اور نہ صرف فکر و خیال بلکہ الفاظ اور ترکیب کے اعتبار سے بھی ہمارے پیش رو غزل گو شعرا شعر و ادب کی وادیوں کو ہموار کر کے، فکر و خیال کے چراغ جلا گئے ہیں۔ ہم ان ہی چراغوں کی روشنی میں منزل سے گزر رہے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ ہم کو اس اجالے کا پورے طور پر احساس نہیں ہوتا، مگر اجالا تو اپنی جگہ پر ہمارا قائم و ثابت ہے۔ ان ہی پرانے چراغوں کے آس پاس ہم بھی کچھ شمعیں روشن کر رہے ہیں، اور آنے والی نسلیں اپنے کو ہم سے زیادہ روشنی میں پائینگی۔

"ولی دکنی کو لوگ بھولتے جا رہے ہیں، حالانکہ آج سے دو سو سال قبل اس نے کہا تھا"

معشوق کو ضرر نہیں عاشق کی آہ سے
بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سے چراغِ گل

خیال و فکر کی قدرت کے علاوہ، الفاظ کے استعمال سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ شعر ہمارے ہی دور کے کسی شاعر کا کہا ہوا ہے۔
میر محمد تقی میرؔ کے اس شعر کا جواب

اس نے دیکھا جو اٹھ کے سوتے سے
اڑ گئے آئینہ کے توتے سے

مشکل ہی سے پیش کیا جا سکے گا۔ ہم کو آج اپنی نظموں پر بہت ناز ہے، مگر میرؔ کے اس شعر کے لطف کو کوئی نظم پہنچا نہیں کر سکتی۔ اگر یہ صحیح ہے کہ روح القدس، شاعروں کی تائید کرتا ہے، تو میرؔ کا یہ شعر اس تائید کا سب سے بڑا مظہر ہے۔
خواجہ میر دردؔ کے اس شعر کو پڑھ کر

جوشِ جنوں کے ہاتھ سے فصلِ بہار میں
گل سے بھی ہو سکی نہ گریباں کی احتیاط

موجودہ زمانہ کی بیسیوں غزلوں کو اگر چاک کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔
مصحفی نے اب سے بہت پہلے جو کہا تھا:۔

چلے بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھیرے گا

بہت سے ہمارے شعروں کو اسی کی صدائے بازگشت سمجھنا چاہیے۔
داغ کا یہ شعر:۔

لذتِ سیر دگر چشم تماشائے گی
ایک بار اور بھی دنیا ابھی پلٹائے گی

انقلابی شاعروں کے لئے آج بھی دلیلِ راہ بن سکتا ہے اور "انقلاب زندہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے بہت زیادہ قوت اس شعر میں پائی جاتی ہے۔
امیر مینائی کے اس شعر پر:۔

لچک ہے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں
بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

آج بھی روح جھومنے لگتی ہے۔ اس دور کے بہترین مصور کا قلم باغ و بہار کو تو دکھا سکتا ہے۔ مگر بہار کو خوشی کے جھولوں میں کس طرح جھلائے گا۔!

میں نے غالب کے اشعار کو قصداً پیش نہیں کیا، اور وہ اس لئے کہ اس کے فکر و خیال کی روح تو ہماری شاعری کے پیکر میں دوڑ رہی ہے، اور کوئی شاعر محسوس یا غیر محسوس طور پر غالب کی شاعری کے تاثرات سے نہیں بچ سکتا۔

ماہر القادری

من کی دنیا حیدرآباد کے نوجوان افسانہ نگار رشید قریشی کے افسانوں کا نفیس مجموعہ ہے۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچہ عمومی اور جناب پروفیسر سروری صاحب کا مقدمہ بھی اس کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ افسانوی ادب سے کو دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں۔ کتاب بہت دلچسپ اور انداز بیان نہایت شگفتہ ہے۔
ہر افسانہ رعنائی اور رنگینی بیان کا بہترین نمونہ ہے۔ اردو کے نئے ادب سے دلچسپی رکھنے والے اور ترقی پسند نظریوں کے پرستاران افسانوں کے مطالعہ سے ضرور محظوظ ہونگے۔ جو اصحاب اردو کے جدید ترین افسانوں کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں وہ اس نوجوان مصنف کے ان پرکیف افسانوں سے ضرور لطف اندوز ہونگے۔ صفحات (۱۶۰) قیمت مجلد (عہ)

اردو شاعری

ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہے کہ شاعری ہے کیا چیز۔ مختلف لوگوں نے مختلف طور پر شاعری کی تعریف کی ہے۔ یہاں پر ان تمام تعریفوں کے اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ شاعری کی تعریف سادے لفظوں میں یہ ہو سکتی ہے، کہ نثر تو ذہنی اور جذباتی تصورات کے سیدھے سادے اظہار کا نام ہے اور شاعری ایسے اظہار کا ایک طریقہ ہے جو کلام موزوں بن جاوے۔ مگر پھر بھی شاعری کا اصلی نقشہ اس تصویر میں نہیں ملتا۔ یہ خوب سمجھ لیجئے کہ شاعری کا میدان عمل وہی ہے جو ایک نثار کا ہے رزم ہو یا بزم، جذبۂ قومیت ہو یا جوشِ مذہبی، ذہنی تخیلات ہوں یا مشاہداتِ کائنات ہر چیز میں جس حد تک نثر کا دخل ہے اسی حد تک شاعری کا بھی ہے سوال یہ ہے کہ پھر اظہار کے یہ دو مختلف انداز و بیان کیوں وجود میں آئے۔ اس لئے اور صرف اس لئے کہ جہاں صنفِ نثر موثر نہ ہو وہاں دوسری صنف یعنی شاعری سے کام لیا جائے۔ دیکھئے شیکسپیر۔ ہومر۔ درجل اور گوئٹے کے ہم عصر صدہا نثار رہتے تھے مگر ان کی قوم کے تمدن میں جس انقلاب کی ضرورت تھی وہ ان سے نہ ہو سکا۔ اس کام کو ان شعراء نے انجام دیا۔ انصاف اور رحم کے نقشے یا انسانی کیریکٹر اور تاثرات کے خاکے جس طرح شیکسپیر نے اپنے ڈراموں میں کھینچے ہیں یا قومی جذبے کے متعلق اسکاٹ نے جو نظمیں لکھی ہیں، یا قدرتی مناظر کا ورڈسورتھ نے جو نقشہ کھینچا ہے، ان کا بیان ایک نثار کتنی ہی خوش اسلوبی سے نثر میں کیوں نہ کرے ان شعراء کی طرح اثر پیدا نہیں کر سکتا۔ جس طرح موسیقی شعر کی خوبیوں پر سونے پر سہاگہ کا کام کرتی ہے اسی طرح نثر شعر کے سانچے میں ڈھل کر خیالات کے اثرات کو دوبالا کر دیتی ہے۔

یہ نہ سمجھئے کہ نظم و نثر کا یہ فرق، قافیہ اور ردیف کی وجہ سے ہوتا ہے خدا جانے کتنے اثرات کا مجموعہ ہے جن سے مل کر شاعری نثر سے بالکل جدا اور اس سے بہت بلند تر اور ایک اچھوتی چیز بن جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ شاعری ایک ایسی قوت ہے جس کا اظہار جذبات کے ہر شعبے پر اثر پذیر ہے خواہ وہ ارتقائے ذہنی ہو خواہ مصوری جذباتِ جمالیت خواہ جوشِ ملی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان شعبوں پر شاعری کا نثر کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ اثر ہے۔

مذکورۂ بالا معیار کی روشنی میں ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آیا ہم شاعری کے اس مفہوم کو سمجھتے ہیں یا نہیں۔ آیا ہم اردو شاعری سے یہ کام لے رہے ہیں یا نہیں۔ اور آیا ہماری شاعری ہمارے انسانی اور قومی ارتقا کی ترجمان ہے یا نہیں۔ گزشتہ صدی کے دورِ شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ ہم نے شاعری سے اعجاز سے کہاں تک کام لیا ہے۔ تعمیری جذبے سے بے نیاز، روح پرور مضمون سے خالی، صرف ذہنی نقطۂ نظر سے ناکارہ اور موضوعی حیثیت سے بھی مصنوعی اور دقیانوسی۔ یہ ہے پرانی داستان ہماری شاعری کی بدقسمتی سے ہمارے شعراء کا میلانِ طبع صرف تغزل کی طرف رہا۔ اور جو نظری مجسمہ حسنِ اظہارِ جذبات کا مرکز بنا رہا۔

اس میں ایک طرف تو سوقیت غالب رہی اور دوسرے جانب جو مجسمہ اظہار تغزل کو تیار کیا گیا وہ ایک عجیب الخلقت ابوالہول سے کم نہیں یعنی نہ وہ مرد ہے نہ عورت نہ فی الحقیقت کوئی ایسی چیز ہے جو صحیح تصویر بن سکے۔ اس کے سر کے بال کمر تک لمبے، مانگ سیندور بھری ہوئی جس کو خط آرہ کشی سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ موباف سرخ و زرد گھنگھور اپیشانی پر افشاں، رخسار پر خال گویا پھول کی پتی پر مگس یا ایمان کے خرمن میں کفر کا ایک دانہ، پاؤں میں پازیب و خلخال کا جنجال جن کی جھنکار محشر خیز، ہاتھوں میں مہندی گویا عاشق کے خون کا رنگ، لب و دندان پر مستی کی دھڑی اور پاؤں کی سرخی قدیم سنگار کے تصور کو بھی شرماتی ہیں۔ انگیا۔ چولی۔ محرم۔ نقاب۔ سیب ذقن۔ انار پستان یہ تو نسوانی علامات ہیں مگر ساتھ ہی معشوق سبزۂ خط سے ریش اثیل بھی ہوتا ہے۔ ظلم و جور۔ اعتبار کے ساتھ سر بازار آوارہ گردی، تیغ آزمائی تیر افگنی، قتل و غارت گری وغیرہ اس کی صنف قوی سے ہونے کا ثبوت ہے۔ حلیہ اس معشوق عجیب کا یہ ہے کہ صراحی کی طرح لمبی گردن، لکھنو کی ککڑیوں سے نازک کلائیاں، کمر بالکل معدوم یا بال کی طرح باریک، لب کوزۂ قند و نبات، دندان سلک مروارید، ناک شمع کافوری، آنکھیں نرگس بیمار، پلکیں تیر و نشتر، بھویں شمشیر و خنجر، رخسار آفتاب، جبین ماہتاب، زلف بل کھائی ہوئی ناگن، گیسو مار سیاہ، موئے خط سبزہ زار، غرض کہ ایشیائی شاعری کے اس خیالی معشوق کو مثالی جامہ پہنا کر کسی بزم شاعرہ میں پیش کر دیا جائے تو ہمارے عشق زدہ کمزور دل شعراء چیخ مار کر بیہوش ہو جائیں اور جری و بہادر لوگ زندہ دل ہنستے ہنستے لوٹ جائیں، اور معشوق صاحب کی وہ گت بنائیں کہ پھر وہ اپنے عاشق شعراء کے خواب و خیال میں بھی آنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ دنیا اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ آج ہر چیز کے لئے عین الیقین کی ضرورت ہے مگر ہمارے شعراء اپنے حسن و عشق کے تخیل میں واقعیت اور حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ تمام تشبیہات و تلمیحات اور حسن و عشق کے فرضی لوازمات ایسے پیش کئے جاتے ہیں جن سے ہمارے ماحول اور محسوسات کو مطلقاً تعلق نہیں۔ اگر کہیں مناظر کی جھلک بھی نظر آتی ہے تو ایسی جن سے ہماری نگاہیں آج تک محروم ہیں اور ناآشنا۔ غیر ملکی مناظر کے لئے جن سے ہمیں مسرت حاصل نہیں ہوسکتی اپنے ملکی و ماحولی مناظر کی طرف اب تک آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

سمند ناز پر ایک اور تازیانہ ہوا۔ اردو غزل میں اس کی ہمیشہ سے اجازت دی گئی ہے کہ ایک ہی غزل میں متفرق خیالات ہوں لیکن اب یہ مرض بڑھتا جا رہا ہے کہ ایک ہی غزل میں متضاد خیالات بھرے جاتے ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے جو ہماری غزلیں غیر فطری سمجھی جاتی ہیں۔ ایک ہی سانس میں دو متضاد جذبے کیسے ہوسکتے ہیں۔ میرا مطلب تغزل کی اہمیت کو کم کرنا نہیں ہے اور اصلی تغزل انسان کے صحیح جذبات کا صحیح آئینہ ہوتا ہے، اور جہاں اور اصناف سخن ایک ہنگامی حیثیت رکھتے ہیں اس کی استقامت اور استقلال

پر زلزلہ لانا دشوار ہے لیکن ہمارے شعراء افراط تفریط کے شکار ہوئے اور محض تغزل اور وہ بھی غیر فطری تغزل کو انہوں نے اپنا نصب العین بنا رکھا اور دوسرے اصنافِ سخن سے بالکل غافل رہے۔

ابتدا میں تو کچھ توجہ قصیدوں اور مثنویوں کی طرف رہی لیکن ان اصناف سے جو اصلی کام لینا چاہیے تھا وہ نہیں لیا گیا۔ اور نظموں کی طرف تو کسی نے خیال ہی نہیں کیا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ تو مناظر قدرت کی تصویر کشی سے مستفید ہوئے نہ جذباتِ ملی و ملکی قوم میں یہ پیدا کر سکے۔ میں جانتا ہوں کہ زبان کے ابتدائی دور میں اس کی صفائی و روانی پر توجہ غالب رہتی ہے۔ اسی طرح ہماری زبان میں بھی ہوا۔ مگر تخیل کا معیار بلند نہ ہوا۔ لیکن اس دور کے بعد دنیائے شاعری کے افق پر ایک روشن ستارہ نجم الدولہ دبیر الملک غالبؔ دہلوی کی صورت میں طلوع ہوا جس نے اپنی شاعری کی بنیاد فلسفۂ حیات اور رموز زندگی کی مستحکم زمین پر قائم کی۔ خیالات کی بلندی جذبات کی لطافت اور پاکیزگی کے ساتھ اس نے ان حقائق کی تصویر کھینچی جو انسانیت کا مرکز نگاہ بننے کے قابل تھے دو اور شعراء انیس و دبیر اصلی معنوں میں شاعر کہلانے کے مستحق ہو سکتے تھے مگر افسوس کہ انہوں نے اپنی فکر طبع کو محدود رکھا۔ منظر کشی، واقعہ نگاری اور جذبات کی تصویریں اتارنے میں یہ دونوں شعراء نے دادِ سخن دی لیکن ان کے یہاں بھی فطرت سے وہ ہم آہنگی اور قرب عنقا ہے جو ورڈسورتھ (Wordsworth) شیلی (Shelley) یا بائرن (Byron) کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

غالبؔ کی روش پر چلنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہوئی لیکن وہ ایک ایسی شاہراہ پیدا کر گئے تھے جو معدوم نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اس ترقی یافتہ دور میں سنجیدہ طبقے نے اس شاہراہ پر گامزنی کی کوشش فرمائی اور اس نے اب خاصی کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس طبقے کے شعراء نے جذبات، حسن و عشق اور فلسفۂ حیات کی حقیقت آگیں تصویر دکھلانے میں جو سعی فرمائی اس نے تغزل میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی ہے ان میں سے خاص طور پر فانیؔ۔ جگرؔ اور حسرتؔ ہیں۔ بے معنی تغزل سے ہٹانے میں پہلی سعی جس شاعر نے کی وہ مولانا حالیؔ ہیں۔ قومی ادبار کی تصویر ان کے سامنے تھی قومی درد ان میں کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا تھا۔ وہ ابل پڑا اور اس نے ان سے مسدس ایسی نایاب چیز لکھائی۔ نیز اسی طرح کی اور نظمیں جن کو پڑھ کر قومی جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور عمل کا احساس ہوتا ہے پھر چکبستؔ نے ایسے دلچسپ پیرایے میں قومی ترانے گلے کہ اس نے قومیت ملکیت، اور وطنیت کا جوشِ جنون پیدا کر دیا۔ فلسفۂ زندگی کو طنزیات کے تحت میں لا کر بیان کرنے میں اکبرؔ الہ آبادی نے جو کمال دکھایا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن ان کا مسلک "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" نہ تھا اس لئے قوم کی ذہنی ارتقاء میں ان کی شاعری ایک سنگِ گراں ثابت ہوئی۔

حالیؔ کو زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ آسمانِ شاعری پر علامہ اقبال نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ سے ایک ایسا پیغام ہم کو پہنچایا جس سے ہماری نظر حقیقتِ انسانی پر پڑی اور ہم سب

ایک خاص جذبے سے متاثر ہو گئے۔ اور اب شعراء کا رجحان تکمیل تغزل کی طرف ہوا اور اسی کے ساتھ ہی ساتھ مذہبی۔ اخلاقی قومی سیاسی نظموں اور نیچرل شاعری کی طرف خاص طور سے توجہ بڑھی جس کا ثبوت ادبی جرائد متواتر پیش کر رہے ہیں۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر حضرت جوش ملیح آبادی۔ پنڈت آنند نرائن ملّا۔ ہادی مچھلی شہری۔ حفیظ جالندھری۔ احسان دانش۔ اختر شیرانی وغیرہ وغیرہ ہیں۔ ان حالات سے امید ہوتی ہے کہ اردو شاعری ایک ہمہ گیر اور مکمل شاعری کی حیثیت حاصل کرے گی۔

شاعروں اور شاعری کے بڑے بڑے کارنامے صفحات تاریخ پر موجود نہیں۔ دنیا کے بہت سے عظیم انقلاب شاعری کے رہین منت ہیں اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ ابھی ہمارا ذہن شعریت سے خالی نہیں ہے اور ہم اس صنفِ سخن سے بہت کچھ کام لے سکتے ہیں۔ آج تو ان ممالک میں جہاں صنعتی اور حرفتی ارتقا حاوی ہو گئے ہیں، وہاں شعراء رفتہ رفتہ عنقا ہوتے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت یورپ میں یہ صورت ہے کہ بلند پایہ ادیب۔ محقق۔ سیاست داں اور صحیفہ نگار تو وافر تعداد میں موجود ہیں مگر شکسپیر۔ ملٹن۔ ورجل۔ ہومر اور ڈ اسنٹے نیا تمدن نہیں پیدا کر سکا۔ اس لئے ہمارے شعراء کو اس حقیقت سے آشنا ہو جانا چاہئے۔ ضرورت ہے کہ اس وقت کو غنیمت سمجھیں اور حقیقی شاعری کا جذبہ ملک میں پیدا کریں۔ جوش جوانی اور عیش پرستی کا ذکر اس قوم کے لئے زیبا ہے جس کو عیش و راحت کی زندگی میسر ہو۔ لیکن جو قوم ایسی ہو کہ اس کے بیشتر افراد کو ایک وقت شکم سیری میسر نہیں اور مصائب اور آفات کے ہجوم سے محزون و مغموم ہیں اس کے شعراء کو یہ کیونکر زیب دے سکتا ہے، کہ خیالی تعشق اور رندی اور بدمستی کے راگ الاپتے رہیں۔

ملک و ملت زبانِ حال سے فریادی ہیں کہ ہم کو زندگی کے اصلی مقصد کی تلاش ہے۔ اقتصادی، معاشی مذہبی، اخلاقی اور تمدنی و معاشرتی آزادی کی ضرورت ہے لہذا ان امور کے حصول کے لئے تمام قومی طبقات کے ساتھ طبقۂ شعراء کو بھی میدانِ جد وجہد میں آکر اپنا فرض ادا کرنا چاہئے۔

نجم الدین احمد جعفری
(الہ آباد)

عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متولیان ریاست اس کتاب کو مجلس علمیہ طیلسانین عثمانیہ نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب اصل میں ایک تحقیقی مقالہ ہے جس کو مولوی علی محسن صاحب نے اپنے ام اے کے امتحان کے لئے لکھا تھا۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کتاب کا مطالعہ اہل اردو کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

تعداد صفحات ۲۰۴ قیمت عہ

اظہارِ مسرت

دکن کی شاہزادیوں کی خیر و عافیت کے ساتھ واپسی پر دکن کی مختلف انجمنوں کی طرف سے جو مبارک باد کا جلسہ بتاریخ ۱۴ر ڈسمبر ۱۹۳۹ء منعقد ہوا تھا اس میں ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ نسوان کی طرف سے بھی اس کی صدر محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ نے پھول پہنائے اور اس شعبہ کی اراکین نے جو نظمیں پڑھیں وہ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

بہارِ تازہ ز مغرب بہ ایں دیار آمد　　نبیرۂ شہہ عثمانِ کامگار آمد

مفخمے کہ فخامت ز روئے او پیداست　　بہ بر گرفتہ چساں دُرِّ شاہوار آمد

زما پیام رساند کسے بہ شاہِ دکن

برار بہ تازہ بہ شہزادۂ برار آمد

۲

تعالیٰ اللہ! دعائیں اپنی پہ تاثیر لائی ہیں　　بخیر و عافیت شہزادیاں یورپ سے آئی ہیں

نہ تھی تشویش تک بھی جنگِ موجودہ تباہی کی　　ہمیں تو فکر رہتی تھی فقط ارکانِ شاہی کی

مساجد، خانقاہوں، شاہراہوں اور مکانوں سے　　نکلتی تھی دعائے واپسی لاکھوں زبانوں سے

مقامِ جنگ سے جب تار وحشت ناک آتے تھے　　ستارے آسمانِ سلطنت کے جھلملاتے تھے

کسی اخبار میں گر "واپسی" عنوان نظر آتا　　گماں فی الفور اپنا، شاہزادوں کی طرف جاتا

کبھی جب نشر گہ سے تازہ کچھ اعلان ہوتا تھا　　دلوں میں جاں نثاروں کے بپا طوفان ہوتا تھا

دعائیں مانگنے کو اجتماعِ عام ہوتا تھا　　ہر اک فرطِ خضوع سے لرزہ بر اندام ہوتا تھا

نکلنے بھی نہ پاتی خاکِ سجدہ تک جبینوں سے　　کہ اٹھ کر پوچھتے تھے کیفیت اخبار بینوں سے

امید و بیم کی یہ کشمکش ہر دم ستاتی تھی　　نہ دن کو چین ملتا تھا، نہ شب کو نیند آتی تھی

سفینہ اپنی تقدیروں کا گردابِ بلا میں تھا　　قبیلہ آصفِ سابع کا اک جو کمِ فضا میں تھا

بفضلِ رحمتِ پروردگار آخر وہ دن آیا　　رعایائے دکن نے "مژدۂ آمد" بھی سن پایا

خدا کا شکر ہے جاتی رہیں بے تابیاں اپنی　　ہجومِ شوق سے لبریز ہے ہر داستاں اپنی

ریاضِ آصفی میں شادمانی کے ثمر آئے　　بخیر و عافیت سرکار کے لختِ جگر آئے

کرم پویاں پویان و مفخم در کنار آمد　　درِ شہوار با شہزادۂ ملکِ برار آمد

جلالِ ترکمانی از معظم جاہ پیدا شد

فرِ نیلوفری بنگر بہ رنگِ تو ہویدا شد

بشیر النساء بیگم بشیر

اظہارِ جذبات

تھیں نظر سے جو نہاں — اپنی شاہزادیاں
منہ پہ تھیں ہر ایک کے — اڑ رہی ہوائیاں
دل تھے صرفِ رنج و غم — ہاتھ سوئے آسماں
تھی دعا ہر ایک کی — اے خدائے انس و جاں

۲

خیریت سے آئیں وہ — خیریت سے آئیں وہ
دل کی اُجڑی بستیاں — آکے پھر بسائیں وہ
اپنے دم سے ملک کو — گلستاں بنائیں وہ
کیف اور سرور کی — ندیاں بہائیں وہ

۳

بدلیاں دعاؤں کی — جب فلک پہ چھا گئیں
جوشش رحیم کی — رحمتیں بھی آگئیں
کام حق کی بخششیں — اس طرح بنا گئیں
شکر ربّ العالمین — شکر ربّ العالمین

۴

پھر دکن کی سرزمیں — نازشِ ارم بنی
خیریت سے آئے وہ — لو تھی جن کی لگ رہی
لب پہ جن کا نام تھا — دل میں جن کی یاد تھی
جو دکن کے ناز ہیں — شان اپنی جس کی

۵

برکتِ ورود نے — کر دیا ہے غم غلط
ہر دکن کے فرد سے — یادِ درد و ہم غلط
لوحِ دل سے ہو گئے — معنیٔ الم غلط
گردشِ جہاں کی — فکرِ بیشِ و کم غلط

۶

پھر وہی چہل پہل — پھر وہی ہے چہچہے
پھر وہی ہنسی خوشی — پھر وہی ہیں قہقہے
جوش یہ سرور کا — کم نہ ہو خدا کرے

دورِ انبساط یہ
یا خدا سدا رہے

لطیف النساء بیگم

ریلوں کی اردو

ہماری بدترین کمزوریوں میں ہماری غفلت، لاپروائی، پست ذہنیت اور احساس کمتری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم غیروں کے ہاتھوں اپنی تہذیب اور زبان کی بربادی گوارا کر رہے ہیں۔ اس بربادی کے اتنے ثبوت دیکھتے ہوئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ تباہی کی یہ نشانیاں دو آبے میں نظر آ رہی ہیں اور اس تباہ کاری کو وہی اہل زبان گوارا کر رہے ہیں جن کی زبان شستہ اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ اگرچہ مجھے بھی علم ہے کہ ریلوں پر ہمارا زور نہیں، آئینی اعتبار سے ریلوے کے کاروبار میں ہمارا عمل دخل نہیں، مگر یہ بھی میں جانتا ہوں کہ ریلوے بورڈوں میں جتنے ہندوستانی افراد ہیں (چاہے وہ حکومت کے نمائندہ ہوں یا تجارتی اداروں کی طرف سے نمائندگی کر رہے ہوں) اگر وہ متحدہ طور پر ہندوستانی زبانوں کی تحقیر کی مخالفت کریں تو اس خرابی کا بہت جلد خاتمہ ہو جائے۔

مجھے خیال تھا کہ کانگریسی راج قایم ہونے کے بعد تحریری زبان سنبھل جائے گی، سرکاری محکمے زبان کی فصاحت اور پاکیزگی نہ سہی کم از کم صحت کا خیال ضرور کریں گے مگر نہیں وہی پرانا ڈھرا قایم تھا، پرانی بدتمیزیاں موجود تھیں، پرانی زبان گشتی جاری تھی۔ بعض گاڑیوں کے نئے نئے ڈبوں میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا تھا، ہر چیز کی ظاہرہ حالت سے پتہ چلتا تھا کہ ابھی ابھی یہ ڈبے بنے ہیں، ہر چیز نئی تھی، جابجا ضروری اعلانوں کی تحریریں بھی نئی تھیں صرف —— زبان پرانی تھی! وہی زبان جو صاحب بہادر استعمال کرتے ہیں، چنانچہ ایک اعلان تھا کہ۔

"مسافروں کو ہوشیار کر دیا جاتا ہے کہ جب گاڑی چلتی رہے تب گاڑی کے دروازے کو نہ کھول رکھیں یا اپنے جسم کے کسی حصے کو کھڑکی یا دروازے کے باہر نہ رکھیں کیونکہ یہ دونوں عادتیں خطرناک ہیں"

خط کشیدہ لفظوں پر غور کیجیے۔ اس سے زیادہ مہمل عبارت اور کیا ہو سکے گی! وہ بھی اس ریلوے کی جو اردو اور ہندی کے گہواروں میں ڈولتی ہے، اردو کے سرچشموں سے سیراب ہو رہی ہے، دو آبے کی دولت سے مالامال ہو رہی ہے اور بیچ بیچ دہلی کی زبانی ٹکسال لال قلعہ میں سے گذرتی ہے۔

شاید آپ کو معلوم نہ ہو یا معلوم بھی رہا ہو تو بھول گئے ہوں کہ دہلی سے غازی آباد کو جو ریل جاتی ہے وہ شاہانِ دہلی کی قیام گاہ، اکبر کے بنائے ہوئے قلعے اور بہادر شاہ ظفر کی آماجگاہ میں سے گزرتی ہوئی جاتی ہے اور اس ریل کی تعمیر کے وقت محض سہولت اور —— کفایت کی خاطر لال قلعے کی دیواروں کو توڑ تاڑ کر ہموار کیا گیا اور رہتی دنیا کے سامنے اپنی بربریت اور غارت پسندی کا ثبوت دیا گیا! غرض، لال قلعہ ٹوٹا، اس میں سے ریل گزری، انگریزی مطلق العنانی کا بھی خاتمہ ہوا مگر ریلوں کی زبان نہ سنبھلنا تھی نہ سنبھلی! کیا کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں کہ اس قسم کے مہمل جملے کا کہ

"اپنے جسم کے کسی حصّے کو باہر نہ رکھیں!"

کیا مطلب ہے؟ اس قسم کے بے معنی اور لغو اعلانوں کا کیا فائدہ؟ کیا اردو کے شیدائی، ہندی کے پریمی، ہندستانی کے دلدادہ

باقی نہیں کہ ریلوے کی زبان کشی کے خلاف جہاد کریں اور ان کے دماغ کو ٹھکانے لگائیں ؟ ؟ اگر خود حکومت کو صحیح زبان کا احساس نہیں تو ریلوے کے ممبر، ریلوے بورڈوں کے ارکان، مجلس مقننہ کے اردو نواز اصحاب کیا کر رہے ہیں ؟

یہ ایک ہی اعلان نہیں جسے نظر انداز کیا جاتا۔ اس قسم کے ہزاروں اعلان انگریزی ٹائپ خانوں، تار گھروں، سرکاری دفتروں اور ریل کے ڈبوں میں نظر آتے ہیں تعجب ہے کہ اردو کی ستیاناسی اسی صوبے میں کی جائے جو اردو کا وطن ہو اور ـــ اہل زبان خاموش بیٹھے رہیں ؟ ! الٰہ آباد میں "ہندستانی اکیڈمی" اعظم گڑھ میں "دار المصنفین" قرول باغ میں "اردو اکاڈمی" ہو،

"ہندی پرچارنی سبھا" کا مسکن بنارس ہو اور انجمن ترقی اردو کا صدر مرکز دہلی میں ہو، پھر بھی اس صوبے میں زبان کی توہین آمیز اور حقارت انگیز عبارتیں گوارا کی جائیں ! ؟ ایک طرف تو سرکاری اور قومی یونیورسٹیوں اور کالجوں، مدرسوں اور پاٹھ شالاؤں، مکتبوں اور درس گاہوں میں صحیح زبان سکھائی جا رہی ہے، اردو کے استادوں اور اردو کے پروفیسروں پر ملک و قوم کا ہزار ہا روپیہ صرف ہو رہا ہے اور دوسری طرف سرکار کے محکموں میں، سرکار کی ریلوں میں اردو کی ناقدری ہی نہیں اردو کا ستیاناس اور غارت گری ہو رہی ہے اور ہم آپ خاموش بیٹھے فلسفہ بگھار رہے ہیں !!

جعفر حسن

نغمہ اردو

اظہار مطالب کی جو تو جان ہے اردو　　ہر ایک ترا دل سے ثنا خوان ہے اردو

جس بزم میں کرتی نہیں تو نغمہ سرائی　　کچھ شک نہیں وہ بزم بھی سنسان ہے اردو

رکتی ہے ترقی تری ؟ ہوں لاکھ مخالف　　دشمن بھی ترا تجھ سے پریشان ہے اردو

کب شستہ و صاف ایسی کوئی اور زبان ہے　　کہنے میں سمجھنے میں بھی آسان ہے اردو

کیا تجھ پہ کوئی اور زباں کی ہو حکومت　　تو مشترکہ قوم کی پہچان ہے اردو

بن جائے گی کچھ روز میں شیرازۂ اقوام　　وسعت میں تری اس کا بھی امکان ہے اردو

سرمایۂ کیوں علم و ادب کا ہو۔ کہ تیرا　　سلطان علوم آج نگہبان ہے اردو

اک روز تو ہو جائے زباں سارے جہاں کی
بس دل میں تمکیں کے یہی ارمان ہے اردو

میر حسن علیخان تمکین

اُردو کے خاموش خدمت گذار

موجودہ زمانے میں "روشناسِ خلق" وہی ہستیاں ہیں جن کو سیاست یا کسی دوسری معرکتہ الآرا تحریک سے قریبی تعلق ہو شعراء اور بعض سر برآوردہ مصنفین بھی رسالوں، تذکروں اور سوانح کے طفیل سے اپنی زندگی اور کام کو عوام تک پہنچا دیتے ہیں اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کے تذکروں کو بھی شوق اور تعظیم سے پڑھا جاتا ہے۔ اور ان کی زندگی لوگوں کے لئے شمعِ ہدایت ثابت ہوتی رہی ہے۔ لیکن زمانے کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ ان قابل قدر ہستیوں کا بھول کر بھی خیال نہیں کرتا جن کو قوموں کی تعمیر میں بہت بڑا دخل ہے۔ جن کی مخلصانہ کوشش ہماری نسلوں کے ذوقِ عمل و تحصیلِ علم کو اکساتی ہیں۔ اور ایسے افرادِ قوم کی ذہنی نشو و نما ان کے ذمہ ہوتی ہے جن سے قوموں کی قسمتیں وابستہ ہوتی ہیں دنیا کا کوئی شخص استاد کی گرانمایہ خدمت سے انکار نہیں کرسکتا۔ یہی وہ سرچشمہ ہے جہاں سے ایسے سوتے ابلتے ہیں جن سے انسانیت کی کھیتی ہری ہوتی ہے۔ یہی وہ انسان نما خضر ہیں جو ہزاروں بھٹکے ہوؤں کو راہِ راست پر لگاتے ہیں اور نئی نئی شاہراہیں کھولتے ہیں افسوس ہے کہ یہی لوگ زمانے کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ محمد علی جناح اور گاندھی جی کے استاد کون تھے ؟ کہاں کے رہنے والے تھے اور انھوں نے ان کی زندگی اور طبیعت و اخلاق کے بنانے میں کیا حصہ لیا تھا؟ ہاں ایکٹرسوں اور ایکٹروں کی زندگیوں کے ایک چھوڑ کئی ایڈیشن نکل سکتے ہیں ان کی حیات کے ہر دور سے لوگ واقف رہیں گے۔ کب فلاں نے فلاں سے ملاقات کی۔ فلاں کی زندگی میں تبدیلی کب پیدا ہوئی۔ غرض کہ ممکنہ معلومات سے ہر شخص واقف ہونا چاہتا ہے۔

میتھو آرنلڈ نے سچے ہیرو کے لقب کو صرف استاد کے لئے مختص قرار دیا ہے اس کے نزدیک اساتذہ صرف اکیلے ہی ترقی کی راہ پر گامزن نہیں رہتے بلکہ ایک کاروان کی بھی رہنمائی کرتے ہیں اور تاوقتیکہ ان سب اہل کاروان کو منزلِ مقصود پر پہنچا نہیں دیتے ان کی محنت ٹھکانے نہیں لگتی۔ اساتذۂ اُردو جس گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں وہ خود ہماری پستی اور ناقدرشناسی کی دلیل ہے۔ ان اساتذہ کی صحیح عظمت کا اندازہ اس حقیقت سے ہوسکتا ہے کہ ان ہی کی کوششوں اور تربیت سے ہر قسم کی علمی و ادبی صلاحیت کے جوہر کھلتے ہیں۔ استاد ہی کی صحیح تربیت کسی کو شاعر، کسی کو افسانہ نگار اور کسی کو خادمِ قوم بننے کا موقع دیتی ہے۔ اس مضمون کے شائع کرنے سے یہ مقصد نہیں کہ صرف اساتذۂ اُردو ہی کے سر ساری عظمتوں کا سہرا ہے بلکہ اس کا یہ مقصد ہے کہ ان خاموش خدمت گذاروں کی طرف بھی لوگوں کو متوجہ کیا جائے یہ میری پہلی کوشش ہے اگر اس میں مجھے کامیابی ہوجائے، اور اُردو کے موجودہ استادوں سے میں اُردو دنیا کو متعارف کرا سکا تو میں کوشش کروں گا کہ ایسے اصحاب کے حالات بھی جمع کروں جو اُردو کی تعلیم دیتے ہوئے اپنی زندگیاں ختم کرچکے ہیں

اُردو زبان کی مقبولیت اور وسعت روز افزوں ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے اس زبان کو بہت بڑی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے اس جامعہ میں ذریعۂ تعلیم اُردو ہے۔ اور وہ تمام مغربی علوم و فنون جو غیر زبانوں میں مقید تھے اب آزاد ہیں اس لئے اُردو کے استاد بھی اِس دور میں پہلے سے زیادہ توجہ، روشناسی اور قدر و منزلت کے مستحق ہیں۔

اُردو کے اِن بہی خواہوں اور سرپرستوں کی گنتی انگلیوں پر کی جاسکتی ہے اور ان میں سے اکثر کسی نہ کسی ادارۂ

درس وتدریس سے متعلق ہیں میں نے اسے اپنا سب سے مقدس اور پہلا فریضہ سمجھا کہ ان قابل احترام ہستیوں سے قارئین سب رس کو متعارف کراؤں ۔ اس خیال کا ذکر میں نے محترمی واستادی ڈاکٹر زور صاحب سے کیا جنھوں نے اس کو بہت پسند کیا اور ممکنہ امداد کے بہم پہنچانے کا وعدہ کیا۔ میں نے ہندستان کی مختلف جامعات کے اُردو کے اساتذہ صاحبان سے خط وکتابت شروع کردی اور ان کے حالاتِ زندگی، کام اور دیگر معلومات کا ایک تفصیلی خاکہ مانگا ۔ عالیجناب ڈاکٹر زور صاحب نے ہر خط پر میری سند عابر توجہ کرنے کے لئے شخصی اثر اور تعلق سے کام لیتے ہوئے سفارش کی لیکن اکثر اساتذہ صاحبان نے روایتی "عدم توجہی" اور "لاجوابی" سے کام لیا ۔ بعض نے نہایت ہی مختصر حالاتِ زندگی کے روانہ کرنے پر اکتفا کی ۔ بعض نے تصویر بھیجا نے سے معذوری ظاہر کی ۔ اور اکثروں نے "میرے حالات زندگی کچھ قابل ذکر نہیں" ۔ "ایک زمانے سے تصویر نہیں کھنچوائی اس لئے معذور ہوں" "میں ایک خاموش کارکن ہوں" لکھ کر مجھے مایوس کردیا ۔ دوبارہ اس سلسلے میں یاد دہانی کی گئی تو بہ زیادہ توجہ سے کام لیا گیا ۔ اور اس کے لئے میں سب سے پہلے ڈاکٹر زور کا اور پھر جملہ اساتذہ صاحبین کا تہہ دل سے مشکور ہوں ۔ دوسروں کے نزدیک "خاموش کارگزاری" اور "عزلت گزینی" چاہے جس نظر سے بھی دیکھی جائے بحیثیت اُردو ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم وسوانح نگار کے میں اس کو ایک ادبی "رجعت پسندی" سے تعبیر کروں گا ۔ اس مضمون میں اگر یکل ہوجائے تو آپ دیکھیں گے کہ ایسی ایسی گمنام ہستیاں آپ کے پیش نظر رہیں گی جن کی زندگی کا ایک ایک باب ہدایت اور رہنمائی کا دفتر لئے ہوئے ہے ۔

ان ہی خواہان اُردو کی زندگیاں جن منزلوں سے گزریں، جو جو مراحل ان مستقل مزاج اصحاب کو برداشت کرنے پڑے، اور جس کس مپرسی اور عزلت گزینی کی حالت میں انھوں نے اپنی زبان اور ادب کی خدمت کی ان سب کو نظروں میں رکھتے ہوئے کون ہے جو خاموش خدمت گذاری اور مستقل مزاجی کا درس نہیں لے گا ۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ مضمون تمام اساتذہ صاحبان اُردو کی زندگیوں پر روشنی نہ ڈال سکے گا ہر حال اسے ایک ابتدائی کوشش سمجھئے ۔ موقع ملے تو یک مستقل تذکرہ اس موضوع پر ترتیب دیا جاسکے گا ۔ اس وقت جن اصحاب کے حالات مہیا ہوسکے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں :-

۱ - مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے ایل ٹی - (لکھنو)
۲ - سید ضامن علی صاحب ایم اے (الہ آباد)
۳ - ڈاکٹر ایم حفیظ سید صاحب ایم اے - پی اچ - ڈی - ڈی لٹ - ایل ٹی (الہ آباد)
۴ - مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم - اے (اسمٰعیل کالج جوگیشوری - بمبئی)
۵ مولانا محمد طاہر صاحب فاروقی ایم - اے - مولوی فاضل - ادیب فاضل - دبیر کامل (آگرہ یونیورسٹی)
۶ - پروفیسر حامد حسن صاحب قادری (آگرہ یونیورسٹی)
۷ - مولوی عبدالقادر صاحب سروری ایم اے - ال ال بی (کلیہ فنون جامعہ عثمانیہ)
۸ - مولوی سید محمد صاحب ایم اے (کلیہ بلدہ - جامعہ عثمانیہ)

(۱) مولوی سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب - ایم اے - ایل ٹی - (لکھنو یونیورسٹی)

آپ نے جس گھر میں آنکھیں کھولیں اس میں تمول نہ تھا تو پریشان حالی بھی نہ تھی ۔ قسمت نے آپ کو ایسے زمانے میں پیدا کیا

پروفیسر سید محمد اشرف ندوی

پروفیسر سید مسعود حسن رضوی
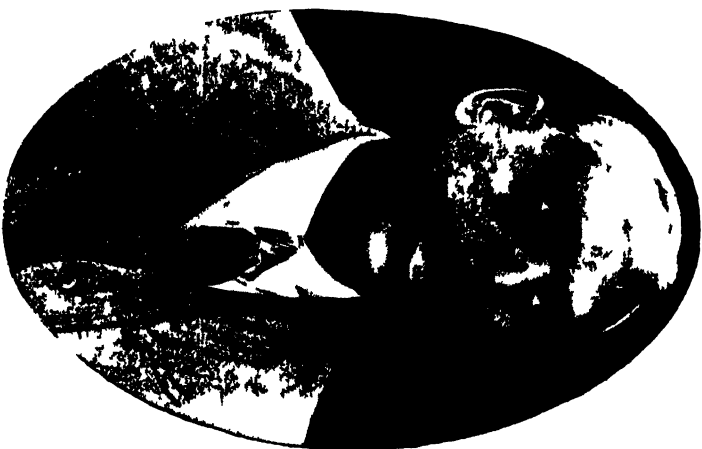
اسمٰعیل میرٹھی - اکبرالہ آبادی
نظم طباطبائی ـ شوق قدوائی

پروفیسر ڈاکٹر حفیظ سید

جب کہ عزت و وقار کا کاروان آپ کے برگزیدہ اور اولوالعزم بزرگوں کے ساتھ کوچ کر چکا تھا۔ آپ گردِ کاروان سے کاروان کی عظمتوں کا اندازہ کرنے کے لئے پیدا ہوئے۔ میراث میں وہ خاندانی ثروت و دولت نہ ملی البتہ چند سرکاری کاغذ زمانے کی دست برد سے محفوظ تھے یہی اس خاندان کی گزشتہ ترقی اور عروج کی یادگار تھے۔ وہ لوگ بھی نہ رہے جنھوں نے اپنی آنکھوں سے اس خاندان کو ترقی کی منزلیں طے کرتے دیکھا۔ ان کاغذات میں آپ کے دادا کے دادا سید عزیز علی ولد سید عبدالمطلب کی ایک جاگیر کی تفصیل درج ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ سید عزیز علی کے دادا سید سیف اللہ ولد سید محمود "بندہائے چوکی خاص" میں سے تھے اور دو صدی ذات کے منصب پر فائز تھے۔ سید عزیز علی کی ایک بڑی جاگیر نواح گورکھپور میں تھی۔

آپ کے والد سید مرتضیٰ حسن مرحوم ایک عالم بزرگ اور حاذق طبیب تھے۔ اُن کا وطن اودھ کے ضلع اناؤ میں قصبہ [illegible] تھا حصولِ علم کے لئے [illegible] لکھنؤ گئے جہاں سے بہرائچ پہنچے۔ مسعود حسن صاحب رضوی کا مقام پیدائش بہرائچ اور تاریخ ۱۵ محرم ۱۳۱۱ھ [illegible] درسگاہ حاصل کریں۔ لیکن اُردو [illegible] خدمت کے لئے منتخب کر لیا تھا آپ کی [illegible] کی موت نے سارے حوصلے پست کر دئے۔ عزیز و اقارب ایسے ہمدرد نہ تھے کہ آپ کی آئندہ فلاح و بہبود کا خیال ان کے دل میں پیدا ہوتا اور وہ آپ کے تعلیمی مصارف کے کفیل ہوتے۔ ایک بیوہ ماں کی اشک شوئیوں اور تسلیوں نے علم کے شوق کو آنسوؤں کی زد میں بہہ جانے سے روکا اور حصولِ علم کی آگ کو افسردگی کی راکھ میں بجھنے نہ دیا۔ اور برابر آپ کی ہمت بندھاتی رہیں۔ آپ کی تعلیمی زندگی اصل میں آپ کی والدہ محترمہ کی بدولت پروان چڑھی۔

آپ کی ذاتی استعداد اور دماغی صلاحیت کو بھی آپ کی تعلیمی ترقی میں بہت بڑا دخل ہے۔ اسکول کے ہر امتحان میں اول آتے اور سال بہ سال ترقی [illegible] آٹھویں درجے میں پہنچے تو دردِ سر کا عارضہ لاحق ہو گیا اور اب تک یہ دردِ سر پیچھا نہیں چھوڑتا۔ سال میں ایک آدھ دفعہ ضرور سر اُٹھاتا ہے سر کے درد کے ساتھ تبخیر معدہ کی شکایت بھی پیدا ہو گئی۔ تو آپ کو سلسلۂ تعلیم جاری رکھنے میں سخت زحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ بعض بہی خواہوں نے مشورہ بھی دیا کہ جان ہے تو تعلیم بھی ہے۔ مگر جو قدم تعلیم کی راہ میں آگے بڑھے وہ رکے اور نہ پیچھے ہٹے۔ آپ نے اس بیماری کی حالت میں بھی تعلیم جاری رکھی اور ۱۹۱۰ء میں کیننگ کالج لکھنؤ سے بی اے کا امتحان کامیاب کر لیا۔ بی اے کے بعد ایم اے کا داخلہ لیا۔ ایک سال ادبیات انگریزی کی تحصیل میں صرف کیا۔ لیکن امتحان میں شریک نہ ہو سکے۔ اسی سال آپ پر ہیضے کے مہلک حملے ہوئے۔ زندگی تھی بچ گئے اور اس دفعہ آپ کے شوقِ تعلیمی کو بیماری کے آگے سرد ہونا پڑا۔

اسی اثناء میں صوبۂ متحدہ کے سررشتۂ تعلیم میں ایک جگہ نکالی گئی۔ کام یہ تھا کہ صوبہ میں جتنی کتابیں بھی شائع ہوں ان کی فہرست تمام ضروری تفصیلوں کے ساتھ ہر سہ ماہی میں صوبے کے سرکاری اخبار (یو۔پی۔ گورنمنٹ گزٹ) میں شائع کی جائے۔ اور عوام کے رجحان کا اندازہ کرنے کے لئے تبصرے لکھے جائیں۔ جس سے رپورٹ کے لئے مواد فراہم ہو سکے۔ اپریل ۱۹۱۱ء میں آپ کا تقرر اس خدمت پر ہو گیا اور آپ لکھنؤ چھوڑ کر الہ آباد چلے گئے اس ملازمت کی بدولت آپ کی نظر سے ہر تازہ کتاب گزرتی اور مطالعہ کا جو شوق آپ کی فطرت میں تھا اس کی پوری بھڑاس نکلتی۔ ڈیڑھ دو سال کے قلیل عرصے میں آپ کی

نظر سے تقریباً دس ہزار کتابیں گزریں۔ اسی ملازمت نے آپ کی معلومات کو وسیع اور تصنیف و تالیف کے جذبہ کو بیدار کر دیا۔ ۱۹۲۲ء میں ٹیچرس ٹریننگ کالج الہ آباد سے آپ نے ایل ٹی کی ڈگری حاصل کی، اسی سال لکھنؤ یونیورسٹی کے جونیر لکچرار کی حیثیت سے آپ کا تقرر بہ یافت ۲۲۵ تا ۲۵۰ ہوا۔

اگست ۱۹۲۷ء میں اُردو کے لکچرار کی حیثیت سے آپ کارگزار ہوگئے۔ ۱۹۲۹ء میں فارسی ام اے کا امتحان اس امتیاز کے ساتھ کامیاب کیا کہ آپ کو یونیورسٹی نے ایک طلائی تمغہ عطا کیا۔ آپ کی فارسی قابلیت بھی مسلم ہے۔ ۱۹۳۳ء میں آپ نے ایرانی زبان کی تحصیل و تکمیل کے ارادے سے ایران کا سفر بھی کیا۔

۱۹۳۳ء سے برابر ان دونوں اہم زبانوں کے پروفیسر ہیں اور دونوں شعبوں کی صدارت آپ ہی کے تفویض ہے۔ آپ کی موجودہ تنخواہ ساڑھے آٹھ سو ماہوار ہے۔ آپ کو قدیم اور نادر کتب کے جمع کرنے کا بے حد شوق ہے۔ ادبیات سے جو گہرا لگاؤ آپ کی طبیعت کو ہے وہ اُردو کی توسیع و اضافہ کا ضامن ہے۔ لکھنؤ کی گلیوں کی خاک چھان چھان کر اور بڑی عرق ریزی کے بعد آپ نے اپنے کتب خانے میں نادر کتابوں کا کافی ذخیرہ فراہم کر لیا۔ قدیم تذکرے اور خطوط، کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ اور ایک قابل ذکر چیز یہ ہے کہ واجد علی شاہ کی تصانیف جتنی آپ کے ذخیرۂ کتب میں محفوظ ہیں دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ ان کی تعداد چالیس بیالیس کے قریب ہے۔

شاعری آپ کے لئے اگرچہ "ذریعۂ عزت" نہیں، پھر بھی جذبات کے اظہار کی خاطر اس کو بھی کام میں لاتے ہیں۔ آپ کے اشعار جذباتی اور بالکل فطری ہوتے ہیں۔ خاص کر بچوں کے لئے آپ جو نظمیں لکھتے ہیں وہ بہت مفید ہیں اور اردو ادب کی کمی کو پورا کرتے ہیں

خرابی صحت نے آپ کے علمی انہماک میں بہت کچھ رخنہ ڈالا۔ پھر بھی آپ کی قلمی کاوشیں کافی تعداد میں منظر عام پر آ چکی ہیں۔

آپ کی ایک تصنیف "ہماری شاعری" کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کتاب کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ دوسری ادبی کوششیں یہ ہیں جو اُردو کے لئے ایک قابل قدر اضافہ ہیں "امتحان وفا، فرہنگ امثال، فیض میر، مجالس رنگین، دلبستان اُردو، روح انیس، نظام اُردو، جواہر سخن جلد دوم۔ ان کے علاوہ کئی ایک تنقیدی مضامین مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں آپ کے زیر تصنیف "تاریخ مرثیہ" ہے۔ یہ کتاب اپنی اہمیت اور نوعیت کے اعتبار سے اپنی آپ نظیر ہوگی۔ آپ نے اس کتاب کی تکمیل کے لئے بڑی کاوش سے مرثیوں اور مرثیہ نگاروں کے حالات جمع کئے ہیں۔ ان میں تقریباً تین سو مرثیہ نگاروں کے کہے ہوئے مرثیے شامل ہیں

آپ کی دیگر علمی و ادبی مصروفیتیں بھی قابل ذکر ہیں آپ "ہندوستانی اکیڈیمی" کے ممبر ہیں اور اکیڈیمی کے سہ ماہی رسالہ "ہندوستانی" کے ایڈیٹوریل بورڈ کے رکن بھی۔ کئی سال تک انجمن اُردو کے سکریٹری رہے اور انجمن کی طرف سے ۱۹۳۵ء میں ایک ادبی جلسہ اور ایک ادبی نمائش کی۔ آپ نے جن مختلف علمی و ادبی انجمنوں میں مقالے پڑھے ان کے نام یہ ہیں۔ آل انڈیا اورنیٹل کانفرنس، آل انڈیا شاعر کانفرنس مسلم اکیڈیمی وغیرہ۔ مسلم اکیڈیمی لکھنؤ کے سکریٹری، نائب صدر اور صدر بھی رہ چکے ہیں۔

جناب مسعود حسن صاحب رضوی اُردو اور فارسی دونوں زبانوں کے مسلمہ ماہر اور ادیب ہیں آپ کی ذات سے اُردو کو بالخصوص ایک بیش بہا امداد اور ترقی کی توقع ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ صاحب موصوف کی بیشتر مصروفیتیں اسی کے لئے وقف ہیں۔ ہندوستان کی وہ تمام انجمنیں جنھیں اُردو کی ترویج و توسیع سے دلچسپی ہے آپ کی خدمات کو حاصل کرنا اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے لازمی سمجھتی ہیں۔ آپ کی ہردلعزیزی، علمی تبحر، اخلاق کی برگزیدگی۔ ایسی خصوصیات ہیں جو آپ کو ایک ایسے درجے پر پہنچا دیتی ہیں جہاں پہنچنا ہر بہی خواہِ اُردو کا مقصد ہونا ہے۔

(۲) کیپٹن سید ضامن علی صاحب ایم اے (الہ آباد یونیورسٹی)

سید ضامن علی صاحب ۱۸۹۲ء میں قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق خاندان گردیزی سے ہے یہ خاندان اپنی عزت و وقار کے لحاظ سے کافی شہرت رکھتا ہے۔ اس کے اکثر افراد ممتاز عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں اس خاندان نے علم و ادب کے بہی خواہ بھی پیدا کئے۔ آپ کے جد امجد سید نوروز علی صاحب فارسی کے اسکالر اور ہندی کے زبردست شاعر تھے اور شاہان اودھ کے عہد میں ناظم سلطنت جیسے جلیل القدر عہدے پر فائز تھے۔ ضامن علی صاحب کا ننھیال اور ددھیال علم و فضل اور جاہ و منصب دونوں حیثیتوں سے قابل ذکر ہے۔ آپ کے ماموں میر علی عباد صاحب سیناں ایک اچھے اور قادر الکلام شاعر تھے آپ کے والد سید واجد علی صاحب بھی اُردو کے بہت اچھے شاعر تھے۔

سید ضامن علی صاحب کی آنکھیں ایسے ماحول میں کھلیں، جس میں علم و ادب کے تذکروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ کا مکتب آپ کا گھر ہی تھا: بچپن کا بیشتر حصہ لکھنؤ میں گزرا۔ علامہ سید جواد صاحب اور مولانا شیخ فدا حسین سے شرف تلمذ رہا۔ علوم شرقیہ کی تعلیم لکھنؤ ہی میں ہوئی۔ البتہ انگریزی تعلیم کے آغاز کے بعد سے آپ کو مختلف مقامات سے امتحانات پاس کرنے پڑے آپ نے آگرہ سے انٹرمیڈیٹ اور الہ آباد سے بی اے اور ام اے کی اسناد حاصل کیں۔ ۱۹۱۶ء میں گریجویٹ ہونے کے بعد ہی الہ آباد ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے مامور ہوئے اور کچھ دنوں بعد ڈپٹی کلکٹری کے لئے بھی نامزد کئے گئے لیکن علم و ادب کی خدمت کے شوق نے آپ کو اس کام سے بیزار کر دیا اور آپ نے ایونگ کرسچن کالج میں فارسی کا پروفیسر بننا پسند کیا۔ اور کم و بیش چھے سال تک اس کالج میں اپنا فرض منصبی نہایت خوش اسلوبی سے ادا کرتے رہے۔ الہ آباد یونیورسٹی کے فارسی پروفیسر جناب ناصری مرحوم جب بجنور ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہو کر چلے گئے تو یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی۔ اور جب اس یونیورسٹی میں پہلے پہل شعبۂ اُردو کھولا گیا تو آپ ہی اس کے صدر مقرر کئے گئے آپ کی علمی قابلیت، طریقۂ تعلیم اور حسن خلق کا ہر شخص معترف ہے اور آپ نہایت کامیابی کے ساتھ اپنے اہم فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں

آپ کی دماغی صلاحیتوں کو شاعرانہ ماحول ملا۔ علم و ادب آپ کی گھٹی میں پڑا تھا۔ آپ بچپن ہی سے اس آب حیات کے پیاسے تھے اور اپنی تمام کوششوں کو حصول اور خدمت علم کے لئے وقف کر چکے تھے۔ آپ کا شمار ہندوستان کے اچھے شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے آپ کی شاعری حضرت منیاں کے فیض صحبت کی مرہون منت ہے۔ یونیورسٹی کے لکچروں کے علاوہ آپ اُردو کی خدمت کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں اُردو زبان اور ادب پر آپ نے ایک زبردست اور عالمانہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ جو ہندوستانی اکیڈیمی اور سپرو کمیٹی کی رپورٹ پر پیش کیا گیا۔ تاریخ زبان اور اُردو ادب پر اس مقالے کے پڑھنے سے کافی عبور حاصل ہو سکتا ہے۔

قصائد، سلام، رباعی، مرثیے بھی آپ کی طبع موزوں اور فکر رسا کا نتیجہ ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً ہندستان کے مقتدر رسائل میں شائع ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے ایک تاریخی مقالہ "واقعات کربلا" پر اورنٹیل کانفرنس میں پڑھا۔ علم تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مقالہ قابل قدر چیز ہے۔ اور وہی لوگ آپ کی کاوش اور محنت کی داد دے سکیں گے۔ اس مقالہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب تک کئی بار طبع ہو چکا ہے۔

مرثیہ نگاری آپ کا مرغوب موضوع ہے۔ آپ نے اس کی تحقیق و تاریخ کی ترتیب کا کام شروع کر دیا ہے۔ بہت جلد اس صنف پر سیر حاصل مواد منظر عام پر آجائے گا۔ آپ کی دوسری تصانیف "سیر کشمیر اور گوہ سیلون" ہیں۔ ان کتابوں میں سیر کشمیر اور سیلون کے حالات درج ہیں۔

آپ اُردو ادب سے تعلق رکھنے والی کئی انجمنوں کے صدر اور ممبر ہیں۔ آپ اکثر تعلیمی بورڈوں اور یونیورسیٹیوں کے ممتحن بھی ہوتے رہتے ہیں اور کئی سال تک انڈین سول سروس کے بھی ممتحن رہ چکے ہیں۔ آپ کو فوجی تعلیم سے بھی کافی دلچسپی ہے۔ ایک ادب کے پروفیسر کے لئے یہ دلچسپی یقیناً شاذ کا حکم رکھتی ہے۔ آپ الہ آباد یونیورسٹی کی یو ٹی سی کے کمانڈنگ افسر کی حیثیت سے اپنا کچھ وقت دیتے ہیں اور گورنمنٹ نے آپ کو کیپٹن کا عہدہ دیا ہے۔

آپ کی گرانمایہ خدمات اُردو کے لئے ایک بیش بہا اضافے کی ضامن ہیں خدا کرے کہ آپ کی غیر مطبوعہ کتابیں جلد شائع ہو کر منظر عام پر آسکیں

(۴) ڈاکٹر ایم حفیظ سیّد صاحب۔ ایم اے۔ پی ایچ۔ ڈی۔ ڈی لٹ۔ ال ٹی۔ (الہ آباد یونیورسٹی)

میرے پہلے عریضے کے جواب میں صاحب موصوف نے لکھا "مجھے افسوس ہے کہ میرے یہاں اپنی کوئی تصویر موجود نہیں اور نہ فی الحال تصویر کھنچوانے کا ارادہ ہے۔ میرے حالات نہایت مختصر ہیں میں چودہ برس سے الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو بی اے اور ایم اے کی جماعتوں کو پڑھاتا ہوں ... میرے مجھے مایوس سا کردیا اس ... میں آپ کے مفصل حالات زندگی اور کام سے اُردو دنیا کو متعارف کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ جانتا تھا کہ صاحب موصوف "گم نامی کی زندگی کو شہرت اور ناموری پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن دوسری دفعہ پھر اسی سلسلے میں یاد دہانی کی بارے جواب خط کے ساتھ تصویر بھی وصول ہوئی۔ حالات اور کام "کافی" کے بجائے صرف "مختصر" رہ گئے۔ جس کے لئے میں آپ کا مشکور ہوں۔

آپ کے والد کا نام نظر حسن اور وطن ضلع غازی پور ہے۔ ضلع کے زمینداروں میں ان کا شمار تھا۔ شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے تھے خود بھی ایک "خوب کہنے والے" شاعر تھے۔ نظر تخلص کرتے تھے۔ ایک مثنوی "جلوۂ طور" انھوں نے اپنی یادگار چھوڑی ہے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مکتب میں ہوئی۔ انگریزی تعلیم دیر میں شروع کی۔ لکھنو اور الہ آباد کے اسکول اور کالجوں میں بی اے کی تعلیم پائی بی اے کی ڈگری لینے کے بعد آپ نے الہ آباد ٹریننگ کالج سے ال ٹی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد آپ نے ملازمت اختیار کرلی۔ دس سال تک مختلف مدارس اور کالجوں میں ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل رہے۔ ۱۹۲۵ء سے الہ آباد یونیورسٹی میں اُردو کی لکچراری پر مامور ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے لندن یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی اور ۱۹۳۳ء میں ڈی لٹ کی ڈگری جامعۂ ماپل لئے سے حاصل کی۔

آپ نے حصولِ علم اور تحقیقاتی کام کے لئے بہت دور دراز سفر کئے۔ ڈی لٹ کی ڈگری فرانس کی ایک قدیم یونیورسٹی "ماپل لئے" سے حاصل کی۔ آپ کو فلسفہ و تصوف سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ درس و تدریس میں آپ کا تجربہ بہت بڑھا ہوا ہے۔ لندن سے ٹیچرس ڈپلوما حاصل کیا۔ الہ آباد کے ال ٹی ہیں۔ اور عمر کا بیشتر حصہ محکمہ تعلیمات کی خدمت میں صرف کر چکے ہیں۔

آپ کی ادبی کاوشیں، مقالوں، مضمونوں اور کتابوں کی صورت میں منظر عام پر آچکی ہیں۔ آپ نے صرف اُردو ہی میں نہیں بلکہ انگریزی میں بھی اپنے علمی شغف اور تبحر کا ثبوت دیا ہے۔ آپ کی حسب ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

سکھ سہیلا، از برہان الدین شاہ جانم۔

منفعت الایمان از برہان الدین شاہ جانم۔

قاضی محمود ... (A mystic poet of 12 th century) کے عنوان سے مستقل طور پر انگریزی میں بھی لکھی گئی ہے

کلیات قاضی محمود بحری مع مقدمہ تشریح اور فرہنگ۔ یہ ڈاکٹر صاحب کا نہایت معرکتہ آلارا اور اہم کارنامہ ہے جس میں دکنی سلطنتوں کے آخری دور کے شاعر بحری کے کلام کو بڑی تحقیق کے ساتھ شایع کیا گیا ہے۔ یہ کام ہر شخص نہیں کر سکتا۔ کیونکہ قدیم اُردو کے قلمی نسخوں کو پڑھنا اور متروک الفاظ کو سمجھنا بڑے بڑے عالموں کے لئے بھی مشکل ہے۔ اس کلیات کی اشاعت نے ڈاکٹر سید صاحب کو اُردو کے بلند پایہ محققوں کی صف میں ممتاز جگہ دے دی ہے۔

"دکن کی اُردو شاعری"۔ (یہ مضمون نگار میں چھپا تھا) "بنگالی شعرائے اُردو"۔ "یورپین شعرائے اُردو" (زمانہ کانپور)
"غالب کے کلام کا مطالعہ" (الہ آباد یونیورسٹی میگزین)

اسی طرح حالیؔ، شبلیؔ، محمد حسین آزادؔ، دیوان جہاںؔ وغیرہ پر آپ کے مضامین شایع ہوئے۔ فرانسیسی میں آپ نے ایک کتاب "آپٹی میزم ان انڈین تھاٹ" (ہندوستانی تخیل میں رجائیت) شائع کی ہے۔

آپ کئی انجمنوں کے معتمد اور ممبر ہیں۔ کئی کمیٹیوں کے سرگرم کارکن اور مختلف "Boards" مجالس کے ممبر بھی ہیں۔ الہ آباد آگرہ اور یوپی کی اکثر تعلیماتی کمیٹیوں کے مشیر اور ممبر ہیں۔ اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر آپ کا شمار شمالی ہند کے سرآوردہ ماہرین تعلیم میں ہو سکتا ہے آپ نے ہندوستان اور دیگر مقامات کا سفر کیا۔ صوبجات بمبئی، متوسط اور یوپی کے مختلف مدارس کا معائنہ کیا اور وہاں کے اصول تعلیم کے متعلق معلومات حاصل کیں اُردو زبان اور ادب کے علاوہ فلسفہ اور فن تعلیم پر بھی آپ کے پچاسوں مضامین اکثر انگریزی اُردو رسائل میں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ آپ کی ذات اُردو اور سررشتہ تعلیم کے لئے بے حد غنیمت ہے۔

صاحب موصوف کی تصنیفات اور مضامین اُردو زبان کی اہم ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔ مشاہیر اُردو ادب، جن کے جواہر پاروں کو صرف سطحی نظروں سے جانچا جاتا تھا، آپ نے ایک ایسے انداز میں روشناس کرایا ہے جس سے ان کی عظمت ... ہر پہلو سے روشنی پڑتی ہے۔ اور وہ منور گوشے جن پر کورذوقی نے پردے ڈال رکھے تھے روشن نظر آتے ہیں۔ آپ نے شاہ برہان الدین جانمؔ، قاضی محمود بحریؔ، محمد حسین آزادؔ، شبلیؔ، حالیؔ، غالبؔ اور دوسرے شعرا اور مصنفین کا جس غائر نظری سے مطالعہ کیا ہے، اور اس کے بعد جس انداز سے ان پر اپنے خیالات اور ان کے محاسن کو پیش کیا ہے، اس سے آپ کی تنقیدی صلاحیتوں اور قوت اخذ و تحقیق کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ دکن سے بھی آپ کو خاص دلچسپی ہے۔ شمالی ہند میں دکن کے قدیم شاعروں کو روشناس کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے قدیم زبان کو سمجھنا اور اس پر کام کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔

(۸) مولوی سید نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے۔ (اسمٰعیل کالج جوگیشوری بمبئی)

ولادت ۱۶ر جون ۱۹۰۱ء۔ مقام ولادت ارموری۔ ضلع چاندہ۔ آپ کے والد ڈاکٹر سید محمد معین صاحب ارموری کے سرکاری ڈاکٹر تھے۔ آپ زیدی واسطی سید ہیں اور سادات بارہا سے خاندانی تعلق رکھتے ہیں جو فرخ سیر کے زمانے سے دیسنہ ضلع پٹنہ صوبہ بہار میں سکونت پذیر رہے ہے۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مرہٹی سے ہوئی چنانچہ اس زبان میں ورنا کلر فائنل کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ اس کے بعد قرآن شریف، اُردو اور فارسی زبان کی تعلیم پائی۔ ۱۹۰۹ء میں آپ کو دارالعلوم ندوہ بھیج دیا گیا۔ آپ ندوہ میں چار سال تک رہے۔ اس دوران میں آپ اپنی جماعت میں ہر سال اول آتے رہے۔ اور ایک ممتاز حیثیت کے مالک رہے۔ آپ مولانا شبلی کے شاگرد رہ چکے ہیں

مولانا نے آپ کی ادبی و علمی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں خاص توجہ سے کام لیا۔ مولانا جس وقت سیرۃ لکھ رہے تھے آپ ان سے "بلاغ المرام" کا درس لیا کرتے تھے۔

آپ کی انگریزی تعلیم ۱۹۱۳ء سے شروع ہوئی ہے۔ میٹرک اور ایف اے کے امتحانات درجۂ اول میں کامیاب کئے اور وظائف سرکاری کے مستحق قرار پائے۔ بی اے میں زیر تعلیم تھے کہ ترک موالات کی وبا اٹھی اور آپ کو سلسلۂ تعلیم قطع کرنا پڑا۔ آپ ۱۹۲۰ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ چلے گئے۔ وہاں آپ کی مصروفیتیں زیادہ تر علمی و تحقیقی رہیں۔ اِس دوران میں ترک موالات کا ہنگامہ کچھ کم ہوا۔ آپ نے پھر تعلیم کی طرف توجہ کی اور بی اے میں شرکت کی۔ ۱۹۲۴ء میں بی اے کا امتحان آنرز کے ساتھ کامیاب کیا۔ اور یونیورسٹی کے جملہ طلباء میں اول رہے۔ یونیورسٹی نے وظیفہ عطا کیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں ام اے فارسی و عربی بھی درجۂ اول میں پاس کیا اور سب میں اول رہے۔ اس صلے میں یونیورسٹی نے طلائی تمغہ اور دو سو روپے کی کتابیں دیں۔

سلسلۂ تعلیم کو ختم کرنے کے بعد آپ علمی خدمت میں منہمک ہوگئے اور دارالمصنفین کا کام کرتے رہے۔ اور اپنی بیش بہا خدمات سے اُردو اور دارالمصنفین کو مستفیض کیا۔ ساتھ ہی مختلف رسائل کو مضامین بھی روانہ کرنے لگے۔ آپ ۱۹۳۰ء میں گجرات کالج احمد آباد میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ آپ اُردو کے سچے بہی خواہ اور خدمت گذار ہیں۔ صوبہ کی انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری ہیں۔ آج کل آپ ایک نہایت ہی گرانمایہ اور اہم کتاب کے لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت نام ہی سے ظاہر ہے یعنی "گجرات میں اُردو" اور یہ صاحب موصوف کی دس سالہ تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہو گی۔ ۱۹۳۱ء سے آپ اسمٰعیل کالج جوگیشوری کے اُردو کے استاد ہیں۔ رقعات عالمگیری کی دوسری جلدوں کی ترتیب کا کام بھی آپ کے پیش نظر ہے دوسری علمی مصروفیتوں کے ذکر میں آپ یونیورسٹی کے اُردو بورڈ کے رکن، اور اردو ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر ہیں۔

نجیب اشرف صاحب ندوی کا نام اُردو کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ کی کتابیں اور مضامین اہمیت اور معلومات کے اعتبار سے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور آپ ہندستان کے اچھے محققین اور ادیبوں کی صف میں اپنے لئے جگہ پاتے ہیں۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ جو منظر عام پر آچکا ہے رقعات عالمگیر اور ان کا معرکتہ الآرا مقدمہ ہے جس کی ترتیب و تالیف نے آپ کو ایک بلند پایہ محقق ثابت کر دیا۔

(۵) مولانا محمد طاہر صاحب فاروقی ام اے۔ مولوی فاضل، ادیب فاضل، دبیر کامل (آگرہ یونیورسٹی)

مولانا السنہ اربعہ (عربی، فارسی، اُردو، انگریزی) کے مستند اور متبحر عالم ہیں۔ اور ساتھ ہی ہومیوپیتھک کے امتحان۔ ایچ ایل، ایم، ایس کے سند یافتہ اور گولڈ میڈلسٹ ہیں۔ ہندوستان کی مختلف جامعات سے آپ نے امتیازی کامیابی حاصل کی لکھنؤ سے دبیر کامل، الہ آباد سے منشی کامل اور مولوی فاضل پنجاب سے مولوی عالم اور ادیب فاضل کی اسناد حاصل کیں اور تقریباً پندرہ سال سے اردو اور فارسی زبان کی تعلیم دیتے ہیں۔ پانچ چھے سال سے آگرہ کالج میں صدر شعبۂ اُردو فارسی ہیں۔

آپ کے اکثر مضامین رسائل میں طبع ہوا کرتے ہیں۔ آپ نے طلبہ کے لئے متعدد نصابی کتب لکھیں۔ ان کے علاوہ چند قابل ذکر تصانیف یہ ہیں:۔

(۱) سیرت مولانا محمد علی۔ مولانا کی وفات کے بعد ۱۹۳۱ء میں سب سے پہلے فاروقی صاحب ہی نے یہ مختصر لیکن جامع سیرت لکھی

اس کتاب میں مصنف نے بعض ایسے حالات بھی لکھے ہیں جو خاندانی ذرائع سے حاصل کئے گئے۔ فاروقی صاحب کو مولنا سے ایک خاص تعلق ، اپنے والد کی طرف سے تھا۔ مولنا اور فاروقی صاحب کے والد محمد محسن مرحوم بڑے گہرے دوست تھے۔ اور اسی دوستانہ کی وجہ سے فاروقی صاحب کو بعض ایسی معلومات بہم پہونچیں جو دوسروں کی دسترس سے باہر ہیں۔ اسلوب بیان نہایت عمدہ اور محققانہ شان لئے ہوئے ہے۔ مولنا کی سیرت پر ایک تشفی بخش اور کامل ریویو کیا گیا ہے۔ ہندستان میں اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

سرکار دوعالم۔ حضور سرور کائنات صلعم کی مختصر سیرت پاک ہے جامعہ ملیہ دہلی نے بھی اپنی کتاب کے لئے یہی نام انتخاب کیا ہے لیکن فاروقی صاحب کی کتاب بہت پہلے طبع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں آنحضرت کی زندگی کو مختلف پہلوؤں سے پیش کیا گیا ہے طرز بیان نہایت موزوں اور موضوع کے شایانِ شان ہے۔

ادبیات ایران نو۔ ایران کی جدید شاعری کو ہندستان میں روشناس کرنے کے لئے پروفیسر فاروقی نے شعرائے ایران کے نظم و نثر کے مختلف نمونے جمع کرکے پیش کئے ہیں اور موجودہ ایران کی ذہنی کش مکش اور رجحان کو ایک مبسوط مقدمہ میں ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب پر مختلف جامعات کے پروفیسر صاحبان نے بڑی اچھی تنقیدیں کی ہیں۔

سیرت اقبال یہ کتاب فاروقی صاحب کا سب سے بڑا ادبی کارنامہ ہے اقبال پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن فاروقی صاحب نے اقبال کے کلام کو صحیح معنوں میں سمجھا ہے۔ اور آپ کی کتاب کو "اقبالیات" میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

مولنا فاروقی بزم اقبال آگرہ کے بانی بھی ہیں۔ اسی بزم کی سرپرستی میں دو شاندار جلسے "یوم اقبال" اور "یوم اردو" کے ترتیب دئے گئے۔ اس بزم کے پیش نظر دو مقاصد ہیں ایک تو یہ کہ زبان اُردو کی خدمت اور دوسرا پیغام اقبال کی اشاعت۔

جامعۂ اُردو۔ مولنا فاروقی کی تحریک سے بزم اقبال کی سرپرستی میں آگرہ میں ایک اُردو یونیورسٹی کا انعقاد عمل میں لایا گیا ہے جس کو سر محمد یعقوب ممبر کونسل ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں۔ خواجہ غلام السیدین کی سرپرستی حاصل ہے۔ فاروقی صاحب اس کے رجسٹرار ہیں۔ جامعہ مذکورہ کی نگرانی میں تین امتحانوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ادیب، ادیب ماہر، ادیب کامل۔ اس تحریک کا اولین مقصد ترویج و خدمت اُردو ہے۔ فاروقی صاحب کی مساعیٔ جمیلہ کو مشکور اور کامیاب دیکھنے کی آرزو ہر بہی خواہِ اُردو کے دل میں ہونی چاہئے۔

(۶) پروفیسر حامد حسن صاحب قادری۔ (آگرہ)

میرے خط کے جواب میں، جس میں میں نے صاحب موصوف سے تصویر، حالات زندگی اور کام کا خاکہ روانہ کرنے کی درخواست کی تھی آپ نے تحریر فرمایا ہے "آپ مجھ سے مری تصویر اور حالات مانگتے ہیں۔ میں تصویر کے جواب میں نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ

"مجھ کو دیکھو میری تصویر میں کیا رکھا ہے" نہ یہ کہ

"ہر کہ دارد میل دیدن در سخن بیند مرا"

تصویر کھینچوانے سے مجھے پرہیز نہیں۔ لیکن دوا کے طور پر گوارا کر لیتا ہوں اب کئی سال سے کوئی تصویر نہیں کھینچی۔ اس لئے بھیجنے سے معذور ہوں مجھے نہ صرف تصویر کی عدم وصولی کا بلکہ آپ نے حالاتِ زندگی بیان کرنے میں جس اختصار سے کام لیا ہے اس کا بھی ذکر کر دینا چاہئے۔ میں

قارئین سب رس کو صرف اسی حد تک متعارف کرواسکتا ہوں کہ آپ کی زندگی نہایت پرسکون گزری ہے اور آپ ایک مقدس خاندان کے نام لیوا ہیں۔ آپ کا سلسلۂ نسب بابا فرید گنج شکر سے ملتا ہے۔ تقریباً چالیس سال سے شعر و سخن اور مضمون نگاری کا شغل ہے۔ درس و تدریس کا سلسلہ کوئی بارہ سال سے جاری ہے۔ سینٹ جانس کالج آگرہ کی اُردو اور فارسی تعلیم آپ ہی کے تفویض ہے۔

آپ کی علم دوستی اور لیاقت کا ہر اُردو داں معترف ہے۔ ہندستان کے اکثر و بیشتر رسائل آپ کے مضامین، نظموں اور غزلوں سے مزین رہتے ہیں۔ تالیف و تصنیف کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ جب ساتویں جماعت میں تعلیم پارہے تھے، ایک انگریزی ناول کا خلاصہ مرتب کیا۔ جسے اخبار پھول نے چھپوایا۔ اور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک تین چھوٹی کتابیں گلدستۂ اخلاق، رفیق تنہائی اور حسنین لکھیں ۱۹۰۶ء سے آپ نے میدانِ صحافت میں باقاعدہ قدم رکھا۔ آپ کی نظمیں اور مضامین زمانہ، مخزن، علی گڑھ منتھلی وغیرہ جیسے مقتدر رسائل میں طبع ہونا شروع ہوئے اور علمی طبقہ میں آپ ایک اچھے شاعر اور کامیاب انشا پرداز سمجھے جانے لگے۔

آپ نے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۴ء تک بچوں کا ایک پرچہ "اخبار سعید" نکالا اور اسی اخبار کے سلسلہ میں "بچوں کا کتب خانہ" جاری کیا اور بچوں کے لئے متعدد اخلاقی کتابیں لکھیں۔ آپ کی مختلف چھوٹی اور بڑی تصنیفات ایک کثیر تعداد میں ہیں۔ جن میں سے اکثر مختلف صوبوں اور محکموں کے نصاب میں جاری اور رائج ہیں۔ بالخصوص شعبۂ تعلیم سے متعلق اور طلبہ کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نے بعض بہت قیمتی اور کارآمد کتابیں لکھی ہیں یہاں میں آپ کی چند مشہور تصانیف و تراجم کا نام دے دینا ضروری سمجھتا ہوں (۱) باغبان۔ یہ کتاب ڈاکٹر ٹیگور کی مشہور تصنیف "گارڈنر" کا ترجمہ ہے جو کملن کمپنی کی فرمائش پر کیا گیا، ترجمہ رفتہ و شستہ اُردو میں ہے (۲) الکہل اور زندگی۔ یہ کتاب بھی مکملن کمپنی کی فرمائش پر لکھی گئی۔ (۳) فطرت اطفال۔ ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے جسے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ نے طبع کیا۔ (۴) کمال داغ۔ داغ دہلوی کے چاروں دیوانوں کا انتخاب ایک مبسوط ناقدانہ اور بصیرت افروز مقدمہ کے ساتھ ہے۔ (۵) تاریخ مرثیہ گوئی۔ اپنی کتاب میں مختصراً مرثیہ کی ابتدا اور عروج کے حالات بیان کئے ہیں اور مرثیہ سے متعلق جملہ معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ (۶) تاریخ و تنقید ادبیات اُردو۔ شعر و ادب اُردو کے متعلق تاریخی و تنقیدی مضامین اس کتاب میں جمع کئے گئے ہیں۔ مزید براں ایک مقدمہ بھی شامل ہے جس میں "اردو، ہندی، ہندستانی" کے مسئلہ پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔ ایک اور کتاب "داستان تاریخ اُردو" کے نام سے زیر طبع ہے۔ اس کتاب میں اردو کی مکمل تاریخ مل سکتی ہے اور بعض گم نام ہستیاں جنھیں دوسرے تذکروں میں نظر انداز کر دیا گیا ہے منظر عام پر آجاتی ہیں۔ اور مصنف کو بعض ذرائع سے ایسے نایاب نسخے بھی ملے ہیں جنھیں اُردو سے بہت گہرا تعلق ہے۔ مثلاً فضلی کی "کربل کتھا"

آپ کی مرتبہ دوسری اور بہت سی کتابیں ہیں۔ جو ابھی زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی ہیں۔ ان کتابوں میں اکثر آپ کے علمی و ادبی مضامین کے مجموعے۔ ناول اور تنقیدی و تاریخی تحریریں شامل ہیں۔ ان مرتبہ کتابوں میں سے چند کے نام یہ ہیں (۱) مرأت سخن۔ (۲) دفتر تواریخ (۳) صید و صیاد (۴) تذکرۂ ہمایوں وغیرہ۔

صاحب موصوف کی تصنیفات اُردو کے لئے ایک اضافہ ہیں تقریباً ہر موضوع پر آپ نے قلم اٹھایا ہے اور جو کچھ بھی لکھا ہے بڑی کاوش اور تحقیق کے ساتھ لکھا ہے اور یہی خصوصیات آپ کو اپنے دوسرے ہمسروں سے ممتاز بناتی ہیں، زمانہ ایسے باہمت اور لائق اصحاب کے لئے مواقع مہیا کرے تو اردو ادب کی کم مایگی کا بہت کچھ ازالہ ہو سکتا ہے۔ آپ کی پوری زندگی علمی انہماک میں بسر ہوئی

پروفیسر سید محمد

پروفیسر عبدالقادر سروری

نواب مرزا سیف علی خاں
ناظم اعزازی کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو

خواجہ حمیدالدین شاہد
مہتمم مدیر سب رس و ادارۂ ادبیات اردو

بچپن ہی سے تالیف و تصنیف کا سلسلہ شروع ہوا اور اب تک کئی قابل قدر کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

(۷) عبدالقادر صاحب سروری ام اے۔ ال ال بی (عثمانیہ)

حیدر آباد کی علمی بیداری، جامعہ عثمانیہ کے چند ہونہار فرزندوں کی مساعی جمیلہ کی مرہون منت ہے۔ انھیں ادیبوں اور انشا پردازوں کی کوششوں نے دکن کو علم و ادب کا مرکز اور ایک خاص اہمیت کا مالک بنا دیا ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری کا شمار بھی انہیں ادیبوں میں ہوتا ہے جنھوں نے حیدر آباد کی علمی دنیا میں انقلاب کی روح پھونکی جن کی تالیفات اور تصانیف نے ایک ایسے دور کی ابتدا کی جو بجا طور پر اُردو کا "دورِ نشاط" کہلایا جا سکتا ہے۔ صاحب موصوف نے تنقید، ترتیب، اور انشا پردازی کے لئے نئے اصولوں اور انوکھے اسلوب اختیار کئے اور تشنگانِ علم و ادب کے لئے نئے نئے راستے کھول دئے۔ حیدر آباد کے اکثر ادیب اور انشا پرداز کسی نہ کسی طرح آپ کی تحریروں سے متاثر نظر آتے ہیں۔

سروری صاحب کی شہرت حیدر آباد تک ہی محدود نہیں بلکہ سارے ہندوستان میں آپ کی تصانیف قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں۔ گزشتہ سال مجھے علی گڑھ جانے کا موقع ملا۔ وہاں میرے ایک دوست زیر تعلیم تھے۔ ان کے توسط سے مجھے وہاں کی علمی فضا میں کچھ دن گزارنے کا موقع ملا۔ پروفیسر صاحب موصوف کے شاگرد ہونے کی سعادت نے مجھے جس "لطفِ خاص" کا مستحق قرار دیا، اس سے میں آپ کی عظمتوں کا اور بھی معترف ہوا۔ سروری صاحب کی گرانمایہ تصنیف "جدید اردو شاعری" نے آپ کو اکثر یونیورسٹیوں میں ایک فاضل ادیب کی حیثیت سے روشناس کیا ہے۔ علی گڑھ میں اسی کتاب کو "نصابی کتب" کا درجہ حاصل ہے۔ وہیں مجھے اس حقیقت کا بھی احساس ہوا کہ حیدر آباد علمی حیثیت سے چاہے کتنا ہی آگے ہو محسن شناسی اور قدردانی کے میدان میں اس نے قدم نہیں اٹھائے۔ سروری صاحب علم و ادب کی خدمت میں اپنی پوری صلاحیتوں کو وقف کئے ہوئے ہیں اور صلہ و تحسین کا خیال کئے بغیر خدمتِ علم و ادب میں مصروف ہیں۔

آپ کی ولادت ۱۳۲۴ھ میں حیدر آباد دکن کے محلہ سلطان شاہی میں ہوئی۔ یہ مشہور قطب شاہی محلہ حیدر آباد کے اکثر علماء و فضلا کا مسکن رہ چکا ہے یہیں کے ادبی ماحول میں آپ کی ذہنی صلاحیتوں نے ایک خاص رنگ اختیار کرنا شروع کیا۔ آپ کے والد ماجد حاجی محمد سرور قادری، معاشدار اور بڑے پابند اوقات بزرگ ہیں۔

آپ کے جد امجد حضرت سرور سلطان کشمیر سے تشریف لائے تھے، انہیں بزرگ کی نسبت سے آپ سروری کہلاتے ہیں۔ حضرت سرور سلطان ایک باخدا بزرگ تھے۔ حیدر آباد آکر نوبت پہاڑ پر چلہ نشین ہوئے اور ارادتمندوں اور اہل غرض کو اپنی روحانی برکات سے مالا مال کرتے رہے۔ آپ کی رحلت کے بعد آپ کا مزار اسی پہاڑ پر بنایا گیا اور آج تک آپ کا عرس بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے انھیں بزرگوں کے سائے میں پروان چڑھتے ہوئے سروری صاحب نے میدانِ علم میں قدم رکھا۔ آپ کے والد انگریزی تعلیم کے مخالف تھے وہ آپ کو مشرقی علوم و فنون کی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ لیکن قسمت نے آپ کو اُردو کی خدمت کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ آپ نے ہر قسم کی قربانی قبول کی۔ اور ایک ایسی منزل میں قدم رکھا جہاں دشواریاں سدراہ تھیں۔ اور سب سے بڑی مصیبت سرپرستوں کی توجہ سے محرومی تھی۔ اس پر بھی آپ نے جدید علوم کی تحصیل کو اپنا مقصد بنایا۔ ایک ادیب کی زندگی کو جن "روایتی" مصایب سے دوچار ہونا پڑتا ہے آپ کی قسمت میں بھی تھیں۔

آپ کی ابتدائی تعلیم مکتب سے شروع ہوتی ہے "زماں خاں شہید" کے گنبد میں ایک "مولوی صاحب" درس دیا کرتے تھے۔ آپ نے ان کے آگے زانوئے شاگردی تہہ کیا۔ پھر آپ "مدرسہ منصبداران" میں اور یہاں سے نکل کر "دھرم ونت وٹیکولر ہائی اسکول" میں شریک ہوئے۔ ان مدارس میں آپ کا شمار ذہین اور محنتی طلبہ میں ہوتا تھا ادبی سرگرمی کا آغاز انہیں ابتدائی منزلوں میں ہوچکا تھا اور جس قلیل عرصے میں آپ نے منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کی وہ انہیں ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہے سٹی کالج حیدرآباد کا قدیم اور مشہور کالج ہے حیدرآباد کا کوئی ادیب ایسا نہیں جسے اس کالج کی فیض رسانیوں نے ممنون نہ کیا ہو "مفید الانام" کے بعد آپ مدرسہ فوقانیہ بلدہ میں شریک ہوگئے۔ میٹرک کامیاب کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ میں داخلہ حاصل کیا۔ اُردو، فارسی آپ کے اختیاری مضامین رہے۔ مولنا وحید الدین سلیم کی شاگردی میں آپ کے علمی جوہر اجاگر ہونے لگے۔ آپ مولنا کے چہیتے شاگرد تھے۔ مولنا کی جوہر شناسی نے آپ کی ہر قسم کی رہنمائی کی اور جب رخصت پر تشریف لے جارہے تھے تو مولنا نے اُردو کی مددگار پروفیسری کے لئے آپ ہی کی سفارش کی۔ اسی سفارش اور ذاتی قابلیت کی بناء پر آپ موجودہ عہدے پر مامور ہوگئے۔

سروری صاحب ام اے۔ ایل ایل بی ہیں۔ ان دونوں امتحانوں میں امتیازی درجہ سے کامیابی حاصل کی۔ ام اے میں ساری یونیورسٹی میں دوم اور ال ال بی میں درجہ اول اور بعض مضامین میں اول رہے۔ قانون کے امتحان کی کامیابی کا اثر آپ کی ادبی مصروفیتوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اکثر جدید مطبوعات کے "مقدمے" آپ نے لکھے ہیں "مقدمے" لکھنے میں سروری صاحب کو خاص کمال حاصل ہوگیا ہے۔ آپ کی علمی مصروفیت قابل تقلید ہے۔ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرنے کے بعد آپ کا بیشتر وقت مطالعہ اور تالیف و تصنیف میں گزرتا ہے۔ کالج میں بھی آپ اسی طرح مصروف رہتے ہیں۔ آپ جو کچھ لکھتے ہیں احتیاط اور کاوش سے لکھتے ہیں اس کے باوجود آپ کی تحریر میں روانی بے ساختگی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ جو قابل تعریف ہے۔ سروری صاحب کی کتابیں مختلف موضوع پر مشتمل ہے۔ آپ کے مرغوب موضوع، تنقید، افسانہ نگاری تاریخ اور مثنوی ہیں۔

"جدید اردو شاعری" کا ذکر اوپر آچکا ہے یہ کتاب آپ کی سب سے بڑی تصنیف ہے۔ اس کتاب پر ہندستان کے مختلف مقتدر جرائد نے بلند پایہ تنقیدیں کی ہیں اور یہ اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے۔ جدید اُردو شاعری کے متعلق یہ سب سے پہلی اور مستند تنقیدی کتاب ہے۔ اس کے پڑھنے سے موجودہ زمانے کے شاعرانہ رجحانات کا عمدگی سے پتہ چلتا ہے۔ اور اردو شاعری کی مکمل تاریخ سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اس کے لکھنے میں بڑی کاوش اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ اب تک اس کے دو ایڈیشن شایع ہوچکے ہیں۔

سروری صاحب ہندستان کے بہترین افسانہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں آپ کے افسانے سنجیدہ ظرافت کے نمونے ہوتے ہیں اکثر رسائل آپ کے افسانوں کو چھاپنا اپنی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ نفسیاتی جز و بھی آپ کے افسانوں میں شریک رہتا ہے، اور جس خوبی سے آپ ان مسائل کو سلجھاتے اور پیش کرتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے آپ کے افسانوں کا مجموعہ زیر طبع ہے۔ اور اسی فن سے متعلق آپ کی دو کتابیں "دنیائے افسانہ" اور "کردار اور افسانہ" شایع ہوچکی ہیں۔ نیز آپ نے ایک سلسلہ "دنیا کے شاہکار افسانے" کے نام سے جاری کیا تھا۔ آپ رسالہ "مکتبہ مجلہ" کے ایڈیٹر بھی کئی سال تک رہ چکے ہیں۔ دوسری ادبی کوشش یہ ہیں "حیدرآباد کی تعلیمی ترقی" یہ کتاب اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔ آپ نے کئی مشہور قدیم کتابوں کو مرتب بھی کیا ہے

جن میں قابل ذکر، مثنوی پھول بن، از ابن نشاطی۔ کلیات سراج اورنگ آبادی۔ مثنوی قصۂ بے نظیر، از صنعتی بیجاپوری۔
ان کتابوں کے سلسلے میں آپ نے خاص تحقیقی کام کیا ہے۔ اور ہر ایک پر مبسوط اور مفصل مقدمہ مع تشریح کے سپرد قلم کیا ہے۔

آپ ادارۂ ادبیات اُردو کے سرگرم ارباب کار میں سے ہیں اور عالی جناب ڈاکٹر زور کے دست راست ہیں۔ ادارہ کے شعبۂ تحقیقات وتنقید کے معتمد بھی ہیں۔

آپ کی ذات سے اُردو کو بڑی بڑی امیدیں ہیں اور بالخصوص حیدرآباد کا ادبی ماحول آپ کے وجود کو بہت غنیمت سمجھتا ہے۔
آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تو یہ ہے کہ آپ نوجوان انشاپردازوں اور بالخصوص افسانہ نگاروں کی صحیح تربیت دماغی کرتے ہیں اور ان کے رجحان کے مطابق ان کو ایک راستے پر ڈال دیتے ہیں۔ اب تک کئی افراد آپ کی ان کوششوں سے متمتع ہوکر "افسانوی دنیا" میں شہرت حاصل کرچکے ہیں۔

(۸) سید محمد صاحب ام اے (عثمانیہ)

سید محمد صاحب ۱۹۰۷ء میں شہر حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتداً مدرسہ مفید الانام میں شریک ہوئے۔ اس مدرسے سے مڈل کا امتحان بدرجہ اول کامیاب کیا اور سٹی ہائی اسکول میں شرکت کی ۱۹۲۲ء میں ہائی اسکول لیونگ سرٹیفکٹ کا امتحان کامیاب کیا اور جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا ۱۹۲۴ء میں انٹرمیڈیٹ بدرجۂ اعلیٰ کامیاب کیا اور اُردو میں صد فی صد نمبر لئے۔ ۱۹۲۶ء میں بی اے اور ۱۹۲۸ء میں ام اے کی ڈگری حاصل کی۔ مولانا سلیم کے زمرۂ تلامذہ میں آپ کو خاص امتیاز حاصل رہا۔ اور اپنی جماعت میں ہمیشہ اُردو میں اول آتے رہے۔

آپ کا تعلیمی دور بے حد شاندار رہا۔ خصوصاً اُردو میں جو امتیازات آپ کو شروع ہی سے حاصل رہے وہ شاہد ہیں کہ آپ کو اُردو سے خاص اور فطری لگاؤ ہے۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کو تحریر و تقریر کے مقابلوں میں حصہ لینے کا شوق تھا اور ہر مقابلہ میں آپ اول آتے۔

سٹی کالج کے ادبی ماحول کو آپ ہی کی ذات سے زندگی حاصل ہے۔ کئی نوجوان آپ کی تربیت کے زیر اثر ادبی دنیا میں روشناس ہیں۔ حیدرآباد کے نوجوان ادیبوں میں سید محمد صاحب کا درجہ بہت بلند ہے۔ آپ نے اپنی گرانمایہ تصانیف کے ذریعہ ایک مقتدر ادیب اور محقق کی شہرت حاصل کرلی ہے۔ آپ کی سب سے پہلی تصنیف "ارباب نثر اردو" ہے یہ کتاب فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے اُردو نویسوں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ ہے۔ ہر مصنف کے متعلق نہایت تحقیق کے ساتھ مواد جمع کرکے سیر حاصل بحث و تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو علمی حلقے میں خاص مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ کئی جامعات کے اُردو کے اعلیٰ امتحانات میں شریک نصاب کی گئی ہے اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

سید محمد صاحب ۱۹۲۸ء سے سٹی کالج کے اُردو کے لکچرار ہیں۔ اس دوران میں آپ نے طلبہ میں ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے اور پھر ان کی ادبی رہنمائی کرنے میں خاص محنت اور دلچسپی سے کام لیا ہے اور اسی دلچسپی کا نتیجہ ہے کہ سٹی کالج اب بھی اپنی "مردم خیزی" کی شہرت کو برقرار رکھ سکا۔ صاحب موصوف کا بیشتر وقت علمی خدمت اور تالیف و تصنیف میں گزرتا ہے۔ آپ کئی انجمنوں کے سرگرم کارکن ہیں۔ مجلۂ طیلسانین کے رکن ادارت اور معتمد ہیں اور آپ کے اکثر مضامین مقتدر رسائل میں شایع ہوا کرتے ہیں

ترجمہ کرنے میں بھی آپ کو خاص مہارت حاصل ہے، آپ کئی کتابوں کے مولف ہیں ۔

گلشن گفتار ۔ خواجہ خاں حمید کا تذکرہ جو اُردو کا اولین تذکرہ ہے ۔

مثنویات میر ۔ (میر تقی میر کی مثنویات جواب تک متفرق اور غلط سلط طور پر ملتی تھیں)

ایمان سخن ۔ شیر محمد خاں ایمان کے کلام کا انتخاب ۔

یادگار ولی ۔ بابائے ریختہ کے جشن یادگار کا مجموعہ

قواعد فارسی ۔ راست اصول تعلیم پر فارسی کی ابتدائی قواعد ۔

مرقع اُردو ۔ اردوئے جدید کے نظم و نثر کا انتخاب

ان کتابوں کو بڑے سلیقہ کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہے ۔ اور ہر ایک کے ساتھ ایک تنقیدی، مبسوط مقدمہ بھی شامل ہے ۔ جس سے کتاب کی اہمیت میں بہت کچھ اضافہ ہوجاتا ہے ۔

مثنویات میر ۔ جامعہ عثمانیہ کے نصاب اردو میں داخل ہے ۔ قواعد فارسی اور دوسری کتابیں اکثر مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں سید صاحب کو قدیم اردو سے بھی گہری دلچسپی ہے ۔ مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے آپ معتمد ہیں ۔ حال ہی میں آپ کی مرتبہ دو نایاب کتابیں شائع ہوئی ہیں ۔ ملک الشعرا نصرتی کی مثنوی گلشن عشق اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کا نایاب دیوان ۔

سید صاحب کی تحریریں تنقیدی شان ہوتی ہے ۔ طرز نگارش سادہ اور سلیس ہوتی ہے اور آپ کے قدرت بیان کی شاہد ۔ حیدرآباد کے موجودہ دور میں اُردو ادب کے سچے خدمت گذار اور بہی خواہ ڈھونڈے جائیں تو جناب ڈاکٹر زور ۔ عبدالقادر سروری اور جناب سید محمد صاحب پر ہی نظریں اٹھتی ہیں ۔ اور دکن میں یہی "ارباب نثر اُردو" کہلانے کے مستحق ہیں ۔

رشید قریشی

سب رس

کا

"فضائی ادب" نمبر

مارچ ۱۹۴۰ء میں شایع ہوگا

نصرتی کا سنہ وفات

بیجاپور کے قدیم اردو شاعروں ملا نصرتی کو غزل، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ تمام اصنافِ سخن میں یکساں کمال حاصل تھا اور وہ اپنے تمام ہم عصر شاعروں میں اپنی دل پذیر طرزِ نگارش اور بلند فکر کی وجہ سے سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت رکھتا ہے۔ اس کی رزمیہ مثنوی علی نامہ خصوصیت کے ساتھ مشہور ہے اور اردو ادب میں اپنی طرز کی ایک لاجواب شاہکار ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ جو شخصیتیں بہت زیادہ مشہور ہوتی ہیں، ان کے حالات و واقعات زندگی کے متعلق طرح طرح کے اختلافات مورخوں اور تذکرہ نویسوں میں نظر آتے ہیں اور عجیب بے سروپا باتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔ نصرتی کا بھی یہی حال ہے۔ کسی نے اس کو برہمن بتایا ہے اور کسی نے بیجاپور کی بجائے کرناٹک کو اس کا وطن قرار دیا ہے۔ اس کی تصانیف اور ان کی تاریخوں نیز اس کے سنہ وفات کے بارے میں بھی کئی اختلاف موجود ہیں۔

غزلوں اور متفرق کلام کے علاوہ اس کی تین مثنویاں مستقل ہیں۔ ایک گلشنِ عشق[1]، دوسری علی نامہ اور تیسری تاریخ اسکندری۔ ان میں سے پہلی مثنوی گلشنِ عشق کا سنہ تصنیف ۱۰۶۸ھ ہے اور اس کے متعلق کسی کو اختلاف نہیں۔

علی نامے کی تاریخ تصنیف مولف اردوئے قدیم نے ۱۰۷۰ھ بتائی ہے اور وہ اس بنا پر ہے کہ اس مثنوی میں پنالے کے قلعہ کی فتح کا ذکر ہے اور خود نصرتی نے اس فتح کا جو مادۂ تاریخ نکالا ہے اس سے ۱۰۷۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف تذکرۂ شعرائے دکن کے مولف نے اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۶ھ بتایا ہے۔ مولوی نصیر الدین ہاشمی صاحب نے اپنی کتاب "یورپ میں دکنی مخطوطات" میں علی نامے کے نسخے کو دیکھنے کے بعد آخر الذکر تاریخ سے اتفاق کیا ہے اور اپنے رائے کی تائید میں عجائب خانہ برطانیہ کے قدیم اور معتبر نسخے میں جو شعر تاریخی درج ہے وہ بھی نقل کر دیا ہے۔

لکھیا شہ میں جس جو یو کر انس   ہزار یک ہو ستر پہ تھے چھ برس

تاریخ اسکندری کا سنہ تصنیف مولوی عبدالحق صاحب کے مملوکہ نسخے کے بموجب ۱۰۸۳ھ ہے۔ بظاہر یہ نصرتی کی آخری مستقل تصنیف ہے۔ اسی سنہ کے اوائل میں اس کے مربی علی عادل شاہ ثانی کا انتقال ہوا اور اس کا کمسن بیٹا سکندر عادل شاہ تخت نشین ہوا جو ۱۰۹۷ھ میں فتح بیجاپور کے بعد عالمگیر کے حکم سے قید کر دیا گیا۔

مولوی عبدالحق صاحب اپنی کتاب نصرتی میں لکھتے ہیں۔

"نصرتی نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا۔ فتوت نے اپنے تذکرۂ ریاض حسینی میں لکھا ہے کہ جب شاہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن فتح کیا تو وہاں کے شعرا کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ ان میں

---

[1] مجلس اشاعتِ دکنی مخطوطات کی طرف سے گلشنِ عشق اور علی نامہ دونوں کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔ اول الذکر کو راقم نے اور مؤخر الذکر کو مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے ترتیب دیا ہے۔

نصرتی بھی تھے اور ان کے کلام کو سب سے افضل تسلیم کیا اور خطاب ملک الشعرائے ہند سے سرفراز فرمایا. مولوی عبدالجبار مرحوم نے تذکرۂ شعرائے دکن میں ان کا سنہ وفات ۱۰۹۵ھ لکھا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ اطلاع انھیں کہاں سے حاصل ہوئی. اگر یہ سنہ وفات صحیح ہے تو فتوت کا بیان صحیح نہیں ہوسکتا عالمگیر نے بیجاپور کو ۱۰۹۷ھ میں فتح کیا تھا."

یہ سچ ہے کہ تذکرہ شعرائے دکن کے مولف نے ۱۰۹۵ھ کو سنہ وفات قرار دینے کی نسبت اپنے ماخذ کا ذکر نہیں کیا لیکن خطاب ملک الشعرا پانے کے بارے میں ان کا بیان فتوت سے بالکل ایک ہے. وہ لکھتے ہیں کہ :-

"علی نامہ ختم کرنے کے بعد نصرتی کو علی عادل شاہ نے خلعت اور ملک الشعرائی کا خطاب عطا فرمایا تھا" عام طور پر اردو تذکرے نصرتی کے ذکر سے خالی ہیں اور فتوت کے سوا کسی اور روایت سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ اورنگ زیب نے دکن کی مفتوحہ سرزمین کے دکنی گو شاعر کی اس طرح قدر افزائی کی ہوگی. اورنگ زیب کی افتاد طبیعت، فاتحانہ شان اور ادب و دیگر فنون لطیفہ کے ساتھ اس کی طبعی بے پروائی کو دیکھتے ہوئے فتوت کا یہ بیان مشتبہ معلوم ہوتا ہے. اور اس کے مقابلے میں یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ علی نامہ جیسی بلند پایہ رزمیہ مثنوی لکھنے پر جس میں رزم و بزم کے بےنظیر مرقعوں کے علاوہ علی عادل شاہ ثانی کی مدح میں ایسے بلیغ قصیدے بھی ہیں جو فارسی کے اعلیٰ درجے کے قصائد کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں، بہادر اور ادب پرور بادشاہ نے نصرتی کو ملک الشعرا کا خطاب عطا کیا ہو.

نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانے میں گلشن عشق کے ایک قلمی نسخے پر نصرتی کی وفات کے متعلق یہ قطعہ تاریخ درج ہے.

ضرب شمشیر سوں یہ دنیا چھوڑ — جا کے جنت کے گھر میں خوش ہو رہے
سال تاریخ آ ملائک نے — یوں کہے نصرتی شہید اہے

"نصرتی شہید اہے" سے ۱۰۸۵ برآمد ہوتے ہیں. اس نسخے کا سنہ کتابت ۱۰۹۳ھ ہے اور یہ بہت ہی قدیم نسخہ معلوم ہوتا ہے. جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے نصرتی کی آخری مثنوی ۱۰۸۳ھ کی لکھی ہوئی ہے اور فتوت کی روایت بھی غور طلب معلوم ہوتی ہے. نصرتی کے متفرق کلام مثلاً رباعیات وغیرہ سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ انقراض دولت بیجاپور کے بعد زندہ رہا ہوگا اس سے بحالات موجودہ اس قطعے کی بنا پر اس کا سنہ وفات ۱۰۸۵ھ قرار دیا جا سکتا ہے. اس قطعے سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ نصرتی پر کسی نے تلوار سے حملہ کیا تھا اور وہ اس صدمے سے شہید ہوا.

سید محمد

ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور

ڈاکٹر زورؔ

"میں نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر زورؔ کی کسی برائی کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ محض اس لئے کہ مجھے ان میں بُرائی کا کوئی پہلو نظر نہیں آیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں ناقدین اسے عقیدت سے تعبیر نہ کریں اور میں یہ سوچتا رہا کہ کوئی بات ایسی مل جائے جس کے ذریعے سے ان کی کسی برائی کو ظاہر کرنے کا موقع ملے۔ مضمون مکمل ہوگیا لیکن "عیب جوئی" کی ناکام کوشش نکتہ چینوں کا منہ بند کرنے کے لئے اس "گناہ بے لذت" کے ارتکاب سے قاصر رہی۔ جب مضمون "سب رس" میں چھپنے کے لئے "نگرانی" کی زد میں آیا تو انھوں نے "اپنی نگرانی" سے "جائز" فائدہ اٹھا کر اسے چھاپنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن مادر جامعہ جانتی ہے کہ میں ایک "گستاخ شاگرد" رہا ہوں۔

میری گستاخی بعض اوقات، حد تعینات کی پروا نہیں کرتی۔ اُن کی "خو" اور میری "وضع" میں ایک تصادم ہوا اور جس کا نتیجہ ظاہر ہے یعنی "نگران کار" سے بچ کر "مدیر" کا یہ مضمون "سب رس" کے صفحات پر ایک کی نیکی اور دوسرے کا جرم بن کر نمایاں ہوگیا۔ ناقدین خوش ہوں کہ میں نے ڈاکٹر زورؔ کی ایک برائی ظاہر کر دی اور ڈاکٹر زورؔ معاف فرمائیں کہ میں نے اپنی گستاخی کا اظہار کر دیا۔"

میکش

ایک زمانے سے خیال تھا کہ ڈاکٹر زورؔ پر مضمون لکھوں۔ اس لئے کہ اس غلط نواز اور ظاہر پرست ملک میں جب تک اپنے محسنوں کو پہچاننے کی صلاحیت پیدا نہ ہوگی ہم صحت بخش مستقبل کی تعمیر نہ کر سکیں گے۔ کورانہ "شخصیت پرستی" بلاشبہ ایک کمزوری ہے۔ لیکن کسی نصب العینی انسان کی زندگی کو سامنے رکھ کر اس سے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا بہرحال ضروری ہے۔ کھیت نہر سے پانی لے کر پانی نہیں اگاتا بلکہ اس پانی سے ایک لہلہاتی ہوئی فصل تیار کرتا ہے۔ "انفرادیت" کو کھوئے بغیر بھی انفرادیت میں بلندی پیدا کی جاسکتی ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی ہستیاں ہمیشہ بڑی ہستیوں ہی سے عظمت کا سبق لیتی رہی ہیں۔ میری نظر میں ڈاکٹر زورؔ کے نام سے دکنی مستقبل کے لئے بھی ایک "نصب العینی ہستی" ملی ہے۔ جس کی روح میں لطافت اور دل میں جذبۂ عمل ہے جو ماضی سے کچھ حاصل کر رہی ہے اور مستقبل کو کچھ دے رہی ہے جس نے مشکلات پر قابو حاصل کر کے ایک ماحول پیدا کیا، اور جو آگے بڑھتے ہوئے ایک وسیع تر ماحول تیار کر رہی ہے۔ ہماری جدید نسلیں، اگر ان میں زندہ رہنے کی تڑپ ہے تو، اس نصب العینی ہستی کو ضرور سامنے رکھیں گی۔

میں ڈاکٹر زورؔ کو صرف نثر نگار کی حیثیت سے دیکھوں تو میرا یہ زاویۂ نگاہ سطحی ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اقبال کو کوئی صرف شاعر کہدے، اقبال کو خراج تحسین ادا کرنے والا صرف اس کے شعروں پر جھوم کر نہیں رہ جاتا بلکہ اپنی روح میں، اپنی فکر میں، اور اپنی زندگی میں ایک انقلاب محسوس کرتا ہے۔ شعر نہیں بلکہ شعر کے ذریعے سے جو انقلاب پیدا ہوا وہی اقبال کی شاعری کی پیغمبرانہ کامیابی ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر زورؔ کی نثر نگاری نہیں بلکہ ان کی وہ تحریر جس نے دائرۂ عمل پیدا کیا، ان کی وہ گفتگو جو ہمیشہ پیام عمل دیتی رہی ہے، اور ان کی بے پناہ مصروفیتیں، اور دوسروں کو مصروف رکھنے کی کوششیں اصل میں ایک مضمون کا عنوان بننے کے قابل ہیں اس لئے کہ دکن کے نوجوان ادیبوں میں خود اعتمادی اور ذوق عمل پیدا کرنے میں انہی کا حصہ رہا ہے۔

۲

ڈاکٹر زور پر ایک لکھنے والا یوں بھی لکھ سکتا ہے کہ "آپ حضرت محمد عالم شہید کے پوتے قاری حافظ مولوی سید غلام محمد شاہ قادری صاحب کے فرزند اور خانوادۂ حضرت سید علی ساگر سے سلطان مشکل آسان رفاعی کے چشم و چراغ ہیں۔ ۲۸ رمضان المبارک ۱۳۲۳ھ کو پیدا ہوئے۔ تعلیم عربی و فارسی سے دار العلوم میں شروع ہوئی۔ اور بعد کو سٹی کالج میں شریک ہوئے۔ اکیس سال کی عمر میں (۱۹۲۵ء) میں بی اے کی ڈگری حاصل کی اور اپنے مضامین فارسی اور اردو میں اول آئے۔ ۱۹۲۶ء میں جامعہ عثمانیہ سے ام اے کی ڈگری لی اور اس دفعہ بھی اول آئے۔ ان نمایاں کامیابیوں کے پیش نظر حکومت نے یورپی وظیفہ دیا۔ چنانچہ اگست ۱۹۲۷ء میں یورپ روانہ ہوئے۔ وہاں آریائی زبانوں کی لسانی تحقیقات کی۔ ۱۹۲۹ء میں پی ایچ ڈی ہوئے۔ اردو کے آغاز و ارتقا پر ایک مقالہ لکھا۔ اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز اور یونیورسٹی کالج (لندن) میں صوتیات کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں تجرباتی صوتیات کا تحقیقاتی کام پیرس کے مشہور ادارۂ صوتیات "دے انستی تیوت دی فونیتک" میں ختم کیا۔ جو پیرس ہی سے انگریزی میں "ہندوستانی صوتیات" کے نام سے کتابی صورت میں شایع کیا گیا۔ اس زمانے میں ہند آریائی لسانیات اور خاص کر پہلوی اور بھیسی زبانوں کے درس "سوربون یونیورسٹی پیرس" میں حاصل کئے۔ ۱۹۳۱ء میں یورپ سے واپس ہوئے اور جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر مقرر کئے گئے۔ اور اب تک یہی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

۳

ایک مضمون یوں بھی لکھا جا سکتا ہے کہ "ڈاکٹر زور نے سب سے پہلی کتاب ۱۹۲۵ء میں "روح تنقید" لکھی جب کہ وہ بی اے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ "روح تنقید" فن تنقید پر اردو میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس کے بعد سے ان کی کئی کتابیں شایع ہوئیں۔ مثلاً

(۱) تنقیدی مقالات۔ اس کتاب میں اصول تنقید نگاری کی وضاحت کے لئے اردو کے بہترین ادیبوں اور کارناموں کی بلند پایہ تنقیدیں درج ہیں۔ یہ کتاب کئی جامعات کے نصاب میں شامل ہے۔

(۲) اردو کے اسالیب بیان۔ یہ اصل میں اردو نثر نگاری کی تاریخ ہے جس میں آغاز سے عہد حاضر تک کے بلند پایہ اور معیاری انشا پردازوں کی نثر اور اس کے اسلوب کی خصوصیات پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

(۳) اردو شہ پارے۔ اردو کے آغاز سے ولی اورنگ آبادی تک کے اردو ادب کے متعلق جدید ترین تحقیقات اور ادبی کارناموں کے اعلیٰ پایہ اور دلچسپ نمونے شامل ہیں جو یورپ اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں کے کم یاب قلمی نسخوں سے منتخب کئے گئے ہیں

(۴) عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ گزشتہ تیس سال سے اردو ادب میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کا مفید و مکمل تذکرہ

(۵) سلطان محمود غزنوی کی بزم ادب۔ غزنین کے فارسی شاعروں اور وہاں کی ادبی و علمی چہل پہل کا دلچسپ تذکرہ ہے معلومات آفریں ہے۔

(۶) ہندوستانی صوتیات (انگریزی) اردو زبان کا صوتی تجزیہ و تشریح جس کا تذکرہ گذر چکا ہے۔

(۷) ہندوستانی لسانیات۔ اردو زبان کا لسانی تجزیہ و تشریح جس کے پہلے حصے میں علم لسان کے مقاصد، فوائد، تاریخ اور زبان کی اہمیت، ارتقا اور تشکیل سے متعلق اصولی معلومات ہیں اور دوسرے حصے میں اردو کے آغاز، ارتقا، ادبی بولیوں اور اردو کی ہمہ گیری پر جدید ترین تحقیقات پیش کرکے اردو ہندی کے جھگڑے اور اردو کے جدید رجحانوں اور ضرورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۸) فن انشاء پردازی۔ مضمون نگاری اور انشاء پردازی کے اصول اور فن تحریر میں تکمیل کے عملی طریقے بتائے گئے ہیں۔

(۹) طلسم تقدیر۔ زوال گولکنڈہ کے وقت کا ایک نیم تاریخی افسانہ ہے جو اتنا مقبول ہوا کہ دوسرا اڈیشن بھی قریب الختم ہے۔

(۱۰) سیر گولکنڈہ۔ گولکنڈہ کی زندگی کے مختلف پہلو دلچسپ افسانوں کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔

(۱۱) گولکنڈے کے ہیرے۔ سیر گولکنڈہ کا دوسرا حصہ ہے۔

(۱۲) روح غالب۔ غالب کے خطوط کے ادبی حصے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔

(۱۳) سرگزشت غالب۔ غالب کی دلچسپ اور مستند مجمل سوانح عمری جو اصل میں روح غالب کا ابتدائی حصہ ہے۔

(۱۴) گلزار ابراہیم۔ اردو کے مشہور تذکروں گلشن ہند اور گلزار ابراہیم کا مجموعہ۔ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو)

(۱۵) گارساں دتاسی مشہور محسن اردو کے حالات اور تصنیفات پر تبصرہ (مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی)

(۱۶) دیوان زادۂ حاتم۔ دہلی کے مشہور شاعر کا کلام اور حیات۔ (۱۷) متاع سخن۔ کلام عزیز کا انتخاب مع حالات۔

(۱۸) بادۂ سخن۔ کلام مائل کا انتخاب مع حالات۔ (۱۹) کیف سخن۔ کلام کیفی کا انتخاب مع حالات۔

(۲۰) فیض سخن۔ کلام فیض کا انتخاب مع حالات۔ (۲۱) مرقع سخن دو جلدیں۔ دکن کے بہتر شاعروں کا تذکرہ جس کی ترتیب نہایت اعلیٰ پایہ ہے اور جس میں مختلف اصحاب سے تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھوا کر شامل کئے گئے ہیں۔

(۲۱) مکتوبات شاد عظیم آبادی۔ بہار کے استاد سخن کے مکتوبات مع مقدمہ۔

ان کتابوں کے علاوہ کئی کتابیں زیر ترتیب یا زیر طبع ہیں اور سیکڑوں [illegible] ہیں یورپ اور ہندوستان کے معیاری رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی نثر عام فہم اور سادہ ہوتی ہے جس میں روانی اور بے ساختہ پن ہوتا ہے۔ ان کی کتابیں ہندوستان بھر میں مشہور ہیں، جامعات کے نصابوں میں شریک ہیں، قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں، اس لئے ان کے نثری نمونے پیش کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ البتہ میں ان کے مکتوبات سے جو میرے نام ہیں بعض عبارتیں نقل کرتا ہوں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خط لکھتے وقت اس کو چھپوانے کا خیال پیش نظر نہیں رہتا اور اسی لئے خط میں کسی کے اصلی اسلوب کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"اردو شاعری میں ہندوستانی عنصر" اچھا موضوع ہے۔ اس پر مواد جمع کرتے رہیے۔ جتنا زیادہ مواد جمع ہو کتاب اتنی ہی شاندار ہوگی اور آپ کا مطالعہ بھی وسیع ہوتا جائے گا۔ کوشش کیجئے کہ دن کے بعض خاص اوقات روزانہ"

"محض مطالعہ کے لئے وقف رہیں۔ یہ عمر آپ کی استفادہ کی ہے۔ جتنا بھی ہو حاصل کیجئے۔ دینے کا وقت بعد میں آئے گا"
"اور ماشاء اللہ سے اب تک آپ نے جو کچھ لکھا ہے قابلِ فخر ہے اور خوش قسمت ہیں آپ کہ اس قدر جلد قدر دان بھی"
"پیدا ہو گئے ورنہ کتنے ایسے پھول ہوں گے جن کی بہار بے کسی اور ناقدر دانی کی وجہ سے بہت جلد ختم ہو گئی اور آج دنیا"
"انھیں جانتی بھی نہیں۔ انسان ہمیشہ اپنے سے خراب حالت والوں کا مقابلہ کر کے اپنی حالت کو دیکھے تو کبھی مایوسی اور"
"ناکامی کا شکار نہ ہو اور جو لوگ آج آپ کو کامیاب اور سرخرو نظر آ رہے ہیں، آپ نہیں جانتے کہ ان میں کتنے ایسے"
"ہیں جن کو ابتداء میں بڑی بڑی سختیاں جھیلنی پڑی ہیں اور رشک و حسد اور مخالفتیں اور سختیاں اور فضا کی"
"ناموافقتیں سب آہستہ آہستہ غائب ہونے لگتی ہیں اگر انسان ذرا ہمت و استقلال اور صبر و شکر سے کام لے۔"
"اور مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ آپ میں یہ سب صفات موجود ہیں۔ آپ ضرور ایک روز"
"اردو ادب کے جگمگاتے ستارے بنیں گے اگر یہی ہمت و استقلال اور محنت و مطالعہ جاری رکھیں اور کبھی برخود"
"غلط نہ ہوں بلکہ خواہش مند رہیں کہ ع اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے"

"ہم سب کی اور ہماری کیا تمام ملک کی عرصۂ دراز کی خواہش، سب رس کی شکل میں پوری ہوئی ہے اور ہم اگر فدا"
"اور توجہ اور محنت سے کام کریں تو یقین ہے کہ یہ کامیاب رہے گا۔ ہم کو ابھی سے ناامید ہونے کی ضرورت نہیں ہے"
"بلکہ موجودہ حالات سے سبق لے کر آئندہ کے لئے استحکام اور قوت پیدا کر لینی چاہیے۔ خاص کر آپ کے لئے یہ بڑی"
"آزمائش کا وقت ہے۔ اگر اس میں آپ کے قدم ڈگمگا جائیں تو یاد رکھئے آئندہ کے لئے بڑا خراب اثر پڑے گا اور"
"کوئی نیا اور اچھا کام شروع کرنے کی خواہش نہ ہو گی۔"
"آپ کی ذات سے ملک کی اور ہماری بڑی توقعات وابستہ ہیں اور ہم سب کی یہی کوشش ہے کہ آپ سرخرو رہیں۔"
"میں نے جو مشکلات اور موانعات پیش کئے ہیں وہ اس لئے پیش نہیں کئے کہ ان کو سن کر آپ پست ہمت ہو جائیں"
"اور ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں بلکہ اس لئے کہ آپ میں شدائد کے مقابلہ کی قوت پیدا ہو اور آپ موجودہ سے زیادہ سرگرمی"
"دکھائیں۔ ناامیدی اور پست ہمتی ان لوگوں سے ہمیشہ دور رہتی ہے جن کے سینے خلوص اور جذبۂ خدمت گزاری سے"
"معمور ہوں اور جن کے کام محض اپنے ملک کی بہبودی اور زبان کی فلاح پر مشتمل ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے دل میں"
"خلوص اور بے غرضی کا سمندر موجیں مارتا رہتا ہے۔ آپ ہر اس کام میں اپنی پوری قوتوں کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے لئے"
"شریک ہو جاتے ہیں، جو ملک کے کسی پہلو سیاسی، علمی، ادبی کی تقویت کا باعث ہوتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ کا"
"جذبۂ عمل آپ کو مایوس ہونے دے، کام کرنے والوں اور مخلص خدمت گزاروں کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آتی"
"ہیں۔ ان کا راستہ اتنا صاف نہیں ہوتا، جتنا ان غرضی بندوں کا ہوتا ہے جو محض نام و نمود یا ذاتی اغراض کی خاطر سرگرمی"
"دکھاتے ہیں اور دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اس قسم کے لوگوں کی شہرت یا قدر و منزلت قتیہ"

" ہوتی ہے جب تک عروج ہے یا ان کا دہوکہ چل سکتا ہے وہ سرخرو رہتے ہیں۔ ایک زمانہ جلد یا دیر سے ایسا آتا ہے جب "
" اُن کی قلعی کھل جاتی ہے۔"

" ہمارا کام [illegible] اور خدمتِ ملک کی خاطر اُس وقت تک جاری رہے گا جب تک کہ ہم "
" بالکل مجبور نہ کر دیے [illegible] ہماری توجہ اس کام کو جاری رکھنے کے لئے وقف رہیں گی۔ ہمارے "
" اہلِ ملک ابھی پوری [illegible] ہوئے ہیں۔ اسی لئے ہم کو زیادہ توجہ اور محنت اور ایثار کی ضرورت ہے "
" میری دلی خواہش [illegible] انشا پرداز اور شاعر نہیں اور ملک کے جمود اور غفلت کو دور کرلے "
" میں [illegible] میری [illegible] توقعات آپ کے ساتھ ہیں۔"

" [illegible] مجھ پر [illegible] ہے۔ میری عمر میں یہ پہلا موقع ہے کہ "
" [illegible] اولیٰ۔"
" آپ اپنی صحت کا ضرور خیال رکھئے۔ صحت سب سے اہم ہے اور اسی صحت اور مشغولیت کی خاطر رسالہ بھی نکالا "
" گیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے رسالہ کا سب کام آپ کے حسبِ منشا انجام پا رہا ہے۔
" آپ کی تقریر اخبار میں چھپی تھی۔ بہت اچھی اور پختہ اور شائستہ ہے۔ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی "

کیا اس اسلوب [illegible] ایک اردو ادب کو ترقی دینے والے اور اردو دانوں میں ادبی ذوق کو عام کرنے والے سرگرم عمل انسان کی روح نہیں بول رہی ہے؟

۴

ایک مضمون یوں بھی لکھا جا سکتا ہے کہ " ڈاکٹر زور کی کتابوں اور ان کے ذوقِ عمل کے بارے میں ملک کے مشہور انشا پردازوں نے ان کے طالب علمی کے زمانے ہی سے اچھی رائیں دیں۔ چنانچہ پروفیسر وحید الدین سلیم نے لکھا تھا کہ۔

" اگرچہ وہ بظاہر چپ چاپ دکھائی دیتے ہیں مگر درحقیقت وہ اور ان کا دماغ علمی خیالات میں ہر وقت مصروف ہے "
" اردو فارسی کے ادب سے ان کو خاص دلچسپی ہے۔ عجب نہیں کہ اگر ان کی یہی مشغولیت اور دماغی مستعدی رہی تو وہ "
" اردو انشا پردازوں کے دائرے میں خاص طور سے ممتاز خیال کئے جائیں اور دکن کو ان کی ذات پر ناز کرنے کا موقع "
" حاصل ہو۔

مسٹر عبدالحلیم شرر لکھنوی نے لکھا تھا کہ:۔

" روحِ تنقید آپ نے بڑی محنت اور قابلیت سے لکھی ہے۔ میں آپ کی اس کوشش کو بہت ہی قابلِ قدر تسلیم کرتا ہوں "
" اور اردو لٹریچر کی جانب سے آپ کا شکر گزار ہوں۔"

غلام بھیک صاحب نیرنگ نے لکھا تھا کہ :۔

"میں بڑے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ کی یہ کتاب ادبیات میں ایک نہایت ضروری اور مفید اضافہ ہے۔"

پروفیسر سید اشرف شمسی مرحوم نے لکھا تھا کہ :۔

"ان کی اس عمدہ قابلیت کی ملک قدر کرے اور ان کو ممتاز افتخار حاصل ہو۔"

نیاز فتحپوری نے لکھا تھا کہ :۔

"جناب زورؔ کا اردو پر احسانِ عظیم ہے کہ انھوں نے اس فن کے متعلق ایسی بیش بہا تصنیف پیش کی۔"

مولانا عمادی نے لکھا تھا کہ :۔

"اپنے موضوع پر اس صدی کی سب سے نمایاں کتاب کہی جاسکتی ہے۔"

مولوی عبدالحق نے لکھا ہے۔

"یہ بہت دلچسپ کتاب ہے اور دلچسپ طرز میں لکھی گئی ہے۔"

غرض کہاں تک لکھیے۔ یورپ کے چند مشہور مستشرقین کی بھی ان کے بارے میں رائے دیکھیے کیونکہ بعض لوگ اپنوں سے زیادہ غیروں کی رائے کو مستند سمجھتے ہیں۔

پروفیسر لائیڈ جیمس صدر شعبۂ صوتیات نے لکھا کہ :۔

"مسٹر ایس جی ام قادری نے اس مدرسہ میں دو سال تک تعلیم حاصل کی۔ پہلے سال انھوں نے عام صوتیات پر میرے
" درسوں میں شرکت کی۔ انگریزی صوتیات کی عملی جماعتوں میں یہ حاضر رہے اور میری ذاتی نگرانی میں انھوں نے
" اردو کی صوتیات پر کام کیا جس میں دکنی صوتیات پر خاص توجہ دی گئی ہے۔
" اس عرصہ میں یونیورسٹی کالج کی انگریزی صوتیات کی بعض جماعتوں میں بھی وہ شریک رہے اور میری
" نگرانی میں انھوں نے اپنی زبان کا تجزیہ کیا۔ یہ کام جب تکمیل کو پہونچے گا تو علم زبان میں ایک گرانقدر اضافہ
" ثابت ہوگا۔"

ڈاکٹر ٹی گراہم بیلی ام اے۔ ڈی لٹ صدر شعبۂ اردو و ہندی اور پروفیسر ولکنسن ناظم شعبۂ مشرقی برٹش میوزیم نے لکھا کہ :۔

"مسٹر قادری کا مقالہ ایک گرانقدر کارنامہ ہے۔ یہ بڑی حد تک اپچی ہے۔ یہ برٹش میوزیم دفتر وزیر ہند، ایڈنبرا یونیورسٹی
" قومی کتب خانہ پیرس کے کتب خانوں کے تحقیقاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں بہت سے ایسے ادیبوں کا تذکرہ
" ہے جن سے آج تک دنیا واقف نہ تھی۔

" نظم و نثر کے بہت سے ایسے کارناموں کا ذکر اس میں موجود ہے جو کسی اور ایسے تذکرے میں موجود نہ تھے
" جو اس وقت تک شایع ہوا ہو موجودہ تذکروں کی غلطیاں اس میں درست کردی گئی ہیں۔ مسٹر قادری اردو کے
" مختلف پہلوؤں پر کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے اردو لسانیات انڈو آرین فیلالوجی پر جو تحقیقی کام کیا ہے اس سے"

" انھیں بڑی بصیرت حاصل ہوئی ہے ۔ ان کے مقالے کے وہ حصے بہت دلچسپ ہیں جن میں اردو کی ابتدائی
" شکلوں پر بحث کی گئی ہے ۔ یہ مقالہ علم میں ایک تحقیقی اضافہ ہے خصوصاً اس کے وہ حصے جن میں دکنی اور شمالی "
" ہند کی زبان کے تعلق پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ جو دکنی صوتیات ابتدائی دکنی ادب پنجابی سے اردو کے تعلق "
" اور شمال میں اردو کے ابتدائی کارناموں سے متعلق ہیں ۔ ہمیں توقع ہے کہ مصنف کئی اور گرانقدر تصنیفیں شائع کریں گے "

پروفیسر آر ایل ٹرنر ناظم اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز نے لکھا کہ :-

" انڈو آرین زبانوں کی تقابلی گرامر پر میں نے جو لکچر دیے تھے ان میں سید محی الدین قادری شریک رہے ۔ میں نے "
" دیکھا کہ وہ ایک ذہین طالب علم ہیں اور انھیں اس موضوع سے بہت دلچسپی ہے ۔ مجھے اس کا اندازہ خاص طور پر "
" اُس وقت ہوا جب میں نے ان سے پی ایچ ڈی کے مقالہ کے اس حصہ کی نسبت تبادلہ خیال کیا جو انھوں نے "
" لسانیاتی پہلوؤں پر لکھا ہے ۔ اس مطالعہ کی تیاری کے لیے ابتدائی سنسکرت کے درس کی جماعتوں میں بھی "
" شریک رہے اپنے پچھلے مطالعہ اور اس مطالعہ سے جو انھوں نے یہاں آنے کے بعد کیا اردو کی تقابلی تاریخی "
" تحقیقات کی بنیاد رکھ دی ہے جس کی بہت ضرورت تھی ۔ "

پروفیسر سیٹن سابق پرنسپل نظام کالج و نگران کار طلبہ حیدرآباد نے لکھا کہ :-

" وہ ہمارے انتہائی ذہین طالب علموں میں سے ہیں اور ان کا کیرکٹر ایسا ہے کہ کوئی شخص اس پر حرف نہیں رکھ سکتا ۔ "

۵

ایک مضمون اس طرح بھی لکھ سکتے ہیں کہ ڈاکٹر زور نے اپنے زمانۂ طالب علمی سے اب تک ملک کے مختلف اداروں کی تخلیق، تعمیر اور تکمیل میں گرمجوشانہ حصہ لیا ہے ۔ مجلۂ عثمانیہ، مجلۂ مکتبہ، ارتقا، اور مجلۂ طیلسانین کی اجرائی میں ان کی کوششوں کو نہیں بھلایا جاسکتا ۔ مختلف چھوٹی بڑی انجمنوں کی سرپرستی اور صدارت کے علاوہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ " ادارۂ ادبیات اردو " کی تشکیل ہے ۔ یہ ادارہ جیسا کہ اردو داں طبقہ جانتا ہے روز افزوں ترقی پذیر ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر زور نے اس ادارہ کے لیے اپنی حیات عمل وقف کردی ہے ۔ ان کی مسلسل دلچسپیوں اور مستقل سرگرمیوں کے باعث اس نے اب تک کئی معیاری کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے اطراف اہل ملک کا ایک وسیع طبقہ پیدا کر دیا ہے جو ترقی اردو کے لئے بے غرض خدمات انجام دے رہا ہے " سب رس " اسی ادارہ کا ترجمان ہے ۔ دکنی مخطوطات کی اشاعت کے لئے سٹی کالج کے یوم دکن کے بعد ایک مجلس مقرر کی گئی اس مجلس کے روح رواں بھی ڈاکٹر زور ہی ہیں ۔ اس مجلس نے بھی بعض نایاب کتابیں شائع کردی ہیں اور کئی کتابیں زیر ترتیب اور زیر طبع ہیں ۔ وہ انٹرنیشنل فونیٹک اسوسی ایشن کے واحد مسلمان رکن ہے جو ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ ان کا یہی شغف اور ذوق ہے جس کے باعث وہ ہندوستان بھر میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں ۔ چنانچہ حیدرآباد کے باہر بھی کئی اداروں نے ان کے علم و عمل سے فائدہ اٹھایا، کئی عظیم الشان جلسوں کی انھوں نے صدارت کی انجمن ترقی اردو سے متعلق کئی مسائل کے حل میں مدد دینے کے لئے ان کو مدعو کیا گیا اور ان کی تصنیفات کئی ہندستانی جامعات کے نصاب میں داخل ہیں ۔ الغرض حیدرآباد میں اور حیدرآباد کے باہر ان کی شہرت ان کی قوت عمل نے پیدا کی اور جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا جا رہا ہے وہ ترقی اردو میں زیادہ قوت کے ساتھ اپنی عملی صلاحیتوں کو صرف کر رہے ہیں ۔

۶

یہ چند پہلو تھے ڈاکٹر زور کی زندگی کے جن میں سے ہر ایک پر ایک طویل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے اپنے اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں لکھا ہے ان کی زندگی کا صرف یہی ایک پہلو ایسا ہے جو ان کی خدمات کو زندۂ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔ میں یہاں یہ بھی نہیں کہنا چاہتا کہ انھوں نے دکن کے اس صحت بخش تمدن کو جو جدید زمانے کے تیز رو دھارے پر بہا جا رہا ہے لوٹانے کی کوشش کی۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے دکن کی قدیم ادبیات کو دنیا کے سامنے پیش کر کے یہ بتا دیا کہ دکن ترقی اردو میں کئی سو برس پہلے سے معروف ہے۔ میں یہ بھی نہیں کہتا کہ انھوں نے اپنی تصنیفات اور تالیفات سے ادب اردو میں ایک قابل قدر اضافہ کیا بلکہ میں صرف ان کے ذوق عمل اور خلوص خدمت پر یہاں زور دوں گا جس کی وجہ سے حیدرآباد میں مخلص خدمت گزاران اردو کی ایک قابل لحاظ جماعت پیدا ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر زور حیدرآباد کی ان چند ہستیوں میں سے ہیں جنھوں نے بے حسی کے ریگستان میں ایک چشمہ پیدا کیا۔ ایسا چشمہ جس کا پرسکون پانی سارے ریگستان کو ایک نخلستان میں بدل دیتا ہے۔ ان ایام کی یاد ابھی دلوں سے نہیں نکلی ہے جب دکن کے "بے زبانوں" کی راہ میں ملک بوس پہاڑ تھے۔ ان کی آواز سانس بن کر نکلتی تھی اور سانس بن کر سینے میں دفن ہو جاتی تھی۔ یہ حقیقت بھلا دی گئی تھی کہ دکن اور صرف دکن ہی وہ مقام ہے جس نے اردو کی مستقل سرپرستی کو اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس وقت بھی جب کہ قطب شاہی زمانۂ حکومت میں اردو نثر و نظم کے زندۂ جاوید کارنامے ظہور پذیر ہوئے اور آج بھی جب کہ [illegible] نے اردو کے قافلہ کو بہت آگے بڑھا دیا ہے، کوئی شخص مجرمانہ انداز میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ دکن [illegible]

ڈاکٹر زور ملک کے ان گنتی کے فرزندوں میں ہیں جنھوں نے مرعوب ہوئے بغیر اپنی کتابیں شائع کیں۔ لکھتے وقت ان کے ہاتھ کانپے نہ قلم تھرایا بلکہ وہ ایک جرأت رندانہ کے ساتھ آگے بڑھے اور اپنوں اور بیگانوں کو بتا دیا کہ اہل دکن "بے زبان" نہیں ہیں۔ خود اعتمادی کا یہی مستحکم احساس ہے جس سے ڈاکٹر زور نے جدید حیدرآباد کی خدمت زبان و ادب میں روح عمل پھونک دی اور اب جب کہ وہ دلوں سے مرعوبیت دور کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ترقی اردو کے لئے ان کی جد و جہد تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ حیدرآباد میں یوں تو بہت سے ایسے اصحاب ملیں گے جو انفرادی طور پر اردو کی پرخلوص خدمت کر رہے ہیں لیکن اس کی اشاعت اور ترقی کی منظم کوشش کا مرکز صرف ڈاکٹر زور کی ذات ہے۔

میکش

پیارے وطن کی پیاری

اُردو ہے سب کی پیاری، اُردو ہے سب کی پیاری — پیارے وطن کی پیاری، یعنی زباں ہماری
قومی یگانگت کا پیغام دینے والی — اک خوشگوار خدمت انجام دینے والی
اک یادگار ہے یہ بیتے ہوئے دنوں کی — الفت بھرے دنوں کی بھولے ہوئے دنوں کی
بچھڑے ہوئے دلوں کو آپس میں ہے ملاتی — پردے کو غیریت کے بالکل ہے یہ اٹھاتی
پھر رشتۂ اخوت اُردو ہی جوڑتی ہے — بھائی بنا کے "ہم[1]" کو اُردو ہی چھوڑتی ہے

ملکی زباں یہی ہے، قومی زباں یہی ہے
اپنا جہاں یہی ہے، ہندوستاں یہی ہے

اُردو میں کیا نہیں ہے کیا کیا نہ ہوگا اس میں — جلوہ نما نہیں کیا دنیا کی سب زبانیں؟
اُردو میں ہے نزاکت، اُردو میں ہے لطافت — اُردو میں ہے فصاحت، اُردو میں ہے بلاغت
اردو میں ہے روانی، اُردو میں ہے سلاست — اُردو میں ہے ملاحت، اُردو میں ہے حلاوت
اُردو میں ہے متانت، اُردو میں ہے طلاقت — اُردو میں ہے تقدس، اُردو میں ہے صداقت
اُردو میں وسعتیں ہیں ہندوستاں سے زیادہ — اُردو کی شہرتیں ہیں ہندوستان سے زیادہ
اُردو کی رفعتوں پر ہے سرنگوں فلک بھی — وہ خوبیاں ہیں اس کی ہوں تر زباں ملک بھی
اس پر بھی تم کو اُردو بھاتی نہیں ہے حیرت! — شاید نہیں وطن کی دل میں تمہارے چاہت

پیارے وطن کی ہر شے جاں سے عزیز تر ہے
اُردو کے مٹنے کو پھر کیوں یہ شور و شر ہے؟

سلیمان اریب

[1] ہندو مسلمان۔

ذکرِ میر

اُردو کا ذکر ہو اور دنیا میر تقی میرؔ کو بھول جائے۔ ایسا تو نہیں ہوسکتا۔ میرؔ پر بہت سے مقالے نکل چکے ہیں۔ یونہیں سہی۔ مگر آج ہم میرؔ کا ہی ذکر کرینگے۔ خواہ موج خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے۔ شیلےؔ کہتا ہے " ہمارے شیریں ترین نغمات وہ ہیں جو غم آگین حسیات کا اظہار کریں"۔ کتنا سچ کہتا ہے۔ واقعی ؎

تو اے کبوتر بام حرم چہ میدانی
طپیدن دل مرغان رشتہ بر پا را

اسی جاذبیت وکشش نے آج میرؔ کو قلمروئے سخن کی صدارت پر متمکن کردیا ہے۔ فرماں روایانِ ادب نے میرؔ کو اُردو غزل گویوں کا سرتاج تسلیم کرلیا ہے۔ وہ ایک عاشق کی زبان سے اس کی رودادِ قلب کا اظہار کرتے ہیں۔ میرؔ کے اندوہناک جذبات میں شدتِ غم، دل تنگی اور مایوسی کا پیچ وتاب شامل ہے۔ اس کے کلام کو پڑھکر یہ احساس ہوتا ہے کہ " خاموش انسانوں کے قلب میں غموں کی کتنی پراسرار گہرائیاں پوشیدہ ہیں"۔ ابونواس نے سچ کہا تھا " قدرتِ خداوندی سے کیا بعید ہے کہ وہ ایک عالم ایک ہی شخص میں پیدا کردے"۔

یونان کی ایک بہت پرانی کہاوت ہے " مصوری شاعری صامت ہے اور شاعری مصوری ناطق"۔ اگر شاعری فی الحقیقت " مصوری ناطق" کو کہتے ہیں تو ہم میرؔ کو بھی ایک بہت بڑا شاعر ماننے پر مجبور ہیں۔ اور یوں بھی شاعر مصورِ فطرت تو ہے ہی۔

بیکنؔ کا نظریہ ہے " شاعری دماغ کو بلند کرتی ہے"۔ ڈاکٹر گریہم بیلی کی نظر میں اُردو زبان کے بہترین شعرا انیسؔ، غالبؔ اور میرؔ ہیں۔

انسانی جذبات و احساسات ہی شاعری کی اصل روحِ رواں ہیں اور اگر مل صاحب کی رائے سے اتفاق کیا جائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے۔

میرؔ شرفائے اکبرآباد سے تھے۔ لیکن ان کے رشتے ناتے سے اس وقت ہم کو بحث نہیں۔ ہم ایک طائرانہ نگاہ ان کے زندگی کے انوکھے حالات پر ڈالتے ہیں۔ اب اس نگاہ میں ہیں جو کچھ بھی مل جائے اس کو قلم بند کردیا جائیگا۔ ان کے میرؔ تخلص کرنے پر ان کے والد بزرگوار نے انھیں منع کیا کہ ایسا نہ کرو۔ ایک دن خواہ مخواہ سید ہوجاؤگے لیکن ان کے سید ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوسکتا۔ ان کی مسکینی وغربت، صبر وقناعت، تقویٰ وطہارت ایک محضر پیش کرتے ہیں اور یہ اوصاف خود ایک شہادت ہیں میرؔ کی سیادت کے۔ رہا زمانے کا۔ اس نے کس کو چھوڑا ہے۔ کس کس کو کیا نہیں کہتا۔ اگر وہ سید نہ ہوتے تو خود کیوں کہتے ؎

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

آزادؔ کہتے ہیں " ہرچند کہ تخلص ان کا میرؔ تھا۔ مگر گنجفۂ سخن کی بازی میں آفتاب بن کر چمکے۔ قدردانی نے ان کے کلام کو جواہر اور موتیوں کی نگاہوں سے دیکھا۔

اور نام کو پھولوں کی مہک بنا کر اُڑایا۔ ہندوستان میں
یہ بات انھیں کو نصیب ہوئی ہے کہ مسافر غزلوں کو
تحفے کے طور پر شہر سے شہر لے جاتے تھے۔"

میر اپنی نازک مزاجی اور بد دماغی میں بڑی شہرت
رکھتے تھے۔ باوجود فلاکت و نحوست کے جو اہل کمال کا
سرمایۂ زندگی ہے ان کے دماغ ہی نہ ملتے۔ وہ کسی کو
خاطر میں نہ لاتے تھے۔ وضعداری کو نباہنے کا فن انھیں
خوب یاد تھا۔

دلی میں شاہ عالم کا دربار اور امرا و شرفا کی
محفلوں میں ادب ان کی جگہ خالی رکھتا تھا مگر بقول آزاد
"خالی آدابوں سے خاندان تو نہیں پل سکتے۔" ناقدری
نے ان کا دل توڑ دیا اور اسی اجڑے ہوئے دل کو لیے
ہوئے یہ دلی کو خیرباد کہتے ہیں۔ وہی دلی جس پر انھوں
نے کبھی اس طرح سر دھنا ہے :-

ع دلی کے جو تھے کوچے اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اسی دلی کے کھنڈر ہو جانے پر یوں کفِ افسوس ملتے
ہیں ع اب خرابہ ہوا جہان آباد
ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا

اب یہاں سے میر لکھنؤ چلے ہیں۔ ذرا اس لطیفہ کو
آزاد سے سنیے :-

"جب لکھنؤ چلے تو ساری گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا۔
ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلی کو خدا
حافظ کہا۔ تھوڑی دور آگے چل کر اس شخص نے بات کی
یہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد پھر
اس نے بات کی۔ میر صاحب چیں بہ جبیں ہو کر بولے کہ صاحب
قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بیشک، گاڑی میں بیٹھیے۔ مگر
باتوں سے کیا تعلق! اس نے کہا۔ حضرت کیا مضائقہ ہے۔
راہ کا شغل ہے۔ باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب
بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے۔ میری زبان خراب ہوتی ہے۔"

لکھنؤ پہنچ کر ایک سرا میں اُترے۔ معلوم ہوا یہاں
ایک جگہ مشاعرہ ہے۔ صبر نہ آیا۔ جی مچل گیا۔ اسی وقت
ایک غزل لکھی اور مشاعرہ میں جا پہنچے۔ اپنی وضع قطع
سے ایک قدیم مُلّا سے آدمی دکھائی پڑتے تھے۔ ان کے
عجیب و غریب سج دھج دیکھ کر حاضرین محفل میں ہنسی کے
ساغر چلنے لگے۔ لوگ سرگوشیوں میں اپنے قہقہے چھپانے
لگے۔ میر صاحب ایک تو غریب الوطنی کا الم لیے ہوئے
تھے۔ دوسرے ناقدرئ زمانہ کے ہاتھوں دلگیر و
دل گرفتہ۔ ایک طرف بیٹھ گئے۔ جب شمع ان کے
سامنے آئی تو پھر سب نے ان کی طرف ٹکٹکی لگا دی۔
کسی نے وطن پوچھا۔ میر تو بھرے ہی بیٹھے تھے۔ فی البدیہہ
یہ مشہور قطعہ سنا دیا۔ ع

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے
دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب
رہتے تھے منتخب ہی جہاں روزگار کے
اس کو فلک نے لوٹ کے ویران کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

سارے ہنسنے والے اس درد بھرے موثر کلام کو سن کر
کھسیانے ہو گئے۔ صبح ہوتے ہوتے سارے شہر میں

یہ خبر پھیل گئی کہ میر صاحب تشریف لائے ہیں۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے سنا اور دو سو روپیہ مہینہ مقرر کر دیا۔ میر کی نازک مزاجی کے تو بہت سے قصے مشہور ہیں جن میں سے بعض تو بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً یہ کہ ایک دن نواب صاحب موصوف نے ان سے ایک غزل کی فرمایش کی۔ دوسرے تیسرے دن جو گئے تو پوچھا کہ میر صاحب! ہماری غزل لائے؟ میر نے تیوری بدل کر کہا۔ جناب عالی! مضمون غلام کی جیب میں تو بھرے ہی نہیں کہ کل آپ نے فرمایش کی اور آج حاضر کر دے۔ اس فرشتہ خصال نے کہا۔ خیر میر صاحب جب طبیعت حاضر ہو گی کہہ دیجیے گا۔

ایک دن نواب صاحب نے بلا بھیجا۔ جب پہنچے تو انھیں حوض کے کنارے رنگین مچھلیوں سے کھیلتا دیکھ کر ناک بھوں سکیڑ لیا۔ نواب حسب معمول انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ کہا میر صاحب کچھ فرمائیے۔ انھوں نے غزل پڑھنی شروع کی۔ نواب کھیلتے بھی جاتے تھے۔ سنتے بھی جاتے تھے۔ میر صاحب چیں بہ جبیں ہوتے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے۔ وہ کہتے کہ ہاں پڑھیے۔ آخر چار شعر سنا کر میر خاموش ہو گئے، اور بولے پڑھوں کیا آپ تو مچھلیوں میں مشغول ہیں۔ متوجہ ہوں تو پڑھوں۔ نواب نے کہا جو شعر ہو گا آپ متوجہ کر لیگا۔ میر صاحب بھلا کہاں تاب لا سکتے تھے۔ ان کے دکھی من کے لیے یہ فقرہ ایک تازیانہ تھا۔ غزل جیب میں ڈال گھر کا راستہ لیا اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ کچھ دنوں بعد بازار میں نظر آئے۔ نواب کی سواری سامنے سے آ گئی۔ دیکھتے ہی محبت نے کہلوا دیا "میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا۔ کبھی تشریف بھی نہیں لاتے"۔ میر صاحب نے ٹوک دیا۔ بازار میں باتیں کرنا آداب شرفا نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے۔ غرض بدستور گھر بیٹھے رہے۔ اور فقر و فاقہ میں عمر بسر کی۔ سنو برس کی عمر پائی۔ امرا کی تعریف و توصیف میں قصیدہ نہ کہنے کا یہ بھی ایک سبب تھا کہ توکل و قناعت انھیں بندہ کی خوشامد کی اجازت نہ دیتے تھے۔ یا پھر شاید خود بینی و خود پسندی جو انھیں لیے دیے رہتی تھی، وہ زبان سے کسی کی تعریف نکلنے نہ دیتی تھی۔

میر کے دیوان میں یوں نام کو سترد و بہتر نشتر ہیں۔ لیکن بقول آزاد "یہ بہتر کی رقم فرضی ہے کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو ہر سخن شناس یہ کہہ اٹھتا ہے کہ دیکھیے یہ انھیں بہتر نشتروں میں سے ہے"

غزل گوئی میں میر جس مقام پر پہنچے ہیں وہاں تک اب کسی کی رسائی ناممکن ہے۔ ان کا صاف اور سلجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک عجیب انداز دکھاتا ہے۔ آزاد کہتے ہیں "حقیقت میں یہ انداز انھوں نے میر سوز سے لیا۔ مگر ان کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں تھیں۔ انھوں نے اس میں مضمون داخل کیا اور گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل کیا"

یہاں پر ان کے کلام کا ایک مختصر سا نمونہ دیا جاتا ہے:۔

عشق کا گھر ہے میر سے آباد — ایسے پھر خانماں خراب کہاں

دیر و حرم سے تو تو ٹک گرم ناز نکلا
ہنگامہ ہو رہا ہے اب شیخ و برہمن میں

ملاحظہ ہو آب حیات ۱۴۳

کعبے جانے سے نہیں کچھ مجھ کو اتنا شوق ہے
چال وہ بتلا کہ میں دل میں کسو کے جا کروں

مثل عنقا مجھے تم دور سے سن لو ورنہ
ننگ ہستی ہوں مری جائے بجز نام نہیں

اس بتکدے میں معنی کا کس سے کریں سوال
آدم نہیں ہے صورت آدم بہت ہیں یاں

مجھ دیوانے کی مت ہلا زنجیر   کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

لاگ اگر دل کو نہیں لطف نہیں جینے کا
الجھے سلجھے کسی کاکل کے گرفتار رہو

کہتا ہے کون میر کو بے اختیار رو
ایسا تو رو کہ رونے پہ تیرے ہنسی نہ ہو

اثر ہوتا ہماری گر دعا میں
لگ اٹھتی آگ سب ارض و سما میں

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

کچھ نہ دیکھا تھا ہم نے پر تو بھی
آنکھ میں آئی ہے نہ دنیا کچھ

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے خدا ہوتے

رشک یوسف ہے آہ وقت عزیز
عمر اک بار کاروانی ہے

سو ملک پھرا لیکن پائی نہ وفا اک جا
جی کھا گئی ہے میرا اس جنس کی نایابی

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آئے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آئے

کٹتی ہے دیکھیے یوں عمر کب تلک اپنی
کہ سنیے نام ترا اور چشم تر کریے

یاقوت کوئی ان کو کہے ہے کوئی گلبرگ
ٹک ہونٹ ہلا تو بھی کہ اک بات ٹھہر جائے

ترا ہے وہم کہ میں اپنے پیرہن میں ہوں
نگاہ غور سے کر مجھ میں کچھ رہا بھی ہے

ہو گئی شہر شہر رسوائی   اے مری موت تو بھلی آئی

مصائب اور تھے پر دل کا جانا   عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

سر کسو سے فرو نہیں ہوتا   حیف بندے ہوئے خدا نہ ہوئے

دنیا کی قدر کیا جو طلبگار ہو کوئی
کچھ چیز مال ہو تو خریدار ہو کوئی

فرصت کم ہے یاں رہنے کی بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزم جہاں افسانہ ہے

میں چراغ صبح گاہی ہوں نسیم
مجھ سے اک دم کے لیے کیا دشمنی

نہ وے لوگ ہیں اب نہ اجماع وہ
جہاں وہ نہیں یہ جہاں اور ہے

کہاں تک لکھوں۔ ایسے بیسیوں نشتر ہیں۔ اب انھیں کے ایک شعر پر یہ داستان ختم کر دی جاتی ہے۔ ؎

کھول کر دیوان میرا دیکھ قدرت مدعی
گرچہ ہوں میں نوجواں پر شاعروں کا پیر ہوں

جہاں بانو بیگم

غزل

ہوا معلوم جب سے۔ میرے دل میں آپ کا گھر ہے
یہ دل اُس دن سے اب تک دل نہیں ہے مجھ کو دلبر ہے

بس اب راضی خوشی سے اُس پہ مرنا ہی بہتر ہے
یہ دنیا جس میں دنیا جی رہی ہے موت کا گھر ہے

ہوا کرتے ہیں ظلم و جور بھی دلکش حسینوں کے
جو سب کے واسطے ہے عیب ان کے حق میں زیور ہے

میں بے دل اور وہ دل دار۔ میں بے آس وہ آسا
نبھے کیا خاک یاری۔ ایک مفلس، اک تونگر ہے

گل اندا موں سے مل کر دل پہ وہ چوٹیں اُٹھائی ہیں
کہ باغِ دہر کا ہر پھول میرے حق میں پتھر ہے

عدو نے بھی اُڑا لیں ہیں ادائیں دل دکھانے کی
ستمگر جو تری صحبت میں بیٹھا ہے ستمگر ہے

نہیں کوئی کسی کا دوست بازی گاہِ دنیا میں
یہاں ہر ایک اپنے داؤ پر ہے اپنے ڈھب پر ہے

بُرا کہتا ہے جب اس سے بُرا دیکھا نہیں جاتا
نصیحت گر اگر دشمن ہے بُرا ہے تو سے بہتر ہے

وہ دینے میں نہیں رُکتا ہے لیکن اور کیا مانگوں
ضرورت سے زیادہ ہے مجھے جو کچھ میسر ہے

وہ مُردے جن کو اُس کے حکم پر جینا نہیں آتا
وہی کہتے ہیں ایسی زندگی سے موت بہتر ہے

نہیں بڑھتے ہیں اپنی حد سے زندے ہوں کہ مُردے ہوں
سب اُتنے پانو پھیلاتے ہیں جتنی اُن کی چادر ہے

یہ دو باتیں ہیں بس اے چارہ گر آگے تری مرضی
جو غم نکلے تو اچھا ہے جو دم نکلے تو بہتر ہے

وہ جا ہے سننے والوں کے لیے بے جوڑ باتیں ہوں
پڑھانے والے نے جو کچھ پڑھایا مجھ کو از بر ہے

نہیں کی میں نے مال و جان و ایماں کے لیے کوشش
تو ان کے بدلے وہ مل جائے جو ان سب سے بڑھ کر ہے

پلا ساقی کہ باقی عمر بے ہوشی میں کٹ جائے
یہ میرے سر کا چکر اب مری قسمت کا چکر ہے

طلسمِ شارعِ عامِ محبت کھل نہیں سکتا
کہ ایسا صاف رستہ اور پھر ٹھوکر پہ ٹھوکر ہے

ہر اک چھالا ہے شاہد گرمیٔ سوزِ محبت کا
کہ جو کچھ میرے دل میں ہے وہی میری زباں پر ہے

میں اُس کو دیکھتا ہوں آئینہ کیا ہے سکندر کیا
جو آئینہ کا آئینہ سکندر کا سکندر ہے

نہ پوچھو ہائے بیمارانِ غم کی زندہ درگوری
اِسی پر جی رہے ہیں موت کا ایک دن مقرر ہے

ہیں کم سے کم زیادہ سے زیادہ عشق کے معنی
سمجھنے والوں کو اک لفظ بے سمجھوں کو دفتر ہے

شہیدانِ محبت زندۂ جاوید ہوتے ہیں
جو سب کے واسطے ہے گورِ ان کے واسطے گھر ہے

صفی کو طفلِ مکتب جانتے ہیں اس لیے شاعر
کہ ہر اک شعر اس کا بچے بچے کی زباں پر ہے

صفی (اورنگ آبادی)

صاحبزادہ میکشؔ کی کتابیں

گریہ و تبسم

"گریہ و تبسم" کے نوجوان مصنف صاحبزادہ میکشؔ کی شاعرانہ صلاحیتوں اور پاکیزہ ادبی ذوق سے اہلِ ملک بخوبی واقف ہیں۔ "گریہ و تبسم" کے متعلق چند رائیں جو یہاں نقل کی جا رہی ہیں، یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ اُردو ادب کی دنیا میں اپنا ایک شاندار مستقبل رکھتے ہیں۔

"ادبی خدمت گزاروں کی شستہ و منتخب جماعت کے ایک رُکن میکشؔ صاحب بھی ہیں جو مدت سے اپنے میخانہ سے شعر و ادب کے جام بھر بھر کر تقسیم کر رہے ہیں۔ گریہ و تبسم انھیں کے کلام کا مجموعہ ہے اور رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ۔ بعض بعض نظموں پر بے اختیار کلامِ اقبال کا دھوکا ہو جاتا ہے۔" (مولانا عبدالماجد دریابادی)

"صاحبزادہ میکشؔ کا شمار ان نوجوان شعراء میں ہے جو اپنے شاعرانہ وجدان کو محض ادبیات تک محدود نہیں رکھتے بلکہ جنہوں نے اپنے لیے خیال و بیان کے کچھ نئے میدان بھی پیدا کر لیے ہیں۔ نوجوان حیدرآباد کی شاعری میں جو ذوقِ جدید پیدا ہو رہا ہے، اسی کا نقیب گریہ و تبسم ہے۔"

(قاضی عبدالغفار)

"آپ کے اشعار غیر معمولی صداقت اور جذبۂ محبت سے مملو ہیں۔ ملک و مالک کے ساتھ سچی اور بے غرض وفاداری ان سے عیاں ہے۔ جب تک دل میں کسی چیز کی ... [illegible] ... احساسات کی ترجمانی نہیں ہو سکتی جیسی کہ آپ کے کلام سے ظاہر ہے۔"

(محمد عبدالرحمٰن خاں سابق صدر جامعہ عثمانیہ)

"شاگردوں کے ادبی انہماک اور ادبی خدمات سے خوشی ہوتی ہے اپنے کلام پر مبارکباد قبول کیجیے۔"

(مرزا حسین علی خاں، وائس پرنسپل جامعہ عثمانیہ)

"میکشؔ کی شاعری کے پیچھے اُردو شاعری کی وہ تمام تحریکات کام کر رہی ہیں جو میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کے کلام میں مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہو رہی ہیں، ان کے کلام کی سادگی اس بات کی شاہد ہے کہ وہ دماغ سے نہیں بلکہ دل سے شاعری کرتے ہیں۔ موضوع اور نقاطِ نگاہ عصرِ حاضر سے ہم آہنگ اسالیب قدیم اساتذۂ سخن سے مشابہ، یہی ہے خاص انداز جس کو میکشؔ ترقی دے رہے ہیں۔" (عبدالقادر سروری)

"گریہ و تبسم جدید اُردو شاعری میں ایک اضافہ ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ اگر اس نوجوان شاعر کی کما حقہٗ قدر کی گئی تو اُردو زبان مستقبلِ قریب میں ایک اچھے شاعر سے بہرہ مند ہو گی۔" (ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ)

کاغذ کی ناؤ

صاحبزادہ میکشؔ خاموشی کے ساتھ زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ چنانچہ ان کے حزنیہ ڈراموں کا مجموعہ "کاغذ کی ناؤ" ثابت کرتا ہے کہ وہ ادب کے ترقی پسند عنصر پر بھی اپنی قوتِ نگارش صرف کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

کھوئے ہوؤں کی جستجو

ان کی تیسری کتاب "کھوئے ہوؤں کی جستجو" عنقریب شائع ہو گی اس کتاب میں قطب شاہی حیدرآباد کے متعلق نیم تاریخی نظمیں ہونگی جن میں سے بعض "سب رس" کے دکن نمبر میں شائع ہو چکی ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے

فرمایا تھا:۔ "میری تمام زندگی کھوئے ہوؤں کی جستجو"

صاحبزادہ میکش کھوئے ہوؤں کی جستجو کو شاندار مستقبل کی تعمیر کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ماضی کا ہر لمحہ حال کی رو میں بہا دینے کے قابل نہیں ہے۔ بیتے ہوئے دنوں سے، آنے والے دنوں کے لیے بھی کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ شاندار ماضی کبھی دفن نہیں ہوسکتا بلکہ وہ عظیم تر مستقبل کی بنیاد بنتا ہے۔ زیرِ طبع

اُلٹی گنگا صاحبزادہ میکش کی چوتھی کتاب ان کے مزاحیہ ڈراموں کا مجموعہ ہوگی۔ اس مجموعہ میں بھوت، بدگمانی اور اُلٹی گنگا جیسے ڈرامے شریک ہیں۔ ان ڈراموں میں مزاح کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

"آواز کی دنیا" نے آواز میں زندگی کو سمٹا دیا ہے۔ موصولی آلے ابھی "صورت نمائی" کے قابل نہیں ہوئے ہیں آواز کے ذریعے سے منظر کی تصویر پیش کرنا نشر نگار کا سب سے بڑا کمال ہے۔ صاحبزادہ میکش کے غنائیوں (Musical Features) نے جو نشر گاہ حیدرآباد سے نشر ہو چکے ہیں، ہندوستان کے ہر خطے سے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔ "نغموں کی وادی" ان کے نشر شدہ غنائیوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اس مجموعہ میں طوفان کی رات، اندھی بھکارن، پھولوں کی خواب گاہ، نغموں کی وادی اور دوسرے غنائیے شامل رہیں گے۔ (زیرِ طبع)

کنول آخر میں ہم صاحبزادہ میکش کی غزلوں، نظموں، رباعیوں اور گیتوں کے دوسرے مجموعے کا تذکرہ کریں گے جو زیرِ ترتیب ہے۔ اس مجموعے کی "دنیائے شباب و شعر" کا اندازہ ان مثالوں سے ہوسکتا ہے۔

نظم ہندوستان کے دو بند:۔

دھوپ سے جھلسے ہوئے بچے پیادوں کے ستم — جس کی ننھی سی زباں سوکھی ہوئی اور آنکھ نم
جیسے کچی نیند سے نازک پپوٹوں پہ ورم — جیسے مینائے تہی کے دل میں فکرِ بیش و کم

جیسے بے رس پھول، جیسے بند مٹھی کا بھرم
کیا اسی کو پالتی ہے، مادرِ ہندوستان

اک سسکتا سانس، اک ٹوٹا ہوا تار رباب — جیسے گہری فکر میں پچھلے پہر کا ماہتاب
جیسے باسی پھول کی بو، جیسے پت جھڑ کا گلاب — جیسے دن میں چاند تارے، جیسے دریا میں حباب
جیسے دیوانے کی جنت، جیسے مفلس کا شباب
کیا اسی کو زندگی کہتے ہیں، اے ہندوستان

نظم "اقبال کے شعر" سے چند شعر:۔

ایمان کی تفسیر قلندر کا ترانہ — سمجھے تو پلٹ آئے بلندی پہ زمانہ
بے تابیٔ فطرت کی سکوں بخش کہانی — شعلوں سے بنائی ہوئی شبنم کی روانی
الہام میں تکمیلِ حقیقت کی ادائیں — شاہین کی پرواز، مجاہد کی نوائیں
سوئی ہوئی قسمت کو جگاتا ہوا نغمہ — ہر سانس کو ہنگامہ بناتا ہوا نغمہ
پت جھڑ کی طرف دیکھ کے ہنستا ہوا بادل — سوکھی ہوئی کھیتی پہ برستا ہوا بادل

اک روح جو انسان کو انسان بنا دے
اک درد جو جذبات کو ایمان بنا دے

نظم "پرچھائیاں" (تین بند)

کس وقت سے ہوا ہے احساسِ زندگانی
لو، میں تمھیں سنا دوں اس وقت کی کہانی
ہلکی سی چاندنی میں لہرا کے رات رانی — تاروں سے کہہ رہی تھی جب عشق کی کہانی
لے کر نئی امنگیں آئی نئی جوانی
نزدیک پا کے مجھ کو جب دور ہو رہی تھیں — مہندی کی باڑ میں تم مستور ہو رہی تھیں
بچپن بنی ہوئی تھی معصوم نوجوانی
پرچھائیوں سے اپنی گھبرا کے آگئیں تم — سینے پہ ہاتھ رکھ کر دل میں سما گئیں تم
شرما رہی تھی مجھ سے سہمی ہوئی جوانی
اس رات سے ہوا ہے احساسِ زندگانی
اب یاد آگئی نا! بھولی ہوئی کہانی

مہتمم "سب رس"

غزلیات

فکر و نظر

مشاہداتِ جمال اور کم نگر کے لئے
یہ انکشاف ہیں مخصوص دیدہ ور کے لئے

نہ پوچھ کب سے ہوں بیتاب اس نظر کے لئے
جو ہو سکے نہ جدا دل کے عمر بھر کے لئے

بڑھا نہ بانگِ فغاں، ضبطِ سوز کر، جل جا
نمود و رقص کا موقع نہیں شرر کے لئے

تری لطیف تجلی نظر میں بھر بھر کر
بنا رہا ہوں نئے آئینے نظر کے لیے

فضا خموش، ستارے اداس، پھیکا چاند
یہ اہتمام شبِ عیشِ مختصر کے لئے

یہ چھپ چھپا کے نظر بازیاں تو رسمی ہیں
روش نئی کوئی ایجاد کر نظر کے لئے

وہ نالہ کر جو لبِ حسن پر فغاں بن جائے
وہ آہ کیا جو بھٹکتی پھرے اثر کے لئے

ہے شوقِ دید، کسی ڈھب سے دیکھ ہی لوں گا
لگا نہ قید کوئی میری چشمِ تر کے لئے

نمودِ لالہ، ضیائے قمر، فروغِ شفق
یہ جتنے رنگ ہیں دھوکے ہیں سب نظر کے لئے

مطالباتِ وفا میں شریک ہوں دونوں
کروں میں نالہ، دعا تم کرو اثر کے لئے

ترے خیال میں بت، ذہن میں صنم خانے
یہ سجدے بار نہ ہو جائیں سنگِ در کے لئے

شباب کا تو نہیں ہوش، ہاں خیال یہ ہے
کہ ایک نیند سی آئی تھی رات بھر کے لئے

پھر آئے عالمِ ہستی میں انقلاب اعجازؔ
کہ منتظر ہے نظر عالمِ دگر کے لئے

اعجاز صدیقی
مدیر شاعر آگرہ

غزل

کرم مجھ پہ کیا کیا وہ فرما رہے ہیں
ستم کر رہے ہیں، ستم ڈھا رہے ہیں

تبسم تھا اس رنگ سے انکے لب پر
میں سمجھا کوئی جام چھلکا رہے ہیں

تمہیں وجہِ بیتابیٔ زرد دل ہو
تمھاری ہی جانب کھنچے جا رہے ہیں

خوشی کا سماں ہے، ہنسی گلفشاں ہے
خبر آ رہی ہے کہ وہ آ رہے ہیں

بہار ایک دم کی ہے کھلتا نہیں کچھ
یہ گل کھل رہے ہیں کہ مرجھا رہے ہیں

ہے آباد میرے تصور کی دنیا
حسیں آ رہے ہیں حسیں جا رہے ہیں

جلیل اُن کے صدقے جو صہبائے رنگیں
پلا کر مجھے ہوش میں لا رہے ہیں

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

رضوانیات

حیا رخصت ہوئی شوخی اٹھاتی ہے نقاب اُن کا
الٰہی خیر رخصت ہو رہا ہے اب حجاب ان کا

کشش ہے یہ محبت کی کہ ہے یہ بھی حجاب اُن کا
جو مجھ سے روز بڑھتا جا رہا ہے اجتناب اُن کا

دلِ مرحوم کی کیا اب وفائیں یاد آئی ہیں
ہوا جاتا ہے کیوں محبوب حُسنِ کامیاب اُن کا

جفائیں ہو رہی ہیں پردۂ صبر آزمائی میں
کرم بھی ہوتا ہے مجھ پہ باندازِ عتاب اُن کا

سوالِ وصل پر پہلو سے اُٹھ کر روٹھے جاتے ہیں
شکیب و صبر کا دشمن ہے یہ رنگِ عتاب اُن کا

ہمیں سے ہو رہی ہیں چھیڑ کی باتیں بھی محفل میں
ہمیں دشمن بھی ہیں اور پھر ہمیں سے ہے حجاب ان کا

نگاہِ واپسیں بس رحم کر دیکھا نہیں جاتا
یہ منہ کو پھیر کر رونا یہ حالِ اضطراب ان کا

لکھی ہیں خط میں وہ باتیں نہیں جو میری قسمت میں
مری تقدیر کا لکھا ہوا آیا جواب ان کا

اٹھائی جا رہی ہے اس طرح تمہید محشر کی
قیامت کا نمونہ بن کے آیا ہے شباب ان کا

نگاہِ قہر میں شوخی ذرا آواز میں تیزی
لئے ہے ساتھ میں لاکھوں ادائیں اک عتاب ان کا
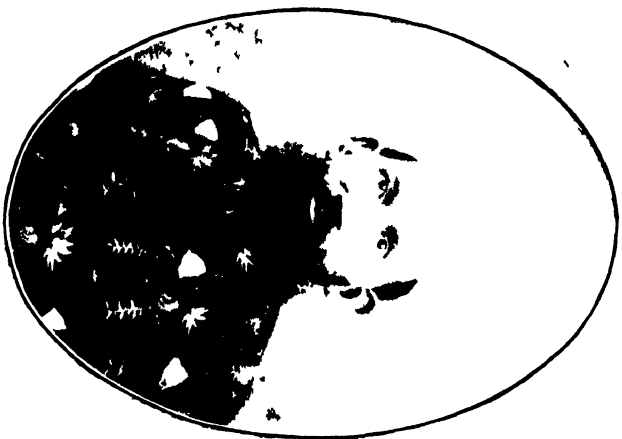
علامہ سر شیخ محمد اقبال مرحوم

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

مزے کیے آئے دن امید امین عیش کی راتیں
کہ ہم آغوش ہوتا ہے لڑکپن سے شباب ان کا

امید رضوی بریلوی

غزل

اور دل توڑ کے جانے والے ۔ دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھکو بھی سمجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت ۔ جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی ۔ سنتا جا شرماتا جا

تجھکو ابر آلود دنوں سے کام نہ چاندنی راتوں سے
بہلاتا ہے باتوں سے ۔ بہلاتا جا ۔ بہلاتا جا

یہ دکھ درد کی برکھا بندے ۔ دین ہے تیرے آقا کی
شکر نعمت بھی کرتا جا ۔ دامن بھی پھیلاتا جا

دونوں سنگ راہ طلب ہیں راہنما بھی منزل بھی
ذوق طلب ۔ ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا!

نغمے سے جب پھول کھلینگے چننے والے چن لینگے
سننے والے سن لینگے ۔ تو اپنی دھن میں گاتا جا

حفیظ جالندھری

غزل

نہیں بہار ہی کچھ زمزمہ سرائے بہار
کلی کلی کا چٹکنا بھی ہے صدائے بہار

ریاض دہر میں ہوں میں مثال نکہت گل
مجھے اڑائے لئے پھرتی ہے ہوائے بہار

دبی نہ آگ جدائی کی سیر باغ سے بھی
غضب ہے اور بھی بھڑکا گئی ہوائے بہار

لگا دے لکھ کے یہ کوئی مزار بلبل پر
شہید غمزۂ گل کشتۂ ادائے بہار

ہزاروں حسن برستے ہیں غنچۂ گل پر
نہ جانے کون ہے صورت گرادائے بہار

بڑے مزے میں ہیں وہ لوگ باغ عالم میں
جو آشنائے خزاں ہیں نہ آشنائے بہار

چمن میں جوش نمو سے نکھر کے رنگ گلاب
ہوا ہے روکش رنگینئ حنائے بہار

زوال ایک کا ہے دوسرے کو وجہ عروج
جو ابتدائے خزاں ہے وہ انتہائے بہار

چمن میں آکے ذرا خامہ زیبیاں دیکھو
گلوں کے جسم پہ پھبتی ہے کیا قبائے بہار

ہنسا دے باد صبا گدگدا کے غنچوں کو
اٹھا دے آج ذرا پردۂ حیائے بہار

ابھی تو ان کا شباب اور گل کھلائیگا
ابھی تو نام خدا سے ہے یہ ابتدائے بہار

قفس میں گزرے نہ معلوم کیا عنادل پر
جب آشیانے ہی میں رات دن رلائے بہار

بہار تھی تو نہ کی ہم نے کچھ بہار کی قدر
گئی بہار تو اب پیٹتے ہیں ہائے بہار

نہیں ہے کام کسی سے قفس نصیبوں کو
چمن سے جائے خزاں یا چمن میں آئے بہار

ہنسی ہے پھولوں کے لب پر خموش ہیں غنچے
بقدر فہم جو سمجھے ہیں مدعائے بہار

جو مجھ سے کوئی سنے تو سناؤں اے خنجر
عجیب قصۂ دلکش ہے ماجرائے بہار

میر یاور علی خنجر

بہاراں

بادِ صبا یہ جھومتی آئی ہے کس دیار سے
جیسے شمیم پھٹ پڑے سینۂ لالہ زار سے

گاہ چمن میں جھومنا، گاہ چمن کو روندنا
کیف اڑا کے لائی ہے موج خرام یار سے

پھر ہو نمودِ زندگی موج خرامِ یار سے
حشر یہیں بپا کریں کون اٹھے مزار سے

برق سی کوندنے لگی اٹھنے لگے شرار سے
میری نگاہ لڑ گئی جب بھی نگاہِ یار سے

ضبط نظر نہ ہو سکا عشقِ کرشمہ کار سے
بڑھ کے نقاب الٹ دیئے یار و حسینِ یار سے

منزلِ رنگ و نور سے مرحلۂ بہار سے
مثل نظر گذر بھی جا عالمِ اعتبار سے

فقر کو میسر ہے دولتِ لالہ زار سے
جنس جنوں بھی ہو تو میں بھیک لوں بہار سے

موڑ کے منہ بہار سے پھیر کے رخ ہزار سے
کھیل رہی ہیں نکہتیں، اُن کے گلے کے ہار سے

زلف میں یاسمن کے پھول، موسم گل کے وہ رسول
توڑے ہوئے بہار کے چھینے ہوئے بہار سے

روح نہ تھی نسیم میں، جان نہ تھی بہار میں
کچھ بھی نہ تھا کنار میں، وہ جو اٹھے کنار سے

جوش نمو کو گل بہ گل لالہ بہ لالہ دیکھ کر
روح جنوں ابل پڑی خم کدۂ بہار سے

فطرتِ حسن و عشق کی ہائے رے بیقراریاں
میں جو ہوں نا شکیب سا وہ بھی ہیں بیقرار سے

آج یہ ڈوبتے ہوئے نجم سحر نے کیا کہا
خون سا کچھ ٹپک پڑا دیدۂ انتظار سے

حسن ہی کو نہیں گلہ عشق بھی تنگ آ گیا
ان کو رلا رلا دیا شکوۂ بار بار سے

دل سے کسی کی یاد بھی کرتی ہے یوں ہی شوخیاں
جیسے صبا الجھ پڑے گل کدۂ بہار سے

خود وہ الجھ کے رہ گئی میرے جنوں کے دام میں
میرا جنوں نہ دب سکا گردشِ روزگار سے

ساغر خام کار پی، بادۂ مشکبار پی
بادہ نہیں بہار پی میکدۂ بہار سے

ساغر نظامی

غزل

مآلِ زندگانی ہے محبت کیش ہو جانا
دلیلِ کامرانی آفتیں در پیش ہو جانا

ہمارا حاصلِ ہستی یہی ہے حضرتِ ناصح
جگر مجروح۔ سر آشفتہ اور دل ریش ہو جانا

ہمیں مطلب نہیں ہے نیک و بد سے کیشِ الفت میں
رقیبوں کو مبارک ہو مآل اندیش ہو جانا

کسی کو دیکھئے دل ہنسنے اگر سیکھا تو یہ سیکھا
جفا سہنا۔ وفا کرنا۔ محبت کیش ہو جانا

جنہیں ہو عشقِ صادق روک سکتا ہی نہیں ان کو
مصیبت ہائے گوناگوں کا گرد و پیش ہو جانا

محبت اول و آخر ہے دنیا ہو کہ عقبیٰ ہو
مبارک عاشقوں کو عاقبت اندیش ہو جانا

رہو دنیا میں دنیا سے الگ اے حضرتِ عابد
وگرنہ کونسا دشوار ہے درویش ہو جانا

قاضی محمد زین العابدین عابد

غزل

ہنس رہا ہوں لبِ مجبور پہ فریاد نہیں
کوئی کیا جانے کہ خوں گشتہ ہے دل شاد نہیں

کیا کہوں کس لئے رہ رہ کے تڑپ اٹھتا ہوں
دل میں اک تیر ہے پیوست تری یاد نہیں

کیا کروں آہ بھلا یا نہیں جاتا مجھ سے
وہی پیمانِ محبت جو تمہیں یاد نہیں

کیا مرے خواب میں آنے کا بھی قدغن ہے یہ
قید ہے جسم میں تو کیا روح بھی آزاد نہیں

چاندنی، کاہکشاں، پھول گھٹائیں، نغمے
کیا یہ سب میری تمناکی ہیں روداد نہیں

یاد ہے وہ شبِ مہتاب میں آہنگِ رباب
اور وہ نکہتِ صحرا جو چمن زاد نہیں

یاد ہے عکسِ شفق سے وہ دلِ دریا میں
منظرِ حسن کہ منت کشِ "بہزاد" نہیں

یاد ہے چھاؤں میں تاروں کی وہ سیر کرنا
اور وہ شکوۂ قدرت کہ ہم آزاد نہیں

وجاہت حسین عندلیب شادانی
(ڈھاکہ)

نغمہ و فریاد

میں باغ میں گر نغمۂ دلگیر سنا دوں
بلبل کو بھی فریاد کے آداب سکھا دوں

کیا تجھ سے کہوں کیا ہیں مری آہ کے جھونکے
چاہوں تو ستاروں کے چراغوں کو بجھا دوں

اچھا ہے کہ سجدے مرے بیکار نہ جائیں
تقدیر کی تجدید و تکبیر دل کو سنا دوں

ڈرتا ہوں کہیں پھول کی پتی نہ لچک جائے
شبنم کو جو کرنوں کی کشاکش سے چھڑا دوں

میں حسن کے ہر ظلم کو، ہر جور کو سہہ کر
اوروں کے لئے عشق کو آسان بنا دوں

ہنس ہنس کے وہ کہتے ہیں کہ ہم بھول گئے تھے
مطلب یہ ہے گزری ہوئی باتوں کو بھلا دوں

ساغر کی کھنک، قلقل مینا میں سمو کر
دنیا کیلئے ایک نیا ساز بنا دوں

گلشن جسے کہتے ہیں وہ آتشکدہ بن جائے
میں آتش گل کو جو لگا ہو تو ہوا دوں

جس نظم پہ ماہر کو بہت [illegible] تھی
کہتے تو [illegible]

ماہر القادری

غزل

ہمارے اشک خونیں کی روانی دیکھتے جاؤ
لہو کا ہے کہ پانی کا کہانی دیکھتے جاؤ

ہوئی ہے شادیٔ مرگ آج تم سے ملکے دشمن کو
تماشا نے وہ نوبت وہائی دیکھتے جاؤ

تمہاری رہگزر میں قتل ہو کر سیکڑوں آئے ہیں
ادھر آؤ تم ان کی بے زبانی دیکھتے جاؤ

تمہارے دیکھنے والوں کا دم اب تو لبوں پر ہے
اثر لایا ہے کیا سوز نہانی دیکھتے جاؤ

نہ دیکھو آئینہ جاتے ہوئے دشمن کی محفل میں
تم اپنا حسن اپنی نوجوانی دیکھتے جاؤ

نہیں ہے بے سبب طوفان آنسو دیدۂ تر کا
دلی حالت کی ہے یہ ترجمانی دیکھتے جاؤ

معین کے شعر سن کر بندہ پرور تم بھی خوش ہو گے
ذرا اس کی طبیعت کی روانی دیکھتے جاؤ

معین

غزل

اے پیکرِ خیال نگاہوں پہ چھا کے دیکھ
میرا عیارِ ذوقِ نظر آزما کے دیکھ

جنت نظر ہے منظرِ رنگینیٔ جہاں
آنکھوں سے امتیاز کا پردہ ہٹا کے دیکھ

کتنی جنوں نواز ہے دنیائے رنگ و بو
اک بار دل میں شمعِ محبت جلا کے دیکھ

تارِ نظر ہو تارِ رگِ جاں بنا ہوا!
لایا ہوں نذرِ غم، ادھر مسکرا کے دیکھ

ہمدرد نگاہِ ناز عجب کام کر گئی
تیور بدل گئے دلِ بے مدعا کے دیکھ

طغیانِ عشق سیلِ حوادث پہ چھا گیا
اے حسن تو بھی جرأتِ طوفاں اٹھا کے دیکھ

سکندر علی وجد

"کچھ نہیں" کے دو پہلو

جنہیں عشق سے واسطہ کچھ نہیں
انہیں حسن سے کیا ملا؟ کچھ نہیں

جہاں زہدِ خشک آ گیا اس جگہ
محبت، مروت، وفا کچھ نہیں

خدا جانے کب دل سے کہتے ہیں لوگ
حسیں اور ان کی ادا کچھ نہیں

نہیں دل کی سلطنت تو یہ ہوش
غضب ماہ میں بھی مزا کچھ نہیں

شمر ہیں یہ بکھرے ستارے اگر
تو ہر خندۂ خوش نما کچھ نہیں

نظر گئے ہیں دھوکے مناظر اگر
تو پھر یہ چمن یہ فضا کچھ نہیں

حکیموں پہ حیرت نہ ہو کیوں مجھے
بڑھا علم تو کہہ دیا کچھ نہیں

نہ ساقی نہ ساغر نہ شاہد نہ باغ
تماشا ان کی تحقیق کا کچھ نہیں

---- ۲ ----

وجود ان کا میری نظر میں ہی کب
عدم ہے عدم کے سوا کچھ نہیں

کہوں کیسے ہستی کے مگر ازیں
فنا ہی فنا ہے بقا کچھ نہیں

میں خوش حسن سے ہوں سوا حسن کے
مری زیست کا مدعا کچھ نہیں

اگر میری نظروں سے دیکھے کوئی | بقا ہی بقا ہے فنا کچھ نہیں
یہ معمورۂ حسن ہے تو یہاں | خوشی ہے خوشی کے سوا کچھ نہیں
نگاہِ حقیقت رسِ حسن سے | تعلق غم و رنج کا کچھ نہیں
مزے اہلِ دل کے لئے ہیں بہت | کہا میں نے کب ؟ یاں مزا کچھ نہیں
یہ ساقی یہ ساغر یہ شاہد یہ باغ | حلاوت ہے دل میں کیا کچھ نہیں

علی منظور

میری ہمسائی

حسین نغموں سے پُر نگاہیں | دریچہ میں مسکرا رہی تھیں
در نوجوانی کی داستانیں | پیام عشرت سنا رہی تھیں
شباب انگڑائی لے رہا تھا | جبین نوریں چمک رہی تھی
گلاب کی بھینی بھینی خوشبو | فضا میں ساری مہک رہی تھی

ندیم ! ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی !
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

عجیب منظر عجب سماں تھا | مری نگاہوں کے عین آگے
بہار کی چاندنی میں جیسے | دکھائی پڑتے ہیں چاند تارے
لطیف ہونٹوں پہ تھا تبسم | جمال افروز خواب آسا
نظر سے مستی ٹپک رہی تھی | شراب آسا شباب آسا

ندیم ، ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

نگاہ بد سے خدا بچائے | بہار تصویر سامنے تھی
جمیل خوابوں کی گویا میرے | حسین تعبیر سامنے تھی
ملاحتوں میں صباحتوں میں | رخ حسیں جگمگا رہا تھا
ادائے دوشیزگی کے صدقے | شباب بھی گنگنا رہا تھا

ندیم ، ہمسائی آج میری دریچہ میں گنگنا رہی تھی
فضا میں مستی سی چھا رہی تھی نسیم بربط بجا رہی تھی

محبوب حسن جگر (عثمانیہ)

مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط

ادارۂ ادبیات اُردو نے مشاہیر اُردو کے غیر مطبوعہ خطوط اور تحریروں کے جمع کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے۔ اس وقت تک متعدد کرم فرماؤں نے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ دیگر مشاہیر کے بھی بیسیوں خطوط اور تحریریں عنایت کی ہیں جن میں سے صرف چند خطوط اس اُردو نمبر میں شایع کیے جا رہے ہیں۔ ان خطوط میں نمبر (۱) معصومہ بیگم مرزا حسین علی خاں صاحب نمبر ۲، ۴، ۵، ۸ اور ۹ سکینہ بیگم سید رحمت اللہ صاحب کے ۳، ۱۰ تا ۱۶ صغریٰ بیگم سید ہمایون مرزا کے اور ۶، ۷ .... ڈاکٹر زور کے عطیہ ہیں۔

شبلی نعمانی کے خطوط

بنام طیبہ بیگم صاحبہ بلگرامی بنت عماد الملک

مکرمہ من۔ تسلیم

کل میں نواب عماد الملک بہادر سے ملا اور اتفاق سے کل ہی میرے نام ایک خط خواجہ صاحب کا ووکنگ سے آیا۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ ریاست سے تو امداد ممکن نہیں لیکن خواجہ صاحب کو لکھ دو کہ بہت جلد (یعنے دس پندرہ دن کے بعد) ہم لوگ ان کے مشن کے لیے ایک معقول ماہوار رقم مہیا کر دیں گے۔ جناب نواب صاحب موصوف اور مولوی انوار اللہ صاحب مل کر اس کام کو کریں گے۔

لکچر کے لیے میں حاضر ہوں۔

خواجہ صاحب کا خط مع اپنی تائید کے کسی اخبار میں شایع کروںگا۔

شبلی شہر یور ۱۳۲۳ف

(کاچی گوڑہ)

بنام طیبہ بیگم (بنت عماد الملک)

بھوپال

مکرمہ من

تسلیم۔ خواجہ کمال الدین کے لیے جو کچھ یہاں کرسکا اس کی اطلاع دے چکا ہوں۔

اس وقت یہ تحریر ہے کہ "ظل سلطان" خاص خواتین کا پرچہ ہے اور حضور سرکار عالیہ کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ اس لیے آپ کبھی کبھی اس میں کچھ لکھا کریں تو بہت منت ہوگی۔

شبلی ۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء

بنام سید ہمایون مرزا بیرسٹر ایٹ لا

مکرمی

ہم لوگ نیلام جا رہے ہیں۔ اگر آپ کو سونے یا کسی اور کام کا وقت نہ ہو تو چلیے۔

شبلی ۱۹ اکتوبر ۱۸۹۸ء

طیبہ بیگم کے خطوط

بنام لیڈی سر آسماں جاہ

جناب بیگم صاحبہ معظمہ و محترمہ دام عنایتہا

بعد تسلیم عرض خدمت گرامی ہے کہ اگر ۱۵ ماہ محرم

کے لیے صرف وہ دربار ہال جو آپ نے مس اونس کو
انعام کے جلسہ کے لیے عنایت فرمایا تھا مجھے بھی
عنایت ہو تو میں نہایت ممنون ہوں گی صرف
ہال اور اس کے اندر کا اسٹیج باقی سب کمرے
بند رکھے جائیں۔ اگر چودہ تاریخ سے اجازت
ہو جائے تو پردہ کا انتظام کروا دیا جائے۔
مولوی شبلی صاحب جو ایک مشہور و معروف
لکچر دینے والے ہیں، اشاعت اسلام پر لکچر دینگے۔
سامنے کے اسٹیج پر وہ رہینگے اور اس کے مقابل
کے دروں پر پردہ باندھ دیا جائے گا۔

اگر ہال کی اجازت دلوادی جائے تو میں
نہایت ممنون ہونگی۔ ۱۰ محرم کو اتوار کا روز بھی
رہے گا۔ دفتر بھی بند رہیگا۔

طیبہ بیگم

بنام عزیز فاطمہ بیگم شمس العلماء نواب عزیز جنگ ولا

جناب ہمشیرہ صاحبہ

آپ کا مضمون ماشاء اللہ نہایت عمدہ ہے
اردو تو آپ ہمیشہ سے پُرزور لکھتی ہیں مگر جہاں
خدا کا ذکر ہو پھر وہاں کا کیا کہنا ہے۔ اُبلا ہوا
دل چھلک پڑتا ہے۔ آپ تو عشق اللہ میں صوفیوں
کا درجہ رکھتی ہیں۔ آپ کے مضمون میں صرف جو
بات کانوں کو ناگوار گذرتی ہے وہ میرا ذکر ہے۔
میں اس کے خلاف ہوں۔ بہت سی وجوہ ہیں۔
صرف اس کو انکسار نہ سمجھئے۔ عند الملاقات
کہونگی۔ خدا ہم کو آپ کی دعوت میں شریک
ہونا نصیب کرے فقط

طیبہ بیگم

فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کے خطوط

بنام نواب ڈاکٹر لقمان الدولہ دل

مہربان من

آپ کی غزل بہت اچھی ہے۔ آپکے اُستاد
شاگرد فیض صاحب نے بہت خوب بنائی ہے۔
غزل کی تعریف، آپ کی طبیعت کے ... رسا
کی اور ان کی اصلاح کی داد دیتا ہوں اس میں
کہیں گنجائش اصلاح نہیں ہے نسخہ جو ممکن ہے
اس کو آپ خوب دیکھ سکتے ہیں۔

ہیچمدان فصیح الملک داغ دہلوی

بنام نواب ڈاکٹر لقمان الدولہ دل

الحمدللہ کہ خیریت سے ہوں۔ روزہ رکھ رہا ہوں۔
کمشنر صاحب صفائی چادر گھاٹ سے جھگڑا ہے۔
مثانہ کے درد کے واسطے دوا بھجوادو پہلی دوا
مفید ہوی۔ فقط

گرامی کے خطوط

بنام نواب قادر نواز جنگ بہادر

ہوشیارپور۔ پنجاب

عالی جناب نواب قادر نواز جنگ بہادر
تسلیم۔ آپ کی صورت دل نواز، آپ کی سیرت
وفاطراز، آپ کا مکان دلفریب، آپ کا وہ

خلق گرامی نواز، گرامی کی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔

حضرت قاضی صاحب کو کہہ دیجئے کہ گرامی کو صوبہ صاحب بہادر کا جذبۂ اخلاص حیدرآباد میں کھینچ رہا ہے۔ بفضلِ خدا فروری کے مہینے میں گرامی نواب قادر نواز جنگ بہادر کی مجلس سماع میں حاضر ہو جاوے گا۔

گرامی حضرت قاضی صاحب کی محبت کا دلدادہ ہے۔ و رصوبہ صاحب بہادر کا رہینِ منت سپالخورده گرامی چند رباعیاں بھیجتا ہے۔ مجھے امید ہے نواب قادر نواز جنگ بہادر پسند فرماویں گے۔

راقم۔ گرامی

بنام مولوی سید احمد

حضرت سید صاحب

رطب و یابس لکھ دیا گیا ہے۔ طول بے معنی ہوتا ہے۔ ہر چہ گیرید مختصر گیرید۔ دو شعر نکال دئے گئے۔ خط کھینچ دیا گیا ہے۔ خوشخط لکھوا لیجئے۔

راقم۔ گرامی

راشد الخیری کا خط

بنام صغریٰ بیگم ہمایوں مرزا

عزیزہ محترمہ۔ سلام مسنون

میں خود آپ سے اس وقت ٹیلیفون پر گفتگو کرتا کہ آپ کا پرچہ پہنچا۔ کھانا یہاں بھی آپ کا ہے اور وہاں بھی۔ اصلی چیز آپ کی محبت، خلوص اور قدردانی ہے جس کا میں ممنون ہوں، بیگم راشد الخیری آج دہلی جارہی ہیں اور ان کا جانا نہایت ضروری ہے کیونکہ یکم اکتوبر سے نیا سیشن شروع ہوتا ہے اور روپیہ کی تعداد دیکھ کر فیصلہ ہوتا ہے وہ آپ کے ہاں چاہ پی چکی ہیں۔ میں دو دفعہ چاہ پی چکا ہوں اگر آپ کی رائے میں کھانا نہایت ضروری چیز ہے تو میں حاضر ہوں اور آپ کے گھر کو اپنا گھر سمجھتا ہوں کسی روز آکر بغیر اطلاع جو موجود ہوگا کھا پی لوں گا۔

نواب معین الدولہ بہادر سے اس وقت ملنے جارہا ہوں امید ہے روپیہ مل جائیگا۔

بیگم مرزا یار جنگ صاحبہ گھر پر موجود نہ تھیں شاید آج کل میں آجائیں۔

میں ابھی ایک ہفتہ اور ٹھیرونگا روانگی سے قبل یہاں کا حساب پریس میں بھیجکر آپ سے انشاءاللہ ملتا ہوا جاؤنگا۔

سید ہمایوں مرزا صاحب کی خدمت میں سلام علیک فرما دیجئے۔　　دعاگو

راشد الخیری

نواب امداد امام اثر کے خطوط

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

کیپ بڑکاڈانڈی　　مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۱۳ء

مجمع فضائل و جود خیال خلاصۂ خاندان مصطفوی و مرتضوی دام مجدکم

بعد گزارش آداب و تسلیم عرض ہے کہ محبت نامہ وارد ہوا۔ دریافت خیریت سے مسرت قلبی حاصل ہوئی۔ خدائے تعالیٰ آپ کو ترقی اقبال کے ساتھ حی و قائم رکھے۔

میری سرگزشت یہ ہے کہ آپ کی لقائے صوری کے بعد جب سے میں وطن کو کلکتہ سے واپس آیا انواع اقسام کی تکلیفات روحی وجسمانی میں مبتلا رہا اور اس وقت تک بلاؤں سے نجات نہیں ملی ہے۔ دو مہینے سے ہزہائنس نواب صاحب فرمانروائے رامپور کا مہمان ہوں۔ یہاں تقریب شکار سے ہم کاب آیا ہوں۔ نہیں معلوم کہ کب تک وطن کو معاودت کرسکوں گا۔ وطن کی یہ حالت ہے کہ دس مہینے سے نیورہ نہیں گیا ہوں۔ میں اپنی پریشانیوں کو کیا عرض کروں۔ آپ کی تصنیف شریف گیا میں ہے ساتھ نہیں ہے۔ اُس پر ریویو لکھنے کا مجھے کوئی موقع حاصل نہیں ہے۔ البتہ گیا جاکر تعمیل حکم کرسکونگا۔ اس وقت امیدوار معافی ہوں۔ فقط زیادہ حدادب دعاگو

امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

آبگلہ۔ گیا۔ صوبہ بہار مورخہ ۳ ہر فروری سنہ ۱۹۳۲ء

قبلہ وکعبہ جناب عموی صاحب مدظلہ العالی۔

بعد بجا آوری مراتب تسلیم وکورنش عرض ہے کہ بخیریت ہوں اور خیریت مدکان حضرت کا درگاہ الٰہی سے طالب۔ ورود سرفراز نامہ نے افتخار دین بخشا۔ امور ضروری ذیل میں گزارش ہوتے ہیں۔

میری شومی بخت کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ بندگان حضرت پٹنہ تشریف لاویں اور میں شرف قدمبوسی سے محروم رہ جاؤں۔ اگر تشریف آوری کی قصد سے اطلاع ہوتی تو میں ضرور پٹنہ میں حاضر رہتا۔ حق یہ ہے کہ کوتاہی بخت کا کیا جواب ہے۔ اب پایانِ عمر کو پہنچ چکا ہوں۔ ایسی حالت میں کیا امید ہوسکتی ہے کہ پھر شرف اندوزِ ملازمت ہوسکونگا۔

میری چند تصنیفات تو ضرور شایع ہوچکی ہیں مگر میں نہیں جانتا کہ کہاں سے دستیاب ہوسکتی ہیں میرے پاس میری تصنیفات کے نہ کوئی قلمی نسخے موجود ہیں اور نہ کوئی چھپے ہوئے۔ تعمیل ارشاد میں مطلق دیر نہ ہوتی مگر کیا کروں مجبور ہوں۔

بحضور جناب چچی صاحبہ مدظلہا۔ آداب و تسلیم عرض ہے اور میری اہلیہ بھی آداب وتسلیم عرض کرتی ہیں۔ بچوں کی طرف سے آداب وتسلیم قبول ہو۔

مجھے حصول ملازمت کی بیحد تمنا ہے۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ پیرانہ سالی مانع نقل وحرکت ہے، تعجب یہی ہے کہ اب تک کیونکر زندہ ہوں، خاص کر حسینؑ امام مرحوم کی رحلت کے بعد فقط

فدوی امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

آبگلہ۔ گیا۔ مورخہ ۲۹ ر اپریل سنہ ۱۹۳۳ء

جناب عموی صاحب قبلہ وکعبہ دام ظلہ العالی۔

بعد گزارش آداب وتسلیم عرض ہے کہ ورود سرفراز نامہ نے سرفراز وممتاز فرمایا۔ دریافت خیریت مزاج عالی سے اطمینان قلبی نصیب ہوا۔ ذرہ نوازی کا شکریہ

قبول ہو۔ شرف قدم بوسی کی تمنا احاطۂ بیان سے
باہر ہے۔ کیا کروں کوئی امر اپنے اختیار کا نہیں
ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمنا پوری نہ ہو سکے گی۔
اس لیے کہ پایان عمر کو پہونچ چکا ہوں۔ صرف فرمان
خداوندی کی دیر ہے۔ علاوہ اس کے زمانہ نے
ایسی کروٹ لی ہے کہ اکثر افراد کو اپنی جگہ سے
جنبش کرنی دشوار ہو رہی ہے۔ یہ زمانہ امراگردی
کا آیا ہے۔ مگر ہم غربا بھی اُن کے شریک حال
ہو رہے ہیں۔ اب اس دیار کی حالت قابل
عرض نہیں رہی ہے اور روز بروز بدتر ہوتی جاتی
ہے۔ اہل غیرت خودکشی سے اپنی آبرو کو بچا سکیں تو
بچا سکیں، ورنہ اور کوئی ذریعہ حفظان آبرو کا
نظر نہیں آتا ہے۔ خیر۔ مرگ انبوہ جشنے دارد۔
بالیقین میں نے اپنی عمر طویل میں کسی زمانے کا ایسا
رنگ نہیں دیکھا تھا جیسا کہ اس وقت دیکھ رہا ہوں۔
اہلیہ آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں اور بحضور
جناب حضرت بھی اماں صاحبہ مدظلہا آداب و تسلیم
کے پہونچا دینے کی مستدعی ہوتی ہیں۔ نحیف کی
استدعا بھی یہ ہے۔ دنیا میں جس قدر خیریت ممکن
ہے میرے جمیع متعلقان کو بفضلہ تعالیٰ نصیب ہے
پریشانی عام کی اور بات ہے فقط زیادہ حد ادب

فدوی امداد امام عفی عنہ

بنام سید ہمایوں مرزا بیرسٹر

آنجگہ۔ گیا۔ مورخہ ۱۲ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء

حضرت عم قبلہ و کعبہ مدظلہ العالی۔ بعد گزارش آداب
تسلیم عرض ہے کہ شرف بخشی کا شکریہ تہ دل سے
ادا کرتا ہوں، قرین پذیرائی ہو۔ یہاں یا صوبۂ
بہار میں علیؑ امام سلمہٗ کی خدمت حیدرآباد کا مذکور
ابھی تک سننے میں نہیں آیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ
یہ خبر تمام تر بے بنیاد ہے۔ ایک مہینے کا عرصہ
ہوتا ہے کہ موصوف یہاں آئے تھے مگر حیدرآباد کا
کوئی ذکر درمیان میں نہیں آیا۔ مجھے حاضری کی
بڑی تمنا ہے خاص کر ایسی حالت میں کہ پایان عمر
کو پہونچ گیا ہوں۔ مگر بہت موانع درمیان میں
حائل دکھائی دیتے ہیں۔ کاش ایسا ہوتا کہ سفر
آخرت کے پہلے شرف قدم بوسی حاصل کر لیتا۔
بیگم صاحبہ آداب و تسلیم عرض کرتی ہیں۔
ہم لوگوں کی طرف سے بحضور جناب چچی اماں صاحبہ
مدظلہا آداب و تسلیم فرما دیجیگا، سایۂ عاطفت
ممدود زیاد فقط زیادہ حد ادب

فدوی امداد امام عفی عنہ

ممتاز علی ایڈیٹر تہذیب نسواں کا خط

بنام صغریٰ بیگم سید ہمایوں مرزا

لاہور۔ جمعرات۔ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء

پیاری بیٹی صغریٰ۔ بعد دعائے فراوان
واضح ہو کہ تمہارا محبت نامہ ملکر بے انتہا خوشی
ہوئی۔ چونکہ تم نے مجھے یہ لکھا ہے کہ آپ مجھے اپنی
بیٹی سمجھیں۔ اس لیے میں یہ خط بیٹی ہی کی طرح
لکھ رہا ہوں۔ میں پہلے بھی تم کے لفظ سے خط و کتابت

کیا کرتا تھا۔ لیکن اُس وقت تم میرے ذہن میں کم عمر متصور ہوئی تھیں۔ پھر جب موقع ملاقات کا ہوا تو عمر زیادہ پاکر میں آپ کے لفظ سے مخاطب ہوا۔ اب اپنی بیٹی جان کر پھر اُسی طرح خطاب کر رہا ہوں جس طرح اپنی پیاری وحیدہ کو خط لکھا کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ تمھیں مع اپنے شوہر محترم کے خوش اور خیریت سے رکھے اور حکیم نابینا صاحب کا علاج راس لائے کہ آپ پورے تندرست ہو کر وطن کو جائیں۔

میں ضرور آتا مگر ڈیرہ اسمٰعیل خاں سے اطلاع آئی کہ سید نذر الباقر صاحب والد مسز سجاد حیدر کا یک بیک حرکت قلب کے بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ میں وہاں جانے والا ہوں۔ مگر تمھاری موجودگی ہی میں مجھے سخت قبض ہو گیا تھا جو بعد جاری رہا۔ اس سے میں بہت ڈرتا ہوں اور یہ سفر میں زیادہ ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ جلاب لینے کے بعد جاؤ۔ مگر جلاب سے میرے امعا میں بہت گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ میں غذا سے درستی کی کوشش کر رہا ہوں۔ ساگ پر زیادہ زور دے رکھا ہے اور موٹے آٹے کا حریرہ گڑ کا کھاتا ہوں۔ اس میں گھی ڈال کر قبض دُور ہو جائے تو میں ڈیرہ اسمٰعیل خاں جاؤں۔

تمھارے جانے کے بعد ہمارا گھر بہت سُونا سُونا معلوم ہونے لگا۔ بالکل سُنسان، خاموش اور بے رونق۔ مگر رفتہ رفتہ اپنی قدیمی بے رونقی کا عادی ہو جاؤں گا۔

تمہارا بار بار ہنسنا اور ہنستے وقت شرم سے ہاتھ مُنہ پر رکھ لینا، بہت یاد آتا ہے۔ بُوا بار بار یاد کرتی اور کہتی ہے کہ اُنھیں پھر بُلا لو۔

اللہ پھر خوشی سے ملائے اور دونوں جانب خیریت رکھے۔

مسز شاہ نواز نے اب تک کوئی فارم نہیں بھیجا حالانکہ میاں حمید نے انھیں خط بھی لکھا۔ مہربانی کر کے تم انھیں تاکیدی خط لکھ دو اور یہ لکھو کہ "میں سید ممتاز علی صاحب اور مسز حمید سے وعدہ کر چکی ہوں کہ مسز شاہ نواز بچی کو ضرور داخل کروا دیں گی۔ پس آپ مجھے ان کے آگے شرمندہ نہ کرائیں اور جلد انتظام داخلہ کے کر کے بچی کو خود ساتھ لے جائیں۔ میں بے انتہا شکر گزار ہوں گی۔"

اس طرح کا خط اپنے دوسرے حالات کے ساتھ جلد لکھ دیجیے۔

سید صاحب محترم کے اشعار اور لکچر نما تقریریں بہت یاد آتی ہیں۔ کاش میرا حافظہ ہوتا اور ان جواہر ریزوں کو محفوظ رکھ سکتا۔ ان سے مل کر دل بہت ہی خوش ہوا۔ اس نمونے کا بیرسٹر پنجاب میں تو ایک بھی نہیں۔ یہاں کے بیرسٹروں میں تو بوٹ سوٹ کے سوا اور کچھ بھی نہیں نہایت بدمذاق، ناسخن شناس، بے علم ہیں۔ ان میں صاحب لوگیت کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ آپ کے شوہر محترم کو تا دیر سلامت باکرامت رکھے۔ کاش حیدرآباد نزدیک ہوتا اور میں آسانی سے

مل سکتا۔ یا تم دس بارہ برس پہلے میری بیٹی بنی ہوئی تھیں تو پیاری بیٹی اب ختم کرتا ہوں۔ قلم سے بوجہ رعشہ لکھ نہیں سکتا۔ پنسل سے بہت آہستہ آہستہ بمشکل لکھا جاتا ہے۔ اتنا لکھنے میں ایک گھنٹے سے کم نہیں لگا۔ ثریا تم دونوں کو آداب کہتی ہے اور سب عزیز سلام کہتے ہیں۔ حمید بیرسٹر صاحب کو بہت یاد کرتے ہیں۔ عزیزی حیدر صاحب کو بھی میرا سلام شوق پہنچا دیجئے۔ اب بالکل رخصت محبت کے ساتھ

ممتاز علی

مکرر آنکہ۔ اس وقت بارش ہو رہی ہے۔ چائے کا وقت ہو گیا تھا۔ میرا کوئی آدمی چائے بنانے والا نہ تھا۔ دلہن نے اوپر سے چائے بھیجی ہے اور ساتھ کچھ پکوان۔ میں خط بند کرنے نہ پایا تھا کہ چائے آ گئی۔ میں نے یہ بھی خط میں درج کر دیا۔ لو اب تو سچ مچ ختم۔ والدعا۔

ممتاز علی

شاد عظیم آبادی کا خط

بنام سید ہمایوں مرزا

دوم جولائی ۱۹۲۶ء عظیم آباد

حبیب محتشم عزیز مکرم دام لطفکم بعد سلام شوق و اشتیاق دیدار کے واضح خدمت ہو یہ خط میرا عزیز از جان مسٹر محمد سلیمان صاحب اور برادر شفیق سید ہمایون میرزا صاحب دونوں حضرات کے نام نامی سے ہے۔ کیفیت یہ ہے کہ بعد تشریف بری آپ کے مولوی سید نور الدین احمد صاحب وکیل میری ملاقات کو تشریف لائے اور از راہ عنایت مجھ سے فرمایا کہ آپ حیدر آباد کا ضرور قصد کیجئے اور وہاں اگر میرے گھر میں چندے قیام کیجئے میں اپنے گھر میں ایک مجلس سید الشہدا برپا کر کے فخر الملک وغیرہ امرا سے آپ سے ملوا دونگا (چونکہ ادھر میں نے بہت سے مرثیے نظم کئے اور مجالس میں خود پڑھے اور ان کی رونق اور تعریف بے حد و حساب ہوئی چنانچہ ایک مجلس عظیم الشان میں اکثر حضرات بیرسٹر بھی شریک تھے اور یک زبان ہو کر بے حساب داد دی اسلئے ہمارے نومیاں کو بہت جوش پیدا ہوا اور یہ صلاح دی)

اوسکے جواب میں اپنے عزیز مسٹر سلیمان صاحب کی رائے ظاہر کی کہ بغیر خط سفارشی مسٹر پلوڈن صاحب کے آنا اچھا نہیں معلوم ہوتا بایں ہمہ آج میں صاحب کمشنر بہادر سے ملنے گیا تھا چونکہ چند روز بعد لفٹنٹ گورنر آنے والے ہیں ایک قطعہ اُن کے ورود کیلئے حسب معمول نظم کر کے کمشنر صاحب کو دکھانے گیا تھا مجھ سے بے اختیار خود کہنے لگے کہ آپ کے لئے ہم حیدر آباد جانا بہت پسند کرتے ہیں، اگر آپ کہئے تو ہم مسٹر پلوڈن صاحب کو چھٹی لکھ دیں بشرطیکہ آپ جانے پر مستعد ہو جئے میں نے کہا کہ میرے دو عزیز بیرسٹر بالفعل حیدر آباد میں پریکٹس کرتے ہیں، میں اُن سے صلاح کر کے آپ کی خدمت میں عرض کرونگا۔

اس وقت یہ خط اس لئے آپ کی خدمت میں

بھیج رہا ہوں ذیل کی باتوں کا جواب دیجئے اور خوب سوچ کر میرے حق میں جو مناسب ہو وہ لکھئے

(۱) خط صاحب کمشنر پٹنہ بنام رزیڈنٹ کافی ہوگا یا اور کچھ بندوبست کریں یعنی کلکتہ جاکر اور اور انگریزوں سے بھی کہیں۔

(۲) اگر کمشنر صاحب سے خط لکھوائیں تو اُس کا کیا مضمون ہو۔

(۳) اپنے لڑکے کو ساتھ لائیں یا نہیں مشکل یہ ہے کہ بغیر لڑکے کے زیادہ قیام میرا ناممکن ہوگا۔

(۴) ایسی حالت میں میرے خرچ آمد و رفت کو پانچ سو روپے کافی ہونگے یا نہیں۔

(۵) لباس کس قسم کا وہاں درکار ہے مطلب یہ ہے کہ جو لباس کی قطع ہے وہ بدلنا ناممکن مگر قسم پارچہ کیا ہو۔

(۶) مولوی خدا بخش خاں صاحب سے امید نہیں، شاید حافظ صاحب بھی کچھ معین ہوں تو اپنے وہاں آنے کی خبر اُن کو خواہ مولوی سید حسن صاحب کو دینا چاہئے یا نہیں۔

(۷) رزیڈنٹ کے ذریعے سے مکان قیام مجھے مل سکتا ہے یا نہیں۔

امید ہے کہ آپ لوگ خوب سوچ بچار کر اس کا جواب تحریر فرما کر مجھ کو مشکور احسان فرمائیے تاکہ اگر میرے ہزار پانچ سو خرچ ہوں تو بیکار نہ جائیں۔

یہاں گرمی کی شدت ہے ایک دو پانی برسا ہے مگر کافی نہیں ہے۔

باقی سب خیریت ہے فقط

آپ کا دعاگو

سید علی محمد شاد غفرلہٗ

رباعیات

گر گل کی ہوس ہے تو الجھ خاروں سے
لے درس حقیقت کا تو افسانوں سے
احساسِ غم و درد مٹا دے یاں تک
کے نغمہ کی پیدا ہو ترے نالوں سے

(۲)

یوں ہمدمو! مشکل کو تم آساں کر لو
بجلی کو نشیمن کا نگہباں کر لو
چھوڑو کوئی اچھی سی نشانی اپنی
مرنا ہے یہاں جینے کا ساماں کر لو

(۳)

اے دوست بتا دے مجھے کچھ رازِ حیات
قبل اس سے کہ اڑ جائے یہ شہبازِ حیات
کس نے چھیڑا ہے اور کیونکر چھیڑا ؟
دلچسپ ہے بسکہ نغمۂ سازِ حیات

(۴)

سننے کو نصیحت تجھے خود گوش نہیں
غفلت میں تو مدہوش ہے کچھ ہوش نہیں
دیتے ہیں خبر خزاں کی گل گلشن میں
گویا ہے زبانِ غنچہ خاموش نہیں

منشی محمد عطاء اللہ عطا گلبانی

حیدر آباد پرنٹنگ ورکس

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)

نشان ٹپہ برطانیہ (M3950)
ٹیلیفون نمبر (۲۲۰۹)

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیرِ نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلسِ ادارت

جلد ۳ شمارہ ۲ — فروری سنہ ۱۹۴۰ء

فہرست مضامین

(۱) اُردو تصنیف و تالیف اور انشا پردازی کا ذوق رکھنے والے اصحاب ادارہ سے مشورہ کر سکتے ہیں۔ ادارہ کے مختلف شعبوں میں ہر موضوع اور ہر فن کے ماہرین موجود ہیں جو خوشی سے مدد دیتے ہیں۔

(۲) اردو زبان سے متعلق جو بھی کام ہو اس کے بارے میں "ادارہ ادبیات اُردو" کی خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔

(۳) اُردو کی ترقی و اشاعت کے لئے اردو کے بہی خواہ جو بھی مفید تجویزیں اور مشورے ادارہ میں روانہ کرتے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا ہے اور ان کے روبہ عمل لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۴) اُردو مطالعہ کا ذوق ہو تو ادارہ کے سب رس کتاب گھر کی فہرست منگوائیے

(۵) اگر اُردو کتابیں خریدنی ہوں تو پہلے سب رس کتاب گھر سے مشورہ کیجئے۔

(۶) مراسلت کرنے والے اصحاب اس امر کا ضرور خیال رکھیں کہ اگر ادارے سے جواب حاصل کرنا ہو تو جوابی کارڈ یا ایک آنے کے اسٹامپ لازماً روانہ کریں۔ ورنہ ادارہ پر جواب کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

(۷) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر دیجئے۔ دیر سے اطلاع آنے پر یا تو پرچے ختم ہو جاتے ہیں یا گزشتہ مہینے کے پرچوں پر زیادہ محصول ڈاک ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تاریخ مقررہ کے بعد اطلاع آئے تو پرچہ روانہ کرنے میں تامل ہوگا۔

سب رس کی قیمت ...... چار روپے سالانہ علاوہ محصول ڈاک ۸/

بچوں کے سب رس کی قیمت ...... ایک روپیہ سالانہ علاوہ محصول ڈاک ۸/

سب رس معلومات کی قیمت ......

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے عہد آفرین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد دکن سے شائع ہوا۔

اناطول فرانس

موپساں

اداریہ

سب رس کے "اُردو نمبر" کا اہل ذوق نے جس طرح "خیر مقدم" کیا ہے، اس سے ہمارے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں اور ہمارا یہ ایقان مستحکم ہوگیا ہے کہ خدمت گزاری اور خلوص کی قدر کرنے والے ہمارے ملک میں بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہم اپنے معاونین سے اگر یہ توقع کریں کہ وہ "سب رس" کی اشاعت میں ہماری مدد کریں گے تو بے جا نہیں اس لئے کہ "سب رس" "ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے" "ادارۂ ادبیات اُردو" اردو کی ترقی و اشاعت کے لئے قائم کیا گیا ہے اور "اُردو" ہم سب کی زبان ہے۔ آپ ہم مل کر یہ کوشش کریں گے کہ "سب رس" زیادہ سے زیادہ اردو داں اصحاب کی نظر سے گزرے۔ اگر اس طرح ہم نے اپنی زبان کی تھوڑی بہت خدمت کر لی تو یقین مانئے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا۔

اس حقیقت کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ سب رس کی اجرائی کسی مالی منفاد کی تمناؤں کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مقصد خدمت زبان و ادب اور صرف خدمت زبان و ادب ہے۔ "سب رس" اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب ہوا؟ اس کے ثبوت میں اس کی ہندوستان گیر مقبولیت پیش کی جاسکتی ہے۔ اس نے نہ صرف اہل ذوق احباب کی، اوقات فرصت میں چارہ گری کی اور اردو داں حلقہ میں اپنی دلچسپی اور تنوع کے باعث مطالعہ کا شوق پیدا کیا بلکہ نوخیز ادیبوں کی ایک امید افزا جماعت بھی پیدا کی اور اس طرح اُردو سے محبت پیدا کرنے اور اردو کو آگے بڑھانے میں اس کی ناچیز خدمتیں، لائق ستائش نہ سہی، بھلائی بھی نہیں جاسکتیں۔

ہوسکتا ہے کہ آپ "سب رس" کے گزشتہ یا موجودہ معیار کو کسی وجہ سے پست خیال فرمائیں۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ کے ذہن میں کسی ایسے "رسالے" کا خاکہ ہو جو آپ کے ذوق کی تکمیل کرسکتا ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ "سب رس" میں آپ کو کچھ خامیاں نظر آتی ہیں اور آپ ان خامیوں کو گوارا نہ فرماتے ہوں لیکن ہم آپ سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ "سب رس" کو ایک ایسے نقطہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی رہی جو یقیناً موجودہ حالات کے اعتبار سے قابل لحاظ ہے۔ "سب رس" ایک طرف تو اہل ذوق کے لئے کچھ دینا چاہتا ہے اور دوسری طرف وہ ان عوام کو اُردو کی طرف مائل کرنا چاہتا ہے جو بلندی سے گھبراتے ہیں ظاہر ہے کہ پستیوں سے ان کو بلندی کی طرف لیجانا آسان نہیں ہے۔ اس لئے "سب رس" ان کا اس طرح ساتھ دے رہا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ "سب رس" کے ساتھ غیر محسوس طریقے سے بلندی کی طرف چلیں۔ تاہم ہم آپ کے گراں قدر مشوروں کو "سب رس" کی ترتیب میں ہمیشہ پیش نظر رکھیں گے اس لئے آپ ضرور ہمیں مطلع کیجئے کہ آپ "سب رس" میں کیا چاہتے ہیں؟

گزشتہ شمارے میں ہم نے "سب رس" کے "فغانیٔ ادب نمبر" کا تذکرہ کیا ہے جو جولائی میں شائع ہوگا۔ یہ نمبر دراصل ایک ضمیمہ ہوگا جس کو سب رس کے معمولی شمارہ سے علحدہ شائع کیا جائے گا۔ اور یہ ضمیمہ خریداران "سب رس" کو رعایتی قیمت پر دیا جائے گا۔ اس ضمیمہ

کے لئے کئی اصحاب نے ریڈیو کے مختلف پہلوؤں پر خاص مضامین لکھنے کا وعدہ کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ایسے مضامین ہونگے جن کو پڑھ کر آپ یقیناً خوش ہوں گے۔ پھر ایک بار ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "ایسا تنوع آپ نے شاید ہی کسی رسالے میں دیکھا ہوگا جیسا کہ سب رس کے نضائی ادب نمبر میں ہوگا۔

آل انڈیا اردو کانفرنس | جب دہلی آل انڈیا اردو کانفرنس" کے سالانہ اجلاس ہو رہے تھے، سب رس کا اردو نمبر تقریباً تکمیل ہو چکا تھا۔ ہم نے مناسب یہی خیال کیا کہ اس کانفرنس سے متعلق اسی وقت کچھ لکھا جائے جب ہم اس کی کارروائیوں سے آگاہ ہو جائیں۔ اس کانفرنس کی صدارت ادارۂ ادبیات اردو کے صدر نواب مہدی یار جنگ بہادر نے فرمائی اور ڈاکٹر زور اور پروفیسر سید محمد مندوبین کی حیثیت سے اس میں شریک ہوئے۔ موجودہ زمانے کو جہاں کئی نام دئے جاسکتے ہیں وہاں اسے "کانفرنسوں کا زمانہ" بھی کہا جاسکتا ہے لیکن بہت کم کانفرنسیں "نشستند و گفتند و برخاستند" سے آگے بڑھتی ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کے قابل صدر کی رہنمائی میں "آل انڈیا اردو کانفرنس" نے اردو کی ترقی و اشاعت سے متعلق کئی مسائل پر غور کیا۔ ہندوستان کی مختلف جامعات میں "جامعہ عثمانیہ" کے تجربہ سے فائدہ اٹھا کر اردو کو ذریعۂ تعلیم قرار دینے کے متعلق جو قرارداد منظور کی گئی ہے اس کو ہم بہت زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ "انجمن ترقی اردو" اس قرارداد کو عملی طریقے سے صورت پذیر کرنے میں اپنی تمام قوتوں سے کام لے گی۔ آل انڈیا ریڈیو" کی زبان کے بارے میں بھی اس کی تحریک وقت کی صحیح آواز ہے۔ اردو کی طباعت میں ٹائپ کے استعمال کی اس کانفرنس نے ترغیب دی ہے لیکن جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے کانفرنس نے رسم الخط کے بارے میں کوئی حل پیش نہیں کیا۔

اردو مطبوعات کی نمائشیں | "نمائشیں" اگر ان کا مقصد تعمیری ہو، ملک کے صحیح رجحانات پیش کرنے کا ذریعہ ہوا کرتی ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو نے حیدرآباد میں "اردو مطبوعات" کی وقتاً فوقتاً نمائشیں کر کے اہل ملک کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ملک کے نوجوان اہل قلم خدمت زبان و ادب میں سرگرم عمل ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ذہنی بلندی کے ساتھ ابھی تک ایک "احساس پستی" ہے اگرچہ یہ "احساس پستی" رفتہ رفتہ دور ہوتا جارہا ہے تاہم ان اصحاب کو جو ملک و قوم کی خدمت کرتے ہیں چاہئے کہ زیادہ سے زیادہ اہل ملک کو اس قسم کی نمائشیں دیکھنے کی ترغیب دیں۔ تاکہ غیر محسوس طور پر ان کے دلوں سے "مرعوبیت" دور ہو جائے۔

دوسری چیز جس کی ہمارے ملک میں ہے وہ نشر و اشاعت کی افادیت سے عدم واقفیت ہے۔ وہ زمانہ گیا جب کسب علم کے لئے طالبان علم لاکھوں میل کا سفر پیدل کرتے تھے۔ اب تو خود علم کو طالبان علم تک پہنچانے کا زمانہ آگیا ہے۔ جب تک کوئی شخص "کسی چیز" سے واقف نہ ہو، وہ کس طرح اسے حاصل کرے گا۔ بہرحال یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی مطبوعات کو عام کرنے کے لئے موثر نشر و اشاعت کی طرف توجہ کریں۔ ترقی یافتہ ممالک میں تو اس کام کے لئے وسیع ادارے قائم ہیں لیکن ہم میں سے اکثر اب تک یہ خیال کرتے ہیں کہ "اشتہار" معائب پر محاسن کی نقاب ڈالنے کا نام ہے پروپگنڈے

کی قوت آج اکل سب سے زیادہ قوی قوت ہے جس پر دنیا کا پہیا گھوم رہا ہے۔ اگر ہم نے اس قوت کو دیانت داری کے ساتھ استعمال نہیں کیا تو سمجھ لیجئے کہ گوشۂ گمنامی ہی ہمارا جنم بھوم ہوگا اور گوشۂ گمنامی ہی ہماری منزل۔

جدید مطبوعات کی فہرست جب سے "ادارۂ ادبیات اردو" میں شعبۂ تنقید قائم ہوا ہے "سب رس" میں ہر ماہ جدید مطبوعات کی فہرست شائع کی جارہی ہے۔ اور اس کام کو ادارہ کے ناظم کتب خانہ نواب سیف علی خاں صاحب خوش سلیقگی اور دلچسپی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اس قسم کی فہرستوں کو شائع کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اہل ملک جدید مطبوعات سے واقف ہوتے رہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ اس کام کو اچھی نظروں سے دیکھا جارہا ہے۔ "سب رس" کے اردو نمبر میں ۱۹۳۹ء کی مطبوعات کو بہ اعتبار موضوعات ایک فہرست کے ذریعے سے پیش کیا گیا ہے۔ جیسا کہ نواب سیف علی خاں صاحب نے اس فہرست کے تعارفی نوٹ میں لکھا ہے۔ "اس فہرست کی ترتیب میں ہندوستان بھر کے اردو رسالوں، مختلف کتب خانوں اور چھاپے خانوں کی فہرستوں اور مقامی کتب فروشوں سے مواد حاصل کیا گیا ہے" لیکن اس کے باوجود بہت سی ایسی مطبوعات ہوں گی جن کا اندراج اس فہرست میں نہ ہوسکا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر اردو کے تمام اہل قلم اپنی کتابوں کا ایک ایک نسخہ ادارۂ ادبیات اردو کو دے دیا کریں تاکہ ایسی فہرستیں مکمل ہوا کریں۔ اگر ایسا انتظام ہوگیا تو ہر سال ادارہ کی جانب سے ایک ایسی کتاب کی اشاعت کا انتظام بھی ہوسکتا ہے جس میں نہ صرف کتابوں کے نام ہوں گے بلکہ ان کا تعارف بھی کرایا جائے گا۔

ادارہ کی خبریں ۱۹۴۰ء کے ساتھ ادارۂ ادبیات اردو نے اپنے دسویں سال میں قدم رکھا ہے۔ گزشتہ نو سال کی تاریخ اور اس ادارہ کی خاموش خدمات کے متعلق ایک باتصویر کتاب شائع ہو رہی ہے جس میں اس ادارہ کے مختلف شعبوں کے حالات اور کام اور اس ادارہ کی مطبوعات کی نوعیت اور دیگر خصوصیتیں تفصیل کے ساتھ درج کی جارہی ہیں۔ جن اصحاب کو حیدرآباد کے اس مخلص اور خاموش خدمتگذار ادارہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے سے دلچسپی ہو وہ یہ کتاب دفتر ادارہ سے مفت حاصل کرسکتے ہیں۔

شعبۂ نسوان اس اثناء میں ادارہ کے اس شعبہ کے دو جلسے ہوئے۔ اس کا سالانہ جلسہ قریب میں خاص اہتمام سے منایا جارہا ہے۔ اس کے دسویں اجلاس میں محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ محترمہ سارا بیگم صاحبہ، محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ اور محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ نے شرکت کی۔ شعبہ کے مئلہ تعلیم بالغات کے لئے نصابی کتب اور رضاکارانہ کام کرنے والوں کے بارے میں تبادلہ خیال کیا گیا۔ مسز محمد یونس صاحب، مسز عزیز علی صاحب اور مس غلام پنجتن صاحب سے مدرسہ میں رضاکارانہ کام کرنے کی استدعا کی جائے۔ اجلاس ماہانہ اور اجلاس سالانہ کے بارے میں بھی مشورہ کیا گیا۔ ادارہ کے اراکین ۱۹۴۰ء میں اضافہ کرنے کے لئے یہ شعبہ خاص دلچسپی لے گا۔ محترمہ عظیم النساء بیگم صاحبہ کے افسانے اور مناول رائے دینے کے لئے اراکین شعبہ کو دئے گئے تاکہ ان کی طباعت کے بارے میں کوئی تصفیہ کیا جاسکے۔ شہزادیان والا تبار کی یورپ سے واپسی کے سلسلہ میں حیدرآباد کی نسوانی انجمنوں نے جو جلسہ خیر مقدم کیا تھا اس میں اس شعبہ کی جانب سے بھی شہزادیوں کو پھول پہنائے گئے۔

اور نظمیں پڑھی گئیں جو جنوری کے سب رس میں شائع ہو چکی ہیں۔

شعبۂ زبان اس شعبہ کا ایک جلسہ ۱۴/ ڈسمبر سنہ ۳۹ء کو منعقد ہوا جس میں پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری، مولوی نورالحسن صاحب، پروفیسر سید محمد صاحب، نواب مرزا سیف علی خان صاحب، ڈاکٹر جعفر حسن صاحب، ڈاکٹر زور صاحب اور ڈاکٹر راحت اللہ خاں صاحب معتمد شعبہ نے شرکت کی۔ قاضی عبدالغفار صاحب نے اطلاع دی کہ دکنی الفاظ او رمحاوروں کا جو کام ان کے سپرد کیا گیا تھا اس کا ایک جزا بھی باقی ہے۔ (اس اثنا میں قاضی صاحب نے اس کام کی مکمل نظر ثانی کر کے اس کو واپس فرمادیا ہے) طے پایا کہ "دکنی الفاظ اور محاوروں کی فہرست میں دکنی کہاوتوں کو بھی شریک کر لیا جائے۔ اور اس کام سے دلچسپی رکھنے والے دوسرے احباب سے بھی مواد طلب کیا جائے۔

(۲) وہ الفاظ جن کی تذکیر و تانیث حیدرآباد کے عوام میں معین نہیں ہے ان کی ایک حد تک مکمل فہرست مرتب کی جائے۔

یہ کام پروفیسر سید محمد صاحب، مولوی نورالحسن صاحب اور نواب مرزا سیف علی خان صاحب نے اپنے ذمہ لیا۔

(۳) ڈاکٹر جعفر حسن صاحب نے حیدرآباد کی دفتری اردو کے متعلق جو مواد جمع کیا ہے اس کو ایک اصلاحی نوٹ کے ساتھ وہ آئندہ جلسہ میں پیش کریں گے دیگر اراکین سے استدعا کی گئی کہ وہ بھی اس سلسلہ میں مزید مواد ڈاکٹر صاحب کے ہاں روانہ کریں۔

متفقہ طور پر طے پایا کہ مندرجہ ذیل امور کی جانب متعلقہ محکموں کو خاص طور پر توجہ دلائی جائے۔

(۱) محکمہ ریلوے سرکار عالی کی جانب سے اسٹیشنوں اور ریلوے بس اسٹانڈ پر ناموں وغیرہ کی جو تختیاں لگائی جاتی ہیں وہ بدخط اور غلط رسم خط میں ہیں۔ نیز ریلوے کی جانب سے جو اعلانات شائع کئے جاتے ہیں یا ریل کے ڈبوں اور اسٹیشنوں پر لگائے جاتے ہیں وہ باعتبار زبان اور رسم خط درست نہیں ہوتے۔ ادارہ ہذا ان امور کے سلسلہ میں محکمۂ مذکور کو ارد و زبان کی اصلاح و خوبی اور خوشخطی ملحوظ رکھنے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

(۲) جس طرح شمالی ہند میں ریلوے کے وقت نامے انگریزی کے سوا اردو زبان میں بھی شائع کئے جاتے ہیں، بعینہٖ ممالک محروسۂ سرکار عالی کے ریلوے کے وقت نامے انگریزی کے سوا اردو زبان میں بھی شائع کئے جائیں۔ قابل دید اور تاریخی مقامات کے متعلق ریلوے کے شائع کردہ کتابچے بہت عمدہ اور مفید ہیں لیکن ان کی مقبولیت اور افادیت میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے اگر وہ اسی اہتمام کے ساتھ اردو زبان میں شائع کئے جائیں۔

(۳) سرکاری دواخانوں میں تختیاں اور اطلاعیں بالعموم انگریزی زبان میں لکھی جاتی ہیں۔ ناظم صاحب طبابت و مہتمم صاحب دواخانہ عثمانیہ کو توجہ دلائی جائے کہ یہ تختیاں وغیرہ انگریزی زبان کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں بھی ہوں تاکہ مریضوں اور ان کے ساتھیوں وغیرہ کو دریافت و اطلاع میں سہولت ہو۔

(ان سب امور کے متعلق معتمد صاحب شعبہ نے مراسلت شروع کر دی ہے۔)

شعبۂ تنقید اس ماہ شعبۂ تنقید نے اپنے معمولی جلسوں کے علاوہ ایک جلسۂ عام بھی کیا جس میں مولوی مخدوم محی الدین صاحب نے نیا ادب کے عنوان پر ایک دلچسپ تقریر کی اور مولوی محمد عمر صاحب مہاجر اور دیگر حاضرین نے اس تقریر کے سلسلہ میں ایسے سوالات کئے جن پر تبادلۂ خیال کرنے کی وجہ سے حاضرین کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ شعبۂ تنقید نے بڑے اچھے کام کا آغاز کیا ہے اور توقع ہے کہ اس کے ایسے علمی جلسے ملک میں ذوق صحیح کی نشوونما میں بڑی مدد دیں گے۔ مخدوم محی الدین صاحب کا مضمون انشاءاللہ سب رس کی آئندہ اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔

فروری ۱۹۴۲ء

شعبۂ سائنس | اس شعبہ کا ایک جلسہ ۱۴ جنوری کو منعقد ہوا۔ پروفیسر محمد سعید الدین صاحب، پروفیسر سید محمد علی خاں صاحب، مولوی فیض محمد صاحب، ڈاکٹر زور صاحب اور ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب معتمد شعبہ نے شرکت کی۔ ادارہ اور شعبہ کے اغراض و مقاصد پر تبادلۂ خیال کیا گیا اور طے پایا کہ (۱) اس شعبہ کا ایک عام جلسہ ۲۰ جنوری کو طلب کیا جائے جس میں سائنس سے متعلق اہم مضامین اور دیگر مسائل پر غور کیا جائے گا (۲) عام فہم زبان میں مفید اور دلچسپ موضوعوں پر چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھی جائیں چنانچہ پروفیسر محمد سعید الدین صاحب نے "مفید پودے" پروفیسر محمد علی خاں صاحب نے "سحر آفریں شعاعیں" ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب نے "زہریلی گیس اور جنگ" اور مولوی فیض محمد صاحب نے "آبدوز کشتیاں" "پرواز" اور "پانی کی کہانی" لکھنے کا ذمہ لیا۔ اس شعبہ میں یوں تو سائنس سے دلچسپی رکھنے والے اکثر اصحاب شریک ہیں لیکن اس کی مشاورتی کمیٹی میں مذکورہ بالا اصحاب کے علاوہ ڈاکٹر رام لال صاحب، ڈاکٹر منور علی صاحب اور پروفیسر یونس وفا قانی صاحب بھی شامل ہیں۔

مجلس امتحانات اردو | اس مجلس کا ایک جلسہ ۱۳ جنوری کو مولوی سید علی اکبر صاحب ایم۔اے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مولوی سجاد مرزا صاحب مولوی غلام ربانی صاحب، مس عیسیٰ نندی، مولوی ظہیر الدین احمد صاحب، مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی، ملا فخر الحسن صاحب مولوی سید محمد صاحب پنڈت نرسنگ راؤ صاحب ڈاکٹر زور صاحب اور عبدالقادر سروری صاحب معتمد مجلس نے شرکت کی۔ معتمد صاحب نے گزشتہ جلسہ سے اس وقت تک جو کام ہوا تھا اس کی تفصیل سنائی جو حسب ذیل ہے۔

(۱) امتحان کے اعلان کے ساتھ ہی ریاست اور بیرون ریاست کے ہر حصہ سے استفسارات اور قواعد کی طلبی کے خطوط آنے لگے چنانچہ اب تک تین سو سے زیادہ خطوط اور درخواستیں وصول ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ حیدرآباد سے آئے ہوئے خطوط میں بلدہ کے علاوہ اضلاع اور تعلقات کے خطوط ہیں۔ اور بیرونی ریاست میں سنبھل پور (اڑیسہ) فیروزآباد (یوپی) بمبئی۔ بنگلور۔ پنجاب۔ بریلی۔ گجرات۔ دھاڑواڑ سے متعدد خطوط اور درخواستیں وصول ہوئی ہیں۔

(۲) بعض اداروں جیسے۔

شاخ ادارۂ ادبیات اردو۔ اورنگ آباد۔ جالنہ۔ محبوب نگر۔ کلیانی کیمپ۔ عثمان آباد۔ اور درسگاہ علوم شرقیہ یاقوت پورہ میں تعلیم کا انتظام ہو چکا ہے۔

(۳) اس کے علاوہ گجرات اور بمبئی میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور پنجاب میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی ادارے کے امتحانات کے لئے مختلف مقامات پر مرکز قائم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اول الذکر نے توقع ظاہر کی ہے کہ وہ امتحانوں کے لئے ہزار کے قریب امیدوار فراہم کریں گے۔

اس کے بعد تصفیہ طلب امور پیش کئے گئے اور طے پایا کہ

(۱) اردو عالم میں اختیاری مضمون خوشنویسی کا وہی ہوگا جو مطبوعہ قواعد کے صفحہ ۱۲ پر درج ہے۔

(۲) اردو عالم میں طبقۂ اناث کے لئے اختیاری مضمون وہی ہوں گے جو مطبوعہ نصاب نامہ میں درج ہیں۔

(۳) امتحانات کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں ہے ہر عمر کے لوگ شریک ہو سکتے ہیں۔

(۴) بلدہ سے باہر مرکز امتحان قائم کرنے کے لئے (۲۵) امیدواروں کی قید ضروری ہے۔

(۵) کوئی شخص عالم اور فاضل میں ایک ساتھ شرکت نہیں کر سکے گا۔

(۶) بعض کتابیں جو بازار میں دستیاب نہ ہو رہی ہوں ان کے متعلق ادارہ سے مراسلت کی جائے۔

ادارہ کی نئی کتابیں اس اثناء میں ادارہ کی تین نئی کتابیں شائع ہو کر بازار میں آچکی ہیں۔ ان میں سب سے اہم اُردو دانی کی پہلی کتاب ہے جس کو مولوی سجاد مرزا صاحب ایم۔ اے نائب صدر مجلس اُردو امتحانات کی نگرانی میں مولوی اظہر الدین صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس میں ایک سو نو تصویریں ہیں۔ متوسط تقطیع کے ۱۰۴ صفحوں میں یہ کتاب جدید ترین اصول کے مطابق بنا کر کے چھاپی گئی ہے اور تصویروں اور ضخامت کے باوجود ادارہ نے محض اُردو کی خدمت کی خاطر اس کی قیمت بہت کم یعنے صرف دو آنے چھ پائی رکھی ہے۔ جو اصحاب اُردو کی توسیع و اشاعت اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں وہ یقیناً اس کتاب کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اور اپنے بچوں عزیزوں اور ملازمین کو اردو سکھانے کے لئے اس سے بہتر کتاب انہیں مل نہ سکے گی۔ ہم ادارہ اور خاصکر مولوی سجاد مرزا صاحب کو اس اہم کتاب کی ترتیب پر مبارکباد دیتے ہیں۔

(۲) ارسطو جاہ اعظم الامراء دکن کے ایک عظیم الشان قائد اور مدبر تھے۔ ان کے حالات زندگی اب تک کتابی صورت میں شائع نہیں ہوئے تھے۔ ادارہ نے عوام کے لئے مشاہیر کی سوانحعمریوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس میں اب تک سالار جنگ اعظم، سر سید احمد خان، اور نظام الملک آصفجاہ کے حالات زندگی شایع ہو چکے تھے۔ ارسطو جاہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اسکے مرتب پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی ایم۔ اے ایل ایل بی ہیں اور اس کتاب کی خوبی ظاہر کرنے کے لئے صرف اس کے مصنف کا نام ہی کافی ہے پروفیسر صدیقی صاحب کی کتاب تاریخ گولکنڈہ گزشتہ سال ادارہ کی طرف سے شائع ہو کر شہرت و مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ ارسطو جاہ اس کے مقابلہ میں ایک بہت چھوٹی کتاب ہے لیکن موضوع اور ترتیب کے لحاظ سے بہت دلچسپ اور مفید ہے اسکی قیمت صرف چھ آنے رکھی گئی ہے تاکہ عوام بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

مکتوبات شاد عظیم آبادی شاد اردو کے ایک سربرآوردہ شاعر اور ادیب تھے ان کے کلام کا پہلا مجموعہ مولانا سلیمان ندوی نے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ اتفاق سے ان کے بہت سے خطوط اور قلمی مسودے محترمہ صغریٰ بیگم ہمایون مرزا کی عنایت سے ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ کے لئے وصول ہوئے ہیں۔ ادارہ کے معتمد ڈاکٹر زور صاحب نے شاد کے کوئی ستر خطوط مرتب کر کے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کئے ہیں۔ یہ خطا اردو زبان اور ادب کی تاریخی معلومات سے معمور ہیں اور ان کی اہمیت کا اندازہ صرف اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ اکثر خط بیس بیس پچیس پچیس مطبوعہ صفحات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کتاب میں شاد کے ایک خط کا عکسی فوٹو بھی شائع کیا گیا ہے۔ کتاب نہایت مبسوط اور تین سو سے زیادہ صفحات پر شائع ہوئی ہے قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے رکھی گئی ہے۔

ادبی تحفے اس اثناء میں ادارہ کے کتب خانہ میں متعدد جدید اردو مطبوعات وصول ہوئی ہیں ان کے علاوہ مولوی سید محمد صاحب نے دیوان مظہر جانِ جاناں کا ایک قلمی نسخہ؛ اور مولوی قاضی عبد الغفار صاحب ایڈیٹر پیام نے مختلف رسالوں کے ۴۲ شمارے اور مولوی ہاشم علی خاں صاحب نے ۱۰ قدیم کمیاب رسالے تحفۃً عنایت کئے ہیں۔ ادارہ کی طرف سے نواب مرزا سیف علی خاں صاحب ناظم کتب خانہ ان سب اصحاب کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

نوٹ:۔ افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے ادارہ کی شاخوں کی روئدادیں شایع نہ ہو سکیں۔ ادارہ

یادِ ایامِ عشرتِ فانی

(ہماری کالج کی زندگی)

جب ہم انگریزی پڑھتے تھے تو جولیس سیزر کا یہ فقرہ بھی نظر سے گزرا تھا کہ Veni. Vidi. Vici ہوا یہ کہ جب جولیس سیزر فرانس فتح کر چکا تو اس نے اپنی فتوحات کی اطلاع روم کو انہی تین الفاظ میں دی تھی جس کے معنی ہیں "میں آیا۔ میں نے دیکھا اور میں نے فتح کر لیا" چنانچہ میں بھی اپنے دہلی آنے کا خلاصہ اس طرح بیان کر سکتا ہوں۔ میں آیا میں نے دہلی دیکھی اور لکچر دینے کی مصیبت میں پھنس گیا۔

خدا معلوم یہ کیا بات ہے کہ میرے عزیز دوست مولوی غلام یزدانی صاحب جہاں کہیں موقع ملتا ہے اپنی محبت سے مجھے ایسی ہی دشواریوں میں پھنسا دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں بھی ان کے ساتھ ٹانگ باندھ کر تین ٹانگ کی دوڑ دوڑوں۔ وہ خود ماشاء اللہ بہت اونچی جگہ پہنچ گئے۔ دنیا میں بہت کچھ مشہور ہو گئے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ مجھے بھی رسی ڈال کر اوپر کھینچ لیں۔ گر حضرات۔ مجھے ترقی کا اتنا شوق نہیں جتنا گرنے کا ڈر ہے۔ بہر حال جب یہاں تک آ گیا ہوں تو پھر کچھ عرض کئے بغیر یہاں سے جانے کو جی بھی نہیں چاہتا۔ مضمون ایسا لیتا ہوں کہ جس سے مجھے مرتے دم تک دلچسپی رہے گی۔ اور اس زمانے کے واقعات بیان کرتا ہوں۔ جب دہلی ہماری تھی اور ہم دہلی کے تھے۔

یہ کچھ انسانی فطرت ہے کہ ہر شخص اپنے زمانے کو اچھا سمجھتا ہے۔ اگر کوئی بڑھا ہے تو وہ

یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جواں تھا

کا خیال کر کے چالیس پچاس برس پہلی باتوں کو یاد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ اب کا زمانہ بھی کوئی زمانہ ہے زندگی کا مزہ ہمارے بچپن اور جوانی میں تھا کوئی جوان ہے تو وہ دربار دہلی کے بعد کے واقعات بیان کر کے اپنے زمانے کو اچھا کہتا ہے۔ کیا کروں۔ میں بھی اس فطرتِ انسانی سے مجبور رہوں اور آپ مانیں یا نہ مانیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ طالب علمی کا جیسا مزا ہمارے زمانے میں تھا۔ وہ اب نہیں رہا اس جوش نے مجھے اپنے مضامین میں "یادِ ایامِ عشرتِ فانی" کے عنوان سے اپنے مدرسے کی زندگی کے حالات لکھنے پر مجبور کیا۔ اور یہی جوش اب مجھے اپنے کالج کے حالات بیان کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔

حضرات! پڑھائی لکھائی پہلے بھی ہوتی تھی اور اب بھی ہوتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے ایک جماعت میں چند طالب علم ہوتے تھے اور اب پڑھنے والوں کی زیادتی مدرسے اور کالج کے بڑے بڑے کمروں کو بھی چھوٹا کر دیتی ہے۔ پہلے مدرسہ اور کالج میں اتنے طالب علم ہوتے تھے کہ استاد اور پروفیسر صرف ان کی ترقی تعلیم کو دیکھ سکتے تھے بلکہ ان کے ساتھ میل جول رکھ کر ان کے عادات اور اطوار کو بھی درست کر سکتے تھے۔ اور اب طالب علم اور استاد ایسے سیارے ہو گئے ہیں کہ ان کا ایک دوسرے کے پاس سے گزرنا ہی مشکل ہے۔ اور اگر خدانخواستہ پاس سے گزر بھی گئے تو ان کے ٹکرا جانے کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے۔ پہلے ہر استاد اور ہر پروفیسر ہر لڑکے کے حالات اور اس کے عادات و اطوار سے واقف

ہوتا تھا اور اب کسی طالب علم کا نام بھی بتاؤ تو شاید اُس کے استاد کو یہ بھی یاد نہ ہو کہ اس نام کا کوئی لڑکا اس کی جماعت میں ہے بھی یا نہیں۔ یہ اچھا ہوا یا بُرا۔ اس کو تو وہ اہل الرائے ہی جانیں جن کے ہاتھ میں تعلیم کی باگ ہے۔ البتہ ہم دور سے دیکھنے والوں کو موجودہ طریقۂ تعلیم میں یہ ذرا کمزوری سی معلوم ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کالج میں وہی پُرانا طریقہ رائج ہو۔ مگر "الشاذ کالمعدوم" سے یہ کمزوری رفع نہیں ہو سکتی۔

میں اپنے مضمون میں آگے چل کر دکھاؤں گا کہ ہمارے پروفیسروں کا رنگ کالج کے کمروں میں کیا تھا۔ اور ان کمروں سے نکلنے کے بعد کیا تھا۔ میں مشن کالج دہلی کا تعلیم یافتہ ہوں پہلے اس کالج کے پرنسپل مسٹر رائٹ تھے۔ میں اس زمانہ میں کالج میں نہ تھا۔ مگر خدا معلوم کیا بات ہے کہ باوجود بے انتہا شریف اور ہمدرد شخص ہونے کے لوگ ان سے خوش نہ تھے۔ ظاہر میں تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ ہندو کالج کے جانی دشمن تھے۔ اور پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ میں ان کے اس فقرے نے کہ

The Hindu college is a standing disgrace to the Punjab University

(ہندو کالج پنجاب یونیورسٹی کی کھلی ہوئی توہین ہے) ذرا دہلی والوں کو ان سے بدظن کر دیا تھا۔ مگر انھوں نے خود اپنے کالج اور خاص کر کالج کے بلڈنگ کے لیے جو کچھ کیا وہ مشن کالج کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ ان بچارے کا انتقال ایک دفعہ ہی ہو گیا۔ مسٹر ہیوبرٹ وائس پرنسپل ہوئے اور مسٹر ڈے انگریزی کے پروفیسر ہو کر آئے۔ کسی شخص نے اسی زمانے میں یہ بامذاق فقرہ کہا تھا۔

جب اس کالج میں راستی (Wright) تھی تو یہاں (wrong) ہر چیز غلط تھی اب (Day) دن ہے تو انشاءاللہ رات (Night) ہی ہو جائے گی۔ زمانے نے اس فقرہ کو مذاق سے آگے نہ بڑھنے دیا۔ اور مسٹر ڈے نے نہ صرف کالج بلکہ ساری دہلی میں وہ اثر پیدا کیا کہ ایسا اثر اور کسی پروفیسر کو نصیب ہونا مشکل ہے۔ راستہ کے بچے جنھوں نے شاید ان کی شکل بھی پوری طرح نہ دیکھی ہو گی۔ ان کے نام کو اس طرح جوش دلی سے لیتے تھے گویا مسٹر ڈے ان کے بڑے پرانے دوست ہیں جو انگریز ان بچوں کے سامنے سے گزرا وہ مسٹر ڈے ہو گیا۔ میں نہیں کہتا کہ ان کو پڑھانے میں کوئی خاص مہارت یا ملکہ تھا۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ ان کی محبت اور ان کا برتاؤ لڑکوں کو خود شوق سے پڑھنے پر مجبور کرتا تھا اور اس کا وہ نتیجہ ہوتا تھا کہ شاید اچھے سے اچھا پروفیسر بھی وہ نتیجہ پیدا نہ کر سکے۔ حضرات! محبت کی مار بڑی سخت مار ہوتی ہے جو کام محبت سے نکل سکتا ہے وہ سرمغزنی سے نہیں نکل سکتا۔ اس لئے استادوں سے میری یہ گزارش ہے کہ وہ طالب علموں سے محبت کریں اور طالب علموں سے یہ عرض ہے کہ وہ اس محبت کی قدر کریں اس کے بعد میں بھی دیکھوں کہ کس طرح طالب علم تعلیم میں ترقی نہیں کرتے۔ رکھ رکھاؤ میں ترقی نہیں کرتے۔ کھیلوں میں ترقی نہیں کرتے اور سب سے زیادہ یہ کہ عادات اور اطوار میں ترقی نہیں کرتے۔

مسٹر ڈے میں دوسری خاص صفت تقریر کی تھی۔ ان کو اس کی پروا نہیں ہوتی تھی کہ ان کی تقریر میں مواد کتنا ہے مگر ان کا جو نقطۂ خیال ہوتا تھا اس کو وہ اپنے الفاظ کے زور اور قوت بیان سے دلوں میں اتار دیتے تھے۔ ان کو بھی اپنے طریقۂ تقریر پر ناز تھا۔ کہا کرتے تھے۔ میں آئرلینڈ والا ہوں۔ اور (Drotor) ہوں۔ آج کل وہ آئرلینڈ میں بشپ ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ وہاں جا کر ان کی تقریر سنوں۔ مگر

" آغا چہ کنم کار ہائے دنیا نمی گزراند "

مسٹر ڈے کی تیسری خصوصیت ان کا شوق تعلیم جسمانی تھا۔ وہ کیمبرج کے مشہور کھلاڑی تھے۔ کرکٹ، فٹ بال، کشتی رانی غرض بہت سے کھیلوں میں وہ انعام پا چکے تھے۔ وہ ہم سب کو بھی اپنا ہی جیسا بنانا چاہتے تھے۔ کوئی کھیل نہ ہوگا جس میں وہ حصہ نہ لیتے ہوں۔ ان کے جوش کا یہ حال تھا کہ ریل میں ٹیم کہیں میچ کھیلنے جا رہی ہے۔ کسی بڑے اسٹیشن پر گاڑی ٹھیری وہ فٹ بال لے کر اترے اور پلیٹ فارم ہی پر فٹ بال شروع کر دی۔ مسافر ہیں کہ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں نئے مسافروں کو گاڑی تک جانے کی جگہ نہیں ملتی۔ سودا بیچنے والے پریشان ہیں۔ گارڈ سیٹیاں بجا رہا ہے۔ لیکن یہاں کھیل کسی طرح ختم نہیں ہوتا۔ کالج کے کمروں میں مسٹر ڈے ضرور پروفیسر بنے رہتے تھے۔ اور بڑا رعب دکھاتے تھے مگر فیلڈ میں آئے اور لڑکوں میں اس طرح مل جل گئے گویا وہ بھی طالب علم ہیں۔ کپتان کی اس قدر عزت اور فرمانبرداری کرتے تھے کہ کوئی لڑکا بھی کیا کرے گا۔ مسٹر ڈے جمعرات کے روز وعظ کے لئے جایا کرتے تھے لیکن جانے سے پہلے کپتان سے ضرور اجازت لیتے تھے۔ اس روز خود کھیلتے نہیں تھے صرف فیلڈ کرتے تھے تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ کھیلے اور چل دئے۔

کوئی ۱۵ برس کی بات ہے کہ میں دہلی گیا تھا۔ اس زمانے میں مشن کالج کا میچ دہلی متحدہ (Delhi Combined) سے ہونے والا تھا۔ کالج کے بعض پرانے لڑکوں کو بھی شریک کر لیا گیا تھا۔ مجھے بھی دعوت دی گئی اور میں راضی ہو گیا۔ پہلے ہی روز کالج کے میدان میں گیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ گزرا ہوگا کہ دو صاحب بہادر آئے۔ آتے ہی ایک نے پیڈ باندھے اور جو لڑکا کھیل رہا تھا اس کو اشارہ کیا۔ وہ ہٹ گیا اور یہ صاحب جا کر کھیلنے لگے جب یہ تھک گئے تو ان کے ساتھی نے ان کی جگہ لی اور وہ بھی اچھی طرح کھیل کر ہٹے۔ دونوں نے کوٹ پہنے اور فیلڈ سے چل دیئے۔ میں نے کپتان صاحب سے پوچھا کہ یہ دونوں حضرات کون تھے معلوم ہوا کہ ایک صاحب تو کالج کے پروفیسر ہیں اور دوسرے ان کے دوست۔ میں نے کہا آپ سے اجازت لئے بغیر ان کو کھیلنے کا کیا حق تھا۔ اور اگر کھیلے بھی تھے تو پھر انھوں نے فیلڈ کیوں نہیں کیا۔ اس کا جواب کپتان صاحب نے ایسا دیا کہ مجھے سن کر حیرت ہو گئی۔ کہنے لگے کہ مرزا صاحب یہ پروفیسر ہیں یہ ہمیشہ اس طرح آتے ہیں اور کھیل کر چلے جاتے ہیں۔ بھلا ہم ان کو کیسے منع کر سکتے ہیں۔ میں نے کہا تو حضرت آپ کو ایسے کھیلنے والے اور ایسے پروفیسر مبارک ہوں۔ میں ایسی جگہ کھیلنا نہیں چاہتا جہاں کرکٹ کے میدان میں بھی کپتان صفر ہو اور جہاں پروفیسر اور طالب علم کا فرق قائم رہے۔ یہ کہہ کر میں وہاں سے چلا آیا اور باوجود لوگوں کے اصرار کے اس میچ میں شریک نہیں ہوا۔

ہمارے کالج کے پرنسپل مسٹر ہیربرٹ ویر تھے۔ یقین مانئے ان سے سب کا دم نکلتا تھا۔ وہ زبان سے نہیں پڑھاتے تھے۔ آنکھوں سے پڑھاتے تھے۔ آپ سمجھے کہ آنکھوں سے پڑھانے کا مطلب کیا ہے۔ حضرات! وہ حضرت مسمریزم جانتے تھے آنکھوں میں ایسی چمک تھی کہ خدا کی پناہ۔ جہاں کسی دن کوئی تیار ہو کر نہیں آیا۔ اور انھوں نے ذرا گھورا اس کے بعد اس طالب علم کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ پھر کبھی بغیر تیاری کئے ہوئے قدم رکھے۔

ہے یہ کہ عام طور پر انسان کا وزن ڈو پونے ڈو من ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ لمبان اور چوڑان کے لحاظ سے اس وزن کی تقسیم انسانی جسم میں مختلف طریقے سے ہو جاتی ہے۔ بعض چوڑے ہوتے ہیں تو لمبان کم ہو جاتی ہے اور بعض لمبے ہوتے ہیں تو چوڑان گھٹ جاتی ہے۔ چونکہ مسٹر ہیربرٹ ویر کی چوڑان کچھ تھی ہی نہیں اس لئے اندازہ کر لیجئے کہ ان کی لمبان کیا ہوگی۔ تمام دنیا میں پیدل پھر آئے تھے اور ہے بھی یہ کہ اتنی بڑی ٹانگیں ہونے پر دنیا کا چکر کاٹ آنا کیا بڑی بات ہے۔ ایک دفعہ ان کی تیز رفتاری سے ہم بھی مار کھا چکے ہیں۔ ہوا یہ کہ فال سٹاف سوسائٹی کی outing ہوئی۔ قرار پایا کہ تغلق آباد میں جا کر ہیملٹ کا ڈراما پڑھا جائے۔ سوسائٹی کے سارے ممبر ایک دن پہلے ہی چل دئیے۔ رہ گئے کون کہ میں اور مسٹر غلام یزدانی۔ ہم دونوں میں ٹھیری کہ رات کے ڈو بجے چلو صبح ہوتے ہوتے قطب پہنچ جائیں گے۔ وہاں ناشتہ کریں گے وہاں سے نکل کر گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں تغلق آباد پہنچ جانا کیا مشکل ہے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ سردی اس بلا کی پڑ رہی تھی کہ پناہ بخدا اگر ہم دلی والے اس سردی کو کیا خاطر میں لانے والے تھے۔ دلی سے نکلے اور دو ہی بجے رات کو نکلے۔ موٹے موٹے اور کوٹ پہنے کانوں سے گلوبند لپیٹے اور کوٹ کی جیبوں میں چبینا بھرا اور چل میرے بھیا قطب کو۔ شہر میں تو ایسی سردی نہیں معلوم ہوئی مگر اجمیری دروازہ سے نکل کر مزا آگیا۔ کان تو خیر چھپے ہوئے تھے۔ پہاڑ گنج سے نکلتے نکلتے ناک غائب ہو گئی۔ وہاں سے ذرا سرپٹ بھاگے اور خدا خدا کر کے صفدر جنگ پہنچ گئے۔ مقبرہ کے سامنے گاڑی بان گاڑیاں کھولے الاؤ جلائے مزے سے بیٹھے حقے پی رہے تھے۔ ہم دونوں بھی وہاں جا بیٹھے جب جا کر ذرا سردی دبی۔ ابھی آدھا راستہ باقی تھا اور صبح ہوتے ہوتے قطب پہنچنا تھا۔ اس لئے پھر اٹھے اور چبینا پھانکتے آگے بڑھے۔ کچھ کچھ صبح ہو رہی تھی کہ قطب صاحب کی لاٹھ کے پاس آ پہنچ گئے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ہمارے ساتھ والے ابھی آرام خاص میں ہیں۔ طبیعت گرائی ہوئی تھی۔ ہم دونوں کی صلاح ہوئی کہ چلو ان سے پہلے تغلق آباد پہنچ جائیں۔ یہ خیال آنا تھا کہ اس پر عمل ہونے لگا۔ کوئی آٹھ بجے ہوں گے کہ ہم دونوں نے یہ مہم بھی سر کر لی۔ اب اس کے بعد کا واقعہ اگر بیان کروں تو شاید مسٹر غلام یزدانی شرمائیں۔

مگر میں سچی بات کہنے سے گھبرانے والا آدمی نہیں ہوں اور جب مجھے اپنی طالب علمی کے واقعات بیان کرنے ہیں تو پھر کسی چیز کو کیوں چھپاؤں۔ تو ہاں۔ سنئے' ہوا یہ کہ کالج میں جب کوئی میچ ہوتا تھا تو شہر کے کسی نہ کسی انگریز کی طرف سے دعوت ہوتی تھی۔ دعوت میں توس ہوتے اور توسوں پر ولایتی مکھن اب یہ ہماری عدم واقفیت سمجھو یا بے وقوفی۔ ہم یہی سمجھتے تھے کہ شہر میں توسوں پر جو مکھن استعمال ہوتا ہے اس میں اور گاؤں کے مکھن میں کوئی فرق نہیں ہے تغلق آباد کے

گاؤں میں جاتے ہی پوچھا کہ یہاں مکھن ملتا ہے۔ معلوم ہوا ملتا ہے۔ ایک گوالی کو روپیہ دیا کہ روپیہ کا مکھن دو۔ اس نے پورے
تین سیر مکھن کا ایک زبردست گولا کاغذ میں لپیٹ حوالہ کیا۔ اب جو ذرا سا توڑ کر منہ میں رکھا تو کچھ نہ پوچھو۔ نہ اگلتے بنتی تھی
اور نہ نگلتے۔ خیال تھا کہ مکھن لے جا کر سوسائٹی کے سکریٹری کو دیں گے چاء کے وقت کام آئے گا۔ مگر اس مکھن کے مزے نے مزا
کرکرا کر دیا۔ واپس کرنا چاہا تو اس گوالی نے واپس لینے سے انکار کیا۔ آخر "زرخوردن" پر عمل کر کے تھوڑا بہت کھایا اور باقی وہیں
پھینک کر چلے آئے۔

خیر یہ تو قصہ معترضہ ہوا۔ اب مسٹر ہیوبرٹ ویر کے چلنے کا حال سنو۔ سہ پہر تک سوسائٹی کے ممبر تغلق کی قبر پر اودھم
مچاتے رہے۔ کوئی ۴ بجے ہوں گے کہ مسٹر ہیوبرٹ ویر نے کہا کہ مجھے آج ۶ بجے وعظ کہنا ہے میں تو جاتا ہوں کوئی میرے
ساتھ چلتا ہے۔ بھلا ہم دونوں کیا دبنے والے تھے ساتھ چلنے پر تیار ہو گئے۔ اس میرے اللہ کے بندے نے قلعہ سے نکلتے ہی
جو لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کئے تو میرا اور مسٹر غلام یزدانی کا فشار ہو گیا۔ ہم دونوں بھاگتے تھے مگر وہ حضرت ہم سے
دو چار قدم آگے ہی رہتے تھے۔ پسینہ ناک سے ٹپکنے لگا۔ ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے۔ آخر بھاگتے دوڑتے اچھلتے
کودتے کالکا جی تک آ ہی گئے۔ یہاں صاحب نے فرمایا "میں آگے جاتا ہوں۔ تمھاری وجہ سے میری منزل کھوٹی ہو رہی
ہے اب تک تو میں دہلی کے قریب پہنچ چکا ہوتا۔" ہم نے کہا "بسم اللہ کیجئے۔ اب ہم میں چلنے کا دم نہیں ہے۔" وہ تو یہ کہہ
روانہ ہوئے اور ہم نے کنوئیں کے پاس آ کر اوور کوٹ اتارے۔ پانی پیا۔ ذرا دم لیا جب کہیں جا کر اوسان درست ہوئے۔
ہمارے وہاں پہنچنے کے ذرا ہی دیر بعد سوسائٹی کے دو ممبر سائیکلوں پر وہاں آئے۔ پانی پیا اور روانہ ہو گئے۔ دوسرے دن
ان سے معلوم ہوا کہ مسٹر ہیوبرٹ ویر ان کو راستے میں کہیں نہیں ملے۔ گویا ان کی رفتار نے ہم دونوں کو تو ہرایا ہی
تھا ان سائیکل والوں کو بھی نیچا دکھایا۔

مسٹر ہیوبرٹ ویر کے پڑھانے کا رنگ مسٹر ڈے کے رنگ سے بالکل مختلف تھا۔ تیار ہو کر آتے تھے اور چاہتے تھے کہ
لڑکے بھی اسی طرح تیار ہو کر آئیں۔ لڑکے اس جال سے نکلنا چاہتے تھے مگر مسٹر ہیوبرٹ ویر کی آنکھوں کا زور ان کو محنت
کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ بہرحال مسٹر ڈے اور مسٹر ہیوبرٹ ویر کے پڑھانے میں یہ فرق تھا کہ ایک محبت سے پڑھاتے تھے
اور دوسرے محنت سے۔

مسٹر ہیوبرٹ ویر کے اس پڑھانے کے شوق نے ایک دفعہ ہم لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ امتحان کا زمانہ قریب
آ گیا تھا مگر مسٹر ڈے اس زمانے میں بھی کسی نہ کسی ٹیم سے کرکٹ میچ کر لیتے تھے۔ مسٹر ہیوبرٹ ویر نے ان سے تو کچھ نہیں کہا۔
ہاں یہ کیا کہ ایک نادری حکم نافذ کر دیا کہ میچ کے روز کالج کو چھٹی نہیں دی جائے گی۔ صرف میچ میں کھیلنے والے جا سکتے ہیں۔
خدا کی قدرت دیکھو کہ اس حکم کے بعد پہلا ہی میچ دہلی کی یوروپین ٹیم سے آ کر پڑا۔ ساڑھے دس بجے سے کھیلنے کا وقت تھا
اور وہ گھنٹہ پرنسپل صاحب ہی کا تھا۔ کھیلنے والوں میں سے دو اس جماعت میں تھے۔ میں اور رام کشور۔ یہ رام کشور وہی ہیں۔

جو آج کل رائے بہادر لالہ رام کشور ایڈوکیٹ وائس چانسلر دہلی یونیورسٹی ہو گئے ہیں۔ تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ مسٹر ڈے کا پیام پرنسپل صاحب کے نام آیا کہ ان دونوں کو بھیج دو۔ دوسری ٹیم میدان میں آچکی ہے۔ مسٹر ہیوبرٹ ویر نے رام کشور سے کہا "جاؤ" وہ کچھ کہہ رہے تھے کہ صاحب نے مسمریزی آنکھوں سے ان کو دیکھا۔ اور ذرا زور سے کہا "جاؤ" ان کا یہ کہنا تھا کہ وہ کتابیں بغل میں مار روانہ ہو گئے اس کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ میں سمجھتا تھا کہ ان کی آنکھ سے آنکھ ملائی اور گئے گزرے ہوئے۔ اس لئے میں نے آنکھیں جھکا کر ان سے باتیں کرنی شروع کیں کہ "معاف فرمائیے۔ میں کھیل کے لئے اپنی تعلیم خراب کرنا نہیں چاہتا۔ ہم کرکٹ اپنے لئے نہیں کھیلتے۔ کالج کے لئے کھیلتے ہیں۔ جب آپ کو اپنے کالج کی نام آوری کا خیال نہیں ہے تو بلا وجہ ہم کیوں اپنا وقت خراب کریں"۔ کہنے لگے کہ "آخر سارے کالج کو سا بقہ لسعہ الحانے سے حاصل"۔ میں نے کہا "جب تک تالیاں بجا کر کالج والے ہماری ہمت افزائی نہ کریں گے اس وقت تک ہم کو جوش کیسے آئے گا"۔ بہر حال بہت دیر تک جھک جھک ہوتی رہی اور نتیجہ یہ نکلا کہ صاحب ہارے اور ہم جیتے۔ وہ حکم اسی وقت اٹھا لیا گیا اور میں کالج کے سارے لڑکوں کو لے کر فیلڈ میں پہنچا۔ اس وقت مسٹر ڈے کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ کہنے لگے "آج جو شکست تو نے دی ہے وہ ہمارے سال بھر کے جیتے ہوئے میچوں سے زیادہ ہے"۔ مسٹر ہیوبرٹ ویر کی شرافت دیکھئے کہ وہ تمام پروفیسروں کو اپنے ساتھ لے کر آئے اور میچ کے ختم تک پویلین میں بیٹھے ہماری ہمت افزائی کرتے رہے۔

ہمارے فارسی کے پروفیسر مولوی شاہجہاں تھے۔ بڑے اچھے آدمی تھے۔ فارسی بہت اچھی تھی۔ پڑھاتے بہت اچھی طرح تھے۔ لیکن پرانے دہلی والے تھے۔ جانتے تھے کہ ان لونڈوں کو ذرا شہ ہوئی اور یہ ہاتھ سے گئے۔ محبت کرتے تھے اور سب کو بچوں کی طرح سمجھتے تھے۔ مگر کسی کو حد سے آگے نہیں پڑھنے دیتے تھے۔ اسی زمانے میں شیشہ پر ہائیڈروفلارک ایسڈ سے پھول پتے بنانے کا مجھے شوق ہوا۔ میں نے شیشہ پر ایک تصویر بنائی تھی۔ اس کو دیکھ کر مولوی صاحب نے کہا "میاں فرحت ہم کو بھی کوئی چیز بنا کر لا دو۔ تمھاری یادگار رہے گی۔ مگر بھئی تصویر نہ بنانا کوئی شعر لکھ دینا" دوسرے یا تیسرے دن میں ایک گلاس بنا کر لے گیا اس پر حافظ کا یہ شعر لکھا تھا

مئے دو سالہ و معشوق چاردہ سالہ

ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

مولوی صاحب نے گلاس لیا۔ اس کی کھدائی کی تعریف کرتے رہے۔ اس کے بعد جو شعر پڑھا تو پھر کچھ نہ پوچھو بس بگڑ ہی تو گئے۔ کہنے لگے "واہ میاں صاحبزادے اپنے دادا کے برابر استاد کی اچھی قدر کی ہے میرے لئے تجھے یہ شعر لکھتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ ذرا مجھ ستر برس کے بڈھے کو دیکھ اور اس شعر کو دیکھ۔ صاحب بہادروں کی صحبت میں رہ کر یہ نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا.........." اور کیا کیا کہا اس کو میں بیان نہیں کرتا۔ مگر یقین مانئے کہ میں نے جان کر یہ شعر نہیں لکھا تھا

گلاس پر لکھتے وقت یہی شعر دھیان میں آیا۔ لکھدیا۔ ہاں جب مولوی صاحب کی باتیں سنیں اور شعر پر غور کیا تو اس وقت معلوم ہوا کہ لاحول ولا قوت کیا بیہودگی ہوئی ہے۔

مولوی صاحب کا خیال تھا کہ ادب کبھی فطرت سے باہر نہیں جاتا۔ اور وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ Nature اور Literature ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے۔ اگر کسی حد درجے کے مبالغہ آمیز شعر کے متعلق ان سے کہا جاتا کہ حضرت یہ Nature کے خلاف ہے تو وہ اس کا یہ جواب دیتے کہ میاں تم Nature سے کیا مراد لیتے ہو Nature کے معنی ہیں، اہل کے لوگوں کی فطرت جہاں کا یہ ادب ہے۔ جس قوم کی فطرت کا مدار غلو پر ہے وہاں انتہائی مبالغہ خود فطرت میں داخل ہے۔ تم تو انگریزی کے طوطوں اور بلبلوں کی نظمیں پڑھ کر اپنی اصلی فطرت ہی سے نکل گئے ہو۔ اب تم ان غریب ایرانیوں اور ہندوستانیوں کو برا نہ کہو گے تو اور کیا کرو گے۔ خیر یہ ہمارے مولوی شاہجہاں مرحوم کے خیالات ہیں اور یہی میر دل میں جاگزیں ہو گئے ہیں۔ آج کل مطابق فطرت جو نظمیں لکھی جا رہی ہیں۔ خدا ان میں برکت دے۔

ہمارے عربی کے پروفیسر مولوی جمیل الرحمٰن صاحب تھے۔ یہ شاعر تھے اور ان کا گھنٹہ اکثر شاعری ہی میں گزر جاتا تھا۔ مگر ان سے ہمارا واسطہ تھوڑے ہی دنوں رہا کیونکہ یہ نوکری چھوڑ کعبۃ اللہ تشریف لے گئے۔ اور ہم کو مولوی نذیر احمد مرحوم کا دامن پکڑنا پڑا۔ مولوی نذیر احمد مرحوم سے جیسی گزری ہے وہ دوسری داستان ہے اور اس کا بہت کچھ حال میں اپنے مضمون "مولوی نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی" میں لکھ چکا ہوں۔

میں بی اے کے ابتدائی سال ہی میں تھا کہ "بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا" یعنی مشن کالج میں ایک ایسا شخص آیا جس پر نہ صرف مشن کالج بلکہ تمام ہندوستان کو فخر ہے اور ہمیشہ فخر رہے گا۔ وہ کون کہ ریورنڈ سی۔ ایف اینڈر روز۔ انھوں نے آتے ہی کالج کا رنگ ہی بدل دیا۔ اور تمام لڑکوں میں خود داری کی رو دوڑا دی۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب وہ پہلی مرتبہ ہمارے ساتھ کرکٹ میچ میں شریک ہوئے۔ اس۔ وز فوج والوں سے ہمارا میچ تھا۔ ہم کھلا رہے تھے اور ان کی طرف سے کیپٹن رینالڈز اور لفٹیننٹ ولسن کھیل رہے تھے۔ ہماری طرف سے سرب کشن امپائر تھے۔ دوڑ لینے میں کیپٹن رینالڈز کریز تک نہ پہنچ سکے۔ سرب کشن نے ان کو اوٹ دے دیا۔

ظاہر ہے کہ لفٹیننٹ ولسن کو ادھر کی حالت دیکھنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ لیکن محض اپنے کپتان کی حمایت میں انھوں نے دوسرے ہی سرے سے فوراً ڈانٹ کر کہا (امپائر، تم اندھے ہو) ان کا یہ کہنا تھا کہ مسٹر اینڈر روز اپنی جگہ سے لنگڑاتے ہوئے لفٹنٹ ولسن کے پاس آئے۔ اس کے بعد انھوں نے لفٹنٹ صاحب کی جو خبر لی ہے وہ ہم کو ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ تم ہی جیسے لوگ ہیں جنھوں نے انگریزوں کی عزت کو بٹہ لگایا ہے۔ اگر تم انگلستان میں ہوتے اور ایسے الفاظ استعمال کرتے تو کیا تم کو کسی میدان میں گھسنا بھی ملتا ابھی معافی مانگو۔ ابھی معافی مانگو۔" بہرحال مسٹر ولسن نے معافی مانگی اور یہ کارروائی ختم ہوئی۔ مگر اس دن سے ہم کو معلوم ہوگیا کہ خودداری بھی

کوئی چیز ہے اور ہم نے بلا وجہ دب دب کر اپنے آپ کو ذلیل کر لیا ہے۔
ایسا ہی ایک اور واقعہ بھٹنڈہ کے اسٹیشن پر ہوا۔ ہم لاہور جا رہے تھے۔ دوسرے روز یونیورسٹی ٹورنامنٹ
میں کرکٹ میچ کھیلنا تھا۔ مسٹر اینڈروز بھی ساتھ تھے۔ وہ ہمارے ساتھ انٹر کلاس میں سفر کرنا چاہتے تھے۔ مگر ہم نے
زبردستی ان کو سکنڈ کلاس میں بٹھایا تاکہ ہماری آزادی میں کھنڈت نہ پڑے۔ انٹر کی ایک ہی گاڑی تھی۔ ساری کی ساری
گاڑی پر ۱۳۔ ۱۴ لڑکوں نے قبضہ کر لیا۔ خوب پھیل کر لیٹے۔ ایک درجہ میں ہم تین لڑکے تھے۔ میں، بلند اقبال
اور حسین مرزا۔ کوئی ایک بجے کے قریب گاڑی بھٹنڈہ پہنچی۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ انگریزی باجہ بج رہا ہے اور ایک
زبردست برات گاڑی میں سوار ہونے کو پلیٹ فارم پر کھڑی ہے۔ بلند اقبال نے حسین مرزا سے کہا "مرزا۔ فوراً دروازہ
روک کر کھڑے ہو جاؤ۔ کسی کو آنے نہ دینا" چونکہ ہمارا ہی درجہ بالکل سامنے تھا۔ اس لئے اسی پر سب سے پہلے اور
سب سے زیادہ سخت حملہ ہوا مگر حسین مرزا کیا ماننے والا آسامی تھا اس نے دروازہ کو انچ بھر کھلنے نہ دیا۔ اسی کشمکش
میں کسی نے اس کو گالی دے دی۔ گالی دینا تھا کہ حسین مرزا تلا نچ مار اس گالی دینے والے پر بھوکے شیر کی طرح جا پڑا۔
اس کا اس طرح گرنا اور سب لڑکوں کا درجے کھول بھر بھر کر کے باہر نکلنا۔ خوب چلی۔ مسٹر اینڈروز اپنے درجہ کی کھڑکی
میں سے یہ تماشہ دیکھتے اور شاباش۔ شاباش کہتے رہے۔ لڑکوں کے مقابلہ میں بھلا یہ برات والے کیا ٹکنے والے تھے۔
"ملا کی دوڑ مسیت" پر عمل کر اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچے۔ وہ صاحب بہادر چند سپاہیوں کو لے۔ گاڑی کی طرف آئے
اور آتے ہی گڑبڑ مچانی شروع کی۔ پولیس والوں کو حکم دیا کہ سب لڑکوں کو گاڑی سے اتار دیا جائے۔ کارروائی اسی
نوبت پر پہنچی تھی کہ مسٹر اینڈروز گاڑی سے اترے۔ آہستہ آہستہ آئے اسٹیشن ماسٹر کے گلے پر ہاتھ رکھا اور کہا "چلے جاؤ۔
یہ میری ٹیم ہے" شاید اسٹیشن ماسٹر کے تجربے میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی انگریز نے ہندوستانیوں کا اس طرح ساتھ
دیا ہو۔ وہ ذرا پیچھے ہٹے اور بلند اقبال سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں۔ بلند اقبال نے کہا مسٹر اینڈروز۔ اس وقت تک
گورنمنٹ میں مسٹر اینڈروز کے اثر اور زور سے سب واقف ہو چکے تھے اس لئے اسٹیشن ماسٹر صاحب یہ کہہ کر رخصت
ہوئے کہ میں اس معاملہ میں دخل نہیں دیتا۔ وہ تو ادھر گئے اور مسٹر اینڈروز نے غصہ میں پلیٹ فارم پر ٹہلنا شروع
کیا۔ وہ ٹہل ہی رہے تھے کہ شادی والوں میں سے ایک بڑے میاں نے مجھ سے آکر کہا "میاں ہمارے پاس انٹر
کے ٹکٹ ہیں ہم تھرڈ میں بیٹھ جاتے ہیں۔ دولہ کو اپنے پاس انٹر میں بٹھا لو" میں نے کہا۔ کیا ہرج ہے۔ بٹھا دو۔
ہماری تمہاری خدانخواستہ کوئی لڑائی تھوڑی ہے۔ زبردستی بات بڑھ گئی۔" ان بڑے میاں نے دولہ کو بلایا۔ اور
ہمارے درجے میں بٹھا دیا۔
ہم نے بھی اس کے لئے پورا ایک بنچ خالی کر دیا۔ دولہ کو وہاں بیٹھے تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ مسٹر اینڈروز
ٹہلتے ہوئے ہمارے درجے کے پاس سے گزرے۔ جھک کر دیکھا تو دولہ میاں کو پورے ایک بنچ پر قابض پایا۔

ہنس کر ذرا اونچی آواز میں کہا "اچھا شریروں۔ میں تمھارا مطلب سمجھ گیا۔ گاڑی چلنے کے بعد تم اس کو ٹھونکنے والے ہو" شادی والوں میں بعض لوگ انگریزی جانتے تھے وہ ہمارے سر ہو گئے کہ دولہ کو اتار دو۔ ہم نے بہت سمجھایا کہ صاحب نے مذاق سے یہ فقرہ کہا ہے مسٹر اینڈ روز نے بھی ہماری تائید کی اور کہا کہ لڑکے کو بیٹھا رہنے دو۔ میں نے صرف اس وجہ سے دخل دیا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر حکومت کا زور دکھانے آیا تھا۔ اگر سیدھی طرح کہتا تو میں خود جگہ دلوا دیتا۔" مگر وہ کیا ماننے والے تھے۔ آخر دولہ کو ہمارے درجہ میں سے اتار تھرڈ کلاس میں ٹھونس دیا۔

اس سفر میں ایک بہت ہی اہم واقعہ خاص لاہور میں پیش آیا۔ ہوا یہ کہ وہاں فورمن کرسچین کالج اور ڈی' اے' وی کالج میں فٹ بال میچ تھا۔ یہ میچ چیف کالج کے میدان میں ہوا۔ اسی زمانے میں ان دونوں کالجوں میں سخت دشمنی تھی اور خبر نہیں کہ ڈی۔ اے۔ وی کالج والے پروفیسر ڈیورنڈ کے کیوں اس قدر مخالف ہو گئے تھے۔ اب رہا کھیل تو کھیل میں دونوں ٹیمیں برابر کی ٹکر کی تھیں۔ بہرحال کھیل شروع ہوا۔ میدان کے آدھے حصہ کو ایک کالج والے اور آدھے کو دوسرے کالج والے گھیرے ہوئے تھے۔ جب گیند ادھر آتی تو ادھر والے لائن کو عبور کر میدان میں جھک آتے۔ اور جب ادھر گیند ادھر جاتی تو ادھر والے بڑھ جاتے۔ یہ ضرور ہے کہ تماشائیوں کا یہ طریقہ اچھا نہیں تھا۔ گر جوش کو کیا کیا جائے۔ جوش میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ اس سال اس ٹورنمنٹ کے سکرٹری مسٹر رابرٹسن تھے۔ انھوں نے یہ غلطی کی کہ سائیکل پر سوار ہو۔ ہاتھ میں چھوٹا سا چابک لے۔ لوگوں کو لائن سے پرے ہٹانا شروع کیا۔ لوگوں نے پہلے تو ان کی اس زیادتی کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ مگر بدقسمتی سے ڈی۔ اے۔ وی کالج پر ایک گول ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کالج کے ساتھ والوں کا جوش بڑھ گیا۔ اس کے بعد جو سکرٹری صاحب کا ادھر سے گزر ہوا اور انھوں نے چابک کا استعمال کیا تو بس قیامت آگئی۔ وہ لکڑی چلی کہ خدا کی پناہ۔ ہمارے کالج والے بھی ایک طرف کھڑے یہ سیر دیکھتے رہے۔ بہرحال ٹیلیفون دیا گیا پولیس آئی۔ جب کہیں جاکر یہ لڑائی ختم ہوئی۔ گر کئی کے سر پھوٹ گئے بہت سے تھوڑی تھوڑی چوٹیں کھا کر میدان سے بھاگے۔ گواہوں میں ہمارے نام بھی لکھے گئے۔ کیونکہ ہم ہی ایسے تماشائی تھے جن کو کسی فریق سے کوئی تعلق نہ تھا۔

یہ معاملہ "پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ" میں پیش ہوا۔ وہاں فورمن کرسچین کالج کے پرنسپل مسٹر یوئنگ کا زور تھا۔ انھوں نے ڈی۔ اے۔ وی کالج کو ۳ سال کے لئے ٹورنامنٹ سے خارج کر دینے پر زور دیا۔ اور شاید اپنی رائے کو منوانے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد دہلی کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ہمفریز پنجاب یونیورسٹی کے کسی عہدہ دار کے ساتھ ہمارے کالج میں آئے اور پرنسپل صاحب کی اجازت سے ہمارے بیان قلمبند کرنے چاہیے مگر مسٹر اینڈ روز نے کہا کہ پہلے میرا بیان لیا جائے کیونکہ میں بھی وہاں موجود تھا۔ اس کے بعد اگر ضرورت ہوئی تو لڑکوں کے بیان بھی لئے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے جو بیان دیا ہے وہ ان کی غیر جانبداری اور ان کے خیالات کا آئینہ ہے۔ انھوں نے اپنے بیان میں ٹورنامنٹ کے سکرٹری صاحب پر اس جھگڑے کا سارا الزام لگا دیا۔ اور سب سے زیادہ اسپر زور دیا کہ چونکہ ڈی۔ اے۔ وی کالج خاص

ہندوستانیوں کا کالج ہے اس لئے اس کو نقصان پہنچانے کے لئے ہر جائز اور ناجائز طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔ کوئی وجہ نہ تھی کہ سکرٹری صاحب چابک سے اس کالج کے لڑکوں کو مارتے اور وہ اس کا بدلہ نہ لیتے۔ سکرٹری صاحب کا ساتھ فورمن کرسچین کالج والوں نے دیا۔ اس لئے یہ جھگڑا ہوا۔ اس میں ڈی۔ اے۔ وی کالج والوں کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان کے اس بیان کا یہ نتیجہ نکلا کہ مسٹر یوانگ اپنے ارادہ میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مسٹر اینڈ روز کی ہمیشہ سے یہ رائے تھی کہ ہندوستانیوں کو بلا وجہ دق کیا جاتا اور ان کی خودداری کو صدمہ پہنچایا جاتا ہے اگر ان کے ساتھ برابری کا برتاؤ کیا جائے اور ان کو بھی انسان سمجھا جائے تو ہندوستان امن کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ اب وہ سیاسیات میں پڑ گئے ہیں۔ مگر اب بھی ان کا نقطۂ نظر وہی ہے جو پہلے تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان سے ہر ہندوستانی محبت کرتا ہے اور ہمیشہ کرے گا۔

مسٹر اینڈ روز کا پڑھانا غضب کا پڑھانا تھا معلوم ہوتا تھا کہ ایک دریا ہے کہ بہہ رہا ہے۔ ٹینی سن کی "ان میموریم" کا پڑھانا ان کے ذمہ تھا ان کی پڑھائی کا اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اس کتاب کے شروع میں ایک صفحہ کی جو افتتاحی نظم ہے اس کو انھوں نے تین دن میں ختم کیا۔ تصوف اور ویدانت کے اصول بیان کر کے اور حضرت امام غزالی ابن عربی مولنا روم اور گیتا کے حوالے دیکر جب وہ ان کا مقابلہ ٹینی سن کے مصرعوں سے کرتے تھے تو آنکھیں کھل جاتی تھیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کی واقفیت عامہ کس قدر ہے اور ٹینی سن نے کس محنت سے ان چیزوں کو جمع کیا ہے اور کس خوبی سے اپنی کتاب میں داخل کیا ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ ان امور میں ابھی یورپ والے ہم ایشیا والوں سے کتنے پیچھے اور ہمارے کس قدر خوشہ چین ہیں۔ اس طرح پڑھاتے ہوئے میں نے دو ہی شخصوں کو دیکھا۔ ایک مسٹر اینڈ روز اور دوسرے مولوی نذیر احمد مرحوم۔ مولوی صاحب مرحوم کا بھی یہی حال تھا وہ حماسہ معلقات اور متنبی کے ہر شعر کے ساتھ یورپ کے مختلف ادیبوں کے مقولے بیان کرتے تھے۔ اور بتاتے تھے کہ دیکھو اس مضمون کو یورپ والوں نے ہم سے لے کر اس طرح ادا کیا ہے۔ ان دونوں کا پڑھانا صرف امتحان پاس کرانے کے لئے نہیں تھا۔ عالم بنانے کے لئے تھا اور ان دونوں سے پڑھنے کے بعد ہم سمجھتے تھے کہ دنیا میں ان کی عزت علمیت کی وجہ سے ہے نہ کہ شخصیت کی وجہ سے۔

الغرض ہمارے تین طرح کے پروفیسر تھے۔ مسٹر ہیوبرٹ ویر کہتے تھے دماغی ترقی کرنے کے لئے "پڑھو۔ پڑھو اور پڑھو" مسٹر ڈے کہتے تھے جسمانی ترقی کے لئے "کھیلو۔ کھیلو اور کھیلو" اور مسٹر اینڈ روز فرماتے تھے کہ اپنی عزت قائم کرنے کے لئے "لڑو۔ لڑو اور لڑو" چونکہ کالج میں طلبا کی تعداد کم تھی۔ اس لئے ہر پروفیسر کے گرد تھوڑے تھوڑے طالبعلموں کا ایک ایک حلقہ قائم ہو گیا تھا اور ہر پروفیسر نے اپنے ذمہ ان لڑکوں کے اخلاق و عادات درست کرنے کی بھی ذمہ داری لے لی تھی۔ کالج میں ملتے تھے۔ فیلڈ میں ملتے تھے۔ گھر پر بلا کر ملتے تھے اور گھر پر آکر ملتے تھے چنانچہ مسٹر اینڈ روز جیسے نامی شخص باوجود اپنی سیاسی مصروفیتوں کے بمبئی سے مدراس جاتے ہوئے صرف مجھ سے اور غلام یزدانی صاحب سے ملنے کے لئے

حیدرآباد میں اترے ہیں اور جب کبھی مسٹر ڈے سے میرے متعلق مشن کالج کے پروفیسر لکھ کر کچھ پوچھتے ہیں تو وہ ایسا جواب دیتے ہیں کہ ان کے نسبت بھرے الفاظ دیکھکر ان پروفیسر صاحبان کو بھی تعجب ہوتا ہے۔

غرض کہاں تک سناؤں۔ وقت کم اور داستان زیادہ ہے اس لئے میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور آخر میں پھر عرض کرتا ہوں کہ جب تک پڑھانے والے پڑھنے والوں سے محبت کا برتاؤ نہ کریں گے جب تک ان کی خودداری کو قائم نہ کریں گے۔ جب تک ان کے اطوار و عادات کا خیال نہ رکھیں گے اور ان کی جسمانی ترقی کو بھی تعلیم کا ایک جزو نہ سمجھیں گے اس وقت تک یہ کبھی نہ کہا جائے گا کہ انھوں نے اپنے فرض کو پوری طرح انجام دیا اور جب تک پڑھنے والے ان پڑھانے والوں کی محبت کی قدر نہ کریں گے جب تک اپنی دماغی تعلیم کے ساتھ اپنی صحت جسمانی کا خیال نہ رکھیں گے اور جب تک یہ نہ سمجھیں گے کہ خودداری بھی ایک بڑا انسانی جوہر ہے اس وقت تک نہ دنیا میں ان کی قدر ہوگی اور نہ یہ کہا جا سکے گا کہ انھوں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

غزل

دل نے کیا دیکھا نگاہِ یار میں — رنج کی باتیں بھی کہہ دیں پیار میں

لختِ دل ہیں دیدۂ خوں بار میں — سو گئے تھے ہم خیالِ یار میں

کیا کرشمے تھے ترے دیدار میں — ہم تماشا بن گئے بازار میں

آپ روٹھے ہیں تو تم بھی ہیں خفا — قول میں وہ تھا نہ یہ اقرار میں

اے دل اپنے دیکھنے والے کو دیکھ — کیا دھرا ہے روزنِ دیوار میں

رحم کر اے گریۂ بے اختیار — آنکھ نیچی ہے ہماری چار میں

اور بھی مجرم بناتی ہیں مجھے — تیرے غصہ کی نگاہیں پیار میں

مجھ کو روتا دیکھ کر کہنے لگا — آج شاید بڑھ گئی مقدار میں

یار لوگوں سے یہ سنتا ہوں صفیؔ
بکتے ہیں معشوق اب بازار میں

صفیؔ اورنگ آبادی

تصویر کا بوسہ

میں اپنے افسانوی کمرے میں ندی کنارے والے
دریچہ کے پاس بیٹھی ہوئی کوئی افسانے کا پلاٹ بنا رہی تھی'
فضا رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی حد درجہ دلکش اور جاذبِ نظر
واقع ہوئی تھی' دور تک حدِ نگاہ پہاڑی ناہموار سلسلہ ایک
خوش کن و دلفریب منظر پیش کر رہا تھا' پانی میں بھیگی ہوئیں
مرطوب پرکیف ہوائیں' مجھ پر ایک سرور آمیز وجد طاری
کر رہی تھیں' اور میں جذبۂ شعریت میں ڈوبی ہوئی ہمہ تن
افسانہ لکھنے میں محو تھی' نہ معلوم سلمیٰ کب سے میرے کمرے میں
آکھڑی تھی' مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا. اب جب کہ اس نے
میرے کندھے ہلائے' میں چونک پڑی۔
کون سلمیٰ ؟ تم' ارے کب سے یہاں ہو'
پندرہ منٹ تو ہوئے' کرسی سرکا کر وہ میرے مقابل بیٹھ گئی'
اس کا پھول جیسا چہرہ خوشی کے مارے دمک رہا تھا' اور
اس کی بڑی بڑی آنکھیں غیر معمولی مسرت کا اظہار کر رہی
تھیں۔
کیسے ٹپک پڑی ؟ — میرے اس بے تکے سوال پر وہ
اٹھی' اور فرطِ محبت سے میری باہوں میں اپنے دونوں
ہاتھ حائل کر دے — بتول! اس نے اپنا خوبصورت
سر میرے منہ کے قریب لا کر کہا" خوش خبری سنانے کے لئے۔
خوش خبری' میں نے حیرت کے ساتھ پوچھا' کیسی خوش خبری؟
مٹھائی کھلانی پڑے گی تمہیں'
آخر بات کیا ہے سلمیٰ؟ میں نے اشتیاق کے لہجے میں
اس کا بازو تھام کر کہا — "جو یوں بدحواس چلی آئی"،

بڑی کام کی بات ہے! اس کا لہجہ شرارت آمیز تھا' تم
سنو گی تو تڑپ جاؤ گی'
کہنے کی بات ہے تو کہہ ڈالو — اصرار نہ کرواؤ سلمیٰ'
ایسے نہیں' شرط پر — بولو منظور ہے —
عجیب ضدی لڑکی ہے — میں نے قدرے بگڑ کر
کہا — کہتی کچھ نہیں' کی جاتی ہے شرط شرط' جا میں
اب تجھ سے نہ بولوں گی' کمبخت تو نے تو میرے سارے
افسانوی خیالات ناس کر دئیے پھر میں ایک کتاب
اٹھا کر یونہی دیکھنے لگی۔
ہوں — بڑی آئی افسانہ لکھنے والی' نہ بولیں گی مجھ سے'
یہ کہہ کر وہ شریر میری مسہری میں جا کر لیٹ گئی —
معاً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا' سلمیٰ چند دنوں پہلے
سے یہ کہہ گئی تھی' اب کی چھٹیوں میں اس کے بھیا علی گڑھ
سے آنے والے ہیں' شاید وہ مجھے ان کے آنے کی خبر دینے
آئی ہو' اس اچانک خیال کے آتے ہی میرے دل میں
ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی' اور میں اس نامعلوم
خوش خبری سننے کے لئے مضطرب سی ہو گئی'
میری اچھی! میں نے سلمیٰ کے کندھے ہلا کر کہا' کیا خفا ہو گئی'
اپنی بتول سے' بولو' روٹھ گئی کیا ؟
میں نے اسے گدگدی کر کے خوب ہنسا دیا'
"بھیا' آ گئے" ادھر سلمیٰ کی زبان سے نکلا — ادھر
میرا دل زور زور سے حرکت کرنے لگا'
کب ؟ ایک لذت آمیز خلش مجھے بے چین کر رہی تھی' میرا
سارا بدن پسینہ میں تر ہو گیا'
آج ہی' صبح کی ٹرین سے — سلمیٰ نے جواب دیا'—

اور آتے ہی تمہیں پوچھا۔

سلمو! ــــ میں نے اپنے آپ کو عجیب اضطراب کی حالت میں
سلمیٰ کی آغوش میں گراتے ہوئے کہا۔ مجھے خبر نہ تھی، اس وقت
مجھ سے کیا حرکات سرزد ہو رہے ہیں، جذبات کے ہجوم
میں میں بے قابو سی ہو چلی تھی، ایک لذت آمیز خیال نے
محبت کی آغوش میں تھپک تھپک کر مجھے بہت جلد سُلا دیا ــــ
ہوش آنے پر میں نے دیکھا ــــ سلمیٰ کمرے سے غائب ہے،
اور میرے ہونٹ نہ معلوم کب سے ایک "کاغذی پیکر" کو
مس کر رہے تھے ــــ یہ ایک تصویر تھی، مردانہ حسن کا
مکمل نمونہ ــــ خوابوں اور خیالوں کا مرکز ــــ میرے
رومانوی دنیا کے ہیرو ــــ آہ کون؟ ــــ میری پیشانی
شرم کے احساس سے بھیگ گئی، ــــ وہی سلمیٰ کے خوبصورت
بھیا، اقبال صاحب ــــ

میں نے تصویر کو بے خیالی میں نہیں ــــ بلکہ پیدا ہونے پر
جذبۂ الفت سے بے خود سی ہو کر کئی مرتبہ چوما ــــ سینے
اور آنکھوں سے لگایا ــــ اس تصویر کو سلمیٰ اپنے ساتھ
لائی تھی ــــ مجھے غافل پا کر چپکے سے اس نے
تصویر کو میرے ہونٹوں پر رکھ دیا ــــ اور چلدی
ــــ شریر کہیں کی ــــ

چند لمحوں تک میری مشتاق نگاہیں، اس حسین و جمیل
مرقعے کی بلائیں لیتی رہیں، آہ تصویر کتنی خوبصورت کتنی
دل موہ لینے والی ــــ جو آنکھوں میں بہ یک وقت مستی اور
بجلی لئے ہوئے ہے، اس کے خوشنما ہونٹ تبسم کا بے بہا
خزانہ اپنے اندر چھپائے ہوئے ہیں، میرے دل میں
عجیب و غریب خیالات کا طوفان بپا تھا، تصویر دیکھتے ہوئے
میرا دل ان واقعات کا اعادہ کر رہا تھا، جن سے متاثر ہو کر ہمارے
دل ایک دوسرے کی شراب محبت کے لئے تشنہ تھے، اگرچہ
واقعات اتفاقات پر مبنی تھے، جو فطری طور پر وقوع میں آئے تھے،
مگر میری روح اب ان واقعات کے احساس سے عرق عرق
ہونے لگتی ہے ــــ بات یہ ہوئی! ــــ

امتحانات ختم ہو چکے تھے ــــ اور نتیجہ شائع ہونے میں
دو ایک دن باقی تھے ــــ میں پیانو کے پاس بیٹھی ہوئی
ایک درد بھرا میٹھا گیت گا رہی تھی ــــ شاید ــــ

"وہ ہنس ہنس کے وعدے کئے جا رہے ہیں"
فریب تمنا دئے جا رہے ہیں (ماہر القادری)

اس اثنا میں سلمیٰ اچانک میرے کمرے میں داخل ہوئی، اور کہنے لگی ــ
بتول! کل نتیجہ شائع ہوگا،
میں نے کہا ــــ جھوٹی کہیں کی ــــ
اس پر سلمیٰ نے زور دے کر کہا ــــ بہن ــــ اقبال بھیا کہہ
رہے تھے ــــ کل نتیجہ شائع ہوگا ــــ انھوں نے مسز
غرا سے سنا ہے ــــ

میں نے سلمیٰ کی بات کی پھر تردید کی ــــ وہ برابر یہی کہتی
تھی ــــ کل نتیجہ ضرور شائع ہوگا ــــ غرض آدھ گھنٹہ
تک ہمارے درمیان تکرار ہوتی رہی ــــ آخر سلمیٰ ہار
مان کر اپنے گھر چلی گئی ــــ

دوسرے دن سلمیٰ پھر آ موجود ہوئی، اس وقت وہ خوشی کا
مجسمہ بنی ہوئی تھی، آتے ہی وہ فوراً مجھ سے چمٹ گئی ــــ
"بتول اب ہم دونوں پاس ہو گئے"۔
ارے، میری زبان سے تعجب و مسرت کا ملا جلا کلمہ نکلا ــــ
کب؟ ــــ

بھیا نے کہا، وہ یونیورسٹی کے نوٹس ہال میں ہمارا نتیجہ دیکھ آئے ہیں۔ اور پھر مسٹر شرما سے بھی ہماری کامیابی کی تصدیق کرالی، بتول! پھر سلمیٰ نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ ہم دونوں اول درجہ میں پاس ہوئے ہیں، سلمیٰ انتہائی مسرت کی حالت میں اچھل اچھل کر کہہ رہی تھی، وہ اپنی کامیابی پر پھولے نہ سما رہی تھی، ادھر میری حالت بھی مارے خوشی کے وارفتہ سی ہو رہی تھی، تمام دن ہم دونوں کامیابی کی مسرت میں ہنستے بولتے رہے —— دوسرے دن اخبار میں ہمارا نتیجہ شائع ہوا ——

اس کامیابی کی خوشی میں سلمیٰ نے اپنے گھر ایک شاندار دعوت ترتیب دی، جہاں بڑی تعداد میں کالج کے لوگ اور اس کے عزیز و اقارب مدعو تھے،

دعوت کے ایک دن پہلے ہی سلمیٰ نے مجھے اپنے یہاں بلا رکھا تھا، میں اور سلمیٰ کی ایک رشتہ کی بہن نوشابہ دعوت کی تیاریوں میں لگے رہے،

سر شام مہمانوں کی آمد شروع ہوئی، ان کا استقبال اور بٹھانے کا انتظام میرے ذمہ کیا گیا تھا، باہر مردانہ میں صرف اقبال صاحب ہی منتظم کی حیثیت سے مصروف تھے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک مہمانوں کی سربراہی ہوتی رہی اخدا خدا کرکے دس بجے کہیں، یہ دعوت کا سلسلہ ختم ہوا۔

سلمیٰ سر کے درد کی وجہ سے اپنے کمرے میں چلی گئی، نوشابہ مجھے اصرار کے ساتھ پائیں باغ میں لے گئی، اور وہاں پہونچ کر ہم دونوں ایک خوشنما فوارے کے پاس بیٹھ کر چاندنی رات کا لطف اٹھانے لگے، نوشابہ نے رائے پاس کی، کسی طرح یہاں سلمیٰ کو گھسیٹ لائیں،

میں نے بھی اس کے خیال کی تائید کی، بات تو تم نے دل کی کہی مگر نوشابہ! وہ اس وقت نہ آ سکے گی۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ——

سب ٹھیک ہو جائے گی —— نوشابہ بولی، تم اُسے پکڑ لاؤ ——

بھئی، مجھ سے یہ کام نہ ہو سکے گا، میں نے جواب دیا، نہیں نہیں، وہ تمہارے کہنے پر ضرور آئے گی، نوشابہ نے اصرار کر کے مجھے سلمیٰ کے لانے کے لئے بھیجا ——

سلمیٰ کے کمرے کے قریب پہونچ کر میں نے اس کے کمرے میں روشنی دیکھی ——

شریر کہیں کی، میں نے اپنے دل میں کہا —— یہ ابھی سر کے درد کا بہانہ کر کے جاگ رہی ہے، دبے پاؤں میں دروازے تک پہونچی، اور کواڑ کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا، میں بے دھڑک اندر داخل ہوئی، یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کمرہ بحیثیت مجموعی مردانہ ساز و سامان لئے ہوئے ہے، ایک طرف کونے میں بڑی شیشہ دار الماری کتابوں سے پٹی پڑی ہے، سنگار میز جس پر کنگھا، برش، تیل لیونڈر اور نہ جانے کیا کیا رکھا ہوا ہے، اس کے قریب ایک چھوٹی سی میز پر انگریزی قسم کا باجا بھی دھرا ہوا ہے —— مسہری کے قریب والی چوبی سرکلی میز پر چند انگریزی اردو رسالے نیم وا حالت میں بکھرے ہوئے اپنے مالک کی عدم موجودگی کا ثبوت دے رہے ہیں، ان رسائل کے قریب ہی ایک چھوٹی سی خوبصورت کانوری فریم میں جڑی ہوئی، مردانہ وضع کی تصویر رکھی ہوئی تھی۔ تصویر حد درجہ دلکش اور جاذب نظر

تھی، میرے ہاتھ بلا ارادہ اس تصویر کی طرف بڑھے چند
سکنڈ میں تصویر میرے ہاتھ میں تھی، پاکیزہ، نورانی چہرہ،
مغربی ملبوس میں میری مشتاق نظروں کو دعوتِ حسن
دے رہا تھا ـــ مردانہ حسن کا مکمل نمونہ، اپنی دلفریب
اداؤں کے ساتھ میرے دل کی گہرائیوں میں ڈوبا جا رہا
تھا، ایک دبی ہوئی آہ میرے منہ سے نکل کر رہ گئی۔ بے ساختگی
میں، میں نے تصویر کو چومنے کی جرأت کی، اُف خدا ـــ
مجھ پر ایک بجلی سی گر پڑی، میں پسینہ میں نہا گئی ـــ
مہین سی قہقہہ کی آواز نکل کر میرے دل کے تاروں سے
ٹکرا گئی ـــ میں نے دیکھا ـــ اقبال صاحب دروازے
کے پاس کھڑے مسکرا رہے ہیں، یہ اُن کا کمرہ تھا، جو میں
غلطی سے یہاں پہونچی ـــ ایک ارتعاش ـــ سر سے
پاؤں تک مجھ پر طاری تھا، تصویر فوراً میرے ہاتھوں سے
چھوٹ کر فرش پر گر پڑی، اور اس کا شیشہ نیچے گر کر چکنا
چور ہو گیا ـــ میں نے فوراً اپنی دونوں آنکھیں میچ لیں
اور چہرہ ہاتھوں سے ڈھانک لیا ـــ میں ایک پتھر کی
مورت کی طرح ساکت، صامت کھڑی ہوئی تھی ـــ
آپ ـــ آپ گھبرائیے نہیں، اقبال صاحب نے
قریب آکر نیچے گری ہوئی اپنی تصویر کو اٹھا کر کہا لیجئے، اس شیشے
سے نازک اور قیمتی وہ شئے ہوتی ہے جسے "دل" کہتے ہیں،
انھوں نے اپنی تصویر کو میری طرف بڑھاتے ہوئے یہ جملہ کچھ
ایسی حالت میں ادا کیا کہ بس کر رہ گئی، سنئے، ایسی بیسیوں
تصویریں آپ کے خوبصورت ہاتھوں کا کھلونا بن سکتی ہیں
اقبال صاحب کے جملوں کا ایک ایک لفظ مجھ پر بجلیاں
گرا رہا تھا ـــ انھوں نے میرے کندھے پکڑ کر کرسی پر لا بٹھایا۔
اور خود میرے سامنے کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔
دیکھئے، آپ پریشان تو نہ ہوں گے ـــ اسے اپنا گھر سمجھئے
آخر ہم سلمیٰ کے بھیا ٹھیرے نا ـــ میں عجیب مشکل میں
آپھنسی تھی ـــ خوف و حیا کے مارے میری جان گھٹی جا رہی
تھی، اور دل سینے میں زور، زور سے دھڑک رہا تھا ـــ
بولیئے، آپ چپ کیوں ہیں ـــ پھر انھوں نے مجھ سے
سوال کیا، ان کا خوبصورت چہرہ ہمدردی کے ہلکے سے نقوش
لئے ہوئے حد درجہ دلکش نظر آ رہا تھا ـــ
مجھے افسوس ہے، میں نے انتہائی شرم محسوس کرتے ہوئے
کہا، آپ کی تصویر کا شیشہ ٹوٹ گیا، کوئی پروا نہیں،
آپ کے سامنے اصلی زندہ تصویر تو موجود ہے، میں ان کے
اس چست جملے سے جھینپ سی گئی، لیکن وہ تصویر ـــ
میں کچھ کہتے کہتے رک گئی ـــ شرم کا جذبہ مجھ پر غالب
آگیا ـــ آپ کو پسند ہے، انھوں نے بلند لہجہ میں جملے
کی تکمیل کی ـــ
کیوں نہیں ـــ ایک مانوس آواز مجھے سنائی دی، سلمیٰ
اور نوشابہ کمرے کے باہر کھڑی ہنس رہی تھیں۔
سلمیٰ، اس کے بھیا نے کہا ـــ یہاں آؤ، تمھاری سہیلی
کمرے کی پہچان میں بڑی غلطی کھائی ہیں؟
ہاں بھیا! ـــ وہ شرارت کی پتلی جواب میں یہ کہتے ہوئے
اندر داخل ہوئی، غلطی نہ سہی جان بوجھ کر آ گئی تو کیا ہوا؟
اب یہ ہماری "بھابی جان" بنیں گی نا ـــ
اقبال صاحب اپنی بہن کا جواب سن کر مسکرا کر چل دیے۔
اور میں شرم کے مارے زمین میں گڑ گئی ـــ
انسان جب بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے ـــ بے اختیار

اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ یہی حالت میری ہوئی ـــــ سلمیٰ نے جب مجھے آبدیدہ دیکھا ـــــ بےساختہ وہ مجھ سے چمٹ گئی ـــــ اور میں دیر تک اس کے سینے سے چمٹ کر مسرت و ندامت میں ڈوبے ہوئے آنسو بہاتا رہا۔

صابر کوسگوی

حسن

حسن کیا ہے دیدۂ فطرت کا نورِ بےمثال
حسن کیا ہے کیف و رنگینی کا شیریں اتصال

شمع کا شعلہ نظر کا کیف پھولوں کا شباب
آرزو کی جان ارمانوں کا دل حسرت کا خواب

ابر کی مستی چمن کی روح ساغر کی کھنک
برق کی شوخی صبا کی چال سبزے کی لہک

خال کی ظلمت جبیں کا نور عارض کی بہار
کاکلوں کا پیچ گیسو کی شکن ابرو کی دھار

عشق کی قیمت جفا کی تیغ تقدیرِ وفا
آبِ حیواں سمِ قاتل دردِ دل دل کی دوا

سازِ قدرت کی صدائے دلنشیں و دل نواز
چارۂ دردِ محبت مایۂ سوز و گداز

خالقِ ذوقِ نظر پروردگارِ دردِ دل
رونقِ عرشِ بریں تزئینِ بزمِ آب و گل

عشق کی پرچھائیوں میں ملنے والی آرزو
سوزِ دل سوزِ جگر میں جلنے والی آرزو

جنسِ ارزانِ مصر کی یعقوب کا خوابِ حسیں
کوہکن کا زورِ بازو وجد کا محمل نشیں

مہرِ عالم تاب کی ضو ماہ کی تابندگی
چومتی ہے جس کی پیشانی کو روحِ بندگی

پُر فضا میدان کی خاموشیوں کا رازداں
چاندنی راتوں کی بزم آرائی کا تنہا پاسباں

رقص فرماتا ہے گاہے منظرِ کہسار میں
پھول بن کر کھیلتا ہے دامنِ گلزار میں

چھین لیتا ہے دلوں سے مایۂ صبر و سکوں
بخشتا ہے زندگی کو لذتِ ذوقِ جنوں

ذرہ ذرہ سے عیاں ہے ذرہ ذرہ میں نہاں
ہر طرف بکھری ہوئی ہیں جس کی رنگیں داستاں

مسکراتا ماہ بھری آنکھوں میں آتا ہے کبھی
بجلیاں بن کر نگاہوں میں سماتا ہے کبھی

سانس لیتی ہے جوانی جب بھری برسات کی
جب خموشی دل کو گرماتی ہے بھیگی رات کی

وجد کرتی ہیں بہاریں جب وفورِ جوش میں
اک تصور بن کے آتا ہے مرے آغوش میں

رشید احمد

صنعتی کی ایک مثنوی

"گلدستہ"

اگست کے سب رس میں پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری نے صنعتی کی مثنوی قصۂ تمیم انصاری پر دوبارہ روشنی ڈالی ہے کہ آج سے تقریباً دس سال پہلے وہ اس موضوع پر اپریل ۱۹۳۲ء کے معارف میں اظہار خیال کر چکے ہیں، میرا خیال تھا کہ اس عرصہ میں ان کو صنعتی کی دوسری مثنوی کا علم ہو چکا ہوگا لیکن مضمون میں اس کا کہیں بھی ذکر نہیں ہے اس لئے اس موقع پر فائدہ اٹھا کر میں اس شاعر کی دوسری مثنوی سے ناظرین کو تعارف حاصل کرانے کی عزت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

یقیناً یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ تاریخ کی کتابیں تذکرے اور خود اس کی دو مثنویاں اس کے حالات پر کوئی روشنی نہیں ڈالیں پھر بھی یہ غنیمت ہے کہ قصۂ تمیم انصاری سے اس کے عہد کا تعین ہو سکتا ہے۔

صنعتی کی یہ دوسری مثنوی جو گلدستہ کے نام سے موسوم ہے ایک ایسے قصہ سے ماخوذ ہے جو شائد ہندوستان میں سب سے زیادہ ہر دل عزیز رہا ہے، کیونکہ اس وقت تک اس کو مختلف اشخاص نے اردو نظم یا نثر کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے عوام و اطفال کے لئے کسی چیز میں دلچسپی پیدا کرنے کا آسان ترین نفسیاتی طریقہ یہ ہے کہ اس تخیل کو حکایتی یا رومانی لباس میں پیش کیا جائے۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے فقہ، عقاید، روایات اور عام معلومات کو عوام تک پہنچانے کی یہ سعی ہے[1]۔ ایک شہزادی اپنی شادی کے لئے یہ شرط لگاتی ہے کہ جو شخص میرے سوالات کا جواب دے گا میں اس کو اپنا رفیق حیات بنانے کی عزت بخشوں گی اور جو ناکام رہے گا وہ قدیم انسانوں کی روایات کے مطابق جان و مال کھو بیٹھے گا۔ مختلف شاہزادے قسمت آزمائی کرتے اور جان کھوتے ہیں تا آنکہ ہیرو جوابات دے کر گوہر مراد کو حاصل کرتا ہے۔ یہ تمام سوالات عموماً مذہبیات سے متعلق ہیں۔ فارسی سے ترجمہ کر رہا ہے لیکن مجھے انتہائی تلاش کے باوجود اس کا فارسی نسخہ نہیں ملا، لیکن اس سلسلہ میں ایک اور چیز نظر سے گزری جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصہ نہ صرف فارسی و اردو بولنے والوں میں مقبول تھا بلکہ فرانس و انگلستان میں بھی متعدد اشخاص نے ترجمے اپنی اپنی زبان میں کیے ہیں۔

الف لیلہ کے جواب میں انگریزی میں ایک صاحب نے فارسی افسانوں کا ایک مجموعہ "ہزار یک روز" کے نام سے شائع کیا ہے، ان کا نام جسٹن، ایچ، میک کارتھی (Justin. H. McCarthy) ہے انھوں نے اپنے دیباچہ میں لکھا ہے کہ

اس کتاب کا پہلا فرانسیسی ترجمہ فرانسیسی

متشرق Petis de la Croix نے ۱۷۱۰ء میں Mille et un jours کے نام سے شائع کیا تھا، اس کے بعد اس کے دوسرے ترجمے اسی زبان میں شائع ہوئے، اسی طرح ان افسانوں کو انگریزی میں سب سے پہلے D.K. [illegible] نے ۱۷۱۴ء میں شایع کیا اور اسکے بعد دوسرا ترجمہ ۱۷۳۵ء میں Ambrose. Philips کی کوششوں کا نتیجہ تھا اور ان تمام تراجم کو سامنے رکھ کر مسٹر جسٹن نے ۱۸۹۲ء میں اپنا ترجمہ شایع کیا، ان کی کتاب کے حصہ اول میں یہ قصہ ۲۸۱ - ۱۷۰ یعنی ۱۱۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

[1] اس قسم کے اور دو قصے گجرات میں لکھے گئے ہیں (۱) ناز نین و شہجان ۱۱۲/(۲) قصہ چور و تمالنی ۱۱۵۸ھ

اس ترجمے میں ہیرو کا نام خلف بن طہمورث شاہ خاں قبیلہ لنگاٹس تاتار (؟)، اور ہیروان کا نام توران دخت بنت التون خاں شاہ چین ہے۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ اگرچہ ہر کتاب میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ فارسی سے ترجمہ ہے لیکن کسی دو میں بھی پورا واقعہ تو خیر بڑی بات ہے ہیرو اور ہیروان کے نام تک ایک نہیں ہیں، اسی لئے مختصراً اُن کا حال لکھتا ہوں۔

(۱) قصہ یوسف ثانی مصنفہ فتح محمد۔ ہیرو کا نام۔ یوسف ثانی۔

بیٹا اوسکوں رب نے دیتا خوش لقا نام اس کا یوسف ثانی رکھا

ہیروان کا نام زہرہ بانو عرف شیریں بنت فغفور چین ہے۔

زہرہ بانو نام رکھا باپ نے اور شیریں نام رکھا آپ نے

اس کتاب کا نسخہ کتب خانہ کلیہ جامعۂ عثمانیہ میں بھی موجود ہے۔ اور پروفیسر سروری نے اپنی فہرست میں اس کا ذکر قصۂ زلیخائے ثانی کے نام سے کیا ہے[1]۔ لیکن لائق مرتب نے مثنوی سے ایسا کوئی شعر نقل نہیں کیا ہے جس سے یہ پتہ چل سکے کہ خود مصنف نے یہ نام رکھا تھا مگر تیسرے نسخہ میں قصۂ یوسف ثانی کا نام خود فتح کا رکھا ہوا ہے۔

تب فتح نے دل میں کیتی فکر کر یوسف ثانی تب قصہ دیگر،

اگرچہ مثنوی میں سنہ تصنیف درج نہیں ہے لیکن اسباب تصنیف کے سلسلہ میں فتح نے جو حالات بیان کیے ہیں ان کی روشنی میں یہ مثنوی بارہویں صدی ہجری کے ربع اول میں لکھی گئی ہے فاضل مرتب نے وجہ تصنیف کا خلاصہ دیا ہے لیکن جو نتیجہ میں نکالنا چاہتا ہوں اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اشعار سامنے رہیں، وہ یہ ہیں:۔

اب سنو فتح کی باتاں سب عیاں (۱) گودھرہ کے شہر میں کیتا بیاں
بیٹھے تھے ایک دن جمع مسجد منیں (۲) کو بوڑھے اور جوان چھوٹے ننھے
شہر میں آیا تھا ایک محمد میا (۳) ان نکالا یو زلیخا کا قصہ
تب فتح نے دل منے کیتی فکر (۴) ایسی دوجی ہندی باندھو اب دیگر
چار بتیاں ساقی کی بولا تمام (۵) ایسے خوش میٹھے زلیخا کے کلام
سنتا تھا محمد امین کور چشم (۶) مجکو سو تب مسجد منے دیتی قسم
سن محمد توں فتح مجیس یہ بات (۷) گودھرہ کے بیچ تو ہے نیک ذات
اس زلیخا کا میں باندھا ہوں قصہ (۸) اے فتح اس بات میں تو سخن کیا کہا
تب فتح نے دل میں کیتی فکر کر (۹) یوسف ثانی تب قصۂ دیگر

فتح محمد گودھرہ کا رہنے والا تھا، یہ گجرات کا مشہور شہر ہے آج سے چند سال پہلے تک وہ ایک ضلع کا صدر مقام تھا، لیکن اب یہ علاقہ بھروچ میں ملا دیا گیا ہے ایک دن مسجد میں "بوڑھے جوان چھوٹے ننھے" سب جمع تھے کہ ایک نووارد محمد میاں نے یوسف و زلیخا کا قصہ بیان کیا اس کو سنکر فتح کو خیال ہوا کہ کیوں اس کو "ہندی باندھوں اب دیگر" فتح کی طبیعت حاضر تھی، اس نے اسی وقت "چار بتیاں ساقی کی بولا تمام" اسی مجمع میں محمد امین بھی موجود تھا، جب اس نے فتح کا یہ ارادہ اور مستعدی دیکھی تو فتح سے کہا کہ "اس زلیخا کا میں باندھا ہوں قصہ" اس لیے تکلیف نہ فرمائیے۔ اس پر فتح نے طے کیا کہ وہ علی الرغم امین یوسف ثانی تب قصہ دیگر" لکھے گا۔ آئیے ایم

[1] فہرست مخطوطات صفحہ ۱۷۵-۶

دیکھیں کہ یہ امین مصنف یوسف زلیخا کون ہے اور اس کا گودھرا سے کیا تعلق ہے۔ خوش قسمتی سے امین کی مثنوی کا بھی ایک نسخہ میرے پاس ہے، اور جناب نصیرالدین ہاشمی صاحب نے اپنے یورپ کے دکنی مخطوطات میں بھی اس کا مفصل حال لکھا ہے، امین نے اس مثنوی میں لکھا ہے:—

گیارہ سو کے اوپر نو جو گزرے ⁂ برس ہجرت محمد مصطفیٰ کے
بتیاں چھ تیس سو اور تیس اوپر ⁂ لکھا میں گودھرے کے بیچ خوشتر [1]
جمادی اولیں (کذا) اتوار کے روز ⁂ اتھی تاریخ دوجی دلسوں افروز

یہی وجہ ہے کہ امین اپنی مثنوی کی زبان کو گجری یا گرجری کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ معلوم ہونے کے بعد کہ امین نے اپنی مثنوی ۱۱۰۹ھ میں لکھی تھی اور وہ اس قدر عام نہیں ہوئی تھی کہ خود اس شہر کے فتح جیسے شاعر کو اس کا علم تھا، یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ امین کی مثنوی کو مرتب ہونے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا اور فتح نے اپنی مثنوی سال بھر میں مرتب کی، اس لئے اس کا زمانہ ۱۱۰۹-۱۲ھ کے درمیان اندازاً مقرر کیا جا سکتا ہے لیکن مزید احتیاط کے لئے میں نے اسے ۱۱۲۵ھ تک وسعت دیدی ہے فتح کی مثنوی میں تقریباً ۱۱۵۰ اشعار ہیں اور یہ دو حصوں پر منقسم ہے، پہلا حصہ اس طرح شروع ہوتا ہے:—

بادشاہ تھا ایک اگلے روزگار ⁂ دولت و نعمت تھی اس کی بیشمار — (۲) قصہ ملکۂ مصر۔ مصنفہ محمود۔ ہیرو کا نام عبدالعلیم (عالم ہندوستانی) کہ تھا ایک عالم ہندوستان میں ⁂ کتیک دن کے بعد از خبر سن انیں — اوک اس کوں اسباب کا کام تھا ⁂ سو عبدالعلیم اس کے تئیں نام تھا
ہیروان کا نام — ملیکہ بنت سلطان فیروز شاہ، بادشاہ مصر
دھرے نام فیروز سلطان شاہ ⁂ اتھا مصر کے تخت کا بادشاہ — ملیکا اچھے نام اوس نار کا ⁂ اتھا شور جگ میں اس نار کا
تعداد اشعار ۴۵۶ — تعداد سوالات ۴۲ ۔ اس قصے کے نسخے عام ہیں۔ سروری صاحب کی فہرست میں بھی اس کا ذکر ہے، لیکن میں اس قصہ کو عاجز کی طرف منسوب کرنے کو تیار نہیں ہوں میرا خیال ہے کہ یہ محمود ہی کا قصہ ہے، اور ۱۱۰۲ھ در اصل فارسی کتاب کے خاتمہ کا ترجمہ ہے، بہرحال اس موضوع پر کسی دوسری صحبت میں عرض کروں گا، یہ مثنوی شائع بھی ہو چکی ہے اور اسی شائع شدہ نسخہ میں یہ عبارت درج ہے:—

" نسخہ منظوم در سوال و جواب تصنیف انیف شاعر مسعود میاں محمود وحید مصر۔ الموسوم بہ قصۂ ملکہ مصر۔

(باقی آئندہ)

سید نجیب اشرف ندوی

---

[1] ہاشمی صاحب کے یہاں دوسرا شعر یوں ہے۔
بتیاں چالیس سو پھر چودہ اور سو ⁂ میں لکھا گودھرے کے بیچ کس کو

ہندوستان میں اسلامی تعمیر کاری

مسلمان جب ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو ان کے سامنے یہ ایک اہم مسئلہ تھا کہ اپنے لئے جائے رہائش اور عبادت کے لئے مسجد کا انتظام کریں۔ مگر یہ لوگ اہل ہند سے بالکل مختلف تہذیب و تمدن رکھتے تھے اور ان کی کوئی بھی معاشرتی عادت و اطوار یہاں کے باشندوں کے مماثل نہ تھی اس لئے وہ مجبور تھے کہ اپنے لئے الگ ہی مکان رہائش اور مساجد کے انتظام کریں مگر یہ بھی مشکل تھا کہ اس قدر جلدی عمارات کی تعمیر کرا سکتے اس لئے وہ مجبور تھے کہ یہاں کے کاریگروں کو لے کر ان سے اپنے مطالب کے مطابق تعمیرات کراتے پھر یہ بھی لازمی تھا کہ وہ مصالحہ تعمیر کو بھی ان قدما کی تعمیرات سے حاصل کرنے میں ان قدیم عمارات کو ہی اپنے مطالب کے مطابق گرا کر از سر نو ٹھیک کر کے استعمال کرتے اس قسم کی بے شمار عمارات ابھی تک ہندوستان میں ملتی ہیں۔ اسی سے ان امور پر روشنی پڑتی ہے ایک تو یہ کہ ان کے اندر ملکہ فن تعمیر بالکل الگ تھا دوسرے ان کی تہذیب و تمدن بالکل مختلف تھے۔ عہد اسلامی کی صحیح عمارت جو اس ابتدائی زمانے کی ابھی تک اسی حالت میں موجود ہے جس سے ہم مسلمانوں کے صحیح جذبۂ تعمیر کا اندازہ کر سکیں وہ دہلی کی مسجد قوۃ الاسلام ہے جس کے بلند محراب ہیں اور اس کا قطب مینار یا زینہ برائے اذاں تیار کیا گیا۔ مسجد قوت الاسلام تو قطب الدین ایبک نے تعمیر کی اور قطب مینار کی تکمیل شمس الدین التمش نے کی ان آثاروں سے بخوبی مسلمانوں کے صحیح فن تعمیر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جب کہ ان کے قدیم ہندو مندر کے آثاروں سے مقابلہ کیا جاتا ہے جو ابھی تک اس مسجد و صحن میں ستون وغیرہ کا کام دیتے ہیں بلکہ نظریہ مکان و زمان اسلامی فن تعمیر بھی بخوبی سمجھ میں آجائے گا امیر خسرو نے اس مسجد کی تفصیل جو دی ہے اس میں گنبد وغیرہ کا ذکر بھی ملتا ہے گو وہ آج موجود نہیں ہیں ورنہ ہم ابتدائی گنبد کی بناوٹ کا مشاہدہ کر سکتے۔ اس کے بعد ہی علاؤ الدین خلجی کا زمانہ آیا تو اس نے اس مسجد قوت الاسلام کے ساتھ جنوب مشرقی کونہ پر ایک دروازہ قائم کیا جس کی محرابیں اور نقش و نگار زیادہ تر ہسپانی ہیں وہی گھر یا محرابیں اور انہی محرابوں پر کتبات اور گرد بندی ہے مسلمانوں کی تعمیرات میں ایک امر قابل لحاظ رہا ہے وہ ان کا زیبائشی پہلو ہے اور اس میں ان لوگوں نے اس قدر جدتیں کیں کہ خاص طور پر نقوش اسلامی شمار ہونے لگے۔ اصل وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو مذہبًا کسی قسم کی تصاویر کے بنانے سے طبعًا نفرت ہو چکی تھی اس لئے ان کے اس جذبے نے دو امور میں زیادہ اظہار کیا ایک تو کتبات کی مختلف طرز تحریر جو نسخ۔ طغرا۔ ثلث وغیرہ میں ظاہر ہے اور دوسرے منظم نقش و نگار جو اس سے قبل نہ تھے اور یہ نقش و نگار بالکل رسمی تھے جیسے انگریزی میں Arabesque کہتے ہیں۔ غرض کہ یہ امور شروع سے ہی ترقی پذیر رہے اور آگے چل کر ہر ایک سلطنت اور ہر ایک مقام کے ساتھ مسلمانوں کا طرز تعمیر بھی خاص ہی صورت اختیار کرتا رہا مگر ان کے اصول جو ایک دفعہ وضع ہو چکے تھے وہ ان میں برابر بدرجۂ اتم سرایت کرتے رہے اور یہی وجہ ہے کہ کچھ مختلف مقام و مختلف سلطنتوں کی تعمیرات نے مختلف اسماء اختیار کر لیے مگر اصولاً سب ایک ہیں۔ ان سب کو الگ الگ بیان کرنا بلکہ ان کی ایک ایک عمارت کو بیان کرنا ایک ایک مستقل کتاب کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ ذیل میں تغلق طرز تعمیر کو دیکھ کر غیر ممالک کا سیاح نورین سے تشبیہ دیتا ہے مگر جب غور سے

دیکھتا ہے تو بالکل محراب وگنبد کے اصولوں پر قائم ہے۔ اسی طرح ہر ایک شاخ اپنی آپ ہی مختلف خصوصیات پر حاوی ہے
مسلمانوں نے فن تعمیر میں جو جدتیں کیں وہ زیادہ تر مساجد اور مقابر میں ہیں اور ان میں کوئی ان کے سامنے مذہبی قیود و اصول تعمیر
میں نہ تھیں اس لئے انھوں نے محض نفس عمارت یعنی ضرورت عمارت کو مد نظر رکھ کر اس کے اندر وہ وہ جدتیں کیں کہ آدمی
حیران رہ جاتا ہے حالانکہ اس کے برعکس اہل ہنود کی عمارات میں وہی مذہبی قیود اور وہی بندشیں شامل حال ہیں جن کی وجہ سے
بعض محققین نے اعتراض بھی کیا ہے کہ جب تعمیر کاران روایات اور قیود سے باہر نہیں آسکتا تو پھر وہ کیسے اپنے جذبات کو
دخل دے سکتا ہے غرض کے مسلمان کا صحیح جذبہ خدادانی جذبہ لطیفیات ان تعمیرات سے بخوبی عیاں ہے اور ان کی تعمیرات
کو دیکھ کر ایک محقق نے یہاں تک کہہ دیا کہ مکان کو تعمیر کر لینا کوئی فن تعمیر میں شامل نہیں ہے کیونکہ یہ ضرورت کو پورا کرتا ہے
بلکہ روضہ کی تعمیر کرنا اور اس میں اپنے جذبات کو پنہاں کرنا فن تعمیر ہے جس طرح شاعر اپنے جذبات کو غزل و قصیدہ و مدح
میں ظاہر کرتا ہے۔ اور یہ واقعہ ہے کہ جس قدر بھی اسلامی روضے نظر آئیں گے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں
اور ہر ایک میں بانی کے صحیح جذبات کی تصویر ہے جو وہ صاحب روضہ کے لئے رکھتا تھا اور اس میں کیا کیا جدتیں کیں جو کسی
عہد میں نہیں ملتیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ہماری ہمسایہ قوم اپنے مذہبی روایات سے مجبور ہے کہ اپنے گزشتگان کا کوئی ایسا
روضہ تعمیر کر سکے بلکہ ان کی تمام جدت کا اظہار ان کے منادر میں ہے جو بالکل روایات کے پابند ہیں۔ آپ بخوبی اس نظریہ
کے تحت شروع سے لے کر آج تک کے اسلامی مقابر کا ملاحظہ کریں تو اس سے بہت سے انکشاف ہوں گے۔ دہلی میں محمد تغلق کا
کا مقبرہ۔ شمس الدین اتکہ خاں کا مقبرہ۔ ہمایوں کا مقبرہ۔ عبدالرحیم خان خاناں کا مقبرہ۔ صفدر جنگ کا مقبرہ اسی طرح آگرہ
میں اکبر کا روضہ۔ اعتماد الدولہ کا مقبرہ۔ ممتاز الزمانی کا روضہ اور دکن میں بہمنی روضے، برید شاہی روضے عادل شاہی روضے
قطب شاہی روضے بھی اسی نظریہ کے تحت آپ کو ملیں گے غرض کہ ایک ہی مقام پر اس قدر مختلف روضے ملیں گے کہ آدمی
حیران رہ جاتا ہے مگر ان میں ایک امر ضرور قابل مطالعہ ہے وہ ان کے گنبد اور دیگر حصص عمارت ہیں جن کا ارتقاء برابر
ابتدا سے ہوتا رہا۔ خاص کر مغل دور روضہ ور توجہ کا محتاج ہے جنھوں نے اس ملک میں آکر کافی دیر حکومت مرکزی کی اور
قریب قریب تمام ہندوستان کو زیر کر لیا تھا ان کی توجہ تعمیرات میں زیادہ تر آگرہ دہلی تک ہی رہی اس لئے ان کے کارناموں
کو بھی مطالعہ و مشاہدہ کرنا چاہئے ایک امر کا افسوس ضرور ہے کہ عام طور پر تعمیرات اسلامی کا تفصیلی بیان ہمیں اس
عہد کی کتب میں بہت کم ملتا ہے اس لئے ہمیں اپنے انفرادی مشاہدات پر ہی قیاس کرنا چاہئے اور ان کے تہذیب و
تمدن کے علاوہ جذبات حسن و عشق کا اندازہ کرنا چاہئے مغل گنبد یا ہندوستانی گنبد کے متعلق یہ بات قابل لحاظ ہے کہ
جس قدر بھی یہاں نظر آتے ہیں ان کے نمونے کم وبیش ایران و توران و عراق میں ملتے ہیں اور خاص کر اسی ضمن میں گور امیر
یعنی روضہ امیر تیمور سمرقند بیان کرنا لازمی ہے جس کی بنا دراصل ایک مسجد بی بی خانم زوجہ امیر تیمور کے نام بنانے سے ابتدا
ہوئی اور اس میں بعد میں امیر تیمور اور غالباً بی بی خانم خود اس میں دفن ہوئیں اور یہ روضہ اس قدر مشہور ہوا کہ اسے گور امیر
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں دو امور قابل ملاحظہ ہیں ایک تو نیچے کا سرداز جس میں اصل قبور ہیں اور ایک اس کا

دوھر اقمقمہ نما گنبد ہے جس سے پیشتر ہم اس قسم کی عمارت دمشق وغیرہ میں دیکھتے ہیں اور اس قسم کے گنبدوں کے حالات سیاح کے سفرناموں میں پڑھتے ہیں چونکہ امیر تیمور فتح کی غرض سے ملک شام میں رہا اس لئے اغلب ہے کہ بہت سے ایسے کاریگر ہمراہ لے کر آیا بلکہ اس قسم کا بیان ہمیں اس کے عہد کی تاریخوں سے بھی ملتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان مغلوں کے گنبد بھی ہمیں دوھرے بلب نما ملیں گے جس کی مثال ہمارے سامنے ہمایون کا گنبد پہلا گنبد ہے اور اس کے بعد بھی بے شمار گنبد تیار ہوئے جو ان اصولوں پر قائم ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ معاصر کتب میں تاج محل آگرہ کے گنبد کو امرودی گنبد لکھا ہے غرض کہ یہ اصطلاح اس وقت کے معماروں میں عام تھی اور اس کے سطحی نقشہ کی شکل کو مثمن بغدادی لکھا ہے یعنی ایک مربع شکل جس کے کونے منظم طریقے پر کٹے ہوئے ہیں اور اس کے گنبد کا مقابلہ باسانی تیمور کے روضہ سمرقند سے ہو سکتا ہے جو بالکل انھیں روایات پر ہے اور تاج میں وہی سرولز اہل تھر پر بعض کا خیال ہے کہ اگر کسی روضہ کے گنبد کے گرد چار چھوٹی برجیاں آجائیں تو یہ کسی غیر اسلامی عمارت سے متاثر ہے جیسا کہ تاج محل وغیرہ میں ہے مگر یہ ہماری کم علمی کی دلیل ہوگی کیونکہ بالکل یہی روایات صدیوں پیشتر ابراہیم سامانی کا روضہ بخارا میں موجود ہے جو قبل محمود غزنوی تیار ہو چکا تھا اور اس کا گنبد بیجاپور کے گنبد محمود عادل شاہ کے گول گنبد کا صحیح نمونہ ہے اگرچہ موخرالذکر دنیا بھر میں سب سے بڑا گنبد مانا جا چکا ہے۔ غرض کہ مسلمانوں نے روضوں کی تعمیر میں وہ وہ جدتیں کیں کہ صاحب بصیرت حیران رہ جاتا ہے اور ان میں سے ہر ایک کا فرداً فرداً مطالعہ کیا جائے تو اس کے اندر مسلمانوں کی صحیح تہذیب و تمدن جسے آج ثقافت کہتے ہیں نہاں پائیں گے۔ یہ عجیب مرحلہ ہے کہ جو سب سے زیادہ مرغوب شئے دنیا میں ہوتی اسی کے دوسرے لوگ مختلف حیثیت سے مالک بن جاتے ہیں بلکہ یوں کہئے کہ مختلف حیثیت سے اسے اپنا معشوق تصور کرنے لگتے ہیں مگر فنون لطیفہ میں یہ جذبہ رشک وشوق کے حدود سے نکل کر حسد کے درجے تک آجاتا ہے اور اسی حاسدانہ جذبات کے تحت پھر اس میں نقائص بھی تلاش کرنے لگتے ہیں مگر یہ بھی مسلمہ ہے کہ اس معشوق کے مسلمہ حسن پر کوئی حرف گیری بھی نہیں کر سکتا یہی واقعات تاج محل آگرہ کے ساتھ پیش آئے ہیں شاہجہاں نے اپنی چاہتی بیوی ممتاز محل کا روضہ آگرہ میں دریائے جمنا کے کنارے تعمیر کیا اور اس کو مجموعی حیثیت فنِ تعمیر میں ہفت عجائبات روزگار میں ایک شمار کیا جاتا ہے۔ اور ایک مصور نے جذبات سے متاثر ہو کر یہ بیان کیا کہ شاہجہاں کی آنکھوں سے جو آنسو ممتاز کی وفات پر بہے تھے ان میں سے ایک منجمد ہو کر یہ روضہ مرمری میں منتقل ہو گیا جو دراصل صحیح معلوم ہوتا ہے یعنی اس سے محض جذباتِ عشق کا تعلق ہے اور یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اس سے پیشتر ایسا کوئی روضہ ہندوستان میں تیار نہیں ہوا تھا جس کی ہم اسے نقل یا شبیہ کہہ سکیں بغیر کسی حجت کے یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ اس کا اصل معمار شاہجہاں خود تھا جس کے بے شمار شواہد ملتے ہیں کہ وہ اس فن کو ابتدا ہی سے خوب سمجھتا تھا اور اس کو فنی حیثیت سے خوب دسترس تھا اس لئے یہ بالکل عقل تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ وہ خود ہی اپنی چاہتی بیوی کا روضہ ایک نمونہ حسن وعشق تیار کر سکتا تھا ایک پادری مینرق نے بیان کیا ہے کہ اس کا معمار ایک وینس کا باشندہ جیرونیمو ویرنیو تھا اور یہ روایت اس نے کسی اور کی زبانی نقل کی ہے۔ یہ اطمینان سے باور کر لینا چاہئے کہ یہ پادری مینرق۔ اس کا راوی کاسٹرو اور یہ خود جیرونیمو ویرنیو ایک سیاسی سازشی ہیں مغلوں کے خلاف ہوگلی کلکتہ میں بالکل اسی زمانے میں شریک تھے اور ان کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اور تحقیق نے اس امر کو بالکل واضح کر دیا ہے۔ پھر ایک اور فرانسیسی اوستن ڈی بورڈو کو اس کا معمار بیان کیا ہے۔ اس کے متعلق محض بسی قدر کہدینا کافی ہے کہ یہ شخص بذات خود برہانپور سے قبل انتقال ممتاز گو پرتگیزوں کے ہاں ایک سیاسی امر میں سفیر بنا کر ارسال کیا گیا تھا اور وہیں اس کو کسی نے قتل کر دیا تھا تو ان کا تعلق تاج کی عمارت سے ہرگز نہیں ہے۔ احمد و حامد دو معمار شاہجہاں کے عہد میں بہت مشہور تھے ان کا ذکر بھی عہد شاہجہانی کی دہلی کی عمارات کے ضمن ملتا ہے جو تاج کی تعمیر کے شروع ہونے سے آٹھ سال بعد بنیاد رکھی گئی مگر ان کا ذکر تاج کے ضمن میں نہیں ملتا ہاں ضرور ہے کہ لطف اللہ مہندس ولد احمد معمار لاہوری نظم میں بیان کرتا ہے کہ اس کے بعد احمد نے تاج تعمیر کیا ہم ابھی خاموش ہیں جب تک کوئی اور شواہد اس ضمن میں تصدیق نہ کرتے۔ ایک اور استاد عیسٰی کا نام پیش کیا جاتا ہے کہ اس نے تاج محل کا نقشہ وغیرہ تیار کیا۔ یہ وثوق سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ عیسٰی نامی شخصیت بالکل ایک افسانہ ہے اور اسے تاج کی تعمیر سے کوئی دخل نہیں ہے۔ عیسٰی کا نام ۱۸۲۵ء سے اوپر نہیں جاتا اور آگرہ کالج کے لڑکوں نے جو ایک فرمائش پر آگرہ عمارات کی گائڈ تیار کی اس میں اس کا نام ملتا ہے اور اسے اس وقت انگریزی میں ایک عیسائی لکھ کر پیش کر دیا گیا۔ غرض وہ مخطوطے جو آگرہ میں تیار ہوئے اور ان میں ایک فہرست کاریگران وغیرہ ہے بالکل بے بنیاد ہیں۔ اور اصل عمارت کے صحیح مطالعہ میں سد باب ہیں۔

تاج کی تعمیر میں اس کے نقش و نگار بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں جن کو اصطلاح میں پرچین کاری کہا گیا ہے جس کی تشریح یوں ہے کہ مختلف قیمتی پتھر سنگ مرمر کی سطح پر کھود کر بھراتے گئے ہیں اور اس کو بعضوں نے ان کی اصلیت کا بنایا ہے واضح رہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی قدیم عمارات میں یہ کام ملتا ہے جس کے نمونے احمد آباد کی قدیم مساجد اور مانڈو میں مقبرہ ہوشنگ شاہ میں موجود ہیں بلکہ یہ بھی کہدینا چاہئے کہ مسلمانوں سے قبل یہ کام ہندوستان میں ہرگز نہیں تھا اگرچہ اٹلی میں یہ کام بھی دسویں صدی ہجری کے دوران میں شروع ہوا اور اس کے اصول فن ممکن ہے ایک ہی ہوں مگر ہندوستانی پرچین کاری سے وہ بہت حیثیتوں سے مختلف ہے۔ دہلی کے ایوان عام میں جو یہ کام جھروکہ نشین ظل الٰہی کے قطعات میں ملتا ہے وہ خالصًا اٹلی اصلیت کا ہے اور یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ کب اور کس نے یہاں لا کر یہ قطعات لگا دیئے حالانکہ اس حصۂ عمارت کی تفصیل جو معاصرانہ کتب میں دی ہے وہ بالکل موجودہ سے مختلف ہے ان تمام امور میں کسی غیر ملکی کو اعزاز کاریگری یا معمار تاج کہتے ہوئے ذرا تامل سے کام لینا چاہئے اور خصوصیت سے کام کی روایات پر نظر ڈالنی چاہئے کہ کیا یہ کام کسی مغربی ماہر فن کے بس کا بھی ہے۔ یہاں پھر اعادہ کیا جاتا ہے کہ در اصل تاج کا معمار شاہجہاں خود تھا اور اس کا صحیح نمونہ گور امیر یعنی روضہ امیر تیمور سمرقند تھا جو اس سے صد سال پہلے تعمیر ہو چکا تھا۔ ایک امر یہ بھی قابل توجہ ہے کہ فنون میں زیادہ تر صنعت کی خوبیوں کی طرف توجہ کرنی چاہئے تاکہ ان کو دیکھ کر اصل سرور اور تزکیہ نفس ہو سکے جو ان اصلی نمونۂ فنون کا مقصد ہونا چاہئے ورنہ ان جزویات میں پڑ کر عام مسرت اور اصل مقصد دونوں فوت ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ حسن کار حسین اشیا کا خالق ہوتا ہے اور حسن کا یہ مقصد ہے کہ حسن کار کو پس پردہ ڈالدے اور حسن کاری کو ظاہر کردے۔

(ڈاکٹر) عبداللہ چغتائی

نقّاد

رات بھر بیٹھ کے اک غم کی حکایت لکھی / خونِ دل سے دلِ وحشی کی شکایت لکھی
یہ حکایت تھی مرے سوزِ دروں کی ہمدم / یہ شکایت تھی مرے حال زبوں کی ہمدم
اپنے اشکوں کو تھا لفظوں میں پرویا میں نے / وحشتِ دل کو تھا شعروں میں سمویا میں نے
ایک اک لفظ میں تھا نارِ جہنم کا اثر / ایک اک حرف میں تھا میرے تبسم کا اثر
وہ تبسم کہ جو آہوں کا اثر رکھتا ہے / بیکسی ہائے زمانہ پہ نظر رکھتا ہے
میں سمجھتا تھا کہ یہ میری حکایت سن کر / موم ہو جائے کا پتھر کا بھی بے رحم جگر
کس مصیبت سے تھے الفاظ جمائے میں نے / خونِ دل پی کے تھے اشعار بنائے میں نے
بجلیاں طورِ تخیل کی تھیں لفظوں میں مرے / بحرِ جذبات کا اک شور تھا حرفوں میں مرے
لے کے پہنچا میں اسے حضرتِ نقّاد کے پاس / جی میں خوش تھا کہ چلو آ گئے اُستاد کے پاس
بزم میں اور بھی نقّاد کئی بیٹھے تھے / شاعروں کے لیے جلّاد کئی بیٹھے تھے
میں نے آہستہ سے کی اپنی حکایت آغاز / جس میں جذبات و تخیل کے تھے لاکھوں اعجاز
کوئی سنتا ہی نہ تھا واں تو کہانی میری / مفت برباد گئی شعلہ بیانی میری
تیشِ دل کو یہ نقّاد بھلا کیا جانیں / لے کو فریاد کی صیّاد بھلا کیا جانیں
آشنا آنکھ نہیں جن کی گہرباری سے / جو کہ زندہ ہیں فقط ایسی اداکاری سے
جو سمندر کے تلاطم سے گزرتے ہی نہیں / ورطۂ غم میں کبھی آن کے گرتے ہی نہیں
جن کے سینوں میں نہیں لذّتِ احساسِ الم / جن کے ہاتھوں میں نہیں عشق کا رنگیں پرچم
جن کو تخلیق کی تکلیف کا احساس نہیں / جن کو کلیوں کے چٹکنے کی صدا راس نہیں
ایسے حضرات کی اس دور میں نقّادی ہے / آسماں! خوب یہ طرزِ ستم ایجادی ہے

اشک (عثمانیہ)

نقدِ سخن! نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز نے حضرت فانی بدایونی کے کلام پر فنی نقطۂ نظر سے سخن ورانہ تنقید کی ہے اردو زبان و ادب اور شعر و سخن سے شغف رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ شمع ہدایت ثابت ہوگا۔ اور سخن فہمی اور ذوق شعر میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

"تنقید ایک سخن سنج اور صاحب نظر کے قلم سے نکلی ہوئی ہے اس میں زبان اور شاعری سے متعلق بہت سے ادبی نکات آ گئے ہیں جن کا مطالعہ نومشق شعراء میں ادبی بصیرت پیدا کرے گا۔" سلیمان ندوی

رسالہ سب رس ۔ کا مطالعہ نہ صرف آپ کے لمحاتِ فرصت کو خوشگوار بنانے میں کامیاب ثابت ہوگا بلکہ آپ کے ذوقِ ادب کی تشفی کا بھی ضامن ہے۔

گل بوٹے

اللہ پاک اچھا رکھے ہماری اس نیک بخت بہن کو جس کے طفیل میں ہمیں ایک بڑی بھاری "پکنک" میں شرکت کی عزت نصیب ہوئی۔ کوئی چھ مہینے سے اس پکنک کی تیاریاں جاری تھیں، تاریخیں ٹھیرائی جا رہی تھیں، مقام پسند کئے جا رہے تھے مگر کوئی نہ کوئی مشکل ایسی نکل آتی تھی کہ بات جمنے نہ پاتی تھی، "آخر تنگ آمد بجنگ آمد" ہماری بہن نے ایک دن یہ اعلان کر ہی دیا کہ دوسرے ہی دن صبح سویرے شہر کے سب سے بڑے تالاب پر ان کے عزیز، قریب کے لوگ اور سہیلیاں اپنا اپنا توشہ لے کر حاضر ہو جائیں، اس پکنک کو "پاٹ لک" قرار دیا گیا تھا اور ہر ایک کے ذمہ کچھ نہ کچھ کھانے پینے کی چیز کر دی گئی تھی۔

جانا تو بہت سویرے ٹھیرا تھا مگر ہماری پھرتیلی اور "وقت کی پابند" گھر والیوں کے انتظام کی یہ خوبی تھی کہ ٹھیک بارہ بجے ہمارا قافلہ چل پڑا اور کوئی آدھے گھنٹے کے اندر "یہ گنگا جمنی" پارٹی تالاب پر پہنچی، یہاں ہمارے ایک "پکنکی" بھائی نے جو ہم سے چند منٹ پہلے پہنچے تھے ہوشیاری یہ کی کہ بے منظر مسافر بنگلہ کی جگہ عالی شان "گسٹ ہوس" ایک روز کے لئے کرایہ پر لے لیا تھا، ان کی اس حرکت پر ہم میں سے بعض نے ناک بھوں چڑھائی مگر لے دے کر آخر میں سبھوں نے کرایہ میں شرکت قبول کی ورنہ ظاہر ہے کہ بھائی صاحب کی ذات اور جائیداد پر پوری ذمہ داری پڑ جاتی۔

تالاب پر پہنچتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا، اسکول اور کالج کی بعض لڑکیوں نے وہ دھما چوکڑی کی اور اودھم مچائی کہ گھر سر پر اٹھا لیا، ہمارے ایک نازک مزاج دوست کو دل کی دھڑکن شروع ہو گئی، اس پارٹی میں ایک پولیس کے افسر بھی تھے۔ انھوں نے ان شریر لڑکیوں کو "ایجی" ایک ایسی ڈانٹ بتائی کہ سب کی سب سہم گئیں، ان کی بیگم ان سے دو قدم آگے بڑھ کر چھت پر پہنچ گئیں اور ساری لڑکیوں کو نیچے اتار کر ادھر ادھر منتشر کر دیا، جب لڑکیاں دفع ہو گئیں تو ہمارے دوست کی جان میں جان آئی اور جان بچی لاکھوں پائے، وہ کمرے سے باہر آئے اور لڑکیوں کو دور جنگل میں اچکتی کودتی، پھدکتی پھلانگتی دیکھ کر فرمانے لگے

"بھئی ان میں وہ لڑکی بھی ہے جس کی بات چیت ہم سے ہو رہی ہے، مگر ہم نے اب تک اس کو نہیں دیکھا! بھلا بن دیکھے کیسے بیاہ کر لیں"؟

ہم نے جواب دیا "دور سے ہم تم دونوں دیکھ سکتے ہیں مگر پرکھنے کے لئے تو نزدیک سے دیکھنا ہوگا! اور یہ کیسے ہوگا"؟

"بھئی کچھ ہی کیوں نہ ہو آج تو ہم انھیں اچھی طرح دیکھیں گے، چال ڈھال، بات چیت، رنگ ڈھنگ، بال بھنوری چہرہ مہرہ غرض ان کی ہر چیز کو ٹھونک بجا کر دیکھیں گے مگر ذرا آپ بھی ساتھ رہنا، آپ کی رائے کی ضرورت ہوگی"۔

ہم نے کہا "دوست! آخر آپ کس طرح" ان کو پرکھیں گے!

فرمایا "آپ کو ہمارے ذہن رسا کی داد دینی ہوگی، ابھی ابھی ایک نہایت آسان تدبیر سمجھ میں آئی ہے، وہ سامنے بڑ کا جو بڑا سا پیڑ کھڑا ہے اس پر آپ ہم چڑھ جائیں گے اور

ہماری "پولیس" بھابی جان سے کہیں گے کہ سب لڑکیوں کو اس کے نیچے ہانک کر لائیں اور اس لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رہیں جس سے ہماری نسبت ہو رہی ہے، کیسی ترکیب ہے"؟

ہم نے کہا "کیا کہنے! خوب سوجھی"!!

اتنے میں "بھابی جان" سامنے نظر آئیں، آپ نے چلایا۔

"بھابی! بھابی جان!! ایک بات سنتے جائیے"!!!

جب "بھابی جان" نزدیک آئیں تو آپ نے انھیں اپنی ترکیب سمجھادی، ہم نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی، "بھابی جان" راضی ہو گئیں اور چلیں لڑکیوں کو گھیرنے!

ہم دونوں درخت پر چڑھ گئے اور اپنے کو پتوں میں اچھی طرح چھپا لیا، ہمارے دوست نے اپنے گلے سے دوربین نکال لی اور لگے اس کو اپنی نظر سے ملانے!

اتنے میں "بھابی جان" ہنستی بولتی، اچکتی پھدکتی لڑکیوں کو لئے درخت کی طرف آرہی تھیں! ہمیں تو اپنی نظر کی کمزوری کی وجہ سے لڑکیاں برابر دکھائی نہیں دے رہی تھیں، آپ نے ہنستے ہوئے اچھل کر فرمایا

"وہ دیکھئے! یقیناً وہ وہی لڑکی ہے جس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بھابی جان آرہی ہیں"!! دوربین ہمیں دیکر کہا "ذرا غور سے دیکھئے تو! رنگ روغن اصلی ہے یا معاملہ پوڈر زدہ ہے"؟

ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا، بھلا اتنی دور سے پوڈر کیا سوجھائی دیتا، ہم نے دوربین واپس دیکر کہا۔

"بھئی ان سے بیاہ تو آپ کا ہوگا! ہماری پسند کس کام کی"!!

اب لڑکیاں درخت کے قریب آگئی تھیں، آپ نے دوربین سے دیکھ کر کہا

"لڑکی بری نہیں ہے! ناک نقشہ کی تو اچھی معلوم ہوتی ہے چھریرہ بدن، اونچی پیشانی، آنکھیں غزالی تو نہیں ہیں مگر خیر بری بھی نہیں، ستواں ناک عنابی ہونٹ، سڈول بازو، پتلی کمر، بھئی بظاہر تو بُری نہیں معلوم ہوتی، کیوں آپ کی کیا رائے ہے"؟

ہم نے کہا یار! جب اتنی خوبیاں موجود ہیں تو تمھیں اور کیا چاہئے!! چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کرلو!!!

کہنے لگے "سچ تو کہتے ہو مگر ہماری امی جان کچھ عجب تلون مزاج ہیں! برسوں سے ہمارے لئے دلہن تلاش کر رہی ہیں، سارا ہندوستان چھان مارا، اگر کوئی لڑکی ان کی آنکھوں میں بھرتی ہی نہیں! کچھ نہ کچھ عیب نکال بیٹھتی ہیں، ہم تو اب بیزار ہو گئے آخر کیا بڑھاپے میں بیاہ کریں گے؟ نہیں بھئی نہیں!! اب ہم نہیں ٹھیر سکتے، بس اس لڑکی سے بیاہ کر لیتے ہیں۔ کیوں آپ کی کیا رائے ہے"؟

"کیوں آپ کی کیا رائے ہے"؟ کمبخت ان کا تکیہ کلام ہو گیا تھا، اتنے میں لڑکیاں درخت تلے آگئیں آپ نے سب پر ایک "طائرانہ" نظر ڈال کر فرمایا

"بھئی ہماری نظر میں تو ان میں سے ایک لڑکی بھی ٹھیک نہیں بیٹھتی! ہم کو تو ہے وہی پسند، اپنی اپنی پسند کو کیا کریں!! کہئے آپ کی کیا رائے ہے"؟

ہم نے کہا "دوست! تم نے تو ان کو پسند کر لیا آخر ان کی پسند بھی کوئی چیز ہے کہ نہیں؟ ذرا تم خود کو بھی تو پسند کرا لو"!!

اس وقت ایک چیل اچانک ہمارے دوست
کی سن ہیاٹ پر جو آپ نے اوپر کی ڈالی پر رکھ دی
تھی، آبیٹھی! اس خیال سے کہ کہیں چیل نہ اڑا دے آپ نے
اچک کر جو ٹوپی کو پکڑنا چاہا تو دوربین ہاتھ سے چھوٹ گئی
اور لڑکیوں کے بیچوں بیچ آ رہی۔ ایک کالی سی چیز درخت
پر سے گرتی دیکھ کر لڑکیاں چیختی چلاتی بھاگ نکلیں اور
ادھر چیل پنجوں میں آپ کی سن ہیٹ لئے اڑنے لگی!
کبھی آپ اور سن ہیاٹ کو دیکھتے ہیں کبھی نیچے دوربین
کو!!! اور کبھی چیختی، بھاگتی جانیوالی لڑکیوں کو!!! اتنے
میں کسی لڑکی نے چیل کے پنجوں میں سن ہیاٹ دیکھ لی اور
لگی چیخنے

"سن ہیاٹ! وہ دیکھو سن ہیاٹ چیل
لیجا رہی ہے"!!!

ہمارے قافلہ میں ایک میر شکاری بھی تھے، انہوں نے
بندوق اٹھا کر جو چیل پر فائر کیا تو چیل نہیں مری، مگر سن ہیاٹ
اوس کے پنجوں سے چھوٹ گئی۔ اب لڑکیاں دور جا
چکی تھیں، ہم دونوں درخت پر سے اترے۔ دوربین
کو ہم نے جو اٹھا کر دیکھا تو اوس کے دونوں دیدے پھوٹ
چکے تھے اور ٹوپی چیل کے چنگل اور چھروں کی مار سے
چھلنی ہوگئی تھی، یہ نقصان اس کام کے مقابلہ میں کوئی
حقیقت نہیں رکھتا تھا جس کو ہمارے دوست نے آج
انجام دیا تھا، برسوں کا مسئلہ منٹوں میں حل ہوگیا ورنہ
معلوم نہیں آپ کو کتنے برس اور پاپڑ بیلنے پڑتے!

کوئی دو بجے ہوں گے کہ کھانا میز پر چنا گیا، لڑکیوں
کے لئے علحدہ انتظام کیا گیا تھا، بیویاں ہمارے ساتھ
بیٹھ گئیں، جن بیویوں نے اس "پاٹ لک" میں حصہ
لیا تھا ان کے ناموں کے اعلان کے ساتھ میز پر ڈشیں
آنے لگیں۔ اس گنگا جمنی پارٹی میں کوئی تیس آدمی ہوں گے
ان سب کے لئے ایک بہن نے سولہ "شکم پر" جن میں آدھا گوشت
اور آدھا چنے کا آٹا تھا اور جن کے پیٹ مسالہ سے خالی
تھے، خاص طور پر تیار کر کے لائے تھے، کسی نے دو سیر
باریک چاول ہی ابال لائے تھے، کسی نے کھٹی دال پر
ہی قناعت کی تھی، کسی نے کہارے بیگن خوب مرچ ڈال
کر پکائے تھے جس کو لوگ اچار کی طرح کھا رہے تھے۔
اور اس طرح کفایت شعار بیویوں نے اپنی "آخر بینی"
کا ثبوت دیا تھا بعض فضول خرچ بیویوں نے آٹھ دس
مرغ کے کباب اور دو چار سیر کے کوفتے لا کر اپنی "عاقبت
نااندیشی" ظاہر کی تھی۔ جب میٹھے کی باری آئی تو سب
کی سب ایک دوسری کا منہ تکنے لگیں

چائے کے دودھ کی "کاغذی" بالائی کی ایک پلیٹ دو
تین تولے شکر کے ساتھ سامنے آئی، اس کے چکھنے والے
دو چار ہی تھے مگر دیکھتے رہے باقی سب!!!

کھانے کے بعد ایک پارٹی پچیسی کھیلنے بیٹھ گئی اڑتے
جوش و خروش سے ہنستے پڑتے نئے شرط یہ تھی کہ جو پارٹی
ہارے فی کس دو روپے دینا ہوگا اقسمت تو دیکھئے اس
پارٹی ہی ہاری جسکے ہم بھی ممبر تھے۔ جیتنے والی پارٹی
پہلے زوجیت کی خوشی میں خوب چیخ پکار مچائی اور پھر لگی ہارنے
والوں سے روپیہ وصول کرنے! اس تفریح میں بڑی
دھینگا مشتی ہونے لگی مگر کسی نے بھی شرط پوری نہیں کی نتیجہ
یہ ہوا کہ ہارنے والوں کی چیزیں غائب ہونا شروع ہوئیں

کسی کی ٹوپی غائب تو کسی کا جوتا! کسی کی شیروانی کہیں روپوش ہو گئی تو کسی کا کوٹ، کسی کا پاندان رفوچکر ہوا تو کسی کی اُگالدان، غرض کہ ایک ہڑبونگ مچ گئی!! آخر میں جب ہارنے والی پارٹی نے پختہ وعدہ کیا کہ اپنی اپنی ہار گھر جاتے ہی بھجوا دیں گے تو سب چیزیں واپس کر دی گئیں مگر یہ پکا وعدہ آج تک پورا نہیں ہوا!

اس ہنگامے کے بعد چائے کا دور شروع ہوا، چائے جس بہن کے ذمہ تھی انھوں نے غالباً چائے کی ان گنت خرابیوں کا لحاظ کر کے دو آنے والی ایک عدد پیکٹ کو کافی سمجھا تھا اور شکر لانا بھول گئی تھیں۔ ادھر اودھر چائے کی تلاش میں نوکر دوڑے بڑی مشکل سے دو چار تولہ اور مل گئی، جنھیں چائے کی شدید عادت تھی صرف ان ہی کی حد تک چائے کو محدود کر دیا گیا، البتہ بسکٹ خاص مقدار میں تھے سبھوں نے بسکٹ والی بہن کا شکریہ ادا کیا اور خالص مسکہ کے نمکین بسکٹ کھا کر ہم نے تالاب کا میٹھا پانی پیا اور چلے سب کے ساتھ گلگشت کرنے!

کبھی ہم سے چھپنے والی لڑکیاں آگے آگے چلتی تھیں اور ہم ان کے پیچھے دس پندرہ قدم کے فاصلہ پر رہتے تھے اور کبھی ہم آگے چلتے تھے اور لڑکیاں صرف اس قدر پیچھے رہتی تھیں کہ ان کی بات چیت ہم اچھی طرح سن سکتے تھے مگر نہ ہم انھیں دیکھتے تھے اور نہ وہ ہم پر نظر ڈالتی تھیں ہمارے دوربین والے دوست اب بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر عینک کے اندر سے برابر لڑکیوں کو گھور رہے تھے بیچارے نظر کی کمزوری کی وجہ سے اس جھرمٹ میں اس لڑکی کو پہچان نہ سکے جس کے کارن انھوں نے اپنی دوربین کی دو نالی آنکھیں پھوڑ لی تھیں۔

لڑکیاں چمن میں پہنچتے ہی جھولے پر چڑھ گئیں اور باری باری سے، دو دو گھڑی جھولنے لگیں، ہم اور ہمارے دوست ایک درخت کی آڑ لے کر یہ تماشا دیکھنے لگے، جب آپ کی منگیتر جھولے پر چڑھنے لگی تو ہم نے چپکے سے ہمارے دوست کے کان میں کہا۔

جھولنے والی ہے رشک گل لالہ جھولا
جا کے بلبل تو رگ گل کا بنالا جھولا"

پہلے تو ہمارے دوست اس شعر پر خوب پھڑکے مگر منہ پھلا کر کہا واہ کیا خوب! ہم آپ کو بلبل دکھائی دے رہے ہیں!! ہم نے کہا "آپ تو کبس جھٹ خفا ہیں! بات کو سمجھتے ہی نہیں!!! اجی آپ بلبل ہیں اور "وہ" گل!!! آیا کچھ سمجھ کی بیچ میں"؟

اس جملہ پر اس زور سے قہقہہ لگایا کہ سارا چمن زعفران زار بن گیا اور لڑکیاں جھولے پر سے کود کود کر بھاگنے لگیں! اب اندھیرا ہو گیا تھا چاند کے نکلنے میں بہت دیر تھی اس لئے سبھوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔

اس پکنک کے کوئی پندرہ دن بعد ہمارے دوست دولہا بنے اپنی دیکھی بھالی دلہن کے گھر پر رونق افروز تھے ہمارے مشورہ پر عمل کر کے اس طرح انھوں نے چٹ منگنی پٹ بیاہ کر لیا اور اپنی تلون مزاجی جان کو ہمیشہ کے "آل انڈیا چکر" سے نجات دلا دی!!

"باغبان"

کھوئے ہوئے لمحات

یاد ہے، یاد ہے بیداری کسی کی اب تک　　پھانس آخر یہ مرے دل میں رہیگی کب تک
اپنے کھوئے ہوئے لمحات کو پاؤں کیسے　　بھول جائیں مجھے لیکن میں بھلاؤں کیسے

کروٹیں لینے لگے ہائے وہ سوتے سوتے
میری بے چینیاں بڑھنے لگیں چپکے چپکے

صبح خفتہ پہ وہ انوار کا مائل ہونا　　مرمریں جسم کی پریوں کا نہانا نازل ہونا
ماہِ دوہفتہ کا محروم صباحت ہونا　　جھلملاتے ہوئے تاروں کا وہ رخصت ہونا
بادِ مسرور کا وہ آپ سے باہر ہونا　　حرکت و زیست کا ہر چیز سے ظاہر ہونا

کتنا جانسوز تھا سورج کا ابھرنا توبہ!
جیب تسکین کا مری اور بکھرنا توبہ!

چوڑیاں بجنے لگیں ہاتھوں کی اب تو پیہم　　شوق وارمان کا اللہ رے مضطر عالم
آنکھیں کھولیں مجھے دیکھا تو بہت شرمائے　　مری دزدیدہ نگاہی سے بہت گھبرائے

میں بھی اٹھا کہ چلوں منظر فطرت دیکھوں
جلوۂ حسن کی پاکیزہ نزاکت دیکھوں

میں نے دیکھا کہ ہیں وہ زلفوں کو سیدھا کرتے　　میری قسمت کی سیاہی کو ہیں یکجا کرتے
عریاں سینہ کو چھپاتے ہوئے لی انگڑائی　　اور پھر اس طرح اٹھے کہ قیامت آئی
فتنے ٹھوکر سے جگاتے وہ چلے اور چلے　　حوصلے میرے بڑھاتے وہ بڑھے اور بڑھے

گوری باہیں مری گردن میں حائل کر دیں
مجھ میں اللہ میں خود بینیاں حائل کر دیں

سلیمان ادیب

جدید مطبوعات

(۱) زندگی (حیات انسانی پر تبصرہ) از چودھری افضل حق قیمت عالہ/
(۲) دنیائے اسلام کا ماضی و مستقبل از اظہر امرتسری قیمت ۴ہ/
(۳) سازِ مشرق (غزلیات) از سید خیرات علی بیتاب (۱۵۰ صفحات) قیمت ۱۲/
(۴) تصورات (افسانے) از ملک سلیمان فاروقی قیمت ۸ہ/
(۵) کربلا کے بعد (تاریخ) از سید عزیز حسن بقائی (۳۶۰ صفحات) قیمت ۸ہ/
(۶) شاعر کی دنیا (چالیس شعرا کا منتخب کلام) مرتبہ محمد عظیم الدین محبت ۹۶ صفحات) قیمت ۶/
(۷) شادی کی جاتی ہے (ڈراما) از غلام محی الدین مائل (۴۰ صفحات) قیمت ۸ہ/
(۸) انتخاب الہلال (مولانا آزاد کے مضامین) مرتبہ ادبستان لاہور قیمت ۸ہ/
(۹) ید بیضا (اسلامی و معاشرتی مضامین) از ڈاکٹر نجم الدین احمد قیمت ۸ہ/
(۱۰) تاریخ اسلام حصہ اول از شاہ معین الدین احمد ندوی قیمت ؎
(۱۱) تاریخ اخلاق اسلامی از عبدالسلام ندوی قیمت عالہ
(۱۲) پیامِ شباب (بنگال کے مشہور شاعر قاضی نذرالاسلام کی نظموں کا ترجمہ) قیمت عہ/
(۱۳) ایک معمولی سی عورت (آسکر وائلڈ کے ڈرامہ کا ترجمہ) از صغیر احمد خاں قیمت عہ/
(۱۴) انقلابی افسانے۔ از گوپال متل بی۔ اے قیمت عہ
(۱۵) مقروض قوم۔ از مسلم بی۔ اے (۲۱۱) صفحات قیمت عہ
(۱۶) دنیا ایک کہانی ہے۔ (افسانے) از شانتی نرائن پوری (۱۹۰ صفحات) قیمت ۶/
(۱۷) جہاتما سقراط۔ از ڈیوتا سروپ بھائی پرمانند جی (۲۰۲ صفحات) قیمت ۴ہ/
(۱۸) تاریخ مسلم لیگ۔ از منشی ندیم صہبائی (۱۹۲ صفحات قیمت ۸/
(۱۹) قوم کی آواز (گاندھی جی کی تقریر اور ان کے سفر کے حالات) از سید عابد حسین ۲۹۴ صفحات قیمت ۴ہ/
(۲۰) سوراجیہ کا راستہ از نرائن دت سہگل ۲۰۸ صفحات قیمت ۴ہ/
(۲۱) چاند سورج کی چوری (افسانہ) از محمد رحیم الدین حسن (۱۶۰ صفحات) قیمت ۱۴/
(۲۲) گلستانِ خیالی (رسالہ جوہر نسوان کا خاص نمبر) مرتبہ غدیر فاطمہ ۱۹۱ صفحات قیمت ۸ہ/
(۲۳) سائنس کے کرشمے از میر حسن ایم۔ اے ۱۱۲ صفحات قیمت عہ
(۲۴) مکتوبات شاد عظیم آبادی مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور (۳۰۰ صفحات) قیمت عالہ/
(۲۵) ارسطو جاہ از عبدالمجید صدیقی ۶۴ صفحات قیمت ۶/

مرزا سیف علیخاں

ہوڑہ ایکسپریس

آرہا تھا میں نجیب آباد سے لاہور کو — کر رہا تھا یاد دل ماضی کے دھندلے دور کو
یوں گرجتی جارہی تھی سرد ویرانوں میں ریل — کھیلتے ہوں دوزخی جس طرح انگاروں سے کھیل
آندھیوں کے سامنے بڑھتی خرامِ ناز سے — منتظر لوگوں کو چونکاتی ہوئی آواز سے
توڑتی جنگل کی خاموشی صدائے تیز سے — ہانکتی تاریکیوں کو نور کی مہمیز سے
پٹڑیاں گونجی ہوئیں دہشت فزا جھنکار سے — جنگلوں میں زلزلہ سا آہنی رفتار سے

چرخ پر تارے زمیں پر یہ چراغاں رواں
ایک ساکن کہکشاں اک چلتی پھرتی کہکشاں

سینۂ صحرا کو لرزاتی ہوا سے کھیلتی — زلزلوں کو لوریاں دیتی فضا سے کھیلتی
بھاگتی، رکتی، جھپٹتی، زلف بکھراتی ہوئی — خارزاروں پر دھوئیں کے ابر پھیلاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں دھوئیں کی چاشنی دیتی ہوئی — اونچی نیچی راہ میں انگڑائیاں لیتی ہوئی
سینۂ گنگا پہ دلکش راگنی گاتی ہوئی — چوٹ کھائے اژدہے کی طرح بل کھاتی ہوئی

گاہے ویرانوں میں گاہے بستیوں میں آگئی
رات کی تاریکیوں کو منتشر فرما گئی

تان لیتی اور برساتی ہوئی شعلوں کے راگ — ہر نفس پر تیز تر کرتی ہوئی سینے کی آگ
دامنِ کہسار میں بھرتی ہوئی شعلوں کے پھول — حال و مستقبل تبسم پاش اور ماضی ملول
جارہی تھی ہونکتی رفتارِ محشر خیز سے — پھاندتی نالوں کو اندازِ جنوں انگیز سے
ٹوٹتی راتوں میں اُف بجتے ہوئے دریا کے پل — آگ کا غصہ دھوئیں کی برہمی لوہے کا غل

سبز و سرخ آئینوں کی تابانیوں کو دیکھتی
جنکشنوں پر نور کی ارزانیوں کو دیکھتی
حاکموں کے حکم کی تعمیل پر مرتی ہوئی
آگئی لاہور، ہوڑہ سے سفر کرتی ہوئی

مسیح الحسن تقا نقوی البخاری

بجنور ہاؤس بیرون شیرانوالہ دروازہ لاہور

دعوتِ نظر

میں ہی میں ہوں کوئی ہشیار کہے جاتا ہے
وہ ہی وہ ہیں کوئی سرشار کہے جاتا ہے

ہمہ اوست اس کی خودی کے لئے مرکز اے دوست
اس کا ناداں "انا" بھی ہے متاعِ ہمہ اوست

ہوش افزا ہے مجھے غلغلۂ ہشیاری
کاش سمجھے اسے تو بھی جرسِ بیداری

انحصار من و تو ٹھیک نہیں، سب سمجھیں
وقت ہے خود کو سمجھنے کا یہی، اب سمجھیں

خود شناسی سے ہے امید کہ بن جائیگا کام
ورنہ اس حالِ زبوں کا ہے تباہی انجام

نہ بصارت نہ بصیرت نہ عزیمت ہم میں
کام کرنے کی نہیں نام کو ہمت ہم میں

اک خودی تھی سو کیا اس کو بھی غفلت کے سپرد
زندگی کی ہوئی یہ لہر بھی یوں دریا بُرد

اس طرف دیکھ فریسان اروپا کی نمود
آج بالذات جو قایم ہے، وہ ان کا ہے وجود

رازِ تقدیر کھلا ان کے عمل سے ان پر
اپنے در پے ہے فقط بے عملی کا چکر

حُسن کاری کا مذاق ان سے ہوا آئینہ
نئی دنیا کا یہ منظر ہے نیا آئینہ

ایسی وحدت پہ نہ ہو کس لئے کثرت شیدا
ایک منزل سے ہیں ہفتاد منازل پیدا

ان کی دنیا ہے نئی اپنی پرانی دنیا
بن گئی اپنے لئے رام کہانی دُنیا

اور باتوں میں تو کیا خاک ملے گی جدت
جب زباں میں بھی گوارا نہیں کوئی جدت

چشم بردا و نظر آتے ہیں وہ نقد نگار
جن کی فطرت کو اُپج سے نہیں بالکل سروکار

نئی ترکیب اگر ان کو کہیں مل جائے
برہم اتنے ہوں کہ پامال زمیں ہل جائے

"پھر یہ ہیں اور ادب سوز مداراتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں" (علامہ اقبالؒ)

سید علی منظور

مرقع سخن (جلد اول) یہ دکن کے پچیس[۲۵] شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ ہے۔ جامعۂ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ طلبا و فارغین اور اہلِ قلم نے اس تذکرہ کی تالیف میں حصہ لیا ہے یہ تذکرہ پانچ دوروں پر منقسم ہے ہر دو کے شروع میں ایک تمہید ہے جس میں اسکی ادبی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے ہر عہد کے مشاہیر شعراء کے حالات ان کے کلام کا نمونہ اور اس پر تبصرہ ہے ان شاعروں کے تذکرہ کے ساتھ دیگر ہمعصر دکنی اور شمالی ہند کے شعراء کے نام دیدیے گئے ہیں تاکہ اردو شاعری کا تاریخی منظر معلوم ہو سکے شاعروں کی تصویروں کے علاوہ فرماں روایانِ دکن اور قدردانانِ ادب و شعر کی بھی تصویریں شریک ہیں۔

(صفحات (۳۹۲) تصاویر (۴۵) قیمت مجلد (ص)

تنقید و تبصرہ

نقوش سلیمانی یہ کتاب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڑھ کی اردو زبان اور ادب سے متعلق تقریروں تحریروں اور مقدموں کا مجموعہ ہے اور رائل سائز کے تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے پہلے ڈیڑھ سو صفحات میں مختلف خطبے درج ہیں۔ ان کے بعد دو سو صفحات میں مقالے اور آخر میں تقریباً سو صفحات میں مقدمے شامل ہیں یہ سب تحریریں اردو زبان اور ادب کے متعلق مفید معلومات اور کارآمد مشوروں سے معمور ہیں۔ اس کی قیمت عہ ہے پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

مولوی سید سلیمان صاحب ندوی علامہ شبلی نعمانی کے بعد اردو کے واحد ادیب ہیں جن کا اسلوب نہایت سنجیدہ اور عالمانہ ہونے کے باوجود خشک نہیں ہونے پاتا۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا نقطۂ نظر اردو زبان سے متعلق کہیں کہیں مولویانہ ہو جاتا ہے، جیسا کہ خود اس کتاب "نقوش سلیمانی" کے نام سے ظاہر ہے جس کو دیکھتے یا سنتے ہی عام طور پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شاید تعویذ فلیتوں یا اوراد و وظائف کی کوئی کتاب یا بیاض ہوگی۔ اس ایک خصوصیت کے قطع نظر پوری کتاب اردو کے متعلق مفید معلومات سے مملو ہے۔ اس کے مصنف کی نظر اردو ادب کے علاوہ ہماری زبان کے بھی بعض اہم پہلوؤں پر پڑتی ہے۔ مثلاً جب انھوں نے اردو ادب کے متعلق تاریخی معلومات کا اظہار کرتے وقت قدیم اردو یا دکھنی ادب اور اس کے شعرا و مصنفین کا بھی تذکرہ کیا ہے زبان پر نظر ڈالتے وقت بعض ایسے لسانی اور صوتی پہلوؤں کو بھی پیش کیا ہے جو پرانے تعلیم یافتہ اصحاب کے پیش نظر نہیں رہتے بلکہ جدید ترین تحقیقات اور محققانہ نقطۂ نظر سے اردو زبان پر کام کرنے والوں کے زیر بحث آتے ہیں۔

یہ کتاب قابل قدر ہے نہ صرف اس لئے کہ اس کے مصنف علوم اسلامی کے ایک ایسے بلند پایہ محقق ہیں جن سے اردو پر کام کرنے کی توقع نہیں ہو سکتی تھی، بلکہ اس لئے بھی لائق ستایش ہے کہ عہد حاضر میں کسی اردو مصنف نے اپنی زبان کے لسانی اور صوتی پہلوؤں کی طرف توجہ نہیں کی ہے حالانکہ اسی کی آج کل بے حد ضرورت ہے۔

"ق"

میری کہانی میری زبانی مجم ۲۲۸ صفحات قیمت ( ) ۔ یہ مولوی سید ہمایوں مرزا مرحوم بیرسٹر ایٹ لا کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے۔ جس کو ان کی بیگم صاحبہ محترمہ صغرا بیگم نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے اس کتاب میں مرحوم نے بہت ہی دلچسپ اور مفید باتیں قلمبند کی ہیں۔ ہمایوں مرزا مرحوم صوبۂ بہار کے ایک صاحب فضل و کمال خاندان کے چشم و چراغ تھے ان کے والد سید شاہ الفت حسین فریاد پٹنہ کے صاحب ذوق رئیسوں میں سے تھے اور مرزا عبدالقادر بیدل کے بعد سرزمین عظیم آباد نے ایسا بلند مرتبہ شاعر عالم و فاضل اور صاحب ذوق نہیں پیدا کیا۔ ان کے شاگردوں اور فیض یافتوں میں نواب امداد امام اثر اور سید علی محمد شاد بہادر شاد کے نام لے دینا ہی کافی ہے۔ ایک صاحب کمال کے فرزند ہونے کے علاوہ ہمایوں مرزا مرحوم میں یہ خوبی بھی تھی کہ انھوں نے نہ صرف خود تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رکھا بلکہ اپنی جوان ہمت رفیقۂ زندگی کی تصنیف و تالیف میں بہت بڑا حصہ لیا۔ واقعہ یہ ہے کہ صغرا ہمایوں مرزا کی ہمہ باشان ادبی زندگی ان کے قابل فخر شوہر کی ہمت افزائیوں اور مشوروں ہی کی رہین منت ہے جس کا خود محترمہ کو اعتراف ہے۔

ایک ایسے شخص کے خود نوشتہ حالات یقیناً قابل مطالعہ ہیں افسوس ہے کہ یہ کتاب مصنف مرحوم کے آخر عمر تک کے حالات پر مشتمل نہیں ہے۔ اور اس میں ہمایوں مرزا صاحب نے اپنے ذاتی حالات سے زیادہ اپنے زمانہ کے واقعات اور معاشرت کو پیش کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ

نام ونمود اور خود نمائی سے بھاگتے تھے۔ اور یہ اگرچہ ایک خوبی ہے لیکن ان کی رفیقۂ حیات نے اس کو ان کے فطری حجاب اور جھجک سے تعبیر کیا ہے۔ اور کوشش کرتی رہی ہیں کہ ان کے اس عیب کو اپنے کاموں اور نام وری کے ذریعے سے دور کریں۔ جو اصحاب عظیم آباد کی معاشرت اور علمی وادبی احول سے واقف ہونا چاہتے ہوں وہ ضرور اس کتاب کا مطالعہ کریں جس طرح مولوی عبدالحلیم شرر نے اپنی کتاب "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" میں لکھنؤ کی تہذیب وتمدن کو زندہ کر دیا ہے اسی طرح ہمایوں مرزا نے عظیم آباد کی تہذیب وتمدن کو محفوظ کر دیا ہے۔ "ق"

گل نغمہ مجموعہ ہے عظیم الدین احمد صاحب کے کلام کا جس کو بی ڈی کھنا وانا پور پٹنہ نے شائع کیا ہے۔ یہ تقریباً ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے اس کی قیمت (عا) ہے۔ اور مختلف سرخیوں مثلاً رقص بسمل، صدائے خاموش اور نغمۂ جوش کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔ اس کا مقدمہ کلیم الدین احمد صاحب نے لکھا ہے جس میں ہر حصۂ کتاب کی خصوصیتیں وضاحت سے بیان کی گئی ہیں۔ عظیم الدین صاحب کی ہر عمر کی کئی تصویریں بھی کتاب میں شامل ہیں وہ ایک کہنہ مشق اور مسلم شاعر ہیں جدید طرز کی نظمیں لکھنے میں بھی انھوں نے کامیابی حاصل کی ہے۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے بہت سے اچھے شاعر ابھی اردو دنیا میں پوری طرح سے معروف نہیں ہیں اور ضرورت ہے کہ ہر صوبے کے خدمت گزاران اردو کی خدمات کو شائع کرکے منظر عام پر لایا جائے۔ کلام کے نمونے کے طور پر چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔

پھر بہار آئے گی پھر جوش میں سودا ہوگا ... زخم دیرینہ سے پھر خون ٹپکتا ہوگا
کیا کوئی موت ہے غفلت کہ نہ چونکا جائے ... زندگی ہے تو سنبھلنے کا تقاضا ہوگا
ہے کف خاک میں امکانِ دو عالم پنہاں ... اس کا ذرہ کبھی دریا کبھی صحرا ہوگا "ق"

محاوراتِ اردو حجم ۱۴۴ صفحات قیمت ۸ر پتہ پریم بک ڈپو سہارن پور۔ اس چھوٹی سی کتاب میں مولوی حافظ عبدالکریم صاحب مفتون نے طلبائے مدارس کے استفادہ کی غرض سے بہت سے اردو محاوروں کو حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ یکجا کرکے ان کے معنی اور ان کے استعمال کے طریقے بتائے ہیں۔ اس قسم کی کتابوں کی اردو میں بے حد کمی ہے اور اردو محاوروں کی ایک مبسوط و مکمل فرہنگ کا مرتب ہونا بھی ضروری ہے۔ مفتون صاحب نے یہ کام طلبہ کے استفادہ کے لئے کیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کوئی صاحب اسی طرح اردو کے پورے محاورے بھی معانی اور طریقۂ استعمال کی وضاحت کے ساتھ مرتب کریں۔ یہ ایک صبر آزما کام ہے۔ اور ایک شخص کے بس کی بات بھی نہیں اور جب تک ایسا مبسوط و مکمل کام نہ ہولے پیش نظر کتاب ہی ہماری قدر دانی کی مستحق ہے۔ اعلیٰ اردو جماعتوں کے طلبہ کے علاوہ عام اردو داں اصحاب بھی اس کتاب سے استفادہ کرسکتے ہیں۔ "ق"

دیوانِ ثاقب حجم ۲۰۵ صفحات قیمت (عہ) پتہ: محمود آباد ہوس، قیصر باغ لکھنؤ۔ گزشتہ نمبر میں ہم نے سلسلۂ یادگار مہاراجہ محمود آباد کی ایک کتاب "گیسں کا دفاع" پر تبصرہ کیا تھا۔ دیوان ثاقب اسی سلسلہ کی پہلی کڑی ہے۔ مرزا ذاکر حسین ثاقب قزلباش لکھنوی عہد حاضر کے مشہور و معروف اساتذۂ سخن میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مہاراجہ محمود آباد قابلِ مبارک باد ہیں کہ انھوں نے اردو تصانیف و تالیف کی اشاعت کا ایک مفید سلسلہ قائم کیا اور اس کی طرف سے ثاقب جیسے پختہ مشق شاعر کا کلام شائع کیا۔ ثاقب زبان میں میر کی پیروی کرتے ہیں۔ اور تخیل کا جہاں تک تعلق ہے غالب تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ چونکہ خود بھی اکبرآبادی الاصل ہیں اس لئے اپنے پیش رو میر اور غالب کی خصوصیات یا تو اکتساباً پیدا کیں یا فطری طور پر وطن کے تعلق سے ان میں بھی پیدا ہو گئیں۔ وہ زیادہ تر غزل گو

ہیں اور نام و نمود کے لالچ کے باوجود نظم گوئی میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ ان کی ایک غزل کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ وہ میر وغالب کی خصوصیات کو کسی خوبی سے نباہتے ہیں۔

کم سمجھتا ہے محبت میں فنا ہو جانا — دل کی قسمت میں ہے کیا جانئے کیا ہو جانا

دام الفت نے قفس مجھ کو دکھایا آخر — خوف کہتا تھا کہ گلشن سے ہوا ہو جانا

زندگی ہے ترے بڑھنے ہی تک اے زلف دراز — چوم کر ان کے قدم میری بلا ہو جانا

ڈھونڈتا ہے چمن عشق میں کیا فصل بہار — خون رلوائے گا زخموں کا ہرا ہو جانا

لطف آزادی دل ان کی اسیری میں ہے — اک نئی قید ہے زنداں سے رہا ہو جانا

جیتے جی آئے قیامت تو مزہ ہے ثاقب — دیکھ لیں وعدۂ فردا کا وفا ہو جانا

دیوان ثاقب کی ترتیب کا ایک عیب ضرور قابل ذکر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس میں اصل دیوان سے زیادہ جگہ ان تبصروں، تقریظوں اور دیباچوں کو دی گئی ہے جو کلام ثاقب کے متعلق لکھے یا لکھوائے گئے ہیں۔ ثاقب ایسے شاعر نہیں ہیں کہ ان کا کلام بہت سے وکیلوں اور مددگاروں کی مدح سرائیوں کے بغیر شایع نہیں ہوسکتا۔ اس میں صرف ان کے حالات زندگی کو شامل کرنا چاہیے تھا اور یہ تمام تبصرے اور تقریظیں جو اس کے ساتھ شایع ہوئی ہیں، وہ اگر اس دیوان کی بجائے اردو کے مختلف ماہناموں میں شایع کی جاتیں تو بہتر ہوتا کیونکہ ان کو پڑھ کر لوگ دیوان ثاقب کی طرف متوجہ ہوتے۔ "ق"

محبت کی چھاؤں حجم ۱۳۲ صفحات قیمت ۱۲؍۔ مرزا ظفر الحسن صاحب بی اے عثمانیہ کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے جو کسی دلنواز کے نام معنون کیا گیا ہے۔ اور ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شایع ہوا ہے۔ اس کا تعارف پروفیسر سروری صاحب نے لکھا ہے جو قصہ نگاری کے فن کے متعلق ایک خاص بصیرت رکھتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس ادارہ کی طرف سے شایع کئے ہوئے پہلے مجموعہ "من کی دنیا" کی طرح "محبت کی چھاؤں" بھی نوجوانی کے البیلے پن اور شباب کی رعنائیوں سے الامال ہے۔ فرق اس قدر ہے کہ "من کی دنیا" کا مصنف اپنے محبوب کو دور سے دیکھتا ہے اور اس کے الھڑپن سے اس کو سابقہ نہیں پڑا۔ محبت کی چھاؤں کا مصنف اپنے دلنواز سے کھیلتا ہے اور بعض جگہ اس کے ناز و انداز کا مضحکہ بھی اڑاتا ہے۔ اس کے افسانے زندگی سے بہت قریب ہیں وہ بات میں بات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے مکالمے شگفتہ اور بے باک ہیں۔ اس کا دلنواز کسی کالج کا نیم تعلیم یافتہ بت طناز ہے جس میں نہ ادائے کافرانہ ہوتی ہے اور نہ شان دلبرانہ۔ یہی وجہ ہے کہ افسانہ نگار قدیم طرز کے عاشقوں اور عقیدت مندوں کے شیوے کے برخلاف اس کو جگہ جگہ چھیڑتا اور برابر کی چوٹ کرتا چلا جاتا ہے۔

افسانوں کا یہ مجموعہ صحیح معنوں میں اُس ماحول کا ترجمان ہے جس میں آج کل کے تعلیم یافتہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی زندگیاں بسر ہو رہی ہیں۔ جن نوشابوں نے اس کوچے میں کبھی قدم رکھا ہے۔ وہ جب ان افسانوں کو پڑھیں گے تو انھیں ان میں سے اکثر خود اُن کی آپ بیتی نظر آئیں گے۔ اور جو لوگ اس دور سے گزر چکے ہیں وہ ان افسانوں کے مطالعہ سے معلوم کریں گے کہ مرزا ظفر الحسن صاحب تقلیدی مصنف یا افسانہ نگار نہیں ہیں۔ ان میں جدت اور قوت تخیل کی ایسی فراوانی ہے کہ قدیم طرز افسانہ نگاری سے ہٹ کر انھوں نے اپنے لئے ایک نیا میدان

نکال لیا ہو نہ تو جدید شباب یاتی اور یک گونہ عریاں ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے اور نہ قدیم عشق عاشقی کے افسانوں میں شامل ہو سکتا ہے۔ یہی وہ انفرادی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب یقیناً مقبول ہوگی۔ "ق"

مقالاتِ ہاشمی یہ کتاب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کے ان علمی و تحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جو گزشتہ دس سالوں میں لکھے اور مختلف رسائل میں شائع کئے گئے ہیں۔ یہ مضامین اردو ادب کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے کے لئے مفید ثابت ہوں گے۔ خاص کر تاریخ ادب اردو کی ترتیب و تدوین میں ان سے بڑی مدد مل سکتی ہے جو اصحاب اپنی زبان اور ادب کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے اس مجموعے میں کافی ذخیرۂ معلومات موجود ہے۔

یہ کتاب تاج کمپنی لاہور سے چھپی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ناشرین نے ترتیب و تدوین میں کسی لائق شخص سے مدد نہیں لی اور نہ مولف ہی کی رائے کو دخل دیا۔ اس لئے کہ نہ ابتدا میں مضامین کی فہرست شامل ہے اور نہ ہر مضمون کسی نئے صفحے سے شروع ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے مطالعہ کرنے والے کو کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ اس مجموعے میں کتنے اور کون کون سے مضمون شامل ہیں اور یہ کہ کونسا مضمون کہاں ختم ہو رہا ہے اور کہاں سے شروع ہو رہا ہے۔ اگر اسی طرح بے ترتیبی اور بدتمیزی سے کتابیں چھپتی رہیں تو اردو کو بے حد نقصان پہنچے گا۔

اس کتاب کا پیش لفظ مولوی فرحت اللہ بیگ صاحب نے لکھا ہے اور جیسا ان کا عام اسلوب ہے اس میں بھی شگفتگی اور دلچسپی کی فراوانی ہے۔ اس کتاب کے اکثر مضامین محققانہ ہیں اور اعلیٰ اردو جماعتوں کے طلبہ اور تاریخ و تحقیق کا ذوق رکھنے والوں کو ان سے ضرور استفادہ کرنا چاہیے۔ کتاب چھوٹی کراؤن سائز کے ۴۶۲ صفحات پر چھپی ہے اور مجلد ہے۔ قیمت عہ/ "ق"

اردو ہندی اڑتالیس صفحات کا ایک رسالہ ہے جس میں اردو کے مشہور ادیب ام اسلم نے اردو ہندی کے معرکۃ الآرا مسئلہ پر بحث کی ہے۔ اصل میں اسلم صاحب نے رسالہ ساقی میں ایک مضمون شائع کیا تھا جس کو کچھ اضافہ کے ساتھ اب کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ مضمون آل انڈیا ریڈیو کی ان چھ تقریروں کا تبصرہ ہے جو ملک کے چھ نامور بزرگوں سے فروری ۱۹۳۹ء میں "ہندستانی کیا ہے" کے عنوان پر کرائی گئی تھیں۔ اسلم صاحب نے ان سب پر نہایت صحتِ ذوق کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ یہ مسئلہ روز بروز پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے اس لئے اس پر جو بھی قلم اٹھاتا ہے اس کو خواہ مخواہ ان سیاسی اور مذہبی جھگڑوں کی طرف اشارہ کرنا پڑتا ہے جن کی وجہ سے یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اسلم صاحب نے اردو کی تائید میں بعض اچھے نکات پیش کئے ہیں۔ اردو والے ان کی ضرور داد دیں گے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہندی والے ان کو ماننے کے لئے تیار ہو سکیں گے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سوال ادیبوں اور شاعروں یا بحث و مباحثے سے طے ہونے والا نہیں ہے۔ زمانہ اور قوت و سیاست ہی اس کو سلجھائے گی۔ اور جو قوم سیاست کے داؤ پیچ اور قوت کی افزائش سے زیادہ کام لے گی اسی کی اس بازی میں جیت رہے گی۔ "ق"

ہندستانی یہ بھی چوبیس صفحات کا ایک رسالہ ہے جس کے لکھنے والے سید مہدی حسین صاحب عثمانیہ ہیں اور جو بزم ادب عثمان شاہی کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ یہ بھی آل انڈیا ریڈیو کی ان تقریروں کو سن کر یا پڑھ کر لکھا گیا ہے جو "ہندستانی کیا ہے؟" کے عنوان پر کرائی گئی تھیں۔ اس کے مولف نے بھی بڑی محنت کے ساتھ اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اب اردو کا ذوق رکھنے والے ان مسائل سے دلچسپی لے رہے ہیں اور یہ بزم ادب قابل مبارکباد ہے کہ اس نے اپنے کام کا آغاز اس رسالہ کی

اشاعت سے کیا ہے۔

"ق"

جذباتِ شاکر حصہ اوّل سید عزیز حیدر صاحب شاکر تلمیذ جناب بسمل صاحب واسطی کی چند غزلوں کا گلدستہ ہے جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاکر صاحب کی طبیعت میں روانی اور جوش بلا کا موجود ہے اور چونکہ وہ اسی جوش کے عالم میں شعر کہتے ہیں اس لئے زبان اور خیال کی مناسبت کا خیال نہیں رکھ سکتے۔ اگر یہ اسی طرح مشق سخن جاری رکھیں اور اپنی ہر غزل کو چھپانے کے خیال سے نہ لکھیں تو اچھے غزل کہنے والوں کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں۔

"ق"

حیات و کلیات اسمٰعیل مصنفہ خان بہادر محمد اسلم سیفی رائل تقطیع ۴۱۹ صفحات نفیس کتابت اور طباعت مطبوعہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی قیمت للعہ۔ اسمٰعیل میرٹھی اردو شاعری میں ایک نئی طرز کے موجد تھے۔ یوں تو انھوں نے قدیم اساتذہ کے انداز میں بھی کلام سرانجام کیا ہے، لیکن ان کا بیش بہا سرمایہ ان کی وہ نظمیں ہیں، جن کے مخاطب' بظاہر کم عمر بچے ہیں، لیکن فی الحقیقت وہ ہر عمر اور ہر مذاق والوں کے لئے یکساں دلچسپی کا سامان رکھتی ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کے بعد اردو کے وہ سب سے پہلے شاعر ہیں، جن کی نظموں میں ہندوستان کی دیہی زندگی کے حقیقی اور دلکش نظارے' موجود ہیں۔

پیش نظر کلیات ان کے پورے کلام پر حاوی ہے۔ اسمٰعیل' حالی کے دبستان کے پیرو تھے' اور قدیم طرز کی وہ حالی سے زیادہ شد و مد کے ساتھ مخالفت کرتے تھے۔ اسی لئے ان کی غزل میں اخلاق کا عنصر زیادہ اور عشق و محبت کا عنصر کم ہے۔ انگریزی نظموں کے اولین منظوم اردو ترجمے یا ان کی تقلید میں نظمیں لکھنے کا سہرا اسمٰعیل ہی کے سر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسمٰعیل' حالی کی کوششوں سے بہت متاثر تھے، لیکن انھوں نے کبھی حالی کی لفظاً یا معناً تقلید نہیں کی بلکہ اپنی اپج سے کام لے کر' اردو میں ایک خاص طرز کے موجد بنے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جدید طرز میں آزاد کا انداز' انھیں زیادہ پسند تھا، چنانچہ بعض نظموں' مثلاً " آب زلال" وغیرہ میں' آزاد کا رنگ پایا جاتا ہے۔

اسمٰعیل نے بہت وسیع موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں' اور ان میں بعض معرکتہ الآرا بھی ہیں' جیسے " آثار سلف" " جریدۂ عبرت" وغیرہ لیکن کچھ تو انھیں شعر و سخن کا وہ ماحول نصیب نہیں ہوا جو حالی اور آزاد کو حاصل تھا' اور کچھ اس وجہ سے کہ ان کی طبیعت ایک خاص طرز کی شاعری پر جم گئی تھی' ان کی ایسی نظمیں جو تاریخ یا اخلاق کے اعلیٰ تر موضوعوں پر لکھی گئی ہیں' نشیب و فراز سے خالی نہیں ہیں۔ اسی لئے اردو میں وہ پایہ حاصل نہ کر سکیں' جو ان کی اولین اور چھوٹی چھوٹی نظموں کو حاصل ہوا۔

اردو کے اس عظیم المرتبت شاعر کی ایک مبسوط سوانح عمری اور سلیقے سے مرتب کئے ہوئے ایک کلیات کی سخت ضرورت تھی۔ اور یہ شاعر اور اردو ادب دونوں کی خوش قسمتی ہے کہ یہ کام شاعر کے قابل فرزند کے ذریعہ انجام پایا۔ خان بہادر محمد اسلم سیفی نے اس قابل قدر کارنامے کی ترتیب میں جس محنت اور ذوق کا ثبوت دیا ہے' وہ اسی طرح کے دوسرے کام کرنے والوں کے لئے نمونے کا کام دے گا اور مولانا اسمٰعیل کی شاعری کے ساتھ ساتھ ہمیشہ اردو ادب میں باقی رہے گا۔ مرتب نے سوانح پر نہایت تفصیل سے لکھا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ' شاعری پر بھی نظر ڈالی ہے۔ اور جیسا کہ ایک سعادت مند فرزند سے توقع ہو سکتی ہے' ہر جگہ احترام کو ملحوظ رکھا ہے۔

اردو کے بہت سے دوسرے بڑے شاعروں کی طرح' اسمٰعیل کی حیات کے ایک نفسیاتی مطالعے اور ان کی شاعری پر ایک بسیط اور غیر جانب دارانہ تنقید کی ضرورت ہے، تاکہ ان کا صحیح پایہ اردو شاعری میں متعین ہو جائے۔ راقم الحروف کا یہ خیال ہے کہ یہ کام اسمٰعیل کے کلام کے ایسے انتخاب سے بھی

ایک حد تک پورا ہو سکتا ہے، جو ان کی عظمت کی بنیاد ہے اور جس میں اسماعیل کا کوئی ہمسر نہیں۔

"ع۔ س"

تصویرِ احساس رائل سائز ۲۹۶ صفحے مطبوعہ عالمگیر الکٹرک پریس۔ ناشر اردو اکیڈیمی پنجاب۔ لاہور۔ قیمت عاں۔ یہ پنجاب کے نوجوان شاعر الطاف مشہدی کی نظموں کا مجموعہ ہے، جس کی ابتدا میں، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کا مقدمہ اور مسٹر کرشن چندر کا ایک دیباچہ اور محترمہ مس نواب ذکیہ سلطانہ صاحبہ ذکی کا دوسرا دیباچہ ہے۔ مصنف نے اپنی شاعری کے متعلق بعض مشہور لوگوں اور اپنے دوست احباب کی رائیں بھی دے دی ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تعارف کے لئے پنڈت کیفی کا مقدمہ کافی تھا، دیباچہ کی اصطلاح کا استعمال بھی عجیب طرح پر ہوا ہے، دیباچہ مصنف کو لکھنا چاہیے۔

الطاف مشہدی، پنجاب کے ان نوجوان شعرا میں سے ہیں جو صاحبِ فکر ہیں۔ یہ نظمیں بہت وسیع موضوعات پر حاوی ہیں اور زیادہ داخلی انداز رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کہیں کہیں شاعر کے خیالات مبہم اور سا اندازِ بیان نامانوس ہو گیا ہے۔ تاہم جگہ جگہ بلند پایہ شاعری کی جھلکیں نمایاں ہیں۔ اور توقع ہے کہ اگر یہی ذوقِ سخن جاری رہا تو الطاف مشہدی کا شمار اردو کے اچھے شاعروں میں ہونے لگے گا۔ نامانوس اندازِ بیان کی چند مثالیں یہ ہیں۔

"مرے نورِ نظر، جامِ شہادت جلد خالی کر۔" جامِ شہادت پینا، محاورہ ہے۔

مرا بھائی ہو سینے میں انی لینے پر آمادہ — سینہ میں انی لینا، نامانوس خیال ہے سینہ پر وار لینا، یا سینہ سپر کرنا ہوتا تو بہتر تھا۔

جگر کی قاش کے خنجر سے باطل کو جھکانے پر — جگر کی قاش کا خنجر۔ غیر فطری استعارہ ہے۔ یہی نامانوس اندازِ بیان یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ شاعر عام ڈگر سے ہٹ کر چلنا چاہتا ہے، لیکن مشق کے ساتھ ساتھ، سلاست بڑھتی جائے گی۔

الطاف مشہدی کا تخیل سطح سے بلند ہوتا ہے تو نہایت عمدہ شعر نکلتے ہیں، مثلاً پہلا ہی شعر۔

"قاضی الحاجات ہم کو بھوک سے کرے نڈھال — ہو مصائب کی فراوانی سے جینا تک محال"

اور اس کے بعد کے اکثر اشعار شاعر کی ذاتی فکر پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس طرح کے اشعار اکثر نظموں میں موجود ہیں۔ بہرحال یہ مجموعہ بہت دلچسپ ہے اور غور اور توجہ سے پڑھے جانے کے قابل ہے۔

"ع۔ س"

سر سالار جنگ اعظم حجم ۴۸ صفحات قیمت ۸ر پتہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد۔ سر سالار جنگ اول کی یہ مختصر سوانح عمری مولوی ابو المکارم فیض محمد صاحب بی اے نے بہت اچھی لکھی ہے یہ کتاب بچوں کے لئے بہت کار آمد ہے۔ بچوں کو یہ کتاب ضرور پڑھانا چاہیئے تاکہ ان کو معلوم ہو کہ سالار جنگ کون تھے اور انھوں نے کیا کیا کام کئے۔ انھوں نے غدر کے زمانے میں برٹش انڈیا کی بہت مدد کی اور جب میر محبوب علیخاں مرحوم سابق نظام دکن کمسنی میں تخت نشین ہوئے تو سالار جنگ اول نے حیدر آباد کی سلطنت کو بہت سنبھالا اور جو اصلاحات کئے وہ قابلِ داد ہیں۔

"ص"

سر سید احمد خاں حجم ۱۶ صفحات قیمت ۲ر پتہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد۔ مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم۔ اے۔ ایچ۔ سی۔ ایس نے یہ چھوٹی سی کتاب لکھی ہے جس میں سر سید احمد خاں مرحوم کے مختصر حالات ہیں۔ گو سر سید کے نام اور ان کے کام کے خیال سے یہ کتاب بہت ہی مختصر ہے لیکن لڑکوں اور لڑکیوں کے پڑھانے اور اسکول کے نصاب میں شریک کرنے کے لئے بہت اچھی ہے سر سید مرحوم سچے مسلمان

تھے گو ان کو لوگ کافر کہا کرتے تھے اور طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے لیکن انھوں نے کبھی ہمت نہ ہاری مسلمانوں کی خدمت برابر کرتے گئے جو کالج انھوں نے قایم کیا تھا اس کا فیض اب تک جاری ہے۔ سچائی اور صداقت سے جو کام کیا جاتا ہے اس کو کوئی مٹانا بھی چاہے تو نہیں مٹ سکتا۔ سرسید کا یہ خیال تھا کہ سب آپس میں مل کر رہیں اس لئے وہ انگریزوں کے بھی دوست تھے اور ہندوؤں کو بھی عزیز رکھتے تھے۔ "ص"

دو بھائی "دو بھائی" نامی ایک کتاب ۶۲ صفحے کی سید احسن صاحب ام اے (علیگ) نے شایع کی ہے۔ یہ ایک فرضی افسانہ ہے جس میں دو بھائی کا قصہ ہے۔ ایک امیر بھائی غریب بھائی کو دھوکا دینا چاہتا ہے اور خود دھوکا کھا جاتا ہے بہت سی باتیں جادوگری وغیرہ کی عقل کے خلاف ہیں یہ افسانہ پرانے زمانے کی کہانیوں کی طرح لکھا گیا ہے لیکن دلچسپ ہے اس کتاب کی قیمت ۴ ہے ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔ "ص"

انیس نسواں یہ رسالہ ماہانہ دہلی سے زیر ادارت شیخ محمد اکرام صاحب بیرسٹر و مسز شیخ محمد اکرام صاحب نکلتا ہے لکھائی چھپائی بہت اچھی ہے مضامین بھی اچھے ہیں مضمون نگار اچھے اچھے لوگ ہیں سر عبدالقادر صاحب کے مضامین بھی رہتے ہیں شیخ محمد اکرام صاحب کسی زمانے میں مخزن اور عصمت کی ادارت کرتے تھے۔ اس رسالہ میں قرآن شریف کے سوروں کے معنی نہایت دلچسپ طریقے سے لکھے جاتے ہیں۔ ہر پڑھے لکھے شخص کو یہ رسالہ پڑھنا چاہیے۔ قیمت سالانہ ؁ ملنے کا پتہ۔ دفتر انیس نسواں دہلی۔ "ص"

مغربی تصانیف کے اردو تراجم از مولوی میر حسن صاحب ام اے مجلد ؏ یہ کتاب چھوٹی تقطیع کے ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کے سلسلۂ مطبوعات کی مختصر مگر مفید کتاب ہے۔ ہماری جدید ادبیات اردو کی ابتدار بیشتر مغربی تصانیف کے تراجم سے ہوئی ہے مگر ادبیات اردو میں کوئی ایسی مستقل تالیف موجود نہ تھی جو ان تراجم کے تاریخی اور تدریجی نشو و نما پر روشنی ڈالتی ہو۔ مولوی میر حسن صاحب ام اے قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اردو ادب کی اس کمی کو پورا کر کے اردو کی قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ قابل مصنف نے مواد جمع کرنے میں کافی محنت اٹھائی ہے یہ ان کے پانچ سال کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

مضمون کتاب کی ترتیب میں موزونیت ہے۔ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ام اے ال ال بی کے مقدمہ کے بعد مولف کا دیباچہ ہے۔ مضامین کی تقسیم حسب ذیل ادوار میں کی گئی ہے۔

پہلا دور (۱) قدیم ترین تراجم سنہ ۱۸۰۰ء تا ۱۸۴۲ء (۲) سنہ ۱۸۴۳ء تا ۱۸۵۷ء (۳) سنہ ۱۸۵۸ء تا ۱۹۱۴ء (۴) سنہ ۱۹۱۴ء تا عصر حاضر۔ ہر دور کی جملہ اجتماعی اور انفرادی کوششیں نہایت شرح و بسط سے بتلائی گئی ہیں۔ مگر بعض بعض اہم کتابیں جو ذیل میں لکھی جاتی ہیں۔

(۱) تاریخ اسپین مترجمہ سید محمد احمد خاں مطبوعہ سنہ ۱۸۴۷ء (۲) تاریخ روسیہ ترجمہ پنڈت رتن ناتھ مطبوعہ نولکشور۔ لکھنؤ (۳) تاریخ سوڈان ترجمہ سید سجاد حسین سنہ ۱۸۹۷ء (۴) وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر بعہد شاہجہاں و اورنگ زیب ترجمہ سید محمد حسین صاحب مطبوعہ سنہ ۱۸۸۸ء (۵) اورنگ زیب مصنفہ اسٹینلی لین پول ترجمہ مولوی محمد اللطیف صاحب مطبوعہ سنہ ۱۹۰۰ء (۶) پروفیسر ویمبری کا سفرنامہ ترجمہ منشی محبوب عالم صاحب مطبوعہ سنہ ۱۹۰۳ء (۷) مستقبل اسلام مصنفہ پروفیسر ویمبری ترجمہ ظفر عمر سنہ ۱۹۱۰ء (۸) تاریخ ابو البشر مصنفہ پروفیسر رڈپاتھ ترجمہ مفتی محمد انوار الحق صاحب سنہ ۱۹۱۰ء۔

ان سب کتابوں کا تذکرہ چھوٹ گیا ہے اور معلوم نہیں کہ تحقیق کرنے پر اس قسم کی اہم کتابیں کس قدر زیادہ دریافت ہو جائیں ابھی

مختلف صوبوں کے چھاپے خانوں نے مغربی تراجم میں جو حصہ لیا ہے ان کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اس کے علاوہ جو کتابیں درج کی گئی ہیں ان کی بالفاظ حروف تہجی کے لحاظ سے کوئی فہرست نہیں دی گئی ہے۔ اگر یہ دی جاتی تو کتاب بہت زیادہ مفید ہوتی۔

قابل مولف نے اپنے دیباچہ میں ماخذ کی فہرست دی ہے مگر متن کتاب میں کہیں ان کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے اور جن کے حوالے دیے گئے ہیں ان کو ماخذ کی فہرست میں نہیں بتایا گیا ہے ایک مقام پر گلزار آصفیہ کا حوالہ دیا گیا ہے مگر صفحہ نہیں لکھا گیا ہے۔ اگر آیندہ طباعت میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے تو یہ مختصر کتاب بلحاظ تالیف وکتابت وطباعت دوسری تالیفات کے لیے بہترین نمونہ بن سکتی ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالمعید خاں

حیات اقبال از ناشران تاج کمپنی لمیٹڈ لاہور قیمت ۸ عہ۔ ۱۴۹ صفحات پر مشتمل چھوٹی تقطیع کی خوشنما طباعت ہے۔ منیجر تاج کمپنی نے مختصر دیباچہ لکھا ہے۔ فہرست مضامین نہیں دی گئی ہے۔ یہ کتاب آٹھ باب میں منقسم ہے۔ اس میں علامہ اقبالؒ کے مختلف وضع کے آٹھ فوٹو اور ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خط کو شامل کیا گیا ہے۔ کہیں کہیں طباعت کی غلطیاں رہ گئی ہیں ایک مصرعہ پورا غلط اور غیر موزوں شایع ہوگیا ہے۔ دیکھیے صفحہ ۲۰ اس کو یوں ہونا چاہیے۔

"جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے"

ناشر نے دیباچہ میں اس مختصر کتاب کے شایع کرنے کا مقصد اقبال اور اقبال کے فلسفے سے عوام کو روشناس کرانا بتایا ہے۔ جہاں تک علامہ اقبالؒ کی زندگی کا تعلق ہے اس میں حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں۔ مگر اقبالؒ کا فلسفہ جس کا جاننا عوام کے لئے نہایت ضروری ہے بے حد تشنہ ہے۔ اقبال کے اسرار خودی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے مگر اقبال نے اسلامی توحید اسلامی اجتماع میں فرد کی اہمیت پر جو روشنی ڈالی ہے اس کو واضح نہیں کیا گیا ہے۔ اقبال کی دوسری نظمیں مثلاً رموز بے خودی، زبور عجم، جاوید نامہ وغیرہ کا خلاصہ نہیں دیا گیا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی شاعری کے نشو ونما کو تفصیلی طور پر ظاہر کیا گیا ہے اقبالؒ کی اردو اور فارسی زبان دانی کے امتیازی خصوصیات دیگر شعرا سے مقابلہ کرکے بتلائے گئے ہیں مگر اسلامی فلسفہ کے ایک خاص انداز کا خود اقبال کے ذہن میں کس طرح نشو ونما ہوا ظاہر نہیں کیا گیا ہے۔

جاوید نامے کے دانتے کی تقلید میں لکھے جانے کی تردید کرتے ہوئے قابل مصنف نے معراج کے واقعات کو ان سب کا ماخذ اصلی قرار دیا ہے مگر عربی ادب کا مشہور شاہکار ابوالعلاء المعری کا رسالۃ الغفران کا ذکر نہیں کیا گیا جو بالکل جاوید نامے کے طرز کی کتاب ہے اور جس کی تقلید کرنا اقبالؒ کا جائز حق ہے۔ اور قرین قیاس ماخذ ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ علامہ اقبالؒ کے سوانح اس میں کافی تفصیلات سے مہیا کر دی گئی ہیں جن کا پڑھنا نہایت مفید ہے۔

ڈاکٹر محمد عبدالسعید خاں

رجسٹرڈ ایم (۳۹۵۰)
ٹیلیفون نمبر (۲۲۰۹)

نشان پتہ آصفیہ (۱۵۳)

چندہ سالانہ ایک روپیہ
علاوہ محصول ڈاک

فی پرچہ ۱ر ۶ ہ

ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا ہے

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے ماہنامہ سب رس کا ضمیمہ

شمارہ ۲	فروری سنہ ۱۹۴۰ء	جلد ۱

فہرست مضامین

حیدرآباد کے مشہور و مقبول رسالہ سب رس کے اس ضمیمے میں مشاہیر کی زندگیاں، عام فہم سائنس کے مضامین، تعلیمی اور سیاسی خبریں، مسابقتی امتحانات سے متعلق معلومات، کھیل کی خبریں وغیرہ شامل رہیں گی۔ اس ضمیمے کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو لوگ حیدرآباد یا برطانوی ہند کے مسابقتی امتحانات میں حصہ لینا چاہتے ہیں ان کیلئے اردو زبان میں قیمتی معلومات اور حالات حاضرہ سے متعلق تمام باتیں فراہم کی جائیں۔ ایسے حضرات کے علاوہ جن لوگوں کو علمی باتوں اور معلومات سے دلچسپی ہے اور جو دنیا کے حالات اور واقعات کو سمجھ کر زمانے کی رفتار پر بھی نظر رکھنا چاہتے ہیں یقین ہے کہ وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں گے

چند مشاہیر

آرتھر شوپن ہائر

آرتھر شوپن ہائر ۲۲ر فروری ۱۷۸۸ء کو ڈانزگ میں پیدا ہوا اس کا باپ اس شہر کے ایک دولت مند گھرانے کا رکن تھا شوپن ہائر کی ماں جوہانا تارسینا چوبیس کتابوں کی مصنف تھی۔ آرتھر شوپن ہائر کا باپ بنک کا کاروبار کرتا تھا۔ اس نے اپنے لڑکے کو انگلستان اور فرانس بھیجا تاکہ وہ اپنے خاندانی پیشے میں عملی تجربہ حاصل کرے۔ وہاں سے واپس آکر شوپن ہائر نے بنک کے کاروبار کو سنبھالا لیکن اس کے والد کی موت کے بعد ہی اس نے اس کاروبار کو ترک کر دیا اس کے بعد شوپن ہائر نے گوتھا اور رویمر کے مدرسوں میں شرکت کی۔ ان مدرسوں میں اس نے قدیم زبانوں کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۰۹ء میں وہ جامعہ گٹن ان جن میں شریک ہوا شوپن ہائر نے فشٹے کے لکچروں سے بھی استفادہ کیا اس کے بعد برلن پہنچ کر اس نے طبی اور طبیعی علوم سے گہری دلچسپی لینی شروع کی۔

وہ تند مزاج، افسردہ طبیعت اور بدگمان آدمی تھا اس کی اسی افتاد طبیعت نے اسے مردوں یا عورتوں سے دیرپا اور بھروسہ کے قابل تعلقات قائم کرنے سے باز رکھا۔ باپ کی موت کے بعد اس کی ماں نے اس سے صاف طور پر کہہ دیا کہ وہ اب اپنے رہنے سہنے کا علحدہ انتظام کرے شوپن ہائر پر اپنی ماں کے اس طرز برتاؤ کا گہرا اثر ہوا اس نے اسی لئے شادی کے مسئلے پر کبھی ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا اس کا خیال تھا کہ عورت ایک بے سمجھ جانور ہے خباثت اس کی فطرت میں داخل ہے اس کا کام صرف بچے پیدا کرنا ہے، ایسے بچے جو دنیا میں تباہیاں پھیلاتے رہیں اور اس طرح دنیاوی آلام و مصائب کو ہمیشہ کے لئے برقرار رکھتے ہیں اس کا فلسفہ پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کے مختصر اور جامع الفاظ میں یہ ہے:۔

"شوپن ہائر کا فلسفہ فلسفۂ یاس" ہے۔ اس نے اپنے فلسفے میں قنوطیت کی اساس کو اس قدر استوار کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ ایک مستقل نظریۂ حیات بن گئی ہے شوپن ہائر کے نزدیک زندگی کے تمام مظاہر ایک عالمگیر کورانہ ارادے کی پیداوار ہیں ایک تاریک اور بے مقصد ارادۂ حیات ہر طرح وجود پذیر ہونے میں کوشاں ہے۔ رنج و مصیبت، دکھ اور درد اس کی لازمی پیداوار ہیں۔ چونکہ ایک اندھا ارادہ زندگی کی اصل ہے اس لئے اس کا کوئی علاج ممکن نہیں۔ شوپن ہائر کا خیال تھا کہ بدھ مت اور ویدانت کی بھی یہی تعلیم ہے۔ زندگی کی کش مکش سے نکل جانا سب سے اعلیٰ اور صحیح مقصد ہے"

شوپن ہائر کا انتقال ۲۱ر ستمبر ۱۸۶۰ء میں ہوا۔

جان ولف گانگ فان گئٹے

جان ولف گانگ فان گئٹے ۲۸ر اگست ۱۷۴۹ء کو بمقام فرانک فرٹ آن دی مین پیدا ہوا اس کا باپ نہایت درجہ قابل آدمی تھا گئٹے مستقل مزاج، محنتی، اصول کا پابند اور مضبوط کیرکٹر کا آدمی تھا اس نے ایک باعزت زندگی بسر کی۔ وہ اطالوی ادب اور آرٹ کا شیدائی تھا گئٹے نے بھی اپنے والد کی طرح قانون کی ڈگری حاصل کی اور اپنے وطن میں وکالت

کرنی شروع کی لیکن اُسے اس پیشے سے دلچسپی نہ تھی۔ اس کی تخلیقی ذہانت نے
اُس کی توجہ ادب اور آرٹ کی طرف پھیر دی۔ اس نے جب شکسپیر کی
تصنیفیں پڑھیں تو اس کے دل میں رقابت کا ساجذبہ پیدا
ہوا۔ اپنا پہلا ڈراما گوئٹز Goetz اس نے ۱۷۷۳ء میں
ختم کیا۔ لیو بٹر کی وجہ سے گوئٹے کو قیافہ شناسی کے علم سے دلچسپی
پیدا ہوئی۔ ۱۷۷۴ء میں گوئٹے نے اپنا ناول ورتھر لکھنا شروع کیا تھا۔
اس کی زندگی پر اسپنوزا کے فلسفے کا گہرا اثر تھا۔ اسپنوزا کی کتاب
"اخلاقیات" نے گوئٹے کی بے چین روح کو سکون بخشا گوئٹے کو علوم طبعی
سے بھی بے حد شغف تھا۔ علم طبقات الارض، معدنیات،
تقابلی علم تشریح اعضا، اور نباتیات سے اسے بے حد دلچسپی تھی۔
اُس کا شمار ان مفکرین کے پیشرؤوں میں ہوتا ہے جنھوں نے
دنیا کے سامنے ارتقا کا نظریہ پیش کیا۔

۱۷۹۱ء میں ویمر کے درباری تھیٹر کا انتظام گوئٹے کے
سپرد ہوا۔ اس نے تھیٹر کے کاروبار سے بہت دلچسپی لی۔ گوئٹے کی
ہدایتوں نے بعض ذہین مردوں اور عورتوں کی صلاحیت اداکاری کو
بہت جِلا دی اور وہ اعلیٰ درجے کا فن کار ہو گیا۔ ۱۷۹۴ء میں شِلر
اور گوئٹے ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ ان دونوں ادیبوں
اور شاعروں میں دوستی کا مضبوط رشتہ شِلر کی موت تک قائم
رہا۔ جو ۱۸۰۵ء میں واقع ہوئی۔

اکتوبر ۱۸۰۶ء میں جینا کی لڑائی ہوئی اس کے ایک دن بعد
نپولین ویمر میں داخل ہوا۔ ۱۸۰۸ء میں نپولین اور گوئٹے کانگریس
آف ارفرٹ کے موقع پر ملے۔ نپولین نے گوئٹے کی کتاب ورتھر سے
متعلق اس سے تبادلہ خیال کیا۔ مصر کی مہم میں بھی یہ کتاب نپولین
کے ساتھ تھی۔ ایک مرتبہ گوئٹے نے اپنے دوست ایکرمان سے کہا کہ
نپولین نے اس کی کتاب ورتھر کو اس طرح پڑھا تھا جس طرح
عدالت فوجداری کا جج اپنے فیصلے کو پڑھتا ہے۔ ورتھر سے متعلق
اسی اسپرٹ میں اس نے گوئٹے سے گفتگو بھی کی تھی۔

جرمنی کے ادیبوں اور شاعروں کا سرتاج گوئٹے، حافظ کے
کلام سے بھی متاثر تھا۔ حافظ ہی کے کلام سے متاثر ہو کر اس نے
بعض عشقیہ نظمیں لکھیں جن کا مجموعہ ۱۸۱۹ء میں West
Gstlicher-Divan کے نام سے شائع ہوا۔ گوئٹے نے اپنے
مشہور ڈرامے "فاوسٹ" کے دوسرے حصے کی تکمیل ۱۸۳۱ء میں کی۔
اس کی موت کے بعد یہ حصہ چھپ کر شائع ہوا۔

۲۲ مارچ ۱۸۳۲ء کو مختصر سی علالت کے بعد مادرِ گیتی کا
یہ قابلِ فخر سپوت اس دنیا سے رحلت کر گیا۔

فریڈرک ولہلم نٹشے

فریڈرک ولہلم نٹشے ۱۵ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو ایک پادری کے
گھر میں پیدا ہوا۔ اس غیر معمولی انسان کو رُوکن کی سرزمین نے
جنم دیا، جو لیپزگ کے قریب واقع ہے۔ اس کی تعلیم کی ابتدا شلپ فورٹا میں
ہوئی۔ بون اور لیپزگ کی جامعات میں اس نے اعلیٰ تعلیم
کے لئے شرکت کی۔ نٹشے نے ابھی طیلسان بھی حاصل نہیں کی تھی کہ
باسلے یونیورسٹی میں قدیم زبانوں کی پروفیسری پر اس کا تقرر
ہو گیا۔ یہاں اس کے شاندار ادبی کارنامے رفتہ رفتہ
فلسفیانہ رنگ اختیار کرنے لگے۔ پروفیسری پر اس کا تقرر
۱۸۶۹ء میں ہوا تھا۔ ۱۸۷۹ء میں اسے وظیفہ دے دیا گیا۔
اس لئے کہ وہ ذہنی اور چشم کی بیماریوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔
وظیفہ پانے کے دس سال بعد تک اس نے سخت اذیت میں
زندگی بسر کی لیکن وہ اس عرصے میں اپنے کام سے مطلق غافل

نہیں رہا۔ نٹشے نے اس زمانے میں اپنے فلسفے کی وضاحت کے لئے
نہایت عمدہ مضامین لکھے۔ زیادہ تر ان ہی مضامین پر اس کی
شہرت کی بنیاد قائم ہے۔ ۱۸۸۹ء کے آخر میں وہ بالکل دیوانہ
ہوگیا تھا۔ ۲۵ اگست ۱۹۰۰ء میں اسی جنون کی حالت میں
اس کا انتقال ہوا۔

نٹشے نہ تو خدا پرست ہے اور نہ دہریت پرست،
وہ ایک ایسے خدا کی پرستش کرتا تھا جو ابھی پیدا نہیں ہوا۔ نٹشے
"فوق الانسان" کا پرستار ہے جو مستقبل بعید میں کبھی پیدا ہوگا۔
"ماورائے خیر و شر" اور "اقوال زرتشت" اس کی دو مشہور
تصانیف ہیں۔

کونٹ لیو ٹالسٹائے

لیو ٹالسٹائے روس کے ایک مقام یاسنایا پلیانا میں
پیدا ہوا۔ اس کا تعلق روسی امرا کے ایک قدیم گھرانے سے تھا۔
ٹالسٹائے کی جوانی رنگین تفریحوں میں بسر ہوئی جب ان
مشاغل سے اس کی طبیعت سیر ہو چکی تو وہ فوج میں بھرتی
ہوگیا۔ اس کے بعد اسے کریمیا کی جنگ میں شریک ہونا پڑا۔
اسی جنگ کے زمانے میں ٹالسٹائے نے لکھنا شروع کیا۔
کریمیا کی لڑائی کے خاتمے پر اسے معلوم ہوا کہ اس کا شہرہ
دور دور تک پہنچ چکا ہے۔ ٹالسٹائے کی یہ ابتدائی تحریریں
بتاتی ہیں کہ وہ غور و فکر کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ اسی
زمانے سے اشتراکیت کی جانب اس کا رجحان ہو چلا تھا۔
زار الکزنڈر دوم کی ترقی پسندی نے بھی اس کی انسانیت دوستی
کے جذبے کو ابھارا، اور ٹالسٹائے نے سماج کی اصلاح کے
موضوع پر دل کھول کر لکھنا شروع کیا۔ ۱۸۶۲ء میں اس کی
شادی ہوئی۔ متاہل زندگی اس نے اپنی جاگیر میں بسر کی۔
اس کے دو ناول "جنگ اور امن" اور "انا کرینینا" Anna Karenina
بہت مشہور ہیں۔ ٹالسٹائے کا انتقال ۲۰ نومبر ۱۹۱۰ء میں
ہوا۔ کارل مارکس سوسائٹی کی از سر نو تشکیل میں تشدد سے
کام لینا چاہتا ہے، اور ٹالسٹائے عدم تشدد سے۔ سرمایہ داری
اور جائداد پر ٹالسٹائے نے مارکس سے بھی زیادہ سخت
حملے کئے ہیں۔

ہنرک ابسن

ہنرک ابسن، جنوبی ناروے میں اسکین کے مقام پر پیدا
ہوا۔ ابتدا میں اس نے دوا سازی کا کام شروع کیا۔ پھر صحافت
کی جانب توجہ کی اور بعد میں برگن کے Ole-Bulls Theatre کا
ڈائرکٹر ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء میں اسے کرسچینا کے نیشنل تھیٹر کا ڈائرکٹر
مقرر کیا گیا۔ یہ تھیٹر ۱۸۶۲ء میں دیوالیہ ہوگیا۔ ابسن نے اس کے بعد
ڈرامے لکھنے شروع کئے Love's Comedy اسی
زمانے کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب معاصرانہ زندگی پر ایک زبردست
چوٹ ہے۔ اس کی اشاعت نے ابسن کے ہمعصروں کو اس کا
مخالف بنا دیا۔ ہمعصروں کی مخالفت، نیشنل تھیٹر کا دیوالیہ
ہو جانا، جرمنی اور ڈنمارک کی لڑائی میں ناروے کا ڈنمارک کی
مدد نہ کرنا، یہ ایسے تکلیف دہ اور دل شکن واقعات تھے جنہوں نے
ابسن کو اپنے ہم وطنوں سے بیزار کر دیا، اور وہ ۱۸۶۴ء میں
ناروے سے چل پڑا۔ ۱۸۹۱ء تک اس نے مختلف مقامات پر
سکونت اختیار کی۔ روم، ڈریسڈن اور میونخ میں وہ

زیادہ عرصے تک ٹھیرا رہا۔ اس کے بعد وہ کرسچینا لوٹ آیا۔
اس کی واپسی پر ناروے کی حکومت نے بادل ناخواستہ
اس کے لئے وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس کی ایک کتاب The
Dolls House بہت مشہور ہے۔ ابسن کی وجہ سے
یورپ میں ڈراما نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ برنارڈ شا پر
اس کا گہرا اثر ہے۔

اناطول فرانس

اناطول فرانس انیسویں صدی کا مایۂ ناز ادیب
سنہ ۱۸۴۴ء میں پیرس کے ایک غریب کتب فروش کے گھر پیدا
ہوا۔ ادبی زندگی کے ایک طویل دور میں اس نے شہرت کے
اوج کمال کو پا لیا تھا۔ لیکن کچھ عرصے سے اس کے عروج کی
یہ تابناکی ماندہ پڑ گئی ہے۔ اناطول فرانس کا اسلوب بیان
شستہ اور پاکیزہ ہے۔ اس کا طنز جو موجودہ نسل کے لئے
بیزار کن ہے بعض اوقات والٹیر کے طنز سے بھی زیادہ چبھتا
ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اناطول فرانس ایک قنوطی ادیب اور
فلسفی ہے۔ اس کا نہ تو خدا پر یقین ہوتا ہے اور نہ ہی
فطرت انسانی کی اچھائی پر۔ وہ لینن اور بالشویوں کا طرفدار
تو ہے لیکن اشتراکیت یا اشتمالیت کو انسانی زندگی کی بنیادی
خرابیوں کا مداوا نہیں سمجھتا۔
اس کے خیال کی انتہائی بلندی، انسانی فطرت کی
گہرائیوں سے اس کی واقفیت، اس کا کلچر، اس کی خداداد
ظرافت، معاصرانہ زندگی پر اس کا طنز، اس کا مختصر اور جامع
اسلوب بیان اسے فرانسیسی طنز نگاروں اور ادیبوں کی صف اول میں
جگہ دیتے ہیں۔ اس کی دو کتابیں تائیس اور جزیرہ پنگوین بہت مشہور ہیں۔

موپاساں

گئی ڈی موپاساں ۵ اراگست سنہ ۱۸۵۰ء کو نارمنڈی میں
پیدا ہوا گستاؤ، سفلاپرٹ نے پہلے پہل اسے لکھنے پر مائل کیا۔
اس کے بعد مسلسل دس برس تک موپاساں فرانسیسی ادب کو
نوازتا رہا۔
دنیا کے باعظمت افسانہ نگاروں میں اس کا شمار
ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر کی مصوری میں اسے کمال حاصل ہے۔
اس کی بصیرت اشیا کو ان کے اپنے اصلی رنگ میں دیکھتی ہے۔
اس کا طرز نگارش بے داغ۔ اثر انگیز، مختصر اور جامع ہوتا ہے۔
اس کی تحریر میں ایک بھی لفظ ایسا نہیں ملتا جو غیر ضروری ہو۔
موپاساں جو دیکھتا ہے بغیر کسی رنگ آمیزی کے وہی بیان
کرتا ہے۔ وہ ایسی تصویریں کھینچتا ہے جو کبھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔
سنہ ۱۸۹۲ء میں وہ دیوانہ ہو گیا تھا۔ اور اس کے ایک سال بعد ہی
پاگل خانے میں اس کی موت واقع ہوئی۔

میر عزیز الحق بی۔ اے (عثمانیہ)

انگریز اور انگریزی

انگریز انگلستان کے اصلی باشندے نہیں ہیں جس طرح کہ
ہندوستان کی اصلی قوم دراوڑی خیال کی جاتی ہے، اور آریا
قدیم نو وارد ہیں اسی طرح انگریز بھی قدیم نو وارد ہیں۔

جہاں تک کہ قیاس ممکن ہے انگریزوں کو انگلستان آئے ہوئے پندرہ سو سال سے زیادہ عرصہ گذرا۔

انگریزوں نے جزائر برطانیہ میں قدم رکھا تو انھوں نے اس خطہ زمین کو بہت ہی پُرخطر پایا۔ اس وقت جو عظیم قطعات گھاس یا چراگاہوں کے پائے جاتے ہیں وہ گھنے جنگل تھے جہاں چلنے کے لئے راستہ تک نہ تھا، پہاڑیاں، غار اور جھاڑیوں سے پٹی پڑی تھیں۔ اسکاٹ لینڈ کے پہاڑ بے سایہ جنگل تھے۔ یہ قطعات بھیڑیے، ریچھ وغیرہ جیسے درندوں کے مسکن تھے جن کی ہڈیاں برآمد کی جاکر شہادت میں پیش کی جارہی ہیں۔ اسی پُرخطر خطۂ زمین میں قدیم باشندے رہتے تھے۔

اس زمانے کو مورخین نے "عہد ماقبل تاریخ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ کوئی مورخ بھی اس زمانے کی کچھ تاریخ نہیں بتا سکتا، لیکن اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ حالت آج سے ہزاروں برس پہلے کی تھی۔ اس زمانے کی تاریخ کا اندازہ کرنے کے لئے ہم کو غار ملتے ہیں جس میں لاشیں، آلات اور ہتھیار پائے جاتے ہیں جس سے اس زمانے کے تمدن وطرزِ رہائش کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ بعض مقامات پر پتھر کھڑے ہوئے پائے گئے ہیں اور بعض جگہ اور دوسری نشانیاں دستیاب ہوئی ہیں جس میں سالسبری کے میدان میں اسٹون ہینگ کے پتھروں کا عظیم دائرہ بھی شامل ہے۔

اگر ہم عہد ماقبل تاریخ کے باشندے کو دیکھنا چاہیں تو صرف تصور کی مدد سے دیکھ سکتے ہیں۔ بندر سے زیادہ مشابہ، میں چھوٹا، کافی طاقتور، چوڑا سینہ، لامبے ہاتھ، گھنے بال، چھوٹی اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں، ننگا جسم، چوڑے چوڑے پنجے، ہاتھ کے، اور بڑے بڑے دانت اس کو ایک ڈراونی شکل میں پیش کرتے تھے۔ یہ اس انسان کا حلیہ ہے جو ان گورے چٹے نازک حسین انسانوں سے پہلے آباد تھا۔ اگر ہم چاہیں تو ان باشندوں کو برٹینس کہہ سکتے ہیں۔

اصل تاریخ کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے جب کہ روم کا فاتح اعظم جولیس سیزر دو ہزار برس قبل اپنے لشکر جرار کے ساتھ برطانیہ میں داخل ہوا۔ عہد ماقبل تاریخ کا لحاظ کرتے ہوئے جولیس سیزر کی آمد زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ اس وقت تک برٹینس کچھ متمدن ہوچکے تھے اور انھوں نے فرانس کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کرلیے تھے۔ وہ دھات کا استعمال اور کپڑا بننا بھی جانتے تھے، اور خیال کیا جاتا ہے کہ وہ لوگ اپنے قبیلے یا چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں منقسم تھے۔ انھوں نے بہادری سے رومیوں کا مقابلہ کیا جس کی وجہ سے جولیس سیزر اور اس کے جانشینوں کو ان کے مطیع کرنے میں زیادہ عرصہ لگا۔

اہل روم بہت ہی مستقل مزاج اور ضدی ہوتے ہیں۔ جب وہ کسی کام کا قصد کرتے ہیں تو بغیر اس کو پورا کئے نہیں چھوڑتے اور یہی وجہ تھی کہ جب تک رومی اس عادت پر قائم تھے، کامیاب رہے۔ چنانچہ ان کی اسی مستقل مزاجی کی وجہ سے تاریخ میں ان کا نام باقی ہے۔ برطانیہ تقریباً پانچ سو برس تک ان کے آہنی پنجے میں پھنسا رہا، اور جب اہل روم شمالی حصے کو فتح نہ کرسکے اور وہاں کے جنگجو وحشی قبائل ان کے مطیع نہ ہوئے تو انھوں نے اپنی سلطنت کو ایک دیوار کے ذریعے ان وحشی قبائل سے جدا کردیا۔ بعد میں یہ قبیلے مختلف ناموں سے یاد کئے جانے لگے ان میں زیادہ تعداد پکٹس اور اسکاٹس کی تھی۔

سلطنت روم میں رفتہ رفتہ زوال شروع ہوا، اور جب

وہ بہت کمزور ہوگئی تو اس عظیم الشان سلطنت کی کئی حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ روم کے زوال پر سب سے پہلے برطانیہ نے فائدہ اٹھایا چنانچہ اہل برطانیہ خود مختار ہوگئے اور رومی اس قدر مجبور ہوگئے کہ وہ خود ۴۱۰ء قبل مسیح میں برطانیہ سے دست کش ہوگئے۔

اس وقت برطانیہ کی عجیب حالت تھی، نہ اس کے بازوؤں میں طاقت تھی اور نہ کوئی قوت اس کی محافظ و مددگار۔ اس کی مثال بالکل ایک زخمی شکار کی تھی جس کو رومیوں نے زخمی کیا تھا، اس لئے کوئی دوسرا شکاری اس کو آسانی سے اپنے قبضے میں لاسکتا تھا۔ اس موقع سے شمال کے وحشی قبائل نے فائدہ اٹھایا اور جنوب کے سارے زرخیز علاقے پر قابض ہوگئے۔ اس مجبوری میں ان کی نظر انگریزوں پر پڑی جو پہلے ان کے دشمن تھے۔ لیکن موقع کی نزاکت کی وجہ اب انھی لوگوں کی مدد مانگنی پڑی تاکہ ان وحشی قبائل کے جور و ستم سے نجات ملے۔ انگریز تو موقع ہی کی تاک میں تھے، فوراً مدد پر آمادہ ہوگئے۔ اس طرح انگریزوں نے برطانیہ میں قدم رکھا اور قدیم امن پسند باشندوں کو ان وحشی قبائل سے بچایا۔

انگریز کسی خاندان یا قبیلے کے لوگ نہ تھے بلکہ یہ خانہ بدوش تھے جو سمندروں میں اِدھر اُدھر پھرا کرتے تھے اور جہاں آرام ملتا وہیں بس جاتے۔ ان میں بڑے قبیلے انگلیس، سیاکسن اور جوٹس تھے۔ ان کے مسکن جرمنی کے دریاؤں کے دہانے تھے اور یہ لوگ اپنی کشتیوں میں جو بر دے اور جیبو سے چلتے پھرتے رہتے تھے۔

ان لوگوں سے جو کچھ توقع کی گئی وہ پوری ہوئی اور یہ ان وحشی قبائل کو نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ اس مقام کو سرسبز و شاداب دیکھ کر وہ آباد ہوگئے اور اپنے ساتھیوں کو بھی آنے کی دعوت دی۔ ایک صدی یعنی ۴۵۰ء تا ۵۵۰ء قبل مسیح تک انگریز قبائل معروف جنگ رہے۔ اور وہ اس طرح برطانیہ میں آباد ہوگئے۔ انگریز بعد میں محنتی اور امن پسند باشندے ثابت ہوئے لیکن ان کی جہاز رانی سے دلچسپی قائم رہی بلکہ ایک حد تک ترقی کرتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ انگریزوں میں آج بھی جہاز رانی کا شوق باقی ہے اور وہ درجہ اول کے جہاز راں ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی ادب میں جس قدر بلند پایہ کتابیں ہیں وہ تقریباً سب کی سب بحری حالات اور سفرناموں پر مشتمل ہیں۔

چار پانچ صدی تک تو انگریز اطمینان سے غاصبانہ قبضہ جمائے رہے لیکن اس کے بعد انھیں بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں ناروے کے باشندوں کی یورش بہت اہم ہے۔ وہ ۱۰۶۶ء میں ولیم فاتح کے ماتحت ہیسٹنگز پر لنگر انداز ہوئے اور بہت جلد سارے جزیرے پر قابض ہوگئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہر طاقتور قوم اپنے حصول مقصد کے لئے دوسری کمزور قوموں کو کچل ڈالتی تھی۔ لیکن ولیم کی کامیابی ایک سپاہی کے کارنامے سے زیادہ اہم نہ تھی جو انگریز قوم کو نقصان نہ پہنچا سکی۔ چنانچہ اس کا انجام یہ ہوا کہ انگریزوں نے اپنی طاقت کے ذریعہ فاتح نارمنوں کو مغلوب کرلیا، اور برطانیہ صرف انگریزوں کا رہا، اور یہی انگلستان[1] کہلاتا ہے۔

انگلستان اپنی زبان، جوش، ہمت، سیاست، نیز رسم و رواج میں متعدد تبدیلیاں جائز رکھ کر آدھی دنیا پر

---

[1] اس کی وجہ تسمیہ غالباً یہ ہوگی کہ اس نو وارد قوم میں فرقہ انگلیس کی تعداد زیادہ تھی، اس لئے یہ ملک انگلستان، مشہور ہوا۔ قوم کا نام حوادث زمانہ سے بدلتا ہوا انگریز ہوگیا۔

قابض ہوگیا، اور خوشامدیوں نے ایک صحیح مقولہ گھڑ لیا کہ:
"سلطنت برطانیہ پر کبھی سورج غروب نہیں ہوتا"۔ نارمنوں کے
حملے کو انگریزی زبان کی نشو و نما میں بہت کچھ دخل ہے۔
چنانچہ اب انگریز جرمن زبان کو اس کی ہیئت اصلی میں
استعمال نہ کرتے تھے بلکہ اپنے ہر جملے میں نارمن زبان کے الفاظ
استعمال کرنے شروع کر دئے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں
کے رسم و رواج اور طور طریق بدل گئے اور مختلف فنون میں
اس زبان کا دخل ہونے لگا۔ مثال کے طور پر انگریز بجائے
Pig کے Pork کہنے لگے اور بجائے Sheep
کے Mutton استعمال ہونے لگا، اور Calf
کی بجائے Veal مستعمل ہوا۔ جب انگریز جرمنی سے
آکر آباد ہوئے تو ان کی زبان میں جرمن الفاظ کی بہتات تھی
اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جرمن زبان ہی کی کوئی بدلی
ہوئی شکل ہے اسی کو آج کل قدیم انگریزی Old English
یا انگلو سیکسن Anglo-Saxon
کہتے ہیں۔ یہ جدید انگریزی کی ابتدا تھی اور فرق صرف
املا Spelling کا تھا۔ ہماری موجودہ انگریزی کے ضروری
الفاظ اسی زبان سے ماخوذ ہیں۔ مثال کے طور پر ہماری
بول چال کے اہم الفاظ ہیں جن کے بغیر ہم انگریزی زبان میں
اپنا مقصد کسی طرح بھی ظاہر نہیں کر سکتے۔ یہ الفاظ بہت عام ہیں
Write, Water, Earth, Women, Man, Dog
Over, In وغیرہ ہفتے کے ناموں میں بھی ہم کو انگلو سیکسن
کے مذہب کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو متعدد خداؤں کو
پوجتے تھے مثال کے طور پر اتوار کے دن کو سورج کا دن
تسلیم کیا گیا، اس لئے اس کو سن ڈے کہنے لگے۔ پیر کے دن کو
چاند کا دن مانا گیا جس کی وجہ سے اس کو مَن ڈے کہا گیا، منگل کا دن
اندھیرے کے خدا "ٹیو" سے منسوب کیا گیا اس لئے اس کو ٹیوز ڈے
کہنے لگے۔

قدیم انگریزی گویا موجودہ انگریزی زبان کی ابتدا تھی۔
کیونکہ قدیم انگریز جو سمندروں میں مارے مارے پھرتے تھے
بالکل سادہ اور نیم وحشی تھے ان کے مقاصد اور تخیلات
بالکل سادہ ہوتے تھے، اپنے مقاصد کے اظہار کے لئے وہ بالکل
مختصر الفاظ استعمال کرتے تھے۔ جب انھیں کوئی نئی چیز معلوم
ہوتی تو اس کے اظہار کے لئے یا تو نئے الفاظ وضع کئے جاتے
یا دوسری زبانوں سے ماخوذ کئے جاتے۔ پہلی صورت مشکل تھی
اور انھیں دوسری صورت ہی میں آسانی نظر آتی تھی۔

سب سے پہلا واقعہ جو انگریزی زبان میں نئے خیالات
کے اظہار کا ذریعہ بنا وہ عیسائیت کی ابتدا تھی۔ تاریخ شاہد
ہے کہ سینٹ آگسٹائن ۵۹۷ء میں کینٹ کے مقام پر وارد
ہوئے اور ان بے دین انگلو سیکسن کی بڑی تعداد کو
عیسائی بنایا۔ یہ صرف طرز عبادت میں تبدیلی نہ تھی بلکہ
اس سے خیالات میں بھی بڑا انقلاب ہوا کیونکہ عیسائی مذہب
کے خیالات ان بے دینوں کے خیالات سے بالکل جدا تھے۔
تحقیق سے پتا چلتا ہے کہ قدیم انگریزی میں Charity
کے لئے کوئی لفظ نہ تھا۔ قدماء اس لفظ کی بجائے Lufu
استعمال کیا جس کے معنی Love کے ہیں، لیکن یہ لفظ اس خیال
کے لئے موزوں نہ تھا اس لئے آخر کار لاطینی زبان کا لفظ ہی
استعمال ہونے لگا۔ اس طرح بہت سے الفاظ جو انھیں عبادت کے
دوران میں استعمال کرنے پڑتے تھے لاطینی زبان سے لینے پڑے یا
یونانی زبان کے الفاظ استعمال ہونے لگے۔ چنانچہ Bishop
Priest, Altar وغیرہ یونانی اور لاطینی سے ماخوذ ہیں۔
(باقی آئندہ)

شریف النساء بیگم

اترا ہوا دریا

کس قدر اترے ہوئے دریا کا ساحل ہے اداس — دیکھ کر یہ منظر عبرت فزا دل ہے اداس

اب نہ وہ جوش تلاطم ہے نہ موجوں میں خروش — صورت شہر خموشاں ہے فضا ساری خموش

خامشی پرور سماں ساحل سے تا ساحل ہوا — فتنۂ محشر خرامی کا اثر زائل ہوا

راہ میں جن کی گرے نخل تناور سر کے بل — اب اسی کی سرزمیں پر ہے نیستاں کا عمل

جوش وحشت ہو چکا تندی گئی تیزی گئی — ساغر صہبائے بدمستی کی لبریزی گئی!

سرکشی موجوں کی باقی ہے نہ وہ آوارگی — ہر طرف چھائی ہے اک افسردگی بیچارگی

یادگار ورطۂ مضطر نہیں جز گرد باد — اب یہاں کوئی اٹھاتا سر نہیں جز گرد باد

یہ خموشی اور یہ رفتار میں آہستگی — یوں ہے جیسے غرق ہو دریائے حیرت میں کوئی

جائے حیرت ہے یہ حالت قلزم زخار کی — ہو گئے دونوں کنارے پسلیاں بیمار کی

ہو گئے ناپید یکسر ورطہ و موج و حباب
جس طرح پیری میں مر جاتے ہیں ارمان شباب

وقت آنے پر چڑھے گا پھر یہ دریا ایک دن — پھر وہی جوش تلاطم اس میں ہوگا ایک دن

زندگی اس وقت جو پہلوئے دریا میں نہیں — دامن کہسار ہے یا آسماں اس کا امیں

وقت پر اس کی امانت پھر اسے مل جائے گی — زندگی کی لہر ساحل تا بہ ساحل جائے گی۔

اس میں ہوں گے پھر ہویدا ورطہ و موج و حباب
آہ پیری سے مگر واپس نہیں آتا شباب!

تلوک چند محروم

آب دوز کشتیاں

"ذیل میں جناب ابوالمکارم فیض محمد صدیقی صاحب بی۔ اے۔ ڈپ۔ ایڈ (عثمانیہ) کا ایک دلچسپ مضمون ہدیہ ناظرین ہے موصوف سائنس کے مضامین کو عام فہم اور دلچسپ پیرایہ میں پیش کرنے کی بہت کامیاب کوشش کرتے ہیں اور ان کو اس کا خاص ملکہ ہے آپنے اسی موضوع پر ایک مفید کتاب بھی لکھی ہے جو ادارہ ادبیات کی طرف سے شائع ہو رہی ہے۔" (اڈیٹر)

جنگ عظیم میں آب دوز کشتیوں کا نام جرمنوں سے کچھ اس درجہ وابستہ ہو گیا کہ عام طور پر ان کو جرمنوں کے دماغ ہی کی پیداوار سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ غلط ہے، بلکہ یہ ایک امریکی ایجاد ہے اس کو پروان چڑھانے میں جان پی ہالینڈ اور سائمن لیک کا نمایاں حصہ رہا، اور انھیں کو موجودہ آب دوزوں کا حقیقی موجد سمجھا جاتا ہے۔ ہالینڈ، آئرلینڈ کا باشندہ تھا۔ سب سے پہلی آب دوز کشتی ڈیوڈ بشنیل نے بنائی، اس کا نام "ٹرٹل" تھا۔ اس کی شکل سگار کی سی تھی، یہ بہت چھوٹی سی کشتی تھی اور اس میں اتنی ہوا سما سکتی تھی جو آدھ گھنٹے تک ایک انسان کے لئے کافی ہو سکے۔ یہ آب دوز برطانوی جہاز "ایگل" کو ڈبونا چاہتی تھی لیکن اپنے مقصد میں ناکام رہی۔

اس کے بعد مختلف ممالک میں آب دوزوں کی تیاری کا کام ہونے لگا لیکن ان کی اہمیت جنگ عظیم تک مسلم نہ ہو سکی۔ جب کہ دشمنوں نے برطانوی اور انگریزی جہازوں پر حملہ کرنے کے لئے آب دوز کشتیوں سے کام لینا شروع کر دیا! اس کے بعد ہی انگلستان، امریکہ، فرانس اور جرمنی نے سرعت کے ساتھ آب دوز بنا ڈالے چنانچہ برطانیہ کے پاس ۲۷۶ فٹ لمبی اور ۲۲½ فٹ چوڑی آب دوز تھی۔

جنگ ختم ہونے کے بعد چند سال تک آب دوز کی تیاری اور ترقی میں جمود سا پیدا ہو گیا لیکن اس کے بعد پھر سے اس طرف توجہ کی جانے لگی۔ چنانچہ ۱۹۲۴ء میں امریکہ نے V-1 آب دوز بنائی جس کا طول ۳۴۱ فٹ اور عرض ۲۷ فٹ تھا اس کا وزن ۲۱۶۴ ٹن۔ اسی طرح سے برطانیہ نے ایسے آب دوز بنائے کہ وہ آب دوز جنگی جہاز معلوم ہوتے تھے! اس میں ۱۲" دھانہ کی توپیں لگی ہوئی تھیں اور تارپیڈو کی چار نالیاں تھیں۔ ساتھ ہی اس کے اس کی بحری گشت کا دائرہ کئی ہزار میل تھا۔

گذشتہ چند سالوں میں تو آب دوز کی ساخت میں حیرتناک ترقی ہو گئی ہے اور اب مختلف حکومتوں کے پاس بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی آب دوزیں موجود ہیں۔ پہلے اکہرے خول کے آب دوز بنائے جاتے تھے لیکن اب بالعموم دوہرے خول کے

آب دوز موجود ہیں۔ ان کی شکل بالعموم جہاز کی سی ہوتی ہے۔ طول (۳۰۰) اور (۴۰۰) فٹ کے درمیان ہوتا ہے۔ وزن بھی دو اور تین ہزار ٹن کے درمیان۔ ان کی شکل بالعموم لمبوتری ہوتی ہے۔ طول کے مقابلہ میں عرض بہت کم ہوتا ہے۔ یہ اعلیٰ درجہ کی مشنری سے آراستہ ہوتی ہیں۔ ان کے درمیان میں ایک حصہ گول گنبد نما ہوتا ہے جسے "گنبد گرداں" کہتے ہیں۔ اس میں حملہ کرنے والا افسر بیٹھتا ہے، اسی حصے میں توپیں لگی ہوتی ہیں کہ اگر ضرورت پڑے تو سطح آب پر آکر جنگی جہاز کا مقابلہ کر سکے۔ آب دوز کے مختلف حصوں میں پانی داخل ہو سکتا ہے جو خاص طور سے اس مقصد کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ پانی بھرنے سے آب دوز کی کثافت بڑھ جاتی ہے اور وہ تیزی سے اندر ڈوبتی ہے۔ اس میں اس امر کا انتظام ہوتا ہے کہ جس گہرائی پر چاہیں اسے روک سکتے ہیں۔ آب دوز سطح آب پر ڈائسیل انجن کی بدولت چلتے ہیں اور جب پانی کے اندر ہوتی ہیں تو برقی مورچہ (بیاٹری) کے ذریعہ چلتی ہیں۔ اسی لئے آب دوز کے لئے کافی برقی قوت درکار ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈائسیل انجن سے گیسیں پیدا ہوتی ہیں جن کا خارج ہو جانا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ جب آب دوز پانی کے اندر ہوتی ہے تو یہ گیسیں خارج نہیں ہو سکتیں اس لئے کہ پانی کا دباؤ گیسوں کے دباؤ سے زیادہ ہوتا ہے اور وہ باہر نکل نہیں سکتیں اس لئے گویا انجن پانی کے اندر ناقابل عمل ہوتا ہے اس لئے اندر برقی مورچہ سے کام لیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آب دوز کو پانی کے اندر زیادہ عرصہ تک نہیں رکھا جا سکتا کیونکہ برقی مورچوں کو برقانے کے لئے کشتی کو سطح آب پر لا کر ڈائسیل انجن چالو کرنا پڑتا ہے تاکہ برقی مورچے برقا جائیں۔ پہلے پہل تو اسی باعث ان کی بحری گشت کا دائرہ بہت محدود تھا لیکن اب اعلیٰ مشنری کی بدولت ان کی کارکردگی اور دائرہ عمل کی وسعت میں معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے۔

آب دوز کی آنکھ اس کا منظر بیں ہوتا ہے۔ جب آب دوز پانی کے اندر ہوتی ہے تو باہر کی دنیا کو دیکھنے کے لئے اسی آلہ سے کام لیتے ہیں۔ اس آلہ کا اصول بالکل معمولی ہے۔ یہ ایک دھاتی نل پر مشتمل ہوتا ہے، اس کے دونوں جانب ایک ایک آئینہ نلی کے ساتھ ۴۵° کا زاویہ بناتے ہوئے رکھا جاتا ہے۔ شعاع نور کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آئینے سے جس زاویہ پر ٹکراتی ہیں دوسری طرف آئینے میں زاویہ پر مڑ جاتی ہیں اس لئے جب ادھر کے آئینے پر شعاع سیدھی آکر پڑتی ہے تو وہاں سے منعکس ہو کر نیچے کے آئینے پر پڑتی ہے اور ابتدائی شعاع کے متوازی منعکس ہو جاتی ہے، اس طرح سے ہم ل کو نیچے کے آئینے میں دیکھ سکتے ہیں۔ اسی معمولی سے آلے کو منظر بیں کہتے ہیں۔
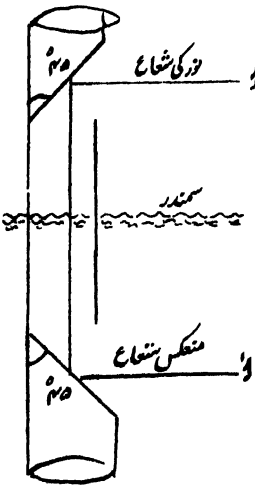
نور کی شعاع
سمندر
منعکس شعاع

بچے فٹ بال کا میاچ دیکھتے یا سپر و تفریح کے وقت کسی جھاڑی کے پیچھے کی چیزوں کو دیکھنے کے لئے یہ آلہ خود بنا کر استعمال کرتے ہیں۔ اسی اصول پر آب دوز میں منظر بیں لگائے جاتے ہیں۔ ان میں اصول تو یہی ہوتا ہے لیکن اس میں نزاکتیں زیادہ پیدا کر دی جاتی ہیں تاکہ چیزیں صاف اور اچھی طرح سے دکھائی دیں۔ منظر بیں کے بغیر آب دوز کی

دنیا تاریک ہے۔

آب دوزیں بالعموم دشمن کے جہازوں پر تارپیڈو سے حملہ کرتی ہیں۔ تارپیڈو اس کے دونوں پہلوؤں میں آگے اور پیچھے کی طرف ہوتے ہیں۔ تارپیڈو کی شکل سگار کی سی ہوتی ہے۔ اس کا وزن کوئی ۵ ٹن ہوتا ہے اور قیمت ایک لاکھ روپیہ سے زیادہ۔ اس کے سامنے کے حصے میں ... اپونڈ کی ایک دھماکو شئے ہوتی ہے جسے ٹرائی نائٹرو ٹیلین کہتے ہیں۔ اس حصے کے پیچھے دبی ہوئی ہوا کا خانہ اور پھر اس کو چلانے والا انجن ہوتا ہے۔ تارپیڈو کی رفتار بالعموم ۵۰ ناٹ (ایک ناٹ = ایک میل اور ۸۰۰ گز) ہوتی ہے۔ آب دوز کشتی بالعموم ۲/۵ و گز سے جنگی یا دوسرے جہاز پر حملہ کرتی ہے۔ جب تارپیڈو جہاز سے ٹکراتا ہے تو سخت و تند دھماکہ پیدا ہوتا ہے اور جہاز پھٹ جاتا ہے چنانچہ موجودہ جنگ ہی میں رائل اوک اور کرجیس جیسے مشہور جنگی جہاز تارپیڈو کا نشانہ بن کر پارہ پارہ ہوگئے۔ یہ بڑا خطرناک حربہ ہے اور جنگی جہاز اس سے بچنے اور اس کی مدافعت کرنے کے لئے پوری قوت صرف کرتے ہیں۔

ابوالمکارم فیض محمد صدیقی

وٹامن (حیاتین)

وٹامن وہ مادے ہیں جو مختلف کھانے پینے کی چیزوں میں پائے جاتے ہیں اور یہ ہماری صحت اور نشو و نما کے لئے بہت ضروری ہیں۔ اگرچہ ان اشیا کی ترکیب اور ان کے افعال اب تک اچھی طرح سمجھ میں نہیں آئے لیکن ان میں سے اکثر و بیشتر کی پہچان ان کے کیمیاوی اور فعلیاتی خواص کی بنا پر کی جاسکتی ہے۔ اب تک کوئی چھ وٹامن دریافت ہوئے ہیں اور وہ یہ ہیں:۔ ا، ب $_1$ (یا ب)، ب $_2$ (یا گ)، ج، د اور ی۔ ان میں سے چار یعنے ب، ب $_2$، ج اور د اب کیمیاوی طور پر الگ کرلئے گئے ہیں۔ تمام وٹامن اپنے خاص اور جداگانہ افعال انجام دیتے ہیں اور یہ سب کے سب قدرتی غذاؤں میں پائے جاتے ہیں۔

وٹامن ا:۔

یہ وٹامن پودوں کی کیروٹینی بافتوں میں موجود ہوتا ہے، اور یہ زیادہ تر سبز اور زرد ترکاریوں، مچھلی کے تیل، انڈے کی زردی، دودھ، مکھن، کریم اور پنیر میں ہوتا ہے۔

افعال:۔ یہ وٹامن نشو و نما میں مدد دیتا ہے اور تولید کو بڑھاتا ہے۔ جسم کی بیرونی ساخت اور ان کے افعال کو برقرار رکھتا ہے اور متعدی امراض کے مقابلے میں قوت مدافعت پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ وٹامن انسان کو عرصے تک غذا میں نہ ملے تو اس کے یہ نتائج ہوں گے:۔ یعنے اس کے نہ ہونے سے نہ صرف نشو و نما موقوف ہوجاتی ہے بلکہ کمزوری اور شب کوری پیدا ہوتی ہے جلد خشک ہوجاتی ہے یا ایسی کھری ہوجاتی ہے جیسے مینڈک کی۔ آشوب چشم اور آنکھ، ناک، حلق، ششش، معدے، آنت اور جلد کی بیماریاں اور بولی و تناسلی نظام کی خرابی بھی اسی سے پیدا ہوسکتی ہے۔

وٹامن ب $_1$ (یا ب، اینورین):۔

اس وٹامن کے ماخذ خمیر، اناج، پھلیاں، سبز ترکاریاں، انڈے، پنیر، مچھلیاں، گردے اور جگر وغیرہ ہیں۔

افعال:۔ کاربوہیڈریٹ کے تعاملات اسی وٹامن کے ذریعہ انجام پاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وٹامن ب اعصاب و عضلات کی بالیدگی کے لئے بھی ضروری ہے اگر کسی کو وٹامن ب زیادہ دن تک نہ ملے تو

اس کے اثرات یہ ہو سکتے ہیں یعنے بھوک غائب ہو جائے گی، وزن کم ہو جائے گا اور ہاضمہ خراب ہو جائے تو عجب نہیں معدے کی بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ تکان زیادہ محسوس ہو گی اور اعصابی کمزوری پیدا ہو جائے گی۔ بیری بیری نام کی بیماری بھی اس ویٹامن کی کمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

ویٹامن ب۲ (ویاگ)۔۔

اس کے ماخذ خمیر، دودھ، سبز ترکاریاں، انڈے، گوشت، گردہ اور جگر ہیں۔

افعال:۔ جلد کی صحت اسی ویٹامن کی بدولت قائم رہتی ہے اور ہضمی اور عصبی نظام کی تندرستی بھی اسی سے برقرار رہتی ہے اگر ویٹامن ب۲ عرصے تک نہ مل سکے تو اس کے یہ نتائج ہو سکتے ہیں یعنے نمو موقوف ہو جاتا ہے، زبان، منہ اور جلد کی خرابیاں، معدے اور آنتوں کی خرابیاں بھی پیدا ہوتی ہیں اور "بلاگرا" نام کی بیماری اسی ویٹامن کی کمی کا بڑا نتیجہ ہے۔

ویٹامن ج۔ اسکاربک ترشہ ۔

سٹرس اور دیگر میوہ جات، کچی ترکاریاں، سرخ مرچ، تازہ دودھ اور جگر اس کے ماخذ ہیں۔

افعال:۔ یہ ایک تعدیلی عامل ہے اور باقی تنفس میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ یہ خون کی شریانوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس ویٹامن کی کمی سے یہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں:۔ اسہال، خون، جلد کی ملائمت اور مسوڑوں کی خرابی، ہڈیوں کی نرمی، جوڑوں کی بیماریاں، اور آنتوں کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، قوت مدافعت کم ہو جاتی ہے۔ "اسکروی" نام کی بیماری بھی اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

ویٹامن د کالسی فرال :۔

یہ ایک کیمیاوی مرکب آرگسٹرال کی اشعاعیت سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انسانی جسم سے براہ راست یا اس کی مصنوعی اشعاعیت سے بھی یہ ویٹامن حاصل کیا جاتا ہے۔ مچھلی کے جگر کے تیل، انڈے کی زردی، مکھن، جگر اور گردے میں پایا جاتا ہے۔

افعال:۔ کیلسیم فاسفیٹ، اسی ویٹامن کے ذریعہ اپنے افعال انجام دیتا ہے۔ ویٹامن د خون میں کیلسیم اور فاسفیٹ کی مقداروں کو برقرار رکھتا ہے اور ہڈیوں اور دانتوں میں کیلسیم کو اچھی طرح جما دیتا ہے۔ اگر اس ویٹامن کی کمی ہو جائے تو اس کے اثرات یہ ہو سکتے ہیں: یعنے ہڈیوں اور دانتوں کی ساخت ناقص ہو جاتی ہے۔ ہڈیاں نرم و نازک ہو جاتی ہیں اور ان میں کجی اور بد شکلی پیدا ہوتی ہے۔ ہڈیوں کی بیماری رکٹس اور دانتوں کی بیماری کیریز بھی اسی ویٹامن کی کمی کا نتیجہ ہے۔ نیز اعصاب اور عضلات کی کمزوری اور تنفسی بیماریوں کی طرف زیادہ میلان ہوتا ہے۔

ویٹامن ی :۔ اس کی کیمیاوی ساخت اب تک معلوم نہ ہو سکی۔ اناج، سلاد، آبی کرس اور مولاسس وغیرہ ترکاریوں اور نباتی تیلوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ عورتوں میں رحم کے افعال کی حفاظت کرتا ہے اور مردوں میں تخم خلیوں کو عمدہ بناتا ہے۔

(ح ن)

کھیل
دنیا کے ہیوی ویٹ چمپین

جیک ڈیمپسی۔ ۱۹۱۹-۱۹۲۶ء　　جین ٹنی۔ ۱۹۲۶-۱۹۲۹ء

میکس شملنگ۔ ۱۹۳۰-۱۹۳۲ء　　جیک شارکی۔ ۱۹۳۲-۱۹۳۳ء

پریمو کارنیرا۔ ۱۹۳۳-۱۹۳۴ء　　میکس بیئر۔ ۱۹۳۴-۱۹۳۵ء

جے۔ براڈک۔ ۱۹۳۵-۱۹۳۷ء　　جو لوئیس۔ ۱۹۳۷-۱۹۳۹ء

ٹیبل ٹینس کے چمپین

۱۹۲۷ء۔ آر جیکوبی (ہنگری)۔ ۱۹۲۸ء۔ زیڈ۔ مک لووِٹز (ہنگری)

۱۹۲۹ء۔ فریڈ پیری (انگلستان)۔ ۱۹۳۰ء۔ وی۔ بارنا (ہنگری)

۱۹۳۱ء ایم۔ زابوڈوس (ہنگری)۔ ۱۹۳۲ء و ۱۹۳۵ء۔ وی۔ بارنا (ہنگری)

۱۹۳۶ء۔ ایس۔ کولار (چیکوسلواکیا)۔

وائٹ من کپ

(انگلستان اور امریکہ کی عورتوں کے درمیان بین قومی ٹینس کے مقابلے)

۱۹۳۳ء۔ امریکہ۔ ۴ میچ میں بمقابلہ ۳ کے کامیاب ہا (فارسٹ ہلس)

۱۹۳۴ء۔ " ۔ ۵ میچ میں بمقابلہ ۲ کے " (ومبلڈن)

۱۹۳۵ء۔ " ۔ ۴ میچ میں بمقابلہ ۳ کے " (فارسٹ ہلس)

۱۹۳۶ء۔ " ۔ ۴ میچ میں بمقابلہ ۳ کے " (ومبلڈن)

۱۹۳۷ء۔ " ۔ ۶ میچ میں بمقابلہ ۱ کے " (فارسٹ ہلس)

۱۹۳۸ء۔ ۔ ۵ میچ میں بمقابلہ ۲ کے " (ومبلڈن)

۱۹۳۹ء۔ " ۔ وان کرام (جرمنی)۔

سنگلز (مرد)۔ ۱۹۳۷ء ڈی بج (ممالک متحدہ)، ۱۹۳۸ء۔ ڈی بج، ۱۹۳۹ء۔ وان کرام (جرمنی)

ڈبلز (مرد)

۱۹۳۴ء۔ جی۔ ایم۔ لاٹ اور ایل۔ بی۔ اسٹوفن

۱۹۳۵ء۔ جے۔ ایچ۔ کرافورڈ اور اے۔ آر۔ کواسٹ

۱۹۳۶ء۔ جی۔ پی ہیوز اور سی۔ آر۔ ڈی ٹکی (انگلستان)

۱۹۳۷ء۔ ڈی۔ بج اور جی۔ ماکو (ممالک متحدہ)

۱۹۳۸ء۔ " " " "

۱۹۳۸-۳۹ء کی فہرست کل ہند رنکنگ

عورتیں:- (۱) مسز بولانڈ (۲) مس لیلا رو (۳) مسز جے بی بلیک من (۴) مس ایم۔ ایچ۔ ڈوبانش (۵) مس ایم وڈکاک (۶) مسز آر۔ ایم۔ فونٹ (۷) مس ایل۔ وڈبرج۔

مرد:- (۱) غوث محمد (۲) ساہنی (۳) کپور (۴) رنبیر سنگھ (۵) وائی۔ سنگھ (۶) بی۔ ٹی۔ بلیک اور جے۔ ایم۔ مہتا (۷) ایس۔ سی۔ بنٹی (۸) ایس۔ اے۔ عظیم اور ایچ۔ ایل۔ سونی (۹) ٹی۔ کے۔ راماناتھم۔

حیدرآباد میں ٹینس کے مقابلے:- ۲۰ جنوری کو مہدی جنگ بازی گاہ میں ٹینس کے دلچسپ مقابلے ہوئے۔ پہلا کھیل افتخار اور پن سے دیوگوسلاویا نمبر ۱ کے درمیان ہوا جس میں افتخار نے ۶-۴، ۶-۲ سے کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد غوث محمد اور منک دیوگوسلاویہ نمبر ۲ کے درمیان مقابلہ ہوا۔ اس میں منک ۴-۶، ۶-۴، ۶-۱ سے جیت گئے۔ تیسرا کھیل ڈبلز کا تھا جس میں غوث، افتخار اور پن منک نے حصہ لیا۔ اس میں غوث، افتخار نے ۶-۲، ۶-۴ سے کامیابی حاصل کی۔ ۲۱ جنوری کو جو کھیل ہوئے

حالاتِ حاضرہ

روس اور فنستان

استونیا، لٹویا اور لتھونیا پر مسلط ہونے کے بعد روس نے فنستان کی طرف توجہ کی۔ روس یہ چاہتا ہے کہ اس کو بحر بالٹک میں آزادی کے ساتھ نقل و حرکت کرنے کا اختیار مل جائے، اور اس کے لئے آلینڈ پر توجہ ہونا ضروری ہے۔ آلینڈ سویڈن اور فنستان کے درمیان بے شمار چھوٹے چھوٹے جزیروں کا مجموعہ ہے ۱۹۱۴ء کی جنگ کے پہلے فنستان روس کے ماتحت تھا اور ۱۹۱۷ء میں یہ روس سے الگ کر دیا گیا تھا لیکن اسی زمانے سے اس کی واپسی کا مسئلہ روز بروز اہم ہوتا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں آلینڈ کے لئے تقلیل اسلحہ کا سوال اٹھا اور اس کے متعلق فنستان اور سویڈن نے ایک سمجھوتہ کر لیا جس پر بڑی اور چھوٹی مملکتیں جن کا بالٹک میں مفاد تھا راضی ہو گئیں۔

۱۹۳۸ء میں فنستان نے آلینڈ میں قلعہ بندی کرنی چاہی جس کے ۱۹۲۱ء والے سمجھوتے میں ترمیم کی ضرورت تھی چنانچہ

اس نے نہ صرف سوئڈن کو راضی کر لیا بلکہ بڑی مملکتوں کو بھی جنھوں نے پچھلے سمجھوتے پر دستخط کئے تھے اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن روس کے اختلاف سے ڈر کر مجلس اقوام نے فنستان کو اسلحہ بندی کی اجازت نہیں دی موجودہ جنگ یورپ میں جب روس کو ہاتھ پیر مارنے کا اچھا موقع مل گیا تو اس نے بالٹک کی چھوٹی مملکتوں کے ساتھ معاہدات طے کر لئے جن کی رو سے اہم مقامات پر قلعہ بندی کرنے اور بحری و ہوائی مرکز قائم کرنے کا اختیار حاصل ہو گیا لیکن بالٹک میں روسی اقتدار کی تکمیل کے لئے فنستان پر قبضہ کرنا بھی روس کے لئے ضروری تھا اس سلسلے میں روس اور فنستان کے درمیان کئی مرتبہ گفتگو ہوئی اور پاسا کیوی کے تحت فنی وفد کئی مرتبہ ماسکو ہو آیا مگر اس کے باوجود کوئی خوش گوار نتیجہ بر آمد نہیں ہوا سوویٹ حکومت کا مطالبہ تھا کہ کریلیا میں بحری مرکز قائم کرنے کے لئے اسے چند جزیرے مل جائیں لیکن فنستانی وزیر اعظم کاجاندر اس پر راضی نہ ہوئے اور بات یہاں تک بڑھ گئی کہ ۳۰ر نومبر ۱۹۳۹ء کو روس نے اپنی بری، بحری اور ہوائی طاقتوں سے فنستان پر حملہ کر دیا اور ہلسنکی پر بم باری ہونے لگی فنستان نے بھی مقابلے کی ٹھانی اور اگرچہ فنستانی حکومت نے استعفیٰ دے دیا اور مشہور اشتراکی ایم ٹیانر نے نئی حکومت بنالی مگر فنستان کے بڑے جاں نثار فیلڈ مارشل مینرہیم اعلیٰ فوجی کمان دار بنے اور ۲ لاکھ فنستانی روس کے ۲ کروڑ سپاہیوں کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے اور گو فنستان روس کے مقابلے میں بہت حقیر ہے لیکن اس نے روس کا ایسا مقابلہ کیا کہ خود روس بھی ششدر ہو کر رہ گئے۔

یورپی دول

روس کے اس حملے کے اثرات یورپی دول پر بھی پڑے چنانچہ روس کی اس پیشقدمی سے ہسپانیہ اور اطالیہ میں ناراضی کا اظہار ہونے لگا اور سوویٹ حکومت پر ملامت کی جانے لگی اگرچہ اطالیہ سرکاری طور پر غیر جانب دار رہا مگر اطالوی باشندوں کی ہمدردیاں فنستانیوں کے ساتھ ہیں اور روس کی دست درازیوں پر نفرت کر رہے ہیں۔ ہسپانیہ میں تو حکومت نے ایک قرارداد منظور کر لی جس میں روس کی اس حرکت کو وحشیانہ بتایا گیا ظاہر ہے کہ ان حالات میں جرمنی کے پرانے دوست اس کا ساتھ نہیں دے سکتے کیونکہ روس اس کے ساتھ ہے چنانچہ اطالیہ اور اسپین اب جرمنی کے بالکل مخالف ہیں اور یہ ماسکو کی دوستی کا صلہ ہے جو ہٹلر کو ملا۔

فوجی کارروائیاں

سوویٹ فوجوں نے تین طرف سے فنستان پر حملے کئے ایک تو جنوب میں خلیج کریلیا کی طرف سے، دوسرے مشرق میں کریلیا کی لامبی سرحد پر اور تیسرا شمال میں پٹسامو کی جانب سے [illegible] بعد معلوم ہوا کہ صرف شمالی رخ سے سوویٹ حملہ کامیاب رہا اور جنوب میں مینرہیم لائن پر بہت مضبوطی کے ساتھ جمے رہے۔ مشرقی رخ سے روس کی یہ کوشش تھی کہ کولاجروی اور سوموسلمی کی جانب خلیج بوتھنیا تک آگے بڑھ جائیں اور اس طرح فنستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں مگر اس کوشش میں بھی روسیوں کو کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی روس کی سب سے بڑی کامیابی آرکٹک کے خطے میں ہوئی جہاں اس نے پٹسامو جیسی اہم بندرگاہ پر قبضہ کر لیا لیکن اس کا یہ منصوبہ کہ جنوب میں مینرہیم لائن کی طرف سے اندر گھس جائے اور فنستان کے بڑے اور اہم شہروں پر قبضہ کرے خاک میں مل گیا کیونکہ روسی فوج کو پہلی شکست خلیج کریلیا میں ہوئی جہاں سے وہ مینرہیم کو توڑ دینا چاہتی تھی۔ یہاں فنستانیوں نے موسمی حالات سے فائدہ اٹھایا اور روسیوں کو منھ کی کھانی پڑی اس پر روس کھسیانی بلی کی طرح کھمبا

لوچنے لگا اور یہ اعلان کردیا کہ میانرہیم لائن، زیگفریڈ لائن کی طرح بہت مستحکم ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ روسی فوج کی ناکامی کا بڑا سبب خود اس کی غیر منظم حالت ہے۔

روس کی پریشانی

فنستان جیسے چھوٹے ملک کی حیرت انگیز جرأت روس کے لئے بہت پریشان کن ہے کیونکہ اس کی غیر معمولی مزاحمت کی وجہ سے اسٹالن کے منصوبوں میں رکاوٹ پڑ گئی بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ سرخ فوج کی کمزوریوں کا حال دنیا کو معلوم ہوگیا۔ اگر اسٹالن کی فوجیں فنستان کی مہم میں کامیاب بھی ہوجائیں تو یہ یقینی ہے کہ دوسری چھوٹی مملکتوں کو جن پر روس بعد میں حملہ کرنا چاہتا ہے مقابلے کی ہمت ہوجائے گی۔ چنانچہ فنستان کے بہادرانہ اقدام سے رومانیا کو بہت ہمت ہوگئی اور اگر روس رومانیا کی طرف رخ کرے تو وہ ضرور مقابلے کے لئے کھڑا ہوجائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسٹالن اسکینڈینیوی مملکتوں سے جو فنستان کی مدد کر رہی ہیں بہت برہم ہوگیا اور برلن روسی شہ پر ناروے اور سوئڈن کو دھمکانے لگا کہ وہ اپنی غیر جانبداری کے مسلک سے ہٹ رہے ہیں۔

فنستان کی مشکلات

فنستان کی طویل سرحد پر جو روس کے ساتھ ملی ہوئی ہے ہر جگہ سے حملہ کیا گیا تھا اور فنستان کو ایسی فوج کا مقابلہ کرنا تھا جو تعداد میں اس کی فوج سے کہیں زیادہ تھی۔ روسیوں نے منرہیم پر اپنی پوری توجہ لگادی تھی اور جھیل لاڈوگا کے شمال مشرق کی طرف سے آگے بڑھنے گئے، مگر فنستانیوں نے خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا اور روسیوں کو اس جگہ ہزیمت ہوگئی بلکہ فنستانی فوجیں پیشقدمی کرکے خود روسی علاقے میں جولانیاں دکھانے لگیں۔ فیلڈ مارشل منرہیم نے اپنی پوری قوت منرہیم لائن پر لگادی اور یہی فنستان کے لئے مفید تھا۔ مگر شمال اور مشرق کی طرف سے روس کو بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ اس طرف سے روسیوں کی یہ کوشش تھی کہ فنستان کو سوئڈن سے بالکل الگ کردے۔ اس کے لئے انھوں نے سوموسلمی کو فتح کرلیا اور خلیج بانتھ نیا کی طرف بڑھتے ہوئے اولو پر بھی قبضہ کرلیا۔ شمال میں سالا اور کولاجروی بھی روسی قبضے میں آگئے اور کیمی جروی کے قریب ریل کے ایک اہم مرکز پر بھی جہاں سے سوئڈن کی امداد پہنچتی تھی قبضہ کرلیا گیا نیز سوویٹ فوجیں پٹ سامو کے جنوب میں بھی بڑھنے لگیں۔ اب مارشل میانرہیم نے اپنی محفوظ فوج سے کام لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روسیوں کو شکست کھا کے پیچھے ہٹنا پڑا، اور فنستانی فوج نے سالا کو دوبارہ حاصل کرلیا۔ اب فنستانیوں کی ہمت اور بڑھ گئی، وہ ہر محاذ پر روسیوں کا مقابلہ کرنے لگے اور روسی فوجیں پیچھے ہٹنے لگیں۔ فنستان کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ موسمی حالات نے اس کا ساتھ دیا اور ایک منظم فوج اور میانرہیم جیسے ماہر فن اس کی پشت پناہ ہیں۔

مسٹر ہور بلی شا

جنوری کے دوسرے ہفتے میں برطانوی کابینہ میں ایک تبدیلی ہوگئی، یعنے برطانیہ کے وزیر جنگ مسٹر ہور بلی شا نے استعفیٰ دے دیا۔ انھوں نے برطانوی فوج کی تنظیم میں بڑا حصہ لیا تھا اور ان کی اہم خدمات کا کئی مرتبہ اعتراف بھی کیا گیا، مگر یہ بات ضرور تعجب انگیز ہے کہ وزیر جنگ فوج کے نئے عہدہ داروں کے ساتھ کام نہ کرسکے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ لارڈ گارٹ سے ان کو اختلاف تھا اور حال میں جنرل آئرن سائڈ سے بھی جو شاہی جنرل اسٹاف کے صدر ہیں، مسٹر ہور بلی شا کی مخالفت ہوگئی غالباً انھی اختلافات کی وجہ سے مسٹر ہور بلی شا نے استعفیٰ دے دیا۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لئے مسٹر چمبرلین نے کابینہ میں ان کو ایک دوسرا عہدہ دینا چاہا لیکن وہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور وزیر اعظم کو ان کا استعفیٰ منظور کرنا ہی پڑا مگر کابینہ کی اس تبدیلی کے کسی طرح یہ معنی نہیں ہوسکتے کہ برطانیہ جنگ کی نسبت کوئی کمزوری دکھائے گا۔ انگلستان میں جنگ کی سرگرمیاں روز بروز بڑھ رہی ہیں اور فرانس میں اتحادی فوجوں کے اعلیٰ کمانڈر جنرل گیملن ہیں جن کی مدافعت جنگ کے مسلک میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی خود مسٹر ہور بلی شا کو جنگ کے جاری رکھنے کے متعلق کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اس طرح ظاہر ہے کہ حکومت برطانیہ جنگ کو برابر جاری رکھے گی۔

عہد آفریں مشین پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔ اڈیٹر عبدالحفیظ صدیقی بی۔ ایس۔ سی (عثمانیہ)

ادارہ ادبیات اردو کی چند مطبوعات

گریہ و تبسم ۔ صاحبزادہ میکش مدیر سب رس کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے جس کے متعلق اردو کے مشہور مبصرین نے گراں قدر آرا کا اظہار فرمایا ہے "صاحبزادہ میکش ایک ہونہار شاعر ہیں جنہوں نے اپنے ذوق کی پاکیزگی اور اپنی فطری شاعرانہ قوتوں کے باعث جدید شاعرانِ تغزل میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا ہے۔" آپ گریہ و تبسم کے ذریعہ "شباب و شعر" کو اپنی حقیقی صورت میں جلوہ گر پائیں گے۔ ضرور پڑھئے۔ بہترین طباعت۔ خوبصورت جلد۔ قیمت (عالہ) روپیے

مغربی تصانیف کے اردو تراجم | میر حسن ام اے کا وہ تحقیقاتی مقالہ ہے جس پر انہیں ارباب جامعہ عثمانیہ نے ام اے کی تکمیل ان عطا کی۔ قابل مصنف نے نہایت محنت و کاوش سے اس کتاب میں ایسا قیمتی مواد جمع کیا ہے جو اردو میں تحقیقاتی کام کرنے والوں کے لئے رہنمائی کا باعث ہو سکتا ہے ان تمام اصحاب کے لئے جو زبان کے ارتقاء میں تراجم کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کرتے اس کتاب کا مطالعہ افادیت سے خالی نہیں۔ مجلد قیمت (۲) روپیے

محبت کی چھاؤں | حیدرآباد کے ہونہار فسانہ نویس مرزا ظفر الحسن بی اے کے دلکش افسانوں کا مجموعہ "محبت کی چھاؤں" میں شباب و محبت کی پرچھائیاں شباب و محبت کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ نوجوانوں کے حقیقی جذبات اپنے نفسیاتی پس منظر کے ساتھ "محبت کی چھاؤں" میں جھلکتے نظر آتے ہیں "محبت کی چھاؤں" میں محبت کے جلوے ہیں۔ "محبت کی چھاؤں" محبت سے بنائی گئی ہے۔ محبت کی چھاؤں "زندگی پر" اور زینت زندگی کا جلوہ بے باک۔ دیدہ زیب سرورق مجلد قیمت (۲) روپیے

سائنس کے کرشمے | میر حسن ام اے نے سائنس سے متعلق ملک کے ماہرین سائنس کی ان تقریروں کو جو نشرگاہ حیدرآباد سے نشر ہو چکی ہیں، کتابی صورت میں مرتب کیا ہے۔ نشری ادب کی یہ خصوصیت خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ وہ عام فہم ہوتا ہے۔ سائنس کے مسائل کو سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

"سائنس کا ہر کرشمہ" اصطلاحوں کی دنیا میں ہمارے لئے "کرشمہ" بنا رہتا ہے لیکن جب ہم اسے سمجھ جاتے ہیں۔ تو وہ ایک عام چیز نظر آتا ہے۔ جو لوگ اصطلاحوں سے گھبرا کر سائنسی ادب کا مطالعہ نہیں کرتے وہ اس کتاب کو ضرور پڑھیں قیمت (۱) آنے

کاغذ کی ناؤ ۔ | صاحبزادہ میکش کی چند مسائلی تمثیلوں کا مجموعہ ہے۔ دنیا کے تلاطم خیز سمندر میں غریبوں کی زندگی ایک کاغذ کی ناؤ ہے جو تصورات اور امیدوں کے پتوار سے چلائی جاتی ہے لیکن مصائب و آلام کے تھپیڑے اسے ہمیشہ کے لئے مذاق کر دیتے ہیں ڈرامہ اور شعریت کو کہیں آپ ہم آہنگ دیکھنا چاہتے ہیں تو "کاغذ کی ناؤ" ضرور پڑھئے جس میں زندگی مجسم درد بنی ہوئی نظر آئے گی۔ قیمت ( ) روپیے

سب رس کتاب گھر (خیریت آباد)

"بچوں سے"

اُردو نمبر تو تم نے ضرور پڑھا ہوگا اکثروں نے اس کی تعریف میں خطوط بھیجے ہیں۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں یہ آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ سب رس کی آئندہ ترقی کا دار و مدار بھی آپ ہی لوگوں پر ہے۔ اُردو نمبر میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ جن کا سب سے اچھا مضمون، افسانہ یا نظم ۱۹۴۹ء کے سب رس کے پرچوں میں چھپی ہو ان کو نواب سیف علی خاں صاحب ناظم کتب خانہ ادارہ کی جانب سے انعام دیا جائے گا۔ سب سے اچھا مضمون "حامد کا امتحان" تھا اس لئے یہ مضمون انعام کے قابل سمجھا گیا۔

سٹی کالج کے وسطانیہ کے طلبہ نے ان کے ایک جلسہ کی روئداد بھیجی ہے اس سے پہلے بھی ان کی ایک روئداد چھپ چکی ہے۔ یہ بچوں کی ایک اچھی انجمن ہے اس انجمن میں اکثر چھوٹے بچے ہیں اور اکثر ان میں ہمارے مضمون نگار بھائی ہیں مثلاً جبیب شمس وغیرہ جن کے مضامین اکثر آپ نے سب رس میں پڑھے ہیں۔ ان لڑکوں نے حال ہی میں اپنے ایک لڑکے کا تعزیتی جلسہ منایا اکثروں نے تقریریں کیں اور بعضوں نے اس لڑکے پر نظمیں سنائیں جلسہ کامیاب رہا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان کی روئداد کا صرف ہم خلاصہ چھاپ رہے ہیں کیونکہ بعض بچوں نے لکھ بھیجا ہے کہ سب رس تو نقہ پرچہ ہے اور اگر روئداد چھپنے لگیں تو مضامین کم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے اسکول کے بچوں کو اس طرف توجہ کرنی چاہئے، وہ ان لوگوں کی طرح اپنے اسکول میں انجمن قائم کر سکتے ہیں۔ ہم نے بھی اپنے جلسہ کی روئداد مختصر کر دی ہمارے شعبہ طلبہ کا ایک جلسہ ۱۶ اسفندار ۱۳۴۹ف کو احدیہ جوبلی ہال واقع افضل گنج شام میں ۵ بجے رحیم الدین ظہیر آبادی نائب صدر شعبہ کی صدارت میں منعقد ہوا ہم نے طلبہ کی آسانی کے لئے یہ تصفیہ کیا ہے کہ آئندہ سے جلسہ مقام مذکور ہی پر منعقد ہو۔ امید کہ طلبہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے۔ اس دن مباحثہ کا عنوان تھا "ہندوستانی طلبہ کو فوجی تعلیم لازمی ہے" محرک خدا بخش سلیم تھے اور مخالف تہنیت علی خاں تھے دونوں نے تائید میں اور مخالفت میں بہت اچھی تقریریں کیں بھیر عبد المجید نے عنوان کی تائید کی۔ رائے لی گئیں اور تصفیہ پایا کہ "ہندوستانی طلبہ کے لئے فوجی تعلیم لازمی ہے" آخر میں صدارتی تقریر ہوئی جس میں صدر جلسہ نے کافی روشنی ڈالی۔ ایک نظم اور بعہ معتمر کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا اور ایک جلسہ ۲۶ اسفندار کو ہوا جس میں پروفیسر سید محمد صاحب ایم۔اے "ہمارے طلبہ اور ہماری زبان" پر تقریر کی اس کی روئداد آئندہ مہینہ کے سب رس میں شائع کی جائے گی۔

معین الدین احمد انصاری

انعامی معمّہ

:- تین۳ دیا سلائیوں کی مدد سے تین۳ مثلث متساوی الاضلاع بناؤ؟

صحیح حل پر "سوتیلی ماں" انعام میں دی جائے گی۔ زیادہ صحیح حل وصول ہونے پر قرعہ اندازی سے انعام نکالا جائیگا۔

خواجہ معین الدین (گلبرگہ)

تاروں کی دُنیا

"بی بی" اور "بابو" کا دوگانہ

بی بی :- راتوں کو کہاں چھپ جاتے ہیں؟
اور دن کو کہاں سے آتے ہیں!

یہ ننھے ننھے تارے بابو
ننھے ننھے تارے

بابو :- ہے دُور یہاں سے اک دُنیا
ہے دور یہاں سے اک دُنیا

جب نیند سے بوجھل ہوتے ہیں تو اس دنیا میں سوتے ہیں
یہ ننھے ننھے تارے بی بی
ننھے ننھے تارے

بی بی :- کوئل جو گیت سناتی ہے سنتے ہیں وہیں سے لاتی ہے
بجلی جو چمک دکھلاتی ہے سنتے ہیں وہیں سے آتی ہے
کیا اُن کو وہیں یہ جاتے ہیں؟
اور رات کو واپس آتے ہیں!

یہ ننھے ننھے تارے بابو
ننھے ننھے تارے

بابو :- ٹھنڈی جو ہوائیں چلتی ہیں باغوں میں جو کلیاں پلتی ہیں
بارش میں مینہ جو برستا ہے جو پھول سحر کو ہنستا ہے
وادی کو جو نہر دُھلاتی ہے بل کھا کھا کر لہراتی ہے
یہ سب بھی وہیں سے آتے ہیں
جوں دیس میں دن کو جاتے ہیں

سب رس — فروری ۱۹۴۰ء

یہ ننھے ننھے تارے بی بی
ننھے ننھے تارے

بی بی :- اس دنیا کو کیا کہتے ہیں
جس میں یہ دن کو رہتے ہیں ؟

یہ ننھے ننھے تارے بابو
ننھے ننھے تارے

بابو :- وہ دیس بہاروں کی دنیا
ہے ننھے تاروں کی دنیا

جب شام کو چڑیاں گاتی ہیں — پیڑوں پر دھوم مچاتی ہیں
یہ اُس دنیا سے آتے ہیں — اس دنیا پر چھا جاتے ہیں
کچھ جگنو بن کر پھرتے ہیں — کچھ شبنم بن کر گرتے ہیں
کچھ دریا میں لہراتے ہیں — کچھ ابر میں چھپ کر گاتے ہیں

یہ ننھے ننھے تارے بی بی
ننھے ننھے تارے

بی بی :- ان ننھے تاروں کی دنیا
کس جا ہے بہاروں کی دنیا ؟

اس دیس کو ہم بھی جائیں گے — چمکیں گے اور لہرائیں گے
جس دیس میں دن کو جاتے ہیں — اور رات کو واپس آتے ہیں

یہ ننھے ننھے تارے بابو
ننھے ننھے تارے

بابو :- ہے دور یہاں سے وہ دنیا
ہے دور جہاں سے وہ دنیا

ہم بھی تو وہیں سے آئے ہیں — دنیا میں مسرت لائے ہیں
جس دیس میں دن کو جاتے ہیں — اور رات کو واپس آتے ہیں

یہ ننھے ننھے تارے بی بی
ننھے ننھے تارے

میکش

ایماندار ریڈ انڈین

ایک دفعہ ایک بوڑھے ریڈ انڈین نے ایک یورپین دوکاندار سے کچھ چیزیں مول لیں۔ جب وہ چیزیں لے کر اپنے خیمہ (ڈیرے) کو واپس آیا اور چیزوں کے گٹھے کو کھول کر دیکھا تو اس میں دوکاندار کے کچھ روپے بھی نظر آئے۔ "میں بہت ہی خوش نصیب ہوں!" اپنے آپ سے اس نے کہا اور اس نے اپنے دل میں سوچا کہ میں اس رقم سے بہت سی چیزیں مول لوں گا۔

جب رات ہوئی تو ریڈ انڈین سونے چلا گیا لیکن اسے رات بھر نیند نہیں آئی کیونکہ تمام رات اسے روپیوں کا خیال آتا رہا۔ اس نے کئی دفعہ پکا ارادہ کیا کہ "میں اس رقم کو اپنے ہی قبضہ میں رکھوں گا اور دکاندار کو ایک روپیہ بھی نہ دونگا۔" مگر اس کے بعد ہی اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی اس کے اندر سے کہہ رہا ہے کہ "تمھیں یہ روپئے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہئے بلکہ ان کو اصلی مالک کے پاس پہونچا دینا چاہئے۔"

دوسرے دن صبح ہی صبح ریڈ انڈین یورپی دوکاندار کے پاس گیا اور اس کی رقم اس کو دے دی۔

دکاندار نے حیرت سے پوچھا کہ "تم نے یہ رقم اپنے لئے کیوں نہیں رکھ لی؟"۔ ریڈ انڈین نے جواب دیا کہ میرے اندر دو آدمی بولتے معلوم ہوتے تھے۔ ایک آدمی کہتا تھا کہ "تم یہ روپئے رکھ لو۔ دوکاندار کو کبھی اس کا پتہ نہ چل سکے گا کہ تم ہی نے روپئے لئے ہیں۔" لیکن دوسرا آدمی میرے اندر سے کہتا تھا کہ "یہ رقم تمھاری نہیں ہے، دوکاندار اس کا مالک ہے اسی کو دے دو۔" تب پہلا آدمی کہتا کہ "تم روپئے رکھ لو کسی کو مت دو۔" پھر فوراً دوسرا کہنا شروع کرتا کہ "نہیں نہیں تم ان روپیوں کو اپنے پاس نہیں رکھ سکتے۔ تم کو چاہئے کہ دوکاندار کو واپس دے دو۔"

ان دونوں خیالوں یا آدمیوں نے مجھے رات بھر سونے نہیں دیا۔ اب میں روپئے آپ کو دیتا ہوں۔ آج دونوں آدمی میرے اندر باتیں نہیں کریں گے اور میں آرام سے سو سکوں گا۔

سب سے بھائی اور بہنو! تم حیران ہوکر دریافت کروگے کہ کہیں آدمی کے اندر سے بھلا آواز بھی آتی ہے۔ ہم تمھیں بتا دیتے ہیں کہ یہ دو آوازیں یا دو خیال جو اس ریڈ انڈین کے دل میں پیدا ہو رہے تھے دراصل یہ نیکی اور بدی کے محرک یعنی پیدا کرنے والی آوازیں ہیں۔ وہ آدمی یا وہ آواز جو کہتی تھی کہ "تمھیں یہ روپئے اصلی مالک یعنی دوکاندار کو واپس کر دینے چاہئیں"۔ وہ نیکی کی آواز تھی۔ ذرا تفصیل سے سمجھو تو یہ ہے کہ تمھارے دل میں ہمیشہ دو قوتیں پیدا ہوتی ہیں ایک قوت نیک کام کرنے کو کہتی ہے دوسری برا کام کرنے کی ترغیب دلاتی ہے۔ اب اس قوت کو جو کہ ریڈ انڈین کے اندر نیکی کرنے کا حکم دیتی تھی ہم اسے ضمیر کہتے ہیں۔ اگر تم اپنے ضمیر کی آواز پر ہر کام کو انجام تک پہونچاؤ تو تم دنیا میں کامیاب رہوگے اور تمھارا دین بھی بہتر رہے گا مگر جب تم اپنے ضمیر کے خلاف یعنی اس ریڈ انڈین کے دل میں جو قوت برائی کا کام کرنے یعنی روپیہ لے لینے کی تحریک کرتی تھی اس کے کہنے پر چلوگے تو تم دنیا میں ذلیل ہو جاؤگے اور کوئی ترقی نہیں کر سکوگے، اسی طرح ضمیر کے خلاف کرنے سے تم دین بھی اپنے لئے خراب پیدا کر لوگے۔

دیکھو! ایک جاہل، اور بالکل اجڈ وحشی جو کہ تمھاری مانند عالی شان عمارتوں میں نہیں رہتا بلکہ پتوں کی جھونپڑی یا چمڑے کے خیمہ (ڈیرے) میں اپنی زندگی گذارتا ہے وہ اپنی ضمیر کی آواز پر عمل کرکے کس طرح ایک یورپین کے دل میں عزت پیدا کر لیتا ہے میں تم سے امید رکھتا ہوں کہ جب کبھی تمھیں ایسے مواقع

پیش آئیں تو تم اطمینان کے ساتھ نیکی کی طرف جھک جاؤ گے اور ایمانداری کے خلاف کوئی کام نہ کرو گے۔

سید خدا بخش سلیم

"عادت"

بھائیو! والٹر اسکاٹ نامی انگریز ادیب کا نام ادبی دنیا میں جس احترام کیساتھ لیا جاتا ہے وہ تو غالباً معلوم ہے مگر آج میں تم سے اس کی ایک عادت کے متعلق کچھ بیان کرونگا۔

والٹر اسکاٹ لڑکپن ہی سے نہایت ذہین و ذکی تھا۔ اپنی ذہانت کی بدولت جماعت میں ہمیشہ اول رہتا تھا۔ اس کی جماعت میں ایک دوسرا لڑکا بھی بہت ہشیار اور چالاک تھا۔ جو اسکاٹ کی امتیازی کامیابی پر رشک کرتا اور ہمیشہ اس سے آگے بڑھ جانے کی سعی کرتا تھا۔ اسکاٹ نے اس کو کبھی بڑھنے نہ دیا لیکن اسکاٹ کو ایک عادت یہ تھی کہ جب ماسٹر صاحب اس سے سوال کرتے تو جواب دیتے وقت عموماً وہ اپنے کوٹ کے بٹن ہاتھ کی انگلیوں سے نیچے اوپر کرتا تھا۔ جب اسکاٹ کی اس عادت سے دوسرا چالاک لڑکا واقف ہو گیا تو اس نے خیال کیا "اگر میں اس کے بٹن کاٹ ڈالوں تو ضرور ہے کہ وہ اپنی عادت کے موافق بٹن دیکھے گا اور جب بٹن غائب رہیں گے تو لازماً اس کا خیال بٹن کی طرف مائل ہوگا اور وہ بہتر طریقہ پر جواب ادا نہ کر سکے گا تو میں اس سوال کا جواب بہتر طریقہ پر ادا کر کے پہلا درجہ حاصل کر لوں گا" اس خیال کے ساتھ ہی اس کو اپنی کامیابی کی امید ہو گئی۔

دوسرے دن جب ماسٹر صاحب نے اسکاٹ سے سوال کیا تو اسکاٹ نے حسب عادت انگلیوں سے بٹن نیچے اوپر کرنا چاہا مگر اس کے ہاتھ بٹن سے محروم تھے کیونکہ دوسرے چالاک لڑکے نے کچھ دیر قبل اس کی بے خبری کے عالم میں بٹن کاٹ ڈالے تھے۔ چنانچہ اسکاٹ کا خیال بٹن کی طرف منتقل ہو گیا جس کی وجہ وہ سوال کا جواب بہتر طریقہ پر نہ دے سکا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس چالاک لڑکے نے سوال کا جواب اسکاٹ سے بدرجہ اتم بہتر ادا کر کے پہلا درجہ حاصل کر لیا۔

عزیز بھائیو! اب تو آپ نے جان لیا ہو گا کہ اسکاٹ کو انگلیوں کی مدد سے بٹن نیچے اوپر کرنے کی کس قدر معمولی عادت تھی مگر اس نے اس حقیر عادت کی وجہ اپنا امتیاز کھو دیا۔ کوئی عادت خواہ کتنی ہی حقیر اور معمولی ہو مگر اس کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔ دانت چبانا، ناخن کترنا، گردن ٹیڑھی کرنا، انگلیاں چٹخانا وغیرہ ایسی عادتیں ہیں جو بظاہر بالکل معمولی ہوتی ہیں مگر یہ اپنا بہت بڑا اثر چھوڑ جاتی ہیں۔ اس قسم کی عادتیں صرف کمسن بچوں ہی میں ہی ہوتی ہیں بلکہ بعض ذی شعور اصحاب بھی ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ مجھے ایک واقعہ یاد ہے جبکہ ایک معزز ہستی نے ایک ایسی ہی معمولی عادت کی وجہ خفت اٹھائی۔ ہمارے گاؤں میں ایک باوقار اور صاحب ثروت آدمی تھے جنہیں ایک عادت یہ تھی کہ جب کبھی وہ کرسی پر بیٹھتے تو کرسی کو آگے پیچھے ہلاتے تھے۔ ایک وقت صاحب موصوف ایک جلسہ میں شریک تھے۔ مقرر دھواں دھار تقریر کر رہا تھا کہ آنجناب نے بھی رنگ میں آ کر کرسی کو آگے پیچھے ہلانا شروع کر دیا۔ سوئے اتفاق سمجھئے یا مولانا کی شومئی قسمت کہ کرسی کا توازن قائم نہ رہا اور کرسی گر پڑی اور جناب نے بھی زمین پر آ کر ہی دم لیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مجلس کی فضا حضار محفل کے قہقہوں سے گونج اٹھی بعض زندہ دل اصحاب نے تو تالیاں بجا کر مبارکباد بھی دی۔

عادت کی عموماً دو بڑی قسمیں ہیں (۱) اچھی عادتیں (۲) بری عادتیں۔ لڑکوں کے لئے اچھی عادتیں علی الصباح اٹھنا، ہر کام کا وقت پر کرنا اور اپنے خالق و آقائے حقیقی کی عبادت کرنا وغیرہ

وغیرہ ہیں اور بری عادتوں میں چند تو اوپر بیان کردی گئی ہیں اور
بہت سی ایسی ہیں جنہیں کم و بیش ہر شخص جانتا ہے ۔ لڑکوں میں عموماً
اچھی عادتوں کے بجائے بری عادتیں ہی پیدا ہوجاتی ہیں اس لئے
جب کبھی ہمیں یہ معلوم ہوجائے کہ ہم میں کوئی بری عادت ہے
تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کو دور کریں اور اس کے بجائے اچھی عادات
کو جگہ دیں ۔ مثل مشہور ہے "عادی بننا آسان ہے مگر اس سے
چھٹکارہ پانا مشکل ہے" ایسی صورت میں ہمارا اولین فرض یہی ہے
کہ ہم پہلے ہی سے اپنے آپ کو اچھی عادتوں کا خوگر بنائیں تاکہ
بعد میں ندامت اور خفت اٹھانی نہ پڑے اور حقیقت یہ ہے کہ دنیا
میں ہمارا احترام، عزت و توقیر محض ہماری عادتوں پر موقوف
ہے ۔

محمد عبد القادر فاروقی (احمد نگری)

"جیسا کروگے ویسا بھروگے"

اور پیچھے ! اس غریب چڑیا کو پتھر کا نشانہ نہ بناؤ" پیچھے
سے ایک بوڑھا آدمی چلا اٹھا ۔

کیوں جناب! لڑکے نے کہا اس چڑیا کی عمدہ آواز کو
سننے کی مجھ میں تاب نہیں اسلئے میں اس کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں ۔

بوڑھا ۔ ہاں سچ ہے اس کی آواز تو خداداد ہے ۔ اس
کا کیا قصور خدا کی دی ہوئی چیز ہر ایک کو پیاری ہے کیا انسان ۔
کیا حیوان ہر ایک خدا کا شکر ادا کرتے ہیں ۔ اس نے ہم سب کو ایسی ایسی
چیزیں عطا کی ہیں کہ جن کو ہم لکھ سکتے ہیں نہ گن سکتے ہیں جس طرح
تمھاری آواز تم جیسے انسانوں کو پیاری ہے اسی طرح اس چڑیا
کی آواز اس کے ہم جنسوں کو پیاری ہے کبھی کسی کو بری نظر سے نہ
دیکھو ۔ بیٹے ! تم ابھی نادان ہو ۔ ان باتوں کو تم کیا جانو ۔ خدا نے
تم کو قوت دی ہے اس کو کسی اچھے کام میں صرف کرو ۔ یہ نہیں کہ
غریب بے زبان پرندوں کا اپنی قوت سے کام تمام کرو ۔ تم کو کوئی
شخص گرا دے یا گالی دے تو تمھیں غصہ آجائے گا اور تم اس سے
بدلہ لینے کی ہزاروں کوششیں کروگے اور بدلہ لئے بغیر خاموش نہ ہوگے

لڑکا ۔ اجی جناب ۔ رہنے دیجئے اپنی تقریر کو میں یہاں
جی بہلانے آیا ہوں اور آپ ہیں کہ میرے کام میں خلل انداز ہوکر
نصیحت کررہے ہیں ۔

بوڑھا ۔ بیٹا ۔ تم نہیں سمجھتے ۔ تم جس کو کھیل سمجھے ہوئے ہو وہ اس چڑیا
کی موت ہے تم کوئی ایسا کھیل کھیلو جس سے سب لوگ تم سے خوش ہوں ۔
معصوم پرندوں کو مارنے سے لوگ تم سے کبھی خوش نہ ہوں گے ۔
بلکہ تم سے نفرت کرینگے ۔

لڑکا ۔ واہ ! آپ بھی خوب کہتے ہیں " لوگ مجھ سے نفرت
کریں گے " یہ آپ کی بھول ہے سب یہی کہیں گے کہ دیکھو بچہ کتنا ہوشیار
ہے ۔ چڑیوں کا شکار کرتا ہے ۔ شوق تو اچھا ہے ۔ ابھی بچہ ہے
جب بڑا ہوگا تو شیر جیسے بڑے بڑے جانوروں کا شکار کرے گا

بوڑھا ۔ یہ تو تمہارا خیال ہے لیکن ان معصوم پرندوں کو مارنا
کتنا گناہ ہے ۔ اس چڑیا نے تمہیں کیا نقصان پہنچایا ہے جو تم اس کو
مار رہے ہو ۔

جب کوئی شخص مرتا ہے تو اس کے رشتہ دار کتنا افسوس کرتے
ہیں ۔ یہ تو شاید تم پر بھی گزری ہوگی ۔ چڑیا کے گھر والے بھی تو ہونگے
اگر یہ بیچاری تمھارا شکار بن جائے تو وہ خوب رنج کریں گے زمین
و آسمان ایک کردیں گے ۔ ہم ان کی باتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے
ان کے مصیبت کے دکھڑے نہیں سن سکتے ۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہیں
تم شکار کی گھات میں رہ کر خود شکار نہ بن جاؤ ۔

لڑکا ۔ میں اس کا مطلب نہیں سمجھا ۔

بوڑھا ۔ تم ان باتوں کو کیا جانو ۔ مثل مشہور ہے "جیسا کروگے
ویسا بھروگے" اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم دوسروں کی

برائی کرنا چاہو تو پہلے تم خود برے ہو گئے۔ نیکی کرو گے تو تمھارا نام ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا۔ اور ہر شخص تمھیں عزت کی نظر سے دیکھے گا۔

لڑکا۔ اچھا آپ کا مطلب۔ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کسی دوسرے کو سمجھائیے۔

بوڑھا۔ میرے بچے! تم ابھی نادان ہو۔ جب بڑے ہو گے تو تمھاری آنکھیں کھل جائیں گی اور تمھیں اس وقت اس کی قدر ہوگی اب کھیل کود میں ان سب باتوں کو بھلا رہے ہو۔ مجھے اس بات کا خوف ہے کہ وہ پتھر الٹا تمھیں نقصان نہ پہنچائے۔

لڑکا۔ کہیں پتھر واپس بھی آتا ہے۔ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں

بوڑھا۔ ہاں واپس آسکتا ہے۔ اگر تم نہیں سمجھے تو آؤ میں تم کو سمجھاتا ہوں۔ (لڑکا نزدیک آجاتا ہے اور کان لگا کر سنتا ہے۔)

بوڑھا۔ ۵ سال پہلے میں تم جیسا ایک بچہ تھا۔ ہر روز پرندوں پر پتھر پھینکا کرتا تھا۔ اس روزانہ کی مشق سے میں ایک کامیاب نشانہ باز بن گیا۔ میرا کوئی پتھر بھی خالی نہ جاتا تھا۔ میرے مکان کے پہلو میں ایک بوڑھے آدمی کا مکان تھا وہ ضعیفی کی وجہ سے کوئی کام نہ کر سکتا تھا۔ ہر روز میں اس کا کام کر دیا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے بہت خوش تھا۔ اس مکان کی چھت میں کسی چڑیا نے ایک گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس میں اس کے دو بچے بھی تھے جب ماں آتی تو وہ چیں چیں کا شور کرتے اور ماں کی چونچ سے دانہ لینے کی کوشش کرتے۔ ایک دن وہ چڑیا ایک کھمبے پر بیٹھی ہوئی تھی میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس کی بھولی بھالی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے یہ اظہار ہو رہا تھا "مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچاؤ" میں نے اس کی کوئی پروا نہ کی میرے دل میں یہ بات سمائی کہ چلو آج اسی چڑیا کو نشانہ بناؤں۔ دیکھوں تو میرا نشانہ پہلا سا ہے یا نہیں۔ میں نے ایک پتھر اس کو دے مارا چڑیا کی گردن ٹوٹ گئی زمین پر آ رہی۔ اور تڑپ تڑپ کر اپنی جان دی۔ میں خوش تھا لیکن جب میں نے اس کو تڑپتے دیکھا تو مجھے بہت صدمہ ہوا میں پچھتانے لگا کہ کیوں میں نے اس بیچاری کی جان لی ؎

اب پچھتائے ہوت کیا جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

اب چڑیا کا کام تمام ہو گیا اب رنج کرنے سے کیا حاصل۔

اس کا جوڑا "چڑا" تمام دن اس کے اطراف چکر لگاتا رہا۔ اس نے اپنی بیوی کے لئے خوب رویا۔ اور خوب ہی ماتم کیا۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے بہت افسوس کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے میرے سینہ میں نشتر چبھو دیا۔ میرا رنج کرنا اس وقت کا ہی تھا بلکہ ہمیشہ کا ہی رونا میں نے مول لیا۔ میں نے یہ واقعہ اس شخص سے نہ کہا لیکن اسے کسی طرح سے معلوم ہو گیا تھا۔ اور وہ مجھ سے کچھ نہ کہا۔ میں اب اس قابل نہ رہا کہ اس کو اپنی صورت دکھا سکوں۔ مجھے جب کبھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو بہت افسوس ہوتا ہے اور تمام جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

دیکھو میرے بچے! اسی معمولی نشانہ سے مجھے اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ میں نے جیسا کیا تھا مجھے ویسا ہی بدلہ ملا "جیسا کرو گے ویسا بھرو گے" میرا بھی یہی حال ہوا۔

لڑکا یہ سن کر بہت متاثر ہوا اور پتھر زمین پر پھینک دیا۔

اس طرح بیچاری چڑیا کو کوئی تکلیف نہ پہنچی ــــ اور لڑکے کو آیندہ کے لئے نصیحت ہوگئی۔

میا رام پرشاد

Reg. No. M 3950.

ادارۂ ادبیات اردو

کی

چند علمی ، ادبی اور دلچسپ کتابیں

۱۔ شعرائے عثمانیہ | جامعہ عثمانیہ کے چھبیس شاعروں کے کلام کا پاکیزہ انتخاب ۔ مختلف نظموں اور غزلوں کا گلدستہ رنگ و بو ۔ ہر شاعر کے کلام پر ایک مختصر مگر جامع تنقید ۔ مرتبہ سید معین الدین صاحب قریشی ایم ۔ اے و عبدالقیوم خان صاحب باقی ایم ۔ اے طباعت و کتابت نفیس رائل سائز صفحات (۲۳۱) قیمت مجلد با تصویر دو روپیہ ۱۲ آنے

۲۔ مغربی تصانیف کے اردو تراجم | مغربی زبانوں کی تصنیفات و تالیفات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا تذکرہ ۔ صاحبان فکر کی نظروں میں اس کتاب کی افادیت دوسری تحقیقی کتابوں سے کم نہیں ۔ مرتبہ میر حسن صاحب ایم ۔ اے طباعت و کتابت نفیس کراؤن سائز صفحات (۱۰۲) قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے ۔

۳۔ محبت کی چھاوں | مرزا ظفرالحسن صاحب بی ۔ اے کے ۱۴ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ۔ ہر فسانے میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدے کے تاثرات کارفرما ہیں ۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کیلئے ایک شایستہ ذہنی تفریح صفحات (۱۳۲) قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے ۔

۴۔ سوتیلی ماں | اس کتاب میں اصلاح معاشرت کے اہم پہلووں پر روشنی ڈالی گئی ہے ۔ سوتیلی ماں اور سوتیلے بچوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے مفید طریقے بیان کئے گئے ہیں مصنفہ رابعہ بیگم صاحبہ طباعت و کتابت نفیس صفحات (۴۸) قیمت مجلد صرف چار آنے ۔

۵۔ روح غالب | اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسداللہ خان غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ۔ صفحات (۲۴۰) با تصویر قیمت دو روپے آٹھ آنے ۔

۶۔ تاریخ گولکنڈہ | وہ کتاب جو کئی سال کی تحقیق اور محنت و معلومات کا نتیجہ ہے ۔ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے استاد تاریخ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی یم ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی نے اس کتاب میں سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند تاریخ قلمبند کردی ہے ۔ تصویریں بھی مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں ۔ صفحات (۳۳۰) قیمت مجلد تین روپیہ آٹھ آنے ۔

۷۔ گریہ و تبسم | صاحبزادہ میکش کے کلام کا دلچسپ مجموعہ ۔ شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ ہے ۔ صفحات (۱۹۲) قیمت مجلد دو روپے

۸۔ سر سالار جنگ اعظم | حیدرآباد کے محسن اعظم کے حالات زندگی اور کارنامے دلچسپ اور سادہ پیرائے میں قلمبند کئے گئے ہیں ۔ مرتبہ مولوی فیض محمد صاحب بی ۔ اے ۔ ڈپ ایڈ صفحات (۴۸) قیمت مجلد صرف چھ آنے ۔

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۳۹۵۰ M
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس ملتا ایک روپیہ آٹھ آنے

سب رس

جلد (۳) شمارہ (۴)
اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

جلد ۳ شمارہ ۴ — سب رس حیدرآباد — اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

(۱) رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر دیجئے۔ دیر سے اطلاع آنے پر یا تو پرچے ختم ہو جاتے ہیں یا گزشتہ مہینے کے پرچوں پر زیادہ محصول ڈاک ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تاریخ مقررہ کے بعد اطلاع آئے تو پرچہ روانہ کرنے میں تامل ہوگا۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر "دفتر ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد دکن سے شائع ہوا۔

اداریہ

دانائے راز ۱۹۳۸ء کا ایسا ہی اپریل تھا جس نے ہم سے اقبال کو چھین لیا' اس عرصہ میں اقبال کے جوش اور ولولہ کی روح جو اس کے کلام کی صورت میں موجود ہے' اور جب تک دنیا' زندگی کی محتاج ہے' موجود رہے گی' ترقی پسند ذہنیتوں پر اپنا اثر بڑھاتی رہی۔ آج' اقبال کے پرستار اتنے زیادہ ہوگئے ہیں' جتنے کہ اس کی زندگی میں بھی نہ تھے۔ اس کی موت اصل میں بے روح زندگیوں پر ایک تازیانہ ثابت ہوئی۔ جب موت نے اس کی آنکھیں بند کیں' تو زندگی نے ہماری آنکھیں کھول دیں اور ہم اس کی بچی ہوئی شراب کی طرف ساغر بکف' بڑھنے لگے ——— بڑھ رہے ہیں ——— بڑھتے جائیں گے۔

اقبال کے کلام اور اس کی زندگی پر اہل ہند نے کافی توجہ کی اور شاید ہی کسی مشرقی شاعر پر اس قدر ادب' شایع ہوا ہو' جس قدر کہ اقبال پر شایع ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال' مستقبل کا شاعر تھا' اُس نے انسانیت کا جو نصب العینی کردار اپنے کلام کے ذریعے سے تخلیق کیا ہے' وہ ایسا نہیں ہے جو آواز بن کر ختم ہو جائے۔ اس کا پیام' بانسری کی سریلی تان نہیں' بلکہ صور اسرافیل ہے۔ اس نے لوری نہیں دی بلکہ شانہ ہلا ہلا کر جگایا۔ اس نے سکون کی تلقین نہیں کی بلکہ "حرکت وحیات" کا نعرہ لگایا۔ یہ "اضطراب مسلسل" جس کی طرف کلام اقبال' رہنمائی کرتا ہے' "زندگیٔ دوام" سے جدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جیسے جیسے خواب سے نیم خوابی اور نیم خوابی سے بیداری پیدا ہوتی جائے گی' اقبال کے کلام کا اثر بھی بڑھتا جائے گا۔ اس کی تہہ در تہہ گہرائیوں میں کئی معلوم نامعلوم منزلیں پوشیدہ ہیں۔ اس لئے فکر ونظر جیسے جیسے ان گہرائیوں میں اترتی جائے گی' اس کو ہر لمحہ نیا طور نظر آئے گا اور ہر نئے طور پر نئی برق تجلی۔ اقبال' پیمانوں کو دیکھ کر شراب تقسیم کرتا ہے' جس کا جتنا پیمانہ ہو' اتنی ہی شراب ملتی ہے اور جتنی شراب ملتی ہے اتنا ہی نشہ حصہ میں آتا ہے ——— دنیا' اقبال کے کلام سے جس قدر قریب ہوتی جائے گی' اس کی کشش اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔

گنبد شاہ سراج اورنگ آباد میں حضرت شاہ سراج اورنگ آبادی کا گنبد نہایت بوسیدہ حالت میں تھا' ادارہ کی تحریک پر مولوی غلام احمد خاں صاحب سابق صوبہ دار نے اس کی ترمیم کے لئے کارروائی کا آغاز کیا تھا اور اب مولوی عبدالباسط خاں صاحب صوبہ دار نے اپنی ذاتی نگرانی میں اس کو مکمل کر دیا ہے۔ ادارہ ان دونوں اصحاب کا شکر گذار ہے۔ اس گنبد کی تصویریں زیر نظر شمارے میں شایع کی جارہی ہیں۔

دکنی اور دیہاتی شاعری حیدرآباد میں دکنی اور دیہاتی زبان میں شاعری کرنے کا خبط بڑھتا ہی جا رہا ہے اور ہر شاعر جو مشاعرہ میں داد حاصل کرنا چاہتا ہو' زبان کو بگاڑ کر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ پہلے پہلے جب نذیر احمد دہقانی' غلام علی اور اعجاز حسین کھٹّا نے ان زبانوں میں شعر کہنے شروع کئے تھے تو ان کا مقصد یہ نہیں تھا کہ ادبی مسخروں کی ایک جماعت پیدا کی جائے۔ جن اصحاب نے' دہقانی' علی اور کھٹّے کی نظمیں سنی ہیں وہ جانتے ہیں کہ انھوں نے ہنسی ہنسی میں سننے والوں کے دلوں میں چٹکیاں بھی لی ہیں۔ زبان سے قطع نظر ان کی بلندیٔ فکر' پرواز تخیل' اور وسعت نظر نے سونے والوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر جگانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی شاعری کا کمال چھلکے میں نہیں بلکہ مغز میں پوشیدہ ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ ہماری محفلوں میں اہل نظر اتنے نہیں ہوتے جتنے کہ تماشائی ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کو اکثروں نے مذاق سمجھ کر قہقہوں کا خراج دیا اور اب ان کے مقلد' ان کے کلام کی مقبولیت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ ہر روز ایسا شاعر پیدا ہو رہا ہے جس کی کھوپڑی خالی ہوتی ہے اور جس کی زبان تتلاتی ہے۔ اسے کون سمجھائے کہ صرف دکنی یا دیہاتی زبان مقبولیت کا راز نہیں ہے بلکہ مقبول ہونے کی وہ صلاحیت ہے جو دلوں کی آواز کو دلوں میں اتارتی ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ دکنی اور دیہاتی شاعری کی یہ وبا کہیں دہقانی' علی اور کھٹّے کے مقاصد کو نقصان نہ پہنچا دے۔ اور ملک ایک عام تاثر کی

بناء پر ایسے اچھے شاعروں کی بلند فکری سے محروم نہ ہو جائے، جیسے کہ دہقانی، علی اور رکھشا ہیں۔ اس لئے ارباب ذوق کو اس خوش فکری کے خلاف ایک حوصلہ شکن محاذ بنانا چاہئے جو ہماری زبان کو بگاڑ رہی ہے۔ افسوس تو اس کا ہے کہ وہ دکنی اور دیہاتی زبانیں جو اپنا کشکولِ شعری لئے شاعرے میں "واہ وا" کی بھیک مانگتی ہیں، دکن کے کسی دیہات میں بھی نہیں بولی جاتیں اور جو زبان بولی جاتی ہے اس سے ہمارے غیور شاعر واقف بھی نہیں۔

نذرِ دکن جنوری کے رسالۂ اردو میں تنقید و تبصرہ کے عنوان کے تحت ڈاکٹر جعفر حسن صاحب کا مضمون "نذرِ دکن تنقید کی آگ میں" پڑھ کر ہمیں سخت تعجب ہوا۔ اگر اس پر مولف کا نام نہ ہوتا تو ہم اور ہماری طرح ہر ایک یہی سمجھتا کہ کسی خام کار اور نوسیکھ مضمون نگار نے خواتین کی انشار پردازانہ قوتوں سے جل کر اپنے احساس کمتری کا اظہار اس مضمون کی شکل میں کیا ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ ڈاکٹر صاحب کے اس جوشِ تحریر کی بنیاد کیا ہے۔ جس کتاب کو انھوں نے بنیاد قرار دے کر اپنی ساری بھڑاس نکالنے کی کوشش کی ہے وہ رسالۂ سب رس بابت جنوری سنہ ۱۹۳۹ء کا ضمیمہ ہے۔ اس میں خواتین کے وہ مضامین شائع ہوئے ہیں جو سب رس کے دکن نمبر کے لئے جمع ہوئے تھے۔ اور تنقید نگار کا اردو میں اپنی "کنواری کوشش" کے آزمانے کے لئے اس کتاب کا انتخاب کرنا! ان کے حسنِ انتخاب کی دلیل ہے۔

یہ تو انتخاب ہوا لیکن اس چھ جزو سے بھی کم صفحات کی کتاب پہ انھوں نے کتنے صفحے سیاہ کئے ہیں! اس سے دوگنی سائز کے (۱۲) صفحے تو سامنے ہیں نہ معلوم کتنے اور باقی ہیں۔ یہ ڈاکٹر صاحب کے احساس تناسب کا ثبوت ہے۔ تنقید میں "باقی دارد" ایک جدت ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کا عنوان "نذرِ دکن تنقید کی آگ میں" سنجیدہ تنقید نگاری کے لب و لہجہ سے کس قدر بعید ہے نہ معلوم یہ آگ ان کے دل میں کہاں سے پیدا ہوئی اور کیوں پیدا ہوئی! ایک معقول اور سنجیدہ تنقید نگار پہلے دماغ میں آگ کیوں سلگا لیتا ہے، کسی آتش گیر اور شعلہ فشاں دماغ سے کیا کسی معقول اور تعمیری تنقید کی توقع ہو سکتی ہے؟

ہم یہ دیکھ کر ایک تبسم کرنا مناسب سمجھتے ہیں کہ اگر یہ ابتدائی اصول ان کے دائرۂ علم میں ہوتا تو وہ اپنی تنقید کا عنوان کم از کم یہ نہ رکھتے! پھر ماشاء اللہ سے عمر بھر میں پہلی بار تنقید پر قلم اٹھایا اور پہلی ہی کوشش میں یہ عدم توازن اور مغلوب الغضبی کی آگ!

قبل اس کے کہ کوئی تنقید کے میدان میں اپنے غضب ناک گھوڑے کو بے لگام چھوڑے کیا کسی اصول تنقید کی مشق اور واقفیت کی ضرورت نہیں ہے، جس کی شکایت دکن کے مصنفین و مصنفات سے کی گئی ہے کہ وہ مشق کئے بغیر ادبی میدان میں کود پڑتے ہیں۔

یہ ایک معمولی سی بات ہے جو ہر صاحب ذوق جانتا ہے کہ کتاب کی نوعیت جس قدر علمی ہوتی ہے تنقید کا لب و لہجہ اسی قدر سنجیدہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی پہلے ہی سے کسی وجہ کی بناء پر پل پڑنے پر تیار بیٹھا ہوا ہو تو پھر اس سے کسی طرح کے توازن کی کہاں توقع ہو سکتی ہے۔ اس اصول کے تحت کہ ایک آتش فشاں تحریر کی تفصیل پر نظر ڈالنا علمی شان کے خلاف ہے ہم دل سے نہیں چاہتے تھے کہ اس تنقید کی غلطیوں پر نظر ڈالیں۔ لیکن پھر یہ خیال ہوتا ہے ایک پڑھے لکھے آدمی کو تھوڑا سا آگاہ کر دینا ایک قسم کی علمی نیکی ہوگی۔

تنقیدی اسلوب اور ادبی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ جس کتاب پر تنقید کی جا رہی ہے اسی کی حد تک اعتراض کئے جائیں، اسی کے نقائص بتائے جائیں۔ لیکن یہاں نام تو نذرِ دکن کا دیا ہے اور اپنے الٹے سیدھے بیانات کو ثابت کرنے کے لئے نقاد نے ایسے اقتباسات بھی پیش کئے ہیں جن میں سے اکثر کو نذرِ دکن تو کجا ادبیات اردو کی کسی دوسری کتاب سے بھی تعلق نہیں۔

اس مضمون میں محض اعتراض کی خاطر کہیں مختلف جملوں اور

نشتر فقروں کو توڑ مروڑ کر ادبی غلطیاں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے تو کہیں مضمون نگاروں کو جو حیدرآباد کی تعلیم یافتہ خواتین ہیں "خود پسند" "خود فریب" اور "مبتدی انشا پرداز" وغیرہ قرار دیا ہے۔ تنقید کا منشاء محض مخالفت اور ذاتی عناد معلوم ہوتا ہے۔ اس میں تعمیر و اصلاح کو ذرا بھی ملحوظ نہیں رکھا گیا۔ ہم جانتے ہیں کہ ادارۂ ادبیات اردو سے بعض غرض پرست اصحاب ناراض ہیں اور اس کے مختلف شعبوں خصوصاً شعبۂ نسواں کی مساعی (جس کی بدولت یہاں کی خواتین میں انشا پردازی اور مضمون نگاری و محنت و مطالعہ کا ذوق روز بروز بڑھ رہا ہے) انہیں سخت ناگوار معلوم ہو رہی ہے۔ لیکن ہمیں کم سے کم ڈاکٹر جعفر حسن صاحب سے ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اپنے جذبۂ خود نمائی کے اس طرح کے اظہار سے کسی کے ذاتی اختلاف کو اس درجہ ناخوش گوار اور غیر علمی انداز میں منظر عام پر لانا پسند کریں گے۔ تعجب ہے کہ رسالۂ اردو کی سنجیدگی اور متانت نے اس مضمون کی اشاعت کیسے روا رکھی؟ سچ ہے مخالفت انسان کو انجان بنا دیتی ہے۔

ہندی والوں کی باہمی رواداری اور زبان کی خدمت کا شوق ہم لوگوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر جعفر حسن صاحب کے مضمون کے خلاف ہمارے پاس متعدد مضامین وصول ہوئے ہیں۔ بعض میں ان پر اسی طرح کی سخت چوٹیں کی گئی ہیں جیسی کہ انھوں نے کی ہیں، بعض میں سنجیدگی سے ان کی اکلوتی کتاب پر تنقیدی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض مضامین خواتین کے قلم سے ہیں اور ان میں ڈاکٹر صاحب کے ادعائے انشا پردازی کا پردہ عجیب طریقہ پر چاک کیا گیا ہے۔ لیکن ہم ان سب مضمون نگاروں سے معذرت چاہتے ہیں، ہمیں ڈاکٹر صاحب پر اس طرح کے حملے کرنے مقصود نہیں کہ ان کو اپنی کتاب کی وجہ سے جس نمود و نمائش کا موقعہ نہیں ملا تھا وہ اب اس تنقید کی وجہ سے مل رہا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ تخلیقی کام مشکل ہے اور تخریبی آسان پھر تخلیقی کام میں نمود و نمائش کا موقعہ کہاں! اگر یہ پہلے ہی سے معلوم ہوتا کہ وہ شعبۂ نسواں کی دوسری کتابوں نذر دلی، من کی بپتا، سوتیلی ماں، سوانح محمد حسین آزاد وغیرہ کو چھوڑ کر سب رس کے ضمیمہ کو اپنے تمام سرمایۂ خردہ گیری کا شکار بنا دیں گے اور رائی کا پربت کر دیں گے تو ہم شعبۂ نسواں کو رائے دیتے کہ نذر دکن کو دکن کی بجائے انہیں کے نام سے معنون کر دیں۔ کیونکہ انھوں نے ہندی نظم کا انتخاب چھاپ کر اردو دنیا میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ اور زیر نظر تنقید میں غالب کو شیفتہ کا شاگرد بتا کر اپنی ادبی معلومات کا شاندار ثبوت دیا ہے۔!!

ممکن ہے کہ ہم آئندہ کسی اشاعت میں خالص علمی اغراض کے تحت ایک دو سنجیدہ مضمونوں کو جن میں ڈاکٹر صاحب کے مذکورہ تنقیدی مضمون اور کتاب منتخبات ہندی کلام کا تنقیدی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے شائع کریں اور ڈاکٹر صاحب کو یہ مشورہ دیں کہ وہ تنقید کی آگ میں اپنی تحریروں کے سونے کو بھی ڈال کر دیکھ لیں شاید اس میں کچھ کھوٹ نظر آئے۔ ہمیں ان سے ہمدردی ہے کہ اس تنقید سے ان کے فہم و ذوق کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ کیونکہ انھوں نے اس میں خواتین کے مضمونوں سے متعدد لفظوں اور ترکیبوں کو نقل کر کے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ وہ ان سے ناواقف ہیں حالانکہ یہ وہ الفاظ ہیں جن کو ہر اردو پڑھا لکھا شخص استعمال کرتا ہے اور خاص کر دکن میں جہاں اردو اور فارسی صدیوں سے تحریری زبان رہی ہے ان لفظوں کو مرد اور عورتیں سب سمجھتے اور لکھتے ہیں۔ اردو کا کوئی ادیب ایسا نہ ہوگا جو فارسی اور عربی لفظوں کے خلاف اس شدت سے جہاد کرنا چاہتا ہو۔ غرض اس تنقید میں ایسی عجیب اور مضحکہ باتیں لکھی ہیں کہ ان کو دیکھ کر وہ مثل یاد آتی ہے کہ کوا ہنس کی چال چلا تو اپنی چال بھی بھول گیا۔ جو لوگ اپنا میدان چھوڑ کر دوسروں کے میدان میں ریس کرنے کے لئے محنت اور مشق کئے بغیر کود پڑتے ہیں ان کا یہی نتیجہ ہوتا ہے ——

ادارہ کی خبریں

گزشتہ شمارے میں جگہ کی قلت کی وجہ سے شعبوں کی روداد میں شریک نہ ہوسکیں، ہم شعبوں کے داعیوں سے معافی چاہتے ہیں۔ اس اثناء میں جن شعبوں کے جلسے ہوئے ان کی مختصر سی تفصیل یہ ہے۔

شعبۂ سائنس کا ایک جلسہ ڈاکٹر قاضی معین الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی پروفیسر کیمیا نظام کالج کے مکان پر منعقد ہوا جس میں معتمد صاحب شعبہ کے علاوہ پروفیسر سید محمد یونس وفاقانی، شاہ محمد صاحب فیض محمد صاحب اور ڈاکٹر زور صاحب نے شرکت کی۔ سائنس سے متعلق عام کتابوں کی اشاعت کا مسئلہ پیش ہوا اور شعبہ کی طرف سے جو کتابیں زیر ترتیب ہیں ان کی رپورٹ دی گئی۔ چنانچہ ان میں سے دو کتابیں آب دوز کشتیاں اور سرنگ اور پانی کی کہانی چھپ چکی ہیں۔ یہ باتصویر ہیں اور ان کے سرورق سہ رنگی و دیدہ زیب بنائے گئے ہیں۔ ہر ایک کتاب کی قیمت باوجود متعدد تصاویر کے صرف چھ چھ آنے رکھی گئی ہے۔

شعبۂ نسواں اس عرصے میں اس شعبہ کے دو اجلاس ہوئے جن میں سے پہلا ۹ فروری سنہ ۴۰ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس میں رابعہ بیگم صاحبہ، لطیف النساء بیگم صاحبہ، جہاں بانو بیگم صاحبہ، بشیر النساء بیگم صاحبہ صدر شعبہ اور سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبہ نے شرکت کی، شعبہ کے مدرسۂ بالغات کے نظم و نسق، طالبات کی حاضر باشی، تعلیمی ترقی، اور تعداد کے اضافے سے متعلق تفصیلی طور پر تبادلۂ خیال کیا گیا، جس سے مدرسہ کی مجموعی حالت اطمینان بخش ثابت ہوئی، سوزن کاری کا کام سکھانے کے لئے محترمہ ملکہ بیگم صاحبہ سے استدعا کی گئی تھی اور وہ ایک عرصہ سے اعزازی طور پر دلدہی سے یہ کام انجام دے رہی ہیں، پکوان سکھانے کے لئے مسز یونس صاحب اور نٹنگ (بُننا) سکھانے کے لئے مسز نجم الدین صاحب نے رضاکارانہ کام کرنے کی رضامندی ظاہر کی۔

شعبہ کے سرمایہ میں اضافہ کے لئے ربیع الاول کے اوائل میں ایک کانسرٹ کرنا طے پایا جس کے بعد شعبہ کا اجلاس عام منعقد کیا جائے گا۔ عظیم النساء بیگم صاحبہ کے افسانوں کو منتخب کرکے بعد نظر ثانی ادارہ کی طرف سے شائع کرنے کی تجویز منظور ہوئی، اس شعبہ کی طرف سے جو کتاب محمد حسین آزاد کے سوانح حیات پر زیر طبع تھی وہ اس مہینے میں شائع ہو چکی ہے، یہ اردو کے اس بلند پایہ انشا پرداز اور ادیب کے حالاتِ زندگی پر پہلی محققانہ اور مبسوط تالیف ہے اور اس کی ترتیب پر اس کی مصنفہ ج نقوی صاحبہ ایم اے قابلِ مبارک باد ہیں۔

شعبۂ امتحانات کی ذیلی مجلس کا ایک اجلاس ابھی منعقد ہوا جس میں مولوی سجاد مرزا صاحب نائب صدر، ڈاکٹر زور صاحب اور پروفیسر سروری صاحب نے شرکت کی، اس میں اردو امتحانات کے امیدواروں کے لئے نصاب سے متعلق تقریروں کا پروگرام مرتب اور منظور ہوا، چنانچہ اس کی بناء پر ختم مارچ تک نو تقریریں ہو چکی ہیں اور اپریل میں حسب ذیل تقریریں کوا پر ٹیو ہال سائنچہ توپ میں شام کے ۶½ بجے ہوں گی۔

پنجشنبہ ۴ اپریل شبلی اور موازنۂ انیس و دبیر۔ سعادت علی صاحب رضوی ایم اے

دوشنبہ ۸ اپریل جوش کی شاعری اور فکر و نشاط۔ مخدوم محی الدین صاحب ایم اے

دو تقریریں پنجشنبہ و جمعہ ۱۱ و ۱۲ اپریل نفسیاتِ جذبات (فلسفۂ جذبات عبد الماجد) صلاح الدین صاحب ایم اے

یکشنبہ ۱۴ اپریل آزاد اور آبحیات۔ جہاں بانو بیگم صاحبہ ایم اے

شنبہ ۱۶ اپریل مقالات سائنس۔ فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ

جمعہ ۱۹ اپریل چکبست کے مضامین۔ سید محمد صاحب ایم اے

یکشنبہ ۲۱ آئین حکومت۔ عبد المجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی۔

جمعہ ۲۶ اپریل۔ اجتماعی زندگی کی ابتدا۔ سراج الدین صاحب ایم اے

دو تقریریں پنجشنبہ و جمعہ ۱۸ و ۱۹ اپریل معاشیات (ڈاکٹر ذاکر حسین) ناصر علی صاحب ایم اے

شعبۂ امتحانات قابلِ مبارک باد ہے کہ اس نے اتنی اچھی سلسلہ تقریروں کا انتظام کیا، جو نہ صرف ادارہ کے امتحانوں کے امیدواروں ہی کے لئے بلکہ ان متعدد اصحاب کے لئے دلچسپی اور علمی و ادبی تغذیہ کا کام دے رہی ہیں جن کو اردو ادب سے لگاؤ ہے۔

شعبۂ زبان

اس کا ایک اجلاس یکم مارچ کو منعقد ہوا اس میں قاضی عبدالغفار صاحب، مولوی سید محمد صاحب، نواب سیف علی خاں صاحب ڈاکٹر جعفر حسن صاحب، پروفیسر سروری صاحب، ڈاکٹر رضی الدین صاحب اور ڈاکٹر محمد راحت اللہ خاں صاحب ایم اے پی ایچ ڈی معتمد شعبہ نے شرکت کی جو تحریکیں پیش اور منظور ہوئیں ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) عام طور پر دیکھا جا رہا ہے کہ دفتری مراسلت میں انگریزی کا استعمال بلا وجہ بڑھایا جا رہا ہے جو سرکاری احکام اور منشا کے بالکل خلاف اور جس سے اردو زبان کو سخت نقصان پہونچ رہا ہے، یہ ادارہ اردو زبان کے بہی خواہوں اور سرکاری عہدہ داروں کو سرکاری احکام اور مقاصد کی تکمیل کی طرف توجہ دلاتا ہے اور توقع کرتا ہے کہ آئندہ بجز ناگزیر صورتوں کے ہمیشہ اردو زبان کے استعمال کو لازمی قرار دیا جائے گا۔ اراکین سے استدعا کی گئی کہ وہ انفرادی طور پر انگریزی کے بیجا استعمال کی مثالوں سے ادارہ کو مطلع کرتے رہیں۔ مذکورہ قرارداد کو مقامی اخباروں میں شایع کر دیا گیا ہے۔

(۲) جمال الدین حیدر صاحب کی پیش کردہ فہرست جو دکھنی الفاظ اور محاوروں پر مشتمل ہے قاضی عبدالغفار صاحب کی نظر ثانی کے بعد پیش ہوئی۔ اور سابقہ فیصلہ کے تحت ڈاکٹر رضی الدین صاحب کے ہاں بھیج دی گئی، نیز اس سلسلہ میں حسب ذیل حضرات سے مراسلت کرنے کا تصفیہ ہوا، آغا حیدر حسن صاحب، راجہ راجیشور راؤ صاحب اصغر، قاضی میر لطف علی صاحب عارف۔ چنانچہ ان کے یہاں مراسلے روانہ کر دیے گئے ہیں۔

(۳) اردو زبان کی سلاست و روانی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ غیر زبانوں کی جمع اور ترکیب بلا ضرورت استعمال نہ کی جائیں اور جہاں تک ممکن ہو سکے اردو کے مقررہ اصول کی پابندی کی جائے یہ قرارداد بھی بالاتفاق منظور ہوئی اور مقامی اخباروں میں بھی شایع ہو چکی ہے۔

شعبۂ طلبہ

اس کے جلسوں کا تذکرہ صفحہ ۶۶ پر درج ہے۔

ادارہ کی شاخیں

افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے ادارہ کی جملہ شاخوں سے متعلق اس شمارے میں بھی تفصیلی معلومات نہیں شایع ہو سکیں، اس مہینہ ۱۲ مارچ کو گلبرگہ میں بمقام محبوب کلب ادارہ کی ایک نئی شاخ قائم کرنے کے لیے جلسہ منعقد ہوا جس میں گلبرگہ کے صوبہ دار صاحب، اول تعلقدار صاحب، تحصیلدار صاحب، سعید الزماں صاحب لکچرار کالج، عبدالوہاب صاحب قاضی گلبرگہ، معراج الدین صاحب گرداور کے علاوہ متعدد مقامی اصحاب نے شرکت کی۔ سید محمود حسین صاحب معتمد نے ادارہ کی تاریخ اور کاموں پر روشنی ڈالی اور گلبرگہ میں دو مہینہ سے اس سے متعلق جو کام ہو رہا ہے اس کا اظہار کیا۔ تبادلۂ خیال کے بعد گلبرگہ میں باضابطہ طور پر شاخ کا افتتاح کرنیکی تجویز اور طرز کار اور دیگر امور طے پائے جس کی تفصیل مقامی اخبارات میں شایع ہو چکی ہے۔

کتب خانہ

اس ماہ ادارہ کے کتب خانے میں حسب ذیل عطیے وصول ہوئے جن کا منجانب ناظم صاحب کتب خانہ شکریہ ادا کیا جاتا ہے، سید محمد ہادی صاحب ناظم بائے اسکوٹ اور ورزش جسمانی حسب ذیل پندرہ کتب اور آٹھ مختلف رسائل۔

۱۔ بست سالہ عہد حکومت۔ ۲۔ آئین قیصری۔ ۳۔ تاریخ نواب۔ ۴۔ تاریخ گلزار شاہی۔ ۵۔ تذکرۂ اعرابی۔ ۶۔ سچی محبت۔ ۷۔ نشتر۔ ۸۔ تاریخ خاندان عثمانیہ۔ ۹۔ سرگزشت لینسڈون۔ ۱۰۔ آئینۂ عرب۔ ۱۱۔ فتنہ۔ ۱۲۔ سفرنامہ قسطنطنیہ عراق و ایران۔ ۱۳۔ اقوام ٹرکی۔ ۱۴۔ سیر ظلمات۔ ۱۵۔ میکدۂ ناز۔

قاضی عبدالغفار صاحب اڈیٹر پیام ۲۲ مختلف رسالے۔ پروفیسر سید محمد صاحب ایم اے ثمرۃ الادب جلد اول مکمل۔ اردوئے معلیٰ اور ترقی کے چھ چھ شمارے۔

ادارہ دوسروں کی نظر میں

علامہ سلیمان ندوی

گزشتہ ماہ جب حیدرآباد تشریف لائے تھے

تو ادارہ کا معاینہ بھی کیا تھا۔ واپسی پر انھوں نے مارچ کے **معارف** میں اپنے سفر حیدرآباد کے تاثرات لکھے ہیں جن میں ادارہ کے متعلق ان خیالات کا اظہار کیا ہے۔

"یہاں اردو کا ایک اور ادارہ بھی دیکھا جس کا نام "ادارۂ ادبیات اردو" ہے، اس کے چلانے والے زیادہ تر جامعۂ عثمانیہ کے نوجوان گریجویٹ ہیں جن کی سربراہی پروفیسر زور، عبدالقادر سروری، عبدالمجید صدیقی وغیرہ کر رہے ہیں، دو تین ہی سال کے عرصہ میں اس ادارہ نے سو کے قریب کتابیں شائع کردی ہیں کچھ کتابوں اور اردو کے قدیم اخباروں کا سرمایہ بھی جمع ہو گیا ہے، اردو کے ہر دور کے شاعروں، مصنفوں اور ادیبوں کے مرقع بھی رکھے ہیں، اردو کی تاریخ کے نقشے بھی نہایت خوبصورتی سے بنائے ہیں۔"

سب رس کا اردو نمبر | اردو نمبر کے متعلق کئی صاحب فن اصحاب کے خطوط وصول ہوئے ہیں۔ لیکن خانگی خطوں کا شائع کرنا ہمیں کچھ پسند نہیں۔ یہاں آگرہ کے مشہور رسالہ **شاعر** نے اپنے فروری کے شمارہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کو نقل کیا جاتا ہے۔

"سب رس ارض دکن کا سب سے وقیع اور بلند ماہنامہ ہے جسے ادارۂ ادبیات اردو کے مقتدر اراکین کی سرپرستی حاصل ہے۔ زیر نظر "اردو نمبر" اردو سے متعلق مضامین کا ایک اچھا اور یادگار مجموعہ ہے۔ متعدد معیاری ادبی مضامین اس نمبر میں نظر آتے ہیں مثلاً اردو ادب کا مطالعہ، موجودہ اردو شاعری، اردو کے نظم گو شعرا، اردو مذاہب اور قومی شاعری، ہندوستان کی زبان، ادب اور تنقید، اردو شاعری، اردو کے خاموش خدمت گزار، ذکر میر، مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط وغیرہ۔ حصہ نظم متنوع اور بلند ہے جس میں امجد حیدرآبادی، علی منظور، احسان دانش، جلیل مانکپوری، حفیظ جالندھری، ماہر القادری، عندلیب شادانی، سکندر علی وجد جیسے ممتاز شعرا کی نظمیں ہیں۔ مشاہیر اردو کا تاریخی گروپ ایک یادگار مرقع ہے اور بھی بہت سے قدیم و جدید شعراء، ادباء کی تصاویر ہیں جو حقیقتاً ادارہ نے بڑی کاوش سے مہیا کی ہوں گی۔ یہ نمبر اس قابل ہے کہ ہر صاحب ذوق اس کا مطالعہ کرے۔ اردو ادب و شعر سے متعلق اس میں کافی مواد ہے۔"

بچوں کا سب رس | ہمارے اس بڑے سب رس کے علاوہ اس کے دو ضمیمے علحدہ مستقل رسالوں کی صورت میں بھی شائع ہوتے ہیں جن میں سے ایک بچوں کا ضمیمہ ہے۔ یہ ضمیمہ چھوٹے بچوں ہی کے لئے نہیں بلکہ وسطانیہ اور فوقانیہ جماعتوں کے طلبہ کے لئے بھی شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں بچوں اور طلبہ کے لئے ایسے دلچسپ اور مفید مضمون اور نظمیں چھپتی رہتی ہیں جو غیر درسی مطالعہ کا ذوق بڑھانے میں مدد دیتی ہیں۔

بعض اصحاب نے اس خیال سے کہ یہ بالکل چھوٹے بچوں کا پرچہ ہے اس کے بعض مضمونوں کے متعلق ہمیں توجہ دلائی ہے کہ وہ چھوٹے بچوں کی استطاعت سے زیادہ ہیں۔ یہ صحیح ہے کیونکہ اس کے بعض مضمون وسطانیہ اور فوقانیہ کے طلبہ ہی کے لئے درج کئے جاتے ہیں۔

طلبا اور بچوں میں سب رس کا یہ چھوٹا پرچہ بہت مقبول ہو رہا ہے اور اس کی تعداد اشاعت اب بڑے پرچے کے قریب قریب پہنچ گئی ہے۔ اس کا سالانہ چندہ صرف ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک ہے۔

سب رس معلومات | سب رس کا یہ ضمیمہ عام علمی معلومات کا ہے اور کالجوں کے ان طلبہ کے لئے نکالا جا رہا ہے جو مقابلوں کے امتحان میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ بعض اصحاب ایسے ہیں جو غزلوں، نظموں اور افسانوں سے زیادہ ٹھوس معلومات کے مضمون پسند کرتے ہیں۔ انھی کے لئے یہ ضمیمہ جاری کیا گیا ہے۔ اور اگرچہ اس کے چند ہی شمارے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ بھی بہت مقبول ثابت ہو رہا ہے۔ اس کی قیمت بھی سالانہ ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک ہے۔

ادارہ

گنبد شاہ سراج اورنگ آبادیؒ [illegible]

(رمضان سنہ ۱۳۵۸ھ سے قبل)

سراج اورنگ آبادی

حضرت سید شاہ سراج کی وفات کے بعد ان کا تکیہ اور
مکان ان کے خلیفہ شاہ چراغ صاحب کے قبضہ میں آیا۔ اور
ان کے بعد ان کے فرزند مقبول چراغ صاحب کے اور مقبول چراغ
صاحب کے بعد ان کے فرزند روشن چراغ صاحب کے۔ معلوم
ہوتا ہے کہ موخرالذکر کے اولاد نہ تھی اور وہ اسقدر مفلس ہو گئے
تھے کہ تکیہ کی حصاربندی و حفاظت اور شاہ سراج صاحب کا
عرس بھی نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ اپنی ماں کی بیماری میں مکان
رہن رکھا دیا تھا اور جب ماں کا انتقال ہوگیا تو ان کا دل بھی
اچاٹ ہوگیا اُدھر تکیہ کی حالت خراب ہوتی جارہی تھی اس لئے
انھوں نے ۲۰ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ کو آٹھ آنے کے ایک کاغذ
مہر پر ایک دستاویز بنام سید جعفر شاہ صاحب ولد سید کریم
شاہ صاحب خلیفہ نقشبندی لکھ دیا جس میں لکھا ہے کہ:

"من کہ روشن چراغ ابن مقبول چراغ مالک
درگاہ و مکان ہا حضرت سید شاہ سراج قدس سرہٗ ساکن
محلہ ڈیوڑھی بازار من محلات بلدہ اورنگ آباد ام
چوں نوشتہ می دہم و اقرار صحیح و واثق می نمایم
برایں معنی کہ خدمت تولیت درگاہ موصوف کہ بر کنار
نالہ پنچ کنواں واقع است بلا تسہیم و شراکت احدے
از بزرگاں من مقرر تا حال شدہ می آید و زمین درگاہ
شریف و اشجار آنبہ و تمر ہندی وغیرہ واقع آنجا در قبض
و تصرف می داشتم چوں دریں ولا بہ باعث ابتری مزاج
خود و نہ بودن ادائی شرط خدمت تولیت درگاہ شریف
خرابی و ابتری از حد گردید کہ تعویذ مزار بزرگاں و
حصار وغیرہ آنجا منہدم گشتہ۔
و بہ نظر تہی دستی و مفلوکی آئندہ ہم طاقت استواری
و درستی آں نمی دارم لہٰذا بہ رضا و رغبت خود بلا اجبار و اکراہ
روبروئے گواہاں مندرجہ ہٰذا اسمی سید جعفر شاہ ولد
سید کریم شاہ خلیفہ نقشبندی را متولی درگاہ موصوف
مقرر کردہ مالک و مختار گردانیدم۔ الی آخرہ"

(تکیہ، مکان اور عرس کے متعلق چند معلومات)

اس کاغذ پر جن گواہوں کے نام ہیں۔ ان میں سے
چند یہ ہیں۔ قربان شاہ خادم، مقبول علی شاہ (مہر ۱۲۹۶ھ)
(۲) غلام محمد صدیقی (مہر ۱۲۸۷ھ) (۳) محمد ہاشم مشروع باف
ساکن شاہ بازار (۴) محمود نواز خاں نیازی (مہر ۱۲۸۰ھ)
(۵) میر تقی علی (مہر ۱۲۷۰ھ) (۶) غلام غریب (۱۲۸۰ھ)
قنبر ولد سیدی قاسم (مہر ۱۲۸۲ھ) میر امام الدین
ولد شاہ ظہور الحق، نادعلی شاہ ارشاد۔ مرتضٰی شاہ صدر سرگروہ وغیرہ

اس کے سات روز بعد روشن چراغ صاحب نے
اور ایک دستاویز لکھ دیا جس پر ان کی مہر بھی ہے اور اس میں
اس بات کا سید جعفر شاہ ولد سید کریم شاہ صاحب کو مجاز
گردانا ہے کہ اپنے اختیار سے آرائشگی مزار اور عود و گل کا
انتظام کریں اور یہ کہ:

"ہر چہ نذر و نیاز زائرین و دفن مردگان و ثمر اشجار
وغیرہ ہر چہ وصول آید نصف متولی و نصف من مقرر گرفتہ باشم"

اور یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میں کسی کو فقیر بناؤں تو
وہ میرے بعد متولی صاحب کی اجازت سے درگاہ شریف
میں جاروب کشی وغیرہ کر سکتا ہے۔ اور بغیر ان کی اجازت
درگاہ کے معاملات میں کوئی دخل نہ دے سکے۔

اس دستاویز پر حسب ذیل اصحاب کی گواہیاں
ہیں۔ (۱) سیدی قمر مشروع باف (۲) مرزا محمد علی بیگ سوار
علاقہ کوتوالی (۳) محمد ہاشم مشروع باف (۴) احمد بخش

یہ دستاویز ۲۷ ربیع الاول ۱۲۸۹ھ کو لکھا گیا ہے۔

اسی سلسلہ میں گیارہ سال بعد کے ایک اور دستاویز کا ذکر کرنا ضروری ہے جو دو آنے کے کاغذ مہور ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۸۱ء پر لکھا گیا ہے اس میں سید کریم شاہ خلیفہ نقشبندی نے ۲۴ صفر المظفر سنہ ۱۳۰۰ھ روز جمعہ کو ایک وصیت نامہ لکھا ہے جس میں لکھتے ہیں کہ

"آمدنی تکیہ حضرت سید شاہ سراج صاحب قدس سرہٗ و بار امرائی .... یار قم آن .... وصول شود منجملہ آن یک حصہ بہ سید جعفر و یکے بہ سید عبدالرزاق فرزندانم و یک حصہ بہ زوجہ ام گرفتہ باشند"... الی آخرہ"

اس دستاویز پر ان گواہوں کے دستخط یا مہر ہیں۔

محمود نواز خاں نیازی۔ مرزا سنگی بیگ رسائی دار اور غلام نبی۔

اس وصیت نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ اصل میں سید کریم شاہ صاحب نقشبندی نے شاہ سراج صاحب کی درگاہ اور تکیہ کی تولیت خود حاصل کر کے اس کا دستاویز اپنے فرزند سید جعفر صاحب کے نام لکھوا لیا تھا اور بعد کو اپنی وصیت میں اس خیال سے کہ کہیں اس تکیہ کی آمدنی صرف ایک ہی فرزند سید جعفر کے قبضہ میں نہ چلی جائے دوسرے ورثاء (یعنی اپنے دوسرے فرزند سید عبدالرزاق، تیسرے سید اکبر اور اپنی زوجہ) کے نام بھی لکھ دیے۔ اس خاندان کے شجرۂ نسب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ سید جعفر صاحب لاولد فوت ہوئے اور اسی تکیہ میں مدفون ہیں۔

ان دستاویزوں کے علاوہ شاہ سراج صاحب کے سالانہ عرسوں کے موقعوں پر جو اخراجات ہوتے تھے ان کی فردہائے حساب بھی موجود ہیں جو ہماری نظر سے گزرے ہیں جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہ ربیع الثانی ۱۲۸۹ھ تک شاہ سراج صاحب کا مکان موجود تھا چنانچہ ایک فرد اخراجات پر لکھا ہے۔

"خرچ حساب مکان کھپریل درگاہ حضرت سید شاہ سراج صاحب قدس سرہٗ العزیز۔

دروازہ۔ استاد دروازہ۔ بالنہا۔ بند ہائے۔ چھوائی ترانٹے۔ کویلو چہار ہزار فی ہزار [illegible] وغیرہ۔ جملہ ([illegible])

ایک دوسری فرد مورخہ ۱۴ شوال سنہ ۱۲۹۱ھ میں عرس کے اخراجات لکھے گئے ہیں۔ جن میں ایک چیز بڑی دلچسپ ہے، اس زمانہ میں بھی عرس کے وقت فقیروں کو گانجہ اور گڑاکو دیا جاتا تھا۔ اس دفعہ عرس میں جملہ ۵ روپیہ صرف ہوئے تھے۔ اور مکان کی تعمیر میں چودہ روپے [illegible] ۱۲۹۱ھ کے عرس کا بھی حساب موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بیس روپے آٹھ آنے ([illegible]) صرف ہوئے تھے۔ ان تمام حسابات کے دیکھنے سے اس زمانہ کی ارزانی اور نرخ اشیاء سے متعلق بڑی دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً گیہوں روپے کو بیس سیر۔ مونگ کی دال بارہ سیر وغیرہ۔

یہ تمام تفصیل مجھے درگاہ حضرت شاہ سراج کے موجودہ متولی ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب لکچرار میڈیکل کالج کی عنایت سے حاصل ہو سکی۔

عجیب اتفاق کی بات ہے کہ حضرت شاہ سراج کے آج سے ستر سال قبل کے اعراس کے تذکرے کے وقت مجھے یکایک یہ خیال آیا کہ ہم نے بھی سفر اورنگ آباد کے وقت ڈاکٹر عابد حسین صاحب، پروفیسر سروری صاحب، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، مولوی محمد ابراہیم صاحب انجنیر اورنگ آباد، اور عبدالرزاق صاحب وغیرہ کے ساتھ حضرت شاہ سراج کے

مزار پر جو غلاف اور چادر گل چڑھائی تھی اس روز بھی ۲۴ر شوال ہی تاریخ تھی یہ ان کی وفات کی تاریخ ہے اور اسی تاریخ عرس ہوا کرتا تھا۔ یہ نہ معلوم حسن اتفاق تھا یا شاہ سراج صاحب کی کرامت! غرض اس طرح ایک طویل عرصہ یعنی تقریباً ساٹھ ستر سال کے بعد پھر حضرت شاہ سراج صاحب کے سالانہ عرس کی ابتدا، ارکان ادارہ ادبیات اردو کے ہاتوں سے ہوئی اور توقع ہے کہ آئندہ بھی سالانہ عرس ہوا کرے گا اور کیا تعجب کہ جس طرح یوم ولی منایا گیا کسی روز یوم سراج بھی اسی اعلیٰ پیمانہ پر منایا جائے۔

زور
سید محی الدین قادری

محسوسات

عشق کی زندگی کو کیا کہیے　　اپنی قسمت، کسی کو کیا کہیے

اک ذرا سی امید پر یہ حال　　آدمی کی خوشی کو کیا کہیے

سامنے اشک ریز ہے شبنم　　مسکراتی کلی کو کیا کہیے

پرسشِ حالِ دل ہے ہنس ہنس کر　　اس کی ظالم ہنسی کو کیا کہیے

حسن پر اعتمادِ چارہ گری!　　عشق کی سادگی کو کیا کہیے

ان کی چلمن کو چھو رہی ہے نگاہ　　جرأتِ عاشقی کو کیا کہیے

موجِ بادِ صبا بھی کانپ اٹھی　　زلف کی برہمی کو کیا کہیے

ان کے رخ پر نظر نہیں جمتی　　چاند کی روشنی کو کیا کہیے

وہ پشیماں سے ہو گئے ماہرؔ
آپ کی شاعری کو کیا کہیے

ماہر القادری

اشتہار بازی

فارسی زبان کا ایک پرانا اور مشہور مقولہ ہے کہ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" مطلب اس کا یہ ہے کہ اگر مشک اچھا ہے تو اس کی مہک آپ ہی خریداروں کو اپنی طرف کھینچ لے گی۔ عطار کے کہنے سننے سے کیا حاصل۔ غور کیجئے تو اس مقولہ سے دو باتیں بڑی دلچسپ معلوم ہوتی ہیں ایک تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگوں میں یعنی مشرقی قوموں میں اشتہار بازی کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا، چنانچہ یہ "بازی" کا لفظ جو اشتہار کے ساتھ لگا ہوا ہے خود برائی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے ہنر یا کمال یا اپنی بنائی ہوئی کسی چیز کا چرچا کرے تو کہتے ہیں کہ وہ بڑا "اشتہار باز" ہے دوسری بات اس مقولے سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگلے زمانے کے لوگ اشتہار بازی کو سرے سے ایک فضول سی چیز سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر چیز اچھی ہے تو آپ اپنے گاہک پیدا کر لے گی۔ ڈھول پیٹنے یا نقارہ بجانے سے کیا حاصل۔

بات دراصل یہ ہے کہ آج سے چالیس پچاس برس پہلے ہمارے ملک کی جو حالت تھی اس میں اشتہار بازی کی کچھ زیادہ گنجائش بھی نہیں تھی۔ ذرا ایک چھوٹے سے قصبہ کی حالت کو اپنے ذہن میں لائیے۔ میاں جلاہے کپڑا بنتے ہیں اور قصبہ والے ہی اسے خریدتے ہیں۔ سنار اپنے قصبہ ہی کی خاتونوں کے لئے زیور بناتا ہے۔ موچی سارے قصبہ کے لئے جوتے تیار کرتا ہے۔ انہیں میں میاں عطار بھی ہیں۔ اپنا طبلہ کھولے بیٹھے ہیں۔ کہیں سے نیا مال، معلوم نہیں کتنے مہینوں کی منزلیں طے کرنے کے بعد آیا ہے، اس میں مشک بھی ہے۔ خوشبو کی لپٹ آ رہی ہے ہر راہ چلتے کا دماغ تازہ ہوتا ہے۔ آبادی ہی کتنی ہے، لوگ آپس میں اس کا چرچا کرتے ہیں۔ آتے ہیں اور خرید لے جاتے ہیں۔ میاں عطار کو نہ اس کی ضرورت کہ دکان پر سائن بورڈ لگائیں، نہ اس کی حاجت کہ دوڑے ہوئے کسی چھاپے خانے میں جا کر اشتہار چھپوائیں کہ "آ گیا، آ گیا، نافۂ آہوئے ختن آ گیا، فوراً فرمائش کیجئے ورنہ پھر پچھتانا پڑے گا"

یہ تو چالیس پچاس برس پہلے کا نقشہ تھا، لیکن ذرا آج کل کی حالت کو دیکھئے۔ ریل، جہاز، ہوائی جہاز، ڈاک، اخبار، تار اور سب سے زیادہ اس ریڈیو نے جس کے ذریعہ ہم آپ سے باتیں کر رہے ہیں ہماری دنیا کو بہت چھوٹی بنا دیا ہے، اور گاؤں گاؤں کا ناتہ سمندر پار کے ملکوں سے جوڑ دیا ہے۔ پردیس کے بیوپاری جنہوں نے ہمارے دیس کی صورت بھی نہیں دیکھی ہر جہاز سے مال یہاں لا رہے ہیں۔ اخباروں کے کالموں میں، رسالوں کے صفحوں میں، اسٹیشن پر، شہر کی دیواروں پر، بجلی کے کھمبوں پر، جہاں دیکھئے رنگ برنگی لفظوں یا تصویروں میں کوئی نئی چیز ہمیں اپنی طرف بلا رہی ہے۔ یہ کیا ہے؟ چائے کا اشتہار ہے، ایک بہت لمبی ڈاڑھی والے بزرگ کھڑے ہیں، پاس ہی چائے کی گرما گرم پیالی رکھی ہوئی ہے۔ اس میں سے بھاپ نکل رہی ہے، اور یہ لکھا گیا ہے کہ "گرم چائے پیو، بہت دن جیو" خوب! بہت خوب!! کسی راہ چلتے سے پوچھ دیکھئے کہ میاں تم بھی چائے پیتے ہو، چمک کر جواب دے گا کہ "جی ہاں، پینے کیوں نہیں ہیں، روز صبح لپٹن کی چائے پیتے ہیں" اب جو اور کرید ئیے کہ "بھائی یہ لپٹن صاحب کون ہیں، کہاں کے رہنے والے ہیں" تو یہ کہہ کر چلتا ہوگا "کہ بھلا یہ سب باتیں ہم کیا جانیں۔ ہم نے تو ان کا نام سنا ہے۔ ان کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے" یہ حالت اب گاؤں گاؤں ہو گئی ہے۔ ایسی حالت میں اگر آج کل ہمارے عطار اس دھوکے میں رہیں کہ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید" تو ان کا حشر کیا ہو۔ دوکان ہے کہ بند ہو جائے۔ اب تو مشک کی خوشبو سے زیادہ عطار کی گویائی کی ضرورت ہے۔ اب وہ قصبہ کی چھوٹی سی گھٹی ہوئی دنیا کہاں رہی۔ اگلے لوگ تیر تلوار سے ملک فتح کرتے تھے۔ آج کل کے تاجر اشتہار سے یہ کام

لیتے ہیں. کوئی نئی چیز بنی نہیں کہ ہوا کے پروں اور بجلی کی لہروں پر اڑکر اس کی خبر سارے جہاں میں پھیلی، انجان واقف کار بنے، ایک پوسٹ کارڈ لکھ دیا اور گھر بیٹھے پلندے کے پلندے اشتہاروں کے آن موجود ہوئے. اب کونسا قصبہ ایسا ہے جہاں برما کا مٹی کا تیل، امریکہ کی ([illegible] D) کی لالٹین، جاپان کے شیشہ آلات اور کپڑا، جرمنی کے رنگ نہیں پہونچے ہیں، اور سچ پوچھو تو یہ ساری کرامت اشتہار بازی کی ہے. ہر سال دنیا کا اربوں روپیہ اس مد میں خرچ ہوتا ہے. ایک ہاتھ سے جاتا ہے، دوسرے ہاتھ سے ایک ایک کے چار چار لاتا ہے. امریکہ والوں نے تو اسے ایک علم بنالیا ہے. سیکڑوں کتابیں اس پر لکھی گئی ہیں. ہمارے ملک کے تاجر ابھی اس کے گُر سے زیادہ واقف نہیں ہوئے ہیں. اشتہاروں کے خلاف ابھی پرانی جھجک باقی ہے اور جہاں یہ جاتی رہی ہے. وہاں رہبری کے ذریعے نہیں. زیادہ تر بے تکے بے اصولی اشتہار چھپتے ہیں، نہ تجارت بڑھتی ہے، نہ گاہک قابو میں آتے ہیں، بلکہ گاہکوں نے تو قسم سی کھا رکھی ہے کہ کسی اشتہار کو سچا سمجھیں ہی گے نہیں.

اشتہار کی اصلی غرض یہ ہوتی ہے کہ کسی چیز کا نام، اس کی اچھائی اس کے بنانے والے کا نام مشہور ہو جائے، لوگوں کو اس کا علم ہو جائے. پرانا انگریزی مقولہ ہے کہ "ضرورت ایجاد کی ماں ہے" اس میں اتنا اور اضافہ کردینا چاہیے کہ "علم ضرورت کا باپ ہے" آپ کہیں گے کہ یہ کیسے سنیئے، بھلا کبھی آپ نے اس پر غور کیا ہے کہ آج کل یہ جو بے شمار "ضروریات" پیدا ہوگئی ہیں جیسے موزہ، رومال، بٹائن، فاونٹن پن، الکٹرک ٹارچ، سیفٹی ریزر، صابن (اور خواتین معاف کریں) پاؤڈر، روج، لپ اسٹک، کریم یہ ہماری ضروریات کی فہرست میں کب اور کہاں سے آئیں. مثلاً ہم نے اپنے بچپن میں تو فاونٹن پن کا نام بھی نہ سنا تھا، اب آج کل کے صاحبزادے مدرسہ میں پہونچے نہیں کہ فاونٹن پن کی ضرورت اجی ضرورت ہی نہیں بلکہ شدید طلب انھیں پیدا ہوئی. بات یہ ہے کہ پہلے کسی بھلے مانس کا ذہن اس طرف لڑا، اس نے ایک قلم بنایا، اشتہاروں نے اس کا چرچا کچھ اس طرح کیا کہ جس نے پڑھا یہی کہا کہ واقعی اس چیز کی تو بہت ضرورت تھی، چلیئے وہ ضرورت بن گئی. ایسی بیسیوں چیزیں ہیں کہ محض ان کا علم ہونے سے ان کی ضرورت پیدا ہوگئی ہے. اگلے لوگ سیدھے سادھے تھے. جن چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی انہی کو تیار کرتے تھے. آج کل کے عقل کے پتلے پہلے چیز بناتے ہیں اور پھر کچھ اس ڈھب سے ہو ے سامنے لاتے ہیں کہ بقول ارشاد

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

ہمیں اس کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے. یا پہلے اگر مدھم تو اب تیز ہو جاتی ہے. ہوشیار اشتہار باز پڑھنے والے کی ضروریات کو سمجھ کر اس کی دُکھتی رگ پکڑ لیتا ہے. تصویروں سے تخیل کو اکسا کر، کبھی ہمارے خودنمائی کے جذبے کو بھڑکا کر، کبھی کبھی (لیکن بہت کم) دلیلوں سے کام لے کر، کبھی کسی بڑے آدمی کا نام لے کر ہماری خواہشات کو شہ دیتا ہے اور ہمیں خریداری پر مائل کر دیتا ہے. ایک اچھے اشتہار کی سب سے پہلی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہماری توجہ اپنی طرف کھینچ لے. اس غرض کے لئے طرح طرح کی ترکیبوں سے کام لیا جاتا ہے، ٹائپ کا بڑا چھوٹا ہونا، عنوان کی دل کشی، تصویریں، یہ سب باتیں توجہ کھینچنے میں مدد دیتی ہیں. ہم بے اختیار اسے دیکھتے ہیں. لیکن مہربان محض متوجہ کر لینا ہی تو کافی نہیں ہے. کوئی بات ایسی بھی تو ہونی چاہیئے کہ وہ چیز اور اس کے بنانے والے یا بیچنے والے کا نام ہمارے حافظہ میں محفوظ رہے اور وقتِ ضرورت یاد آجائے.

ہمارے ہندوستانی اشتہار باز ہمیں آکر دھوکا کھا جاتے ہیں وہ اپنی عجیب وغریب سرخیوں سے ہماری توجہ تو حاصل کر لیتے ہیں،

لیکن اسے قایم نہیں رکھ سکتے۔ ان کا اشتہار صرف بے اختیار دیکھ لیا جاتا ہے، لیکن پڑھا اور سمجھا نہیں جاتا۔ ان کے عنوانات میں اور جس چیز کا وہ اشتہار دیتے ہیں اس میں کوئی ربط نہیں ہوتا مثلاً بہت دنوں تک بعض اردو اخباروں میں ایک اشتہار نکلتا رہا۔ "آنکھیں کھل گئیں جب چاند نظر آیا" جو شاید سرمہ کا اشتہار تھا، لیکن یہ یاد نہیں کہ کون سا سرمہ تھا، اور کون صاحب اسے بیچتے تھے۔ اس طرح سے ایک اور اشتہار چھپتا تھا جس کی سرخی یہ ہوتی تھی۔ "گورنر بگڑ گیا" پڑھنے والا فوراً اسے دیکھتا تھا لیکن جب تھوڑی دور آگے چل کر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ گرامو فون کے رکارڈ کا اشتہار ہے اور گورنر سے مراد خدا نخواستہ لاٹ صاحب نہیں بلکہ باجے کا وہ کلّہ ہے جس میں سوئی لگائی جاتی ہے تو بجائے رغبت کے طبیعت میں ایک طرح کی ضد پیدا ہوتی تھی۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ محض توجہ کھینچ لینا ہی کافی نہیں ہے۔ اشتہار میں اس کی صفت بھی ہونی چاہیئے کہ وہ حافظہ میں قائم رہے۔ اب ذرا دیر کے لئے بعض انگریزی اشتہاروں کی تاثیر پر غور کیجئے، کسی سے پوچھ دیکھئے کہ بھائی صابن کون کون سے اچھے ہوتے ہیں۔ جھٹ سے پیرس، لکس، کیوٹی کیورا، پام آلیو، سن لائٹ وغیرہ کے نام لے دے گا۔ دانتوں کے ولایتی منجنوں کے بارے میں دریافت کیجئے تو کالی نوس، کال گیٹ، پیپ سوڈنٹ اور ابھی کچھ دنوں سے "میک لین" کے نام فوراً ذہن میں آئیں گے۔ چاء کے ناموں میں سے لپٹن اور بروک بانڈ اور دار جیلنگ ٹی اسے یاد آئیں گے گلیک سو اور اوولٹین کے نام اَن پڑھ عورتوں کی زبانوں پر بھی چڑھ گئے ہیں۔ بات کیا ہے! صرف یہ کہ ان چیزوں کے اشتہار دینے والے نفس انسانی کے اس بھید سے واقف ہیں کہ لکھی ہوئی چیز وہی یاد رہتی ہے جس میں جدّت یا انوکھا پن ہو، جس میں شدّت یعنی اپیل کی قوت ہو، جس میں فطرت یعنی ہماری کسی فطری خواہش سے

کام لیا گیا ہو، جس میں کثرت ہو یعنی جو بار بار نظر سے گزرے یہاں تک حافظہ کا جزو بن جائے۔ ان چاروں خصوصیتوں میں سے یعنی جدّت، شدت، فطرت، کثرت، ہر ایک ایسی ہے کہ اس پر ایک ایک مضمون تیار ہو سکتا ہے۔ لیکن ہمیں اتنی فرصت کہاں ہم تو محض دو چار باتیں آپ کو بتا کر آپ سے رخصت ہو جائیں گے۔ انوکھے پن کی کچھ مثالیں ہم نے آپ کو بتائی ہیں۔ جدّت کا اندازہ کرنا ہو تو "میک لین ٹوتھ پیسٹ" کے اشتہاروں کا مطالعہ کیجئے، ایک شخص دوسرے سے پوچھتا ہے "کیوں آج میک لین لگایا یا نہیں" وہ اسے مسکرا کر جواب دیتا ہے "دیکھ لیجئے نا" تصویریں ہمیشہ بدلی ہوئی ہوتی ہیں، اشتہار سے ہر پڑھنے والے میں ایک خوش گوار تاثر پیدا ہوتا ہے، اور یہ سب کس لئے؟ محض اس لئے کہ میک لین کا نام ذہن میں اٹکا رہے اور "وقت ضرورت کام دے" اشتہار کی دوسری صفت شدّت چھاپے کے چھوٹے بڑے کرنے، پورے صفحے یا آدھے صفحے میں اشتہار دینے، اور سیاہی اور سفیدی کی دھوپ چھاؤں دکھا کر پیدا کی جاتی ہے، یہ دو چیزیں یعنی جدّت اور شدّت توجہ بھی کھینچتی ہیں اور حافظہ میں بھی مدد دیتی ہیں ان کے بارے میں امریکہ میں بے شمار تجربے کئے گئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اخبار اور رسالے اشتہارات کی اجرت انچوں کے حساب سے لگاتے ہیں۔ اس لئے اس تحقیق کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جتنی جگہ اشتہار میں خرچ ہوتی ہے اس کی کمی زیادتی کا توجہ اور حافظہ پر کیا اثر پڑتا ہے، چنانچہ اسکاٹ نے مختلف سائز کے یعنی پورے صفحے، نصف صفحے، پاؤ صفحے اور صفحے کے آٹھویں حصے کے ۱۰۰ اشتہارات ایک کتاب کی صورت میں جمع کر کے ۵۰ آدمیوں کے حوالے کئے اور ان سے کہا کہ دس منٹ کے اندر تم ان سب اشتہاروں کو دیکھ جاؤ اور اس کے بعد یہ کہہ دو کہ یہ اشتہار کن کن چیزوں کے تھے۔ اس تجربے سے یہ معلوم ہوا کہ پورے صفحے کا اشتہار دینے والا اگرچہ نصف صفحہ والے سے

دوگنا خرچ کرتا ہے، لیکن جہاں تک حافظہ میں محفوظ رہنے کا تعلق ہے وہ دگنے سے زیادہ کامیاب ہوتا ہے۔ اسی طرح پورے صفحہ والا چوتھائی صفحہ والے سے چوگنا خرچ کرتا ہے، لیکن چھ گنا زیادہ کامیاب ہوتا ہے اور آٹھویں حصہ والے سے آٹھ گنا زیادہ خرچ کرتا ہے لیکن چالیس گنا زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ ہمارے ملک میں اس قسم کے تجربے کرنے کا ابھی کسی کو بھی خیال نہیں آیا ہے۔

اب ہم اشتہار کی سب سے اہم خصوصیت یعنی اس کے فطرت کے مناسب ہونے سے بحث کرتے ہیں اصل میں یہی چیز اشتہار کی جان ہوتی ہے، یعنی ایسے جذبات سے کام لینا اور ایسی خواہشوں کو اکسانا جو اس خاص چیز کے خریداروں کو خریداری پر مائل کریں۔ ہر کامیاب اشتہار باز پہلے پڑھنے والے کی توجہ حاصل کرتا ہے، پھر اس کی خواہشات کو اکساتا ہے اور پھر اس کا انتظام کرتا ہے کہ یہ خواہش مدھم نہ پڑے بلکہ تیز ہی ہوتی جائے۔ ہم نے ہندوستان کے مشہور انگریزی ہفتہ وار اخبار (the Illustrated India weekly) کے ایک تازہ پرچے کے اشتہاروں کو گنا تو اس کے ۱۷۰ اشتہاروں میں سے ۷۰، یعنی تقریباً ۵۰ فیصدی صحت و تندرستی کے متعلق تھے اور ۲۰ فیصدی یعنی ۳۴ حسن و زینت کے متعلق۔ اس کے بعد ضروریات خورد و نوش اور کاروباری اعلانات کا نمبر تھا۔ وجہ ظاہر ہے انسان کو سب سے زیادہ عزیز اپنی تندرستی ہوتی ہے، اور پھر جذبۂ خودنمائی کا شوق ہے، اور یہ شوق عورتوں میں مردوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ اچھے اشتہار کی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ محض اشاروں اشاروں میں ہماری کسی خواہش کو شہ دیتا ہے، اگر اس کی مخاطب عورتیں ہیں تو ان کے مناسب حال تصویریں دی جاتی ہیں۔ اگر نوجوان ہیں تو عبارت اور تصویریں دوسری ہوتی ہیں۔ پیٹنٹ دواؤں کے اشتہار اس طرح دئے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے میں اپنی صحت کے متعلق تجسس پیدا ہو جائے۔ بناؤ سنگھار کی چیزوں کے اشتہار ایسے ہوتے ہیں کہ عورتوں کا جی بے اختیار ان چیزوں کو آزمانے کو چاہے۔ امریکہ میں ڈاکٹر ایڈورڈ کے۔ اسٹرانگ نے اس بارے میں متعدد تجربے کئے ہیں کہ مختلف فطری خواہشات میں سے ایسی کون سی ہیں جن سے اشتہار بازی میں زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ مثلاً انھوں نے ہوٹلوں اور چائے خانوں کے بیس اشتہار جمع کر کے انھیں یونیورسٹی کے پچاس طالب علموں کے حوالہ کیا کہ وہ انھیں پڑھ کر ان کی ترغیبی قوت کو لکھیں یعنی یہ کہ اگر خود خریدار ہوتے تو سب سے پہلے کس دوکان پر جاتے پھر کس پر، اور پھر کس پر۔ ان تجربوں کی بنا پر ڈاکٹر اسٹرانگ نے یہ نتیجہ نکالا کہ سب سے زیادہ ترجیح پاکی و صفائی کو دی گئی، اس کے بعد ان اشتہارات کا نمبر تھا جنھوں نے ڈاکٹروں کی تصدیق دی تھی کہ یہاں کی چیزیں خالص ہوتی ہیں۔ تیسرے نمبر پر وہ اشتہارات تھے جنھوں نے ذائقہ اور صحت کی طرف اشارا کیا تھا۔ چوتھے نمبر پر وہ اشتہارات تھے جن میں کاروبار کے قدیم اور مشہور ہونے کا ذکر تھا۔ پانچویں نمبر پر وہ اشتہارات تھے جن میں ارزانی کی طرف اشارہ تھا، چھٹے وہ تھے جنھوں نے کسی مشہور آدمی کا حوالہ دیا تھا۔ ان تجربوں کا ایک نقص یہ ہوتا ہے کہ ان سے جو نتیجے نکالے جاتے ہیں وہ صرف ایک خاص گروہ کے لئے صحیح ہوتے ہیں، مثلاً اگر یونیورسٹی کے طالب علموں کی بجائے یہی تجربہ فوج کے سپاہیوں یا کارخانے کے مزدوروں پر کیا جاتا تو شاید نمبروں کی ترتیب بالکل مختلف ہوتی، تاہم ان سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اشتہار کی ترغیبی قوت کیا ہے اس قسم کے تجربے بہت مفید ہوتے ہیں اور ان کی بنا پر اشتہارات کی تصویریں اور عبارتیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ تجربے سے یہ ثابت ہوا ہے کہ اشتہارات میں اگر دلیل کی بجائے تخیل سے کام لیا جائے اور کسی جذبے کو اکسایا جائے تو اس کی اپیل زیادہ کامیاب ہوتی ہے۔ اسی طرح سے اشتہار کی چوتھی صفت یعنی کثرت کے متعلق بھی مشہور ماہر نفسیات -

(Psychological) ڈاکٹر فنسٹر برگ نے تجربے کئے ہیں۔ ان کا مقصد یہ دریافت کرنا تھا کہ مختلف سائز کے اشتہارات کتنی مرتبہ چھپیں کہ سب سے زیادہ حافظہ میں باقی رہیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ معلوم کیا کہ ایک ہی اخبار میں چوتھائی صفحے کا اشتہار اگر چار مرتبہ چھپے تو پورے صفحے کے ایک مرتبہ چھپنے والے اشتہار سے ۵۰ فیصدی زیادہ یاد رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی باتیں ایسی ہیں جن پر تجربے کئے جاچکے ہیں، مثلاً یہ کہ سرورق یعنی پہلے صفحے کا اشتہار زیادہ یاد رہتا ہے یا بیچ کے اور آخری صفحے کا، تجربے سے معلوم ہوا کہ پہلے اور آخری صفحے کے اشتہار زیادہ یاد رہتے ہیں، اسی طرح سے وہ اشتہار جو اخبار میں مضامین اور خبروں کے بیچ بیچ میں ہوتے ہیں بہ نسبت ان کے زیادہ یاد رہتے ہیں جو الگ تھلگ کونوں پر یا اشتہاروں کے لئے جو صفحے مخصوص ہیں ان پر ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا یہ چیز بھی تجربے کے قابل ہے کہ کن چیزوں کے اشتہار روزآنہ اخباروں میں کامیاب ہوتے ہیں، کن کے ہفتہ وار اخباروں میں، اور کن کے ماہانہ رسالوں میں۔

میری ان باتوں سے آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ اشتہار بازی کی اہمیت آج کل کاروبار کے لئے کتنی زیادہ ہے اور آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ اس میں کوئی پہلو اخلاقی برائی کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ذریعہ تجارتی ترقی کا ہے۔ ہمارے ملک کی بے شمار صنعتیں ایسی ہیں جو محض اس وجہ سے گمنامی کی حالت میں ہیں کہ کماحقہٗ اشتہار بازی کے اصولوں سے ان میں کام نہیں لیا جاتا۔ خود ہماری اس ریاست میں حیدرآباد کے بٹن، بیدر کا چاندی کا کام، اورنگ آباد کا ہمرو مشروع وغیرہ ایسی صنعتیں ہیں کہ اگر ان کا اشتہار دیا جائے تو ان کی خریداری جو آج کل مقامی ہے، پھیل اور بڑھ سکتی ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ ہمارے باکمال اپنے ہنر پہ پردہ ڈالیں۔ انھیں میدان میں آنا چاہیے، اور اپنی جگہ خود پیدا کرنا چاہیے۔ البتہ ضرورت اس کی ہے کہ پہلے اشتہار بازی کے اصولوں کی واقفیت حاصل کی جائے۔ اس کے متعلق اور تجربے کئے جائیں اور جو ذریعہ بہ نظر آئے انھیں استعمال کیا جائے، بدقسمتی سے ہماری دیسی زبانوں کے اخبارات کی اشاعت بہت محدود ہوتی ہے اور چھپائی اور تصویروں کا مناسب انتظام نہیں ہے، مقامی استعمال کی چیزوں کے لئے ان سے فائدہ اٹھایا جائے اور جو چیزیں عام مذاق کی ہیں اور ہر جگہ مقبول ہو سکتی ہیں ان کے اشتہار کے لئے زیادہ کثیرالاشاعت اخبار اور رسالے استعمال کئے جائیں، خواہ کسی زبان کے ہوں۔ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں اصول اشتہار بازی پر کتابیں تیار کی جائیں اور ہمارے ملک میں نفسیات داں حضرات اس بارے میں تجربے کریں اور اپنے معلومات سے ہمارے تاجروں اور مشتہروں کو فائدہ پہونچائیں۔

(تقریر حیدرآباد ریڈیو)

سید وہاج الدین احمد شمیم

مغنیہ

جس زمانہ میں کہ وہ نوجوان حسین نظر آتی تھی، اور آواز میں بلا کی رنگینی تھی، ایک روز اس کا شیدائی نکوتے، مغنیہ کے گرمائی مکان کے باہر کے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ ناقابلِ برداشت گرمی تھی اور دم رک رہا تھا۔ نکوتے نے ابھی ابھی ناشتہ سے فراغت حاصل کی اور گھٹیا قسم کی پورٹ (Port) کی ایک پوری بوتل حلق کے نیچے اتاری تھی، جس کی وجہ سے کچھ بدمزگی اور بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ دونوں مضمحل اور اس انتظار میں تھے کہ جونہی دن کی گرمی میں کچھ کمی ہو تو سیر کیلئے کہیں نکل پڑیں۔

یکایک دروازہ پر ملاقاتی گھنٹی بجنے لگی۔ نکوتے کوٹ اتارے ہوئے، سلیپر پہنے، جو بے تکلفی کے ساتھ دراز تھا، چوکنا ہو کر اچھل پڑا، اور تجسسانہ نگاہوں سے پیشا کو دیکھنے لگا۔

"یہ خطوط رساں ہے یا لڑکیوں میں سے کوئی آئی ہوگی" مغنیہ نے کہا۔

خطوط رساں یا پیشا کی کوئی سہیلی، نکوتے کو اس مقام پر دیکھ لے تو اس کی اسے کوئی پرواہ نہیں، تاہم احتیاطاً اپنا لباس سمیٹ کر دوسرے کمرہ میں چلا گیا، اس اثناء میں پیشا دروازہ کھولنے دوڑی۔ دروازہ پر کوئی خطوط رساں تھا نہ کوئی سہیلی، بلکہ ایک اجنبی نوجوان خوبصورت عورت شریف خواتین کی طرح لباس پہنی ہوئی استادہ تھی اس کو دیکھکر پیشا کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔

اجنبی کا چہرہ زرد تھا اور سانس ایسی پھولی ہوئی جیسے کہ وہ کوئی گہرے اتار سے چڑھاؤ کی طرف دوڑتی ہوئی آئی ہو۔

"کون ہو، کیا چاہتی ہو؟" پیشا نے پوچھا۔

خاتون کی زبان سے فوری کوئی جواب نہیں نکلا۔

وہ ایک دو قدم آگے بڑھی۔ خاموشی کیساتھ کمرہ کا جائزہ لیا، اور اس انداز سے نیچے بیٹھ گئی کہ ایسا معلوم ہوا تھکاوٹ اور ماندگی، یا شاید کسی بیماری کی وجہ سے وہ کھڑی نہیں ہو سکتی؛ جب اس نے کچھ بولنے کی کوشش شروع کی تو بڑی دیر تک اس کے زرد ہونٹ کانپتے رہے، اور کوئی صاف لفظ ادا نہ ہو سکا۔

"کیا میرے شوہر یہاں موجود ہیں؟" آخر کار اپنی بڑی آنکھیں جن کے سرخ پلک آنسوؤں سے تر تھے، پیشا کی طرف اٹھاتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

"شوہر؟" پیشا نے آہستہ سے کہا۔ اور اس پر ایسا خوف چھا گیا کہ ہاتھ پیر شل معلوم ہونے لگے۔

"کیسا شوہر؟" اس نے کچھ کانپتے ہوئے دہرایا۔

"میرے شوہر نکولے"

"جی نہیں، خاتون میں میں کسی شوہر کو نہیں جانتی۔"

ایک منٹ خاموشی میں گذر گیا۔ اجنبی نے دستی سے اپنے زرد ہونٹوں کو کئی بار چھوا، اور اپنی اندرونی بے چینی کو چھپانے کیلئے سانس روکتی رہی۔ اس وقت پیشا ستون کی طرح بیات و صامت کھڑی ہوئی، خوف و استعجاب کیساتھ اس کو تک رہی تھی۔

"تو تم یہ کہتی ہو، وہ یہاں نہیں ہیں؟" خاتون نے پوچھا، اس مرتبہ اس کا لہجہ تحکمانہ، اور لبوں پر طنز آمیز تبسم تھا۔

"آپ جس شخص کے متعلق دریافت کر رہی ہیں میں میں اسے نہیں جانتی۔"

"تم خطرناک، کمینی اور بدچلن ہو" اجنبی نے پیشا کو نہایت حقارت اور نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں .... تم نہایت خطرناک ہو۔ میں بیحد خوش ہوں کہ میں، تمہیں صاف صاف آخر یہ سنا سکی!"

خاتون اور اس کا سیاہ لباس، غضبناک آنکھیں اور نرم و نازک سفید انگلیاں، یہ سب بیتشا پر ہیبتناک اثرات طاری کر رہے تھے۔ اس کے مقابل بیتشا اپنے پھولے ہوئے گال، [illegible] ناک اور پیشانی پر کے گھنگریالے بال، جو کنگھی سے پیچھے کی طرف کبھی لائے نہیں جا سکتے، ان کی وجہ سے شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر یہ نازک اندام ہوتی، صورت پر غازہ کی مالش نہ ہوتی اور پیشانی پر گھنگریالے بال نہ ہوتے تو شاید وہ معزز نظر آنے میں کامیاب ہوتی؛ اور اس پراسرار اجنبی خاتون کے روبرو کھڑے ہونے میں خوف و خجالت محسوس نہ کرتی۔

"میرے شوہر کہاں ہیں؟" خاتون نے کہنا شروع کیا۔ "وہ یہاں ہیں یا نہیں ہیں، گو مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں ہے، لیکن تمھیں بتا دینا میرا فرض ہے کہ رقم کا تغلب ہوا ہے اور وہ مکوڑے کی تلاش کر رہے ہیں۔ وہ یقیناً ان کو گرفتار کر لینگے۔ یہ تمہاری کارگزاری ہے۔"

خاتون اٹھ کھڑی ہوئی اور غیظ و غضب کی حالت میں کمرہ میں ٹہلنے لگی۔ بیتشا نے اس کی طرف دیکھا، پر اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی۔

"کہیں نہ کہیں پتہ چل جائے گا اور آج وہ گرفتار ہو جائینگے،" خاتون نے کہا، اور ایک آہ بھری جس کی صدا میں کس کا اضطراب و تنفر سنائی دیتا تھا۔ "جس نے انھیں اس خوفناک نوبت تک پہنچا دیا اس کو میں خوب پہچانتی ہوں! ذلیل خبطی! کمینی! نفرت انگیز! آوارہ گرد! بھگنی!" خاتون ناک بھوں چڑھائے کراہیت سے کہہ رہی تھی "میں بے سہارا ہوں، اے رذیل عورت سن رہی ہے تو؟ میں لاچار ہوں، تو وہ تیری حالت بدرجہا بہتر ہے۔ ہاں ایک وجود دے جو میری اور میرے بچوں کی حفاظت کریگا! اللہ ہر چیز کو دیکھتا ہے! وہ عادل ہے! ہر آنسو اور شب بیداریوں کی سزا تجھے ضرور دیگا۔ ایک وقت آئے گا جب تو یاد کرے گی! ... ."

پھر خاموشی چھائی رہی۔ خاتون اپنے ہاتھ مروڑتے ہوئے کمرہ میں ٹہلتی رہی۔ اور بیتشا کی یہ کیفیت کہ خالی الذہن اس کو گھور رہی تھی۔ خاتون کی تقریر کا مطلب خاک بھی سمجھ میں نہ آرہا تھا، اور کسی خوفناک انکشاف کا انتظار کر رہی تھی۔

"مجھ کو اس معاملہ کا کوئی علم نہیں ہے، خاتون!" یہ کہکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تم جھوٹ بک رہی ہو!" خاتون نے چیخ کر کہا اور غصہ سے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اس کو دیکھا۔ "میں اس معاملہ سے خوب واقف ہوں! ایک کافی عرصہ سے میں تمھیں جانتی ہوں۔ اور یہ امر بھی مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے کہ گزشتہ پورے مہینہ سے روزانہ وہ تمھارے ساتھ گزار رہے ہیں۔"

"ہاں بالکل ٹھیک۔ تو پھر کیا ہوا؟ میرے ہاں کئی ایک آتے جاتے ہیں، لیکن میں کسی کو جبر کر کے تو نہیں بلاتی۔ وہ اپنی مرضی کے مختار ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔"

"میں تمھیں صاف طور سے کہتی ہوں کہ رقم کے غائب ہونے کا ان لوگوں کو پتہ چل گیا ہے۔ انھوں نے دفتر میں رقمی تغلب کیا ہے! آپ جیسی ذات شریف کی خاطر، ہاں تمھاری وجہ سے انھوں نے واقعی جرم کا ارتکاب کیا ہے، سن رہی ہو،" خاتون نے مستحکم لہجہ میں کہا۔ "شاید تمھارے پاس اصول و ضوابط کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ تمھاری زندگی کا مقصد لوٹنا اور نقصان پہنچانا ہے۔ لیکن کوئی تمھیں اس قدر گئی گذری تصور نہیں کر سکتا کہ جس میں انسانی احساس کا شائبہ تک بھی نہ ہو! ان کی بیوی ہے، بچے بھی ہیں ..... اگر ان کو جلا وطنی کی سزا مل جائے تو ہم بھوکوں مرینگے،

بچے اور میں .... تم نے کچھ سمجھا! اس وقت بھی ان کو بچا لینے اور
ہم کو تباہی و بدنامی سے محفوظ رکھنے کا موقع حاصل ہے۔ اگر میں آج
ہی ان لوگوں کو نو سو روبلس (ایک سکہ) ادا کر دوں تو پھر ان پر وہ
دست اندازی نہیں ہو سکے گی۔ دیکھو صرف نو سو روبلس!"

"کیا، نو سو روبلس؟" لیشا نے نرم لہجہ میں پوچھا "میں
.... میں بالکل نہیں جانتی .... میں نے نہیں لئے ہیں۔"

"نو سو روبلس کے لئے میرا سوال نہیں ہے ...... تمہارے
پاس رقم نہیں ہے تو مجھکو اس سے سروکار بھی نہیں ہے تو تم سے کوئی
اور چیز طلب کر رہی ہوں۔ مرد عموماً تم جیسی عورتوں کو قیمتی چیزیں
دے بیٹھتے ہیں۔ میرے شوہر نے تمہیں جو چیزیں
دی ہیں بس وہی مجھ کو واپس ملجائیں۔"

"بیگم صاحبہ، انھوں نے آج تک کوئی چیز بطور تحفتہً مجھ کو
نہیں دی!" لیشا نے اصل معاملہ کو بھانپتے ہوئے دلگیر طرز میں کہا۔

"تو تم کہاں چلی گئی؟ انھوں نے اپنی، اور میری اور لڑکوں
کی رقم لٹا دی .. .. تو آخر گئی کہاں یا میری استدعا سنو!
جوش و غصہ میں بہت کچھ برا بھلا میں نے تمہیں سنا دیا۔ اس کیلئے
میں صدق دلی سے معافی چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں
مجھ سے نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن تم میں ہمدردی کی اہلیت
ہے، تو اس خستہ حالت میں تھوڑی دیر کیلئے میری جگہ اپنے
کو موجود سمجھو اور دیکھو اسنو! ان چیزوں کی واپسی کیلئے میں تم
سے التجا کرتی ہوں!"

"ہوں!" کی آواز لیشا کے منہ سے نکلی؛ اور اس نے
اپنے شانے ہلائے۔ "میں خوشی واپس کر دیتی، لیکن خدا گواہ
ہے کہ انھوں نے تحفتہً کوئی چیز مجھکو کبھی نہیں دی یہ میری ضمیر کی
آواز ہے! اس پر یقین کیجئے۔ تاہم آپ کا خیال درست ہے"
اگرچہ کہ" مغنیہ نے گھبراہٹ سے کہا، "دو چھوٹی چیزیں انھوں نے
لاکر دی تھیں۔ اگر تم چاہو تو، یہ میں ضرور واپس دے دوں گی۔"

لیشا نے اپنے سنگار خانہ کے ایک دروازہ کو کھینچا اور سونے
کی ایک کھوکھلی چوڑی اور ایک معمولی انگوٹھی جس پر یاقوت جڑا ہوا
تھا نکالی۔

"بیگم صاحبہ، لیجئے!" اس نے چیزیں پیش کرتے ہوئے بلا تامل
سے خطاب کیا۔ خاتون چونک کر کانپ گئی اور ذلت محسوس کی
"تم مجھ کو دے کیا رہی ہو؟" اس نے کہا "میں کوئی بھیک
نہیں مانگ رہی ہوں، بلکہ وہ چیزیں طلب کر رہی ہوں جو تمھاری
ملکیت میں داخل نہیں ہیں۔ وہ چیزیں جو تم نے اپنی شرمناک
زندگی کی طفیل ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے میرے شوہر سے
لوٹ لیں ..... وہ کمزور، ناخوش انسان ..... پنجشنبہ کو
جس وقت تمہیں میرے شوہر کے ساتھ مندر گاہ پر چہل قدمی کرتے
ہوئے دیکھا، تو تم قیمتی زیورات اور چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔
لہذا ان طفلانہ حرکات سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ اب تم سے اخیر
مرتبہ مطالبہ کرتی ہوں کہ وہ چیزیں دیتی ہو یا نہیں؟"

"تم عجیب عورت ہو، میری بات پر" لیشا نے برا مانتے
ہوئے کہا "یقین کیجئے کہ بجز اس چوڑی اور چھوٹی سی انگوٹھی کے
تمہارے نکلے نے کوئی چیز مجھکو نہیں دی۔ وہ صرف میٹھے
کیک لاکر دیتے رہے"۔

"میٹھے کیک!" اجنبی ہنس پڑی۔ "بچوں کے لئے گھر میں
سوکھے ٹکڑے بھی نصیب نہیں، اور تمھارے لئے میٹھے کیک
مہیا کئے جاتے ہیں۔ خیر! تو وہ تحائف واپس نہ کرنے کا تم نے
مصمم ارادہ کر لیا ہے"؟

کوئی جواب نہ ملنے کی وجہ سے خاتون پیچھے بیٹھ گئی اور خلا میں
گھورتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

"اب کیا کیا جائے؟ خاتون نے کہا "اگر مجھ کو نو سو روبلس
نہ ملے تو وہ برباد ہو جائیں گے اور ساتھ ہی بچے اور خود بھی تباہ ہو جاؤنگی
کیا اس کمینی عورت کو قتل کر دوں یا گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے

اس تک پہونچوں ؟"

خاتون نے اپنی دستی سے چہرہ کو زور سے دبا یا اور سسکیاں بھرنے لگیں "میں تمھاری منت کرتی ہوں !" اجنبی کی سسکیوں میں سے لیشا کو یہ الفاظ سنائی دئے "تم نے میرے شوہر کو تباہ و برباد کر دیا ...... تمھیں ان کا تو کوئی احساس نہیں ہے" لیکن بچے ...... ہائے بچے ......معصوم بچوں نے کیا گناہ کیا ہے ؟"

لیشا نے چھوٹے بچوں کو گلی کوچہ میں کھڑے ہوئے بھوک پیاس سے بلبلاتے ہوئے حالت میں تصور کیا۔ اور خود اس کی سانس بھی رقت سے پھول گئی ۔

"میں کر ہی کیا سکتی ہوں ، بیگم ؟" اس نے کہا ۔ آپ فرماتی ہیں کہ میں ایک ذلیل عورت ہوں اور میں نے نکولے کو تباہ کر دیا ہے .... خدائے قادر مطلق کو حاضر ناظر جان کر تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ انھوں نے مجھکو کچھ بھی نہیں دیا ہے ..... ہماری جماعت میں صرف ایک لڑکی ایسی ہے کہ جس کا چاہنے والا دولتمند ہے ۔ باقی ہم سب ایک کشمکش کی زندگی بسر کرتی ہیں ۔ نکولے اعلیٰ تعلیم یافتہ ، مہذب اور شریف آدمی ہیں ، اسی لئے ان کی آمد و رفت میرے لئے مرغوب خاطر ہے ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ شریف آدمیوں کو خوشامد کہنے کیلئے ہم مجبور ہیں "

"میں ان چیزوں کا مطالبہ کر رہی ہوں ! وہ چیزیں میرے حوالے کر دو ...... میری حالت ناگفتہ بہ ہو رہی ہے .... میں خود کو عاجز بنا رہی ہوں ...... اگر تم چاہتی ہو تو میں دو زانو ہو کر التجا کرتی ہوں !"

خوف و ہراس سے کانپ کر لیشا نے اپنے ہاتھ ہلائے ۔ یہ زرد رو اور خوبصورت لیڈی ، جس کی رفتار و گفتار سے ایسی شان و تمکنت ٹپک رہی تھی کہ گویا وہ اسٹیج پر ہے ۔ لیشا کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے مرتبہ و حیثیت کو بالائے طاق رکھکر ضرور گھٹنوں کے بل اس کے سامنے آجائے گی ، اور اپنے کو حلیم و مسکین بناتے ہوئے ۔ اس مغنیہ لڑکی کو اور بھی ذلیل و خوار کرے گی ۔

"اچھا تو میں چیزیں دے دیتی ہوں" عجلت سے آنکھیں پونچھتی ہوئی لیشا نے کہا "یہ نکولے نے نہیں دیں .... بلکہ اور لوگوں نے عنایت کی تھیں بخیر مجھے آپ کی خوشی منظور ہے "

لیشا نے میز کے اوپری دراز کو کھینچا ، الماس کی ایک کلغی ، مونگے کا نکلیس ، چند انگوٹھیاں اور چوڑیاں نکال کر تمام لیڈی کے حوالے کر دیں ۔

"آپ کا اصرار ہے تو یہ لیجئے لیکن یہ واضح رہے کہ تمہارے شوہر سے مجھکو کوئی چیز نصیب نہیں ہوئی ۔ یہ لے لو اور مالدار بن جاؤ ،" خاتون کے دو زانو ہونے کی دھمکی سے متاثر ہو کر لیشا بے تحاشا کہے جا رہی تھی ۔ "فی الواقعہ اگر تم ایک لیڈی اور اس کی جائز بیوی ہو تو انھیں اپنی گرد میں باندھ رکھو ۔ پھر میں یہی کہوں گی ، میں نے دعوت دے کر انھیں نہیں بلایا ، وہ اپنی مرضی سے چلے آتے ہیں ۔"

خاتون نے اپنی پر اشک آنکھوں سے زیورات کو دیکھا پرکھا اور کہا "یہ ساری چیزیں تو نہیں ہیں ...... ان سب کی قیمت بمشکل پانسو روبلس ہو گی ۔"

لیشا نے کچھ جذبہ کیسا تھ دراز میں سے سونے کی گھڑی سگار کیس اور چند بٹن نکالے اور اپنے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا : "اب میرے پاس کچھ نہیں رہا .... تم خود تلاش کر سکتی ہو ۔"

ملاقاتی نے ایک سرد آہ بھری، کانپتے
ہوئے ہاتھوں سے زیورات کو دستی میں باندھ لیا اور
بغیر ایک لفظ کہے یا سر ہلائے باہر چلی گئی ۔
بازو کے کمرہ کا دروازہ کھلا اور نکولے صاحب اندر
تشریف لائے ۔ وہ بالکل زرد اور گھبراہٹ سے اس کا
سر ہلا رہا تھا ۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ شاید اس نے
نہایت کڑوی کوئی چیز حلق کے نیچے اتاری ہے آنکھوں
میں آنسو جھلک رہے تھے ۔
"جناب کیا کیا تحفے آپ نے مجھ کو لا دئے ؟"
لیشا اس پر برس پڑی ۔ "اس قسم کی خواہش کے اظہار
کا آپ نے موقع ہی کب آنے دیا ؟"
"تحفے .. ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے !"
نکولے نے کہا اور اپنے سر کو زور سے ہلایا ۔ "افسوس ! تیرے
سامنے وہ زار زار روئی اور اپنے کو حقیر حیثیت میں پیش
کیا ... "
"میں تم سے دریافت کر رہی ہوں کہ تم نے مجھ کو
کیا تحفے تحائف لا دئے ؟" اس نے چیخ کر کہا ۔
"میرے خدا ! وہ، جو کہ نہایت شریف، خوددار اور
نیک سیرت خاتون ہے، ایک فاحشہ کے سامنے اپنے گھٹنوں
کے بل چلنے تیار ہو گئیں ! اور میری وجہ سے ان کی یہ حالت
ہوئی ! گویا رضا خوشی سے یہ نوبت پہونچی !"
اس نے اپنے سر کو زور سے جھنجھوڑا اور گریہ وزاری کرنے لگا ۔
"نہیں ، میں اس کے لئے اپنے کو ہرگز ہرگز معاف نہیں
کر سکتا ! ذلیل عورت، میرے سامنے سے دفع ہو جا" ۔
لیشا سے دور ہٹنے، کانپتے ہوئے ہاتھ سے اس کو دور
ڈھکیل کر، پیچ و تاب کھاتے ہوئے چلا اٹھا ۔ "وہ دوزانو
ہونے آمادہ ہو گئیں ... وہ بھی تیرے سامنے ۔
آہ میرے خدا !"
اس نے جلدی سے کپڑے پہنے، اور لیشا کو حقارت سے ڈھکیلتے
ہوئے باہر چلا گیا ۔
لیشا زمین پر گر گئی، اور زور سے آہ و بکا کرنے لگی ۔ جو
چیزیں اس کے قبضے سے نکل گئیں اس کا بیحد صدمہ تھا اور اس
کے تمام جذبات مجروح تھے ۔ اس وقت اس کو تین سال پیشتر
کا ایک تکلیف دہ واقعہ بھی یاد آگیا جبکہ کسی تاجر نے اس کو بلا وجہ پیٹ
دیا تھا ۔ اس کے بعد اس نے اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا ۔

"انطون چیخوف" (ترجمہ) لیس ۔ بی انفتا

"فلسفہ کی شکست"

یورپ سے واپسی کے بعد پروفیسر شمیم کا حلقۂ احباب محدود ہونے لگا، کالج کے اوقات گذار کے وہ سیدھا مکان کا راستہ لیتے اور کافی پی کر لائبریری روم میں داخل ہوتے، جہاں وہ رات گئے فلسفہ کی کتابوں کے مطالعہ میں لگے رہتے، یا اکثر دفعہ انہیں رات بھر مصروف مطالعہ دیکھا گیا صبح جب وہ کمرے سے باہر نکلتے ایک بیمار کی مانند مضمحل اور کمزور دکھائی دیتے، آنکھیں نیند سے مغلوب ہو کر اندر کو دھنسی ہوئی ہوتیں، سر کے بال منتشر حالت میں ان کی شکن آلود پیشانی پر پڑے ہوتے۔ ایک موٹا سا چرٹ ہمیشہ ان کے ہونٹوں کی گرفت میں رہتا جو تنہائی میں بڑی حد تک، فلسفیانہ مسائل کے حل کرنے میں ان کا معاون ثابت ہوتا۔

پروفیسر شمیم اس وقت اپنی عمر کی اٹھائیسویں منزل طے کر رہے تھے۔ والدین کے انتقال کے بعد کافی جائداد ان کے ترکہ میں آئی، تعلیم کے ابتدائی منازل طے کرنے کے بعد بہت جلد وہ یورپ روانہ ہوئے۔ جہاں تین سال کی مدت میں کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفہ کی اعلیٰ ڈگری حاصل کر کے ہندوستان واپس ہوئے۔ کچھ ہی دنوں بعد انہیں ایک انگریز دوست کی توسط سے مدراس کی ایک کالج میں پروفیسری کی جگہ مل گئی۔

مختصر سا معمولی مکان اور بڈھا عیسائی ملازم جو دمہ اور کھانسی کا شکار ہو کر تمام رات اپنے مالک کی طرح "فلسفۂ حیات" کی گتھی سلجھانے میں لگا رہتا۔ زندگی کی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے کافی سمجھا گیا۔

شادی کے متعلق پروفیسر کے کچھ عجیب خیالات تھے۔ ان کی اپنی لغت میں "عورت" کا حسین و جمیل لفظ محض بے کیف سا رہ گیا تھا۔

یورپ کے دوران سفر میں بیسیوں مرتبہ انھیں "جنس لطیف" کی ملاقاتوں کا موقع ملا۔ مگر حسن و شباب کے طلسمی اثرات ذرا بھی شمیم کے دل کو متاثر نہ کر سکے، اور نہ کوئی تبدیلی ان کے خیالات میں واقع ہوئی، وہ زیادہ تر اپنا وقت حصول تعلیم کے لئے بڈھے خشک مزاج پروفیسروں کی صحبتوں میں گزارا کرتے، ہندوستان آکر بھی پروفیسر شمیم نے اپنی محدود سوسائٹی میں ایک جوشیلی تقریر کر کے ان نفرت انگیز جذبات کا اظہار کر ڈالا۔ جو ایک حد تک ان کی عادت ثانیہ بنکر سینے میں پرورش پا رہے تھے۔

مس پال سیمن اس کالج میں معلمہ تھی۔ خد و خال اور روپ رنگ کے اعتبار سے لاکھوں میں ایک تھی، اس کی بادہ فروش آنکھیں دوشیزگی کا ملکوتی جذبہ لئے ہوئے دیکھنے والوں کی نظروں کو مخمور سا بنا دیتیں، اس کے احمریں ہونٹ ہمیشہ تبسم کا خزانہ لئے ہوئے، سڈول، گداز شانے بڑی دلفریبی کے ساتھ حسن کی دلکشی میں اضافہ کر رہے تھے۔

مس پال کو کالج میں ملازم ہوئے زیادہ دن نہ ہوئے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے اپنے حسن و شباب کی بدولت کافی دل خرید لئے تھے، اس کا حسن شعراء اور افسانوں کا موضوع بنا رہتا بحیثیت ایک زمرہ میں ہونے کے پروفیسر شمیم بھی حسن کی آتشیں شعاعوں کی زد سے نہ بچ سکے۔ کبھی کبھی اس سے مڈبھیڑ ہو جاتی، مس پال مسکراہٹ کے ساتھ ان سے مصافحہ کرتی، اور دلبرانہ انداز کے ساتھ خیریت پوچھتی، شمیم بے چینی کی حالت میں ایک تلخ مسکراہٹ لئے ہوئے "تھنک یو" کہتا ہوا اپنی کلاس میں چلا جاتا، مس پال دوران ملاقات میں ہمیشہ اپنے نسوانی حربہ سے کام لینے کی کوشش کرتی لیکن پروفیسر شمیم کے معاملہ میں ہر دفعہ اسے ناکامی کی صورت

دیکھنی پڑتی، اس نے اپنے دل کو مطمئن بنانے کے لئے کالج کے پروفیسروں سے کے بعض حالات و خیالات معلوم کر لئے تھے۔

جنوری کے پہلے دن "کالج ڈے" کا شاندار جلسہ ترتیب دیا گیا جس میں بڑی تعداد میں معزز عہدہ دار اور شہر کے بعض ممتاز حضرات و خواتین مدعو کی گئی تھیں۔

پروفیسر شمیم نے ایک مختصر سی افتتاحی تقریر کی جو فلسفیانہ رنگ لئے ہوئے جامع اور موزوں الفاظ سے پر تھی، تقریر کے اختتام پر پروفیسر نے حاضرین جلسہ سے مس پال کا تعارف کروایا۔

"عورت اور کائنات" کے عنوان پر مس پال نے ایک بسیط تقریر کی دنیا کی تاریخ کو اس نے الٹ ڈالا۔ خدا اور رسول کے احکام پیش کرتے ہوئے، آسمانی صحیفوں کا حوالہ دیا گیا، ادیبوں اور فلسفیوں کے اقوال کو دہرا کر ایک مدلل بحث کی، مذہب اور پابندیوں سے بالکل آزاد ہو کر نفسیاتی پہلو اختیار کئے گئے۔ اور یہ ثابت کر دکھایا کہ دنیا کا چپہ چپہ صنف نازک کے زرین کارناموں سے مملو ہے، آج بھی ان کے احسان عظیم سے دنیا والوں کی گردنیں خم ہیں، تقریر میں ایک جادوگری تھی، جو محفل کے ہر فرد کو متاثر کئے بغیر نہ رہی، مسلسل ایک گھنٹہ تک موزوں اور دلکش پیرایہ میں "عورت اور کائنات" پر بحث کر کے مس پال نے یہ ثابت کیا کہ عورت کے ایک ادنیٰ اشارے پر آج بھی ہٹلر اور موسولینی کے بلند ترین حوصلے ڈگمگا سکتے ہیں، اس کی ذراسی بات پر دنیا کا نظام درہم برہم ہو سکتا ہے۔ لیکن موجودہ دور کے بعض افراد کی تنگ خیالی نے عورت کو ایک بے کیف اور مہمل سی چیز سمجھ رکھا ہے۔ یہ ان کی کم دانی کا نتیجہ ہے، ان کے اپنے نزدیک عورت محض ایک غیر دلچسپ کھلونا ہے، مرد کے نفسانی گندے جذبات صنف نازک کی لطیف ترین احساسات سے کھیلنے اور مجروح کرنے کے متمنی رہتے ہیں، کاش وہ اس معمہ کو سمجھ سکتے، اور اس راز کو معلوم کر سکتے۔ کہ عورت قدرت کا ایک بہترین شاہکار ہے ایک اچھوتا تخیل ہے — زندگی کا راز ہے — لیکن مرد نفس کا بندہ ہوس کا پجاری کبھی عورت کے راز کی گہرائیوں تک نہیں پہونچ سکتا۔

تقریر حد درجہ دل پذیر اور متاثر کن تھی، مجمع پر ایک سکوت آمیز وجد طاری تھا، شمیم کچھ بے چینی کی حالت میں اپنی مرضی کے خلاف یہ تقریر سنتا رہا۔ نفرت انگیز طیش میں ڈوبے ہوئے جذبات بے تابانہ اس کے سینے میں مچل رہے تھے، اس نے چاہا مس پال کی تقریر کی منہ توڑ تردید کرے لیکن تقریر ختم ہوتے ہی مجمع منتشر ہو گیا۔

اضطراب کی حالت میں شمیم کسی سے ملے بغیر اپنے گھر روانہ ہوا، راستہ بھر وہ تقریر کے موضوع اور پہلو پر غور کرتا رہا۔

کتنی مہمل سی بے کیف تقریر ہے اس نے تھکے ہوئے لہجہ میں ایک صوفہ پر دراز ہو کر کہا، عورت، قدرت کا بہترین تخیل زندگی کا راز، جھوٹ غلط، نہیں، بلکہ گناہ کی پتلی تباہی و بربادی کی جڑ، شیطان کی مرید، عورت، ہاں عورت، وہ دیر تک یونہی بڑبڑاتا رہا، اور پھر اٹھ کر کمرے کی فرش ناپا کیا۔

نہ جانے اور کتنی دیر وہ ان خیالوں میں الجھا رہتا لیکن ملازم کی مداخلت نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑ دیا۔

حضور، جان نے مودبانہ عرض کیا، کوئی لڑکی باہر کھڑی آپ سے ملنے کی متمنی ہے، کوئی لڑکی کون؟ اس کی زبان سے تعجب کا کلمہ نکلا۔ اور بڑھ کر طشتری میں رکھے ہوئے کارڈ کو اٹھا کر غور سے دیکھنے لگا — مس سین پال، وہ زیر لب گنگنایا۔

شمیم چند ثانیوں تک کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا مختلف خیالات اس کے دماغ میں چکر لگا رہے تھے، ملاقاتی کارڈ اس کی انگلیوں کی گرفت میں تھرتھرا رہا تھا، اس نے ایک بار پھر کارڈ کا جائزہ لیا ملازم تا حال اس کے حکم کا منتظر تھا، سرکار! اس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

ہاں اُسے اندر بھیج دو ۔ شمیم نے چیرٹ کو روشن کرنے کے بعد کہا ۔

ایک منٹ میں لڑکی اس کے مقابل کھڑی تھی، رنگین ملبوسات میں لپٹا ہوا مجسمہ حد درجہ حسین دکھائی دے رہا تھا، حسن و شباب کی رعنائیاں رنگ و بو کی جھرمٹوں میں چھپی ہوئیں فلسفی کے دل و دماغ کو معطر کر رہی تھیں شرابی آنکھوں سے ایک کیف آور مستی ابل رہی تھی اور احمریں ہونٹوں پر تبسم کی شوخ و شنگ دوشیزہ ناچ رہی تھی، مصافحہ کے بعد شمیم نے اسے ایک صوفہ پر جگہ دی، اور خود مقابل والی نشست پر بیٹھ گیا،

معاف کیجئے، مس پال نے ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا، مخل تو نہیں ہوئی، آپ مصروف ہوں گے ۔ کوئی مصروفیت نہیں اس نے دھوئیں کے چھلے بناتے ہوئے اطمینان کے لہجے میں کہا، فرمائیے آپ نے کیسی زحمت کی،

یونہی، حسین دوشیزہ نے تبسم کو نمایاں کرتے ہوئے جواب دیا ۔

میں آپ کو پندرہ منٹ دے سکتا ہوں، فلسفی نے کہا، اوہ ۔ پندرہ منٹ تو بہت زیادہ ہیں، صرف ایک منٹ مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنے کے لئے کافی ہے ۔

شکریہ، نوجوان فلسفی کا منہ حیرت کے مارے نیم وا ہوگیا، کس امر کا خاتون ۔

یہی آپ نے، اس نے اپنی نظریں زمین پر گاڑ دیں ۔ تقریر سننے کی زحمت جو گوارا فرمائی، ایک خفیف حقارت آمیز قہقہہ کے ساتھ شمیم نے کہا، بس اتنی سی بات، میں سمجھتا ہوں اس نے کھلے الفاظ میں اپنے جذبات کا اظہار کیا، مجھے ایسے شکریہ کی ضرورت نہیں، جو محض، بے کیف اور مہمل تقریر پر مبنی ہے

لڑکی کا حسین چہرہ ایک بارگی اتر گیا، اس نے اپنی دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا

توقع نہیں، بلکہ یقین کے ساتھ سمجھ لینا چاہئے، شمیم کا لہجہ متانت میں ڈوبا ہوا حقارت آمیز تھا، مس پال کے جذبات کو ٹھیس لگی، تو کیا مجھے اپنے شکریہ کے الفاظ واپس لینے پڑیں گے؟ اس نے کچھ بے بسی کے عالم میں کہا ۔

ہاں خاتون حسین مفکر نے جواب دیا، مناسب تو یہی معلوم ہوتا ہے،

لڑکی رخصت ہونے کے لئے کھڑی ہوئی،

اچھا گڈ بائی ۔

مجھے افسوس ہے، شمیم نے مصافحہ کرتے ہوئے طنز آمیز لہجہ میں کہا، آپ ناکام لوٹ رہی ہیں ۔

لڑکی کچھ کہے بغیر وہاں سے روانہ ہوئی ۔

دو دن سے پروفیسر شمیم کی موٹر کارخانہ میں پڑی ہوئی تھی وہ ٹیکسی یا ٹرام کے ذریعہ کالج آتے جاتے رہے، آج بھی وہ کالج کے اوقات گزار کر ٹرام کے انتظار میں کالج کے گیٹ کے پاس کھڑے ہوئے تھے، اس اثناء میں مس پال کی موٹر ان کے قریب سے گزری ۔

ہلو مسٹر شمیم! مس پال نے گاڑی کو بریک کرتے ہوئے کہا، کس کا انتظار ہو رہا ہے ۔

ٹیکسی کے لئے یہاں کھڑا ہوں ۔ پروفیسر نے جواب دیا ۔

آئیے میری کار آپ کو گھر پہونچا دے گی

نو، تھینک یو ـــــ پروفیسر نے معذرت چاہی ۔

چلئے، آپ تکلیف نہ کریں، مس پال اپنی موٹر سے اتر پڑیں، نفرت تو آپ کو ہم لوگوں سے ہے ۔ اس غریب موٹر سے تو نہیں ۔

شمیم نے کچھ جواب نہ دیا مجبوراً اُسے موٹر میں سوار ہونا پڑا ۔ پہلی مرتبہ پروفیسر کو حسن کی قربت نصیب ہوئی حسن و شباب

کی رعنائیاں رنگ وبو کی نکہتوں میں بسی ہوئیں فلسفی کے دل کی
گہرائیوں کا جائزہ لے رہی تھیں،
پروفیسر ایک سکتہ کے عالم میں چپ چاپ بیٹھا ہوا اپنے دل
گھمانے والے خوبصورت ہاتھوں کو تک رہا تھا، اس کی کیف
وجستجو میں ڈوبی ہوئیں نظریں کبھی کبھی ان حسین رخساروں سے
ٹکرا جاتیں جو دلفریبی کا نمونہ لئے ہوئے ایک کیف آور منظر
پیش کر رہے تھے، مجھے یہیں اترنا ہے پروفیسر نے ایک
کتب فروش کی دوکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
اوہ ۔ کوئی فلسفہ کی کتاب خریدنی ہے آپ کو۔
بریک کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پروفیسر کے جسم سے
چھو گیا شمیم کے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑی اس نے فوراً
اپنا بدن سکیڑ لیا، اور کار سے اتر پڑا ۔ موٹر تیزی کے
ساتھ نکل کر بھیڑ میں گم ہو گئی، شمیم کے گھر پہونچنے تک
گیارہ بج چکے تھے، وہ خلاف معمول اتنی دیر باہر
رہا رات کا کھانا بھی اس نے ایک ہوٹل میں کھالیا اور سینما
کا پہلا کھیل دیکھ کر گھر روانہ ہوا۔
رات اس نے نہ تو فلسفہ کا مطالعہ کیا، نہ کوئی
ادویات وسمیات کا تجربہ کیا ۔
اس وقت اس کا دل ودماغ ایک عجیب الجھن
میں پھنسا ہوا تھا، ایک رنگین پیکر اس کا مرکز تصور بنا ہوا
تھا، وہ ایک عجیب وغریب مسئلہ حل کرنے میں محو تھا شاید
زندگی کا راز ــــــ سکون ومسرت کا ساحل جو کبھی اسے
کوسوں دور نظر آرہا تھا، آج اس کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔
صبح جب وہ بیدار ہوا ایک طمانیت بخش سکون آمیز
خیال اپنے دل ودماغ میں لئے بستر سے اٹھا، شاید
تاریکی میں دھندلی سی روشنی کی لہر. جو زندگی کے پیچیدار
تاریک راستوں میں رہبر کا کام دے سکے" وہ عورت
اور اس کی محبت تھی"
وہ خود اپنی اس اچانک تبدیلی پر حیران تھا جس نے
یک بیک اس کے خیالوں کی دنیا میں ہیجان پیدا کر دیا،
ایک انقلاب جو اسے اپنے آپ کو فوراً بدل ڈالنے پر
مجبور کیا ۔
کالج سے واپسی کے وقت ایک بار پھر پروفیسر شمیم مس پال
کے برابر موٹر میں بیٹھے ہوئے دکھائی دیئے، اس وقت
ان کا دل نہایت مسرت کے ساتھ سکون کے تالاب میں
تیر رہا تھا، تمام رات ان کے کمرے میں لائٹ جلتی رہی
وہ فلسفہ کی کتابوں کا مطالعہ نہیں بلکہ "عورت کی حسین وجمیل
معیت" میں بسر کر رہے تھے، صبح ہونے تک انھوں نے
حقیقی مسرت وزندگی کا راز معلوم کر لیا ۔
صبح مس پال جب پروفیسر کے کمرے سے نکلی،
اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک تسخیر آمیز جذبہ اور ہونٹوں
پر کامرانی کا تبسم رقص کر رہا تھا، اس نے اپنے
عزیز ترین جوہر کی قربانی کرکے پروفیسر سے "فلسفہ
کی شکست" منوالی ۔

صابر کوسگوئی

تاش کی دنیا

کسی زمانے میں ایک بہت دور سمندر میں ایک سنسان جزیرہ تھا جہاں تاش کی سلطنت میں تاش کے بادشاہ، رانیاں، اکے اور غلام رہا کرتے تھے۔ دہلے اور نہلے بھی دون اور تینیوں اور دوسرے افراد کے ساتھ ایک عرصہ دراز سے وہاں رہ پڑے تھے لیکن مشہور درباری تیوں کی طرح یہ دو رخی نہ تھے۔

اکے، بادشاہ، اور غلام، یہ تین ذاتیں سب سے اعلیٰ تھیں۔ چوتھی ذات ادنیٰ تیوں کے امتزاج سے بنائی گئی تھی۔ دوئے اور تیئے سب سے ادنیٰ درجہ کے تھے۔ ان پنج ذات تیوں کو اعلیٰ ذات کے درباری تیوں کے ساتھ ایک ہی صف میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔

بلاشبہہ اس جزیرے کی سلطنت کے قوانین اور ضابطے عجیب و غریب تھے۔ ہر ایک فرد کا مخصوص درجہ ایک ایسے زمانے سے متعین چلا آتا تھا جس کی یاد تک فراموش ہو چکی تھی۔ ہر شخص کو اپنی مفوضہ خدمت انجام دینی ہوتی تھی، اس کے علاوہ انھیں اور کچھ نہ کرنا پڑتا تھا۔ وہ مقررہ ضوابط کے مطابق جہاں کہیں جاتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیر مرئی ہاتھ ان کی رہنمائی کر رہا ہے۔

تاش کی سلطنت میں کسی کو بھی سوچنے کا کوئی موقع نہ تھا کسی کو کوئی فیصلہ کرنے کی ضرورت تھی اور نہ کسی کو کسی نئے موضوع پر بحث ہی کرنے کی حاجت۔ تمام شہری بغیر ایک دوسرے سے بات کئے، ایک سر دفار میں گھومتے رہتے۔ گڑبڑ تو گڑبڑ کوئی آواز تک نہ نکالتا تھا۔ وہ اپنی پشت کے بل لیٹ جاتے، اور ہر ایک اوپر آسمان کی طرف اپنی منقطع صورت جائے، دائما گھورتا رہتا۔

تاش کی سلطنت میں حیرت ناک خاموشی چھائی رہتی تھی۔ قناعت اور توکل دونوں ان کے مدور وجود میں مکمل تھے۔ شور و غل یا ہنگامہ وہاں کبھی نہیں ہوا۔ جوش و خروش کے مظاہرے وہاں کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔

بحر بے کراں اس جزیرے کو اپنی آغوش میں لئے کبھی نہ ختم ہونے والے راگ میں لوری سناتا اور اپنی موجوں کے سفید ہاتھوں سے اسے سینکڑوں نرم تھپکیاں دیتا تھا۔ وسیع و عریض آسمان، انڈے سینے والے پرندے کے پھیلے ہوئے بازوؤں کی طرح اس جزیرے پر جس میں لیشیی جھنڈے تھے، محیط تھا۔ بہت دور افق میں ایک گہری نیلی لکیر دوسرے کنارے کا پتہ دیتی تھی لیکن اس کامل سکوت کو توڑنے والی لڑائی جھگڑے یا ہنگامے کی کوئی آواز تاش کے جزیرے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

(۲)

سمندر پار، بہت دور اس دوسرے ملک میں ایک نوعمر شہزادہ رہا کرتا تھا جس کی ماں ایک غم نصیب ملکہ تھی۔ یہ ملکہ بادشاہ کی چشم التفات سے محروم ہو گئی تھی، اور وہ اپنے اکلوتے بیٹے کے ساتھ ساحلِ سمندر پر رہا کرتی تھی۔ شہزادہ اپنا لڑکپن اپنی بے کس ماں کے ساتھ بیٹھتے، اپنی تمناؤں کا عظیم جال بنتے ہوئے تنہائی اور بے کسی میں گزار رہا تھا۔ وہ اڑنے والے گھوڑے، سانپ کے پھن کے ہیرے جنت کے گلاب اور طلسمی راستوں کی تلاش میں جانے یا تیرہ دریا، سات سمندر پار "اوگرے"[1] کے قلعہ کو جہاں حسن کی شہزادی سویا کرتی ہے، ڈھونڈ نکالنے کی تمنا کیا کرتا تھا۔

---

[1] اوگرے۔ (Ogre) یالک دیو مالا کی رو سے وہ خون خوار دیو جس کا گذارا انسانی گوشت پر ہے ۱۲ (مترجم)

حکمت میں، سوداگر کے بیٹے سے اس نے بیرونی سلطنتوں کے قصّے سنے۔ کوتوال کے لڑکے سے اسے چراغ کے موکلوں کے کارنامے معلوم ہوئے۔ جب آسمان پر بادل چھا جاتے، بارش ہونے لگتی تو وہ اپنے گھر میں سمندر کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاتا اور اپنی غم نصیب ماں سے کہتا: "اماں مجھے کسی بہت دور کے ملک کی کہانی سناؤ۔"

اور اس کی ماں اپنے بچپن کی سنی ہوئی ایک عجوبہ روزگار ملک کی کبھی نہ ختم ہونے والی داستان سناتی جہاں حسن کی شہزادی رہا کرتی تھی۔ نوجوان شہزادے کا دل ہجوم تمنا سے بیٹھنے لگتا، وہ مکان کے صحن میں بیٹھا باہر سمندر کی طرف دیکھتا رہتا، اپنی ماں کی عجیب و غریب داستان سنتا جاتا اور اس دوران میں بارش ہوتی رہتی اور بھورے بادل آسمان پر چھائے رہتے۔

ایک دن سوداگر کا بیٹا شہزادے کے پاس آیا اور بے دھڑک کہنے لگا "دوست، میری پڑھائی ختم ہوگئی۔ اب میں اپنی قسمت آزمانے بحری سفر پر جا رہا ہوں۔ میں تمھیں خدا حافظ کہنے آیا ہوں۔"

"شہزادے نے کہا: "میں تمھارے ساتھ چلوں گا۔"

اور کوتوال کے لڑکے نے کہا: "سچے اور قابل اعتماد ساتھیو، تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ میں بھی تمھارا ساتھ دوں گا۔"

نوجوان شہزادے نے اپنی غم نصیب ماں سے کہا "اماں" "میں اپنی قسمت آزمانے سفر پر جا رہا ہوں جب میں واپس آ جاؤں گا تو یقیناً مجھے آپ کے غم غلط کرنے کی کوئی نہ کوئی سبیل معلوم ہوگی۔"

اس طرح تینوں ساتھی سفر پر روانہ ہوگئے۔ بندرگاہ میں سوداگر کے بارہ جہاز لنگر ڈالے کھڑے تھے، تینوں ساتھی سوار ہوگئے۔ جنوبی ہوائیں چل رہی تھیں، بارہ جہاز چل پڑے اسی تیزی سے جیسے شہزادے کے دل میں تمناؤں کا طوفان اٹھ رہا تھا۔

سیپ گھونگھے کے جزیرے میں انھوں نے گھونگھوں سے ایک جہاز بھر لیا۔ صندل کے جنگل کے جزیرے میں انھوں نے دوسرا جہاز صندل سے بھر لیا اور مونگے کے جزیرے میں انھوں نے تیسرے جہاز میں مونگے بھر لیے۔

چار برس کی مدت میں انھوں نے اور چار جہاز بھرے ایک ہاتھی دانت سے، ایک مشک سے، ایک لونگ سے، اور ایک جوز سے۔

لیکن جب یہ سب جہاز بار کر لیے گئے تو ایک زبردست طوفان اٹھا۔ سب کے سب جہاز ڈوب گئے اور ان میں بھری ہوئی اشیا، صندل، مشک، ہاتھی دانت، لونگ اور مونگے سمندر میں تہ نشین ہوگئیں۔ وہ جہاز جس میں یہ تینوں ساتھی سوار تھے، ایک جزیرے کی چٹان سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا لیکن اس کے تینوں سوار صحیح سلامت ساحل پر پہنچ گئے۔

یہی وہ مشہور ناشش کا جزیرہ تھا جہاں اکّے، بادشاہ، رانی اور غلام نہلوں، دہلوں اور دوسرے تمام اراکین اپنے قوانین کے مطابق رہا کرتے تھے۔

(۳)

اب تک اس جزیرے کی خاموشی میں مخل ہونے والی کوئی بات واقع نہیں ہوئی تھی۔ نہ کوئی نئی بات کبھی پیش آئی تھی۔ بحث مباحثہ کی بھی کبھی نوبت نہ آئی تھی۔

اور اب، یکایک، یہ تین ساتھی، جنھیں سمندر یہاں لا پھینکا تھا، نمودار ہوئے ۔۔۔ اور عظیم مباحثہ شروع ہوا ۔ نزاع کے تین اہم نقاط تھے۔ پہلا یہ کہ یہ ذات اپنی کس ذات سے تعلق رکھتے ہیں؟ کیا انہیں دربار کے پتوں کا مرتبہ حاصل ہے؟ یا یہ محض ہیچ ذات کے لوگ تھے جنھیں نہلوں اور دہلوں میں شمار کیا جائے؟ کوئی نظیر بھی ایسی موجود نہ تھی جس سے اس اہم مسئلہ کا فیصلہ کیا جاتا ۔

دوسرے یہ کہ ان کی قومیت کیا تھی؟ کیا ان کا صاف رنگ روپ اور درخشاں چہرہ پان کی طرح تھا یا ان کا رنگ پھول کی طرح سیاہ تھا؟ اس مسئلہ پر بڑی زوردار رد و قدح ہوئی۔ جزیرے کے شادی بیاہ کے طور طریق اور اس کے پیچیدہ قوانین کا انحصار اسی مسئلہ کے عمدہ حل پر تھا ۔

تیسرے یہ کہ یہ کیا غذا کھائیں گے کس کے ساتھ بیٹھیں گے اور کس کے ساتھ سوئیں گے؟ کیا ان کے سر شمال مغرب کی طرف رکھے جائیں گے یا جنوب مغرب کی طرف یا محض جنوب مشرق کی طرف؟ تاش کی سلطنت میں ایسے طویل نازک مسائل پر اس سے پہلے کبھی مباحثہ نہیں ہوا تھا ۔

اور ادھر تینوں ساتھیوں کا بھوک سے برا حال ہونے لگا انہیں کسی نہ کسی طرح غذا ملنی ضروری تھی۔ چنانچہ یہ مباحثہ اپنی لامتناہی خاموشی اور وقفوں کے ساتھ جاری تھا اور اکّوں نے اپنی مجلس طلب کی اور اپنی ایک کمیٹی اس غرض سے بنائی کہ اس مسئلہ کا کوئی دقیانوسی حل دریافت کیا جائے ۔ ادھر تو یہ کارروائیاں ہو رہی تھیں اور ادھر تینوں ساتھی جو کچھ مل سکتا تھا کھا رہے تھے، ہر کوزہ کو پی پی کا خالی کر رہے تھے اور تمام قوانین توڑ رہے تھے ۔

دوئے اور تینے تک اس وحشیانہ طرز عمل سے کانپ اٹھے ۔

تینوں نے کہا "دوئے بھائیو، یہ لوگ تو بالکل بے حیا ہیں!" اور دوؤں نے کہا "تینے بھائیو، یہ لوگ تو صاف طور پر ہماری ذات سے بھی نیچ ذات کے معلوم ہوتے ہیں!"

کھانے سے فارغ ہوئے تو تینوں ساتھی شہر میں گھومنے کے لئے نکل پڑے ۔

جب انھوں نے متفرق اور متفکر لوگوں کو اپنے افسردہ جلوسوں میں منقطع اور سنجیدہ چہروں کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو شہزادہ سوداگر کے لڑکے اور کوتوال کے طرف پلٹا پھر اپنا سر پیچھے کی طرف ڈال کر ایک زوردار قہقہہ لگایا ۔

شاہی سڑک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اکا چوک کے اطراف اور غلام گردی کے اندر یہ عجیب، کبھی نہ سنی ہوئی ہنسی ۔۔۔ وہ ہنسی جو خود اپنے آپ پر حیران تھی، خاموشی کے اس عظیم خلا میں دوڑ گئی ۔

اپنے اطراف ایسی بھیانک خاموشی دیکھ کر کوتوال کے لڑکے اور سوداگر کے بیٹے کا خون ہڈیوں کے اندر جم گیا۔ وہ شہزادے کی طرف پلٹے اور کہنے لگے: "دوست، یہاں سے چل دینا چاہئے۔ ان خوفناک بھوتوں کے ملک میں ہمیں ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں ٹھہرنا چاہئے۔"

لیکن شہزادے نے کہا "دوستو، یہ لوگ تو آدمیوں سے مشابہ معلوم ہوتے ہیں، اس لئے میں انھیں نیچے اوپر اور الٹ پلٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ آیا ان کی رگوں میں زندگی کے گرم خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے یا نہیں۔"

(۴)

ایک ایک کر کے دن گزرنے لگے اور جزیرے کی ساکن دنیا تقریباً بغیر کسی آواز کے جیسی کی ویسی ہی رہی۔ تینوں ساتھی نہ تو کسی قاعدے کی پابندی کرتے تھے اور نہ کسی

قانون کی۔ نہ بیٹھنے میں، نہ کھڑے رہنے میں، نہ لیٹنے میں نہ پشت کے بل لیٹنے میں — کسی بھی چیز کو وہ ٹھیک طرح انجام نہیں دیتے تھے۔ برخلاف اس کے جب کبھی وہ ان چیزوں کو آئین و آداب کے تحت، عین قوانین کے مطابق ہوتا دیکھتے تو دل کھول کر ہنستے۔ ان ازلی قوانین کی دائمی سنجیدگی کا ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

ایک دن بڑے درباری بنئے سوداگر کے بیٹے کوتوال کے لڑکے اور شہزادے کے پاس آئے

"کیوں"، انھوں نے دھیمی آواز میں پوچھا "آپ لوگ قوانین کے مطابق حرکت نہیں کرتے؟"

تینوں ساتھیوں نے جواب دیا "کیونکہ یہی ہماری مرضی ہے۔"

دربار کے بنیوں نے کھوکھلی، گونجتی ہوئی آواز میں جیسے کوئی طویل خواب سے آہستہ آہستہ جاگتا ہے، یک زبان ہوکر کہا "مرضی! بتائیے مرضی کون ہے؟"

وہ سمجھ نہ سکے کہ مرضی کیا ہے لیکن آہستہ آہستہ پورا جزیرہ اس سے واقف ہونے لگا۔

نور کی پہلی شعاع ان کے خانۂ دل میں دوڑ گئی جب انھوں نے شہزادے کی حرکات کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ جان لیا کہ وہ ایک ہی صف میں اس سمت کے خلاف بھی جاسکتے ہیں جس سمت میں اس سے قبل وہ حرکت کرتے چلے آئے تھے۔

پھر انھوں نے ایک اور تعجب خیز انکشاف کیا کہ بنیوں کا دوسرا رخ بھی ہے جسے انھوں نے اب تک غور سے نہیں دیکھا تھا۔

یہ تھی انقلاب کی ابتدا۔

اب کہ انقلاب شروع ہوچکا تھا تینوں ساتھی انھیں مرضی کے اسرار و رموز سے عمیق سے عمیق تر طور پر آشنا کرنے کے قابل تھے۔ رفتہ رفتہ بنئے محسوس کرنے لگے کہ زندگی کا انحصار قوانین پر نہیں۔ وہ اپنی مرضی کے شاہانہ اختیار کے استعمال میں ایک اندرونی اطمینان محسوس کرنے لگے۔

لیکن مرضی سے اسی پہلی ہی ٹکر میں تاش کی پوری گڈی آہستہ آہستہ ڈھیلی ہونی شروع ہوئی اور پھر زمین کے برابر ہوگئی۔ یہ نظارہ ایسا تھا جیسے کوئی بڑا اژدہا بڑی دیر کے بعد جاگ رہا ہو، جیسے وہ اپنی بے گنتی کنڈلیوں کو اپنے جسم کو ایک جھٹکا دے کر کھول رہا ہو۔

(۵)

اس وقت تک پان، حکم، پھول اور اینٹ کی رانیاں پردے کے پیچھے یا تو خلا پر اپنی نظریں جمائے بیٹھی تھیں، یا ان کی آنکھیں زمین پر لگی ہوئی رہتی تھیں۔

اور اب، یکایک، موسم بہار کی ایک دوپہر کو پان کی رانی نے چھپے پردے سے ایک لمحہ کے لئے اپنی تاب ناک سیاہ بھویں اٹھائیں اور اپنے گوشۂ چشم سے شہزادہ پر ایک نظر ڈالی۔

"اللہ اکبر"، شہزادہ چلا اٹھا "میں سمجھتا تھا کہ یہ سب نقش کی ہوئی تصویریں ہیں لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ بہرحال یہ تو عورتیں ہیں"

پھر نوجوان شہزادے نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اپنے قریب بلایا اور فکرمند لہجہ میں بولا "دوستو، ان عورتوں میں ایک ایسی دلکشی ہے جو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ جب میں نے رانی کی سیاہ، روشن آنکھوں کی ایک ایسی نظر دیکھی جو دل میں نئے احساسات اور جذبات کا چراغ روشن کرنے والی تھی مجھے ایک نوزائندہ دنیا میں صبح کی دھیمی شعاع کا سا احساس ہوا۔"

دونوں ساتھیوں نے ایک واقف کارانہ مسکراہٹ سے اس کا خیر مقدم کیا اور کہا "کیا واقعی ایسا ہی ہے، شہزادے؟"

اس دن سے یان کی رانی کی حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ اس نے حقیقی معنی میں قاعدے اور قانون کو رسوا کن انداز سے طاقِ نسیاں میں رکھ دیا۔ مثلاً اگر صف میں اس کی جگہ غلام کے بازو تھی تو اس کی بجائے وہ بالکل اتفاق سے اپنے آپ کو شہزادے کے بازو کھڑا پاتی۔ اس پر غلام چہرے کو حرکت دئے بغیر سنجیدہ آواز میں کہتا "رانی تم نے غلطی کی"۔

غریب یان کی رانی کے سرخ گال سرخ تر ہو جاتے۔ لیکن شہزادہ مردانہ وار اس کی بگو غلامی کے لئے آتا اور کہتا "نہیں! کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ آج سے میں غلام بنتا ہوں!"

اب یہ ہونے لگا کہ ہر ایک یان کی خطا کار رانی کی غلطیاں درست کرنے کی کوشش کرتا ہوا خود بھی غلطیاں کرنے لگا۔ اکوں نے اپنے آپ کو بادشاہوں کے پہلو میں پایا۔ بادشاہ غلاموں میں گڈمڈ ہو گئے۔ نہلوں اور دہلوں نے ایسا انداز اختیار کیا گویا وہ بڑے درباری پتوں میں سے ہیں۔ دونے اور تینے خفیہ طور پر اس جگہ پر قبضہ جمائے ہوئے دیکھے گئے جو خاص طور پر چوں اور پنجوں کے لئے مخصوص تھی۔ اس سے پہلے کبھی ایسی بدنظمی پیدا کرنے والی افراتفری دیکھی نہیں گئی تھی

تاش کے جزیرے میں بہار کے کئی موسم آئے اور گئے تھے۔ بہار کی مغنیہ کوئل سال بہ سال اپنے نغمہ سناتی ہی رہتی تھی۔ لیکن اس نے خون کو اس طرح گرمایا نہیں تھا جیسے کہ اب گرمایا تھا۔ گذرے ہوئے دنوں میں سمندر اپنا لامتناہی راگ الاپا ہی کرتا تھا، لیکن اس سے قانون کا ازلی عدم تنوع ثابت ہوتا تھا۔ اور اب یکایک اس کی موجیں اپنی چمک دمک، اپنے درخشاں سائے، اور اپنی لاتعداد آوازوں میں قلب محبت کی عمیق ترین آرزوؤں کی شرح کر رہی تھیں!

(۱۱)

کہاں ہیں اب ان کے منقطع، مدور، باقاعدہ اور مطمئن چہرے؟ اور ہر ایک بیمار عشق کا چہرہ ہے جس پر محبت کی ساری حسرتیں برس رہی ہیں۔ اور ہر ایک دل ہے جو ندامت اور پشیمانی سے دھڑک رہا ہے۔ اور ہر ایک جان ہے جو شکوک اور توہمات کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ نغمہ اور آہ سرد، مسکراہٹ آنسو انہیں سے ساری فضا معمور ہے زندگی کی ہر طرف نمود ہے، دل ٹوٹ رہے ہیں، جذبات کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔

ہر شخص اپنی ہی شکل و صورت کے متعلق سوچ رہا ہے اور مقابلہ دوسروں سے کر رہا ہے۔ پھول کا اکا آپ ہی غلطاں و پیچاں ہے، حکم کا اکا بس مشکل ہی سے حسین کہلایا جا سکتا ہے "لیکن" وہ کہتا ہے "جب میں سڑک پر نکلتا ہوں تو دیکھو لوگوں کی نظریں میری طرف کیسی لگی رہتی ہیں"۔ حکم کا بادشاہ کہہ رہا ہے "یہ کیا بات ہے کہ پھول کا اکا یہاں ہمیشہ گردن پھلاتا اور مور کی طرح اکڑتا پھرتا ہے؟ وہ سمجھتا ہے کہ ساری رانیاں اس کے عشق میں مری جا رہی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ——" یہاں وہ رک جاتا اور آئینہ میں اپنے چہرے کا جائزہ لیتا۔

لیکن رانیوں کی حالت سب سے گئی گذری تھی۔ انہوں نے اپنا سارا وقت نہلوں کی مدد سے بننے سنورنے میں گزارنا شروع کیا۔ نہلے ان کے حقیر و ذلیل غلام بن گئے۔ ایک دوسرے پر ان کے پھبتے ہوئے طعنے اس سے بھی زیادہ دل خراش تھے۔

جوان آدمی بے حس و حرکت درختوں کے نیچے پتوں پر بیٹھے رہتے اور جنگل کے سائبان میں اپنے بازوؤں کو

پھلائے پڑے رہتے۔ کنواری لڑکیاں ہلکے نیلے دوپٹے
اوڑھے ٹہلتی ہوئی اتفاقاً اسی جنگل کے انہیں درختوں کے
انہی سائبان میں چلی آتیں، اور ادھر اُدھر اس طرح دیکھتیں
جیسے کہ انھوں نے وہاں کچھ دیکھا ہی نہیں، اور ایسی بن
جاتیں جیسے وہ کسی کو دیکھنے کے لئے آئی ہی نہیں ہیں۔
پھر ان نوجوانوں میں سے کوئی ایک نوجوان جو زیادہ جری
ہوتا جنون کے دورے میں کسی ایک نیلے کپڑے پہنی ہوئی
کنواری کے قریب جانے کی ہمت کرتا۔ لیکن جب وہ جاتا تو
اس کی زبان یاری نہ کرتی۔ پھر بہ لب، بیوقوف بنا وہیں
کھڑا رہتا اور ایسا وقت سعید نکل جاتا۔

سروں کے اوپر کوئلیں کوک رہی تھیں، نسیم شمال کے
شوخ جھونکے، بالوں سے اٹھکھیلیاں کرتے، کان میں کانا
پھوسی کرتے اور خون میں نغمہ کی آگ لگاتے چل رہے تھے
درختوں کی پتیاں زیر لب سرسراتی ہوئی مسرت کا تذکرہ
کر رہی تھیں۔ اور سمندر نے کبھی نہ رکنے والی آواز میں
عشق مجسّم کا مل میں عورت اور مرد کی ساری بے زبان تمناؤں
کا طوفان اٹھا رکھا تھا۔

یہی تین ساتھی تھے جنھوں نے دنیائے ناشناس
کی خشک و بے آب نہروں میں ایک نئی زندگی کا سیلاب
بہا دیا تھا۔

ہر چند کہ سیلاب اپنے شباب پر تھا لیکن اس میں
ایک وقفہ کی تمو بھی تھی، جیسے اٹھتی ہوئی موجیں ٹوٹ کر
کف نہ بنیں اور ہمیشہ کے لئے اسی طرح کھڑی رہیں۔ کوئی
بات علی الاعلان نہ کہی جاتی تھی۔ اگر ایک محتاط قدم آگے
بڑھتا تو دو پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ ہوائی قلعوں یا بالو کی
فصیلوں کی طرح لوگ اپنی ناتمام آرزوں کا انبار لگاتے
نظر آتے تھے۔ ان کے چہرے زرد تھے اور زبان گنگ، ان
کی آنکھیں شعلہ بار تھیں اور سرد لبوں سے ان کے ہونٹ کانپ
رہے تھے۔

شہزادے نے دیکھا کہ یہ علامتیں کچھ ٹھیک نہیں۔
اس نے جزیرے کے ہر ایک باشندے کو طلب کیا اور کہا
"تمام رباب اور طبلے، قرنے اور ڈھول یہاں لے آؤ،
ہم سب مل کر انہیں بجائیں گے اور مسرت کی تانیں اڑائیں گے
کیونکہ آج رات یان کی رانی اپنے بر کا انتخاب کرے گی۔"
چنانچہ نیلے اور دبلے اپنے بربط اور بانسریاں بجانے
لگے، اٹھوں اور ستوں نے اپنے طنبورے اور سارنگ
کا زنگ چھڑایا اور دونے اور تینے بھی دیوانہ وار اپنے ڈھول
پیٹنے لگے۔

جب نغمہ سرائی کی یہ لہر چلی تو اس نے ایک ہی جھونکے
میں تمام سرد آہوں اور دلگیریوں کو بہا دیا۔ اور پھر قہقہوں
اور نعروں کا کیسا طوفان اٹھا! جرأت رندانہ کے مظاہرے
تھے اور ان کے جواب میں بناوٹی انکار، گپ شپ اور رنگ
چہل بھی اور ہنسی مذاق۔ گویا یہ کسی گھنے جنگل کے درمیان ایک
گرمائی مکان میں پتیوں اور ٹہنیوں کے جھومنے، ملنے، سرسرانے
اور سائیں سائیں کرنے کے مشابہ تھا۔

لیکن یان کی رانی ایک گلابی دوپٹہ اوڑھے ہوئے
خنیہ "برگ پوش" میں خاموش بیٹھی گانے بجانے کی اس
ہنگامہ خیز آواز اور ہنسی مذاق کے اس شور و غل کو سن رہی
تھی جو اس کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں
کھولیں تو شہزادے کو اپنے سامنے زمین پر بیٹھا اس کے
چہرے کو تکتا ہوا پایا۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے اپنی
آنکھیں ڈھانپ لیں اور مسرت کی ایک اندرونی لہر کے

ساتھ وہ کانپتی ہوئی پیچھے جھک گئی ۔

شہزادے نے تمام دن موجیں مارتے ہوئے سمندر کے کنارے پر ٹہلتے ہوئے گزارا ۔ اس کے دل میں رانی کی پریشان نظریں اور اس کے چہرے کے متوحش آثار سمائے ہوئے تھے اور اس کا دل امید وصال میں بری طرح دھڑک رہا تھا ۔

اسی رات کو، خوش نما پوشاکوں میں ملبوس نوجوان مرد اور کنواری لڑکیاں اپنے مسکراتے چہروں کے ساتھ قصر کے دروازے پر منتظر کھڑی تھیں ۔ قصر کا ہال جادو کے قمقموں سے جگمگا رہا تھا، اور موسم بہار کے پھولوں سے اس کی تزئین و آرائش کی گئی تھی ۔ یاں کی رانی خراماں خراماں داخل ہوئی اور اس کے استقبال کے لئے سارا مجمع اٹھ کھڑا ہوا ۔ اپنے ہاتھ میں چنبیلی کا ایک ہار لے وہ شہزادے کے آگے نظریں نیچی کئے کھڑی ہوگئی ۔ اپنے منتخب کردہ بر کے گلے میں ہار ڈالنے کے لئے شرم وحیا سے اس کے ہاتھ اٹھتے نہ تھے ۔

لیکن شہزادے نے اپنا سر جھکا دیا اور ہار کھسک کر اپنی جگہ پر آگیا ۔ نوجوان مرد اور کنوری لڑکیاں اس کے انتخاب کا بے صبری سے سانس روکے انتظار کر رہی تھیں ۔ اور جب انتخاب ہوگیا تو سارا مجمع مجنونانہ خوشی سے اچھلنے کودنے لگا ۔ ان کی چیخ اور پکار کی صدائیں جزیرے کے ہر حصہ میں اور سمندر میں بہت دور جہازوں تک سنائی دیں ۔ اس سے پہلے تاش کی سلطنت میں ایسا ہنگامہ کبھی نہ ہوا تھا ۔

اور وہ شہزادے اور اس کی دلہن کو لے کر چلے، انھیں تخت پر بٹھایا اور قدیم جزیرۂ تاش میں ان کی رسم تاج پوشی فوراً عمل میں آئی ۔

اور شہزادے کی ماں، غم نصیب ملکہ، بہت دور سمندر کے دوسرے کنارے کے جزیرے سے اپنے بیٹے کی نئی سلطنت میں سونا منڈھے ہوئے جہاز میں بیٹھ کر آئی ۔

اور اب شہری باشندے قوانین کی سخت زندگی بسر نہیں کرتے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق نیک ہیں یا بد، یا دونوں ہیں ۔

سید مبارزالدین احمد

(ٹیگور کے ایک افسانے کا ترجمہ)

تاریخ گولکنڈہ

حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ۔ ال ال بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقاء، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے ۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے ۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنیوں کا تمدن" بھی عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آجائے گی ۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں حاصل کی گئی ہیں ۔ بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت (سے)

رائج اُردو کی اصلاح

ادارۂ ادبیات اُردو کے شعبۂ زبان کی مجلس نے اپنے ایک جلسہ میں یہ طے کیا کہ حیدرآباد میں آج کل جو تحریری زبان رائج ہے اس کی اصلاح کی طرف ادارہ کو توجہ کرنی چاہئے۔ اس مقصد کے لئے ادارہ میں جو تجویزیں پیش ہوئیں ان کی توضیح اور تشکیل کے لئے تنقیدی مضمون شایع کئے جائیں تاکہ مضمون نگار اور عام اہلِ قلم اپنی زبان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں

یہ بہت ضروری ہے کہ ایسی تنقیدیں ذاتیات میں الجھے بغیر ہونی چاہئیں تاکہ کہیں سرے سے وہ مقصد ہی فوت نہ ہو جائے جو ادارہ کے پیش نظر ہے یعنی ٹھنڈے دل سے زبان پر غور کرنا اور تنقید کا فرض ایک جراح کی طرح انجام دینا نہ کہ قصاب اور جلاد کی طرح۔ ذیل کی مختصر تنقید اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ صاحب مضمون کا یہاں حوالہ نہیں دیا جا رہا ہے۔ اور دوستانہ طور پر ان سے اس تنقید کی اجازت لے لی گئی زیر تنقید مضمون رسالہ سب رس میں شائع ہوا ہے اور حیدرآباد کے ایک نامور ادیب کا تحریر کیا ہوا ہے اس لئے ہم نے اس کو حیدرآباد کی آج کل کی بہترین تحریر کا نمونہ سمجھ کر انتخاب کیا ہے۔ چونکہ تنقید صرف زبان کے نقطۂ نظر سے مقصود ہے۔ اس لئے مضمون کے صرف چند فقرے ادھر ادھر سے نقل کیے جائیں گے۔ اس کا خیال رہے کہ یہ صرف ہمارے نئے قایم کئے ہوئے اصولوں کی زد میں آتے ہیں اور چونکہ یہ اصول نئے ہیں اور ابھی عام طور پر تسلیم نہیں کیے گئے اس لئے ہم یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ ہم نے جس لفظ یا ترکیب کو اصلاح کے قابل سمجھا ہے اس کو لکھ کر مضمون نگار نے دراصل کوئی غلطی کی ہے ہماری اصلاح صرف سفارش کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۱) غیر ضروری فارسی اضافتیں اور عطف

جیسا کہ اصل مضمون میں لکھا گیا ہے	جو ہم تجویز کرتے ہیں
آسانی کار	کام میں آسانی یا کام کی آسانی
مجلس ادارت	ادارت کی مجلس
علمی و ادبی معیار	علمی اور ادبی معیار
فلاح و بہبود	فلاح اور بہبود
شعبۂ زبان اردو	اردو زبان کا شعبہ
حالات زندگی	زندگی کے حالات
خزائن فنون لطیفہ	فنون لطیفہ کے خزانے
بکمال مہربانی	کمال مہربانی کے ساتھ (کمال مہربانی بغیر اضافت کے اردو کی ایک عمدہ ترکیب)
مستحق مبارک باد	مبارک باد کے مستحق
نتیجۂ قلم	قلم کا نتیجہ
معتمد شعبۂ نسواں	عورتوں کے شعبہ کا یا کی معتمد
اہل ملک	ملک والے

(۲) غیر ضروری فارسی اور عربی لفظ اور ترکیبیں اور جمعیں

جدید	نئی
ہر ماہ	ہر مہینے
نسوانی فلاح	عورتوں کی فلاح
اہم مسائل	اہم مسئلے
معاونین کا شکریہ	معاونوں کا شکریہ

مناظر کی تصاویر	منظروں کی
شمارہ	نمبر رائج ہوچکا ہے اور زیادہ سہل ہے پھر اس عربیت کی کیا ضرورت ہے۔

۳۔ محاورے کی غلطیاں

زخموں میں چور ہوگیا ـــ زخموں سے چور ہوگیا

اگر اہلِ قلم ہماری تجویزوں کو پسند کریں تو ان سے امید ہے کہ اپنی تحریروں میں ان باتوں کا خیال رکھیں گے اور اپنی زبان کو جہاں تک ہوسکے سہل بنائیں گے غیر زبانوں کے جو لفظ اور ترکیبیں اردو کا گوشت پوست بن گئی ہیں وہ ہمارے سر آنکھوں پر ہیں وہ لفظ جن کے لئے اردو میں لفظ موجود ہے اور وہ ترکیبیں جو اردو کے ایک آریائی زبان ہونے کی وجہ سے اس کے مزاج کے موافق نہیں ان سے پرہیز کریگے۔

ضیاء الدین

محمود گاواں کے مزار پر

سکوتِ موت طاری ہے زمینوں آسمانوں میں
لہو رورو کے سورج چھپ گیا ہے کوہساروں میں

کوئی رازِ عدم شاید نہاں ہے اس خموشی میں
ہوا کی آہ و زاری میں، فضا کی بے خروشی میں

فرشتے تیرے مدفن پر صفِ ماتم بچھاتے ہیں
تری واماندگی پر نور کے آنسو بہاتے ہیں

طلسمِ خواب باندھا ہے تقدس کی ہواؤں نے
تبسم سا کیا پیدا فرشتوں کی دعاؤں نے

"یہاں آکر زمیں نے آسماں کی ہمسری کرلی
یہاں مٹی نے حاصل دو جہاں کی سروری کرلی"

یہاں آکر مسلماں کے لہو نے زندگی پائی
فنا میں زیست پائی، زیست کی تابندگی پائی

یہاں ہر مردِ مومن کے لئے عبرت کا ساماں ہے
یہاں مٹی کے ذروں میں پیامِ زیست پنہاں ہے

محمد نعیم الدین صدیقی

کیج کے حالات

کیج تعلقہ مومن آباد کا ایک قصبہ ہے۔ پہلے یہ ضلع بیڑ کا تعلقہ تھا لیکن جدید ضلع بندی میں یہ تعلقہ قصبہ ہو چکا۔ یہ قصبہ عہد قدیم سے ہے گو زمانہ ماضی کے آثار اب پائے نہیں جاتے لیکن اب زمین سے جو اشیا برآمد ہو رہی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شہر کوئی ڈیڑھ ہزار سال او پر کا ہے ایک سال کا عرصہ ہوا کہ تاج الدین "راج گھر بنانے کے لئے دیوار کا پایہ کھود رہا تھا کہ ایک "دیوی" زمین سے برآمد ہوئی جس سے پتہ چلا کہ یہ "جینوں" کے وقت کا شہر ہے چنانچہ اس دیوی کو ایک سو روپے میں جین لوگوں نے خرید کر "کنھل گری" جو ضلع عثمان آباد میں جین لوگوں کا مندر ہے لیجا کر رکھا۔ ویجناتھ اور اس کی بہن جوگی، کیگی، کنڈ کالی، کالکائی بہین کے باشندے تھے ویجناتھ پرلی چلا گیا کنڈ کالی بیڑ اور کالکائی نیکنور چلی گئی۔ کیگی کیج ہی میں رہی اور جوگی مومن آباد میں اپنی بود و باش اختیار کی تین سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ زمین سے ایک پتھر برآمد ہوا جس پر سنسکرت زبان میں الفاظ لکھے ہوئے تھے لیکن ایک راج نے اس کو صاف کیا اور مسجد جامع کے منبر پر لگا دیا عہد گزشتہ میں یہاں کفرستان زیادہ ہونے کی وجہ سے حضرت قاضی الاولیا، خواجہ مہذب الدین صاحبؒ قدس سرہٗ العزیز تشریف لائے اور اشاعت اسلام میں ہمہ تن مشغول رہے آپ نبیرۂ حضرت بابا شیخ فرید گنجشکرؒ ہیں اور خواجہ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی دہلوی سے خرقہ خلافت حاصل فرمایا۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں جو چودہ سو اولیاء کرام کی پالکی دکن میں تشریف لائی تھی آپ انھیں چودہ سو اولیائے کرام کے قاضی تھے اور آپ کو قاضی الاولیاء کا خطاب حضرت محبوب الٰہی دہلوی سے عطا ہوا۔ اس سے پتہ چلا کے آپ کتنے زبردست منصف تھے۔ حضرت شہنشاہ کوچک جن کی زیارت گاہ بیڑ میں ہے آپ ہی کے خلیفہ ہیں۔ حضرت شہنشاہ کوچک کا مفصل حال میں نے اپنے بیڑ کے مضمون میں تحریر کیا ہے۔

حضرت گیسو دراز بیڑ سے حضرت شہنشاہ کوچکؒ سے استفادہ حاصل فرما کر بطرف گلبرگہ راہی ہو رہے تھے کہ اتفاق سے آپ کا گزر کیج کی طرف ہوا۔ حضرت قبلہ کے ہمراہیوں نے فرمایا کہ یہاں حضرت قاضی الاولیا خواجہ مہذب الدین صاحب قدس سرہٗ العزیز تشریف رکھتے ہیں اور آپ حضرت شہنشاہ کوچک کے مرشد ہیں تو آپ نے فرمایا کہ "جس کے مرید کا یہ حال ہو اس کے مرشد کا پوچھنا کیا" یہ جملہ فرما کر آپ سرمد سرحد ہوتے ہوئے گلبرگہ شریف تشریف لے گئے۔ آپ کی بیوی صاحبہ کا نام "مدنی صاحبہ" تھا ان کے بطن سے ایک صاحبزادے "حضرت قاضی شفاء الدین صاحبؒ" تھے اور حضرت قاضی شفاء الدین صاحبؒ کا مرید خاص شہنشاہ سلطان محمد تغلق تھا۔ جس زمانے میں حضرت قاضی الاولیاءؒ کا وصال مبارک قریب تھا اس وقت آپ کے فرزند ارجمند حضرت شجاع الدین صاحبؒ بیجا پور میں مقیم تھے۔

حضرت قبلہ کا خیال تھا کہ خلافت اپنے فرزند ارجمند کو دیں جب آپ نے آواز دی کہ کون حاضر ہے" تو شہنشاہ کو چک نے فرمایا کو چک حاضر ہے" اس کے بعد آپ نے حضرت شہنشاہ کو چک کو خلافت دے دی آپ کا وصال مبارک ۱۰۳۵ھ میں ہوا۔ بعد وفات آپ کے حضرت قاضی شجاع الدین صاحبؒ تشریف لے آئے اور آپ کی ایما سے گنبد مبارک تیار ہوگیا۔ آپ نے چند سال رہ کر داعی اجل کو لبیک فرمایا گنبد مبارک میں حضرت قاضی الاولیاؒ اور آپ کی بیوی "مدنی صاحبہ" اور آپکے فرزند استراحت فرمارہے ہیں۔ آپ کی موجودہ کرامت زبان زد خاص و عام ہے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ قاضی مہذب الدین سچے جو کھائے سو نچے، قاضی مہذب الدین لال، نہ رہے مکھی نہ رہے بال"۔ مکھی کھالنے کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہہ لے تو انشاءاللہ تعالیٰ اسے "قے" ہرگز نہیں ہوگی۔ کھانے کے پیشتر ہی یہ لفظ کہے جائیں تو بہتر ہے آپ کے گنبد مبارک کے اندر مکھی نہیں جاسکتی۔ ایک سال کا واقعہ ہے کہ ایک شخص چند مکھیاں پکڑ کر "قند سیاہ" کے ساتھ رومال میں رکھ کر گنبد مبارک کے اندر لایا اور رومال کھولا۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ مکھیاں ندارد۔ اس کا اعتقاد زیادہ ہوگیا۔ توبہ توبہ کیا دوسری کرامت یہ کہ ایک سال کیج میں پانی نہیں پڑا یہاں کے ہندوؤں نے علی الصباح نہا دھو کر ایک ایک گھڑا ندی سے پانی لاکر درگاہ میں اس لئے ڈالا کہ یہ حضرت قبلہ دعا فرمائیں۔ اسی دن چار بجے پانی ایسا پڑا کہ ندی نالے ایک ہوگئے۔

آپ بڑے عابد و زاہد تھے۔ لیکن باوجود متقی و پرہیزگار ہونے کے "سماع" کا شوق بہت رکھتے تھے۔ اس خاکسار کا حضرت قبلہ سے سلسلہ نسب پدری سولھویں پشت پر جاملتا ہے آپ کی ادائی خدمت کے لئے حضرت عالمگیرؒ نے "سالیگاؤں" اور بوبلیا کی باڑی" جاگیر بھی عنایت کی تھی لیکن سو سال کا عرصہ ہوچکا ہے کہ آپس کی برادری میں تقسیم پر جھگڑے ہوئے اور اس ضمن میں ایک بھائی نے ایک بھائی کو مار ڈالا اور اس بناء پر حکومت نے وہ جاگیر اپنے قبضۂ اقتدار میں کرلی۔ لیکن اس جاگیر سے کوئی حصہ درگاہ کو نہیں ملا۔ میری گورنمنٹ سے مودبانہ عرض ہے کہ یہ جاگیریں پھر بحال فرمادی جائیں تاکہ مستحقین اپنے حقوق کو پہنچیں۔

آپ کے گنبد مبارک میں جو محمل کی چاندنی ہے اس کو میرے ایک عزیز اسعد الدین دوم تعلقدار (جو اب انتقال فرماچکے ہیں) نے چڑھایا تھا تقریباً یہ چاندنی پانچ روپیہ میں تیار ہوئی۔ آپ کے غلاف مبارک کے نیچے ہر روز روپیہ نکلا کرتا تھا اور وہ جاروب کش لے لیا کرتا تھا اب روپیہ نکلنا بند ہوچکا اس لیے کہ جاروب کش نے اس روپیہ سے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ جاروب کش کی اب کوئی اولاد باقی نہیں رہی۔

گنبد مبارک کے باہر آپ کے استاد استراحت فرما ہیں آپ کی مزار شریف کے پاس ایک خاص خوبی یہ دیکھی گئی کہ ایک چھوٹا سا چنبیلی کا درخت ہمیشہ ہرا ہی ہرا نظر آتا ہے چاہے موسم گرما ہو یا موسم خزاں۔ ۱۳۰۹ف کے قحط میں بھی یہ درخت سوکھا نہیں آپ کی پالکی کے ساتھ جو بھوئی آئے تھے وہ بھی فرش کے نیچے مدفون ہیں۔

———— (۲) ————

(الف) درگاہ شریف کے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلہ پر حضرت سید سادات صاحبؒ آرام فرما رہے ہیں۔

آپ بڑے پائے کے بزرگ ہیں اور آپ حضرت قاضی الاولیاؒ کے ہمراہ تشریف لائے تھے۔ آپ کی مزار شریف حضرت قاضی الاولیاؒ کی مزار شریف سے جانب مشرق و شمال واقع ہے۔

(ب) درگاہ شریف کے جانب مشرق اور ایک سید ساداتؒ کی زیارت گاہ ہے آپ حضرت قاضی الاولیاؒ کے ہمراہ ہی تشریف لائے تھے۔

(ج) جب ملک عنبر اُس وقت مرتضیٰ نظام شاہ دوم کی تاجپوشی پر بیندہ میں کر کے جانب فتح آباد چلا تو کیج میں سخت معرکہ ہوا۔ اسی لئے حضرت سید سادات صاحب کے پاس ہی "گنج شہیداں" واقع ہے۔ ان شہیدوں کے مزاروں میں ایک اہل دل کی بھی مزار شریف ہے جن کا نام معلوم نہیں پہلے مزار شریف زمین دوز تھی لیکن اب تعویز بنوادیا گیا ہے۔ آپ جلالی بزرگ ہیں۔ اگر کوئی شخص آپ کے مزار پر پاؤں دیدے تو بس اس کے پیٹ میں درد شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت تک کم نہیں ہوتا جب تک وہ شیرینی لاکر فاتحہ نہ دے اور معافی چاہے۔ یہاں قبروں کی بے حرمتی بہت ہوتی ہے مختلف گاؤں کے راستے شہر خاموشاں ہی سے گزرتے ہیں جس میں سے گھوڑا گاڑی وغیرہ بھی آتے جاتے ہیں گورنمنٹ سے استدعا ہے کہ سررشتہ امور مذہبی کو توجہ دلائی جائے۔

(د) درگاہ کے دو میل کے فاصلے پر جانب مغرب محمد کبیرؒ کی زیارت گاہ ہے آپ حضرت خواجہ صاحب کے جاروب کش تھے آپ کا زمانہ ۸۰۷ھ کا ہے۔

(ہ) درگاہ کے جانب جنوب ایک فرلانگ کے فاصلے پر "ندی لینڈی" ہے اس ندی میں ایک چھوٹا سا کنواں بھی ہے۔ اس کنوئیں میں سے حضرت قاضی الاولیاؒ کے مزار مبارک تک سرنگ چلی گئی ہے اب زمانے کے انقلاب کی وجہ سے یہ کنواں مفقود ہوچکا ہے اور ممکن ہے آیندہ آنے والی نسلوں کو یہ یاد بھی نہ رہے گا کہ یہاں کنواں تھا۔

(و) درگاہ کی جانب شمال تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر حضرت پیر کوچکؒ تشریف رکھتے ہیں۔ آپ حضرت قاضی الاولیاؒ کے ساتھ ہی تشریف لائے تھے۔

(ز) درگاہ شریف کے جانب مشرق کچھ فاصلے پر حضرت بوڑکے باوا" استراحت فرما ہیں آپ کا زمانہ ۱۲۹۲ھ کا ہے۔ اہل ہنود زیادہ عقیدت رکھتے ہیں آپ کی کرامت یہ ہے کہ ایک سال کیج کے جنگل میں چوہے بہت ہو گئے تھے کسانوں نے آپ کے مزار شریف کے نیچے سے پتھر اٹھایا اور اس پتھر کو جنگل لے ایک کوشٹ میں رکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چوہے جنگل سے نیست و نابود ہو گئے۔

(ح) درگاہ شریف کے چار فرلانگ کے فاصلہ پر جانب مشرق حضرت اسمٰعیل صاحبؒ کی مزار شریف ہے آپ کا زمانہ بھی ۱۲۰۰ھ کا ہے۔ آپ اپنے ساتھ ہمیشہ طوطے مرغیاں بلی اور کتے رکھتے تھے اور سب کو ایک ہی برتن میں کھلاتے تھے۔ اب بھی ایک بزرگ مجذوب سالک زندہ ہیں آپ کا کام یہ ہے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھیں اور بعد فراغت نماز کتوں کو لے کر پھریں اور ان کو روٹی کھلائیں کتوں کی خدمت میں ان کا دن گزر جاتا ہے

ایک دن مجھے حضرت نے اپنے رومال میں سے ایک جواری کا سوکھا پیپڑ نکال کر کہا کہ فوراً کھالو۔ میں نے لیا اور فوراً کھالیا۔ اس پیپڑ میں اس بلا کی حلاوت تھی کہ ابھی تک میری زبان پر اس کا چسکا ہے۔

(ط) درگاہ شریف کی جانب مغرب ایک فرلانگ کے فاصلے پر عیدگاہ بنی ہوئی ہے۔ تقریباً اس عیدگاہ کو بن کر تین سو سال ہو چکے ہیں۔ یہ عیدگاہ میں سمجھتا ہوں کہ صوبہ اورنگ آباد میں بے نظیر ہے۔ کسی اور مقام پر مجھے ایسی عیدگاہ نظر نہیں آئی عیدگاہ کے پاس ہی ایک زبردست میدان واقع ہے جو کہ تفریح کے لیے نہایت ہی پرفضا ہے۔ اگر حکومت پبلک کی تفریح کی خاطر پارک بنائے تو یہ پارک اپنی نظیر آپ ہوگا۔ لیکن یہ زمین انعامی اور بنجر ہے حکومت اس کا معاوضہ دے کر پارک بنا سکتی ہے۔ یہاں ایک پتھر کنواں کا بنا ہوا ہے تقریباً ڈیڑھ سو سال کا ہے یہاں کی شے کوئی مشہور تو نہیں البتہ آم مشہور ہیں۔ ضلع بیڑ میں تین مقام ایسے ہیں جہاں آم کے درخت بکثرت ہیں پہلا مقام تو تیک نور ہے جو تعلقہ بیڑ میں واقع ہے۔ سنا جاتا ہے کہ یہاں ایک لاکھ آم کے درخت ہیں۔ دوسرا مقام سائیگاؤں جاگیر تعلقہ مومن آباد میں ہے یہاں بھی آم بکثرت ہیں اور تیسرا نمبر اسی مقام کا ہے۔ یہ تینوں مقام علی الترتیب یکے بعد دیگرے آم میں مشہور ہیں۔ موسم میں آم فیصد ایک آنہ دو آنہ فروخت ہوتے ہیں۔ یہاں ایک عام کا درخت مشہور ہے جس کا نام "کھجوری" ہے یہ درخت غالباً دو سو سال کا ہے۔ ندی کے کنارے ہے بہت سا حصہ تو گر گیا ہے۔ اب صرف تھوڑا باقی ہے میرے والد صاحب قبلہ یہ آم ایکسال ناندیڑ لے آئے (کیونکہ ہم اس وقت ناندیڑ میں مقیم تھے) تو ناندیڑ کے قاضی مولوی غلام نبی صاحب نے (جو میرے پھوپی زاد بھائی ہوتے ہیں) جناب منظور جنگ بہادر اول تعلقدار ناندیڑ کو تحفتاً آم دیا۔ صاحب معزنے کھانے کے بعد یہ فرمایا کہ "قاضی صاحب میں نے عسہ روپے فی صد کے آم کھائے لیکن حقیقت ہے کہ یہ آم ان آموں سے بدرجہا بہتر ہیں، جب صاحب موصوف عادل آباد تشریف لے گئے تو دوسرے سال پھر وہاں سے طلب فرمایا لیکن آم نہ آنے کی وجہ سے روانہ نہ کئے جا سکے واقعی یہ آم بے انتہا لذیذ ہیں۔ بہت سوں نے اس کا تخم لگایا پھل آئے۔ نمونہ وہی رنگ وہی لیکن کھانے میں وہ مزہ نہ رہا ممکن ہے کہ زمین کی تاثیر ہو۔

ابو الفیض قاضی سراج الدین احمد منیر کیجی

دہلی

تضمین بر غزل اُستادی فصیح الملک حضرت داغؔ دہلوی مرحوم و مغفور

اے فصیح الفصحا، اے ہمہ دانِ دہلی ۔۔ شاعرِ نغز بیاں عظمت و شانِ دہلی
خالقِ شعر و ادب روحِ روانِ دہلی ۔۔ بلبلِ گلکدۂ خلد فشانِ دہلی
آج روتے ہیں تجھے پیر و جوانِ دہلی ۔۔ ڈھونڈتی ہے تجھے چشمِ نگرانِ دہلی
سچ کہا تو نے یہ اے مرثیہ خوانِ دہلی ۔۔ "یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی
تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی"

لکھنؤ پہونچا جو کوئی شیوہ بیانِ دہلی ۔۔ ہوگئی رنگوں میں کچھ گرم فغانِ دہلی
بٹ گئی چار طرف جنسِ گرانِ دہلی ۔۔ رہ گیا نام ہی دہلی کا ازآنِ دہلی
منتشر ہو گئے سب نام ورانِ دہلی ۔۔ بن گئے وقت کے بیٹے پدرانِ دہلی
الغرض ہو گیا تاراج جہانِ دہلی ۔۔ "لے گئے لوٹ کے سب شوکت و شانِ دہلی
پوربی پہلے اڑاتے تھے زبانِ دہلی"

اب کہاں ہے وہ جو دہلی کی تھی پہلے صورت ۔۔ نہ وہ شعریت پیشیں نہ وہ رومانیت
نہ وہ رنگینیٔ خلوت نہ شکوہِ جلوت ۔۔ نہ وہ محفل نہ وہ ساقی، نہ وہ دورِ عشرت
دلّی والوں کی تھی دنیا سے الگ اک نہفت ۔۔ نئے ایوانوں میں رہنے کی ہے انکو عادت
جنتِ کہنہ میں ممکن ہی نہیں ان کی کھپت ۔۔ "دلّی والوں کے لئے تازہ بنے گی جنت
لے گئے سر پہ ملک تحفۂ مکانِ دہلی"

باغِ دہلی میں جب اقبال کی تھی فصلِ بہار ۔۔ غنچۂ گل میں تھا مہتاب و ثریا کا وقار
ہر مکاں خلد تھا، ہر ایک گلی تھی گلزار ۔۔ خاک کے ذرّوں سے تھی بارشِ رنگ و انوار
برگ اور بار میں کیا کیا تھے نمو کے آثار ۔۔ قطرے قطرے میں تھی جولانیٔ ابرِ کہسار
ہائے وہ دن کہ نہ تھا سر فگنی سے سرو کا ۔۔ "رشکِ شمشاد تھا ہر خوش قد و ہر خوش اطوار
سروِ آزاد تھا، ہر ایک جوانِ دہلی"

وہ مکاں جن کے دریچے بھی تھے حوروں کے عذار ۔۔ اور وہ بام، وہ در، جلوہ بکف ضو بکنار
گوہر و لعل و جواہر کا وہ ہر سو انبار ۔۔ جگمگایا ہوا ماحول، فضائیں بیدار
نظر افروز لبِ نہر چراغانِ بہار ۔۔ صاف شفاف وہ سڑکیں وہ درختوں کی قطار
قاف در قاف تھا آئینہ ہر راہ گذار ۔۔ "عارضِ صاف تھا، ہر ایک مصفّا بازار
چشم پُر جلوہ تھی ہر ایک دکانِ دہلی"

آئے دہلی کی طرف زندہ دلانِ پنجاب — سمت آیا اسی گوشے میں جہانِ پنجاب
مہ رخ و ماہ جبیں ماہ وشانِ پنجاب — جانِ پنجاب ہی کچھ آئی بجانِ پنجاب
کوئی شاعر کوئی مردِ ہمہ دانِ پنجاب — کہیں صنّاع کہیں نغمہ گرانِ پنجاب
گرمیٔ بزم تھے آتش نفسانِ پنجاب — "گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رخانِ پنجاب
گل کھلائے ہیں نئے تو نے خزانِ دہلی"

ہمیں دہلی کی سنانی ہے وہ روداد شباب — اور پھر قصۂ افسردگیٔ دورِ خراب
پیہم تغیر کے بتانے ہیں ہمیں کچھ اسباب — سازِ بشکستہ کو لانا ہے قریبِ مضراب
وہ سرافرازی و سطوت کا چمکتا ہوا خواب — وہ نظارے کا فریب اور نگاہوں کا سراب
پھر اس اندھیر کا فطرت سے بھی لینا ہے جواب — "اس سے بڑھ کر کوئی محشر میں نہیں طولِ حساب
بس یہی ہو گا کہ ہم اور بیانِ دہلی"

جامع مسجد دہلی ہے بہت رفعت مند — اس کے ہونے سے ہوا ذوقِ عبادت دوچند
خلد میں روح رہے شاہجہاں کی خورسند — کیا عمارت ہے دل افروز دل آرا دلبند
انقلاباتِ جہاں سے اسے پہونچے نہ گزند — یہ دعا عرش پہ اللہ کو بھی ہو گی پسند
رفعتِ مسجدِ اقصیٰ سے ہو اس کا پیوند! — "یا خدا مسجدِ جامع کا رہے نام بلند
کعبے والے کہیں وہ آئی اذانِ دہلی"

یاد دہلی کی وہ مرحوم فضا آتی ہے — یاد کیا آتی ہے ماضی کی بلا آتی ہے
جھومتی اور گرجتی جو گھٹا آتی ہے — نوحہ زن نوحہ گر و نوحہ سرا آتی ہے
خون میں ڈوبی ہوئی موج ہوا آتی ہے — بوئے بربادیٔ خاکِ شہدا آتی ہے
نہ فقط خاک سے آوازِ بکا آتی ہے — "آسماں پر سے بھی نوحے کی صدا آتی ہے
کیا فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی"

ہے ادب فطرتِ دہلی میں ازل سے پنہاں — کبھی خالی نہ رہا اہلِ ادب سے یہ مکاں
نیّر و غالب و آزردہ گئے سوئے جناں — سائل و بیخود و شاعر تو ہیں موجود یہاں
نام لیوا ابھی ترے آج ہیں مشہورِ جہاں — وہی دہلی کی فصاحت وہی دہلی کی زباں
بہ ادب عرض کروں گا کہ غلط تھا یہ گماں — "نیّر و غالب و آزردہ سے پھر لوگ کہاں
داغ اب ہیں یہ غنیمت ہمہ دانِ دہلی"

سیماب اکبرآبادی

———— ❊ ————

میں نے بھی محبت کی

اگر محبت اسی کا نام ہے تو کہہ سکتا ہوں کہ میں نے بھی محبت کی، لیکن کس سے؟ اس سے جس کے سامنے اظہارِ محبت تو کجا، محبت کی نظر سے بھی، اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اسے میں نے ہزاروں میں انتخاب کیا تھا۔ اور جب اُسے دیکھا بھی نہ تھا، اس کی ترنم ریز آواز کے ساتھ محبت کرتا تھا۔ وہ جاں بخش صدا، نہ میں نے چنگ ورباب میں سنی اور نہ انسانوں اور طیور میں۔ اس کا پہلا ہی لفظ جو میرے کانوں میں پڑا، دل کے راستے سے گزر کر میری روح کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ اس آواز کو میں "محبوبانہ آواز" کہتا ہوں کیونکہ اس کے تجزیہ کے لئے الفاظ نہیں ملتے۔ جب سے وہ صدا میرے من میں بسی ہر صدا کا معیار بن گئی۔ جو آواز بھی میں سنتا، اس کا اپنے کانوں میں رچی ہوئی آواز سے غیر شعوری طور پر مقابلہ کرتا۔ لیکن وہ صدا اسی لب و دہن کے ساتھ مخصوص تھی۔

جب میں نے اسے پہلی دفعہ دیکھا، کچھ دیکھا کچھ نہ دیکھا، لیکن ایسا معلوم ہوا کہ یہ قد اور یہ نقشہ ازل سے میرے دل میں بسا ہوا ہے۔ اسی کو میری روح تلاش کر رہی تھی، لیکن مجھے معلوم نہ تھا۔ جب ایک بار اسے پالیا، تو پھر سے کھو کیسے سکتا تھا۔ وہی میرے دل کا مکین، اور زندگی کا سہارا ہو گیا۔ اپنا خیال میں اس کے بغیر کر نہیں سکتا تھا۔

اب میرے لئے اپنے آپ کو گم کرنا آسان ہو گیا تھا، چنانچہ میں نے یہی کیا اور اسی کی آنکھوں سے دیکھنے اور اسی کی زبان سے کہنے لگا لیکن اس کا بھی مجھے علم نہ ہوا۔ میں سمجھتا تھا کہ میں ہی دیکھ رہا ہوں، میں ہی بول رہا ہوں۔

میں اکثر اس کے سامنے حاضر ہوتا۔ اور جب تک وہاں ہوتا، مکان اور زمان کی قیدوں سے آزاد رہتا۔ اور جب جدائی کی گھڑی آتی اسے ہزار کوششوں سے ٹالتا۔ لیکن جب خود وہاں سے جانے کا حکم ملتا، تو چپکے سے اٹھ کر چلا جاتا۔ کہاں جاتا؟ یہ میں نہیں جانتا۔ جی تو چاہتا کہ کسی دور دراز مقام پر چلا جاؤں۔ کبھی نہ لوٹنے کے لئے۔ راستہ کے برابر ہو جاؤں۔ لیکن یہ بھی میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں ایک کل کا پُرزہ تھا۔ اسی کے چکر میں گھومتا رہتا۔ میری مرضی یا ارادے کو اس میں کچھ دخل نہ تھا۔

می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

اس حسنِ معصوم نے، جب سے میرے دل میں گھر کیا، میری روح کو بیدار سا کر دیا۔ اور سب سے پہلے محبت کے معنی مجھے سمجھائے۔ "محبت وہیں ہوتی ہے جہاں جسمانی وصل کی گنجایش نہ ہو"۔ پھر کائنات کے راز بھی کچھ کچھ کھلنے لگے۔ میرا جسم اور دماغ معطل سا ہو گیا تھا، لیکن روح کو سیر بیں حاصل تھیں۔

اس حسنِ غیور کی میں چپکے چپکے پرستش کرتا رہا۔

پنہاں رکھا ہوں درد کو لوہو کے گھونٹ پی ۔ کہتا نہیں کسی سے کہ بستار ہونگا

حضوری سے میں اکثر شاد کام رہتا، لیکن لبِ اظہار بند تھے۔ اور میں کچھ ایسا قانع بہ ہیچ بھی ہو گیا تھا کہ اس کی ضرورت بھی کم محسوس کرتا۔ برہمن بت کی پوجا کرتا ہے۔ لیکن کبھی یہ جتانے کا خیال اس کے دل میں نہیں آتا کہ میں ایسا کرتا ہوں۔ کچھ ایسا ہی حال میرا بھی تھا۔ یہ نہیں کہ میں اس کے اظہار سے معذور تھا، بلکہ یہ کہ اس کا اظہار کرنا، میں اپنے جذبۂ پرستش کی توہین سمجھتا تھا۔ اس نے مجھے موقعے بھی عطا کئے، لیکن میں اپنے حقیر تحفے کو اس کی نذر کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔

اس محبت نے مجھے سب کچھ دے دیا۔ درد کی کسک، آنکھوں کی نمی، دل کی دھڑکن اور اس کے معاوضے میں مجھے اپنے آپ سے لے لیا۔ یہ سودا مجھے بہت سستا معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ مجھے اس کا ڈر تھا کہ اس خاموش پرستش میں بھی کوئی رقیب نہ پیدا ہو جائے۔ میں جانتا ہوں کہ اس میں خود غرضی کی بو آتی ہے، لیکن اس خود غرضی سے میں ابھی تک

باہر نہیں ہوا تھا۔ غالباً یہی رشک ہے کہ جب میں اسے دوسروں پر نظر عنایت کرتے دیکھتا، تو اپنے آپ کو بڑا بے کس محسوس کرتا۔

اس کے سراپا کا میں کیا حال بیان کر سکوں گا۔ اس قامتِ رعنا کو اگر سرو کہوں تو ظاہر ہے کہ یہ محض شاعری ہوگی۔ سرو میں وہ خوبی کہاں۔ اس کی چشمِ فتاں کو نرگسِ بیمار سے تشبیہ دینا عبث ہے۔ نرگس بے نور ہے اور پھر اس میں وہ خمار آلودہ پن، وہ نیند کا متوالا انداز کہاں ہے، جس کے اثر سے میری روح میں بجلیاں دوڑنے لگتی ہیں۔ اس کی چال کو کبک دری کی چال کہنے سے مجھے شرم آتی ہے ہاں میر تقی میر کو اسی طرح کی کوئی جھلک نظر آگئی تھی، جس پر یہ برجستہ شعر کہہ گئے۔

ان گل رخوں کے قامت لہکے ہیں یوں ہوا میں
جس رنگ سے لچکتی پھولوں کی ڈالیاں ہیں

اس قامت کشیدہ اور اس چال کے ساتھ، اس کا زمین پر قدم رکھنا مجھے ناگوار تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کا جو قدم اٹھے میرے سر میری آنکھوں پر ہو۔

عرصہ کی خاموش پرستش کی آبرو، کمبخت دل نے ایک دم کھو دی۔ اس کے شانوں کو چھو لیا، اس کے لبِ لعلین کو مس کر دیا، اس کی زلفوں کو سنوار دیا۔ وہ مجھ سے خفا سا ہو گیا۔ اس غم سے مجھے آج تک نجات نہ مل سکی۔

یہ راز کہ اس کو بھی مجھ سے محبت تھی یا نہیں، میں نے کبھی حل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ کافی تھا کہ ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ وہ میری روح کی گہرائیوں میں بسا ہوا تھا اور میں بھی اس کے دل کے گوشے میں پڑا ہوا ضرور تھا۔ اس کے دل میں میری قدر کا جذبہ بھی تھا، ممکن ہے اس میں محبت کا شائبہ بھی ہو، یا نہ ہو۔ "عشق اول در دلِ معشوق" کی حقیقت ابھی مجھ پر منکشف نہیں ہوئی تھی۔ لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ میری پرستش اگر اس کے دل کے گوشے میں، ذرا سا بھی لگاؤ نہ پیدا کر سکی، تو یہ میرے جذبۂ ناتمام کا قصور ہے۔ اس پر میں جس قدر بھی جلوں کم۔ لیکن اس کے نازک اور پاکباز دل کو میں جذبات سے اس قدر عاری نہیں سمجھتا!۔

اس کے دل معصوم کی میں اسی قدر کرتا تھا کہ اپنی محبت کا فسوں پڑھ کر، اسے کانٹوں میں گھسیٹنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اسے اسی طرح چاہنا چاہتا تھا جس طرح وہ تھا۔ اور یہی میری حیات کا مقصد نظر آتا تھا۔ خدا سے دعا تھی کہ اسے طرازِ دوام عطا کرے۔

عبدالقادر سروری

سائنس کے کرشمے

نگار (مارچ سنہ ۴۰ء) کی رائے

اس کتاب میں سائنس کے بعض ایسے مسائل کے متعلق دلچسپ و مفید معلومات یکجا کر دی گئی ہیں، جن کا جاننا، ہر شخص کے لئے ضروری ہے، مثلاً ہوا، پانی، بجلی، طیران وغیرہ۔ یہ مقالات سب ماہرینِ فن کے لکھے ہوئے ہیں اور زبان و اسلوب بیان کے لحاظ سے بہت سہل و سادہ ہیں، ابتدا میں ڈاکٹر زور کا دیباچہ ہے اور اس کے بعد میر حسن ایم اے کا مقدمہ جو اس مجموعہ کے مرتب ہیں، یہ کتاب اس قابل ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو درساً درساً پڑھائی جائے۔

ساقی (مارچ سنہ ۱۹۴۰ء) کی رائے

یہ سب مضامین لائق پروفیسروں کے لکھے ہوئے ہیں اور عام معلومات کے لئے ان کا مطالعہ ضروری اور بہت مفید ثابت ہوگا۔ زبان آسان اور پیرایۂ بیان عام فہم ہے۔ ایسی علمی کتابوں کی ہماری زبان میں کمی ہے امید ہے کہ اس سلسلے کی اور کتابیں شائع کر کے ادارہ ادبیاتِ اردو اپنے لئے امتیاز خاص کرے گا۔

اَن دیکھی دیوی کے گیت

دیوی۔ گونج تیرے گیتوں کی من میں یوں لہراتی ہے
جیسے پاک پوتّر ندی بن میں بہتی جاتی ہے

دیوی تیرے گیت ہیں جیسے مندر میں لوبان جلے
یا اس دل کا دھواں ہے جس پر گیان کا اگنی بان چلے

دیوی تیرے گیت ہماری اس دنیا کی گیت نہیں
یہ تو کوئی اور لگن ہے کام لوبھ کی پریت نہیں

تیری آنکھیں جل مندر ہیں تیرے آنسو موتی ہیں
اس مندر میں پریم کی پریاں چندر ہار پروتی ہیں

حفیظ جالندھری

غزل

مستی بھری نگاہ کا ساغر پلا کے دیکھ
پھر میکشوں کے ظرف کو تو آزما کے دیکھ

دنیا کو انتظار ہے پھر انقلاب کا
محشر خرامیوں سے قیامت اٹھا کے دیکھ

اے دوست پھر تبسم رنگیں کا واسطہ!
میرے جہانِ ہوش کو رنگیں بنا کے دیکھ

کلیاں مری امید کی بن جائیں کاش اپھول
اے جانِ نو بہار مجھے مسکرا کے دیکھ

زاہد ہماری رندی و مستی پہ تو نہ جا
گر ہو سکے تو زہد کا پردا اُٹھا کے دیکھ

کھلتا ہے کس طرح سے نیا پھول باغ میں
اک تیر ناز اور جگر پر چلا کے دیکھ

سرمایۂ بہار ہے زخم دل عظیم
اس گلستاں کو ایک نظر تو بھی آ کے دیکھ

عظیم (عثمانیہ)

گل بوٹے

حال ہی میں ہمیں اپنے ایک دوست کی عقد خوانی کی "خانگی" تقریب میں شرکت کی عزت حاصل ہوئی، "خانگی" اس لئے کہ اس میں صرف ایک درجن نوشہ کے عزیز و احباب شریک تھے، دوسری وجہ اس تقریب کے "خانگی" ہونے کی یہ تھی کہ دولہ میاں عقد کے بعد تناول ماحضر فرما کر دولہن کو اپنے پیچھے موٹر یا میانہ میں لئے برات کے ساتھ بہ بانڈ اور تاشہ کے ذریعہ اپنی عقد خوانی کا "اعلان" اور شان و شوکت کا مظاہرہ کرنے عوض دولہن کو اسی کے گھر میں اپنے خسر بزرگوار کی حفاظت اور ضمانت میں چھوڑ کر "بیرنگ" گھر لوٹنے والے تھے۔

شام کے کوئی پانچ بجے ہم سب معہ نوشہ میاں نخانۂ عروس پر نازل ہوئے، چونکہ تقریب "مخصوص" تھی اس لئے عقد کے بعد صرف "عصرانہ" ہونے والا تھا، کچھ تو ہماری "وقت کی پابند" گھر والیوں اور کچھ قاضی صاحب کے دیر سے آنے کی وجہ سے عقد خوانی میں "تھوڑی سی" دیر ہوگئی، یعنے ٹھیک ساڑھے نو بجے خطبۂ عقد ختم ہوا، اس کے بعد قاضی صاحب نے آدھے سے زیادہ چھوارے مصری بادام اپنے رومال میں باندھ لئے اور باقی کچھ کم آدھے نوشہ میاں سلمہٗ پر نچھاور کئے گئے، چونکہ سب کی آنتیں "قل ہو اللہ" کی تلاوت کر رہی تھیں اس لئے ہم سب لگے چھوارے مصری چبانے! بادام کا مغز نکالنا اس وقت "جوئے شیر" لانے سے کم نہ تھا!! کیونکہ بھوک کی شدت کی وجہ سے ہمارے دانتوں نے ان کو چبانے یا پھوڑنے سے صاف انکار کر دیا تھا!!

جب ایک نہایت "خوش رنگ" صاف ستھرا سرخ مدرسے کا "خوشبودار" "صورت" "غربالی" دسترخوان ہمارے سامنے تانا جانے لگا تو جان میں جان آئی اور ہم اپنے دوست کے خسر نامدار کی فیاضی اور دریا دلی کے قائل ہوگئے کہ باوجود "چار پانی" کے معاذ کے موصوف ہمیں روایتی "ماحضر" سے سرفراز فرمانا چاہتے ہیں، مگر ہماری ساری امیدوں کا خون ہوگیا اور ہم پر "یاس و حرمان" کا ہمالیہ ٹوٹ پڑا جب ہم نے دیکھا کہ دسترخوان پر "کافی" کی چھوٹی چھوٹی پیالیوں میں آدھی پیالی سے کچھ زیادہ چار کی "سرویس" شروع ہوگئی، چار کے ساتھ کوئی آدھا پونڈ نمکین بسکٹ، دو عدد موسمبی، دو عدد سنترے اور پاؤ پونڈ کھٹے انگور ہم سب کے حصہ میں آئے سچ ہے!

"وہی ملتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے!!"

چار نوشی کے بعد ہم نے سمجھا کہ "دعوت عصرانہ" ختم ہوگئی مگر "الداعی" نے موسم کی سختی کا خیال کرکے دوسری فیاضی یہ کی کہ ہم سب کو آئسکریم سے بھی "سیراب" فرمایا، اگرچہ کہ "عصرانہ" کا وقت گزر جانے کی وجہ سے آئسکریم مارے شرم کے پانی پانی ہو رہی تھی پھر بھی ہم نے کچھ کم ایک اونس برف زدہ خالص شربتِ دودھ نوش جان کیا، آئسکریم کھانے یا پینے کے بعد "کولڈ ڈرنک" کی خواہش بیدار ہوئی، جب پینے کو کچھ مانگا تو نہایت صاف و شفاف عثمان ساگر کا "آب خالص" جو شرمندۂ برف نہ ہوا تھا مرحمت ہوا، خالص دودھ اور اس پر خالص پانی پی کر ہم نوشہ میاں سلمہٗ اور ان کے "دریا دل" خسر بزرگوار کا، جو اپنے داماد سے شرما کر سامنے نہیں آرہے تھے، شکریہ ادا کر کے ٹھنڈے ٹھنڈے رات کوئی گیارہ بجے بخیر و خوبی گھر لوٹے!!

ایک دن صبح سویرے ہم ٹہلنے کے لئے جا رہے تھے، دروازے کے بیچوں بیچ ایک مرد معقول سے آمنا سامنا ہوا، دیکھتے ہی انھوں نے بڑے ادب سے جھک کر کوئی ایک درجن چھوٹے چھوٹے سلام کئے اور ایک کاغذ پیش کیا۔

"یہ کیا ہے"؟ ہم نے پوچھا

"حضور للہ اس کاغذ کو ملاحظہ فرمائیں! یہ فدوی کی عرضی ہے!!"

ہم نے لے کر دیکھا تو بہت ہی صاف خط میں لکھا تھا "اردو عملی پرچو ہمارے باغ میں حال ہی میں خالی ہوئی ہے عرضی گزار کو مامور کیا جائے۔

"یہ درخواست تمھیں کس نے لکھ دی"؟ ہم نے دریافت کیا۔

"غریب پرور! خانہ زاد ہی نے لکھی ہے"!! بڑے ادب سے جواب دیا

"بھئی زبان تو تمھاری بہت صاف ہے مگر کاغذ کو "قاغذ" کیوں بولتے ہو"؟

"خدا حضور کو سلامت رکھے! فدوی کے پڑوس ایک پروفیسر رہتے ہیں وہ "قاغذ" ہی فرمایا کرتے ہیں۔ اسلئے غلام بھی "قاغذ" بولا کرتا ہے"!!

ہم نے کہا "نہیں جی! بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے!! کوئی پروفیسر کاغذ کو "قاغذ" کبھی نہیں بول سکتا"!!!

"حضور کے سرِ اقدس کی قسم! فدوی "صبوں صبوں" جھوٹ نہ بولے گا!! اگر یہ غلط ثابت ہو تو حضور اپنے "چپڑاسی" سے دھکے دلوا کر خانہ زاد کو نکلوا دیں۔"

"یہ "صبوں" کیا بلا ہے"؟ ہم نے پوچھا

"غریب پرور یہ بھی فدوی نے پروفیسر صاحب ہی سے سنا ہے زمانہ کے ساتھ زبان بھی بدل رہی ہے حضور! جب دہلی کے ریڈیو والے "ڈکبنی کشتی"۔ "وزیر بچاؤ"۔ "بھمی فرنٹ" وغیرہ وغیرہ بول سکتے ہیں تو ایک اہلِ زبان اور وہ بھی اردو کا پروفیسر! کاغذ کو "قاغذ" صبح کو "صبوں" اور چپڑاسی کو "چپڑاسی" اگر بولے تو کیا برائی ہے سرکار"!!

باغباں

ایک غریب جذامی سے!

بتا اے جذامی دکھاتا ہے کیوں دل ... جہاں سب ہی اندھے ہوں رونے سے حاصل
یہ مانا کہ دنیا نہیں تیری دنیا ... امیروں کی دنیا رئیسوں کی دنیا
یہ مانا کہ ہے تو ہی قسمت کا ہیٹا ... بنا یا گیا ایک مفلس کا بیٹا
بجا ہے کہ راحت نہیں تیری ساتھی ... یہ سچ ہے کہ خوشیاں نہیں تیری باقی

یہ سب کچھ سہی پھر بھی سب کچھ ہے بجا
بہرحال سہنا ہے سہنا پڑے گا

کہوں کیا کہ دنیا کے یہ رہنے والے ... برائی کے دریا میں یہ بہنے والے
یہ آدم کی بیدرد اولادِ انساں ... خدائی کے مالک یہ مغرور شیطاں
یہ مارِ سیہ یعنے سرمایہ والے ... ضمیروں کے گندے گناہوں کے پالے
تجھے اک نظر بھی نہ دیکھیں گے اصلا ... تری لاش کو تک نہ پھینکیں گے حاشا

کہ ڈر ہے انھیں لگ نہ جائے مرض یہ
نہ عیاشیوں سے چھڑائے مرض یہ

بھلا دے بھلا دے تو سب کو بھلا دے ... تجھے رب نے بھولا تو رب کو بھلا دے

تری خونچکاں زندگانی ہے سب کچھ
تری دکھ بھری یہ کہانی ہے سب کچھ

سلیمان اریب

بلند فطرتوں سے!

سو رنگ سے دل کے افسانے غیروں کو سنائے جاتے ہیں
جب اپنی ادائے خودبیں کو دنیا سے چھپانا ہوتا ہے
اے ظلمتِ دل کے دیوانو! تم نے بھی کبھی یہ سوچا ہے
معلوم نہیں جب اوروں کی رفعت کا انھیں احساس نہیں
احساس اگر ہے دیکھ تو لیں وہ خود بھی اپنی ظلمت کو
کس رنگ کے ہیں انوارِ ازل اے کاش انھیں معلوم تو ہو
اک حوصلہ و گرمیِ سفر جب اپنی فطرت ہی میں نہیں
ہنگامہ پسندی تھم تھم کر تاثیر مٹائے دیتی ہے
اک کھیل نیا سوجھا ہے انھیں تا دور ہو اپنی بے رنگی
اے حاملِ دردِ علم و عمل اے زخمیِ تیرِ عقل و نظر
کہہ دے کوئی ان سے اہلِ نظر رکھتے ہیں نگاہیں اونچی ہی

پھر اپنی نگاہِ الفت کے حق ہم پہ جتائے جاتے ہیں
بےباک نگاہیں رکتی ہیں پردے سے گرائے جاتے ہیں
کس طرح محبت والوں کے اسرار چھپائے جاتے ہیں؟
کس واسطے اپنی رفعت کے افسانے بنائے جاتے ہیں
کیوں بزمِ حریفاں میں اگر وہ شمع جلائے جاتے ہیں؟
جو خاک کی گندی بستی کے نغمات سنائے جاتے ہیں
کیوں بے خطر چلنے والوں کے قدموں پہ گرائے جاتے ہیں
وہ سمجھے ہوئے ہیں دنیا پر ہم رنگ جمائے جاتے ہیں
آتی ہے ہنسی کج بحثوں پر جو بات بنائے جاتے ہیں
اس بزم سے اٹھ ہر وقت جہاں فتنے ہی جگائے جاتے ہیں
جو ذوقِ یقیں کم رکھتے ہیں سر اپنا جھکائے جاتے ہیں

باقی (عثمانیہ)

محبت کی چھاؤں (نگار لکھنؤ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کی رائے)

مرزا ظفر الحسن بی اے کے بارہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے مرزا صاحب حیدرآباد کے نوجوان ادیبوں میں سے ہیں اور ایک خاص انداز تحریر کے مالک ہیں" ہلکا پھلکا مزاح اور صاف صاف تنقید" یہ ہے اصل روح ان افسانوں کی جو بیک وقت دلچسپ بھی ہیں اور مفید بھی
ان افسانوں کی تحریر کی غایت جو کچھ ہو لیکن چونکہ ان کا تعلق عہد حاضر کی معاشرت سے ہے اس لئے ہمارے لئے ان میں سامان تفریح ضرور موجود ہے۔

مغربی تصانیف کے اردو تراجم (نگار مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کی رائے)

میر حسن ایم اے کی تالیف ہے اور بڑے کام کی چیز ہے اس میں انھوں نے سنہ ۱۸۰۱ء سے لے کر اس وقت تک جتنے تراجم مغربی تصانیف کے اردو میں ہوئے ہیں، ان سب کی مکمل فہرست پیش کر دی ہے، اس موضوع پر اس وقت تک کوئی کتاب موجود نہ تھی۔

"باتیں!"

"تم نے تو ہمارے یہاں آنا ہی چھوڑ دیا!"

"آؤں تو کس لئے؟"

"پہلے کیوں آتے تھے؟"

"آپ کی خاطر"

"تو میں تو اب بھی زندہ ہوں"

"لیکن آپ کی دوشیزگی جو فنا ہو چکی"

"تو کیا تمھیں میرے کنوار پن سے محبت تھی؟"

"شاید"

"پھر وہ بے غرض محبت کیا ہوئی؟"

"بے غرض تو دنیا میں کوئی کام بھی نہیں ہوتا، یہاں تک کہ دنیا کا قیام بھی کسی غرض ہی سے وجود میں آیا ہوگا"

"وہ کیا؟"

"ہم دن کا کام ختم کر کے دماغی عیاشی چاہتے ہیں اور کچھ نہیں تو سینما میں بے جان تصویروں سے ہی دل بہلاتے ہیں ایسا ہی جب خدا فرشتوں کی صحبت اور ان کی یک رنگ پارسائی سے تنگ آ گیا تو اس نے دنیا کا اسٹیج بنا دیا جہاں اس کی ادا آموزی میں ہر روز نت نئی تمثیلیں ہوتی ہیں اور کردار اس کی ہدایت سے کٹھ پتلیوں کی طرح ناچا کرتے ہیں"

"توبہ — تو کیا خدا بھی اک بازی گر ہے"

"ہاں اس میں کیا شک"

"تم تو مذہب سے بالکل دور ہو گئے سنا ہے اب تم نماز بھی نہیں پڑھتے"

"نماز کیوں پڑھوں۔ یہ تو اسی وقت ممکن تھا جب آپ نے میری نارسائی کا خیال کیا ہوتا اب — کہ آپ ہونٹوں کی عفت جسم کی عصمت کھو چکیں — پارسائی کا مطالبہ تو اچھا نہیں معلوم ہوتا!! اور ایسی نماز بھی کس کام کی کہ پڑھی جائے واسطے اللہ کے لیکن دماغ میں تصور ہو اس کے اک بندے کا۔ اس سے تو یہ اچھا کہ کبھی رات کے بے کراں سناٹے میں جب دوری کا خیال ستائے تو بے ساختہ خدا یاد آ جائے۔"

"اچھا۔ میں ذرا نماز پڑھ لوں"

"کوئی دعا میرے لئے بھی"

"یہ التجا کروں کہ اے خدا اک دیوانے کو عقل سلیم دے"

"آپ وہ، چلی گئیں جیسے دعائیں افق کے پار جاتی ہیں اب کوئی عقل سلیم لے کر ریگ زاروں میں خاک اڑاتا پھرے تو کیا!؟"

دیوانہ مصطفیٰ آبادی

تاریخ گولکنڈہ — حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبد المجید صاحب صدیقی ام اے۔ ال ال بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات، دکن کا تمدنی ارتقا، بادشاہوں، وزیروں کے حالات، اثرات، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایک اور کتاب "بہمنی کا تمدن" بھی عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آ جائے گی۔

تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔

بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت ؎ للعہ

لمحۂ رنگیں

(اپنے دوست مسٹر رام نارائن ماتھر کی شادی کے موقع پر)

کھلتی ہوئی کلیوں میں دل کی دھڑکن کو سمو کر لایا ہوں
مہتاب کی کرنوں میں ننھے تاروں کو پرو کر لایا ہوں

جاگی ہے بہاروں کی دنیا، دو پھول کنول سے کھلتے ہیں
اب ذوقِ جنوں کے ہاتھوں ہی سے چاکِ گریباں سلتے ہیں

سرشار نگاہوں سے اٹھا فطرت کے حسیں رخ سے آنچل
ہر سانس پیامِ مستی ہے، پیمانے لبوں سے ملتے ہیں

پھولوں کی جوانی میں بس کر مہکی ہوئی سانسیں گاتی ہیں
اس عالمِ شعر و جوانی میں ساغر کی کھنک بن جاتی ہیں

تکمیلِ تمنا چنتی ہے، بیدار امنگوں کی کلیاں
فردوسِ محبت کو چھو کر مستانہ ہوائیں آتی ہیں

میخانۂ ہستی کے ہنگامے، خود ہی ہو گم پینے میں
جاگے ہوئے ارمانوں نے لی بے تاب سی کروٹ سینے میں

برسات کے کافر موسم میں، جو درسِ سکوں بن جاتا ہے
اس کیفِ حیات آفروز کی لہریں بہتی ہیں اب جینے میں

اے دوست! تجھے یہ "لمحۂ رنگیں" ذوقِ محبت سکھلائے
اس جرعۂ مستی کا دھارا، ہر سانس سے تیری مل جائے

میکش

مکتوباتِ شاد عظیم آبادی

نگار (مارچ ۱۹۴۰ء) کی رائے

مجموعہ ہے شاد عظیم آبادی کے ان خطوط کا جو سید ہمایوں مرزا بیرسٹر اور ان کی بیگم کے نام لکھے گئے تھے، ان کی ابتدا شاد کی عمر کے پچاسویں سال سے ہوئی ہے، اس لئے ان میں وہ سب کچھ ہے جو ایک پختہ کار شاعر ادیب کے خطوط میں ہونا چاہئے، ان مکاتیب سے نہ صرف شاد کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے بلکہ بہت سے شاعرانہ نکات بھی سامنے آجاتے ہیں۔

ڈاکٹر زور کی یہ خدمت اردو ادب میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے کے قابل ہے۔

ساقی (مارچ ۱۹۴۰ء) کی رائے

ان خطوط میں دل کھول کر شاد مرحوم نے باتیں کی ہیں، بہت سی خانگی باتوں کا بھی ذکر ہے۔ - - - - - - - - - - -

یہ خط تیس سال کے عرصے پر محیط ہیں، آخری خط انتقال سے دو ہفتے پہلے کا ہے۔ پہلے خط سے لے کر آخری خط تک شاد کی دو بڑی آرزوئیں تقریباً ہر خط میں درج ہیں، حیدرآباد جانے کی آرزو اور اپنے استاد کی سوانح عمری کی تکمیل۔

ڈاکٹر زور نے ان خطوط کو مرتب کر کے چھاپا ہے، شاد کے متعلق ان میں بیش بہا معلومات یکجا ہیں اس لئے قابلِ قدر ہے۔

غزلیں

(دیارِ نبیؐ میں)

بَری ہو کے اندیشۂ بیش و کم سے
ہم آسان گزرے حدودِ حرم سے

سماں مسجدِ خیف کی برکتوں کا
بڑا خوب نظّارۂ جامِ جم سے

کریں گے وہ کیا لے کے عیشِ دو عالم
جو عشاق گرویدہ ہیں اُن کے غم سے

عطا پاش از بسکہ تھی رحمت ان کی
ولی بن کے چھُپے خطا کار ہم سے

ہمیں بھی ملے حسرت اے کاش حصّہ
درِ حضرتِ حق کے فیضِ اتم سے

۲

فنا ہے بقا مسلکِ عاشقی میں
اگر رو نما ہو دیارِ نبیؐ میں

کبھی دیکھ لو گے خود اپنی گلی میں
جو کچھ ہم ہیں ٹھانے ہوئے اپنے جی میں

خوشا ربطِ ناز و نیازِ محبت
کہ یہ جنگ میں ہے نہ ہے آشتی میں

ہمیں بھی ہے ناز اپنی جانبازیوں پر
جو وہ فرد ہیں شیوۂ دلبری میں

سفر جب نہ ہو پھر مدینہ سے حسرت
وہ کب آئیں گے دن تری زندگی میں

۳

بہ ملکِ تمنا بہ صد طرفہ کاری
ترا شوق کرتا رہے شہریاری

ترے در پہ عشاق اے شاہ خوباں
غلامانہ کرتے رہیں جاں نثاری

تری نذر کو لائے ہیں نقدِ جاں ہم
بہ صد عذر خواہی بصد شرمساری

ترے دور میں سخت مشکل ہے ساقی
کہ باقی رہے رسمِ پرہیزگاری

شرف رکھتی ہے بادشاہی پہ بے شک
مدینے کی حسرت غریب الدیاری

حسرت موہانی

(یہ مقالہ اردو کانفرنس میں پڑھا گیا تھا جو بصدارت نواب کمال یار جنگ بہادر بتاریخ ۲۳ جنوری ۱۹۴۲ء بلدۂ حیدرآباد میں منعقد کی گئی تھی)

صحافت اور اردو

انسان ایک حیوان ناطق ہے۔ بقائے حیات کے لئے اُس کا اولین فرض اپنی جان اور مال کی حفاظت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس فرض کی تکمیل کے لئے انسان میں تجسس کا مادہ بھی قدرت نے ایسا ودیعت کیا ہے کہ خطرات سے بچنے کے لئے وہ ہمیشہ اپنوں اور غیروں کے حالات اور واقعات معلوم کرنے کی فکر میں رہتا ہے اور اس کی یہ پیاس کبھی بجھتی نظر نہیں آتی۔ اسی تجسس کے باعث آدم کو بہشت چھوڑنا پڑا اور رفتہ رفتہ یہی چیز انسانی ترقی کا سنگِ بنیاد قرار پائی۔ تہذیب و تمدن کی طرف انسان کا ہر قدم دراصل اسی جذبۂ تجسس کے تحت اٹھتا گیا۔ اور آج بھی دنیا کی ساری ترقی اسی تجسس کی رہینِ منت ہے۔ غرض انسانی فطرت کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اپنے اور اپنے گرد و پیش کے حالات سے باخبر رہے بلکہ انسانی دماغ کی ساخت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ کد و کاوش اور تجسس اس کی غذا ہے۔ یہیں سے دراصل اخبارات کی ابتدا ہوتی ہے۔

ابتدائی زمانہ میں جب صحافت موجودہ ترقی پذیر صورت میں نہیں تھی تو خبروں کی اشاعت کے مختلف طریقے تھے۔ عموماً مسافرین اور سیاح ایک شہر سے دوسرے شہر یا ایک ملک سے دوسرے ملک میں خبریں پہنچاتے رہتے تھے۔ بادشاہ کے پاس یا دارالخلافہ میں خبریں سرکاری ذرائع سے فراہم کی جاتی تھیں۔ حکومت کی جانب سے جو احکام صادر ہوتے تھے وہ اعلانات یا فرامین شاہی کے ذریعہ ملک کے طول و عرض میں مشتہر کئے جاتے تھے یا فوری خبریں پہنچانے کے لئے کبوتروں یا ہرکاروں سے کام لیا جاتا تھا۔

یوں دیکھا جائے تو صحافت مشرق کی پیداوار ہے جو مغرب کے ہاتھوں پروان چڑھی ہے۔ ڈیڑھ ہزار سال قبل دنیا کا پہلا اخبار چین سے نکلا جو (پیکن گزٹ) کے نام سے مشہور ہے۔ یہ آج کل کے اخبارات کی طرح نہیں تھا بلکہ اس کی حیثیت ایک سرکاری جریدہ کی تھی جس کا مقصد شاہی فرامین اور احکامات کی اشاعت تھا۔ یہی صحافت کی بنیاد ہے جس پر آج اتنی سربفلک عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ صحافت کی ابتدا کا سہرا چین کے سر ہے لیکن اس میں قابلِ ذکر ترقی ازمنہ وسطیٰ کے بعد شروع ہوئی۔ قسطنطنیہ کے ترکی قبضہ کے بعد وہاں کے عالموں کی جماعت سارے یورپ میں پھیل گئی جس نے تھوڑی مدت میں عیسائی ممالک سے جہالت کو دور کیا۔ اس زمانے میں جب یورپ اپنے عہدِ بربریت سے نکل کر تمدن کی طرف قدم بڑھا رہا تھا کہ طباعت نے جنم لیا۔ اس کا ایجاد ہونا تھا کہ توسیعِ علم کا ایک نیا باب کھل گیا اور صحافت جو طباعت کے بغیر ایک جسدِ بے روح تھی از سرِ نو زندہ ہو گئی۔ صحافت اور طباعت میں چولی دامن کا ساتھ ہے طباعت کے طریقوں میں تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ صحافت بھی ابتدائی منازل طے کرنے لگی۔ آج مشینری ہی پر اخبار کی کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہے۔

تمدنِ جدید کی بنیاد جمہوریت پر قائم ہے اور جمہوریت میں ہر شخص کو تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ ہر انفرادی رائے سے دراصل اس رائے عامہ کی تشکیل ہوتی ہے جس پر جمہوریت کی عالیشان عمارت کھڑی ہے۔ اس لحاظ سے رائے عامہ کے تشکیل کرنے کے لئے موجودہ زمانہ میں اخبارات سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ کسی ملک کی صحافت اس ملک کے

احساسات اور جذبات کی ترجمان اور وہاں کی سیاسی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی اور علمی حالت کی مظہر ہوتی ہے۔ صحافت کی ترقی پذیر صورت ہی پر ملک کی ترقیوں کا انحصار ہے۔ صحافت ایک جادو ہے جس کے بول میں خیر و شر کی بجلیاں روپوش ہیں۔ اس لئے اخبارات کا ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہنا ضروری ہے جو اخبار نویسی شوق یا روزگار کی خاطر اختیار نہیں کرتے بلکہ ان کے دل میں قومی خدمت کی تڑپ ہوتی ہے اور وہ اس پیشہ کو پیشہ کی خاطر نہیں بلکہ اس جذبہ خدمت گزاری کی خاطر قبول کرتے ہیں اور آخر وقت تک ان کے اس جوش میں فرق پیدا نہیں ہوتا ورنہ حق اور صداقت کی تائید میں جتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اتنا کسی دوسرے پیشہ میں کرنا نہیں پڑتا۔ لیکن ساتھ ہی جہاں انسان اپنے اس فرض سے گریز کرنا چاہے اور اپنے ضمیر کی آواز کا ساتھ دینا چھوڑ دے اس کے لیے زندگی اتنی ہی آسان بھی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اردو صحافت کے متعلق کچھ کہیں ہم مختصراً صحافت کے فرائض پر نظر ڈالیں گے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں گے کہ اس کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔

صحافت کا اولیں فرض خبروں کا جمع کرنا ان کو شائع کرنا اور ان پر رائے زنی کرنا ہے۔ اخبار در اصل ایک تاریخ ہے جو روزآنہ لکھی جاتی ہے۔ جس طرح تاریخ دنیا کے اہم واقعات بادشاہوں کے جنگ وجدل کے قصے اور ان کے کارناموں کا ذخیرہ ہوتی ہے اسی طرح اخبارات میں روزآنہ کے واقعات کی تفصیل درج ہوتی ہے۔ تاریخ اور اخبار میں فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر کی جگہ کتب خانوں کی الماریاں ہیں تو ثانی الذکر کا مقام پنساری کی دکان ہے۔

اے جے بلیر نے اخبار کے فرائض کی یوں توضیح کی ہے "ان کے کیا فرائض ہیں۔ میرے نزدیک لوگوں کو ایسے واقعات اور حالات سے واقف کرانا ہے کہ دنیا میں زمان و مکان اور ماحول کا فرق باقی نہ رہے جن کے بغیر انسان میں وسیع النظری پیدا نہیں ہوسکتی ایک روزآنہ کا اخبار پڑھنے والا بڑی حد تک دنیا کے اہم واقعات سے واقف رہتا ہے جو نہ صرف خود اس کے ملک میں واقع ہوتے ہیں بلکہ ساری دنیا میں اور رفتہ رفتہ وہ غیر ارادی طور پر یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ دنیا میں باوجود نسلی، جغرافی، سیاسی، سماجی، مذہبی و تعلیمی امتیازات کے مقاصد میں کتنی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ جو لوگ اخبار نہیں پڑھتے وہ وسیع النظر نہیں ہو سکتے۔ ان کی نظریں اپنے ماحول سے آگے نہیں جاتیں اس طرح اخبارات کو بڑی تعلیمی و تدریسی اہمیت حاصل ہے انسان کے خیالات میں ان سے وسعت پیدا ہوتی ہے اور مختلف قوموں میں یکجہتی پیدا کرنے میں یہ بڑے معاون ثابت ہوتے ہیں۔"

بہرصورت اخبار احتیاجاتِ انسانی کے رفع کرنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے اور اس سے تین مختلف فرائض متعلق کئے جاسکتے ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ اخبار کا ایک اور فرض یہ بھی ہے کہ وہ کاروبار کی ترقی کا بڑا ذریعہ ہے۔

حالات اور واقعات کی اشاعت کو اگر صحافت کا مقصد قرار دیا جائے تو دنیا میں اس کا وجود کسی نہ کسی شکل میں پایا جاتا ہے۔ مینار، کتبے، پتھر پر کندہ کی ہوئی عبارتیں اور اسی قسم کے بہت سے طریقے صحافت کے ابتدائی نقوش ہیں۔ ہندوستان میں اب تک یہ چیزیں ماضی کو بے نقاب کرتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں صحافت کی طرف پہلا قدم عہدِ مغلیہ کی واقعہ نویسی ہے۔

اس زمانے میں واقعہ نویس خصوصیت سے حکومت کے مختلف صوبوں میں مقرر کئے جاتے تھے تاکہ بادشاہ کو ان علاقوں کے واقعات اور حالات سے اطلاع دیتے رہیں اسی طرح عمائد سلطنت کے بھی اپنے واقعہ نویس ہوتے تھے۔ ان لوگوں کی بھیجی ہوئی خبریں عام معنوں میں مشتہر ہو جاتی تھیں۔ واقعہ نویس اپنی حد تک بہت آزاد تھے مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد واقعہ نویسی کو بھی زوال آگیا اور انگریزوں کے حکمراں ہونے تک ہندوستان میں صحافت سوئی ہوئی تھی۔

۱۷۸۰ء میں ہندوستان میں پہلا اخبار (بنگال گزٹ) جاری ہوا اس کے بعد انگریزوں کی کوشش سے اور بھی اخبار نکلے۔ ۱۸۱۶ء میں گنگادھر بٹاچار نے پہلا بنگالی اخبار جاری کیا۔ ۱۸۱۸ء میں سرام پور کے عیسائی مشنریوں نے (دگدرشن) نام کا ایک اخبار جاری کیا۔ جو انگریزوں اور بنگالی دو زبانوں میں شائع ہوتا تھا۔ دیسی زبانوں میں بنگالی نے سب سے پہلے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ ۱۸۳۵ء تک اخبار جاری کرنے میں حکومت کے قوانین کی وجہ سے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جب اس سال پریس کو آزادی حاصل ہوئی تو صحافت میں بھی ترقی ہونے لگی۔ اردو میں سب سے پہلا اخبار آزاد کے والد باقر حسین صاحب نے دہلی سے (اردو اخبار) کے نام سے ۱۸۳۶ء میں جاری کیا یہ ایک ادبی پرچہ تھا اس میں خبریں شایع نہیں ہوتی تھیں۔ غالب، مومن، ذوق اور دیگر شعراء کی طرحی غزلیں شایع ہوتی تھیں۔ ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رام نے لاہور سے (کوہ نور) جاری کیا جس نے بہت جلد مقبولیت حاصل کرلی۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا۔ اس کے بعد ہفتہ میں دو اور پھر تین بار شایع ہونے لگا۔ لیکن یہ زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکا۔ اور اس کی جگہ دوسرے اخباروں نے لے لی۔ منشی نولکشور جن کے اردو زبان پر بڑے احسانات ہیں اسی اخبار میں ملازم تھے۔ انھوں نے ۱۸۵۹ء میں (اودھ اخبار) جاری کیا۔ اس کی بیشتر خبریں انگریزی اخبارات سے ترجمہ کی جاتی تھیں۔ اس کا کوئی سیاسی مسلک نہیں تھا۔ اور ہمیشہ دامن بچاکر چلنے کا عادی تھا۔ پہلے یہ ہفتہ وار تھا اور اس کے بعد روزآنہ ہوگیا۔ اس کے بعد دوسرا قابل ذکر اخبار لاہور کا "اخبارِ عام" ہے جس کو پنڈت مکند رام نے جاری کیا جو پہلے کوہ نور میں ملازم تھے یہ حقیقی معنوں میں اخبار تھا۔ اس کی قیمت بھی بہت کم تھی۔ اور حکومت اور پبلک دونوں میں یہ مقبول تھا۔ یہ پہلا اخبار ہے جس نے لوگوں میں اخبار بینی کا شوق پیدا کیا۔

جس طرح اردو زبان کی ترقی اور اشاعت میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔ اسی طرح اردو صحافت کو آگے بڑھانے میں ہندوؤں نے مسلمانوں سے زیادہ کوشش کی۔ منشی ہرسکھ رام منشی، نولکشور، پنڈت رتن ناتھ سرشار اور پنڈت تربھوان ناتھ سپرو ہجر انیسویں صدی عیسوی کے اواخر کے ممتاز صحیفہ نگاروں میں ہیں۔ اس زمانہ میں سرسید کی شخصیت تمام صحیفہ نگاروں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے سرسید نے ۱۸۶۲ء میں لٹریری اور سائنٹیفک سوسائٹی کی بنا ڈالی جس کا ترجمان (علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ) تھا جس میں سرسید نے ہر موضوع پر سیاسی، سماجی، مذہبی، اخلاقی مضامین لکھے ۱۸۷۰ء میں سرسید نے تہذیب الاخلاق جاری کیا جس نے مسلمانوں میں بیداری کی روح پھونک دی اس کے مشہور مضمون نگار محسن الملک اور مولوی چراغ علی تھے۔ منشی سجاد حسین کا اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے جاری ہوا جو اردو کا پہلا فکاہیہ

اخبار ہے اور جس کے مزاحیہ نگاروں میں مرزا مچھو بیگ ستم ظریف سب سے زیادہ مشہور ہیں۔ اس پرچہ کی بڑی خصوصیت آزادیٔ تحریر تھی۔ اردو کا یہ پہلا اخبار ہے جو خبروں کے ساتھ ایک مستقل پالیسی کے تحت شایع ہوتا تھا۔ قومی تحریک اور ہندو مسلم اتحاد کا یہ حامی تھا اس کے ساتھ ہی مذہبی معاملات میں تنگ نظر تھا۔ اور بعض وقت مبتذل مذاق پر اتر آتا تھا۔ اس کے مضمون نگاروں میں اکبر الہ آبادی، احمد علی شوق، پنڈت تربھوان ناتھ سپرو ہجر، احمد علی کسمنڈوی، پنڈت جوالا پرشاد برق، نواب سید محمد آزاد خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

سنہ ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے ایک اور اخبار (ہندوستانی) کے نام سے جاری ہوا۔ یہ پہلا اخبار ہے جس میں سیاسی معاملات اور حالاتِ حاضرہ پر باقاعدہ تنقید و تبصرہ کیا جاتا تھا۔ اس کا معیار بھی بلند تھا۔ انیسوی صدی کے اواخر کی ایک اور بڑی ہستی جس کی زندگی اردو صحافت کے سنوارنے میں گذری ہے مولانا شرر کی ہے۔ ان کی صحافتی زندگی کی ابتدا پنڈت نولکشور کے اودھ اخبار کی نائب ادارت سے ہوتی ہے سنہ ۱۸۸۲ء میں انھوں نے لکھنؤ سے ایک ہفتہ وار اخبار (محشر) جاری کیا۔ سنہ ۱۸۸۷ء میں رسالہ "دلگداز" سنہ ۱۸۹۰ء میں "مہذب" ہفتہ وار سنہ ۱۹۰۰ء میں رسالہ "پردۂ عصمت" اور اس کے بعد رسالہ "اتحاد" اور "العرفان" ان کی ادارت میں شایع ہوئے۔ شرر نے ہر قسم کے موضوعات پر قلم اٹھایا۔ سیاسی، معاشرتی، مذہبی، اخلاقی، ادبی۔ اردو ادب کی شرر نے جو مختلف النوع خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ ادب اردو کا ایک زرین باب ہے۔

سنہ ۱۸۸۷ء میں لاہور سے (پیسہ اخبار) جاری ہوا جس کے ایڈیٹر اور مالک منشی محبوب عالم تھے۔ جنھوں نے اپنے اخبار کا چندہ کم رکھ کر اردو صحافت میں ایک انقلاب برپا کیا۔ اس میں کثرت سے اشتہارات شایع ہوتے تھے۔ تجارتی اور کاروباری نقطہ نظر سے یہ بہت کامیاب اخبار تھا۔ قدیم اردو صحافت کے تذکرہ کو ختم کرتے ہوئے ہم مختصراً ان شخصیتوں کا ذکر کریں گے جنھوں نے اردو صحافت کے ارتقاء میں مدد دی ہے۔ ان میں قابلِ ذکر محمد حسین آزاد ہیں جو کچھ دنوں اخبار (اتالیق پنجاب) کے نائب مدیر تھے۔ یہ ایک سرکاری اخبار تھا جس کے مدیر راے بہادر ماسٹر پیارے لعل آشوب تھے۔ دوسری قابلِ ذکر ہستی پروفیسر وحید الدین سلیم کی ہے جو سرسید کے ادبی معتمد تھے سرسید کی وفات کے بعد انھوں نے ایک رسالہ (معارف) کے نام سے جاری کیا اور علیگڈھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے یہ مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ سلیم نے اردو صحافت کی نمایاں خدمت مسلم گزٹ لکھنؤ کی ادارت کے زمانے میں انجام دی جب کہ کانپور کی مسجد کے قضیے کے وقت انتہائی بے باکی سے انھوں نے حکومت کی پالیسی پر اعتراضات کئے۔ جس کی وجہ سے انھیں ادارت سے سبکدوش بھی ہونا پڑا۔ بعد میں سلیم (اخبار زمیندار) کے چیف ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے تھے لیکن جب اخبار کی پالیسی کی وجہ سے اس کی ضمانت ضبط کرلی گئی تو انھوں نے اخبار سے اپنا تعلق منقطع کرلیا۔

بیسویں صدی کے ربع اول میں "الہلال" ہمدرد، زمیندار اور "خلافت" خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں کہ ان کی وجہ سے اردو صحافت نے اعلیٰ معیار حاصل کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال کے ذریعہ اردو صحافت اور اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ الہلال اردو کا مقبول ترین اخبار رہا ہے۔ جس نے اپنے پڑھنے والوں کے دلوں پر وہ گہرے نقوش

چھوڑے ہیں کہ اس کی یاد ابھی تک محو نہیں ہوتی ہے۔ الہلال مصری صحافت کا آئینہ دار تھا اس کے مقالات بہت ہی بلند پایہ ہوتے تھے اس نے اردو میں ایک نئے اسلوب بیان کی ابتداء کی جو مولانا ابوالکلام آزاد کا خاص اسٹائل ہے "ہمدرد" اردو کا وہ پہلا اخبار ہے جس میں اخبار کی ساری خصوصیتیں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ مولانا محمد علی نے "ہمدرد" کے ذریعہ صحافت کی جو خدمت کی ہے اس کے احسان کا بار اردو زبان پر ہمیشہ رہیگا۔ "ہمدرد" اردو اخبارات کے لئے ایک نمونہ تھا۔ اس کی خبریں اس کے اداریئے اس کے مقالات انگریزی اخبارات پر سبقت لے جاتے تھے۔ مولانا محمد علی کی سیاسی مصروفیتوں اور پبلک کی بے التفاتیوں کی وجہ سے "ہمدرد" ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا رہا۔ لیکن آخر وقت تک وہ آزادی اور حریت کا علمبردار تھا۔ اردو صحافت میں ایثار کا مجسم نمونہ اگر کوئی اخبار ہے تو وہ "زمیندار" ہے جو مولانا ظفر علیخاں کے جوش عمل اور جذبہ ایثار کا مظہر ہے۔

"خلافت" نے تحریک خلافت کے زمانہ میں کافی مقبولیت حاصل کرلی تھی لیکن اس تحریک کے سرد پڑنے کے بعد خلافت کی اہمیت باقی نہیں رہی۔ اس زمانہ کے ایک اور صحیفہ نگار مولانا سید جالب ہیں جو "ہمدم" لکھنؤ کے مدیر تھے اور جن میں ایک اخبار نویس کی جملہ خصوصیتیں جمع تھیں۔

ان اخباروں کے علاوہ آج کل اردو میں بیسوں اخبارات اور رسائل شایع ہوتے ہیں۔ لاہور اردو صحافت کا مرکز ہے اور جو خدمت صحافت کی لاہور انجام دے رہا ہے وہ اردو صحافت کا ایک درخشاں باب ہے۔ اردو صحافت کی اس مختصر تاریخ کے بعد ہم کو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے در

اس وقت اردو میں کوئی اخبار کل ہند اہمیت کا نہیں ہے اور نہ الہلال یا ہمدرد کے پایہ کا ہے علاوہ ازیں جس طرح اردو صحافت ابتداء میں اردو کے مایہ ناز ادیبوں اور مصنفین کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے اپنے کارناموں سے اردو ادب اور زبان کو مالا مال کیا ہے اتنی ہی آج کل ایسے لوگوں کی کمی ہے۔ اس کے کیا اسباب ہیں اور اردو صحافت میں تنزل کی یہ کیفیت کیوں پیدا ہوگئی ہے اس کی مختلف وجوہات ہیں۔ سردست ہم اردو صحافت کی بعض عملی دقتوں کی طرف آپ حضرات کی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اردو صحافت ابھی دیگر متمدن ممالک کی صحافت کے مقابلہ میں بہت پیچھے ہے اس میں سب سے بڑی دقت طباعت کی ہے۔ جب تک موجودہ طباعت کے طریقوں میں تبدیلی نہ ہو اردو صحافت کا ترقی کرنا مشکل ہے حیدرآباد اور برطانوی ہند میں ٹائپ کی ایجاد کے متعلق کافی تجربے کئے جاچکے لیکن تعجب ہے کہ کسی مقام کے ٹائپ نے عام مقبولیت حاصل نہیں کی اور اردو اخبارات کی طباعت میں کوئی سہولت پیدا نہ ہوسکی۔ یا تو یہ ایجادیں اتنی قیمتی ہیں کہ اخبار کے مالک انھیں خرید نہیں سکتے یا بجائے خود ان ایجادوں سے موجودہ طباعت کی مشکلات کا ازالہ نہیں ہوسکتا۔ اس گتھی کو سلجھانا ضروری ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ اس کے بغیر اردو صحافت کو نقصان پہنچے گا۔ آج کل جب اردو زبان خود سیاسیات حاضرہ کا ایک اَن بوجھ مسئلہ بن گئی ہے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی مقبولیت اور اشاعت کے لئے زیادہ سے زیادہ موثر تدابیر اختیار کی جائیں جن میں سب سے پہلے طباعت کا نمبر ہے۔

اس کے بعد خبروں کے جمع کرنے کی باری آتی ہے یہ اردو صحافت کی بدقسمتی ہے کہ اردو پریس کے لئے کوئی خبر رساں ایجنسی نہیں ہے۔ ہندوستان میں جو ایجنسیاں کام کر رہی ہیں وہ یا تو باہر کی ہیں یا ایسی ہیں کہ انھیں اردو صحافت سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اردو کا کوئی روزنامہ ایسا نہیں ہے جسے کل ہند اہمیت حاصل ہو۔ اپنے شہر یا صوبہ سے نکلتے نکلتے تک وہ باسی ہو جاتا ہے اس کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہمارے اخبارات خبروں کے لئے انگریزی اخبارات کے محتاج ہیں۔ اردو کا شائد ہی کوئی ایسا اخبار ہو گا جس کے نمائندے کم از کم ہندوستان کے بڑے شہروں میں ہوں۔

اردو صحافت ایک ترقی پذیر صورت اسی وقت اختیار کر سکتی ہے جب کہ اشتہارات اس کا لازمی جزو بن جائیں۔ اخبار کے منجملہ اور فرائض کے ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے کاروباری اور تجارتی اغراض کو پیش نظر رکھے۔ کیونکہ اشتہارات پر اخبار کی زندگی اور موت کا دارومدار ہے۔

اردو صحافت کی ترقی کے لئے صحافتی کانفرنسوں کے انعقاد کی بڑی ضرورت ہے۔ ہر ملک میں اس قسم کی مجلسیں صحافت کی جان ہوتی ہیں۔ باہمی تبادلۂ خیال سے آپس کی بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے اور ملک کے اہم مسائل پر مختلف نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے۔ اور اپنی فلاح و بہبود کے متعلق بہت سی تدابیر سوچی جا سکتی ہیں۔

اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے حیدرآباد کی موجودہ صحافت پر بھی ہم ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے۔ اس وقت حیدرآباد میں سب سے مقبول ترین اور ہر دلعزیز اخبار (رہبر دکن) ہے جو صحیح معنوں میں ملک کے جذبات اور احساسات کا ترجمان ہے۔ علاوہ ازیں یہ بہت ہی پابندی سے شائع ہوتا ہے۔ اس کی کتابت اور طباعت بہترین ہوتی ہے اور اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان میں یہ پہلا اردو اخبار ہے جو بالالتزام خبروں کے ساتھ سیاسیات حاضرہ کی اہم شخصیتوں کی تصویریں شائع کرتا ہے۔ اس میں عربی اخبارات کے ترجمے شائع ہوتے ہیں اور لندن میں اس کا ایک اپنا خصوصی نامہ نگار بھی ہے۔ حیدرآباد کے اردو اخبارات میں رہبر دکن کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اور حکومت کے نزدیک اس کی بڑی وقعت ہے۔

(پیام) (صبح دکن) (مشیر دکن) (صحیفہ) (نظام گزٹ) بھی حیدرآباد کے روزنامے ہیں۔ پیام کے ایڈیٹر اردو کے مشہور ادیب قاضی عبدالغفار ہیں۔ قاضی صاحب کو صحافت کا وسیع تجربہ ہے۔ آپ "ہمدرد" کی مجلس ادارت میں بھی رہ چکے ہیں لیکن بدقسمتی سے حیدرآباد میں آپ کی صحافت کو مقبولیت کی سند حاصل نہ ہو سکی جس کے مختلف وجوہات ہیں "صبح دکن" بھی ملک کا ایک مقبول اخبار ہے جو اہل ملک کے خیالات کا آئینہ دار ہے "نظام گزٹ" بھی ابھی ہفتہ وار سے روزآنہ ہوا ہے مشیر دکن بھی کافی ہر دل عزیز ہے لیکن یہ زیادہ تر ہندوؤں میں پڑھا جاتا ہے اس کی پالیسی معتدل ہے۔

"صحیفہ" ایک قدیم روزنامہ ہے۔ اس پر مذہبی رنگ غالب ہے۔ تعجب ہے کہ اس اخبار نے ابھی تک ملک میں اپنے لئے کوئی خاص جگہ پیدا نہیں کی۔

روزناموں کے ذکر کے ساتھ "وقت" مرحوم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ حیدرآباد کا یہی وہ اخبار تھا جس نے

ملک میں اخبار نویسی کے ذوق کو عام کیا اور اتنا عام کیا کہ ملک کا ہر پڑھا لکھا شخص اخبار بین بن گیا۔ ملک میں جو سیاسی شعور اور بیداری "وقت" نے پیدا کی وہ حیدرآبادی صحافت کا ایک زرین کارنامہ ہے "وقت" ہی وہ اخبار تھا جس نے آزادیٔ تحریر کی صحیح معنوں میں علمبرداری کی ہے جس نے صحافت کی اعلیٰ ترین معیار کو برقرار رکھا اور جس کی آواز زبان خلق بن کر ملک کے گوشہ گوشہ سے گونج اٹھتی تھی "وقت" کے ملک پر بڑے احسانات ہیں۔ اس نے ملک میں عمل کی روح پیدا کی۔ اس نے اہل ملک کے جائز حقوق کی حفاظت اور حکومت کی پالیسیوں پر اس کی صحیح اور مخلصانہ تنقیدیں اب بھی دوسرے اخبارات کے لئے دلیل راہ ہیں۔ . . . .

. . . . "وقت" کے دوبارہ اجرا کی اجازت ہی اہل ملک کے بے چین قلوب کو مطمئن کر سکتی ہے۔

ہفتہ وار اخبارات میں قابل ذکر "رعیت" اور "اقبال" ہے۔ "رعیت" دیہی ترقیوں اور کاشتکاروں کی فلاح و بہبود کے ساتھ سیاسیات میں کانگریسی ذہنیت کا ترجمان ہے۔ "اقبال" سکندرآباد کا پہلا ہفتہ وار ہے۔ جس نے ایک تھوڑے عرصہ میں اپنی آزادیٔ تحریر کی وجہ سے ملک میں کافی اہمیت پیدا کرلی ہے۔

حیدرآبادی صحافت کی ایک بڑی کمزوری یہ ہے کہ یہاں بجز ایک دو اخبارات کے خبروں پر زیادہ زور نہیں دیا جاتا۔ حکومت کی عنایتوں سے جملہ اخبارات کو "اسوشی ایٹیڈ پریس" اور رائٹر کی خبریں بہم پہنچائی جاتی ہیں لیکن خود ملک میں خبروں کے جمع کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اضلاع کی خبریں عام طور پر جلسوں اور عہدہ داروں کے تبادلوں کی روداد [illegible]

کی جاتی ہیں۔ ان خبروں کے بھیجنے والے عام طور پر وہی لوگ ہوتے ہیں جو اخبار میں اپنا نام شائع کرانے کے خیال سے خبریں بھیجتے ہیں۔ صرف ایک "اعظم نیوز سرویس ہے" جس کے نمایندے اضلاع کے اہم مقامات پر ہیں۔ لیکن ضرورت اس کی ہے کہ خود اخبار کے نمایندے بھی اضلاع پر متعین رہیں جو فوراً وہاں کی اہم خبروں کو بلا تاخیر روانہ کریں۔ تعجب یہ ہے کہ خود دارالسلطنت میں کسی اخبار کے پاس مقامی نمایندے نہیں ہیں۔ دکن نیوز ایجنسی ہی تمام اخبارات کو خبریں بہم پہنچاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ایجنسی "حیدرآباد پریس سرویس" ہے۔ ہمارے پاس کا ہر اخبار مقامی خبروں اور حکومت کے فراہم کردہ تاروں کی وجہ سے ایک دوسرے کا مثنیٰ معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اخبار پڑھنے والا دوسرے اخبار سے تقریباً بے نیاز رہتا ہے۔ جس شہر سے چھ سات روزنامے نکلتے ہوں وہاں خبروں کی اشاعت کے لئے ایک دوسرے سے مسابقت کا نہ ہونا تعجب خیز ہے۔

حیدرآباد یا بیرون ہند کے اخبارات کی تعداد اشاعت بھی محدود ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اخبارات کی قیمت زیادہ ہے۔ اتنی ہی قیمت میں انگریزی اخبارات دگنا تگنا مواد بہم پہنچاتے ہیں۔ اگر اخبار کی قیمت اس کے حجم کی مناسبت سے رہے تو اس کی اشاعت بھی کثیر ہو سکتی ہے۔ "وقت" روزانہ دس دس پندرہ پندرہ ہزار تک شائع ہوا ہے محض اپنی قیمت کی وجہ سے۔ حیدرآباد میں ایک زمانہ میں اخبارات کو حکومت کی جانب سے مالی امداد بھی دی جاتی تھی گو اس میں ترمیم ہوگئی ہے لیکن پھر بھی بعض اخبارات کے ساتھ حکومت کی خاص رعایت اس کی جانب دارانہ پالیسی کو ظاہر کرتی ہے۔ اس میں مزید نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

حیدرآباد کی صحافت کی ترقی کے لئے ایک انجمن صحافت کی

کی سخت ضرورت ہے اس خصوص میں اب تک متعدد مرتبہ کوشش بھی کی گئی لیکن مزید کوشش کی ضرورت ہے۔

اپنے مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں ایک اور چیز کے متعلق آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ یہ کہ صحافت جتنی آسان ہے اتنی ہی مشکل بھی ہے۔ محض اس کی آسانی کی وجہ سے لوگ جنھیں کوئی روزگار نہیں ملتا اس پیشہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور اس پیشہ کی ذمہ داریوں کو اٹھا نہیں سکتے۔ ایسے لوگ جنھیں کوئی باقاعدہ تعلیم نہ ملی ہو، جو سیاسیات کی ابجد سے بھی واقف نہ ہوں صحافت کے فرائض کو کبھی انجام نہیں دے سکتے۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ایسے حضرات اس پیشہ میں قدم رکھیں جن کے دل میں قومی خدمت کی تڑپ ہو اور جنھوں نے ضروری تعلیم حاصل کی ہو۔ آج ایسے ہی لوگوں کی کمی کی وجہ سے صحافت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس کی ذمہ داری بڑی حد تک ان لوگوں پر بھی عائد ہوتی ہے جو ایسے اخبارات کی سرپرستی فرماتے ہیں۔

اردو صحافت کو جنم لئے ہوئے ایک سو سال کا عرصہ ہوا ہے۔ ایک صدی تک اس پر اس طرح خود فراموشی کی کیفیت کا طاری رہنا کیا ارباب اردو کے لئے دعوت فکر و نظر نہیں ہے؟ کیا حالات کا فوراً جائزہ لے کر اس کی بہتری کی کوئی صورت نہیں نکالی جا سکتی؟

محمد بدرالدین خاں شکیب

اردو کی نئی کتابیں

۱۔ سپاس جناب امیر از علامہ اقبال مرحوم ۲۰ صفحات قیمت [illegible]

۲۔ ختم نبوت اور قادیانیت (علامہ اقبال مرحوم کا ایک مقالہ) مرتبہ حسن الدین [illegible] قیمت [illegible]

۳۔ ریزۂ مینا (مشہور فسانہ نگاروں کے پچاس افسانوں کا مجموعہ) مرتبہ شاہد احمد دہلوی ایڈیٹر ساقی ۔۔۔ صفحات قیمت [illegible]

۴۔ سوانح حیات سبھاش چندر بوس از رگھوبنس چوپڑا ۱۱۲ صفحات۔

۵۔ سوانح حیات موجد طب جدید (احمد دین مرحوم کے حالات) از دوست محمد ۲۷۲ صفحات

۶۔ چشم عنکبوت (افسانہ) از افضل مزرا ۳۲۰ صفحات۔

۷۔ انگلینڈ کی تاریخ از ڈاکٹر پی پی منور مدار ۲۵۹ صفحات

۸۔ چہار قانون (آٹھواں ایڈیشن) از مرزا فریدوں بیگ ۲۴۰ صفحات۔

۹۔ قانون اشامپ (جلد دوم) از گردہاری لال ۱۷۹ صفحات۔

۱۰۔ کرشمات عینکگری از علی بشیر ۴۰ صفحات۔

۱۱۔ راز نسواں (علاج نسواں) از عزیز ایم اے ۹۶ صفحات۔

۱۲۔ مصباح الحکمت (دوسرا ایڈیشن) از محمد فیروز الدین ۳۲۰ صفحات۔

۱۳۔ جامع الحکمت جلد دوم از محمد حسن قریشی ۳۲۰ صفحات۔

۱۴۔ بہتر دیہات (دیہات سدھار) از ایف۔ ایل۔ برائن ۳۹ صفحات۔

۱۵۔ بنیادی قومی تعلیم از ڈاکٹر ذاکر حسین ۴۲ صفحات

۱۶۔ روپ متی اور باز بہادر (تاریخی ڈراما) از محشر عابدی قیمت [illegible]

۱۷۔ ماہ و انجم (افسانے) از کوثر چاند پوری قیمت [illegible]

۱۸۔ تاج شاہی عشق کے قدموں میں (تاریخی افسانے) قیمت [illegible]

۱۹۔ تاریخ اسلام (تین جلد) از اکبر شاہ خاں نجیب آبادی قیمت [illegible]

۲۰۔ صراط الحمید جلد اول (سفرنامہ مقامات مقدسہ) از محمد الیاس برنی قیمت [illegible]

۲۱۔ نبض (نبض کی حقیقت) از حکیم عبد اللطیف ۲۰۴ صفحات۔

۲۲۔ ہندوستان کی تہذیب کی تکمیل از کالیداس کپور ۵۰ صفحات قیمت [illegible]

۲۳۔ سوشلزم (اشتراکیت کی تاریخ) فریڈرک اینگلز کی کتاب کا ترجمہ ۴۶ صفحات قیمت [illegible]

۲۴۔ مضامین فراق از خواجہ ناصر نذیر فراق دہلوی ۱۶۰ صفحات قیمت [illegible]

۲۵۔ کاغذ کی ناؤ (مختصر ڈرامے) از صاحبزادہ میکش ۱۲۰ صفحات قیمت [illegible]

۲۶۔ دادا بھائی نوروجی (مختصر سوانح) از ظہیر الدین احمد ایچ سی ایس ۱۹ صفحات قیمت [illegible]

۲۷۔ محمد حسین آزاد (سوانح حیات) از جہاں بانو بیگم ایم اے ۲۰۰ صفحات قیمت [illegible]

مرزا سیف علیخاں

حیدرآباد کی مچھلی

حیدرآباد کی مچھلی اصل معنوں میں مرل ہے جس کو بنگال میں سورہ اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں "سول" یا "سولی" کہتے ہیں۔ یہ مچھلی ہندوستان میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ عام طور پر یہ گدلے پانی میں رہتی ہے لیکن دوسری جگہ صاف پانی میں بھی بکثرت ملتی ہے۔

اس کی دو بڑی اور دو چھوٹی قسمیں یہاں پائی جاتی ہیں ایک جس کے اوپر پھول نما سفید دھبے ہوتے ہیں۔ "پھول مرل" کہلاتی ہے۔ اور دوسری جس کے اوپر سیاہ اور سفید دھاریاں ہوتی ہیں "کالی مرل" کہتے ہیں۔ اس کی چھوٹی قسموں کو "پھول ڈھوک" اور "دھیڑ ڈھوک" کہتے ہیں لیکن ان دونوں کو عموماً غریب لوگ ہی کھاتے ہیں۔ بے مزہ ہیں کچھ زیادہ اچھی نہیں ہوتیں۔

"مرل اس وجہ سے یہاں زیادہ مرغوب ہے کہ یہ بہ کثرت کے ساتھ ملتی ہے اور تھوڑے پانی کے اندر بھی زندہ رہ سکتی ہے۔ علاوہ اس کے یہ انڈے بند پانی میں دیتی ہے۔ اور وہیں اُس کے بچے بھی نکلتے ہیں۔ لیکن یہ صورت دوسری مچھلیوں کے ساتھ نہیں پائی جاتی۔ اس لئے کہ وہ انڈے صرف بہتے پانی یا بڑے تالابوں میں ہی دیتی ہیں۔

دوسری وجہ اس کے پسند کئے جانے کی یہ ہے کہ پانی کے باہر بھی یہ مچھلی کافی دیر تک زندہ رہ سکتی ہے۔ اور جب بازار میں اس کو پکڑ کر لاتے ہیں تو اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے یہ مرنے نہیں پاتی اور زندہ حالت میں تازہ ملتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اس میں کانٹے زیادہ نہیں ہوتے اور کھانے میں تکلیف نہیں ہوتی لیکن بعض دوسری مچھلیوں میں کانٹے بہت ہوتے ہیں اور لوگ انھیں پسند نہیں کرتے۔

اب تک جو مچھلیاں دستیاب ہوئی ہیں ان کی مختلف قسموں کی تعداد (۵۲) ہے جن میں سے ان مچھلیوں کا ذکر کرنا ہی مناسب ہوگا جو عام طور پر ملتی ہیں۔

"مہاسیر" دراصل سب سے زیادہ لذیذ مچھلی ہے لیکن یہاں کمیاب اور نہایت مشکل سے ملتی ہے۔ یہ پہاڑی ندیوں میں اور گہرے پانی میں رہتی ہے۔ اس لئے چھلکے نہایت بڑے ہوتے ہیں۔ اور ان کے بٹن تیار کئے جاتے ہیں۔ یہ یہاں کی تمام مچھلیوں میں سب سے بڑی ہے اور اکثر اس کا وزن کئی من تک ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو "مہاسیر" کہتے ہیں۔

دوسری مچھلی جو عموماً برسات میں جب کہ پانی زیادہ ہوتا ہے اکثر ملتی ہے "روہو" کہلاتی ہے۔ اس کے چھلکے بڑے ہوتے ہیں اور ہر چھلکہ کے اوپر سرخ یا قرمزی رنگ کا ایک دھبہ پایا جاتا ہے۔ یہ بھی نہایت لذیذ مچھلی اور ہر طرح مرل سے بہتر ہوتی ہے۔ لیکن پکڑنے کے بعد دیر تک زندہ نہیں رہ سکتی اس لئے جب اس کو منڈی تک لاتے ہیں تو اکثر اس میں بو پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔

ایک اور مچھلی جس کو یہاں عموماً "پڑو" کہتے ہیں۔ اس کا گوشت نہایت ملائم ہوتا ہے۔ اور اس کو انگریز نہایت پسند سے کھاتے ہیں۔ اکثر اس کے گوشت کے نرم ہونے کی وجہ سے یہ (   ) بھی کہلاتی ہے۔ یہ مچھلی صاف اور گہرے پانی میں رہتی ہے۔ اور اکثر موسم برسات ہی میں منڈی میں آتی ہے۔

بام مچھلی سانپ کی شکل کی ہوتی ہے اور اس کی پیٹھ پر تیز کانٹوں کی ایک قطار پائی جاتی ہے۔ اس کی تین اقسام

ملتی ہیں۔ جو رنگ اور مختلف نشانیوں کی وجہ سے شناخت کی جا سکتی ہیں۔ یہ مچھلی عموماً غریب لوگ کھاتے ہیں اس لئے کہ ذائقہ کے لحاظ سے کچھ اچھی مچھلی نہیں۔ دوسری خرابی ان میں یہ ہے کہ اکثر اس کے گوشت اور پیٹ کے اندر کیڑے ہوتے ہیں۔ جو اگر زندہ حالت میں انسان کی انتوں میں چلے جائیں تو نقصان کا باعث ہوں گے۔ اس لئے ہمیشہ نہ صرف اسی مچھلی کے لئے بلکہ تمام مچھلیوں کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان کو خوب پکانا چاہیے تاکہ کیڑے مرجائیں ورنہ اس کا اندیشہ ہے کہ یہ نقصان پہونچائیں گے۔

دوسری چند عام مچھلیوں کے صرف نام ہی بتانا کافی ہوگا۔ یہ "چیل مچھلی" کٹرنا۔ بچھو مچھلی، سنگھی، معروف، مِٹن روپ چھال اور پرکلیاں وغیرہ ہیں۔

چیل مچھلی بکثرت ملتی ہے اور بالکل چپٹی ہوتی ہے۔ یہ اس لئے زیادہ پسند نہیں کی جاتی کہ اس میں کانٹے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ یہاں اب تک صرف چھوٹی قسم کی مچھلی ملی ہے۔ لیکن ہندوستان کے بعض حصوں میں اس کی بڑی قسم بھی ملتی ہے جو اکثر دو فٹ تک لانبی ہوتی ہے۔ "موہ" کہتے ہیں اور اکثر شوقین حضرات مینڈک کے چارہ سے اس کو پکڑتے ہیں۔ لوگ نہایت شوق سے اس کے پیٹ کے حصہ کو کھاتے ہیں۔

سنگھی، کٹرنا، اور بچھو مچھلی شکل میں ملتی جلتی ہوتی ہے۔ ان کے سامنے کے حصہ پر مونچھیں پائی جاتی ہیں۔ اور سر کے قریب دو تیز کانٹے ہوتے ہیں۔ بچھو مچھلی کے کانٹے نہایت تیز ہوتے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی اسے ہاتھ لگانے کا اتفاق ہوا ہو تو اس کے نام کی اہمیت اور موزونیت آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔ یہ ہاتھ لگاتے ہی اپنے بچاؤ کے لئے کانٹوں سے حملہ کرتی ہے اور ہاتھوں کو گھائل کر دیتی ہے۔ زخم گہرے ہوتے اور اکثر مشکل سے بھرتے ہیں۔ یہ مچھلیاں بند اور بہتے پانی میں یکساں طور پر ملتی ہیں۔

معروف بھی نہایت لذیذ مچھلی ہے اور گھر کے اندر حوض میں رکھی جا سکتی ہے اس کا رنگ سیاہی مائل ہوتا ہے۔ جسم پر چھلکے نہیں پائے جاتے۔ اور منہ کے قریب "مونچھیں" ہوتی ہیں۔ غذائیت کے لحاظ سے یہ "مرل" سے بھی بہتر ہے۔ اور اکثر بنگالی گھرانوں میں اس کا شوربہ ان کمزور لوگوں کو دیتے ہیں جنھیں مقوی اور زود ہضم غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔

"مِٹن" بھی ایک کافی بڑی اور مزے دار مچھلی ہے۔ یہ صاف اور گہرے پانی میں ملتی ہے۔ اس کا گوشت لذیذ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ مشہور ہے کہ اس کو کھانے سے بیماری پیدا ہوتی ہے۔ یہ محض غلط فہمی ہے اور اس قسم کی کوئی خرابی اس کو کھانے سے نہیں ہوتی۔

"روپ چھال" اور مختلف "پرکلیاں" سفید اور چمک دار ہوتی ہیں۔ یہ تالابوں کے کنارے کم پانی میں کثرت کے ساتھ ملتی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ نہایت اچھی ہیں کہ ان میں فاسفورس کی مقدار بمقابلہ بڑی مچھلیوں کے زیادہ ہوتی ہے۔

"تنبو" مچھلی کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ سانپ کی شکل کی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے اوپر کانٹے نہیں ہوتے۔ یہ کمیاب ہے۔ اس کے اوپر زرد رنگ کا مادہ پایا جاتا ہے۔ جو اتنا چکنا ہوتا ہے کہ مچھلی کو ہاتھ سے پکڑنا غیر ممکن ہے۔ اس سے متعلق مختلف قصے ہیں لیکن دراصل ان کی کوئی اہمیت نہیں اور طبی لحاظ سے بھی اس میں کوئی خاص جز و نہیں پایا جاتا گر یہ

ایک عام قاعدہ ہے کہ جو چیز مشکل سے دستیاب ہوتی ہے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی خاص بات لگادی جاتی ہے۔

مچھلی ہر جگہ کثرت کے ساتھ بطور غذا استعمال کی جاتی ہے۔ اور دنیا کے ہر حصہ میں لوگ اس کو پسند کے ساتھ کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اب تو اکثر جگہ اس کو بجائے گوشت کے ترکاری میں داخل کر دیا گیا ہے۔ یہ آسانی کے ساتھ ہضم ہو جاتی ہے اور بیماروں کو بھی کھانے کے لئے دی جاتی ہے۔ اس میں ایسے غذائی اجزا موجود ہیں جو خاص طور پر دماغ اور جسم کے لئے مفید ہیں۔ اس میں پروٹین بہ کثرت ہے۔ اور اس کے علاوہ فاسفورس، کیلشیم یعنی چونے چربی اور لوہے کے عناصر بھی داخل ہیں۔ وٹامن یا حیاتین (　　) اور (　　) اور (　　) بھی موجود ہیں۔ اصل جزو پروٹین ہے جو انسان کی بقاء اور طاقت کو قایم رکھنے کے لئے نہایت اہم ہے۔ یہ خاص طور پر بڑھتے ہوئے بچوں اور دودھ پلانے والی ماؤں کے لئے ایک نہایت اہم چیز ہے۔ اس لئے کہ جسم میں جو کچھ کمی یا کمزوری پیدا ہوتی ہے۔ وہ پروٹین کے ذریعہ ہی پوری ہوسکتی ہے۔

دوسری چیز وٹامن (　　) ہے یہ بھی نہایت لازمی جزو ہے اور اس کی کمی دودھ، دہی، گھی، انڈوں اور خصوصاً مچھلی کے تیل سے پوری کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ مچھلی کے جگر کے تیل میں اس کی مقدار کافی ہوتی ہے۔ وٹامن (　　) بھی کافی مقدار میں مچھلی کے تیل کے اندر موجود ہوتی ہے۔

فاسفورس دماغ اور ہڈیوں کے لئے اور کیلشیم خاص طور پر ہڈیوں، ناخون اور دانتوں کے لئے لازمی چیز ہے۔ ورنہ یہ حصے کمزور رہیں گے۔ لوہے کی ضرورت خون کے لئے ہے۔ ورنہ انسان کمزور اور بیماریوں کا شکار ہوتا رہے گا۔

مچھلیوں کی تعریف دراصل بنگالیوں سے پوچھنی چاہیے۔ اس لئے کہ وہ اس کے نہایت والہ و شیدا ہیں۔ اور کسی بنگالی کا کھانا اس وقت تک پورا نہیں سمجھا جاتا۔ جب تک کہ مچھلی کسی نہ کسی صورت میں اس کے دسترخوان پر موجود نہ ہو۔

میں دو بنگالی کہاوتیں یہاں بیان کرتا ہوں ان سے بخوبی معلوم ہو سکے گا کہ بنگالیوں کے نزدیک مچھلی کی کیا اہمیت ہے۔ ایک کہاوت یہ ہے:۔

بھیتو بنگالی۔ ایک ٹکڑو ماچ پیلے
ایک تھالا بھات کھے اے پھیلے

یعنی یہ کہ ایک بھات یا خشکہ کھانے والا بنگالی مچھلی کے ایک ٹکڑے کو صرف دیکھ کر ہی بھات کا ایک پورا مشقاب ہڑپ کر سکتا ہے۔

مچھلی بنگالیوں کو اتنی مرغوب ہے کہ جب بڑی بوڑھیاں کسی عورت کو دعا دیتی ہیں تو یہ کہتی ہیں۔

"چیرو کال۔ اے یستری ہو اے۔ تھاکو۔ تو ار ماچ بھات جنیو باجائے تھاک" یعنی اے سہاگن عورت تیرا شوہر زندہ رہے اور تو ہمیشہ مچھلی اور بھات کھا کر خوش و خرم رہے۔

بنگالیوں میں یہ قاعدہ ہے کہ بیوہ عورتیں مچھلی نہیں کھاسکتیں اور مچھلی صرف سہاگن عورتوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ دعا تک میں مچھلی داخل ہوگئی ہے۔

میرے اکثر بنگالی دوست ہیں اور جب کبھی ان سے کھانے کی بابت ذکر آیا ہے اور یہ دریافت کرنے کا اتفاق ہوا کہ دنیا کے کھانوں میں سب سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے۔ تو سب یہی کہتے ہیں کہ "ماچ کھوب بھالو چھے" یعنی مچھلی

نہایت اچھی چیز ہے۔ ان کا یہ کہنا واقعات پر مبنی ہے۔ اگر بنگالیوں کی غذا سے مچھلی نکال دی جائے تو دراصل کوئی خاص تقویت کی چیز ان کے کھانے میں نہیں رہتی اس لئے کہ ان کی غذا کا دوسرا اہم جزو صرف بھات یا چاول ہے۔ جس میں غذائیت تقریباً بالکل نہیں پائی جاتی۔

مچھلی نہایت عمدہ اور جلد ہضم ہونے والی غذا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن کے ذریعہ یہ تازہ حالت میں بہ کثرت اور سستے داموں مل سکے تاکہ لوگ اس کو زیادہ سے زیادہ مقدار میں استعمال کر سکیں۔

حیدرآباد میں مچھلیاں مختلف قسم کی اور بکثرت ملتی ہیں اس لئے کہ یہاں تالاب اور جھلیں بہت زیادہ ہیں اور ندیاں بھی کئی ہیں۔ اگر صحیح اصول پر ان کی نگہداشت کی جائے تو گاؤں والوں کو ایک عمدہ غذا آسانی کے ساتھ مل سکتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ سرکار کی آمدنی میں بھی کافی اضافہ ہو سکتا ہے۔ حیدرآباد کسی طرح بنگال یا مدراس سے میٹھے پانی کی مچھلیوں کی فراوانی میں کم نہیں۔ اس بارے میں بشرط فرصت میں پھر کبھی کچھ عرض کر سکوں گا اور یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ کس طرح ایسی تدابیر عمل میں لائی جا سکتی ہیں۔ جس سے ہماری یہ خواہش اور ضرورت پوری ہو سکے۔

(تقریر حیدرآباد ریڈیو) محمد رحیم اللہ

ٹینس

ٹینس کی ابتدا تقریباً ستر سال قبل انگلستان میں ہوئی ایک عرصہ تک اس کا شمار مردانہ کھیلوں میں نہیں ہوا۔ بلکہ یہ ایک تفریحی ورزش خیال کی گئی۔ جامعوں اور پبلک اسکولس نے اس کی جانب توجہ نہیں کی اور اس کی خوبیوں کو نہیں پہچانا درآں حالیکہ اس کھیل کے لئے کسی بڑے میدان کی ضرورت نہیں۔ اس میں وقت کم صرف ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے میلان و قویٰ کے موافق ورزش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ برابری کے مقابلے میں کھلاڑیوں کو فٹ بال یا ہاکی سے زیادہ محنت و جانفشانی کرنی پڑتی ہے ہاکی و فٹ بال کی طرح اس کھیل میں گیارہ کھلاڑیوں کا جمع ہونا ضروری نہیں ہوتا بلکہ دو یا چار کھلاڑی جمع ہو کر اپنی مرضی کے موافق ورزش کر سکتے ہیں۔ نہ صرف کھلاڑیوں بلکہ تماشہ بینوں کے لئے یہ ایک دلچسپ کھیل ہے اگر اس کھیل میں کوئی نقص ہے تو یہ ہے کہ اس پر اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔ انگلستان کی طرح ہندوستان میں بھی اس کھیل کے فوائد اور خوبیوں سے واقفیت ایک عرصۂ دراز کے بعد ہوئی یہاں بھی اس کی ابتدار انگریزوں ہی نے کی اور شروع میں زیادہ تر بوڑھے ہی ایک تفریحی ورزش کی طرح اس کو کھیلا کرتے تھے اور جوانوں اور بچوں کو اس طرف راغب کرتا تو گویا اس کھیل سے منع کیا جاتا تھا چنانچہ خود میرا تجربہ ہے کہ جب میں مدرسۂ عالیہ میں تعلیم پاتا تھا تو مسٹر برنٹ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم بوڑھے ہو جاؤ اس وقت اس کھیل کو کھیلنا۔ انگلستان میں تو ۱۹۰۱ء کے بعد سے اس کھیل نے عام مقبولیت حاصل کر لی اور آب تو اس کھیل کو تقریباً ہر ملک نے خاص اہمیت دی ہے۔

لیکن ہندوستان نے اس کی طرف خاطرخواہ توجہ نہیں کی۔ خاص کر یہاں کی جامعوں اور مدارس میں اس کی ترقی کی بہت گنجایش ہے۔

ٹینس کے موجدوں نے اس کو مقبول عام بنانے کی خاطر ایک ٹورنمنٹ کی ابتدا سنہ ۱۸۷۷ء میں کی جو اب ومبلڈن ٹورنمنٹ کے نام سے مشہور ہے۔ پہلے تو اس میں صرف انگریز کھلاڑی ہی حصہ لیتے رہے اور انہیں کو کامیابی ہوتی رہی جن میں قابل ذکر اے ڈبلیو گور اور دو ہارٹی بھائی ہیں جنھوں نے اپنے کھیل کے معیار کو بہت بلند کیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۹ء کے بعد سے اسٹریلین اور امریکن کھلاڑی پیش پیش آنے لگے چنانچہ سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک دو اسٹریلین کھلاڑی واُملڈنگ اور نارمن بروکس نے سب پر برتری حاصل کی سنہ ۱۹۱۵ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک جنگ کے سبب یہ ٹورنمنٹ موقوف رہا اور سنہ ۱۹۱۹ء میں جب جاری ہوا تو پھر ایک اسٹریلین کھلاڑی پیاٹرسن نے اس چمپین شپ کو جیتا سنہ ۱۹۲۰ء و سنہ ۱۹۲۱ء میں ٹلڈن کی جو امریکن ہیں شہرت شروع ہوئی اور ہر دو سال انھوں نے دنیا کے ٹینس کے تمام بہترین کھلاڑیوں کو شکست دی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ٹینس کا موجودہ اسٹیڈیم جہاں یہ ٹورنمنٹ کھیلا جاتا ہے تیار ہوا کیونکہ پبلک کا شوق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ پرانا اسٹیڈیم کافی نہ ہوتا تھا۔ جدید اسٹیڈیم کا سینٹر کورٹ دیکھنے کے قابل ہے۔ یہاں تقریباً بیس ہزار کی تعداد میں تماشائی بیٹھ سکتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں پھر پیاٹرسن نے یہ ٹورنمنٹ جیتا اور سنہ ۱۹۲۳ء جانسٹن نے جو امریکن کھلاڑی ہیں۔ فرانس نے سنہ ۱۹۲۱ء سے دنیا کا ایک بہترین کھلاڑی پیدا کرنے کی کوششیں شروع کیں جو سنہ ۱۹۲۴ء میں بارآور ہوئیں اور اس ملک کے تین کھلاڑی بروترا، لاکاسٹ اور کوشے نے یکے بعد دیگرے چھ سال تک ومبلڈن

چمپین شپ میں کامیابی حاصل کی۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں ٹلڈن نے پھر یہ ٹورنمنٹ جیت لیا اور سنہ ۱۹۳۱ء سے سنہ ۱۹۳۲ء تک امریکہ کے ہی کھلاڑی جیتتے رہے۔ لیکن سنہ ۱۹۳۳ء کے بعد سے ایک انگریز کھلاڑی فرو پیری نے تین سال تک فوقیت حاصل کی اور جب وہ پیشہ ور ہو گئے تو پھر امریکہ کے کھلاڑی وائنز، ڈانلڈ بج نے چمپین شپ جیتا۔ ڈانلڈ بج گزشتہ سال تک چمپین رہے لیکن چونکہ اب وہ بھی پیشہ ور ہو گئے ہیں اس لئے اس سال کے نتیجہ کے متعلق کوئی پیش خیالی کرنا دشوار ہے۔ اس ٹورنمنٹ کے علاوہ جس ٹورنمنٹ نے اس کھیل کو بین الاقوامی حیثیت اور اہمیت دی وہ ڈیوس کپ ہے۔ اس کی ابتدا امریکہ میں سنہ ۱۹۰۰ء میں ہوئی اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ ومبلڈن کی طرح اس میں کوئی کھلاڑی شخصی طور پر حصہ نہیں لے سکتا بلکہ ہر ملک اپنی ٹیم شریک کر سکتا ہے جس میں کھلاڑیوں کی تعداد کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ چار پر مشتمل ہوتی ہے۔ ہر مقابلہ پانچ میاچز کا ہوتا ہے جن میں چار سنگلز اور ایک ڈبلز کا کھیل ہوتا ہے۔ اس ٹورنمنٹ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ آخری کھیل اس ملک میں ہوتا ہے جہاں پچھلے سال کپ گیا ہو۔ ابتدا میں اس ٹورنمنٹ میں صرف تین ممالک امریکہ، انگلستان اور اسٹریا حصہ لیتے تھے اور پہلے دو سال تک امریکہ نے اس میں کامیابی حاصل کی لیکن سنہ ۱۹۰۲ء سے سنہ ۱۹۰۶ء تک انگلستان نے اپنی برتری قائم کی اور سنہ ۱۹۰۷ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک اسٹریلیا نے واملڈنگ و نارمن بروکس کی مدد سے اس کپ کو اپنے ملک میں رکھا۔ یہ ٹورنمنٹ بھی گزشتہ جنگ کے دوران میں موقوف رہا اور جب سنہ ۱۹۱۹ء میں جاری ہوا تو پھر اسٹریلیا نے اس کو جیتا۔ جنگ کے بعد سے اس ٹورنمنٹ میں شریک ہونے والے ممالک کی تعداد بڑھ گئی اور سنہ ۱۹۲۱ء میں بیس سے زائد ہو گئی۔

۱۹۲۰ء میں امریکہ نے ٹلڈن، جانسٹن اور ولیمس کی مدد سے
یہ کپ حاصل کیا اور ۱۹۲۶ء تک کامیاب دفاع سے اپنے یہاں
رکھا۔ لیکن فرانس کی ٹینس کے عروج کے ساتھ جس کے بانی وہاں
کے چار بند و تیغی یعنی بروترا۔ لاکاسٹ۔ کوشے اور برینان تھے
۱۹۲۶ء میں ڈیوس کپ بھی اس ملک میں پہلی مرتبہ آیا اور
۱۹۳۲ء تک فرانس ہی میں رہا۔ فرانس کی کامیابی نے
انگلستان کو جوش دلایا اور ۱۹۲۶ء میں اس ملک نے منظم تیاری
شروع کر دی تھی۔ کئی ٹینس کورٹ بنوائے گئے ٹینس کے معلمین
غیر ممالک سے بلوائے گئے اور کم سن کھلاڑیوں کا انتخاب کر کے
ان کی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور ان میں سے جو بہتر پائے گئے۔
ان کو دنیا کے سفر پر بھیجا گیا تاکہ وہ مختلف ممالک میں ٹینس کھیلیں
اور تجربہ حاصل کریں آسٹن، پیری اور ہیوز نے اس سفر سے پورا
فائدہ اٹھایا جس کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ آسٹن جن کو میں نے
۱۹۲۵ء میں ایک ٹورنمنٹ میں نہایت آسانی سے ہرایا تھا
سفر سے واپسی کے بعد مجھ سے کہیں بہتر کھلاڑیوں کو شکست دینے
کے قابل ہو گئے تھے۔ منظم تیاری ہمیشہ بار آور ہوتی ہے۔ چنانچہ
انگلستان کی اس تیاری کا پھل وہاں کی انجمن کو ۱۹۳۳ء میں
ملا جب کہ پیری، آسٹن اور ہیوز فرانس کو شکست دے کر
اکیس سال کے بعد ڈیوس کپ کو اپنے ملک میں واپس لائے۔
یہ کپ انگلستان میں ۱۹۳۶ء تک رہا۔ جب پیری پیشہ ور ہو گئے
تو ان کا موزوں جانشین نہ مل سکا اور کپ بھی امریکہ چلا گیا
جہاں ڈانلڈ بج جیسے کھلاڑی موجود تھے۔ اور اب تک یہ کپ
وہیں ہے۔ فرانس اور انگلستان کی ناکامیابی کا سبب یہ ہوا کہ
انھوں نے کم سن کھلاڑیوں کی منظم تیاری میں ویسا جوش نہیں
دکھلایا جیسا کہ ابتدا میں ظاہر کیا تھا، جس سے وہاں کے
اچھے کھلاڑیوں کے جانشین مہیا نہ ہو سکے۔

ہندوستان نے ڈیوس کپ میں ۱۹۲۱ء سے شرکت کرنی
شروع کی۔ پہلے ہی سال ان کی ٹیم فائنل تک پہنچ کر ہاری اور
۱۹۲۴ء میں اسے سمی فائنل راونڈ میں شکست ہوئی۔
یہ ابتدا ایک نمایاں مستقبل کا پتہ دے رہی تھی لیکن بعد میں
یہ ثابت ہوا کہ یہی دو سال ہندوستان کی ٹینس کی تاریخ میں
درخشاں ہیں حالانکہ مقابلتہً اس کھیل کو اب زیادہ اہمیت
اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستان
سے اعلیٰ معیار کے کھلاڑی کیوں نہیں نکلتے اور ہندوستانی ڈیوس کپ
ٹیم کا نتیجہ سابقہ نتیجے سے بہتر کیوں برآمد نہیں ہوتا بعض کا خیال
ہے کہ ہندوستانی ٹیم کی سابقہ کامیابی کا سبب یہ تھا کہ یورپ کی
ٹینس کا معیار اس وقت کم تھا اور چونکہ یہ اب بڑھ گیا ہے اس لئے
اگرچہ ہندوستانی کھلاڑیوں کا معیار سابقہ ہندوستانی کھلاڑیوں
سے بہتر ہے تاہم ڈیوس کپ میں کامیابی کے قابل نہیں۔
مجھے یقین ہے کہ ہر تجربہ کار کھلاڑی اس خیال سے اختلاف کرےگا
خاص کر اگر اس نے سلیم، جیکپ اور فیضی جیسے کھلاڑیوں کے
کھیل کو ان کے عروج کے زمانہ میں دیکھا ہو۔ اس کی مثال
یہ ہے کہ بلجیم نے واشر و واشبرن جیسے کھلاڑی اب تک پیدا
نہیں کئے اور ان کھلاڑیوں کے باوجود ہندوستان کی سابقہ
ٹیموں نے بلجیم کو ہرایا۔ اس سے اس وقت کے اور حالیہ
معیار کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں ہندوستان
کی ٹینس کا عام معیار پہلے سے بہتر ہو گیا ہے اور زیادہ کھلاڑی
پیدا ہو رہے ہیں لیکن یہاں کے کھلاڑیوں کا معیار سابق
کے اعلیٰ کھلاڑیوں سے کم ہے اس کی کئی وجوہ ہیں جس میں
سے ایک یہ ہے کہ سابق کے کھلاڑیوں نے اپنی ٹینس کو

یورپ میں رہ کر ترقی دی تھی اور یہ ظاہر ہے کہ ترقی کے لئے جو سہولتیں اور مواقع یورپ میں ہیں وہ ہندوستان میں نہیں مل سکتے۔ آل انڈیا لان ٹینس اسوسی ایشن نے ابھی تک اسی کو کافی سمجھ رکھا ہے کہ ہندوستان کی ٹیم ہر سال ڈیوس کپ ٹورنمنٹ میں شریک کر دی جائے اور اس کے لئے یہاں کے اچھے کھلاڑیوں کا انتخاب ہو۔ اس اصول سے مجھے اختلاف ہے کیونکہ کسی ملک کا مطمح نظر صرف شرکت ہی نہیں بلکہ ڈیوس کپ کو حاصل کرنا بھی ہونا چاہیے۔ اس کے لئے کئی سال کی تیاری کی ضرورت ہے لہذا اگر وہ ابھی سے شروع کر دی جائے تو ممکن ہے کہ آئندہ پانچ یا سات سال میں کوئی مفید نتیجہ نکلے۔ اسوسی ایشن نے بالآخر اب اس کو محسوس کیا ہے اور حال ہی میں جو آئندہ کا پروگرام شائع کیا گیا ہے وہ نہایت مفید معلوم ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ اگر میں بھی چند تجاویز پیش کروں تو ممکن ہے کہ سودمند ثابت ہوں اور ٹینس کی ترقی کا باعث ہوں۔ کم عمر لڑکوں کے لئے ہر پراونس و اسٹیٹ میں ٹورنمنٹ منعقد کئے جائیں جس میں اٹھارہ سال اور اس سے کم عمر کے کھلاڑی شریک کئے جائیں۔ آل انڈیا اسوسی ایشن کی جانب سے بھی اسی قسم کا ٹورنمنٹ ہو اور اسمیں جو کامیاب رہے اس کو آل انڈیا بوائز چمپین کا لقب دیا جائے۔ اس ٹورنمنٹ کے شرکا وہی ہوں جن کو کہ پراونشل یا اسٹیٹ اسوسی ایشن نے نامزد کیا ہو اور ہر ٹینس اسوسی ایشن کو چار یا اس سے کم کھلاڑیوں کو نامزد کرنے کا اختیار دیا جائے۔ شرکا کے قیام اور خورد و نوش کے اخراجات کا بار آل انڈیا اسوسی ایشن برداشت کرے اور سفر کے اخراجات پراونشل یا اسٹیٹ اسوسی ایشن اٹھائے۔ ایک کمیٹی تجربہ کار کھلاڑیوں کی بنائی جائے جو اس ٹورنمنٹ کے ہر کھلاڑی کے کھیل کا اندازہ لگائے اور اس کے اختتام پر چار ہونہار کھلاڑیوں کا انتخاب کرے۔ اس کمیٹی کے لئے یہ ضروری نہیں ہوگا کہ کامیاب کھلاڑیوں ہی کو منتخب کرے کیونکہ ممکن ہے کہ کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان کے کھیل میں آئندہ ترقی کی گنجائش نہیں۔ منتخب شدہ کھلاڑیوں کو ایک اچھے ٹینس کے معلم کے سپرد کیا جائے اور انہیں ایک سال تعلیم دلائی جائے جس کے بعد انھیں آل انڈیا چمپین شپ میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔ جو بھی اس ٹورنمنٹ میں اچھا کھیلیں ان کی تعلیم جاری رکھی جائے اور جن کی ترقی محدود ہو گئی ہو ان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اس تنظیم کی ابتدا سے تین سال بعد منتخب شدہ کھلاڑیوں کو چار ماہ کے لئے یورپ روانہ کیا جائے لیکن انھیں ڈیوس کپ یا ومبلڈن میں نہ شریک کیا جائے بلکہ وہاں کے چھوٹے ٹورنمنٹوں میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔ اس سے میرا منشاء یہ ہے کہ یہ کھلاڑی وہاں کے موسم کے عادی ہوں اور بڑے کھلاڑیوں کو کھیلتا دیکھ کر تجربہ حاصل کریں۔ اس سفر سے واپسی کے بعد پھر ان کی تعلیم جاری رکھی جائے اور آئندہ سال ڈیوس کپ ٹورنمنٹ میں ٹیم شریک کر کے ان کھلاڑیوں کو یورپ بھیجا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس قسم کی تنظیم سے امید افزا نتائج برآمد ہوں گے۔ ممکن ہے کہ میری بعض تجاویز کو عملی جامہ پہنانے میں رقمی دشواریاں پیش آئیں۔ لیکن یہ دشواریاں ناقابل عبور نہیں۔ بشرطیکہ ہندوستانی انجمنیں اور رؤسا اس میں حصہ لیں۔

(باقی آئندہ)

سید محمد ہادی

محبّت

محبّت باعثِ تخلیقِ آدم — محبّت تخمِ موجوداتِ عالم
محبّت شمعِ بزمِ انبیا ہے — محبّت خضرِ راہِ ربِّ اکرم
محبّت مشعلِ راہِ طریقت — محبّت مسلکِ اقطابِ اعظم
محبّت شیوۂ اربابِ تسلیم — محبّت حاصلِ ماہِ محرم
محبّت رہنمائے پارسایاں — محبّت بحرِ عرفاں ہے مسلّم
محبّت سروِ بستانِ ریاضت — محبّت زخمِ اہلِ دیں کا مرہم
محبّت اضطرابِ دردِ ایوبؑ — محبّت فقرِ ابراہیمِ ادہم
محبت نصفتِ نوشیروانی — محبت فیضِ وجود و بذلِ حاتم
محبت نارِ ابراہیمِ آذر — محبت نذرِ اسمٰعیلِ اکرم
محبت داستانِ کوہکن ہے — محبت قصۂ مجنونِ پُرغم
بقائے دہر کا رازِ نہفتہ — وجودِ خلقتِ خلد و جہنم
زمین و آسماں و دشت و بستاں — اسی لفظِ محبت سے ہے قائم
نہ ہوتی گر زمانے میں محبّت — خدائی کا نہ ہوتا کوئی محرم

بنا کے خلق کا مقصد ہاشمیہ
محبت ہی محبّت ہے مسلّم

لطف النساء بیگم صاحبہ ہاشمیہ

بچوں سے

ایک ماہ بعد ہم آپ سے مخاطب ہیں۔ یہ پرچہ شائد آپ غور سے نہ پڑھیں کیونکہ ہر ایک امتحان کی تیاری میں مصروف ہوگا۔ بھئی مارچ اور اپریل کا مہینہ بڑا سخت ہوتا ہے اکثر امتحانات انہی مہینوں میں ہوتے ہیں۔ آپ میں سے بعض تو فارغ ہو گئے ہوں گے اور بعض ابھی مصروف ہوں گے کوشش کیجئے کہ آپ میں کا ہر ایک امتیاز کے ساتھ کامیاب ہو۔ جو کوئی سب رس کی بھائی یا بہن اپنی جماعت میں اول رہیں، وہ ہمیں اطلاع دیں۔ ہم ان کے نام خوشی کے ساتھ سب رس میں شایع کردیں گے۔ امتحانات سے فراغت پانے کے بعد امید ہے کہ آپ پھر اُسی انہماک کے ساتھ سب رس کی طرف متوجہ ہوجائیں گے۔ اور پھر گرما کی تعطیلات بھی ہیں ان تعطیلات میں آپ کا جو نظام العمل رہے گا اس کی نقل ہمارے ہاں بھیج دینا۔ دیکھیں آپ ان تعطیلات میں اردو کی کیا خدمت کرتے ہیں۔ کہاں کہاں جلسے کرنے والے ہیں اور کتنے اچھے اچھے مضامین سب رس کے لئے لکھنے والے ہیں۔

آپ کی انجمن تو بڑی کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ مہینہ میں کئی بار جلسے ہوتے ہیں وہاں کئی ایک سب رسی بھائیوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ تقریریں ہوتی ہیں، بحث مباحثے ہوتے ہیں۔ ۲۵ر فروری ۱۹۴۰ء کو بھی ایک جلسہ ہوا تھا طلبہ نے اپنے مختلف مضامین پڑھ کر سنائے۔ بعض تو بڑے اچھے مضمون تھے۔ آپ کے اکثر مضمون نگار بھائیوں نے بھی مضامین پڑھے مثلاً عارف علی انصاری۔ خدا بخش وغیرہ۔ خدا بخش نے مبتدی افسانہ نگار ایک مقالہ پڑھا اور محی الدین علی نے جذبۂ حب الوطنی اور عارف علی نے شکر سازی اور عبدالمجید نے تعلیم اور کھیل وغیرہ پر اپنے مضمون سنائے۔ پھر برہان الدین نجم نے اردو پر ایک بڑی عمدہ نظم سنائی جس کو طلبہ نے بہت پسند کیا وہ کسی موقع پر سب رس میں شایع ہوجائے گی اردو سے متعلق ایک اور مضمون محمد علی عادل نے محسنین اردو سنایا۔

ایک مہینے کے لئے جلسے ملتوی کردیے گئے ہیں اس کے بعد اس انجمن کا ایک سہ ماہی جلسہ ہونے والا ہے جس کو کامیاب بنانے کے لئے اراکین ابھی سے کوشش کر رہے ہیں۔ اس موقع پر شائد ایک ڈرامہ بھی ہو۔ غرض اسی طرح کی دلچسپیاں رہیں گی۔ موقع کھونا نہیں۔ یہ جلسہ اپریل کے آخر میں یا مئی کے شروع میں ہوگا۔ اخبارات تو آپ سب پڑھتے ہی ہوں گے اگر گھر میں اخبار نہ آتا ہو تو امتحانات کے بعد یعنی اپریل کے آخر ہفتہ کے اخبارات کسی مطالعہ گھر میں دیکھ لینا۔ تاریخ مقام اور دوسری تفصیلات اخبارات میں شایع ہوجائیں گی اور اگر جب تک سب رس شایع ہوجائے تو بہت آسانی ہے اس میں اطلاع چھپ جائے گی۔ گزشتہ وقت جو معمہ شایع ہوا تھا اس کے انعام کے مستحق اعجاز علی (گرامر اسکول) قرار پائے وہ انعامی کتاب دفتر سے حاصل کریں۔

معین الدین احمد انصاری

لطیفے

۱۔ انسپکٹر جماعت میں سوال کرتا ہے "گدھا صرف نحو میں کیا ہے"؟

خالد نے کہا: "فعل"

انسپکٹر۔ "اس کی گردان کرو"

خالد۔ "وہ گدھا، وہ گدھے، تو گدھا، تم گدھے" اس کے بعد خاموش ہوگیا۔

انسپکٹر:۔ "آگے"

خالد:۔ جناب اس کے چار ہی صیغے ہیں!

سید خواجہ معین الدین

۲۔ والد:۔ تمہارے ماسٹر صاحب کیسے آدمی ہیں۔

لڑکا:۔ اچھے آدمی ہیں لیکن کبھی کبھی جھوٹ بولنے لگتے ہیں۔

والد:۔ وہ کیسے۔

لڑکا:۔ وہ کل کہتے تھے کہ ۵ اور ۵ دس ہوتے ہیں اور آج کہتے ہیں کہ ۴ اور ۶ دس ہوتے ہیں۔

دھرم رام پرشاد (متعلم)

مولوی صاحب کی بیوی نے افسانہ لکھا

مولوی صاحب کی بیوی کو کتابیں اور رسالے پڑھنے کا بے انتہا شوق تھا۔ کئی رسالے جاری تھے۔ ہر مہینے کچھ نہ کچھ کتابیں ضرور آتی تھیں۔

ایک رات کی بات ہے کہ مولوی صاحب کھانے سے فارغ ہوکر سگریٹ اڑانے بیٹھے تھے، اور بیوی ایک نئی کتاب کے مطالعے میں منہمک تھیں۔ یکایک مولوی صاحب کچھ سوچ کر اچھل پڑے، پھر بیوی کی طرف مخاطب ہوکر کہا "سُناتم نے؟"

بیوی نے مولوی صاحب کے جواب میں صرف "جی؟" کہا اور پھر پڑھنے میں مشغول ہوگئیں۔ مولوی صاحب بولے "تم جب اتنی کتابیں اور افسانے پڑھتی ہو تو خود بھی تو کچھ لکھا کرو!"۔

بیوی نے کتاب میز پر ڈال دی، اور سیدھی ہوکر بیٹھ گئیں۔ انھیں خود بھی افسانہ نویسی کا بڑا شوق تھا، جب میاں کی بھی شہ پائی تو پھر کیا تھا! میاں نے پیشین گوئی بھی کی کہ ان کی بیوی نہ صرف اپنی نوعیت کی اچھی، بلکہ ایک مشہور عالم افسانہ نویس ثابت ہوں گی۔ میاں کی زبانی اپنی ہونے والی شہرت کا حال سن کر بیوی پھولی نہ سماتی تھیں۔

چنانچہ دوسرے ہی دن سے افسانہ کی تیاری شروع ہوگئی۔ خوبصورت جلد، اور عمدہ کاغذ کی ایک بیاض منگوائی گئی، فونٹن پن خاص طور پر خرید اگیا، صورت پر ذرا اکڑ بھی زیادہ پیدا ہوگئی، اور دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی افسانہ لکھنے بیٹھ گئیں۔ آٹھ، دس رسالے سامنے رکھ لئے، شاید اس لئے کہ موقع نہ بنے تو ایک آدھ افسانہ آج خواہ چُراکرہی لکھیں، مگر ضرور لکھیں۔

پلاٹ سے پہلے عنوان پر غور وفکر شروع ہوئی۔ خدا خدا کر کے عنوان ذہن میں آیا۔ خوشی سے اچھل پڑیں، اور جھٹ سے اُسے لکھ لیا۔ اتنے میں مولوی صاحب بھی باہر سے آئے۔ آتے ہی بیوی سے پوچھا۔ "کیوں، افسانہ لکھا؟"

" اَے ہے، ابھی تو بیٹھی ہوں! عنوان تو ہوگیا ہے، اب صرف افسانہ باقی ہے سو یہ کون بڑی بات ہے!"

میاں نے بھی عنوان دیکھا۔ بے انتہا خوش ہوئے، اور کہا "بھئی، عنوان تو خوب ہے! افسانہ بھی کچھ ایسا ہی لکھو تو بات ہے!" بیوی ایک وقار سے بولیں "ہو جائے، تب دیکھ لینا!" اور پھر افسانہ لکھنے میں مشغول ہوگئیں۔

یہ ادہر افسانہ لکھ رہی ہیں، ادہ میاں اُدہر دیوان خانے میں بیٹھے دوستوں سے کہ رہے ہیں کہ "بیگم آج افسانہ لکھ رہی ہیں۔ عنوان تو لکھ ہی ڈالا! واللہ خوب ہوا ہے حالانکہ یہ پہلی کوشش ہے!" دوست سب جانتے تھے،

پھر بھی، ہنسی کو ضبط کر کے، کہا "مولوی صاحب، تو پھر ہمیں بھی منہ ور دکھانا!"

مولوی صاحب خوش ہو کر بولے "ضرور، ضرور!"

ایک: "گر مولوی صاحب یہ تو بتائیے کہ کونسے رسالے میں چھپوائیے گا؟"

مولوی صاحب: "بھئی، تم ہی بتاؤ کہ کونسے رسالہ میں چھپوایا جائے؟"

دوسرا: "مولوی صاحب، میرا تو خیال ہے کہ "ساقی" "ہمایوں" یا "سب رس" میں چھپوایا جائے کیونکہ وہ بہت مشہور پرچے ہیں!"

تیسرا: "ارے لاحول ولا! یہ تو صرف بڑ ہے! ورنہ یہ اردو پرچے بھی بھلا کوئی پرچے ہیں کہ جن میں آپ کی بیوی کا افسانہ چھپایا جائے میرا تو خیال ہے کہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرا کے "ٹائمس آف انڈیا" (Times of India) یا "السٹریٹڈ ویکلی" (Illustrated Weekly) میں چھپوا دیا جائے!"

غرض، ہر ایک کی ایک ایک رائے تھی کہ اتنے میں ایک اور صاحب آدھمکے۔ انھوں نے جو یہ قصہ سنا، نئی ہی سنائی کہ "واہ صاحب، خوب رہی! محنت کریں ہم اور مشہور ہوں رسالے! بھلا کیا ضرور ہے کہ رسالوں میں ہی چھپوایا جائے۔ مولوی صاحب کچھ ایسے کنگال، محتاج تھوڑی ہیں کہ بیوی کے افسانہ پر کچھ روپے بھی نہ صرف کر سکیں۔ سچ پوچھئے تو، مولوی صاحب، میری رائے یہ ہے کہ ایسے افسانہ کی اگر صحیح معنوں میں قیمت بڑھانی ہے تو بس اُسے کتابی صورت میں شایع کرا دیجئے، پھر دیکھئے کہ شہرت کے ساتھ دولت بھی آپ کی بیوی کے قدم چومتی ہے یا نہیں!"

مولوی صاحب کو بات پتہ کی لگی، لہذا پھول کر کپّا ہو گئے، اور ادہران مسخروں نے بھی ارادہ کر لیا کہ مولوی صاحب کی بیوی کا افسانہ چھپوا کر ان کا اور ان کی بیوی کا ایک نیا مذاق اڑایا جائے۔

مولوی صاحب گھر میں آئے تو بیوی کو افسانہ لکھنے میں مشغول پایا۔ خوشی سے کہا "لاؤ تو دیکھیں!"

آدھے سے زیادہ لکھ چکی تھیں، بولیں "اُئے، ایسی بھی کیا جلدی ہے، ذرا پورا تو ہونے دیجئے!"

اور لیجئے، پورا بھی ہوگیا۔ مولوی صاحب نے دیکھا۔ جی کھول کر تعریف کی، دوستوں سے کرائی، بیوی کو سنائی، اور طے پا ہی گیا کہ افسانہ کو کتابی شکل میں شایع کیا جائے۔

دوسرے دن پھر دوست آئے، بڑی خوشی سے پھر دکھایا، ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے ایک نے کہا "واللہ، مولوی صاحب، خوب افسانہ ہوا ہے۔ حقیقت میں افسانہ اسے کہتے ہیں!"

ایک نے بن دیکھے ہی کہہ دیا " مولوی صاحب، اگر کچھ اصلاح وغیرہ کی ضرورت ہو تو یہ بندہ حاضر ہے!"

تیسرا " میں کتاب کا سرورق اپنے ڈرائینگ ماسٹر دوست سے تیار کرا دوں گا!"

چوتھا " مولوی صاحب اگر خاکسار کو اس قابل سمجھیں تو مقدمہ میں لکھ دوں گا!" مولوی صاحب خندہ پیشانی سے بولے "کیوں نہیں، ضرور، ضرور!"

ایک اور بولا " مولوی صاحب چھپائی کا کام میرے ذمے!" آخری صاحب اٹھے اور بولے " مولوی صاحب کہاں کے اس جنجال میں پھنس کر آپ اس افسانہ کی مٹی پلید کرنے چلے ہیں! مجھ سے پوچھئے تو نہ میں اس میں اصلاح کی ضرورت سمجھتا، نہ سرورق کی، نہ مقدمہ کی، اور نہ چھپائی کی! سب سے بہتر تو یہ ہے کہ آپ ایک اعلان نکال دیجیے کہ میری بیوی نے ایک شاہکار افسانہ لکھا ہے، اور بس! جس کو ضرورت ہو، وہ آپ آکر نقل کر لے گا، ورنہ جھک مارے!"

غرض، مولوی صاحب سب کی سنتے گئے، اور خوش ہوتے گئے۔ گھر میں آکر بیوی سے دوستوں کی تعریف کا ذکر کیا اور مسکراتے ہوئے بولے "مختصر یہ ہے، بیگم کہ میں اور تو ہی کیا، ایک دنیا اس افسانہ کو نایاب سمجھتی ہے! اور میرا خیال ہے کہ چھپنے کے بعد تمہارے افسانہ کی قیمت ۱۴؍ رکھی جائے۔ امید ہے کہ ہاتھوں ہاتھ کتاب فروخت ہو گی!"

مولوی صاحب نے اپنے اس خیال کو دوستوں پر بھی ظاہر کیا،

ایک نے کہا "مگر مولوی صاحب چودہ آنے قیمت تو بہت ہو گی، کیونکہ افسانہ تو بالکل مختصر ہے!"

دوسرے نے جواب دیا "تو یہ کون بڑی بات ہے! اس کی ترکیب یوں ہو سکتی ہے کہ افسانہ کو موٹے حروف میں لکھوا کر کتاب کا حجم بڑھا دیا جائے!" سب نے یک زبان ہو کر مان لیا کہ "ترکیب تو خوب ہے!"

تیسرا " مگر مولوی صاحب کتابوں کی تعداد کیا ہو گی؟ میں سمجھتا ہوں، ایک ہزار کافی ہے!"

چوتھا " ایک ہزار تو ہندوستان میں پڑھنے والے ہی نہ ہوں گے، اور آپ ایک ہزار کتابیں چھپائیں گے! بھئی حماقت کی بھی انتہا کر دی!"

تیسرا " اس میں حماقت کی کیا بات ہے؟ ایک ہزار پڑھنے والے نہیں، تو نہ ہوں۔ کتابیں سڑ تھوڑی جائیں گی! اب نہیں تو آئندہ نسلوں کے کام آئیں گی۔ آخر، ایسی چیزیں بار بار تھوڑی نصیب ہو سکتی ہیں!"

چوتھا " ہاں بھئی، یہ بھی ٹھیک کہی!"

شکر ہے کہ سب مرحلے طے ہو گئے، اور اب ایک صاحب نے (جن کے ذمہ چھپائی کا کام تھا) مولوی صاحب سے کہا کہ وہ چالیس روپے دے دیں تاکہ جلد سے جلد کتاب چھپائی جا سکے۔

مولوی صاحب روپیہ دے کر گھر میں آئے، اور بیوی سے کہا " بھئی، سنا تم نے؟ کتاب کی قیمت چودہ آنے طے ہو گئی ہے، تو اب یہ بھی طے ہو جانا چاہیے کہ سات آنے تمہارے، اور سات آنے ہمارے!"

بیوی ٹھنک کر بولیں " اے، واہ! یہ اچھی بات ہے! ہماری محنت کدھر گئی؟"

مولوی صاحب کہنے لگے " اور ہمارے پیسے کدھر گئے؟"

کہا" ایسے کیا پیسے ہو گئے ہوں گے! زیادہ سے زیادہ چار یا پانچ روپیہ ہوئے ہوں گے! سو کتاب کی قیمت آنے پر میں دے دوں گی!"

مولوی صاحب اچھل کر بولے "کیا کہا! کہیں اسی خواب میں نہ رہنا! پورے چالیس روپے اٹھے ہیں۔ پورے چالیس روپے! سمجھیں؟"

آثار ایسے تھے کہ شاید تکرار کی نوبت آجاتی، مگر آخر میں مولوی صاحب ہی نے یہ کہہ کر بیوی کو خاموش کر دیا کہ "اچھا بھئی، تمھارے نو آنے اور ہمارے پانچ آنے!"

اب مولوی صاحب کے پاس سنہری چھوٹی سی خوبصورت جلد کی کتابیں آگئی ہیں۔ مولوی صاحب ہاتھ میں ایک کتاب لئے گویا اچھل رہے ہیں، اور جو ان کے پاس آتا ہے اس کو بڑے شوق سے دکھاتے ہیں۔ لوگ ان کے ہاتھ سے کتاب لے کر دیکھتے ہیں، اور سرورق یا لکھائی کی تعریف کرتے ہوئے واپس کر دیتے ہیں، مگر کوئی خریدتا نہیں!۔ کیوں؟ —

جوہر کی قدر جوہری جانے!۔ انھیں کیا خبر کہ افسانہ کس پایہ کا ہے!۔ افسوس ہے کہ ہمیں بھی پورا پڑھنے کا موقعہ نہ ملا، البتہ پہلے ہی جملوں کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ غضب کی جدت ہو گی۔ تمطراز ہیں:۔

"ایک چوہا باڑی باڑی پھرتا تھا......"

مولوی صاحب کے اس نادر افسانے کے جتنے نسخے شایع ہوئے تھے وہ سب کے سب مولوی صاحب کی الماری میں نہایت سلیقہ سے چنے ہوئے ہیں۔ البتہ چند نسخوں کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ مولوی صاحب اور ان کی بیوی نے تحفتہً اپنے اپنے خاص احباب کی خدمت میں پیش کئے تھے۔

مولوی صاحب نے اخباروں میں افسانے کے اشتہارات بھی دیئے مگر افسوس ہے کہ سب بے سود!

ادہر مولوی صاحب کی بیوی کو افسانہ ناکام ثابت ہونے کا ملال تھا، تو ادہر مولوی صاحب کو اپنے چالیس روپیہ جانے کا افسوس۔ ایک دن مولوی صاحب کی بیوی کو لوگوں کی اس بدمذاقی پر غصہ آیا تو پوری کتابیں صحن میں ڈال کر آگ لگادی۔

افسانہ کی خاک اڑ چکی ہے، اس واقعہ کو عرصہ گزر چکا ہے، اور شاید بیوی کے لئے افسانہ کی ناکامی کا ملال بھی پرانا ہو گیا ہو، مگر مولوی صاحب کو اب بھی اپنے چالیس روپیوں کا داغ ہوگا، کہ افسانہ سے زیادہ ایک حقیقت معلوم ہوتا ہے!

صاحبہ جہدوی

آج کا دن نہ کیجئے ضایع — کیجئے کل کے واسطے ساماں
حیف اگر ہم نے آج کچھ نہ کیا — ہوگا حاصل نہ کچھ بجز حرماں
رنج و غم کا شکار اگر ہو جائے — دل شکستہ مگر نہ ہو انساں
پر نہ سمجھے کہ کچھ نہیں حاصل — غیر اندوہ و حسرت و حرماں
شبِ تاریکِ غم میں ہیں اکثر — لوگ مصروفِ نالہ و افغاں
خون کے آنسوؤں سے تر ہے زمیں — اور ہے آنکھوں سے سیلِ اشک رواں
چاہیے اُن کو یہ سمجھ رکھتیں — صبحِ عشرت ضرور ہوگی عیاں
خاتمہ اس غم و الم کا ہے — نہیں رنج و الم یہ بے پایاں
تخم ریزی ہم آج کرتے ہیں — کل ہے امیدِ آبِ باراں
ہمت اپنی اگر نہ ہاریں ہم — مشکلیں ہو رہیں گی سب آساں
کھیت پر گر برس پڑیں اُولے — پھر دوبارہ رہیں گے ہم کوشاں
کرتے ہیں آج طے بیاباں ہم — کل ہے امیدِ سبزۂ بُستاں
چاہیے تم کو اے جواں مردو! — کھوئیں ہرگز نہ اپنی عزت و شاں
ہو دلیرانہ زندگی میں بسر — ہے جواں مردوں کو یہی شایاں
رہتے ہیں جس طرح میانِ غلاف — تیغِ مسلول و خنجرِ بُرّاں

فتح محنت کے ساتھ ہے فیاضؔ
جس طرح ساتھ جیب کے داماں

ابوالفیض فیاض (دیوکنڈہ)

نظام الملک آصفجاہ اوّل اس مختصر کتاب میں نظام الملک آصفجاہ اول کے مجمل حالات و مستند واقعاتِ زندگی نہایت سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے گئے ہیں ادارہ دوسرے سلاطینِ آصفی کے سوانح حیات بھی تیار کر رہا ہے۔
اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھنا چاہیے۔
مصنفہ مولوی شیخ چاند مرحوم ایم اے ایل ایل بی (ریسرچ اسکالر) قیمت ۴ر

چوہے ماموں

رمیش سہ پہر کو مدرسے سے واپس آکر کچھ تھوڑا بہت ناشتہ کرنے کے بعد ٹینس کھیلنے چلا جاتا۔ جو اس نے ابھی ابھی شروع کیا تھا۔ ٹینس کھیل کر گھر آتا اور ۸ بجے تک اسکول کا کام کرتا پھر کھانا کھانے کے بعد ایک گھنٹے تک اخبار میں مقامی خبریں پڑھتا یا کسی دلچسپ اور نصیحت آمیز کہانی سے اپنا دل بہلایا کرتا اور جب گھڑی نو بجاتی تو وہ سونے کے وقت کا لباس پہن کر سو جایا کرتا تھا۔

ایک روز رمیش کے دوست نے کہا "رمیش آج کل ایک اچھا کھیل آیا ہوا ہے جس کی کہانی ہم اپنی انگریزی کتاب میں بھی پڑھ رہے ہیں۔ دیکھنے چلوگے۔" رمیش نے کہا "اچھا چلو" غرض رمیش کھیل دیکھ کر آیا اور سونے میں دیر ہو گئی۔ گیارہ بجے تھے رمیش نے ہر چند سونے کی کوشش کی۔ مگر نیند نہ آئی۔ بارہ بج گئے پھر بھی اس کو نیند نہ آئی۔ جب وہ نیند سے بالکل مایوس ہوگیا تو اس نے ایک کتاب کھولی اور پڑھنا شروع کیا۔ ایک بجا پھر دو بجے رمیش کتاب ہی پڑھتا رہا۔ اس کے کمرے میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا صرف میز پر ایک موم بتی جل رہی تھی۔ ہر روز رمیش صبح کے لئے ایک گلاس میں دودھ رکھ لیا کرتا تھا۔ کوئی تین کا عمل ہوگا۔ ایک آواز کان میں آئی رمیش نے فوراً ہی دھیان نہ دیا۔ پھر دوبارہ اسی قسم کی آواز آئی اور ساتھ ہی چیزوں کے گرنے کی گھڑگھڑاہٹ بھی سنائی دی۔ اس وقت رمیش کی آنکھ لگ رہی تھی گھبراہٹ سے جلد اٹھ بیٹھا آنکھوں کو ملتا ہوا ادھر اُدھر دیکھنے لگا مگر کوئی نتیجہ اخذ نہ کر سکا۔ اس نے خیال کیا کہ میں ضرور کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اور اطمینان ہونے کے بعد سو گیا۔

دوسرے روز جب رمیش حسب معمول سویا تو پھر آواز آئی مگر رمیش کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔ صبح اٹھا تو اس نے دیکھا کہ دودھ کم ہے رمیش نے خیال کیا کہ نوکر نے کم رکھا ہوگا۔ پھر اس نے اطمینان کرنے کے لئے نوکر سے پوچھا۔ "کیوں کیا بات ہے رات کیوں تم نے میرے لئے دودھ کم رکھا؟" نوکر گھبرا گیا اس کی بھی سمجھ میں نہ آیا کیونکہ رمیش نے کبھی اس سے اس قسم کے سوال نہیں کئے تھے کہنے لگا۔ "حضور! میں نے تو گلاس پورا بھرا ہوا رکھا تھا۔" رمیش خاموش ہوگیا اور مدرسہ چلا گیا۔ رمیش نے اپنے دماغ پر بہت زور دیا کہ معلوم کرے کیا بات ہو سکتی ہے مگر وہ بالکل معلوم نہ کر سکا ایک ہفتہ اسی طرح گزرا۔ کبھی دودھ کم ہوتا اور کبھی آوازیں آتیں جس سے اس کی آنکھ کھل جاتی۔

ایک رات رمیش نے اپنے کمرے کی بجلی جلا رکھی اور سو گیا۔ نیند اسے بالکل نہ آئی پھر اس نے کتاب لے کر پڑھنا شروع کیا۔ یکایک ایک آواز آئی۔ اس نے دیکھا ایک سیاہ چیز گلاس کے طرف بڑھی آ رہی ہے۔ پھر دوبارہ اس نے دیکھنے کی کوشش کی تو نظر نہ آئی۔ اور غائب ہو گئی پھر نہ تو آواز آئی اور نہ وہ سیاہ چیز دکھائی دی۔

صبح رمیش اسی کشمکش میں اٹھا تو کیا دیکھتا ہے کہ گھر کی بلی "چوہے ماموں" کو منہ میں دبائے کمرے سے نکل رہی ہے۔ رمیش کی سمجھ میں آیا کہ یہی حضرت رات میں مجھے دکھائی دیئے اور فوراً رفو چکر ہو گئے تھے۔ رمیش کو دوبارہ ایسا سابقہ نہ پڑا۔ مگر جب کبھی "چوہے ماموں" کا خیال آتا تو وہ اپنی ناسمجھی اور نادانی پر ہنستا اور خوب ہنستا۔

راجہ جتیندر پرشاد جوہر

ننھا بچہ

بھائی بہنو! دنیا میں بہت سی عجیب چیزیں ہیں لیکن کبھی آپ نے یہ بھی خیال کیا کہ انسان کے بچہ سے زیادہ بھی کوئی عجیب چیز ہے؟ نہیں۔ کیوں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انسان سے زیادہ کوئی اتنا بے بس پیدا نہیں ہوتا اور انسان سے زیادہ کسی اور کو اپنی ابتدائی زندگی میں یار و مددگار کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس میں شک نہیں، ماں باپ (خاص طور پر ماں) بچہ کی ابتدائی زندگی کے نگہبان و رہبر و معلم ہیں لیکن ہماری آج کل کی زندگی نے جس کو چاہے آپ مصنوعی زندگی کہیں، حالات بدل دئے ہیں۔ بے شک قدرت نے بقائے زندگی کے لئے بہت سے انتظامات کر رکھے ہیں لیکن جب سے انسان قوانینِ قدرت کے راز دریافت کرنے کی کھوج میں لگ گیا ہے اور اس کو قدرت سے جنگ کرنی پڑی ہے، چاہے وہ قدرت پر کتنا ہی قابو حاصل کرتا جائے مگر ہماری معاشرتی زندگی کے قدیم ڈھانچہ پر یکے بعد دیگرے ایسی کاری ضرب لگی ہے کہ اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ زندگی روز بروز پیچیدہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ خاندان ملت میں اور ملتیں قوم میں جذب ہو رہی ہیں۔ قوم انسانی برادری کا دامن پکڑ رہی ہے۔ ذاتی فرائض اور ذمہ داریاں، قومی فرائض اور ذمہ داریاں بن گئی ہیں۔ ماں باپ کی جگہ مدرس نے لی تھی اب مدرس حکومت کا ایک کارندہ بن گیا ہے۔ بچہ ماں باپ کی ملکیت سے نکل کر قوم کی بہترین ملک اور سرمایہ ہو گیا ہے۔

اگر آپ کو کسی قوم کی تہذیب اور شایستگی کا معیار معلوم کرنا ہے تو اس کے بچوں کی دیکھ بھال، تعلیم و تربیت کے انتظامات دیکھئے، انگلستان یورپ اور امریکہ کی حکومتیں تو اپنے بچوں میں اتنی دلچسپی لیتی ہیں کہ ان کی اور ان کی ماؤں کی نگرانی میں ایک دوسرے کو مات کرتی ہیں۔ ہر حکومت ہر سال اپنے بچوں کی ترقی اور سکھ چین کے لئے برابر قوانین بناتی اور طرح طرح کے انتظامات کرتی رہتی ہے۔ ان کی بہتری پر روپیہ خرچ کرنے سے کبھی نہیں چوکتی۔ کسی انگریز نے کیا خوب کہا ہے کہ اگر کسی نے بچوں پر روپیہ صرف کرنے میں ذرا بھی بخل کیا تو قوم کو بڑا بھاری نقصان اٹھانا پڑے گا۔ جو انگریز روپیہ کو بچوں سے زیادہ سمجھتا ہے وہ ہرگز انگریز کہلانے کے لائق نہیں ہے۔ ان ممالک کے پیشواؤں اور حکومتوں کو خصوصاً جنگِ عظیم کے بعد یہ راز معلوم ہو گیا ہے کہ ملک کی ترقی اور بچوں کی صحت تعلیم و تربیت میں ایک خاص قسم کا تناسب ہے اور بلا لحاظ ذات پات اور مذہب اور ملت ہر بچہ برابر ہے۔ جس قدر بچوں کے دماغ روشن اور جسم مضبوط ہوتے ہیں اسی قدر ملک کی دولت ثروت اور قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

چنانچہ گزشتہ دس بارہ برس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ بچوں کے حقوق کے متعلق منشور یعنی چارٹر ترتیب دئے گئے۔ خواتین کی بین الاقوامی کونسل نے ۱۹۲۲ء میں سب سے پہلا منشور اطفال ترتیب دیا۔ اس میں مختلف عنوانات کے تحت تفصیل سے یہ بتلایا گیا ہے کہ بچہ کے کم سے کم حقوق کیا ہیں۔ یہ منشور اس قسم کا قرار دیا گیا ہے کہ مقامی حالات کے مدنظر مناسب ترمیم کے بعد یہ ہر قوم کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے۔
بہتیری قوموں نے اس کو منظور کر لیا ہے لیکن جہاں تک میرا علم ہے ان اقوام میں ہندوستان کا نام شریک نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ لیگِ اقوام نے صرف اس منشور پر اکتفا نہیں کیا۔

اس نے بچوں کی سیوا کے لئے ایک مستقل کمیٹی قایم کردی جس کا
فرض یہ ہے کہ بچوں سے متعلقہ قوانین اور ضوابط یکجا کرے
ان کے نفاذ وغیرہ کے بارے میں مواد فراہم کرے' بالک سیوا
کی مقامی اسکیمات اور مسایل کی چھان بین اور بین الاقوامی
اہمیت کے معاملات پر توجہ کرے اور کانفرنسوں وغیرہ میں
سوچ بچار کے لئے پیش کرے۔

واقعہ یہ ہے کہ بچہ کی بین الاقوامی حیثیت تسلیم ہوجانے
کے باعث ہر ملک پر چاہے اس کی حالت کتنی ہی گری ہوئی
ہو' بڑا بھاری اثر ہوا۔ ایسے ممالک میں جہاں پہلے سے کچھ
نہ کچھ ہو رہا تھا وہاں بھی زیادہ جدوجہد شروع ہوگئی اور مردہ
تحریکات میں جان پڑگئی۔ ممالک متحدہ امریکہ نے اپنے وسیع
محکمہ تعلیمات کو اس اہم کام کے لئے ناکافی سمجھ کر ایک خاص
([illegible] Born) محکمہ اطفال قایم کیا۔ اگر
چند پیش پیش ممالک ہی کی کیفیت پیش کی جائے تو بہت وقت
درکار ہوگا اس لئے میں یہ مناسب خیال کرتا ہوں کہ ذرا
تفصیل سے صرف انگلستان ہی کے اس بنیادی قانون کا ذکر
کروں جس کا اثر نہ صرف سلطنت برطانیہ بلکہ اور ممالک پر بھی ہوا۔

یوں تو تعلیمی ضوابط خصوصاً جب کہ وہ جبری کر دئے
جائیں یہ ظاہر کرتے ہیں کہ پھر بچوں کی حد تک چنداں تشویش
کی ضرورت نہیں ہے لیکن انگلستان نے ابتدائی تعلیم مفت
اور جبری کرنے کے تقریباً چالیس سال کے بعد یہ محسوس کیا کہ
. . . . . مقصد تعلیم کے لئے صرف یہ عمل کافی نہیں ہے
چنانچہ ۱۹۰۸ء میں قانون اطفال منظور و نافذ ہوا جس کے
بموجب ہر وہ شخص قابل سزا قرار دیا گیا جو بچہ کو کافی غذا اور
کپڑا نہ دے' اس کا علاج نہ کرائے اور رہائش کا موزوں
انتظام نہ کرے۔ اگر والدین اپنی غفلت کی پاداش میں سزا پاجائیں
تو ایسی صورت میں ان کا بچہ کسی اور کی سرپرستی میں دیا جائے
لیکن اس کے اخراجات کا بار والدین ہی پر ڈالا جائے' اگر
والدین نشہ باز ہوں یا مجرمانہ خصلتیں رکھیں تو بچہ کو ان سے
علحدہ کرکے صنعتی مدرسہ میں روانہ کیا جائے جن کے قیام اور
اخراجات کے متعلق مزید قوانین ہیں۔ اس کے علاوہ بچہ سے
برے برتاؤ اور غفلت کو قابل دست اندازی پولیس۔ انتظامی
کمیٹی یا انجمن ہی کو قرار نہیں دیا بلکہ ہر ہمدرد شخص کو والدین
اور سرپرستوں وغیرہ کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا مجاز گردانا گیا۔
چھ برس سے کم عمر کو تمباکو فروخت کرنا چاہے وہ کسی دوسرے
ہی کے لئے ہو۔ ۱۴ برس سے کم عمر سے کوئی چیز رہن لینا۔ پانچ
برس سے زیادہ عمر کی تعلیم میں مانع ہونا' پانچ برس سے کم
عمر کو ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر کوئی نشہ کی چیز دینا یا شراب خانوں
میں آنے دینا' قابل سزا قرار پایا اور باشندگان حیدرآباد
کے لئے جہاں سات آٹھ ہزار سے زیادہ ہٹے کٹے فقیر موجود
ہیں یہ امر زیادہ دلچسپی کا باعث ہوگا کہ اگر کوئی بچہ بھیک
مانگے تو اسی قانون کے بموجب والدین یا سرپرست کو قابل سزا
ٹھیرایا گیا اب تک میں نے جو کچھ حکومت کی کارروائیوں کے
بابت عرض کیا اس سے محض یہ نتیجہ نکال لینا کہ ماں باپ رہی
سہی ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو گئے ہرگز صحیح
نہ ہوگا۔

اُن پر درحقیقت' سماج (So[illegible])
کے رکن ہونے کی حیثیت سے اور زیادہ ذمہ داری عاید
ہوجاتی ہے اور جو لاولد ہیں وہ بھی اتنے ہی بچہ کی فلاح
بہبود کے ذمہ دار ہوتے ہیں جن حکومتوں نے بچے کی

فلاح و بہبود کو تمام تر اپنے ذمہ لیا وہ نہ صرف واقعات اور حالات سے مجبور ہوگئی تھیں بلکہ نوع انسان کے خدمت گزاروں نے، جن کی آئے دن مثالیں انگلستان یورپ و امریکہ ہی کے افراد پیش کرتے رہتے ہیں، انجمن قایم کرکے اپنے ہم قوم اور حکومت دونوں پر اپنی خدمت گزاری سے ثابت کر دکھایا کہ کس قسم کے انتظامات اور قوانین لازمی اور ضروری ہیں۔ شاید آپ نے سنا ہو کہ ایک بین الاقوامی انجمن محافظ اطفال (Save the Children) کے نام سے قائم ہے اس کا مستقر جنیوا میں ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ بلا لحاظ سیاسی یا مذہبی عقائد، جس ملک میں بھی ہو بچہ کو خرچ کی تنگی اور مصیبتوں سے محفوظ رکھے۔ یہ ایک بالکل خانگی انجمن ہے جس نے ۱۹۱۹ء سے اب تک تین کروڑ روپیہ سے زیادہ چندہ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے فراہم کرلیا ہے۔
اس کی شاخیں سلطنتِ برطانیہ اور ایسے ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں جہاں انگریز آباد ہیں۔ اس کی پینتیس۳۵ شاخیں دوسرے ممالک میں بھی قایم ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ آیا اس کی کوئی شاخ ہندوستان میں بھی ہے، بہرحال ہمارے ملک میں اس کی شاخ قایم کرنے میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ درجنوں انجمنیں ایسی ہیں جو معذور یا غریب بچوں کی مدد کرتی ہیں بیمار بچوں کو بعد صحت تازہ ہوا اور اچھی غذا کا موقع دیتی ہیں اور حکومت سے مدد لئے بغیر اپنے نیک فرائض کو انجام دیتی ہیں۔ میرے ہم پیشہ سننے والوں کی زیادہ دلچسپی کا باعث غالباً انگلستان کی وہ انجمنیں ہوں جو نادار بچوں کو تعطیلات میں سیر و سیاحت کراتی ہیں۔ ایک انجمن (Children's Fresh Air Mission) کے نام سے ہی اس کا مقصد ظاہر ہے۔ اسی قسم کی دوسری انجمن (Children Country Holiday Fund) ہے۔ ابتدائی مدارس کے ساتھ ساتھ نگہبان کمیٹیاں ہیں جن کے اراکین نہایت مستعدی سے ان تمام فرائض کو پوری طرح انجام دیتے ہیں جو فرض شناس اور تعلیم یافتہ والدین کو دینے چاہئیں۔ اب میں ایک اور خانگی انجمن کا ذکر کرکے اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔ یہ فرانس کی مشہور خانگی انجمن (Caisses des Ecoles) ہے۔ اس کی حیثیت بالکل خانگی ہے۔ لیکن یہ محکمۂ صفائی یعنی بلدیہ سے مل جل کر کام کرتی ہے۔ اس کے صدر وغیرہ اکثر اراکین صفائی یعنی بلدیہ ہوتے ہیں اور محکمہ صفائی کی طرف سے اس کے حسابات کی تنقیح ہوا کرتی ہے۔ یہ نادار اور مفلس بچوں کو غذا بہم پہونچانے کے علاوہ ان کے لئے کپڑے لتے کا انتظام کرتی ہے۔ بچوں کے لئے خاص شفاخانے قایم کرتی اور حمام خانے بناتی ہے۔ تعطیلات میں ان کو صحت بخش مقامات کی سیر کراتی ہے۔ یہ شہر پیرس کے ہر محلہ میں قائم ہے جن محلوں میں نادار بچوں کی کثرت ہے وہاں ایک مستقل تنخواہ یاب عملہ رکھا جاتا ہے۔ جو صبح سے شام تک کام کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس عملہ کی تنخواہ برائے نام ہوتی ہے۔ کیونکہ وہی لوگ اس خدمت کو اچھی طرح سے انجام دیتے ہیں جو ایثار کا مادہ رکھتے ہیں اور محض بچوں کی سیوا کو روپیہ آنہ پائی کے معاوضہ سے زیادہ اہم تصور کرتے ہیں۔ مدارس میں بچوں کو جب گیارہ بجے وقفہ ملتا ہے تو اس انجمن کے کارپرداز مدرسہ کے تالار یعنی ہال کے ڈسکوں پر دسترخوان بچھا کر، کھانے کا کمرہ بنا دیتے ہیں۔ ہر بچہ کے لئے دھات کے برتن چمچے اور نپکن رکھ دئے جاتے ہیں۔ اسی تالار میں ایک طرف

ہاتھ دھونے کے سیلابے ۱۸ سے ۲۰ انچ اونچے نصب رہتے ہیں۔ جن میں بچے کھانے سے پہلے ہاتھ منہ دھوتے ہیں جو بہت کمسن ہوں ان کے منہ ہاتھ خدمت گذارہ دھلاتی ہیں صابن تولیہ وغیرہ بھی انجمن کی طرف سے دیا جاتا ہے۔ مدرسہ کا عملہ کام میں ہاتھ بٹاتا ہے۔ ہر بچہ کو ابلا ہوا گوشت یا قیمہ اور ترکاریاں دی جاتی ہیں اور یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ ہر قسم کی ترکاریاں بدل بدل کر دی جائیں۔

خدمت گذارہ کا فرض ہے کہ بچوں کو پیٹ بھر کھانا کھلائے لیکن اس کے ساتھ اس کی نگرانی رکھے کہ بچے جھوٹا کھانا چھوڑ کر نہ اٹھ کھڑے ہوں عموماً بچے اپنے ساتھ گھر سے دودھ یا شربت لاتے ہیں۔ لیکن جو اس کی بھی استطاعت نہ رکھتے ہوں ان کی سربراہی انجمن کرتی ہے۔ کھانے پینے کا جو سامان خریدا جاتا ہے اس کی مشیر طبی نگرانی کرتا ہے۔

اس انجمن کے تمام اخراجات چندہ سے چلتے ہیں۔ محلہ کا ہر شخص کچھ نہ کچھ مدد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اراکین انجمن جلسے اور نمایش وغیرہ کر کے اچھی خاصی رقم فراہم کر لیا کرتے ہیں مثلاً پیرس کے ایک محلہ کی انجمن نے عارضی طور پر محکمہ صفائی سے افتادہ اراضی حاصل کر کے اس پر نمایش گاہ قائم کی اور کامیابی کے ساتھ کافی رقم جمع کر لی میں نے اب تک جو کچھ عرض کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

۱۔ بچہ بلا لحاظ مذہب، ملک اور قوم کی حیات کے مد نظر محض والدین یا سرپرست کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اس کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت کا دخل ضروری ہے۔

۳۔ محض ابتدائی تعلیم کا لزوم ناکافی ہے۔

۴۔ حکومتی احکامات کی تکمیل بلا جبر سرکاری امداد پوری نہیں ہو سکتی۔

لہذا میری درخواست ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص طبقۂ نسواں اس مسئلہ پر خاص طور پر توجہ فرمائے۔ موجودہ انجمنیں جن کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ اپنے دائرۂ عمل میں وسعت پیدا کریں۔ ایسی خواتین جو موجودہ انجمنوں میں شریک نہیں ہیں ایک نئی انجمن محض بالک سیوا۔ بہبودی اطفال کے لئے قائم فرمائیں۔ محلہ محلہ اس کی شاخیں کھولیں: بچوں کو غفلت، ظلم و آوارگی سے بچائیں اور ان کو اپنی کم سنی کے زمانے کو اطمینان اور خوشی سے بسر کرنے کا موقع دیں تاکہ وہ آئندہ چل کر اچھے شہری اور وفادار رعایا بنیں اور ہماری بہنیں یہ ثابت کر دیں کہ پردہ نشین خواتین بھی انسانیت اور خدمت گزاری میں یورپ کی آزاد منش خواتین سے پیچھے نہیں ہیں۔

(تقریر حیدرآباد ریڈیو)

سجاد مرزا

محرم نامہ

سانحہ کربلا کے متعلق مضمونوں، مرثیوں، سلاموں، نوحوں اور تصویروں کا عظیم الشان مجموعہ۔ آج تک ایسا محرم نامہ شایع نہیں ہوا اس کے محققانہ اور ادیبانہ مضامین میں واقعات کربلا اور فلسفۂ شہادت پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے اور تقریباً پچاس شعرا کے مرثیوں، نوحوں اور سلاموں کو تاریخ وار شایع کیا گیا ہے۔ مرثیہ گو شعرا اور مجالس کی نایاب تصویریں شامل ہیں۔ مجلسوں میں تقسیم کرنے کے لئے اس سے بہتر تحفہ یا تبرک اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

تعداد صفحات (۱۱۲) تعداد تصاویر (۹) قیمت مجلد (عہ)

اخبار اور رسالے

بچو! تم میں سے بہت سے ایسے لڑکے ہوں گے جو اخبار کے معنی نہ سمجھتے ہوں گے، سنو، اخبار خبر کی جمع ہے۔ اس لحاظ سے خبروں کا ذخیرہ یا مجموعہ اخبار کہلائے گا۔

اخبار کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ جو اخبار ہر روز شائع ہوتا ہے اس کو روز نامہ کہتے ہیں۔ جو ہفتہ میں دو بار نکلتا ہے۔ اُس کو سہ روزہ کہتے ہیں۔ جو ہفتہ میں صرف ایک بار نکلتا ہے اُسے ہفتہ وار کہتے ہیں۔ جو شخص اخبار کو مرتب کرتا ہے۔ اس کو مدیر یا ایڈیٹر کہتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں ایک چیز اور ہوتی ہے۔ جس کو اردو میں جریدہ یا رسالہ اور انگریزی میں "میگزین" کہتے ہیں۔ یہ مہینہ میں ایک بار نکلتا ہے۔ اس میں ادبی، اخلاقی، معاشرتی، تاریخی تمدنی، اور بہت سے مفید اور دلچسپ مضامین شائع ہوتے ہیں۔

یہاں تک پڑھنے کے بعد تمھیں شوق پیدا ہوا ہوگا کہ اخبار اور رسالے کے کچھ تاریخی حالات بھی تمھیں معلوم ہو جائیں اس لئے مختصراً اِن کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔

ہندوستان میں سب سے پہلا اخبار ۱۷۸۰ء میں جاری ہوا تھا۔ جس کا نام "گورنمنٹ گزٹ" تھا لارڈ وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں ہکی نامی شخص نے "ہکی گزٹ" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا تھا جو مدت تک نکلتا رہا۔ ۱۸۳۲ء تک ہندوستان میں صرف گیارہ اخبارات شائع ہوتے تھے۔ جن میں سے چھ انگریزی زبان میں نکلتے تھے۔

اردو کا سب سے پہلا اخبار ۱۸۱۰ء میں کلکتہ سے مولوی اکرام علی صاحب نے جاری کیا لیکن اس میں کچھ لوگوں کو اختلاف ہے۔ کہتے ہیں کہ اردو اخبار کی ابتدا پہلے پہل ہندوستان میں مولوی محمد باقر صاحب دہلوی نے کی۔ بہرحال ان دو اخباروں میں سے کسی ایک کو پہلا ماننا پڑے گا۔

رسالہ کی ابتدا مرزا پور سے ہوئی جس کو ایک پادری صاحب نے نکالا۔ اس رسالہ کا نام "خیر خواہ ہند" تھا جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان کے اخبارات میں روز افزوں ترقی ہوتی گئی اور نت نئے اخبار اور رسالے نکلنے لگے۔ لوگوں میں اخبار بینی کا شوق بڑھتا گیا۔ اس وقت کوئی شہر ایسا نہ ہوگا۔ جہاں سے کوئی اخبار یا رسالہ نہ نکلتا ہو۔ لیکن اب تک عوام کو اخبارات و رسائل سے بہت کم شوق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے اخبارات اور رسالے ہمیشہ مالی مشکلات کا شکار ہو کر بند ہو جاتے ہیں۔ اور جو نکلتے ہیں وہ مالی مشکلات کی وجہ سے ترقی نہیں کر سکتے۔

دیگر ممالک کے مزدور بھی اخبار خرید کر روزآنہ پڑھتے ہیں اور جو ان پڑھ ہیں وہ دوسروں سے پڑھوا کر سنتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ غیر ممالک کے اخباروں کی تعداد اشاعت لاکھوں کروڑوں تک پہنچ جاتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کے لئے۔ اخبار یا رسالے

ضروریاتِ زندگی میں شامل ہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں اخبار یا رسالے کا خریدنا ایک قسم کی فضول خرچی سمجھی جاتی ہے۔ یہ خیال ہمارے لئے بہت ہی خطرناک ہے۔

اخبار یا رسالہ کا مطالعہ بڈھوں اور بچوں دونوں کے لئے برابر ہے۔ اس کے پڑھنے سے بہت سی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ہر ملک کی نئی نئی خبریں معلوم ہوجاتی ہیں۔ دلچسپ اور سبق آموز افسانے دیکھنے میں آتے ہیں ہر ملک کے مشہور لوگوں کے حالات سے واقفیت ہوتی ہے۔ زبان درست ہوجاتی ہے۔ غرض بے شمار فائدے ہیں اگر تم اخبارات اور رسالوں کا مطالعہ نہیں کرتے تو یقیناً غلطی کرتے ہو۔ لہٰذا تمھیں لازم ہے کہ اخباروں اور رسالوں کا پڑھنا ضروری سمجھو۔ اگر تم اخبار یا رسالہ خرید کر نہیں پڑھ سکتے تو اپنے شہر کے کسی کتب خانے میں جاکر رسالے پڑھا کرو۔

رمن راج سکسینہ (سٹی کالج)

خبر کیسے پھیلی

شاہ اورنگ زیب کا منشا
اس سے پہلے کہ بات حملے کی
شہر میں سارے ہوگیا چرچا
سخت تشویش بادشاہ کو ہوئی
ہوا معلوم کھوج کرنے پر
بادشاہ نے طلب کیا فوراً
تجھ کو کس طرح سے ہوا معلوم
ہاتھوں کو جوڑ کر یہ اس نے کہا
وضو کے وقت، صبح بہرِ نماز
آپ نے رُخ دکن کی سمت کیا

تھا دکن پر چڑھائی کرنے کا
بادشاہ کی زبان پر آتی
ہونے والا دکن پہ ہے حملہ
بات لوگوں میں کس طرح پھیلی!
اس کا بانی ہے قلعہ کا نوکر
اور پوچھا نہیں بتا فوراً
تو نے کس بات سے لیا مفہوم
"مجھ سے بے شک قصور آج ہوا
آپ کا تھا حضور خاص انداز
اور مونچھوں پہ ہاتھ کو پھیرا

میں ارادہ سمجھ گیا کیا ہے
ہونے والا دکن پہ حملہ ہے"

شور عابدی (گلبرگہ)

ننھے خاں کی شادی

بڑی آرزو تھی ماں کو اپنے منتوں مرادوں والے بیٹے کے سہرے کے دیکھنے کی' بڑے ارمان تھے باپ کو اپنے اکلوتے "ننھے" کی شادی رچانے کے۔ آخر خدا خدا کرکے وہ دن آ ہی گیا' ننھے خاں کے سہرے کے پھول کھل ہی گئے ـــ اب کیا تھا تمام محلے میں ایک شور مچا ہوا تھا کہ جمعدار کے چہیتے بیٹے ننھے خاں کی شادی قرار پاگئی ہے۔ تاریخ کا مقرر ہونا تھا کہ گھڑا گھڑی اور راتوں رات تیاریاں شروع ہوگئیں اور آخر وہ وقت سعید آ ہی گیا جب ننھے خاں نے ماں باپ کے سایہ میں سر کو سہرا بندھوایا' گھوڑے پر سوار ہوکر دلہن کے گھر چلے ـــ جمعدار کی خاطر برات میں کثیر مجمع تھا۔ جمعدار اپنے "ننھے" اور مجمع کی کثرت کو دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے اور اپنے بڑی بڑی گھنی مونچھوں پر تاؤ دے رہے تھے۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی کی خوشی میں انھوں نے افیون کی گولی بڑی کھا لی تھی ـــ اور اس کا نشہ جمعدار کی خوشی پر سونے پر سہاگے کا کام کر رہا تھا۔ غرض برات تاشہ اور بانڈ کی کان پھوڑنے والی آوازوں کے ساتھ دلہن والوں کے گھر پہونچ ہی گئی ـــ

چلمنوں اور پردوں کی آڑ سے لوگ دولہا کو جھانک جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ "سالوں" نے دروازہ بند کر رکھا تھا۔ سوال و جواب ہونے لگے' بہت کچھ گلفشانیاں ہوئیں آخرکار دولہا میاں نے ہار مان کر پچاس روپیہ دے ہی دیئے۔ کرتے کیا "ساری خدائی" اک طرف کا معاملہ تھا۔ مہمانوں کا ہجوم بڑھتا گیا' کوئی جمعدار کو مبارک باد دیتا تو کوئی دولہا میاں کو' کوئی دولہن کے باپ اور بھائیوں کو ـــ غرض شادی کی بزم زوروں پر تھی ـــ شہر کی مشہور رقاصہ مشتری جان گا رہی تھی ع

یہ بزم خوشی اور یہ شادی مبارک

دولہا میاں مسند پر اکڑے ہوئے بیٹھے تھے' منہ پر سہرے کی "جھالر" پڑی ہوئی تھی۔ دست حنائی میں دستی لئے اپنے چہرے کو ہوا دینے کی کوشش کر رہے تھے ـــ

قاضی صاحب تشریف لائے اور بادام مصری کا فیصلہ کرکے چلتے بنے۔ اب "صبح تا نصف النہار" کی باری تھی۔ یہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہوگئی ـــ زنانے میں ہم لوگوں کی اس کی اطلاع برابر آ رہی تھی ـــ غرض خوشی کی گھڑیاں گانے بجانے' مبارک بادیوں اور کھانے کی گڑبڑ اور سلامیوں کی حیرانی میں ختم ہوگئیں۔ اور اب دلہن کی رخصتی کا وقت آیا ـــ تمام گھر میں شور مچا ہوا تھا کہ دولہا' دلہن کی رخصتی کے لئے آ رہا ہے۔ سالے شرمائے ہوئے ادھر سے ادھر پھر رہے تھے تو دولہا کے بھائی غرور میں چور پھول رہے تھے۔ آخر دولہا کے بھائی تھے نا ـــ

"چھپنے والے ہٹ جاؤ دولہا میاں آ رہے ہیں" کی آواز کے ساتھ دولہا میاں ریشمی منڈپ کے سایہ میں ٹھمکتے ٹھمکتے آتے نظر آئے' بڑی بوڑھیاں' نوجوان لڑکیاں' بچے بچیاں غرض کیا چھوٹے اور کیا بڑے سب کے سب دولہا میاں کو دیکھنے کے لئے ایک پر ایک گرے جا رہے تھے۔ دولہا میاں اپنا ساڑھے تین فٹ کا قد لئے چوڑی دار پائجامہ پہنے دستار لگائے اور قد سے لانبا سہرا باندھے چلے آ رہے تھے ـــ شوخ مراسن نے دور سے دولہا کو جو دیکھا تو ہنس کر ساتھ والی سے بولی

"دولہا ہے مٹی بڑو چندی کا گڑا ہے" غرض بڑی نزاکت سے دولہامیاں مسند پر بیٹھ ہی تو گئے" والان میں پہنائے ہار" کے گیت کے ساتھ دولہا کا رسم شروع ہوا۔ رسم کے ختم ہوتے ہی ماں نے اٹھ کر چٹ چٹ بلائیں لیں۔ دولہامیاں ایک ایک کو جھک جھک کر سلام کرتے تھے اور سب دعائیں دے رہے تھے۔

یہ تو تھا دولہامیاں کا حال' ادھر بے چاری دلہن رضیہ روتے روتے نڈھال ہوگئی تھی۔ کبھی ماں سے لپٹ کر روتی تو کبھی بہنوں سے ـــ دلہن کے باپ محبوب خاں نے اپنی "نورچشمی" کو سینے سے لگا کر بہت کچھ ہمت دلائی اور طیش میں آکر کہہ دیا کہ "بیٹی تجھے ذرا بھی تکلیف پہونچی تو جان دے دوں گا"۔

غرض خاں صاحب نے روتے ہوئے اپنی بیٹی کا ہاتھ نتھے خاں کے ہاتھ میں دے دیا ـــ باہر گڑبڑ ہورہی تھی۔ دولہامیاں دلہن کو ساتھ لئے بیانڈ باجے سدیوں کے ناچ اور آتشبازی کی روشنی میں اکڑتے اکڑاتے چلے جارہے تھے ـــ میری دلی دعا ہے کہ میری سہیلی رضیہ ہنسی خوشی رہے اور اپنی اولاد کا سہرا دیکھے۔

بلقیس میر حسن علی خان

ہمت

"بہرکاری کہ ہمت بستہ گردد اگر خاری بود' گلدستہ گردد"

ہمت ایک ایسی صفت ہے جس کی بدولت ادنیٰ درجے کے لوگ اعلیٰ درجے کے شاعر' حکیم' فلاسفر' بادشاہ' وزیر وغیرہ بن گئے ہیں۔ دنیا میں کوئی ایسا کام نہیں ہے جس کو انسان کی ہمت فتح نہ کرسکتی ہو۔

بہت سے لوگ دنیا میں ایسے گزرے ہیں کہ جن میں ذہانت وجودت معمولی تھی۔ مگر ہمت اور محنت سے یہی لوگ علامۂ عصر بن گئے ہیں۔

ہمت ہی کی مدد سے بڑے بڑے کام انجام پاتے ہیں۔ گو ابتدا میں وہ کام مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اور پست ہمت لوگ اس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ" دیکھو چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ جس کام کی ان میں قابلیت نہیں کس کے پورا کرنے میں اپنی اوقات ضائع کرتے ہیں۔"

ایسے پست ہمت اور سست لوگوں کی باتوں کا کچھ خیال نہیں کرنا چاہیے۔ اور اپنے کام میں مشغول رہنا چاہیے۔

انسان کی شرطِ زندگی ہمت ہے۔ بقول شخصے:۔

"گر پڑے ہے آگ میں پروانہ سا کرم ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو! لیکن جو ہمت ہو تو ہو"

اکثر اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ پہلی دفعہ لوگ ناکام ہوتے ہیں۔ لیکن اس ناکامی سے ہمت نہ ہارنا چاہیے۔ اور نہ مایوس ہونا چاہیے۔ بلکہ ہمت اور استقلال کے ساتھ کوشش کئے جانا چاہیے۔ کیونکہ ناکام وہی ہوتا ہے جو کام کرتا ہے۔ اور گرتا وہی ہے جو دوڑتا ہے۔

"گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں
وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے"

معصومہ بیگم

تنقید و تبصرہ

اعجاز نما قرآن مجید مترجم و مفسر - اردو ترجمہ از محمد اشرف علی صاحب - تھانوی مقدمہ و تفسیر از آغا رفیق صاحب بلند شہری - ۴۴۰ صفحات ناشر حافظ سید وزیر حسن نقابی مدیر رسالہ پیشوا اکیسیج - دہلی -

اس قرآن مجید کے مقدمہ میں خدا کے وجود کے دلائل، مذہب اسلام کی حقیقت، نبوت کی تشریح، وحی کی تعریف اور اس کے اقسام وغیرہ و قرآن مجید کی خصوصیات، قرآن کے اعمال و ظائف، قصص امثال، تاریخ اور فضائل وغیرہ کو مختصر مگر دلنشین پیرایہ میں سمجھایا گیا ہے مقدمہ کے آخر میں مضامین قرآن مجید کی مفصل فہرست درج ہے یہ مقدمہ ۴۴ صفحوں پر مشتمل ہے اس کے بعد قرآن مجید مترجم شروع ہوتا ہے ترجمہ سلیس اور واضح ہے، حاشیہ پر مصر کے مشہور عالم علامہ فرید آبادی کی تفسیر "بیان الفرقان کامل" کا ترجمہ آغا رفیق صاحب نے پیش کیا ہے - باوجود ان ساری خوبیوں کے اس قرآن مجید کا ہدیہ صرف (عیم ۱۲) ہے - "س"

شمع ہدایت - از عبد الصمد سراج الدین صاحب - صدر مسلم نوجوانان صوبہ گلبرگہ (۶۵) صفحات - ناشر سید الدین بی اے سی - مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ پریس - حیدرآباد -

یہ مجموعہ ہے چند چھوٹے چھوٹے اصلاحی اور اخلاقی مضامین کا، جن میں مسلمانوں کو آیات قرآنی کی روشنی میں ان کی ترقی کے راز بتائے گئے ہیں اور فلاح و بہبود کے طریقے پیش کئے گئے ہیں، آخر میں کلام الٰہی کی ہدایتوں کا ترجمہ بھی درج ہے - "س"

بہار عید - از سید خوند میر صاحب متین ۱۴ صفحات - قیمت ۱ر مطبوعہ نظام دکن پریس حیدرآباد -

یہ چھوٹی سی کتاب مجموعہ ہے چند تہنیتی قطعات اور عیدیوں کا جن کو جناب متین نے اپنے عزیز و احباب کے لئے عیدین کے موقعوں پر لکھے تھے - اکثر عیدیاں ناصحانہ ہیں اور اس قابل ہیں کہ بچوں کو پڑھائی جائیں - "س"

صد برگ متین (ہفت رنگی) از سید خوند میر صاحب متین - ۸۰ صفحات قیمت چار آنے مطبوعہ حمایت دکن پریس - حیدرآباد -

سات رنگ کی اردو فارسی رباعیوں کے اس مجموعہ کا آغاز حمد باری سے ہوتا ہے، دوسرے رنگ میں آن حضرت کی نعت ہے، تیسرا رنگ موعود خلیفۃ اللہ سے متعلق ہے، چوتھے میں فنا و بقا کا مسئلہ بیان کیا گیا ہے، پانچواں رنگ اصلاح عمل پر مشتمل ہے چھٹے میں دنیا کی دو رنگی کا ماتم ہے اور ساتویں میں قوم کی زبوں حالی پر اظہار تاسف کیا گیا ہے - ہر رنگ میں گنی رباعیاں کہی گئی ہیں - ان کی تشریح سید قطب الدین صاحب پالن پوری نے کی ہے - "س"

اسلام (دینی اور دنیوی ترقی کا صحیح راستہ بتاتا ہے) از عبد الحفیظ خاں صاحب ۴۹ صفحات مطبوعہ دار الطباعت رہبر (حیدرآباد)

یہ رسالہ انجمن علم و عمل کی جانب سے لکھوایا گیا ہے، یہ انجمن جس کے صدر نشین نواب سر نظامت جنگ بہادر ہیں مسلمانوں کو حقیقی معنوں میں مسلمان بنانا چاہتی ہے، اسی مقصد کے تحت تین سو روپے انعام مقرر کر کے اس رسالہ کے عنوان پر مضامین لکھوائے گئے اور انتخاب کے لئے ایک ایک کمیٹی کے حوالہ کئے گئے جس کے اراکین نواب سر نظامت جنگ بہادر، نواب ناظر یار جنگ بہادر اور نواب اکبر یار جنگ بہادر وغیرہ تھے، اس کمیٹی نے زیر نظر مقالہ کو پسند کیا، یہ دلچسپ پیرایہ میں لکھا گیا ہے اور مختصر تنقید بھی ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے نوخیز لڑکے اور لڑکیاں اس دینی اور دنیوی ترقی کے صحیح راستہ پر گامزن ہوں - "س"

شادی کی جاتی ہے - از مائل انبالوی - (۴۰) صفحات قیمت ۲ر پتہ مائل انبالوی - پیس کالج - انبالہ چھاؤنی -

یہ ایک مختصر سا ڈرامہ ہے جس کا پلاٹ ٹینی سن کی نظم "دورا" سے لیا گیا ہے، اس ڈرامہ کا مقصد یہ ہے شادی کرائی نہیں جاتی بلکہ

کی جاتی ہے" محترمہ شکنتلا کماری نے اپنی تنقید میں بہت صحیح لکھا ہے کہ ڈراما نگار مکالمہ کے لئے حکیم احمد شجاع کی زبان کا رنگ ضرور دیکھیں گے اور پریم چند کی کتابیں بھی ضرور پڑھیں، مکالمہ میں جان نہ ہونے کی وجہ سے "ڈرامہ" "فسانہ" بنکر رہ گیا ہے اس کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ جناب مائل دوسرے ایڈیشن میں اس کے مکالمہ کو درست کریں اور اس کی قیمت ایک ربع کر دیں"۔

ادب لطیف کا ڈراما نمبر بابت ۱۹۳۹ء مرتبہ چودھری برکت علی بی۔ اے و مرزا ادیب بی۔ اے حجم ۲۰۸ صفحات قیمت ۱۲ ر پتہ مکتبہ اردو لاہور۔

"ادب لطیف" کا یہ خاص نمبر تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے میں پانچ قابل ادیبوں کے مقالے ہیں "ڈراما کی مختصر تاریخ۔" "ڈراما اور تعلیم" اور "ڈراما فنی نقطۂ نظر سے" پڑھنے کے قابل ہیں، پہلے مقالہ میں ڈراما کی مختلف منزلیں بتاتے ہوئے ڈراما کی دلچسپ تاریخ چند صفحوں میں قلمبند کر دی ہے دوسرے میں ڈراما کی تعلیمی حیثیت پر تبصرہ کیا گیا ہے اور تیسرے میں ڈراما کے فن پر قابلیت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرے حصہ میں سترہ ڈرامے ہیں جن میں ہر قسم کے مختصر عمدہ ڈرامے ہیں۔

تیسرے حصہ میں چند منظوم ڈرامے ہیں، ان میں "گزری ہوئی رات"، "ضیغم ہندوستان" اور "گل و شاعر" "فلسفیانہ اور روح پرور نظمیں ہیں۔ بحیثیت مجموعی یہ ڈراما نمبر اس قابل ہے کہ ڈراما اور فن ڈراما نویسی سے دلچسپی رکھنے والے اس سے اپنے اپنے کتب خانہ کی زینت بڑھائیں، ادارۂ ادب لطیف نے بڑی کاوش اور محنت سے اس نمبر کو مرتب کیا ہے اور ہندوستان کے مشہور مقالہ نگاروں اور ڈراما نویسوں کے رشحات قلم سے اس کو زینت دی ہے۔ اردو ڈراما کی اس خدمت کے لئے ادارۂ موصوف مستحق مبارکباد ہے۔" "قدس"

ادب لطیف کا افسانہ نمبر بابت ۱۹۳۹ء مرتبہ چودھری برکت علی بی۔ اے و میرزا ادیب بی۔ اے حجم ۲۰۱ صفحات قیمت ۱۰ ر پتہ مکتبۂ اردو لاہور۔

ادارۂ ادب لطیف کی عالی ہمتی قابل تحسین ہے ڈراما نمبر کے صرف تین مہینے بعد اس نے یہ خوبصورت اور دلچسپ "افسانہ نمبر" شائع کیا ہے، ڈراما نمبر کی طرح اس کو بھی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے حصہ میں چند مقالے ہیں جن میں "افسانہ نگاری کا تاریک پہلو" خاصہ کی چیز ہے، اس میں قابل مقالہ نگار نے افسانہ نگاروں کو چند نہایت مفید مشورے دئے ہیں، اسی طرح ایک اور مقالہ "جدید افسانہ" بھی اچھے مشوروں سے مملو ہے دوسرے حصہ میں (۱۹) افسانے ہیں جو ملک کے مشہور افسانہ نگاروں سے لکھوائے گئے ہیں، محترمہ سحر صاحبہ کا افسانہ "دلہن اماں" اس قابل ہے کہ نفس پرست بوڑھے اس سے عبرت حاصل کریں، اردو رسائل کے اڈیٹر حکیم احمد شجاع صاحب کا افسانہ "معجزات ادارت" ضرور پڑھیں، یہ واقعہ ہے کہ اکثر اردو رسالے ایسے ہی مضامین سے بھرے ہوتے ہیں جیسا کہ حکیم صاحب نے لکھا ہے۔ تیسرے حصہ میں دو منظوم افسانے "شاہی مزدور" اور "اے سکھی" قابل مطالعہ ہیں۔ یہ "افسانہ نمبر" اپنے اندر بہت سی دلچسپیاں رکھتا ہے اور دس آنے میں بہت سستا ہے۔ "دس"

یاد چکبست ۔ مرتبۂ پنڈت آنند نراین ملا۔ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد میں چھپی۔ قیمت ندارد۔ کتاب اچھی ہے۔ سرورق نہایت ہی جاذب نظر۔ مجلد۔ یہ ۱۰۷ صفحات کا ایک منظوم و نثری گلدستہ ہے۔ مؤلف نے بڑے ہی اہتمام و سلیقہ سے ترتیب دیا ہے۔

۱۲ر فروری ۱۹۳۹ء کو یوم چکبست منایا گیا تھا۔ اس خصوص میں جو تقاریر و نظمیں پڑھی گئیں ان سب کو ایک جگہ مجتمع کر کے اپنے ذوق ادب کا ثبوت دیتے ہیں۔ جلسہ کا آغاز خود چکبست کی نظم "خاک ہند"

سے ہوا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے انسان چکبست کو اچھی طرح سمجھ جا سکتا ہے۔ اس کے ہر پہلو پر اس کے مطالعہ سے روشنی پڑتی ہے۔ چکبست سے متعلق ہر قسم و ہر نہج کے معلومات بہم پہنچائے ہیں۔ مختلف نامہ نگاروں کے لکھے ہوئے مضامین اس شیرازہ کی بندش اور حسن ترتیب میں شامل ہیں۔

اس کو ادبی دنیا بخوبی جانتی ہے کہ چکبست کا درجہ اردو شاعری میں کس قدر بلند ہے اور پھر جب وہ انیس سے متاثر ہیں۔ ان کے کلام میں جابجا انیس ہی کا رنگ جھلکتا ہے انیس کے ہی تیور پائے جاتے ہیں تو پھر اس فیصلہ میں تو شبہہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں کہ چکبست کوئی معمولی شاعر نہیں ہے۔ غالب میر یا انیس کے ہمپایہ ہونا کوئی آسان بات نہیں۔ جبکہ ڈاکٹر گراہم بیلی کی نظر میں بھی انھیں تینوں شعراء پر رعد رعہ کے اٹھتی ہیں اور ان کے حیطۂ تخیل میں ان تینوں سے بہتر کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے نظم انسانی زندگی کا بہترین سرمایہ ہے۔ اس کتاب کی ترتیب میں ایک خاص امر جو ملحوظ ہے وہ یہ کہ کہیں یکسانیت نہیں۔ بلکہ نثر کے بعد نظم اور نظم کے بعد نثر کے قوس و قزاحی سلسلہ نے اس کی دلچسپی و جاذبیت کو دوبالا کر دیا ہے۔ مشاعرہ کی نظموں کا وجود بھی اس شیرازہ کی ایک اہم کڑی ہے جس سے قند مکرر کا لطف آتا ہے۔

مختصر یہ کہ اس موقر و دلچسپ مجموعہ نے بزم ادب میں ایک حسین اضافہ کر دیا۔ کتاب بہر نوع رنگین و دلنشین حسیات کی سرمایہ دار ہے۔ "ج"

رسالہ پیام نسواں :- اردو ادب میں رسائل کا وجود ایک نفریحی محل پیدا کرتا ہے۔ کتاب میں یکسانیت رہتی ہے۔ رسالہ گوناگوں دلچسپیوں کا حامل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے پیام نسواں ایک اچھا رسالہ ہے۔ لکھنؤ سے نکلتا ہے۔ چندہ سالانہ (عـ۲)

۴۰ صفحات اس کی کائنات ہے۔ کتابت و طباعت پاکیزہ کاغذ اچھا ہے سرورق پر کنول انگڑائیاں لے رہا ہے۔

مختلف موضوع پر کم و بیش ۱۶ مضمون ہیں جس میں مسز وجے لکشمی پنڈت کی "دلچسپ"، واقعی بہت دلچسپ ہے۔ علاوہ اس کے دو افسانے اور ایک تاریخی مضمون درحقیقت اس ذری سی جان کے لئے بہت ہیں۔ تین چار صفحے بچوں سے بھی مخاطب ہوتے ہیں۔ یہ بڑی آپا کا حصہ ہے۔ آخری میں سنگاری کے بھی نمونے شامل ہیں۔ نیز مشہور شعراء نے اپنی اپنی نظموں سے اس کی رونق کو بڑھا دیا ہے۔ غرض عـ۲ کے قلیل چندہ میں یہ اردو ماہنامہ نسوانی دنیا کے لئے برا نہیں۔ "ج"

جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کے خاص نمبر

"ساقی" ۴۰۴ صفحات عـ۲ "ساقی" اردو کے بہترین رسالوں میں سے ہے اور یہ اپنے ہر خاص نمبر میں مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے سابق ناظم دارالترجمہ جامعۂ عثمانیہ سے کسی نہ کسی مشہور انگریزی شہکار کا ترجمہ کرا کے شائع کرتا ہے، اس دفعہ شکسپیر کی شہرۂ آفاق تمثیل "رومیو جولیٹ" کا ترجمہ تقریباً ۶۰ صفحوں میں شائع کیا گیا ہے۔ بعد کے صفحات میں اردو کے مشہور ادیبوں اور شاعروں مثلاً حسن نظامی، فانی، مرزا محمد سعید، قاضی عبدالغفار، وزیر حسن، علی منظور، ایم اسلم انصار ناصری، عابد حسین، حجاب امتیاز علی، عظیم بیگ چغتائی، صادق الخیری، اور ماہر القادری وغیرہ کے رشحات قلم پیش کئے گئے ہیں۔ یہ سالنامہ معنوی حیثیت سے اردو کے اکثر سالناموں سے بہتر ہے۔ اگرچہ کہ ظاہری رونق اور آب و تاب کے لحاظ سے بعض دوسرے سالنامہ اس سے بہتر ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شاہد صاحب اس امر کی کوشش کر رہے ہیں کہ اردو پڑھنے والوں کے لئے مضمونوں اور نظموں ہی میں ایسی رنگا رنگی اور دلچسپی پیدا کی جائے کہ سادہ اور رنگین تصویروں کے بغیر بھی اہل اردو اپنے رسالوں اور کتابوں سے لطف اندوز ہونے

کی عادت ڈالیں ۔ یہ ایک مستحسن کوشش ہے ۔

اس سالنامے کا حصۂ نثر جس معیار تک پہنچ سکا ہے افسوس ہے کہ حصۂ نظم اس کی برابری نہیں کرسکتا ۔

"نگار" ۱۲۰ صفحات قیمت عہ ۔ نگار کا سالنامہ "نظیر اکبر آبادی" کی حیات اور کلام کے لئے وقف کر دیا گیا ہے، نگار نے اب تک جو خاص نمبر شائع کئے ہیں ۔ ان کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ پورا مجموعہ ایک خاص موضوع کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے یہ ایک اچھا خیال ہے ۔ لیکن بعض دفعہ اس کی وجہ سے ایک خاص دبستان خیال کے اہل ذوق ہی دلچسپی لے سکتے ہیں دوسروں کے لئے ایسی کوششوں میں دلچسپی کے سامان مفقود رہتے ہیں

نظیر اکبرآبادی اُردو کے بڑے شاعروں میں سے ہیں اور انکی شہرت اور قدر و منزلت جیسی کے چاہئے ابھی نہیں ہوئی ، جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا اور اہل اردو زندگی کی حقیقتوں اور زمانے کی تلخیوں کو عریاں دیکھنے کے عادی ہونے جائیں گے نظیر کا کلام بھی صحیح معنوں میں روشنی میں آتا جائے گا اور اس وقت نگار جیسی کوششوں کی صحیح قدر کی جائے گی ۔

افسوس کی بات ہے کہ اس کام میں اردو کے اچھے لکھنے والوں نے حصہ نہیں لیا اور یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ نظیر کے شایانِ شان نظر نہیں آتا ۔

اس میں نظیر اکبرآبادی کی جو تصویر دی گئی ہے وہ اس تصویر سے بہت گھٹیا درجے کی ہے جو اس سے پہلے شائع ہوئی ہے ۔ اس میں اتنا تصنع ہے اور فن تصویر کی خوبیوں کا خیال اتنا رکھا گیا ہے کہ خود صاحب تصویر کی شخصیت دھندلی ہوگئی ۔ بہتر ہوتا کہ اس تصویر کے ساتھ نظیر کی وہ قدیم قلندرانہ وضع کی تصویر بھی شائع کی جاتی ۔

نیاز نے نظیر کو سمجھنے کی کامیاب کوشش کی ہے لیکن اس خاص نمبر کے بہت کم مضمون نگار ایسے ہوں گے جن کے نتائج قلم خود نیاز کے معیار تک پہنچ سکے ہوں گے ۔

بہر حال یہ ایک ایسی کوشش ہے جو آئندہ کام کرنے والوں کے لئے خام مواد کا کام دے گی ۔ بہتر ہوتا کہ نظیر کے اس غیر مطبوعہ کلام کا کافی حصہ اس نمبر میں شائع کیا جاتا جو نیاز صاحب کو دستیاب ہوا ہے اور جس کو وہ یقیناً چھاپنا چاہتے ہیں ۔ لیکن اس کی اشاعت سے قبل اس کا اطمینان کرلینا ضروری ہے کہ اس میں سے کتنا کلام خود نظیر کا ہے اور کتنا الحاقی ۔

"ہمایوں" ۱۰۰ صفحات ۱۲؍ اس خاص نمبر میں سات چھوٹی بڑی تصویریں ہیں ۔

ہمایون کا سالگرہ نمبر اس کے گزشتہ خاص نمبروں کا مقابلہ نہیں کرسکتا ۔ میاں بشیر احمد صاحب کو آجکل سیاسی محفلوں اور اردو کی تبلیغ و اشاعت کے کام سے اتنی دلچسپی ہوگئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے وہ اب ہمایون کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہیں اور اگر توجہ بھی کرتے ہیں تو اُردو انجمنوں اور اُردو کے متعلق پرچار کی خبریں جمع کرنے اور ان کو شائستگی سے پیش کرنے کی حد تک ۔

اس نمبر میں ان کا ایک مضمون جو کشمیر سے متعلق ہے بہت دلچسپ اور مفید معلومات پر مبنی ہے ۔

حصۂ نظم میں علی منظور صاحب کی نظم "فاتحہ سالانہ" خاصے کی چیز ہے ۔ اتفاق کی بات ہے کہ یہی نظم سب رس کے جنوری میں بھی شائع ہو چکی ہے ۔

"جدید اُردو" کلکتہ ۱۰۸ صفحات قیمت ۱۲؍ ۔

جدید اُردو کا یہ خاص نمبر بنگال کے متعلق معلومات کے لئے وقف کر دیا گیا ہے ۔ عہد حاضر میں صوبہ بنگال کو اہمیت حاصل ہے وہاں اردو کی اشاعت اور ترقی کے لئے جتنی بھی کوشش کی جائے کم ہے اور سالنامہ اس قسم کی کوشش کے لئے ممد و معاون

ثابت ہوگا۔

اردو کتابت و طباعت کے لحاظ سے بنگال ابھی بہت پیچھے ہے اور یہی وجہ ہے کہ باوجود خاص اہتمام کے اس خاص نمبر کا ظاہر کچھ زیادہ شاندار نہیں ہے۔ اس میں رضا علی صاحب وحشت کا مضمون اردو کا تعلق بنگالے سے اگرچہ مختصر ہے لیکن قابل مطالعہ ہے۔

افسوس ہے کہ اصل موضوع سے متعلق "جدید اردو" کو کافی مضمون وصول نہ ہو سکے اس لئے اس میں غیر متعلق مضامین بہت سے نظر آتے ہیں۔

بنگال کے مشہور شاعر انقلاب قاضی نذر السلام کی تصویر۔ مختصر حالات اور ان کی نظموں کے ترجمے اس خاص نمبر کے خاصہ کی چیز ہے۔ ٹیگور کے بھی ترجمے نظر سے گزرتے ہیں۔ احسن احمد صاحب اشک اپنی اس کوشش کے لئے قابل مبارکباد ہیں توقع ہے کہ وہ آئندہ ایک ایسا نمبر شائع کریں گے جس میں زیادہ تر صوبہ بنگال ہی کے اردو لکھنے والوں کا حصہ ہوگا اور اس طرح سے وہیں کے گزشتہ اور موجودہ اردو ادب کی پوری ترجمانی ہو سکے گی۔ ق

"صبح امید" بمبئی (۹۴) صفحات قیمت ۸؍ عبدالحمید خاں صاحب بوبیرے بمبئی میں اردو کے ایک اچھے خادمت گزار ہیں، انھوں نے یہ سالنامہ بڑی محنت سے مرتب کیا ہے اس کا سرورق رنگین اور نہایت دیدہ زیب ہے اس میں بھی چند اچھی تصویریں ہیں مضامین بھی دلچسپ ہیں، اس لحاظ سے کہ بمبئی سے کوئی اچھا اردو رسالہ شائع نہیں ہوتا اور اردو کی کتابت اور طباعت بھی ابھی بہت پیچھے ہے وہاں کا یہ سالنامہ قابل قدر ہے۔ ق

"عالمگیر" ۲۰۰ صفحات قیمت ۱۲؍ یہ سالنامہ عالمگیر کے گزشتہ خاص نمبروں کی طرح اچھا ضخیم ہے اس میں متعدد رنگین اور سادہ تصویریں بھی دی گئی ہیں لیکن اس کی کتابت اور طباعت کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔

اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۱۔ علمی و ادبی مقالات جس میں ۱۰ مضمون ہیں۔ ۲ افسانے اور ڈرامے جس میں ۱۴ لکھنے والوں نے حصہ لیا ہے ۳۔ منظومات جس میں ۳۲ اصحاب کے نتائج فکر شامل ہیں۔

حامد حسن قادری، ابوظفر ندوی، ایم اسلم، ماہر القادری، جلیل، جگر، مجاز، روش، ظفر علی خاں، اور پروفیسر سالک اس سالگرہ نمبر کے مشہور لکھنے والے ہیں۔ ق

"ادبی دنیا" (۲۰۸) صفحات قیمت ۱۲؍ اس سال کے جملہ سالناموں میں تصویروں، کتابت و طباعت اور دیدہ زیبی کے علاوہ مضامین کے لحاظ سے بھی ادبی دنیا کا یہ سالنامہ ایک کامیاب کوشش ہے۔ اس کا حصہ نظم حصہ نثر سے بہتر ہے اتفاق کی بات ہے کہ اس میں بھی نظیر اکبرآبادی کے متعلق ظہیر الدین احمد صاحب کا ایک اچھا مضمون شامل ہے۔

خان بہادر عبدالرحمن چغتائی کی رنگین تصویر بہ عقیدت تمام فن کاری کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ پایہ کی ہے۔

میراجی اور صلاح الدین احمد صاحب مستحق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اس آب و تاب کا سالنامہ شائع کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسی قسم کی کوششوں سے ہماری زبان کی عظمت اور اہمیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ق

"ہندوستانی" اس کتاب کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ اور یہ اصل میں ان چند تقریروں کا مجموعہ ہے۔ جو آل انڈیا ریڈیو کی طرف سے "ہندوستانی" کیا ہے کے

سوال پر چھپے مختلف اصحاب نے مختلف تاریخوں میں کی تھیں۔ ہر
تقریر سے پہلے مقرر کی ایک اچھی سی تصویر بھی شامل کی گئی ہے۔
جو غالباً ریڈیو اسٹیشن ہی میں لی گئی تھی۔

پہلی تقریر ڈاکٹر تاراچند کی ہے جو ہندوستانی اکیڈمی
الہ آباد کے معتمد کی حیثیت سے کئی سال سے کوشاں ہیں کہ اُردو
اور ہندی کے درمیان ایک زبان ہندوستانی ایسی نکل آئے
جو دونوں کے لئے قابل اطمینان ہو لیکن یہ کوشش اسی وقت کامیاب
ہو سکتی ہے جب اہل اُردو اور اہلِ ہندی کسی سمجھوتے کی طرف
مائل ہوں۔ لیکن یہاں سمجھوتے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ یہاں تو
ہر فریق اپنا بول بالا کرنا چاہتا ہے۔ ایسی صورت میں ایک نئی
زبان ہندوستانی کے رواج کی کوشش کیسے سرخرو ہو سکتی ہے۔

اس تقریر کے اکثر مطالب صحت ذوق پر مشتمل ہیں لیکن
آخر میں تہذیب اور زبان کو علٰحدہ ثابت کرنے کی جو کوشش کی
کی گئی ہے اس کے ماننے کے لئے بہت کم لوگ راضی ہوں گے۔

دوسری تقریر ڈاکٹر مولوی عبدالحق معتمد انجمن ترقی اُردو
کی ہے اور انھوں نے بسم اللہ کے ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ "ہندوستانی
کا لفظ آج کل بھیڑوں کا چھتہ بنا ہوا ہے اب آل انڈیا ریڈیو نے
اس چھتے کو چھیڑا ہے تو اسے ڈنک سہنے کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے"
پھر لفظ ہندوستانی پر بحث کرتے ہوئے اس زبان اور
خیال کی مخالفت کی ہے جو پہلے لکچر میں ڈاکٹر تاراچند نے پیش کی
تھی۔

تیسری تقریر بابو راجندر پرشاد کی چوتھی ڈاکٹر ذاکر حسین
خاں کی پانچویں پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی اور چھٹی آصف
علی صاحب بیرسٹر کی ہے۔ اور ان سب میں ایک دوسرے
کے بیانات کا تضاد اور اختلاف پایا جاتا ہے۔ اور کوئی ایک
تقریر ایسی نہیں جو اس مسئلہ کو حل کر سکے۔ البتہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں
نے لفظوں کے استعمال اور املا کے بارے میں جو مشورے دئے ہیں
وہ سب سے زیادہ عملی اور مفید ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ
خیالی باتوں۔ نظریوں اور اصولی بحثوں سے زیادہ عمل سے
طے ہوگا اور عمل کے لئے جو شرائط اور خصوصیتیں درکار ہیں ان کا
جس زبان کے بولنے والے زیادہ لحاظ رکھیں گے وہی کامیاب
رہے گی۔ اور اسی کا نام ہندوستانی ہو جائے گا۔ ق

"**ارمغان جذب**" یہ پنڈت رانگھویندر راؤ صاحب
جذب وکیل عالیپوری کی دلچسپ رباعیوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔
چند سال پیشتر جناب جذب صاحب کی رباعیوں کا پہلا حصہ
رباعیات جذب کے نام سے شائع ہوا تھا۔ زیرنظر مجموعے
میں جو رباعیاں شامل ہیں وہ زیادہ تر سنسکرت شاعروں اور
خاصکر راجہ بھرتر ہری کے خیالات سے متاثر و ماخوذ ہیں۔
بھرتر ہری وہی سنسکرت شاعر ہے جس کے منظومہ ترجمے سے
علامہ اقبال نے اپنی کتاب بالِ جبریل کا آغاز کیا ہے
اردو زبان میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے خیالات
اور معلومات کے پیش کرنے کی بہت کچھ ضرورت ہے اور خوشی کی
بات ہے کہ جناب جذب نے اس طرف توجہ کی ہے۔ اس کتاب
کا مقدمہ ماہر القادری صاحب نے بڑی محنت سے لکھا ہے اور
اس میں سنسکرت شاعروں سے متعلق نہایت تفصیل سے معلومات
پیش کی ہیں۔

"**رسولِ پاک**" میں مولوی عبدالواحد صاحب سندھی جامعی
استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ ملیہ دہلی نے بتایا ہے کہ رسول پاک
کون تھے۔ کیسے تھے۔ اور آپ نے کیا سکھایا۔
یہ کتاب بچوں کے لئے نہایت سلیس و شگفتہ اور آسان زبان

میں لکھی گئی ہے۔

کتاب رسولِ پاک میں حضرت پیغمبر اسلام کی زندگی کے متعلق ایسی ضروری مختصر اور سادہ باتیں بیان کی گئی ہیں جن کے مطالعہ سے نہ صرف مسلم بلکہ غیر مسلم بچے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لکھائی چھپائی کے ساتھ کاغذ بھی اچھا ہے۔ بچے اس کتاب کو بہت شوق سے پڑھیں گے۔ ق

جوہر تخلیق سید محمد علی حشم صاحب داعی پوری کی ایک طویل مثنوی ہے جو شاہنامہ کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ حشم صاحب کو فردوسی کی اس زندہ جاوید کتاب کے مطالعہ کا بے حد شوق ہے۔ کثرت مطالعہ کی وجہ سے ان کو شاہنامہ کی تقلید میں لکھنے کا بھی شوق پیدا ہوا چنانچہ یہ مثنوی اسی شوق کا نتیجہ ہے۔ اس میں شاہنامہ ہی کی بحر میں شاہنامہ کے ایک حصہ کا ترجمہ کیا گیا ہے اور اس مقصد میں مصنف بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں اردو زبان میں فارسی کے شہکاروں کے ترجمے قدیم دور کے بعد معدوم سے ہو چکے ہیں اور اب زمانے کے حالات کے پیش نظر توقع بھی نہ تھی کہ کوئی ایسی کامیاب کوشش کرے گا لیکن بقول سعدی ہر بیشہ گمان مبر کہ خالی است واقعہ یہ ہے کہ جناب حشم صاحب نے فردوسی کی کامیاب تقلید کر کے عہد قطب شاہیہ و عادل شاہیہ کے ادبی ترجموں کی یاد تازہ کر دی ورنہ اردو ادب سے دوسری زبانوں کے شہکاروں کے ایسے طویل منظوم ترجمے رفتہ رفتہ معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ ق "ما"

ہلال و صلیب:۔ تالیف جناب ایم اسلم کراؤن تقطیع (۲۴۰) صفحے مجلد قیمت عہ ملنے کا پتہ اردو اکاڈیمی لوہاری گیٹ لاہور یا مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد

ایم اسلم کا نام اردو ادب میں کافی شہرت رکھتا ہے۔ آپ کے افسانوں اور مضمونوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ارباب صلیبی کے ہیرو سلطان صلاح الدین ایوبی کی یہ سوانح عمری بھی آپ کے زور قلم اور مورخانہ تحقیق و تلاش کا نتیجہ ہے۔ اس میں سلطان کی ابتدائی تربیت، ترقی اور بیت المقدس پر پرستاران صلیب کی یورشیں اور ان کے مقابلے تمام مسائل تفصیل اور تحقیق سے لکھے گئے ہیں یہ کتاب تاریخ اسلام کے ہر طالب علم کو ضرور مطالعہ کرنی چاہیئے۔ سید محمد

سیرت سید احمد شہید:۔ تالیف جناب سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کراؤن تقطیع (۴۶۴) صفحات مجلد قیمت عہ ملنے کا پتہ نامی پریس لکھنو یا مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔

یہ ہندوستان کی پہلی تحریک جہاد و تنظیم کے بانی مولانا سید احمد صاحب شہید بریلوی اور آپ کے رفقائے کار کی محققانہ سوانح حیات ہے اور اس سے تحریک جہاد و تنظیم مسلمانان پر بھی اچھی طرح روشنی پڑتی ہے جو آپ نے شروع کی تھی۔ ابتدا میں مولانا حسین احمد صاحب مدنی دیوبندی و مولانا عبد الماجد دریابادی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تقریظیں مختلف عنوانات سے شریک ہیں جو کتاب اور موضوع کتاب پر سیر حاصل بحثیں ہیں۔ یہ کتاب بہت تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ سید محمد

عصر نو:۔ یہ مجموعہ چھوٹی سائز کے ۲۷ صفحات پر چھپا ہے۔ اس کے مصنف محمد صدیق صاحب ضیا ہیں جنہوں نے عہد حاضر کے مختلف رجحانات کو مسدس مختلف بندوں کی صورت میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یعنے پہلا بند حرف الف پر ختم ہوتا ہے۔ تو دوسرا ب پر، اور تیسرا ت پر، یہ ترتیب اگرچہ جدت کے لئے اختیار کی گئی ہے لیکن تکلفات بارد ہی شمار کی جائے گی۔ شاعر اپنے کلام کو اس قسم کی قید و بند سے جتنا زیادہ آزاد رکھے گا اتنا ہی اس کے اسلوب میں قوت

اور طرز میں بے ساختگی پیدا ہو گی ۔

جناب ضیاء اچھے شاعر اور مفکر معلوم ہوتے ہیں

یورپ کی خونی سیاست : ۔ یہ کتاب گاہ دہلی کی طرف سے شائع ہوئی ہے اس کے مصنف سید تصور حسین ایم اے، بی۔ ٹی ہیں۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۲۶ صفحات ہیں سرورق پر یورپ کا نقشہ دیا گیا ہے جس میں لڑائی کے محاذ دکھائے گئے ہیں۔ اس کتاب میں مولف نے جنگ بلقان سے لے کر موجودہ جنگ عظیم تک یورپ کی تمام سیاسی قلابازیوں کو نہایت تشریح و بسط کے ساتھ دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے ۔ اسکے آغاز میں مصور حسین صاحب نظم مرادآبادی نے ایک مقدمہ لکھا ہے اور اصل کتاب ۱۹ ابواب پر مشتمل ہے جن میں بعض یہ ہیں ۔

خونی بادل جنگ عظیم سے پہلے ۔ انقلاب روس ۔ ورسیز کا صلحنامہ ۔ ورسیز کے بعد میونک سے پہلے ۔ اور میونک کے بعد وغیرہ ۔ یہ مفید اور پر از معلومات کتاب ہے ۔

اسلامی مصوری : ۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ صاحب چغتائی ڈی لٹ پیرس نے اوسط تقطیع کے (۹۲) صفحات میں اسلامی مصوری کی ایک مختصر تاریخ شائع کی ہے جس میں یونان ۔ روما ۔ چین ۔ ہندوستان اور عربستان وغیرہ میں قبل اسلام کے فنون کی ترقی کے تذکرے کے بعد مسلمانوں کے عہد کی ترقی فنون کو بڑی خوبی سے بتایا ہے ۔ یہ کتاب بہت ہی مفید اور ضروری معلومات سے معمور ہے ۔ اور ایک ایسے موضوع پر لکھی گئی ہے ۔ جس پر اردو تو کیا دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی کوئی مواد نہیں ہے ۔

اسلامی کوزہ گری ۔ اسلامی مصوری کی طرح ڈاکٹر عبداللہ صاحب نے اسلامی کوزہ گری کے موضوع پر بھی ایک سیر حاصل کتاب تحریر کی ہے ۔ اس کے ساتھ چند بڑی خوبصورت تصویریں بھی ہیں ۔ اور یہ پہلی کتاب سے زیادہ بسیط اور ضخیم ہے یہ ایسے اچھوتے اور اہم موضوع ہیں کہ ان سے متعلق کتابیں لکھکر ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے اردو پر احسان عظیم کیا ہے ورنہ یہ ہماری بدقسمتی رہی ہے کہ مشرقی چیزوں سے متعلق اکثر مضامین اور کتابیں انگریزی یا دوسری زبانوں میں لکھی گئی ہیں اور اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے

اسلامی مصوری اور اسلامی کوزہ گری دونوں کی کتابت طباعت بھی نفیس ہے ۔ اور توقع ہے کہ سنجیدہ ذوق رکھنے والے ان سے ضرور مستفید ہوں گے ۔ ق

اردو دانی کی پہلی کتاب ۔ اس کتاب کو مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے نے اپنی خاص نگرانی میں مولوی اظہار الدین صاحب سے مرتب کرایا ہے اور ادارۂ ادبیات اردو کے مجلس امتحانات اردو دانی کے نصاب میں اس کو شامل کیا ہے یہ کتاب جدید ترین اصول تلفظ شناسی کے مطابق لکھی گئی ہے ۔ اس میں ایک سو تصویریں اور ۸۰ صفحات ہیں ۔ ادھر کچھ عرصے سے ملک میں تعلیم بالغان کی طرف خاص طور پر توجہ کی جا رہی ہے ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ وقت کی بڑی اہم ضرورت ہے جس کی تکمیل کی طرف ہر بہی خواہ اردو کو متوجہ ہونا چاہیئے ۔

تعلیم بالغان کی تحریک اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ بالغوں کی ضرورت اور حالت کے مطابق کتابیں تیار نہ کی جائیں ۔ بچوں کے قاعدے اور درسی کتابیں ان کے لئے غیر مفید ثابت ہوتی ہیں ۔ اور اردو میں ایسی کتابیں موجود نہیں ہیں جو اس ضرورت کی تکمیل کر سکیں اسلئے یہ اردو دانی کی پہلی کتاب یقین ہے کہ تمام ہندوستانیں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیگی اور اس موضوع کی دوسری کتابیں بھی [illegible]

Reg. No. M 3950.

ادارۂ ادبیات اردو

کی

چند علمی ، ادبی اور دلچسپ کتابیں

۱۔ شعرائے عثمانیہ | جامعہ عثمانیہ کے چھبیس شاعروں کے کلام کا پاکیزہ انتخاب ۔ مختلف نظموں اور غزلوں کا گلدستہ رنگ و بو ۔ ہر شاعر کے کلام پر ایک مختصر مگر جامع تنقید ۔ مرتبہ سید معین الدین صاحب قریشی ایم ۔ اے و عبدالقیوم خان صاحب باقی ایم ۔ اے طباعت و کتابت نفیس رائل سائز صفحات (۲۳۱) قیمت مجلد با تصویر دو روپیہ ۱۲ آنے ۔

۲۔ مغربی تصانیف کے اردو تراجم | مغربی زبانوں کی تصنیفات و تالیفات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا تذکرہ ۔ صاحبان فکر کی نظروں میں اس کتاب کی افادیت دوسری تحقیقی کتابوں سے کم نہیں ۔ مرتبہ میر حسن صاحب ایم ۔ اے طباعت و کتابت نفیس کراؤن سائز صفحات (۱۰۲) قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے ۔

۳۔ محبت کی چھاوں | مرزا ظفرالحسن صاحب بی ۔ اے کے ۱۴ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ ۔ ہر فسانے میں تخیل کی جولانیاں اور مشاھدے کے تاثرات کارفرما ھیں ۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کیلئے ایک شایستہ ذھنی تفریح صفحات (۱۳۲) قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے ۔

۴۔ سوتیلی ماں | اس کتاب میں اصلاح معاشرت کے اھم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ھے ۔ سوتیلی ماں اور سوتیلے بچوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے مفید طریقے بیان کئے گئے ھیں مصنفہ رابعہ بیگم صاحبہ طباعت و کتابت نفیس صفحات (۴۸) قیمت مجلد صرف چار آنے ۔

۵۔ روح غالب | اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسداللہ خان غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ۔ صفحات (۲۴۰) با تصویر قیمت دو روپے آٹھ آنے ۔

۶۔ تاریخ گولکنڈہ | وہ کتاب جو کئی سال کی تحقیق اور محنت و معلومات کا نتیجہ ھے ۔ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے استاد تاریخ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم ۔ اے ۔ ایل ۔ ایل ۔ بی نے اس کتاب میں سلاطین قطب شاھیہ کی نہایت مستند تاریخ قلمبند کردی ھے ۔ تصویریں بھی مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ھیں ۔ صفحات (۳۳۰) قیمت مجلد تین روپیہ آٹھ آنے ۔

۷۔ گریہ و تبسم | صاحبزادہ مہکش کے کلام کا دلچسپ مجموعہ ۔ شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ ھے ۔ صفحات (۱۹۲) قیمت مجلد دو روپے

۸۔ سر سالار جنگ اعظم | حیدرآباد کے محسن اعظم کے حالات زندگی اور کارنامے دلچسپ اور سادہ پیرائے میں قلمبند کئے گئے ھیں ۔ مرتبہ مولوی فیض محمد صاحب بی ۔ اے ۔ ڈپ ایڈ صفحات (۴۸) قیمت مجلد صرف چھ آنے ۔

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۳۹۵۰ M
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۶)
جون ۱۹۴۰ء

جلد (۳) جون ۱۹۴۰ء شمارہ (۶)

خواجہ حمیدالدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

سر مہاراجہ کشن پرشاد یمین السلطنت کی وفات

مہاراجہ یمین السلطنت کے انتقال نے حیدرآباد سے مشرقی تہذیب کا آخری نصب العینی پیکر چھین لیا۔ مہاراجہ کی ذات ایک مستقل ادارے کی حیثیت رکھتی تھی ایسے زمانے میں جب کہ نئے تمدن کے برقی قمقموں نے قدیم روایات کے فانوسوں کو جھٹلا دیا ہے، ایک کافوری شمع کی طرح ہمارے دلوں میں اپنی کھوئی ہوئی عظمتوں کی یاد دلاتے تھے۔ ان کا وجود، نہ صرف ماضی کی ایک عظیم الشان نشانی تھا، بلکہ وہ جدید نسل کے لئے مستی کردار کا ایک سبق تھے۔ جو کتاب مغلیہ تہذیب کی تاریخ پیش کرتی ہے، اس کا آخری باب گویا مہاراجہ کی آخری سانسوں کے ساتھ ختم ہوگیا۔

مہاراجہ کی زندگی کا ہر پہلو، ایک مستقل تفصیل کا محتاج ہے۔ ان کی زندگی، زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی تھی۔ ان کی بخشش عزیزوں کے لئے سہارا۔ ان کا اخلاق دلوں کو موہنے والا، ان کا ذوق حسن کاری، ان کی روح کی طرح لطیف، ان کا ہر سانس، نغمۂ عمل وہ کبھی ایک امیر کی طرح اپنی خاندانی عظمت کا نقشہ کھینچ دیتے اور کبھی ایک فقیر کی طرح فقیروں میں گھل مل جاتے۔ وہ "شاد" ان سے ملنے والے شاد ـــ ایوانِ شاد کی سکون پرور ہنگامہ آرائیوں کی صدائیں ابھی تک حیدرآباد کی فضاؤں میں گونج رہی ہیں۔ یہ ایوان اصل میں مشرق و مغرب کا مرکز امتزاج تھا۔ مشرق کی روایتیں وہاں ـــ مغرب کی کارفرمائیاں بھی ایک حد تک۔

مہاراجہ اردو کے بڑے اچھے ادیب اور شاعر تھے۔ ان کے ذوق تصنیف و تالیف کی کئی نشانیاں، کتابوں کی صورت میں اب بھی موجود ہیں۔ ان کی تحریروں کا زیادہ تر حصہ تصوف پر مشتمل ہے۔ وہ اپنے آپ کو صوفی منش بتاتے تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کا مسلک "صلح کل" تھا۔ وہ فرقہ پرستی کے ادنیٰ تعصبات سے بلند و بالا تھے۔ ان کا خدا " برہمن کے نزدیک" رام" اور مسلمان کے نزدیک" اللہ" تھا۔ وہ "اللہ اور" رام" میں کوئی فرق نہ پاتے تھے۔ ان کی شاعری میں ان عقائد کے جابجا عکس جھلکتے ہیں۔ ان کے عقائد سے قطع نظر، ان کی تحریروں پر اگر ادبی نقطۂ نگاہ سے نظر ڈالی جائے تو ان میں روانی اور پختگی کا ایک سیلاب ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔ وہ اردو کو عزیز رکھتے تھے اور اس زمانے میں جب کہ اردو اور ہندی کی بحث نے فرقہ پرستوں کے لئے ایک نئی رزم گاہ کھول دی ہے۔ ان کی اردو نوازیوں کی جیسی کچھ اہمیت تھی ظاہر ہے۔ اردو ادب میں ان کی تحریروں کا اگرچہ کوئی بلند مقام نہیں ہے۔ لیکن ہمیں اس امر کے اظہار میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ ان کا اردو کو اپنے ذوق نگارش کے لئے انتخاب کرنا ہی بہت کافی تھا۔

مہاراجہ آنجہانی، ہر حیدرآبادی کے دل میں اپنے لئے جگہ رکھتے تھے۔ ہر حیدرآبادی ان کی عزت کرتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ ایک امیر تھے بلکہ اس لئے کہ" حیدرآبادی قومیت" اور حیدرآبادی روایات کی وہ ساری خصوصیات ان میں موجود تھیں، جو ایک حیدرآبادی کو حیدرآبادیوں کے نزدیک قابلِ عزت بنانے کے لئے ضروری ہیں، حیدرآباد کی رعایا انھیں اپنا ہمدرد پاتی تھی۔ وہ اہل حیدرآباد کو اپنے عزیزوں کی طرح جانتے تھے۔ حیدرآباد کی عزت میں اپنی عزت سمجھتے تھے۔ حیدرآباد کی مصیبت پر ان کی پیشانی پر بل پڑجاتے تھے۔

ایسی ہستی کا ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوجانا ایک عظیم نقصان ہے۔ جس کی تلافی ہوتی نظر نہیں آتی۔

میکش

اداریہ

ہمارے لئے یہ امر موجب اطمینان ہے کہ سب رس اور اس کے ضمیموں "بچوں کا سب رس" اور "سب رس معلومات" کی مقبولیت میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے، ہر قسم کے معاونوں میں برابر اضافہ ہوتا جارہا ہے اور اس کی ترتیب و اشاعت کو بہت پسند کیا جارہا ہے اس کا ایک ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ معاصر "نیرنگ خیال" نے اپنے اس سال کے سالنامہ میں (جہاں اپنی سالانہ روایات کے مطابق اردو کے بہترین ادیبوں اور شاعروں وغیرہ کی خدمات کے اعتراف میں خطابات دیئے ہیں) مدیر سب رس کے لئے "مدیر اعلیٰ" کا خطاب تجویز کیا ہے۔

اس ماہ وقت کی کمی کی وجہ سے تنقید و تبصرہ کے صفحات حذف کر دئے گئے ہیں۔ آئندہ شمارے میں زیادہ کتابوں پر تنقیدیں شایع ہو جائیں گی۔ اس دفعہ نذر دکن سے متعلق "حضرت مخلص" کا ایک پر جوش مضمون متعدد خواتین و اصحاب کی فرمائش پر شایع کیا جارہا ہے۔ چونکہ صاحب موصوف کی تنقیدیں اکثر رسائل خاص کر ساقی دہلی میں بڑے شوق سے پڑھی جاتی ہیں اس لئے اس کو پہلے جگہ دی گئی ہے ورنہ اس سے پیشتر کے وصول شدہ کئی مضمون اس موضوع سے متعلق دفتر میں موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں کئی اہل قلم اصحاب نے خطوں کے ذریعہ سے بھی اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن یہاں صرف دو خطوں کے اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔ مولٰنا عبدالماجد صاحب دریا بادی ایڈیٹر صدق لکھنؤ طبقۂ نسواں کی فلاح و بہبود پر خاص طور پر نظر رکھتے ہیں، اور ہمیشہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ اس طبقہ کو ترقی کی دھن میں بے راہ روی سے بچنا چاہیے۔ وہ جدید نظریۂ ترقی و آزادئ نسواں کے سخت مخالف ہیں اور صنف نازک کی بیجا حمایت اور حوصلہ افزائی کو پسند نہیں کرتے اسلئے انکی رائے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ اپنے ایک عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"تنقید کی آگ دیکھی۔ واقعی آتش زبانی کے لحاظ سے "آگ" ہی ہے۔ دل شکن بھی۔ حوصلہ شکن بھی۔"

ساتھ ہی محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر کے ایک عنایت نامہ کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ موصوفہ حیدرآباد کی مشہور اور نغز گفتار شاعرہ ہیں۔ وہ لکھتی ہیں۔

"یہ محض حاسدانہ جذبات کی زیادتی ہے، اور اس کا سبب ادارے کی عام مقبولیت ہے۔ ...... ادارے اور شعبۂ نسواں کی بنیادیں نہ صرف مستحکم ہو رہی ہیں، بلکہ ان کا اقتدار بقائے دوام حاصل کر رہا ہے۔ چیزیں اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں۔ خلوص کی قدر کے لئے بدخواہی و خود غرضی کا وجود ضروری ہے۔ بہرحال کوئی چیز تو ہے جس کی خاطر! یہ انسانوں کو انسانیت اور اخلاق سکھانے والے، اپنی انسانیت سے ہاتھ دھو بیٹھنے پر تلے ہیں۔ افسوس تو اس سعی لاحاصل پر کیجئے جو بد نامی کے ساتھ ہو رہی ہے۔ میں تو اس طرف متوجہ ہونا بھی تضیع اوقات سمجھتی ہوں ......"

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا؟

ادارے کی خبریں

اس مہینے ادارے کی مجلس انتظامی کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولوی محمد لیاقت اللہ خاں صاحب ایچ سی ایس معتمد فینانس (نائب صدر ادارہ) مولوی

سید محمد اعظم صاحب ایم اے کینٹب منصرم ناظم تعلیمات، مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے کینٹب نائب ناظم تعلیمات، پروفیسر محمد صدیقی ایم اے ایل ایل بی، پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی، پروفیسر عبدالقادر صاحب صدیقی ایم اے اور ڈاکٹر زور صاحب معتمد اعزازی نے شرکت کی۔ ۱۹۳۹ء کی سالانہ روئداد اور ادارہ کی سرگذشت کی اشاعت کا تصفیہ کیا گیا۔ ادارہ کے حسابات کی باضابطہ تنقیح عمل میں آئی اور آڈیٹر صاحب نے ادارہ کے دفتر کی باضابطگی اور حسابات کی صفائی پر بڑی مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا۔ سنہ ۱۹۴۰ء کی آخری شش ماہی کے لئے مطبوعات کا انتخاب کیا گیا اور ادارہ کی بعض شاخوں کے قیام کی توثیق عمل میں آئی۔

ادارہ کے **شعبۂ نسواں** کی مجلس انتظامی کا بھی ایک جلسہ ۳ر اپریل کو منعقد ہوا جس میں محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، محترمہ سارہ بیگم صاحبہ، محترمہ جیلانی بیگم صاحبہ، محترمہ جہاں بانو بیگم صاحبہ، محترمہ عزت بیگم صاحبہ، محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر اور محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد اعزازی شعبہ نے شرکت کی۔ اس مجلس میں بھی حسابات پیش کئے گئے اور ان کے صاف ہونے کی تصدیق کی گئی۔ مدرسۂ تعلیم البالغات، اجلاس عام اور کانسرٹ وغیرہ مسائل سے متعلق تصفیے عمل میں آئے۔ معلوم ہوا کہ مدرسہ بالغات میں اوقات کی پابندی اور درس و تدریس میں باقاعدگی ہے۔ مسز محمد یونس صاحب پابندی سے آتی ہیں پکوان میں طالبات دلچسپی لے رہی ہیں۔ حالت امید افزا ہے۔ مدرسہ کے لئے ایک کتاب الرائے رکھنے کا تصفیہ ہوا تاکہ مدرسہ کے معاینہ کو آنے والے اپنے تاثرات قلمبند کرسکیں۔

ادارہ کی شاخیں برابر سرگرم عمل ہیں۔ کلیانی میں ۲۶ر اپریل کو ایک کامیاب جلسہ ہوا۔ اور بتایا گیا کہ ادارہ کے امتحانات کے سلسلہ میں مولوی عبدالکریم صاحب نے اردو عالم اور اردو دانی کی تعلیم دینی شروع کردی ہے۔ اس شاخ کے صدر مولوی محمد رحمت اللہ صاحب ایم اے ایل ایل بی، معتمد مولوی عطاء اللہ صاحب عطا، شریک معتمد مولوی محمد عبدالکریم صاحب، رکن تشہیر مولوی غلام معین الدین صاحب اور رکن مراسلات و خازن مولوی محمد تاج الدین صاحب ہیں۔ اس جلسہ نے دارالمطالعہ کے قیام کے بارے میں بھی تصفیہ کیا۔

پربھنی، محبوب نگر، گلبرگہ، کپل، اور عثمان آباد وغیرہ کی شاخیں بھی برابر کام کر رہی ہیں۔ آئندہ مہینے سے سب رس کے چند صفحات شاخوں سے متعلق معلومات کے لئے وقف کردئیے جائیں گے۔ ان شاخوں کے معتمدین براہ کرم اپنی اپنی مصروفیتوں سے متعلق ایک مختصر لیکن جامع نوٹ روانہ فرمائیں تاکہ من وعن شائع ہوسکیں۔ شاخوں کے جلسوں کی جو روئدادیں دفتر میں وصول ہوتی رہتی ہیں وہ اس طرح لکھی ہوتی ہیں کہ ان کو شائع کرنے کے لئے انھیں دوبارہ لکھنا پڑتا ہے۔

شعبۂ طلبہ ادارہ کا یہ شعبہ بڑی سرگرمی سے کام کر رہا ہے۔ اس کا کتابچہ معلومات رنگین سرورق کے ساتھ نہایت دیدہ زیب چھپا ہے۔ طلبہ دفتر سے مفت طلب کرسکتے ہیں۔ اس شعبہ کے معتمد اور سب رس کی مجلس ادارت کے رکن مولوی معین الدین صاحب انصاری کو (جو بچوں کے سب رس کے ایڈیٹر ہیں) اس ماہ صوبۂ میدک کی طلبہ کانفرنس منعقدہ محبوب نگر میں صدارت کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے وہاں جو خطبہ پڑھا وہ جلسہ میں مطبوعہ شکل میں تقسیم کیا گیا تھا اور اب اس شمارہ میں بھی شائع کیا جارہا ہے۔ اس میں طلبہ کے لئے بڑی کام کی باتیں درج ہیں توقع ہے کہ طلبہ ان سے فائدہ اٹھائیں گے۔

اشاعت اردو کے لئے دورے۔ اس مہینے ادارے

کی طرف سے چند اصحاب نے مختلف مقامات کے دورے کئے۔ اور لوگوں کو اردو کی تعلیم، مطالعہ خانوں اور شاخوں کے قیام اور ادارہ کے اردو امتحانات کی ترویج کے لئے آمادہ کیا۔ اس سلسلہ میں پہلے مولوی حفیظ صدیقی بی اس سی (رکن مجلس ادارت سب رس و مدیر سب رس معلومات) کا سفر آندھرا دیس خاص کر قابل ذکر ہے۔ انھوں نے اپنے سفر کی تفصیلی رپورٹ مرتب کرلی ہے جو آئندہ شمارہ میں شایع ہوگی۔

مولوی شیخ رحیم الدین صاحب (نائب صدر شعبۂ طلبا ادارہ) نے بھی ظہیرآباد، چرک پلی اور بیدر اور اس کے اطراف واکناف کا میاب دورہ کیا۔ حمید الدین شاہد مہتمم مدیر سب رس نے صوبہ میدک کی طلبہ کانفرنس کے سلسلہ میں محبوب نگر کا سفر کیا، کئی روز قیام کرکے وہاں کی شاخ ادارہ کا کام دیکھا اور صوبہ میدک کے مختلف مقامات میں ادارہ کی شاخوں کے قیام کی کارروائی کی۔

ادارہ

تاریخ گولکنڈہ

(مبصرین کی نظر میں)

مولفہ جناب عبدالمجید صدیقی ایم اے ایل ایل بی استاذ تاریخ جامعۂ عثمانیہ

علاوہ مقدمہ کے کتاب پانچ حصوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ دکن کے اس حصہ میں سلطنت کا آغاز کیونکر ہوا، دوسرے حصے میں اس کے استحکام اور تیسرے میں اس کے عروج سے بحث کی گئی ہے چوتھا حصہ زوال سے متعلق ہے اور پانچویں میں گولکنڈہ کی تمدنی، سیاسی وعلمی تاریخ بیان کی گئی ہے عمارات وسلاطین قطب شاہی کی گیارہ تصاویر بھی شامل ہیں، کتاب بہت مفید اور تاریخ دکن سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

مولانا نیاز فتحپوری۔ نگار مئی ۱۹۴۰ء

یہ قطب شاہی دور حکومت کی مفصل تاریخ ہے جس کو مرتب نے پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے، حصہ اول میں سلطنت کی تاسیس حصہ دوم میں سلطنت کا استحکام حصہ سوم میں سلطنت کا عروج حصہ چہارم میں سلطنت کا زوال حصہ پنجم میں گولکنڈہ کے تمدن پر سیر حاصل بحث موجودہ تحقیق وتلاش کی روشنی میں کی گئی ہے۔ اور حصوں کو مختلف ابواب میں تقسیم کرکے تاریک سے تاریک پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے اردو زبان کی مروجہ تاریخوں میں اس تاریخ کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اس دور کی معاشرت اور حالت کا بھی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، قطب شاہی دور حکومت کا ذکر تاریخ ہند لکھنے والوں نے بہت مختصر الفاظ میں کیا ہے۔ اس کی ایک وسیع تاریخ ہے۔ جس کے ہر دور ے ملد جزر میں تمدن کی بڑی بڑی حقیقتیں پوشیدہ ہیں جس کا خوش گوار تمدن دو سو سال تلنگانے کے رہنے والوں کو گرویدہ کئے ہوئے تھا۔ قابل اور لایق مرتب نے اردو زبان میں گولکنڈہ کی جامع اور مفصل تاریخ لکھ کر بڑا احسان کیا ہے، امید ہے کہ ناظرین اس کے مطالعہ سے نہایت محظوظ ہوں گے۔

رہنما مرادآباد اپریل ۱۹۴۰ء

جنابِ میکش کی خدمت میں

(شادی خانہ آبادی کی تقریب میں)

دہر میں دو پاک روحوں کا دوامی اتصال
زندگی کی کشمکش کو فتح کرنے کے لئے

جستجوئے منزلِ تکمیل میں دو ہمسفر
شوق کی پیچیدہ راہوں سے گزرنے کے لئے

دو نظر افروز جلووں کا مقدس اجتماع
غیرتِ مہر مبیں بن کر ابھرنے کے لئے

عقد کیا ہے! اک نیا احساسِ تکمیلِ حیات
آرزوؤں کے نئے سانچے میں تشکیلِ حیات

اختر

نذرِ میکش

(تقریبِ خانہ آبادی کی خوشی میں)

حیاتِ خانۂ شادی کا باب بن کے رہی
تلاشِ نغمۂ سکون رباب بن کے رہی

نگاہِ ساقی کی میکش نوازیاں مت پوچھ
کہ میکدے کی ہر اک شئے شراب بن کے رہی

تمام عمر محبت کے خواب دیکھے تھے
تمام عمر محبت کا خواب بن کے رہی

کسی کی لغزشِ مبہم ارے معاذ اللہ
کسی کی جنبشِ بندِ نقاب بن کے رہی

وہ ایک چیز جو پنہاں تھی چشم ساقی میں
سرورِ مستئ عہدِ شباب بن کے رہی

حیا کو ناز مبارک، وفا کو عہدِ وفا
کہ پھر وفا ہی حیا کا جواب بن کے رہی

شرارِ نغمۂ ہستی کی جلوہ فرمائی
قرارِ شورشِ چنگ و رباب بن کے رہی

کلی کلی کو مبارک نظرؔ پیامِ بہار
کلی کلی کی تمنا گلاب بن کے رہی

نظر

تصویر دیکھ کر

یہ نگاہِ حشر ساماں، یہ جوانی کی پھبن
ڈر رہا ہوں وقت سے پہلے قیامت آ نہ جائے

تیرے ہونٹوں کے تبسم نے اسے دہرا دیا
وہ فسانہ جو کہا جائے مگر سمجھا نہ جائے

تو نے کیوں تعویٰ شکن زلفوں کو برہم کر دیا
میکدوں پر پھر کہیں ساون کی بدلی چھا نہ جائے

میری للچائی نگاہوں کو پریشاں دیکھ کر
مجھ کو یہ ڈر ہے تری تصویر بھی شرما نہ جائے

دل کی خواہش ہے کہ ساری عمر دیکھے جائیے
عقل کہتی ہے تری تصویر کو دیکھا نہ جائے

تو ہی فریاد سے کہ پھر مجبورِ انساں کیا کرے!
زندگانی میں اگر جذبات سے کھیلا نہ جائے

بحرِ ہستی میں ہیں دھوکے کی چٹانیں زیرِ آب
تیری امیدوں کی کشتی بھی کہیں ٹکرا نہ جائے

میری آہِ گرم سے موج ہوا ہے بے قرار
تیرے فوٹو کی جبیں پر بھی پسینہ آ نہ جائے

مجھ کو آتا ہے ترس تیری جوانی دیکھ کر
تو بھی اس منزل میں میری طرح ٹھوکر کھا نہ جائے

ماہر القادری

کیفِ جاوید

آ گئے لو آ گئے وہ آ گئے
چاندنی بن کر فضا پر چھا گئے

جب بھی گزری رات کو بادِ نسیم
دل یہ سمجھا آ گئے وہ آ گئے

کاش مایوسی کی حد ہوتی کوئی
تیرے گلدستے بھی اب مرجھا گئے

میں کسی کا ہائے کیا شکوہ کروں
میرے ارماں تھے مجھے تڑپا گئے

جانے کیا نظروں نے میری کہہ دیا
ہنس رہے تھے یا ابھی شرما گئے

گو دہ ہے وہ زینتِ آغوشِ شب
دل یہی سمجھا کہ دھوکا کھا گئے

تم نہ آئے حسبِ وعدہ رات کو
ہنستے ہنستے پھول بھی کمھلا گئے

میں نے دامن میں لیا قیصری انھیں
اشک بن کر گود میں جو آ گئے

قیصری

رائج اردو کی اصلاح

(مراسلات کا جواب)

مئی کے سب رس میں دو مراسلے میرے مضمون "رائج اردو کی اصلاح" سے متعلق شایع ہوئے ہیں۔ پہلا مراسلہ جناب ماہر القادری صاحب کا ہے جو ایک معروف شاعر ہیں چنانچہ آپ کا اسلوب اور استدلال بھی شاعرانہ ہے۔ تحریر مرا بہ مشاعرہ کہ برد۔ جو بحث چھیڑی گئی ہے وہ تو ٹھنڈے دل سے غور چاہتی ہے۔

آپ نے لکھا ہے کہ "اگر یہ خبر صحیح ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کے شعبہ زبان کی مجلس مروج تحریری زبان کی اصلاح کر رہی ہے تو پھر بخدا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے"۔ مجھے اس شعبہ سے جو تعلق رہا ہے اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ہاں یہ خبر صحیح ہے۔ ہم اصلاح کی کوشش کر رہے ہیں۔ ماتم کو ہم روک نہیں سکتے۔

میں نے اردو کو آریائی زبان کہا تھا۔ آپ نے شاید اس کو آریہ سماجی پڑھ لیا اور قرآن کا ذکر کرنا ضروری خیال فرمایا۔

دوسرا مراسلہ جناب عبدالقدوس صاحب کا ہے۔ آپ کی تحریر سنجیدہ اور مدلل ہے۔ ادارہ اختلاف کے باوجود آپ کی رائے کا احترام کرنے پر مجبور ہے۔ آپ جیسے اصحاب ہمارے صحیح مخاطب ہیں۔ ادارہ نے غیر ضروری فارسی اور عربی لفظوں اور ترکیبوں کے استعمال کو چھوڑ دینا تجویز کیا ہے۔ یہ اجمال کسی قدر تفصیل چاہتا ہے۔ اردو زبان بہت سی زبانوں کے میل سے بنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں بہت سے لفظ ایک ہی معنوں کے آ گئے ہیں اور آتے جا رہے ہیں۔ اگر دو یا زیادہ لفظ تقریباً ہم معنی ہوں لیکن پورے پورے ہم معنی نہ ہوں اور ان میں معنوں کے کوئی پہلو مختلف بھی ہوں تو ایسے لفظ زبان کو ترقی یافتہ اور مال دار بناتے ہیں اور خیال کے اظہار میں آسانی پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً امیر، غنی اور مال دار یا دانا، عقل مند اور ہوشیار کہ ان کے معنی قریب ہیں لیکن ایسے بالکل ایک نہیں کہ ایک دوسرے کا بدل ہوں۔ ان لفظوں کو کوئی غیر ضروری نہیں کہہ سکتا۔ چاہے وہ کسی زبان سے آئے ہوں۔ لیکن بعض لفظ ایسے ہیں جو بالکل ایک دوسرے کا بدل ہوتے ہیں مثلاً درخت اور جھاڑ اسکول اور مدرسہ مسرت اور خوشی۔ ایسے لفظوں کا وجود دو عملی پیدا کرتا ہے اور نوسیکھ کو خصوصاً بہت دقت ہوتی ہے کہ دو میں سے آخر کس کو استعمال کرے۔ ان سے زبان دھنی نہیں بلکہ الٹا بوجھل اور مشکل بنی جا رہی ہے۔ اب اردو زبان کو پھر سے ٹکسالی بنانا ضروری ہو گیا ہے۔ ایسے لفظوں کی چھان بین ہوتی رہنی چاہئے۔ اور جن کے بالکل ہم معنی زیادہ رائج لفظ موجود ہوں ان کو چھوڑ دینا چاہیے۔ مثلاً دیکھنا یہ ہے کہ "نیا" کے ہوتے "جدید" کی اور "عورتیں" کے ہوتے "نسواں" کی کیا ضرورت ہے۔

ترکیبوں کا معاملہ لفظوں سے بہت زیادہ اہم ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اجنبی زبان کا لفظ تلفظ کے لحاظ سے جوں کا توں یا کچھ بدل کر ہماری زبان میں کھپ گئے۔ اور ضرورت سے لیا گیا ہو مثلاً ریل۔ یا بے ضرورت ہو لیکن بعد میں استعمال کی کثرت سے اپنے لیے جگہ پیدا کرے مثلاً نمبر، کالج، ایڈیٹر۔ لیکن

ترکیب کا قاعدہ ہر زبان کا علحدہ ہوتا ہے۔ اور قواعد زبان کی بنیاد ہیں۔ کوئی زبان آزاد اور مستقل ہو نہیں سکتی جب تک اس کے قواعد آزاد اور مستقل نہ ہوں۔ اس کی مثال آزاد اور غلام ملک کی ہے۔ آزاد ملک میں اول تو پردیسی کے آنے پر روک ٹوک ہوتی ہے۔ پھر آنے کے بعد اس کو رائج قانون کی پابندی کرنی ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے ساتھ اپنا ذاتی قانون لائے۔ غلام ملکوں میں بعض آزاد ملکوں کے باشندوں کے لیے خاص قانون بلکہ خاص عدالت ہوتی ہے۔ ملک آزاد ہوتے ہی سب سے پہلے اس ذلت کو دور کرتا ہے۔ یہی حال زبان کا ہے۔ اگر اردو کو اپنا ایک مستقل وجود بنانا ہے تو اس کے قواعد علحدہ ہونے چاہیں۔ اور ان قواعد کا اطلاق تمام لفظوں پر ہونا چاہیے چاہے وہ کسی زبان سے آتے ہوں۔ اگر ان لفظوں کو اردو میں رکھنا ہے تو ان سے اردو قواعد کی پابندی کرانی ہوگی۔ مثلاً اردو میں جمع بنانے کا قاعدہ مونث کو "ان" یا "ین" لگانا ہے۔ تصویر کا لفظ یا تو اردو کا ہے یا نہیں ہے۔ اگر نہیں ہے تو اردو میں استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہے تو اس کی جمع تصویریں ہوگی نہ کہ تصاویر۔ اس طرح اضافت کی علامت اردو میں 'کا' 'کی' 'کے' ہے۔ نتیجہ اور قلم کو اگر اردو میں استعمال کرنا ہے تو ان کی اضافت "قلم کا نتیجہ" ہوگی۔ بعض ترکیبوں کو بے شک مستثنیٰ کرنا ہوگا۔ ایسی ترکیبیں جو تلمیح یا استعارے وغیرہ کے طور پر استعمال ہوتی ہیں یا جو بمنزلہ ایک واحد لفظ کے سمجھی جا سکتی ہیں یا جو اصطلاح بن گئی ہیں مثلاً شیر خدا' صاحب دل فنون لطیفہ ایسی ترکیبیں جائز رکھی جا سکتی ہیں۔ لیکن یہ نہیں جاری رکھا جا سکتا کہ [illegible] لکھتے وقت جہاں دو [illegible] ی الاصل یا [illegible] الاصل الفاظ نزدیک آئیں ان کے [illegible] اردو کی علامت کا کی کے کی بجائے زیر دھر دیا۔ مثلاً اخبار اور رسالے نہ لکھ کر اخبار و رسائل لکھنا یا فنون لطیفہ کے خزانے نہ لکھ کر خزائن فنون لطیفہ لکھنا۔ اور یہ اس کثرت اور دیدہ دلیری سے ہوتا ہے گویا کہ اردو میں حرف عطف دو ہیں "اور" اور "و" اور اضافت کی علامت کا کی کے کے علاوہ زیر بھی ہے۔ اگر ان کو با قاعدہ اردو میں شامل کرنا ہے تو بسم اللہ پھر گنگر بتھر گی لکھیے اور ڈھیر گیہوں کو بھی صحیح سمجھیے۔ ورنہ تہیہ کر لیا جائے کہ ایسی نئی نئی ترکیبیں نہیں بنائیں گے جو اردو کے قواعد سے میل نہیں کھاتیں۔

اب ظاہر ہے کہ سوال آسانی اور دشواری کا نہیں بلکہ دو عملی کے خاتمہ کا اور زبان کی آزادی استقلال اور غیرت کا ہے۔ عربی اور فارسی لفظوں اور ترکیبوں سے مجھے چڑ ہوتی تو اتنے عربی اور فارسی لفظ اور ترکیبیں میری زبان پر نہ آتے لیکن بحث میری ذات سے نہیں۔ میں ایک اصول اور وہ بھی ایسا اصول پیش کر رہا ہوں جس کو ادارۂ ادبیات اردو نے طے کیا ہے۔ میری حیثیت صرف پیش کرنے والے کی ہے۔ اگر میں اس اصول کی خلاف ورزی کر دوں تو اس سے اصول کا غلط ہونا لازم نہیں آتا۔ اگر یہ اصول آپ کو تسلیم ہے تو اس کی روشنی میں میری ناچیز تحریر پر مشق ناز فرمائی کیجائے۔ میری گردن تسلیم خم پائیے گا۔

شمارہ بے شک عربی نہیں۔ بس ہیچ مداں کو خود حیرت ہے کہ اسے کیسے عربی لکھ گیا۔ ممکن ہے کہ یہ نمبر سے زیادہ فصیح ہو لیکن اعتراض قایم ہے کہ نمبر کے ہوتے اس کو گڑھنے کی ضرورت کیا تھی۔ نمبر ہماری زبان میں اس قدر گھل مل گیا ہے کہ ان پڑھ سے ان پڑھ بھی اس کو سمجھتا ہے۔ اس کو نکالنا

گوشت سے ناخن کا نکالنا ہوگا۔ اور ایسے لفظ کہیں آپ کے ہمارے لگائے نکلتے ہیں۔ یونین اور یونیورسٹی اور ایڈیٹر تو نمبر سے ہزار گنا کم رواج پائے ہوئے تھے لیکن خود جامعۂ عثمانیہ کے طالب علم بزم اتحاد یا جامعہ یا مدیر نہیں کہتے۔ جب کہیں گے وہی یونین یونیورسٹی اور ایڈیٹر یہی حال عربی اور فارسی کے سہل اور رائج الفاظ کا ہے۔ اگر ان کا بدل ان سے زیادہ سہل اور رائج نہ ہو تو ان کو نکالنے کی کوشش کا بھی یہی انجام ہوگا۔ البتہ ان الفاظ کو رعایا بن کر رہنا چاہیے نہ کہ حاکم

خلاصہ یہ کہ غیر زبانوں کے غاصبانہ تسلط سے آزاد کرکے اردو کو ایک مستقل زبان بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

اب رہا [illegible] کے دوسرے کنول کا یا میرا ذاتی عمل تو ہم کوشش [illegible] کریں گے کہ جو کہیں اس پر خود عمل کرکے۔ کہا ہے لیکن عادتیں پختہ ہوگئی ہیں چھوٹتے چھوٹتے چھوٹیں گی

ضیاءالدین انصاری

غزل

گلوں سے پی رہا ہوں میں بغرض نہیں ہے جام سے
معیتیں معیتیں ہیں عیش ناتمام سے

بچو سیاستِ الم میں اس ہجوم عام سے
ہزار اہتمام سے ہزار احترام سے

مری پرستشِ دلی میں چند خامیاں سہی
حلاوتِ الم کی تلخیاں بدل کے رہ گئیں

خزاں کی جھاڑیوں سے اس طرف ہے کشتِ زعفراں
رواں دواں ہے زندگی کے ساتھ ساتھ عقل بھی

گرفتِ غم سے بھاگنا۔ گرفتِ غم کا سامنا
افق کی سرخ بدلیوں پہ عکس ڈالتے ہیں وہ

نثار ہو رہا ہے سادگی پہ حسنِ یاسمن
وہ برشِ نظر کہ دل دو نیم ہو کے رہ گیا

گزر رہے ہیں سیکڑوں تری نظر سے بے خبر
عجب نہیں جو گفتگو کے بعد اور لے بڑھے

حلال جب ملے تو واسطہ مئے حرام سے
"خمارِ مستقل" نہ لے۔ "نشاطِ کم قیام سے

جہاں ستم کو جانچنے لگے ہوں فہم خام سے
چلا ہوں بت کدہ کی سمت مسجد الحرام سے

مگر جبینِ بندگی لگی ہوئی ہے کام سے
لب و زباں پہ کیف چھا رہا ہے تیرے نام سے

تو اپنی ابتدا تو کر کُل کے اختتام سے
یہ نشہ سوار بے خبر ہے مصرفِ لجام سے

قفس کی تیلیوں میں آرہا نکل کے دام سے
مجسمے بنا رہی ہے رات مل کے شام سے

وہ آ رہے ہیں سیر کے لئے اس اہتمام سے
نظر کو یاد کر رہا ہوں۔ تیغ بے نیام سے

مرے لئے ہی بجلیاں سی گر رہی ہیں بام سے
"پیام" تک تو آچکا ہے سلسلۂ "سلام" سے

محرکِ غزل ہے **شاد** مجھ کو اس کی ہر ادا
نہیں ہے میری شاعری شرابِ لالہ فام سے

م شاد ۔ما ۔و

غزل

دل مائلِ فریاد ہے معلوم نہیں کیوں　　ناشاد سا ناشاد ہے معلوم نہیں کیوں

ہر جہد کا، ہر جبر، ہر اقدام کا حاصل　　اک فطرتِ آزاد ہے معلوم نہیں کیوں

میں شوق سراپا ہوں، محبت ہوں سراپا　　مجھ پر تری بیداد ہے معلوم نہیں کیوں

وہ جنسِ وفا کوئی بھی خواہاں نہیں جس کا　　سرمایۂ ایجاد ہے معلوم نہیں کیوں

انسان جسے "احسنِ تقویم" کہا ہے　　مجموعۂ اضداد ہے معلوم نہیں کیوں

دنیائے محبت کی تباہی کا خلاصہ　　اک لمحۂ برباد ہے معلوم نہیں کیوں

فرہاد کی محنت کا صلہ وائے مقدر　　خونِ سرِ فرہاد ہے معلوم نہیں کیوں

آ دیکھ، تری یاد میں اک بزمِ تماشا　　ہر "اشکِ جگر زاد" ہے معلوم نہیں کیوں

جو نالہ گزرتا تھا سرِ عرش سے اک دن　　ہمرہِ لبِ فریاد ہے معلوم نہیں کیوں

برباد ہوا تھا میں تری راہِ طلب میں　　اب خاک بھی برباد ہے معلوم نہیں کیوں

ہے ہے وہ سنا کر مجھے اک شوخ کا کہنا　　"دیکھو جسے ناشاد ہے معلوم نہیں کیوں"

سب کچھ تو اثرؔ بھول گیا جوشِ جنوں میں
کہنا ترا بس یاد ہے "معلوم نہیں، کیوں؟!"

مرزا جعفر علیخاں اثرؔ

نذر دکن تنقید کی آگ میں

کوئی صاحب ہیں ـــ مسٹر جعفر حسین۔ جنھوں نے اس عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے۔ جو جنوری ۱۹۴۶ء کے رسالۂ اردو میں شایع ہوا ہے۔ صاحب مضمون کے نام کے ساتھ "ڈاکٹر"۔ "پی۔ ایچ ڈی" اور "استاد عمرانیات" کے سابقے اور لاحقے دیکھ کر خیال ہوا تھا کہ یہ مضمون علم و ادب کی چیز ہوگا مگر پڑھا تو معلوم ہوا کہ اس میدان میں موصوف کچھ ایسے ہی "ڈاکٹر" ہیں جیسے کوئی کمپاؤنڈر حسن اتفاق سے ڈاکٹر بن بیٹھے۔ وجہ یہ ہے کہ موصوف تنقید کے ابتدائی اصولوں سے بھی واقف نہیں معلوم ہوتے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ دنیائے علم و ادب میں "آگ" لگا کے تنقید کو تنقیص نہ بناتے۔ ہم سے پوچھئے تو یہ "آگ" ان کے دل کی آگ ہے۔ جو علمی یا ادبی شئے نہیں۔ نری ذاتی چیز ہے۔ جسے رسالۂ اردو کے ممتاز صفحات میں منظر عام پر نہیں آنا چاہئے تھا۔ موصوف نے زبردستی یہ آگ کیوں بھڑکائی ایک دلچسپ سوال ضرور ہے۔ جسے ہم سے زیادہ ان کے سوانح نگار صاف کریں گے!

مضمون نگار صاحب کی تنقیص، تو یہ ا تنقید خواتین دکن کے ان مختلف مضامین پر ہے۔ جو انھوں نے رسالۂ "سب رس" کے لئے لکھے تھے۔ اور جو "ادارۂ ادبیات" سے ایک جگہ شایع ہوئے ہیں۔ چند مختلف مضامین کا ایک جگہ شایع ہونا ایک مستقل تصنیف کی خصائص اور درجہ نہیں رکھتا۔ وہ ایک ایسا گلدستہ ہوتا ہے جس کی ساخت میں گوناگوں پھول پتیوں سے کام لیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے وہ بجائے خود ایک چیز ہوتا ہے اور اسے اسی نظر سے دیکھنا بھی چاہئے۔ مگر مضمون نگار صاحب نے اس پر جس شد و مد سے اظہار خیال فرمایا وہ ایک غیر ضروری اپیچ بن کر رہ گیا ہے۔ جس کے ہاتھوں وہ "عمرانیات" کے "پی ایچ ڈی" کے علاوہ کسی ادبیات کے بھی سند یافتہ بن گئے ہیں!

تو ہاں، جیسا اوپر ظاہر کیا گیا۔ "نذر دکن" میں خواتین دکن کے مختلف مضامین ہیں۔ اور یہ ایک مسلمہ چیز ہے کہ حیدرآباد میں تعلیم نسواں ابھی ابتدائی دور میں ہے۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جہاں صاحب مضمون جیسے "کوڑ مغز"۔ "عربی و فارسی سے ناواقف"۔ اور "گنوار اور جاہل" (اپنی یہ تصویر موصوف نے خود اتاری ہے!) مرد کار ہوں۔ وہاں کی خواتین اپنے ابتدائی ذوق علم و ادب میں کس طرح دفعتہً "براؤننگ بہنیں" بن جائیں گی۔ یہ چیز نادانستہ طور پر خود مضمون نگار صاحب کے ذہن میں بھی آتی ہے۔ کیونکہ بزعم خود وہ بھی خواتین دکن کو دنیائے ادب میں "مشق" کرتے رہنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ان کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ "نذر دکن" بھی تو ایک مشق ہی ہے جسے ملک کی ایک خاتون نے مرتب و پیش کیا ہے۔ یہ کس نے کہا کہ یہ مجموعہ ادب اردو کا شہ کار ہے۔ جس پر مضمون نگار صاحب اس قدر آپے سے باہر ہو رہے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ ٹھنڈے دل سے غور کریں تو انھیں خود محسوس ہوگا کہ ایک چیز ہے۔ (Appreciation) اور ایک چیز ہے (Crticism) مرتب "نذر دکن" نے جب اپنی ادبی بہنوں کے مضامین ملک کے سامنے پیش کئے تو صاف طور پر کہہ دیا کہ یہ مجموعہ خواتین دکن کی "پہلی عملی" کوشش ہے۔ مگر مضمون نگار صاحب کو اتنا غصہ ہے کہ یہ

اعتراف انھیں سجھائی نہیں دیتا۔ پھر مرتب اس عملی کوشش پر تنقید نہیں کر رہی تھیں بلکہ اس کا (Appreciation) لکھ رہی تھیں۔ جسے موصوف اپنی "کورمغزی" سے تنقید سمجھ بیٹھے۔ اس طرح اگر مرتب نے تعارف کتاب میں اپنی ادبی بہنوں کو وسعت قلب سے سراہا تو کیا ایسا گناہ کیا؟ دیکھیئے مہربان! چونکہ آپ نے خود اپنی زبان سے اپنی "جہالت" کا اعتراف فرمایا ہے۔ اس لئے آپ کو یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ادب آئینۂ زندگی ہوتا ہے۔ اور گو ہندوستان کی نسوانی زندگی آج ایک عبوری دور سے گزر رہی ہے پھر بھی اپنی نسلی خصوصیات کے باعث مروت، انکسار، اور تواضع کی ایک نمایاں شئے ہے۔ مرتب کتاب ایک ہندی خاتون ہیں۔ وہ جس طرح اپنی محفلوں میں دوسری ہمجولیوں سے مروت، انکسار اور تواضع سے ملتی جلتی ہیں۔ ایک کتاب کا تعارف لکھتے ہوئے بھی فطرتاً وہ وہی رہیں گی جو وہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "نذر دکن" کے تعارف میں ان کا (Appreciation) ایک رنگ لئے ہوئے ہے جو ان کی شرافتِ نفس کی دلیل ہے۔ مگر آپ اپنی نفسانیت کی وجہ سے اس کو "خوشامد"۔ "چاپلوسی" اور نہ معلوم کیا کیا سمجھ رہے ہیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ!

رہا صاحب مضمون کا یہ اعتراض کہ محبوبیہ گرلز اسکول کی بعض طالبات نے اپنے ناموں میں بدعت کی ہے۔ اور یہ اُن کی طفلانہ حرکت ہے تو یہ بات خود موصوف کی علمیت پر حرفِ آخر ہے۔ معلوم ہوتا ہے مضمون نگار صاحب یہ نام دیکھ کر شاید اس وجہ سے چیں بہ جبیں ہو گئے کہ اسم معرفہ میں انھیں کوئی معنی نظر نہیں آتے! نہ جاننا بھی مزے کی چیز ہے۔ اور اس سے کہیں زیادہ مزے دار یہ ہے کہ انسان کچھ نہ جانے۔ پھر بھی یہ سمجھے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے! اس معاملہ میں موصوف بھی ایسے ہی ذہنی مغالطہ میں ہیں۔ مثلاً ان کا بڑا اعتراض یہ ہے کہ لیلیٰ اقبال انوار اللہ جیسے نام نہ قابلِ قدر ہیں۔ نہ مقبول ہو سکتے ہیں۔ بلکہ یہ مغرب زدگی کا نتیجہ ہیں۔ لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیئے کہ قبول اور نا قبول کا فیصلہ زمانہ کیا کرتا ہے! یہ ضروری نہیں کہ "عمرانیات" کے ایک "پی۔ ایچ ڈی" کی سمجھ میں ایک بات نہ آئے اور اسے مقبول نہ ہو تو وہ بات ہی سرے سے مہمل بن جائے۔ یا سارا زمانہ اس کی قدر نہ کرے۔ یہاں ہم کیا یہ پوچھ سکتے ہیں کہ خود صاحبِ مضمون کا نام "جعفر حسین" کیسے "مقبول" اور "قابلِ قدر" ٹھیرا؟ حالانکہ ان کا نام صرف "جعفر" یا "حسین" بھی ہو سکتا تھا۔ فرمایئے کیا یہ بھی مغرب زدگی ہے؟ مشفق!

سنیئے بات یہ ہے کہ عربوں کا طریقہ ہے کہ انساب کی حفاظت و نمائندگی کے لئے وہ ایسے نام رکھتے ہیں۔ ثبوت میں خود آپ کا نام اس طریقے کی بے معنی تقلید ہے۔ حالانکہ یہ نام عرب میں جعفر بن حسین ہوتا جس سے نسب کا بھی پتہ چلتا۔ گو آج یہاں "جعفر حسین" سے یہ بات لاپتہ ہے! اس رواج کو دیکھتے یہ بھی ایک کوشش ہے جو مستورات اپنے ناموں میں اپنے افرادِ خاندانی کی طرف نسبت دیتی ہیں۔ اس لئے باور کیجیئے کہ یہ مغرب زدگی نہیں! دوسرے مدارس وغیرہ میں عموماً ایک ہی نام کی کئی لڑکیاں ہو سکتی ہیں۔ اس لئے انھیں ایک دوسرے سے متمیّز کرنے کے لئے بھی ایسا ہوتا ہے۔ یوں یہ نام اکثر

ادبی دنیا میں بھی آجاتے ہیں، لیکن صاحبِ مضمون ان پر معترض ہیں۔ اور اپنی دانست میں یہ سمجھ کر خوش ہیں کہ انھوں نے کوئی بڑی "ریسرچ" فرمائی ہے!

مضمون نگار صاحب نے کچھ اسی قبیل کے اور بھی اعتراض فرمائے ہیں کہ مضامین میں عربی اور فارسی کے غیر ضروری الفاظ ہیں۔ ترکیبیں بھونڈی ہیں۔ مضامین کا کوئی معیار نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور اس سلسلہ میں وہ ایک جگہ حالی مرحوم پر بھی منہ آئے ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ ایسے اعتراضات ان سے متعلق ہی نہیں۔ انھیں کرنے ہی نہیں چاہیئے تھے۔ وہ "عمرانیات" کے آدمی ہیں۔ ادب دوسری چیز ہے۔ اس لئے ہمارے خیال میں ان کی یہ بھول قابلِ معافی ہے۔

امید ہے کہ خواتینِ دکن بھی انھیں معذور خیال کرکے درگزر فرمائیں گی۔ بات یہ ہے کہ دوسروں کی دیکھا دیکھی انھوں نے بھی یہ اعتراض فرما دیئے ورنہ انھیں خود اپنی کم سوادی کا اعتراف ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جواب دینے کا بھی کوئی موقع نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ بجائے جواب دینے کے اخلاقاً انھیں یہ مشورہ دے دینا زیادہ مفید ہوگا کہ چونکہ انھیں تنقید و تبصرہ کا شوق معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے پہلے وہ کچھ کتابیں اصولِ تنقید پر ملاحظہ فرمائیں تاکہ نظر میں وسعت اور قلب میں حوصلہ مندی پیدا ہو۔ کیونکہ تنقید بڑے ظرف کی چیز ہے۔ پھر ہم یقین دلاتے ہیں کہ اپنی "کوڑمغزی" کے باوصف ایک دن نام خدا وہ کچھ بن جائیں گے! مگر اس دوران میں انھیں یہ مقولہ بھی عنوانِ زندگی بنانا ہوگا کہ:۔

ایاز قدرِ خود بشناس!

آخر میں صرف اتنا اور کہنا ہے کہ چونکہ صاحبِ مضمون نے اپنا مضمون بارہ تیرہ صفحات پر پھیلا کر بھی باقی رکھا ہے۔ اس لئے ہم نے بھی یہ چند سطور ابھی بطور "مشتے نمونہ" پیش کی ہیں۔ پورا مضمون شایع ہولے تو انشاءاللہ پوری پوری خدمت کی جائے گی جس کا ابھی سے وعدہ!!

"مخلص"

خواب گاہ

مرحبا۔ اے دوست دن کے خاتمہ پر میری آغوش میں تمہاری آمد موجبِ راحت ہوگی۔ میری اس چار دیواری میں تمھاری تفریح کے لئے سامان موجود ہے۔ آؤ مجھ سے بغل گیر ہو جاؤ۔

یہاں اپنے تفکرات سے آزاد رہو۔ ان کو نکال پھینک کر جیسے سانپ کینچلی پھینک دیتا ہے اور صبح صادق تک آرام سے [illegible] چھاؤں میں چین مناؤ

دیکھو! خواب شیریں کا کیا بے بہا ہدیہ تمھارے لئے فراہم کیا گیا ہے۔ اس خواب گاہ کا خمار آلود سماں تمام رات خوش بودار پھولوں کی طرح تم کو مست و بےخود بنا دے گا۔ کبھی تمھارے سرہانے ٹھنڈک لائے اور کبھی تمھارے خوابیدہ آرام قلب کو گرمائے گا......

تم اس کشتیِ خواب میں ساحلِ امن کو سدھارو۔ اے معزز مہمان۔ اے تن خستہ کی جان۔ آ.... جلد آ... دن ختم ہوچکا۔ تجھے خوشامدید کہنے کو آرام و سکون منتظر ہیں۔

مطیع الرسول

ہمارے ملک کی قومی زبان

جو صاحبانِ علم ہیں اب ترجمانِ علم　　واقف ہے ان تمام سے یہ رازدانِ علم
کس ملک میں نہیں ہے گہر ریز کانِ علم　　ضوپاش ہر دیار میں ہیں صاحبانِ علم

ہے قاہرہ کی شرط نہ لندن کی قید ہے
بحر العلوم ر اس کی مانند زید ہے

میں مانتا ہوں علم ہے اللہ کی صفت　　ہے اس کی ہر صفت سی ضیا گیر ہر جہت
مختص اک اپنی قوم سے کرکے یہ مکرمت　　انفصال مطلقہ کی کروں کیسے منقصت

ہر قوم بہرہ یاب ہے فیضانِ علم سے
گوہر بکف نکلتے ہیں سب کانِ علم سے

انگریز کہہ رہا ہے کہ میں ہوں جہانِ علم　　دعویٰ عرب کو ہے کہ بڑھی مجھ سے شانِ علم
کہتا ہے پارسی کہ مجھی سے ہے آنِ علم　　ہر قوم کی زبان ہے گویا زبانِ علم

بے شک متاعِ علم ہر اچھی زبان ہے
اردو ہمارے ملک کی قومی زبان ہے

فیض اس زبانِ مشترکہ کا ہے چار سو　　ممتاز اس سے گلشنِ دہلی کی ہے نمو
پنجاب کی بہار اسی سے ہے سرخرو　　باغِ دکن میں اس کا اثر جانِ رنگ و بو

سی۔ پی سے ہے اس کو نہ یو پی سے رنج ہے
اردو سرورِ جان و دلِ نکتہ سنج ہے

علی منظور

زخ ش اور ان کی شاعری

محترمہ زاہدہ خاتون شروانیہ (ز۔خ ش مرحومہ)

ان معدودے چند ہستیوں میں سے تھیں جن پر طبقہ نسواں جتنا فخر کرے بجا ہے۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ دنیائے ادب کی یہ نوزائیدہ کلی بن کھلے ہی مرجھا گئی اور وہ بن بیاہی ابتدائے شباب ہی میں دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ ان کی جوانا مرگ نے اردو علم و ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اتنی کم عمری میں ان کی حیرت انگیز قادر الکلامی طبقۂ نسواں کے لئے باعث صد افتخار تھی۔ ان کی نظمیں مستقبل کے لئے ایک بہت بڑی شاعرہ کا پتہ دیتی تھیں۔ اے وائے یہ بلبل اپنا درد بھرا لیکن سریلا راگ الاپ ہی رہی تھی کہ صیاد اجل نے ایک ہی تیر سے چمن کی رونق چھین لی۔ حسرت رہ گئی کہ اسے کچھ دیر اور چہچہاتا دیکھتے، لیکن فانی انسان کی ہر خواہش بر نہیں آتی۔

۱۹۲۲ء میں ان کی وفات پر ادیب جلیل سید سجاد حیدر یلدرم نے جو دلخراش نالے بلند کئے ہیں، اس کا ایک ایک لفظ دل پر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔

" وہ عندلیب خوش الحان جس کے عرفاں پاش نغمے قفس کی تیلیوں سے نکل نکل کر ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے یکایک خاموش ہو گئی۔ نغمے فضا میں متلاطم ہیں، گر عندلیب ہمیشہ کے لئے ساکت۔"

" وہ حقیقت طراز گر شیریں آواز سراپردۂ دولت کے پیچھے سے (جہاں سے بے معنی خندہ اور فضول مکالمہ کے سوا کچھ کم سنائی دیتا ہے) سنا رہی تھی کہ صدق و صفا، علم و عرفان، سوز التہاب، درد و گداز سوگوار ہیں کہ ان کی مشاطہ ان کو دل آویز آرائشوں میں اب پیش نہ کرے گی۔

" وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی، قفس میں جی اور اس نے قفس ہی میں دم توڑا۔ اس چند گز نیلگوں آسمان کے سوا جو اس کے صحن خانہ پر حسرت بار رہا، اس نے فطرت کی زیبائش، آفریدۂ دست انساں کی آرائش نہ دیکھی، آفتاب جو دنیا کو زندگی اور حرارت بخشتا ہے قفس کی تیلیوں سے لپٹے ہوئے کپڑے سے گزر نہ سکا۔ لیکن خود اس کے قلب منور نے ایک شمع روشن کی، جس نے اسے باہر کے نور سے بے نیاز کر دیا۔ شمع تخیل!"

" وہ اپنی مختصر گر متجلی زندگی میں اپنے تئیں "خاک نشین ز۔خ۔ش" کہا کی، آج حقیقتاً وہ خاک نشینی کی آرزومند آسودۂ خاک ہے۔

" خوش درخشید گر شعلۂ مستعجل بود "

باوجود جستجوئے بسیار و تلاش بلیغ مرحومہ کے تفصیلی حالات زندگی ہمیں دستیاب نہ ہو سکے۔ تعجب اور افسوس ہے کہ اس دور کے تمام تذکرے خصوصاً خواتین کے تذکرے اردو کی سب سے بڑی شاعرہ کے ذکر سے خالی ہیں۔ اور بھی زیادہ قابل افسوس ہے۔ یہ امر کہ اس بے مثل شاعرہ کے عزیز اقربا اور اس کے جاننے پہچاننے والوں میں سے کسی نے بھی اس طرف اب تک کوئی توجہ نہیں کی۔ خود مرحومہ نے بھی کبھی اپنا پورا نام ظاہر نہیں کیا، اور شہرت طلبی سے ہمیشہ گریزاں رہیں۔ "خاک نشین" الفقیرۃ الفانیہ ز۔خ۔ش (علی گڈھی)" کے سوا انھوں نے کچھ نہ لکھا۔ اگرچہ وہ نزہت تخلص کیا کرتی تھیں، اور اسے اپنے کلام میں اکثر جگہ باندھا بھی ہے، لیکن اشاعتی کلام میں اس کو بدل کر ز۔خ کر دیا کرتی تھیں ؎

نزہت بے نوا ہے ہدیہ بدست ؛ ہو قبول جناب سلطانی

حمد میں ایک شعر ہے جس میں نزہت کو ز۔خ کر دیا ہے۔ ع

ہر ڈھب سے لب ز۔ خ پہ سب ہے اے بار خدا اذکور ترا

مرحومہ، نواب سر مزمل اللہ خاں مرحوم رئیس بھیکم پور کی چھوٹی صاحبزادی تھیں۔ نواب صاحب مرحوم کے نام نامی سے کون محب وطن ہے جو واقف نہیں۔ قومی معاملات اور تعلیم سے ان کی گہری دلچسپی، نہ صرف علی گڈھ بلکہ سارے ہندوستان میں شہرت رکھتی تھی۔ وہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی اور اسلام کے سچے شیدائی تھے۔ لایق بیٹی نے اپنے فاضل باپ سے یہی اعلیٰ جذبات اور پاک تخیلات ورثے میں پائے اور ان کو اشعار کے بے مثل دل نشیں سانچے میں ڈھال کر حقوق نسواں کی حمایت اور ان کی اصلاح کا پورا پورا حق ادا کیا۔

مرحومہ سنہ ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئیں اور بچپن ہی میں عزیز و شفیق ماں سے جدائی کا صدمہ سہنا پڑا۔ لیکن اولاد پر جان چھڑکنے والے باپ نے اس طرح دل داری اور دلدہی کی کہ انھیں اس صدمہ کا احساس نہ ہونے پایا۔ چنانچہ خود انھوں نے اپنی ایک نظم (ثمر کا شجر سے خطاب) میں اس کا اظہار کیا ہے؂

تھی نظر سے دور اک معصومہ، اک حور جناں
میں سمجھتی تھی کہ میرا باپ ہی ہے میری ماں

تعلیم نسواں کے سچے حامی باپ نے خود اپنی بیٹی کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ ایرانی معلمہ فرخندہ بیگم صاحبہ خواہر آغا کمال الدین سنجر ان کی استانی اور اتالیق تھیں، جنھوں نے مرحومہ کی فارسی کی ابتدا، اور تکمیل کی۔ وہ خود بھی بلند پایہ شاعرہ تھیں، اور ان کے بھائی استاد سنجر فارسی کے مشہور قادر الکلام شاعر تھے۔ کلام اللہ، حدیث و تفسیر اور دیگر علوم دینی کی مرحومہ کو نہایت باقاعدہ تعلیم دی گئی تھی عربی سے بھی وہ بہ خوبی واقف تھیں۔ فارسی میں ان کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ان کا فارسی کلام ہے۔ قرآن مجید کی آیتیں اور احادیث نبوی گویا ان کے کلام کا زیور ہیں۔

اردو کی خوش قسمتی ہے کہ مرحومہ کی متفرق نظموں کا مجموعہ ان کی زندگی ہی میں "آئینۂ حرم" کے نام سے پہلی بار سنہ ۱۹۲۰ء میں دارالاشاعت پنجاب لاہور سے شایع ہوا۔ پھر چھ سال کی قلیل مدت کے اندر ہی سنہ ۱۹۲۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن نکلا۔ اردو دنیائے صحافت سے جو حضرات واقف ہیں، بخوبی جانتے ہیں کہ کسی شاعر کے مجموعۂ کلام کا اتنی قلیل مدت میں دو بار چھپ جانا، اس کی ہر دل عزیزی اور مقبولیت کی کتنی زبردست دلیل ہے۔

آئینۂ حرم میں مرحومہ کی کل گیارہ نظمیں شامل ہیں جن میں سے ایک فارسی ہے۔ ان نظموں کے علاوہ اور کئی نظمیں راقمہ کی نظر سے گزری ہیں۔ ایک تو اردو کا وہ مشہور سپاسنامہ ہے جو اردو کے محسن اعظم اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی بارگاہ میں جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے موقع پر پیش کیا گیا تھا۔ ان کی دو نظمیں "جوش محبت" اور "تحفۂ درویش" سال نامۂ کاروان سنہ ۱۹۳۳ء اور سنہ ۱۹۳۴ء میں شایع ہوئیں۔ "تہذیب نسواں" "شباب اردو" "ہمایوں" "استانی" اور دوسرے رسائل میں ان کا کلام چھپتا رہا ہے، راقمہ بشرط فرصت ان پر بھی اظہار خیال کا ارادہ رکھتی ہے۔

زاہدہ خاتون کی شاعری پیشہ ورانہ یا رسمی شاعری نہیں اور نہ محض تفنن طبع کا نتیجہ ہے۔ ان کی شاعری درحقیقت ایک حساس دل کی پکار، ایک دردمند قلب فگار کی دھڑکن اور ایک چشم گریاں کے ٹپکتے ہوئے آنسو ہیں، درد و اضطراب کے وہ بے اختیار نالے اور آہیں ہیں جو زبان قلم سے نکل کر شعر کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ انھوں نے غزل کے خار زار میدان سے اپنا دامن بچائے رکھا اور فضول تک بندی اور قافیہ پیمائی کو اپنا شعار نہیں بنایا۔ حب نبوی، میاں بیوی کی محبت، تعلیم نسواں، حقوق نسواں، اصلاح نسواں، اور کیف سرمدی کے متعلق اپنے گوہر بار تخیل سے شعر کے موتی صفحۂ قرطاس پر بکھیرے ہیں۔ ان نظموں

کے لئے وہ کسی تحسین اور ستائش کی طالب نہ تھیں، چنانچہ بعض تقاریب کے موقع پر ان کا نام و نشان ظاہر کئے بغیر ہی پڑھی گئیں۔

"آئینۂ حرم" میں بعض نظموں پر تشریحی نوٹ ہیں، جو بجائے خود اردو نثر نگاری کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ نثر میں بھی وہ ایک طرز خاص اور ایک اچھوتے اسلوب بیان کی مالک تھیں۔

اس کتاب کا انتساب انھوں نے اپنے والد محترم کے نام پر کیا ہے قطع نظر اس خلوص و محبت اور درد اور تڑپ کے جو اس کے ایک ایک لفظ سے ہویدا ہے طرز ادا اور طرز بیان کی لطافت ملاحظہ ہو

"یہ آنسوؤں کی لڑی، یہ درد کی تڑپ، یہ سوزش کی آہ، ہاں، ایک فریادی کا استرحام، ایک ناشاد کی نوحہ گری ایک زخمی کی چیخ، یعنی کتاب "آئینۂ حرم" اسلام کے اس سچے شیدائی تعلیم نسواں کے اس زبردست حامی کے نام نامی سے منسوب و معنون کی جاتی ہے جس کا فیضان تربیت اس مجموعۂ پریشان خیال کی تشدید و تنشید کا معنوی سبب ہے اور جس کی قوی محبت وراثتی اثر و نسبی خصوصیت کے طور پر خاکسار مصنفہ کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے یا دوسرے لفظوں میں "کل شیئ یرجع الیٰ اصلہ" کے عام اصول کی متابعت میں دریا کے سامنے قطرہ، خورشید کے حضور ذرہ، گلشن کے پاس پھول "گرچہ خورد یم نسبتے ست بزرگ" کا فخریہ کلمہ پڑھتے ہوئے اپنی سعی بے حقیقت کو ہدیتاً پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ میرے جان سے زیادہ پیارے والد ماجد دام ظلہ العالیٰ اس نذر محقر کو خوشی کے ساتھ شرف قبولیت بخشیں گے ۔

ہمتم بدرقہ راہ کن، اے طائر قدس
کہ دراز است رہ منزل و من نو سفرم!"

اس مجموعہ میں ترتیب زمانی کے لحاظ سے ان کی پہلی نظم "قدوم میمنت لزوم" سنہ ۱۹۱۴ء کی نظم کردہ ہے اور آخری "ترانۂ عمر" سنہ ۱۹۲۰ء کی گویا اس طرح یہ مجموعہ ان کی شعر گوئی اور نغمہ سنجی کی چھ سالہ مختصر مدت تک حاوی ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء سے کئی سال پہلے مرحومہ کی شاعری شروع ہو چکی تھی، افسوس ہے یہاں اس کی ابتداء کے متعلق صحیح زمانہ کی یادداشت ہمارے پاس موجود نہیں۔

زاہدہ خاتون کی رگ رگ میں سچی اسلامیت سرایت کئے ہوئے تھی۔ صحیح اسلامی تعلیمات سے ان کا دل منور تھا، اور اس نور سے وہ اپنی دوسری بے کس اور جاہل بہنوں کے قلوب کو روشن کرنا چاہتی تھیں۔ وہ ان عقائد باطلہ کی سخت مخالف تھیں جو قدیم رسم و رواج کے پابند جاہلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ "آئینۂ حرم" کے عنوان سے انھوں نے جو طویل مسدس لکھا ہے "حب اسلام" حقوق نسواں کی پاسداری، اور اصلاح نسواں کا بہترین آئینہ ہے۔ اس کا پہلا بند ملاحظہ ہو، طبقۂ نسواں کی زبوں حالی اور بے زبانی کا نقشہ کھینچا ہے، قاری کو بے اختیار اقبال کے شکوہ کی یاد دلاتا ہے۔

میں نے مانا کہ خموشی ہے بیاں سے بہتر لب پیوستہ، لب شہد فشاں سے بہتر
صبر شیون سے، شکیبائی فغاں سے بہتر دل ہے اسرار کے رہنے کو زباں سے بہتر
پر ہر اک شئے کے لئے حد ہے معین لوگو
ضابطِ درد ہو کب تک جگر زن لوگو

پھر آگے طبقۂ نسواں کی بے کسی اور بے بسی کی کیسی سچی تصویر کھینچی ہے ۔

کیا کہوں۔ کیسے الم دیدہ و ناشاد ہیں ہم خستۂ جور ہیں ہم کشتۂ بے داد ہیں ہم
تختۂ مشق سناں بازیٔ صیاد ہیں ہم آدمی کا ہے کو ہیں۔ پیکر فولاد ہیں ہم
ہائے یہ ظلم کہ بے جرم چلائیں خنجر
اس پہ یہ حکم کہ فریاد نہ آئے لب پر

ہم کو کیا علم کہ کیا شئے ہو مزا دنیا کا ٭ نہ یہ معلوم خوشی نام ہے کس چڑیا کا

آہ بے جرم ہمیں صنفِ قوی نے تاکا تختۂ مشق بنایا ستمِ بے جا کا

آج انساں کے فضائل سے ہیں دونوں محروم

ایک تفسیرِ "جہول" ایک تفسیرِ "ظلوم"

بار ہیں دہر پہ ناخواستہ مہماں کی طرح پھر گرما کی طرح۔ برفِ زمستاں کی طرح

وحشی و جاہل و بے علم ہیں حیواں کی طرح دائم الحبس ہیں ہم قاتلِ انساں کی طرح

بے حس و حرکت۔ بے بس و سرافگندہ

بچہ و ردستِ جراں۔ مردہ بدستِ زندہ

اس سے تشبیہ نہ دو بے بسیٔ نسواں کو رخصتِ سیرِ چراگاہ ہے جب حیواں کو

ہے قفس میں بھی یہ سکھ بلبلِ خوش الحاں کو یاد کر سکتی ہے رو رو کے گلِ خنداں کو

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے

گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے (مضمون)

پھر ان حضرات کرام کی خبر لی ہے جو اپنے مطلب کے لئے قرآن کریم کی اس آیت اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ (الآیہ) کے لفظ "قوام" کا ترجمہ "آقا" "سرکار" کرتے ہیں ؎

حرفِ "عزت" سے نہیں کان ہمارے آگاہ سرنوشتِ رخِ نسواں میں ہے ذلت کی نگاہ

کہتے ہیں اپنے تفوق کا ہے قرآں گواہ مصحفِ رب پہ یہ بہتان بھیاذاً باللہ

کون یہ کہہ کے بنے کشتنی و قابلِ دار

ترجمہ کیجئے نہ "قوام" کا آقا۔ سرکار

اسی مسدس میں انھوں نے آگے چل کر پوری طرح نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے کہ ایک جاہلہ، دنیا اور دین کے کاروبار تو رہے ایک طرف خود امور خانہ داری ہی کے لئے کس قدر ناموزوں ہوتی ہے۔ کس طرح اس کا گھر گندہ اور ناپاک رہتا ہے۔ کس طرح اس کے بچے حسن تربیت سے محروم رہتے ہیں اور کس طرح ایسا گھر مختلف امراض کا آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ جب تک بیوی تعلیم یافتہ نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ وہ قومی معاملات میں میاں کے ساتھ ہمدردی رکھے، اور ہو سکے تو ان کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائے ؎

ماتم ترکی و ایراں ہے وہاں جامہ دری یاں پھٹے چیتھڑے اور شغلۂ بخیہ گری

شیر سے معرکہ آرا ہے وہاں مرد جری دیکھ کر غوک کو یاں "ہائے مری ہائے مری"

شوقِ طیارے میں اڑنے کا شب و روز وہاں

ریل کے نام سے اٹھتا ہے یہاں دل میں دھواں

پھر اسلام کی شوکت رفتہ کی یاد دلائی ہے کہ کس طرح اس عہد میں مسلمان سربلند و مفتخر تھے، اور آج یہ دن ہے کہ نکبت و بدبختی کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ اس کا سبب، وہ حقوق نسواں کا غصب کر لینا، اور نور علم سے انھیں محروم کر دینا سمجھتی ہیں۔ وہ آزادیٔ نسواں اور جائز حقوق نسواں کا مطالبہ کرتی ہیں اور سمجھاتی ہیں کہ اسی راستے سے ہماری نجات ہو سکتی ہے۔ آزادیٔ نسواں سے ان کی مراد ہرگز ہرگز یہ نہیں کہ پردہ سے بے نیازی حاصل کر لی جائے، یا عورتوں کو تھیٹر یا سینما بازی کی آزادی مل جائے ؎

شوقِ نظارۂ تھیٹر و بازار نہیں مقصدِ حریتِ علم یہ زنہار نہیں

حکم بردارئ شوہر سے بھی انکار نہیں بخدا پردہ دری کے بھی روادار نہیں

ہے حیا بادشہِ علم کے سر کا افسر

قول مشہور ہے "العلم حجاب الاکبر"

نہ آزادیٔ نسواں سے ان کی مراد مردوں سے حقارت یا نفرت کا برتاؤ ہے ؎

آئے گا ہم کو نہ اس فرقے سے نفرت کا خیال نور احمد نے کیا جس میں نزولِ اجلال

بے وفائی کے تصور سے تنفر ہے کمال یہ تو بااین ہمہ بیداد و تظلم ہے محال

دل پاکم بہ لب پر گلہ۔ اے مرد رشید

گرگِ آلودہ دہانے است کہ یوسف نہ درید

حقوق نسواں سے مراد ان کے یہاں جائز اسلامی حقوق، جائز اسلامی تعلیم اور جائز اسلامی آزادی ہے، جسے جاہل، ظالم اور ناسمجھ مردوں نے خود اسلام کا نام لے لے کر غصب کر لیا ہے۔

"عالم نسواں میں انقلاب" کے عنوان کے تحت جو نظم لکھی ہے اس میں بتایا ہے کہ خود حضرت پیغمبر اسلام (اُمی وابی فداک) کو عورتوں کا کتنا پاس و لحاظ تھا، ان کی بھلائی اور بہتری کا آپ کتنا خیال فرماتے تھے۔ ضرورت ہے کہ شرعِ محمدی کے پیرو، خود اپنے آقائے دو جہاں کے اتباع میں عورتوں کی تعلیم اور ان کی حریت کی طرف متوجہ ہوں۔ آخر میں مردوں پر ایک ہلکا سا طنز بھی کیا ہے ؎

اس بیاں کو "شرع کی تعریف" کہنا ہے غلط
جیسے یہ کہنا کہ "بے جانوں" کا یہ اعلان تھا

صوبۂ پنجاب میں لڑکیوں کو محروم الارث کرنے کا جو شریعت سوز رواج قائم تھا، اس کو ۱۹۱۵ء میں قانونی استحکام بخشنے کی تجویز تھی، مرحومہ نے اخبارات کے ذریعہ مردوں کو غیرت دلائی ؎

ایسا بھی کیا حیات دو روزہ پہ پھولنا | ہو دل میں کچھ تو دغدغۂ ساعتِ جزا
ہم بے زبان پردہ نشینوں کی سوزِ آہ | اے مسلمو! خدا کے غضب سے ڈرو ذرا
کہتے تھے تم تو "مرد ہیں عورات کے وکیل" | سچے ہو گر تو حقِ وکالت کرو ادا
اک فرقۂ ستم زدہ کے واسطے بھی آج | سرکار کے حضور میں جا کر ہو لب کشا
روکا تھا ہم کو حق طلبی سے اسی لئے | اس مستبد کی ایسی غم آگیں خبر سنی کیا

دیکھو شکستِ شرع پہ اچھا نہیں سکوت
نازل نہ ہو کہیں غضبِ حیِّ لایموت

مسلم لیڈیز کانفرنس منعقدہ ۱۹۱۶ء کے لئے جو نظم انھوں نے لکھی تھی اس کا آخری شعر ہے ؎

ہمیں یارب حمیت دے۔ رگِ غیرت میں حرکت دے
عمل کا شوق و رغبت دے۔ عمل میں خیر و برکت دے

اسی لیڈیز کانفرنس کے ایک اور اجلاس میں انھوں نے "مہذب" بہنوں کی خوب خبر لی ہے جو تہذیب کے معنی سمجھتی ہیں شعائرِ اسلام کا ترک کر دینا ؎

بہنو! خدا کے واسطے اٹھو نماز کو | رگڑو در خدا پہ جبینِ نیاز کو
ہیہات! اپنے ہاتھ سے کرتی ہو ہیندم | روزے نہ رکھ کے خلد کے دروازہ باز کو
برقعہ بہن کے شوق سے پھینکو ضرور تا | سمجھو غنی ثبوت سے اس کے جواز کو
مل جائے گا خدا انھیں شوہر کی چاہ سے | سمجھو ذرا حقیقتِ عشقِ مجاز کو
قصے کہو نہ طفل سے ابطال غرب کے | از بر کراؤ سیرتِ شاہِ حجاز کو

"دامِ فریب" کے عنوان کے تحت ایک نظم ہے، پوری کی پوری پاکیزہ خیالات اور حکمت سے قطع نظر صرف روانی اور محاورات کی نشست اور برمحل استعمال ملاحظہ ہو ؎

بہن! یاد رکھ دستِ حسرت ملے گی | سیانوں کے کہنے پہ گر تو چلے گی
جہنم میں جھونک اے بہن یہ فتیلے | انھیں کی طرح ورنہ تو بھی جلے گی
یہ تعویذ کیا پار بیڑا کریں گے | بھلا ناؤ کاغذ کی کیونکر چلے گی
فقیروں کی پوجا جو کی زر کی دھن میں | فقیری ہی چھاتی پہ کودِل دلے گی
سلامت رہے نقش جلتا ہوا ہے | تری ہر بلا اس عمل سے ٹلے گی
میاں پاؤں دھو دھو کے تیری پئے گا | جو تو پاؤں دابے گی پنکھا جھلے گی
دعائیں جو تو لے گی بوڑھے بڑوں کی | تو دودھوں نہائے گی پوتوں پھلے گی

مرے ڈھب پہ لانے کی کیوں بحث ہے
نہ یاں دال اے سُست کی گلے گی

ذیل کے فارسی اشعار میں اسلام کی کتنی سچی تعریف کی ہے۔

طاعتش اسلامِ ما، عشقِ رخش ایمانِ ما
روئے تیش فردوسِ ما، خاکِ رہش اکسیرِ ما
ما و دست و دامنِ پیرِ خمستانِ حجاز
نیست یارانِ طریقت! غیر ازیں تدبیرِ ما!

جامعہ عثمانیہ کی تاسیس کے موقع پر اردو کی طرف سے انھوں نے جو سپاس نامہ زندہ کنندۂ علم وفن اعلیٰحضرت سلطان العلوم کی بارگاہ میں پیش کیا تھا، اردو ادب میں اپنی آپ نظیر ہے۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے بعد اردو پر جو قیامت گزری اور جس بے کسی و بے بسی کا اسے سامنا کرنا پڑا، اور آخر میں حضور نے کس طرح اس کی دست گیری فرمائی، اس کا ذکر انھوں نے بڑے اچھوتے انداز میں کیا ہے اور حق یہ ہے کہ اردو کی منت شناسی اور سپاس گزاری کا پورا پورا حق ادا کر دیا ہے ؎

آخر در محسن تک قسمت مجھے لے آئی — ہاں تجھ کو بشارت ہو اے ذوق جبیں سائی
جو مثل شمس و قمر روشن ہے اسم شریف اس کا — ہے نام خدا جس میں زینت کی یکجائی
ہے آج بصد زینت سر کا جو ہے زیرہ — عثمان علی خاں کا آوازۂ یکتائی

عثماں کی "حیا" نے کی آ کر مری غم خواری
دیکھی نہ گئی اس سے یہ ذلت و رسوائی

کی بن کے "غنی" آخر شاہانہ ادا ظاہر — اک جامعہ کی یعنی تاسیس ہو فرمائی
جاں اس نے بخشی ہے تن مردہ میں — پھر زندہ کیا اس نے اعجاز مسیحائی

آخر میں اپنی ہیچمدانی اور دعوائے زباں دانی و مشق سخن آرائی سے ناواقفیت کا اظہار کتنے انکسار اور فروتنی سے کیا ہے ؎

قاصد ہوں اک اردو کی اے شاہ نہیں مجھ کو
دعوائے سخن دانی، مشق سخن آرائی

نہیں زاہدہ، جب تک اردو زبان زندہ ہے، جب تک جامعہ عثمانیہ قائم ہے، جب تک زندہ کنندہ علم وفن، سلطان العلم وشعر وسخن کا نام نامی تاریخ میں روشن ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ تمھاری سخن دانی اور سخن آرائی کا اعتراف نہ کیا جائے۔ ادب اردو میں تمھارا نام ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا کہ تم نے تنہا وہ فریضہ ادا کر دیا جو پوری دنیائے اردو کا فریضہ تھا، جس کے جذبات کی تم نے اس دل نشیں انداز میں ترجمانی کر دی!

"جوش محبت" کے پہلے بند میں لندن کی لفظی تصویر کھینچی ہے۔ دوسرے بند میں مشہور زمان رائٹر ایجنسی کے مالک کی خودکشی کے واقعہ کو نظم کیا ہے کہ کس طرح اس نے اپنی محبوب بیوی ایڈیتھ کی وفات پر اپنی جان دے ڈالی۔ جوانی کی ترنگوں کو جان لیتے سنا ہے، لیکن ایک مرد معمّر کا اپنی بیوی پرستی ہونا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا ؎

لیتی ہیں اگر جان جوانی کی ترنگیں — یاں زوجہ یہ ہونا ہے ستی مرد معمّر
بے مثل ہے یہ واقعۂ زوج پرستی — نادر ہے یہ تمثیل وفاداریٔ شوہر

اللہ کو پیاری ہے زن و شو کی محبت
دنیا کے لئے ہے یہی شئے باعث رحمت

آگے چل کر عشق حقیقی کے نازک نکات کھول کھول کر بتائے ہیں اور "مدرسہ مہر وفا کے طلبا" کو مقصود رسی کی راہیں سمجھائی ہیں ؎

ناکامی و حرماں میں بہت سہل ہے جینا — ہیں مرد وہی جی کے جو الفت کو نباہیں
ہمت سے شجاعت سے کریں ضبط محبت — سوز تپ فرقت سے پھکیں اور نہ کراہیں
پہنچیں گے وہی منزل مقصود تک اک دن — جو راہ رو جادۂ تسلیم و رضا ہیں

آخری بند میں سچے عشق اور سچی محبت کی حمد و ثنا ملاحظہ ہو ؎

آرام دل و جاں ہیں آلام محبت — ہے اہل بقا کشتۂ صمصام محبت
جا پہلے زباں پاک کر آ۔ لوٹ ریا سے — طاہر ہے، مقدس ہے، نہ لے نام محبت
ہے راہبر عشق حقیقی ترا حرماں — طوبیٰ لک طوبیٰ لک ناکام محبت
کر پیشکش خدمت محبوب نہ ہرگز — جب تک نہ ہو پختہ ثمر خام محبت

ہے منتظم محفل امکاں غم الفت
ہے ماحصل ہستی انساں غم الفت

"تحفۂ درویش" میں آپ کو ایک ایسی صوفیانہ اور درویشانہ صدا ملے گی جو صرف چند ہی قدسی نفوس کا حصہ ہوتی ہے۔ خصوصاً یہ دو شعر نہ صرف دنیائے نسواں، بلکہ تمام عالم انسانی کے لئے اپنے اندر ایک مستقل پیغام رکھتے ہیں ؎

نمونۂ خط ز۔خ۔ش مرحومہ

۱۶ آخر در محسن تک قسمت مجھے لے آئی + ہان تجھکو بشارت ہو۔ اے ذوق جبین سائی

۱۷ جون شمس و قمر روشن ہے اسم شریف اسکا + ہے نام خدا جس مین "نورین" کی یکجائی

۱۸ ہے آج بصد زینت ہر کان کا آویزہ + عثمان علی خان کا آوازۂ یکتائی

۱۹ عثمان کی "حیا" نے کی آکر مری غمخواری + دیکھی نہ گئی اس سے یہ ذلت و رسوائی

۲۰ کی بر سے "غنی" آخر۔ شاہانہ ادا ظاہر + اک حاتم کی یعنی تاسیس ہے فرمائی

۲۱ جان از سر نو بخشی۔ میرے تن مردہ میں + پھر زندہ کیا اسنے۔ اعجاز مسیحائی

۲۲ خواہان ترقی ہو۔ رخشندہ ہے مستقبل + اے حال قنوط افزا ماضی ہو تمنائی

۲۳ اے روز سیہ کر ہی۔ اپنا کہیں منہ کالا + کافور ہو اب تو بھی ہان اے شب تنہائی

* ۸ * *

۲۴ قاصد ہون اک اردو کی۔ اے شاہ! نہیں مجھکو
دعوائے زبان دانی۔ مشق سخن آرائی

بقلم خود
ز۔خ۔ش (علی گڈھ)

رونے دھونے سے جان کھونے سے　　کہیں بنتے ہیں کام دیوانی
دردِ دل دردآفریں کو ستا　　گر گر جی میں ہے جو کچھ ٹھانی

ان اشعار میں کیسی روحانی بلندی، کیسا نورانی سوز و گداز، اور کیسا پاکیزہ تخیل ہے ؎

مایۂ اشک یاں بضاعتِ مور　　ہیچ واں شوکتِ سلیمانی
پہلے دے صدقہ ما سوی اللہ کا　　پہلے کر جان و دل کی قربانی
بے خبر پہلے نقش کر دل پر　　عظمت بارگاہ یزدانی

آخری شعر ہے ؎

دیں ہے الفت وطن فغانستان　　عرف مجنوں ہے پیشہ حسانی

کاش! افغانستان کے باشی، مجنوں نام کے ایسے حسانی جن کا دین الفت ہوتا، خاک دان ہند میں اور دو چار پیدا ہوئے ہوتے!

اس مجموعہ کی آخری نظم میں انھوں نے اپنے بچپن اور اپنے شفیق اور پیارے باپ کی محبت آمیز تربیت کا نہایت دلفریب نقشہ کھینچا ہے۔ ان گریزپا، مگر تخیل فریب دنوں کو یاد کرکے جو کبھی واپس نہیں آئیں گے، کتنی حسرت اور یاس سے کہتی ہیں ؎

یوں مرے پیش نظر ہے ابتدائی زندگی　　یاد تھی جس طرح آدم کو بہشتی زندگی
وا دریغا! دن دہاڑے کل جہاں کے سامنے　　میرا گنج عیش لوٹا راہزن ایام نے
لوٹ آ اے عشرت ایام طفلی لوٹ آ　　پھر مجھے اک بار بس اک بار اپنا منہ دکھا

بچپن گزر گیا، جوانی ایسی ہستیوں کے لئے بے کیف ہوتی ہے، موت کا خیال آتا ہے، ہائے، شفیق و مہربان باپ کے جذبات کا پاس و لحاظ ہونے کے باوجود زبان سے نکل ہی گیا ؎

پھر سے گرچہ تیرا پاس جذبات پدر　　کہہ رہا ہے دل زبانِ بے زبانی سے مگر
ہو جدا یعقوب سے یوسف نہ زنداں کے لئے　　پھل نہ مہجور شجر ہو حلق انساں کے لئے
جب کہوں میں خیرباد اس عالم حق پوش کو
روح چل دے سونپ کر قالب تری آغوش کو!

قدرت کو یہی منظور تھا کہ اس صوفی منش زاہدہ کی بات رکھ لی جائے، محفل ادب سونی ہو جائے، اور اردو کا چمن اس عندلیب خوش الحان کے عرفان آگیں نغموں سے ہمیشہ کے لئے محروم!

اپنی مختصر مگر مبارک زندگی میں وہ اپنے آپ کو ہمیشہ "الغیرۃ الفانیہ" لکھا کیں، آج ان کا جسم فنا ہو گیا، لیکن ان کی زندۂ جاوید روح ہمیشہ کے لئے اپنی بے کس بہنوں میں احساس برتری و ترقی پیدا کرنے کے لئے زندہ ہے۔ انھوں نے اپنی ناپائیدار مگر درخشاں زندگی کی چھبیس[۲۶] سے زیادہ بہاریں نہ دیکھیں، لیکن اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ کے لئے سدا بہار ہے، وہ اپنے آپ کو ہمیشہ "خاک نشیں" لکھا کیں، آج ان کا جسم خاک نشیں نہیں ہے لیکن ان کی پاک روح حضرت سیدۃ النساء کے ساتھ باغ جناں میں گلگشتِ خرام ہے!

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!

معین النساء بیگم

نوٹ: اس مضمون کے لئے بعض مفید مشوروں اور مرحومہ کی چند مطبوعہ و غیر مطبوعہ نظموں کے لئے راقمہ مرحومہ ز۔ خ۔ ش۔ صاحبہ کی پھوپی زاد بہن مخدومہ و محترمہ انیسہ خاتون بیگم ہارون خاں شیروانی کی سپاس گزار ہے۔

وہ بھی سچے تھے

"تو بگاڑ کیسے ہوا؟" بڑی بی نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا "ہم سے نہ کہوگی"
"کہنے میں تو کچھ ہرج نہیں" رضیہ بولی۔ "لیکن جب بات یاد آتی ہے تو
کچھ ملال سا ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ بھی سچے تھے"
"بچی!" بڑی بی بولی۔ "تم تو معموں میں باتیں کرتی ہو۔ کچھ
صاف صاف کہو تو پتہ بھی چلے"

بڑی بی ایک دقیانوسی خیالات کی بوڑھی عورت تھی۔ لڑکیاں
بالیاں اس کی باتیں بہت شوق سے سنتیں اور خوب ہنستیں۔ رضیہ
کے میکے والوں کے یہاں بھی اس کا آنا جانا تھا۔ جب سے رضیہ
شوہر کے ہاں سے آئی تھی بڑی بی کو وجہ معلوم کرنے کی بڑی کرید سی
لگی رہتی جب آتی یہی ذکر لے بیٹھتی۔
رضیہ بولی۔
"بڑی بی! یہ تو میری بپتا کی کہانی ہے۔ کوئی افسانہ تو ہے نہیں جو
تم پوچھ رہی ہو"
بڑی بی بولی
"بیٹی رضیہ! خیر سے ایک بچی کی تو تم ماں ہو گئیں۔ لیکن عقل نہ آئی
تمھیں۔ دوسرے سے دکھ درد کی کہنے سے بھڑاس نکل جاتی ہے۔
غم ہلکا ہو جاتا ہے"
اتنے میں ماما ایک طشتری میں چھالیا لے آئی۔ رضیہ بولی۔
بڑی بی! سروتا لو اور یہ چھالیا تو کاٹ ڈالو"
"ہاں یہ ٹھیک رہے گی" بڑی بی طشتری پکڑ کر بولی۔ "میں چھالیا کاٹوں گی
تم ذری یہ قصہ کہہ دو تو گویا اب میل ملاقات تو بند ہی ہے"
"ہاں!" رضیہ نے جواب دیا "بند ہی سمجھو!"
"اور بچی کو بھی بھول گئے کیا!" بڑی بی نے نجمہ کی طرف جو کھلونوں سے
بیٹھی کھیل رہی تھی دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں تو!" رضیہ بولی۔ "اسے تو کبھی کبھی بلوا لیتے ہیں"
"دیکھو بیٹی!" بڑی بی نے کہا "ہوشیار بیٹھو ذرا کہیں چھین کر ہی نہ لے
جائیں۔ پھر صورت دیکھنے کو بھی ترسو گی سمجھ لیا نا"
"پگلی ہو تم تو!" رضیہ نے ہنس کر کہا "چھین کر کیسے لے جائیں۔
ان کی بچی ہے میرے پاس رہے یا ان کے پاس ایک ہی بات ہے"
"ٹھیک کہتی ہو" بڑی بی نے کہا "لیکن وقت کیسے کٹتا ہے"
"نجمہ جو ہے میری" رضیہ نے محبت بھری نگاہوں سے بچی کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا "مجھے تو اس سے ہی فرصت نہیں۔ کہیں نہلانا ہے۔ کبھی
کپڑے پہنانے ہیں پکانا، پلانا، کھلانا۔ آنکھ جھپکتے وقت گذر جاتا ہے۔
پھر یہ محلے کی لڑکیاں آجاتی ہیں۔ کسی کو قرآن مجید پڑھاتی ہوں
کوئی سینا پرونا سیکھتی ہے۔ مزے سے دن گذر جاتا ہے"

نجمہ نے جو اپنا نام سنا تو ماں کی گود میں آ بیٹھی۔ رضیہ اسے
سینے سے لگا کر بولی۔
"بلا سے! آبا نہیں آتے تو نہ آئیں۔ میری نجمہ تو میرے پاس ہے۔
بس ناراضگی تو یہی ہے کہ ہم ماں بیٹی بھی کیوں جل نہ مریں،
"اے توبہ کرو بیٹی!" بڑی بی بولی۔ "یہ تم نے کیا کہا" جل مریں تمھارے

دشمن !"

اور رضیہ ہنس کر بولی۔

"تو اور کیا ! غصہ بھی تو اس بات کا ہے۔ ناراضگی بھی تو یہی ہے۔"

"کچھ تیز مزاج ہوں گے" بڑی بی نے کہا۔ "بیٹی ! پہلے ہی سوچ سمجھ لینا تھا۔ یہ تو تمھاری دوسری شادی تھی نا" رضیہ ایک آہ بھر کر کہنے لگی۔

"نصیب ہی کچھ ایسے لے کر آئی ہوں کہ دو گھڑی کا سکھ بھی نہیں۔ خدا جنت نصیب کرے۔ ان کے (پہلا شوہر) تو گھر قدم رکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔ نکاح کے بعد رخصت ہی میں دو سال گزر گئے۔ شہر میں وبا پھیلی انھوں نے بھی جنت کی راہ لی۔ لو ! یہ تو پہلی شادی کا قصہ رہا۔ نہ سسرال دیکھے نہ شوہر سے بات کرنی نصیب ہوئی اور بیوہ ہوگئی۔ خدا ابا جان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے جنھوں نے تعلیم دلوائی اور تربیت کا پورا پورا خیال رکھا ورنہ زندگی کے یہ چار دن کاٹنے بھی دشوار ہو جاتے۔ سال بھر منحوس۔ سبز قدم۔ بدنصیب سبھی کچھ کہلوایا۔ لیکن کب تک خاموش رہتی تنگ آمد بجنگ آمد۔ پھر جو کسی کی زبان سے کوئی بیہودہ لفظ سنا تو وہ ڈانٹ بتلائی کہ پھر کسی کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہوئی۔ تم جانو ! میں منحوس کیوں ہوئی۔ کیا شہر میں وبا میرے کارن پڑی۔ تو خیر ! میری سہیلی کلثوم خدا اسے اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔ اپنے گھر آباد تھی۔ شادی کے بعد وہ عموماً مجھ سے ملنے آیا کرتی۔ اس کے میاں بھی ساتھ ہوتے۔ میں ان سے کچھ یوں ہی سا پردہ کرتی۔۔۔۔۔۔"

"کیا کہا ؟" بڑی بی نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "رضیہ ! تم غیر محرموں سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ کسی نے مت بھی نہ دی تمہیں بیٹی ! پردہ تو عورت کی زینت ہے۔ پردے سے تو عورت کی عزت ہے اللہ رحم کرے ہم لوگوں پر۔ میرے تو اس نئی پود کی لڑکیوں کے لچھن دیکھ دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جسے دیکھو شتر بے مہار ہر جگہ موجود۔ پردے سے یہ چھوکریاں تو ایسے متنفر ہیں جیسے یہ بھی کوئی وبائی بیماری ہے جو چھونے سے آچمٹے گی۔ اور پھر ان مردوں کی غیرت تو دیکھو ! موؤں کو شرم بھی تو نہیں آتی۔ گھر والیوں کو مجمع عام میں یوں سجا بنا کر ساتھ لئے پھرتے ہیں گویا بڑا ہی ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ اور تو اور یہ شریف زادیاں بھی اپنے میاں کے دوستوں سے یوں بے حجاب ہو کر ملتی ہیں گویا رشتے میں ان کے ماموں لگتے ہیں۔ ہائے توبہ ! یہ بے حیائی۔ یہ بے عزتی بھی اندھی تقلید تو مسلمانوں کو لے ڈوبی۔ میرا بس چلے تو میں تو آج فتویٰ دلوا دوں کہ جن گھرانوں کی عورتیں بے پردہ ہیں کوئی مسلمان ان سے رشتہ ناطہ نہ کرے۔"

"سچ ہے !" رضیہ نے جواب دیا۔ "اس ہمارے ملک میں جہاں ہمیں غیر اقوام سے واسطہ پڑتا ہے ایک مسلمان عورت کے لئے پردہ لازمی چیز ہے۔ لیکن کلثوم کے میاں کوئی غیر تو تھے نہیں میرے بھی قرابت دار تھے۔ خیر ! شادی کے کچھ عرصہ بعد اللہ میاں نے کلثوم کی گود ہری کر دی اور اس کے ہاں ایک خوبصورت بچی ہوئی۔ اس بچی کا نام انھوں نے طاہرہ رکھا۔

اللہ کی مرضی ! طاہرہ ابھی تین ایک سال کی ہوئی تھی کہ کلثوم نے دنیا سے منہ موڑا۔ اب طاہرہ کے ابا ننھی سی جان کو ہر وقت سینے سے لگائے پھرتے لیکن وہ کاروباری آدمی تھے آخر بچی کو اس کے ننھیال بھیج دیا۔ ادھر مجھے بھی بیوہ ہوئے تیسرا سال جا رہا تھا۔ کلثوم کے مرنے کے بعد وہ ہمارے یہاں بہت کم آنے جانے لگے۔"

"اور بچی کو تو بالکل بھول گئے ہوں گے" بڑی بی نے پوچھا۔

"توبہ کرو بڑی بی !" رضیہ بولی۔ "بچی پر تو وہ جان چھڑکتے تھے تو خیر ! ساون رت تھی۔ کچھ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ماما نے آکر ان کے آنے کی اطلاع دی۔"

"کن کے آنے کی ؟" بڑی بی نے پوچھا۔

"اسے توبہ!" رضیہ بولی۔ "طاہرہ کے ابا کی۔ انہی کا تو ذکر کر رہی ہوں۔"
وہ اندر آکر ماں کے پاس تخت پر بیٹھ گئے۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں
ہونے لگیں۔ اماں کسی کام سے کوٹھے پر چلی گئیں میں نے طاہرہ
کی خیر خبر پوچھی تو وہ ہنس کر بولے۔
"تمھیں طاہرہ سے بہت محبت ہے رضیہ؟"
"ہے تو سہی!" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے جواب دیا
وہ اچانک بولے
"طاہرہ کی ماں بنوگی؟"
میں یہ سن کر جھینپ سی گئی وہ بولے
"شرم کیسی! جواب دو!"
میں نے ہولے سے کہا۔
"امی جانے!"
دو روز بعد میرا ان سے نکاح ہوگیا۔ میرا نیا گھر خوب آراستہ تھا۔
نوکر چاکر، ماما، موٹر سبھی کچھ موجود تھا۔ دو چار روز بعد مجھ سے کہنے لگے۔
"تم کہو تو میں طاہرہ کو یہاں لے آؤں؟"
میں نے ہنس کر کہا۔
"شکر ہے آپ کو طاہرہ یاد تو آئی [illegible] خموش کیوں [illegible] آج
ہی جا کر لے آیئے [illegible] ایک کمرہ تیار کیے دیتی [illegible]
میرا اتنا اشتیاق دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور موٹر پر سوار ہو کر
اسے لانے کے لئے چلے گئے۔ میں نے ان کے آنے آنے اپنے سونے
والے کمرے کے ساتھ کا کمرہ طاہرہ کے لئے سجا دیا اور ماما کو اچھا کھانا
تیار کرنے کو کہا۔ ظہر سے پہلے وہ طاہرہ کو لے آئے۔ میں دوڑ کر سیڑھیوں پر
جا کھڑی ہوئی اور طاہرہ جب اوپر آئی تو میں نے اسے سینے سے لگا لیا
لیکن وہ مجھ سے ہٹ کر اپنے ابا کے پاس چلی گئی۔ دس بیس روز
میں طاہرہ کچھ مجھ سے مانوس ہوگئی۔ وہ مجھے آپا کہتی۔ خدا کی قسم! مجھے

اس بچی سے بڑی محبت تھی لیکن وہ مجھ سے کچھ علیحدہ علیحدہ رہتی۔ خاص کر
جب اس کے ابا گھر پر ہوتے تو گویا وہ مجھے بھول ہی جاتی۔ ایک روز میں نے
اسے گود میں لے کر پوچھا۔
"طاہرہ! تمھیں مجھ سے پیار ہے یا ابا سے؟"
وہ میری گود سے اتر کر ابا کے پاس چلی گئی اب انھوں نے پوچھا
"طاہرہ! تم میری بیٹی ہو یا آپا کی!"
"آپ کی؟" طاہرہ نے [illegible] جواب دیا
"نا بھائی! [illegible] اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے
"آدھی میری آدھی آپا کی ٹھیک ہے نا!"
لیکن طاہرہ نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔ اس سے میرے دل کو کچھ
ٹھیس سی لگی۔ وہ لطروں سے بھانپ گئے وہ ہنس کر بولے۔
"سیانی ہوگی تو خود ہی سمجھ جائے گی!"
میں کیا کہتی خاموش ہو رہی۔
طاہرہ کو میرے پاس آئے کچھ اوپر دو سال ہو چکے تھے کہ اللہ نے
مجھے بچہ دی طاہرہ جتنی مجھ سے کھنچی کھنچی رہتی تھی اتنا ہی بچہ سے
پیار کرتی۔ ایک [illegible] نے طاہرہ [illegible]

[illegible]

"[illegible]"
"ہاں!" اس نے پھر اسی طرح بھولے پن سے کہا۔
"مجھے بھی کھلونے دو گی" میں نے ہنس کر پوچھا
"نہیں!"
میں ہنسنے لگی [illegible] طاہرہ [illegible] سے بھی پیاری
ہے! [illegible] میں [illegible] آتا [illegible]
"یہ [illegible] کیا ہوتا ہے" بڑی بی نے تعجب سے پوچھا۔

رضیہ ہنس کر بولی۔

"تھر ڈ نہیں۔ تھی ایڑ کہو"

بڑی بی سر دہاتھ سے رکھ کر بولی۔

"رضیہ! توبہ کرو! میں کوئی کرسٹان تھوڑے ہی ہوں جو ناپاک الفاظ بھی میں نے یاد کر رکھے ہوں"

"ناپاک الفاظ کیسے!" رضیہ نے ہنستے ہوئے پوچھا

"ناپاک نہیں تو اور کیا" بڑی بی نے جواب دیا" جیسے کرسٹانی لوگ ناپاک ویسے ان کی زبان ناپاک"

رضیہ نے ہنس کر کہا۔

"تم جنھیں کرسٹانی کہتی ہو یہ بھی تو اہل کتاب ہی ہیں۔ تم نے انھیں ناپاک کیسے کہہ دیا"

"ناپاک نہیں تو اور کیا؟" بڑی بی بولی" میں نے سیکڑوں بار انھیں کتوں کا منہ چومتے دیکھا ہے رضیہ! میں تو تمھیں بہت سمجھ دار لڑکی سمجھتی تھی۔ لیکن تمھیں تو اتنا بھی معلوم نہیں کہ جس گھر میں کتا ہو وہاں فرشتہ نہیں آتا"

یہ سن کر رضیہ خوب ہنسی پھر کہنے لگی

"تو بڑی بی شہر بھر میں بھی تو سیکڑوں کتے ہیں پھر تو اللہ میاں کے فرشتے یہاں بھی نہ آتے ہوں گے"

"اس میں شک ہی کیا ہے؟" بڑی بی نے جواب دیا" فرشتے آتے ہوں تو شہر میں یہ آئے دن ہیضہ کیوں پڑے۔ طاعون کیوں پھوٹے۔ تم نے مذہب کی کوئی کتاب پڑھی ہو تو تمھیں ان مسائل کی بھی خبر ہو۔ تو خیر! شہر میں وہ تھر ڈ آیا۔ (تھوک کر) باوضو بیٹھی تھی اب وضو بھی کرنا پڑا"

"تو گویا!" رضیہ نے کہا" انگریزی لفظ زبان پر آتے ہی وضو بھی ٹوٹ جایا کرتا ہے اے بڑی بی! یہ مسائل کہاں سے سنے تم نے؟"

"بیٹی!" بڑی بی بولی" یہ بال دھوپ ہی میں سیاہ نہیں کئے ہیں میں نے۔ چلو چھوڑو اس قصے کو پھر ہوا کیا؟"

"تو ان کے ابا ایک رات تماشا دیکھنے گئے۔ جاڑوں کے دن تھے ہم لوگ سوتے تھے۔ اچانک میری آنکھ کھلی۔ دیکھا تو کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی کھولی تو مکان کا شمالی حصہ جلتا ہوا نظر آیا۔ میری چیخ پکار سے نوکر بھی جاگ اٹھے۔ میں نے بچہ کو تو گود میں لیا پھر جھنجوڑ کر طاہرہ کو اٹھانے لگی۔ تم جانو! پانچ چھ سال کی بچی کی نیند کیسی ہوتی ہے وہ کہاں اٹھتی تھی میں نے ہاتھ سے پکڑ کر اسے اٹھایا۔ اور چلا کر کہا۔

"طاہرہ! آؤ میرے ساتھ! مکان میں آگ لگ گئی بھاگو؟"

لیکن وہ بھاگ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ اور اندر سے کنڈی چڑھالی۔ میں لپک کر دروازے پر پہنچی اور دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ اور آوازیں دینے لگی۔ لیکن لڑکی نے دروازہ نہ کھولا۔ پھر میں نے نوکروں کو پکارا۔ لیکن اس شور شرابے" میں میری آواز کون سنتا تھا۔ آگ بالکل قریب پہنچ چکی تھی دھوئیں سے میرا دم بھی گھٹنے لگا تھا اتنے میں موٹر کی آواز آئی۔ پھر وہ بھاگے بھاگے اوپر آئے اور آتے ہی پوچھا۔

"میری طاہرہ؟"

"غسل خانے میں!" میں نے کہا" بھاگئے جلدی۔ اس نے اندر سے دروازہ بند کر رکھا ہے"

اس وقت تک لوگوں نے آگ پر قابو پالیا تھا۔ میں مکان سے نکل کر سڑک پر کھڑی تھی اتنے میں ماما آئی میں نے اس سے پوچھا تو وہ کہنے لگی کہ انھوں نے لاتیں مار کر غسل خانے کا دروازہ توڑا۔ لیکن طاہرہ غریب دم گھٹ جانے سے مری پڑی تھی۔ اس کے ابا اسے گود میں لے کر وہیں بیٹھ گئے اور رونے لگے۔ لوگوں نے زبردستی

وہاں سے نکالا۔ ورنہ نصیب دشمناں انھیں بھی گزند پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ نقصان کا تو انھیں ذرہ بھر بھی ملال نہ تھا۔ لیکن بیٹی کی موت نے انھیں سخت نڈھال کر دیا۔ طاہرہ کا جنازہ اٹھنے نہیں دیتے تھے۔ بچی سے لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ تمام دن گھر بیٹھے۔ بیٹی کو یاد کرتے اور روتے۔ بہت روز اسی طرح گزر گئے اس تمام عرصے میں مجھ سے کچھ کہا سنا نہ تجمہ کو گود میں لیا۔ ایک روز میرے پاس آئے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے پھر کہنے لگے

"رضیہ! اگر طاہرہ کی ماں زندہ ہوتی تو اسے جیتے جی مرنے کے لئے نہ چھوڑ جاتی!

"خیر! جو ہوا سو ہوا؟"

پھر انھوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف پھینکا اور کہا

"یہ لو! گھر بیٹھے تمھیں دو سو روپے ماہوار مل جایا کریں گے۔ تمہاری مرضی ہے یہاں رہو یا میکے چلی جاؤ!"

اتنا کہہ کر چلے گئے سات آٹھ روز تو میں وہیں رہی۔ لیکن اس عرصہ میں انھیں ایک بار بھی نہ دیکھا۔ آخر اٹھ کر میکے چلی آئی اس واقعہ کو سال سے کچھ اوپر ہونے کو ہے۔ بنک سے ہر مہینے دو سو روپے تجمہ کے نام آجاتے ہیں۔ لو! یہ ہے قصہ! اب تو خوش ہو تم؟"

بڑی بی ایک آہ بھر کر بولی

"بیٹی صبر کرو! غم غلط ہوگا تو آپ ہی چلے آئیں گے"

"ان کی مرضی ہے!" رضیہ نے جواب دیا "لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ جو محبت مجھے تجمہ سے ہے دوسرے کو نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اب جو میں سوچتی ہوں تو ماننا ہی پڑتا ہے کہ وہ بھی سچے تھے!!"

ایم اسلم

حسن سر راہ

نہ پوچھ! کس سے ہوئی تھی مری نگاہ دوچار
نہ پوچھ! کس نے الٹ دی بساطِ صبر و قرار

نہ پوچھ! مجھ سے وہ دلکش ادائے جلوۂ ناز
قدم قدم پہ فدا تھی مری نگاہِ نیاز!

خرد کی شام تھی منت کشِ صباحِ جمال!
ریاضِ طور تھا ہر ذرۂ غبارِ خیال!

نفس نفس میں تھا رقصاں ترانۂ گلپوش
رگوں میں دوڑ رہی تھی تجلیٔ خاموش

سنک رہا تھا فضاؤں میں حسن کا سیلاب
جھلک رہا تھا غنائی شباب کا ہر خواب

خدا فریب تھا منظر، بہار کی سوگند!
جنوں پسند نگاہوں کے پیار کی سوگند!

کاوش

حیدرآباد کی چیخ پکار

ایک اجنبی یا ایک ملکی دیہاتی کے لئے اس سے بڑھ کر حیرت انگیز اور اس سے زیادہ ہیبت ناک کوئی اور شئے نہیں ہوتی جس قدر کہ حیدر آباد کی چیخ پکار۔ میرے قابل ذکر دوست مسٹر ہیبت خاں ہمیشہ اس کا تذکرہ فرمایا کرتے ہیں کہ ان کے یہاں تشریف لانے کے بعد کامل ایک ہفتہ گزرنے تک اس چیخ پکار کی گونج ان کے دماغ سے گئی اور نہ انھیں اطمینان کی نیند نصیب ہوئی۔ اس کے برخلاف نواب چمن لکھنوی اس کو نغمہ ہائے شیریں کے نام سے موسوم کرتے ہیں حتیٰ کہ اس کو بلبل ہزار داستان کی خوش الحانی اور دنیا کی تمام نغمہ سنجیوں پر ترجیح دیا کرتے ہیں۔ حال ہی میں ایک عجیب وغریب شخص سے مجھے ایک خط وصول ہوا ہے، بجائے اس کے کہ میں خط کے حُسن و قبح سے بحث کروں یا اس پر کوئی تنقیدی نظر ڈالوں، ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے بجنسہٖ اس کی نقل درج کی جاتی ہے۔

"مکرمی بندہ! السلام علیکم۔ میں ایک بیکار شخص ہوں اور ہر ایسی خدمت کے لئے تیار ہوں جس سے مجھے اکل حلال مل سکے، میں نے بہت سی ایسی تدابیر سوچ رکھی ہیں جن سے کروڑہا روپیہ بغیر مشقت اور جاں سوزی کے پیدا کیا جا سکتا ہے، لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ گورنمنٹ مری طرف متوجہ نہیں ہوتی، بلکہ مجھے ایک جنونی، اور خیالی، سمجھتی ہے، اس لئے حکومت کی اس حوصلہ شکنی اور عوام الناس کی سرد مہری کی وجہ نہ تو میں خود ہی دولتمند بن سکتا ہوں اور نہ اپنے ملک کو ہی مالا مال کر سکتا ہوں، اب میں چند ایسے مشورے جو ایک خاص تحریک سے متعلق ہیں اور جو ایک راز سربستہ کی طرح میرے دل میں پوشیدہ تھے آپ کے پاس لکھ بھیجتا ہوں اگر آپ مہربانی فرماکر میرے زرین خیالات کی تائید فرماتے ہوئے حیدر آباد اور سکندر آباد کی میونسپلٹی بورڈ میں میری سفارش فرمادیں تو شاید مجھے کوئی معقول مشاہرہ مل سکے۔

یہ عہدہ جس کا میں اب تذکرہ کرنے والا ہوں، صدر ناظم چیخ پکار حیدر آباد وسکندر آباد کے نام سے موسوم ہوگا، کیونکہ اب تک اس کے لئے نہ کوئی قوانین وضع ہوئے اور نہ کوئی قواعد مرتب کئے گئے۔ میرا خیال ہے کہ اس اہم خدمت کے لئے میں نہایت ہی موزوں ہوں کیونکہ میرے پھیپھڑے نہایت ہی قوی ہیں اور میں نے حیدر آباد کی تجارت اور صنعت وحرفت کا مطالعہ نہایت غور و تعمق سے کیا ہے، اس کے علاوہ میں فن موسیقی کا ماہر بلکہ یکتائے دہر ہوں۔

حیدر آباد کی چیخ پکار دو بڑے شعبوں پر منقسم ہوسکتی ہے ایک زبانی دوسرے آلوں کی۔

آخر الذکر میں آج کل بالکل بے قاعدگی پائی جاتی ہے۔ یہاں کے ایک معمولی متنفس کو بھی اس بات کی آزادی دی گئی ہے کہ وہ گھنٹوں پتیل کے برتن یا لوہے کے توتے زور زور سے بجاتے ہوئے بیچنے کے لئے سڑکوں پر پھرے اور اس طرح آسایش عامہ میں خلل ڈالے۔ یا موٹر چھاپنیوں میں نقت بے وقت جتنے ۔۔ بگل کی آواز سنائی دیتی ہے وہ ڈراؤنی اور کرخت ہوتی ہے کہ اس سے بسا اوقات بچوں اور صنفِ نازک کے دل دہل جاتے ہیں۔ ڈھول بیچنے والے میں ایک حد تک موسیقی پائی جاتی ہے لیکن ہم اس کو گاہے ماہے سنتے ہیں۔ اس لئے میں نہایت زور شور سے یہ تحریک کرتا ہوں کہ اس قسم کے ہی موسیقی آلے کو اس وقت تک استعمال میں نہ لایا جائے۔ جب تک کہ میں اس کے تال اور سر ٹھیک نہ کروں اور اس لئے احتمال کی

اجازت نہ دوں تاکہ میں اس امر کی اچھی طرح آزمایش کروں کہ ان آلات کی آواز کس صورت میں عوام کے کانوں کو خوش گوار معلوم ہوتی ہے اور کب سمع خراش؟

مگر اس سے بھی بڑھ کر قابل توجہ امر یہ ہے کہ یہاں زبانی شور بکثرت مروج ہے اور وہ اس قدر پر وحشت اور مہمل ہوتا ہے کہ کوئی نیا شخص اس سے نہ کوئی مطلب اخذ کر سکتا ہے اور نہ کچھ اس کے معنی سمجھ سکتا ہے اس لئے وہ ہمارے شہر کو ایک پر شور مقام سمجھتا ہے۔ گولی جب وہی بیچتا ہے تو ہی...... کی آواز نکالتا ہے جو اس قدر تیز ہوتی ہے کہ اس سے ہمارے دانت بجنے لگتے ہیں۔ لکڑیاں بیچنے والا کسی خاص انداز پر قائم نہیں رہتا، کبھی نہایت درشت لہجے میں چیخ اٹھتا ہے اور کبھی نہایت تیز طریقے سے، کبھی نہایت بلند اور کبھی نہایت پست۔ میوے والے میں بھی یہی بات دیکھی گئی ہے اور یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ وہ صرف "موزے موز یا انگور لے انگور" پکارتا ہے اور دوسرے میووں کے نام نہیں لیتا حالانکہ اس کے پاس انجیر، سیب اور سنترے وغیرہ سب ہی کچھ موجود ہوتے ہیں۔ اس لئے اس قسم معاملات میں میرا اہم خیال ہے کہ میں ایسے چلر فروشوں کے سڑکوں پر آنے سے پیشتر ہی ان کی آوازوں میں ترنم اور نغمہ سنجی پیدا کروں، اور ان کے شور کو ان کے اشیائے فروختنی کی نسبت سے ترتیب دوں اور اس امر کو بطور خاص ملحوظ رکھوں کہ وہ شخص ہرگز سب سے زیادہ نہ چیخے جو سب سے کم قیمتی اشیاء فروخت کرتا ہے جس کی مثال "تاگے کا پنڈا پیسہ، پیسہ" یا "پیسے میں آٹھ سوئیاں پیسے میں آٹھ سوئیاں" سے دی جاسکتی ہے۔ جن کی نسبت میں یہی کہا کرتا ہوں کہ "ایں چہ شوریست کہ در گرد شہر می بینم"۔

بعض آخر الذکر چلر فروش معمولی اشیاء کے فروخت کرنے میں اس قدر چیختے اور چلاتے ہیں کہ ایک دفعہ میرے ایک ملاقاتی نازک دماغ دوست نے ایک میوہ بیچنے والے سے بالمعاوضہ قول لیا کہ وہ دوبارہ ان کے دروازہ پر سے نہ گزرے گا، لیکن اس معاہدہ کا کیا نتیجہ نکلا؟ دوسرے ہی دن علی الصباح اس کے دوسرے ہم پیشہ ان کے دروازے پر سے اس امید پر کہ کچھ فروخت ہو نہایت ہی کرخت آواز سے "کھوپرا لے کچا کھوپرا ...... قوبانیاں لے قوبانیاں ۔" پکارتے ہوئے یکے بعد دیگرے گزرنے لگے۔ ہمارے شہر کی چیخ پکار میں دوسرا نقص یہ ہے کہ نہ ان کے لئے کوئی وقت ہے اور نہ ساعت صبح سے شام اور شام سے پھر رات تک یہی ہنگامہ افرینی اور یہی شور محشر بپا رہتا ہے۔

میں جناب کو توجہ دلاتا ہوں کہ میرا یہ مضمون بہت جلد اخبارات میں شایع کر دیا جائے اس لئے کہ اس کا تعلق بہت کچھ تجارت سے ہے اور اس کی تاخیر سے سخت مالی نقصان ہونے کا احتمال ہے لیکن ہر طرح یہ عجلت بے معنی نہ ہو جیسا کہ آتش زدگی کے موقع پر بغیر کچھ سوچے سمجھے آگ آگ کہہ کر چیختے ہیں یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ عوام کا بھی وتیرہ رہا ہے۔ ایک خوں ریز جنگ کی خبریں ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آناً فاناً میں خوف زدہ کر دیتی ہے۔ افواج کی نقل و حرکت کی اطلاعیں فرانسیسی اخبارات میں اس قدر جلد جلد شایع ہوا کرتی ہیں کہ پڑھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دشمن گھر کے دروازہ تک پہنچ گئے، اس لئے میں اس کا بھی بیڑا اٹھانے کو تیار ہوں کہ افواج کی نقل و حرکت، قیام، شکست اور فتح کی خبروں کے اندراج میں خاص امتیاز قایم کیا جائے، جرمنی فوج کی خبریں ایک طرح شایع کی جائیں اور امریکی یا جاپانی خبریں دوسری طرح۔

اسی ضمن میں میں ان ترکاری والیوں کو بھی کبھی نظر انداز نہ کروں گا جو ترکاریوں کے موسم میں ہماری سڑکوں پر عجب اُودھم مچا رکھتی ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر ناقابل معافی اس لئے ہیں کہ

ان کا مال ٹھنڈا ہو کر خراب ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔

ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان میں بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کا شور، موسیقی سُر لئے ہوئے ہوتا ہے جو تھوڑی دیر کے لئے پُر اثر بھی ہوتا ہے، چنانچہ ملائی کا برف بیچنے والے کی آواز بغیر موسیقی کے نہیں ہوتی یا میں جب کبھی "بڈھی کے بال" والی غمگیں آواز سنتا ہوں تو بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا، خود آپ کا حافظہ ایسی بہت سی دردناک آوازوں کو یاد دلائے گا جن کی تان کا اتار چڑھاؤ ایک خاص تاثر انگیز طریقہ کے ساتھ ہوا کرتا ہو۔

میری مسرت کی اس وقت کوئی انتہا نہیں ہوتی جب میں "قلفی ملائی" کی سریلی صدا سنتا ہوں لیکن افسوس یہ آواز جو بلبل خوشنوا کی ترنم ریزی سے بھی کہیں بڑھ کر ہوتی ہے، سال میں دو ماہ سے زیادہ نہیں سنائی دیتی، اس لئے مجھے خیال ہوتا ہے اور میں نہایت سنجیدگی سے غور کرنے لگتا ہوں کہ پکارنے کی یہی خوش گوار طرز سب کے لئے کیوں نہ استعمال کرائی جائے اسی طرح یہ مسئلہ بھی غور طلب ہے کہ ایک نہایت باقاعدہ شہر میں ایسے مسخرے کس حد تک قابل فروگذاشت ہیں جنھوں نے اپنے اسلاف کی رواج دی ہوئی بولیوں کو چھوڑ کر اس غرض کے لئے خاص خاص نظمیں یا اشعار موزوں کر لئے ہیں مثلاً چورن یا اوڈھنی بیچنے والے۔

مجھے یہاں اس لغویت کو بھی ہرگز نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو موجودہ شور پسند نسل میں عموماً رائج ہے ان کی چیخ پکار سے نہ صرف سمع خراشی اور سوہانِ روح ہوتا ہے بلکہ عوام کے لئے ان کی بولیاں مہمل اور لغو ہوتی ہیں اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے نامکمل جملے کہتے ہیں جو بالکل ناقابل فہم ہوتے ہیں زیادہ تر قرین قیاس یہ ہے کہ لوگ صرف لہجے سے پہچان جاتے ہیں کہ کونسی چیز بک رہی ہے ورنہ کوئی بھی لفظ سمجھ میں نہیں آتا، چنانچہ اکثر میں نے گاؤں سے آئے ہوئے لڑکوں کو دیکھا ہے کہ وہ ککڑیاں خریدنے کے لئے لکڑیاں بیچنے والے کے پیچھے دوڑتے ہیں یا قوانچہ والا سمجھ کر چھری چاقو تیز کرنے والے کے پاس دوڑ کر آتے ہیں۔ اس قبیل میں سے بعض شور اس قدر بے وقوفی سے کئے جاتے ہیں کہ وہ سوائے ان کے ہم پیشہ لوگوں کے سب کے لئے ایک لاینحل معمہ ہوتے ہیں، یہ کیسے معلوم ہو کہ ایک گھنٹی بجانے والا شکر کے کھلونے فروخت کرنے والا ہوگا اور اد ے، اوے کی آواز نکالنے والی ایک سوئیاں دھاگا بیچنے والی ہوگی۔

چونکہ اس قماش کے لوگوں میں ایجاد و اختراع کا مادہ یا دماغی صلاحیت تقریباً ناپید ہوتی ہے اس لئے میں اس کو نہایت مناسب تصور کرتا ہوں کہ ایک سمجھ دار اور با مذاق آدمی اس چیخ پکار کی صدارت کے لئے منتخب کیا جائے جو ایسے لوگوں کو ہرگز سڑکوں پر چیخنے کی اجازت نہیں دے گا جس کی آواز میں ترنم اور موسیقیت نہ پائی جائے اور نیز ایسے اشخاص بھی اس کے مجاز نہ گردانے جائیں گے جن کی آواز عوام کے غل و غش اور ٹانگوں اور جھٹکوں کی گھڑ گھڑاہٹ پر حاوی ہو کر مختصر اور صاف صاف جملوں میں خوش گواری کے ساتھ ہمارے کانوں تک نہ آ سکے اس لئے میں نہایت خاکساری کے ساتھ خود کو اس خدمت کے لئے پیش کرتا ہوں، اگر اس طرح میری حوصلہ افزائی کی جائے گی تو میں اور بھی اسی قسم کی بلکہ اس سے بھی عمدہ عمدہ تدابیر کو جو میرے خانہ ہائے دماغ میں خزائن اجنہ کی طرح مستور ہیں، عملی جامہ پہنانے کی کوشش کروں گا، جس سے خلائق عامہ کو بہت کچھ منفعت و آسائش کی توقع ہو سکتی ہے۔

راقم الحروف بہی خواہ ملک و قوم "سرمست خاں"

محمد ابراہیم

محبت کا مزار

اس خوب صورت جھیل کے کنارے، ان آم کے درختوں کے گھنے سایے میں، ان مرغزاروں کے بیچوں بیچ ایک چھوٹی سی خوبصورت سنگ بستہ قبر ہے، جس کے متعلق اس نواح کے ذرہ ذرہ کی زبان پر خون رلانے والی درد انگیز داستان لکھی ہوئی ہے، سال میں ایک مرتبہ جب ان آم کے درختوں میں مور آتا ہے تو ہواؤں کے جھونکے صبح و شام دونوں وقت نہایت فیاضی کے ساتھ اس قبر پر پھول نچھاور کرتے ہیں۔ اور خوش نما جھیل جو ہر سال برسات کے پانی سے لبالب ہوجاتی ہے اس کی شفاف سنہری لہریں نہایت بے تابی کے ساتھ قبر کے کنارے کو چھو آتی ہیں۔ گاؤں کی عقیدت مند دوشیزائیں اپنے مقدس دامنوں میں انواع و اقسام کے پھول لئے آتی ہیں، اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ اس خوبصورت قبر کے سبز غلاف پر بکھیر دیتی ہیں پھر وہ اپنی پرنم پلکوں سے قبر کے پائین حصہ کو بوسہ دے کر چلی جاتی ہیں، اس خوب صورت جھیل والی قبر کا محافظ جواں عمر مگر نحیف الجسم شخص پایا گیا، جو وہیں قبر کے قریب ایک گھاس کی چھوٹی سی جھونپڑی میں زندگی کے دن گزار رہا ہے۔ اس کے دن اور رات کا زیادہ تر حصہ قبر کے پاس آنسو بہاتے ہوئے کٹ جاتا ہے، منو شکل و صورت کے اعتبار سے برا نہ تھا، اس کا سرو جیسا قد امتداد زمانہ کے باعث قدرے جھک گیا تھا، اس کے جھریوں دار چہرے پر غم کے آثار پائے جارہے تھے، اس کی بڑی بڑی روشن آنکھوں کے اطراف ہلکی سی سیاہی پھیلی ہوئی تھی، منو اس گاؤں کے ایک شریف متمول گھرانے کا منظور نظر تھا، اس کی زندگی کا ابتدائی زمانہ نہایت راحت و مسرت کے ساتھ کٹا۔

اس قبر کی سنگین آغوش میں سونے والی لڑکی نازو، منو کی محبوبہ تھی، نازو کا باپ شیرو، منو کے کھیتوں کی رکھوالی پر متعین تھا، اس کے رہنے کے لئے منو کے باپ نے اپنے ہی مکان کا ایک علحدہ حصہ دے رکھا تھا، شیرو دن بھر کھیتوں کے پاس پڑا رہتا، اس کی بیٹی نازو اس کے لئے دونوں وقت کھانا لے جاتی اور دن کا بقیہ حصہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ کھیل کود میں بسر کرتی جب وہ چند مہینے کی بچی تھی، اس کی ماں اسے اپنے شوہر کی آغوش میں سونپ گئی تھی۔

نازو فطرتاً ذہین، سنجیدہ مزاج واقع ہوئی تھی، گو وہ زیادہ حسین نہ تھی، لیکن ناک نقشہ کے اعتبار سے منو جیسے فطرت پرست انسان کے خیالوں پر چھا گئی، وہ اپنی مستانہ وار اداؤں کے ساتھ منو کے دل میں گھر بنا گئی یہ دونوں کبھی کبھی کھیتوں کو مل کر جاتے، وہاں خوب پانی اور پھولوں سے کھیلا کرتے، پھر دونوں لڑتے جھگڑتے اور آپ ہی آپ من بھی جاتے، سچ تو یہ ہے قدرت نے انھیں ایک دوسرے کے لئے پیدا کیا تھا، ابتدائی دور شباب کی منزل سے گزرا۔ انھوں نے اپنے دل میں ایک گدگدی سی محسوس کی، ان کی معصوم آنکھوں سے ایک ملکوتی جذبہ نمایاں ہوکر ازدیاد محبت کے باعث امڈنے لگا، نازو اب حسن و شباب کی ملکہ بنی ہوئی، منو کے خیالات و احساسات پر چھانے لگی، اس کی دلی آرزو تھی کہ نازو کے دل پر حکمرانی کرے، وہ اسے چاہتا تھا، اتنا ہی جتنا کہ نازو اسے چاہتی تھی، اس کے جذبات ہمیشہ نازو کی محبت سے کھیلا کرتے، لیکن دنیا والوں کی تنگ نظری کو کیا کہا جائے جو محبت کو گناہ سے تعبیر کرتے ہیں، ان کا ملاپ، ان کی محبت ظالم سماج کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی، بزرگوں نے ان کے حرکات و سکنات پر نکتہ چینی کی، اور پھر منو کے والدین نے ان کا ملنا جلنا قطعاً منع کردیا مگر ان کے دل میں محبت تھی۔ انھیں ایک دوسرے کو دیکھے بغیر چین نہ آتا۔ ان کے محبت آشنا دل، اپنے بزرگوں کی نظریں بچا کر اپنی بے ہنگام تشنگی کو بجھانے کی کوشش کرتے۔

ایک سال منّو کے آموں کے درختوں میں کثرت کے ساتھ بہار آئی، جس کی نگرانی وحفاظت کے لئے "نازو" اور اس کے باپ کو متعین کیا گیا، منّو کبھی کبھی نازو سے ملنے کے لئے بے تاب ہوکر چھپے چھپے رات کے وقت جایا کرتا، ایک رات جب کہ فضا چاند کی نقرئی بارش میں بھیگی ہوئی پرکیف تھی، منّو کا دل نازو کی شوقِ ملاقات سے تڑپ اٹھا، وہ فوراً اپنے گھر سے نکل پڑا۔

نازو کا بڈھا باپ نیند سے مغلوب ہوکر خراٹے بھر رہا تھا، اور نازو دل کی نامعلوم تڑپ سے بے تاب ہوکر جاگ رہی تھی آم کے خشک شدہ پتوں میں اس نے کھڑکھڑاہٹ سی محسوس کی، وہ چونک اٹھی اور راستہ کی جانب نظر کی، دفعتاً اس کی نورانی آنکھیں چمک اٹھیں، کون؟ اس کی زبان سے خوشی کا کلمہ نکلا، منّو! اتنی رات گئے، آنے والے نے کوئی جواب نہ دیا۔ دبے پاؤں قریب آکر اس کی کلائی پکڑی "چلو یہاں سے، اس جھیل کے پاس" مدھم آواز فضا میں تھرآئی، محبت کے دو گنہگار قیدی اپنے دلوں میں جذباتِ محبت کا بے بہا خزانہ لئے ہوئے جھیل کی طرف بھاگ نکلے ان کے دل احساسِ گناہ سے زور زور سے دھڑک رہے تھے، لبِ جو وہ ایک چٹان پر بیٹھ گئے، چاند کی کرنیں بھیگی ہوئی نورانی کرنیں ان پر نچھاور ہو رہی تھیں۔ حسن ومحبت کا دیوتا ان پر سایہ کئے ہوئے تھا، ان کے دل ایک دوسرے کی شرابِ محبت میں سرشار سے ہو گئے تھے۔ منّو کے جذبات میں بڑی زور وشور کے ساتھ ہلچل مچی ہوئی تھی، اس کے آغوش میں سب کچھ تھا اپنے استوار محبت کی خاطر پیمانِ وفا باندھا۔ اور کئی پرجوش گرم بوسوں سے اس کے رخساروں اور پیشانی کو عرق آلود کر دیا۔

بالآخر منّو کے دل نے جذبات اور فضا سے متاثر ہوکر گناہ کا ارتکاب کیا، ایسا گناہ جس کی تلافی غیر ممکن ہے۔ اس نے حسن کی نازک پنکھڑیوں کو چوما اور مسل کر پھینک دیا۔ شرابِ محبت پینے کے بعد بلوری شیشے کو توڑ دینا آہ کتنی توہینِ الفت ہے جسن عشق ومحبت کے ہاتھوں اپنی "شکست کی آواز" پر آنسو بہاتا ہوا گھر روانہ ہوا، یہ تھا محبت کا انجام، جو جذبات سے مغلوب ہوکر منّو کے ہاتھوں ہوا۔

محبت کا راز بھی کہیں چھپ سکتا ہے، گناہ کا پیالہ آخر چھلک اٹھا۔ دنیا کی نظروں نے انھیں مجرم جانا، اور یہ تاڑ لیا کہ نازو ایک دن ضرور ماں بنے گی اس کے بڈھے باپ نے اپنی بیٹی کی یہ حالت معلوم کرکے بہت رنج وتاسف کیا، اور اسے گھر سے نکل جانے پر مجبور کیا۔

نازو، عورت تھی، عورت گناہ کرکے کبھی کبھی پشیمان ہو جاتی ہے، وہ اپنی بدنامی پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی رہی، منّو کے باپ نے بالآخر بیٹی کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ اور اپنے بیٹے کو گناہ سے محفوظ رکھنے کی خاطر کسی عزیز کے پاس ناگپور بھیج دیا۔ بڈھا شیرو اپنی بدنامی کے صدمہ سے جانبر نہ ہو سکا ایک ہفتہ کے اندر اندر وہ موت کا شکار ہوگیا۔ اب نازو دنیا میں تنہا رہ گئی، شاید مصائب کی کڑیاں جھیلنے کے لئے۔ وہ اپنے آپ کو انتہا درجہ کی بدقسمت اور گنہگار تصور کر رہی تھی، زندگی کی قیمت اس کی نظروں میں قابلِ وقعت نہ تھی، اس کا دل خودکشی پر مجبور تھا۔ لیکن "ضمیر کی پکار" نے ہمیشہ نازو کو اس خونیں ارادے سے باز رکھا۔ وہ سخت مصیبت میں گرفتار تھی۔

چند دنوں میں اس کے گناہوں کا راز افشا ہوگا۔ اور ایک جیتی جاگتی "گناہ کی تصویر" اس کی گود میں نظر آئے گی، اس نے چند خطوط منّو کے پاس روانہ کئے۔ لیکن منّو نے اس کی جانب کوئی توجہ کی اور نہ خط کا جواب دیا، اس نے ارادہ کرلیا کہ کسی طرح وہ منّو کے پاس جائے گی جس کی سبب اسے یہ تحفہ لینا پڑے گا۔ ناگپور اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ مگر پھر بھی وہ اس کا پتہ دریافت کر کے رہی، منّو جو کبھی اس کا تھا، شہر کی رنگین فضاؤں اور دلچسپ سوسائٹی میں الجھ کر اب بالکل بدل چکا تھا، اور ساتھ ساتھ اس کے خیالات بھی اس نے نازو کی پریشانی ومصیبت کا اندازہ

لگانے کے بعد بھی اپنی مجبوریوں کی آڑ لے کر کھلے الفاظ میں اس کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ اور پھر اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔

نازو کا دل مبہم صدمات کی وجہ سے مجروح ہو چکا تھا خلاف توقع اس نے اپنے محبوب کو انکاری صورت میں پایا' اس کا نازک دل محبت کی یہ کھلی توہین برداشت نہ کر سکا' وہ اپنے آپ کو اس مطلب پرست دنیا سے نجات دلانا چاہتی تھی' مگر قدرت نے اس کے ذمہ ایک معصوم بچہ کی جان رکھ چھوڑی تھی اس کے ضائع کرنے میں وہ گنہگار بھی جائے گی انتہا درجہ کے رنج وغم کے عالم میں وہ ناکام اپنے گاؤں لوٹی۔ اور اپنے رشتہ کی ایک ضعیفہ کے پاس پناہ لی۔

ایک ہفتہ کے بعد اس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا لیکن مرا ہوا۔ دو دن تک نازو بے ہوش رہی مرے ہوئے بچے کے زہریلے اثرات اس کے جسم میں سرایت کر گئے تھے' مرنے سے پہلے جب وہ کسی قدر ہوش میں آئی' اس کی سوکھی ہوئی زبان پر منو کا نام تھا'

مرنے والی کی یہ انتہا درجہ کی خواہش تھی کہ وہ مرنے سے پہلے ایک بار اپنے محبوب کو دیکھ سکے لیکن آہ ایسا نہ ہو سکا۔ وہ اپنے دل میں امید وحسرت کا ایک زبردست خزانہ لئے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کے آغوش میں سو گئی۔ دنیا مرنے کے بعد کسی کی قدر کرتی ہے یا اپنے تغافل نما اداؤں پر پشیمان ہوتی ہے۔ یہی حال نازو کا ہوا۔ کہا جاتا ہے اس طرح کا شان دار جنازہ آج تک اس گاؤں میں کسی کا نہیں نکلا۔

منو نازو کے مرنے کے چند ہی دنوں بعد اپنے وطن آیا' اس کے والدین کسی عارضہ میں مبتلا ہو کر اچانک مر گئے۔ اب منو اداس اور تنہا رہنے لگا۔ واقعات نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا۔ ضمیر نے اسے سخت ملامت کی جیسے وہ کوئی زبردست گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔ دفعتاً وہ بیمار پڑ گیا، ایسا کہ صحت مند ہونے کے بعد بھی وہ اپنا دماغی توازن قائم نہ رکھ سکا۔ پاگلوں کی سی حرکتیں اس سے سرزد ہونے لگیں اب اس کی زبان پر ہمیشہ نازو کا نام جاری تھا۔ ایک دن کیا جی میں آیا کہ بیٹھے بیٹھے اس نے جنگل کی راہ لی اور پھر وہیں کا ہو رہا۔ نازو کو مرے ہوئے پانچ بہاریں بیت چکیں۔ مگر اب تک منو اس کی قبر کے پاس بیٹھ کر آنسو بہاتے ہوئے بھی اپنے گناہوں کی تلافی نہ کر سکا۔

صابر کوسکوی

تنقیدی مقالات :- طبع دوم (۲۹۶) صفحات قیمت ہے

اعلیٰ اصول تنقید نگاری کی وضاحت کے لئے بہترین ادیبوں اور انکے کارناموں پر بلند پایہ تنقیدیں' میر تقی' میر' جرأت' میر حسن' میر امن' میر انیس' سودا غالب' حالی' کیفی' اقبال' اکبر' جوش' عظمت اور سلیم وغیرہ کے کلام اور تصنیفات پر تفصیلی ناقدانہ نظر۔ یہ کتاب ہندوستان کے مختلف جامعات میں اردو ادب کے نصاب تعلیم میں شامل ہے۔

اردو کے اسالیب بیان :- طبع سوم (۱۷۶) صفحات قیمت عہ۔ اردو نثر نگاری کی تاریخ جس میں آغاز سے عہد حاضر تک کے بلند پایہ اور معیاری اردو انشا پردازوں کی نثر اور اس کے اسلوب کی خصوصیات پر ناقدانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ موجودہ نثر نگاروں کے اسالیب پر جداگانہ اور مستقل تبصرہ۔ جدید اردو نثر کے رجحانات اور اس کے مستقبل کے متعلق مشورے۔

غزلیں

کھلے جس سے گلہائے امیدواری
سواری تری ہے کہ بادِ بہاری

جز افزائشِ غم جدا ہو کے تم سے
ہمیں کیا ملا حاصلِ اشک باری

رضا تیری ثابت ہے میری خوشی سے
مقدم بہ آئینِ خدمت گزاری

خود ان پر نہیں روشن اے کاش ہوتی
جو ہے ان کی فرقت میں حالت ہماری

وہ قائم ہیں خوئے تغافل پہ اب تک
نہ کام آئی حسرت مری بے قراری

(۲)

مصیبت بھی راحت فزا ہوگئی ہے
تری آرزو رہنما ہوگئی ہے

یہ وہ راستہ ہے دیارِ وفا کا
جہاں بادِ صرصر صبا ہوگئی ہے

میں درماندہ اس بارگاہِ عطا کا
گنہگار ہوں اک خطا ہوگئی ہے

ترے رتبہ دانِ محبت کی حالت
ترے شوق میں کیا سے کیا ہوگئی ہے

پہنچ جائیں گے انتہا کو بھی حسرت
جب اس راہ کی ابتدا ہوگئی ہے

(۳)

تری یاد بے اختیار آ رہی ہے
تمنا کی فصلِ بہار آ رہی ہے

حرم سے ہوا خوش گوار آ رہی ہے
دوائے دلِ بے قرار آ رہی ہے

ترے کہنہ ملبوس کی دھجی دھجی
پئے راحتِ جاں بکار آ رہی ہے

کہوں حال کیا اس کی جاں پروری کا
جو کعبہ سے خوشبوئے یار آ رہی ہے

ہوس دل کی ان سے جدا ہو کے حسرت
سراسیمہ و اشک بار آ رہی ہے

(مرسلہ معین الدین)

حسرت موہانی

دکن میں اسلامی تعمیر کاری

ماہرین محققین نے ہندوستانی اسلامی فن تعمیر کی طرزوں کے بے شمار نام بتائے ہیں جو یا تو کسی سلطنت کے نام پر ہیں یا کسی شہر کے نام پر، چنانچہ ان کا معتدبہ حصہ دکن سے وابستہ ہے جو آج بہمنی شاہی۔ برید شاہی۔ نظام شاہی۔ عادل شاہی۔ قطب شاہی۔ مغل وغیرہ ناموں سے مشہور ہیں۔ اور ہر ایک طرز ہند کی تاریخ فن تعمیر کے اہم باب کی حیثیت رکھتی ہے۔

حقیقتاً کسی ملک کی تمام تہذیب و تمدن کا انحصار بھی ان تعمیرات پر ہے کسی نے کیا خوب کہا ہے، اگر مسلمانوں کی تہذیب کا ہندوستان میں صحیح جائزہ لینا چاہو تو ان کے بنائے ہوئے مقبروں مسجدوں محلات اور قلعہ جات کو دیکھو جو ابھی تک موجود ہیں۔

علاؤالدین خلجی کی فتح دکن مشہور ہے جس کی یاد میں اس نے قلعۂ دولت آباد میں ایک مسجد اور ایک منار تعمیر کیا۔ مینار آج فتح مینار یا چاند مینار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو دور سے نظر آتا ہے غرض یہ ابتدائی عمارات دکن میں عہد اسلامی کی شمار کرنی چاہئیں۔

مگر جب سب سے پہلے بہمنی سلطنت کا قیام گلبرگہ شریف میں مستقل طور پر ہوا جس کی ابتدا علاؤالدین حسن گنگو سے ہوئی تو اس نے ابتدا میں ایک قلعہ بنوایا اور ایک جامع مسجد ۷۶۹ھ میں تعمیر کی جو ابھی تک صدیوں کے دست برد کے باوجود سلامت ہیں۔ اس مسجد کا معمار رفیع بن شمس بن منصور قزوینی تھا۔ یہ عمارات اسلامی فن تعمیر ہند کی اولین یادگاریں ہیں۔ اگر آج یہ خدانخواستہ مٹ جائیں تو اسلامی فن تعمیر کی بہت بڑی کڑی گم ہو جانے کا اندیشہ ہے، جن کو ہم اسلامی ہندوستانی فن تعمیر کے ارتقاء کی حیثیت سے دکن میں ہی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یہ ابتدائی آثار خالص اسلامی فنون کے اصولوں پر ہیں جن کے اصل نمونے آج بھی عراق و عجم و توران میں موجود ہیں۔

بہمنی سلطنت جب حسن آباد (گلبرگہ) سے محمد آباد (بیدر) میں منتقل ہوئی تو وہاں سلاطین بہمنی نے تعمیرات کی طرف خاص توجہ مبذول کی اور نئی نئی عمارات بنا کر چار چاند لگا دئے جو اس وقت تمام عالم میں اپنی نظیر نہیں رکھتے ان میں خصوصیت سے قابل ذکر احمد شاہ ولی بہمنی کا روضہ ہے اور اس کے گنبد کے اندرونی کتبات سے عیاں ہے یہ نقش و نگار شکر اللہ قزوینی کے تیار کئے ہوئے ہیں جس کا نام اس گنبد کے اندر مکتوب ہے۔ یہ تمام کتبات رسم الخط کے اعتبار سے نسخ، کوفی، ثلث اور طغرہ کی طرزوں پر مشتمل ہیں اور ان کی مثال آج بہت کم ملتی ہے۔ اس قسم کا کام اول مصر عرب کی عمارات میں ہوا۔ اس کے بعد سمرقند کی عمارات میں نظر آتا ہے اور یہاں بیدر میں یہی نقش و نگار اسی عمدگی سے محفوظ ہیں۔ بیدر میں خواجہ محمود گاواں شہید کے مدرسہ کی طرز تعمیر بالکل سمرقند کے قدیم مدارس و مساجد کی سی ہے اس کی دیواروں پر کاشی کاری کی شان اس کے حسن کو دوبالا کر رہی ہے۔ اس طرح بیدر میں برید شاہی عمارات میں علی برید کا مقبرہ اپنی الگ شان رکھتا ہے جو بلند کرسی پر مکعب نما صورت میں مع اعلیٰ گنبد کے کھڑا ہے۔ اس کے اندر چاروں طرف کھلے کمان دار در ہیں جن کے اندر دیواروں پر کاشی کاری ہے جو عام طور پر عمارتوں کے اندر کم نظر آتی ہے۔ پھر اسی کاشی کاری میں فارسی رباعیات میں چاروں طرف کتبات ہیں جن کا رسم الخط نسخ اور نستعلیق کے رہین منت ہے۔

اگرچہ بیجاپور اس وقت ممالک محروسہ میں داخل نہیں ہے مگر مجموعی حیثیت سے اس کا دکن کے اسلامی فن تعمیر میں ضرور شمار ہے۔ وہاں ابراہیم عادل شاہ کا مقبرہ، مسجد اور محمد عادل شاہ کا گول گنبد قابل ذکر ہیں خصوصیت سے موخر الذکر اپنی فنی خوبیوں کے

اعتبار سے بول یا بولی گنبد کے نام سے ضرب المثل ہے۔ اور اصحابِ فن حیران ہیں کہ دنیا کا یہ سب سے بڑا گنبد بغیر کسی اندرونی گنبد کے اپنے اتنے بڑے قطر اور ارتفاع کے ساتھ صدیوں سے صحیح و سالم کس طرح کھڑا ہے۔ اس کا مقابلہ رومہ کے پانتھیوں سے کیا جاتا ہے مگر وہ بھی اس کی بلندی اور محیط کو نہیں پہونچتا۔

قطب شاہی سلاطین کا پایہ تخت گولکنڈہ تھا جو دراصل پہلے بہمنی سلطنت کا ایک صوبہ تھا سلطان قلی قطب شاہ متوفی ۹۴۰ھ نے اس کی بنیاد ڈالی۔ دوسرے سلاطین نے بھی خاص قطب شاہی فن تعمیر سے اس مقام کو بہت فروغ دیا۔ یہاں کے مقابر کے شاندار گنبدوں کی وجہ سے اس طرز کا نام قطب شاہی مشہور ہو گیا ہے۔ شاہان قطب شاہیہ کی دو عمارات خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں جن کی مثال تمام عالم میں کبھی نہیں ملے گی چنانچہ ان میں ایک تو چار مینار کی مشہور عمارت ہے جو اس وقت تمام دنیا میں حیدرآباد کا صحیح ملکی نشان بن چکی ہے اس کی فنی اور ظاہری خصوصیات کو مدنظر رکھ کر تاجدارِ دکن نے اپنے سکہ جاریہ اور ڈاک کے ٹکٹوں پر اس کی تصویر اپنا امتیازی نشان تجویز کیا جس طرح تمام عالم میں مصری ابوالہول اور اہرام مصری مصر کے نشان بن چکے ہیں۔ اس کی بنا سلطان محمد قلی قطب شاہ نے ۹۹۹ھ میں رکھی اور اس کی تکمیل ۱۰۰۰ھ میں ہوئی جو لفظ یا حافظ سے ماخوذ ہے اس کی استرکاری ملک کے سچے بہی خواہ نواب سالار جنگ بہادر نے ۱۳۰۲ھ میں از سر نو کی۔ سلاطین قطب شاہیہ نے اسی ماحول کو دیکھ کر اس کے گرد چار سوق ارفع کمانداز قایم کیا۔ اس دور کی دوسری عمارت جو فن تعمیر میں بین الملّی درجہ رکھتی ہے، وہ بادشاہی عاشورخانہ ہے جسے ۱۰۰۳ھ میں سلطان قلی قطب شاہ نے تعمیر کرایا اور بعد ازاں عبداللہ قطب شاہ نے ۱۰۲۰ھ میں دیواروں پر کاشی کاری کرائی۔ چونکہ سلاطین قطب شاہیہ ائمہ معصومین سے عقیدت رکھتے تھے اس لئے حسنین علیہ السلام کی عزاداری کی خاطر ایسے عاشورخانے قایم کئے آج اگر اس ضمن میں کچھ لکھنا مقصود ہوگا تو اسی عاشورخانے کا تذکرہ لابدی ہوگا کیونکہ اس سے قبل ایسی کوئی عمارت ہمیں نہیں ملتی اس سے واضح ہوتا ہے کہ کس طرح علم بٹھاتے اور اٹھاتے تھے کس طرح بادشاہ وقت ایسے موقعوں پر برآمد ہوتے اور کس طرح سوزخواں سوزخوانی کرتے غرض کہ ابھی تک یہ قدیم علم مع ان سلاطین کے اسماء کے کتبات کے موجود ہیں۔ یہ تمام نظم و نسق اس تعمیر میں مضمر ہے۔

مغلوں کا دور دکن میں دراصل اورنگ زیب سے شروع ہوتا ہے اور تعمیرات کے ضمن میں کوئی خاص امر قابلِ بیان نہیں معلوم ہوتا۔ مگر اس دور کی ایک خصوصیت مابہ الامتیاز نظر آتی ہے وہ اورنگ آباد میں رابعہ دورانی دلرس بانو بیگم زوجہ اورنگ زیب کا مقبرہ ہے اگر تاج محل آگرہ یعنی مقبرہ والدین اورنگ زیب کے متعلق لکھنے والے محقق کو اس کے بیان کی تکمیل مقصود ہو تو اس کے لئے اس روضہ کا مشاہدہ لازمی ہوگا جو بالکل تاج محل آگرہ کی نقل ہے اگرچہ اس سے ادنیٰ ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تاج کا معمار احمد لاہوری تھا تو ہمیں ایک گونہ مسرت ہوگی کہ یہ روضہ دلرس بانو اس کے لڑکے عطاءاللہ کا تعمیر کردہ ہے جس کا نام روضہ کے دروازہ پر پیتل میں کندہ ہے۔

مغلوں کے بعد آصف جاہی دور میں بے شمار عمارتیں تعمیر ہوئیں مگر سلطان العلوم کی مساعی جمیلہ قابلِ صد فخر و مباہات ہیں جن میں عمارت عدالت العالیہ، شفاخانہ، سٹی کالج وغیرہ بہت عمدہ ہیں مگر تھمر گٹی کا تو تعمیر شدہ بازار زیادہ اہم ہے جس کا مقابلہ غیر ممالک کا سیاح لندن کی ایجنٹ اسٹریٹ اور وینس کے

سنٹ مارکو کے سامنے کے مکانات سے کرے گا۔ اسی طرح عمارت جامعہ عثمانیہ جو اس وقت بفضل ایزدی پایۂ تکمیل کو پہونچکر اس ملک کی تاریخی عمارات میں ایک معتدبہ اضافہ ثابت ہو رہی ہے اور اپنی گوناگوں خوبیوں کے باعث نظیر نہیں رکھتی غرض کہ جس طرح یہ جامعہ تعلیمی اعتبار سے بالکل امتیازی صورت رکھتی ہے اس طرح فنی اعتبار سے بھی اپنی آپ نظیر ہے۔ اس عہد میں.... مصری اور ہسپانی طرزوں کے بھی بہترین نمونے یہاں ملتے ہیں آقائے ولی نعمت سلطان دکن نے اپنی ذات کے لئے ایک مسجد مصری طرز پر تیار کروائی ہے جو باغ عامہ میں ہزارہا زائرین کا مرجع ہے اس کو دیکھ کر مصر کی مساجد کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے، وہی صفائی۔ وہی پہل دار گنبد۔ وہی نازک طاقچے غرض کہ تمام مصری لوازمات موجود ہیں۔ اس مسجد کے قریب دوسری ہسپانی طرز کی عمارت میں وہی گھر یا محرابیں اور وہی گچ میں نسخی نقش و نگار نظر آئیں گے۔

اگر یورپ کی تمام جدید ترایجادات تعمیرات کا انہیں روایا پر صحیح مشاہدہ مقصود ہو تو ہندوستان سے سفر کرکے یہاں آکر یہاں کے جدید مکانات کو دیکھنا چاہئے۔ یعنی وہی کعبیت (Cubism) جس کا انحصار زیادہ تر ری انفورس کنکریٹ پر ہے اور وہی فلش سسٹم ہے

اخیر میں نہایت فخر سے کہنا چاہیے کہ قدیم۔ قرون وسطیٰ و جدید فن تعمیر کی تمام طرزیں اپنے اصلی روپ میں نظر آئیں گی جو دیگر حصص ہند میں نہیں ملیں گی غرض یہاں تمام تاریخ فن تعمیر ابتدا سے لے کر آج تک مسلسل اپنی اعلیٰ حالت میں مشاہدہ و مطالعہ میں آئے گی اور یہ سب خوبیاں سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ کے عہد زریں کی بہترین یادگاریں ہیں۔

عبداللہ چغتائی

غزل

ہم بزم میں تیری کبھی آیا نہ کریں گے
اظہارِ وفا سے تجھے رسوا نہ کریں گے

ہو جاتی کچھ اور بھی وحشت میں ترقی
آغاز میں انجام کو سوچا نہ کریں گے

اک دھن میں پہونچ جائیں گے منزل پہ اپنی
دیوانے تری راہ میں بھٹکا نہ کریں گے

مرضی جو یہی ہے تری اے رنگ خموشی
شکوہ کبھی تجھ سے لب گویا نہ کریں گے

جب طاقتِ دیدار نہیں طالبِ دیدار
بھولے سے ترے سامنے آیا نہ کریں گے

مٹ جائے نہ اشکوں سے کہیں داغِ محبت
مایوس محبت کبھی رویا نہ کریں گے

کیا ہو نہ ملے پھر بھی اگر منزلِ مقصد
یہ سوچتے ہیں حال گدا یا نہ کریں گے

یہ عہد ہے میخانہ میں ساقی سے یمیںؔ کا
پی جائیں گے لیکن کبھی بہکا نہ کریں گے

میر حسن علیخان یمینؔ

حسین تعارف

(ایک بیلڈ (Ballad) مسوری کی پہاڑیوں میں)

"پلاٹ" بکھرے ہوئے ہیں مرے فسانوں کے
وہاں مسوری سے کچھ دور۔ کوہساروں میں
وہاں دیہات کے معصوم ماہ پاروں میں
وہاں خموش گر دل نشیں نظاروں میں
حسین نظم کے عنوان پائے جاتے ہیں

عروسِ صبح کی انگڑائیوں میں، رقصِ شباب
شعاعِ مہر کی رعنائیوں میں، رنگِ شراب
سنہرے چاند کی پرچھائیوں میں، حسن کا خواب
قسم ہے ایسی بہاریں کبھی نہیں دیکھیں

وہاں کا منظرِ جنت بدوش کیا کہنا !
وہاں کا نغمۂ فردوسِ گوش کیا کہنا !
وہاں فرشتوں کا رقصِ خموش کیا کہنا !
کوئی کسانوں کا چھوٹا سا گاؤں بستا ہے

وہیں پہ رقص کناں جوئے بار کی جانب
وہیں پہ نغمہ بہ لب آبشار کی جانب
وہیں پہ وادئی فردوس زار کی جانب
وہاں پہاڑی پہ میں نے کسی کو دیکھا ہے

حسین ماتھے پہ افشاں سی جھلملائے ہوئے
حنائے شوخ کفِ ناز میں لگائے ہوئے
سفید ساری پہ قوسِ قزح بنائے ہوئے

بساطِ راہ پہ اس طرح چل رہی تھی وہ
کہ جیسے سیر میں مصروف ماہِ تاباں ہو
جلو میں زہرۂ زریں قدم بھی رقصاں ہو
فضاؤں میں متحرک ربابِ پنہاں ہو
بڑی ادا سے وہ جانِ ادا خراماں تھی

کبھی کلائی کو آنچل سے اپنے موڑ لیا
کبھی تو تالی بجانے کو ہاتھ جوڑ لیا
کبھی تو راہ کا رنگین پھول توڑ لیا
کچھ اس طرح تھی خراماں حسینۂ معصوم

کہ جیسے حسن کے ہر رسم و راہ سے محروم
کہ جیسے جلوہ کسی جلوہ گاہ سے محروم
کہ جیسے ایک جوانی، گناہ سے محروم
غرض کہ میں نے یہ پوچھا تمہارا نام ہے کیا!

تمہیں کو لوگ بہشتِ خیال کہتے ہیں ؟
تمہیں کو زہرہ و پرویں جمال کہتے ہیں ؟
تمہیں سے لوگ محبت کا حال کہتے ہیں ؟
دیا یہ مجھ کو ذرا مسکرا کے اس نے جواب

نہ جانے پوچھا ہے کیا کیا۔ رکو! بتاتی ہوں!
یہاں پہاڑی پہ میں گھومنے کو آتی ہوں!!
میں اپنے گاؤں میں چمپا پکاری جاتی ہوں!!!

وہی جو گاؤں میں اک شاہکارِ فطرت تھی
سلام! اصل میں ناواقفِ "محبت" تھی!؟!

سلام
(مچھلی شہری)

مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط

جناب مخدومی و مکرمی متعنا سلا!

تسلیم۔ آج رمضان کی اکیسویں تاریخ ہے اور مجھ کو رمضان کے آخر پر جو ایک سخت ضرورت ادائے زر امانت کی پیش آنے والی ہے اوس کا زمانہ بہت ہی قریب رہ گیا اور ہر ایک ضرورت پر جس کا اظہار میں اپنے سابقہ عریضہ میں کر چکا ہوں یہ ضرورت مقدم ہے یہ رقم چار ہزار کلدار کی ہے اور اوس کے بعد دوسرے نمبر پر میرا بنگلور کا سفر ہے اسی سفر میں مجھ کو گورنر صاحب مدراس اور چیف جسٹس صاحب سے بھی ملنا ہوگا جہاں وہ ہوں گے اور جس کے مصارف کا تخمینہ ایک ہزار روپیہ میں نے بہت ہی اعتدال کے ساتھ لکھا ہے یہ ضرورت اگرچہ ادائے امانت کے مقابلہ میں دوم نمبر کی ہے لیکن اس حیثیت سے کہ وہ ایک ذریعہ اس بات کا ہے کہ آئندہ محمد احمد کے مصارف سے مجھ کو سبکدوشی حاصل ہو جسکے بعد میری آمدنی میرے مصارف کے لئے اچھی خاصی طرح کفایت کرے گی سب سے مقدم ہے نمبر ۳ پر میرے باقی اور قرضوں کی ادائی ہے اور وہ بھی سب ایسے ہیں کہ اپنے اپنے وقت ادا پر وہ بھی میرے لئے سوہان روح ہوں گے۔

یہ مجھ کو کامل یقین ہے کہ آپ کی اور جناب رائے صاحب کی طرف سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ ہوا ہوگا لیکن تاہم نتیجہ ایک امر تقدیری ہے اور اوس پر کسی کا قابو نہیں ہے لہذا میں بہت ہی مشکور ہونگا اگر بمجرد ملاحظہ عریضہ ہذا مجھ کو تار پر نتیجہ سے اطلاع مل جاوے تار میں کاتب کا کوئی نام جو آپ مناسب سمجھیں کفایت کرے گا اور مکتوب الیہ محمد صبغت اللہ بی اے امروہہ تیلی گراف آفس۔

(مولوی مشتاق حسین کا خط

مولوی محسن عطاء اللہ کے نام)

اگر امید منظوری ہے تو یہ لکھنا کفایت کرے گا کہ "حکیم صاحب کی فیملی خیریت سے ہے" اور بصورت مایوسی یوں لکھ دیجئے کہ "یہاں کے کالج سے آپ کو سارٹیفکٹ نہیں مل سکتا" یاس میں بھی ایک قسم کی راحت ہے میرا یہ عریضہ آپ کو غالباً ۱۱ مارچ کو ملے گا مطابق ۲۵ رمضان اور اوسکے دوسرے روز امید ہے کہ آپکا تار کسی نہ کسی طرح کا مجھ کو مل جاوے گا۔ اوسوقت بصورت مایوسی میں کوئی دوسری فکر اسی کے انتقال وغیرہ کے شروع کروں گا۔ تاکہ عید کے تعطیل میں میں اوس طوفان کا مقابلہ کر سکوں جو کہ پیش آنے والا ہے لوگوں کو خوشی ہے کہ رمضان اب عنقریب ختم ہوگا اور عید آوے گی اور میرا خون خشک ہو رہا ہے۔

جناب رائے صاحب کے خدمت میں بھی مضمون یہی ہے اور اگر اس عرصہ میں آپ کو کوئی قطعی جواب مرحمت فرما دیا ہو جو کہ مجھ کو ۲۵ رمضان سے پیشتر ہی مل سکے گا تو پھر کسی تار کے ضرورت نہیں ہے۔

آخر میں اس تکلیف دہی کی جسکے سوا کوئی چارہ کار مجھ کو نظر نہ آیا معافی چاہتا ہوں اور خداوند تعالیٰ جل شانہٗ سے آپکی خیر و عافیت اور کامیابیوں کا خواہاں ہوں۔ والتسلیم

خاکسار

مشتاق حسین

کونین

تقریباً ۴۰۰ سال قبل کا ذکر ہے کہ جنوبی امریکہ سے "ارائیو" نامی ایک شخص سیر و سیاحت کو نکلا دوران سفر میں اس کو دلدلی زمین پہاڑ اور مرطوب ہوا سے گزرنا پڑا جس کی وجہ اس کو جاڑے کے ساتھ بخار آیا اور وہ ایک نالے کے کنارے جنگل کے سایہ میں بے یار و مددگار پڑا رہا۔ مسلسل دو روز تک وہاں خوب آندھی اور طوفان رہا جس کی وجہ سے نالے کے کنارے اکثر درخت اکھڑ کر نالے میں گر پڑے۔ تیسرے دن آندھی کے اختتام پر "ارائیو" کو پیاس محسوس ہوئی تو اس نے نالے کا گدلا پانی پی کر اپنی پیاس بجھائی اور اسی نالے کے کنارے گزارا۔ ہر روز نالے کا گدلا پانی پینے کی وجہ سے اس کے بخار کا بہت تھوڑے عرصہ میں استیصال ہو گیا اور پھر وہ اپنے پروگرام کے مطابق سفر کرنے لگا۔

جب "ارائیو" سفر سے گھر لوٹا تو اس نے وہ تمام باتیں اپنے گھر والوں سے بیان کیں جو اس کو دوران سفر میں پیش آئی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ کس طرح ایک قسم کے درخت کے نالے میں گرنے سے نالے کا پانی گدلا ہو گیا۔ جس کو پی کر اس نے بخار سے نجات حاصل کی۔ دوسرے دن "ارائیو" کے باپ نے اس نالے کا پتہ لگا کر یہاں سے گدلا پانی ایک گھڑے میں بھر کر گھر لایا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد "ارائیو" کی والدہ مرض ملیریا میں مبتلا ہو گئی تو اس کو بھی یہی پانی پلایا گیا جس سے اس کو صحت ہو گئی علاوہ ازیں انھوں نے آس پاس کے دیگر بخار کے مریضوں کو بھی یہی پانی پلایا جس سے ان کا بخار بھی جاتا رہا۔

جب گھر لایا ہوا پانی ختم ہو گیا تو "ارائیو" پھر اس نالے پر گیا مگر اس مرتبہ نالے کا پانی بالکل صاف و شفاف تھا کیونکہ نالے میں پڑے ہوئے پہلے کے درختوں کی تمام چھال نکل گئی تھی لہذا اس نے اس قسم کے درختوں کا سراغ لگایا اور ان کی چھال نکال کر گھر لے گیا۔ گھر جانے پر جب اس نے چھال کو پانی میں ڈال دیا تو اس پانی کا رنگ بھی نالے کے سابقہ پانی کی طرح میلا ہو گیا تھا جب "ارائیو" اور اس کے پڑوسیوں کو اس امر کا اطمینان ہو گیا کہ یہ پانی ملیریا کے لئے مجرب ہے تو انھوں نے اس کو اپنے ہی تک محدود رکھا۔

۱۶۳۸ء میں اسپین کا ایک زمیندار کاؤنٹ سنکو نامی اپنی بیگم کے ساتھ یہاں آیا اس کی بیوی نہایت ملنسار اور ہر دلعزیز تھی وہ غریبوں پر بہت مہربان تھی اور اکثر اوقات ان کی مدد کیا کرتی تھی۔ اتفاقاً بیگم کاؤنٹ مرض ملیریا میں مبتلا ہو گئی اور روز بروز مرض بڑھتا گیا حتیٰ کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ مقامی لوگوں نے بیگم سے چھال کی خوبیاں بیان کیں اور چھال کچھ ان کے حوالہ کر دی۔ جب بیگم کاؤنٹ نے چھال کا پانی استعمال کیا تو "ارائیو" کی طرح اس کا بخار بھی جاتا رہا۔ اور بیگم کاؤنٹ بھی چھال کی خوبیوں کی معترف ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد جب اسپین کے لوگ یہاں آئے تو بیگم کاؤنٹ نے انھیں اس کی خوبیوں سے آگاہ کیا۔ اس کے چند سال بعد یعنی ۱۶۴۳ء میں بیگم کاؤنٹ اسپین واپس گئی اور اپنے ساتھ چھال بھی لیتی گئی کیونکہ اسپین میں ملیریا کی عام شکایت تھی۔ چونکہ سب سے پہلے اسپین میں اس چھال کو کاؤنٹ

سنکونا لے گیا تھا اس لئے اسپین میں یہ سنکونا کی چھال کے نام سے مشہور تھی اور آئندہ چل کر اسی نام سے ساری دنیا میں بھی مشہور ہو گئی۔ سنکونا کے درخت زیادہ تر پیرو، ایکویڈور اور کوہ انڈیز کی ڈھلانوں پر سطح سمندر سے ۳۰۰۰ تا ۹۰۰۰ کی بلندی پر پیدا ہوتے ہیں اسی درخت سنکونا کی چھال سے "کونین" تیار کی جاتی ہے۔ جو آج کل ملیریا کے اندفاع کے لئے بہ کثرت استعمال ہوتی ہے۔

پہلے پہل ہندوستان میں اس درخت کو سنہ ۱۸۳۵ء میں ڈاکٹر ریلے لایا تھا اور اسی نے ہندوستان میں اس کی کاشت کی بنیاد رکھی۔ پہلی مرتبہ اس کے صرف ۳۰ یا ۴۰ درخت حاصل ہوئے مگر سنہ ۱۸۹۷ء اور سنہ ۱۸۹۸ء میں اس کی کاشت ۴۳۴۶ ایکڑ زمین پر کی گئی مگر چائے اور کافی کی طرح زیادہ نفع دینے والی ثابت نہ ہوئی جس کی وجہ سے اس کی کاشت پر زیادہ لوگوں نے اپنی توجہ مبذول نہ کی۔

مذکورہ بالا سوانح عمری اس "کونین" کی ہے جس کو آج کل ہم لوگ ملیریا کے انسداد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور جس کا مزہ کڑوا ہوتا ہے مگر حلق سے اترتے ہی ہماری امداد پر تل جاتی ہے۔

محمد عبد القادر فاروقی

مغربی تصانیف کے اردو تراجم

مرتبہ جناب میر حسن صاحب ایم اے۔ اردو زبان میں سنجیدہ تصانیف کے آغاز کے ساتھ ہی مغربی زبانوں کے تراجم کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، اور اس وقت اس میں ان تراجم کا اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے، لائق مؤلف کی تلاش و تحقیق سے جہاں تک پتہ چل سکا ہے، انھوں نے اس کتاب میں ان ترجموں کو جمع کر دیا ہے، فورٹ ولیم کالج کے زمانہ اٹھارویں صدی سے اس وقت تک چار دور قائم کئے ہیں اور ہر دور کے ماتحت اس عہد کی انفرادی اور جماعتی کوششوں یعنی اشخاص اور علمی اداروں کے تراجم کا ترتیب کے ساتھ ذکر ہے، ابتدائی دور کے ترجموں پر مختصر تبصرہ اور بعض کے نمونے بھی دیدیئے ہیں، مختلف فہرستوں خصوصاً سجاد مرزا بیگ کی الفہرست میں کافی ترجموں کا ذکر ہے لیکن اس استیعاب کے ساتھ یہ پہلی کوشش ہے اور بڑی حد تک کامیاب ہے، یہ موضوع ایسا ہے کہ ممکن ہے کچھ ترجمے مرتب کے علم میں نہ آسکے ہوں، جن کے اندراج کی بعد میں گنجائش باقی ہے، کتاب کے شروع میں ایک مختصر اور مفید مقدمہ بھی ہے۔

معارف اعظم گڈھ
مئی سنہ ۱۹۴۰ء

اردو مثنوی کا ارتقاء

جس کے مصنف عبد القادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی۔ استاد ادب اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ہیں اس کتاب کو بھی ادارہ ادبیات اردو نے شائع کیا ہے جس کی قیمت ۱۲ عہ ہے۔

مصنف نے کتاب کو مختلف ابواب میں منقسم کر کے مثنوی کا دیکھا اس کے ابتدائی اور متوسط اور جدید دور پر جامع اور مفصل بحث کی ہے اور سابق بادشاہوں کے عہد میں ان کی ارتقائی کیفیات کو مثالیں دے کر سمجھایا ہے، یہ ایسی جامع اور مکمل تصنیف ہے جس کا مطالعہ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے از بس ضروری ہے، اس کے لائق اور قابل مصنف اپنی تحقیق کے لئے قابل صد ستائش ہیں۔

رہنما مراد آباد
اپریل سنہ ۱۹۴۰ء

صنعتی انقلابِ انگلستان کے اثرات

انقلاب و ارتقا ہم معنی الفاظ نہیں۔ ان میں زمین اور آسمان کا فرق ہے۔ سب سے بڑی چیز جو ان دونوں میں مابہ الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انقلاب یکایک ہوجاتا ہے اور اس کی پیشین گوئی اور وقت کا تعین بہت مشکل ہے اس کے برخلاف ارتقاء ایک تدریجی ترقی کا نام ہے۔ جس سے ہر شخص باخبر رہتا ہے اور اس کی ابتدا و انتہا کا پتہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں۔

اس تشریح و تمہید کے بعد جب ہم صنعتی انقلاب انگلستان کی وجہ تسمیہ پر غور کرتے ہیں تو بڑا تعجب ہوتا ہے کیونکہ یہ صنعتی انقلاب جو انگلستان میں اٹھارویں صدی میں واقع ہوا نہ تو کوئی ناگہانی سے برسی ہوئی چیز تھی اور نہ چند دنوں یا مہینوں کی پیداوار۔ حقیقت یہ ہے کہ سال ہا سال کے گزر جانے کے بعد بھی یہ پایۂ تکمیل کو نہ پہونچ سکا۔ اس کی ابتدا سنہ ۱۷۶۰ء سے ہوئی جب کہ ایسی ایجادیں شروع ہونے لگیں جن کی مدد سے انگلستان کی صنعتوں کو بہت جلد فروغ و ترقی ہوئی۔ اور کہیں پچاس سال کی مدت میں یہ اس قابل ہوا کہ اس کے لئے لفظ تکمیل کچھ صحت کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا تھا بعض معاشیین کے خیال میں تو یہ انقلاب ایک لامتناہی عرصہ تک جاری رہا اور بعض کے خیال میں اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اور اس زمانہ کی ہر وہ ایجاد جو صنعتوں کے لیئے فائدہ مند ہے اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھی جاتی ہے۔ لیکن سب سے زیادہ قابل قبول تعین مدت سو سال کی ہے جو سنہ ۱۷۵۰ء سے (جب کہ کوئلہ سے نپانے کا طریقہ ایجاد ہوا) شروع ہوکر سنہ ۱۸۴۶ء (جب کہ پہلی بار پہلی بڑی ریلوے اسکیم روبہ عمل لائی گئی) میں ختم ہوتی ہے۔

جب اصل واقعہ یہ ہے تو اسے انقلاب کیوں کہا جاتا ہے؟ کیوں نہ اسے ارتقاء ہی کے نام سے موسوم کیا جائے؟ تاریخ عالم کے مشہور انقلابات کو لیجئے اور ان کا مقابلہ اس سے کیجئے اور دیکھئے کہ ان میں کہاں تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ انقلاب فرانس سنہ ۱۷۸۹ء سب سے اچھی مثال ہوگی۔ اس کی پوری عمر چند ماہ سے زائد نہ تھی۔ اس کی پیشین گوئی نہ کسی نے کی اور نہ کسی کو قبل وقوع اس کا گمان تھا۔ لیکن انگلستان کے صنعتی انقلاب کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ بایں ہمہ اسے بھی انقلاب کہا جاتا ہے۔ کیوں؟

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اسے ٹون بی Toynbee نے غلطی سے انقلاب کا نام دیا۔ غالباً اس کو اس کے ہمہ گیر دوررس اور ان گنت اثرات کی وجہ سے انقلاب کہا جاتا ہے۔ بعض معاشیین تو انگلستان کی ہر ترقی کو اس پر محمول کرتے ہیں انگلستان کی کثرت دولت کا سبب اس کو قرار دیتے ہیں۔ اس کی وسعت مملکت کا ذریعہ اسی کو بتلاتے ہیں اور یہاں تک کہ ان کے خیال میں علوم و فنون کی ترقیاں اور تہذیب و تمدن کا ارتقاء اسی کا نتیجہ ہے۔

بالفاظ دیگر صنعتی انقلاب انگلستان اپنے اثرات کے باعث ہی انقلاب کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے اثرات جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے بہت ہی دیرپا، دوررس اور ان گنت تھے چنانچہ زندگی کا ہر پہلو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کے اثرات سے متاثر ہوا۔ اور مملکت کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جو اس کے اثر سے بچ سکا۔

مختصر یہ کہ اس کی بدولت صنعت پارچہ بافی اپنے
معراج کمال کو پہونچی۔ نئی نئی ایجادوں کی وجہ سے کم قیمت
اور کم وقت میں بہتر و نفیس کپڑا تیار ہونے لگا۔ حرکت دینے
والی قوت (Motive power) میں جو تغیرات
و ایجادات ہوئیں وہ بھی صنعتوں کی ترقی کے لئے بیحد مدد و معاون
ثابت ہوئیں۔ اس وقت ہم سات قسم کی قوتوں سے واقف
ہیں (۱) انسان (۲) جانور (۳) پانی (۴) ہوا (۵) بھاپ
(۶) گیاس (۷) برق۔ صنعتی انقلاب تک صرف اول الذکر
چار قوتوں سے دنیا روشناس تھی۔ لیکن آخری تین قوتوں
کا انکشاف جو انقلاب ہی کے باعث رونما ہوئیں، موجودہ
مشنری کو معرض وجود میں لایا۔

لوہے اور کوئلہ کی صنعت نے بھی بیحد ترقی کی جب
لوہے کو کوئلے سے تپانے کا طریقہ معلوم کر لیا گیا تو اس صنعت
کی ترقی کی رفتار اور بھی تیز ہوگئی لوہا اور کوئلہ خود ایک دوسرے
کے لئے فائدہ مند ثابت ہوئے۔

علاوہ ازیں چینی اور مٹی کے برتنوں (China
Earthenware) کی صنعت نے بھی بہت کچھ ترقی کی۔ کیمیاوی
تجربات (Chemical processes)
بھی ترقی سے محروم نہ رہے کلورین گیاس کے انکشاف نے کپڑوں
کی صفائی میں بڑی سہولت پیدا کر دی جس کی مدد سے رنگوائی
وغیرہ آسانی سے ہونی لگی۔

ان کے علاوہ حمل و نقل کے طریقوں میں بھی بہت سی
مفید تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ سڑکیں اور نہریں نہ صرف درست
کی گئیں بلکہ نئے نئے تعمیری کام بھی کئے گئے۔

انگلستان کا یہ حقیقی انقلاب بذات خود اور تین انقلابات
کا پیش خیمہ بنا۔ اول یہ کہ صنعتی و معاشی نقطۂ نظر سے اس نے
انگلستان میں موجودہ معاشرہ کی بنیاد ڈالی۔ جس کو نظام سرمایہ داری
کہا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس نے انگلستان کے تجارتی مسلک
کی بھی کایا پلٹ کر دی۔ جس کی وجہ سے پرانے "نظام تجارت"
(Merchantalism) کی جگہ
"عدم مداخلت" (Laisse Faire)
نے لے لی۔ تیسرے یہ کہ یہ صنعتی انقلاب زرعی انقلاب کا بھی
محرک ہوا جس کے تحت زمین داری و کاشتکاری میں نئے
نئے اصول رائج کئے گئے۔

اس انقلاب کے چند برے نتائج بھی ظاہر ہوئے۔
مثلاً گاؤں ویران ہونے لگے۔ شہر آباد ہوتے گئے۔ جس کی
وجہ سے صفائی کا کم خیال رکھا جانے لگا، اور مشینوں کی بدولت
بے روزگاری عام ہوتی گئی۔ مزدوری بھی کم دی جانے لگی۔ عورتوں
اور بچوں سے زیادہ کام لیا جانے لگا۔ اموات خصوصاً بچوں کی
اموات کا اوسط بڑھنے لگا۔ کارخانہ جات نے گھریلو صنعت پر
فوقیت و تسلط پاتے ہی "خاندانی" زندگی کو تباہ کر ڈالا۔
اور سب سے زیادہ اس انقلاب نے مزدور اور آقا میں ایک
لا تناہی جنگ چھیڑ دی جس کا حل دنیا اب تک معلوم نہ کر سکی۔

لیکن مجموعی حیثیت سے یہ انقلاب بہت سود مند
ثابت ہوا۔ اس کی بدولت انگلستان میں ایک متوسط طبقہ پیدا
ہوگیا جو انگلستان کی ترقی کا بڑی حد تک ضامن ہے۔ اس
انقلاب ہی کی بدولت انگلستان کی دولت، ثروت، سطوت،
وسعت، تجارت، صنعت و حرفت اور تمدن و معاشرت میں
اتنی ترقی ہوئی کہ اس کو دنیا کے سب سے بڑے ممالک میں
شمار کیا جانے لگا۔ بعض کم فہموں نے انگلستان کی تجارتی ترقی کو

حقارت کی نظر سے دیکھا اور نپولین نے تو اہلِ انگلستان کو ایک "تجارت پیشہ گروہ" کے ادنیٰ نام سے یاد کیا۔ مگر یہ یاد رہے کہ انگلستان کی اس تجارتی ترقی ہی نے اس کو نپولین کے مقابلے میں کامیابی عطا کی۔

آغا محمد بیگ

ناروے کا حشر

اس خطا پر اُسے مارا کہ خطا وار نہ تھا

اگر موجودہ جنگ میں جرمنی کے طرزِ عمل پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اتحادیوں پر سامراج کا الزام لگانیوالا جرمنی خود ہوس ملک گیری کا شکار ہو رہا ہے۔ اس نے کبھی طاقتور ملکوں پر حملہ کرنے کی جرات نہیں کی بلکہ ہمیشہ کمزور اور بے بس قوموں کا خون چوسا جو ملک پہلے ہی سے نازی اِستبداد سے خائف ہو کر غیر جانبداری کا اعلان کر چکے تھے اور جنہوں نے کبھی جرمنی کو کسی قسم کی شکایت کا موقع ہی نہیں دیا جرمنی نے "خوے بدرا بہانہ بسیار" کے مصداق کوئی نہ کوئی بہانہ ان پر قبضہ کرنے کے لئے تراش ہی لیا اور اُن پر چڑھ دوڑا۔ بالکل یہی طرزِ عمل جرمنی کا ناروے کے ساتھ بھی رہا۔ اِس پر یہ الزام لگا کر کہ وہ صحیح معنوں میں غیر جانب دار رہنے کے قابل نہیں ہے جرمنی نے اسے اپنے آغوش عافیت میں لے لینے کا تہیہ کر لیا۔

جنگ یورپ کی ابتدا کے ساتھ ہی ناروے نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا تھا اور اس نے قولاً و فعلاً انتہائی احتیاط کے ساتھ غیر جانبداری کے تمام قوانین کی پابندی بھی کی۔ اپنے سمندر کو متحاربین کی ساری جائز جہازرانی کے لئے کھلا رکھا۔ اور وہ برطانیہ اور جرمنی ہر دو کے ساتھ تجارت کرتا رہا۔ لیکن اس طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ ناروے کے مغربی ساحل یعنی ناروے کی تنگنائے یا محفوظ راستہ میں سے جرمن جنگی اور دیگر جہاز ناروے اور سویڈن کے سمندروں میں سے اتحادیوں کی ناکہ بندی کے باوجود گذرنے لگے۔

اس راستہ کا وجود اور ناروے کی غیر جانبداری اتحادیوں کے لئے بہت نقصان رساں اور جرمنی کے لئے بہت ہی فائدہ بخش ثابت ہوئی۔ جرمنی اس طریقہ سے گویا اتحادیوں کی ناکہ بندی کو شکست دینے میں ایک حد تک کامیاب ہو رہا تھا۔ چنانچہ ناروے کی اس غیر جانبداری کا نتیجہ یہ تھا کہ ناروے سے مختلف قسم کا خام مال اور خاص طور پر خام لوہا جرمنی پہنچ رہا تھا۔ یہ اتحادیوں کو کس طرح گوارا ہوتا۔ انہوں نے اس کو روکنا چاہا۔ چنانچہ اس غرض کے لئے اتحادیوں نے ناروے کے سمندر میں بعض مقامات پر اچانک سُرنگیں بچھادیں اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض بڑے جرمن جہاز اس سمندر میں ڈوب گئے لیکن اتحادیوں کے سرنگ بچھانے کی وجہ سے ناروے کی حکومت کو سخت صدمہ پہنچا اور وہ اتحادیوں کے مقاصد کو نہ سمجھ سکا۔ ناروے نے اسے بین قومی قانون اور غیر جانبداری کی بالجبر خلاف ورزی پر محمول کیا اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی چنانچہ اس نے اتحادیوں سے مطالبہ کیا کہ سُرنگیں فوراً صاف کر دی جائیں۔

ابھی ناروے کی حکومت اس احتجاج میں مصروف تھی کہ جرمنی نے شاید اس خیال سے کہ ناروے اس رنجش کی بنا پر جو اس میں اور متحدین میں پیدا ہو گئی تھی اس کا ساتھ دیگا، اپنی فوجیں آگے بڑھادیں۔ اس کے علاوہ واقعہ یہ تھا کہ متحدین کا یہ حربہ کہ ناروے کے سمندر میں اچانک سُرنگیں بچھادی گئیں، بہت کارگر ثابت ہوا لیکن اتحادیوں کی اس کارروائی پر جرمنی کو ایک اچھا بہانہ مل گیا۔ ۹ر اپریل کو جرمن فوج کی اعلیٰ کمان نے اعلان کیا کہ ڈنمارک اور ناروے کے خلاف جو کارروائیاں جاری ہیں ان کا ازالہ کرنے اور ان دونوں پر کسی مخالف حملہ کا سدباب کرنے کی غرض سے جرمنی ان دونوں ممالک کو اپنی حفاظت میں لینا اپنا فرض سمجھتا ہے اس کے بعد ہی ڈنمارک اور ناروے پر اچانک حملہ کر دیا۔ ڈنمارک نے تو صرف بارہ گھنٹہ کے اندر ہی جرمنی کی ماتحتی قبول کر لی اور اتحادی بھی اس کو بچا نہ سکے۔ البتہ ناروے پر حملہ کے ساتھ ہی

ناروے کی حکومت نے اجتماع عام کا حکم دیدیا اور اپنے ملک کی حفاظت کرنے کا تہیہ کرلیا۔

ناروے کی فوج ابھی سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ جرمن فوج اس طریقہ جنگ سے جس کو جرمن زبان میں (Blitzkrieg) (وہ جنگ جو بجلی کی طرح ہو یعنی مختلف سمتوں سے پوری طاقت کے ساتھ شروع کردی جائے اور ایسا اچانک حملہ کیا جائے کہ دشمن بالکل بے بس ہوجائے اور اس کو سنبھلنے کا بھی موقع نہ مل سکے) کہا جاتا ہے، کام لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی اہم مقامات پر اپنا قبضہ جمالیا اس کے بعد ہی اتحادیوں نے ناروے کو کامل امداد دینے کا فیصلہ کیا اور اپنی فوجیں روانہ کیں۔ ناروے کی فوج برطانوی افواج سے مل گئی اور جنگ باقاعدہ طور پر جاری ہوگئی ابتداً مقابلہ میں جرمنوں کو پسپائی ہوئی لیکن بعد میں جرمن فوج نے کافی اہم مقامات پر قبضہ حاصل کرلیا۔

ناروے کی شکست کے بعد دارالعوام میں اس پر جو مباحثہ ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فوج اتحادیوں نے روانہ کی تھی وہ پوری طرح تربیت یافتہ نہیں تھی۔ زیادہ تر نوجوان سپاہی تھے جن کے پاس حربی سامان تھا اور نہ اغذیہ کا کافی ذخیرہ۔ دوسرے یہ کہ جرمنی کا ہوائی حملہ اس قدر سخت اور شدید تھا کہ اتحادی افواج اس کی تاب نہ لا سکیں تیسرے یہ کہ جس واحد جنگی جہاز پر سامان حرب اور مدافعتی آلات ناروے بھیجے جا رہے تھے اسے جرمنی نے ڈبو دیا مسٹر لائیڈ جارج نے حکومت کی اس پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ "برطانوی افواج کی پہلی قسط جو ناروے روانہ کی گئی تھی منتخب سپاہیوں پر مشتمل ہونی چاہیئے تھی۔ حکومت کے پاس منتخب سپاہی تھے۔ برطانیہ نے ایک علاقہ وار بریگیڈ روانہ کیا جس کو کوئی زیادہ ٹریننگ حاصل نہیں تھی۔ یہ ایک ایسی فوج کا مقدمتہ الجیش تھا جس کو ایک دشوار فریضہ انجام دینا تھا اور جس پر ساری فوج کا انحصار تھا۔ ہمارے پاس فوج اور بحریہ میں اجتماعی اور متحدہ کارروائی ہونی چاہیئے تھی ہمارے پاس ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں تھی۔ ہم نے ایک ایک ہوائی پڑاؤ حاصل کرنے کے موقع کا جوا کھیلا۔ یہ مہم انگلستان کے لئے بے انتہا اہم تھی لیکن اسے ناتربیت یافتہ غیر پختہ کار دیہاتی فوج کا تابع بنایا گیا۔ اور وہ بھی فوج اور بحریہ کے مابین کسی اجتماع کے بغیر۔"

در اصل ناروے کی شکست کی یہی وجوہات تھیں۔ وزیر اعظم پر حزب الاختلاف کی اس تنقید کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناروے کی شکست کے ساتھ ہی مسٹر چیمبرلین نے استعفاء دیدیا اور مسٹر چرچل نے حکومت سنبھالی۔ اب آگے دیکھئے کیا ہونے والا ہے۔

محمد جلال الدین جعفر

حالاتِ حاضرہ

ترکی اور شام کا معاہدہ:۔ اپریل کے مہینے میں ترکی اور شام کے مابین ایک "معاہدہ حسن جوار" طے پایا یہ اصل میں ایک پچھلے معاہدہ کی تجدید ہے جس کی مدت اپریل میں ختم ہو رہی تھی نئے معاہدے کے ساتھ بہت سے اہم تہہ ناموں کی بھی تکمیل ہوئی۔ اِس معاہدے کی رو سے اسکندرونہ کو ترکی کا ایک جز تسلیم کیا گیا ہے اور شام میں جو ترک مقیم ہیں ان کو شام کے ملکی حقوق عطا کئے گئے ہیں۔

یہ معاہدہ حربی نقطہ نظر سے بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس کی رو سے ہر ملک کو فوجی ضرورت کے لئے دوسرے کی اراضی کے استعمال کا حق مل گیا ہے۔

عراق کی نئی وزارت:۔ نوری پاشا السعید کی وزارت نے اپریل کے پہلے ہفتہ میں استعفیٰ دے دیا۔ اور رشید عالی بک گیلانی رئیس دیوان شاہی کی صدارت میں دوسری کابینہ بن گئی۔ رشید عالی بک پہلے بھی ایک مرتبہ وزیر اعظم رہ چکے ہیں۔ اس نئی وزارت کی دو خصوصیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس میں عراقی پارلیمان کی تمام سیاسی پارٹیاں شریک ہیں اور دوسری یہ کہ نئے وزیروں میں چار سابق وزیر اعظم بھی ہیں۔

میثاق سعد آباد:۔ کہا جاتا ہے کہ میثاق سعد آباد کو ایک فوجی معاہدے کی شکل میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایران اور ترکی اس کے اصل محرک ہیں۔ لیکن افغانستان روس اور جرمنی کے دباؤ کی وجہ اس میں شرکت کرنے سے پس وپیش کر رہا ہے۔ پھر بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان اتحادیوں کی طرف مائل ہے اور وہ ترکی اور ایران کی رائے سے اختلاف نہیں کرے گا۔

ترکی کمانڈران چیف کی تقریر:۔ ابھی چند روز ہوئے مارشل فوزی چقماق کمانڈران چیف افواج ترکی نے دیار بکر کے فوجی معائنہ کے بعد ایک اہم تقریر کی۔ انھوں نے پہلے تو ترکوں کی تاریخی شجاعت اور موجودہ عسکریت کا ذکر کیا پھر قبائلی نوجوانوں کی فوجی تربیت اور جنگی قابلیت کی بہت ستائش کی اور کہا "میرے دل کو اس سے بڑی تقویت اور تسلی ہوتی ہے کہ میری قوم کا بچہ بچہ وطن کی حفاظت کیلئے تیار ہے۔ جو لوگ ہم کو مرد بیمار کا خطاب دیتے تھے اُن کو یہ معلوم ہو جانا چاہئیے کہ اَب دنیائے اسلام ایک بے جان جسد نہیں بلکہ ایک زبردست فاعل طاقت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہم کسی پر غاصبانہ دست برد کو پسند نہیں کرتے اور نہ کسی سے لڑنا بھڑنا چاہتے ہیں لیکن اگر ہم پر حملہ کیا گیا تو چین سے لیکر مراقش تک ایک آگ پھیل جائے گی اور یہ ہمارے دشمنوں کو خاک سیاہ کر دے گی۔ میثاق سعد آباد کے شریک تو ایک دوسرے کی امداد کے پابند ہیں لیکن ان کے علاوہ اور بھی ایسی اسلامی طاقتیں ہیں جو بوقت ضرورت اسلام کی پشت پناہ بن کر کھڑی ہو جائیں گی۔ ہندوستان میں سلطنت حیدرآباد، مشرق اقصیٰ میں شام وجمہوریہ آذربائیجان واقع ہیں جو اسلام کے نام پر ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہیں۔ شمالی افریقہ میں بھی بیداری پیدا ہوگئی ہے اور نہ صرف طرابلس، الغرب اور مراقش بلکہ تیونس بلغاریہ اور حبش کے

مسلمانوں میں بھی روح عمل کام کر رہی ہے۔ "

ایران اور روس:- ایران اور روس کے مابین ایک معاہدہ تجارت وجہاز رانی طے پا گیا۔ چونکہ ایران او رسوویٹ کی مشترک سرحد دو ہزار کیلومیٹر سے زیادہ ہے، اس لئے دونوں مملکتوں کو ایک عرصہ سے باہمی امداد وتعاون کی خواہش تھی اور دونوں کو یہ فکر تھی کہ دوستانہ تعلقات اور معاشی ترقی کے وسائل میں وسعت پیدا کی جائے۔ اس نئے معاہدہ کی رو سے دونوں مملکتوں کے معاشی تعلقات ٹھوس بنیاد پر قائم ہو گئے ہیں۔

رومانیہ کی حکومت:- ۱۱ مئی کو رومانیہ کی حکومت نے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن وزیر اعظم ایم ٹاٹا رس کیو نے شاہ کیرول کے ایما پر نئی حکومت قائم کر لی۔ یہ نئی حکومت صرف چند تبدیلیوں کے بعد قائم ہوئی ہے اور اس میں وزیر خارجہ ایم گافنسو بھی شامل ہیں نئی حکومت بالکل غیر جانبداری کے مسلک پر قائم ہے۔

اطالیہ:- اطالوی بحری بیڑوں نے ۱۵۔ اپریل سے بحیرۂ روم میں موسم بہار کی مشقیں شروع کر دیں، غالباً اس کارروائی کا مقصد جرمنی کو مدد دینا اور اتحادیوں کو متنبہ کرنا تھا۔ چنانچہ سینیر گیاڈا نے ایک مضمون میں فرانس پر الزام لگایا ہے کہ وہ معاہدہ ورسائے کے بعد سے اطالیہ کے خلاف مسلک پر کاربند ہے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ بحیرۂ روم پر اطالیہ کا حق ہے اور کوئی دوسری قوم اس حق سے استفادہ نہیں کر سکتی۔

چند دنوں بعد اطالیہ نے جزائر ڈوڈے کینز میں اپنی بحری اور ہوائی طاقتیں جمع کر لیں اور یوگوسلاویہ سے پرخاش شروع کر دی چنانچہ اب یوگوسلاویہ بہت خطرہ میں ہے۔ نیز سینیر مسولینی نے فرانس سے بھی حسب ذیل مطالبے کر دیے ہیں اور ان کی تکمیل کو وہ "فاچستی وقار" کے لئے بہت ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) فرانسیسی بندرگاہ جبوتی پر مساوی نگرانی (۲) نہر سوئز کے بورڈ میں دو نشستیں اور (۳) تیونس میں اطالوی حقوق کی وسعت۔

ڈنمارک اور ناروے:- جرمنی نے ۹ اپریل کو ڈنمارک اور ناروے پر حملہ کر دیا ڈنمارک نے بارہ گھنٹے کے اندر جرمنی کی ماتحتی قبول کر لی۔ ناروے پر بھی بالکل اچانک حملہ ہوا تھا۔ جس وقت جرمن فوجیں ڈنمارک اور جنوبی ناروے میں داخل ہوئیں اس وقت جرمن سپاہیوں کو لے کر ناروک کی بندرگاہ میں پہنچ گئے جو ناروے کے بالکل شمال میں ہے اور ناروے کی تمام بندرگاہوں پر ایک ہی وقت میں قبضہ کر لیا۔ ناروے کی حکومت دارالسلطنت آسلو سے شمال کی طرف بھاگنے پر مجبور ہوئی۔ ایک منظم فوج کا مقابلہ قزاقانہ جنگ سے کیا جانے لگا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ناروے ہٹلر کی ہوس ملک گیری کا شکار ہو گیا۔

ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ:- جرمنی نے ۱۰ مئی کو ہالینڈ، بلجیم اور لکسمبرگ تینوں پر حملہ کر دیا۔ ہٹلر نے حسب عادت اس تازہ اقدام کا الزام بھی اتحادیوں اور ہالینڈ اور بلجیم ہی کے سر دں پر رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ ان ملکوں کی غیر جانبداری برائے نام ہے اور وہ اتحادیوں کے ساتھ مل گئے ہیں۔ اس کے ثبوت میں

ہٹلر نے مثلاً بلجیم کا طرز عمل پیش کیا کہ اس نے اپنی جرمنی سرحد کو مستحکم کرلیا اور فرانسیسی سرحد کو غیر محفوظ چھوڑ دیا۔ بہرحال چند بہانے تراش کر ہٹلر نے وسط یورپ کی ان کمزور مملکتوں کو اپنی ہوس ملک گیری کا شکار بنایا۔

ہالینڈ اور بلجیم نے اتحادیوں سے مدد طلب کی اس نئے محاذ جنگ کی غیر معمولی اہمیت کے مدنظر اتحادی ان چھوٹی مملکتوں کی مدد کو دوڑے لیکن "Blitzkrieg" ایک ایسا حربہ ہے کہ مدافعت کرنے والے سنبھل نہ سکے اور ۱۵ مئی کو ہالینڈ نے اطاعت قبول کرلی۔ ہالینڈ کے سپہ سالار جنرل ونکلمان نے فوج کے نام احکام نشر کرتے ہوئے کہا کہ اب ہالینڈ کی سلامتی اسی میں ہے کہ ہتھیار ڈال دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چند ہی روز میں ہالینڈ پر جرمنی کا مکمل قبضہ ہوگیا اور ہٹلر نے اپنی طرف سے ہالینڈ کا کمشنر بھی مقرر کر دیا۔ بلجیم میں ابھی جنگ جاری ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ختم ہو رہا ہے۔

فرانس پر حملہ:۔ مئی کے تیسرے ہفتہ میں جرمن فوجیں مثر ینو لائن کے ایک حصے کو توڑ کر شمالی فرانس میں داخل ہوگئیں اور کہا جاتا ہے کہ وہ آگے بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس نازک صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے فرانس کی حکومت میں تبدیلی ہوگئی ہے۔ ایم۔ رینا ڈ تو حسب سابق صدر اعظم ہیں اور ساتھ ہی وزیر جنگ بھی۔ مارشل پے تیان کو نائب صدر اعظم بنایا گیا ہے۔ ایم۔ دلادیر وزیر خارجہ، ایم۔ ماندل وزیر داخلیہ، ایم۔ رالن وزیر نوآبادیات اور ایم۔ لیون باری وزیر تجارت مقرر ہوئے ہیں۔

مسٹر چیمبرلین کا مسلک:۔ ناروے کے بعد انگلستان میں حکومت پر سخت تنقیدیں کی گئیں۔ خصوصاً مسٹر لائیڈ جارج نے مسٹر چیمبرلین کے مسلک کی بڑی مذمت کی۔ جنگ کے بارے میں دارالعوام میں ایک معرکہ کا مباحثہ بھی ہوا۔ اس میں حزب الاختلاف کے اراکین کے علاوہ خود حکومتی جماعت کے اکثر افراد نے مسٹر چیمبر کے مسلک سے ناراضگی ظاہر کی اور حکومت پر بہت کچھ ملامت کی مسٹر چیمبرلین، چرچل اور لارڈ ہیلی فکس نے تقریریں کیں لیکن اس سے مسٹر ایٹلی اور سر آرچی بالڈ سنکلیر وغیرہ کی تشفی نہ ہوسکی۔ مسٹر ہور بلیشا سابق وزیر جنگ اور مسٹر المیری سابق وزیر خارجہ جیسے حکومتی جماعت کے افراد نے بھی حکومت کی سخت مخالفت کی۔ غرض قوم نے حکومت کے موجودہ مسلک کو پسند نہیں کیا اور حکومت میں تبدیلی پر زور دیا جانے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۱ مئی کو مسٹر چیمبرلین مستعفی ہوگئے۔

انگلستان کی نئی حکومت:۔ مسٹر چیمبرلین کی جگہ مسٹر چرچل نے لی۔ یہ اکثریتی جماعت ہی کے رکن ہیں اور چونکہ انھیں احرار اور عمال کی بھی تائید حاصل ہوگئی ہے، ان کی حکومت سے بہت سی توقعات ہیں۔ اب برطانیہ کی قومی کابینہ بن گئی ہے جس میں عمالی لیڈر مسٹر ایٹلی اور احراری لیڈر سر آرچی بالڈ سنکلیر بھی شامل ہیں۔ اب کابینہ جنگ حسب ذیل افراد پر مشتمل ہے:۔

وزیر اعظم اور وزیر مدافعت ۔ مسٹر ونسٹن چرچل

لارڈ پریوی سیل ۔ مسٹر سی۔ آر۔ ایٹلی

لارڈ پریسیڈنٹ آف دی کونسل مسٹر نویل چیمبرلین

وزیر خارجہ - لارڈ ہیلی فیاکس
وزیر بلا قلمدان - مسٹر آرتھر گرین وڈ
وزیر اعظم اور کابینہ جنگ کے دیگر اراکین نے ۱۲ مئی کو شاہ انگلینڈ کے سامنے حلف اٹھایا بعد میں ذیل کے اشخاص کا تقرر بھی ہوا مگر یہ کابینہ جنگ میں شریک نہیں ہیں۔
سر جان سائمن - لارڈ چانسلر
سر چارلس کنگس لے وڈ - چانسلر آف دی اکس چیکر
سر جان انڈرسن - ہوم سکریٹری
مسٹر ہربرٹ ارلین - وزیر سپلائی
مسٹر ڈف کوپر - وزیر معلومات
سر اینڈ رو ڈنکن - صدر بورڈ آف ٹریڈ
مسٹر ایل۔ یس۔ المیری - سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا
وغیرہ

ح۔ ص

مولوی سید محمد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج کی کتابیں

گلشن گفتار:- شعرائے اردو کا قدیم ترین تذکرہ جس کو مولوی سید محمد صاحب ام اے نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے صفحات ۲، قیمت ۱۲ار

مثنویات میر:- میر تقی میر کی تمام مثنویوں کو ترتیب و تصحیح کے ساتھ شایع کیا گیا ہے صفحات ۲۴۴ قیمت عا

ابتدائی فارسی:- براہ راست طریقۂ تعلیم کے مطابق فارسی کی صرف و نحو۔ قیمت ۱۲ار آنے۔

یادگار ولی:- اردو شاعری کے ابو الآباء ولی اورنگ آبادی کے جشن دو صد سالہ کے مقالوں کو نہایت سلیقہ سے شایع کیا گیا ہے متعدد نایاب تصویریں اور ولی کے کلام کا انتخاب بھی شامل ہے۔ صفحات ۲۷۲ قیمت عا۔

ارباب نثر اردو:- فورٹ ولیم کالج کے نثر نویسوں کا محققانہ تذکرہ اردو نثر کے ارتقاء کی مکمل تاریخ قیمت مجلد عا روپے۔

پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری کی کتابیں

اردو مثنوی کا ارتقاء:- مثنوی اردو شاعری کی سب سے زیادہ اہم صنف ہے۔ اور اب تک اس کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی تھی۔ پروفیسر سروری صاحب نے کئی سال کی محنت اور تحقیق کے بعد یہ کتاب مرتب کی ہے۔ تاریخ ادب اردو سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے اس کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا۔ قیمت عا۔

دنیائے افسانہ:- افسانہ نگاری کے اصول اور مبادی پر سیر حاصل بحثیں۔ اردو افسانہ نگاری کی تاریخ پر مستند تصنیف یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ دوبارہ شایع کرنا پڑا۔ صفحات ۲۲۰ قیمت صرف عہ

کردار اور افسانہ:- افسانوں میں کردار پیدا کرنے کے اصول ان کی اہمیت نوعیت وغیرہ پر اردو کی پہلی اور واحد کتاب۔ صفحات ۲۳۲ قیمت عہ

تاثراتِ سفرِ یورپ

۲۹ راگست تا ۱۹ ر ستمبر

گو کانگریس کا افتتاح ۲۹ راگست کو ہونے والا تھا لیکن چونکہ میرے پاس اطلاع آچکی تھی کہ مجھے مشرق اقصیٰ کے ماموریہ کا رکن بنایا گیا ہے اور اس کا جلسہ ۲۷ راگست کو ہونے والا تھا اس لیے اسی تاریخ کو صبح کے وقت برلیسٹن برگ سے زیورخ چل دیا اور زیورخ میں ہوٹل نیٹون میں ٹھیرا۔ یورپ کی عام طور پر اور سوئستان کی خصوصاً تنظیم کی یہ کیفیت ہے کہ یورپ کی روانگی سے پہلے حیدرآباد ہی میں زیورخ کے ہوٹلوں کی مکمل فہرست مل گئی تھی جس میں نہایت تفصیل سے کمروں کی کیفیت، کرایہ، ہوٹلوں کا محل وقوع، کھانے کے اوقات غرض ہر ایک چیز لکھی ہوئی تھی، اور خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ جلد از جلد ہوٹل مطلوبہ کی نشان دہی کی جائے۔ غرض ہوٹل پہونچتے ہی مطلق کوئی دقت نہیں ہوئی اس لئے کہ میرے لئے وہاں ایک کمرہ مخصوص تھا۔ دوسری پر لطف بات یہ ہے کہ جب میں پیرس میں تھا اسی زمانے میں مجھے مشرق اقصیٰ کے ماموریہ کی رکنیت کی اطلاع ہوئی تھی، اور اس اطلاع کے ساتھ اس عظیم الشان عمارت کا مکمل نقشہ بھی بھیج دیا گیا تھا جس میں ماموریہ اور کانگریس کے اجلاس ہونے والے تھے اس نقشے میں ہر کمرے پر نمبر پڑے ہوئے تھے اور یہ لکھا ہوا تھا کہ کانگرس کے کونسے شعبہ کا کس نمبر کے کمرے میں اجلاس ہوگا کانگریس کے جملہ اجلاس سوئستان کی اعلیٰ فنی تعلیم گاہ (Technische Hochschule) میں ہونے والے تھے۔ کہنے کو تو یہ ایک "اسکول" ہے لیکن اس کی حیثیت ایک فنی جامعہ کی ہے۔ جس میں تمام ملک کے ۰۰ ۷ اطلبہ تعلیم پاتے ہیں اور سنہ ۱۹۲۳ء میں یہاں سے ۰۰ ۱ اطلبہ نے فنی طیلسان حاصل کیا تھا۔ یہ اس ملک کی تعلیم گاہ ہے جس کی آبادی نصف کروڑ بھی نہیں اور جس کا رقبہ ہمارے

زیورخ اور بین الاقوامی تاریخی کانگریس ۱۰

تین اضلاع کے برابر ہوگا۔

مشرق اقصیٰ کے ماموریہ کا اجلاس ۳ بجے ہوا۔ جس طرح انجمن اقوام مختلف ماموریوں میں منقسم تھی اسی طرح بین الاقوامی کانگریس بھی متعدد ماموریوں میں منقسم ہے اور ہر ماموریہ کا مقصد یہ ہے کہ کسی خاص شعبہ تاریخ میں جو تحقیقات ہو رہی ہیں۔ اس میں باہمی ربط پیدا کیا جائے اور تحقیقات کو آگے بڑھایا جائے۔ اس ماموریہ "مشرق اقصیٰ" میں بالفعل ہندوستان شامل کر لیا گیا ہے ماموریہ کے اس جلسے کے لئے میں نے کئی تحریکیں اس کی معتمد ڈاکٹر اولیویا میک لاغلن صاحبہ کے پاس بھیج دی تھیں۔ جن میں سے ایک یہ تھی کہ اس وقت تک مغربی مورخوں نے اسلامی تاریخ اور اسلامی روایات کا غلط اندازہ کیا ہے اور بجائے اس کے اسلام کو ایک عالمگیر تحریک تصور کیا جائے اسے محض تاریخ عرب یا تاریخ ایران کا ایک عہد سمجھا جاتا ہے۔ اس پر بہت بحث ہوئی اور تقریباً سب ہی اراکین نے حصہ لیا جن میں سے ڈاکٹر کروم (Krom) ولندستان، ڈاکٹر ٹیمپرلے (Temperley) انگلستان، مس میک لاغلن (Mechaerlan) اور فادر ہیراس (Father Heras) ممتاز تھے۔ ایک قرارداد منظور ہوئی کہ جو ممالک اس ماموریہ سے متعلق ہیں یعنی مشرق اقصیٰ اور ہندوستان، اس میں اسلام کے جو تمدنی اثرات پڑے ہیں انھیں کافی اہمیت دی جائے اور کانگریس کی طرف سے جو الہیات تاریخی (Historical Bibliography) ہر سال ترتیب دی جاتی ہے اس میں اسلامی اثرات کا خاص عنوان قائم کیا جائے۔ میری تحریک پر یہ بھی قرار پایا کہ سالنامے میں غیر دینی

زبانوں کی کتابوں کا اندراج بھی کیا جائے اور علاوہ اصلی رسم الخط کے ان کتابوں کے نام لاطینی رسم الخط میں بھی لکھے جایا کریں۔

شام کے وقت مجھے صدر کانگرس ڈاکٹر ٹیمبرلے کا خط ملا جس میں مجلس عاملہ کانگریس کی شعبۂ ہفتم (غیر یورپی ممالک کی تاریخ) کی صدارت کروں۔ دفتر کانگریس سے کانگرس کے متعلق جملہ کاغذات مل گئے۔ یعنی تمام ارکان کی فہرست مع زیورخ کے پتے کے، کانگریس کے جملہ شعبہ جات کا پورا پروگرام، نامۂ زیورخ کی کتاب رہنمائی اور ملخصات مقالہ جات کی کتاب جو دو جلدوں میں ہے اور مجموعی حجم ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ تمام کاغذات ایک بڑے لفافے میں نہایت سلیقے سے بند تھے۔ دفتر میں جو رضاکار اور رضاکارنیاں کام کر رہی تھیں ان میں سے اکثر تین زبانیں یعنی جرمن، فرانسیسی، اطالوی بے تکلف بولتی تھیں اور ہر رکن سے انتہائی خلق سے پیش آتی تھیں۔ ایک سے میں نے کہا کہ رضاکاروں کو تو بڑی مصروفیت ہوگی تو مسکراتے ہوئے جواب ملا کہ زیادہ تر مصروفیت تو ختم ہو چکی اب تو آرام کا زمانہ ہے!

۲۸ راگست کو کانگریس کے افتتاح کا دن تھا۔ تمام ارکان شہر کے گرجا سینٹ پیٹر میں جمع ہوئے جو تیرھویں صدی عیسوی کا بنا ہوا ہے۔ اس سے قبل یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ سوئستان کے پروٹسٹنٹ گرجاؤں میں اغلباً اسلامی اثرات کی وجہ سے کسی قسم کی تصاویر یا بت نہیں ہوتے نہ کھڑکیوں میں کسی قسم کی رنگین تصاویر ہوتی ہیں۔ یہی کیفیت اس گرجا کی بھی تھی جس میں سوائے ایک ارغن کے اور کوئی "گرجائیت" نظر نہ آتی تھی۔ کانگریس کا افتتاح خدا کی حمد سے ہوا جس کی ابتدا ہوتے ہی جملہ حاضرین سرو قد کھڑے ہو گئے اور جب تک ارغن پر اس کے نغمے بجتے رہے سب کھڑے رہے۔ سب سے پہلے پروفیسر ناجو تنزا (Nabholz) نے جو سوئستانی انتظامی کمیٹی کے صدر تھے، سوئستان کی تینوں سرکاری زبانوں یعنی جرمن، فرانسیسی اور اطالوی میں خوش آمدید کہا اس کے بعد ہیراپٹر (Etter) نے جو ۱۹۳۹ء میں سوئستان کے صدر ہو گئے تھے۔ اور ۱۹۳۸ء میں وزیر داخلہ تھے، حکومت کی طرف سے جرمن میں تقریر کی، بعد ازاں صوبہ زیورخ کی حکومت کے صدر ڈاکٹر ہافنر (Haffner) نے سواگت کیا اور سوئستانی مجلس مدارس کے صدر ڈاکٹر روہن (Rohn) نے جرمن میں چند الفاظ اور ڈاکٹر ہاولڈ (Hawald) ریکٹر جامعۂ زیورخ نے تینوں سرکاری زبانوں میں ارکان کو خوش آمدید کہا اس کے بعد صدر کانگریس ڈاکٹر ٹیمبرلے نے اپنا ایڈریس پڑھا جس کے بعض حصے جرمن میں بعض فرانسیسی میں بعض اطالوی میں اور بعض انگریزی میں تھے۔ اپنے خطبے کے انگریزی حصے میں انھوں نے دو مرتبہ میرا نام لیا اور یہ کہ ہم کل ہند کے نمائندوں یعنی قادر ہیراس اور پروفیسر شروانی کو یہاں دیکھ کر نہایت مسرور ہیں اور میں بطور خاص ایک خالص ہندوستانی پروفیسر شروانی کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ ان کی تقریر کے آخر میں پھر خدا کی حمد گائی گئی اور جلسہ تقریباً ڈیڑھ بجے برخاست ہوا۔

رات کے وقت انجمن مورخین قدیم (Society of Antiquaries) کی طرف سے جامعہ کی عالی شان عمارت میں ایک عشائیہ ترتیب دیا گیا تھا جس میں تقریباً تمام مندوبین شریک تھے۔ انجمن کے صدر ڈاکٹر لارگیادر (Largiader) نے جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں مندوبوں کا خیر مقدم کیا جس کا جواب مہمانوں کی طرف سے

جامعۂ گوٹنگین کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر برانڈی (Brandt) نے دیا۔ معلوم ہوا کہ کانگریس میں دنیا کی ۵۰ قوموں کی طرف سے ۰۰۰ نمائندے آئے ہیں اور ہندوستان کی جامعات کلکتہ، بمبئی، ناگپور، دہلی، لاہور اور عثمانیہ نے اپنے نمائندے بھیجے ہیں جن میں سے بمبئی اور عثمانیہ کے نمایندوں کو کل ہند کی طرف سے مندوب ہونے کا فخر حاصل ہے۔ میں نے ہر مجمع میں اس بات کی کوشش کی کہ جہاں تک ہو سکے زیادہ سے زیادہ مندوبوں سے ذاتی تعلقات پیدا کروں تاکہ میرے ذریعے سے ہماری سلطنت ابد مدت حیدرآباد اور ہماری جامعہ عثمانیہ کے متعلق لوگوں کو زیادہ واقفیت حاصل ہو۔ اس خاص حیثیت سے میں جامعہ ویلز کے پروفیسر ٹرے ہارن (Treharne) لاہور کے پروفیسر وارڈ (Ward) اور جامعۂ ڈمریو (امریکہ) کے پروفیسر ٹریکیٹ (Trickett) سے ملا۔ موخر الذکر سے معلوم ہوا کہ شہر نیویارک میں پانچ جامعات ہیں، جن میں سے ایک میں ۳۶ ہزار، دوسرے میں ۱۳ ہزار اور باقی تین میں اوسطاً ۵، ۵ ہزار طلبہ پڑھتے ہیں، گویا صرف شہر نیویارک میں تقریباً ساٹھ ہزار طلبہ جامعی تعلیم پا رہے ہیں!! ہمارے حیدرآباد میں صرف ڈیڑھ دو ہزار طلبہ جامعہ میں شریک ہیں اور اس پر بھی ابھی سے بے روزگاری کا غلغلہ ہے! ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

۲۹ اگست کو کانگریس کا پہلا کاروباری دن تھا اور آج زیادہ تر وہی مقالے پڑھے گئے جنہیں زیادہ اہم یا زیادہ نزاعی سمجھا گیا۔ میرا مقالہ صبح کے وقت دوسرا تھا۔ چونکہ اس کا موضوع "اسلامی سیاسی فلسفہ اور اس کی حیثیت نظام سیاسیات میں" تھا اس لئے اسے شعبہ ۱۲ ("خیالات، فلسفہ، فنون لطیفہ اور ادبیات کی تاریخ") میں رکھا گیا۔ اس شعبہ کی صدارت ڈاکٹر کرن (Kern) نے کی جو سوئٹسان کے ذخیرۂ کاغذات سرکاری کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ مجھ سے پہلے صرف ایک صاحب نے اور مقالہ پڑھا جس کے لکھنے والے ڈاکٹر زیلنسکی (Zielinski) پولستان کے بڑے ماہرین تاریخ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ مجھے اپنا مقالہ پڑھنے میں چالیس منٹ لگے۔ اس کے بعد سوالات کی بوچھار ہوئی۔ مباحثے میں حسب ذیل علماء نے حصہ لیا۔

ڈاکٹر گھوشل (Ghoshal) (کلکتہ)؛ پروفیسر لامونٹے Lamonte (سنسناٹی، امریکہ)؛ ڈاکٹر سپیر Spear (دہلی)؛ پروفیسر بوکھورسٹ Bokhorst (پریٹوریا، جنوبی افریقہ)؛ پروفیسر وارڈ (لاہور)؛ ڈاکٹر ابراہیم حسن (قاہرہ)؛ ڈاکٹر وڈمار Wadmar (سوئٹسان)۔

خدا نے میری مدد کی اور ایک ایک سوال کا حسب دلخواہ جواب دیا۔ مباحثے کے اختتام پر بہت سے مندوب میرے پاس آئے اور میرا مقالہ دیکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔

شام کے وقت زوریخ کا کتب خانہ عامہ دیکھنے گیا جہاں اس زمانے میں مشہور مذہبی مصلح زوئنگلی (Zwingli) کے آثار کی نمائش ہو رہی تھی۔ اس نمائش میں حسب ذیل اشیاء خاص طور پر دلچسپ نظر آئیں۔ زوئنگلی کے خطوط مارٹن لوتھر کے نام اور کرینمر اور لیڈی جین گرے کے خطوط اس کے نام، اس کے علاوہ زوئنگلی کی ہمعصر تصاویر، اس کی نشان کی ہوئی کتابیں، کپڑے وغیرہ بھی مرکز توجہ بنے ہوئے تھے۔ زوئنگلی کی شخصیت ہمارے لئے دلچسپ ہے کہ یہی وہ شخص ہے جس نے اسلامی توحید سے متاثر ہو کر سوئٹسان کے ایک بڑے حصے کو مسیح پرستی، بت پرستی اور آثار پرستی سے نجات دی تھی۔

(باقی آئندہ) ہارون خاں شروانی

نئی کتابیں

۱۔ مطالعۂ حافظ (حافظ کے کلام پر تبصرہ) از احتشام الدین ایم اے حجم ۱۶۰ صفحات قیمت عہ/

۲۔ نظارے (افسانے) از کرشن چندر ایم اے حجم ۲۵۰ صفحات قیمت عہ۔

۳۔ جذباتِ وفاداری (دکن کے وفاداروں کا تذکرہ) از مولوی شمس الدین صدیقی وظیفہ یاب منصف حجم ۶۴ صفحات۔

۴۔ عہدہ داروں کا آئین (مجموعہ مضامین) از مولوی شمس الدین وظیفہ یاب منصف حجم ۱۰۴ صفحات۔

۵۔ بنگاری بابو اور دیگر افسانے (سائنس کے مسائل افسانوں کے لباس میں) از حبیب احمد فاروقی حجم ۵۸ صفحات قیمت ۸/

۶۔ مقاصد الاسلام حصہ اول دوسرا ایڈیشن (اخلاق و تمدن پر تبصرہ) از نواب فضیلت جنگ مرحوم حجم ۱۵۰ صفحات قیمت ۱۴/

۷۔ وطن دار (رہنمائے پٹیل پٹواری) از کاشی ناتھ راؤ وکیل حجم ۸۶ صفحات۔

۸۔ مضمون نگاری مرتبہ اخلاق دہلوی حجم ۶۴ صفحات قیمت ۱۰/

۹۔ مبادی اللغات (اردو کا مختصر لغت) از فیض محمد بی اے حجم ۴۹۶ صفحات قیمت عہ/

۱۰۔ نغمۂ عندلیب (افسانہ) از لالہ گوبند سنگھ حجم ۲۳۰ صفحات

۱۱۔ کلام رونق از منشی پیارے لال رونق حجم ۱۰۷ صفحات قیمت ۱۲/

۱۲۔ حیات سلطانی (سلطان جہاں بیگم مرحومہ بیگم بھوپال کے حالات) از محمد امین زبیری

۱۳۔ سوشلزم کی بنیادی حقیقت از سید شمسی ایم اے حجم ۳۰۴ صفحات قیمت عا/

۱۴۔ رہنمائے صحت (صحت کے اصول) از مہانند ایڈیٹر رسالہ کرانتی لاہور حجم ۶۰۰ صفحات قیمت عا/

۱۵۔ علاج الامراض دوسرا ایڈیشن (حکیم محمد شریف خاں مرحوم کی بیاض کا ترجمہ) حجم ۹۵۶ صفحات قیمت ؏

۱۶۔ مجربات سلطانی حصہ سوم (مجرب نسخے) از حکیم محمد یار خاں حجم ۲۴۰ صفحات قیمت عا/

۱۷۔ معمولات و مجربات با تصویر (مشہور اطبا کے حالات اور ان کے مجربات) از حکیم محمد شریف حجم ۴۴ صفحات قیمت ؏

۱۸۔ معمولات طب (مجرب نسخے) از حکیم عبدالرحیم حجم ۱۳۰ صفحات قیمت عہ

۱۹۔ رہنمائے کلوروفارم (کلوروفارم اور ایتھر کا استعمال) از حکیم خواجہ رضوان احمد حجم ۴۰۰ صفحات قیمت لے

۲۰۔ طبیب اطفال (بچوں کی بیماریوں کا علاج) از حکیم عبدالحفیظ حجم ۲۱۶ صفحات قیمت عہ/

۲۱۔ مغلوں کا مد و جزر از خواجہ محمد شفیع حجم ۶۸ صفحات قیمت ۶/

۲۲۔ متاع حمید (معاشی اور تاریخی مضامین) از ابوالمنصور حمید مرحوم حجم ۱۶۲ صفحات

۲۳۔ آمد و رفت رنگ از فیض محمد بی اے حجم ۸۴ صفحات قیمت ۶/

۲۴۔ پانی کی کہانی خود اس کی زبانی از فیض محمد بی اے حجم ۵۲ صفحات قیمت ۶/

۲۵۔ لیڈر (ڈراما) از فضل حق قریشی دہلوی حجم ۸۴ صفحات قیمت ۳/

۲۶۔ سیرت مہدی (مرزا غلام احمد قادیانی کی سوانح عمری) از مرزا بشیر احمد ایم اے حجم ۳۰۸ صفحات

۲۷۔ مہاراجہ کرشن اور ان کی تعلیم (ساتواں ایڈیشن) از لالہ لاجپت رائے حجم ۲۶۸ صفحات

مرزا سیف علیخاں

باتیں

"کیا مجھے جگانے آئے تھے۔ میں تو بہت دیر سے جگ رہی ہوں۔ تم تو ایسے آئے جیسے کوئی چور۔ رات کو باہر نہ نکل سکے اور پکڑے جانے کے خوف سے صبح ہوتے ہی سامنے آجائے اور اپنی خاموشی سے کچھ ایسا اظہار کرے "اب جو سزا آپ تجویز کریں، میں حاضر ہوں"

"جی ہاں اب حاضر ہوں، جو سزا آپ تجویز کریں"

"سزا — اچھا، آئندہ ایسی باتیں نہ ہوں گی۔ اتفاق تو ہم اس لئے آزاد ہیں کہ وہ دورہ پر گئے ہوئے ہیں اور ان کی ماں اپنی اک بیٹی کے یہاں گئی ہیں ورنہ تم نے تو کوئی کسر اپنی محبت کو رسوائے عالم کرنے میں اٹھا نہیں رکھی — محبت، محبت اس لفظ کو سنتے سنتے ہمارے تو کان پک گئے یہ تو بیکاروں کا شغل ہے تم کیوں اپنے وقت کو اس بے سرے راگ میں رائگاں کرو، کچھ کام کرو کام اور بیکار باتیں بنانا ختم۔"

"لیکن محبت ہی کا جذبہ جدوجہد کی تحریک کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے لیکن جب محبت کا کوئی صلہ نہ مل پائے تو اس کی طرف راغب ہی نہ ہونا چاہئے۔"

"رغبت اور چاہت کا سوال اپنے بس کی بات تو نہیں"

"لیکن اک جوان مرد کو اتنا بے بس و لاچار تو نہیں ہونا چاہیئے۔"

"ابھرنے کی برابر کوشش کر رہا ہوں لیکن اگر اک گرتے ہوئے سر کو حسین بازوؤں کا سہارا مل جاتا تو شاید اس کوشش میں کامیابی کی زیادہ توقع ہوتی۔"

"تم نے وقت کی قدر نہ جانی"

"وقت کی قدر — یہ لیجئے اس کا اظہار، یہ بندے نذر کو لایا ہوں، یہ آپ کے نیپی رخساروں کو چوما کریں گے"

"وہ نہیں ہیں تب ہی تو تم کو یہ کہنے کا موقع مل گیا، لاؤ رکھے لیتی ہوں لیکن اک شرط پر کہ اب تم ایسی باتیں نہیں کرو گے۔"

"کیسی باتیں"

"یہی پیار اور محبت کی باتیں۔ یہ ہم غریبوں سے سننا نہیں چاہتے اور نہ ہی نذریں قبول کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ ہم تمھارے لئے ایک ہی سزا تجویز کرتے ہیں کہ آئندہ تم ہم سے ملنے بھی نہ آیا کرو گے۔"

"اجازت"

"اچھا — ارے یہ تم ہاتھ جوڑے کیوں کھڑے ہو گیا ہمارا کوئی قصور کیا ہے تم نے؟"

"جی ہاں۔ جب سے آپ مسلمان ہوئی ہیں، میں کافر ہو گیا ہوں"

"کیا کسی ہندی لڑکی کو پسند کر لیا ہے۔ قومیت کا یہی اک نادر تصور تو تمھارے جدت پسند دماغ میں سما گیا ہے"

"اب اسی تصور کی تشکیل کرنے جا رہا ہوں"

"میں شریمان جی کو آشیرباد دیتی ہوں"

"شریمتی جی — تو سنئے !!"

بچوں سے

بہت سے بھائیوں اور بہنوں نے اپنی گرمائی تعطیلات کی مصروفیات سے ہمیں مطلع کیا ہے۔ اکثروں نے اردو کی خدمت کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ کئی بھائیوں نے اضلاع میں شعبہ طلبہ کے قیام کے لئے کوششیں کی ہیں یہ اپنے ارادوں میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ اگر آپ میں کا ہر ایک اسی قسم کی کوشش کرے تو یقیناً مستقبل بڑا شاندار رہے گا۔ اکثر طلبہ بڑی بےچینی سے شعبہ طلبہ کے دستور کا انتظار کر رہے تھے اب وہ مکمل ہوکر شایع ہوچکا ہے۔ اس میں نہ صرف شعبہ کے اغراض ومقاصد شرائط اور طریق کار ہیں بلکہ ادارہ کے قیام کی تاریخ اور معلومات اور طلبہ کے لئے ادارہ نے جو کتابیں شایع کی ہیں ان کی تفصیلات بھی شامل ہیں اس کا دیدہ زیب سرورق ہے اور خوبی یہ ہے کہ اسے شعبہ ہی کے ایک رکن نے تیار کیا ہے ہر خریدار کو مفت بھیجا جارہا ہے۔ جن کے پاس ابھی نہیں پہونچا ان کے پاس بھی جلد سے جلد بھیج دیا جائے گا۔ طلبہ یہ بھی کرسکتے ہیں کہ اپنے دوست احباب کی ایک مفصل فہرست ایسے طلبہ کی جنھیں ایسے کاموں سے دلچسپی ہے روانہ کریں ہم ان کے پاس بھی بھجوادیں گے سب رس کا ہر خریدار شعبہ کا رکن تصور کیا جائے گا بشرطیکہ وہ درخواست شرکت کی خانہ پری کرکے ہمارے پاس بھیج دے۔ چندہ تو برابر ہم کو وصول ہوتا ہے اور ہر وہ طالب علم جو ایک روپیہ (للعہ) سالانہ چندہ یا ایک روپیہ آٹھ آنے (اضلاع) سالانہ چندہ روانہ کرے اسے سب رس مفت دیا جائے گا۔ اس طرح سے آپ تمام خریداران سب رس درخواست کی خانہ پری کرکے روانہ فرمائیں اور شعبہ کے ہر کام میں برابر دلچسپی لیتے رہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ آئندہ اپنی زندگی میں ناکام رہیں۔

اس پرچہ میں زیادہ تر تاریخی مضامین چھپے ہیں اس لئے کہ آپ انھیں ان تعطیلات میں غور سے پڑھیں اور نہ صرف ہندوستان کی بلکہ غیر ممالک کی بھی تاریخ سے واقف رہیں۔ گزشتہ پرچہ میں "شبن کی شورش" جو مضمون چھپا تھا اس کی تعریف میں اکثروں نے خطوط لکھے ہیں۔ اسی قسم کے مضامین بھیجئے سب رس ضرور شایع کرے گا۔

گزشتہ پرچہ میں ایک سہل انعامی معمہ شایع ہوا تھا۔ بہت کافی تعداد میں حل وصول ہوئے جن میں سے مندرجہ ذیل بھائیوں اور بہنوں کے حل بالکل صحیح تھے۔ ۱۔ حبیب شمس ۲۔ حسن بانو فخرالدین ۳۔ عارف علی انصاری ۴۔ حبیبہ حبیب الرحمن ۵۔ عبدالجبار تاجر ۶۔ زہرہ ہاشم علیخاں ۷۔ حامد علیخاں یوسف زئی۔ مندرجہ ذیل دو نے قریب ترین صحیح حل روانہ کئے ہیں مگر یہ مقابلہ میں شامل نہیں کئے گئے (۱) راشد سلطانہ (۲) حمید خاں۔ قرعہ اندازی کے بعد حبیب شمس انعام اول کے اور عارف علی انصاری دوسرے انعام کے مستحق قرار پائے۔ یہ اپنی اپنی کتابیں دفتر سے حاصل کریں۔ معمہ کا صحیح حل "نذیر احمد" ہے۔ اس قسم کے انعامی معموں کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

معین الدین احمد انصاری

سلطنتِ آصفیہ کس طرح قایم ہوئی؟

بھائیو اور بہنو! کیا تم کو یہ معلوم ہے کہ آصفجاہی خاندان جس کے ہمارے موجودہ بادشاہ ساتویں آصفجاہ اور دسویں فرمانروا ہیں' حیدرآباد میں کب سے حکومت کر رہا ہے؟ اور اس سے پہلے کون حیدرآباد پر حکومت کرتا تھا؟ آؤ آج ہم تم کو یہ بتائیں کہ اس خاندان کے سب سے پہلے بادشاہ کون تھے اور ان سے پہلے کون حکومت کرتا تھا۔

سنہ ۱۷۰۷ء میں اعظم شاہ دہلی کا بادشاہ ہوا لیکن چونکہ اس کے تینوں بھائی اس کے خلاف تھے اس لئے تینوں نے اس سے لڑکر اس کو تخت سے اتار دیا۔ اس کو تخت سے اتارنے کے بعد یہ تینوں پھر آپس میں لڑنے لگے کہ کون بادشاہ ہو۔ اس لڑائی کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان میں سے ایک بھائی "جہاں دار شاہ" بادشاہ بنا۔ یہ اچھا بادشاہ تھا۔ اس لئے دو مشہور بھائی سید عبداللہ اور سید حسین نے اس کے بیٹے فرخ سیر کو جہاں دار شاہ کے خلاف کرکے ان دونوں کو لڑایا اور فرخ سیر کو تخت پر بٹھادیا۔

فرخ سیر نے سید عبداللہ کو قطب الملک کا خطاب دے کر وزیر اعظم بنادیا اور سید حسین کو امیرالامراء کا خطاب دے کر اپنی فوج کی سپہ سالاری دے دی اور ان کے علاوہ چونکہ چین قلیچ خاں نے بھی اسی کا ساتھ دیا تھا اس لئے ان کو بھی نظام الملک کا خطاب دے کر دکن کا صوبہ دار بنا دیا۔ لیکن امیرالامراء اور قطب الملک نواب نظام الملک بہادر کے اس لئے خلاف ہو گئے تھے کہ ان کو دکن جیسا بڑا صوبہ دیا گیا تھا۔ اس لئے دونوں نے بغیر بادشاہ کی اجازت کے حضرت آصفجاہ بہادر کو مرآباد کا صوبہ دار بنا دیا اور امیرالامراء خود دکن کا صوبہ دار بن گیا۔ اس پر فرخ سیر بہت برہم ہوا لیکن دونوں بھائیوں نے فرخ سیر سے استعفیٰ لے لیا اور اس کی بجائے شاہزادہ رفیع الدرجات کو بادشاہ بنادیا۔ ساتھ ہی نظام الملک آصفجاہ کو مالوے کا بھی صوبہ دار کر دیا۔ رفیع الدرجات کے انتقال کے بعد انھوں نے اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو شاہجہاں ثانی کا لقب دے کر تخت پر بٹھا دیا لیکن یہ بہت جلد مر گیا اور اس کے بعد جہاں دار شاہ کے بڑے بیٹے کو محمد شاہ کا خطاب دے کر دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔

جب محمد شاہ کی والدہ نے' جو ایک عقلمند ملکہ تھی' یہ دیکھا کہ بادشاہ کے پاس اب کچھ اختیار باقی نہیں رہا ہے اور اب وہ خود کچھ نہیں کر سکتا تو نواب نظام الملک آصفجاہ بہادر سے کہا کہ اب تم دکن کو چلے جاؤ اور اس کی حفاظت کرو۔ یہ سن کر نواب نظام الملک بہادر برہان پور کی طرف روانہ ہوئے' راستے میں امیرالامراء کے بھتیجے عالم علی خاں سے

لڑائی لڑی اور اس کو شکست دی۔ یہ خبر سن کر امیر الامراء محمد شاہ کو ساتھ لے کر دکن کی طرف چل دیا لیکن چونکہ بہت سے لوگ اس کے خلاف تھے اس لئے کچھ امیروں نے سازش کرکے اس کو مار ڈالا۔ جب نواب نظام الملک آصفجاہ بہادر نے دیکھا کہ سلطنت کا ایک دشمن مار ڈالا گیا تو فوراً محمد شاہ کے ساتھ وفاداری کا اعلان کر دیا اس کے بعد قطب الملک گرفتار کر لیا گیا اور محمد شاہ نے نواب نظام الملک بہادر کو وزیر اعظم بنا کر دہلی بلا لیا۔

جب نظام الملک آصفجاہ بہادر دہلی پہنچے تو وہاں کی رعایا کو حکومت کے خلاف پایا۔ اس پر انھوں نے دکن کی حالت درست کرنے کی خاطر شکار کے بہانے سے دکن کا رخ کیا۔ ۱۷۲۴ء میں دکن پہنچے اور آصفجاہی حکومت کی بنیاد ڈالی اور قلمرو دکن کے پہلے آصفجاہ بنے۔

اب تم کو یہ معلوم ہوگیا کہ ہماری سلطنت کی بنیاد حضرت نواب نظام الملک بہادر آصفجاہ اول نے ڈالی تھی۔ آؤ اب ہم سب مل کر دعا کریں کہ خداوند تعالیٰ سلطنت حیدرآباد کو ہمیشہ قایم و دائم رکھے اور ہمارے پیارے بادشاہ کو بھی بڑی عمر عطا فرمائے آمین

مصطفیٰ کمال خاں شروانی

بچّوں کیلئے قابل عمل باتیں

جو بات سچی ہو۔ وہ سناؤ — نہ دل میں اندیشہ۔ کوئی لاؤ
جو کھیلو بھائی بہن سے بچّو — کسی کو ہرگز نہ تم ستاؤ
ہے تندرستی ہزار نعمت — صحت کو جیسے بنے بچاؤ
نہ عیب جوئی کرو کسی کی — نہ جھوٹے الزام تم لگاؤ
بڑوں کی طاعت کیا کرو تم — ہوں چھوٹے الفت سے پیش آؤ
ملے گی دولت رہے گی راحت — جو پڑھنے لکھنے میں دل لگاؤ

ہے علم کی بس یہی نصیحت
کسی کے دل کو نہ تم دکھاؤ

محمد کریم الدین خاں علم

فرانسیسی بچّے

"آؤ سلیم!" ہم نے سلیم کو اپنے کمرے کی طرف لیجاتے ہوئے کہا "آج ہم تمھیں بڑی مزے دار باتیں سنائیں گے۔"

"کوئی کہانی یا قصہ؟" سلیم نے ہم سے دریافت کیا۔

"نہیں جی!" ہم نے جواب دیا۔

"خوش گپی؟" سلیم نے پھر سے پوچھا۔

"وہ بھی نہیں" ہم نے کہا۔ "بلکہ ہم تمھیں آج یورپ کی سیر کرائیں گے۔ اور یورپ کے ایک ایسے ملک میں لے جائیں گے جو دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت مقام مانا جاتا ہے"

اب سلیم سوچنے لگا کہ آخر وہ کونسا مقام ہے۔ ہم نے بھی اسے کچھ مہلت دی کہ وہ اپنے دماغ کا امتحان لے۔ جب دو تین منٹ گزر گئے اور سلیم نے کچھ نہ کہا تو ہمیں خیال ہوا کہ شائد وہ نہ جانتا ہو۔ اس لئے ہم نے اس سے پوچھا "کیوں! کبھی "فرانس" کا نام سنا ہے؟"

سلیم چونک پڑا اور کہنے لگا "ہاں سنا تو ہے لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ دنیا کا سب سے زیادہ خوبصورت مقام ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ ایک شہر نیویارک نامی، جو امریکہ میں ہے، سب سے زیادہ خوبصورت ہے؟" "ٹھیک ہے" ہم نے جواب دیا "لیکن وہ صرف بڑی بڑی خوبصورت عمارتوں کی حد تک ہے۔ وہاں انسان کی صناعی نے اپنے جوہر بتائے ہیں۔ تو یہاں قدرت کی صناعی اپنے بے مثل نمونے پیش کرتی ہے۔ تمھیں سچ بتاتے ہیں ہمیں فرانس سے زیادہ محبت، فرانسیسی بچوں سے ہے"۔

"اچھا!" سلیم نے متعجب ہو کر گویا اپنے آپ میں کہا "اس کی کوئی وجہ؟" "بات یہ ہے سلیم! ان کی زندگی ایسی پُرلطف ہوتی ہے کہ کچھ پوچھو نہیں" ہم کہنے لگے "بعض مرتبہ تو خیال ہوتا ہے کہ کاش! ہم وہیں پیدا ہوتے اس ملک کی آب وہوا، اور اس سے زیادہ وہاں کا ماحول ایسا ہوتا ہے کہ ہر بچہ ہمیشہ خوش و خرم نظر آتا ہے۔ فرانس میں بچوں کی تعلیم کی طرف بڑی توجہ دی جاتی ہے۔ تم نے کتابوں میں پڑھا ہوگا کہ فرانس میں ہزاروں مدارس اور کالج ہیں۔ صنعت و حرفت، زراعت و تجارت کی اعلیٰ تعلیم کے لئے لڑکوں کو بچپن ہی سے تیار کیا جاتا ہے۔ فرانس کے بعض بڑے بڑے شہروں میں دست کاری کے کئی مدارس قایم ہیں۔ یہاں لڑکوں کو ادب اور سائنس کے علاوہ دست کاری کی ایسی عمدہ تعلیم دی جاتی ہے کہ آگے چل کر یہی بچے بڑے بڑے صناع اور کاریگر نکلتے ہیں"۔

"یہاں تعلیم فرانسیسی زبان میں ہی دی جاتی ہے؟" سلیم نے ہم سے سوال کیا "ہاں! ہاں" ہم نے جواب دیا "بے شک انھیں تعلیم خود ان کی مادری زبان میں دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے کئی مدارس اور ہیں جہاں انگریزی ذریعۂ تعلیم ہے۔

سچ تو یہ ہے سلیم! کہ کسی ملک کی نوجوان نسل ہی پر اس
ملک کی ترقی اور فلاح و بہبود کا انحصار ہے۔ فرانس
کے متعلق تم کبھی کسی کتاب میں پڑھو تو معلوم ہوگا
کہ یہاں کی یہی ننھی ننھی مخلوق ترقی کرکے ملک کے
ذمہ دار عہدوں پر فائز ہوتی ہے۔"

"ان کی مدرسہ کی زندگی کیسی ہوتی ہے؟" سلیم نے
ہم سے دریافت کیا" بڑی مزے دار" ہم نے بھی
اس میں دلچسپی محسوس کرتے ہوئے کہا۔" بہت پر لطف
فرانس کے کسی مدرسہ میں جاکر تم دیکھو تو تمھیں
وہاں کی دنیا کچھ اور ہی نظر آئے گی۔ تمھیں ایسا
معلوم ہوگا کہ گویا تم "جنت ارضی" میں ہو۔ مدرسہ
کی عمارت کسی ایسے کھلے مقام پر ہوگی جہاں کی آب و ہوا
پاک صاف ہو۔ عمارت سے لگے ہوئے خوبصورت چمن
تمھیں دکھائی دیں گے، کھیلوں کے لئے وسیع
میدان ہوں گے۔ بہ ہر حال وہ سب کچھ ہوگا جو
ہمارے مدارس میں نہیں ہوتا۔ یہاں کے مدارس
کے لڑکے وقت کے بڑے پابند ہوتے ہیں۔ اور
صفائی کا انھیں اتنا خیال ہوتا ہے کہ پوچھو نہیں۔
مدرسہ سے قریب ایک اور عمارت ہوتی ہے جہاں
لڑکے رہتے سہتے ہیں۔ اس عمارت کو "اقامت خانہ"
کہتے ہیں۔ لڑکوں کو ہر چھٹی میں تعلیمی تفریح کرائی
جاتی ہے۔ لڑکے مزے مزے سے سائیکلوں پر
جاتے ہیں۔ اور خوب کھیلتے کودتے ہیں۔ اکثر انھیں
دریائے سین کے کنارے تفریح کے لئے بھجوایا جاتا
ہے۔ جہاں وہ خوب تیرتے ہیں۔ اور کھانا وغیرہ کھا کر
واپس ہوتے ہیں تم نے پیرس کا نام تو سنا ہوگا نا؟
یہ شہر اسی دریا پر واقع ہے۔ پیرس جیسا خوبصورت
شہر دنیا بھر میں تمھیں کہیں نہ ملے گا۔ یہاں بھی مدارس
اور کالج ہیں جہاں ہر قسم کی تعلیم دی جاتی ہے۔ چھوٹے
چھوٹے بچے اکثر انگوروں کے بغیچوں میں گھس جاتے
ہیں۔ اور پیٹ بھر کر انگور کھاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ان کے
والدین کے ہی باغ ہوتے ہیں۔ جامعہ آکسفورڈ اور
جامعۂ کیمبرج کے قائم ہونے سے قبل یہاں ایک
جامعۂ "سربان" نامی قایم ہوئی تھی۔ یہاں ہزاروں
اور لاکھوں کی تعداد میں تمام دنیا کے طلباء آکر
تعلیم حاصل کرتے تھے۔ کیمبرج اور آکسفورڈ کے قیام
کے بعد اس کی اتنی قدر باقی نہیں رہی لیکن اب
بھی طلبا کی کافی تعداد یہاں مصروف تعلیم ہے۔

خیر یہ تو بڑے بڑے شہروں کے بچوں کا
ذکر تھا۔ اب ان بچوں کا حال سنو جو کسی چھوٹے سے
گاؤں یا قصبہ میں رہتے ہیں۔ تعلیم یہاں
گو بہت عام ہوچکی ہے۔ لیکن بعض گاؤں ایسے بھی ہیں
جہاں سرکاری مدرسے یا کالج نہیں۔ یہاں کے بچے
عموماً زراعت اور کاشت کاری میں اپنے والدین
کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ صبح سویرے یہ لوگ کھیتوں میں
چلے جاتے ہیں۔ اور شام کے وقت جب کہ سورج
ڈوبتا ہوتا ہے گھروں کو واپس ہوتے ہیں۔ فرانس
کے جنوب مغرب میں ایک بڑا پہاڑی سلسلہ ہے۔ جو
ہسپانیہ سے فرانس کو جدا کرتا ہے۔ اسے "پرانیز"
(Pyranese) کہتے ہیں۔ ان پہاڑوں کے

دامن میں بسنے والے بچے بڑے نڈر اور بہادر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنا وقت زیادہ تر انگوروں کے بیلچوں میں گزارتے ہیں یہ لوگ گھوڑے کی سواری میں بھی بڑے مشاق ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات یہاں کے بچے ٹولیاں بنا کر پہاڑوں پر چڑھتے ہیں۔ اور دل بھر کر کھیلتے کودتے ہیں۔ کیونکہ انہیں روکنے والا کوئی نہیں ــــ عجیب زندگی ہوتی ہے ان کی بھی"

"بھئی واقعی آج تو آپ نے بڑی عمدہ باتیں بتائیں" سلیم نے ہماری طرف دیکھتے ہوئے کہا: "ہاں تو آگے کچھ اور سنائیے" "نہیں جی۔ اب ختم کرو۔ پھر کبھی اس کا سلسلہ قائم رکھیں گے۔ ہمارے سر میں بہت درد ہو رہا ہے"

سلیم ہمارے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور ہم ایک آرام کرسی پر دراز ہو گئے۔

عزیز رضوی

ــــ یہ مضمون نشر گاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا

بچہ اور چاند

سنا ہے کہ قوس قزح کے کنارے جہاں ہیں رواں برق کے تیز دھارے
جہاں سیر کرتے ہیں ننھے ستارے جہاں ٹوٹ کر شب کو گرتے ہیں تارے
وہیں چاند! کہتے ہیں تو حکمراں ہے

جہاں اچھے منظر انوکھے سماں ہیں جہاں پر رواں دودھ کی ندیاں ہیں
جہاں پر چمکتی ہوئی بجلیاں ہیں! جہاں بادلوں کے بڑے کارواں ہیں
وہیں چاند! کہتے ہیں تو حکمراں ہے

وہ چاندی کے پھولوں کا باغ جناں ہے جہاں کا ہر اک ذرہ ذرہ جواں ہے
زمیں جس کی تاروں بھرا آسماں ہے سنا ہے کہ اس کا تو ہی باغباں ہے
وہیں چاند کہتے ہیں تو حکمراں ہے

تری اوڑھنی سرخیاں ہیں شفق کی
تری سیرگاہیں بلندی افق کی!

مسیح الدین خاں متین

شوق

شوق ایک غیر معمولی خواہش، یا کسی چیز کے حصول میں انہماک، اور کسی چیز یا بات سے گہری دلچسپی کا نام ہے۔

تقریباً ہر انسان کو کسی نہ کسی بات کا شوق ہوتا ہے، کسی کو اچھے کپڑے پہننے کا تو کسی کو اچھا کھانا کھانے کا، کسی کو پڑھنے اور کتابیں و رسائل جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے تو کسی کو روپیہ جمع کرنے کی فکر گھلائے رکھتی ہے، یہ تو عام شوق ہیں، جس کا ہر شخص کو کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ملتا ہے۔

لیکن بعض شوق خاص اور شخصی ہوتے ہیں، جیسے ٹکٹ جمع کرنا، یا جانوروں کے انڈے جمع کرنا، بعض تصاویر جمع کرتے ہیں، بعض کو پرانی چیزیں، پرانی کتابیں پرانے سکے وغیرہ کی دھن رہتی ہے۔ بعض ماچس کے تصاویر جمع کرتے ہیں، بعض چاکلیٹ ٹافی میں کی فوٹوز جمع کیا کرتے ہیں۔

اپنے شوق کی وجہ سے انسان اس چیز کے حصول کی کوشش کیا کرتا ہے کوشش اور محنت کی وجہ سے اس چیز کا کافی ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے اور یہ ایک دلچسپ چیز ہو جاتی ہے۔

شوق کسی خاص آدمی کا ورثہ نہیں، بڑے بڑے آدمی ایسے شوقوں کے حامل ہوئے ہیں، یورپ میں تو بڑے بڑے بادشاہ، اور امراء کو ایسی چیزوں کا شوق ہے اور وہ اپنی مطلوبہ چیزوں پر بے دریغ روپیہ خرچ کرتے ہیں جب ہی تو ان کے عجائب خانے بھی قابل دید اور نایاب ہوتے ہیں۔

ہمارے پاس بھی بچوں کو ٹکٹ (اسٹامپ) جمع کرنے کا بہت شوق ہے، اسی طرح بعض بچوں کو عدد کارڈ، اور مونوگرام اور فوٹوز وغیرہ جمع کرنے کا شوق ہے، میرے بھائی کو بادشاہوں کی تصویریں جمع کرنے کا شوق ہے ان کے پاس ان تصاویر کا ایک دلچسپ البم بن گیا ہے۔ اسی طرح میری بڑی بہن کو خوش نما پتھر بڑے پسند ہیں جہاں کہیں کوئی چھوٹا اور خوش نما پتھر نظر آ جائے وہ اسے خوشی سے اٹھا لیتی ہیں، ان کے بچپن کے جمع کئے ہوئے پتھر اب تک ہیں، آج سے اٹھارہ انیس برس پہلے جب ایلورہ، اجنٹا کی سڑکیں تیار ہو رہی تھیں تو گار کے بے شمار خوش نما پتھر نظر آتے تھے اور انھیں جو بھی سفید و خوش نما پتھر نظر آ جاتا وہ اسے اٹھا لیتیں۔

مجھے بھی ایک شوق ہے، اور وہ "ڈیوک اینڈ ڈچس آف ونڈسر" سے ان کے غیر معمولی واقعات کی بناء پر دلچسپی ہے، اسی بناء پر میں ان کی تصاویر جمع کرتی ہوں۔ چنانچہ میرے پاس ان کے فوٹوز کا جو بڑی کوششوں اور تلاش سے جمع کی گئی ہیں، ایک البم تیار ہو گیا ہے۔ اور ان لوگوں کو بھی جنھیں ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ بھی اس البم کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہیں۔

یورپ والے اپنے شوق کی تکمیل کے لئے بہت محنت اور کوشش کرتے ہیں، دولتمند بے حساب روپیہ صرف کرتے ہیں، اپنے شوق کی تکمیل کے لئے دور دور کے ملکوں کے لوگوں سے خط و کتابت کرتے ہیں، اور اپنے مطلب کی چیزیں حاصل کر لیتے ہیں۔

اسی طرح سب رسی بہن بھائی آپس میں اپنے شوق کی چیزوں کا تبادلہ کریں تو ان کی چیزوں میں کئی گنا اضافہ ہو سکتا ہے۔

کبریٰ اقبال

فصیل بیدر

(ایک نیم تاریخی ڈرامہ)

پہلا منظر۔

(علی برید شاہ اپنے کمرہ میں مسند نشین ہے)

علی برید شاہ۔ (پکارتا ہے) سپاہی۔

سپاہی۔ (کمرے میں آکر) جی حضور، ارشاد۔

علی برید شاہ۔ کسی دربان کو وزیر اعظم کے گھر روانہ کرو اور کہو کہ "مابدولت نے طلب کیا ہے"۔

سپاہی۔ (فرشی سلام کرکے) حضور کے حکم کی ابھی تعمیل کی جاتی ہے۔

(سپاہی چلا جاتا ہے)

دوسرا منظر

سپاہی۔ (بادشاہ کے کمرے میں آکر) عالی جاہ وزیر اعظم تشریف لائے ہیں۔

علی برید شاہ۔ ان کو یہاں بلا لاؤ۔

سپاہی۔ (باہر جاکر) سلطان عالی شان آپ کو یاد کر رہے ہیں۔

وزیر اعظم۔ اچھا میں جاتا ہوں۔

(وزیر اعظم کمرے میں داخل ہوتا ہے)

وزیر اعظم۔ (قدمبوس ہوکر) حضور نے مجھ کو کس لئے طلب کیا ہے۔

علی برید شاہ۔ (متانت سے) تم اس وقت جاؤ اور علمائے سلطنت کو مابدولت کے پاس آنے کی دعوت دو۔

وزیر اعظم۔ (سنجیدگی سے) حضور کے حکم کی ابھی تعمیل کی جاتی ہے۔

(وزیر اعظم چلا جاتا ہے)

تیسرا منظر

سپاہی۔ (بادشاہ کے کمرے میں آکر) حضور تمام علما آچکے ہیں۔

بادشاہ۔ کیا وزیر اعظم نہیں آئے؟

سپاہی۔ وہ بھی آگئے ہیں اور باہر ٹھیرے ہیں۔

علی برید شاہ۔ اچھا جاؤ میں ابھی آتا ہوں۔

(سپاہی چلا جاتا ہے)

(بادشاہ کپڑے پہن کر باہر جاتا ہے تمام علما سلام کرتے ہیں)

علی برید شاہ (سلام کا جواب دے کر متانت سے کہتا ہے) میں نے آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ لوگوں سے ایک اہم بات پوچھوں .... وہ یہ ہے کہ زندوں کی حفاظت زیادہ ضروری ہے یا مردوں کی۔

تمام علما۔ (کچھ دیر بعد بادشاہ کو فتویٰ دیتے ہیں) عالی جاہ مردوں سے زیادہ زندوں کی حفاظت ضروری ہے۔

علی برید شاہ۔ (وزیر اعظم سے) تم جاؤ اور مابدولت کا یہ حکم نافذ کردو کہ میری سلطنت میں جتنے مقبرے اور گنبدیں ہیں سب توڑ دئے جائیں اور ان کے پتھروں سے ایک فصیل بیدر کے اطراف جلد از جلد تعمیر کردی جائے تاکہ مصیبت کے وقت میری سلطنت اور رعیت کی حفاظت ہو سکے۔

وزیر اعظم۔ عالی جاہ! آپ کے ارشاد کے مطابق آج ہی تمام سنگین عمارتیں مسمار کردی جائیں گی۔

(بادشاہ چلا جاتا ہے)

غلام مجتبیٰ قمر (بیدر شریف)

محمود گاواں

کشمیر جنت نظیر کے مغرب کی طرف وسط ایشیا میں ایک سرسبز و شاداب علاقہ ہے۔ جس کو ایران کہتے ہیں۔ ایران کی سرزمین نے جہاں حافظ و سعدی جیسے بلند پایہ نامور سخن پیدا کئے ہیں۔ وہیں پر دنیا کی سیاست میں طوفان برپا کرنے والے خواجہ محمد جیسے بیدار مغز سپوت نکالے۔ خواجہ محمد محمود گاواں کے نام سے مشہور ہے۔ اس بیدار مغز وزیر نے ایران کے صوبہ گیلان میں ۱۴۰۵ء میں جنم لیا تھا۔ خواجہ ایران کے ایک معزز گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ مصائب زمانہ سے تنگ آکر ۴۷ برس کی عمر میں ہند کا رخ کیا۔ ہندوستان کی سرزمین میں اس وقت بہمنیہ [illegible] دکن کا خاتمہ ہو گیا۔ اس وقت محمد شاہ دکن پر حکومت کر رہا تھا۔ اس کے آنے کے بعد محمود گاواں کو وزارت کے عہدے پر سرفراز کیا۔ گاواں کی بیدار مغزی اور شاہ وقت کی اعلیٰ قدر دانی نے گاواں کے پوشیدہ جوہر کو چمکا دیا۔ اس کی بہادری علم دوستی سیاست وغیرہ کے اچھے صفات کے لئے دفتر درکار ہے۔

اور تواریخ اس کی شاہد ہیں، اس کے علاوہ خود بیدر[1] اپنی زبانِ حال سے اس کی تعریف کے گیت گا رہا ہے۔ موجودہ شہر بیدر سے کچھ فاصلے پر ایک نہایت پُرفضا مقام پر یہ ہیرا دفن ہے گو اس سادہ مزاج ولی صفت کے مزار پر دنیاوی جاہ و حشم نہیں اور نہ اپنا اونچا گنبد دکھا کر سیاحوں کے دلوں کو راغب کرتا ہے لیکن اس کا سادہ سا مزار حساس طبیعت رکھنے والوں کے لئے شمع ہدایت کا کام کرتا ہے۔ اور دنیا کی بے ثباتی کا درس دیتا ہے۔ باوجود سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک ہونے کے اس نے اپنے رہنے کے لئے کوئی شاندار محل بنا کر فضول خرچی نہ کی بلکہ اسی پیسے کو کارِ خیر میں صرف کر کے آنے والوں کے لئے مثال قائم کی چنانچہ اس کی قبر ایک سادہ چھوٹی سی دیوار سے گھری ہوئی ہے۔ جو سات فٹ کی ہے۔ جس پر موجودہ حکومت کی طرف سے ایک سنگ تربت نصب کیا گیا ہے۔ اطراف کے مناظر سوہانِ روح ہیں۔ آس پاس کے درخت اپنی زبان سے اس اعلیٰ دماغ ماہر کا ماتم کر رہے ہیں۔ الغرض اس مدبر کی قبر دیکھنے کے بعد فوراً غالب مرحوم کا یہ مصرع یاد آتا ہے۔

"خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں"

[1] بیدر (حیدرآباد کا ایک ضلع)

اقبال احمد صدیقی
(نلنگہ ضلع بیدر)

گرمی

کپڑے گرم اُتارو بھائی — سردی گئی اور گرمی آئی
گرمی کے ہیں چار مہینے — خوب بہیں گے سب کے پسینے
اتنی چلیں جب گرم ہوائیں — گھر سے باہر نکل آئیں
کیسے ہیں چھوٹے چھوٹے بچّے — دیکھ کے پانی غم غم کرتے
سُرخ ہوئے ہیں پھول سے چہرے — باغ میں لالہ پھولے جیسے
چڑیاں چوں چوں بول رہی ہیں — گرمی سے منہ کھول رہی ہیں
چوپائے بھی دھوپ کے مارے — بیٹھ گئے ہیں چھاؤں میں سارے
ڈھونڈ رہی ہیں بھینسیں ساری — ٹھنڈک، سایہ، کیچڑ، پانی
بڑھتی چلی ہے پیاس کی شدّت — زوروں پر ہے دھوپ کی حدّت
چلتے مسافر بیٹھ گئے ہیں — سوئے ہیں کچھ لیٹ گئے ہیں
چٹیل میدان آگ کی چادر — شعلہ نما ہیں کنکر پتھر
چمک رہے ہیں ریت کے ذرے — جیسے بچھائے کوئی شرارے
جھونکے پیہم گرم ہوا کے — جھلس رہے ہیں منہ کوآ کے
سوکھ گیا دریا کا کنارا — اور اترا ہے پانی سارا
اوپر سورج شعلہ فشاں ہے — نیچے زمیں بھی آتش داں ہے

سیّد یعقوب (چنچل گوڑہ)

نظام الملک آصفجاہ اوّل اس مختصر کتاب میں نظام الملک آصفجاہ اول کے مکمل حالات زندگی مستند واقعات نہایت سلیس اور شگفتہ زبان میں تحریر کئے گئے ہیں ادارہ دوسرے سلاطینِ آصفی کے سوانح حیات بھی تیار کر رہا ہے۔ اس کتاب کو اس سلسلے کی پہلی کڑی سمجھنا چاہیے۔

مصنفہ مولوی شیخ چاند مرحوم ایم اے ایل ایل بی ریسرچ اسکالر قیمت ۴

خدا جھوٹ نہ بلوائے

شہر کی مسرت فضا میں پہنچ جانے کے چند ہی روز بعد لٹ لٹا کر ملک ہوگیا۔ وہ جیب جو کبھی نانبائی کے تنور کی طرح ہمیشہ گرم رہا کرتی تھی اب کسی قالب مردہ کی طرح سرد ہے۔ کوشش کررہا ہوں کہ کسی طرح شہر کی اس ہاہو شور و غل سے دیوانہ وار کسی چھوٹے سے گاؤں کی طرف بھاگ جاؤں جہاں کی زندگی میں تصنع نہیں جو زندگی فطری زندگی ہے لیکن پاس ٹوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ نہ معلوم ایسے بُرے وقتوں میں دوست احباب عزیز اقارب کہاں مرگئے۔ اتفاق سے کبھی کوئی ملتے ہیں تو علیک سلیک کے بعد ہی پوچھ بیٹھتے ہیں کہ "کہاں ٹھیرے ہو اور کب جاؤ گے؟" یہ سوال کچھ ایسا معنی خیز ہوتا ہے کہ اس کے بعد پھر ان کے اخلاق کریمہ سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اس آڑے وقت میں حاتم دوراں بن سکیں گے۔

لیکن امید کا چراغ ناامیدی کے تیز سے تیز جھونکوں سے کبھی گل نہیں ہوتا۔ دن بھر ٹھیلہ گاڑی کی طرح شہر میں چکر لگاتا رہتا ہوں۔ امید بندھ جاتی ہے کہ خدائے عرش بریں من و سلویٰ کے کرشمے کی طرح اب بھی کوئی نیا معجزہ تبلانے والا ہے۔

ایک دن یوں ہی خدا سے لو لگائے نام پلی اسٹیشن پہنچ گیا۔ خوش قسمتی سے ایک دوست مل گئے جو گلبرگہ جارہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں سفید سفید چمک دار سکوں کو دیکھ کر بس رال ہی تو ٹپک پڑی ان سے مل کر میں نے اپنی دوستی اور محبت کے بڑے بڑے بلند آہنگ دعوے پیش کئے۔ اور آخر میں کہا۔

"دوست تمھارے ساتھ اسباب بہت ہے لاؤ تمھارا ٹکٹ میں خرید لوں۔"

میرا دوست مسکرا رہا تھا — میرے ہاتھ میں چاندی کے چار سکے پڑے جگمگا رہے تھے۔ ایک مدت کے بعد روپیوں کو ہاتھ میں پکڑتے ہی جسم میں ایک بجلی سی دوڑ گئی۔ تیر کی طرح تیزی سے ٹکٹ گھر پہنچا۔ ٹکٹ خریدا اور نو آنے ہاتھ میں دبائے باہر آیا۔ دوست نے جب باقی پیسوں کا مطالبہ کیا تو صرف چار آنے میرے ہاتھ سے اس کے ہاتھ میں گرے اور پانچ آنے میں نے اپنی مٹھی میں مضبوطی سے پکڑ لئے تھے۔ دوست نے ایک معنی خیز نظر سے میرے بشرے کا مطالعہ کیا۔ میرے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کررہا تھا کہ ریل نے سیٹی دی اور میرا دوست مجھے خدا حافظ کہتا ہوا چلا گیا۔ میں اسٹیشن سے باہر چلا آیا۔ میرا دل خوشی سے بانسوں اچھل رہا تھا۔ پانچ آنے آج میرے لئے پانچ روپے سے زیادہ قدر کے تھے۔

پانچ آنوں میں پورا ایک دن بھی تو نہ گزر سکا۔ پھر دنیا کسی فوٹو گرافر کے ڈارک روم کی طرح اندھیری

نظر آرہی تھی۔ دن تمام شتر بے مہار کے طرح پھر۔ سر شام عابد روڈ پر ایک بجلی کے کھمبے سے سہارا لےکر سگریٹ کی نبض دیکھنے لگا۔ تانگہ والوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا جو آتا پوچھتا۔

"کہاں جائیں گے صاب ؟"

تنگ آکر اور اپنی ٹوئیڈ کی شیروانی کی عزت برقرار رکھنے کے لئے میں نے کہہ دیا۔

"نہیں نہیں! میں "ویکاجی" جارہا ہوں"

یہ بات گئی گزری ہوگئی۔ میں آدھے گھنٹے تک وہیں اطالوی مجسمے کی طرح کھڑا رہا۔ وہ کمبخت تانگے والا بھی ٹلنے کا نام نہ لیتا تھا۔ اسی اثنا میں ایک اور تانگے والا آیا اور وہی سوال جو ان کی گھٹی میں پڑا ہے دہرایا۔

"کہاں جائیں گے صاب ؟"

قبل اس کے میں کچھ جواب دیتا۔ پہلے بدمعاش تانگے والے نے کہا۔

"چپ رہو باصاب ویکاجی جارہے ہیں"

اس نے کچھ اس انداز بلکہ اکھڑپن سے یہ جملہ ادا کیا کہ تمام تانگے والوں میں ایک فرمایشی قہقہہ پڑا۔ میری غصہ سے بری حالت ہوئی جارہی تھی۔ سر سے پیر تک غصہ سے کانپ رہا تھا لیکن غصہ کو کڑوی دوا کی طرح پی گیا۔ اگر میں کوئی پولیس انسپکٹر ہوتا یا کم از کم جمعدار ہی ہوتا تو بدمعاش کی وہ درگت بناتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا لیکن ــــ خدا کو منظور نہ تھا اس لئے حضرت ایوب علیہ السلام کے صبر کو یاد کرتا ہوا وہاں سے ٹل گیا۔

سامنے ایک پرانے اور جگری دوست ملے۔ ان سے افلاطونی قسم کی محبت تھی انھوں نے "عزیز کمپنی" چلنے کی دعوت دی۔ منہ میں پانی ابھر آیا خدا جھوٹ نہ بلوائے صبح سے ایک کھیل تک اڑ کر منہ میں نہ گئی تھی۔ خواہ مخواہ کے عذر و حیلے کے بعد خوشی خوشی ان کے ساتھ ہوگیا۔ خوب سیر ہوکر کیک، پیسٹری، آیسکریم وغیرہ جسیم دیئے۔ جب وہ بل دے رہا تھا تو میں نے عمداً اپنی خالی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے پورے لکھنوی انداز میں کہا۔

"ایں قبلہ۔ کیا غضب کررہے ہیں آپ! بل میں ادا کروں گا"

انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا

"جانے دو یار تکلف کو"

میں جان بچی لاکھوں پائے کا ورد کرتا ہوا چلا جارہا تھا کہ پیلی پگڑیا والا دوست ملا۔ اس نے منی آڈر نے کی بشارت دی۔ سر سے پیر تک بجلی دوڑ گئی۔ خوشی سے بے اختیار زبان سے نکلا۔

"اے خطوط رساں! جی چاہتا ہے کہ تیرا منہ چوم لوں تجھے اپنے دل میں بٹھالوں روز دیوتا کی طرح تجھے پوجوں۔ تو منی آڈر نہیں لایا بلکہ میرے لئے پیغام زیست لایا ہے تو خطوط رساں نہیں فرشتہ ہے ـــ ــ"

میرے ایک دوست نہ معلوم میری اس وارفتگی کا کب سے مطالعہ کررہے تھے ان کی مسکراہٹ ہنسی سے قہقہہ میں تبدیل ہوگئی اور ان کے قہقہے نے میرے قصیدہ کا ٹینٹوا دبا دیا۔

خیر ہم اور وہ وہاں سے نکلے۔ اب میں مور کی طرح اکڑتا اکڑتا چلا جارہا تھا ویکاجی کے سامنے کھڑے ہوکر ایک فاتحانہ نظر ان بدمعاش تانگے والوں پر ڈالی وہ مرعوب ہوکر ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ویکاجی کے صحن میں داخل ہوتے ہی میں کارل مارکس کی طرح غریب اشتراکی نہ رہا بلکہ اپنی گزشتہ بیچارگی کا بدلہ نکالنے کی غرض سے اپنی سرمایہ داری کا خوب خوب مظاہرہ کیا۔ میرا دوست گا رہا تھا۔

جنت میں بھی یاد آئیں گے یہ چند مہینے

ابراہیم جلیس

خطبۂ صدارت

(جو طلبہ کانفرنس صوبہ میدک حیدرآباد دکن میں بروز چہارشنبہ ۲۹ مئی ۱۹۴۰ء بمقام محبوب نگر پڑھا گیا۔)

سب سے پہلے مجھے اس خداوند قدوس کا شکر ادا کرنا چاہیے جس نے ہم کو شکر گزار بندوں میں شامل کیا۔ بانیان کانفرنس کا مخلصانہ شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے کہ انھوں نے اس اہم کانفرنس کا صدر مجھے منتخب کیا ہے۔ یہ میری سب سے بڑی خوش قسمتی ہے کہ میں آج ایک ایسی کانفرنس کی صدارت کر رہا ہوں جو ان کے لئے منعقد کی جا رہی ہے جن سے آئندہ ملک کو بہت زیادہ توقعات ہیں۔ اور جن کی خوبی یا خرابی پر ملک و ملت کی خوبی یا خرابی منحصر ہے۔

معزز طالب علمو! یہ ہم سب کی خوش قسمتی ہے کہ ہم ایک ایسے زرین دور میں پھل پھول رہے ہیں جس کے فیض کا دروازہ ہر ایک کے لئے کھلا ہے۔ اور جہاں ہمیں وہ وہ سہولتیں اور آسانیاں حاصل ہیں جو شاید ہی کہیں اور ہوں بشرطیکہ ہم صحیح طور پر ان سے استفادہ کریں اور باہمی فلاح و بہبود کے نیک خیالات کو اپنے دل و دماغ میں پیدا کرتے رہیں۔

سلطنت حیدرآباد کا اور عہد عثمانی کا سب سے بڑا اور درخشاں کارنامہ اردو کو ذریعہ تعلیم بنانا ہے۔ اس سے میری مراد جامعہ عثمانیہ کا قیام ہے۔ اس کا بڑا مقصد یہی ہے کہ ہم میں اپنی زبان کی سچی محبت پیدا ہو۔ دوسری زبانیں بولنے والے اس کی تباہی کے درپے ہیں مگر اردو مٹائے نہیں مٹ سکتی کیونکہ وہ ہندوستان کی سب جلیل القدر قوموں کی مشترکہ زبان ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے مقصد کو پورا کریں اور اس زبان کی اشاعت اور ترقی کی ممکنہ کوشش کریں۔ جہاں تک ہوسکے ہم کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ تحریر و تقریر کے وقت غیر زبانوں کے الفاظ استعمال نہ کریں۔ ہماری زبان سب زبانوں سے زیادہ آسان زبان ہے۔ اس میں ویسے سخت اور بھدے الفاظ نہیں جو غیر زبانوں میں پائے جاتے ہیں۔ دوسری زبانوں کے سیکھنے کے لئے کافی وقت درکار ہے مگر غیر زبان داں اصحاب بھی بغیر کسی مشکل کے اردو بول لے سکتے ہیں۔ اردو زبان میں بہت ساری دوسری زبانوں کے الفاظ آگئے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے زیادہ آسان الفاظ ہماری زبان میں موجود ہیں اس لئے دوسری زبانوں کے مشکل الفاظ سے ہم کو قطعی پرہیز کرنا چاہیئے۔ طالب علموں کا طرۂ امتیاز یہی ہے کہ وہ صحیح اردو بولیں۔ غلط الفاظ کے استعمال نے بھی زبان کی خرابی میں بڑا حصہ لیا ہے۔ طالب علموں کا یہ فرض ہے (اگرچہ تلخ ہی سہی) کہ جہاں کوئی غلط الفاظ استعمال کرے اسے صحیح الفاظ سے آگاہ کردیں۔

ادنیٰ طبقہ کے اکثر ملازمین غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں۔ یہاں دوسری زبانوں کی طرف سے تعلیم بالغان کا کام شروع ہوگیا ہے وہاں اردو داں اصحاب اور خاص کر طالب علموں کی طرف سے بھی یہ کوشش ہونی چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ بڑی عمر کے لوگ اردو سیکھیں لکھیں اور پڑھیں۔ اگر ہم چھٹی کے زمانے میں یا فرصت کے وقت اپنے ملازموں اور محلے کے ان پڑھ لوگوں کو اردو پڑھانا اپنا فرض منصبی سمجھیں تو یہ ہمارے لئے ایک ایسی سعادت ہوگی جس پر ہم جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔

جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے بعد ملک میں عام علمی بیداری پھیلی اور کئی ایک انجمنوں اور اداروں کا قیام عمل میں آیا۔ ہم کو چاہیے کہ ان سب کی مدد کریں جو واقعی اردو کی کچھ خدمت اور حفاظت کر رہی ہیں اس کے علاوہ ان سب اخبارات و رسائل کی مدد کرنا ہمارا اولین فرض ہے جو اردو کی اشاعت اور توسیع کی کوشش کر رہے ہیں۔

طالب علم ابھی سے ملک کے حالات سے دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ طلبہ کو باہر کی دلچسپیوں میں کبھی حصہ نہیں لینا چاہیے اور اپنی تعلیم کی طرف ہمیشہ متوجہ رہنا چاہیے۔ مگر یہ ہر وقت اور ہر جگہ کے لئے صحیح نہیں ہے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ قوم اور ملک کی آئندہ ترقی کی باگ ڈور ہم طلبہ ہی کے ہاتھ میں ہوگی۔ اگر طلبہ ابھی سے ملک کی حالت کا مطالعہ نہ کریں تو آئندہ ان کی زندگیوں میں بہت سی دشواریاں پیش آئیں گی اور وہ ملک کی آئندہ ترقی کے لئے کسی طرح سے بھی کارآمد نہیں ثابت ہو سکتے۔ اگر ہم مدرسہ کی چار دیواری ہی میں رہیں تو ہم دنیا کے واقعات سے واقف نہیں ہوں گے جو آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ ہم تعلیم ترک کر کے کسی سیاسی جماعت کے روح رواں ہو جائیں بلکہ طالب علموں کو چاہیے کہ اپنی تعلیم پر زیادہ زور دیں مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ملک کی سیاست سے بھی تھوڑا بہت واقف رہیں تاکہ آئندہ زندگی کے لئے تیار ہو سکیں۔

اس کے علاوہ دوسری قسم کی غیر درسی دلچسپیوں میں حصہ لینا بھی طلبہ کے لئے نہایت ضروری ہے۔ نمائشوں سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر تعلیمی نمائشیں بھی ہوتی رہتی ہیں جن سے درسی کتابوں کے مطالعہ میں بہت مدد ملتی ہے۔ سینما دیکھنا بھی طالب علموں کے لئے مضر ثابت نہیں ہوتا۔ لیکن انہیں ایسے فلم دیکھنے چاہئیں جو ان کی درسی کتابوں سے متعلق ہوں۔ ایسے فلم زیادہ تر انگریزی میں ہوتے ہیں مثلاً اکثر فلم مشہور مصنفوں کے لکھے ہوئے ناولوں اور قصوں سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور انہیں میں سے بعض نصاب میں بھی شامل ہیں۔ طلبا کی زندگی ایک خاص نظام نامہ کے تحت ہونی چاہیئے۔ طالب علم کو اپنے تمام کام وقت مقررہ پر کرنے چاہئیں ایسی صورت میں اس کی زندگی ایک پابند اور کامیاب زندگی کہلائی جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طالب علم ہونے کی حیثیت سے یہ نہیں ہونا چاہیے کہ دن بھر وہ درسی کتابوں ہی کو پڑھتا رہے۔ ایسی غیر درسی دلچسپیوں میں حصہ لینا اور ایسی غیر درسی کتابوں کا مطالعہ بھی اس کے لئے نہایت ضروری ہے جو اس کے اخلاق کو سنوارے اور جن کی وجہ سے اس کی معلومات میں اضافہ ہو۔

مدرسوں میں بعض مضامین مضمون اختیاری کی حیثیت سے پڑھائے جاتے ہیں۔ مگر ان سے ہر طالب علم کا واقف ہونا ضروری ہے۔ مثلاً عربی و فارسی جن کا کئی سو سال ہندوستان میں بول بالا رہا مگر افسوس ہے کہ اب ہم ان زبانوں کو بھولتے جا رہے ہیں۔ اس صورت میں ایک طالب علم کا فرض ہے کہ وہ خانگی طور پر اس کا مطالعہ کرے ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس کا ہماری زندگی سے کس قدر قریبی تعلق ہے۔ مگر یہ مضمون بھی ہر طالب علم کو نہیں پڑھایا جاتا اور اس کی شاخوں مثلاً نباتیات و حیوانیات وغیرہ کو مضمون اختیاری کہا گیا ہے۔ اس لئے ہم کو عام معلومات کی کتابیں پڑھنی چاہئیں تاکہ ان سے ہم ان ساری باتوں سے واقف ہو جائیں جو مدارس میں نہیں بتائی جاتیں۔ ان کے ساتھ ساتھ اخباروں اور رسالوں کا مطالعہ بھی نہایت ضروری ہے تاکہ ہم کو جس وقت کی خبریں اسی وقت ملتی رہیں اور معلومات کا دائرہ وسیع ہو۔ مدارس میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اسی پر اکتفا کرنے سے زیادہ ترقی نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ساتھ ساتھ ہم اسی مضمون سے متعلق دوسرے مصنفوں کے خیالات سے بھی واقف نہ ہوں۔ اس صورت میں بھی غیر درسی کتابوں کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

طلبہ کو چاہیے کہ اپنی ایک مستحکم برادری قائم کریں یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ طلبہ میں آپس میں اتحاد و اتفاق ہو۔ اس وقت تک ہم ترقی نہیں کر سکتے جب تک ہم کو ایک دوسرے سے واقفیت نہ ہو اس کے بغیر دنیا میں ہم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔ ہم ایک دوسرے

کے تعاون اور ہمدردی کے ذریعہ سے اپنے کاموں کو بہت زیادہ سہل بنا سکتے اور اپنی دلچسپیوں میں اضافہ کر سکتے ہیں طلبہ میں باہمی ہمدردی اور محبت کا جذبہ پیدا ہونا ضروری ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن اقوام میں اتفاق و اتحاد تھا وہی دنیا پر غالب رہیں۔ اور جہاں کہیں نفاق پیدا ہوا وہ قومیں نیست و نابود ہو گئیں۔ کوئی خوبی نہیں پیدا ہو سکتی جب کہ طلبہ میں ایک دوسرے کی محبت نہ ہو اور ایک دوسرے کا لحاظ نہ ہو۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں
اس چمن میں کوئی لطفِ نغمۂ بلبل نہیں

محبت اور اتفاق اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب کہ ہم ایک دوسرے سے واقف رہنے کی کوشش کریں اور آپس میں ہمدردی سے پیش آئیں۔

طلبہ کو اپنی علمی و ادبی صلاحیت بڑھانے کے لئے تحریری اور تقریری مقابلوں میں شریک ہونا نہایت ضروری ہے۔ ان مقابلوں میں شریک ہونے کی وجہ سے تحریری مشق پختہ ہو جاتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ طلبہ کو خود اپنی جانب سے اس قسم کے مقابلے منعقد کرنے چاہئیں اور ساتھ ہی انعامات وغیرہ دیکر ایک دوسرے کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ اس کی وجہ سے ترقی کے میدان میں ایک دوسرے کی ریس کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کی مدد اور ہمدردی کے جذبات بھی پیدا ہونے لگتے ہیں۔

مضمون نگاری اور تصنیف و تالیف کا ذوق بھی طلبہ میں شروع ہی سے پیدا ہونا چاہیے۔ مضمون نگاری ایک خاص شغلہ ہے جس میں وہ لطف آتا ہے جو شاید ہی کسی اور شغل میں آتا ہو۔ ہم کو ایسے مضامین یا کتابیں لکھنی چاہیں جن سے دوسروں کو کچھ فائدہ پہنچے۔ غیر مفید کتابیں شائع کر کے شہرت حاصل کرنا سخت معیوب بات ہے۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا ہو سکتا ہے جتنے بڑے بڑے مضمون نگار مصنف اور انشا پرداز مشہور ہیں۔ ان میں سے اکثروں کو طالب علمی ہی کے زمانے سے اس قسم کا شوق تھا اور اسی زمانے سے اگر ہم مشق رکھیں تو آئندہ چل کر ہم میں سے بعض بڑے مصنف بھی بن سکتے ہیں۔

جیسا کہ اس سے پہلے میں نے بتایا ہے عام مطالعہ کا شوق بڑھایا جائے۔ درسی کتب کے بعد سب سے زیادہ توجہ ہم کو اسی طرف کرنی چاہیے۔ ہماری ذہنی نشو و نما کے لئے کتابیں بہت کام آتی ہیں۔ بڑے بڑے مقررین جن کو اب ہم دیکھ رہے ہیں ان کا مطالعہ طالب علمی ہی کے زمانے میں بہت وسیع تھا۔ وہ اچھی اچھی کتابیں پڑھتے تھے اور دوسرے مصنفوں اور مضمون نگاروں کے خیالات اور طرز تحریر سے واقف ہو کر خود اسے سیکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہماری تحریریں اور تقریریں دونوں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہیں جب کہ ہم ہر مشکل لفظ یا ترکیب کے معنی سمجھیں اور اسے پھر اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

دماغی محنت کے بعد ایک طالب علم کو سیر و تفریح کی سخت ضرورت ہے۔ اس کی یہ تفریح بھی ایک بڑی حد تک اس کو فائدہ پہنچا سکتی ہے اس کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور طالب علم میں سیر و سیاحت کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اور سفر کے تجربے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر ہم ترقی یافتہ ممالک کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہاں کے طلبہ تعطیل کے دن کبھی اپنے گھر بیں نہیں رہتے بلکہ پکنک کے لئے باہر نکل جاتے ہیں۔ ایک تو تبدیل آب و ہوا ہو جاتی ہے، دوسرے انھیں اس سیر و تفریح سے کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ جب بڑی چھٹیاں ملتی ہیں اور مدرسے کا کام بھی زیادہ نہیں رہتا اس وقت طلبہ اگر دور دور کے مقامات کا دورہ کریں تو بہت مفید ثابت ہوگا۔ اس وقت ہم کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ دوسری جگہوں کے طلبہ کے ساتھ تعلقات استوار ہوں اور ایک دوسرے سے واقفیت ہو۔

(باقی آئندہ)

معین الدین احمد انصاری

Reg. No. M 3950.

ادارۂ ادبیات اردو

کی

چند علمی، ادبی اور دلچسپ کتابیں

۱۔ شعرائے عثمانیہ | جامعہ عثمانیہ کے چھبیس شاعروں کے کلام کا پاکیزہ انتخاب۔ مختلف نظموں اور غزلوں کا گلدستہ رنگ و بو۔ ہر شاعر کے کلام پر ایک مختصر مگر جامع تنقید۔ مرتبہ سید معین الدین صاحب قریشی ایم۔ اے و عبدالقیوم خان صاحب باقی ایم۔ اے طباعت و کتابت نفیس رائل سائز صفحات (۲۳۱) قیمت مجلد با تصویر دو روپیہ ۱۲ آنے

۲۔ مغربی تصانیف کے اردو تراجم | مغربی زبانوں کی تصنیفات و تالیفات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا تذکرہ۔ صاحبان فکر کی نظروں میں اس کتاب کی افادیت دوسری تحقیقی کتابوں سے کم نہیں۔ مرتبہ میر حسن صاحب ایم۔ اے طباعت و کتابت نفیس کراؤن سائز صفحات (۱۰۲) قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے۔

۳۔ محبت کی چھاوں | مرزا ظفرالحسن صاحب بی۔ اے کے ۱۴ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ۔ ہر فسانے میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدے کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کیلئے ایک شایستہ ذہنی تفریح صفحات (۱۳۲) قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے۔

۴۔ سوتیلی ماں | اس کتاب میں اصلاح معاشرت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سوتیلی ماں اور سوتیلے بچوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے مفید طریقے بیان کئے گئے ہیں مصنفہ رابعہ بیگم صاحبہ طباعت و کتابت نفیس صفحات (۴۸) قیمت مجلد صرف چار آنے۔

۵۔ روح غالب | اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسداللہ خان غالب کی حیات اور کارناموں کی ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ صفحات (۲۴۰) باتصویر قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

۶۔ تاریخ گولکنڈہ | وہ کتاب جو کئی سال کی تحقیق اور محنت و معلومات کا نتیجہ ہے۔ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے استاد تاریخ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے اس کتاب میں سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند تاریخ قلمبند کردی ہے۔ تصویریں بھی مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ صفحات (۴۳۰) قیمت مجلد تین روپیہ آٹھ آنے۔

۷۔ گریہ و تبسم | صاحبزادہ میکش کے کلام کا دلچسپ مجموعہ۔ شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ ہے۔ صفحات (۱۹۲) قیمت مجلد دو روپے

۸۔ سر سالار جنگ اعظم | حیدرآباد کے محسن اعظم کے حالات زندگی اور کارنامے دلچسپ اور سادہ پیرائے میں قلمبند کئے گئے ہیں۔ مرتبہ مولوی فیض محمد صاحب بی۔ اے۔ ڈپ ایڈ صفحات (۴۸) قیمت مجلد صرف چھ آنے۔

سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ (۱۵۳)

نشان ٹپہ برطانیہ M3950

ٹیلیفون نمبر (۲۲۰۹)

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ

سب رس

زیر نگرانی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت

صاحبزادہ محمد علی خاں میکش

سکینہ بیگم

خواجہ حمید الدین شاہد

عبدالحفیظ صدیقی بی۔ اس۔ سی

معین الدین احمد انصاری

جلد ۳ شمارہ ۳

مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

فہرست تصاویر

فہرست مضامین

سب رس کی قیمت .... چار روپے سالانہ علاوہ محصول ڈاک ۴؍

بچوں کے سب رس کی قیمت ...... ایک روپیہ سالانہ علاوہ محصول ڈاک ۸؍

سب رس معلومات کی قیمت .... " " " " " " "

(۱) رسالہ پہنچنے کی اطلاع ۱۵ تاریخ کے اندر دیدیجئے۔ دیر سے اطلاع آنے پر یا تو پرچے ختم ہو جاتے ہیں یا گزشتہ مہینے کے پرچوں پر زیادہ محصول ڈاک ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے تاریخ مقررہ کے بعد اطلاع آئے تو پرچہ روانہ کرنے میں تامل ہوگا۔

(۲) مراسلت کرنے والے اصحاب اس امر کا ضرور خیال رکھیں کہ اگر ادارے سے جواب حاصل کرنا ہو تو جوابی کارڈ یا ایک آنے کے اسٹامپ لازماً روانہ کریں۔ ورنہ ادارہ پر جواب کی ذمہ داری نہیں رہتی۔

(۳) اردو مطالعہ کا ذوق ہو تو ادارہ کے سب رس کتاب گھر کی فہرست منگوائیے۔

(۴) اگر اردو کتابیں خریدنی ہوں تو پہلے سب رس کتاب گھر سے مشورہ لیجئے۔

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ "رفعت منزل" خیریت آباد دکن سے شائع ہوا

ادارہ

اس ماہ کے اوائل میں ادارے میں معزز مہمان تشریف لائے۔ فضل العلماء مولانا عبد الوہاب بخاری ایم اے، ایم ایل سی (سابق پرنسپل جمالیہ کالج مدراس) نے ادارہ کے کاموں کی تفصیل معلوم کر کے خود کو بھی عملی خدمت کے لئے پیش کیا اور توقع ظاہر کی کہ ادارہ کے امتحانات کی مقبولیت صوبۂ مدراس میں بھی صوبۂ بمبئی سے کم نہ ہوگی۔ ان کی خواہش پر صوبۂ مدراس کے چند بڑے شہروں میں ادارے کی شاخوں کے قیام کا مسئلہ زیر غور ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد وہاں بھی کام شروع ہو جائے گا۔

اس سے پہلے سب رس میں ذکر کیا گیا ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی نے گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود ادارہ کا رفیق بننا قبول فرمایا تھا۔ اس دفعہ جب وہ حیدرآباد تشریف لائے تو ادارہ میں ان کو ایک عصرانہ پر مدعو کیا گیا اور ان کے علاوہ حضرت امجد، مولانا مناظر احسن، مولوی عبد الباری ندوی اور مولوی سید ہاشم ندوی وغیرہ نیز شعبہ جات ادارہ کے داعیان و اراکین عاملہ کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ ادارہ کے قلمی نسخوں اور نایاب قدیم اردو رسائل کو دیکھ کر علامہ ندوی نے مسرت کا اظہار کیا اور رسائل سے متعلق معلومات نوٹ فرمالیے۔ بڑی پرلطف صحبت رہی۔

علامہ ندوی اور سر شیخ عبد القادر کو ایک ساتھ ادارہ کا رفیق منتخب کیا گیا تھا اور عجیب اتفاق کی بات ہے کہ وہ بھی سلیمان ندوی صاحب کے ایک ہفتہ بعد ہی بلا اطلاع یکایک ادارے میں تشریف لائے اور کارکنان ادارہ کی ہمہ وقتی مصروفیت پر حیرت و مسرت کا اظہار کیا۔ ادارہ کی نئی مطبوعات کے بارے میں اپنی مفید رائے ظاہر کی اور آئندہ کے نظام العمل میں مشورے دیئے۔

نئی کتابیں | اس ماہ ادارہ نے اور تین نئی کتابیں شائع کیں۔ عماد الملک ۲۔ اردو مثنوی کا ارتقا اور ۳۔ کاغذ کی ناؤ۔

"نواب عماد الملک" ادارہ کے شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مرتب مولوی فیض محمد صاحب بی اے ٹوپ ایڈ ہیں۔ "مختار الملک سر سالار جنگ اعظم" کی طرح یہ کتاب بھی بچوں اور عوام کے لئے نہایت سلیس و سادہ اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ عماد الملک کے حالات زندگی کے مطالعہ سے نیک دلی، علم و فضل کا ذوق، اور حق پرستی کے جذبات موجزن ہونے لگتے ہیں۔ یہ کتاب بڑی نفیس اور پاکیزہ چھپی ہے۔ سرورق پر عماد الملک کی تصویر ہے اور قیمت بچوں کے لئے صرف ۱ر رکھی گئی ہے۔

"اردو مثنوی کا ارتقا" بڑی عالمانہ و محققانہ تالیف ہے جس کے افادہ و معیار کے اظہار کے لئے صرف اس کے مصنف پروفیسر عبد القادر سروری کا نام ہی کافی ہے۔ سروری صاحب کی نظر اردو شاعری کی تاریخ پر اتنی وسیع اور باریک ہے کہ اس خصوص میں عہد حاضر کے کسی محقق و ادیب کو ان کی ہمسری نصیب نہیں۔ اردو شاعری کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ بڑی سائز نہایت دبیز کاغذ پر بہت ہی پاکیزہ چھپی ہے۔ قیمت عہ رکھی گئی ہے۔ اس کے عنوانات سے اس کی اہمیت اور تلاش جستجو کا اندازہ ہو سکے گا۔ ۱۔ مثنوی کا درجہ اصناف شعر میں۔ ۲۔ اردو مثنوی کے اولین نمونے۔ ۳۔ طویل تر مثنویاں ۴۔ قدیم مثنوی کا سنہری زمانہ۔ ۵۔ بیجاپور کی مثنویاں۔ ۶۔ گولکنڈے کی مثنویاں۔ ۷۔ مغلیہ عہد کی متصوفانہ اور مذہبی مثنویاں۔ ۸۔ دور متوسط کی ابتدائی مثنویاں۔ ۹۔ دور متوسط میں مثنوی کی ترقی اور ۱۰۔ مثنوی جدید دور میں۔ ہر موضوع پر سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں اور مکمل معلومات درج ہیں۔

"کاغذ کی ناؤ" مدیر سب رس کی مختصر نشری تمثیلوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں چھ مختصر ڈرامے شامل ہیں جن میں سے پہلے دو کاغذ کی ناؤ اور قیدی دو ایکٹ کے ہیں اور بقیہ چار یعنی تماشا، اہل کرم

۲۔ منڈر۔ ۳۔ بھیک اور ۴۔ گناہ ایک ایکٹ کے۔

یہ سب غریبوں کی زندگی کے عکس ہیں۔ ان کے ذریعہ سے "انسان دوستی" کے احساسات کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے جو ہر انسان کے دل میں ہیں۔ تمام ڈرامے طبعزاد ہیں۔ البتہ "گناہ" قاضی نذر اسلام کی نظم "طوائف" سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے۔ ان ڈراموں میں مصنف کے دل کی دھڑکن اور روح کی تڑپ نے لفظی پیکر اختیار کر لیا ہے۔ کتاب ۴۰ صفحات پر جدید طرزِ طباعت و ترتیب کے ساتھ شایع ہوئی ہے اس کا سرورق بھی شاعرانہ ہے قیمت صرف عہ ۴ ر

سب رس کے آئندہ شمارے | افسوس ہے کہ کاغذ کی گرانی کی وجہ سے ہم اسّی صفحات سے زیادہ شایع نہیں کر سکتے ورنہ ایسے اعلیٰ پایہ کے اور دلچسپ مضمون اور مقالے ہمارے ہاں موجود ہیں کہ ہم ہر ماہ دو سو صفحوں کا رسالہ شایع کر سکتے ہیں آئندہ دو شماروں کے چند مضمونوں اور نظموں کے نام یہ ہیں۔ ۱۔ صحافت اور اردو۔ بدر شکیب۔ ۲۔ دہلی۔ سیماب اکبر آبادی۔ ۳۔ کیچ کمالات۔ سراج الدین احمد نیر۔ ۴۔ تماشہ کی دنیا۔ مبارز الدین احمد ۵۔ فلسفہ کی حکمت صابر کوسگوی ۶۔ سراج اورنگ آبادی کا عرس اور تکیہ۔ ڈاکٹر زور۔ ۷۔ رائج اردو کی اصلاح۔ ضیاء الدین انصاری۔ ۸۔ اشتہار بازی سید وہاج الدین شمیم ۹۔ پیشۂ وکالت۔ نواب اکبر یار جنگ۔ ۱۰۔ ننھا کچہ۔ سجاد مرزا۔ ۱۱۔ ان دیکھی دیوی کے گیت۔ حفیظ جالندہری ۱۲۔ محبت سے پہلے اختر انصاری۔ وغیرہ ان کے علاوہ متعدد دلچسپ افسانے بھی۔

سب رس کا اردو نمبر | ہم نے لکھا تھا کہ اس سال کا پہلا شمارہ ہماری توقع سے زیادہ مقبول ہوا۔ اس کے ثبوت کے طور پر ہم اپنے بعض ہمعصروں کے خیالات ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

معارف ۔ فروری ۱۹۴۰ء۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدر آباد اردو زبان کا خدمت گزار ادارہ ہے اسی سلسلہ میں اس نے سب رس کا یہ اردو نمبر نکالا ہے اس میں اردو زبان اور ادب سے متعلق بہت سے مضامین ہیں جو بیشتر تاریخی اور ادبی پہلوؤں کے متعلق ہیں اب اردو کے خدمت گزاروں کو ایسے تعمیری مسائل پر لکھنے کی ضرورت ہے جو اردو زبان کی زندگی اور اس کی ترقی و توسیع کے لئے مفید ہو۔ ادبیاتِ اردو کام کرنے والا ادارہ ہے۔ اس کا یہ نمبر اس قسم کے مضامین سے خالی نہیں ہے " ادب اردو کا مطالعہ" ڈاکٹر حفیظ سید "خواتین دکن کی ادبی خدمات" نصیر الدین ہاشمی " دکن کے چند کالستھ شعرا" ہسندہ راج سکسینہ "ضلع" مرزا عصمت اللہ بیگ " ہندوستان کی زبان" اہم سلسلے مفید مضامین ہیں نئی مطبوعات کے تعارف کا سلسلہ بھی مفید ہے مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا افسانہ "حیدرآباد تا دتی" بھی دلچسپ ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے متعدد دلچسپ مضامین و معلومات ہیں نظم کا حصہ بہت اچھا ہے۔

پروفیسر حامد حسن صاحب قادری (آگرہ)

اردو نمبر آپ نے خوب نکالا ہے بعض خطوط اور بعض تصویریں سب سے زیادہ قابلِ قدر ہیں مختلف معلومات خوب جمع کر رہے ہیں بلاشبہ ادارہ نے بڑی کوشش و کاوش سے یہ مجموعہ مرتب کیا ہوگا۔ مینکش صاحب نے بہت اچھا کیا کہ ڈاکٹر ندوی کے " علی الرغم " مضمون چھاپ دیا۔ ان کا نوٹ بہت خوبصورت ہے۔ رسالہ کی کامیابی پر مینکش صاحب کو پرجوش مبارک باد دیجیے۔ (باقی)

"ادارہ"

نٹشے — گوئٹے — شوپنہار

حیدرآباد کے عاشور خانے

تاریخوں کے مطالعہ اور حیدرآباد کے عاشور خانوں اور علموں کے دیکھنے کے بعد یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں سب سے پہلے سنہ ۱۰۰۱ھ میں عاشور خانے بنائے اور علم مبارک استاد کئے گئے۔ سب سے پہلا اور اہم تاریخی عاشور خانہ وہ ہے جو اس وقت بادشاہی عاشور خانہ کہلاتا ہے، اور جس کے وسطی محراب میں کارکاشی میں بخطِ طغرا یہ کتبہ لکھا ہوا ہے۔ "نصر من اللہ و فتح قریب و بشر المومنین غلام علی محمد قلی قطب شاہ سنہ احدی والف"۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا آغاز سنہ ۱۰۰۱ھ میں ہوا اور ساتھ ہی غربی دیوار کے ایک کتبہ سے یہ پتا چلتا ہے کہ اس کی تعمیر اور آرائش سنہ ۱۰۰۵ھ تک جاری رہی۔ چنانچہ وہاں بھی آیۃ الکرسی کے بعد ابوالمظفر محمد قلی قطب شاہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کے ساتھ ہی سنہ ۱۰۰۵ھ مکتوب ہے۔ یہ اصل تعمیر کا زمانہ ہے، یوں تو بعد کو عبداللہ قطب شاہ نے بھی اس کی تزئین و آرائش میں اضافہ کیا۔ اس عمارت کی تعمیر میں ساٹھ ہزار روپے صرف ہوئے۔ اب اس کا صرف اندرونی دالان موجود ہے۔ بیرونی دالان بعد کو منہدم ہو چکا تھا اور نواب میر نظام علی خان آصفجاہ ثانی کے عہد میں اس کو دوبارہ میر نوازش علی خاں شیدا کے زیر اہتمام بنایا گیا۔ یہ عمارت ۱۲ گز یعنی ۳۶ فٹ بلند تعمیر کی گئی تھی اور اس میں چودہ معصوموں کے نام کے جو چودہ علم استاد کئے گئے تھے ان کو عہد محمد قلی کے استادان نادر اور ہنرمندان ماہر نے اپنے اپنے کارناموں کے طور پر بنا کر پیش کیا تھا۔ چودہ گز کے زربفتی نشان جن میں شاہی شعر بافوں نے قرآنی آیتیں اور ادعیۂ ماثورہ نہایت کمال کے ساتھ بُن دی تھیں، ان کو چڑھائے جاتے تھے۔ اور عاشور خانے کے صحن میں طاقچوں کی دس صفیں ایک دوسرے کی متوازی قائم کی گئی تھیں۔ ہر صف میں تقریباً ایک ہزار طاقچے بنائے گئے تاکہ اتنے چراغ روشن ہوں۔ پہلی شب میں پہلی صف روشن کی جاتی، دوسری میں پہلی اور دوسری، اسی طرح دسویں کی رات کو پوری دس صفیں روشن ہو جاتی تھیں اور دس ہزار چراغوں کی روشنی سے عاشور خانہ بقعہ نور بن جاتا۔ ان کے علاوہ بڑے بڑے چراغ دان بھی بصورتِ اشجار پر شاخ بنائے گئے جن میں ہر ایک میں ایک سو بیس (۱۲۰) شمعوں اور چراغوں کی روشنی کا انتظام کیا گیا۔ ان پیتلی جھاڑوں کو عاشور خانوں کے دالانوں کے برابر رکھا جاتا تھا اور خود ایوان میں اور حوض کے اطراف قدِ آدم سے بھی بلند کافوری شمعیں ہر رات روشن کی جاتی تھیں۔ عصر کے وقت خود بادشاہ بنفشی رنگ کا لباس پہن کر آہستہ رفتار سواری میں یا سیاہ مخمل کے سنگاسن میں بیٹھ کر جبکہ سیاہ پوش مقربین، مجلسیوں، امیروں، اور وزیروں کے ساتھ الاوہ میں آتا اور دو خوش آواز ذاکران شاہی سنگاسن کے دونوں طرف خود بادشاہ کے مصنفہ مرثیے پڑھتے ہوئے آتے

جب بادشاہ عاشور خانے کے دروازہ میں داخل ہوتا تو سواری سے اتر کر برہنہ پا آتا اور اپنے ہاتھ سے علموں پر پھول چڑھاتا اور شام کے وقت تمام کافوری شمعوں اور ایوان کے برابر کے چراغوں کو بھی اپنے ہاتھ ہی سے روشن کرتا۔ اس وقت مرثیہ خوانی ہوتی رہتی اور ائمہ معصومین کی مدحیں پڑھی جاتیں۔ چراغ روشن کرنے کے بعد ایک فصیح و بلیغ خطیب کھڑے ہو کر شہدائے کربلا کی امداح کے لئے بآوازِ بلند فاتحہ پڑھتا جس کے بعد بادشاہ دولت خانۂ عالی کی طرف واپس ہو جاتا اور وہاں کے عاشور خانے میں

امرا و وزرا کے ساتھ آدھی رات تک ماتم و مرثیہ خوانی میں بسر کرتا۔ یہاں کندوری (جو بغیر گوشت کے قسم قسم کے تکلفات سے تیار کی جاتی) اور شربت اور سک نمک وغیرہ کی تقسیم عمل میں آتی۔

ابھی یہ ذکر گزرا کہ دولت خانۂ عالی میں بھی ایک عاشور خانہ بنایا گیا تھا۔ یہ اس وقت موجود نہیں ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ نے جب بادشاہی عاشور خانہ کی بنیاد رکھی اس کے ساتھ خود دولت خانۂ عالی میں بھی ایک خاص عاشور خانہ تعمیر کیا ہو غالباً اُس جگہ واقع تھا جہاں اب مٹی کا شیر موجود ہے۔ کیونکہ اسی کے اطراف اکناف میں شاہی محلات بنائے گئے تھے۔

اس عاشور خانہ کے علم کوتوال شہر کے اہتمام میں رہتے تھے اور چھٹی محرم کو میدانِ دلکشائے وسیع الفضائے داد محل میں لائے جاتے تھے اس میدان میں اب چوک کی گھڑی مسجد اور محبوب چوک واقع ہے۔ اس میدان کے اطراف و اکناف کے بازاروں اور راستوں پر چراغاں کئے جاتے اور تابوتوں اور تعزیوں کو بہترین زیب و زینت اور قسم قسم کی نقاشی اور تکلفات سے آراستہ کرکے اور ان کے اندر اور باہر بہت سی شمعیں روشن کرکے لے آتے تھے۔ فانوسوں مشعلوں اور چراغوں کا ایک انبوہ علموں کے سامنے چلا آتا۔ داد محل کے نیچے دونوں طرف چراغ روشن رہتے اور درمیان میں علم۔ داد محل کی چوتھی منزل پر سے جب بادشاہ اس چراغ زار کو نظر ڈالتا تو عزاداروں کے شور و شیون سے اس پر بھی رقت طاری ہو جاتی اور وہ انکے لئے اپنے یہاں سے نان ریزے کے خوان روانہ کرتا اسی طرح اس عاشور خانہ دولت خانۂ عالی کے علم ایام عاشورہ کے ختم تک اس میدان میں لائے جاتے تھے۔ لیکن نویں محرم کی رات میں بجائے میدانِ داد محل میں لے جانے کے اس عاشور خانے کے علموں کو میدانِ دربارِ خسروی یعنی چار کمان کے میدان میں لے آتے تھے۔ اس رات بادشاہ پھول چڑھانے اور علموں کو آراستہ کرنے کے بعد خاصے کی کافوری شمعیں جملہ مجلسیوں مقربوں اور اور حجاب عظیم الشان کو اپنے ہاتھ سے تقسیم کرتا اور اس طرح تمام مجلسی، سردار، اعیان، و اکابر اور دولت خانۂ شاہی کے جملہ چھوٹے بڑے ملازم اس عاشور خانہ سے ہاتھوں میں شمعیں لئے ہوئے نکلتے اور میدانِ چار کمان میں پہنچتے۔ اس میدان کے ایوانوں کے سامنے چالیس چالیس فیٹ بلند ہاتھی، شیر اور درخت سرو وغیرہ کی عجیب دل پذیر شکلیں بنا کر روشن کی جاتی تھیں۔ اور چاروں کمانوں پر بھی سر سے پاؤں تک طاقوں محرابوں اور طرح طرح کے درختوں کے نقشے اتار کر ان میں روشنی کی جاتی تھی۔

جب محل کے عاشور خانہ سے علم باہر نکلتے تو بادشاہ تقریباً پانچ سو (۵۰۰) قدم علموں کے ساتھ اُس چوڑی دیوار پر سے جاتا جو اس کمان پر پہنچتی تھی جو چار مینار کے مقابل ہے اور جس کو آج کل میوے والوں کی کمان کہتے ہیں۔

دسویں محرم کی صبح کو مقربین وزرا و امرا، اور ملازمین اور خاص غلام علموں کے آگے مرثیے پڑھتے ہوئے محل کے عاشور خانے کی طرف آتے تو بادشاہ بھی ماتم کرتا ہوا ایوان الاوہ کی قریب کی مسجد میں پہنچتا۔ یہ مسجد اب بھی مٹی کے شیر کے قریب موجود ہے اس مسجد میں قصۂ شہادت اور گرفتاری حرم محترم سنایا جاتا اور شہدا کے لئے فاتحہ اور بادشاہ کے لئے دعا پڑھی جاتی اس کے بعد حکم دیا جاتا کہ دو سو یتیم سید زادوں کو پیش کیا جائے۔ ان کو نفیس لباس اور رقم دی جاتی تھی۔

ان دو عاشور خانوں کے سلسلہ میں ہمیں قلعہ گولکنڈہ کے اس تاریخی عاشور خانے کی طرف اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے

جو ابھی محفوظ ہے۔ اور جو حسینی علم کا عاشور خانہ کہلاتا ہے۔ اس میں جو علم مبارک اس وقت تک محفوظ ہے وہ موجودہ معلومات کی بنا پر حیدرآباد کا قدیم ترین تاریخی علم ہے کیونکہ شہر کے بادشاہی عاشور خانے کے علم قدیم نہیں ہیں۔ بلکہ حضرت آصفجاہ ثانی کے عہد کے ہیں۔ قلعہ کے حسینی علم کے درمیانی حصہ میں طغرے کی شکل میں " نصر من اللہ و فتح قریب و بشر المومنین غلام علی محمد قلی قطب شاہ سنہ احدی والف " بطور جالی کے کھدا ہوا ہے۔ یہ علم پیتل کا نہیں بلکہ مرکب فولادی دھات کا بنا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں پیتلی علم نہیں بنائے گئے۔ بلکہ سفید فولادی علم۔ اور بادشاہی عاشور خانہ کے علم بھی ایک روایت کے مطابق اگر قیمتی پتھروں یعنی جواہر کے نہ تھے تو فولادی ہی ہوں گے۔

قلعہ میں شاہی مسجد صفا کے برابر جو شاہی عاشور خانہ اب بھی موجود ہے۔ اس کے علم مبارک پیتلی ہیں۔ اور نہایت شان دار۔ ان کی بناوٹ اور سجاوٹ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عاشور خانہ اور علم دونوں بعد کے بنائے ہوئے ہیں۔ کیونکہ سنہ ۱۰۰۱ھ کا وہ علم مبارک جس کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے نسبتاً سادہ ہے۔ البتہ اس کی درمیانی مذکورہ عبارت کے اطراف مدور جالیاں ہیں جن میں ائمہ معصومین کے نام بنائے گئے ہیں۔

ان چار عاشور خانوں کے بعد پانچواں قدیم عاشور خانہ حیدرآباد کا حسینی علم ہے۔ یہ علم سلطان محمد علی قطب شاہ ہی کے عہد میں اس کے ذوق و شوق کو دیکھ کر لایا گیا تھا۔ لکھا ہے کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی سیف دستی کو ایک علم میں لگا کر علی آقا ایرانی حیدرآباد لے آئے تھے جب ان کی آمد کی خبر بادشاہ کو ہوئی تو اس نے استقبال کیا اور اسی مکان میں استادہ کرنے کا حکم دیا جو اب عاشور خانۂ حسینی علم کہلاتا ہے۔ علی آقا نہ صرف انعام و اکرام سے مالامال ہوئے بلکہ اس علم کی خدمت گزاری بھی انہی کے تفویض ہوئی اس عاشور خانہ سے ملحقہ مسجد اور باؤلی انہی علی آقا کی بنائی ہوئی ہے۔ ان کے نواسے داراب بیگ نے بعد کو سنہ ۱۱۵۱ھ میں اس قدیم عاشور خانہ کی اصلی عمارت کو بدل کر مشرق رویہ بنا دیا اس وقت سے یہ عاشور خانہ اسی حالت میں اب تک موجود ہے۔ اس کے مصارف کے لئے سرکار سے سالانہ چار ہزار روپے کی جاگیر بھی دی گئی ہے۔ یہ علم بھی غرہ سے عاشورۂ محرم تک ہر سال استادہ ہوتے ہیں۔

حسینی علم کے بعد بی بی کا علم نعل مبارک دارالشفاء اور پنجہ شاہ کے عاشور خانے حیدرآباد میں مشہور تاریخی اہمیت رکھتے ہیں لیکن یہ سب سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے ہیں۔ چنانچہ پنجہ مبارک کے سلسلے میں جو فرمان نافذ ہوا تھا وہ اب تک موجود ہے۔ اور پنجہ شاہ کے عاشور خانے میں ایام عاشورہ میں آویزاں کیا جاتا ہے۔ اس پنجۂ مبارک کو درویش علی ابن شیر علی اپنے ساتھ نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ سے لے آئے تھے اور ان کے استقبال کے لئے عبداللہ قطب نے حکام کرام اور وزرائے عظام کو روانہ کیا تھا اور ایک بہت اچھے مکان میں اس کو نصب کیا گیا تاکہ ہر جمعرات کو لوگ اس کی زیارت کر سکیں اس عاشور خانے کے خرچ لنگر کے لئے بھی بادشاہ نے احکام جاری کر دیے۔

(باقی آئندہ)

سید محی الدین قادری زور

سلام بدرگاہِ امامِ ہمام

السلام اے مہرِ افلاکِ امامت السلام
السلام اے نیرِ برجِ شرافت السلام

السلام اے وجہِ تخلیقِ زمین و آسماں
السلام اے سرِ پنہانِ حقیقت السلام

السلام اے باغبانِ گلشنِ دیں السلام
السلام اے سالکِ راہِ طریقت السلام

السلام اے رہنمائے اولیاء و اصفیا
السلام اے ہادیِ خضرِ ہدایت السلام

السلام اے لالۂ بستانِ زہراؑ و علیؑ
السلام اے بلبلِ باغِ نبوت السلام

السلام اے کشتۂ تیغِ رضائے لم یزل
السلام اے تشنۂ جامِ شہادت السلام

السلام اے بادشاہِ انس و جاں کون و مکاں
السلام اے مالکِ روزِ قیامت السلام

السلام اے مبتلائے گردشِ چرخِ زبوں
السلام اے رہروِ دشتِ حقیقت السلام

سر کٹا کر امتیازِ حق و باطل کر دیا
السلام اے گوہرِ بحرِ صداقت السلام

راکبِ دوشِ محمدؐ شافعِ روزِ جزا
السلام اے صاحبِ تاجِ شفاعت السلام

نورِ چشمِ فاطمہؑ ابنِ علیؑ سبطِ نبیؐ
السلام اے جلوۂ نورِ رسالت السلام

حاضرِ دربارِ والا ہے اثیمہ دلفگار
باریابی کی ملے اس کو اجازت السلام

لطف النساء بیگم صاحبہ اثیمہ

اردو امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اردو کی چند نصابی کتابیں جو سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہیں۔

اردو دانی

- اردو دانی کی پہلی کتاب
- اردو دانی کی دوسری کتاب (زیرِ طبع)

اردو عالم

- انتخابِ اردو (نظم و نثر)
- سیپارۂ دل
- قواعدِ اردو حصہ دوم ۱۰/
- مجموعۂ نظمِ حالی ۱۲/
- ملخصِ عروض و قافیہ
- تاریخِ ادبِ اردو (زیرِ طبع)
- فنِ انشا پردازی
- دنیا کی تاریخ یا دنیا کی کہانی
- سائنس کے کرشمے
- دفتری معلومات (زیرِ طبع)

اردو فاضل

- توبۃ النصوح ۱۵/
- صبحِ وطن
- پردۂ غفلت ۱۰/
- کیمیاگر اور دیگر افسانے
- یادگارِ غالب
- بانگِ درا
- فکر و نشاط
- دیوانِ غالب ۱۲/
- انتخابِ کلامِ میر
- سراجِ سخن ۱۲/
- تاریخِ ادبِ اردو (زیرِ طبع)
- آبِ حیات آزاد
- مقدمۂ شعر و شاعری حالی
- موازنۂ انیس و دبیر شبلی
- روحِ تنقید ڈاکٹر زور
- معاشیات ڈاکٹر ذاکر حسین
- اجتماعی زندگی کی ابتدا، محمد عاقل ۱۰/
- معلوماتِ سائنس آفتاب حسن
- فلسفۂ جذبات عبدالماجد
- آئینِ حکومت مجید سالک
- محاسنِ کلامِ غالب ڈاکٹر عبدالرحمٰن
- سرگذشتِ غالب ڈاکٹر زور

ایک انوکھی دعوت[۱]

دنیا کے ہر حصے میں برس کے بارہ مہینوں میں ایک زمانہ ایسا ضرور آتا ہے جو اُس ملک کا موسمِ بہار کہلایا جاسکتا ہے۔ ہمارے ملک میں برسات کا زمانہ "موسمِ بہار" کہلاتا ہے۔ لیکن میرے خیال میں ہمارے ملک میں جاڑوں کے دن دیہات والوں کے لئے موسمِ بہار سے کم نہیں۔ اِس زمانہ میں فصل ربیع و تابی کی کھیتیاں لہلہاتی نظر آئینگی۔ اور دیہاتیوں کے موسمی تحفے بوٹ (چنے)، گنّے، بیر وغیرہ جو اُن کے لئے نعمت ہوتے ہیں بہ افراط ہوں گے۔ اِس زمانہ میں بڑے اور بچوں کی خوشی کا عالم بیان نہیں کیا جاسکتا۔

میں شہری ہوں، اور اُس پر فخر بھی ہے۔ مگر گاؤں پر رہنے سے دیہاتیوں کے حالات سے واقف ہوں۔ اور گاؤں کی زندگی میں جو لطف ہے اُس سے بہرہ اندوز ہوں۔ میں تو کہوں گی: موسمی تبدیلیوں کا جو لطف دیہاتی اٹھاتے ہیں، وہ ہمارے شہر والوں کو میسر نہیں۔

میں "بیر" پر کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ ہم میں سے بہت سے لوگ ہوں گے، جو بیر کے نام سے ناک بھوں چڑھائینگے۔ دراصل یہ گاؤں والوں کے حصے کے ہوتے۔ آپ انہیں کے "نقطۂ نظر" سے دیکھئے۔ جن کے نزدیک یہ ہندستانی آلو بخارے اور ایک بڑے موسمی میوے سے کم نہیں۔ ایک قصہ سنئے، جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ مجھے یاد ہے۔ میرے بچپن میں میرے والد صاحب کے دورہ کے زمانے میں اُن کے پاس ایک مقدمہ پیش ہوا تھا۔ ایک بہت بڑا اور پرانا بیر کا درخت تھا جو گاؤں کے غریب دھیڑوں کی ملکیت تھا۔ مگر گاؤں کے دوسرے مرفہ الحال لوگوں نے اپنا قبضہ کر لیا تھا۔ جبکی بڑی لڑائی تھی۔ آخر والد نے غریب دھیڑوں کو قبضہ دلا دیا تھا۔ جس سے غریب بہت ہی خوش ہو گئے تھے۔

شاید آپ کو بیر پسند نہ ہوں۔ مگر کیا کسی سرسبز کھیتوں کے درمیان یا کسی ٹیلے (وہ دیہاتی باغ جو باؤلی کے دامن میں ہمیشہ شاداب رہتا ہے) میں گھنے بیر کے درخت کے نیچے، لال لال، پیلے پیلے گدرے گدرے کھٹے میٹھے بیر دیکھکر یکبارگی آپ چند دانے ہی چننے پر مجبور نہ ہو جائینگے؟

یہاں مزرعہ (Farm) پر جہاں دور دور تک کھیتیاں چلی گئی ہیں۔ ہمارے مکان سے کوئی دو ایک فرلانگ پر کچھ ایسے ہی موقع پر ایک بہت گھنا بیر کا درخت ہے۔ چنانچہ اسے دیکھکر دل میں گدگدی سی پیدا ہوئی۔ اور جی چاہا کہ چند بے تکلف بہنوں کو اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے مدعو کروں۔

---

[۱] پچھلے سال بزمانہ قیام صدر مزرعہ پر بھی یہ مضمون حوالہ قلم کیا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ زندگی میں زندہ دلی، خوش طبعی، اور خوشگوار بندیلیاں ضروری ہوتی ہیں۔ تاکہ انقباض اور فکر مندی کار وعمل ہو کر عام صحت برقرار رہے۔ جو انسان زندہ دل ہوتا ہے، اُسے باغوں کی سیر، تفریحی سیر وسفر۔ پکنک وغیرہ نئی نئی باتیں سوجھتی ہیں۔ ان سے انسان کے افکار وآلام میں کچھ خوشگوار تبدیلی ضرور ہوا کرتی ہے۔

کہتے ہیں یورپ میں ایسی خوشکن تبدیلیوں کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ تعطیل کے دن، اور چھٹیوں کے زمانے وہاں کے لوگوں کے لئے "پیام نشاط" ہوتے ہیں۔ فرصت کے اوقات اس لطف ومسرت سے گذارے جاتے ہیں، کہ حیات میں تازگی اور طبیعت میں اولوالعزمی پیدا ہوتی ہے اور زندگی کی کشمکش انسان کے لئے بار نہیں ہو جاتی۔

مگر ہمارے غریب ملک میں ان باتوں کو ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ اور نہ اسے کوئی اہمیت حاصل ہے۔ یہی باعث ہے کہ ہمارے جذبات ہمارے احساسات اور ہماری زندگیاں پژمردگی سے معمور، اور جینا ہمارے لئے دُوبھر ہوتا ہے۔

ہاں تو میرا جی چاہا کہ اپنی اُن بے تکلف بہنوں کو جو چار دیواری کے اندر پر تکلف وسراپا تمکنت زندگی بسر کرنے کی عادی ہوتی ہیں، کھلی فضا میں "چہل پہل" کا موقع اور ایک سادہ تفریح بہم پہونچاؤں۔ اس کے لئے میں نے شنبہ کا دن موزوں سمجھا۔ کیونکہ اُس دن فارم کے آدھے دن کی تعطیل کی وجہ دوپہر سے کوئی آدمی نہیں ہوتا۔ جس سے مستورات آزادی سے پھر سکتی اور کھلی فضا میں سانس لے سکتی ہیں۔

چنانچہ شنبہ کے ایک دن سہ پہر میں بیر کھانے کے لئے چند بہنیں میرے گھر تشریف لے آئیں۔ پانچ بجے سے پہلے ہم نے درخت کا رخ کیا۔ راستہ میں دو طرفہ تور، جوار، گیہوں کے لہلہاتے کھیت عجب بہار دے رہے تھے۔ بہنوں کی سبک خرامی نے شام ہی کر دی، دو ایک فرلانگ کا فاصلہ اُن کے لئے ایک مسافت تھی۔

میں نے ایک لڑکے کو بیر گرانے کے لئے پہلے ہی بھجوا دیا تھا۔ اُس نے سب کو آتا ہوا دیکھکر درخت پر پتھر برسانے شروع کئے جس سے بہنوں میں امنگ پیدا ہوئی، اور جلد جلد درخت کے نیچے جا پہونچیں۔ دیکھا! کہ نیچے بیروں کا بچھونا ہو رہا ہے۔ پھر سب نے جس شوق ومسرت وعجلت سے بیر چننا شروع کئے، وہ میرے لئے قابل دید منظر تھا۔ جسے دیکھکر میں بیحد مسرور ہو رہی تھی۔

ایک بہن نے کہا کہ میں ایک بڑی دستی اسی لئے لائی ہوں کہ خوب سے بیر جمع کروں۔

ایک نے کہا کیا ہی کھٹے میٹھے بیر ہیں!

میں نے کہا یہ لطف بھی دیکھئے بیر کتنی وضع کے ہیں۔ کوئی بڑا کوئی چھوٹا۔ کوئی پکا، کوئی گدرا، کوئی کھٹا، کوئی میٹھا۔ ایک اور بہن نے کہا بیر تو کچھ ایسے قابل تعریف نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ نہ بیر ہی قابل تعریف ہیں اور نہ بیر کھانا ہی پسندیدہ ہے۔ مگر اس کیفیت کو دیکھئے۔ اس سادگی وبے تکلفی اور آزادی کا اندازہ کیجئے۔ کیا آپ نے ایسی کھلی فضا میں درخت کے نیچے خود کبھی بیر بھی چنے ہیں؟

اتفاق سے مدارسِ نسواں (مرہٹی اور اردو) کی صدر معلماۃ بھی موجود تھیں۔ میں اُن کے بیر کھانے پر بہت محظوظ ہو رہی تھی۔ کیونکہ مدرسوں میں ان لوگوں کا وہ رعب داب ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ! اُن کی تمکنت اُن کی تادیب کی بدولت معصوم بچیاں اپنی سادگی اور طفلانہ حرکتوں کو بھول جاتی ہیں۔ مگر ان کی اس تفریح میں بھی کتنی سادگی تھی!

غرضکہ مغرب کے وقت سب بیحد مسرور جلد جلد گھر لوٹے' تو میں نے کہا کہ بھئی! آپ لوگ بھی عجیب ہیں۔ میں نے جو کہا تھا کتنے قسم کے بیر ہیں تو اس پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ بات یہ ہوئی کہ ہم نے آپ بہنوں کو یہ "انوکھی دعوت" تو دیدی مگر بعد میں یہ معلوم کر کے کہ ابھی اس درخت کے بیر نہیں پکے ہیں۔ ہمیں فکر ہوئی بالآخر ہمکو اور اور جگہ سے بیر منگوانے پڑے جو ملازم لڑکے نے بڑی خوبی سے درخت کے نیچے بکھیر دیئے تھے۔

بہنوں نے خوب قہقہے لگائے۔ اور بعض نے مذاقاً اُس لڑکے کو برا بھلا بھی کہنا شروع کیا جس نے اپنا پارٹ بڑی خوبی سے ادا کیا تھا۔ سب کو دور سے آتا ہوا دیکھکر درخت پر پتھر برسانے شروع کئے تھے۔ اور آخر میں مزید بیر گرانے کی خواہش پر کہا تھا کہ "آپ کے آنے سے پہلے ہی میں سب بیراں گرادیا"

شاید یہ ایک دہوکا تھا۔ مگر پرلطف وخوشگوار اور دلچسپ بھی۔ جسے میں نے روا رکھا۔

حفیظ جمال (مسز برہان الدین حسین)
(ناندیڑ)

غزل

بہارِ گل کے دن ہیں' بات رکھ لے باغباں میری
یقیں مانو! نہ خالی جائیگی آہ و فغاں میری

اٹھائیں عشق کی کڑیاں خوشی سے آخری دم تک
بجا ہے ناز ہو جتنا مجھے اس سرفرازی پر

تری گردش سے میں ڈرتا نہیں' قوت دکھا ایسی
فدا کر دی ہے اپنے دل کی دنیا تیرے جلووں پر

جو تجھ کو بھولے بیٹھا ہے کبھی تو آ ہی جائے گا
اسی باعث تو میں بھی جانشینِ قیس بن بیٹھا

مزا کچھ آئیگا جوشِ جنوں کا موسمِ گل میں
میں اپنے جذبۂ دل کو دبائے ہوں اسی ڈر سے

محبت میں فنا ہونے پہ یہ عقدہ کھلا عارف

دعاؤں سے بدل جائے گی یہ آہ و فغاں میری
بہت بیتاب کر دیں گی تمہیں بیتابیاں میری

مبارکباد کے قابل ہے جانِ ناتواں میری
تمہاری کاکلیں بڑھکر بنی ہیں بیڑیاں میری

جو قسمت میں بھی رخنے ڈالدے اے آسماں میری
ترے الطاف کا باعث بنیں تبدیلیاں میری

اُسے بیتاب کر دیں گی یہ اک دن ہچکیاں میری
زمانے کی زباں زد ہو چکی ہے داستاں میری

اڑائے جائیں گے کانٹے قبا کی دھجیاں میری
کہیں رسوا نہ کر دیں آپ کو رسوائیاں میری

مبارک باد دیتی ہے حیاتِ جاوداں میری

قاضی میر لطف علی عارف

سوئستان کی دیہاتی زندگی

۱۲ راگسٹ تا ۱۹ ر ستمبر

(گو اس ایک سال میں یورپ کی سیاسی بساط میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی ہے تاہم کیفیات مندرجہ اسلئے دلچسپ ہیں کہ ان سے جرمنی کے الحاق چیکوسلوفاکیہ سے پہلے کی وسطی یورپ کے امن و امان کی یاد تازہ ہوتی اور وہاں کی دیہاتی زندگی کا ایک مرقع سامنے آجاتا)

اس موجودہ جنگ سے پہلے شاید یورپ کے کسی ملک کے داخلے میں اسقدر آسانی نہ تھی جتنی سوئستان کے داخلے میں۔ سرحدی قصبے والورب کے اسٹیشن پر پاسپورٹ افسر نے بالکل میکانی طریقے پر پاسپورٹوں پر مہر لگادی اور کسی سے یہ بھی نہیں دریافت کیا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ والورب سے لوزان (وہی لوزان جہاں موجودہ صدر جمہوریہ ترکیہ عصمت انونو نے اغیار کے حلق سے اپنے ملک کی آزادی کی دستاویز نکالی تھی) ایک گھنٹہ میں پہونچ گئے۔ لوزان پر ریل بدلتی تھی اور یہیں اس ملک کی مرفہ الحالی اور اعلےٰ معیار زندگی کا پہلا تجربہ ہوا۔ جنگ سے پہلے فرانس اور سوئستان کے سکّے قدر و قیمت میں بالکل مساوی تھے، یعنی ایک انگریزی پونڈ کے معاوضے میں دونوں ملکوں کے فرانک ۲۵ ۲۵ آتے تھے، لیکن اب فرانسیسی فرانک کی قیمت اسقدر کم ہوگئی ہے کہ ایک پونڈ کے ۱۸۷ آتے ہیں لیکن سوئس فرانک کی قدر پہلے سے بھی زیادہ ہے چنانچہ ۲۱ سوئس فرانک ایک پونڈ کے معاوضے میں ملتے ہیں۔ مرفہ الحالی کا ادنےٰ مظاہرہ یہ ہے کہ جب ہم نے ایک گاڑی سے دوسری میں اپنا اسباب رکھنے کے لئے قلی کیا تو معلوم ہوا کہ قلی کی مزدوری ہلکے اسباب ڈھونے کی نصف فرانک یعنی ۶ر فی بیگ ہے اور بھاری بکس اٹھانے کے پون فرانک یعنی تقریباً ۹ر دینے پڑتے ہیں۔

مجھے Beerenberg نامی ہوٹل جانا تھا جو (Seengen) نامی گاؤں میں واقع ہے اس لئے کہ میں نے اپنی اہلیہ کے مستقل قیام اور علاج کے لئے پہلے سے یہ مقام تجویز کیا تھا۔ لوزان سے ہمارا راستہ فرائی برگ اور سوئستان کے صدر مستقر برن ہو کر تھا، اور صرف چند گھنٹے ہی کے سفر میں اس عجیب و غریب ملک کی بوقلمونی عیاں ہوگئی۔ والورب اور لوزان میں فرانسیسی زبان بولی جاتی ہے، فرائی برگ میں فرانسیسی اور جرمن دونوں زبانیں اور برن میں صرف جرمن۔ ان زبانوں کے علاوہ ملک کے جنوب و مشرقی گوشے میں اطالوی اور اقصائے مشرق میں ایک خاص زبان یعنی رومانش بولی جاتی ہے جسے حال ہی میں ملک کی چوتھی "قومی" زبان کی حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ اس نسلی اور لسانی۔ تضاد کے باوجود سوئس لوگوں میں آپس میں ایسا اتفاق و اتحاد ہے کہ بیان سے باہر ہے۔

ہم لوگ (Aarau) کے اسٹیشن پر اترے جہاں ہم نے تار دیکر بریسٹن برگ سے موٹر منگائی تھی۔ آراؤ سے بریسٹن برگ تقریباً ۱۶ میل ہے۔ ہم دوپہر کے بارہ بجے نہایت درجہ بارش اور سردی کے عالم میں بریسٹن برگ پہونچے۔ ہوٹل زمانہ وسطی کے پرانی گڑھی میں ایک نہایت ہی پُرفضا جھیل (Hallwiler See) پر واقع تھا۔ اس گڑھی

میں ایک قدیم کتبہ اسوقت تک محفوظ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسکی بنیاد ۱۲۳۵ء میں رکھی گئی تھی۔ اسی کے متعلق بیسیوں ایکڑ کا باغ تھا جسمیں سیکڑوں درخت سیب، ناشپاتی اور انگور کے تھے۔ اس نواح میں سیب ناشپاتی اس افراط سے پیدا ہوتے ہیں کہ ان کا مشکل سے کوئی پرسان حال ہے اور سیکڑوں کچے پھل ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ جو سیب ہمارے یہاں روپیہ کے ۸، ۱۰ آتے ہیں وہ سوئٹستان کے اس حصے میں کوڑیوں کے مول ملتے تھے۔ تیز رو موٹر کی کھڑکیوں سے جب ہم نے ہزاروں درخت ایسے دیکھے جن پر لاتعداد سرخ سبز اور زرد پھل لگے تھے۔ تو ہم سمجھے کہ کسی پھلدار درخت کی کوئی قسم ہوگی اور نکلے وہ سیب اور ناشپاتی کے درخت۔ ہوٹل کے باغ کے ایک حصے میں ایک قدرتی چشمہ ابلتا تھا جسے ایک نہایت نفیس فوارے کی شکل میں مقید کر لیا گیا تھا۔ اور قریب ہی اس چشمے کے پانی کے کیمیاوی اجزا کا نقشہ آویزاں تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسکا پانی نہایت ہاضم اور بہت سی بیماریوں کے لئے ایک قدرتی علاج ہے۔

سوئٹستان کے اس گاؤں سے اس ملک کی مرفہ الحالی اور تمدنی معیار کا اظہار ہوتا تھا۔ ہمارے گاؤں (Seengen) کی آبادی صرف بارہ سو تھی، لیکن اسمیں بھی بڑے بڑے شہروں کی سی تمدنی آسائیاں، صفائی اور نفاست پائی جاتی تھی۔ گاؤں کی سڑکیں سب کی سب سمنٹ کی تھیں اور مکانات، جن میں سے بعض پندرہویں اور بعض سولھویں صدی کے بنے ہوئے تھے، نہایت ہی صاف شفاف تھے۔ کوئی ایسا مکان نہ ہوگا جسکے سامنے نفیس ترین پھولوں سے بھرا ہوا باغیچہ، ترکاری کی کیاریاں نہ ہوں اور بعض میں مرغیوں کے لئے تار کی جالی کے بڑے بڑے احاطے بنے ہوئے تھے۔ موچی کی دوکان اور اسکا مکان ایسا کہ ہمارے یہاں کے بعض امیروں کو بھی میسر نہیں، لہار کی دوکان میں بجلی کی مشین جسمیں نفیس پہیے دار ہل بنائے جاتے تھے، گاؤں میں کئی نانبائی خانے، اسباب خانہ داری کی دوکانیں اور تین چار ہوٹل تھے، اور راستہ میں مجھے بڑا ہی اچنبھا ہوا کہ آخر اس چھوٹے سے قصبے میں خریداری کون کرتا ہوگا۔ لوگ نہایت درجہ خلیق ہیں اور ہر شخص جب دوسرے سے ملتا ہے تو (Grüss gott) یعنی "آپ پر خدا کی برکت ہو" صرف کہتا ہے اور جاتا ہے تو (Adieu) یعنی خدا کی سپرد" کہہ کر رخصت ہوتا ہے۔ جتنے دن اس گاؤں میں رہنے کا اتفاق ہوا روز نت نئے انکشافات ہوتے گئے۔ تیسرے دن یہاں کا مطبع دیکھا جسمیں کسی چیز کی کمی نہیں۔ یہاں تک اس مطبع سے ایک ہفتہ وار اخبار (Seethaler) بھی نکلتا ہے جسکی کافی اشاعت ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے اپنی اہلیہ کے لئے دوا لکھوائی تو یہاں کے مقامی دواساز نے اس تمیز سے دوا دی کہ ہمارے ملک کے بڑے بڑے دواساز بھی شاید نہ دیتے۔ ایک معمولی بات ہے کہ آنکھ میں دوا ڈالنے کی قطرہ پچکاری شیشے کے نلکے میں رکھی آئی تاکہ باہر کی گرد و غبار نہ لگے۔

یورپ والے تاریخی آثار کو نہایت احتیاط سے رکھتے ہیں بلکہ مایۂ ناز سمجھتے ہیں۔ گاؤں میں دو مکان بھی ہیں جنمیں کسی زمانے میں یہاں کے امرا رہا کرتے تھے اور جنمیں کسی زمانے میں آسٹریا کے خاندان ہاپسبرگ کا بانی رودولف

بھی رہا تھا، چنانچہ اس مکان پر ایک کتبہ بھی نصب ہے۔ گاؤں سے تقریباً ایک میل پر اس نواح کا مشہور قلعہ (Schloss Hallwil) ہے جسکے بعض حصے ایک ہزار سال پرانے ہیں اور متعدد ایوانات سنہ ۱۱۱۳ء کے بنے ہوئے ہیں۔ جب پرانا حصہ سکونت کے قابل نہ رہا تو یہاں کے امیر نے ۱۵۵۸ء میں اسکی تجدید کی۔ اس قلعہ میں یہاں کے کاؤنٹ حال حال یعنی ۱۸۷۴ء تک رہتے تھے۔ اور جائے عبرت ہے کہ انکے قبضے میں قرب وجوار میں چالیس ایسی ہی گڑھیاں تھیں جو رفتہ رفتہ سب کی سب ہاتھ سے نکل گئیں۔ اب اس قلعہ کی نگہداشت حکومت کرتی ہے اور اس کی دیکھ بھال کے لئے دربان وغیرہ مقرر ہیں۔ قابل ذکر یہ بات ہے کہ حالانکہ اس گڑھی میں نہ کوئی بادشاہ رہا نہ شہنشاہ لیکن محض ایک تاریخی مقام ہونے کی وجہ دور دور سے دیکھنے کے لئے لوگ آتے ہیں اور بعض کمروں کو حکومت نے اسی طرح آراستہ کر رکھا ہے جیسے وہ اپنی شان کے زمانے میں آراستہ تھے۔

ہال ویل سے ذرا آگے بونس ویل کا چھوٹا سا گاؤں تھا جسکی آبادی مشکل سے (۸۰۰) ہوگی، لیکن یہاں بھی ایک اعلےٰ درجہ کا بجلی سے چلتا ہوا بسکٹ اور چاکلیٹ کا کارخانہ اور ایک بجلی سے چلتا ہوا دودھ کے صندوقوں کا کارخانہ دیکھا۔ یہ ہے اس خطے اور براعظم یورپ کی ذہنی اور مادی دولت کا مظاہرہ کہ اس ذرا سے ملک میں، جسکی آبادی ہمارے ممالک محروسہ سرکار عالی کی آبادی سے صرف ایک چوتھائی ہے، گاؤں گاؤں کارخانے قائم ہیں اور کہیں فقیروں اور منگتاؤں کا پتہ نہیں۔

دیہات [illegible] کے دوران قیام میں یہ [illegible] حتے الامکان روزانہ دس ساڑھے دس بجے نکل جاتا اور ۱۲ بجے کے وقت واپس آتا تاکہ دیہاتی زندگی اور قرب وجوار کے گاؤں کا تھوڑا بہت مطالعہ کرسکوں۔ ہمارے ہوٹل کے سامنے جو جھیل ہے اسپر صبح کے وقت عجیب وغریب منظر ہوتا تھا یعنی جھیل کے اوپر چار پانچ گز کی بلندی تک بادلوں کا جھرمٹ ہوتا ہے اور یہ سب دھوپ نکلتے ہی ہوا میں مل جاتے تھے۔ اس کے کنارے کنارے نہایت ہی پرلطف سڑکیں ہیں۔ میں ایک سڑک پر ہولیا اور قریہ (Tennwil) ہوکر (Meisterschwanden) نامی گاؤں تک چلا گیا جسکی آبادی مشکل سے ایکہزار ہوگی۔ اول الذکر قریہ میں زیادہ سے زیادہ دس بارہ گھر ہوں گے جسمیں کاشتکار رہتے ہیں۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی گھر ایسا ہو جسمیں پھول کے باغیچے اور سیب ناشپاتی کے درخت نہ ہوں۔ ایک آدھ "کاشتکار" کے گھر میں ریڈیو کی بلیاں بھی نظر آئیں اور ہر مکان میں برقی روشنی اور کھڑکیوں پر نہایت سلیقے سے پردے لگے ہوئے دیکھے۔ قریب ہی دخانی کشتیوں کا اسٹیشن تھا جہاں سے مختلف سمتوں میں چھوٹی چھوٹی دخانی کشتیاں جھیل کے مختلف سمتوں میں جاتی تھیں۔ مائسٹر شوانڈن کے قریب ہی گرجا ہے اور اسکے محاذ میں قبرستان جو کچھ اعلےٰ درجہ کے چمن کی طرح بنچوں، کرسیوں، پھولوں کے تختوں اور سرو وغیرہ کے درختوں سے سجا ہوا تھا اور خواہی نخواہی اسمیں بیٹھنے سے بجائے کسی طرح کے خوف کے مسرت اور فرحت ہوتی تھی۔ ایک ہمارے

یہاں کے ٹوٹے پھوٹے قبرستان ہوتے ہیں۔ مانا کہ اسلام میں مقبرے بنانا خالی از کراہت نہیں، لیکن کیا چمن لگانا بھی ممنوع ہے؟

۲۶ راگست کو ٹہلتا ٹہلتا ([illegible]) اگاؤں گیا جہاں کا چھوٹا سا گرجا ان اثرات کے اعتبار سے جو یقیناً اسلام کا یہاں کے مذہب پر پڑا ہے، نہایت دلچسپ نکلا۔ گرجا تیرھویں صدی کا بنا ہوا ہے اور اسکی محرابیں ہماری پرانی مسجدوں کی طرح بالکل گول تھیں۔ گرجا میں نہ بت نظر آئے نہ تصویریں نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت نہ صلیب، بلکہ ایک طرف کو منبر رکھا تھا اور سامنے قطار در قطار بنچیں پڑی تھیں۔ سوئستان کے اکثر گرجاؤں کی تنظیم زونگلی یا کالون کے اصول پر ہے، اور ان دونوں پر اسلامی توحید کا بڑا اثر پڑا، چنانچہ کو انھیں طرح طرح کی اذیتیں پہونچائی گئیں، دیس نکالا دیا گیا لیکن یہ اپنے اپنے حلقوں کے گرجاؤں سے بت پرستی کے تمام لوازمات نکال دینے میں کامیاب ہوئے۔ شمالی سوئستان میں رومن کیتھولک آبادی بھی ہے لیکن مختلف مذاہب والوں میں مکمل رواداری کا جذبہ ہے اور کہیں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ توحید پرستوں اور مورتی پجاریوں کے درمیان شمہ بھر بھی مذہبی کشمکش پائی جاتی ہو۔

سوئستان کے دیہاتی راستوں میں ایک خاص بات دیکھنے میں آتی ہے کہ جنگل میں جگہ جگہ یک بیک پانی کی ٹونٹیاں لگی ملتی ہیں جنھیں سے مسلسل پانی بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ میں نے پہلے تو اسپر بڑا تعجب کیا کہ اسقدر تنظیم کے باوجود اسکا انتظام نہیں ہے کہ جو شخص پانی لے چکے وہ ٹونٹی کو بند بھی کر دے، اور جب بعض ٹونٹیاں بالکل کھلی ہوئی ملیں جنھیں بند ہی نہیں کیا جا سکتا تو میرا تعجب اور بھی بڑھ گیا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ اس پانی پر ایک حبہ بھی خرچ نہیں ہوتا بلکہ یہ وہ پہاڑی چشمے ہیں جنھیں مقید کر لیا گیا ہے اور موقع محل کے اعتبار سے نل لگا دئے گئے ہیں تاکہ پینے کے پانی کی قلت نہ ہو اور زمین بھی سیراب ہوتی رہے۔ پانی بہ افراط سوئستان کے چپے چپے پر نظر آتا ہے۔ مجھے فوراً خیال ہوا کہ ہمارے ملک میں بھی اللہ تعالےٰ کا دیا ہوا سب کچھ موجود ہے لیکن ہم اس کی نعمتوں سے کام نہیں لیتے اسلئے روز بروز ہماری حالت گرتی جاتی ہے۔ اس ذرا سے ملک کی ذہنی قابلیت کی یہ حالت ہے کہ جنگلی بہتے ہوئے پانی کو قبضے میں کر کے اس سے کام لیا جاتا ہے!

ہمارے نواح میں ۶ر، ستمبر سے بڑی چہل پہل تھی، اسلئے کہ خبر تھی کہ آئندہ ہفتہ دنیا کے سب سے بڑے کشتی ران سر میلکم کیمبل یہاں آکر خود اپنی کشتی رانی کا ریکارڈ توڑنے کی کوشش کرینگے۔ ہماری جھیل (Hallwil) کے کنارے کئی روز تک بڑھئی اور معمار کشتی گھر بنانے میں لگے رہے اور اسمیں بجلی ٹیلیفون وغیرہ لگا کر مکمل کر دیا۔ جب یہ مکمل ہو گیا تو سر میلکم کی مشہور آفاق کشتی (Bluebird II) بھی ٹھیلے میں لدی ہوئی انگلستان سے آگئی اور اپنی جگہ پر رکھ دی گئی۔ ساتھ ہی چار مستریوں نے، جو انگلستان سے آئے تھے۔

رولز رائس (Rolls Royce) کا ایک نیا انجن جس کی قیمت ۶ ہزار پونڈ یعنی (ملوٹ ۸۰ ہزار) روپیہ تھی لگا دیا۔ صرف کشتی کی قیمت ۵ ہزار پونڈ تھی اور اس نئے انجن لگنے کے بعد کشتی (جس میں صرف ایک ہی بیٹھک ہے) تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ کی ہوگی۔ لطف یہ ہے کہ کشتی گھر بھی بن اور ہر ضرورت سے لیس ہوگیا کشتی بھی آگئی ایک دوسری کشتی جس میں اخبارات کے نمائندے بیٹھیں وہ بھی آگئی نیا انجن بھی لگ گیا یہ سب سوئٹسان کے ایک غیر معروف قریہ میں ہو رہا تھا اور خود سر میلکم کیمبل جو چند ہی روز میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے والے تھے برابر انگلستان میں بیٹھے رہے اور دوسرے کاموں میں مشغول رہے!!

یہ عجیب و غریب تباین یورپ کے احساس فرائض اور ہمارے دیس کی باہمی بے اعتباری کے درمیاں ڈیڑھ لاکھ تو ڈیڑھ لاکھ ہمارے یہاں تو کوئی شخص معمولی اثاثہ بھی کسی کے سپرد نہیں کریگا اور کریگا بھی تو جسکے سپرد کریگا وہ اس اثاثہ کی ریڑھ لگا دے گا۔ یہ وہ تباین ہے جسکی وجہ سے دنیا کا سب سے چھوٹا براعظم سب سے بڑے براعظم پر حکومت کر رہا ہے۔ مالک کئی سو میل پر بیٹھے ہیں اور ملازموں کا یہ حال ہے کہ مالک کیا اتنی دیکھ بھال کریگا جو یہ کرتے ہیں۔ پھر ہر چیز یہاں تک کہ پٹرول، تیل، جس لاری پر کشتی آئی ہے وہ، غرض ہر چیز پر انگریز تھا۔ غرض حب وطن، باہمی اعتبار اور تنظیم کا یہ عجیب و غریب تماشا نظر آیا۔

سر میلکم کے چار ساتھی پہلے ہی سے ۱۰ ستمبر کو آگئے۔ کشتی گھر پر انگلستان کا یونین جیک اور سوئٹسانی سادہ صلیب کے نشان والا بادبانا اڑنے لگا اور دور دور سے لوگ جوق جوق کشتی کو دیکھنے آنے لگے۔ ہمارے ہوٹل میں انکی آمد کی خبروں سے بڑی چہل پہل رہی خیال تھا کہ اگر وہ بھی آجائینگے اسلئے سیکڑوں کی تعداد میں دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے کے لئے لوگ ہمارے ہوٹل میں جمع ہوے۔ اگر ہندوستان میں ایسا ہوٹل ہوتا جسمیں صرف ۴۰، ۵۰ کے لئے انتظام ہو اور یک بیک سیکڑوں آجائیں تو خیر انتظام تو جیسا ہوسکے ہوجائے لیکن کیا غل غپاڑا ہوگا۔ یہاں ہر چیز خاموشی سے طے ہوتی ہے ہمیں تو اتنا [illegible] کا پتہ اسوقت لگا جب میں چہل قدمی کے لئے باہر نکلا اور چبوترہ اور باغ مرد عورتوں سے بھرا دیکھا۔ ۱۳ ستمبر کو آخر سر میلکم بھی آگئے۔ ۱۰ سے لیکر انکے قیام کے دوران میں سلسل (Silsel) کا گاؤں [illegible] ہمارا [illegible] ہوٹل عید کا سماں تھا۔ خود سر میلکم نہایت خوش خلق تھے اور ان کی بات چیت نشست و برخاست سے معلوم نہ ہوتا تھا کہ دنیا کے چوٹی کے جانبازوں میں سے ایک ہیں۔ ہمارے ملک میں کسی کو سر کا خطاب مل جائے تو اکثر ایسے لوگوں کی نظریں آسمان کی سیر کرنے لگتی ہیں اور یہ فانی انسانوں کو کمتر درجہ کا تصور کرنے لگتے ہیں کیمبل اتنا نامی گرامی شخص ہے لیکن تفاخر اسمیں جھوٹ موٹ کو بھی نہیں ہے۔ ۵۴ برس کی عمر ہے اور کشتی رانی کا ریکارڈ توڑنے پر ۴۰ سال کی عمر میں بادشاہ نے سر کا خطاب دیا تھا۔ خود نہایت محتاط زندگی بسر کرتے ہیں۔ کم کھاتے، کم پیتے اور تقریباً روزانہ میلوں سائیکل پر سواری کرتے ہیں۔ ۱۴ ستمبر کو انہوں نے پہلی مرتبہ اپنی کشتی کو جسے انکے ملازموں نے تیار کرکے رکھ دیا تھا ہاتھ لگایا اور اسے جھیل پر لے گئے۔ اس سے پیشتر کا خود انکا ریکارڈ، ۱۲۹ میل فی گھنٹہ تھا۔ پہلے ہی دن ۱۳۵ میل تک کی رفتار کشتی کی ہوگئی۔

ہوا کی تیزی کم ہو جائیگی اس وقت ریکارڈ توڑنے کی امید ہے۔ مجھ سے ان سے ملاقات ہوگئی۔ کہتے تھے کہ ایک نیا انجن تیار کر رہا ہوں جو اس نئے (Rallo Royce) سے بھی ہلکا اور تیز رو ہوگا۔ کیمبل نے آخر خود اپنا ریکارڈ ، ار ستمبر کو توڑ دیا اور ۵ر۱۳۱ میل فی گھنٹہ کے حساب سے کشتی چلانے میں کامیاب ہوگئے۔ میں نے جب سر میلکم کو اس کی مبارکباد دی تو وہ اپنے فطری انکساری سے پیش آئے اور کہا کہ خدا نے چاہا تو اس سے بھی زیادہ رفتار کی امید ہے۔ یہ ہیں یورپ والوں کے عزم۔ کیا ضرورت تھی کہ کیمبل نے خود اپنے آپ جو ریکارڈ قایم کیا تھا اسے خود ہی توڑنے کی کوشش کرتے۔ صرف وجہ یہ تھی کہ انھیں خطرہ تھا کہ کہیں کسی دوسرے ملک والا ۱۷، ۱۴۹ کے ریکارڈ کو توڑ نہ دے اس لئے خود ہی اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنا ہی سیار پہلے سے بھی بلند کر دیا۔　　　(باقی آیندہ)

ہارون خاں شیروانی

غزل

نظر فریب مثالِ حباب ہو کے رہی　　ہماری عمرِ رواں نقش آب ہو کے رہی

یہ جس کے دل میں رہی پیچ و تاب ہو کے رہی　　طلسم کاکلِ تری کاکل جواب ہو کے رہی

شرابِ عشق کے جلووں سے ہے جہاں روشن　　جہاں کہیں بھی رہی آفتاب ہو کے رہی

تری نگاہ کی مستی کو کیا کہوں ساقی　　جو اتری شیشۂ دل میں شراب ہو کے رہی

نقاب بنکے رہا لمعۂ ظہور ان کا　　خودی ہماری، ہمارا حجاب ہو کے رہی

جواب حسن کا ان کے کہاں زمانے میں　　جو لاجواب تھی سے لاجواب ہو کے رہی

جو دل سے نکلی دعا رحمتوں نے گھیر لیا　　لبوں تک آئی نہ تھی مستجاب ہو کے رہی

کسی کی مست نگاہی سے زندگی اپنی　　خراب ہوتی تھی آخر خراب ہو کے رہی

تمہاری آنکھ سے دیکھا تھا تم کو خاطرؔ نے
جبھی تو اس کی نظر کامیاب ہو کے رہی

غلام دستگیر خاطرؔ

اُردو ادب کا باغ

ایک عرصہ سے یہ . ا مو، تلاطم پیدا ہوگیا تھا کہ مَیں ایسی زبان کی نسبت چند خیالات کا اظہار کروں، جس کا دائرہ بہت وسیع ہے اور آج کل کم و کاست ہندوستان کے تمام صوبہ جات میں اسی کا دور دورہ ہے۔

اس اثنا میں کئی مرتبہ میرے دل کے ساگر میں لہریں اُٹھی تھیں اور ساتھ ہی بجھ جاتی تھیں۔ چنانچہ اس ادب کے میدان میں بڑے بڑے باکمال نظر آتے ہیں، جن کو دیکھ کر میرے من میں ایک قسم کی گھبراہٹ پیدا ہوگئی اور کلیجا تھرانے لگا، حافظہ اپنے کام کرنے سے رہ گیا، کھلا ہُوا دل مُرجھا گیا، جمائے ہوئے خیالات بکھر گئے، سُلجھا ہُوا مضمون اُلجھ گیا، چہرے پر اُداسی چھا گئی کیونکہ اس میدان میں بہت سے گھڑ سوار ہیں، جن میں مَیں پیادہ ہُوں، وہ بھی لنگڑا۔ بھلا ایسی صورت میں گھڑ سوار کے آگے کہیں پیادہ ٹِک سکتا ہے "کہاں وہ اور کہاں یہ" بقول نسیم۔

سُورج کو چراغ ہے دکھانا　　　آگے اُن کے فروغ پانا

مطلب یہ ہے کہ جس طرح سُورج کے آگے چراغ کی روشنی ماند ہو جایا کرتی ہے اُسی طرح اُن باکمالوں کے سامنے اپنا کمال . . . . . وبڑی برکت ہے۔ اس لئے مَیں نے ہمت کے میدان کا بغور جائزہ لیا تو دل جوش کھانے لگا، قلم کو جنبش ہُوئی، رہبر نے اولو العزمی کا راستہ دکھایا۔ بقول دیگر۔

ہر منزلِ دُشوار کو آسان بنایا　　　انسان سے دنیا کا سفر ہمیں نے کرایا

بس پھر کیا تھا یک لخت پژمردہ دل شگفتہ ہُوا، بکھرے ہوئے خیالات اکٹھے ہوئے، اُلجھا ہُوا مضمون سُلجھ گیا، دل باغ باغ ہُوا لہٰذا اب قلم یوں مضمون آغاز کرتا ہے۔

یہ امر . . . ہے کہ ہندی اور فارسی کے ملاپ سے اُردو زبان نے جنم لیا۔ احتیاج کی ماں نے اسے لاڈ سے پالا ہوگا اور اپنی آنکھ سے اوجھل رہنا پسند نہ کیا ہوگا۔ لیکن لاڈلے بچے کا پاؤں ایک جگہ نہ ٹکا ہوگا۔ احتیاط کی ماں نے اس پر نگرانی رکھی ہوگی۔ پہلے پہل یہ ننھا بچہ اپنے ادھورے جملہ سے سب کے دلوں کو بھاتا ہوگا اور اپنے چھوٹے چھوٹے فقروں سے ہر ایک کا مطلب ادا کرتا ہوگا اور بے جوڑ جملے بھی بولتا ہوگا۔ یہ نئی ایجاد ہر ایک کو بھاتی ہوگی۔ یہ ہونہار بانکے سپاہی کی مانند گلی کوچوں میں ترچھی نظر ڈالتے ہوئے لوگوں کے دلوں پر تیر کا نشانہ بناتا ہوگا۔ لوگ اس کو دیکھنے کے لئے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے ہوں گے وہ اپنی بے رُخی سے لوگوں کو تڑپاتا ہوگا جس سے لوگ گھائل ہوتے ہوں گے اور اس کے مرہم کی فکر بھی کرتے ہوں گے۔

ایک دن یہ نونہال مُصمم ارادہ کرکے سرِ راہ . . پریم کا جال بچھا کر بیٹھا ہُوا تھا کہ کوئی آشفتہ مزاج میرے پھندے میں آ جائے۔ حسنِ اتفاق سے اس کی مایا جال میں ولی پھنس گئے۔ اس کی نگاہیں، ادائیں دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھے۔

وَلی کو اس کی ادا بہت بھائی۔ اُنہوں نے جھٹ اس کو اپنی گود میں اُٹھالیا اور اپنے گھر لے آئے۔ چونکہ اس کے خیالات کا لباس بازاری تھا اس لئے وَلی نے شائستہ گھرانوں کا لباس پہنایا اور حسن و عشق ہجر و وصال کی غزلیں کہہ کر لطف اُٹھانے لگے اور دیوان مرتب کرکے دہلی بھیجا۔ شعراء دہلی کو رشک پیدا ہوگیا۔ دیوان دہلی پہنچتے ہی گھر گھر اس کا چرچا ہوگیا۔ شعراء دہلی نے اس ہونہار لڑکے پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ اس میں ایسی ایسی نزاکتیں، لطافتیں، ادائیں نظر آئیں، جن کو دیکھ کر وہ خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ لہذا اُنہوں [illegible] کو اپنے ہاں لالچ دے کر بُلایا۔ چونکہ شعراء دکن کی صحبت میں رہنے سہنے سے اس کی زبان غیر مانوس ہوگئی تھی اس لئے اُنہوں نے اس کو دہلی کے اُمرا کی زبان سکھائی اور فصاحت و بلاغت کی وردی پہنائی اور غزلیں، قصائد، مثنویاں، مرثیے وغیرہ کہہ کر لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا۔ ان کا کلام جس مشاعرہ میں پڑھا جاتا تھا اس کے صلہ میں بجانب محفل تحسین و آفریں کے پھول برستے تھے۔ خصوصاً میر تقی اور مرزا غالب کی غزلیں، سودا اور ذوق کے قصائد، میر حسن اور پنڈت نسیم کی مثنویاں، میر انیس اور مرزا دبیر کے مرثیے سب کا پایہ بہت بلند ہے۔ اُنہوں نے اُردو ادب کی بہت بڑی خدمت کی ہے۔ جن کا احسان اُردو زبان جب تک زندہ ہے، بھولا نہ جائیگا۔ اور حضرت آزاد دہلوی، نثر اُردو میں بہت بڑے ادیب ہوئے ہیں، انہوں نے آب حیات اور نیرنگ خیال کو نظم کا ہم پایہ بنا دیا ہے۔ اس ایجاد کا سہرا آزاد کے سر رہے گا۔ اور جب تک نثر اُردو کا وجود رہے گا۔ اس موجد کا نام ہندوستان کے ماتھے پر سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔ گو اُردو زبان میں بہت کچھ ترقی ہو چکی ہے۔ لیکن حیدرآباد ریاست کے اکثر تعلیم یافتوں کی بول چال کا نرالا ڈھنگ ہے۔ اس کا زیادہ تر سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دکن میں اکثریت کی زبان مرہٹی، تلنگی اور کنٹری ہے اس لئے میزبانوں کا اثر مہمان پر پڑا تو کوئی عجب نہیں۔ اس کا مزاج ایسا ملنسار واقع ہوا تھا کہ جس ٹاپو میں رہا اسی ٹاپو کے الفاظ استعمال کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ قَایم نے یوں تصویر کھینچی ہے۔

قَایم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

ف ۱:۔ پیڑ یا درخت کی بجائے جھاڑ اور رست کی جگہ نکو بولا جاتا ہے

ف ۲:۔ ماضی متعدی معروف کے افعال، ماضی فعل لازم کے قیاس پر بولے جاتے ہیں مثلاً میں درخواست لکھا ہوں وغیرہ جو غیر صحیح ہے۔ اس کا صحیح استعمال یوں ہے جیسے میں نے درخواست لکھی یا میں درخواست لکھ چکا ہوں۔

ف ۳:۔ تم کے ساتھ جو افعال لائے جاتے ہیں وہ غیر صحیح ہوتے ہیں مثلاً تم آتے ہو، آؤ گے، آئے ہو، ہوگے کی بجائے تم آتے ہیں، آئیں گے، آئے ہیں، ہوں گے وغیرہ۔

ف ۴:۔ ہمیں یا ہم کو، مجھے یا مجھ کو وغیرہ کی بجائے ہمارے کو، میرے کو وغیرہ بولنا غلط ہے۔ رالے، ری کے ساتھ حروف سالمہ یعنی کو، سے، پر، میں وغیرہ نہیں لائے جاتے ہیں۔

ف ۵:۔ عورتوں کی نسبت بات چیت کی جاتی ہے تو ان کے افعال جمع مذکر لائے جاتے ہیں مثلاً بیگم صاحبہ کہاں

جاتی ہیں، لڑکیاں کیا کرتی ہیں وغیرہ کی بجائے بیگم صاحب کہاں جاتے ہیں، لڑکیاں کیا کرتے ہیں وغیرہ
اسی طرح بے جان چیزوں کا ذکر یوں کیا جاتا ہے مثلاً ہنڈیاں آئی ہیں وغیرہ کی بجائے ہنڈیاں آئے ہیں۔

ف۶:۔ اتنا، کتنا کی بجائے اتا، کتا میں نون کو حذف کر کے ان پر تشدید دے کر بولنا غیر صحیح ہے۔

ف۷:۔ وہ، یہ کی بجائے اُنے، اِنے بولا جاتا ہے مثلاً وہ آیا، اس نے لیا کی جگہ اُنے آیا اِنے لیا وغیرہ

ف۸:۔ ق کی آواز خ کی مانند نکالی جاتی ہے مثلاً قبر بولنا ہو تو خبر کی آواز کی مانند نکالی جاتی ہے

ف۹:۔ اُردو زبان میں مرہٹی کے ہندسے لائے جاتے ہیں مثلاً انتالیس، تیتالیس، چون، تہتر، چوتہر وغیرہ کو انچالیس، ترتالیس، چوپن، تر تر، چواتر وغیرہ

ف۱۰:۔ فعل مجہول کے ساتھ کو کا لانا خلاف قاعدہ ہے۔ مثلاً جوان بھیجا گیا کی بجائے جوان کو بھیجا گیا

ف۱۱:۔ دستخط کا لفظ دست اور خط سے مرکب ہے یہ دونوں لفظ مفرد کی حالت میں مذکر بولے جاتے ہیں اور مرکب کی صورت میں جمع مذکر۔ مثلاً میں نے دستخط کئے۔ لیکن ہمارے دفاتر میں دستخط واحد مونث استعمال کیا جاتا ہے مثلاً میں نے دستخط کی۔

ف۱۲:۔ پاؤں، چاول، گاؤں وغیرہ بروزن جاؤں، آؤں صحیح ہیں لیکن ان کو بروزن جانوں، مانوں لکھنا صحیح نہیں ہیں۔

ف۱۳:۔ اُس، اُن، کتابت میں الف کے بعد واؤ زیادہ کر کے اوس، اون لکھا جاتا ہے جو درست نہیں بلکہ صرف الف پر پیش دینا کافی ہے۔ کیونکہ ہندی میں اُس، اُن، اِس، اِن کے وزن پر بنائے گئے ہیں جب اوس، اون (ہندی میں اس کو دیرگ کہتے ہیں) صحیح ہے تو اس، اِن کی بجائے ایس، این کیوں نہ لکھا جائے۔

ف۱۴:۔ کہا (कहा) اور کھا (खा) دو علحدہ لفظ ہیں چونکہ ان کے تلفظ اور معنوں میں اختلاف ہے اس لئے ان کے املا میں بھی فرق ضروری ہے مثلاً ساتھ، ہاتھ وغیرہ کی بجائے ساتہہ، ہاتہہ وغیرہ کو ہائے مخلوط نے طریقہ پر لکھنا غلط ہے۔ اسی طرح تمہارا، ہر وغیرہ کو تمھارا، ھر وغیرہ ہائے دوچشمی سے لکھنا غیر صحیح ہے۔ پس ان ہ ھ کی کتابت میں امتیاز ضروری ہے۔

ف۱۵:۔ گائے کے بچے کو اہل زبان بچھڑا، بچھڑی کہتے ہیں لیکن دکن میں پاڑی، پاڑا کہا جاتا ہے۔

ف۱۶:۔ دو علحدہ لفظ ایک جگہ ملا کر لکھنے سے ایک حرف حذف ہو جاتا ہے مثلاً نہ ہو کو نہو

ف۱۷:۔ اکثر عبارت میں چونکہ کا استعمال بے محل ہوتا ہے۔ حرف شرط، چونکہ، کے ساتھ حرف جزا اس لئے لایا جاتا ہے۔ مثلاً چونکہ آپ نے بلایا تھا اس لئے میں آیا۔

ف۱۸:۔ بعض کی جمع کے الفاظ موجود ہوتے ہوئے جمع الجمع لائے جاتے ہیں مثلاً رقوم، وجوہ کو علی الترتیب

رقومات' وجوہات وغیرہ۔

۱۹۔ بعض الفاظ کا تلفظ غلط بولا جاتا ہے۔ خطابت میں اس کا عیب چھپ جاتا ہے لیکن بات چیت میں قابلیت کا اظہار ہو جاتا ہے۔ مثلاً نقَص (بالفتح) عِصمت (بالکسر) کو علی الترتیب بالضم' بالفتح بولنا غلط ہے۔

۲۰۔ 'اور' 'و' یہ دونوں حرفِ عطف ہیں اور دونوں کے معنی ایک ہی ہیں لیکن ان کے استعمال کا طریقہ جُدا ہے۔ جب کسی جملہ میں دو فارسی لفظ ہوں تو ان دونوں کے درمیان واؤ آئیگا اس کے برخلاف ایک لفظ فارسی اور دوسرا ہندی کا ہو تو ان کے مابین واؤ نہیں آتا بلکہ اور آتا ہے مثلاً دل وجان، ورنہ دل اور آنکھ وغیرہ لکھنا صحیح ہوگا۔

۲۱۔ وہی' یہی' یونہی' جونہی وغیرہ کی بجائے وہ ہی' یہ ہی' یوں ہی' جوں ہی وغیرہ لکھنا غلط ہے۔

۲۲۔ قریبِ مرگ' لبِ راہ' ہنوز' تقریباً وغیرہ کی بجائے قریب المرگ' لب سڑک' اہلِ ہنود قریباً وغیرہ لکھنا غیر صحیح ہے۔

۲۳۔ جب کاتب اپنی عبارت یا مضمون میں ایک لفظ یا جملے کا دوسرے لفظ یا جملہ سے جُدا کر کے معنی واضح کرنے کے لئے ٹھہراؤ (وقفہ) کرتا ہے تو مبتدا کو عبارت کا مطلب آسانی سے سمجھ میں آتا ہے۔ اس لئے رموز اوقاف کا استعمال ضروری ہے مثلاً زید' بکر اور احمد آج اسکول کیوں نہیں گئے ؟

اگر ایک ایک لفظ سپردِ قلم کیا جائے تو ایک چھوٹی موٹی کتاب بن جائے لیکن مضمون کی طوالت کے خوف سے بہت سی باتیں نظر انداز کر دی گئیں۔

اب خاتمہ مضمون پر یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ حیدر آباد ریاست کے تمام دفاتر میں اُردو کا عمل دخل ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ خصوصاً اکثر اضلاع کے کارکنانِ دفاتر غلط اُردو لکھا کرتے ہیں۔ پس جن لوگوں نے مدارس سرکاری میں تعلیم پائی ہے ضرور ہے کہ وہ صحیح اُردو لکھنے اور بولنے کی فکر کریں تاکہ ہمارے دامن سے یہ داغ دھل جائے۔ اگر ہم وطن کی محبت اپنے دلوں میں رکھتے ہیں اور اس کی ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اُردو زبان سے محبت کریں' اس لئے ہمیں چاہئے کہ دکن میں جو غیر فصیح الفاظ بولے جاتے ہیں ان کو ترک کر دیں۔

ایک زمانہ تھا کہ ہندی بھاشا نے اپنی کشادہ پیشانی سے حاکم وقت کی زبانیں فارسی' عربی' ترکی کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور ان کے اکثر الفاظ بجنسہٖ بلا ترجمہ لینے میں کوئی عیب نہ سمجھا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ میرے خزانہ میں ادائے مطالب کے لئے بیسوں الفاظ اور خیالات موجود ہوں تاکہ دنیا میں کوئی زبان میرا مقابلہ نہ کر سکے اور بھاشا نے خیالات کے ساتھ اپنا نام بھی تبدیل کر کے اُردو نام رکھ لیا۔ اب اسی نام سے پکارا جاتا ہے چونکہ کچھ عرصہ سے ہندوستان میں انگریزی کا دور دورہ ہے اس لئے اُردو کی وسعت اخلاق نے انگریزی زبان کے الفاظ اور خیالات لینے کے لئے اپنا دامن پھیلائے رکھا ہے۔ اس میں ہزاروں الفاظ آ کر شامل ہو گئے ہیں۔ لیکن بعض ترقی داں حضرات انگریزی الفاظ کی جگہ عربی کے مشکل الفاظ لا رہے ہیں

جس سے ہماری زبان عوام کیا بلکہ خاص لوگ بھی نہ سمجھ سکیں گے۔ پس اس میں عام فہم اور روزمرہ الفاظ لائے جائیں تاکہ اُردو زبان ہندوستانی زبان بننے کا دعویٰ کرے۔ یہ دعویٰ اُس صورت میں ہوسکتا ہے جبکہ ہماری زبان غیر تعلیم یافتہ بھی سمجھ سکے ورنہ ایک روز سنسکرت کی مانند صرف کتابوں کی زبان بن جائے گی لہذا ہر ایک ادیب کو چاہئے کہ عربی کے مشکل الفاظ لانے کی بجائے زمانہ جن الفاظ کو لانے کے لئے مجبور کرے وہی الفاظ لائے اس پر عمل کرنے سے اُمید ہے کہ ہمارا مشرقی باغ "مغربی باغ کی مانند لہلہاتا، ہرا بھرا نظر آئے گا ورنہ یہ شعر صادق آئے گا

ہر ایک باغ میں ہے اک نئی ہوا چلتی
چمن میں ہُوا ہیں لیکن بہار ہے باہر

جی این ریڈی (مومن آباد)

اے افلاس

نوائے دل کو ابھی [illegible] بیاب کرنا ہے　　ابھی تو تارِ رگِ جاں رباب کرنا ہے
ابھی تو اشکِ ندامت کو خوں بنانا ہے　　ابھی تو خونِ جگر کو شراب کرنا ہے
ابھی تو لینی ہیں بیواؤں کی دعائیں مجھے　　ابھی تو سخت کلیجوں کو آب کرنا ہے
خزاں رسیدہ گلستاں کے خشک پھولوں کو　　ہجومِ اشک سے جنت مآب کرنا ہے
ابھی تو مجھ کو بُھلانا ہے آستانِ حرم　　جہانِ کفر میں اک انقلاب کرنا ہے
ابھی تو عشق کی محشر نواز آہوں سے　　غرورِ حسن کو خانہ خراب کرنا ہے
ابھی تو رفعتِ تخیل سے زمانے میں　　ہر ایک ذرے کو شعر و شراب کرنا ہے

ستا نہ عہد جوانی میں مجھکو اے افلاس
مجھے بھی دہر میں کارِ ثواب کرنا ہے

(شیدائے غم)　　اختر رضوانی

میزبان

ایک جگہ دعوت تھی چار پانچ شاعروں کے ساتھ' مجھ ایک غیر شاعر [illegible] گئی تھی
ایک چھوٹا سا مشاعرہ تھا۔ سامعین کی تعداد' شعرا کے لئے بڑی ہمت شکن تھی' میزبان' ان کے ایک دوست' اور میرے
سوا جو تھا وہاں کوئی نہ تھا جو مصرعہ اٹھاتا مگر میزبان کے شاعری کے ذوق نے شاعروں کی کچھ امید بندھا دی تھی۔ کھانے
پینے کا شغل بڑی دیر تک ہوتا رہا۔ میزبان بولتے اور شاعر کھاتے رہے۔ آخر محفل مشاعرہ جمی۔ شاعروں نے اپنی اپنی بیاضوں
کو' جنھیں وہ ابھی تک اپنی جیبوں اور رومالوں میں چھپائے بیٹھے تھے' بے نیام کیا۔ ایک شاعر' جو اپنے حافظہ کی مدد
سے' بیاض کی جھنجٹ سے بے نیاز رہے۔ اور شاعروں کی طرف بڑی حقارت سے دیکھ کر مجھ پر داد طلب
نظریں ڈال رہے تھے۔ میزبان کے ایک اشارہ نے مشاعرہ شروع ہونے کے کچھ آثار پیدا کر دیئے۔ صف
شعرا میں کچھ ہل چل ہوئی۔ کچھ ہاتھ عینکوں کی طرف بڑھے اور کچھ بیاضوں کی طرف اور جن کے پاس بیاضیں نہ تھیں
وہ اپنی جبین ٹٹولنے لگے۔ میزبان نے ایک پُریقین انداز میں مشاعرے کے شروع ہونے کا اعلان کیا۔ اور ایک شاعر
کا نام لیکر کلام سنانے کی درخواست کی' دوسرے شاعروں نے اپنی گردنیں [illegible] لیں۔ [illegible] کا نام لیا گیا تھا
وہ صفِ شعرا سے کچھ آگے بڑھ کر بیٹھ گئے اور اپنی بیاض کھول' ورق گردانی کرنے لگے۔ ادھر شاعروں نے نظروں میں ایک
دوسرے سے بات چیت شروع کی' کچھ کانا پھوسی ہونے لگی تو' آگے بڑھے ہوے شاعر نے ان سب کی طرف گھور کر
دیکھا اور پھر میزبان پر شفقانہ نظریں ڈال کر بولے۔ ادھر ایک سال سے کچھ کہا نہیں ہے' ایک پرانی ہی چیز عرض
کرتا ہوں' سب نے کہا "ارشاد" شاعر نے پہلے اپنی آواز صاف کی' دو ایک سکنڈ گنگنایا اور پھر لَے' سے مطلع
پڑھا۔ پہلا مصرعہ خوب زوروں سے اٹھا۔ "سبحان اللہ" اور "خوب ہے" کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اب مجھے
معلوم ہوا کہ سامعین میں شعرا بھی شریک ہیں' بلکہ ایک دو تو داد دینے میں سب سے آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے
دوسرا شعر پڑھا۔ کچھ تعریف نہیں ہوئی۔ تیسرا شعر بھی یونہی گیا۔ شاعر کے ہاتھوں میں کچھ تھرتھراہٹ پیدا ہوئی۔ نظروں
میں کچھ ناامیدی کے ساتھ التجا کا رنگ جھلکنے لگا۔ دوسرے شاعروں کے چہرے دیک رہے تھے۔ اور ادھر میں
اور میزبان' تعریف کرنے اور داد دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے ابھی مصرعہ ختم بھی نہیں کیا تھا کہ تعریف کا ایک
شور اٹھا۔ "شاباش ہے شاعر' اور "کیا خوب مصرعہ کہا ہے" اور "واللہ حق ادا کر دیا ہے شاعری کا" کی آوازیں آتی
رہیں۔ کچھ لوگ جھوم رہے تھے اور کچھ ہنس رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دوسرے شاعر' اس شاعر کے خلاف
محاذ بنائے بیٹھے ہیں۔ آخر مقطع آیا تو میں نے اور میزبان نے اسے خوب دہرایا اور تین بار' مکرر ارشاد' کی آواز لگائی۔
تب کہیں جاکر اس شاعر کے چہرے پر غم و غصہ اور نفرت و حقارت کی جگہ ذرا اطمینان کے آثار جھلکنے لگے۔ اب

دوسرے شاعر صاحب کی باری تھی۔ ان کا رنگ جدید تھا۔ بیاض ساتھ نہیں تھی۔ وہ آگے بڑھے۔ جیب میں سے کاغذ کا پرزہ نکالا اور اسے دو انگلیوں میں پکڑ کر کہنے لگے۔ ایک نظم عرض کی ہے پار سال میں کشمیر گیا تھا' اس کی رنگین بہاروں سے یہ رنگ اڑا لایا ہوں" ایک دوسرے شاعر نے اس پر اس طرح مصرعہ لگایا" وہ جگہ ہی ویسی تھی ورنہ ایسی نظمیں زندگی میں بار بار تھوڑی ہی ہوتی ہیں" نظم شروع ہوئی۔ ختم ہوئی تو سب شعرا نے تعریف کی مگر اس انداز میں کہ گویا داد دیکر صرف اس کے حوصلے بڑھائے جا رہے ہیں۔

تیسرے اور چوتھے شاعر بھی اسی طرح آئے اور چلے گئے۔ اب آخری شاعر کی باری تھی کھنکتی ہوئی پاٹ دار آواز میں انھوں نے شعر خوانی شروع کی محفل میں کچھ گرمی آچلی تھی۔ پہلے شعر پر میزبان نے "سبحان اللہ" کا نعرہ لگایا تو دوسرے شعر پر شاعر ساری محفل پر چھا گیا۔ دوسرے شاعر حسرت سے ایک دوسرے کی صورت تک رہے تھے مگر اب دوسری باری کی کچھ امید نہ تھی۔ مشاعرہ کا رنگ اب جم رہا تھا کہ غزل ختم ہوگئی مقطع پر ایسا خوب شور مچا یا اس لئے کہ یہ مشاعرہ کا آخری شعر تھا پھر نہ معلوم کب موقع ملے۔ اب سارے شعرا کی نگاہیں میزبان پر جمی تھیں۔ اس امید میں کہ شائد ایک اور دور چلے۔ میزبان نے ذرا مسکرا کر کہا۔" میں بہت مشکور ہوں کہ آپ حضرات نے تکلیف فرما کر قدم رنجہ فرمایا' اور اپنی شاعری سے لطف اٹھانے کا موقع دیا" اور پھر مسکرا کر اپنے دوست کی طرف دیکھا۔ دوست نے کہا" آپ ہی کچھ سنائیے" اور مجمع کو مخاطب کر کے کہنے لگے" آپ بھی بڑے اچھے شاعر ہیں۔ ویسے سناتے ذرا تکلف کرتے ہیں اور مشاعروں میں کبھی نہیں جاتے' اس لئے ان کی شاعری کا حال کسی کو معلوم نہیں"

ہمیں تو اس کی خبر ہی نہیں' آپ کو ضرور سنانا ہوگا" سب ایک ساتھ بولے تو میزبان نے کہا" آپ لوگ اصرار ہی کرتے ہیں تو مجھے کوئی عذر نہیں' مگر میں کیا اور میری شاعری کیا!"

اس کے بعد نہ پوچھئے کہ کیا ہوا۔ دو گھنٹہ تک میزبان اپنی شاعری سے مہمانوں کو نوازتا رہا اور جب مہمان باہر چلے ہیں تو بڑی دیر تک میزبان کی شخصیت موضوع بحث بنی رہی۔

اشفاق حسین

گولکنڈے کے ہیرے ۔ (۱۲) افسانے ۸ تصاویر ۲۶۴ صفحات قیمت مجلد ۱۲ ار۔

گولکنڈے کے ہیرے تمام دنیا میں مشہور ہیں ان کی قدر و قیمت چمک دمک ہر زمانہ میں باقی رہی اور ہمیشہ باقی رہے گی۔ ان کی طرح گولکنڈہ کے اکثر کردار بھی ہیروں سے کم نہ تھے۔ ان دونوں کے دلچسپ قصے اس کتاب میں درج ہیں۔ اس مجموعے کے ہر افسانے کے پڑھنے میں اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی کہ ہیرے مل جانے پر ہوگی۔ گولکنڈہ کی کوئی سیر و تفریح ان کتابوں کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ جو گولکنڈہ دیکھ چکے ہیں وہ جب یہ افسانے پڑھتے ہیں تو محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں دیکھا' جنھوں نے کبھی گولکنڈے کی سیر نہیں کی ان کے دل میں ان کو پڑھنے کے بعد گولکنڈہ کی سیر کی امنگیں موجزن ہو جاتی ہیں۔

ابدی مثلث

۔ اسکولوں میں پڑھایا جاتا ہے کہ تین نقطے جو ایک سیدھ میں نہ رکھے ہوں، انہیں لکیریں کھینچ کر ملایا جائے تو جو شکل بنے گی اُسے مثلث کہتے ہیں۔ انسانی فطرت بھی ایک مثلث بنایا کرتی ہے۔ اس کے لئے نقطوں کا ایک سیدھ میں ہونا شرط نہیں، کہ وہ رکھے ہی بے ٹھکانے ہوتے ہیں۔ یہ اٹل تکونیا کبھی دو عورتوں اور ایک مرد سے بنتا ہے اور کبھی دو مرد اور ایک عورت سے ترتیب پاتا ہے۔ ہم جس مثلث کو پیش کر رہے ہیں وہ اس آخری قسم کا تھا۔

سینما سے نکل کر جب دونوں موٹر میں بیٹھ لئے تو نواب نعمت علی خان نے اپنے رفیق اور دم ساز جمالی سے پوچھا۔

"کہو کیا رائے ہے ـــ فلم کیسا تھا؟"

"کہانی میں ندرت پیدا ہونا تو اس لئے مشکل تھا کہ وہ موضوع ہی حضرت انسان کے برابر پُرانا ہے، مگر اس کا تو پلاٹ بھی سپاٹ تھا۔ البتہ کامنی نے اپنے کردار میں جان ڈال دی ہے ـــ شبہ ہوتا ہے کہ فسانہ ہی کامنی کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔"

"کامنی نے واقعی غضب کا کام کیا ہے!"

"اُس نے کمال یہ کیا ہے کہ جذبات کے اظہار کو فلسفے کی صورت دیدی ہے!"

موٹر جب جمالی کے دروازے پر رکی اور وہ اترنے لگا تو نواب نے کہا۔

"یار کل بمبئی چلینگے۔"

یہ سن کر جمالی حیران تو اس لئے نہ ہو سکتا تھا کہ نوابوں رئیسوں کے ارادے اسی طرح قایم ہوتے ہیں، اور یہ دونوں تو اسکول کے زمانے کے دوست تھے، لیکن اتنی تھوڑی مہلت میں اُسے خود تیار ہو سکنا دشوار معلوم ہوا۔ اُس نے جواب میں کہا۔

"بھئی ہم نہ جا سکینگے۔ والد صاحب کل ہی بگڑ چکے ہیں کہ میں نے کاروبار کو بالکل بھلا دیا ہے۔"

"بہت اچھا آپ نہ چلئے!"

"تمہیں تو بس بگڑنا آتا ہے۔ نہ سوچنا نہ سمجھنا۔ بات یہ ہے۔"

"میں نے کہا تو تم نہ چلو پھر بات وات کی ضرورت کیا؟"

"لاحول ولا قوۃ! اچھا خیر، کس گاڑی سے چلنا ہے؟"

"سب بھلے آدمی ڈاک سے سفر کرتے ہیں!"

"مگر تم کب سے بھلے آدمی ہوگئے! ہوں، صبح گیارہ بجے! بہت خوب!"

دوسری صبح کو جب یہ دونوں اسٹیشن پہنچ کر فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ لئے تو جمالی نے پوچھا۔

"اب اگر مضائقہ نہ ہو تو مجھے میرے سفر کا مقصد بھی بتا دو!"

"میرا ساتھ اگر کوئی بڑا مقصد نہیں تو ایک اعلیٰ افسانے کے لئے بیش قیمت تجربہ!"

"ساتھ تو کہتے ہیں ہر وقت بیوی بھی نہیں دے سکتی، رہ گیا فسانے کے لئے مسالا تو اس غرض سے سفر لازمی نہیں!"

"لیکن اس سفر کے تجربے کو تم نے افسانے میں ڈھال لیا تو سمجھو گے کہ سفر واقعی ضروری ہے، خاص کر میری معیت میں!"

یہ بات بس اتنے ہی پر ختم ہو گئی۔ بمبئی پہنچ کر دونوں جیسٹک ہوٹل میں ٹک گئے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر بیٹھے تو نواب نے ٹیلیفون ڈائرکٹری کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اور جمالی اخبار میں منہمک ہو گیا۔ ورق لوٹتے پلٹتے نواب نے خود "او ہو نہہ!" کر کے جمالی سے کہا۔

"جمالی، ایک خط تو لکھو، 'ابدی مثلث'، کی تعریف میں، خوب داد دی جائے!"

"فلم کی یا مس کامنی کی؟"

"مقصود تو کامنی کی اداکاری کو سراہنا ہے!"

جمالی نے ایک مختصر تحسینی خط لکھ دیا۔ نواب نے پڑھکر کہا۔

"نہیں، یہ نہیں۔ اسے واحد غائب میں لکھو!"

"تو مجھے غائب سمجھو، خود حاضر ہو جاؤ!"

"مذاق نہ کرو!"

"تو میں اس واحد غائب کا مطلب خاک نہیں سمجھا!"

"سنو جمالی، مجھے نواب بنانے میں تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"میں کوئی احمق ہوں، تم تو قوم کے نواب ہو، بننے بنانے کی بات کیا ہے؟"

"یہ کہ تم میرے سکرٹری بنجاؤ!"

"بہت خوب، بنگیا، پھر؟"

"یہ کہ تم اپنی طرف سے لکھو کہ ہمارے نواب کو آپ کا فلم بہت پسند آیا وغیرہ"

"مگر ہاتھ گھما کر ناک پکڑنے کی ضرورت؟"

"یہ کہ سکریٹری بطرزِ مناسب لکھ سکتا ہے کہ آپ کی اداکاری کے اعتراف میں نواب صاحب کوئی تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں —"

"نتیجہ؟"

"یہ کہ بمبئی کا چندون کا قیام لطف سے گزرے گا!"

"انکار ہوگیا تو کیا توہین نہ ہوگی؟"

"ائے توہین ہوتی ہے جب بات تیسرے کے کان پڑے! وہ کیا اخبار میں چھپواتی پھرےگی؟"

"اور اپنا احساس وضمیر کوئی چیز نہیں؟"

"تمہیں کس نے فسانہ نگار مان لیا؟ ضمیر ہمیشہ رسم ورواج کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے!"

"آخر تو قومی نواب ہیں۔ ادہر ادھر ایک بات سن لی اور لگے ہر جگہ بگھارنے! نواب صاحب، ضمیر نام اُس بطون کا ہے جو رسم رواج کیا معنی ہر غلط بات کے خلاف بولتا ہے۔ وہ سانچے میں ڈھل نہیں جاتا بلکہ مردہ ہو جاتا ہے!"

"آپ سے کوئی جیت تھوڑی سکتا ہے، اسی بات پر خط لکھ ڈالو!"

جمالی نے نہایت بنا چنا کر خط لکھا اور نواب مطمئن ہی نہیں خوش تھے۔ اپنے ہاتھ سے خط کو ڈاک میں ڈالا۔ اُسی روز شام کو دستی جواب آیا۔ نواب صاحب کی صناعت پسندی کی خوب داد دی گئی کہ جن باریکیوں اور نزاکتوں پر ان کی نظر پڑی ہے تحسین وتعریف کے سیکڑوں ہزاروں خطوں میں ایک بھی ایسا نہیں آیا۔ دوسرے دن صبح نفح الصفا کو چائے پر مدعو بھی کیا گیا تھا۔

نواب نے اُسی آدمی کے ہاتھ شکریے کے ساتھ دعوت کی منظوری لکھ بھیجی۔

"یار یہ تو بڑی غلطی ہوئی!" نواب نے افسوس کے لہجے میں کہا۔

"کونسی؟"

"کہ تمہیں سکرٹری بنا دیا!"

"ابھی تک تو میں نے کوئی چیک وصول کیا نہیں ہے، اور خرابی کیا ہوگئی؟"

"یہ کہ تم ساتھ نہ ہوگے!"

"پہلی ملاقات میں تم اس کو پسند بھی نہ کرتے! نہ معلوم کیا افتاد پڑے!"

"لطف آدھا رہ جائے گا!"

"مردِ خدا تو نیم نان ہی پر قناعت کر لیتا ہے!"

"آؤ چلو بازار کی سیر کر آئیں!"

دونوں ہوٹل سے نکلے، ٹہلتے ہوئے قلعے کی دوکانوں میں گئے۔ ایک جوہری کی دوکان میں گھس گئے۔ نواب نے گلے بند و دست بند کا موتی کا

پلیٹ پسند کیا۔ جمالی نے اسے خوش ذوقی کے خلاف بتایا۔ اور متفقہ رائے سے طلائی "وینیٹی کیس" اس کی چوتھائی قیمت میں خرید لیا گیا۔

دوسرے دن شام ہونے تک نواب کو بے کلی سی رہی۔ جمالی خوشی سے تماشا دیکھتا رہا۔ نواب نے ذکر چھیڑا بھی تو اُس نے بہلا دیا۔ تیسرا پہر ہوا تو نواب مِس کامنی کے مکان "پریم نواس" پر وارد ہو گئے۔ وہ منتظر ہی تھی۔ بڑے تپاک سے پذیرائی ہوئی۔

کامنی واقعی زندگی میں اُس سے زیادہ من موہنی معلوم ہوئی جتنی کہ پردۂ سیمیں پر نظر آئی تھی۔ گھر پر اس کا بیساختہ پن اور کھلا انداز ایک جیتا جاگتا جادو ثابت ہوا۔ تحفے کی بار بار تعریف کی گئی، بار بار شکریہ ادا ہوا۔ نواب کی آرٹ کی نظر کی بڑی داد دی گئی۔

جب ایسی دلنواز صحبت ہو تو چائے شراب کا درجہ رکھتی ہے۔ نواب کو ابتدائی مرحلے اس آسانی اور حسن وخوبی سے طے ہو جانے کی امید نہ تھی۔ جب رخصت ہونے لگے تو نواب نے مِس کامنی کو دعوت دی۔ اُس نے اپنے کام کی زیادتی اور ذمہ داری کا عذر کیا۔ لیکن ڈائرکٹر سے رخصت لیکر صبح فون کرنے کا وعدہ کیا۔ نواب نے ہوٹل پہنچ کر جمالی کو حال سنایا۔ اُس نے بے توجہی سے سن لیا۔

دوسری صبح فون نہ آیا تو نواب نے خود فون کیا۔ جواب ملا۔

"اوہو، نواب صاحب، عجب اتفاق ہے۔ حسنِ اتفاق! میں آپ کو فون کرنے کے لئے ریسیور اٹھا ہی رہی تھی کہ آپ نے گھنٹی دیدی!" یہ کہکر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا جس کا نشہ نواب کے رگوں میں بجلی کی طرح دوڑ گیا۔ پھر بولی "مجھے چھٹی مل گئی ہے۔ پانچ بجے آپ کی منتظر رہوں گی۔"

پانچ بجے جمالی کو زبردستی ساتھ لئے "پریم نواس" پہنچ گئے۔ جمالی کا تعارف کرایا۔

"یہ میرے بچپن کے دوست، ایک کامیاب تاجر، اور اعلیٰ رتبے کے افسانہ نگار بھی ہیں!"

"اوہو! ہماری جنس میں سے ہیں!" اسی بجتی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"میں آپ کی جنس بن جانے کے لئے ڈاکٹروں کی مدد ضرور حاصل کرتا مگر اندیشہ ہوتا ہے کہ اس ڈیل ڈول کو کون قبول کرے گا!"

کامنی نے پھر شرابی ہنسی ہنسی۔ نواب نے بھی سنگت دی۔ مگر جمالی سنجیدہ صورت بنائے بے خبر رہا۔ وہ اُس سے بار بار مخاطب ہوئی مگر وہ دو حرفی جواب دیکر چپ ہو جاتا رہا۔ اس پر وہ دل میں جھلائی بھی۔ پھر نواب سے کہنے لگی۔

"آج ایک اہم سین لیا جانیوالا تھا، اور چھٹی ملنا مشکل۔ مگر میں نے کام چھوڑ دینے کی دھمکی دی تو ڈائرکٹر سیدھا ہوا۔" پھر تینوں باہر نکلے دیر تک موٹر میں سیر ہوتی رہی اور پھر تاج کے "ڈنر ڈانس" میں شریک ہوئے۔ صحبت نہایت خوش آئند تھی۔ زیادہ تر جمالی سے شعر و ادب پر گفتگو ہوتی رہی۔ جمالی جتنا کھنچے رہا وہ اتنی ہی اس سے بات کرنے پر مصر نظر آئی۔ اگرچہ دل میں بہت کڑھتی ہی رہی۔

دوسری صبح کامنی نے فون سے کہا۔

"کہئے نواب صاحب، مزاج بخیر؟"

"آپ جیسے نوازیں اس کے مزاج بخیر نہوں!"

"دھنکی، سنئے" ہلو، میں نے اپنے ڈائرکٹر سے آرٹ کے مربی ہونے کی حیثیت سے آپ کی بڑی تعریف کی ہے۔ وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ بھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"میں ایسا کہاں!"

"سنئے، ہلو" آپ سے ان کی ملاقات ہو جانے کے بعد مجھے چھٹی ملنے میں سہولت رہے گی۔ ہلو، میں خود حاضر آتی مگر ایک نہایت

ضروری کام ہے اور پھر اُن کو کئی روز تک فرصت نہ ہوگی، ہلو!"

"جی، ہلو، میں اُن سے مل کر نہایت خوش ہوں گا۔ ہلو، آج شام کو۔"

"اُن سے ملاقات کے بعد مجھے فون کیجئے گا۔"

"بہت خوب، ہلو، آج شام کو —— ہلو ہلو، تسلیم۔"

دوپہر کے بعد ٹیلیفون پر نواب سے دریافت کیا گیا کہ مس کامنی نے آپ کی آرٹ پسندی کی بڑی تعریف کی ہے کمپنی کے ڈائرکٹر اور مینجنگ ایجنٹ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اس وقت آپ کو فرصت ہے؟

"میں اُن کا منتظر رہوں گا، بڑے شوق سے تشریف لائیں۔" نواب نے جواب دیا۔

دونوں آئے رسمی تعارف ہوا، مختلف اور سطحی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ نواب کی آرٹ پسندی پر اظہار مسرت و اطمینان کیا گیا۔ اور جب اُٹھنے لگے تو نواب کو "نگار خانہ" دیکھنے کی دعوت دی اور نواب نے قبول کر لی۔ اُن کے جانے کے بعد نواب نے کامنی کو اطلاع کی اور بتایا کہ کل نگار خانہ دیکھنے گے۔ کامنی نے تعلقات قائم ہوجانے پر مسرت ظاہر کی۔ نواب نے اُس کے پاس آنے اور سیر کو چلنے کی آرزو ظاہر کی تو بولی۔

"روز روز! کیا خوب! نہیں، آج نہیں، کل تو ملاقات ہوگی ہی!" کامنی نے بڑے چوچلے کی آواز میں کہا اور ہنس دی۔

نواب کی مایوسی کا احساس اُس کی ہنسی کے نشے میں ڈوب گیا۔ نواب کو محسوس ہوا کہ کمپنی والوں کو دوست بنائے رکھنا کامنی سے ملاقات جاری رکھنے کے لئے ایک شرط ہے۔

دوسرے دن دوپہر بعد کامنی اور ڈائرکٹر آئے اور ان دونوں کو ساتھ لے گئے۔ بڑی شان کا استقبال ہوا۔ سارا اسٹاف موجود تھا۔ کام بند کر دیا گیا تھا۔ ایک ایک چیز دکھائی سمجھائی گئی۔ چائے کا اہتمام اعلیٰ پیمانے پر تھا۔ جب سب چائے پینے بیٹھے تو مس کامنی نے کمپنی کی طرف سے میزبانی کے فرائض ادا کئے۔ کمپنی کی مشہور رقاصہ نے اپنے فن کا کمال دکھایا۔ دوسری اداکارہ نے گانا سنایا جو اسی خاص موقع کے لئے "منشی جی" اور "اُستاد جی" نے مرتب کیا تھا۔ پھر نواب دفتر میں لیجائے گئے۔ جمالی اور کامنی گفتگو کرتے رہے۔

مینجنگ ایجنٹ نے نواب سے کمپنی کے کاروبار کا ذکر چھیڑا اور بتایا کہ اب تک کمپنی کتنا منافع کرتی رہی ہے۔ اور یہ بھی کہ کتنا منافع نہیں کر سکی اور کیوں نہیں کر سکی ہے۔ پھر سرمایہ بڑھانے کی اسکیم بتائی کہ نئی اسکیمیں چلائی جائیں گی۔ آخر میں درخواست کی کہ نواب بھی ایک لاکھ کے حصے لیں اور کمپنی کے ڈائرکٹر بن جائیں۔

نواب نے بلا تامل دستخط کر دئے۔ شاید پہلا موقع تھا کہ اُس نے جمالی سے مشورہ کئے بغیر کوئی کام کیا ہو۔ اور پہلا موقع تھا کہ اُس نے جمالی سے اس بات کو مخفی رکھنا چاہا!

پھر کامنی اُن کے ساتھ ہوٹل تک گئی۔ نواب نے دوسرے دن کی قرار داد چاہی تو بولی۔

"آپ کو معلوم نہیں ایک فلم ایکٹریس کی زندگی کتنی دشوار ہے۔ ڈائرکٹر روز روز کی ناغہ کبھی جائز نہ رکھیگا۔ خدا حافظ!"

لیکن اس کے بعد رفتہ رفتہ دن عید اور رات شب برات گزرنے لگی۔ کامنی کام پر ہوتی تو نواب سائے کی طرح ساتھ ہوتے۔ کمپنی کو نواب سے یہ اُمید بھی ہوگئی تھی کہ وہ اپنے تعلقہ دار دوستوں سے کمپنی کے لئے سرمایہ فراہم کرا دیگا کہ کمپنی کی نئی اسکیموں کو خاطر خواہ چلایا جاسکے۔ اب کامنی حکم کی باندی تھی۔

جمالی کو احساس ہوا کہ معاملہ خلاف توقع بہت جلد طول پکڑ گیا۔

اور یہ خود اس کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ اور نواب نعمت ایسا دوست نہیں
جسے آنکھوں دیکھے خراب و تباہ ہونے دیا جائے۔ اُس میں خوبیاں
بھی ہیں اور زندگی کے تجربات ان خوبیوں میں ابھی اضافہ کرنیوالے
ہیں۔ جمالی کو کامنی کی طبع و سرشت کا اندازہ پہلی ہی ملاقات میں ہوگیا
تھا۔ اُسے علم تھا کہ کامنی خود اس پر ملتفت ہے۔ اُس نے سوچا کہ
اگر موقعہ دیکھ کر کامنی کے التفات کو بڑھا چڑھا کر نواب کو یقین کرا دیا جائے
تو فطری رشک سے، نواب کامنی سے بیزار ہو جائے گا۔ لیکن جب تک
وہ خود قدم نہ بڑھائیگا، اب کامنی اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھے گی۔ وہ
کوئی گری پڑی تو ہے نہیں! لیکن نواب کو اُس کی طرف سے صدمہ ـــ
صدمہ نہیں تعلق بھی ختم ہو سکتا ہے! اگر بچپن کی دوستی کی قربانی دوست کے
کے لئے بھی بڑی قربانی ہے۔ لیکن اُسے اگر دوستی کا دعوےٰ ہے تو قربانی
دینا ہی چاہئے۔ دوستی بھی قیمت میں دیکر دوست کو بچا لینا ہی دوستی ہے!

جمالی نے شروع دن سے اور شرارت کے خیال سے یہ اہتمام
رکھا تھا کہ جب کامنی اس کی طرف دیکھتی وہ نظریں چرا لیتا۔ اس سے
کامنی چڑھ جاتی تھی۔ ایک دن جب یہ دونوں تنہا تھے، کامنی نے
اس کی طرف دیکھا تو اُس نے حسب معمول نگاہ پھیر لی۔ کامنی نے جھنجلا کر کہا

"یہ آپ کی کیا ادا ہے؟"

"میری اور ادا! کونسی؟"

"کہ جب میں دیکھوں آنکھیں چرا لینا!"

"یہ تو ناکسی کا مداوا ہے یا بے بسی کا انتقام!"

"یعنے؟"

"یہ کہ میں اس طرح حسن کو ناقابل التفات ٹھہرا کر اپنا دل
ٹھنڈا کر لیتا ہوں!"

"آپ اپنا دل جلاویں ہی کیوں؟"

"اس لئے کہ میں نہ نواب نہ نوابزادہ!"

"کیا خوب! آپ راجہ نواب بننے کی تمنا لئے ہوئے ہیں۔
یہ بھیڑوں کا گلہ جو صرف اس لئے بنا ہے کہ جہاں جائے اُون اتاری
جائے! میں تو آپ کو بہت بلند سمجھ رہی تھی!"

"مگر یہ نتیجہ آپ نے غلط نکالا کہ مجھے تمنا ہے! حقیقت و
واقعہ کا احساس تمنا نہیں کہا جا سکتا۔ بہر کیف، غنیمت ہے۔ آپ مجھے،
بھیڑ، نہیں سمجھتیں، شکریہ!"

"آپ تو رمز شناس ہیں، مجھے تو کہ جہاں حصول زر مقصود
ہو وہاں کبھی دلی تعلق ہو سکتا ہے! شکر ہے کہ آپ راجہ نواب نہیں
اگرچہ میری نظروں میں آپ راجوں کے راجہ ہیں!"

"شکریہ ـــ اب آپ نے بنانا شروع کر دیا!"

"ایک ذہین انشاپرداز کو عامیانہ باتیں زیب نہیں دیتیں،
آزمائیے! نہیں تو وقت بڑی کسوٹی ہے!"

"کیا ایک ایسا آدمی جو نہ نواب ہو نہ نواب زادہ تمہارے
دل کے کسی گوشے میں جگہ پا سکتا ہے؟"

"جمالی، میرے دل کی پوری مملکت پر تمہارا سکہ چلتا ہے!"

کامنی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اُس نے اپنا سر جمالی کے
شانے پر لگا دیا۔

نواب نے آڑ میں کھڑے ہو کر ان کی باتیں سن لیں۔ اندر
داخل ہوئے تو حواس برجا نہ تھے، ہونٹوں پر خشکی تھی اور دل میں دونوں
کی بیوفائی پر غصہ کا طوفان۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ وہاں سے
رخصت ہوئے تو راستے میں بھی بات نہ کی۔ مگر ہوٹل کے کمرے میں پہنچے
تو پھوٹ پڑے۔

"یہی شرافت اور اخلاق ہے جس کے درس تم دنیا کو دیتے
رہتے ہو، جمالی!"

"دماغ کو تکلیف دینا تو تم نے سیکھا نہیں۔ تم درخت کی

ڈالی ہلاؤ اور ایک پختہ رسیلا آم میری گود میں آپڑے تو کیا میں اُسے پھینکدوں گا؟"

"مگر مجھے اس سے الفت تھی!"

"تم نے اس کی زبان سے سن لیا' تھی تو اب نہ رہنا چاہئے! تم دہوکے میں تھے!"

"اور تم دوستی و رفاقت کی توہین کرنے پر اسی لئے آمادہ ہوگئے کہ اُسے مجھ سے محبت نہیں ہوسکتی؟"

"بلکہ تمھاری حماقت ثابت کرنے کے لئے!"

"دغاباز بننا بھی قبول کیا!"

"دنیا کے معیار اعتبارات پر قائم ہوتے ہیں۔ اُس فلم کو یاد کرو جو کاتمنی نے سینما کے پردے پر دکھایا تہا اور اس حقیقت کو دیکھو جو وہ زندگی کی بساط پر دکھا رہی ہے۔ وہ تمھاری دوست نہ تھی محض دولت و تنعم کی خاطر! وہ مجھ پر ملتفت ہے صرف جذبات کی بنا پر! یہ حقیقت ہے باقی سب لغو!"

"تم نے نہایت کمینے پن کا ثبوت دیا ہے' جمالی!"

"مکروریا کی دنیا میں حقیقت سے دور بہت سے حسین لفظ استعمال ہوتے ہیں! لیکن فطرت کی نظر میں ان کے کوئی معنی نہیں۔ اس کو حقائق سے دوچار ہونیوالا سمجھ سکتا ہے!"

"تم انسانیت کے لئے ننگ ہو!"

"تمہیں حق حاصل ہے' اس لئے میں بُرا بھی نہیں مانتا' اور جواب دے ہی چکا ہوں۔ بہرحال میں تمھارا شکرگزار ہوں!"

"میں آج ہی لکھنو واپس جارہا ہوں!"

"جاؤ' مجھے تو افسانے کی تکمیل کرنا ہے۔ یاد نہیں' تم نے کہا تہا اس سفر میں ایک اعلیٰ افسانے کا مسالا حاصل ہوگا۔ شکریہ!"

یہ کہہ کر جمالی نکل کے چلا گیا اور نواب نعمت علی خان اس حقیقت غور پر کرنے میں" کہ محبت و دوستی سی شئے کا وجود ہے بھی یا نہیں" اپنا دل خون کیا کئے۔

ل۔ احمد

چلے گئے

صہبائے چشم مست پلا کر چلے گئے
ساغر سے بے نیاز بنا کر چلے گئے

پھولوں میں بوئے زلف معنبر بکھیر دی
کلیوں میں اپنا رنگ بسا کر چلے گئے

ہر سمت مسکرا کے نظر ڈالتے ہوئے
منظر میں چار چاند لگا کر چلے گئے

اللہ رے تصورِ کامل لہ، بارہا
دھوکہ سا دل کو تھا کہ وہ آکر چلے گئے

جرأت بھی دست شوق کی تھرا کے رہ گئی
دامن کچھ اس ادا سے چھڑا کر چلے گئے

اٹھی جو چشم شوق تو کچھ آگیا حجاب
نظریں جھکائے آنکھ بچا کر چلے گئے

جلوے فروغ حسن کے آنکھوں میں بس گئے
ذروں کو آفتاب بنا کر چلے گئے

وہ حسن شعلہ بار وہ رنگ خرام ناز
اک آگ سی فضا میں لگا کر چلے گئے

کیا تھیں ہمیشہ ہائے وہ انکی تسلیاں
جاتے ہوئے گلے سے لگا کر چلے گئے

رشید احمد رشید (عثمانیہ)

مشاہدے

کئی سال بعد علیگڈھ جانے کا اتفاق ہوا۔ سرسید کے لگائے ہوئے پودے ہرے بھرے تناور درخت ہوگئے ہیں، ان کے پھل پھول دیکھ کر دل خوش ہوتا ہے۔ ایک شخص کی ہمت اور عقلمندی پر آفریں ہے کہ اس نے کیا کیا دقتیں اٹھائیں، کیسی کیسی مالی مصیبتوں کا سامنا کیا مگر ہمت نہ ہار نا تھی نہ ہاری۔ سرسید کے متعلق ایک قصہ معلوم ہوا، آپ نے نہ سنا ہوگا آپ یقیناً دلچسپی سے سنیں گے اور کبھی سُنا بھی تھا تو اس کی یاد تازہ ہو جائے گی۔ بہر صورت آپ دل ہی دل میں سرسید کی حاضر دماغی اور افادیت پسندی پر صاد کریں گے۔

قصہ یہ ہے کہ جب سرسید مسلمانوں کی قومی درس گاہ کے لئے روپیہ جمع کر رہے تھے تو ایک طوائف نے دس ہزار کا نقد چندہ بھجوایا۔ تمام ٹرسٹی انکار پر تلے تھے اور رقم واپس بھجوائی جا رہی تھی کہ سرسید کو اس کا علم ہوا۔ انھوں نے فوراً منع کیا۔ تمام ٹرسٹی حیران ہوگئے۔ سُنا ہے کہ ایک نے صاف صاف کہدیا کہ

"حرام کی کمائیوں سے روپیہ لے کر آپ جس کالج کو سینچیں گے اس کے علم و اخلاق کا کیا معیار ہوگا! کیا آپ کی حالت ابھی سے ایسی گئی گذری ہوگئی ہے کہ.......... آپ رنڈی بھڑووں کا پیسہ لینے بیٹھے ہیں!"

سرسید نے جواب دیا

"بھئی۔ گھبراتے کیوں ہو؟ دیکھو تو کہ اس روپیہ کا بھی کوئی موزوں مصرف نکل ہی آئے گا۔"

غرض سرسید نے روپیہ رکھ لیا، شکریہ کی رسید بھجوادی اور اس رقم سے مختلف حصوں میں بیت الخلاء بنوا ڈالے، دینے والی نے نیک نیتی سے روپیہ دیا تھا، لینے والے نے نیک نیتی سے روپیہ لیا۔ اور ایک مفید غرض پر صرف کر کے دکھا دیا کہ نیک کام کرنا مفید کام کرنا ہے اور مفید کام کرنا ــــــ نیکی کرنا ہے۔ جہاں سرسید نے رشوت لینے والے عہدیداروں، استحصال اور غصب، لوٹ اور فریب سے کمانے والے ہر پیشے اور طبقے کے "معززوں" سے پیسہ لیا تھا وہاں انہوں نے "عصمت فروش" سے بھی روپیہ قبول کرلیا۔ جب ضمیر فروشوں سے روپیہ لینے میں کوئی ہرج نہیں تو عصمت فروشوں سے روپیہ لینے میں کیا قباحت ہے؟ یہ بھی سرسید کی مصلحت شناسی تھی کہ انہوں نے تنگ نظر ٹرسٹیوں کی خاطر اتنی رعایت کی۔ بہر حال ان کی حکمت عملی قابل داد ہے کہ انھوں نے جھوٹی شیخی، بے موقع گھمنڈ اور بُرژوائی نخوت سے متاثر ہوکر دس ہزار کا گراں قدر نقد چندہ کھو نے نہ دیا۔

جب میں اپنے شہر میں اور دوسرے شہروں اور قصبوں میں لوگوں کو عام راستوں پر غلاظت کرتے اور گندگی پھیلاتے دیکھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ ضرورت نہیں بدتمیزیوں پر مجبور کرتی ہے۔ علیگڈھ کے یونیورسٹی والے خوش قسمت ہیں کہ وہ بدتمیزی کرنے پر مجبور نہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اخلاق کا انحصار بڑی حد تک ہماری دولت پر ہے۔ اخلاق اور شرافت، تمیز اور تہذیب کی یہ معاشی تاویل کیا غلط ہے کہ دولت اور سہولت ہمیں صفائی اور پاکیزگی سکھاتے ہیں؟ ہماری سہولتوں کے ماحول میں انسان صفائی کا عادی اور نفاست کا شوقین ہو سکتا ہے۔ غلاظت اور گندگی بیشتر انسانوں کے جمالیاتی احساسات کو غارت کر دیتی ہیں۔

کسی کا کہا ہوا یہ جملہ مجھے بار بار یاد آرہا ہے کہ

"وہی روپیہ اچھا ہے جس کا مصرف ٹھیک ہو اور وہی آدمی بھلا ہے جس کا خاتمہ بالخیر ہو!"

علیگڈھ ہی میں بعض مشتبہ قابلیت اور مخلوط اخلاق کے لوگوں کو دیکھ کر اس خیال کو تقویت ہوئی کہ بعض لوگ جو قومی اداروں

چھ دام بھی دینا گوارا نہیں کرتے اپنے مطلب اور فائدے کے لئے قومی اداروں اور تعلیمی درس گاہوں کو چوسنے اور اس سے مستفید ہونے سب سے پہلے تیار ہو جاتے ہیں۔ لاہور میں بھی میں نے یہ مشاہدہ کیا۔ انجمن حمایت اسلام کی پچاس سالہ جوبلی منائی جارہی تھی۔ یہ وہی مشہور انجمن ہے جس کے سالانہ جلسوں میں اقبال نے اپنی بہترین نظمیں سنائی تھیں، یہ وہی انجمن ہے جس کا شمار ہندوستان کی بہترین رفاہی انجمنوں میں ہونا لازمی ہے یہ وہی انجمن ہے جس نے عمل کے ذریعہ اپنے وجود کی ضرورت و افادیت کو کئی بار ثابت کیا ہے۔ اعلیحضرت کے تیس ہزار کے عطیہ کا اعلان کیا گیا، حکومت پنجاب نے بھی اسی قدر رقم دی، اہل خیر نے مختلف رقمیں عطا کیں غریبوں سے "پیسہ فنڈ" میں پیسہ پیسہ جمع کیا گیا مگر ایسی عمدہ انجمن کے لئے اور ایسے زرین موقع پر بھی بعض لوگوں نے باوجود استطاعت کے کچھ نہ دیا۔ انجان بنجانے والوں میں بعض بڑی بڑی ہستیاں تھیں۔

وہاں سے ایک کے صاحبزادے بی۔ اے جیسا معمولی امتحان وہ بھی معمولی درجے میں پاس کر کے ہندوستان کی ایک مشہور درسگاہ میں قسمت آزمائی کے لئے آئے تھے، ان کے والد بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے ایسی جوڑ توڑ کی اور خوشامد اور منت سماجت کر کے ایسا زور باندھا کہ آخر اپنے کم اہل بیٹے کو دو ڈھائی سو کی خدمت پر چپکا ہی دیا۔ ان سے زیادہ قابل، ان سے زیادہ مخلص، ان سے زیادہ شریف منہ دیکھتے رہ گئے۔ بعض لوگ قومی درس گاہوں پر جان و مال سے قربانیاں کرتے ہیں اور بعض لوگ جونک بن کر قوم پر پلتے ہیں۔ بعض لوگ اپنے عیش اور آرام کو قوم پر بیٹتے ہیں اور بعض لوگ عیش اور آرام کی خاطر قومی دولت سمیٹتے ہیں۔

جعفر حسن

غزل

خوش خوش دلِ بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں
غم اور بھی نایاب ہے معلوم نہیں کیوں

گلزارِ محبت میں مرا نخلِ تمنا
سرسبز ہے شاداب ہے معلوم نہیں کیوں

عالم کا وہ پارینہ صحیفہ ہے کہ جس میں
بے ربطیِ ابواب ہے معلوم نہیں کیوں

کیا وجہ بتاؤں ۔ دلِ مایوسِ محبت
بے چین ہے بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں

اب بارگہِ عشق میں گستاخ نہیں دل
پابندیِ آداب ہے معلوم نہیں کیوں

پھر بزم میں ہیں مجھ پہ ہی وہ مست نگاہیں
پھر دورِ مئے ناب ہے معلوم نہیں کیوں

آما جگہِ حسرت و ارماں تھا کبھی دل
اب رنج بھی کم یاب ہے معلوم نہیں کیوں

ایسا تو نہ تھا پہلے دُرِ اشک مگر اب
خوش رنگ ہے خوش آب ہے معلوم نہیں کیوں

دل آپ ہی خوش ہے تو کبھی آپ ہی غمگیں
بیگانۂ اسباب ہے معلوم نہیں کیوں

شاید کوئی دشمن ہے مرے دل کے سکوں کا
دن رات جو بے تاب ہے معلوم نہیں کیوں

دیکھے تو کوئی دیدۂ نم پر صفِ مژگاں
میلہ سا لبِ آب ہے معلوم نہیں کیوں

یوں پرسشِ احوالِ بشیر اور مسلسل
بے حسِ دلِ احباب ہے معلوم نہیں کیوں

میر بشیر الدین بشیر

جذبۂ بے اختیار

تم دوائے دل تھے دردِ لادوا کیوں ہو گئے؟
آشنا ہو کر وفا نا آشنا کیوں ہو گئے؟
گھٹتے گھٹتے مہربانی بے رخی کیوں ہو گئی؟
ہوتے ہوتے دشمنِ مہر و وفا کیوں ہو گئے؟

اللہ اللہ یہ تمہارے عہد و پیماں کا مآل
زمزمے کمبخت پیغامِ قضا کیوں ہو گئے؟

تم مجھے پہروں کیا کرتے تھے تلقینِ وفا۔
آج خود غارت گرِ جنسِ وفا کیوں ہو گئے؟

فکرِ مستقبل، غمِ احباب، جورِ روزگار
اس پریشانی میں تم مجھ سے جدا کیوں ہو گئے؟

کاش خودداری اجازت دے کہ اتنا پوچھ لوں
تم وفا کے مدعی تھے بے وفا کیوں ہو گئے؟

تم کو غیروں سے وفا منظور تھی کرتے مگر
میرے اطمینانِ ہستی سے خفا کیوں ہو گئے؟

اشک بھر آئے ہیں کیوں احسان ان کو دیکھ کر
یہ زباں کے فرض آنکھوں سے ادا کیوں ہو گئے؟

احسان دانش

ریاست باؤنی کا آصفی خانوادہ

ہز ہائینس اعظم الامرا فخر الدولہ معین الملک صاحب جاہ معین سردار نواب باص الحسن خاں ظفر جنگ نواب بہادر والی ریاست باؤنی۔ حضرت آصف جاہ مغفرت مآب کی اولاد سے ہیں جو اس وقت فرماں روا والی ریاست باؤنی ہیں جن کو ۱۱ توپ کی سلامی مقرر ہے۔ آپ کے حالات خاندانی اس ریاست ابد قرار سے وابستہ ہیں اس کو آپ تاریخ کی روشنی میں تفصیل سے ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) نواب قمر الدین خاں نظام الملک آصفجاہ مغفرت مآب

حضرت آصف جاہ مغفرت مآب کو چھ صاحبزادے اور چھ صاحبزادیاں تھیں جن کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) حافظ میر محمد پناہ غازی الدین خاں۔ نظام الملک امیر الامرا فیروز جنگ ولادت سنہ ۱۱۰۲ھ وفات سنہ ۱۱۵۶ھ مدفن دہلی

(۲) میر احمد علی خاں نظام الدولہ ناصر جنگ شہید ولادت سنہ ۱۱۲۴ھ وفات سنہ ۱۱۶۴ھ مدفن اورنگ آباد۔

(۳) سید محمد خاں آصف الدولہ امیر الممالک صلابت جنگ ظفر جنگ سپہ سالار ولادت سنہ ۱۱۶۴ھ وفات سنہ ۱۱۷۷ھ مدفن بیدر شریف۔

(۴) میر نظام علی خاں نظام الدولہ نظام الملک اسد جنگ فتح جنگ ولادت سنہ ۱۱۴۶ھ وفات سنہ ۱۲۱۸ھ مدفن مکہ مسجد حیدر آباد۔

(۵) میر محمد شریف خاں شجاع الملک بسالت جنگ شجاع الدولہ ولادت سنہ ۱۱۴۹ھ وفات سنہ ۱۱۹۵ھ مدفن قلعہ ادھونی۔

(۶) میر مغل علی خاں ہمایوں جاہ ناصر الملک معتضد الدولہ ہمایوں جنگ چین قلیچ خاں صوبہ دار بیجا پور ولادت سنہ ۱۱۵۰ھ وفات سنہ ۱۲۱۶ھ مزار درگاہ سید حسن برہنہ شاہ رحمتہ اللہ علیہ حیدر آباد۔

حضرت آصف جاہ اول مغفرت مآب کو چھ صاحبزادیاں تھیں جن میں سے ایک صاحبزادی موسوم خیر النسا بیگم صاحبہ نواب متوسل خاں بہادر سے منسوب تھیں یہ نواب ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ کی والدہ محترمہ ہیں۔

(۲) نواب غازی الدین خاں فرزند اول آصف جاہ مغفرت مآب آپ کا اسم گرامی حافظ میر محمد پناہ خطاب غازی الدین خاں نظام الملک امیر الامرا فیروز جنگ دیوان دہلی سنہ جلوس بہادر شاہی مطابق سنہ ۱۱۲۰ سنہ ۱۱۱۶ھ (دربار آصف) میں پیدا ہوئے آپ کی والدہ ماجدہ حضرت سید النساء بیگم عرب بی بیگم صاحبہ نواب عضد الدولہ عوض خاں بہادر کی صاحبزادی تھیں اور زیب النساء بیگم دختر وزیر الممالک آپ کی محل محترمہ تھیں۔ حضرت فردوس آرامگاہ محمد شاہ بادشاہ جب سنہ ۱۱۵۳ھ میں سریر آرائے سلطنت دہلی ہوئے تو آپ کو اپنا دیوان خاص مقرر فرمایا۔ اور سنہ ۱۱۶۵ھ میں خطاب نظام الملک نظام الدولہ کل صوبہ داری دکن سے سرفرازی بخشی۔ نواب غازی الدین خان بہادر اپنے برادر ناصر جنگ شہید کے بعد دہلی میں اپنے فرزند نواب میر شہاب الدین خاں کو نائب دیوان مقرر کر کے ملہار راؤ کے ہمراہ اپنی کثیر فوج کے ساتھ اکتوبر ۱۷۵۲ء مطابق محرم سنہ ۱۱۶۵ھ اورنگ آباد پہنچے۔ مورخین کا بیان ہے کہ آپ کو زہر دیا گیا سوء ہضمی سے

جان پر آبنی بہرحال جان چلی گئی۔ اس وقت نواب
صلابت جنگ بہادر آپ کے برادر صوبہ دار دکن تھے۔
اس واقعہ کی تفصیل سراج الدین طالب مرحوم نے اپنی
تصنیف "نظام علی خاں" میں نہایت تحقیق سے بیان
فرمائی ہے۔ آپ نے ۵۴ سال کی عمر میں بمقام اورنگ آباد
۷۔ ذی الحجہ ۱۱۶۵ھ میں انتقال فرمایا۔ میر حشمت خاں و
تیر انداز خاں بعد تجہیز و تکفین میت دہلی لے گئے اور وہاں
آپ کو حضرت مغفرت مآب کے والد کے مقبرہ میں دفن کیا گیا۔
نواب غازی الدین خاں مرحوم کو ایک صاحبزادہ مسمی
نواب میر شہاب الدین خاں اور تین صاحبزادیاں تھیں۔

(۱) پہلی صاحبزادی ہدایت النسا بیگم صاحبہ
محل خواجہ قلندر خاں بہادر آپ کی بطن سے ایک فرزند
اور دو لڑکیاں تھیں۔

(۲) دوسری صاحبزادی امیر النسا بیگم صاحبہ
محل خواجہ سکندر خاں عزیز الدولہ ان کو ایک فرزند اور
ایک دختر ہوئی۔

(۳) تیسری صاحبزادی سعادت النسا بیگم صاحبہ
نبیرہ وزیر الممالک خواجہ محمود خاں بہادر سے منسوب
ہوئیں جن کے بطن سے ایک لڑکی اور ایک فرزند ہوا۔

ان ہر سہ صاحبزادیوں کی اولاد کی تفصیل ملاحظہ
ہو شجرۂ آصفیہ مصنفۂ بدر الدین خاں تمیز امیر پائیگاہ۔

(۴) نواب میر شہاب الدین خاں فرزند
حافظ میر محمد پناہ خلف حضرت مغفرت مآب۔

میر شہاب الدین خاں بہادر نواب حافظ میر محمد پناہ
غازی الدین خاں بہادر (خلف اکبر حضرت آصفجاہ مغفرت
مآب) کے صاحبزادے ہیں آپ کی والدہ ماجدہ کا نام
زیب النسا بیگم صاحبہ تھیں جو وزیر الممالک کی دختر تھیں۔

آپ کا عقد نواب معین الملک میر منو رستم ہند
طغائی بہادر کی صاحبزادی عمدۃ النسا بیگم صاحبہ سے
ہوا تھا۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۶ سال کی تھی بسعی و
سفارش صفدر جنگ وزیر آپ کو دربار دہلی سے
غازی الدین خاں عماد الملک کا خطاب عطا کیا گیا۔ اور
۱۱۶۶ھ میں وزیر الممالک عماد الدولہ نصرت جنگ کے
مزید خطابات سرفراز کیے گئے۔ جب صفدر جنگ کو احمد شاہ
بادشاہ دہلی نے معزول فرمایا تو انتظام الدولہ خانخاناں
اور نواب غازی الدین خاں موصوف کا دہلی پر قبضہ اور
انتظام تھا۔

صفدر جنگ نے جب بغاوت کی تو آپ نے اپنی
فوج اور جاں نثاروں کو لے کر اس بغاوت کو فرو کیا
(امیر الامرا) یعنی مدار المہام سلطنت دہلی بھی مقرر ہو چکے
تھے۔ عہد عالمگیر ثانی میں آپ نے سات سال تک
وزارت ہند کی خدمت انجام دی۔ آپ کا انتقال
۱۱۹۹ھ میں ہوا۔ آپ کے حسب ذیل صاحبزادے
اور صاحبزادیاں تھیں۔

صاحبزادگان

۱۔ حافظ میر خیرات علی حمید الدولہ متہور جنگ۔
۲۔ غلام محی الدین خاں محی الدولہ
۳۔ معلاً صاحب معلاً جاہ
۴۔ میر قطب الدین خاں قطب الملک
۵۔ میر محمد نصیر الدولہ شیر جنگ (بانی ریاست باؤنی)
۶۔ میر جیلانی خاں عرف میاں بخشو شرف الدولہ
۷۔ غلام فخر الدین خان (داماد ہمایون جاہ)

۸ - میر آصف خاں منور الدولہ
۹ - محمد بخش خاں انتظام الدولہ
۱۰ - غلام نظام الدین (مقیم کالپی)
۱۱ - خواجہ بخش خاں
۱۲ - میر نصر اللہ خاں ناصر الدولہ

صاحبزادیاں

۱ - مینڈو بیگم محل خواجہ وزیر خاں نواسہ وزیر الممالک
۲ - دردانہ بیگم محل خواجہ امیر خاں نواسہ وزیر الممالک
۳ - حاجی بیگم محل خواجہ قطب الدین خاں نواسہ وزیر الممالک
۴ - فضل النساء بیگم محل امیر محمد علی خاں نواسہ وزیر الممالک
۵ - عظمت النساء بیگم محل محمد صلاح الدین فرزند وزیر الممالک
۶ - فرخندہ بیگم محل میر سعد اللہ خاں
۷ - فرحت بیگم محل میر نصر اللہ خاں

(۴) نواب میر محمد نصیر الدولہ شیر جنگ بہادر

آپ کا نام "میر محمد" المخاطب نصیر الدولہ شیر جنگ آپ نواب میر شہاب الدین خاں بہادر نبیرہ حضرت آصفجاہ اول مغفرت مآب کے فرزند پنجم ہیں آپ کی والدہ ماجدہ کا نام گنہ بیگم صاحبہ ہے آپ کو ایک صاحبزادی پادشاہ بیگم صاحبہ جو احمد بخش خاں بہادر فرزند ناصر الدولہ خلف وزیر الممالک سے منسوب تھیں۔

تاریخ بندیلکنڈ

بندیلکنڈ ہندو راج دھانی تھا۔ عہد شاہجہاں بادشاہ میں راجہ چیت رائے اور اس کے فرزند چھتر سال نے ایک جدید خاندان مشترک ملک میں قایم کیا محمد خاں بنگش افغان رئیس فرخ آباد نے چھتر سال کے ملک پر حملہ کیا پیشوا باجی راؤ کی امداد سے حملے کی مدافعت کی گئی۔

یہ علاقہ علی بہادر پونا باجی راؤ بیٹا شیو بہادر اور فرزندان چھتر سال میں تقسیم ہو گیا تھا۔ شیو بہادر بن علی بہادر سنہ ۱۸۲۳ء میں جب فوت ہوا تو اس کے بھائی ذو الفقار علی کے نام یہ علاقہ سپرد ہوا۔ من بعد علی بہادر کا سنہ ۱۸۵۶ء میں خاتمہ ہو گیا۔ بندیلکنڈ ایک وسیع علاقہ ہے جہاں صرف یہی ایک اسلامی ریاست واقع ہے۔

ریاست باؤنی

نواب میر شہاب الدین خاں بہادر نبیرۂ حضرت آصفجاہ مغفرت مآب نے پیشوا سے باون مواضع کا ایک علاقہ حاصل کیا تھا جس وقت بندیلکنڈ میں سرکار عظمت مدار برطانیہ کا قبضہ ہوا تو نواب نصیر الدولہ شیر جنگ بہادر کا قبضہ ریاست باؤنی پر برقرار رہا۔

سنہ ۱۸۰۶ء میں اس ریاست نے سرکار عظمت مدار سے اپنا توسل پیدا کیا اور ذریعہ کپتان بیلی۔ آنریبل گورنر جنرل بہادر سے بعض معاہدات کیے جس کی تفصیل عہد نامجات جلد سوم متعلق بندیلکنڈ میں ملاحظہ ہو۔

جب نواب نصیر الدولہ شیر جنگ بہادر کا انتقال ہوا تو سنہ ۱۸۱۵ء میں ان کے صاحبزادے نواب غلام قادر خاں امیر الملک بہادر اور ان کے بعد سنہ ۱۸۳۶ء میں آپ کے صاحبزادے نواب محمد حسین خاں بہادر جانشین ہوئے نواب صاحب موصوف نے سنہ ۱۸۵۶ء میں اپنے فرزند نواب مہدی حسین خاں المخاطب امام الدولہ بہادر کو اپنا قایم مقام مقرر فرمایا۔

نواب محمد حسین خاں بہادر والی ریاست باونی کا انتقال اگست سنہ ۱۸۵۹ء میں ہوا۔ نواب مہدی حسین خاں امام الدولہ بہادر کو سنہ ۱۸۶۲ء میں سند تعین وراثت عطا ہوئی۔

نقل سند ملاحظہ ہو۔

سند جو نواب مہدی حسین خاں امام الدولہ باونی
والہ کو عطا ہوئی المرقوم ۱۱ مارچ ۱۸۶۲ء۔

جناب ملکۂ معظمہ کی یہ خواہش ہے کہ حکومت اکثر
رئیسان و راجگان ہندوستان کی جو اب اپنے اپنے
علاقہ میں حکمران ہیں واسطے دوام کے رہے اور شان و شوکت
ان کے خاندان کی جاری رہے بہ تعمیل اس خواہش
شاہنشاہی کے یہ سند تم کو دیجاتی ہے۔ جس کے رو سے
اطمینان دیا جاتا ہے کہ درصورت نہ ہونے وارث اصلی
کے گورنمنٹ انگریزی اس شخص کو منظور کر کے جانشین
تمہارے علاقہ کا کرے گی جو از روے شرع محمدی کے
جائز ہوگا۔ بشرطیکہ نصف آمدنی علاقہ اس سال کی
بطور نذرانہ داخل ہوگی جب کہ سند نشینی کسی وارث
اصلی کی منائی جاے گی اطمینان رکھو کہ کوئی امر
مخل اس شرط کا نہ ہوگا جو تم سے کی جاتی ہے جب تک
تمہارا خاندان نمک حلال تخت و تاج شاہی رہے گا
اور جب تک وہ شرائط عہدنامجات و عطانامجات
واقرارنامجات کی جو گورنمنٹ انگریزی سے ہوئے ہیں
تعمیل باایمانداری کرتے رہیں گے۔

(از عہدنامجات جلد سوم)

نواب مہدی حسن خان امام الدولہ بہادر نے
۱۸۸۳ء میں ریاست سے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور
حسب صوابدید سرکار عظمت مدار آپ کے صاحبزادے
نواب محمد حسین خاں بہادر جانشین ہوئے۔ عرصہ دراز
تک نہایت نیک نامی کے ساتھ ریاست کا انتظام
فرماتے رہے آپ کی وفات پر آپ کے صاحبزادے
ہز ہائینس اعظم الامرا فخر الدولہ معین الملک صاحب جاہ
معین سردار نواب ریاض الحسن خاں ظفر جنگ بہادر۔
سریر آراے سلطنت باونی ہوئے۔ حضور ممدوح کے
تفصیلی حالات آئندہ شایع کیے جائیں گے۔ اس ریاست
کا رقبہ ایک سو بائیس مربع میل آبادی انیس ہزار سات سو
اسّی۔ اور آمدنی ایک لاکھ روپے سے زائد ہے اور اس
ریاست کے رئیس کو ۱۱ ضرب توپ کی سلامی کا بھی اعزاز
حاصل ہے۔

حضرت آصفجاہ اول مغفرت مآب نور اللہ مرقدہٗ
نے نہ صرف دکن ہی میں اپنی سلطنت کی بنا ڈالی بلکہ
ہندوستان میں بمقام بندیلکھنڈ ایک اسلامی سلطنت
چھوڑی جہاں بحمد اللہ اب تک آپ کی اولاد فرماں روا کا
سلسلہ باقی ہے کیونکہ اس وقت تک حیدرآباد دکن میں
عامۃ الناس بہت کم اس ریاست سے واقف ہیں اب
مختصر حالات پر اکتفا کیا جاتا ہے کسی فرصت سے
ریاست باونی کے تفصیلی حالات پیش کیے جائیں گے۔

شجرہ

۱۔ نواب محمد قمر الدین خاں نظام الملک آصفجاہ مغفرت مآب
۲۔ حافظ میر محمد پناہ غازی الدین خاں فیروز جنگ میر الامرا نظام الملک
۳۔ میر شہاب الدین خاں غازی الدین خاں وزیر الممالک عماد الملک عماد الدولہ نصرت جنگ
۴۔ میر محمدی نصیر الدولہ شیر جنگ۔ (۵) غلام قادر خان امیر الممالک
۶۔ محمد حسین خان بہادر (۷) مہدی حسین خان امام الدولہ
۸۔ محمد حسین خان بہادر ثانی (۹) فرماں روا رئیس باونی نواب
ریاض الحسن خان ظفر جنگ بالقابہم۔

حکیم شفا مجددی

ایک بحر میں تین غزلیں

(۱)

محبت کا آغاز، سو سو بہانے
اچٹتی نگاہیں، ادھورے فسانے

میں کچھ کہہ رہا ہوں، میں کچھ سُن رہا ہوں
یہ کیا گفتگو ہو رہی ہے، نہ جانے

ملائی گئی مئے میں آنکھوں کی مستی
مٹائے گئے ہستیوں کے خزانے

پلٹ آئی شاید مری عمرِ رفتہ
وہی مست راتیں، وہی دن سہانے

بہاروں سے پت جھڑ گلے مل رہی ہے
چھپائے کہیں شاخِ گُل آشیانے

مری روح کا قہقہہ بن گئے ہیں
لبوں پر سسکتے ہوئے سے ترانے

صراحی کوئی چھین لے اُن سے میکش
وہ اٹھے ہیں محفل میں ساغر اٹھانے

(۲)

محبت کے دن ہم نے یوں بھی گزارے
سمجھتے رہے نامکمل اشارے

نہیں یوں نہ معصوم کلیوں سے کہہ دو
تمہیں چومنے کو اترتے ہیں تارے

گھٹاؤں سے کھیلے ستاروں کو چومے
زمیں پر ہی برسائے بجلی شرارے

قدم لڑکھڑاتے تھے میکش کے لیکن
سنبھلتا رہا، لغزشوں کے سہارے

(۳)

یہ انداز تو، اک جہاں بن رہا ہے
کوئی مجھ سے کہہ دے کہاں بن رہا ہے

یہ کیا ہو گیا میرے سجدے کو یارب
یہیں اک نیا آستاں بن رہا ہے

جو گم کردہ منزل کا نقشِ قدم تھا
وہ اب رہبرِ کارواں بن رہا ہے

خزاں فرشِ گُل کر رہی ہے چمن میں
چمن، دامنِ باغباں بن رہا ہے

محبت کے گیتوں پہ سر دھننے والے
اسی لئے میں ذوقِ فغاں بن رہا ہے

غریبوں نے اتنا نوازا کہ میکش
یقیں بھی یقینِ گماں بن رہا ہے

میکش

گُل بُوٹے

ایک بزرگ خاتون کئی برساتوں سے ایک ایسے مکان میں رہتی ہیں جو ایک دن برسے تو تین دن ٹپکتا ہے، بعد از خرابی بسیار اب گھر بدلنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔ ہر ہفتے دو چار مکان دیکھ ڈالتی ہیں مگر کوئی جی کو نہیں لگتا "خدا کی قدرت" دیکھئے کہ ہمارا ابھی ایک گھر اسی اثنا میں خالی ہوا۔ ایک دن صبح سویرے کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھنے لگے وہ آئیں، اور گھر کے چپہ چپہ کو خیابان خیابان ارم کرنے لگیں" ہر کمرے میں دس پندرہ منٹ ٹھہرتیں، اسے کو ٹھیک کرتیں در و دیوار کو، دیکھتیں، اپنے آنے والی ضرورتوں کا اندازہ لگائیں، یہاں تک کہ کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے لیٹنے سونے، اللہ اللہ کرنے وغیرہ وغیرہ کے لیے کمروں کی نام رکھائی بھی ہوگئی، ہم نے یہ سمجھا کہ مدظلہا کو گھر پسند آگیا ہے اور ہم دل ہی دل میں اس کے کرایہ پڑھنے کی خوشی منا ہی رہے تھے کہ یوں گویا ہوئیں۔

"گھر بڑا سہانا ہے، صحن خاصا ہے، دالان اور کمرے قرینے کے ہیں کیا اچھا ہوتا جو کچھ اور گنجائش بھی ہوتی"! ہم نے پوچھا "اور کس قسم کی گنجائش چاہئے"؟

فرمایا ـــ میری بھتیجی بیٹی کے میاں مجھ سے بہت مانوس ہیں، یوں تو دوسرا گھر کرلیا ہے مگر ان کا روز کا آنا اور بچوں کے ساتھ میرے پاس کا کھانا پینا کبھی نہیں ٹلتا! میری بیٹی کی نشانی بیچارے وہی تو رہ گئے ہیں!! اللہ رکھے نواسہ تو اسی بھی موجود ہیں۔ مگر داماد آخر داماد ہی ہوتا ہے! ان کے اٹھنے بیٹھنے کے لیے دو تین کمرے اور ہوتے تو اچھا تھا!!!

ہم نے دریافت کیا یہ کمرے آپ کس قسم کے چاہتی ہیں"؟

جواب ملا " اگر آپ تین معمولی کمرے ٹین کی چھت ڈال کر بنوادیں گے تو میں اس گھر سے کبھی نہ جاوں گی، کرایہ ساٹھ کے عوض سو روپے لیجئے!

ہم نے عرض کیا " اگر آپ سو روپے کرایہ دیں اور تین سال کی گیارنٹی لکھ دیں تو ہم ایک مہینے کے اندر کمرے بنوا دیتے ہیں" بولنے لگیں "میری بات پتھر کی لکیر ہوتی ہے" قول مرداں کی مثل مشہور ہوگئی ہے لیکن اس کی حقیقت نقش بر آب، سے زیادہ نہیں ہوتی"! سو روپے کے کرایہ کے خیال سے ہم نے اس قول کی تردید نہیں کی مگر ان مناتے ہوئے عرض کیا۔

" آپ سچ فرماتی ہیں جب ہی تو دنیا میں یہ طوفان اٹھ رہے ہیں"!!

ہم کچھ اور کہنے کو تھے کہ ہماری بولتی بند ہوگئی جب مدظلہا بات کاٹ کر یہ فرمانے لگیں۔

" گھر کی چھتیں کچھ ٹھیک نہیں ہیں، میرے فیملی ڈاکٹر نے مجھ کو سخت تاکید کی ہے کہ ایسے گھر میں نہ رہوں جس کی چھتوں میں لوہے کی نالیں ہوں! کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ ان کی جگہ لکڑی کی نالیں لگوادیں"؟

اس فرمائش سے ہم چہ کنم ہوگئے اور انہیں " قیامت کے فتنہ کی طرح سر سے پاؤں تک تکنے لگے۔ جب یہ دیکھا کہ وہ ماشاءاللہ جواب کی منتظر ہیں تو کہنا ہی پڑا۔

"ایک دو دن سوچ کر عرض کیا جائے گا"۔

ہم اس ادھیڑ بن میں ہی تھے کہ دوسرے دن مزلطیا نے لکھ بھیجا ۔فیملی ڈاکٹر کی رائے نہیں ہے کہ میں ایسے مکان میں جاؤں جس میں سے بیم نکال کر لکڑی لگائی گئی ہو' اس وجہ سے کہ ایسا کرنے سے چھتیں کمزور ہو جاتی ہیں لہٰذا ابھی چھتوں میں لکڑی لگانے کا کام شروع نہ کیا جائے"!!

ایک شاعروں کے "قدر دان" بزرگ کسی جگہ رونق بزم تھے' طوائف صفیؔ لکھنوی کی غزل گا رہی تھی جس کا مطلع ہے۔

"یہ درد عشق نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا اس دل سے ✽ کہ موت آئے گی آسانی سے دم نکلے گا مشکل سے"

آپ جھوم جھوم کر "داد کلام" دے رہے تھے' جب اس نے مقطع گایا۔

پلٹ کر عمر رفتہ کو صفیؔ آواز دیتا ہوں ✽ نکل آیا ہوں اپنی رو میں اتنی دور منزل سے

آپ کی سمجھ میں کچھ نہ آیا' اپنے ایک دوست سے جو آپ کے بازو بیٹھے تھے فرمایا۔

" بھئی عجب مہمل شعر ہے! کچھ مطلب ہی نہیں نکلتا" !!

دوست نے کہا "بھائی صاحب شاعر نے بڑی نازک بات کہی ہے کہ کس طرح تغافل شعار انسان دنیا کی بھول بھلیوں میں پھنس کر زندگی کی منزل سے دور نکل جاتا ہے اور آخر عمر میں پچتاتا ہے جب کہ اس کے بس میں کچھ نہیں ہوتا" شاعری کی یہ موٹی موٹی باتیں" آپ کے نازک دماغ میں بھلا کیسے آسکتی تھیں! مگر آپ نے اس انداز سے سر اقدس کو جنبش دی گویا سب کچھ سمجھ گئے ہیں !!

دوسرے روز صبح میں بیدار ہوتے ہی آپ کی محترم بیگم کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ آپ اُلٹے پاؤں چل رہے ہیں! سبب پوچھا تو فرمایا۔

"رات کو دعوت میں ایک شعر سنا تھا معلوم ہوا کہ انسان کی گزری ہوئی عمر اس کے پیچھے پیچھے چلتی ہے! چنانچہ شاعر آخر عمر میں اپنی "عمر رفتہ" کو پلٹ پلٹ کر پکارتا ہے۔میں نے کل کی رات ہی سے یہ عمل شروع کر دیا ہے !! اب تک تو "وہ" کمبخت نظر نہیں آئی۔ پلٹ پلٹ کر بار بار دیکھنے کی زحمت سے بچنے کے لیے میں نے الٹے پاؤں چلنا شروع کر دیا ہے تاکہ "وہ" نظر آتے ہی پکڑ لوں! کیوں؟ کیسا آسان طریقہ۔" اعادۂ شباب" بلکہ اعادۂ طفلی" کا میں نے سوچا ہے" !!

باغبان

تنقید و تبصرہ

بہاران ۔ تقطیع ۔ ۲۰۸ صفحے نفیس لکھائی چھپائی ۔
مطبوعہ نظامی پریس لکھنؤ ۔ قیمت (۳ روپئے)

یہ خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے کلام کا مجموعہ ہے ۔ جو کئی حیثیتوں سے موجودہ اردو شاعری میں اہمیت رکھتا ہے۔

غزل پر جو تنزل آتش اور ناسخ کے بعد سے طاری ہونے لگا تھا، اس کو توڑنے میں غالب کی شاعری کو جتنا دخل ہے، اتنا ہی دخل اس کو محاورہ بندی کی بے مزہ تک بندیوں کے اثر کو گھٹانے اور شعر میں خیال کی اہمیت کو بڑھانے میں ہے غالب کی شاعری سے لوگوں کے ذہن جس قدر مانوس ہوتے گئے، اردو غزل میں نئی نئی راہیں کھلنے لگیں۔ اس وقت یہ اثرات فضا میں پھیلے ہوئے ہیں، اور شعوری یا غیر شعوری طور پر، اردو شاعران سے متاثر ہو رہے ہیں ۔ چنانچہ اس زمانے کے بعض شعرا کے کلام میں غالب کی شاعری کے خاص خاص پہلو نمایاں نظر آتے ہیں ۔ اصغر گونڈوی مرحوم نے غالب کی جدت طرازانہ اور ایک حد تک فلسفیانہ ساز فکر کو نمایاں کرنے کی کوشش کی اور فانی کی شاعری میں غالب کے کلام کا قنوطی پہلو بہت زیادہ گہرا ہو گیا ہے جگر اور اثر پر یہ اثرات راست نہیں پڑے ۔ تاہم غالب کے بعد سے اردو غزل کے ارتقا پر نظر والے، تغزل کی اس وسعت کے رشتے کو جس کا ان شعرا کے پاس ثبوت ملتا ہے، غالب کے بواسطہ اثر کے سوا کسی اور ماخذ سے نہیں جوڑ سکتے۔ زیر نظر مجموعے میں بھی، ترکیبوں، زمینوں اور مضامین میں جگہ جگہ یہ اثرات کارفرما نظر آتے ہیں ۔

اثر کے کلام میں، غنائی رجحانات، کا غیر معمولی اعتدال، اس سبب سے پیدا ہو گیا ہے کہ انہوں نے، میر کی سادہ بیانی کو اپنا مطمح نظر قرار دیا ہے ۔ نام اور سرنامے کے اشعار کے علاوہ ذیل کے شعر سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے

دل کش نہ ہو کیوں کلام اثر کا　　سیکھا ہے یہ اس نے میر سے فن

"بہاراں" میں بہت سے اشعار اور غزلیں ایسی موجود ہیں جو یہ ظاہر کرتی ہیں کہ شاعر بار بار اپنے ماحول سے نکل کر اسی قدیم شعری فضا میں اپنے آپ کو پہنچانا چاہتا ہے، جو اس کا نصب العین ہے ۔ اور یہاں سے وہ الہام حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ اس کوشش میں ہماری زیادہ بسیط اور پیچیدہ معاشرت میں رہنے والا شاعر، جسقدر کامیاب ہو سکتا ہے، اتنی کامیابی اثر کو بھی حاصل ہوئی۔

اثر، میر کی طرح، ایک غنائی شاعر ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہئے کہ شاعری اگر پیشے کے طور پر بھی اختیار کی جا سکتی ہے، تو اثر کی شاعری ذوق کی شاعری ہے ۔ پیشے میں زندگی کے دوسرے مسائل سے ان کا واسطہ ہے۔

اثر کی شاعری میں لکھنؤ کی شستہ اور ثقہ طرز فکر کے ساتھ ساتھ میر کی سادہ خیالی اور سادہ بیانی کے پیوند نے بڑا لطف پیدا کر دیا ہے اور اس میں، کہیں کہیں لفظی رعایتوں کی پابندی سے، لکھنؤ کے گذشتہ دور شاعری کے ساتھ اس کا رشتہ مستحکم ہو گیا ہے ۔ اثر کی طبیعت کی روانی کا پتہ ان کی طویل غزلوں سے چلتا ہے جو اس مجموعے میں بہت خاصی تعداد میں موجود ہیں ۔ بعض غزلیں مسلسل بھی ہیں ۔ اور اکثر ایسی غزلوں ہیں جو مسلسل نہیں ہیں، بے ربط خیالات کی تہ میں طبیعت کے وقتی تاثر کی یکسانیت کا رشتہ موجود ہے،

غزل کے تمام اساتذہ کی طرح، اثر نے بھی، اپنے عاشقانہ اور غنائی انداز کو ماحول کے تاثرات کا پردہ بنایا ہے ۔ غزل کے وسیع اور منتشر مضامین کے درمیان، ان کا ایک ذاتی احساس، خاص طور پر ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے، اور یہ "بہار" سے اثر پذیری ہے ۔ نہ جانے شاعر نے کتنے وسیع تصورات میں بہار کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے

"س"

ارمغان حجاز:۔ از علامہ اقبال۔ لکھائی چھپائی بانگ درا کی سی ہے۔ صرف اسقدر فرق ہے کہ اس کا خط بانگ درا کے خط سے جلی ہے اور یہ (۲۸۰) صفحات پر مشتمل ہے اور بانگ درا کی بہ نسبت اسکی نظموں کے عنوانوں میں زیادہ ہم آہنگی اور پختگی خیال ہے ارمغان حجاز میں کوئی دیباچہ نہیں ہے۔ اسکو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا حصہ فارسی کلام کا ہے اس میں حضور حق' حضور رسالت صلعم' حضور ملت' حضور عالم' انسانی بہ یاران طریق کے عنوان کے تحت نظمیں لکھی گئی ہیں' ان نظموں کا ماحصل یہ ہے کہ اقبالؒ نے وہی اپنے دلپذیر پیرایہ میں عقائد اسلامی کے راز کا انکشاف کیا ہے خودی کو پہچاننے' افراد کو قرآنی تعلیم اور نبی کریم صلعم کے اسوہ حسنہ سے محکم کرکے ملت کو "انا الحق" کہنے کا دعویدار بنانے کی اقبال نے تلقین کی ہے۔ بہ حضور حق و بہ بارگاہ نبی کریم صلعم وہ عامی مسلمان کی زبان حال سے شکوہ آمیز التجا بڑی لطافت و دل پذیر پیرایہ میں کرتے ہیں۔ وہ عامی مسلمان کی اس لئے عذر خواہی کرتے ہیں کہ وہ اس دنیا کے کیوں اور کس لئے کے معمے حل کرنے میں مبتلا ہے۔ نیکی اور بدی کے اور عقل و دل کے درمیان ان کا دل فطرتاً متحیر و مضطرب رہتا ہے۔ ہندوستانی مسلمان کے لئے وہ زیادہ رحم و کرم کے طالب ہیں کیونکہ یہ نہایت بلندی سے گرا ہوا اور دردمند دل رکھنے والا مسلمان ہے۔ ہندی مسلمان سے عدم تنظیم آپس کے نفاق۔ عدم موجودگی قائد ملت کی انہیں شکایت ہے وہ اس کی جیب میں درم دیکھتے ہیں نہ ہاتھ میں تلوار۔ نہ قرآنی تعلیم سے اسکو آشنا پاتے ہیں ان کو تعجب ہو رہا ہے کہ وہ مسلمان ہو کر کس طرح بے "اللہ ھو" کے جی رہا ہے۔ علامہ اقبال اس اسیر غلامی کی اللہ و رسول سے مدد کے طالب ہیں۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ ان کا سوز مسلمانوں کے دل میں تکبیر کی آگ بھڑکا دے اور ان کا یقین ایمان مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہو جائے۔

ارمغان حجاز کا دوسرا حصہ اردو نظموں کا ہے۔ اس کی پہلی نظم ابلیس کی مجلس شوری سے شروع ہوتی ہے۔ اس میں موجودہ سیاسی نظام پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ یورپی جمہوریت کو اقبالؒ ملوکیت کی ایک دوسری شکل سمجھتے ہیں اور ملوکیت کی تعریف وہ یوں کرتے ہیں۔

مجلس ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو ہے وہ سلطان غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

وہ روسی اشتراکیت کے فلسفے کا جواب اٹلی کے فاسسٹی نظام میں دیکھتے ہیں ان کی دوربین آنکھیں اشتراکیت کو خطرہ فردا نہیں سمجھتیں بلکہ وہ اپنے اسلامی دور جدید کے اپنے قدیم خواب کی تعبیر کے منتظر ہیں اور کہتے ہیں۔

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

اسلام کے قوانین شرعیہ میں ان کو وہ تمام خصوصیات نظر آ رہی ہیں جن کے پھیلنے کے لئے عصر حاضر تقاضا کر رہا ہے۔ یہ پیشگوئیاں ہیں جن کو اقبال جیسے دیدہ ور شاعر نے مدتوں پہلے بیان کیا تھا اور آج ہم اپنی آنکھوں سے یورپ کا نقشہ بدلتا ہوا دیکھ رہے ہیں اس ارمغان میں انہوں نے پھر اپنی قدیم پیشن گوئیوں کی یاد تازہ کی ہے۔ ان سے استفادہ کرنا یقیناً ہر سمجھدار انسان کا فرض ہے کیونکہ

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس اردو کلام کے حصے میں اور نظمیں مثلاً بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو' تصویر اور مصور' عالم برزخ وغیرہ مکالمے کے طرز کی نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں بعض اردو نظموں کے عنوانین گنجلک پیدا ہوگیا ہے' یہ عنوان کہ "ملا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" اس کے پڑھنے والے کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا ایک بیاض پر نظم لکھی گئی ہے مگر پڑھنے سے معلوم ہوا کہ ناشر کا مقصد وہ چیدہ چیدہ اردو فارسی ابیات ہیں جو ملا زادہ کے بیاض سے ماخوذ ہیں۔ اسی طرح ایک اور نظم سر اکبر حیدری صدر اعظم حیدر آباد دکن کے متعلق ہے جس کے تحت دو سطروں میں حسب ذیل عبارت ہے "یوم اقبال کے موقع پر

توشہ خانہ حضور نظام کی طرف سے جو صاحب صدر اعظم کے ماتحت ہے ایک ہزار روپے کا چک بطور تواضع وصول ہونے پر" یہ جملہ ناقصہ واضح ہو جاتا اگر کبھی گئی اس کے ساتھ لکھدیا جاتا۔ اسی طرح کتاب کے آخر صفحے پر صرف عبدالمجید پروین رقم لکھا ہوا ہے اگر اس کے ساتھ کاتب کا لفظ لکھدیا جاتا تو اس نام کے لکھے جانے کی خصوصیت ظاہر ہو جاتی۔ بہرحال قطع نظر طباعت کی بعض غلطیوں کے ارمغان حجاز شور رومی سوز خسرو اور اخلاص سنائی رکھنے والے دل درد آشنا شاعر کے اردو فارسی کلام کا بہترین گلدستہ ہے۔

(ڈاکٹر محمد عبدالمعید خان)

شاعر کی دنیا۔ چالیس شعراء کی بزم ہے۔ جس کو محمد عظیم الدین صاحب محبت نے آراستہ کی ہے۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس قیمت ۶ر

پیش لفظ جناب ماہر القادری نے پیش کیا ہے۔ جو بجائے خود شاعرانہ نثر کا ایک دلچسپ ٹکڑا ہے اس میں شک نہیں "بدعت" تو ہوئی ہے صاحب موصوف سے۔ مگر بقول خود ان کے چوک ہو چکی ہے اور اب خمیازہ بھی غالباً انھیں کو بھگتنا پڑے گا پیش لفظ کے بعد محبت صاحب کا عرض حال ہے۔ پھر اُن کی تصویر ہے۔ اس طرح صفحہ (۱۱) سے شعراء کی صف کا آغاز اجلال کے کلام سے ہوا ہے۔ نمونۂ کلام سے پہلے مختصر طور پر حالات زندگی بھی درج ہیں اجلال صاحب کا یہ شعر تصوف کے رنگ میں خوب ہے ؎

کب تک سنیں یہ دیر و حرم کی حکایتیں الٹو نقاب ختم ہو یہ داستاں کہیں

پھر اختر و اشک والم ہیں اور امجد کی دنیا ہی سب سے الگ ہے یہ بالکل انوکھے رنگ میں جلوہ گر ہیں۔ کہیں "گزار دے" پہ تضمین کی مرصع بندش ہے۔ ان کے رباعیات تصوف کی جان ہیں۔ جن سے دنیا سے بیزاری، قناعت و سکون قلب کا رنگ جھلکتا ہے۔ پھر تو باقی کے فاؤسٹ کا آزاد ترجمہ ہے۔ تابش، تمریز، جعفر کے بعد استاد جلیل ہیں۔ جن کے کلام میں امیر مینائی کے تیور ہیں۔ خصوصاً یہ دو شعر کتنے پاکیزہ ہیں ؎

کیا کہوں ہجر کے جینے کا مزہ اے خضر یہ زندگانی اور ہے
یوں تو سب کچھ ہے زبان شکر پر کہتی ہے جو بے زبانی اور ہے

حامد کے نالے یہاں سے بلند ہوتے ہیں۔ یہ صاحب دہائی دیتے ہوئے نکلے ہیں۔ حرماں و حزیں کے کلام میں ان کے تخلص کا عکس نمایاں ہے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ تمناؤں میں بھی الجھے ہوئے ہیں۔ حسرت تو اسم بامسمیٰ معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی دونوں غزلوں میں یاس والم کا رنگ نمایاں ہے۔ آخر میں ایک ہی شعر جو دیا ہے وہ بہت اچھا ہے ؎

مختاری اس کو کہتے ہیں مجبوری نام اسی کا ہے
جو تم نے چاہا ہو کے رہا جو ہم نے چاہا ہو نہ سکا

خیالات میں اکبر آبادی کے انداز ہیں۔

رشید ترابی کے شکوہ کا جواب "شاعر کی دنیا" کا بلیغ ترین سرمایہ ہے۔ اقبال کا جواب ہے اور اقبال کے ہی رنگ میں۔ ڈاکٹر زور کی نظم "چاندنی" میں ٹیکسپیئر کی شاعری کا پرتو ہے۔ خصوصاً یہ شعر کتنا مرصع ہے ؎

نشتر سے میرے دل میں چبھوئے ہوئے سے ہیں
نغمے مرے رباب میں سوئے ہوئے سے ہیں

زیبا، ساز، سعید، صدق، صفا، صفی، عارف، عرش، عزیز، علی اور غیور کے بعد فانی ہیں، جن کے لئے خود مؤلف نے لکھا ہے۔ "دور حاضرہ کے امام المتغزلین ہیں"۔ ان کے کلام کا قنوطی پہلو اپنے گہرائیوں میں میر کی شان لئے ہوئے ہے۔ ان کے یہاں ایک فلسفہ ہے۔ ان کی شاعری غم والم یاس و حرماں کا مرقع ہے۔ دونوں غزلیں اس مجموعہ میں ان کی اچھی ہیں۔ خصوصاً دوسری غزل کا یہ شعر ؎

زندگی کی دوسری کروٹ تھی موت زندگی کروٹ بدل کر رہ گئی

شاعر کے لئے آلام حیات اور آرزوؤں کی پامالی بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر صحیح جذبات بیدار ہی نہیں ہوتے پھر قتیل ہیں جن میں فانی کی

بوباس پائی جاتی ہے۔ یہ شعر ان کا اقبال کے تخیل کی غمازی کرتا ہے ؎

وہاں دل شا کی تاب تکلم خموشی بھی جہاں اک داستاں ہے

ماہر تو فن شاعری کے ماہر ہی ٹھیرے۔ ان کی زبان کا شباب اور بانکپن بے حد مسحور کن ہے مثلاً ؎

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا سو بار جنوں نے تری تصویر دکھادی

یہ ویرانہ یہ سناٹا یہ وحشت خیز خاموشی عزیزوں نے مری میت کو کیا سمجھا کہاں رکھ دی

تری محفل ناز سے اٹھنے والے نگاہوں میں تجھ کو لئے جا رہے ہیں

ان کے بعد جامعہ عثمانیہ کے وہ مایۂ ناز شاعر ہیں جن کا نام ہی تخلص میں گھل مل گیا ہے۔ ان کے موت کا گیت اور انتظار دونوں کا کیا پوچھنا پھر تو سیکش کی "ہنسی" ہے جو غالباً ان کا ایک ایسا ہی شہ کار ہے جیسے اقبال کا شکوہ اور جواب شکوہ نظر کے نمونۂ کلام پہ یہ شاعری کی دنیا ختم ہو جاتی ہے۔

شاعری جزویست از پیغمبری کی دلیل کو اگر تسلیم کر لیا جائے تو اب حد نظر تک ہمیں اس میدان میں پیغمبری پیغمبر نظر آتے ہیں۔ ذوق شاعری کے ہر دلعزیز ہو جانے سے مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ ادب میں قوت پھیلنے سے آتی ہے۔ لیکن بعض نوخیز شعرا کے کلام کو دیکھ کر ہمت پست ہوئی جاتی ہے۔ کلام تبدی ہی کرحامیانہ نہو۔ خیالات میں روانی کیساتھ مہذب و شستہ مذاق، وقار و متانت کی بہت سخت ضرورت ہے جذبات کے حقوق پامال ہونے کے لئے نہیں ہیں۔ محسوسات کسی ٹھیس کے بھی متحمل نہیں ہوتے۔ شاعر کا کلام اسی دل کی دنیا کا عکس ہوتا ہے۔ اس کو جہاں تک ممکن ہو سکے پاکیزہ تر اور لطیف ہونا چاہیئے۔

بہرکیف یہ مجموعہ بھی مطب ویابس کے زنجیرے کی ایک کڑی ہے۔ تاہم فاضل مؤلف کے خدمات قابل قدر ہیں۔ (ج)

کربلا کے بعد، مصنفہ سید عزیز حسن بقائی صاحب۔ مقام اشاعت رسالہ پیشوا۔ جامع مسجد۔ اردو بازار۔ دہلی سنہ ۱۹۳۹ء قیمت (عہ)

تمہید سے معلوم ہوتا ہے کہ پیش نظر کتاب انہیں مصنف کی ایک تصنیف "سیدہ فاطمہؑ کا لال عرف مظلوم کربلا" کا دوسرا حصہ ہے۔ مصنف نے سبب تالیف یہ ظاہر کیا ہے کہ ان کا مقصد اہل بیت اطہار رضی اللہ عنہم کی تاریخ اور ان کی مظلومیت کی داستان بیان کرنا ہے۔ اسی وجہ سے گو بنو امیہ تمام اموی اور عباسی خلفا کی مختصر تاریخ بیان کی ہے مگر اپنے مقصد کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا بلکہ ہر خلیفہ کے عہد میں بنو علیؓ پر جو گذرا اُسے کافی تفصیل سے بیان کیا ہے، اور جہاں تک ہو سکا ہے ہر واقعہ کے اسباب و علل پر بھی بحث کی ہے۔ مگر بعض مقامات پر الزام لگاتے وقت ثبوت پیش نہیں کیا گیا۔ صرف ممکن ہے لکھ دینا جیسا کہ صفحہ ۸۸ اور ص ۹۲ پر کیا گیا ہے کافی نہیں، یا تو الزام ہی نہ لگائیے اور اگر لگائیے تو ثبوت ضرور پیش کیجئے۔ مصعب بن زبیر کو اس لئے قتل نہیں کیا گیا تھا کہ وہ حضرت سکینہ کے شوہر تھے، بلکہ وہ ایک جنگ میں جس کے اسباب خالصتہً سیاسی تھے، عبدالملک کی فوج کے مقابلے میں لڑتے ہوئے شہید ہوئے تھے، اس واقعہ کو اس رنگ میں پیش کرنا جس سے عبدالملک اہل بیت اطہار کا دشمن ثابت ہو، درست نہیں کہا جا سکتا۔ بنو عباس کے زمانے میں بنو علیؓ اور خاندان خلافت میں کے درمیان جو واقعات پیش آئے ان میں بھی سیاسی رُخ پر غور و فکر نہیں کیا گیا، اور ہر واقعہ اس رنگ میں پیش کیا گیا ہے گویا کہ یہ خلفاء اہل بیت کے دشمن تھے۔ یہ ضرور ہے کہ خلفاء عباسیہ نے بنو علیؓ پر زیادہ سخت نگرانی رکھی تھی، مگر اس کے اسباب بھی تھے۔ خود مصنف صاحب نے اکثر جگہ ذکر کیا ہے کہ متعدد موقعوں پر، باوجود اس کڑی نگرانی کے، کسی ظاہری سبب کے بغیر بنو علیؓ کے مختلف افراد کی طرف سے کشت و خون کے واقعات پیش آئے تھے۔ مثلاً ص ۲۱۴ سے ۲۱۶ ملاحظہ ہو۔ کیا ہر حکومت کا فرض نہیں کہ اس قسم کے فسادات سے بچنے کے لئے احتیاط برتے؟ آخر میں اس کتاب کے ماخذوں کی ایک فہرست دی گئی ہے۔ جن میں یزید نامہ، سفینۃ الاسلام، تاریخ الائمہ، سکینہ بنت حسین جیسی کتابوں کو ماخذ کہنا ظلم ہی ہوگا۔

بہرحال کتاب بحیثیت مجموعی دلچسپ ہے، اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن زیادہ مفید ہوگا۔

ہندوستان کی صنعت اور تجارت :- از منت اللہ صاحب رحمانی ایم۔ ایل۔ اے۔ چھوٹی تقطیع۔ لکھائی چھپائی عمدہ حجم ۲۱۲ صفحات قیمت درج نہیں۔ پتہ: مکتبۂ سیفیہ۔ مونگیر (بہار)

اس کتاب کی تالیف کی وجہ جناب مؤلف نے دیباچہ میں یہ بیان کی ہے۔ "غالباً ہندوستان کے تجارتی اور صنعتی حالات اب تک اردو زبان میں اس طرح یکجا نہیں کئے گئے جن کا علم ہر ایک ہندوستانی کے لئے بہت ہی ضروری ہے" اسی خیال کے تحت قابل مؤلف نے ہندوستان کی اقسام کی تجارتوں اور صنعتوں کی درآمد برآمد کے اعداد و شمار کئی سال کی محنت اور تجسس کے بعد جمع کئے ہیں اور نہایت عمدہ پیرایہ میں ان کو بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کتاب کیا ہے زمانہ قدیم سے لیکر آج تک کی تجارت اور صنعت و حرفت کی مختصر تاریخ ہے۔ اس کتاب کی ابتدا مغل بادشاہوں کے زمانے کی تجارت اور صنعت و حرفت سے ہوتی ہے اس دور کے قبل کی تجارت وغیرہ کا مختصر خاکہ بھی دیا گیا ہے۔ مغلیہ دور کے مختلف یوروپین اور انگریز سیاحوں کے بیانات کا بھی درج ہے۔ آخر مین ایسٹ انڈیا کمپنی اور اوس کے بعد کے زمانے میں ہندوستان کی تجارت اور صنعت و حرفت کی جو تباہی اور بربادی ہوئی اُس پر صراحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب کارآمد اور دلچسپ ہے۔ "س"

ماہنامہ تصویر :- رام پور بابتہ ۱۵۔ اکتوبر سنہ ۱۹۳۹ء مرتبہ برقی زیدی حجم ۵۰ صفحات قیمت سالانہ عالی

"تصویر" کا یہ پہلا نمبر ہے ہمیں امید ہے کہ جناب برقی اپنی برقی قوت سے بہت جلد اس "تصویر" میں علم و ادب کی روح پھونک دینگے۔ زیر نظر نمبر میں بعض مضامین نظم و نثر کہنہ مشق لکھنے والوں کے قلم کے منت کش ہیں۔ پہلا مضمون "ہندوستانی نوجوانوں سے" پروفیسر رام سروپ کوشل ایم۔ اے۔ نے لکھا ہے، نوجوانوں کے لئے یہ مقالہ سبق آموز اور بصیرت افروز ہے۔ نجم الحسن بی۔ اے۔ نے "موجودہ تعلیم کے اثر" پر جو کچھ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ ہر طالب علم اس کو غور سے پڑھے اور سمجھے۔ بشر ایم۔ اے کا مختصر اڈراما "نوجوان" غریب مزدوروں کی کس پرسی اور ظالم سرمایہ داروں کی عیش پرستی کی اچھی تمثیل ہے۔ حصہ نظم میں صفدر، دل، ملقیس جمال، شرف زیدی، ولایت، نگہت، بہزاد، وفا وغیرہ کی اخلاقی نظمیں اور رنگین غزلیں نتیجہ خیز اور کیف آور ہیں۔ "س"

معین ہفتہ وار :- (عرس نمبر) مرتبہ خواجہ ضیا، حجم ۲۴ صفحات قیمت ۲ر

حضرت خواجہ اجمیریؒ کے عرس کے موقع پر معین ہفتہ وار نے اپنا یہ "عرس نمبر" نکالا ہے، اس میں تقریباً جملہ مضامین حضرت خواجہؒ کے حالات زندگی، ان کے مقالات، ان کا تصوف، ان کی تصانیف اور شاعری، اون کے روحانی کمالات وغیرہ پر مشتمل ہیں، ان متبرک مضامین کے ساتھ ساتھ "جنسی امراض" اور مقویات کے اشتہار حد درجہ بدنما ہیں۔ ایک جگہ سفوف اور گولیوں کا اشتہار ایک گھنٹہ قبل کھانے کی ہدایت کے ساتھ نہایت شرمناک ہے۔ "س"

ماہنامہ البیان :- امرتسر بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۹ء مرتبہ محمد حسین صاحب۔ حجم ۲۰ صفحات قیمت سالانہ تین روپے

امت مسلمہ امرتسر کا یہ ماہواری پرچہ ہے۔ اس کے شروع میں حالات حاضرہ پر ایک مختصر دلچسپ نوٹ ہے۔ اس میں آل انڈیا ریڈیو کی زبان پر اچھا تبصرہ کیا گیا ہے۔ "قرآن اور فصاحت و بلاغت" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ فیروزالدین صاحب نے لکھا ہے۔ اس مین آیات قرآنی کی روشنی مین کفار عرب کے ہفوات، صفات قرآن کا مقصد، قرآن کی زبان وغیرہ پر وضاحت کے ساتھ لکھا گیا ہے اور اسی سلسلہ میں بعض یوروپین فلسفیوں، پروفیسروں وغیرہ کے تاثرات بھی درج کئے گئے ہیں۔ رسالہ کے آخر میں "تفسیر بیان للناس" کو بہ

اقساط شائع کیا جا رہا ہے۔ "س"

تعلیمی گزٹ:۔ نئی دہلی مرتبہ پروفیسر ایم۔ اے۔ قریشی صاحب دہلوی

زیر نظر نمبر میں جناب اخلاق دہلوی پرنسپل اونیٹل کالج نئی دہلی کا مرتبہ رسالہ "اردو مضمون نگاری" سب رس کے سائز کی ۹۴ صفحوں پر شائع ہوا ہے۔ یہ رسالہ ٹیکسٹ بک کمپنی صوبہ دہلی کا منظور شدہ ہے اس کی قیمت دس آنے ہے، ادبی سوسائیٹی نئی دہلی سے ملسکتا ہے۔

جناب اخلاق نے اس رسالہ میں مضمون نگاری کے اصول' لکھنے کے اوقات اور مقامات' مضامین کے خاکے' مضمون نگاروں کی قسمیں ہاتھ کی لکیروں کی روشنی میں' مختلف مضامین کے نمونے' فن تقریر' شاعری' تعلیم' مصوری' وغیرہ پر وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔ رسالہ کے آخر میں دنیا کا صرف اقالیم کی حد تک مختصر جغرافیہ بھی بیان کیا ہے' کچھ حالات دہلی کے بھی لکھے ہیں فوقانی جماعتوں کے مضمون نگاری سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ اس رسالہ سے کچھ نہ کچھ استفادہ کر سکتے ہیں۔ "س"

ناموران اسلام:۔ مصنف محمد حسین خانصاحب (جامعی) اڈیٹر پیام تعلیم دہلی چھوٹی سائز حجم (۲۸۸) صفحے کتابت' کاغذ وغیرہ دیدہ زیب' مجلد قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے' اس میں ناموران اسلام کے حالات شائع کئے گئے ہیں' ان میں مفسر' محدث' فقیہ' علما' معلمین' صوفیا' خلفا' سلاطین' وزرا' سپہ سالار' جہاز ران' مورخین' فلسفی' طبیب' سائنس دان' سیاح' شعرا' ادیب' مدبرین۔ شامل ہیں جملہ تعداد (۱۰۴) ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لئے مرتب ہوئی ہے۔ اس لئے نہایت سلیس اور سادہ زبان کا استعمال ہوا ہے' لیکن یہ صرف بچوں کے لئے ہی نہیں بلکہ بڑوں کے لئے بھی مفید' اور پر از معلومات ہے' ضروری اور صحیح حالات کا دلچسپ طریقہ سے تذکرہ ہوا ہے۔

لیکن تبصرہ سو سال کی تاریخ اسلام سے صرف (۱۰۴) فرزندان اسلام کا انتخاب کیا گیا ہے' اس سے واضح ہے کہ بیسیوں ناموران اسلام جن کے کارنامے زندگی جاوید کہتے ہیں' متروک ہو گئے ہیں۔ مثلاً اگر صرف جنوبی ہند پر نظر کی جائے تو فیروز شاہ بہمنی' ٹیپو سلطان' ابو القاسم فرشتہ' سالار جنگ وغیرہ ایسی ہستیاں تھیں جن کو اس تفصیل میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا قابل تذکرہ امر یہ ہے کہ مصنف نے کوئی سلسلہ قایم نہیں کیا ہے' نہ تو نام کے لحاظ سے ردیف وار بیان ہے اور نہ انتقال کے سنہ کا لحاظ رکھا گیا ہے اور پھر فن کا لحاظ بھی نہیں ہے' اگر کسی خاص سلسلہ کے تحت بیان ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔

اس کے قطع نظر کتاب مفید' دلچسپ' اور کار آمد ہے' اس کا مطالعہ وسیع معلومات کا ذریعہ ہوگا۔

دلچسپ مقامات:۔ مؤلف اصغر حسین صاحب فرزند ڈاکٹر ارسطو یار جنگ بہادر۔ پانچ حصے ہیں ہر حصے کی قیمت (ایک روپیہ) ملنے کا پتہ:۔ خورشید بلڈنگ مکرم جاہی روڈ حیدر آباد دکن۔

(۱) حصہ اول شہر حیدر آباد اور گولکنڈہ　　حجم (۱۰۲) صفحے مجلد

(۲) " دوم صوبہ اورنگ آباد　　" (۱۲۷) " "

(۳) " سوم صوبہ گلبرگہ　　" (115) " غیر "

(۴) " چہارم صوبہ میدک　　" (۴۸) " مجلد

(۵) " پنجم صوبہ ورنگل　　" (۳۲) " "

ان میں جیسا کہ نام سے واضح ہے سلطنت آصفیہ کے دلچسپ اور مشہور مقامات کا تذکرہ ہے۔ قدیم اور جدید کوئی عمارت متروک نہیں ہوئی ہے۔ ان پر جو کتبے نصب ہیں ان کی بھی صراحت کی گئی ہے' اگر عربی کتبہ ہو تو اس کا ترجمہ بھی شامل ہے یہ کتابیں باتصویر ہیں چھوٹی سائز ہے۔ قیمت بہت زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ نہ صرف سیاحوں بلکہ دیگر شائقین تاریخ وغیرہ کے لئے بھی دلچسپ ہیں۔ ہر کتاب کے ساتھ ایک نقشہ بھی شریک ہے۔ ریلوے اور بس کے سیاحوں کے لئے اس کا مطالعہ زیادہ مفید اور کار آمد ہوگا۔ ن۔ ص۔

ارسطو جاہ ۔ تقطیع ۷×۵ صفحات ۴۶ مطبوعہ ادارہ ادبیات اردو
قیمت ۶ ر

یہ چھوٹی سی کتاب بھی ادارہ ادبیات اردو ہی نے شایع کی ہے۔
اس کے مرتب پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی، تاریخ دکن، مشہور عالم ہیں۔
اس سے پہلے آپ کی معرکتہ الآرا کتاب "تاریخ گولکنڈہ" قدر و منزلت کے
ہاتھوں لی جاچکی ہے۔ یہ کتاب، خانوادۂ آصفی کے مشہور وزیر، اعظم الامرا
غلام سید خان ارسطو جاہ کے حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے۔ ارسطو جاہ
کا زمانہ دکن میں اردو ادب اور شاعری کے نقطۂ نظر سے بھی بڑی اہمیت
رکھتا ہے۔ شمالی ہند سے زبان اور شاعری کی نئی تحریک یہاں پھیل رہی
تھی، اور اس کو منتظم کرنے میں۔ ارسطو جاہ کی شعری سرپرستیوں نے بڑا کام انجام
دیا۔ مرتب نے، ان تمام واقعات کو نہایت سلیقہ اور وضاحت کے ساتھ
پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب تاریخ دکن میں خاص اہمیت رکھے گی۔

مکتوبات شاد عظیم آبادی ۔ ۷×۵ صفحات ۱۴۰ مطبوعہ
ادارۂ ادبیات اردو قیمت ۱ روپیہ ۸ آنہ (۱ عہ)

شاد عظیم آبادی کے خطوط کا یہ مجموعہ ادارۂ ادبیات اردو نے شائع
کیا ہے۔ اور اس کی ترتیب معتمد ادارہ پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
کی مرہونِ منت ہے۔
شاد عظیم آبادی، پٹنہ کے مشہور شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کا زمانہ،
اردو ادب میں اس لحاظ سے معرکتہ الآرا تھا کہ، اس وقت حالی اور سر سید
کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں ان تحریکوں اور ان کے عمل اور رد عمل کا اندازہ
تاریخ سے اس قدر واضح نہیں ہو سکتا، جتنا کہ، ادب اور خاص طور پر ایسے
خطوط سے ہو سکتا ہے اسی وجہ سے "مکتوبات شاد عظیم آبادی" غیر معمولی اہمیت
رکھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات اس کو ضروری سمجھیں کہ خطوط کی شخصیتوں
پر حاشیہ بھی چڑھایا جائے لیکن خطوط میں اتنے زیادہ لوگوں کا ذکر ہے کہ،
محض ان کی معلومات حاصل کرنے کے لئے عرصہ دراز لگ جاتا اس کے
باوجود حیدرآباد میں رہتے ہوئے اس کا یقین نہ تھا کہ اس میں مرتب کو
کامیابی ہوگی۔ جو لوگ پٹنہ کی تاریخ سے واقف ہیں وہ اگر اس کمی کو پورا
کردیں تو اس عہد کی اچھی ادبی تاریخ ہو جائے گی۔
شاد بہ حیثیت شاعر بھی کچھ کم اہمیت کے مالک نہیں تھے۔ وہ داغ کی
ٹکر کے شاعر تھے، لیکن ان کا اندازہ جدا تھا۔ مرتب نے ان امور کی صراحت
اپنے مقدمہ میں عمدگی سے کردی ہے۔
ڈاکٹر زور صاحب نے، یہ خطوط شائع کرکے، اردو ادب سے دلچسپی
رکھنے والوں اور متعلمین کے لئے بیش بہا خدمت انجام دی ہے اور ادارۂ
ادبیات اردو کا یہ کارنامہ ہر لحاظ سے ستائش کا مستحق ہے۔ "س"

گیت مالا ۔ پنجاب کے مشہور رسالہ ادبی دنیا کے مدیرین
صلاح الدین احمد اور میراجی نے مرتب کر کے کتب خانہ ادبی دنیا
لاہور سے شائع کیا ہے۔ یہ متوسط تقطیع کے ۴۸ صفحات کا مجموعہ
نظم ہے جس کی نظموں کو تین حصوں، پریت کے گیت (۲) رات کے گیت
اور (۳) جگ بیتی میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدا میں ۲ صفحوں کا ایک دیباچہ
نثر گیت کی ریت کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ جس میں گیتوں کی خصوصیتیں
اور فائدے بیان کئے گئے ہیں اس نثر کا اسلوب بھی دلآویز ہے
کیونکہ اس میں گیتوں ہی کی زبان استعمال کی گئی ہیں۔ اس قسم کی
کوششیں قابل مبارکباد ہیں۔ یقین کہ یہ گیت مالا بہت مقبول
ہوگی۔ یہ تمام گیت مختلف اصحاب کے لکھے ہوئے ہیں لیکن زیادہ تر
اندرجیت شرما حفیظ ہوشیارپوری اور بقول حسین احمد پوری کے
نتائج طبع ہیں۔ پہلا گیت اندرجیت شرما ۔ پریتم کی تلاش ہے۔ اس کا
پہلا اور آخری بند ہے۔

پریتم کو ڈھونڈنے میں تو سکھی آج گئی۔ پریتم کو ڈھونڈنے
پھولوں کے رنگ میں
جل کے ترنگ میں
کرنوں کی جنگ میں

پریتم کو ڈھونڈنے میں تو سکھی آج گئی۔ پریتم کو ڈھونڈنے۔

چنپے کے جھاڑ میں

بوندوں کی اڑ میں

بن میں پہاڑ میں

پریتم کو ڈھونڈنے میں تو سکھی آج گئی۔ پریتم کو ڈھونڈنے

ایک اور نظم روگ کا راگ کے چند شعر بھی پیش کئے جاتے ہیں یہہ راج کماری بکاولی کی لکھی ہوئی ہے۔

نہیں جی سے میں کیسے بھلاؤں سکھی مرے جی کو جو آکے لبھا ہی گئے

مرے من میں وہ پریم بسا ہی گئے مجھے پریت کا روگ لگا ہی گئے

کئے میں نے ہزار ہزار جتن کہ بچا رہے پریت کی آگ سے من

مرے من میں ابھار کے اپنی لگن وہ لگاؤ کی آگ لگا ہی گئے

رہے رات کی رات سدھار گئے مجھے سپنا سمجھ کے بسار گئے

میں تھی ہار گلے کا اتار گئے میں دیا تھی جیسے وہ بجھا ہی گئے

سکھی کوئلیں ساونی گائیں گی پھر نئی کلیاں بھی چھاؤنی چھائیں گی پھر

مری چین کی راتیں نہ آئیں گی پھر جنھیں نین کے نیر مٹا ہی گئے

مرے جی میں تھی بات چھپائے رکھوں سکھی چاہ کو من میں دبائے رکھوں

نہیں دیکھ کے آنسو جو آہی گئے مری چاہ کا بھید وہ پا ہی گئے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا عظمت اللہ خان مرحوم کی نظم ہے۔ افسوس ہے کہ عظمت بہت جلد دنیا سے منہ موڑ گئے اور ان کی بے وقت موت نے اردو شاعری کو بہت بڑا نقصان پہنچایا۔ یہہ بھی افسوس کا مقام ہے کہ ان کے کلام کا مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا ورنہ اس قسم کی شاعری کے بڑے ولولہ انگیز نمونے منظر عام پر آجاتے۔

معین سخن :۔ نواب معین الدولہ بہادر معین کا مجموعہ کلام بڑی تقطیع کے ۲۲۸ صفحات میں شائع ہوا ہے۔ اور اسکو مولوی میر یاور علی صاحب جعفر نے اپنی نگرانی میں نہایت نفاست اور خوبی سے چھپوایا ہے۔ اس کے آغاز میں میرا لکھا ہوا ایک مقدمہ ہے اور آخر میں چالیس سے زیادہ ہمعصر شعرا کی کہی ہوئی تاریخیں اور تقریظی نظمیں بھی شامل ہیں جن میں صفی اورنگ آبادی اور ماہر القادری کی نظمیں نہایت پر تکلف اور پاکیزہ ہیں۔

نواب معین الدولہ بہادر کو بچپن ہی سے شعر و سخن سے شغف رہا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری نواب مرزا داغ دہلوی کے رنگ میں شروع کی اور چونکہ یہہ اسلوب ان کی طبیعت کے مناسب بھی تھا۔ اس لئے برابر ترقی کرتا گیا اور اب تو انہوں نے اپنے تغزل میں ایک پختگی پیدا کرلی ہے۔ ان کے اس مجموعہ میں متعدد ایسے شعر نظر سے گذرتے ہیں جو صحیح معنوں میں غزل گوئی کا کمال ہیں اور سہل ممتنع اشعار کی بہترین مثال سمجھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً

ہر ادا آپ کی ہر ایک چلن دیکھ لیا

سادگی دیکھ لی بے ساختہ پن دیکھ لیا

کبھی نصیب تھے ہم کو بھی گل کے نظارے

کبھی چمن میں ہمارا بھی آشیانہ تھا

آگیا دل اپنا جس پر آگیا

ہوگئی جس سے محبت ہوگئی

تو ہی جب بے رخی سے ملتا ہے

کون ہم سے خوشی سے ملتا ہے

تمہاری نظر کا نہیں اعتبار

ابھی یہ ادھر سے ادھر ہوگئی

نواب معین الدولہ بہادر کوئی پیشہ ور شاعر نہیں ہیں انہوں نے تکلفات باردہ اور غیر ضروری مبالغہ آرائی سے کام لیکر اپنی استادی کا رعب ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے وہ جو کچھ کہتے ہیں صحیح اور پاکیزہ زبان میں کہتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں تعقید یا گنجلک نہیں پایا جاتا۔

"ق"

منزل

دن تو جوں توں روتے دھوتے کاٹ ہی لیتا ہوں میں
ٹھوکریں کھا کھا کے دادِ زندگی دیتا ہوں میں

یوں ہی کچھ کھویا ہوا بہکا ہوا رہتا ہوں میں
اپنی دھن میں آپ ہی اُلجھا ہوا رہتا ہوں میں

جیسے دیوانہ سرِ مغرب ہو صحرا میں کہیں
چل رہا ہو خواب کی مسحور دنیا میں کہیں

کیا کروں اپنے دلِ بیتاب کی آواز کو
کیا کروں تخئیل کی بہکی ہوئی پرواز کو

رات کی خاموشیوں، تاریکیوں کو کیا کروں
فکر کی تنہا فلک پیمائیوں کو کیا کروں

لے ہی جاتی ہیں مجھے تیرے حریمِ ناز میں
تیرے دل میں اور دل کی بزمِ سوز و ساز میں

تجھ کو چھا جانا تھا ہستی پر مری چھا ہی گیا
دل کے مٹ جانے پہ آخر کار چین آ ہی گیا

ماہ و انجم سے ابھی میں نے نظر پھیری نہیں
جستجو کو دعوتِ فکر و عمل دی ہی نہیں

اک فریبِ حسنِ فطرت تک رسائی ہے مری
مشتمل رنگین دھوکوں پر خدائی ہے مری

سن رہا ہوں میں فسانہ ہستیٔ موہوم کا
اس جہانِ رنگ و بو کا عالمِ مغموم کا

آندھیوں میں بانسری جیسے بجاتا ہو کوئی!!
یا اُفق کے پار جیسے گنگناتا ہو کوئی!!

میرا ہر تارِ نفس، اک نغمۂ روح خموش
میری ہر اک آہ، پیغامِ وفا۔ الفت بدوش

ہر قدم ہے ایک نامعلوم منزل کی تلاش
ہر نظر ہے اک شکستہ شیشۂ دل کی تلاش

نیم بے ہوشی میں نغماتِ جنوں گاتا ہوں میں
زندگی کی وادیوں میں دوڑتا جاتا ہوں میں

میرے رستے میں نہیں حائل صدائے کائنات!!
ہم نشیں۔ منزل ہے میری ماورائے کائنات!!

صمد رضوی ساز

ہماری تعلیمی زبان

بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ اردو یا ہندوستانی زبان اپنے مولد سے میلوں دور دکن میں جہاں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں آج سے چار پانچ سو سال پہلے کس طرح اس آسانی کے ساتھ رائج ہو سکی اور نشو و نما پا سکی کہ تھوڑے عرصہ کے اندر اندر یہاں کے رہنے والوں کی رگ و پے میں جذب ہو گئی۔ اس سے بھی زیادہ تعجب انگیز یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قریب ہی زمانے میں زبان کے نہ صرف بولنے اور سمجھنے والے دکن کے طول و عرض میں موجود تھے بلکہ اعلیٰ درجہ کے شاعر بھی پیدا ہو گئے تھے۔

زبانوں کے رائج ہونے اور نشو و نما پانے کا درحقیقت یہ ایک آسان اور عام فہم اصول ہے۔ سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ یہ زبان ہندوستان کی وہ عظیم الشان مگر مختلف اللسان جماعتوں کے مابین تبادلۂ خیال کے آلۂ کار کی ناگزیر مجبوری سے وجود پذیر ہوئی تھی، اس سے ظاہر ہے کہ یہ عوام کی زبان تھی اور اس کے سب سے پہلے معمار عوام ہی ہیں۔

دکن میں جب مسلمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور یہاں ان کی حکومتیں بھی قائم ہو گئیں تو حکومت کے عہدہ داروں اور رعایا میں تبادلۂ خیال کی بڑی دقت تھی۔ مسلمانوں کی مادری زبان فارسی تھی اور ان کے تمام کاروبار مملکت اسی زبان کے ذریعہ انجام پاتے تھے۔ سالہا سال سے ہندوستان کے ملکی اور مالی دفاتر میں اس زبان کے رائج ہونے کے سبب اس میں دفتر کی تمام اصطلاحات موجود تھیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ دکن کے وسیع خطے میں فارسی کو اس طرح رائج کرنا کہ وہ عوام کی ثانوی زبان بن جائے۔ مشکل اور طوالت طلب کام تھا۔ ان دقتوں نے مسلمانوں کو اپنی مادری زبان چھوڑ کر عامۃ الناس کی اس زبان کو اختیار کرنے پر آمادہ کر دیا جس کے رواج پانے کے یقیناً زیادہ امکانات تھے اور جس کو مسلمان مصنفین اپنی زبان کے مقابلے میں ہندی یا ہندوی یعنی ہندوؤں کی زبان کہتے تھے۔ اور چونکہ اس کا ادب اور شاعری ابتدائی زمانے میں یہیں پیدا ہوئی اس لیے اس کو دکھنی بھی کہتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان فاتح شمال کی طرح کچھ عرصے کی کوشش کے بعد دکن کی علمی زبان فارسی بنا سکتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی سنین میں انھوں نے سرکاری دفاتر میں فارسی استعمال کر کے اس کی کوشش بھی کی کیونکہ جس سرزمین میں ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہوں وہاں نو وارد فاتحین کے لئے یہ تصفیہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ سرکاری دفاتر کے لئے کون سی زبان اختیار کی جائے۔ عموماً ہر جگہ یہی ہوتا آیا ہے کہ فاتح اپنی زبان ہی کو اختیار کرتے ہیں۔ لیکن جب نو واردوں کے تعلقات ملک سے قائم ہو جاتے ہیں اور وہ اس کے قدیم باشندوں کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں تو عموماً دونوں زبانوں کے خلط ملط سے نئی زبانیں تعمیر پاتی رہی ہیں۔ چنانچہ سیکسن قوم کی فتح انگلستان کے بعد اینگلو سیکسن زبان کا پیدا ہونا اور آریوں کی فتح ہندوستان کے بعد پراکرتوں کا نشو و نما پانا اسی حقیقت کا نتیجہ ہے۔ حکومت نے تو اپنی حد تک فارسی کو اختیار کر لیا تھا لیکن نو وارد مسلمان دکن کے ساتھ رہنے بسنے اور لین دین کی ناگزیر ضرورتوں کے باعث رفتہ رفتہ فارسی کو ترک کرتے گئے اور اس دیسی زبان کی طرف راغب ہوتے گئے جسے وہ ہندوؤں کی زبان سمجھتے تھے۔ تھوڑے عرصے کے اندر اندر یہ زبان عوام کی

بول چال سے بڑھ کر تصنیف و تالیف اور شعر و شاعری میں بھی استعمال ہونے لگی. جب اس زبان نے ترقی کے آثار ظاہر کئے تو فاتحین بھی رواداری سے کام لے کر اس کی سرپرستی کرنے پر آمادہ ہو گئے چنانچہ بعض حضرات کی تحقیق کے مطابق عادل شاہی اور قطب شاہی خاندانوں کے چند بادشاہوں نے اس زبان کو سرکاری دفاتر میں رائج کر دیا تھا. جب ضرورت کسی امر کا تصفیہ کر دیتی ہے تو پھر اس کو اٹل سمجھنا چاہیے. دکن میں اس زبان کے جلد ہی ادبی و علمی بن جانے کا بھی یہی سبب ہے. شمال سے ان کے تعلقات منقطع ہو جانے کے سبب وہ فارسی کی بجائے ہندوستانی زبان کو ترقی دینے اور اس میں تصنیف و تالیف کرنے لگے. مصنف کے لئے پڑھنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے. اگر فارسی بولنے والے فارسی ہی میں تصنیف و تالیف کرتے تو ان کے مخاطب صرف وہی لوگ ہوتے جو ان کے ہمراہ آئے تھے یہ عیسیٰ لکھے موسیٰ پڑھے کے مصداق ہوتا. مصنف کی لازمی طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کی تصنیف زیادہ سے زیادہ پڑھی جائے اور وسیع سے وسیع حلقوں میں گشت لگائے. فارسی بولنے والوں کا ہندوستانی میں تصنیف و تالیف کرنا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ انھیں پڑھنے والوں کا وسیع تر حلقہ اسی زبان میں میسر آسکتا تھا. اس کے علاوہ ابتدائی اردو کارنامے جو زیادہ تر مذہبی موضوعات پر مشتمل ہیں اس بات کا مزید ثبوت ہیں کہ وہ اپنے ہم مذہبوں کے لئے نہیں بلکہ زیادہ تر ان نومسلموں اور غیر مسلموں کے لئے لکھے گئے تھے جن کے لئے وہ اپنے مذہب کی حقانیت اس کے اصول قوانین اور احکام پیش کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتے تھے.

تصنیف و تالیف کے بعد دوسرا درجہ تعلیم و تدریس کا ہے. ظاہر ہے کہ کوئی چین میں عبرانی بائبل شایع کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا. جو کتابیں عام طور پر پبلک میں لکھی جائیں گی وہی مدارس میں پڑھائی بھی جاتی چاہئیں. لیکن ہندوستانی کی تعلیم گزشتہ صدی کے وسط تک زیادہ تر دینیات کے حلقہ کی کتابوں تک محدود تھی. انگریزوں کی سلطنت کے قیام تک بھی ہندوستانی تعلیم کا یہی حال تھا. حیدرآباد میں جس وقت سے تعلیم کی تنظیم شروع ہوئی اور عام تعلیم کے لئے مدارس قائم ہونے لگے ان کی ترقی میں ہندوستانی زبان نے جو حصہ لیا وہ دوسری تمام زبانوں سے بڑھ کر ہے. اس زبان کا تعلق حیدرآباد کی تعلیم سے بھی ایسا ہی قدیم ہے جیسا کہ زبان کے ادبی اور شعری کارنامے اولین ہیں.

حکومت کی طرف سے تنظیم تعلیم کی مساعی کے آغاز ہونے سے پہلے جو مدارس ہمارے حد علم میں آسکے ہیں ان میں قدیم ترین مدرسہ جامع مسجد کا ہے جو مسجد کے ساتھ محمد قلی قطب شاہ کے عہد میں تعمیر ہوا تھا. بعد میں جب مولانا حافظ شجاع الدین نے اس مسجد کی خانقاہ میں سکونت اختیار کی تو ان کی کوشش سے یہ مدرسہ از سر نو زندہ ہوا. اس مدرسہ میں زیادہ تر دینیات کی تعلیم ہوتی تھی اور ملک کے طول و عرض سے طالبان علم حصول علم کے شوق میں آتے تھے. تعلیم کے ساتھ طلبہ کے رہنے کا بھی انتظام تھا اور کھانا وغیرہ بھی اوقاف مسجد سے ملتا تھا. اس مدرسے میں جو کتابیں پڑھائی جاتی تھیں اس میں شک نہیں کہ فارسی اور عربی کی قدیم درسی کتابیں تھیں لیکن ان کی تعلیم اور تفہیم کا ذریعہ زیادہ تر یہی زبان تھی. چنانچہ اس کا بڑا ثبوت مولانا کی مشہور کتاب "کشف الخلاصہ ہندی" سے ملتا ہے.

جو مسائل فقہ پر نظم میں لکھی گئی ہے اور مدرسے کے طلبا کے لئے مقصود تھی۔ لیکن یہ ایسی مقبول ہوئی کہ حیدر آباد کے تمام مدارس میں زمانۂ حال تک بھی پڑھائی جاتی تھی۔

دوسرا مدرسہ اس کے کچھ عرصہ بعد کا ہے جو پائیگاہ کے امیر کبیر اور سلطنت کے علم دوست وزیر نواب فخر الدین شمس الامراء ثانی نے ۱۲۵۰ھ میں اپنی ڈیوڑھی میں قائم کیا تھا۔ یہ مدرسۂ فخریہ کے نام سے موسوم تھا اور اس میں درس دینے کے لئے ہندوستان کے طول و عرض سے علما بلائے گئے تھے۔ سارے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا یہ واحد مدرسہ تھا جہاں مروجہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ حکمی علوم کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ خود نواب فخر الدین خاں کو حکمی علوم سے غیر معمولی شغف تھا۔ چنانچہ اس دلچسپی کی پیش رفت میں انھوں نے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس میں حکمی علوم کی کتابوں کے ترجمے انگریزی سے اردو میں کئے جاتے تھے۔ ضرورتاً اصطلاحیں بھی بنائی جاتی تھیں۔ ان کتابوں میں ستۂ شمسیہ بہت مشہور ہے۔ ہیئت کی تعلیم میں اجرام فلکی کے مشاہدات کی غرض سے یہاں نما کی رسدگاہ بھی تعمیر کرائی گئی تھی جو آج تک باقی ہے۔

یہ کتابیں دراصل مدرسہ فخریہ کے طلبا کے لئے لکھی گئی تھیں لیکن مولانا امام خاں تاریخ خورشید جاہی کے مصنف کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے طول و عرض کے طلبا میں یہ ایسی مقبول ہوئیں کہ ہاتھوں ہاتھ لی گئیں۔

حضرت غفران منزل نواب ناصر الدولہ کی سر پرآرائی کے آخر زمانے سے تنظیم تعلیم کی سعی شروع ہوئی اور عجیب بات ہے کہ سب سے پہلے جو مدرسہ قائم کیا گیا وہ ڈاکٹری کی تعلیم کا تھا۔ اس مدرسے کے متعلق ایک اہم بات یہ ہے کہ اس میں مغربی طب کی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی۔ یہ اردو میں طب کی تعلیم دینے کی اولین کوشش تھی۔ اپنے نتائج کے لحاظ سے یہ مدرسہ کس قدر کامیاب رہا اس کے متعلق صرف یہ معلوم کرنا کافی ہوگا کہ نواب لقمان الدولہ مرحوم اور ہمارے زمانے کے ہر دلعزیز اور قابل قدر ڈاکٹر عبد الحسین ارسطو یار جنگ بہادر اس مدرسے کے تعلیم یافتہ تھے اس تربیت کا اثر یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے نسخے آج تک اردو میں لکھے جاتے ہیں۔

ہمارے قریبی زمانے کے مدارس میں سب سے زیادہ قابل ذکر مدرسہ دار العلوم ہے جس کی بنیاد ۱۲۷۱ھ میں نواب مختار الملک سر سالار جنگ کے ہاتھوں پڑی تھی۔ اس مدرسہ کا نظام و نصاب پہلے پہل قدیم درس نظامیہ پر مبنی تھا۔ بعد کو اس میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ لیکن اس میں تفہیم و تدریس کا ذریعہ اردو زبان تھی۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی دلچسپی سے پڑھا جائے گا کہ سالار جنگ مرحوم کا نقطۂ نظر زبان کے معاملہ میں انگریز مدبروں سے ملتا جلتا تھا وہ فارسی کے سخت طرف دار تھے اور اس زبان کے علاوہ کسی اور زبان کو دفاتر میں رائج کرنے کے خیال سے جز بز ہوتے تھے لیکن واقعات کی رفتار کچھ اور ہی چیز ہے۔ کسی ایک شخص یا گروہ کی کوشش سے یہ رک نہیں سکتی چنانچہ سلطنت آصفیہ کے دفاتر میں بھی یہ زبان رائج ہو گئی۔ مدرسہ دار العلوم میں اگر قصداً اردو رائج کرنے کی کوشش کی جاتی تو سر سالار جنگ شاید اس کو پسند نہ کرتے لیکن یہ چیز بغیر جانے اور بغیر کوشش کے صرف اس لئے رائج ہو گئی کہ معلمین اور متعلمین دونوں کی زبان یہی تھی۔ دار العلوم کی توسیع کے بعد قدیم مدرسہ فخریہ بھی اس سے متعلق ہو گیا تھا اور دار العلوم ہی کے نصاب کی یہاں تکمیل کرائی جاتی تھی۔

سنہ ۱۸۷۱ء میں حیدرآباد کے ایک ہمدرد عالم مولوی امیر الدین نے مدرسہ نظامیہ کی بنیاد ڈالی۔ دارالعلوم میں دینیات کے علاوہ بہت سے دنیاوی علوم بھی داخل ہوگئے تھے۔ اس لئے ایک مدرسے کی ضرورت محسوس کی گئی جو محض دینیات کی تعلیم کے لئے مختص رہے۔ اس مدرسے میں بھی عربی زبان اور دینیات کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں لیکن درس کا ذریعہ اردو زبان ہی تھی۔

غرض یہ ایک سرسری خاکہ ہے اس حقیقت کا کہ جس وقت سے حیدرآباد میں عام تعلیم کا چرچا شروع ہوا اور سرکاری طور پر یا خانگی جو مدارس قائم ہوئے وہ معلمین اور متعلمین کی سہولت اور ضرورت کے مدنظر درس کی تفہیم اردو زبان کے ذریعہ ہی کرتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر حیدرآباد کی عام تعلیم کی شروعات ہی سے یہ زبان بطور ذریعۂ تفہیم کے حیدرآباد کے اکثر چھوٹے بڑے مدارس میں رائج رہی ہے۔ لیکن ملکی ضروریات نے جب سے سرکاری دفاتر میں بھی اس زبان کا رواج ناگزیر کردیا، اس کا حلقۂ اثر اور بھی وسیع اور مستحکم ہوگیا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ملکی مالی ٹپہ حساب کتاب ریاستی کاروبار اور رسل و رسائل کی اصطلاحات کا ایک بڑا ذخیرہ اس زبان میں پیدا ہوتا گیا جس سے اس کو بڑی تقویت حاصل ہوئی۔

عدالتوں میں اس کے رواج نے اس زبان کو علمی اور جامعی بنانے میں بھی ایک قدم آگے بڑھایا کیونکہ عدالتوں کے کاروبار کے دو رخ ہیں جن میں سے ایک میں قانون سازی بالکل علمی اور جامعی طرز کا کام ہے۔ اس کے شروع ہو جانے سے ملک کا قانونی علم، شعور اور احساس رفتہ رفتہ اس قدر ترقی کر گیا کہ قانون کی اکثر و بیشتر اصطلاحات اس زبان میں فراہم ہوگئیں۔ مختلف زبانوں کے بولنے والے ایسے قدیم وکلاء کی ہمارے یہاں کوئی کمی نہیں ہے جو انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے لیکن قانونی علم میں وہ درک رکھتے ہیں جو شاید انگریزی داں بھی کم رکھتے ہوں گے۔ ایسے وکلاء نے ملک کی بڑی بڑی ذمہ دارانہ خدمات بھی انجام دی ہیں۔ حیدرآباد کے لئے جس وقت اعلیٰ تعلیم کے راستے پنجاب کی جامعہ کی طرف سے بند کردیے گئے تو ملک میں جامعہ کے قیام کا احساس نظرتاً شدت کے ساتھ پیدا ہوگیا۔

اعلیٰ حضرت سلطان العلوم میر عثمان علیخاں بہادر خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ نے سریر آرا ہوتے ہی آپ نے سب سے پہلے ملک کی شدید ضرورت کو محسوس فرمالیا اور جو شغف آپ کو علم سے ہے اس کی بنا پر رفت میں اپنی تخت نشینی کی یادگار کے طور پر جامعہ عثمانیہ کے قیام کا حکم محکم صادر فرمایا لیکن ملک کے خاص حالات ضروریات اور قدیم روایات کے احترام میں جامعہ کا ذریعۂ تعلیم اردو ہی قرار دیا۔

یہ اہل ملک کے لئے ایک مانوس چیز تھی اس لئے کہ یہ ملک کے قلوب اور دماغوں کے ساتھ ہم آہنگ ہوگئی اور ایک قلیل مدت کے اندر اندر ملک کی علمی جدوجہد کا پورا نقشہ بدل گیا۔ ایک صاحب بصیرت بزرگ کے الفاظ میں گویا علم نامانوس زبانوں میں مقید تھا وہ اس سرزمین میں آزاد کردیا گیا۔

وہ حضرات جن کو حیدرآباد کے حالات کا بغور مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا جامعہ کے قیام اور اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد یہاں مستند پایہ کی علمی اور اچھی تصانیف کی کثرت کو ایک معجزہ سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تاریخی اور تدریجی ارتقا کا نتیجہ ہے۔ واقعات کی رفتار اور سیلاب کے بہاؤ کے رخ کو حضرت سلطان العلوم سے بڑھ کر کسی نے نہیں پہچانا۔ آپ نے ملک کو اپنی تخت نشینی کی یادگار میں وہ تحفہ عطا کیا جس کو آپ کی بصیرت افروز نظر نے ملک و قوم کی حقیقی ضرورت سمجھا اور اس تصفیہ ہی میں ملک کی موجودہ علمی چہل پہل اور ترقیوں کا راز پوشیدہ ہے۔

عبدالقادر سروری

فنستان

موجودہ جنگ یورپ میں بحر بالٹک کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چند مہینوں پہلے لٹویا، اسٹونیا اور لیتھونیا کی قسمتوں کا فیصلہ بھی یہیں ہوا اور اب فنستان روسی حملوں کا نشانہ بنا ہوا ہے۔ فنستان جیسے چھوٹے ملک پر روسی حملے رنگ لائے بغیر نہیں رہے۔ متمدن دنیا اس وحشیانہ اقدام پر بہت لعنت ملامت کر رہی ہے اور اس قدر غیض و غضب کا اظہار ہو رہا ہے کہ شاید آسٹریا، بوہیمیا اور پولستان کی تسخیر میں بھی نہیں ہوا۔ چنانچہ امریکہ بھی روس پر سخت برافروختہ ہے۔ برطانیہ و فرانس اس چھوٹی مملکت کی حمایت پر آمادہ ہو گئے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ روس مجلس اقوام سے الگ کر دیا گیا اور فنستان کو اس وقت تمام متمدن دنیا کی ہمدردی حاصل ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ صرف ہمدردی کسی مصیبت کا علاج نہیں ہوتی۔ اگر فنستان کے ساتھ محض ہمدردی کی جاتی اور اس ملک کے باشندوں میں اتنی قابلیت نہ ہوتی کہ باہر کے سیلاب کا مقابلہ کر سکیں تو فنستان کب کا ختم ہو جاتا۔ فنستانی بہادر ہیں اور اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے تیار رہیں۔ انھوں نے اپنے ملک کی حفاظت کرنے کا تہیہ کر لیا ہے خواہ اس میں کتنا ہی نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ ان بلند حوصلوں کے ساتھ قدرت نے بھی اس کے لئے ایسا جغرافیہ بنایا ہے کہ اس سے خاطر خواہ مدافعت ہو سکتی ہے اور وہ دشمن کا اچھی طرح مقابلہ کر سکتے ہیں۔ گو دونوں فریق برف کا مقابلہ کرنے کے عادی ہیں لیکن فنستان کی برف ایسی ہے جو خود اہل ملک کی محافظ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے لاکھوں سپاہیوں کو ناکامی کی صورت دیکھنی پڑ رہی ہے۔ غرض ملک کے جغرافیہ اور اہل ملک کی دلیری کی بدولت فنستان روس جیسی بڑی طاقت کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس وحشی سیلاب کا برابر مقابلہ کر رہا ہے۔ اگر اس موقع پر فنستانیوں کی کچھ نسلی تحقیق کی جائے تو دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون سی قوم ہے اور فنستان میں آ کر کس طرح آباد ہوئی؟

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فنستان بالٹک ملک نہیں ہے۔ بلکہ اسکانڈی نیوی سلسلے میں شامل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سویڈن کے ساتھ اس کا قریبی تعلق ہے اور مغربی یورپ کے ساتھ اس کا سیاسی، تاریخی اور تمدنی رشتہ ہے لیکن حقیقت میں اس کی اصل ٹیوٹانی ہے نہ سلاوی بلکہ اس کی تاریخی اور تمدنی کڑیاں وسط ایشیا کے کوہستانی سلسلوں یعنی التائی سے ملتی ہیں۔ چنانچہ ایک بڑی مثنوی میں جو کالی والا (Kalewala) کے نام سے مشہور ہے اور جس کے بعض حصے تین ہزار سال پہلے کے ہیں، فنستانیوں کا وہ زمانہ ملتا ہے جب کہ وہ ابھی یورپ سے متاثر نہیں ہوئے تھے۔

فنستانیوں کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سائبیریا کی ایک وحشی قوم تھی جو ہرن پالا کرتی تھی۔ یہ لوگ دریائے ینے سی (Yenesee) کے منبع سے لے کر خلیج چٹن گا (Chatanga) تک جو بحر شمالی کا حصہ ہے، پھیلے ہوئے تھے۔ ان پر بعد میں تاتاریوں کا دباؤ پڑنے لگا جس کی وجہ سے وہ مغرب کی طرف ہٹتے گئے اور کوہستان یورال کی دونوں جانب بس گئے۔ اسی جگہ انھوں نے دھاتوں کا استعمال سیکھا۔ اکثر شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ پانچ سو یا چھ سو قبل مسیح تک یہ لوگ یورال ہی میں آباد رہے۔ لیکن بعد میں ترکی کرغیز (Turki Kirghiz) کے قبیلے فنیوں کو یورال سے ڈھکیلنے لگے اور یہاں سے یہ لوگ مختلف سمتوں میں منتشر ہو گئے۔ ایک گروہ والگا (Volga) کی طرف چلا گیا اور پھر دریائے ڈینیوب کو عبور کر کے ہنگری جا پہنچا۔

فنستان اور اس کی ہمسایہ مملکتیں

دوسرے گروہ نے شمال کی سمت اختیار کی اور بحر اسپین کے کنارے بس گئے۔ ... سے بعض لوگ اور آگے بڑھنے لگے اور دریائے والگا کے کنارے کنارے جھیل لڈوگا (Ladoga) تک پہنچ گئے اور پھر یہاں سے بالٹک کے ملکوں میں پھیل گئے۔ اگرچہ ان علاقوں میں وہ ایک مدت تک بس گئے تھے لیکن بعد میں جرمنوں اور اہل لتھونیا نے انھیں یہاں سے بھی مار بھگایا۔ یہ نیم وحشی پہلے پہل لیوونیا، کورٹ لینڈ اور اسٹونیا کے باشندوں کے ساتھ گھل مل گئے تھے چنانچہ وہ انہی کی زبانیں بولتے تھے اور انہی کے تمدن میں رنگ گئے تھے۔ یہاں تک کہ اکثر انہی لوگوں کی مذہبی رسوم اور ملکی قوانین کی تقلید کرنے لگے۔ وہ باشندے جو آج فینی قومیت کی شکل میں ہمارے سامنے ہیں، انہی لوگوں کی نسل سے ہیں اور یہ سب غیر آریائی ہیں جنھوں نے اپنی علحدہ قومیت اور آزادی کو اب تک برقرار رکھا۔ ڈاکٹر اے ایچ۔ کین لکھتے ہیں "اس کے باوجود کہ مغرب میں سویڈن کی طرف سے اور مشرق میں روس کی طرف سے فنستان پر دباؤ پڑتا رہا، فنستانیوں نے یورپ میں اپنی جداگانہ قومیت کو برابر قایم رکھا اور اپنی میٹھی زبان کی اتنی خدمت کی کہ وہ ادبی اور شعری زبان بن گئی"۔

فنستان اور لیاپستان کے باشندے ایک ہی نسل کی دو شاخیں ہیں۔ اس سے پہلے کہ فنستانی فنستان کے جنوبی حصوں میں آکر بسے لیاپستان کے باشندے شمالی حصوں میں آباد ہو گئے تھے۔ چنانچہ آج بھی ان میں منگولوں کی بہت سی نشانیاں پائی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ ان کے چہرے منگولوں کی طرح چپٹے اور رخسار کی ہڈیاں ابھری ہوئی ہوتی ہیں۔ اگرچہ نسلی اعتبار سے لیاپ اور فینی ایک ہی ہیں لیکن زمانے کے اثر نے ان دونوں کو شکل و صورت کے لحاظ سے بالکل جدا کر دیا ہے۔ اور نہ صرف جسمانی لحاظ سے بلکہ دماغی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی ان لوگوں کو لیاپ کے ساتھ بظاہر کوئی رشتہ نہیں معلوم ہوتا۔ فنستانیوں نے بارہویں صدی تک تو اپنے اجداد کی طرح سادہ زندگی بسر کی لیکن جب ان کے پرانے مذہبی عقیدے بدل گئے اور سویڈن کے شاہ ایرک ہشتم کے اثر سے عیسائیت ان کا قومی مذہب ہو گیا تو ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ اس کے بعد سے فنستان پر سویڈن کا تمدنی اثر بھی بہت بڑھ گیا حتیٰ کہ اوائل انیسویں صدی کی ان جنگوں میں جو روس کے خلاف ہوئیں فنستان نے سویڈن کا ساتھ دیا اور روس کا مقابلہ کیا۔ مگر روسی طاقت کے سامنے فنستانی زیادہ عرصے تک نہ ٹھیر سکے چنانچہ ۱۸۰۹ء میں پورا فنستان روس میں شامل کر لیا گیا۔ اگرچہ زار الگزنڈر اول نے وعدہ کیا کہ فنستانی دستور بحال رکھا جائے گا اور چند دنوں تک اس کے مطابق عمل بھی ہوتا رہا لیکن بعد کے زاروں نے فنستان کی آزادی کو ختم کرنے کی کوشش کی اور اسے بالکل روس کا غلام بنا لینا چاہا۔ اس کا رد عمل ناگزیر تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۷ء میں روس میں انقلاب ہوا تو فنستان نے اپنی آزادی کے لئے ہلچل شروع کر دی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لینن نے فنستان کی آزادی تسلیم کر لی لیکن اس کے بعد سے روس اور فنستان کے تعلقات میں برابر کشیدگی رہی اور ۱۹۱۸ء میں تو سرخ انقلابیوں نے فنستانی اشتمالیوں کو اپنے ساتھ ملا کر فنستان میں خانہ جنگی شروع کر دی جو چار مہینے تک جاری رہی جنرل مینرہیم نے فنستانی فوجوں کی رہنمائی کی اور جرمن فوجوں کی مدد سے روسیوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ اس کے بعد روس اور فنستان کے درمیان امن قائم ہو گیا۔ فنستان اپنی

جمہوری حکومت کے سایہ میں ترقی کرتا رہا، اس کی تجارت بڑھتی گئی اور دنیا میں اس نے ایک خاص حیثیت حاصل کرلی۔ خصوصاً ممالک متحدہ میں تو فنستانیوں نے بڑا اثر پیدا کیا اور یہی وجہ ہے کہ اس ملک کو اب ممالک متحدہ کی ہمدردی حاصل ہے۔

فنستان میں زبان کا مسئلہ بھی بہت الجھا رہا۔ ملک میں اونچے طبقے کی زبان سویڈنی تھی اور اوسط طبقے کی فنستانی۔ مگر اب دونوں بولیاں ایک ہی درجہ پر آگئی ہیں اور اس طرح اب زبان کا مسئلہ ایک حد تک حل ہوگیا ہے۔ فنستان کے ایک آزادی پسند شخص نے کہا تھا کہ "اب ہم سویڈنی نہیں رہے اور روسی تو کبھی نہیں ہوسکتے" یہی تخیل فنستانیوں کے لئے مشعل ہدایت بنا رہا اور فینی قومیت اسی کے سہارے زور پکڑتی گئی۔ فنستانیوں نے اپنی محنت و جفاکشی اور بلند حوصلوں کی بدولت اپنے کو آزادی کا اہل ثابت کردیا ہے اگر روس اس آزادی کو جو ان کا حق ہے، چھیننا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ روس کی زیادتی ہے اور قدرت اس وحشیانہ اقدام کا کسی نہ کسی طرح ضرور جواب دے گی۔

چند عجیب پودے

حفیظ صدیقی

دنیا میں ہزاروں قسم کے پودے اگتے ہیں اور ہر پودے کے لئے خاص زمین اور خاص آب و ہوا کی ضرورت ہے۔ بعض پودے تو خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہیں اور بعض اس سبب سے کہ بہت اونچے اور بڑے ہوتے ہیں۔ بعض اس لئے کہ ان کی لکڑی بہت قیمتی ہوتی اور عمارت کے کام آتی ہے۔ اور بعض اس وجہ سے کہ اس کے پھل خوش ذائقہ اور پھول نہایت خوشبودار ہوتے ہیں۔ مگر بعض پودے ایسے بھی ہیں جو محض اس لئے قابل لحاظ ہیں کہ وہ بہت عجیب وغریب ہوتے ہیں۔

بحر جنوبی کے جزیروں میں ایک درخت ہوتا ہے جسے وہاں کے لوگ نان پاؤ کا درخت کہتے ہیں اس درخت میں بڑے بڑے پھل ہوتے ہیں جو تقریباً اپل کے برابر ہوتے ہیں۔ جب انھیں آگ پر رکھا جاتا ہے تو ان کا رنگ اور ذائقہ بالکل نان پاؤ کے جیسا ہوجاتا ہے۔ یہاں کے رہنے والے کیسے خوش نصیب ہیں کہ انہیں درختوں میں سے پکی پکائی روٹی مل جاتی ہے۔ اس جگہ ایک اور درخت ہوتا ہے جس کو یہاں کے لوگ گوبھی کا درخت کہتے ہیں۔ اس کی اونچائی تیس گز سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اوپر جانے کے بعد پتے نکلتے ہیں پتے ایسے ہوتے ہیں جیسے ہماری پانی کی گوبھی۔ مزہ بھی اسی طرح کا اور شکل بھی ویسی ہی

اسٹریلیا میں ایک درخت ہوتا ہے جس کو گھاس کا درخت کہتے ہیں اس کی شاخوں کے سروں پر گھاس کے گچھے کے گچھے نکل آتے ہیں۔ جانور اس کو بڑی خواہش سے کھاتے ہیں۔

گرم ملکوں میں بعض درختوں سے دودھ نکلتا ہے اور یہ ایسا ہی مزہ دار اور مقوی ہوتا ہے جیسا کہ گائے یا بھینس کا دودھ سورج نکلتے ہی ان درختوں کی شاخوں سے دودھ ٹپکنا شروع ہوجاتا ہے۔ وہاں کے رہنے والے صبح ہوتے ہی برتن لے کر دودھ بھرنے چلے جاتے ہیں۔

ملک گنی میں ایک درخت ہوتا ہے جسے مکھن کا درخت کہتے ہیں اس درخت کے بیجوں سے ایک قسم کا تیل نکلتا ہے جس کا مزہ تازہ مکھن کا سا ہوتا ہے۔ خوبی یہ ہے کہ لوگ اسے سال بھر تک رکھتے ہیں لیکن اس کے ذائقہ اور بو میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ملک چین میں ایک درخت ہوتا ہے جسے وہاں چربی کا درخت کہا جاتا ہے اس میں سے جو چربی نکلتی ہے یہاں کے لوگ اس کی موم بتیاں بنا کر جلاتے ہیں ان موم بتیوں کی روشنی نہایت

صاف ہوتی ہے مطلق دھواں نہیں نکلتا اور یہ چربی ریل کے پہیوں میں بھی ڈالی جاتی ہے۔

اسٹریلیا میں عجیب عجیب درخت ہوتے ہیں۔ ایک درخت ایسا ہوتا ہے جسے لوہے کا درخت کہتے ہیں اس کی لکڑی اتنی وزنی ہوتی ہے کہ پانی میں ڈالتے ہی فوراً ڈوب جاتی ہے۔ اور بسولے سے کاٹیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی لوہے کی سلاخ پر بسولا چلایا جا رہا ہے۔

ایک درخت اور بھی ہوتا ہے جس کو بچھو کا درخت کہتے ہیں اگر اس کے پتوں کو چھو لیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بچھو نے ڈنک مار دیا لیکن اسی درخت کے نیچے ایک اور بوٹی پیدا ہوتی ہے اگر اس کو مل دیا جائے تو جھنکار فوراً کم ہو جاتی ہے۔

جنوبی افریقہ میں ایک قسم کا درخت ہوتا ہے جس کو چھینکنی کا درخت کہتے ہیں اس کی لکڑی میں کیڑا نہیں لگتا۔ جب آرہ کش اس پر آرہ چلاتا ہے تو چھینکتے چھینکتے اس کا ناک میں دم آ جاتا ہے۔

جزائر فجی میں ایک عجیب درخت ہوتا ہے اس کو کھجلی کا درخت کہتے ہیں اگر اس کے پتوں کو ہاتھ لگایا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی گرم اور دہکتے ہوئے لوہے پر ہاتھ رکھ دیا گیا ہے اس سے خارش بھی ہوتی ہے جو مہینوں نہیں جاتی۔

بعض جنگلوں میں بہت چھوٹے چھوٹے پودے ہوتے ہیں جن سے تقریباً سارا میدان بھرا ہوا ہوتا ہے اگر اس میدان میں سے کوئی آدمی یا جانور جاتا ہے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرف گیا ہے کیونکہ جہاں جہاں سے وہ گزرتا اور پودوں کو چھوتا جاتا ہے پودے مرجھاتے جاتے ہیں۔

محمد احسن

انگریز اور انگریزی

(بسلسلہ گزشتہ)

نئے نئے خیالات کے اظہار کے لئے ان سیدھے سادے انگریزوں کو نئے الفاظ وضع کرنے پڑے۔ زمانہ گزرتا گیا انگریز زیادہ تعداد میں پھیلتے رہے۔ اس دوران میں ان کو مختلف قسم کے لوگوں سے ملنے اور ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا جو بالکل نئے خیالات کے حامل تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی زبان میں کثرت سے نئے الفاظ بھرتی ہو گئے جس سے قدیم انگریزی زبان کے الفاظ بہت کم رہ گئے لیکن ان کی اہمیت میں کسی قسم کی کمی نہ ہوئی۔

چھٹی صدی عیسوی میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کے بعد اہم واقعہ گیارہویں صدی عیسوی میں نارمنوں کی فتح ہے نارمن فرانس کے شمال سے آئے تھے اور وہ مخلوط فرانسیسی زبان بولتے تھے جس میں مختلف شمالی زبانیں شامل تھیں کیونکہ نارمن خود بھی انگریزوں کی طرح "بحری خانہ بدوش" تھے جو صدیوں قبل علاقہ نارمنڈی کو فتح کر کے قابض ہو گئے تھے۔

نارمنوں نے بہت جلد انگریزوں پر فتح حاصل کی اور ان کے علاقے پر قابض ہو گئے تھے۔ دو تین صدی تک وہ قابض رہتے تو ممکن تھا کہ وہ انگریزی زبان پر بھی قابض ہو جاتے اور اپنی زبان رائج کرتے اور اگر ایسا ہوتا تو ہم اس زمانے میں ایک قسم کی "نارمنی فرانسیسی" زبان میں گفتگو کرتے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ نارمن ہزاروں کی تعداد میں آ کر بس گئے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو لاکھوں انگریزوں کے درمیان پایا۔ پہلے پہل یہ دونوں قومیں بڑی حد تک جدا رہیں۔ نارمن بلند مرتبہ سمجھے جاتے جنھوں نے اپنے زور بازو سے انگریزوں کو مطیع کیا تھا اور انگریز پست درجے کے سمجھے جاتے جو اپنے فاتحین کے لئے سخت کام کرتے تھے۔

یہ حالت تقریباً دو صدی تک رہی چنانچہ انگریز پرانی سادہ زندگی بسر کرتے رہے اور قدیم انگریزی ہی کو بول چال کا ذریعہ بنائے رہے اور باوجودیکہ نارمنوں نے اپنی تہذیب اور زبان کو رواج دینے کی بہت کوشش کی لیکن انگریزوں نے اس تہذیب کو ہرگز قبول نہ کیا لیکن پھر بھی زبان نارمنوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔ حاکم زبان کا اثر محکوم باشندوں کی زبان پر پڑنا ضروری تھا چنانچہ نارمنوں کی زبان کے بہت سے الفاظ قدیم انگریزی میں بھرتی ہو گئے جو بول چال میں عام طور پر استعمال ہونے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں نئے الفاظ انگریزی میں داخل ہو گئے بہادری اور جنگ کے بیان کرنے میں مثلاً (Tournament، captain خطابات اور عہدے مثلاً DhKe، prince، Vicar وغیرہ، حکومت اور قانون میں مثلاً Jirdge، Peeliament وغیرہ شکار اور دوسرے شغلوں میں مثلاً catch، chase وغیرہ طباخی میں مختلف گوشت کی وضاحت اور تخصیص کے لئے (Beef، Multon، pork، veal وغیرہ الفاظ انگریزی زبان میں نہ صرف داخل ہو گئے بلکہ عام طور پر بے تکلفانہ استعمال کئے جانے لگے اور وہ انگریزی زبان کے ساتھ ایسے شیر و شکر ہو گئے کہ ان کی پہچان مشکل ہو گئی۔

فتح نارمن کے بعد کئی صدی تک ایسا زمانہ رہا جس میں تمام یورپ ایک قسم کی نیند میں تھا علم کا شوق کم ہو گیا تھا۔ سائنس اور دیگر فنون میں کسی قسم کی ترقی نہ ہوئی تھی۔ چنانچہ یہ "عہد تاریک (Dark age)" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے لیکن اس کے بعد فطرتاً بیداری کے آثار نمایاں ہوتے رہے لوگ عام طور پر اطراف و اکناف کے حادثوں اور واقعات پر غور کرنے لگے۔ سوچنے سمجھنے لگے۔ اور کولمبس جیسے سیاح سیاحت عالم کے لئے نکلے۔

یہ تحصیل علم کا زمانہ "عہد بیداری" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یہ دور چودھویں صدی عیسوی سے شروع ہوا اور اب یہ اپنی انتہائی منازل طے کر رہا ہے۔ انگلستان میں اس دور کے عمدہ نتائج ملکہ الزبتھ کے عہد حکومت میں رونما ہوئے۔ ہر قسم کی کتابیں خصوصاً یونانی زبان میں تحریر کی ہوئی کتابیں جستجو اور محنت سے جمع کی جانے لگیں۔ اور لوگ ان کو شوق سے پڑھنے لگے۔ مردہ زبانوں نے نیا جنم لیا اور یونانی اور لاطینی الفاظ پھر ایک دفعہ کثرت کے ساتھ انگریزی میں استعمال کئے جانے لگے۔

یہ دوسرا اہم واقعہ ہے کہ لاطینی اور یونانی الفاظ کو لوگوں نے قبول کیا۔ ہر لفظ ایک خاص خیال اور مطلب کا حامل تھا۔ اس لئے الفاظ کی بھرمار ہونے لگی۔ اور یہ الفاظ تعلیم یافتہ طبقہ تک محدود تھے۔ علماء، وکیل اور پادری ان الفاظ کو بہت بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے۔ اس کا اس قدر گہرا اثر ہونے لگا کہ لوگوں کو ڈر ہوا کہ کہیں انگریزی لاطینی اور یونانی میں ضم نہ ہو جائے۔ عیسائی مذہب کی ابتدا۔ نارمنوں کی فتح۔ عہد بیداری کا اثر یہ تینوں واقعات انگریزی زبان کی تاریخ میں تو بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ خصوصاً عہد بیداری کے بعد سے بہت سی زبانوں کے الفاظ انگریزی بول چال میں استعمال ہونے لگے تھے اور آج کل یہی زبان عالمگیر زبان ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے نیز شدت کے ساتھ اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ بین قومی زبان اسی انگریزی کو قرار دیا جائے۔

یہ امر بہت مشکل ہے کہ ہم غیر زبان کے ان الفاظ کی صحیح صحیح تعداد بتلا سکیں جو انگریزی میں شریک کر لئے گئے ہیں۔ یا یا الفاظ دیگر انگریزی میں گھل مل گئے ہیں کہ ہم بلا تکلف انگریزی بول چال میں (بلالحاظ اس کے کہ وہ غیر زبان کے ہیں) استعمال کرتے ہیں یہ امر یقینی ہے کہ غیر زبانوں کے تقریباً ۲ لاکھ الفاظ انگریزی میں مستعمل ہیں شیکسپیئر نے

جس کے مضامین کی تعداد سب مضمون نگاروں کے مضامین کی تعداد سے جدا جدا زاید ہے تقریباً بارہ ہزار غیر زبانوں کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ شخص کم سے کم چھ ہزار غیر زبان کے الفاظ استعمال کرتا ہے لیکن روزمرہ زندگی میں دو دو ہزار الفاظ کا استعمال ضروری اور کافی ہے۔

ان الفاظ کے انبار میں جو انگریزی کی بڑی بڑی لغتوں میں ملتے ہیں صرف چند ہزار الفاظ قدیم انگریزی کے ہیں جو بجا طور پر "سا انگریزی الفاظ" کہلانے کے مستحق ہیں لیکن پھر بھی ہم اس مخلوط زبان کو انگریزی کہتے ہیں اور آئندہ نسلیں بھی اس زبان کو انگریزی ہی کہیں گی۔

شریف النسا بیگم

اردو کی نئی کتابیں

۱. اندھا دیوتا (تین افسانوں کا ترجمہ) مرتبہ سید احسان علی شاہ قیمت (عہ)

۲. بربط ناہید (مکتوبات) از جہاں بانو بیگم ایم اے (عثمانیہ) ۱۶۴ صفحات قیمت (عہ)

۳. عروس سخن (میر انیس کے چند مرثیے) مرتبہ بیگم رضا ۱۰۰ صفحات قیمت ؏

۴. بلبل ہزار (مجموعہ مضامین) از علامہ راشد الخیری مرحوم قیمت ۱۰/

۵. سچے افسانے (تاریخی افسانے) از گوپال متل بی اے ۲۰۰ صفحات قیمت ؏

۶. کالیداس اور دو ما (ڈراما) از پنڈت جگدیش چندر جوش قیمت ۸/

۷. امیر العروض (عروض اور قافیہ کے اصول) از بزمی انصاری بی اے ۲۰۰ صفحات قیمت عہ ۱۲/

۸. لب المجربات تیسرا ایڈیشن (مجرب نسخے) از حکیم دلبر حسن خاں ۲۳۲ صفحات قیمت عا۔

۹. ایشیا کے بڑے لوگ چار حصے (چند مشاہیر کے حالات) از محمد مرزا قیمت عا۔

۱۰. دوشیزۂ صحرا (افسانہ) از صادق الخیری قیمت عہ

۱۱. ساز فطرت (افسانے) از حسن عزیز جاوید قیمت عہ

۱۲. فرشتوں کا امتحان (مزاحیہ) از حاجی لق لق قیمت ۸/

۱۳. لمحات رنگین (افسانے) از زبیدہ سلطانہ قیمت عا۔

۱۴. نیلوفر (افسانے) از حسن عزیز جاوید قیمت عہ

۱۵. مشیر عالم ڈائرکٹری (مشاہیر دکن کے حالات) مرتبہ سید عباس حسین صمصام قیمت عہ۔

۱۶. یورپ کی خونی سیاست (یورپ کے انقلاب کی تفصیل) از سید تصدق حسین ۱۳۶ صفحات قیمت ۸/

۱۷. جوش عمل (سیاسی نظموں کا مجموعہ) از محمد مصطفیٰ خاں حق ۱۵۰ صفحات قیمت ۱۲/

۱۸. رباعیات حیدر از حیدر دہلوی ۱۲۵ صفحات قیمت عہ

۱۹. عصر نو (نظموں کا مجموعہ) از محمد صادق ضیا ۸۴ صفحات قیمت ؏

۲۰. مہابلی بھیم (سوانح) از سیلارام وفا ۶۴ صفحات قیمت ۶/

۲۱. قائد اعظم (سوانح محمد علی جناح) از ایم اے سلام ۸۴ صفحات قیمت ۶/

۲۲. ترکوں کا باپ (سوانح مصطفیٰ کمال) از ایم اے سلام ۷۵ صفحات قیمت ۸/

۲۳. اسرار شریانیہ (نبض کی تحقیق) از حکیم محمد عبدالوہاب انصاری ۸۰ صفحات قیمت ۸/

۲۴. نگارشات (ادبی مضامین وغیرہ) از آغا محمد باقر ۱۶۲ صفحات قیمت ؏

۲۵. بندے ماترم از محمد داود حسین ۵۰ صفحات قیمت ۲/

۲۶. حیدرآباد اور آئینی اصلاحات از سید احمد عارف ۶۵ صفحات قیمت ۴/

۲۷. اندرون حیدرآباد از خالدہ ادیب خانم ۴۴ صفحات قیمت ۲/

مرزا سیف علی خاں

حالاتِ حاضرہ

برطانیہ کے مقاصدِ جنگ۔ فروری کے پہلے ہفتے میں وزیرِ جنگ مسٹر ہور بیلشا صاحب نے نیوکاسل میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارا ایک جنگی مقصد ہے اور وہ جنگ کا جیتنا ہے۔ ہم صلح چاہتے ہیں مگر ایسی صلح جو پائدار ہو۔ اس کے بعد انھوں نے کہا "معاہدہ ورسائے میں خامیاں چاہے کتنی ہی ہوں لیکن اس کا محرک صرف یہی خیال تھا کہ دوسری قومیتوں کو جرمن حکمرانی سے آزاد کردیا جائے۔ جرمن معاہدہ ورسائے کو امن کے منافی سمجھتے ہیں لیکن اگر جرمنی جنگ میں کامیاب ہوجائے تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ برطانیہ کے ساتھ کم ازکم معاہدہ ورسائے کی طرح کا کوئی معاہدہ کرے گا۔ اس کے برخلاف برطانیہ اپنی سلطنت، بیڑے اور تجارت سے محروم ہوکر ایک چھوٹا سا گنجان جزیرہ بن جائے گا اور اس کی سبحالی ناممکن اور بقا مشتبہ ہوجائے گی۔ اپنی حد تک ہم جرمنی یا جرمنوں سے کچھ نہیں چاہتے۔ ہم ان کی تباہی کی خواہش نہیں رکھتے۔ ہم کو ان کی خوشحالی سے شکایت نہیں۔ ہم ان کو ایسے غلام کسان نہیں بنانا چاہتے جو انھوں نے لاکھوں آدمیوں کو بنایا اور نہ ہم ان کی زمین کو صحرا بنانا چاہتے ہیں جس طرح انھوں نے ایک ربع یورپ کو بنادیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ پُرامن اور خوشحال یورپ کے پُرامن اور خوشحال رکن رہیں لیکن موجودہ یا کسی دوسرے دور میں ان کو اس کا اختیار کبھی نہ ملنا چاہیے کہ دنیا کو مصیبت اور بلا میں مبتلا کریں۔"

ایران اور امریکہ۔ ایران اور امریکہ کے درمیان اب خوشگوار تعلقات قائم ہوگئے ہیں ورنہ تین سال پہلے ان دو ملکوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی تھی۔ اس کشیدگی کی بنا یہ تھی کہ ایرانی وزیر کو موٹر تیز چلانے کی وجہ سے میری لینڈ میں ایک پولیس کے جوان نے روک دیا تھا۔ شاید معمولی بات چیت سے معاملہ آگے کو بڑھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانی وزیر کو گرفتار کرلیا گیا۔ بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ ایرانی وزیر کو سفارتی استثنا حاصل ہے تو اس کو چھوڑ دیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی امریکہ کے سکرٹری آف اسٹیٹ کارڈل ہل صاحب نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ سفارتی استثناء کے یہ معنی نہ ہونے چاہئیں کہ مستثنیٰ آدمی اس کو خلاف ورزیٔ قانون کا پروانہ سمجھنے لگے۔ بلکہ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ خود ذمہ داری کا احساس پیدا کریں۔ اس طرزِ عمل سے حکومتِ ایران ناخوش ہوگئی اور اس لئے اپنے وزیر کو امریکہ سے واپس بلا لیا۔

جنوبی افریقہ۔ جس وقت سے جنرل اسمٹس نے اپنی نئی کابینہ بنائی ہے "افریقہ کی شرکتِ جنگ کے متعلق برابر اختلاف کیا جا رہا ہے اور ہرٹزاگ اور ملن کی جماعت نے اسمبلی میں اور اسمبلی سے باہر خوب شور مچایا۔ لیکن نئی حکومت نے اختلاف کو عرصہ تک دبائے رکھا اور مخالفوں کو عدم اعتماد کی تحریک کے پیش کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جنرل اسمٹس اتنی مخالفتوں کے باوجود اپنے مسلک پر برابر قائم ہیں۔

سردی اور جنگ۔ اس سال فرانس میں اتنی زیادہ سردی پڑی ہے کہ شاید پچھلے کئی سال سے ایسی سخت سردی نہیں ہوئی۔ چنانچہ اب ۲۰ درجہ حرارت ہے۔ اس کی وجہ سے اتحادیوں اور جرمنی کے درمیان برف کی ایک سدِ سکندری حائل ہوگئی ہے اور ہر ایک فریق اپنے سپاہیوں اور جانوروں کو سردی سے محفوظ رکھنے کی فکر میں ہے جس کی وجہ سے ان کو لڑائی کا خیال بھی نہیں رہا۔ لیکن بحری جنگ برابر جاری ہے اور شاید پچھلے پانچ مہینوں سے زیادہ سخت ہورہی ہے۔ اطالیہ، امریکہ اور جاپان کو چھوڑ کر جو طاقتور غیر جانبدار ممالک ہیں، دوسرے تمام ملکوں کے جہاز خطر ہیں۔

ہیں کیونکہ جرمن یو بوٹ ان پر بغیر اطلاع کے حملہ کر دیتی ہیں۔

۲۸۷ جہاز۔ جنگ کی ابتدا سے اس وقت تک ۲۸۷ جہاز غرق ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ۱۶۲ برطانوی جہاز ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ جنگ شروع ہونے کے بعد سے اب تک جرمنی نے روزآنہ ایک برطانوی جہاز ڈبو دیا۔ غیر جانبدار ملکوں کے ۱۶۵ جہاز ڈوبے جن میں سب سے زیادہ نقصان ناروے اور سویڈن کا ہوا۔

ان نقصانات کے جواب میں اتحادیوں نے ۳۲ جرمن جہازوں کو ڈبو دیا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جرمنی کے نقصانات متحدین کے نقصانات کے مقابلے میں بہت حقیر ہیں لیکن بات یہ ہے کہ جرمنی کے پاس جہازوں کی تعداد بہت کم ہے اور اسی تعداد کا لحاظ کرتے یہ جرمنی کا بہت بڑا نقصان ہے۔

جہاز اور آبدوز۔ فروری کے مہینے میں بہت سے جہاز غرق ہوئے جن میں سے بعض غیر جانبدار ملکوں کے جہاز تھے اور بعض برطانوی۔ ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

۱۳ فروری کو سویڈن کا ایک دخانی جہاز "اورہنیا" (۱۸۵۴ ٹن) دشمن کے تارپیڈو کا شکار ہوا۔ اس جہاز کے ۱۰ آدمیوں کو ایک برطانوی جہاز نے بچا لیا۔ اسی دن سویڈن کا ایک اور دخانی جہاز "ڈالارو" (۳۹۲۷ ٹن) بحر اوقیانوس میں ڈوب گیا لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ ڈالارو سرنگ سے ٹکرایا یا تارپیڈو کی وجہ سے ڈوبا۔ ۱۴ فروری کو ناروے کا ایک حربی جہاز "اسنتاڈ" (۴ ہزار ٹن) جو امریکہ جا رہا تھا ایک دھماکہ سے ڈوب گیا۔ دھماکہ یا تو سرنگ سے ہوا یا تارپیڈو سے۔ ناروے کا ایک دخانی جہاز "نیداہوم" (۳۴۸۲ ٹن) بھی جو امریکہ جا رہا تھا اسی دن ڈوب گیا۔ جہازیوں کو ناروے کے ایک دوسرے جہاز نے بچا لیا۔ ۱۵ فروری کو ڈنمارک کے ایک دخانی جہاز "جسٹین ایرسک" کو جرمن آبدوز نے ڈبو دیا۔ اس کے ۳۰ ملاحوں کو ایک برطانوی طیارے نے بچا لیا۔ ڈنمارک کا ایک اور جہاز "مارٹن گولڈشمڈٹ" بھی ڈوب گیا۔ ۱۶ فروری کو اطالیہ کا ایک تجارتی جہاز "جیواوہلسن" (۵۶۹۴ ٹن) ایک سرنگ سے ٹکرا کر غرق ہو گیا۔ ان کے علاوہ ہالینڈ کا ایک جہاز "برگرڈجک" بھی تارپیڈو سے ڈوب گیا۔

۱۴ فروری کو برطانیہ کے تین بڑے جہاز "کرسٹافیلڈ" "برٹش ٹرایمف" اور "سلطان اسٹار" ڈوب گئے۔ برٹش ٹرایمف ۸۵۰۱ ٹن کا جہاز تھا جو بحر شمالی میں ایک دھماکے کے بعد الٹ گیا اور سلطان اسٹار ۱۲۰۰۰ ٹن کا تھا جو تارپیڈو کا شکار ہوا۔ لیکن ان برطانوی جہازوں کو غرق کرنے والی دو جرمن آبدوزوں کو بھی تباہ کر دیا گیا۔

فنستان کی جدوجہد۔ میانرہیم لائن پر روسیوں نے پوری توجہ لگا دی ہے اور روسی فوجیں اس جگہ خوب دباؤ ڈال رہی ہیں۔ لیکن فنستانی بھی روسیوں کے مقابلے میں اپنی پوری قوت کے ساتھ ڈٹ گئے ہیں۔ فنستانیوں کے لئے یہ بات بھی ہمت افزا ہے کہ برطانیہ نے اس چھوٹی سی مملکت کی عملی طور پر مدد کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔

فروری کے تیسرے ہفتے میں صدر فنستان ایم۔ کالیو نے ہلسنکی میں ایک بیان دیا جس میں وہ کہتے ہیں "فنستان اپنی آزادی کے لئے لڑ رہا ہے اور ہماری جدوجہد یقیناً ہماری کامیابی کی ضامن ہے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اس امداد کو جو جلد اور موقع پر پہنچائی جائے بہت بڑی امداد سمجھنا چاہیے اور ہمیں امید ہے کہ دوسرے ہمدرد ملکوں کے سپاہی بہت جلد ہمارے دوش بدوش لڑنے کے لئے آجائیں گے۔ ہم کو مدد کی سخت ضرورت ہے اور اس سے کہیں زیادہ مدد کی ضرورت ہے جو اب تک ہم کو ملی۔

اطالیہ کی تیاری۔ فروری کے دوسرے ہفتہ میں سولینی نے مسلسل پانچ دن تک مدافعتی اعلیٰ کونسل کے اجلاس منعقد کئے۔

روم کی بعض اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کونسل نے اطالیہ کو جنگ کے لئے بالکل تیار کر دینے کا تصفیہ کیا ہے۔ اس موقع پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اطالیہ کو جرمنی اور روس کے متحدہ حملے کا خوف ہے یا کسی ایک سے حملہ کا ڈر ہے؟ اور اگر بلقان پر جہاں اطالیہ کا زیادہ مفاد ہے حملہ ہو جائے تو اطالیہ کیا کرے گا؟

اب یہ امر قرین قیاس نہیں ہے کہ ہٹلر اور مسولینی اپنے پچھلے اختلافات سے درگزر کر کے بلقان میں البانیہ کی طرح کوئی نیا گل کھلائیں گے۔ البتہ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اطالیہ اپنے مفاد کے تحفظ کی خاطر یقیناً کوئی کارروائی کرے گا اور اس قسم کے اقدام کو اتحادی مستحسن نظروں سے دیکھیں گے۔

ہندوستان

گاندھی جی کا بیان۔ گورنر جنرل اور گاندھی جی کے درمیان حالیہ گفتگو کے بعد جب گاندھی جی دلی سے ناکام لوٹے تو انھوں نے ہریجن میں ایک مضمون لکھا۔ اس میں انھوں نے کہا کہ اس ناکامی کو ناکامی نہیں سمجھنا چاہیے۔ پھر وائسرائے بہادر کے خلوص کی تعریف کرتے ہوئے گاندھی جی نے کہا کہ ان کو برطانوی حکومت کے مسلک کی پابندی کرنی پڑتی ہے اور یہ کہ وہ ایک طرح سے معذور سمجھے جانے چاہئیں۔ اس کے بعد گاندھی جی نے کانگریس کی بعض کمزوریوں کا بھی اعتراف کیا اور کہا کہ پہلے ان کمزوریوں کو دور کر لینا چاہیے۔ اسی ضمن میں گاندھی جی نے مسلمان اور دوسری قلتوں کے ساتھ تعلقات پر بحث کی کہ "کانگریس کو چاہیے کہ انھیں راضی کرے" ان کا روئے سخن خاص طور پر مسلمانوں کی طرف ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں "ہم قائد اعظم جناح کی غیر عملی اور سراسر غیر قومی روش کو اپنے ذہن سے خارج کر سکتے ہیں لیکن ہم مسلمانوں کو اپنے غور و خوض سے خارج نہیں کر سکتے۔" مسلمانوں کو کانگریس کے حلقے میں لانے کے لئے گاندھی جی یہ تدبیر بتاتے ہیں کہ "کانگریس کمیٹیوں، مقامی جماعتوں اور اسی قسم کی مجالس کے بعض انتخابات میں زیادہ مسلمانوں کو منتخب ہونے کا موقع دیا جائے۔"

وزیر ہند کی توقعات۔ فروری کے دوسرے ہفتے میں لارڈ زٹلینڈ نے ایک اخباری نمایندے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ گاندھی، وائسرائے گفت و شنید کی ناکامی سے انھیں مایوسی اور حیرانی ہوئی۔ اس کے بعد وزیر ہند نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ تجدید کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی کے اس بیان سے جو انھوں نے ابھی چند روز پہلے دیا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریسی رہنما اپنے ابتدائی مطالبات سے بالکل نہیں ہٹے۔ اس کے بعد لارڈ زٹلینڈ نے یہ توقع ظاہر کی کہ کانگریسی رہنما اُن مشکلات کا زیادہ لحاظ کریں گے جو ان کے مطالبات کی تکمیل کی نسبت برطانوی حکومت کی راہ میں حائل ہیں۔

یارک شائر پوسٹ اور کانگریس۔ ۸ر فبروری کو لندن کے مشہور اخبار یارک شائر پوسٹ نے ایک افتتاحی مقالہ میں چند سوال کئے ہیں۔ وہ پوچھتا ہے کہ ہندوستانی اور برطانوی سیاست دانوں پر اعتماد اشتراک کو کونسی چیز روکتی ہے؟ ہندوستان کی جانب سے بولنے اور ان کی نسبت فیصلہ کرنے کا اختیار کس کو حاصل ہے؟ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ جب تک خود ہندوستانی اس سوال کا متفقہ جواب نہ دیں کانگریسی مطالبات پر برطانیہ سر نہیں جھکا سکتا۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں برطانیہ کو اپنے باعزت مفادات پورے کرنے ہیں اسے مسلمانوں اور دیگر قلتوں کے مستقبل کا تحفظ اور والیان ریاست کی نسبت اپنی پابندیوں کا احترام کرنا ہے۔ اگرچہ برطانوی عوام ہندوستانی باشندوں کو کامل قومیت کی شاہراہ پر گامزن دیکھنے کے مشتاق ہیں لیکن برطانیہ اپنی اس ذمہ داری سے دست بردار نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کے خارجی اور داخلی تحفظ کو قرار

رکھے اور اس کا یقین دلائے کہ اس ملک کی تمام قومیتوں سے انصاف کیا جائے گا۔ برطانوی باشندوں کو ہندوستانی جذبات سے گہری ہمدردی ہے لیکن برطانیہ ہندوستانی ترقی میں بہت کم مدد دے سکتا ہے تاوقتیکہ خود ہندوستانی جماعتیں تعاون کرنا نہ سیکھیں۔

کانگریس کا نیا صدر۔ اس سال کانگریس کی صدارت کے لئے ایم۔ این رائے اور ابوالکلام آزاد بطور امیدوار کھڑے ہوئے تھے ۱۶ر فبروری کے اعلان کی بموجب ایم این رائے کو ۱۸۳ رائیں ملیں اور آخر الذکر کو (۱۸۶۴) اس طرح مولانا آزاد (۱۶۸۱) آراء کی کثرت سے کانگریس کے صدر منتخب ہو گئے۔

مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ۔ کُل ہند مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ لاہور میں ۲۲، ۲۳، ۲۴ مارچ کو منعقد ہو رہا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے اجتماعی مسائل اور موجودہ بین قومی نازک صورتِ حال کی وجہ سے اس جلسے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ غالباً بیشتر اسلامی مملکتوں کے نمایندے بھی شریک ہوں گے۔ مسٹر جناح جلسے کی صدارت کر رہے ہیں۔

سندھ۔ سندھ کے صدر اعظم خان بہادر اللہ بخش نے ۱۵ر فبروری کو استعفاء دے دیا ہے۔

جملہ کتب کے ملنے کا پتہ

"سب رس" کتاب گھر

رفعت منزل۔ خیرت آباد

حیدرآباد دکن

سب رس کتاب گھر کی فہرستِ کتب

پروفیسر سروری

کتاب	قیمت
دنیائے افسانہ	عہ ۸/
کردار اور افسانہ	عہ ۸/
جدید اردو شاعری	عل ۸/
حیدرآباد کی تعلیمی ترقی	عہ
انگریزی افسانے	عہ ۴/
چینی اور جاپانی افسانے	۶/
سراجِ سخن	۱۲/
اردو مثنوی کا ارتقاء	عہ ۱۲/

پروفیسر سید محمد ایم اے

کتاب	قیمت
اربابِ نثرِ اردو	عال
گلشنِ گفتار	۱۲/
مثنویاتِ میر	عال
یادگارِ ولی	عال
ابتدائی فارسی	۱۲/
انتخابِ اردو	۱۲/
ایوانِ سخن	۱۲/

پروفیسر عبدالمجید صدیقی

کتاب	قیمت
تاریخ گولکنڈہ	سے ۸/
ارسطو جاہ	۶/
مقدمہ تاریخ دکن	۸/

محمد امیر اورنگ آبادی

کتاب	قیمت
من کی بانسری	عہ

بچوں کے لئے ایک دلچسپ سفرنامہ
منزل
جس میں شمالی ہند، کشمیر، بنگلور اور سرزمین دکن کی تاریخی عمارتوں کے حالات نہایت دلچسپ پیرائے میں اور عام فہم زبان میں لکھے گئے ہیں
ہندوستان کا مشہور و مقبول
ہفتہ وار
ایشیا
آگرہ
اگر آپ آزادیٔ وطن کے حامی ہیں۔
اگر آپ پستیوں سے ابھرنا چاہتے ہیں۔
اگر آپ بہترین افسانوں سیاسی اور ادبی مضامین کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں
اگر آپ اردو کی ترقی کے آرزومند ہیں
اگر آپ تمام دنیا کی معتبر تازہ ترین خبریں دیکھنا چاہتے ہیں
تو آج ہی
"ایشیا"
کے خریدار ہو جائیے
"ایشیا" یوپی کے تمام ہفتہ وار اخباروں میں سب سے زیادہ سستا اور مقبول اخبار ہے
آپ کے شہزادوں کے لئے معلومات کے قیمتی
ادبی موتی
از حضرت مولانا سیماب اکبرآبادی
منیجر اخبار "ایشیا" ہینگ کی منڈی آگرہ

بچوں سے

سب رس کے تیسرے سال کا تیسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ سب رس نے اس قلیل مدت میں جو ترقی اور اردو کی خدمت کی ہے اس سے آپ سب واقف ہیں۔ ادارۂ ادبیات اردو نے اس مدت میں اردو کی ترقی کے لئے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ادارہ نے مختلف شعبے قائم کرکے اپنے کام کو اور وسیع کیا ہے۔ ہر ایک شعبہ اپنی جگہ پر برابر کام انجام دے رہا ہے۔ بچوں اور طلبہ کے لئے بھی دو شعبے قائم ہیں ایک شعبۂ اطفال ہے جو بچوں کے لئے چھوٹی چھوٹی کتابیں شایع کر رہا ہے جس میں وہی لوگ ہیں جو اس کام سے واقف اور جنھیں اس کام سے دلچسپی ہے۔ ایک اور شعبے کا قیام حال ہی میں عمل میں آیا جس سے آپ بخوبی واقف ہیں اس سے مراد شعبۂ طلبہ ہے۔ اس شعبہ میں زیادہ تر طبقۂ وسطانیہ اور فوقانیہ کے طلبہ ہیں۔ اس کے جلسے مہینہ میں ایک دو بار ضرور ہوتے ہیں۔ طلبہ میں ابھی سے تقریر کرنے کا شوق پیدا کرایا جا رہا ہے۔ ادارۂ ادبیات اردو کا ہمیشہ سے یہ مقصد رہا کہ بچوں، بچیوں اور طلبہ کی طرف پہلے توجہ کرنی چاہیے اور انھیں ایک ایسے راستے کی طرف متوجہ کرنا چاہیے جو اُن کے لئے مفید ہو۔ کیونکہ نوجوان طلبہ ہی اردو کی خدمت اچھی طرح انجام دے سکتے ہیں اور بڑے ہو کر اپنے ملک اور زبان کی خدمت کے قابل بن سکتے ہیں آپ سب کو چاہیئے کہ ادارہ کا ہاتھ بٹائیں اور خود بھی اس میں حصہ لے کر اردو کی ترقی کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں۔ ایسا کرنے میں آپ کا بھی فائدہ ہے اور ادارہ کا بھی۔ اور سب سے بڑھ کر اپنی پیاری زبان اردو کا۔

اس عرصہ میں شعبۂ طلبہ کے کئی جلسے ہوئے۔ ایک جلسے میں پروفیسر سید محمد صاحب ام اے نے "ہمارے طلبہ اور ہماری زبان" پر ایک مفید اور دلچسپ تقریر کی، اور طلبہ کو توجہ دلائی کہ وہ اردو کی ترقی کے لئے کوشش کریں، اور بات چیت آسان اور سلیس زبان میں کریں تاکہ ہر ایک ہماری زبان سمجھ سکے۔ ایک اور جلسہ ۲۰ رفروری سنہ ۴۲ء کو ہوا جس میں طلبہ نے مختلف عنوانات پر اپنے لکھے ہوئے مضمون سنائے۔

اکثر بچوں نے فبروری کے پرچے کی تعریف کی ہے کیونکہ اس میں بڑے ہی مفید اور دلچسپ مضمون چھپے تھے۔ آپ توقع رکھئے کہ اب اسی طرح ہمیشہ چھپا کریں گے۔ ضرورت اس کی ہے کہ آپ اپنے دوستوں اور ساتھیوں کو اس کے پڑھنے کا شوق دلائیں۔ ہر لایق، اور ترقی کرنے والا لڑکا یا لڑکی سب رس ضرور خریدتا ہے اور بڑے شوق سے اس کے پرچے جمع کرکے سال بھر فائل مکمل کرتا ہے۔ چنانچہ سب رس کے دفتر میں اکثر پرانے رسالوں کی خریدی کے خط آتے ہیں مگر افسوس ہے کہ ہمارے یہاں بعض پرچے ختم ہوگئے ہیں۔ اگر آپ میں سے کسی کے یہاں ۱۹۳۵ء کے ماہ جنوری و فبروری کے پرچے اچھی حالت میں ہوں اور آپ ان کو فروخت کرنا چاہتے ہیں تو دفتر سب رس کو ایک کارڈ ڈال دیجئے۔ دفتر سے اصل قیمت روانہ کرکے پرچے حاصل کر لئے جائیں گے۔

معمّہ کے حل تو وصول ہوئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اکثروں نے بعض الفاظ کے معنی نہیں سمجھے وہ اپنے استاد صاحب سے دریافت کرلیں اور پھر معمّہ کا صحیح حل روانہ کریں۔

پھر ایک ماہ بعد ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ

معین الدین احمد انصاری

علم

"بیاموز جز علم گر عاقلی" که بے علم بودن بود غافلی"

علم کی غایت اصلی عرفان الٰہی حاصل کرنا اور نیکی اور بدی میں تمیز کرنا ہے۔ علم ہی سے انسان کو خدا تعالیٰ کی شناخت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب ایک عالم شخص موجودات عالم یعنی بلند آسمان، متجلی سیارے، وسیع زمین، عمیق سمندر، گونا گوں نباتات، عجیب و غریب حیوانات اور رنگا رنگ جمادات پر نظر کرتا ہے۔ اور پھر ان کے نظام و حرکات تغیر و تبدل حیات و ممات، ماہیت و حقیقت پر غور کرتا ہے تو وہ خالق عالم کی ہستی مطلق۔ اس کی قدرت و حکمت اور عظمت و جبروت پر دل سے یقین کرتا اور بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ

یوں تو موجوداتِ عالم کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ لیکن جاہل و عالم کے مشاہدے میں زمین و آسمان کا فرق ہے اس کی نظر سطحی ہوگی اور یہ جہاں سے جہاں آفریں کا پتہ لگاتا اور سبب سے مسبب کی حقیقت دریافت کرتا ہے۔ سعدی علیہ الرحمہ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

"که بے علم نتواں خدا را شناخت"

علم کا دراصل خلاصہ یہ ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی صفات اعلیٰ سے آشنا ہو۔ اور اچھی بری باتوں کی تمیز پیدا کرے اور ہر ایک امر کی کماحقہٗ حقیقت سے واقف ہو جائے۔

علم کا حاصل کرنا فرائض انسانی میں داخل ہے۔ چنانچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ" علم ایک ایسا بحر ناپیدا کنار ہے کہ بڑے سے بڑا شناور اس سمندر کو عبور نہیں کر سکتا۔

علم ہی سے انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہے اسی سے انسان کی خوبیاں اور کمال چمک جاتا ہے اور اسی کی مدد سے وہ ہر کام کو عمدگی اور خوش اسلوبی سے انجام دے سکتا ہے۔ دنیا نے جو کچھ ترقی کی ہے اور ایجادات و اختراعات ہوئی ہیں۔ سب علم ہی کے بدولت ہیں چنانچہ سائنس جو علم و عقل کا مجموعہ ہے۔ ایسی عجیب و غریب اور نادر الوجود اشیاء جس کو دیکھ کر معمولی علم و عقل کا آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ ایجاد کرتی ہے جیسے "بجلی کی روشنی" "ہوائی جہاز" "ٹیلیفون" وغیرہ جن کی وجہ سے بنی نوع انسان کو ہر طرح کا آرام و آسائش حاصل ہے۔

علم سے دولت مل سکتی ہے لیکن دولت سے علم نہیں حاصل ہو سکتا۔ علم ہی سے ناموری و شہرت ہوتی ہے۔ عالم لوگوں ہی کی یاد صفحۂ دنیا پر باقی ہے جتنے بڑے بڑے مصنف گزرے ہیں وہ سب اگر عالم نہ ہوتے تو کوئی ان کو جانتا تک نہیں ان کی تصنیفات ہی ان کے شہرہ کا باعث ہوئیں نہ صرف ان کی شہرت کا بلکہ ان کی بھی جن کے حالات انھوں نے بیان کئے ہیں۔ بقول فردوسی

منش کردہ ام رستم پہلواں وگرنہ یلے بود در سیستاں

علم ایک ایسی لازوال دولت ہے جس کے ضایع ہونے کا کوئی خوف واندیشہ نہیں۔ حصولِ علم سے ایسا سرور حاصل ہوتا ہے کہ دنیا کی کوئی مسرت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

علم سے محروم رہنا بڑی بدنصیبی کی بات ہے۔ جاہل آدمی مثل ایک اندھے کے ہے۔ گو اس کی آنکھیں موجود ہیں لیکن وہ دوسروں کی آنکھوں کا محتاج، وہ دنیا میں ہے مگر دنیا کے حالات سے بے خبر۔ مخلوقات دنیا کو دیکھتا ہے لیکن ان کی حقیقت سے نابلد۔ غرض کسی چیز سے کما حقہٗ فائدہ نہیں حاصل کرسکتا حتیٰ کہ اپنے فطری جوہر کو بھی کام میں نہیں لاسکتا۔ مگر جاہل سے بھی زیادہ بدنصیب وہ صاحبِ علم ہیں جو علم جیسی دولت کو ملازمت کے بھینٹ چڑھاتے ہیں یعنی صرف ملازمت کے لئے علم حاصل کرتے ہیں۔

علم کا مقصد، معرفت، تزکیہ نفس و درستیٔ اخلاق ہونا چاہیے کہ آخرت اچھی ہو یا بہبود خلایق و رفاہ عام، نہ کہ ملازمت و غلامی۔

بدیں اے فرومایہ دنیا مخر
چو خر بہ انجیل عیسیٰ مخر"

معصومہ بیگم

سماج میں عورت کا درجہ

اسلام نے عورت کو ایسے حقوق دیئے ہیں جو اس سے پہلے اس کو کبھی حاصل نہ تھے۔ وہ تمام جائز اختیارات اور کاموں میں مرد کے بالکل برابر رکھی گئی۔

وراثت کے مسئلے اور جائداد کے شخصی حصہ میں مسلمان عورت کا درجہ دوسرے مذہب کی عورتوں سے بہت بہتر ہے۔

مرد کو اپنے والدین اور عزیز جو جائداد چھوڑیں اس میں سے ایک حصہ لینا چاہیے۔ قرآن کہتا ہے کہ عورت کو اس کے والدین اور عزیز کی جائداد کا ایک مخصوص حصہ ملنا چاہیے۔ اس طرح جو وہ سو برس پہلے اسلام نے عورت کو حق جائداد دیا۔ لیکن انگلستان میں ۱۸۸۲ء تک عورت کو ایسا حق حاصل نہ تھا اور فرانس میں اس کو اس وقت تک یہ حق حاصل نہیں ہے۔ ایک مسلمان عورت اپنی جائداد صرف کرنے اور منتقل کرنے کا پورا حق رکھتی ہے۔ وہ اپنے طور پر تجارت کرسکتی ہے اور اپنی خواہش سے کسی معاہدہ میں بھی شریک ہوسکتی ہے۔ اس کے شوہر کو اس میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ شادی کے بعد بھی وہ اپنی انفرادیت قائم رکھ سکتی ہے اور اس کو شوہر کا نام اختیار نہیں کرنا پڑتا۔ جیسے مسز فلاں فلاں۔ اس طرح عورت مرد کی آزاد حصہ دار اور حقیقی ساتھی ہے۔

شوہر کے انتخاب میں آزادی۔

شادی کے متعلق مسلمان عورت کو اپنے شوہر کے انتخاب کی پوری آزادی دی گئی ہے۔ بغیر اس کی مرضی کے کوئی معاہدہ قانوناً تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ عورت کو اپنی مرضی ظاہر کرنی پڑتی ہے اور اس کے سرپرست اس کو منظور کرتے ہیں۔ کوئی سرپرست بغیر لڑکی کی مرضی

حاصل کئے اس کی شادی نہیں کرسکتا۔ اگر سرپرست لڑکی کی کمسنی میں شادی کردے تو وہ بڑی ہو کر اپنی مرضی سے شادی کو نامنظور کرسکتی ہے۔ اس کے علاوہ عورت کے مہر کا تصفیہ ہوئے بغیر شادی کا کوئی معاہدہ طے نہیں پاسکتا اور عورت جتنا چاہے اپنا مہر بندھا سکتی ہے۔ شوہر کے انتقال کے بعد جائداد پر تمام وارثوں اور قرض داروں کے مقابلہ میں عورت کے حق کو ترجیح دی گئی ہے۔ عورت کو خاص حالات میں طلاق لینے کا حق بھی حاصل ہے اور جہاں تک روحانی اور ذہنی ترقی کا تعلق ہے اس کی قابلیت مرد سے کم نہیں سمجھی گئی ہے۔ قرآن شریف کا ایک پورا سورہ اس کے نام سے موسوم ہے۔ سب سے پہلی سطر کا ماحصل یہ ہے " لوگو اس سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے عورت کو پیدا کیا اور اس نے دنیا میں سب عورتوں، مردوں کو پھیلایا۔ خدا سے ڈرو جس کے نام سے تم مدد مانگتے ہو اور اس عورت کا احترام کرو جس سے تم پیدا ہوئے ہو۔ یقیناً خدا تم کو دیکھ رہا ہے۔"

کیا اس سے ان غیر مسلم مصنفوں کا بڑا الزام جھوٹا نہیں ثابت ہوتا کہ اسلام نے عورت کو عزت نہیں دی! قرآن شریف یہ بھی نہیں کہتا جیسا کہ انجیل میں ہے کہ عورت مرد کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس کے برخلاف وہ صاف طور پر یہ بتلاتا ہے کہ ایک کی دوسرے کے برابر کی ذمہ داری ہے اگر مردوں کے عورتوں کے کچھ حقوق ہیں تو ویسے ہی حقوق عورتوں کے مردوں پر بھی ہیں۔

بیوی پن کا تصور۔ پیغمبر اسلام نے عورت کی عزت کو مذہبی تعلیم کا ایک جز قرار دیا ہے۔ آپ نے " جنت کو ماں کے قدموں کے نیچے " کہا ہے اور یہ ارشاد فرمایا ہے کہ عورت اپنے شوہر کے گھر کی ملکہ ہے۔ اسلام میں بیوی پن کے معنی محبت اور خلوص ہیں نہ کہ تابعداری اور غلامی۔ مسلمان عورت کو بدکرداریوں سے محفوظ رکھنے والی ہستی سمجھتے ہیں نہ کہ " بدی کا راستہ " خیال کرتے ہیں وہ شیطان کے حملوں کو روکنے کے لئے ایک مضبوط قلعہ ہے نہ کہ " شیطان کے داخل ہونے کا دروازہ "۔ وہ نیکی کا ایک منور گھر ہے جو مرد کو اخلاقی تباہی سے بچاتا ہے جب وہ خواہشات کی اٹھتی ہوئی موجوں میں غوطے لگا رہا ہو نہ کہ " شیطان کا آلہ " ہے جس کو وہ ہماری روح پر قبضہ پانے کے لئے استعمال کرتا ہے۔ ایک نیک عورت کی سچی محبت ہی وہ چیز ہے جو انسان کو حیوان سے فرشتہ بناتی ہے۔ اسلامی ممالک میں رہنے والی عورتوں کا درجہ ان بہنوں سے جو دوسرے ممالک میں رہتی ہیں بہت اونچا ہے اور اگر کہیں مسلمان عورت تعلیم اور روشن خیالی میں پیچھے ہے اور سماج میں اور گھر میں اپنی جگہ پر نہیں ہے تو وہ وہاں کی تہذیب کی کمی کی وجہ سے ہے نہ کہ اسلام کے کسی قانون یا اصول کی خرابی کی وجہ سے اگر اسلام کو اس کے پیروؤں کی موجودہ زندگی سے جانچا جائے تو یہ ظلم ہوگا۔

(ترجمہ)　　**اکرام**

نامپلی زنانہ ہائی اسکول

حیدرآباد کے معدنی وسائل

کسی ملک کی معدنی دولت اُس کا سب سے اہم قومی سرمایہ ہوتا ہے۔ اس اہمیت کے لئے حیدرآباد کی ریاست مدتوں سے شہرۂ آفاق ہے۔ سونا، ہیرا، لوہا اور تانبا چند اہم چیزیں ہیں جن سے پچھلی صدیوں میں کام لیا گیا ہے۔

ملک کے اہم معدنی چیزوں اور ان کے معاشی امکانات کا یہاں کچھ ذکر کیا جاتا ہے۔

سونا:۔ اس زمانے میں سونے کی کانوں کی کھدائی کا کام ۱۸۹۱ء سے شروع ہوا اور ۱۹۲۰ء تک جاری رہا۔ حال ہی میں سررشتہ متعلقہ کی طرف سے جو پیمایش ہوئی ہے اس نے ریاست کے پچھمی علاقوں میں اس کی تجدید کے بہت ہی ہمت افزا امکانات کا انکشاف کیا ہے اور سونے کی موجودہ چڑھی ہوئی قیمت سونے کے کانوں کی کھدوائی کی صنعت کو ایک نئی قوت بخشے گی۔ حال ہی میں آٹھ لاکھ روپے کی رقم پیمایش کے ابتدائی اخراجات کے لئے منظور ہوئی ہے۔

کوئلہ:۔ اس وقت کوئلہ سنگارینی، تندور، کوتھا گودام اور ساستی کے کانوں سے نکالا جا رہا ہے اور گوداوری کی وادی میں اس کے پائے جانے کے بڑے امکانات ہیں۔ کوئلہ اب صرف بھاپ کے بنانے میں صرف کیا جاتا ہے، لیکن گیسولین، کولتار اور ساتھ کے ضمنی مرکبات کی تیاری میں اس کے استعمال کے امکانات کو معلوم کرنے کے لئے مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔

ہیرا:۔ مشہور ہیرے کی کانیں دریائے کرشنا کی شمالی وادی میں واقع ہیں۔ دنیا کے چند سب سے زیادہ مشہور و معروف اور بیش بہا ہیرے انہی کانوں سے نکالے گئے تھے اور یہاں اسی قسم کے اور ہیرے پائے جانے کے امکانات باقی ہیں۔ کرشنا کی وادی میں ایسے پتھر اور کنکر پائے جاتے ہیں جن سے الماس نکالا جا سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ان کا بغور معاینہ کیا جائے اور جدید آلات اور مشینوں کو کام میں لا کر ان سے الماس نکالا جائے۔ وزنی ہیرے زیورات کے کام آ سکتے ہیں اور چھوٹے اور ادنیٰ قسم کے ہیرے صنعتی کاموں میں لائے جا سکتے ہیں۔ کرشنا کی جنوبی وادی میں یوروپین کمپنی کی جدید کامیاب مہم نے اس کے امکان کی تصدیق کر دی ہے۔

لوہا:۔ لوہے کی کچی دھات ریاست کے مختلف مقامات پر کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اس کے اقسام میں کافی فرق پایا جاتا ہے اور یہ قریب قریب ریاست کے تمام ارضی طبقات میں پائی جاتی ہے۔ ایک وقت تھا جب کہ دمشق اور اصفہان کی مشہور عالم تلواروں کے پھل حیدرآباد میں تیار کی ہوئی فولاد سے بنائے جاتے تھے۔ گو خارجی مقابلہ نے اس صنعت کو پس پشت ڈال دیا ہے پھر بھی اس صنعت میں جان ڈالی جا سکتی ہے اور یہ ممکن ہے کہ یہاں فولاد کی تیاری وسیع تجارتی پیمانے پر حکومت کی حمایت اور سرپرستی میں کی جائے۔

تانبا:۔ تانبے کی دھات کی علامتیں مختلف مقامات پر پائی گئی ہیں۔ اور تفصیلی معاینہ کی ضرورت ہے۔ رائچور کے

دو آبے میں تانبے کے نکالنے کے قدیم سامان موجود ہیں۔
اور حال ہی میں ضلع نلگنڈہ کے بعض مقامات پر تانبا نکالا
گیا ہے۔

مانگنیس :- اضلاع بیدر اور نظام آباد میں
متفرق مقامات پر پایا گیا ہے اور اس کے معاشی امکانات
کا اندازہ لگانے کے لئے تحقیق کی ضرورت ہے۔

ابرق :- قابل بازار تقطیع پر ابرق ورنگل میں
پائی گئی ہے۔ اور بہت سے مقامات پر چھوٹی تقطیع پر
ملتی ہے جو خشک چکنی اشیاء کے بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔

یاقوت :- پالونچا اور غریب پیٹھ (ضلع ورنگل)
کے قریب جمع کیا ہوا یاقوت سنہ ۱۹۲۹ء تک بڑی مقدار میں
باہر بھیجا گیا۔ انہی مقامات پر آئندہ استفادہ کے لئے حوصلہ
افزا نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ انہیں مقامات سے زیادہ
یاقوت کے پائے جانے کی خبریں وصول ہوئی ہیں۔

سرمہ :- سرمہ ضلع ورنگل میں یاقوت کے ساتھ
پایا جاتا ہے اور کانوں سے نکال کر باہر بھجوایا جا رہا ہے۔
سنا گیا ہے کہ کم مقدار میں ضلع کریم نگر میں بھی ملا ہے۔ چونکہ
مانگنیس اور سرمہ دونوں ریاست کے اندر ہی موجود ہیں
اس لئے بیاٹریوں وغیرہ کی صنعت کا فروغ توجہ کا مستحق ہے۔

گالینا (GALENA) ضلع نلگنڈہ میں موجود
ہے اور اس سے استفادہ کے لئے تحقیق کی ضرورت
ہے۔ اس مقام کے نمونے میں چاندی کی بڑی مقدار ہے۔
معلوم ہوا ہے کہ یہ ورنگل میں اور حیدرآباد کے قریب بھی
پایا جاتا ہے۔

چکنی مٹی :- بہت ہی عمدہ قسم کی چکنی مٹی جو
سفال گری کے کام آتی ہے موٹی تہوں میں چینترالا،
ضلع نلگنڈہ میں اور کام تھنا کے قریب بیدر میں پائی جاتی ہے۔
یہ مٹی باہر کے عمدہ کاولین سے بھی اعلیٰ قسم کی تصور کی جاتی ہے۔

قیمتی پتھروں کے ساتھ ساتھ پوٹاس جو سفال گری میں
کام آتا ہے اضلاع تلنگانہ اور کرناٹک میں مختلف مقامات پر
پایا جاتا ہے۔ ایک قسم کی مٹی (FIRE CLAY)
کثرت کے ساتھ کوئلوں کے پرتوں سے ملی ہوئی ملتی ہے۔
یہ خام دھات کی صفائی کے لئے بھٹی کی ترتیب میں استعمال
ہو سکتی ہے۔

ایک قسم کا نرم پتھر جو سلیٹ سے مشابہ ہوتا ہے گلبرگہ
میں گوگی کے قریب پایا جاتا ہے۔ یہ پنسل پالش وغیرہ کے
بنانے میں کام آتا ہے۔

شیشہ سازی میں جو اشیاء کام میں لائی جاتی ہیں انہیں سے
بہت سی چیزیں بکثرت ریاست کے متفرق مقامات پر
ملتی ہیں۔ سنگ مردہ اور ریت جو شیشہ سازی کے لئے
بہت ضروری ہیں بڑے وسیع پیمانے پر پائے جاتے ہیں۔

سوڈے کی سفوف جن پھولوں سے بنتی ہے وہ
عام طور پر ملک کے اکثر حصوں میں پائے گئے ہیں۔ اسی طرح
اکثر مقامات پر شیشہ سازی کی صنعت کے امکانات مستحکم ہیں۔

نمک :- حیدرآباد میں نمک سازی کی امتناع
کا کوئی قانون نہیں ہے اور اس حیثیت میں حیدرآباد
یکتا ہے۔ نمک سازی کی اس دیسی صنعت کا قدیم الایام سے
ریاست میں وجود ہے۔ خوردنی اور چمڑے کو رنگت دینے
والے نمک کے غیر محلول اجزا، کو پانی کے ذریعے سے کھاری مٹی
سے علیحدہ کرلیا جاتا ہے اور اس طرح نمک کی تیاری عمل میں
آتی ہے۔ یا سورج کے عمل تبخیر سے کھاری پانی کے
کنوؤں سے نمک نکالا جاتا ہے۔ مختلف اقسام کے نمک کی

تیاری کے لئے سائنس کے جو جدید اور ترقی یافتہ طریقے رائج ہو رہے ہیں ان پر حکومت غور کر رہی ہے اور امید کیجاسکتی ہے کہ مستقبل قریب ہی میں ریاست میں ان کو رائج کر دیا جائے گا۔

ایک قسم کی مٹی (جس میں لوہا ملا ہوا ہوتا ہے) جو رنگدار رنگ کی ہوتی ہے۔ ریاست کے مختلف مقامات پر ملتی ہے۔ یہ رنگوں کے بنانے میں کام آسکتی ہے۔

ادھ قیمتی پتھر

عقیق، سبز حجر الصلب (PLASMA)

لال پتھر اور سلیکا کی دوسری اقسام اضلاع مرہٹواڑی میں عام طور پر ملتی ہیں اور سنگ تراشی کے ہنرمند با اصول سے نظر فریب نگینوں اور جواہرات میں تراشی جاسکتی ہیں۔

پیریٹس (PYRITES) سونے کی چٹانوں میں گلبرگہ میں چونے کے پتھروں میں اور گرہ دار سنگ مثانہ کی شکل میں کوئلے کی پرتوں میں پایا جاتا ہے۔ کیمیائی صنعت کے لئے یہ ایک قیمتی خام شئے ہے اور خاص طور پر (SULPHURICACID) کے بنانے میں بہت کام آتا ہے۔

سوپ اسٹون (SOAP STONE)

ریاست میں بعض مقامات پر ملتے ہیں اور یہیں پر اس کے برتن وغیرہ بنا لئے جاتے ہیں۔

ریاست میں عمارتوں کے لئے اعلیٰ قسم کے پتھروں کی کمی نہیں ہے۔ یہ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ انگم پلی، رائچور اور خیرآباد کے گرانیٹ، ابردین کے مشہور گرانیٹ سے بھی عمدہ قسم کے ہوتے ہیں۔ تعمیر کی مختلف اشیاء لامحدود مقدار میں ریاست میں ملتی ہیں۔ یہ بڑی عمارتوں اور ان کی آرائش و زیبائش کے لئے بہت موزوں ہوتی ہیں۔

شاہ آباد کے سیلو کے پتھر فرش اور چھت کے لئے استعمال ہوتے ہیں اور بڑے پیمانے پر بکتے ہیں۔ چونے کے پتھر اور ساتھ کے شیلس (SHALES) سے سمنٹ کی ایک سرسبز صنعت وابستہ ہے جو ملک کی ایک بڑی صنعت ہے اور شاہ آباد کا سمنٹ کا کارخانہ ریاست کا واحد کارخانہ ہے۔ مختلف رنگ کے مرمر بلندو کے قریب ملتے ہیں اور ان میں سے بعض تو نہایت ہی عمدہ قسم کے ہوتے ہیں۔

حسن علی
(نظام کالج)

نیک کام کا انجام

حفیظ کو بچپن سے یہ تعلیم دی گئی تھی کہ نیکی کا پھل ضرور ملتا ہے۔ جب اس کی طالب علمی کا زمانہ ختم ہوا تو اس کے باپ نے جو ایک بڑا سوداگر تھا۔ چاہا کہ یہ بھی میری طرح سوداگری کرے۔ چنانچہ اس نے اس کو ایک بڑا جہاز جس میں لاکھوں روپے کا سامان تھا دیا تاکہ وہ دوسرے ممالک میں جا کر تجارت کرے۔

حفیظ نے بحری سفر شروع کیا۔ ایک دن اس کا جہاز ایک اور جہاز سے جا ملا۔ جس میں سے شور وغل اور رونے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے اس جہاز کے ملاحوں سے اس کی وجہ دریافت کی تو ملاحوں نے جواب دیا "اس میں بہت سے قیدی ہیں جن کو ہم نے کئی ایک ملکوں سے گرفتار کیا ہے اور اب ان کو غلام بنا کر بیچیں گے۔"

رحم دل حفیظ نے کہا "کیا آپ کا سردار ان غلاموں کو میرے ہاتھ فروخت کردے گا۔ انھوں نے سردار سے دریافت کیا جو بڑی خوشی سے رضامند ہوگیا۔ حفیظ نے اپنا بہت سا سامان اُن لوگوں کو دیا اور غلاموں کو خرید کر آزاد کردیا سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ لیکن اس میں ایک خوبصورت لڑکی اور ایک بوڑھی عورت بھی تھی جب ان سے جانے کے لئے کہا گیا تو اس بوڑھی عورت نے کہا "اے نیک دل نوجوان ہم بہت دور سے آرہے ہیں یہ لڑکی بادشاہ کی اکلوتی لڑکی ہے اور میں اس کی دایہ ہوں۔ میں نے بچپن سے اس کی پرورش کی ہے ایک دن ہم محل سے دور ایک دریا کے کنارے سیر کو گئے تھے۔ ان بدمعاشوں نے ہمیں دیکھ لیا۔ اور اس کے زیور وغیرہ کو دیکھ کر اسے گرفتار کرلیا۔ میں اس کی مدد کو گئی تو انھوں نے مجھے بھی پکڑ لیا۔ اور ایک جہاز پر ہم دونوں کو لے آئے پھر چند دن بعد وہ جہاز وہاں سے روانہ ہوگیا۔ اب جب کہ تم نے ہمیں اس مصیبت سے نکالا ہے تو ہم کو اپنے ہی ساتھ رکھو۔ غرض حفیظ نے اس لڑکی سے شادی کرلی اور اس کی دایہ کو ساتھ لے کر اپنے گھر واپس آیا۔

جب گھر پہونچا تو اس کے باپ نے جہاز اور مال کی بابت دریافت کیا۔ اس نے جو کچھ گزرا تھا سب سنا دیا۔ جس کو سن کر اس کا باپ بہت ناراض ہوا اور اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ غریب اپنی بیوی اور دایہ کو لے کر اسی گاؤں میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگا اور ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتا رہا کہ اس کا باپ اس کی خطا معاف کردے۔

چنانچہ کچھ عرصہ بعد باپ کو اس پر رحم آیا اور اس کو بی بی اور دایہ سمیت اپنے گھر میں بلا لیا۔

تھوڑے عرصہ بعد اس کے باپ نے ایک اور جہاز جو پہلے جہاز سے زیادہ قیمتی تھا تیار کرالیا اور اپنے لڑکے کو دوبارہ سفر پر روانہ کیا۔ حفیظ کو چونکہ اپنی بیوی اور دایہ سے بہت محبت تھی اس نے ان کو بھی ساتھ لے لیا اور جہاز کے ایک طرف بیوی کی اور دوسری طرف دایہ کی تصویر بنادی۔ کچھ دنوں تک سفر کرنے کے بعد یہ جہاز ایک شہر میں پہونچا شام کا وقت اس شہر کے بادشاہ کی جانب سے ایک شخص دریافت کے لئے آیا کہ وہ کون ہیں اور کس لئے یہاں آئے ہیں لیکن

جب اس شخص نے جہاز پر اپنی شہزادی اور اس کی دایہ کی تصویر دیکھی تو بہت حیران ہوا اور الٹے پاؤں جاکر بادشاہ کو اس کی خبر دی دوسرے دن بادشاہ اپنے وزیر کے ساتھ جہاز پر آیا اور تصویر دیکھ کر واپس چلا گیا۔ واپس جانے کے بعد اس نے جہاز کے کپتان کو بلوایا اور اس سے دریافت کیا کہ جہاز پر تصویریں کس کی ہیں۔ کپتان نے سوچا کہ کسی اور کو کیا ضرورت پڑی ہے جو دریافت کرے یہ بادشاہ ضرور میری بیوی کا باپ ہے۔ چنانچہ اس نے سارا قصہ سنایا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور کہا یہ لڑکی میری اکلوتی لڑکی ہے تم چونکہ اس کے شوہر ہو لہذا میرے تخت و تاج کے وارث ہو۔ اب جاؤ اپنے ماں باپ اور سب خاندان کو لے آؤ۔ تمہارا باپ میرا بھائی اور تمہاری ماں میری بہن ہوگی۔

غرض حفیظ اپنے ماں باپ کے ساتھ وہاں آگیا اس کے یہاں آنے کے چند سال بعد بادشاہ کا انتقال ہوگیا۔ اور اس کی جگہ حفیظ بادشاہ بنا اور ایک مدت دراز تک نہایت اطمینان کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔

م ص د آصفیہ ہائی اسکول،

الطاف کا کھیل

جاؤں گی صبح مدرسہ امی — چھٹی ہوتے ہی آؤں گی امی
سب سبق میں تمہیں سناؤں گی — صاف لکھ کر تمہیں بتاؤں گی
ہو کھڑے باادب کروں گی سلام — آپ ہی سے میں لوں گی پھر انعام
اپنی سب ساتھیوں کو میں لے کر — عصر کی ہاں نماز میں پڑھ کر
شام تک ان کے ساتھ کھیلوں گی — بعد گھر کو میں اپنے آؤں گی
کر کے مغرب کی میں نماز ادا — ہاتھ اٹھا کر کروں گی پھر یہ دعا
"اے زمیں آسمان کے مالک — ساری دنیا جہان کے مالک"
میرے ماں باپ اور چچا ابا — خوش رہیں یہ سدا خداوندا
خالہ اور خالو میری پھوپی جاں — خوش رہیں ماموں زاد ماموں میاں
خوش رہیں یا الہی نانی ماں — چچی جاں اور میری آپا جاں

دلِ معصوم کی خداوندا
تیری درگہ میں ہو قبول دعا

محمد حسین شریف درد
متعلم جماعت ششم (سٹی کالج)

جسمانی صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ورزش ایسی ہی ضروری ہے جیسے چراغ کے لئے تیل، کبھی تم نے چراغ کو بغیر تیل کے جلتا ہوا نہیں دیکھا ہوگا اسی طرح اگر انسان اپنی پوری تندرستی میں رہنا چاہے تو اس کو لازم ہے کہ ورزش کی عادت ڈالے خصوصاً طالب علموں کو ورزش کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ ان کا بہت سا وقت ذہنی اور دماغی کام میں صرف ہوتا ہے اور انھیں جسمانی حرکت کا موقع نہیں ملتا۔ اس لئے انھیں یہ لازم ہوا کہ ورزش کریں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ مزدور لوگ کسان اور دیہاتی کوئی خاص قسم کی ورزش نہیں کرتے لیکن دن بھر وہ محنت ومشقت اور اپنے دست وپا سے کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے وہی ایک اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے اور یہی لوگ مال داروں سے زیادہ چست وچالاک اور طاقتور ہوتے ہیں۔

موجودہ دور میں جب کہ نئی تہذیب ہر ملک کے نوجوانوں کو کمزور کر رہی ہے اور کر چکی ہے تو ضرورت اس امر کی ہے کہ ملک کے نوجوانوں کی جسمانی حالت ایسی نہ ہو جو بہ زبان حال اترے ہوئے چہروں ہڈیوں کے ڈھانچوں، سوکھے سڑے جسموں سے اپنی کمزوری، بزدلی، ناکامی، شکست، دماغی کمزوری کا اعتراف کر رہی ہو۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جسمانی حالت ہی ملک وقوم کی عزت اور برتری کی دلیل ہے اگر تمہاری جسمانی حالت کمزور ہے تو دنیا میں کمزور سے کمزور دشمن بھی تمہارے سامنے اکڑے گا اس لئے سب سے بڑی چیز کی اس وقت جو ضرورت داعی ہے وہ ورزش جسمانی ہے جو ہمارے قویٰ کو اور جسمانی حالت کو درست کر سکتی ہے۔

اکثر اوقات طالب علم بیمار ہو جایا کرتے ہیں اور وہ بیماری میں لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں تو وہ آرام کرنے کی ہدایت کرتا ہے اور پڑھنے لکھنے سے بھی منع کرتا ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ اکثر طالب علم اپنا وقت کھیل کود اور ورزش جسمانی میں صرف کرنے کی بجائے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ اتنے وقت میں کچھ پڑھ لیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دماغی قوت کمزور ہو جاتی ہے، اور پہلے پہل سر کا درد شروع ہو جاتا ہے پھر بخار اور اسی طرح کی اور کئی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں اس لئے ایک دو گھنٹے عموماً طالب علموں کو کتاب کی دنیا سے علیحدہ ہونا چاہیے اور یہ وقت ورزش میں اور کھیلوں میں صرف کرنا چاہیے جو لڑکے ورزش کے عادی ہوتے ہیں وہ نہ صرف صحت مند اور تندرست رہتے ہیں بلکہ ان کی دماغی حالت بھی اچھی رہتی ہے ورزش کرنے والے لڑکے عموماً سستی اور کاہلی سے دور رہتے ہیں ان کے چہرے ہمیشہ خوشی کو ظاہر کرتے ہیں ان کی امنگیں، ہمتیں، استقلال اور حوصلے بڑھتے ہیں جو ان کے ہشاش بشاش چہروں سے عیاں ہیں۔

دماغی محنت کرنے والے بغیر ورزش کے اپنی دماغی محنت سے کامیاب نہیں ہو سکتے اور جو لڑکے محنت سے

پڑھنے لکھنے کے بعد کھیلتے نہیں وہ کبھی تندرست نہیں رہ سکتے اگر وہ کھیلوں کو پسند نہ کرتے ہوں تو بہتر یہی ہے کہ وہ صبح و شام بطور تفریح کچھ دور پیدل نکل جائیں کیونکہ یہ بھی بہت اچھی ورزش ہے کھیلوں میں عمدہ کھیل فٹ بال ٹینس، کرکٹ اور والی بال وغیرہ ہیں جو لڑکے ان تمام چیزوں میں بھی حصہ نہیں لیتے وہ مسلسل محنت کی وجہ سے سِل ودق کی بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ بڑھئی اس آلے کو جس سے کہ وہ لکڑی کاٹتا ہے۔ ہر دو تین گھنٹے کے بعد تیز کر لیا کرتا ہے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرے تو بہت جلد اس کا وہ آلہ جس سے لکڑی کاٹ رہا تھا خراب ہو جائے گا اور اس سے لکڑی کاٹی نہیں جائے گی۔ یہی حال دماغ کا بھی ہے تمہیں معلوم ہے کہ اسکولوں میں بھی تین یا چار گھنٹے بعد وقفہ رہتا ہے تاکہ لڑکے دماغ کو کامل سکون اور آرام دیں۔ اگر وہ طلبا اپنے دماغوں کو سکون نہ دیں گے تو ان کا دماغ ناکارہ ہو جائے گا اس لئے دماغ کو ہمیشہ کام میں مت لگائے رہنے دو بلکہ اس کو تیز کرنے کے لئے ورزش کرو تاکہ بیمار نہ ہو سکو۔

عبدالمجید خاں یوسف زئی

تلنکرات کا دن

آؤ آؤ پتنگ اڑائیں
کھیلیں کودیں خوشی منائیں

بھائی میاں بھی پتنگ لائے
لال اور پیلے اودے کالے

دیکھو کیسا پتنگ ہے میرا
کیسا ہے یہ چاند اور تارا

دیکھو ہو کر بلند کتنا
میرا پیارا پتنگ ہے اڑتا

شمیم بھاگو جلدی بھاگو
میرے پتنگ کو لوٹ کے لاؤ

کیسی اچھی بچی ہو تم
میرے پتنگ کو لائی ہو تم

یہ لو کٹا وہ آیا گرا وہ
یہی صدا ہے پکڑو پکڑو

میر محمود علی اکبر مشیر

گیہوں

گیہوں سب اناجوں میں مفید و مقوی ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں بہت بویا جاتا ہے۔ اور اتنا پیدا ہوتا ہے کہ اور ملکوں کے بیوپاری یہاں سے مول لے جاتے ہیں۔ ریل گاڑیاں بھر بھر کر بھیجتے ہیں۔ اس سے زمینداروں کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔

گیہوں کا پودا گھاس کی قسم کا ہوتا ہے۔ کوئی گز سوا گز اونچا ہوتا ہے۔ لمبے لمبے پتے، ہلکا رنگ جب ہوا چلتی ہے تو ہرے بھرے کھیت لہراتے ہوئے دیکھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ جب بالیں یعنی جس میں گیہوں ہوتے ہیں پک کر زرد ہو جاتی ہیں تو ان کے اندر سے سخت دانے بیچ میں سے چیرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے اوپر چھلکا ہوتا ہے اور سرے پر تس یعنی گیہوں کے آخر میں جو سخت حصہ ہوتا ہے۔ بعض قسم کے دانوں پر تس نہیں ہوتا۔ گیہوں ہر قسم کی زمین میں اُگ سکتا ہے۔ بونے سے پہلے زمین میں کئی بار ہل چلاتے ہیں تاکہ نرم ہو جائے برسات سے پہلے بیج بو دیتے ہیں۔ اگر بیج اچھا ہوتا ہے تو پیداوار بھی اچھی ہوتی ہے۔ چھ مہینے میں پودے پک جاتے ہیں۔ گرمی کے موسم میں کھیت کاٹ لیتے ہیں۔ گیہوں نکال کر الگ رکھ لیتے ہیں اور بھوسا الگ کر دیتے ہیں۔ گیہوں کا پودا بڑے کام آتا ہے ہرے ہرے پودوں کو گائے بھینس خوشی سے کھاتی ہیں گیہوں کے پودے کے مختلف حصوں سے ٹوکریاں، ٹوپیاں وغیرہ بنتی ہیں۔ بھوسا گائے اور بیل کھاتے ہیں۔ گیہوں پیس کر آٹا، میدا اور روا بھی بناتے ہیں۔ آٹے کی روٹیاں، پوریاں، کچوریاں، پراٹھے، میدے کا حلوا، سویاں اور بہت سی مٹھائیاں بنتی ہیں۔

صالحہ سید علی جعفری
(محبوبیہ گرل اسکول)

زندگی کو اچھا بناؤ

ہمیں اپنی زندگی کو اچھا بنانا چاہیے۔ بچپن ہی سے ہر انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی فضول نہ گنوائے شروع ہی سے وقت کی پابندی، نیک صحبت، اچھے گن، عمدہ اخلاق اور نیکی و بھلائی کی راہیں اختیار کرے۔ کیونکہ یہی چیزیں ہیں جو زندگی کا صحیح مصرف سکھاتی ہیں اور انہیں چیزوں سے زندگی بنتی اور سنورتی ہے۔

تم اپنی کورس کی کتابوں کے علاوہ اور دوسری کتابوں میں خواہ اردو ہو یا انگریزی تم پڑھتے ہوں گے کہ اس میں بھی ایک نیک زندگی بسر کرنے کے صحیح اور سچے اصول بتائے گئے ہیں۔ یہ یاد رکھو ہر قوم ہر مذہب میں نیکی و بھلائی پسند کی جاتی ہے۔ قدیم کتابوں اور خود موجودہ اچھی کتابوں میں تم دیکھو گے جس میں تمہیں ایک اچھی اور عزت کی زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہے۔ انہیں بے بہا اور گراں مایہ ہدایات اور نصائح سے تم اپنی زندگی کو علمی اور ادبی بنا سکو گے۔

قدیم مذاہب کے رہنماؤں اور پیغمبروں کی مشہور کتابوں اور سوانح عمریوں میں پڑھو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ خود ان میں شروع ہی سے ایک نیک زندگی بسر کرنے کے کیسے اچھے اچھے گن موجود تھے۔ ان میں وہ سب باتیں موجود تھیں جو ایک عمدہ زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس وقت بھی تم اپنے ملک کے رہنماؤں، مشہور لیڈروں اور نیک لوگوں کی تقلید کرو۔ ان سے کچھ سیکھنے کی کوشش کرو۔ یہ کافی ہے کہ تم جوہر اعتبار سے سب میں ممتاز سمجھے جائیں۔ اپنے میں موثر مادے، نیک احساسات اور اچھے خیالات پیدا کرو جو تمھیں زندگی میں کامیاب بناسکیں۔ صرف عمدہ کھانے اچھا پہننے یا خوش حال رہنے سے زندگی کامیاب و عزت مند نہیں سمجھی جاتی۔ بلکہ اس کے علاوہ تم پر اور بھی حقوق ہیں وہ یہ کہ علم، اخلاق، عقائد وغیرہ کے اعتبار سے تم سب میں عمدہ ثابت ہوسکو۔ انسان کو اپنی معیاری حالتوں سے بڑھ کر اپنے عملی اور علمی معیار کو بڑھانے کی ممکن الحصول جدوجہد و کوشش کرنی چاہیے۔ موجودہ دنیا صرف عمل کی ہے۔ دنیا میں صرف فارغ البال زندگی کچھ زیادہ عزت کی نگاہوں سے نہیں دیکھی جاتی جتنی ایک نیک اور موثر عملی زندگی کی قدر کی جاتی ہے۔ انسان کے ظاہری حالات سے بڑھ کر اس کو اپنے باطنی کردار پر نظر رکھنی چاہیے نیک عمل، اچھے اخلاق و عادات اور نیکی و بھلائی عمدہ کردار وغیرہ کو مذہب کی پابندی تصور کریں۔ ہر انسان کے بچپن کا زمانہ سیکھنے کا ہے۔ تم شروع ہی سے اپنی زندگی کا ایک خاص نصب العین قرار دو اور پھر اس کے تحت راہیں اختیار کرو۔ اچھے اور ہوشیار ادیبوں کے ساتھ ملنا، عمدہ کتابیں مطالعہ کرنا اشد ضروری ہے۔ ہر وقت اپنے آپ کو مصروف رکھنا اور دنیا کے روشن پہلو کی طرف دیکھنے کی کوشش کرنا ہم کو خوش اور زندہ دل بنا دے گا۔

دنیا میں بہت سے برے کام ہیں۔ ان سے بچنا چاہیے ؎

ہنسو اور دنیا بھی تم سے ہنسے گی
جو روؤ تو تم ہی کو رونا پڑے گا

لیکن تم ہنس کر ہی نہ گزار دو۔ زندگی ایک سنجیدہ کام کے لئے ہے۔ اکثر دو قسم کے لوگ اس دنیا میں نظر آتے ہیں وہ جو کبھی نہیں ہنستے اور وہ جو ہمیشہ ہنستے ہیں۔ ہمیں تیسری قسم کے لوگوں ہی سے ہونا چاہیئے۔ جو جانتے ہیں کب ہنسنا چاہیے اور کب سنجیدہ ہونا چاہیے۔ ہم اپنی زندگی کو بہتر نہیں بنا سکتے جب تک ہمارے سامنے کوئی مدعا نہ ہو۔ تم جانتے ہو کیا سیکھنا چاہیے، کیا کام کرنا چاہیے، کس بات کو نہ کرنا چاہیے ہر وقت سیکھنے ترقی کرنے اور تجربہ حاصل کرنے کا موقع تلاش کرنا چاہیے۔ کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں دینا چاہیے۔ تمھیں معلوم ہے کہ بابر اور شیر شاہ سوری نے موقع تاڑ کر تمام ہندوستان فتح کرلیا۔ اکبر نے بھی کبھی موقع ضایع نہ کیا۔ اورنگ زیب اور ٹیپو سلطان نے بھی حق کے لئے لڑائیوں میں بہادری اور سختی کا ثبوت دیا۔ تمھارے وقت اور موقعوں کو بنانے کے لئے جو کچھ کیا گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی زندگی کو اچھا بناؤ جیسا کہ ایک مصنف کہتا ہے۔ زندگی بنانا سیکھو۔ کوئی خوشی کا دن نہ گنواؤ۔ وقت تمھارے لئے گزرے ہوئے موقعوں کو واپس نہیں لائے گا۔

محمود علی

گائے اور شیر

ایک گائے جنگل میں چر رہی تھی۔ ایک شیر نے اسے دیکھ لیا اور کھانے کا ارادہ کیا۔ گائے نے کہا اے جنگل کے راجہ مجھے اپنے پیارے بچے سے مل لینے دے تب میری جان لینا۔ وہ میری راہ دیکھتا کھڑا ہوگا شیر نے کہا میں تجھے ہرگز نہیں چھوڑوں گا تو دھوکا دے کر بھاگ جانا چاہتی ہے۔" میں سچ کہتی ہوں۔ ضرور واپس آؤں گی۔" شیر بولا " تو بچے کو تکلیف دینے کیوں جاتی ہے؟" وہ یہ سن کر روئے گا۔" گائے نے کہا لیکن وہ میری راہ دیکھتا کھڑا ہوگا۔ میں نہ جاؤں گی تو وہ انتظار ہی میں مرجائے گا۔ مجھے ایک بار اس سے مل جانے دو۔ شیر کو رحم آگیا اس نے کہا اچھا جا لیکن بچے کو دودھ پلا کر جلدی آنا گائے گھر آئی بچے کو دودھ پلا کر رونے لگی۔ بچے نے پوچھا اماں آج تم کیوں روتی ہو۔ گائے نے کہا بیٹا آج میں ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی ہوں۔ اب تم کو میرا دودھ کبھی نہ ملے گا تم ہری گھاس کھا کر اپنی زندگی بسر کرنا۔ بچے نے کہا تم اب جنگل میں نہ جاؤ شیر اب تمہارا کیا کرسکتا ہے۔ بیٹا میں اس سے وعدہ کرچکی ہوں مجھے ضرور جانا چاہیے۔ تم خدا پر بھروسہ کرو اور زندگی بسر کرو۔

گائے جنگل میں گئی۔ شیر اسے آتا دیکھ بڑا خوش ہوا۔ گائے سے پوچھا کیا تو اپنے بچے کو دودھ پلا آئی گائے نے کہا اے جنگل کے راجہ میں اسے خدا کے بھروسے پر چھوڑ آئی ہوں۔ شیر نے کہا تو اب گھر جا میں نے اب تجھے رہا کردیا کیونکہ تو بات کی سچی نکلی۔ میں تیرے اس سچے کام کے بدلے میں تیری جان بخشتا ہوں۔ آج سے جہاں تیرا جی چاہے چرا کر۔ کوئی جانور تجھے کچھ نہ کہے گا۔ گائے خوشی خوشی گھر آئی۔

بچو! جو بات منہ سے نکالو اسے ضرور پوری کرو اس کا نتیجہ اچھا ہی ہوگا۔

نارائن لعل (تھرڈ فارم اے)
رستی کالج

اردو دانی کی پہلی کتاب

اس کو مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے نائب صدر مجلس اردو امتحانات کی نگرانی میں مولوی ظہیر الدین صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس میں ایک سو نو (۱۰۹) تصویریں ہیں۔ متوسط تقطیع کے ۶۰ صفحوں میں یہ کتاب جدید ترین اصول کے مطابق تیار کر کے چھاپی گئی ہے اور تصویروں اور ضخامت کے باوجود ادارہ نے محض اردو کی خدمت کی خاطر اس کی قیمت بہت کم یعنی صرف دو آنے چھ پائی رکھی ہے۔ جو لوگ اردو کی توسیع واشاعت اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں وہ یقیناً اس کتاب کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور اپنے بچوں عزیزوں اور ملازمین کو اردو سکھانے کے لئے اس سے بہتر کتاب انھیں مل نہ سکے گی۔

گداگری

یوں تو دنیا میں گداگروں اور فقیروں کی کمی نہیں۔ گر ہندوستان میں ان کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ جس کا نتیجہ ملک میں عالمگیر افلاس و تنگدستی کا دور دورہ ہے۔

اصل معنوں میں مستحق فقیر تو چند ہی ہوں گے۔ لیکن ہٹے کٹے (غیر مستحق) سُست، کاہل، جاہل اور کام چور، بلکہ اصل معنی میں چور بہت نکل آئیں گے۔ جن میں اکثر و بیشتر کسی نہ کسی نشہ پانی کے ضرور عادی ہیں۔ اور اسی طلب کے مارے بہ تنگ خلقت، در بدر بھیک مانگتے، ٹکڑے توڑتے پھرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ ورنہ فقیری کوئی پیشہ نہیں۔

سُست و کاہل، اپاہج و کام چور، بے عزت و ننگ خاندان ہی اس در بدر بھیک کو قبول کر سکتے ہیں۔ ورنہ کسی مذہب نے بھی فقیری کی تعلیم نہیں دی۔ بلکہ محنت و مزدوری، ملازمت، تجارت، زراعت، صنعت و حرفت ان تمام سے دولت حاصل کرنے کی تعلیم دی ہے۔

ہندوستانیوں کے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی (۴۲) کروڑ آبادی میں سے صرف معدودے چند ہی جائز پیشوں میں لگے ہوئے ہیں۔ اور آبادی کا نوّے فیصدی حصہ تو بس مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے، کے مصداق دوسروں کے کندھوں پر اپنا ناجائز دباؤ ڈال کر خود کو سُست و کاہل، بیکار اور نکما سمجھا ہوا ہے اور محنت مزدوری کو باعث شرم سمجھتا ہے۔ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ آجا کے اک نگوڑی ملازمت ہی رہ جاتی ہے۔

عزیز بچو! یاد رکھو ہرگز اس قسم کی پست ذہنیت اور تنگ نظری اختیار نہ کرنی چاہیے اور نہ خود کو مجبور و محتاج خیال کر کے آمدنی کے ناجائز ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔

سنو، دنیا کے تمام مذاہب نے اس خصوص میں کس قسم کی تعلیم دی ہے۔

محنت کرو، خود کو محنت کا عادی بناؤ، علم و ہنر سیکھو۔ تجارت کرو خوب دولت کماؤ اور عیش کی زندگی بسر کرو۔ مگر یاد رکھو غلام نہ بنو۔ کیونکہ غلامی کی زندگی بسر کرنے سے تو موت زیادہ بہتر ہے۔

زندگی باعثِ ذلت ہو تو مرنا بہتر — موت منظور، غلامی ہمیں منظور نہیں

غیر کیوں چھین لیں عہدہ نہ جہانداری کا — تم کو جب پاس نہ ہو جذبۂ خودداری کا

ایک مدت سے ہیں سوئے ہوئے اپنے وطن

نام لیتے نہیں کمبخت یہ بیداری کا!!

احقر صدیقی (عالمہ)

Reg. No. M 3950.

ادارۂ ادبیات اردو

کی

چند علمی، ادبی اور دلچسپ کتابیں

۱۔ شعرائے عثمانیہ | جامعہ عثمانیہ کے چھبیس شاعروں کے کلام کا پاکیزہ انتخاب۔ مختلف نظموں اور غزلوں کا گلدستہ رنگ و بو۔ ہر شاعر کے کلام پر ایک مختصر مگر جامع تنقید۔ مرتبہ سید معین الدین صاحب قریشی ایم۔ اے و عبدالقیوم خان صاحب باقی ایم۔ اے طباعت و کتابت نفیس وائل سائز صفحات (۲۳۱) قیمت مجلد با تصویر دو روپیہ ۱۲ آنے

۲۔ مغربی تصانیف کے اردو تراجم | مغربی زبانوں کی تصنیفات و تالیفات کو اردو زبان میں منتقل کرنے کی تمام انفرادی اور اجتماعی کوششوں کا تذکرہ۔ صاحبان فکر کی نظروں میں اس کتاب کی افادیت دوسری تحقیقی کتابوں سے کم نہیں۔ مرتبہ میر حسن صاحب ایم۔ اے طباعت و کتابت نفیس کراؤن سائز صفحات (۱۰۲) قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے۔

۳۔ محبت کی چھاوں | مرزا ظفرالحسن صاحب بی۔ اے کے ۱۴ افسانوں کا دلچسپ مجموعہ۔ ہر فسانے میں تخیل کی جولانیاں اور مشاہدے کے تاثرات کارفرما ہیں۔ نوجوانوں کے نصب العینی معاشرہ کی سچی تصویر اور مصروف زندگیوں کے لمحات فرصت کیلئے ایک شایستہ ذہنی تفریح صفحات (۱۳۲) قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے۔

۴۔ سوتیلی ماں | اس کتاب میں اصلاح معاشرت کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سوتیلی ماں اور سوتیلے بچوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے مفید طریقے بیان کئے گئے ہیں مصنفہ رابعہ بیگم صاحبہ طباعت و کتابت نفیس صفحات (۴۸) قیمت مجلد صرف چار آنے۔

۵۔ روح غالب | اردو اور فارسی کے مشہور شاعر و ادیب مرزا اسداللہ خان غالب کی حیات اور کارناموں کا ایک مجمل سرگزشت اور ان کے اردو خطوط کے دلچسپ ادبی حصوں کا انتخاب مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ صفحات (۲۴۰) با تصویر قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

۶۔ تاریخ گولکنڈہ | وہ کتاب جو کئی سال کی تحقیق اور محنت و معلومات کا نتیجہ ہے۔ حیدرآباد کے مشہور مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے استاد تاریخ مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی یم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی نے اس کتاب میں سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند تاریخ قلمبند کردی ہے۔ تصویریں بھی مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ صفحات (۳۴۰) قیمت مجلد تین روپیہ آٹھ آنے۔

۷۔ گریہ و تبسم | صاحبزادہ میکش کے کلام کا دلچسپ مجموعہ۔ شاعری کا ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ رنگ و بو کا ایک خوش منظر گلدستہ ہے۔ صفحات (۱۹۲) قیمت مجلد دو روپے

۸۔ سر سالار جنگ اعظم | حیدرآباد کے محسن اعظم کے حالات زندگی اور کارنامے دلچسپ اور سادہ پیرائے میں قلمبند کئے گئے ہیں۔ مرتبہ مولوی فیض محمد صاحب بی۔ اے۔ ڈپ ایڈ صفحات (۴۸) قیمت مجلد صرف چھ آنے۔

سب رس

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

نشان ڈاک آصفیہ ۱۵۳
نشان ڈاک برطانیہ ۳۹۵۰ ۸۹
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۸)
اگست سنہ ۱۹۴۰ء

سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور
مجلس ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش
سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہد
عبد الحفیظ صدیقی بی ایس سی
معین الدین احمد انصاری

جلد (۳) بابت اگست سنہ ۱۹۴۰ء شمارہ (۸)

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا

عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی
سب رس معلومات کے مدیر

معین الدین انصاری
بچوں کے سب رس کے مدیر

اداریہ

اس مہینے یعنی اگسٹ کی ۱۶، ۱۷ اور ۱۸ تاریخوں کو ادارہ ادبیات اردو کے اردو امتحانات (اردو دانی، اردو عالم، اردو فاضل، خوش نویسی) پانچ مختلف مرکزوں حیدرآباد، گلبرگہ، پربھنی، کلیانی اور کشتگی میں لئے جارہے ہیں۔

پہلا یعنی اردو دانی کا امتحان اُن لوگوں کے لئے قائم کیا گیا ہے جو مدرسوں میں تعلیم نہیں پاسکتے اور جو اپنی عمر کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ بچوں کی الف، بے۔ کی کتابیں ان کے لئے ناموزوں ہیں۔ ایسے لوگوں کو پڑھا لکھا بنانے کے لئے ادارہ نے اردو دانی کی پہلی اور دوسری (دو الگ کتابیں) ملک کے مشہور ماہر تعلیم مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے کی نگرانی میں مولوی اظہر الدین صاحب مدرس عثمانیہ ٹرینگ کالج بلدہ سے لکھوا کر شائع کی ہیں۔ یہ کتابیں ممالک محروسہ سرکار عالی کے علاوہ برطانوی ہند میں بھی بہت مقبول ہوئیں۔ چنانچہ مسٹر جے ایس ولیمس صاحب بی اے۔ سی ٹی صدر شعبۂ اردو کرائسٹ چرچ ہائی اسکول بمبئی نے لکھا ہے۔

"دیکھ کر از حد خوشی ہوئی کہ کتاب مذکور نہایت محنت سے لکھی گئی ہے اور موجودہ تعلیمی اصولوں کے مطابق ہے۔ مبتدیوں کو لکھنے پڑھنے میں بھی سہولت ہوگی۔ اور میرا ارادہ ہے کہ اس کو اپنے اسکول کے نصاب میں داخل کروں۔ اور صوبۂ بمبئی کے دیگر یوروپین اسکولوں میں بھی اس کے پڑھائے جانے کی تحریک کروں"

اردو دانی کے امتحان میں (۱۶۵) امیدوار شریک ہوئے ہیں۔ جن میں متعدد عورتیں بھی شامل ہیں۔ بلدہ میں عورتوں کی تعلیم کے لئے ادارہ کے شعبۂ نسواں کی سرپرستی میں ایک مدرسہ تعلیم بالغات قائم ہے۔ جس کی نگرانی محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبۂ نسواں کے ذمہ ہے۔ اس امتحان میں ہندو امیدوار بھی کثرت سے شریک ہوئے ہیں۔ اس کا تحریری امتحان۔ بروز شنبہ ۱۷ اگست ۱۹۴۳ء کو دس بجے سے ساڑھے بارہ بجے تک لیا جائے گا اور زبانی امتحان دو سے ساڑھے چار تک۔

اردو عالم کے امتحان میں بھی ہندو اور مسلمان اور مرد اور عورتیں سب شریک ہیں۔ اس کے امیدواروں کی تعداد (۴۰) ہے۔ یہ امتحان جمعہ ۱۶ اگسٹ کو تین بجے سہ پہر سے شروع ہوگا۔ شنبہ اور یکشنبہ کو روزانہ دو پرچے ہوں گے۔ اردو فاضل کے امتحان میں بھی اسی طرح ہندو مسلمان اور مرد اور عورتیں شریک ہیں۔ یہ ۱۶ اگست جمعہ کو صبح نو بجے سے شروع ہوکر ۱۸ اگست کو ختم ہوگا۔

خوش نویسی کا امتحان جمعہ کو تین سے ساڑھے پانچ تک لیا جائے گا اس کے امیدواروں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس قسم کا امتحان پہلی دفعہ لیا جارہا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ خطاطی اور کتابت کے امتحان میں کوئی امیدوار شریک نہیں ہوا۔

ان امتحانات کے سلسلے میں کشتگی کے مرکز سے اول آنے والے امیدواروں کے لئے دو علم دوست اصحاب مولوی احمد عبداللہ صاحب انسپکٹر آبکاری لنگسگور اور مولوی محمد حسین صاحب سب انسپکٹر ہمنا گنجے بعبر کسی فرمایش کے تمغے دینے کا پیش کش کیا ہے۔ جس کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ اردو پڑھنے لکھنے کا شوق بڑھانے کے لئے اس قسم کی ہمت افزائیاں بہت کامیاب ثابت ہوں گی۔

درخواست شرکت اور فیس داخل کرنے کی تاریخ گزر جانے کے بعد کئی اصحاب کی درخواستیں وصول ہوئیں جن کو افسوس ہے کہ قبول نہیں کیا جاسکا۔ ایسے امیدواروں کو آئندہ امتحان میں بروقت شرکت کی کوشش کرنی چاہئے۔ ۲۰ اگست کے بعد سے درخواست شرکت کے مطبوعہ فارموں کی پھر سے اجرائی شروع کی جائے گی اور فیس اور درخواست داخل کرنے کی تاریخ کا متعاقب اعلان کیا جائے گا۔ ان امتحانات کی مجلس انتظامی حسب ذیل اصحاب

مشتمل ہے۔

صدر ۔ مولوی سید علی اکبر صاحب ام اے (کنٹب) نائب ناظم تعلیمات ممالک محروسہ

نائب صدر ۔ مولوی سجاد مرزا صاحب ام اے (کنٹب) پرنسپل ٹریننگ کالج حیدرآباد

معتمد ۔ مولوی عبدالقادر صاحب سروری ام اے ال ال بی۔ اردو لکچرار جامعہ عثمانیہ

اراکین

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام اے پی ایچ ڈی (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

مولوی غلام ربانی صاحب بی اے بی ٹی۔ پرنسپل چادر گھاٹ ہائی اسکول حیدرآباد

مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ام اے ایچ سی ایس۔ محاسب محکمہ ریلوے حیدرآباد۔

مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ام اے ال ال بی لکچرار تاریخ جامعہ عثمانیہ۔

مولوی سید محمد صاحب ام اے۔ اردو لکچرار سٹی کالج حیدرآباد دکن۔

مس جیسی سندی۔ بی اے (آنرز) لندن صدر مہتمم تعلیمات حیدرآباد دکن

مولوی میر اکبر علی خاں صاحب بی اے۔ ال ال بی (آنرز) بیرسٹرایٹ لا

مولوی ملا فخر الحسن صاحب بی اے بی ٹی اردو لکچرار کلیہ تعلیم المعلمین حیدرآباد

پنڈت نرسنگ راؤ صاحب ایڈیٹر رعیت۔

ان امتحانات کی سندیں ادارۂ ادبیات اردو کے صدر نواب مہدی یار جنگ بہادر کے دستخط سے اجرا کی جائیں گی اس وقت تک جملہ امیدواروں کے ہال ٹکٹ ان کے پتوں پر ارسال کر دئیے گئے ہیں۔ جن کو اب تک نہ پہنچے ہوں وہ دس اگست تک دفتر کو اطلاع دیں۔

ادارہ کے شعبے ادارۂ ادبیات اردو کا کام جن دس بارہ شعبوں پر مشتمل ہے وہ برابر سرگرم کار ہیں سب رس میں جگہ کی قلت کی وجہ سے ان کی تفصیلی روداد یں شایع نہ ہو سکیں۔

شعبۂ نسواں کا ایک جلسہ ۵ جولائی کو منعقد ہوا جس میں معتمد شعبہ سکینہ بیگم صاحبہ کے علاوہ رابعہ بیگم صاحبہ، سارہ بیگم صاحبہ، بشیر النساء بیگم صاحبہ، جہاں بانو بیگم صاحبہ اور لطیف النساء بیگم صاحبہ نے شرکت کی۔ مدرسہ بالغات جو ماہ تیر میں بند کر دیا گیا تھا اس کے دوبارہ کھلنے کی اطلاع دی گئی اور نئی میقات سے اردو دانی کے دوسرے حصے کی تعلیم کا آغاز کرنے کا تصفیہ ہوا۔ لیڈی حیدری مرحومہ کے انتقال پر اظہار ملال و تاسف کیا گیا اور انجمنان حیدرآباد کی طرف سے جو جلسہ منعقد ہو رہا تھا اس میں شعبہ کی طرف سے بھی قرارداد تعزیت روانہ کی گئی۔ اوائل اگست میں بیگم مہدی یار جنگ بہادر کی صدارت میں مدرسہ بالغات کی امداد کے لئے ایک کانسرٹ منانا طے پایا۔ چنانچہ اس کے جملہ انتظامات مکمل بھی ہو گئے تھے لیکن پھر جنگ کی وجہ سے اس کو ملتوی کر دینا پڑا۔ مجلس عاملہ کی رکنیت کے لئے مستعد اور کار پرداز خواتین کے انتخاب کے سلسلہ میں فاطمہ بیگم صاحبہ بنت غلام پنجتن صاحب کو شریک کرنے کی تحریک منظور ہوئی۔

شعبۂ زبان ۔ ۱۳ جون کو ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں پروفیسر ضیاء الدین انصاری، ڈاکٹر زور، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، ڈاکٹر جعفر حسن، نواب مرزا سیف علی خاں صاحب، مولوی قاضی عبدالغفار صاحب اور ڈاکٹر راحت اللہ خاں معتمد شعبہ نے شرکت کی۔ مندرجۂ ذیل تحریکیں باتفاق منظور کی گئیں۔

(۱) اس ادارے کی رائے میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی افادیت اور کارگزاری کو بڑھانے اور عوام کو اس کے کاموں سے زیادہ روشناس کرنے کے لئے ضروری ہے کہ دارالترجمہ کے تیار کردہ تراجم پر تبصرے شائع کئے جائیں۔ اس مقصد کے تحت دارالترجمہ سے اس کی مطبوعات طلب کی جائیں۔

(۲) مقامی اردو اخباروں میں عام طور پر صحافتی الفاظ اور اصطلاحوں کے ترجمے میں یکسانیت نہیں پائی جاتی مناسب ہے کہ ایسی اصطلاحوں کے ترجمے کو معیاری بنایا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے مروجہ اصطلاحوں کو جمع کرنے کا کام ضیاء الدین انصاری صاحب نے اپنے ذمہ لیا۔ مجلس میں ان پر غور کرنے کے بعد ان کی اشاعت عمل میں لائی جائے گی۔

(۳) دفتری اردو زبان کی اصلاح سے متعلق کافی مواد جمع

ہو جانے کے بعد اس پر غور کر کے مقامی جرائد کو متوجہ کیا جائے تا کہ صحیح معنوں میں عملی طور پر اصلاح زبان کی طرف قدم اٹھایا جا سکے۔

شعبۂ شعراء و مصنفین دکن :- ۲۹ جون کو اس کا ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں مولوی سید محمد صاحب معتمد شعبہ کے علاوہ نواب عنایت جنگ بہادر، مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی اور ڈاکٹر زور نے شرکت کی۔ حسب ذیل امور طے پائے شعراء و مصنفین دکن سے دلچسپی رکھنے والے مزید اصحاب کو اس شعبہ کا رکن بنایا جائے۔ قلمی یادگاریں جمع کی جائیں، علمی و ادبی آثار کی حفاظت اور کتبوں کے لگانے کی طرف مزید توجہ کی جائے۔ دکن کے شعراء اور مصنفین کی اردو کتابوں کو اشاعت کی غرض سے منتخب کر کے صدر مجلس ادارہ میں پیش کیا جائے۔ مرقع نثر کی تکمیل کی طرف اصحاب متعلقہ کو توجہ دلائی جائے۔

دوسرے شعبوں کی رودادیں اور کتب خانہ سے متعلقہ عطیوں کا اعلان آئندہ شمارے میں درج رہے گا۔

ادارہ کی شاخیں یوں تو ادارہ کی جملہ شاخیں اپنے فرائض کو خوبی سے انجام دے رہی ہیں اور بعض نئے مقامات سے شاخوں کے قیام کی درخواستیں وصول ہو رہی ہیں لیکن افسوس ہے کہ جگہ کی قلت کی وجہ سے ان سب کا تذکرہ یہاں نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ صرف پربھنی کی شاخ سے متعلق اتنا کہنا ضروری ہے کہ حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد کی کوششوں سے اس شاخ کو چند اچھے علم دوست اصحاب مل گئے ہیں جو برابر سرگرم عمل ہیں۔ بالخصوص مولوی سید عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری و مولوی محمد فاروق صاحب اچ سی اس وہ تعلقدار شاخ کے کاموں میں عملی اور گہری دلچسپی لے رہے ہیں چنانچہ ۱۰ مئی کو ایک جلسہ مولوی سید عارف الدین حسن صاحب کی صدارت میں ہوا جس میں ادارہ کی شاخ کے لئے حسب ذیل اصحاب کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر۔ مولوی محمد فاروق صاحب بی اے اچ سی ایس۔ **نائب صدر** مولوی جلال الدین صاحب اشک بی اے ال ال بی۔ **معتمد** حمید اللہ خاں صاحب شیدا۔ **شریک معتمد** ڈاکٹر عبد الحکیم صاحب۔ **کتب خانہ دار** مولوی سید عبد الرحیم صاحب۔ **خازن** صالح بن محمد صاحب۔ **اراکین** مولوی سید عارف الدین حسن صاحب، مولوی ذو الفقار علی بیگ صاحب، مولوی عبد الرزاق صاحب، مولوی مغل بیگ صاحب۔ یہ سب اصحاب پربھنی میں ایک اچھے دار المطالعہ کے قیام اور اردو امتحانات کے لئے امیدواروں کی تیاری کے سلسلہ میں قابل قدر خدمت انجام دے رہے ہیں۔

"ادارہ"

اطلاع

جن خریدار اصحاب کے چندے ختم ہو گئے ہیں ان کو مطلع کر دیا گیا تھا مگر بعض نے اب تک کوئی جواب نہیں بھیجا۔ ایک ماہ اور انتظار کر کے ستمبر کا رسالہ ان کے نام ایک سال کے لئے وی پی کر دیا جائیگا امید کہ وہ وی پی وصول کرلیں گے اور دفتر کو اخراجات ٹپہ کا نقصان برداشت کرنا نہ پڑے گا۔

مہتمم مدیر سب رس

افتتاحی تقریر

"طلبہ کانفرنس صوبہ میدک کی صدارت سب رس کی مجلس ادارت کے ایک رکن معین الدین احمد انصاری نے کی تھی۔ چنانچہ ان کا خطبۂ صدارت سب رس کے گزشتہ شماروں میں شائع ہو چکا ہے۔ یہاں اس تقریر کا اقتباس شائع کیا جا رہا ہے جو نواب بہادر یار جنگ بہادر نے اس کانفرنس کا آغاز کرتے ہوئے کی تھی اور جس کو رکن نے محفوظ کر لیا تھا۔"

برادران عزیز و کرم! جب آپ نے طلبہ کانفرنس کی افتتاح کی خواہش کی تو میں نے خوشی سے قبول کیا۔ آپ مجھے ایک طالب علم کے سوا کچھ نہ سمجھیں۔ ہم سب طالب علم ہیں۔ ہر علم والے سے دوسرا علم والا زیادہ ہے۔ میں ہمیشہ ایک چیز کہتا رہا ہوں آج پھر واضح کرنا چاہتا ہوں۔ امام فخر الدین رازیؒ کی لوحِ مزار پر ایک قطعہ لکھا تھا جس سے میری آنکھیں کھل گئیں ؎

هرگز دلِ من ز علم محروم نہ شد — کم ماند ز اسرار کہ مفہوم نہ شد
ہفتاد و دو سال درس خواندم شب و روز — معلومم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

اس جلسے کی صدارت میرا ایک بھتیجا کرے گا ان کے والد ظہور الحسن (اللہ اس کو تقرب اعلیٰ عطا کرے) نے میرے قلب میں ایک دہکتی آگ روشن کر دی۔ وہ ایک شعلہ تھا مجسم شعلہ۔ ایک طوفان تھا سر سے پاؤں تک طوفان۔ اتنا بے قرار طبیعت آدمی شاید کسی نے اپنی عمر میں دیکھا ہو۔ اگر وہ رہتا تو اس کا نام سرِ فہرست رہتا۔ مرحوم ظہور الحسن مدنی نواب کا جب انتقال ہوا تو یہ بالکل بچے تھے۔ آج طلبہ کانفرنس کی صدارت وہ لڑکا کر رہا ہے جس کے باپ نے طلب علم میں اپنی جان دیدی۔ وہ یورپ جاتے ہوئے اجمیر شریف میں بنگلہ سے گر کر شہید ہوئے۔ آج اس کے فرزند کو اس مقام پر صدارت کرتے دیکھ مجھے یقین ہے کہ اس کے اندر مدنی نواب کا قلب کام کر رہا ہے۔ خدا کرے وہ اپنے نانا نواب رفعت یار جنگ مرحوم کی تربیت کا بہترین نمونہ ثابت ہو۔ میں آپ سب کو ایسے اچھے صدر کے ملنے پر مبارک باد دیتا ہوں۔ ان کا خطبہ صدارت ہم سب کے لئے مفید ثابت ہو گا۔ میں ان سے صدارت کی درخواست کرتا ہوں۔ ہمارا مستقبل تمام تر طلبہ پر منحصر ہے۔ ایک سوال میرے سامنے ہمیشہ پیش رہا ہے۔ جس کو آج کے صدر بھی اپنے خطبہ میں پیش کریں گے۔

میں ان طالب علموں کو دیکھ کر بڑا خوش ہوتا ہوں کہ وہ ہماری مجلس میں طالب علموں کی حیثیت ہی سے شریک ہوتے ہیں۔

میں بہ مسرت تمام اور خدا کا نام لے کر اس کانفرنس کی افتتاح کرتا ہوں۔

بہادر یار جنگ

فریب

زردار کہتا ہے میں غریب کی ذہنیت کو خوب جانتا ہوں ۔
بادشاہ کہتا ہے میں ملکوں کی تاریخ بدل دینے پر قادر ہوں ۔
شاعر سمجھتا ہے فطرت کے تمام اسرار اس کے سامنے عریاں ہیں ۔
سنگ تراش اپنے آہنی قلم سے پتھروں کو اپنی خواہش کے مطابق ڈھال دینے پر قدرت رکھتا ہے ۔
جسے دیکھو وہ یہ جانتا ہے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے
پر جو جانتا ہے وہ یہ جانتا ہے
کہ وہ کچھ نہیں جانتا ۔

چغتائی

غزل !

اِک برقِ تجلی نے میری تعمیر کے ٹکڑے کر ڈالے
تدبیر کے ٹکڑے کر ڈالے تقدیر کے ٹکڑے کر ڈالے

پایا نہ تھا جب تک اس بت کو میں اپنی پرستش کرتا تھا
ہاتھ آگئی جب اصلی صورت تصویر کے ٹکڑے کر ڈالے

بھولا ہوا جب تک تھا چپ تھا جب آگئی اس کو یادِ وطن!
بس ایک ہی جست میں قیدی نے زنجیر کے ٹکڑے کر ڈالے

غم میں مرا غمخوار آ ہی گیا رونے پہ اُسے پیار آ ہی گیا
تدبیر نے میری قسمت سے تقدیر کے ٹکڑے کر ڈالے

افسانۂ غم کہنے کے لئے سوچے تو بہت کچھ تھے امجد
اک تیز نظر نے ظالم کی تقریر کے ٹکڑے کر ڈالے

امجد

گاؤں کو جاتے ہوئے

السّلام اے ہمنشیں اب گاؤں کو جاتا ہوں میں
شہر کے آباد ویرانے سے گھبراتا ہوں میں

رو رہی ہوگی کوئی معصوم میری یاد میں
ہو رہی ہوگی فضا مغموم میری یاد میں

لوگ دل میں سوچتے ہوں گے کہ یہ زہرہ جبیں
کچھ دنوں سے کیا خبر، ہے کس لئے اندوہگیں

ماں نے لوگوں سے کہا ہوگا کہ یہ بیمار ہے
دل کی دھڑکن کا اِسے کچھ روز سے آزار ہے

چومنے کے واسطے پھولوں سے قدموں کا شباب
کھیت کی مغموم راہیں ہوں گی وقفِ اضطراب

لے کے ہونٹوں میں مری "شیریں ادا" کے نام کو
شبنمیں آنسو بہاتی ہوں گی کرنیں شام کو

چومنے کے واسطے چکیلی تانوں کی مٹھاس
ہو رہے ہوں گے در و دیوار غمگیں اور اُداس

ہمنشیں پہنچوں گا جونہی سادہ کلیوں کے قریب
پھول کی مانند کھل جائے گی میری غم نصیب

آنکھ پُرنم اور دل میں آتشِ بے دُود ہے
دوست جانے دے مجھے اب روکنا بے سُود ہے

الطاف مشہدی (لاہور)

محسوسات

وہ داستاں جو خونِ وفا سے لکھی گئی
تم سے سُنی گئی نہ مجھی سے کہی گئی

اے بے قرارِ شوق، مرے خوش نصیب دل!
دھڑکن کی آڑ سے تجھے آواز دی گئی

فردا کی فکر ہے نہ گزشتہ کا کوئی غم
اب بے خودی کا دور ہے وہ آگہی گئی

اس شوخ کو بٹھا کے تصور کی بزم میں
بے تابیٔ خیال کی تصویر لی گئی

کس کو خبر مریضِ شبِ غم نے کیا کہا؟
کروٹ کے ساتھ آخری ہچکی سُنی گئی

اُس جانِ آرزو کی ندامت بھری نگاہ
محشر میں دادخواہ کے ہونٹوں کو سی گئی

اے یادِ دوست! تیری نوازش کا شکریہ،
اک بے نوا کے واسطے تکلیف کی گئی

یہ زورِ برق و باد، یہ غمناک سی فضا
شاید کہیں بنائے نشیمن رکھی گئی

فریاد اے محبتِ مجبور کے خدا!
وہ کیا کرے کہ جس سے خوشی چھین لی گئی

میں وہ کہ تم کو سونپ دئے جان و دل تمام
تم وہ کہ تم سے مجھ کو تسلی نہ دی گئی

ماہر ازل کے روز جو بٹنے لگے نصیب
قسمت میں میری مرگِ مسلسل لکھی گئی

ماہر القادری

غریب شاہ

وہ شہر کے قریب ایک ویران قبرستان میں رہا کرتا تھا۔ قطب شاہی عہد کے اس لاوارث شہر خموشاں میں، ایک ٹوٹا ہوا مقبرہ اس کی جائے پناہ تھی۔ لوگ اسے فقیروں کے ایک عام لقب "غریب شاہ" سے جانتے تھے۔

صدیوں کا اجڑا ہوا قبرستان یوں بھی ہیبتناک بن جاتا ہے، اس پر اضافہ یہ کہ اس کے متعلق لوگوں میں طرح طرح کی خبریں مشہور تھیں۔ کوئی اسے شیطانوں کا مسکن بتاتا تھا، اور کسی کو یہاں بھوت، پریت، جنات، چڑیل غرض ہر نظر نہ آنے والی مخلوق نظر آتی تھی۔

میں نے جب اسے پہلی مرتبہ دیکھا، وہ بڑھاپے کی منزل میں قدم رکھ چکا تھا۔ چہرے پر جھریاں پڑنے لگی تھیں اور منہ سے دانت جھڑ رہے تھے۔ رات کی سنسان خاموشی میں وہ راستے سے سوال کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ یہ سوال دنیا کی ناپائیداری سے متعلق ایک گیت تھا، جسے اس کی درد بھری آواز کے اتار چڑھاؤ نے اور بھی موثر بنا دیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کشکول اور دوسرے ہاتھ میں "یکتارا" تھا جس کو وہ رہ رہ کر چھیڑتا جاتا۔ یکتارے کی نغمہ ریزی، خود اس کی آواز کا درد، نظم کا موضوع اور رات کی سنسان فضا نے مل جل کر اس گیت کو ایک فردوسی نغمہ سا بنا دیا تھا۔ یہ مبالغہ نہیں کہ اس کو سن کر، بوڑھے، جوان اور بچے سب ہی پر ایک بے خودی سی طاری ہونے لگتی۔ عورتیں تو دور ہی سے اس کی صدا سن کر اپنے اپنے بچھونوں میں اٹھ بیٹھتیں اور نہایت عقیدت سے اس کا سوال سنتیں۔ جب تک اس کی لے سنائی دیتی، مائیں اپنے بچوں کو، بیبیاں اپنے شوہروں کو اور گھر کی دوسری تمام عورتیں ہر کس و ناکس کو خاموش رہنے کی تاکید کرتیں، غریب سے غریب عورت بھی، خدا جو مقدور دے، اس کو دینا، ثواب سمجھتیں گویا وہ اپنی آواز کے پیچھے ساری گھر والیوں کو کھینچ لیے جاتا تھا۔

اس کی عادت عجیب تھی کہ وہ پیسہ دھیلا لینے کے لئے اپنی جگہ سے نہیں ہلتا تھا، جو کچھ دینا ہوتا اسے وہیں پہنچا دیا جاتا، جہاں یہ سوال کرتا کھڑا رہتا۔

اس طرح اس کو ہر روز اتنا مل جاتا تھا، کہ کسی اور فقیر کو مہینے بھر میں ہزار ہا منتوں اور سماجتوں کے بعد بھی مشکل سے ملتا ہوگا۔ گویا اس کا یکتارا اور اس کی آواز اس کا قیمتی سرمایہ تھے، جن کے بل بوتے پر وہ بے فکری کی زندگی بسر کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے پاس دو تین کتے، چند بلیاں، اور کئی پرندے مثلاً چنڈول، بیا، بلبل، اصیل مرغ وغیرہ، ہر وقت پلے رہتے۔

اپنے مقام کو صاف ستھرا رکھنے اور دیواروں کو طرح طرح کے نقش و نگار سے رنگنے کا بھی اسے بہت شوق تھا۔ اس کی محراب ہر وقت گلدانوں اور تشتریوں سے سجے رہتے۔ اس ویران قبرستان میں اور اجڑے مقبروں کے درمیان یہ جگہ ریگستان کا مرغزار معلوم ہوتی تھی۔

غریب شاہ کہنے کو تو پھٹے پرانے کپڑے پہنا رہتا، لیکن اس کا کھانا پینا، اور شوق ذوق، ایسے بہت سے خوش حال لوگوں سے بھی بڑھا چڑھا تھا، جو اس کو بھیک دیا کرتے تھے۔

اس کی افیون کا خرچ ہی روزانہ سات آٹھ آنے ہوتا تھا۔

ایک آدھ دفعہ کسی نے اس سے کہا تھا۔

"غریب شاہ، تم بھیک کیوں مانگتے ہو، صحیح سالم اور تندرست آدمی ہو، محنت یا نوکری کیوں نہیں کرتے؟"

اس نے جواب دیا۔

"ہم محنت مزدوری کریں؟ بابا فقیر ہیں، کسی کے غلام نہیں، غلامی وہ کرتا ہے، جس کو بیوی بچے ہوں۔ ہم تن بہ تقدیر ہیں، بھیک لیتے اور دینے والے کی جان و مال کو دعا دیتے ہیں۔ فقیر کی دعا رد بلا"

اس کو اپنے پیشہ کے احترام کا کس قدر خیال تھا، اس واقعہ سے ظاہر ہوگا کہ اس زمانے میں اطراف دور تک پانی کے نل نہیں تھے۔ کبھی کبھی بہشتی پانی نہ لاتا تو، عذاب نازل ہو جاتا تھا۔ لوگ غریب شاہ کی خوشامد کرتے، اور ایک ایک گھڑے پانی کے لئے ایک ایک آنہ نذر کرنے تیار ہو جاتے، لیکن وہ اصول کا فقیر، ٹس سے مس نہ ہوتا، نہ مروت سے اور نہ لالچ سے۔

غریب شاہ نے اپنی آواز اور یکتارے سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کے لئے پھیری کا جو وقت مقرر کیا تھا، وہ بہت موزوں تھا۔ وہ رات کے نو بجے اور بارہ بجے کے درمیان نکلتا باقی دن بھر میں کام کاج سے جو وقت بچا رہتا، وہ سونے اور جانوروں کی دیکھ بھال میں صرف ہو جاتا۔ یہی اس کے بڑے مشاغل تھے۔ کبھی کبھی، وہ نئے پرانے قصوں کی کتابیں لے بیٹھتا۔ اس کے پاس "طلسم ہوش ربا" "الف لیلہ" "گل بکاؤلی" جیسی کتابوں کا کافی ذخیرہ تھا، جن کو وہ دہرا دہرا کر پڑھتا تھا۔

غرض افیون کھانا، یکتارے پر گانا اور قصے پڑھنا اس کی لطیف دلچسپیاں تھیں۔ یکتارے پر گانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ وقت کے مناسب ایسا سر لگاتا کہ منکر بھی سر ہلانے لگتے۔ قصے ہم نے اس سے بہت سنے، کبھی کوہ قاف کی پریوں کے، کبھی سنگلدیپ کے راجوں کے، کبھی آسمانوں کے اور کبھی زمینوں کے، لیکن یہ قصہ جو اس نے ایک خاص حالت میں بیان کیا تھا، وہ آج تک میرے دل پر نقش ہے۔

ایک روز ہم، رات کا کھانا کھانے کے بعد ٹہلتے ٹہلتے غریب شاہ کے پاس گئے۔ وہ کچھ مغموم سا دکھائی دے رہا تھا، ہم کو آتا دیکھ کر، اسے کچھ خوشی ہوئی اتفاقی بات ہے کہ ہمارے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ہماری دلچسپی کے لئے، غریب شاہ ادھر ادھر کے قصے بیان کرنے لگا۔

قصہ گوئی پر اس کی طبیعت کو آمادہ دیکھ کر، ہم نے کہا۔

"غریب شاہ، آج کوئی ایسا قصہ سناؤ، کہ کبھی نہ سنا ہو۔ تمہارے جن، پری اور دیوؤں کے قصوں سے تو سیری ہو گئی۔"

" اس پر وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ پھر اپنی یکتارے جیسی گونج پیدا کرنے والی آواز میں کہنے لگا"

" کیا قصہ سناؤں"۔ پھر تھوڑی دیر سوچ کر کہا۔ "آج اپنے ایک ساتھی فقیر کا قصہ سناتا ہوں لیکن ذرا دردناک ہے"۔

" میں نے کہا۔ یہی چاہیئے اس وقت طبیعت کچھ اسی طرح کی چیز سننا چاہتی ہے۔ لیکن ہو سچ مچ قصہ"۔

" اچھا سنئے" تھوڑی دیر تک وہ سوچتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

" اسی شہر میں ایک فقیر رہتا تھا ..... وہ میرا ساتھی اور دوست تھا صورت شکل کا وہ بہت سیدھا تھا۔ اور نہایت جامہ زیب۔ ہمارے گروہ کے فقیروں کی عادت کے مطابق وہ رات کو دس گیارہ بجے "بستی" کو نکلتا اور یکتارے پر گا کر مانگتا۔ جب وہ "بستی" کو جاتا، تو زرد عمامہ سر پر سجاتا اور

بال بال کو سنوار کر ایسا معطر کرتا کہ قریب سے گزرنے والے سبحان اللہ پڑھنے لگتے۔ اس کو خدا نے ایسا گلا بخشا تھا کہ تان سین بھی سنتا تو سر دھننے لگتا۔ جب وہ سوال کرتا ہوا راستے سے گزرتا، تو ایسا معلوم ہوتا کہ ابدی نغمے زمین پر اتر رہے ہیں، راستہ چلنے والے اپنا کام چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو جاتے تھے

ایک روز وہ حسب معمول "بستی" سے واپس ہوتے ہوئے سوال کرتا امیروں کے ایک محلے سے گزر رہا تھا، یہ سردیوں کی ایک اندھیری رات تھی، اور کوئی بارہ بجے کا عمل ہوگا۔ راستے تمام سنسان پڑے تھے، اور مشکل سے کوئی یکا دکا راہ رو دکھائی دیتا تھا۔ جب وہ ایک بڑی ڈیوڑھی کے سامنے تھوڑی دیر کے لئے رکا، تو اسے ایک دروازے کے کھلنے کی آواز آئی، اور

"لیتے جاؤ، سائیں جی" کی باریک سریلی آواز کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت ہاتھ، دروازے سے باہر نکلا۔ اس ہاتھ کی نزاکت اور اس کے نئے جوڑے کی چمک سے فقیر کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔ فقیر کا یہ دستور تھا کہ پیسہ دھیلا اسے وہیں پہنچا دیا جاتا، جہاں وہ کھڑا سوال کرتا تھا، لیکن اس وقت، اس ہاتھ کی نزاکت کو دیکھ کر، اور اس شیریں صدا کو سن کر، اس کے پیر لڑکھڑا گئے اور اپنے اصول قاعدے کا اسے کچھ خیال نہ رہا سیدھا دروازے کی طرف بڑھا جوں ہی وہ دروازے کے قریب پہنچا، کمرے کی روشنی میں وہ بوٹا سا قد اور وہ من موہن مورت بھی اسے نظر آ گئی۔

فقیروں کو ایسے ہوش ربا نظاروں سے اکثر سابقہ پڑتا ہے، لیکن وہ شکل و شمائل کچھ اور ہی چیز تھی۔ فقیر نے بھیک لینے جب ہاتھ بڑھانا چاہا، تو دل کی ایک بے قابو حرکت نے اس کا سر بھی جھکا دیا، اور اس نے بجائے پیسہ لینے کے، اس خوبصورت ہاتھ کا ایک بوسہ لے لیا۔

یہ حرکت اس سے سرزد تو ہو گئی، لیکن فوراً ندامت اور خوف نے اسے گھیر لیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹا، اور شاید بھاگ جانا چاہتا تھا، لیکن بھاگنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ تھوڑی دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ اس کی آنکھوں نے دیکھا کہ پٹ ذرا اور کھلا، اور اب وہ پورا جلوہ نظر کے سامنے تھا۔ وہ ہاتھ اندر کھنچنے کی بجائے اسی طرح رکا رہا۔ بلکہ اس میں فقیر کو ایک رعشہ کی سی کیفیت بھی محسوس ہوئی۔ فقیر ہاتھ کے اس اشارے کو سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے پچھلے تجربوں نے اسے ہمت دلائی کہ "اب" یا "کبھی نہیں"۔ اس نے فوراً ایک جست کی، اور کمرے کے اندر تھا۔

وہاں وہ حسین مورت ساکت و سامت کھڑی تھی۔ فقیر نے اسے چھو کر دبا کر اطمینان کرنا چاہا، تو اس میں ہلچل پیدا ہوئی۔ وہی ہاتھ بہ مشکل ہونٹوں تک اٹھا، اور خاموش رہنے کی تاکید ہوئی۔ جن لوگوں کی پچھلی کوئی زندگی نہیں ہوتی، وہ بڑے منچلے بھی ہوتے ہیں اور جلد باز بھی۔ جلد بازی شیطانی کاموں میں رحمت ہوتی ہے۔ اسی لئے فقیر نے بغیر کچھ کہے سنے اپنا سر اس نازنین کے قدموں پر رکھ دیا۔ اس جسم کو حرکت ہوئی، اور وہ دور ہٹ کر کھڑی ہو گئی،...... تھوڑی دیر بعد اس کے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے دو نازک ہونٹوں سے یہ آواز نکلی جو یکتارے کے بولوں سے زیادہ شیریں تھی۔

"اب جاؤ ــــ کل اسی وقت ..... ضرور"

فقیر کے لئے یہ سب اس قدر جلد جلد اور بے توقع واقع ہو گیا کہ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس کی زبان سے صرف اس نازنین کا آخری لفظ ہی بے اختیار نکل گیا۔

"ضرور۔"

وہ بادل ناخواستہ باہر نکلا۔ اور بادلوں کی طرح اس
ڈیوڑھی، اس کے در و دیوار اور راستے کو گھورتا، نہ معلوم کتنی
ٹھوکریں کھاتا، اپنی قیام گاہ کو پہنچا۔

اس کی رات بڑی الجھن میں کٹی کہ آخر ان واقعات کا
کیا مطلب ہو سکتا ہے؟۔ کبھی وہ اسے ایک خواب سمجھتا، اور کبھی
دھوکا۔ غرض اُس ادھیڑ بن کے درمیان صبح ہوئی۔ اس کا دل تو
بہت چاہتا تھا کہ کوئے دلدار کا ایک دفعہ طواف کر آئے کہ شاید
ادھر سے کچھ اشارہ مل جائے، لیکن اس نازنین کی قطعی ہدایت
کے خیال نے، اس کے قدم تھام لئے۔ دن بھر وہ بغیر کھائے پیئے،
سوچتا پڑا رہا۔ کبھی اس نازنین کے حسن صبیح کا، اور اس کے مرتبہ کا
خیال کرکے، اسے اپنی قسمت پر رشک آنے لگتا کبھی اپنی اور اس کی
حیثیت کا فرق اسے یاد آتا تو وہ اس پورے معاملہ کو ایک جال
اور ایک دھوکا سمجھنے لگتا۔

بہرحال اسی ادھیڑ بن میں شام ہوئی، اور وہ ابھی سے
جانے کی تیاری کرنے لگا صاف ستھرے کپڑے پہنے، ہر روز سے
زیادہ خوشبو لگائی اور سر اور داڑھی کے بالوں کو سنوارا تین
چار گھنٹوں تک اس مقام پر مارے مارے پھرنے میں جو خدشہ
تھا وہ اگر نہ ہوتا، تو شاید وہ فوراً اس آستانے پر پہنچ جاتا۔ پھر بھی
وہ دو گھنٹہ پہلے گھر سے نکل گیا، اور چکر ہی کاٹتا، بارہ بجے کے
قریب وہاں پہنچ کر، اس در سے تھوڑی دور دیوار کے سایہ میں
دیوار ہی سے لگا تصویر بنا کھڑا ہو گیا۔ لوگوں کی آمد و رفت
اب ختم ہو چکی تھی، پھر بھی یکے دکے راہ گیر کے قدموں کی
آہٹ سنائی دیتی، تو زمین اس کے پیروں تلے سے نکل
جاتی۔ بہ ہزار وقت گھنٹہ پون گھنٹہ گزر ہی گیا۔ آخر کار
وہ دروازہ کھلا فقیر احتیاط کے خیال سے تھوڑی دیر اسی طرح
چپکا کھڑا رہا۔ پھر ایک چھوٹا سا خوبصورت سر باہر نکلا، تو وہ آگے
بڑھا اور جلدی سے کمرے میں گھس کر، کواڑ بھیڑ لئے۔

یہاں اسے کچھ اور ہی نقشہ نظر آیا۔ وہ نازنین سر سے
پیر تک ایک سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی آمادۂ سفر کھڑی تھی، ایک
مختصر سی گٹھڑی اس کے بغل میں تھی جس میں اس کا اثاثہ تھا۔
فقیر کو دیکھتے ہی اس نے دبی آواز میں کہا۔

" چلو، جلد یہاں سے نکل چلو، وقت کم ہے "

فقیر کے لئے یہ چیز بھی خلاف توقع تھی، اس نے حیرت سے
پوچھا۔

" کہاں "

جواب ملا۔

" یہاں سے دور پھر باتیں ہوں گی "

اس جواب کے بعد کچھ کہنے سننے کا موقع نہیں تھا۔ وہ دونوں
کمرے سے باہر نکلے۔ اس نازنین نے کمرے کے کواڑ آہستہ سے
بند کر دئے۔ اور رات کی تاریکی میں دونوں ایک طرف کو روانہ
ہو گئے۔ فقیر کو اپنے گھر کی طرف رخ کرتے شرم آ رہی تھی۔ لیکن
اس وقت اس کے سوا کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں تھا۔ راستہ میں
انہوں نے کوئی بات نہیں کی اگر کوئی راہ گیر مل جاتا، تو وہ نازنین
فقیر کے پیچھے اس طرح آ جاتی کہ تاریکی میں کوئی مشکل سے تمیز
کر سکتا۔ اسی طرح وہ اس مقام کے قریب پہنچ گئے جہاں فقیر رہا
کرتا تھا۔ فقیر کو جاڑا سا محسوس ہو رہا تھا، اس کے دانت بج
رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب بخار چڑھ آئے گا۔
بدقت تمام اس نے زبان کھولی۔ اور پوچھا " کہاں چلنے کا
ارادہ ہے "

" تمہارے مقام کو " نازنین نے بے تکلف جواب دیا۔

"لیکن وہ ......" فقیر نے عذر کرنا چاہا۔

"اس وقت تو وہی سب کچھ ہے، پھر دیکھ لیں گے۔"

تھوڑی دیر میں وہ فقیر کے اجڑے مقام تک پہنچ گئے۔

ہر طرف پرسکون سناٹا طاری تھا، لیکن فقیر کا دل جذبات کے طوفان میں تھپیڑے کھا رہا تھا۔ جب وہ دروازے کا قفل کھولنے کے لئے بڑھا تو قفل کی آواز بھی اس کے دل کی دھڑکن تیز کر رہی تھی۔ بہر حال دروازہ کھلا، اور وہ نازنین کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ اور کواڑ بند کر دئے پھر اس نے بتی جلائی۔ کمرہ روشن ہونے کے بعد نازنین نے کمرے کے چاروں طرف نظر ڈالی اور سب سے پہلی بات جو اس کی زبان سے نکلی یہ تھی کہ

"کس قدر خاموش مقام ہے۔ ایسا جیسا ہم چاہتے تھے۔"

اپنا برقعہ اتارے بغیر ہی وہ ایک طرف بوریے پر بیٹھ گئی۔ فقیر کو بدحواسی میں دری بچھانے کا تک خیال نہ رہا۔ حیرت میں کبھی وہ اس حسن کی دیوی کو اور کبھی اپنے اجڑے شبستان کو دیکھتا تھا۔

آخر اس نے ہمت کر کے کہا۔

"آپ کے نازک پیروں کو یہاں تک آنے میں بہت اذیت ہوئی۔"

"آرام کا خیال ہی ہوتا تو گھر سے نکلتی کیوں۔ مجھے سہارے کی ضرورت تھی، سو تمھاری صدا میں مل گیا۔ اسی کے پیچھے کھنچ کر آ رہی ہوں۔ آگے خدا جو دکھائے۔"

"یہ آپ کی عنایت ہے۔"

"فقیر نے لجاجت سے کہا۔

"یہ مقام تو اچھا ہے۔ ...... لیکن یہاں، اس شہر میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ میں اپنی کہانی تو فرصت سے کہوں گی۔ اب وقت نہیں گنوانا چاہئے۔"

تھوڑی دیر سوچ کر اس نے پھر کہا۔

"بمبئی سنتے ہیں بڑا شہر ہے۔ پھر یہاں سے بہت دور بھی ہے۔"

فقیر بچپن میں ایک دفعہ گھر سے بھاگ کر بمبئی جا چکا تھا کچھ دن محنت مزدوری سے بسر کرنے کے بعد گھر کا آب و دانہ اسے کھینچ لایا تھا۔ وہ نقشہ اس کی آنکھوں میں پھر گیا۔ اس نے جواب دیا۔

"بڑا غدار شہر ہے ...... وہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا، میں بچپن میں اسے دیکھ چکا ہوں۔"

"بس وہی ہماری پناہ گاہ ہے۔ میرے ساتھ کچھ روپیہ اور اپنا زیور ہے تھوڑے دن گزر ہی جائیں گے۔ پھر خدا رزاق ہے۔"

روپیہ اور زیور کا نام سن کر فقیر کو اور بھی اطمینان ہوا۔ اب وہ دوزخ میں بھی جانے کے لئے تیار تھا۔ یہاں شہر میں اس کا تھا ہی کون، جس کو چھوڑنے کا اسے غم ہوتا۔ نوجوانی، یار جانی، روپیہ، زیور اور بمبئی کی سیر۔ مزے کا سماں اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ اس نے کہا۔

"اگر ہم صبح یہاں نہیں کرنا چاہتے، تو وقت نہیں کھونا چاہیے۔ اب دو بج چکے ہوں گے۔ صبح گاڑی چھوٹتی ہے ...... لیکن سواری؟"

"مل جائے تو اچھا ہے، نہ ملے تو فکر نہیں۔ آخر یہ پاؤں ہیں کس روز کے لئے آزادی کے راستے میں تھکان بھی راحت ہے۔"

یہ طے ہوتے ہی فقیر نے جلدی جلدی اپنا اسباب سمیٹا اور کام کی چیزوں کو گٹھڑی میں باندھ لیا۔ کچھ بچا کھچا روپیہ جو ایک کونے میں گاڑھ رکھا تھا، نکال کر وہ بھی رومال کے پلو میں باندھ لیا اور تیار ہو گیا۔

اس نازنین کی اسے فکر تھی۔ اگر وہ چاہتا تو اس کو سواری بھی مل سکتی تھی۔ کیونکہ کئی جھٹکے والے اس کے شناسا تھے، لیکن اس وقت ان کو چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس لئے وہ پاپیادہ روانہ ہوئے۔

جب وہ اسٹیشن پہنچے ہیں، تڑکا ہو رہا تھا۔ گاڑی کے آنے تک، دونوں ایک گوشہ میں چھپے بیٹھے رہے۔ آخر گاڑی بھی دن دن کرتی آ گئی، فقیر نے پہلے اس نازنین کو زنانہ ڈبے میں سوار کرا دیا۔ پھر خود آپ، دوسرے ڈبے میں جا بیٹھا اس طرح یہ جوڑا بھاگنے والوں کی جنت کی طرف روانہ ہوا۔

ریل کو بمبئی پہنچنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ چند گھنٹوں میں، وہ وہاں اتر گئے اور آبادی سے دور، ایک اجڑی بستی میں چھوٹا سا کمرہ کرایہ پر لے کر رہنے لگے۔

وہ نازنین جو فقیر کے ساتھ بھاگ آئی تھی، اس دیوڑھی کی پروردہ لڑکی تھی بیگموں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے اس کا طرز، بات چیت کا انداز منجھ گیا تھا۔ اس نے سن شعور سے لے کر بھاگنے کے روز تک، کبھی اچھا سلوک نہیں دیکھا تھا اسے روپیہ پیسہ ملتا تھا، لیکن آزاد زندگی جو ایک نوجوان عورت چاہتی ہے اس سے وہ محروم تھی اسی لئے بھاگ نکلنے کے لئے موقع کی تاک میں تھی۔ لیکن مشکل اس بات کی تھی کہ کس جائے تو کہاں جائے۔ فقیر کا سوال، وہ اکثر سن چکی تھی۔ اور سچ پوچھو تو اس پر لٹو ہو گئی تھی، لیکن فقیر کی اس روز کی جرأت نے اس کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ اور اس نے سوچا کہ جب آزاد ہونا ہی ٹھیرا تو فقیر کا ساتھ بھی کیا برا ہے۔ پھر یہ فقیر شکیل نوجوان تھا؟ اور لڑکی کی عمر بھی سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ جوانی دیوانی مشہور ہے۔ گھر کی روز روز کی بدسلوکیوں نے، اسے یہ بھی سوچنے کا موقع نہ دیا کہ وہ جس کے پلے پڑ رہی ہے، آخر وہ کس قماش کا آدمی۔ اس کے لئے یہی کافی تھا کہ یہ مرد ہے، نوجوان ہے، اور طرحدار ہے۔ پھر جادو کی آواز بھی رکھتا ہے۔ عورت فلسفی نہیں شاعر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو تصفیہ کرنے میں دیر نہیں لگتی۔

فقیر کی اول اول کی گرمجوشیوں نے، اس نازنین کے دل سے گھر کا غم بھلا دیا۔ وہ اب آزادی اور زندگی کا لطف اٹھا رہی تھی۔ فقیر کو چین کی زندگی میسر آئی، تو وہ بھی عاقبت کا خیال خدا کو سونپ کر، مزے سے دن گزارنے لگا۔

لیکن اس طرح زندگی کب تک نبھی ہے۔ آمدنی کوڑی کی نہیں، ٹھاٹ امیروں کا سا۔ رفتہ رفتہ ان کا جمع جتھا کم ہونے لگا، فقیر کو جیسا اس کی فکر ہوئی، تو ہاتھ پاؤں ہلانے کی بجائے، الٹا، اس نازنین سے الجھنے لگا۔ کئی دفعہ جھڑپ ہو گئی، لیکن وہ محبت کی ماری اپنا ہاتھ کبھی نہیں روکتی تھی۔ اس پر بھی فقیر کو قناعت نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ ٹھیرا آزاد منش، چھیلا، جہاں گرد بارہ گھاٹ کا پانی پیا ہوا۔ ایک عورت کی محبت اور آرام کی زندگی بھی اس کی عادتیں نہ بدل سکی۔ آخر ایک رات جب وہ نازنین میٹھی نیند سو رہی تھی، اس نے اس کا سارا بچا کھچا زیور سمیٹ لیا، اور اسے سوتا چھوڑ کر، اپنے شہر کی راہ لی۔ لیکن یہ اس کی جوانی کی بھول تھی اس وقت اس بے مہر کو ذرا بھی خیال نہ آیا کہ وہ بے کس، جس نے اس کی خاطر سارا دھن من لٹا دیا، ایک اجنبی بستی میں، کس کی ہو کر رہے گی۔ جوانی کے نشے اور دل کے کھوٹ کے سبب اس نے، اس کی اور اس سے بڑھ کر اس کے محبت بھرے دل کی کچھ قدر نہ کی۔ اور ٹھکرا کر چلدیا .... لیکن اب! ......اب وہ اسے بہت یاد آتی ہے۔ پر کیا کر سکتا ہے.... اب ایک جگ

بیت چکا ہے۔"

یہ کہتے کہتے غریب شاہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اب بارش بھی تھم چکی تھی، اور میرا حلق بھر گیا تھا اس لئے میں یہ کہتا ہوا اٹھا، اور گھر کی راہ لی۔

"غریب شاہ یہ قصہ سب قصوں سے بڑھ گیا۔ اب رات بہت ہو گئی۔ چین سے سو رہو۔"

عبدالقادر سروری

غزل

سارے جہاں کو بھول جاؤں یاد فقط وہی رہے
ہوش رہے نہ زاہدہ اور نہ بے خودی رہے

دل ہو غموں میں شاد کام لذتِ زندگی رہے
ہوش کے ساتھ ساتھ اگر تھوڑی سی بیخودی رہے

عشق سے خوں ہو دل مگر لب پہ دعا ہی رہے
میری خوشی ہو پائمال اس کی خوشی خوشی رہے

کشمکشِ حیات سے تیرے مریض چھوٹ جائیں
فکر یہ ہے کہ دل رہے اور نہ درد ہی رہے

عشق کی نامرادیاں ہیں مری کامیابیاں
تو نہ ستم سے باز آ جائے کہ زندگی رہے

ہو نہ وفا سے بدگماں اچھا نہ سن مری فغاں
میں ہوں اسی میں شادماں جس میں تری خوشی رہے

ہو گئے سب سے بے خبر ہے وہ دل اور نہ وہ نظر
قید جو تھے تو تھے رہا چھٹ کے تو قید ہی رہے

ہاں پھر اسی طرح ذرا سامنے آ نقاب اٹھا
زورِ شباب ہو فزوں حسن میں دلکشی رہے

ہجر کے غم فنا ہوئے کاہشِ شوق مٹ گئی
اب یہ دعا ہے عمر بھر عالمِ بے خودی رہے

راحت و رنج کی حدیں دور ہوں یا ملی رہیں
دل میں ترا خیال ہو اور نظر پھری رہے

وقتِ اخیر زاہدہ آنے کا ہے یہ مدعا
چاہتے ہیں کہ بعدِ مرگ حسرتِ زندگی رہے

زاہدہ خاتون

بیگم خلیق الزماں صاحب (لکھنؤ)

(مرسلہ مولانا عبدالماجد دریابادی)

ندی کنارے

اسی ندی کے کنارے ریتی پر ان ہی شفاف لہروں کی سطح پر ان ہی صنوبر کی پتیوں پر ایک ایسی الم انگیز داستان لکھی گئی ہے جو آج بھی گاؤں کے بچے جوان اور بوڑھے کی زبان سے دہرائی جا سکتی ہے۔ کئی دنوں پہلے کی بات ہے۔

اسی ندی کے کنارے ایک خوبصورت بستی آباد تھی جس نے گھٹتے گھٹتے معدوم ہو کر گاؤں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اُس وقت کا حکمران ایک قدیم وضع کا رحم دل انصاف پسند ہونے کے علاوہ مدبر بھی واقع ہوا تھا۔ ہمیشہ اس کے دل میں پرجا کی بہبودی اور بھلائی کا خیال بندھا رہتا تھا، اس کے عہد میں گاؤں کا ہر طبقہ خوشی و خرمی کے ساتھ اطمینان کی زندگی بسر کر رہا تھا آبادی کے ایک کونے میں کسانوں کا خوشحال گروہ آباد تھا جو اپنے چوپایوں کی نگہداشت اور کھیتوں کی تیاری میں ہمہ تن مشغول رہتا تھا ـــــ بدھوا نامی کسان ان سب کاشتکاروں کا بزرگ اور سردار مانا جاتا متمول ہونے کے علاوہ پٹیل پٹواری تک اس کی رسائی تھی۔ تنگو اس کا اکلوتا لڑکا تھا جس کو وہ جان کے برابر عزیز رکھتا تھا۔ تنگو بچپن سے ہی آزادانہ زندگی بسر کرنے کا عادی تھا۔ اس کے باپ نے گائے بکریوں کی رکھوالی کا انتظام اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ چوپایوں کو لے کر ندی کنارے چلا جاتا اور سورج کے ڈوبنے تک ادھر اُدھر کھیلوں میں لگا رہتا۔ تنگو کو ندی کنارے بہت سے ہم عمر لڑکے لڑکیاں کھیلنے کے لیے مل جاتیں۔ اُسے ایک غریب کسان کی لڑکی بھدرا کے ساتھ کھیلنے کی عادت سی ہو گئی تھی جو اپنی ماں کے ساتھ پانی بھرنے ندی کے کنارے آیا کرتی اور سارا دن وہ تنگو کے ساتھ کھیل کود میں لگی رہتی دونوں مل کر ندی کے کنارے ریت کے گھروندے بنا کر کھیلتے۔ پھر خود ہی روٹھ کر ایک دوسرے کے گھروندے توڑ ڈالتے، پانی اچھالتے اور مختلف سمت منہ پھلائے دور جا بیٹھتے۔

تنگو کبھی بھدرا کو مغموم دیکھ کر بے چین سا ہو جاتا اپنے حرکات پر پشیمان ہو کر دل میں کہنے لگتا، میں نے ناحق بھدرا کا گھروندا بگاڑ دیا۔ اور اسے برا بھلا کہا اس پر پانی اچھالا مجھے اب چل کر اس سے معافی مانگنی چاہئے۔ نہیں، نہیں، یہ میرا قصور نہیں پھر وہ اپنے آپ سے کہنے لگتا۔ میں بھدرا سے کبھی معافی نہیں مانگ سکتا۔ تنگو ایک غلط انداز نظر سے معصوم بھدرا کی طرف دیکھتا، جو ریت کے ڈھیر میں پیر دھنسائے بیٹھی ہوئی تھی ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی اُس نے ایک کنکر اٹھایا اور مسرت آمیز لہجہ میں چیخ کر کہنے لگا ہیرا مل گیا ہیرا ـــــ اب بھدرا چپ کیسے رہتی دوڑتی ہوئی اس کے پاس آئی تنگو! مجھے دکھاؤ کیسا ہے۔ وہ ہیرا، بہت قیمتی ہے وہ تنگو دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا ـــــ تنگو دکھاؤ نا کیسا ہے وہ ہیرا، بھدرا نے التجائی لہجہ میں کہا۔ نہیں، تنگو نے کسی قدر اکڑ کر کہا۔ ہم تمہیں نہیں دکھائیں گے۔ تم مجھ سے چھین لو گی، تنگو بھیا اس نے منت کے ساتھ کہا، دور ہی سے دکھاؤ میں تمہارے قریب نہ آؤں گی "اب تم مجھ سے کبھی نہ روٹھو گی" تنگو نے اس سے دریافت کیا۔

"کبھی نہیں میرے اچھے تنگو ـــــ سادہ لہجہ میں بھدرا نے جواب دیا۔ تنگو نے اب مٹھی کھولی۔ ایک معمولی پتھر کا ٹکڑا اس کی ہتھیلی پر سورج کی شعاعوں میں چمک رہا تھا۔ تنگو اور بھدرا اب خوشی خوشی پانی میں نہانے ندی کی طرف دوڑ آئے اور بڑی دیر تک موجوں سے کھیلتے رہے۔ سورج کے سروں پر آنے تک وہ برابر پانی میں ڈبکیاں لگاتے رہے۔ آخر بھوک اور تھکن سے مجبور ہوکر آموں کے گھنے سایہ میں پہونچ کر وہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔

دھوپ کی تیزی بتدریج بڑھتی گئی۔ تنگو اور بھدرا آموں کی ڈالیوں پہ بیٹھ کر خوب جھولا جھولتے رہے یہاں تک کہ سورج شفق کی وادیوں میں پہونچ کر گہرا سرخ ہو جاتا تب وہ دونوں خوشی خوشی اپنی گایوں پر بیٹھ کر گھروں کا راستہ لیتے۔

دن گزرتے گئے ہفتے مہینوں اور مہینے سالوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ بچے جوان اور جوان بڈھے ہوگئے۔ اسی ندی کے کنارے عہد طفلی کی داستان کے مدھم حروف جو بھدرا اور تنگو کے دلوں پر نقش تھے اب وہ ایک دوسرے کے دلوں پر اچھی طرح کندہ تھے۔

ایک روز تنگو ندی کنارے بھدرا کا نہایت بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس کی پرشوق نگاہیں گاؤں کے راستہ پر لگی ہوئی تھیں۔ دو دن ہوئے اس نے بھدرا کا خوبصورت چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے خیال کیا کہیں بھدرا کے دشمن بیمار نہ ہوں۔

دور سے اس نے گاؤں کے راستہ پر کسی کو آتے دیکھا اگر اس کی نگاہیں دھوکا نہ دیں اس نے خیال کیا وہی ہوگی واقعی اس کا خیال صحیح نکلا۔ اس نے بھدرا کو ندی کی طرف آتے دیکھا جو کندھے پر پانی کا گھڑا لئے ہوئے کسی خیال میں ڈوبی ہوئی آرہی تھی۔ اس کی نگاہیں زیادہ تر زمین کے ذرات کا جائزہ لے رہی تھیں، تنگو فوراً پیپل کے بڑے تنے کی آڑ میں چھپ گیا۔ وہ پوشیدہ طور پر بھدرا کے حرکات و سکنات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ بھدرا غیر معمولی مغموم سی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ پانی کے کنارے آئی۔ اس نے پہلے پانی کی موجوں کو ہٹا کر خوب جی بھر کے پانی پیا۔ منہ دھو ڈالا اور پانی کی شفاف سطح میں چہرہ دیکھ کر بکھرے ہوئے بال ٹھیک کرنے لگی۔ اب تنگو درخت کی آڑ سے نکل آیا ـــــ اور بغیر آواز کئے وہ بھدرا کے پیچھے آکر پانی اچھالنے لگا۔ بھدرا خوفزدہ ہوکر پیچھے مڑ کر دیکھی۔ خلاف توقع اپنے محبوب کو قریب پاکر اس کا کمھلایا ہوا چہرہ چمک اٹھا۔

"تنگو دو دن تک کہاں رہے تم" بھدرا نے اس سے دریافت کیا "یہی تو میں تم سے پوچھنے والا تھا۔ ہمارے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے" بھدرا نے پانی بھرتے ہوئے کہا۔ "میں تمھاری راہ دیکھتے تھک گیا۔" اس نے قریب آکر بھدرا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ـــــ ہوں، بھدرا نے گھڑا سر پر اٹھا لیا ـــــ

"بھدرا! تم بڑی تنگ دل ہو دو دن تک صورت بھی نہیں دکھائی"۔ "کیسے صورت دکھاتی" بھدرا نے جواب دیا "وہ لوگ مجھے دیکھنے آئے تھے"۔ اب وہ ریت پر اپنا گھڑا رکھ کر بیٹھ گئی۔ "دیکھنے کیوں؟" تنگو کا دل دھڑکنے لگا۔

"شادی جو ہوگی" ـــــ "شادی!" تنگو نے بے چین ہوکر سوال کیا "کب ـــــ کس سے؟" "ندی پار والے گاؤں کے کھیا کے لڑکے سے، وہاں ان کے بہت سے کھیت ہیں۔" "کیا تم سچ مچ

شادی کرو گی بھدرا" ـــ تنگو نے مایوسانہ لہجہ میں اس سے سوال کیا۔ کیوں نہ کروں گی، بھدرا نے شوخ لہجہ میں جواب دیا، جوان جو ہو گئی ہوں"۔

" آہ بھدرا تم واقعی سنگ دل ہو۔ میں تمھارے بغیر بے موت مر جاؤں گا۔ رحم کرو میرے حال پر رحم کرو۔ آہ اب کیا ہوگا"۔

"دل گرفتہ نہ ہو تنگو" بھدرا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا" میں تم سے صرف مذاق کر رہی ہوں۔ میں مرتے دم تک تمھاری رہوں گی۔ دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایک دوسرے سے علیٰحدہ نہیں کر سکتی۔ مگر صرف موت!!

" کیا تم سچ کہہ رہی ہو بھدرا"۔ اس نے اپنی محبوبہ سے شک اور یقین کے ملے جلے لہجہ میں کہا ہاں! بالکل سچ کہتی ہوں"۔

"مگر کیا بات ہے مجھے یقین نہیں آتا"؟

" یقین کیوں نہیں آتا؟ جب کہ ہماری محبت کی گواہ اس ندی کی موجیں ہیں۔ یہ چاند، یہ ستارے یہ ہوائیں یہ شفق کی سرخیاں اور کائنات کا ذرہ ذرہ ہے"۔

تنگو اب بھدرا کے خوبصورت بالوں سے کھیل رہا تھا۔ کہنے لگا "پھر ہم بے خوف ہو کر ان سب سے الگ ایک نئی دنیا بسائیں گے"۔ ہاں اب مجھے جانے دو۔ ماں میرا انتظار کرتی ہو گی"۔ پھر کب ملو گی؟ ـــ تنگو نے اس کا بازو تھام کر اٹھاتے ہوئے کہا ـــ کل صبح ـــ بھدرا چپ چاپ گھڑا اٹھا کر گاؤں کی جانب روانہ ہوئی۔ تنگو کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔

تنگو رات بھر بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدلتا رہا۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ ندی کے کنارے پہونچ گیا۔ یہاں پہونچ کر اس کے دل کو کچھ سکون ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں راستہ پر لگی ہوئی تھیں۔ سورج افق مشرق سے بلند ہو چکا تھا۔ مگر تا حال بھدرا نظر نہیں آئی، انتظار کی گھڑیاں بھی کتنی تڑپانے والی ہوتی ہیں۔ تنگو کے دل میں بے شمار خیالات کا طوفان امنڈ رہا تھا۔ آنکھیں راہ تکتے تکتے تھک گئی تھیں۔ اور اب وہ مایوسیوں کے سمندر میں ڈوبا چلا جا رہا تھا۔ اس نے خیال کیا شاید آج وہ نہ آئے گی۔ عاجز ہو کر نیم کے گھنے سایہ کے نیچے لیٹ گیا۔ درخت کے ٹھنڈے سایہ اور ندی کی پرکیف ہوا نے اسے بہت جلد نیند کی آغوش میں سلا دیا۔ کافی دیر کے بعد اس کی آنکھیں کھلیں۔ اس نے دیکھا بھدرا اس کے پیروں کے پاس غمگین بیٹھی ہے۔

" بھدرا"! ایک مسرت آمیز آواز اس کے منہ سے نکلی۔ بھدرا رو رہی تھی۔ اس کی نرگسی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپک رہے تھے"۔ بھدرا کیا بات ہے"۔ تنگو نے حیرت و استعجاب میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں کہا ـــ "شادی طے ہو گئی" اس نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

" تیری شادی طے ہو گئی، آہ اب کیا ہوگا" شدت غم سے وہ تھر تھرا رہا تھا۔ اور بھدرا ابھی مسلسل آنسو بہا رہی تھی۔

تنگو پریشانی کے عالم میں اپنے گھر چارپائی پر پڑا ہوا تھا۔ آہ خدا اب کیا ہوگا، اس نے دیوانگی کی حالت میں کہا، بات طے ہو گئی! ـــ بیٹا! ـــ آرام کرو ـــ میں اس سے اچھی دلہن تیرے لئے بیاہ لاؤں گی۔ اس کی ماں نے تسلی آمیز لہجہ میں کہا۔

تنگو سو گیا تھا اس نے خواب میں دیکھا ندی کی لہریں بڑی زور شور کے ساتھ اٹھ اٹھ کر ساحل کی بڑی بڑی چٹانوں سے

مسکرا رہی ہیں۔ بھدرا کے والدین اس کی شادی کرنے کی غرض سے ندی کے اس پار ناؤ میں بیٹھ کر جا رہے ہیں۔ بھدرا رنگین لباس میں مغموم بیٹھی ہوئی ہے اس کی نگاہیں ندی کے ساحل پر لگی ہوئی ہیں۔ جہاں اس نے عہد طفلی کے رنگین لمحات گزارے تھے۔ ناگاہ ایک زبردست لہر آئی اور ناؤ چٹان سے ٹکرا گئی —— آہ —— تنگو نے اس وحشتناک خواب سے متاثر ہو کر ایک دلدوز چیخ ماری، سارے گھر کے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے —— اور اس کی دیوانگی پر آنسو بہانے لگے۔ وہ بڑبڑاتا ہوا ندی کی طرف چل دیا "میں ابھی تجھے بلاؤں سے نجات دلاتا ہوں" اس نے دیکھا کچھ لوگ ناؤ میں سوار ہیں۔ دفعتاً اس کی نگاہیں بھدرا کے چہرے پر جا پڑیں جو ان سب سے الگ ناؤ میں بیٹھی ہوئی بے اختیار آنسو بہا رہی تھی یکبارگی اس کی زبان سے نکلا۔ بھدرا!! اور ندی میں پھاند کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ بھدرا نے جواب دیا "تنگو میں بھی آتی ہوں" اور وہ بھی بے تحاشہ ندی میں کود پڑی کوئی نصف لمحہ بعد دونوں لاشیں ایک دوسرے سے وابستہ سطح آب پر نظر آئیں۔ اور قبل اس کے کہ انھیں نکالا جائے وہ ایسی غائب ہوئیں کہ صدیاں گزر گئیں آج تک پتہ نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دونوں دیوتا تھے۔ دنیا والوں کو محبت کا سبق دینے کے لئے آئے تھے۔ اور پھر مقررہ وقت پر دونوں ندی میں سما گئے۔

آج بھی جنوبی ہند کی مشہور ندی "تنگ بھدرا" ان کی نہ مٹنے والی محبت کی داستان آہستہ آہستہ سناتی ہوئی اس طرح بہہ رہی ہے جیسے کسی قابل عظمت جنازے کے ساتھ ایک مغموم جلوس رواں ہوتا ہے۔

صابر کوسگوی

غزل

وارفتگیٔ دل نے چلن ہی بدل دیا — گویا مزاج چرخ کہن ہی بدل دیا
اب ہے ہر ایک درد میں پہلو نشاط کا — دل نے مذاق رنج و محن ہی بدل دیا
دیکھیں سفر میں اس کی طرف کیا اٹھا کے آنکھ — غربت نے رنگ صبح وطن ہی بدل دیا
منصور خاک دار و رسن سے عذر کرے — جب مدعائے دار و رسن ہی بدل دیا
ہم کو تو زندگی سے بہت کچھ امید تھی — دست قضا نے جامۂ تن ہی بدل دیا
نیرنگ کیا کیا یہ ہوائے بہار نے — بیٹھے بٹھائے رنگ چمن ہی بدل دیا

کیا بیسویں صدی کی منور ہے یہ غزل
تم نے تو اس میں طرز سخن ہی بدل دیا

منشی بشیشور پرشاد منور (لکھنوی)

عثمانیہ کالج اور جامعہ عثمانیہ کی چند پرانی باتیں (بسلسلۂ گزشتہ)

عثمانیہ کالج کے افتتاح کے باعث دار العلوم کالج کا جو مکان کرایہ پر لیا گیا تھا وہ خالی کر دیا گیا۔ اور دار العلوم کی کالج کی جماعتیں یعنی کامل (دو سالہ) فاضل (دو سالہ) عالم (ایک سالہ) دبیر (ایک سالہ) اس طرح یہ چھ جماعتیں عثمانیہ کالج میں شعبۂ دینیات کی حیثیت سے منتقل ہو گئیں۔ مولوی و منشی اور انگریزی کی اسپشل جماعت جو دار العلوم کالج میں باقی تھیں ان کو شہر میں منتقل کر دیا گیا گویا ہائی اسکول دار العلوم باقی رہا اور دار العلوم کالج کا نام و نشان معدوم کر دیا گیا۔ یا دوسرے الفاظ میں اس نے عثمانیہ کالج کا قالب اختیار کر لیا۔ عثمانیہ کالج کا شعبۂ دینیات جو دار العلوم کی باقی ماندہ جماعتوں پر مشتمل تھا بتدریج جدید قالب میں منتقل ہو گیا۔ غالباً چھ یا سات سال کے بعد پوری طرح شعبۂ دینیات کی کلاسیں ایف اے، بی اے، اور ایم اے قائم ہو گئیں اور عالم فاضل، کامل ختم ہو گئے۔

یہاں یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ جو طلبہ دار العلوم عثمانیہ کالج کے شعبۂ دینیات میں منتقل ہو گئے تھے ان کی کامیابی کے بعد (جو قدیم نصاب میں ہوتی تھی) جو اسناد دئے گئے ان میں ان طلبہ کو طلبہ جامعہ عثمانیہ لکھا گیا ہے۔ اس طرح وہ عثمانی طلبہ کہے جا سکتے ہیں۔

چونکہ عالم اور دبیر کی جماعتوں میں تاریخ اسلام کیمیا اور طبعیات کا درس بھی شامل تھا اس لئے ان کی تعلیم کے لئے عثمانیہ کالج کے پروفیسر یعنی جمیل الرحمن صاحب، وحید الرحمن صاحب اور چودھری برکت علی صاحب ہی کا اوقات مقرر ہوئے تھے۔

عثمانیہ کالج کی صدارت پر ایک عرصہ تک کسی کا تقرر نہیں ہوا۔ ناظم تعلیمات ہی اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔ اس طرح مہدی یار جنگ اور پھر راس مسعود صاحب اس کے صدر رہے۔

مولوی حمید الدین[1] صاحب بی اے ایک دو ماہ تک شعبۂ دینیات کے صدر رہے۔ اس کے بعد انہوں نے کنارہ کشی اختیار

---

[1] مولوی حمید الدین مرحوم، علامہ شبلی کے قریبی عزیز تھے، الہ آباد یونیورسٹی سے دار العلوم کالج کی صدارت پر (صلہٗ الست) ماہوار سے آئے تھے۔ مولوی صاحب عربی کی اچھی قابلیت رکھتے تھے۔ خصوصاً تفسیر قرآن میں بڑی مہارت تھی۔ مولوی وحید الدین سلیم اپنے تقرر سے پہلے کئی ماہ تک مولوی صاحب کے یہاں رہے تھے اور اسی یہانی کے زمانے میں ان کا تقرر عثمانیہ کالج میں ہوا۔ مولانا حمید الدین راقم کے نانا کے مکان کے ایک حصہ میں کرایہ سے مقیم تھے اس لئے مولانا اور مولوی سلیم سے میری اچھی ملاقات تھی وہ مجھے اپنا شاگرد تصور کرتے تھے۔ گو کہ میں نے کوئی کتاب ان سے نہیں پڑھی اور نہ کوئی درس لیا۔

کرلی اور الہ آباد واپس ہوگئے، مولوی صاحب موصوف کو خیال تھا کہ انھوں نے جامعہ عثمانیہ کے قیام وغیرہ میں عملی حصہ لیا تھا اس لئے انھیں صدر عثمانیہ کالج بنایا جائے گا۔ جب وہ صدارت عثمانیہ کالج پر مامور نہیں کئے گئے تو دل برداشتہ ہوکر چلے گئے، ان کے جانے کے بعد ایک عرصہ تک شعبۂ دینیات کے صدر کی جگہ خالی رہی اس کے بعد مولوی عبدالقدیر صاحب کا تقرر اس خدمت پر ہوا۔

راس مسعود صاحب کی واپسی کے بعد وہ نظامت تعلیمات کے ساتھ عثمانیہ کالج کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے مگر ظاہر تھا دونوں کام ایک شخص کے بس کے نہیں تھے بالآخر عثمانیہ کالج کی صدارت پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب کا تقرر ہوا اور وہ پٹنہ کے کالج سے طلب کئے گئے۔

اگرچہ ڈاکٹر صدیقی صاحب باہر سے طلب ہوئے تھے مگر ان کو حیدرآباد سے خاص تعلق تھا۔ ان کے دادا مختارالملک کے زمانے میں ناظم فوجداری تھے، والد بھی سررشتہ عدالت میں مامور تھے، چچا سالار جنگ کے اسٹیٹ میں تحصیلدار تھے، صدیقی صاحب کی پیدائش حیدرآباد میں ہوئی ابتدائی تعلیم ہائی اسکول تک انھوں نے گلبرگہ میں پائی تھی۔

قبل اس کے کہ مزید صراحت صدارت وغیرہ کے متعلق کروں کچھ دوسرے حالات کا تذکرہ ضروری ہے، جو اس کے پیشتر ہوئے تھے۔

عثمانیہ کالج کے افتتاح کے بعد اس کے انتظامات، تنظیم، اوقات درس وغیرہ کے متعلق مختلف کمیٹیاں ہوتی تھیں جس میں نامور شدہ اساتذہ شریک ہوتے تھے اور ان کی صدارت کے فرائض مسٹر ولنکر کے ذمہ ہوتے تھے کیونکہ وہ سینیر پروفیسر تھے۔ ان کمیٹیوں کے تمام کام اردو میں ہوا کرتے تھے۔

"کالج یونین" کے متعلق بھی ایک مرتبہ بحث پیش ہوئی جس طرح دارالعلوم کے فرنیچر، آلات سائنس، کتب خانہ سے عثمانیہ کالج کے لئے استفادہ کیا گیا اسی طرح دارالعلوم کی "انجمن ثمرۃ الادب" "کالج یونین" کے لئے خوان یغما ثابت ہوئی۔ اس کا کتب خانہ جس میں اس وقت تک کی شایع شدہ اردو کی جملہ کتابیں موجود تھیں، "یونین" کے کتب خانے کو دے دیا گیا۔ عبدالمجید صدیقی اس کے آخری معتمد مقرر ہوئے تھے، فخر یار جنگ کی صدارت میں اس کا یہ آخری جلسہ سالانہ ہوا تھا۔

"انجمن ثمرۃ الادب" دارالعلوم کی انجمن تھی، اس کی معتمدی کے فرائض کئی سال تک راقم کے ذمہ تھے، انجمن سے ایک ماہوار رسالہ ثمرۃ الادب بھی شایع کیا گیا تھا۔ اس زمانے میں چونکہ دارالعلوم میں انگریزی جماعتیں قایم ہو چکی تھیں گویا جامعہ عثمانیہ کا علمی ظہور ہو چکا تھا اس لئے اس رسالہ کے جو مقاصد مقرر کئے گئے تھے ان میں سے بعض کی صراحت یہاں ضروری ہے۔

(۱) عثمانیہ یونیورسٹی کے لائق اساتذہ کی تحقیقاتوں کی اشاعت تاکہ اہل ملک اس سے فائدہ حاصل کرسکیں اور ان کو یہ معلوم ہوتا رہے کہ ہماری تعلیمی مشین کس رفتار سے چل رہی ہے۔

(۲) طلبہ کے خیالات کا ملک کے سامنے پیش کرتے رہنا تاکہ اولیاء کو اپنے اقرباء کی تعلیمی ترقی کا وقتاً فوقتاً علم ہوتا رہے اور ہمارے اہل ملک پر ظاہر ہوتا رہے کہ ہماری یونیورسٹی طلبہ کو صرف کتابیں پڑھا کر اسناد ہی نہیں دیتی بلکہ اس کے ساتھ ان کو علمی تلاش و تجسس کا بھی خوگر بناتی ہے۔

ان مقاصد سے واضح ہوسکتا ہے کہ عملاً دارالعلوم اور اس کے اساتذہ اور طلبہ نے جامعہ عثمانیہ کا کام شروع کردیا تھا اور وہ اپنے آپ کو مادر جامعہ کے فرزند تصور کرتے تھے۔

رسالۂ ثمرۃ الادب کے یہ مقاصد صرف تحریری نہیں تھے بلکہ

رسالہ میں ایسے مضامین شائع بھی ہوتے تھے چنانچہ چودھری برکت علی
بابو امرت لال سہیل، اور پروفیسر جمیل الرحمٰن صاحب کے متعدد
مضامین اس رسالہ میں شائع ہوئے تھے جن کو تحقیقی مضامین
قرار دینا ضروری ہے۔

یہ میں لکھ چکا ہوں کہ عثمانیہ کالج کے لئے دارالعلوم
بلدہ اور اورنگ آباد کے مشرقی مدرسہ میں طلبہ تیار ہوتے
تھے، اس کے علاوہ بعض دیگر، اس سے بھی اسکول فائنل کامیاب طلبہ
شریک ہونے لگے اور جب کہ بی اے کھل گیا تو بعض نظام کالج
کے طلبہ نے بھی اسی کالج میں اپنا نام شریک کرا دیا۔ اس قسم کے
طلبہ میں محمد علی خاں صاحب (پروفیسر نظام کالج) اور سید حسن علی خاں
صاحب (انجینیر ریلوے) یوسف الدین صاحب (مدرس مدرسہ
فوقانیہ نام پلی) غالباً ظہیر الدین صاحب بی سی ایس وغیرہم ہیں۔
اسی طرح علی گڑھ کالج سے بھی کئی حیدرآبادی طلبہ یہاں آکر
شریک ہوگئے جن میں ڈاکٹر میر سیادت علی (مددگار معتمد عدالت
وامور عامہ) ڈاکٹر ولی الدین (مددگار پروفیسر عثمانیہ کالج)۔
صلاح الدین (مددگار پروفیسر عثمانیہ کالج) وغیرہ شامل ہیں،
غالباً میر اکبر علی خاں صاحب بھی علیگڑھ ہی سے واپس آئے تھے۔

دارالعلوم ہائی اسکول سے کئی سال تک برابر وہ طلبہ
آتے رہے جو مولوی اور منشی کی کامیابی کے بعد صرف انگریزی
کے پرچہ میں کامیابی حاصل کرکے عثمانیہ کالج میں شرکت کرتے تھے۔
ایسے طلبہ میں ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر منور علی، انتقال الدین
انجینیر، ابو النصر فتح اللہ مرحوم بی سی ایس وغیرہ کئی نام آور طلبہ
شامل تھے۔

جامعہ عثمانیہ کا پہلا امتحان انٹرمیڈیٹ ۱۳۳۹ف ۱۹۲۱ء میں
ہوا۔ (۱۱۹) امیدواروں نے اپنے نام بھیجے مگر امتحان میں (۱۱۶)

طلبہ شریک ہوئے، جن میں سے (۹۱) طلبہ کامیاب ہوئے اس زمانے
میں باہر کے طلبہ بھی شریک امتحان ہوتے تھے۔ اس لئے جو طلبہ کالج
سے شریک ہوئے تھے وہ (۹۷) تھے باقی طلبہ عثمانیہ کالج سے غیر متعلق
تھے۔ ان (۹۷) طلبہ کے منجملہ (۸۵) نے کامیابی حاصل کی تھی۔

تحریر کی رو میں میں بہت آگے نکل گیا مجھے تو افتتاح کے
دن کی کچھ اور باتیں لکھنی ہیں۔ خیر ان کی صراحت یہاں کردی جاتی ہے،
کیونکہ ہمارے مضمون کو کوئی تسلسل تو ہے نہیں چند پرانی باتوں کا
اظہار مقصود ہے۔

جامعہ عثمانیہ کے باعث اس وقت طیلسانیوں کے "گون"
اور "ہڈ" نئی چیز نہیں ہیں، لیکن افتتاح کالج کے دن جب بعض
مہمان اور پروفیسران کالج اسی علمی لباس میں آئے تو ہمارے لئے
ایک نئی چیز معلوم ہو رہی تھی، سیاہ گون اور رنگ برنگ کے ہڈ ایک
خاص سماں پیدا کر رہے تھے۔

چاہئے تو یہ تھا کہ کالج کے افتتاح کے دن مکان وغیرہ
جھنڈیوں سے آراستہ کیا جاتا مگر آراستگی کی جانب کسی نے
توجہ نہیں کی تھی۔ اخباری نمائندے بھی غالباً ایک دو کے سوا زیادہ
نہیں تھے۔

عبدالحمید خاں صاحب کا تقرر تو ہو چکا تھا مگر وہ غالباً
جلسہ کے دن حاضر نہیں تھے، خلیفہ عبدالحکیم صاحب، وحید الرحمٰن صاحب،

اور جمیل الرحمٰن صاحب کئی ماہ تک ایک ہی مکان میں رہا کرتے تھے۔

اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو ابتداً دارالعلوم ہی کی بورڈنگ عثمانیہ کالج کے لئے استعمال کی گئی اس کے بعد مسرت منزل کا مکان بورڈنگ کے لئے دیا گیا اور وحید الرحمٰن صاحب اس کے نگران کار مقرر ہوئے

سر اکبر جب حیدرآباد سے بمبئی کی صدر محاسبی پر چلے گئے۔ اور راس مسعود صاحب بھی رخصت پر گئے تو ان دونوں کے وداعی جلسے کالج کی جانب سے آغا منزل میں ہوئے تھے۔ سر اکبر کے رخصتی جلسہ میں جو تقریریں ہوئیں ان میں کالج کی ایک دو تقریروں کے علاوہ سید خورشید علی صاحب نے بھی تقریر کی تھی۔ اور بطور خاص لیڈی حیدری کا شکریہ ادا کیا تھا۔

کالج میں کئی سال تک مسلسل میلاد کے جلسے نہایت شاندار پیمانہ پر ہوتے رہے، اس قسم کے جلسوں کے انتظامات وحید الرحمٰن صاحب نہایت سلیقہ سے کرتے تھے۔

قبل ازیں میں نے صراحت کر دی ہے کہ کالج میں "یونین" قائم کرنے کے متعلق بحث مباحث ہوئے تھے، مجھے یہ نہیں معلوم کب "یونین" قایم ہوئی، جہاں تک مجھے معلومات ہیں، ابتدائی سال تو یہ قائم نہیں ہوئی تھی۔ البتہ جس مرتبہ یونین کی صدارت میر سیادت علی خاں کو ملی تھی (غالباً دوسری صدارت تھی) انھوں نے اپنے خطبہ میں دارالعلوم وغیرہ کی تفصیلی صراحت کی تھی۔ اور ان کا خطبۂ صدارت خاص طور پر پسند کیا گیا تھا۔

ڈاکٹر عبدالستار صاحب کے زمانے میں بعض وجوہ سے مولوی عبدالواسع صاحب شعبۂ دینیات میں منتقل ہو گئے اور ان کی جگہ دینیات لازمی پر مولانا مناظر احسن صاحب کا تبادلہ ہو گیا۔

خواجہ نعمت اللہ خاں صاحب (صدر مہتمم تعمیرات نزل) وہ پہلے عثمانی ہیں جن کو سرکار عالی نے یورپین وظیفہ عطا فرمایا خواجہ صاحب جامعہ سے صرف ایف اے کی کامیابی کے بعد وظیفہ حاصل کرکے یورپ گئے تھے۔

اسی زمانے میں کالج کے پروفیسروں کو بھی تعلیمی فرصت اور رخصت کا حق منظور ہوا تھا۔ اس سے استفادہ کرکے خلیفہ عبدالحکیم صاحب، وحید الرحمٰن صاحب اور عبداللطیف صاحب یورپ گئے تھے۔ اول الذکر اور آخر الذکر ڈاکٹری کی ڈگریاں لے کر واپس ہوئے خلیفہ صاحب کی جگہ مولوی عبدالباری صاحب کا مستقلاً تقرر ہوا تھا۔

کئی سال تک مسلسل ایک نہ ایک پروفیسر کا انتقال ہوتا رہا۔ سب سے پہلے مولانا محمد ادریس فرنگی محلی کا انتقال ہوا، پھر سری کنٹیا، چودھری برکت علی، مولوی عبدالواسع، مولوی شبیر علی، مولوی اشرف شمسی، مولوی سلیم وغیرہ وغیرہ تقریباً دس بارہ اساتذہ یکے بعد دیگرے انتقال کرتے رہے۔

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صاحب غالباً تین چار سال کے بعد واپس ہو گئے ان کی جگہ عبدالرحمٰن خاں صاحب کا تقرر ہوا، خاں صاحب اس کے پیشتر نظام کالج میں طبعیات کے پروفیسر تھے، جامعۂ عثمانیہ سے بحیثیت رکن کمیٹی اصطلاحات وغیرہ آپ کا تعلق شروع سے تھا۔ آپ کے زمانے میں کالج میں جو جو اصلاحات ہوئیں، ترقیاں ہوئیں، انتظامات ہوئے، ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ اور نہ مجھے پوری طرح ان کا علم ہے۔ البتہ ایک بات جس کو کوئی شخص فراموش نہیں کر سکتا وہ یہ ہے کہ آپ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے جامعہ کے فارغ التحصیلوں کی سرپرستی

کرکے ان کو کالج میں امور فرمایا ان کو یوروپین وظائف دلائے اور بعد واپسی پروفیسری کی خدمتوں پر تقرر فرمایا۔ غالباً ہندستان کی جامعات میں ایک عثمانیہ یونیورسٹی ہی ہے جہاں اس کے اپنے فرزند بہ تعداد کثیر پروفیسر، لکچرار اور ریڈر کی خدمت پر امور ہیں۔

اب اور کہاں تک تفصیل پیش کی جائے ممکن ہے اس میں سے بہت سی باتیں لوگوں کو معلوم ہوں مگر آیندہ تاریخ کے لئے ان کا مرتب ہوجانا مناسب ہے، کیا فرزندانِ عثمانیہ کالج کم ازکم اپنے جامعہ کے جملہ فرزندوں کی فہرست مرتب کرنے کی کوشش کریں گے؟ جامعہ کے جشن سیمین کے موقع پر (جس کے لئے ابھی سے تیاری کرنی چاہیئے) ایسی فہرست نہایت ضروری ہے۔

نصیرالدین ہاشمی

روحِ فغفور

دخترِ خواجگی روحِ غارت گری
جہل و افلاس کے تخت پر جلوہ گر
وہ شب اندام وہ قبر کی تیرگی
ناچتی کودتی شور کرتی ہوئی
پرچمِ غم ہوا میں نچاتی ہوئی
ایڑیوں سے دلوں کو کچلتی ہوئی
موت سے کہہ رہی تھی وہ یوں دمبدم
تیرے ترکش میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں
کیا میری کاکلوں میں بلائیں نہیں
کیا مجھے جوعِ ارضی نے پالا نہیں

موت کی ہم سفر مرگھٹوں کی پری
کچھ بچاری ادھر کچھ بچاری ادھر
میرے گھر میں وہ کل یک بہ یک گھس گئی
میری خوشیوں سے جیبوں کو بھرتی ہوئی
مسکراتی ہوئی کھلکھلاتی ہوئی
خون پی پی کے گرتی سنبھلتی ہوئی
اے مری ہم نفس اے مری ہم قدم
کونسی وہ ادا ہے جو مجھ میں نہیں
کیا تنفس میں میرے وبائیں نہیں
کیا یہ انسان میرا نوالا نہیں

پشتِ گیتی پہ میں بھی تو ناسور ہوں
دیکھ تو کون ہوں روحِ فغفور ہوں

مخدوم

خوں خوار تہذیب

۱۹۳۰ء میں جبکہ میں یورپ گئی تھی۔ مجھے یوروپین اقوام کے بعض خصائص نے نہ صرف اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ بلکہ دوران سفر میں بعض وقت حسرت پیدا ہوتی تھی کہ کاش ان لوگوں کی بعض خوبیاں کسی طرح ہماری ہندوستانی معاشرت میں اختیار کی جاسکتیں۔ اور ہم ان پر عامل ہوسکتے!! مثلاً پابندی اوقات مشاغل علمی و عملی و تفریح وغیرہ میں التزام اور انہماک۔ اصول حفظانِ صحت کی پابندی۔ اور سونے جاگنے، اٹھنے، بیٹھنے، لکھنے، پڑھنے غرض تمام مشاغل حیات میں انتہائی صفائی اور با اصولی۔ آقا و ملازمین کے تقسیم فرائض۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے طور طریق وغیرہ بہت سی باتیں ایسی تھیں جن پر غور و خوض کرنے کا مجھے تمام دورانِ سفر میں اتفاق رہا۔ اور واپسی کے بعد اپنے ملک اپنی قوم اور خاص اپنے گھر کی وہ تمام کوتاہیاں جن میں مجھے اصلاح کی ضرورت نہایت شدت اور شد و مد کے ساتھ محسوس ہو رہی تھی میری آنکھوں میں عرصہ تک خار بنی رہیں۔ اور بے ساختہ دل چاہتا تھا کہ کم از کم اپنے گھر میں ہی کسی طرح یوروپین اقوام کے وہ تمام محاسن جمع کردوں جنہوں نے مجھے ایک حد تک فریفتہ کر لیا تھا۔ اس وقت یہاں یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں کامیابی ہوئی یا نہیں۔ لیکن یہ لازمی امر تھا کہ مرورِ زمانہ سے رفتہ رفتہ اس اکراہ میں کمی آتی گئی۔

مگر ایک عجیب و غریب بات اس ضمن میں قابلِ ذکر یہ ہے کہ اس وقت اگر مجھے ہندوستانی معاشرت کا کوئی قبح و نقص ناگوار گزرتا ہے اور اس سے کچھ ناپسندیدگی پیدا ہوتی ہے تو فوراً بجلی کی تیزی سے ان مہذب قوموں کی موجودہ "خونخوار تہذیب" کا ایک موہوم مگر بھید ڈراؤنا نقشہ نگاہ کے سامنے پھر جاتا ہے۔ جس کے خوفناک مظاہرے نے آج کل یورپ میں قیامت صغریٰ برپا کر رکھی ہے۔ اور یورپ تو خیر ہلاکت و خوں ریزی کا میدان وحشت بنا ہی ہوا ہے۔ مگر اس سے ہزاروں میل فاصلے پر بسنے والی قوموں اور ملکوں کے اطمینان خاطر اور قلبی آسائشیں ان مدعیان علم و تہذیب کی باہم دست و گریبانی اور خون آشامی کی وجہ سے عنقا ہوچکی ہیں۔ معاذاللہ

مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ؕ ۔

اور اب ان لوگوں کے چشم دید اوصاف و محاسن کا خیال آتے ہی حالیہ تباہ کاریوں کے خفیف ترین تصورات سے دل میں لرزہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اور نفرت کا احساس رگ و پے میں دوڑ جاتا ہے۔ کیا یہ وہی قوم و ملک ہیں جنہوں نے گویا علم و تہذیب کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اور جو آج عقل و سائنس کے معراج کمال پر پہونچی ہوئی ہیں؟ جن کی علم و تحقیقات نے تمام دنیا کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دی ہے۔ جن کی ایجاد و اختراع کے سامنے بڑے بڑے مشرقی ممالک کے سر نگوں ہو گئے اور دنیا کے تمام بازار ان کی مصنوعات سے مالا مال ہو کر اپنی صنعت کاریوں کے لئے سرد ہو گئے؟ کیا یہ وہی ہیں جن کی اندھی تقلید نے خصوصاً ہم ہندوستانیوں کو

مجنوں بنا کر اپنی ہر خوبی اور اپنے اسلاف کی روایات خیر سے روگرداں اور باغی کر دیا ہے۔ اور وہ نہ صرف خود بالکل مغربی ہو کر رہ گئے ہیں۔ بلکہ اپنی بیوی بہن اور بیٹیوں پر بھی یہی جادو چلانا اپنا عین ایمان سمجھتے ہیں۔ انہی کی ریس میں اپنے مذہب سے دور ہو گئے/ اور ہوتے جا رہے ہیں۔ اور ان کی طرح اس حیات دو روزہ کی رنگا رنگی اور خودی کے بھنور میں پھنس کر حیات بعد الممات کے خیال کو بالکل پس پشت ڈال دیا ہے ؟۔

آج کل مغرب جس ہیبتناک مقتل کا نمونہ بنا ہوا ہے کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کو روحانیت نہ سہی مگر انسانیت سے شمہ بھر بھی کچھ واسطہ ہے ؟ یہ تمام دنیا کی آزادی کا ٹھیکہ دار اور ہندوستانی آزادی کا خصوصاً دعویدار اور علمبردار جرمن جس طرح یکے بعد دیگرے چھوٹی قوموں کو ہوائی بموں اور مشین گنوں کے ذریعہ بے ڈکار ہضم کرتا چلا جا رہا ہے۔ کیا اسی کا نام تہذیب و انسانیت ہے ؟۔ اس دشمن انسانیت کا اس طرح کمزور قوموں کو اپنی بڑھی ہوئی جنگی قوتوں سے مغلوب و مفتوح کرنا خدارا بتائیے کس اصول تہذیب و آئین و شائستگی کی رو سے جائز ہو سکتا ہے ؟ ؟۔ روحانیت اور مذہب کو تو چھوڑ دیئے کہ اس کا تو نام ہی ان لوگوں کے خلاف شان ہو گیا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس سے زیادہ درندگی وحشت اور بے آئینی کا زمانہ کوئی اور آ سکتا ہے۔ سب سے زیادہ ہنسی اس وقت آتی ہے جب کہ جرمن ریڈیو کی طرف سے بے چارے مظلوم غریب کس مپرس جاہل بے تہذیب ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی کے بے پناہ جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں پر بڑے مظالم ہو رہے ہیں۔ اور وہ ہوتے ان کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے اور ویسا کیا جاتا ہے۔ ان بے چاروں کو صدیوں سے غلام بنا رکھا ہے وغیرہ وغیرہ۔ کوئی ان شیطانوں سے پوچھئے کہ بھائیو ! تم نے اپنی ہمسایہ بے گناہ چھوٹی قوموں کے ساتھ کیا کیا ؟۔ ان کو کن خطاؤں کی پاداش میں پیس کر رکھ دیا۔ اور ان کا نام دنیا کے نقشہ سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا۔ اب ان کا صفایا اور تیا پانچا کرنے کے بعد تم کو ہندوستان یاد آ رہا ہے۔ بقول شاعر

توبہ فرمودی و خود توبہ نمی کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

ہندوستانی لاکھ گئے گزرے جاہل نادان سہی۔ مگر کمزور و بے گناہ ممالک کے ساتھ آپ کا یہ حسن سلوک دیکھنے کے بعد آپ کو اپنا ہمدرد اور ناصح مشفق تو سمجھنے سے رہے۔ !!!! بھیڑیے کی دوستی کا غریب بکریاں کس طرح یقین کریں۔ بی بی بلائی بخشو۔ مرغا بے دُم کا ہی بھلا۔ ہم بے تہذیب گنوار ہندوستانی ایسی تعلیم یافتہ مہذب قوموں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ جن کی خونخواریوں اور علم و عقل کے کمال نے انسانی خون کو اتنا ارزاں کر دیا ہے کہ اس کی ندیاں بہانے کے بعد بھی ان خون آشاموں کی پیاس بجھائے نہیں بجھتی۔ جن کی تباہکاریوں نے ان وحشی قزاقوں کی لوٹ مار اور قتل و غارت کو مات کر دیا۔ جن کے افسانے ہم سنتے آئے تھے۔ ہمارا سو سو سلام ہے اس مردم خور تہذیب و شائستگی کو اور علم و کمال کی اس معراج کو جس پر پہونچ کر ہمارے اور جانوروں کے درمیان کوئی فرق ہی باقی نہ رہے۔ اس خون آشام تہذیب کے محاسن ہمارے سامنے سانپ اور شعلے کے حسن کی مثال پیش کرتے ہیں۔ جو ظاہری دلفریبی کے ساتھ ہی ساتھ جاں ستاں اور قاتل ہے۔ ہم لوگوں کو چاہیے کہ مغربی اقوام کے

ان بدترین حالات و اعمال سے سبق حاصل کریں اور اپنی روایات کو نظر استحقار سے دیکھنا چھوڑ دیں۔ خاص کر تہذیب جدید نے روحانیت کو انسانیت سے جدا کر کے جو بدترین مثالیں دنیا کے سامنے پیش کی ہیں۔ ان پر پورے طور سے کما حقہ غور کریں کہ اس ایک نکتہ میں بے شمار باریکیاں پوشیدہ ہیں۔ یہ جنگ نہیں بلکہ عذاب الٰہی ہے جو خدا سے دور اور خودی سے قریب اقوام پر نازل ہوا ہے۔ ہم کو چاہیے کہ اس پُرفتن زمانے میں اپنے اعمال و افکار و اقوال کی خبر لیں اور اس جنگ سے مفید سبق سیکھیں۔

علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ نے ان لوگوں کی بابت فرمایا تھا ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو، خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

آج اس کی صحت میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔

انیسہ ہارون بیگم شروانیہ

غزل

دل کا جب غم شعار ہی نہ رہا — دل کا پھر کچھ شمار ہی نہ رہا
اس کرم کا بھی کچھ ٹھکانہ ہے — کوئی امیدوار ہی نہ رہا
ہوسِ آشیاں ہو کیا مجھ کو؟ — عہدِ برق و شرار ہی نہ رہا
میری قدرت تری رضا! گویا — کچھ مجھے اختیار ہی نہ رہا
غم میں خوش ہوں تو وہ سمجھتے ہیں — غم مجھے ناگوار ہی نہ رہا
آپ نے اب نقابِ رُخ الٹا — جب کوئی ہوشیار ہی نہ رہا

نعمتِ درد کیا ملی تابشؔ؟
کچھ ہمیں سازگار ہی نہ رہا

مسعود الحسن تابش

حالی اور مقدمۂ شعر

زندگی کی طرح ادب بھی ارتقاء کی ایک پہیلی ہے۔ لہذا کسی ادبی تحریک کی ابتدا اور انتہا کا صاف و صریح طور پر تعین کرنا بڑا ہی نازک مسئلہ ہے۔ بسا اوقات محض سہولت کی خاطر کسی ایک مقام سے کسی ادبی تحریک کی ابتدا کرنی پڑتی ہے اور کسی ایک نقطہ پر لاکر اسے ختم کرنا پڑتا ہے۔ جدید اردو شاعری کا یہی حال ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ۱۸۷۴ء میں اس کی ابتدا ہوئی جبکہ کرنل ہالرائیڈ (ناظم تعلیمات پنجاب) کی تحریک اور محمد حسین آزاد کی بے لاگ کوششوں کی بدولت ایک خاص نوعیت کے مشاعرے لاہور میں ہونے لگے۔ جن میں شعرا کی طبع آزمائی کے لیے بجائے طرح مصرعوں کے موضوعوں کا اعلان کیا جاتا تھا۔ اس زمانے کا لحاظ کرتے یہ ایک انقلابی قدم تھا اور اس میں شک نہیں کہ بانیانِ مشاعرہ نے اردو نظم میں نئی راہیں نکالنے اور مغربی ادب کی وساطت سے اردو شاعری میں وسعت پیدا کرنے کے خیال سے یہ انوکھا تجربہ کیا تھا جو کامیاب بھی رہا۔

اس مشاعرے کے موضوعوں کا خاصہ اندازہ ہمیں محمد حسین آزاد اور خصوصاً حالی کی ابتدائی مثنویوں سے ہوتا ہے جو بعد کو "مجموعۂ نظم حالی" کے عنوان سے دوسری نظموں کے ساتھ علی گڑھ سے شائع ہوئیں۔ غالباً یہ مثنویاں محمد حسین آزاد کی مثنویوں سے زیادہ مقبول ہوئیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آزاد کی مثنویوں سے نسبتہً بہتر بھی ہیں۔ کچھ دنوں بعد شعرا کا یہ دنگل بچھڑ گیا۔ حالی نے علیگڑھ کی راہ لی جہاں ان کی شاعری نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔ آزاد لاہور ہی میں رہے لیکن نظم کو چھوڑ کر نثر کا میدان لیا جس میں انہوں نے وہ بات پیدا کی جو ان کی نظم میں نہیں۔

حالی کی مثنویوں کے عنوانات ہیں ' برکھا رت '، نشاط امید، حب وطن اور مناظرہ رحم و انصاف۔ سرخیوں کے علاوہ ان مثنویوں کا اسلوب بھی صاف بتا رہا ہے کہ یہ قدیم شعرا اور ان کی قدامت پسندانہ روش کے خلاف بغاوت کا ایک کھلا اعلان تھا۔ یہ نظمیں جو آج کسی قدر روکھی پھیکی معلوم ہوتی ہیں' اس زمانے میں بہت مقبول ہوئیں اور ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اس لئے کہ ملک کا بدلا ہوا مذاق اور ماحول ان کے موافق تھا۔ ایک حیثیت سے حالی کے دو پیشرو (غالب اور نظیر) ان کے لئے زمین بھی ہموار کر چکے تھے۔ یوں بھی حالی غالب کے شاگرد تھے' اس لئے غالب کا اثر حالی کی روش اور ان کی ابتدائی کوششوں پر پڑنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ یادگار غالب، مرثیہ غالب اور دیوان حالی کی بعض غالب نما غزلیں اس کا روشن ثبوت ہیں۔ البتہ نظیر اکبرآبادی کا انہوں نے کوئی اثر لیا یا نہیں' اس کے بارے میں قطعیت کے ساتھ ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔

حالی کے وسیع مطالعے سے (جس کا ثبوت ان کے لکھے ہوئے "مقدمہ شعر و شاعری" سے ملتا ہے) بعید بھی نہیں کہ انہوں نے نظیر سے کچھ نہ کچھ ضرور اخذ کیا ہوگا۔ لیکن صاف اعتراف سے وہ غالباً اس لئے ہچکچائے کہ خوش ذوق حضرات غریب نظیر کو حال حال تک ایک تک بند اور بازاری شاعر ہی سمجھتے رہے۔

لیکن مرزا غالب یا لاہور کی تحریک نے حالی کو حالی نہیں بنایا۔

حالی کی نئی شاعری اور ان کی بے نظیر شہرت کا مدار تمام و کمال علیگڑھ کی تحریک سے وابستہ ہے، جس کے بانی اور روحِ رواں خود سرسید تھے۔ سرسید ہی نے انھیں اکسایا اور چمکایا، اور حالی نے بھی نہایت خلوص کے ساتھ ان کا ساتھ دیا۔ حالی کی وہ مقبولِ خاص و عام نظم جسے ان کی زندگی کا حاصل کہنا چاہیے (یعنی مسدس مدوجزر اسلام مطبوعہ ۱۸۷۹ء) سرسید ہی کی عظیم شخصیت سے دوچار ہونے کے بعد لکھی گئی تھی۔ خود اس نظم کے دیباچہ کے بعض مقامات حالی کی بے پایاں عقیدت کا جو انہیں سرسید سے تھی، کھلا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ہر متعلم ادب کو دیباچہ اور مسدس غور سے پڑھنا چاہیے۔ ادبی اور تاریخی حیثیت سے ان دونوں کی بڑی اہمیت ہے

حالی کو مرے کوئی پچیس چھبیس سال ہوتے ہیں اس ربع صدی میں اردو ادب نے بہت کچھ ترقی کی۔ بہتیرے پرخلوص خدمت گزار اور ادیب پیدا کئے، اور ناساعد حالات کے باوجود ہماری زبان نے بہت کچھ مقبولیت اور ہمہ گیری حاصل کی۔ لکھنؤ اور دہلی کے قدیم حصاروں کو توڑ کر اردو نے اب کئی ایک مستقل مراکز اپنے طور پر قائم کر لئے ہیں، جن میں پنجاب اور دکن خاص طور پر بڑے سرگرم صوبے ہیں جہاں کسی نہ کسی روپ میں اردو کو آگے بڑھانے اور پروان چڑھانے کی عملی کوششیں ہو رہی ہیں۔ یہ سب ثمرہ ہے ان خدمت گزاروں کی بے لاگ کوششوں کا جنھوں نے ابتدا علیگڑھ کو علیگڑھ اور لاہور کو لاہور بنایا۔ ان دونوں مقامات کی تحریکوں کا سرگرم رکن حالی تھا جو صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک اچھا تنقید نگار اور نثر نگار بھی تھا، گو اس میں شک نہیں کہ اس کی نثر کی اہمیت محض افادی اور معلوماتی ہے۔ لیکن یہی کیا کم ہے کہ اس نے ایسی کتابیں نثر میں یادگار چھوڑی ہیں جو بھلائی نہیں جا سکتیں یادگارِ غالب لوگ برابر شوق سے پڑھتے رہیں گے، جب تک غالب سے دلچسپی برقرار ہے۔ حیاتِ جاوید اس وقت تک پڑھی جائے گی جب تک کہ سرسید کی پرخلوص خدمات کی یاد ملت کے دلوں میں تازہ ہے اور اس برتر ہستی کے سوانحِ حیات کے تفصیلی مطالعے کی امنگ تجسس پسند دل کو تلاش اور تحقیق کی طرف مائل کرتی رہے گی۔ مقدمہ شعر و شاعری اس وقت تک غور و فکر کے ساتھ جب تک کہ اردو شاعری کے جدید رجحانات اور اس کے کارکنوں کی خدمات کو جانچنے اور آنکنے کا سودا متعلمین ادب کے دلوں میں موجزن رہے گا۔

ادبی اور تاریخی زاویۂ نگاہ سے مقدمہ اور مسدس بہت اہم ہیں اور ہر متعلم ادب کو جسے حالی سے دلچسپی ہے، یہ دونوں کتابیں غور سے پڑھنا چاہیے۔ نظم و نثر کے یہ دو پاکیزہ مرقعے نہ صرف حالی کے معتقدات اور اصلاحی نظریوں کا نچوڑ ہیں، بلکہ ان سے اس زمانے کی عام حالت، ادبی ذوق، اور سماجی تخیلات کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے۔

مقدمہ پہلے پہل دیوانِ حالی کے ساتھ چھپا تھا۔ یہ بذاتِ خود ایک جدت تھی یا ضرورت، یا ضرورت اور جدت دونوں۔ مشرقی ادب میں اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ البتہ انگریزی ادب کی طویل داستان میں دو ہی مثالیں اس قسم کی ملیں گی۔ ایک "ورڈز ورتھ" کی جس نے اپنی نظموں کے ساتھ ایک طویل دیباچہ اپنے شاعرانہ نظریوں کی توضیح میں لکھا تھا۔ دوسری مثال "برنارڈ شا" کی ہے جو اپنے ڈراموں کے ساتھ ضخیم دیباچے لکھا کرتا ہے جن میں وہ اپنے فن کارانہ اور تخلیقی پہلوؤں کی خود تنقید یا صفائی پیش کرتا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ اس کے دیباچے بعض اوقات اس کے ڈراموں سے زیادہ اہم اور دلچسپ ہوتے ہیں۔

حالی کا مقدمہ بھی دلچسپ نہ سہی لیکن اہم ضرور ہے اور بہت ممکن ہے کہ ان کے اپنے زمانے میں دلچسپی سے پڑھا گیا ہو۔ بہرحال اس کی تفریحی اہمیت نہ سہی تاہم تاریخی اہمیت ضرور ہے اس میں حالی نے نہ صرف اردو شاعری کے بعض اصناف پر تنقیدی نظر ڈالی ہے بلکہ اس تنقید کی لپیٹ میں بہت کچھ مفید معلومات، نظریے اور اصلاحی تجاویز پیش کی ہیں۔

مقدمہ مباحث کے لحاظ سے صاف و صریح طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں جو تقریباً تیس پینتیس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، شعر و شاعری پر تمہیدی بحث کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ شاعری ایک وہبی چیز ہے جو اکتساب سے حاصل نہیں ہوتی۔ شعر گوئی کی پہلی شرط ہے موزونیٔ طبع اور تاثیر اور جاذبیت شعر کی اہم ترین خصوصیات ہیں۔ ان خصوصیات کے ساتھ اگر شعر میں اصلیت بھی ہو تو شعر جادو بن جاتا ہے۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ پہلے حصے کے ابتدائی اوراق میں شعر کی جاذبیت اور حسن قبول سے بحث کرتے ہوئے مثالوں کے ذریعے یہ واضح کیا گیا ہے کہ مشرق و مغرب میں سدا سے شاعروں کی کتنی قدر و منزلت رہی ہے۔ کس طرح شعرائے عرب اپنے جوشیلے اشعار سے اپنے قبیلوں کو گرماتے اور جنگ پر آمادہ کرتے تھے۔ شعرائے عجم میں رودکی نے کس طرح اپنی جادو بیانی سے امیر وقت کو ہرات سے ترت بخارا لوٹنے پر اکسایا! کس طرح بائرن کی نظم ترکوں کے خلاف دولِ مغرب کو ابھارنے اور یونانیوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہوئی۔

اسی ضمن میں دو باتیں اور بتائی ہیں۔ وہ یہ کہ شاعری کا اخلاق اور سوسائٹی سے گہرا تعلق ہے۔ شاعری کے معین اخلاق ہونے کے بارے میں خود حالی کے یہ الفاظ دلچسپی سے خالی نہیں "شعر سے جس طرح نفسانی جذبات کو اشتعالک ہوتی ہے اسی طرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں .... مانا کہ شعر براہ راست علم اخلاق کی طرح تلقین و تربیت نہیں کرتا لیکن ازروئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب کہہ سکتے ہیں۔"

"اب رہ گیا دوسرا مسئلہ یعنی سوسائٹی اور شعر میں کس قسم کا ناتہ ہے؟ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدا میں سوسائٹی کا مذاق فاسد شاعری کو بگاڑتا ہے، پھر شاعری سوسائٹی کا ناس کرتی ہے۔ اور اس طرح بدی کا یہ دائرہ پھیلتا جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جھوٹ اور مبالغہ اور شاعری کے ذریعے قوم و ملت کی رگوں میں تیر جاتے ہیں۔ لہذا سب سے بڑا نقصان جو شاعری کے بگڑ جانے یا اس کے محدود ہو جانے سے ملک کو پہنچتا ہے وہ اس کے لٹریچر اور زبان کی تباہی و بربادی ہے۔ جھوٹ اور مبالغہ جب شعرا کا شعار بن جاتا ہے تو اس کا اثر مصنفوں کی تحریر اور فصحا کی تقریر اور خواص و عوام کے روزمرہ اور بول چال پر بھی پڑتا ہے۔"

ان حالات میں شاعری میں تبدیلیاں کیں بلکہ اپنے انوکھے مقدمے کے ذریعے اپنے نظریوں اور اصلاحی تجاویز کو مدلل پیرایے میں پیش کیا۔

دوسرے حصے میں جو کم و بیش پچھتر صفحوں پر پھیلا ہوا ہے، شعر کی ماہیت سے بحث کرتے ہوئے حالی نے شاعری کا جدید تصور پیش کیا ہے۔ یہ حصہ پہلے حصے سے زیادہ اہم ہے۔ اصل میں مقدمے کا یہ حصہ کالے اور ملٹن کے تصور اور توصیف شعری پر ٹکا ہوا ہے اور انہی دو مغربی مصنفوں کے اقوال کی روشنی میں محاسنِ شعر کو جانچنے کی کوشش کی گئی

ہے۔ سب سے پہلا سوال جو اس ضمن میں اٹھایا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ شاعری ہے کیا؟ اس کا جواب بھی مکالے کے الفاظ میں دیا گیا ہے۔ مکالے کا خیال ہے کہ "شاعری ایک قسم کی نقالی ہے جو اکثر اعتبارات سے مصوری، بت تراشی اور ناٹک سے مشابہ ہے۔ مصور، بت تراش اور اداکار کی نقل شاعر کی نسبت بظاہر کامل تر ہوتی ہے ...... لیکن شاعری کا میدان وسیع اس قدر ہے کہ بت تراشی، مصوری اور ناٹک یہ تینوں اس فن کی وسعت کو نہیں پہنچ سکتے ...... نفس انسانی کی باریک، گہری اور رنگا رنگ کیفیتیں صرف الفاظ ہی کے ذریعے ظاہر کی جا سکتی ہیں۔ شاعری کائنات کی تمام اشیائے خارجی کا نقشہ اتار سکتی ہے۔"

اس کے بعد شاعری کی تین اہم شرطوں (تخیل، مطالعہ کائنات اور تفحص الفاظ) سے بحث کرتے ہوئے شعر کے حقیقی محاسن کا حالی نے جائزہ لیا ہے اور اس موقع پر ملٹن کے مقولے کی روشنی میں محاسن شعر کے تین اہم عناصر بیان کئے ہیں۔ ملٹن کی رائے میں شعر وہی ہے جو (۱) سادہ ہو (۲) جوش سے بھرا ہو (۳) اور اصلیت رکھتا ہو۔ اس کے بعد شرح و بسط کے ساتھ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حالی نے بتایا ہے کہ "سادگی سے خیال اور اسلوب دونوں کی سادگی مراد ہے۔ دنیا کے تمام مقبول شاعروں کا کلام ایسا ہی دیکھا گیا ہے۔ ان کے کلام کی ہر ذہن سے مصالحت اور ہر دل میں گنجایش ہے ...... ہومر، شکسپیر، اور سعدی کی عالمگیر مقبولیت کا راز اسی میں ہے۔" اصلیت سے مراد یہ ہے کہ "خیال کی بنیاد ایسی چیز پر ہو جو حقیقتاً وجود رکھتی ہو۔ محض خیال بندی جیسی کہ متاخرین کی شاعری، نہ تو عام پسند رہی اور نہ ہونے کی مستحق ہے ......"

اب رہ گیا ایسا کلام جس میں یہ تینوں خوبیاں سرے سے نہ ہوں، سو حالی کے نزدیک ہمارے شعرا کا بیشتر کلام اس سے داغ دار نظر آئے گا۔ اور انہی وجوہ کی بنا پر حالی نے اپنی نئی شاعری میں اصلاحی تجاویز کو بروئے کار لانا ضروری سمجھا۔ اس ضمن میں حالی کے یہ چند ریمارک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

(۱) قدیم شاعری موجودہ حالات میں پنپ نہیں سکتی۔ جن حالات میں مشرقی شاعری نے ترقی پائی، اب باقی نہیں رہے۔ سائنس اس کی جڑ کاٹ رہا ہے اور سولیزیشن، اس کا طلسم توڑ رہی ہے ...... لہٰذا شاعری میں اسی کو قدم رکھنا چاہیے جس کی فطرت میں یہ ملکہ ودیعت کیا گیا ہو۔ شاعر بننے کے لئے سب سے اول سبق استعداد ہے پھر کائنات و سرشت انسانی کا گہرا مطالعہ اور اس کے بعد کثرت سے اساتذہ کا کلام دیکھنا اور ان کے برگزیدہ کلام کا اتباع کرنا۔

(۲) جھوٹ اور مبالغے سے پرہیز۔ سچا شعر کہنے کی صلاح اس لیے نہیں دی جاتی کہ جھوٹ بولنا گناہ ہے بلکہ اس لئے کہ تاثیر جو شعر کی علتِ غائی ہے، وہ جھوٹ میں بالکل باقی نہیں رہتی۔ پھر یہ کہ علوم و معارف کی ترقی جو آج کل دنیا میں ہو رہی ہے، وہ جھوٹی شاعری کو کبھی پنپنے نہیں دے گی۔

(۳) زبان اردو کی درستی و صفائی:۔ شعر کی زبان معیاری ہوتی ہے۔ اس لئے زبان کی اصلاح و درستی کا کام شعرا کا فرض ہے۔ اردو زبان میں صلاحیتیں موجود ہیں۔ البتہ نئی ضروریات کے مدنظر اس میں وسعت اور اصلاح کی ضرورت ہے۔ قومی ہم آہنگی کے لئے اردو سے موزوں تر کوئی زبان ہندوستان میں نہیں۔

آخری حصے میں (جو تقریباً سو صفحوں پر مشتمل ہے) شاعری کی تین اہم صنفوں پر طویل تبصرہ اور اصلاحی تجویزیں ہیں۔ یہی حصہ مقدمے کی جان اور حالی کی اعلیٰ تنقیدی صلاحیتوں اور اس کے فن کارانہ نظریوں کا نچوڑ ہے۔ حالی کے کٹر مخالفین بھی اس کو پڑھنے کے بعد اس کی علمی قابلیت اور نظر کی گہرائی کے معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ حصہ محض ایک متعلم ادب کی نسبت ان لوگوں کے لئے زیادہ مفید ہوگا جو شعر و سخن میں دخل رکھتے ہیں۔

جنہیں فن سے دلچسپی ہے وہ تفصیل چاہیں گے، اور تقاضائے فن بھی یہی ہے۔ پھر خلاصے کی ضرورت؟

ابوظفر عبدالواحد

پنگھٹ پر!

صبح دم رام رام پنگھٹ پر　　مُسکرا یا سلام پنگھٹ پر

ایک طرفہ بہار رہتی ہے　　ہمنشیں صبح شام پنگھٹ پر

شوخ و چنچل کنواریوں کا ہجوم　　اک حسیں اژدہام پنگھٹ پر

دل لگی، کھیل، قہقہے باتیں!　　یہی رہتا ہے کام پنگھٹ پر

ہمنشیں! دل سے کرنا پڑتا ہے　　حسن کا احترام پنگھٹ پر

حسن کی بادشاہی رہتی ہے　　عشق ہے کس، غلام پنگھٹ پر

کیف ہی کیف ہے یہاں ساقی　　آج ہو انتظام پنگھٹ پر

آؤ ڈھونڈیں گے بہر نظارہ　　سب سے اونچا مقام پنگھٹ پر

شامِ غم دور، دیکھ آئے ہیں　　سارے ماہِ تمام پنگھٹ پر

سب ہیں لیکن نظر نہیں آتا　　میرا ماہِ تمام پنگھٹ پر

جس کے دم سے قیام پایا ہے　　عاشقی کا نظام پنگھٹ پر

سوتے فتنے جگاتے جاتا ہے　　جس کا ہر ایک گام پنگھٹ پر

جس کے ماتھے پہ سرخ بندی ہے　　دعوتِ لطفِ عام پنگھٹ پر

گاؤں میں جس کو رادھا کہتے ہیں　　جس کا رانی ہے نام پنگھٹ پر

شورؔ، دیکھو وہ کون آ نکلا　　ہاں، وہی لالہ فام پنگھٹ پر

شورؔ عابدی (گلبرگہ)

گُل بُوٹے

جب سے ہمارے گھر میں بیاڈمنٹن کا شوق چرایا ہے صبح و شام دو وقت شام کو بڑی چہل پہل رہتی ہے، اندر جگہ نہ ہونے سے مجبوراً ہم نے باہر بیاڈمنٹن کورٹ بنایا اور شام کے ملنے والوں کو خیرباد کہہ دیا۔ گیٹ کے مقابل پرانے نل خرید کر نصب کئے اور ان کے درمیان تار کی جال بنا کر اس پر بیلیں چڑھا رہے ہیں، یہ اس لئے کیا کہ بیاڈمنٹن کھیلتے وقت جب سواریاں آتی ہیں تو پھٹ سے گیٹ کھل جاتا ہے اور کھیلنے والیاں تھوڑی دیر کے لئے بے پردہ ہو جاتی ہیں۔

ہماری بہنوں کے پردہ کا بوجھ تو مدت ہوئی بقول اکبر الہ آبادی ہماری عقلوں پر جا پڑا ہے، مگر بعض کھلاڑی بہنیں راستہ چلنے والوں کے سامنے کھیلتے کودتے ذرا شرماتی ہیں، ان ہی کی خاطر ہم تاروں کو قسم قسم کی بیلوں سے منڈھ رہے ہیں۔

رنگ برنگی خوبصورت پھولوں کی بیلیں فراہم کرنے میں ہمیں بڑی محنت اٹھانی پڑی، یہاں تک کہ جب کبھی ہم باہر نکلتے تو ادھر اُدھر کی دیواروں پر اور خانہ باغوں کے اندر نظریں دوڑاتے اور جہاں کہیں کوئی اچھے پھولوں کی بیل نظر آئی کہ ہم نے اس کا پودا مالی کو انعام دیکر حاصل کیا یا گھر والوں سے مانگ لیا۔

یہ سلسلہ ابھی جاری ہی تھا کہ ایک دن کسی مکان کی دیوار پر آسمانی رنگ کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پھولوں کی بیل دیکھ کر ہم بلاتکلف مکان کے اندر داخل ہو گئے، ہمیں دیکھ کر ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا، ہم نے اس سے مکان کے مالک کا نام پوچھا تو جواب ملا

"جی بیگم صاحب کو کہاں سے آئے بولوں"؟

ہم نے کہا "بیگم صاحبہ کو نہیں تمہارے سرکار کو سلام بولو اور یہ ہمارا کارڈ دو"!

وہ بولا "سرکار ہمارے پچھلے مہینہ گزر گئے، بیگم صاحب ہیں"!

ذرا سوچ کر ہم نے کہا "اچھا تو بیگم صاحبہ سے کہنا سامنے کی دیوار پر آسمانی رنگ کے پھولوں کی جو بیل ہے اگر اس کا ایک پودا وہ ہمیں مرحمت کریں تو بڑی عنایت ہوگی"!

لڑکا دوڑتا ہوا بیگم صاحبہ کو ہمارا پیام دینے گیا اور کوئی پانچ منٹ کے بعد آ کر بولا۔

"چلئے بیگم صاحب آپ کو گول کمرے میں بٹھو بولی ہیں"۔

ہماری محتاط طبیعت نے کچھ دیر کے لئے ہمیں موٹر سے اترنے نہ دیا، مگر کچھ تو نئی بیل لینے کے شوق میں اور کچھ بد اخلاقی کے خوف سے ہم خراماں خراماں لڑکے کے ساتھ ہو لئے۔

گول کمرہ بڑے سلیقے اور قرینے سے سجایا گیا تھا ہر چیز سے نفاست اور ستھرے مذاق کا ثبوت ملتا تھا، جب ہم نے کمرے کی چیزوں کو غور سے دیکھا تو ہمیں اس کمرے کی دنیا ہی نرالی نظر آئی جس رنگ کے پھولوں کی بیل ہم نے باہر کی دیوار پر دیکھی تھی کمرے کی ہر چیز اسی رنگ کی تھی، چھت، دیواریں، پردے، صوفے، قالین، بجلی کے چراغ، تصویروں کے فریم، گلدان غرض یہ کہ ہر چیز آسمانی تھی، ہمیں اپنی شیروانی کے رنگ پر افسوس ہو رہا تھا کہ کمرے سے میل نہیں کھا رہا تھا!

اس آسمانی رنگ کی دنیا میں ہم ابھی کھوئے ہوئے ہی تھے کہ

سامنے کے دروازے کا پردہ ہٹا اور بیگم صاحبہ رونق افروز ہوئیں ہم اس کے لئے بالکل تیار نہ تھے، ہمارے حاشیہ خیال میں بھی نہ تھا کہ بیلوں کے ایک "بھکاری" کی اس طرح عزت افزائی ہوگی! ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ غالباً بیگم نے مالی کو بیل کے پودے نکالنے حکم دیا ہوگا اور اس کے پودے نکالنے تک اخلاقاً ہمیں کمرے میں بٹھایا ہوگا۔

بیگم صاحبہ قدم رنجہ فرماتے ہی ہم سر و قد تعظیم کے لئے اپنی ساری پریشانیوں کے ساتھ کھڑے ہوگئے اور بڑے ادب سے جھک کر انھیں سلام کیا۔

"تشریف رکھئے" بیگم صاحبہ کی نقرئی آواز کمرے میں گونجی، تب کہیں ہمیں کچھ ہوش آیا۔ اس ارشاد کی تعمیل میں ہم صوفہ پر بیٹھ گئے، ہمیں بٹھا کر بیگم صاحبہ بھی ہمارے روبرو بیٹھ گئیں، اب جو ہم نے بیگم صاحبہ پر نظر ڈالی تو وہ بھی آسمانی دکھائی دیں، نیلی بنارسی ساڑی زیب بدن تھی، کانوں میں نیلم کے خوبصورت بُندے، ناک میں فیروزہ کی کیل، سینہ کے کھلے ہوئے گلے میں نیلے نگوں کی مالا، دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں دو چار فیروزہ اور نیلم کی انگوٹھیاں اور پاؤں میں نیلا سنہری سینڈل تھا۔

بیگم صاحبہ نے بیٹھتے ہی کمرے پر ایک طائرانہ نظر ڈالی پھر ہماری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ کو نیلے پھولوں کی بیل کے پودے چاہئیں؟"

ہم نے جواب دیا "جی ہاں! آپ کی بیل کے پھول بڑے خوبصورت ہیں اگر اس کا ایک پودا ہمیں عنایت ہو تو بڑی نوازش ہوگی"!!

"ضرور! شوق سے!! ایک کیا دو تین لے جائیے، اس کی بساط ہی کیا ہے، مگر یہ بیل ہے بڑی نازک! پودے جمنے تک سایہ میں رکھئے"!!

بیگم صاحبہ نے مالی کو حکم دیا کہ دو چار پودے احتیاط سے نکال کر ہماری موٹر میں رکھ دے۔ ہم نے بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کیا اور اٹھنے لگے تو فرمایا۔

"بیٹھئے! ایسی بھی کیا جلدی ہے! ابھی تو مالی گیا ہے"!!

ہم نے بیٹھتے ہوئے کہا "معلوم ہوتا ہے آپ کو آسمانی رنگ بہت پسند ہے، اس مکان کی تو ساری دنیا آسمانی نظر آتی ہے"!

ہمارے اس جملہ پر بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں اور عجیب انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں! مجھ کو نیلے رنگ سے بہت محبت ہے، آپ کو کونسا رنگ پسند ہے"؟

"اس ناچیز کو بھی یہی رنگ پسند ہے، ایک نجومی نے تو نیلے رنگ کو بہت مبارک بتایا ہے"!

"ارے کیا سچ"؟ بیگم صاحبہ نے آنکھوں میں کچھ عجیب چمک پیدا کرتے ہوئے پوچھا "مجھ کو بھی ایک نجومی نے ہمیشہ نیلا لباس استعمال کرنے کی تاکید کی تھی"!

"عجیب اتفاق ہے"! ہم نے تعجب سے کہا۔

"مرحوم کو بھی، اللہ پاک انھیں کروٹ کروٹ بہشت نصیب کرے، نیلا رنگ بہت پسند تھا، آج انھیں جنت کو سدھارے ایک مہینہ ہوتا ہے (آہ بھر کر) خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں! ان کے چہلم کو ایک ہفتہ باقی ہے، اگر زحمت نہ ہو تو چہلم کے فاتحہ میں ضرور آئیے"!

ہم نے اخلاقاً کہہ دیا ضرور، حاضر ہوں گے۔ آنکھوں پر نیلا ریشمی رومال پھیرتے ہوئے بیگم صاحبہ نے آبدیدہ ہو کر کہا

"نیلی بنارسی ساڑیاں مرحوم کو بہت پسند تھیں، مہینہ میں دو چار عمدہ نیلی ساڑیاں وہ میرے لئے خرید لاتے تھے اور مجھ کو"

پہنا کر "میری آسمانی حور" کہہ کر میرا منہ چوم لیا کرتے تھے، اسی لئے
میں نے ان کے سوگ میں ان کے پسندیدہ رنگ میں اپنے کو رنگ لیا ہے"۔

اس وقت مالی نے اطلاع دی کہ بیل کے پودے ہماری
موٹر میں رکھ دئے گئے ہیں، ہم نے بیگم صاحبہ کا بہت بہت شکریہ
ادا کیا اور سلام کر کے جانے لگے تو بیگم صاحبہ نے اصرار سے کہا۔

" دیکھیے! بھولنا مت!! مرحوم کے چہلم میں ضرور آنا!
اپنا پتہ چھوڑ جائیے، دعوت کا کارڈ بھیج دوں گی"۔

ہم نے کارڈ پر اپنا پتہ لکھ کر بیگم صاحبہ کو دیا اور دعوت کا
پیشگی شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے۔

دوسرے ہی دن ہمیں نیلے رنگ کا ایک نہایت خوشنما
دعوت نامہ ملا، "دنیا فانی ہے" سے کارڈ کا مضمون شروع
ہوا تھا اور آخر میں "سوگوار" کے بعد بیگم صاحبہ کا نام جلی قلم سے
لکھا تھا۔

دعوت کے دن ہم کوئی نو بجے دن کے مرحوم کے مکان
پہنچے، صحن میں ایک بہت بڑا شامیانہ تانا گیا تھا جس میں صاف
ستھرے فرش پر مہمان جمع ہو رہے تھے اور شامیانہ کے سرے پر
ایک صاحب کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے، کوئی بیس
پچیس دعوتی قرآن مجید کے پارے لئے بیٹھے تھے، ہم بھی ایک طرف
پارہ لے کر تلاوت میں مصروف ہو گئے، جب ہم نے پارہ ختم کر کے
نظر اٹھائی تو کوئی سوسوا سو مہمان آچکے تھے، اکثروں نے
پارے ختم کر لئے تھے، چار چھ جو تلاوت میں مصروف تھے وہ بھی
جلد جلد پڑھ کر سیدھے ہو بیٹھے تھے، اتنے میں استقبال کرنے
والے صاحب مجلس میں آئے اور ہم سب سے مخاطب ہو کر بولے
"مرحوم کی روح فاتحہ کی منتظر ہے! سب حضرات فاتحہ
پڑھ کر روح کو شاد کریں"!!

سبھوں نے فاتحہ پڑھی اس کے بعد موصوف نے فرمایا کہ ہم سب
مل کر مرحوم کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائیں، چند قدم پر قبرستان
تھا جہاں مرحوم ایک خوبصورت لحد کے اندر قیامت کی نیند سو رہے
تھے، ہم سب نے مل کر مرحوم کی آرام گاہ پر پھولوں کی چادر چڑھائی
اور فاتحہ پڑھ کر اٹھ رہے تھے کہ ان ہی صاحب نے ہمارے کان
میں کہا،

" بیگم صاحبہ نے کہا ہے کہ ماحضر تناول کئے بغیر آپ تشریف
نہ لے جائیں"!

ہم نے آہستہ سے کہا "بہت اچھا! بیگم صاحبہ کو ناراض کر کے
ہم کیسے جا سکتے ہیں"!!

بہت سے مہمان کچھ نہ کچھ عذر کر کے چلتے بنے، کوئی بیس!
پچیس دعوتی رہ گئے، جب ہم قبرستان سے واپس ہوئے تو
کھانا تیار تھا۔ بڑے سلیقہ سے دسترخوان پر انواع و اقسام کے
کھانے چنے ہوئے تھے، رکابیاں، ڈشیں، گلاس سب کے سب
آسمانی رنگ کے تھے، سب مہمانوں کے ساتھ ہم بھی دسترخوان پر
بیٹھ گئے، دسترخوان پر ہم نے جو نظر ڈالی تو کھانوں کی قسمیں
دیکھ کر ہمیں بڑی پریشانی ہوئی کہ کیا کھائیں اور کیا نہ کھائیں،
ہمارے بازو ایک بزرگوار بیٹھے تھے انہوں نے چپکے سے کہا،

"معلوم ہوتا ہے قدیم روایت کی پوری پابندی کی گئی ہے"!

ہم نے پوچھا "قدیم روایت سے آپ کا مطلب کیا ہے"؟

ارشاد ہوا "چہلم کی دعوت میں پورے چالیس قسم کے کھانے
ہوتے ہیں کہ مرحوم کی روح کو سیری ہو"!

اس نرالی روایت کو سن کر ہمیں ہنسی آنے لگی، ہم نے کہا،

" عجیب بات ہے! کیا مرحوم کی روح بھی اس دسترخوان پر

موجود ہے"؟

ہمارے اس طنز پر وہ بزرگوار بگڑ کر فرمانے لگے۔

"ذرا غور سے دیکھنا! کتنی قسم کی چیزیں آپ کے سامنے رکھی ہیں!! ان چیزوں کے دسترخوان پر رکھنے کا مطلب یہی ہے!! آپ نئی روشنی کے نوجوان اس کو مانیں نہ مانیں، مگر ہمیں تو یقین ہے کہ مرحوم کی پاک روح بھی اس وقت ہمارے ساتھ کھانے میں شریک ہے"!

بات بڑھتی دیکھ کر ہم نے چپ سادھ لی اور چپکے سے کھانوں کا ہم نے جو شمار کیا تو واقعی چالیس قسم کی چیزیں دسترخوان پر موجود تھیں، مرحوم کی روح ہمارے ساتھ کھائے کہ نہ کھائے مگر ہم نے تو خوب ہی بھر کر مزے مزے کی چیزیں نوش جان کیں اور بیگم صاحبہ کو ہزاروں دعائیں دیں کہ اللہ پاک انھیں نظرِ بد سے بچائے اور ایسی ہی پرتکلف تقریبیں کرنی نصیب کرے!

کھانے کے بعد بیگم صاحبہ کی جانب سے جو صاحب میزبانی کر رہے تھے ہم نے اُن سے کہا کہ ہماری جانب سے بیگم صاحبہ کا شکریہ ادا کریں اور ان کی خدمت میں ہمارا سلام پہنچا دیں۔

وہ بولے "ابھی آپ نہیں جا سکتے! بیگم صاحبہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں"۔

یہ سن کر دو چار تعزیتی جملے ہم نے یاد کر لئے، جب سب مہمان جا چکے تو بیگم صاحبہ نے ہمیں اسی گول کمرے میں یاد فرمایا جس میں ہم نے پہلی دفعہ بیگم صاحبہ سے نیاز حاصل کیا تھا۔ بیگم صاحبہ کمرے میں پہلے ہی سے موجود تھیں، جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو بیگم صاحبہ اٹھ کھڑی ہوئیں، ہم نے آداب عرض کرتے ہوئے کہا

"اللہ پاک مرحوم پر رحمت نازل کرے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے، مرحوم کا چہلم واقعی آپ نے بڑے سلیقے اور دریادلی سے کیا، مرحوم کی روح آج آپ سے بہت خوش ہوئی ہوگی"۔

یہ کہہ کر جب ہم نے بیگم صاحبہ کے چہرے کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جگہ ہم نے ہلکی سی مسکراہٹ رقص کرتی دیکھی، ہم بہت چکرائے کہ یہ کیا ماجرا ہے! آج بھی بیگم صاحبہ نیلی زری ساڑی پہنی ہوئی تھیں، کانوں میں وہی نیلی بُندے اور گلے میں لاکٹ تھا جس میں مرحوم کی چھوٹی سی تصویر آویزاں تھی۔

مسکراتے ہوئے بولیں "جب آپ کو آج کی دعوت پسند آئی تو ہمیں ہماری محنت کی خاطر خواہ داد مل گئی! آپ نے کچھ کھایا بھی ہے یا صرف دیکھتے ہی رہے"؟

ہم نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ کھانوں کی قسمیں دیکھ کر بھوک مر گئی اور طبیعت سیر ہو گئی! کھایا کم گر دیکھا بہت"!!

اس جواب سے بیگم صاحبہ خوش ہو کر کہنے لگیں۔

"ہم آپ کو آج رات کا کھانا کھلائے بغیر جانے نہ دیں گے"!

ہم نے پوچھا "یہ کس تقریب میں"؟

مسکراتے ہوئے فرمایا "آپ نے سنا ہوگا" شادی و غم توام ہوتے ہیں، اس کی مثال بھی آج دیکھ لیجئے!

ہم نے عرض کیا "غمی کی اس تقریب کے بعد ہماری سمجھ میں نہیں آتا خوشی کی کیا تقریب ہوگی"!

کچھ جھینپتے ہوئے کہا "آپ میرا مطلب نہیں سمجھے! خدا بخشے مرحوم کو بڑے نیک دل انسان تھے!! میری جوانی پر رحم کھا کر مجھ سے جدا ہوتے وقت وصیت کی تھی کہ ان کے چہلم کے بعد دوسرا بیاہ کر لوں! اگر آج مرحوم کی وصیت پر عمل نہ کروں تو ان کی روح کو کس قدر ملال ہوگا!! وہ کبھی مجھ سے ناخوش نہیں ہوئے! جنھیں زندگی میں کبھی میں نے دکھ نہیں دیا انھیں اب مرنے کے بعد خدانخواستہ کیسے رنجیدہ کروں!! اس لئے میں نے طے کر لیا ہے کہ آج ہی شام کو عقد کر لوں"!!!

"باغباں"

میر احمد علیخاں شہید دہلوی

سلطنت مغلیہ کا باغ تاراج، اوراق گل پریشان، بلبلان چمن آوارہ گرد ہو رہے ہیں کچھ مشرق کی جانب کچھ مغرب کی طرف، ایک کا منہ دکن کی سمت اٹھتا ہے۔

طائر مصروف پرواز ہے شمال سے جنوب تک راہ کے تمام مصائب جھیلتا گردش ایام کے تھپیڑے کھاتا دکن پہنچتا ہے، تھکا ماندہ طائر سب سے اونچے قصر پر گر پڑا، سنتے ہیں نواب سکندر جاہ بہادر کا عہد اور راجہ چندو لال کا محل تھا، کہ خدا کی دور رس نگاہیں کنگرے پر بیٹھے ہوئے پرندے کے قلب کی گہرائیوں تک پہنچتی اور اندرونی کیفیات بھانپ لیتی ہیں، صورت سے عیاں ہے کہ خاک نجابت کے ذرات باد حوادث کے ہاتھوں سرگرداں ہیں!

دانہ ڈالا جاتا ہے ــــ طائر ــــ انسان سے مانوس اور معارف پروری کا بھوکا ــــ طائر نیچے اترا، قدر دانی اور ہمت افزائی کے آثار نظر آئے، اطمینان کا سانس لیا اور یہیں کا ہو رہا،

میر احمد علی خاں نام، شہید تخلص، سید جعفر علی خاں بہادر کے فرزند، ان کے جد اعلیٰ سید سادات خاں بہادر مرغشی جلال الدین محمد اکبر شہنشاہ ہند کے امرا میں تھے۔

سادات خاں بہادر کی بیٹی محمد فرخ سیر بادشاہ دہلی کے نکاح میں آئیں اس لحاظ سے مراتب میں اضافہ سید صلابت خاں خطاب اور ــــ داروغگی توپخانہ کی خدمت پر مامور ہوئے، جس زمانے میں سادات بارہہ نے محمد فرخ سیر بادشاہ کو گھیر لیا تو خان مذکور لڑتے بھڑتے چاندنی چوک تک پہنچے اور دو بیٹوں سمیت حق نمک ادا کیا۔

خان موصوف کے باقیات میں تین بیٹے رہے۔ ذوالفقار جنگ، سیف خاں، اور سید حسین خاں، سلطان ابراہیم کی جنگ کے وقت ذوالفقار جنگ قطب الملک کے ساتھیوں میں تھے ہمارے ہیرو حضرت شہید کا سلسلہ ذوالفقار جنگ موصوف تک منتہی ہوتا ہے،

سنہ ۱۱۳۳ھ فردوس آرامگاہ کا نکاح گوہر النسا، (سادات خاں مذکور الصدر کی بیٹی) ــــ سے ہوا اس کے سوا خود ذوالفقار جنگ کی بیٹی بھی فردوس آرامگاہ کے حبالۂ عقد میں آئیں اور صاحبہ محل کہلائیں (یہ شہید کی دادی تھیں) ان مناسبات کے مدنظر ذوالفقار جنگ اول چار ہزاری منصب بخشی گیری احدیاں بعدہ بخشی گیری چہارم پر سرفراز ہوئے۔ اس زمانے میں حمید الدین خاں عالمگیری کا انتقال اور انھیں ان کی جگہ ترقی دی جاتی ہے۔

فردوس آرامگاہ کو مذکور الصدر ہر دو بیگمات سے کوئی اولاد نہ ہوئی، اس لئے دونوں نے مرزا احمد بہادر یعنی احمد شاہ کو پال لیا۔ سنہ ۱۱۶۱ھ ہنگامۂ نادری فرو کرنے کے لئے شاہزادہ مذکور ذوالفقار جنگ کی اتالیقی میں اعتماد الدولہ وزیر و صفدر جنگ میر آتش وغیرہ کے ہمراہ مقرر کئے گئے، اسی اثناء میں فردوس آرامگاہ نے بمرض استسقا وفات پائی اور احمد شاہ تخت نشین ہوئے نئے بادشاہ نے تخت پر بیٹھتے ہی منصب ہشت ہزاری و ہشت ہزار سوار حضرت نظام الملک بہادر سے منتقل کرکے انھیں بخشا سید سادات خاں ذوالفقار جنگ خطاب عطا ہوا اور گفتگو میں شاہ موصوف "نانا بابا" سے مفتخر

فرماتے تھے۔

صاحب "محبوب الزمن" اس کے خلاف شہید کا سلسلہ نواب سربلند خاں بہادر، دلاور جنگ مبارز الدولہ مبارز الملک صوبہ دار گجرات سے ملاتے ہیں۔ پچھلے دنوں تعطیلات میں تقدس مآب حضرت مولانا سید رستم علی صاحب کے خزینۂ نوادر میں شہید کا ایک قلمی اردو دیوان نظر آیا، یہ ان کے کسی شاگرد غلام مصطفےٰ مندوزی ۱۲۷۰ھ کا مکتوبہ ہے۔ شہید ۱۲۹۲ھ میں فوت ہوئے اس لحاظ سے یہ نسخہ شہید کے حین حیات لکھا گیا، بہت ممکن ہے خود شاعر کی نظر سے بھی گزرا ہو۔ کہیں کہیں حواشی پر کاتب نے شاید استاد کے مشورے سے اغلاط کو صاف و صحیح کیا ہے، خط صاف ہے ۲۷۲ صفحات کا حجم کل غزلیات ۲۴۱ ہیں رباعیات و قطعات مزید برآں خاتمہ اس عبارت پر ہوتا ہے "بفضلہ تعالیٰ شاہد کتاب ہذا یعنی دیوان اول حضرت استاد اکمل سخندان بے بدل حضرت میر احمد علی صاحب الموسوی المتخلص بہ شہید ساکن شاہجہان آباد عرف دہلی بمقام بلدہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد از خط شاگرد حضرت معز مسمیٰ بہ غلام مصطفیٰ خان مندوزی بتاریخ بستم شہر صفر المظفر ۱۲۷۰ھ النبوی صلعم باتمام رسید" اس صفحہ کے عقبی حصہ پر دوسرے قلم سے وزیر کی ایک رباعی، قطعہ اور شہید کے بعض ۱۲۷۳ھ کے تاریخی قطعات ہیں۔

اس دیوان کے دیباچہ میں شہید نے اپنے خانوادہ کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ "سید سادات خاں بہادر ذوالفقار جنگ کو کہ فقیر کے دادا اور احمد شاہ ابن محمد شاہ کے نانا تھے سر دربار خطاب سے "نانا بابا" کے یگانہ و ممتاز کیا اور خدمت سے امیر الامرائی یعنی میر بخشی گیری کے باقدر و اعزاز کیا" دوسری جگہ فرماتے ہیں "اور محل "صاحبہ محل" کا کہ فقیر کی دادی اور احمد شاہ کی ماں اور شاہ عالم بادشاہ کی پھپی تھیں محل پادشاہی میں داخل ہے۔"

صاحب محبوب الزمن نے سادات خاں بہادر یا مذکورۂ بالا اعزازات کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

نواب سربلند خاں صوبہ دار گجرات جن کا ذکر محبوب الزمن میں ہے۔ یہ شہید سے ایک غیر متعلق ذات ہے۔ ہر دو ہم عصر تھے اور ایک مرتبہ انھیں بھی حضرت نظام الملک سے منتقل ہو کر منصب ملا تھا شاید یہی وجہ التباس ہے ورنہ سربلند خاں کے خاندان میں سلسلہ امارت ان کی اولاد پر ختم ہو جاتا ہے بخلاف اس کے ذوالفقار جنگ کا خانوادہ کمپنی کے عہد تک معزز و محترم تھا جیسا کہ خود شہید کہتے ہیں۔ "خویش و اقارب عاصی کے سوا اس جاگیر کے فرد فرد نقد ماہوار سے برکت اندوز اور دربار میں حاضر ہیں۔"

موضع ترآئینہ اور کوٹ قاسم وغیرہ انہیں کے خاندان کی جاگیرات تھیں جو منجملہ دیگر املاک شاہی کمپنی کے قبضہ میں آئیں۔

شہید کو شاید خانگی حالات سے مجبور ہو کر دہلی چھوڑنا اور حیدرآباد بسانا پڑا، حیدرآباد اس وقت مرکز اہل کمال بنا ہوا تھا لوگ ہر طرف سے راہیں مسدود پاتے اور دکن کا رُخ کرتے یہاں قدر دانیاں پہلے ہی سے چشم براہ رہتی تھیں۔ آتے ہی ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے اور کہیں سے کہیں پہنچ جاتے، اور اسی زمانے کے لئے کیا مخصوص ہے۔ اب بھی سرکار فیض آثار حضرت جلالتہ الملک سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ کا آفتاب کرم اپنی گہربار و زرپاش کرنوں سے اقصائے عالم کو منور کر رہا ہے دنیا کا ہر ذرہ بقدر خود اکتساب نور میں مصروف ہے۔

حیدرآباد پہنچ کر شہید کی آہ رسا فیاض زماں مہاراجہ چندو لال بہادر کے کانوں تک پہنچتی ہے مہاراجہ کی زربخشی کے متعلق شاید اتنا کہنا کافی ہو گا کہ جہاں "چندو لال کا حیدرآباد کہا کرتے تھے" تو پھر بھلا شہید ہی کیوں محروم رہتے۔ اس لئے مہاراجہ و میراج خلف الرشید مہاراجہ چندو لال کے مصاحبین کی مالا میں یہ دُرِّ نایاب بھی پرو دیا گیا۔

سنہ ۱۲۴۴ھ نواب ناصرالدولہ بہادر مغفور نے جلوس کے موقع پر تمام امراو و اہل کمال کو بلایا' ان میں شہید بھی تھے سب کا نصیبہ جاگا۔ اضافہ خلعت اور مصاحبت سے سرفراز ہوئے مگر قسمت کی افتاد بے چارے شہید کچھ محروم سے رہے اس واقعہ کا ذکر بہت حسرت و یاس سے کرتے ہیں" جب نواب ناصرالدولہ ابن سکندر جاہ نے سنہ ۱۲۴۴ھ میں جلوس فرمایا تو ریاست پر بیٹھتے ہی منصبداروں کو بلایا اور مخلع کیا اور مخاطب و مصاحب بنایا' فقیر بھی حسب الطلب دربار میں آیا اور اضافہ و خلعت و قربت و صحبت سے فائدہ اٹھایا اگرچہ چشم پوشی سے زمانۂ بے دید کی یا نا مساعدت سے بخت ناسعید کی ناسعادت دنیوی حاصل ہوئی بہر حال یہ بھی غنیمت ہے کہ بدولت اس کے نوالہ خشکے کا پاؤ ٹکڑا روٹی کا روکھا سوکھا کھا کر ساتھ عزت و راحت کے ٹھنڈے پانی کا گھونٹ پی کر بال بچوں سمیت آرام سے پاؤں پھیلائے سوتا ہوں اور اگر جاگتا ہوں تو اس کا شکر نعمت اور اس کے حق میں دعا نثار کرکے' سعادت یاب دارین ہوتا ہوں' ہمیشہ ہو اقبال اس کا اور قائم رہے اجلال اس کا۔"

صاحب محبوب الزمن لکھتے ہیں کہ اس موقع پر انھیں امیرالشعراء کا خطاب بھی ملا حالانکہ خود شہید اس معاملہ میں حرف حسرت بہ لب ہیں۔ بلکہ "اضافہ و خلعت و قربت و صحبت" کا اعتراف تو خود انھوں نے بھی کیا ہے اب کسر صرف خطاب ہی کی تھی جس پر بخت ناسعید یا زمانہ بے دید مورد طعن ٹھیرا۔ اس کے علاوہ ان کے شاگرد غلام مصطفےٰ خاں نے بھی ان کے نام کے ساتھ اس خطاب کا الحاق نہیں کیا' بنا بریں اتنا تو ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ کم از کم سنہ ۱۲۷۰ھ تک امیرالشعراء نہ تھے' بہرحال امیرالشعراء نہ سہی ناصری منصبدار ضرور تھے' جیسا کہ فرماتے ہیں" اور سرکار فیض آثار میں نواب آصفجاہ دام اقبالہٗ کے سرکار پر بزرگوں کی کہ قدیم سے یہاں وارد تھے توسل بہم پہنچایا' شکر خدا کا کہ شاعر اور منصبدار ہی کہلایا اور اس کا نعم البدل پایا" سید نصیرالدین قادری المعروف شاہ نصیر سے شاعری میں تلمذ تھا۔

شہید کے کلام میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ آج سے ایک صدی قبل وہ زبان استعمال کرتا ہے جس کے بنانے کی سعی کی جا رہی۔ عربی و فارسی کے موٹے موٹے نامانوس لغات سے ہمارے شاعر کا دامن پاک ہے وہ ہر جگہ نہایت سہل تراکیب خالص اردو الفاظ اور ٹھیٹ ہندستانی محاورات استعمال کرتا ہے۔ مثلاً

دل سے ہم تو ہاتھ دھو بیٹھے ہیں پر واقف ہیں لوگ
یوں نہ گھبرا اے شہید یک دم ہزار امید ہے

یا مثلاً

اکثر گئے ہیں کھاٹ سے دہاں خون چاٹ کے
قائل ہیں تیغ ابروئے قاتل کی کاٹ کے

یا

سخت کیوں ہو نہ مریض غم ہجراں تیرا
لس ہر ایک سوج کے ہو جس کے بدن کی لکڑی

اس کے علاوہ شہید کے کلام کی ایک ممتاز صفت سادگی ادا ہے اچھے شعر کی ایک یہ تعریف بھی ہے کہ سامع کے منہ سے' سنتے ہی بے ساختہ واہ نکلے اور یہ چیز بغیر سادگی کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ شہید کا سارا دیوان دیکھ جائیے کہیں کوئی شعر نہ ملے گا جسے سادگی ادا کے معیار سے ساقط کیا جائے۔ وہ دقیق فلسفیانہ مسائل بھی ایک چٹکی بجاتے حل کرتا ہے مثلاً

یوں منزل جہاں سے گزر جائیگا بھلا دنیا ؛ آ کر گھروں کو پھرتے ہیں جیسے لوگ گاٹ کے

بعید الفہم تشبیہات سے کوسوں دور ہے بدلیسی مشابہات کو
ہاتھ نہیں لگاتا ایرانی گل و بلبل، نوروز و بہار سے اسے کوئی
مطلب نہیں۔ وہ جب کہتا ہے جو کچھ کہتا ہے اپنی بات اپنی
چیز اپنا مال۔ اس کی بلبل کوئل ہے اس کی بہار بسنت، اس کی
آتشِ عشق آتش کدۂ فارس کی ممنونِ کرم نہیں بلکہ یہ وہ ہندستانی
آگ ہے جو فی الواقع بلا تمیز مرد و زن مردہ و زندہ انسانوں کو
جلا دیا کرتی تھی۔

تھی پس از مرگ تفِ غم سے مری ہر پسلی
جوں بھڑکتی ہوئی ہندو کی چتا کی لکڑی

شہید کے لئے اپنا سیدھا سادہ "شادیانہ" اغیار کے چنگ و
رباب سے زیادہ سامعہ نواز ہے۔

لیتے احسان اجل ہم مگر اس شرط کے ساتھ
شادیانے اگر آگے ترے در کے بجتے

ہندوستان میں تقاریب کے موقع پر یہ رسم اب بھی جاری ہے،
خالص ہندستانی تشبیہات کے استعمال نے شہید کے کلام میں
جدت سی پیدا کردی ہے مثلاً شاید کسی نے باندھا ہو۔

نکتہ سنجی کی تو پھینک اس سے ہے وابستہ شہید
کیوں نہ خامہ کو کہوں اہلِ سخن کی لکڑی یا

نہ ہے بسنت نہ ٹیسو نہ بن کو آگ لگی
شہیدِ عشق کے شاید کفن کو آگ لگی

آس و نراس کے موقع پر دل کا اضطراب سب ہی نے باندھا
ذرا شہید کی ندرت ملاحظہ ہو۔

پھر اب مجھے زمین پہ دیتا ہے ٹیکیاں
لیجا کے تا فلک دلِ مضطر زمین سے
گر ہوں فلک سے ایک تڑپ میں زمین پر
پھر دوسری تڑپ میں فلک پر زمین سے

ہمارا شاعر جم و کسریٰ کے افسانے نہیں گاتا بلکہ اسے راجہ اندر
سے اُنس ہے۔

خاکساری نقشِ پا کی طرح حاصل کر شہید
راجہ اندر کی سواری کا سنگاسن چھوڑ دے

وہ رستم و سہراب یا روئیں تن و اسفندیار کے سہارے نہیں
جیتا بلکہ ـــ

کوئی ہیرا من کا پٹھا اب کہیں ملتا نہیں
ورنہ سنگل دیپ کا کچھ یہ انتر بید ہے

شہید کا کلام برجستگی و روانی میں اپنی مثال آپ ہے آورد کا کہیں
نام نہیں ہر طرف آمد ہی آمد نظر آئے گی کہیں کسی قسم کی جھجک
تصنع یا بناوٹ کا پتہ نہیں معلوم ہوتا ہے شاعر کد و کاوش سے
قطعاً بے نیاز ہے جو بات کہتا ہے وہ خود ہی موزوں ہوتی اور
شعر کا جامہ پہنتی جاتی ہے، مثلاً

اماں! کدھر کے چار تل واعظ بھی قائل ہو گیا
کان میں جوں ہی صدائے خندۂ قلقل گئی
شہید آج تو شیخی بنی ہوئی بگڑی
ملے تو اٹھ کے وہ خم سے بہ شرمگیں سے ملے

دربار پر پہنچنے کے بعد جن جھڑکیوں اور دشنوں سے
عاشق کی تواضع کی جاتی ہے اسے باندھا تقریباً سب ہی نے
مگر ذرا شہید کی آواز پر کان لگا دیجئے۔

بولے ہو چیں بہ جبیں حلقۂ در کے بجتے
کیوں رے مردود! پھر آیا تو گجر کے بجتے

لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد وامق و عذرا سے اپنی برتری
ثابت کرنے کے لئے شعرا نے کیا کیا زمین آسمان کے قلابے
نہ ملا دیئے۔ اور پھر بھی کوئی ایسی بات بہت کم کہہ سکے جسے
حق پسند قلوب قبول کریں۔ شہید صرف ایک ہی بات کہتا ہے۔

مگر ایسی جو دل میں اتر جائے. بہت سادی نہایت معمولی گر سچی ؎

لیلیٰ مجنوں، وامقِ عذرا گزر سے ان کا کیا مذکور

میراںؔ کا ذکر الفت طرفہ قصہ اب کا ہے،

کسی مسئلہ میں مناظرہ کی انتہائی شدت کو آپ کا ایک فقرہ جتنا جلد ختم کر دے گا کوئی مدلل بات نہیں کر سکتی، "اچھا بھئی چھوڑو اب گئی گزری" لیلیٰ مجنوں وغیرہ کے افسانوں کی اہمیت گھٹانے کے لئے اس سے زیادہ کامیاب شعر کم ملے گا.

اکثر تشبیہات ایسی اچھوتی اور نازک استعمال کی ہیں کہ ان کی تحلیل شعر کا خون کرنے کے مترادف ہو گی، مثلاً

ابروؤں میں تیرے سر دل کا جھکا رہتا ہے

شیشہ اک طاق میں کعبہ کے دھرا رہتا ہے

یا

وہ دیکھے ہے منہ صبح اٹھ آرسی میں

چمن آئینہ میں اُگا چاہتا ہے

دلِ عاشق سے اٹھنے والے دھوئیں کی مختلف تشبیہات شعرائے باندھی ہیں مگر خالص ہندوستانیت شہیدؔ کی بندش میں نظر آئے گی۔ ؎

یوں دھوئیں کی ہیں لٹیں شعلۂ داغ دل پر

سر پہ جوگی کے کھلا جیسے جٹا رہتا ہے

ہوا سے درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کی وجہ جو کچھ شہیدؔ بیان کرتے ہیں وہ شاید ہی کسی اور کی سمجھ میں آئی ہو ؎

خاک ہے زیر شجر کون سے کرتا لی کی

نال سے برگ ہیں جو شاخ شجر کے بجتے

شہیدؔ کے دیوان میں بہت کم اشعار ایسے ملیں گے جنھیں پڑھ کر آپ کے لبوں پر ہلکا سا تبسم نہ کھیل جائے۔

قدرت زبان کا یہ عالم ہے کہ ٹ، ڈ، ڑ جیسے ثقیل اور مشکل قوافی میں بھی شہیدؔ بند نہیں۔

جس طرح سالن میں مناسب نمکینی اس کو لذیذ بنا دیتی ہے اسی طرح شہیدؔ کے کلام میں شوخی و لطافت کی چاشنی عجیب مزا دیتی ہے، یہ دیوان اب تک غیر مطبوعہ ہے اس کی اشاعت اردو دنیا میں ایک مفید باب کا اضافہ کرے گی۔

قدسی صفات حضرت سید رستم علی صاحب ڈیوڑھی مستقیم الدولہ چھتہ بازار کے پاس آپ بھی اس کا مطالعہ فرما سکتے ہیں۔

سید مجتبیٰ حسین نوگانوی

دفتری معلومات

:- از مولوی ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ایچ سی ایس صفحات ۵۶ قیمت ۶/

یہ ایک مفید کتاب ہے جس کے پہلے باب میں دفاتر کے عام طریق کار، دوسرے میں حسابی معلومات تیسرے میں ملازمت سرکار عالی کے متعلق احکام و ضوابط سلیس زبان میں قلمبند کئے گئے ہیں. ہر ملازم و غیر ملازم سرکار کو ان باتوں سے واقف ہونا چاہیے۔

جنگل کا قانون

ایک خوب صورت اور زرخیز وادی کے عین درمیان ایک تنہا پہاڑی کھڑی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وادی کی واحد حکمراں ہے۔

اُس کے تین طرف نہایت ہی ڈھلوان چٹانیں ہیں البتہ چوتھے رخ پر ایک راستہ کافی کشادہ لہراتا ہوا پہاڑی کے سب سے اونچے حصہ تک جا پہونچتا ہے۔

" بادل ایک بوڑھا سال خوردہ بوربچہ ایک بڑی انجیر کی ٹہنی کے قریب جو زمین کو چھو رہی ہے لیٹا ہوا ہے۔ انجیر کا درخت بازو سے گزرتے ہوئے راستہ پر پورا چھایا ہوا ہے۔ بادل وہاں تڑکے ہی سے دھوپ کھانے کے لئے آکر لیٹ رہا تھا۔ بھوک کے نہایت ہی شدید تلوں کو بھلانے کے لئے کبھی اس کروٹ اور کبھی اُس کروٹ ہو جاتا۔ راستہ پر اس کی پُر امید نگاہیں لگی ہوئی تھیں کہ شاید کوئی بھولا بھٹکا آنکلے۔ آج اسے شکار ملنا چاہیے تاکہ پیٹ کا دوزخ بھرے۔ بہتے ہوئے نالہ کے شفاف پانی سے وہ اپنا پیٹ بھر چکا تھا جو راستہ کے متوازی خرام نازا اور ایک خوش گوار شور کے ساتھ چلا جاتا تھا لیکن بادل کے پیٹ میں کئی دنوں سے ایک دانہ بھی اُتر کر نہ گیا تھا۔ فاقہ کشی کی موت اس کی نظروں میں چھائی جا رہی تھی۔ ایک طرف ضعیفی اس کی فراہمی غذا کی قوتوں کو فنا کرتی جا رہی تھی اور پھر اس فاقہ کشی نے اس کے رہے سہے حواس بھی منتشر کر دئے تھے۔ اب بادل کیا تھا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ وہ خوبصورت داغ دار ریشم کا کھال جس پر اس کو ناز تھا سخت اور خار دار ہو چکی تھی۔ پیٹ پیٹھ کو آ لگا تھا۔ پنجے پُر آماس اور درد سے آلودہ تھے۔ چلنا اور کھڑا رہنا ایک بار تھا۔ بڑی مصیبت سے وہ اس جگہ آن کر ایک کونہ میں پڑ گیا۔ اس کو معلوم تھا کہ یہ پہاڑی جنگلی جانوروں کا وطن ہے۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے وہ اس راستے یقیناً پہاڑ پر آئیں گے۔ تاکہ اپنی اپنی آرام گاہوں میں بسیرا لیں ـــــ" پس ان جانوروں میں سے صرف ایک آہ کاش صرف ایک میرے پیٹ کی وسعتوں کو بھر دے۔")

بادل نے سوچا کہ اگر آج رات تک اس نے ایک جانور کا شکار نہ کیا تو بس صبح تک اس کی موت ہے۔

آفتاب عالم تاب دن بھر کے سفر سے تھک کر مغرب کی طرف آرام کو چلا۔ بادل نڈھال وبے حال راستہ کی طرف نگاہ لگائے سوچنے لگا کہ "اب جلدی یہ راستہ جانوروں کی آمد سے بارونق ہو جائے گا مجھ کو چاہیے کہ نہایت تدبیر اور احتیاط سے اپنے شکار پر حملہ کروں اس کے بعد اسے کھینچکر جھاڑیوں میں فوراً لے آؤں اور پھر ـــــ" اس نے آج کی ہونے والی پر تکلف دعوت کے خیال پر اپنے ہونٹ چاٹے۔ بادل نے تمام وقت اپنے ہونے والے شکار کے متعلق خوب نقشے جمائے۔

" ہر چیز بڑی احتیاط اور سرعت کے ساتھ ہونی چاہیے۔ ایک ذرا سی غلطی بھی اسے شکار سے محروم کر دے گی۔ کیونکہ پھر دوسرے جانور بھی باخبر ہو جائیں گے اور پھر ـــــ موت تو ہے ہی۔"

آخرش کارزار کا وقت قریب آیا۔ بادل نے ان تمام آداب شکار کو ملحوظ رکھتے ہوئے سانس روک لی

اور دبک رہا جو سالہا سال کے تجربے نے اسے سکھا دیے تھے۔ ان کی صحت اور غلطی پر اس کی بقا اور فنا کا انحصار تھا اس نے اپنی پرانی ہڈیوں کے ڈھانچے کو بے گوشت پنجوں اور رانوں پر سکیڑ لیا اور راستہ کی طرف آنکھیں جما دیں۔ آخرکار جانوروں کے کاروان کا ہراول آن پہونچا۔ بادل نے ہر گزرتے ہوئے جانور کو غور سے دیکھا اس نے غور کیا کہ کونسا جانور اس کے حملہ کے لیے موزوں ہو سکتا ہے۔ بھوک اگرچہ اسے فوری حملہ پر اکسا رہی تھی لیکن اس نے اس جذبہ کو پوری قوت سے روکا کیونکہ اب اس کی وہ شہزوری پنجوں کی قوت اور ناخنوں کی تیزی ایک افسانہ بن کر رہ گئی تھی عقل کا تقاضا تھا کہ ابھی انتظار کرنا چاہیے تاکہ کوئی ایسا جانور نظر آئے جو نسبتاً آسانی سے حاصل ہو سکے۔

جانور ایک ایک کرکے گزر گئے لیکن کوئی جانور ایسا نہ گزرا جس سے اس کی کامیابی کی توقع وابستہ ہو سکتی تھی۔ وہ جوا نہیں کھیلنا چاہتا تھا یقین اس کی سب سے بڑی موجودہ پالیسی تھی۔ پہاڑی کے نیچے بھیڑیوں کے بھونکنے کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں۔ اب یہ بھیڑیے ہی بادل کے ٹوٹتے ہوئے دل کی آخری امید تھے۔ لیکن بادل پر ایک جھرجھری سی طاری ہوئی۔ یہ بھیڑیے بڑے پلید جانور ہیں۔ لوزبچہ اگر جوان اور طاقتور بھی ہو تو بھیڑیوں پر حملہ کرنے سے پہلے دو وقت اپنے ارادہ پر سوچ بچار کر لیتا ہے۔ بادل کے دل میں گزشتہ لڑائیوں کی یاد اب تک تازہ تھی۔ کئی دفعہ اس نے ان سے زکیں اٹھائیں اور زخموں کے نشان تو اب تک اس کے جسم پر موجود ہیں۔ بھوک اسے مجبور کر رہی تھی کہ ایک آخری بار قسمت آزمائی کرنی چاہیے۔ اور دوسری طرف ناطاقتی اسے موت کے منہ میں جانے سے روک رہی تھی۔ ان بھیڑیوں کے بھی گزر جانے کے بعد اس کی شکم سیری کے مواقع درجۂ صفر پر آ جائیں گے۔ اپنی بےبسی پر اسے رونا آگیا۔

یکایک ایک ہلکی سی آواز کسی بھیڑئے کی دور سے سنائی دی بادل کی مردہ آرزوئیں جاگ اٹھیں وہ سنبھل کر بیٹھا اور راستہ کے موڑ پر آنکھیں گاڑ دیں۔ ایک تنہا لیکن غیر معمولی جسیم بھیڑیا موڑ سے گزر کر سامنے آیا۔ یہ بادل کا آخری موقع تھا۔ اس نے گھات لگائی اس امید سے کہ اب پیچھے بھیڑیے نہیں آ رہے ہیں یہ اگر اکیلا ہی ہے تو مار لوں گا۔ غرض اب غذا یا موت۔

جوں ہی بھیڑیا اس کے قریب آیا بادل اپنی پوری قوتوں کو مجتمع کرکے اس کی پیٹھ پر ایک گٹھڑی کی طرح جا گرا۔ اس بے خبر حملہ نے بھیڑئے کو بالکل ہراساں کر دیا۔ وہ ایک طرف کو بری طرح گرا۔ لیکن اتنا وقت پھر بھی اسے مل سکا کہ اس غیر متوقع آفت کی خبر اپنے ساتھیوں کو ایک ہیبت ناک چیخ کے ساتھ کر دے اور اس کے بعد وہ زندگی کے لئے لڑنے لگا۔

بادل کے دانت بھیڑئے کی گردن پر تھے اور ناخن کھلے پیٹ کے اندر دھنس رہے تھے۔ بھیڑئے کے لئے بھی آخر موت و زیست کا سوال تھا اس نے بادل کی گرفت سے آزاد ہونے کی پوری کوشش کی لیکن بادل اس شکار کو چھوڑ نہ سکتا تھا۔ اس کے دانت نرخرے کے اندر پہونچ گئے۔ ناخنوں نے پیٹ کی آنتیں نکال دیں۔ چند لمحوں میں وہ بھوک کی لعنت سے آزاد ہو گیا اس نے اپنی کوشش دوچند کر دیں۔ امید کی آخری کرن نے اس میں کافی توانائی پیدا کر دی۔

لیکن بھیڑئیے کی چیخ نے چار بھیڑیوں کو مطلع کر دیا تھا وہ اس کی مدد کو آن پہونچے چاروں طرف بادل کو گھیر کر وہ اس پر بری طرح حملہ آور ہوئے۔ لیکن بادل اپنے کام میں مشغول رہا۔ پھر جب کہ اس نے بھیڑئیے کا پوری طرح خاتمہ کر دیا تو اسے اب اپنی سلامتی کے لئے لڑنا تھا۔ ایک خوفناک گرج کے ساتھ وہ ان چاروں پر حملہ آور ہوا۔ کبھی ایک پر برستا کبھی دوسرے پر حملہ کرتا لیکن ہر حملہ میں اس کی قوت اور ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اور بھیڑئیے مسلسل حملہ کر رہے تھے۔ پھر جنگ کے شور نے دوسروں کو بھی آگاہ کر دیا اب بادل بھیڑیوں کی فوج کے درمیان تنہا گھرا تھا جو اس کی تکا بوٹی کر رہے تھے۔ اس کی طاقت سرعت سے زائل ہو رہی تھی۔ کئی دفعہ وہ جھلایا ہوا ایں قلابازیاں لگائیں۔ کاٹا دھمکیاں دیں اور بار بار پشت سے حملہ آور ہونے والوں کی گرفت سے آزاد ہوا۔ لیکن سب بے سود تھا۔ خون اس کے جسم سے فوارہ کی طرح نکل رہا تھا۔ گو دشمنوں کے جسم بھی لہو لہان تھے لیکن یہ کوئی تسلی کی بات نہ تھی۔

آخر کار، اس نے پسپائی کا فیصلہ کر لیا اور بھیڑیوں کے حلقہ سے ایک تیز جست لگا کر علیحدہ ہو گیا۔ زخموں کی تکلیف سے بے قرار ہولناک چیخیں مارتے ہوئے اس نے ایک بڑی چٹان کے پیچھے پناہ لی اور قریب کی جھاڑیوں میں جس کو چند جنگلی بیلوں نے بہت گنجان بنا دیا تھا آ گرا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بھیڑئیے ایسے خطرناک مقام تک اس کا پیچھا نہ کریں گے۔ اس نے اپنے خون آلود زخموں کو چاٹا اور شور مچاتے ہوئے بھیڑیوں کی طرف زور زور سے گرجیں لگائیں تاکہ ان کو پیچھا کرنے سے روکے۔ بھیڑیوں نے آنے کی ہمت نہ کی۔ اب وہ حملہ سے محفوظ تھا۔

لیکن ہر سانس اب اس کے پھیپھڑوں کو کاٹتے ہوئے جانے لگی۔ اس نے زخموں میں شدت کا درد محسوس کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بوٹی بوٹی اور ہڈی ہڈی کسی نے چبا ڈالی ہے۔ زخموں کی بڑھتی ہوئی تکلیف بھوک پر بھی غالب آتی نظر آتی تھی۔ اور تھوڑے ہی فاصلہ پر اس کا جائز شکار اس کے قوت بازو کی کمائی رکھی ہوئی تھی۔ جس کی اسے سخت ضرورت تھی۔

شام کی ہلکی روشنی کی جگہ اب تاریکی لے چکی تھی بھیڑیوں کا کھسیانا گروہ بکتا جھکتا پہاڑی کی چوٹی پر جا چکا تھا اور ہر جگہ اب خاموشی مسلط تھی۔

بادل نے اپنے کھوئے ہوئے حواس ایک آخری جدوجہد کے لئے مجتمع کئے۔ کچھ نہ کچھ اسے اپنے پیٹ میں ڈال لینا چاہئے۔ درد کی ہلکی کراہوں کے ساتھ وہ جھاڑی سے نکل کر باہر تانہ جوا میں پہونچا۔ نا قابل احساس درد کی حالت میں اس نے اندھیرے میں اپنے شکار پر ایک نظر ڈالی۔ بڑھتی ہوئی کمزوری سے وہ جنگ کر رہا تھا۔ کچھ قدم اور آگے بڑھائے گئے لیکن ہر ہر قدم ایک قیامت تھی۔ صرف بھوک تھی جو اسے کھینچ رہی تھی۔ بہت سی منزلوں میں اس نے یہ تھوڑا فاصلہ طے کیا اور آخر کار منزل مقصود پر پہونچتے ہی بیدم ہو کر بھیڑئیے کے جسم پر گر پڑا اب گوشت کو پھاڑنے کی بھی سکت اس میں نہ رہی تھی۔ بار بار اس نے اپنے دانت بھیڑئیے کے پھٹے ہوئے پیٹ پر جمائے لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم عظیم ایک جھٹکے کے ساتھ نیچے آ رہا اور سانس اکھڑنے لگی۔ اس کا سر آگے کی طرف اپنے آخری شکار پر گر پڑا اور آخر کار یہ بے جگر روح عالم بالا کی طرف پرواز کر گئی۔

ابھی سورج پوری طرح طلوع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مُردار خوار پرندوں کی ایک ٹکڑی ہوا میں منڈلانے لگی۔ اور پہاڑی کے مختلف حصوں سے جانوروں کی صدائیں کسی دعوتِ عام کا اعلان کرنے لگیں بہت جلد فاتح و مفتوح ان مفت خوروں کی غذا بن جائیں گے۔

"یہ جنگل کا قانون ہے کہ کمزور فنا ہوتا کہ طاقتور زندہ رہے۔"

(ترجمہ)　**محمد نجم الدین انصاری**

غریب نوجوان

سرمایہ دارِ دُنیا　با اختیارِ دُنیا
ہنگامہ بارِ دُنیا　نفرت شعارِ دُنیا
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

ہر دم سنورنے والو　پھولوں پہ مرنے والو
کانٹوں سے ڈرنے والو　بچ کر گزرنے والو
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

عیش و طرب کے بندو　جام و سبو کو پوجو
راتوں کو دن بناؤ　کیوں میرا حال پوچھو
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

سب مُسکرا رہے ہیں　چرخ کے لگا رہے ہیں
تسکین پا رہے ہیں　کس کو بنا رہے ہیں
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

ہوش و خرد سے ہارا　دیوانگی کو پیارا
ناکامیوں کا مارا　بے آس بے سہارا
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

طوفاں میں بہنے والا　ہر جبر سہنے والا
کچھ بھی نہ کہنے والا　خود دار رہنے والا
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

ہر دل کی غمگساری　ہر غم پر اشکباری
احساس کا بھکاری　احساس کا پجاری
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

میری جواں امیدیں　خوابِ جناں امیدیں
ہوں کامراں امیدیں　ایسی کہاں امیدیں
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

یہ چاندنی، یہ تارے　یہ سین، یہ نظارے
القصہ عیش سارے　مجھ سے رہیں کنارے
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

یہ خوش گوار صُبحیں　یہ کیف بار موجیں
یہ "پی کہاں" کی جاپیں　سازِ طرب نہ چھیڑیں
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

یہ کون گا رہا ہے　عالم پہ چھا رہا ہے
بے خود بنا رہا ہے　کچھ یاد آ رہا ہے
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

ہر تان دل نشیں ہے　معصوم ہے، حسیں ہے
صد کوثر آفریں ہے　میرے لئے نہیں ہے
اک بدنصیب ہوں میں
یعنی غریب ہوں میں

سحر رام پوری

بے گناہ مجرم

"میرا موکل ایک شریف اور غریب آدمی ہے تمام لوگ اس کی دیانتداری اور نیک چلن سے واقف ہیں۔ پولیس کے عاید کردہ الزامات سرتاپا غلط اور بے بنیاد ہیں چنانچہ میرے موکل کا بیان اس حقیقت کو بے نقاب کردے گا۔" وکیل نے عدالت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا وکیل کا جملہ ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ حاکم عدالت اور تماشائیوں کی نگاہیں ملزم پر پڑیں جو دفور غم سے حیرت اور پریشانی کا مجسمہ بنا کھڑا تھا۔

"تم اپنے خدا کو حاضر ناظر جان کر تمام حالات من وعن بیان کرو تاکہ تمھارا انصاف کیا جائے۔" حاکم عدالت نے ملزم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"سرکار میں ایک غریب و بیکس ٹانگہ والا ہوں" ملزم نے حلف اٹھاتے ہوئے کہا "ایک روز میں تاج محل ہوٹل کے قریب شام کے وقت اس امید میں کھڑا تھا کہ شاید کوئی سواری ادھر آنکلے اور میں دو چار آنے اور کمالوں۔ تاکہ اس سے میرے دن بھر کے بھوکے معصوم بچوں اور بیوی کے لئے کھانے کو کچھ سامان خرید لوں میں بہت دیر تک انہی خیالات میں ڈوبا رہا آخر کار مایوسی اور ناامیدی کا منہ دیکھنا پڑا اور میں گھر لوٹنا ہی چاہتا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آواز دی" یہ ٹانگہ تمھارا ہے" "جی ہاں میرا ہے کہاں چلوگے" میں نے پیچھے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اور دیکھا کہ دو شخص انگریزی لباس پہنے ہوئے میرے پیچھے کھڑے ہیں۔

"کیا تم ہمارے ساتھ مغربی گھاٹ تک چلوگے" ان میں سے پہلے نے کہا جناب مجھے کوئی عذر نہیں لیکن اس وقت شام ہوچکی ہے جاڑے کا موسم ہے علاوہ ازیں راستے کے نشیب و فراز اور گنجان جھاڑیوں کے خونخوار درندوں کا خوف مجھے روک رہا ہے۔

"جنگل اور اس کے جنگلی جانوروں کا کچھ خوف نہ کرو ہم محکمہ جنگلات کے عہدہ دار ہیں کسی کام کی وجہ سے ہمارا اسی وقت وہاں جانا نہایت ضروری ہے ہماری موجودگی میں تمھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی" دوسرے نے پانچ روپیہ کا نوٹ میرے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا پانچ روپیہ کا نوٹ دیکھ کر میری باچھیں کھل گئیں اور میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ اگرچہ کہ سفر لانبا اور موسم ناقابل برداشت ہے تاہم میری محنت کا صلہ بھی تو کچھ کم نہیں قدرے توقف کے بعد میں نے رضامندی ظاہر کی اور وہ دونوں سوار ہوگئے۔ اب ٹانگہ مغربی گھاٹ کی طرف روانہ ہوا آبادی کے آخری ناکہ پر پہنچ کر میں نے اپنے ٹانگہ کا نمبر اور مسافروں کی تعداد نوٹ کرادی۔ شہر کے باہر ہوا کے تیز جھونکے چل رہے تھے میں سردی کی تاب نہ لاسکا اور میرا جسم بید کی طرح کانپنے لگا۔ آسمان پر تاریکی چھائی ہوئی تھی فضا میں کھڑے ہوئے کالے کلوٹے پہاڑ کاٹ کھانے کو دوڑ رہے تھے گھوڑے کی رفتار بھی سفر کی دوری اور وحشتناک فضا سے کسی قدر سست ہوگئی تھی۔

"کیا تم سردی محسوس کر رہے ہو" ان میں سے ایک نے کہا۔

"ہاں جناب سردی اس بلا کی ہے کہ میرے نحیف و ناتوان جسم میں اس کے برداشت کی سکت نہیں" میں نے گھوڑے کو ہانکتے ہوئے کہا۔ "یہ پہن لو" ایک نے اپنا اوورکوٹ دیتے ہوئے کہا میں نے کوٹ پہن لیا۔ ہم شاید ایک آدھ گھنٹے میں منزل مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔ "انشاءاللہ ضرور" دوسرے نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا میں برابر گھوڑے کو ہانک رہا تھا۔ لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے جارہے تھے میری دہشت میں اضافہ ہورہا تھا۔ بارے خدا خدا کرکے ہم ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں کا منظر نہایت خوفناک تھا۔ راستے کی دونوں جانب گنجان

درختوں کا بن کھڑا تھا۔ اس بن کہیں کہیں پہاڑیوں کے پیچ و خم کھاتے ہوئے سلسلے دکھائی دیتے تھے۔ جن میں سے خوفناک درندوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اس روح فرسا منظر سے میری وحشت و اضطراب میں اور اضافہ ہوا وہاں خوف اُگ تھا اور وحشت برستی تھی۔ "گاڑی کو روک دو"۔ ان میں سے ایک نے کہا اور یہ کہتے ہوئے کہ "تم یہاں ٹھیرے رہو ہم ابھی آتے ہیں" دونوں ٹارچ کی روشنی میں بن میں داخل ہوئے اور فوراً میری نظروں سے غائب ہو گئے۔ اب میرا خوف و ہراس اور بڑھتا گیا۔ طرح طرح کے خیالات میرے دل میں پیدا ہونے لگے۔ کبھی میرا ضمیر مجھ کو لعنت کر رہا تھا اور کبھی اپنے پیشہ پر غصہ آرہا تھا کبھی بچوں کی یتیمی اور بیوی کی بیوگی کا خوف ستا رہا تھا۔ خدا جانے میں انہی خیالات میں کب تک ڈوبا رہا۔ آخر کار درختوں سے انسانی گفتگو کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر بعد وہی دونوں آدمی آتے ہوئے دکھائی دئے۔ قریب پہنچ کر ایک نے کہا "کیا تم انتظار کرتے کرتے ہو ہمیں ذرا دیر ہو گئی"۔ میں خوف و ہراس کا مجسمہ بنا کھڑا تھا جواب دینے کی کوشش کی لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔ اب پھر دونوں ایک غیر مانوس زبان میں گفتگو کرنے لگے اسی اثنا میں ایک دیو ہیکل طویل قامت انسان کمبل کی گھٹڑی سر پر لئے نزدیک پہنچ گیا اور ان کے اشارے سے ٹانگہ پر رکھ کر روانہ ہو گیا۔

"دیکھو ٹانگہ والے اس پوٹلی میں کچھ میوہ اور سامان ہے ہم کسی ضروری کام کی وجہ سے اسی وقت واپس نہیں ہو سکتے اسے احتیاط کے ساتھ مسٹر سعید امین جنگلات کے گھر پہنچا دینا"۔ "کروڑ گیری کے ناکہ پر اگر محصول طلب کیا جائے تو ادا کر دینا"۔ ان میں سے ایک نے دس روپے میرے ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا۔ اب میں دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا آبادی کی طرف روانہ ہوا۔ میرے دل سے خوف و ہراس کافور ہو گیا میں بہت مسرور تھا کبھی یہ خیال آتا کہ اتنی کثیر رقم سے میرے بگڑے ہوئے کام بن جائیں گے کبھی یہ خیال کرتا کہ میں اپنے معصوم بچوں کے لئے کپڑے اور بیوی کے لئے کچھ زیور خرید لوں گا۔ غرض اس قسم کے خیالی پلاؤ پکاتا ہوا تیز تیز چلا جا رہا تھا کہ "ٹانگہ روکو" دو کی دل شکن آواز نے مجھے چونکا کر دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کسٹم آفس کا پہرہ دار اور پولیس کانسٹبل جس کا تھانہ محصول خانہ سے متصل تھا میری طرف بڑھ رہے ہیں۔ نزدیک پہنچ کر محصول خانے کے جوان نے کہا اس گھٹڑی میں کیا ہے؟ "جناب اس میں کچھ پھل اور سامان ہے جو مسٹر سعید امین جنگلات کے گھر پہنچانا ہے"۔ میں نے ٹانگہ سے اترتے ہوئے جواب دیا۔

امین جنگلات کے پھل　تو کچھ بہتر ہوں گے ہمیں بھی دو ایک کھلا دو"۔ پولیس کانسٹبل نے کہا اور دونوں پوٹلی کے بند ڈھیلے کرنے لگے۔ بند کھول کر اوپر سے گھاس پھوس ہٹایا۔

"ہیں یہ کیا مسٹر سعید کی لاش" کسٹم آفس کے جوان نے چونک کر کہا۔ "کیا کہا مسٹر سعید امین جنگلات کی لاش" میں متعجب ہو کر دیکھنے کے لئے آگے بڑھا اور جب واقعی لاش دکھائی دی تو مجھ پر غشی طاری ہو گئی اور میں دھم سے زمین پر آرہا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے علم نہیں جب مجھے ہوش آیا تو میں خود کو پولیس کی آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا پایا ان کا ایک افسر کچھ نوٹ کر رہا تھا۔ اور لوگوں کا ہجوم مجھے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑ رہا تھا۔ میرے مالک اور آقا یہ ہے میری سچی درد بھری داستان"۔ ٹانگہ والے نے پیشانی اور چہرے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

حاکم عدالت نے ملزم کو بے گناہ قرار دے کر پولیس کو اصلی ملزموں کی تلاش کا حکم دیا۔

محمد عبد الکریم (کلیانی)

تنقید و تبصرہ

حسن و عشق :- مرتبہ محمد صدیق صدقی خیرآبادی چھوٹی تقطیع ۴۸ صفحات قیمت ۸ر فی جلد۔ یہ اصل میں ایک بیاض ہے جس میں مصنف نے حسن اور عشق کے موضوعوں پر اپنی پسند کے مختلف اشعار جمع کر دیے ہیں اس طرح کے کئی مجموعے اس سے پہلے بھی چھپ چکے ہیں اور یہ مجموعہ بھی ان اصحاب کے لئے قابل مطالعہ ہے جو حسن اور عشق کے مختلف پہلوؤں کے متعلق مشاہیر شعرا کے منتخب اشعار کو ایک جگہ دیکھنے کے خواہش مند ہوں۔ محمد صدیق صاحب کا ذوق اچھا ہے اور انھوں نے بڑے سلیقہ کے ساتھ بہت سے دلچسپ شعر ایک جگہ کر دیے ہیں۔

الہاماتِ شاد :- مرتبہ عبدالمالک آروی ۴۰ صفحات قیمت ۸ر۔ یہ چھوٹی سی کتاب سلسلۂ مطبوعات طاق بستان آرہ کی تیسری کڑی ہے۔ اس میں شاد عظیم آبادی کے حالاتِ زندگی اور محاسن شعری پر ایک تاریخی و ادبی تنقید پیش کی گئی ہے، اس میں مصنف نے بہت سرسری طور پر عظیم آباد کے اس مشہور شاعر کے متعلق معلومات قلمبند کی ہیں اور جیسی کچھ چاہیے تحقیق و تفتیش نہیں کی گئی۔ اس اثنا میں شاد سے متعلق متعدد اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کا مطالعہ کرنا شاد پر کچھ لکھتے وقت نہایت ضروری ہے۔ خاص کر چند ماہ قبل ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شاد کے مکتوبات کا جو ۴۰۰ صفحات کا مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں شاد کے متعلق اتنی معلومات شامل ہیں کہ اگر الہاماتِ شاد کے مصنف صرف اسی کتاب کو دیکھنے کی زحمت گوارا کرتے تو ان کی یہ کتاب اتنی تشنہ نہ رہ جاتی اور شاد کے متعلق وہ ایک مبسوط کتاب پیش کر سکتے۔

مقدمہ زندگانی محمدؐ :- مؤلفہ محمد حسین ہیکل و مترجمہ محمد حسین عرشی چھوٹی تقطیع ۱۲۸ صفحات قیمت ۱۰ر۔

دفتر امت مسلمہ امرت سر کی طرف سے مذہبی موضوعوں سے متعلق کچھ عرصہ سے اچھی کتابیں شائع ہو رہی ہیں جن میں تعلیماتِ قرآن، مطالعۂ حدیث، برہان القرآن اور اسلام اور حریت و مساوات جیسی کتابیں قابلِ ذکر ہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور اس میں ان نوجوانوں کے لئے جو اسلام اور پیغمبرِ اسلام کو اہلِ مغرب کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان بزرگوں کے لئے جو عہدِ رسالت کے بعد کی تصنیفات کو بے خطا سمجھے ہوئے ہیں بڑی مفید اور کام کی باتیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ یہ کتاب اصل میں عربی میں لکھی گئی اور مصر میں چھپی تھی اور اتنی مقبول ہوئی کہ پہلا ایڈیشن پریس ہی سے تین ہزار سے زائد کی تعداد میں فروخت ہو گیا اور بقیہ سات ہزار جلدیں تین مہینوں میں ختم ہو گئیں۔ بعد کو ایران میں آقا ابوالقاسم پائندۂ ایرانی نے اس کا ترجمہ ایرانی زبان میں بھی شائع کیا اور اب اردو میں چھپا ہے۔ مغرب زدہ نوجوانوں کے لئے اس کا مطالعہ واقعی مفید ثابت ہوگا۔

آزادی کی نظمیں :- مرتبہ سبط حسن صاحب ۱۹۲ صفحات چھوٹی تقطیع قیمت عہ۔ یہ کتاب انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے شائع ہوئی ہے اور اس میں اردو شاعروں کی ان تمام نظموں کو ایک جگہ کر دیا گیا ہے جن میں اسلوب بیان اور پرواز خیال کے لحاظ سے شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے اور شگفتگی شاعری کی جان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادھر کچھ عرصہ سے ہمارے نوجوان شاعر اس قسم کی شاعری کی طرف خاص توجہ کر رہے ہیں، اس مجموعہ میں غالب، آزاد، حالی، اسمٰعیل میرٹھی، شبلی، سرور، جہاں آبادی، اقبال، ظفر علی خاں، چکبست، حسرت موہانی سے لے کر عہد حاضر کے متعدد جواں سال شاعروں تک کے کلام سے انتخابات جمع کر دیے گئے ہیں۔ نوجوان شعرا کے کلام میں شدت اور تلخی کا پیدا ہونا ضروری ہے، جوانی ہی وہ موسم ہے جس میں جذبات کا سمندر اپنی پوری تلاطم خیزیوں کے ساتھ موجزن ہوتا ہے اور زمانے کا تقتضا اس سیلاب کو جس طرف چاہے بہا لے جاتا ہے۔

(باقی)

"ق"

شعرائے عثمانیہ (ادارۂ کی ایک اہم کتاب)

یہ مرقع سخن کی چوتھی جلد ہے جس میں جامعہ عثمانیہ کے چھبیس ممتاز شعراء کا کلام اور اس پر مختصر تبصرہ ہے شعراء کے کلام کے انتخاب میں دقت نظر سے کام لیا گیا ہے ۔ان شعرا میں بعض ایسے ہیں جو دکن سے باہر بھی مقبول ہیں اور بعض مقامی طور پر ہی روشناس ہیں۔

اس مختصر تذکرہ کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ دکن کے شعراء ہندوستان کے دیگر ادبی مراکز کے خیالات اور رجحانات کے دوش بدوش چل رہے ہیں اور اغلب نہیں کہ وہ ان ہی شعرار کی صف میں جلد از جلد آجائیں جن کی شاعری بہر اعتبار دوسروں سے ممتاز ہے چونکہ جامعہ عثمانیہ کے شعرار کی پیداوار قدیم و جدید تعلیم کے امتزاج سے ہوئی ہے ۔اس لئے ان کی شاعری میں زندگی پائی جاتی ہے اور فرسودگی بہت کم ہے۔

شاعر مئی سنہ ۴۰ء

اس سے پہلے کی تین جلدوں میں عہد حاضر سے پہلے کے شعرار کا حال درج کیا گیا تھا۔اس مجموعے میں جامعہ عثمانیہ دکن کے چھبیس ۲۶ فارغ التحصیل شعرار کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کا انتخاب کلام دیا گیا ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد موجودہ دور شاعری میں کتنی ترقی کر رہا ہے۔

نگار مئی سنہ ۴۰ء

انتخاب تقریباً سب ہی صنفوں پر مشتمل ہے ۔یعنی اس میں حسن و عشق، شعر و شباب رزم و بزم، حمد و نعت اور تاریخ و سیاست ہر نوع کا کلام موجود ہے بعض عنوانات بالکل نئے ہیں مثلاً تاروں کا مدرسہ، سلطانہ رضیہ میدانِ جنگ میں ۔تاج محل کو دور سے دیکھ کر ساغو جہاں گیر آواز قدم، نیاپل اور شام آسمان کی زبان سے وغیرہ ۔ شعرائے عثمانیہ میں زیادہ تر تعداد نوجوان شاعروں کی ہے، اس واسطے تقریباً سارے انتخاب میں شباب اور زندگی کی روح پھلتی ہوئی نظر آتی ہے ۔اس مجموعے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ دکن کے نوجوانوں کو کتنے اچھے پیرایہ پر تربیت دے رہی ہے اور وہاں فارغ التحصیل طلبار کتنے صاف اور سلجھے ہوئے دماغوں کے مالک ہیں۔

ترتیب کے سلیقے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی نمایاں طور پر قابل لحاظ ہے کہ ایڈیٹروں نے ہر شاعر کی خصوصیات کلام پر الگ الگ نوٹ بھی لکھ دیئے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ یہ حسین و جمیل مجموعہ ارباب شعر و ادب سے تحسین و آفرین حاصل کرے گا اور ادارۂ ادبیات اردو کی حوصلہ افزائی کا موجب ہوگا۔

البیان جولائی سنہ ۴۱ء

شعرائے عثمانیہ مرقع سخن کے سلسلے کی چوتھی جلد ہے جس میں جامعہ عثمانیہ کے ۲۶ پرانے طالب علموں کے کلام کا انتخاب تھوڑی تھوڑی تنقید کے ساتھ چھپا ہے ۔کتاب ادارۂ ادبیات کی دوسری مطبوعات کی طرح خوش مذاقی سے شائع کی گئی ہے۔ کتابت اور طباعت بھی اچھی ہے اور ظاہری شکل و صورت بھی کتاب دیکھ کر اسے پڑھنے کو جی چاہتا ہے

جامعہ جولائی سنہ ۴۱ء

مجھے نقلی ہٹلر بنایا گیا تھا

(ہنس بر کے حیرت انگیز انکشافات)

تمام پارٹی میں گھبراہٹ پھیلی ہوئی تھی ہم سب نے قتل کے متعلق افواہیں سن رکھی تھیں لیکن ہماری پارٹی کا کوئی ممبر بھی) اس کے متعلق تفصیلات معلوم نہ کرسکا تھا۔ جب نورمبرگ میں داخل ہوئے تو میں بہت بے چین ہو رہا تھا۔ کیونکہ مجھے معلوم نہ تھا کہ میں کس وقت قتل کر دیا جاؤں گا۔ جن سڑکوں پر سے ہم گزر رہے تھے وہ مشتعل لوگوں سے پر تھیں۔ میں لوگوں کے سلاموں کا جواب دیتا ہوا ہر شخص کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے ہر دم یہی ڈر تھا کہ کسی بندوق کا فیر مجھے ٹھنڈا نہ کر دے۔

تھوڑی دیر کے بعد ہمارے جلوس کے آگے کچھ جھگڑا شروع ہوا اس لئے ہماری موٹروں کو رک جانا پڑا ہماری پارٹی کے بہت سے ممبر جو ایسی ہی ضرورت کے لئے جگہ بجگہ متعین کر دئے گئے تھے جھگڑا چکانے کو دوڑتے ہوئے آئے۔ موٹروں میں سے بھی ہمارے کئی ساتھی ان کی مدد کے لئے اتر کر گئے۔ میں غور سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا خدا جانے کیا ہونے والا تھا اس زمانے میں ایسا جھگڑا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی لیکن میرے دل میں۔ [illegible] اس وقت کیسے خیالات [illegible] ہو رہے تھے [illegible] کا مجھے ڈر تھا وہی ہوا۔ میں نے اتفاق [illegible] ایک مکان کی دوسری منزل کی کھڑکی [illegible] دیکھی [illegible] اور تھوڑی دیر کے [illegible] کھڑکی میں سے [illegible] ہماری [illegible]

ایک طرف ہٹا لیا میری جان تو بچ گئی لیکن میں زخمی ہوگیا۔ ادھر رائفل نے ایک زور کی آواز کی اور ادھر مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے کوئی چیز زور سے میرے کندھے پر دے ماری ہو مجھے اب تک یاد ہے کہ مجھے اس وقت جان بچ جانے پر کتنی خوشی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً اپنا دوسرا ہاتھ زخمی کندھے پر رکھ دیا اور زخمی بازو کو ایسا اٹھا دیا کہ عوام نے سمجھا کہ میں نازی سلام کر رہا ہوں لیکن میرے لباس کو خون لگ چکا تھا اور جو لوگ کہ مجھ سے نزدیک تھے انھوں نے دیکھا کہ ان کا ہونے والا "فیورہر" زخمی ہو چکا ہے لیکن اکثر لوگ جھگڑے کو دیکھنے میں مشغول تھے اور انھوں نے مجھے زخمی دیکھا بھی تو انھوں نے جب ہٹلر کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا تو یہی سمجھا کہ ان کی نظر نے ان کو دھوکا دیا۔ "کیا تم بری طرح زخمی ہوئے ہو کیا ہم اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتے" ہٹلر نے مجھ سے آہستہ سے پوچھا میں نے جواب دیا "میں بالکل اچھا ہوں" اس وقت تک جھگڑا ختم ہو چکا تھا اس لئے ہماری موٹریں آگے بڑھیں۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ ہماری پارٹی کے چند ممبر اس مکان میں داخل ہوئے جس سے مجھ پر گولی چلائی گئی تھی۔ جس شخص نے مجھ پر فائر کیا تھا وہ کرٹ ہیسلر نامی ایک نوجوان طالب علم تھا۔ عام طور پر یہ مشہور کر دیا گیا کہ ہٹلر کے باڈی گارڈوں نے اس کو اپنے کمرہ میں مردہ پایا اور وہ اپنی ہی رائفل کی گولی سے زخمی پایا گیا۔ لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے ہیسلر نے بھاگ جانے کی کوشش کی لیکن وہ ہماری پارٹی والوں کے ہاتھ [illegible] اس کو اتنی [illegible] ماریں کہ وہ بیچارہ مر گیا [illegible] ہمارا دیر [illegible] کی طرف جانا تھا جہاں

ہٹلر کی تقریر ہونے والی تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مجھے ایک چھوٹے سے دروازے سے لے جاکر چھپا دیا گیا۔ ہٹلر ہم سے پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے انھوں نے میری جگہ اس کمال سے لی کہ کسی کو شک تک نہ ہوا۔

مجھے ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچایا گیا جہاں ہماری پارٹی کے ایک ڈاکٹر نے میری مرہم پٹی کی میں سمجھتا تھا کہ ہٹلر اس شخص کو ضرور دیکھنے آئیں گے جس نے اپنی زندگی تک ان کے لئے خطرے میں ڈالی تھی لیکن میرے اس شوق کو جس سے میں ہٹلر کی اطاعت گزاری کیا کرتا تھا بڑا دھکا پہنچا جب مجھ کو معلوم ہوا کہ ہٹلر مجھ کو بغیر دیکھے ہی چل دئیے۔

چاہے اصلی ہٹلر سفر کر رہا ہو یا نقلی اوس کی جان کی بہت سخت حفاظت کی جاتی ہے یہ اس وجہ سے نہیں کہ نقلی ہٹلر کی جان پیاری ہوتی ہے بلکہ اس لئے کہ ایک ڈکٹیٹر کی جان پر حملے کا قوم پر بہت اثر پڑتا ہے۔ جب کبھی فیورر کہیں تقریر کرتے ہیں تو ہمارخود یا ان کا چنا ہوا اسٹارم ٹروپرس کا کوئی کرنل۔ پولس افسر اور ہٹلر یوتھ مومنٹ کے مقامی لیڈر سے مل کر فیورر کی حفاظت کے جملہ انتظامات کرتا ہے ہٹلر یوتھ مومنٹ کے اراکین سے سڑکوں کو پُر کر دیا جاتا ہے پولس کو ان تمام حفاظتوں کی تفصیلی اطلاع دے دی جاتی ہے جو کہ فیورر کی جان بچانے کے لئے ضروری ہیں۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں جب ہٹلر کو جرمن کا چانسلر نامزد کر دیا گیا تو وہ اپنے تمام دوستوں کے ساتھ برلن روانہ ہو گیا تھوڑے ہی عرصہ کے بعد ہم نے دیکھا کہ ہٹلر کے عہد میں جرمنی کس شاندار طریقہ پر ترقی کر رہا ہے۔ مجھے ایک ایسی بلڈنگ میں رکھا گیا جہاں جولیس شیرک جو کہ ہٹلر کا خاص ڈرائیور تھا اور کارل ایرنیسٹ جو کہ ایک اسٹارم ٹروپر تھا رہتے تھے ارنسٹ اور میں نے ایک چھوٹا سا شراب خانہ پسند کر لیا تھا جہاں کی شراب تو اچھی تھی لیکن زیادہ مجمع نہیں رہتا تھا ایک روز ہم دونوں نے رات کا کھانا ایک جگہ کھانے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ میں وقت مقررہ پر اپنے کمرے میں اُس کا انتظار کر رہا تھا جب وہ دو اور ٹروپرس کی معیت میں میرے پاس آیا اور کہنے لگا "نہیں مجھے افسوس ہے میں تمہارے ساتھ نہیں آسکتا تھا مجھے گرنگ کا حکم ملا ہے کہ دو قابل اعتماد ساتھیوں کے ساتھ حاضر ہو جاؤں۔" دوسرے روز صبح اہل برلن ریشں اسٹاک کی بلڈنگ کے جلا دئیے جانے کا مشتعل ہو کر ایک دوسرے سے ذکر کر رہے تھے لیکن اس وقت بھی میں نے رات کے واقعہ کو کچھ اہمیت نہ دی میں ابھی اپنے کپڑے بھی پوری طرح بدلنے نہ پایا تھا کہ ارنسٹ میرے کمرے میں داخل ہوا اس کا چہرہ متوحش اور زرد تھا میں اس کو اچھی طرح جانتا تھا اور سمجھ گیا کہ کوئی وحشت ناک چیز اوسکو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھلا رہی ہے میں نے اس سے دریافت کیا کہ بیٹے تو اُس نے انکار کر دیا پھر کہنے لگا "نہیں میں جانتا ہوں کہ تم پر اعتبار کیا جا سکتا ہے میں جانتا ہوں کہ جو چیزیں تم دیکھتے ہو یا سنتے ہو ان کا کسی سے ذکر تک بھی نہیں کرتے جو بات میں تم سے کہنے والا ہوں اگر تم نے اُس کا کسی سے بھول کر بھی ذکر کیا تو یاد رکھو کہ تمہاری اور میری موت یقینی ہوگی" تب وہ سانس لینے کے لئے ٹھیر گیا اور پھر کہنے لگا "نہیں میں نے ہی رات ریشں اسٹاک کو آگ لگائی تھی" یقیناً تم پاگل ہو گئے ہو میں اس کا یقین ہی نہیں کرسکتا تم اور ایسی غداری۔ ناممکن ہے" میں نے

اوسکو تعجب سے گھورتے ہوئے کہا اس نے جواب دیا
"نہیں نہیں نہیں یہ غداری نہیں ہے مجھے احکامات ہی
ایسے ملے تھے ۔ یہ گورنگ اور گوبلس کے احکامات تھے"
"اس نے آخری جملہ بہت آہستہ کہا" میں تھا را یقین نہیں
کرسکتا" میں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا" یقیناً تم بہت
پی گئے ہو وہ پاگل تھوڑے ہی تھے جو ایسے احکامات دیتے"
تب اُس نے مجھے پورا قصہ سنایا وہ اپنے دونوں ساتھیوں
کے ساتھ گورنگ اور گوبلس سے آخرالذکر کے دفتر میں ملا وہاں
اُن کو صاف صاف الفاظ میں رئش اسٹاگ کو آگ لگا دینے کا
حکم دیا گیا ۔ ہنس ایک اسٹارم ٹروپر نے ان کو بایع فاسفورس
آگ لگانے کے لئے لاکر دی اور اس نے ان کو ایک خفیہ زیرزمیں
راستے سے رئش اسٹاگ تک پہنچایا اس کے بعد ارنسٹ چلاگیا
تھوڑی دیر بعد مجھے معلوم ہوا کہ ہٹلر نے ایک اعلان کے ذریعہ
اشتراکیوں کو اس واردات کا ذمہ دار ٹھیرایا اور قانون کے
اس حصہ کو جو آزادیٔ پریس اور تقریر کا ذمہ دار تھا ختم کرڈالا
اب کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا ۔ قوم میں غصہ کی لہر دوڑانے
کے لئے ایسی ہی واردات کی ضرورت تھی اس حادثہ نے قوم
کو ان تمام سخت قوانین کے لئے تیار کردیا جو کہ بعد میں بنائے گئے
میں نہیں سمجھتا کہ ہٹلر کم ازکم اس وقت تک اس بات سے
واقف تھا کہ اس ہی کی پارٹی کے اراکین اس حادثہ کے ذمہ دار ہیں
اس حادثہ کے کچھ عرصہ بعد میری چھ سالہ
زندگی کا جو کہ میں نے "نقلی ہٹلر" کی طرح گزاری
سب سے عجیب وغریب واقعہ پیش آیا مجھے ٹھیک
تاریخ تو یاد نہیں لیکن میرا خیال ہے کہ تقریباً نصف
مارچ گزرچکا تھا ۔ ہماری پارٹی کے زمانہ قیام

میونخ میں کیپٹن ارنسٹ روہم ایک لال بالوں والی رقاصہ
کا گرویدہ ہوگیا تھا ۔ روہم اکثر اُس عورت کے ساتھ دیکھا گیا تھا
اور جب وہ ہٹلر کے ساتھ برلن آیا تو ہم کو بہت تعجب ہوا جب ہم نے
دیکھا کہ وہ رقاصہ بھی جس کا نام زیلنک تھا اس کے ساتھ آئی۔
ایک روز دوپہر کو مجھے چانسلری میں آنے کا حکم ملا وہاں
میں نے ہٹلر کو اپنا انتظار کرتے ہوئے پایا اس نے مجھ سے
کہا "میں چاہتا ہوں کہ آج رات کے نوبجے تم ایک بندموٹر میں
اس پتہ پرجاؤ" انھوں نے مجھے ایک کاغذ کا ٹکڑا دے دیا جس پر
ایک عورت کا پتہ لکھا ہوا تھا پھر ہٹلر کہنے لگا" وہاں تم کو ایک
عورت ملے گی تم اُس کے ساتھ یہاں واپس آؤگے اور بڑے
دروازے سے داخل ہوگے اور میرے حکم تک وہیں ٹھیروگے"
میں دل ہی دل میں تعجب کرتا ہوا ہٹلر کا بھیس بدلنے لگا" ایک
عورت کو فیوہرر کے دفتر میں رات کو لانے والا ہوں" یہی خیال
میرے دل میں بار بار آرہا تھا میں نے اپنی عمر میں کبھی ہٹلر کو کسی
عورت کو اچھی طرح ملتے ہوئے نہیں دیکھا تھا ۔ آخر کیوں "نقلی ہٹلر"
کو ایک عورت کے لانے کے لئے احکامات دے جارہے ہیں
یہ سوال میں اپنے دل سے بار بار کررہا تھا لیکن میرے تعجب کی
کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ جس عورت کو میں چانسلری
لے جارہا ہوں وہ زیلنک یعنی روہم کی پرانی معشوقہ تھی ہم دونوں
آپس میں کبھی کبھار بات کرتے تھے میں سمجھتا ہوں کہ وہ سمجھ گئی تھی کہ
میں "اصلی ہٹلر" نہیں ہوں میرا تعجب انتہا کو پہنچ گیا جب میں نے
دیکھا کہ چانسلری خلاف معمول بجلی کی روشنی سے منور تھی۔
ڈیوڑھی داروں کی بجائے چار موجود تھے ۔ ہماری موٹر بجائے
لوہے کے بڑے دروازے کے اندر داخل ہونے کے باہر ہی
کھڑی ہوگئی ہم دونوں اترپڑے اور چانسلری کے دروازے

تک پیدل گئے میں جانتا تھا کہ روہم کو اس واقعہ کی ضرور اطلاع ہو جائے گی کیونکہ ایڈمنڈ جو کہ روہم کا ایک عزیز دوست تھا ہمارے بالکل قریب سے گزرا۔ جب ہم ہٹلر کے خاص کمرے میں پہنچے تو میں اور زیادہ متعجب ہوا۔ کیونکہ زیلنک بالکل نہیں گھبرائی بلکہ اس نے اپنا لمبا کرتا اتار دیا ہٹلر کی کرسی کو آگے کھینچا اور ریڈیو کا بٹن دبا دیا۔ اتنے میں ہٹلر داخل ہوا اور کہنے لگا "تم میرے احکامات تک یہیں انتظار کرو" تقریباً پانچ گھنٹے تک میں کمرے میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا اس اثنا میں میں نے کئی سگریٹ پیئے ہزار ہا قسم کے خیالات میرے دل میں پیدا ہو رہے تھے میں کبھی کبھی زیلنک سے جو کہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی کچھ بات بھی کر لیا کرتا تھا۔ آخر ہٹلر دوبارہ داخل ہوا اور زیلنک سے کہنے لگا "تم اب جا سکتی ہو" اور پھر مجھ سے کہنے لگا تم ان کے ساتھ پھاٹک تک جاؤ وہاں اپنے آپ کو ظاہر کرو لیکن باہر مت جاؤ" جب میں گیٹ پر پہنچا تو زیلنک ہٹلر کی بڑی موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی مجھے یقین ہے کہ اس وقت میں نے روہم کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا۔

تین راتوں کے بعد وہی واقعہ پھر دہرایا گیا لیکن جب زیلنک چانسلری میں داخل ہوئی تو ہٹلر نے اس سے پوچھا "کیا اس نے تم سے دریافت کیا تھا" اس نے جواب دیا "تم کیا امید کرتے تھے۔ میں نے اس کو سچ سچ کہہ دیا کہ میں یہاں دفتر میں گھنٹوں رکھی گئی اور پھر بغیر کچھ کہے سنے واپس کر دی گئی لیکن وہ یقین ہی نہیں کرتا تم جانتے ہو وہ کیسا شخص ہے وہ ہر چیز پر شبہ کرتا ہے" "اگر تم سے دوبارہ پوچھا جائے تو سچ سچ سب کہہ ڈالو" ہٹلر نے جواب دیا اس دفعہ زیلنک کے پہنچنے تک ٹھیرایا گیا اس مرتبہ میں اس کو پھاٹک تک چھوڑنے گیا میں نے وہاں دوبارہ روہم کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا تیسری دفعہ پھر میں زیلنک کو چانسلری لانے کے لیے بھیجا گیا۔ اس دفعہ جب ہم داخل ہوئے تو ہم نے بلا شک و شبہ روہم کو دیکھا اس کے چہرے سے غصہ اور جلن کے آثار نمایاں تھے اس نے غالباً خیال تک بھی نہیں کیا کہ اصلی ہٹلر نہیں بلکہ وہ نقلی "اس کی معشوقہ کے ساتھ جا رہا ہے زیلنک نے بھی اس کو دیکھا اور گھبرا سی گئی چانسلری میں داخل ہوتے ہی وہ کھسیانی بلی کی طرح ہٹلر کی طرف بڑھی اور کہنے لگی "میں آج آخری دفعہ یہاں آئی ہوں اگر تم چاہتے ہو تو مجھے قید کر دو مجھے بالکل پروا نہیں" ہٹلر ہنسا اور کہنے لگا "ہاں یہ آخری دفعہ ہے زیلنک۔ آج تم یہاں سے جانے کے بعد ویانہ کی گاڑی میں سوار کرا دی جاؤ گی" تب وہ اس کی طرف بڑھا اور اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگا "تم کو اپنی زندگی کا یہ حادثہ بھلا دینا پڑے گا۔ تم اس کو ایک ایسا واقعہ تصور کرو جو کبھی ہوا ہی نہیں"

اس کے بعد میں نے کبھی اس کو نہیں دیکھا لیکن اس کے متعلق گسٹاپو کی بہت سی رپورٹیں دیکھیں کیونکہ ہٹلر کے احکامات کے تحت اس کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی کچھ عرصہ بعد گسٹاپو نے رپورٹ دی کہ وہ بہت پینے لگ گئی ہے اور پی کر بعض بہکی بہکی باتیں کرتی ہے جب میں نے مثل کو آخری دفعہ دیکھا تو اس پر سرخ سیاہی سے موٹے حرفوں میں لکھا ہوا تھا "ارے ڈگٹ" یہ الفاظ گسٹاپو اس وقت استعمال کرتی ہے جبکہ کسی شخص کی موت کی وجہ سے مثل ختم کر دی جاتی ہے۔ ہٹلر نے دوبارہ اس واقعہ کا مجھ سے ذکر تک بھی نہ کیا مجھے نہیں معلوم کہ آیا ہٹلر کو اس عجیب و غریب ڈرامے کی جو اس کے نام سے اس کے دفتر میں کھیلا گیا تھا اطلاع تھی یا نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ اس سے بے خبر تھے یہ بھی غالباً ان متعدد حادثوں میں سے ایک تھا جن میں کہ نازی ماہر ہیں۔ یہ ہٹلر گورنگ اور گوبلس کی سازش ہٹلر اور روہم کے تعلقات خراب کرنے کے لئے تھی اور میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ہٹلر اور روہم دونوں بے وقوف بنائے گئے۔ ہٹلر گورنگ اور گوبلس میں سے کوئی بھی ہٹلر اور روہم کی دوستی کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہٹلر صرف ان ہی پر اعتبار کرے۔ روہم کی طبیعت ایسی واقع ہوئی تھی کہ وہ بقول زیلنک کے "ہر شخص پر ہر قسم کا شبہ کرتا تھا" زیلنک کی چانسلری آنے جانے کے بعد ہٹلر اور روہم کے تعلقات دن بدن خراب ہوتے گئے۔

سلیم احمد خاں لودھی (اورنگ آبادی)

اڈگر و یالیس

انگریزی زبان کے ادیبوں میں اڈگر و یالیس ہی ایک ایسا ادیب ہے جس کی تصانیف نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کی۔ اس کے سحر نگار قلم سے فسانے، صحافتی مضامین اور ڈرامے سرعت رفتار کے ساتھ نکلے اور اس طرح اس نے بے اندازہ دولت پیدا کی۔ آخری زمانے میں اس کی آمدنی ڈھائی لاکھ ڈالر سالانہ تک پہنچ گئی لیکن رقم وصولی سے پہلے خرچ ہو جایا کرتی۔ اتنی دولت پیدا کرنے کے بعد بھی وہ مرتے وقت سات لاکھ ڈالر کا قرضدار تھا۔ اور یہ قرضہ صرف دو سال کی قلیل مدت میں اس کی کتابوں کی قیمت سے ادا کر دیا گیا۔ وہ انتہا سے زیادہ مُسرف اور پکا جواری تھا اور اپنے اخراجات کی بڑھتی ہوئی فہرست کے لحاظ سے وہ محنت بھی ایسی ہی کیا کرتا تھا۔ اس کو صرف بحیثیت ادیب شہرت پانے کی تمنا تھی اور اس شہرت کی تحصیل کے لئے وہ اپنی جان ہتیلی میں لئے کام کرتا رہا۔

اڈگر اپنی ماں کا دوسرا بچہ سنہ ۱۸۷۴ء میں گرین وچ (انگلستان) میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں ایک غیر معروف اداکار اور طوائف تھی۔ اسی لئے اس کے باپ کے نام سے کوئی واقف نہیں۔ پالی رچرڈ ایک بیوہ تھی اور اس کی گذر بسر تھیٹر میں اداکاری کی آمدنی سے بدقت تمام ہوتی تھی۔ وہ اور اس کے دونوں بچے اسی حقیر آمدنی پر پرورش پاتے رہے۔ واقعات بھی کچھ ایسے پیش آتے رہے۔ اڈگر کی پیدائش کو مخفی رکھنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس کی محرم راز سوائے اس کی دایہ کے اور کوئی نہ تھی۔ حتیٰ کہ اڈگر کا باپ بھی ولادت سے لاعلم رکھا گیا۔

پالی بچہ کی پیدائش سے ایک ہفتہ بعد اس کو بپتسمہ کرانے کے لئے ایک کیتھولک پادری کے پاس لے گئی۔ وہاں اس نے بچہ کے باپ کا نام رچرڈ ہوریشیو اڈگر بتلایا لیکن کلیسا کے دفتر میں اس نے بجائے اس نام کے والٹر و یالیس لکھوادیا۔ پھر اس نے اڈگر کو بیلنگس گیٹ کے ماہی گیر فری مَن کی بیوی کے حوالے کر دیا جس نے پانچ شلنگ فی ہفتہ پر اڈگر کی پرورش کی۔

یہ اڈگر کی خوش قسمتی تھی کہ جارج فری مَن اور اس کی بیوی بچوں سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ ان کے دس بچے چار کمروں والے مکان میں پرورش پا رہے تھے اور جب پالی رچرڈ نے مسز فری من سے اپنی ناداری اور غربت کا حال سنایا تو مسز فری مَن نے اڈگر و یالیس کو بھی اپنا گیارھواں بچہ سمجھا

اڈگر نے اپنے شفیق سرپرست کے زیر سایہ تھوڑا بہت علم حاصل کر لیا اور بارھویں سال کی عمر میں نیوگٹن کا رڈ سے کے مطبع میں نوکر ہو گیا یہ اس کی پہلی اور طویل ملازمت تھی ورنہ اس نے دوسری ملازمتیں چند دن کر کے چھوڑ دی تھیں۔

ایک دفعہ اس کی ملاقات ایک ملاح سے ہوئی اور پندرھویں سال میں اس نے ایک گرمزلی کے دام کشتی پر جہازی باورچی کے ماتحت سال بھر تک کام کرنے کے معاہدے پر دستخط کر دئے۔ دسمبر کا مہینہ تھا، موسم خراب تھا اور دام کشتی بحر شمالی کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہی تھی۔ مچھلیوں کی بدبو نے اور بدحواس کر دیا تھا، اڈگر و یالیس نے اپنی بحری بیماری اور ملازمتی ناقابلیت کو انتہائی طور پر چھپانے کی کوشش کی۔ وہ اپنے ساتھیوں میں مقبول بھی نہ ہوا۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ وہ سخت چڑچڑے

معاملے میں بالکل کورا تھا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ اس نے
الپین کا ایک تختہ اپنے ساتھ رکھ کر ان کے توہمات کی
خلاف ورزی کی تھی۔

جب دو مہینے بعد دام کشتی گرمزبی پہنچی تو اس نے
ساتھیوں کو خیرباد کہہ دیا اور پیادہ پا لندن کی راہ لی۔ وہ
نان بائی کی دوکان سے روٹی چرا لیتا اور ملازمین کے مکان
میں سو جاتا۔ غرض روٹی اور پانی کے سہارے وہ تین ہفتہ
تک چلتے رہنے کے بعد لندن پہنچا۔ جب مسز فری من نے
اس کو دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا اور وہیں رہنے پر مجبور کرنے لگی
لیکن اڈگر تلاش معیشت میں سرگرداں تھا اس لئے وہ ایک
اسٹر کار کے معاون کی حیثیت سے کلاکٹن میں نوکری کرنے لگا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں اس نے اپنے مستقبل کو نہایت
دھندلا، تاریک اور غربت زدہ دیکھا۔ گشتی کتب خانہ اس
کی تشنگی علم کو نہ بجھا سکا۔ اس لئے اس نے پھر ایک بار اپنی
قسمت آزمائی چاہی گو مسز فری من نے ہزار التجائیں کیں لیکن
وہ ان سب کو ٹھکراتے ہوئے رائل ویسٹ کنٹ رجمنٹ میں
سات سال کے معاہدے پر بھرتی ہوگیا۔

اس نئے سپاہی کو فوجی زندگی موزوں ثابت ہوئی۔
ابتداً اس کو غذا بھی اچھی ملتی رہی اور وہ برابر کام کرتا رہا۔
اس کی لاغری دور ہونے لگی۔ چند مہینے بعد اس نے طبی
عملے میں منتقل ہونے کی درخواست دی جو منظور ہوگئی اور اس
کو آلڈر ساٹ میں منتقل کر دیا گیا۔

آلڈر ساٹ لندن سے قریب ہونے کی وجہ سے نوجوان
اڈگر جو اپنے آپ کو ڈرامہ نگاری کے میدان کے لئے تیار
کر رہا تھا اپنی دولت موسیقی ہال اور رقص گاہوں میں خرچ
کرنے لگا۔ اس موسیقی اور نغموں میں مسرت محسوس کی۔
اب وہ اکثر و بیشتر ریل میں راہیوں پر اور ہر جگہ اپنی دل بہلائی
کے لئے مشہور نظموں پر اپنی لکھی ہوئی نظمیں گنگناتا ہوا نظر آنے لگا۔

اس کی نظمیں فوجی مے خانوں میں ہر وقت سنائی دینے لگیں
اس نے ایک نغمہ لندن میوزک ہال کے ہیرو آرتھر رابرٹس کے
لئے لکھا جو قابل یقین طور پر منظور ہوگیا اور اڈگر نے اس کو
سازوں پر سننے کے لئے لندن جانے کا ارادہ کرلیا۔ اس نے
اپنے عہدہ دار سے رخصت چاہی اور اس نے انکار کر دیا۔
ایک دن دوپہر میں وہ نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے فوجی
کیمپ سے روانہ ہوا اور پانچ دن تک لندن میں رہ کر اپنے
تصنیف شدہ نغموں کو لندن کے میوزک ہال میں پانچ پونڈ
جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا خرچ کر کے سنا اور جب دوبارہ فوجی
کیمپ پر واپس ہوا تو اس کو غیر حاضری کی علت میں چار دن
قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

چند مہینے بعد اس کو اردلی درجہ دوم پر ترقی دی گئی اور
پھر جنوبی افریقہ جانے والی پلٹن میں اس کا بھی انتخاب کیا گیا
۱۸۹۶ء میں بغاوت کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ اگرچہ اس
کے تین سال بعد تک جنگ کا آغاز نہ ہوا لیکن جیمسن کی
تباہ کاریوں اور شورشوں نے برطانیہ کے خلاف بوئروں کے
جذبات میں کافی ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔

نوجوان اردلی کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کو سائمنس
ٹاؤن ہاسپٹل پر رہنا پڑے گا تو اس کو سخت تکلیف ہوئی
کیونکہ وہاں اس کے ذمہ مکان اور طبی اشیاء کی صفائی تھی
اس کا معاوضہ اس طرح ہوا کہ دوا خانے کے سامنے
اصلاح سازوں کی دوکانوں اور قہوہ خانوں کے آگے دیر تک

مشن روم تھا جس کا معزز پادری ولیم کالڈی کاٹ تھا اس کا ایک معمولی کتب خانہ بھی تھا جہاں کتابیں مطالعہ کے لئے دی جاتی تھیں معزز پادری کی بیوی سیاری رین کالڈی کاٹ اچھے دل و دماغ کی عورت تھی۔ اس نے اڈگر سے دلچسپی لینی شروع کی۔ اس کے لئے وہ قابل مطالعہ کتابیں انتخاب کرتی اور اس کی نظمیں سن کر اس کی حوصلہ افزائی کرتی۔ یہ پہلا خاندان تھا جہاں اڈگر کو تہذیب اور تمدن کا گہرا رنگ نظر آیا۔ وہ اب نہایت اطمینان کے ساتھ جب جی چاہتا گھر میں گھومتا رہتا۔ وہ کالڈی کاٹ کی موجودگی میں کچھ بے چین سا رہتا۔ وہ کسی معمولی سپاہی وغیرہ سے زیادہ خلا ملا رکھنا پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن میاری این اور اس کی لڑکی کی صحبت میں اس کے خیالات بہت بلند رہتے اور اسی کو اپنی ترقی کے امکانات بھی نظر آتے۔ خاص طور پر آئی وی اٹھارہ سال کی دوشیزہ اس کی باتوں پر ہمہ تن گوش بن جاتی۔ اڈگر اس کے لئے غیر معمولی شخصیت بن گیا تھا۔ وہ اس کو ایک بڑا مفکر تسلیم کرتی۔ اڈگر نے اپنی ترقی کا ایک قدم اور بڑھایا اس نے افریقی اخباروں کو اپنے چند مضامین فروخت کئے جس سے آئی وی کو اور بھی یقین ہو گیا کہ وہ واقعی مفکر اور عالی دماغ ہے۔ یہ دوستی بڑھتی گئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں نے شادی کے عہد و پیمان کر لئے۔

اس کی زیادہ شہرت اس وقت ہوئی جب کہ انگلستان کا مشہور فسانہ نگار اور شاعر رڈیارڈ کپلنگ جنوبی افریقہ پہنچا اور اس کے استقبال پر اڈگر والیس نے جو نظم کہی وہ کیپ ٹائمز میں شایع ہوئی۔ اس سے بھی بہتر موقع اس کو اس وقت ملا جب کہ اس کو سٹی کلب میں کپلنگ کے الوداعی جلسہ میں ڈنر میں مدعو کیا گیا۔ نوجوان سپاہی کی زبان سے کپلنگ اپنی تعریف میں قصیدہ سن کر بہت متاثر ہوا لیکن چلتے ہوئے جو نصیحت کی وہ حوصلہ افزا نہ تھی اس کے آخری الفاظ تھے۔ "خدا کے واسطے ادب کو اپنا پیشہ نہ بناؤ، ادب شاندار عصا ہے لیکن بیوی کے فرائض انجام نہیں دے سکتا"۔ کپلنگ کی نصیحت بیکار ثابت ہوئی۔ کپلنگ سے دوستی کرنا پارلمنٹ کے اراکین، مدیران جرائد اور پروفیسر سبھوں سے دوستی کرنے کے مترادف تھا اڈگر نے کپلنگ کی واپسی کے بعد اس کو خط لکھا کہ اگر میرا مستقبل مجھے موقع دے (اور یقیناً مستقبل نے اس کو موقع دیا اور اس نے کر دکھایا) تو میں صرف ادب ہی کی بدولت وہ چیز حاصل کروں گا جس کی دنیا متمنی رہتی ہے۔

باقی آئندہ۔

اکبر صدیقی

آج کل کے اُردو رسالے

اردو کے حالیہ دَور کو اگر رسالوں کا دَور کہا جائے تو بیجا نہیں۔ کیونکہ گذشتہ دس سال اردو صحافت کے لئے جتنے سازگار ثابت ہوئے ہیں ادب کی کسی اور صنف کے لئے نہیں ہوئے۔ اس زمانے میں قدیم رسالوں کے علاوہ بعض ایسے اچھے جدید رسالے جاری ہوئے ہیں جن کی وجہ سے ہماری زبان دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ ہوگئی۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اگر کسی زبان کی شگفتگی، قوت اور زندگی کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے رسالوں ہی کو دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی وہ پیمانہ ہے جس سے کسی ملک و قوم کا ثقافتی رتبہ معلوم کیا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر اُردو پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس نے صحافتی نقطۂ نظر سے اس اثنا میں اتنا عروج حاصل کیا ہے کہ ہندستان کی کوئی اور زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی!

آج کل کے اُردو رسالوں کو ان کی نوعیت کے لحاظ سے دس عنوانات میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یعنے
۱۔ علمی و ادبی اداروں کے ترجمان ۲۔ مقبول عام ماہ نامے ۳۔ مخصوص علمی و ادبی مقاصد کے رسائل۔ ۴۔ سستے عام پسند رسالے ۵۔ نسوانی رسالے ۶۔ بچوں، بچیوں، اور طلبہ کے رسالے ۷۔ کالجوں کے میگزین۔ ۸۔ مذہبی مجلے ۹۔ طبی رسالے اور ۱۰۔ قانونی رسائل۔
ان میں سے ہر عنوان اس قابل ہے کہ اس پر ایک علحدہ تقریر کی جائے۔ یا مضمون لکھا جائے۔ آج کی اس مختصر سی صحبت میں اس کا بھی موقع نہیں کہ ان سب عنوانات کے تحت جو رسالے شامل ہوسکتے ہیں ان کے نام ہی بتادئے جائیں۔ اس لئے اس وقت صرف چند رسالوں پر ایک سرسری نظر ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ سب سے پہلے وہ رسالے قابل ذکر ہیں جو علمی یا ادبی اداروں کے ترجمان کی حیثیت سے شائع ہورہے ہیں۔ ان میں اُردو دہلی۔ معارف اعظم گڈھ۔ اورنٹیل کالج میگزین لاہور۔ جامعہ دہلی۔ ہندوستانی الٰہ آباد۔ سب رس حیدرآباد۔ نیا ادب لکھنو۔ مجلہ تحقیقات علمیہ۔ اور مجلہ طیلسانیین حیدرآباد۔ قابل ذکر ہیں۔
اُردو، اورنٹیل کالج میگزین، ہندوستانی، مجلہ تحقیقات علمیہ اور مجلہ طیلسانیین سہ ماہی ہیں اور بقیہ ماہوار۔ سہ ماہی رسالوں میں چونکہ زیادہ تر علمی اور تحقیقاتی مضمون اور مقالے ہی چھپ سکتے ہیں اس لئے یہ عوام میں مقبول نہیں ہونے پاتے۔ ان کے پڑھنے والے خاص خاص علم دوست اصحاب ہوتے ہیں اور اسی لئے ان کے معیار کو بلند رکھنا پڑتا ہے۔ رسالہ اردو اور مجلہ طیلسانیین عثمانیہ کے ارباب کار اپنے پرچوں کو مقبول بنانے کی خاطر ان میں بعض ایسے ادبی اور تنقیدی مضمون اور نظمیں بھی شامل کردیتے ہیں جن کا علمی معیار اس قسم کے سہ ماہی رسالوں کے شایان شان نہیں ہوسکتا۔ ہندوستانی اورنٹیل کالج میگزین اور مجلہ تحقیقات علمیہ اس لحاظ سے بہت کامیاب ہیں۔ اول الذکر میں علوم شرقیہ اور خاص کر فارسی ادب، اور موخرالذکر میں سائنس، علوم جدیدہ، اور تاریخ سے متعلق معیاری مضمونوں اور مقالوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔
اس نوعیت کے ماہناموں میں معارف، تاریخ و معارف اسلامیہ کا ایک بے نظیر پرچہ ہے۔ جامعہ میں علوم عمرانی

اور سیاست حاضرہ پر خاص توجہ کی جاتی ہے۔ سب رس مضامین کے تنوع اور شگفتگی پر زور دینے کے علاوہ اردو ادب کے ذوق کو ہمہ گیر بنانے میں کوشاں ہے اور نیا ادب صحیح معنوں میں اردو کے نئے ادب کا نمایندہ ہے۔

۲ - ہماری تقسیم کے بموجب دوسری نوعیت کے رسالوں میں وہ مقبول عام ماہنامے شامل ہیں جو اپنے مدیروں کی شخصیت یا اپنی اشاعت کی قدامت یا مضامین کی رنگا رنگی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کی فہرست میں نگار لکھنو۔ ساقی دہلی۔ کارزمانہ کانپور۔ ہمایوں، ادبی دنیا، اور ادب لطیف لاہور۔ شہاب حیدرآباد۔ شاہکار، نیرنگ خیال، اور عالمگیر لاہور۔ ندیم وسہیل گیا۔ جدید اردو کلکتہ۔ تصویر رامپور۔ اور شاعر آگرہ بالترتیب شامل کئے جا سکتے ہیں۔

پہلے چار رسالوں کو اردو کے مقبول ترین ماہناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ نگار اپنے مدیر کی بے باک رائے اور رنگین تحریروں کی وجہ سے، ساقی انگریزی ادب عالیہ کے نفیس ترجموں اور اچھے افسانوں کے باعث، اور زمانہ اپنی قدامت اور ہندو ادیبوں اور شاعروں کے نقطۂ خیال کا ترجمان ہونے کے سبب اپنی اپنی جگہ انفرادی حیثیت کے مالک ہیں۔ ہمایوں، شاہکار، ادبی دنیا، اور ادب لطیف اپنے مدیروں کے پاکیزہ ذوق انتخاب اور کتابت و طباعت کی نفاست کی وجہ سے قابل دید ہیں جو اصحاب انگریزی رسالوں کی دیدہ زیبی کے مقابلہ میں اردو رسائل کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ لاہور کے ان رسالوں کو دیکھیں تو اپنے خیال میں ضرور تبدیلی کرلیں گے۔

شہاب حیدرآباد کا ایک پرانا رسالہ ہے جس میں طبقۂ نسواں کی علمی و ادبی قوتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ شاعر آگرہ اسکول کے شاعروں کا بڑا اچھا ترجمان ہے۔ نیرنگ خیال اور عالمگیر بھی دیدہ زیب پرچے ہیں جو زیادہ تر اپنے خاص نمبروں اور سالناموں کی وجہ سے مقبول ہیں۔ ندیم، سہیل، جدید اردو اور تصویر، گیا، کلکتہ، اور رامپور کے قابل ذکر رسالے ہیں جو ان مقامات میں اردو ادب کے ذوق کی کامیاب اشاعت کر رہے ہیں۔

۳ - ہماری تقسیم میں تیسرا نمبر ان علمی رسالوں کا ہے جو کسی مخصوص مقصد کے تحت شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں المعلم حیدرآباد۔ نئی زندگی گجرانوالہ۔ حیدرآباد ٹیچر، سب رس معلومات، اور سیاست حیدرآباد۔ اور ہمارا مستقبل لکھنو۔ بہت نمایاں ہیں المعلم اور حیدرآباد ٹیچر، جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے مدارس کے استادوں کے لئے نکالے جاتے ہیں اور فن تعلیم و تدریس کے متعلق اردو زبان میں بڑی اچھی معلومات کا اضافہ کر رہے ہیں۔ سیاست سیاسی و اجتماعی علوم کا سہ ماہی مجلہ ہے جس میں اجتماعی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو صاف اور سلیس زبان کے ذریعہ سے اردو داں طبقہ میں مقبول بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ سب رس معلومات اصل میں ماہنامہ سب رس کا ضمیمہ ہے اور ان نوجوانوں کے لئے علحدہ شائع کیا جاتا ہے، جو مقابلہ کے امتحانوں میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔

اور ٹھوس علمی و حکمی معلومات حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں۔ نئی زندگی اور ہمارا مستقبل اصلاحی اور سیاسی رسالے ہیں اور اسی سال جاری ہوئے ہیں۔ لیکن ان کی نوعیت ظاہر کرتی ہے کہ یہ کافی مفید اور مقبول ثابت ہوں گے۔ کیونکہ عہدِ حاضر میں اہل اردو سیاسی معلومات کی تحصیل کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے ہیں۔

۴۔ چوتھی قسم کے رسالے وہ ہیں جو بالعموم پنجاب سے سستے داموں میں عوام کے لئے شائع کئے جا رہے ہیں اور جو علمی و ادبی خدمت سے زیادہ عوام کے ذوق کی خاطر مرتب کئے جاتے ہیں۔ ان میں بازاری اور سینما کے اشتہاروں کی بھی کثرت ہوتی ہے لیکن اشتہاروں کی وجہ سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ رسالے غیر مفید ہیں۔ ان کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ سستے داموں کی وجہ سے جز معاش لوگ بھی ان کو خرید سکتے ہیں اور اس طرح اردو ادب کا ذوق ہر طبقہ میں نشو و نما پا سکتا ہے۔ ان رسالوں کی دو قسمیں ہیں ایک تو محض فلم اور سینما کے رسالے اور دوسرے وہ رسالے جو لاہور سے مست قلندر، ایشیا، خضر راہ، تندرستی، موج بہار وغیرہ ناموں سے شائع ہوتے ہیں۔

۵۔ ہماری تقسیم میں پانچویں قسم عورتوں کے رسائل کے لئے مخصوص ہے۔ اس خصوص میں یہ رسالے قابل تذکرہ ہیں: عصمت دہلی۔ زیب النساء لاہور۔ انیس نسواں دہلی۔ پیام نسواں لکھنو۔ ناہید حیدرآباد۔ تنویر ملّی اور سہاگ لاہور۔ یہ سب ماہنامے ہیں۔ ان میں عصمت اور انیس نسواں بہت ممتاز ہیں۔ پہلا علامہ راشد الخیری کی یادگار ہے۔ اور تینتس ۳۳ سال سے پابندی سے نکل رہا ہے۔

دوسرے پرچے کے مدیر شیخ محمد اکرام، مخزن کی ادارت میں سر شیخ عبدالقادر کے شریک کار رہ چکے تھے اس لئے وہ بہت سلیقہ سے یہ رسالہ شائع کر رہے ہیں۔ ناہید رسالۂ شہاب حیدرآباد کا ضمیمہ ہے۔ بقیہ نسوانی رسائل بھی قابل مطالعہ ہیں۔

(۶) چھٹی نوعیت کے رسالوں میں ان پرچوں کو شریک کیا گیا ہے جو بچوں، بچیوں، اور مدرسوں کے طلبہ کے لئے نکالے جاتے ہیں۔ ان میں بنات، الو، پیام تعلیم دہلی۔ بچوں کا سب رس حیدرآباد۔ سعادت لاہور۔ آصفیہ میگزین اور تلمیذ حیدرآباد قابل ذکر ہیں۔ بنات بھی عصمت کی طرح راشد الخیری مرحوم کا نکالا ہوا ماہنامہ ہے۔ جو بچیوں کے لئے تیرہ سال سے باتصویر شائع ہو رہا ہے۔ پیام تعلیم جامعہ ملیہ کی طرف سے اور بچوں کا سب رس ادارۂ ادبیات اردو سے شائع ہوتے ہیں اور دونوں بچوں اور بچیوں میں بہت مقبول ہیں۔ آصفیہ میگزین مدرسہ آصفیہ حیدرآباد اور تلمیذ مدرسہ فوقانیہ نامپلی کے طلبہ کے سہ ماہی رسالے ہیں۔

۷۔ اردو کے ساتویں قسم کے رسالے وہ ہیں جو مختلف کالجوں سے زیادہ تر سہ ماہی شائع ہوتے ہیں۔ ان میں علیگڈھ میگزین، مجلۂ عثمانیہ، نظام ادب، دی پاس، نورس، الموسی، اور مجلۂ عثمانیہ کالج ورنگل کا تذکرہ ضروری ہے۔ اول الذکر دو رسالے ہندوستان کی دو مشہور جامعات یعنی مسلم یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کے ترجمان ہونے کی وجہ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ نظام ادب نظام کالج حیدرآباد اور دی پاس اسمٰعیل کالج جوگیشوری سے

نکلتے ہیں۔ اور دونوں کا معیار قریب قریب یکساں ہے۔ الوسی حیدرآباد کی مشہور درسگاہ سٹی کالج کا پاکیزہ اور دیدہ زیب مجلہ ہے۔ نورس اورنگ آباد کالج اور موخر الذکر ورنگل کالج کے طلبہ کے سہ ماہی مجلے ہیں ان دونوں کو خاص توجہ سے مرتب کیا جاتا ہے۔

ہماری تقسیم کے مطابق اردو رسائل کی بقیہ تین قسمیں مذہبی، طبی، اور قانونی رسائل پر مشتمل ہیں۔ ان تینوں قسم کے رسالوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ آج کی صحبت میں ہم ان کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس سے پہلے ہم نے جن سات قسم کے رسالوں کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی کسی طرح سے مکمل نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ یہ تو ایک تعارفی تقریر ہے اور اس میں اردو کے موجودہ رسالوں پر تبصرہ کرنا یا ان کی تاریخ بیان کرنا تو کجا قلت وقت کی وجہ سے بہت سوں کے نام بھی نہیں لئے جا سکے۔ اور انہیں رسالوں کے نام لئے گئے جو ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں آتے ہیں اور جن کا مجھے پابندی سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔

(تقریر حیدرآباد لاسلکی نشرگاہ)

سید محی الدین قادری زور

اردو دانی کی پہلی کتاب

یہ کتاب حرف شناسی کے لئے بہترین ہے اور بالکل جدید اصولوں پر مرتب کی گئی ہے جس سے بچے، بالغ، بوڑھے، بہت جلدی اردو الفاظ پر عبور حاصل کر سکتے ہیں، اس میں تصاویر کے ذریعہ الفاظ کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے، تصاویر کی تعداد (۱۰۹) ہے گو یہ بات نئی نہیں لیکن مرکب الفاظ کے جوڑوں کو ذرا سا فصل دے کر الفاظ کی ہیئت ذہن نشین کرانے کا جو طریقہ اس میں لکھا یا ہے وہ بالکل جدید ہے اس قسم کے قاعدے تمام ہندوستان میں رائج ہونے چاہیں۔ **شاعر مئی ۱۹۴۰ء**

اس زمانہ میں پڑھنے سے زیادہ پڑھانا محنت و ذہانت چاہتا ہے اور اس لئے فن تعلیم کو آج کل بڑی اہمیت دی جاتی ہے اردو سکھانے کی یہ پہلی کتاب مدرس مدرسہ خیریت آباد نے اسی فنی حیثیت سے لکھی ہے۔ **نگار مئی ۱۹۴۰ء**

یہ ایک قاعدہ ہے جو ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کے شعبۂ امتحانات کے نصاب کے لئے تیار کیا گیا ہے، خصوصیات اس قاعدے کے حسب ذیل ہیں۔

(۱) مختلف تصویریں قانون تلازم کے مطابق دی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ الفاظ کی شکلیں ذہن نشین ہو جائیں (۲) ہر لفظ کے بول کو الگ الگ لکھا ہے تاکہ مبتدی کو سہولت ہو (۳) الفاظ کی تحلیل کر کے حرفوں کی پوری شکلیں اور ان کے جوڑوں کی شکلوں کی وضاحت کی گئی ہے (۴) رسم الخط ایسا استعمال کیا ہے کہ حرفوں کی اصل حتی الامکان اپنی اصلی حالت پر قائم رہیں اور (۵) ذخیرۂ الفاظ کو جملوں میں بار بار استعمال کیا گیا ہے تاکہ خوب مشق ہو جائے۔ یہ قاعدہ اس لحاظ سے بہت مفید ہے۔ **جامعہ جولائی ۱۹۴۰ء**

"پائریا"

پائریا ایک ایسا مرض ہے جس سے بے اعتنائی نہیں کی جا سکتی ۔ کیونکہ اس سے انسان کی عام صحت متاثر ہو جاتی ہے اور وہ بآسانی گٹھیا (وجع مفاصل) بدہضمی اور Appendicitis کا شکار ہو جاتا ہے ۔ تنفس پر بھی اس سے اثر ہوتا ہے اور حلق کی سوجن کی کہنہ بیماری اسی سے ہوتی ہے ۔ دانتوں کی صحت کا خیال نہ رکھنے اور پائریا کا علاج نہ کروانے سے نتیجۃً پھیپھڑوں پر چھالے آ جاتے ہیں اور پھیپھڑے خراب ہو جاتے ہیں ۔

کسی کے مسوڑے بگڑ گئے ہوں، یا دانت خراب ہو گئے ہوں تو اس کی صحت بگڑنی شروع ہو جاتی ہے ۔ لیکن اگر مسوڑوں کا علاج ہو جائے تو صحت دوبارہ حاصل ہو سکتی ہے ۔

پائریا کی نشو و نما کیونکر ہوتی ہے؟ دوبارہ جب دانت نکلتے ہیں تو اس وقت سے لیکر عمر کے ہر دور میں یہ بیماری پیدا ہو سکتی ہے ۔ یوں تو بہت سے اسباب ہیں جن کی بنا پر "پائریا" ہو سکتا ہے ۔ خاص کر کیلشیم Calcium اور حیاتین Vitamins کی کمی ۔ دانتوں کی بے ترتیب ساخت، دانتوں کے اندر کھرونڈ Tartar جم جانے، غذا کو اچھی طرح سے نہ چبانے، اور کافی آرام نہ لینے، ریاضت جسمانی کے نہ ہونے، اور تازہ ہوا کے نہ ملنے سے یہ بیماری پیدا ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ اور بھی چند اسباب ہیں، جس کی وجہ سے یہ مرض پیدا ہوتا ہے ۔

مثلاً غذا میں بے اصولی ۔ شراب نوشی، سگریٹ نوشی کے عادی ہونے سے اور بعض اوقات اگرچہ کہ بظاہر دہن بالکل پاک و صاف رکھنے پر بھی پائریا و دیگر امراض دانتوں کی بیماریوں کے ساتھ ساتھ پیدا ہو جاتے ہیں ۔

پائریا کی ابتدائی حالت میں پہچان مسوڑوں پر خفیف سی بے توجہی سے دانتوں کے اطراف میل کی تہہ جم جاتی ہے ۔ اور اکثر مسوڑوں سے خون بہنے لگتا ہے ۔

پائریا دوسرے درجہ میں مسوڑے پلپلے ہو جاتے ہیں ان پر سوجن آ جاتی اور سرخ ہو جاتے ہیں ۔ معمولی ٹھیس پر خون نکلنے لگتا ہے ۔ اگر مسوڑوں کو دبایا جائے تو پیپ اور خون نظر آتا ہے منہ سے بدبو آنے لگتی ہے ۔

آخری حد پر تو مسوڑے حد سے زیادہ پلپلے ہو جاتے ہیں ۔ اور بکثرت خون اور پیپ نکلتا رہتا ہے ۔ دانتوں کی جڑیں باہر آ جاتی اور دانت ہلنے لگتے ہیں اور سخت تکلیف سی ہوتی ہے ۔ حد سے زیادہ بدبو آنے لگتی ہے ۔

اگلے وقتوں کی بہ نسبت آج کل پائریا کا مرض زیادہ عام ہے ۔ اس کا سبب پروٹین Proteins اور کاربو ہائیڈریٹ Carbohydrates کا حد سے زیادہ استعمال ہے ۔ اور ایسی غذاؤں کی کمی جن میں حیاتین Vitamins اور ارگن Organic Rough-age نمکوں اور Organic کی کمی ہو استعمال کرنا ہے ۔ غذا میں سڑی گلی چیزیں نہ ہونی چاہئے ۔

آج کل کی پر ہنگامہ زندگی، زندگی کے مصائب یا

پرجوش کیفیات، ریاضت جسمانی کی کمی، اور صاف ہوا کے نہ ملنے سے یہ مرض پھیل رہا ہے۔

اگر حاملہ عورتوں اور دودھ پلانے والی ماؤں نیز بچوں کو ٹھیک غذا دی جائے تو بچوں کے دانت اور ہڈیوں کے مضبوط ہونے کی ابتدا ہی سے بنیاد پڑیگی اور بیماری کا دفعیہ ہو جائے گا۔ عورتوں کی صحت بزمانہ حمل نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ اگر اس دوران میں دہن اچھا نہ رہے تو غذا برابر نہ کھائی جاسکے گی۔ نیز دودھ پلانے کے زمانے میں بھی اگر ماں کا دہن صاف نہ رہے تو بچے کی صحت کے لئے مضر ہے۔

ڈاکٹر مس یم پاٹروگر

(جولائی کے سب رس میں مس یم پاٹروگر کا مضمون "دانتوں کی اہمیت" غلطی سے حفیظ جمال کے نام سے شائع ہو گیا ہے جو دراصل ترجمہ ہے)

محمد حسین آزاد

ہونہار مولفہ نے ایم اے کے امتحان کے لئے مولانا محمد حسین آزاد پر یہ قابل قدر مقالہ لکھا تھا، جسے ادارۂ ادبیات اردو نے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ اس میں آزاد کے سوانح، ان کے علمی و ادبی خدمات و کمالات اور ان کے تصانیف پر تبصرہ ہے، سوانح کے حصہ میں ان کے جو حالات تلاش و جستجو سے مل سکے ہیں جمع کر دئے گئے ہیں، تبصرہ کے حصہ میں ان کے ادب و انشا پر بڑی حد تک خوش مذاقی سے تبصرہ ہے۔ ہونہار مولفہ نے بڑے حسن مذاق اور سلیقہ سے کتاب لکھی ہے اور اس سے اردو میں آزاد کے متعلق ایک اچھی کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔

معارف جون ۴۰ء

(اشاعۂ ادبیات اردو)

اردو ادب میں مولانا محمد حسین آزاد کی ہستی نہ صرف ادبی نقطۂ نظر سے توجہ کے لائق ہے بلکہ ان کی شخصیت بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ سیرتی مطالعہ کے لحاظ سے غدر کے بعد مرزا سودا کے علاوہ اگر کوئی ادیب ہمیں اپیل کرتا ہے تو وہ آزاد مرحوم ہیں غالباً حیدرآباد کی یہ کتاب اس بے نظیر ادیب کے حالات زندگی کے متعلق پہلی کوشش ہے جسے محترمہ جہاں بانو بیگم نقوی ایم اے نے تالیف کیا ہے۔ اس سوانح عمری میں نہ صرف آزاد کے حالاتِ زندگی بیان کئے گئے ہیں بلکہ ان کی تصانیف اور کلام پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے انداز بیان نے اکثر جگہ آزاد مرحوم کو قاری کے لئے ایک جیتی جاگتی چلتی پھرتی اور بولتی چالتی مورت بنا دیا ہے۔ **ادبی دنیا جون ۴۰ء**

تاریخ کی کتابوں میں ایک بڑی خامی یہ ہوتی ہے کہ ان کا انداز بیان بالعموم خشک اور غیر دلچسپ ہوتا ہے، زیر نظر کتاب "محمد حسین آزاد" کے متعلق بھی تبصرہ نگار کا یہی خیال تھا لیکن مطالعہ کرنے سے یہ خیال غلط ثابت ہوا، کتاب میں آزاد مرحوم کی زندگی کے حالات بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ دئے گئے ہیں۔ آزاد کی سیرت نگاری کا فرض سب سے بڑھ کر پنجاب پر عائد ہوتا ہے مگر اس بات پر رشک ہوتا ہے کہ یہ شرف دکن کی ایک خاتون کو حاصل ہوا۔ **البیان جولائی ۴۰ء**

ممالک متحدہ کے صدر کا انتخاب

ممالک متحدہ امریکہ کی صدارت کا عہدہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ دستور مملکت کی رو سے عاملہ کے پورے اختیارات صدر ہی کے تفویض ہوتے ہیں دنیا بھر میں غالباً یہی ایک ایسا عہدہ ہے کہ جس کے حصول کے لئے ہر طرح کی جائز اور ناجائز کوشش کی جاتی ہیں اور ہر چوتھے سال جب کہ صدر کے انتخاب کا زمانہ آتا ہے، گھر کی رونق ایک ہنگامے پر موقوف ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صدر کے انتخاب کا سوال اور اس انتخاب کے طریقۂ کار کا مطالعہ بحید دلچسپ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ممالک متحدہ کے دستور میں اس چیز کی ممانعت نہیں کہ کوئی صدر انتخاب کے لئے ایک سے زیادہ مرتبہ کھڑا نہ ہو، لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اس مملکت کی تاریخ میں اب تک کسی شخص کا انتخاب دو سے زیادہ مرتبہ نہیں ہوا، اور جارج واشنگٹن نے جو نظیر قایم کی تھی اس پر اب تک برابر عمل ہوتا رہا۔

اس مملکت کے دستور سازوں نے عاملہ کو مقننہ سے آزاد اور علحدہ کرنے میں بڑی دانائی سے کام کیا، اس کی بدولت صدر کی ایک خاص حیثیت ہوگئی ہے اس لئے کہ وہ مقننہ کے ماتحت نہیں ہے۔ دستور سازوں نے صدر کے لئے بالواسطہ طریقۂ انتخاب تجویز کیا ہے جو کسی قدر پیچیدہ ہے۔ دستور میں صدر کے انتخاب کا جو طریقہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مجلس قانون ساز کی ہدایت کے مطابق ہر ریاست چند انتخاب کرنے والوں کا تقرر کرے گی، اور ان انتخاب کرنے والوں کی تعداد مجموعی طور پر سناتیوں اور نمائندوں کی اس تعداد کے مساوی ہوگی جو اس ریاست کی طرف سے کانگریس میں موجود ہوں۔ لیکن ان انتخاب کنندوں کے تقرر میں ان لوگوں کو کوئی موقع نہیں مل سکے گا جو سناتی یا نمائندے ہوں یا ممالک متحدہ کے اور طور پر سرکاری عہدہ دار ہوں۔" مثلاً اگر کسی ریاست کی طرف سے کانگریس میں دو سناتی اور چار نمائندے بھجوائے گئے ہوں تو اس ریاست کو حق ہوگا کہ اپنی طرف سے چھ انتخاب کرنے والوں کا تقرر کرے ان انتخاب کنندگاں کا تقرر شہریوں کی رائے دہی سے راست یا بلا واسطہ طریقے پر ہوتا ہے۔ اس طرح مختلف ریاستوں کے انتخاب کنندوں سے مجموعی طور پر ایک حلقہ انتخاب (Electoral College) تشکیل پاجاتا ہے۔ جس میں رایوں کی جملہ تعداد (۵۳۱) ہوتی ہے۔ صدر کے انتخاب کے لئے ان میں سے کم از کم ۲۶۶ رائیں ضروری ہیں۔

غالباً اس طریقۂ انتخاب سے دستور سازوں کا مقصد یہ تھا کہ صدر کے انتخاب میں انتخاب کنندگان اپنے اختیار تمیزی سے کام لیں، لیکن جیسا کہ لارڈ برائس کہتے ہیں یہ ایک عجیب بات ہے کہ حکومت کے ابتدائی عشرات ہی سے ملک کی بڑی سیاسی جماعتوں نے صدارت کے لئے اپنے امیدوار نامزد کر دینے شروع کر دئے اور منتخب شدہ انتخاب کنندگاں کا فرض صرف اتنا رہ گیا کہ نامزد کئے ہوئے امیدوار کا صدارت کے لئے انتخاب کریں۔ یہ نامزدگی صرف صدر ہی کی حد تک نہیں رہی بلکہ سیاسی جماعتیں حلقۂ انتخاب کے امیدواروں کو بھی نامزد کرنے لگیں اور ظاہر ہے کہ اس طرح ہر انتخاب میں ان سیاسی جماعتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔ چنانچہ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ جو امیدوار کسی سیاسی جماعت کی

طرف سے بحیثیت انتخاب کنندگاں کھڑے کئے جاتے ہیں ان کا یہ لازمی فریضہ ہے کہ وہ منتخب ہو جانے کے بعد صدارت کے لئے صرف اسی امیدوار کا انتخاب کریں جو اس جماعت کی طرف سے نامزد کیا گیا ہو۔ اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ نومبر کے انتخاب کے بعد جب کہ انتخاب کنندگان چنے جاتے ہیں، ہر شخص کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ آئندہ صدر کون شخص ہوگا اور بالآخر ۴ مارچ کو جب کہ منتخب شدہ صدر اپنے عہدے کا جائزہ لے لیتا ہے، اس کی طرفدار سیاسی جماعت اپنی کامیابی پر خوشیاں منانے لگتی ہے۔

آج کل اس انتخابی مہم کا سب سے پہلا زینہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کے سیاسی فرقوں کی تنظیم شروع ہو جاتی ہے اور ہر فریق اپنے اپنے نمایندوں کا تقرر کر لیتا ہے۔ ان سیاسی جماعتوں کا اجتماع ہمیشہ جون یا جولائی میں ہوتا ہے اور اس میں صرف وہی لوگ شریک ہوتے ہیں جو مملکت کے مختلف حصوں سے نامزد ہو کر آتے ہیں یا پھر ایسے لوگ حصہ لیتے ہیں جو ایک ذیلی انتخاب کے ذریعے چن لئے جاتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک ہر ریاست کے مندوبین کی تعداد اس کے سناتوں اور نمائندوں کی مجموعی تعداد کی دوگنی ہوتی ہے اور عمومی جماعت (Democratic National Convention) کی تشکیل تو اب بھی اسی اصول پر مبنی ہے۔ لیکن جمہوری جماعت کے مندوبین ان قاعدوں کے تحت چنے جاتے ہیں جو سنہ ۱۹۲۳ء میں بنائے گئے تھے۔ ان قاعدوں کی رو سے "ہر ریاست کو زیادہ سے زیادہ چار مندوبین کے انتخاب کا حق ہوتا ہے، اور اگر اس ریاست میں کانگریسی حلقے (Congressional Districts) بھی ہوں تو ہر ایسے صوبے کی طرف سے دو مندوبین بھجوائے جا سکیں گے، اور اگر وہ ریاست پچھلے صدارتی انتخاب کے زمانے میں جمہوری (Republican) نقطۂ خیال کی ہو گئی تھی تو مزید تین مندوبین کا تقرر ہو سکے گا۔ نیز ہر کانگریسی صوبے کی طرف سے ایک اور مندوب کا بھی تقرر ہو سکے گا، بشرطیکہ پچھلے انتخاب میں اس صوبے کی ۰۰۰۰ آرائیں جمہوری نمایندوں کو حاصل ہوئی ہوں"۔ اس طرح ہر ریاست کو ایک ایسی وحدت تصور کیا جا سکتا ہے جس کا فریضہ صرف یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کے لئے امیدواروں کو نامزد کر دے اور ظاہر ہے کہ جس ریاست کی آبادی جتنی زیادہ ہوگی اس کا اثر بھی اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ کسی ریاست کو کم اور کسی کو زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے گو نظریہ کے لحاظ سے تمام ریاستیں مساوی درجہ رکھتی ہیں۔

اگرچہ صدر کا انتخاب راست طور پر رائے دہی کے ذریعے عمل میں آتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ منتخب شدہ صدر کو یقینی طور پر عوام کی کثرت کی تائید حاصل ہے کیونکہ اگر کسی ریاست میں ایک جماعت کو تھوڑی سی اکثریت حاصل ہو تو اسی جماعت کو اس ریاست کی طرف سے پورا حق انتخاب مل جاتا ہے۔ چنانچہ جو مندوبین صدر کا انتخاب کرنے کے لئے چنے جاتے ہیں، وہ اسی جماعت کے رکن ہوتے ہیں اور ریاست کے باقی افراد کی جو اس کثرت کے مقابلے میں ہار جاتے ہیں، اب کوئی آواز باقی نہیں رہتی اور ان کی مرضی کے خلاف کسی صدر کا انتخاب ہو جاتا ہے مختصر یہ کہ ممالک متحدہ میں تو عوام کی رائے اتنی اہمیت رکھتی ہے اور نہ ریاستوں کی تعداد۔ بلکہ سب سے زیادہ اہمیت صرف انتخاب کنندوں (Electors) کو حاصل ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کوئی امیدوار نومبر کے انتخاب میں اپنے مخالف آراء کی کثرت کے باوجود صدر منتخب ہو سکتا ہے۔ یہ چیز بظاہر بالکل انوکھی اور ناقابل عمل معلوم ہوتی ہے لیکن بات یہ ہے کہ ممالک متحدہ میں اس طریقے کا انتخاب صرف اس وجہ سے کامیاب رہا ہے کہ وہاں صرف دو سیاسی جماعتیں ہیں۔ اگر آج ممالک متحدہ میں دو کی بجائے تین جماعتیں کھڑی ہو جائیں تو اس انتخابی طریقے میں معتدبہ تبدیلی کرنی پڑے گی۔ **حفیظ صدیقی**

اثرِ انقلاب

ماحول دلگداز جو ہے "غم اثر" ہے پھول
منظر اسی کا ورنہ کبھی خوش گوار تھا

گلشن میں ایک "نرگسِ حیراں" کو چھوڑ کر
دیدار اس کا سب کے لئے کیف بار تھا

اپنے حسیں تبسمِ عشرت نواز سے
ہمرازِ خندۂ چمن روزگار تھا

ہر شان اس کی حسن کی آئینہ دار تھی
ہر جلوہ اس کا ذوق کا سرمایہ دار تھا

مسرور اس کی دید سے تھی سب کی چشمِ شوق
مانوس اس کے رنگ سے ہر گلعذار تھا

تصویر اس زمانہ کی ہے اب کوئی تو دیکھ
کس درجہ دلفریب یہ اسے حسن کا رتھا

گنبد میں آج "یاس فزائے مزار" ہے
کل گلستاں میں "زیب دہِ شاخسار" تھا

یاد اس کی داستانِ جمال آہ کس کو ہے
کیا جانے کون اس کا سوانح نگار تھا

آتا پتہ تو دیتا ہے آج انقلابِ دہر
گلچین بھی اس کے حسن پہ دل سے نثار تھا

یہ پھول اب جو حسرتِ قبر شکستہ ہے
سرمایۂ نشاطِ عروسِ بہار تھا

سید علی منظور

مسافر

سورج ڈوبا، بڑھا اندھیرا ہُو کا عالم چپ سی دنیا
رات اندھیری منزل دور

بجلی چمکے، بادل گرجے پروا سنکے، ساون برسے
رات اندھیری منزل دور

جاگ اٹھے ہیں شب کے مسافر راہ پہ اپنی چل نکلے پھر
رات اندھیری منزل دور

جھوم رہے ہیں، بادل کالے چڑھے ہوئے ہیں، ندی نالے
رات اندھیری منزل دور

تارا ٹوٹا، جی گھبرایا کچھ یاد آیا، جی بھر آیا
رات اندھیری منزل دور

جھینگر پھرتے، شور مچاتے جنگل سارا سر پہ اٹھاتے
رات اندھیری منزل دور

موجوں میں ہے خواب کا منظر سست ہوائیں مست معطر
رات اندھیری منزل دور

مجھ کو رستہ، کون بتائے دیکھے سہارا، کون بچائے
رات اندھیری منزل دور

گھر کر آئے، بادل کالے فلک پہ چھائے بادل کالے
رات اندھیری منزل دور

بھول گئے ہیں میرے پاؤں کون ہے اپنا، کس کو دکھاؤں
رات اندھیری منزل دور

محمد مظفر الدین ظفر ہاشمی

بچوں سے

اس پرچے میں بعض اچھے اچھے مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ مثلاً ایک مضمون شیخ رحیم الدین ظہیرآبادی کا ہے جو سب رس کے ایک اچھے مضمون نگار ہیں ان کے مضامین دلچسپ اور سبق آموز ہوتے ہیں۔ عبدالقادر فاروقی کا ایک مضمون "لاسلکی کا موجد" شائع ہوا ہے۔ ان کے مضامین بھی سب رس میں اکثر شائع ہوتے رہتے ہیں جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ پُراز معلومات بھی ہوتے ہیں۔

اس پرچے میں دو انعامات کا اعلان کیا جا رہا ہے۔

ایک تو محمود علی اکبر کا ایک انعامی معمہ شائع ہو رہا ہے۔ جسے ۱۵ تاریخ تک حل کرکے روانہ کر دیجئے انعام میں ایک اچھی کتاب دی جائے گی مرزا محمد انور نے ایک انعامی کتاب بھیجی ہے۔ اس کتاب کا نام لینن ہے کتاب بڑی دلچسپ ہے۔ انھوں نے یہ خواہش کی ہے کہ سب رس کی طرف سے کسی عنوان کا اعلان کیا جائے۔ لینن کو آپ سب جانتے ہوں گے پس اسی کی سوانح حیات ۱۵ تاریخ تک لکھ بھیجئے۔ جن کا مضمون سب سے اچھا رہے گا انھیں "لینن" انعام دی جائے گی۔ سوانح عمریاں لکھنے کی بھی عادت ڈالنی چاہئے۔ سوانح عمریاں لکھنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ دیکھیں لینن کی سوانح عمری کون اچھی لکھتا ہے۔

شعبہ طلبہ کی جانب سے ایک مباحثہ ۱۴ اگست سنہ ۴۰ء کو ہونے والا ہے جس میں مدرسوں کی طرف سے کئی جماعتیں اس مقابلہ میں شریک ہو رہی ہیں۔ آپ بھی کوشش کیجئے کہ اپنے اسکول کی طرف سے آئیں اور اگر آپ کو مدرسہ کی جانب سے نہ بھیجا جائے تو اس صورت میں بھی آپ خانگی طور پر اپنی ایک پارٹی بنا کر شریک ہو سکتے ہیں۔ پارٹی دو طلبہ پر مشتمل ہوگی ایک عنوان کی مخالفت کرے گا اور دوسرا موافقت میں تقریر کرے گا۔ فی کس ۸ر فیس شرکت ادا کرنی ہوگی۔ مقابلہ ۱۴ اگست کو ۴½ بجے احمدیہ جوبلی ہال افضل گنج میں ڈاکٹر زور صاحب کی صدارت میں ہوگا۔ مقررین کا ۳½ بجے آجانا ضروری ہے۔ عنوان کا اعلان ایک گھنٹہ پہلے کیا جائے گا۔ اول، دوم اور سوم آنے والے طلبہ کو انعامات دیئے جائیں گے۔ یکم مہر تک فیس اور درخواست شرکت روانہ کر دیجئے۔

معین الدین احمد انصاری
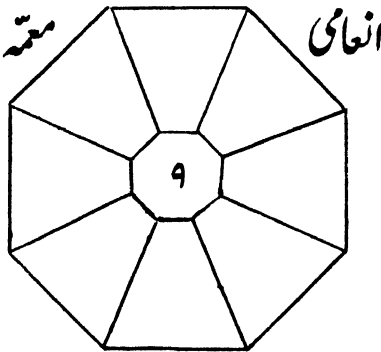
ان خانوں میں ایسے ہندسے خوش خط لکھے جائیں کہ ہر طرف سے جن کو پڑھنے پر جملہ (۲۰) ہوں۔

محمود علی اکبر مشیر

سچّی کہانی

(ایک نئے طرز کا خط)

پیارے دوست!

بہت روز ہوئے تمھیں کوئی خط نہیں لکھا تم حیران ہوں گے کہ خلاف معمول میں نے کیوں چپ سادھ رکھی ہے بات یہ ہے کہ اس اثنا میں ایک کہانی تیار کر رہا تھا جو اب تمھیں سُنا رہا ہوں۔ یوں تو تم نے بہت سی کہانیاں سنی ہوں گی لیکن یہ اپنی طرز کی بالکل نئی ہے۔

کہتے ہیں کسی دریا کے کنارے ایک بہت ہی بڑا اور پُر رونق شہر آباد تھا۔ اس شہر کا نام "چین آباد" تھا۔ اس شہر کے تقریباً سب باشندے دولت مند اور خوشحال تھے۔ اس شہر میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو زندگی کی تلخیوں کی شکایت کرے۔

شکایت و شکوہ کیوں کرتے جب کہ ان کی زندگی میں کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش ہی نہ آیا ہو۔ اس شہر کا حاکم بہت ہی نیک دل اور منصف مزاج تھا۔ اسے رعایا سے بے انتہا محبت تھی اور ان کے دکھ درد میں برابر کا شریک رہتا تھا۔ وہ اپنی رعایا سے ان کے ماں باپ کا سا سلوک کرتا تھا۔

انسان کے لئے موت یقینی ہے۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک دن حاکم اجلاس پر بیٹھا بیٹھا مرگیا۔ یہ سانحہ رعایا کے لئے بہت ہی سخت تھا۔

کئی دن تک شہر میں صفِ ماتم بچھی رہی۔ ساری رنگ رلیاں خواب و خیال ہوگئیں۔ بچہ، جوان بوڑھا سب ہی نوحہ کناں دکھائی دیتے تھے۔ ان کے سروں پر غم کا ایسا پہاڑ ٹوٹ پڑا کہ وہ اپنے رنج و الم کو کسی طرح بھی بھُلا نہ سکے۔ یوں تو سبھوں نے آہ وزاری کی لیکن ایک کمسن لڑکے کو بہت زیادہ قلق ہوا۔ اس کا غم اتنا بڑھ گیا کہ آنسو تک بھی خشک ہوگئے۔ کئی دن تک وہ شہر میں ادھر ادھر پھرتا رہا، لیکن چین نہ آیا۔ حتیٰ کہ اس نے کھانا پینا بھی چھوڑ دیا۔ اس نے اپنے شہر کو خیر باد کہا۔ اور دریا کے کنارے پہنچ گیا۔ سامنے ایک ذخار دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا دکھائی دیا۔ اس لڑکے نے ارادہ کیا کہ دریا کے اس پار جاکر اپنی زندگی کا آغاز کرے لیکن اطراف میں کہیں کوئی کشتی دکھائی نہ دی۔ اس نے دریا کے کنارے چلنا شروع کیا۔ کوئی دس قدم بھی ختم نہ ہونے پائے تھے کہ ایک کشتی دکھائی دی۔ اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔ وہ حیران تھا کہ آخر اس کشتی کا کون مالک ہوگا؟ سامنے ایک قدِ آدم گھنا درخت تھا۔ اس سے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ یہ لڑکا لپک کر اس پودے تک پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوڑھا آخری سانسیں

لے رہا ہے۔ اس بوڑھے نے لڑکے کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور صرف ایک لفظ " ارادہ" کہا اور وہاں سے غائب ہو گیا۔ لڑکا حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ آواز آئی۔

ستاروں سے پرے اپنے لئے منزل بنا لو تم
کہ ہو اوجِ ثریا بھی تمہارے دلستانوں میں

لڑکا غیر ارادی طور پر کشتی میں بیٹھ گیا اور زور زور سے اسے چلانے لگا جب کشتی چلاتے چلاتے تھک جاتا تو کوئی اچھا سا راگ چھیڑ دیتا۔ اس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔

دریا کا پاٹ بہت ہی چوڑا تھا۔ اس دریا کا عبور کرنا بہت ہی خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ دریا میں جگہ جگہ گرداب اور بھنور تھے۔ جس میں اس سے پہلے بہت سی کشتیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ لڑکا دریا کے تیز و تند موجوں کے سینہ پر سوار برابر چلا جا رہا تھا۔ نہ تو وہ طوفانی موجوں ہی کو خاطر میں لاتا تھا اور نہ گرداب ہی سے ڈرتا تھا۔

رفتہ رفتہ شام ہونے لگی۔ لڑکے کے ہاں جو چراغ تھا وہ بہت ہی چھوٹا اور دریائی سفر کے لئے ناکافی تھا۔ جب زیادہ اندھیرا چھانے لگا تو اس نے اپنی کشتی کا لنگر ڈال دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اندھیری رات میں سفر کرنا جنون ہے۔ جب صبح اس کی آنکھیں کھلیں تو چٹان کے اوپر ایک بڑا سا چراغ دکھائی دیا۔ یہ لڑکا چراغ پاکر مارے خوشی کے پھول گیا اور چراغ لے کر پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش کے ساتھ کشتی کھینے لگا۔ اب اس کی کشتی برق رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ دوپہر کی چلچلاتی دھوپ بھی اسے اپنے سفر سے باز نہ رکھ سکی۔ پورا دن وہ مصروفِ سفر رہا لیکن اس کی تیز رفتاری میں کسی قسم کا فرق نہ آنے پایا۔ خاور مشرق نے دور دریا کے اس پار پانی میں اپنا عروسی چہرا چھپا لیا اور رات نے اس کی حکومت کا جائزہ لے لیا۔ اس کی روشنی بہت کافی تھی۔ اس لئے اس نے اپنا سفر اسی رفتار کے ساتھ جاری رکھا۔ آدھی رات گئے ہوا تیز تیز چلنے لگی۔ اور مشرق کی طرف سے ایسی زبردست لہر آئی کہ کشتی الٹ جاتی لیکن لڑکا بڑا ہی عقلمند تھا اس نے کچھ اس ترکیب سے کشتی کا رخ پھیر دیا کہ وہ الٹنے سے بچ گئی۔ ان مشکلات نے لڑکے کے حوصلوں میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی اس کا ارادہ اٹل اور حوصلے بہت بلند تھے۔ دنیا کی کوئی زبردست سے زبردست طاقت بھی اسے اپنے ارادوں سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کے ہاں سفر کا پورا سامان موجود تھا۔ پتوار مضبوط، کشتی درست، ہمت اور ارادہ راسخ اور چراغ روشن تھا پھر وہ سفر کیوں نہ جاری رکھتا۔

تمام رات اس نے اپنی کشتی کھینے میں گزار دی۔ رات کی تاریکی کو دیکھ کر کبھی کبھی اس کے دماغ میں مایوس کن خیالات پیدا ہوتے تھے۔ لیکن اس کا دل کہتا تھا ہر رات کے بعد دن کا نکلنا یقینی امر ہے۔

صبح کا ستارہ جھلملانے لگا۔ اور آسمان کے

سب تارے یکے بعد دیگرے غائب ہونے لگے۔ دریائی پرندوں نے نغمہ سرائی شروع کی اور خاور مشرق کی نرم و نازک ابتدائی شعاعوں سے پانی میں بھانت بھانت کے رنگ پیدا ہونے لگے یہ منظر اتنا دلکش اور حسین تھا کہ لڑکا محو نظارہ ہو گیا۔ اور اسی عالم خود فراموشی میں ایک ایسا میٹھا راگ چھیڑ دیا کہ گاتے گاتے بے ہوش ہو گیا۔

بہت دیر بعد جب لڑکے کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھوں سے پتوار چھوٹ چکے ہیں۔ لڑکا اپنے کئے پر بہت پچھتا تا رہا لیکن غلطی کے بعد کف افسوس ملنے سے کیا حاصل۔ دانشمندی تو نقصان کی تلافی کرنے میں ہے۔ لڑکا تھا بڑا ہی عقلمند اس نے اپنے ہاتھوں ہی سے پانی کھینا شروع کیا۔ اتفاق سے ہوا موافق تھی کچھ دیر تک تو کشتی آگے کی طرف بڑھتی رہی لیکن کب تک۔

دیکھتے ہی دیکھتے منظر بدل گیا۔ ہوائیں سناٹا بھرنے لگیں۔ دریا میں تلاطم پیدا ہونے لگا۔ موجوں میں تو پہلے سے بھی زیادہ تیزی اور طاقت پیدا ہو گئی۔ اور ان موجوں نے گرداب کی صورت اختیار کرلی۔ ایسے وقت میں بھی لڑکے نے اپنی منزل کا خیال اپنے دل سے جانے نہیں دیا لیکن یوں سمجھتا رہا کہ یہ بھی ان حادثات کا ایک تتمہ ہے جو اس کو ابتدائے سفر سے پیش آرہے تھے۔

طوفان سخت سے سخت تر ہوتا جا رہا تھا۔ صورت حال اس قدر نازک ہو گئی تھی کہ اب اس پر قابو پانا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ ان حوصلہ شکن حالات میں بھی اس نے دامن امید کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا بلکہ تدبیریں سوچتا رہا۔

اب لڑکا تیز و تند طوفان کے سینے پر اپنی کشتی کھے رہا تھا۔ طوفانی موجوں نے کشتی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ گئی تھی پانی اندر داخل ہو رہا تھا۔ لڑکا اس مصیبت سے بچ نکلنے کی بساط بھر کوشش کر رہا تھا لیکن کسی طرح کامیابی نہ ہوتی تھی۔

چراغ گل ہو چکا تھا لیکن دل کا چراغ پہلے سے بھی زیادہ روشن تھا۔ گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن دماغ کی روشنی اس پر دھیان دینے نہ دیتی تھی۔ وہ اپنے دل و دماغ کی روشنی میں اپنے خیالات کی دنیا کو تو بغور دیکھ رہا تھا لیکن دریائی راستہ کو نہ دیکھ سکا اور اس کی کشتی ایک سیاہ سخت چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔

اب لڑکا پانی میں تیر رہا تھا۔ اس نے امکان بھر کوشش کی لیکن ہاتھ پاؤں جواب دے چکے تھے۔ اس نے خدا سے گڑگڑا کر دعا کی کہ یا رب مجھے اس مشکل سے پار لگا دے اس وقت میرا سوائے تیرے کوئی مددگار نہیں۔ اس نے یہ الفاظ پوری طرح ختم بھی کرنے نہیں پائے تھے کہ وہ ایک چٹان سے جا لگا۔

اس چٹان پر چڑھ کر سب سے پہلے دو رکعت نماز اپنے مالک کی شکر گزاری میں ادا کی۔

جب ذرا ہوش و حواس درست ہوئے۔ تو اس نے ان چوڑے چوڑے تختوں کو باندھ کر ایک چوڑا سا تختہ بنا لیا جو بھیڑوں کے تختہ کا سا تھا۔

اب وہ اس تختہ پر منزل مقصود کی طرف جا رہا ہے۔ جب پہنچ جائے گا تو پوری کہانی لکھوں گا۔ ابھی تو یہ اس لڑکے کی پہلی منزل ختم ہونے کو ہے۔ دوسری منزلوں کے واقعات کا انتظار کرو۔

شیخ رحیم الدین (ظہیر آبادی)

آموں کا مزہ

عظمت اور خسرو تھے دو لڑکے
دونوں تھے شیطان کے بھائی
اک دن اپنی ٹولی لے کر
دیکھتے کیا ہیں پیڑ کھڑے ہیں
ان سب کو جو سوجھی شرارت
پیلے پیلے پڑے جو پائے
آم مزے لے لے کر چکھے
اتنے میں رکھوالا آیا
سب نے مل کر اس کو مارا
اب تو رکھوالا چلایا
دوڑتے کچھ لوگ اور جو آئے
رکھوالوں نے ٹھیک بنایا
مار پڑی دل میں شرمائے

اک گاؤں کے باہر رہتے تھے
کام تھا ان کا مار کٹائی
جا پہنچے اک باغ کے اندر
پیڑوں کے نیچے آم پڑے ہیں
پھر کیا تھا بس آئی قیامت
پھر کچھ ڈھیلے مار گرائے
کچھ کھائے کچھ جیب میں رکھے
ان کو دیکھ بہت جھلایا
کیا کرتا تنہا بےچارا
دوسرے رکھوالوں کو بلایا
لڑکے دیکھ انھیں گھبرائے
شیطانی کا مزہ چکھایا
ڈنڈے کھا کر گھر کو آئے

محمود ندیم اللہ

سوتیلی ماں

رشیدہ بستر مرگ پر پڑی ہوئی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ یکایک اس کی نظر مسعود پر پڑی جو کسی خیال سے رنجیدہ بیٹھا ہوا تھا۔ رشیدہ نے مسعود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "مسعود میری ننھی کا خیال رکھنا"۔ مسعود چونک پڑا۔ اس کی آواز گلے میں رک گئی۔ وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ دو غمگین آنسو بے اختیار گر پڑے۔ "خدا حافظ" رشیدہ نے دم توڑتے ہوئے کہا — مگر مسعود پھر بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ ایک ہچکی کے ساتھ رشیدہ اس دنیائے فانی سے چل بسی۔ اپنی ایک یادگار چھوڑ کر — گھر میں کہرام مچ گیا — ننھی شاکرہ دنیا سے بے خبر کھیل میں مصروف تھی جب چیخوں کی آواز سنی تو ڈر کے مارے سہم گئی اور دوڑتی ہوئی ماں کے پاس گئی کہ ماں کی گود میں پناہ لے مگر آہ۔ ماں تو چل بسی تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی — مسعود نے اس کو بہلانے کی ناکام کوشش کی — آخر وہ روتے روتے تھک کر سو گئی۔

دن گزرتے گئے اور مسعود کا غم بھی گھٹتا گیا۔ مسعود اب زیادہ تر دوستوں میں رہتا۔ کیونکہ جب کبھی وہ گھر میں آتا تو رشیدہ بے اختیار یاد آجاتی اور پھر شاکرہ اپنی ماں کے باتیں پوچھتی — دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ دوسری شادی کر لے تاکہ اس کا رنج و غم مٹ جائے مگر مسعود نے انکار کر دیا — آخر کب تک انکار کرتا۔ دوستوں کے اصرار نے شادی کرنے پر اسے مجبور کر دیا — تھوڑے دن بعد شاکرہ کے لئے "نئی ماں" آہی گئی — شاکرہ آج بھی کھیل میں مصروف تھی۔ آہ اس کو کیا معلوم تھا کہ اس کے لئے دنیا بدل چکی ہے۔ نادان لڑکی یہ سمجھی کہ جو ماں اتنے دن سے کہیں چلی گئی تھی اب واپس آگئی ہے۔ وہ دوڑتے ہوئے ماں کے پاس گئی اور مسکرا کر کہنے لگی "ماں تم اتنے دن سے کہاں گئی تھیں" — ماں چپ تھی — کوئی جواب نہ ملا۔ ننھی لڑکی نے پھر دریافت کیا — جمیلہ نے جھڑکی کے ساتھ کہا "میں تیری ماں نہیں —" غریب لڑکی سہم کر کانپنے لگی — بھاگی بھاگی مسعود کے ہاں گئی اور کہنے لگی "ابا اماں کہتی ہیں کہ میں تیری ماں نہیں"۔

مسعود کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے — شاکرہ کو بہلاتے ہوئے اس نے کہا "نہیں وہ برابر تیری ماں ہیں" — بھولی لڑکی مسعود سے چمٹ گئی —

جمیلہ اب پورے گھر کی مالک تھی — ہر کام اس کے حکم سے ہوتا۔ وہ جو چاہتی کرتی — معصوم شاکرہ اس کے نزدیک کنیز سے بھی بدتر تھی — وہی شاکرہ جو سات سال تک اپنی ماں کی گود میں نازو نعم سے پلی اور جس کے لئے کئی کنیزیں نوکر تھیں آج خود دوسروں کی لونڈی بنی ہوئی تھی وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے گھر کا کام کرتی تھی۔ کبھی کوئی کام خراب ہو جاتا تو جمیلہ مار مار کر نیم مردہ کر دیتی — مسعود کی آنکھوں پر نئی دلہن کی پٹی بندھی ہوئی تھی — بہرحال جو کچھ کرتی

کم تھا کیونکہ آخر " ماں " تھی ــــ مسعود اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا مگر اُف تک نہ کرتا۔ نئی دلہن کی محبت کے نشے میں چُور تھا ــــ یہ وہی شاکرہ تھی جس کو مسعود ایک منٹ کے لئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل ہونے نہ دیتا تھا مگر نہ معلوم اب وہ محبت کیا ہوگئی تھی ــــ نئی دلہن کو پاتے ہی کیسا رنگ بدل گیا۔ غریب شاکرہ صبح پانچ بجے اٹھتی اور رات کے دس بجے سوتی۔ دن بھر کام کرتی مگر پھر بھی سختی اور بُرا سلوک ــــ اس کو دو دو وقت کھانا نہ ملتا۔ شاکرہ جس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی تھی۔ اب " تصویرِ غم " بن گئی تھی ــــ چھوٹی سی جان اور یہ مصیبت۔ آہ خدا۔ گرمیوں کی ایک دلفریب شام کو مسعود کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ یکایک کسی خیال سے چونک پڑا۔ فوراً اندر گیا اور جمیلہ سے کہنے لگا کہ چلو تیاری کرو کل رشیدہ کی برسی ہے"۔ بھلا جمیلہ اور یہ کام ــــ اُس نے صاف کہہ دیا میری طبیعت ٹھیک نہیں یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ مگر مسعود نے بہت کچھ اصرار کے بعد زبردستی اس کو راضی کرلیا۔ تیاری شروع ہوئی ــــ باری آئی غریب شاکرہ کی ــــ پورا کام اس کے سپرد ہوا۔ ماں کی برسی معصوم بیٹی کے ہاتھوں تمام رات غریب شاکرہ کام کرتی رہی ــــ دوسرا دن آیا مگر پھر بھی شاکرہ کو فرصت نہ ہوئی۔ بھوکی پیاسی وہ کام کرتی رہی دوپہر میں جمیلہ نے شاکرہ کو برتن دھونے کے لئے دیئے۔ اتنے بہت برتن وہ کیسے اٹھا سکتی۔ ہاتھ سے چھوٹ کر کچھ پھوٹ گئے' شاکرہ مارے ڈر کے کانپنے لگی مگر سنگ دل جمیلہ کو رحم نہ آیا۔ اس نے بُری طرح مار پیٹ کی۔ غمزدہ ' بھوکی اور ناتوان لڑکی اس کی تاب نہ لا سکی اور ایک جگر گداز چیخ کے ساتھ گر پڑی اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگئی ــــ

مسعود بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ غریب لڑکی اپنی پیاری ماں کی آغوش میں جا چکی تھی ــــ مسعود کے قدم نہ اٹھ سکے ــــ جمیلہ خوش تھی جیسے کہ اس کی پرانی امید بر آئی ہے ــــ تھوڑی دیر بعد جمیلہ نے ایک چیخ ماری ــــ مسعود سنگ دل اور بیوی کا غلام مسعود چک کر کمرے میں بھاگا لیکن جمیلہ ختم ہو چکی تھی ایک کالا ناگ اس کے پاؤں پر لپٹا ہوا تھا ــــ انسان نہ سہی مگر حیوان نے تو غریب شاکرہ کی موت کا بدلہ لیا ــــ مسعود رنج و غم سے سہم کر کھڑا ہوا تھا۔

بلقیس محسن علیخاں

بلی

آہا! میں نے پالی بلی
میاؤں میاؤں کرکے آتی
بھیّا! اس کو گود میں لے لو
کیسی میں نے پالی بلی

کیسی اچھی بھولی بھالی
کھیل اور کود کے دل بہلاتی
ڈرتے کیا ہو شوق سے لے لو
پیاری پیاری نازک بلی

سیّد خواجہ معین الدین فائز

بلبن

۱۲۳۶ء میں جب سلطان شمس الدین التمش کا انتقال ہوا تو اس کے بعد ۱۲۴۶ء تک کوئی مستقل حکومت قائم نہ ہو سکی۔ التمش کے بعد رکن الدین، رضیہ سلطانہ، بہرام اور مسعود یکے بعد دیگرے بادشاہ ہوتے رہے۔ جن کا دور نہایت ہی مختصر رہا۔ اور تاریخ میں کچھ زیادہ اہم نہیں۔ ان کے زمانے میں ملک مغلوں کے حملے کی وجہ سے بدامنی کا شکار تھا۔ بالآخر ۱۲۴۶ء میں امرا نے شمس الدین التمش کے سب سے چھوٹے بیٹے سلطان ناصر الدین محمود کو تخت دہلی پر متمکن کیا۔ یہ نہایت سادہ لوح، درویش صفت اور نرم دل بادشاہ تھا۔ اُس نے اپنے ایک دانشمند اور مدبر غلام الغ خاں (جس نے بعد میں غیاث الدین بلبن کا لقب اختیار کیا) اپنا وزیر بنایا۔

بلبن سلطان التمش کا ایک ترکی غلام تھا۔ اس کی پرورش و تربیت التمش ہی کے دربار میں ہوئی تھی۔ یہ آہستہ آہستہ ترقی کرکے اس عہدہ تک پہنچ گیا۔ اس کو رضیہ سلطانہ کے زمانے میں شکاری کے عہدہ پر مامور کیا گیا تھا۔ ہانسی اور ریواڑی کا علاقہ اس کو جاگیر میں دے دیا گیا تھا۔ اسی نے سلطان ناصر الدین محمود کو تخت دہلی پر بٹھانے کی بہت کوشش کی تھی۔ بلبن وفادار، جفاکش، محنتی اور ایمان دار شخص تھا۔ "اگر سلطان ناصر الدین محمود کو بلبن جیسا جابر تشدد پسند وزیر نہ ملتا تو بہت ممکن تھا کہ سلطنت دہلی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی۔"

۱۲۴۶ء میں جب قبلہ کوہ کار نے بغاوت کی تو اس نے دریائے راوڑی عبور کرکے اس کی سرکوبی کی۔ اور اسی سلسلہ میں اس نے قیسور اور انتقسنور کی بھی تسخیر کی۔ اس کی واپسی کے بعد سلطان محمود نے ۱۲۴۹ء میں بلبن کا عقد اپنی بیٹی کے ساتھ کر دیا ۱۲۵۱ء بلبن نے گوالیار، چندیری، مالوہ اور نزوار کی تسخیر کی۔ اس مہم میں شیر خاں بھی اس کا ہم رکاب تھا۔

"رشک و حسد کے دیو شہرت اور مرتبہ کے سائے میں چلتے ہیں۔" اسی طرح جب بلبن کا ستارہ عروج پر تھا اور جب یہ سلطنت کے سیاہ و سفید کا مالک تھا تو دوسرے امرا اس کے بڑھتے ہوئے عروج کو دیکھ کر حسد کرنے لگے۔ ان حاسدوں کا سرگروہ عماد الدین ریحان تھا۔ یہ اکثر اوقات بادشاہ کو بلبن سے بھڑکا دیتا تھا۔ آخر کار جب بادشاہ اُچھ اور ملتان کی چڑھائی سے واپس آ رہا تھا تو اس نے بادشاہ کو بلبن سے بدظن کر دینے میں کامیابی حاصل کر لی۔

۱۲۵۳ء میں بلبن عہدۂ وزارت سے معزول اور جلا وطن کر دیا گیا۔ بلبن کے جاتے ہی نام لائق اور تجربہ کار عہدہ دار بدل گئے۔ اور ان کی جگہ بلبن کے مخالفین نے لی۔ جو نہایت نالائق و نااہل ثابت ہوئے۔ محمد جنیدی وزیر مقرر ہوا۔ اور عماد الدین اپنے عہدہ سے ترقی کرکے کلید برداری کے منصب

مامور ہوا۔ ملک میں بدامنی پھیل گئی۔ اور تمام مفتوحہ علاقوں کو آزاد ہوتے دیکھ کر بادشاہ نے محسوس کیا کہ بلبن کے بغیر ملک میں امن و چین قایم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ دوسرے ہی سال ۱۲۵۴ء میں پھر قلمدانِ وزارت اس کے حوالہ کردیا گیا۔

۱۲۵۵ء میں قتلغ خاں نے بغاوت کی۔ جو اودھ کا حاکم تھا۔ بلبن نے اس بغاوت کو فرد کیا۔ اور قتلغ خاں سے اطاعت کا وعدہ لے کر دہلی واپس ہوا۔ ۱۲۵۷ء میں مغلوں نے ملک پر حملہ کیا۔ اس دفعہ مغلوں نے دیکھا کہ ان کے مقابلے کے لئے پہلے ہی سے ہندوستانی فوج تیار ہے اور سرحد پر باضابطہ چھاؤنیاں قائم ہیں جس میں ایک منتظم فوج رکھی گئی ہے۔ تو وہ بغیر لڑے بھڑے واپس ہوئے۔ اور اسی سال چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں نے جو اس زمانے میں مغلوں کا سردار تھا دوستی کی خاطر دربار دہلی میں اپنا ایک سفیر روانہ کیا۔

بلبن نے مغلوں کے ارادے کو پہچان کر تمام چھاؤنیوں سے فوج کو دارالخلافہ میں طلب کرکے سلیقہ سے اس طرح جمایا کہ جدھر نظر پڑتی فوج ہی فوج نظر آتی تھی و نیز شاہی جلوس اس تزک و احتشام سے نکالا گیا کہ مال و دولت اور فوج کی کثرت دیکھ کر مغل سفیر دنگ رہ گیا۔

۱۲۶۶ء میں سلطان ناصر الدین محمود کا انتقال ہوگیا۔ اس کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ اور نہ سوائے بلبن کے کوئی امیر اس سلطنت کے لئے اہل تھا۔ اس لئے ۱۲۶۶ء میں الغ خاں نے سلطان غیاث الدین بلبن کے لقب سے تخت دہلی پر جلوس کیا۔ وہ اسی نام سے تاریخ میں زیادہ مشہور ہے۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔

سابق وزیر کے بادشاہ ہوتے ہی تمام اندرونی بدنظمیوں کا قلع قمع ہوگیا۔ اس نے فوج کی تنظیم نئے سرے سے کی۔ اور لائق اور تجربہ کار لوگوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔ اس نے عدل و انصاف کی اتنی سختی سے پابندی کی کہ اس کے دوست و اعزہ تک اپنے قصور کی سزا پانے سے بچ نہ سکے۔

اس کے زمانہ میں محکمۂ ڈاک کا بھی قیام عمل میں آیا۔ اس نے یہ محسوس کرکے کہ جو علاقے سلطنت دہلی سے دور دراز واقع ہیں ان کی خبریں دارالخلافہ کو بڑی دیر سے وصول ہوتی ہیں۔ اور اگر کوئی بغاوت ہوجائے تو اس کا بروقت سلطنت دہلی انتظام نہیں کرسکتی۔ اُس نے اس خوبی سے انتظام کیا کہ تمام علاقے چاہے قریب ہوں یا بعید اپنی اطلاعیں نہایت سہولت کے ساتھ مرکزی حکومت کو پہنچا سکتے تھے۔ اور اس لئے حکومت ان کی بروقت انسداد کرسکتی تھی۔

حاکم بنگال طغرل خاں نے یہ جان کر کہ سلطان غیاث الدین بلبن ملک کی اصلاحات میں منہمک ہے۔ اور دوری مسافت کی وجہ سے فوج کشی میں دشواری پیش آئے گی، علم بغاوت بلند کردیا اور سنار گاؤں میں اپنی خود مختاری کا اعلان بنام

مغیث الدین کر دیا۔

باد شاہ نے پہلے دو سردار اس کی سرکوبی کے لئے بھیجے۔ لیکن دونوں کو بھی شکست ہوئی۔ تو یہ خلجی سردار مطمئن ہوگیا کہ باد شاہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ مگر بادشاہ یہ عہد کرکے کہ جب تک وہ طغرل خاں کا سر قلم نہ کرے گا چین نہ لے گا۔ خود ایک کثیر فوج کے ساتھ بنگال کا رخ کیا۔ سفر کی مشکل، مسلسل بارش اور طوفان کی تکالیف سہتا سنار گاؤں پہنچا۔ طغرل خاں نے یہ سن کر راہِ فرار اختیار کی۔ بلبن نے اسے گرفتار کرکے قتل کر دیا۔ اور تمام باغیوں کو گرفتار کرکے سولی پر لٹکا دیا۔ اور پند و نصیحت کے بعد اپنے بیٹے بغرا خاں کو یہاں کا حاکم مقرر کرکے واپس ہوا۔ اس طرح اندرون ملک بدامنیوں کا قلع قمع کرکے چین بھی نہ لینے پایا تھا کہ ۱۲۸۵ء میں مغلوں کے حملے کی خبر ملی۔ سندھ اور ملتان پر سلطان بلبن نے اپنے بڑے لڑکے محمد کو حاکم مقرر کیا تھا۔

شہزادہ محمد بھی اپنے باپ کی طرح نہایت شائستہ اخلاق، منتظم و مدبر شہزادہ تھا اس کی علم پروری و بہادری کے افسانے مشہور ہیں۔ چنانچہ اس کے پاس امیر خسرو اور میر حسن جیسے مشہور شعرا رہتے تھے۔ کئی دفعہ مغلوں نے حملہ کرکے شکستیں اٹھائیں لیکن تیمور خاں کی سرکردگی میں انہوں نے تیسری دفعہ نہایت زور و شور سے حملہ کیا۔ اس دفعہ بھی انہیں پسپا ہونا پڑا۔

اسی جنگ میں بوڑھے سلطان پر رنج و غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یعنی اس کا نوجوان بیٹا محمد اس جنگ میں کام آیا۔ یہ شہزادہ اپنی حفاظت کا خیال نہ کرکے دور تک ان کا تعاقب کررہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی فوج سے بچھڑ گیا۔ مغلوں نے اسے تن تنہا پاکر مقابلہ کی جرأت کی۔ اور پلٹ پڑے۔ شہزادہ کو بچ نکلنے کا موقع تو حاصل تھا مگر اس کی شجاعت نے اسے لڑنے پر مجبور کیا۔ اور وہ لڑتے ہوئے مارا گیا۔

اس عظیم الشان حادثہ نے ہر کس و ناکس کو خون کے آنسو رلائے۔ اور ضعیف بلبن کو اپنے جوان بیٹے کی جدائی کا بے حد اثر ہوا۔ وہ دن میں اپنا دبدبہ و شان و شوکت برقرار رکھنے دربار کیا کرتا تھا۔ لیکن رات میں اپنے نوجوان اور بہادر بیٹے کا ماتم کیا کرتا تھا۔ آخر کار اس حادثے نے بلبن کو مرض الموت میں گرفتار کر دیا۔

سلطان بلبن نے یہ دیکھ کر کہ وہ اس مرض سے جانبر نہ ہو سکے گا اپنے بیٹے بغرا خاں کو بنگال سے اپنی تیمار داری کیلئے بلوایا۔

بغرا خاں نے یہ دیکھ کر کہ سلطان کی حالت اتنی نازک نہیں جتنی کہ سمجھتا تھا شکار کے بہانہ سے بنگال واپس ہوا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ بغرا خاں کی واپسی کی یہ وجہ ہوئی کہ بغرا خاں اپنے کو شاہی مخمصوں اور سلطنت کی الجھنوں سے دور رکھنا چاہتا تھا اس لئے اس نے بادشاہ سے بہانہ کرکے بنگال کی راہ لی۔ اس سے اسی سال کے بوڑھے سلطان کو بہت صدمہ ہوا۔ اور اس نے بسترِ مرگ پر شہزادہ محمد کے

بیٹے خسرو کو اپنا جانشین بنانے کی وصیت کرکے دنیا سے ۱۲۸۶ء میں راہی ملکِ عدم ہوا۔

یہ ایک وفادار، محنتی، جفاکش، عدل پسند، بہادر، ایمان دار اور منتظم بادشاہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سخت گیر ضرور تھا مگر اس کی سختی اور ناصر الدین محمود کی نرمی دونوں نے ملک سلطنت کے انتظامات کو مستحکم بنانے میں بہت مدد دی۔ باغیوں اور سازشیوں سے بڑی سختی سے پیش آتا تھا۔ باغیوں کو سزا دینے میں بلبن نے سختی اس لئے روا رکھی کہ دوسروں کو بغاوت کی جرأت نہ ہو۔

اس نے جس طریقہ سے ہندوستان کو مغلوں کے حملوں اور دوسری آفات سے بچایا اور ملک میں امن و امان قایم کیا وہ تاریخ ہند میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

سید محمد علی باقری

شہری زندگی

شہری زندگی شہریوں کے لئے آرام دہ ہے۔ اور دیہاتی زندگی دیہاتیوں کے لئے باعثِ سکون لیکن شہروں میں جو سہولتیں ایک انسان کو میسر ہیں وہ دیہاتیوں کو نصیب نہیں۔ شہری زندگی میں انسان کے لئے تجربوں کا ایک بڑی کتاب کھلی ہوئی ہے۔ ایک شہری کے لئے جو سہولتیں مہیا ہیں ان کا یہاں ہم مختصراً جائزہ لیں گے

(۱) شہری زندگی میں انسان کو متمدن، تہذیب یافتہ اور تعلیم یافتہ اشخاص سے سابقہ پڑتا ہے علما اور صاحبانِ بصیرت کی صحبت میسر آسکتی ہے۔ مختلف ممالک کے علما وہاں آتے ہیں۔ اور ان کی تقاریر وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان بہت سی عقل کی باتیں سیکھ سکتا اور خود کو ایک روشن خیال آدمی بنا سکتا ہے۔

(۲) تعلیم حاصل کرنے کے کافی ذرایع مہیا رہتے ہیں۔ ہر علم و فن کی تعلیم زمانے کی رفتار کے ساتھ دی جاتی ہے۔

(۳) ہر انسان کے ساتھ دکھ بیماری لگی ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کے لئے بڑے بڑے دواخانے ہوتے ہیں۔ اور ایک سے ایک ماہرِ فن ڈاکٹر اور حکیم کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

(۴) رہنے کے لئے ہوا دار بڑے بڑے مکانات دستیاب ہو سکتے ہیں۔ جہاں انسان اپنی صحت کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

(۵) دولت پیدا کرنے کے کافی ذرایع موجود رہتے ہیں۔ ایک لایق اور محنتی شخص کے لئے گویا

خزانے کا منھ کھُلا رہتا ہے۔

(۶) روزآنہ کئی ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی زندگیاں زمانے کی رفتار کے ساتھ بنتی اور بگڑ تی رہتی ہیں۔ اور ایک سمجھ دار انسان کے لئے۔ ان واقعات کو دیکھ کر سبق لینے کے بہت سے مواقع رہتے ہیں۔ برخلاف اس کے دیہاتی زندگی میں یہ سہولتیں اور آرام میسر نہیں ہو سکتا سوائے اس کے کہ دیہات کی آب و ہوا بمقابل شہر کی آب و ہوا کے پاک وصاف ہوتی ہے۔

لیکن شہریوں کی بہ نسبت دیہاتی زندگی میں بڑی مصیبتیں ہیں۔ وقت پر علاج کے لئے حکیم یا وید قابلِ اطمینان نہیں ملتے جو حکیم یا وید گاؤں میں رہتے ہیں اُن کا دماغ ساتویں آسمان پر رہتا ہے وہ بڑے لالچی ہوتے ہیں۔ بعض قبرستان آباد کرنے کا ٹھیکا لیتے ہیں۔ سخت افسوس ہوتا ہے کہ دیہاتی عورتوں مردوں اور بچوں کی تکالیف کا کوئی معقول اور تسلی بخش علاج نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی شخص تحقیقات کرے تو یہ ضرور ثابت ہوجائے گا کہ دیہات میں شرح اموات شہروں کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ دیہاتیوں کی زندگی خود ایسی ہوتی ہے کہ ان کو موت کا شکار بنا دیتی ہے۔

میرے خیال میں شہری زندگی اِن امور کے مدنظر دیہاتی زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔

رفعت اللہ بیگ

لاسلکی کا موجد

لاسلکی کی ایجاد کا سہرا مارکونی کے سر ہے۔ یہ دنیا کی وہ عظیم الشان ایجاد ہے جس سے آج ساری دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ لاسلکی بحر و بر میں تعلق قائم رکھنے کا اہم ذریعہ ہے اور ایک ملک کا دوسرے ملک سے ربط قائم رکھتا ہے اور ہر شخص اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے نشر گاہوں کی مختلف تفریحات سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ یہ سب دنیائے سائنس کے انمول موتی مارکونی کی محنت اور دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ جس نے اس کو ایک ادنیٰ کھلونے اور تجربہ گاہ کے معمولی انکشاف سے بلند کر کے ایک عظیم الشان ایجاد بنا دیا۔

مارکونی ۱۸۷۴ء میں اٹلی کے ایک قصبہ "بلوگ" میں پیدا ہوا۔ یہ بہت ذہین و ذکی تھا۔ لڑکپن ہی سے اس کے مزاج میں تلاش و تجسس کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ جب مارکونی کی عمر ۱۴ برس کی ہوئی تو اس کا شوق اختراعات و ایجادات میں بیحد بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ اپنی اولین ایجاد کا تجربہ ۱۸۹۵ء میں اس نے خود اپنے گھر پر ہی کیا تھا۔ اس نے اپنے مکان میں ۳۰ فٹ کے فاصلہ پر ایک گھنٹی نصب کی اور اپنی والدہ کو بتایا کہ گھنٹی محض شعاعوں کی مدد سے بجتی ہے۔ یہی لاسلکی کا پہلا زینہ تھا جو آج کل آپ کے سامنے

ریڈیو کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس کے بعد اس نے اس گھنٹی کو ایک میل کے فاصلہ پر سے بجوایا اور پھر انگلستان گیا جہاں وہ اس کو ۹ میل کے فاصلے سے بجوانے میں کامیاب ہوگیا۔ جب اس نے اپنے اس تجربہ کی بنا پر یہ اعلان کیا کہ وہ بہت جلد بحر اوقیانوس کے پار بغیر سلسلۂ تار برقی کے اپنے پیامات بھیجیگا تو آسمانِ سائنس کے درخشاں ستاروں نے اس کے بیان کو مضحکہ خیز ٹھیرایا اور مارکونی کو فاترالعقل کہا۔ مگر اس نے ان کی کوئی پرواہ نہ کی اور برابر کوشش کرتا رہا۔

۱۸۹۷ء میں حکومتِ اٹلی نے مارکونی کو اٹلی بلایا اور اس کی نگرانی میں لاسلکی اسٹیشن قائم کیا یہاں مارکونی کو بہت زیادہ کامیابی ہوئی ۱۹۰۰ء میں دو ہزار میل ۱۹۱۰ء میں ۶ ہزار میل اور ۱۹۱۸ء میں انگلستان اور آسٹریلیا کو خبریں بھیجی جانے لگیں۔

مارکونی کا مطمح نظر یہی تھا کہ اس نے جس چیز کی بنا ڈالی ہے اس کی خاطر اپنے آپ کو وقف کردے اور ہمیشہ اس کی جستجو میں لگا رہے۔ چنانچہ وہ اپنے عزم راسخ اور سعی پیہم کی بدولت اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔

۱۹۱۹ء میں اس نے نوبل پرائیز حاصل کیا۔ اس کے بعد اس کی عزت و وقعت چہاردانگ عالم میں پھیل گئی اور ہر طرف سے آفرین و تحسین کی صدائیں آنے لگیں۔ اور اب ہر شخص کی زبان پر اسی مارکونی کا نام تھا جس کے اس اظہارِ خیال پر کہ وہ دنیا کے ممالک کا لاسلکی کے ذریعہ ربط پیدا کردیگا۔ بڑے بڑے محققین اور سائنس دانوں نے اس کو دیوانہ اور پاگل ٹھیرایا تھا۔

لاسلکی کے موجد اعظم مارکونی نے دنیا کے لئے سہولتوں اور آسائشوں کے دروازے کھول دینے کے بعد ۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو شہر روم میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ بلاشبہ یہ مارکونی ہی تھا جس نے لاسلکی کے غیر محدود فوائد و امکانات پر غور کرکے رہتی دنیا تک اپنا نام چھوڑ گیا۔

محمد عبدالقادر فاروقی

صحبت

دنیاوی زندگی میں کسی شخص کے اخلاقی، تہذیبی یا معاشرتی درجات کو دیکھنا یا جانچنا منظور ہو تو اس کی صحبتوں پر غور کیا جاتا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات کہلانے کے باوجود بُری صحبتوں کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا، بلکہ اپنی صحبت کے مطابق کام کرتا یا زندگی بسر کرتا ہے، یعنی اگر کوئی شخص نہایت ہی شریف اور متمدن ہو اور اتفاق یا بدقسمتی سے اس کو چوروں اور ڈاکوؤں کی صحبت میں رہنا پڑے تو فطرت کا یہی تقاضا ہے کہ وہ ضرور چوری کرے۔

اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم یہ کہتے کہ انسان اپنی شرافت کو کام میں لاتا اور بُری صحبت کے رہنے کے باوجود اچھے کام کرسکتا ہے۔

ہر انسان کسی نہ کسی کی صحبت میں رہنے اور زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہے کیونکہ بغیر صحبت یا ماحول کے کوئی شخص بھی زندگی بسر نہیں کرسکتا۔

اس لئے ہر فرد بشر کو چاہیے کہ وہ اپنے لئے اچھی سے اچھی صحبت کو پسند کرے یعنی مہذب، شریف اور تجربہ کار شخصیتوں کی صحبت کو اختیار کرے، تاکہ اس کی آئندہ زندگی آرام و چین سے گزرے۔

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

سید علی نقی نقوی

آداب

چلنے میں جلدی نہ کرو کہ کم عقلی کی علامت ہے۔ اور نہ زیادہ دیر ہی کرو کہ علامت کسل ہے۔ متکبّروں کی طرح خراماں نہ چلو۔ اور نہ عورتوں اور مخنثوں کی طرح اتراؤ۔ آگے پیچھے بہت نہ دیکھو۔ ہمیشہ آگے کو سر نہ جھکائے رکھو کہ غلبۂ فکر کی علامت ہے سواری میں بھی اعتدال نگاہ رکھو پاؤں لمبے کرکے نہ بیٹھو۔ بادشاہ استاد یا ماں باپ کے سوا کسی کے سامنے دو زانو نہ بیٹھو۔ سر کو زانو اور ہاتھوں پر نہ رکھو کہ علامت حزن و فکر ہے۔ گردن ٹیڑھی نہ کرو۔ حرکاتِ عبث سے احتراز کرو۔ ناک اور منہ میں انگلی نہ ڈالو۔ انگلی کے جوڑوں سے آواز نہ نکالو۔ جمائی اور انگڑائی سے احتراز کرو۔ آب دہن اور آب بینی اس طرح پھینکو کہ حاضرین سے کوئی اس کو دیکھے نہ اس کی آواز ہی سُنے اور قبلہ کی طرف پھینکنے سے محترز رہو۔ اور ہاتھ یا آستین یا دامن سے نہ پونچھو۔ جب کسی مجلس میں جاؤ تو اپنی جگہ سے نیچے یا اُس سے اوپر نہ بیٹھو اگر غلطی سے اپنی جگہ پر نہ بیٹھو تو واقف ہونے کے بعد اپنی جگہ پر واپس آجاؤ۔ حرم و خدم کے سوا کسی کے سامنے اپنے ہاتھوں اور چہرے کے سوا بدن کا

کوئی حصہ ظاہر نہ کرو۔ ناف سے لیکر زانو تک جو حصہ ہے اس کا قضائے حاجت یا غسل یا اور کسی مجبوری کے سوا برہنہ کرنا حرام ہے۔ لوگوں کے سامنے سونے سے احتراز کرو۔ چت لیٹ کر سونے سے بھی اجتناب کرو خصوصاً جب خراٹے مارتے ہو اگر کسی مجلس میں خواب غلبہ کرے تو وہاں سے اگر ممکن ہو تو اٹھ آؤ ورنہ کسی خیال سے نیند کو دفع کرو اگر تمام لوگ سونے لگیں تو تم بھی اِن کی موافقت کرو۔ یا وہاں سے چلے جاؤ خلاصہ یہ ہے کہ اس طرح رہو کہ لوگوں کو تم سے نفرت اور زحمت نہ ہو۔

(ترجمہ)　سیّد سلطان محی الدین قادری

بارش کا دن[1]

دن سرد ہے ابر گھر کے آیا　　برسات کا بندھ گیا ہے تانتا
اٹھتی ہیں گھٹائیں کالی کالی　　چلتی ہیں ہوائیں ٹھنڈی ٹھنڈی
انگور کی بیل چڑھ رہی ہے　　بوسیدہ کھنڈر پہ بڑھ رہی ہے
جھونکوں سے ہوا کے زرد پتے　　شاخوں سے ہیں کھڑکھڑا کے گرتے

دن سرد ہے ابر گھر کے آیا
برسات کا بندھ گیا ہے تانتا

ہے میری حیات کا یہی حال　　تاریکیٔ غم کا بچھ گیا جال
اور یاس کے سرد سرد جھونکے　　ہر سانس کے ساتھ ہیں وہ چلتے
ماضی کا خیال آرہا ہے　　بچپن کا زمانہ جارہا ہے
سودائے مآل ہے جو سر میں　　ماضی کی بہار ہے نظر میں

دن سرد ہے ابر گھر کے آیا
برسات کا بندھ گیا ہے تانتا

اے دل تو کیوں دھڑک رہا ہے　　ہر سانس پہ کیوں جھجک رہا ہے
مایوس نہ ہو اُدھر نظر کر　　تاریک و خنک گھٹا کے اوپر
خورشید فلک پہ ہے نمودار　　ہے جس کی جلو میں روح انوار
تاریک فضائے یاس تیری　　چھٹ جائے گی ایک دن وہ یوں ہی

تقدیر سبھی کی ہے مقدر
ہے ساتھ خوشی کے غم مقرر

احمد محی الدین رؤف

[1] یہ نظم لانگ فیلو کی نظم (Rainy Day) سے ماخوذ ہے۔

رجسٹرڈ ایم ۳۹۵۰

نشان گھر آصفیہ ۵۳

ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

	صفحات	قیمت آنہ	روپیہ
من کی بیتا	۸۰	۸	
سرگزشت غالب	۲۴	۸	
نظام الملک	۳۸	۴	
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۸	۳
دکن نمبر (۷۸ تصاویر)	۱۲۸		۲
ارمغان جذب	۱۲۰	۱۲	
سوتیلی ماں	۴۸	۴	
سر سید احمد خاں	۱۶	۲	
سر سالار جنگ	۴۸	۶	
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۴	۱
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۴	۱
اقبال نمبر	۱۹۸	۴	۱
سائنس کے کرشمے	۱۱۲		۱
رسائل طبیہ			
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۱۲	۲
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۸	۲
دادا بھائی	۱۶	۲	
اردو نامہ	۴۰۰		۲
ارسطو جاہ	۹۵	۶	
عماد الملک	۴۰	۶	
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۶	۲
" " دوسری کتاب	۵۶	۶	۴
محمد حسین آزاد	۲۰۰		۲
کاغذ کی ناؤ	۱۴۰	۴	۱
فن تقریر		۸	
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴		۱
پانی کی کہانی	۴۸	۶	

	صفحات	قیمت آنہ	روپیہ
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۴	
ورڈ سورتھ اور اس کی شاعری	۱۸۴	۸	
ہوش کے ناخن	۹۴		
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹		
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۸	
متاع سخن	۱۲۴	۱۲	
کیف سخن	۱۲۲	۱۲	
بادۂ سخن	۱۲۷	۱۲	
سراج سخن	۱۵۲	۱۲	
ایمان سخن	۱۲۰	۱۲	
فیض سخن	۱۴۴	۱۲	
مرقع سخن جلد اول صفحہ (۴۰۰) ۵۰ تصاویر			
" " دوم " " "			
نقد سخن صفحہ	۱۷۵		
نذر ولی	۹۴۲	۸	
گریہ و تبسم	۱۹۴		
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴		
من کی دنیا	۱۴۵		
مدراس میں اردو	۱۹۶	۸	
محرم نامہ	۱۱۲		
نذر دکن	۱۰۴	۴	
روح غالب	۲۴۰	۸	
عاصم	۲۰۰	۴	
دفتری معلومات		۶	
آبدوز کشتیاں اور سرنگ		۶	
اردو مثنوی کا ارتقا		۱۲	

حیدرآباد پرنٹنگ ورکس

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۸۸۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۹)
ستمبر ۱۹۴۰ء

جلد ۳ — بابت ستمبر ۱۹۴۰ء — شمارہ ۹

فہرست مضامین

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپ کر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شائع ہوا۔

اداریہ

ادارۂ ادبیات اردو نے جو اردو امتحانات قائم کئے ہیں وہ مقررہ تاریخوں میں پانچ مردانہ اور تین زنانہ مرکزوں میں لئے گئے۔ ہر مرکز کے لئے ادارہ کی طرف سے ایک ایک صدر نگرانکار صاحب کا انتخاب کیا گیا۔ اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہر مرکز میں باضابطگی، اوقات کی پابندی اور خوش اسلوبی کے ساتھ یہ اہم کام تکمیل کو پہونچا۔

شہر حیدرآباد میں مردوں کے لئے سٹی کالج اور خواتین کے لئے زنانہ ہائی اسکول نامپلی امتحانات کے مرکز تھے۔ اول الذکر میں پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری معتمد مجلس اردو امتحانات اور موخر الذکر میں محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ معتمد شعبۂ نسوان نے صدر نگرانکار کے فرائض انجام دیئے۔ گلبرگہ میں عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج میں امتحان لیا گیا چنانچہ پروفیسر سید محمد صاحب معتمد شعبہ شعرا و مصنفین دکن گلبرگہ کو پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی معتمد شعبہ تاریخ دکن اور عبدالحفیظ صاحب صدیقی مدرس سے معلومات کلیانی کو، مولوی فیض محمد صاحب پربھنی کو اور مولوی اکبرالدین صاحب صدیقی کنشگی کو بہ حیثیت صدر نگران کار بلدہ سے تشریف لے گئے اور اضلاع کے نسوانی مرکزوں کا انتظام وہیں کی خواتین کے ذریعہ سے کرایا گیا۔ ان سب اصحاب نے اپنے اپنے مرکزوں کی تفصیلی روداد یں مرتب کرکے روانہ کی ہیں جو سب رس کے آئندہ شمارے میں امتحانات کے نتائج کے ساتھ شائع کی جائیں گی۔ اضلاع میں ادارہ کے امتحان بہت مقبول ہوتے جارہے ہیں۔ ہر جگہ متعدد لوگوں نے عدم واقفیت کی بنا پر ان امتحانات میں شریک نہ ہو سکنے پر تاسف کا اظہار کیا اور آئندہ امتحان میں نہ صرف اپنی بلکہ قرب و جوار سے بھی امیدواروں کی شرکت کی توقع ظاہر کی۔ اضلاع کے مرکزوں میں متعدد اصحاب نے مذکورۂ بالا صدر نگران کار صاحبان کا بڑی خوشی سے ہاتھ بٹایا اور انتظامات کے کام کے علاوہ ان کی خاطر تواضع اور مہمان داری میں بھی فیاضی دکھائی۔ ادارہ کی سرگرمیوں کے متعلق بھی ہر جگہ کئی اصحاب نے معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا چنانچہ ان کی خواہش پر تقریروں اور گفتگو کے ذریعہ سے ادارۂ ادبیات اردو کے مقاصد و طرز کار کی وضاحت کی گئی جس کی بنا پر ادارہ کی شاخوں کا قیام عمل میں آیا۔ مسرت کا مقام ہے کہ اضلاع میں لوگوں کو اردو زبان اور ادب سے خاص دلچسپی ہے اور اس کی ترقی اور توسیع کے لئے ہر شخص مستعد نظر آتا ہے۔

اس سلسلہ میں مزید معلومات آئندہ شمارے میں درج کئے جائیں گے۔ جس کو صحیح معنوں میں "**اردو امتحانات نمبر**" سمجھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ زیر نظر شمارہ مکمل ہوچکا تھا جب کہ اضلاع کے مرکزوں کے صدر نگران کار صاحبان نے بلدہ واپس ہوکر اپنی تفصیلی رپورٹیں ادارہ کے دفتر میں روانہ کیں۔ ان رودادوں میں ان سب اصحاب کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے جنھوں نے اس مفید کام میں ادارے کے نمایندوں کی رضاکارانہ طور پر امداد کی۔ امتحانوں میں اول آنے والوں کو انعامات عطا کرنے کے بارے میں گزشتہ شمارے میں جو تذکرہ کیا گیا تھا اس کے سلسلے میں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ کنشگی کے مرکز سے اردو دانی کے امتحان میں اول آنے والے امیدوار کو مسٹر رستم جی منتا جر نے ایک تمغہ دینے کے لئے مبلغ پانچ روپے

روانہ فرمائے اور ادارہ کے مدرسہ تعلیم بالغات سے اول آنے والی امیدوارہ کو محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ ایک انعام عطا فرمائیں گی۔

ادارۂ ادبیات اردو کی روز افزوں سرگرمیوں اور کتب خانہ میں کتب و رسائل کے اضافہ کی وجہ سے موجودہ عمارت ناکافی ہوتی جارہی ہے اور اس کے لئے ایک شایان شان عمارت کی ضرورت شدت سے محسوس ہورہی ہے۔ اس مہینے بھی ادارہ کے علمی ذخیرے میں بڑا اچھا اضافہ ہوا متعدد نادر کتابیں خریدی گئیں اور اس کے علاوہ پروفیسر سید محمد صاحب نے گلدستۂ جوہر، سیلاب دکن، طفل اشک، جذبات توفیق، دیوان عمر، سوانحعمری امام جنگ، مجلس ہفت ملوک، لیلیٰ مجنوں اردو قلمی، رسالہ مالگزاری نمبر ۵ و ۶، کتابیں اور خواجہ نصیر الدین صاحب لکچرار گلبرگہ کالج نے اپنی کتاب "اکبر" کے دو سو نسخے اور مجلس کا ایک قلمی نسخہ ادارہ کو بطور تحفہ عنایت کیا ادارہ نے تصفیہ کیا ہے کہ ان کی کتاب کی فروخت سے جو رقم وصول ہوگی، اس سے شاغ گلبرگہ کے دار المطالعے کے لئے ضروری کتب خرید کر روانہ کی جائیں۔

ادارہ

سب رس کتاب گھر کی بعض کتابیں

۱۔ طوطی نامہ مجلد از غواصی ۱۲/
۲۔ پھول بن از ابن نشاطی ۱۲/
۳۔ قصۂ بے نظیر مجلد از عزلتی ۱/۴
۴۔ کلام الملوک مجلد سلاطین دکن کا فارسی کلام ۱/۱۲
۵۔ سیف الملوک و بدیع الجمال مجلد از غواصی ۱/۸
۶۔ جدید اردو شاعری از پروفیسر عبدالقادر سروری ۱/۸
۷۔ تنقیدی مقالات مجلد از ڈاکٹر زور ۱/۴
۸۔ یورپ کے تاثرات از بدر شکیب ۱/۸
۹۔ نظر کے دھوکے از بدر شکیب ۱/۴
۱۰۔ محبت کا فسانہ مجلد از ل۔ احمد ۱/۸
۱۱۔ ادب اور زندگی از مجنوں گورکھپوری ۲/۴
۱۲۔ آغاز ہستی از مجنوں گورکھپوری ۱۵/
۱۳۔ میری جد و جہد مجلد ۲/
۱۴۔ ضمیر از عبدالرحمٰن خاں سابق پرنسپل جامعہ عثمانیہ ۱۲/
۱۵۔ قنوطیت از ڈاکٹر ولی الدین ۱/
۱۶۔ اکبر اعظم از خواجہ نصیر الدین لکچرار گلبرگہ کالج ۸/
۱۷۔ ارباب نثر اردو از پروفیسر سید محمد ۱/
۱۸۔ اردو شہ پارے مجلد از ڈاکٹر زور ۲/۴
۱۹۔ انوری بیگم از طیبہ بیگم مرحومہ ۱/۸
۲۰۔ دھوئیں کی پھانسی ۱۰/
۲۱۔ جنون و حکمت ۱/۱۲
۲۲۔ کسان ۲/
۲۳۔ شریر لڑکا ۴/
۲۴۔ بچوں کا انصاف ۴/

عظمت اللہ خاں

عظمت اللہ خاں مرحوم اردو کے اُن چند شاعروں میں سے تھے جنھوں نے اپنے قلب و دماغ کی غیر معمولی قوتوں کی وجہ سے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ ان سے پہلے محمد قلی قطب شاہ، ولی اورنگ آبادی، مظہر جان جاناں، میر تقی میر، نظیر اکبر آبادی، مرزا غالب، محمد حسین آزاد اور الطاف حسین حالی کو یہ شرف حاصل ہو چکا تھا اور ان کے ہم عصروں میں صرف اقبال اور جوش کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔ لیکن اقبال اور جوش دونوں کو زمانہ نے اتنا موقع دیا کہ وہ اپنی کوششوں کو دیر تک جاری رکھ سکے اور جو اُن کے سامنے ہی بار آور ہوئیں۔ لیکن عظمت کی شاعری کا نیر اقبال پوری طرح طلوع بھی نہ ہونے پایا تھا کہ موت کے سیاہ بادلوں نے اس کو اپنے اندر چھپالیا۔ تاہم مختصر سے عرصہ میں عظمت مرحوم نے شعر و سخن کی جو کچھ بجلیاں چمکائیں وہ قدیم طرز سخن کی متوالی آنکھوں کو خیرہ کئے بغیر نہ رہیں۔

عظمت اللہ خاں ایک حساس اور درد مند شاعر اور صاحب ذوق ادیب ہونے کے علاوہ ایک اچھے مفکر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ انسان بھی تھے۔ اس لحاظ سے اردو شعراء میں صرف علامہ اقبال مرحوم کو اُن پر فضیلت دی جاسکتی ہے۔ ورنہ قلب و دماغ کی اتنی وافر قوتیں اردو کے دوسرے ادیبوں اور شاعروں میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔

تاریخ، فلسفہ، نفسیات اور سیاسیات کی کتابوں کا مطالعہ اور درس و تدریس عظمت مرحوم کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ وہ انگریزی اور اردو ادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے تھے کہ اس موضوع سے متعلق ان کے مضامین اعلیٰ پایہ اور معیاری تنقید نگاری کے بہترین نمونے سمجھے جاسکتے ہیں۔

اسلوب تحریر کے علاوہ ان کا طرز گفتگو بھی اتنا دلکش تھا کہ اہل ذوق ان کی صحبت سے کبھی سیر نہ ہونے پاتے تھے۔ دفتر ہو یا گھر، ہر جگہ صاحبان فضل و کمال اور طلبہ ان کو گھیرے رہتے تھے۔ وہ اگرچہ کسی کالج کے پروفیسر نہ تھے لیکن کالجوں کے اکثر طلبہ ان سے خانگی طور پر مستفید ہوتے رہتے تھے۔ اور وہ بھی لایق اور محنتی طالب علموں کی بڑی قدر افزائی اور مدد کرتے رہتے تھے۔

حسن اتفاق سے مجھے بھی ان کے شریفانہ کردار کے مطالعہ کا موقع ملا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ان کے جیسے علم دوست بہت کم دیکھے ہیں۔ اعلیٰ قابلیت، ذاتی وجاہت اور عہدہ دارانہ حیثیت کے ساتھ ساتھ دلی اخلاص اور سچی ہمدردی جتنی ان میں نظر آئی کسی اور میں دکھائی نہ دی۔ ان کی بڑی خوبی یہ تھی کہ دلی سے نکل کر انھوں نے حیدرآباد کو اپنا سچا وطن بنالیا تھا۔ وہ اُن عہدہ داروں میں سے نہ تھے جو حیدرآباد صرف کمانے کے لئے آتے ہیں۔ اور اہل حیدرآباد کی طبعی مروت اور انتہائی سادگی سے بے جا فائدہ اٹھانے کے باوجود ان کو کسی کام کا اہل نہیں سمجھتے' اور اپنے دماغ سے اپنی برتری کا احساس کبھی دور نہیں ہونے دیتے۔

عظمت اللہ خاں مرحوم کی درد مند طبیعت ان کی اکثر نظموں میں بے نقاب نظر آتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ہندوستانی عورت کو جو مظلومیت کا مجسمہ اور مرد کی ستم رانیوں کا اکثر شکار رہتی ہے اپنی شاعری کا اہم ترین موضوع بنایا۔ اور اس

موضوع پر جو نظمیں لکھیں ان میں ایسی پتے پتے کی باتیں بتا گئے ہیں جن کی طرف ان سے پہلے کسی اردو شاعر نے توجہ نہ کی تھی۔ ہماری سماج کا یہ سب سے بڑا عیب ہے کہ مرد کی تمام تباہ کاریاں تو معاف کردی جاتی ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر خرابی عورت کی طرف سے شروع ہوتی ہے۔ نقطۂ نگاہ کی یہی وہ غلطی ہے جس کی وجہ سے ہمارے اخلاق و عادات کو گھن سا لگتا جارہا ہے۔ ہر نوجوان لڑکا یہ سمجھتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح کسی شریف لڑکی کو اپنے جذبات کی بھینٹ چڑھائے۔ اور اس مقصد کی خاطر وہ ایسے ایسے فریب اور اتنی ریاکاری سے کام لیتا ہے کہ ناتجربہ کار لڑکیاں دھوکے میں آجاتی ہیں، اور اس کے مصنوعی اظہار محبت پر یقین کرلیتی ہیں۔ ہر وہ نوجوان مرد قابل معافی سمجھا جاتا ہے جو شریف پردہ نشین لڑکیوں کو اپنی تاک جھانک کے ذریعہ سے، یا دنیا بھر کے بدنما طریقے استعمال کرکے اپنی طرف مائل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن وہ لڑکی فوراً بے حیا اور بدتمیز اور نہ معلوم کیا کیا قرار دے دی جاتی ہے جس سے اگر کبھی سہواً بھی ایسی حرکت کیوں نہ سرزد ہوئی ہو۔ غرض عظمت مرحوم نے اس موضوع پر بجائے اخلاقی اور ناصحانہ انداز میں خیال آرائی کرنے کے ایسا پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے جو بہت موثر ہے۔ ان کی ایک نظم جس کے یہ ابتدائی دو بند ہیں، بڑے بڑے واعظوں اور مصلحوں کی خطیبانہ تقریروں سے زیادہ اثر رکھتی ہے ؎

نہ بھلے کی تھی نہ بُرے کی تھی مجھے کچھ جہاں کی خبر نہ تھی
تمھیں عشق کا ہی جو دھیان تھا تمھیں میری چاہ اگر نہ تھی
مرے حسن کے لئے کیوں مرے نہیں لینے تھے تمھیں یوں مرے

بہت اپنی چاہ جتا جتا مرے دل کو موہ کے لے لیا
مرے واسطے یہ بہشت تھی تمھیں دل لگی تھی یہ کھیل تھا
مرے حسن کے لئے کیوں مرے نہیں لینے تھے تمھیں یوں مرے

اسی طرح اور چار نظمیں یعنی

(۱) وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے۔
(۲) مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا۔
(۳) دام میں یاں نہ آیئے دل نہ یہاں لگائیے۔
(۴) تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔

اسی موضوع کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں اور اردو شاعری کا شاہکار سمجھی جاتی ہیں۔ ان کی زبان کی شیرینی، تخیل کی بلندی، اسلوب کی گھلاوٹ اور مضامین کی حلاوت ایسی نہیں کہ کوئی ان کو ایک بار پڑھے اور بار بار نہ پڑھنا چاہے۔ اگر عظمت مرحوم ان مذکورہ پانچ نظموں کے علاوہ اور کچھ نہ لکھتے تو بھی ان کا شمار اردو کے ان مخصوص شاعروں کی صف اول میں ہوتا جنھوں نے فطرت کی کامیاب ترجمانی کی ہے۔ صرف یہی پانچ نظمیں اردو کے ایسے سیکڑوں شاعروں کے ضخیم سے ضخیم دیوانوں پر بھی بھاری ہیں جنھوں نے شاعری محض قافیہ پیمائی کی خاطر کی اور جن کی غزلوں نے قوم کے نوجوانوں کے کثیف جذبات کو ابھارنے کے سوائے اور کوئی اچھا کام انجام نہیں دیا۔

ان پانچ نظموں کے علاوہ برکھارت کا پہلا مینہ، وطن، موہنی سورت موہنے والی، پیارا پیارا گھر اپنا وغیرہ ایسی پاکیزہ نظمیں ہیں جو عظمت جیسے نازک خیال شاعر ہی کے قلم سے نکل سکتی تھیں۔ ان میں خیالات اور جذبات کے اظہار میں جو کاوش کی گئی ہے حد درجہ قابل داد ہے۔ انوکھی تشبیہوں کے

استعمال میں تو ان کو بڑا کمال حاصل تھا اور ساتھ ہی لفظوں اور ترکیبوں کو وہ اس خوبی سے مصرعوں میں بٹھاتے تھے کہ ان کی نظموں کا ہر بول سریلا معلوم ہوتا ہے۔

ان کی شاعری کی ایک اہم خصوصیت اس کا سریلا پن ہے۔ وہ ہندی عروض سے بہت زیادہ متاثر تھے اور انھوں نے اس نقطۂ نظر سے شاعری کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ شاعری کے عنوان سے ان کا جو مضمون اس مجموعہ میں شریک کیا جا رہا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ فن عروض میں انھوں نے ایک اجتہادی شان حاصل کرلی تھی۔ اس موضوع سے متعلق ان کے خیالات اور نتائج پر کسی اور موقع پر بحث کی جائے گی۔ اس وقت صرف اس واقعہ کا اظہار کافی ہے کہ امیر خسرو کے بعد اگر کسی اردو شاعر نے عروض میں غیر معمولی جدتیں پیدا کیں تو وہ عظمت ہی تھے۔ ان کی بعض نظموں کی بحریں اور شکلیں اردو کے لئے نئی ہیں۔ انھوں نے نئے نئے ترکیب بند اختیار کئے۔ اور اپنی شاعری کو مطالب و معانی اور ترتیب و اسلوب دونوں کے لحاظ سے اردو ادب میں ایک بالکل نئی سوغات بنا کر پیش کیا۔

اردو میں ہندی لفظوں اور بحروں کا استعمال عظمت ہی کی شاعری کی وجہ سے مقبول ہوا۔ ان سے پہلے اگرچہ نظیر اکبرآبادی نے بھی اس طرف کچھ توجہ کی تھی لیکن ان کے کلام کے سوقیانہ حصے نے ان کی اس خوبی کو نمایاں نہ ہونے دیا۔ لیکن عظمت نے اپنی پاکیزہ نظموں کے ذریعہ سے اس خصوصیت کو اس خوبی سے چمکایا کہ آج کئی اردو شاعر مثلاً جوش، حفیظ، ساغر اور حامد اللہ افسر وغیرہ انہی کے رنگ میں لکھ کر مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ عظمت اللہ خاں نے ایک ایسی شاہراہ بنادی جس پر اب آسانی سے ہر شاعر گامزن ہو سکتا ہے۔

عظمت اللہ خاں کی نظمیں جب پہلی دفعہ منظر عام پر آنے لگیں تو نوجوانوں کے علاوہ بعض پختہ مشق شاعروں پر بھی ان کا اثر پڑنے لگا۔ چنانچہ سلیم اور جوش سب سے پہلے ان سے متاثر ہوئے۔ اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہیں کہ سلیم نے جو آخر عمر میں پھر شاعری کی طرف توجہ کی اس کے اسباب میں سے ایک اہم وجہ عظمت اللہ خاں کی انہی ولولہ انگیز نظموں کی اشاعت تھی، جن کو پڑھ کر اس بوڑھے ادیب میں پھر سے جوانی کی ترنگیں موجزن ہو گئیں۔ حالانکہ سلیم نے سالہا سال سے شعر و سخن کا مشغلہ ترک کر دیا تھا۔

افسوس ہے کہ یہ رباب اس قدر جلد ٹوٹ گیا۔ لیکن اس سے جو نغمے پیدا ہوئے وہ دیر تک باقی رہیں گے۔ اور نئے نئے نغموں کی تخلیق کا باعث ہوں گے۔

جیسے جیسے زمانہ گزرتا جائے گا عظمت مرحوم کی شاعری کی صحیح عظمت بے نقاب ہوتی جائے گی۔ اور خاص کر عہد حاضر میں اردو اور ہندی کو ملا کر ایک ہندستانی زبان بنانے کی جو کوششیں کی جا رہی ہیں، وہ اگر کامیاب ہو گئیں تو عظمت کا کلام اس "ہندستانی" کا قدیم ترین نمونہ سمجھا جائے گا، اور وہ اس قومی زبان کے اولین شاعر مانے جائیں گے۔ یوں تو اب بھی ان کے کلام کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر اس کو اردو رسم الخط میں لکھا جائے تو اردو ہے، اور ناگری میں لکھا جائے تو ہندی۔ کیا تعجب ہے کہ ہندی ساہتیہ سمیلن جو آج قدیم دکنی شاعروں کے کلام کو ہندی رسم الخط میں چھاپ کر اپنے ادبی خزانہ میں اضافہ

کر رہی ہے، کل عظمت مرحوم کے کلام کو بھی چھپوا لے. اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ کلام ناگری رسم الخط میں منتقل ہونے کے بعد خود ہندی شاعری کو بھی مالا مال کر دے گا۔

سید محی الدین قادری زور

(مقدمہ مجموعۂ کلام عظمت مرحوم)

ایک رخصتی شام

(بلیا میں کہی گئی)

رُخِ شام بے طرح سنولا رہا ہے　　تجلّی میں ظلمت کا دور آ رہا ہے

شفق میں گھلی جا رہی ہے سیاہی　　دھواں سا بیاباں پہ منڈلا رہا ہے

یہ محسوس ہوتا ہے ویران گردوں　　زمیں کی طرف کو جھکا جا رہا ہے

برستا ہے شاخوں سے کاجل ہی کاجل　　جو سایہ ہے گہرا ہوا جا رہا ہے

دکھائی نہیں دے رہی عمر گھٹتی　　مگر وقت بڑھتا نظر آ رہا ہے

فسوں ایسا پھونکا ہے افسردگی نے　　چراغِ بشاشت بجھا جا رہا ہے

خبر دے رہے ہیں تنک تاب ذرّے　　ستاروں کے ہنسنے کا وقت آ رہا ہے

ہر اک شے کو کالا کفن دے کے گردوں　　اندھیرے کے گنبد میں دفنا رہا ہے

بھنچی جاتی ہیں ظلمتوں سے ضیائیں　　فضاؤں کا دل ڈوبتا جا رہا ہے

تجلّی کی ریتی پہ موجیں بچھاتا　　اندھیرے کا دریا چڑھا جا رہا ہے

سفر سے تھکی نہر کے آئینے میں　　درختوں کا فوٹو لیا جا رہا ہے

ہے جھونکوں کی رفتار سے صاف ظاہر　　ہواؤں کو دھندلا نظر آ رہا ہے

یہ سیلی ہوئی جھاڑیوں میں ہیں جھینگر　　کہ جنگل کوئی راگنی گا رہا ہے

ہے ڈوبا ہوا سوچ میں ذرّہ ذرّہ　　سمجھ میں مگر کچھ نہیں آ رہا ہے

احسان دانش

محمد حسین آزاد اور آبحیات

اردو کے اس مائیہ ناز ادیب کی ولادت ۱۰ ذی حجہ ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۳۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ ان کی تاریخ پیدائش "مظہر اقبال" سے نکلتی ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد کے آباد اجداد شاہ عالم کے زمانہ میں ہمدان (ایران) سے براہ کشمیر ہندوستان آئے۔ اور خاک ہند ایسی دامنگیر ہوئی کہ یہیں کے ہو رہے۔ آبا و اجداد کا پیشہ اجتہاد تھا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے بہت سے مجتہد اس خاندان میں پیدا ہوئے۔

آزاد مولوی محمد باقر مرحوم کے خلف الرشید تھے۔ جو خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق کے دلی دوست تھے۔ شمالی ہندوستان میں سب سے پہلا اردو اخبار نکالنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ یہ اخبار ۱۸۳۶ء میں انھوں نے نکالا۔ اس کا ذکر آزاد نے آبحیات کے صفحہ ۲۶ پر کیا ہے۔ اس کا نام "اردو اخبار" ہفتہ وار تھا۔ اس کی اب کوئی کاپی نہیں ملتی۔ کیونکہ یہ غدر میں ضبط ہو گیا تھا۔ آزاد کے والد مولوی محمد باقر مرحوم کو محض اس الزام پر شہید کر دیا گیا کہ انھوں نے مسٹر ٹیلر کو بجائے اپنے ہاں پناہ دینے کے باغیوں کے حوالہ کر دیا۔ آزاد مغلوں کے معزز خاندان کی ایک بے مثل یادگار تھے۔ ان کی والدہ ایرانی النسل تھیں۔

اولاد۔ آغا محمد طاہر صاحب فلسفۂ الہیات کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ آزاد مرحوم کے ہاں ۱۵-۱۶ بچے پیدا ہوئے اکثر بڑھے۔ جوان ہوئے پروان چڑھے مگر قریب قریب سب آنکھوں کے سامنے خاک کا پیوند ہو گئے۔ لیکن ان میں سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی رہ گئے تھے۔ لڑکے کا نام انھوں نے محمد ابراہیم رکھا تھا۔ یہ غالباً ذوق سے انتہائی محبت کا نتیجہ تھا۔ محمد ابراہیم پنجاب میں منصفی کے عہدہ پر مامور تھے۔ باپ کے دس سال بعد ۱۹۲۰ء میں انتقال کیا۔ کثیر الاولاد تھے۔ آزاد کو ان بچوں سے انتہا درجہ محبت تھی۔ اپنی اکلوتی لڑکی سے تو آزاد مرحوم کو گویا عشق تھا۔ انہوں نے ان کو بڑے شوق سے عربی فارسی کی تعلیم دی تھی۔ وہ نوشت و خواند میں ان کا دست و بازو تھیں۔ ایک روایت کے بموجب "نصیحت کا کرن پھول" انھیں مرحومہ کی تصنیف ہے۔ ان کی شادی ریاست پٹیالہ کے خلیفہ نام ایک مشہور و معزز خاندان میں ہوئی تھی۔ اس ہونہار لڑکی کا انتقال عین عالم شباب میں ہو گیا۔ جس کا انھیں بے حد صدمہ ہوا۔ ان کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ جنون کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ جس کے مرنے پر انھوں نے یہ الفاظ کہے تھے۔

"میرا دل ٹوٹ گیا۔ میری تصنیفات کا قلمدان الٹ گیا"۔

آغا محمد ابراہیم کے بچوں میں سے اکثر کا انتقال عالم شباب میں ہو گیا۔ ان میں سے اب یہ باقی ہیں۔ آغا محمد طاہر، آغا محمد باقر ایم اے۔ آغا محمد اشرف ایم اے۔ آخر الذکر اس وقت کیمبرج میں اردو کے لکچرار ہیں۔

آزاد بلا کے ہنس مکھ اور نکتہ رس تھے۔ نگاہوں سے متانت رعب اور نور کی بارش ہوتی تھی۔ ان کی آنکھوں سے ان کے ضمیر کا خلاصہ معلوم ہو جاتا تھا۔ زبان میں وہ جادو، باتوں میں وہ سحر اور مٹھاس۔

انداز بیان میں ایسی شگفتگی وگیرائی کہ صحبت میں کوئی تھوڑی دیر بیٹھے تو اس پر ایک محویت طاری ہوجائے۔ بذلہ سنجی ذکاوت وذہانت میں آپ اپنا جواب تھے۔ طبیعت کی شگفتگی نے انھیں ہردلعزیز بنا دیا تھا۔ ان کی تقریر کا جادو سننے والوں کے قلوب کو موہ لیتا تھا۔ ان کی تحریر میں جو کشش ہے اس میں ان کی تقریر کا عکس صاف طور پر نمایاں ہے۔ اسی ترنم و شعریت کا یہ ایک خوش گوار پرتو ہے۔ طبیعت میں انتہائی غیرت تھی۔ ان کی تصنیفات کی شہرت ومقبولیت ان کی زندگی ہی میں ہوگئی تھی۔ یہ اپنی تعریف سننا تک گوارا نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ جو شہرت سے بھاگنا چاہتا ہے مقبولیت سے دور دور رہنا چاہتا ہے شہرت و مقبولیت اس کو خود ڈھونڈ نکالتی ہے۔ مشہور ہوجانا کچھ اپنے بس کی بات تو ہے نہیں۔ شیکسپیر کہتا ہے بعض لوگ خود بڑے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا پیدا ہوجانا ہی ایک شہرت ہے۔ بعض اپنی خداداد قابلیتوں سے مشہور ہوجاتے ہیں۔ اور بعض مفت کے بڑے بن جاتے ہیں۔ لیکن آزاد کی شہرت ان کی ذہنی کاوشوں کا ایک درخشاں نتیجہ تھی۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں: "احمق کا قاعدہ ہے کہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتا ہے۔ میرا یہ حمق حد سے بہت گزر گیا ہے کہ تعریف سن کر مجھے غصہ آتا ہے۔"

آزاد مرحوم کی طبیعت انتہا درجہ محنت پسند واقع ہوئی تھی۔ ان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے کہ جس پر ان کے عیش و اطمینان سے بسر کرنے کا دھوکا ہو سکے۔ ساری عمر ملک و قوم کی قلمی خدمت پر کمربستہ رہے۔

مولوی عبدالحق صاحب کے نقطۂ نظر سے "آزاد زود رنج تھے۔ ان میں رشک و حسد بھی تھا" لیکن جہاں تک میرا خیال ہے جو ذکی الحس ہوتا ہے وہ انتہا درجہ کا ذکی حِس بھی ہوتا ہے۔

اے روشنئ طبع تو برمن بلا شدی

ان کی طبیعت میں انتہائی نفاست تھی۔ صفائی کے خوگر تھے۔ لباس میں سادگی اور وضع داری ہمیشہ ملحوظ رہتی تھی۔ ان کی انتہائی کسر نفسی اور کسر المزاجی کا ثبوت ان کے اُن خطوط سے ملتا ہے جو انھوں نے اپنے شاگردوں کے نام لکھے۔

کھانے میں بھی نفاست و پاکیزگی کو بڑا دخل تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ذائقہ کا بھی بڑا خیال تھا۔ خوش خوراک تھے۔ سبزی ترکاریاں بڑے شوق سے کھاتے۔ پودینہ کی چٹنی ان کے ہر دسترخوان پر رہتی۔ غالب کو آم پسند تھے تو آزاد تربوز بہت شوق سے کھاتے تھے۔ آم بھی انھیں پسند تھے مگر تربوز کے بعد۔ جب ان پر جنون کے آثار ظاہر ہونے لگے تو تربوز کھا کر نمک اور کالی مرچیں بہت کھاتے تھے۔ گوشت انھوں نے کھانا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ اس وہم میں کہ جانور کی بجائے مجھے آدمی کا گوشت کھلاتے ہیں۔

آزاد کی آزادی: آزاد واقعی اسم بامسمیٰ تھے۔ چمنستان ادب کے اس سرو آزاد نے ہمیشہ سماج کے نمائشی ڈھکوسلوں سے اپنی زندگی الگ تھلگ بسر کی۔ کسی قسم کی ملکی یا قومی تحریک، انجمن، ایسوسی ایشن کے ممبر نہیں ہوئے۔ نہ کسی درباری مدح سرائی سے اپنے قلم کو آلودہ کیا۔ قومی و ملکی کام ان کی زندگی کی روح رواں تھے۔ ان کے علم و ادب کی شہرت، ان کے کارناموں کی مقبولیت محض ان کے ذاتی جوہر اور اصلی معیار کی وجہ سے ہوئی۔ ہمیشہ نمود و نمائش سے پرے ہٹ کر انھوں نے زندگی بسر کی۔ نام نہاد

لیڈری اور نمائشی ممبرشپ کی پیچیدگیوں میں کبھی خود کو انھوں نے
نہیں الجھایا۔ ایک خط میں سرسید کو یہ شعر لکھتے ہیں جس سے
ان کی غیورئ طبع کا اندازہ لگتا ہے ؎

خدا سے چاہتے ہم بھی تو تاج زر لیتے
مگر ہوا نہ گوارا یہ بار سر لینا

آزاد کا بچپن اور لڑکپن بے فکری و خوش حالی میں بسر
ہوا اتنا ہی جوانی کا زمانہ پہاڑ کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا غدر
کے وقت یہ بمشکل ۲۶، ۲۷ برس کے تھے کہ جلا وطنی نے قدم چومے
اور یہ چل پڑے۔ دہلی سے لاہور گیا آئے کہ سرکاری ملازمت
میں داخل ہو گئے۔ پھر تو سفر ان کی زندگی کا ایک حصہ
بن گیا۔ کلکتہ کسی سرکاری کام پر بھجوائے گئے۔ پھر کابل
و بخارا کا سفر کیا۔ دوبارہ پھر ایران کا سفر کیا۔ واپس
جب لاہور آئے تو پھر یہیں کے ہو رہے۔ اور مر کے ہی
اٹھے۔

میجر فلر نے انھیں کسی لسانی شبہ کو دور کرنے کی
غرض سے بلوایا۔ ملاقات کے بعد ان کی علمیت و قابلیت
سے اتنا متاثر ہوا کہ اردو فارسی عربی کی تعلیم پر ان کا تقرر ہو گیا۔
وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر انھیں ہندوستان میں سب سے
پہلی مرتبہ شمس العلماء کا خطاب ملا۔ جس کے ساتھ گورنمنٹ کی طرف سے
پانچسو روپے سالانہ قلمدان کا خرچ ملتا تھا۔ لیکن یہ انھوں نے
نہیں لیا۔ بلکہ اس رقم سے مستحق طالب علموں کو وظیفے دیئے۔
چنانچہ اب تک گورنمنٹ کالج لاہور میں فارسی کے بہترین ایم اے
کو ایک نقرئی "آزاد میڈل" ملتا ہے۔

آزاد کی زندگی ایک مصائب و آلام کا سلسلہ تھی۔
جسمانی و روحانی دونوں اذیتوں سے ان کا دامنِ حیات مالامال
تھا۔ بواسیر ایک کہنہ مرض بن کر انھیں لاحق ہو گئی تھی۔ ایران کے
سفر میں اونٹ سے گر پڑے تھے۔ پسلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔
اس بے سروسامانی میں علاج معالجہ کہاں۔ پسلی تو نیچر کے
کرشموں سے جڑ گئی۔ لیکن ایک گرہ جو باقی تھی وہ مدت العمر
باقی رہی۔

دیوانگی:۔ ان کی درخشاں زندگی کا نہایت ہی عبرتناک پہلو
ہے۔ کبھی کبھی باتیں کرنا۔ تختی کے ذریعہ روحوں کو بلانا۔ غرض
آخر عمر میں تو بالکل ہی فاترالعقل ہو گئے تھے۔

پہلے ذوق سے پھر حکیم آغا جان عیش سے تکمیل ادب کی۔
دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ خصوصاً منشی ذکاءاللہ مرحوم،
میجر سید حسن بلگرامی، مولانا سید ممتاز علی مرحوم، ڈاکٹر لائٹنر،
اور حکیم ناصر نذیر فراق قابلِ ذکر ہیں۔ آخرالذکر کو ان کی شاگردی
کا بھی شرف حاصل تھا۔

انھوں نے بہت سی کتابیں لکھیں جن میں قابلِ ذکر یہ ہیں۔
آبحیات، نیرنگِ خیال (۲ جلد)، مکتوباتِ آزاد، دیوانِ ذوق،
دربارِ اکبری، سخندانِ فارس، نگارستانِ فارس، سیرِ ایران
فلسفۂ الٰہیات، سپاک و نمک، نصیحت کا کرن پھول، نظمِ آزاد،
ڈرامۂ اکبر۔

علاوہ اس کے بچوں کے لئے بہت سی کتابیں تصنیف کر کے
اپنی ہمہ گیر مقبولیت کا سکہ بٹھا دیا۔

آبحیات:۔ آزاد کا ایک مہتم بالشان اور لافانی شاہکار
ہے۔ جس کی ضخامت ۵۵۲ صفحے ہیں۔ اس تذکرے میں شعراء
اور مصنفین کے حالات بھرے پڑے ہیں۔ مگر شعراء کے نسبتاً
زیادہ ہیں۔ یہ تذکرہ اردو زبان کا بالکل انوکھا اور جدید تذکرہ
ہے۔ اس کی زبان ایک الہامی زبان ہے۔ اس کو پڑھتے جائیے

طبیعت چاہتی ہے اور پڑھو۔ آزاد کا قلم خیالات کی روانی میں ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔

یہ طرز جدید کا سب سے پہلا تذکرہ اور اپنے وقت کے سارے تذکروں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ آبحیات کی تنقیدیں اور آبحیات کا تنقیدی پیرایہ اپنی آپ نظیر ہے۔ اگر اس کے پیرایۂ تنقید میں کوئی سقم ہے تو اس قدر کہ اس میں تنقیدی زبان کی بجائے افسانوی زبان استعمال کی گئی۔ اب رہی واقعات اور جزئیات کی صحت تو اس کے لیئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ مولانا آزاد سے جو شعراء کے تذکرے کے پہلے مدون تھے مورخانہ انداز اور اتنی شدید صحت کی توقع رکھنا خلاف عقل و انصاف بلکہ ایک زیادتی ہے۔

آبحیات کی زبان نہیں جادو ہے، سحر ہے، افسوں ہے۔ اردو کے کسی اور انشا پرداز یا ادیب کی زبان میں یہ کشش وگیرائی نہیں، نہ مولانا حالی کے ہاں یہ شوخی و ظرافت ہے، نہ سر سید کے ہاں یہ رنگینی و لطافت ہے، نہ اکبر کے ہاں یہ علمی وقار و متانت ہے۔ نہ نذیر احمد کے ہاں یہ اختصار و زور بیان ہے، نہ منشی ذکاء اللہ کے پاس یہ حسن و نزاکت کی دنیا ہے۔ غرض مختصر یہ کہ آزاد کا نیکھا پن اور ان کے قلم کا جادو بس انہیں کا حصہ تھا۔ ادب کا یہ تبسم انھیں کے سر کا سہرا بن کر رہ گیا۔

اردو زبان میں آبحیات کی زبان کو ایک خاص نمایاں و ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ حسن نظامی صاحب کہتے ہیں "آبحیات شعراء کا تذکرہ بھی ہے اور بزم مشرق کی آخری بہار کا فسانہ بھی۔" شبلی مرحوم آزاد کی وفات پر ندوہ کے ماتمی جلسہ میں آبحیات کو بغل میں دبائے ہوئے آئے اور فرمایا "آج جس شخص کا ماتمی جلسہ کرنے ہیں اس کی اس تصنیف کو میں نے ۱۸ مرتبہ پڑھا ہے"

اس تذکرے کی مقبولیت اور کیا ہوگی اس سے بڑھ کر کہ اس کے آٹھ دس ایڈیشن اب تک نکل چکے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دلکش جملے اور ان کا مترنم توازن، خوبصورت آسان ترکیبیں، سریع الفہم تشبیہیں، مصور الفاظ، نرم و شیریں انداز بیان، نتھری ہوئی دہلی کی زبان۔ یہ کاغذی نقوش اپنے اندر اتنی جاذبیت و محویت رکھتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں کھو جاتا ہے۔ اس کی زبان کی موسیقیت اور ترنم ریزیاں دل و دماغ کو مست و سرشار کردیتی ہیں۔ اور لطف یہ کہ کہیں ابتذال و سوقیانہ پن نہیں۔ غرض آبحیات ایک گیتائے شعراء ہے۔ جس میں دنیائے شاعری کے درخشندہ ستارے آزاد کے قلم سے جینے لگے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس کا ذکر انھوں نے آبحیات میں کر دیا ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندۂ جاوید ہو گیا اور جس کا ذکر بھولے سے نہیں آیا وہ ان کے آبحیات سے محروم رہ گیا۔ آزاد نے یہ ایک ایسا ادبی نغمہ اپنے پیچھے چھوڑا ہے کہ دنیائے ادب ان کے اس ادبی احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اور یہ ان کی بلند پایہ ادبیت کا ایک کھلا ثبوت ہے۔

آخر اس عالم محویت، جنون و بے خودی میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ء مطابق ۹ محرم الحرام ۱۳۲۸ھ کو آزاد قید ہستی سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ لاہور کو ان کی جائے مزار ہونے کا اعزاز رہے گا۔ مولانا حالی نے جو تاریخ وفات لکھی ہے اس کے اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

آزاد وہ دریائے سخن کا در یکتا
جس کی سخن آرائی پہ اجماع تھا سب کا
ہر لفظ کو پائیں گے فصاحت کا نمونہ
جو اس کے قلم سے دم تحریر ہے ٹپکا

ملکوں میں پھرا مدتوں تحقیق کی خاطر
چھوڑا نہ دقیقہ بھی کوئی رنج و تعب کا
دیکھا نہ سنا ایسا کہیں اہل قلم میں
تصنیف کا، تدوین کا، تحقیق کا لپکا
صحت میں علالت میں اقامت میں سفر میں
ہمت بھی بلا کی تو ارادہ تھا غضب کا
فرض اپنا ادا کر کے کئی سال سے مشتاق
بیٹھا تھا کہ آئے کہیں پیغام طلب کا
آخر شب عاشور کو تھی جس کی تمنا
آ پہنچا نصیبوں سے بلاوا اسے رب کا
تاریخ وفات اس کی جو پوچھے کوئی حالی
کہہ دو کہ "ہوا خاتمہ اردو کے ادب کا"

آزاد کا درجہ اردو ادب میں:- مہدی الافادی کہتے ہیں "آزاد کی ادبی فتوحات تاریخ لٹریچر کا ایک واقعہ ہے جس کا فیصلہ خود فلسفۂ ادب کے ہاتھوں ہوگا۔ اور پروفیسر آزاد کا درجہ بہ حیثیت ادیب جو کچھ ہے اس کا سمجھنا دوم درجہ کی خلقت کے لئے جو فلسفۂ لٹریچر سے قطعاً بیگانہ ہے آسان نہیں ہے۔"

دنیائے ادب نے انھیں زبان اردو کا مسلم الثبوت استاد تسلیم کر لیا ہے۔ مولانا حالی ان کا کلمہ پڑھتے رہے۔ مولانا شبلی نے "خدائے سخن" کہہ کر پکارا، نذیر احمد و ذکاء اللہ وغیرہ نے ان کی خوبیوں کو بارہا سراہا، وہ اپنے وقت کے ایک عدیم المثال نثار، جادو بیان، انشاپرداز ہی نہیں بلکہ ایک زبردست نقاد بھی سمجھے جاتے تھے۔ اور ایک عرصہ تک وہ اس میدان کے تنہا شہسوار تھے۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ان کی ادبی حیثیت میں فرق آتا گیا۔ یہاں تک کہ لوگوں نے کھلم کھلا انھیں مورخ یا نقاد کہنے سے انکار کر دیا۔ ہاں ان کے سحر کار قلم کا طلسم ہوشربا باقی ہے۔ وہ کسی سے نہ ٹوٹ سکا، نہ ٹوٹ سکتا ہے، نہ ٹوٹے گا۔

ہمارے نزدیک آزاد کا تذکرہ سب سے پہلا تذکرہ ہے جو اپنی تنقیدات کے لحاظ سے "علم تنقید" ہے۔ گویا ان کی تنقیدیں پڑھ پڑھ کر لوگ تنقید کرنا سیکھتے ہیں۔ آزاد سے پہلے تنقید کا عدم اور وجود برابر تھا۔ آزاد تنقید کے روح القدس یا بابا آدم ہیں۔ تنقید کا پیرایہ ان کے ذہن رسا کی میراث ہے۔ آزاد کی تنقید اگر معرض وجود میں نہ آتی تو یہ امر بہت مشتبہ ہے کہ نقادوں کے قلم میں تنقید کا حوصلہ بھی پیدا ہوتا۔ سچ پوچھئے تو تنقید کی داغ بیل آزاد نے ہی ڈالی ہے۔ اور باقی سب ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

نیرنگ خیال کی شہرت عام و بقائے دوام کے دربار میں غالب کو ان دو جملوں میں جتنا سمجھا گئے، ایک دفتر بھی اتنا نہیں کر سکتا۔" غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا، مگر سب واہ واہ سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔" بتائیے کچھ ٹھکانہ ہے اس تنقید کا؟

آزاد کا درجہ اردو ادب میں کیا ہے اس کی تشریح کے لئے ہم نواب صدر یار جنگ بہادر کا یہ فقرہ یہاں نقل کرتے ہیں۔ "اردو میں انشاپرداز اب تک ان سے بہتر نہیں ہوا۔ انھیں کی نثر اردو میں ایسی ہے کہ جتنی بار پڑھی جائے لطف ادب حاصل ہو۔"

شاید آزاد کے لئے ہی کسی نے یہ کہہ دیا تھا ـــ

کسی کی آنکھ میں جادو تری زبان میں ہے

نہ یہ سوانح نگار ہیں نہ مورخ، نہ مذہبی مصنف ہیں نہ ناول نویس وہ محض انشا پرداز ہیں اور بس۔

جس شاعری کا جھنڈا لئے ہوئے ہندوستان کے مشہور ترین شعراء آگے بڑھ رہے ہیں سب سے پہلے وہ حالیؔ نے نہیں، آزادؔ نے بلند کیا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جس نے اپنی زبان اور اپنے ادب کی خدمت پر اپنے ہوش و حواس اپنی صحت اور اپنی زندگی کو قربان کردیا۔ علامہ شبلیؔ اپنے کمالات کے باوجود آزاد کا ادب کرتے اور فرماتے تھے۔ "آزاد اردوئے معلیٰ کا ہیرو ہے۔ اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔"

جہاں بانو بیگم

غزل

ان لبوں پر میرا نام آ ہی گیا — نالۂ ناکام، کام آ ہی گیا

سارے عالم کو بھلا دے جس کی یاد — یاد پھر وہ لالہ فام آ ہی گیا

آئے وہ کچھ اس خرام ناز سے — دور میں رنگین جام آ ہی گیا

وہ جو آئے سو بہاریں آ گئیں — زندگانی کا پیام آ ہی گیا

مر مٹے ہم اپنی شمعِ حسن پر — عشق میں پروانہ کام آ ہی گیا

جذبِ الفت کا تقاضا دیکھنا — وہ نگارِ خوش خرام آ ہی گیا

اللہ اللہ! یہ محبت کی کشش! — کوئی پھر بالائے بام آ ہی گیا

شامِ وعدہ، تھا یہ اعجازِ وفا — کھینچ کے وہ بدر تمام آ ہی گیا

دیکھ کر بولے وفاؔ کو بزم میں — لیجئے دل کا غلام آ ہی گیا

ابن ندیم وفاؔ

اُف وہ خواب

آنکھ کھلی تو کیا دیکھتی ہوں اماں سرہانے کھڑی ہیں۔ ان کا ہاتھ میری پیشانی پر ہے۔ اور ان کی انگلیاں کانپ رہی ہیں۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں لیمپ کی مدھم روشنی رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں کونوں کونوں منہ چھپائی پھر رہی تھی۔ میز پر ایک کھلی ہوئی کتاب کے ورق ہوا کے جھونکوں سے درختوں کے خشک پتوں کی طرح کھڑکھڑا رہے تھے۔ میں اپنی ماں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ رات کے بارہ بجے وہ میرے کمرہ میں کیا کر رہی تھیں؟ میری طرف اس طرح گھبرائی ہوئی نظروں سے کیوں دیکھ رہی تھیں؟ "آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔ کیا ہوا آپ کو؟" میں نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں پوچھا اور پیشانی سے لیسنہ صاف کیا۔ "مجھے" انھوں نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "مجھے کیا ہوا۔ میں تو اچھی ہوں۔ میں پوچھتی ہوں۔ تجھے کیا ہوا؟" میں نے اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ لیسنہ میں شرابور ہو گئی تھی۔ زبان خشک تھی۔ دایاں ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔ "مجھے کیا ہو گیا؟" میں سوچنے لگی۔ لیکن مجھے کسی تبدیلی کا احساس نہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا۔ اماں نے میرے برابر بیٹھ کر دلاسا دیتے ہوئے پوچھا "کیا بات ہے؟" "مجھے نہیں معلوم" میں نے آہستہ سے کہا۔ لیکن پھر سوچنے لگی "آخر کیا بات ہوئی۔ اماں کو اتنی تشویش کیوں ہے؟ ــــ" اماں نے میرے سر پہ ہاتھ پھیرنا شروع کیا "کوئی برا خواب دیکھا ہے کیا؟" میرے حواس پھر کام کرنے لگے۔ "کیوں؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔ "تم چیخ رہی تھیں۔ مجھے پکار رہی تھیں۔ تمھیں خیال نہیں؟" ــــ اماں کی متجسس آنکھیں میری طرف لگی تھیں۔ "میں چیخ رہی تھی۔ اماں کو پکار رہی تھی ــــ میں خواب دیکھ رہی تھی" میں نے سوچنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد حافظہ کے پردہ پر کچھ دھندلے دھندلے نقوش ابھر آئے۔ میں نے اماں سے کہا ــ "کچھ نہیں۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں پڑتا۔ خواب۔ شاید دیکھا ہوگا۔" اماں نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ اور یہ کہتے ہوئے اندر چلی گئیں "نا ٹکے نیچے نہ سو۔ اپنا پلنگ وہاں سے ہٹا لے۔" میں نے "اچھا" کہا۔ لیکن پلنگ نہ ہٹائی۔ میں نے سوچا۔ اسی جگہ سو رہوں تو شاید وہ خواب اچھی طرح یاد آ جائے۔ اُف وہ خواب۔ "میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنے میں اماں اندر آئیں "بیٹی تیرے ماموں آئے ہیں۔ چل ان سے مل" میں کپڑے درست کرتی اٹھی۔ اماں نے مجھے سر سے پیر تک ایک نظر دیکھا۔ کہنے لگیں "یہ کپڑے بدل ہی دو"۔ میں نے دل میں سوچا "نہ جانے کیا مصلحت ہے؟" اور دوسرے کپڑے پہن لئے "یہ کہاں ہیں وہ؟" میں نے اماں سے پوچھا "دیوان خانے میں" اماں نے میری طرف سے منہ پھیرتے ہوئے کہا "اکیلے" میں نے اپنے اطمینان کے لئے پوچھا "ہاں۔ ہاں"۔ اماں تیز تیز قدم اٹھاتی وہاں سے چلی گئیں۔ میں دیوان خانے تک گئی۔ ماموں جان کوئی غیر آدمی نہ تھے۔ مگر میرے قدم جیسے من من بھر کے ہو گئے ہوں۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے پردہ اٹھایا۔ اور اندر چلی گئی۔ ماموں جان کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے انھیں نہایت ادب سے سلام کیا۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ "ادھر آؤ نا بیٹی"۔ میری وحشت اب کچھ دور ہوئی۔ میں نے ماموں جان کو غور سے دیکھا۔ لیدپ میں رہ کر ان کی جسمانی حالت میں کافی سے زیادہ تغیر ہو گیا تھا۔ رنگ بھی خاصا نکھر آیا تھا۔ خیالات کا حال مجھے نہیں معلوم۔ لیکن۔ لیکن..... میں جو آزادی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتی

میں نے دیکھا ماموں جان سے ذرا پرے ایک نوجوان سوٹ بوٹ پہنے۔ مسکراتا بیٹھا تھا۔ میری کا ہے کو کبھی ایسی شامت آئی ہوگی۔ میں نے آنچل سے اپنا منہ لپیٹ لیا۔ اور روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔ اماں شاید میری منتظر ہی کھڑی تھیں "کیا ہوا؟" "کیا ہوا" انہوں نے پریشانی کے عالم میں پوچھا "کچھ نہیں" میں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ اتنے میں ماموں جان بھی آگئے۔ "دیکھو آپا اتنا پڑھ لکھ کر بھی آپکی لڑکی شرمیلی اور پرانے خیال کی ہے۔" اماں کو مجھ سے پہلے ہی سے شکایت تھی۔ اب جو ماموں جان نے ناراضی کا اظہار کیا۔ مجھ پر ہی برسنے لگیں۔ "میں تو تنگ آگئی ہوں۔ اللہ رکھے۔ اب سولہواں سال ہے۔ لیکن اپنے بھلے برے کی تمیز نہیں۔ اسے خود اپنی سدھ نہیں۔ گھر ہو باہر ہو، وہی ہلکی سیدھی سادھی ساڑیاں پہنتی ہے۔ نہ سنگار نہ کچھ نہ کیا۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ مگر اس ناشکری بچی نے نہ جانے دل میں کیا سوچا ہے۔" اور میری طرف متوجہ ہوکر "بی بی ابھی سے کیوں رو رہی ہو" میں اور بھی زور سے رونے لگی "رونے کے دن تو آگے آرہے ہیں۔" اتنا کہہ کر اماں چپ ہوگئیں۔ ماموں جان نے کہا: "آپا اس کے ابا کا کیا خیال ہے؟" "ارے ان کو فکر ہوتی تو کیا بات تھی۔ بس وہ ایک اپنے بھائی کا بچہ مل گیا ہے گھر بیٹھے۔ بس جب دیکھو اسی کا نام "میں اپنی بیٹی دوں گا تو اسی کو دوں گا" مانتی ہوں بچپن ہی میں دونوں کی نسبت ہو چکی ہے۔ لیکن اب میری بیٹی بڑی بڑی جماعتوں میں کامیاب ہو چکی ہے۔ اور پھر صورت شکل ہزاروں میں ایک ہے۔ تم دیکھتے رہنا۔ بڑے بڑے گھرانوں سے پیام آئیں گے۔" "کیوں نہیں ضرور" ماموں جان نے کہا۔ اور آہستہ سے کہنے لگے۔ "بیٹی ۔۔ ابھی جسے تو نے دیکھا ہے۔ پسند ہے تجھے۔ وہ تو بس دیوانہ ہوگیا۔ اگر تو کہے "ہاں" یا گردن ہلا دے تو ہمارا ذمہ ہم یہ بات پکی کئے دیتے ہیں۔" میں ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے کوئی مجھے گالیاں دے رہا ہے۔ میں نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا۔ "آپ لوگ مجھے مار ڈالیں گے" کہتے ہوئے میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔ تکیہ پر منہ رکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد اماں میرے کمرے میں آئیں۔ سنجیدہ بن کر پوچھنے لگیں۔ "آخر یہ ڈھونگ کس لئے ہے؟" اور مجھے غیر متاثر دیکھ کر نرم لہجہ میں کہنے لگیں "بیٹی تو جانتی ہے۔ ہم سب تیرے بھلے کے لئے ہی کہتے ہیں۔ یہ لڑکا تین چار سو ماہوار کماتا ہے۔ شریف ہے تو پڑھی لکھی ہے۔ سمجھ دار ہے۔ اگر تیری جگہ کوئی دوسری ہوتی تو بغیر پوچھے گچھے ہی سب کچھ طے ہو جاتا۔ بول تیری کیا مرضی ہے؟" میں نے اماں کے پیر پکڑ لئے ۔۔ "آپ خدا کے لئے اکیلی چھوڑ دیجئے مجھے میں اب آپ کو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ آپ جائیے ۔۔ جائیے خدا کے لئے ۔۔" "سمجھی" اماں نے تند و تیز لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "اس نکھٹو لڑکے کا خیال ہے شاید ۔۔ صورت نہ شکل ۔۔ کمائی نہ دھمائی ۔۔ اور تو اسے پسند کرتی ہے۔"

صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ ادب اور لحاظ نے اماں پر تالا لگا رکھا تھا۔ صبر کی آخری بوند بھی چھلک پڑی تو میری زبان میری نہ رہی۔ "اماں آپ اتنی حریص اور ظالم کیوں ہوگئی ہیں ۔۔ وہ جس سے میری نسبت بچپن ہی میں ہو چکی ہے۔ مجھے محبت کرتا ہے۔ میری جدائی میں روتا ہے۔ میری ہی امید میں وہ زندہ ہے۔ میں اس کے ساتھ نا انصافی نہیں کر سکتی۔ میں ان لڑکیوں میں نہیں ہوں جو محبت کو کھیل سے بڑھ کر نہیں سمجھتیں آج کسی سے محبت کی، کل کسی سے۔ مجھے جتنا اپنا خیال ہے، اسی قدر دوسرے کا ہے۔ میری زندگی ہے۔ اور اس کی کچھ بھی نہیں۔ میں خوش رہوں۔ اور وہ دنیا کی ٹھوکریں

کھاتا پھرے۔ یہ میں کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔" اماں دم بخود تھیں۔ "محبت۔ اری یہ سب مردوں کے ڈھکوسلے ہیں۔" "جی نہیں اماں۔ یہ سب ہماری دھوکا بازی ہے۔ ہم جب کسی کے ساتھ دھوکا کرنا چاہتی ہیں تو الزام سارا دوسرے کے سر تھوپتی ہیں۔ ہم میں استقلال نہیں اماں۔ ہم عورتیں کمزور دل کی ہوتی ہیں۔ مگر میں بتادوں گی کہ رشتہ ایک مرتبہ جڑتا ہے۔ دل ایک مرتبہ لگتا ہے۔ اور کنواری لڑکی کی محبت پہاڑ کی طرح اٹل ہے۔

اور اس کا وعدہ اسے اپنی جان سے عزیز۔ اماں میں اسے قول دے چکی ہوں۔ میں اسی سے شادی کروں گی۔ بس میں کہہ چکی۔" "بکواس بند کر بدتمیز" اماں نے غصہ سے کہا۔ اور چلی گئیں۔

ہندستانی لڑکی لاکھ تعلیم یافتہ ہو۔ آزاد خیال ہو۔ والدین کے حکم سے سرتابی کرنے کی قوت اس میں نہیں آتی۔ میں نے کھانا پینا چھوڑا۔ ہنسنا بولنا چھوڑا۔ اپنے کمرہ میں مقید ہوگئی۔ مگر کسی کا دل نہ پسیجا۔ سب میری جبری شادی پر تلے ہوئے تھے۔ اماں نے بات چیت ترک کردی تھی۔ انھیں اب شادی کی تیاریوں سے فرصت ہی کب ملتی تھی۔ اسی نوجوان سے میری نسبت قرار پائی۔ اور اب شادی بھی مقرر ہو چکی تھی۔ اس اثنا میں میرے پہلے منگیتر نے مجھے پوچھ کر بھی نہ دیکھا۔ آہ اس نے میرے متعلق کیا سوچا۔ نہ جانے اس کا اب ارادہ کیا ہے؟۔ میری بیوفائی کا رونا روتا پھر رہا ہوگا۔ لیکن وہ مجھ سے ملا کیوں نہیں۔ میں لاکھ بے وفا سہی۔ مجھے اگر میرے وعدے یاد دلائے جاتے۔ معصوم محبت کے پیمان دھرائے جاتے۔ میں مجبور ہو جاتی۔ میں اس کے لئے سب کچھ کرتی۔ انھیں خیالات میں گم تھی کہ کئی عورتیں میرے کمرے میں گھس آئیں۔ مجھے کپڑے دھکڑ کر دلہن بنایا گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ یکے بعد دیگرے چلی گئیں۔ میں نے تیزی سے اٹھ کر دروازہ بند کرلیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اگر ایک لمحہ کی بھی دیری ہوتی تو میں دوسرے کی ہو جاوں گی۔ میں نے تکیے کے نیچے سے ایک بڑا چاقو نکالا۔ کلمہ پڑھا۔ اور اپنے سینے میں بھونک لیا۔ تھوڑی دیر بعد میں چیخیں مار رہی تھی۔ اماں۔ اماں کہہ کر پکار رہی تھی۔"

رات ہی کو سوچ چکی تھی کہ صبح اٹھتے ہی اماں سے اپنا خواب کہہ دوں گی۔ اور شاید اماں مان جائیں۔ صبح تک میں رنگین خوابوں کی دنیا میں گھومتی رہی۔ صبح کو اماں نے مجھے بیدار کرتے ہوئے کہا۔ "مسکرا کیوں رہی تھی؟" میں شرما کر چپ ہو رہی۔

رشید قریشی

ایک رومان

کسی دور کے رشتہ کی وہ میری بڑی بہن تھیں —
قد میں مجھ سے کچھ چھوٹی لیکن عمر میں بڑی۔ ان کی شادی بھی
ہو چکی تھی — جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس وقت میں لڑکپن
سے گزر کر ابھی احساسات کی دنیا میں قدم رکھا تھا اور میرے ذہن
میں اس سوال نے کافی اہمیت پیدا کرلی تھی کہ مرد عورتوں سے
زیادہ محبت کرتے ہیں یا عورتیں مردوں سے؛ لیکن اس کا جواب
میری وسعت فہم سے ورے تھا!

میری نظروں میں رہنے والے خاندان کے سارے بیاہے
مردوں اور عورتوں کو دیکھ کر میں نے اپنے دل میں چند اطمینان بخش
نتائج حاصل کرلئے تھے وہ یہ کہ ہر عورت مرد کی مطیع ہوتی ہے اور
مرد بھی اس کا رفیق ہوا کرتا ہے۔ ہر عورت کسی نہ کسی مرد
اور اسی طرح مرد بھی کسی نہ کسی عورت سے بیاہنے کے لئے پیدا
کیا گیا ہے۔ ان نتائج نے میرے شوقِ تجسس کو بڑی حد تک
زائل کردیا تھا۔

محبت کا مفہوم ابھی میرے حلقۂ ذہن کا اسیر نہ ہوا تھا۔
اپنے گھر کے لوگوں کی زندگیاں بھی کسی خصوصیت کی طرف اشارہ
نہ کرسکتی تھیں میں یہ سمجھتا تھا کہ بچپن کے ہمجولیوں کو "میاں
اور بیوی" کا لقب دے کر عمر بھر کے رفیقوں میں تبدیل کردیا
جاتا ہے اور بس!!

بیاہ ہو جانے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے گاؤں
میں رہتی تھیں جو ہمارے گاؤں سے کچھ دور تھا۔ جس
گاؤں میں وہ رہتیں وہاں ہر سال ایک بہت بڑا میلا
لگتا جس میں ہم سب شریک ہوتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے
کہ جس واقعہ کا ذکر میں آگے کروں گا اس سال سے
پیشتر بھی متعدد مرتبہ میں اس میلے میں شریک ہو چکا تھا۔
اور جس سال یہ عجیب واقعہ ہوا اسی کے بعد سے آج تک
میں نے اس میلے میں شرکت نہیں کی۔

دس سال ہوئے جب کہ متعدد دعوتی خطوط کے بعد
گھر کے اور افراد کے ساتھ میں نے اس میلے میں شرکت کی۔ ان کے
گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ اس میلے میں شرکت کی غرض سے
آنے والے ہمارے خاندان کے بہت سے لوگ انہیں کے ہاں
قیام کرتے کیونکہ ان کا گھر بہت بڑا تھا اور وہاں بڑا آرام
بھی ملتا۔ وہ ایسی خوش اخلاق واقع ہوئی تھیں کہ مکان کے
ہر حصہ میں لوگوں کے بھر جانے کے باوجود ہر نئے آنے والے کو
خوش آمدید اور نہایت خندہ پیشانی سے کسی نہ کسی طرح ان کے
ٹھیرنے کا انتظام کردیتیں۔

وہ بے حد خوبصورت تھیں اور ان کا ہنس مکھ دلکش
چہرہ آج تک میری آنکھوں میں بسا ہوا ہے ہر ایک سے
ہمدردی اور تواضع سے پیش آنا ان کی فطرت میں داخل تھا۔
چند گھنٹوں کی یکجائی میں ہر نئے آدمی پر اپنی شخصیت کا اثر
جمانا انہیں کا کام تھا۔

وہ جب کبھی ہمارے گاؤں کو آتیں جہاں ان کے
والدین رہا کرتے تھے تو ضرور ہمارے بھی گھر آتیں اور مجھ سے
متعلق ایک خاص بات ان میں یہ بھی تھی کہ ضرورتاً یا اکثر یونہی
مجھ سے گفتگو کرنے کی کوشش کیا کرتیں۔ ان کے اس تبسم اور
غیر معمولی التفات سے میں شرم اور غیرت کے مارے پریشان
ہو جاتا؛ اور بسا اوقات ان کی موجودگی تک میں مکان سے

باہر ہی رہتا ۔۔۔ آج مجھے ان کے اس التفات کا سبب معلوم ہو چکا ہے لیکن اب ....

جس وقت ہم لوگ ان کے گھر پہونچے وہ اور لوگوں کے انتظامات میں مصروف تھیں جونہی ان کی نظر ہم پر پڑی وہ سب کام چھوڑ کر ہمارے پاس آئیں اور ہنس ہنس کر ہر ایک سے ہمارے گاؤں اور گھر کے حالات پوچھنے لگیں۔ ان کے بھائی بھی ساتھ تھے جو اپنے گھر کے واقعات سناتے رہے اس تمام عرصہ میں وہ برابر ٹکٹکی لگائے میری جانب دیکھتی رہیں عجیب جذبات سے مغلوب ہو کر جب دوسری جانب دیکھتے دیکھتے غفلت میں ایک آدھ بار ان پر نظر ڈالتا تو وہ برابر متبسم چہرے سے مجھے یوں گھورتیں گویا اس پورے وقت میں وہ مجھ ہی سے مخاطب رہی ہیں۔ تھوڑے تھوڑے دقیقہ سے مجھے بھی سوالات کا ہدف بنایا جاتا لیکن میں اکثر مختصر جوابات سے انھیں ٹال دیا کرتا۔ مگر مجھے اپنی اس بے رخی کے باوجود کہنا پڑتا ہے کہ اس مرتبہ پہلی بار میں نے ان کے چہرے پر ایک خاص جذبہ اور حزن کی لہر محسوس کی جس کا پہلے مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوا کرتا تھا ۔۔۔ حتیٰ کہ میں بھی اپنے دل میں ایک نئے جذبہ کی تخلیق کو محسوس کرنے لگا۔

بہ ہزار کوشش میلے کی دلچسپیوں میں شریک ہونے کے بہانے میں ان کے بھائی کے ہمراہ باہر نکلا۔ راستہ میں ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں لیکن اب میں ان کے سمجھنے سے بھی عاری ہو چکا تھا۔ میرا دھیان اب کسی اور طرف تھا ۔۔۔ چنانچہ میلہ اس میں شریک ہونے والے ہزارہا آدمی ۔۔۔ کھیل کود، تماشے، دکانوں اور راستوں کی آرایش ۔۔۔ غرض کوئی چیز میری توجہ اپنی جانب منعطف نہ کرا سکی اپنی اس حالت کے متعلق میں کوئی قطعی رائے قائم نہ کر سکا مختصر یہ کہ مجھ میں ایک بے چینی تھی اور ساتھ ہی ایک ہلکا سا خوف کہ گھر جا کر پھر مجھے انہیں کا سامنا کرنا ہے مگر اب کی بار آرزو کی ایک ہلکی سی خلش بھی دل میں پنہاں تھی۔

گھر آنے کے بعد ہم نے اپنے اسباب کو ایک جانب قرینے سے رکھا ہوا پایا۔ دالانوں میں صاف فرش کیا گیا تھا۔ مغرب ہو چکی تھی جس کی وجہ سے گھر کے ہر حصے میں لیمپوں اور قندیلوں کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ تنہا ہونے کے خیال سے میں نے ایک دور کا کمرہ اپنے لئے پہلے ہی سے منتخب کر لیا تھا اس لئے آتے ہی میں نے اپنے ہی کمرے کا رخ کیا ۔۔۔ وہاں بھی صاف فرش اور بستر تیار تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا میز تھا جس پر چند کتابیں بکھری پڑی تھیں ۔۔۔ ایک کرسی تھی۔ دوسرے جانب ایک سوٹ کیس رکھا تھا اور بس!

کپڑے اتار کر میں نے میز کا رخ کیا یہاں الٹ پلٹ کر دیکھنے سے عظیم بیگ چغتائی کی کولتار نظر آئی اور ساتھ ہی آرسین لوپن کے کارناموں کا ایک تذکرہ بھی ہاتھ آیا میں نے کہا چلو تفریح کا سامان تو ہاتھ آیا اور پہلے آرسین لوپن کے کارناموں ہی کو دیکھنے لگا۔

پہلے تو میں نے چاہا تھا کہ چونکہ کھانے کا وقت قریب تھا اس لئے کھانے سے فراغت پا کر ہی ان کتابوں کو دیکھ ڈالوں لیکن جب دو تین ورق اسی خیال میں دیکھ ڈالے تو اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی کہ سارے خیالات گم ہو گئے اور میں اس میں محو ہو گیا اور اسی کے سنسنی خیز واقعات کی تصویر الفاظ کے پیکر میں میری آنکھوں کے آگے گھومنے لگی۔

ناول کی دلچسپی نے آنے جانے والوں کے شور و غل کو بھی مدھم کر دیا تھا میں اپنے کمرے میں کسی کی موجودگی سے اس وقت

باخبر ہوا جب کہ آنے والے کے ہاتھ میرے کندھوں پر رکھے گئے۔

آدمی کو غافل، پاکر اچانک اسے آگاہ کرنا یا پیچھے سے آکر کسی کی آنکھیں بند کرنا یہ سب میرے خیال میں انتہائی بھونڈے مذاق کی مثالیں ہیں ـــــ غور تو کیجئے کہ جس شخص کی آنکھیں بند ہوں وہ بند کرنے والے کے ہاتھوں کی بو، سردی اور ایسی ہی دوسری چیزوں سے کتنا نالاں رہتا ہے۔

میں پیشانی پر بل ڈال کر اٹھا لیکن وہاں پھر ان کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی اور ساتھ ہی کچھ پریشانی بھی ہونے لگی۔ اس بیجا سکوت سے چھٹکارا پانے کے لئے میں نے سوال کیا۔

"آپ کس لئے تشریف لائی ہیں ؟"

بجائے اس کے کہ کسی ضروری کام یا اپنی موجودگی کی کوئی اور وجہ بتا کر وہ مجھے مطمئن کرتیں عجیب حرکات کرنے لگیں اور کہنے لگیں (انکی کل کی تقریر سے یہی ایک نا تمام جملہ مجھے یاد رہ گیا)

"تم بھی عجیب بھولے .... تمھیں تو کسی چیز کا علم ہی نہیں!"

یہ کہتے کہتے آگے بڑھ کر انھوں نے میرا ایک بوسہ لے لیا۔

انتہائی شرمندگی اور ایک نامعلوم بوجھ کے اثر سے میرے لب گویا پیوست ہو گئے تھے۔ میری قوتِ گویائی اور قوت تخیل ان کی مسلسل تقریر کے آگے بیکار ہو چکی تھیں۔ میرے ہاتھ اور پیر بے انتہا وزن ہو گئے حتیٰ کہ ان کے اس بے حجابانہ طرز عمل کی مدافعت کرنے کا بھی مجھے ہوش نہ رہا۔

وقت اور موقعہ کی نزاکت کا احساس انھیں ہی ہوتا تو ہوتا مجھے تو پہلے ہی لوگوں کی آمد و رفت کا خیال نہ تھا۔ وہ اپنی موجودہ حرکت کے خطرے سے اسی وقت آگاہ ہوئیں جب کہ ان کا شوہر ـــــ ایک کینہ پرور، انتقام پسند، سخت گیر اور ظالم شخص جیسا کہ میں پہلے سن چکا تھا۔ وہاں آ چکا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ لیا۔ اس کی آنکھوں سے آگ کے شعلے نکل رہے تھے وہ اسی غیض و غضب کی حالت میں واپس چلا گیا۔ انھوں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میرا ایک اور بوسہ لیا اور کمرے سے نکل گئیں۔

میں اسی وقت باہر نکلا اور میرے گاؤں واپس ہونے والے ایک کسان کی بنڈی کے ذریعے صبح تک گھر پہونچ گیا۔ اس واقعہ کے تھوڑے ہی عرصہ بعد میں نے خبر سنی کہ زہر کھلا کر میری بہن کی جان لی گئی۔ مجھے ان کی جلد بازی، مجبوری اور ان کے اس بوسہ کی قیمت کی گرانی کا خیال عمر بھر ستاتا رہے گا۔ وائے محرومی!!

سید ابو الفضل

فتح آباد پر ایک نظر

میں منجلے گاؤں کسی کام کی وجہ سے جارہا تھا کہ راستہ میں فتح آباد ملا یہ مقام تاریخی لحاظ سے اہم ہے۔ اس لئے چند گھنٹے یہاں ٹھیرا اور آثار قدیمہ دیکھے۔ یہ مقام سلسلۂ بالاگھاٹ کی چوٹی پر واقع ہے۔ تعلقہ مومن آباد کا ایک قصبہ ہے۔ اس کا پہلا نام دھارور ہے اور اب بھی بعض لوگ دھارور کہا کرتے ہیں۔ سدی عنبر نے اس کو فتح کرکے فتح آباد نام رکھا۔ یہ قصبہ دو حصوں میں منقسم ہے۔ یہاں پانی کی سخت تکلیف ہے۔ تالاب کے کنارے جو آبادی ہے اس کو قصبہ کہتے ہیں اس آبادی کے کنارے ایک مسجد ہے جس میں ۳۰ کھم پتھر کے لگے ہوئے ہیں۔ کتبہ حسب ذیل ہے۔

ایں عمارت در عہد خلافت ......

محمد نظام شاہ سلطان ...... باشد

فتح باد تیار شدہ متولی محمد علی العشرین شعبان

اس مسجد کی جانب شمال دوسرے تالاب کے کنارے دوسری مسجد ہے جس کا کتبہ حسب ذیل ہے۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

خادم شرع متین کرد از کمال صدق جاں

مسجدی احداث بہر مقدم صاحبدلاں

ہاتف طبع سخن پرور بگوش ہوش گفت

موجب اسباب فضل دیں بگو تاریخ آں

بانیٔ مسجد خادم شرع عبدالوہاب ۱۰۹۱ھ

اس قصبہ کو سدی عنبر نے فتح کرکے بالکلیہ نظام شاہیہ کے زیر سلطنت لالیا۔

دوسرے تالاب کی جانب شمال جو آبادی ہے اس کو پیٹھ کہتے ہیں۔ بیوپاریوں کی دکانیں وغیرہ سب اسی جگہ ہیں۔ یہ قصبہ تجارتی لحاظ سے اہم ہے۔ اس قصبہ کا محصول کروڑگیری سالانہ کافی ادا ہوا کرتا ہے۔ حالانکہ اس مقام پر آمد و رفت کے ذرائع بالکل مہیا نہیں ہیں۔ اس آبادی کی جانب شمال جامع مسجد ہے جس میں چونے کا فرش کیا ہوا ہے۔ لیکن اب کہیں کہیں چونا نکل گیا ہے۔ اس مسجد کی دیوار کے نیچے ایک کنواں ہے۔ مسجد کا دروازہ چھوٹا ہے۔ کتبہ درج ذیل ہے۔

اللہ محمد علی

زغیب آورده شد تاریخ مسجد	بکن تحقیق از مصراع اول
ذکی بشمار اماں لفظ تحقیق	بود مصراع اول لفظ اول
بنا می کرد	مسجد۔ زفیض فائض فضل مفضل

پہلے مصرع میں جو لفظ "زغیب" ہے وہ اس مسجد کی تاریخ کا لفظ ہے جس سے پتہ چلا کہ یہ مسجد ۱۰۱۹ھ میں بنی ہے۔ جامع مسجد کے تقریباً ۴ فرلانگ کے فاصلہ پر جانب مغرب قلعہ واقع ہے۔ قلعہ کا بالاحصار انتہائی دانشمندی سے بنایا گیا۔ کیونکہ قلعہ کی تینوں جانب پہاڑ کے درے واقع ہیں۔ صرف جانب مشرق بطرف آبادی پہاڑ نہیں ہے اسی لئے یہ قلعہ کا راستہ بنا ہوا ہے۔ پہاڑ کے درے کو غنیم کسی طریقہ سے عبور نہیں کرسکتا۔ اگر وہ عبور بھی کرلے تو قلعہ میں جانے کے لئے خندق حائل ہوجاتی ہے۔ خندق کا عرض تقریباً ۴ سو فٹ ہے اگر اتفاق سے خندق کو غنیم عبور کرلے تو بالاحصار ہے اور بالاحصار کے اندر پھر اور خندق بنائی گئی ہے جس میں اب بھی

پانی بے شمار ہے اس حصہ کے تمام لوگ اسی خندق کا پانی پیتے ہیں۔ دشمن یہاں آکر یہیں کا ہو رہتا ہے قلعہ کے اندر جا نہیں سکتا اس قلعہ کو عالمگیرؒ کے بعد کبیر خاں نے از سرِ نو تعمیر کیا۔ سنا جاتا ہے کہ اس قلعہ کو ہندوؤں نے تعمیر کیا۔ لیکن اس کی تحقیق نہ ہو سکی۔

ف۔ قلعہ کے دروازہ پر کتبہ لکھا ہوا ہے لیکن اتنا اونچا ہے کہ پڑھا نہیں جاتا۔

ف۔ قلعہ کے اندر جانے کے بعد بائیں جانب تین لاونیاں سلسلہ سے بنی ہوئی ہیں۔ ایک لاونی کے چھت پر نقش و نگار عجیب طریقہ کا بنایا گیا ہے۔ اور رنگ بھی دیا گیا ہے لیکن رنگ اب تک اڑا نہیں۔ رنگ سیاہ اور نیلا نظر آتا ہے۔ دوسری لاونیاں مختلف ڈیزائن کی ہیں۔

ف قلعہ کے دروازے پر ایک برج پر کتبہ لکھا ہوا ہے۔

ایں........ بنام.......... جلہ انام

در.......................زلملک نام

۱۰ار ذیحجہ......   برابر پڑھا نہیں گیا

ف۔ قلعہ کے دروازے کے قریب ایک اور برج ہے جس کو شاہ برج کہتے ہیں۔ اس برج پر ہاتھ کے دائیں اور بائیں پنجے کے نشانات ہیں۔ سنا جاتا ہے کہ یہاں دو پہلوان رہتے تھے انھوں نے کسی کا خون کیا اور ہاتھ خون میں بھر کر اپنے ہاتھ کی نشانی دیوار پر لگادی اور مر گئے۔ یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے معلوم نہیں لیکن زبانِ زد عوام و خواص ہے اب بھی جہاں یہ نشان ہے وہ جگہ دو پنجے کی حد تک سیاہ نظر آتی ہے۔

ف۔ قلعہ کے وسط میں حضرت سید عیسیٰؒ صاحب کی درگاہ ہے۔ دروازے کے باہر جالی چونے سے بنی ہوئی ہے۔ سنا جاتا ہے کہ حضرت قبلہ کا جسم شریف یہاں اور سر مبارک اپلائی تعلقہ منجلے گاؤں میں ہے۔ آپ لڑتے لڑتے یہاں آئے اور شہید ہو گئے۔

ف۔ درگاہ کے کچھ دور کے فاصلہ پر جانب مغرب ایک دروازہ ہے دروازہ سے گزرنے کے بعد اندر کی جانب، لاونیاں ہیں۔ ان لاونیوں میں اب بھی اگر زمین کھودی جائے تو بارود نکلتی ہے۔ ان لاونیوں میں سے ایک لاونی سے سرنگ جانب جنوب چلی گئی ہے۔ ایک آدمی اچھی طرح سے جا سکتا ہے۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ بارود خانہ تھا۔ ان لاونیوں کے بالمقابل ایک کالی کوٹھڑی ہے۔ اس کوٹھڑی کے عقب میں ایک حوض ہے جو کہ تقریباً ۵ فٹ چوڑا اور ۲۰ فٹ لمبا ہے۔ اس کے قریب کنواں بھی ہے۔ اس حوض میں زمانۂ بارش میں دو طرف سے مغرب کی جانب سے پانی آتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں ہوا کہ پانی کہاں سے آتا ہے۔ حوض کے بالمقابل جانب مغرب ایک لاونی کے اندر کنواں نظر آتا ہے۔ اس کنوئیں کے اندر سے سرنگ چلی گئی ہے جس کا پتہ تقریباً دو میل کے فاصلہ پر جانب جنوب و مغرب ایک برج پر لگا ہے۔

ف۔ درگاہ کے جانب مغرب ایک مسجد ہے جس کے پیچھے حوض ہے جو تقریباً اچھا ہے۔ صرف صفائی نہیں ہے۔ فرش چونے کا بنا ہوا ہے اس حوض میں مغرب کی جانب سے ایک نل آیا ہوا ہے اور جانب جنوب سے ایک۔ اس حوض کے جانب جنوب اور ایک حوض ۱۰ فٹ اونچی جگہ پر بنا ہوا ہے۔ جس میں جنوب کے طرف سیڑھی کے بازو ایک جالی کے نمونہ کی چادر بنائی گئی ہے۔ وسط حوض میں ایک گڑھا نظر آتا ہے معلوم یہ ہوا کہ یہاں فوارہ تھا اس حوض کے اوپر نالیاں بنی ہوئی ہیں اور کچھ چھوٹے چھوٹے حوض بھی ہیں۔

اِن چھوٹے چھوٹے حوضوں کے جانب جنوب بتقریباً ۱۰ قدم کے فاصلہ پر محل ہے جس کو آئینہ محل کہتے ہیں۔ اب یہ محل منہدم ہوگیا ہے۔ لیکن کچھ کچھ آثار اب بھی نظر آتے ہیں۔ اس محل کے جانب مغرب باورچی خانہ کے دو کمرے ہیں۔ ان کمروں کے گنبدوں پر سوراخ بھی ہیں جو کہ دھواں جانے کے لئے بنائے گئے ہیں۔ کمرے میں چولھے بھی بنے ہوئے ہیں۔ باورچی خانہ کے جانب جنوب اور ایک عمارت ہے اور اس کو نعمت خانہ کہتے ہیں۔ آئینہ محل کے جانب مغرب دو حوض ہیں اس حوض پر چھت بنی ہوئی ہے۔ اب بھی ان حوضوں میں سے ایک حوض میں پانی رہتا ہے اور ایک حوض میں سے سرنگ جانب مشرق اور شمال جاتی ہے۔ اس میں ایک آدمی اچھی طرح سے جا سکتا ہے۔

ف۔ آئینہ محل کے نزدیک ہی جانب شمال مسجد واقع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاہی مسجد ہے۔ مسجد بہترین کاریگری کا نمونہ ہے اور یہ اپنی صنعت میں اپنی آپ نظیر ہے دروازہ پر کتبہ لکھا ہوا ہے جو کہ حسب ذیل ہے۔

در عہد نظام شاہ عالی مقدار آں شاہ جہاں پناہ خورشید لقب
بانیٔ بنائے خیر شد میحز خاں آں منبع خلق و لطف .... و ادب
تاریخ بنائی خیر اکبری خواہی از قبلۂ .... عجز و اخلاص طلب

اگر حکومت کی جانب سے ان کتبوں کی دیکھ بھال ہوئی تو بہتر ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ انقلاب زمانہ کی وجہ سے یہ بھی حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گے۔ اور بھی یہاں آثار قدیمہ بہت سے ہیں لیکن میں جلدی میں ان سب کو دیکھ نہ سکا اور اتنے تنگ وقت میں جو کچھ بھی دیکھ سکتا تھا دیکھ لیا۔ انشاءاللہ اگر کسی وقت جانا ہو تو یہاں کے حالات مفصل لکھوں گا۔

ابوالفیض قاضی سراج الدین احمد نیّر

غزل

تیری الفت نے جس کو مارا ہے اس کو کب زندگی گوارا ہے
جی رہا ہوں فراقِ جاناں میں وعدۂ وصل کا سہارا ہے
رخِ روشن سے نور چھنتا ہے حسن کے آسماں کا تارا ہے
خود فریبِ حیات کے ہاتھوں ہم کو مرنا بھی اب گوارا ہے
آسماں پر شفق پھلے پھولے خونچکاں آنکھ کا اشارا ہے
دل میں اٹھتے ہیں ولولے لاکھوں ہر نفس برق ہے شرارا ہے
زندگی، زندگی بنا دے عظیم
لبِ جاں بخش کا اشارا ہے

عظیم حیدرآبادی

سری ناگناتھ مہاراج کا مندر

ہندوستان میں بارہ جوتر لنگ ہیں جو مقدس مانے جاتے ہیں ان میں سے تین لنگ ممالک محروسہ میں موجود ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) پرلی ضلع بیڑ (۲) ایلورہ ضلع اورنگ آباد (۳) اونڈہ تعلقہ ہنگولی ضلع پربھنی۔

قدیم واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ لنگ کی ابتدا اونڈہ سے ہوئی ہے۔ اس مقام کا سابقہ نام "دوارکا بن اورامرک" تھا جو بعد میں اونڈہ کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ قصبہ تعلقہ ہنگولی میں واقع ہے۔ مقام پرفضا اور پہاڑیوں سے گھیرا ہوا ہے۔ اس دیول کے مختصر واقعات یہ ہیں کہ کورو اور پانڈو کی جنگ سے کچھ سال قبل تخمیناً اب سے پانچ ہزار سال قبل کورو جب بن باس ہوئے تو اونڈہ میں ہی ان کا مقام ہوا۔ مقام شاندار و دلچسپ ہونے کی وجہ قیام طویل رہا۔ اس وقت یہ مقام چاروں جانب پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے یہاں ایک تالاب بھی تھا جو "امرک" تالاب کے نام سے موسوم تھا۔ گائیں روزآنہ پہاڑیوں پر چرنے جایا کرتیں۔ ایک گائے تالاب میں تیر کر جاتی اور ایک مقام پر ٹھیر جایا کرتی حسب معمول دودھ نکالا جاتا تو نہ نکلتا۔

بھیم نے جس کی قوت ایک ہزار ہاتھی کے برابر تھی اپنی روحانی قوت سے تالاب کا پانی خارج کیا۔ اخراج آب سے تمام دنیا میں روشنی پھیل گئی رات نظر نہ آتی تھی۔ رشی لوگ جن کا استھان ان ہی پہاڑیوں پر تھا نہایت پریشان ہوئے۔ خدا سے دعا کی کہ یہ کیا معاملہ ہے مگر پتہ نہ چل سکا۔ وشنو اور برہم دیو نے تمام دنیا کا چکر لگایا۔ مگر روشنی کا پتہ نہ چلا سکے۔ باالآخر رشیوں نے پھر خدا سے دعا کی۔ ندا آئی کہ جس جگہ روشنی ہے اس جگہ بھیم کے ہاتھ سے بھاگرتی ندی کی ریت ڈلوائی جائے اور اس کے بارہ حصے کئے جائیں ایک حصہ اسی جگہ رہے اور مابقی دوسرے مقامات پر تقسیم کر دیے جائیں ایسا کرنے پر روشنی کم ہو گئی۔

اس وقت بھی تہ خانہ میں یہ ریت کا لنگ موجود ہے جس کی زیارت صرف اہلِ مذہب ہی کر سکتے ہیں۔

ویرم راج پسر کلاں نے اس جگہ تعمیر دیول کا حکم دیا اور عمارت پتھر دیول تعمیر ہوئی اس کا معمار "وشوکرم" تھا۔

اصل دیول نقشی پتھر اور نصف چونے اور اینٹ کی بنی ہوئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو مرتبہ اس کی تعمیر ہوئی ہے اس دیول سے متصل جانب مشرق ایک چٹان بھی اس زمانے کی موجود ہے۔ جانب جنوب ایک باؤلی ہے جس کے پانی سے مشہور ہے کہ ہڈی گل جاتی ہے۔ بچے کی پیدا وار اور جڑی بوٹی کے لئے یہ مقام مشہور ہے۔ زائرین و معتقدین مختلف اور دور دراز مقامات سے ہر سال پچیس ہزار سے زیادہ آتے ہیں۔

معاش :۔ یہ موضع پرلی جاگیر تعلقہ بسمت نگر میں واقع ہے۔ انعامات تعلقات جنتور و ہنگولی میں ہیں۔ یہ معاش عطیہ شاہانِ مغلیہ ہے۔ سند تانبے کے پتھر پر دی گئی ہے جو اب تک موجود ہے۔ علاقہ برار تعلقہ باسم سے ایک ہزار نقد معاش ہے۔ پیشوا نے ایک قیمتی ہار جڑاوی نذر دیا ہے۔

مسز عبدالقادر حسینی
(اورنگ آباد)

بوڑھا ڈاکٹر

بوڑھا ڈاکٹر برسات کی بچپاتی ہوئی گرمی سے گھبرا کر صحن میں ٹہلنے لگا۔ برسات کا آخر زمانہ تھا۔ جس طرح ہر موسم کے بدلنے سے پہلے فضا بہت سہانی ہو جاتی ہے اسی طرح آج بھی تھی۔ باہر صحن میں وہ ہوا میں ایک ہلکا پن محسوس کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا جس طرح بڑھاپے کی آمد سے پہلے سر میں کہیں کہیں سفید بال بھلے معلوم ہوتے ہیں اسی طرح سردیوں سے پہلے کا یہ موسم بھی بہت خوش گوار ہوتا ہے۔ اور اس اچھے طریقہ سے ٹھٹھرا دینے والے جاڑے کی آمد سے انسان کو خبردار کرتا ہے۔

بادلوں کے بکھرے ہوئے ٹکڑے بارش کی آمد کی خبر دے رہے تھے۔ برسات کے آخر میں بجلی کی چمک اور بادلوں کی گرج بہت ہوتی ہے۔ آج بھی بجلی گھڑی گھڑی چمک رہی تھی۔ ڈاکٹر نے سوچا کہ کل بارش ضرور ہوگی۔ بارش ہونے سے پہلے معلوم نہیں، کیوں اس کے کندھے میں ہلکا سا درد ہوتا تھا۔ آج بھی اسے وہی پرانی تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ بڑھاپے کی وجہ سے برسات میں باہر جانا اس کے لئے بہت مضر ثابت ہوتا تھا۔ وہ اکثر خوشگوار موسم میں بھی شام کو بہت تھکا ہوا رہا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی مضبوط جوان ڈاکٹر گاؤں میں اس کی جگہ لے لے۔

وہ دن قریب آرہے تھے جب اس کو کام بالکل چھوڑ دینا پڑے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ گھر بیٹھ جائے وہ چاہتا تھا کہ کوئی اس کی جگہ لے لے تاکہ گاؤں کے لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ شہر سے ڈاکٹر کو بلانا بہت مشکل تھا۔ اور لوگ بھی ایسا ڈاکٹر چاہتے تھے جس سے وہ اچھی طرح واقف ہوں۔ ایک نیا ڈاکٹر چند روز ہوئے گاؤں میں آکر رہا تھا۔ شاید آہستہ آہستہ لوگ اس سے مانوس ہو جائیں۔ مگر فی الحال اس کی لیاقت پر بھروسہ کرنا مشکل تھا۔

بڑھا ڈاکٹر پتھر کی ٹوٹی ہوئی دیوار پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ سگریٹ پیتے ہوئے ڈاکٹر خورشید (نئے ڈاکٹر) کے متعلق سوچنے لگا۔ چند مہینے ہوئے کچہری کے ایک افسر (سراج الدین) کے ساتھ وہ شہر سے آیا تھا۔ ان کی صرف ایک بچی تھی جس کے متعلق خورشید نے کہا تھا کہ اسے گھٹیا کا مرض ہونے کا خطرہ ہے۔ جب سے ان کی بیوی اس سے بہت خفا تھیں یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ڈاکٹر خورشید کبھی میرے گھر میں قدم نہ رکھیں۔ مگر خود سراج الدین نے ڈاکٹر خورشید سے فرمائش کی تھی کہ وہ بچی کا خیال رکھا کرے۔ کیونکہ وہ روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔

"وہ ہم کو بہت پیاری ہے اگر اس کو کچھ ہو گیا تو ہماری زندگی تباہ ہو جائے گی"۔ سراج الدین نے کہا۔

ڈاکٹر خورشید بڈھے ڈاکٹر کے ساتھ بہت عزت سے پیش آتا تھا۔ اسی لئے اور بھی بڈھے ڈاکٹر کو وہ بہت پسند تھا۔ "یہ مت سمجھئے کہ میں کسی قابل نہیں ہوں اس لئے شہر میں کسی ہسپتال میں مجھے جگہ نہیں ملی۔ بلکہ وہاں اتنے ساری مریضوں کا چارج ہم کو ایک دم سے مل جاتا ہے کہ ہم ان کو بے جان تصور کرنے لگتے ہیں اور ان میں کسی قسم کی دلچسپی نہیں لیتے۔ اس سے تجربے میں بالکل اضافہ نہیں ہوتا۔ اس لئے میں گاؤں میں آگیا ہوں"۔

بڈھے ڈاکٹر نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور کہا کہ

اسے اس بات سے خوشی ہوتی ہے کہ ایک جوان ڈاکٹر چند روز میں اس کی جگہ کے لئے تیار ہو جائے گا۔

ان چند مہینوں کے اندر وہ ڈاکٹر خورشید سے بہت دفعہ مل چکا تھا اور اس کو یہ معلوم کر کے اطمینان ہوتا تھا کہ گاؤں کے اکثر لوگوں نے اسے بلانا بھی شروع کر دیا ہے۔ اس کو یقین تھا کہ وہ دن قریب آ رہے ہیں جب وہ آرام سے گھر میں بیٹھ سکے گا۔

بڈھا ڈاکٹر جلے سگریٹ آخری حصہ صحن میں پھینک کر اندر چلا گیا۔ جب وہ صبح کو اٹھا تو زمین بالکل تر تھی ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ آسمان کالے بادلوں سے بالکل ڈھکا ہوا تھا۔ کچھ سماں ایسا تھا کہ چند گھنٹوں میں موسلا دھار بارش ہونے والی ہے۔ بڈھا ڈاکٹر دل ہی میں کہنے لگا "خدا کرے آج مجھے کہیں جانا نہ پڑے ورنہ مر ہی جاؤں گا۔ کچھ ایسی بات ہو جائے کہ آج کوئی بیمار نہ پڑے"۔

دس بجے کے قریب وہ خط لینے کے لئے ڈاک خانے گیا۔ سڑکیں کیچڑ سے دلدل بنی ہوئی تھیں۔ راستہ چلنے والوں کے پاؤں ٹخنوں تک کیچڑ میں دھنسے جا رہے تھے۔ ڈاک خانہ اس کے گھر سے صرف دس قدم پر تھا۔ مگر وہ واپس آیا ہی تو اس کے کپڑے کیچڑ میں لت پت تھے۔ ہوا اس قدر ٹھنڈی تھی کہ خون جما جا رہا تھا۔ گھر آ کر اس نے دریافت کیا کہ اسے کوئی بلانے تو نہیں آیا تھا۔ کیونکہ ایسے ہی وقت میں لوگ زیادہ بیمار پڑتے ہیں ایک تو موسم کی خرابی دوسرے برسات میں وہ زیادہ تر گھر سے باہر نہیں نکل سکتے کچھ کام نہ ہونے کی وجہ سے معمولی بیماری اور درد بھی بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اور بے ضرورت ڈاکٹروں کو تنگ کرتے ہیں۔ اصل تو یہ ہے کہ برسات میں لوگ زیادہ تر وہم کی بیماری میں مبتلا رہتے ہیں۔ ڈاکٹر کا خیال سراج الدین کی بچی کی طرف گیا۔ اگر اسے آج کچھ ہوا تو ڈاکٹر خورشید اسے دیکھنے جائے گا افسوس اسے ہی اس بات کی تاکید کی تھی۔ دوپہر کو اسے خیال ہوا کہ آج کسی کو بھی کچھ نہ ہوگا۔ مگر تین بجے کے قریب ایک آدمی گھبرایا ہوا آیا۔ "آپ کو نجم الدین صاحب بلا رہے ہیں"۔

"کیا بات ہے کس کی طبیعت خراب ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "ان کے لڑکے نے اپنی ٹانگ توڑلی ہے باغ میں کھیل رہا تھا۔ ایک پتھر کو سرکانے لگا وہ سرک کر اس کی ٹانگ پر آ گرا جلدی چلئے خون بہت بہہ رہا ہے"۔

"ہاں تم چلو میں ابھی آیا" ڈاکٹر نے کہا

اس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی بڈھا ڈاکٹر رنجیدہ ہو کر سوچنے لگا کہ اس کی ٹانگ بھی آج ہی ٹوٹنی تھی معمولی موچ ہوتی تو ایک دن کے لئے رک سکتے تھے۔ مگر اب تو جتنی جلد ہو سکے وہاں پہنچنا ضروری تھا۔ نجم الدین کا گھر وہاں سے پانچ میل تھا۔ اور ڈاکٹر خورشید کے گھر سے صرف دو میل۔ ڈاکٹر خورشید کو کیوں نہیں بلاتے"؟

"وہ کہتے ہیں کہ بارش بہت ہو رہی ہے وہ بغیر سواری کے نہیں آ سکتے"۔ نوکر نے کہا۔

"اچھا تم چلو میں آیا۔ تم جب تک بچے کی ٹانگ گرم پانی سے اچھی طرح دھو۔ اس طرح کہ اس کو تکلیف نہ ہو۔ پھر سلا دینے کی کوشش کرو۔ میں جتنی جلدی ہو سکے آنے کی کوشش کروں گا"۔

ڈاکٹر نے گرم مفلر اچھی طرح گلے کے گرد لپیٹا گرم کوٹ اور اس پر برساتی پہنی۔ اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل کھڑا ہوا۔

راستے میں ہی اندھیرا ہونے لگا تھا مگر گھوڑا بغیر ٹھوکریں
کھائے آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر خورشید کے
متعلق سوچنے لگا ایسا ڈاکٹر کس کام کا جو موسم کی خرابی کا عذر
کرکے مریضوں کو دیکھنے نہ جائے۔ ڈاکٹر کو اس کی اس حرکت
پر بہت افسوس ہوا اسے یہ سوچ کر راحت ہوتی تھی کہ گاؤں
میں کوئی اس کی جگہ لینے کو آگیا ہے۔ اس کو خبر نہیں تھی کہ
وہ کتنے دن کا مہمان ہے۔ ٹھنڈی ہوا سائیں سائیں کرتی
ہوئی اس کے کانوں میں گھسنے لگی۔ اس وقت اس کو اپنی
کمزوری کا بہت احساس ہو رہا تھا۔

برسات میں رات بھی جلدی ہو جاتی ہے۔ ابھی وہ
آدھا راستہ بھی پار نہ کرسکا تھا کہ اندھیرے کی وجہ سے کچھ
سجھائی نہ دینے لگا۔ اسے کچھ لوگ سڑک صاف کرتے ہوئے
دکھائی دئے۔ "میری واپسی تک یہ سڑک بالکل ٹھیک کر دینے
کی کوشش کرو" اس نے ایک سے کہا۔

"کیا آپ ہیں ڈاکٹر صاحب؟ ہم یہ بڑی سڑک جب تک
ضرور ٹھیک کر دیں گے۔ اور ڈاکٹر خورشید بھی آپ کے پیچھے
آرہے ہیں"

بڈھے ڈاکٹر نے جب یہ سنا تو اس کو بہت حیرت ہوئی۔
اور امید کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی۔ ڈاکٹر خورشید کا گھر وہاں
سے بہت دور تھا۔ ڈاکٹر نے دل ہی میں اس کی ہمت کی داد
دی۔ بارش کیچڑ اور اندھیرے کے مارے راستہ چلنا دشوار تھا۔
"شاید سراج الدین کی لڑکی کو دیکھنے جا رہا ہے" اس نے سوچا۔

اس سے قبل کہ وہ پلٹ کر اس سے جا ملے۔ وہ اس
کے قریب تھا۔ "آپ کہاں جا رہے ہیں" ڈاکٹر خورشید نے پوچھا۔
"نجم الدین کے پاس ان کے لڑکے کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے"
بڈھے ڈاکٹر نے کہا۔ "انھوں نے تم کو بلایا تھا"

"جی ہاں بلایا تھا ان سے تو میں نے انکار کر دیا تھا۔ اب
سراج الدین صاحب کی لڑکی بیمار ہے وہاں جانا تو ضروری ہے"

"ہاں وہاں ضرور جاؤ ان کی ایک ہی بچی ہے اگر وہ
مرگئی تو بہت برا ہوگا" بڈھے ڈاکٹر نے کہا۔

"اگر معاملہ نازک ہوا تو آپ کو بھی آنا پڑے گا" ڈاکٹر
خورشید نے کہا۔

"میرا اس بچے کے پاس رہنا زیادہ ضروری ہے" بڈھے
ڈاکٹر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"وہاں تک پہنچنا دشوار ہے۔ راستے میں دلدل میں
پھنس جانے کا اندیشہ ہے" ڈاکٹر خورشید نے کہا۔

"میرا جانا ضروری ہے ورنہ بچے کی ٹانگ بیکار
ہو جائے گی"

"مگر ڈاکٹر صاحب آپ کا رات کو پہنچنا بہت مشکل ہے۔
سویرا ہونے تک ٹھیرنا پڑے گا"

"یہ ناممکن ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے آج رات میرا
وہاں پہنچنا ضروری ہے"۔ بڈھے ڈاکٹر نے کہا۔ "اور تم بھی
نہیں رک سکتے۔ بچاری بچی کی جان خطرے میں ہے"

"مگر ہمارا ان تک پہنچنا بھی ناممکن ہے" ڈاکٹر خورشید نے
کہا۔ بوڑھا ڈاکٹر ہنسا اور کہنے لگا "جب خدا اتنے برے موسم
میں معصوم بچوں کو اتنی تکلیف دے سکتا ہے تو ہم بھی ان تک
پہنچ سکتے ہیں" اور کچھ کہے بغیر گھوڑے کی باگ سنبھالی اور
چل کھڑا ہوا۔ "ٹھیرئے میں بھی ساتھ چلوں گا" ڈاکٹر
خورشید نے پکارا۔

بڈھے ڈاکٹر نے اسے بھی پیچھے بٹھالیا۔ جب گھوڑا

گرنے لگے تو ایک دم سے کود جانا۔" یہ کہہ کر اس نے گھوڑے کی باگیں تھامیں اور چل پڑا۔ تھوڑی دیر تک وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ بارش اور ہوا کی تندی کی وجہ سے گھوڑے پر توازن قایم رکھنا دشوار تھا۔

"یہ اچھا ہے کہ ہوا چل رہی ہے بادلوں کو اُڑا لے جائے گی۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "کانوں کو اچھی طرح ڈھکا ہے یا نہیں؟

ہاں ڈھک لیا ہے۔ میں ساتھ چائے لایا ہوں آپ پئیں گے؟

"اتنی ہوا اور بارش میں سے گذرتے ہوئے چائے پینا مضر ہے۔" بڈھے ڈاکٹر نے کہا "نجم الدین کے پاس جا کر پئیں گے۔"

ڈاکٹر خورشید خشک ہنسی ہنسا۔ "ہم آج رات تو کہیں بھی نہیں پہنچ سکیں گے"۔

"پھر تم آئے کیوں"؟ بڈھے ڈاکٹر نے ذرا اُترشی سے کہا۔ جہاں تک آپ چلیں گے میں ساتھ چلوں گا۔ ڈاکٹر خورشید نے کہا۔

"اچھا تو چلو نجم الدین کے پاس"

آخر دلدل میں گھوڑا ڈگمگانے لگا۔ بارش خوب زور سے ہو رہی تھی۔ سردی کے مارے گھوڑا بھی کانپ رہا تھا۔ بوڑھے ڈاکٹر نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھا اور ایک پُرانا ٹاٹ اور کمبل جو ساتھ تھا اسے اڑھایا۔ اور دونوں پیدل چلنے لگے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ڈاکٹر خورشید نے کہا "اب اُجالے کا انتظار کریں تو بہتر ہے۔"

"میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میرا نجم الدین کے پاس پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

ڈاکٹر خورشید نے آہستہ سے کہا "عجیب آدمی ہے۔ مگر کیسے جائیں گے کیا اُڑ کر پہنچیں گے۔"

"نہیں چلیں گے۔ تم آج تک دلدل میں نہیں چلے؟

"نہیں۔" ڈاکٹر خورشید نے کہا۔

تو اس بات کا خیال رکھو کہ پاؤں آہستہ سے مگر مضبوطی کے ساتھ زمین پر رکھو۔ گھبراؤ نہیں زیادہ مشکل نہیں پڑے گی۔ مگر جلدی جلدی چلنے کی کوشش نہ کرنا۔" پھر بوڑھا ڈاکٹر ذرا سوچ کر کہنے لگا "یا تم یہیں ٹھیر جاؤ۔"

"وہ نہیں میں چلوں گا۔" اس نے شرمندہ ہو کر کہا۔

بارش کسی طرح رُکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ ان دونوں کے جوتوں کے ساتھ منوں مٹی چمٹ گئی تھی جس سے چلنا اور بھی دشوار تھا۔ سردی کے مارے ہاتھوں کی انگلیاں اکڑ گئی تھیں۔ بوڑھا ڈاکٹر خاموشی سے آگے آگے چلنے لگا۔ چند قدم چلنے کے بعد ڈاکٹر خورشید ہانپنے لگا۔ ننگے پاؤں چلنا زیادہ بہتر ہے میرے جوتے بہت بھاری ہو گئے ہیں۔" اس نے کہا۔ "ننگے پاؤں چلنا بہت خطرناک ہے" بوڑھے ڈاکٹر نے کہا۔

ڈاکٹر خورشید کو اس سے تسلی نہیں ہوئی وہ بیدلی سے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ ابھی بہت دور نہ گیا تھا کہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر اوندھے منہ ایک گڑھے میں گر گیا جو کیچڑ اور پانی سے بھرا ہوا تھا۔ اور بے بس ہو کر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

(باقی آیندہ)

معتصمۃ الرحمن

نذرالاسلام اور میرے دوست

میرے دوست حضرت اشک نے بنگالی زبان کے مشہور شاعر قاضی نذرالاسلام کے متعلق ایک دلچسپ نوٹ لکھا ہے جو سب رس میں شایع ہوا۔ چونکہ اس میں ایک خاص قسم کا اثر ہے، جو ہر پڑھنے والے کے دماغ پر پڑتا اور نذرالاسلام سے متعلق اُسے تذبذب میں ڈال دیتا ہے، اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک علمی رائے کو جو ایک خاص انداز سے قائم کی گئی ہے، اور جو نذرالاسلام جیسے بلند پایہ شاعر کی حد تک محدود نہ ہونی چاہئے اقتضائے حال کے مطابق کچھ آگے بڑھاؤں۔

جس وقت حضرت اشک نے کسان کے سر پر جگمگاتا ہوا تاج دیکھا، اور عدم مساوات کی اگلی سی محفل گرم پائی، اور جس وقت آپ کے سامنے نذرالاسلام کی شاعری اور ان کے دوست کی تحسین ایک علامت استفہام بن گئی، وہی درحقیقت ایک معرکے کا وقت تھا۔ وہی بلند ساعت تھی جب کہ وقت کے بہتے ہوئے دھارے میں نذرالاسلام کا پیغام پہلی دفعہ کامیاب ہوا تھا۔ اس وقت میرے دوست کو یہ دیکھنا چاہیئے تھا کہ زمانے میں ایسا کون انقلاب آیا کہ شہنشاہیت، امارت، نااتفاقی، تحقیر و تکبر اور عدم مساوات کی دنیا تھوڑے دنوں کے لئے غریب انسانوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے؟ اس پر کس طرح ایسے انسان قابض ہو گئے جو مدتوں سے حق و صداقت، اور سچی محنت کی نمایندگی کر رہے تھے، اور جن کو زمانے نے زبردستی ٹھکرا کر مظلوم و بیکس بنا یا تھا، جن کی عظمتیں دولت اور استبداد کے ہاتھوں پامال ہو رہی تھیں اور جن کی اہمیتوں کو مدتوں سے زمانہ تسلیم نہیں کر رہا تھا؟ انھیں مدہوش ہو جانے کی بجائے دیکھنا چاہیئے تھا کہ غلط تعبیروں کی دنیا میں کیا طوفان تیز آیا ہے اور اب کس طرح چیزیں اپنی اصل روشنی میں جگمگا رہی ہیں؟ تاج کوئی نمایش کی چیز نہیں، بلکہ درحقیقت وہ انسانیت کی فلاح و بہبود، امن و اتحاد، حق و انصاف کی ایک درخشاں اور باعظمت اور قابل احترام نشانی ہے۔ بادشاہ کے سر پر ہو یا کسان کے سر پر، انسانیت نے اس وقت تک اس کی عزت کی جب تک یہ امن و انصاف کا کفیل بنا رہا، اور جب کبھی اس میں کوئی کمی ہوئی، ایک نذرالاسلام پیدا ہوا اور اس نذرالاسلام نے اُسی تاج کو دوسرے شخص کے سر پر رکھ دیا جو اس وقت انسانیت کے ایک کثیر حصے کی نمایندگی کر سکتا تھا۔ مصر و بابل کی تاریخ تمدن سے لے کر آج تک کئی نذرالاسلام پیدا ہوئے۔ میرے دوست کے مشاہدے کے وقت جب کسان کے سر پر تاج آگیا تو یہ انسانیت کی مظلوم آواز اور بیکسوں کی اُن دعاؤں کا نتیجہ تھا جو شاعر نذرالاسلام کی زبان سے ادا ہوتی رہتیں۔ کسان کے بادشاہ بن جانے کے یہ معنی نہیں ہیں، جس طرح میرے دوست نے خیال فرمایا ہے کہ وہ جبر و اختیار، دولت اور زمین کا مالک بن گیا، بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ محنت اور حقیقی عظمت نے اعتبار اور تسلیم کا وہ بلند ترین مقام حاصل کر لیا ہے جو اس کا پیدائشی حق ہے اور جو مدتوں تک اس سے غصب کیا جاتا رہا۔ کسان اور مزدور کی یہ فتح حق و صداقت کی فتح اور سرمایہ داری کی شکست، ناروا ظلم اور فوقیت کی شکست ہے۔ یہ تھوڑے ہی دنوں کے لئے حاصل کیوں نہ ہو، وقت اور زمانہ ان مبارک

ساعتوں پر صدیوں تک ناز کرتا رہے گا۔

نذر الاسلام درحقیقت اسی فتح کا آرزومند ہے۔
وہ عظمت اور صداقت کو اپنے اصل مقام پر دیکھنا چاہتا ہے۔
یہاں وہ انسان کی بلند ترین تمناؤں کی نمائندگی کر رہا ہے
جو حالات زمانہ کے لحاظ سے ہمیشہ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ وہ
ایک ایسا انقلاب چاہتا ہے جو سیلاب کی طرح آئے اور
ایک کافی مدت تک دنیا کو خس و خاشاک سے پاک کر دے۔
وہ یہ نہیں دیکھ رہا ہے کہ اس کی کسی تمنا کو بقائے دوام
حاصل ہو رہا ہے یا نہیں، کیونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ کائنات
میں دوام درحقیقت تغیر کا دوسرا نام ہے۔ ہمیشہ کے انقلاب
اور تغیر کو ازل اور ابد کہتے ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی بھی
ایک تغیر ہے، بلند سے پست، اور پست سے بلند۔ ہماری
دوسری زندگی بھی شاید اس نشیب و فراز سے معمور ہو!
جو شاعر پستی سے ابھر کر بلندی کا پیغام دے، اسے یہ کہہ کر
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے بعد پھر پستی ہوگی۔ غلام
یہ سمجھ کر آزادی کا طالب نہیں ہوتا کہ اسے پھر ایک نہ ایک
دن غلام ہونا ہے۔ اس خیال کی یہ مثال ہوئی کہ ہم سمندر کی
عظمت کو صرف اُن موجوں کے ذریعے جانچیں جو ابھرتی ہیں،
اور جو گر کر پھر بلند ہونے کی طاقت رکھتی ہیں انھیں سمندر سے
علحدہ کوئی چیز قرار دیا جائے۔ دریا کا اتار چڑھاؤ مکمل دریا
ہے۔ نہ اتار ہے اور نہ چڑھاؤ!

میرے دوست نے براہ راست تو نہیں لیکن لگے
لپٹے اپنے نوٹ میں شاید اس امر کی طرف بھی اشارہ کیا
ہے کہ بلند ترین شاعر وہ ہے جو ازل اور ابد کے راگ
گائے محبت اور فطرت کے نغمے الاپے، عشق اور حسن کے
دریا میں غوطے لگائے۔ چونکہ ان کے نزدیک نذر الاسلام
تخریب، انقلاب، زلزلہ، آگ، بھونچال، سیلاب، بغاوت
اور جہاد کا ذکر کرتا ہے، اس لئے وہ بلند پایہ شاعر نہیں
ہے۔ یہاں میرے دوست سے یہ عرض کرنا ہے کہ بعض
بلند ہستیاں تصورات سے نہیں حقائق سے بحث کرتی
ہیں اور جانچی بھی جاتی ہیں۔ حقیقت خواہ کتنی ہی چھوٹی ہو
تصور کے مقابلے میں بہت بڑا درجہ رکھتی ہے۔ اس لئے
حقیقت کا درجہ ازل اور ابد کی موہوم فضا سے زیادہ بلند
ہے۔ گلشن کے نغمہ سرا، دور خزاں میں رہ کر بہار کے ترانے
نہیں گاتے، بلکہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بہار ایک عارضی
چیز ہے، اسی کے لئے دعائیں مانگتے ہیں۔ خیام اور حافظ کی
ترنگیں بھی آواز دے رہی ہیں کہ ایک ساعت کی موجودہ
خوشی، موہوم نعمتوں کی صدیوں سے زیادہ مغتنم ہے۔
جب اقبال کہتا ہے۔ لعبت خاک ساختن ہی نہ سزد
خدائے را۔ جب غالب دعوت پکارتا ہے۔

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است		بردار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت

تو ان سب میں دراصل نذر الاسلام کی روح بول رہی ہے
وہی حقیقت پرستی وہی دعوت انقلاب و ایثار و آزادی۔

آپ دیکھئے تصورات کی دنیا، حقیقت کی دنیا سے
بالکل الگ چیز ہے۔ جو لوگ تصورات کی دنیا میں گم رہتے
ہیں وہ درحقیقت انسانیت کے ایک جز پر حکومت کرتے
ہیں۔ اگر ایک زخمی شخص سے یہ کہہ دیا جائے کہ وہ آیندہ
صحت کا تصور کرتا رہے اور اپنے زخم پر کوئی مرہم نہ رکھے
تو اس کا صحت مند اور مطمئن ہونا معلوم۔ آفتاب گو زمین
سے بہت بلند ہے اور ہمیشہ درخشاں ہے، لیکن مغرب کے

بعد جب وہ ہم سے جدا ہوتا ہے تو آفتاب نہیں رہتا، ہم اپنے آپ کو آفتاب سے دور محسوس کرتے، تاریکی دیکھتے اور صبح کا انتظار کرتے ہیں۔ جب تاریکی سے اُجالا پھیلتا ہے تو صبح کا لطف آتا ہے اور ہر صبح تازہ دکھائی دیتی ہے۔ نذرالاسلام ہی ایمان بالغیب رکھنے کے ساتھ ساتھ رہتی دنیا کا پرستار ہے، وہ شدت کے ساتھ حقیقت پرست ہے، وہ افلاس، غربت، بے حسی، بدنفسی کی دنیا میں رہ کر ازلی محبت، ابدی حسن، معشوق، جبرئیل، میکائیل، جنت بلکہ خدا کے تصور کو تھوڑی دیر کے لئے ایک دور کی چیز سمجھتا ہے۔ وہ انتقام چاہتا ہے۔ ایسا انتقام جو ہمیشہ برائیوں کا سر کچل دے اور نیکی کو فتحمند بنائے۔

ہم قدرت کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ ہم پر حکومت کرتی ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہے کہ ہم اس کے پراسرار قوانین کے سامنے گرجائیں اور اپنی انفرادیت گم کردیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو قدرت کو ہمیں پیدا کرنے میں اتنی زحمت اُٹھانے کی ضرورت کیا تھی؟ اس اسپرٹ کو آپ الحاد کہئے یا جذبۂ انتقام، یہ نذرالاسلام کی اسپرٹ ہے۔ وہ خدا کو غلاموں کا آقا نہیں سمجھتا، بلکہ وہ زندہ اور باکمال اور اس کی طرح ترقی پسند انسانوں کا پیدا کرنے والا سمجھتا ہے۔ وہ ایسے خدا کو مٹا دینا چاہتا ہے جو انسان سے، ہر چیز سے احساس آزادی مٹا دے۔ اس کا دوسرا نام "آزادی" ہے۔ اس آزادی کے لئے وہ ہر چیز کی قربانی چاہتا ہے اور اُس انقلاب کو پکارتا ہے جس نے ہمیشہ انسانیت کی مدد کی ہے۔ وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ برائی پھر پیدا ہوگی۔ اس کا کلام ہمیشہ انسانوں کو آزادی، انقلاب اور انتقام کی دعوت دیتا رہے گا۔ اور ہمیشہ ہمیشہ یہ بتاتا رہے گا کہ انسان فطرتاً ایک مجاہد، ایک مرد غازی ہے جو قدرت کی ہر چیز اور برائیوں کی ہر کوشش سے متصادم ہوتا ہے۔ وہ اس اعتقاد پر کہ خدا نے اس میں آزادی کے حصول اور اس سے کام لینے کی جو صلاحیتیں دی ہیں وہ کائنات سے زیادہ منتظم ہیں۔ اس کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے تیار ہوجاتا ہے، خواہ اس قربانی میں موجودہ انسانی زندگی کا سارا انتظام ہی کیوں نہ بگڑ جائے اور چاروں طرف سے موت ہی موت کیوں نہ نظر آئے۔ یہ ہے نذرالاسلام کا دوام یہ ہے اس کی اہمیت اور یہ ہے اس کا پیغام! اس "نعرۂ بے باک" کی نظیر ادب میں شاید مشکل ہی سے مل سکے۔

جو لوگ فرط محبت سے زمین کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے ہیں۔ اب یہ زمین اپنے کو انہیں کے سپرد کردی گی۔ میں ان پیروں کو بوسہ دیتا ہوں جن میں یہ خاک پاک لپٹ گئی ہے آج مظلوموں اور بے کسوں کے خون میں رنگ کر بلند ہوتی سو آفتاب تازہ پیدا ہوا اب تمام پابندیوں اور بندشوں کو پھینک دو۔ فلک کج رفتار کو چاہئے کہ پاش پاش ہو کر ہمارے آشیانے پر گر پڑے ہمارے سر پر چاند اور ستارے پھول بن کر برس پڑیں کہ ہم نے ایک جہان نو کی داغ بیل ڈالی ہے۔

محمد عبدالقیوم خاں باقی

اردو کی نئی کتابیں

(۱) بغداد کا جوہری (افسانہ) از اشرف صبوحی دہلوی قیمت عمہ پتہ کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی

(۲) آدم خور (آدم خواروں کے حالات) از مرزا عظیم بیگ چغتائی قیمت ۱۲ر پتہ دفتر کتابت۔ جودھپور

(۳) شہدا (کربلا کے واقعات) از مرزا فدا علی خنجر حجم ۱۶۲ صفحات قیمت ۱۰ر پتہ مرزا محمد احمد۔ منصور نگر۔ لکھنو

(۴) یورپ کی حکومتیں از ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری و مظہر انصاری حجم ۲۱۶ صفحات قیمت ۱۲ر پتہ مکتبہ جامعہ۔ دہلی

(۵) پریمی (افسانے) از راحت آرا بیگم حجم ۱۲۸ صفحات قیمت عمہ پتہ از مصنفہ معرفت کامٹریڈ بیانک کلکتہ۔

(۶) کشتگان فریب (افسانہ) از حاجی نبی احمد حجم ۱۶۵ صفحات ۸ر مرتبہ از مصنف۔ درزی چوک بریلی

(۷) شب کی پکار (افسانے) از راحت آرا بیگم حجم ۱۲۰ صفحات پتہ تاج کمپنی۔ لاہور

(۸) غنچہ افسانہ " " " " " " ۱۶۰ " " " " "

(۹) بانسری کی آواز " " " " " " ۱۶۰ " " " " "

(۱۰) سائنس کی انوکھی کہانیاں از ڈاکٹر محمد قدرت خدا حجم ۴۳۰ صفحات قیمت عالہ پتہ ماڈرن بک ایجنسی۔ کالج اسکوائر کلکتہ

(۱۱) کلام الملوک (بہمنی۔ عادل شاہی اور قطب شاہی بادشاہوں کا کلام) مرتبہ میر سعادت علی رضوی ایم۔ اے حجم ۱۱۲ صفحات پتہ سب رس کتاب گھر حیدر آباد

(۱۲) ۱۰۰ ماں ہند کی حیات سیاسی از محمد مرزا دہلوی حجم ۲۵۶ صفحات قیمت ۱۲ر پتہ کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی

(۱۳) حسین ابن علیؑ (امام حسینؑ کی نفسیاتی حیثیت) از نکہت شاہجہاں پوری قیمت ۸ر پتہ شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ کشمیری بازار۔ لاہور

(۱۴) خبطی (ناول) از محمد علی واحدی قیمت ۸ر پتہ انوار بکڈپو۔ لکھنو

(۱۵) آزادی کی نظمیں مرتبہ سید سبط حسن اڈیٹر نیا ادب قیمت عمہ پتہ حلقۂ ادب۔ مال روڈ۔ لکھنؤ

(۱۶) محبت کے افسانے (چند عشقیہ مقالوں کا مجموعہ) از الطاف حسین رشدی پتہ محمد سعید خاں آزاد۔ جامع مسجد بیاور (راجپوتانہ)

(۱۷) اصطلاحات پیشہ وراں (دس پیشوں کی اصطلاحیں) از ظفر الرحمن حجم ۲۳۷ صفحات قیمت ۱۲ر پتہ انجمن ترقی اردو۔ دہلی

(۱۸) ہندوستان میں برطانوی حکومت (حکومت کے اقتصادی پہلو اور اس کے مالی حالات) از ڈاکٹر زین العابدین احمد قیمت ۸ر پتہ مکتبہ جامعہ دہلی۔

(۱۹) مسلمانوں کی تعلیم از ڈاکٹر محمد افضال حسین قادری قیمت ۸ر پتہ از مصنف ابرار منزل مسلم یونیورسٹی۔ علیگڈھ

مرزا سیف علیخاں

کیا آپ مہذب ہیں؟

یہ ہماری فکر اور ہمارے غور کی کم مائگی کا ایک واقعی ثبوت ہے کہ روزانہ بول چال میں ہم بعض ایسے الفاظ استعمال کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ جن کے حقیقی معنوں سے ہم بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ وہ اس دور میں اس کثرت و شدت سے برتے جاتے ہیں، شائد اس سے قبل وہ کبھی نہ ہوئے تھے۔

آپ یقین مانئے کہ عہد قدیم میں جس کو ہم مذہبی جنون کا ایک دور سمجھتے ہیں خدا، دین یا شیطان کے الفاظ اس دیوانگی سے استعمال نہیں کئے جاتے تھے جس فراخدلی سے ہم آج مہذب، تمدن، وطن، کلچر، مساوات، آزادی، اخوت، حریت، نیچر، محبت، ادب، آرٹ اور نہ جانے کیا کیا کہہ جاتے ہیں۔ اگر اس زمانے کے اخبار و رسائل کو خواہ وہ کسی زبان میں شایع ہوتے ہوں اکٹھے کیجئے اور اُن سرخیوں پر نظر دوڑائیے جن کو برتنے پر ان کی اشاعت ہے تو یقیناً آپ میرا منشاء سمجھ جائیں گے۔ یہ سرخیاں جو حقیقت میں عوام کے رجحانات کا عکس ہیں، جتنی بے معنی ہوں گی اسی قدر جاذب نظر اور پر جوش بھی۔ اور اسی نسبت سے قابل مدیر کی بلند پروازی کا ثبوت ہوں گی۔

یہ سب اس لئے ہے کہ ہم روزانہ زیادہ سہل نظر بنتے جارہے ہیں۔ سماج میں سطحیت کی ہر روز مانگ بڑھتی جاتی ہے۔ اور ہم نے زندگی کی مصروفیتیں اتنی سر سے اونچی کرلی ہیں کہ ہمارے یہاں کسی بات پر سوچ بچار کے لئے وقت نہیں ہے۔ پھر بازار میں تیار اور ریڈی میڈ اشیاء کی اتنی فراوانی ہے، اور بے چارے خریدار کو اس قدر کم فرصت ہے کہ وہ مشکل سے ان کو پرکھ سکتا ہے۔ ان سب کے ساتھ ساتھ مارکٹ میں ان تجارتی نمائندوں اور مہذب ایجنٹوں کی کمی نہیں جو ہر فرسودہ مال کو ناتجربہ کار گاہکوں کے آگے "اصلی" کہہ کر ٹھونستے جاتے ہیں۔

اور باتیں تو چھوڑئے تہذیب و تمدن کا مفہوم جتنا مبہم ہمارے ذہن میں ہے اسے دیکھ کر بعض وقت تو مجھے ان الفاظ کے بامعنی ہونے پر ہی شبہ ہونے لگتا ہے۔ فلاں شخص مہذب ہے یا فلاں سوسائٹی مہذب ہے جس سے عموماً ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ اس فرد یا افراد کے گروہ میں بعض ایسے قوانین کی پابندی سختی سے کی جاتی ہے، جن کو ایک مقام اور ایک زمانے کے انسانوں نے اپنے لئے پسند کرلیا ہے۔ اور ان سے عمداً یا سہواً انحراف کرنے والا بدتہذیب اور غیر مہذب۔

ان معنوں میں اگر تہذیب ہے تو وہ کسی میونسپل کارپوریشن یا مجلس وضع قوانین کے دستور العمل سے زیادہ ہماری نظروں میں وقعت نہیں رکھے گی۔ اور نہ اس کے تصنع کی بابت کوئی شبہ کیا جاسکے گا۔ میں نے سنا ہے کہ مغرب میں بعض ایسے کلب ہیں۔ جو اپنے مخصوص قواعد و ضوابط رکھتے ہیں۔ جب تک آپ وہاں ہیں، اُن کے پابند ہیں۔ اور اگر آپ نے انہیں دیدہ و دانستہ توڑا یا ان کی خلاف ورزی کی تو ممبری سے خارج کردئے جائیں گے یا کچھ جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

ٹھیک یہی حال مجھے ہماری مہذب سوسائٹیوں کا معلوم ہو رہا ہے جہاں یہ ایک بدبختی ہے کہ ان سے انحراف کی صورت میں آپ کا نام تو خارج نہیں کیا جاتا لیکن نام نہاد شرکار کے نشانِ ملامت ہونے کا جرمانہ ضرور ادا کرنا ہوتا ہے۔

اس پر طرّہ یہ ہے کہ یہ مہذب گروہ جو اپنے سوائے تمام ستر پوش افراد کو برہنہ تصور کرتا ہے۔ خواہ مخواہ آپ کو اپنی سوسائٹی کا ممبر سمجھتا ہے۔ ایسی تہذیب جو محض چند اشخاص کی پسند ناپسند کی پیداوار ہو جتنی بھی کم پائدار سمجھی جائے بجا ہے اور جس قدر بھی عجائبات سے پُر ہو مناسب ہے۔

اسی تہذیب کے چند مترادف ' شائستگی فیشن ' کلچر ' اور انسانیت بھی ہیں۔ شائد کوئی ادیب یا ماہر عمرانیات یہ کہہ بیٹھے کہ میں الفاظ کو غلط استعمال کر رہا ہوں۔ لیکن کہنا تو یہی ہے کہ کچھ مجھے بھی ان الفاظ کے معنی کا علم ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ لغت اور ادب میں کسی لفظ کا ایک مفہوم ہوتا ہے لیکن مہذب دنیا اس کو اسی معنوں میں استعمال کرنے کی نہ تو پابند ہے اور نہ مجبور کی جا سکتی ہے۔ اور جن معنوں میں وہ آج کل ان الفاظ کو استعمال کر رہی ہے۔ وہی میرا مبحث ہیں۔ مثال کے طور پر آج اگر کوئی شخص یہ جاننا چاہتا ہو کہ وہ مہذب ہے یا غیر مہذب تو اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ وہ اس سوال بند کے مقابل " ہاں " یا " نہیں " درج کرتا جائے۔ اور پھر اس خانہ پُری کے بعد اس کے متمدن یا غیر متمدن ہونے کا انحصار " ہاں " یا " نہیں " کے تناسب پر منحصر ہوگا یقیناً یہ ایک عمرانیاتی سے زیادہ حسابی عمل ہے اور سادہ سہ اصولی مساوات پر مبنی۔ یعنی اسے دیکھنا ہوگا کہ

(۱) کیا اس کی شیروانی کی کاٹ وہی ہے یا تقریباً ویسی ہی ہے جو شام کے پانچ اور ۱۰ بجے رات کے درمیان عابد شاپ سے لیکر آل سینٹ جمنازیم ہال کی سڑک پر نظر آتی ہے (کالر کی اونچائی۔ کمر اور آستین و دامن کا محیط تصفیہ کن نقاط ہیں)

(۲) کیا اس کے بے داغ پاجامہ کی استری میں شکن تو نہیں ہیں۔ اور کیا پائچوں کا نچلا حصہ بوٹ کی ایڑی سے ہوتا ہوا لاپروائی سے سڑک جھاڑنے میں کوتاہی تو نہیں کرتا۔

(۳) کیا وہ سگریٹ کے دھوئیں سے حلقے بنا سکتا ہے۔

(۴) کیا وہ شام کے وقت ٹوپی پہننے کے دقیانوسی رواج کا عادی تو نہیں۔

(۵) کیا اس کی ٹوپی کی اونچائی ۲ء۱ — ۵ء۱ سے کم تو نہیں ہے اور عموماً اس کا زاویہ کیا ہوتا ہے۔

(۶) کیا خدانخواستہ اس کی آنکھیں چشمہ کے استعمال سے ناآشنا تو نہیں ہیں۔

سر کے بالوں کی نسبت دو مکتب خیال ہیں۔ اتنا تو شکر ہے کہ کم از کم دو نقاط نظر تو موجود ہیں۔ مثلاً

(۷) کیا اس کے سر کے بال لاپروائی سے بکھرائے جاتے ہیں (یہ طبقہ عموماً شاعر ہوتا ہے)

(۸) کیا اس کے بال نہایت جانفشانی اور اہتمام سے جمائے جاتے ہیں (یہ گروہ عموماً شاعر پسند ہوتا ہے)

(۹) کیا اس کو کسی "——" یا "——" کی کوئی چھبتی ہوئی نظم یاد ہے۔ اور کیا وہ اس نظم کو اسی لے اور ترنم میں دہرا سکتا ہے۔ یا اگر ضرورت ہو تو کیا وہ "خود اپنی" کوئی نظم سنا سکتا ہے۔

(۱۰) کیا اسے جو نظمیں یاد ہیں ان کے عنوان "وطن" "آزادی" "محبت" "عریانی" "اس سے خطاب" "جوانی" یا ایسے ہی مترادف سے ملتے جلتے ہیں۔

(۱۱) وہ مہینے میں کتنے ڈرامے اور فلم دیکھتا ہے۔ اور کیا وہ کم از کم ان خواتین و حضرات سے واقف ہے۔

سائیال، سہگل، موتی لال، بروا، نجم الحسن، اشوک کمار، سربندر، کنن بالا، اُما، لینا، جمنا، راج کماری، دیوکا رانی، سبیتا، مایا بنرجی، شانتا آپٹے۔ اور کیا وہ ان کے سوانح حیات ان کی اداکاری اور متعلقہ فلم کمپنیوں سے بخوبی واقفیت رکھتا ہے۔ اور اگر ضرورت داعی ہو تو ان پر عالمانہ بحث کرسکتا ہے۔

(۱۲) آیا اس کو ہالی وڈ کی ڈائرکٹری از بر ہے۔
اور کیا وہ کسی فلمی رسالے کا باضابطہ خریدار ہے۔ یا کم از کم کبھی کبھی خرید لیتا ہے۔

(۱۳) کیا وہ مقامی نگار خانوں کی ہر تبدیلی سے قبل از قبل باخبر رہتا ہے۔ اور کیا مروجہ فلموں پر اس کی رائے سوسائٹی کے مذاق کا ساتھ دیتی ہے۔ اور کیا وہ آنے والے کھیلوں کے متعلق پیش گوئی کرسکتا ہے۔

(۱۴) کیا وہ ہر سال کرکٹ ٹورنمنٹ کا موسمی ٹکٹ خریدتا اور بلاناغہ تماش بینوں کے خیمے میں حاضر رہتا ہے (اس بارے میں کھیل کے حسن و قبح سے باعلم ہونے کی چنداں ضرورت نہیں) البتہ جب کبھی وہ چیرز دیتا ہے تو کیا اس کی تصفیق زیادہ مہذب شامیانوں کے ساتھ سم پر اترتی ہے۔ یا نہیں۔

(۱۵) کیا وہ دنیا کے یا کم از کم ہندوستان کے اچھے کھلاڑیوں کے نام ایک سانس میں دہرا سکتا ہے۔ اور کیا اس کو معلوم ہے کہ اس موسم میں کس کا اسکور زیادہ رہا اور کس قدر۔

(۱۶) کیا وہ عموماً شام میں ٹینس کے مخصوص لباس میں نظر آتا ہے (کھیلتے رہنے یا کھیل سے واقف ہونے کی کوئی ایسی ضرورت تو نہیں البتہ ٹینس کے بلوں کے مختلف تجارتی نام اور ان کی قیمتوں سے باخبر رہنے کی شرط ضروری ہے۔)

(۱۷) کیا وہ ٹوئیڈ، ہناوا، سلک، سرج وغیرہ کی مختلف اقسام سے واقف ہے اور ان کے بازاری نرخوں سے کم و بیش واسطہ قریبہ رکھتا ہے۔

(۱۸) کیا وہ تاش کے تمام دلچسپ کھیل جانتا ہے۔

(۱۹) کیا وہ آرٹ، محبت، آزادی یا ایسے ہی مضامین سے متعلق برجستہ جملے گھڑ سکتا ہے اور ان کو کسی بڑے آدمی سے موسوم کرسکتا ہے۔

(۲۰) کیا وہ ان الفاظ کا محل استعمال جانتا ہے
"عیش" "لطف" "زندگی" "محبت" "آزادی"

شاید یہ تفصیل آپ کی نظروں میں طویل ہوگئی ہو لیکن مجھے یقین ہے بعض احباب ابھی اس نام میں شرائط کا اضافہ چاہتے ہوں گے اور سچ پوچھئے تو یہ فہرست مزید اضافہ کی اس لئے بھی محتاج ہے کہ سوسائٹی کے یہ غیر تحریر یافتہ ضوابط بہ تعداد کثیر ہیں۔ اور ان کا جاننا خود ایک مستقل "علم" ہے اور چونکہ اس باب میں میرا نقد علم نہایت کوتاہ ہے اس لئے اس فہرست کو تشنہ چھوڑتا ہوں اس خیال سے بھی کہ چشم بددور اس میں آئندہ اضافہ ہوتا رہے گا۔

مہندر راج سکسینہ

طرزِ نشاطِ زندگی

(The Character of a Happy Life.) کا منظوم ترجمہ

حقیقت میں وہ کتنا خوش نصیب انسان ہے عباس
نہ پہنا طوق جس نے اپنی گردن میں غلامی کا
رہا کرتا ہے جس کو زندگی میں راستی کا پاس
حوادث کے مقابل راست بازی جس کا ہے شیوہ

(۲)

رکھا کرتا ہے قابو میں سدا جو خواہشات اپنی
ہمیشہ جو رہا کرتا ہے مرنے کے لئے تیار
رہی جس کو امورِ دینوی سے کامل آزادی
نہ رنجِ لعن و طعن اس کو، نہ حبِّ مال و زر زنہار

(۳)

چہ میگوئیوں سے لوگوں کی جس کو کچھ نہیں مطلب
ضمیر پاک اس عالم میں ہے جس کا بڑا رہبر
خوشامد کر کے کوئی جس سے لے سکتا ہے دولت کب
عدو افلاس سے بھی فتح پا سکتا نہیں جس پر

(۴)

برائی سے کہ خوش بختی سے رتبہ جس نے پایا ہے
حسد اس پر نہیں کرتا نہ بیجا مدح کا حامی
دول کی جو سیاسی نت نئی چالوں سے کورا ہے
ہے نیکی کے طریقوں سے بخوبی جس کو آگاہی

(۵)

ہے شغلِ روز و شب جس کا عبادت حق تعالیٰ کی
عطیوں سے زیادہ ہے جو طالب فضلِ مولیٰ کا
صدیقِ منتخب کے ساتھ یا پڑھ کر کتاب اچھی
جو دن کی خاطریں یوں کر کے خوش کرتا ہے دل اپنا

(۶)

یہی انسان آزادی کا مالک ہو کے ہے خوشحال
امید اس کو ترقی کی نہ خوف اس کو تنزل کا
نہ رکھنے پر بھی کچھ شئے ہے حقیقت میں وہ مالا مال
اراضی کا نہیں، ہے بلکہ اپنے نفس کا آقا

سید اسد اللہ عباس

گُل بُوٹے

ہمارے ایک عزیز کو ساون کی کالی گھٹاؤں میں بڑے شکار کی سوجھی، کوئی چھ ہفتوں سے شکار پارٹی کی تیاری ہو رہی تھی، آخر کار جو دن مقرر ہوا تھا اس کے دو دن پہلے ہی سے جھڑی لگی ہوئی تھی، ہمیں بھی ساتھ چلنے کہا گیا، پانچ شکاریوں میں چھٹے ہم شکار دیکھنے والے تھے، بارش کی وجہ سے ہم کچھ اَن منانے لگے تو ہمارے عزیز کی بیگم صاحبہ کا ارشاد ہوا "آگ برسے یا اولے پڑیں ہمیں چلنا ہی ہوگا" اس "نادر شاہی" حکم کی اگر ہم تعمیل نہ کرتے تو ہماری عزیز بہن کے روٹھنے بگڑنے اور خفا ہونے کا ڈر تھا۔

اس تقریب میں ہماری بیچاری بارہ سال کی "ننی" شیور لیٹ بھی آفت میں مبتلا ہوئی، یہ غریب اس قدر بھیگی کہ اس کے نئے رنگ اور پرانی ٹاپ کی خاصی گت بن گئی، جانا تو بہت سویرے ٹھیرا تھا مگر ہم ناشتہ کر کے فرصت سے کوئی نو بجے نکلے، شکاریاں ہم سے پہلے نکل گئے تھے، راستہ بخیر و عافیت طے ہوا، جب شکار کے مقام سے قریب پہونچے تو دور ہی سے ہمارے عزیزوں کی موٹریں نظر آئیں، شکاری غائب تھے اور ہماری بہنیں "نادر شاہی" بہن کے پیچھے پیچھے کنٹے پر چہل قدمی کر رہی تھیں، ان سے معلوم ہوا کہ شکاری شکار کی جستجو میں پہاڑ کے دامن میں گھوم رہے ہیں۔

پندرہ، بیس منٹ کی چہل قدمی کے بعد ہماری یہ شکار کی شوقین بہنیں تھک کر چور ہوگئیں اور چلیں مسافر بنگلے کی طرف! مسافر بنگلہ اس مقام سے کوئی پچاس ساٹھ قدم ہوگا، ہانپتی کانپتی بڑی مشکل سے وہاں پہونچیں، کوئی پلنگ پر لیٹ کر کراہنے لگیں اور کوئی آرام کرسی پر گر کر دونوں ہاتھوں سے سر دابنے! کسی نے پیر دبوانے شروع کئے تو کسی کی کمر پر چپی ہونے لگی!! کسی کے پیٹ میں درد ہونے لگا تو کسی کو ناف ٹلنے کا شبہ ہوا!!! غرض یہ کہ تھوڑی دیر کے لئے مسافر بنگلہ ہسپتال بن گیا۔ سب سے پہلے ہماری "نادر شاہی" بہن زمین کو لات مار کر اٹھ بیٹھیں اور چلیں کھانے پکانے کا انتظام کرنے باورچی خانے کی طرف! ان کا اٹھنا تھا کہ سب کی سب مارے ڈر کے اٹھ بیٹھیں اور لگیں ان کا ہاتھ بٹانے، اس اثنا میں باورچی نے مرغ کے سالن کو بگاڑ دیا تھا ایک بہن نے بڑی نفاست سے اس کو سدھارا، بگڑتے بگڑتے یہ سالن کچھ ایسا سنبھلا کہ آج تک بس زبان پہ اس کا چٹخارہ رہ گیا!

اچھا ہوا کہ ہماری سب بہنیں خیر خوبی سے بنگلے میں آگئی تھیں، کچھ ایسی موسلا دھار بارش ہونے لگی کہ اگر وہ باہر رہتیں تو کیا عجب ہے کہ پانی اور ہوا کے زور سے کنٹے میں جا پڑتیں، ہمیں تو ان کی صحت پر رشک آتا ہے، دن بھر اور سوتے دم تک دس بیس مرتبہ کریم اور پوڈر لگا جائیں مگر کیا مجال ہے کہ کبھی ہاتھ دکھنے کی شکایت کرتیں! واقعی صحت ہو تو ایسی ہو!!

بادل کی کڑاک اور بجلی کی چمک سے سب کی سب سہمی جا رہی تھیں، چلنا پھرنا تو کیا اپنی جگہ چپ بیٹھے رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ "جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو" کا ورد تھا، ہر گرج اور کڑاک پر آنکھیں بند اور اوسان خطا ہو جاتے تھے، چیخیں مار مار کر ایک دوسرے کو لپٹ جاتی تھیں، چونکہ شکاری اپنے ساتھ موٹر لے گئے تھے اس لئے کچھ اطمینان تھا، اتنے میں

کیا دیکھتے ہیں کہ شکاری خود بارش کے شکار بن کر خالی ہاتھ عجیب وضع سے بیرنگ آ رہے ہیں، ان کے کپڑوں سے پانی ٹپک رہا تھا اور وہ بھیگی چڑیاں بن گئے تھے، ہم سب نے تولیوں سے ان کے جسموں کو اچھی طرح پونچھا، بھیگے کپڑے بدلے اور آگ سے خوب سینکھا تب کہیں شکاریوں کی جان میں جان آئی۔

اب بارش تھم گئی تھی، طوفان کے بعد سکون ہو گیا تھا، کھانے کے بعد کوئی پانچ بجے ہم سب ٹہلنے کنٹے کی طرف چل پڑے، شکاری بھی بندوقوں کے ساتھ ہمارے ساتھ ہو لئے، راستے میں درختوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ نظر آئے، ایک شکاری نے دن سے فائر کر دیا اور سامنے بیچارا ایک غریب چھوٹا سا بٹیر ڈھیر ہو کر رہ گیا، اسی طرح آدھی درجن بٹیر بڑی خوبصورتی سے شکار ہوئے کھلے تو تھے بڑے شکار کے لئے مگر قسمت میں بٹیر ہی لکھے تھے، چاء کے ساتھ ان کے کباب نے بڑا مزہ دیا، کوئی سات بجے ہم سب گھر لوٹے۔

ایک شکاری کا مکان راستے میں پڑتا تھا، مکان خالی تھا کیونکہ چند روز سے وہ ہماری "نادر شاہی" بہن کے مہمان تھے راستے سے ہٹ کر کوئی ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ان کا مکان تھا۔ وہاں سے انھیں کچھ سامان لینا تھا، ہم سب کو باہر ہی بٹھا کر وہ سامان لانے اندر گئے، تھوڑی دیر کے بعد ہمیں مکان کے پچھلے حصے سے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں، ہم سب کے سب بندوقیں لئے دوڑے، دیکھتے کیا ہیں کہ صاحب خانہ اور ان کے نوکر اندھیرے میں لکڑیوں سے ورانڈے میں کسی چیز کو مار رہے ہیں، دوڑتے دوڑتے دور ہی سے ہم نے چلا کر پوچھا تو فرمایا "اژدہا ہے اژدہا" !!

خدا خیر کرے! واقعی ایک بہت بڑا سانپ پڑا ہوا نظر آیا، شکاریوں نے صاحب خانہ سے کہا آپ ہٹ جائیے ہم ابھی مارے دیتے ہیں، چنانچہ چاروں شکاریوں نے نشانہ تاک کر باڑھ چلائی اور ہم نے ٹارچ کی روشنی "اژدہے" پر جو ڈالی تو بے ساختہ سب کے سب قہقہے مارنے لگے، ایک موٹی سی موٹ کی رسی بل کھائی ہوئی ورانڈے کے اس سرے سے اس سرے تک پڑی ہوئی تھی، اور صاحب خانہ بےچارے شرم کے مارے سر جھکائے ایک طرف کھڑے مسکرا رہے تھے۔

ایک بزرگوار کو بندوق کے شکار کا شوق ہوا، اپنے ایک دوست سے نشانہ بازی کے طریقے سیکھنے شروع کئے، ہفتوں مشق ہوئی مگر "روز اول" کا مضمون رہا، آخر آپ کے دوست نے تنگ آ کر ایک تدبیر نکالی، جب کبھی آپ نے کسی شکار کو دیکھ کر بندوق اٹھائی اور نشانہ لیا کہ ساتھ ہی آپ کے دوست کی بندوق بھی سیدھی ہوئی ادھر آپ نے فائر کیا اور ادھر آپ کے دوست نے بھی آواز ملا کر فائر کر دیا اور شکار نیچے آ رہا، آپ کو اپنی بندوق کی آواز میں دوسرے فائر کی خبر ہوئی اور اپنے زعم میں یہی سمجھتے رہے کہ شکار آپ ہی نے مارا، غرض یہ کہ اس طرح آپ کے دوست کو آئے دن کی نشانہ بازی کی مشق کرانے سے نجات ملی مگر شکار برابر ہوتا رہا اور آپ خود کو بڑا شکاری سمجھنے لگے، اس اثنا میں سیکڑوں شکار پارٹیاں ہوئیں اور آپ کے دوست کی چابک دستی سے سب کی سب کامیاب رہیں۔

ایک دن ہمارے بزرگ کو بڑے شکار کا شوق ہوا، اپنے شکاری دوست اور دو بھانجوں کو ساتھ لئے ایک جنگل میں پہنچے، خوش قسمتی سے دو چار نیل گائے اور چار چھ ہرن دوڑتے اور چوکڑیاں بھرتے تھوڑے فاصلہ پر سامنے سے

گزرے، ان کو دیکھتے ہی آپ نے بندوق سنبھالی مگر اتنے میں
وہ درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے، دوست کی رائے ہوئی کہ
آپ اور وہ اور آپ کے دونوں بھانجے کچھ فاصلے سے ایک ہی طرف
بیٹھیں کیونکہ ایک دوسرے کے مقابل بیٹھنے میں گولی لگ جانے کا
اندیشہ تھا، چنانچہ اسی طرح دونوں پارٹیاں گھات میں بیٹھ گئیں،
اتنے میں کچھ ہرن آتے نظر آئے، بزرگ نے فوراً بندوق اٹھائی
ادھر آپ کے دوست نے حسب عادت آپ کے ساتھ بندوق چلائی
دن، دن، دن تین فائر ہوئے اور چار ہرن زمین پر آرہے،
آپ کے بھانجوں کو فکر ہوئی کہ بندوقیں چار، شکاری چار مگر فائر
تین کیوں ہوئے؟ چپکے سے ماموں جان کی بندوق کا جو
امتحان لیا تو دونوں نالیاں کوری اور صاف نظر آئیں! گویا
تینوں بندوقوں سے ایک ایک فائر ہوا تھا، اس حساب سے
دو ہرن آپ کے دوست نے اور دو دونوں بھانجوں نے
مارے تھے، یہ راز کھلتے ہی دونوں بھانجے ماموں کے سر ہو گئے
اور لگے مذاق اڑانے!

واقعہ یہ ہوا کہ ہرن سامنے آتے ہی ماموں گھبرا کر
بندوق میں کارتوس ڈالنا بھول گئے، دوست نے فائر،
کرنے کو جو کہا تو بغیر کارتوس کے بندوق چلا دی جب بھانجے تنگ
کرنے لگے تو آپ ذرا گرم ہو کر بولے،

"کیا بک بک کر رہے ہو! کچھ بڑوں کا بھی لحاظ ہے!
ہر وقت وہی بیہودہ مذاق!!"

بھانجوں نے عرض کیا "مذاق کی کوئی بات نہیں ہے
یہ معمہ حل نہیں ہوتا کہ تین فائر ہوئے چار ہرن مرے، ان میں
سے دو آپ کے دوست نے مارے اور دو ہم نے، مگر آپ کا فائر
کدھر گیا"؟

ہنستے ہوئے فرمایا "کیا خوب! ایک فائر سے دو ہرن
کیسے مرے! ہرن نہ ہوئے مرغابیاں ہوئیں"!! بھانجوں نے
کہا "مگر آپ کی بندوق تو صاف ہے! ہرن کس چیز سے مرا؟"
ارشاد ہوا "لونڈے ہو نا آخر! چار دن کے شکاری
اور لگے ہیں ہم سے بحث کرنے!! ذرا تجربہ کار شکاریوں سے پوچھو!
شاید تمہیں معلوم نہیں!! ولایتی بندوق بھری بھی چلتی ہے اور خالی بھی!!

ایک "خاں صاحب" بیرسٹری کی ڈگری لانے ولایت سدھارے
اور ایک فیملی میں سکونت اختیار کی، آپ صوم و صلوٰۃ کے بہت
پابند ہیں، اکثر ہندوستانیوں کی طرح "بتان فرنگ" کی پرستش کو
آپ نے اللہ کی بندگی پر ترجیح نہیں دی، پانچ وقت کی نماز برابر
وقت پر ادا کرتے رہے۔

ایک روز کالج سے واپسی کے بعد آپ مغرب کی نماز پڑھ رہے
تھے کہ مالک مکان کی نوجوان لڑکی جو آپ سے ذرا بے تکلف تھی
کمرے کا دروازہ زور سے کھٹکھٹانے لگی، آپ نے "ہوں! ہوں!!"
کہا تو وہ سمجھی اپنی زبان میں اندر بلا رہے ہیں! جھٹ سے دروازہ
کھول کمرے میں گھس آئی!! خاں صاحب پر جو نظر پڑی تو اس نے
دیکھا کہ وہ کچھ عجیب و غریب حرکتیں کر رہے ہیں، یہ دیکھنا ہی تھا کہ
ماں کے پاس دوڑی آئی اور کہا۔

"مسٹر خان بڑا اچھا آدمی تھا"!!

ماں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا پوچھا "تمہارا مطلب کیا ہے؟ آخر اس کو
ہو کیا گیا ہے"؟

لڑکی نے افسوس کا اظہار کر کے کہا "معلوم نہیں اس کو کیا ہو گیا
ہے! اس کی دماغی حالت کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت
وہ کمرے میں عجیب عجیب حرکتیں کر رہا ہے!! کبھی کھڑا ہوتا ہے،
کبھی بیٹھ جاتا ہے، کبھی اوندھا پڑ جاتا ہے، کبھی جھک جاتا ہے اور
ساتھ ساتھ کچھ کہتا بھی جا رہا ہے"۔

ماں کی سمجھ میں کچھ نہ آیا، لڑکی کے ساتھ وہ خاں صاحب کے کمرے پر آئی اور دروازہ کھٹکھٹایا، اس اثنا میں خاں صاحب نے نماز ختم کر دی تھی دروازہ کھولا تو ماں بیٹی کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔

"کیا ماجرا ہے؟ آپ دونوں کچھ پریشان سی معلوم ہوتی ہیں"!

ماں نے آپ کو غور سے دیکھ کر دریافت کیا" ابھی ابھی آپ کیا کر رہے تھے"؟

جواب دیا" نماز پڑھ رہا تھا"!

ماں نے کہا" میری لڑکی نے آج تک کسی مسلمان کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا تھا، آپ کو اٹھتے بیٹھتے دیکھ کر خود بھی پریشان ہوئی اور مجھ کو بھی حیران کیا! وہ یہ سمجھی کہ خدانخواستہ آپ پر "جنون" کا دورہ پڑا ہے"!!

اسی سلسلے میں ہمارے خاں صاحب کو ایک واقعہ "ہائیڈ پارک" میں بھی پیش آیا، ہوا یہ کہ ایک روز آپ عصر کی نماز سبزہ زار پر پڑھ رہے تھے کہ اسکول کے لڑکوں نے آپ کو گھیر لیا اور آپ کی نقل و حرکت کو غور سے دیکھنے لگے! جوں ہی آپ نے نماز ختم کی اور ان کی طرف پلٹے سب کے سب بے تحاشا بھاگے —— ! بھاگتے جاتے تھے اور پلٹ پلٹ کر دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں آپ ڈنڈا لئے ان کا پیچھا تو نہیں کر رہے ہیں!!۔

"باغبان"

غزل

میں طوفاں پہ چھاتا چلا جا رہا ہوں — سفینہ بڑھاتا چلا جا رہا ہوں

محبت پہ چھاتا چلا جا رہا ہوں — میں پردے اٹھاتا چلا جا رہا ہوں

وفاؤں سے اپنی جفا کا طریقہ — کسی کو سکھاتا چلا جا رہا ہوں

محبت غلط اک فریب ایک دھوکا — جسے آزماتا چلا جا رہا ہوں

دلِ غمزدہ کو میں ان آنسوؤں سے — دلاسا دلاتا چلا جا رہا ہوں

مرا ساتھ دیں گے مرے اشک کب تک — یہی آزماتا چلا جا رہا ہوں

میں خود اپنی ہستی کو اپنے ہی ہاتھوں — بناتا مٹاتا چلا جا رہا ہوں

وہ رہ رہ کے اتنے ہی یاد آ رہے ہیں — میں جتنا بھلاتا چلا جا رہا ہوں

وہ اب مجھ سے نظریں چرانے لگے ہیں — میں آنکھیں بچھاتا چلا جا رہا ہوں

کوئی درس لے یا نہ لے اس سے زاہد — فسانہ سناتا چلا جا رہا ہوں

زاہد حیدری

برار

(تاریخی نقطۂ نظر سے)

برار کا قدیم نام ودربھا ہے۔ مہابھارت میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ نل اور دمینتی کے افسانے کا بھی برار سے گہرا تعلق ہے۔ دمینتی ودربھا کے راجہ کی لڑکی تھی اور نل مالوہ کا راجہ تھا۔ اس افسانے کا بعد میں فیضی نے فارسی نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ ودربھا کی حکومت کا صدر مقام موجودہ بیدر بتایا جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکومت دکن کے اچھے خاصے حصے پر پھیلی ہوئی تھی۔

راجہ اشوک کے انتقال کے بعد دکن میں آندھرا یا ستواہن خاندان کی حکومت قائم ہوگئی جس کا صدر مقام پیٹھان تھا۔ برار کا سارا علاقہ اس حکومت کے تحت آگیا۔ آندھرا خاندان نے تقریباً چار صدی تک نہایت شان و شوکت کے ساتھ حکومت کی۔ سلطنت روما کے ساتھ آندھرا خاندان کے سیاسی اور تجارتی تعلقات تھے۔ جن کا ثبوت قدیم رومن تحریروں سے ملتا ہے۔

آندھرا خاندان کے زوال کے بعد واکاٹک خاندان، اہیر خاندان اور چلوکیہ خاندان نے برار میں اپنی حکومت قائم کی۔ پانچویں صدی عیسوی میں چلوکیوں نے تقریباً سارے دکن کو اپنے زیر نگیں کر لیا تھا۔ چار صدی کی حکومت کے بعد راشٹرکوٹوں نے چلوکیوں کو نیچا دکھایا لیکن دسویں صدی عیسوی میں چلوکیوں نے پھر اپنا کھویا ہوا اقتدار حاصل کر لیا۔ اور برار پر ان کا تسلط قائم رہا۔ چلوکیوں کا سب سے بڑا راجہ پلاکیشن دوم گذرا ہے۔ جس نے گجرات اور مالوہ کو بھی اپنا باجگذار بنایا تھا۔ اس نے ہرش وردھن سے دریائے نربدا کے کنارے جنگ کی اور اس کو شمالی ہند واپس جانے پر مجبور کیا۔ اس کے زمانے میں چلوکیہ خاندان کے بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات قائم ہوگئے تھے۔ سنہ ۶۲۵ء میں ایران کے بادشاہ خسرو دوم نے پلاکیشن دوم کے دربار میں اپنی سفارت بھیجی۔ اجنٹہ کی ایک دیواری تصویر میں اس سفارت کے پلاکیشن دوم کے دربار میں پہنچنے کا منظر نہایت خوبی سے دکھایا گیا ہے۔ اجنٹہ کی خانقاہ اس راجہ کے زمانہ میں آباد تھی اور اس کی بیشتر تصاویر مکمل ہو چکی تھیں۔

راشٹرکوٹوں میں کرشن اوّل بڑا زبردست راجہ گذرا ہے چلوکیوں کے وارث کی حیثیت سے راشٹرکوٹوں نے برار پر اپنا تسلط جمایا۔ الورا میں کیلاش کا مشہور مندر کرشن اوّل کے زمانے میں بنایا گیا تھا۔ راشٹرکوٹوں کے زوال پر مغربی چلوکیوں نے دکن میں پھر غلبہ حاصل کیا اور کلیانی کو اپنا صدر مقام بنایا۔ اس خاندان کے ایک سردار نے دیوگری کو مرکزی حکومت سے آزاد کر لیا۔ اور ایک نئے خاندان کی بنا ڈالی جو یادو خاندان کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان نے برار اور دکن کے بیشتر حصہ پر علاؤالدین خلجی کے حملہ تک حکومت کی۔

اب ہم تاریخ کی اس منزل پر پہنچ گئے جب کہ اس ملک کی اجتماعی زندگی میں ایک عنصر نے اپنی جگہ پیدا کر لی تھی۔ ہماری مراد ہے ترکوں کے شمالی ہند پر تسلط قائم کرنے سے۔ ترک حکمرانوں میں علاؤالدین خلجی بڑا حوصلہ مند تھا جس زمانہ میں وہ کڑہ مانک پور کا حاکم تھا اس نے دیوگری کی بے شمار دولت کے افسانے سنے تھے۔ اس کی بلند طبیعت کا تقاضا تھا کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے اس کی شہرت اور قوت میں اضافہ ہو۔ چنانچہ اس نے سنہ ۱۲۹۴ء میں وندھیا کو پار کیا۔ دیوگری کے راجہ نے مقابلہ کیا لیکن اسے شکست ہوئی راجہ نے بہت سا روپیہ بطور تاوان ادا کیا اور ایلچ پور کا شہر علاؤالدین کے حوالے کر دیا۔ راجا نے سلطنت دہلی کو خراج دینے کا بھی

وعدہ کیا۔ علاء الدین نے ایلچ پور میں اپنا سفیر مقرر کیا اور راجہ کو اس کا ملک واپس کر دیا۔ علاء الدین کی پالیسی آئندہ بادشاہ ہونے کے بعد بھی یہی رہی کہ دکن اور جنوبی ہند کو بجائے سلطنت دہلی میں براہ راست ملحق کرنے کے صرف اپنی بالادستی تسلیم کرائے۔ اور حکومت کی ذمہ داری وہیں کے والیان ملک پر رہنے دے۔ وہ چاہتا تھا کہ خراج کے ذریعہ اپنی سلطنت کی مالی حالت کو مستحکم کرے تاکہ سرحد پر منگولوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔

علاء الدین خلجی کے انتقال کے بعد دیوگری کے راجہ نے سلطنت دہلی کو خراج دینا بند کر دیا۔ چنانچہ قطب الدین مبارک شاہ نے دیوگری پر حملہ کیا۔ اور راجا کے سارے علاقہ کو جس میں برار بھی شامل تھا سلطنت دہلی میں ملحق کر لیا۔ کچھ عرصے بعد محمد بن تغلق نے دیوگری کو اپنا پایہ تخت بنایا اور اس کا نام دولت آباد رکھا۔ دولت آباد کے صدر مقام بننے سے ظاہر ہے برار کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔

لیکن محمد بن تغلق کے آخری زمانہ میں جب ملک کے ہر گوشہ میں بدنظمی پھیل گئی تو دکن کے امراء نے اپنے میں سے ایک تجربہ کار امیر اسمٰعیل مغ کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ اس حکمران کے تحت سلطنت دہلی کے تمام علاقے جن میں برار بھی شامل تھا آزاد ہو گئے۔ اسمٰعیل مغ نے جو بہت بوڑھا تھا امراء کے مشوروں سے ظفر خاں کو حکومت کا سارا کام سپرد کر دیا۔ ظفر خاں نے محمد بن تغلق کے عہد میں دکن میں نظم و نسق قائم کرنے میں کارہائے نمایاں انجام دیے تھے اس واسطے اس کا تمام ترکی امراء پر بہت اثر تھا۔ ظفر خاں نے سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی کا لقب اختیار کیا۔ اور ۱۳۴۷ء میں خاندان بہمنیہ کی بنا ڈالی۔ گلبرگہ کو اس نے پایہ تخت بنایا۔ بہمنیوں کے زمانہ میں دکن کو آٹھ اطراف میں تقسیم کیا گیا تھا جنہیں اس زمانہ کے صوبے سمجھنا چاہیئے۔ ان اطراف میں ایک طرف برار کی بھی تھی۔ بہمنی خاندان کے آخری زمانہ میں برار میں گاول اور ماہور کے قلعداروں کے اختیارات بہت وسیع ہو گئے تھے۔ چنانچہ محمود شاہ دوم بہمنی کے عہد حکومت میں گاول کے قلعہ دار عماد الملک نے برار میں خود مختار حکومت قائم کر لی اور مرکزی بہمنی حکومت سے اپنے تئیں آزاد کر لیا۔ اب برار میں عماد شاہی حکومت کی بنا پڑی۔ اس زمانہ میں گولکنڈہ میں قطب شاہی احمد نگر میں نظام شاہی بیجا پور میں عادل شاہی اور بیدر میں برید شاہی خاندان برسر اقتدار ہوئے اور بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ عماد شاہی خاندان نے برار پر ۸۵ سال حکومت کی۔ عماد الملک کے بعد علاء الدین عماد شاہ، دریا عماد شاہ، اور برہان عماد شاہ نے حکومت کی۔ آخر الذکر کے عہد میں نظم و نسق میں انتشار پیدا ہو گیا تھا اور سازشوں کا بازار گرم تھا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر احمد نگر کی نظام شاہی حکومت نے برار کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا

یہ زمانہ وہ ہے جب کہ شمالی ہند میں اکبر اعظم نے سلطنت مغلیہ کو مستحکم کر لیا تھا سنہ ۱۵۹۱ء اکبر اعظم نے دکن کے سلاطین کے نام پیغام بھیجے کہ سلطنت مغلیہ کی بالادستی تسلیم کریں۔ سوائے سلطان خاندیس کے دوسرے سلاطین نے باجگذار بننے سے انکار کیا۔ چنانچہ مغلوں اور دکن کے حکمرانوں کی کشمکش کا آغاز ہوا ۱۵۹۳ء میں مغلیہ افواج نے احمد نگر کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن چاند سلطانہ کی دلیری اور استقلال کے آگے ان کی ایک نہ چلی ۱۵۹۶ء میں مغل فوجوں نے پھر یورش کی۔ چاند سلطانہ نے کمالِ دور اندیشی سے مصلحت اس میں سمجھی کہ مغلوں سے صلح کر لی جائے اور چنانچہ اس نے برار کا علاقہ حوالہ کر کے نظام شاہی سلطنت کو عارضی طور پر مغلوں کے تسلط سے بچا لیا۔ جہانگیر کے عہد حکومت میں ملک عنبر نے برار کے بیشتر حصے کو مغلوں سے

آزاد کرا لیا تھا۔ ملک عنبر کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے فتح خاں نے مغلیہ سلطنت کا اقتدار تسلیم کرلیا اور منصب و مراتب قبول کر کے صلح کرلی۔ شاہ جہاں کے عہد میں نظام شاہی سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا اور دکن کے مغلیہ علاقوں کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں ایک صوبہ برار کا تھا جس کا صدر مقام ایلچ پور قرار پایا۔ شہزادہ اورنگ زیب ان چار صوبوں کا حاکم اعلیٰ مقرر ہوا۔ بادشاہ ہونے پر اورنگ زیب نے پورے دکن کو سلطنت مغلیہ میں شامل کرلیا۔ اس کے انتقال کے بعد دکن میں مرہٹوں کا زور بڑھ گیا اور عملاً نظم و نسق سلطنت مغلیہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔

اورنگ زیب پورے ہندوستان کو ایک مستحکم مرکزی حکومت کے تحت لانا چاہتا تھا۔ تاکہ اس طرح اس ملک کے مرکز گریز رجحانوں پر قابو حاصل ہو سکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے مذہب و ملت کے کسی امتیاز کو نہ مانا۔ سرحد کے مسلمان قبائل اور گولکنڈہ اور بیجاپور کی سلطنتوں کے ساتھ اس طرح پیش آیا جس طرح راجپوتوں اور مرہٹوں کے ساتھ۔ اس کے عہد حکومت میں مرہٹوں سے آویزشوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ اس کے مرنے کے بعد بھی جاری رہا۔ سیواجی کے بیٹے سمبھاجی اور اس کے بعد راجا رام کی بغاوتوں سے برابر یہ سلسلہ رہا۔ اور نظم و نسق میں انتشار کی کیفیت رہی۔ اورنگ زیب کے بعد دکن میں مرہٹوں کا زور شور بڑھ گیا۔ فرخ سیر کے سپہ سالار امیر الامرا حسین علی خاں نے دکن (جس میں برار شامل تھا) کے تمام علاقوں میں مرہٹوں کے چوتھ اور سردیش مکھی کے حق کو تسلیم کرلیا۔ گویا عملاً دکن کا نظم و نسق سلطنت مغلیہ کے ہاتھ سے نکل گیا۔

لیکن نظام الملک آصفجاہ اول نے شکر کھیڑا کی جنگ کے بعد سنہ ۱۷۲۴ء میں دکن میں اپنا تسلط قائم کیا۔ اس جنگ کے بعد دکن کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ شکر کھیڑا برار میں واقع ہے۔ نظام الملک آصفجاہ اول نے اس کا نام فتح کھیڑا رکھا۔ یہ مقام آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔ جنگ شکر کھیڑا کے بعد سے آج تک برار پر خاندان آصفجاہی کو حقوق اقتدار حاصل ہیں۔

نظام علیخاں آصف جاہ دوم کے عہد حکومت میں جنگ اودگیر اور جنگ کھرڈلا کے بعد بھونسلا اور پیشوا کو برار کے بعض اضلاع کے حقوق مالگذاری حاصل ہو گئے تھے۔ لیکن جب انگریزوں نے آرتھر ولزلی کے تحت مرہٹوں کی متحدہ افواج کو شکست دی تو برار سے مرہٹہ عمال کو خارج کر دیا گیا۔ اور بھونسلا اور پیشوا کو برار کے حقوق سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا پڑا۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں فرانسیسی سیاح موسیو تھے وے نو نے برار کے علاقہ کا سفر کیا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ یہ علاقہ سلطنت مغلیہ کے نہایت زرخیز ترین حصوں میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن اٹھارویں صدی میں مرہٹوں کی یورشوں کے باعث برار کے نظم و نسق میں انتشار پھیل گیا تھا اور یہاں کی مالگذاری بہت کم رہ گئی تھی۔ آصفجاہی خاندان کے تحت برار کی آمدنی بمقابلہ پہلے کے بڑھنا شروع ہوئی اور توقع تھی کہ اچھے نظم و نسق کی بدولت یہاں کی زمین سونا اگلنے لگے گی۔ لیکن بعد میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ انگریزی حکومت نے برار کو اپنے نظم و نسق کے تحت لیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

سنہ ۱۸۰۰ء کے معاہدے کی رو سے سرکار نظام نے اس انگریزی فوج کے اخراجات کی کفالت اپنے ذمہ لی تھی۔ جو ان کے علاقہ میں متعین ہو گی۔ چونکہ کچھ عرصہ سے ریاست حیدرآباد کی مالی حالت قابل اطمینان نہ رہی تھی اس لئے مجبوراً انگریزی

افواج کے اخراجات کی ادا بجائے انگریزی حکومت سے قرض لے کر
کی جارہی تھی۔ ۱۸۵۳ء میں قرض کی رقم ۴۵ لاکھ تک پہنچ گئی۔
چنانچہ لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل ہند کے ایما پر سرکار نظام اور حکومت
ہند میں معاہدہ ہوا جس کی رو سے برار کا علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے
زیر انتظام دے دیا گیا۔ لیکن اس پر سرکار نظام کے حقوق مقدراً
بدستور قائم رہے۔ اس معاہدہ میں طے پایا کہ برار کی آمدنی سے
قرضہ کی ادائی کی جائے اور اعانتی افواج کی تنخواہوں کا خرچ
نکال کر جو رقم بچے وہ حساب کے بعد سرکار عالی کے خزانہ میں داخل
کی جائے۔ لیکن معاہدہ کی اس دفعہ پر عمل نہیں کیا گیا۔ اور حساب فہمی
کی صفائی مدنظر نہ رہی۔ ۱۸۶۰ء میں غدر کے بعد جدید معاہدہ
کے ذریعہ برار کی حوالگی کی تصدیق کی گئی۔ اس وقت سے ۱۹۰۲ء
تک برار کی دستوری اور انتظامی حیثیت میں فرق پیدا نہیں ہوا۔

لارڈ کرزن نے ۱۹۰۲ء میں سرکار نظام سے برار کے
متعلق ایک نیا معاہدہ کیا۔ جس کی رو سے حکومت ہند کو برار کا
دوامی پٹہ حاصل ہوگیا۔ اور یہ علاقہ صوبہ متوسط میں انتظامی اغراض
کے لئے شریک کردیا گیا۔ ۱۸۵۳ء کے معاہدہ کے مطابق برار کا علاقہ
برطانوی حکومت کو حوالہ یا تفویض assign کیا گیا تھا
لیکن ۱۹۰۲ء کے معاہدہ کے مطابق یہ علاقہ اجارہ یا پٹہ
lease پر دیا گیا ہے۔ ان دونوں اصلاحوں کا جو قانونی
فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ ۱۹۰۲ء کے معاہدہ سے سرکار نظام
کی قانونی حیثیت جہاں تک کہ سیاسی اور انتظامی حق کا تعلق ہے
بہ نسبت پیشتر کے زیادہ متعین ہوگئی۔ ۱۹۰۲ء کے معاہدہ کے
مطابق حکومت ہند نے سرکار نظام کے شاہی اقتدار اور برار
کے حق ملکیت کو تسلیم کیا اور ۲۵ لاکھ روپیہ سالانہ بطور پیشکش
دینے کا وعدہ کیا۔

گذشتہ ربع صدی میں ممالک محروسہ سرکار عالی کی خارجی
حکمت عملی زیادہ تر مسئلہ استرداد برار سے متعلق رہی۔ جنگ عظیم کے بعد
جب کہ برطانوی حکومت کو یکسوئی حاصل ہوچکی تھی اعلیٰحضرت بندگانعالی
نے ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۳ء لارڈ ریڈنگ وائسرائے ہند کے نام ایک
مکتوب ارسال فرمایا جس میں مسئلہ برار کی دستوری نوعیت کو جو
دستاویزی شہادتوں پر مبنی تھی واضح فرمایا۔ پچھلی جنگ عظیم میں
ممالک محروسہ نے حکومت برطانیہ کی ہر طرح سے امداد کی تھی اور
اس کے علاوہ ویسے بھی خاندان آصفجاہی نے حکومت برطانیہ
کے ساتھ ہمیشہ جس دوستی اور اتحاد کا ثبوت دیا ہے اس کی بناء
پر توقع تھی کہ استرداد برار کے مطالبہ پر از سر نو غور کیا جاسکے گا۔
لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ بجائے اس کے حقوق بالادستی کا دوسرا
غیر متعلق مسئلہ چھیڑ دیا گیا۔ دس سال کا زمانہ گذر گیا اور بالآخر
نومبر ۱۹۳۳ء میں لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہند حیدرآباد تشریف
لائے۔ اور شاہی دعوت کے موقع پر مسئلہ برار کے متعلق
اطمینان بخش اعلان فرمایا۔ یکم دسمبر ۱۹۳۳ء اس مسئلہ کے متعلق
فرمان مبارک شرف صدور لایا۔

"ہز ایکسلنسی وائسرائے بہادر کے میری ریاست سے روانہ
ہوجانے سے قبل اور باعتراف اس اعلان کے جو انہوں نے
اسٹیٹ بنکوٹ کے موقع پر فرمایا ہے میں ان جدید انتظامات کے
متعلق اپنا اطمینان ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو سرکار عظمت مدار
کے ساتھ حالیہ گفت و شنید کے نتیجے کے طور پر ہندوستان میں
وفاقی دستور قائم ہونے پر میرے ملک برار کے آئندہ نظم و نسق
کی نسبت عمل میں آئیں گے۔ میری رعایا کو ان تدابیر کے تفصیلی
اعلان کا سخت انتظار رہیگا۔ جن کی رو سے میرے ملک برار
کا نظم و نسق اس خطۂ ملک ملک معظم کے ساتھ جو بنام ممالک متوسط

موسوم ہے، بہ مثل ایک صوبہ واحد کے ہوگا جس کا نام ممالک متوسط و برار رہے گا۔ اور برار پر میری سلطنت عملاً اس طرح ہوگی کہ اس میں شک و شبہ کی گنجایش نہ رہے گی۔"

سنہ ۱۹۳۳ء کے معاہدہ کی رو سے یہ طے پایا کہ برار کا علاقہ اعلیٰحضرت ہی کے زیر اقتدار رہے گا۔ گو نظم و نسق کی اغراض کے لئے وہ صوبہ متوسط کے ساتھ شریک کرلیا جائے گا۔ برار میں جہاں کہیں انگریزی جھنڈا لہرائے گا وہاں اعلیٰحضرت کا جھنڈا بھی اس کے ساتھ بلند کیا جائے گا۔ اعلیٰحضرت آئندہ سے "**ہز اکزالٹڈ ہائینس دی نظام آف حیدرآباد اینڈ برار**" کا موروثی خطاب اختیار فرمائیں۔ اور آپ کے **ولیعہد** "**ہز ہائینس دی پرنس آف برار**" کہلائیں گے۔ گورنر صوبہ متوسط و برار **اعلیٰحضرت** کے مشورے کے بعد مقرر ہوا کریگا۔ اور **اعلیٰحضرت** کو حق ہوگا کہ برار کے ان معاملات کے متعلق جو ریاست حیدرآباد کو متاثر کرتے ہوں یا جن سے حیدرآباد کو دلچسپی ہو اپنے خیالات کی نمائندگی کے لئے ایک ایجنٹ مقرر فرمائیں۔ اس معاہدے کی رو سے اعلیٰحضرت کے نام کا خطبہ برار میں پڑھا جا سکتا ہے۔ اور دربار بھی منعقد ہوسکتا ہے۔ اور اعلیٰحضرت اپنے برار کی رعایا کو خطابات بھی عطا فرما سکتے ہیں جس کے لئے وائسرائے سے مشورہ ضروری ہوگا۔ اس کے علاوہ اس معاہدے کے ذریعہ یہ بھی صاف ہوگیا کہ جس فوجی امداد کا وعدہ برار سے وابستہ تھا وہ حسب حال قائم رہے گا۔ اور انگریزی حکومت حسب سابق ۲۵ لاکھ کی رقم سالانہ ادا کرتی رہے گی۔

یوسف حسین خاں

(یہ تقریر لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے نشر کی گئی)

صیاد

یہ کہہ رہی ہے مری چشم خونچکاں صیاد
اسیرِ دام بنا، ذبح کر، میں حاضر ہوں!

لگی وہ چوٹ سی دل پر کہ آہ کیا کہئے!
بہارِ گردشِ رنگِ طرب ہے، غور سے دیکھ!

رہا اسیرِ قفس میں، گر چمن میں رہا!
بہار خود بھی ہے عبرت کی داستاں صیاد

رہے نہ دل میں تمنائے امتحاں صیاد
قفس میں ہوں نہ سنا حالِ گلستاں صیاد

مجھے مٹا کے رہے گا نہ شادماں صیاد
مری نگاہ میں ہے رازِ آشیاں صیاد

وہ غم نصیب ہے کاوشؔ کہ سرزمینِ چمن
ہوئی ہے اس کے مقدر سے آسماں صیاد

کاوشؔ

تنقید و تبصرہ

سفرنامہ مقامات مقدسہ - از مولوی سید محمد جواد صاحب بی۔ اے بی ٹی (علیگ) مہتمم تعلیمات ضلع نلگنڈہ حجم ۱۶۰ صفحات کاغذ عمدہ چھپائی صاف ستھری۔ قیمت درج نہیں۔ مطبوعہ انتظامی پریس حیدرآباد۔ ملنے کا پتہ۔ غلام دستگیر صاحب۔ تاجر کتب چار کمان عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

اس سفرنامے میں مولوی سید محمد جواد صاحب نے سمندر کے راستہ سے عراق اور وہاں سے ایران اور خشکی کے راستے سے واپسی ہندوستان کے اپنے سفر کے حالات نہایت سادہ زبان میں بیان کئے ہیں۔ کتابت کی غلطیاں زیادہ ہونے کی وجہ سے پڑھتے وقت تکلیف ہوتی ہے۔ اگرچہ کہ کتاب کے آخر میں آٹھ صفحوں کا ایک غلط نامہ لگایا گیا ہے مگر بار بار غلط نامہ سے مدد لینا دشوار ہے امید ہے کہ دوسرے ایڈیشن میں یہ غلطیاں درست کردی جائنگی۔

اس سفرنامے کے ایک باب میں عراق فلسطین اور ایران کے مدرسوں کا حال لکھا ہے۔ اس میں جناب مولف نے مدرسوں کا اسٹاف اور اس کی تنخواہیں' لڑکوں اور جماعتوں کی تعداد' مدرسہ کے اوقات اور اس کی عمارت اور ہم نصابی مشاغل پر طائرانہ نظر ڈالی ہے اس باب میں جناب مولف اپنے فنی نقطۂ نظر سے وہاں کے طریقۂ تعلیم پر ناقدانہ نظر ڈالتے تو زیادہ بہتر ہوتا اس اعتبار سے یہ باب مزید تفصیل کا محتاج نظر آتا ہے۔

اس میں مقامات مقدسہ کا ایک نقشہ بھی دیا گیا ہے جس میں ہندوستان سے ایران' عراق اور شام کو جانے کا خشکی کا راستہ بتادیا گیا ہے' ایران کے حالات میں رضا شاہ پہلوی کے دور حکومت میں جو اصلاحیں ہوئی ہیں اور ہر جہتی ترقی کی جو شاہراہیں وہاں کھل گئی ہیں ان کو صراحت سے بیان کیا گیا ہے غرض یہ کہ یہ سفرنامہ اپنے اندر اقسام کی دلچسپیاں رکھتا ہے اور زائرین کے لئے اچھا رہبر ثابت ہوسکتا ہے۔

"س"

سائنس کی انوکھی کہانی اس کے مصنف ڈاکٹر محمد قدرت خدا صاحب ڈی ایس۔ سی (لندن) ڈی ای سی ایم ایس سی کلکتہ ہیں اور مترجم مولوی رشید احمد صاحب ندوی' اس کتاب کو مصنف نے اعلیحضرت سلطان العلوم شہریار دکن کے نام معنون کیا ہے اور اس میں دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ کی اصطلاحوں سے استفادہ کیا گیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف یا مترجم کی نظر سے حیدرآباد کی وہ کتابیں نہیں گزریں۔ جو سائنس کے موضوعوں پر طبقۂ فوقانیہ کے طلبار کے لئے لکھی اور چھاپی گئی ہیں کیونکہ اس کتاب میں بعض بڑی مشکل اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں جو غالبًا اعلیٰ جماعتوں کی کتابوں کے لئے وضع کی گئی ہوں گی۔ یہ ۳۰۴ صفحات میں چھپی ہے اور قیمت عہ رکھی گئی ہے۔ اس میں سات باب ہیں جن کی تفصیل یہ ہے (۱) علم ہیئت (۲) طبقات الارض (۳) عالم نباتات (۴) حیات حیوانات (۵) داستان عضویات (۶) شئے مادہ کی مختلف کہانیاں (۷) علم کیمیا کی ابتداء۔

ان سب عنوانات کو دیکھ کر نواب شمس الامرا کے سلسلۂ شمسیہ کی طرف خیال منتقل ہوتا ہے جس میں تقریبًا ان ہی عنوانوں پر طالب علموں کے لئے مفید معلومات اردو میں منتقل کردی گئی تھیں۔

نازی ازم مصنفہ عبدالرحیم شبلی بی کام ۸۳ صفحات قیمت ۲ر موجودہ سیاسی حالات کے پیش نظر جرمنی کی اس مشہور تحریک کے متعلق اردو معلومات منتقل کرنے کی ضرورت تھی جس کی تکمیل کے لئے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے اس کو دارالادب پنجاب نے شایع کیا ہے لیکن کتابت وطباعت اور کاغذ موضوع کے شایان شان نہیں ہے' مصنف نے پندرہ ابواب میں اس کتاب کو تقسیم کیا ہے اور نازیت کی پیدایش سے اب تک اس کے سارے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اس کا افتتاحیہ مولانا ظہر امرتسری سابق ایڈیٹر زمیندار نے قلمبند کیا ہے۔ یہ کتاب سرسری مطالعہ کے لئے مفید ہے لیکن اس کے بعد بھی یورپ کی اس اہم تحریک کے متعلق ایک

مکمل اور مبسوط کتاب کی اردو میں کمی رہ جاتی ہے کیونکہ اس میں نازی طرز حکومت اور نازیوں کے خطرات کے متعلق جیسا چاہئے نہیں لکھا گیا۔

مقدمۂ تاریخ دکن از مولوی عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے ایل ایل بی استاد تاریخ جامعہ عثمانیہ ۱۴۴ صفحات متوسط تقطیع قیمت عہ

حیدرآباد میں اگرچہ گذشتہ ربع صدی سے علم و فضل اور تصنیف و تالیف کی طرف خاص طور پر توجہ کی جا رہی ہے لیکن اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جو اس عظیم الشان سرزمین کی مکمل تاریخ سمجھی جا سکے خوشی کی بات ہے کہ پروفیسر صدیقی صاحب نے اس کام کا آغاز کیا ہے اور اس کے مقدمہ کے طور پر یہ مبسوط کتاب شایع کی ہے جس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جب ان کی پوری تاریخ مکمل ہو کر منظر عام پر آجائیگی تو ملک کی کتنی بڑی خدمت ہوگی۔ اس مقدمہ میں انہوں نے اس سرزمین کے پچیس حکمران خاندانوں کے آغاز، ارتقا، عروج اور زوال کے متعلق تعارفی معلومات کے علاوہ حکمرانوں کا پورا شجرۂ نسب اور ہر حکمران کی تاریخیں بھی قلمبند کر دی ہیں اس طرح سے مختلف خاندانوں کے تقریباً سات سو افراد اس کتاب کے ذریعہ سے روشناس ہو گئے ہیں۔ اس کے آخر میں ایک مبسوط اشاریہ بھی شامل ہے جس کو سلیمان اریب صاحب نے مرتب کیا ہے اور یہ ایسا مکمل ہے کہ اس کی ترتیب میں کافی محنت اور دیدہ ریزی کی گئی ہے۔

اس کتاب کو پروفیسر صدیقی نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے میں دور قدیم کے دس حکمران خاندانوں کے شجرے اور ان کے متعلق معلومات ہیں۔ دوسرے حصے میں دور وسطیٰ کے آٹھ ہندو اور مسلمان حکمرانوں کا تذکرہ ہے۔ تیسرے میں دور حالیہ کے تین خاندانوں کا اور چوتھے میں نوابانِ کرناٹک، کرنول، سدھوٹ اور ساونور کا تذکرہ ہے ابتدا میں ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں تاریخ دکن پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے سچ تو یہ ہے کہ یہ مقدمہ بجائے خود دکن کی ایک مختصر سی تاریخ ہے۔ یہ کتاب پروفیسر مرزا حسین علی خاں صاحب کی تحریک پر لکھی گئی ہے اور جب پوری مکمل تاریخ شایع ہو جائے گی تو محرک اور مرتب دونوں کے نام تاریخ دکن کے خدمت گذاروں کی حیثیت سے کبھی بھلائے نہ جا سکیں گے۔ اس کو ادارۂ ادبیات اردو نے متوسط تقطیع پر نہایت نفیس اور پاکیزہ شکل میں شایع کیا ہے۔

پریمی افسانوں کا مجموعہ از راحت بیگم صاحبہ کلکتہ صفحات ۱۲۸ قیمت عہ

راحت بیگم صاحبہ کلکتہ کے مشہور عالم شمس العلماء کمال الدین احمد صاحب یم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ یس کی صاحبزادی ہیں اور بنگالی ہونے کے باوجود اردو ادب کا بڑا اچھا ذوق رکھتی ہیں۔ ان کے افسانے رسائل میں بھی شایع ہوتے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ پریمی میں ان کے چار افسانے شایع ہوئے ہیں جن میں بعض خود نوشت ہیں اور بعض ترجمہ۔ راحت بیگم آرا صاحبہ کا اسلوب سلیس ہے تصنع اور تکلف سے وہ دور رہتی ہیں جذبات بھی ماحول اور فضا اور فطرت کے مطابق ہیں۔ اس کا پیش لفظ حکیم محمد یوسف صاحب ایڈیٹر رسالہ نیرنگ خیال نے لکھا ہے۔ کتاب بڑی تقطیع پر اچھی چھپی ہے اور ایک بنگالی خاتون کے افسانوں کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے اہل اردو اس کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔

پریم رس ڈاکٹر محمد عباس علی خاں صاحب لمعہ حیدرآبادی کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ٹیگور کے رنگ میں لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب کا دیباچہ حکیم محمد یوسف حسین صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال لاہور نے لکھا ہے اور کتاب بھی انہی نے اپنے اہتمام سے لاہور میں چھپوائی ہے

ابتدا میں مصنف کا ڈیڈیکیشن ہے جس میں اس مجموعہ کو علامہ سر محمد اقبال مرحوم کے نام معنون کیا گیا ہے اور اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مصنف کے خیالات میں زندگی اور زندہ دلی اقبال ہی کے فیض سے پیدا ہوئی ہے۔

جیسا کہ دیباچہ میں ایڈیٹر صاحب نیرنگ خیال نے لکھا ہے

"ملک کے ہزاروں نوجوانوں نے ٹیگور کے ادبی رنگ کو اپنا بنانے کی کوشش کی ہے مگر ان میں سے کسی کو بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن ڈاکٹر لمعہ کی ذات مستثنیات سے ہے۔ آپ کی یہ ادبی کاوش ٹیگوریت کا جامہ اس خوبی سے اوڑھے ہوئے ہے کہ اگر ڈاکٹر لمعہ کا نام بعض عبارتوں کے نیچے سے خارج کر دیا جائے تو ان پر ٹیگور کی تحریر کا شبہہ ہونے لگتا ہے۔ اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستان بھر میں ڈاکٹر لمعہ کو ہی سر رابندر ناتھ ٹیگور کی روحانی شاگردی کا فخر حاصل ہے تو اسے ایک حقیقت سمجھا جائے گا۔

ڈاکٹر لمعہ ادیب کے علاوہ ایک اچھے نظم گو شاعر بھی ہیں چنانچہ ان کے کلام کا کچھ نمونہ اور خصوصیات سخن پر تبصرہ ادارۂ ادبیات اردو کے مشہور تذکرہ مرقع سخن جلد دوم میں شایع ہو چکا ہے اور معلوم ہوا ہے کہ ان کے کلام کا مجموعہ بھی آج کل زیر طبع ہے اور قریب میں شایع ہو کر منظر عام پر آ جائے گا۔ اگرچہ ان کی نثر میں بھی ایک طرح کی ادبی حلاوت موجود ہے لیکن اظہار خیال کے لئے انہوں نے ٹیگور کی تقلید میں جو پیرایۂ بیان اختیار کیا ہے وہ نوجوانوں میں بلا کہ مقبول سہی لیکن اردو ادب کے موجودہ رجحانات میں کسی مفید صنف کا اضافہ نہیں کرتا اور لمعہ جیسے صاحب غور و فکر ادیبوں کو دیکھ کر نوسیکھ انشا پردازوں کے اس راہ میں بھٹک جانے کا اندیشہ ہے اگر ان مضامین کی جگہ ڈاکٹر لمعہ افسانوں کے ذریعہ سے اپنے تاثرات کو پیش کرتے تو یقین ہے کہ اردو افسانہ نگاری میں کچھ نہ کچھ اضافہ ضرور ہوتا۔

بہر حال یہ کتاب پیم لتا اس قسم کے دوسرے تخیلی مجموعوں کے مقابلہ میں بہت بہتر ہے اور ادب لطیفہ کا ذوق رکھنے والوں کے لئے ایک بڑی نعمت ثابت ہوگی۔

خواب بیداری

از سید یوسف حسین صاحب زیدی مطبوعہ جوائی نظامی پریس لکھنو۔ چھوٹی سائیز ۹۳ صفحات قیمت ۶ آنے۔

یہ اصل میں اخوند ملا فتح علی شیرازی کی مشہور فارسی کتاب خواب شگفت کا ترجمہ ہے۔ ملا فتح علی ایران کے ایک ممتاز انشا پرداز تھے انہوں نے یہ کتاب اپنے ملک کی اصلاح اور اپنی غافل قوم کو بیدار کرنے کے لئے لکھی تھی۔ ان کو ایرانیوں میں جو جو عیب نظر آتے تھے وہ سب مترجم کے خیال میں ہندوستانیوں میں بھی موجود ہیں اور اسی لئے انہوں نے اس کتاب کو اردو میں منتقل کر کے شائع کیا ہے۔ ترجمہ کامیاب ہے اور کہیں ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ یہ کسی کتاب دوسری زبان سے اردو میں منتقل کی گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ خود اردو میں بھی اس قسم کی اچھی کتابیں لکھی جائیں۔ حال ہی میں حیدرآباد سے اسی طرح کے موضوع پر ایک کتاب "شیطان کا انتقام" شائع ہوئی ہے جس کے بعض مضامین زیر نظر کتاب "خواب بیداری" سے بہت ملتے جلتے ہیں۔ لیکن شیطان کے انتقام کا مقصد مذہبی اصلاح سے زیادہ اخلاقی اور سماجی خرابیوں کی طرف تلخ اور طنزیہ طریقہ پر متوجہ کرنا ہے۔ اس کے برخلاف "خواب بیداری" میں مذہبی تعصبات اور خاص کر اسلامی فرقوں کے آپس کے اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زیدی صاحب کی یہ کوشش قابل مبارکباد ہے اور اس کی قدر اس لئے بڑھ جاتی ہے کہ انہوں نے یہ کتاب لکھنؤ میں لکھی اور شایع کی ہے جہاں کچھ عرصے سے دو بڑے اسلامی فرقوں کے آپس میں ناخوش گوار تعلقات پیدا ہو گئے ہیں۔

"ق"

حالاتِ حاضرہ

ستیاگرہ اور ہٹلریت - ابھی چند روز ہوئے گاندھی جی نے ہریجن میں ایک دلچسپ مضمون چھاپا جس کا عنوان تھا "ہٹلریت کا کس طرح مقابلہ کیا جائے"۔ وہ ہٹلریت کو ایک بے رحم قوت بتاتے ہیں جو "سائنٹیفک جحت کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے" اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ہٹلریت کی شکست جوابی ہٹلریت سے کبھی نہ ہوگی۔ پھر اپنے دیرینہ تجربہ کی بناء پر گاندھی جی فرماتے ہیں کہ اگر ہٹلریت کا مقابلہ کسی قوت سے ممکن ہے تو وہ صرف عدم تشدد کی قوت ہے۔ اس مضمون کے آخر میں وہ لکھتے ہیں "یہ سطریں میں نے یورپی ملکوں کے لئے لکھی ہیں لیکن یہ خود ہمارے لئے بھی ہیں۔ اگر میری دلیل مان لی گئی تو اب یہ اعلان ہوجانا چاہئے کہ طاقتوروں کے مقابلہ کے لئے ہم عدم تشدد کے حربے پر کامل ایقان رکھتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کی حفاظت اسلحہ کی قوت سے نہیں بلکہ عدم تشدد کی قوت سے کریں گے"۔

اس مضمون کی اشاعت کے کوئی ایک ہفتہ بعد گاندھی جی نے راست طور پر انگریزوں کو مخاطب کیا اور "ہر برطانوی سے" پرزور اپیل کی کہ وہ جنگ کی بجائے عدم تشدد کے اصول پر ایمان لائیں۔ وہ انگریزوں سے کہتے ہیں "میں اپیل کرتا ہوں کہ لڑائی بند کر دی جائے۔ اس لئے نہیں کہ آپ تھک گئے ہیں بلکہ اس لئے کہ جنگ دراصل بری چیز ہے۔ آپ نازیت کا خاتمہ نہیں کریں گے۔ آپ اس کا خاتمہ کبھی نہیں کر سکتے۔ آپ کے سپاہی جرمنوں ہی کی طرح بربادی کا کام کر رہے ہیں۔ . . . آپ کو نازیوں سے زیادہ بے رحم ہونا پڑے گا۔ کوئی مقصد چاہے وہ انصاف ہی پر کیوں نہ مبنی ہو، اس بے اندھا دھند خونریزی کسی حالت میں درست نہیں قرار پاسکتی" اس کے بعد گاندھی جی عدم تشدد پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں "آپ کی جسمانی قوت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ کیا آپ کے لئے اس کا مظاہرہ بھی ضروری ہے؟ . . . . . میں ایک زیادہ شریفانہ اور زیادہ بہادرانہ طریقہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جو بہادر ترین سپاہی کے شایان شان ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ نازیوں سے بغیر اسلحہ کے لڑیں۔ مجھے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسلحہ ڈال دیں کیونکہ جو اسلحہ آپ کے پاس ہیں وہ آپ کو اور انسانیت کو بچانے کے لئے بیکار ہیں۔ آپ ہٹلر اور مسولینی کو مدعو کریں کہ آپ کے مقبوضہ ملکوں میں سے جو چاہیں لے لیں۔ اپنا خوبصورت جزیرہ اس کی ساری خوبصورت عمارتوں کے ساتھ انہیں لے لینے دیجئے۔ آپ یہ سب کچھ دے دیں گے لیکن اپنی روحیں اور اپنے دل و دماغ اپنے پاس رکھیں گے۔ اگر یہ اصحاب آپ کے گھروں پر قبضہ کرلینا چاہیں تو آپ ان کا تخلیہ کردیں۔ اگر وہ آپ کو باہر جانے کی اجازت نہ دیں تو آپ خود کو اور اپنی عورتوں اور بچوں کو ذبح ہوجانے دیں لیکن آپ ان کی اطاعت سے انکار کردیں۔ اسی طریقے کا نام میں نے بے تشدد ترک موالات رکھا ہے" اس دلچسپ اپیل کے بعد مہاتما جی فرماتے ہیں "یہ کسی ایسے شخص کی اپیل نہیں ہے جو اپنا کام نہیں جانتا۔ میں مسلسل ۵۰ سال سے سائنٹفک جحت کے ساتھ عدم تشدد کی مشق کر رہا ہوں میں نے گھریلو، سماجی، معاشی اور سیاسی غرض زندگی کے ہر شعبہ میں اس کو کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے"۔ آخر میں گاندھی جی نے کہا کہ اگر برطانیہ چاہے تو وہ اس سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرینگے

اہل برطانیہ سے گاندھی جی کی یہ مخلص اپیل بہت پسندیدہ ہے

اور ہٹلریت کے مقابلے میں ستیاگرہ کے استعمال کا مسئلہ بہت دلچسپ اور فلسفیانہ غور و خوض کا محتاج تھا لیکن گورنر جنرل نے جو جواب گاندھی جی کو دیا وہ ان کے لئے یقیناً بہت مایوس کن ہے اس جواب میں یہ بتلایا گیا ہے کہ گاندھی جی کی اپیل ملک معظم کی حکومت تک پہنچا دی گئی اور وہاں اس پر ہمدردانہ طور سے غور کیا گیا لیکن موجودہ صورت حال ایسی ہے کہ گاندھی جی کے "عدم تشدد" پر عمل پیرا ہونا برطانیہ کے لئے ممکن نہیں۔

کانگریس کا رویہ۔ جون کے آخری ہفتہ میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا جو اجلاس واردھا گنج میں ہوا اس میں "نیا سیاسی صورت حال" سے متعلق ایک قرارداد منظور کی گئی۔ اس قرارداد میں مجلس عاملہ نے گاندھی جی کے عدم تشدد کے اصول سے اختلاف کرتے ہوئے اپنا نیا مسلک معین کیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ گاندھی جی کو "ان کے عظیم الشان تخیل پر اپنے طریقے پر کاربند رہنے کی آزادی ہونی چاہئے" کانگریس کی اس عجیب و غریب قرارداد کے چند ہی روز بعد یعنی ۷ جولائی کو مجلس عاملہ نے نئی دہلی میں ایک اور قرارداد منظور کی۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ "برطانیہ ہندوستان کی کامل آزادی کا غیر مبہم اعلان کر دے۔ اور اس سلسلے میں پہلے قدم کے طور پر مرکز میں ایک عارضی قومی حکومت قایم کرے جس پر مرکزی مقننہ کے منتخب اراکین کو اعتماد ہو اور جس کو صوبہ جات میں ذمہ دار حکومتوں کا قریب ترین تعاون حاصل ہو" ان دونوں قراردادوں سے کچھ نہیں تو کانگریس کے مسلک کی وضاحت ضرور ہو گئی ہے ان کو پڑھنے کے بعد ایک معمولی فہم کا انسان بھی یہ کہہ دے گا کہ کانگریس عدم تشدد کو چھوڑ کر اب عملی طور پر انگریزوں کی مدد کرنی چاہتی ہے لیکن صرف اس شرط پر کہ انگریز ہندوستان کو اس طور پر آزاد کر دیں کہ کانگریس راج قائم ہو جائے۔ اصل میں کانگریس کا طرز عمل بھی یہ ہے کہ وہ برطانیہ کی موجودہ مشکلوں سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ کانگریس کی اس قسم کے مطالبہ سے حکومت ہند کے سامنے یقیناً ایک گتھی پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ حکومت اس گتھی کو کس طرح سلجھائے گی اس مسئلے کے صرف دو حل ہیں۔ ایک تو یہ کہ حکومت کانگریس کے مطالبہ کو قبول کرے اور اس طرح مسلمانوں ہریجنوں اور دیگر قلیتوں و نیز والیان ریاست کے حقوق کو نظر انداز کر دے۔ دوسرے یہ کہ کانگریس کے مطالبے کو نظر انداز کر کے دوسری جماعتوں کے اشتراک سے ایک عارضی حکومت قائم کرے۔ اب اس سوال کا جواب کہ حکومت کس طرح اس گتھی کو سلجھائے گی، آئندہ رفتار واقعات میں تلاش کرنا چاہئے اس سلسلہ میں وائسرائے بہادر کا وہ اعلان بھی بہت اہمیت رکھتا ہے جو اگست کے دوسرے ہفتہ میں شائع ہوا ہے اس میں گورنر جنرل نے اپنی کونسل کی توسیع اور جنگ کے ختم ہونے پر ہندوستان کو مستعمراتی درجہ عطا کرنے کا وعدہ کیا ہے لیکن معلوم نہیں کہ اس سے یہ گتھی سلجھ سکیگی یا نہیں۔

فرانس کی شکست۔ ۲۲ جون کے دن فرانس نے جرمنی کے ساتھ صلح کر لی اور ہٹلر کی تمام شرطوں کو مان لیا۔ اس کے ایک دو روز بعد ہی اطالیہ کے ساتھ بھی صلح کا اعلان ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ فرانسیسی جنرل اسٹاف کے غلط مشوروں اور آپس کے سیاسی جھگڑوں کی وجہ سے فرانس کو مجبوراً صلح کر لینی پڑی اور اسے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ لیکن شکست کی وجوہات چاہے کچھ ہی ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک آزاد ملک غلامی کی زنجیروں میں جکڑ گیا اور فرانس کی سرزمین جس نے نپولین جیسے بہادر پیدا

کئے تھے، اب مارشل پیتان جیسے رہنماؤں کو ہاتھوں آمریت ابتدا کا شکار ہو گئی ۔

اس شکست کا فرانس پر سب سے بڑا اثر یہ پڑا کہ وہاں کی حکومت میں تبدیلی شروع ہو گئی ۔ ایم، لبرون کی جگہ مارشل پیتان فرانس کے صدر ہو گئے اور ایم، لاوال کے تحت نئی حکومت تشکیل پا گئی۔ شکست کے بعد فرانس کی حکومت نے سب سے پہلے ملک کے دستور کی طرف توجہ کی چنانچہ فرانس کے نئے وزیر اعظم ایم، لاوال نے قومی اسمبلی میں یہ قرارداد پیش کی کہ مملکت فرانس کے لئے ایک نیا دستور بنانے کا مارشل پیتان کو کامل اختیار دیا جائے۔ اس قرار داد کو فرانس کی اسمبلی اور سینیٹ دونوں نے منظور کر لیا ۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ مارشل پیتان کو دستور سازی کا کامل اختیار مل گیا اور اس طرح فرانس کی تمام جمہوری روایتوں کا خاتمہ ہو گیا ۔ موجودہ حالات کی روشنی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عملی طور پر اب سینیٹ اور اسمبلی دونوں کا اثر ختم ہو گیا اور مارشل پیتان ہی فرانس کے "سب کچھ" ہو گئے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم کی زندگی میں جو جمہوریت کی بڑی علم بردار تھی، اب ایسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں جو اس کی کایا پلٹ دیں گی ۔ اس سلسلے میں یہ خبر قابل غور ہے کہ مارشل پیتان بلا شرکت غیرے خود دستور سازی کریں گے اور دستور تیار ہونے تک تنہا حکومت کریں گے ۔ جب دستور تیار ہو جائے تو وہ اپنی ہی قایم کردہ نئی اسمبلی سے اس کی توثیق کروالیں گے ۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ مارشل پیتان اس سرزمین کے سپوت ہیں جس میں روسو جیسے مفکر پیدا ہوئے تھے ۔ مگر آج ان کی قیادت، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں رفتہ رفتہ آمریت قایم کر دے گی ۔

برطانیہ اور فرانس ۔ فرانس کے شرائط صلح قبول کر لینے سے پہلے برطانیہ نے اس کے سامنے کامل اتحاد اور یگانگت کا ایک پیشکش کیا تھا لیکن مارشل پیتان کی حکومت نے اپنے پرانے رفیق کا ساتھ نہ دیا اور جرمنی سے ایسی صلح کر لی کہ فرانس کی آزادی بالکل ختم ہو گئی، فرانس کی یہ حرکت انگریزوں کے لئے بہت صبر آزما تھی کیونکہ اب انھیں ہٹلریت کا تنہا مقابلہ کرنا تھا ۔ لیکن انگریزوں نے اس نازک موقع پر اپنی بڑائی کا ثبوت دیا اور یہ فیصلہ کر لیا کہ جن مقصدوں کے لئے جنگ شروع کی گئی تھی ان کی خاطر وہ تنہا لڑیں گے اور اسی فیصلے اور مصمم ارادے میں انگریزوں کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے ۔

فرانس کی کمزوری سے ظاہر ہے کہ انگریزوں کو بہت سی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کے سامنے ایک بڑا سوال فرانس کے بحری بیڑے کا تھا ۔ فرانس اپنے جرمن آقاوں سے اتنا مغلوب ہو گیا تھا کہ برطانیہ سے کئے ہوئے وعدوں کے خلاف اس نے بہت سے کام کئے ۔ مثلاً یہ کہ جرمن ہوابازوں کو جو فرانس میں قید تھے، فرانسیسی حکومت نے جرمنی کے حوالے کر دئے حالانکہ ان کے متعلق یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ برطانیہ کے حوالے کئے جائیں گے ۔ اس قسم کے طرز عمل سے انگریزوں کو بڑا اندیشہ یہ تھا کہ ہٹلر فرانس کے بحریہ پر قبضہ کرلے گا اور پھر اسے برطانیہ کے خلاف استعمال کرے گا ۔ اگرچہ ہٹلر نے فرانس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ فرانسیسی بیڑے کو برطانیہ کے خلاف استعمال نہیں کرے گا لیکن اس کے وعدوں کی اصلیت معلوم تھی اور جرمنی کا اس بیڑے سے فائدہ اٹھانا یقینی تھا ۔ لیکن انگریزوں نے اس موقع پر بڑی ہوشیاری سے کام لیا ۔ ان کے پاس یہ یقین کرنے کے کافی اسباب تھے کہ جرمنی اپنے وعدے کا پابند نہیں رہے گا ۔ اسی لئے انھوں نے

فرانس کے بحری بیڑے کو اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کی اور اس کے لئے ان کو ایک سخت کارروائی کرنی پڑی۔ انگریزوں نے بعض فرانسیسی جہازوں پر تو قبضہ کر لیا مگر دوسرے جہازوں پر جنھوں نے برطانیہ کی شرطیں نہیں مانیں، آتشبازی کی اور ان کو تباہ کر دیا۔ اس طرح دشمن کو فرانسیسی بیڑے سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملا۔

برطانیہ کی صورت حال۔ فرانس کو ختم کرنے کے بعد ہٹلر نے انگلستان کی طرف توجہ کی اور کم و بیش روزانہ جرمن ہوائی جہاز انگلستان پر حملے کرتے ہیں لیکن حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریز بھی ہر قسم کے مقابلہ کے لئے اچھی طرح تیار ہو گئے ہیں۔ پہلے تو یہ تھا کہ بہت سی انگریزی فوجیں فرانس میں مصروف تھیں لیکن اب وہ برطانیہ واپس آگئی ہیں اور انگریزوں کی پوری توجہ برطانیہ کی مدافعت کی طرف ہو گئی ہے۔ صرف مدافعت ہی نہیں بلکہ اب برطانوی ہوائی جہاز جرمنی اور اس کے نئے فتح کئے ہوئے ملکوں پر بھی کامیابی کے ساتھ بم برسا رہے ہیں۔ برطانیہ اپنے وسیع ذرایع کی بدولت روز بروز طاقتور ہوتا جا رہا ہے اور اس کی جنگی تیاریاں اب بڑی حد تک اطمینان بخش ہیں۔ اس وقت انگریزوں کے پاس پندرہ لاکھ تربیت یافتہ اور مسلح فوج ہے۔ اور شاہی ہوائیہ بھی بہت منظم ہے جس کی طاقت اور برتری کا ثبوت روزانہ مل رہا ہے۔ بڑی جنگی تیاریوں کے ساتھ انگریزوں کا یہ مصمم ارادہ کہ کامیابی حاصل ہونے تک برابر لڑتے رہیں گے، سلطنت برطانیہ کے لئے بہت خوش آئند ہے، کیونکہ جو قوم کسی مقصد کے حصول کے لئے پکا ارادہ کر لیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی مقدور بھر کوشش بھی کرتی ہے، اس کو صرف کامیابی ہی کی توقع کرنی چاہئے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انگریزوں کے لئے بہت صبر آزما وقت ہے لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اب تک اپنی بڑائی کا ثبوت دیا ہے اور یہ کہنا بیجا نہیں کہ ان کا عزم بالجزم ہی ان کی کامیابی کا ضامن ہے۔

مشرق کا اصول منرو۔ ۲۹ رجون کو جاپان کے وزیر خارجہ مسٹر اریتا نے اپنی ایک نشری تقریر میں یہ اعلان کیا کہ جاپان مشرق بعید اور جنوبی سمندروں کی حد تک اصول منرو پر عمل کرے گا۔ اصل میں جاپان یہ چاہتا ہے کہ مشرق میں ایک جدید نظام قایم کرے۔ چنانچہ مسٹر اریتا کے یہ الفاظ قابل غور ہیں "مشرقی علاقے اور جنوبی سمندروں کے ملک جغرافی، تاریخی، نسلی اور معاشی اعتبار سے آپس میں ایک خاص رشتہ رکھتے ہیں اور ان ملکوں کو ایک ہی رشتہ میں منسلک کر دینا بالکل قدرتی چیز ہے ..... جاپان کو توقع ہے کہ مغربی ملک مشرقی ایشیا میں اپنے موقف کے استحکام کی کوشش نہ کریں گے۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ جاپان نے چین میں اپنی سرگرمیاں بڑھا دی ہیں اور مشرقی ایشیا پر پوری طرح چھا جانا چاہتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے فرانسیسی ہند چین میں جاپان کا عمل دخل اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

برما کی سڑک اور جاپانی کابینہ۔ جاپان میں امیر البحر یونائی کی کابینہ نے ۱۷ر جولائی کو استعفیٰ دے دیا اور حکومت میں دوبارہ فوجی عنصر غالب آگیا۔ یعنی شہزادہ کونائی اب پھر وزیر اعظم بن گئے۔ نئی کابینہ میں یوسکی متسوکا وزیر خارجہ، امیر البحر یوشیڈا وزیر بحریہ اور لفٹنٹ آئیکلو وزیر جنگ مقرر ہوئے ہیں۔ شہزادہ کونائی اور مسٹر متسوکا کے برسر اقتدار آنے کے معنی جیسا کہ چینیوں کا خیال ہے، یہ کہ جاپان اب فاشستی بن رہا ہے

یہ صحیح ہو یا غلط، اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اب مشرق میں زرد خطرہ بڑھ رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جاپان یورپ کی موجودہ صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کو مغرب میں مصروف دیکھ کر جاپانیوں نے اس پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور برما کی سڑک کو بند کر دینے کا مطالبہ کیا۔ برطانیہ نے جاپان کے ساتھ اس سڑک سے متعلق ایک راضی نامہ طے کر لیا اور برما کے جس راستے سے چین کو سامان روانہ ہوتا تھا اسے فی الحال تین مہینے کے لئے بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جاپان کی نئی حکومت مشرق بعید میں من مانی کارروائی کرنے پر تل گئی ہے اور اب جاپانیوں کو غالباً میدان اتنا صاف نظر آ رہا ہے کہ وہ امریکہ کی بھی کوئی پروا نہیں کرتے۔ چنانچہ برما کی سڑک کے بند کر دیئے جانے کو مسٹر کارڈل ہل نے ناپسند کیا تو اس پر جاپانیوں نے کہا کہ ہمیں امریکہ کی مخالفت کا ڈر نہیں۔ موجودہ صورت حال ایسی ہے کہ صرف ممالک متحدہ امریکہ ہی جاپان کے ارادوں میں کچھ مزاحمت کر سکتا ہے کیونکہ مشرقی اور مغربی اصول منرو میں تصادم کا قوی امکان ہے، لیکن معلوم نہیں کہ امریکہ بحرالکاہل میں اپنی بڑائی کا ثبوت دے گا یا خاموشی اختیار کرے گا اگر امریکہ نے اس موقع پر کسی قسم کی کمزوری دکھائی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ جاپانیوں کو جنوب میں پھیلنے کا موقع مل جائے گا اور بحرالکاہل کے امن میں خلل پڑ جائے گا۔

روس اور رومانیہ پہلے چند روز سے بلقان کے حالات بڑی اہمیت اختیار کر رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روس، اطالیہ اور جرمنی تینوں مل کر بلقان کی مملکتوں کو آپس میں تقسیم کر لینا چاہتے ہیں چنانچہ ایک طرف یہ اندیشہ ہے کہ جرمنی اور اطالیہ ہنگری کے ذریعہ کوئی نیا گل کھلائیں گے اور دوسری طرف یہ خطرہ ہے کہ روس برابر آگے بڑھتا جائے گا۔ فی الحال روس کی کارروائی صرف اتنی تھی کہ اس نے جون کے آخر ہفتہ میں رومانیہ کو ایک الٹی میٹم دے کر اس کے سامنے اپنے مطالبات پیش کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رومانیہ کی حکومت ۲۸ر جون کو مستعفی ہو گئی اور اس کی جگہ جو نئی حکومت آئی اس نے روس کے مطالبات مان لئے چنانچہ روس کو رومانیہ کے دو علاقے یعنے بسارے بیا اور بکووینا مل گئے اور اس طرح مملکت روس کی سرحدیں کچھ اور آگے بڑھ گئیں۔ اس موقع پر یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس کارروائی کے متعلق اسٹالن اور ہٹلر میں پہلے سمجھوتہ ہو گیا تھا اور ہٹلر نے رومانیہ کی نئی حکومت کو جو نازیوں کی طرف دار ہے، یہ مشورہ دیا تھا کہ رومانیہ بغیر لڑے اپنے دونوں علاقے روس کے حوالہ کر دے دوسری طرف ہنگری اور یوگوسلاویا بھی ہٹلر کے بل بوتے پر رومانیہ پر دباؤ ڈال رہے ہیں اور بہت ممکن ہے، کہ رومانیہ کا کچھ علاقہ ان دونوں کی بھی نذر ہو جائے۔

مسٹر روزولٹ کی نامزدگی ۔ ممالک متحدہ امریکہ کے صدر کا انتخاب ہر چوتھے سال ہوا کرتا ہے اور ملک کی عمومی اور جمہوری دونوں سیاسی جماعتیں انتخاب کے لئے اپنے اپنے نمایندوں کو نامزد کرتی ہیں۔ اس مرتبہ بھی حسب روایت جون اور جولائی میں کافی سرگرمی رہی اور ان دونوں جماعتوں نے اپنے اپنے مسلک کی وضاحت کی کہ ان کا نامزد کردہ صدر اسی مسلک پر کاربند ہوگا۔ جمہوری جماعت نے ملک کے موجودہ نظم و نسق پر الزامات لگائے اور اعلان کیا کہ وہ جنگ کے بالکل خلاف ہے۔ عمومی جماعت نے بھی اپنے خارجی مسلک کی وضاحت کی اور کہا جاتا ہے کہ امریکہ کو جنگ سے الگ رکھنے کا وعدہ کیا عمومی جماعت اس دفعہ مسٹر روزولٹ کو تیسری بار صدر بنانا چاہتی ہے چنانچہ مسٹر روزولٹ اب پھر صدارت کے لئے نامزد کئے گئے ہیں۔ اگرچہ رائے دہی سے پہلے مسٹر المرہان وغیرہ نے اعتراض کیا کہ کسی شخص کا تیسری مرتبہ انتخاب نہ ہونا چاہئے۔ مگر یوں کہنا چاہئے کہ مسٹر روزولٹ متفقہ طور پر نامزد کر دئے گئے اور انھوں نے امیدواری قبول بھی کر لی۔

(ح - ص)

موجودہ جنگ اور دنیائے اسلام

اسلام اپنی ضرب المثل اخوت اور گوناگوں خوبیوں کی بنا پر ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں اسلام کے پیرو اور خدائے وحدہٗ لاشریک کے پرستار موجود نہ ہوں قطبِ شمالی کے سرد اور برفیلے ممالک میں بھی مسلمان ہیں اور افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں بھی اذان کی آواز گونجتی ہے۔

مسلمان سب سے زیادہ جن علاقوں میں آباد ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں۔

افغانستان (آبادی ایک کروڑ) ایران (ایک کروڑ پچاس لاکھ) عراق (تیس لاکھ) شام (تیس لاکھ) سعودی عرب و یمن (ایک کروڑ بیس لاکھ) فلسطین (آٹھ لاکھ بیس ہزار) جاپان و چین (چھ کروڑ) اور ہندوستان (آٹھ کروڑ بیس لاکھ) افریقہ مصر (ایک کروڑ پچاس لاکھ) لیبیا اور الجیریا (۶۲ لاکھ ۸۰ ہزار) ترکی (ایک کروڑ پچاس لاکھ) اور البانیہ وغیرہ ہیں۔

ترکی۔ یورپ کی واحد اسلامی مملکت (البانیہ کو چھوڑتے ہوئے) ترکی ہے جو مرحوم اتاترک کی مدبرانہ سیاست کی بدولت سنہ ۱۹۱۴ء کے مرد بیمار سے آج یورپ کی طاقتور سلطنت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ گو مصطفےٰ کمال انتقال کر گئے لیکن ان کے جانشین عصمت انونو کی قیادت میں ترکی برابر ترقی کر رہا ہے۔ اگرچہ پچھلے چند دنوں سے ترکی بعض آسمانی بلاؤں کا شکار رہا لیکن ان مصیبتوں سے ترکوں کے حوصلے کم نہیں ہوئے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایسے نازک زمانے میں جبکہ ترکی میں زلزلے اور طوفان نازل ہو رہے تھے، ترکوں کے سامنے جنگ یورپ کا مسئلہ بھی کھڑا ہو گیا۔ یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ ترکی نے اس نازک دور میں بھی اپنی سیاست کی کشتی کو کامیابی کے ساتھ چلایا یا کم از کم اب تک چلاتا رہا۔

موجودہ جنگ میں اس کی پالیسی مرنجان مرنج کی رہی ہے یعنی یہ کہ وہ کسی یورپی طاقت سے ناخوشگوار تعلقات پیدا کرنا نہیں چاہتا بلکہ سب کو خوش رکھنا چاہتا ہے یہ بلقان کی اہم ترین مملکت ہونے کی حیثیت سے اور درۂ دانیال کے محافظ ہونے کی بنا پر یونان، روس، جرمنی، اطالیہ اور برطانیہ بھی اس سے بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتے۔ چنانچہ جب فرانس برطانیہ اور ترکی کے درمیان پچھلے سال معاہدہ پر دستخط ہوئے تو ترکی روس کا بھی برابر حلیف رہا۔ موجودہ جنگ میں گو وہ بظاہر برطانیہ کا طرفدار ہے لیکن حقیقی معنوں میں وہ غیر جانبدار ہے۔ اس کا ثبوت وہ معاہدہ ہے جو جرمنی اور ترکی کے درمیان حال میں طے پایا۔

حال میں برلن ریڈیو نے یہ افواہ اُڑائی تھی کہ روس نے ترکی کو الٹی میٹم دیا ہے لیکن خود اس کی تردید ماسکو کے ریڈیو نے کر دی اور ساتھ ہی وزیر اعظم ترکی نے پارلیمان کو مخاطب کرتے ہوئے اس کی تردید کر دی

ایران۔ مرحوم مصطفےٰ کمال کا سب سے بڑا کارنامہ میثاق سعد آباد تھا جس نے تمام اسلامی ممالک کو ایک رشتہ میں جکڑ دیا۔ ترکی اور ایران کے درمیان حال میں جو ریلوے لائن کا افتتاح ہوا ہے اس میثاق کا عملی ثبوت ہے۔ ایران اپنے تیل کے ذخائر کی بنا پر بیرونی ممالک کی خود غرضانہ نظروں کا شکار بنا ہوا ہے۔ ان ممالک میں روس کا نمبر پہلا ہے۔

جس سے ایران کو ہمیشہ اندیشہ لگا رہتا ہے۔ حال ہی میں عساکرِ ایران کو مخاطب کرتے ہوئے جلالۃ الملک رضا شاہ پہلوی نے ایک معرکۃ الآرا تقریر فرمائی جس میں انھوں نے اعلان کر دیا کہ ایران بیرونی حملہ کا ترکی بہ ترکی جواب دے گا۔

چونکہ ایران اور عراق میں معاہدات کی بنا پر تیل کا اجارہ برطانیہ کو دیا گیا ہے اس لئے یہی دو ایسے ممالک ہیں جن پر بیرونی حملہ کا اندیشہ ہے۔

افغانستان ۔ شاہ ظہیر شاہ کے دورِ حکومت میں یہ ملک ترقی کر رہا ہے۔ گو یہ ملک موجودہ جنگ سے بالکل الگ تھلگ ہے لیکن ہندوستان اور اس کے درمیان واقع ہونے کی بنا پر یہ خاص اہمیت رکھتا ہے عام طور پر یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں اشتراکیت کا سیلاب افغانستان کے راستے ہندوستان میں نہ آجائے لیکن اس کے سدباب کے لئے برطانوی حکومت نے سرحد پر زبردست انتظام کر رکھا ہے۔ دوسرے یہ کہ میثاق سعدآباد کا اہم رکن ہونے کی حیثیت سے اگر کوئی اس کو چھیڑ بیٹھے تو گویا وہ ساری اسلامی دنیا کو اپنا مخالف بنالے گا۔

مصر ۔ بحیرۂ روم کے مالک اور سوئز کے حکمران کی حیثیت سے مصر کو موجودہ جنگ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چنانچہ جنگ کی ابتدا کے بعد ہی احتیاطاً اس کا راستہ بند کر دیا گیا اور آج کل بحیرۂ روم میں جہازرانی کی آمد و رفت رُکی ہوئی ہے۔ برطانیہ کا ایک بڑا بیڑا یہیں موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان کی فوج بھی آج کل یہیں کیمپ ڈالے ہوئے ہے۔ مصر پر برطانیہ کا اقتدار ہے لیکن اسے اندیشہ اپنے دوسرے پڑوسی یعنی اطالیہ سے لگا رہتا ہے۔ چنانچہ جس وقت یہ خبر سننے میں آئی تھی کہ فرانس اطالیہ کو شام دینے کے لئے تیار ہے اگر وہ ٹیونس و کارسکا کے مطالبہ سے دست بردار ہو جائے اس خبر سے مصر کے اندیشوں کو اور تقویت پہنچ رہی تھی اس لئے کہ اس لحاظ سے مصر تین طرف سے اطالیہ سے گھر جاتا ہے گو مسولینی نے اعلانِ جنگ کے وقت یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ مصر پر حملہ نہیں کرے گا لیکن آمروں کی بات کا کوئی اعتبار نہیں مصر میں برطانوی علاقہ پر تو اطالیہ کا حملہ ہو گیا ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں مصر پر بھی اطالوی عقاب کا سایہ نہ پڑجائے لیکن برطانوی بحری بیڑہ اور اس کی کثیر افواج کا مقابلہ کرنا اطالیہ کے لئے آسان کام نہیں ہے۔
چند سال قبل مسولینی نے خود کو محافظ اسلام، ظاہر کیا تھا گو اس کی اسلام دوستی کا ثبوت حبشہ اور البانیہ پر قبضہ کے بعد ہی مل گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت سے اسلامی ممالک پر قبضہ کا خواہشمند ہے کہ بحیرۂ روم جس کو وہ "ہمارا سمندر" کہتا ہے اطالیہ کے قبضہ میں آجائے۔

مراقش ۔ اور الجیریا بھی ہٹلر اور مسولینی کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مسولینی شمالی افریقہ کے فرانسیسی مقبوضات پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے بے چین ہے اس بنا پر وہ طرابلس میں افواج جمع کر رہا ہے تاکہ مصر اور ٹیونس پر حملہ کر سکے۔ اطالیہ کی دست درازیوں کو روکنے کے لئے "اتحادِ عرب" کی تجویز عملی جامہ پہننے کو ہے چنانچہ حالیہ اطلاعات مظہر ہیں کہ عراقی فوجی افسر یمنی افواج کو قواعد سکھا رہے ہیں۔
عراق اور نجد میں بھی خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے ہیں اس اتحاد کا مرکز مصر ہے۔

فلسطین ۔ گو ایک عرصہ تک برطانیہ سے برسرپیکار رہا لیکن اب برطانیہ کی بدلی ہوئی پالیسی نے فلسطینی عربوں کے دل موہ لئے ہیں چنانچہ تمام عرب اس وقت برطانیہ کا ساتھ دے رہیں اور اس کی فتح کے خواہشمند ہیں۔

جلال الدین جعفر

اڈگر والیس (بسلسلۂ گذشتہ)

اس مقصد کی تحصیل کے لئے وہ فوج سے بعجلت ممکنہ علحدہ ہونے کی کوشش کرنے لگا اور ہر وہ موقع جو خدمت اَدب کے لئے اس کو ملتا کام میں لاتا۔ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ اٹھارہ پونڈ ادا کرکے فوجی ملازمت سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے تو اس نے ۱۷ مئی ۱۸۹۹ء کو یہی ترکیب کی اور اپنے چال چلن کا ایک صداقت نامہ حاصل کرکے مہذب اور شریف انسان کی حیثیت سے کالڈی کاٹ کے گھر اٹھ آیا اور چار مہینے تک وہیں ٹھیرا رہا لیکن اس کی مصروفیت کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بہت کم وقت گھر پر رہتا۔ رات کی آخری آنے والی گاڑی سے وہ اپنے قصبہ میں آجاتا اور صبح کو پہلی جانے والی گاڑی سے اپنی نظموں اور مضامین کا پلندہ بغل میں دابے جنوبی افریقہ کے مختلف اخباروں کو دینے کے لئے روانہ ہوجاتا۔ لیکن انہیں دنوں میں کالڈی کاٹ نے جو اپنی لڑکی کی وجہ متفکر اور اس شادی کا مخالف تھا ایک نیا روڑا اٹکا دیا۔ ابھی اڈگر نے اس میدان میں قدم بھی نہ جمانے پائے تھے کہ کالڈی کاٹ نے نسبت توڑ دینے کی غرض سے دونوں کو دو سال تک علحدہ رہنے کا حکم دے دیا۔ اس زمانے میں اڈگر اپنے کو اس کے قابل بنا رہا تھا اور آئی وی بھی اس میں کوشش پا رہی تھی۔ اکتوبر ۱۸۹۹ء میں جب کہ بوئر کے خلاف لڑائی کا اعلان ہوا تو اڈگر کو ریوٹرس نے مغربی علاقے کے نامہ نگار کی خدمت پیش کی اور اس کے بھاگ کھل گئے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی توجہ زیادہ تر طویل پایہ افسانوں پر صرف کی۔ یہ افسانے مختلف اخبارات میں شائع ہوئے۔ جن میں "ڈیلی میل" بھی شامل ہے۔ جنگ میں اس نے کئی مہینے گذار دیئے اور ہر شخص کو یہ یقین ہوگیا کہ جنگ بالکل ختم ہوگئی۔ اڈگر بھی تین مہینے کی رخصت لے کر انگلستان چلا گیا تاکہ اپنی نظموں کا مجموعہ شائع کرے۔ وطن میں اس کی یہ آمد خوشگوار نہ ہوئی جوں ہی وہ لندن پہنچا اس کو فری من کے انتقال کی اطلاع ملی اور اس کی کتاب جو اس احتیاط اور فخر کے ساتھ لکھی گئی تھی ناکام رہی کیونکہ اس سے اڈگر کو صرف پندرہ پونڈ ملے لیکن اس کے لندن آنے سے اس کے ملاقاتیوں میں "ڈیلی میل" کے اڈیٹر "مارلو" کا اضافہ ہوا اس نے "ڈیلی میل" کے لئے جنگ سے متعلق چند طویل مضامین بھیجنے کی فرمائش کی۔ کوئی نصف درجن مضامین نے مارلو کو یقین دلا دیا کہ اب زیادہ آزمائش کی ضرورت نہیں اس لئے اڈگر کو نامہ نگار مقرر کرلیا۔

اپریل ۱۹۰۱ء میں اڈگر کیپ ٹاؤن گیا اور آئی وی سے شادی کرلی۔ انھوں نے اپنا ہنی مون منانے کے لئے کیپ ٹاؤن کے مضافات میں ایک چھوٹا سا خوبصورت بنگلا انتخاب کیا۔ پھر اڈگر اپنے کام پر چلا گیا۔ لڑائی بے لطفی کے ساتھ ہوتی رہی۔ اور اڈگر نے صحیح واقعات جنگ برطانیہ تک پہنچائے اور خوف زدہ عوام کو جنگ کی تفصیلات اور برطانوی نقصانات کی صحیح تعداد بتلاتا گیا۔ اور لارڈ کچنر نے اس پراسرار خبر رسانی کو جو لندن کی گلی گلی میں پہنچ جاتی اور وہاں سے دشمنوں تک بھی معلوم ہوجاتی، احتسابی ذرائع سے بالکل بند کردینا چاہا لیکن اڈگر ہمیشہ اس احتسابی گرفتاری سے باہر رہا۔ دوسرے اور اخباروں نے اس کے مضمون سے اقتباسات لینے شروع کئے اور حوالہ دیتے وقت وہ اس کے نام کے ساتھ خوشامدانہ الفاظ لکھنے لگے۔

اپریل سنہ۱۹۰۲ء تک یہ ضروری ہوگیا کہ بوئر لیڈر معاہدۂ امن پر دستخط کردیں۔ ان کے نمایندے ۱۵ رمئی کو "ویری نی ننگ" میں "خیمۂ امن" پر جمع ہوئے۔ لارڈ کچنر نے معاہدۂ امن کی نزاکتوں کا خیال رکھتے ہوئے تمام نامہ نگاروں کو کیمپ سے باہر کردیا تاکہ گذرنے والے واقعات پر وہ نکتہ چینی نہ کرسکیں اور ساتھ ہی خیمے کے اطراف پہرہ دار بھی مقرر کردئے تاکہ "دیوار ہم گوش دارد" کا خطرہ رہتے ہی نہ پائے۔ لیکن دو ہفتے کے سکوت کے بعد "ڈیلی میل" نے معاہدہ کے امکانات اور اس کی ترقی کے متعلق ایک تفصیلی اطلاع شائع کی۔ اور کسی کو یہ نہ معلوم ہوسکا کہ اتنی رازداری کے باوجود اطلاع باہر کیسے گئی۔ جب "ڈیلی میل" نے اس دل خوش کن امن کی اطلاع شائع کی تو دوسرے اخبار جن کے ادارے مختلف پیشین گوئیوں کے حامل تھے برہم ہوگئے اور انھیں اس بات کا یقین نہ آیا جب دوسرے دن "بالفور" نے معاہدہ امن کا اعلان کیا تو سمجھا لیا کہ "ڈیلی میل" نے دفتر جنگ کے اہلکاروں کو معتدبہ رقم بطور رشوت دے کر یہ خبریں حاصل کی تھیں۔

لیکن حقیقت نہ اتنی دل خراش تھی اور نہ اتنی سادہ جب دوسرے نامہ نگار "خیمۂ امن" کے اطراف چکر لگارہے تھے تو اڈگر نہایت معصومانہ انداز میں ریل میں بیٹھا کیمپ کے مضافات میں پھر رہا تھا۔ ریل "خیمۂ امن" کے قریب سے ہوکر گذری یہاں اڈگر نے اپنے ایک دوست کو متعین کردیا تھا اور تین مختلف رنگ کی دستیاں اظہار کے لئے مقرر کی تھیں سرخ دستی بیکاری کی علامت تھی، نیلی ترقی پذیرگی اور سفید دستی اس بات کی علامت تھی کہ معاہدۂ امن پر دستخط ہوچکے ہیں جب دوست "خیمۂ امن" کی ڈیوٹی ختم کردیتا تو باہر آکر اڈگر کو حالات سے آگاہ کردیتا۔

اڈگر پبلک کی نظروں میں بحیثیت ممتاز نامہ نگار اور حکومت کی نظر میں مجرم بنا ہوا کیپ ٹاؤن آگیا۔ اس کے پاس شاندار اطلاعیں تھیں اس لئے وہ ایک نئے اخبار "رینڈ ڈیلی میل" کا بمشاہرہ دو ہزار پونڈ سالانہ ایڈیٹر بن گیا۔ یہ اخبار جوہانسبرگ سے جاری ہوا تھا۔ اڈگر کی ابتدائی آمدنی اٹھائیس پونڈ تھی اور اب شادی مرگ کردینے والی رقم ایک ایسے شخص کے لئے جس کی عمر صرف ستائیس سال ہو بیحد اہمیت رکھتی تھی لیکن نو مہینے بعد یہ نظام درہم برہم ہوگیا۔ وہ ہمیشہ کامیابی کی دھن میں مختلف تجاویز سوچتا رہتا۔ اس نے اپنی کامیابی کے لئے کافی مواد حاصل کرنے میں اپنی دولت نہایت دریادلی سے خرچ کردی تھی اور بڑی بڑی تنخواہیں رکھنے والا خارجی نامہ نگاروں کا عملہ قائم کیا تھا اس تمول کے زمانے میں اس نے نہایت آرام و اطمینان سے زندگی گذاری۔ ایک بڑی عمارت اپنے قیام کے لئے کرایہ پر لی۔ اس نے اپنی دولت گھوڑدوڑ وغیرہ میں بھی بڑی بے دردی سے خرچ کی۔ لیکن آخرکار اڈگر کو "رینڈ ڈیلی میل" کے مالک سے لڑکر جنوبی افریقہ چھوڑنا پڑا۔ جنوبی افریقہ چھوڑتے وقت وہ تاجروں اور ملاقاتیوں کا سیکڑوں کا قرضدار تھا۔ جوہانسبرگ کا سنہری موقع ہاتھ سے جاتا رہا اور وہ پھر مفلس کا مفلس رہ گیا۔

وطن کی طرف بحری سفر دل خوش کن نہ تھا اس کی ایک کمسن لڑکی اسی اثنا میں انتقال کرگئی۔ اڈگر کے پاس صرف اسّی پونڈ تھے اور اس میں سے بھی اس نے کچھ رقم تاش کھیل کر گنوادی اور میاں بیوی دونوں اپنی حالت پر ماتم کرتے ہوئے صرف چھ شلنگ کے مالک بنے گھر پہنچے۔ اب اس کا اثاثہ صرف ایک ڈراما "سے سل رھوڈز" تھا

جس پر وہ لگاتار محنت سے کام کر رہا تھا۔ اڈگر نے اپنی گھڑی بارہ پونڈ میں رہن رکھی اور ڈل وچ میں ایک کمرہ میں مقیم ہو گئے۔ دوسرے دن اڈگر تار آو سے ملا جس نے پندرہ پونڈ فی ہفتہ کی ایک جانماد نامہ نگاری "ڈیلی میل" پر اس کا تقرر کر دیا۔ اڈگر کے جذبات پھر بیدار ہو گئے وہ اب فلیٹ اسٹریٹ میں اٹھ آیا۔

ابتدائی چند ہفتوں میں اس کی ملاقات پالی رچرڈ سے ہو گئی۔ اس کی اکلوتی لڑکی کا انتقال ہو چکا تھا اور اب پالی تن تنہا غریب و خستہ حال ہو گئی تھی۔ اگرچہ بیس سال سے اس نے اپنے بیٹے کو نہیں دیکھا تھا اور نہ دیکھنا چاہتی تھی اور اسی امید پر اڈگر نے بھی ماں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ سے کسی قسم کی امید رکھنے کی ضرورت نہیں۔ چند مہینے بعد وہ سفری کمپنی کا اداکار بن کر براڈ فورڈ پہنچی جہاں اس کی صحت نے جواب دے دیا۔ اس کو وہیں دواخانے میں داخل کر دیا گیا جہاں اس نے کس مپرسی کے عالم میں انتقال کیا، اس کے داماد نے اس کے آخری مراسم ادا کئے اور اس کی انجیل بطور یادگار اڈگر کے پاس بھیج دی گئی۔ ماں کی موت کے جاں گداز واقعہ نے اڈگر کو بے حد متاثر کر دیا اور وہ اپنے طرز عمل پر ملامت کرنے لگا۔ اس نے اپنی ماں کو بہت دیر بعد پہچانا اس کو خود داری کے امتحان میں کامیاب پایا جس نے اڈگر کے نفرت آمیز الفاظ آخری وقت میں سنے اور لندن سے نکل کر موت و حیات کی کشمکش میں پڑ گئی۔

اڈگر نے اپنی نامہ نگاری کے دوران میں مختلف ممالک دیکھے۔ کناڈا، اسپین اور بلجیم کانگو بھیجا گیا جہاں اس نے اس آخر کے ملک کی ظالمانہ افعال کی تحقیقات کی۔

اس کا دوسرا تجربہ بدترین بہ شکل ایک مہینے کا ہوگا کہ بالک چوری کے سلسلہ میں مراکو گیا اسی اثنا میں اس کا ڈراما "سے ل رعوڑ ز" پیش کیا جانے والا تھا جس سے اڈگر کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں لیکن جب وہ لندن پہنچا تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ بمشکل چھ راتیں چل سکا ہے۔ اس کے لئے یہ بے حد سخت صدمہ تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس ڈرامے کی آمدنی سے مالی مصائب دور ہو جائیں گے کیونکہ ابھی تک وہ حسب معمول آمدنی سے زیادہ صرف کر رہا تھا۔

وہ فلیٹ اسٹریٹ سے ناٹنگ ہل میں منتقل ہو گیا۔ یہاں اس نے ایک ناول لکھا جس میں سراغ رسانی کے سلسلے میں لندن کی خفیہ پولیس کام کر رہی تھی۔ لیکن افسانہ کا پس منظر سیاسیات تھا۔ اس زمانے میں آئی وی خود بخت دیر کا انتظام کرتی اور اڈگر بچے کو گود میں لئے لکھنے میں مصروف رہتا۔ وہ اپنی کتاب "چار عادل" پر تیزی کے ساتھ کام کر رہا اور جب ناشر کو مسودہ فروخت کرنے میں کوئی سہولت نظر نہ آئی تو اس نے خود ہی تالس پریس سے شائع کرنے کا ارادہ کر لیا۔ کتاب کی تشہیر کے لئے ایک ہزار پونڈ کی کثیر رقم رکھی اور اس معائی افسانے کے صحیح حل پر پانچ سو پونڈ کا انعام مقرر کیا۔

کتاب کی اشاعت کے تین مہینے بعد اس کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ کتاب کی بکری اچھی ہو رہی تھی لیکن اس سے زیادہ اشتہارات کے بل آ رہے تھے اور مطبع والے الگ ناخوش تھے اور اپنا حساب صاف کرا لینا چاہتے تھے ان قرضوں سے بے باق ہونے کے لئے اس کو دو ہزار پونڈ کی ضرورت تھی جس میں اس کے فائدہ کا ایک پیسہ بھی شامل نہ تھا اور انعامی رقم کا مسئلہ الگ پریشان کر رہا تھا

تاس پریس میں ہزاروں حل آچکے تھے جن میں کئی ایک صحیح بھی تھے ۔ کتاب کے پڑھنے والے غضبناک ہو کر خطوط لکھ رہے تھے اور "چار عادل" کو ایک ذلیل دھوکا سمجھ رہے تھے ۔ لوگوں نے "ڈیلی میل" کے دفتر میں بھی خطوط ڈالے ۔ الفرڈ ہار سورتھ نے اخبار کی نیک نامی کے خیال سے اڈگر کی تنخواہ ایک ہزار پونڈ پیشگی دے دی اور اس طرح اڈگر دیوالیہ ہوتے ہوتے بچ گیا ۔

اس طرح اس کو "میل" کے دفتر میں کام کرنے کا موقع ملا لیکن ابھی سال بھی ختم نہ ہوا تھا کہ اس کی لاپروائی کی وجہ سے بے بنیاد خبروں کی بناء پر اخبار کو دو مقدموں میں کثیر نقصان برداشت کرنا پڑا اور ہارسورتھ نے فیصلہ کر لیا کہ "میل" کے صفحات کو اڈگر کے رشحات قلم کا مرہون منت ہونے کی ضرورت نہیں ۔ اڈگر پھر مفلس ہو گیا اور عام طور پر یہ مشہور ہو گیا کہ وہ ایک خطرناک اور ناقابل اعتبار نامہ نگار ہے ۔ فلیٹ اسٹریٹ کا ہر دروازہ اس پر بند ہو گیا ۔

مہینوں گذر گئے لیکن اس کو کوئی کام نہ ملا اور اس کی میز ناقابل اشاعت مضامین اور افسانوں سے لد گئی اور اس بے روزگاری کے عالم میں اڈگر اور اس کی بیوی میں اختلاف پیدا ہونے لگا ۔

سنہ ۱۹۰۹ء میں قسمت نے پھر پلٹا کھایا ۔ اتفاقاً اس کی ملاقات ایک ایڈیٹر مسز تھروڈن سے ہوئی جس نے اڈگر کا ایک افسانہ قبول کیا اور مختصر افسانے لکھنے کی نصیحت کی ۔ ایک دن تھروڈن لندن برج کو جانے کے لئے ایک بس میں سوار ہوئی اور اتفاق کی بات کہ اس بس میں اڈگر بھی تھا ۔ مزید براں اس کو اڈگر کی بازو والی نشست پر جگہ مل گئی ۔ وہ اصلاعات کانگو کے جلسے میں شرکت کے لئے جا رہا تھا ۔ اثنائے گفتگو میں اس نے اس ملک کے چند قصے مسز تھروڈن کو سنائے جن کو اس نے یا تو سنا تھا یا بچشم خود دیکھا تھا ۔ مسز تھروڈن نے کہا "تمہارے پاس سب کچھ ہے مواد، کردار، رنگ، روغن، محو حیرت بنا دینے والی چیزیں، پھر کس چیز کی کمی ہے ۔ میرے ہفتہ وار داستاں گو کے لئے چند افریقی قصے لکھ دینا"۔

افسانوں کا یہ سلسلہ "سانڈرس آف دی ریور" نہایت کامیاب ثابت ہوا اور اڈگر نے یہ سمجھ لیا کہ ایک ایسا سرچشمہ اس کے ہاتھ آگیا ہے جو کبھی نہ خشک ہو گا ۔ اس نے کانگو کی نامہ نگاری کے دوران میں کئی یادداشتیں رکھ چھوڑی تھیں اور اب انھیں چیزوں کو اپنے خیال کی مدد سے کام میں لا رہا تھا ۔ قومیں، قبیلے، رسم و رواج، محاورے، توہمات، دیومالا اور کانگو زبان سے اس کی یادداشتیں بھری پڑی تھیں اور چونکہ یہ تمام حقیقتیں اس کے سامنے تھیں اس کو من گھڑت میں بھی دیر نہ لگتی تھی ۔

اڈگر پھر دولتمند تھا ۔ لندن کی تماشہ گاہوں اور گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں لوگوں کی نظریں اس پر اٹھنے لگیں ۔ آئی وی اس کے برعکس ان چیزوں سے متنفر تھی ۔ اڈگر کی تلون مزاجی نے عورتوں کی خوشامدانہ اور مضطربانہ آرزوؤں کا جواب دیا اور ان گنت عارضی معشوقوں سے آئی وی متوحش ہو گئی حتیٰ کہ ان کی عارضی اور عام فطرت بھی اس پر ظاہر ہو گئی ۔ طرفہ یہ کہ اس کو اڈگر کی خواہش پر یہ کہنے کے لئے ٹیلیفون پر بیٹھا جاتا تھا کہ اڈگر گھر پر نہیں ہے حالانکہ وہ سامنے آرام کرسی پر لیٹا ہوا سگریٹ کے حلقے بنا کر چھوڑتا رہتا ۔ باقی آئندہ ۔

اکبر صدیقی

چائے کی سرگذشت

دنیا کا کوئی متمدن ملک ایسا نہیں جہاں چائے مہماں نوازی کا لازمی عنصر نہ ہو ۔ اگنس ریپلیر Agnes Repplier کے الفاظ میں "چائے امیروں کی دوست اور غریبوں کی عزیز ہے" چائے پینے میں جو لمحات صرف ہوتے ہیں وہ ہماری زندگی کے بہترین لمحات ہوتے ہیں ۔ چائے ایک مجسم شاعری اور بذات خود ایک رومان ہے ۔ جس کی سرگذشت یہاں مختصر الفاظ میں بیان کی جائے گی ۔

چائے کی ابتدائی تاریخ پوشیدہ ہے ۔ لیکن عام طور پر روایات یہ ہیں کہ اس کے انکشاف کا سہرہ شہنشاہ چن ننگ Chinnung کے سر ہے جو سنہ عیسوی کے تین ہزار سال پہلے کا آدمی ہے ۔ اس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ چین کی زرعی ترقی بڑی حد تک اسی کی بدولت ہوئی ۔ اس کا ایک قول مشہور ہے کہ چائے شراب سے کئی گنا بہتر ہے اس لئے کہ نشہ آور نہیں ... یہ پانی سے بہتر ہے اس لئے کہ اس میں جراثیم نہیں ہوتے ۔ کنفیوسش Confucius بھی چائے کی تعریف میں کچھ کم رطب اللسان نہ تھا اس نے اپنے ساتھیوں کو یہ تاکید کی تھی کہ اگر کوئی آکر کہے کہ وہ پیاسا ہے تو اس کو بغیر معاوضہ کے ایک چائے کی پیالی دیدو ۔ چائے کے متعلق قدیم چینی ادب بھرا پڑا ہے لیکن کین لنگ Kainlung نے جو چوتھی صدی عیسوی کا مشہور اہل قلم تھا اس پودہ کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے ۔ نیز چینی مورخ لویو Loyu بھی اس سلسلہ میں قابل ذکر ہے جو غالباً ساتویں اور دسویں صدی عیسوی کے درمیانی زمانہ کا آدمی ہے ۔ اس پودہ کا سائنٹفک مطالعہ کرنے کے بعد ان لوگوں نے اس کا جوشاندہ تیار کرنا شروع کیا ۔

کین لنگ لکھتا ہے "اپنی فرصت کے وقت اس طرح تیار کئے ہوئے مشروب کو نوش فرمائیے جو آپ کے رنج و ملال کی پانچوں وجوہات کو دور کرے گا ۔ اس مشروب کے پینے سے جو اثرات دل و دماغ پر مرتب ہوتے ہیں انھیں الفاظ میں نہیں بیان کیا جاسکتا بلکہ صرف محسوس کیا جاسکتا ہے" اسی طرح لویو نے چائے کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "یہ جذبات کو ٹھنڈا کرتی ہے دل کو سکون پہنچاتی ہے تھکان دور کرتی اور خیالات میں بیداری پیدا کرتی ہے کاہلی کو دور کرتی اور جسم کو ہلکا بناتی ہے ۔ رنج و ملال کے خیالات اس سے دور ہو جاتے ہیں"

یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ چائے کا پودا سب سے پہلے کس سرزمین پر پیدا ہوا بعض کا خیال ہے کہ یہ پودا چین میں جنم لیا اور بعض اسے ہندوستان کی پیداوار بتاتے ہیں لیکن یہ چین کی پیداوار ہو یا ہندوستان کی یہ بات تو یقینی ہے کہ صرف چینی ہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے چائے کے فوائد اور افعال کا انکشاف کیا ۔

اس کے متعلق بہت معلومات نہیں کہ چینیوں نے سب سے پہلے اس درخت کو کہاں سے حاصل کر کے اپنے پاس کاشت شروع کی ۔ اس لئے کہ اس وقت چین میں جن چائے کے پودوں کی کاشت ہوتی ہے ان کی قسم اس سے بالکل مختلف ہے جس کی زمانہ قدیم میں کاشت کی جاتی تھی ۔ علم نباتات سے

ہیں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ سدا بہار پودے
جن کا تعلق خاندانِ کیمیلیا Camellia سے
ہے چین ہندوستان اور برما کے پہاڑی حصوں میں
اُگتے ہیں۔ اور جہاں تک تاریخ ہماری مدد کرتی ہے
اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ شان اسٹیٹ Shan states
کے باشندوں نے عرصہ دراز تک اس پودہ کی کاشت
کی گو وہ لوگ بحیثیت مشروب اس کے فوائد اور خواص
سے قطعی طور پر ناواقف تھے ۔

سنہ عیسوی کے اوائل میں اہل چین نے بہت
بڑے پیمانہ پر چائے کی تجارت شروع کی۔ کچھ عرصہ بعد
چائے کا پودا جاپان بھی پہنچ گیا اور جاپانیوں کو دسویں
صدی تک چائے پینے کی عادت پڑگئی۔ اس کے
بعد کسی حد تک دنیا میں اہل چین اور جاپان دو ایسی
قومیں تھیں جو چائے کی عادی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ
اہلِ پرتگال نے سب سے پہلے یورپ میں چائے نوشی
کی ابتدا کی۔ لیکن ٹھیک طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ سترھویں
صدی عیسوی میں ولندیزیوں نے بحیثیت مشروب
اسے یورپ میں مقبول عام کیا۔ کارنیلیس باٹرلو
Cornelius Bottrloe نامی جامعہ
لیڈن کے ایک پروفیسر نے ۱۶۴۹ء میں چائے کے
فوائد پر سب سے پہلی کتاب تصنیف کی تاکہ لوگ اس
نئے مشروب کے خواص اور فوائد سے پوری طرح
واقف ہوجائیں۔ سترھویں صدی عیسوی کے اواخر
تک یورپ چائے سے اچھی طرح آشنا نہ تھا لیکن جب
اسٹیٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ لندن میں چائے کے نمونے
پہنچ گئے تو اس وقت اس کی باقاعدہ تجارت شروع ہوگئی
لیکن اس کے بعد بھی انگریز ایک عرصہ تک چائے کے
استعمال کو بے جا عیش پسندی سمجھتے رہے لیکن جیسے
جیسے زمانہ گذرتا گیا چائے پینے والوں کی تعداد
بڑھتی گئی چنانچہ سنہ ۱۸۱۹ء تک سلطنت برطانیہ کے کم وبیش
تمام باشندے چائے کے عادی ہوگئے۔ اور عام طور پر
فی شخص ایک پونڈ کے حساب سے چائے کا خرچہ ہونے لگا۔

چائے کا سب سے پہلا انگریز تاجر تھامس گاروے
ہے اور یہی شخص ہے جس نے سب سے پہلے چائے خانہ
کی ابتدا کی۔ گاروے نے سنہ ۱۶۶۰ء میں چائے کی
تعریف میں ایک انوکھا اشتہار شائع کیا تھا جو اب تک
برطانوی عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ
سمیل پیپی Samuel pepys اور اس کی بیوی
ان لوگوں میں سے ہیں جو سب سے پہلے گاروے
کی ترغیب کا شکار ہوئے۔ پیپی کی ڈائری میں ۲۵ ستمبر سنہ ۱۶۶۰ء
کی تاریخ یہ الفاظ درج ہیں "میں نے ایک چائے کی
پیالی منگوائی ہے جو ایک چینی مشروب ہے اور جس کو
میں نے اب تک نہیں پیا۔"

چائے کے متعلق سب سے پہلا اشتہار لندن گزٹ
کی ڈسمبر سنہ ۱۶۵۸ء والی اشاعت میں شایع ہوا جس میں
ایک شخص تھامس ایگل Thomes Eagle
نے اعلان کیا کہ "بہترین چائے کا ایک پارسل اتفاقاً
میرے ہاتھ لگا ہے جو تیس شلنگ فی پونڈ کی قیمت پر
حاصل کیا جاسکتا ہے" اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں
انگلستان کا صرف متمول طبقہ ہی چائے کو استعمال کرتا ہوگا۔

جو تین شلنگ فی پونڈ کی قیمت برداشت کر کے اسے
خرید سکتا ہو۔

عہد وکٹوریہ کے ابتدائی زمانہ یعنی ۱۸۳۲ء تک
چائے کوئی قیمتی چیز نہ رہی بلکہ خاص و عام میں بحیثیت چینی
مشروب کے مقبول ہوگئی۔ لیکن اس وقت تک بھی اس کی
تجارت صرف چینیوں ہی کے قبضہ میں رہی۔ اس کے ایک
سال بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی چائے کی تجارت کا ٹھیکہ
ختم ہوگیا اور خود ہندوستان میں اس کی کاشت شروع
ہوئی۔ ابتداءً یہ شبہ تھا کہ اس کی کاشت ہندوستان میں
کامیابی کے ساتھ نہ ہو سکے گی۔ گو ۱۷۸۰ء میں دو ماہرین
نے اس کی کامیابی کا یقین بھی دلایا تھا البتہ ہندوستان
میں چائے کی کاشت پر تجربے ضرور کئے گئے چنانچہ کرنل کڈ
نے سر جوزف بیانکس کو اپنے ایک خط میں لکھا کہ اس کے
باغ کنین Canton سے لائے ہوئے چائے کے
پودے بہت سرسبز اور شاداب ہو رہے ہیں اور اسی
سال وارن ہیسٹنگ Warren Hasting
نے بھوٹان کے جارج باگل کے پاس ہائسن Hyson
کی چائے کے چند بیج روانہ کئے پھر آٹھ سال بعد خود سر جوزف
بنکس نے بنگال میں بڑے پیمانہ پر چائے کی تجارت کے
متعلق تحقیقات کی لیکن یہ تمام کوشش کچھ زیادہ کامیاب ثابت
نہیں ہوئی اور جس وقت تک آسام میں دیسی چائے کے
درختوں کی کاشت کا انکشاف نہیں ہوا اس وقت تک
تجارتی پیمانہ پر چائے کی ابتدا نہ ہو سکی۔

۱۸۲۰ء میں مسٹر ڈیوڈ اسکاٹ کمشنر آسام نے
کلکتہ کو چائے کی چند پتیاں روانہ کیں جن کے متعلق سمجھا گیا تھا
کہ وہ جنگلی چائے کے پودوں کی ہیں ان میں کی بعض ابھی
تک ہنائین سوسائٹی Hinnaen Society
لندن کے نباتیاتی ذخیرہ میں محفوظ ہیں۔ بلاشبہ یہ ان ہی
پودوں کی پتیاں ہیں جن کی کاشت آسام میں آج بھی ہوتی
ہے۔ یہ پتیاں ڈاکٹر ولیچ Dr. Wallich کو
جو اس وقت کلکتہ کے نباتیاتی باغ کے سپرنٹنڈنٹ تھے
بھیجی گئی تھیں۔ چودہ برس کی تحقیق کے بعد یہ ماہر نباتیات
اس نتیجہ پر پہنچا کہ اصلی چائے کا پودہ حقیقت میں آسام ہی
کی پیداوار ہے۔ ۱۸۳۴ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کی حکومت
میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ وہ چین سے پودوں کی فراہمی
اور ہندوستان میں اس کی کاشت کے موزوں ترین
مقام کے مسائل پر غور کرے ابھی دیسی پودوں کی کاشت
کا مسئلہ زیر غور ہی تھا کہ اس کمیٹی نے ایک گشتی کے ذریعہ اس
قسم کی آراء طلب کیں جن سے یہ پتہ چلے کہ ہندوستان
کے کس مقام پر چائے کی کاشت کامیاب طریقہ سے
ہو سکتی ہے اور اپنے ایک کارکن مسٹر جی جے گارڈن
کو چین روانہ کیا تاکہ وہ اپنے ساتھ چائے کے بیج اور
کچھ کاشتکاروں کو بھی لیتے آئیں۔ اس سلسلہ میں ایک عجیب
و غریب بات یہ ہے کہ اس وقت تک بھی کسی کے ذہن میں
یہ خیال نہ آیا کہ آسام میں چائے کی کاشت کی جائے اور چین کے
بھیجے ہوئے وفد سے سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ نہیں
نکلا کہ ہندوستان اور چین کے درمیان چائے کے بیجوں کی
بڑے پیمانہ پر تجارت شروع ہوگئی۔ بالآخر چند سال بعد
اس چیز کا انکشاف ہوا کہ آسام کے پہاڑی علاقہ میں بھی
اس کی کاشت ہو سکتی ہے۔

یہ پودے امتحان کے لئے ڈیوڈ اسکاٹ کے ذریعہ ماہرین نباتیات کے پاس دوبارہ بھیجے گئے۔ لیکن ان لوگوں نے اس بات کو تسلیم کرنے میں شبہ ظاہر کیا کہ آیا ان کی کاشت کے لئے ہندوستان کی فضا موافق ہے۔ کمیٹی کی گشتی ملنے پر کیپٹن جان کنس نے جنھیں آسام کی وادی کا چارج دیا گیا تھا۔ اور جو دیسی پودوں کے متعلق نہ صرف اچھی طرح واقف تھے بلکہ خود بھی چائے کا استعمال کیا کرتے تھے۔ اس گشتی کو ایک نوجوان افسر لفٹنٹ کارلٹن مقیم سیڈیا کے پاس روانہ کر دیا۔ کارلٹن نے فوراً ہی (۸ر نومبر ۱۹۳۴ء) چائے کے ساتھ اس کے پھلوں اور پتیوں کے نمونے بھی کلکتہ روانہ کر دئے۔ یہاں اس کا اچھی طرح امتحان کیا گیا اور اب یہ نتیجہ نکالا گیا کہ یہ اسی قسم کے پودے ہیں جن کی چین میں کاشت ہوتی ہے۔ مسٹر گارڈن کو چین سے واپس بلا لیا گیا اور کمیٹی نے آسام کو اس کی کاشت کا مرکز قرار دیا جہاں ایک سو سال کے اندر ہی بہت بڑے پیمانہ پر اس کی کاشت ہونے لگی۔ اس کے بعد ہندوستان میں چائے کی خفیہ تاریخ۔ اس کی مقبولیت اور مخالفت اور اس کے کاشتکاروں کی ان تھک محنت بذاتِ خود ایک رومان ہے۔

۱۸۳۶ء کے بعد جب کہ پہلی مرتبہ کلکتہ میں چائے کے پودے بھیجے گئے تھے اس کی صنعت باوجود گوناگوں مشکلات کے برابر ترقی کرتی گئی اور اس طرح بڑے تجارتی پیمانہ پر اس کی کاشت کی بنیاد پڑ گئی۔ آج سے کوئی ایک سو سال پہلے آسام کے ایک ماہر نباتیات نے چائے پر مضمون تحریر کئے تھے۔ ان کی بدولت ہندوستانی چائے ساری دنیا کے باشندوں کی زندگی کا اہم جزبن گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج دنیا میں لاکھوں آدمی اسے روزانہ ایک شروب کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں لوگ اپنی دوسری مصروفیتوں کے باعث اس چیز کو بھول جاتے ہیں کہ معمولی سے پودے نے انسان کی روزمرہ سماجی زندگی میں کتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہے آج بھی یہ معمولی پودا انسانی زندگی میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے اور چائے ہماری موجودہ تہذیب کا ایک اہم عنصر ہے۔

محمد جلال الدین جعفر

بچوں سے

گذشتہ مہینے میں جو معمہ شائع ہوا تھا اسکے حل کافی تعداد میں وصول ہوئے۔

صحیح حل بھیجنے والے حسب ذیل ہیں:۔

سید آصف علیخاں۔ سرہری۔ محمد ابراہیم۔ رفعت النسا بیگم سید غلام دستگیر۔ صابر حسین خاں۔ اختر سلطان۔ آصف اقبال۔ حبیب سلطانہ۔ غوث محی الدین۔ محمد ظہیر الدین:۔

قرعہ اندازی کے بعد "سید آصف علیخاں" انعام کے مستحق قرار پائے وہ محمود علی اکبر مشیر کی لکھی ہوئی کتاب دفتر سے حاصل کریں۔

اگست کے پرچہ میں اعلان کیا گیا تھا کہ تیسن کی سوانح حیات لکھ بھیجیں بجائے اس کے "محسنین اردو" ایک مضمون لکھ بھیجے جو دو صفوں سے کم اور تین صفوں سے زیادہ نہ ہو۔ اچھے مضمون کو نہ صرف انعام دیا جائے گا بلکہ وہ اکتوبر کے سب رس میں شائع بھی کیا جائے گا۔

۱۶ اگست کو شعبۂ طلبا ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے ایک بین مدارسی تقریری مقابلہ احمدیہ جوبلی ہال افضل گنج میں شام چار بجے منعقد ہوا۔ ہال طلبہ سے بھرا ہوا تھا۔ اس مقابلہ میں گورنمنٹ ہائی اسکول چادرگھاٹ، دار العلوم، دار الشفاء، مفید الانام، آل شمس ہائی اسکول اور مدرسۂ عالیہ کے طلبہ سرکاری طور پر شریک تھے۔ حکم صاحبان ڈاکٹر زور صاحب، لطیف احمد فاروقی صاحب اور عبد القیوم صاحب باقی تھے۔ ۵ بجے مقابلہ شروع ہوا اور بڑا کامیاب رہا۔ ۷ بجے کے قریب نتیجہ سنایا گیا حمید احمد فاروقی (دار الشفا) اول سید یعقوب حسین قادری (مفید الانام) دوم، علی محمد حسین خسرو (مدرسہ عالیہ) سوم رہے۔ لطیف فاروقی صاحب نے شمس راؤ (آل شمس) کو اور باقی صاحب نے شمس الدین (دار العلوم) کو انعامات دیئے۔ انعامات کی تقسیم ادارہ کی کوئی خاص تقریب کے وقت عمل میں آئے گی۔ شعبۂ طلبہ کے انتخابات عنقریب عمل میں آنے والے ہیں۔ جلد جلد رکن بنتے اور بناتے جائیے۔ خریداروں کا صرف کوپن بھر کر بھیج دینا کافی ہے شعبۂ طلبہ کا دستور دفتر ادارہ سے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے۔

معمہ کا حل یہ ہے۔
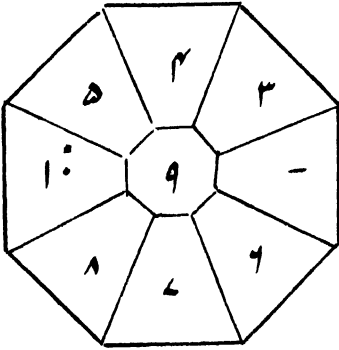
اس ماہ ادارہ کی جانب سے اردو امتحانات منعقد ہوئے۔ کافی تعداد میں امیدواروں نے اس میں شرکت کی۔ یہ امتحانات نہ صرف حیدرآباد میں بلکہ اضلاع میں بھی اکثر مقامات پر ہوئے۔ ایک ماہ بعد نتیجہ نکلے گا دیکھنا ان میں سے سب رسی بھائی کتنے کامیاب ہوتے ہیں۔

معین الدین احمد انصاری

جھٹکا

ہمارے حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں عام طور پر غریبوں کو دو طرح کی سواریاں ملتی ہیں۔ ایک تو ایسی ہے کہ جس میں جانور نہیں جوتے جاتے بلکہ جانور کی جگہ ایک انجن ہوتا ہے جو تیل سے چلتا ہے اس سواری کو موٹر بس کہتے ہیں۔ بیس پچیس آدمی تک اس میں بیٹھ سکتے ہیں اور یہ سواری اور دوسری سواریوں سے تیز چلتی ہے مگر اس میں عیب یہ ہے کہ مسافروں کو ان کے گھروں تک نہیں پہنچاتی بلکہ انھیں چوراہے کا صدقہ بنا کر وہیں چھوڑ دیتی ہے اور بقیہ منزل خود مسافر کو اپنا سامان پیٹھ پر لاد کر پیدل طے کرنی پڑتی ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ چلنے سے پہلے اس کے پیچھے سے اتنا دھواں اٹھتا ہے کہ پورا رستہ دھواں دھار ہو کے رہ جاتا ہے۔
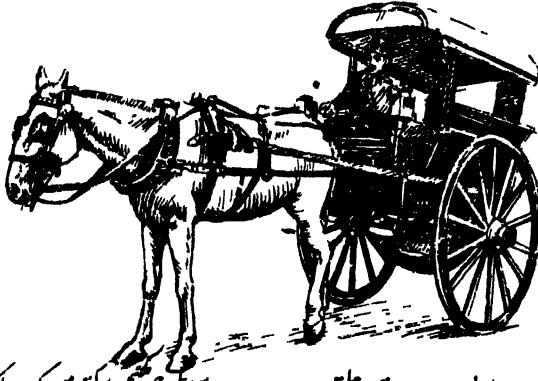
دوسری سواری ایسی ہے جس میں باہر کی طرف ایک جانور جتا رہتا ہے اور اندر ایک آدمی بیٹھا رہتا ہے۔ اس سواری کا نام جھٹکا ہے۔ یہ بڑی قدیم، تاریخی اور روایتی ہے۔ اس کے تین عنصروں میں سے ایک تو خود جھٹکا ہے دوسرے وہ جتا ہوا جانور جو ٹٹو کے نام سے مشہور ہے اور تیسرا جھٹکے والا یعنی وہ آدمی جو سامنے بیٹھا ہوا ٹخ ٹخ کر کے اسے چلاتا ہے۔

اس سواری کا نام جھٹکا شاید اس لئے پڑا کہ اس میں بیٹھنے والے کو جھٹکے پر جھٹکے کھانے پڑتے ہیں۔ جھٹکے کی تصویر موٹے لفظوں میں اس طرح کھینچ سکتے ہیں کہ یہ لکڑی کا ایک بڑا سا چوکور ڈبہ ہے، جس کے نیچے ایک لوہے کا ڈنڈا اڑا کر دو پیوں پر کس دیا ہے۔ دھوپ اور پانی کے بچاؤ کے لئے اوپر ایک چھت اور ہوا کے لئے پہلوؤں میں دو روشن دان بنا دیئے ہیں سواری کے چڑھنے اترنے کے لئے پیچھے ایک پٹ کی کھڑکی ہے اور ادھر ادھر سے دو لمبی لکڑیاں سامنے کی طرف نکلی ہوئی ہیں جنھیں برکل کہتے ہیں۔ ان برکلوں کے بیچ میں ٹٹو کو چمڑے کے تسموں سے

کس کر دو انکڑوں میں اٹکا دیا جاتا ہے۔

یہ ٹٹو بھی خاص قسم کا ہوتا ہے۔ اس کی شکل وصورت ومدار تاروں سے بہت ملتی ہے۔ اس لئے کہ اس کی بناوٹ میں دم کا حصہ زیادہ اور ٹٹو بہت کم ہوتا ہے۔ چلنے سے پہلے وہ سکڑتا ہے اور اپنی دم کو دونوں ٹانگوں کے بیچ میں زور سے دبا لیتا ہے۔ ٹٹو کی اس حرکت سے بیٹھنے والے کو ایک ایسا جھٹکا لگتا ہے جس سے ایک طرف تو اس کے سر کا اگلا حصہ جھٹکے والے کی پیٹھ سے ٹکراتا ہے اور دوسری طرف پچھلا حصہ کھڑکی کے کنارے سے ٹکر کھاتا ہے۔ مگر تھوڑی دیر میں ٹٹو کی رفتار ٹھیک ہوجاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیٹھنے والے کے صرف دونوں بازو جھٹکے کے اِدھر اُدھر کے روشن دانوں سے رگڑے پہ رگڑے کھاتے رہتے ہیں۔

بیٹھنے والے کے جھٹکوں اور حرکتوں کا دارومدار ٹٹو کی چال پر ہے۔ ٹٹو جس طرح چال چلتا ہے بیٹھنے والا بھی اسی ڈھب کے جھٹکے کھاتا ہے۔ مثلاً جب ٹٹو لہریا چلتا ہے تو بیٹھنے والا دائیں بائیں جھوکے کھاتا چلا جاتا ہے اور جب ٹٹو دُلکی چلتا ہے تو بیٹھنے والا اس طرح آگے پیچھے ہلتا ہے جس طرح مکتب کے بچے بغدادی قاعدہ پڑھتے وقت حرکت کرتے ہیں۔ بعض وقت چلتے چلتے ٹٹو کو بھوک لگتی ہے یا شاید اپنا گھر یاد آجاتا ہے تو بجائے آگے چلنے کے پچھلے پاؤں واپس ہونے لگتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دولتیاں بھی جھاڑتا ہے جو جھٹکے کے اگلے حصے یعنی پنکھے پر لگتی ہیں۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا میدان جنگ میں بم باری ہورہی ہے۔ اس حرکت سے اکثر کھڑکی کھل جاتی ہے چونکہ یہ اندر بیٹھنے والے کے لئے تکیے کا کام دیتی ہے اس لئے کبھی اس کے کھلتے ہی، وہ کھڑکی میں سے پھسلتا ہوا سڑک پر دھڑام سے گر پڑتا ہے۔ بعض جھٹکے والے گدیوں پر موم جامہ منڈھ کر، نشستوں پر رکھ دیتے ہیں تاکہ دولتیوں سے بم باری کرنے کی حالت میں کھڑکی کھل جائے تو بیٹھنے والے کو پھسلنے میں سہولت ہو اور وہ آسانی کے ساتھ مع گدّی کے سر کے بل گر پڑے۔

اپنے دبلے پتلے ٹٹو کی طرح جھٹکے والا بھی نہایت غریب اور مفلس مگر بڑا باتونی اور بڑا حاضر جواب ہوتا ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے ایک جھٹکے والا پتھرگٹی پر کھڑا ہوا آواز لگا رہا تھا۔ ایک سواری نام پلی اسٹیشن کو، آؤ صاحب آؤ، کہاں جائیں گے، سرکار آیئے بیٹھئے، ہوا کی طرح لے چلوں گا ہوا کی طرح، ایک صاحب آئے اور پوچھا کیا لو گے۔ جواب دیا، تقصیر آپ سے زیادہ کیا لینا ہے، بس بیٹھ جائیے، بس کا کرایہ دید یجئے، اللہ چاہے تو آپ کو بس سے پہلے پہنچا دوں گا۔ پوچھا، آخر کتنے پیسے، منہ سے تو بولو۔ جواب دیا، بس وہی دو آنے پیسے اور کیا۔ اس نے کہا ایک بات کہتے ہیں، دیکھو ایک آنہ دیں گے اور نام پلی کے موڑ پر اتر جائیں گے، بولو، کیا بولتے ہو۔ جھٹکے والے نے کہا کہ تقصیر!

یہ ایک آنے کے پیسے بھی کیوں دیتے ہیں۔ حفاظت سے رکھیئے بال بچوں کے کام آئیں گے، میرے ٹٹو کی دُم پکڑ کے بھاگتے چلو تو مفت پہنچ جائیں گے۔

اس ہیرا پھیری میں اگر کوئی اللہ کا بندہ مل گیا تو وہ فوراً اسے جھٹکے پہ بٹھا، ٹٹو سے یہ کہتا ہوا آگے بڑھا، ہاں بیٹا چلو! ناک کی سیدھ پر، ٹخ ٹخ، ٹخ، ہمارے سرکار کو بس پہنچنے سے پہلے پہنچاؤ۔ ٹٹو اس کی ٹیٹکاری پر دم دبا کر چل کھڑا ہوتا ہے اور یہ اپنا چابک ہیے میں اڑا دیتا ہے۔ پیا گھومتا جاتا ہے اور چابک میں سے کٹ کٹ، کڑ کڑ کی آوازیں رستہ چلنے والوں کے لئے الارم کا کام دیتی ہیں کہ ہوشیار، خبردار، سامنے سے ہٹ جاؤ، ورنہ کسی ٹکر وکر کے ہم ذمے دار نہیں۔ ادھر جھٹکے والا جھٹکے نشین سے مزے مزے کی باتیں شروع کر دیتا ہے۔ ایسے ایسے تاریخی حالات اور واقعات بیان کرتا ہے جو اس کے باپ دادا سے سینہ بسینہ چلے چلے آرہے ہیں اور دنیا کی وہ وہ تازہ خبریں سناتا ہے کہ بس معلوم ہوتا ہے کہ گویا رائیٹر کی ایجنسی اس کے گھر کی کسی کوٹھڑی میں سمٹ آئی ہے۔ کبھی اپنے ٹٹو کی تعریف میں خیالی گھوڑے سرپٹ دوڑاتا ہوا کہتا ہے۔ تقصیر! یہ ٹٹو ایسا ویسا نہیں، ہوائی گھوڑے کی نسل سے ہے۔ فراٹے بھرتا ہوا، ہوا سے باتیں کرتا ہوا، کیا تراٹ جارہا ہے۔ دیکھیئے نا، بسوں سے کیا مقابلہ کر رہا ہے۔ لوگاں باگاں بولتے تھے کہ بساں نکلیں گے تو جھٹکے قبرستان کو پہنچ جائیں گے اور ٹٹو قصائی کی دوکان پر لٹکتے نظر آئیں گے، مگر واہ رے میرے خواجہ، تیری بھی کیا شان ہے۔ تقصیر تیل بند ہو جائے تو دیکھنا بساں بند ہو جائیں گے مگر اللہ چاہے تو ہمارے جھٹکے اسی طرح زوروں پر چلتے رہیں گے۔

مرزا عصمت اللہ بیگ
(بہ اجازت حیدرآباد ریڈیو)

لطیفہ

ایک دیہاتی دوست سے ایک شہری دوست نے کہا کہ میں نے شہر میں ایک ریل گاڑی دیکھی ہے جس میں ہم بیٹھتے ہیں اور گاؤں کو آتے ہیں۔ اس کا رنگ کالا ہے اور اس کے منہ سے دھواں نکلتا ہے۔ یہ سننے کے بعد دیہاتی دوست کو بھی خواہش ہوئی کہ وہ بھی اسے دیکھے۔ اور دوسرے ہی دن وہ صبح شہر گیا جس وقت اسٹیشن پہونچا اس وقت اسٹیشن پر کالے رنگ کا گارڈ کالے کوٹ پتلون میں سگریٹ پیتے ہوئے ٹہل رہا تھا اور اس کے منہ سے دھواں نکل رہا تھا۔ یہ دیہاتی سمجھا کہ یہی گاڑی ہے اور وہ اس کے کندھوں پر سوار ہوگیا۔

حسین شریف درد

دنیا کے سات عجائبات

یوں تو دنیا خود ایک عجائب خانہ ہے لیکن اس عجائب خانے میں سے میری نظر میں سات چیزیں عجائبات کہلانے کی مستحق ہیں۔

(۱) ماؤنٹ ایورسٹ (۲) تاج محل (۳) دیوار چین (۴) پیسا کا ترچھا مینار (۵) آبشار نیاگرا (۶) رصد خانہ گرنیوچ (۷) اہرام مصر۔

اب میں ان سب کا تفصیلی ذکر نیچے درج کرتا ہوں۔

(۱) ماؤنٹ ایورسٹ :- یہ ایک پہاڑ کی چوٹی ہے اس پہاڑ کا نام ہمالیہ ہے جو دنیا کا بلند ترین پہاڑ ہے اس کی چوٹی ماؤنٹ ایورسٹ انتیس ہزار دو فٹ یعنی ساڑھے ۵ میل اونچی ہے اور سال کے بارہ مہینے برف سے ڈھکی رہتی ہے اتنی بلندی تک پہنچنے کے لئے کئی لوگوں نے کوششیں کیں جن میں امریکہ و پولینڈ کی جماعتیں مشہور ہیں اس پر چڑھنے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں ان کے حسب ذیل اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ یہاں بہت زیادہ سردی ہوتی ہے دوسرا سبب یہ ہے کہ اس پر چڑھنے والوں کو جو دقتیں پیش آتی ہیں اسے وہیں کے لوگ جانتے ہیں اگر برف پر گر جائیں تو پھر کبھی نہ اٹھ سکیں تیسرا سبب ہوا کی لطافت ہے وہاں کی ہوا اتنی لطیف ہے کہ چڑھنے والے کو آکسیجن کا ڈبہ ساتھ لے جانا پڑتا ہے۔ چوتھا سبب برف کی گہرائی ہے کبھی کبھی برف کے بڑے بڑے تودے لڑھکتے ہوئے نیچے آجاتے ہیں۔

(۲) تاج محل :- ہندوستان کی جنت نشانی آج سے نہیں بلکہ ڈھائی ہزار برس پیشتر سے مشہور ہے یہاں کی زراعت صنعت و حرفت کا دور دور شہرہ تھا یوں تو شروع ہی سے ہندوستانی تاریخی واقعات مشہور ہو چکے تھے لیکن سترہویں صدی بہت مبارک ہے اسی صدی میں جہانگیر و شاہجہاں ہندوستان کو جنت نشان...... بنا رہے تھے۔ جہانگیر و نورجہاں کی محبت بھری زندگی ختم ہوگئی اب ممتاز محل و شاہجہاں کی محبت مشہور ہوگئی تھی ان دونوں کی محبت نے جہانگیر و نورجہاں کی محبت کے افسانے لوگوں کے دلوں سے بھلا ڈالے اور اپنا قبضہ جمالیا واقعی ان دونوں کی محبت نورجہاں و جہانگیر کی محبت سے زیادہ گہری نکلی لیکن فلک کج رفتار کو کسی کی بھلائی اچھی نہیں دکھائی دیتی۔ ممتاز محل کو عدم آباد آنے کی دعوت ملی وہ جاتے ہوئے وصیت کرجاتی ہے کہ میری قبر پر ایک ایسا مقبرہ بنانا جس کی مثل کہیں نہ ملے خدا جانے کس ماہر تعمیرات نے اس عمارت کا نقشہ بنایا تھا کہ اس کے سامنے سے گزرتے ہی ہم اپنے آپ کو سلطنت مغلیہ کے دور میں محسوس کرتے ہیں اور شاہجہاں کو معمار بھی ایسے ملے کہ گویا قدرت نے ان معماروں کو صرف اسی کے لئے پیدا کیا تھا یہ عمارت سرتاپا سنگ مرمر کی ہے نفاست و کاریگری نے اس کی

خوبصورتی میں چار چاند لگا دیئے ہیں یہ عمارت فن تعمیر میں اول درجے کی سمجھی جاتی ہے۔

(۳) دیوار چین :۔ یہ عظیم الشان دیوار چین کی شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ تقریباً پانچسو میل تک چلی گئی ہے یہ زمین پر ۳۵ اور پہاڑوں پر ۱۵ فٹ بلند ہے اور اتنی چوڑی ہے کہ چار سوار اپنے گھوڑے ملا کر دوڑا سکتے ہیں یہ ایک تو دیوار کا کام دیتی ہے اور دوسرے مورچے کا۔ بہت مضبوط ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی کتابوں میں اس کا کئی جگہ ذکر آیا ہے کہ "سکندر اعظم نے چینیوں کو شمالی باشندوں کی دستبرد سے بچانے کیلئے یہ دیوار تعمیر کی تھی کہا جاتا ہے کہ یہ دیوار شمالی باشندوں کے ہاتھ قیامت کے قریب ٹوٹ جائے گی" چنانچہ یہی ہوا یعنی سال ڈیڑھ سال پیشتر جاپانیوں نے اسے توڑ دیا اس دیوار کا قرآن میں "سد سکندری" نام بتلایا گیا ہے لیکن تاریخ میں سکندر کے وہاں تک پہنچنے کا کوئی پکا ثبوت نہیں ہے۔

(۴) پیسا کا ترچھا مینار :۔ پیسا PISA اٹلی میں ایک مقام کا نام ہے یہیں یہ مینار سات منزلہ بنا ہوا ہے اس کے اطراف کئی بلند مکانات بنے ہوئے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ترچھا ہی بنایا گیا تھا اور اس کے گرنے کا کوئی خطرہ نہیں اس کو اگر تصویر میں دیکھا جائے تو جامٹری کے لحاظ سے یہ مینار سطح زمین کے ساتھ ۲۰ درجے کا زاویہ بناتا ہے اس کی پانچویں منزل سے سارے شہر پیسا اور گرد و نواح کے مواضع ہتیلی میں نظر آتے ہیں

اس عمارت کی تصویر دیکھنے سے بنانے والوں کی دماغی کاوشوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۵) آبشار نیاگرا :۔ یوں تو اس آبشار سے بھی بلند آبشار دنیا میں موجود ہیں دریائے زمبزی (افریقہ) کا آبشار وکٹوریہ ۳۶۰ فٹ بلند ہے خود ہندوستان میں میسور کا آبشار گروسپا جس کو وہاں کے لوگ "سیوا سمندرم واٹر فالس" کہتے ہیں ۳۰۰ فٹ سے زیادہ بلند ہے لیکن نیاگرا میں پانی کی جتنی مقدار آتی ہے اتنی دنیا کے کسی آبشار میں نہیں اس کی ایک دھار ½ میل چوڑی ہے۔ اور یہ ۱۶۷ فٹ کی بلندی سے گرتا ہے اس میں اتنا زیادہ پانی آنے کی وجہ یہ ہے کہ دریائے سینٹ وارنس پانچ بڑی بڑی جھیلوں سپیریر، ہیورن، مشیگن، ایری، انٹاریو میں سے گزرتا ہے ان کا مجموعی رقبہ صوبہ پنجاب کے برابر ہے جھیل ایری سے جھیل انٹاریو میں داخل ہوتے وقت دریا کا پانی ۱۶۷ فٹ کی بلندی سے گرتا ہے اس آبشار سے امریکہ میں جھیلوں کے علاقے کے شہروں میں روشنی کی جاتی ہے اور تنہا اس کی ایک دھار ۵۰۰ گھوڑوں کی طاقت رکھتی ہے

(۶) رصدخانہ گرینوچ :۔ لندن کے قریب ایک رصد خانہ ہے یہ دنیا میں سب سے بڑا رصدخانہ ہے یہاں سے اجرام فلکی کی رفتار وغیرہ کا مشاہدہ کیا جاتا ہے مشہور جغرافی خطوط طول بلد کا مرکزی دائرہ اسی رصدخانے پر سے گزرتا ہے۔ اس لئے اس دائرے کو مرکز مان کر مشرق و مغرب میں

خطوط طول بلد کھینچے جاتے ہیں۔

(۷) اہرام مصر۔ مصر پر کل ۲۴ چھوٹے بڑے خاندانوں نے حکومت کی ہے ان میں سے ۱۹ خاندانوں کے مقبرے مصر میں موجود ہیں یہ کل ستر کی تعداد میں مختلف مقامات پر پھیلے ہوئے ہیں ان میں اٹھارویں خاندان کے مقبرے بہت مشہور ہیں مصر میں سونے کی کثرت تھی اتنی کثرت کہ اب اگر وہی کان شاہ فاروق کی حکومت کو مل جائے تو حکومت مصر دنیا میں متمول ترین حکومت ہو جائے اس لئے اکثر مقبروں میں سونا ہی سونا نظر آتا ہے قاہرہ سے دریائے نیل کے کنارے کنارے ۶۰ میل تک اٹھارویں خاندان کے مقبرے ہیں اور ایک مصری بادشاہ (جو اسی خاندان سے تھا) کے مقبرے میں سے [illegible] سونے کی چیزیں نکلی ہیں کہ جن کا کوئی شمار نہیں صرف اس کی لاش پر سے ۱۴۳ چیزیں نکلیں جن میں سے صرف دو لوہے کی تھیں اور باقی سب سونے کی اس بادشاہ کا نام توت عنخ آمون تھا قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ انسان کو مرنے کے بعد اس کے اعمال کے مناسب راحت ملتی ہے وہ تعویز گنڈوں کے بہت معتقد تھے مردوں کی لاشوں کو مسالے لگا کر محفوظ کرنے میں یہ لوگ ماہر تھے۔ بادشاہوں کی لاشوں کو سونے سے منڈھا جاتا تھا اور اسی طرح مردے کی شبیہ تیار کی جاتی تھی کہ اصلی اور نقلی میں فرق کرنا ناممکن ہے اہل مصر اسی طرح کے بہت سے مجسمے تیار کر کے مقبروں میں کھڑا کر دیتے تھے اور ان مجسموں کو مردے کا ہمزاد قرار دیا گیا تھا مقبروں میں کھانے پینے کی چیزیں رکھ دی جاتی تھیں۔ ایک الگ کمرے میں ان ملازمین کو مار ڈالا جاتا تھا جو قبر والے کو پسند تھے وادی شاہان مصر میں ایک وادی ہے جس میں چھوٹے بڑے کل ۲۷ حکمران ابدی نیند سو رہے ہیں ان میں سے ایک توت عنخ آمون بھی ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے مسافرات یا دن میں جب چاہیں ان مقبروں کو دیکھ سکتے ہیں اور یہ رات بھر روشنی سے جگ مگ جگ مگ کرتے رہتے ہیں۔ فقط

محمد فیروز الدین صدیقی (رشدی کالج)

ہمارا سفر

میں اور میرے ایک دوست مقبول حسین چمن افضل گنج میں چہل قدمی کر رہے تھے جس کی بہار کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس کو تفریح کا شوق ہو ہم ٹہلتے ٹہلتے ایک ایسے خوشگوار مقام پر پہنچے جہاں نشستیں وغیرہ تھیں ہم دونوں بیٹھ گئے وہ منظر کچھ ایسا تھا کہ ہم دونوں پر خاموشی چھا گئی اس خاموشی کے قفل کو مسٹر مقبول نے اس طرح توڑا۔ بھائی احمد خاں میرے دل میں ایک خیال سما رہا ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ کیا خیال ہے مسٹر مقبول نے کہا بھائی خاں صاحب ایک عرصۂ دراز سے سفر کلیانی شریف کا خیال ہے مگر مجبور ہوں کہ کوئی ساتھی نہیں میں نے کہا ساتھی کی کیا ضرورت ہے جب کہ آپ موٹر اور ریل میں سفر کرتے ہوں مسٹر مقبول نے کہا ہاں بھائی یہ تو سچ ہے مگر میرا خیال بائیسکل پر سفر کرنے کا ہے میں نے کہا کہ بسم اللہ حاضر ہوں مقبول نے فرمایا آپ کی ہمت افزائی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں اچھا تو کل صبح چلنا چاہیئے میں نے کہا آپ سفر کی تیاری کر لیجئے اور سیکلوں کا انتظام بھی صبح چلینگے مختصر یہ کہ سیکل وغیرہ کے انتظام کے بعد صبح چھ بجے کے قریب ہم دونوں نے حیدرآباد سے کلیانی شریف کی راہ لی۔ تقریباً ۹ بجے کا وقت ہوگا کہ ہم رام چید دور پہنچ گئے وہاں ایک چھوٹی سی مسجد اور ایک چھوٹا سا آبدار خانہ تھا۔ ہم مسجد میں جا کر ناشتہ سے فارغ ہوئے مسٹر مقبول نے کہا کہ بھائی خاں صاحب موسم گرما ہے زیادہ ٹھیرنا مناسب نہیں۔ کیونکہ دھوپ بہت سخت ہو جاتی ہے میں نے کہا اچھا بھائی چلو تھوڑا رستہ طے کرنے کے بعد دھوپ کی شدت کی وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی مگر ہم اپنے صبر و استقلال کو برقرار رکھتے ہوئے اور رستے کے بڑے بڑے گھنے درختوں کے سایہ سے گذرتے ہوئے دن کے ۲ بجے کے قریب سداسیو پیٹھ پہنچے۔ آدھ گھنٹہ آرام لینے کے بعد پھر چلنے لگے ہم کچھ میل گئے تھے کہ ایک موضع ملا نام مجھے یاد نہیں وہاں ایک شخص ملا اس سے ہم نے پوچھا کہ یہاں سے ظہیرآباد کتنے میل ہوگا کئی میلوں کا فاصلہ بتایا جسے سن کر بھائی مقبول بڑے پریشان ہوئے خدا خیر کرے ایسے سفر کا۔ بہرحال ٹھیک ۷ بجے رات ظہیرآباد پہنچے یہاں پہنچنا تو خصوصاً میرے لئے دوزخ سے جنت میں داخل ہونا تھا۔ یعنی شب بھر کا قیام قرار پایا میں اور مسٹر مقبول کوئی ۷ یا ۸ بجے کے قریب کھانا کھا کر بیٹھے تھے کہ ادھر سے ایک پنڈت صاحب کا گذر ہوا۔ ہم نے شرکت تناول کی دعوت دی دو لقموں سے شرکت ——— فرمائی ختم تناول ——— کے بعد پنڈت صاحب کے ساتھ ہم نے آرام کیا۔ راستہ کی تھکن نے ہم کو مردہ بنا دیا تھا۔ اس کے بعد خواب غفلت سے بیدار ہوئے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پنڈت صاحب غائب ہیں تحقیق سے معلوم ہوا کہ پنڈت صاحب مسٹر مقبول کے جیب سے ایک کرنسی نوٹ مبلغ (صہ) روپیہ لے کر بھاگ گئے ہیں

مسٹر مقبول نے کہا جو کچھ خدا کو منظور تھا ہوگیا زیادہ رنج سے کیا فائدہ۔ میں نے کہا کہ بھائی مقبول آپ یہ سمجھ لیجئے کہ مصیبت پریشانی جو کچھ بھی ہو ہم کو اپنا ارادہ پورا کرنا ہے خدا کے فضل سے تقریباً ½ ۲ بجے کلیانی شریف پہنچے۔ کلیانی شریف میں پہنچنے کے بعد مسٹر مقبول نے کہا کہ

بھائی صاحب اشنان کرلینا چاہئے کیونکہ (۶۰) کوس کا سفر ہم نے طے کیا ہے غسل کے بعد مسٹر مقبول اپنے بچازاد بھائی کے دولت خانہ پر مجھے ساتھ لے گئے جو کہ مدرسہ انجمن اسلامیہ کے مدرس تھے اس کے علاوہ وہ شاخ ادارۂ ادبیات اردو کلیانی شریف کے مددگار مہتمم بھی ہیں انہی کے پاس ٹھہرے رہے۔ تناول طعام کے بعد گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی اثنا گفتگو میں مسٹر مقبول کے بھائی مسٹر تاج الدین صاحب نے کہا کہ جناب احمد خاں صاحب ہمارے پاس ادارۂ ادبیات اردو کی شاخ قائم ہوئی ہے۔ جس کو سن کر ...... خوشی و مسرت کی لہر دوڑ گئی کھانے کے بعد چہل قدمی کے لئے باہر نکلے تو دیگر مناظر نے مسرت میں سونے پر سہاگہ کا کام کیا وہ کیا تھا مسٹر تاج کئی بالغان کے ساتھ تعلیم و تلقین میں مصروف تھے دارالمطالعہ کا معائنہ کیا گیا جس میں ادارہ کی چند کتب نظر سے گذریں۔ گویا شب تمام ایسے مشغلوں میں گذری۔ بہرکیف صبح کے ناشتہ سے فراغت پائی۔

تقریباً ۱۲ بجے کا وقت ہوگا کہ مسٹر مقبول کی طبیعت چشمہ کی سیر کی طرف مائل ہوئی۔ ہم بھی مسٹر مقبول کی مدد کے لئے تیار ہوگئے آخر کار مسٹر مقبول چشمہ پہنچے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد مقبول نے ایک ایسی سرنگ لگائی جس کو خان جری کہتے ہیں میں اور میرے دوست مسٹر تاج و دیگر تماشائی حیرت و تعجب کر رہے تھے چشمہ کے اطراف واکناف سے واہ واہ کی صداؤں کا شور اس قدر گونجا کہ حاضرین نے کانوں میں انگلیاں رکھ لیں۔ واہ بھائی چشمہ کی سیر بھی خوب رہی۔ اور خوب رہا ہمارا سفر۔ یہاں سے نکلے ایک دوسرے موضع کو پہنچے جس کا فاصلہ کلیانی شریف سے تقریباً ۲ میل ہے وہاں کے مناظر کچھ عجب تھے جو کہ تحریر سے باہر ہیں۔ غرض مجھکو اور میرے دوست مسٹر مقبول کو دیہاتی زندگی بہت ہی پسند آئی پھر جلد واپس ہونیکا قصد ہوا عجب حالت رہی مختصر یہ کہ مسٹر تاج مع طلباء انجمن و طلباء ادارہ ادبیات اردو مع مدرسین مدرسہ بالغان تقریباً نصف میل تک ہمراہ آئے شکریہ ادا کرنیکے بعد ہم واپس ہوئے اور پہنچنے پر یہ رائے قائم کی کہ دیہاتی زندگی شہری زندگی سے بہتر ہے۔

احمد خاں

جانوروں کی عمریں

جانوروں کی عمر مقررہ ہوتی ہے اور پودے ایک خاص عمر میں مر جاتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل جانوروں کی عمر سے آپ بھی واقف ہو جاتے ہیں۔

خرگوش	کی عمر	۵ سال	ہوتی ہے
بکرے	،،	۱۲ ،،	،، ،،
بلی	،،	۱۳ ،،	،، ،،
کتا	،،	۴۰ ،،	،، ،،
بکری	،،	۱۵ ،،	،، ،،
گائے	کی عمر	۲۵ سال	ہوتی ہے
سور	،،	۱۰ ،،	،، ،،
گھوڑا	،،	۲۷ ،،	،، ،،
اونٹ	،،	۴۰ ،،	،، ،،
ببر	،،	۴۰ ،،	،، ،،
ہاتھی	،،	۱۰۰ ،،	،، ،،
مگرمچھ	،،	۳۰۰ ،،	،، ،،
تا ہبل	،،	۳۵۰ ،،	،، ،،
وہیل (مچھلی)		۵۰۰	

(ترجمہ) مس اقبال باسط علیخاں

جھوٹ کی سزا

امتحان کے دن قریب تھے اور محرم کی چھٹیوں کا آنا تھا۔ اور لطف یہ کہ میٹرک کا ہمارا امتحانی سال۔ کچھ تو ہمیں اپنی کامیابی کا خیال اور کچھ تو کیا ـــــ بلکہ ہم سے بھی زیادہ ہمارے والدین کو ہماری تعلیم کی طرف توجہ تھی۔

ہم رات دن امتحان کی تیاری میں گم سم رہتے تھے یہاں تک کہ ہمارے اس انہماک کے دیکھنے والوں کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ ہم اس سال کامیاب ہو کر ہی رہیں گے۔

ہم علی الصباح بیدار ہو جاتے تھے اور کتاب ہماری آنکھوں کے سامنے رہتی تھی اکثر اوقات ناشتہ کرنے کا وقت بھی گذر جاتا مگر ہم کو ہماری دھن تھی۔ کھانے پینے کا تو امتحان دینا نہیں تھا کہ فوراً وقت پر یا وقت کے پہلے کھا پی لیتے۔ بلکہ پڑھنے لکھنے کا دات بھی بہت دیر تک پڑھا کرتے۔ غرض ہماری اس طرز تعلیم سے والدین تو کیا ہمسایہ تک خوش تھے۔

ایک دفعہ میری ہم جماعت بہن اور میں دونوں مل کر الجبرا کے ایک ہی سوال پر غور کر رہے تھے اور حقیقت یہ تھی کہ سوال بہت اہم تھا اور ہماری استادنی صاحبہ نے اس کے سمجھانے میں اپنا بہت سا عزیز وقت بھی صرف کیا تھا۔ مگر اس پر بھی ہم کو اس کے حل کرنے میں طرح طرح کی دقتیں پیش آ رہی تھیں ہم اپنی غلطی کا احساس نہیں کرتے تھے۔ اسی غور و فکر میں تھے کہ دور سڑک پر یک بیک شور و غل اٹھا۔ ہم نے اس جانب کوئی توجہ نہ کی۔ بالآخر اسی شور و غل نے ہمیں بے چین سا کر دیا اور ہم نے مجبوراً دریچہ سے باہر جھانکا تو کیا تھا!

ایک مجمع کثیر تھا۔ چھوٹے بڑے جمع تھے۔ کوئی ہنس رہا تھا تو کوئی زور زور سے چیخ رہا تھا۔ آوازیں فضائے بسیط میں گونج تو رہی تھیں مگر صاف طور پر سنائی نہیں دیتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک پر مچھلی مارکٹ قائم کیا گیا ہے۔ ہم بے ساختہ ہنس رہے تھے مگر یہ سمجھ نہ سکتے تھے کہ آخر بات کیا ہے۔

اتنے میں خادمہ ہمارے کمرے میں آئی۔ میں نے اس سے پوچھا "خادمہ! یہ کیا ہو رہا ہے؟" خادمہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا! حضور! یہ سب لوگ ایک بوڑھے فقیر کو ستا رہے ہیں۔ اب اس فقیر کو راستہ چلنا تک دشوار ہو گیا ہے۔ جہاں کہیں فقیر دکھائی دیتا ہے دو چار بچے مل کر اس کو ستاتے ہیں ہم نے اس کے ستائے جانے کا سبب دریافت کیا تو خادمہ نے کہا۔ "یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایکدن اس فقیر نے اپنا گھر صاف کرنے کی غرض سے صفائی کی مزدورنی سے جاروب حاصل کی تھی۔ اور جب اس مزدورنی نے اپنی جاروب کا مطالبہ کیا تو بوڑھے فقیر نے جاروب کے دینے سے انکار کر دیا۔ مزدورنی تھی ہوشیار۔ فوراً صفائی کے جوان کو بلا لائی۔ جوان نے فقیر کو ڈانٹنا شروع کیا۔ محلہ کے چار لوگ بھی جمع ہو گئے۔

بالآخر یہ طے پایا کہ فقیر کی خانہ تلاشی لیجائے۔ چنانچہ خانہ تلاشی لی گئی اور پتہ لگ گیا کہ جاروب ایک پرانی چٹائی میں لپیٹ کر چھت پر بحفاظت تمام رکھی گئی تھی۔ راز کا فاش ہونا ہی تھا کہ اس دن سے اس محلہ کے بچے بوڑھے سب لوگوں نے اس کا نام "جھاڑو" رکھدیا۔ اور اب تک بھی یہی نام چلا آ رہا ہے۔ جہاں کہیں بیچارہ

نظر آجاتا ہے ۔ بچے بوڑھے جوان سب اس کے پیچھے ہو جاتے ہیں اور ایسا ہی اچھا خاصہ ایک مجمع ہو جاتا ہے ۔ حضور ! اللہ میاں نے اس بوڑھے فقیر کو اس جھوٹ کی سزا اگر ایسا اس طرح دی ہو کہ وہ دنیا میں دوسروں کے لئے بھی عبرت کا نمونہ ثابت ہو سکے ۔

اس واقعہ کے سنتے ہی ہم دونوں بہت ہنسے اور خاص طور پر ہم نے اس فقیر اور اس مجمع کے دیکھنے کے لئے دوبارہ اسی دریچہ سے باہر جھانکا تو نہ وہ مجمع کثیر ہی تھا اور نہ وہ بوڑھا فقیر ـــــ

سعیدہ خاتون

وطن والوں سے

نرالی ہیں ہوائیں آج دنیا کی فضاؤں میں
زمانہ گھر گیا ہے آج گوناگوں بلاؤں میں

عزیزانِ وطن یہ وقت غفلت کا نہیں اٹھو
زمانہ تیغ در دست و کفن بر دوش ہے دیکھو

تمھیں سے اس کی عزت ہے تمھی سے اس کی وقعت ہے
تمھارا نام ہے اس میں تمھاری اس میں شوکت ہے

کبھی یہ اتحادِ باہمی ہونے نہ پائے کم
کہ ہے نظمِ نظامِ قوم و ملت اس سے مستحکم

نفاقِ باہمی جس قوم میں یکسر ہوا پیدا
تباہی کے سوا اس کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا

تمھارے سامنے ہر دم رہے تصویرِ آزادی
سراسر ہو تمھاری زیست اک تفسیرِ آزادی

خبر ہے زندگی کا راز کچھ کرنے میں پنہاں ہے
تغافل کیش انساں بھی کوئی انساں میں انساں ہے،

زمانہ غافلوں کا ساتھ ہرگز دے نہیں سکتا
کہ لطفِ کاوش و ذوقِ عمل کا نام ہی جینا

جو رسوائی کا باعث ہو عمل ہے ایسا نادانی
"چیزے کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی"

وطن کے نام کی سوگند ہے تم کو وطن والو
نئے سر سے نظامِ زندگانی کو بدل ڈالو

غلام محی الدین خاں کیفؔ (عثمانیہ)

ملاح کا بیٹا

کسی گاؤں میں ایک ملاح رہا کرتا تھا۔ وہ اکثر اپنی بیوی اور بچے کو کشتی میں سیر کو لے جاتا تھا۔ ایک شام وہ انھیں دریا کی سیر کروا رہا تھا ہوا سائیں سائیں چل رہی تھی موجیں کنارے سے آ آ کر ٹکرا رہی تھیں ملاح کنارے سے بہت دور نکل چکا تھا یکایک کشتی بھنور میں آ کر الٹ گئی وہ تو کسی طرح نکل گیا اور اس کو یقین ہو گیا کہ اس کی بیوی اور کمسن بچہ ڈوب گیا۔ رات آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی سورج کی آخری کرن بھی غائب ہو گئی بیچارے ملاح کے لئے صرف موجوں کی آواز اور پرندوں کی پکار باقی رہ گئی۔ اس کا بیٹا چندن ڈوبا نہیں تھا بلکہ پانی کے تھپیڑوں سے کنارے پر آ گیا اتفاقاً ایک دوسرے ملاح کی نظر اس پر پڑی اور وہ اس کو اپنے گھر لے گیا وہ صرف بیہوش ہو گیا تھا تھوڑی دیر میں اسے ہوش آ گیا۔ اس ملاح کا کوئی بیٹا نہ تھا صرف ایک بیٹی موہنی تھی وہ چندن کو اپنے بچے کی طرح پالنے لگا۔ اور چندن بھی اس کو اپنا باپ سمجھتا تھا۔ اس واقعہ کو کئی سال گذر گئے اب چندن اچھا بڑا ہو چکا تھا وہ کرایہ پر اپنی کشتی چلایا کرتا تھا۔ گاؤں میں میلہ تھا کنارے پر خوب چہل پہل تھی چاندنی رات تھی چندن اور موہنی کشتی میں سیر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ جب وہ واپس ہوئے تو کنارے پر ایک بوڑھا روتا ہوا دکھائی دیا۔ یہ دونوں اس بوڑھے کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ کنارے کے اس پار جانا چاہتا تھا کسی نے اس کی پوٹلی چرالی جس میں اس کی کل چیزیں تھیں۔ بوڑھا بولا بابا میرا کوئی نہیں میں تنہا ایک جھونپڑی میں رہتا ہوں یہ سن کر چندن نے کہا آؤ ہم تمھیں اپنے گھر لیے چلتے ہیں۔ تم وہاں اپنے گھر کی طرح رہنا وہ اس کو اپنے گھر لایا اور باپ سے کہنے لگا۔ یہ بہت دکھی ہیں ان کا کوئی نہیں ہے ہم انھیں اپنے پاس رکھیں گے۔ موہنی بوڑھے کے پاس بیٹھ گئی چندن کشتی لے کر چلا گیا موہنی کے باپ نے اس بوڑھے سے پوچھا۔ تم کون ہو کیا تمھارا کوئی نہیں بوڑھا بولا کئی سال ہو گئے ہیں کرایہ پر اپنی کشتی چلایا کرتا تھا ایک روز میں اپنی بیوی اور بچے کو کشتی پر سیر کروا رہا تھا کہ کشتی الٹ گئی اور وہ دونوں ڈوب گئے اب میرا کوئی نہیں۔ موہنی کے باپ نے پوچھا کیا تمھارے بچے کے گلے میں کوئی چیز تھی؟ بوڑھے نے چونک کر کہا ایک چاندی کا تعویذ اسکے گلے میں تھا کیا تمھیں اس کا کوئی پتہ معلوم ہے موہنی کی ماں نے وہ تعویذ لا کر دکھایا جو چندن کے گلے میں پایا گیا تھا۔ بوڑھا تعویذ کو دیکھکر کہنے لگا یہ وہی ہے۔ بتاؤ میرا بیٹا کہاں ہے۔ ملاح نے کہا وہ تمھارا ہی بیٹا تھا جس نے تمھیں یہاں لایا وہ اب آتا ہی ہوگا۔ دور سے چندن کی کشتی دکھائی دی جب وہ نزدیک آئی تو بوڑھا دوڑ کر اپنے بیٹے سے لپٹ گیا۔ پھر موہنی کے باپ نے چندن کو سارا قصہ سنایا وہ بھی اپنے باپ سے مل کر بہت خوش ہوا چندن کی شادی موہنی سے ہو گئی اور وہ سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔

صغراس عبدالرحیم

رات کے کوئی دس بجے کا وقت ہوگا میں پڑھنے سے فارغ ہوکر اپنے کمرہ میں چارپائی پر لیٹی تھی ۔ خیال ہوا کہ ابھی تو صرف دس بجے ہیں چلو کسی اور کتاب کا مطالعہ کریں میز سے ایک رسالہ اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد میری آنکھ سامنے والی کھڑکی پر پڑی کیا دیکھتی ہوں دو بہت ہی ڈراونے ہاتھ میری جانب بڑھ رہے ہیں میں پہلے ہی سے بلا کی ڈرپوک ہوں بہت گھبرائی غور سے دیکھنا شروع کیا تھوڑی دیر میں ایک صورت بھی نظر آنے لگی میں جھٹ رسالہ پھینک لحاف اوڑھ لی آنکھیں خوف سے بند کرلیں ڈر کا یہ عالم تھا کہ آواز نکالنا دوبھر تھا بھاگنا چاہتی تھی لیکن باہر جانے کا دروازہ کھڑکی کے بالکل قریب تھا ۔ آنکھ بند کرکے سو جانے کی کوشش کرتی مگر جہاں سے آنکھ بند کی بس وہی صورت نظر آتی طرح طرح کے خیالات دماغ میں چکر لگا رہے تھے ۔ ادھر اسکول کا ڈر کیونکہ ۸ بجے کے اسکول ۔ امتحان کا زمانہ ۔ رات کے کوئی چار بجے خدا خدا کرکے میری آنکھ لگ گئی سویرے ہی ۔ عارفہ نے آکر جگا دیا اٹھو آپا جان کب تک سوتی رہوگی میں اٹھی اور پھر سے کروٹ بدل کر سو گئی نہ معلوم کتنے دفعہ عارفہ نے آکر جگایا ۔ آخر تنگ آکر بیچاری اسکول روانہ ہوگئی ۔ میری آنکھ ساڑھے گیارہ کے قریب کھلی ۔ بھوک بیحد لگ رہی تھی ۔

جلد منہ دھوکر امی جان کے پاس گئی امی جان تعجب سے کہنے لگیں ۔ کیوں تم اب تک اسکول نہیں گئیں ۔ میں نے خیال کیا اگر رات کا واقعہ بیان کیا جائے تو ایک بزدلی ظاہر ہوگی بہتر ہے کہ کوئی حیلہ بنا دیا جائے میں نے کہا امی آج سر میں بہت درد تھا ۔ جس کی وجہ سے ناشتہ کیا اور نہ اسکول گئی ۔ خیر امی نے جو کچھ بچا تھا منگوایا وہاں سوائے دال خشکے کے اور کچھ نہ تھا بھوک کے وقت ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے ۔ جلد ناشتہ سے فارغ ہوکر اپنے کمرے میں آئی اور سوچنا شروع کیا کہ امی کو تو ایک حیلہ بتا دیا کل ٹیچر کو بھی کچھ حیلہ بنا دینگے لیکن عارفہ سے کیا کہیں ورنہ وہ شریر ہمارے دیر سے اٹھنے کو امی سے کہدے گی ۔ خیر اس کے لئے بھی ایک ترکیب سوچ لی ۔ ایک بجے عارفہ اسکول سے آئیں میں نے فوراً بلایا اور کہا دیکھو بھئی یہ تمہارے امتحان کا زمانہ ہے ۔ اگر صبح کا واقعہ تم امی سے کہدوگی تو میں تمھیں کسی قسم کی مدد نہیں دوں گی بیچاری پڑھنے میں بہت کمزور تھی بہت گھبرائی اور کہنے لگی میں ہرگز بیان نہ کرونگی آپ اطمینان رکھئے اس دن سے میں نے امی جان سے کہکر دوسرا کمرہ لے لیا پھر اب تک ویسا ڈراؤنا واقعہ پیش نہیں آیا ۔ یہ قصہ پڑھ کر بہنیں ہماری بہادری پر خوب ہنسیں گی ۔

مس نور فاطمہ سید نور العلیٰ

دیہاتی زندگی

شہروں کے عالیشان محلوں میں رہنے والے بھلا کیا جانیں کہ دیہات والے مناظر قدرت کی دلچسپیوں سے کس طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔

شہری تو ایک ایسی دنیا میں رہتے ہیں جہاں عیش اور صرف عیش ہی کا دورہ ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ پیدا کس لئے کئے گئے ہیں — ان کا مقصد آفرینش کیا ہے۔ وہ تو صرف پیدا ہوتے ہیں اور جب جوان ہوتے ہیں تو خود کو عیش اور مسرت کے بے پایاں سمندر میں ڈھکیل دیتے ہیں — پھر مر جاتے ہیں — ایک معمولی انسان کی طرح۔ زندگی کا تو یہ مقصد نہیں ہونا چاہئے برخلاف اس کے دیہاتیوں کو اپنے فرائض کا کس قدر احساس ہے جس کے رہنے کے لئے بانس کی جھونپڑی تک میسر نہیں ہوتی۔ اس کو معلوم ہے کہ وہ دنیا میں صرف اس لئے پیدا ہوا ہے کہ وہ اپنی محنت کشی سے اپنے ہی ہاتھوں سے دوسروں کو کھلائے اور خود نہ کھائے۔ تمام دن محنت شاقہ کے بعد اس کو چند روٹی کے سوکھے ہوئے ٹکڑے ملتے ہیں — یہی اس کی غذا ہوتی ہے لیکن وہ ان ہی سوکھے ہوئے ٹکڑوں کو کھا کر ہم سے زیادہ خوش رہتا ہے — کیوں — محض اس لئے کہ وہ دنیا اور اس کے عارضی تفکرات سے کوسوں دور ہے ابھی صبح بھی نہیں ہونے پاتی کہ غریب دیہاتی اپنی نیند کا پورا پورا مزہ لے چکتے ہیں کچھ دیر تو وہ خود کو مناظر قدرت کی دلچسپیوں میں گم کر دیتے ہیں پھر اپنے اپنے کھیتوں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں — دور سے لہلہاتا ہوا کھیت ان کو خوش آمدید کہتا ہے — حقیقت تو یہ ہے کہ وہ لوگ قدرتی مناظر کے سچے پرستار ہوتے ہیں۔ وہ محنت کرتے ہیں اور یہی ان کی تفریح، ورزش اور محنت ہوتی ہے۔

انکی زندگی بالکل سادہ ہوتی ہے مگر وہ لوگ خلوص کے پتلے ضرور ہوتے ہیں۔ ان کا انتقام بہت خوفناک ہوتا ہے مختصر یہ کہ وہ شہریوں سے بدرجہا بہتر ہوتے ہیں

محمد رفیع الدین فاروقی آزاد

لڑکپن

لڑکپن پڑا سو رہا ہے خبر کچھ نہیں ہے
وہ مدہوش بچہ وہ خاموش بچہ
زمانہ کسے کہتے ہیں کیا وہ جانے
کوئی بھی ہو سچا کوئی بھی ہو جھوٹا
نہ شب کی خبر ہے نہ دن کی خبر ہے
کہیں ہو اندھیرا کہیں ہو اجالا
زمیں پر ہو پتھر کہ لعل و جواہر
نہیں جانتا وہ برا اور اچھا
چمن ہو کہ صحرا کسی کا نہیں غم
نہ جینے کی خواہش نہ مرنے کا کھٹکا
ہے معصوم صورت تو ہے پاک سیرت
ہے لاریب اس پر خدا ہی کا سایہ
ہے بیداغ دل اس کا یا آئینہ ہے
جو رخسار گل ہے تو لب اس کا غنچہ
نظر میں کشش ہے ادائیں لچک ہے
اسے پیار کرتا ہے اللہ کا جلوہ
لڑکپن کی باتیں ہیں رونق کچھ ایسی
کہ ان کو کوئی بھی نہیں بھول سکتا۔

علی حسن رونق

حساب کا پرچہ

ٹھیک بارہ بجکر تیس منٹ پر گھنٹی بجی اور حساب کا پرچہ ختم ہوا۔ حساب میرا ایک ایسا غیر دلچسپ مضمون ہے کہ میں نہ کبھی اس میں کامیاب ہوا اور نہ ہوں گا۔ میرا دل دھک دھک رہا تھا کیونکہ مجھے یہ معلوم تھا کہ میں حساب کے پرچہ میں کیا کرنے آرہا ہوں پرنسپل صاحب کی مہربانی کہئے یا میری حسابی قابلیت کہ میں نے میٹرک کے آزمائشی امتحان میں بہت اعلیٰ درجہ کے نمبرات حساب میں حاصل کئے۔ خیر میں خوب دھکے کھاتے ہوئے کمرۂ امتحان سے باہر نکلا اور نکلنے کے ساتھ ہی سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ہر لڑکے کے منہ کے سامنے اپنے سوال کا پرچہ رکھدیا (جسکے حاشیہ پر جواب درج تھے) اور لگا پوچھنے "دوست دوست چوتھے سوال کا جواب چودہ صحیح ہے نا اور دسویں کا جواب سات بٹے دس ہے ($\frac{7}{10}$) ذرا دیکھئے تو آپ پاس کیا آیا ہے۔ اور وہاں جامیٹری کے [illegible] میں ڈو [illegible] کٹ جاتے ہیں کیوں ان صاحب کو اپنی پڑی تھی انھوں نے دیکھا کہ ایک جگہ بہت سے لڑکے کھڑے ہیں وہاں پہنچ کر جو ابوں کو جو ملاتا ہوں تو میرے جوابات بالکل غلط نکلے۔ جوابات ملا رہے ہیں تو اس طرف اس انداز سے کہ جیسے میں نے انھیں پکڑ لیا تھا اور میں ان کے پیچھے لپکا جیسے انھیں پھر پکڑنا ہے۔ خیال کیا کہ چلو جامیٹری تو صحیح ہوگی نظر پلٹی تو دیکھا ایک صاحب زمین پر اپنی انگلی سے جامیٹری کی شکل نبا رہے ہیں اور کم از کم بیس پچیس لڑکے ان کو گھیرے ہوئے ہیں میں جو دوڑا کر سب کے اوپر سے چھلانگ لگاتے ہوئے گرا تو سیدھے اس شکل پہ جو زمین پر بنائی جا رہی تھی۔ اتفاق سے ان صاحب کی انگلی جس سے کہ وہ شکل نبا رہے تھے ہمارے سینڈل کی ایڑی کے نیچے آگئی اور میرا خیال ہے کہ ان کی انگلی کی اچھی خاصی پتلون نما استری ہوگئی ہوگی" ارے" کہہ کر انھوں نے انگلی کھینچی اور میری طرف غصے سے دیکھنے لگے۔

"اوہو معاف فرمائیے" بدحواسی میں میرے منہ سے نکلا وہ پھر شکل کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اب میں نے شکل کی طرف دیکھا تو ہمارے رہے سہے حواس بھی غائب ہوگئے کیونکہ میرا [illegible] اس سے بالکل مختلف تھا۔

پیچھے سے آواز آئی "رفیق" میں نے پلٹ کر دیکھا تو مظفر منہ کھولے میری طرف بھاگا چلا آرہا ہے۔ اس نے چیخ کر کہا۔

"مار دیا خاں۔ مار دیا ارے ہاتھ ملا" اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا" پانچ سوال [illegible] R ہیں۔ تو نے کتنے سوال صحیح کئے؟" میں نے منہ بنا کر اپنا پرچہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے زور زور سے سب جواب پڑھے اور بڑی متانت سے بولا۔

"ارے یہ تو سب غلط ہیں اب تک میری نظر لڑکیوں کی طرف نہیں پڑی تھی میں نے خیال کیا چلو دیکھیں ان عورتوں میں سے کسی کا جواب میرے جواب سے ملتا ہے یا یہ بھی مردوں کی طرح حساب میں کوری نکلتی ہیں۔ مگر کانوں نے یہی سنا کہ "آپکا جواب غلط ہے" اب میں بڑا سٹپٹایا نتیجہ نکلنے پر خیال میں نام کا شائع نہیں ہونا والد محترم کا غصہ بھرا چہرہ دوستوں کے جملے اور سب سے بڑھ کر پرنسپل صاحب کی طرف سے ہماری اچھی خاصی ضیافت تھوڑی دیر بعد ایک لڑکی اس بدحواسی سے اندر سے نکلی کہ مجھ سے آٹکرائی اور میں اوندھے منہ زمین پر گر تے گرتے بچا اور اب میں اسے ملامت ہی والا تھا اس نے خوشی سے کہتے ہوئے زمین پر سے پرچہ اٹھالیا" ارے چوتھے نمبر کا جواب تو بالکل صحیح ہے دسویں کا جواب بھی صحیح۔ اور جامیٹری کا [illegible] بھی مل ہوا ہے میں مارے خوشی کے بجائے پرچہ ہاتھ سے لینے کے اسکی ساڑی کا پلو کھینچ ڈالا اور ساڑی جو کاندھے پر کانٹے سے لگی تھی اس جا لٹکی سے نیچے تک سمٹ گئی جیسے ہم دونوں کا حاشیہ [illegible] میں بہت گھبرا گیا مگر اس نے کہا "خیر جانے دیجئے میرے اور آپکے جوابات ملتے ہیں ہم دونوں کامیاب ہو جائیں گے"۔ یہ میری اور زہرہ کی پہلی ملاقات تھی۔ اتنے میں گھنٹہ بجا اور ہم دوسرے پرچہ کیلئے کمرۂ امتحان میں داخل ہوگئے۔ امتحان کا نتیجہ نکلا تو ہم دونوں کا نام غائب تھا۔ زہرہ کی مجھ سے شادی ہوگئی ہے۔ اور سات سال سے برابر ہم دونوں میاں بیوی میٹرک کا ۴۷

* امتحان دے رہے ہیں [illegible] ہر سال حساب میں فیل [illegible] اتفاق [illegible] جوابات ایک ہی [illegible] فقط [illegible] رفیق

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳

ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹

رجسٹرڈ ایم ۳۹۵۰

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

کتاب	صفحات	قیمت آنہ	قیمت روپیہ
من کی بیتا	۸۰	۸	
سرگزشت غالب	۲۴	۸	
نظام الملک	۳۸	۴	
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۸	۳
دکن نمبر (۷۸ تصاویر)	۱۲۸		۲
ارمغان جذب	۱۲۰	۱۲	
سوتیلی ماں	۴۸	۴	
سر سید احمد خاں	۱۶	۲	
سر سالار جنگ	۴۸	۶	
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۴	۱
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۴	۱
اقبال نمبر	۱۶۸	۴	۱
سائنس کے کرشمے	۱۱۲		۱
رسائل طبیہ			
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۱۲	۲
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۸	۲
دادا بھائی	۱۶	۴	
اردو نامہ	۲۰۰		۲
ارسطو جاہ	۶۵	۶	
عماد الملک	۴۰	۶	
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۶	۲
,, ,, دوسری کتاب	۵۶	۶	۴
محمد حسین آزاد	۲۰۰		۲
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۴	۱
فن تقریر		۸	
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴		۱
پانی کی کہانی	۴۸	۶	

کتاب	صفحات	قیمت آنہ	قیمت روپیہ
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۴	۱
ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری	۱۸۴	۸	۱
ہوش کے ناخن	۹۴		۱
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹		۱
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۸	۱
متاع سخن	۱۲۴	۱۲	
کیف سخن	۱۲۲	۱۲	
بادۂ سخن	۱۲۷	۱۲	
سراج سخن	۱۵۲	۱۲	
ایمان سخن	۱۲۰	۱۲	
فیض سخن	۱۴۴	۱۲	
مرقع سخن جلد اول صفحہ (۴۰۰) ۵۰ تصاویر			۵
,, ,, دوم ,, ,,			۵
نقد سخن صفحہ	۱۷۵		۱
نذر ولی	۹۴۲	۸	۲
گریہ و تبسم	۱۹۲		۲
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴		۱
من کی دنیا	۱۴۵		۱
مدراس میں اردو	۱۹۶	۸	۱
محرم نامہ	۱۱۲		۱
نذر دکن	۱۰۴	۴	۱
روح غالب	۲۴۰	۸	۳
عاصمہ	۲۰۰	۴	۱
دفتری معلومات		۶	
آبدوز کشتیاں اور سرنگ		۶	
اردو مثنوی کا ارتقا		۱۲	۱

حیدرآباد پرنٹنگ ورکس

سب رس

ادارہ ادبیات اردو

حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش
سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہد
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی
معین الدین احمد انصاری

سب رس

لسان شدہ صفحہ ۱۵۳
لسان شدہ سرطانیہ ۳۹۵۰ ۸۸
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۱۰)
اکتوبر ۱۹۴۰ء

جلد ۳ — بابت اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء — شمارہ ۱۰

تصویریں

۱ کتبہ قدسیہ بصیرہ دہلوی   ۲ سید علی منظور حیدرآبادی

(فہرست مضامین)

خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیریت آباد سے شایع ہوا۔

سید علی منظور حیدرآبادی

کتبۂ مرقد شاہ نصیر دہلوی
محاسب ادارۂ ادبیات اردو

اردو امتحانات کے نتیجے

۱۶ تا ۱۸ اگست سنہ ۱۹۴۳ء کو ادارہ کی طرف سے جو اردو امتحانات لئے گئے تھے ۔ ان کے نتائج کی تفصیل یہ ہے۔

مرکز بلدہ سے **امتحان اردو دانی** میں کل ۳۶ امیدوار شریک ہوئے جن میں سے ۲۹ حاضر رہے۔ اور یہ سب کے سب کامیاب ہوئے ان میں ایک نے امتیاز حاصل کیا۔

امتحان اردو عالم میں کل ۲۳ امیدواروں نے شرکت کی جن میں سے ۲۰ حاضر تھے۔ گیارہ امیدواروں نے کامیابی حاصل کی۔ نتیجہ ۵۵ فیصد سے زیادہ رہا۔

امتحان اردو فاضل میں نو (۹) امیدوار شریک اور چار کامیاب ہوئے۔ نتیجہ ۴۴ فیصد رہا۔

امتحان خوشنویسی میں پانچ امیدوار شریک ہوئے جن میں سے چار حاضر تھے۔ تین کامیاب ہوئے ان میں سے ایک نے درجۂ اول حاصل کیا۔

زنانہ مرکز بلدہ سے **امتحان اردو دانی** میں گیارہ طالبات شریک اور کامیاب ہوئیں۔ جن میں سے چھ نے امتیاز حاصل کیا اور ایک تو پورے امتحان میں اول آئی۔ اور انعام کی مستحق قرار دی گئی۔

امتحان اردو عالم میں آٹھ طالبات شریک اور سات حاضر تھیں۔ جن میں سے پانچ کامیاب ہوئیں۔ اور دو نے درجۂ اول حاصل کیا۔ نتیجہ ۷۱ فی صد رہا۔

امتحان اردو فاضل میں دو طالبات نے شرکت کرکے کامیابی حاصل کی۔ جن میں سے ایک پورے امتحان میں اول آئی اور "طیبہ بیگم" مڈل کی مستحق قرار پائی۔

مرکز پربھنی سے **امتحان اردو دانی** میں ایک امیدوار نے شرکت کرکے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔

امتحان اردو عالم میں پندرہ امیدواروں نے شرکت کی جن میں سے چودہ حاضر تھے۔ اور تیرہ کامیاب ہوئے۔ ایک نے درجۂ اول حاصل کیا اور پورے امتحان میں اول آیا۔ نتیجہ ترانوے فیصد رہا۔

امتحان خوشنویسی میں ایک امیدوار نے شرکت کی لیکن ناکام رہا۔

مرکز گلبرگہ سے **امتحان اردو دانی** میں پندرہ امیدوار شریک ہوئے جن میں سے دس حاضر تھے۔ نو کامیاب ہوئے اور ایک نے امتیاز حاصل کیا۔ نتیجہ نوّے فیصد رہا۔

امتحان اردو عالم میں چودہ امیدوار شریک اور نو کامیاب ہوئے اس طرح نتیجہ چونسٹھ فیصد رہا۔

مرکز کلیانی سے **امتحان اردو دانی** میں تینتیس امیدوار شریک اور انتیس حاضر تھے۔ جن میں سے پچیس کامیاب ہوئے اور دو نے امتیاز حاصل کیا۔ نتیجہ ۸۶ فی صد رہا

امتحان اردو عالم میں نو امیدوار شریک اور پانچ کامیاب ہوئے۔ نتیجہ ۵۶ فیصد رہا۔

زنانہ مرکز کلیانی سے **امتحان اردو دانی** میں دو طالبات نے شرکت اور کامیابی حاصل کی۔

مرکز گشتگی سے **امتحان اردو دانی** میں اکسٹھ امیدوار

نے شرکت کی جن میں سے بیالیس حاضر تھے۔ اکتالیس امیدوار کامیاب ہوئے۔ تین نے امتیاز حاصل کیا۔ جن میں سے ایک مستحق انعام قرار پایا۔

امتحان اردو عالم میں تین امیدوار شریک تھے جن میں سے ایک کامیاب اور مستحق انعام قرار دیا گیا۔ نتیجہ ۳۳ فیصد رہا۔

امتحان خوشنویسی میں چار شریک اور دو کامیاب ہوئے۔ ایک مستحق انعام قرار دیا گیا۔ نتیجہ پچاس فیصد رہا۔

زنانہ مرکز کشتگی سے **امتحان اردو دانی** میں گیارہ طالبات شریک ہوئیں جن میں سے دس حاضر اور کامیاب ہوئیں۔ اور ایک مستحق انعام قرار پائی۔

بہ حیثیت مجموعی جملہ امتحانات کے کامیاب طلبہ کا اوسط یہ رہا

اردو دانی — ایک سو چونتیس حاضر۔ ایک سو اٹھائیس کامیاب۔ پندرہ بدرجۂ امتیاز۔ نتیجہ چھیانوے فیصد۔

اردو عالم — اڑسٹھ حاضر۔ چوالیس کامیاب۔ تین بدرجۂ اول۔ نتیجہ پینسٹھ فیصد۔

اردو فاضل — گیارہ حاضر۔ چھ کامیاب۔ تین بدرجۂ دوم۔ نتیجہ پچپن فیصد۔

خوش نویسی — نو شریک۔ پانچ کامیاب۔ ایک بدرجۂ اول نتیجہ ۵۵٫۵ فیصد۔

جملہ امتحانات کے نتیجے درج ذیل ہیں۔

اردو فاضل

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے۔

مرکز	داخلہ نمبر	نام	درجہ کامیابی
بلدہ	۹	بلقیس بانو .... (مستحق انعام طیبہ بیگم مڈل)	دوم
"	۲	خورشید بیگم	دوم
"	۱۱	محمد مختار احمد (بی ایس سی) .	دوم
"	۷	علی حسن	سوم
"	۱	سید کلیم اللہ حسینی (منشی فاضل)	سوم
"	۴	مظہر الدین احمد قریشی	سوم

اردو عالم

ناموں کی ترتیب بلحاظ نشانات محصلہ کی گئی ہے۔

مرکز	داخلہ نمبر	نام	درجہ کامیابی
پربھنی	۳۵	اشرف الدین فیضی .... (مستحق انعام ادارہ)	اول
بلدہ	۶۹	عصمت النساء بیگم	اول
"	۶۸	محمودہ بیگم	اول
کلیانی	۱	محمد مخدوم	سوم
"	۲	سید قادر	دوم
"	۳	غلام معین الدین	سوم
"	۵	محمد عبد الکریم	دوم
کشتگی	۱۰	لبٹیا (مستحق انعام کشتگی معطیہ (مولوی احمد عبد اللہ صاحب لنگسگور)	سوم
گلبرگہ	۱۱	شیخ احمد	دوم
"	۱۵	سید ضیاء الدین	سوم
"	۱۶	محمد عبد الحمید	دوم
"	۱۷	محمود احمد انصاری حسرت	دوم
"	۱۸	محمد جعفر	سوم

مرکز	نمبر	نام	درجہ
گلبرگہ	۱۹	سید النصر علی	دوم
"	۲۰	محمد عمر خاں خیام	سوم
"	۲۱	نیاز علی خاں نیاز	دوم
"	۲۲	محمد عبدالرشید	دوم
پربھنی	۲۴	حمید اللہ خاں شیدا	دوم
"	۲۶	مرزا نذیر بیگ	دوم
"	۲۷	محمد یٰسین جلالی	دوم
"	۲۹	محمد ناصر	دوم
"	۳۰	امین الدین احمد	دوم
"	۳۱	وجاہت علی	دوم
"	۳۲	سید صدر الدین ہاشمی	دوم
"	۳۳	غلام محمد یوسف	دوم
"	۳۴	غلام حسن صدیقی	دوم
"	۳۶	سید عبدالرزاق جعفری	دوم
"	۳۸	احمد بن محمد	دوم
"	۳۹	محمد اختر حسین فاروقی اختر	دوم
بلدہ	۴۴	خواجہ خلیل الدین احمد	سوم
"	۴۵	ابوالحسنات محمد الحسینی	سوم
"	۴۷	محمد عبدالکریم	سوم
"	۴۹	سید خواجہ محمود قریشی	دوم
"	۵۰	محمد اعظم صدیقی	دوم
"	۵۱	محمد غوث الدین داؤدی	سوم
"	۵۲	میر حبیب علی امدادی	دوم
"	۵۳	غلام غوث (بی ایس سی)	دوم
"	۵۶	محمد سرور دکھنی	سوم
"	۶۰	محمد رفیع الدین	سوم

مرکز	نمبر	نام	درجہ
بلدہ	۶۷	محبوب فاطمہ	دوم
"	۷۰	غوثیہ نیر الدین	دوم
"	۷۱	ولی النساء بیگم	سوم
کلیانی	۲۷	محمد قاضی الدین	دوم
بلدہ	۷۴	میر یٰسین علی	سوم

خوش نویسی

مرکز	نمبر	نام	درجہ
بلدہ	۶	ابوسعد سید اسمٰعیل سید .... (مستحق انعام ادارہ)	اول
کشتگی	۹	کریم داد خاں .... (مستحق انعام کشتگی عطیہ مولوی محمد حسین صاحب ہم سالگی)	دوم
بلدہ	۳	محمد عبدالمجید خاں قائم خانی	سوم
"	۵	شیخ احمد	سوم
کشتگی	۸	سدرامیا	سوم

اردو دانی

حسب ذیل امیدوار بدرجۂ امتیاز کامیاب ہوئے ہیں اور ان کے ناموں کی ترتیب نشانات محصلہ کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ ان سب کو ادارہ کی طرف سے ایک ایک سلیس اردو کتاب بطور انعام دی جائیگی۔

مرکز	داخلہ نمبر	نام
بلدہ	۱۴۳	امجدی بیگم۔ (مستحق انعام عطیہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ)
کشتگی	۱۶۴	کریم داد خاں (مستحق انعام عطیہ جناب محمد عبدالستار صاحب)
بلدہ	۱۴۶	عزیز بیگم ....
"	۱۴۷	جانی بیگم ....
پربھنی	۱۲۴	سید شمس الضحیٰ ....
بلدہ	۱۳۷	ثریا سلطانہ ....
"	۱۴۵	رفیع النساء بیگم ....
"	۱۴۴	سعید النساء بیگم ....

گلبرگہ	۱۵۳	شوکت علی	بلدہ	۱۷	محمد عثمان علی ....
کشتگی	۱۳۲	بنکن گوڑا	کلیانی	۱۱۰	مہادیو سنگہ ....
"	۱۶۳	محمد جعفر	کشتگی	۵۰	محمد نظام الدین ....
کلیانی	۹۸	عبد القادر			

حسب ذیل امیدوار کامیاب ہیں ان کے نام بلحاظ نشان داخلہ درج ہیں ۔

۱	میر محبوب علی	۲۵	محمد عبد الواحد	۴۹	عزیزہ بیگم	۸۵	لبستپا
۲	ین جی پاپنا ڈکر	۲۶	محمد عبد الستار	۵۱	ہنمنت راؤ پٹواری	۸۶	وٹھپا ارلی کٹی
۳	سید حامد حسین	۲۷	محمد عبد الجبار خاں	۵۴	نارائن گوڑا	۸۷	لنگپا
۴	سید عزیز اللہ حسینی	۳۰	سید رزاق علی	۵۵	سید پاشاہ	۸۹	وٹھپا
۵	محمد فقیر	۳۱	محمد بی بی	۵۶	محبوب پیراں	۹۲	محمد مرتضیٰ
۶	وینکٹ رنگیا	۳۲	اختر النساء بیگم	۵۷	سید احمد حسینی	۹۳	محمد مستان
۷	شیخ عبد الباسط	۳۴	محمد غوث	۵۸	سید محی الدین پیراں	۹۴	محمد عبد الکریم
۹	نارائن سوامی	۳۵	محمد عبد الغفور	۵۹	گوبند گوڑا	۹۵	کلپا
۱۰	محمد قاسم	۲۶	محمودہ بیگم	۶۲	گریپا	۹۹	عبد العزیز
۱۱	یعقوب خاں	۳۷	شریفہ بیگم	۶۳	شاہ حمید	۱۰۰	امان اللہ خاں
۱۲	محمد جعفر	۳۸	سعادت النساء بیگم	۶۴	شیخ حمید	۱۰۱	شیخ احمد
۱۳	محمد عمر	۳۹	آمنہ بی	۶۵	زلیخا بیگم	۱۰۲	محمد اعظم
۱۴	غلام دستگیر	۴۰	صغرا بی	۶۷	این گوڑا	۱۰۳	محمد ریاض الدین احمد
۱۵	عثمان شریف	۴۱	فاطمہ بی	۶۸	وٹھوبا گوڑا	۱۰۴	مرزا طاہر بیگ
۱۶	شیخ شہاب الدین	۴۲	خواجہ بی	۶۹	شیخ دادے	۱۰۵	شنکر گیرجی
۱۸	سید محمود علی	۴۴	محمد اکبر	۷۵	نرنجیا	۱۰۶	محمد عبد الحمید
۱۹	لچھمیا	۴۵	گل داد خاں	۷۹	بندیا	۱۰۷	رام لال
۲۱	محمد عبد الستار خاں	۴۶	رام چندر راؤ	۸۰	اریا سوامی	۱۰۸	اقبال احمد
۲۲	محمد عبد الرحیم خاں	۴۷	حفیظہ بی	۸۱	صدر الدین	۱۱۱	محمد معین الدین
۲۴	محمد قطب الدین	۴۸	محمد مرتضیٰ خاں	۸۳	میراں صاحب	۱۱۲	محمد امام الدین

۱۱۳	سید رفیع الدین	۱۲۳	زاہدہ خاتون	۱۳۴	فقیرپا	۱۴۹	محمد عبدالشکور
۱۱۴	محمد عبدالغفور	۱۲۵	اننت راؤ	۱۳۵	سیون گوڑا	۱۵۰	محمد عبدالغنی
۱۱۵	محمد سبیل اللہ خاں	۱۲۷	ونایک راؤ	۱۳۶	سنگنگوڑا	۱۵۱	شیخ محبوب
۱۱۶	محمد عنایت اللہ خاں	۱۲۸	محمد عبدالحفیظ	۱۳۸	سید قمر محی الدین	۱۵۵	محبوب علی
۱۱۷	مرزا محمد بیگ	۱۲۹	یلپا	۱۳۹	ہنمنت راؤ	۱۵۹	شیخ لاڈلے
۱۱۹	اللہ بخش	۱۳۰	ایرنگوڑا	۱۴۰	خواجہ حسیم الدین	۱۶۰	محمد حسین
۱۲۰	نذیر الدین	۱۳۱	لعل محمد	۱۴۱	فاطمہ بیگم	۱۶۱	محمود حسین
۱۲۲	بی کریمہ خاتون	۱۳۳	بسگوڑا	۱۴۲	پاشا بیگم	۱۶۲	لعل احمد

۱۶۵ حسینی بیگم

انعامات

اردو دانی میں امتیاز کے ساتھ کامیاب ہونے والے جملہ امیدواروں کو ادارہ کی طرف سے ایک ایک سلیس اردو کتاب بطور انعام دی جائے گی۔ اس طرح اس سال اس امتحان کے (۱۵) امیدوار انعام کے مستحق قرار پائے۔ جن کے نام کامیاب امیدواروں کی فہرست کی ابتداء میں درج ہیں۔

دوسرے امتحانوں میں ادارہ کی طرف سے صرف اس اول آنے والے امیدوار کو انعام دیا جائے گا جس نے درجۂ اول میں کامیابی حاصل کی ہو۔ اور جس کو کسی اور معطی کی طرف سے انعام نہ مل رہا ہو۔

اس امتحان کے انعام یافتہ امیدواروں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

۱۔	اردو فاضل	بلقیس بانو	مستحق طلیبہ بیگم ٹدل	(عطیہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ)
۲۔	اردو عالم	اشرف الدین فیضی	مستحق انعام ادارہ	
۳۔	" "	بسٹیا	مستحق انعام گلشنگی	(عطیہ مولوی احمد عبداللہ صاحب لنگسگور)
۴۔	خوش نویسی	ابوسعد سید اسمٰعیل سید	مستحق " ادارہ	
۵۔	" "	کریم داد خاں	مستحق انعام کشتگی	(عطیہ مولوی محمد حسین صاحب ہمساگر)
۶۔	اردو دانی	امجدی بیگم	" " " "	(عطیہ محترمہ سکینہ بیگم صاحبہ)
۷۔	" "	کریم داد خاں	" " " "	(عطیہ احمد عبداللہ صاحب لنگسگور)
۸۔	" "	آمنہ بی	" " " "	(عطیہ مسٹر رستم جی مناجر کشتگی)

ادارہ کا کتب خانہ | دوسرے شعبوں کی طرح ادارہ کا شعبۂ کتب خانہ بھی روز افزوں ترقی کر رہا ہے۔ گزشتہ مہینے میں متعدد قلمی اور مطبوعہ کتابیں خریدی گئیں اور مختلف علم دوست اصحاب نے بھی کئی قلمی و مطبوعہ کتابیں اور رسالے بطور تحفہ ادارہ کو عطا کئے جن میں سے حسب ذیل قابلِ ذکر ہیں۔

مولوی سید علی اکبر صاحب ایم اے مدیر مسئول رسالہ حیدرآباد ٹیچر نے اس رسالے کے ۴۰ شمارے عنایت فرمائے ان میں چند سالوں کی جلدیں تو مکمل ہیں اور جو شمارے کم ہیں ان کی فہرست آخر میں دے دی جا رہی ہے جو اصحاب فاضل نہ رکھتے ہوں براہ کرم ادارہ کو تحفۃً یا قیمتاً عنایت فرمائیں۔

دوسرے عطیوں کی فہرست حسب ذیل ہے۔

(۱) مولوی تراب علی خاں صاحب باز۔ چلبلا رسالہ

(۲) خواجہ حمید الدین شاہد رسالہ مخزن

(۳) مولوی سردار محمود خاں صاحب خالدی انتخاب لاجواب و دیگر رسائل کی دو جلدیں۔

(۴) مولوی شمس الدین صاحب خلف نواب عزیز نواز جنگ بہادر آرائش محفل۔

(۵) ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور۔ نظام الملک حصہ اول و دوم۔ شبیر جنگ۔ میر عالم۔ تریاہٹ۔ دیوالا۔ ڈاکٹر صاحب۔ اور دیگر ۳ رسائل۔

(۶) مولوی کاظم علی صاحب برق سولوی۔ نظم شہید مذاق عشق۔ جواہر الاشعار اور تسہیل المعمہ۔

(۷) مولوی میر عباس علی صاحب نبیرۂ حضرت میر مومن صاحب قبلہ۔ قلمی نسخہ جات۔

ضرورت ہے | ادارہ کے کتب خانہ کے لئے حیدرآباد ٹیچر سہ ماہی کے حسب ذیل شماروں کی۔

جلد (۱) مکمل۔ جلد (۲) شمارہ (۱) و (۲)۔ جلد (۳) شمارہ (۲)۔ جلد (۴)۔ شمارہ (۱) جلد (۷) شمارہ (۳)۔ جلد (۹) شمارہ (۴)۔ جلد ۱۰ شمارہ (۱)۔ جلد ۱۲ شمارہ (۴)

ادارہ

غزل

جو کیا تم نے سب بجا نکلا — جو کیا ہم نے ناسزا نکلا
ظلم تیرا ہو میری مظلومی — جو ہوا حد سے وہ سوا نکلا
یوں تو ہونے کو سب ہوئے مجنوں — کوئی مجھ سا نہ دوسرا نکلا
چاک کر ڈالا نامۂ عصیاں — تیری رحمت کا آسرا نکلا
دیکھ مر جائیں گے جہاں دونوں — تو جو پردہ سے اک ذرا نکلا
حاصل جد و جہدِ عمرِ عزیز — ایک نالہ سو نارسا نکلا
نہ رکی میری فطرتِ آزاد — دل میں جو تھا وہ لب پہ آ نکلا
عمر کی صرفِ عیش اور دم مرگ — کیا ہوا منہ سے جو خدا نکلا

صفیہ بیگم قمر

کلیانی

اس مرکز کے انتظامات اور نگرانی کے لئے پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم اے ایل ایل بی اور حفیظ صدیقی مدیر سب رس معلومات نے کلیانی کا سفر کیا۔ موخر الذکر نے اپنے سفر کی یہ روئداد قلمبند کی ہے۔ (سب رس)

۱۵ راگست کو ساڑھے تین بجے حیدر آباد سے روانہ ہوئے اور رات کے آٹھ بجے ہمنا آباد پہنچے۔ اور مسافر بنگلے میں قیام کیا دوسرے روز یعنی جمعہ ۱۶ راگست کو صبح کے نو بجے کلیانی کا قصد کیا اور دس بجے تک پہنچ گئے۔ کلیانی میں مولوی عبدالکریم، غلام معین الدین قاضی الدین، تاج الدین، نیر الدین صاحبان اور مسٹر ترل راؤ بی اے (عثمانیہ) نے ہمارا خیر مقدم کیا اور ہم کلیانی کے مسافر بنگلے تک پہنچائے گئے۔ چونکہ مدرسہ وسطانیہ کلیانی کی عمارت جس میں کہ امتحانات لئے جانے والے تھے مسافر بنگلے سے بہت قریب تھی اس لئے سب سے پہلے ہم مدرسہ روانہ ہوئے تاکہ امیدواروں کی نشستوں کے متعلق انتظامات کا معائنہ ہو سکے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہمارے ادارے کی شاخ کے کارکنوں نے جن کے نام اوپر بیان ہوئے ہیں، تمام انتظامات مکمل کر لئے تھے۔ یعنی مدرسہ کے ایک بڑے ہال میں نشستوں کا باقاعدہ انتظام کیا گیا تھا اور امیدواروں کے نام اور رول نمبر کی چٹھیاں بھی میزوں پر چسپاں کر دی گئی تھیں حتیٰ کہ ہال کے باہر ایک گھنٹہ بھی مہیا کیا گیا تھا تاکہ امتحان کے شروع اور ختم ہوتے وقت اسے استعمال کیا جا سکے۔ اس انتظام کی خوش سلیقگی کو دیکھ کر ہمیں عبدالکریم صاحب کا جو ہمارے ادارے کی شاخ کے نائب معتمد اور اس کی روح رواں ہیں، شکریہ ادا کرنا پڑا کہ انھوں نے ہمارا بہت سا کام ہلکا کر دیا امتحان گاہ کے اس معائنہ کے بعد ہم مسافر بنگلہ واپس ہوئے۔

تھوڑی دیر کے بعد مولوی عطاء اللہ صاحب عطا تشریف لائے۔ موصوف نواب صاحب کلیانی کے منتظم پیشی اور ادارہ ادبیات اردو کلیانی کے معتمد ہیں۔ ان کے آنے کے بعد ادارے کے دوسرے کارکن جو ہمارے ساتھ تھے، دوسرے انتظامات کے لئے ہم سے رخصت ہوئے لیکن اور لوگ جن میں مقامی عہدہ دار اور مدرسے کے اساتذہ شامل ہیں، ہم سے ملنے کے لئے آتے رہے۔ ساڑھے بارہ بجے ہم نے مولوی عطاء اللہ صاحب کے ساتھ جامع مسجد کا قصد کیا اور ڈیڑھ بجے تک نماز جمعہ سے فارغ ہو کر واپس آئے دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام لیا اور پھر ۲ ½ بجے کے قریب امتحان گاہ پہنچ گئے کیونکہ اردو عالم کا پہلا پرچہ ۳ سے ۶ تک تھا۔ جب ہم لوگ امتحان گاہ پہنچے تو وہاں اردو عالم کے پورے ۹ امیدوار اور مدرسہ کے چند اساتذہ نگران کاروں کے فرائض انجام دینے کے لئے موجود تھے۔ ان میں مرزا محمد بیگ میر نذیر الدین، بابو راؤ اور ترل راؤ صاحبان قابل ذکر ہیں۔ مدرسہ کے ایک چپراسی کو بھی ہم نے بھتہ دے کر مقرر کر لیا تھا۔ تین بجنے میں پانچ منٹ کم تھے کہ ہال کے دروازے کھول دیئے گئے اور امیدواروں سے کہا گیا کہ آ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ جائیں ٹھیک تین بجے گھنٹہ بجا اور ہم نے پرچہ ہائے سوالات کا سر بمہر لفافہ اٹھایا۔ سب سے پہلے ہم نے دو امیدواروں کو لفافہ دکھلایا اور ایک کاغذ پر ان کے دستخط لے لئے۔ پھر لفافہ چاک کر کے پرچے تقسیم کر دیئے۔ تقریباً ساڑھے پانچ بجے کے قریب تمام امیدواروں نے

پرچے ختم کر دیئے اور ہم نے ان کی جوابی بیاضوں کو ایک لفافہ میں بند کر کے اس پر ادارے کی مہر ثبت کر دی۔ اس کے بعد ہم مسافر بنگلہ واپس ہوئے جہاں مولوی عطا اللہ اور مدرسہ کے بہت سے اساتذہ اور ادارے کے کارکن ہمارا انتظار کر رہے تھے۔

ان لوگوں کے ساتھ ہم بات چیت میں مصروف تھے کہ نواب صاحب کلیانی کے پاس سے ایک چٹھی آئی۔ اس میں ہفتہ کے دن دوپہر کو بیترانت کے تالاب پر ہماری دعوت کی اطلاع تھی لیکن اس خیال سے کہ ہفتہ کے روز دو امتحان ہیں اور ہم کو دوپہر میں صرف ایک گھنٹہ ملتا ہے، ہم نے یہ مناسب خیال کیا کہ دعوت کا وقت بدل دیا جائے۔ لیکن جو لوگ اس وقت وہاں موجود تھے انھوں نے کہا کہ بیترانت کا تالاب بالکل قریب ہے اور ہم وقت پر واپس آ سکتے ہیں۔ مگر دقت یہ تھی کہ ہم کو کھانے کے بعد فوراً واپس ہو جانا پڑتا اور نواب صاحب سے بات چیت نہ ہو سکتی۔ اس لئے مناسب یہ معلوم ہوا کہ ابھی شام میں جا کر نواب صاحب سے ملاقات کر لی جائے اور ان کو ہماری مصروفیت سے آگاہ کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم عطا اللہ صاحب کے ساتھ قلعہ پہنچے۔ یہاں کلیانی کے منصف مولوی رحمت اللہ صاحب جو ایک عثمانی طیلسانی ہیں، موجود تھے۔ ان سے گفتگو ہوتی رہی پھر تھوڑی دیر بعد نواب صاحب سے ملاقات ہوئی۔ چونکہ نواب جمال الدین حسن خاں صاحب والئ اسٹیٹ کلیانی پروفیسر صدیقی صاحب کے شاگرد ہیں، انھوں نے اپنے استاد کی بڑی تعظیم اور آؤ بھگت کی۔ بہت دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں اور رخصت ہوتے وقت نواب صاحب نے ہفتہ کی دعوت کے متعلق کہا کہ ہم کو کھانے کے بعد ہی رخصت کر دیا جائے گا اور ہماری مصروفیت میں رکاوٹ پیدا نہ ہوگی۔ کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ہم لوگ قلعہ سے رخصت ہوئے اور مسافر بنگلہ پہنچ کر آرام کیا۔

دوسرے دن یعنی ۱۸ر اگست کی صبح کو بعض مقامی حضرات اور مدرسے کے اساتذہ سے جو ہم سے ملنے کے لئے آئے تھے، بات چیت رہی۔ ۹ بجکر ۴۴ منٹ پر ہم امتحان گاہ میں داخل ہوئے۔ آج کا دن بڑی مصروفیت کا تھا کیونکہ اردو عالم کے دو پرچوں کے علاوہ اردو دانی کا بھی امتحان تھا۔ ہم نے نگران کار صاحبین اور مولوی عبدالکریم صاحب وغیرہ کی مدد سے ہال میں جوابی بیاضیں رکھ دیں۔ وقت سے پانچ منٹ پہلے ہال کے دروازے کھول دئیے گئے۔ تمام امیدوار ہال میں داخل ہوئے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ٹھیک دس کو گھنٹہ بجا اور ہم نے پرچہ ہائے سوالات تقسیم کر دیئے۔ اردو عالم کے پورے نو امیدوار موجود تھے اور وہ پرچہ حل کرنے میں مصروف ہو گئے لیکن امتحان اردو دانی کے امیدواروں کے ساتھ تھوڑی بہت دقت اٹھانی پڑی کیونکہ ان میں بعض بچے بھی شریک تھے جو جوابی بیاضوں پر لکھی ہوئی ہدایتوں کو بھی مشکل سے سمجھ سکتے تھے۔ اس لئے ان کو ہدایتیں پڑھ کر سمجھا دی گئیں اور اس کے بعد وہ پرچوں میں لگ گئے۔ اس امتحان میں جملہ ۳۲ امیدوار شریک تھے جن میں سے صرف ایک غیر حاضر رہا۔ باقی ۳۱ میں سے دو لڑکیاں تھیں اور ان کے لئے ایک علحدہ کمرے میں انتظام کیا گیا تھا جس کی نگرانی کلیانی کے مدرسۂ نسواں کی معلمہ نجم النساء بیگم صاحبہ نے کی۔ اردو دانی کا پرچہ تحریری ۱۲ بجے تک تھا چنانچہ اس وقت اردو دانی کے تمام امیدواروں سے پرچے وصول ہو گئے۔ ایک بجے تک اردو عالم کے امیدواروں نے بھی اپنے پرچے ختم کر دئے۔ ہم نے تین علحدہ علحدہ لفافوں میں

(اردو دانی برائے ذکور اور برائے اناث اور اردو عالم) ان پرچوں
کو بند کرکے ان پر مہر لگادی۔ اس وقت تک مولوی عطاء اللہ صاحب
ہمارے پاس آگئے تھے۔ ایک بجے کے قریب ہم ان کے ساتھ بذریعہ
موٹر کار ہیرات کے تالاب کو روانہ ہوئے۔ تالاب کے سامنے
ایک قدیم عمارت میں دعوت کا انتظام تھا اور نواب صاحب
کے ساتھ انکے مصاحبین اور بہت سے مقامی عہدہ دار موجود تھے
جن کی تعداد تقریباً چالیس ہوگی۔ ہمارے جانے کے فوراً بعد دسترخوان
چن دیا گیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو نواب صاحب نے ہمیں
رخصت کیا اور ہم جلد ہی امتحان گاہ پہنچ گئے۔ دوپہر میں
حسب معمول اردو عالم والوں کے لئے پرچے تقسیم کردیئے لیکن
اس وقت اردو دانی کے ۱۳ امیدواروں کا بھی زبانی امتحان
تھا۔ لڑکیوں کا امتحان تو معلمہ صاحبہ نے لیا اور لڑکوں کا
امتحان پروفیسر صدیقی صاحب نے۔ امتحان کے لئے تمام
امیدواروں کو ایک کمرے میں بٹھادیا گیا اور اس سے متصل
دوسرے کمرے میں ممتحن صاحب اور ترمل راؤ صاحب مدرس
بیٹھے رہے۔ اس کمرے میں ایک ایک امیدوار داخل ہوتا اور
اسے امتحان کے بعد دوسرے دروازے سے باہر روانہ کیا
جاتا۔ غرض دوپہر کے یہ امتحانات بھی خیر و خوبی کے ساتھ ختم ہوئے۔
یہاں سے فارغ ہوکر جب ہم مسافر بنگلہ پہنچے تو مولوی رحمت اللہ
صاحب منصف ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ نواب صاحب سے
یہ وعدہ تھا کہ کشتی رانی کے لئے ہم تالاب پر شام میں دوبارہ
جائیں گے لیکن چونکہ اس وقت بارش ہو رہی تھی، ہم تالاب
نہ جاسکے۔ مسافر بنگلہ پر منصف صاحب ہی سے بات چیت ہوتی
رہی۔ انھوں نے دوسرے روز یعنی ۱۸ اگست کی شام کو چائے
پر مدعو کیا۔ کچھ عرصہ بعد مولوی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل تشریف
لائے۔ ان سے بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے
۱۸ اگست کی شام کو اپنے پاس کھانے کی دعوت دی۔

۱۸ اگست کی صبح کو آٹھ بجے کے قریب حضرت
خواجہ شہ سوار کی درگاہ پر زیارت کی غرض سے گئے۔ وہاں
سے واپس آئے تو مسافر بنگلہ پر مدرسہ کے چند اساتذہ اور
ادارے کے کارکن ہمارے منتظر تھے۔ ان سے بات چیت
ہوتی رہی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد سب رخصت ہوئے اور ہم
ناشتہ سے فارغ ہوکر امتحان گاہ جانے کی تیاری کرنے لگے۔
اس وقت مولوی عبدالکریم صاحب آئے اور دوپہر کے کھانے پر
اپنے پاس مدعو کیا۔ جب ہم امتحان گاہ میں داخل ہوئے تو تمام
امیدوار موجود تھے۔ حسب طریقہ پرچے تقسیم کردئے گئے اور
ایک بجے تک امیدواروں کی تمام بیاضیں وصول ہوگئیں تو
ان کو سربمہر لفافہ میں بند کرکے بنگلہ واپس آئے۔ پھر مولوی
عبدالکریم صاحب کی دعوت سے فارغ ہوکر ۱-۳۰ تک امتحان گاہ
پہنچے اور حسب معمول دو بجے سے امتحان شروع ہوا۔ تھوڑی دیر کے
بعد عطاء اللہ صاحب آئے اور پروفیسر صدیقی صاحب ان کے ساتھ
قلعہ تشریف لے گئے تاکہ نواب صاحب کے قدیم کتب خانہ اور اسلحہ
کا معائنہ کرلیں۔ راقم الحروف امتحان گاہ میں ٹھیرا رہا اور جب
امتحان ختم ہوا تو پرچوں کو لفافوں میں بند کرکے ان پر مہر لگادی
اور بنگلہ واپس آیا۔ معلوم ہوا کہ پروفیسر صدیقی صاحب منصف
صاحب کے بنگلہ پر ہیں میں بھی موٹر میں وہیں چلا گیا۔ وہاں
مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار کلیانی، کلیانی کے سرکاری ڈاکٹر
اور مدرسہ کے چند اساتذہ موجود تھے۔ چار کے بعد تھوڑی دیر تک
ادارہ کے بارے میں گفتگو رہی۔ سات بجے عبدالکریم صاحب اور
غلام معین الدین صاحب ہمارے پاس آئے اور آٹھ بجے کے قریب

ہم لوگ ان حضرات کے ساتھ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب وکیل کے مکان پر پہنچے۔ موصوف سے کھانے پر اور اس کے بعد بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ بنگلہ پر تاج الدین صاحب اور مولوی نذیر الدین صاحب نذیر ہمارے منتظر تھے۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد نذیر صاحب نے جو ایک کہنہ مشق شاعر ہیں، اپنا کلام سنایا۔

۱۹ اگست کی صبح رحمت اللہ صاحب آئے اور ہم ان کے ساتھ مولوی احمد حسین صاحب تعلقدار کے مکان پر گئے ان کے ہاں ناشتہ کی دعوت تھی۔ وہاں سے واپس ہونے تو بنگلہ پر ادارے کے کارکنوں اور مدرسہ کے اساتذہ کے علاوہ مولوی عطاء اللہ صاحب وغیرہ بھی موجود تھے ان تمام حضرات کے ساتھ ہمارا ایک گروپ فوٹو لیا گیا اور پھر صرف ادارے کے کارکنوں کے ساتھ ایک اور گروپ ہوا۔ اس کے بعد ہمیں ادارے کا دفتر اور کتب خانہ دکھلایا گیا۔ جو بہت باضابطہ اور منظم حالت میں تھا۔ اس کے بعد ہم نے سب کو خدا حافظ کہا اور عازم حیدرآباد ہوئے۔

کلیانی میں ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیاں وہاں کے بے لوث کارکنوں کی بدولت خوب ہو رہی ہیں۔ ان میں سے مولوی عبدالکریم صاحب نائب معتمد اور مولوی عطاء اللہ صاحب معتمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو ادارے کا کام بڑی دلچسپی کے ساتھ کرتے ہیں۔ ادارے کے صدر مولوی رحمت اللہ صاحب بھی ایک اچھے کارکن ہیں۔ عبدالکریم صاحب میں کام کرنے اور دوسروں سے کام لینے کی صلاحیت بہت اچھی ہے۔ چنانچہ ان ہی کا اثر ہے کہ تاج الدین، غلام معین الدین، قاضی الدین، نیر الدین اور ترابؔ صاحبان وغیرہ جیسے لوگ اردو کے کام میں سرگرم عمل ہیں۔ یہ لوگ کلیانی سے باہر بھی جاتے اور اردو اور ادارہ کی خدمت کرتے ہیں چنانچہ قریب کے ایک مقام چِنگوپہ سے ایک امیدوار کلیانی آیا تھا اور اس نے اردو عالم کا امتحان دیا۔ ان سب لوگوں کے علاوہ نواب صاحب کلیانی ہمارے شکریہ کے خاص طور پر مستحق ہیں جنھوں نے ادارے کی سرپرستی قبول کرلی ہے۔ موصوف سے کلیانی کا ہر بچہ اور بوڑھا خوش ہے اور آپ کے اخلاق کا یہ حال ہے کہ اپنے استاد کو رخصت کرنے کے لئے اپنے محل سے قلعہ کے باہر والے دروازے تک اتر کر آتے تھے۔ یوں تو عام طور پر کلیانی کے لوگ بہت خوش خلق اور ملنسار ثابت ہوئے لیکن نواب صاحب کی سادہ طبیعت اور خوش خلقی سراہنے کے قابل ہے۔

ادارۂ ادبیات اردو نے امتحانات کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس سے بہت سی توقعات ہیں۔ اور فائدوں کے علاوہ سب سے بڑی بات ہمارے خیال میں یہ ہے کہ ان امتحانات کی وجہ سے اردو کا ذوق پھیل جائے گا۔ جو بات ہم نے کلیانی میں خاص طور پر محسوس کی وہ یہ تھی کہ ان امتحانات کی وجہ سے عوام میں اردو پڑھنے کا شوق بہت عام ہو رہا ہے اور آئندہ بہت زیادہ امیدواروں کے شریک ہونے کی توقع ہے۔ اس امتحان کا اثر صرف کلیانی تک محدود نہیں بلکہ قرب و جوار کے مقامات میں بھی اس کا اثر پڑا ہے اور اب ہر شخص ادارے کے نام اور اس کے کام کے علاوہ اردو کی اہمیت سے واقف ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آئندہ سال چِنگوپہ سے تیس۳۰ امیدوار صرف اردو عالم میں بیٹھیں گے اور اس طرح چِنگوپہ کو بھی امتحان کا مرکز بنانا پڑے گا۔ اسی طرح مرکزوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جائے گا اور ادارے کا دائرۂ عمل وسیع تر ہوتا جائے گا۔

حفیظ صدیقی

کشٹگی

کشٹگی شہر حیدر آباد سے کافی دور واقع ہے اور وہاں پہنچنے کے لئے راستہ بھی دشوار گذار ہے چنانچہ ریل کے علاوہ کئی جگہ بس تبدیل کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اکبر صدیقی صاحب بی اے مصنف مشاہیر قندہار دکن نے اس ہفتوان کو بڑی زندہ دلی سے طے کرلیا اور اردو کی خدمت کے لئے طویل سفر کی زحمتیں گوارا کیں۔ (سب رس)

راستہ کی سہولتوں کا لحاظ کرتے ہوئے بلدہ سے کپّل پہنچا لیکن بارش کی وجہ سے موٹروں کی آمد و رفت بند تھی۔ سرفراز علی صاحب مہتمم تعلیمات اور تحصیلدار صاحب و منصف صاحب کپّل کی کوششوں سے مجھے بروقت کشٹگی پہنچنے میں آسانی ہوئی۔ جمعے کے دن صبح میں کشٹگی پہنچ گیا۔ انسپکٹر صاحب آبکاری لنگسگور اور سب انسپکٹر صاحب آبکاری ہنم ساگر ڈاک بنگلہ میں منتظر تھے۔ قیام و طعام کا انتظام بھی صاحبان موصوف ہی نے کردیا تھا۔ امتحان سہ پہر سے شروع ہونے والا تھا اس لئے صبح ہی مدرسہ کی عمارت، بجلی اور امیدواروں کی نشستوں کا انتظام کردیا۔ اس سلسلے میں مولوی خواجہ معین الدین صاحب صدر مدرس اور مولوی سید شاہ عبدالرزاق صاحب مدرس نے قابل ذکر امداد کی۔ اردو عالم میں تین امیدوار شریک تھے لیکن صرف دو حاضر رہے۔ پرچوں کی تقسیم کے وقت بلونت راؤ صاحب گھاٹلے بی اے ایل ایل بی منصف کشٹگی بھی تشریف لائے اور امتحانات سے اپنی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ دوسرا دن اردو دانی کے امتحان کا تھا۔ ستر امیدوار شریک تھے لیکن تریسٹھ حاضر رہے۔ جن میں اناث کی تعداد دس تھی اور ان کا انتظام بیگم عبدالکریم صاحبہ نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ صبح آٹھ بجے ہی سے قرب و جوار کے مقامات سے امیدوار اپنے اپنے اساتذہ کے ساتھ آنے شروع ہوئے اور دس بجے تک ہال بھر گیا۔ امیدواروں میں سولہ ستر سال کی عمر سے (۶۵) سال کی عمر تک سب ہی شریک تھے۔

پرچے بروقت تقسیم کردیا گیا۔ خواجہ معین الدین صاحب صدر مدرس۔ سید شاہ عبدالرزاق صاحب، قاضی محمد حسین صاحب بی اے سب انسپکٹر آبکاری کشٹگی اور مرزا انوار اللہ بیگ صاحب ڈرائیکٹ ماسٹر مدرسہ کشٹگی و اہلیہ عبدالکریم صاحب چیچک برار (زنانہ ہال) نے نگران کاری کے فرائض انجام دیئے

اس دن یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ ان اساتذہ نے جنھوں نے تعلیم بالغان کے سلسلے میں دلچسپی لی تھی اور غیر اوقات میں شام کے سات سے دس تک ان لوگوں کو پڑھایا تھا۔ ارباب تعلیمات نے باز پرس کی اور اسی بناء پر صدر مدرس صاحب نے امتحان کے لئے مدرسہ کی عمارت دینے میں بھی پس و پیش کیا۔ یہاں کے رجحان اور شوق کو دیکھ کر یہ خیال ہوا کہ پبلک کی موجودگی میں ادارہ کی ایک شاخ یہاں قائم کردی جائے اسی خیال سے چار بجے مدرسہ ہی میں مقامی معززین و عہدہ داروں کو زحمت دی گئی لیکن ذوالفقار علی صاحب ناظم کوتوالی نے اس خیال کو عملی جامہ پہننے سے باز رکھا اور جلسوں کے امتناعی احکام روانہ کردیئے۔ مجبوراً ہم نے خاموشی اختیار کرلی چار بجے پرچوں کے ختم ہوجانے کے بعد جناب منصف صاحب تشریف لائے اور اس جلسہ کو ملتوی کرتے ہوئے ادارہ کی شاخ کے قیام کو ضروری قرار دیا اور فرمایا کہ حکومت کا کروڑہا روپیہ محض اپنی رعایا کو تعلیم یافتہ

کے لئے کتابیں فراہم کردیں۔ ان تمام حضرات سے مدد دلوائی جو اس کام کے لئے موزوں تھے۔ موصوف نے یہ دیکھا کہ محض کتابی علم معلومات میں اضافہ نہیں کرسکتا ' اس لئے شاخ میں ایک دارالمطالعہ قائم کیا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا جب میں نے مطالعہ کی میز پر کوئی بیس اردو اور نصف درجن انگریزی رسالوں اور اخباروں کو دیکھا۔ انھوں نے صرف اخباروں ہی کا انتظام نہیں کیا ہے بلکہ اس امر کی بھی نگرانی رکھتے ہیں کہ لوگ اردو اخبار اور رسائل پڑھیں اور ان پر بحث و مباحثہ بھی کریں۔ کسی کی علمی مشکلات کا حل تلاش کرنا ان کا روز کا مشغلہ ہے۔ اس طرح سے اردو کا صحیح ذوق پیدا کرنے (جو ادارے کا ایک خاص مقصد ہے) کے سلسلے میں موصوف ہر طرح لائق مبارکباد ہیں اور ہمیں امید ہے کہ آپ ہر وقت ادارے کے مقاصد کو برلانے میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔ موصوف نے مجھے اور ادارے کی شاخ کی کابینہ کے جملہ ارکان کو ایک پر تکلف دعوت بھی دی جس کا شکریہ ضروری ہے۔

پربھنی کے کام کرنے والوں کی فہرست نامکمل رہے گی اگر میں شاخ کے جوشیلے معتمد حمید اللہ خاں صاحب شیدا کا ذکر نہ کروں۔ شیدا صاحب ایک جوان صالح ہیں اردو لکھنے پڑھنے کا بے حد شوق ہے۔ انھوں نے زراعت پر ایک کتاب بھی لکھی جو بہت اچھی ہے۔ نواب بہادر یار جنگ بہادر پر ایک چھوٹا سا رسالہ لکھا ہے، جو اگر مکمل ہوجائے تو یقیناً ایک اچھا کام ہوگا۔ ادارہ کے یہ ایک پرخلوص کام کرنے والے ہیں۔ ان کی خدمت قدر کے قابل ہے۔

پربھنی میں عام طور پر اردو بولی جاتی ہے اور ہر مذہب اور فرقے کے لوگ مرہٹی کے ساتھ ساتھ بے تکلف اردو بولتے ہیں۔ عوام میں اردو سے دلچسپی ہے چنانچہ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ دوران ملاقات میں بیشتر حضرات نے ادارہ سے متعلق اپنی کافی معلومات اور اچھے تاثرات کا اظہار کیا۔ امتحان کے سلسلے میں پرلی اور قندہار سے بھی امیدوار آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے بھی کہا کہ ہمارے پاس اردو سے لوگوں کو بے حد دلچسپی ہے اور اگر امتحانات کا ہمیں پہلے سے علم ہوتا اور ان کا معیار معلوم ہوجاتا تو ہمارے پاس سے ایک کثیر تعداد میں امیدوار شریک ہوتے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے ضلع کے دوسرے تعلقوں اور قصبوں والوں کے بھی کچھ تاثرات آپ کو معلوم ہیں تو کہنے لگے "ہمارا جہاں تک تعلق ہے، ہم نے یہی دیکھا کہ سب لوگ ادارہ کے امتحانات کو بہت اچھا سمجھ رہے ہیں، ہم کو اس کی بڑی ضرورت تھی، ہمارے لئے اپنی قابلیت کا معیار معلوم کرنے اور اردو درست کرنے کا بہترین موقع نکل آیا۔"

دوران گفتگو میں، میں نے پوچھا "یہ کیا بات ہے کہ اردو عالم میں تو تعداد زیادہ ہے اور اردو دانی میں کم؟" اس کا جواب ملا "یوں تو اردو دانی میں شریک ہونے والے امیدواروں کی تعداد زیادہ ہے، لیکن مرکز چونکہ اتنا دور تھا کہ ان امیدواروں کے لئے اخراجات برداشت کرنا ناممکن تھا۔ اسی لئے شریک نہ ہوئے۔" میری رائے میں اگر ایسے امیدواروں کے لئے قریب قریب مرکز رکھے جائیں اور ایک شخص دورہ کرکے امتحان لیتا جائے تو مناسب ہوگا۔

ایک صاحب کی تجویز ہے کہ اردو عالم اور اردو دانی یا کم از کم اردو دانی کے امتحانات سال میں دو مرتبہ ہوں۔ یہ تجویز ادارہ کے لئے لائق غور ہے۔

امیدواروں کی عام رائے یہ ہے کہ سیپارۂ دل

اور سائنس کے کرشمے کا مطالعہ ان کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا اس لئے ان کے مضامین میں ربط نہیں ہے اور دوسرے ان میں سے اکثر حصوں کا معیار بلند ہے اور ایسے مقامات کے رہنے والوں کے لئے جہاں ہر قابلیت کا آدمی تعلیم کے لئے مل نہیں سکتا ان کتابوں کا مطالعہ بہت مشکل ہے چنانچہ یہ حال دیکھ کر میں نے "سائنس کے کرشموں" پر کوئی دو گھنٹہ تک تقریر کی اور اس کے مختلف اجزا کو امیدواروں کی استعداد کے مطابق واضح کیا۔

آخر میں، میں مظاہر الدین سلمہٗ کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے قیام پربھنی کے زمانے میں ہر طرح کی مدد پہنچائی اور امتحان کے کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔

ادارہ کی شاخ کی جانب سے جو پھول پہنائے گئے۔ اور متعدد حضرات نے اسٹیشن پر خدا حافظ کہنے کی جو تکلیف گوارا فرمائی، میں اس کے لئے بے حد ممنون ہوں۔

فیض محمد صدیقی

مرکز نسواں بلدہ

حیدرآباد میں امتحانات ادارہ کے نسوانی مرکز کے لئے مدرسہ فوقانیہ نامپلی کا انتخاب ہر طرح سے موزوں ثابت ہوا۔ مس جلسن کے ہم ممنون ہیں کہ ازراہ عنایت اپنے مدرسہ کو اس موقع پر استعمال کرنے کی اجازت دی اور مس جیسی نندی کے مشکور ہیں کہ انھوں نے اپنی مہربانی سے ہمارے لئے ہر طرح کی سہولت بہم پہنچائی

مقررہ نظام العمل کے مطابق ۱۶، ۱۷، اور ۱۸، اگست کو اردو امتحانات بہ پابندی وقت عمل میں آئے۔ اردو دانی کے نو، اردو عالم کے دس اور اردو فاضل کے دو امیدواروں نے شرکت کی۔

امتحانات کی نگرانی میں مسز عبدالقادر سروری نے تینوں دن حصہ لیا۔ ۱۸ اگست کو مسز انوار اللہ اور اسی دن سہ پہر میں مسز قرانی نے بھی مدد کی اور اردو دانی کا زبانی امتحان بھی انہی دونوں نے لیا۔ ادارہ کی طرف سے ہر سہ خواتین کی خدمت میں ان کی مخلصانہ اعانت اور دلچسپی کی قدر کرتے ہوئے دلی شکریہ پیش کرتی ہوں۔

امسال صرف اردو دانی کے امتحان میں حیدرآباد اور اضلاع سے ۱۹۵ امیدوار شریک ہوئے تھے۔ امتحانات کے قیام کے ساتھ ہی ان کی یہ مقبولیت خود اس بات کی دلیل ہے کہ ایسے امتحانات کی ہمیں ضرورت تھی۔ ادارہ کے وہ ارباب جو امتحانات کے قیام کے ذمہ دار ہیں خاص طور پر قابل مبارکباد ہیں کہ ملک کی ایک بڑی ضرورت پوری کر دی۔

ان کا یہ اقدام سب کے لئے عام طور پر اور ان امتحا کے لئے خاص طور پر مفید ثابت ہوگا جنھیں ان امتحانوں کی عدم موجودگی میں مولوی، عالم اور فاضل وغیرہ کے امتحانات کے لئے دوسرے صوبوں کو جانے کی زحمت اور صرفہ برداشت کرنا ہوتا۔

معتمد صاحب شعبۂ امتحانات کو ان کی سعی و کوشش اور امتحانات کی کامیابی پر جتنی مبارکباد دی جائے کم ہے ایک قلیل مدت میں ان کے شعبہ نے اپنے قیام کے مقصد کو جس خوبی و کامیابی کے ساتھ پورا کیا ہے وہ قابل تحسین و تقلید ہے۔ (کاش ہمارے لئے ان کا یہ جوش عمل، بیداری کا پیام بن جائے!)

سکینہ بیگم

گلبرگہ شریف

میں ۹ر مہر ۵۹ف کو شام کے چار بجے گلبرگہ پہنچا۔ امتحانات کے لئے عثمانیہ انٹرمیڈیٹ کالج کی عمارت میں جو انتظامات کئے گئے تھے تفصیل سے دیکھ لئے۔ اگلے روز سے امتحانات شروع ہوئے۔ مرکز گلبرگہ میں اردو دانی کے امیدواروں کی تعداد (۱۵) اور اردو عالم کے امیدواروں کی (۱۴) تھی۔ اردو دانی کے امیدواروں میں سے پانچ غیر حاضر تھے۔ دریافت کرنے سے اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ ان میں سے بعض چپراسی ہیں جنھیں اپنے عہدہ داروں کے ساتھ انہی دنوں دورے پر جانا پڑا اور امتحان میں حاضر نہ ہو سکے۔ اردو دانی کے تقریباً تمام امیدوار ادنیٰ ملازمین اور اہل حرفہ تھے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی مدرسے کا طالب علم نہیں معلوم ہوتا تھا۔ سب بالیقین اڈلٹس تھے۔ ایک امیدوار کی عمر تو ساٹھ سال سے بھی رسیدہ تھی۔ اس کا شوق دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوشش کی جائے تو معمر اور بالغوں میں تعلیم پھیلانے کے بڑے اچھے امکانات ہیں۔ اردو دانی کے امیدواروں کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ادارے کا یہ امتحان تعلیم بالغان کے سلسلے میں بہت ہی مقبول اور سود مند ثابت ہوگا۔

اردو عالم کے (۱۴) امیدوار برابر حاضر تھے۔ اور سب نے امتحان کی معقول تیاری کی تھی۔ تقریباً تمام امیدوار ہر پرچے کو آخر وقت تک محنت سے لکھتے رہے۔ کوئی امیدوار ایسا نہیں نظر آیا جو وقت مقررہ سے آدھا یا پاؤ گھنٹہ پہلے پرچہ ختم کرکے اُٹھ گیا ہو۔ ادارے کی شاخ گلبرگہ کے معتمد مولوی محمود حسین صاحب نے ان امیدواروں کو تیار کرایا ہے۔ اور بہت دلچسپی اور شوق سے انھیں پڑھایا ہے۔

گلبرگہ کی شاخ بہت عمدگی سے کام کر رہی ہے۔ اس کی فکر سے ایک مطالعہ خانہ بھی قائم ہے۔ یہ سب کچھ اس کے مخلص اور سرگرم معتمد مولوی سید محمود حسین صاحب کی مساعی کا نتیجہ ہے۔

نواب غوث یار جنگ بہادر صوبہ دار گلبرگہ شریف سے جو ادارے کے سرپرست بھی ہیں ملاقات ہوئی۔ صاحب موصوف نے ادارے کے مختلف امور دریافت فرمائے اور اس کی ترقی و توسیع کے بارے میں اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا۔ مولوی سید جمیل حسین صاحب تعلقدار، مولوی ذوالفقار علی صاحب حقانی پرنسپل، شرف الدین صاحب میونسپل انجینیر اور دیگر کئی سرکاری عہدہ داران اور چند پبلک اصحاب سے بھی ملاقات کا موقع ملا اور ادارے کے اغراض و مقاصد کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ سب کو ادارے کا ہمدرد اور اس کی کوششوں کا قدر داں پایا۔

جناب مولوی ذوالفقار علی صاحب حقانی پرنسپل گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کالج کی عنایات خاص طور سے قابل تشکر ہیں۔ صاحب موصوف نے ہر طرح سے مدد فرمائی۔ کالج کے اساتذہ میں سے مولوی خواجہ نصیر الدین صاحب اردو لکچرار اور مولوی احمد عبدالعزیز صاحب لکچرار معاشیات دونوں نے نگرانی کے کام میں ہاتھ بٹایا۔ مولوی محمود حسین صاحب معتمد شاخ ادارہ نے بھی شروع سے آخر تک میرے ساتھ رہ کر ہر طرح میری مدد فرمائی جس کے لئے میں ان کا بہت ممنون ہوں۔

حیدرآباد

حیدرآباد کے مرکز کلئیہ بلدہ میں حسب ذیل امیدوار شریک تھے۔

(۱) اردو فاضل ۹ (۲) اردو عالم ۲۵
(۳) سند اردو دانی ۳۶ (۴) خوشنویسی ۹

صدر کلیہ نے اپنی عنایت سے، نہ صرف عمارت کے استعمال کی اجازت عطا فرمائی بلکہ نشستوں، میزوں اور دواتوں کا بھی انتظام فرمایا۔ مولوی سعید احمد خاں صاحب، مسٹر رام چندریا، مسٹر شنولکر، مولوی غلام رسول صاحب اور مولوی عبدالرحمٰن شریف صاحب مددگاران کلیہ نے نہایت مہربانی سے، نگرانی کے صبر آزما کام میں مجلس کا ہاتھ بٹایا۔

جناب مولوی سید علی اکبر صاحب، صدر مجلس امتحانات نے ۱۸ اگست کی صبح کو مرکز کا معائنہ فرمایا اور بیش بہا مشورے عنایت کئے۔

جناب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، معتمد اعزازی ادارہ امتحان کے پورے اوقات میں، مرکز میں تشریف فرما رہے۔ اور مولوی حمید الدین صاحب شاہدؔ مہتمم ادارہ و مدیر "سب رس" نے انتظامی اور دفتری کاموں میں بیش بہا مدد فرمائی۔

اس مرکز کے ہر امتحان کے تمام امیدواروں نے جس باضابطگی اصول اور اوقات کی پابندی، شریفانہ رویہ اور لب و لہجے کا اظہار کیا وہ نہایت قابلِ تعریف تھا۔

۱۸ اگست کو ختم امتحان کے بعد تمام معاونین امتحانات نے چائے نوشی کی۔

عبدالقادر سروری

جلسۂ شاخ کشنگی

خوشی کی بات ہے کہ کشنگی کے علم دوست حضرات نے بغیر کسی تحریک کے ادارہ کی شاخ قائم کرکے اپنی اردو دوستی اور جذبۂ عمل کا ثبوت دیا۔ اس سلسلہ میں جناب بلونت راؤ صاحب گھاٹے منصف بطورِ خاص قابل مبارک باد ہیں۔ کہ انھوں نے شاخ کے قیام میں ذاتی دلچسپی لی اور اپنی صدارت میں مسٹر چندپا پٹیل تحصیلدار، مسٹر بسپا ساہو اور قاضی محمد حسین صاحب جیسے پرجوش اصحاب کی مفید صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقع دیا۔ (سب رس)

۲۱ مہر ۱۳۴۹ف کو بصدارت جناب بلونت راؤ صاحب گھاٹے بی اے۔ ایل ایل بی۔ منصف تعلقہ کشنگی۔ ادارہ کی شاخ کا قیام عمل میں آیا۔ ادارہ کے امتحانات کے صدر نگران مولوی اکبرالدین صاحب صدیقی بی اے بھی موجود تھے۔ چونکہ اس وقت تحصیلدار صاحب اور دیگر اصحاب مستقر پر موجود نہ تھے۔ اس لئے بتاریخ ۲۲ مہر ۱۳۴۹ف بصدارت جناب منصف صاحب ممدوح ایک تجدیدی کمیٹی کا انعقاد ہوا۔ اور متفقہ طور پر مندرجۂ ذیل عہدہ داران اور اراکین کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر۔ جناب بلونت راؤ صاحب گھاٹے بی اے۔ ایل ایل بی منصف کشنگی۔
نائب صدر۔ جناب مسٹر چندپا صاحب پٹیل بی ایس سی (عثمانیہ) تحصیلدار تعلقہ کشنگی۔

معتمد۔ مسٹر لبسٹپا صاحب ساہو تعلقہ کشتگی۔

اراکین مجلس انتظامی

(۱) مولوی خواجہ معین الدین صاحب　(۵) مولوی عبدالرزاق صاحب
(۲) " عبدالمجید صاحب　(۶) " میر جمال علی صاحب
(۳) " واجد علی صاحب قید　(۷) " کریم داد خاں صاحب ساہو
(۴) " سید اشرف حسین صاحب　(۸) " فدا اللہ بیگ صاحب
(۹) قاضی محمد حسین صاحب بی اے (عثمانیہ)

بعد کو حسب ذیل تحریکات پیش اور بہ اتفاق آرا منظور ہوئیں۔

(۱) ۔ اردو دانی اور اردو عالم میں شریک ہونے والے امیدواروں کے لئے تعلیم کا باضابطہ انتظام کیا جائے۔

(۲) ۔ فی الحال جناب لبسٹپا صاحب ساہو کا مکان جو ٹپہ خانہ کے قریب واقع ہے ادارہ کی تعلیم گاہ کے طور پر استعمال میں لایا جائے۔

(۳) ۔ ایسے اساتذہ کی رضاکارانہ خدمات حاصل کی جائیں۔ جو بہ طیب خاطر غیر اوقات مدرسہ میں تعلیم دے سکیں۔

(۴) ۔ جناب لبسٹپا صاحب کے مکان میں ایک دارالمطالعہ بھی قایم کیا جائے۔ جہاں اردو ادب کی ہر مفید کتاب مطالعہ کے لئے رکھی جائے۔

(۵) ۔ حسب ذیل حضرات نے ازراہ کرم اردو دانی اور اردو عالم کے امیدواروں کو تعلیم دینے کے لئے اپنی اعزازی خدمات پیش فرمائیں۔

(۱) جناب پنڈت بلونت راؤ صاحب کھاٹے　(۴) مولوی عبدالمجید صاحب
(۲) " چندپا صاحب پٹیل　(۵) " عبدالرزاق صاحب
(۳) مولوی خواجہ معین الدین صاحب　(۶) " قاضی محمد حسین صاحب بی اے (عثمانیہ)

(۶) ۔ نادار امیدواروں کی ضروریات تعلیم کی فراہمی کے لئے یہ طے پایا کہ اراکین شاخ ادارہ و دیگر حضرات ماہانہ (۱۲؎) روپیہ چندہ ادا کریں۔ اس سے کم چندہ بھی قابل قبول ہوگا۔ اور اس کا ایک باضابطہ رجسٹر رکھا جائے۔

لبسٹپا
(معتمد شاخ کشتگی)

پربھنی میں ادارۂ ادبیات اردو کی سرگرمیاں

ادارۂ ادبیات اردو شاخ پربھنی کے زیر اہتمام عالیجناب مولوی عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری کی صدارت میں ایک غیر معمولی جلسہ ہوا ابتدا میں جناب صدر نے شرکائے امتحانات ادارۂ ادبیات اردو کو نہایت ہمدردانہ نصیحت کی اور فرمایا کہ "جب تم کسی کام کو اپنے ہاتھ میں لو تو اس کو انتہائی کوششوں سے کامیاب بناؤ اور پایۂ تکمیل کو پہونچانے کی کوشش کرو اور جب کہ تم ادارے کے امتحانات میں شریک ہو رہے ہو تو ان کو محنت کرکے کامیاب کرو تاکہ تمہاری وجہ سے زبان و ادب کو تقویت پہونچے اور ادارہ کے اعلیٰ مقاصد میں کامیابی حاصل ہو۔"

یہ کہتے ہوئے موصوف نے اردو فاضل سند ثریفیہ کی جماعت کا افتتاح فرمایا۔ زاں بعد حمید اللہ خاں شیدا معتمد شاخ پربھنی نے ادارۂ ادبیات اردو کے اعلیٰ مقاصد اور اس کے طرز کار اور شعبہ جات پر تفصیلی روشنی ڈالی اور کہا کہ قابل مبارکباد ہیں وہ ہستیاں جنھوں نے اس نازک دور میں ملک کی عام ضروریات اور اہل ملک کے بڑھتے ہوئے جذبات کا لحاظ کرکے آغاز کار کے

اپنے پُرخلوص عطیوں سے اس کی بنیاد رکھی۔ ان حضرات میں خاص طور پر پروفیسر عبدالقادر سروری۔ پروفیسر عبدالمجید صدیقی پروفیسر عبدالقادر صدیقی۔ مولوی نصیرالدین ہاشمی اور دکن کے مایۂ ناز سپوت ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اردو زبان اور ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا جائے۔ ملک کے نوجوان انشاپردازوں اور شاعروں میں تصنیف اور تالیف کا شوق بڑھایا جائے اور حیدرآباد کی علمی اور عملی کوششوں کو اجتماعی شکل دی جائے اور جو نوجوان علم و ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں ان کی صحیح رہنمائی کی جائے اور ان کی تصنیفات اور تالیفات کو زیور طبع سے آراستہ کیا جائے اور ان کی عملی اور علمی قوتوں کو برسرکار لایا جائے۔

چنانچہ ادارے نے اس مقصد عظیم میں بڑی کامیابی حاصل کی۔ اس کے بعد مقامی شاخ کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ خوش قسمتی سے پربھنی میں ادارہ کی شاخ قائم ہوگئی ہے۔ موجودہ صورت میں مقامی شاخ نے ۴ شعبہ جات قائم کئے ہیں شعبہ امتحانات۔ شعبہ تقریر۔ شعبہ شاعری۔ شعبہ تحریر۔ اور ان کی تفصیل بتلاتے ہوئے شرکت کی درخواست کی جس پر متعدد حضرات نے شرکت فرمائی۔

اس کے بعد مرزا نذیر بیگ صاحب نذیرؔ نے اپنا مسدس سنایا جو موصوف نے دور حاضرہ کے عنوان سے لکھا ہے جس سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ زاں بعد مادر جامعہ عثمانیہ کے مایۂ ناز ادیب و شاعر حضرت جلال الدین صاحب اشکؔ نائب صدر نے نہایت ہی فصیح و بلیغ تقریر فرمائی۔ اور آبِ حیات اور اس کے مصنف پر بہترین لکچر دیا۔

فی الوقت جماعت اردو فاضل میں ۱۲، اردو عالم میں ۱۲، خوشنویسی میں ۵، اور اردو دانی میں دس طلبہ نے شرکت کی ہے۔ توقع ہے کہ سابقہ امتحانات کے نتائج کے بعد بہت زیادہ طلبہ شریک ہوں گے۔

مولوی عبدالحی صاحب بی اے عثمانیہ مددگار مہتمم آبکاری اور مولوی عبدالباری بی اے ایل ایل بی انسپکٹر آبکاری نے معاشیات اور تاریخ پر لکچر دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ مدرسہ فوقانیہ پربھنی کے اساتذہ بھی کچھ ایثار سے کام لے کر تھوڑا سا وقت صرف کریں تو طلبہ کے لئے بڑی آسانی ہوگی۔ اس کے بعد شاہ ذیجاہ کے عمر و اقبال میں ترقی کی دعا کی گئی اور جلسہ نہایت کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔

حمید اللہ خاں شیدا

(معتمد شاخ پربھنی)

تاریخ ادب اردو۔ ادارۂ ادبیات اردو نے طلبہ اور عوام کے لئے ایک تاریخ ادب اردو مرتب کر کے شایع کی ہے جو تین حصوں اور (۱۷۶) صفحات پر مشتمل ہے اردو کی اتنی مختصر تاریخ اب تک شایع نہیں ہوئی تھی اس میں آٹھ سو سے زیادہ مضمون، کتابوں اور رسالوں کے متعلق ضروری معلومات شامل ہیں ہر اردو جاننے والا اس سے مستفید ہو سکتا ہے۔ قیمت بہت ہی کم یعنی (عہ) رکھی گئی ہے۔

سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد سے طلب فرمائیے۔

گلبرگہ میں اردو کی تعلیم

عامۃ الناس کی فلاح و بہبود کا خیال کوئی نیا نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے اب تک لوگ اپنے طور پر مخلوق خدا کی خدمت کرتے چلے آئے ہیں لیکن خدمتوں میں بھی فرق ہے۔ بعض ذاتی منفعت کے لئے خدمتِ خلق کے درپے ہوتے ہیں۔ بعض نام و نمود کے خاطر دوسروں کی آگ میں کودتے ہیں۔ لیکن تیسرا طبقہ ان سب سے جدا قوم کی ترقی کے لئے خدمت کرتا ہے۔ اس کے افراد اپنے پہلو میں دردمند دل رکھتے ہیں۔ اور قوم کے لیے غرض محسن ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسی ہی ہستیوں کے زیر اثر گلبرگہ میں ادارہ کی شاخ قایم ہوئی جس کے قیام کا سہرا مولوی محمود حسین صاحب (عثمانیہ) کے سر ہے۔

موصوف گلبرگہ میں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ادارہ کے اغراض و مقاصد کا مطالعہ کیا اور اردو زبان کی خدمت کا بیڑا اٹھایا۔

پہلے پہل انھوں نے ادارہ کے قیام کے لئے ایک ہونہار سے کام لیا۔ یعنی محمود حسین صاحب کی کوششوں سے اصغر علی صاحب کی شکل میں ایک شمع روشن ہوگئی جس نے آہستہ آہستہ اردو کے بہت سے پروانے اپنے گرد جمع کر لئے۔

اس طرح ۲۴ اسفندار ۴۹ف سے ادارہ کی امتحانی جماعتوں کی تعلیم شروع ہوئی۔ چند دنوں تک مولوی صاحب کے مکان پر درس و تدریس جاری رہی بعد میں ان کے ایک دوست نے اپنا دیوان خانہ اس کے لئے مرحمت فرمایا۔ لیکن طلبہ کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر یہ دیوان خانہ بھی ناکافی ثابت ہونے لگا۔ جس کی وجہ سے محلہ کا ایک عاشور خانہ (جو سوائے ماہ محرم کے ہر وقت خالی رہتا ہے) اہل محلہ سے درخواست کر کے مانگ لیا گیا۔ عاشور خانہ بہت خستہ حالت میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی مرمت کے لئے اہل محلہ سے چندہ کی درخواست کی گئی بعض سادہ لوح حضرات نے تو حالتِ سکر میں مولوی صاحب سے غیر مہذب گفتگو کی لیکن انھوں نے خاموشی اختیار کی۔ اور اپنا کام کرتے چلے گئے بعض نادار لڑکے جو کسی صورت سے بھی کتابیں نہیں خرید سکتے تھے ان کو کتابیں دلوائیں اور کئی لڑکوں کی امتحانی فیس بھی اپنی جیب سے ادا کرنی پڑی۔

جملہ طلبائے ادارۂ ادبیات اردو شاخ گلبرگہ کی مولوی محمود حسین صاحب نے حقیقی معنوں میں تن من دھن سے خدمت کی ہے۔ جس کے شکریہ کے لئے ہمارے پاس الفاظ نہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ خدا ان کے جذبۂ ایثار میں استحکام بخشے اور ادارہ کی شاخ کو دن دونی رات چوگنی ترقی نصیب کرے۔

ادارہ کے ساتھ ایک دار المطالعہ کا قیام بھی ضروری تھا تاکہ لوگوں میں ادب کا صحیح ذوق پیدا ہو جائے لیکن مالی حالت ابتر ہونے کی وجہ سے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حاجی محمد یوسف صاحب تاجر عطر۔ یعقوب علی ہاشم صاحب تاجر و منیجر کرشیل ٹاکیز نے حتی الامکان چندہ دے کر اس مبارک کام کی انجام دہی فرمائی۔

احسان فراموشی ہوگی اگر اس سلسلہ میں ہم نواب غوث یار جنگ بہادر مولوی نصیر الدین صاحب نظامی لکچرار کالج گلبرگہ، مولوی عبد الکریم صاحب مددگار وسطانیہ مومن پورہ اور مولوی محمد عمر صاحب سررشتہ دار صدر محاسبی تعلقہ کا شکریہ ادا نہ کریں نواب صاحب معزز نے ہمیشہ ہماری ڈھارس بندھائی۔ اور وقتاً فوقتاً قیمتی مشوروں سے ہمیں سرفراز فرمایا۔ مولوی نصیر الدین صاحب نے عروض جیسے ادق مضمون کی تعلیم اپنے ذمہ لی، مولوی عبد الکریم صاحب نے سائنس کا پورا نصاب بڑی عمدگی سے ختم کرایا اور مولوی محمد عمر صاحب نے دفتری معلومات کی عملی تعلیم دی۔

نیاز علیخاں نیاز

نوبل پرائز

ہمارے لئے یہ خبر نہایت ہی مسترت خیز ہے کہ ادارۂ ادبیات اردو کے ایک قدیم رفیق اور ادارہ کے شعبۂ زبان کے سرگرم رکن ڈاکٹر رضی الدین صاحب صدیقی کو نوبل پرائز کمیٹی نے مشاہیر ماہرین سائنس میں سے اس سال کے انعام کےلئے منتخب کیا ہے۔

یہ وہ اعزاز ہے جو دنیا کے صرف اعلیٰ ترین ماہرین ہی کو مل سکتا ہے۔ اور جس کی وجہ سے نہ صرف وہ فرد جس کو یہ انعام دیا جاتا ہے بلکہ اس کی پوری قوم اور ملک کا رتبہ بلند ہوجاتا ہے

ادارہ کے شعبۂ زبان کا گزشتہ اجلاس اپنے اس مایۂ صد افتخار رکن کی خدمت میں ہدیۂ مبارکباد پیش کرچکا ہے۔ اور اب سب رس کی مجلس ادارت بھی اپنے پرخلوص جذبات کے اظہار کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو دلی مبارکباد دیتی ہے۔

ناظرین سب رس کو یاد ہوگا کہ علامہ اقبال سے متعلق ڈاکٹر صاحب کا بسیط مضمون سب رس کے صفحات پر شایع ہوکر مقبولیت حاصل کرچکا ہے۔

ادارہ

غزل

کچھ تو مجھے اے جلوۂ جانانہ بنا دے
اپنا نہ بنا آپ سے بیگانہ بنا دے

در پردہ مئے حسن کا مستانہ بنا دے
پردہ نہ اٹھا اور مجھے دیوانہ بنا دے

افسانہ طلب حسن ہے اس کا مجھے ڈر ہے
ظالم مری ہستی کو نہ افسانہ بنا دے

آئینۂ رخ سے تری ہٹتی نہیں آنکھیں
یہ ذوقِ نظر مجھ کو بھی تجھ سا نہ بنا دے

میں منتظر اس موسمِ گل کا ہوں جو مجھ کو
گلچینِ بہارِ رُخِ جانانہ بنا دے

دل کب سے ہے مشتاق ترا بادِ بہاری
آ اور بھی دیوانے کو دیوانہ بنا دے

میخانہ جو آنکھوں کو بنا رکھا ہے ساقی
مستی کو مری حاصلِ میخانہ بنا دے

پھر شوقِ تماشا لئے جاتا ہے کسی سمت
پھر ذوقِ طلب مجھ کو تماشا نہ بنا دے

دل پھیر دیا اس نے جلیل آج یہ کہہ کر
دیوانہ ہے مجھ کو بھی نہ دیوانہ بنا دے

نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

فرصت کا استعمال

انسان کے لئے آرام لینا نہایت ضروری ہے۔ لیکن آرام سے مراد کاہلی نہیں بلکہ مشاغل کی ایسی تبدیلی ہے جس سے ہم کو تفریح حاصل ہو ہمارے دماغ میں تازگی پیدا ہو اور تندرستی قائم رہے تاکہ ہماری کارکردگی میں اضافہ ہو۔

تفریحی مشاغل | فرصت کے گھنٹوں میں مذہبی اور خانگی فرائض بھی داخل ہیں یہ فرائض مختلف اشخاص کے لئے مختلف حیثیت رکھتے ہیں، اور بعض کے لئے کم اور بعض کے لئے زیادہ ہیں۔ لیکن یہ کتنے بھی زیادہ کیوں نہ ہوں ان کو انجام دینے کے بعد بھی انسان ایسے مشاغل کے لئے سوا اس کی تندرستی قایم رکھنے علاوہ میں اضافہ کرنے اور زندگی سے لطف اندوز ہونے کا باعث ہوتے ہیں وقت نکال سکتا ہے۔ ان مشاغل میں تفریحی مشاغل یعنی Hobbies کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ موسیقی، فوٹوگرافی، مصوری، معموں کو حل کرنا ڈاک کے ٹکٹ کا جمع کرنا اور اسی قسم کے دوسرے تفریحی مشاغل نہ صرف ہماری زندگی کی لذت کو بڑھاتے ہیں بلکہ ہمارے ذہن کی اصلاح بھی کرتے ہیں۔ فرصت کے گھنٹوں میں انگلستان کے مشہور وزیر اعظم گلاڈسٹون کو درخت کاٹنے اور پوسٹ کارڈ لکھنے کا شوق تھا۔ اور دنیا کے مشہور فلسفی ہربرٹ اسپنسر بلیرڈز کھیل کر اپنا دل بہلایا کرتے تھے موجودہ زمانہ میں ایران کے بادشاہ رضا شاہ کا تفریحی مشغلہ موسیقی ہے۔ اس قسم کے کثرت سے اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ میں آج ایسے مشاغل کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو عام طور پر مفید اور ضروری ہیں۔

ورزش جسمانی | ایسے اشخاص کو جو دماغی کام کرتے ہیں یا بند جگہ کام کرتے ہیں کام سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے کھلی ہوا کی فکر کرنی چاہئے حیدرآباد جیسے بڑے شہر میں کھلی ہوا کا مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ گزشتہ چند سال سے محکمہ آرائش بلدہ اور محکمہ بلدیہ کی توجہ اس طرف مبذول ہے اور جابجا عوام کے لئے تفریح گاہیں بنائی گئی ہیں نیز ہمارے شہر میں کھیل کے میدانوں کی جو کمی ہے اس کو پورا کرنے کی بھی کوشش کی جارہی ہے۔ قدیم یونانیوں کا ایک مقولہ یہ ہے کہ آدمی اس وقت تک جوان رہے گا جب تک کہ وہ کھیلتا رہے گا۔ بعض کھیل مثلاً ٹینس اور بیاڈمنٹن ایسے ہیں جن میں انسان عالم جوانی گزرنے کے بعد بھی حصہ لے سکتا ہے۔ پیراکی اور چہل قدمی کے لئے بھی عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ اگر روزآنہ کام سے پہلے یا بعد کوئی شخص نصف گھنٹہ تیر لیا کرے یا تین چار میل کھلی ہوا میں چہل قدمی کرے تو صحت کو برقرار رکھنے کے لئے اس کو کسی اور ورزش کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ ہر شخص تیرنا نہیں جانتا اور جو لوگ جانتے ہیں ان کے لئے پیراکی کے موقعے کم ہیں۔ لیکن جوان بوڑھے، مرد عورت امیر غریب سب پیدل چل سکتے ہیں۔

جب کوئی شخص گھر سے ٹہلنا ہوا نکلے تو اس کا دماغ گھر یا ملازمت یا پیشہ کی فکروں سے خالی رہنا چاہئے۔ اگر ایک یا دو ہم مذاق دوست اس کے ساتھ ہوں تو ایسی فکروں سے نجات حاصل کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ کھیل کو ٹہلنے پر اسی لئے ترجیح حاصل ہے کہ کھیل کے دوران میں فکروں کو بھلا دینا زیادہ آسان ہے۔

رسم و رواج کی وجہ سے ہندوستان میں عورتوں اور خصوصاً پردہ نشین عورتوں کی صحت کا مسئلہ خاص طور پر محتاج توجہ ہے۔ خدا ان آٹے کی گرنیوں کا بھلا کرے کہ گھر میں چکی پیسنا بھی اب موقوف ہوگیا ہے۔ عورتوں کے لئے خاص تفریح گاہیں اور کلب بھی موجود نہیں ہیں اگر ہیں بھی تو صرف متمول عورتوں کے لئے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ عورتوں کے لئے

دلکش اور کھلی ہوا کے موقعے بہم پہونچانے کی جانب خاص توجہ کی جائے۔

باغبانی | باغبانی بالحاظ سن وصنف سب کے لئے بہترین مشغلہ ہے جن عورتوں کو باہر جانے کا کم موقع ملتا ہے ان کے لئے سینے پرونے اور گھر کے دوسرے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد باغبانی تفریح طبع کا اچھا ذریعہ ہے۔ باغبانی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ گھر کا احاطہ وسیع ہو صحن اگر مختصر بھی ہو تو اس میں باغبانی کے لئے گنجائش نکالی جاسکتی ہے۔ پھولوں سے گھر کی رونق بڑھتی ہے اور اگر ترکاری کی بھی پیداوار ہو تو اس سے گھر کے خرچ میں کفایت ہوتی ہے۔

اخبار بینی اور کتب بینی | جیسے جیسے تعلیم میں ترقی ہورہی ہے ویسے ویسے لوگوں میں اخبار پڑھنے کا شوق بڑھتا جاتا ہے۔ لیکن اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کو مقامی اور بیرونی سنسنی خیز خبروں کے سوا دوسری عام خبروں سے دلچسپی ہوتی ہے البتہ جب سے کہ جنگ کا آغاز ہوا ہے جنگ کی خبریں لوگ شوق سے پڑھنے لگے ہیں جس کا ایک اچھا نتیجہ یہ بھی ہے کہ ان خبروں کے سلسلہ میں وہ مختلف ملکوں کے جغرافیہ، طرز حکومت اور دوسرے حالات سے واقف ہوتے جارہے ہیں۔ یورپ میں مزدور بھی اخبار خرید کر پڑھتے ہیں لیکن ہندوستان میں اخبار کے خریدار کم اور پڑھنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔

ہماری ریاست میں روزآنہ اور ہفتہ واری اخبار اور ماہواری رسالوں کی کمی نہیں ہے لیکن ان میں دیہی باشندوں کی دلچسپی کا مواد بہت ہی کم ہوتا ہے اس کے علاوہ ان کے مضامین ایسے ادق اور ان کی زبان ایسی مشکل ہوتی ہے کہ معمولی لکھا پڑھا ان سے پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ دیہی اور کم تعلیم یافتہ اشخاص کے لئے خاص اخباروں کی ضرورت ہے مگر ایسے خاص اخبار جاری بھی ہوجائیں تو عام افلاس اور بے توجہی کے سبب ان کی کافی خریداری میں شک ہے کچھ اسی قسم کے وجوہ کی بنا پر بعض غیر ممالک میں وال پیپر یعنی دیواری اخبار کا طریقہ جاری کیا گیا ہے کسی گاؤں یا محلہ کے چند پرجوش اشخاص اپنی ایک کمیٹی بنا کر ہفتہ واری دیواری اخبار نکالتے ہیں یہ ایک بڑی تقطیع کے کاغذ پر ہاتھ سے لکھا ہوا ہوتا ہے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی شخص کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہو بعض دفعہ تو (Cuttings) ...... یعنی چھپے ہوئے اخبارات اور رسالوں کے تراشے جو ناظرین کے لئے دلچسپ یا سبق آموز ہوں اس پر چپکا دئے جاتے ہیں۔ ان پڑھ بھی خاکے اور تصویریں دیکھ کر کچھ لطف اٹھاتے ہیں اور غیر شعوری طور پر خواندگی کی طرف مائل ہوتے ہیں اگر اس قسم کا دیواری اخبار کسی مرکزی مقام مثلاً گاؤں کی چاوڑی میں لگا دیا جائے اور ان پڑھوں کو پڑھ کر سنایا جائے تو میرے خیال میں ایک عمدہ تعلیمی خدمت ہوگی اور گاؤں کی مردہ فضا میں زندگی کی ایک لہر دوڑنے لگے گی۔

جس کسی کو طالب علمی کے زمانہ میں تفریح کے طور پر کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں ہوا اس کی تعلیم کو ادھورا سمجھنا چاہئے۔ لیکن یہ ایسی کمی ہے جس کی تلافی کے لئے عمر کی قید نہیں ہے تنہائی میں کتاب سے بہتر اور کوئی رفیق نہیں ہوسکتا۔ ہر ترقی یافتہ زبان میں ایسی کتابوں کا جن کے پڑھنے کو جی چاہتا ہے اتنا ذخیرہ موجود ہے کہ اس کے مطالعہ کے لئے انسان کی عمر کافی نہیں ہے۔ اس پر آئے دن نت نئی کتابیں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ نئی کتابوں کے انتخاب میں ایسے دوست احباب سے جو

ان کو پڑھ چکے ہوں مشورہ کرلینا یا ان پر اخباروں اور رسالوں کی تنقید سے رہبری حاصل کرنا مناسب ہوگا۔ عوام کے لئے موزوں اور سستی کتابیں ہندوستان کی تقریباً ہر زبان میں بہ کثرت شایع ہورہی ہیں۔ خانگی کتب خانہ ایک بڑی نعمت ہے۔ لیکن کتابیں کتنی ہی سستی کیوں نہ ہوں بہت کم لوگ وہ تمام کتابیں خرید سکتے ہیں جن کو پڑھنے کے وہ خواہشمند ہیں۔ یہ ضرورت عام کتب خانوں سے پوری ہوسکتی ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ حیدرآباد میں متعدد کتب خانے اور مطالعہ گھر قایم ہوگئے ہیں لیکن اضلاع میں کتب خانوں کی کمی ہے اور جس طرح بڑودہ میں گشتی کتب خانے قایم کئے گئے ہیں اسی طرح ہماری ریاست میں دیہات کے باشندوں کے لئے کتب خانے قایم کرنے کی ضرورت ہے۔

علمی جلسے اور مشاعرہ | معلومات میں اضافہ کرنے اور خیالات میں بلندی اور نظر میں وسعت پیدا کرنے کے لئے علمی جلسوں میں شرکت نہایت مفید ہے اور جن حضرات کو شعر و شاعری کا ذوق ہے ان کے لئے مشاعرہ ایک اچھا مشغلہ ہے بشرطیکہ اس میں اعتدال سے کام لیا جائے۔

سینما | سینما نہ صرف تفریح بلکہ اضافۂ معلومات کا ذریعہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ اداکاری اور معلومات کے نقطۂ نظر سے فلم اچھا ہو بہت سے ایسے فلم ہیں جن سے ہم کو دوسرے ممالک کی طرز معاشرت اور تاریخ و جغرافیہ کے متعلق مفید معلومات حاصل ہوسکتی ہیں یا کسی غیر زبان میں ہم کو اپنی استعداد بڑھانے اور اس کا صحیح تلفظ اور لہجہ سیکھنے میں مدد دیتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سینما کے دیکھنے سے آنکھوں پر بار پڑتا ہے اور بند جگہ دو ڈھائی گھنٹے بیٹھے رہنا صحت کے لئے بھی مضرت رساں ہے۔ البتہ کبھی کوئی اچھا فلم دکھایا جائے تو اس کو ضرور دیکھنا چاہیئے۔ اور مہینہ میں ایک دو دفعہ سینما جانے سے صحت پر بھی بُرا اثر نہیں پڑ سکتا۔

لاسلکی | لاسلکی زمانۂ حال کی ایک حیرت انگیز ایجاد ہے۔ اور فرصت کے اوقات کو مفید طریقہ پر اور لطف سے گزارنے کا بہترین ذریعہ ہے خصوصاً ہندوستانی عورتوں کے لئے جن کو تفریح کے لئے یا اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کے لئے گھر سے باہر جانے کا کم موقع ملتا ہے۔ اس ایجاد کی بدولت ہم گھر بیٹھے موسیقی کے علاوہ تازہ ترین خبریں اور مشہور مصنفین اور مدبرین وغیرہ کی تقریروں کو سُن سکتے ہیں۔ لاسلکی کی اہمیت کا لوگوں کو کبھی اس قدر احساس نہیں ہوا تھا جس قدر کہ موجودہ جنگ کے آغاز سے ہوا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ اب نہ صرف دہلی، بمبئی، کلکتہ اور مدراس بلکہ مقامی لاسلکی نشرگاہ میں بھی علمی مضامین پر تقریروں کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ طلبہ کی دلچسپی کا پروگرام دیہاتیوں کے لئے نہایت مفید اور دلچسپ ہوتا ہے۔ اگر اسی طرح ہماری ریاست میں نہ صرف اردو بلکہ تلنگی، مرہٹی اور کنڑی میں دیہاتی پروگرام نشر کیا جائے اور کم از کم ہر تعلقہ کے مستقر کے لئے ایک لاسلکی سٹ مہیا کیا جائے تو اس سے دیہات سدھار کے کام میں بڑی مدد ملے گی۔ اکثر جاہل لوگ نشہ کا استعمال محض اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ان کے لئے اور دلچسپیاں نہیں ہیں۔ سماجی اصلاح کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم تعلیم کے ذریعہ سے عوام کی دلچسپیوں میں اضافہ کریں اور ان کے لئے تفریح طبع کا موزوں سامان مہیا کریں۔

قومی کام | وہ لوگ قابل احترام ہیں جو اپنے فرصت کے گھنٹوں میں

ایثار سے کام لے کر کوئی قومی خدمت انجام دیتے ہیں۔ ہندوستان کی معاشی اور تعلیمی پستی کے مدنظر تعلیم یافتہ اشخاص کا فرض ہے کہ ایسی تحریکات کے لئے جن پر ملک کی ترقی کا دار و مدار ہے تھوڑا بہت وقت دیا کریں ان میں بہت سی ایسی بھی تحریکات ہیں مثلاً تعلیم بالغان اور تنظیم دیہی کی تحریکات جن میں ملازمین سرکار بھی حصہ لے سکتے ہیں۔

تعطیلات کا مصرف فرصت کے اوقات میں چھٹی کے دن بھی شامل ہیں۔ ہفتہ میں ایک دن اپنے پیشہ یا ملازمت کی فکروں کو بھول کر آرام لینا اور دوسری مصروفیات سے اپنی تھکان دور کرنا ضروری ہے۔ ورنہ زندگی اپنی یکسانیت کی وجہ سے بے مزہ ہوجاتی ہے اور صحت کے بھی متاثر ہونے کا اندیشہ ہے سرکاری ملازمین کو دوسری تعطیلات کے علاوہ ہفتہ میں ایک دن چھٹی ملتی ہے لیکن اکثر خانگی ملازمین کو چھٹیاں کم ملتی ہیں مغربی ممالک میں ہر اتوار کو قانوناً تمام دوکانیں اور کارخانے بند کئے جاتے ہیں۔ کیا اچھا ہوگا اگر اس قسم کا قانون ہمارے ہاں بھی جاری کیا جائے۔

انگلستان میں ویک اینڈ یعنی ہفتہ کی سہ پہر سے پیر کی صبح تک کی چھٹی کا ہر شخص شوق سے منتظر رہتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں رہنے والے ارزاں ریل کے ٹکٹ سے استفادہ کرکے اکثر شنبہ کو کسی ساحلی یا اور کسی دلفریب مقام کو جاکر پورے ہفتہ کی تھکان کھیل، پیراکی، مچھلیوں کے شکار دلکش مناظر کے مشاہدے اور اسی قسم کے دوسرے مشاغل سے دور کرتے ہیں اور دوشنبہ کو اپنے کام پر تازہ دم واپس ہوتے ہیں جو لوگ اپنے مستقر سے کسی وجہ سے باہر نہیں جاسکتے وہ وہیں کسی تفریح گاہ میں اپنا دل بہلاتے ہیں۔ چنانچہ اتوار کے دن ہر شہر کے باغوں اور دوسری تفریح گاہوں میں ہزاروں کی تعداد میں مخلوق نظر آتی ہے۔ اور اکثر لوگ تعطیل میں یا جب کبھی فرصت ملے فٹ بال یا کرکٹ میاچ دیکھنے سے نہیں چوکتے۔ اس طرح ہفتہ میں ایک دن تعطیل منانے کے علاوہ اپنی آمدنی میں سے کچھ روپیہ ہر مہینہ بچا کر اکثر لوگ موسمی تعطیلات میں یا اگر ان کو موسمی تعطیلات نہ ملتی ہوں تو رخصت کے حق سے استفادہ کرکے دلچسپ مقامات کی سیر و سیاحت کرتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو کرسمس کے زمانہ میں جب کہ ریلوے کمپنیاں ٹکٹ میں رعایت کرتی ہیں تاریخی اور دوسرے قابل دید مقامات کی سیر کا اچھا موقع ملتا ہے۔ لیکن عام طور پر اس قسم کی رعایت سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو اپنے خویش و اقربا سے ملنے یا شادی غمی میں شریک ہونے کے لئے دوسرے مقامات کو جایا چاہتے ہیں۔ تعطیل منانے کا شوق بہت کم ہندوستانیوں میں پایا جاتا ہے۔

کنٹربری کے اسقف اعظم نے کیا خوب کہا ہے کہ کسی انسان کی تعلیم اور کلچر کی جانچ محض اس سے نہیں ہوتی کہ وہ اپنے فرائض کس طرح انجام دیتا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ اپنی فرصت کے اوقات کس طرح استعمال کرتا ہے۔ جاپان اور مغربی ممالک کی قوموں کی ترقی کا راز یہی ہے کہ وہ کام کے وقت پوری دلچسپی اور انہماک سے کام کرتے ہیں اور فرصت کے وقت ایسی تفریح کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ جس سے ان کو زندگی کا حقیقی لطف ملتا ہے اور ان کی کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ ملک کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم نہ صرف مدرسوں میں طالب علموں کو فرصت کا صحیح استعمال سکھائیں بلکہ جہاں تک ہوسکے عام لوگوں کو بھی اس کے فائدوں سے واقف کرائیں۔

سید علی اکبر

(نوٹ) یہ تقریر ۲۰ر اگست ۴۰ء کو حیدرآباد لاسلکی اسٹیشن سے نشر کی گئی۔

بوڑھا ڈاکٹر

(سلسلہ گزشتہ)

"تم اٹھنے کی کوشش مت کرو۔ ٹھیرو میں ابھی آیا۔" بڑھے ڈاکٹر نے کہا۔ پہلے اس نے ڈاکٹر خورشید کے جوتے اتارے تاکہ وہ مضبوطی سے زمین پر پاؤں جما سکے۔ پھر اس کو سہارا دیکر کھڑا کر دیا۔ "ابھی طرح پاؤں جماؤ ایسا نہ ہو کہ ہم دونوں گر پڑیں اب سامنے والے پتھر پر جوتے صاف کر کے پہن لو۔ اور آہستہ آہستہ چلو۔"

جب وہ دونوں پھر چلے ہیں تو ان کے پاؤں چھ چھ انچ دلدل کے اندر جا رہے تھے۔ اس طرح چلنے کی عادت نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر خورشید کے پاؤں بری طرح دکھنے لگے۔ ایک ایک قدم اٹھانا اس کے لئے دوبھر تھا۔ اور بوڑھے ڈاکٹر کا ساتھ دینے کے لئے اسے تیز بھی چلنا پڑتا تھا۔

بہت دیر کے بعد آخر بوڑھا ڈاکٹر ٹھیرا۔ اور ڈاکٹر خورشید ہانپتا ہوا اس کے قریب آیا۔ "یہاں سے سراج الدین کے گھر کی طرف سڑک مڑتی ہے۔ مگر چڑھائی بہت ہے۔ بہتر ہے کہ تم میرے ساتھ نجم الدین کے پاس چلو۔ وہاں سے راستہ صاف ہے۔ اور شاید تم یہاں سے راستہ بھی بھول جاؤ۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں آپ کے ساتھ چلوں گا" ڈاکٹر خورشید نے کہا۔

اب چلنے کھڑے ہونے سے خون جمتا ہوا معلوم ہو رہا ہے" آخر وہ لوگ ایک پتلی سی گلی میں داخل ہو گئے۔ یہاں میدان کی نسبت گرمی تھی۔ یہاں آ کر ڈاکٹر خورشید کی حالت سنبھل گئی۔

آخر وہ نجم الدین کے گھر پر پہنچ گئے۔ کمرہ بہت گرم تھا۔ بڈھا ڈاکٹر تھک کر آرام کرسی پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر تک اس کا سانس ٹھیک نہیں ہوا۔ ڈاکٹر خورشید الگ بیٹھا ہانپ رہا تھا جب بوڑھے ڈاکٹر کا سانس ٹھیک ہوا تو کہنے لگا "جوتے اتار کر صاف کرو۔" ڈاکٹر خورشید فرمانبردار بچے کی طرح کہنا ماننے لگا۔ نجم الدین نے ڈاکٹر کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ پاس ہی پلنگ پر لڑکا لیٹا کراہ رہا تھا۔ یہ نجم الدین کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس گلی میں رہتا تھا۔ اگر ذرا اور دور ہوتا تو ان دونوں کا وہاں تک پہنچنا دشوار تھا۔ آخر بوڑھے ڈاکٹر نے اطمینان سے کوٹ اور مفلر اتار کر پٹیاں باندھنے کی تیاری شروع کر دی۔

"نجم الدین صاحب ڈاکٹر خورشید کے لئے تین چار پیالی گرم چائے بنوا دیجئے۔ انھیں سراج الدین کے پاس جانا ہے۔ ان کی بچی سخت بیمار ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"اس بچی کا معلوم نہیں کیا حشر ہوگا جب دیکھو بیمار رہتی ہے۔ اور ماں باپ کی اکلوتی بھی ہے۔" نجم الدین نے کہا

"ان کا تبادلہ شہر میں ہو گیا ہے وہ آج کل میں جانے والے تھے۔ مگر بچی کی بیماری کی وجہ سے ٹھیر گئے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کے لڑکے کی ٹانگ کو زیادہ چوٹ نہیں آئی انشاءاللہ جلدی اچھی ہو جائے گی۔ صرف چند روز تک گھر میں بیٹھنا پڑے گا۔ چائے تیار ہے" بڈھے ڈاکٹر نے ڈاکٹر خورشید سے کہا۔ جو خاموشی سے آرام کرسی پر لیٹا چائے دان کو تک رہا تھا۔ جلدی سے پی لو ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ ڈاکٹر خورشید نے کچھ کہے بغیر چائے پینی شروع کر دی۔ تم یہ لمبا گرم کوٹ نہ پہنو تو بہتر ہے۔ ٹانگوں سے چمٹا رہے گا۔ اور چلنا مشکل ہو جائے گا چلنے کی تھکن سے تم خود بخود گرم ہوتے رہو گے۔ اور یہ اپنا کیس گلے میں ڈال لو تاکہ دونوں ہاتھ خالی رہیں۔ اور اس کا تسمہ اونچا کر کے باندھو۔ تاکہ وہ گھڑی گھڑی تمہاری ٹانگوں کو

نہ تگے تمھارے جوتے بہت نازک ہیں اور کیچڑ بھی اندر آتا ہے میرے جوتے پہن لو۔" جب تک ڈاکٹر خورشید چلتے پیتا رہا بوڑھا ڈاکٹر برابر کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔ تاکہ اس کا خیال تھکان کی طرف نہ جائے۔

جب وہ جلنے لگا تو ڈاکٹر نے کہا بیٹا ہمت سے کام لو۔ خورشید پلٹ کر مسکرایا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے اپنے اوزار گرم پانی میں ڈالے۔ اتنی دیر میں نجم الدین نے پلنگ کی چادر بدلوائی اور لڑکے کی ٹانگ کے قریب لمپ رکھوایا تاکہ زخم اچھی طرح دکھائی دے۔ ڈاکٹر نے پٹیاں باندھنے سے پہلے دونوں ہاتھوں کو خوب ملا تاکہ ان میں گرمی پیدا ہو جائے اور چستی آ جائے ہڈی کو اپنی جگہ پر لانے اور بچے کی چیخ پکار اور ہائے ہائے کے دوران میں وہ پسینے میں نہا گیا۔ اس کو ڈر تھا کہ کہیں ہسپتال لیجا کر ایکس رے نہ کروانا پڑے آخر گھنٹہ بھر کی کشمکش کے بعد ہڈی جگہ پر بیٹھی تو ڈاکٹر نے اطمینان کا سانس لیا۔ چند پٹیاں مضبوط باندھ کر آخری پٹیاں باندھنے کا کام اس نے دوسروں پر چھوڑ دیا۔ اور خود بیٹھا دیکھتا رہا۔ جب بچے کے آرام کا سب انتظام ہو چکا تو وہ بھی فرش پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا اچھا ہو کہ اسے اب اٹھنا نہ پڑے تھکان سے اس کی ہڈی ہڈی دکھ رہی تھی۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں اسے کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ کیا دیکھتا ہے کہ سامنے ڈاکٹر خورشید کھڑا ہے۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ "لڑکی کا برا حال ہے آپ کا جتنی جلدی ہو سکے چلنا ضروری ہے"۔ اس نے کہا۔

"آخر ہوا کیا؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"لڑکی معلوم ہوتا ہے کہ آخری سانس لے رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے جتنی جلدی ہو سکے ہسپتال لے جانا چاہئے۔ مگر اس کی ماں کہتی ہے کہ اگر اسے گھر سے لے جایا گیا تو وہ رو رو کر جان دیدے گی۔

"تو پھر کیا کیا جائے؟" بوڑھے ڈاکٹر نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "کیا بتاؤں۔ آپ چلیں تو شاید کچھ کام بن جائے۔"

اچھا چلو یہاں کھڑے کھڑے باتیں کرنے سے تو صرف وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اس نے گرم کوٹ پہنا مفلر لپیٹا اور پھر دونوں چل کھڑے ہوئے بارش تھمنے کا نام نہ لیتی تھی اور ہر طرف اندھیرا گھپ تھا۔ مگر وہ دونوں چلتے رہے۔ ان کو صرف اتنی خبر تھی کہ یہاں سے اگر سیدھے چلے چلیں تو سراج الدین کا گھر آدھا میل ہے۔

"میں آگے چلوں گا مجھے راستہ معلوم ہے۔" خورشید نے کہا۔ پھر ان کو اسی پرانی دلدل کا سامنا کرنا پڑا۔ بوڑھا ڈاکٹر خاموشی سے اس کے پیچھے چلتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر میں چڑھائی آنے والی ہے۔

چڑھائی کے بعد ہی ایک دم سے ڈھلوان آیا۔ بوڑھے ڈاکٹر کا پاؤں پھسلا تو ڈاکٹر خورشید پر گرا۔ جو اس کے انتظار میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کی بانہہ تھام لی۔ وہ کچھ کہہ رہا تھا مگر بوڑھے ڈاکٹر کو بارش کے شور میں کچھ سنائی نہ دیا۔ خورشید نے اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر چیخ کر کہا۔ "سراج الدین کا گھر آ گیا ہے وہ دیکھئے سامنے روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ بوڑھے ڈاکٹر نے سر اٹھا کر دیکھنے کی تکلیف بھی گوارا نہ کی۔ اس وقت سر اٹھانا بھی اسے بھاری مشقت معلوم ہو رہی تھی۔ تھکان کے مارے اس کا سر بھاری ہو گیا تھا۔ اور لمحہ بہ لمحہ جھکتا جا رہا تھا۔ "بس بیٹا چلے چلو۔" اس نے کہا اور ڈاکٹر خورشید کا ہاتھ تھام لیا۔

بوڑھے ڈاکٹر کو وہ بہ مشکل تمام سراج الدین کے گھر تک پہنچا سکا۔ چار دن تک اسے خبر نہیں ہوئی کہ وہ کہاں ہے۔

پانچویں دن جب وہ صبح کو اٹھا ہے تو خورشید اور سراج الدین اس کے پلنگ کے پاس کھڑے تھے۔

بوڑھے ڈاکٹر نے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔ "آپ کی شکل ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی بیٹی اب بالکل اچھی ہے۔"

"ہاں بالکل اچھی ہے اور آج تو صبح سے باتیں بھی کر رہی ہے۔" ڈاکٹر خورشید نے کہا۔

"اور میں آپ کا کسی طرح شکریہ نہیں ادا کر سکتا۔" سراج الدین نے کہا۔

"میرا شکریہ آپ کیوں ادا کرتے ہیں سب کام تو انھوں نے کیا۔" بوڑھے ڈاکٹر نے خورشید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اس نوجوان ڈاکٹر پر فخر کر رہا ہے کہ اس سے اس کی امید بر آگئی مجھے اس میں اب کسی طرح کا شبہ نہیں رہا کہ تم سب ذمہ داریاں اٹھا سکتے ہو۔"

معتصمۃ الرحمن

یہ آنسو ؟!!

کیوں آج تیری چشمِ سیہ غم نواز ہے؟!!

کیوں آج تیرے ناز میں رنگِ نیاز ہے؟!!
فطرت نے کس لئے تجھے ناشاد کر دیا!

دنیائے انبساط کو برباد کر دیا!
نومیدیوں سے دامنِ امید بھر دیا!

کیوں وقفِ نالہ بربطِ ناہید کر دیا!

(سانیٹ)

ٹپکے مژہ سے اشک گرانبار کس لئے؟
بے قدر ہو گئے درِ شہوار کس لئے؟

کس کو خبر تھی رنج ہے اس سن کے واسطے!
وہ مختصر سا عیش تھا اس دن کے واسطے!

دیوی مسرتوں کی اور آہوں سے ہمکنار!
آہوں سے ہمکنار، کراہوں سے ہمکنار!

پروردۂ بہار۔ نصیب خزاں! غضب!!
مرہونِ غم، تبسمِ عشرت فشاں غضب!!

عزیز جہاں بیگم ادا (بدایون)

تنقید و تبصرہ

کشتگان فریب :- از حاجی نبی احمد صاحب بریلوی ۔ چھوٹی سائز ۱۶۵ صفحات قیمت ۸ر آنے ۔ ملنے کا پتہ نظامی پریس بدایون

یہ ناول کے طرز کا ایک افسانہ ہے جس میں قدیم موضوع محبت کے غیر فانی ہونے کو بڑی خوبی کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے ۔ زبان اور بیان دلچسپ ہے ۔ لیکن ترتیب اور کتابت و کاغذ وغیرہ اچھا نہیں ہے ۔ اس کو دیکھتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج سے پچیس تیس سال پہلے کی چھپی ہوئی کتاب ہے ۔ مصنف نے پیری و مریدی کے سلسلے میں بعض نام نہاد مرشد جاہل اور کم فہم عوام کو جو نقصان پہنچاتے ہیں ان کا نقشہ کھینچنے میں کامیابی حاصل کی ہے ۔

فلاح مسلم :- از غوثی شاہ صاحب قادری مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس ۔

یہ درمیانی سائز کا چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں مسلمانوں کی فلاح سے متعلق قرآنی آیتوں کی مدد سے مفید معلومات قلمبند کر دی گئی ہیں ۔ اس میں اہل اسلام کی باہمی تنظیم کے علاوہ بے ہودہ رسم و رواج کی اصلاح کے لئے بھی مفید مشورے دیئے گئے ہیں ۔

علامہ اقبال اور قرآن کریم :- یہ بھی ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جس کو شرکت ادبیہ منہاس روڈ امرتسر نے شایع کیا ہے ۔ اس میں اقبال کی مختلف فارسی نظموں سے ایسے اشعار منتخب کر کے مختلف عنوانوں کے تحت جمع کر دئے گئے ہیں جن میں شاعر مرحوم نے قرآن کا ذکر کیا ہے، یا قرآن کے مطالب کو پیش کیا ہے ۔ اشعار کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ تمہید اور تشریح بھی لکھ دی گئی ہے جس کی وجہ سے یہ کوشش دلچسپ ہوگئی ہے ۔

دُرِ نجف حصہ اول :- از سید عزیز حیدر صاحب شاکر بلگرامی ۔ یہ بھی چھوٹی سائز کا ایک رسالہ ہے، جو نواب عنایت جنگ بہادر کی سرپرستی میں شایع ہوا ہے ۔ اس میں حضرت علی اور اہل بیت کرام کی منقبت اور سلام وغیرہ درج ہیں ۔ شاکر صاحب کا کلام اس سے پہلے بھی ایک چھوٹے سے مجموعہ میں شایع ہو چکا ہے ۔ زیر نظر رسالہ میں بعض سلام قابل مطالعہ ہیں ۔ لیکن اس میں سر مہاراجہ یمین السلطنت کا بھی ایک مشہور سلام صفحہ پندرہ پر چھاپ دیا گیا ہے ۔ کیونکہ پورا مجموعہ جناب شاکر کے کلام ہی پر مشتمل ہے اس لئے درمیان میں ایک اور شاعر کے سلام کو شامل نہیں کرنا چاہئے تھا چونکہ یہ حصۂ اول ہے ۔ اور ممکن ہے کہ نواب عنایت جنگ بہادر کی دلچسپی کی وجہ سے دُرِ نجف کے دوسرے حصے بھی شایع ہوں اس لئے آئندہ اس قسم کی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے ۔

چمنستان :- یہ ایک ماہوار رسالہ ہے جو قصر شاعر دہلی کی طرف سے اسی مہینہ سے شایع ہوا ہے ۔ اس کے مرتب آغا سرخوش قزلباش دہلوی ہیں جو افسر الشعرا حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کی یادگار کے طور پر اس کو نکال رہے ہیں ۔ سرخوش آغا شاعر مرحوم کے فرزند ہیں اور ان کی ادبی قابلیت سے توقع ہے کہ یہ رسالہ کامیاب رہے گا ۔ اس کے پہلے شمارہ میں خواجہ حسن نظامی، جوش ملیح آبادی، بہزاد لکھنوی، اور کیفی دہلوی کے مضامین نظم و نثر شامل ہیں ۔ اگر یہی معیار قائم رہے تو کوئی تعجب نہیں کہ چمنستان ایک کامیاب رسالہ ثابت ہوگا ۔

سیر گولکنڈہ طلبہ کے لئے :- یہ کتاب سیر گولکنڈہ کا دوسرا اڈیشن ہے جو طالب علموں کے لئے چھاپا گیا ہے ۔ اس میں بہت سے ایسے حصے حذف کر دیئے گئے ہیں جنکا مطالعہ طلبہ کیلئے غیر ضروری تھا اور قیمت بھی طلبہ کی خاطر تقریباً نصف رکھی گئی ہے ۔ یہ اصل میں نیم تاریخی افسانوں کا مجموعہ ہے اور اس کے مطالعہ کی وجہ سے سرزمین حیدرآباد کی قدیم تاریخ سے دلی محبت پیدا ہو جاتی ہے ۔

(ق)

رقاصہ

مدن پید ایک چھوٹی سی ریتیلی ندی کے کنارے خوبصورتی کے ساتھ ۴۰۔۵۰ مکانوں کو لئے ہوئے آباد تھا برسات کے چار مہینے یہ ندی لبالب رہتی گاؤں والے اپنی سہولت کے مدنظر ہر سال ندی پر ناؤ کا بندوبست کر لیتے کیونکہ ندی کے اس پار ایک بڑا شہر حیدرآباد واقع تھا۔ جہاں ہر ضرورت کی چیز مہیا ہوسکتی اس مرتبہ مصطفےٰ نامی لڑکے کو پانچ روپے ماہانہ پر ناؤ کھینے کے لئے ملازم رکھا گیا۔ مصطفےٰ ماہی گیر کا لڑکا تھا۔ گذشتہ طاعون کے زمانے میں اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ اس نے گاؤں کے ملاجین کے پاس کریما' آمدن' قرآن شریف کے دو تین پارے اور محمد اسمٰعیل صاحب کی اردو کی تیسری کتاب تک تعلیم پائی تھی' صورت شکل کے اعتبار سے مصطفےٰ برا نہ تھا، اس کے قوی مضبوط سینہ کشادہ ہونے کے علاوہ تنومند واقع ہوا تھا، ماں باپ کے مرنے پر اسے اپنے ہی ایک رشتہ دار کے کھیتوں پر متعین رہنا پڑا، لیکن بد ہنگامی کی باعث دو تین مہینے ہی میں وہاں سے علٰحدہ کیا گیا چند دنوں تک تو وہ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال لیتا لیکن اکرام علی نمبردار کی مہربانی سے اُسے دو چار مہینے تک پانچ روپے کی مستقل آمدنی ہوگئی۔

چند دنوں سے نیرآباد شہر میں "وائیٹ سٹی" کے نام سے ایک سرکس کمپنی آئی ہوئی تھی' جس میں شیر' ہاتھی' گھوڑے' بندر سبھی جانور تھے۔ پھر دوسرے کمالات طلسمی کرتب' کامک ناچ گانا' ساری دنیا کی دلچسپیاں سمٹ کر سرکس کے بڑے پنڈال میں جمع ہوگئی تھیں' لوگ بہت دور دور سے اس تفریح گاہ میں حصہ لینے کے لئے جمع ہوتے۔

کئی دن سے مصطفےٰ نے یہ سن رکھا تھا کہ نیرآباد میں ایک بڑی سرکس آئی ہوئی ہے جہاں ہاتھی شیر اور بندر ناچتے ہیں' تعجب کے ساتھ اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح تماشا دیکھ لینا چاہئے۔ وہ اپنے گاؤں والوں سے جو تماشا دیکھ کر گھروں کو آنے کے لئے اس کی ناؤ میں سوار ہوتے' بڑی حسرت و اشتیاق کے ساتھ ان ہاتھی اور بندر کے ناچ کے متعلق دریافت کرتا' لوگ مزے لے لے کر اس سے کھیل کی تعریف کرتے مصطفےٰ یہ سن کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتا۔

مس شیریں کمپنی کی مشہور رقاصہ تھی' اس کا حُسن و شباب دل موہ لینے والا' اس کی شربتی آنکھیں میکدہ بردوش' اس کے پتلے پتلے سرخ ہونٹ ہمیشہ تبسم کا خزانہ لئے ہوئے ہوتے' اس کی آواز میں بلا کا لوچ تھا' جو نغموں میں تحلیل ہو کر سامعین کو حد درجہ متاثر کر دیتا' کمپنی کا ہر فرد اس کے ادنٰی اشاروں پر آنکھیں اور دل فرش راہ بنانے کا متمنی رہتا' اور سرکس کا مالک مسٹر فیروز تو اسے اپنے دل کی ملکہ سمجھنے لگا تھا۔

شیریں کبھی کبھی شام کے فرحت افزا لمحات میں ندی کے کنارے ٹہلنے کے لئے فیروز کے ساتھ موٹر سے آتی اور ایک آدھ گھنٹہ ان پرکیف فضاؤں میں کیف و نغمہ کا حظ اٹھا کر مسرور و مخمور واپس روانہ ہوتی۔

ایک دن شیریں اور فیروز کافی دن رہے' ندی کی طرف نکل آئے' انہوں نے اپنی کار بالکل پانی کے قریب لا کر کھڑی کی' مصطفےٰ ندی کے کنارے اپنی ناؤ کے سایہ میں ریت پر لیٹا ہوا گہری نیند کے مزے لے رہا تھا' موٹر کے ہارن کی آواز کے باوجود بھی وہ جوانی کی سرشار نیند سے بیدار نہ ہوسکا' فضا رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی کیف آلود تھی' ندی کی روانی عجیب

مستانہ اداؤں کے ساتھ خوش گوار منظر پیش کر رہی تھی دفعۃً شیریں کے دل میں "ندی کی سیر" کی خواہش پیدا ہوئی اس نے فوراً اپنے دل میں پیدا ہونے والی خواہش کا اظہار فیروز سے کردیا، جس کے لئے وہ ہمہ تن تیار ہوگیا،

اے لڑکے! فیروز نے مصطفےٰ کو جگانے کے بعد کہا، کیا تم اس وقت ہم کو ندی کی سیر کرا سکتے ہو مصطفےٰ آنکھوں میں نیند کا بے پناہ خمار لئے ہوئے تعجب خیز نظروں سے ان کی طرف چند ثانیوں تک دیکھتا رہا۔

سنتے ہو جی، شیریں نے دل کش لہجہ میں کہا، ہمیں "ندی کی سیر" کراؤگے؟

مصطفےٰ اپنی جگہ سے اٹھا "حضور"! اس کی زبان سے نکلا۔ دوڑ کر اس نے ناؤ کے بند کھول دئے جس کو ایک بڑی چٹان کے ساتھ مضبوطی سے باندھ رکھا تھا۔

"آئیے سرکار"! نوجوان ملاح نے ناؤ کے پائیدان کو جھکا کر کہا، شیریں اور فیروز ناؤ میں سوار ہو گئے کائنات کا ذرہ ذرہ رنگینیوں میں ڈوبا ہوا، کیف آلود منظر پیش کر رہا تھا، ندی کی شوخ سنہری موجیں نہایت بے تابی کے ساتھ اٹھ اٹھ کر سکون و مسرت کی تلاش میں کھوئی جا رہی تھیں ندی کے اس پار کوئی چرواہے کا لڑکا رسیلی آواز میں میٹھے گیت گا رہا تھا شاید کہ

"آ شوخ سنہری موجوں سے ہم دل کی نیا کھیویں گے۔"

نغمے آہستہ آہستہ فضا میں بلند ہو کر کائنات کو مدہوش بنا رہے تھے، مصطفےٰ کے ہاتھ تیزی کے ساتھ چپو گھمانے میں مصروف تھے، بعض وقت اس کی مشتاق نگاہیں اس خوبصورت چہرے تک پہنچنے کی کوشش کرتیں، جس پر ان کالے کالے بالوں کی لٹیں نہایت گستاخی کے ساتھ طمانچے لگا رہی تھیں،

اس کا ساتھی ایک بھدے جسم کا کریہ المنظر چہرہ رکھتے ہوئے، ادھیڑ عمر کا شخص تھا، وہ ایک قیمتی سوٹ میں ملفوف تھا، ایک موٹا سا خوشبودار چروٹ اس کے ہونٹوں کی گرفت میں تھا،

مصطفےٰ نے ایک ہی نظر میں دونوں کا جائزہ لے لیا، اس کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی، اس نے خیال کیا، یہ حسین گل اندام لڑکی، اس بڈھے بدنما انسان کے ساتھ کیوں چمٹی ہوئی ہے، اسے کیوں اس شخص کی صورت اور صحبت سے ڈر اور کراہت معلوم نہیں ہوتی پھر وہ یہ خیال کر کے چپ ہو رہا، شاید یہ اس کا باپ ہو۔

کشتی کو واپس لے چلو، اس کے بدصورت ہم راہی نے کہا، جب کہ سورج مغربی وادیوں میں لڑھک رہا تھا، وہ دونوں ریت پر کود پڑے، شیریں نے ملاح کو کچھ دام دینے چاہے لیکن فیروز نے بڑھ کر مصطفےٰ کی ہتیلی میں ایک چمکدار روپیہ رکھ دیا، جس کو فوراً اس نے قمیص کی میلی جیب میں ڈال لیا۔

کیا نام ہے تمہارا۔ شیریں نے اس سے دریافت کیا،

مصطفےٰ :—

پھر وہ دونوں سرعت کے ساتھ اپنی موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوئے، مصطفےٰ ایک عجیب مسرت کن حالت میں موٹر کے نظروں سے اوجھل ہونے تک وہیں کھڑا رہا۔ پھر وہ گنگناتا ہوا اپنی ناؤ کو گاؤں والے گھاٹ کی طرف لے جانے لگا مسرت و کامرانی میں ڈوبا ہوا ایک دل کش نغمہ اس کی نوکِ زبان تھا۔

دوسرے اور تیسرے دن بھی مصطفےٰ کو اسی حسین عورت اور اس کے بدشکل ساتھی کی سیر کے معاوضہ میں ایک ایک روپیہ اجرت ملتی رہی، وہ روز شام کے وقت ان دونوں کی

آمکا منتظر رہتا آج بھی مصطفٰے دیر تک ان دونوں کا انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ سورج کی چمکیلی کرنیں ماند پڑنے لگیں، چاروں طرف فضا میں سکوت اور تاریکی پھیلی جا رہی تھی، مصطفٰے نے خیال کیا آج وہ ہستیاں مجھے خوش قسمت تصور کرنے کا موقع نہ دیں گی، چاند مشرقی افق سے آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا، اس کی کیف و نور میں بھیگی ہوئی کرنیں سطح آب پر تھرتھرا رہی تھیں، مصطفٰے نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر انگڑائی لی، اور واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا، اسے موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی "وہ آگئے" اس نے مسرت کے لہجے میں کہا، اور موٹر کی طرف رخ کیا اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا موٹر میں صرف لڑکی بیٹھی ہوئی ہے "آپ کی والدہ" مصطفٰے کچھ کہتے کہتے رک گیا،

'میرے والد' لڑکی کی زبان سے تعجب کا کلمہ نکلا۔

'وہ ـــ وہ جو روز آپ کے ہمراہ آیا کرتے ہیں نا' مصطفٰے نے ڈرتے ڈرتے جملے کی تکمیل کی، 'وہ میرے باپ نہیں ہیں' شیریں کار سے اتر پڑی، مصطفٰے خاموش ہو گیا، کوثر میں بھیگی ہوئی نورانی کرنیں، بڑی آب و تاب کے ساتھ پانی کی سطح پہ شعلہ باری کا منظر پیش کر رہی تھیں 'کیا ہوتے ہیں وہ آپ کے' مصطفٰے نے پھر شیریں سے ناؤ میں بیٹھنے کے بعد سوال کیا، 'وہ اس سرکس کمپنی کے مالک ہیں، جو ان دنوں شہر میں ٹھیری ہوئی ہے'

"سرکس کے مالک" مصطفٰے نے کسی خیال کے تحت جملہ کو دہرایا، وہی جہاں ہاتھی اور شیر ناچتے ہیں" بھولے بھالے انسان کا یہ جملہ سن کر شیریں کھلکھلا کر ہنسی،

"مصطفٰے! تم نے کبھی انھیں ناچتے دیکھا ہے" شیریں نے بالکل اس کے قریب آ کر اس کے کندھے چھو کر کہا، 'نہیں' اس کے چپو چلانے والے ہاتھ رک گئے، اور مڑ کر یاس آمیز لہجے میں کہا، 'میرے پاس ان کا ناچ دیکھنے کے لئے اتنی زیادہ رقم نہیں' مصطفٰے کے اس جملہ نے حسین رقاصہ کو کافی متاثر کیا، 'میں تمھیں یہ ناچ دکھا سکتی ہوں' اس نے کہا،

'آپ دکھا سکتی ہیں' مصطفٰے کی آنکھیں غیر معمولی خوشی کے اظہار کے لئے چمک اٹھیں۔

'ہاں، کیوں نہیں' شیریں نے کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ انگریزی حروف لکھے اور کہا، اِس کے دکھانے سے گیٹ والے تمہیں اندر چھوڑ دیں گے،

کوئی پیسے نہیں مانگے گا، مصطفٰے کاغذ کے پرزے کو اپنی جیب میں رکھ کر بولا۔

نہیں، شیریں نے جواب دیا، مسکراہٹ کی شوخ ترنگ دوشیزہ اس کے ہونٹوں پر ناچ رہی تھی، رات میں ضرور آنا، میں تمہارا انتظار کروں گی، اس نے رخصت ہوتے وقت کہا، مصطفٰے تمام رات سرکس کے کھیل، کرتب، ہاتھی اور شیر کے کمالات دیکھتا رہا ـــ اس کے بعد اس نے شیریں کے رقص کے کمالات حیرت و انبساط کی نظروں سے دیکھے اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، جذبات کا ایک طوفان اس کے سینے میں امنڈ رہا تھا، کھیل کے ختم ہوتے ہی وہ گاؤں کو لوٹنے کے ارادے سے دروازے کی طرف روانہ ہوا، اس عرصے میں سرکس کے ایک ملازم نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، اجی صاحب! بائی جی، آپ کو بلاتی ہیں 'بائی جی کون؟' اس نے حیرت سے پوچھا

وہ جو ہوٹل میں بیٹھی ہیں، مصطفٰے کی نظریں ہوٹل تک

بہنیں، اس نے شیریں کو اپنا منتظر پایا! طلسمی طاقت خودبخود
اسے شیریں تک کھینچ لے گئی۔

مصطفیٰ! دیکھا تم نے ناچیوں کا ناچ، شیریں نے
تبسم ہوکر کہا، شرارت کی پریاں اس کی آنکھوں میں ناچ رہی
تھیں، وہ ایک رنگین فاخرہ گون پہنی ہوئی تھی، سچ مچ وہ ایک
پری معلوم ہو رہی تھی۔

مصطفیٰ پر فطرتاً کچھ شرم کا جذبہ غالب آگیا۔ تمہارا۔
ناچ — وہ کہتے کہتے رک گیا تمہیں پسند ہے۔

ہاں۔

بیٹھ جاؤ یہاں، اس نے پکڑ کر کرسی پر بٹھا دیا۔

کچھ کھاؤ گے؟ — بھوک نہیں ہے۔ شیریں نے ہوٹل کے
ملازم سے کچھ کہا، چند لمحوں کے اندر میز میووں، کیک بسکٹ
اور چار کے سامان سے سج گئی، آج تمہاری دعوت ہے،
شیریں نے کچھ محبت کے ملے جلے لہجہ میں کہا، وہ اس کے قریب
کرسی پر بیٹھ گئی۔

میری، مصطفیٰ نے حیرت و مسرت کے درمیانی لہجے
میں اپنی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا ہاں ہاں شرماؤ
نہیں، شیریں نے انگور کا ایک بڑا خوشہ اس کے ہاتھ میں
پکڑا دیا،

تمہاری شادی ہوگئی ہے نا، شیریں نے ایسا سوال
کیا، جس سے مصطفیٰ کی کشادہ پیشانی عرق آلود ہوگئی،

نہیں، اس کی نظریں زمین کے ذرات کا جائزہ لے
رہی تھیں۔

پھر تمہارے گھر میں کون رہتا ہے۔

کوئی نہیں مصطفیٰ نے جواب دیا، میں تنہا رہتا ہوں

تنہا کیوں؟ تمہارے ماں باپ کہاں ہیں

سب لوٹ کر اللہ میاں کے پاس چلے گئے، الفاظ کو ادا
کرتے ہوئے مصطفیٰ کی آنکھیں ڈبڈبائیں، وہ آنسو پونچھ کر گھر
جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

چلے تم — شیریں کچھ متاثر ہوکر کہا،

ہاں صبح ہو رہی ہے،

کل پھر آؤ گے؟

کل پھر — مصطفیٰ کی زبان سے نکلا۔ مگر روز — روز —

تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا مصطفیٰ۔ تم بلا خطر
اندر داخل ہو سکتے ہو، میں پہرے والے سے کہہ دوں گی

مصطفیٰ بغیر کچھ کہے وہاں سے نکل پڑا، ندی پہنچتے تک
سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا تھا، چند لمحوں تک وہ ایک چٹان پر
بیٹھ کر سوچتا رہا۔ آہ کتنی خوبصورت، کتنی اچھی ہے وہ۔ سچ
سچ پری معلوم ہوتی ہے، خدا جانے میرے حال پر وہ اس قدر
مہربان کیوں ہے۔ شاید میری غربت پر اسے کچھ ترس آگیا
ہوگا، مگر میرا دل اس کے لئے اتنا کیوں بیتاب ہے۔ کیا میں اس سے
محبت کر سکتا ہوں — نہیں — وہ بے حد خوبصورت اور
مالدار عورت ہے۔ ہم غریبوں کو ایسے خیالات زیبا نہیں
— بے اختیار اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، وہ تمام
دن کھویا ہوا سا رہا۔ اس کے سر میں خفیف سا درد بھی ہونے
لگا۔ آج اس کا جی مطلق کام کرنے کو نہ چاہا۔ سورج ڈوبنے
سے پہلے ہی اس نے اپنے گھر کی راہ لی — رات نہایت
کرب و اضطراب کے ساتھ کٹی، وہ حیران تھا، کہ اس کا دل
اس قدر کیوں بے چین ہے۔ اس نے خیال کیا، آہ اب کیا
ہوگا، محبت اسی تڑپ، بے چینی، آنسو، اور آہوں کا نام ہے

یہ سب میرے لئے ناقابل فہم اور قوت برداشت سے باہر ہیں'
علی الصبح وہ اپنے گھر سے چل پڑا' ندی کی طرف روانہ ہوا' اس کے قدم کسی نامعلوم طاقت سے متاثر ہو کر جلد جلد اٹھنے لگے' اس نے دور سے ندی کے پار کوئی پیلی چیز دیکھی' اس کی نظر اگر دھوکا نہ دے' یہ ضرور کسی کی موٹر ہے قریب پہنچنے پر اس کا خیال ٹھیک نکلا۔ اس موٹر میں مصطفےٰ کی نگاہوں نے رنگین ملبوسات میں لپٹا ہوا مجسمۂ نور دیکھا۔ یہ دلفریب منظر دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھا۔ شیریں ہمہ تن اس کے لئے منتظر بیٹھی تھی' مسرت میں ڈوبی ہوئی ہلکی سی آہ اس کی زبان سے نکلی۔

مصطفےٰ کل رات کہاں رہے' اس کی محبوبہ نے آگے بڑھ کر سوال کیا۔

مصطفےٰ چپ چاپ اس کی طرف ٹکٹکی باندھے ہوئے تھا' اس کی پلکیں آنسوؤں میں تر ہو گئی تھیں' ارے — تم اتنے اداس کیوں ہو؟ شیریں نے اس کا بازو تھام کر کہا' تو رات تم کیوں نہیں آئے' بخار آ گیا تھا — اس نے بھیگی ہوئی آنکھوں پر انگلیوں کو پھیرتے ہوئے کہا'

بخار — شیریں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا' پھر تم نے دوا پی۔

"دوا پینے سے کیا ہوگا؟" — خدا جانے یہ جملہ مصطفےٰ نے کس حالت میں ادا کیا —

اچھے ہو جاؤ گے۔

پھر'

اچھے ہو کر شادی کر لو۔

ہوں' مصطفےٰ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر آسمان کی طرف دیکھا — شیریں اس کے مغموم چہرے سے دلی کیفیات کا جائزہ لیتی رہی' اس اثناء میں کمپنی کا مالک فیروز شیریں کی تلاش میں ادھر آ نکلا — اور شیریں کو بادلِ ناخواستہ اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا — تمام دن مصطفےٰ کی طبیعت خراب رہی۔ شام ہوتے ہوتے اسے خوب بخار چڑھ آیا' گھر پہنچ کر اس نے روٹی پکائی اور نہ بازار سے کچھ خرید کر کھایا' رات بھر اس پر بے ہوشی کا عالم طاری رہا۔ دو دن تک وہ اسی حالت میں پڑا رہا۔ بخار کی شدت سے اس پر نقاہت کے حملے ہو رہے تھے' تیسرے دن بخار نے اس کے اوپر کچھ رحم کیا' مصطفےٰ نے آنکھیں کھولیں اسے تشنگی سی محسوس ہونے لگی' آہستہ سے اس نے اپنے بستر سے اٹھ کر تین دن کا رکھا ہوا پانی اٹھا کر پی لیا' تب کہیں اسے قدرے سکون نصیب ہوا۔ دنیا میں کوئی میرے دکھ درد کا شریک نہیں' موت اس زندگی سے بدرجہا بہتر ہے اب مجھے دنیا میں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں' وہ کچھ دیر تک ان ہی خیالوں میں الجھا رہا۔ کمزوریٔ دماغ کے باعث اس پر کچھ نیم غشی سی طاری ہو گئی' مکان کی گندگی' فرش کی بے ترتیبی' لباس کی گندگی اور اس پر بیماری و بے کسی نے مصطفےٰ کو زندگی سے بیزار بنا دیا تھا' دفعتہً مکان کا دروازہ کھلا — رحمت کا فرشتہ محبت و ایثار کا پتلا' شریف رقاصہ کے بھیس میں داخل ہوا' شیریں حسین و جمیل شیریں' عیش و مسرت کی فضاؤں میں پلی ہوئی تتلی' سرود و نغمہ کی روح رواں امیروں اور سرمایہ داروں کے دلوں کا سکون' تماشائیوں کی مشتاق نگاہوں کی مرکز جس کے سینے میں دل تھا — اور دل درد احساس سے لبریز۔ اس نے دیکھا مصطفےٰ بے حس و حرکت' گندگی کی آغوش میں پڑا ہوا زندگی کے دن پورے کر رہا ہے' شیریں کی آنکھوں سے بے اختیار

آنسو ٹپک پڑے، آہ غریب کی دنیا، ایک بوسیدہ گھاس کا جھونپڑا، چند ٹوٹے پھوٹے برتن، کثیف میلا بستر، ایک ہمدردی کی لہر ایک بے پناہ محبت کا جذبہ شریف رقاصہ کے سینے میں امنڈ آیا، اس کی آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آنکھیں ــ مسلسل موتی رول رہی تھیں ـ

مصطفٰے ! ــ غیر ارادی طور پر اس کی زبان سے نکلا ـ آہ ــ تم، اس حالت میں ــ دنیا پر فریب اور مطلبی ہے۔ اس نے کہنا شروع کیا ـ اور اس میں بسنے والے دغاباز جھوٹے مکار، ان کے سینے میں دل نہیں، پتھر ہیں، آنکھوں میں آنسو نہیں، لبوں پر آہیں نہیں وہ سب کے سب حسن و نغمے کے متلاشی، عیش و مسرت کے متمنی، ہوس کے بندے، دولت کے پجاری، شیطان کے مرید، سنگ دل بے وفا، صرف چند سکوں کے عوض اپنا دین و ایمان اپنا جوہر بیچنے کے لئے زندہ رہتے ہیں، شیریں جذبات کی رو میں مسلسل کہے جا رہی تھی، اس تاریک بدبودار اندھیرے میں وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی، جو چکا چوند کرنے والی برقی شعاعوں میں بھی نظر نہ آسکتا تھا، دفعتہً شیریں کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹا ـ مصطفٰے نے کراہتے ہوئے کروٹ لی،

مصطفٰے ! ــ مصطفٰے ! شیریں کی آواز بھر آئی، وہ اس کے سرہانے کھڑی رو رہی تھی، مصطفٰے میرے پیارے آنکھیں کھولو دیکھو میں آگئی ہوں تمہارے پاس تمہارے قدموں پر اس مطلبی دنیا کو چھوڑ کر جو چند چاندی کے ٹکڑے دے کر میری خوشی میری عصمت و عزت مول لیتی تھی، وہ جھکی، اس نے اپنی آغوش میں مصطفٰے کا سر لے لیا، وہ چند لمحوں تک اس کے بے ترتیب بالوں اور گرم گرم ہتھیلیوں کو سہلاتی رہی ـ

مصطفٰے ــ اٹھو ــ دیکھو باہر تمہارا ڈاکٹر تمہارا منتظر کھڑا ہے
بیمار کے خشک ہونٹوں پر ایک تبسم کی لہر دوڑی، اس کی پتلیاں آنسوؤں میں تیر رہی تھیں، اس کی حیرت و مسرت میں ڈوبی ہوئی نگاہیں شیریں جیسی پیکر محبت کی بلائیں لے رہی تھیں،

ایک ہفتے کے بعد سرکس کی دنیا کا شیرازہ درہم و برہم ہو کر رہ گیا، کیونکہ اس کمپنی کی جان مس شیریں تھی، جس نے اب اپنا رقص، نغمے، تبسم اور ساری خوشیاں مصطفٰے کی دنیا کے لئے وقف کر دی تھیں، شیریں رقاصہ تھی، جس کے سینے میں شریف دل تھا، مگر آہ اس کے انتخاب کے لئے دنیا والوں کی نگاہوں نے زبردست لغزش کھائی ـ

صابر کوسگوی

ڈاکٹر

کمرے میں قبرستان کی سی خموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس سناٹے میں جھینگر کی کرخت آواز خموشی کو توڑنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی شاہدہ دریچے میں کھڑی ہوئی گہری سوچ میں غرق' باغ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ڈاکٹر ہمایوں جو کہ شاہدہ کے لڑکے سعید کی تیمارداری کے لئے بلایا گیا تھا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے' اپنی ٹوپی سے کھیلتا ہوا کچھ سوچ رہا تھا۔

اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا اور تاریکی دنیا کی ساری چیزوں کو اپنے میں لپیٹ رہی تھی۔ شاہدہ نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا کہ اس سے بڑھ کر اور زیادہ بدنصیبی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر میں بچے سے جدا ہو کر ایک لمحے کے لئے بھی زندہ نہیں رہ سکتی

"ہاں میں جانتا ہوں" ڈاکٹر نے کہا۔

شاہدہ کی آواز میں بلا کا درد تھا کپکپاتی ہوئی غم سے لبریز لہجے میں کہنے لگی کہ سعید کے بغیر میری زندگی بے سود ہے۔ وہ میرے لئے سب کچھ ہے میری جان میری خوشی میری راحت اور میری تمنا۔ میرا لختِ جگر اگر مجھ سے چھین لیا گیا تو میں ایک غیر مادی خیال بن جاؤنگی اور کبھی زندہ نہ رہ سکوں گی

شاہدہ اضطراب اور دیوانگی کے عالم میں کھوئی ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہنے لگی کہ جب سعید پیدا ہوا تھا تو میں اسے یتیم خانے بھجوا دینا چاہتی تھی لیکن میرے معبود ۔ اے داور محشر۔ اس زمانے اور آج میں کتنا بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ میں اس وقت بدنیت تھی بیوقوف اور کندذہن تھی لیکن اب میں ایک ماں ہوں۔ یہی میں جاننا چاہتی ہوں کہ میں ایک ماں ہوں'۔ وہ خوب رونے لگی۔ آنسوؤں کا سیلاب اس کی آنکھوں سے امنڈا پڑ رہا تھا۔

بہت دیر تک خموشی رہی۔ ڈاکٹر نشستوں پر نشستیں بدلتا رہا۔ اس کی نگاہیں شاہدہ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ شاہدہ سے کچھ کہنا چاہتا تھا اور موقع کا منتظر۔ شاہدہ گریۂ و اضطراب کے عالم میں ساڑی کو درست کرتی ہوئے کہنے لگی کہ "ڈاکٹر تم خاموش کیوں ہو؟ تمہاری خاموشی میری زندگی کو متزلزل کر رہی ہے۔ ڈاکٹر! ڈاکٹر!! کیا مجھے آج بالکل مایوس ہو جانا چاہئے؟" ہمایوں نے کہا شاہدہ میں بہت خوش ہوتا اگر کچھ امید نظر آتی سچ تو یہ ہے کہ سعید کے دماغ میں پھوڑا ہو گیا ہے جو نہایت ہی مہلک اور جان لیوا ثابت ہوگا ایسے مریض بہت کم صحت یاب ہوتے ہیں شاہدہ تمہیں اب اس کی جدائی کا غم برداشت کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔"

ڈاکٹر تم سچ کہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم غلط بیانی سے کام لینے کے بڑے عادی ہو۔ یہ مذاق کا وقت نہیں ہے ہمایوں"

"شاہدہ! ان بے فائدہ سوالات سے کچھ نتیجہ نہیں نکل سکتا"

ڈاکٹر کے اس جواب پر شاہدہ نے دریچے میں سر رکھ کر خوب رونا شروع کیا۔ اس کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔ ہمایوں اپنی جگہ سے اٹھا اور شاہدہ کے قریب ہو گیا۔ وہ ساکت تھا۔ کچھ کہنے کی ناکام کوششیں کر رہا تھا۔ بڑی دیر کے بعد دو لمحوں کی اجازت مانگنے کی جرأت کی۔

شاہدہ وفورِ غم سے بے ہوش ہوئی جا رہی تھی۔ ہمایوں آہ بھرتا ہوا سعید کے پاس گیا۔ پلنگ پر بیٹھ کر اس کی نبض دیکھنے لگا۔ سعید سے پوچھنے لگا کہ کیا تمہارے سر میں درد ہو رہا ہے؟ سعید نے نحیف اور کمزور آواز میں ہاں کہتے ہوئے ڈاکٹر سے کہا کہ میں بعض اوقات خواب بھی دیکھا کرتا ہوں" ڈاکٹر نے دریافت کیا "کس قسم کے خواب" جس پر سعید نے کہا کہ ہر قسم کے خواب نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر نے کئی سوالات کر ڈالے۔ سوالات کی بوچھار اس وقت ختم ہوئی جب کہ سعید سے ڈاکٹر نے یہ پوچھا کہ کیا تم مجھے جانتے ہو۔ جس پر سعید خاموش رہا۔

ان سوالات کے بعد ہمایوں اس کمرے میں گیا جہاں کہ شاہدہ کھڑی رو رہی تھی۔ اب رات بہت زیادہ گزر چکی تھی۔ اس تاریکی

اور سناٹے میں ہمایوں نے شاہدہ سے بلب روشن کرنے کے لئے پوچھا لیکن شاہدہ ایک بت کی طرح خاموش تھی۔ جھینگر اسی طرح پکار رہے چلا جا رہا تھا، بڑی بھیانک خموشی تھی۔ رات بھی بڑی ہیبت ناک ڈراؤنی تھی۔

ڈاکٹر شاہدہ کے قریب گیا، دیکھا تو وہ گم تھی، مجنون بنی ہوئی تھی۔ اپنی محویتوں میں اس قدر غرق تھی کہ ہمایوں نے اسے جھنجوڑ کر بیدار کیا۔ اس کا جسم سرد ہوتا جا رہا تھا۔ گلو گیر آواز میں کہنے لگی کہ میں کسی اور طبیب سے مشورہ لینا چاہتی ہوں۔ ڈاکٹر نے رضامندی تو ظاہر کی لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ مشورہ فضول ہوگا۔ شاہدہ ڈاکٹر کی آنکھوں میں اس کے مافی الضمیر کو دیکھ کر اور زیادہ رونے لگی۔ فرط غم سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ اس وقت دور کہیں شادی رچائی جا رہی تھی جس کی موسیقی کی آواز صاف طور پر سنائی دے رہی تھی۔

شاہدہ نے پھر ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ اگر سعید تکلیف میں ہے تو وہ خاموش کیوں رہتا ہے سارا دن خاموش رہتا ہے اور کسی چیز کی شکایت نہیں کرتا۔ اس کی گرتی ہوئی حالت سے یقین ہو گیا ہے کہ خداوند قدوس اس امانت کو ہم سے چھین لے گا۔

وہ آہ بھرتی ہوئی کہنے لگی کہ اے معبود کیا اب اس کو بچایا نہیں جا سکتا۔ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے ڈاکٹر سے مخاطب ہوئی۔ تم تو یہ جانتے ہی ہوں گے کہ اس کو بچانے کے لئے کیا کرنا ہوگا۔ میں اس کو کھو نہیں سکتی اگر یہ جانبر نہ ہو سکا تو میرا عرصۂ حیات بھی تنگ ہو جائیگا۔ ڈاکٹر اضطراب کے عالم میں ٹہل رہا تھا۔ شاہدہ رو رہی تھی۔ اور موسیقی کی آواز برابر چلی آ رہی تھی۔ گھر میں قیامت کا اندھیرا تھا۔ شاہدہ سعید کے پاس جاتی، لپٹتی اور پھر اسی طرح رونے لگتی تھی۔ وقت مشکل سے کٹ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سلسلۂ شب کبھی نہ ٹوٹے گا۔ اور کبھی پو نہ پھٹے گی۔

موسیقی جب ختم ہو چکی تو ڈاکٹر چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ شاہدہ سے کہنے لگا کہ میں صبح آؤں گا اور تم آرام کرو۔ اس نے اپنا کوٹ پہنا دو قدم آگے بڑھا۔ پھر کچھ سوچ کر ٹھٹک گیا اور کہنے لگا۔

"تم سنتی ہو شاہدہ میں کل صبح آؤں گا"۔

شاہدہ خاموش تھی اس کی قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر اسی حالت میں شاہدہ کے بازو میں بیٹھ کر دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"شاہدہ میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ تم سچ کہو۔ تم نے مجھ سے کہا ہے کہ سعید میرا ہی لڑکا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟ کیا تم نے سچ کہا ہے شاہدہ؟ تم نے زندگی کے کچھ دن میرے ساتھ بھی گذارے ہیں۔ میرے احساسات اور وجدانات کا خوب اندازہ لگا سکتی ہو۔ تم سچ کہو۔ میں تم سے سچے جواب کی التجا کرتا ہوں۔ ایسے موقع پر کوئی جھوٹ نہیں کہہ سکتا۔ جلدی کیونکہ سعید میرا لڑکا نہیں ہے شاہدہ جلد کہئے۔ شاہدہ"۔

شاہدہ غصے میں بھری ہوئی کہنے لگی کہ ڈاکٹر سعید تمہارا لڑکا ہے تمہاری اولاد ہے۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ڈاکٹر نے کہا کہ "افسوس کہ تم ایسے موقعوں پر بھی جھوٹ بولتی ہو۔ تقدس اور معصیت تمہارے لئے بے معنی الفاظ ہیں۔ میں تمہیں جانتا ہوں تم آوارہ تھیں۔ بدنیت تھیں۔ لیکن اس کے باوجود میں صرف تم سے محبت کرتا تھا اور کرتا ہوں۔ تمہاری وہ محبت اب جب کہ میں بوڑھا ہو رہا ہوں خون میں سفیدی پیدا ہو رہی ہے مجھے ایک سرمدی سرور عطا کرتی ہے۔ وہ میرے لئے ایک مشعل طور ہے تم جھوٹ کہہ کر اپنی بلند قیمت اور میرے احساسات کے شکوہ کو کیوں مجروح کرتی ہو۔

شاہدہ نے کہا کہ "تمہیں میرے سچ کہنے پر بھی اعتبار نہیں" ڈاکٹر نے جواب دیا "شاہدہ تم بھول گئی ہو میں

تم کو یاد دلانے کی کوشش کروں گا کہ بیٹے پر باپ کے جو حقوق ہوتے ہیں معین اور اقبال بھی اس کے کچھ حصہ دار ہیں جو سعید کی تعلیم کرتے مدد کرتے ہیں، جیسا کہ میں کیا کرتا ہوں، پہلے تم جھوٹ بولا کرتی تھیں تو میں معاف کر دیا کرتا تھا، لیکن اب اس وقت جب سعید بستر مرگ پڑا ہوا ہے تمہارا جھوٹ بولنا ایک جرم ہے جو نا قابل معافی ہو۔ پیاری شاہدہ وقت کی نزاکتیں بھی کیا تمہیں متاثر نہیں کرتیں۔ تم سمجھتی ہو کہ اگر تم سچ کہو گی تو میں تمہاری امداد بند کر دوں گا۔ تمہارا یہ تخیل بہت تکلیف دہ ہے تم گناہوں میں اتنی غرق ہو کہ کچھ اندیشہ سود و زیاں بھی نہیں ہے یہ جھوٹ اب نا قابل برداشت بن گیا ہے۔ مجھے تمہیں اب چھوڑنا پڑے گا۔"

شاہدہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب رواں تھا ہمایوں کی گفتگو نے اسے بالکل مبہوت بنا دیا تھا۔ اس کی بے کسی اور اس کا الم ہمایوں کو اس کی مایوسیوں کا حال سنا رہا تھا۔ ہمایوں اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ اس کی سانس درست نہیں تھی۔ کچھ پھولی سی اور بھاری تھی۔ رقت آمیز لہجے میں کہنے لگا، اس کی آواز میں ندامت کا سارا اثر تھا الفاظ شرم ساری میں غرق تھے۔ وہ کہنے لگا "غصہ میں وقت اور موقع کے تقاضوں کو بھول چکا اور تمہارے زخموں پر نمک چھڑکتا رہا" لیکن پھر منت بھری نظروں سے گھورتا رہا۔ اس سے سچ کہنے کی التجا کی شاہدہ کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ کپکپاتی ہوئی آواز میں اداس اور غم کے ساتھ کہنے لگی کہ

"سعید تمہارا ہی لڑکا ہے"

ہمایوں نے کہا — "شاہدہ میں سچ کہتا ہوں کہ اقبال کے نام تمہارا ایک خط محفوظ ہے جس میں تم نے اقبال کو سعید کا باپ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ میں صرف تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔

شاہدہ خاموش روتی رہی۔ ہمایوں کچھ انتظار کے بعد باہر چلا گیا اور صبح آنے کا وعدہ کر گیا۔ راستہ تمام وہ سوچتا رہا۔ اور اپنے ضمیر کو مطعون کرنے لگا کہ وہ حقیقت تک پہنچ نہیں سکتا۔ اس میں ترغیب کی قوت اور قائل کرانے کا اعجاز ہی نہیں ہے۔ ورنہ وہ ستم رسیدہ اور مغموم عورت کو دکھ پہنچائے بغیر راز کو جان لیتا۔

جھوٹی عورت کی خموشی نے اسے ساری حقیقت سنا دی تو اس عورت کا سچ کیا کچھ نہ بتلا سکتا تھا وہ کرب اور اضطراب کے عالم میں ساری رات تڑپتا رہا۔ (ترجمہ از چیخوف)

عابد صولت (عثمانیہ)

انقلابی شاعری کے چند پہلو

یوں تو ہر دور میں تاریخ ادب اردو نے پہلو بدلے مگر غدر کے بعد سرسید ایسے اصلاح کرنے والے اور جوشیلے اشخاص نے ایک نئے دور کی طرف راستہ دکھایا جس میں سب سے پہلے حالی نے مسدس حالی لکھ کر قدم اٹھائے۔ یہ وہ دور ہے جب کہ سماجی شاعری نے آنکھیں کھولیں۔ حالی نے زبان کی طرف توجہ دکھائی گو کہ ان کا انداز خطیبانہ تھا اور ان کے مسدس میں بظاہر شاعری کا کوئی حسن نہ تھا پھر بھی وہ ایک نیا انداز تھا جس کا ہمیں احسان مند ہونا پڑتا ہے لیکن بڑی خوشی کی یہ بات ہے کہ وہ زبان جس کا ماضی ہمیں اتنا ناامیدانہ معلوم ہوتا تھا بہت جلد ایک ایسے دور میں قدم رکھا جس میں اصلیت اور واقعیت کے پہلو سے اس کا دامن مالا مال ہے اس کا سہرا صرف حالی ہی کے سر نہیں ہے بلکہ اور بہت ہیں مثلاً آزاد، اسمعیل، چکبست، اکبر اور اقبال، ان اساتذہ کی کوشش کا اثر یہ ہوا کہ آج کل ہم کو غزلوں کی بھرمار نہیں دکھائی دیتی اور نہ اتنی ممدوح سمجھی جاتی ہے جتنی کہ وہ میر، غالب اور مومن کے زمانے میں تھی۔ اس کو سمجھنے کے لئے اور موجودہ نظم کے رجحانات کے معلوم کرنے کے لئے ہم کو اپنے سماج پر بھی غور کرنا ہوگا۔

ہماری روزمرہ کی زندگی میں خصوصاً ان چند سالوں میں ہندوستان میں غریبی بڑھنا شروع ہوگئی مزدوروں کی مصیبتیں۔ کسانوں کے جھگڑے بڑھنے لگے اور ان سب چیزوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ درمیانی پڑھے لکھے طبقے میں بے روزگاری بڑھنے لگی۔ اسی کے ساتھ ساتھ سیاسی تحریک بڑھی جس نے ہم کو ہماری مصیبتوں اور اپنے سماج کی ابتر حالت کا احساس کرایا یعنی جنگ عظیم سنہ ۱۹۱۴ء سے سنہ ۱۹۱۸ء تک۔ نان کو اپریشن سنہ ۱۹۲۱ء۔ معاشیاتی زوال سنہ ۱۹۲۹ء اور سنہ ۱۹۳۰ء۔ تحریک حکم نافرمانی سنہ ۱۹۳۱ء اور پھر ملوکیت اور سررشتوں کی حکومت اور اہلکاروں کے راج کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف لڑائی نے نوجوانوں کے دلوں میں انقلاب کی روح پھونک دی کوئی بھی اپنے ملک کے معاملات سے جدا نہیں رہ سکتا پھر بھلا شاعری اس اثر سے کب مبرا رہ سکتی تھی جبکہ یہ مصیبتیں ہماری زندگی کا جزو اعظم بن چکی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ شاعروں نے اس سماج سے عاجز ہو کر شاعری کی خوشگوار مگر موہوم دنیا میں کھیڑوں سے دور خیالی تعیش میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ کسی نے رومانی نظمیں لکھیں تو کسی نے نیچرل شاعری میں مزہ لینا شروع کر دیا' رومانی نظم لکھنے والوں میں سب سے پہلا نام جوش ملیح آبادی کا ہے جنھوں نے اپنے ابتدائی دور میں چند نہایت خوبصورت رومانی نظمیں لکھی ہیں مثلاً جنگل کی رانی' اشک اولیں' گنگا کے گھاٹ پر' جمنا کے کنارے وغیرہ اس قسم کی بڑی نظمیں ہیں۔ گو کہ انھوں نے خیالی دنیا میں ان نظموں کے ذریعہ پناہ لی ہے' نئی تشبیہیں' نئے استعارے منظر کشی نہایت سلیقہ سے دکھائی گئی ہے۔ جہاں معشوق کا خاکہ کھینچا ہے وہاں واقعیت موجود ہے' معشوق انسان ہے جنت کی حور یا کوہ قاف کی پری نہیں جہاں اظہار عشق ہے وہاں نفسیات کا پہلو بھی ہے یہ باتیں صرف جوش ہی نہیں بلکہ اس دور کے تمام رومانی شعرا میں کمی بیشی کے ساتھ موجود ہیں' دوسرے رومانی شعرا میں احسان دانش' الطاف مشہدی' ساغر نظامی' فطرت واسطی وغیرہ خاص ہیں' گو کہ رومانی شاعری ہمارے لئے بہت کارآمد نہیں اور نہ زیادہ رہنے والی ہے لیکن اس نے ایک ٹھہری ہوئی ندی میں طوفان پیدا کر دیا ہے۔

بعض لوگوں نے نیچرل شاعری میں پناہ لی گو کہ یہ نیچرل شاعری انگلستان کے رومانی دور کے مشہور شاعر ورڈسورتھ کی شاعری سے بہت مختلف ہے۔ پھر اس کی ایک خاص جگہ ہے۔ صفی لکھنوی نے اس صنف میں سب سے زیادہ کمال حاصل کیا، ان کی نظمیں الہ آباد، لکھنؤ، جونپور وغیرہ نہایت عمدہ ہیں۔

لیکن اس دور کی سب سے اہم صنف سماجی شاعری ہے روزمرہ کی مصیبتوں کو دیکھ کر ہماری گری ہوئی حالت کو محسوس کرکے ہمارے اکثر شعراء نے اِن حالتوں کا نقشہ اپنی نظموں میں کھینچا ہے اور اس کے بعد اس ابتری کی وجہ ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے اور اس کا علاج بیان کیا ہے۔ گو کہ شاعری کے کمال کے لحاظ سے اقبال مرحوم کا رتبہ سب سے بلند ہے مگر ان کی شاعری ایک محدود فرقہ یعنی مسلمانوں کے لئے ہے جن کی ابتری کی وجہ ان کے خیال میں اسلامی اصولوں کا بھلا دینا ہے اور جس کا علاج اسلام ہے ان کی بعض نظمیں مثلاً ترانۂ ہندی، نیا شوالہ وغیرہ قومی تو ہیں مگر وہ عمل کا پیغام صرف مسلمانوں کو دیتے ہیں۔ پھر بھی انھوں نے اس فرقے کی صحیح مگر گری ہوئی حالت کا اندازہ ضرور لیا۔

مگر بہت زیادہ تعداد میں وہ نوجوان جوشیلے شاعر افق اردو پر چھائے ہوئے ہیں جو ان مصیبتوں کو سمجھتے ہیں اس کی وجہ بھی جانتے ہیں اور اس کا صحیح علاج بھی بتاتے ہیں اس میں درخشاں ستارہ جوشؔ ملیح آبادی ہے، ان کی پرجوش نظمیں ہمیں اپنے مردہ سماج سے نفرت دلا کر اس انقلاب کی دعوت دیتی ہیں جو نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر سے غریبی، مصیبت، تکلیف اور مفلسی کو فنا کردے گا۔ ان کی نظموں میں اصول انقلاب کو پوری طرح سمجھنے کا اثر تو نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ وہ خود اس جدوجہد سے جو ہماری مفلس قوم آنے والے انقلاب کے لئے کر رہی ہے بہت دور ہیں۔ اور دوسرے قابل ذکر شاعر روشؔ صدیقی، مجازؔ ردولوی احسان دانشؔ، جاں نثار اخترؔ، معین احسن جذبیؔ وغیرہ ہیں۔ اردو شاعری بہت دنوں تک معشوقوں کے ناز اٹھا چکی ہے، اب وہ اس انقلاب کی رہنمائی کرنے والی ہے جو سارے سنسار پر ننگے اور بھوکے کام کرنے والوں کی حکومت قائم کردے گی۔

یہی وہ شعراء ہیں جو تمام انقلاب کی مصیبتیں جھیلنے کو سینہ سپر ہیں ان کے خیالات غالباً کچھ اشتراکیت سے ملتے جلتے ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ اگر قوم کا فرد فرد خوش ہو اور ہر فرد مال و دولت میں برابر ہو تو پھر ہندوستان میں امن و امان کی زندگی بسر کرسکیں گے انھیں اس بات کا یقین کلی ہے کہ ان کی یہ مفلسی صرف سرمایہ داروں کے بڑھتے ہوئے ظلم کی وجہ سے ہے۔

جوشؔ ہندوستان کی مفلسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی حالت کس قدر خراب ہے اور اس پر بھی ہندوستانی خاموش بیٹھے ہیں، وہ اپنی ایک نظم "ضعیفہ" میں ایک غریب اور بوڑھی عورت کی حالت بتاتے ہیں جو بہت بیمار ہے اور اس بیماری کی کوئی خبر لینے والا نہیں ہے

اک ضعیفہ سو رہی ہے راستے میں خاک پر
مردنی چھائی ہوئی ہے چہرۂ غمناک پر
عبرت و دہشت کا خنجر ہے دلِ غمناک پر
ہائے یہ بے دم پڑا ہے کون مشتِ خاک پر
آہ یہ کس ضعیفہ غم کی تڑپائی ہوئی
ہے زمانے کی جھوڑی زیست کی ٹھکرائی ہوئی
خدمتِ اغیار سے فرصت کوئی پاتا نہیں
سچ ہے اپنوں پہ غلاموں کو ترس آتا نہیں
اپنی تاب لیے سے آ سرمایہ دار و ہوشیار
اپنے تاجوں کی چمک سے تاجدار و ہوشیار

ایک دوسرے موقع پر جوشؔ ایک بہت ہی افسوس ناک

اور دردناک حالت کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ ایک نوعمر جوان لڑکی بستر مرگ پر
لیٹی ہوئی ہے اور اس کا علاج نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ مفلس ہے
غریب ہے ؎

موت کے بستر پہ اک دوشیزہ ہے لیٹی ہوئی، جس نے دیکھی ہیں ابھی چودہ بہاریں عمر کی
چہرہ گلرنگ ہے اس طرح بیماری سے فق، جھٹپٹے کے آخری لمحات میں جیسے شفق
یا اتنی مجبوریاں بیٹھی ہوئی ہے سرنگوں، کہہ رہی ہے کس سے مانگوں بھیک مولا کیا کروں
کیا ہوا جاتا ہے جی کو، میری دوڑو کوئی! لمبے تکیئے سے ڈھلی جاتی ہے گردن ہو کیا
بعد ازاں اک آخری ہچکی، کمس بے بسی! مرغ جاں کی پرفشانی موت کی سنجیدگی
لاش کا چہرہ خدا معلوم کیا کہنے لگا، گر پڑی چکرا کے ماں سر سے لہو بہنے لگا
پو پھٹی اتنے میں کانپی لاش پر پہلی کرن، لاش تھی یا سو رہی تھی ہند کی ماتی دلہن

احسان بن دانش نے اسی مضمون کو مختلف طریقے سے
ادا کیا ہے وہ اپنی نظم "مزدور کی جوانی" میں پہلے ستمبر کے خوش کن اور
فرحت بخش مناظر کا ذکر کرتے ہیں اور پھر ایک غریب مزدور کی
جوانی کو اس شعر میں یوں کہا ہے ؎

دامن عسرت میں عہد نوجوانی غنچہ ریز، مفلسی کی گود میں پالی ہوئی نعش شباب

الطاف مشہدی بڑے دردناک اور غمناک طریقے سے ہندوستان
کی مفلسی اور غریبی کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ اپنی نظم "وصیت" میں ایک
ضعیفہ کے متعلق لکھتے ہیں جو بستر مرگ پر وصیت کرتی ہے۔ ظاہر ہے
کہ وہ کیا وصیت کرے گی۔ یہی کہ یہ ہندوستان بھوکا ہے غریب ہے
اور کیوں ہے اس وجہ سے کہ اہل زر روپیہ پیسہ غریب طبقہ سے
گھسیٹ لیتے ہیں ؎

خشک ٹکڑا بھی جہاں مزدور کو حاصل نہیں، ہے ہوس کے رنگیں اہل زر کی آستیں
آہ یہ اس بیدل مزدور کی تصویر ہے، جس کے ہاتھوں زحمتوں کے باب کی زنجیر ہے

خورشید انصاری ایک غریب مزدور کی مفلس زندگی کا حال
لکھ کر دنیا کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی حالت بہت خراب ہے
وہ ایک شعر میں یہ صاف صاف بتا دیتے ہیں کہ ایک مزدور جو صبح
سے شام تک سخت محنت کرتا ہے اس کے صلے میں بجائے اس کے
کہ وہ امیر ہو جائے اسے اب بھی خوف ہے۔

اللہ اللہ خوف اور انسان سے انسان کو، چند سکے مول لے لیتے ہیں شاید جان کو

شہاب ملیح آبادی ایک نئے انداز سے اسی مضمون کو لکھتے
ہیں، وہ غریب اور خوبصورت بیمار کے متعلق یوں تحریر کرتے ہیں کہ
وہ بیچاری بیمار اور اس موجودہ سماج کی شکار رہی ہے ؎

خستہ خستہ سی جوانی مردہ مردہ سا شباب، تا صحن بستانِ نظر میں ایک پژمردہ گلاب
دفتر ارماں میں ماضی کے مقالے رہ گئے، چند آہیں چند آنسو چند نالے رہ گئے

ابھی تک تو یہ شاعر ہندوستان کی اس پست اور ذلیل حالت
کا بیان کر کے مزدور طبقے کو خوابِ غفلت سے جگا دینا چاہتے تھے
وہ یہ جانتے ہیں کہ اس سماج کو اچھا بنانے کے لئے انقلاب کی
ضرورت ہے اور وہ انقلاب بھی غریب مزدور اور کسان ہی کریں گے
کوئی سرمایہ دار اس میں حصہ نہیں لے گا، شاعر کا یہ خیال ہے کہ ابھی
تک یہ لوگ خوابِ غفلت میں ہیں اور اپنا فرض سمجھتا ہے کہ ان کو
جھنجھوڑ کر جگائے تاکہ وہ انقلاب کے لئے ہوشیار ہو جائیں۔
اسی لئے جوش اب ان کو خطاب کر کے ان کو جگانا چاہتا
ہے۔ اپنی نظم "غلاموں سے خطاب" میں وہ اسی طبقے سے مخاطب ہے اور
ان کو موجودہ حالت سے آگاہ کرتا ہے ؎

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ، شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لئے نگاہ
اس خوفناک رات کی آخر سحر بھی ہے، توپیں گرج رہی ہیں سروں پر خبر بھی ہے
تجھ کو یقیں نہ آئے گا اے دائمی غلام، میں جا کے مقبروں میں سناؤں اگر کلام
خود موت سے حیات کے چشمے ابل پڑیں، قبروں سے سر کو پیٹ کے مردے نکل پڑیں
تو چپ رہا، زمیں ہلی، آسماں ہلا! تجھ سے تو کیا خدا سے کروں گا میں یہ گلا
ان بزدلوں کے حسن پہ شیدا کیا ہے کیوں، نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں

اسی طریقے سے یہی شاعر اپنی دوسری نظم "بیدار ہو بیدار" میں ان کو انقلاب کے لئے جگا کر تیار کر رہا ہے ؎

تو نے روشِ خدمتِ اغیار نہ چھوڑی، اب تک بہ سبحہ و زنار نہ چھوڑی
آشفتگیٔ اندک و بسیار نہ چھوڑی، افسوس ہے اے جنسِ غلامی کے خریدار

بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار

اب جب کہ شاعر کو یہ یقین ہو گیا کہ سب اس کی چیخ پکار سے جاگ اٹھے ہیں تو وہ اب ان کے دلوں کو انقلاب کی طرف رجوع کرنا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ انقلاب کے لئے یہ مزدور پیشہ لوگ جلد از جلد تیار ہو جائیں، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ انقلاب سرمایہ داروں کے خلاف ہو گا لہٰذا وہ ان غریبوں کو ان کے خلاف کھڑا ہونے کے لئے کہتا ہے۔ وہ اس موجودہ سماج سے بہت نالاں ہے۔

معین احسن جذبی اپنی ایک نظم "دعوتِ جنگ" میں عوام کو چلا چلا کر بلا رہا ہے کہ وہ اس انقلاب میں حصہ لیں اور وہ ان کے غصے کو کسی نہ کسی طرح بھڑکانا چاہتا ہے ؎

دیکھ وہ مزدور اٹھے ہیں برائے انتقام، ہاں اٹھا ہے تجھے سرمایہ داری کا نظام
کیوں نہیں ہوتی تری تلوار آخر بے نیام، اے سپاہی کھینچ اپنی خون فشاں تلوار کھینچ
جن کے آگے ماہ کا نہیں ان جبینوں کو نہ دیکھ، تو ہی چلا دِ فلک زہرہ جبینوں کو نہ دیکھ
آسماں پرواز کر بڑھ کر زمینوں کو نہ دیکھ، اے سپاہی کھینچ اپنی خون فشاں تلوار کھینچ

یا ایک دوسرا شاعر وقار اس موجودہ سماج سے پریشان ہو کر اور گھبرا کر انقلاب کر بیٹھتا ہے اور وہ ان لوگوں سے جنہوں نے اس کو مجبور کر دیا ہے انتقام لینا چاہتا ہے۔ اپنی نظم "انتقام" میں ان خیالات کا یوں اظہار کرتا ہے ؎

بے کسی کی آنکھ ہو آئینہ دارِ انقلاب، مفلسی کے آنسوؤں میں ہیں شرارِ انقلاب
بے بسی کا درد ہے سرمایہ دارِ انقلاب، بندگی پر کھول دے راہِ دیارِ انقلاب

انتقام اے انتقام اے انتقام اے انتقام

کھائیں بھی مزدور کا مزدور پہ غرائیں بھی، دن کو محنت بھی کرائیں رات کو رلوائیں بھی
بھوک سے مزدور کے بچے بھی بلکیں مائیں بھی، تف ہے سرمایہ پرستوں پر کہیں مٹ جائیں بھی

انتقام اے انتقام اے انتقام

مخدوم محی الدین اس سماج کو برباد کر دینا چاہتے ہیں اور وہ نہ صرف آدمیوں کو مدد کے لئے بلاتے ہیں بلکہ وہ تمام مہلک قوی کو دعوتِ انقلاب دیتے ہیں اور ان کی مدد سے اس ذلیل سماج کو برباد کر دینا چاہتے ہیں ؎

جاگ اٹھنے کو ہے اب خونِ تلاطم دیکھو، ملک الموت کے چہرے کا تبسم دیکھو
پھونک دو قصر کو گر کن کا تماشہ ہی سہی، زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہی سہی
زلزلو آؤ دہکتے ہوئے شعلو آؤ، بجلیو آؤ گرجدار گھٹاؤ آؤ

آندھیو آؤ۔ جہنم کی ہواؤ آؤ

آؤ یہ کرۂ ناپاک بھسم کر ڈالیں، کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں

شاعر طرح طرح سے غریب طبقے کو انقلاب کی طرف لا رہے ہیں۔ الطاف مشہدی اب ایک ضعیفہ کے متعلق بیان کرتے ہیں جو بسترِ مرگ پہ ہے اور اپنے بچوں سے وصیت کرتی ہے کہ ان سرمایہ داروں کے خلاف جنگ کرنا، ان کے عیش و آرام کو خاک میں ملا دینا ؎

اے ہوا اے تیرگیٔ بخت اے پرنم فضا، جب سنبھالیں ہوش یہ معصوم دل نم خدا
ان سے کہنا کر گئی ہے یہ وصیت ماں تمہیں، اہلِ دولت نے سلایا خاکِ ذلت میں تمہیں
زورِ بازو سے بدل دو گردشِ ایام کو، نوچ لو زربفت میں لپٹے ہوئے اصنام کو
کھینچ لو ان معصیت کاروں کی بینائی کا نور، توڑ کر رکھ دو زر و دولت کے بندوں کا غرور
ٹھوکروں سے سیم و زر کے بت ملا دو خاک میں، اب مسرت کی چمک ہو دیدۂ غمناک میں

اب شہاب ملیح آبادی نے دوسرا طریقہ استعمال کیا وہ اب انقلاب کے منہ سے کہلوا رہے ہیں۔ اپنی ایک نظم "انقلاب کی پکار"

میں وہ انقلاب کو انسان قرار دے کر کہلواتے ہیں کہ اہل زر کا
سر کچل ڈالوں گا، پیس ڈالوں گا اور رگڑ دوں گا ؎

گھوم میداں کی طرف او سو کیے اے سو غلام، ہو رہا ہے جنگ آزادی کا خونیں اہتمام
آ رہا ہوں جھنجھناتا دیتا صدائے انقلاب، مجھ کو کہتے ہیں تلاطم زندگی طوفاں شباب
سر غرور و کبر و نخوت کا کچل ڈالوں گا میں، پیس ڈالوں گا رگڑ دوں گا مسل ڈالوں گا میں

علی سردار جعفری اپنے انقلاب یا بغاوت کو صرف سیاسی
میدان ہی تک محدود نہیں کرتے۔ وہ انقلاب کے معنی صرف سیاست
ہی میں آزادی نہیں سمجھتے وہ تو مذہب، تہذیب، سماج،
علم اور معاشیات میں، آ ز ا د ی کو آ ز ا د ی سمجھتے ہیں ؎

بغاوت میری منزل ہے بغاوت راستہ میرا، بغاوت میرا مذہب ہے بغاوت ہی تو ہے میرا
بغاوت رسم چنگیزی سے تہذیب تتاری سے، بغاوت جبر و استبداد سے سرمایہ داری سے
بغاوت اپنی آزادی کی نعمت کھونے والوں سے، بغاوت غفلت رفتہ کے اوپر رونے والوں سے
بغاوت مفلسی کی عاجزانہ بد دعاؤں سے، بغاوت سخت پتھر کی طرح بے حس خداؤں سے
بغاوت درد سہنے سے بغاوت غم اٹھانے سے، بغاوت ہاں بجز انسان کے سارے زمانے سے

علی سردار جعفری کو یقین کامل ہے کہ اگر یہ انقلاب کامیاب
ہو سکتا ہے تو صرف مزدور پیشہ لوگوں کی مدد سے ہوگا کیوں کہ ان ہی
کے لئے یہ انقلاب ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ سرمایہ داری نے خدا بن کر
مظالم ڈھائے ہیں۔ وہ اپنی نظم "حال اور مستقبل" میں لکھتے ہیں ؎

کہیں آپس میں اہل زر کے مذہب کی لڑائی ہے، کہیں کھوٹے کھرے چاندی کے ٹکڑوں کی خدائی ہے
نہ جانے کیوں یہ دنیا تو میت کے راگ گاتی ہے، یہ وہ چکی ہے جس میں آدمیت پیسی جاتی ہے
مظالم ڈھائے اس سرمایہ داری نے خدا بن کر، تمدن آگیا رسم کہن کا دیوتا بن کر
جوانی ہے متاع کفر و دیں کو لوٹنے والی، یہ اک جھٹکے میں زنجیر غلامی توڑنے والی

یہی شاعر اب ایک گاؤں کی لڑکیوں کی مفلسی کو بیان
کرتا ہے اور بڑی ہمدردی اور جوش کے ساتھ ان کی ان تمام طاقتوں
کا ذکر کرتا ہے جن پر وہ حاوی ہیں، وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہی وہ ہیں جو

آئندہ اپنے ملک کی تقدیر کو بدل سکتی ہیں ؎

گردش افلاک نے گودی میں پالا ہی نہیں، سختی آلام نے سانچے میں ڈھالا ہی نہیں
بے کسی ان کی جوانی مفلسی ان کا شباب، سازِ ان کا سوز حسرت خامشی ان کا رباب
لیکن ان کی پتیوں کو اپنی غربت سے نہ دیکھ، ان کی غربت پہ نہ جا ان کی قناعت سے نہ دیکھ
اپنی نظروں سے یہ لکھ سکتی ہیں تاریخوں کے باب، ان کے تیور دیکھتی رہتی ہے چشم انقلاب
بن کے قوت ایک دن ابھرے گی ہر سو ان کی تھکن، دیکھ لینا یہ بدل دیں گی نظام انجمن

مجاز کا ایک بہت مشہور گانا ہے جس کو تمام دنیا گاتی پھرتی
ہے اس میں اس نے غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کو بہادر
قرار دے کر ان کی ہمت بڑھائی ہے ؎

ہم وہ ہیں جو بے رخی کرتے نہیں ہم وہ ہیں جو موت سے ڈرتے نہیں
ہم وہ ہیں جو مر کے بھی مرتے ہیں آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں
لاکھ لشکر آئیں کب ہلتے ہیں ہم، آندھیوں میں جنگ کے کھلتے ہیں ہم
موت سے ہنس کر گلے ملتے ہیں ہم، آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

اسی شاعر کی ایک دوسری نظم ہے جس کا عنوان "اندھیری
رات کا مسافر ہے" وہ اس نظم میں بڑی خوبی اور مضبوطی کے ساتھ
مختلف رکاوٹوں کے متعلق لکھتے ہیں مگر یہ بھی بتلاتے ہیں کہ اگرچہ
منزل مقصود بہت دور اور اندھیرے میں ہے اس پر بھی ہمت اور
بہادری کا یہ عالم ہے کہ بڑھتے ہی جاتے ہیں ؎

بدی پر بارش لطف و کرم تکی یہ تقریریں، جوانی کے حسین خوابوں کی ہیبت ناک تعبیریں
بکلی نیز رنگینیں ہیں خون آشام شمشیریں، مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
افق پر جنگ کا خونی ستارہ جگمگاتا ہے، ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلب گیتی کانپ جاتا ہے، مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
حکومت کے مظاہر جنگ کے پرہول نقشے ہیں، کدالوں کے مقابل توپ بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل تازیانے بیڑیاں پھانسی کے تختے ہیں، مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

ہمیں چاہئے کہ جوش کا جو خیال آج کل کے لڑکوں کے

متعلق ہے وہ بھی لکھیں انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ
ان لڑکیوں کو اس قسم کی باتیں لکھ کر ان کو شرم دلائیں تاکہ وہ اپنی
اس نزاکت کو چھوڑ کر انقلاب کے لئے تیار ہو جائیں ؂

چھین لی تم نے فنا ئیت سے ہر شیریں ادا مرحبا اے نازک اندامان کالج مرحبا
جنگ سر پر اور یہ محبوبیت چھائی ہوئی ناز سے نیچی نگاہیں چال اٹھلائی ہوئی
نازکی کا مقتضی پتلی چھڑی باندھے ہوئے شوق کنگن کا کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے
جنگ اور نازک کلائی ہائے ہیں تقدیر کیسے مڑ نہ جائے گی نگوڑی بوجھ سے شمشیر کے
پاؤں رکھتے ہو دم گلگشت کس کس ناز سے اے میں قرباں ان میں جا دیکھے اسی انداز سے
شغل زینت سے گر فرصت تمہیں ملتی نہیں کیا تمہارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں

برخلاف اس کے مجاز جوان لڑکیوں کو ہدایت کر رہے ہیں
کہ سرمہ اسی چھوڑو اور جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ ؂

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

شاعر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ملوکیت اور سرمایہ داری کا خاتمہ
کر دیا جائے تو پھر زندگی میں امن و امان ہو جائے گا اور چین سے
گذرے گی ساتھیوں نے اسی لئے ابھی سے پروگرام بنا لیا ہے کہ
سب سے پہلے وہ دنیا کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ اس کے بعد
وہ پھر دنیا کو ایک نئے طریقے سے اور ایک نئے نمونہ پر بنائیں گے
جو بغیر ملوکیت اور بغیر سرمایہ داری کے ہوگی اور ممکن ہو تو بغیر
کردگاری کے ہوگی جوش اپنی نظم "سرمایہ دار شہریار کردگار" میں ان
تینوں کو برا بھلا کہتا ہے ؂

اے پجاری کے ہٹے انگور اہل غش تو جا آدمی پر رحم کرنے کو سمجھتے ہو گناہ
اے امیر منہ دکھانے کے بھی تم قابل نہیں ہتھیلیوں میں زر دبا ہے سینے میں لیکن دل نہیں
آدمی کب آدمی کی شکل کے تو ڈھے ہو تم پشت مخلوقات پر سرطان کے پھوڑے ہو تم
اور اے غاصب حکومت دشمن لطف و کرم موت کے جادے ہیں تیرے گیسوؤں کے پیچ و خم
ہم نے مانا یہ کہ غفلت کیش ہیں نادان ہیں اے حکومت پھر بھی ہم حیوان نہیں انسان ہیں

اور ہاں اے ماورائے فہم ہستی اے خدا مجھ میں ہے اقرار کا یارا نہ دم انکار کا
کون آتا کو ہے ترا انکار کر سکتا ہے کون کس کے منہ میں دانت ہیں اقرار کر سکتا ہے کون
سنتے ہیں تو ہے کروڑوں ماؤں سے بڑھ کر شفیق اے امیروں کے مربی شہریاروں کے رفیق
بے زروں کے غم سے کیا ہوتا نہیں تجھ کو قلق تیرے زرداروں ہی کو کیا قید جینے کا حق
اغنیا بے حس خدا غافل حکومت بے عمل بن پڑے تجھ سے تو ان تینوں کے پھندے سے نکل
کر بھی دے بے دخل ان ارباب غرور و جاہ کو آسمانوں پر خداؤں کو زمیں پر شاہ کو
اٹھ کہ یہ ہستی کا بحر بیکراں کچھ بھی نہیں مرد کے آگے زمین و آسماں کچھ بھی نہیں

اس انقلابی شاعری پر ایک گہری نظر ڈالنے سے ایک نقطہ صاف
صاف ظاہر ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان شعراء میں حد سے زیادہ جوش و خروش
ہے ہم ان کے اس جوش سے انقلاب کی آگ بھڑکتی دیکھتے ہیں اور یہ آگ آہستہ
آہستہ ہندوستان کے نوجوانوں کے دلوں میں بھی منتقل ہو رہی ہے یہی نہیں بلکہ
موجودہ خرابیوں اور تکلیفوں کے خلاف لڑنے میں اپنا مصمم ارادہ ظاہر کر رہے ہیں
ان کی نظمیں اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت ہی خوش سلیقہ ہیں طرز ادا بہت
ہی جوشیلا اور لکھنے میں کافی قابلیت اور ذہنیت سے کام لیا گیا ہے مگر با وجود ان
تمام باتوں کے شاعری کی خصوصیات کے لحاظ سے اعلیٰ پیمانے کی شاعری نہیں
کہی جا سکتی۔ اس انقلابی شاعری کی زیادہ تر نظموں میں واعظ یا مصلح کو بہت زیادہ
مداخلت ہے ان کی شاعری میں اسی لئے خطیبانہ، نفسیانہ، منادیانہ اور قاصدانہ انداز
بہت ہے یہ شاعر در حقیقت فن شاعری سے کوئی تعلق نہیں رکھتے کیونکہ فن علم میں
شور و شغب اور چیخ چلاہٹ نہیں ہوتی' ادب سے اس زمانے میں امید تھی کہ وہ
لوگوں کے دلوں میں جگہ کرے گا اور ہر دل عزیز ہو کر لوگوں کے دماغوں کو
روشن کر دے گا اور حقیقت سے آگاہ کر کے انقلاب کی طرف لائے گا شاید اپنے
جوش و خروش میں یہ شاعر اپنا مطلب خبط کر دیں گے' یہ دل سوز' رقت انگیز اور
موثر تقاریر ہمارے دلوں اور دماغوں پر ایک مستقل نقش نہیں ڈال سکتی ہیں اور
نہ ہم کو کسی عمل کے لئے جھنجھوڑ سکتی ہیں۔

دوسری خرابی جو یہ شاعری پیدا کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ وہ تمام شاعر

جو انقلاب پر لکھ رہے ہیں وہ خود انقلاب کے پرمعنی اور پیچیدہ تصورات اور نظری قیاس سے بالکل واقف نہیں ہیں، سوائے چند لکھنے والوں کے بقیہ تمام شعراء انقلاب کے صحیح وجوہات کو، انقلاب کے نشو و نما اور ابھار کو واقعات کے انجام کو اور معاملات کے تعلقات کو نہیں سمجھ سکے، وہ بالکل نہیں جانتے کہ کیونکر سماج روز بروز اپنے چہرے بدل رہا ہے اور یہ انقلابات کیوں ہو رہے ہیں! ان کی یہ لاعلمی جو ان کے کلام سے ظاہر ہے بہت ہی نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔

ان شاعروں کی ایک تاسف انگیز رغبت اور ہے جو ان کی شاعری کو بہت ناکامیاب بنا رہی ہے اور وہ یہ کہ وہ ان مزدور پیشہ، کسان اور غریبوں کے انقلاب کی مہلک صورت کو بہت زیادہ زور سے تاکیداً لکھتے ہیں، ہم کشت و خون، سرمایہ داروں کا قتل اور بربادی تمام موجودہ چیزوں کی خواہ ایمانداری سے یا بے ایمانی سے سنتے ہیں بجائے اس کے کہ ہم اس کو سمجھیں اور ہمدردی ظاہر کریں ہمیں اس انقلاب سے ڈر معلوم ہونے لگتا ہے یعنی یہ کہ انقلاب اس ستم و ظلم کو توڑتا ہے۔ انقلاب ان تمام خونی اور بین قومی جنگوں کا خاتمہ کرتا ہے، انقلاب کے ماننے والے امن و امان پھیلاتا ہے، غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ شاعر ہر وقت خون ہی خون کا ذکر کرتے ہیں اور بس ایک یقین دماغ میں رہ جاتا ہے کہ انقلاب کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ سرمایہ داروں کا خون بہائے، اگر کوئی تسکین دینے والا اور صلح پسند ان کے اس کلام کو تعصب کی عینک اتار کر پڑھے اور پھر اگر وہ اس انقلاب کی لہر کو روکنا چاہے تو وہ قصوروار نہ ٹھہرایا جائے گا، انقلاب کے مہلک نقطۂ نظر کا غیر قانونی بے اصولی گمراہ کن اور جہالت کا ہی وہ زوردار جوش ہے جو سیاست کے میدان میں خوف اور دہشت پیدا کر دیتا ہے جو ادب کے اس حصے کی طرف لے جاتا ہے جہاں کہ مبالغہ غلو اور تعلی اور داستان اور افسانے ہیں، یہ ایک بڑی غلطی ہے جو بہت نقصان پیدا کر رہی ہے۔ "انقلاب" کے نقطے کو سمجھنے کی مشکلات، عوام الناس کے جھگڑوں کی لاعلمی اور اشتراکیت کی کمزوری وغیرہ وہ غلطیاں ہیں جو سامنے نہیں آتیں۔

اپنی شاعری کو عمدہ موثر اور حقیقی بنانے کے لئے چاہئے کہ شاعر انقلابی جوش کے ساتھ ساتھ انقلابی خیالات اور انقلابی سمجھ کو بھی باہم متفق کر دے، شاعر کو یہ بھی لازمی ہے کہ وہ خود اس عمل میں شرکت حاصل کرے تاکہ وہ اس کی اہمیت، معنی و مطلب کو بہ آسانی سمجھ سکے، دنیا کے مشہور انقلابی شاعر اور لکھنے والے جان کنفرڈ رالف فاکس اور کرسٹوفر کاڈول، اسپین کے انقلاب میں ان لوگوں کی طرف سے جن کے لئے وہ لکھ رہے تھے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اسی طرح ہندوستان کے شعراء کو بھی جو عوام کی طرف سے لکھ رہے ہیں اور لڑائی میں یورپ کے شاعروں کی طرح حصہ لینا چاہتے ہیں اپنے آپ کو خوب ایک دوسرے سے واقف کر لینا چاہئے، تاکہ ان کا کلام مصنوعی غیر حقیقی اور مردہ نہ معلوم ہو، ادب اور بالخصوص انقلابی ادب زندگی کی حقیقی لڑائی سے جدا نہیں کیا جا سکتا، اسی سلسلے میں یہ اشارہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ عوام کے مقصد کی ذی شعور رسائی حاصل کرنے کے لئے انقلابی شاعر اشتراکی فلسفے کی مکمل قابلیت کے اور مقامی و زبانی مادہ اور روحانیت کو بغیر سمجھے اپنا کام نہیں چلا سکتا اگر کوئی شاعر اپنی صنعت و حرفت کے علم و ہنر اور فن شاعری کے قواعد و اصول کے عطیے کو ایسی قابلیت کے ساتھ متحد کر دے تو پھر وہ اپنے پڑھنے والوں پر ضرور ایک گہرا اور زوردار اثر پیدا کرے گا۔ اس قسم کا شاعر علم ذاتی کے عنصر اور انقلابی شور و شغب کو اپنے کلام سے نکال دے گا، وہ بجائے تباہی اور قہر ناکی پکار کے دوسرا اچھا اور عمدہ طریقہ عمل میں لائے گا۔ وہ ضرور اس بات کا خیال کرے گا کہ کہیں وہ اپنے اور اپنے کلام کی وقعت کو اس مردہ فلسفہ میں گم نہ کر دے کیوں کہ اس کا کام تو یہ ہے کہ وہ اپنے پڑھنے

والوں تک سچائی صداقت اور خوبصورتی سے اپنے خیالات پہنچا دے۔ وہ کوئی سماجی مصلح نہیں ہے اور نہ اس کو مختلف نظریوں میں پھنس کر پریشان ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس کا کام وعظ کرنا اور تلقین کرنا نہیں ہے اس لئے اس کو خطاب بھی نہ کرنا چاہئے۔ اس کا صحیح کام تو یہ ہے کہ دیکھے سمجھے اور شرح کرے۔ اس کی حقیقت اور اصلیت سطحی چیزوں تک محدود نہیں بلکہ وہ سماج کے واقف اور غیر واقف رسم و رواج پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کی شاعری علم حرکت سے تعلق رکھتی ہوگی۔ وہ اس متحرک دنیا سے واقف ہوگی اور ان تمام قوی کو پہچانتی ہوگی جو اس کو حرکت دے رہے ہیں کیونکہ وہ اسی وقت سکوت سے بچ سکتی ہے ورنہ یہ شاعری بہت جلد ساکت ہو جائے گی۔ یہ بتانا ضروری ہے تاکہ دنیا معلوم کرے اور شعراء آگاہ ہو جائیں کہ موجودہ انقلابی شاعری میں بہت نقائص ہیں جو اس کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں

ایک اور خرابی جو ہمارے چند بہت اچھے شعراء کے کلام کی خوبی کو خراب کئے دیتی ہے وہ ان کی خود پسندیگی خود غرضی اور خود بینی ہے۔ ایک شخص یا مفرد پر زیادہ زور دینا کام کو بے حقیقت بنا دیتا ہے۔ جوش ملیح آبادی غالباً اسی کے شکار ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد انقلابی شاعری ختم ہو جائے گی کیونکہ مضامین کی کمی نظر آتی ہے تمام شعراء جو انقلاب کی بابت لکھتے ہیں وہ پرانے مضامین کو دہراتے ہیں۔ قریب قریب ہر شاعر کسان، مزدور وغیرہ پر لکھ چکا ہے ان کے سامنے بس یہی مضامین ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے کہ انقلابی شاعر مضامین میں وسعت پیدا کریں۔ اچھوتے اور انوکھے خیالات انقلابی شاعری میں پیش کریں اور جدت پیدا کرنے کی کوشش کریں ورنہ اس شاعری کا بالکل وہی حشر ہوگا جو غزل کا ہوا۔ پھر کون چبائے ہوئے نوالوں کو نگلے گا۔

انقلابی شعراء کو چاہئے کہ وہ بین الملی اور بین قومی مضمونوں پر زیادہ زور دیں۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستان کے شعراء اسپین کے مزدور پیشہ اور غریبوں کی جمہوریت کے متعلق جو فاشیت کے خلاف لڑتے لڑتے مر گئی، چین کے ان بہادروں کے متعلق جو لاکھوں کی تعداد میں اپنی آزادی کو بچانے کے لئے لڑ رہے ہیں فلسطین کے ان آزاد پسند عربوں کے متعلق جو آزادی کے دلدادہ ہیں، اپنے ان دوستوں کے متعلق جن کی اٹلی اور جرمنی میں آزادی چھین لی گئی اور ان لوگوں کے متعلق جو امریکہ اور برطانیہ عظمیٰ میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے لئے کام کر رہے ہیں، نہ لکھیں۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہماری انقلابی شاعری کو محدود نہ ہو جانا چاہئے ایسی نظموں کی جن میں قومیت کی بو آتی ہو اور بین قومیت کی بو نہ آتی ہو ہمت افزائی نہ کرنا چاہئے۔ ایسی نظمیں جن میں تعصب کی بو آتی ہو دور ہٹا دینا چاہئے کیونکہ جیسا کہ اندازہ کیا گیا ہے پانچ چھ سال کے بعد جب کہ ہندو مسلمانوں کا تعصب خود بخود دور ہو جائے گا تو ان نظموں کی کوئی اہمیت اور وقعت نہ رہے گی۔ مثلاً آنند نرائن ملا کی مسلم لیگ کے متعلق نظمیں یا شہاب کی وہ نظم جس کا عنوان "صدر مسلم لیگ سے خطاب" ہے۔

سید علی ضامن نقوی

اڈگر ویالیس

(سلسلہ گزشتہ)

ان ملاقاتوں کا نتیجہ ظاہر تھا ان میں کسی ایک کو وہ اپنا ہمدرد و مونس بنا لیتا۔ ڈیزی جس نے ابھی ابھی تیسرے دہے میں قدم رکھا تھا ایک حسین اور دلکش دوشیزہ تھی، وہ نہایت ہنسوڑ تھی اس کے برخلاف آئی وی منقطع اور دلیر تھی اور یہ بزدل، غرض اڈگر اس کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہوگیا اور اس طرح اس نے دس سال تک اپنی زندگی عیش و آرام کے ساتھ بسر کی۔

"سیانڈرس" کے سلسلے نے اڈگر کی زنگ آلود شہرت کو دوبارہ جلا دے دی تھی اور رپورٹر، افسانہ نگار اور اڈیٹر کی حیثیت سے ہر طرف سے اس کی مانگ شروع ہوگئی، اس نے خندہ پیشانی سے سب کا استقبال کیا اور پھر ایک دفعہ فلیٹ اسٹریٹ میں اٹھ آیا اور کئی ایک اخباروں کے دفتروں میں جائدادیں قبول کریں جن میں سے چند اس کے آخر دم تک باقی رہیں، ان گوناگوں دلچسپیوں میں گھرنے کے بعد ڈیزی اب اس کا ہاتھ بٹانے لگی تھی، اس کے مسودے پڑھتی، صاف کرتی، پروف صحیح کرتی، اس کے افسانے کے کرداروں اور موضوعوں پر رائے زنی کرتی آئی وی نے ناچار اس کو اپنا شریک خاندان سمجھا اور صورت حال کو چند رسمی معاملات سے ہموار کر لیا۔

اڈگر کی عمر انتالیس سال کی تھی کہ جنگ عظیم پھوٹ پڑی اور انگلستان کا مشہور افسانہ نگار پھر نامہ نگار بن گیا لیکن وہ اب "ڈیلی نیوز" کا نامہ نگار تھا۔ اس کے مضامین جو جنگ کے دوسرے دن سے شروع ہوئے اور صلح تک جاری رہے انتہائی انہماک کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ لوگوں نے اس کے حوصلہ افزا نظریوں کی تعریف میں ہزاروں خطوط لکھے، اپنے نظریوں کو تسلیم کرانے کی ایسی ناقابل تنقید قابلیت اس سے پہلے کبھی نہیں ظاہر ہوئی، جوں ہی لڑائی چھڑی ہر ایک جرمن اس کے لئے "ہن" اور لڑکے ہیرو بن گئے، یہ اس لئے نہیں تھا کہ وہ عوام کی رائے سے خائف تھا بلکہ وہ ہمیشہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ ان چیزوں میں حصہ لیتا تھا، یہ اس کا نفسیاتی اہم پہلو ہے جس نے اس کو بعد میں ایک کامیاب ادیب اور انشا پرداز بنا دیا۔

جب اس کے معتمد رابرٹس نے ایک ٹائپسٹ کی جگہ کے لئے اشتہار دیا تو ایک بھوری آنکھوں والی اٹھارہ سالہ دوشیزہ نے مس وایولٹ کنگ کے نام سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ بہت شرمیلی تھی اور اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اپنی بوکھلاہٹ میں اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ اڈگر ویالیس کا نام اس نے کبھی نہیں سنا لیکن اس کے اظہار کا اس کو ہمیشہ افسوس رہا اور اس میں زیادہ شدت اس وجہ سے بھی ہوئی کہ اڈگر کو یہ جواب ناگوار گذرا۔ اڈگر نے اس کی درخواست منظور کر لی اور اپنے نام کو عرفیت ہی سمجھ کر دل بہلا لیا، اس کے باوجود بھی اڈگر نے اس لڑکی میں کشش پائی دو گھنٹے کی غیر متعلق گفتگو کے بعد دوسرے دن صبح نو بجے کام کے متعلق کہا گیا۔

آئی وی اور مس کنگ میں کسی قسم کی ان بن نہیں تھی وہ ہمیشہ اس کو ٹائپسٹ سے مخاطب کرتی لیکن ڈیزی اس سے مشکی تھی اور اسی شک نے تینوں کے درمیان عداوت کی ایک خفیہ رو دوڑائی۔ ان خاندانی الجھنوں میں پھنسنے کے لئے اڈگر کے پاس نہ وقت تھا اور نہ اس کو ان سے کوئی دلچسپی لیکن وہ معترف تھا کہ آئی وی کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے، وہ نہایت متین اور خاموش تھی اور اڈگر اس کی موجودگی کے باوجود عدم موجود سمجھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اس نے ان کشیدگیوں کی طرف کوئی خیال نہیں کیا چودہ سال پہلے جو شادی محبت کی بنا پر ہوتی تھی اب وہ ایک المیہ

بن رہی تھی آئی وی کی اطاعت شعار اور تربیت پذیر فطرت اڈگر کے جذباتی ضروریات کو مطمئن کرنے میں کامیاب نہ ہوسکی، اڈگر میں زندگی کی خواہش بہت زیادہ تھی اس غیر مادی زندگی سے اکتا کر اس نے سنہ ۱۹۱۷ء میں اڈگر سے کہہ دیا کہ اس کو آزادی دے دی جائے مقدمہ چلا اور جون سنہ ۱۹۱۹ء میں انکی طلاق منظور ہوگئی چند مہینے بعد اڈگر نے مس کنگ کے ساتھ خاموشی سے چھپا کر شادی کرلی اس شادی کے بعد پانچ سال نہایت امن و اطمینان سے گذرے، اس کے جذبات میں سکون پیدا ہوگیا تھا، کثرت کار کی وجہ سے اس کو ان دنوں میں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

اب تک اڈگر نے اپنی کتابیں حق تصنیف کا خیال کئے بغیر ستراسی پونڈ میں فروخت کردی تھیں۔ آخر کار اے، پی، واٹ نامی ایک شخص نے سر آرنسٹ ہاڈر ولیم سے اڈگر کا تعارف کرایا جس نے چھ ناول حقوق تصنیف محفوظ کرتے ہوئے ٹھیکے پر لئے سر آرنسٹ کا خیال تھا کہ یہ ناکام شخص جس کی عمر اب پچاس کے لگ بھگ ہے دنیا کا ہر دل عزیز ادیب بن سکتا ہے، اس نے سمجھ لیا کہ اڈگر کے کارنامے دنیا کو محو حیرت بنا دینگے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا صرف یہی واحد ذریعہ ہوسکتا ہے کہ اس سے سرعت رفتار کے ساتھ کتابیں لکھوائی جائیں، اس اسکیم کی کامیابی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس فرم نے دس سال کے عرصے میں اس کے چھیاسٹھ ناول شایع کئے اور ان کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی، ان تصانیف کی کثرت جو ستائیس سال کے عرصے میں ڈیڑھ سو کتابوں تک پہنچ گئی تھی اس کا سمجھانا ایک مشکل امر ہے، ویالیس اپنے حلقۂ احباب میں انتہائی سست کاہل اور احدی مشہور تھا، تھیٹر اور گھڑ دوڑ کے میدان میں ہر شخص اس کو دیکھتا یہ بھی عام بات تھی کہ وہ صد گز کا فاصلہ بھی کسی کے بغیر طے نہیں کرتا، جیسے ہی اس کی کثیر التصانیف

ہونے کی شہرت بڑھتی گئی، لوگ اس کا مضحکہ اڑانے لگے، کوئی اس کو "ہفتہ وار ویالیس" کہتا اور کوئی "دوپہر کا ویالیس" عام طور پر یہ خیال کیا جارہا تھا کہ یہ تمام تصانیف اس کے قلم کی نہیں ہیں، بلکہ اس کا معتمد بھی برابر کا شریک ہے یا تو پھر اس نے کسی جن یا بھوت کو قبضہ میں رکھا ہے جو اس کے لئے تیزی کے ساتھ ادبی کتابیں لکھ دیتا ہے، غرض یہ افواہیں کبھی نہ رکیں، اس نے پانچ ہزار پونڈ کا ایک انعام بھی اس شخص کے لئے مقرر کردیا تھا جو یہ ثابت کرے کہ اس کی تصانیف میں کا ایک لفظ بھی کسی دوسرے کا لکھا ہو، یہ افواہیں اس کے مرتے دم تک رہیں اور اب بھی جاری ہیں۔

اس تیزی سے لکھنے والے کی تحریریں افسانوں اور ناول میں واقعات یا قواعد کی غلطیاں ہونا بدیہی بات تھی لیکن ان چیزوں کو نہ تو مصنف ہی نے کوئی اہمیت دی اور نہ ناشر نے، ویالیس کے ناولوں اور افسانوں کے موضوع ایسے مافوق الفطرت ہیں کہ پڑھنے والا آئندہ واقعات کی دھن میں پڑ جاتا ہے، وہ حقایق سے دور رہ کر تشویش اور امید و بیم کی بھول بھلیاں میں جو اس کر بھری دنیا میں اس کے خیالات نے پیدا کی ہے گھومنے لگتا ہے، ان تمام دہشتوں کے باوجود افسانے پڑھنے والے پر یقین اور اعتقاد راسخ کے نقوش مرتسم کرتا ہے اور اس میں ہمیشہ فتح حق اور انصاف کی ہوتی ہے، کردار کے جنسی اخلاق بشمول مجرم ہمیشہ ملعون و مطعون ہوتے ہیں۔

اڈگر کہتا ہے "ہمارا موجودہ ادب گندگیوں سے اتنا آلودہ ہے کہ میں واقعتاً بیمار ہو جاتا ہوں اور اسی لئے میں ایسے افسانے لکھنا چاہتا ہوں جن کی حقیقت "معصوم قتل" سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتی"

اڈگر سالہا سال تک نہایت استقلال کے ساتھ ڈرامے لکھتا

اور انہیں لندن کے منتظمین تھیٹر کو بیچتا رہا' ایک ڈرامے کو اس نے
خود پیش کیا تھا لیکن مضحکہ خیز طور پر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔
آخر کار وہ ایک میلو ڈراما لکھنے میں کامیاب ہوگیا "رنگر" ونڈھم
تھیٹر میں یکم مئی سنہ ۱۹۲۶ء کو پیش کیا گیا اور یہ معلوم ہوگیا کہ جو جذبات
اس کے دل میں زندگی بھر پرورش پاتے رہے اب ان کا عوام کو
احساس ہوگیا ہے اس دن سے تیس سال پہلے وہ موسیقی ہال
میں دم بخود بیٹھا آرتھر رابرٹس کی زبانی اپنا نغمہ سن رہا تھا اور اسی
وقت سے عالمگیر شہرت کے خواب کی تعبیر تھی' یہ مسلسل ایک سال تک مختلف
تماشا گاہوں میں چلتا رہا اور اس نے ویالیس کو ڈراما نگار بنادیا
اس کے بعد کے چھ سال میں اس نے سترہ ڈرامے لکھے جن میں نصف سے
زیادہ کامیاب ثابت ہوئے۔

جب سنہ ۱۹۲۹ء میں اڈگر ویالیس نے ممالک متحدہ امریکا کا
سفر کیا تو وہاں خانہ جنگیاں زوروں پر تھیں وہ اس دنیا کے مجرموں
کو دیکھنا چاہتا تھا جو اس کے ناول کے مجرموں سے زیادہ دہشتناک
اور جاذب نظر تھے اس نے شکاگو کا بھی ہوائی سفر کیا جہاں ایک
لفٹننٹ پولیس نے اس کو اپنے سفر میں ساتھ رکھا اور کیا پون
کے ہیڈ کوارٹرس بتلائے اس نے پھولوں کی اس دوکان کو بھی
دیکھا جہاں ڈی بن اوبینین کو قتل کیا گیا تھا اور وہ گیاریج بھی
دیکھی سینٹ ویلن ٹائن کا قتل ہوا۔ یہ مقام ہیسرو کے مضافات
میں واقع ہے۔

بحری سفر کے پانچ دن اڈگر نے نہایت خاموشی اور
رنج میں بسر کئے لیکن یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اس کا دماغ کسی خاص
چیز کی تخلیق میں محو ہے جب وہ لندن پہنچا تو اس نے اپنے معتمد کو
بلاکر ایک دہشتناک ڈراما "آن دی سپاٹ" لکھوانا شروع کیا۔
وہ بغیر کسی وقفہ اور تامل کے یہ ڈراما لکھاتا رہا چوتھے دن ڈراما
ختم ہوا اور وہ اپنی دماغی تھکن دور کرنے کے لئے بستر پر جا پڑا۔ اس
میں کوئی شک نہیں کہ یہ ویالیس کا شاہکار اور ہمارے زمانے کا بہترین
میلو ڈراما ہے۔

اڈگر کی رفتار تحریر سالہا سال کی مشق سے بہت بڑھ گئی
تھی یہاں تک کہ اس کے خاص دوست بھی اس پر حیرت کرنے
لگے تھے سر پیٹرک ہسٹنگز نے اڈگر کے پاس ایک ہفتہ گزارا اور ہر
جمعہ کی شام سے پیر کی صبح تک مکمل ناول لکھاتے دیکھا۔ اور اڈگر
سے یہ سن کر اور بھی متحیر ہوگیا کہ یہ موضوع زیادہ اہم نہیں ہے۔
وہ پیر کے دن صبح نو بجے کمرے سے باہر نکلا' داڑھی بڑھ گئی تھی
آنکھیں کھنچ گئی تھیں وہ اس حالت میں باہر آیا اور اپنے دوست سے
کہنے لگا کہ اس نے اپنا اسی ہزار الفاظ کا ناول ختم کیا ہے اس ناول
سے جس کو اس نے ساٹھ گھنٹوں میں ختم کیا تھا چار ہزار پونڈ ملے'
ناول ختم کرنے کے بعد وہ دو دن تک سوتا رہا چھ سات ناولوں کے
موضوع اس نے تیار کر لئے تھے' مدیران جراید فرمایشیں کرتے
رہتے اور وہ بھی عقوبت سرمایہ داری سے لے کر نوجوانوں کے
گناہوں تک کو نہایت آسانی کے ساتھ سپرد قلم کردیتا۔ وہ اپنے
مضامین کی قیمتیں بہت زیادہ بتلاتا لیکن فلیٹ اسٹریٹ کے
احباب اچھے اچھے مضامین پر دس پانچ گنیاں دے دیتے اور
وہ خاموش ہوجاتا' کثرت کار اس کی فطرت ثانی بن گئی تھی اسی لئے
اس نے کسی مدیر کو نفی میں جواب نہیں دیا' اخبار کے مضامین وہ
آدھے گھنٹے یا اس سے کم وقت میں لکھ دیا کرتا۔

اس کی آمدنی افسانۂ قارون بن رہی تھی اس لئے اس کا
ہر کام مسرفانہ ہونے لگا اس نے دو بڑے بڑے مکانات خریدے
اور ملازمین کے لئے الگ مکان خریدا' کبھی کوئی دعوت اس وقت
تک نہ دی جاتی تھی جب تک کہ اس کے شایان شان نہ ہو

دعوتیں اکثر ہوتیں اور ہر دعوت میں کم از کم دو سو مہمان مدعو رہتے۔

اس کا محبوب مشغلہ گھڑ دوڑ میں شرکت تھی اس نے گھوڑ دوڑ کے متعلق "اسٹار" میں کئی مضامین لکھے اس کے پاس خود کئی دوڑ کے گھوڑے تھے جو اگرچہ اپنی ذاتوں کے لحاظ سے برابر نہ تھے لیکن انہوں نے اڈگر کو گھوڑوں کا مالک بنا کر کافی شہرت دی اور "اسٹار" سے آئی ہوئی تین ہزار پونڈ کی آمدنی انہیں کے نذر ہوگئی۔

وہ اپنے ڈراموں کو معاشی اصول پر چلاتا تھا لیکن اس کا افتتاح اس شان سے کرتا کہ کئی پونڈ اسی کی نذر ہو جاتے۔ بڑی دعوت دی جاتی، ملازمین کی تنخواہیں دگنی کر دی جاتیں لیکن اگر کوئی اس سے اضافہ تنخواہ کا ملتجی ہوتا تو وہ برانگیختہ ہو جاتا اور انکار کر دیتا۔ بغیر اطلاع کے کسی کی تنخواہ بڑھا دینا اور کسی کو بغیر انعام و اکرام کے خارج کر دینا اس کے لئے بالکل معمولی بات تھی۔

زندگی کے آخری دو سال میں کثرت کار نے اس کو چڑچڑا اور بدمزاج بنا دیا۔ چالیس سال سے اس کے کام کی رفتار کا یہی عالم تھا۔ اس کی ذہنی قوت ایسے درجہ پر پہنچ گئی تھی جہاں اس کا خیال فطرت اور کائنات کی معمولی سی ہنگامہ آرائی پر وجد کرنے لگتا۔ اس کا مالی موازنہ جو کبھی برابر نہ رہتا تھا ۱۹۳۱ء سے بہت بگڑ گیا صرف انکم ٹیکس میں وہ بیس ہزار پونڈ کا مقروض ہوگیا۔ اس کی بزدلی اور رجائیت نے اس کو اپنے معاملات میں کسی قسم کی تنقیح و تحقیقات کی اجازت نہ دی اس کا خیال تھا کہ اس کا قرضہ اصل سے چوگنا ہوگا۔ اسی اثناء میں جب اس کو ہالی ووڈ سے دعوت نامہ ملا تو اس نے ایسے سنہرے موقع کو چھوڑ دینا مناسب نہ سمجھا۔

وہ اپنے اس سفر پر مایوس سا تھا لیکن روانگی کے دن مایوسیوں اور مسرتوں کی متضاد علامتیں اس کے چہرے سے ظاہر تھیں وہ روانگی سے قبل اپنا نیا ڈرامہ "دی گرین پیاک" ختم کر دینا چاہتا تھا تاکہ مالکان تھیٹر کو دے دے۔ اس نے نہایت بے تابی اور عجلت میں اس کو ختم کیا، اس کی صحت کی خرابی کے باعث وایولٹ کنگ نے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے لئے کہا بھی لیکن اس کو اپنی تندرستی پر اعتماد تھا حالانکہ ضیابیطس اس کی تمام قوتوں کو سلب کر رہا تھا۔

وہ "امپرس آف برطانیہ" کے ذریعہ نومبر ۱۹۳۱ء میں اپنے معتمد کرٹس اور ایک ملازم کے ساتھ امریکہ روانہ ہوا اور وایولٹ اپنے اکلوتے بیمار بچے پینی لوپ کے علاج کے لئے انگلستان ہی میں ٹھیری رہی۔ اس نے دو مہینے ہالی ووڈ میں گذارے اس کی بے حد عزت کی گئی اس کے چند ڈرامے جب اسٹیج پر کرنے کے لئے انتخاب کئے گئے تو وہ مزید جنوری کے آخر تک ٹھیرنے کا فیصلہ کر لیا۔

"دی گرین پیاک" ۹ر فروری کو پہلی بار پیش کیا جانے والا تھا اور اپنی کامیابی کا خیال کرتے ہوئے اڈگر نے ایک تقریر نشر کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن پہلی ہی رات کو اڈگر نمونیا میں بیمار ہوگیا، تھیٹر کی پھاٹک پر اس اعلان کے لئے بڑے بڑے اشتہارات لگائے گئے اور اڈگر کو انگلستان بھیج دیا گیا۔ والٹر ہسن جو ہالی ووڈ میں اڈگر کا دوست ہوگیا تھا، کرٹس اور ملازم ان تینوں نے اڈگر ہی کے پاس رات گذاری اور تین گھنٹوں تک وہ سوئے ہوئے اڈگر کے پاس بیٹھے رہے لیکن ان تینوں میں کسی نے نہیں جانا کہ اڈگر کی روح کب پرواز کر گئی۔

ہیتھبنک ساؤتھمپٹن کے سامنے نہایت خاموشی سے چل رہا تھا کہ وایولٹ کی آمد کا تار ملا اور جب جہاز شربرگ پہنچ

گیا تو وابولٹ جہاز سے اتری اس کے ساتھ اڈگر بھی تھا لیکن اس نے اپنی زندگی کا ڈرامہ ختم کر دیا تھا۔ بیرنگیریا کے عرشہ پر جہاز والوں نے لاش پر علم اتحاد اڑھا دیا اور لاش کو پھولوں سے ڈھک دیا اور کیبن میں لے آئے۔

جب جہاز بندرگاہ ساوتھمپٹن میں داخل ہو رہا تھا اس کا علم اس کے نصف مستول تک اتر چکا تھا تمام کلیساؤں کے علم جھکا دئے گئے تھے، فلیٹ اسٹریٹ کے گھنٹے بج رہے تھے اور دھندھم میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یہ اس کے اعزاز کے لئے تھا اگرچہ وہ ان تمام نمایشوں سے بے نیاز ابدی نیند سو رہا تھا۔

اکبر صدیقی

اردو کی نئی کتابیں

(۱) خلافت وسلطنت (تاریخ خلافت عباسیہ) از ڈاکٹر امیر حسن صدیقی ۱۳۷ صفحات پتہ۔ دار المصنفین اعظم گڑھ۔

(۲) تاریخ دستور حکومت ہند از ڈاکٹر یوسف حسین خان۔ ۲۵۴ قیمت عا/ پتہ انجمن ترقی اردو۔ دہلی

(۳) نیا شوالہ باتصویر (افسانے) از سید فرید جعفری قیمت عہ پتہ شانتی پریاگی۔ فاطمہ اسٹیٹ۔ الہ آباد

(۴) الاکسیر جلد اول (حکیم محمد اعظم خاں کی اکسیر اعظم کا ترجمہ) ۴۰۸ صفحات قیمت للعہ پتہ دفتر المسیح۔ قرول باغ دہلی

(۵) اکسیر نورانی (دو سو مرکبات کے اجزاء اور فوائد) از حکیم نور محمد ۱۶۸ صفحات قیمت عہ پتہ از مرتب۔ رانی پورہ اندور

(۶) خواتین دکن کی اردو خدمات از نصیر الدین ہاشمی ۲۹۲ صفحات۔ قیمت عا/۔ پتہ عبد الرزاق تاجر کتب عابد روڈ حیدرآباد دکن

(۷) رومان اور دوسرے رنگین افسانے مرتبہ ادارۂ رسالۂ رومان ۲۰۰ صفحات قیمت عہ۔ پتہ منیجر رسالۂ زیب النساء۔ لاہور

(۸) انسان کے حقوق (ایچ۔ جی ویلز کی کتاب کا ترجمہ) از ظفر قریشی بی۔ اے ۳۰۰ صفحات پتہ کتب خانہ علم و ادب۔ دہلی۔

(۹) اردو مثنوی کا ارتقاء از پروفیسر عبد القادر سروری ۱۴۳ صفحات قیمت عہ پتہ۔ سب رس کتاب گھر۔ حیدرآباد دکن

(۱۰) ہندوستان کے آثار قدیمہ پر ایک اجمالی نظر از مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ ۵۰ صفحات پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی۔

(۱۱) میری ہوش ربا داستان زندگی (انگریزی ناول کا ترجمہ) از مسعود جاوید ۲۸۰ صفحات۔ پتہ تعلیمی ٹریڈنگ پریس۔ لاہور

(۱۲) شاہان اسلام کی رواداریاں اور ہندو مصنفین از ملک فضل حسین ۱۶۸ صفحات الہ بخش اسٹیم پریس۔ قادیان

(۱۳) کلیہ عرائض نویسی جلد پنجم از دولت رام سیٹھی ۱۲۸ صفحات پتہ جنرل برقی پریس۔ جالندھر

(۱۴) جنرل رویس مع ترمیمات ۱۹۳۸ء جلد اول مترجمہ بابو کرشنا دیال ۲۱۰ صفحات پتہ آگرہ اخبار برقی پریس۔ آگرہ

(۱۵) کامل جدید موٹر سیکل گائیڈ از ایم۔ ایس۔ آغا ۲۶۶ صفحات پتہ حجازی پریس۔ لاہور

(۱۶) لطف زندگی۔ (ہندو مسلم اتحاد) از کانشی رام چاولا ۱۶ صفحات۔ پتہ جنرل برقی پریس۔ جالندھر

(۱۷) انکم ٹیکس اور مشکلات حساب از مدن گوپال ۱۰۰ صفحات پتہ مسلم پرنٹنگ پریس لاہور۔

مرزا سیف علی خاں

میکانی انقلاب

یوں تو مختلف فلاسفہ نے انسان کی مختلف تعریفیں پیش کی ہیں مگر سب سے زیادہ موزوں اور صحیح تعریف معلوم ہوتی ہے انسان ایک ہتیار والا حیوان ہے man is an animal with tools اس لئے کہ ہتیار کی تاریخ ایسی قدیم ہے جیسی کہ خود انسان کی یہاں تک کہ قدیم انسان کو خود اس کے ہتیار کی ماہیت کی نسبت سے نام دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ہم نوع انسان سے منلتھک زمانے میں دوچار ہوتے ہیں جب کہ وہ پتھر کے ہتیار استعمال کرتا تھا اس کے بعد کا زمانہ (قدیم حجری) کے نام سے موسوم ہے اس زمانے میں قدیم پتھر کے ہتیار سے انسان کام لیتا تھا اس کے بعد کا زمانہ (جدید حجری) کہلاتا ہے۔ اس زمانے کے ہتیار (قدیم حجری) زمانے کے ہتیاروں سے زیادہ اچھے اور زیادہ ترقی یافتہ ہوتے تھے Reinderage کا انسان بارہ سنگھے کی سینگ اور ہاتھی کے دانتوں سے ہتیار بناتا تھا اور ان پر جانوروں کے نقش بنایا کرتا تھا جن میں بعض اب معدوم ہو چکے ہیں مثلاً Mainmoth وغیرہ حتیٰ کہ تانبے کا زمانہ آیا تو انسان نے تلوار، کلہاڑی وغیرہ بعض ایسے ہتیار بنائے جو اپنی خوبی وضع اور نفاست کے لحاظ سے اس زمانے کے ہتیاروں سے بہت کچھ قریب نہیں۔ انسان کو قدرت نے غیر مسلح پیدا کیا تھا وہ دوسری مخلوق کی بہ نسبت بہت ہی کمزور تھا نہ اس کے شیر کے سے پنجے تھے اور نہ وہ ہاتھی کا سا قوی ہیکل تھا تاہم اس کو ان سے عہدہ برا ہونا تھا اس نے اپنی عقل خداداد سے ہتیار کو استعمال کر کے دوسرے ہتیار تیار کئے جیسے آج

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مشین کی تخلیق دوسرے مشین کی مدد سے ہوتی ہے۔ ان ہی ہتیاروں کی مدد سے اس نے دوسری مخلوقات پر قابو پایا اور سب کو رام کیا یہاں تک کہ کئی ایک حیوان و نبات کے لئے اس کا وجود سم قاتل کا کام کیا چنانچہ ابھی حال میں لندن کا ایک درندہ Grey Wolf وہاں سے معدوم کر دیا گیا۔ انسان اگر یہ ہتیار صرف دوسرے جانوروں سے اپنی حفاظت کے لئے ہی استعمال کرتا تو یہ حقیقت میں اس کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ تھا لیکن یہ ہتیار جو ایک مطیع و فرمانبردار خادم تھا اب ایک چڑچڑا مالک بن گیا انسان کا ہتیار اس کے لئے Boomerag ہو گیا۔ انسان اس کو انسان کے لئے استعمال کرنے لگا وہ تلوار جو کسی درندے پر اٹھتی تھی انسان پر اٹھنے لگی وہ خنجر جس کی پیاس ہرن اور بھیڑ کے خون سے بجھتی تھی انسان کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ یہی ہتیار جو انسان کو غذا مہیا کرتا تھا انسان کو اپنی غذا بنا لیا۔ حرص و آز کی آب نے اس تلوار میں وہ جوہر پیدا کئے کہ Darius اور پھر اس کے بعد Xerxes یونان پہنچے تو ملک گیری کی طمع نے سکندر کو ہندوستان و ایران کھینچ لایا اسی تلوار نے Carthaginians اور Romans کے معرکے سر کئے۔ سارگن، حمورابی، سناچرب، اٹیلا اور ہلاکو اس تلوار کی پیداوار ہیں۔ اور بعدازاں جب منگولوں نے جنہوں نے بارود اور بندوق بنانا سیکھا تو اس ہتیار نے چنگیز خاں کے ہاتھوں یورپ و ایشیا کو لرزہ براندام کر دیا۔ اور پھر اسی ہتیار نے تیمور لنگ کو انسانی کھوپڑیوں کے مینار بنا کر دیکھنے اور خوش ہونے کے جنون میں مبتلا کر دیا اسی تلوار نے کہیں مجاہد کے ہاتھ میں آکر مذہب و ملت کے نام پر

لاکھوں جانیں لیں تو کہیں یہی ظالم ملک گیر فاتح کے حرص و آز
کی تکمیل کا سامان بن گئی۔ کہیں Charlemagne
تو کہیں Attila بن کر نظر آئی

گذشتہ صدی اور خصوصاً اس ربع صدی نے جنگ
کو جو پہلے ہی سے ایک قیامت تھی۔ قیامت عظمیٰ کر دیا ہے۔ ہم
دیکھ چکے ہیں کہ گذشتہ جنگ عظیم ہی میں ۱۹۱۸ء کے انفلوئنزا
اور Justenian کے زمانے کی پلیگ سے کہیں زیادہ
ہلاکتیں وقوع میں آئیں۔ موجودہ جنگ اس سے زیادہ مہیب ہے
اور آئندہ جنگیں نہ جانیں کتنی زیادہ ہیبت ناک اور بھیانک
ہونگی۔ یہ سب عصر حاضر کی میکانی ترقیوں کی وجہ ہے جس کی
تاریخ پر اب ہم روشنی ڈالینگے۔

انیسویں صدی عیسوی میں جب یورپ نپولین کے
بے پناہ جنگی معرکوں سے تھک کر اپنی توجہ معاشری اور سیاسی
مسائل کی طرف مبذول کر رہا تھا جو اب بھی اس کے سامنے
موجود نہیں تو عین اسی زمانے میں سارے یورپ میں ایک
نئے انقلاب کی موج دوڑ گئی۔ یہ نہ امریکہ کا سیاسی انقلاب
تھا اور نہ فرانس کا جمہوری انقلاب بلکہ یہ تھا میکانی انقلاب جس نے
انسانی قوت اور زندگی کے مادی رخ میں ایک روح پھونک
دی۔ یہ نئی روح اور جدید زندگی تھی سائنس داں کے غور و فکر
کا نتیجہ۔ Rogers Bacon کی چھ سو سال قبل کی
پیش گوئیاں رو بہ عمل ہو رہی تھیں عمل کے گوشہ نشین سائنس دانوں
کی خاموش مساعی کا نتیجہ ہے کہ یہ انقلاب عوام کے سامنے
آموجود ہوا۔ جس میں سب سے پہلے اور سب سے زیادہ نمایاں ایجاد
بھاپ کے انجن کی تھی اول اول جب لوہے کے پگھلانے
کے لئے کوئلے کی ضرورت ہوئی تو یہ کوئلہ کانوں سے زیادہ تعداد
میں حاصل کیا جانے لگا ان کانوں سے پانی خالی کرنے کے
لئے سب سے پہلے Steam pumping Engine
استعمال ہوا بعد میں James watt نامی کے
Glasgow کے باشندے نے جو ریاضی کے آلات بنایا کرتا تھا
اس بھاپ کے انجن کو ترقی دے کر اس سے مشین کے
چلانے میں مدد لی۔ اور اس قسم کا سب سے پہلا انجن
Nottingham میں ۱۷۸۵ء میں روئی کی گرنیوں
میں استعمال کیا گیا۔ ۱۸۰۱ء میں Trevithick
نے پہلا انجن بنایا جس سے حمل و نقل کا کام لیا جاسکتا تھا
۱۸۲۵ء میں سب سے پہلی ریلوے ٹرین Stockton
اور Darlington کے درمیان آمد و رفت کے لئے
بنائی گئی۔ انیسویں صدی کے وسط تک سارے یورپ میں
ریلوں کا ایک جال بچھ گیا۔ انسانی زندگی کے جمود میں اس
نئی ایجاد نے ایک غیر معمولی حرکت پیدا کر دی انسان برسوں
کا سفر دنوں میں طے کرنے لگا۔ روس کی تباہی کے بعد جب
نپولین Vilna سے Paris آیا تو کہتے ہیں اس کو باوجود
عام سہولتیں مہیا ہونے کے اس سفر میں ۳۱۲ گھنٹے
صرف کرنے پڑے۔ معمولی مسافر تو اس سے دوگنے وقت
میں بھی طے نہیں کر سکتا تھا یہ بات نہایت دلچسپی سے خالی
نہیں کہ پانچویں صدی قبل مسیح سے انیسویں صدی تک
انسان نے حمل و نقل کے ذرائع بڑھانے اور سفر میں سہولتیں
پیدا کرنے میں کوئی قابل لحاظ ترقی نہیں کی تھی۔ پیرس اور
روم کا فاصلہ اٹھارویں صدی عیسوی میں مسافر اتنے ہی
عرصے میں طے کر سکتا تھا جتنا کہ Rome اور Gaul
کا فاصلہ طے کرنے میں وہ پہلی صدی عیسوی میں صرف کرتا تھا

یا جتنا کہ Sardis اور Susa کے فاصلہ
کو طے کرنے میں ایک مسافر کو چوتھی صدی قبل مسیح میں صرف
کرنا پڑتا تھا۔ جو سفر پہلے دس روز میں ہوتا تھا اب ایک روز
میں ہونے لگا۔ گویا یورپ کے طول و عرض میں ریلوں کی
ایجاد نے ۹/۱۰ حصے کی کمی کر دی۔ اس کے ساتھ بھاپ کے ذریعہ
چلنے والی کشتی بھی ایجاد ہوئی سنہ ۱۸۰۲ء میں۔ . . .
Charlott Dundas نامی کشتی + in th
of chyde cannal پر پہلی مرتبہ اتاری گئی سنہ ۱۸۰۷ء
میں ایک امریکی شخص Fulton نے ایک بڑے جہاز کا
مالک تھا جس کا نام Clermont تھا۔ سب سے
پہلا دخانی جہاز Phoenix جو نیویارک سے
Philadelphia پہنچا امریکی تھا۔ اور
Savanah بھی پہلا امریکی دخانی جہاز تھا۔
جس نے بحر اوقیانوس کے پار کیا تھا۔ ان تمام جہازوں کے۔ . . .
paddle wheels ہوتے تھے جن کے ٹوٹ جانے
کا بہت اندیشہ رہتا تھا Screws والے دخانی جہازوں کی
ایجاد ہونے تک بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا اس کے
بعد سے سمندری سفر کے ارتقائی منازل بہت زیادہ تیزی
سے طے ہونے لگے۔ ماوراالاوقیانوسی سفر جو ایک بڑی مہم سمجھا
جاتا تھا اور مہینوں میں ہوتا تھا نسبتاً کم عرصے میں آسانی
سے ہونے لگا۔ حتیٰ کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں صرف پانچ دن میں ہوا
ساری دنیا میں اسی طرح کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ
فاصلہ طے ہونے لگا۔ حمل و نقل کے ان بحری و بری ذرایع کی
ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی میل ملاپ میں ایک اور جدید قوت نے
جس کی ایجاد کا سہرا Galvani Volta
اور Faraday کے سر ہے مزید سہولتیں بہم پہنچائیں
یہ تھی برقی قوت۔ سنہ ۱۸۳۵ء میں برقی تار کا وجود ہوا۔ تہ آب
برقیہ کے تار فرانس اور برطانیہ کے درمیان سنہ ۱۸۵۱ء میں
بچھائے گئے۔ یہ ایجادیں انیسویں صدی کے
لئے بہت ہی انقلابی اہمیت رکھتی تھیں لیکن حقیقت میں یہ
اس بہت بڑی سائینٹیفک ایجادوں کی فصل کے مقابل جو
آئندہ کاٹے جانے والی تھی محض ثمر اولیں تھیں۔ لوہا جس کی
مانگ اسلحہ اور مختلف مشینوں کی تیاری کے لئے بڑھتی جا رہی
تھی سنہ ۱۷۲۸ء میں Blast Furnace
کی ایجاد کے بعد سے بڑی بڑی سلاخوں اور چادروں کی
شکل میں حاصل کیا جا سکا۔ زمانہ قدیم میں فلس کاری کی
غیر موجودگی کی وجہ سے انسان بھاپ کی مخفی طاقتوں سے
فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ معمولی Steam pumping Enjine
لوہے کی چادروں کے بغیر نہیں تیار کیا جا سکتا۔ سنہ ۱۸۶۴ء
میں Bessemer کے قاعدے کی مدد سے لوہا
ہر حالت میں پگھلایا جانے لگا اور اب برقی بھٹیوں میں سیکڑوں
ٹن لوہا پگھلتا اور صاف ہوتا ہے۔ انیسویں صدی کے قبل
کوئی جہاز دو ہزار ٹن سے زیادہ وزن کا نہیں تھا اور اب
پچاس ہزار ٹن کا جہاز کوئی تعجب خیز چیز نہیں۔ یہاں ہم نے
محض لوہے اور فولاد کی فلس کاری کا ذکر مثال کے طور پر
کیا ہے ورنہ یہی حال تانبے سیسے اور متعدد دوسری دھاتوں
کا بھی ہے۔ اس کے ساتھ ہی برقی قوت کو جبلی قوت۔
روشنی اور حرارت میں تبدیل کرنے کی قابلیت تانبے کے
تار کے ذریعے ایک مقام سے دوسرے مقام برق کو
بھیجنے کی سہولتیں پیدا ہوئیں۔

علم کی اس گوناگوں ترقی میں فرانس اور برطانیہ سب سے پیش پیش تھے مگر اب جرمنی بھی اس طرف قدم اٹھانے لگا۔ اس امر کا یہاں ذکر کر دینا ضروری ہے کہ انگلستان کی جامعات ان دنوں یا بانی اثرات کی زد میں آکر علم کو عوام تک پہنچانے سے قاصر تھیں وہ اعلیٰ اور متوسط طبقوں کو بھی محض مذہبی تعلیم دے سکتی تھیں یا زیادہ سے زیادہ یونانی اور لاطینی زبان کے ادبی انتخاب سے وہ بہرہ مند کر سکتی تھیں اسی طرح فرانس میں بھی تعلیم پر چرچ کا رنگ غالب تھا البتہ جرمنی جوان قیود سے نسبتاً جلد آزاد ہو چکا تھا سائنٹفک تحقیقات اور علمی سرگرمیوں کو فرانس اور انگلستان سے پہلے منظر عام پر لا سکا۔ اس کے علاوہ برطانیہ اور فرانس کے سائنس داں کی ان تحقیقات سے اگرچہ کہ یہ دونوں ملک دولت مند ہونے لگے لیکن خود بیچارے موجد کو اپنی ایجاد سے کوئی مالی فائدہ نہیں پہنچا اس کا صلہ اس کے لئے غم غلاطوں ہو گیا۔ اور اس کی کوئی قابل لحاظ ہمت افزائی نہیں کی گئی اس کے برخلاف جرمنی میں بڑے بڑے کارخانوں کے سرمایہ دار مالک سائینٹفک محقق کو نہیں بھولے۔ اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے جرمنی میں سائنس نے وہ ترقی کی کہ کچھ عرصے بعد سائنس کے ہر طالب علم کو جرمنی زبان کا سیکھنا ناگزیر ہو گیا۔ اور جرمنی صنعت و حرفت میں کہیں آگے نکل گیا۔

روم کے قدیم Pluto ancient نظام کا خاتمہ۔ علم و تحقیق کی عام اخوت کا احساس پیدا ہوتا تحقیق و تجسس اور علمی چھان بین کا پردۂ اخفا اور شخصی مفاد کی زنجیروں سے آزاد ہو کر اشاعت، اشتراک عمل اور منفعت عام کی صورت اختیار کرنا یہ تھے وہ چند عناصر جو میکانی انقلاب کے لئے تازیانہ ثابت ہوئے۔ برطانیہ کی British Royal Society اور Florentine Society کا قیام بھی اسی قبیل سے ہے۔

اب برق اور بھاپ کے سوا ایک تیسری شئے کا وجود ہوا یعنی انجن میں پھیلاؤ کی قوت جو بھاپ کے ذریعہ حاصل کی جاتی تھی اب ایک دھماکو آمیزہ سے حاصل کی جانے لگی۔ اس سے جو ہلکے انجن تیار ہوئے یونانی ہوا باز Daedalus کے خواب کو پورا کر دکھایا یعنی انسان کا اڑنا ممکن ہو گیا۔

Smithsonian Institute Washington کے پروفیسر Langsley ۱۸۹۷ء میں ایک چھوٹا اڑنے والا مشین بنانے میں کامیاب ہوئے چند سال بعد Maxim نے کافی بڑا مشین تیار کیا امریکہ کے Wright Brothers کی کوششیں بھی اس سلسلہ میں ابتدائی اہمیت رکھتی تھیں۔ بالآخر ۱۹۰۹ء میں انسان ہوا میں اڑنے لگا۔ انیسویں صدی عیسوی میں لندن Edinburgh کا سفر ایک ہفتے میں طے ہوتا تھا اب اس عرصے میں نصف سے زیادہ دنیا کا سفر ممکن ہے۔ اس کے بعد بے تار برقی اور ریڈیو جیسی ایجادوں نے تو کم از کم کرۂ ارض کے لئے مکان و زمان کے فرق کو ختم ہی کر دیا۔ اگرچہ کہ آئن اسٹائن Einstein کا کہنا ہے کہ جب ہم

Universe کائنات سے بحث کریں تو محض
وقت کہنا غلط ہوگا بلکہ Space Time کہنا چاہئے۔

یہ سارا انقلاب دنیا میں ایک صدی کے اندر اندر
ہوا اور یہ انقلاب قلب ماہیت انسان کے لئے محض نعمت عظمیٰ
بن کر نہیں آیا اس ابر رحمت کے آغوش میں گہر سے
زیادہ بجلیاں تھیں۔ ان ایجادوں کے چمن میں گل سے
زیادہ خار پنہاں تھے۔ اس علم و فن کی روشنی پر صبح قیامت
کا گمان غالب آتا تھا۔ یہ انقلاب بجائے اس کے کہ ساری
دنیا کے انسانوں کو انسانی اخوت کے ایک رشتہ میں
منسلک کر دیتا اور انسان کو citizen of the world
بناتا طمع کو پہلے سے زیادہ تیز اور ہوا و ہوس کو عام کر دیا۔ شعر وڈز
ورتھ سے Goethe میں اور Kipling سے
Neitzsche اور Moltke میں بدل گیا۔
Gibbon نے اپنی کتاب The Decline
and fall of Roman Empire
میں یہ پیشن گوئی کی تھی کہ دنیا پھر کبھی چنگیز خاں اور
Attila جیسے انسان پیدا نہیں کرے گی اور
بربریت دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔
گر واقعات اس کے برخلاف ہیں بلکہ وہ جنگ جو اگلے زمانے میں محض ایک
مقامی نزع ہوتی تھی اب ایک عالمگیر عذاب بن کر ساری نوع انسانی
پر نازل ہوتی ہے۔ پھر موجودہ میکانی فتنہ سامانیاں اس کو بد سے بدتر بنا دیتی
ہیں۔

دنیا سے جنگ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے کی ان
گذشتہ پچیس سالوں میں جو کوششیں ہوئی ہیں وہ سب پر روشن
ہیں اور ان مساعی کی ناکامی بھی ظاہر ہے۔ ہماری
رائے میں جنگ کو صرف ایک ہی طریقے سے ہمیشہ
کے لئے ختم کر دیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ ساری دنیا میں
بہ یک وقت فوجی ہڑتال شروع کی جائے۔
کوئی شخص فوجی خدمت نہ کرے اور ایک
World military boycott
کیا جائے۔ یہ بادی النظر میں ایک Utopia
ضرور معلوم ہوتا ہے لیکن سنہ ۱۹۰۴ء کے سوشل انقلاب
کی کوششوں کے ناکام ہو جانے کے بعد کون کہہ
سکتا تھا کہ روس Russia میں پھر سنہ ۱۹۱۷ء
میں ایک انوکھا نظام یعنی مزدوروں Prolatariat
کی حکومت قائم ہو کر رہے گی۔ جب وہ ممکن ہوگیا تو یہ
تجویز بھی بآسانی روبہ عمل آ سکتی ہے۔

محمد قطب الدین

ہو میں جب تک انگریزوں کا اقتدار ہے اس قسم کا اندیشہ ہی نہیں کیا
جا سکتا لیکن بہت ممکن ہے کہ جرمنی اور اطالیہ اور ذرائع اختیار کر کے
شام میں اپنا عمل دخل حاصل کر لیں اس لئے اس بات کی ضرورت
ہے کہ شام میں ایک منظم اور طاقتور حکومت قائم رہے۔

(ح۔ ص)

اسلامی دنیا

ترکی اور بلقان۔ گو بظاہر اطالیہ۔ جرمنی۔ اور روس کے آمر ایک دوسرے کے حلیف ہیں اور اس طرح انھوں نے اپنا ایک محور بنالیا ہے لیکن اس دوستی کی کسوٹی بلقان ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بلقان پر ان تینوں کی آنکھیں ہیں۔ جرمنی پٹرول اور تیل کے ذخائر کی وجہ سے رومانیہ پر اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے چنانچہ اس نے آئرن گارڈ کا جال رومانیہ میں ایک عرصے سے بچھا رکھا ہے۔ ادھر اطالیہ رومتہ الکبریٰ کا سنہرا خواب دیکھ رہا ہے اور وہ اس خواب کی تعبیر حاصل کرنے کے لئے بلقان پر قبضہ کرنے کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہے تیسری جانب روس بلقان کو اپنے قبضے میں کرنے کی فکر میں ہے اس طرح دول محور کے اراکین بظاہر حلیف لیکن ایک دوسرے کے حریف ہیں اور بلقان کو اپنا مرکز بنا کر آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔

روس نے جرمنی کو راضی کر کے اور ذرا دھمکا کر بسارے بیا اور بکو بنیا حاصل کرلیا۔ ادھر ہنگری نے موقعہ غنیمت جان کر ڈابروجی کا مطالبہ شروع کردیا۔ تیسری طرف ہٹلر نے آئرن گارڈ کی مدد سے شاہ کرول کو تنگ کرنا شروع کردیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ کرول اپنے بیٹے شہزادہ مائیکل کے حق میں دست بردار ہوگئے اور سوئٹزرلینڈ چلے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت رومانیہ میں وزیر اعظم ایم انٹونسکیو کی آمریت ہے۔

یہ آگ اور بھڑک جاتی لیکن اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کا سبب ترکی ہے۔ اطالیہ کی نظریں یونان پر پڑی ہیں دراصل وہ یونان سے کارفو چاہتا ہے اس لئے محض ایک جہاز کو ڈوبنے کو بہانہ بنا کر یونان سے وہ لڑنا چاہتا تھا مگر محض ترکی کی وجہ سے یہ آگ بھی ٹھنڈی پڑ گئی اس لئے کہ چھ ماہ قبل ہی یونان، ترکی اور یوگوسلاویہ وغیرہ کے درمیان معاہدہ طے پاچکا ہے جس کی رو سے یونان کی امداد کا ترکی نے وعدہ کیا تھا۔ چونکہ اطالیہ ترکی سے لڑنا نہیں چاہتا اس لئے اس نے مجبوراً یونان کو اسی کے حال پر چھوڑ دیا۔

روس اور ترکی کی بڑھتی ہوئی دوستی کو دیکھ کر جرمنی رشک و حسد سے جل اٹھا۔ چونکہ اس کی ترکی سے دوستی نہ ہوسکی اس لئے اس نے ایک اور چال چلی اور غلط طور پر یہ پروپگنڈہ کرنا شروع کردیا کہ روس ترکی سے کسی حصے کا مطالبہ کر رہا ہے تاکہ اس طرح روس اور ترکی کے تعلقات کو ناخوشگوار کردے۔ اس غلط پروپگنڈے کی تردید غازی عصمت انونو صدر جمہوریہ نے ایک حالیہ تقریر میں کی۔ انھوں نے صاف طور پر یہ اعلان کردیا کہ اگر ترکی کی داخلی پالیسی اور اقوام عالم کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات اور معاہدات کے معاملات میں دخل اندازی کی گئی تو ترکی اس کا دنداں شکن جواب دے گا۔ اگرچہ کہ غازی موصوف نے اس سلسلہ میں کسی مخصوص قوم یا ملک کا نام نہیں لیا لیکن ارباب بصیرت خوب جانتے ہیں کہ اشارہ کس کی طرف ہے

مصر۔ یاد ہوگا کہ آمر اطالیہ نے اعلان کیا تھا کہ وہ مصر پر حملہ نہیں کریں گے لیکن وہ آمر ہی کیا جو جھوٹ نہ بولے۔ اب اطالیہ کی نیت بدل رہی ہے اس کے تیور سے پتہ چلتا ہے کہ وہ مصر پر حملے کا متمنی ہے۔ اور مصر پر یہ الزام تراشا جارہا ہے کہ چونکہ وہ برطانیہ کے زیر اقتدار ہے اس لئے اطالیہ اسے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ ضیغم اطالیہ کی اسلام دوستی کا اس وقت علم ہوگیا تھا جب وہ البانیہ پر قبضہ کر چکے تھے مگر بہر حال مصر ان حملوں کے لئے تیار ہے۔

حال میں یعنی ۲۶ راگست کو حسن صبری پاشا وزیر اعظم نے چند انتظامی مصلحتوں کے تحت اپنی کابینہ کا استعفا پیش کر دیا لیکن جلالۃ الملک شاہ فاروق نے استعفیٰ قبول کرنے کے بعد انھیں حکم دیا کہ وہ نئی کابینہ تشکیل دیں۔ چنانچہ نئی کابینہ تشکیل پا چکی ہے اور امید ہے کہ مصر کو اطالوی خطرے سے بچانے کے لئے یہ کابینہ اپنی پوری کوشش صرف کر دے گی۔ اور یقینی ہے کہ اگر اطالیہ مصر پر حملہ کر دے تو مصر اور برطانیہ باہم متحد ہو جائیں گے چنانچہ اسی سلسلہ میں مصری متحرک ڈویزن حربی اہمیت کے مقامات پر پہنچ چکی ہے اطالیہ نے مصر سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی ہے چنانچہ اسکندریہ اور نہر سوئیز پر اس کے ہلکے ہلکے حملے ہو رہے ہیں۔ لیکن مصری افواج اس کا دنداں شکن جواب دے رہی ہیں بہر حال میثاق سعد آباد کی وجہ سے بھی مصر بہت زیادہ محفوظ ہے اور مصر پر حملہ کرنا گویا ایک سوتے ہوئے فتنے کو جگانا ہے۔

شام ۔ فرانس کے جرمنی اور اطالیہ کے روبرو سر تسلیم خم کر دینے کے بعد شام اپنی آزادی کے لئے پوری پوری کوشش کر رہا ہے عوام کے رجحانات زیادہ تر ترکی کی طرف ہیں۔ چنانچہ ترکی کی حمایت میں ڈاکٹر جیلانی کی قیادت میں دمشق کے بازاروں میں زبردست مظاہرے کئے گئے۔ اور نعرے لگائے گئے کہ "شام پر فرانس کا انتداب ختم ہو گیا۔ آج سے شام آزاد ہے۔ شام کو ترکی حفاظت میں دے دیا جائے۔"

اس کے علاوہ فرانسیسی فوج کے بہت سے عرب سپاہی شام کی حدود کو پار کر کے فلسطین میں داخل ہو گئے ہیں اور آئندہ چند ہفتوں کے اندر شام میں زبردست بغاوت کا امکان ہے۔

جو لوگ شام کی بیس برس کی تاریخ اور اس کی ابتدائی حیثیت سے واقف ہیں وہ شامیوں کے اس اعلان کو کہ "اب فرانسیسی انتداب ختم ہو گیا" اور "شام آزاد ہے" غلط نہیں سمجھ سکتے۔

شام کو جنگ عظمیٰ کے بعد مجلس اقوام نے فرانسیسی جمہوری حکومت کے انتداب میں دے دیا اور انتداب یاب دول نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ان کو بتدریج آزادی دے دی جائے گی۔ شام نے شروع ہی سے یہ دعویٰ کیا کہ اس میں صلاحیت آزادی موجود ہے ان نے ابتدا ہی میں اپنی صلاحیت کے مظاہرے کے لئے فرانس کی استبدادی حکومت کے خلاف ہتھیار اٹھائے اور جتنی بڑی قربانیاں اس نے اپنی آزادی کی خاطر برداشت کیں ان سے دنیا واقف ہے۔ فرانسیسی حکومت اپنی طاقت کے بل بوتے پر شام کی اس تحریک آزادی کو دبانے میں کامیاب ہوتی رہی مگر اس مطالبۂ آزادی کا گلا اپنی آخری سانس تک بھی نہ گھونٹ سکی اس نے اپنے اچانک بستر مرگ پر پڑ جانے سے قبل کئی بار وہاں کے دستور میں تبدیلیاں کیں اور اپنی موت سے کچھ ہی پہلے اس نے اس کو عراق کا مرتبہ دینے کا حتمی وعدہ کیا تھا۔ لیکن آج فرانس کا تختہ الٹ گیا ہے، خود مجلس اقوام درہم برہم ہو گئی اور اس کے کئی اراکین جرمنی کے آہنی پنجے میں پھنس کر دم توڑ چکے ہیں جب یہ حالت ہے کہ نہ انتداب دینے والی مجلس اقوام باقی ہے اور نہ وہ فرانسیسی حکومت جس کو انتداب دیا گیا تھا تو پھر شام کا یہ اعلان کہ "اب وہ آزاد ہے" آئینی طور پر غلط نہیں ہو سکتا۔

جرمن عارضی صلح کے کمیشن کے ایک نمائندے کو عنقریب شام روانہ کیا جا رہا ہے تاکہ اطالوی عارضی صلح کے مطالبات کی تائید کرے۔ بظاہر یہ کمیشن اطالوی قیدیوں کو رہائی دلانے اور فوجی ساز و سامان کی فہرست مرتب کرنے کے لئے تشکیل دیا گیا ہے لیکن اس کا اصلی مقصد شام کو اطالوی مفادات کے ناقابل بنانا ہے اس سلسلہ میں معلوم ہوا ہے کہ کمیشن شام سے تمام سامان حرب۔ آئیل ٹینک سے لے کر ہوائی جہاز اور مسلح موٹروں کو منتقل کر دے گا۔ لیکن شام کے باشندے ہر قوت کے مقابلے کے لئے تیار ہیں۔

افغانستان۔ افغانستان موجودہ جنگ میں اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر چکا تھا۔ حال ہی میں افغانی پارلیمان کی چوتھی میقات کا افتتاح کرتے ہوئے جلالۃ الملک ظاہر شاہ نے فرمایا کہ "موجودہ جنگ کے آغاز سے ہی افغانستان نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا تھا جس پر وہ اب تک قائم ہے۔ حالانکہ جنگ میں شامل ہونے والے ممالک سے اس کے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات ہیں۔ افغانستان کی ہمیشہ سے یہی خواہش رہی ہے کہ اپنے قومی مفاد کی حفاظت کی جائے" ملک ن کو دور کرنے اور ملک کو خوش حال بنانے کی اسکیموں کا ذکر کرنے کے بعد آپ نے دنیا میں امن و امان کے قیام کے لئے دعا فرمائی۔ میثاق سعد آباد کے بعد ترکی اور افغانستان کے تعلقات نہایت ہی دوستانہ ہو گئے ہیں۔ حال ہی میں سفیر افغانستان نے ایک ملاقات کے دوران میں ایک صحافتی نامہ نگار سے کہا کہ افغانستان کی عسکری قوت میں اضافہ کرنے کے لئے ترکی پوری پوری کوشش کر رہا ہے چنانچہ اس وقت بھی کابل میں ایک ترکی عسکری مشن موجود ہے جو افغانی فوج کو موجودہ طریقہ ہائے جنگ کی تربیت دے رہا ہے ایران، ترکی اور افغانستان کا یہ اتحاد قریب میں عالم اسلام کے لئے ایک اچھے مستقبل کا پتہ دے رہا ہے۔

ایران۔ تیل کے چشموں کی خداداد دولت سے مالا مال ہونے کی وجہ سے ایران روس کی عقابی نظروں کا ایک عرصے سے شکار بنا ہوا ہے لیکن ایران کے برطانیہ کے ساتھ تیل کے چشموں کے سلسلے میں معاہدات طے ہو چکے ہیں۔ تجارتی معاہدے کی رو سے ایرانی، برطانوی اسپشل کمپنی دونوں حکومتوں کی مشترکہ ملک ہے اور برطانیہ اس میں چالیس فیصدی حصے کا مالک ہے گو رسمی طور پر افغانستان اور ایران غیر جانبدار ہیں لیکن درحقیقت وہ برطانیہ ہی سے وابستہ ہیں جب سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ خلیج فارس، عراق اور ایران اور ہندوستان میں پٹرول کے ذخائر برآمد ہوئے ہیں نازیوں اور فاشسٹیوں کے لائحہ عمل میں تبدیلی ہو گئی ہے چنانچہ مشرق وسطی اور مشرق قریب پر ان ممالک کی نظریں پڑ رہی ہیں لیکن دول سعد آباد پر ہاتھ ڈالنا آسان کام نہیں ہے۔

عرب و فلسطین۔ عرب آمریت سے متنفر ہونے کی وجہ سے اتحادیوں کا ابتدا ہی سے ساتھ دیتے آئے ہیں۔ گو بظاہر برلن نشرگاہ نے عربوں کو برطانیہ کے خلاف بھڑکانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی لیکن عرب اس کے پھندے میں نہ آ سکے۔ دوسری طرف اطالیہ نے بار بار یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ وہ عربوں کا حلیف ہے لیکن عربوں کے سامنے البانیہ کی مثال ہے اور وہ اطالیہ کی اسلام دوستی سے خوب واقف ہو چکے ہیں۔

اب یہ خبریں آ رہی ہیں کہ اطالیہ نے فلسطین اور

مصر پر حملہ شروع کر دیا ہے۔ اس خبر نے تمام عربوں میں آمریت کے خلاف منافرت کی آگ بھڑکا دی ہے۔ اس لئے امید ہے کہ اطالیہ کو اس حرکت کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اس مرتبہ عازمین حج پریشان تھے کہ کہیں موجودہ جنگ انھیں اپنے فرض کی تکمیل سے روک نہ دے لیکن حکومت حجاز نے اعلان کر دیا ہے کہ اس سال حسب معمول حج ہوگا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مکہ معظمہ کو جانے والی خشکی اور سمندر کی راہیں جو بحیرۂ احمر کی بندرگاہ جدہ سے گذرتی ہیں حاجیوں کے لئے محفوظ ہیں۔ سعودی حکومت ارض مقدس کو جانے والے حاجیوں کی ممکنہ امداد کرے گی۔

محمد جلال الدین جعفر

حالات حاضرہ

جنرل دوگال اور فرانس جنرل دوگال ایک ہوشیار سپاہی ہیں لیکن ان کی شہرت محض سپاہیانہ قابلیت پر مبنی نہیں بلکہ وہ اس وجہ سے زیادہ مشہور ہوسے کہ انھوں نے امن کے بیس سال تک فرانس کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کے آلات حرب پرانے ہوگئے ہیں اور کسی دشمن کے مقابلے کے لئے نئے نئے آلات کی ضرورت ہے۔ ان کی کتاب "فوجی مصلحت کے خلاف" Vers L' Armee de Metier جو سنہ ۱۹۳۴ء میں چھپی تھی فرانس کو اس کی گہری نیند سے جگانے کے لئے کافی تھی لیکن اس پر کسی نے توجہ نہیں کی۔ البتہ ایم۔ رینا ڈہی ایک ایسے شخص تھے جنھوں نے اس کتاب کے مطلب کو سمجھا چنانچہ انھوں نے سنہ ۳۵ء میں "فرانس کے فوجی مسائل" Le probleme Militaire Francais کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس کے ذریعہ فرانس کو آنے والے خطرے سے جگانے کی کوشش کی۔ انھوں نے پیشین گوئی کی کہ بلجیم پر حملہ ہو جائے گا اور یہ کہ بلجیم کی طرف سے دشمن کے حملے کا قوی اندیشہ ہے لیکن ان کی آواز صحرا میں گم ہو کر رہ گئی۔ فرانس نے فشر پنولین اور اپنی شہری فوج پر پورا بھروسہ کیا اور اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ لیکن اس کے باوجود جنرل دوگال اپنی قوم کو جگانے کی برابر کوشش کرتے رہے گو انھیں اندیشہ تھا کہ ان کی قوم بہت دیر کے بعد ان کا مطلب سمجھ سکے گی۔

بالآخر جب فرانس ہار گیا اور پیتاں کی حکومت نے نازیوں کی غلامی اختیار کرلی تو جنرل دوگال جو آج کل لندن میں ہیں میدان میں کود پڑے انھوں نے آزاد فرانسیسوں کو اپنے ساتھ اکٹھا کیا اور انگریزوں کے دوش بدوش دشمن کے مقابلے کے لئے ڈٹ گئے۔ ۱۸ر جون سنہ ۴۰ء کو انھوں نے اپنی ایک نشری تقریر میں کہا تھا "گرچہ بعض فرانسیسی جنرل جرمنی دبابوں طیاروں اور بمبکنڈوں کے سامنے ہمت ہار چکے ہیں لیکن ابھی فرانس ختم نہیں ہوا۔ میں تمام فرانسیسی افسروں اور ان لوگوں کو جو برطانوی علاقوں میں موجود ہیں، اس امر کی دعوت دیتا ہوں کہ ہمارے ساتھ اشتراک عمل کریں"۔ اسی کے چھ دن بعد "فرانسیسی قومی کمیٹی" تشکیل پاگئی اور جنرل دوگال نے اس کے مقاصد بیان کئے اور اعلان کیا کہ وہ فتح حاصل ہونے تک انگریزوں کا ساتھ دیں گے۔ چند روز بعد برطانوی حکومت نے دوگال کو تمام آزاد فرانسیسوں کا رہنما تسلیم کرلیا اور جنرل دوگال نے بھی یہ تہیہ کرلیا کہ سلطنت برطانیہ میں جتنے فرانسیسی رہتے ہیں یا وہ جو بعد کو آکر شامل ہو جائیں، ان سب کی صحیح قیادت کریں گے چنانچہ ۸ر جولائی سے اولمپیا میں "آزاد فرانسیسوں" کی بھرتی شروع ہوگئی اور ایسے لوگ جو برطانیہ کے ساتھ اشتراک کرنے پر آمادہ تھے ایک ہی جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ جنرل دوگال نے اپنی ایک تقریر میں کہا "ہمیں یقین ہے کہ وہی ہتیار جن کی وجہ سے پہلے دن دشمن کو کامیابی ہوئی، آئندہ ہماری کامیابی کے ضامن ہوں گے۔

اس نے چھ ہزار دبابوں اور چھ ہزار طیاروں سے ہم کو شکست دی تھی اب ایک دن ایسا آئے گا کہ ۲۰ ہزار دبابے اور ۲۰ ہزار طیارے اسے تباہ کر کے چھوڑیں گے۔"

رومانیہ کا حشر۔ پچھلے چند روز سے رومانیہ نے جرمنی کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھانے کی کوشش کی اور اس کے لئے رومانیہ کو بہت سی قربانیاں بھی کرنی پڑیں چنانچہ اسے روس کو اپنا کچھ علاقہ دینا پڑا لیکن جرمنی کی یہ دوستی رومانیہ کے کام نہ آئی۔ وہ مصیبتوں کے جال میں پھنس گیا۔ بسارابیا اور بکوینا کھو دینے کے بعد بھی اسے چین نہ مل سکا اور اب ہنگری اور بلغاریہ نے اپنے مطالبات آگے بڑھانے شروع کر دئے۔ رومانیہ کے وزیر دوڑے ہوئے برلن گئے کہ شاید اس نئے دوست سے کچھ کام بن سکے لیکن وہاں انھیں مایوسی ہوئی اور ان سے یہی کہا گیا کہ رومانیہ کو بلقان کے امن کے لئے ضروری قربانی کرنی چاہیئے۔ ادھر ہنگری اور بلغاریہ نے ٹران سلوے نیا اور دوبروجہ کے مطالبے میں سختی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند روز بعد رومانیہ کو بلغاریہ کی مانگیں پوری کرنی پڑیں اور تھوڑی سی کشمکش کے بعد ہنگری کو بھی مطمئن کرنا پڑا۔ یعنی ۳۰ اگست کو ویانا میں ایک راضی نامہ پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے رومانیہ اور ہنگری کی سرحدوں کا تعین ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ رومانیہ اور ہنگری کی جرمن اقلیتوں کا مسئلہ بھی طے پایا۔ لیکن رومانیہ میں جو کچھ ہوا وہ صرف یہی نہیں تھا کہ بہت سے علاقے اس کے ہاتھ سے نکل گئے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ رومانیہ کی حکومت بدل گئی اور جنرل انطونسکو نئے وزیر اعظم بنے یہاں تک کہ خود شاہ کیرول کو تخت سے دستبردار ہونا پڑا۔ ان کی جگہ کیرول کے بیٹے مائیکل کو بٹھا دیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اتنی قربانیوں کے بعد رومانیہ نے بلقان کا امن خریدا اور بلقان کا ایک نیا اٹھتا ہوا فتنہ دب گیا لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس عارضی امن کے لئے رومانیہ نے بہت بڑی قیمت ادا کی۔ مگر شاید اسے ایسا کرنا ہی چاہیئے تھا کیونکہ وہ کمزور تھا اور کمزوروں کو محفوظ اور امن کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے اس قسم کی قربانیاں کرنی ہی پڑتی ہیں۔

بلجیم کے متعلق نازی ارادے۔ وسط یورپ میں نازی جس قسم کا پروپگنڈہ کر رہے ہیں اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ بلجیم کے وجود کو بالکل ہی ختم کر دینا چاہتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بلجیم کی آزادانہ حیثیت باقی نہیں رہے گی۔ اسے ایک ماتحت ریاست بنا لیا جائے گا اور اس طرح برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ایک واصل سلطنت قائم کر دی جائے گی۔ اس کے لئے غالباً ریاست فلانڈرس کی نئی تعمیر کی جائے گی جس میں بلجیم فرانس اور ہالینڈ کے علاقے لئے جائیں گے۔ . . . .

. . . . یہ خیال بلجیم والوں کا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ نازیوں کو اپنی کامیابی کا یقین نہیں رہا اور اسی لئے وہ برطانیہ اور جرمنی کے درمیان ایک واصل سلطنت . . . . . کو قیام کی فکر میں ہیں۔

شام اور برطانیہ۔ شام میں اس کا قدیم نظم و نسق برابر قائم ہے اور ایک بڑی منظم فوج اس کی حفاظت کے لئے تیار ہے چند روز سے یہ خبر مشہور ہو رہی ہے کہ برطانیہ شام کو تقسیم کر کے اسے اپنے اور ترکی کے درمیان بانٹ لینا چاہتا ہے لیکن یہ محض دشمن کا پروپگنڈا ہے۔ اس کے ساتھ یہ خبر بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ شاہی ہوائیہ نے باکو کے تیل کے چشموں پر حملے کی کوشش کی۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ برطانیہ روس کے ساتھ اچھے تعلقات قائم کرنا چاہتا ہے یہ خبر بالکل خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے چنانچہ ترکی کے حالیہ سرکاری بیان سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اس قسم کی تمام جھوٹی خبریں ترکی اور روس کے درمیان بگاڑ پیدا کرنے کی غرض سے پھیلائی گئی ہیں اور ان کی حیثیت جھوٹے پروپگنڈے سے زیادہ نہیں برطانیہ اصل میں یہ چاہتا ہے کہ شام پر دشمن کا ہاتھ نہ پڑ سکے بشرقی بحر روم ۲۲

باقی صفحہ (۵۹) پر دیکھئے۔

بچوں سے

اس سے تو آپ سب واقف ہیں کہ گزشتہ ماہ ادارہ کے امتحانات نہ صرف حیدرآباد میں بلکہ اکثر اضلاع میں بھی ہوئے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ پہلا امتحان تھا تاہم بہت سے امیدوار اس میں شریک ہوئے اور متعدد کامیاب بھی ہوگئے چنانچہ اردو فاضل کے امتحان میں (۱۱) امیدوار شریک تھے جن میں سے (۶) کامیاب ہوئے۔ اردو عالم میں (۶۸) شریک رہے اور (۴۴) کامیاب ہوئے جن میں سے (۳) امیدواروں نے بدرجۂ اول کامیابی حاصل کی۔ خوش نویسی کے امتحان میں (۹) شریک رہے اور (۵) کامیاب ہوئے ایک بدرجۂ اول۔ اردو دانی کے امتحان میں (۱۳۵) شریک تھے اور (۱۲۹) کامیاب ہوئے اور (۱۵) امیدواروں نے بدرجۂ امتیاز کامیابی حاصل کی۔

معین الدین احمد انصاری

آتش بازی

آہا آیا ماہِ شعباں
چھٹے پٹاخے دھڑ دھڑ دھن دھاں

پھٹا وہ دھن دھن ہوا پٹ پٹ
سر سر، سو سو پھس پھس چٹ چٹ

کہیں ہے گڈی کہیں ہیں پھریاں
کہیں پٹاخے کہیں ہیں لڑیاں

مرچی، بچھو، سانپ، بگولا
میں نے کیا کیا نہیں ہے مولا

تن من دھن میں آگ لگی ہے
سوکن سوکن جل کے مری ہے

انار اڑا لونڈی کنارے
پیچھے بھاگے چاند ستارے

اوہو دیکھو رنگ جھڑی میں!
قوس قزح سے بڑھ کر رنگ ہیں

سپیاری پر وارے نیارے
چودھویں شب کے سب مہ پارے

یہ ہے تار پلاٹینم کا
آگ لگاتے ہی بس چمکا

ہیچ ہیں اس کے آگے سارے
اللہ میاں کی بجلی کے دھارے

جو نہی جلائی دیا سلائی
موذی سب کے عیب بتائی

چھی چھی تم کو ناک نہیں ہے
ناک نہیں ہے ناک نہیں ہے

خوب ہے تیری کرشمہ سازی
واہ رے میری آتش بازی

توپ، تفنگچہ، بندوق اور بم
غرض کہ کوئی چیز نہ تھی کم

شب بھر خوب رہا یہ رنگ ڈھنگ
جیسے یورپ، جرمن کی جنگ

مسیح الدین خاں متین

ادب

ادب کے معنی ہیں نیک اطوار۔ ہر چیز کے اندازے کا خیال اور ہر شخص کے مرتبہ کا لحاظ رکھنا جو شخص جس لیاقت و دانائی کا ہو، اس کے ساتھ اسی طرح پیش آنا۔ مجمع عام میں بزرگوں کی تعظیم و تکریم کرنا وغیرہ۔ یہ سب چیزیں ادب میں داخل ہیں۔ کسی دانا کا قول ہے کہ۔

"باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔"

باادب ہمیشہ خوش و خرم رہتا ہے۔ سب لوگ اس کے مداح اور طرف دار، جملہ خویش و اقارب اس سے خوش اور راضی، غرض سب اس کے مددگار رہتے ہیں۔

یوں تو ہر انسان میں ادب کا ہونا بہت اچھا ہے مگر بچوں میں خاص کر اس کی بے حد ضرورت ہے۔ وہ ادب ہی کی بدولت کمال حاصل کر سکتے ہیں اور سب کی نظروں میں عزیز رہتے ہیں۔ اگر ان کی طبیعت میں یہ نیک خو داخل ہوگئی اور پائدار ہوگئی تو تمام عمر ان کے کام آتی ہے۔

باادب بچوں پر استاد دل و جان سے مہربان رہتے ہیں اور ان کو شوق اور دلچسپی سے پڑھاتے ہیں۔ اور والدین بھی محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

بے ادب اور گستاخ بچوں سے غیر تو غیر والدین تک نفرت کرتے ہیں۔ اور اکثر اوقات گھر سے بھی نکال دیتے ہیں۔ بے ادب کا کوئی دوست نہیں ہوتا۔ نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔

آج کل کے لڑکوں اور اکثر لڑکیوں نے گستاخی اور بے ادبی کو آزادی سمجھ رکھا ہے۔ بزرگوں کے سامنے بے باکانہ اور گستاخانہ گفتگو کرتے ہیں۔ گویا خود کو عقلمند اور ان کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ اور اپنے کئے پر فخر بھی کرتے ہیں۔

آج کل کے نوجوان طالب علم ایسے ہیں کہ جہاں انھوں نے چار کتابیں انگریزی کی پڑھ لیں اور کچھ ادہر ادہر کی کتابیں دیکھ ڈالیں، بس حکیم دانا ہو گئے۔ بزرگوں کی باتوں سے انکار، مذہبی مسائل پر اعتراض، بات بات میں حجت اور تکرار کرنے لگتے ہیں۔ مگر جب ان سے بحث کی جاتی ہے اور دلیل مانگی جاتی ہے۔ تو وہ منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ بعض اپنی غلطی کو تسلیم کر لیتے ہیں اور بعض تو ایسے جہل مرکب میں گرفتار ہوتے ہیں کہ باوجود کچھ نہیں جاننے کے اپنے کو سب کچھ اور ہمہ داں خیال کرتے ہیں۔ اور "ہمچو من دیگرے نیست" کے خیال میں تباہ ہوئے جاتے ہیں۔ یہ کوتاہ بیں جس کو آزادی سمجھتے ہیں۔ وہ آزادی نہیں بلکہ جہالت ہے۔ آزادی کی نیک عادت کا تقاضا اور شرط یہی ہے کہ چھوٹے بزرگوں کا ادب کریں۔ اگر

بڑوں کی بات کا جواب دینا بھی ہو تو نہایت نرمی اور بردباری سے ان کی بزرگی کا خیال رکھ کر دیں۔ کیونکہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بزرگوں کے سامنے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔

معصومہ بیگم

کاہلی کی لعنت

عزیز بچو! یوں تو دنیا میں سیکڑوں بری چیزیں ہیں لیکن جو چیز ہماری ساری زندگی کو تباہ و برباد کر دیتی ہے وہ کاہلی ہے۔ اگر یہ بری بلا بچپن ہی سے ہمارے سر ہو جائے تو پھر اس سے چھٹکارا بہت مشکل ہے۔ (the child is the father of the man) انگریزی کی پرانی مثل ہے یعنی جو عادتیں بچپن ہی سے ہماری طبیعت میں پیدا ہو جاتی ہیں وہ بڑے ہونے کے بعد بھی باقی رہتی ہیں۔ اس لئے اگر بچپن ہی سے اچھی باتوں کی عادت کریں تو زندگی کامیابی کے ساتھ بسر ہو سکتی ہے۔ جو لوگ اچھی اور بری باتوں میں تمیز نہیں کرتے وہ دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔

کاہلی کا دوسرا نام موت ہے اور کاہل آدمی ہمیشہ زندہ درگور رہتا ہے۔ کھوئی ہوئی دولت محنت سے دوبارہ جمع ہو سکتی ہے، صحت کی خرابی اعتدال اور پرہیز سے دور ہو سکتی ہے، بھولا ہوا سبق یاد کرنے سے تازہ ہو سکتا ہے لیکن کیا کسی نے کھوئے ہوئے وقت کو پایا اور ضائع کئے ہوئے موقعوں کو پھر حاصل کیا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ کاہل آدمی کی مثال ایک ایسی گھڑی کی سی ہے جو چل تو رہی ہے مگر اس کی سوئیاں غائب ہیں اور اس طرح اس کا چلنا اور نہ چلنا دونوں برابر ہیں۔ کاہل آدمی ایک ایسے راستے پر چلتا ہے جو تباہی کی طرف لے جاتا ہے اور جس پر ٹھیرنے کے لئے بہت کم مقامات ملتے ہیں۔ یہ سمجھو کہ وہ سڑک نہیں بلکہ ایک ڈھلوان چٹان ہے جس پر سے پھسل کر گرنا یقینی ہے۔ جگنو کو تم نے کئی بار دیکھا ہوگا لیکن کبھی یہ بھی غور کیا کہ وہ اپنی پوری چمک کب دکھاتا ہے۔ جب وہ ہوا میں اڑتا ہے تو اسی وقت اپنی پوری چمک دکھاتا ہے اور تم اس کو پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے پیچھے دوڑتے ہو۔ اور جب وہ کسی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے تو اس کی چمک میں کمی پیدا ہو جاتی ہے یہی حال انسان کے دماغ کا بھی ہے۔ جب انسان اپنے دماغ سے کام نہیں لیتا ہے تو اس پر ایک قسم کی تاریکی چھا جاتی ہے۔

کاہل آدمی میں دنیا بھر کی برائیاں جمع ہو جاتی ہیں اور یہ مقولہ بالکل سچ ہے کہ کاہل دماغ

شیطان کی فیکٹری ہے جہاں سے ہر قسم کی برائیاں ڈھل کر باہر نکلتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس طرح شیطان دوسروں کو بھٹکاتا ہے کاہل آدمی شیطان کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ گوئٹے کہتا ہے کہ فطرت کبھی آرام نہیں لیتی اور ہر بیکاری پر لعنت بھیجتی ہے۔ بیکاری کے سبب جتنی برائیاں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور کسی چیز سے نہیں ہوتیں۔

فرانس کے قیدخانہ میں ایک قیدی کے سیدھے بازو پر یہ الفاظ گودے ہوئے تھے کہ ماضی نے مجھے دھوکا دیا، حال مجھے ستا رہا ہے اور مستقبل ڈرا رہا ہے۔ بیکاری ایک ایسا جادو ہے جس سے جیل خانوں کے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں کہا جاتا ہے کہ کسی شہر کے ۹۰ فیصدی قیدیوں نے بیکاری کے سبب قیدخانہ کی صورت دیکھی۔ جب سرہورلیس ویرے سے اس کے بھائی کی موت کا سبب دریافت کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ بیکاری نے اسے موت کے گھاٹ اتارا۔ ایک دفعہ ایک کاہل آدمی نے شکایت کی کہ اس کے بال بچوں کی پرورش کے لئے اسے کہیں بھی روزی نہ مل سکی۔ یہ سن کر ایک ایمان دار اور محنتی مزدور نے جواب دیا کہ روزی حاصل کرنے کے لئے کام کرنا پڑتا ہے۔ جس طرح ایک ٹیڑھا پودا بڑا ہوکر ٹیڑھا درخت ہی رہتا ہے اسی طرح ایک کاہل بچہ آگے چل کر کاہل آدمی بن جاتا ہے۔ کاہلی جب لوگوں میں پھیلتی ہے تو اس کی ابتداء مکڑی کے جالے کی طرح بودی ہوتی ہے لیکن اس کی انتہا لوہے کی زنجیروں سے بھی زیادہ سخت ہو جاتی ہے۔ اگر اس وقت ہم کچھ بھی نہیں ہیں تو پھر بھی ہم کو کچھ بننے کی کوشش کرنی چاہیے۔

سستی اور کاہلی اس قدر آہستہ پھیلتی ہے کہ ہم کو خبر تک نہیں ہونے پاتی اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم مصیبتوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور افلاس اچانک ہم پر چھا جاتا ہے۔ کاہل بننا گویا مفلس بننا ہے۔ آرام انہی لوگوں کو خوش گوار اور بھلا معلوم ہوتا ہے جنھوں نے محنت کے بعد اسے حاصل کیا ہے۔ یہی آرام ان لوگوں کے لئے مصیبت کا پہاڑ بن جاتا ہے جنھوں نے اس کو بغیر محنت اور کوشش کے حاصل کیا ہو۔

کاہلی سوسائٹی کا سب سے بڑا جرم ہے۔ کسی زمانے میں انگلستان میں بیکار رہنے والوں کو عمر بھر سزائے قید بھگتنی پڑتی تھی۔ جو شخص بیکار رہتا تھا اس کے کوڑے لگائے جاتے تھے۔ اگر دوسری دفعہ بھی وہ بیکار پایا جاتا تو اس کا کان کاٹ ڈالتے اور اگر اس پر بھی نہ مانتے تو جیل خانے بھیج دیا جاتا جہاں اس سے سخت سے سخت کام لئے جاتے۔

ایک مالدار نوجوان نے اپنی کالج کی زندگی ختم کرنے کے بعد تمام دنیا کا سفر کیا اور جب گھر لوٹا تو بیکاری میں اس کے دن کٹنے لگے۔ یہاں تک کہ اس کی زندگی دوبھر ہو گئی۔ بیکاری

تنگ آکر اس نے اپنے ایک دوست سے خودکشی کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کا دوست کسی کارخانے کا مالک تھا اس کو اپنے کارخانے میں لے گیا۔ کارخانے کے مزدوروں نے اپنے مالک کا اشارہ پاکر اس کو پکڑ لیا اور اپنے ساتھ کام پر لگا دیا یہاں تک کہ وہ پسینہ پسینہ ہوگیا۔ جب مزدوروں نے اپنا کام ختم کیا اور کھانے پر بیٹھے تو وہ نوجوان بھی ان غریبوں کے ساتھ کھانے میں شریک ہوگیا۔ اور اس معمولی کھانے میں جو لذت اسے ملی وہ مزے مزے کے کھانوں میں بھی نہ ملی تھی۔ آرام کے یہ چند لمحے جو محنت کے بعد نصیب ہوئے تھے اس بیکاری کی زندگی سے بدرجہا بہتر تھے۔ اس کی یہ چال کارگر ہوگئی اور اس نوجوان نے اپنی مصروفیت کے لئے نئے نئے کام تلاش کر لئے جس کی وجہ سے اس کی زندگی مفید کاموں اور آرام و آسایش میں بسر ہونے لگی۔ (ماخوذ)

خواجہ حمید الدین

نیند تمھاری

کیسی بھولی کیسی پیاری
جس دم چاہو اس کو بلا لو
سونے والوں کی ہے راحت
ہردم رہتی ہے بے چاری
اس سے اپنا دل بہلاؤ
سچ بولو یہ جادو گرنی
کر دیتی بے ہوش وہ کیسے؟
جب یہ آنے والی ہوتی
آنکھوں میں وہ پھرتی رہتی
ایک غشی سی ہوتی طاری
کیسے کیسے رنگ وہ لاتی

کیسی یہ ہے نیند تمھاری
جس دم روٹھے اس کو منالو
اس کی تم پر ہے یہ عنایت
دکھ ہو تم کو یا بیماری
اس کو آنکھوں میں بٹھلاؤ
تم پر کیسا جادو کرتی
لاتی ہے وہ ہوش میں کیسے؟
آنکھوں میں کچھ لالی ہوتی
پلکوں میں وہ چھپتی رہتی
یہ ہے گویا نیند تمھاری
کیسے کیسے رنگ دکھاتی

اس کے آگے سب ہیں برابر
آقا ہو وہ ہو یا نوکر

محمد باقر
(اورنگ آباد)

سنگِ مرمر

سنگ مرمر ایک خاص قسم کے سفید پتھر کو کہتے ہیں جس سے آرائش کی مختلف چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ مجسمے یعنی پتلے تراشے جاتے ہیں اور اعلیٰ درجہ کے مکانوں میں اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ بہت نرم اور نازک پتھر ہوتا ہے۔ اس لئے اس میں تصویریں کھودنے اور اس کے مجسمے بنانے میں سہولت ہوتی ہے۔ مرمر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض مقامات پر ہلکے اور گہرے کالے رنگ کے پتھر بھی پائے جاتے ہیں۔ ڈیون اور ڈربی شائیر قسم کے سنگ مرمر پر دھاریاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ دھاریاں ان مقامات کی مٹی کے اثر کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جہاں سے وہ نکالا جاتا ہے۔ سفید قسم کے سنگ مرمر کو کرارا کی کانوں سے نکالا جاتا ہے۔ کرارا اٹلی کا ایک شہر ہے جو اس کے مغربی ساحل پر واقع ہے۔ یہاں کا سنگ مرمر اپنی نفاست اور عمدگی کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ تمام دنیا کے مجسمے بنانے والے زیادہ تر یہیں کا سنگِ مرمر استعمال کرتے ہیں۔ اسی مقام کی بعض کانوں میں کالا اور زرد رنگ کا سنگ مرمر بھی ملتا ہے۔ جس سے آرائش کی چیزیں بنائی جاتی ہیں ایک اور قسم کا سنگ مرمر بھی ہے جسے سنگ سلیمانی کہتے ہیں۔ یہ پتھر الجیریا، میکسیکو اور جنوبی امرکیہ میں نکالا جاتا ہے۔ اس پتھر میں مختلف رنگ کی تہیں ہوتی ہیں۔ ایک تہہ تو دودھ جیسی سفید ہوتی ہے اور دوسری زمین سے لگ کر کالی یا رنگین ہوتی ہے۔ لوگ اس دھاری دار پتھر کو بھی مکانات وغیرہ کو سجانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور نقاش اس پر تصویریں کھودتے ہیں۔ اس کی سفید، سیاہ اور رنگین دھاریاں چہرے اور لباس وغیرہ کے ابھار اور رنگ کو نمایاں کرنے اور تصویر کو کہیں گہری اور کہیں پھیکی دکھانے میں بڑی مدد دیتی ہیں۔ یہ آئرلینڈ، اٹلی اور یونان میں ملتا ہے۔

ہماری ریاست حیدرآباد میں بھی اچھی قسم کے سنگ مرمر کی کانیں پائی جاتی ہیں ان سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہماری حکومت نے حال ہی میں پچاس ہزار روپیوں کی امداد منظور کی ہے ماہرین کی امداد سے اس کی بڑی بڑی چادریں نکالی جانے لگی ہیں۔ اگرچہ اس کام کو بڑے پیمانے پر شروع کئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن پھر بھی باہر سے اس کے آرڈر وصول ہونے لگے ہیں۔

پیارے بچو! ہمارے ملک ہندوستان میں دنیا کی سات مشہور عمارتوں میں سے ایک عمارت تاج محل ہے۔ اس کا نام تو تم نے ضرور سنا ہوگا۔

یہ عمارت دیکھنے کے قابل ہے۔ اس لئے کہ اس میں سنگ مرمر استعمال کیا گیا ہے۔ چاندنی میں جب اس سفید عمارت پر چاند کی کرنیں پڑتی ہیں تو بہت بھلا معلوم ہوتا ہے اور سنگ مرمر کی خوبصورتی اور عمدگی پورے بہار پر نظر آتی ہے۔

اکثر مندروں، درگاہوں اور مسجدوں میں بھی مرمر مختلف طریقوں سے استعمال کیا جاتا ہے۔ مندروں میں سیڑھیاں بنائی جاتی ہیں اس کا فرش بچھایا جاتا ہے۔ مسجدوں میں مرمر کے منبر اور جالیاں وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔

سنگ مرمر نہ صرف مجسمے تراشنے، تصویریں کھودنے اور آرائش و زیبائش کی دوسری چھوٹی چیزیں بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا چورا اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑے چونا بنانے کے بھی کام آتے ہیں۔ یہ چونا عام چونے سے بہت زیادہ سفید چمک دار اور پائدار ہوتا ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس کے استعمال پر عام چونے کی بہ نسبت کچھ زیادہ خرچ بھی نہیں آتا۔

آخر میں ہمیں ایک لطیفہ یاد آگیا ایک دن ہم اور ہمارے چند دوست اشرف میاں کے گھر مہمان تھے۔ اتنے میں بازو کے کمرے سے کسی چیز کے نیچے گر کر ٹوٹنے کی آواز آئی۔ ہم نے اس کا سبب دریافت کیا تو اشرف میاں نے جلدی سے کہا بھائی جان شاید میرا سنگ مرمر کے پتھر کا گھوڑا گر کر ٹوٹ گیا ہے۔ یہ سن کر ہم سب ہنس پڑے اور اشرف میاں کچھ کھسیانے سے ہوگئے۔ اشرف میاں ہی پر کیا موقوف ہے۔ وہ تو ٹھیرے کمسن طالب علم۔ ہم نے بعض بڑی عمر والوں کو بھی اس قسم کی غلطی کرتے سنا ہے۔ سنگ مرمر کا پتھر۔ شب لیلۃ القدر روز جزا کا دن۔ اور نہ جانے فصاحت کے ایسے کتنے ہی دفتر ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا نہ کرے ہمارے سننے والوں میں سے کوئی ایسی غلطی کرتا ہے۔

سالم بن عمر

(آل انڈیا ریڈیو نشر گاہ حیدرآباد سے نشر کیا گیا)

بچوں اور بچیوں کیلئے کتابیں :-

۱۔ نظام الملک آصفجاہ اول از شیخ چاند مرحوم ایم اے قیمت ۴ر

۲۔ سر سید احمد خاں از ظہیر الدین احمد صاحب ایم اے ایچ سی ایس قیمت ۲ر

۳۔ سر سالار جنگ اعظم از مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ قیمت ۶ر

۴۔ اعظم الامراء ارسطو جاہ از مولوی عبد المجید صاحب صدیقی ایم اے ال ال بی ۶ر

۵۔ دادا بھائی نوروزجی از ظہیر الدین احمد صاحب ایچ سی ایس قیمت ۶ر

۶ عماد الملک سید حسین بلگرامی از مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ قیمت ۶ر

۷۔ اردو دانی کی کتابیں پہلا حصہ زیر نگرانی مولوی سجاد مرزا صاحب ایم اے ۲ر ۳ر

۸۔ سوتیلی ماں از محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ صدر شعبۂ نسوان ادارہ قیمت ... ۴ر

۹۔ من کی بیتا از محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ ایم اے قیمت ۸ر

۱۰۔ پانی کی کہانی از مولوی فیض محمد صاحب بی اے ڈپ ایڈ قیمت ۲ر

۱۱۔ آب دوز اور سرنگ از فیض محمد صاحب بی اے۔ ڈپ ایڈ قیمت ۲ر

خلیفۂ مامون کی مہمان نوازی

آج سے قریب قریب بارہ سو برس پہلے خلیفۂ مامون عراق، شام اور حجاز کے مسلمانوں کا بادشاہ تھا۔ اس کا پائے تخت بغداد کا مشہور شہر تھا۔ مامون بہت بڑا عالم، فلسفی قاری اور قرآن کا حافظ تھا۔ اور عالموں اور شاعروں کی دل سے عزت کرتا تھا۔

کہتے ہیں کہ ایک رات ایک عالم مامون کے محل میں مہمان رہا۔ شام کے کھانے میں پر تکلف اور چکنی چپڑی غذائیں کھانے سے عالم کو رات میں نیند نہ آئی۔ اس لئے وہ کروٹیں بدل بدل کر سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر اس کو نیند نہ آتی تھی۔ پیاس سے اس کا حلق خشک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے قریب کی صراحی میں جتنا پانی تھا تھوڑا تھوڑا کرکے پی چکا تھا۔ رات گئے شاہی نوکر سو رہے تھے۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ محل میں کہیں کہیں چراغ جل رہے تھے۔ آسمان پر تارے جگمگا رہے تھے۔ عالم نے کسی نوکر کو جگا کر اس کی نیند کرکری کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس لئے خود آب دار خانے کی طرف جانے لگا۔

اتفاق سے اس رات کو خلیفۂ مامون بھی نہ سویا تھا۔ اور اپنے بستر پر پڑا ہوا کچھ سوچ بچار کر رہا تھا۔ یکایک اس کی نظر عالم پر پڑی جو پانی کی تلاش میں آب دار خانے کی طرف جا رہا تھا۔ خلیفۂ مامون بہت ہوشیار تھا وہ تاڑ گیا کہ عالم کے قریب کی صراحی میں پانی ختم ہو چکا ہے اس لئے اس نے کہا "آپ اپنی جگہ پر تشریف لے جائیے میں ابھی پانی بھیج دیتا ہوں"۔ عالم کو اپنی جگہ پر واپس جانا ہی پڑا۔ اس کو اپنی جگہ پر واپس ہوکر ابھی کچھ دیر بھی نہ ہوئی تھی کہ خلیفۂ مامون پانی لیا ہوا وہاں پہنچ کر کہنے لگا۔ "پانی حاضر ہے پیجئے"۔ عالم نے پانی لے کر کہا "خود آپ نے کیوں تکلیف فرمائی؟" خلیفۂ مامون نے جواب دیا "یہ نوکروں کے آرام کا وقت ہے۔ سب سو رہے ہیں۔ میں نے کسی کو جگا کر اس کے آرام میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا"۔ پھر عالم نے کہا "آپ نے خود مجھے کیوں پانی نہ پینے دیا"۔ مامون نے کہا "یہ میری مہمان نوازی سے دور تھا۔ مہمان کی آؤ بھگت کرنا میزبان کا خوشگوار فرض ہے۔ آپ بے تکلف پانی پی لیجئے۔ میں نہ صرف آپ کا بلکہ ساری قوم کا خادم ہوں کیوں کہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے"۔ عالم نے پانی پی کر مامون سے کہا "تم وہ تمام فرض جو خلیفہ ہونے کے سبب تمہارے ذمے ہیں اچھی طرح انجام دے رہے ہو۔ تم مسلمانوں کے حقیقی بادشاہ ہو۔ تم ہی اپنے بزرگوں کے نام روشن کرو گے"۔ اس کے بعد یہ دعا دی "خدا تمہاری عمر دراز کرے اور

حکومت کو تمہارے خاندان میں ہمیشہ کے لئے قائم رکھے۔"

پیارے بچو! تم نے ابھی ابھی سنا کہ خدمت میں بڑائی ہے۔ جو شخص اچھی طرح خدمت کرسکتا ہے وہی اچھی طرح حکومت بھی کرسکتا ہے۔ اس لئے اگر تم بھی اپنے بزرگوں، استادوں اور آقاؤں کی خدمت شوق، اور دلچسپی سے انجام دو تو ایک نہ ایک دن دوسرے لوگ بھی خوشی سے تمہاری خدمت کریں گے۔

محمد عبدالسلام ذکی

علم

علم کے معنی کو سمجھے ہیں غلط انداز سے
روشنی پاکر بھی ہیں محروم نور کے راز سے

علم ہے اِک نام رازِ حق سے آگاہی کا یاں
اور حق ہے نام سچ کا، ہے یہ علماء کا بیاں

علم سے حاصل سچائی جس کو دنیا میں ہوئی
کامیابی زندگی میں اس کو دنیا میں ہوئی

جیسے بڑھتی ہے چمک سونے کی کندن سے بہت
علم سے ہوتی ہے ویسے عقل، انساں کی درست

خوبیاں انساں کی ظاہر ہوتی ہیں تعلیم سے
رہبری کرتا ہے حق ان کی جہانِ غیب سے

علم پاکر آدمی انسان کامل بن گئے
علم سے دنیا ملی اور وہ خدا سے مل گئے

خود نمونہ بن کے بے غرضی کا استاد اُن دنوں
اپنے شاگردوں کو کامل تھے بناتے اُن دنوں

ایک بچہ ننھی سی جاں اور کتابوں کا یہ ڈھیر
یہ خدا کی شان ہے یا عقل انسانی کا پھیر

بات جس کو ایک لمبی یاد رکھنا ہے محال
وہ بھلا ان فلسفوں کی کیا کرے گا دیکھ بھال

ان کو رٹنا یاد کرنا پھر سمجھنا ہے ضرور
اس بیچارے کی معیت کا ٹھکانہ بھی ہے دور

سعدی و سقراط و افلاطون جیسے رازداں
اور تلسی داس، کالی داس جیسے ودواں

طرزِ تعلیم نوی نے کب کئے پیدا یہاں
اب بھی جاگو آنکھ کھولو جاؤ پہلے تھے جہاں

مسز برکت رائے

بہادر لڑکا

آج سے تقریباً ۶ ہزار سال پہلے سوئٹزرلینڈ میں ولیم ٹیل نامی ایک چرواہا رہتا تھا وہ بہت طاقتور، توانا، بہادر، چالاک شکاری اور بہترین تیرانداز تھا۔ سوئٹزرلینڈ کے اطراف واکناف میں کوئی بھی ایسا شخص نہ تھا جو پہاڑ پر تیزی سے دوڑتے ہوئے چڑھنے میں اس سے بازی لے جائے۔ وہ بہت محنتی تھا اس لئے لوگ اسے چاہتے تھے۔ دنیا میں سب سے عزیز اور پیاری چیز اُسے اپنا ایک لڑکا تھا جو اس وقت دسویں سال کی عمر میں تھا۔ لڑکے کے بچپن میں ہی ماں کا انتقال ہوگیا تھا۔ جب بھی ولیم ٹیل کسی مقام پر جاتا اس کا لڑکا اس کے ہمراہ رہتا۔ جب ولیم ٹیل آلٹرف نامی گاؤں کی پہاڑیوں پر شکار کے لئے جاتا تو اس وقت اس کا لڑکا بکریوں کی دیکھ بھال کرتا۔ آلٹرف کا گورنر ظالم، سخت اور ضدی طبیعت کا آدمی تھا۔ وہ منصف حکمراں نہ تھا۔ وہ قانونی حکومت نہیں کرتا تھا بلکہ جو کچھ بھی اس کی خواہش ہوتی اسی قسم کے احکام صادر کرتا۔ ایک وقت ولیم ٹیل، آلٹرف میں کچھ ضروری چیزیں خریدنے آیا اس وقت اس کی نظر ایک گڑے ہوئے بانس پر پڑی جو مارکٹ کے عین درمیان میں تھا اور اس پر ایک ٹوپی بھی رکھی ہوئی تھی اس نے بانس کے بازو آسٹرین گورنر (جو جیسلر کے نام سے مشہور تھا) ایک گھوڑے پر سوار تھا۔ اور اس کے اطراف نوکروں اور سپاہیوں کا ایک طوفان تھا۔ ہر وہ شخص جو مارکٹ میں داخل ہوتا اس کا یہ فرض ہوتا کہ وہ زمین تک سلام کے لئے جھک جائے تاکہ اس ٹوپی کا احترام ہو۔ جب ولیم ٹیل وہاں سے گزرا تو اس نے صرف گورنر کو سلام کیا اور آگے جانے لگا۔

گورنر کو یہ گوارا نہ ہوا اور اس نے غصہ سے چلا کر کہا کہ "اس کتے کو پکڑ لاؤ" اس کو یہ لازم ہوگا کہ "وہ میری ٹوپی کے سامنے سلام بجالائے ورنہ اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے"۔ سپاہیوں نے جیسلر کے سامنے ولیم ٹیل کو لایا۔ لیکن ولیم ٹیل نے گورنر کی اطاعت سے انکار کردیا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ گورنر کو صرف سلام کروں۔ لیکن میں نہ ان کے سامنے احترام کے لئے سر تسلیم خم کرسکتا ہوں اور نہ اس ٹوپی کے سامنے ایسا کرسکتا ہوں۔ ایسے فرائض تو میں صرف خدا کے ہی کے سامنے ادا کروں گا اور اس کے سوا کسی کے سامنے اپنی گردن نہیں جھکاؤں گا اگر ایسا ہی ہے تو میری جان حاضر ہے لیکن تم میرے ضمیر کو نہیں لے سکتے" جیسلر نے گرجتے ہوئے کہا" اس کو مار ڈالو یہ بدمعاش میرے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ گارڈ کے سپاہی قریب تھا کہ ولیم ٹیل کے آنکھوں میں برچھے

چھو دیتے کہ اتنے میں جیسلر کے چہرے پر مکارانہ ہنسی نمودار ہوئی اور اس نے تھوڑی دیر ٹھہرنے کے لئے کہا "سوئٹزرلینڈ کی یہ پہاڑیاں جہاں تیراندازی بخوبی کی جاسکتی ہے" گورنر نے کہا "اس کے لڑکے کو لے جاؤ اور اس درخت کے نیچے کھڑا کردو۔ اور اس لڑکے کے سر پر ایک پھل (میوہ) رکھ دو اور ولیم ٹیل نے (ہ) تیر چلائے اور وہ اتنے مار میں اس پھل کو گرادے جو لڑکے کے سر پر ہے اگر ولیم ٹیل اس میں ناکام رہا تو اسے اور اس کے لڑکے دونوں کو فوری قتل کردو اور اگر اس نے پھل گرا دیا تو دونوں کو چھوڑ دیا جائے" اس ظالم گورنر کا یہ خیال تھا کہ ولیم ٹیل پھل گرانے کے لئے تیر چلائے گا اور ایک نہ ایک تیر ضرور اس کے لڑکے کو جاکر لگے گا۔ یا اگر ولیم ٹیل پھل اور لڑکے کی شرط سے انکار کردے تو ولیم ٹیل کو قتل کردیا جاسکے گا۔

دنیا میں کوئی بھی انسان ایسا نہیں ملے گا جو اپنے ہاتھ سے اپنے لڑکے کو مار ڈالے ولیم ٹیل کو اندیشہ تھا کہ پھل گرانے میں لڑکے کی جان نہ چلی جائے۔ "مجھے سزا دو اور میرے بچے کو آزاد چھوڑ دو اس لڑکے نے تمھیں کیا تکلیف پہنچائی ہے" ولیم نے کہا۔ "نشانہ باندھو یا مرجاؤ" جیسلر گورنر نے کہا "نشانہ خطا ہوا اور تم دونوں بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئے" ولیم نے اپنے لڑکے کو جو درخت کے نیچے کھڑا تھا یہ سمجھ کر کہ وہ تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔ نظر حسرت سے، روتے ہوئے اور خدا سے رحم کے لئے دعا کرتے ہوئے دیکھا۔ لیکن ادھر اس کا لڑکا بالکل مستعد اور تیار کھڑا تھا اور باپ کے تیر کا منتظر تھا۔ لڑکے کا دل فخر کے جذبات سے بھرا ہوا تھا اور اس کے دل میں ذرا بھی خوف نہ تھا۔ ولیم نے دوبارہ اپنے لڑکے کے چہرے کو دیکھا جب کہ اس نے تیر چلانے کے لئے کمان کو اٹھایا اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے پتھر الٹ دیا ہے لیکن لڑکا برابر مستعد اور تیار کھڑا تھا۔ لڑکے نے اپنے باپ سے کہا "سیدھا نشانہ باندھو تاکہ ہم دونوں بچ جائیں"۔ "خدا تجھ پر رحم کرے تیری ہمت نے میرے بھی حوصلے بلند کردئیے" اس نے نشانہ باندھ کر تیر چھوڑا اور وہ پھل لڑکے کے سر سے دیکھتے ہی دیکھتے دو ٹکڑے ہو کر گر پڑا اور تیر درخت میں گھس گیا۔ "بہت خوب" جیسلر گورنر نے کہا۔ "میں اپنے الفاظ پر قایم ہوں۔ تم دونوں آزاد ہو۔ میرا شکریہ ادا کرو اور چلے جاؤ۔" "میں تمھارا شکریہ ادا نہیں کرتا" ولیم نے کہا "میں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ اس نے تیر کو سیدھا چلانے میں میری مدد کی اور اس کا بھی خیال رہے کہ اگر بفرض محال وہ تیر خطا کرجاتا اور لڑکے کو جا لگتا تو میرے دوسرے تیر کا نشانہ تمھارا دل ہوتا۔"

(ترجمہ)

عبدالمجید خان یوسف زئی

فخرِ قوم

(سر سید احمد خاں مرحوم)

وہ محبِ قوم تھا اسلام کا بہتر نگیں
اس کے بہتر کام پر ہوتی ہے ہر جا آفریں

سوز تھا اس کے جگر میں درد دل رکھتا تھا وہ
قوم ہی کے نام کی مالا سدا جپتا تھا وہ

ناخدا بن کر سنبھالا قوم کی کشتی کو بس
بھر دیا سب کے دلوں میں علم و فن کا اس نے رس

ہم نہ ہوتے ڈاکٹر اور نہ بنتے جج کبھی
یوں نہ عہدے پاتے اچھے اور نہ یہ برتری

رات دن رہتا تھا غم میں ہر گھڑی سالارِ قوم
ہوتی تھی ہر وقت اس پر کفر کے فتووں کی دوم

جو کیا اس نے بتاؤ آج تک کس نے کیا
جس نے اپنی موت تک اصلاح میں حصّہ لیا

مرنا جینا اس کا تھا بس قوم ہی کے واسطے
وہ بتائے اس نے کیسے اور بہتر راستے

رات دن روتا تھا اس کو دیکھ کر پستیٔ قوم
وہ نہ ہوتا ڈوب جاتی بالیقیں کشتیٔ قوم

بھیک تک مانگی ہے اُس نے قوم ہی کے واسطے
کون ہے ایسا بتاؤ قوم پر جو مر مٹے

خط ہزاروں گالیوں کے ڈاک پر آتے رہے
مذہبی اخبار اس پر روز چلاتے رہے

اِک ادارہ بن گیا پھر قوم کا دارالعلوم
روز افزوں تھے علی گڑھ کے فوائد بالعموم

اس کے طلباء تھے وہی محمود[1]، اقبال[2] آفتاب[3]
جن کا دورِ زندگی رکھتا نہ تھا اپنا جواب

اور یہ مرزا عزیز[4] و شوکت[5] و جوہر[6]، ظفر[7]
قوم کی خدمت میں گزری عمر جن کی سر بسر

سب اسی کے خرمنِ تعلیم کے ہیں خوشہ چیں
کر لیا حاصل جنھوں نے راحتِ دنیا و دیں

مرحبا سالارِ قوم اے سیدِ عالی وقار
ساتھ ہے تیرے دعائے قوم و فضلِ کردگار

گلشنِ فردوس کا ہے بالیقیں تو ایک پھول
ہے ازل سے قدرداں تیرا یہ منصورِ ملول

محمد احمد اللہ خاں منصور

---

۱ مسٹر محمود مرحوم جج ہائیکورٹ الہ آباد خلف سر سید احمد خاں۔ ۲ علامہ سر اقبال مرحوم۔ ۳ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم۔ ۴ مولوی عزیز مرزا مرحوم معتمد ہوم سکریٹری حیدرآباد
۵ مولانا شوکت علی مرحوم۔ ۶ مولانا محمد علی مرحوم جوہر۔ ۷ مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر اخبار زمیندار۔

چمنستان

"بہن موتیا دیکھا اس کا اترانا" چنبیلی نے پنکھڑیوں کو مسلتے ہوئے کہا۔

موتیا۔ "کیا ہے بوا چنبیلی! کیوں خیر تو ہے! کیسی اکھڑی اکھڑی باتیں کر رہی ہو۔ ادھر دیکھو چاند کی معصوم کرنیں جب سطح آب پر جگمگاتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی لہریں ان کو آشنان کرا رہی ہیں۔ فضا کس قدر خوش گوار ہے۔ خموشی کا راجہ ادب سے ہاتھ باندھے چاند کے دیوتا کے آگے کھڑا ہے۔ نورانی دنیا میں اتنی جاذبیت پیدا ہوگئی ہے کہ چندر راج بھی وشنوجی کا حکم بھول کر سکتے کے عالم میں محو تماشائے فطرت ہیں۔ کیا رائی اور کیا پربت دونوں سکوت کے دریا میں غرق ہیں۔ دیکھو تو گلاب کا تختہ کس قدر حسن افروز منظر پیش کر رہا ہے۔ خیر تم تو ان کی شیدائی ٹھیریں پھر یہ مزے میں کرکری کیسی؟"

چنبیلی: "اجی! آپ کی فصیح البیانی پر خدا کی مار" چنبیلی کچھ اور کہنا ہی چاہتی تھی کہ موتیا نے کہا۔

موتیا: "لو اور سنو۔ جب چاند کی مستانہ کرنیں سبزہ زار پر بیتابانہ لوٹتیں ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے زمردین فرش پر روپہری بیل بوٹے بنائے ہیں۔ صدہا غنچے چٹک چٹک کر فضا کو معطر کر رہے ہیں۔ وہ! دیکھو بی جوہی بھی چٹک پڑیں" موتیا کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

یہ سہانا اور دلفریب منظر کچھ ایسا دلکش اور دلربا تھا کہ تمام چمن پر "نیم بے ہوشی" طاری ہو چکی تھی۔ بھینی بھینی اور خوشبو سے معطر فضا دلچسپ رنگینیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

ایک طرف گلاب کا معطر آگیں تختہ اپنی آن بان سے متمکن تھا۔ تو دوسری طرف موتیا اور چنبیلی اپنی اپنی رعنائیوں کا جوبن دکھلا رہی تھیں۔ دائیں بازو بڑے بڑے پتوں میں باریک باریک پھولوں کے گچھے لٹک رہے تھے گویا قدرت کی کاریگری نے زمرد اور الماس کو ایک جا جڑ دیا تھا شاید یہی وجہ ہے کہ اس کو رات کی رانی کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نزاکت میں تمام پھولوں کی رانی ہے۔ رہی خوشبو وہ بھی اوروں سے کم نہیں۔ اس کے دوسری جانب چنپا اور جوہی کی کلیاں کھل کھل کر ایک عجیب منظر پیدا کر رہی تھیں۔ مدن مست کا پھول اپنی بو میں آپ مست اور اپنی جا آپ مگن ہے۔ اس کا درخت سب سے الگ تھلگ دور کھڑا مستی میں جھوم جھوم رہا ہے۔ "بہن موتیا مذاق کو رہنے دو، تمھیں معلوم رہے کہ اس دلفریب موقع پر ناچیز تنکے ہم ہی سے ڈنک مار رہے ہیں۔" چنبیلی نے تحقیر آمیز لہجہ میں کہا۔

موتیا: "اس بھری چاندنی رات کی قسم بہن

مجھے تو اس کا مطلق علم نہیں"

چنبیلی:- "اونہہ، یہ بھی کوئی بات ہے، ذرا اپنی داہنی طرف کو تو دیکھو۔ ذرا ذرا سے تنکے کیسی خوبروئی اور جانفزائی دکھلا رہے ہیں تھوڑی سی خوشبو کیا پائی ہے کہ دماغ عرش معلیٰ پر چڑھ گیا ہے۔ دن بھر مرجھائے رہتے ہیں پر یہ دماغ! اور شب میں تازگی اور بالیدگی پانے پر یہ شان! غرور اور نخوت کا یہ عالم ہے کہ اب بادشاہ گلاب پر بھی آنکھ مارتے ہیں"

موتیا:- "کس کی مجال جو گلاب کو آنکھ بھر کر بھی دیکھے"۔ موتیا کی پنیوں پر خفیف سی تیزی محسوس ہو رہی تھی

چنبیلی:- "اجی ابھی تم نے سنا ہی کیا ہے۔ نہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسے رات کی رانی کہتے ہیں۔ رانی .... !"

موتیا:- "خدا غارت کرے! اسے رانی آخر کس موئی نے بنایا ہے!! بھلا اس کی ہمارے آگے کیا حقیقت ہے۔ لمبوتری صورت پر یہ غرور۔ سچ کہتی ہوں بہن اگر بس چلتا تو مسل ڈالتی"

سوسن جو بازو ہی تھیں بول اٹھی:- "آخر بات کیا ہے جو اتنی غصے میں ہو۔ خیر تو ہے۔ اگر کسی نے آنکھ بھر کر دیکھا ہے تو کہو۔ بھلا ایسی خوشگوار فضا میں یہ ناخوشگوار باتیں تمہیں بھلی معلوم ہوتی ہیں!"

چنبیلی:- "لگیں منہ دیکھی باتیں کرنے۔ ذرا اس باغ کی رانی کو تو دیکھو!"

"ذرا ٹھیرو تو۔ ابھی اس کو آڑے ہاتھوں لیتی ہوں" زبان دراز سوسن یہ کہتے ہوئے پلٹی اور رات کی رانی پر برس پڑی۔

رشک و حسد کی چنگاریاں فضا میں ہر طرف پھیل گئیں۔ نرگس آنکھیں دکھلا رہی تھی۔ سنبل بھی پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ غرض یہ کہ ہر جگہ رات کی رانی کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اس قدر خوف چھا گیا کہ کلیاں مارے ہیبت کے بکھر بکھر کر پھول بن گئیں مگر رات کی رانی ہے کہ برابر اپنی اسی حالت پر قایم ہے۔ گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی باتوں کو وہ خاطر میں نہیں لاتی۔ بلکہ اور زیادہ سنجیدگی اختیار کرلی ہے جس سے اس کی نزاکت میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

باغ میں اس قدر ہلڑ مچا کہ ہر پھول پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا تھا گلاب نے بھی محسوس کیا کہ رنگ میں بھنگ پڑ گیا ہے۔ اس بدمزگی کو دور کرنے کیلئے گلاب کا چاروں طرف دیکھنا تھا کہ سب پر غشی طاری ہوگئی۔ اس "نیم مستانہ" فضا میں دھنسنے والی ایک "پرستار الفت" بلبل کے پھڑ پھڑاتے ہوئے پروں کی آواز سے چاندنی رات میں ایک کشش اور جاذبیت سی پیدا ہوگئی تھی اور موثر سماں بندھ گیا تھا۔ چودھویں رات کے چاند کی کرنیں گلاب کی پتیوں پر ٹھمک ٹھمک کر رقص کر رہی تھیں بلاشبہ رات پر دن کا گمان

ہوتا تھا۔ بلبل کے "شوق آفریں" دل کو اس وقت کا سماں ایسا پسند آیا کہ بے تحاشہ گلاب کے تختے پر اتر پڑی۔ آدھی رات تھی ــــ نیند آنکھوں میں جھلا رہی تھی ــــ سناٹا چھایا ہوا تھا ــــ رات خموشی کے گیت گا رہی تھی ــــ کہ ایک "خار لعنت" دل میں چبھ گیا ــــ بے چاری بلبل اپنی حسرت بھری تمناؤں کے ساتھ "حسن مطلق" کے قدموں پر نچھاور ہو گئی۔

سید یعقوب حسین قادری

صبح باغ میں

ذرہ ذرہ چمک رہا ہے　　قطرہ قطرہ جھلک رہا ہے
دیکھو سورج جھانک رہا ہے　　پربت سے وہ تاک رہا ہے
جھاڑ، تنا اور نازک پودے　　پتلی شاخیں ڈال وہ موٹے
مست بنے سب جھوم رہے ہیں　　گل کے ساغر گھوم رہے ہیں
پھولوں سے اس طرح لدے ہیں　　دولہ سے اشجار بنے ہیں
مرغ چمن سب نغمہ خواں ہیں　　اور ہوا میں رقص کناں ہیں
فوارے دل کھول رہے ہیں　　منہ سے موتی رول رہے ہیں

حیرت سے ہے نرگس حیراں
نور کا دریا جوش پہ طوفاں

خواجہ معین الدین

نشان تہم آصفیہ ۵۳،

ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹

رجسٹرڈ ایم ۳۹۵۰

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

نام کتاب	صفحات	قیمت آنہ	قیمت روپیہ
من کی بیتا	۸۰	۸	
سرگزشت غالب	۲۴	۸	
نظام الملک	۳۸	۴	
تاریخ گولکنڈہ	۳۳۰	۸	۳
دکن نمبر (۷۸ تصاویر)	۱۲۸		۲
ارمغان جذب	۱۲۰	۱۲	
سوتیلی ماں	۴۸	۴	
سر سید احمد خاں	۱۶	۲	
سر سالار جنگ	۴۸	۶	
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۴	۱
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۴	۱
اقبال نمبر	۱۶۸	۴	۱
سائنس کے کرشمے	۱۱۲		۱
رسائل طیبہ			
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۱۲	۲
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۸	۲
دادا بھائی	۱۶	۲	
اردو نامہ	۲۰۰		۲
ارسطو جاہ	۶۵	۶	
عماد الملک	۴۰	۶	
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۶	۲
" " دوسری کتاب	۵۶	۶	۴
محمد حسین آزاد	۲۰۰		۲
کاغذ کی ناؤ	۱۲۰	۴	۱
فن تقریر		۸	
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴		۱
پانی کی کہانی	۴۸	۶	

نام کتاب	صفحات	قیمت آنہ	قیمت روپیہ
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۴	۱
ورڈ سورتھ اور اس کی شاعری	۱۸۴	۸	۱
ہوش کے ناخن	۹۴		۱
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹		۱
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۸	۱
متاع سخن	۱۲۴	۱۲	
کیف سخن	۱۲۲	۱۲	
بادۂ سخن	۱۲۷	۱۲	
سراج سخن	۱۵۲	۱۲	
ایمان سخن	۱۲۰	۱۲	
فیض سخن	۱۴۴	۱۲	
مرقع سخن جلد اول صفحہ (۴۰۰) ۵۰ تصاویر			۵
" " دوم " " "			۵
نقد سخن صفحہ	۱۷۵		۱
نذر ولی	۹۴۲	۸	۲
گریہ و تبسم	۱۹۲		۲
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴		۱
من کی دنیا	۱۴۵		۱
مدراس میں اردو	۱۹۶	۸	۱
محرم نامہ	۱۱۲		۱
نذر دکن	۱۰۴	۴	۰
روح غالب	۲۴۰	۸	۲
عاصم	۲۰۰	۴	۱
دفتری معلومات		۶	
آبدوز کشتیاں اور سرنگ		۶	
اردو مثنوی کا ارتقا		۱۲	۱

حیدرآباد پرنٹنگ ورکس

تسہ مرقد مہ شمس ادن محمد یس
مجاب ادارۂ ادبیات اردو

تسہ مرقد میر احمد علی عصہ
مجانب ادارۂ ادبیات اردو

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا ماہنامہ سب رس

زیر نگرانی
ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

مجلس ادارت
صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش
سکینہ بیگم
خواجہ حمید الدین شاہد
عبدالحفیظ صدیقی بی ایس سی
معین الدین احمد انصاری

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳
نشان ٹپہ برطانیہ ۴۳۹۵۰
ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹
چندہ سالانہ چار روپیہ آٹھ آنے
بچوں کا سب رس ایک روپیہ آٹھ آنے
سب رس معلومات ایک روپیہ آٹھ آنے
جلد (۳) شمارہ (۱۱)
نومبر ۱۹۴۰ء

جلد ۳ — بابت نومبر ۱۹۴۰ء — شمارہ ۱۱

(فہرست مضامین)

ضروری:- اگر کسی عیسوی مہینے کی پندرہ تاریخ تک پرچہ وصول نہ ہو تو اسی مہینے دوسرا پرچہ طلب فرمالیں۔ ورنہ فرمائش کی تکمیل نہ ہو سکے گی۔

خواجہ حمیدالدین شاہد کے اہتمام سے اعظم اسٹیم پریس میں چھپکر دفتر ادارہ رفعت منزل خیرت آباد سے شائع ہوا۔

اداریہ

سب رس کا چوتھا سال ایک خاص شمارہ سے شروع کیا جائے گا جو سب رس کے گزشتہ سالناموں کی طرح باتصویر اور ضخیم ہوگا۔ کوشش کی جارہی ہے کہ یہ سالنامہ بھی سب رس کی روایات کے شایان شان ثابت ہو۔ اس میں دنیا کے جدید ترین ادبی رجحانات سے متعلق نہایت دلچسپ باتصویر مضمون شایع کئے جارہے ہیں۔ ان مضمونوں، نظموں، اور تصویروں سے متعلق تفصیل ہمارے آیندہ شمارے میں شریک رہے گی۔ غرض یہ سالنامہ اردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ کرے گا۔ اور جنوری ۱۹۴۱ء کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوجائے گا۔ ادارۂ سب رس کئی ماہ سے اس کے لئے تیاری کررہا ہے۔

سب رس کا زیر نظر شمارہ مضامین کے تنوع اور افادیت کے بحیثیت نظر دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ اسی طرح ڈسمبر کا شمارہ بھی خاص اہتمام سے مرتب کیا جارہا ہے۔

نمودِ زندگی ادارۂ ادبیاتِ اردو کی مطبوعات میں اس مہینے تین اہم کتابوں کا اضافہ ہوا ہے۔ جن میں سب سے پہلے مولوی سید علی منظور صاحب حیدرآبادی کا مجموعۂ کلام نمودِ زندگی قابل ذکر ہے۔ یہ ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ ابتدا میں مصنف کی تصویر اور عرض حال کے علاوہ جناب پروفیسر ڈاکٹر زور صاحب کا دیباچۂ عمومی بھی شامل ہے۔ جس کی چند سطروں کا اقتباس درج ذیل ہے۔

"سید علی منظور صاحب جدید حیدرآباد کے پختہ مشق اور مشہور شاعروں میں سے ہیں اور حضرت امجد کی طرح ان کی شاعری کی شہرت صرف اس سرزمین میں محدود نہیں ہے۔ ان کے کمال نے قدردان دور دور پھیلے ہوئے ہیں۔ اردو کا کوئی مشہور و مستند رسالہ ایسا نہیں جس میں آئے دن ان کی غزلیں اور نظمیں نہ چھپتی ہوں۔ اور پھر یہ نظمیں ایک رسالے سے دوسرے رسالہ میں نقل کی جاتی ہیں۔"

اور آخر میں لکھا ہے کہ :۔

"یہ ایک فیض جاری ہے جو رہتی دنیا تک باقی رہے گا اور عہد حاضر کی سیاسی و معاشی کشمکش کے بعد بھی اس کا اثر زایل نہ ہو سکے گا۔"

فنِ تقریر عہد حاضر میں تقریر کو بہت اہمیت حاصل ہوتی جارہی ہے۔ اور لاسلکی کی وجہ سے تو اس فن کی افادیت میں خاص اضافہ ہوگیا ہے۔ مولوی سجاد مرزا صاحب کی فرمایش پر ادارہ نے فن تقریر سے متعلق ایک نہایت مفید کتاب شایع کی ہے جو چھ ابواب اور تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں جگہ جگہ تصویریں بھی شامل ہیں جن کی مدد سے تقریر کرتے وقت ٹھیک طور پر کھڑے ہونے اور حرکات و سکنات کے سلسلہ میں مفید معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کتاب کی قیمت ۸ر بہت ہی کم رکھی گئی ہے۔ اس کی نسبت جناب پروفیسر ڈاکٹر زور صاحب نے اپنے دیباچۂ عمومی میں تحریر فرمایا ہے کہ :۔

اگرچہ ترقی یافتہ زبانوں میں فن تقریر و خطابت سے متعلق کئی کتابیں لکھی گئی ہیں اور آئے دن لکھی جارہی ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اردو میں اس موضوع پر کوئی کتاب موجود نہیں۔ اور یہ بھی مولوی سجاد مرزا صاحب کی بالغ نظری اور موقع شناسی کا نتیجہ ہے کہ زیر نظر کتاب ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے شایع کی جارہی ہے۔ ..... آخری باب اور تصویریں عہد حاضر کی انگریزی اور امریکن مطبوعات سے مدد لیکر تیار کی گئی ہیں۔ ان کی تیاری و ترتیب میں بھی مولوی سجاد مرزا صاحب نے ذاتی دلچسپی لی اور ادارہ کی خاطر خواہ مدد فرمائی۔ بہرحال یہ کتاب صحیح معنوں میں مسافت کی منزلیں طے کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

سلک گوہریں | یہ ایک چھوٹا سا منظوم ڈرامہ ہے جس کو مولوی جلال الدین صاحب اشک بی اے ایل ایل بی نائب صدر شاخ ادارۂ ادبیات اردو پربھنی نے تصنیف کیا ہے۔ ان کی پہلی کتاب شیطان کا انتقام ادبی حلقوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر چکی ہے اور یقین ہے کہ یہ حسین وجمیل مختصر ڈراما بھی اہل ذوق سے ضرور خراجِ تحسین حاصل کرے گا۔ باکمال شاعر نے اس کی تصنیف میں چند خاص ادبی نظریوں کو پیش نظر رکھا ہے جن کی اہمیت اس ڈراما کے مطالعہ کے بعد ہی واضح ہو سکتی ہے۔ نہایت دیدہ زیب شایع ہوا ہے اور قیمت بہت ہی کم یعنی صرف چار آنے رکھی گئی ہے۔

ادارے کے شعبے | ادارہ کے مختلف شعبے برابر سرگرم کار ہیں۔ اس شمارہ میں صرف دو مجلسوں کی روئدادیں شامل کی جا رہی ہیں۔

شعبۂ نسواں | مجلس عاملہ شعبۂ نسواں کا چودھواں اجلاس ۱۰ اکتوبر کو منعقد ہوا جس میں ذیل کی خواتین نے شرکت کی۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ، محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بشیر لطیف النساء بیگم صاحبہ معتمد شعبہ۔ سابق اجلاس کی روئداد کی تصدیق کے بعد حسب ذیل امور کا تصفیہ ہوا۔

(۱) مدرسۂ بالغات (۲) اجلاس عام (۳) کانسرٹ (۴) انجمن بلبلسانیین کی درخواست متعلقہ نصاب تعلیم (۵) ماہانہ اجلاس کے عوض سہ ماہی اجلاس (۶) دیگر امور۔

(۱) طالبات مدرسہ جو اردو دانی میں کامیاب ہو گئی ہیں ان کے لئے ایک درمیانی امتحان کا نصاب تجویز کیا گیا۔ مدرسہ کے لئے ایک معلمہ حمیدی بی صاحبہ کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا۔ امتحان کی کامیاب طالبات کے لئے سرِ دست (۲) جماعتوں کا نصاب زیر غور ہے۔

(۲) اجلاسِ عام ۲۴ نومبر سنہ ۴۳ء صبح دس بجے بصدارت بیگم صاحبہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کیا جائے جس میں ادارہ کی کتابوں کی نمائش بھی کی جائے گی۔ رابعہ بیگم صاحبہ شعبہ کی کارگزاری اور سہ سالہ رپورٹ پیش کریں گی۔ لطیف النساء بیگم صاحبہ خواتین سے تعاونِ عمل کے لئے اپیل کریں گی۔ بشیر النساء بیگم صاحبہ شعبہ سے متعلق نظم اور معتمد شعبہ شکریہ ادا کریں گی۔ طے پایا کہ اسی موقعہ پر ادارہ کے اردو امتحانات کی کامیاب خواتین میں اسناد اور انعامات کی تقسیم بھی عمل میں آئے تو مناسب ہے۔

شعبۂ تاریخ دکن | کا معمولی جلسہ ۲۵ ستمبر کو منعقد ہوا۔ ڈاکٹر زور صاحب، خواجہ محمد احمد صاحب، سید سراج الدین احمد صاحب، محمد غوث صاحب ایم اے اور معتمد شریک تھے۔ میر محمود علی صاحب جلسہ سے کچھ پہلے آئے تھے اور اپنی غیر معمولی مصروفیت کی وجہ سے شرکت جلسہ سے معذرت چاہی۔ جلسہ میں ڈاکٹر عبداللہ چغتائی صاحب کا خط پڑھا گیا۔ موصوف عہد اورنگ زیب کے تمام ماخذوں پر ایک بسیط مقالہ لکھنا چاہتے ہیں تاکہ اس عہد کے محققین کی خاطر خواہ رہنمائی ہو اور ان کی خواہش ہے کہ وہ مقالہ ادارۂ ادبیات کے طرف سے شایع ہو۔ بس طے ہوا کہ کام اچھا ہے لیکن اس کی طباعت واشاعت کا فیصلہ کرنے سے پہلے مقالہ کا مسودہ دیکھنا ضروری ہے۔ اس کے بعد رہبر فاروقی صاحب کے مولفہ مسودے پیش ہوئے۔ موصوف نے شعبۂ تاریخ دکن کے لئے ناصر جنگ شہید، مکہ مسجد، حضرت شاہ راجو لکھے ہیں اور صلابت جنگ اور مظفر جنگ پر بھی مقالے لکھنا چاہتے ہیں۔ طے پایا کہ ناصر جنگ صلابت جنگ اور مظفر جنگ کی کتابیں سلسلۂ سلاطینِ آصفیہ کی بجائے مشاہیر دکن کے سلسلہ میں شایع ہو سکتی ہیں بشرطیکہ ان کا معیار اعلا ہو۔ ناصر جنگ اور مکہ مسجد کے مقالے خواجہ محمد احمد صاحب کے سپرد کئے گئے کہ وہ پڑھ کر رائے قایم کریں۔ زاہد حیدرآبادی صاحب کا مسودہ ٹیپو سلطان بھی پیش ہوا۔ یہ مسودہ بھی رائے کے لئے خواجہ محمد احمد صاحب کے تفویض کیا گیا حضرت شاہ راجو کا

مقالہ معتمد شعبہ کے سپرد کیا گیا۔ آخر میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ اس شعبے کو زیادہ ترکس سرزمین کی تاریخ پر زور دینا چاہیے۔ یہ طے ہوا کہ دکن کو ایک وسیع مفہوم میں یعنی دریائے تاپتی سے دریائے کاویری تک سمجھنا چاہیے اور اسی وسیع سرزمین کا تاریخی مواد جمع کرنا چاہیے۔ گو آج کل ہم دکن صرف اس محدود سرزمین کو کہتے ہیں جو اس وقت سلطنت آصفیہ کی عملداری میں ہے۔ لیکن جغرافی اعتبار سے دکن ایک وسیع ملک ہے جو دریائے تاپتی سے دریائے کاویری تک پھیلا ہوا ہے۔

اس شعبہ کی طرف سے بعض مشاہیر دکن کے آثار کی تلاش وحفاظت کا کام برابر جاری ہے چنانچہ مشہور قطب شاہی امیر و سپہ سالار خیرات خاں کے گنبد واقع محلہ سلطان شاہی کی حفاظت اور احترام کے لئے محکمہ جات آثار قدیمہ، امور مذہبی، اور کوتوالی سے مراسلت کی گئی کیونکہ ادارہ کو معلوم کرایا گیا کہ بعض غیر ذمہ دار لوگ اس کی بے حرمتی کر رہے ہیں۔ چنانچہ محکمہ امور مذہبی اور کوتوالی سے اطلاع وصول ہوئی ہے کہ وہ اس کی طرف توجہ کر رہے ہیں۔

ادارے کی شاخیں ادارے کی شاخیں بھی شعبوں کی طرح پوری سرگرمی سے کام کر رہی ہیں۔ اس شمارے میں صرف دو شاخوں کی مصروفیتوں کا کچھ حال درج کیا جاتا ہے :۔

شاخ پربھنی میں جشن سال نو سنہ ۱۳۵۱ف یکم آذر سنہ ۱۳۵۱ف کو شاخ ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے ایک جلسۂ عام بصدارت مولوی محمد فاروق صاحب تیخ سی ایس دوم تعلقدار نہایت اعلیٰ پیمانہ پر منعقد کیا گیا۔ عوام کے علاوہ مقامی عہدہ دار بھی شریک تھے۔ سب سے پہلے مولوی عارف الدین حسن صاحب مہتمم آبکاری نے قرآن مبارک کو پڑھنے کی عزت حاصل کی جس کو حاضرین نے استادہ ہوکر سننے کی سعادت حاصل کی۔ مولوی حمید اللہ خاں صاحب شیدا معتمد شاخ نے ادارۂ ادبیات اردو کے مقاصد پر ایک پر مغز مقالہ سنایا۔

جناب نارائن صاحب ونڈے گاؤں کر بی اے ایل ایل بی (عثمانیہ) نے تقریر کی۔ آخر میں جناب صدر نے ادارۂ ادبیات اردو کے مقاصد کو واضح طور پر بیان کرتے ہوئے عوام کو اردو امتحانات میں شرکت کی طرف توجہ دلائی اور اردو عالم بابتہ سنہ ۱۳۴۰ف کے کامیاب طلبہ کو عارضی اسناد تقسیم کیں۔ مولوی عارف الدین صاحب کی طرف سے سب سے زیادہ رسائل پڑھنے والے اور سب سے زیادہ اخبارات پڑھنے والے کو دو انعامات دئیے گئے۔ اول الذکر انعام حمید اللہ خاں صاحب شیدا اور موخر الذکر تفضل حسین خاں صاحب کو ملا۔ تقسیم انعامات کے بعد مولوی عارف الدین حسن صاحب نے حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا اور "شاہ عثماں زندہ باد" کے نعرہ ہائے مسرت میں جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

شاخ گلبرگہ مولوی محمود حسین صاحب (عثمانیہ) معتمد شاخ گلبرگہ نے سنہ ۱۳۵۱ف کا ایک تفصیلی لائحہ عمل مرتب کر کے روانہ کیا ہے اگر اس کو عملی جامہ پہنایا گیا تو یقین ہے کہ وقت کی ایک اہم ضرورت پوری ہو جائے گی۔ گلبرگہ کے علم دوست اصحاب سے توقع ہے کہ وہ اس تعمیری کام میں شاخ کا ہاتھ بٹائیں گے۔ عوام کی معلومات کے لیے اس لائحہ عمل کا اقتباس درج کیا جاتا ہے۔

گلبرگہ شریف میں اردو زبان و ادب کا صحیح ذوق پیدا کرنے کے لئے اردو امتحانات کی ترویج اور ایک دار المطالعہ عام کا قیام عمل میں لایا جا رہا ہے؛ اور یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ اس دار المطالعہ میں زیادہ سے زیادہ کتابوں کو جمع کر کے ایک مکمل کتب خانہ بنا دیا جائے۔ گلبرگہ شریف چونکہ ایک تاریخی مقام اور علم و ادب کا گہوارہ رہ چکا ہے اس لئے وہاں کے تاریخی اور ادبی آثار کی حفاظت کی طرف توجہ کی جا رہی ہے۔ عوام کی معلومات میں اضافہ کرنے اور ان میں تقریر کی صلاحیت پیدا کرنے کے لئے تقاریر کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ تعلیم بالغان سے متعلق مفید

تجاویز کو روبہ عمل لانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہر سال عرس شریف کے موقع پر سالانہ جلسہ کرکے تقاریر اور اردو مطبوعات کی نمائش منعقد کی جائے گی تاکہ زیادہ سے زیادہ اصحاب اپنی زبان کی کتابوں سے واقف ہوجائیں۔ دیہات سدھار کے سلسلے میں مختلف دیہاتوں کا دورہ کرکے دیہاتیوں میں علمی ذوق پیدا کیا جائے گا اور بالخصوص اردو دانی کے امتحان کے لئے وہاں کے لوگوں کو تعلیم دی جائے گی تاکہ وہ امتحان دینے کے قابل ہوجائیں اور ناخواندگی جاتی رہے۔

سرپرست شاخ گلبرگہ شریف | شاخ گلبرگہ کے علم دوست سرپرست نواب غوث یار جنگ بہادر صوبہ دار گلبرگہ نے اپنے قیام حیدرآباد کے زمانہ میں صدر ادارہ کا تفصیلی معائنہ فرمایا۔ مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرکے اپنے مفید مشوروں سے کارکنان ادارہ کو مستفید کیا اور کتب خانہ میں کتابوں کے ذخیرہ میں اضافہ کرنے کے لئے مبلغ پچیس روپے کا عطیہ عنایت کیا جس کے لئے ادارہ کی طرف سے شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

ادارہ

نغمہ و فریاد

اے کیفِ سجدہ ریزی کیا مجھ کو ہوگیا ہے　　ذروں سے پوچھتا ہوں یہ کس کا نقشِ پا ہے

دنیا میں آدمی کی تخلیق اور کیا ہے!　　اک شعلۂ محبت سانچے میں ڈھل گیا ہے

بدمست ہو رہی ہے کیفیتِ تبسم　　تم نے چمن میں شاید کلیوں کو چھو لیا ہے

تنگ آکے زندگی سے مر بھی سکے نہ کوئی　　آخر، غمِ محبت کس درد کی دوا ہے

ہر منظرِ جہاں کو پوجا کریں گی نظریں　　جب تم نے امتیازِ جلوہ اٹھا دیا ہے

اک اک قدم پہ ٹھوکر، ہر بات میں تغافل　　انسان لغزشوں کا پتلا نہیں تو کیا ہے

کیا کوششوں سے ہوگا ماہر خدا پہ چھوڑو
گرداب میں ہے کشتی طوفان بڑھ رہا ہے

ماہر القادری

غزل

روزِ ازل سے آنکھ کا پردہ حجاب تھا　　　تارِ نگاہ رشتۂ بندِ نقاب تھا

تسکینِ قلب میں بھی مرے اضطراب تھا　　　دنیا کا انقلاب نگاہوں میں خواب تھا

محشر میں دل جلوں کو یہ معلوم ہو گیا　　　دوزخ کا نام تو فقط ان کا عتاب تھا

آنکھیں کھلی ہیں شانِ کریمی کو دیکھ کر　　　حائل اگرچہ پردۂ خوفِ عذاب تھا

فصلِ بہار آتے ہی توبہ کا ٹوٹنا ؟　　　میرے تو حق میں مژدۂ جامِ شراب تھا

دشمن پہ گر رہا ہے یہ بن بن کے بجلیاں!　　　اب تک تو میرے دل میں مرا اضطراب تھا

اُس بے وفا کو دل جو دیا چوک ہو گئی !　　　قسمت کا کیا گلہ ہے مرا انتخاب تھا

توبہ کے بعد بھی یہ رہی اپنی کیفیت!　　　نشہ کی طرح آنکھوں میں ذوقِ شراب تھا

جمتی نہ تھی نگاہِ تصور میں ان کی شکل　　　شوخی اُدھر تھی اور اِدھر اضطراب تھا

روزِ جزا حساب ہی میں شام ہو گئی　　　پیچیدہ کچھ گناہوں کا ایسا حساب تھا

دشمن کا راہ و رسمِ محبت میں کیا گلہ؟　　　دشمن تو خود مرا دلِ خانہ خراب تھا

داغِ جگر کو اپنے سمجھتے تھے ہم تو داغ
دیکھا عزیزؔ غور سے تو آفتاب تھا

عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

ہلالِ عید

مطلعِ تاریک پر رویت ہلالِ عید کی　　　آسمانِ یاس پر ہے کہکشاں امید کی

یعنے ہم حرماں نصیبوں کی مسرت کیلئے　　　اک نویدِ تازہ آئی ہے کسی کی دید کی

عظیم الدین محبت

غزل

آغازِ شوقِ یاد دلایا بہار نے
محشر بپا کیا دلِ بے اختیار نے

ہوتی رہیں ہزار مسرت کی یورشیں
چھوڑا نہ دل کا ساتھ غمِ روزگار نے

قصرِ امید اُن کے تغافل نے ڈھا دیا
تعمیر جو کیا تھا مرے اعتبار نے

یہ صبحِ گلستاں، یہ ضیا پاشِ آفتاب
بھیجا ہو جیسے کوئی پیمبر بہار نے

ہر انقلاب ہے مجھے درسِ حیاتِ نو
بخشی ہے وہ نظر مجھے پروردگار نے

دیکھا گیا نہ غنچہ و گل کا شکستِ ضبط
آخر چمن میں آگ لگا دی بہار نے

دل خوگرِ خزاں ہے نظر ناقدِ بہار
انساں بنا دیا ستمِ روزگار نے

اپنی نظر بساطِ خزاں سے نہ اُٹھ سکی
پردے اٹھائے لاکھ عروسِ بہار نے

لالے کے دل میں ہے مرے سینے کا داغِ عشق
میرے چمن سے پھول چنے ہیں بہار نے

ایسی گھڑی کچھ آئی خزاں جم کے رہ گئی
ایسی گئی پلٹ کے نہ دیکھا بہار نے

گہرا بہت تھا گرچہ فسونِ خزاں کا رنگ
حسنِ چمن نکھار کے چھوڑا بہار نے

اُن کا غرور اُن کو بلندی پہ لے گیا
مجھ کو سبک کیا دلِ زود اعتبار نے

جب مجھ کو تم نے اپنی نظر سے گرا دیا
پھر آ رہے ہو کیوں درِ دل پر پکار نے

احسان دشمنوں پہ بھی آنے لگا ہے پیار
وہ غم مجھے دیا ہے مرے غمگسار نے

احسان دانش

ادب اور سطح پسندی

عام خصوصیت | عمل کی دنیا میں، ہندوستان کی ایک عام خصوصیت بڑی دلچسپ ہے جسے ہم "تقلید و تعاقب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی مسئلہ ہو — علمی، اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی، ذہنی، جذباتی — ہر چیز میں جب کسی شخص کو نمایاں کامیابی ہوتی ہے، کوئی نیا راستہ سوجھتا ہے، کوئی جدت کی جاتی ہے، تو ہم سب اس عمل، اس جدت، اور اس راستے کا پیچھا اٹھاتے اور اسی انداز سے چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ پیچھا اٹھانا" دو قسم کا ہوتا ہے" ایک یہ کہ اس کام کو دیکھ کر کچھ رد و بدل کچھ تغیر کیا جائے" کچھ جدت سے کام لے کر اسے" اپنا لیا جائے یا صرف تقلید کی جائے۔ پہلا کام کسی قدر ذہانت والوں کا ہوتا ہے دوسرا ان کا جو نرے "بدھو" ہوتے ہیں۔ اگر کسی سے یہ دونوں کام نہ ہو سکیں تو وہ سطح پسندی پر اتر آتا ہے، جو ہمارے نزدیک ذہنی اور جسمانی عمل کا ایک مہلک اور فرسودہ جزو ہے۔

نظریۂ تقلید و تعاقب | ہمیں "تقلید و تعاقب" کا نظریہ سب سے زیادہ ادب میں نظر آتا ہے، اور اسی مناسبت سے سطح پسندی بھی۔ افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، مضمون نگار، نقاد، خطوط نویس، شاعر، ہندوستان میں کثرت سے پیدا ہو رہے ہیں، لیکن علمی نقطۂ نظر سے اگر ان کی تقسیم و ترتیب کی جائے تو جدت پرست اور تخلیقی اہلِ ادب دو چار فی صد سے زیادہ نہ ہوں گے، باقی سب مقلدین کی فہرست میں آ سکیں گے۔ بظاہر یہ تنقید سخت معلوم ہوتی ہے لیکن واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو حقیقت کے نظر آنے میں دیر نہ لگے گی۔ ایک شاعر پیدا ہوتا ہے جو اپنے فطری کمال کے تحت، اظہارِ خیال کا ایک خاص میدان، ایک نیا راستہ اختیار کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ جوشؔ کی مثال لیجئے۔ اس کا خاص میدان، اس کی شبابیات اور تنقید زندگی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ کئی ایک طریقوں سے جوشؔ کی شبابیات کا عنصر ہماری شاعری کے بڑے حصے میں داخل ہو گیا ہے۔ کہیں یہ ظاہر ہے، اور کہیں پوشیدہ۔ اسی طرح اس کے انقلابی خیالات میں "تقلید و تعاقب" کی گرم بازاری نظر آ رہی ہے۔ قاضی نذر الاسلام اور اُس کا انقلابی ادب اس پر ایک اور اضافہ ہے۔ اگرچہ بنگال کا یہ مشہور سخنور اردو زبان کا شاعر نہیں، لیکن ترجموں کی وجہ سے ہی، اس کے تیز خیالات نے شعری دنیا کے ایک پُرجوش حصے کو مسخر کر لیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے کہا، شاعری کے میدان میں "تقلید و تعاقب" کا نظریہ کئی طرح سے کام کر رہا ہے۔ لیکن جوشؔ کی کھلم کھلی تقلید ہے۔ کہیں نذر الاسلام پر بدلے ہوئے الفاظ کا پردہ ہے، کہیں اقبال کے موضوع سے کوئی دوسرا موضوع نکالا جا رہا ہے کہیں جوشؔ کے انقلاب سے کسی اور طرف زد لگائی جا رہی ہے۔ یہی حال غزل گوئی کے میدان میں غالبؔ کے اندازِ بیان کا ہے۔

نتیجے | اس نظریۂ "تقلید و تعاقب" کے مختلف نتیجے پیدا ہو رہے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ ادب بدقسمتی سے ہر کس و ناکس کا میدان بنتا جا رہا ہے، کیونکہ ان کے نزدیک ادب "سستی چیز ہے" ادب کی اس مقبولیت کی وجہ، جس کا نام غلطی سے "ارزانی" رکھا گیا ہے، یہ ہے کہ ادب زندگی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے۔ انسان کی فطرت میں ادب کو ایک لطیف اور خوش گوار شئے کی صورت میں قبول کرنے کی عام صلاحیت ہوتی ہے، اور چونکہ ادب حیات کی لطافتوں سے براہ راست متعلق ہے، اس لئے مکدر دنیا کے لوگ اسے ایک جائے پناہ سمجھ کے، اپنی روح، قلب اور دماغ کو اس کے سائے میں لے آتے ہیں۔ ادب میں پناہ ڈھونڈنے کی حد تک تو اُن کی کوشش

جائز ہے، لیکن وہ اونٹ کی طرح عرب کے ڈیرے میں سر رکھ کے، آہستہ آہستہ سارے ڈیرے پر قبضہ جمانے کی سعی کرتے ہیں تو مضحکہ خیز بن جاتے ہیں۔ ہمارا نظریہ یہ ہے کہ دوسرے علوم و فنون کی طرح ادب، گو وہ زندگی سے انتہائی قریب ہے، ایک خاص فن، ایک خاص شعبہ ہے جس میں کامیابی کے لئے فطری صلاحیت اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ ہمیں بہت افسوس ہے کہ نظریہ "تقلید و تعاقب" اس اصول کی خلاف ورزی کر کے ادب کو بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ "تقلید و تعاقب" ہمارے نزدیک اگر کسی بلند تر ادب اور ترقی یافتہ آرٹ کا کیا جائے تو برا نہیں، لیکن ہر وقت اس کا استعمال، آزادیٔ عمل کی ایک اندھی قربانی ہے۔

ادبی خودکشی | اس منزل پر بعض ادب پسند حضرات کا جو کسی بےلاگ تنقید سے ہمیشہ چیں بہ جبیں ہوتے ہیں شاید یہ جواب ہو کہ ادب کی دنیا میں "بڑی شخصیت" "بڑی تحریکات" کا ایسا ہی اثر ہوتا ہے۔ ہم بھی اس کے مخالف نہیں ہیں، لیکن عرض کرنا یہ ہے کہ بڑی شخصیت سے متاثر ہونا حلال، لیکن اسے اپنے اندر اس طرح حلول کرنا کہ اپنی شخصیت گھر سے نکالے ہوئے غلام کی طرح الگ جا پڑے حرام ہے۔ یہ ایک قسم کی خودکشی ہے۔ اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ کسی بڑے اثر کو قبول کرنے سے ہمیشہ انکار ہی کیا جائے "تاکہ اپنی دنیا" خواہ وہ محدود اور غیر ترقی یافتہ ہی کیوں نہ ہو، اس سے دور رہے۔ اس قسم کی خودکشی کرنے والے اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے اور اس پر فخر و ناز کرتے ہیں، اور ان کے معتقدین انھیں سراہنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔

سطح پسندی اور تین طبقے | ادب کی نشر و اشاعت اور عام ترقی کی حد "نظریہ تقلید و تعاقب" پھر بھی اتنا برا نہیں جتنا اس سے پیدا ہونے والی ایک اور خرابی یعنی "سطح پسندی" ہے۔

یہ ایک قسم کا گھن ہے جو ادب کے ثمردار درخت کو لگ جاتا ہے اور ہٹائے نہیں ہٹتا۔

ادب کی دنیا میں "تقلید و تعاقب" کی زد سے محفوظ رہنے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن میں تخلیق کا مادہ آزاد او رفطری ہے، دوسرے وہ جو نرے اپاہج ہیں اور کوئی اپنا کام نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کے درمیان جو متوسط طبقہ ہے وہ کسی نہ کسی طرح "تقلید و تعاقب" کی گرفت میں آجاتا ہے۔ اس کے برعکس، ہر وقت اس کا امکان ہے کہ "سطح پسندی" کی زد میں اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ، تینوں درجوں کے لوگ آجائیں۔ ادنیٰ درجے کے لوگوں کا ذکر ہی فضول ہے، البتہ متوسطین اور اعلیٰ سے بحث کی جا سکتی ہے۔

متوسطین | ادب کے متوسط طبقے سے ہماری مراد وہ لوگ ہیں جو صرف ایک "ذہنی عشرت" اور "دماغی تفریح" میں مبتلا ہیں یہ اوسط درجے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کا علم بھی "تھوڑا" ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کسی کی شاعری کا یہ عالم ہو کہ وہ جگر اور جوش کی پیداوار پر زندگی بسر کرتا ہو، یا کسی کی تنقید کا یہ حال ہو کہ اس کی معلومات بہ مشکل آب حیات اور مقدمہ شعر و شاعری سے آگے جاتی ہوں، تو ہم ایسوں کو متوسط طبقے ہی میں شمار کریں گے۔

ہندوستان کی ادبی دنیا میں، دوسرے ملکوں کی طرح، "متوسطین" کافی تعداد میں ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ ہمارا طبقۂ متوسطین، اگر ایک طرف "تقلید و تعاقب" میں گرفتار ہے تو دوسری طرف وہ سطح پسندی کے جال میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے ممالک کے متوسطین، یا تو اپنی آزاد خیالی اور فطرت سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں، یا خاموش رہتے ہیں۔ ہندوستان کی طرح خواہ مخواہ دخل انداز ہو کر ادب کے پاک چشمے کو گندلا نہیں کرتے۔

اعلیٰ قسم کے سطح پسند اعلیٰ قسم کے "سطح پسند" ہماری گہری توجہ اور ہمدردی کے محتاج ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے سامنے علم کی وسعت موجود رہتی ہے، جو خدا داد جوہر اور اعلیٰ صلاحیت کے مالک ہوتے ہیں، ان کے سامنے ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کی بہت سی توقعات وابستہ رہتی ہیں۔ جب یہ لوگ ادبی عمل کی شاہراہوں سے ہٹ کر تنگ و تاریک گلیوں اور چھوٹے چھوٹے راستوں پر چلنے لگتے ہیں تو ان پر بڑا رحم آتا ہے۔ یہ سوانح لکھتے ہیں، لیکن سوانح نگاری کے بلند اصولوں اور لوازم سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ یہ شعر کہتے ہیں، لیکن دل و دماغ پر خاص زور ڈالنا نہیں چاہتے۔ دنیا کی سطحی واہ وا سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تنقید کرتے ہیں، لیکن تنقید کے چند اعلیٰ اصول مثلاً تقابل توازن، بلند نظری اور الطاف سے کام نہیں لیتے۔ چھوٹی چھوٹی تعریفوں اور چھوٹی چھوٹی ہمت افزائیوں سے دل موہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی یہ خدمتیں علمی نقطۂ نظر سے ادب والوں کے حق میں ایک قسم کی زہرخورانی ہوتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہندوستان میں قابل لوگ زیادہ ٹھوس، زیادہ سنجیدہ اور زیادہ مشکل ادب پیدا کرنے کی طرف توجہ کریں، تاکہ علم و عمل دونوں سے "سطح پسندی" کے زہریلے اثرات زائل ہو جائیں۔

سطح پسندی کے چند اسباب سطح پسندی کی نوعیت واضح طور پر اس وقت سمجھ میں آئے گی جب ہم اس کے چند اسباب پر غور کریں گے۔ ہندوستان میں اور خصوصاً ہمارے ملک میں سطح پسندی کیوں عام ہے؟ یہ ایک دلچسپ اور ضروری سوال ہے۔ سطح پسندی کو اکسانے والے مختلف اسباب میں سے چند قابلِ توجہ اور اہم ہیں۔

سب سے پہلی وجہ جسے ہم نے واضح کر دیا ہے نظریہ "تقلید و تعاقب" ہے۔ "تقلید و تعاقب" کے مدرسے سے جو لوگ تربیت حاصل کر کے نکلتے ہیں وہ کسی نہ کسی طرح سطح پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ سیکھنے کے لئے ابتداءً انسان دوسروں سے مدد لیتا ہے، دوسروں کا پیچھا اٹھاتا ہے، لیکن اس راہ عمل میں اگر وہ صرف مدد لینے اور پیچھا اٹھانے ہی کا ہو جائے تو وہ ایسے کاموں میں پڑ جاتا ہے جو کم محنت، زیادہ کامیابی کم قابلیت زیادہ نمائش، کم تکلیف اور زیادہ مسرت کا باعث ہوتے ہیں۔ وہ بتدریج شخص پرست بھی بن جاتا ہے۔ اسے علم کی وسیع دنیا اور اس کے بے شمار آزاد اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، وہ بار بار اس جگہ آتا اور اس کے اطراف گھومتا ہے جہاں ایک معین اور محدود فضا پہلے سے تیار مل جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ دوسرے چراغ سے اپنا چراغ جلاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس میں اندر سے روشنی پیدا کرنے کی صلاحیت گم ہو جاتی ہے، اسی لئے اقبال نے لکھا ہے۔

> ترک کن ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
> اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

عدم مطالعہ سطح پسندی کا دوسرا بڑا سبب "عدم مطالعہ" ہے۔ عدم مطالعہ سے ہماری مراد نہ صرف کتابیں پڑھنے سے محروم رہنا ہے، بلکہ ایسی کتابیں بھی پڑھنا ہے، جو نسبتاً کم درجے کی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انسان کی تعلیم کے تین اجزا ہیں — ایک کتاب، دوسرے زندگی، تیسرے نفس کی خود تعلیمی۔ ان میں فرق مدارج کرنا صحیح نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک انسان کی مکمل تعلیم کے لئے یہ تینوں ذرائع لازم و ملزوم ہیں۔ "عدم مطالعہ" سے ہماری مراد ان تینوں ذرائع سے محرومی ہے۔

اردو ادب میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے، لیکن جو لوگ دوسری زبانوں کے ترقی یافتہ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ انھیں یہ کہتے ہوئے خوف نہیں محسوس ہوتا کہ اردو میں ابھی بھی ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ بعض لوگ ہمارے اس خیال کے حامی

نہیں۔ وہ صرف ایک جذبۂ یعنی "زبان سے محبت" کے تحت ایسا
کہتے ہیں۔ لیکن ایسا کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ "نادانی کی دوستی"
ہے۔ افسانہ، ڈرامہ، سوانح، مضمون نگاری، شاعری، تنقید،
ناول نویسی، خطوط نگاری، ڈائری نویسی، آپرا، یہ سارے
میدان خالی پڑے ہیں۔ شاعری اور افسانے کی طرف کچھ توجہ
ضرور ہے لیکن یہ بھی معیاری نہیں۔ ان حالات میں اردو ادب پڑھنے
کے لئے ضروری ہے کہ اگر وہ موجودہ علم کے رجحانات اور جدید زمانے
کے اقتضا کا ساتھ دینا چاہتا ہے تو کم از کم انگریزی ادب سے
جو اس وقت دنیا کے وسیع ترین ادب میں شمار کیا جاتا ہے کچھ قریبی
تعلق پیدا کرے۔ اس وقت دنیائے علم میں ہر شعبۂ علم و فن سے
متعلق مستند اور معیاری کتابیں مل سکتی ہیں۔ سطح پسندی کے چنگل
سے نکلنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کسی بلند نظر اور وسیع تر دنیا
کی سیر کرے اور ادب کے چند اعلیٰ نمونوں اور شاہکاروں سے
استفادہ کرے۔

تقابل اور توازن

اس مقام پر دو قسم کے مبالغوں سے
بچنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ انسان مطالعے کی کثرت میں اپنی
انفرادیت اور آزادیٔ خیال گم نہ کرے، دوسرے وہ اس طرح
غیر زبان کا ہو کر نہ رہ جائے کہ اسے اپنی ہر چیز سے نفرت اور
تحقیر پیدا ہو اور آہستہ آہستہ ذوق ہی سے ہاتھ دھونا پڑے۔
بعض مغرب زدہ ہستیاں اردو ادب پر اس قسم کے احسانات
فرماتی ہیں۔ ان احسانات سے دور رہنا ضروری ہے۔ اس کے
ساتھ یہ امر نہایت مفید ہے کہ انسان وسعت مطالعہ کے دوش
بدوش "تقابل مطالعہ" کی بھی عادت ڈالے۔ ادبی خوبیوں کا اندازہ
تقابل اور توازن سے بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہماری
ادبی دنیا میں تقابل اور توازن کا اصول زیادہ رائج نہیں ہے۔

اس میں کچھ تو مطالعہ اور ذوق کی کمی، اور کچھ "ادبی تعصب" کو
دخل ہے۔

ذوق کا فقدان اور دماغی کج روی

سطح پسندی
کا تیسرا اہم سبب ذوق کا فقدان، یا "دماغی کج روی" ہے۔ ذوق اور
وہ بھی ذوق سلیم ایک خداداد جوہر ہے، اور اسی کی بدولت ہر شعبۂ علم و فن
اپنے امتیازات رکھتا ہے۔ ادب کا بھی ایک فطری ذوق اور ایک
جبلی صلاحیت ہوتی ہے جو اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ تربیت سے زیادہ
قیمتی ہے۔ اگر ذوق نہ ہو تو ادب کی دنیا میں انسان "مردہ"
بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن جس طرح ذوق ایک خداداد نعمت
ہے، اسی طرح ایک زحمت بھی ہے۔ بسا اوقات ذوق ہی کے تحت
کثیر اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے اور بدقسمتی سے یہ اختلاف رائے
سطح پسندی کی بنیاد بن جاتا ہے۔ لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ
یہ ہماری پسند کی چیز ہے، ضروری نہیں کہ آپ کی پسند کی بھی ہو۔
کہتے ہیں، کیا ضروری ہے کہ آپ کی مرغوب کتاب یا ادبی
کام ہمارے نقطۂ نظر سے بھی معیاری ہو؟ یہاں ایک نفسیاتی مغالطہ
کام کر رہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ذوق اگر صحیح ہے تو ادب میں معیار
اور عمدگی کا سمجھنا اتنا دشوار نہیں، اور یہ ذوق کی نیک اور خوش گوار تربیت
پر منحصر ہے۔ بہت سے صاحب ذوق ایسے ہوتے ہیں جنہیں صحیح تربیت
نہیں ملتی، اس لئے ان کی خداداد صلاحیت کا ایک بہت بڑا حصہ
رائگاں جاتا ہے۔ جب ایسے شخص سے سابقہ ہو تو کسی ادبی
مسئلے کے حل کرنے، اور اگر وہ بدقسمتی سے سطح پسندی کے جال میں پھنس
گیا ہو تو اسے اس جال سے نکالنے میں بے شمار دقتوں کا سامنا
کرنا پڑتا ہے۔

کج دماغی کا اثر ادب پر

صاحب ذوق کے علاوہ ادبی کج دماغ
بھی ہوتے ہیں۔ ان کی یہ کج دماغی نفسیاتی نقطۂ نظر سے کوئی خطرناک

نہیں ہوتی، کیونکہ یہ نتیجہ ہوتی ہے انسان کی اس جبلی خاصیت کا جسے "احساسِ آزادی" کہتے ہیں۔ بعض لوگ اس مزاج کے ہوتے ہیں کہ وہ فطرت کے ہر بندھن، علم، فن، تہذیب کی ہر بندش سے اپنی آزادی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ کج دماغ شخص اپنے اندر آزادیٔ خیال کا شدید جذبہ رکھتا ہے۔ اگر اس کا یہ جذبہ اپنا کام کرتا ہے تو ادب کی دنیا میں اس کی کج دماغی اچھی چیز ثابت ہوتی ہے، اس کے برعکس اگر وہ سطح پسندی اور کاہلی کا شکار ہو تو اس کا مرض متعدی ہونے کے علاوہ لاعلاج بھی بن جاتا ہے۔

کج دماغی کی بہت سی قسمیں ہیں، اگر ہم اس کا تجزیہ کریں تو بحث طویل ہو جائے گی۔ مختصراً ہم اس کج دماغی کو اچھا سمجھتے ہیں جو حالی کے اس شعر پر شدت کے ساتھ کاربند ہوتا ہے۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں!

لیکن اگر کسی ایسے کج دماغ سے سابقہ پڑ جائے جو کم درجے کی چیزوں اور گھٹیا درجے کے ادب کا حامی ہو، اور اس کے دماغ میں بلند و پست کا توازن اتنا مفقود ہو کہ وہ صحیح رائے قائم کرنے میں غلطی بھی کرے اور اصرار بھی، تو ادب کو ایک قسم کی وبا اور ہلاکت سے دوچار ہونا پڑے گا۔

ذوق اور علم کا توازن بےحد ضروری ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی ایک طرف پلہ بھاری ہونے اور دوسری طرف کم ہونے سے خطرناک سطح پسندی پیدا ہوتی ہے۔ کم علم آدمی اپنے ذوق محض سے کام نہیں لے سکتا، اسی طرح بدذوق آدمی اپنے علم کو اپنے لئے وبالِ جان بنا لیتا ہے۔ علم کا کام یہ ہے کہ وہ ادب کا بلند مقام بتائے، اور ذوق کا کام یہ ہے کہ انسان کو بلندی اور پستی کے امتیاز کے ساتھ اس رفعت تک پہنچا دے جس کی رہنمائی علم نے کی ہے

ادبی ضد سطح پسندی کی محرک ایک قسم کی "ادبی ضد" بھی ہے جو عام طور پر بحث مباحثے کی کثرت سے پیدا ہو جاتی ہے۔ زید ایک کتاب پڑھتا ہے، اور کئی حالات کے تحت اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ اسی کتاب کی مخالفت کوئی دوسرا شخص کرتا ہے، دونوں میں شدت کے ساتھ بحث شروع ہو جاتی ہے گھنٹوں کی دماغ ریزی کے بعد اصل مسئلہ تو ہٹ جاتا ہے اور دونوں میں ایک ضد پیدا ہو جاتی ہے کہ یا تو اپنی بات منوائے یا اس پر اپنی سختی سے قائم رہے کہ دوسرا اس سے لڑ کر پسپا ہو جائے۔ ادبی مسائل میں اگر بحث سنجیدگی اور اصول کے ساتھ ہو تو یہ وسعتِ خیال کا باعث ہوتی ہے۔ مگر یہ عام تجربہ ہے کہ ان حدوں کو قائم رکھنا بحث کرنے والوں کی قوت سے باہر ہو جاتا ہے۔ اس لئے بسا اوقات ادبی بحث، انسان کے مذاق کو متلون، اور اس کی قوتِ توازن کو سخت متاثر کرتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ایسی باتوں پر سختی کے ساتھ اڑ جاتا ہے جو اصولاً سطحی ہوتی ہیں، لیکن حالات کے تحت دل و دماغ اس سے سخت متاثر رہتے ہیں۔

خارجی اسباب ادب میں کسی امر کے پسند یا ناپسند ہونے کے چند خارجی اسباب بھی ہیں۔ فرض کیجیے میں ایک ایسے زمانے میں جب کہ زندگی نے مجھے پریشان کر دیا ہے، ایسی کتاب پڑھوں جس کے لفظ لفظ سے انتقام اور انقلاب کی آواز آ رہی ہے، لازم ہے کہ میں اس وقت اس کتاب کو بہت پسند کروں گا لیکن اگر میں اسے کسی ایسے شخص کے قلب و دماغ پر سوار کرنے کی کوشش کروں جو امن و سکون کی زندگی بسر کر رہا ہو، تو ظاہر ہے کہ انقلاب کی آواز اسے صدائے بے ہنگام معلوم ہوگی۔

جذبۂ غرض مندی جہاں تک ہماری سرزمین کا تعلق ہے سطح پسندی کے اسباب میں نمایاں سبب ایک جذبہ ہے جسے "غرض مندی" کا

کہا جا سکتا ہے "غرضمندی" کئی قسم کی ہوتی ہے — دوستی کا لحاظ، مالی منفعت، نقصان کا خوف، محبت، ممنونیت، تشکر، اظہار عجز و تواضع وغیرہ۔ ہمارے یہاں شخصیتوں کی عظمت کا توازن چند اور خارجی حالات سے بھی کیا جاتا ہے جو اصلی نہیں ہوتیں بلکہ اضافی ہوتی ہیں۔ اکثر و بیشتر، ان اضافی تعلقات کی بناء پر کوئی شخص، کوئی طبقہ، کوئی خاندان بلکہ کوئی قوم، ادب کی دنیا میں چند ایسی کوششوں کی تعریف اور نشر و اشاعت پر مجبور ہو جاتی ہے جو کسی سطحی لیکن اضافی طور پر کسی "بڑے شخص" یا بڑی جماعت" کی طرف سے شائع ہوتی ہیں۔ ادب کے متعلق نظریہ یہ کچے ڈ ٹے سے دیا جلتا ہے "یہاں یہ نظریہ کار فرما ہے کہ" ادب سے کام نکلتا ہے۔"

اعتقاد | "ادبی غرضمندی" کا ایک بدلا ہوا روپ "اعتقاد" بھی ہے۔ بعض اصحاب کو بعض ادیبوں کے کارنامے اس قدر بھا جاتے ہیں کہ اس کے بعد وہ اعتقاد کی دنیا میں گم ہو کر، ساری قوت تنقید و توازن کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ ادب کے ہر شعبے میں اپنی اعتقادی تمثیل ہی سے محاکمہ کرتے ہیں۔ اگر یہ جذبہ انفرادی حیثیت رکھے تو برا نہیں، لیکن جہاں اعتقاد اور حسن ظن باقاعدگی کے ساتھ ایک مدرسۂ خیال بن جاتا ہے، جہاں کمزور محاکمات کو دوسروں کے دماغوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جہاں آزادیٔ رائے کو کچلا جاتا ہے، جہاں جماعت بندیاں ہوتی ہیں، اور ہیرو پرستی کا مذہب، رائج ہوتا ہے، وہاں ادیب ایک قیدی بن جاتا ہے جسے آزادی کے ساتھ ہاتھ پاؤں مارنے کی مطلق اجازت نہیں ہوتی۔ حالانکہ ادب کو ایک آزاد پرندے کی طرح اڑنا چاہئے کہ وہ فطرت کے جس مناسب مقام پر چاہے بیٹھے اور جس طرح چاہے نغمہ سرائی کرے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ادب میں "غرض مندی" کا رتبہ جب تک بلند نہ ہوگا اس وقت تک سطح پسندی اس سے دور نہ ہو سکے گی۔ بڑے ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار کی صرف یہ غرض نہ ہونی چاہیے کہ لوگ اس کی تعریف کریں، اس کی شہرت بھی ہو اور مادی منفعت بھی۔ اصل شان تو یہ ہے کہ اس کے اعلیٰ خیالات سے قوم کے دل و دماغ مستفید ہوں اور مستقبل سنوارا جا سکے۔ "سستی محنت اور سستی شہرت" کے لئے ہندوستان میں بہت سے ادبی کام ہو رہے ہیں؛ اور بہت سے گھٹیا درجے کے رسالے اپنی غلط تعریفوں سے نہ صرف ادبی معیار کو گھٹا رہے ہیں بلکہ قوم کے مذاق کو خراب کر رہے ہیں۔

تنقید | اس سلسلے میں مناسب یہ ہے کہ تنقید کا مختصر ذکر بھی کر دیا جائے، جو سطح پسندی کی نشر و اشاعت کا ایک اہم آلہ ہے۔ فن تنقید ایک مخصوص فن ہے، اور اس کے لئے ذوق کے ساتھ علمی تبحر کی بھی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اہل قلم اپنے تھوڑے سے ذوق کے تحت ادبی کاموں کے متعلق خام رائے ظاہر کرتے، اور غیر ذمہ دارانہ تعریف یا مذمت سے کام لیتے ہیں، وہ اپنی کم علمی سے ایک معصوم گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں جو ادب کی دنیا میں قابلِ معافی نہیں ہو سکتا۔ بار بار ایسی تنقیدیں یا تعریفیں چھپتی ہیں جس کی آڑ میں چھوٹے چھوٹے لوگ سامنے لائے جاتے ہیں، اور اصول پرست اور اعلیٰ خیال اہلِ علم کو پچھلی صف میں ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ ادبی خدمت نہیں بلکہ ادبی منافقت ہے۔ سطح پسندی کے تحت، تعریف تو خطرناک ہوتی ہی ہے، لیکن تنقیص یا مذمت اس سے زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ اس کی بدولت علمی معیار اور ضوابط کو سخت دھکا لگتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے ادب والوں میں اعلیٰ مطالعہ، اعلیٰ تبادلۂ خیال کے ساتھ ساتھ "حق شناسی" کا ذوق بھی پیدا کیا جائے۔

قدر افزائی جب سطح پسندی پر اعتراض ہوتا ہے تو بعض لوگ "ادبی قدر افزائی" کی بحث چھیڑتے ہیں، لیکن یہاں غور و فکر سے کام لینا ضروری ہے۔ قدر افزائی واقعی ایک قابلِ قدر چیز ہے، لیکن قدر حاصل کرنے والے سے زیادہ، قدر بڑھانے والے پر اس کی ذمہ داری ہوتی ہے، کہ وہ مناسب اور محتاط طریقے سے ادبی اعمال کی نگہداشت کرتا رہے۔ قدر افزا شخص میں اعلیٰ اور پست ادب کو پہچاننے، وزنی اور غیر وزنی، ٹھوس اور سطحی، اصولی اور غیر اصولی ادبی مساعی میں ایک خوش گوار توازن کرنے کی اعلیٰ صلاحیت ہونی چاہیے۔ "علمی قدر افزا" خاموش طریقے پر ایک قسم کا عالمگیر محرک ہوتا ہے، اور ظاہر ہے کہ ادب کی وسیع دنیا میں اس کی تحریکات کو محدود نہ ہونا چاہیے۔ اگر وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ایسے امور کی حمایت کرنے کے لئے جو زیادہ تر اس کے مذاق اور سطح کے ہیں، تو اس کی حمایت "سطح پسندی" پیدا کریگی، کیونکہ اس کے بڑھائے ہوئے لوگ اس سے خوش ضرور ہوں گے، لیکن ان میں اعلیٰ عزم، احتیاط، بلند تر کوشش اور سعی مکرر کی وہ صحت بخش صفات پیدا نہیں ہوں گی جو ادبی اعمال کے لئے ازبس ضروری ہیں، بسا اوقات بے لگام ہمت افزائی کی بجائے ایک نہایت "محتاط گوشمالی" سے ادبی قابلیت نشو و نما حاصل کرتی اور ترقی پاتی ہے۔ ہمت افزائی یا قدر افزائی کے لئے عام طور پر تحسین و تعریف ہی کا ذریعہ استعمال کرنا جائز نہیں، کیونکہ آگے چل کر یہ ذریعہ کام کرنے والے کی صلاحیتوں کو محدود کر دیتا اور انھیں عام تحسین کا تابع بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس بعض وقت اس امر کی ضرورت، نہ صرف افراد بلکہ قوموں کو لاحق ہوتی ہے کہ خوش گوار تنبیہہ اور نیک ہدایت سے کام لیا جائے۔ وقتیہ تنقید کمزوریاں رفع کرتی اور ترقی کے راستے کھولتی ہے۔

جذبۂ رعب و امتیاز سطح پسندی کا ایک اور سبب وہ مرعوب کن جذبہ ہے جو انسان میں ہر وقت ابھرتا ہے۔ عنفوانِ شباب ہی سے انسان یہ کوشش کرنے لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو منوائے اور سوسائٹی میں ایک امتیاز حاصل کرے۔ یہ صفت بہت اعلیٰ قسم کی ہے، لیکن اس کی نشو و نما میں، خصوصاً ادب کی حد تک احتیاط کی ضرورت ہے۔ بہت سے لوگ رعب گانٹھنے کے لئے ریا آمیز طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ان میں سے عام طریقہ بڑی بڑی کتابوں کا حوالہ دینا، چند مشہور مقولوں کو نقل کر دینا، یا بڑے لوگوں کے نظریات کا ذکر کر کے گپ بازی کرنا ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی سطح پسندی ہے، کیونکہ اس مشرب میں ادیب یہ محسوس نہیں کرتا کہ حوالے اور مقولے اور گپ بازیاں اسی وقت جچتی ہیں، جب کہ خود اس کی تحریر اور نظریات میں بلندی اور جدت ہو۔ تحریر کا انداز صاف بتا دیتا ہے کہ لکھنے والا کس مقام پر ہے۔ اگر وہ کمزور خیالات اور کمزور اندازِ بیان میں اس قسم کی چیزوں کو چسپاں کر دے گا تو صاف ظاہر ہو گا کہ ٹاٹ میں حریر کا پیوند لگایا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ لوگ "ادبی کثرتِ کار" کو اپنے جذبۂ شہرت اور تسلی کا آلۂ کار بناتے ہیں۔ اگر اس کثرتِ کار میں صحیح معیار نہ ہو تو ظاہر ہے کہ ان کی یہ مساعی ہر قدم پر اپنا آپ مضحکہ بن جائیں گی۔ بعض لوگ کچھ بھی نہیں کرتے، لیکن اپنا اندازِ تخاطب بہت بلند، محتاط اور موثر رکھنا چاہتے ہیں۔ کبھی کبھی لفاظی اور چرب زبانی سے تنقید و تبصرہ کا میدان جیتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک ایسے انسانوں کی مثال اس ریڈیو کی ہے جس سے اعلیٰ تقریریں نشر ہوتی ہیں لیکن خود اس میں دو چار نلیوں کے سوائے کچھ نہیں ہوتا۔

شانِ بے نیازی اس سلسلے میں ایک اور صفت کا ذکر ضروری ہے جو سطح پسندی کی تخلیق کرتی ہے۔ ہم اس کا نام

"شانِ بے نیازی" رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ وہ صفت ہے جو ادیب کو علمی تنقید، اصولی گرفت اور معقول اعتراض سے بے پروا بنا دیتی ہے۔ شعر غلط کہے جا رہے ہیں، تنقید میں اوچھا پن پایا جاتا ہے، افسانے اور ڈرامے صاحب نظر اصحاب کے نزدیک معمولی درجے سے زیادہ نہیں، لیکن شاعر، نقاد، ڈرامہ نویس اپنا کام کئے جاتے ہیں اور کسی چیز کی پروا نہیں کرتے۔ یہ بے حسی ایک قسم کی بناوٹ ہے، اور اس کا محرک وہی جذبۂ زعم و امتیاز ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کی سطروں میں کیا ہے۔ ایسے اصحاب کا عموماً یہ استدلال ہوتا ہے کہ وہ "اپنی نظیر آپ ہیں"۔ یہ شاید درست ہو، لیکن ادب کی دنیا میں "اپنی آپ نظیر" کے معنی یہ تو نہیں کہ اصول، معیار اور ذمہ داری کی ساری حدود کو نیست و نابود کر دیا جائے؟ جب تک ادیب ایسی بے حسی اور غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے وہ ایک طرح کی سطح پسندی ہی کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر بے نیازی کی دنیا میں آجاتا ہے تاکہ ادبی کمزوریاں جو قابلِ گرفت ہوں، اور جس کا دور کرنا اس کے بس کی بات نہ ہو۔ اس پر کوئی ذمہ داری نہ عائد کریں اور اس کا کام چلتا رہے۔

خطرے کی گھنٹی ان حالات کے تحت ہم شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے ادبی ماحول میں طالب علم، فارغ التحصیل، اہل شوق اور اہل ذوق سبھی کے لئے سطح پسندی سے نجات حاصل کرنا ازبس ضروری ہے۔ یہ ایک خطرے کی گھنٹی ہے جو شب و روز بج رہی ہے، اگر اس کی آواز پر کان نہ لگائے گئے تو بہت دنوں کے بعد بھی ہماری ادبی قوم اپنے اصلی مقام پر نہ کھڑی ہو سکے گی۔ "تقلید و تعاقب" "سطح پسندی" اور "شدید خیالی" سب کے سب ادب کے نقصان رساں عناصر ہیں۔ ان سے ہر اہلِ ذوق کو دور رہنا چاہیے۔ قوم کی ادبی کوششوں کا بڑھنا بے شک ایک کار باصواب ہے، لیکن قوم کی ذہنیت اور مذاق کا سطحی ہو جانا، بہت بڑا عذاب ہے!

محمد عبد القیوم خاں باقی

غزل

انھیں دل دے کے اب پچھتا رہا ہوں
سزا اپنے کیے کی پا رہا ہوں

انھیں در پردہ ہے مجھ سے محبت
انھیں باتوں میں دل بہلا رہا ہوں

پلا دے ساقیا ہاں پھر پلا دے
کہ پھر موجود خود کو پا رہا ہوں

وہ آئیں گے اور اب آتے ہی ہوں گے
میں اپنے دل کو یوں سمجھا رہا ہوں

گھڑی بھر دم تو لے اے اخترِ صبح
ترے ہمراہ میں بھی... آ رہا ہوں

پلا ساقی کہیں توبہ نہ کر لوں
کہ ہشیاری میں بہکا جا رہا ہوں

شبِ فرقت میں ناصر چپکے چپکے
کسی کی داستاں دہرا رہا ہوں

اختر الزماں ناصر

دو خواب

(۱)

تیس (۳۰) تا ساٹھ (۶۰)

تیس تا ساٹھ پر میرا تقرر ہوا تھا۔ گریجویٹ ہی تو تھا۔ بھلا میرے لئے ترقی کی کون راہ رکی ہوئی تھی۔ سکنڈ گریڈ، فرسٹ گریڈ، تحصیلداری، تعلقداری غرض میں تمام عہدوں کے لایق تھا یا یوں سمجھئے کہ یہ سب عہدے میرے قابل تھے اور پھر ترقی کے لئے ہے ہی کن چیزوں کی ضرورت۔ ذرا سی دیانتداری اس پر افسر اعلیٰ کی خوشی اور ناراضی کا کامل لحاظ بس بیڑا پار ہے۔ مجھے ترقی کیسے ہوئی یہ تو یاد نہیں رہا۔ ہاں اتنا خیال ہے کہ دیکھتے دیکھتے تحصیلدار اور پھر تعلقدار بن بیٹھا۔

تعلقداری کی شان دار عمارت میں کرسی حکومت پر متمکن ہوں۔ چپراسیاں کمربستہ ایستادہ ہیں صیغہ وار باری باری سے امثلہ پیش کر رہے ہیں صرف دستخط کرتے کرتے ہی میری طبیعت اکتا گئی ہے۔ پسینہ پسینہ ہو گیا ہوں۔ برقی پنکھا چل رہا ہے لیکن میری تھکن دور نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے دماغ کی گرمی کا اثر نزلہ ہوتا ہے اور جب کسی تعلقدار کا نزلہ گرتا ہے تو اپنے ماتحتین کے سوا کسی اور پر کیوں گرنے چلا۔ "عجیب بیوقوف ہو جی۔ تمھاری عقل ماری گئی ہے۔ بڑے بدو بیل ہو کچھ دماغ بھی ہے" وغیرہ وغیرہ غرض کسی پر برستے اور کسی پر قہر آلود نظریں ڈالتے ہوئے کام ختم کیا۔

مکان آکر بیٹھا ہی تھا کہ منتظم صاحب پولس نے آکر کھٹ سے سیلوٹ مارا۔ اور یہ خبر سنائی کہ ڈاکوؤں کا ایک جتھا ضلع میں گھس پڑا ہے۔ پولس ان کی گرفتاری کے لئے شب و روز حیران ہے۔ ڈاکو بہت ہی چالاک اور پختہ کار معلوم ہوتے ہیں اتنا سن کر میرے ہوش بجا نہیں رہے۔ فورا منتظم صاحب سے کہا کہ چار پولس کے جوان گیٹ پر متعین کریں اور داروغہ کو آواز دے کر تاکید کی کہ رات بھر ہوشیار رہے [illegible] رات ہوائی پولس گیٹ پر پہرہ دے رہی ہے۔ داروغہ اور دوسرے ملازمین بھی جاگ رہے ہیں لیکن نہ معلوم کہاں سے ایک شخص میرے کمرے میں گھس آیا اس کی ہیبت ناک شکل دیکھتے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ بارے ہمت کی اور ذرا رعب دار آواز میں کہا "ابے او تو ہے کون اور کیوں اس طرح گھس کر چلا آیا"

"میں ہوں حضور آپ کا خادم"

"نہیں .. تو .. میرا خادم"

"جی ہاں .. آپ کا غلام"

"یہ غلام .. آج تک تو سنتے تھے کہ مہمان بن بلائے وارد ہوا کرتے ہیں لیکن اب تو خادم اور غلام بھی خواہ مخواہ گلے پڑنے لگے ...... تو چاہتا کیا ہے۔ میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں حضور صرف اپنی تجوری کھول دیجئے۔"

"ارے کیا بک رہا ہے۔ نکلتا نہیں یہاں سے۔ ورنہ ابھی داروغہ کو آواز دے کر جیل کی ہوا کھلاؤں گا۔

"دال، الف زبر، دا کے منہ سے نکلنے سے پیشتر ہی خدا بخش حضور کا سر کھول دے گا"، یہ کہتے ہوئے اس نے ایک موٹا ڈنڈا جو بغل میں دبائے ہوئے تھا میرے سر کی طرف بڑھایا۔ میں نے کہا "بھائی بگڑ کیوں رہا ہے یوں مانگ لے کچھ دیدوں گا۔ چوری سے فائدہ دنیا میں ذلیل آخرت میں گنہگار" یہ سنتے ہی

وہ جھٹ سے میرے سینے پر چڑھ بیٹھا اور ملامت آمیز لہجے میں کہنے لگا "یوں مانگ لے کچھ دیدوں گا۔ خیرات کی اب سوجھی جب جان پر بن آئی۔ تمھیں اور تمھارے گھر بار کو دعائیں دیتے ہوئے منت سے سماجت سے ہم نے ہاتھ پھیلائے تو جھڑکیاں دے دے کر نکال دیا۔ نوکروں سے گردنیاں دلوادیں۔ اس وقت تو تمھارے کیسہ سے ایک پائی نہ نکلی۔ اب بخشش کے لئے حاتم طائی تیار ہے۔ کون کہتا ہے چوری گناہ ہے۔ چوری ہمارا حق ہے۔ ہمارا جائز حق ہے۔ ہم چوری نہ کریں گے تو کیا بھوکے مریں گے۔ نہ ہمارے باپ دادا نے کوئی ملک چھوڑی اور نہ ہماری قسمتوں ہی میں کوئی معاش لکھی گئی۔ کوئی ہمارا پرسانِ حال نہیں سوسائٹی اپنی دولت سے آپ مزے کر رہی ہے۔ تمھارے بنائے ہوئے قانون نے دولت کی تقسیم کو اپنوں ہی میں محدود کر رکھا ہے۔ لاکھ لاکھ روپے ایک ایک آدمی کے پاس اور اس کا بھائی اس کو ہاتھ لگانے کا مجاز نہیں۔ واہ رے بنی آدم کی برادری! تم جس طبقے کو چور اور ڈاکو سمجھتے ہو وہ دراصل ایک باغی طبقہ ہے جس کی آنکھوں میں آتشِ انتقام نے خون اتار رکھا ہے۔ انتہائے غضب میں جسے نیک وبد کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ ہم نہیں جانتے سچائی کس کو کہتے ہیں۔ دیانت کس پرند کا نام ہے نیکی کون جانور ہے۔ ہم وہ لوگ ہیں جنھیں قدرت نے بہت کم سرفراز کیا"۔

"صرف حواسِ خمسہ اور صحیح سالم بدن کے ساتھ زمین کی پیٹھ پر بوجھ بنا کر پھینکے گئے۔ ہمارے انتقام کی آگ بجھانے کے لئے یہی چیزیں کافی تھیں۔ تم لوگوں نے دولت کو لوہے کی بڑی بڑی تجوریوں میں چھپا کر اور انھیں مسلح سپاہیوں کے پہرے میں رکھ کر یہ سمجھ رکھا تھا کہ اب وہ دولت محفوظ ہے۔ لیکن ہمارے چالاک ہاتھوں نے تمھارے اس زعم باطل کو مٹا دیا۔ ہم نے معصوم بچیوں کی کلائیوں سے سونے کی چوڑیاں نکال لیں۔ بے گناہ عورتوں کے گلے گھونٹ کر چندن ہار اتار لئے۔ کمزوروں پر رعب ڈال کر اپنی جیبیں گرم کیں۔ نمازیوں کے کیسے کترے۔ کلیسا کا سامان چرایا۔ دیوتاؤں کے گہنے اڑائے۔ سماج کو بنی نوع سے غفلت برتنے کا خوب مزا چکھایا اور برابر چکھاتے آرہے ہیں گنہگار ہم! ہم سے مواخذہ کس بات کا۔ یہ سوال اُس کارخانے میں کیجئے جہاں مٹی، آگ اور ہوا پانی کی ترتیب دی جاتی ہے۔ یہ بات وہیں جا کر پوچھئے جہاں انسان کا مستقبل قسمت کے سانچے میں ڈھالا جاتا ہے ...... اتنا کہہ کر وہ میرا گلا زور زور سے گھونٹنے لگا۔ میں گھبرا کر چیختا ہوا اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں مل مل لیں۔ خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ سب خواب تھا۔ تکیہ کے نیچے سے اپنے تقرر کی فہمایش نکالی۔ اسے آنکھوں سے لگایا۔ سینے سے لگایا۔ ایسی تونگری سے تو میری غریبی اچھی۔

"تیس تا ساٹھ زندہ باد"

(۲) غنڈا

مدت سے پریشان تھا کہ غنڈے کی صحیح تعریف کس طرح کی جائے۔ بہتیرے لوگوں سے دریافت کیا کہ ان کے نکتۂ خیال میں غنڈے کا حقیقی تصور کیا ہے۔ کسی نے کہا "بنی نوع کا وہ فرد جو عام اخلاقی معیار سے گرا ہوا ہو"۔ کسی نے کہا "وہ انسان جو اپنی ہوس پرستی کے لئے دوسرے انسانوں کی تباہی کا درپے ہو"۔ کسی نے کہا آدم کا وہ بیٹا جسے بچپن سے شیطانوں کی صحبت ملی ہو۔ غرض میں نے غنڈے کی بیسیوں تعریفیں سنیں اور ہر تعریف کو ان لوگوں کے حالات کے مقابل رکھ کر غور کیا جنھیں سوسائٹی غنڈوں کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ تعریف کو حالات کے ساتھ مطابقت دینے میں

مجھے سخت ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک تعریف جہاں ایک پر صادق آتی تھی وہاں دوسرے کے ساتھ اسے کوئی رابطہ نہ تھا۔

ایک رات بستر پر لیٹا لیٹا سوچ رہا تھا کہ آخر غنڈہ ہے کس صنفِ انسان کا نام۔ اسی دھن میں آنکھ لگ گئی۔۔۔

عابد شاپ پر سے سگریٹ پیتا ہوا گذر رہا ہوں۔ دفعتہً ایک شخص نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھا۔ ہٹا کٹا آدمی۔ سر پر بڑے بڑے بال۔ بدن پر میلے کچیلے کپڑے۔ ٹوپی پر چار چار انگل گرد جمی ہوئی پاؤں میں پھٹی ہوئی جوتی ہلگائے اور کہنے لگا "اے صاحب ذرا دیاسلائی تو عنایت فرمائیے"۔ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ جی میں تو آیا کہ اس غنڈے کو اس کی گستاخی پر ایک طمانچہ رسید کروں۔۔۔۔ غصے کی تو بات تھی۔

اس کو دیکھو ایک آوارہ صورت انسان۔ اور ایک گریجویٹ سے شاہراہ عام پر اس طرح شانے پر ہاتھ رکھ کر گفتگو کرنا چاہتا ہے میری سفید پوشی پر کتنا بڑا دھبہ تھا۔ سوسائٹی کی عزت کے لئے کتنی بڑی ٹھیس تھی۔ خون کے گھونٹ پیتا ہوا اس کا ہاتھ اپنے شانے سے جھٹک دیا اور اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنی راہ لی۔

باغ عامہ میں ہری ہری گھاس پر بیٹھے تفریح کرتے ہوئے چند لمحے نہ گزرے ہوں گے کہ وہ شخص پھر سامنے آدھمکا۔ اور ہاتھ جوڑ کر عرض کرنے لگا "حضور خفا ہو گئے آپ" میں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں جب دیکھا کہ نہ کوئی ہمیں سن رہا ہے اور نہ کوئی دیکھ رہا ہے تو اس سے کہا "ابے تجھے کہیں اور دیاسلائی نہ مل سکی جو تو نے یہاں تک میرا پیچھا کیا"۔

"حضور دیاسلائی تو ہر قدم پر ایک مل جاتی ہے لیکن مجھے کچھ آپ سے عرض کرنا ہے"۔

"بول کیا کہنا چاہتا ہے" میں نے اس کو ٹالتے ہوئے کہا۔

آپ نے میرے دیاسلائی مانگنے پر برا مانا۔۔۔۔۔۔

"ہاں تو"۔۔۔۔۔۔

"اگر میں آپ کی طرح خوش لباس ہوتا تو کیا آپ اسی طرح جھڑکتے" میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "سرکار میں خوب جانتا ہوں آپ کے ہاں اس کا کوئی جواب نہیں۔ آپ نے مجھے اس قدر حقارت سے صرف اسی لئے جھڑکا کہ میری ظاہری حالت ٹھیک نہیں تھی میرا لباس میلا تھا۔ خدا نے آپ کو اعلیٰ تعلیم پانے کے لائق بنایا تعلیم نے جہاں آپ کے خیالات کو عام سطح سے بلند کیا وہاں آپ کی زندگی کا معیار بھی عام زندگی سے ہزار گنا اونچا کر دیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ کہنے کی بھی اجازت دیجئے کہ آپ نے جس قدر بلندی کی طرف پرواز کی اسی قدر پستی کے سامان بھی پیدا کئے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے تعلیم سے فراغت حاصل کرکے اپنے آپ کو ان باعزت لوگوں میں شامل کر لیا جن کے ہاتھوں میں قوم کی تنظیم و ترقی کی باگ ہے۔ جن کی تحریروں میں قانون پرورش پاتا ہے جن کی تقریروں سے انقلاب کی تعمیر ہوتی ہے۔ جانتا ہوں آپ قانون بنانا جانتے ہیں۔ اپنے مطالبات بہتر سے بہتر پیرائے میں پیش کرکے اپنے حقوق حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کمیٹیوں میں زوردار تقریریں کرتے ہیں اور تحسین و آفرین کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ لیکن کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ ادھر آپ نے مطالبات لکھ بھیجے اور ادھر کام بن گیا۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ نے ایوان میں تقریر کی اور اپنے مطالبات منوالئے۔ یقین مانیے۔ آپ قوم کے عضوِ معطل ہیں۔ اگر آپ کے ساتھ غنڈے ہوں۔

آپ انھیں کی ہمت پر گھر بیٹھے دھمکیاں دیتے ہیں۔ جس حاصل شدہ حق کو آپ اپنی محنت کا صلہ تصور کرتے ہیں۔ وہ دراصل انھیں غنڈوں کا خوں بہا ہے۔ غنڈے ہی سروں پر لاٹھیاں کھاتے ہیں۔ غنڈے ہی سینوں پر گولیوں کی بارش جھیلتے ہیں۔ غنڈے ہی قید کی سختیاں اٹھاتے ہیں۔ انھیں کی بدولت آپکے حقوق کا قدرے قائم ہے۔ انھیں کے بل پر آپ آزادی کا نام لیتے ہیں۔ اور انھیں کے طفیل سے آپ کے سر پر شرافت کی سفید پگڑی برقرار ہے۔ میرے بھائی! آپ کے لئے اپنی جان دینا تو بلا استثنیٰ [illegible] کا طرہ امتیاز ہوا اور آپ ہیں کہ اس سے بات کرتے ہوئے کتراتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ ہی کی طرح دو ہاتھ۔ دو پیر اور دو آنکھ رکھنے والے آدمی غنڈے کیوں کہلائے۔ غنڈے کے آپ کے ہاں کیا معنی ہیں۔ آپ [illegible] کھینچنے سے تو رہے۔ یقیناً آپ کا فیصلہ ظاہری حالت پر موقوف ہے۔ غنڈہ آپ کے نزدیک ایک [illegible] مفلس شخص ہے جس کے پاس پہننے کے لیے کپڑے نہ ہوں [illegible] کو [illegible] سوسائٹی کے ساتھ [illegible] بیٹھنے کی اجازت نہ دی ہو۔ آپ شرافت کو [illegible] سے پرکھنے کے عادی ہیں۔ دیکھئے ایسی گندی [illegible] کے اندر کیسے کیسے محبت بھرے دل [illegible] آپ پر سے قربان ہونے کے لئے تیار ہیں۔ یہی ہاتھ جسے آپ نے اس قدر حقارت سے جھٹک دیا تھا کس دلیری [illegible] آپ کے دشمنوں کے سروں پر تیر برساتا ہے۔ یہی بڑے بڑے بالوں والے سر جن پر میلی میلی ٹوپیاں بے پروائی کے ساتھ رکھی ہوئی ہیں کیسی شوریدگی سے جور و استبداد کی آہنی دیواروں سے ٹکراتے ہیں۔ سرکار!

آپ کی قوم میں کوئی غنڈہ نہ تھا۔ وہ تو وہ ہر وہ شخص جسے آپ اپنا لیا کرتے تھے شریف بن جاتا تھا۔ اب یہ دن ہیں کہ آپ اپنے ہاتھوں غنڈے بنا رہے ہیں۔ آپ کی سفید پوشی نے آپ کو ہمارے ساتھ ملنے جلنے اٹھنے بیٹھنے سے روکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ صحبت کے اثرات ہم سے دور رہے۔ ہم میں جہالت اور درشتی پیدا ہوگئی۔ آج آپ اپنی بلندی سے اپنی قوم کی خاطر نیچے اتر آئیے۔ ہمارے ساتھ نشست و برخواست کو گوارا کیجئے۔ کمی بیشی۔ دولت اور افلاس کے امتیازات کو اٹھا دیجئے۔ پھر دیکھئے غنڈہ ایک مہمل لفظ بن کر رہ جائے گا۔"

"حضور میں شریف النسب ہوں۔ چھٹے درجہ تک ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ مفلسی نے آگے بڑھنے نہ دیا۔ ماں باپ کا سایہ لڑکپن ہی میں سر سے اٹھ گیا۔ مزدوری کرکے جیتا ہوں۔ اتنی حیثیت نہیں کہ آپ کی طرح سفید کپڑے پہنوں۔ دوسرے معنوں میں غریب ہوں۔ غنڈہ ہوں۔ میں نے آپ سے دیا سلائی مانگ کر سر راہ آپ کو ذلیل کیا۔ خدارا مجھے معاف کیجئے۔ آئندہ اگر کبھی جان پر بھی بن آئے تو کسی تعلیم یافتہ سفید پوش کو نہ چھیڑوں گا۔ مجھے معاف کیجئے۔ مجھے معاف کیجئے" اتنا سن کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ بے تابانہ کھڑے ہو کر اسے سینے سے لگا لیا۔

مجھے ایسے معلوم ہوا جیسے کوئی میرے شانے جھنجوڑ رہا ہے۔ آنکھیں کھل گئیں۔ میرا بھائی کھڑا کہہ رہا تھا "اٹھو بھائی اٹھو ناشتہ ٹھنڈا ہو گیا۔ کب تک سوتے رہیں گے آپ؟"۔ میں اٹھ بیٹھا اور اس خواب کو دیکھے کوئی ہفتہ بھر گذر گیا لیکن اب تک یہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

"غنڈہ آپ کے نزدیک ایک ایسا مفلس شخص ہے جس کے ہاں پہننے کے لیے کپڑے نہ ہوں۔ اور اگر ہوں بھی تو بدلنے کے لئے نہ ہوں جس کو مفلسی سوسائٹی کے بنائے ہوئے قوانین پر چلنے کی اجازت نہ دیتی ہو۔"

محمود قطبی

برسات

اے خوشا قسمت وہ بادل چھا گئے افلاک پر
گرمیوں کی دھوپ میں کرتے تھے جن کا انتظار!

کھلکھلاتی ندیاں بڑھ کر گلے ملنے لگیں
لہلہاتی کھیتیوں کا دیدنی ہے اب نکھار

چھوٹے چھوٹے "تاج" ہر لحظہ بنا کرتے ہے
اجلے اجلے چاندنی جیسے وہ بگلوں کی قطار

لو وہ مرجھائے درختوں نے نیا جوبن لیا
باغ کی نوخیز کلیوں نے بھی چھیڑا ہے ملہار!

سیم تن پھولوں کے منہ پھر موتیوں سے بھر گئے
برق نے انگڑائی لی جاگا وہ ابرِ نوبہار!

پھر ہواؤں نے اڑائیں نیلی نیلی ساریاں
گاؤں کی پریاں بنیں جھولوں کے پینگوں کی بہار

پھر کسی مخمور چرواہے کی بنسی جاگ اٹھی
پھر کوئی نوخیز دوڑی کھیت کو بے اختیار

یہ بھری برسات، یہ کالی گھٹا، ٹھنڈی ہوا
ساری دنیا کے لئے اے دوست پیغام بہار

اور ہم مفلس پریشاں نوجوانوں کے لئے
آسمانی قہر ہے یا رحمت پروردگار؟!

نظر

میر الشعراء شہید دہلوی

مولوی سید مجتبیٰ حسین صاحب نوگانوی کا مضمون (امیر محمد علی خاں شہید دہلوی، مطبوعہ سب رس اگست سنہ ۱۹۴۰ء) میری نظر سے گزرا۔ چونکہ فاضل مضمون نگار کے ماخذ صرف "محبوب الزمن" اور دیوان شہید قلمی مکتوبہ سنہ ۱۲۷۱ھ تھے، اس لئے موصوف کو بنیادی غلط فہمی ہوئی۔ نیز شہید کے مخصوص رنگ، اخلاقی شاعری، اور بعض ضروری امور پر کچھ روشنی نہ ڈال سکے۔ شاید صاحب مضمون کی نظر سے شہید کا کلیات موسوم بہ "نظم شہید" اردو مطبوعہ سنہ ۱۳۰۹ھ نہیں گذرا[1]۔ شہید کے جس دیوان کو موصوف نے غیر مطبوعہ تصور فرمایا ہے، وہ دراصل چھپ چکا ہے۔ چنانچہ اسی غلط فہمی کو دور کرنے اور مذکورۂ بالا کمی کو پورا کرنے کے لئے، میں یہ مضمون سپردِ قلم کر رہا ہوں۔ اس سلسلہ میں اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ، شہید راقم السطور کے حقیقی پر دادا ہوتے ہیں۔

ماخذات۔ شہید کے حالات، اجداد کا ذکر، اور اولاد کا تذکرہ حسب ذیل کتابوں میں ملتا ہے۔

۱۔ تاریخ دکن　فارسی　ڈپٹی نصر اللہ خاں خویشگی　مطبوعہ نولکشور سنہ ۱۲۹۴ھ

۲۔ ماثر الامراء جلد دوم　"　صمصام الدولہ شاہنواز خاں　"　"

۳۔ خمخانۂ جاوید　اردو　لالہ سری رام ایم، اے　"　"

۴۔ تزک محبوبیہ　اردو　غلام صمدانی خاں گوہر　مطبوعہ حیدرآباد سنہ ۱۳۱۱ھ

۵۔ محبوب الزمن تذکرۂ شعرائے دکن۔ اردو　محمد عبد الجبار خاں صوفی ملکاپوری　مطبوعہ سنہ ۱۳۲۹ھ

۶۔ یادگار ضیغم　اردو　نواب محمد عبد اللہ خاں ضیغم　"　حیدرآباد

۷۔ دکن میں اردو　"　مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی　"　سنہ ۱۹۲۶ء

۸۔ سخنورانِ دکن　"　مولوی تسکین عابدی صاحب　"　"

۹۔ شاعر کی دنیا　"　مولوی عظیم الدین صاحب محبت بی اے　"　سنہ ۱۹۳۹ء

اولادِ معنوی

۱۔ دیوانِ اول شہید دہلوی، اردو، قلمی مکتوبہ سنہ ۱۲۷۱ھ موجودہ کتب خانہ سید رستم علی صاحب چھتہ بازار۔

۲۔ نظم شہید، کلیات میر الشعراء شہید دہلوی　اردو　مطبوعہ سنہ ۱۳۰۹ھ

۳۔ دیوانِ شہید۔ فارسی قلمی مکتوبہ سنہ ۱۲۸۱ھ۔ موجودہ کتب خانہ حکیم میر نادر علی صاحب رعد قطبی گوڑہ۔

۴۔ متفرق اوراق قلمی مشتمل بر نوحہ جات، قصائد، سلام وغیرہ موجودہ کتب خانہ حکیم میر نادر علی صاحب رعد قطبی گوڑہ۔

خطاب منصب وغیرہ:۔ مولوی مجتبیٰ حسین صاحب نے شہید کا خطاب "امیر الشعراء" لکھا ہے حالانکہ شہید "میر الشعراء" سے مخاطب تھے۔ چنانچہ اس کی تصدیق تاریخ دکن سے ہوتی ہے (یہ نہایت مستند تاریخ ہے اور شہید کی زندگی میں لکھی گئی ہے) اصل عبارت یہ ہے۔

" پنجاہ سال می گذرد کہ میر احمد علی خاں شہید وارد حیدرآباد است، منصبدار و مقرب حضرت غفران منزل بود و بخلعت و خطاب میر الشعراء ممتاز والحال ہم بدستور بعہدۂ منصبداری سر فراز" صفحہ ۱۴۹

خود شہید نے بھی جا بجا خطاب کا ذکر کیا ہے۔

پھولا نہ سماتا ہے شہید آج خوشی سے　بخشا ہے لقب شہ نے جو میر الشعراء کا

ہر چند کہ میر الشعراء تو ہے شہید آج　لیکن نہیں شعرا سے سوا اور میرے بہتر

منصب:۔ مہاراجہ چندو لعل شاداںؔ نے شہید کو تین روپے

---

[1] یہ کلیات قبلہ گاہم حضرت رعد کے اہتمام سے سنہ ۱۳۰۹ھ میں مطبع فخر نظامی حیدرآباد میں چھپا جواب نایاب تو نہیں مگر کمیاب ضرور ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ کے نمبر () دواوین پر محفوظ ہے۔ میرے پاس اس کا صرف ایک نسخہ رہ گیا ہے جو مضمون ہذا کے ساتھ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو میں داخل کیا جا رہا ہے۔ اس کلیات میں شہید کا تمام اردو کلام ابتدائے شاعری سے وفات تک شامل ہے۔

یومیہ مقرر فرمایا تھا اور حضرت آصفجاہ رابع سے تین سو روپیہ ماہانہ منصب مقرر تھا۔ (یہ منصب تاحال جاری ہے)

ولادت، وفات۔ شہید ۱۱۹۷ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، ۱۲۳۶ھ میں حیدرآباد آئے اور ۱۲۹۲ھ میں (۹۵) سال کی عمر میں حیدرآباد میں وفات پائی۔ تکیۂ گجراتی شاہ رام کوٹ میں مدفون ہیں۔ آپنے آصفجاہ ثالث، رابع، خامس اور سادس چار بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔

اولاد۔ شہید کے خاندان میں تاحال سلسلۂ شاعری جاری ہے۔ چنانچہ شہید کے فرزند (راقم الحروف کے دادا) میر کاظم علی خان شعلہ موسوی (۱۲۵۲ھ تا ۱۳۰۸ھ) فارسی اردو دونوں میں طبع آزمائی فرماتے تھے۔ فارسی دیوان "مذاقِ عشق" کے نام سے ۱۳۱۱ھ میں چھپ چکا ہے، اردو کلام متفرق اور غیر مطبوعہ ہے۔ شعلہ کے دو فرزند، بڑے حکیم سید نوازش علی لمعہ (۱۲۸۰ھ تا ۱۳۴۳ھ) صاحب تصانیفِ کثیرہ تھے[1]۔ آپ کی مشہور تالیف "جواہر الاشعار" ہے۔ شعلہ کے چھوٹے فرزند قبلہ گاہم حضرت رعد (راقم الحروف کے والد) ہیں۔ آپ متعدد کتابوں کے مصنف اور اس وقت بقید حیات ہیں۔

شہید کا مخصوص رنگ

شہید کی انفرادی خصوصیات کو ہم دو نمایاں عنوانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

۱۔ خالص دیسی تشبیہات کا استعمال۔ ۲۔ اخلاقی موضوعات پر طبع آزمائی

۱۔ دیسی تشبیہات:۔ یہ عجیب بات ہے کہ شہید اپنے ہمعصر شعراء کے خلاف خالص ہندوستانی تشبیہات و تلمیحات استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایرانی شعراء کی پیروی نہیں کرتے۔ شہید کے گلزارِ سخن میں بلبل کے نغموں اور قمری کے نالوں کے عوض کوئل کی کوک اور پپیہے کی ہوک سنائی دیتی ہے۔ شہید کے کلام میں ہم کو لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد اور وامق عذرا کی بجائے ہیر رانجھا، نل دمن اور رادھا کرشن کے نام ملتے ہیں۔

پھر نہ کوئل کا نشاں تھا نہ پپیہا کا — صبح میں نے جو کیا باغ میں نعرہ ہو کا

سچ پوچھو تو میں عشق میں پیا نجا سی ہوں گی — وہ مرتبۂ حسن میں ہے ہیر سے بہتر

تم تنگ دہن گر ہو تو میں ثانی نل ہوں — رادھا ہو جو تم میں بھی ہوں کرشن مرے صاحب

کب دل میں ترے خال کا سودا نہیں آتا — کب گانوں میں گوکل کے کنھیا نہیں آتا

شہید کے کلام میں ایران کی بہارِ نوروز کے عوض ہندوستان کی برکھا رت کا سماں بندھا ہوا ہے۔ وہ رستم و سام کے عوض بھیم اور ارجن، نوشیروان و جم کی بجائے رام اور کرشن، باغِ داد، قصرِ فریدوں، دریائے نیل اور جیحوں کے عوض۔ دہلی کے محلات اور گنگا جمنا کی مثالیں دیتے ہیں۔ غرض کہاں تک گناؤں، ہندوستانی تلمیحات، تشبیہات، رسومات تمام باتیں ہندوستانی پائی جاتی ہیں۔

ساون کی گھر بار گھٹا سر پہ کھڑی ہے — یا ہنگ میں اس شوخ کے موتی کی لڑی ہے

اس ابروئے پرخم کے تصور کی کہے تاب — ارجن بھی نہ کھینچے یہ کمان ایسی کڑی ہے

خالِ رخِ روشن کا کسی کے ہے تصور — یا صبح کے تارے سے مری آنکھ لڑی ہے

ہے دیدۂ تر ابر کا دامن مرے صاحب — بھادوں کبھی لیں برسے ساون مرے صاحب

چہرے پہ ملے راکھ نہ کیوں آرسی اپنی — منھ دیکھ تمھارا ہوئی جوگن مرے صاحب

یہ کاہکشاں حلقۂ پروین ہے بنا ہی — یا گوری کلائی میں ہے کنگن مرے صاحب

راجہ بنسی والا زلفِ چلیپا ہو گیا — خالِ رخ کا تیرے دیوانہ کنھیا ہو گیا

شاید آئے شرم اسے نیرنگِ الفت سے شہید — قصہ اس بت کو سنا سیتا کا نو اور رام کا

صدقے اس پیکر کے کوئی دین کی تصویر — گھر کے صحیر سے اتارے کوئی نل کا پتلا

سرسوں پھولی مری نظر میں — پہنی جو بسنتی اس نے پوشاک

دلی کیوں کر نہ یاد آئے — کیسے کیسے محل نسب ح ناک

وہ سیرِ مکانِ قطب صاحب — جھرنے کا وہ لطف لذت تاک

---

[1] لمعہ کا مجموعۂ کلام میرے اہتمام سے زیر ترتیب ہے۔ برق موسوی

کعبہ جانا تو فرض ہے پر شیخ
طوفِ دل کا بھی حج اکبر ہے

گو قالبوں میں صورتیں ڈھلتی ہیں مگر — پتلا بنا جو درد کا سو وہ بشر بنا

سلسلہ بار کا چلا ہے جو تری محفل میں — پہلے جوں شمع کرے اشکِ مسلسل پیدا

دل گداز اپنا نہ تھا جب سخت پتھر تھا شہید
درد کا پتلا بنا جب سے میں انساں ہو گیا

رہِ مقصود میں قبلہ نما کی یاں نہیں حاجت — مقامِ عرش تک دیتا ہے یہ قلبِ نما پہنچا

اک جنبشِ دل ہے سفرِ عشق میں درکار — آئینہ ہے پھر راستہ خشکی و تری کا

غرض فہمیدنی ہیں مستیاں اور ولولے دل کے — مرے اللہ یہ جوش و خروش اک قطرۂ خوں میں

چشمِ دل کھول کے اندک حق و باطل سمجھا
صاف میں دل کی زباں میری زباں دل سمجھا

شکلِ ہمتا نہ جدا ہوں کبھی اک دم تجھ سے — تو نہ ملے پر نہیں ممکن نہ ملیں ہم تجھ سے

تجھے لحاظِ مروت اگر نہیں تو نہ ہو — ہمیں تو مدِ نظر پاسِ آشنائی ہے

مضمون ختم کرنے سے پہلے یہ بتا دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ مولوی مجتبیٰ حسین صاحب کے مضمون سے پہلے بھی شہید پر دو مختصر مضمون لکھے جا چکے ہیں۔ ایک مضمون مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کا ہے جو ساقی اگست سنہ ۳۵ء میں شایع ہو چکا ہے' دوسرا مضمون خود میرا ہے' جو منشور ۱۵ ستمبر سنہ ۳۶ء جلد (۷) میں چھپ چکا ہے تاہم شہید پر ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ شہید کا ایک مختصر انتخاب بعنوانِ حال کے مذاق کے موافق ترتیب دوں۔ دیکھئے زمانہ کب فرصت دیتا ہے!

فرصت کہاں کہ چشمِ تمنا کو وا کروں
میں اے شہید قطرۂ اشکِ چکیدہ ہوں

میر کاظم علی برق موسوی
(نظامیہ طبی کالج)

نغموں کی آبادی

کوئی ساقی سے کہہ دے اب نہیں تابِ شکیبائی — وہ چمکیں بجلیاں' وہ مور بولے' وہ گھٹا چھائی
بہکنا چاہتا ہوں' اور بہک کر جان دیدینا — کہ اس موسم میں رسوائی سے بچنا بھی ہے رسوائی

یہ ہواؤں کی ترنم ریزیاں' یہ برشگال — یہ گلوں کی جلوہ سامانی' شگوفوں کا جمال
آج تم کچھ اس طرح صحنِ چمن میں آ گئے — جیسے آئے ذہنِ شاعر میں کوئی رنگیں خیال

مجھے تسلیم ہے اے دوست' تیری بزمِ عشرت بھی — نئی رسموں کی دنیا ہے نئی ریتوں کی دنیا ہے
کبھی تو سازِ دل کو چھیڑ' مضرابِ محبت ہے — یہ اک نغموں کی آبادی ہے اور گیتوں کی دنیا ہے

باغ میں کچھ پھول توڑے' اور بنایا ایک ہار — آپ کے آنے کا جب دل کو یقیں ہونے لگا
وائے ناکامی نہ آئے آپ اور میں بدنصیب — ہار خود اپنے گلے میں ڈال کر رونے لگا

شاہد صدیقی

عید کی ملاقاتیں

دور سے کسی نے مجھے سلام کیا۔ میں نے بھی مسکراتے ہوئے اس کا جواب دیا۔ جب دونوں قریب ہونے تو اس "سلام" کے صدقے میں کچھ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ خیر جاتے وقت میں نے دبی زبان سے کہا "معاف کیجئے، میں نے آپ کو پہچانا نہیں" میرے رہرو دوست نے بھی کچھ شرم اور کچھ شرارت کے انداز میں فرمایا "اور میں بھی جناب سے ناواقف ہوں" یہ بھی ایک ملاقات تھی۔

آپ کو دور سے دیکھ کر پہلے تو میں نے خیال کیا کہ آپ "ہم" ہیں۔ جب آپ کچھ آگے بڑھے تو خیال ہوا، آپ کے بڑے بھائی ہوں گے، اب جو دیکھتا ہوں تو آپ ہیں نہ آپ کے بڑے بھائی۔

"آداب عرض ہے" "خدا حافظ"۔ یہ بھی ایک ملاقات تھی۔

کشمیر جا رہا ہوں لیجئے صاحب تکلیف کی کیا بات ہے۔ دو لوانے ہماری خاطر ——— کہئے وہاں کا کیا رنگ ہوگا موسم بہار میں تو جنت بن جاتا ہے یہ لیجئے کباب ——— گزشتہ سال لاہور میں اتنی سخت گرمی تھی کہ توبہ ہی بھلی لیکن کشمیر جب پہنچا ہوں ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے دوزخ کے جلے ہوئے مُردے کو جنت میں پھینک دیا ——— ٹرین رکی تو ہم سفر "میزبان" نے توشہ دان درست کرتے ہوئے کہا "خدا حافظ جناب۔ مجھے فی الحال یہیں اترنا ہے۔ میں نے آدھی لقمی تھامے ہوئے ہاتھ کو پیشانی تک لے جا کر آدھی لقمی کو چباتے ہوئے اور سالم لقمی کو جو توشہ دان میں بند ہو گئی تھی یاد کرتے ہوئے حسرت سے جواب دیا۔ "خدا حافظ" یہ بھی ایک ملاقات تھی۔

"کہو کیسی گزر رہی ہے" انھوں نے ہنستے ہوئے کہا

"خدا کا شکر ہے" میں نے جواب دیا

"اوے یار کہاں وہ صحبتیں" انھوں نے ایک آہ بھر کے کہا

"جی ہاں" میں نے جواب دیا

"تم تو بالکل بدل گئے" انھوں نے کہا

"جی نہیں" میں نے جواب دیا

"سب خیریت سے تو ہیں نا" انھوں نے پوچھا

"جی ہاں" میں نے جواب دیا

میں اب بھی سوچتا ہوں کہ وہ بزرگ آخر تھے کون لیکن میرا حافظہ اس کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

یہ بھی ایک ملاقات تھی۔

"فلاں صاحب کے صاحبزادے میرے ہم جماعت تھے۔ انھوں نے آپ کا پتہ دیا ہے۔"

آپ چاہیں تو میرا کام نکل سکتا ہے ——— میں نے کہا ——— کام تو کسی کا نام لئے بغیر بھی نکل سکتا تھا۔ کیونکہ وہ صاحب جن کے صاحبزادے نے آپ کو میرا پتہ دیا ہے۔ میرے ماموں کے چچا کے بھانجے کے دوست ہیں۔ یہ بھی ایک ملاقات تھی۔

بہرحال "شاعر" نے سچ کہا ہے "تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے" یہاں تقریب سے مراد وہ تقریب نہیں ہے جس کے لئے رقعہ کی ضرورت ہو اور جو کبھی از صبح تا نصف النہار بن کر شام تک چلتی رہے اور کبھی بعد نماز مغرب شروع ہو کر بعد نماز مغرب ہی ختم ہو نہ وہ تقریب جو کسی کتاب کی "شانِ نزول" بن کر نازل ہوتی ہے اور نہ وہ جس کو غالبؔ نے اس طرح استعمال کیا ہے۔

جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا
تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

بلکہ یہاں تقریب سے مراد وہ تقریب ہے جو "کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے"۔ اب شاید میری طرح آپ بھی سوچ رہے ہوں کہ روزانہ دن بھر جو ملاقاتیں ہوتی ہیں تو ان کی تقریب آخر کیا ہوتی ہے۔

ہے نا اس لئے کہ تقریب پوری نہ سہی کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔
دوسری ملاقاتوں کو چھوڑ دیئے۔ ان کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے مثلاً

سرسری ان سے ملاقات ہے گاہے گاہے
صحبتِ غیر میں گاہے سرِ راہے گاہے

یا.......... اب وہ پہلی سی ملاقات نہیں
کیا ہوئی بات کہ وہ بات نہیں

یا..... اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

یا.......... تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت کی ملاقاتیں

ان ملاقاتوں کی بھلا کیا تقریب ؟

"کہتے ہیں عشق جس کو خلل ہے دماغ کا" البتہ اس ملاقات کا ذکر کرنا ضروری ہے جو بہر حال تقریب سے بے نیاز ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ بے روزگاری نے بیکاری پیدا کردی ہے اور بیکاری نے ملاقاتیں۔ اگر آپ بفضلِ ایزدی نوجوان ہیں لیکن بے روزگار نہیں تو پھر دیکھئے۔ صبح سے لے کر شام تک اور شام سے لے کر صبح تک ملاقاتیوں کا وہ ہجوم ہوگا کہ آپ "جوئے شیر کی طرح فرصت کی جستجو کرنے لگیں گے۔ اور جب کبھی کچھ فرصت ملے گی خشوع و خضوع کے ساتھ اس مشہور مضمون کی تلاوت شروع کردیں گے۔ جس کا عنوان ہے۔ "خدایا مجھے اپنے دوستوں سے بچا" اور اگر خدانخواستہ آپ خود بے روزگار ہیں تو پھر آپ —— پھر آپ

میرا مطلب یہ ہے کہ "خدایا مجھے اپنے دوستوں سے بچا" آمین

بہر حال ان ملاقاتوں کی تقریب جو فکر معاش کا غم غلط کرنے کے لئے کی جاتی ہیں۔ دروازے کو بند پا کر دستک "بغیر اجازت اندر آنا منع ہے" کی تختی کو دیکھ کر ملاقاتی کارڈ اور کچھ بھی نہ پا کر "دخل در معقولات" ہوتی ہے۔

یہ ملاقاتیں تو ہوتی ہی رہی ہیں اور ہوتی ہی رہیں گی لیکن ملاقاتیں پھر عید کی ملاقاتیں!

ان میں بیزاری بھی ہے اور اشتیاق بھی۔ عید گاہ میں خطبہ سننے کے بعد تین باتیں بہت ضروری ہیں ایک بات تو وہ ہے جس کے تصور ہی سے بے چینی شروع ہو جاتی ہے۔ خیال آتا ہے کہ کل ہی میں نے خریدا تھا۔ ابھی وہ ٹھوکریں کھا کر سرخرو بھی نہیں ہوا تھا اور ابھی اس کے دونے ہونے چھالے پھوٹنے بھی نہ پائے تھے۔

"ایسے حادثات"

اس میں کوئی شک نہیں کم ہوتے ہیں لیکن ہوتے ضرور ہیں اور حالی کے زمانے سے جب کہ انھوں نے یہ بانگ دہل کہا تھا۔

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

آج تک۔ یہ ذرا میں زیرِ لب کہنا چاہتا ہوں۔ یہی دستور چلا آتا ہے۔ دوسری بات معانقہ ہے اور تیسری چیز "معانقہ"۔ یا اللہ معانقہ۔ "معانقہ کا لفظ اتنا ہیبت ناک ہے کہ کوئی اس کے معنی سمجھے یا نہ سمجھے اس کو سن کر ہیبت ضرور کھا جاتا ہے۔ لیکن معانقہ سے مراد اگر گلے ملنا ہے تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ "خالص ہندستانی" نہ سہی لیکن "خالص ہندستانی" کی بے آزار خصوصیت اس میں ضرور موجود ہے۔ اور اگر معانقہ کسی دیو پیکر کا ہم جیسے انسان کو سینے سے لگا کر اپنی قوت کا ہلکا سا مظاہرہ کرنا ہے تو میں کراہتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ

"کیونکر بنے گی ان سے بغیر التجا کئے" اور اس کے بعد "زندگی نام ہے مر مر کے جئے جانے کا" خیر "معانقہ" کی بحث کو چھوڑ دیئے۔ اس "معانقہ و مصافحہ" کی دنیا سے نکل کر سب سے پہلے جن سے ملاقات ہوتی ہے وہ نہ مصافحہ کے لئے آگے بڑھتے ہیں نہ معانقہ کے لئے بلکہ عید مبارک کی بجائے ان کا

زبان پر وہ سب کچھ ہوتا ہے جس کو سن کر یا تو بے اختیار جیب کی طرف ہاتھ بڑھتے ہیں یا پھر ہماری زبان پر بھی آجاتا ہے "معاف کرو بھائی اس وقت کچھ بھی نہیں ہے" اس "معاف کرو" میں کبھی پشیمانی کبھی حسرت اور اکثر اوقات جھوٹ ہوتا ہے۔ ویسے بھی "معاف کرو" کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

فرض کیجئے کہ آپ کسی کو دانستہ یا نادانستہ گھونسہ مار دیں اور اس کے بعد سر کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ فرما دیں "معاف کیجئے" اس کا جواب نہ غیظ ہوگا نہ غصہ بلکہ "نہیں کوئی بات نہیں" جس طرح "معاف کیجئے" کہنے سے کہنے والے کا مقصد دراصل "حفاظت خود اختیاری" ہوتا ہے اسی طرح "نہیں کوئی بات نہیں" دراصل ایک اخلاقی رسم ہے جس کو کہتے وقت ہونٹوں پر خواہ مخواہ تبسم کی ایک لہر آتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ موقع ملے تو ہم بھی ایک گھونسہ رسید کر کے کہہ دیں "معاف کیجئے" ــــ معاف کیجئے۔ میں ذرا اپنے موضوع گفتگو سے ہٹ گیا تھا مجھے یقین ہے کہ آپ لوگوں کی آواز بھی اگر مجھ تک آتی تو یہی آتی کہ "کوئی بات نہیں"۔ اس لئے یہ کوئی بات نہ تھی۔ اب میں ان ملاقاتیوں کو ٹال کر آگے بڑھتا ہوں۔ اس کے بعد جو ملاقات ہوتی ہے اسے نظری ملاقات کہہ سکتے ہیں۔ یعنی نظریں کپڑوں سے ملتی ہیں۔ چہرے تو روز ہی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن کپڑے اور پھر عید کے کپڑے بس یوں سمجھ لیجئے کہ ملاقاتیں اور پھر عید کی ملاقاتیں۔ "عید سیل" کا یہ فیضِ رنگین اور درزیوں کی شبانہ روز محنت کا یہ چست نتیجہ، یقیناً اس قابل ہے کہ اس سے نگاہیں معانقہ کریں۔ رنگ برنگ کا لباس۔ راستے میں کہیں عیدگاہ پلٹ لوگوں کی کوئی ٹکڑی دکھائی دیتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے رمضان کے پرتکلف سامان افطار میں کسی نے جان ڈال دی ہے۔ گھر پہنچتے ہی "گھریلو ملاقات" "بیرونی دروازے کی پہلی سیڑھی ہی سے شروع ہو جاتی ہے یعنی شوفر جو عیدگاہ سے گھر تک وفاداری کے ساتھ موٹر چلاتا آیا تھا اب اپنی "خدمت گزاری" کو ایک فرشی سلام کے ذریعہ اس طرح ہماری آنکھوں میں جھونکتا ہے کہ ہم اسے انعام دئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس انعام کے صلہ میں کئی دنوں تک ہماری موٹر گیالن میں بیس میل چلنے لگتی ہے۔ چلتی تو وہ ہمیشہ گیالن میں بیس میل ہی ہے لیکن جلائی جاتی ہے اٹھارہ میل۔ اس کے بعد بعضوں کو ہم بزرگ سمجھ کر اور بعض ہمیں بزرگ خیال کر کے سلام کرتے ہیں۔ احساس کمتری کے بعد ہی خیال بزرگی اور خیال بزرگی کے بعد ہی احساس کمتری۔ کبھی قدمبوسی کی پستی سے اٹھ کر دعا گوئی کے مینار پر جا بیٹھتا ہوں۔ کبھی دعا دیتے دیتے ادب سے سلام کر لیتا ہوں۔

اس درونِ خانہ مصروفیت سے فرصت پا کر جب "خود فراموشی" دور ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پیشانی کی شکنیں شیروانی کی شکنوں سے کہیں زیادہ ہیں۔

ان شکنوں کو عید کی ملاقاتوں پر غالب پا کر اطمینان کا سانس لیتا ہوں کہ نوکر کہتا ہے "کوئی آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں"۔ عطر بھری "دستی کو پسینہ پوچھنے کے لئے ہاتھ میں لے کر دیوان خانہ میں اس طرح آتا ہوں جیسے عید آتی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میں ذرا غلط آگیا ہوں اس لئے الٹے پاؤں گھر میں جا کر اپنی بجائے "ایک روپیہ" کو ان سے ملنے کے لئے بھیج دیتا ہوں۔ کیونکہ میرا ملاقاتی دھوبی ہے جو نئے نئے کپڑے پہننے والوں کو غافل پا کر ان کے پرانے کپڑے جو دھلنے کے لئے آئے تھے زیب بدن کر لئے ہیں۔ ابھی اس کی اس "مغالطہ دہی" پر غور کرنے بھی نہیں پایا کہ دستک کی آواز کان میں آتی ہے۔ پھر باہر آتا ہوں معانقہ کے لئے ہاتھ بڑھتا ہے تو میرا ملاقاتی امید اور یقین کے ساتھ ہاتھ پسار دیتا ہے۔ سچ ہے "دینے والا ہاتھ بہتر ہے نیچے کے ہاتھ سے" مجھے کوفت میں خیال بھی نہیں

رہتا کہ آج عید ہے۔ میں کہہ دیتا ہوں" کل ہی تو میں نے ڈاڑھی بنوائی تھی" پھر خیال آتا ہے "دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی" یعنی اگر اسے عید کا انعام نہ دیا جائے تو کل کہنا پڑے گا" بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے" میں تو آئینہ دیکھتے ہی رہ جاؤں گا اور وہ ـــــ وہ تو مجھے "سرخرو" ہی کر کے چھوڑے گا۔ پھر گھر میں جاتا ہوں اور مستقبل پر سے حال کو قربان کر کے ایک روپیہ باہر بھیج دیتا ہوں۔ صندلی پردے میں سے دکھائی دیتا ہے کہ کوئی صوفے پر بیٹھا گنگنا رہا ہے اخلاق کا مکمل ثبوت دینے کے لئے باہر نکلتا ہوں۔ ماما کے صاحبزادے بلند اقبال آئینہ میں صورت دیکھ کر جھوم رہے ہیں۔ اخلاق کا مکمل ثبوت دینے کے لئے منہ پھیر کر پھر گھر میں چلا جاتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد ان ہی صاحبزادے کی آواز سنائی دیتی ہے۔" بیٹھئے"۔ سمجھتا ہوں کہ کوئی صاحب تشریف لائے ہیں۔ باہر نکلتا ہوں تو" گولی کھڑا ہے۔ جی میں آتا ہے گلے مل کے رو دوں پھر خیال آتا ہے کہ آج عید ہے۔ ہنس دیتا ہوں اس لئے کہ دودھ نہیں تو شیر قورمہ نہیں اور شیر قورمہ نہیں تو عید نہیں۔

ان رسمی ملاقاتوں سے گھبرا کر ارادہ کر لیتا ہوں کہ اب کبھی باہر نہ آؤں گا۔ اس لئے سمجھ لیتا ہوں بلکہ نوکروں کو بھی سمجھا دیتا ہوں کہ میں گھر میں نہیں ہوں۔ یہ کمال ہر شریف آدمی کو آتا ہے کیونکہ اس کے لئے "ریاضت" کی ضرورت نہیں۔ صرف مستقل مزاجی کی عادت چاہئے۔ خبر ملتی ہے کہ عزیزی اشفاق آئے ہیں۔ نوکر کہتا ہے کہ "صاحب گھر میں نہیں ہیں" اشفاق اصرار کرتے ہیں کہ" ہیں" اس اصرار کی نوعیت بالکل ایسی ہی ہے جیسے آپ کسی فقیر کے سوال پر کہہ دیں کہ "میرے پاس کچھ بھی نہیں" آپ کی حجت اور اس کا اصرار دونوں جاری رہتے ہیں۔ نہ وہ تھکتا ہے نہ آپ تھکتے ہیں لیکن خدا بہتر جانتا ہے کہ اس کا علم غیب دانی صحیح ہے یا آپ صحیح فرما رہے ہیں۔ بہر حال مجھ سے نہیں رہا جاتا چلا کر کہتا ہوں جیسے اپنے وجود کا خیال آ جائے" میں ہوں اور آ رہا ہوں" چنانچہ اپنے دوست سے گلے مل کر گفتگو شروع کرتا ہوں۔ ایک قوال صاحب ستار بغل میں لئے اس طرح نازل ہوتے ہیں جیسے عین اس وقت جب کہ کوئی فطرت پرست شاعر سہانے جھرنے کے قریب بیٹھا ہو اور بازو کی جھاڑی سے شیر نکل کر اسے دبوچ لے جی چاہتا ہے کہ بھائی اشفاق کو قتل کر کے خودکشی کر لوں۔ لیکن قتل جرم ہے اور خودکشی گناہ۔ اس لئے سنتا ہوں کہ

عیدگاہِ ماغریباں کوئے تو ؎ انبساطِ عید دیدن روئے تو

سوچنے لگتا ہوں کہ کیا یہ قوال میری صورت دیکھ کر عید کا انبساط حاصل کرنے آیا ہے۔ لیکن بہت جلد مطلب واضح ہو جاتا ہے جب دوسری غزل شروع ہوتی ہے۔

ہو جائے غریبوں پہ عنایت کی نظر بھی

فوراً جیب میں ہاتھ پڑتا ہے اور پھر میں سنتا ہوں۔

کچھ حسن کا صدقہ مرے سرکارِ ادھر بھی

لیکن چونکہ اپنی قوتِ ارادی کی توہین منظور نہیں اس لئے پہلے مصرع پر عمل کرتا ہوں اور دوسرے مصرعے کا اثر نہیں لیتا مجھے یقین ہے کہ پہلے مصرع میں قوال نے مجھ سے مخاطبت کی ہے اور دوسرا مصرعہ تو شاعر نے اپنی معشوق سے کہا تھا۔

قوال کے جاتے ہی اشفاق صاحب بھی اس طرح چلے جاتے ہیں جیسے کسی نغمہ کے پیچھے روح چلی جائے۔ اس کے بعد جو گھر میں جاتا ہوں تو پھر آپ قسم لیجئے اگر میں جھوٹ بولوں کہ میں نے اپنے جھوٹ کو شام تک نباہ دیا۔ یعنی پلنگ سے اٹھا ہی نہیں۔

اب یہاں آیا ہوں آپ سے گفتگو کرنے کے لئے۔ میں سمجھتا ہوں۔ یہ ہوائی ملاقات" میرے نقطۂ نظر سے سب میں اچھی ہے اس لئے کہ اس میں نہ گلے ملنا پڑتا ہے۔ نہ مصافحہ کرنا اور نہ انعام دینا۔ شب بخیر۔

میکش

(یہ تقریر حیدرآباد ریڈیو سے نشر کی جا چکی ہے)

گل بوٹے

کوئی آدھی رات کا عمل ہوگا کہ موٹر کے ہارن کی "کان پھوڑ" آواز سے ہم سوتے سوتے اچھل پڑے، دیکھتے کیا ہیں کہ ہمارے چار شکاری بھائی چلے آرہے ہیں اور ان کے پیچھے شکار دیکھنے کی شوقین بہنیں ہنستی بولتی محو خرام ہیں۔ دو دن پہلے پچھلی دفعہ کی طرح ہمیں پھر شکار دیکھنے کی شہر سے کوئی چونسٹھ میل پر مسلسل بہتر گھنٹے کی دعوت دی گئی تھی مگر ایک ضروری کام کی وجہ سے ہم نے انکار کر دیا تھا جس پر ہماری وہی "نادری بہن" نے ہمیں بہت کچھ جلی کٹی سنائی تھیں کہ ہم نرے گاؤدی ہیں! ہمیں شکار کرنے کا شوق ہے نہ دیکھنے کا!! مجذوب کی طرح ہم گھر میں بیٹھے رہتے ہیں وغیرہ وغیرہ!!! اپنے مجذوب ہونے کو تسلیم کرکے ہم نے شکار پارٹی کے ساتھ جانے سے بالکل انکار کر دیا تھا مگر آنے والی بپتا ٹلتی کب ہے! ہمیں یہ خبر نہیں تھی کہ آدھی رات کے وقت شکاری ناگہانی آفت کی طرح نازل ہوں گے اور نخچیر کی طرح ہمیں فتراک میں باندھ لیں گے!! چار و ناچار ہم اس پر راضی ہوئے کہ بعض ضروری کاموں کی وجہ سے سویرے تو نہیں البتہ دوپہر کو چلیں گے! اس شرط کو سن کر ہماری "نادری بہن" آگ بگولہ ہوگئیں، آنکھوں سے چنگاریاں پھینکنے اور پھلجھڑیاں چھوڑنے لگیں! مگر ہم ٹس سے مس نہیں ہوئے!! مجذوب جو ٹھیرے!

آدھی رات کی ملاقات کے بعد شکاریاں رخصت ہوئے اور چلتے چلتے ہماری نیند بھی لیتے گئے! گویا ان کا پہلا شکار ہماری "نیند" تھی!! کوئی دو گھنٹے کے بعد ہماری آنکھ لگی اور پھر صبح چھ بجے موٹر کے ہارن کی آواز نے ہمیں جگا دیا، یہ موٹر ایک شکاری نے بھیجی تھی کہ اس میں ہمارے اور ایک اور شکاری بھائی کے نوکر بھیجے جائیں اور ہم بارہ بجے تک ان کے گھر پہنچ جائیں، یہ شکاری جمعہ کو ظہر سے پہلے شکار کو نہیں جاتے اب تو ہم لاجواب ہوگئے!

کھانے کے بعد ایک بجے کے قریب ہم ان کے گھر پہنچے، بیبیاں اور بی بیاں اندر بیٹھ گئیں، شکاری نے شوفر کی جگہ سنبھالی اور ہم ان کے بازو بیٹھ گئے، جس موٹر میں ہم آئے تھے اس میں سامان اور نوکر بھر دئے گئے اور دونوں موٹریں چل پڑیں! دس پندرہ میل جانے کے بعد نوکروں کی موٹر جو پیچھے آرہی تھی غائب ہوگئی، بی بیاں بے چین ہوگئیں، موٹر آہستہ چلانے کی خواہش کی گئی، مگر شوفر صاحب نے صاف انکار کر دیا، اتنے میں ایک آدمی ریل کے سگنل کی طرح ہاتھ اٹھائے کھڑا نظر آیا، نزدیک جب پہنچے تو اس کے ہاتھ میں کئی تیتر جن کی ٹانگیں ایک سُتلی سے بندھی ہوئی تھیں الٹے لٹک رہے تھے، پانچ تیتر کے وہ دو روپے لگ رہا تھا ہم نے روپے کے آٹھ مانگے مگر شوفر صاحب نے جلدی کرکے بھاؤ بگاڑ دیا اور روپے میں پانچ خرید لئے۔

یہاں سے ایک دو میل گئے ہوں گے کہ بی بیوں کا پیاس سے برا حال ہونے لگا، موٹر ٹھیرانے کہا تو ہم نے مشورہ دیا کہ خاموش بیٹھیں، باتیں کئے جائیں بارش کا پانی ہوا سے اڑ کر منہ میں آئے گا اور پیاس بجھائے گا، جب تقاضہ بہت ہونے لگا تو موٹر ٹھیرائی گئی، شوفر صاحب بندوق لے کر شکار کی تلاش میں نکلے! پانی پی کر پان لگائے جا رہے تھے کہ نوکروں کی موٹر رینگتے گھسٹتے آ ہی پہنچی!! اس کو دیکھ کر بی بیوں کی جان میں جان آئی، نیچے جا کر کچھ کھانے پینے کی چیزیں نکال لائے، کچھ منہ کا مزہ بدلنے کے بعد دونوں موٹریں روانہ ہوئیں۔

منزل مقصود کا جو پتہ دیا گیا تھا اس کے حساب سے چھپن میل کے بائیں جانب ہمیں مڑنا تھا مگر چھپن ویں میل کے پتھر کے آگے پیچھے راستہ کا کوئی نشان نہیں تھا، شوفر صاحب بہت پریشان ہوئے، ہم نے کہا چلے چلئے جہاں راستہ بائیں جانب نظر آئے گا پلٹ جائیں گے، چھپن میل کے عوض ساٹھ میل کے پتھر کے بعد راستہ بائیں جانب مڑتا نظر آیا، یہاں دو تین آدمی بھی کھڑے تھے، بات چیت ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ہمارے ہی لئے آئے ہیں، یہاں سے کوئی آٹھ میل پر گاؤں ہے مگر راستہ صاف نہیں ہے، موٹریں کیچڑ میں پھنس جاتی ہیں چنانچہ شکاریوں نے اپنی ایک موٹر مسافر بنگلہ میں چھوڑ دی ہے اور بڑی مشکل سے دو موٹریں کئی آدمیوں کی مدد سے ساتھ لے گئے ہیں، راستہ کی نسبت یہ وحشتناک خبر

سن کر شوفر صاحب بہت پریشان ہوئے، بی بیوں نے تو واپس چلنے کا مشورہ دیا۔ گاؤں والوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دو شکاری سامنے کے تالاب پر ہمارے منتظر ہیں، مجبوراً دونوں موٹریں آگے بڑھیں، کچھ فاصلہ پر ایک گڑھا نظر آیا جس پر ہاتھیوں کے شکار کے گڑھوں کی طرح پتے بچھے ہوئے تھے آہستہ سے اس پر موٹر جو چلائی تو سامنے کا ایک پایہ فٹ بھر اندر اتر گیا، یہاں سے نکلے تو دس قدم پر ریت میں دونوں پائے پھنس گئے، راستہ کچھ ایسا خراب نہیں تھا۔ صرف کیچڑ، پتھر اور ریت سے دلدل میں پائے پھنسنے کی وجہ سے موٹر کی رفتار ذرا سست ہو گئی تھی، چار پانچ میل گھنٹے کی چال سے ہماری موٹریں چل رہی تھیں۔

جب تالاب پر ہم پہنچے ہمارے شکاری عزیز جن کے دم کے ساتھ یہ ساری برات تھی بندوق نے ایک شکاری کے ساتھ چہل قدمی کر رہے تھے، ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، مزاج پوچھا تو فرمایا۔

"پانچ بج رہے ہیں مگر ابھی تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا اور موٹروں کے لیجانے میں اس قدر محنت کرنی پڑی کہ کچومر نکل گیا"!

یہاں دو کھاچریں بھی موجود تھیں، بی بیوں نے موٹر میں بیٹھ کر کیچڑ میں پھنستے ہوئے جانے سے کھاچر میں بیٹھنا پسند کیا اور ہم سب براتیوں کی طرح پیچھے چلنے لگے، دس بارہ آدمی موٹر کو لپٹ گئے، ایک کھیت سے دوسرے میں، دوسرے سے تیسرے میں اور تیسرے سے دلدل میں، دلدل سے نالے میں، نالے سے گڑھے میں، گڑھے سے ٹیلے پر، ٹیلے سے ریت میں، ریت سے کیچڑ میں پھنساتے، کھینچتے، چڑھاتے اتارتے میدان میں لے آئے، نوکروں کی موٹر بھی اسی طرح "آسانی" سے نکل آئی اب ہم سب موٹر میں بیٹھ گئے۔

یہاں سے دونوں موٹریں ایک پگڈنڈی پر چلنے لگیں، اس کے دونوں طرف کھیت تھے اور کانٹی لگی ہوئی تھی، اس کانٹی نے موٹر پر کئی خوب "نقش و نگار" بنائے، غرض کہ گرتے پڑتے کوئی چھ بجے گاؤں میں داخل ہوئے، گاؤں والے اپنے مکانوں اور جھونپڑیوں سے نکل کر ہمیں اس طرح گھور رہے ہیں کہ گویا ہم "عجیب الخلقت" مخلوق میں سے ہیں!

جب جاگیردار صاحب کے مکان پر پہنچے تو ہماری موٹروں کو بچے بڑے سب کے سب گھیر لئے اور ہم ایک تماشہ بن گئے، اندر داخل ہوتے ہی "نادری بہن" سامنے آئیں، یہ بے چاری تھک کر اس قدر چور ہو گئی تھیں کہ معلوم ہوتا تھا دو چار روز سے ان کے منہ میں ایک کھیل تک اڑ کر نہیں گئی ہے؛ ہم نے خیریت پوچھی تو اس گھڑی کو کوسنا شروع کیا جب کہ ان کے میاں نے بندوقیں خریدی تھیں، نہ بندوقیں آتیں نہ شکار پارٹیاں ہوتیں! اور نہ وہ یہ مصیبتیں جھیلتیں!! دو شکاری جو چشم بد دور ذرا گدگدے جسم کے تھے فرش پر چت لیٹے

"اب تو سر بھی مرے تن پہ بار ہے"!

زبانِ حال سے بول رہے تھے، نوکر کھانے کی تیاری میں ادھر سے ادھر دوڑ رہے تھے اور ہماری "نادری بہن" بیچ میں کھڑی احکام صادر کر رہی تھیں منہ ہاتھ دھو کر ہم نے مکان کا جائزہ جو لیا تو دالان کے بیچوں بیچ دیوار پر ایک تصویر نظر آئی، اس میں ایک بزرگوار دستار لگائے شیروانی پر اور کوٹ پہنے تلوار ٹیکے کھڑے تھے ان کے سامنے جو صاحب ادب سے کھڑے تھے وہ ان کے مصاحب معلوم ہوتے تھے کیونکہ دستار کے ساتھ انھوں نے بگلوس بھی لگا رکھا تھا یہ بھی ایک موٹا سا "اور کوٹ" پہنے ہوئے تھے، ان دونوں کے بیچ میں دس بارہ سال کی ایک لڑکی گلے سے پیروں تک فراک کے جیسا "فرغل" پہنے ہاتھ جوڑے کھڑی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "ڈراپ" اٹھتے ہی "حمد" گائیگی، اس کے پیچھے دو تین چھوٹے چھوٹے لڑکے کچھ بیٹھے کچھ کھڑے تھے، ان کی شیروانیوں پر چھوٹے چھوٹے "اور کوٹ" بڑے بھلے معلوم ہو رہے تھے، سب کو موٹے موٹے "اور کوٹ" پہنے دیکھ کر ہم نے سوچا کہ کسی زمانے میں یہ مقام کشمیر یا نیلگیری سے کم ٹھنڈا نہ ہوگا۔ حالانکہ پچھلی گرمیوں میں جب ہم نیلگیری گئے تھے تو "اور کوٹ" کے بغیر

چار پانچ دن بغیر کسی تکلیف کے ہم نے وہاں گزارے تھے، ہم ابھی اس مسئلہ پر غور کر ہی رہے تھے کہ گانے کی ایک شوقین بہن ہارمونیم ہمارے سامنے رکھ کر گانے بیٹھ گئیں، سچ پوچھئے تو شکاری انہیں اور ہمیں اسی لئے لائے تھے کہ جب وہ شکار سے تھک کر آئیں تو گا بجا کر ہم ان کا جی بہلائیں، یہ سلسلہ کوئی ایک گھنٹہ تک رہا ہوگا کہ " نادری بہن " نے سب کو فوراً اٹھ جانے کا حکم دیا، دالان کی صفائی شروع ہوگئی۔ کئی مرتبہ جھاڑو ہوئی تب کہیں دستر خوان چنا گیا " نادری بہن " نے کھانے بڑے مزے کے پکوائے تھے گر ذرا مرچ تیز ہوگئی تھی، صبح سے جو لوگ بھوکے تھے خوب سیر ہو کر کھائے، ہم نے بھی مزے مزے کی چیزیں کھا کر شکاریوں کو دعائیں دیں کہ ایسی ہزاروں پارٹیاں کرنی نصیب ہوں، مگر ہمارے عزیز نے جنھیں ساون اور بھادوں میں بڑے شکار کی سوجھی تھی اعلان کر دیا کہ یہ پارٹی جاتی برسات کی آخری ہے، آتی سردیوں میں دیکھا جائے گا!

کھانے کے بعد پھر گانا شروع ہوا اور آدھی رات تک وہ تانیں لگائی گئیں کہ تان سین کی روح کو وجد آگیا ہوگا اور وہ تلملانے لگی ہوگی، آخر میں اقبال کی مشہور غزل

" کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں "

شاہانہ کی دھن میں گا کر ہماری بہن نے سب کو محوِ خواب کر دیا۔

پھر اس غضب کے تھے کہ ہمیں تو نیند آنا دشوار ہوگیا تھا، بڑی مشکل سے ایک گھنٹہ تک کروٹیں بدلنے کے بعد کچھ نیند لگی تھی کہ باز و کے کمرے سے آوازیں آنے لگیں! اس کمرے میں ایک شکاری پھر دان تانے بڑے مزے سے سو رہے تھے مگر اب وہی " ہات ہت " کر رہے تھے، یہ سمجھ کر کوئی جانور ان کے کمرے میں گھس گیا ہے یا شکار خود شکاری کے پاس آگیا ہے، ٹارچ کی روشنی ان کے پھر دان پر جو ڈالی تو اندر ایک چھوٹی لڑکی کھڑی نظر آئی، ہوا یہ کہ ان کی بھاج

کی جو گری نیند میں لوٹتے لوٹتے بڑے موقع سے ان کے پھر دان میں گھس گئی تھی مگر اس " تقریب " میں ہماری نیند اچاٹ ہوگئی۔ اور صبح صبح کچھ آنکھ لگی تھی کہ " الارم " کی گھنٹی سر پر بجنے لگی، وہ شکاریوں کو جگانے کے لئے تھی، ایک نیند کے متوالے شکاری نے اس کو فوراً بند کر دیا مگر اب ہمیں نیند نہ آنا تھا نہ آئی، لوٹ پوٹ کر چھ بجے اٹھ بیٹھے، آنکھ کھلتے ہی ایک شکاری کو عبادت الٰہی میں مصروف دیکھ کر سارا دن خیر خوبی سے گزرنے کا ہم نے شگون لے لیا، نماز ختم کر کے انھوں نے ہارمونیم پر " بھیرویں " چھیڑ دی اور شکاری دھوم دھوم گھر سے جاتے ۔ سانبر پر کچھ لوبھی لاتے بچوں نے مل کر کورس گانا شروع کیا، ناشتہ کے بعد شکاری جنگل کی طرف چلے گئے اور ہم گانے بجانے میں مشغول ہوگئے۔

بارہ بجے ہوں گے کہ " نادری بہن " کے اصرار پر شکاریوں کا انتظار کئے بغیر ہم نے کھانا کھا لیا اور کوئی دو بجے شکاریوں سے ملے بغیر سب کو خدا حافظ کہہ کر دو ہی نوکروں کی موٹر میں گھر چلے، گڑھوں اور ٹیلوں پر سے ہوتے ہوئے دلدلی کھیتوں میں پہنچے، ادھر ادھر دیکھا کوئی آدمی نظر نہ آیا حالانکہ گاؤں کے پٹیل نے چھ آدمی ہماری موٹر کی " ناؤ " کو پار لگانے بھیجنے کا وعدہ کیا تھا، شوفر آدمیوں کی تلاش میں نکلا اور اس نے دو چار آوازیں بھی لگائیں جو صدا بہ صحرا ہوگئیں! بیگم بہت پریشان ہوئیں کہ بیچ جنگل میں آخر کب تک اڑے رہیں گے!! شوفر نے کھیتوں سے موٹر پار لیجانے کا خیال ظاہر کیا تو وہ مارے ڈر کے اتر گئیں، ہم بھی تو آخر " رفیقِ حیات " ہی ٹھیرے! ان کی تقلید کی، اترنا ہی پڑا!! دو چار قدم چل کر موٹر دلدل میں کچھ ایسی پھنسی کہ نہ آگے بڑھتی تھی نہ پیچھے ہٹتی تھی، ہم سب دلدل کے اوپر آسمان کے نیچے بھیگتے کھڑے تھے، بیگم نے پوچھا اب کیا ہوگا؟ ہم نے کہا ہوگا کیا! چار پانچ میل کی " دھاپوش " کر کے

گاؤں والوں کو پکڑ لائیں گے، اتنے میں دور سے کچھ آدمی آتے نظر آئے اشاروں سے ہم نے انہیں جلد آنے کے لئے کہا، اب بیگم کی جان میں جان آئی! سب نے مل کر بڑی مشکل سے موٹر کو کھیتوں سے باہر نکالا، ہم کوئی چار چھ فرلانگ موٹر کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، جب "آفات ارضی" سے موٹر صحیح سلامت نکل گئی تو سوار ہو گئے اور کچھ دے دلا کر گاؤں والوں سے جان چھڑائی۔

ریت، کیچڑ اور دلدل کو پار کرنے میں ہمارے اندازہ سے زیادہ پٹرول جل گیا، حالانکہ نکلتے وقت فاصلہ کے حساب سے زیادہ ہی ڈلوایا گیا تھا۔ مگر اب کچھ کم دو گیلن رہ گیا تھا اور ساٹھ میل طے کرنے تھے، شوفر نے مشورہ دیا کہ کوئی آٹھ میل پر پٹرول ملتا ہے دو گیلن لینا بہتر ہوگا، اتنے میں ہمارے ایک شکاری عزیز کا نوکر سیکل پر جاتے جاتے ہم سے کہتا گیا ہمیں اجازت ہے کہ جتنا چاہیں پٹرول خریدیں کوئی تکلف کی بات نہیں ہے اس اجازت کے بعد ہماری جرأت اور بھی بڑھ گئی دو گیلن پٹرول خرید کر گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

اب بارش زیادہ ہونے لگی تھی، کالی گھٹائیں بھی اٹھ رہی تھیں، اگر اس وقت ہماری گانے والی بہن ہوتیں تو

"برسن لاگی رے بدریا ساون کی"

ملہار کی دھن میں بڑے مزے سے گاتیں، ہمیں ساون کی ان گھٹاؤں کے حال زار پر افسوس ہو رہا تھا کہ ان سے ہم سب بیزار بیٹھے تھے، کوئی ان کی خیر منانے والا اور یہ کہنے والا نہ تھا۔

"الہٰی یہ گھٹا دو دن تو برسے"!

گھر سے کوئی بیس پچیس میل ہوں گے کہ اندھیرا ہو گیا، سامنے کے آئینہ پر پانی اس قدر جم گیا کہ راستہ نظر آنا دشوار ہو گیا، جب بجلی کی روشنی والی سڑک پر آئے تو دم میں دم آیا، اندھیرے سے تو نجات ملی مگر ساتھ ہی ہماری موٹر ایک بھینس سے ٹکرائی! ہم نے شوفر کو جو ڈانٹا تو اس نے نہایت برجستہ جواب دیا! بھینس کا رنگ اور سڑک کا رنگ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر مل گئے تھے کہ بھینس میں اور سڑک میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا تھا اس لئے بھینس کو اس نے سڑک کی چڑھائی سمجھ کر موٹر اس پر چلا دی!! سیدھا مڈگارڈ بھینس سے ڈر کر ٹائر سے لپٹ گیا! اور اس پر کی قندیل ایسی رفو چکر ہوئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ!! اس کے بعد بفضلہ تعالیٰ کوئی حادثہ نہیں ہوا، دو بجے دن کے نکلے رات کے نو بجے ٹھنڈے ٹھنڈے بخیر و عافیت بھیگی مرغیوں کی طرح گھر پہنچے۔

دوسرے دن کے پانچ بجے ہوں گے کہ اس پارٹی کے دو شکاری اپنی بیگموں کے ساتھ گھر جاتے جاتے ہم پر نازل ہوئے، شکار کا حال پوچھا تو ایک نے اِن مناتے ہوئے کہا

"ایک بور بچہ ملا"!

چھٹتے ہی ان کی بیگم نے فرمایا آئندہ اس پر بیٹھ کر جناب میر شکاری صاحب تشریف لا رہے ہیں"!!

"باغباں"

قتلِ عام

رنگِ شفق کے نور سے دھوئی ہوئی جبیں خوابِ شباب و شعر کی تعبیرِ دلنشیں
دستِ خدائے حسن کا شہ کارِ آتشیں اک پیکرِ تجمل و دوشیزۂ حسیں
اک غم شناسِ عشق و اک آرزو نواز
کھڑکی سے پھینکتی ہے کمندِ نگاہِ ناز

طوفانِ رنگ و بو ہے فضائے بسیط پر دنیا ہے سیلِ نور میں غرقاب سربسر
مسحور ہیں دماغ تو ناکام ہے نظر تھرا رہے ہیں اہلِ جہاں کے دل و جگر
ہر خشک و تر میں طور کا جلوہ بکھر گیا
یا چودھویں کا چاند زمیں پر اُتر گیا

بزمِ نظر میں ذوقِ کرم باریاب ہے مستی بھری نگاہ سے دنیا خراب ہے
سو شوخیوں کی زد میں خیالِ حجاب ہے طفلی کے گلستاں میں بہارِ شباب ہے
شاعر کی آرزو ہے، مصور کی جستجو
مٹھی میں ہے جمالِ دو عالم کی آبرو

رنگِ رخِ جواں میں مچلتی ہوئی بہار ابرو میں ماہِ نو کا تبسم ہے بے قرار
ہر جنبشِ نظر ہے مئے ناب کی پھوار یہ حسنِ شعلہ بار یہ ملبوسِ زرنگار
ہیکل گلے میں کان میں بندے پڑے ہوئے
گیسو میں پھول ہیں کہ ستارے جڑے ہوئے

دنیا کو پھونک دے گی یہی لالہ فام کیا؟ نیرنگئ شباب اسی کا ہے نام کیا؟
دیتی ہے انقلابِ جہاں کا پیام کیا؟ ہونے لگی ہے تیغ کوئی بے نیام کیا؟
لاکھوں نزاکتوں سے ہے ظالم کھڑی ہوئی
یا قتلِ عام پر ہے جوانی اڑی ہوئی

رشید احمد (عثمانیہ)

فرض کی قربان گاہ

چندنالے جن میں میری زندگی کا ساز ہے
نذر لایا ہوں ترے کیفِ ترنم کے لئے

شیاما پیاری۔

تم نے بارہا مجھے میری خاموشی پر چھیڑا ہے تنگ کیا ہمیشہ اس ٹوہ میں رہیں کہ میری خاموشی اور میری سوچ کا سبب معلوم کرسکو۔ لیکن انتہائی کوشش کے باوجود تم اس کی تہ کو نہ پہنچ سکیں میں کس سوچ میں رہتی ہوں اور یہ "چپ کیوں سادھ لی ہے"؟ سنو گی اب بھی۔ تو لو سنو اور کان دھر کر سنو ۔ یہ ایک ایسا افسانہ ہے جو زمانے کی نیرنگیوں اور سماج کی پابندیوں کے باوجود ان سے بے نیاز رہا۔ جو درحقیقت افسانہ نہیں بلکہ محبت کی بارگاہ نیاز میں ایک عقیدت مند دل کا پُرخلوص نذرانہ ہے۔

شیاما ایثار کا دوسرا نام محبت ہے۔ اپنی ہستی کو دوسرے پر مٹا دینا ــــ اسی کو پریم کہتے ہیں۔ یہ ایک بے نفس قربانی ہے۔ گناہ نہیں۔

لیکن دنیا والے کیا جانیں کہ سچا پریم کسے کہتے ہیں۔ ان کے تنگ و تاریک دماغ میں محبت اور ہوسناکی مترادف الفاظ ہیں۔ اس روحانی جذبہ سے وہ یکسر ناواقف ہیں جس کو بجا طور پر "پریم" کہا جاسکتا ہے۔

یہ وہ لطیف جذبہ ہے جو دل کی گہرائیوں میں پرورش پاتا ہے۔ وہ پاک اور منور دیا ہے جو من مندر میں فروزاں ہوکر اپنی ضیا پاشیوں سے دنیا کی تمام چیزوں کو نورانی کر دیتا ہے۔ وہ زخار سمندر ہے جس کا شناور ساحل پر پہنچ کر اپنا دامن گوہر مراد سے بھر لیتا ہے۔ جس نے اس پاک جذبہ کا مزہ چکھا ہو اور اس کے درد کی لذت اٹھائی ہو وہی کچھ اس کی لطافت کی داد دے سکتا ہے۔ اس پاپ بھری دنیا میں جس جذبہ کو محبت کہتے ہیں وہ محبت نہیں ہوس ہے ـــ ہوس اور نفس پرستی۔

اس لئے دنیا والوں کے دماغ میں محبت کے تصور کے ساتھ ساتھ گناہ کا تصور آتا ہے۔ ان کے خیال میں ایک کا دوسرے سے جدا رہنا ناممکن ہے۔ ان کی عقل میں یہ بات سماتی ہی نہیں کہ محبت کرنے والوں کا دامن آلائشوں سے پاک بھی رہ سکتا ہے۔ ان کے خیال میں محبت کا انجام بجز معصیت کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔

شیاما تم جانتی ہو کہ میں نے اپنی ازدواجی زندگی کس طرح بسر کی۔ میرا گھر جنت الارض تھا جس میں محبت کی بے پایاں حکومت تھی۔ میں اپنے گھر کی ملکہ تھی اور ایک سچے اور نیک آدمی کی پرستار محبت۔

ہماری محبت خود ایک افسانہ ہوگئی تھی۔ لوگ مثال کے طور پر ہماری محبت کو پیش کرتے تھے۔ ہاں یہی لوگ جو آج کے دن میرے دامنِ عصمت کی دھجیاں بھی باقی رکھنا نہیں چاہتے انھیں کیا خبر کہ رادھا کا دامن پاک ہے وہ ایک ہندستانی عورت ہے جو پتی کی ہوکر پھر کسی کی نہیں ہوسکتی۔ وہ ایک احساس اور درد مند دل رکھتی ہے جو محبت کی تمام وسعتوں سے آشنا ہے جس میں پھول بھی ہیں اور کانٹے بھی لیکن جس نے پریم نگر کی پرخار و خطر وادیوں سے صرف پھول چن لئے اور کانٹوں میں اپنا دامن الجھنے نہیں دیا۔ اور خدا اس بات کا شاہد ہے۔

ہاں ۔ تو ہماری محبت خود ایک افسانہ تھی۔ ہم دنیا کے شور و شر سے دور ندی کے کنارے ایک پُر فضا مقام پر رہتے تھے۔ جہاں کے خوشنما مناظر ہماری پرسکون زندگی میں ایک دلفریب ہم آہنگی پیدا کرتے۔ میری عمر کا وہ حصہ جو عموماً کشمکش میں گزرتا ہے میرے لئے راحت و سکون

اور روحانی مسرتوں کا ایک بیکراں سمندر تھا جس کی سطح پر میری کشتیٔ حیات نہایت آسودگی سے رواں تھی اور میں اپنی زندگی کا بہترین زمانہ اس خوش گوار ماحول میں اطمینان سے بسر کر رہی تھی۔

زمانہ کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا۔ نظامِ ہستی میں نت نئی تبدیلیاں ہوا کرتی ہیں۔ پھر میری زندگی کیونکر اس سے مستثنیٰ رہتی۔ ہماری اس خوش آئند زندگی میں خلل ڈالنے والا میرا وہ جذبۂ ہیجان تھا جس نے میری زندگی میں ایک غیر معمولی ہل چل ڈال دی۔ ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ میرا سکون اضطراب سے بدل گیا۔ میرے دل میں ایک درد، ایک تڑپ پیدا کر دی جو پھر کبھی منتِ کش درماں نہ ہوئی۔ اور جس کی خلش میں اب بھی میرے لئے کیف و سرور کے راز پنہاں ہیں۔

اسے تم میرا اقبالِ جرم سمجھو یا میرا رومان۔ لیکن حقیقت میں یہ دونوں بھی نہیں بلکہ میری زندگی کا وہ نادر تجربہ ہے جس نے مجھے دنیا کی لطافتوں، اس کے دکھ درد، اور اس کے نشیب و فراز سے روشناس کر دیا جس نے مجھے انسان کی ہستی، اس کی فطرت اس کی نفسیات اور ان کے حسن و قبح کا تجزیہ کرنے کا موقعہ دیا۔ جس نے ایک قلیل مدت مجھے ایک ناتجربہ کار لڑکی سے ایک فلسفی بنا دیا۔

سچ پوچھو تو دنیا کی کسوٹی پر ہی کھرے اور کھوٹے کو پرکھا جاتا ہے۔ شیا مایقین مانو کہ تمہاری رادھا اس امتحان میں اپنی ثابت قدمی کی وجہ سے پوری اتری۔

کرشنا میری بھاوج کا عزیز تھا اور کبھی کبھی ہمارے یہاں بھی آیا کرتا۔ میرے بھائی کا تبادلہ گاؤں پر ہو گیا۔ بھابی نے کرشنا کو جو ان کے ساتھ رہتا تھا میرے پتی کے حوالے کیا۔ اب وہ ہمارے ساتھ رہنے لگا۔

میں کبھی خاص طور پر اس کی طرف متوجہ نہ ہوئی۔ البتہ مہمان کی حیثیت سے اس کے کھانے پینے اور آرام و آسائش کا کم و بیش خیال رکھتی۔

رفتہ رفتہ میں یہ محسوس کرنے لگی کہ وہ اکثر خاموش اور کچھ کھویا ہوا سا رہتا ہے پھر میں نے اکثر اسے میری طرف غور سے دیکھتا ہوا پایا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ میں بدستور اپنے کام کاج میں منہمک رہتی۔ لیکن عورت بہت حساس ہوتی ہے۔ چند ہی دنوں میں میں نے محسوس کیا کہ میرا کام، میرا مذاق، میرا رکھ رکھاؤ غرض میری ہر چیز اس کو مرغوب ہے۔ گو اس نے زبان سے کبھی اس کا اعتراف نہیں کیا۔ لیکن اس کی نگاہیں اس کی پسندیدگی کا اظہار کر جاتیں۔

عورت کی خلقت میں جہاں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں خود پسندی اور خود ستائی کا بڑا عیب بھی موجود ہے۔ میں نے گو بظاہر اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش نہ کی ہو، لیکن دل میں اس کی قدر دانی اور ستائش کی ضرور متمنی رہتی۔

بہت ممکن ہے کہ میری اس ظاہری بے توجہی نے ہی کرشنا کو میری طرف مائل کیا ہو۔ کیونکہ مردوں کی عادت ہے کہ وہ ایسی چیز کی تمنا کرتے ہیں جس کا ملنا دشوار ہو۔ اور شاید ہونا بھی یونہی چاہیئے کیونکہ تمنا تمنا ہی نہیں جب وہ حاصل ہو جائے۔ بہر حال کرشنا بھی ایک ایسی تمنا کا شکار ہوا جس کا حاصل کرنا نہ صرف دشوار بلکہ بالکل ناممکن تھا۔ اس حقیقت سے میں مدتوں بے خبر رہی اور اچھا ہوتا اگر ہمیشہ ہی بے خبر رہتی۔ لیکن مشیت ایزدی میں کس کو دخل ہے۔ اس کو تو میری آزمائش مقصود تھی!

ہاں، تو کرشنا ہمارے ساتھ رہنے لگا۔ وہ میرا ہم عمر اور ہم خیال تھا اس لئے بہت جلد ہم ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے۔ کام سے واپس آ کر وہ گھنٹوں میرے ساتھ گزارتا۔ ہم کبھی

کنارے اکثر ہم شام میں جاکر بیٹھتے اور مختلف عنوانوں پر گفتگو کرتے وہ ادھر ادھر کے قصے سناتا کبھی کبھی گاتا بھی۔ اس نے نہایت دردبھری اور رسیلی آواز پائی تھی۔

چھٹی کے دن وہ گھر بار کے کام میں میری مدد کرتا۔ کبھی اچھی کتابیں پڑھ کر سناتا۔ میرے پتی اس کو بہت پیار کرتے۔ اور ہمیشہ تاکید کرتے کہ اس کو تکلیف نہ ہونے پائے اسی طرح دو چار مہینے گزر گئے اور میں اس سے خاصی بے تکلف ہوگئی۔

اکثر ہم میں ان بن ہوجاتی میں اس سے روٹھ جاتی تو وہ "رادھے کرشنا بول مکھ سے" گنگنانے لگتا میں فوراً ہنس پڑتی۔ جب میں کسی بات پر بحث و دلیل لیکر بیٹھتی تو وہ مجھے طنزاً ـــ "سرسوتی دیوی جی" کہہ کر مخاطب کرتا۔

میرے پتی ایک خدا ترس، نیک اور پاک طینت انسان تھے وہ ہماری سرگوشیاں سن کر خوش ہوتے اور محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھ کر کہتے "رادھے تو اس غریب کو اتنا تنگ کرتی ہے۔ دیکھو وہ کہیں گھبرا کر بھاگ نہ جائے" میں اپنی شوخی اور طراری سے کہتی "پھر تو ان کے لئے بیڑیاں تیار کرنی ہوں گی" یہ کرشنا شرما کر آنکھیں نیچی کرلیتا۔ اس کے چہرہ پر ایک ہلکی سی سرخی دوڑ جاتی اور وہ کوئی بہانا کرکے باہر چلا جاتا۔

کرشنا اسم با مسمّٰی تھا اس کی سیاہ چمکیلی آنکھیں اس کے جذبات کی پاکیزگی اور اس کی محبت کی فراوانی کی ضامن تھیں۔ اس کی اداؤں میں بانکپن اور اس کی آواز میں ایک دلفریب کشش تھی۔ ایک ساتھ کے اٹھنے بیٹھنے، رہنے سہنے نے میرے دل میں بھی اس کا خیال پیدا کردیا تھا۔ اس کی شب و روز کی خدمت۔ اس کا ادب و احترام اس کا خلوص اور اس کا مشفقانہ برتاؤ ـــ یہ ایسی باتیں نہ تھیں جن سے میں متاثر نہ ہوتی۔ رفتہ رفتہ میرے دل میں یہ باتیں گھر کر گئیں، اور انھوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ میرے دل میں بھی اس کی محبت پیدا ہوگئی۔ گو میں نے اس وقت اس جذبہ کو محبت سے تعبیر نہ کیا تھا لیکن اس کی قربت سے میرے دل میں ایک خوشی کی لہر سی دوڑ جاتی۔ ایک کیف حاصل ہوتا اور ایک بے پایاں مسرت سی محسوس ہوتی جس کو میں سمجھنے سے قاصر تھی۔

اسی اثناء میں میرے بھائی گاؤں سے واپس آگئے اور کرشنا اپنے ٹھکانے واپس چلا گیا۔ اس کے چلے جانے سے گھر بالکل سونا ہوگیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ میں نے محسوس کیا کہ کرشنا کا وجود میری زندگی کا ایک اہم جزو ہے۔ اس کے بغیر میری ہستی ایک بجھے ہوئے چراغ اور ایک بے نور آنکھ کی مانند تھی مجھے وہ ہر وقت اور ہر لحظہ یاد آتا۔ اس کی محبت، اس کی روا داری اس کا ادب و احترام، اس کی دل لگی اور چھیڑ چھاڑ اس کی وہ دلفریب کہانیاں۔ میں نے نہ صرف گھر ہی میں اس کی جگہ خالی پائی بلکہ میرے دل میں بھی کسی چیز کی کمی محسوس ہونے لگی۔ میرا سکون قلب جاتا رہا۔

میرے پتی بھی اکثر اس کو یاد کرتے اور ہم دونوں اکثر اسی کی باتیں کیا کرتے۔ لیکن جب میرے پتی اپنے کام پر چلے جاتے تو میں پہروں بیٹھی سوچا کرتی کہ مجھے یہ کیا سودا ہوگیا ہے۔

صرف سوچنا بے سود تھا جب تک کہ اس کی مدافعت کی تدبیریں اختیار نہ کی جاتیں لیکن جو شخص محبت اور اس کی نفسیات سے ہی بیگانہ ہو وہ کیونکر اس کی تہ کو پہنچ سکتا ہے مجھے ہر وقت کرشنا کا دھیان اور کرشنا کا خیال رہنے لگا۔ کسی کام میں دل نہ لگتا تھا۔ میری دنیا دلچسپیوں اور لطافتوں سے خالی نظر آنے لگی اور میں کچھ کھوئی کھوئی سی رہنے لگی۔

میرے پتی بڑے فطرت شناس آدمی تھے۔ گو میں ہر وقت

ان سے اپنے اس ہیجان کو چھپاتی رہی لیکن میرے جذبات ان سے چھپ نہ سکے۔ انھوں نے تاڑ لیا کہ کرشنا کی مفارقت مجھ پر شاق گزر رہی ہے۔ اشارۃً و کنایتہً انھوں نے کبھی مجھے اس کا طعنہ نہیں دیا۔ برخلاف اس کے وہ ہر وقت میری دلجوئی میں مصروف رہتے۔ اور اکثر کرشنا ہی کا ذکر کیا کرتے جس سے مجھے ایک گونہ سکون حاصل ہوتا۔ وہ صحیح معنوں میں ایک غمخوار و غمگسار رفیق حیات کا حق ادا کر رہے تھے۔ ان کا یہ سلوک خود میرے لئے ایک تازیانہ تھا۔ لیکن میں مجبور تھی۔

اتفاقاً اسی زمانہ میں میں بیمار ہوگئی۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ دن رات کی خلش اور تڑپ نے آخر کار مجھے بیمار کر دیا۔ میرے حق میں یہ ایک غیبی اعانت تھی۔ میں تمام دن بستر پر آنکھیں بند کئے پڑے رہتی۔ مجھے اپنی سدھ ہی نہ تھی۔ چوبیس گھنٹے جو خیال دامنگیر تھا وہ کرشنا کا۔ اسی کا تصور میرا دن رات کا شغل تھا۔

میری عیادت کو ایک دن بھابی آئیں۔ ان سے معلوم ہوا کہ ان کی والدہ جو اپنے وطن مدراس میں رہتی تھیں سخت بیمار ہوگئی ہیں۔ بھابی کرشنا کے ساتھ انھیں دیکھنے جا رہی ہیں۔

وہ رات میں نے کانٹوں پر کاٹی۔ مجھے یقین تھا کہ کرشنا مجھ سے بن ملے نہ جائے گا خصوصاً میری علالت کی خبر پاکر۔ لیکن یہ میری خوش فہمی تھی۔ کرشنا بن ملے ہی چلا گیا اس کی بے التفاتی نے میرے جذبات کو ایک ایسی ٹھیس لگائی کہ ایک عرصہ تک میں اس سے جانبر نہ ہوسکی۔ میرے نسوانی وقار کو ایک ناقابل برداشت دھکا لگا۔ میں نے اس وقت محسوس کیا کہ عورت مرد کی نگاہ میں ایک کھلونے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اور جب اس کا دل بھر جاتا ہے تو کھلونے ہی کی طرح اس کو ٹھکرا بھی دیتا ہے۔

میری خودداری کو ایک کاری ضرب لگی تھی۔ میں نے ٹھان لیا کہ اب کبھی کرشنا سے نہ ملوں گی۔ پھر سوچتی کہ کرشنا سے میری خفگی بیجا ہے آخر اس کا قصور؟ اس کو مجھ سے واسطہ ہی کیا ہے۔ نہ رشتہ نہ ناتا۔ پھر وہ کیوں میرا خیال کرے۔ کیوں میرے دیکھنے کو بھاگا بھاگا آئے۔ اس سے یہ امید رکھنا خود میری نادانی تھی۔ غلطی میری اور قصوروار بھی میں ہی ہوں پھر گلہ کس بات کا۔ میں اگر اس کو پسند کرتی ہوں تو ضرور نہیں کہ وہ بھی مجھے پسند کرے۔ کیسی کم عقل اور نادان ہوں میں! لیکن پھر اس کی آنکھیں اس کا وہ سکوت جس پر گویائی بھی نثار تھی میرے دماغ میں ایک تلاطم برپا کر دیتے۔

اب میں بہت جلد اچھی ہوگئی۔ اور اپنے کام کاج میں مصروف رہنے لگی پھر میرا گھر تھا اور وہی میں۔ کہتے ہیں کہ قوت ارادی سے انسان بہت سی چیزوں پر قابو پا سکتا ہے۔ میں نے بھی کرشنا کے خیال کو اپنے دل سے محو کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ مستقل مزاجی سے اس پر کاربند رہی اور اپنی دانست میں کامیاب بھی ہوگئی۔

یوں ہی دو مہینے گزر گئے۔ لیکن بھابی کی واپسی کے دن جوں جوں قریب آتے گئے میں نے اپنے میں ایک بےچینی محسوس کی جو اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ آخر وہ دن آ ہی گیا کہ بھابی واپس ہوگئیں مجھے اس کی خبر میرے پتی نے دی۔ میرا دل نہ جانے کیوں بلیوں اچھلنے لگا۔ چاہتی تھی کہ پوچھوں "کرشنا بھی آیا کہ نہیں" لیکن زبان تک یہ الفاظ نہ آسکے۔ اس وقت مجھ پر ثابت ہوا کہ دو مہینے کی یہ کوشش بے سود ہوئی۔ میں کرشنا کے خیال کو یوں تو مٹا چکی تھی لیکن "نہاں خانۂ دل" میں ہنوز اس کی یاد باقی تھی۔

ساون کا مہینہ تھا۔ ہمارے محلہ میں ایک شادی کے موقعہ پر ہم سب وہاں مدعو تھے۔ بھابی کی چونکہ برادری تھی۔

کرشنا کے وہاں آنے کا امکان تھا۔ ایک اسی خیال نے مجھے ہزاروں
الجھنوں میں ڈال دیا۔ ہم نہ جاتے بھی بن نہ پڑی۔

میں دلہن کے پاس بیٹھی پان لگا رہی تھی کہ کرشنا کے
دیکھنے کا ایک موہوم سا آسرا جو دل میں تھا۔ اس سے بھی مایوس
ہو چکی تھی۔ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ اسے اپنی خوش نصیبی
تصور کروں یا بدبختی۔ انھیں خیالات میں غرق ——— پان بنائے
جا رہی تھی۔ کہ یکایک "کیوں رادھا بہن ہمیں پان نہ دوگی"۔
کی آواز سے چونک پڑی۔ نگاہ اٹھائی تو کرشنا سامنے کھڑا کچھ
عجیب معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھ رہا تھا۔ نہ معلوم اس سے
یوں اچانک ملنے کی خوشی تھی یا اس کی آواز کی کشش کہ میرے تن
بدن میں ایک سنسنی سی پھیل گئی۔ ہاتھ سے پان چھوٹ گیا۔ دوبارہ
مانگنے پر پان کی تھالی تو بڑھا دی لیکن زبان سے ایک حرف بھی
نہ نکلا۔ ہر چند میں نے کوشش کی اپنی اس کیفیت کو چھپانے ہی کی خاطر
کچھ بولوں یہی کہہ کر ٹال دوں" کہ واہ آپ نے تو مجھے ڈرا دیا"
لیکن زبان نے یاری نہ کی معلوم ہوتا تھا کہ سانپ سونگھ گیا ہے۔

غرض کرشنا نے دیکھا کہ میں خاموش ہوں تو وہ یہ کہتا ہوا
چلا گیا "بہن اس دفعہ تو تم کو منانا ٹیڑھی کھیر ہے۔ پان ہی مل گئے
یہی بڑا احسان ہے۔ اچھا ہم خود ہی چلے جاتے ہیں" اس واقعہ کے
بعد گو میں وہاں دو تین دن رہی۔ لیکن کرشنا سے ملنے کا اتفاق
نہ ہوا۔ ایک تو وہ خود اندر کم آتا۔ دوسرے جب وہ آتا تو میں کسی
بہانے سے اٹھ جاتی۔ اس کی اچانک ملاقات نے میرے جذبات
برانگیختہ کر دئے تھے۔ اور میں نہیں چاہتی تھی کہ میری یہ سراسیمگی
اس پر ظاہر ہو گھر آنے پر پھر وہی اپنے کام دھندوں میں مشغول
ہو گئی۔ لیکن از سرِ نو کرشنا کا تصور صبح شام میرے خیالات پر چھایا
رہنے لگا۔

ایک دن میں بیٹھی کشن کاڑھ رہی تھی۔ پتی اپنے کام پر
گئے ہوئے تھے۔ دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ میں نے خیال
کیا بھیا آئے ہوں گے۔ ایسے وقت اور کون آ سکتا ہے۔ اس لئے
پکار کر کہا "آئیے" میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں
نے دیکھا کہ بھیا تو نہیں کرشنا چلا آ رہا ہے۔

مجھ پر پھر وہی وارفتگی چھا گئی۔ ہاتھ پیر میں رعشہ سا ہونے
لگا۔ نمستے کر کے خاموش کھڑی ہو گئی۔ آخر کرشنا نے کہا "کیا آپ
مجھے بیٹھنے کے لئے بھی نہ کہیں گی" اس وقت میرے ہوش و حواس
ٹھکانے ہوئے۔ میں نے بیٹھنے کو اشارہ کیا اور خود بھی بیٹھ گئی۔

پہلے تو ہم دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر کرشنا نے
مدراس جانے سے قبل نہ آنے کی معذرت کرتے ہوئے اپنی مجبوری
کا اظہار کیا "تم خیال کرتی ہوگی کہ کتنا بے مروت احسان فراموش
ہے کہ بن ملے چلا گیا۔ رادھا میں احسان فراموش نہیں لیکن تم کو
وجوہات بتانے سے بھی قاصر ہوں تم اس کو میری بے التفاتی
نہ سمجھو۔ تم مجھ سے خفا ہو، تمھاری خفگی بجا ہے۔ لیکن میں
اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ للہ مجھے معاف کر دو" وہ خاموش
ہو گیا میں بھی کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکی۔ مجھے ہمیشہ اپنے ضبط
و استقلال پر ناز تھا۔ لیکن کرشنا کی اس التجا نے مجھے نہ جانے
کیوں بے چین کر دیا۔ میری پلکیں بھیگ گئیں۔ میں شربت کا
بہانہ کر کے اندر چلی آئی۔

ہاں تو شاید وہ میری اس وارفتگی کو اس سراسیمگی کی
کیفیت کو اس خاموشی کو خفگی پر محمول کر رہا تھا۔ مدتیں ———
مدتیں اس پر غور کرنے اور سر دھننے کے باوجود بھی اطمینان بخش نتیجہ
پر نہ پہنچ سکی کہ آخر اس وارفتگی اور ارتعاش کے کیا معنے ہیں۔

یوں ہی دن بیتا کئے۔ ہم ایک دوسرے سے بہت کم ملتے۔
کرشنا نے ہمارے یہاں کا آنا جانا ترک کر دیا تھا۔ مجھے خود ہی

الجھنوں سے اتنی فرصت کہاں تھی کہ دنیا کے دھندے لئے بیٹھتی، کہیں جاتی آتی۔ اور دل بھی تو نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو "وہی فرصت کے رات دن" کا طلبگار تھا۔ یوں بھی میں زیادہ جانے آنے کی عادی نہ تھی محفلوں سے میرا جی گھبرا اٹھتا تھا۔ اس لئے بیرونی دنیا اور اس کے ہنگاموں سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔ میری دنیا میری چار دیواری کے اندر محدود تھی۔ "اپنا گھر سب سنسار تھا" جس میں میرے تخیل کی رنگ آمیزیوں سے مجھے سورگ سکھ کا آنند حاصل تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ کرشنا کی شادی کے چرچے ہو رہے تھے۔ ہر آدمی کی زبان پر یہی ذکر تھا۔ ایک خبر نہ تھی تو مجھے۔ اور مجھے ہوتی بھی کس طرح میں نے تو گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی لیکن ایسی بات کسی طرح پھیل ہی جاتی ہے۔ ہوتے ہوتے میرے کانوں تک بھی پہنچی۔ میں نے اس پہلو پر اس سے قبل کبھی غور نہ کیا تھا۔ اس لئے پہلے پہل یہ خبر کسی قدر شاق گزری دل میں کرشنا کا خیال چٹکیاں لینے لگا۔ لیکن میں ایسی نادان بھی نہ تھی کہ اپنے اور کرشنا کے فرائض کو نظر انداز کر دیتی۔ تاہم وہ دن میں نے بڑی کرب و بے چینی میں کاٹا۔ تپی کے سو جانے کے بعد میں نے رات عبادت میں بسر کی اور اپنے پروردگار سے سکون قلب کی بھیک مانگی۔ اس سے التجا کی کہ مجھے نیک ہدایت دے گناہوں کی آلودگی سے دور رکھے۔ دنیا میں عزت و آبرو اور آخرت میں سرخروئی نصیب کرے۔ شیاماتم روحانیت کی قائل نہیں۔ خواب اور ان کے روحانی تعلق سے تمھیں انکار ہے۔ لیکن یہ خواب سن کر شاید تم بھی انکار نہ کرسکو۔ دعا کرکے جب میں صبح صبح بستر پر لیٹی تو فوراً ہی میری آنکھ لگ گئی۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شاہ راہ پر میری لاش پڑی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میری بصارت، سماعت، اور احساس کی قوتیں زائل نہیں ہوئی ہیں۔ کیونکہ

میں سب کچھ دیکھ، سن اور محسوس کر رہی ہوں۔ میں نے دیکھا کہ چند عورتیں جن کے ہاتھوں میں کانٹیاں ہیں۔ اس شاہ راہ سے گزر رہی ہیں۔ ان کے تیوروں سے غصہ کے آثار نمایاں ہیں۔ کچھ بڑبڑاتی بھی جا رہی ہیں۔ میری لاش کو دیکھ کر وہ میری طرف بڑھیں۔ اور کچھ کہتی ہوئی ان کانٹوں کا میرے سر کے گرد ایک حلقہ سا لگا دیا۔ ابھی یہ کچھ آگے بڑھی ہوں گی کہ ادھر سے ایک مرد آ پہنچا اس کا دامن گلاب کے خوبصورت پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے میری لاش پر جھک کر نہایت احترام سے ان کانٹوں میں ایک ایک پھول لگا دیا پھول لگاتے ہوئے وہ یہ کہتا جا رہا ہے۔ "جس طرح ان پھولوں کی مہک فضا کو معطر کر رہی ہے۔ اسی طرح تمھاری خوشبو سے سارا عالم مہک اٹھے گا۔ فضائے عالم میں تمھاری خوبیاں ایسی ہی چھا جائیں گی۔ جیسے ان پھولوں کی مہک یہاں چھائی ہوئی ہے" میرے سر پر اب بجائے کانٹوں کے پھولوں کا تاج تھا — وہ اٹھا اور جانے لگا — میری آنکھ کھل گئی۔

میری دعا قبول ہو گئی تھی۔ فرط خوشی سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میری آتما سکھ اور آنند سے بھرپور تھی — اور میرے خواب کی تعبیر — یہی جو تم دیکھ رہی ہو اور ممکن ہے آگے دیکھو۔

اس دن مجھ پر ایک روحانی مسرت سی طاری رہی۔ ایک زمانہ کے بعد میرا قلب مطمئن تھا۔ دل سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اب وہاں سکون ہی سکون تھا۔

اس واقعہ کو ابھی کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ ایک دن کرشنا میرے یہاں آیا۔ کرشنا بچپن سے ایک جگہ منسوب تھا۔ لڑکی والے اب رخصتی کے لئے جلدی کر رہے تھے۔ لیکن کرشنا کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ روز ایک نیا حیلہ ایک نیا بہانہ، بھابی — سارا قصہ سن چکی تھیں اس لئے میں نے بیٹھتے ہی اکل

ذکر چھیڑا۔ میرے اس ذکر سے وہ کسی قدر مکدر ہوا۔ اس نے سر نیوڑھا لیا اور رادھا بہن اس کا ذکر چھیڑ دو میں شادی نہیں کرسکتا۔" کہتے ہوئے اٹھ کر ٹہلنے لگا اس کے چہرے سے اس کی اندرونی کشمکش کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ بیٹھ گیا اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے جن کو دیکھ کر میرا دل تڑپ اٹھا۔ یہ وقت کمزوری کا نہ تھا میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا۔ میں نے اپنے جذبات کو کچلنے کی آخری اور انتہائی کوشش کی۔ اس کی خاطر میں ہر طرح کی قربانی کرنے تیار تھی اور یہی میری آزمائش کا وقت تھا۔ میں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ آج سے اس کی زندگی کو پُرمسرت بنانا ہی میرا نصب العین ہوگا۔ اس پر ثابت قدم رہی اور شکر ہے کہ پرماتما کی مہربانی سے حصول مقاصد میں کامیاب رہی۔

میں نے کہا "کرشنا تم کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ بھلا شادی کیوں نہیں کرسکتے؟۔ کوئی وجہ بھی تو معلوم ہو۔ خیر سے تم اب نوکر بھی ہو۔ کیا اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس غریب کی زندگی برباد کرو گے۔ جو تمھاری جائز استری ہے۔ میں تو تمھیں ایسا نہ سمجھتی تھی۔ میرا تو خیال تھا کہ تم ان معدودے چند مردوں میں سے ہو جو کمزور ہستیوں کی سیوا کو اپنا دھرم سمجھتے ہیں۔" میرا نشانہ ٹھیک بیٹھا کرشنا بے چین و مضطرب ہوگیا اس کی آنکھیں نمناک اور آواز گلوگیر ہوگئی۔ "رادھا" اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔ اس کی آنکھیں اس کا طرز اس کی بیتابی اس کی ہر ہر ادا سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرا پرستار ہے۔ وہ اب اپنے جذبات کو چھپا نہ سکا۔ اس نے جھک کر میرے قدم چھوئے اور بے تابانہ بول اٹھا: رادھا اس آستاں کی جبیں سائی کے بعد عرش کی حکومت بھی قبول نہیں۔"

تھوڑی دیر کے لئے مجھے اس انکشاف نے مبہوت کر دیا۔ میری ہستی پر ایک بے خودی سی چھا گئی۔ فرط انبساط سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے میرا دل دھڑکنے لگا۔ یا اللہ یہ کون نیکی کا صلہ تھا پھر میں سوچ رہی تھی ـــــ اس نے بھی میری طرح کرب و بے چینی میں نہ جانے کتنے دن بسر کئے ہوں گے۔ نیک و بد، حق و باطل، .... کی کشمکش نے اسے بھی پریشان کیا ہوگا۔ بے خوابی کی تکلیفیں جھیلی ہوں گی ـــــ مجھے اس کے ساتھ دلی ہمدردی تھی ـــــ اب مجھے اس کی باتیں ایک ایک کرکے یاد آنے لگیں۔ اس کا شرما کر باہر چلا جانا۔ اس کا ملنے کو نہ آنا پھر وجوہات تبلانے میں پس و پیش کرنا۔ اس کا اضطراب اس کی خاموشی ـــــ

میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا میرا صبر و شکیب رخصت ہوگیا۔ میں نے ہر چند چاہا کہ انھیں روکوں لیکن بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

اس سارے واقعہ کو ایک چشم زدن سے زیادہ وقت نہ لگا ہوگا۔ لیکن اس قلیل عرصہ میں میری کائنات بدل گئی تھی میں نے خلوص دل سے دعا کی" پرماتما میری لاج تیرے ہاتھ ہے۔ مجھے ثابت قدم رکھ۔"

شاید میری اضطراری کیفیت سے کرشنا کو میرے قلب کی کیفیت کا پتہ چل گیا ہو۔ میں جانتی ہوں کہ میرے اس وقت کے ہیجان کا کچھ تھوڑا بہت احساس کرشنا کو ضرور ہوا کیونکہ اس کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اس نے جھک کر نہایت احترام کے ساتھ میرے ہاتھ چوم لئے۔

" رادھا تم حقیقت میں رادھا ہو۔ میں شرمندہ ہوں کہ اپنی تکلیف کے خیال میں تمھارے جذبات کا خیال نہ رکھ سکا۔ مجھے نہ اس کی توقع تھی۔ نہ اس کا علم۔ مجھے اپنی خوش نصیبی پر ناز ہے۔"

وہ چپ ہوگیا میں نے بہ ہزار دقت اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اس کو شادی پر آمادہ کرنے کی ایک نئی تجویز پیش کی "کرشنا میری بڑی آرزو ہے کہ ایک چھوٹی سی بھاوج بیاہ لاؤں۔ بھیا کی جب شادی ہوئی ہے میں بالکل ذرا سی تھی۔ کیا تم میری آرزو پوری نہ کرو گے اگر تم کو میرا ذرا بھی پاس ہے تو تم یقینی میری خوشی کو سب چیزوں حتیٰ کہ اپنے جذبات پر بھی مقدم سمجھو گے۔"

یہ محبت کا ایک انوکھا اور نیا معیار تھا۔ لیکن حالات کا لحاظ کرتے مناسب اور بہترین معیار۔ وہ اس کو رد نہ کر سکا۔ اس کا چہرہ اس کے جذبات کا آئینہ دار تھا جس سے ایک زبردست کش کش کا پتہ چل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں امنڈ آئیں۔ اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا "رادھا! جس میں تمھاری خوشنودی۔ تم واقعی پرستش کے قابل ہو۔ آج سے تم میری دیوی ہو۔ اور میں تمھارا پجاری تمھارے نام کی مالا جپنا میری زندگی کا مقصد رہا ہے اور ہمیشہ رہے گا"
اس نے دوبارہ میرے پاؤں چھونے چاہے لیکن میں نے یہ کہہ کر باز رکھا کر "شاید مجھے ثابت قدم رہنے و مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہو"!
ایک لمحہ کے لئے اس کی نگاہیں میرے چہرے پر اٹھیں۔ ان میں پرستش یاس اور محرومی کا ایک عجیب طلسم بھرا تھا۔ جس کے آگے میری آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔

وہ تھوڑی دیر اسی طرح کھڑا رہا پھر بیساختہ اس کے منہ سے نکلا "بیڑیاں اسی لئے بنوائی تھیں کہ آزاد کر دو"! —— وہ پلٹا اور دروازہ کی راہ لی —— پھر اسے میں نے نہیں دیکھا۔
ایک مہینے بعد اس کی شادی ہو گئی میرے پتی اس زمانے میں بیمار تھے۔ اس لئے ہم شریک نہ ہو سکے۔ اس میں بھی خدا کی مصلحت ہو گی۔ وہ ضرورت سے زیادہ اپنے بندہ کو آزمانا نہیں چاہتا!

اس کی شادی کی تفصیلی کیفیت میں نے بعد کو سنی لیکن مجھ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میرا وہ ہیجان فرو ہو گیا تھا۔ اور اور اس کی جگہ سکون نے لی تھی۔ وہ سکون جو ایک زبردست ہنگامہ یا طوفان کے بعد طاری ہوتا ہے "جس دل میں اکھنڈ آنند کا نواس رہتا ہے اس میں دنیوی دکھوں کا گزر نہیں ہوتا" ہم نے گیتا میں پڑھا تھا۔ اس کی صداقت کا اندازہ مجھے اب ہوا۔

میں اس سطح پر پہنچ چکی تھی جہاں دکھ اور سکھ میں کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ جہاں رنج و راحت بے معنی الفاظ بن کر رہ جاتے ہیں۔ میں ہر چیز سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ میں نے آتما سکھ کی دعا مانگی تھی مجھے آتما سکھ مل گیا تھا۔
غیر متزلزل ارادہ، بے لاگ محبت، ایثار و قربانی نے جہاں مجھے سکون قلب بخشا وہاں مجھ میں فکر و تجسس، طلب و جستجو سوچ اور بچار کی خو بھی ڈال دی۔ جب انسان، چوبیس گھنٹے سوچنے اور غور کرنے کا عادی ہو جاتا ہے تو خاموشی اس کی عادتِ ثانیہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ بس یہی وجہ مری خاموشی کی ہے —— مجھے خاموشی میں وہ لذت حاصل ہے جو کسی کو گویائی میں بھی میسر نہیں!
شیاما یہ ہے وہ داستان جس کو تم سننے کے لئے بے قرار تھیں۔ میں نے بلا کم و کاست سب کچھ تمھیں بتا دیا۔ اب اس پر تمھیں تنقید و تبصرہ کا اختیار ہے۔
کہتے ہیں کہ تاریکی کے بعد اجالا رنج کے بعد راحت اور ہنگامہ کے بعد سکون لازم و ملزوم ہیں۔ مری تلخ کامیوں کی تاریکی میں میری رہنمائی کے لئے جوش کے یہ اشعار مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔ انہی کی روشنی نے اس بھیانک تاریکی میں میری دستگیری اور رہبری کی تھی۔ اس لئے انہی پر اپنے اس طویل خط کو ختم کرتی ہوں کہ یہی میرا سرمایۂ حیات ہیں!

گرا نہ آنکھ سے آنسو فریبِ قسمت پر
سکون جس سے ہو وہ اضطراب پیدا کر
مژہ میں روک لے آنسو کہ دل ہو آئینہ
ستارے توڑ دے اور آفتاب پیدا کر

وہی تمھاری
رادھا!

سکینہ بیگم

عثمانیہ کالج اور جامعہ عثمانیہ کی چند پُرانی باتیں

جولائی اور اگست کے "سب رس" میں مندرجہ بالا عنوان پر میرا ایک مضمون شایع ہو رہا' اسی سلسلہ میں چند اور باتیں قابل تذکرہ ہیں لیکن قبل اس کے کہ ان باتوں کا ذکر کیا جائے گزشتہ قسطوں کی بعض غلطیوں اور فروگذاشتوں کا ازالہ ضروری ہے۔

افتتاح عثمانیہ کالج کا سنہ ہجری، ۱۳۳۷ تو صحیح شایع ہوا مگر عیسوی سنہ ۱۹۱۹ کی بجائے ۱۹۰۹ شایع ہو گیا ہے اس طرح منشور خسروی کا سنہ عیسوی ۱۹۰۸ نہیں بلکہ ۱۹۱۸ ہے اور جامعہ عثمانیہ کا پہلا امتحان ۱۹۲۱ میں ہوا تھا۔

بابو امرت لال صاحب سابق مددگار پروفیسر ریاضی کے نام کے ساتھ "سہیل" لکھ دیا گیا، در اصل ان کا خاندانی نام "سیل" ہے اسی طرح مرحوم مولانا سید اشرف صاحب ہاشمی کی بجائے "شمسی" ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر رضی الدین کے متعلق میں نے یہ لکھا تھا کہ انھوں نے دار العلوم سے منشی کے امتحان میں کامیابی کے بعد عثمانیہ میٹرک کے صرف انگریزی گروپ میں کامیابی حاصل کر کے عثمانیہ کالج میں شرکت کی تھی لیکن یہ صحیح نہیں بلکہ منشی کی کامیابی کے ساتھ ہی انھوں نے عثمانیہ میٹرک کے جملہ گروپ کا امتحان دیا تھا اور امتحان میں اول آئے تھے، اور یہ امتیاز انھوں نے جامعہ کے سارے امتحانوں میں برقرار رکھا اور اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو ان کی علمی اور طبیعیاتی غیر معمولی قابلیت کے اعتراف کے طور پر مشہور بین قومی نوبل انعام ملنے والا ہے۔ جو نہ صرف جامعہ عثمانیہ' حیدرآباد یا ہندوستان کے لئے باعث فخر ہے بلکہ ساری دنیائے اسلام کے لئے۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب پہلے جواں سال مسلمان ہیں جن کو یہ اعزاز نصیب ہوا

میں نے انتصار الدین صاحب کو دار العلوم کا طالب علم بتایا تھا لیکن تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ وہ دار العلوم کے طالب نہیں تھے۔

اگلی قسط میں یہ لکھا گیا تھا کہ جامعہ عثمانیہ کے تین پروفیسر ابتداً ایک ہی مکان میں سکونت رکھتے تھے' یہ "اصحاب ثلاثہ" پروفیسر وحید الرحمٰن صاحب' پروفیسر خلیفہ عبد الحکیم صاحب اور پروفیسر ہارون خاں صاحب شروانی تھے' جمیل الرحمٰن صاحب نہیں۔

کالج یونین کے سلسلہ میں یہ سن لیجیے کہ یونین کے پہلے صدر عبد الستار صاحب ایم اے پرنسپل چنچل گوڑہ ہائی اسکول۔ اور پہلے سکریٹری عبد المجید صاحب بی اے ایل ایل بی متعلم فوج تھے۔

عثمانیہ کالج میں بی اے اور بی ایس سی کے بعد فوراً ہی ایم اے اور ایم ایس سی کی جماعتیں قائم نہیں ہوئیں بلکہ چند سال کے وقفہ کے بعد ان جماعتوں کا انتظام کیا گیا' پہلے سال جن طلبہ نے بی اے اور بی ایس سی' میں کامیابی حاصل کی تھی ان میں سے چند طلبہ کو دیگر ہندوستانی جامعات میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے وظایف دیئے گئے تھے۔ وہ طلبہ جنھوں نے ان جامعات میں اپنی اعلیٰ کامیابی سے امتیاز حاصل کیا تھا حسب ذیل ہیں۔

ڈاکٹر میر ولی الدین' ڈاکٹر سید حسین' پروفیسر صلاح الدین' پروفیسر عزیز الرحمٰن وغیرہ۔

اگلی قسط میں اس امر کی صراحت ہو چکی ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے سب سے پہلے یورپ جانے والے طالب علم خواجہ نعمت اللہ صدر مہتمم تعمیرات ہیں' جن کو انٹرمیڈیٹ کی کامیابی کے بعد سرکاری وظیفہ ملا تھا۔ اس زمانہ میں انگلستان کی کسی یونیورسٹی نے "جامعہ عثمانیہ" کو قبول نہیں کیا تھا۔ اس لئے خواجہ نعمت اللہ صاحب نے وہاں شرکت کے لئے یہ درخواست کی تھی کہ ان کا امتحان لیا جائے اور بعد امتحان شریک کیا جائے۔ چنانچہ ان کی شرکت اسی طرح ہوئی

جب تک عثمانیہ کالج توپ کے سانچہ کے مکانوں میں رہا اس وقت تک طلبا کے کھیل کا میدان عارضی طور پر درگاہ عبدالرحیم شاہ کا عقبی حصہ زمین رہا جہاں گزشتہ سال انجمن اتحاد المسلمین کا اجلاس ہوا تھا۔ "گیمس" کے نگرا نکار یا مہتمم مولوی الیاس صاحب برنی ناظم دارالترجمہ تھے جو اس زمانہ میں معاشیات کے مددگار پروفیسر تھے۔

پروفیسر قاری قطب الدین صاحب جامعہ عثمانیہ کے وہ پہلے طالب علم ہیں جن کو سکندرآباد کی مجلس میلاد نے بہترین مضمون کے صلہ میں طلائی تمغہ دیا تھا۔ اس زمانہ تک جامعہ عثمانیہ کے کسی طالب علم کو باہر سے یا خود جامعہ سے کوئی تمغہ نہیں ملا تھا۔

جامعہ عثمانیہ کے کئی طالب علموں نے یورپ میں تعلیم پائی اور پا رہے ہیں۔ اس موقع پر ان چند طالب علموں کا نام لیا جاتا ہے جن کو کسی نہ کسی خصوص میں اولیت کا شرف حاصل ہے اور ان میں سے بعض بہت ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر میر سیادت علی
۲۔ ڈاکٹر میر ولی الدین
۳۔ ڈاکٹر سید حسین
۴۔ ڈاکٹر رضی الدین
۵۔ ڈاکٹر زور
۶۔ ڈاکٹر مقبول علی
۷۔ ڈاکٹر حمید اللہ
۸۔ پروفیسر سید محمد علیخاں
۹۔ میر اکبر علی خان بیرسٹر
۱۰۔ خواجہ نعمت اللہ خاں
۱۱۔ سید یٰسین علی خاں
۱۲۔ ظہیر الدین احمد

فرزندان جامعہ سے جامعہ میں ملازم ہونے والے سب سے پہلے شخص مولوی یوسف الدین صاحب مہتمم کتب خانہ جامعہ ہیں، جن کو بی اے کی کامیابی کے بعد اس خدمت پر مامور کر دیا گیا۔

اور اساتذہ کے زمرہ میں شامل ہونے والے سب سے پہلے شخص عبدالمجید صاحب صدیقی ہیں۔

اس تفصیل کے بعد دو بول دختران جامعہ کے متعلق بھی کہنا ضروری ہے۔

جامعہ عثمانیہ سے سب سے پہلے جس خاتون نے بی اے کی ڈگری حاصل کی وہ نوشابہ خاتون دختر مولوی عبدالحق صاحب سابق مددگار صدر ناظم کوتوالی اضلاع ہیں۔ جنہوں نے کلیہ اناث کے قائم ہونے کے پہلے سال یعنی سنہ ۱۳۳۳ف (۱۹۲۴ء) میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اور کلیہ اناث قائم ہونے کے بعد پہلی خاتون درۃ البیضاء بیگم ہیں جنہوں نے سنہ ۱۳۳۵ف میں بی اے پاس کیا۔ مجوری بیگم اہلیہ مولوی جمیل حسن صاحب ایچ سی ایس وہ پہلی خاتون ہیں جو بی اے میں جامعہ بھر میں اول آئیں۔ جامعہ سے یورپ جانے والی خواتین میں اولیت مسز جمال الدین اور مسز زین یار جنگ کو حاصل ہے۔

جامعہ عثمانیہ سے مجھے تعلیمی تعلق بہت کم رہا ہے اس لئے تفصیلی حالات کا تذکرہ میں کرنے سے قاصر ہوں، یہ کام کسی طلبان کا ہے، چونکہ اس قسم کی کسی نے کوشش نہیں کی تھی میں نے مختصراً یہ خاکہ پیش کر دیا۔ اگر جامعہ عثمانیہ کی جوبلی سے پہلے کوئی باہمت شخص اس طرف توجہ کرے تو یہ اس کا خوش گوار فرض ہوگا۔

نصیر الدین ہاشمی

تنقید و تبصرہ

اس مہینے کی مطبوعات میں ایک چھوٹی سی کتاب سپاس جناب امیرؑ از مرحوم علامہ سر اقبال قابل ذکر ہے۔ اس نظم کو چند دوسری نظموں اور رباعیوں کے ساتھ تصدق حسین صاحب تاج نے شایع کیا ہے۔ اور ماہر القادری صاحب سے ان پر ایک چھوٹا سا مقدمہ بھی لکھوا کر شامل کیا ہے۔ موصوف نے اقبال سے متعلق چند دلچسپ اور کام کی باتیں قلمبند کی ہیں۔

حضرت علیؑ کی منقبت میں اقبال نے یہ نظم بہت پہلے لکھی تھی اور ان کے دوست سر شیخ عبد القادر نے اس کو اپنے مشہور رسالے مخزن بابتہ جنوری ۱۹۰۵ء میں شایع کیا تھا۔ یہ فارسی نظم مثنوی کی شکل میں لکھی گئی ہے جس کی آخری دو بیتیں یہ ہیں۔

جز عشق حکایتے ندارم ؁ پروائے ملامتے ندارم
از جلوۂ علم بے نیازم ؁ سوزم گریم تپم گدازم

بقیہ حصہ میں اعلیٰ حضرت تاجدار دکن۔ سر سید علی امام اور خواجہ حافظ شیرازی کو مخاطب کرکے جو نظمیں لکھی گئی تھیں وہ اور ان کے علاوہ چند اردو غزلیں شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسی ہیں جو اقبال کے مجموعوں میں شریک نہیں ہیں۔ اس لئے تصدق حسین صاحب تاج کی یہ کوشش اقبال کے شیدائیوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

ہمارے بزرگ۔ از رشید اختر صاحب ندوی ناشر کتاب خانہ سعادت لاہور قیمت آٹھ آنے۔ یہ چھوٹی سائز کے ایک سو بارہ صفحات کی ایک مفید کتاب ہے جس کا دیباچہ عبد المجید صاحب سالک ایڈیٹر انقلاب لاہور نے لکھا ہے۔ رشید اختر صاحب نے مسلمان بچوں کے لئے تاریخی کہانیوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کا یہ پہلا حصہ ہے اور اس میں چاروں خلفائے راشدین کے حالات زندگی سلیس زبان میں تحقیق سے درج کئے گئے ہیں۔ جو لوگ اپنے بچوں کے لئے کام کی کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں وہ اس کے مطالعہ سے خوش ہوں گے۔

اسلامی تعلیم۔ مولانا ظہیر احمد عثمانی۔ ناشر کتابخانہ سعادت لاہور قیمت ۲/ ۔ یہ کتاب بھی چھوٹے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اور اس میں اسلام سے متعلق مفید معلومات درج ہیں۔

ہندستانی تہذیب کی تکمیل۔ مصنفہ کالی داس صاحب کپور ایم اے ایل ٹی ناشر نولکشور پریس لکھنؤ قیمت آٹھ آنے۔

کپور صاحب نے گزشتہ سال لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے اس عنوان کی چھ تقریریں کی تھیں اب ان تقریروں کو کچھ اضافہ کے ساتھ کتاب کی شکل میں شایع کیا گیا ہے۔ کپور صاحب کا اسلوب بیان سادہ ہے۔ اردو ہندی کے درمیان ایک مشترک زبان رائج کرنے کی جو کوشش کی جا رہی ہے اس میں اس قسم کی کتابیں معاون ثابت ہوں گی۔ ایسی ہی کتابیں باہمی نا اتفاقی کی آگ ٹھنڈی کرنے میں مدد پہنچاتی ہیں اور ہندستانی تہذیب کے بنانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے جو برابر کا حصہ لیا ہے اس کی تشریح کرتی ہیں۔ کتاب میں چند تاریخی تصویریں بھی شریک ہیں۔

پیامِ کیف۔ از مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل اعظم گڑھ مطبوعہ معارف پریس قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

احسان احمد صاحب اعظم گڑھ کے قریب ایک دیہات کے باشندے ہیں اور شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ پیام کیف میں ان کی منتخب نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ اس کو انھوں نے اپنے بھائی مرزا سلطان احمد صاحب ایم اے ایل ایل بی ڈپٹی کلکٹر کے نام معنون کیا ہے۔ احسان صاحب اصغر گونڈوی سے خاص طور پر متاثر نظر آتے ہیں۔ اور ان کے کلام میں بھی وہی خصوصیتیں موجود ہیں جو اصغر مرحوم کا طرۂ امتیاز تھیں۔ مثال کے طور پر چند شعر پیش ہیں۔

یہ شورشیں دلِ بے تاب کے فسانے کی ؁ رہی ہیں روز ازل سے رہیں گی تا بابد
یہ صورتیں ہیں فقط ان کے مسکرانے کی ؁ بہار لالہ و گل جلوۂ مہ و انجم
بس ایک دیر ہے ان کے نظر اٹھانے کی ؁ بیجان محو تجلی یہ گل ہو غرق نشاط

فضائے عرصہ کو تین دیکھتا ہوں میں　　کہ اس میں کتنی ہے وسعت جگر سانے کی

خفیہ خط و کتابت :۔ مصنفہ سید خواجہ صاحب وکیل ہائیکورٹ مطبوعہ شمسی مشین پریس حیدرآباد۔ قیمت ایک روپیہ۔

سید خواجہ صاحب حیدرآباد کے ایک قدیم وکیل اور مصنف ہیں۔ ان کی بعض کتابیں چھپ بھی چکی ہیں جن میں حدیقۂ مملکت عثمانیہ قابلِ ذکر ہے۔ اس میں مصنف نے مختصر سی جگہ میں تاریخ دکن سے متعلق بہت سی ضروری معلومات درج کردی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب بھی ایک نادر موضوع پر لکھی گئی ہے اور دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔

خواتینِ دکن کی اردو خدمات :۔ مؤلفہ نصیر الدین ہاشمی صاحب ناشر سید عبدالرزاق تاجر کتب۔ قیمت دو روپے۔

مولوی ہاشمی صاحب حیدرآباد میں عرصہ سے نسوانیات پر کام کر رہے ہیں۔ یہ موضوع ایسا دلچسپ ہے کہ آدمی کام سے نہیں تھکتا اور خاص کر ہاشمی صاحب تو طبقۂ نسواں سے متعلق ایسے ایسے پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہیں جن کی طرف عام طور پر توجہ نہیں کی جاتی۔ خواتین دکن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہاشمی صاحب کی نظر کتنی دور دور تک پڑتی ہے اور انھوں نے کیسی کیسی مخفی اور گمنام خواتین کو پردہ کی چار دیواری سے باہر لاکر منظرِ عام پر پیش کر دیا ہے۔ یقین ہے کہ یہ کوشش طبقۂ نسواں میں بہت مقبول ہوگی۔ اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ سرزمینِ دکن میں اردو کی خدمت اور ترقی کے لئے ہر مذہب اور فرقے کی خواتین مردوں کے دوش بدوش کام کر رہی ہیں۔ خاص کر عہد حاضر میں تو حیدرآباد کی علمی و ادبی چہل پہل میں خواتین کا بڑا حصہ ہے۔

خیال آفریں دماغ :۔ از عرش تیموری ناشر حالی پبلشنگ ہاؤس قیمت چھ آنے۔

عرش تیموری صاحب رسالہ افادہ حیدرآباد کے مدیر اور مشہور شاعر مرزا نظام شاہ لبیب کے فرزند ہیں۔ اس سے قبل ان کی ایک چھوٹی سی کتاب قلعہ معلی کی جھلکیاں چھپ چکی ہے۔ اور وہ ایک نوجوان شاعر کی حیثیت سے بھی روشناس ہو چکے ہیں۔ خیال آفریں دماغ ایک چھوٹا سا ڈرامہ ہے جس میں تجزیاتی و تحلیلی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر انسانی کردار پیش کیا گیا ہے۔ جگہ جگہ نوجوان مصنف کے دماغ کی خیال آفرینیاں جھلکیں دکھا رہی ہیں۔ کتاب اہتمام سے پاکیزہ چھاپی گئی ہے۔ توقع ہے کہ اگر عرش صاحب کی ادبی مصروفیتیں اسی طرح جاری رہیں تو وہ اردو کے ایک اچھے ادیب ثابت ہوں گے۔

خنداں :۔ از پروفیسر رشید احمد صدیقی مکتبہ جامعہ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

پروفیسر رشید صدیقی صاحب نے اردو کے مزاحی ادب میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کرلی ہے ان کے بعض طنزیہ اور ظریفانہ مضمون اردو ادب کے شاہکار سمجھے جاسکتے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعہ بھی ان کے ایسے ہی مضمونوں پر مشتمل ہے لیکن یہ وہ تقریریں ہیں جو آل انڈیا ریڈیو سے وقتاً فوقتاً نشر ہوئی ہیں۔ اور ریڈیو کی ضرورتوں کے پیش نظر ان میں مصنف کا دماغ وہ بے باکیاں اور جولانیاں نہ دکھا سکا جو اس کا قدیم شیوہ رہا ہے۔ لیکن اس قید و بند کے باوجود رشید صاحب (خود ان کی زبان میں) پوری طرح سے چوکڑی نہیں بھولے۔ بہتر ہوتا کہ ناشران تقریروں کو چھپواتے وقت خود رشید صاحب سے ان پر نظرِ ثانی کرا لیتے تاکہ وہاں میں وہ بے ساختگی اور بیباکی پیدا کر دیتے جو ایک سرکاری محکمہ کی طرف سے پڑھتے وقت نقد و احتساب کے نظر کر دی گئی ہے۔ بحالتِ موجودہ بھی یہ مجموعہ اسم بامسمیٰ ہے اور اس کو پڑھتے وقت جگہ جگہ مطالعہ کرنے والا ہنسے یا مسکرائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جام طہور :۔ از خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی ناشر تاج کمپنی لاہور۔

اثر صہبائی حضرت امجد کی طرح اردو کے رباعی گو شاعر ہیں۔ بیس برس کی عمر سے رباعی لکھنی شروع کی ہے اور خیام کا اتنا مطالعہ کیا ہے کہ اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ ان کی رباعیات کا پہلا مجموعہ

جام صہبائی ۱۹۲۳ء کے آغاز میں شایع ہوا تھا۔ اس کے بعد ان پر اقبال اور ٹیگور کا اثر پڑنے لگا چنانچہ زیر نظر مجموعہ جام طہور میں اس اثر کی جھلکیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ رباعیات کے آخر میں متعدد چار بیتی قطعے بھی درج ہیں۔

فریادِ قرآن:۔ از محمود اسرائیلی۔ ناشر ادارہ عالمگیر تحریک قرآن مجید شاخ بمبئی۔ یہ ایک مسدس ہے جس میں مسلمانوں کو قرآن خوانی کا صحیح ذوق پیدا کرنے کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ اکثر بند دلچسپ ہیں اور اقبال کے مسدس شکوہ اور جواب شکوہ کا رنگ ان میں جھلکتا ہے۔

جوہرِ آئینۂ عجم:۔ از سید کریم الدین و ابوالمحاسن متین۔ قیمت دس آنے۔ آئینۂ عجم مشہور فارسی ادیبوں اور شاعروں کے مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہے جو جماعت ہشتم کے نصاب میں شامل ہے۔ یہ کتاب اس کی شرح ہے جس میں ہر مضمون سے پہلے مشکل الفاظ کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ آسان اور معنی خیز ترجمہ بھی لکھا گیا ہے اور آخر میں امتحانی سوالات بھی طلبہ کی سہولت کے لئے بطور نمونہ درج کر دیئے گئے ہیں۔ ابوالمحاسن متین صاحب نے اس سے پیشتر بھی اس قسم کی شرحیں لکھ کر شایع کی ہیں جو طلبہ کے لئے سہولت کا باعث ہوئیں۔ اس قسم کی کوششیں قابلِ قدر ہیں اور یقین ہے کہ متین صاحب اسی طرح اپنے دوستوں کی مدد سے علم و ادب کی خدمت جاری رکھیں گے۔

طلسم عمل:۔ از سید مجتبیٰ حسن صاحب بی اے مطبعہ نظامی پریس لکھنؤ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے۔

یہ کتاب جو بڑی سائز کے ڈھائی سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل ہے اصل میں امریکہ کے ماہر تعلیم اور فلسفی مسٹر ڈیل کارنیجی کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اس میں معاشرت اور زندگی کو کامیاب بنانے کے رازہائے سربستہ کو بڑی خوبی سے بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس قسم کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے سے سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اہل ہند مغربی ممالک کی بعض خوبیوں اور کامیابیوں کے اسباب سے واقف ہو سکتے ہیں۔ اب تک مغربی زبانوں کے جو ترجمے اردو میں شایع ہوئے۔ وہ زیادہ تر ادبی محاسن کے ترجمان تھے۔ اور ادب میں شاعر افسانہ نگار یا ادیب بے باکی کے ساتھ زندگی کے بھلے اور برے دونوں پہلوؤں کو پیش کر دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے عوام اور ایسے لوگ جن کی علمی و اخلاقی نشو و نما کی تکمیل نہ ہوئی ہو بھٹک جاتے ہیں اور مغربی زندگی کے خراب پہلوؤں ہی کی تقلید کو باعث کامیابی سمجھتے ہیں۔ جو سنجیدہ اصحاب اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے عہد حاضر کی ترقی کا مطالعہ کرتے ہیں وہ اسی نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ جدید نسلوں نے یورپ اور امریکہ کی تقلید میں بہت سی برائیوں کو بھلائیاں سمجھ کر اختیار کر لیا ہے۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے کیونکہ مشرقی زبانوں میں مغرب کی ایسی کتابوں کے بہت کم ترجمے ہوئے ہیں۔ جیسی کہ اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

یہ کتاب چھ حصوں پر منقسم ہے اور ہر حصہ نہایت ہی مفید نفسیاتی اور اخلاقی موضوع پر لکھا گیا ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ ایک معمولی انسان بھی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنے سے اپنے حلقۂ اثر کو کیونکر وسیع بنا سکتا ہے۔

کتاب میں بعض جگہ انگریزی ناموں کا غلط تلفظ درج ہے اور ابتداء میں صرف مترجم کا دیباچہ ہی کافی تھا۔ ایک سے زیادہ اصحاب سے تعارف یا اظہار رکھوانا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

سریلے بول:۔ یعنی مجموعہ نظم محمد عظمت اللہ خاں بی اے مرحوم قیمت دو روپئے آٹھ آنے۔

یہ تقریباً دو سو پچیس (۲۲۵) صفحات پر دیدہ زیب اور صاف

پاک شائع ہوا ہے۔ اس کی سائز بھی اقبال اور جوش کی کتابوں کی طرح رکھی گئی ہے۔ اور مصنف کی ایک تصویر اور خط کا عکس بھی شامل ہے۔ ابتدا میں دیباچہ اور حالاتِ زندگی کے علاوہ خود عظمت مرحوم کا ایک مضمون بھی درج ہے جو شاعری پر لکھا گیا ہے۔ مولٰنا حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد سے اب تک کسی اردو شاعر نے اپنے کلام کی وضاحت کے لئے ایسا اچھا مقدمہ نہیں لکھا تھا۔

اردو میں ہندی لفظوں اور بحروں کا استعمال عظمت ہی کی شاعری کی وجہ سے مقبول ہوا۔ ان سے پہلے اگرچہ نظیر اکبرآبادی نے بھی اس طرف کچھ توجہ کی تھی لیکن ان کے کلام کے سوقیانہ حصے نے ان کی اس خوبی کو نمایاں نہ ہونے دیا۔ لیکن عظمت نے اپنی پاکیزہ نظموں کے ذریعہ سے اس خصوصیت کو ایسی خوش اسلوبی سے چمکایا کہ آج کئی اردو شاعر۔ مثلاً جوش، حفیظ، ساغر اور حامد اللہ افسر وغیرہ انہی کے رنگ میں لکھ کر مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ عظمت اللہ خاں نے ایک ایسی شاہ راہ بنا دی جس پر اب آسانی سے ہر شاعر گامزن ہو سکتا ہے۔ ان کے کلام کے مجموعے کا عرصہ سے اہلِ ذوق کو انتظار تھا اردو دنیا کو عظمت زبیدہ بیگم کا مرہونِ منت ہونا چاہیے کہ ان کی وجہ سے یہ مجموعہ اب شائع ہو کر منظرِ عام پر آ گیا ہے۔

تنہائی

تارے گردوں پہ جھلملاتے ہیں — گویا ہیرے ہیں جگمگاتے ہیں
نرم جھونکے ہوا کے آتے ہیں — سبز پودے بھی لہلہاتے ہیں
دنیا خاموش رات کالی ہے — اک مرا دل خوشی سے خالی ہے

لو وہ مشرق کے کوہساروں پر — آبشاروں پہ سبزہ زاروں پر
بحر میں بہار ہا ہے چاند — سارے عالم پہ چھا رہا ہے چاند
اک حسیں غمزدہ کی سی صورت — پڑ گئی پھیکی چاند کی صورت
دنیا خاموش لوگ سوتے ہیں — پر جو ہیں غمزدہ وہ روتے ہیں

یاد گزری ہوئی بہاروں کی — بیٹھ کر چھاؤں میں ستاروں کی
کرتا جاتا ہوں روتا جاتا ہوں — گویا اک راگ گنگناتا ہوں

محمد مظفر الدین ظفر (عثمانیہ)

جادُوگری

(۱)

تری باتوں میں سحرِ سامری ہے
نظر میں کیا بلا جادوگری ہے
سمانا اُس کا وہ رگ رگ میں جیسے
اترتی شیشۂ دل میں پری ہے

(۲)

تکلم اک ادائے نغمہ زا ہے
خموشی ایک تصویرِ ادا ہے
زسرتا پا ہے تو جادُو کا پتلا
تجھے کیا زیب دیتی خودسری ہے

(۳)

چلے تو اک قیامت سر پہ ڈھائے
اگر بیٹھے تو سو فتنے اٹھائے
بچے دل کس طرح جادُو سے تیرے
تری ہر ہر ادا جادو بھری ہے

(۴)

تری دوری ہو یا قربت ستم ہے
نظر میٹھی بھی حق میں دل کے سَم ہے
تو ہے جانِ محبت، جانِ عالم
تجھے زیبا جہاں میں سروری ہے

(۵)

تری رعنائیاں غارت گرِ دیں
تری بے باکیاں شب خوں زنِ چیں
غضب ہے موجِ طوفاں تیوریوں کی؟
ترا فرمان حکمِ نادری ہے

(۶)

ہنسی سے بجلیاں دل پر گراتا
نظر سے خرمنِ ہستی جلاتا
چلا آتا ہے جب تو جھم جھماتا
پکار اٹھتا ہے دل "جادوگری" ہے

عبدالقادر سروری

ادبِ لطیف

آدمیوں میں جس طرح ایک صنفِ لطیف ہوتی ہے، ادب میں ادبِ لطیف بھی ایک صنف ہوتا ہے۔ اور جس طرح صنفِ لطیف کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اسے کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا اسی طرح ادبِ لطیف کو ــــ کم سے کم میں تو نہیں سمجھ سکا، اور جو کچھ دیکھا اور سمجھ سکا، اس کا خلاصہ غالباً یہ ہے کہ چند نہایت مہمل جملوں کو بڑے سلیقہ سے پیش کرنے کی کوشش کا نام " ادبِ لطیف " ہے۔

جو رتبہ شاعری میں غزل کا ہے وہی نثر نگاری میں " ادبِ لطیف " کا ہے۔ لیکن جس طرح ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں آکر غزل نے اپنا رتبہ گرالیا اسی طرح " ادبِ لطیف " نے بھی نادشماسے منہ لگ کر اپنی بنی بگاڑ لی۔

تقریباً ہر لکھنے والا اس پر نظرِ عنایت کرتا ہے، اور خصوصاً یہ اعتماد ہو جانے کے بعد کہ وہ بھی (اپنی دانست میں) ایک بڑا لکھنے والا ہے، کچھ تو غالباً اس لئے کہ ادبِ لطیف کو ہم نے بہت آسان سمجھ رکھا ہے، اور کچھ اس لئے کہ یہ بہت مختصر ہوتا ہے، اور ہم بغیر کسی محنت کے اس پر مشقِ ستم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ مجھے بھی سوجھی کہ میں بھی ادبِ لطیف عرض کروں۔ اس سلسلہ میں خود ادبِ لطیف کی تعریف وغیرہ سے ابتداء کی جاتی ہے!

(۱) ادبِ لطیف وہ ادب ہوتا ہے جس کا لکھنا سمجھنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے اور جس کا سمجھنا نہیں لکھنے، سے زیادہ آسان!

(۲) یعنے ادبِ لطیف میں عموماً جذبات زیادہ سمجھ لئے جاتے ہیں، الفاظ کم ہوتے ہیں مطلب سطحی ہوتا ہے، اور مقصد لایعنی!

(۳) ادبِ لطیف ان اجزائے مہملیہ کو کہتے ہیں جو نتیجہ ہوتے ہیں کسی ادیب یا شاعر کے ہیجانِ قلبیہ، جنونِ دماغیہ، قصورِ عقلیہ اور عاداتِ سستیہ کا! ــ ان اجزائے مہملیہ کے ارکان لاینفک زیادہ تر ہوتے ہیں (!!!- ؟؟؟- ــــ) یعنے نقطہ دار الف، نقطہ دار ہمزہ اور بے نقطہ لکیر، یہ دونوں تینوں حروف تہجی ان ہی کے لئے ایجاد ہوئے ہیں۔ ادبِ لطیف کے دوسرے نام " شہ پارے " اور " تخیلات " وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔

(۴) " آہ، واہ، ہیں، اُف، افسوس، تُف " وغیرہ ــــ یہ چند اہم اسکرو ہیں جو ادبِ لطیف کو فِٹ کرنے میں استعمال کئے جاتے ہیں۔

یہ تو ہوئی ادبِ لطیف کی تعریف۔ اب مختلف عنوانات کے تحت اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔ اگرچہ آپ نے اکثر رسالوں میں ادبِ لطیف کے تخیلاتِ عالیہ دیکھے ہوں گے، لیکن یہاں کوشش کی گئی ہے کہ ہمارا ادبِ لطیف دوسروں کے ادبِ لطیف سے بالکل مختلف رہے۔

اب سوچ یہ ہے کہ ادبِ لطیف کو شروع کس عنوان سے کیا جائے۔ چونکہ " عورت " انسانی زندگی، اور خود ادب کا بھی ایک اہم اور دلچسپ موضوع ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سے شروع کیا جائے۔

(۱) عورت :-

اے عورت !!! ــــ تو عورت ہے !!! ــــ بس اور کیا عرض کریں !!! ــــ باقی سب خیریت !!! ــــ ہماری طرف سے وہاں سب بڑوں کی خدمت میں قدمبوسی اور چھوٹوں کی خدمت میں دعا عرض کر دینا !!! ــــ

(۲) عشق :-

جہاں عورت ہو، وہاں عشق نہ ہو ؟؟ ایسا ہو سکتا ہے ؟ ــــ آہ !! ــــ اگرچہ یہ آہ کا کونسا موقعہ ہے ؟؟ ؟ ــــ

آہ پیارے، میں تجھے دل و جان سے چاہتی ہوں، اور اس کی اطلاع تو تجھے پہلے بھی دی جا چکی ہے !! ــــ میں نہیں چاہتی کہ تو کبھی میری آنکھوں سے اوجھل ہو، اور تو نے بھی براہ کرم نہیں چاہا کہ مجھے

چھوڑ کر کہیں جائے!!— کہا جا سکتا تھا کہ ہماری محبت غیر فانی تھی!

— مگر آہ! ظالم حکومتوں نے کب کسی کو چین لینے دیا ہے!!—

بادشاہ کا بیٹا کو میں جنگلی بھیڑیئے ہیں! — آہ، پر یتیم تو بھی انہیں کے منہ میں جانے پر مجبور ہے! — جا! — میری بہترین تمنائیں تیرے ساتھ ہیں!! — میں نے تجھے روکنے کی بہتیری کوشش کی، مگر تو تو بنا ہی جنگ کے لئے تھا، پھر تیری ذہنیت تجھے کس طرح چین سے بیٹھنے دیتی! — اس لئے جا!! — لیکن، خدا کرے جس طرح پیٹھ دکھا کر جا رہا ہے، پھر منہ دکھانے نہ آئے! — جا! — نکل جا!! پیارے!!! —

میں تجھے نہ دیکھوں، نہ دیکھوں!

میں تجھ سے نہ ملوں، نہ ملوں!

تو مجھے نہ دیکھے نہ دیکھے

تو مجھ سے نہ ملے نہ ملے

لیکن ہم دونوں میں محبت تو ہو جائے

کیوں کہ

محبت ہی

ایک ایسی

شے ہے

کہ

جس کو ہو جانا چاہیئے

کیونکہ

اس کی حقیقت "بلینک ورس"

سے زیادہ پُر لطف ہے!!!

آہ محبت کی خیالی دنیا!!! — اور نوجوانوں کی تمنا!!۔

میں نے چمن کی جس روش پر قدم رکھا، پھولوں کو تیری شاگردی میں محو پایا، و لالہ تیرے گلِ عارض کی تعریف کرتا تھا، نرگس تیرے جسم نازک کی، غنچہ تیرے دہن کی، ہلال تیری ناک کی، سنبل تیری زلف کی، شاخ گل تیرے بازو کی، تخم حنا تیرے دانتوں کی — غرض، ہر ایک نے اپنی اپنی مناسبت سے تجھے پسند کر لیا — لیکن آہ! "کلین شیو" (clean shave) کے بعد مجھ میں اور تجھ میں اتنی مناسبت پیدا ہو گئی، پھر بھی نہ تو میری تعریف کرتی ہے نہ پسند کرتی! — افسوس!!! —

یہ چند قبریں ہیں! — یہیں میرے باپ دادا دفن ہوئے تھے! — میں بھی دفن ہوں گی، اور بہت سے لوگ بھی دفن ہوں گے! — مگر آہ پریتم! نہیں معلوم تم کہاں دفن ہو گئے! — کیا اچھا ہوتا جو میں اپنی آنکھوں سے تمھاری پیاری قبر دیکھ سکتی!! — اور یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم دونوں میں کون پہلے مرے گا!! — وائے ناکامیٔ شوق!!! —

(۳) آدمی :-

آدمی بنتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد!! —

یہ شعر تو محض ناول نویسوں کی سی اسٹائل پر لکھ دیا گیا ہے، جس طرح وہ ناول کا ہر باب شروع کرنے سے پہلے لکھنا غالباً ضروری سمجھتے ہیں، — کہنے کا مطلب ہمارا یہ تھا کہ "آدمی" پر بھی کچھ "ادب لطیف" کی "جھلکیاں" چھوڑیں یا چند تخیلاتِ فاسدہ کا اظہار کریں :-

آدمی کس سے بنا؟ — مٹی سے! — مٹی کس سے بنی؟ —

زمین سے! — زمین کس سے بنی مٹی سے!! — آہ!!! —

کہتے ہیں کہ آدم کے لغوی معنے "گندمی" کے ہیں۔ چونکہ حضرت آدمؑ کا رنگ دنیا میں آنے کے بعد گندمی ہو گیا تھا، آپ کو آدم کہا جاتا تھا، ورنہ آپ کا رنگ اس قدر گورا یا نورانی تھا جس کا تصور بھی مشکل ہے

اس لئے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ جو عورتیں یا مرد خوبصورت بننا چاہتے ہیں وہ پوڈر، کریم، پینٹ وغیرہ میں سر کھپانے کی بجائے جنت میں چلے جانے کی کوشش کریں؟ —— اُف!! ——

شاہوں کا بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی —— آدمی!
مفلس جو بے نوا ہے سو ہے وہ بھی —— آدمی!
ماتحتوں کو ڈانٹتا ہے سو ہے وہ بھی —— آدمی!
بیوی سے کانپتا ہے سو ہے وہ بھی —— آدمی!
"پربھات کمپنی" میں جو بنا ہے سو ہے وہ بھی —— "آدمی!"

یاد رکھئے کہ یہ آخری "آدمی" "پربھات چترپٹ" ہے اور اگر اہلِ زبان کی کثرتِ استعمال سے کہیں "ر" گر گیا تو پھر "چت پٹ" ہوا "گفتگوئے ہندی" میں تو ہم سے نہ کر بؔ یہ ہماری زبان ہے پیارے!

---

(۴) شاعری:-

شاعری اُن امراضِ شریفہ میں سے ہے جو ایک دفعہ لاحق ہونے کے بعد عمر بھر نہیں چھوٹتے۔ اور یہی شرطِ وفا بھی ہے! ——

شعر کہنے کا بہترین موسم جوانی کا آغاز، جذبات کا ہیجان، عشق کا خفقان اور شکم پُری کے سامان کے زمانہ سے متعلق ہے۔ اور خصوصاً جب عشق میں ہجر کے داغ بھی ہوں تو پھر شاعری اور بھی زیادہ پُرلطف ہو جاتی ہے، چنانچہ اسی عشق اور داغ کی مناسبت سے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

ہم عشق کے داغوں کو ربر سے مٹا دیتے ؎ ربر کے مگر خود ہی مٹ جانے کو کیا کہئے!
آہ! کیا "خاصہ کی چیز" ہوتی ہے!! بلکہ میں تو سمجھتا ہوں خاصہ اور ناشتہ دونوں کی ملا کر ایک ہی چیز ہوئی ہے!!! ——

بعض حضرات کو نثر کا ذوق ہوتا ہے، اور بعض کو نظم کا۔ اس لئے سارے ادبِ لطیف کو نثر میں پیش کرنا ایک قسم کی ناانصافی ہوگی، اس لئے کچھ حصہ نظم کا بھی رکھ دیا جاتا ہے۔ وہو ہذا:-

افکارِ نو یا رباعیاتِ جرمن وزاؔن:-

کس منہ سے رباعی کی ہو تعریف بھلا! — یہ دیتی ہے لکھنے پڑھنے والے کا شیطان بھگا
اس واسطے ہوتا ہے رباعی کا وزن — لاحول ولا قوۃ الا باللہ

المختصر اک فن ہے رباعی کہنا — محدث ہے جو شاعری تو رباعی گہنا
ہے شرط کہ اس کے چار مصرعے ہوں ضرور — لازم نہیں ان میں کوئی مطلب رہنا

عشق ان کا ہے کھوٹا یہ ہو اسٹیل نہیں — ہجر کی شب میں اندھیرا ہے یہ قندیل نہیں
اتوار کے بعد پیر کو ہے کھلتا اسکول — اس سے ہوا ثابت کہ پیر کو تعطیل نہیں

افسوس کہ استری ہے، گر کانت نہیں — کہنے کو تو من من ہے مگر شانت نہیں
بے شک و شبہ کھیلتے ٹینس ہم بھی — پر کیا کریں، بیاکٹ ہے مگر تانت نہیں

چھوڑو گل و جوش کی ڈینگیں چھوڑو — اور نام ترقی کے سر پہ پتھر پھوڑو
از بس کہ جو ہوتے ہیں مہینے کے دن — کاٹو کسی طرح اور تنخواہ لے لو!

ہو کر بھی قدیم یہ دنیا ہے ہر دم نئی — دیکھئے اب تک کئی رنگ اور بھی دکھلائے گی
اب آتی نہیں فلموں میں سلوچنا اکثر — شاید کہ "امپیریل کمپنی" بیٹھ گئی

وحشت کو یہ سودا ہے کہ جنگل جاؤں — حیران ہوں کہ کار کہاں سے لاؤں؟
"تو ہے مرا ایمان" یہ شاکر ہے بجا — چاہنے کو "مس قمشار" کہاں سے لاؤں؟

آتی ہے مجھے شرم کہ بے میڈم ہوں — یوں ہونے کو ہوں پارک میں بے ہمدم ہوں
افسوس! یہ دورِ روشن اور میں! — بس کیا ہوں، اپنا آپ ماتم ہوں

یوں تو طلاق لے لی، پر عشق اٹل ہے — آزادی مل گئی ہے، اور دل مچل رہا ہے
بس کو تلاش ہے اب اک اور راسٹر کی — گاڑی ٹھہر گئی ہے انجن بدل رہا ہے

---

(۵) حقایق:-

حق تعالیٰ نے آنکھیں دیکھنے کے لئے، کان سننے کے لئے، زبان بولنے کے لئے، ہاتھ کرنے کے لئے، پاؤں چلنے کے لئے، دل چاہنے

کے لئے جگر بھوننے کے لئے' اور گردے تلنے کے لئے دیے ہیں!!۔۔۔

یہ زندگی کے حقائق ہیں!!!۔۔۔

مچھلی کے بچے کو تیرنا' نوجوانوں کو عشق کرنا' اور بڈھوں کو چڑچڑانا
سکھانے کی ضرورت نہیں۔ ہر چیز اپنے وقت پر کام کرتی ہے!!!۔

لکیر نقطہ سے شروع ہوتی ہے' دائرہ مرکز سے شروع ہوتا ہے'
اور پرکار ہاتھ میں گھومتا ہے!!۔۔۔ تو اس سے مطلب!؟؟؟۔
تو جناب' سارے "ادب لطیف" ہی سے کیا مطلب ہوا ہے!؟۔۔۔

ایک زمانہ تھا کہ جو عورت بالکل فاحشہ ثابت ہوتی تھی' اس کی
ناک چوٹی کاٹ دی جاتی تھی' اور اب "مس" کی صرف چوٹی کاٹی جاتی ہے!!

جس طرح دیوار کا سایہ بڑھتے بڑھتے گھٹ جاتا ہے' اسی طرح
سورج بھی ڈھلتے ڈھلتے غروب ہوجاتا ہے!!۔۔۔ آہ!!۔۔۔

---

(۶) اصول زندگی :۔

زندگی کا سب سے بہتر اصول ہے: "آج کی مرغی
سے کل کا انڈا بہتر ہے"

---

(۷) حفظ ما تقدم :۔

بیمار ہوکر دوا کھانے سے تو یہ بہتر ہے کہ بیماری
سے پہلے ہی دوا کھاتے رہیں تاکہ بیماری آنے ہی نہ پائے!

---

(۸) اقتصاد :۔

ایک ایسی قوم ہے جس میں چھوٹی سے چھوٹی لڑکی
کو کرتا' ازار' یا لہنگے وغیرہ میں لپیٹ دیا جاتا ہے' اور ایک ایسی قوم
ہے جس میں نوجوان سے نوجوان عورت کو صرف ایک بچکانی کرتا پہنا کر
چھوڑ دیا جاتا ہے!۔۔۔ یہ اقتصادی دور ہے!!!۔۔۔

---

(۹) مناظر قدرت :۔

رات کی تاریکی!!۔۔۔ اور دن کی تمازت!!

آہ قدرت' تیرے مناظر!!۔۔۔

---

(۱۰) تعجب :۔

مہینے کی چودھویں رات تھی' سورج ڈوب چکا تھا'
تارے ٹمٹما رہے تھے کہ اتنے میں چاند بھی نکل آیا!!!۔۔۔ میں
دیکھ کر متعجب ہوگئی کہ یا خدا! یہ چودھویں رات کو چاند کہاں سے
نکل آیا!!!۔۔۔

---

(۱۱) آپ :۔

آپ' ہندی میں میرے دیوتا ہیں' اور فارسی میں
میرے سرتاج اور اردو میں!؟۔۔۔ کیا کروں اردو زبان اتنی وسیع
ہونے کے باوجود کوئی لفظ نہیں!!۔۔۔ اس لئے اردو میں تو آپ
میرے "آپ" ہی ہیں!!۔۔۔

---

(۱۲) عزاداری و غمگساری

مرنا ہر انسان کو ہے' اس لئے کس کس کا غم کس کو ہوتا ہے'
پھر بھی فلاں کے انتقال کی خبر آگئی ہے' اس لئے ہمیں جلسے کرکے جلسے جلسہ
تعزیتی قرارداد منظور کرنی ہے!!۔۔۔ کوئی ہے تیار!؟!۔۔۔ جی ہاں'
ہم ہیں! انجمن والے' رسالے والے' اخبار والے' اور اداروں کی
صدارت والے!!۔۔۔ اور کسی کی ضرورت ہے!؟۔۔۔!!!۔۔۔ جی نہیں '

فی الحال تو یہی بہت کافی معلوم ہوتے ہیں!!! ——

(۱۳) چار :۔

"چار پیو، بہت دن جیئو!!!"

(۱۴) ہوٹل کی تختیاں :۔

"پان کھا کر فرش و دیوار پر تھوکنا منع ہے!!"
ویسے بغیر پان کھائے تو میز اور کرسیوں پر بھی تھوک سکتے ہیں!!!——

"آج نقد کل اُدھار!"

"براہ کرم ادھار طلب فرما کر ہمیں شرمندہ نہ کیجئے"!!! کیونکہ ادھار کے معاملے میں ہم عورت سے زیادہ شرمیلے واقع ہوئے ہیں!

(۱۵) اوکاسا :۔

زنانہ و مردانہ کمزوریوں کا واحد ہندوستانی و ملکی علاج!!—— یہ رگ پٹھوں کو چست کر کے انسان میں نئی توانائی و طاقت پیدا کر دیتا ہے!!—— مردوں کے لئے سلور اور عورتوں کے لئے گولڈ طلب فرمائیے!!!——

(۱۶) ترجمہ :۔ فارسی میں ترجمہ کرو:۔

جب میں اسٹیشن سے اترا تو ہوا کچھ ایسی تھی کہ طبیعت از خود گنگنانے لگی۔ یہ جو لوگوں سے سنا تھا کہ اس مقام کی آب و ہوا بہت بہتر ہوتی ہے، بالکل صحیح نکلا۔ آہ، وہ بھینی بھینی خوش بو! وہ کھلے کھلے میدان! وہ پھول پھول بھونرے! وہ بلبلوں کا چہچہانا! وہ کوئل کا کوکنا! وہ صاف شفاف نہریں!!—— آہ، یہ وہ نظارے ہیں کہ اگر ان پر شاعر کے حسن تخیل کی پرچھائیں ہو تو ساری کائنات مجسم جنت بن جائے!

فارسی میں ترجمہ کر دیا:۔

جب من از اسٹیشن اُتردم تو ہوا کچھ ایسی می بود کہ طبیعت از خود گن گن می کند۔ ایں جو از لوگہا شنیدہ بودم کہ آب و ہوائے اس مقام بہت بہتر است بالکل صحیح برطرف شد۔ آہ! آں بھینی بھینی خوشبو! آں اوپن اوپن گروانڈس! آں گل گل کیڑہ بزرگ سیاہ (یعنی بھونرے!) آں چہچہائے بلبل! آں کوئلوں کا کوکنا! آں صاف شفاف نہر!!!—— آہ! ایں آں چنیں نظارہ ہاست کہ اگر برایں ہا شاعر کے حسن تخیل کی پرچھول باشد تو ساری کائنات جنت مجسم ساختہ شدہ گردد!!!——

ماخوذ از "دکن میں فارسی"

(۱۷) درد :۔

دنیا کے سب دردوں سے زیادہ قابل لحاظ قوم کا درد ہے، کیونکہ یہ ایک خالص ملکی درد ہوتا ہے جس کی قدر کرنا ہر شہری کا فرض ہے!!!——

(۱۸) لیڈر :۔

قوموں کا زوال، خدا کا عذاب، برادران قوم کی اصلاح سازی، خواہران قوم سے عشق بازی، انقلاب و اتحاد، دنگہ فساد، بدامنی و ذلت، قتل و خون، غربت و لعنت، یوں تو گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں، لیکن یہ سب جا کر جہاں ختم ہو جاتے ہیں وہ صرف لیڈر کی ذات ہے!!——

کھانا فراغت سے مل رہا ہے، زبان میں بھی اثر پیدا ہوتا جا رہا ہے، حرکات میں بھی خوبی و پسندیدگی کا امکان ہے!۔ اور کوئی ضروری کام بھی نہیں!!۔ اسی لئے سوچتا ہوں کہ کسی قوم کا

لیڈر بن جاؤں یا کسی فلم اسٹار کا عاشق! ـــــ خدایا تو ہی بتا کہ ان دونوں میں کون قابلِ ترجیح ہے؟؟ ـــــ آسانی کے لحاظ سے تو لیڈری معلوم ہوتی ہے! لیکن ہر دلعزیزی کے اعتبار سے ایکٹری!! ـــــ مگر ایکٹری کے لئے ڈائرکٹری کی محتاجی ہے، اور لیڈری کے لئے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں! صرف چند قوم کے نعروں پر سر دھننے والے کافی ہیں!!! ـــــ

برادرانِ قوم، شخصی حکومتوں نے تمہاری جڑیں کھوکھلی کردی ہیں، تمہارے حقوق چھین لئے گئے ہیں، ذہنیتوں کو غلام بنا دیا گیا ہے!! ـــــ تم پر ظلم ہو رہا ہے ظلم!!! ـــــ سمجھو یہ کونسی زبان کا لفظ ہے!! ـــــ نہ سمجھو گے تو پچھتاؤ گے اے دنیا جہاں والو، تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!!!۔

لیکن ہم کریں کیا؟

استبدادیت کو توڑ دو، شخصی حکومت کا خاتمہ کردو، حق تلفی کرنے والوں کو کچل ڈالو!! ـــــ قوم اور وطن کے لئے بیوی بچوں کو وقف کر ڈالو، اور جتنی دولت اور جائداد ہے اسے بھی قوم کے نام پر اڑا دو!! ـــــ اور جب یہ سب اڑ اڑا کے کافی ہو جاؤ تو پھر خود آگے بڑھو اور قوم کو بھی آگے ڈھکیلو! قوم کے لئے مٹ جاؤ! یا قوم کو مٹا دو! بہرحال دنیا میں کچھ کام کرو، ورنہ کم سے کم ہماری طرح نام کرو!.........

کیوں جی! سننے میں تو الفاظ بڑے زوردار معلوم ہوتے ہیں!۔ لیکن یہ سب کریں کس طرح؟۔ ہماری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آتا!! ـــــ

ہاں ہاں، بھائیو، تمہاری سمجھ میں نہیں آنے میں ہی ہمارا فائدہ ہے! ـــــ چلو آؤ!! ـــــ یہ وقت تمہاری سمجھ سے کام لینے کا نہیں!! بلکہ تمہارے سر اور ہماری سمجھ مل کر کام بنائیں گے!! اندھے کے پاؤں کا فائدہ لنگڑے کو ہوگا، اور لنگڑے کی آنکھوں کا فائدہ اندھے کو! ـــــ غرض، ایسے ہی بھائی چارہ سے تم فائدہ اٹھا سکو گے!! اس لئے تم اپنا مال و دولت، عزت و آبرو، اہل و عیال، چال چلن غرض سب کچھ ہمارے لئے وقف کردو! ـــــ پھر ہم تمہارے لئے وقف ہیں!! ـــــ آؤ، ہمارا ساتھ دو!! ـــــ ہم یعنے قوم اس وقت تمہاری ہی مدد کے محتاج ہیں! ـــــ اگر تم ہماری مدد کروگے تو گویا اپنی آپ مدد کروگے! ـــــ اور اس کے کیا معنے ہوتے ہیں، وقت آنے پر تمھیں خود بخود معلوم ہو جائیں گے! ـــــ اس وقت ہم دشمن کے نرغہ میں ہیں! ـــــ اسے فنا کردو! ـــــ پھر تم آزاد ہو! ـــــ تمہاری حکومت آزاد ہے! تمہاری راحت آزاد ہے! ـــــ آہ! وہ وقت بھی کیا ہوگا جب آفتاب سوا نیزہ پر اتر آئے گا!۔ زمین تانبے کی ہوگی، آسمان فولاد کا ہوگا! نہ بیٹا ماں کو پوچھیگا، نہ ماں بیٹے کو پوچھے گی! اس وقت تک ہر شخص آزاد ہوگا، ہر شخص بادشاہ ہوگا، شخصی حکومتوں کی لعنتیں کچل دی جائیں گی، اور اس کی جگہ جمہوری حکومت کا نقشہ گلی گلی نظر آئے گا!!! ـــــ کہو، اب بھی ساتھ دینے میں کوئی تامل ہے!!؟ ـــــ

جی نہیں، اب ہم ہر طرح آپ کے ساتھ ہیں!! ـــــ افسوس ہے کہ اب تک ہماری عقلوں پر جالا آگیا تھا۔ اب ہم نے انھیں بالکل صاف کردیا ہے! ـــــ فرمائیے، کیا ارشاد ہوتا ہے؟ ـــــ

سنو، سب سے پہلے بادشاہت کا خاتمہ کردو! ـــــ پھر دشمن کو مار بھگاؤ! ـــــ

لیکن یہ کس طرح کریں شہریان جی؟

جی ہاں، مولانا ہم بھی تو یہی سوچتے ہیں!

پہلے دین و مذہب کے نام پر اپنے ہی چند بھائیوں کا گلا کاٹو، پھر جب کافی فساد ہو جائے، اور آدمیوں کی ایک کثیر

تعداد مرجائے، تو حکومت کی بد انتظامی اور ظلم ثابت کر دو! اور جب حکومت میں اس کے قصور اور غلط طریقہ کا احساس پیدا ہو جائے تو اس کو زیر کرکے اپنے حقوق منوالینا بلکہ حکومت چھین لینا کوئی بڑی بات نہیں!

جی ہاں، مولنا ہم سمجھ گئے!

جی ہاں مہاتما ہم بالکل سمجھ گئے!

چنانچہ رپورٹ آئی کہ فلاں جگہ جھڑپ ہوگئی، فلاں مقام پر فساد ہوگیا، دو سو مرے، پانچ سو زخمی ہوئے، اور بہ فضلہ سو پچاس زندہ بھی ہیں، وہ تو خدا کی خوبی میں تھا کہ پولیس نے عین وقت پر مداخلت کرکے صورتِ حال کو قابو میں لے لیا، اور مدد بہم پہنچائی، ورنہ پانچ، دس پر ہی ہنگامہ ختم ہوگیا ہوتا!!۔

پنڈت جی، ہم ڈوب گئے!!

حضرت ہم فنا ہوگئے!!

اچھا اچھا، پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں!— آیندہ احتیاط کرو!! اتنے ہی نقصان پر گھبرا جاؤ تو آیندہ حکومت کیسے حاصل کروگے؟— یاد رکھو کہ ہر فائدہ کے لئے نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے، اس لئے قوم کو بچانا ہے تو قوم کے لئے جان بھی دینا ہوگا!!— صبر و استقلال کے بغیر کام نہیں چلے گا!!۔

لیکن، شریمان، ہم پر بے جا ظلم ہو رہا ہے، ہم مدرسوں سے ہڑتال کر دینا چاہتے ہیں!!

حضرت، ہماری مسجدوں کی بے حرمتی ہو رہی ہے، اس لئے ہم احتجاجاً نمازیں ملتوی کر دینا چاہتے ہیں!!—

مارو دشمنوں کو!!— لیکن یہ ظاہر نہ ہونے دو، کیوں کہ یہ ایک آپس کی بات ہے!! ورنہ سب کو آپس میں متحد و متفق ہوکر ہی کام کرنا اور ایک متحدہ محاذ و متحدہ پلیٹ فارم قائم کرنا چاہیے ورنہ بغیر پلیٹ فارم کے ریل پر کیسے سوار ہو سکو گے!!!

لیکن اب تک جو ہم نے یہ سب قربانیاں کیں اس کا نتیجہ ہمیں کیا ملا؟

حکومت!

کیا حکومت اسی کا نام ہے، مہاشے، کہ نہ فوج قبضہ میں ہو، نہ دولت، نہ خارجی اختیارات!! بس، آپس میں ہی لڑ مریں!؟

آج آپس میں لڑنے کے قابل ہوئے ہیں، تو کل دشمن سے بھی لڑنے کے قابل ہو جائیں گے!!۔ دھیرے، دھیرے ہی کوئی چیز حاصل ہوتی ہے!!—

غرض، استبدادیت کے ٹکڑے کرنے کے لئے، آدمیوں کے ٹکڑے کرتے ہوئے کافی مشق ہوگئی ہے!!— اور اب استبدادیت مٹی کہ شخصی حکومت مری!!— پھر آزادی ہے، حکومت خود اختیاری ہے، لوگ ہیں اور مولنا و مہاتما ہیں!! اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے؟؟—

الحمدللہ کہ بادشاہت کی غلامی سے ہٹے، اور غلاموں کی غلامی میں آگئے!!!— آہ، انقلابی دور کے درخشاں کارنامے!!!

ہمیں افسوس ہے کہ یہ ٹکڑا "ادب لطیف" کے عام سائز سے بہت بڑھ گیا ہے!! ناظرین چشم پوشی کریں!!—

شاکر

ناقابل اشاعت مضامین کی فہرست

(حسب ذیل مضامین نظم و نثر سب رس میں شائع نہیں ہو سکتے)

ان کا خط
نوائے سروش
غزل عاشق
جل دیا (غزل)
زندگی کا مقصد
جامعہ عثمانیہ کے طلباء سے خطاب (نظم)
پتنگ و پتنگہ
دو دماغ کی سیر
ملک گزٹ
واعتصموا بحبل اللہ جمیعا
غزل حضری
میرے لئے (غزل)
صحرا کی کہانی طائروں کی زبانی (نظم)
ترانۂ دور حاضر (نظم)
دو ساغر (غزل)
عالم عشق کا افسانہ (نظم)
شاعر سے خطاب (نظم)
بربادِ تمنا
خاموش ہے
دیوانہ بنادے (غزل)
آفتاب (نظم)
تیتری

اشکوں کا پانی (غزل)
نغمہ سحری (نظم)
تیرے بغیر (نظم)
جل پریاں
تصورات
عرش (نظم)
حسن (نظم)
کتاب عشق کا پہلا سبق (نظم)
دہقان سے خطاب (نظم)
استقلال (نظم)
بلبل کی کہانی خود اس کی زبانی (نظم)
رقاصہ (نظم)
قدامت پرست شاعر سے (نظم)
پی گیا (غزل)
آکے دیکھ (غزل)
ہوشیار (نظم)
گریۂ عید (نظم)
تمنا (نظم)
تاثرات نکہت (نظم)
آباد کرتے ہیں (غزل)
آبا نی نہیں جاتی (غزل)
اردو مؤتمر کے مہمانوں کا خیر مقدم (نظم)

عید قرباں (نظم)
مرنے والے سے خطاب (نظم)
قوس قزح اور شاعر (نظم)
احساس شباب (نظم)
پیارے (غزل)
چاہتا ہوں (غزل)
صدمات شدید الہ بادی (نظم)
مبارک ہو (غزل)
دنیا کی بلائیں (نظم)
کوش تھا (غزل)
دنیا (غزل)
مٹانے والے (غزل)
محبت (نظم)
غزل حبیب
کیوں (غزل)
آشیانے کی (غزل)
غمخواریاں ہیں (غزل)
بکار رہے (غزل)
وہ کوسوں بھاگتے ہیں نعرۂ اللہ اکبر سے (نظم)
امواج شمیم (غزل)
معاملات (نظم)
ذوق بربادی (غزل)

جل جانے کا (غزل)
آشنائی کی تو ہم نے کی (غزل)
پوچھتے کیا ہو (غزل)
دیکھ کر (غزل)
کیف و شباب میں (غزل)
محبت کا حسرت کا (غزل)
ہستی (نظم)
دیکھا (غزل)
واسطہ نہیں (غزل)
پی گیا (غزل)
ٹوٹ رہا ہے (غزل)
نشاط زندگی (نظم)
فریب نما (غزل)
زندگی کی ایک شام (نظم)
نغمۂ شباب (غزل)
دکن سے خطاب (رباعی)
ذکر جاناں کر رہا ہوں (غزل)
جذبات آرزو (نظم)
ہوس رانی کو (غزل)
تیرے بغیر (غزل)
اتا ترک (نظم)
آہ صغرا (نظم)
مرگ نوجوانی (نظم)
تانا شاہ کے مزار کے سامنے (نظم)
پھول کی سی زندگی (نظم)

غذا کس طرح ہضم ہوتی ہے

اگر ہماری غذاؤں کی ایک مکمل فہرست مرتب کر کے اس پر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ (۱) نائٹروجنی مثلاً پروٹیڈس یا پروٹین (گوشت۔ مچھلی۔ انڈا۔ دال وغیرہ) یہ غذائیں خاص طور پر توانائی پیدا کرتی ہیں اور ان سے حرارت بھی پیدا ہوتی ہے (۲) غیر نائٹروجنی غذا۔ اس کی تین ذیلی قسمیں ہوتی ہیں

الف۔ چربی یا روغنیات مثلاً گھی۔ مسکا۔ تیل اور چربی وغیرہ ان سے صرف حرارت پیدا ہوتی ہے۔

(ب)۔ کاربوہائیڈریٹ۔ مثلاً گیہوں۔ نشاستہ۔ شکر۔ چاول۔ ترکاریاں وغیرہ۔ ان سے حرارت پیدا ہوتی ہے اور توانائی بھی مگر بہت کم۔

(ج)۔ نمک مثلاً کلورائیڈس۔ سلفیٹس۔ نائٹریٹس۔ فاسفیٹس وغیرہ غرض جو اشیاء رات دن استعمال کرتے ہیں حسب ذیل اہم اجزا پر مشتمل ہوتی ہیں پروٹیڈس۔ روغنیات۔ کاربوہائیڈریٹ۔ اور نمک یہ غذائی اجزا جب انسان کے ہضمی نظام (منہ۔ حلق۔ معدہ۔ اثنائے عشری۔ آنت اور معائے مستقیم۔) سے گزرتے ہیں تو ان میں ہضمی عرقوں کے شریک ہو جانے سے مختلف تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ ان ہی تبدیلیوں کو غذا کا ہضم ہونا کہتے ہیں غذا کے ہضم ہونے سے توانائی۔ حرارت خون پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ انسان کی بقا اور اس کی نشوونما کے لئے ضروری ہے۔

ہضمی نظام۔ غذا پہلے منہ میں اچھی طرح چباتے ہیں اور اس عمل کو "چبانا" کہتے ہیں۔ اس سے غذا کے علحدہ علحدہ اجزا باہم مل جاتے ہیں اور اس کے ساتھ لعابی غدود سے لعاب جس میں ٹائلین ہوتا ہے اور جس کا عمل قلویانہ ہوتا ہے غذا میں شریک ہوجاتا ہے پھر غذا حلق کے ذریعہ اندر جاتی اور معدہ میں پہنچ جاتی ہے۔ منہ سے معدہ تک پہنچنے کے دوران میں ہاضمہ میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

معدے میں چند غدود پائے جاتے ہیں جن سے گیسٹرک عرقوں کا افراز ہوتا ہے یہ عرق ہائیڈروکلورک ترشہ اور چند خمیری مادوں مثلاً پپسن وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان عرقوں سے غذا پر حسب ذیل عمل ہوتا ہے۔

الف۔ پروٹیڈس۔ اس کے بعض اجزا براز او ہائیڈروکلورک ترشہ اور پپسن کے عمل سے حل پذیر پپ تون تیار ہوتے ہیں۔

(ب) روغنیات۔ معدے کی حرارت کی وجہ سے پگھل جاتے ہیں

ج۔ کاربوہائیڈریٹ۔ اس کا کچھ حصہ لعاب کے ٹائلین کے عمل سے حل پذیر شکر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

د۔ حل پذیر نمک۔ جذب ہونے کے لئے بالکل تیار رہتے ہیں

اس طرح کچھ کچھ ہضم شدہ غذا معدے سے اثنائے عشری میں پہنچتی ہے اس حالت میں غذا کو "چائم" کہتے ہیں۔ غذا کو اس حالت کے اختیار کرنے تین گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔

اثنائے عشری میں دو نہایت اہم عرق داخل ہوتے ہیں

(۱) عرق لبلبہ۔ اس کا عمل سوڈیم کاربونیٹ کی وجہ سے قلویانہ ہوتا ہے اور یہ تین ذیلی اقسام پر مشتمل رہتا ہے۔

الف۔ اسٹیپسن۔ (ب) امیلاپسن۔ (ج) ٹرپسن

(۲) عرق پت یا صفرہ۔ یہ بھی قلویانہ ہوتا ہے

الف۔ بقیہ پروٹیڈس۔ عرق لبلبہ کے ایک جز یعنے ٹرپسن کے عمل سے حل پذیر پپ ٹون میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

ب۔ پگھلی ہوئی چربی۔ صفرے کے عمل سے یہ چربی قطروں کی شکل میں بٹ جاتی ہے اور ان قطروں پر عرق لبلبہ کے پہلے جز یعنی اسٹیپسن کے عمل سے چربی ترشہ اور گلیسرین پیدا ہوتے ہیں اور یہ سوڈیم کے نمک سے ملکر حل پذیر صابن میں تبدیل ہو جاتے ہیں

جس کو "صابن کاعمل" کہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ ذرات جن کو "جال" کہتے ہیں لمفاٹک نظام کے خاص اعوئیہ لیاکٹیل کے ذریعہ جذب کیئے جاتے ہیں۔

ج۔ نشاستہ اور دوسرے کاربوہائیڈریٹ صفرے کے اثر سے حل پذیر شکروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور عرق لبلبہ کے دوسرے جز یعنی امی لاپ سن کے زیرعمل دوسرے کاربوہائیڈریٹ بھی حل پذیر شکروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

د۔ حل پذیر نمک

غذا کے ہاضمہ کے لئے غذائی اجزا کا حل پذیر ہونا اور ان کا جذب ہونے کے قابل بن جانا مقصود ہوتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ غذائی اجزا حل پذیر حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ یہ حل پذیر غذا آنت کی انگشت نما ساختوں کے ذریعہ جذب ہونا شروع ہوتی ہے۔

اثنا عشری سے غذا حل پذیر حالت میں آنت کے اندر داخل ہوتی ہے۔ اثنائے عشری میں غذا کی تحلیل کے لئے چار گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔

آنت میں بھی دو قسم کے عرق پائے جاتے ہیں۔

(۱) ایرپ سن (۲) سکس انٹری کس

(الف) حل پذیر پپ ٹون۔ عرق ایرپ سن کے عمل سے سادہ امائنو ترشہ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

(ب)۔ نشاستہ سکس انٹری کس کے عمل سے حل پذیر شکروں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

ج۔ کچھ حصہ ذروں میں تبدیل شدہ چربی کا موجود رہتا ہے۔

د۔ پانی اور حل پذیر نمک

اب غذا بالکل حل پذیر حالت میں اور جذب ہونے کے قابل ہو جاتی ہے۔ آنت کی انگشت نما ساخت میں خونی شریانوں کا ایک جال پایا جاتا ہے اور ان کا تعلق جگر بابی نظام سے ہوتا ہے۔ یہ شریانیں حل شدہ غذائی مادہ کو جذب کرکے جگر بابی نظام کے ذریعہ جگر کو دے جاتی ہے۔ جگر غذائی مادوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جہاں سے جسم کے مختلف حصوں کو غذا پہنچائی جاتی ہے۔

معائے مستقیم میں عملی طور پر انجذاب کا عمل بالکل نہیں ہوتا اور یہاں سے فضلہ براز کے ذریعہ خارج ہوتا ہے۔ فضلہ میں کچھ حصہ غیر ہضم شدہ غذا کا اور زیادہ تر غیر جذب شدہ غذائی حصے کا جو سلفائیڈس اور مختلف اقسام کی بدبودار گیسوں پر مشتمل ہوتا ہے پایا جاتا ہے۔

محمد مختار احمد

تاریخ گولکنڈہ حیدرآباد کے مورخ اور جامعہ عثمانیہ کے معلم تاریخ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی نے سلاطین قطب شاہیہ کی نہایت مستند اور مبسوط تاریخ قلمبند کی ہے جس میں گولکنڈہ اور اس کے آس پاس کی سلطنتوں کے تعلقات دکن کا تمدنی ارتقا، بادشاہوں اور امیروں کے حالات، لڑائیاں، علم و فضل کی سرپرستی غرض ہر پہلو پر قدیم نادر اور قلمی تاریخوں کی مدد سے روشنی ڈالی ہے۔ اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے جو اس اہتمام اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ اس کے مولف نے تاریخ دکن کے متعلق خاص تحقیقات کی ہیں اور ان کی ایما پر کتاب "بہمنیوں کا تمدن" بھی عنقریب شائع ہوکر منظر عام پر آئیگی۔ تاریخ گولکنڈہ باتصویر ہے اور اس کی تصویریں بھی اس کے مواد کی طرح قدیم تاریخی ماخذوں سے حاصل کی گئی ہیں۔ بڑی سائز ڈھائی سو سے زیادہ صفحات قیمت (عہ) سب رس کتاب گھر سے مل سکتی ہے۔

اردو کی نئی کتابیں

١۔ نوع انسان کی کہانی (ہسٹری آف مین کائنڈ کا ترجمہ) ٥٢٠ صفحات مفید عام پریس لاہور
٢۔ پرکاش ساگر جلد اول (منظوم ہندو تاریخ) از نوبت رائے۔ مرکنٹائل " "
٣۔ سحر حلال (اخلاقی نظمیں) از رشید احمد خان رویش۔ ٨٠ صفحات۔ احسن المطابع۔ میرٹھ
٤۔ نغمۂ ربانی (نعتیہ کلام) از ضیاء القادری بدایونی۔ ٦٢ " قیمت عہ روپیہ عثمانی پریس بدایوں
٥۔ جیل کہانی۔ از خوش حال چند خورسند۔ ١٩٢ " پنجاب آرٹ پریس لاہور
٦۔ مجدد الف ثانی (اسلام کا فلسفہ اور اصول) از ہدایت اللہ۔ ١٨٧ " معارف پریس اعظم گڑھ
٧۔ ایران حصہ اول۔ (سفرنامہ) از ڈاکٹر عبد الحکیم شجاع ایم اے ٢٠٩ " گیلانی پریس لاہور
٨۔ واردھا طریقۂ تعلیم میں سماجک گیان از چودھری خوشی رام۔ پریمی پریس۔ میرٹھ
٩۔ پریم رس (مکالمے اور رفاقتی) از ڈاکٹر عباس علی خان لمعہ ٧٢ " قیمت ١٢ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد
١٠۔ خواب بیداری (فتح علی شیرازی کی خواب گشتہ کا ترجمہ) از سید یوسف حسین زیدی ٩٣ صفحات
قیمت ۸ نظامی پریس لکھنؤ۔
١١۔ اسلام کیسے شروع ہوا۔ از عبد الواحد سندھی۔ ٣٠٨ صفحات قیمت [illegible] مکتبہ جامعہ نئی دہلی
١٢۔ دستور الاصلاح (کلام کی اصلاح کے اصول) از مولانا سیماب اکبرآبادی قیمت [illegible] دفتر رسالہ شاعر آگرہ
١٣۔ مختصر تاریخ دکن از پروفیسر عبد المجید صدیقی۔ ٢٤٠ صفحات قیمت عہ سب رس کتاب گھر خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن
١٤۔ مرقع عبرت (مسلمانوں کے اخلاقی اور سیاسی زوال پر تبصرہ) از سید یحییٰ عظیم آبادی۔ بنکی پور پٹنہ
١٥۔ حسن انتخاب (مشہور شعرا کا منتخب کلام) مرتبہ مظہر فریدآبادی قیمت عہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی
١٦۔ حیات وارث (سید وارث علی شاہ کے حالات) قیمت ۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی
١٧۔ نئے زاویے (افسانے اور ڈرامے) مرتبہ کرشن چندر۔ مکتبۂ اردو۔ لاہور
١٨۔ روشنی اور سائے (افسانے) از نور کمال۔ ٢٤٠ صفحات قیمت [illegible] مکتبۂ ہندیہ۔ لاہور
١٩۔ اسلام کا اقتصادی نظام مرتبہ ندوۃ المصنفین ٢٦٤ " " [illegible] از مرتب۔ دہلی
٢٠۔ زلف و بو۔ (افسانے) از فیاض محمود۔ " [illegible] مکتبۂ اردو۔ لاہور
٢١۔ سرکش روحیں۔ (افسانے) از خلیل جبران۔ مترجمہ ابو العلا چشتی " ١٢ " " "
٢٢۔ ذخیرۂ اردو۔ (خط لکھنے کے طریقے اور محاورے) از شیخ رحمت اللہ ٢٤٢ صفحات [illegible] نیشنل لائبریری۔
ریلوے روڈ لاہور۔
٢٣۔ یادگار بصیر (مجموعۂ کلام) از سید بصیر الدین نصیر ٢٤٢ صفحات قیمت [illegible] سید ظہیر الدین [illegible] مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

٢٤۔ تمدن یورپ۔ از ڈاکٹر احسان محمد خان ٦٢ صفحات قیمت [illegible] یگانہ بکڈپو۔ رامپور۔
٢٥۔ فلم کرنگ گائڈ۔ از ڈاکٹر پرتمی سنگھ ٢٠٠ " [illegible] مستقلمند بکڈپو لاہور
٢٦۔ جام طہور (رباعیات و قطعات) از آثر صہبائی [illegible] تاج کمپنی۔ لاہور
٢٧۔ صبح نشاط (نظمیں) از اصغر حسین خان نظیر قیمت [illegible] [illegible] صفحات [illegible]
٢٨۔ تحفۂ خط و کتابت (ذخیرہ مراسلت کے طریقے) از سید خواجہ [illegible] قیمت [illegible] معین الدین
جنرل مرچنٹ متصل ساگر ٹاکیز۔ حیدرآباد دکن
٢٩۔ سلیم (ڈراما) از آغا اشرف ١٥٠ صفحات قیمت [illegible] پنجاب لٹریچر کمپنی۔ لوہاری دروازہ لاہور
٣٠۔ حسن و عشق (اشعار کا مجموعہ) مرتبہ محمد صدیق خیرآبادی ٢٤٨ صفحات قیمت [illegible] محمد ایوب تاجر عطر چوک لکھنؤ
٣١۔ پیام کیف (مجموعۂ کلام) از مرزا احسان احمد وکیل ٢٠٠ صفحات [illegible] از مصنف اعظم گڑھ
٣٢۔ ادب اور زندگی (تنقیدی مضامین) از مجنوں گورکھپوری [illegible] ایوان اشاعت گورکھپور
٣٣۔ ہومیو ڈاکٹر (یونانی اور انگریزی علاج کے طریقے) از حکیم مظفر حسین ٢٢٥ صفحات قیمت [illegible]
کتب خانہ لطف زندگی۔ موچی دروازہ۔ لاہور۔
٣٤۔ کلام رونق۔ از منشی پیارے لال رونق دہلوی قیمت [illegible] کارونیشن بکڈپو نئی سڑک دہلی
٣٥۔ نغمۂ قیصر (ٹھمریوں کا مجموعہ) از منشی گوری شنکر قیصر ١٦٠ صفحات قیمت [illegible] کارونیشن بکڈپو " "
٣٦۔ علمائے ہند کا شاندار ماضی ٥ حصے از مولانا محمد میاں ٢٢٤ صفحات کتب خانہ فخریہ امروہہ گیٹ مراد آباد
٣٧۔ طرز المائدہ (صنعت و حرفت کے طریقے) از غلام حسن شیرانی ٥٠٠ صفحات قیمت [illegible]
دار الکتب شیرانی۔ دہوا۔ ڈیرہ غازی خاں۔
٣٨۔ کلام عاصی۔ از منشی گھنشام لال عاصی ٢٤٦ صفحات قیمت [illegible] کارونیشن بکڈپو نئی سڑک دہلی
٣٩۔ دیوان حیا۔ از کنیز فاطمہ حیا۔ قیمت [illegible] منیجر رسالہ زیب النساء۔ لاہور
٤٠۔ گلشن فانی (مجموعۂ کلام) از ڈاکٹر حبیب المبین احمد فانی ٢٠٨ صفحات قیمت [illegible] ممتاز بکڈپو فراش خانہ دہلی
٤١۔ ہماری غذائیں از " " " " " " " "
٤٢۔ بچوں کی دیکھ بھال " " " " " " "
٤٣۔ دلی کی آوازیں (سودا بیچنے والوں کی صدائیں) از خواجہ محمد شفیع دہلوی " " " "
٤٤۔ نظام آباد دکن (تاریخی مرقع) از غلام احمد وکیل ٢٠٠ صفحات قیمت [illegible] دار الاشاعت
کاشانہ۔ نظام آباد
٤٥۔ آخری رسول (سوانح) از ماہر القادری ٢٠٤ صفحات قیمت [illegible] مکتبۂ علمیہ چار مینار حیدرآباد

دیوجانس کلبی

دیوجانس کلبی یونان کا مشہور فلسفی تھا جو حضرت مسیح سے چار سو تیرہ سال قبل صوبہ بطس کے شہر سینوب میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اسکیوس صرافی کیا کرتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی کھوٹے روپے بھی چلاتا تھا۔ اس لئے گرفتار کر لیا گیا اور قید ہونے کے بعد جیل ہی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ باپ کی وفات کے بعد دیوجانس ایتھنز چلا آیا اور یہیں رہنے لگا۔ یہاں اس کی حالت نہایت حقیر و ذلیل فقیروں کی سی تھی۔ ننگے پاؤں شہر میں پھرتا تھا۔ ہاتھ میں لکڑی اور پیٹھ پر ایک گٹھڑی رکھ کر سارے شہر کا گشت لگانا اس کا معمول تھا۔ جس پر لوگ ہنستے اور مذاق اڑاتے تھے۔ اس کی ڈاڑھی خاص طور سے لوگوں کے لئے ہنسی کی وجہ بنی ہوئی تھی۔

اگرچہ ان تمام باتوں کی وجہ سے دیوجانس تمام شہر کے باشندوں کے لئے ایک مسخرہ بن گیا تھا لیکن اسی زمانے میں اس نے فلسفۂ ادبیہ کی اشاعت بھی شروع کر دی تھی۔ اور اس سلسلہ میں وہ بالکل انتقنس کی تقلید کرنے لگا۔ یہ حالت اس کی روز بروز بڑھتی رہی اور وہ نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ اشاعت علم میں مصروف ہوگیا۔ اور اس قدر مصروف ہوا کہ اس کی اس علمی زندگی نے اس کے تمام عیوب پر پردہ ڈال دیا۔

وہ خیالات جو اس کے دماغ میں پیدا ہوتے تھے اور جن کی وہ اشاعت کرتا تھا۔ انتقنس کی تعلیمات کا نتیجہ تھیں اسی لئے وہ اس کا اس قدر دلدادہ ہوگیا تھا کہ اس کے تمام اعمال و افعال میں استاد کا رنگ جھلکنے لگا تھا اور ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ دیوجانس کے جسم میں انتقنس کی روح سما گئی ہے۔

عام لوگوں کے نزدیک دیوجانس اگرچہ مسخرا سمجھا جاتا تھا لیکن پھر بھی جب وہ گھر سے باہر نکلتا تو ایک ہجوم اس کے ساتھ ہوتا۔ لوگ سوال کرتے جاتے اور وہ جواب دیتا رہتا۔ اور لوگ اس کے جوابوں کو یاد رکھتے۔ کیونکہ اس کے جوابوں میں ایک حقیقت تھی جو دوسروں کو ضرورت کے وقت فایدہ پہنچاتی۔ رفتہ رفتہ اس کو اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ شہر کے امرا اور اکابر بھی اس کی جانب متوجہ ہوگئے۔ یہاں تک کہ کوئی تقریب ایسی نہ تھی جہاں دیوجانس خاص طور سے مدعو نہ کیا جاتا ہو۔ وہ اپنے اس حال کو نہایت ہوشمندی سے سنبھالے ہوئے اپنی تبلیغی خدمات برابر ادا کرتا رہا کیونکہ جو تجربات اس کو ماضی میں ہوتے جاتے تھے وہ مستقبل کے لئے مفید ثابت ہو رہے تھے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ آئندہ کیوں کر اپنی تبلیغ کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اور اب اسے کس قدر احتیاط سے کام کرنا چاہئے۔ اسی لئے وہ ہر فرقہ اور ہر مذہب کے لوگوں کے ساتھ شریک ہونے لگا اور ان کا ہم خیال ہو کر ان کی تربیت اور تہذیب میں اصلاح کرنے لگا۔ یہاں تک وہ ہر دل عزیز بن گیا۔ اور اسی بنا پر لوگوں نے اسے کلبی کا لقب دے دیا جو اس زمانے میں (اس خیال کے زیر اثر کہ ان کی طبیعتیں کتوں سے مشابہ ہوتی ہیں) فلاسفہ کے لئے مخصوص تھا۔

دیوجانس نے ابتدا میں اپنے اوپر تمسخر کی کیفیت طاری کرلی تھی ہر چند اس کا اقتضا یہی تھا کہ لوگ اسے دیوانہ سمجھتے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کی یہی دیوانگی اس قدر ہشیاری ثابت ہوئی کہ تمام قلوب اس کی طرف مائل ہوگئے اور چند ہی روز میں وہ نہایت قابل قدر فلسفی مان لیا گیا۔

اشاعت فلسفہ کے لئے اس نے جو عجیب عجیب طریقے اختیار کئے تھے ان کا درس اس نے جانوروں سے لیا تھا۔ چنانچہ چوہوں سے یہ سبق لیا کہ انسان کو کسی خاص مقام کی ضرورت نہیں

جہاں اتفاق لے جائے وہیں قیام بھی ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس نے اپنے رہنے کے لئے کوئی مکان نہیں بنوایا۔ بلکہ اپنے ساتھ ایک صندوق رکھنے لگا جسے آگے آگے لڑھکاتا ہوا چلتا اور جب رات ہو جاتی تو اسی میں گھس جاتا۔

وحشی جانوروں سے اس نے یہ سیکھا کہ کھانا پکانے اور برتن وغیرہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں کچا گوشت ناخنوں سے کاٹ کر کھایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کا طرز عمل یہی تھا۔ اور سوائے ان صورتوں کے جب وہ کسی دعوت میں شریک ہوتا۔ یا خاص مجمع میں مدعو کیا جاتا اسی طرح ناخنوں سے نوچ نوچ کر کھاتا۔

کتوں سے اس نے یہ سبق سیکھا کہ سنجیدگی متانت یا پابندئ رسوم کی کوئی ضرورت نہیں تمام مطالب اور مقاصد پورا کرنے کے لئے آزادی اور بیباکی کی ضرورت ہے۔ اگرچہ لوگ دیوجانس کی ان حرکتوں کو حیرت سے دیکھتے تھے لیکن خود دیوجانس دوسروں پر افسوس کرتا تھا کہ لوگ اس کے اصول پر عمل کیوں نہیں کرتے۔

کلبی کی عادت تھی کہ کبھی دن کو اپنے ساتھ ایک قندیل لے کر نکلتا تھا۔ اس پر اگر لوگ پوچھتے کہ یہ کس ضرورت سے ہے تو جواب دیتا کہ مجھے اپنے ایک ہم مشرب کی تلاش ہے۔ چنانچہ وہ لوگوں کو آواز دیتا اور اپنے پاس جمع کرتا۔ جب سب آجاتے تو ڈنڈا لے کر سب کو منتشر کر دیتا۔ اور کہتا "مجھے انسان کی تلاش ہے اور تم میں سے کوئی انسان نہیں ہے" اس کے جواب میں اگر کوئی کہتا کہ "وہ آدمی کسے کہتے ہیں۔ تم نے کبھی کسی آدمی کو دیکھا ہے" تو کہتا "نہیں میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا البتہ اسپارٹا میں چند بچے دیکھے ہیں"۔

دیوجانس کا یہ جواب ٹھیک ہوتا اگر وہ انسانی حقیقت سے بھی واقفیت رکھتا۔ لیکن اس کے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اقوال صرف اوہام تھے اور وہ لوگوں کے معائب پر ان کے محاسن سے زیادہ غور و خوض کیا کرتا تھا۔

ایک دن کا قصہ ہے کہ لوگوں نے اس کو دیکھا بتوں کے سامنے ہاتھ پھیلا پھیلا کر کچھ مانگ رہا ہے اور ایک کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملتا تو دوسرے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور دوسرا بھی کچھ نہیں بولتا تو تیسرے کو مخاطب کرتا ہے۔ وہ بھی خاموش رہتا ہے تو چوتھے کو دیکھنے لگتا ہے لوگوں نے پوچھا "تم ان سے کیا چاہتے ہو؟" کہنے لگا میں لوگوں کے پاس اپنی کوئی خواہش لے کر جاتا ہوں تو وہ بھی انہیں بتوں کی طرح بےحس و حرکت رہتے ہیں اسی لئے میں ان بتوں سے التجائیں کر کے لوگوں سے مانگنے اور نہ پانے کا خوگر ہو رہا ہوں۔

اس کی یہ عادت تھی کہ موسم گرما میں جب سخت گرمی پڑنے لگتی تو دوپہر کے وقت خوب گرم ریت پر اور شدید سردی میں برف کی چٹانوں پر لوٹتا لوگ پوچھتے "یہ کیوں؟" تو کہتا "اس سے مجھے سردی و گرمی برداشت کرنے کی عادت پڑ جائے گی"۔

وہ ذی ثروت اور دولتمندوں کی بے انتہا تحقیر کرتا خطیبوں اور مقررین کو سمجھتا کہ یہ رعایا کے غلام ہیں۔ فلاطون اور اس کے تلامذہ کے لئے اس کی رائے یہ تھی کہ وہ سب کے سب فضول خرچ تھے۔ اس کا قول تھا کہ بادشاہوں کے تاج ایسے ہیں جیسے شیشے کے برتن اور شہرت پسندی صرف دیوانوں کا شیوہ ہے وہ کہا کرتا کہ جب میں دنیا کے حکام فلاسفہ وغیرہ کو دیکھا کرتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ واقعی انسان اپنی عقل و ادراک کے لحاظ سے جانوروں سے بالاتر ہے۔ لیکن جب ان لوگوں کو دیکھتا ہوں جو وحی و الہام تعبیر و رؤیا کے مدعی ہیں یا ان لوگوں پر نظر پڑتی ہے جو مال و جاہ حاصل کرنے

کے بعد متکبر و مغرور ہو جاتے ہیں تو خیال کرتا ہوں کہ انسان سخت مجنون ہے اور اس لحاظ سے حیوانوں سے بھی زیادہ پست و ذلیل۔

ایک روز اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا چلو سے پانی پی رہا ہے اس نے اپنا چوبی پیالہ پھینک دیا اور کہا "یہ بچہ مجھ سے زیادہ عقلمند اور صاحب بصیرت ہے"۔

وہ اس شخص کی بہت زیادہ تعریف کرتا جو شادی کے لئے تیار تو ہوتا مگر شادی نہ کرتا کیونکہ اس کے نزدیک جو جوانی میں شادی کر لیتا ہے وہ عجلت کرتا اور جو انحطاط کے بعد آمادہ ہوتا ہے وہ تاخیر کر دیتا ہے اس لئے دونوں میں سے کوئی بھی اسے پسند نہ تھا۔

وہ ایک روز بازار میں کھڑا ہوا وعظ کہہ رہا تھا دیکھا تو پاس ایک متنفس بھی نہ تھا گانا بجانا شروع کر دیا پھر تو لوگ پروانوں کی طرح اس کے گرد جمع ہو گئے تھوڑی دیر تک یہ حالت دیکھتا رہا اس کے بعد سب کو لعنت و ملامت کرنے لگا۔ کہ افسوس ہے تم ایک لغویات کے لئے تو میرے گرد جمع ہو گئے لیکن میرے زرین نصائح کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔

دیو جانس ان لوگوں کا سخت مخالف تھا جو موسیقی میں مہارت رکھتے تھے وہ کہتا تھا کہ یہ لوگ بجائے اس کے کہ لوگوں کے خصائل میں اصلاح، عادات میں استقلال تہذیب میں استقامت پیدا کریں ان کو جوش اور لطف اندوز کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے چند روز میں یہ بیکار ہو جاتے ہیں۔

وہ علمائے فلکیات اور اہل رصد کا بھی بڑا مخالف تھا اور کہا کرتا تھا کہ ان لوگوں کو اپنے پاؤں کے نیچے کا حال تو معلوم نہیں اور آسمان اور اجرام سماوی کے حالات جاننے کے مدعی ہیں۔

خطیب اور واعظ حضرات سے بھی بیزار تھا۔ اس لئے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے۔ بخیلوں کا بھی دشمن تھا ان کی نسبت اس کی یہ رائے تھی کہ ظاہر میں تو ان پر زہد و قناعت کے آثار ہوتے ہیں لیکن دل میں صرف مال جمع کرنے اور دنیا کی حرص ہوتی ہے جو لوگ معابد میں جا کر عبادت کرتے ہیں۔ اور باہر نکل کر خرافات میں جاتے ہیں ان سے بھی اسے سخت نفرت تھی وہ کہتا تھا "ایسے تو بہت سے لوگ میں نے دیکھے ہیں جو مذاق اور فضولیات میں اپنا وقت ضائع کر دیتے ہیں مگر انسانی فضائل اور اخلاقی کمالات حاصل کرنے میں ایک منٹ بھی صرف نہیں کرتے"۔

ایک روز دیو جانس ایک شخص کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے روانہ ہوا اور عظیم الشان محل کی جانب جا نکلا یہ محل نہایت آراستہ اور سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا۔ اس پر سونے کا کام بھی تھا۔ جب اس نے تمام محل کی سیر کر لی اور اسے نہایت صاف و ستھرا پایا تو اپنے ساتھی کے منہ پر تھوک دیا اور کہا "مجھے تھوکنے کی ضرورت تھی معاف فرمائیے۔ آپ کے منہ سے زیادہ مجھے اس کام کے لئے کوئی میلی جگہ نظر نہ آئی۔ جہاں تھوک سکتا"

ایک روز دیو جانس ایسی جگہ جا پہنچا جہاں لڑکے کھیل رہے تھے۔ خود بھی وہیں کھڑا ہو گیا لڑکوں نے اسے گالیاں دے کر نکال دیا۔ چلا تو آیا لیکن ان سب کے نام بھی لکھ لئے تاکہ شہر میں گشت کر کے اعلان کرے۔

ایک مرتبہ لوگوں نے اس کے فقر و فاقہ پر ملامت کی اور شرم دلانی شروع کی۔ اس نے کہا فقیر ملامت کا مستحق نہیں ہے بلکہ وہ لوگ جو مالدار ہیں اور رات دن گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ اچھی چیز وہ ہے جو سستی ہو میں نے بسا اوقات سنگ مرمر کی تصویریں دیکھی ہیں جو ہزاروں روپے میں فروخت ہوتی ہیں۔ لیکن ایک من گیہوں کے مقابلے میں ان کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا جو ایک روپے میں آجاتا ہے۔

ایک روز وہ حمام میں گیا دیکھا کہ پانی بہت میلا ہے۔ حمام والے سے پوچھا "جو شخص یہاں نہاتا ہے وہ اپنا بدن کہاں جا کر پاک کرتا ہے؟"

ایک روز لوگ اسے شاہ فیلپس کے پاس پکڑ لائے فیلپس نے پوچھا "تم کون ہو؟" جواب دیا "تمہاری طرح ایک جاسوس" اس نے اس فقرے کو بہت پسند کیا اور اسے چھوڑ دیا۔

اس کا قول تھا کہ حکما کو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے تمام چیزیں ان کے قبضے میں ہیں وجہ پوچھی گئی تو بتایا کہ ہر چیز خدا کی ہے اور یہ لوگ خدا کے محبوب ہیں۔

ایک مرتبہ سکندر اس کی ملاقات کو گیا اور دیکھا کہ وہ دھوپ میں بیٹھا ہے اور اس کا صندوق بھی سامنے پڑا ہے۔ سکندر نے اس کے پاس جا کر کہا کہ میں سکندر ہوں۔ وہ بولا میں دیوجانس کتا ہوں۔ سکندر نے کہا تم مجھ سے ڈرتے نہیں ہو اس نے کہا "تم نیک ہو یا بد" اس نے جواب دیا "نیک" کہنے لگا "تو پھر نیک آدمی سے کیوں خوف کروں؟" سکندر اس جواب سے بہت خوش ہوا اور کہا کہ تم اپنی کوئی حاجت میرے سامنے پیش کرو میں پوری کروں گا۔ اس نے جواب دیا "میرے سامنے سے ہٹ جاؤ تم نے دھوپ روک لی ہے" اس نے کہا "ہم دونوں میں کون زیادہ بے پروا ہے ایک کمبل اور ایک گھڑی والا یا وہ شخص جو اپنی وسیع سلطنت اور عظیم الشان حکومت پر قانع نہیں ہے بلکہ بقیہ دنیا کو قبضے میں لانے کے درپے ہے اور مفت میں اپنی جان کو خطرات میں ڈال رہا ہے" سکندر کے رفقا بہت متعجب ہوئے خاص کر جب انہوں نے دیکھا کہ باوجود اس شخص کی بیباکی اور جراٴت کے سکندر کے دل میں کچھ اور عزت بڑھتی جا رہی ہے سکندر نے اس کو محسوس کیا اور اپنے رفقا کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ "اگر آج میں سکندر نہ ہوتا تو دیوجانس ہوتا"

دیوجانس ایک جہاز کا سفر کر رہا تھا دریائی ڈاکو آئے اور اسے پکڑ لے گئے۔ اور جزیرۂ کریٹ میں ایک غلام کی صورت سے بیچنے لگے اس نے ایک موٹے شخص کو دیکھا جو اچھی وضع اور لباس میں تھا کہنے لگا مجھے اس کے ہاتھ بیچ دو اس کو ایک معلم اور موٴدب کی ضرورت ہے اس شخص کا نام زیناڈس تھا۔ دیوجانس اس شخص کی طرف بڑھا اور کہا "بیٹے مجھے خرید لو میں تمہیں تعلیم دوں گا۔ ادب سکھاؤں گا" زیناڈس نے کہا "تم کیا جانتے ہو؟" بتایا "میں تہذیب و تربیت کے اصول سے واقف ہوں" آخر کار زیناڈس نے خرید لیا۔ جب اسے لے کر چلا تو دیوجانس نے کہا "میں تمہارا غلام تو ہو گیا ہوں مگر شرط یہ ہے کہ جو کچھ میں کہوں اس پر عمل کرنا" زیناڈس نے اسے اپنے لڑکوں کا معلم مقرر کیا دیوجانس نے بڑی کوشش سے ان کی تعلیم و تربیت کی اور انہیں شعر گوئی، حکمت، پہلوانی، شکار اور تیراندازی وغیرہ سکھائی۔ اور قناعت کرنے اور موٹا کپڑا پہننے کی ترغیب دی۔

ایک روز ایک شخص اس کے پاس آیا جو اسے آزاد کرانا چاہتا تھا۔ دیوجانس نے کہا "تمہیں نہیں معلوم کہ جو شخص شیر کو کھلاتا پلاتا ہے وہ خود شیر کا قیدی ہے شیر اس کا قیدی نہیں ہوتا"

ایک شخص نے اس سے پوچھا کہ کھانے کے لئے کونسا وقت مناسب ہے اس نے کہا "اگر تم مالدار ہو تو جب چاہو کھاؤ اور فقیر ہو تو جب مل جائے وہی وقت مناسب ہے"

اس کی عجیب عادت یہ تھی کہ بجائے سر کے پاؤں میں خوشبو لگاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا یہ کیا حرکت ہے تو جواب دیا کہ سر میں خوشبو لگانا فضول ہے کیونکہ وہ ہوا کے ساتھ پھیل کر ضائع ہو جاتی ہے اور آدمی اس سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ اگر پاؤں میں لگا لی جائے تو اس سے ہر وقت فائدہ پہنچ سکتا ہے

ایک شخص نے اس سے کہا کہ اگر میری ملاقات کو نہ آؤگے تو میں تمہیں قتل کروں گا۔ اس نے کہا یہ تو کوئی کمال کی بات نہیں ہے۔ ایک چھوٹا سا زہریلا کیڑا بھی یہ کام کر سکتا ہے۔

ایک مرتبہ اس نے دیکھا کہ حکام ایک چور کو سزا دے رہے ہیں جس نے سرکاری خزانے سے ایک برتن چرایا ہے۔ دیو جانس نے کہا "بڑے بڑے چور چھوٹے چور کو سزا دے رہے ہیں"۔ جب اسے کوئی ضرورت ہوتی اور کسی کے پاس مانگنے جاتا تو اس سے کہتا تھا کہ "تم نے مجھ سے پہلے کسی اور کو بھی دیا ہے یا نہیں۔ اگر دیا ہے تو اسی طرح مجھے بھی دو اور نہیں دیا تو مجھی کو وہ پہلا شخص قرار دو جسے تم اپنی عمر میں سب سے پہلے کچھ دینے والے ہو۔"

وہ کہا کرتا تھا کہ شہرت مصائب کی جڑ ہے۔ علما معبود کے مظاہر ہیں۔ پیٹ زندگی کا وبال ہے۔ عشق بیکاری کا شغل ہے۔ بڑھاپا اور افلاس دونوں بلا ہیں۔ اور دنیا میں سب سے بہتر چیز آزادی ہے۔

لوگوں نے اس سے پوچھا کہ لوگ اندھوں اور لنگڑوں کو دیتے ہیں اور فلاسفہ کو نہیں دیتے اس کی کیا وجہ ہے اس نے جواب دیا کہ وہ لوگ ڈرتے ہیں کہ کسی روز اندھے یا لنگڑے نہ ہو جائیں مگر فلسفی ہونے کا انہیں ذرا بھی خوف نہیں۔

ایک مرتبہ لوگوں نے اس سے کہا کہ تم ہی تو کھوٹے روپے بنایا کرتے تھے کہا جب تمہاری طرح تھا لیکن اب میں اس مرتبہ پر پہنچ گیا ہوں جسے تم عمر بھر حاصل نہیں کر سکتے۔ ایک دفعہ اس نے دیکھا کہ ایک شخص تیر چلا رہا ہے اور کبھی اس کا تیر نشانہ پر نہیں لگتا۔ دیو جانس نے جا کر اپنا سر نشانہ کی جگہ لگا دیا اور کہا کہ کہیں اور تو مجھے خوف ہے کہ تیر نہ لگ جائے لیکن یہاں تو میں اطمینان سے رہ سکتا ہوں۔

لوگوں نے اس سے کہا تم بازاروں میں کیوں کھاتے پھرتے ہو کہا جس طرح گھر میں بھوک لگتی ہے اسی طرح بازار میں بھی لگتی ہے۔ لوگوں نے کہا یہ عادت تمہاری کتوں کی طرح ہے۔ اس نے کہا کتے تم ہو جو کھانے والے کے پاس جمع ہو گئے ہو۔

وہ کہتا تھا جو لوگ وعظ اور نصیحت کرتے ہیں اور خود اس پر عمل نہیں کرتے وہ آلات موسیقی کی طرح ہیں جن سے نہایت دل خوش کن نغمات نکلتے ہیں لیکن خود وہ بے شعور اور بے حس ہیں۔

لوگوں نے اس سے کہا جب تم مرو تو کہاں دفن کریں کہا جنگل میں ڈال دینا لوگوں نے کہا درندے کھا جائیں گے۔ کہا میرے پاس ایک لکڑی رکھ دینا۔ اگر کوئی کھانے آئے گا تو بھگا دوں گا۔ لوگوں نے کہا مرنے کے بعد بھی تم ایسا کر سکو گے جواب دیا میں کچھ نہ کر سکوں گا تو مجھے کوئی تکلیف بھی نہ ہوگی پھر اس کی فکر کیا کہ میں کہاں دفن ہوں گا۔

دیو جانس کے اس قسم کے نوادر کثرت کے ساتھ منقول ہیں۔ ۹۰ سال کی عمر میں اس نے انتقال کیا۔ مشہور یہ ہے کہ جس روز سکندر کا انتقال ہوا اسی روز اس نے بھی وفات پائی۔ موت کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ گائے کا ایک پیر کچا کھا گیا اور اسے ہضم نہ ہو سکا اور مر گیا بعض کہتے ہیں خود اس نے اپنی سانس روک لی تھی۔ یونانیوں نے اس کی قبر پر ایک کتے کا مجسمہ بنا دیا تھا اور اس کی مختصر سیرت بھی قبر پر لکھ دی تھی۔

شبیر احمد (کوٹی) اومتی جبلپور

اطلاع

جن اصحاب کے چندے ختم ہو چکے ہیں براہ کرم وہ منی آرڈر کے ذریعہ سے چندہ روانہ کر دیں یا دفتر ہذا کو وی پی کرنے کا آرڈر دیں۔

رومانیہ کی ایک غیر سرکاری ڈائری

(شاہ کیرول کس طرح تخت سے دست بردار ہوئے)

سنہ ۱۹۳۹ء

۲۵ راگست۔ رومانیہ کی حکومت نے ہنگری کے ساتھ ایک معاہدہ عدم اقدام طے کرنا چاہا۔ ہنگری کی حکومت اس کے لئے تیار نہ تھی کیونکہ رومانیہ کے ایک لاکھ سپاہی اس کی سرحد پر جمع ہوگئے تھے۔

۸ رستمبر۔ سینماؤں میں جرمن وزراء کی تصویریں بتائی گئی تھیں جن پر لوگوں نے خوب شور مچایا۔ حکومت نے اس قسم کے مظاہروں کو منع کر دیا۔

۱۵ رستمبر۔ پولستان کے شکست خوردہ وزراء آنے لگے۔

۲۰ رستمبر۔ وزیراعظم کالی نسکو بخارسٹ میں قتل ہوئے۔ آئرن گارڈ کے ۲۹۲ آدمی مارے گئے اور باقی لوگ باغی قرار دئے گئے اس قتل کے لئے جرمنی نے برطانیہ کو ذمہ دار ٹھیرایا حالانکہ آئرن گارڈ کے آدمیوں نے جو نازیوں کے زیر اثر تھے اس کا ارتکاب کیا تھا۔

۷ راکتوبر۔ رومانیہ اور ہنگری اس بات پر راضی ہوگئے کہ ہر ملک اپنی اپنی سرحد سے فوجیں ہٹالے۔

۹ رنومبر۔ شاہ کیرول نے بلجیم اور ہالینڈ والی امن کی اپیل سے اتفاق کیا

۱۰ رنومبر۔ یہ اعلان ہوا کہ رومانیہ میں پولستان کے ۴۶ ہزار شہری ۲۲ ½ ہزار فوجی اور ۱ ½ افسر ہیں۔

۱۳ رنومبر۔ جرمنی سے ہر کلاڈیوس کے تحت ایک معاشی مشن بخارسٹ آیا۔ رومانیہ نے جانوروں کی برآمد بند کر دی۔

۲۲ رنومبر۔ نیشنل ایکانمی کے وزیر نے جو جرمن مشن کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا استعفیٰ دے دیا۔ کلاڈیوس کو چھوڑ کر یہ مشن جرمنی واپس ہوا اور رومانیہ نے اپنی خام پیداوار جرمنی بھجوانے کا وعدہ کیا۔

۲۳ رنومبر۔ کابینہ مستعفی ہوگئی۔ ٹاٹارسکو نے نئی حکومت بنائی۔

۷ رڈسمبر۔ رومانیہ اور جرمنی کے درمیان جو حمل و نقل ہوتی تھی، روسی پولستان میں اس پر پابندیاں عائد ہوگئیں۔

۲۱ رڈسمبر۔ جرمنی کے ساتھ ایک تجارتی راضی نامہ پر دستخط ہوئے۔ اس کے ذریعہ لیئی اور مارک میں شرح تبادلہ مقرر ہوئی۔ اور رومانیہ سامان حرب کے معاوضہ میں جرمنی کو ہر مہینہ ایک لاکھ تیس ہزار ٹن دینے پر آمادہ ہوا۔

سنہ ۱۹۴۰ء

یکم جنوری۔ شاہ کیرول نے رومانیہ کے مسلک کو واضح کیا کہ عدم اقدام پر مبنی ہوگا لیکن "اپنی ہر چیز کی رومانیہ حفاظت کرے گا"۔

۶ رجنوری۔ شاہ کیرول نے ایک تقریر میں کہا بسارے بیا رومانیہ کی ملک ہے۔ وہ اس کی حفاظت کریں گے۔

۱۸ رجنوری۔ کلاڈیوس مزید بات چیت کے لئے دوبارہ بخارسٹ آیا۔ رومانیہ کی سرحد کے قریب سوویٹ پولستان میں جرمن فوجیں بڑی تعداد میں جمع ہونے لگیں۔

۲۱ رجنوری۔ جرمنی کے لئے رومانیہ سے جو تیل جاتا ہے اسے روس نے فنستان کے لئے لے لیا۔

۲۷ رجنوری۔ رومانیہ نے برطانیہ کو سرکاری طور پر اطلاع دی کہ جرمنی کو جو تیل روانہ کیا جاتا ہے اس کی مقدار میں اضافہ نہیں کیا گیا۔

۱۰ رفروری۔ شاہی فرمان کے ذریعہ برآمد کی جانے والی اشیاء پر محصول عائد ہوا (تیل پر ۱۲ فیصد)

۲۶ رفروری۔ جرمنی کو جو اشیاء روانہ کی جاتی تھیں اور جن میں تیل بھی شامل ہے ان پر ریل کا کرایہ ۱۲ سے ۴۰ فیصد تک بڑھا دیا گیا۔

۷ر مارچ ۔ شاہ کیرول: "ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنی سرحدوں کی جن پر ہمارا تاریخی حق ہے برابر حفاظت کریں گے۔"

۱۷ر مارچ ۔ وزیر اعظم ٹاٹارسکو ایک نشری تقریر میں: "ہمارا سب سے بڑا کام اپنے حقوق کی حفاظت کرنا ہے۔ اور اس کے لئے ہم تیار ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے بادشاہ کی قیادت میں ملک اندرونی لحاظ سے کافی طاقتور ہو گیا ہے اور ہمارے خارجی مسلک کا بھی یقین ہو گیا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ہمارے لئے کوئی قربانی بھی بڑی نہ ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہماری قسمت بدل جائے لیکن ہمارے ملک کی سرحدیں نہیں بدل سکیں گی۔"

۱۸ر مارچ ۔ کلاڈیوس پھر بخارسٹ آیا۔ وزیر خارجہ گافن سو نے سینٹ میں کہا: "ہم اپنی دولت کو کسی دوسرے کی جنگی اغراض کے لئے صرف نہیں کریں گے۔"

۲۰ر مارچ ۔ نازی فلم "دوزخ کی آگ" جس میں پولستان کی تباہی بتائی گئی تھی بخارسٹ میں دکھلایا گیا۔

۲۱ر مارچ ۔ کلاڈیوس نے مزید تجارتی مراعات کا مطالبہ کیا اور حکومت کو اطلاع دی کہ رومانیہ کے تجارتی مسلک میں مسلسل تبدیلی اب جرمنی کو پسند نہیں۔

۲۳ر مارچ ۔ رائٹر کا بلقان والا نمائندہ جس نے ان مطالبات کو "ڈکٹیشن" کا نام دیا تھا، رومانیہ سے نکال دیا گیا۔

۱۴ تا ۱۹ر اپریل ۔ مدافعت اور اندرونی حفاظت کی مزید تدابیر

۲۷ر اپریل ۔ شریک جنگ ملکوں کی مطبوعات کا داخلہ بند

۳ر مئی ۔ بخارسٹ میں پانچویں کالم کے بعض افراد کا راز فاش ہو گیا۔ جنہوں نے پولستان سے آئے ہوئے پناہ گزینوں کا بھیس ڈال لیا تھا۔ بعض جرمن گرفتار بھی کئے گئے۔

۴ر مئی ۔ راتوں میں ڈینیوب کی جہازرانی بند کر دی گئی۔

۱۱ر مئی ۔ حکومت مستعفی ہو گئی۔ ٹاٹارسکو نے ایک اور حکومت بنائی جس میں وزیر خارجہ گافن سو ہی رہے۔

۲۰ر مئی ۔ تمام غیر ملکی جو پہلی دسمبر سے اب تک رومانیہ آئے اور جنہوں نے اجازت نامے حاصل نہیں کئے تھے ان کو ۳۰ر مئی تک چلے جانے کا حکم دیا گیا۔

۲۳ر مئی ۔ ۳ لاکھ محفوظ فوج بلائی گئی اور اب مسلح فوج کی تعداد ۱۲ لاکھ تک پہنچ گئی۔

۲۴ر مئی ۔ پلواسٹی پر جرمنی سے جو تیل کے خالی ڈبے آئے ان میں پانچویں کالم کے لئے آلات حرب پائے گئے۔

۱ر جون ۔ گافن سو نے استعفیٰ دیا اور اس کی جگہ گی گورٹو وزیر خارجہ بنا۔

۱۱ر جون ۔ لندن میں برطانیہ کے ساتھ ایک تجارتی معاہدے پر دستخط ہوئے۔

۲۶ر جون ۔ سویٹ حکومت نے ایک الٹی میٹم کے ذریعہ مطالبہ کیا کہ بسارے بیا اور شمالی بکووینا کے علاقے روس کو دے دئے جائیں۔ بسارے بیا پر تمام متعدد روسی طیارے پرواز کرتے رہے۔

۲۷ر جون ۔ رومانیہ نے روسی مطالبات مان لئے۔ روسی فوجوں نے دوپہر تک سرحدوں کو پار لیا۔

۲۸ر جون ۔ رات میں فوجوں کو تیار رہنے کا حکم ملا۔ گافن سو نے ایک اور حکومت بنائی۔

یکم جولائی ۔ وزیر خارجہ ارگی ٹورٹو نے موجودہ پوری صورت حال کے لحاظ سے رومانیہ کا آئندہ مسلک معین کیا اور ۱۳ر اپریل ۱۹۳۹ء کو اتحادیوں نے جو ضمانت دی تھی اسے کالعدم سمجھ لیا۔ فوجیں ہنگری کی سرحدوں پر جمع ہونے لگیں اور ہنگری نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔

۳؍ جولائی ۔ جرمن وزیر بخارسٹ آیا اور حکومت کو اطلاع دی کہ جرمنی فی الحال
رومانیہ کی فوجی امداد نہیں کر سکتا۔

۴؍ جولائی ۔ حکومت مستعفی ہو گئی۔ گی گورڈ نے نئی کابینہ بنائی جس میں مانوسکو
"آئرن گارڈ کا رکن" وزیر خارجہ بنا۔

۶؍ جولائی ۔ چالیس برطانوی باشندے جو تیل کے چشموں سے برطرف کئے
گئے استنبول روانہ ہوئے۔ وزیر اعظم گی گورڈ: "یہ بات بالکل صاف ہے
کہ اب رومانیہ کا خارجی مسلک محور کے زیر اثر ہے" اس اعلان کی
تصدیق ان کارروائیوں سے ہوئی جو یہودیوں اور دوسری
قلتوں کے خلاف اختیار کی گئیں۔

۱۰؍ جولائی ۔ میونخ میں ہنگری کے نمائندوں یعنے ٹلے کی اور چاکی نے
ہنگری کے رومانیہ پر حقوق کے بارے میں ہٹلر، ربن ٹراپ
اور سیانو کے ساتھ بات چیت کی۔ رومانیہ میں آئرن گارڈ
کا لیڈر انٹونسکو گرفتار ہوا۔

۱۷؍ جولائی ۔ بڈاپسٹ واپس ہوتے ہوئے چاکی نے کہا کہ ہنگری
کے امن پسند ارادوں سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا۔

۲۵؍ ۳۰؍ جولائی ۔ بلغاریہ کے وزیر اعظم فی لاف نے اعلان کیا کہ سالس برگ
میں اطالوی، جرمن اور بلغاری نمائندوں کے درمیان جو گفتگو
ہوئی وہ ڈینیوب کے امن کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔
رومانیہ کے اخباروں میں "سالس برگ کی آمریت" پر خوب طعن کیا۔

۲۸؍ جولائی ۔ ڈینیوب میں برطانوی جہازوں کے روک دئے جانے اور برطانوی
باشندوں کے نکال دئے جانے پر حکومت برطانیہ نے رومانیہ کے
خلاف احتجاج کیا۔ اور رومانیہ کے جہازوں کو اسکندریہ پر جبراً
گرفتار کر لیا گیا

۲۰؍ اگست ۔ کرائی ویا میں رومانیہ اور بلغاریہ کے درمیان مفاہمت کی گفتگو شروع ہوئی۔

۲۲؍ اگست ۔ کرائی ویا میں ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے جنوبی دوبروجہ
بلغاریہ کو واپس ملا اور رومانوی باشندے رومانیہ واپس آگئے۔

۲۴؍ اگست ۔ رومانیہ اور ہنگری کے درمیان بات چیت منقطع ہو گئی۔ شاہ
کیرول نے فوجوں کو جمع ہو جانے کا حکم دیا۔

۲۷؍ اگست ۔ رومانیہ کے ایک طیارے نے ہنگری کے ایک طیارے پر
"دبرک زن" کے مقام پر حملہ کیا۔

۲۹؍ اگست ۔ ربن ٹراپ اور چیانو نے ہنگری اور رومانیہ کے نمائندوں سے
بات چیت کی۔ اس گفتگو میں روس شریک نہیں تھا۔

۳۰؍ اگست ۔ ویانا میں ایک معاہدہ طے پایا جس کی رو سے "رومانیہ اور ہنگری
کی سرحدوں کا قطعی طور پر تعین ہوا۔" ہنگری کو ٹران سلوے نیا میں
۴۵ ہزار مربع میل کا رقبہ دے دیا گیا۔ یہ معاہدہ محوری ملکوں کی ایما
سے ہوا تھا اور چونکہ رومانیہ نے ان ملکوں کی بات مان لی تھی اس لئے
رومانیہ کو آئندہ کے لئے ضمانت دی گئی اب اس کے ۱۹۱۲ء
والے رقبے پر مزید دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔

۱؍ ستمبر ۔ رومانیہ کا سرکاری بیان "ویانا کی کانفرنس کچھ ایسے حالات میں منعقد
ہوئی کہ رومانیہ کو ناگزیر طور پر اپنے علاقے کی قربانی کرنی پڑی کیونکہ
اس وقت رومانیہ کی زندگی اور موت کا مسئلہ درپیش تھا اور وہ اپنے کو
دشمنوں سے گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جو نقصان ہم کو برداشت کرنا پڑا وہ
بہت تکلیف دہ ہے لیکن بہرحال ہماری حفاظت کی جو ضمانت ملی ہے
وہ ہماری قربانی کا بدلہ سمجھی جا سکتی ہے"

۴؍ ستمبر ۔ بخارسٹ کی اطلاعوں سے معلوم ہوا کہ جنوبی بکووینا اور سویٹ رومانوی
سرحدوں کی حفاظت نا تسی فوج کرے گی۔

۵؍ ستمبر ۔ شاہ کیرول نے رومانیہ کے دستور کو منسوخ کر دیا۔ پارلیمان برخواست کر دی اور رومانیہ
کے "طاقت ور انسان" جنرل انٹونسکو کو تمام قسم کے اختیارات دے دیئے

۶؍ ستمبر ۔ شاہ کیرول اپنے ولی عہد شہزادہ مائیکل کے حق میں تخت سے دست بردار ہو گئے اور
سوئٹزرستان کی راہ لی۔ جنرل انٹونسکو نے اعلان کیا کہ رومانیہ اور محوری ملکوں کے
تعلقات بہت استوار رہیں گے۔ (مش)

نازیوں کو تیل کی ضرورت

ہر سال جرمنی کو (بشمول آسٹریا، چکوسلواکیہ اور نازی پولستان) تقریباً ۸۰ لاکھ ٹن تیل کی ضرورت ہے۔ فرانس ۷۰ لاکھ، اطالیہ ۳۵ لاکھ، رومانیہ ۱۹ لاکھ، ہالینڈ ۱۲ لاکھ، ڈنمارک ۹ لاکھ، بلجیم ۷ لاکھ، ناروے ۶ لاکھ، سوئٹزرلینڈ ۵ لاکھ اور ہنگری اور یوگوسلاویہ ۵ لاکھ ٹن تیل خرچ کرتے ہیں۔ گویا ان تمام ملکوں کے لئے مجموعی طور پر ہر سال دو کروڑ ۶۵ لاکھ ٹن تیل درکار ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ان ملکوں میں اتنا تیل پیدا نہیں ہوتا اور اس کے لئے یورپ کو زیادہ تر باہر سے درآمد کرنی پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خود جرمنی میں تیل کی کافی مقدار پیدا ہوتی ہے لیکن یہ مقدار کسی صورت میں ۵۰ لاکھ ٹن سالانہ سے زیادہ نہیں اور فی الحال اس میں کسی اضافہ کی بھی توقع نہیں۔ البتہ رومانیہ یورپ کا واحد ملک ہے جہاں سب سے زیادہ تیل پیدا ہوتا ہے چنانچہ یہاں ہر سال ۶۰ لاکھ ٹن تیل نکالا جاتا ہے۔ اب تک تو رومانیہ اپنے تیل کی برآمد سمندری راستوں سے کرتا رہا مگر اب سمندری راستے اتنے محفوظ نہیں رہے کہ رومانیہ کے تیل کی معتدبہ مقدار جرمنی اور اٹلی تک پہنچ سکے گو اب رومانیہ کے نازی اثر میں آجانے کی وجہ سے اس بات کا امکان ہے کہ رومانیہ کے پورے تیل کو جرمنی کی طرف لے جانے کی کوشش کی جائے۔ رومانیہ کے علاوہ نازیوں کو البانیہ، فرانس اور ہنگری سے بھی تیل مل سکتا ہے لیکن ان ملکوں کی مجموعی پیداوار ۱۰ لاکھ ٹن سے زیادہ نہیں

بہرحال بہتر سے بہتر حالات میں نازیوں کو ہر سال ایک کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن سے زیادہ تیل نہیں مل سکتا۔ لیکن بعض اوقات جرمنی نے اور ذرائع سے بھی تیل حاصل کیا ہے چنانچہ جو غیر جانب دار یورپی ملک باہر سے تیل منگواتے تھے اس کی کچھ مقدار نازیوں کے ہتھے بھی چڑھ گئی۔ مثلاً اسی سال کے ابتدائی پانچ مہینوں میں ممالک متحدہ امریکہ نے ۳۸ ½ لاکھ ٹن تیل اسپین کو بھجوایا تھا اور اس کی کچھ مقدار نازیوں تک بھی پہنچ گئی۔ لیکن چونکہ اگست کے مہینے سے برطانیہ نے جرمنی کے ساتھ اور ملکوں کو بھی جو نازی اثر میں ہیں، اپنے محاصرے میں شامل کرلیا ہے اس لئے اب غیر یورپی ملکوں کے راستے کسی قسم کی امداد جرمنی تک نہیں پہنچ سکے گی۔ اب رہا روس جو ۳ کروڑ ٹن تیل پیدا کرتا ہے تو یہ مقدار خود روس کے لئے مشکل سے کافی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ وہ کسی دوسرے ملک کو اپنا تیل نہیں دے سکتا۔ تیل کی اس محدود فراہمی کے ساتھ ساتھ جرمنی کو اور بھی دقتوں کا سامنا ہے کیونکہ شاہی ہوائیہ عرصے سے جرمنی کے تیل کے ذخیروں اور اس سے متعلق مشنری کو تباہ کرنے کی کوشش میں ہے اور اسے بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جرمنی میں نئے تیل کی فراہمی مشکل ہوگئی ہے اور پرانے تیل کا ذخیرہ بھی ختم ہو رہا ہے۔

اسی موقع پر مشرق قریب میں اطالیہ کی مہم پر بھی غور کیا جانا چاہئے۔ بات یہ ہے کہ عراق ۴۰ لاکھ ٹن تیل پیدا کرتا ہے جو ایک پائپ لائن کے ذریعہ شام اور فلسطین کے رستے بحر روم کے ساحلوں تک پہنچتا ہے اور ایران میں ایک کروڑ ٹن سے زیادہ تیل نکلتا ہے۔ اگر ان دونوں ذرائع پر قابو حاصل کرلیا جائے تو ظاہر ہے کہ نازیوں کی مشکلیں آسان ہو جائیں گی چنانچہ اطالیہ نے مشرق قریب میں جو مہم شروع کی ہے اس کی صریح وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ جرمنی تک تیل پہنچایا جا سکے۔ تیل کے ان ذخیروں تک درِ دانیال کے راستے تو رسائی نہیں ہو سکتی کیونکہ ترکی اور روس کے ساتھ مڈبھیڑ ہو جانے کا اندیشہ ہے اسی لئے اطالیہ نے بحیرۂ قلزم اور سوئز پر قبضہ جمانے کی فکر کی ہے لیکن یہ راستے بھی آسانی کے ساتھ اختیار نہیں کئے جا سکتے کیونکہ یہاں اب تک برطانوی بحریہ چھایا ہوا ہے۔ اگر کسی طرح عراق کے ذخیرے تک اطالویوں کی رسائی ہو بھی جائے تو نازی اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے کیونکہ پہلے تو تیل کے اس ذخیرے کو آسانی کے ساتھ تباہ کیا جا سکے گا اور پھر پائپ لائن بھی بہت جلد توڑ دی جائے گی۔

(ا۔ م)

حالات حاضرہ

ہندوستانیوں کی غذا۔ کونور کے تجربے کونور میں مسئلہ تغذیہ سے متعلق جو انجمن قائم ہے اس کو اب تک ہندوستانی ریسرچ فنڈ اسوسی ایشن کی مالی امداد حاصل رہی ہے۔ نیز بعض خیر خواہوں کے عطایا اور چندوں سے بھی اس کے کام میں بڑی مدد ملتی رہی اس سلسلے میں راجہ صاحب پارلک میڈی کا ایک لاکھ روپیہ کا عطیہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جو انہوں نے سنہ ۱۹۲۶ء میں انجمن کو دیا تھا۔ اس انجمن نے کرنل مک کیاریسن کے تحت جو کونور کے تجربہ خانوں کے پہلے ناظم ہیں، غذاؤں پر بہت سی تحقیقات کیں اور ہندوستانیوں کے لئے بڑا کارآمد مواد فراہم کیا۔

پہلے پانچ سال کے عرصے میں غذاؤں کے امتحان اور تجزیہ پر بڑی توجہ کی گئی ہے چنانچہ ہندوستان کے مختلف مقامات پر کوئی ساٹھ امتحان اس سلسلے میں کئے گئے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی غذاؤں کی خرابیاں معلوم کی جائیں اور بہتر غذاؤں کی سفارش کی جائے۔ اس انجمن نے محکمہ زراعت کے تمام شعبوں کو بھی اپنی مفید رپورٹ کے نسخے روانہ کئے ہیں تاکہ کاشتکاروں اور عوام کو اس سے فائدہ پہنچے۔

ہندوستان کی کیمیاوی دوائیں ہندوستانی کارخانوں میں اب پہلی مرتبہ کلوروفارم، کلیسم لیاک ٹیٹ اور کاربالک ترشہ تیار کیا گیا ہے جس کے نمونے محکمہ میڈیکل اسٹورز میں امتحان کی غرض سے روانہ کئے گئے اور کاربالک اور کرسلک ترشے تو بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ ایک بنگالی کارخانے نے کلوروفارم تیار کیا ہے اور کلکتے میں اس کا امتحان کیا جا رہا ہے۔ ایک اور بنگالی کارخانے نے ان دیس بھٹک ریتھر بھی تیار کیا ہے جو کافی اچھا ثابت ہوا۔ ایک ہندوستانی کارخانہ ایسا ہے جو ہر مہینے دس ٹن کے حساب سے گلیشل ایسٹک ترشہ تیار کر رہا ہے اور ضرورت پڑے تو کارخانہ اسی مشنری سے ماہانہ ۳۰ ٹن ترشہ بھی تیار کر سکتا ہے۔ اس کارخانے میں ایک سال کی ضرورت کے موافق خام اشیاء بھی کافی مقدار میں موجود ہیں۔

مشرق کی جنگی امداد دلی میں مشرقی ملکوں کی ایک کانفرنس اکتوبر کے مہینے میں ہو رہی ہے جس میں جنگی ضروریات سے متعلق عام پیداوار کی فراہمی کا باضابطہ انتظام کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ منسٹری آف سپلائی مشن کا بھی کام ہوگا جس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں ملکی دفاع اور برطانیہ کی جنگی امداد کے سلسلے میں بڑے پیمانے اور زیادہ منظم طور پر سہولتیں فراہم کی جائیں اور خصوصاً مشرق قریب اور مشرقی سوئز کے لئے فوجوں کی فراہمی ہو۔ مجلس اقوام کے مشہور ادارے انٹرنیشنل لیبر آفس نے ہندوستان کو دنیا کے بارہ بڑے صنعتی ملکوں کا ایک رکن تسلیم کیا تھا اور اب اس ملک سے جتنی ہو سکے صنعتی امداد حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا گیا ہے۔ سپلائی مشن کو جو پانچ یا چھ اراکین پر مشتمل ہے اور جس کے صدر سر الگزنڈر راجر ہیں، تقریباً پندرہ فنی مشیروں کا تعاون بھی حاصل رہیگا یہ مشن پورے ہندوستان کا دورہ کر کے تمام ہندوستانی کارخانوں کا معائنہ کرے گا اور حکومت برطانیہ اور حکومت ہند کو مشورہ دیگا کہ کس طرح صنعتی پیداوار کو بہتر طریقے پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس مشن کو منسٹری آف سپلائی نے مقرر کیا ہے۔

ایسٹرن گروپ کی اس کانفرنس میں جسے سپلائی مشن کی امداد بھی حاصل رہے گی آسٹریلیا، نیوزیلینڈ، جنوبی افریقہ، جنوبی رھوڈیشیا، برما، ہانگ کانگ، لنکا، ملایا وغیرہ کے نمائندے شرکت کریں گے۔ ان کے ساتھ ہندوستانی نمائندے بھی شریک رہیں گے۔ اس کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مشرق کے یہ تمام ملک جنگی امداد میں منظم طور پر مل کر حصہ لیں۔

لبنسرام۔ چند روز ہوئے مسٹر ای۔ جے۔ بنگ نے مدراس سے ایک نشری تقریر کے دوران میں کہا کہ برطانیہ پر محاصرے کا الزام جرمن پروپگنڈے سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہیں رکھتا اصل میں جرمنی جغرافی لحاظ سے خود محصور ہے اور اس کی یہی حالت رہیگی تاوقتیکہ وہ پورے یورپ پر قابض نہ ہو جائے۔" سنہ ۱۹۱۴ء سے پہلے کسی وقت جرمنی کا محاصرہ کیا گیا یا نہیں اس کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے اور اگر سنہ ۱۹۱۹ء کے بعد جرمنی کا محاصرہ ہوا تو اس سے فرانس کے مسلک پر روشنی پڑتی ہے اور اس کے نتیجہ کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محاصرہ بالکل بے اثر رہا۔ اب رہی یہ بات کہ آیا سنہ ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے جرمنی کو محصور کرنے کی کوشش کی تو اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ مگر اسے جرمنی کے لبنسرام کا نتیجہ سمجھنا چاہئے۔ جرمنی ایک عرصے سے اپنے علاقے کی توسیع کا خواہاں رہا ہے تاکہ اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے زیادہ جگہ میسر آسکے۔ اس طرح کی خواہش دوسرے ملکوں اور قوموں کو بھی ہو سکتی ہے۔ پولستان اور چکوسلواکیا کے باشندے بھی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھئے تو لبنسرام کے معنی ایک نئے نظام عالم کے ہیں۔ جرمنی کے اس مطالبے کے صریح معنی یہ ہیں کہ نازیوں کے سوا دنیا کی کسی دوسری قوم کو آزاد رہنے کا حق نہیں۔ ۔ ۔ ۔"

جاپان اور محور کا معاہدہ۔ چندی روز ہوئے برلن میں جرمنی، اطالیہ اور جاپان کے درمیان دس سال کے لئے ایک فوجی، سیاسی اور معاشی معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے میں جاپان نے یورپ میں جرمنی اور اطالیہ کی قیادت تسلیم کرلی اور ادھر جرمنی اور اطالیہ نے مشرق میں جاپان کے اقتدار کو تسلیم کر لیا۔

پروفیسر لاسکی اور ہندوستان۔ "ڈیلی ہیرالڈ" کی ایک حالیہ ۔ ۔ ۔ ۔ اشاعت میں پروفیسر ہیرلڈ لاسکی نے ہندوستان کی موجودہ سیاسی پیچیدگی سے متعلق ایک مضمون لکھا ہے اس میں موجودہ کابینہ کے لیبر ممبروں پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور پچھلے ستمبر سے ہندوستان کے متعلق برطانیہ کا جو طرز عمل رہا ہے اس کی مخالفت کی ہے۔ ان کو توقع ہے کہ آزاد ہندوستان جنگ میں برطانیہ کی جو مدد کر سکے گا وہ بہت زیادہ قیمتی ہوگی۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ مسٹر ایمری کے اعلان کو آخری اور قطعی نہیں سمجھنا چاہئے، وہ آئندہ کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کرتے ہیں۔ "ہم کو چاہئے کہ پورے ہندوستان کی ایک کابینہ بنائیں جو مقننہ کے سامنے ذمہ دار ہو اور جس کے فرائض بالکل عاملہ کے ہوں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح برطانوی کابینہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس کابینہ کے دو اہم کام ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ وہ برطانیہ کی جنگی امداد میں خوب دل کھول کر حصہ لے اور دوسرے یہ کہ نیا دستور بنانے کے لئے ایک دستوری کنونشن کا قیام عمل میں لائے یا پھر برطانیہ کے ساتھ اس معاملہ میں بات چیت کر سکے۔"

"اس دستوری کنونشن کے لئے ہر صوبے کی مقننہ سے نمایندوں کا انتخاب ہونا چاہئے۔ اور اگر ضرورت پڑے تو اس کے لئے صوبوں میں نیا انتخاب بھی ہو سکتا ہے۔ اگر مسلمان اور اچھوت ہندوؤں کے ساتھ سمجھوتہ نہیں کر سکتے تو ایسی صورت میں بہتر یہی ہے کہ وہ کسی تیسری آزاد شخصیت مثلاً ممالک متحدہ کے صدر کو اپنا ثالث بنائیں اور اس کا جو بھی فیصلہ ہو اس پر پابند ہو جائیں اگر ہندوستانی ایسا کر سکیں تو ہم کو چاہئے کہ جنگ ختم ہونے کے ۱۲ مہینے کے اندر پارلیمنٹ کے ذریعہ ایک نیا دستور منظور کریں۔"

بلقان کی صورت حال۔ رومانیہ کی سیاست نے جو پلٹا

کھایا ہے اس کے بعد کے حالات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر اور مسولینی بلقان میں اپنا اثر بڑھانے کی برابر کوشش کر رہے ہیں چنانچہ رومانیہ کو ختم کرنے کے بعد بلغاریہ میں نازیوں کی ہلچل اسی بات کا ثبوت ہے۔ لیکن یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ بلقان کی سب سے اہم مملکت یعنے ترکی اب ہر بیرونی حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے اور اس نے اعلان بھی کر دیا ہے کہ اگر نازیوں نے ترکی کا رخ کیا تو ان کی ہر قسم کی پیش قدمی کو قوت کے زور سے روک دیا جائے گا۔ ترکی اور یونان کے درمیان ان کی جغرافی نزاکت کے پیش نظر حال میں بات چیت بھی ہوتی رہی ہے۔ بعض معتبر حلقوں کا یہ بھی خیال ہے کہ ترکی اور یونان کے مابین فوجی اتحاد کا ایک معاہدہ طے پا جائے گا۔
جنوب مشرقی یورپ میں حالات کچھ ایسے تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں کہ اس کے متعلق کسی قسم کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ہٹلر کے لئے بلقان میں اور آگے بڑھنا دشوار ہے کیونکہ اب اسے ایسی مزاحمت کا سامنا کرنا ہوگا، جس کا اسے یورپ کے اس گوشے میں اب تک تجربہ نہیں ہوا۔

جاپان اور برما کی سڑک ۔ اکتوبر کے تیسرے ہفتے میں برما کی سڑک کھول دی گئی اور ظاہر ہے کہ اس کے بہت دور رس نتائج نکلیں گے۔ سب سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سڑک کے کھل جانے سے چین کو امریکہ سے قرضے وغیرہ حاصل کرنے میں سہولت ہوگئی ہے۔ دوسرے یہ کہ حکومت ہند نے جاپان کو ہندوستان سے غیر خالص لوہا حاصل کرنے کا جو اجازت نامہ دیا تھا وہ کالعدم ہوگیا۔ چونکہ چین کے دوسرے تمام راستے یکے بعد دیگرے بند ہوگئے تھے اس لئے اب ۷۲۶ میل کی یہ سڑک چین کے لئے ایک نعمت ثابت ہوگی کیونکہ دنیا کے دوسرے ملکوں سے لین دین کرنے اور راہ و رسم بڑھانے کے لئے اسے پھر ایک اچھا راستہ مل گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ جاپان کو کسی طرح پسند نہیں ہو سکتا۔ جاپان نے اپنا غصہ یوں ظاہر کیا کہ اس سڑک پر خوب بم باری کی۔ لیکن سڑک پر بم برسانے کا اثر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہو سکتا کہ چند گھنٹوں کے لئے آمد و رفت روک دی جائے اور اس سے بڑھ کر جاپان کو کچھ اور شرارت کرنے کی ہمت بھی نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی قسم کی ہلچل کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ ایک طرف برطانیہ اور امریکہ کو اپنا دشمن بنالے گا اور دوسری طرف روس بھی اس کے لئے کچھ کم خطرناک ثابت نہ ہوگا۔

(حفیظ صدیقی)

بچوں سے

گزشتہ مہینے کے سب رس میں اور مقامی اخبارات میں اردو امتحانات کا نتیجہ شایع ہوا تھا جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان امتحانوں میں کافی تعداد میں امیدواروں نے شرکت کی غالباً یہ امتحانات دوبارہ اگست ۱۹۴۱ء میں ہوں گے تاریخ کا اعلان متعاقب کیا جائے گا۔ ان امتحانات کے اسناد عنقریب تقسیم کئے جائیں گے۔ اسی موقع پر ہم نے یہ انتظام کیا ہے کہ شعبۂ طلبہ کی جانب سے جو تقریری مقابلہ منعقد ہوا تھا اس کے انعامات بھی تقسیم کئے جائیں۔

اس کے بعد جنوری میں شعبہ طلبہ ۱۹۴۱ء کی مجلس انتظامی کے انتخابات عمل میں آئیں گے۔ اسی لئے جلد از جلد رکن بنتے اور بناتے جائیں تاکہ آپ کو بھی بحیثیت رکن انتخاب کے لئے رائے دینے کا حق حاصل رہے آپ خود بھی مجلس کی رکنیت کے لئے کھڑے ہوسکیں۔ دستورالعمل دفتر ادارہ سے حاصل کرسکتے ہیں۔

اس سے پہلے یہ اعلان کیا گیا تھا کہ آپ سب ایک مضمون "محسنین اردو" لکھ بھیجیں جن کا مضمون سب سے اچھا رہے گا انھیں انعام دیا جائے گا۔ چنانچہ بہت سے مضامین وصول ہوئے۔ جس میں عبدالحمید (کولا پوری) کا مضمون انعام کے قابل ہے وہ مرزا محمد انور صاحب کی بھیجی ہوئی کتاب "محسنین" دفتر سے حاصل کریں۔

مرزا محمد انور صاحب نے لکھا ہے کہ وہ مضامین پر انعامات دینے سلسلہ قایم رکھیں گے اس کے لئے ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کہ آپ سب ان کے انعامات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

خوشی کی بات ہے کہ اس مہینے میں دیوالی بھی ہے اور عیدالفطر بھی، ہم سب رسی بہنوں اور بھائیوں کو مبارک باد دیتے ہیں۔ اس پرچہ میں ہر دو سے متعلق مضمون چھپ رہے ہیں۔ راجہ جیتندر پرشاد صاحب جوہر نے ایک اچھا مضمون "پریم کی دیوالی" لکھا ہے۔ آپ کو اردو سے بڑی محبت ہے۔ سب رس کے لئے آپ اکثر مضامین بھیجتے رہتے ہیں۔ ایک اور سب رسی بھائی کی نظم عید سے متعلق چھپ رہی ہے۔

ہمارے فائیل میں بہت سے مضامین اور نظمیں ہیں۔ اس مرتبہ ہم نے ان سب کو پڑھ کر دیکھا۔ جو نا قابل اشاعت مضامین اور نظمیں نکلیں ان کی فہرست اس پرچہ میں شایع ہو رہی ہے۔ بقیہ کی فہرست آیندہ پرچے میں شایع ہوگی۔ بھائی بہنیں ٹکٹ بھیج کر اپنے مضامین حاصل کر لے سکتے ہیں ورنہ وہ ضایع کر دیے جائیں گے۔

معین الدین احمد انصاری

بڑے گھر کی شادی

شادی کے معنی خوشی کے ہیں خواہ وہ خوشی کسی قسم کی ہو۔ مگر ہمارے ہاں یہ لفظ عموماً بیاہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور اسی خوشی پر ہماری زندگیوں کی خوشی کا انحصار ہے۔ اگلے زمانے میں یہ ہوتا کہ دلہا دلہن کے خانگی حالات، ان کا چلن ان کی تعلیم، ان کے خیالات ان کے عادات غرض ان کی ہر بات پر کامل غور کیا جاتا اور ہر چیز میں موافقت ڈھونڈھی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ خود دلہا دلہن کو اختیار رہتا کہ چاہیں منظور کریں اور چاہیں منظور نہ کریں۔ اگر وہ انکار کر دیتے تو ہرگز والدین کو رنج و ملال نہ ہوتا۔ جب سب طے ہو لیتا تو عام محفل میں شرعی احکام انھیں سنا دئے جاتے اور علی الاعلان طرفین سے ان کی پابندی کا وعدہ لے لیا جاتا۔ تاکہ ایک دوسرے کے حقوق بے وجہ پامال نہ کئے جائیں۔ غیرت و حمیت وعدہ خلافی کے مانع ہے۔ اسلام میں مہر اس وجہ سے مقرر نہیں کیا جاتا تھا کہ ایک اجنبی لڑکی کی جان، مال، آزادی شوہر کے ہاتھ بک جائے بلکہ اس کی آیندہ زندگی کے لئے اس بہانے کچھ سرمایہ جمع ہو جائے۔

یہی وہ عمدہ اصول اور اعلیٰ خیالات ہیں، جو میاں بیوی میں روز افزوں محبت اور اتحاد پیدا کرتے ہیں۔ اور یہی شادی کا بہترین مقصد اور نتیجہ ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ آج کل ہم میں کس طور کی شادی ہوا کرتی ہے اور اس کا ہمارے اخلاق و تہذیب پر کیا اثر پڑ رہا ہے۔

کیا دکن کیا ہندوستان، ہر جگہ مسلمانوں کی شادی کا ایک عجیب ڈھنگ ہے۔ غیر قوموں کے بہت سے غیر ضروری رسم و رواج مسلمانوں میں داخل ہو گئے ہیں جن کے بغیر کوئی شادی شادی نہیں ہو سکتی۔

غریبوں کے ہاں اتنا پیسہ ہی کہاں جو ان رسموں کو پورا کر سکیں۔ دل کی تمنائیں دل ہی میں رہ جاتی ہیں۔ مگر اس سے یہ ہوتا ہے کہ مفلسی زنجیر پا بن کر افلاس و فلاکت کے راستہ میں قدم روک لیتی ہے۔

البتہ امیروں کے ہاں کی شادی قابل دید و قابل ذکر ہے۔ ماں باپ کا چشم و چراغ جہاں چار پانچ برس کا ہوا فکر دامنگیر ہوئی۔ چوطرف خیالات دوڑنے لگے۔ بے جا عداوت اور ذاتی خصومت نے بہت سے شریف گھروں کے دروازے بند کر دیئے اور حرص نے دولت و ثروت کا لالچ بتا کر آنکھوں پر ایسا پردہ ڈالا کہ شریف و رذیل اور اچھے اور برے کی پہچان نہ رہی۔ کمسنی ہی میں دو معصوموں کی آیندہ زندگی کا فیصلہ ہو گیا۔ کم سن بچے سن شعور کو پہنچنے تک سب باتوں سے بے خبر رہے اور جب ہوش سنبھالا تو آنکھ کھلی کہ ان کی آزادی، ان کی مسرت، ان کی خوشی کا فیصلہ ہمیشہ کے لئے ہو چکا ہے۔ اور وہ بھی ایسا کہ اگر ذرا بھی

انکار اور ناراضگی کا اظہار ہو تو نافرمان، گستاخ، شوخ اور بے ادب کے معزز خطابوں کے علاوہ رہی سہی امیدوں کا بھی خون ہو جائے۔

نوجوان کی جان عذاب میں پڑگئی کہ کیا کیا جائے۔ تعلیم بالکل الگ، خیالات بالکل مخالف اور طبیعتیں بالکل متضاد۔ انکار ممکن نہیں۔ بڑوں کی ٹھیرائی ہوئی بات میں ناراضگی کیسی۔ نہ آنکھ سے دیکھا نہ کان سے سنا۔ کچھ ہی ہو کرنا ہی پڑے گی اور اگر بعد کو معدہ ہضم نہ کرے تو پھر کسی دوا کی تلاش کرلینا۔ ماں باپ کی تجویز نہیں قضا و قدر کا قطعی حکم ہوگیا۔

مگر جو لوگ عقل سلیم رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ اس ایک انتخاب کا سلب کرلینا کس قدر مضرت رساں ہے۔ بہت سی کمینہ حرکات اور ناجائز افعال کا ارتکاب محض اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ انھیں آپ اپنا انتخاب کرلے کا مجاز کرنا تو کجا ان سے صلاح و مشورہ تک نہیں لیا جاتا۔ اور پھر طرہ یہ کہ ماں باپ کو دعویٰ بھی ہے کہ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اپنی اولاد کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھ کر کرتے ہیں۔

غرض جس دن کا ماں باپ کو مدت سے انتظار تھا وہ قریب ہوتا گیا۔ برسوں سے مہینوں کی نوبت آئی۔ یہاں تک کہ بیاہ کا دن تاریخ مقرر ہوگئی۔ شادیانے بجنے لگے۔ رسمیں شروع ہوگئیں ساہوکاروں کی مراد برآئی۔ مکان رہن، زیور گرو، گوّیے گا رہے ہیں، طوائفیں ناچ رہی ہیں۔

غرض منجے ساچق وغیرہ اور دنیا بھر کی رسمیں ادا کی گئیں۔ خوشامدیوں نے تعریفوں کے پل باندھنے لگے۔ پھر کیا تھا کچھ تو آبائی اعزاز کا خیال، کچھ ناموری کی ہوس، کچھ سخاوت کی داد۔ سب نے مل کر کچھ ایسی پٹی پڑھائی کہ ارادہ کرلیا کہ جہاں تک ہو سکے ایک بھی رسم نہ چھوٹنے پائے اور معلوم ہوجائے کہ ہم بھی ان کے ہم پلہ ہیں بلکہ کچھ زیادہ۔

افسوس! انھیں یہ نہیں سوجھا کہ چار دن کے بعد زیور بک جائیگا، معاش بند ہوجائے گی اور گھر چھن جائے گا زندگی تلخ اور جینا محال ہوجائے گا۔ اور کوئی ایک بھی نہ ہوگا کہ ان کے افلاس و تباہی پر ہمدردی کے دو آنسو بہائے۔

مگر انھیں اتنی مہلت کہاں کہ ان باتوں کو سوچیں۔ کل کا دن عقد کا ہے۔ صبح سویرے کوئی چھ بجے سواری بڑے تکلف سے نکلی۔ کئی دنوں کے تھکے ماندے نیند سے چونک اٹھے۔ اور چھوٹے بچے باجوں کی دہشت ناک آواز سے خوف زدہ ہوکر ماؤں کے سینوں سے چمٹ گئے۔ دولہا گلی کوچوں سے ہوکر شاہ راہ پر پہنچا اور شہر کی گشت لگاتے ہوئے دلہن کے مکان پر آموجود ہوا۔ سالے جو پہلے سے منتظر تھے انھوں نے فوراً کواڑ بند کرلئے۔ فقرے کسے جانے لگے۔ ذلیل اور ناشائستہ الفاظ زبان پر آ آکر مزا دینے لگے۔ بڑے بوڑھے سب کھڑے سن رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔

افسوس کہ ایسی ایسی فضول رسمیں جب ہماری تفریح اور دلگی ٹھیریں تو ہمارے اخلاق نہ بگڑیں تو کیا ہوں۔

غرض بڑے جھگڑے کے بعد روپے گن دیئے اور سالے نے دروازہ کھولا۔ دولہا اندر داخل ہوا اور مسند پر بڑی شان وشوکت سے جلوہ افروز ہوا۔ قدرتی حسن کو تصنع کے بیدرد ہاتھوں نے ایسا بگاڑا کہ خدا کی پناہ۔ زرق برق شیروانی، سرپر دستار وطرہ۔ زرین جوتا، غرض ان سب چیزوں نے دولھے کی ہئیت بگاڑ دی، مگر اس صرفِ کثیر اور بے لذت گناہ پر بھی وہ انتہا درجہ خوش ہیں اور ہر ایک کی پُرشوق نگاہیں دولھے پر گڑی ہوئی ہیں۔ اب قاضی صاحب کے آنے کی دیر ہے تو وہ آتے آتے آخر بڑی دیر میں تشریف لائے۔ اور اپنے ساتھ دوچار طفیلی بھی لائے مہر کا مسئلہ پیش ہوا۔ دل میں تو سب کچھ منظور مگر منہ پر انکار کہ اس قدر نہ ہوگا اور اُدھر سے اصرار کہ اس سے کم کیا ہو۔ بناوٹی غصہ، تو تو میں میں۔ جب دونوں تھک گئے تو خود بخود تصفیہ ہوگیا۔ دولھے نے دستخط کر دیئے اور جو سچ پوچھو تو ایک کوڑی بھی دینے کا ارادہ نہیں۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے نکاح باندھا اور بادام مصری کی بارش شروع ہوئی۔ اس وقت کا سماں بھی قابلِ دید ہوتا ہے۔ بوڑھے بچے بن جاتے ہیں اور نہایت بے تکلفی سے بادام مصری لوٹتے ہیں۔ نہ خود داری کا پاس اور نہ چھوٹوں کا خیال۔ ایک طوفانِ بدتمیزی برپا ہوجاتا ہے۔ کھانے دانے کے بعد جس پر بے دریغ روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے .... اور دوسری فضول رسمیں بھی ادا کی جاتی ہیں کہ جن کا سلسلہ ہی ختم نہیں ہوتا اور تب کہیں جاکر اس شادی خانہ آبادی کی نہیں بلکہ خانہ بربادی کی تکمیل ہوتی ہے۔

—— نہیں معلوم ہم کب بیدار ہوں گے۔

آصف احمد (عثمانیہ)

پریم کی دیوالی

"امّی امّی کدھر ہو کہاں گئیں" کہتی ہوئی پریم ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرنے لگی۔

موہنی۔ پریم ادھر آؤ میں یہاں ہوں کیا کہنا چاہتی ہو، کیوں اسکول نہیں گئیں؟

پریم۔ امّی آج تو اتوار کی چھٹی ہے۔ بھجو امّی تم ہر سال پٹاخے لاکر دیتی ہو نا۔

موہنی۔ ہاں بٹیا وہ دیوالی کے روز لایا کرتے ہیں۔ پریم اچھا تو بتاؤ دیوالی کب ہے۔ مجھے ابھی بولو۔

موہنی۔ نہیں اچھی بٹیا ہوکر ایسی ضد نہیں کرتے دیوالی تو آنے ہی والی ہے اس مرتبہ تم کو زیادہ پٹاخے لاکر دوں گی۔ پریم کے چہرے پر کچھ خوشی تھی اور کچھ ناراضگی۔ باہر چلی گئی دیوالی کا دن آیا۔ پریم کو اس دن بھی چھٹی تھی۔ صبح اٹھی اور جلد جلد امّی کے پاس پہنچی پھر کہا "میری اچھی امی بتاؤ آج تو دیوالی کا دن ہے پٹاخے کہاں ہیں"۔ موہنی نے کہا "ہاں آج دیوالی کا دن ہے تو تمھارے لئے پٹاخے لے آئی ہوں انھیں جلاؤ اور خوب جلاؤ۔ رات کو جلانا بڑا لطف دیگا اگر ان کو دن میں جلاؤ تو سارا لطف جاتا رہیگا"۔ پریم نے جواب میں تو اچھا کہا مگر دل نہ مانتا تھا۔ آدھے سے زیادہ تو دن میں ہی جلادئے اور تھوڑے سے رات کے لئے رکھ چھوڑے۔ جب رات آئی تو پریم کے گھر میں بجلی کی روشنی کی گئی تھی اور اس کے گھروندے میں نئی نئی گڑیاں اور کھلونے سجائے گئے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا ہوگیا۔ پریم اپنے بچے ہوئے پٹاخے جلانے لگی۔ بچی تو تھی ہی وہ جلاتے جلاتے ایسی خوشی میں آگئی کہ اپنے آپ کی خبر نہ رہی۔ ایک پٹاخہ اپنے ہاتھ میں ہی جلادیا اور اس کی چنگاری سے کپڑے جلنے لگے۔ موہنی نے جب پریم کو اس حالت میں دیکھا تو "ہائے کیا کروں، لٹ گئی، برباد ہوگئی" کہتی ہوئی اس کے پاس آئی، پریم بے ہوش ہوگئی تھی۔ موہنی نے اور آدمیوں کو بھی بلایا۔ آگ بجھائی گئی۔ پھر اس کو ہسپتال...... لے گئے۔ کئی دن تک پریم کو وہاں پر ہی رکھا گیا۔ جب وہ پوری طرح سے اچھی ہوگئی تو اس کو گھر لایا گیا۔ اسی طرح سال بھر گزر گیا۔ پھر دیوالی آئی موہنی نے پیار سے پریم کو بلایا اور کہا پریم اس مرتبہ پٹاخے نہ جلاؤ گی؟

پریم۔ امّی کیا میں وہ دن بھول سکتی ہوں جب کہ میں پٹاخوں ہی کی وجہ سے جل گئی تھی۔ اس دفعہ میں نہیں جلاؤں گی۔ موہنی نے کہا شاباش تجھے اب عقل آئی، میں نے پہلے ہی کہا تھا اس وقت تم مانتی ہی نہ تھیں۔ پریم نے کہا جانے بھی دو امّی آدمی کو کہو وہ جلائے گا۔ اور میں دیکھوں گی۔ موہنی بولی اچھی بات ہے یہ ٹھیک ہے آدمی جلاتا ہے اور تم دیکھنا قریب نہ جانا۔ پریم دیکھو

امی وہ انار کیسا اچھا ہے، پھولجڑی کتنی رنگین ہے۔ اور دیکھو دیکھو پیاری اوپر گئی آسمان کی طرف۔ رنگ برنگ کی چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ امی میں یہاں سے ہی دیکھتی رہوں گی۔ ہاتھ نہ لگاؤں گی۔

جتیندر پرشاد جوہر

عید کا چاند

کیا سبب ہے کہ خوشی چھائی ہے
آج دنیا میں بہار آئی ہے

مسکراہٹ ہے لبوں پر آتی
کیوں صبا پھرتی ہے آج اِتراتی

ننھے بچے بھی تو روتے نہیں آج
عید کے شوق میں سوتے نہیں آج

نئے کپڑے ہیں نیا ہے جوتا
کل ہر اک شخص بنے گا دولہا

عیدگاہ شوق سے کل جائیں گے سب
شکر خالق کا بجا لائیں گے سب

ہے ہر اک دل پہ مسرت چھائی
اور یہ بات زبان پر جاری

یہ دن اللہ نے دکھلایا ہے
عید کا چاند نظر آیا ہے

بنارسی لال

چند نیازیں اور اُن کے پکوان

حیدر آباد میں نذر و نیاز کثرت سے ہوتی ہیں اور ہر نیاز یا فاتحہ کے لئے خاص پکوان مقرر ہے اور اس دن وہی پکوان ہوتا ہے۔ اگرچہ نئی تعلیم پانے والے گھرانوں نے انھیں ترک کردیا ہے اور پہلے کی بہ نسبت اب ان کا رواج بہت کم ہوگیا ہے لیکن پھر بھی حیدرآباد میں یہ نیازیں بکثرت ہوتی ہیں۔ میں اپنے سب رسی بہن بھائیوں کی دلچسپی کے لئے ذیل میں چند مشہور نیازوں کا ذکر کرتی ہوں امید ہے کہ دوسرے مضمون نگار بھی اس سلسلے میں اپنی معلومات سے مستفید فرمائیں گے۔

محرم :۔

یہ تو سب کو معلوم ہے کہ محرم کا فاتحہ شہیدانِ کربلا کے نام سے ہوتا ہے۔ محرم کا چاند دیکھتے ہی شربت بنایا جاتا ہے اور اس کا سلسلہ ۱۲ محرم تک بکثرت اور اس کے بعد اربعین تک بھی جاری رہتا ہے اس فاتحہ کے خاص پکوان یہ ہیں۔ کھچڑی، شربت، روٹ، پونگے، بتی حلیم اور نُقل اور سکھ مکھ۔

داؤد پیغمبر کا مالیدہ :۔

جمادی الثانی کی ۲۲ تاریخ کو داؤد پیغمبر کا مالیدہ بنتا ہے۔ اسے، دال، شکر، اور گھی ہم وزن ڈال کر بناتے ہیں اور یہ اس قدر چکنا ہوتا ہے کہ زیادہ نہیں کھایا جاتا۔

رجب کے کونڈے :۔

رجب میں بھی ۲۲ تاریخ کو حضرت امام جعفر صادق کے نام سے فاتحہ ہوتا ہے اور اس کو کونڈوں کی نیاز کہتے ہیں۔ اس نیاز کا مخصوص پکوان پوریاں، کھیر، گھوڑے اور قبولی ہے۔ پوریاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک حلوے کی اور دوسری سوکھے میوے کی اور گھوڑے دراصل میٹھی ٹکولیاں ہوتی ہیں۔ اس مہینے میں مختلف گھروں میں مختلف تاریخیں مقرر ہیں۔ لیکن ۲۲ تاریخ سب سے زیادہ مقبول ہے۔

مُردوں کا فاتحہ :۔

ماہ شعبان میں ۱۴ تاریخ کو لوگ اپنے مرے ہوئے عزیز و اقارب کے نام سے فاتحہ دلواتے ہیں اور اس کا خاص پکوان تھولی اور روٹی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس تاریخ کو مرے ہوئے عزیزوں کی روحیں گھر میں آتی ہیں اور اس لئے اس دن پٹاخے یا کسی قسم کی دوسری آتشبازی چھوڑنے سے منع کیا جاتا ہے کیونکہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ روحیں پٹاخوں کے ڈر سے بھاگ جاتی ہیں۔ لیکن یہ تو سب توہمات ہیں۔

یہ نیازیں تو خاص مہینوں اور خاص تاریخوں سے متعلق ہیں لیکن بعض نیازیں ایسی بھی ہیں جن کے لئے کوئی مہینہ یا تاریخ مقرر نہیں۔ یہ نیازیں مرادوں یا منتوں کے پورا ہونے پر کی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک سہ منی ہے جو حضرت شاہ بو علی قلندرؒ کے نام سے ہوتی ہے۔ اس کو سہ منی اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں تین چیزیں ایک ایک من کی رکھی جاتی ہیں یعنی دہی روٹی، اور قورمہ اس پکوان میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ قورمہ میں کوئی ہڈی نہ ہو۔ اس پر بھی اگر کسی شخص کے کھانے میں ہڈی نکل آئے تو اسے بہت نیک بخت سمجھا جاتا ہے اور یہ ضروری خیال کیا جاتا ہے کہ وہ خود ویسی ہی نیاز کرے اگر صاحب قدرت نہ ہو تو آدھی یا پاؤ نیاز بھی کر سکتا ہے۔

اسی قسم کی دوسری نیازیں بھی ہیں مثلاً بی بی کی صحنک جو حضرت فاطمۃ الزہرؓ کے نام سے ہوتی ہے۔ اور منت کے کھجور کی نیاز بھی اکثر گھروں میں کی جاتی ہے۔

حبیبہ حبیب الرحمٰن

مولوی صاحب کی دعوت

گزشتہ چہارشنبہ کا واقعہ ہے شام کے کوئی چھ بجے ہوں گے ہم سب لوگ بنگلے پر بیٹھے ہوئے تھے اتنے میں چھوٹے بھائی جان دوڑتے ہوئے آئے اور کہنے لگے "سنئے سنئے مولوی صاحب آئے ہیں" "کہاں ہیں" ہم لوگوں نے پوچھا "نیچے باوا جان سے باتیں کر رہے ہیں" چھوٹے بھائی جان نے کہا۔ مدت سے مولوی صاحب تشریف نہ لائے تھے اور ہم مولوی صاحب کو دیکھنے ترس رہے تھے۔ خدا نے مولوی صاحب کو ڈھکیل کر بھیجا —— مولوی صاحب کی شادی ہوئے دو ماہ گزرے تھے انھوں نے شادی میں ہم لوگوں کو دعوت بھی دی تھی مگر کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ ہم لوگ نہ جا سکے۔ اس لئے ہم کو مولوی صاحب کی دلہن کو دیکھنے کی بھی بڑی خواہش تھی۔ ہم نے فوراً والدہ صاحبہ سے اجازت لی اور مولوی صاحب کے ہاں کہلا بھیجا کہ جمعہ کو وہ اپنی دولہن کے ساتھ تشریف لائیں اور کھانا وغیرہ بھی یہیں کھائیں۔ مولوی صاحب نے دعاؤں اور شکریہ کے ساتھ ہماری دعوت قبول کرلی۔ جمعہ کے دن کا ہم بے چینی سے انتظار کر رہے تھے مولوی صاحب کی دولہن کو دیکھنے کی آرزو رہ رہ کر دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ خدا خدا کرکے جمعہ آیا۔ صبح سے ہم لوگ بنگلہ پر کھڑے چلمنوں کی آڑ سے "مولوی صاحب کی سواری" کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے —— کوئی ساڑھے دس بجے ہوں گے، ہمارا دل خوشی سے اچھل پڑا جب ہم نے دیکھا کہ ایک زنانی ٹانگے کے سامنے مولوی صاحب ہاتھ میں ایک بڑی کشتی لئے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ٹانگہ پھاٹک میں داخل ہوا اور سارے بنگلے میں شور مچ گیا۔ "ارے مولوی صاحب کی دولہن آئیں" چھوٹے بھائی جان ادھر سے دوڑے کہ مولوی صاحب کا استقبال کریں، باجی اور میں ادھر سے گرتے پڑتے بھاگے کہ مولوی صاحب کی دولہن کو اتاریں —— غرض ہم لوگوں نے مولوی صاحب کی دولہن کی تعظیم کی اور بہت احترام کے ساتھ ان کو بنگلہ پر لائے۔ والدہ صاحبہ، ہم اور مولوی صاحب کی دولہن ایک جگہ بیٹھے ہوئے باتیں کررہے تھے۔ مولوی صاحب نیچے کے حصے میں والد سے گفتگو کرنے لگے۔ مولوی صاحب کی دلہن ہوں گی یہی کوئی سولہ سترہ سال کی۔ گوری تو نہیں البتہ کافی کھلا رنگ، کتابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، موزوں ناک نقشہ، بہرحال مولوی صاحب کی دولہن کافی نمکین تھیں۔ ہم نے سنا تھا کہ مولوی کو دولہن بیحد پسند ہے اور ان کو اپنی دولہن پر ناز ہے کئی مرتبہ بڑے بھائی جان اور چھوٹے بھائی جان کے سامنے مولوی صاحب نے اپنی دولہن کی سلیقہ مندی اور اطاعت کی بڑی تعریف کی تھی —— اب مولوی صاحب کی

دولہن کو جو دیکھا تو ہم نے ایک حد تک مان لیا کہ مولوی صاحب کا اپنی خوبصورت دولہن پر ناز کرنا بیجا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد کھانے کے لئے مولوی صاحب بھی اوپر تشریف لے آئے۔ میں اور باجی نے مولوی صاحب کو بڑے ادب سے سلام کیا اور مولوی صاحب نے دعائیں دیں اور نہایت شفقت سے گفتگو کرنے لگے مجھے فوراً وہ وقت یاد آگیا جب کہ آج سے کوئی چار سال پہلے ان ہی مولوی صاحب سے ہماری روح کانپتی تھی اور معمولی معمولی غلطی کے لئے سزا ملتی تھی۔ باجی نے پڑھتے پڑھتے میری طرف دیکھا کہ گوشمالی۔ بڑے بھائی جان سے کسی نے کہہ دیا تھا تو بڑے بھائی جان نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ مولوی صاحب آپ نے سنا چار مینار دھوپ اور پانی سے خراب ہو رہا تھا تو اس پر لال اطلس کا غلاف چڑھا یا گیا ہے کیا یہ صحیح ہے اور مولوی صاحب نے غصے میں آکر کہ ان سے مذاق کیا جا رہا ہے بھائی جان کو پیٹ ڈالا ـــــ مگر اب وہی مولوی صاحب تھے کہ ہم سے اتنی شفقت سے گفتگو کر رہے تھے۔ چار بجے مولوی صاحب اور ان کی "دولہن کو چائے پلانے کے بعد پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور اماں نے دولہن کے ہاتھ میں سلامی دی مولوی صاحب خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے اور ساتھ ہی کنکھیوں سے اپنی دولہن کو دیکھ رہے تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی دولہن کی کچھ سرسری تعریف بھی کی۔ بے چاری دولہن جھیپ رہی تھی۔ غرض شام کے کوئی چھ بجے مولوی صاحب اور ان کی دولہن اپنے گھر کو سدھارے جاتے وقت مولوی صاحب نے ہم لوگوں کو بہت کچھ دعائیں دی۔ مولوی صاحب کے جانے کے بعد ان کے اور ان کی دولہن کے متعلق بہت کچھ باتیں ہوئیں۔ کسی نے کہا کہ مولوی صاحب تو پچاس برس کے اور دولہن اتنی جوان ـــــ والدہ نے مولوی صاحب کی، دولہن کی طبیعت کی تعریف کی ہم لوگوں نے ناک نقشہ کی، بڑے بھائی جان اور چھوٹے بھائی جان نے مولوی صاحب کی قسمت کی، مگر ایک منہ پھٹ ماما نے صاف کہہ دیا ـــــ "مٹی ٹڑو دونوں کا کچھ جوڑا نہیں ہے" "چلو چپ بیٹھو" باجی نے ماما کو ڈانٹ بتائی۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب نے جو کشتی لائی تھی اس کو کھولا گیا تو اس میں مٹھائی اور آم تھے۔ انھوں نے ناحق تکلیف کی ـــــ مولوی صاحب تو اپنی دولہن سے بہت خوش خدا جانے دولہن بھی خوش ہے یا نہیں ہماری دلی دعا ہے کہ مولوی صاحب اور ان کی دولہن ہمیشہ خوش رہیں۔

سیدہ حسن علیخاں

اطلاع ۔۔ جن خریداروں کے چندے ختم ہو چکے ہیں۔ براہ کرم وہ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر روانہ کردیں یا دفتر کو وی پی کرنے کا آرڈر دیں۔ اگر ایک ہفتہ کے اندر کوئی جواب نہ ملے تو رسالہ وی پی کردیا جائے گا۔ وی پی حاصل کرنا آپکا اخلاقی فرض ہوگا۔

محنت اور کوشش

اس پُر آشوب زمانے میں ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری پستی کی وجہ کیا ہے۔ ہماری جہالت کے اسباب کیا ہیں۔ ہم کیوں ذلت و گمنامی کے غاروں میں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ ہم کیوں دنیا کی نظروں میں ذلیل اور ناکارہ ثابت ہو رہے ہیں۔ آج ہم کیوں دنیا کی ترقی یافتہ قوموں میں سب سے پیچھے ہیں۔ اگر دنیا کے بڑے بڑے لوگوں کے بچپن کے حالات پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ اُن میں اکثر غریب تھے۔ لیکن آخر میں اپنی محنت کے پھل سے کچھ سے کچھ ہوگئے۔ دنیا کا کوئی کام ایسا نہیں جو محنت و کوشش کے آگے غیر ممکن ہو۔ جس نے محنت و کوشش کی اس نے اس کا پھل بھی پایا۔ مثلاً چند نام پیش کئے جاتے ہیں۔

ہومر۔ یونان کا شاعر جو دنیا میں مشہور ہے آج دنیا اِس کو سب سے بڑا شاعر سمجھتی ہے۔ مگر اس کے بچپن کی حالت یہ ہے کہ اس کا باپ معمولی کسان تھا اور بڑی مشکل سے گزر بسر کرتا تھا۔

ورجل اٹلی کا بہت ہی بڑا آدمی تھا۔ آج اٹلی والے اس کا نام لے کر فخر کرتے ہیں لیکن یہ ایک قلی کا بیٹا تھا۔

شکسپیر۔ انگلستان کا سب سے بڑا شاعر اور فلسفی سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک قصائی کا بیٹا تھا۔

نپولین اعظم۔ ایک معمولی سپاہی کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ لیکن مرتے وقت فرانس کا بادشاہ تھا۔

جوزیفائن۔ ایک تمباکو فروخت کرنے والے کی لڑکی تھی جو اپنی قابلیت سے فرانس کی ملکہ ہوگئی۔

جنرل گرانٹ۔ ایک غریب چمار کا لڑکا تھا۔ لیکن اپنی محنت و کوشش سے حکومتِ امریکہ کا صدر (بادشاہ) منتخب ہوا۔

کیتھرائن۔ جو شاہی فوج میں ایک خادمہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ روس کی ملکہ بن بیٹھی۔

غرض کہ اس قسم کے سیکڑوں لوگ غریب گھرانوں میں پیدا ہوئے۔ لیکن جب مرے تو دنیا کے سب سے بڑے آدمی تھے۔ شاید بعضوں کا خیال ہوگا کہ وہ زمانہ دوسرا تھا۔ اب ایسا نہیں ہوسکتا۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔

ترکی کے مصطفیٰ کمال، اٹلی کے مسولینی .... کا نام تو سنا ہوگا۔ یہ کون تھے؟ مصطفیٰ کمال مرحوم (جو اتاترک یعنی ترکوں کے باپ کہلاتے ہیں) ایک معمولی سپاہی زادہ تھے۔ مسولینی ایک لوہار کا لڑکا ہے .... رضا شاہ پہلوی ایران کا بادشاہ ایک معمولی سپاہی تھا۔ اور چین کا چانگ کائی، روس کا اسٹالن، برطانیہ کے میکڈانلڈ، بالڈون، چمبرلین۔ جو یکے بعد دیگرے سرکار برطانیہ کے وزیر اعظم ہو گئے یہ کیا تھے؟ یہ بھی ایک معمولی درجہ کے آدمی تھے لیکن اپنی انتھک کوششوں اور محنتوں سے ان لوگوں نے اپنی عزت اور اپنے اقتدار کو اتنا بڑھایا کہ آج دنیا کی حکومتیں ان کے سامنے اپنا سر جھکا رہی ہے۔ اس لئے اپنے ارادوں کو بلند رکھو۔ ہمت سے کام لو۔ محنت اور کوششوں سے کمال پیدا کرو تو ضرور محنت اور کوشش کا پھل تم کو بھی ملے گا۔

محمد تاج الدین (کلیانی)

نافرمان فرشتہ

جھمر جھمر مینہ برس رہا تھا۔ اور پانی کے ننھے ننھے قطرے کنول کے پتوں پر ناچ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس ایک پارہ ہے کہ رہ رہ کر تھرک رہا ہے۔

ایسے وقت ایک ننھا فرشتہ آسمان سے جھانک رہا تھا۔ اسے ہزاروں، لاکھوں بجلی کے چراغ جگمگ جگمگ کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ دیکھ کر ننھے فرشتے کے دل میں خوبصورت دنیا کی سیر کا خیال ہوا۔ دوڑ کر ایک دوسرے فرشتے کے پاس گیا۔ اور کہا "دوست! دیکھتے ہو۔ آج دنیا کتنی بھلی دکھائی دے رہی ہے" دوست نے کہا" ہاں۔ دنیا دور ہی سے بھلی معلوم ہوتی ہے۔ نزدیک جاکر دیکھو تو وہ بڑی بری خراب ہے" ننھا فرشتہ یہ سن کر کسی قدر پریشان ہوگیا۔ اور سوچنے لگا کہ آخر دنیا قریب سے بری کیوں ہوگی۔ جب اسے ان باتوں پر یقین نہ آسکا تو وہ دوڑتا ہوا اپنے دوسرے دوست کے پاس گیا۔ اس نے کہا "کیوں یہ تم ہانپ کیوں رہے ہو۔ کیا کوئی ضروری کام ہے؟" ننھا فرشتہ اس وقت اس سے کچھ کہہ نہ سکا۔ اس لئے کہ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ البتہ تھوڑی دیر دم لے کر کہا۔" آپ نے سُنا۔ ابھی میرے ایک دوست یہ کہتے تھے کہ دنیا دور ہی سے اچھی ہے لیکن اسے نزدیک جاکر دیکھو تو بڑی خراب ہے۔ کیا یہ سچ بات ہے؟" یہ سن کر ننھے فرشتے کا دوست کچھ دیر کے لئے خاموش ہوگیا۔ پھر اس نے کہا۔"ہاں۔ دنیا بڑی خراب جگہ ہے"۔ لیکن ننھا فرشتہ یہ سن کر خاموش نہ رہ سکا۔ اس کے دل میں دنیا کی سیر کا خیال چٹکیاں لے رہا تھا۔ پھر اس نے بے چین ہوکر کہا" لیکن یہ آپ نے کیسے معلوم کرلیا کہ دنیا نزدیک سے بہت خراب ہے"۔ جب فرشتے نے دیکھا کہ وہ کسی طرح خاموش نہیں رہتا تو اس سے اپنا دنیا کے سفر کا واقعہ سنانے لگا۔ فرشتے نے کہا" آج سے سولہ سال پہلے کا ذکر ہے اسی طرح بیٹھے بیٹھے ایک دن میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ چلو آج دنیا کو ذرا نزدیک سے دیکھ آئیں۔ یہ خیال کر کے میں اسی وقت دنیا کی طرف چل پڑا۔ اور تھوڑی دیر میں ایک عالیشان محل کی چھت پر اتر گیا۔ وہ محل کسی بڑے بادشاہ کا تھا۔ جب میں اس کے اندر داخل ہوا۔ تو وہاں مجھے کئی خوبصورت خوبصورت چیزیں دکھائی دیں۔ محل کے دروازے اور اس کی دیواروں پر رنگا رنگ کے بیل بوٹے اور ہیرے جواہر لگے ہوئے تھے۔ اور بجلی کی روشنی سے سارا محل جگمگ جگمگ کر رہا

تھا۔ کمروں میں نرم نرم صوفوں پر کچھ انسان بیٹھے خوشیاں منا رہے تھے۔ یہ سن کر ننھے فرشتے نے کہا" پھر اتنی اچھی دنیا خراب کیوں ہے؟" فرشتے نے کہا" ابھی یہ قصہ تو سن لو، اس کے بعد تم جو چاہو پوچھو۔ میں اس کا جواب دوں گا" اس کے بعد فرشتے نے کہا" ہاں تو اس عالیشان محل کو اچھی طرح دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ اور پھر وہاں سے شہر کی سیر کو نکل پڑا۔ ابھی تھوڑی دور گیا تھا کہ اتفاق سے مجھے بہت سے انسان دکھائی دیے اور ایک بوڑھا میرے قریب سے گزرا۔ یوں تو اس کی عمر کوئی زیادہ نہیں تھی۔ مگر کمزوری کی وجہ سے اس کے ہاتھ پیر میں رعشہ پڑ گیا تھا۔ وہ کمزور انسان اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے لکڑیوں کا ایک وزنی گٹھا سنبھالے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے اسی وقت کہا" کیوں بھائی تم نے اتنا وزن کیوں اٹھا لیا ہے؟" یہ سن کو کمزور انسان نے کہا" بھائی ہم غریب ہیں۔ اگر وزن نہ اٹھائیں تو کھائیں کیا؟۔ اسی محنت مزدوری سے جو کچھ مل جاتا ہے بس اسی سے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پلتا ہے"۔ یہ کہہ کر غریب انسان تو چلا گیا۔ مگر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دنیا میں ہمدردی کا نام نہیں وہاں امیر آدمی عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور غریبوں کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ اس لئے یہ دنیا بڑی خراب ہے"۔

یہ قصہ سنا کر وہ تو اپنے کام میں مشغول ہو گیا اور ننھا فرشتہ چپ چاپ وہاں سے واپس ہو گیا اب وہ ان باتوں پر غور کرنے لگا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کا دوست اس کو دنیا کی سیر سے اس لئے منع کر رہا ہے کہ وہاں غریبوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اس نے خیال کیا۔ میں تو غریب نہیں ہوں۔ مجھے غریبوں سے مل کر کیا کرنا ہے، اور ساتھ ہی آسمان سے نکل پڑا۔ اڑتے اڑتے تھوڑی دیر میں وہ ایک اچھے سے شہر میں جا پہونچا۔ اچھے اچھے مکانات اور محلات دیکھے۔ خوبصورت خوبصورت باغوں کی سیر و تفریح کی۔ اور اس کے بعد ایک محلے میں داخل ہوا۔ اتفاق سے وہاں چند اوباش لڑکے کھیل رہے تھے۔ یہ بھی آخر بچہ ہی تھا۔ اس لئے بچوں کا کھیل دیکھنے کے لئے رک گیا۔ دل میں خواہش ہوئی کہ چلو ان کے ساتھ مل جل کر کھیلیں۔ مگر ان سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اتنے میں ایک لڑکے نے کہا" آؤ دوست چور کا کھیل کھیلیں۔ خاموش کیا کھڑے ہو۔"
ننھا فرشتہ یہ سن کر بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اس کی منہ مانگی مراد پوری ہوئی تھی۔ پھر وہ جلدی سے ٹوپی جوتا، اتار کھیل میں لگ گیا۔ اس واقعہ کے بعد سے ننھے فرشتے کا دل برے لڑکوں کی صحبت میں ایسا لگ گیا کہ پھر وہ آسمان کو بالکل ہی بھول گیا۔ اور بچپن سے چوری کے

کھیل کھیل کر جب وہ بڑا ہوا تو پکا چور ہوگیا اور کئی دفعہ جیل کی ہوا کھائی۔

عزیز بچو! ننھے فرشتے کی کہانی سے تم کئی سبق لے سکتے ہو۔ ایک تو یہ کہ بری صحبت میں بیٹھنے سے آدمی کیا فرشتہ بھی چور اور بدمعاش ہو جاتا ہے۔ دوسرے وہ لوگ جو بڑوں کا کہا نہیں مانتے انھیں فرشتے کی طرح زک اٹھانی پڑتی ہے۔ اور تیسرے یہ کہ فرشتے دنیا میں غریب آدمیوں کا برا حال دیکھ کر اسے خراب سمجھتے ہیں۔ اس لئے تمھیں چاہیے کہ ہمیشہ نیک اور اچھی صحبت اختیار کریں بڑوں کا کہا مانو اور غریبوں اور محتاجوں کی مدد کیا کرو تاکہ تمھاری دنیا فرشتوں کے نزدیک ایک اچھی جگہ کہلائے۔

افضل عابدی

مناجات

ہو علم اور ہنر سے ہر مرد و زن کا چرچا
یارب رہے ہمیشہ ملکِ دکن کا چرچا

اس ملک کی زمیں کو حاصل ہو ایسی رفعت
بھولے ہر ایک انساں چرخِ کہن کا چرچا

ہو اتفاق و الفت ملکِ دکن میں ایسی
صادق ہو جس کے آگے اک جان و تن کا چرچا

پیدا ہوں پھر دکن میں ثانیٔ میرؔ و غالبؔ
تازہ ہو پھر جہاں میں باغِ سخن کا چرچا

دارائے ہفت کشور یارب ہوں شاہ عثماں
ہوتا ہے چرخ ہفتم شاہِ دکن کا چرچا

تیری زبانِ مبارک مقبول یہ دعا ہو
معصومؔ ہو جہاں میں تیرے سخن کا چرچا

سید عباس حسینی معصوم

شہنشاہِ اورنگ زیب

شہنشاہِ عالمگیر کا نام تو آپ نے ضرور سنا ہوگا۔ ان کا اصلی نام غازی محی الدین اورنگ زیب ہے ہندوستان پر سیکڑوں بادشاہوں نے حکومتیں کیں۔ لیکن اورنگ زیب کا نام بہت مشہور ہوا۔ بچپن ہی سے یہ بہت ذہین تھے۔ جب یہ بیس برس کے تھے تو ان کے والد شاہ جہاں نے ان کو دکن کا صوبہ دار بنا دیا۔ اور وہاں کے سارے انتظامات ان کے سپرد کر دیے انھوں نے اس چھوٹی سی عمر میں دکن کا بہت اچھا انتظام کیا۔ دولت آباد پہنچ کر بہت سارے قلعے اور عالی شان عمارتیں بنوائیں بڑے بڑے بازار اور شہر آباد کئے، ہماری ریاست کا مشہور شہر اورنگ آباد ان ہی کا بسایا ہوا ہے۔ اور ان ہی کے نام سے مشہور ہے۔ جب باپ کا انتقال ہوا تو باپ کی جگہ بیٹے نے تخت سنبھالا اور شہنشاہِ ہند کہلائے۔ اس وقت عالمگیر کی عمر چالیس برس کی تھی ان کے تخت پر بیٹھنے کے بعد ان کے دوسرے بھائی بادشاہت کے لالچ میں ان سے لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ ایک عرصہ تک بھائی بھائی میں خوب لڑائی ہوتی رہی۔ لیکن آخر میں جیت اورنگ زیب کی رہی۔ لڑائیوں سے فرصت پاکر یہ اپنی سلطنت کے انتظام اور توسیع کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہ کام بہت مشکل تھا۔ اس کے لئے عالمگیر کو بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں لیکن آخر میں ہمیشہ فتح اورنگ زیب ہی کو نصیب ہوئی۔

عالمگیر کے زمانے میں مغلوں کی سلطنت خوب پھلی پھولی اور ان کا ستارا خوب چمکا۔ مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک سارے ہندوستان پر اس مغل شہنشاہ کا جھنڈا لہراتا تھا۔ عالمگیر کو صرف ملک فتح کرنے کا ہی شوق نہ تھا بلکہ وہ ملک اور رعایا کی بھلائی کے لئے خوب جی کھول کر روپیہ خرچ کرتے تھے عالمگیر کو اپنا کام دوسروں پر چھوڑنے کی عادت نہ تھی وہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی خود ہی اپنے ہاتھ سے کرتے تھے ان کا سارا وقت ملک کی بہتری کی نئی نئی اور اچھی اچھی تدبیریں سوچنے میں گزرتا۔ لوگوں کی فریاد خود سنتے اور خود انصاف کرتے ان کے زمانہ میں ہر امیر اور غریب چین سے زندگی بسر کرتا تھا۔

بادشاہ کو پڑھنے لکھنے کا بڑا شوق تھا خود پڑھے لکھے تھے اور پڑھے لکھوں کی قدر کرتے تھے ان کے دربار میں اچھے اچھے ادیبوں کا جمگھٹ رہتا۔ لیکن بچو تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اورنگ زیب کو کھیل کود کا بالکل شوق ہی نہ تھا۔ نہیں۔ اورنگ زیب تو بہت بہادر تھے وہ مردانہ کھیلوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ شاہجہاں ہاتھیوں کی لڑائی دیکھ رہے تھے۔ عالمگیر بھی کھڑے ہوئے تھے۔ مست ہاتھی لڑ رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہاتھی بگڑ گیا۔ ایک ہلڑ مچ گیا۔ ایک یہاں بھاگا، ایک وہاں بھاگا۔ لیکن اورنگ زیب اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ ستون کی طرح وہیں کھڑے رہے۔ ہاتھی ان ہی کی طرف لپکا لیکن اورنگ زیب نے اس ہاتھی کا بڑی مردانگی سے مقابلہ

کیا اور بچ گئے یہ تو صرف چھوٹا سا واقعہ ہے۔ ان کی زندگی ایسے بہت سارے واقعوں سے بھری پڑی ہے۔ جب تم بڑے ہو گے تو خود کتابوں میں پڑھ لوگے۔

اورنگ زیب نے انچاس برس حکومت کی، اور نواسی سال کی عمر میں ہندوستان کے اس سب سے بڑے شہنشاہ نے انتقال کیا۔ خلد آباد کی چھوٹی سی بستی میں یہ شہنشاہ ہمیشہ کے لئے سنگِ مرمر کی ایک قبر کے نیچے سو رہا ہے۔

چاروں طرف سنگ مرمر کی چار دیواری ہے۔ قبر کے قریب ایک کتبہ ہے جس پر اس شہنشاہ کا نام کندہ ہے۔ اور دوسرا ایک سیاہ پتھر ہے جس پر کلمطیبہ لکھا ہوا ہے۔ قبر کے بیچوں بیچ ایک چھوٹا سا درخت قبر پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ کہنے کو تو اورنگ زیب کو مرے ہوئے آج تین سو برس ہو گئے لیکن ان کا نام اور کام آج تک زندہ ہے اور رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔

صفی اللہ
(چادر گھاٹ ہائی اسکول)

ناقابلِ اشاعت مضامین اور نظمیں

حسب ذیل مضامین اور نظمیں بچوں کے سب رس میں شائع نہیں ہوں گے۔ مضمون نگار بھائی اور بہن ٹکٹ بھیج کر اپنے مضامین اور نظمیں حاصل کر سکتے ہیں۔

مضامین :- میری حکومت۔ مدرسہ کا پہلا دن۔ ان آنکھوں نے کیا دیکھا۔ ایک قصہ۔ سلور جوبلی۔ کام کی باتیں۔ اچھی کہانی۔ جھوٹ کی سزا۔ قاضی صاحب۔ میری کہانی۔ بچپن اور جوانی۔ کھیل کی ضرورت۔ گدھے کی کہانی اسی کی زبانی۔ میں سوچتا ہوں۔ طالب علم کے اخلاق۔ پابندیٔ رسوم۔ ایک وفادار گھوڑا۔ غریب ہی بہتر ہیں۔ بھوت۔ ہمارا کنگر۔ پارسا شہزادہ۔ ایک غریب کی داستان۔ ہوا اور سورج کی لڑائی۔ ناگپور کا سفر۔ ماں باپ۔ ہماری تعطیلات۔ بچہ۔ ایک بندر اور بلی کی کہانی۔ فضیلت علم۔ ایک بچہ کا خواب۔ مسلما نو غفلت کی نیند سے جاگو۔ بے وفا کے نام۔ کاش میں اس زمانہ میں پیدا ہوتا۔ نشہ۔ مرزا کا خواب۔ ایک عجیب افسانہ۔ نشہ بازی۔ معظم جاہی مارکٹ۔ ایک دن کا روزنامچہ۔ جنون کا شہزادہ۔ اخلاق۔

نظمیں :-
ننھی چڑیا۔ علم کے دیوتا سے۔ قانون۔ حسد حسّمد۔ غزل۔ پیاری اماں کی جدائی۔ بچہ۔ نعمت سے۔ غزل۔ طلباء سے خطاب۔ پروانہ۔ بارش۔ جوش کہن سوز فرقت۔

(باقی آئندہ)

نشان ٹپہ آصفیہ ۱۵۳

ٹیلیفون نمبر ۲۲۰۹

رجسٹرڈ ایم ۳۹۵۰

ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں

	صفحات	قیمت آنہ	قیمت روپیہ
با	۸۰	۸	
غالب	۲۴	۸	
ملک	۳۸	۴	
یم گولکنڈہ	۳۳۰	۸	۳
کن نمبر (۷۸ تصاویر)	۱۲۸		۲
ارمغان جذب	۱۲۰	۱۲	
سوتیلی ماں	۴۸	۴	
سر سید احمد خاں	۱۶	۲	
سر سالار جنگ	۴۸	۶	
مغربی تصانیف کے اردو تراجم	۱۴۵	۴	۱
محبت کی چھاؤں	۱۳۲	۴	۱
اقبال نمبر	۱۶۸	۴	۱
سائنس کے کرشمے	۱۱۲		۱
رسائل طبیہ			
شعرائے عثمانیہ	۲۳۰	۱۲	۲
مکتوبات شاد عظیم آبادی	۳۰۰	۸	۲
دادا بھائی	۱۶	۲	
اردو نامہ	۲۰۰		۲
ارسطو جاہ	۶۵	۶	
عماد الملک	۴۰	۶	
اردو دانی کی پہلی کتاب	۵۶	۶	۲
" دوسری کتاب	۵۶	۶	۴
محمد حسین آزاد	۲۰۰		۲
	۱۲۰	۴	۱
		۸	
مقدمہ تاریخ دکن	۱۴۴		۱
پانی کی کہانی	۴۸	۶	

	صفحات	قیمت آنہ	قیمت روپیہ
تاریخ ادب اردو	۱۷۶	۴	۱
ورڈ سورتھ اور اس کی شاعری	۱۸۴	۸	۱
ہوش کے ناخن	۹۴		۱
یوسف ہندی قید فرنگ میں	۸۹		۱
ٹیگور اور ان کی شاعری	۱۲۸	۸	۱
متاع سخن	۱۲۴	۱۲	
کیف سخن	۱۲۲	۱۲	
بادۂ سخن	۱۲۷	۱۲	
سراج سخن	۱۵۲	۱۲	
ایمان سخن	۱۲۰	۱۲	
فیض سخن	۱۴۴	۱۲	
مرقع سخن جلد اول صفحہ (۴۰۰) ۵۰ تصاویر			۵
" " دوم " "			۵
نقد سخن صفحہ	۱۷۵		۱
نذر ولی	۶۴۲	۸	۲
گریہ و تبسم	۱۹۲		۲
مشاہیر قندھار دکن	۱۸۴		۱
من کی دنیا	۱۴۵		۱
مدراس میں اردو	۱۹۶	۸	۱
محرم نامہ	۱۱۲		۱
نذر دکن	۱۰۴	۴	۱
روح غالب	۲۴۰	۸	۲
عاصم	۲۰۰	۴	۱
دفتری معلومات		۶	
آبدوز کشتیاں اور سرنگ		۶	
اردو و ملئوی کا ارتقا		۱۲	۱

حیدرآباد پرنٹنگ ورکس